

تفسیر، حدیث، فقہ، تصوف اور اسرار شریعت کا حسین مجموعہ
ایک عظیم انسائیکلو پیڈیا

جلد چہارم

آحیاء علوم الدین

جدید اور با محاورہ سلیس ترجمہ

مذاہق العارفین

مُصَنَّف

حجتہ الاسلام امام ابو حامد محمد الغزالیؒ

مترجم: مولانا ندیم الواجهدی فاضل دیوبند

دارالاشاعت

اردو بازار، کراچی ۷ فون ۲۶۳۱۸۶۱

فہرست مضامین

جلد چہارم

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
۲۷	وجوب توبہ کی عمومیت کا سبب	۱۷	کتاب التوبہ
۲۸	ایک شے کا جواب	۱۷	توبہ کا بیان
۲۹	ہر حال میں توبہ کا وجوب	۱۷	توبہ کی ضرورت
۳۲	قبول توبہ شرائط کی صحت پر منحصر ہے	۱۷	پہلا باب
۳۳	اطاعت و معصیت کی تاثیر	۱۷	توبہ کی حقیقت اور تعریف
۳۳	قبولیت توبہ کے دلائل	۱۸	توبہ کی تعریف
۳۶	کیا اللہ تعالیٰ پر توبہ قبول کرتا واجب ہے	۱۸	علم، حل اور عمل
۳۶	قبول توبہ میں شک کی وجہ	۱۸	توبہ اور ندامت
۳۶	دو سرا باب	۱۹	توبہ کا وجوب اور اس کے فضائل
۳۶	گناہوں کا بیان	۱۹	وجوب کے معنی
۳۷	گناہ کی تعریف	۲۱	آدم علیہ السلام کو تہنیت
۳۷	بندوں کے اوصاف کے لحاظ سے	۲۱	اقتیاد و قدرت کا مسئلہ
۳۷	گناہوں کی قسمیں	۲۳	خلق قضاء الہی کا پابند ہے
۳۷	اوصاف اربعہ کی فطری ترتیب	۲۳	ایک تناقض کا ازالہ
۳۷	حقوق اللہ اور حقوق العباد	۲۳	توبہ فوری طور پر واجب ہے
۳۸	صغیرہ و کبیرہ گناہ	۲۳	ایمان کی ستر قسمیں
۳۹	کبیرہ کے معنی	۲۵	گناہ گار مومن کی مثال
۴۰	کبائر کی تقسیم	۲۶	علوم مکاشفہ اور علوم معاملہ لازم و طہوم ہیں
۴۱	کبائر کے تین مراتب	۲۶	وجوب توبہ کی عمومیت
۴۳	سو کھانا کبیرہ ہے یا نہیں	۲۶	محل کب کامل ہوتی ہے
۴۳	گالی دینا اور شراب خوری وغیرہ	۲۷	شہوت محل پر مقدم ہے
		۲۷	توبہ فرض میں ہے

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
۵۹	تیسرا درجہ۔ نجات یافتگان		
"	چوتھا درجہ۔ اصحاب فلان	۴۴	ایک اعتراض کا جواب
۶۰	صفیر و گناہ کبیرہ کیسے بنتا ہے	"	ایک آیت کی تشریح
"	پہلا سبب اصرار و مواعظت		
۶۱	دوسرا سبب گناہ کو معمولی سمجھنا	۴۶	اعزوی کے درجات کی تقسیم
"	مومن گناہ کو بڑا سمجھتا ہے	۴۶	دنیاوی اعمال پر
۶۲	تیسرا سبب گناہ سے خوشی	"	تعبیر خواب کی حقیقت
۶۲	چوتھا سبب اللہ تعالیٰ کے علم کا سارا لینا	۴۷	انبیاء علیہم السلام کا کلام
"	پانچواں سبب گناہ کا اظہار و اعلان	"	آخرت کے سلسلے میں وارد مثالیں
۶۳	چھٹا سبب مقتدی کا گناہ کرنا	۴۸	خواب سچے کیوں ہوتے ہیں؟
۶۴	تیسرا باب	۴۸	بعضوں پر آخرت کے درجات کس طرح
"	توبہ کی شرائط اور	"	تقسیم ہوں گے؟
"	آخر عمر تک اس کی بقا	۴۹	قیامت میں لوگوں کی قسمیں
۶۴	کمال توبہ	۴۹	پہلا درجہ۔ ہا لکین
"	ندامت کی پہچان اور کمال دوام	۵۱	لطیفہ قلب
"	گناہوں کی لذت کیسے دور ہو؟	۵۲	دوسرا درجہ معذرتین
۶۵	قصد کا تعلق بتینوں زمانوں سے ہے	۵۳	آخرت کے عذاب کی شدت شدت
۶۵	اطاعت میں قصور کا تذکرہ		اور کیفیت میں اختلاف
۶۶	معاصی کا تذکرہ	"	عذاب عدل کے ساتھ ہوگا
۶۷	حقوق العباد میں کوتاہی کا تذکرہ	۵۴	ایمان کی دو قسمیں
۶۸	حقوق العباد کی تفصیل	"	بعض ارکان کا تذکرہ
"	لش سے متعلق حقوق	۵۵	اصناف کی حقیقت
۶۹	قصص اور حد و ذل و غیرہ	۵۶	انبیاء و اولیاء کی آزمائش
"	دل کو اپنے اپنے کا جرم	"	معرفت الہی حواس کے دائرے سے خارج ہے
۷۰	مچھلی امٹوں کے ایک شخص کا قصہ	"	یہ امانت کیسی ہے؟
۷۱	مستقبل سے متعلق قصد	۵۷	دو رخ سے صرف موند نکلیں گے
"	صحت کے اجمل کی تفصیل	۵۷	ظلم و دخل جنم کا بڑا سبب
۷۲	شرک اور ندامت کا فرق	۵۸	یہ احکام ظاہر پر مبنی ہیں

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
۹۱	پہلی قسم	۷۲	بعض گناہوں سے توبہ کرنے کی تین صورتیں
۹۲	دوسری قسم	۷۳	عین کی زنا سے توبہ
۹۴	تیسری قسم	۷۵	دل سے معصیت کی ظلمت کیسے دور ہو
۹۶	چوتھی قسم	۷۶	دونوں میں سے کون افضل ہے؟
۹۷	ایک سوال کا جواب	۷۷	مجاہدہ مقصود نہیں ہے
۹۹	صبر سے علاج	۷۸	فضیلت میں ایک اور اختلاف
۱۰۰	جوش شہوت کے دو سبب	۷۹	حضرت داؤد علیہ السلام کے واقعے
۱۰۱	مصر علی المعصیت کا ایمان	۸۰	سے استدلال
۱۰۲	مومن گناہ کیوں کرتا ہے؟	۸۱	دوام توبہ میں لوگوں کی قسمیں
۱۰۳	مذکورہ اسباب کا علاج	۸۲	پہلی قسم
۱۰۴	ایک سوال کا جواب	۸۳	دوسری قسم
۱۰۵	کتاب الصبر والشکر	۸۴	تیسری قسم
۱۰۶	صبر اور شکر کا بیان	۸۵	چوتھی قسم
۱۰۷	پہلا باب	۸۶	ارتکاب معصیت کے بعد
۱۰۸	صبر کا بیان	۸۷	نیک عمل کرنے کا طریقہ
۱۰۹	صبر کی فضیلت	۸۸	ایک اعتراض کا جواب
۱۱۰	احادیث	۸۹	توبہ و استغفار کے درجات
۱۱۱	آثار	۹۰	توبہ ہر حال میں مؤثر ہے
۱۱۲	صبر کی حقیقت اور اس کے معنی	۹۱	خلق کی تین قسمیں
۱۱۳	صبر مقام دین۔ منہل سلوک	۹۲	چوتھا باب
	معرفت	۹۳	دوائے توبہ اور گناہ پر
	باعث دین اور باعث شہوت	۹۴	اصرار کا طریق علاج
	حالات اور ثمر	۹۵	فغلت کی ضد علم
	کراہا کا تین کے فرائض	۹۶	آدمی کی دو قسمیں
	کراہا کا تین کے صحیفے	۹۷	علماء کا فرض
	بدن کی زمین سے مشابہت	۹۸	دل کے امراض زیادہ کیوں ہیں؟
	قیامت صغریٰ اور قیامت کبریٰ کا فرق	۹۹	رجاء اور خوف
	مقصود کی طرف واپسی	۱۰۰	دعوت کا صحیح طریقہ

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
۱۳۵	علم کے ساتھ تین عمل	۱۱۳	صبر نصف ایمان کیوں ہے؟
۱۳۶	دو سراپاب	۱۱۴	باعث ہوی کی دو قسمیں
"	شکر کا بیان	"	صبر کے مختلف مفہوم، مختلف نام
"	پہلا رکن۔ نفس شکر	۱۱۵	قوت اور ضعف کے اعتبار سے صبر کی قسمیں
"	شکر کی فضیلت	۱۱۶	صبر کی دو اور قسمیں
۱۳۹	شکر کی حقیقت	"	مقام رضا
"	پہلی اصل۔ علم	۱۱۸	صابرین کے تین درجے
۱۴۰	توحید سے شرک کی نفی	"	صبر کا حکم
"	درمیانی واسطے مضطربین	"	بندہ ہر حال میں صبر کا محتاج ہے
۱۴۱	دوسری اصل۔ حال	"	خواہش کے موافق احوال
۱۴۲	تیسری اصل۔ فرح کے بموجب عمل	۱۱۹	ناموافق حالات
۱۴۳	شکر کی مختلف تشریحات	"	پہلی قسم۔ اختیاری احوال
"	اللہ تعالیٰ کے حق میں شکر کے معنی کی وضاحت	۱۲۰	اطاعت پر صبر
۱۴۴	نظریہ وحدت یا فناء نفس	۱۲۱	معصیت پر صبر
۱۴۶	مکر، مشرک، موحّد	۱۲۲	دوسری قسم۔ ابتدائیں غیر اختیاری پھر اختیاری
۱۴۷	رسول خدا کی توحید	۱۲۳	تیسری قسم۔ اختیاری احوال
۱۴۸	مقصد کی طرف رجوع	۱۲۵	کیا صبر اضطراری ہے یا اختیاری؟
۱۴۹	فضل۔ عطائے خداوندی	۱۲۶	موءے پر دنا صبر کے خلاف نہیں
"	خلق۔ خدا کے عمل کا عمل ہے	"	معصیتوں کو چھپانا مکمل صبر ہے
۱۵۰	اختیار نہیں تو عمل کا حکم کیوں؟	۱۲۷	شیطان کے دو لشکر
"	اللہ تعالیٰ کی پسندیدہ	۱۲۸	صبر پر دو اور
"	اور ناپسندیدہ چیزیں	"	اس پر اعانت کی صورت
۱۵۱	حکمت کی دو قسمیں	"	مانع صبر اسباب
۱۵۲	عقلی حکمتوں کی مثال	۱۲۹	باعث شہوت کس طرح کمزور ہو
"	درہم و دینار کی تخلیق کا مقصد	"	باعث دین کی تقویت
۱۵۴	چاندی سونے کے برتن	۱۳۲	رویہیت مطلوب ہے
"	سودی کا دیوار	۱۳۳	دنیا و آخرت کی بادشاہی
۱۵۵	حدود شرع	۱۳۴	زہد سلطنت کیوں ہے؟

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
۱۷۶	امت کی مثال	۱۵۶	عدل کے تقاضے
۱۷۷	تو بیعتی نعمتوں کی حاجت	۱۵۷	فقراء کا منصب
۱۷۸	مثال ہدایت	۱۵۸	درخت کی شاخ توڑنا
۱۷۹	رشد کے معنی	۱۵۹	ایک اعتراض اور اس کا جواب
۱۸۰	تسبیح کی تہلیل	۱۶۰	اللہ تعالیٰ کی صفت قدرت
۱۸۱	تائید اور عصمت کے معنی	۱۶۱	عبادت - غایت تخلیق
۱۸۲	اللہ تعالیٰ کی بے شمار نعمتیں اور ان کا تسلسل	۱۶۲	فعل کی نسبت
۱۸۳	اسباب اور اک کی تخلیق	۱۶۳	مقاصد شکر
۱۸۴	میں اللہ کی نعمتیں	۱۶۴	سلاطین دین کی تقویت کا باعث ہیں
۱۸۵	حواس خمسہ کی ترتیب میں حکمت	۱۶۵	دوسرا رکن -
۱۸۶	خصوصیت عقل	۱۶۶	لائق شکر نعمتیں
۱۸۷	ارادوں کی تخلیق میں اللہ کی نعمتیں	۱۶۷	نعمت کی حقیقت اور اس کی اقسام
۱۸۸	شہوت کا طعام	۱۶۸	پہلی تقسیم
۱۸۹	قدرت اور آلات حرکت کی تخلیق میں اللہ کی نعمتیں	۱۶۹	دوسری تقسیم
۱۹۰	کھانے کے عمل میں اعضاء کا حصہ	۱۷۰	تیسری تقسیم
۱۹۱	روح ایک عظیم تر نعمت	۱۷۱	چوتھی تقسیم
۱۹۲	روح کی مثال پر اعتراض	۱۷۲	پانچویں تقسیم
۱۹۳	وہ اصولی نعمتیں جن سے غذا حاصل ہوتی ہے	۱۷۳	قلب کی چار قسمیں
۱۹۴	کھانے کی تین قسمیں	۱۷۴	چھٹی تقسیم
۱۹۵	ہر چیز کی غذا مخصوص ہے	۱۷۵	وسائل کی قسمیں
۱۹۶	دنیا کی کوئی چیز بے کار نہیں	۱۷۶	پہلی قسم - مخصوص تر وسائل
۱۹۷	غذاؤں کے نقل و حمل میں اللہ تعالیٰ کی نعمتیں	۱۷۷	دوسری قسم - فضائل بدنی
۱۹۸	غذا کی تیاری میں اللہ کی نعمتیں	۱۷۸	تیسری قسم - فضائل غیر بدنی
۱۹۹	غذا تیار کرنے والوں میں	۱۷۹	چوتھی قسم - جامع فضائل
۲۰۰	اللہ کی نعمتیں	۱۸۰	طریق آخرت کے لئے خارجی نعمتوں کی ضرورت
۲۰۱	فرشتوں کی تخلیق میں اللہ کی نعمتیں	۱۸۱	فضائل بدنی کی ضرورت
۲۰۲		۱۸۲	نعمت بھی مذمت بھی
۲۰۳		۱۸۳	قلبت مدح اور کثرت ذم کی وجہ

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
۲۲۰	معارف کی کوئی قسم افضل ہے	۱۹۷	خون اپنی سرشت کے بغیر نہیں
۲۲۱	احوال قلب کی کیفیت	۱۹۸	فرشتوں کی کثرت پر اعتراض
"	عمل - معصیت یا طاعت	۱۹۹	ظاہری و باطنی نعمتوں کا شکر
۲۲۲	ایک اعتراض کا جواب	"	پلک بھیکنے میں اللہ کی نعمت
۲۲۳	مال لینا فقراء کا احسان ہے	۲۰۰	سانس میں اللہ کی نعمتیں
"	مہربانوں میں تینوں مقامات کا وجود اور باہمی تعلق	۲۰۱	لوگ شکر کیوں نہیں کرتے
"	مہربانوں کے تین مقامات	"	نعمت سے غفلت کے اسباب
۲۲۶	مہربانوں کی فضیلت	"	ایک تنگ دست کی شکایت کا قصہ
۲۲۷	مہربانوں کے درجات	۲۰۲	اللہ تعالیٰ کی خاص نعمتیں
"	ایک پوچھے کا قصہ	۲۰۳	نعمتوں میں تخصیص کی ایک اور صورت
"	کتاب الخوف والرجاء	۲۰۴	ایمان و یقین ہی اصل دولت ہے
۲۲۸	خوف اور رجاء کا بیان	۲۰۵	غافل قلوب کا علاج
"	پہلا باب	۲۰۶	تیسرا باب
"	رجاء کی حقیقت، فضائل	"	مہربانوں کا ارتباط
"	دوائے رجاء اور طریقہ حصول	"	ایک چیز میں مہربانوں کا اجتماع اور اس کی وجہ
۲۲۹	رجاء کا اطلاق کہاں ہوگا	"	نعمت و معصیت کی تقسیم
۲۳۱	رجاء کے بعد جدوجہد	۲۰۸	بعض نعمتیں معصیت ہیں
۲۳۲	رجاء کے فضائل اور ترغیبات	۲۰۹	ہر وجود میں اللہ کی نعمت
۲۳۳	رجاء کی تدبیر اور حصول کا طریقہ	۲۰۹	دنیا کی معصیتوں کے پانچ پہلو
"	حال رجاء کیسے پیدا ہو؟	"	دنیا کے مصائب
۲۳۵	اعتبار کی صورت	"	آخرت کے راستے ہیں
"	آیات و روایات کا استقراء	۲۱۲	دنیا سے رغبت رکھنے والے کی مثال
۲۳۵	خوف کی حقیقت	"	مصائب پر صبر کی فضیلت
"	خوف کے اجزائے ترکیبی	۲۱۷	معصیت پر نعمت کی فضیلت
۲۳۶	خوف کے اثرات	۲۱۸	صبر افضل ہے یا شکر؟
۲۳۷	اعمال میں خوف کے مراتب	۲۱۹	پہلی بحث عوامی
"	خوف کے درجات اور	۲۲۰	استدلال کا دوسرا رخ
۲۳۸	قوت و ضعف کا اختلاف	"	مہربانوں وغیرہ مقامات کے افراد

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
۲۷۸	{ خوف خدا میں انبیائے کرام اور	۲۳۹	خوف سے مرنے والے کی فضیلت
۲۸۲	{ ملائکہ علیہم السلام کے حالات	۲۴۰	خوف کی اقسام
۲۸۲	{ شدت خوف میں صحابہ کرام، تابعین اور	۲۵۰	خائفین کی مختلف حالتیں
۲۸۲	{ سلف صالحین کے حالات	۲۵۱	خوف خدا مقصود ہے
۲۹۰	کتاب الفقر والزهـد	۲۵۱	مطیع و عاصی دونوں پابند ہیں
۲۹۰	زہد و فقر کا بیان	۲۵۲	خوف کے فضائل اور ترغیبات کا ذکر
۲۹۱	سلا باب	۲۵۸	آیات و روایات سے فضیلت خوف کا ثبوت
۲۹۱	فقر کی حقیقت اور احوال و اسماء کا اختلاف	۲۵۹	قلوبہ خوف افضل ہے یا قلوبہ رجاء یا ان
۲۹۱	فقر کی پانچ حالتیں	۲۶۲	دونوں کا اعتدال افضل ہے
۲۹۲	غنی اور مستغنی	۲۶۳	افضل کے بجائے اصل
۲۹۲	زاد اور مستغنی	۲۶۳	حضرت عمرؓ کے خوف و رجاء میں مساوت
۲۹۳	فقر کے فضائل	۲۶۳	خوف کی حالت حاصل کرنے کی تدبیر
۳۰۲	مخصوص فقراء، راضین، قاصمین اور صادقین کے فضائل	۲۶۳	خوف کی دو صورتیں
۳۰۳	غنی پر فقر کی فضیلت	۲۶۵	عذاب و ثواب اطاعت و معصیت پر موقوف نہیں
۳۰۶	فقر و غنی میں فضیلت کی حقیقت	۲۶۶	بقیۃ قدرت میں انسان کی حیثیت
۳۰۷	مال اور پانی کو برابر سمجھنا والا غنی	۲۷۰	خوف کا ثبوت قرآن و حدیث سے
۳۱۰	غنائے مطلق کیا ہے؟	۲۷۱	عارفین کو سوء خاتمہ کا خوف
۳۱۱	فقیر حریص اور غنی حریص	۲۷۱	ایک بزرگ کی وصیت
۳۱۱	حالت فقر میں فقیر کے آداب	۲۷۲	سوء خاتمہ کے چند اسباب
۳۱۲	باطنی آداب	۲۷۳	سوء خاتمہ کے معنی
۳۱۲	ظاہری آداب	۲۷۳	دولت کا عذاب آخرت میں
۳۱۳	ذخیرہ کرنے کے تین درجے	۲۷۴	سوء خاتمہ کا موجب اسباب
۳۱۳	{ بلا طلب عطا یا قبول کرنے	۲۷۴	پہلا سبب فک و انکار
۳۱۳	{ میں فقیر کے آداب	۲۷۴	دنیا کی محبت ایک لاعلاج مرض ہے
۳۱۳	معلیٰ کے اغراض	۲۷۴	دوسرا سبب معاصی
۳۱۴	صدقہ و زکوٰۃ	۲۷۴	خواب کے واقعات کی مثال
۳۱۵	{ طلب شہرت اور ریا کاری	۲۷۴	معاصی کے خیالات سے بچنے کا طریقہ
			سوء کے بچنے کی تلقین

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
۳۴۷	لینے والے کی اغراض	۳۱۵	امری حق کیا ہے؟
"	بلا ضرورت سوال کی حرمت اور سوال	"	زہد کے احکام
۳۴۸	کے سلسلے میں فقیر مضطر کے آداب	۳۱۸	ماسوی اللہ کے ترک کا مطلب
۳۴۹	حضرت عمر کا ایک اہم اقدام	۳۲۰	ضروریات زندگی میں زہد کی تفصیل
"	ضرورت کے لئے سوال کی اباحت	"	ضروریات زندگی
"	سوال کا ذکر وہ میوب سے محفوظ رکھنے کا طریقہ	۳۲۱	پہلی ضرورت۔ غذا
۳۵۱	ایک اعتراض کا جواب	۳۲۲	دوسری ضرورت۔ لباس
۳۵۵	اباحت سوال کی حد	۳۲۳	تیسری ضرورت۔ مسکن
۳۵۷	غنا کی وہ مقدار جس سے سوال حرام ہو جاتا ہے	۳۲۴	چوتھی ضرورت۔ گھریلو سامان
۳۵۹	سائنکین کے احوال	۳۲۶	پانچویں ضرورت۔ نکل
۳۶۰	ارباب احوال کے مختلف احوال	۳۲۷	چھٹی ضرورت۔ مال اور جاہ
۳۶۳	زہد کا بیان	۳۲۸	زہد کی علامات
"	زہد کی حقیقت	"	کتاب التوحید والتوکل
"	حال کے معنی	"	توحید اور توکل کے بیان میں
"	زہد کے مختلف درجات	۳۲۹	پہلا باب
"	علم کے معنی	۳۳۰	توکل کے فضائل
"	عمل کے معنی	۳۳۱	آیات
۳۶۷	زہد سخاوت نہیں	۳۳۲	روایات
"	زہد کے فضائل	۳۳۳	اصل توکل توحید کی حقیقت
۳۶۹	آیات	"	علم
"	روایات	۳۳۴	توحید کے چار مراتب
"	آثار	۳۴۰	اشیاء کی تسبیح و تقدیس
۳۷۳	زہد کے درجات اور اقسام	۳۴۲	قلم کی نکل دل سے گفتگو
۳۷۴	پہلی تقسیم۔ نفس زہد کے اعتبار سے	"	تین عالم
۳۷۵	دوسری تقسیم۔ مرغوب فیہ کے اعتبار سے	۳۴۳	عالم ملکوت کی ابتدا
۳۷۶	تیسری تقسیم۔ مرغوب عنہ کے اعتبار سے	۳۴۴	سالمک اور قلم کی گفتگو
"	زہد کے سلسلے میں مختلف اقوال	۳۴۶	سالمک کا سفر یمن کی طرف
۳۷۸	اقوال میں اختلاف کی نوعیت	۳۴۷	

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
۳۸۰	تیسری قسم وہی اسباب	۳۸۰	اول و آخر اور ظاہر و باطن و تضاد
۳۸۲	متوکلین کے تین درجات	۳۸۲	انسان کس طرح مسخر ہے
۳۸۵	اولاد اور خیراء کے لئے کسب معیشت	۳۸۲	جبر و اختیار کی بحث
۳۸۶	خائفانوں میں توکل	۳۸۲	فضل کے تین اطلاقات
۳۸۶	توک کسب الفضل ہے یا کسب؟	۳۸۲	فضل اختیاری میں جبر
۳۸۶	دل کو اسباب ظاہری سے اسباب باطنی	۳۸۲	ارادہ کس حرکت کرتا ہے
۳۸۶	کی طرف مائل کرنے کا طریقہ	۳۸۲	قدرت ازلیہ کے شاخصانے
۳۸۸	عطائے رزق اور منع رزق کے عجیب و غریب واقعات	۳۸۵	شرط کے بغیر مشروط کا وجود ممکن نہیں
۳۸۸	عیال دار کا توکل	۳۸۶	اللہ اور بندہ دونوں فاعل ہیں
۳۸۸	کیا تہیم اور بالغ برابر ہیں؟	۳۹۰	ثواب و عتاب چہ معنی دارو؟
۳۸۸	اسباب سے تعلق میں متوکلین کے احوال کی مثال	۳۹۰	متوکل کا وکیل پر اعتماد کامل
۳۸۸	دوسرا مقصد۔ حفظ منفعت	۳۹۱	دو سرا باب
۳۸۸	تیسرا مقصد۔ دفع مضرت	۳۹۱	توکل کے احوال و اعمال
۳۸۸	اسباب و انفع کی قسمیں	۳۹۱	توکل کا حال
۳۸۸	حفاظتی تدابیر کے بعد توکل	۳۹۲	توکل کی حقیقت
۳۸۸	ایک اشکال کا جواب	۳۹۳	عدم توکل کے دو سبب
۳۸۸	مسلمان کے چوری کے بعد متوکلین کے جواب	۳۹۳	اطمینان اور یقین
۳۸۸	پہلا ادب	۳۹۳	حالت توکل کے تین درجے
۳۸۸	دوسرا ادب	۳۹۵	احوال توکل میں مدد اور اسباب ظاہر سے تعلق
۳۸۸	تیسرا ادب	۳۹۶	تدابیر خلاف توکل نہیں
۳۸۸	چوتھا ادب	۳۹۸	توحید کی دو گھٹائیاں
۳۸۸	پانچواں ادب	۳۹۹	توکل کے سلسلے میں مشائخ کے اقوال
۳۸۸	چھٹا ادب	۴۰۰	متوکل کے اعمال
۳۸۸	چوتھا مقصد۔ ازالہ مضرت (موجودہ)	۴۰۱	پہلا مقصد۔ جلب منفعت
۳۸۸	دوا کے استعمال کا حکم	۴۰۱	پہلی قسم۔ قطعی اسباب
۳۸۸	دوا اور دواغ میں فرق	۴۰۱	دوسری قسم۔ ظنی اسباب
۳۸۸	بعض حالات میں دوا نہ کرنا	۴۰۳	اسباب ظاہری اور مخفی اسباب
۳۸۸	مانع اسباب۔ پہلا سبب	۴۰۳	کسب اور توکل

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
۴۵۸	پانچواں سبب	۴۳۲	دو سرا سبب
۴۶۰	معرفت الہی اور دیدار الہی کی لذت	۴	تیسرا سبب
"	انسانی ظہار اور ان کی لذتیں	۴۳۳	چوتھا سبب
۴۶۱	طبع قلب	۴۳۴	پانچواں سبب
۴۶۲	لذات میں تفاوت ہے	۴۳۵	چھٹا سبب
"	لذات کی قسمیں	۴۳۶	دورانہ کرنا ہر حال میں افضل نہیں
۴۶۶	لذت کے سلسلے میں مخلوق کے حالات	"	حضرت عمر کا واقعہ
۴۶۷	دیدار الہی کی لذت معرفت الہی کی لذت سے زیادہ ہوگی	۴۳۸	دہائی علاقوں سے فرار نہ ہونے کا حکم
"	خیال اور رؤیت	۴۴۰	مرض کے اظہار اور کتمان میں متوکین کے احوال
۴۶۸	تجلی باری تعالیٰ	"	اظہار کے تین مقاصد
۴۶۹	تجلی کے مختلف درجات		کتاب المحبۃ والشوق والانس
۴۷۰	ایک شبہ کا جواب	۴۴۱	والرضا
۴۷۱	عارف موت کو پسند کرتا ہے	"	محبت، شوق، انس اور رضا کے بیان میں
۴۷۲	محبت الہی کو پسند کرنے والے اسباب	۴۴۲	محبت الہی کے شرعی دلائل
"	پہلا سبب دنیا علائق سے انقطاع	۴۴۳	آیات و روایات
۴۷۳	دو سرا سبب معرفت الہی کو پسند کرنا	"	محبت کی حقیقت اس کے اسباب اور اللہ
۴۷۶	معرفت افضل سے معرفت خالق	"	کے لئے بندے کی محبت کے معنی
"	پہلے کی تخلیق	۴۴۵	محبت کی حقیقت
۴۷۷	مکمل کے عجائبات	"	درکات حواس اور محبت
۴۷۸	محبت میں لوگوں کے تفاوت کے اسباب	۴۴۸	محبت کے اسباب
۴۷۹	معرفت الیہ میں مخلوق کے قصور فہم کے اسباب	۴۵۰	چوتھا سبب حسن و جمال
۴۸۲	شوق خداوندی کے معنی	۴۵۱	مناسبت خفیہ
۴۸۳	پہلا طریقہ نظر و اعتبار	۴۵۲	محبت کا مستحق صرف اللہ ہے
۴۸۵	دو سرا طریقہ اخبار و آثار	۴۵۳	پہلا سبب
۴۸۹	بندے کے لئے اللہ کی محبت کے معنی	۴۵۴	دو سرا سبب
۴۹۰	اللہ سے بندے کی محبت	۴۵۵	تیسرا سبب
			چوتھا سبب
			علم قدرت اور پاکیزگی

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
۵۴۷	تیسری قسم مشارکت	۵۹۳	اللہ سے بندے کی محبت کی علامات
۵۴۸	چوتھی قسم معلومت	۶	آثار محبت
۵۴۹	سرکار دو عالم ﷺ کے اقوال کی حقیقت	۵۰۱	شراب خالص کی جزاء
۵۵۱	نیت عمل سے کیوں افضل ہے؟	۵۰۲	ملین کیا ہے
۵۵۱	نیت کے اعمال کی تفصیل	۵۰۹	انس باللہ کے معنی
۵۵۲	پہلی قسم معاصی	۵۱۰	انس کی علامت
۵۵۳	دوسری قسم طاعات	۵۱۱	قلبہ انس کی نتیجہ میں پیدا ہونے والا
۵۵۹	تیسری قسم مہامات	۵۱۶	انبساط اور اولال
۵۶۱	نیت غیر اختیاری ہے	۵۱۶	اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر راضی ہونا
۵۶۱	طاعات میں لوگوں کی مختلف نیتیں	۶	رضا کی حقیقت اور فضائل
۵۶۳	دو سرا باب	۶	رضا کے فضائل
۵۶۴	اخلاص فضائل، حقیقت، درجات	۵۲۱	رضا کی حقیقت اور اس کا خواہش کے خلاف ہونا
۵۶۷	اخلاص کے فضائل	۵۲۳	محسن کے اقوال و احوال
۵۶۷	اخلاص کی حقیقت	۵۲۷	دعا رضا کے خلاف نہیں
۵۶۹	عدم اخلاص کا علاج	۵۳۲	ہلاو معصیت سے فرار اور اس کی مذمت
۵۷۰	اخلاص کے سلسلے میں مشائخ کے اقوال	۵۳۳	کون سا شخص افضل ہے؟
۵۷۲	اخلاص کو مکدر کرنے والی آفات اور شوائب	۶	محسن خدا کی حکایات
۵۷۴	مطلوبہ اعمال کا ثواب	۶	اقوال اور مکاشفات
۵۷۷	تیسرا باب	۶	لویاء اللہ کے احوال کا کچھ اور ذکر
۵۷۷	صدق کی فضیلت اور حقیقت	۵۴۰	محبت سے متعلق کچھ اور مفید انتہائی گفتگو
۵۷۷	صدق کے فضائل	۶	کتاب النیۃ والاخلاص والصدق
۵۷۹	صدق کی حقیقت اس کے معنی اور مراتب	۵۴۲	نیت، اخلاص اور صدق کا بیان
۵۸۱	پہلا صدق لسان	۵۴۳	پہلا باب
۵۸۱	دوسرا صدق نیت و ارادہ	۶	نیت کی فضیلت اور حقیقت
۵۸۱	تیسرا صدق - عزم	۶	نیت کی فضیلت
۵۸۲	چوتھا صدق و قائم عزم	۵۴۶	نیت کی حقیقت
۵۸۲	پانچواں صدق - اعمال	۵۴۷	پہلی قسم نیت خالص
۵۸۳	چھٹا صدق - مقلات	۶	دوسری قسم رفاقت و باعث

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
۶۳۸	نوع اول۔ معاصی	۵۸۶	صلوچین کے درجات
۶۳۹	نوع ثانی۔ طاعات		کتاب المراقبۃ والمحاسبۃ
۶۴۰	نوع ثالث۔ صفات ملکہ	۵۸۷	مراقبے اور محاسبے کا بیان
۶۴۱	نوع رابع۔ صفات منجیہ	۵۸۸	پہلا مقام۔ نفس سے شرط لگانا
۶۴۲	صفات ملکہ اور صفات منجیہ	۵۹۲	دو سرا مقام۔ مراقبہ
۶۴۵	دو سری قسم اللہ تعالیٰ کی		مراقبے کے فضائل
	جلالت، عظمت اور کبریائی میں فکر	۵۹۴	مراقبے کی حقیقت اور اس کے درجات
۶۴۶	خلق خدا میں فکر کا طریقہ	۵۹۵	مقربین کے درجات
۶۴۷	موجودات کی قسمیں	۵۹۸	مراقبے کی پہلی نظر
۶۴۸	انسانی نطفے کا ذکر	۶۰۱	مراقبے کی دوسری نظر
۶۵۲	زمین میں فکر	۶۰۲	بندے کی تین حالتیں
۶۵۵	جوہر اور معدنیات	۶۰۳	تیسرا مقام۔ عمل کے بعد نفس کا محاسبہ
۶	حیوانات	۶	محاسبے کے فضائل
۶۵۷	وسیع اور گہرے سمندر	۶۰۵	عمل کے بعد محاسبے کی حقیقت
۶۵۹	فضائیں محبوس ہوئے لطیف	۶۰۶	چوتھا مقام۔ قصور کے بعد نفس کی تعذیب
۶۶۱	آسمان اور زمین کے ملکوت اور کواکب	۶۰۹	پانچواں مقام۔ مجاہدہ
	کتاب ذکر الموت وما بعدہ	۶۱۰	بندگان رب کے کچھ اور حالات
۶۶۶	موت اور ما بعد الموت کا بیان	۶۱۸	نیک سیرت عورتوں کا ذکر
۶	پہلا باب	۶۲۲	چھٹا مقام۔ نفس کو عتاب کرنا
۶۶۷	موت کا ذکر اور اسے کثرت سے یاد کرنا	۶۲۶	نفس کو کچھ اور قیمتی نصیحتیں
۶۶۸	موت کی یاد کے فضائل		کتاب التفکر
۶۷۰	دل میں موت کی یاد راجح کرنے کا طریقہ	۶۳۲	فکر و تدبیر کے بیان میں
۶۷۱	طول اہل قصر اہل	۶	فکر کی فضیلت
۶	طول اہل کے اسباب اور طریق علاج	۶۳۵	فکر کی حقیقت اور اس کا ثمرہ
۶۷۳	آٹھ صحابہ و تابعین	۶۳۶	فکر کے ثمرات
۶۷۶	طول اہل کے اسباب اور علاج	۶	فکر کے پانچ درجات
	طول اہل اور قصر اہل کے سلسلے میں	۶۳۷	مواقع فکریہ فکری راہیں
۶۷۸	لوگوں کے مراتب	۶۳۸	پہلی قسم۔ متعلقات نفس

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
۴۲۶	موت کی حقیقت	۶۷۹	اعمال کی طرف سبقت کرنا اور تاخیر سے بچنا
۴۲۷	تغیر حال کی دو نوعیتیں		موت کے سکرات اور شدت
۴۳۱	میت سے قبر کی گفتگو	۶۸۳	اور موت کے وقت مستحب احوال
۴۳۳	عذاب قبر اور منکر نکیر کا سوال	۶۸۳	سکرات موت کی تکلیف
۴۳۵	خلاف مشاہدہ امور کی تصدیق	۶۸۴	موت کے وقت انسان کیوں نہیں چٹختا
	منکر نکیر کا سوال، ان کی صورت، قبر کا دیاؤ	۶۸۶	موت کی مصیبتیں
۴۳۸	اور عذاب قبر کے سلسلے میں مزید گفتگو	۶۸۷	مومنین کی مدح قبض کرنے والا فرشتہ
۴۳۹	خواب میں مردوں کے احوال کا مشاہدہ		موت کے وقت مردے کے حق میں کون سے
۴۴۲	مردوں کے احوال سے متعلق کچھ خواب	۶۸۸	اعمال بہتر ہیں
۴۴۴	مشائخ عظام کے خواب	۶۹۰	ملک الموت کی آمد پر حیرت ظاہر کرنے
۴۴۸	دو سراپاب		والے واقعات
	صور پھونکنے سے جنت یا دوزخ میں جانے	۶۹۲	سرکارِ دو عالم ﷺ کی وفات شریف
۴۴۹	تک مردے کے حالات	۷۰۱	حضرت ابو بکر صدیقؓ کی وفات
۴۴۹	نفع صور	۷۰۲	حضرت عمر ابن الخطابؓ کی وفات
۷۵۱	میدان حشر اور اہل حشر	۷۰۵	حضرت عثمانؓ و انورین کی وفات
۷۵۲	میدان حشر میں آنے والا پسینہ	۷۰۶	حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی شہادت
۷۵۳	طویل یوم قیامت		موت کے وقت خلفائے اسلام
۷۵۴	قیامت اس کے مصائب اور اسماء	۷۰۷	امراء کرام اور صحابہ عظام کے اقوال
۷۵۶	سوال کی کیفیت	۷۰۹	اجلہ صحابہ اور تابعین اور دوسرے بزرگان امت کے اقوال
۷۶۰	میزان کا بیان		جنازوں اور قبرستانوں میں عارفین
۷۶۱	خصوصیت اور ادائے حقوق	۷۱۳	کے اقوال اور زیارت قبور کا حکم
۷۶۵	پہل صراط کا بیان	۷۱۴	جنازے میں شرکت کے آداب
۷۶۷	شفاعت	۷۱۵	قبر کا حال اور قبروں پر بزرگوں کے اقوال
۷۷۱	حوض کوثر	۷۱۶	کتبوں پر لکھے ہوئے شعر
۷۷۲	جہنم اور اس کے دہشت ناک عذاب	۷۲۰	اولاد کے مرنے پر بزرگوں کے اقوال
۷۸۱	جنت اور اس کی مختلف نعمتیں		زیارت قبور میت کے لئے دعا
۷۸۲	جنتوں کی تعداد	۷۲۱	اور اس کے تعلقات
	جنت کے دروازے	۷۲۳	زیارت قبور کے آداب

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
۷۸۷	اہل جنت کے مختلف اوصاف	۷۸۳	جنت کے غرفے اور ان کے
۷۸۹	جو دیالیات میں وارد ہیں	۷۸۴	درجات کی بلندی کا اختلاف
۷۹۰	اللہ تعالیٰ کے وجہ کریم کی رویت	۷۸۵	جنت کی دیواریں، زمین، درخت اور نہریں
	خاتمہ کتاب وسعت رحمت الیہ کا ذکر	۷۸۶	اہل جنت کا لباس، بستر، مسکواں
	بطور نیک فال		بکلیے اور میٹھے
	تمام شد		اہل جنت کا کھانا
			حور اور لڑکے

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

کتاب التوبہ

توبہ کا بیان

توبہ کی ضرورت گناہوں سے تائب ہونا اور غیروں کے جاننے والے اور عیبوں کو چھپانے والے کی طرف رجوع کرنا راہ سلوک کا پہلا قدم ہے اور منزل تک پہنچنے والوں کی گراں قیمت پونجی ہے، مگر لیکن طریقت سب سے پہلے توبہ کا راستہ اختیار کرتے ہیں، توبہ گم کردہ راہ لوگوں کے لئے استقامت کی کنجی ہے، مقربین اسی سے تقرب حاصل کرتے ہیں، انبیاء اسی کے ذریعہ سعادت پاتے ہیں، خاص طور پر ہمارے ہدایتی حضرت آدم علیہ السلام کے لئے توبہ ہی نہایت اور ہلندی درجات کا باعث بنی، اپنے آباء اجداد کی اقتداء کرنا اولاد ہی کے شایان شان ہے، اگر کسی سے کوئی گناہ سرزد ہو جائے توبہ بات حیرت انگیز نہیں کیوں کہ خطا کار آدم کی اولاد ہے، لیکن کیوں کہ باپ نے توبہ کے ذریعہ اپنی خطا کی خطائی کی تھی اس لئے بیٹے کے لئے بھی ضروری ہے کہ وہ ان دونوں باتوں میں باپ کے مشابہ ہو، حضرت آدم علیہ السلام نے خطا کی، لیکن وہ طویل مدت تک عداوت کے آئسو بہاتے رہے، اگر کوئی شخص صرف خطا میں انھیں اپنا مقتدی سمجھے اور توبہ میں ان کی تقلید نہ کرے وہ گمراہ ہے، ناخلف ہے، اسے اپنے باپ کی طرف نسبت کرنے اور اقتدی کا دعویٰ کرنے کا حق حاصل نہیں ہے، حق بات یہ ہے کہ خیر کا ہو کر رہ جانا ملائم مقربین کا شیوہ ہے، اور صرف شر میں مشغول ہونا شیطان کا مشغلہ ہے، شر میں پڑ کر خیر کی طرف رجوع کرنا انسان کا کام ہے، اس کی سرشت میں دونوں خصلتیں پائی جاتی ہیں، خیر کی خصلت بھی اور شر کی خصلت بھی، اب یہ خود اس پر موقوف ہے کہ وہ انسان بنے یا شیطان کی طرف منسوب ہو، اگر کوئی شخص گناہ کے بعد تائب ہوتا ہے توبہ کہا جائے گا کہ اس نے اپنی انسانیت کیلئے دلیل فراہم کی ہے اور سرکشی بر اصرار کرنے والے کے متعلق کہا جائے گا کہ وہ اپنے آپ کو شیطان کی طرف منسوب کرنا چاہتا ہے جہاں تک ملائم کی طرف نسبت کا سوال ہے توبہ انسان کے دائرہ امکان سے خارج ہے کہ وہ صرف نیک اعمال کرے اس سے گناہ سرزد نہ ہو، اس لئے کہ خیر میں شر اور خیر دونوں کی ایسی پختہ آمیزش ہے کہ صرف عداوت کی حرارت یا دونوں کی آگ ہی سے ان دونوں میں جدائی ہو سکتی ہے، انسانی جوہر کو شیطانی خباثت سے پاک کرنے کیلئے ضروری ہے کہ اسے ان دونوں حرارتوں میں سے ایک میں ڈالا جائے اب یہ اس کے اختیار کی چیز ہے کہ وہ کوئی حرارت پسند کرنا ہے جس حرارت کو ہلکی سمجھے اسی کی طرف بہت کرے ورنہ موت کے بعد مہلت نہیں ہے وہاں یا جنت میں ٹھکانہ ہو گا یا دوزخ میں۔

دین میں توبہ کا ایک اہم مقام ہے، اس لئے نہایت کے ابواب میں اس کا سب سے پہلے ذکر کرنا ضروری ہے، تاکہ سالک کے سامنے اس کی حقیقت، شرائط، اسباب، علامات، ثمرات، آفات و موانع اور طریقہ علاج کی تفصیل آجائے، یہ تمام امور چار ابواب میں بیان کئے جائیں گے۔

پہلا باب

توبہ کی حقیقت اور تعریف

توبہ کی تعریف : توبہ تین چیزوں کا نام ہے جو بالترتیب پائی جاتی ہیں، اول علم، دوم حال و رسوم، ثلث ان میں پہلا دوسرے کے لئے اور دوسرا تیسرے کے لئے موجب ہے یہ نظم و ترتیب ملک اور ملکوت میں اللہ تعالیٰ کی سنت کے مطابق ہے، اب ان تینوں

کی الگ الگ تفصیل کی جاتی ہے۔

علم، حال، اور عمل : علم سے مراد یہ جانتا ہے کہ گناہوں کے بے شمار نقصانات ہیں ان میں سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ یہ گناہ بندے اور اس کے محبوب کے درمیان حجاب بن جاتے ہیں، جب یہ حقیقت دل پر غالب آجاتی ہے کہ گناہ سے انسان اپنے محبوب سے محروم ہو جائیگا تو اس معرفت سے وہ تکلیف محسوس کرتا ہے کیونکہ اسے محبوب سے محروم رہنا کسی بھی حالت میں گوارہ نہیں ہوتا اس لئے وہ اپنے اس فعل پر افسوس کرتا ہے جو اس سے سرزد ہوا ہے، اور جو اس کے اور محبوب کے درمیان حجاب بنا ہے، اس افسوس کو ندامت کہتے ہیں اور یہی توبہ کی دوسری چیز یعنی حال ہے، پھر جب یہ رنج دل پر غالب آتا ہے تو اس سے ایک حالت اور پیدا ہوتی ہے جسے فعل کا قصد و ارادہ کہتے ہیں، اس فعل کا تعلق تینوں زمانوں سے ہوتا ہے، زمانہ حال سے اس طرح کہ جو گناہ پہلے کیا کرتا تھا وہ چھوڑ دے مستقبل سے اس طرح کہ آنے والی زندگی میں اس گناہ کو چھوڑنے کا عزم کرے جو محبوب کے ملنے میں حارج ہے اور ماضی سے اس طرح کہ اس گناہ سے جو نقصان ہوا ہے اگر وہ قابل تلافی ہے تو اس کی تلافی کرے۔

حال قصد و ارادہ اور فعل ان تمام امور کا سرچشمہ علم ہے جسے ہم ایمان و یقین بھی کہہ سکتے ہیں ایمان اس حقیقت کی تصدیق کا نام ہے کہ گناہ مسلکِ زیر ہیں اور یقین اس تصدیق کا دل میں اس طرح راسخ ہو جاتا ہے کہ کسی طرح کا کوئی حکم باقی نہ رہے جب ایمان و یقین کا نور دل کے مطلع پر چھا جاتا ہے، تو اس سے دل میں رنج و غم اور ندامت کی آگ بجڑک اٹھتی ہے کیوں کہ وہ اس نور کی روشنی میں یہ دیکھتا ہے کہ وہ اپنے فلاں عمل کی وجہ سے محبوب سے دور ہو گیا، جیسے کوئی شخص اندھیرے میں ہو کہ اچانک رات کے پہلو سے سپیدہ سحر نمودار ہوا اید چھٹے اور سورج طلوع ہو اور اچانک محبوب نظر آئے، اور وہ ہلاکت کے قریب ہو، تو دل میں محبت کی آگ شعلہ زن ہوتی ہے، اور اسکی حرارت اسے اس بات پر آمادہ کرتی ہے کہ کوئی نہ کوئی تدبیر ضرور کی جائے، اسی طرح جب گناہ ہلاکت سے قریب کر دیتے ہیں تو ایمان و یقین کی شمع اسے تدارک کے راستے دکھلاتی ہے۔ غرضیکہ علم، ندامت اور زمانہ حال و استقبال میں ترک گناہ اور ماضی میں تلافی، مافات کے قصد و ارادے کے مجموعے کا نام توبہ ہے،

توبہ اور ندامت : کبھی ندامت اور توبہ ایک ہی مفہوم کے لئے یوں لے جاتے ہیں، اس صورت میں علم کو اس کا مقدمہ اور ترک گناہ کو اس کا ثبوت کہتے ہیں۔ اسی اعتبار سے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

النَّدَمُ تَوْبَةٌ مَا جَاءَ ابْنَ حَبَابٍ ابْنَ مَسْعُودٍ

ندامت توبہ ہے۔

ندامت کے لئے ضروری ہے کہ وہ کسی وجہ سے ہوئی ہو، اور بعد میں اس پر کچھ ثمرہ بھی مرتب ہوا ہو، اس طرح گویا ندامت اپنے دونوں طرفوں علم اور قصد کو شامل ہے، اور اپنے سبب اور مسبب دونوں کے قائم مقام ہے اس لحاظ سے کسی شخص نے توبہ کی یہ تعریف کی ہے کہ توبہ سابقہ غلطی پر باطن کا سوز ہے، بعض لوگوں نے کہا ہے کہ توبہ ایک آگ ہے جو دل میں بجڑکتی ہے اور دود ہے جو جگر سے جدا نہیں ہوتا، کسی شخص نے ترک گناہ کا لحاظ کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ توبہ جفا کا لباس اتار کر وفا کی بسات بچھانے کا نام ہے، سہیل ابن عبد اللہ حستری فرماتے ہیں کہ توبہ مذموم اخلاق کو محمود اوصاف سے بدلنے کا نام ہے، اور یہ بات گوشہ نشینی، سکوت اور اکل حلال کے بغیر حاصل نہیں ہوتی، سہیل ابن عبد اللہ نے غالباً توبہ کی تیسری تعریف کی طرف اشارہ کیا ہے، توبہ کی تعریف میں اور بہت سے اقوال ہیں، ہم یہاں صرف چند اقوال کے ذکر پر اکتفا کرتے ہیں، جو شخص ان باتوں کو جان لے جو ہم نے بیان کی ہیں، ان کے درمیان ربط و ترتیب بھی سمجھ لے تو وہ یقیناً یہی کہے گا کہ توبہ کی اس تعریف میں جس قدر جامعیت ہے وہ دوسری تعریفوں میں نہیں ہے، مقصود توبہ کی حقیقت جاننا ہے الفاظ کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔

توبہ کا وجوب اور اسکے فضائل : اخبار و آیات سے صاف ظاہر ہے کہ توبہ واجب ہے، جس شخص کو اللہ نے نورِ بصیرت

سے نوازا ہے، اور ایمان کی روشنی سے اس کا سینہ منور کیا ہے، یہاں تک کہ وہ تاریک راستوں میں اپنے ایمانی نور کی روشنی میں چلتا ہے اور منزل تک پہنچنے کے لئے کسی رہنما اور دھبہ کی ضرورت محسوس نہیں کرتا وہ جانتا ہے کہ توبہ ایک اخرو واجب ہے (۱) جس طرح جلنے والوں کی دو قسمیں ہوتی ہیں، ایک وہ جو دیدہ بھار کھتے ہیں، اور وہ آگے بڑھنے کے لئے کسی کی اعانت کے محتاج نہیں ہوتے، اور دوسرے وہ جو بصارت سے محروم ہوتے ہیں اور کسی کی اعانت کے بغیر قدم نہیں بڑھا پاتے، اسی طرح سالکین دل کی دو قسمیں ہیں بعض لوگ وہ ہیں جو صرف تقلید کر سکتے ہیں، وہ قدم قدم پر قرآن یا حدیث کے کسی نص صریح کی حرارت محسوس کرتے ہیں، اور جہاں کہیں انھیں نصوص نہیں ملتیں وہاں حیران کھڑے رہ جاتے ہیں، ایسے لوگوں کا سفر طویل عمر اور مسلسل محنت و مشقت کے باوجود مختصر ہوتا ہے، ان کے قدم بھی چھوٹے ہوتے ہیں، رفتار بھی سست ہوتی ہے، گرتے پڑتے زندگی کا سفر پورا کرتے ہیں، اور بعض لوگ جنھیں بجا طور پر نیک بخت اور خوش قسمت کہا جاسکتا ہے وہ ہیں جن کے سپنے اللہ تعالیٰ نے اسلام کے لئے کھول دیئے، اور جن کے دلوں میں ایمان کے اجالے بھردئے، وہ اپنے رب کے عطا کردہ نور کے حامل ہیں، ذرا سی رہنمائی سے راہ سلوک کی مشکلات پر قابو پا لیتے ہیں، اور بڑی سہولت سے دشوار گزار وادیاں اور گھاٹیاں طے کر لیتے ہیں، ان کے دل میں نور ایمان اور نور قرآن کی گھمبیں روشن ہیں، اور اس نور کی شدت کے باعث ان کے لئے ذرا سی رہنمائی، معمولی تنبیہ اور ادنیٰ اشارے کافی ہو جاتے ہیں، ان کی مثال ایسی ہے۔

يَكَادُ رُتُّهَا يَفْضِي وَلَوْ كُمْ تَمَسُّسُهُ نَارٌ (پ ۱۸ ر ۱۱ آیت ۳۳)

اسکا تھل (اس قدر صاف اور سلگنے والا ہے کہ) اگر اسکو آگ بھی نہ چھوئے تو ایسا لگتا ہے کہ خود بخود جل اٹھے گا۔

آگ لگانے یعنی بتلانے کے بعد ان کی یہ مثال ہو جاتی ہے کہ

نُورٌ عَلَى نُورٍ هِيَ الَّتِي كُنُورٌ مَنْ تَشَاءُ (پ ۱۸ ر ۱۱ آیت ۳۳)

اور (جب آگ بھی لگ گئی) تو نور علی نور ہے اللہ تعالیٰ اپنے (اس) نور تک جس کو چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے۔

ایسا شخص ہر واقعہ میں نص مقول کا محتاج نہیں ہوتا، جس شخص کی یہ حالت ہوتی ہے اگر وہ وجوب توبہ کا علم حاصل کرنا چاہے تو کسی مقول نص کی جستجو نہیں کرتا، بلکہ اپنے نور بصیرت کے ذریعہ پہلے یہ دیکھتا ہے کہ توبہ کسے کہتے ہیں، اور وجوب کے معنی کیا ہیں، پھر توبہ اور وجوب دونوں کے معنوں میں جمع کرتا ہے اور کسی شک کے بغیر یہ جان لیتا ہے کہ توبہ کے لئے وجوب ثابت ہے۔

وجوب کے معنی : پہلے وہ یہ جانتا ہے کہ واجب اور ضروری وہی چیز ہے جو ابدی سعادت حصول کا ذریعہ اور دائمی ہلاکت سے نجات کا باعث ہو، اسلئے کہ اگر کسی چیز کے کرنے یا نہ کرنے سے سعادت یا شقاوت کا تعلق نہ ہو تو اسکے واجب ہونے کے کوئی معنی نہیں جہاں تک کہنے والے کے اس قول کا تعلق ہے کہ فلاں کام واجب کرنے سے واجب ہو گیا تو یہ محض لغاعی ہے، حقیقت سے اس کا ذرا واسطہ نہیں ہے اسلئے کہ جن چیزوں سے حال یا مستقبل میں ہماری کوئی غرض وابستہ نہیں ہے، ان میں مشغول ہونے سے ہمیں کیا فائدہ ہو گا خواہ کوئی انھیں ہم پر واجب کرے یا نہ کرے اس سے معلوم ہوا کہ واجب وہی چیز ہے جو دائمی سعادت کے حصول کا ذریعہ ہو چنانچہ جب وہ واجب کے معنی جان لیتا ہے، اور یہ بھی جان لیتا ہے کہ قیامت کے دن دیدار الہی سے بڑھ کر کوئی دوسری سعادت نہیں ہے، نیز جو شخص اس سعادت عظمیٰ سے محروم رہتا ہے، اس کی بد بختی میں کوئی شبہ نہیں ہے، دیدار الہی کی

(۱) توبہ کے وجوب پر اس طرح کی روایات و دلائل ملتی ہیں، مسلم میں افراہی کی روایت: "يَا أَيُّهَا النَّاسُ تَوْبُوا إِلَى اللَّهِ" ابن ماجہ میں حضرت جابر کی روایت: "يَا أَيُّهَا النَّاسُ تَوْبُوا إِلَى رَبِّكُمْ قَبْلَ أَنْ تَمُوتُوا"

سعادت سے وہ محض محروم رہتا ہے، جو خواہشات نفس کا اسیر ہو یہ خواہشات اللہ کے اور اسکے درمیان حجاب بن جائیں گی، وہ آتش فراق میں بھی کھلے گا اور دوزخ کی آگ میں بھی جلے گا، وہ یہ بھی جان لیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ملاقات اور اس کے دیدار سے بعد اسی وقت دور ہوتا ہے، جب وہ نفسانی خواہشات میں مبتلا ہو، عالم قافی سے الگ رہتا ہو اور ان چیزوں پر گرتا ہو جن سے بچنا نبی اکملؐ کے ناگزیر ہے، دیدار الہی سے قریب نہ ہو، شخص ہے جو دنیا کی ہلک لڑائیوں سے اپنے قلب کا تعلق قطع کر کے بہترین اللہ کی طرف توجہ دے جائے اس کی یاد اور اس کے ذکر سے السیت پلٹے اور اپنی ہمت کے بعد اس کے بلال حیران کی معرفت حاصل کرے اور اس سے محبت کرے اور وہ یہ سب بھی سمجھ لیتا ہے کہ جن گناہوں کے باعث میں اللہ تعالیٰ سے منحرف، اس کا عاصی اور نافرمان اور شیطان مرود کا قبیح کلمات ہوں ان ہی کی وجہ سے میں جہنم خداوندی سے محبوب ٹھہروں گا اور لاندہ درگاہ کلماتوں گا۔ ان تمام باتوں کے جاننے کے بعد وہ محض کبھی اس حقیقت میں شک نہیں کرے گا کہ قرب الہی کے لئے اس راستے سے انحراف کرنا ضروری ہے جو قرب سے دور کرتا ہے۔ اور دوری کی راہ سے انحراف ان تین باتوں کے بغیر ممکن نہیں جنہیں علم، ندامت اور عزم کہتے ہیں، اسلئے کہ جب تک یہ بات معلوم نہیں ہوگی کہ گناہ محبوب سے دوری کے اسباب ہیں اس وقت تک ندامت نہیں ہوگی، اور نہ دوری کی راہ پر چلنے سے تکلیف محسوس کرے گا، اور جب تک دوری کی راہ سے نہیں گزرے گا اس وقت تک واپسی کا تصور بھی نہیں کرے گا، واپسی کے معنی ہیں ترک گناہ کا عزم کرنا، اس سے معلوم ہوا کہ محبوب تک پہنچنے کے لئے یہ تینوں معانی ضروری ہیں یہ ان لوگوں کی حالت کا بیان ہے جنہیں نور بصیرت سے ایمان حاصل ہوتا ہے، مگر جو لوگ اس مرتبے کے قابل نہیں جیسا کہ اکثر لوگوں کا یہی حال ہے ان کیلئے تقلید اور اتباع کی بڑی گنجائش ہے، وہ اس راہ سے سلامتی حاصل کر سکتے ہیں، اپنی زندگی کا سفینہ ساحل مراد تک لے جاسکتے ہیں، ان ہی لوگوں کیلئے توبہ کے سلسلے میں وارد آیات قرآن، احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور اقوال سلف درج کئے جاتے ہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ۔

وَتُوبُوا إِلَى اللَّهِ جَمِيعًا أَيُّهَا الْمُؤْمِنُونَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ (پ ۱۸، آیت ۳۰)

اور مسلمانوں تم سب اللہ کے سامنے توبہ کرو تاکہ تم فلاح پناؤ۔

اس میں تمام اہل ایمان کو توبہ کا حکم دیا گیا ہے۔ ایک جگہ ارشاد فرمایا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا تَوْبُوا إِلَى اللَّهِ تَوْبَةً تَصْوَحًا (پ ۲۸، آیت ۸)

اے ایمان والو تم اللہ کے سامنے سچی توبہ کرو

نصوص کے معنی یہ ہیں کہ توبہ صرف اللہ کے لئے ہو، اسمیں کسی طرح کی آمیزش نہ ہو، یہ لفظ ص سے مشتق ہے جسکے معنی ہیں خلوص، توبہ کی فضیلت پر قرآن کریم کی یہ آیت دلالت کرتی ہے۔

إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِينَ (پ ۲، آیت ۲۲۲)

اللہ تعالیٰ محبت رکھتے ہیں توبہ کرنے والوں سے اور محبت رکھتے ہیں پاک و صاف رہنے والوں سے

حدیث شریف میں ہے

التَّائِبُ حَبِيبُ اللَّهِ (ابن ابی الدنیا۔ النس)

توبہ کرنے والا اللہ کا دوست ہے۔

التَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَا ذَنْبَ لَهُ (ابن ماجہ۔ ابن مسعود)

گناہ سے توبہ کرنے والا اس شخص کی مانند ہے جس پر کوئی گناہ نہیں۔

لِلَّهِ أَفْرَاحٌ بِتَوْبَةِ الْعَبْدِ الْمُؤْمِنِ مِنْ رَجُلٍ تَزَلَّ فِي الرُّبُصِ رَوْيَةً مُهْلِكَةً مَعَهُ رَاحِلَتُهُ عَلَيْهِمَا طَعَامُهُ وَشَرَابُهُ فَوَضَعَ رَأْسَهُ فَنَامَ نَوْمَةً فَاسْتَيْقَظَ وَقَدْ نَهَبَتْ رَاحِلَتُهُ فَظَلَبَ حَتَّى اشْتَدَّ عَلَيْهِ الْحَزُّ وَالْعَطَشُ لَوْ مَا شَاءَ اللَّهُ قَالَ لَرَجِعَ إِلَى مَكَانِي الَّذِي

كُنْتُ فِيهِ فَإِنَّمَا حَتَّى لَمُوتٍ فَوَضَعَ رَأْسَهُ عَلَى سَاعِدِهِ لِيَمُوتَ فَاسْتَبَقَ ظَفِيرًا
رَاحِلَتَهُ عِنْدَهُ عَلَيْهَا رَأْسُهُ وَشَرِبَتْهُ قَالَ اللَّهُ تَعَالَى اشْهَدُوا خَاشِعُونَ الْعَبِيدَ الْمُؤْمِنِينَ مِنْ
هَٰذَا يُرَىٰ اجْلِسْتُمْ سَلَمُ السُّبْحِ بخاری و مسلم ابن مسعود

ایک شخص ناموالی اور ملک سرزمین میں فروکش ہو، اس کے ساتھ اس کی سواری ہو جس پر کھائے
پینے کا سامان لدا ہوا ہو، وہ شخص زمین پر سر رکھ کر سوجائے، جب آنکھ کھلے تو دیکھے کہ سواری کم ہے اس کی
تلاش میں نکلے، یہاں تک کہ گرمی و پیاس کی وجہ سے حالت دگرگوں ہو جائے تو یہ کہنے لگے کہ میں جہاں تھا
وہیں چلا جاؤں، اور سواریوں یہاں تک کہ مر جاؤں، چنانچہ وہ مرنے کے لئے اپنے بالند پر سر رکھ کر سوجائے،
جب جاگے تو یہ دیکھے کہ اسکی سواری کھائے پینے کی اشیاء کے ساتھ اسکے سامنے موجود ہے، یہ شخص اپنی
سواری کی بازیافت سے جس قدر خوش ہوتا ہے اس سے زیادہ اللہ تعالیٰ اپنے بندہ مومن کی توبہ سے خوش ہوتا
ہے۔

ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ وہ اپنی سواری کے ملنے سے اس قدر خوش ہو کہ الفاظ میں تقدیم و تاخیر کی تیز کو بیٹھے، اور یہ
الفاظ اس طرح نکلیں کہ اے اللہ تو میرا بندہ اور میں تیرا پروردگار ہوں۔

آدم علیہ السلام کی تہنیت : حضرت حسن سے مروی ہے کہ جب حضرت آدم علیہ السلام کی توبہ قبول ہوئی تو فرشتوں نے
انھیں مبارک باد پیش کی، حضرت جبریل علیہ السلام اور میکائیل علیہ السلام انکے پاس تشریف لائے اور کہنے لگے کہ اللہ تعالیٰ نے
آپ کی توبہ قبول فرمائی، اور آپ کے دل کو سکون بخشا، حضرت آدم علیہ السلام نے فرمایا کہ اگر اس توبہ کے بعد بھی قیامت کے روز
مجھ سے سوال ہوا تو کیا ہوگا اللہ تعالیٰ نے وحی نازل فرمائی کہ اے آدم حیرتی اولاد کو تجھ سے مصیبتیں بھی درافت میں ملی ہیں اور توبہ
بھی، ان میں سے جو شخص مجھے پکارے گا میں اسکی پکار سنوں گا جس طرح حیرتی پکار سنی ہے اور جو شخص مجھ سے مغفرت کا خواستگار
ہو گا میں اس کی مغفرت کرنے میں جھل نہیں کروں گا، اسلئے کہ میں قریب ہوں، محیب ہوں۔ اے آدم! میں توبہ کرنے والوں کو ان کی
قبول سے ہتے ہوئے اور بشارت سننے ہوئے انھوںں کا، ان کی دعا قبول ہوگی۔ توبہ کے وجوب کے سلسلے میں بے شمار روایات اور
آثار موجود ہیں اس پر امت کا اجماع بھی ہے، اس لئے کہ توبہ کے معنی یہ ہیں کہ بندہ کو اس بات کا علم ہو کہ معاصی ملک ہیں اور
اللہ سے دور کرنے والے ہیں اور یہ بات وجوب ایمان میں داخل ہے، مگر بھی اس سے غفلت ہو جاتی ہے، اور توبہ کے ذریعہ اسکا
تدارک کیا جاتا ہے، پچھلے صفحات میں توبہ کی تعریف میں علم کا ذکر کیا گیا تھا، اس سے مراد اسی غفلت کا ازالہ ہے، اور اس علم کے
وجوب میں کوئی شبہ نہیں ہے، توبہ کی تعریف میں یہ بھی داخل ہے کہ نہانہ حال میں معاصی ترک کر دیے جائیں، مستقبل میں ترک
کا عزم کیا جائے، اور ماضی میں جو قصیر ہو چکی ہے اس کا تدارک کیا جائے، ظاہر ہے اس کے وجوب میں بھی کوئی شبہ نہیں کیا
جاسکتا، ماضی کے افعال پر نہ امت اور حزن بھی واجب ہے، کیوں کہ حزن و غم امت ہی توبہ کی صراح ہے، اور ماضی کے گناہوں کا
تدارک اسی طرح ہوتا ہے، اور ظاہر ہے جس سے توبہ کی تکمیل اور ماضی کی طمانی ہو وہ واجب کیسے نہ ہوگی، یہ تو ایک طرح کا رنج
ہے جو اس معرفت کے بعد پیدا ہوتا ہے کہ میں نے اپنی عمر اللہ کی نافرمانی میں گزار دی۔

اختیار و قدرت کا مسئلہ : اگر یہ کہا جائے کہ قلب کا تمکین ہونا ایک امر ضروری ہے، اس پر بندے کو اختیار نہیں ہے،
اسلئے قلب کے حزن کو واجب قرار نہیں دیا جاسکتا، اس کا جواب یہ ہے کہ اس حزن کا سبب یہ ہے کہ بندے کو محبوب کے نہ ملنے کا
قلبی علم ہوا ہے، اور وہ اس علم کے سبب کو حاصل کرنے کا اختیار رکھتا ہے اسی اعتبار سے علم وجوب میں داخل ہے اس لئے نہیں
کہ بندہ خود علم کو پیدا کرنے والا ہے، کیونکہ یہ حال ہے، بلکہ، نہ امت، فعل، ارادہ قدرت قادر سب اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ چیزیں
ہیں، اور اس کے فعل سے انھیں وجود حاصل ہوا ہے، ارشاد ربانی ہے۔

وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ مِمَّا تَعْمَلُونَ (پ ۲۳ ر ۷ آیت ۹۶)

حالانکہ تم کو اور تمہاری بنائی ہوئی چیزوں کو اللہ ہی نے پیدا کیا ہے۔

ارباب بصیرت کے نزدیک یہی صحیح ہے، باقی گمراہی ہے، تاہم یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ بندے کو فعل اور ترک فعل کا اختیار حاصل ہے یا نہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ بندے کو اختیار حاصل ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ بندے کا اختیار اس کی مخلوق ہے بلکہ تمام چیزیں ان میں بندے کے اختیارات بھی داخل ہیں اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں لہذا وہ اپنے ان اختیارات میں جو اسے اللہ کی طرف سے عطا ہوئے ہیں مجبور ہے، مثلاً اللہ تعالیٰ نے انسان کا ہاتھ صحیح سالم پیدا کیا، لہذا کھانا پیدا کیا، معدے میں کھانے کی خواہش پیدا کی، اور دل میں یہ علم پیدا کیا کہ کھانے سے معدے کی خواہش پوری ہوئی ہے، اور یہ تردد بھی پیدا کیا کہ اس کھانے میں کوئی ضرر بھی ہے جس کے باعث اس کا کھانا مشکل ہو جائے، پھر یہ علم پیدا کیا کہ اس طرح کا کوئی مانع نہیں ہے، یہ تمام اسباب جمع ہوتے ہیں تب کہیں جا کر کھانے کا ارادہ بنتا ہوتا ہے، ان ترددات اور غذا کی خواہش کے غلبہ کے بعد ارادے کی پہچان کو اختیار کہتے ہیں، اور اسباب کی فراہمی کے بعد اختیار کا وجود ضروری ہو جاتا ہے، مثلاً جب اللہ تعالیٰ کے پیدا کرنے سے ارادے میں پہچان آتی ہے، تب ہاتھ کھانے کی طرف ضرور بڑھتا ہے، کیونکہ ارادہ و قدرت کی تکمیل کے بعد فعل کا ظہور میں آنا ضروری ہے اسی لئے ہاتھ کو حرکت ہوتی ہے، معلوم ہوا کہ ارادے کی پہچان اور قدرت اللہ کی مخلوق ہے، اور ان سے ہاتھ کو حرکت ہوتی ہے، جسے اختیار کہتے ہیں، اسلئے اختیار بھی اللہ کی مخلوق ہے، البتہ ان اختیارات میں اللہ تعالیٰ نے ایک مخصوص ترتیب قائم فرمائی ہے، اور بندوں میں یہ نظام اسی ترتیب اور عادت کے مطابق جاری ہے، چنانچہ ہاتھ اس وقت تک لکھنے کیلئے حرکت نہیں کرتا جب تک اس میں قدرت حیات اور معمم ارادہ نہ ہو، اور معمم ارادہ اس وقت تک پیدا نہیں کرتا جب تک نفس میں خواہش اور رغبت نہ ہو۔ اور یہ رغبت اس وقت تک عروج پر نہیں آتی جب تک دل میں اس امر کا علم نہ ہو کہ لکھنے کا عمل حال یا مآل میں نفس کے مطابق ہے، خلاصہ یہ ہے کہ علم اور خواہش طبع کے بعد بنتا ارادہ ہوتا ہے اور قدرت و ارادے کے بعد حرکت واقع ہوتی ہے، ہر فعل میں بھی مخصوص ترتیب ہے اور اس ترتیب کے تمام اجزاء اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں، لیکن کیوں کہ بعض مخلوقات بعض کے لئے شرط ہیں اسلئے بعض کا مقدم اور بعض کا مؤخر ہونا ناگزیر ہے، چنانچہ جب تک علم نہ ہو اس وقت تک ارادے کی تکمیل نہیں ہوتی، اور میل کی تکمیل سے پہلے علم پیدا نہیں کیا جاتا اور جسم سے پہلے حیات معرض وجود میں نہیں آتی، اس سے معلوم ہوا کہ جسم کا وجود حیات کے لئے ضروری ہے، کیونکہ حیات جسم سے پیدا ہوتی ہے، اور علم کے وجود کے لئے حیات شرط ہے، اسکے یہ معنی نہیں کہ علم حیات سے پیدا ہوتا ہے، بلکہ عمل میں معلومات قبول کرنے کی استعداد اس وقت پیدا ہوتی ہے، جب وہ زندہ ہو، اسی طرح پہچان ارادہ کے لئے علم کا وجود شرط ہے، اسکا یہ مطلب نہیں ہے کہ ارادے کی پہچان علم سے پیدا ہوئی ہے، بلکہ ارادے کو وہی جسم قبول کرتا ہے جس میں حیات ہو اور علم ہو، فرضیکہ موجودات میں تمام ممکنات داخل ہیں اور امکان میں ایسی ترتیب ہے جس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی، اسلئے کہ اس طرح کی ہر تبدیلی محال ہے، جب کسی وصف کی شرط پائی جاتی ہے تو اس شرط کے باعث عمل میں وہ وصف قبول کرنے کی لیاقت اور صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے، پھر وہ وصف اللہ تعالیٰ کی محتاجت اور قدرت ازیلی کی عطا سے لیاقت پیدا ہو جانے کے بعد موجود ہو جاتا ہے، پھر جس طرح شرطوں کے باعث لیاقت کے وجود میں ترتیب ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کے کرنے سے ممکنات کے موجود ہونے میں بھی ترتیب ہوتی ہے، اور بندہ حوادث و ممکنات کی ترتیب کے لئے عمل ہے، اور یہ حوادث قضاء الہی ہیں، جو پلک جھپکنے سے بھی کم مدت میں قدرت ازیلہ کے اشارے سے اپنی مخصوص اور متعین ترتیب کے ساتھ ظہور پذیر ہوتے ہیں، جس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ ان کے ظہور کی تمام تفصیلات اندازہ الہی سے متعلق ہیں، ایک جزئی بھی اپنی حد سے تجاوز نہیں کرتی، ارشاد باری ہے۔

اِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنَاهُ قَدَرًا (پ ۲۷ ر ۱۰ آیت ۴۹)

ہم نے ہر چیز کو انداز سے پیدا کیا۔

اس آیت میں قضاء کی اذلی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔
 وَمَا أَمْرُنَا إِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمْحٍ الْبَصَرِ (پ ۲۷ آیت ۵۵)
 اور ہمارا حکم یکبارگی ایسا ہو جائیگا جیسے آنکھوں کا چمکنا۔

اَللّٰهُ قَضَاءُ اَللّٰہی کی پابند ہے : بندے اس قضاء و قدر الہی کے آگے مجبور محض ہیں۔ یہ بھی قدر الہی ہے کہ کاتب کے ہاتھ میں حرکت پیدا کی لیکن اس سے پہلے ایک مخصوص صفت پیدا فرمائی جسے قدرت کہتے ہیں اور نفس میں پختہ میلان پیدا کیا جس کا نام قصد ہے اور مرغوب چیزوں کی واقفیت پیدا کی جسے اوارک کہتے ہیں جب باطنی ملکوت سے یہ چاروں باتیں اس جسم پر ظاہر ہوتی ہیں جو تقدیر الہی کے تابع اور قضاء الہی کے لئے مسخر ہے تو عالم شہادت (ظاہری دنیا) کے رہنے والے جن کی نگاہوں سے غیب کی باتیں اور اسرار او جہل ہیں یہ کہنے لگتے ہیں کہ اس شخص نے حرکت کی اس نے کھانا سنے پھینکا۔ لیکن غیب کے پردے سے یہ آواز آتی ہے۔

وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّعْمَ مَلَىٰ (پ ۲۹ آیت ۱۷)
 اور آپ نے خاک کی مٹی نہیں پھینکی مگر اللہ نے پھینکی۔
 قَاتِلُوْهُمْ يَعْذِبُهُمُ اللّٰهُ بِمَا يَكْفُرُوْنَ (پ ۸۱ آیت ۲۳۰)
 ان سے لڑو اللہ ان کو تباہ کرے ہاتھوں سزا دیگا۔

یہاں پہنچ کر ان لوگوں کی عقلیں حیران رہ جاتی ہیں جو عالم ظاہری سے وابستہ ہیں اسی لئے بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ بندہ مجبور محض ہے اور بعض یہ کہتے ہیں کہ بندہ اپنے افعال کا موجد ہے تقدیر سے اس کے افعال کا کوئی تعلق نہیں ہے بعض اعتدال پسند یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ بندے کے تمام افعال کسی ہیں لیکن اگر ان پر آسمان کے دروازے کھول دئے جائیں اور وہ عالم غیب اور عالم ملکوت کا مشاہدہ کر لیں تو ان پر یہ ظاہر ہو کہ ہر فرقہ من وجہ سچا ہے لیکن کچھ نہ کچھ اور کہیں نہ کہیں غلطی ہر فرقے سے ہوئی ہے کسی بھی فرقے کے بارے میں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس کا علم زیر بحث مسئلے کے تمام پہلوؤں کو محیط ہے اس کا مکمل علم اسی صورت میں حاصل کیا جاسکتا ہے جب اس روشند ان سے جو عالم غیب کی طرف کھلا ہوا ہے نور کی چمک آئے اور یہ جانے کہ اللہ تعالیٰ ظاہر و باطن سب کچھ جانتا ہے اپنی غیب کی باتوں پر کسی کو مطلع نہیں کرتا سوائے اپنے منتخب پیغمبروں کے جب کہ ظاہر پر ان لوگوں کو بھی مطلع کر دیتا ہے جو پسندیدگی کے ذمے میں نہیں آتے جو محض اسباب اور مسببات کے سلسلے کو حرکت دے ان کے تسلسل کی کیفیت اور ارتباط کی وجہ دریافت کرے اور یہ جانے کہ اس سلسلے کی انتہا مسبب الاسباب پر کس طرح ہوئی ہے تو اس پر تقدیر کا راز ظاہر ہو جائے۔

ایک تاقض کا ازالہ : ہمارے اس بیان میں بظاہر تاقض ہے اسلئے کہ ہم نے جبر و اختیار اور اختیار کے قائلین کو من وجہ سچا بھی کہا ہے اور ہر ایک کی غلطی بھی واضح کی ہے جبکہ صدق و خطا میں تاقض ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہاں کوئی تاقض نہیں ہے یہ بات ہم ایک مثال کے ذریعے سمجھاتے ہیں اس طرح آپ سہولت سے سمجھ جائیں گے فرض کیجئے کہ کچھ اندھوں نے یہ سنا کہ فلاں شہر میں ایک عجیب و غریب جانور آیا ہوا ہے جسے ہاتھی کہتے ہیں نہ وہ ہاتھی سے واقف تھے اور نہ اس کا نام جانتے تھے پہلی مرتبہ اسکا ذکر اور حال سنا کر انھیں بڑا تعجب ہوا اسلئے انھوں نے طے کیا کہ اپنے چند نمائندوں کو اس کے بارے میں صحیح حالت دریافت کرنے کے لئے بھیجنا چاہیے چنانچہ چند اندھے وہاں پہنچے جہاں ہاتھی موجود تھا اور ٹٹل کر دیکھنے لگے ایک اندھے کا ہاتھ پاؤں پر پڑا ایک نے دانتوں کو چھو کر دیکھا اور ایک نے کان پکڑ کر دیکھے جب وہ لوگ اپنے باقی ساتھیوں کے پاس واپس پہنچے تو انھوں نے ہاتھی کی کیفیت دریافت کی اس اندھے نے جس نے پاؤں چھو کر دیکھا تھا کہا کہ ہاتھی ستون کی مانند ہے اس کا ظاہر کمزور ہے البتہ ستون کی نسبت تھوڑی سی نرمی لئے ہوئے ہے جس نے دانتوں پر ہاتھ رکھا تھا اس نے کہا کہ وہ سخت ہے اس

میں نرمی نام کو نہیں ہے، تم کہتے ہو کہ وہ کمزور ہے حالانکہ وہ کمزور نہیں ہے چکنا ہے، وہ ستون کی طرح تو نہیں البتہ موسل کی طرح ہے، تیسرے اندھے نے جس نے کان دیکھے تھے کہا کہ وہ تو نرم اور کمزور ہوتا ہے، ستون اور موسل کی طرح نہیں ہوتا بلکہ موٹے چڑے کی طرح پھیلا ہوا ہے۔ ظاہر ہے ان تینوں کے بیانات مختلف ہونے کے باوجود من وجہ صحیح ہیں کیونکہ جتنا جسے معلوم تھا اس نے اتنا ہی بیان کیا، سب نے ہاتھی ہی کے اوصاف بیان کئے، مگر مجموعی طور پر کسی ایک کا بیان بھی صحیح نہیں ہے، ہاتھی کی حقیقت کسی کو بھی معلوم نہ ہو سکی۔

یہ بڑی اہم مثال ہے، اسے خوب اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے، اور ذہن میں محفوظ کر لینا چاہئے، اس لئے کہ اکثر اختلافات کی یہی نوعیت ہے، اس موضوع کا تعلق علوم مکاشفہ سے ہے، اسلئے کہ ہم اس موضوع کو ہمیں چھوڑتے ہیں، اور اسی موضوع پر دوبارہ گفتگو شروع کرتے ہیں جو زیر بحث تھا یعنی توبہ واجب ہے، اور اسکے تین اجزاء، علم، ندامت اور ترک بھی واجب ہیں، ندامت واجب میں اس لئے داخل ہے کہ یہ ان افعال الہی میں واقع ہے جو بندے کے علم اور ارادے کے درمیان گھرا ہوا ہے، اسکے ایک طرف بندہ کا علم ہے اور دوسری جانب ارادہ ترک، جس فعل کا یہ وصف ہو وہ واجب کو شامل ہوتا ہے۔

توبہ فوری طور پر واجب ہے

توبہ کے فوری طور پر واجب ہونے میں کسی قسم کا شبہ نہیں ہے، اسلئے کہ معاصی کو ملک سمجھنا نفس ایمان میں داخل ہے، اور یہ علی الفور واجب ہے، یہ واجب وہی شخص ادا کر سکتا ہے جو اس کے وجوب سے واقف ہو اس طرح واقف ہو کہ ان معاصی سے باز رہ سکے، یہ معرفت علوم مکاشفہ میں سے نہیں ہے، جن کا عمل سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، بلکہ اس کا تعلق علوم معاملہ سے ہے، اور جس علم سے یہ مقصد ہوتا ہے کہ اس سے عمل پر تحریک ہو، اس کی ذمہ داری سے آدمی اس وقت تک عمدہ برآئیں ہو سکتا جب تک اس کی ملت غافل طور میں نہ آئے، گناہوں کے ضرر کی معرفت اسی لئے مقصود ہے کہ اس سے گناہوں کے ترک کی ترغیب ہوتی ہے، چنانچہ جو شخص گناہوں سے اپنا دامن نہ بچائے گا وہ ایمان کے اس حصے سے محروم رہے گا، حدیث شریف سے مراد یہی ہے

لَا يَزْنِي الزَّانِي حِينَ يَزْنِي وَهُوَ مُؤْمِنٌ (بخاری و مسلم۔ ابو ہریرہ)
زنا کرنے والا جب بھی زنا کرتا ہے وہ اس حال میں مومن نہیں رہتا۔

اس میں ایمان سے وہ ایمان مراد ہے جس کا تعلق علوم مکاشفہ سے ہے جیسے اللہ اور اسکی وحدانیت، اسکی صفات، اس کی کتابوں اور پیغمبروں کا علم، زنا سے یہ ایمان زائل نہیں ہوتا، بلکہ خدا کی قربت کو ایمان سے تعبیر کیا گیا ہے، زنا سے یہ قربت ختم ہو جاتی ہے، اور بندہ خدا کا مبغوض ٹھہرتا ہے، زنا کرنے والا گویا اس گناہ کے ملک یا معر ہوئے کا معتقد نہیں ہے، اسکی مثال ایسی ہے جیسے کسی طبیب نے مریض سے کہا کہ فلاں چیز مت کھانا، وہ تمہارے لئے زہر ہے، وہ شخص کھا لیتا ہے، توبہ کنا جائیگا کہ یہ شخص طبیب کا معتقد نہیں ہے، اسکا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ وہ طبیب کے وجود پر یقین نہیں رکھتا یا اسکے معالج ہونے کا معترف نہیں ہے، بلکہ یہ مطلب ہوتا ہے کہ طبیب نے جس چیز کو زہر قاتل کہا تھا وہ اسے حلیم نہیں کرتا کیونکہ اگر وہ اس کو ملک سمجھتا تو کبھی نہ کھاتا، اس سے معلوم ہوا کہ گناہ گار کا ایمان ناقص ہوتا ہے۔

ایمان کی ستر قسمیں : ایمان ایک ہی چیز کا نام نہیں ہے بلکہ اس کے ستر سے زائد شعبے ہیں، سب سے اعلیٰ شعبہ توحید باری کی شہادت ہے، اور سب سے ادنیٰ شعبہ راستے سے ایمان دینے والی چیز ہونا ہے، اسکی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص یہ کہے کہ دنیا میں انسان ایک ہی طرح کے نہیں ہوتے، بلکہ اگلی ستر سے زیادہ قسمیں ہیں، ان میں سب سے اعلیٰ قسم ان لوگوں کی ہے جن کے قلب و روح دونوں صاف ہوتے ہیں اور ادنیٰ قسم میں وہ لوگ شامل ہیں جن کی ظاہری جلد میل پچیل سے صاف ہو، ناخن کٹے ہوئے

ہوں، مونچھیں ترشی ہوئی ہوں، ناکہ بہائم سے ممتاز ہو سکے، جو بے شمار گھومتے پھرتے ہیں، ان کا جسم خود ان کی نجاست سے آلودہ رہتا ہے، کمر اور ناخن اتنے بوسے رہتے ہیں کہ انکی صورت بری ہو جاتی ہے، یہ مثال بالکل ٹھیک ہے، ایمان کی مثال انسان کی سی ہے اگر شہادت سے توحید نکال دی جائے تو ایمان باقی نہیں رہتا، اسی طرح آدمی کے جسم سے اسکی روح اور قلب نکال دیا جائے تو اس کا ہونا نہ ہونا برابر ہو جاتا ہے، جو شخص توحید و رسالت کا ایمان رکھتا ہے وہ اس انسان کی مانند ہے جس میں روح تو ہو مگر ہاتھ پاؤں آنکھ اور دوسرے ظاہری و باطنی اعضاء سے محروم ہو، یہ شخص بظاہر جیتا جاگتا ہے لیکن مومنوں سے بدتر ہے، قریب ہے کہ موت کی گرفت میں آجائے اسلئے کہ اعضاء کی قوت سے محرومی کے باعث اسکی روح ضعیف ہے، وہ مدافعت قوت نہیں رکھتی، اس لئے بہت جلد پرواز کر جائے گی، اسی طرح جو شخص صرف کلمہ طیبہ کی شہادت پر قانع ہو اور اعمال میں کوتاہ ہو، وہ بھی فنا ہونے کے قریب ہے، ذرا بھی حیر و تدبیر ہوا چلے گی اسکے ایمان کا کنور درخت جڑ سے اکٹڑ جائے گا حیر و تدبیر ہوا سے وہ احوال و خطرات مراد ہیں جو ملک الموت کی آمد کے وقت پیش آتے ہیں، جس ایمان کی جڑیں مضبوط نہیں ہوتیں اور جس کی شاخیں وسیع نہیں ہوتیں، وہ ملک الموت کی آمد کے وقت پیش آنے والے خطرات کا مقابلہ نہیں کر پاتا، بلکہ اپنی جگہ سے چل جاتا ہے اور بعض اوقات زمین پر آ رہتا ہے، خاتمے کے وقت وہی ایمان سلامت رہتا ہے جسکی بنیاد طاعات پر ہو، اور جو اعمال خیر کے چشموں سے سیراب ہوا ہو اور جس کی جڑیں زمین کی گرائیوں میں اور شاخیں آسمان کی بلندیوں میں دور تک ہوں۔

گناہ گار مومن کی مثال : بعض گناہ گار اہل ایمان نیک مومنین سے کہتے ہیں کہ تم میں اور ہم میں فرق ہی کیا ہے، ہم بھی ایمان کی دولت رکھتے ہیں، تم بھی رکھتے ہو، ان کی مثال ایسی ہے جیسے کدو کے درخت نے صنوبر کے درخت سے کہا تھا کہ ہم دونوں میں فرق ہی کیا ہے، میں بھی درخت ہوں اور تو بھی درخت ہے، صنوبر نے جواب دیا کہ ہم دونوں کا نام یقیناً مشترک ہے لیکن نام کے اس اشتراک سے تو جس غلط فہمی کا شکار ہے وہ بہت جلد دور ہو جائے گی، جب موسم خریف کی آمد ہی چلے گی تیری جڑ اکٹڑ جائے گی، اور پتے پھر جائیں گے، اس وقت معلوم ہو گا کہ تو نام کی وجہ سے دھوکے میں تھا، اور اس وصف سے غافل تھا جس کے باعث درخت مضبوط رہتا ہے۔

سَوْفَ تَرَىٰ إِذَا انْجَلَىٰ الْغُبَارُ أَفْرَسٌ نَّحْتُكَ أَمْ جَمَارٌ

(جب غبار چھٹ جائے گا تو خود دیکھ لے گا کہ تیرے نیچے گدھا ہے، کھوڑا ہے؟)

حقیقت خاتمے کے وقت منکشف ہوتی ہے، ایمان کی قوت و ضعف کا حال اس وقت ظاہر ہوتا ہے جب فرشتہ اجل قریب آتا ہے، موت کی مصیبت اور اس کے احوال و خطرات سے عارفین کے جگر پارہ ہو جاتے ہیں، عام لوگوں کا تو ذکر ہی کیا ہے، وہ وقت ہی ایسا نازک ہے کہ بہت کم لوگ ثابت قدم رہتے ہیں، اور سلامتی کے ساتھ منزل تک پہنچتے ہیں، اگر کوئی گناہ گار اپنے گناہوں کے باعث دوزخ کی آگ میں رہنے سے خائف نہ ہو تو اس کی مثال ایسے تندرست و توانا شخص کی سی ہے جو یہ سوچ کر شہوات میں ڈوبا رہتا ہے اور موت سے نہیں ڈرتا کہ موت عام طور پر اچانک نہیں آتی، اس سے کہا جائے گا کہ تندرست کو مرض کا خوف رہنا چاہئے اور مریض ہو تو موت سے ڈرنا چاہئے، اسی طرح گناہ گار کو بھی سوء خاتمہ کا خوف ہونا چاہئے، خدا انخواستہ خاتمہ اچھا نہ ہوا تو آگ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رہنا ہو گا، ایمان کے لئے گناہ ایسے ہیں جیسے بدن کے لئے معرذات ہیں کہ معدے میں جا کر اخلاط کے مزاج میں تبدیلی کرتی ہیں، اور آدمی اپنی بدلتی ہوئی حالت سے اچھی طرح باخبر بھی نہیں ہوتا کہ موت اسے اچانک آتی ہے، ایمان پر گناہ بالکل اسی طرح اثر انداز ہوتے ہیں۔

جب اس فانی دنیا کا یہ عالم ہے کہ لوگ ہلاکت کے خوف سے زہریلی چیزیں اور معرذات میں چھوڑنا واجب سمجھتے ہیں اور اسی وقت عمل کرتے ہیں تو ابدی ہلاکت کے خوف سے مسلک چیزیں استعمال نہ کرنا بطریق اولیٰ فوری طور پر واجب ہو گا، اسی طرح جب انسان کوئی زہریلی غذا کھا لیتا ہے تو اپنے فصل پر نادم ہوتا ہے اور ضروری سمجھتا ہے کہ تے کر کے یا کسی دوسری تدبیر سے اپنا معدہ

اس زہریلی چیز سے خالی کر لے، تاکہ یہ زہر مؤثر ہو کر اس کے جسم کے ضیاع کا باعث نہ بن جائے جو چند روز بعد فنا ہونے والا ہے، یہی حال اس شخص کا ہونا چاہئے جو دین کا زہر کھالے، یعنی گناہ کر لے، اس کے لئے بطریق اولیٰ ضروری ہے کہ وہ گناہوں سے رکے، اور اگر مرتکب ہو جائے تو فوری طور پر تدارک کرے تاکہ آخرت تباہ نہ ہو جس میں دائمی نعمتیں اور پائیدار لذتیں ہیں، اگر آخرت تباہ ہوئی، تو پھر دوزخ کی آگ، اور جہنم کے عذاب کے سوا کچھ ملنے والا نہیں ہے یہ سزا اتنے طویل عرصے تک بھگتی ہوگی جس کی کوئی تحدید نہیں کی جاسکتی، آخرت کے دنوں کو دنیا کے دنوں سے ذرا بھی مناسبت نہیں ہے، جب صورت حال یہ ہے تو گناہ گار کے لئے ضروری ہے کہ وہ توبہ ہی کی طرف سبقت کرے، ایسا نہ ہو کہ تاخیر کرنے سے گناہوں کا زہر روح میں سرایت کر جائے، اور پھر طیب بھی اسکا علاج نہ کر سکے، نہ اس کے لئے پرہیز مفید ہو، نہ وعظ و نصیحت سے کام بنے اور تباہ حال لوگوں کے زمرے میں اسکا شمار ہو جائے، اور اس آیت کا مصداق بنے۔

اِنَّا جَعَلْنَا فِيْ اَعْنَاقِهِمْ اَغْلَالًا فَهِيَ اِلَى الْاٰتِقَانِ فَهُمْ مَّقْمَحُوْنَ وَجَعَلْنَا مِنْ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ سَبْلًا وَمِنْ خَلْفِهِمْ سَبْلًا فَاعْشَيْنَا لَهُمْ فَهَمْ لَا يُبْصِرُوْنَ وَسَوَاءٌ عَلَيْهِمْ اَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ (پ ۱۸، آیت ۸ تا ۱۰)

ہم نے انکی گردنوں میں طوق ڈال دیئے ہیں پھر وہ ٹھوریوں تک ہیں جس سے ان کے سر اُل گئے اور ہم نے ایک آڑان کے سامنے کروی، اور ایک آڑان کے پیچھے کروی، جس سے ہم نے انکو (ہر طرف سے) گھیر دیا سو وہ نہیں دیکھ سکتے اور ان کے حق میں آپ کا ڈرانا نہ ڈرانا دونوں برابر ہیں، یہ ایمان نہ لائیں گے۔

یہ کتنا صحیح نہ ہوگا کہ اس آیت میں کافروں کا ذکر ہے، کیونکہ ہم یہ بات واضح کر چکے ہیں کہ ایمان کے سترے زائد شعبے ہیں اور یہ کہ زانی حالت زنا میں مومن نہیں رہتا، اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص اس ایمان سے دور ہوگا جو شاخ اور فرع کی مانند ہے وہ خاتمے کے وقت اصل ایمان سے بھی مجرب ہوگا، جس طرح وہ شخص جو تمام اعضاء سے محروم ہو جلد مر جاتا ہے کیونکہ اصل شاخوں کے بغیر قائم نہیں رہتی اور شاخیں بغیر اصل کے باقی نہیں رہتیں، اصل اور فرع میں صرف ایک فرق ہے فرع کا وجود اور اس کی بقا دونوں اصل کے وجود پر منحصر ہیں جب کہ اصل کا وجود فرع پر منحصر نہیں، البتہ اسکی بقا فرع پر منحصر ہے۔

علوم مکاشفہ اور علوم معاملہ لازم و ملزوم ہیں : علوم مکاشفہ اور علوم معاملہ دونوں لازم و ملزوم ہیں جیسے فرع و اصل ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں، ایک دوسرے سے مستثنیٰ نہیں رہ سکتا، اگرچہ ایک اصل کے مرتبے میں ہے، اور ایک تابع کی حیثیت رکھتا ہے، علوم مکاشفہ اصل ہیں، اور علوم معاملہ فرع کے قائم مقام ہیں، علوم معاملہ سے اگر آدمی کو عمل پر تحریک نہ ہو تو اسکے ہونے سے نہ ہونا بہتر ہے، اسلئے کہ ان کا جو اثر یا جو فائدہ ہونا چاہئے تھا، وہ نہیں ہوا اسلئے وہ وبال جان بنیں گے، اور تارک عمل پر حجت قائم کریں گے، اسی لئے اگر عالم گناہ کرتا ہے تو اسے جاہل گناہ گار کی نسبت زیادہ گناہ ملتا ہے، اس سلسلے میں جو آیات و روایات وارد ہیں وہ کتاب العلم میں لکھی جا چکی ہیں۔

وجوب توبہ کی عمومیت : وجوب توبہ کی عمومیت اس آیت سے ثابت ہے۔ اہل ایمان کو خطاب عام ہے۔

تَوْبُوْا اِلَى اللّٰهِ جَمِیْعًا اِنَّهَا الْمُتَوَسِّلُوْنَ لَعَلَّكُمْ تَفْلِحُوْنَ (پ ۱۸، آیت ۳۱)

اے مسلمانوں! تم سب اللہ کے سامنے توبہ کرو تاکہ فلاح پاؤ۔

نور بصیرت سے بھی اسی حقیقت کی طرف رہنمائی ہوتی ہے، اس لئے کہ توبہ کے معنی ہیں اس راستے پر واپسی جو اللہ تعالیٰ سے دور کرنے والا ہے، اور شیطان سے قریب کرنے والا ہے اور یہ رجوع صرف عاقل ہی سے ممکن ہے۔

عقل کب کامل ہوتی ہے : عقل کی اصل اس وقت تک کامل نہیں ہوتی جب تک شہوت، غضب اور ان تمام صفات

مذمومہ کی اصل جو انسان کی گمراہی کے لئے شیطان نے بطور وسیلہ اختیار کر رکھی تھی، درجہ کمال تک نہیں پہنچتی، جب آدمی چالیس برس کی عمر کو پہنچتا ہے تب اس کی عقل مکمل ہوتی ہے البتہ اصل عقل سن بلوغ تک پہنچنے تک مکمل ہو جاتی ہے اور اس کے مبادی سات سال کی عمر سے ظاہر ہونے لگتے ہیں، شہوات شیطانی فکری ہیں، اور عقل ملائکہ کی فوج ہے، جب یہ دونوں فوجیں کسی ایک مقام پر جمع ہوتی ہیں تو ان میں جنگ برپا ہوتی ہے اسلئے کہ ایک کے سامنے دوسرا ٹھہر نہیں سکتا دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں، ایک دوسرے کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتے جس طرح رات اور دن میں، روشنی اور تاریکی میں اجتماع نہیں ہو سکتا، اگر ایک غالب آجائے تو دوسرے کا وجود کسی حال میں باقی نہیں رہتا، اور کیوں کہ شہوات کمال عقل سے پہلے ہی جوانی اور بچپن کے زمانے میں انسان پر غالب آجاتی ہیں، اس لئے شیطان کے قدم عقل سے پہلے ہی راسخ ہو جاتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ دل عموماً شہوات کی محبت و انسیت میں گرفتار رہتا ہے اور اس کی گلو خلاصی مشکل ہو جاتی ہے، پھر جب عقل ظاہر ہو جاتی ہے جو اللہ کی جماعت اور اس کا لشکر ہے، اور اولیاء اللہ کو دشمنان خدا کے ہاتھوں سے بتدریج نجات دلانے والی ہے، اس لئے اگر عقل میں قوت و کمال نہ ہو گا تو شیطان اپنا کام کر دکھائے گا، اور میدان اس کے ہاتھ رہے گا

لَا حُتْنِيكَنْ ذَرِيَّتَهُ إِلَّا قَلِيلًا (پ ۵ ر ۷ آیت ۳)

تو میں (بھی) بجز قدرِ قلیل اسکی اولاد کو اپنے بس میں کر دوں گا۔

جب عقل پختہ اور مکمل ہو جاتی ہے تو اس کا پہلا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ شہوات کا زور توڑ کر، عادات سے کنارہ کش ہو کر اور طبیعت کو زہد ستی عبادات کی طرف مائل کر کے شیطانی فوجوں کو عبرتاً کھٹکت دے، یہی توبہ کے معنی ہیں کہ آدمی اس راہ سے انحراف کرے جس کا رہبر شیطان ہے اور جس کی رہنما شہوت ہے اور اس راستے پر چلے جو اللہ تعالیٰ تک پہنچاتا ہے۔

شہوت عقل پر مقدم ہے : ہر انسان میں عقل سے پہلے شہوت ہوتی ہے شہوت کی عزیمت عقل کی عزیمت پر مقدم ہوتی ہے، اسلئے شہوات کی اجراع میں جو اعمال سرزد ہوئے ہوں ان سے رجوع کرنا ہر انسان کے لئے ضروری ہے خواہ وہ نبی ہو یا غیبی، یہ خیال نہ کرنا چاہئے کہ رجوع کرنا صرف حضرت آدم علیہ السلام کی خصوصیت تھی بلکہ یہ تو حکمِ ازیٰ ہے جو جنسِ انسان کے ہر فرد پر لکھا ہوا ہے، اس کے خلاف فرض کرنا ممکن ہی نہیں ہے جب تک سنتِ الیہ میں تبدیلی نہ ہو۔

اگر کوئی شخص حالتِ بلوغ میں کفر یا جہل پر ہو اس کے لئے ان سے توبہ کرنا ضروری ہے، اور اگر کوئی شخص اپنے والدین کی اجراع میں مسلمان ہوا ہو اور یہ نہ جانتا ہو کہ اسلام کی حقیقت کیا ہے، اس پر واجب ہے کہ وہ اپنی اس جہالت اور غفلت سے توبہ کرے اور یہ توبہ اس طرح ہوگی کہ اسلام کی حقیقت سمجھے، اور یہ جانے کہ والدین کے اسلام سے اسے کوئی فائدہ نہیں ہوگا، جب تک خود مسلمان نہ ہو، جب یہ بات جان لے تو شہوات کی الفت اور بے راہ روی کی محبت سے تائب ہونا اور صحیح راستے پر چلنا بھی ضروری ہے، یعنی ہر حال میں اللہ تعالیٰ کی عائد کردہ حدود کی رعایت اور فرائض کی پابندی کرے، خواہ دینے میں ہو یا لینے میں، عمل میں ہو یا ترک عمل میں، اور یہ مرحلہ توبہ کا دشوار ترین مرحلہ ہے، اکثر لوگ یہیں پہنچ کر ہلاک ہوئے ہیں کہ خواہش کے باوجود رجوع نہ کر سکے۔

توبہ فرض عین ہے : اس تفصیل سے ثابت ہوا کہ توبہ ہر شخص کے لئے فرض عین ہے، کوئی فرد بشر بھی اس سے بے نیاز نہیں رہ سکتا، جب حضرت آدم علیہ السلام جیسے اولوالعزم پیغمبر اور انسانی سلسلے کے پہلے فرد اس سے بے نیاز نہ رہ سکے تو دوسرے لوگ کیسے رہ سکتے ہیں۔

وجوب توبہ کی عمومیت کا سبب : توبہ ہر حال میں اور ہمیشہ واجب ہے اس لئے کہ کسی بھی شخص کے اعضاء منہا سے خالی نہیں ہیں، اس سے انبیاء کرام تک محفوظ نہ رہ سکے جیسا کہ قرآن کریم میں ان کی خطاؤں کا، ان پر ہشامی، مگر یہ وزارت کا ذکر ہے،

اگر بعض اوقات آدمی اعضاء کی معصیت سے محفوظ رہ گیا تو دل کے ارادہ معصیت سے محفوظ نہ رہ پائے گا، دل میں ارادہ گناہ نہ ہوا تو شیطانی وساوس سے نہ بچ سکے گا کیونکہ شیطان دلوں میں وسوسے ڈالتا رہتا ہے جن سے اللہ کے ذکر سے غفلت ہوتی ہے، اگر وساوس سے بھی محفوظ رہ گیا تو اللہ کی صفات اور افعال سے واقف ہونے میں کوتاہی کرے گا یہ تمام باتیں نقصان کی ہیں، اور ہر نقصان کا کوئی نہ کوئی سبب ہوتا ہے اس سبب کو ترک کرنا اور اس کی ضد اختیار کرنا ہی رجوع ہے توبہ سے یہی مقصود بھی ہے، آدمی کا اس نقصان سے خالی ہونا بظاہر ناقابل فہم ہے، البتہ لوگ مقدار نقصان میں ایک دوسرے سے مختلف اور متفاوت ہو سکتے ہیں، اصل نقصان میں تمام لوگ شریک ہیں، یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

إِنَّهُ لَيُبَغَّانِ عَلَىٰ قَلْبِي حَتَّىٰ اسْتَغْفِرَ اللَّهُ فِي الْيَوْمِ وَاللَّيْلَةِ سَبْعِينَ مَرَّةً (مسلم، امر الزنی)

میرے دل پر زنگ آجاتا ہے یہاں تک کہ میں دن رات ستر مرتبہ اللہ سے مغفرت کی دعا کرتا ہوں۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے انھیں فضیلت بخشی، فرمایا۔

لِيَغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِن ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ (پ ۹۳۱ آیت ۲)

تاکہ اللہ تعالیٰ آپ کی سب اہل کچھل خطائیں معاف فرمادے۔

جب آپ کا یہ حال ہے کہ مغفرت کی دعا فرماتے اور تمام گناہوں کی بخشش کی بشارت کے باوجود دن میں ستر بار اور ایک روایت کے مطابق سو بار اپنی خطاؤں کی بخشش چاہتے تھے۔

ایک شبہ کا جواب : یہاں ایک اعتراض ہو سکتا ہے، اس اعتراض کی تمہید یہ ہے کہ قلب پر جو فاسد خیالات یا وساوس وارد ہوتے ہیں وہ نقص ہیں، کمال یہ ہے کہ قلب ان سے خالی رہے، اسی طرح اللہ عزوجل کی صفات و افعال سے پوری طرح واقف نہ ہونا بھی ایک نقص ہے، اس میں بھی کمال ہے کہ آدمی کی معرفت زیادہ سے زیادہ ہو، جتنی معرفت زیادہ ہوگی اتنا ہی کمال زیادہ ہوگا، اسکے یہ معنی ہوئے کہ اسباب نقص سے اسباب کمال تک پہنچنے کے معنی رجوع ہیں، اسے توبہ بھی کہہ سکتے ہیں، اور توبہ کے سلسلے میں یہ بات بیان کی جا چکی ہے کہ توبہ بہر حال اور ہمیشہ واجب ہے، ہمارے خیال میں وساوس سے قلب کا خالی ہونا اور صفات الہیہ سے کماحقہ واقفیت فضاائل ہیں فرائض نہیں ہیں، کیونکہ کمال حاصل کرنا واجب نہیں ہے، اس صورت میں مذکورہ بالا امور میں توبہ بہر حال میں کیسے واجب ہو سکتی ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ جیسا پہلے بیان کیا جا چکا ہے انسان عقل کی دلیزیر پر قدم رکھنے سے پہلے شہوت کی اتباع سے اپنا دامن نہیں بچلا پاتا، توبہ کے معنی یہ نہیں کہ جن اعمال سے توبہ کی جارہی ہے وہ آئندہ کے لئے ترک دئے جائیں بلکہ توبہ کے لئے ضروری ہے کہ ماضی میں جو کچھ ہو چکا ہے اس کا تدارک بھی ہو جائے، آدمی جس شہوت میں بھی مبتلا ہوتا ہے، اس سے دل پر تاریکی سی چھا جاتی ہے، جیسے منہ کی بھاپ سے آئینے پر تاریکی آجاتی ہے، پھر اگر شہوات کی اتباع مسلسل ہوتی رہے تو دل کی تاریکی تہہ بہ تہہ گہری ہو جاتی ہے، اور زنگ سالک جاتا ہے جس طرح منہ کی بھاپ اگر آئینے پر مسلسل پڑتی رہے تو زنگ لگ جاتا ہے، شہوات سے دل پر زنگ لگنے کا ذکر قرآن کریم میں ہے۔ فرمایا

كَذَٰلِكَ زَاَنَّ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ مَّا كَانُوا يَكْسِبُونَ (پ ۸۳۰ آیت ۱۳)

ہرگز ایسا نہیں بلکہ ان کے دلوں پر انکے اعمال (بد) کا زنگ بیٹھ گیا ہے۔

اگر زنگ گہرا ہو جاتا ہے تو اسے دل پر ہر گز لگنے سے تعبیر کیا جاتا ہے جیسے اگر آئینے پر زنگ لگ جائے اور اسے دیر تک اسی حالت پر رہنے دیا جائے تو مصیبت کی کوئی گنجائش نہیں رہتی اور وہ آئینہ بیکار قرار دیدیا جاتا ہے، بہر حال جس طرح آئینے کی صفائی کے لئے یہ کافی نہیں ہے کہ آئندہ اس پر زنگ نہ لگنے دیا جائے بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ جو زنگ ماضی میں اس پر لگ چکا ہے وہ مٹایا جائے،

اسی طرح دل کے لئے بھی یہ کافی نہیں کہ آئندہ کے لئے اجتناب شہوات سے توبہ کی جائے، بلکہ ماضی میں جو گناہ سرزد ہو چکے ان سے بھی رجوع کرنا ضروری ہے تاکہ دل پر پچھلے گناہوں کی جو تاریکی چھائی ہے وہ مٹ جائے جس طرح گناہ سے دل تاریک ہوتا ہے اسی طرح نیکی سے دل منور اور روشن ہوتا ہے، اطاعت سے معصیت کا اندھیرا ختم ہوتا ہے، اور روشنی پھیلتی ہے، حدیث شریف میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔

اتَّبِعِ السَّبِيلَ قِيَالِ حَسَنَةٍ تَمُحُّهَا (ترمذی — ابو ذر)
معصیت کے بعد نیکی کرے، نیکی اس معصیت کو مٹا ڈالے گی۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ بندے کو ہر حال میں اپنے دل سے گناہوں کا اثر ختم کرنے کے لئے جدوجہد کرنی چاہئے، اور یہ جدوجہد اسی صورت میں ہو سکتی ہے کہ نیک عمل کرے کیوں کہ نیک اعمال کے آثار گناہوں کے آثار کی ضد ہیں یہ ہوں گے تو پچھلے آثار خود بخود ختم ہو جائیں گے، یہ اس دل کا بیان تھا جسے پہلے صفائی حاصل تھی، پھر ماضی اسباب کی وجہ سے وہ زنگ آلود ہو جاتا ہے ایسے دل کا زنگ دور کرنا زیادہ مشکل نہیں ہے، لیکن ابتداء میں قلب کا تزکیہ اور تعفیہ بہت دشوار ہے، یہ ایسا ہی ہے جیسے آئینے سے زنگ دور کرنا مشکل نہیں ہے، لیکن آئینے کو ابتداء ہی میں چمکدار اور روشن بنانا بڑا مشکل ہے۔

ہر حال میں توبہ کا وجوب : اس سے معلوم ہوا کہ آدمی ہر حال میں توبہ واجب ہے، یہ جواب کا ایک پہلو ہے، دوسرا پہلو یہ ہے کہ ہر حال میں وجوب توبہ کے کیا معنی ہیں؟ یاد رکھئے وجوب دو طرح کے ہیں ایک وہ جس کا تعلق شرعی احکام سے ہے، اس میں تمام حقوق برابر ہے، اور یہ وجوب اس قدر ہے کہ اگر تمام بندگان خدا اسے ادا کریں تو عالم جاہ و برہان نہ ہو جیسے بدنی اور مالی عبادات، نماز روزہ، حج وغیرہ، کمال کے درجات اس وجوب میں داخل نہیں ہو سکتے، کیونکہ اگر ہر شخص پر یہ واجب کر دیا جائے کہ وہ اللہ سے اس طرح ڈرے جیسا کہ ڈرنے کا حق ہے تو تمام لوگ دنیاوی کا دہار، اور محاش و غیو ترک کر دیں گے، اس صورت میں تقویٰ باقی ہی نہ رہے گا، کیوں کہ تقویٰ کی فرصت کسی کو بھی نہ ملے گی، ہر شخص کا دہار معیشت میں مصروف رہے گا، خود بوائے کا خود کالے کا، خود بے کا خود بیٹے کا، یہ تمام درجات واجب نہیں ہیں، شریعت میں واجب صرف اس قدر رہے کہ تمام لوگ اس پر عمل کریں تو عالم کے نظام میں خلل نہ ہو۔

دوسرا واجب وہ ہے جو صدیقین کے مقام محمود تک پہنچنے اور رب العالمین کا تقرب حاصل کرنے کے لئے ضروری ہو، جن چیزوں سے ہم نے توبہ کرنے کے لئے لکھا ہے وہ سب اس درجے تک پہنچنے کے لئے واجب ہیں، اس کی مثال اس طرح سمجھنی چاہیے جیسے یہ کہا جائے کہ نوافل میں طہارت واجب ہے اسکے معنی یہ ہیں کہ نفل نماز پڑھنے کے لئے طہارت بدن ضروری ہے اس کے بغیر نفل کا ثواب نہیں ملے گا، مگر جو شخص نوافل سے محروم رہے اس پر نفل کی رو سے طہارت واجب نہیں ہے، یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص یہ کہے کہ آٹھ، کان، ہاتھ اور پاؤں انسان کے وجود کے لئے ضروری ہیں، یعنی انسان مکمل ہی اس وقت ہوتا ہے جب یہ تمام اعضاء موجود ہوں، اسی صورت میں اس کی انسانیت مفید ہو سکتی ہے اور انہی اعضاء کے ذریعہ وہ دنیا میں درجات کمال تک پہنچ سکتا ہے، اب اگر کوئی شخص ان اعضاء سے محرومی پر قانع ہو اور گوشت پوست کے ایک لوٹھرے کی حیثیت سے زندہ رہتا منظور کرے تو اس کے لئے یہ اعضاء ضروری نہیں ہیں، بہر حال ان تمام واجبات سے جن میں سب لوگ برابر کے شریک ہیں نجات حاصل ہوتی ہے، اس نجات کی مثال زندگی ہے، اور اس نجات کے علاوہ جتنی سعادتیں ہیں، اور جس قدر بلند درجات ہیں وہ سب اعضاء کی مانند ہیں، محض نجات خوبصورت نہیں ہوتی جب تک اسکے ساتھ سعادتیں نہ ہوں، اسی طرح محض زندگی خوبصورت نہیں ہوتی جب تک اسکے ساتھ اعضاء نہ ہوں انبیاء کرام، اولیاء اللہ، اور علمائے ربانی انہی سعادتوں کے حصول کے لئے جدوجہد کرتے ہیں وہ انہی بلند درجات تک رسائی حاصل کرنے کے لئے دنیا کی لذتوں سے اپنا تعلق منقطع کر لیتے ہیں، چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایک دن سر کے نیچے پھر رکھ کر سو گئے، شیطان نے آکر کہا کہ آپ نے تو دنیا ترک کر دی تھی، فرمایا! ایچینا، تو نے کیا دیکھا

جس سے یہ معلوم ہوا کہ میں نے دنیا ترک نہیں کی، شیطان نے عرض کیا پھر کو تکیہ بنانا بھی دنیاوی لذت ہے، زمین پر سر رکھئے، آپ نے سر کے نیچے سے پھر نکال کر پھینک دیا اور زمین پر سر رکھ کر سو گئے، پھر نکال کر پھینکنا آپ کی ایک دنیاوی لذت سے توبہ تھی، ہم پوچھتے ہیں کیا حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس حقیقت سے واقف نہ تھے کہ پھر سر رکھنا عام شریعت میں واجب نہیں ہے، اسی طرح کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس امر سے لاعلم تھے کہ منقش چادر پر نماز ادا ہو جاتی ہے، اسکے باوجود آپ نے نماز میں منقش چادر کو وجہ غلل سمجھا اور اسے اتار کر نماز پڑھی، اسی طرح آپ نے جوئے کے لئے قے کو قلب کی مشغولیت کا باعث سمجھ کر پرانا قسمہ باقی رکھنا بہتر سمجھا، حالانکہ یہ وہ امور ہیں جو عام لوگوں پر مقرر کردہ شریعت میں واجب نہیں ہیں، ظاہر ہے یہ بات حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھی معلوم تھی، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی جانتے تھے، پھر آپ حضرات نے وہ اعمال ترک کیوں کئے؟ اس کا ایک ہی جواب ہے اور وہ یہ کہ آپ نے ان اعمال کو اپنے قلب میں مؤثر اور مقام محمود تک پہنچنے کے لئے مانع سمجھا۔

حضرت صدیق اکبرؓ نے ایک بار کہیں سے آیا ہوا دودھ نوش فرمایا، بعد میں معلوم ہوا کہ وہ کسی ناجائز ذریعے سے حاصل ہوا تھا، آپ نے بلا تاخیر خلق میں انگلی ڈال کر قے کی، اور اس شدت سے دودھ کا ایک ایک قطرہ جسم سے باہر نکال دیا کہ قریب تھا کہ ساتھ ہی روح بھی نکل جائے، کیا آپ کو معلوم نہیں تھا کہ بھول کر کھالینے میں کوئی گناہ نہیں ہے، اور پی ہوئی چیز کا کالنا واجب نہیں ہے، پھر آپ نے پینے سے رجوع کیوں کیا، اور معدے کو اس شدت سے خالی کرنے کی ضرورت کیوں محسوس کی؟ اس کا جواب صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ حضرت ابو بکر جانتے تھے کہ عوام کے لئے جو احکام ہیں ان کا اطلاق خواص پر نہیں ہوتا، راہ آخرت کے خطرات سے بچنا بڑا مشکل مرحلہ ہے اور اس سے صرف صدیقین ہی محفوظ رہ سکتے ہیں۔

بہر حال ان بزرگوں کے حالات پر غور کرنا چاہئے جو مخلوق میں سب سے زیادہ اللہ کو جاننے والے اس کے طریق اور اس کے عذاب کی معرفت رکھنے والے اور بندوں کے مغاللوں سے واقفیت رکھنے والے ہیں، دنیوی زندگی کے فریب سے ایک بار اللہ تعالیٰ پر فریب کھانے سے ہزار بار بچو، اور اس کی خوفناک پکڑ سے ڈرو۔ غرضیکہ یہ وہ اسرار و رموز ہیں کہ جس شخص کے دل و دماغ میں ان کی خوشبو بس جاتی ہے وہ یہ سمجھ لیتا ہے کہ اللہ کی راہ پر چلنے کے لئے ہر لمحہ اور ہر آن توبہ، انصوح واجب ہے، اگرچہ اسے عمر و روح ہی کیوں نہ مل جائے، اور توبہ بھی فوراً بلا تاخیر واجب ہے، ابو سلیمان دارانیؒ نے کس قدر عجیب بات کہی ہے کہ اگر عقل مند انسان اپنی زندگی کے باقی دن اس افسوس میں رو کر گزار دے کہ اس کا ماضی اطاعت کے بغیر ضائع ہو گیا، توبہ اسکے شایان شان ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جو لوگ اپنی باقی زندگی میں بھی نافرمانیوں کے مرکب رہیں ان کا حال کیا ہوگا، اس کی وجہ یہ ہے کہ جب عقل مند انسان کی ملکیت میں کوئی قیمتی جوہر آتا ہے، اور وہ بلا وجہ ضائع ہو جاتا ہے، تو وہ اس پر روتا ہے اور اگر جوہر کے ساتھ مالک بھی ہرماں ہو رہا ہو تو اس کا گریہ و بکا قابل دید ہوگا، آدمی کی زندگی کا ایک ایک لمحہ اور اس کا ہر سانس ایک ایسا جوہر ہے جس کا کوئی بدل نہیں، اس لئے کہ اس میں انسان کو ابدی سعادت تک پہنچانے اور دائمی شقاوت سے بچانے کے صلاحیت ہے، اس سے زیادہ قیمتی جوہر اور کیا ہوگا، اگر آدمی اپنی غفلت اور لامردائی سے یہ جوہر شین ضائع کر دے تو یہ ایسا نقصان ہوگا جس کی تلافی نہیں ہو سکتی اور اسے مصیبت الہی میں ضائع کرنا تو اتنا دور ہے کہ ہرماں کی اور ہلاکت ہے، اگر آدمی اس عظیم مصیبت پر خون کے آنسو نہ روئے تو یہ اس کی نادانی اور جہالت ہے، جہالت بجائے خود ایک بڑی مصیبت ہے، لیکن جاہل کو اپنی مصیبت کا احساس نہیں ہوتا، کیونکہ غفلت کی نیند اس کے اور مصیبت کی معرفت کے درمیان حائل ہو جاتی ہے، افسوس تمام لوگ اسی خواب غفلت میں مبتلا ہیں جب موت ان کے دروازوں پر دستک دے گی تب بیدار ہو گئے اسوقت ہر مفلس کو اپنے الطاس کا اور ہر مصیبت زدہ کو اپنی مصیبت کا اندازہ ہوگا، لیکن تدارک کا کوئی ذریعہ باقی نہ رہے گا، جو نقصان ہو چکا ہے اس کی تلافی نہ ہو سکے گی، ایک عارف کہتے ہیں کہ جب فرشتہ جاہل کسی بندے کے پاس آتا ہے اور اسے یہ بتا دیتا ہے کہ تمیری موت میں ایک لمحہ باقی رہ گیا ہے، جو اپنی جگہ اٹل ہے، نہ اس سے پہلے موت آئے گی اور نہ بعد میں تو اس وقت اس کی حسرت و ندامت کا عالم قاتل دید ہوتا ہے، اگر اسکے پاس دنیا جہاں کی دولتیں ہوں تو

وہ اپنی زندگی میں تدارک کا ایک لمحہ حاصل کرنے کے لئے یہ تمام دو لہتیں قربان کر دے مگر اس وقت مہلت نفس بھی نہ ملے گی، اس آیت کریمہ کا یہی مفہوم ہے۔

وَحِيلَ بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ مَا يَشْتَهُونَ (پ ۳۲ ر ۴ آیت ۵۴)

اور ان میں اور ان کی آرزو میں ایک آڑ کر دی جائے گی۔

ذیل کی آیت کریمہ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

مَنْ قَبِلَ أَنْ يَأْتِي أَحَدَكُمْ الْمَوْتُ فَيَقُولَ رَبِّ لَوْلَا أَخَّرْتَنِي إِلَىٰ أَجَلٍ قَرِيبٍ فَأَصْدَقْ وَأَكُن مِنَ الصَّالِحِينَ وَلَنْ يُؤَخِّرَ اللَّهُ نَفْسًا إِذَا جَاءَ أَجَلُهَا (پ ۳۸ ر ۱۳ آیت ۹ تا ۱۱)

اس سے پہلے (خریج کرلو) کہ تم میں سے کسی کی موت آگھڑی ہو اور پھر وہ بطور تمنا و حسرت کہنے لگے کہ اے میرے پروردگار مجھ کو اور تھوڑے دنوں کی مہلت کیوں نہ دی کہ میں خیر خیرات دے لیتا، اور نیک کام کرنے والوں میں شامل ہو جاتا، اور اللہ تعالیٰ کسی شخص کو جب کہ اس کی ميعاد آجاتی ہے ہرگز مہلت نہیں دیتا۔

اس میں اجل قریب تک مہلت دینے کی خواہش ہے، جیسا کہ بعض بزرگ کہتے ہیں کہ جب ملک الموت بندے پر یہ انکشاف کرتا ہے کہ میری موت کا وقت قریب آچکا ہے، تو وہ فرشتہ اجل سے درخواست کرتا ہے کہ اے ایک دن کی مہلت دی جائے تاکہ وہ اپنے خالق سے اپنی کوتاہیوں کی اور گناہوں کی مغفرت طلب کر سکے، اور اپنے لئے اچھے اعمال کا توشہ تیار کر سکے، فرشتہ اجل اس سے کہتا ہے کہ تو نے بے شمار روز و شب ضائع کر دیئے تھے ایک دن کی بھی مہلت نہیں دی جاسکتی بندہ کہتا ہے کہ ایک دن کی نہ سہی ایک ساعت ہی کی مہلت دیدو، فرشتہ کہتا ہے کہ تو نے بہت سی ساعتیں ضائع کی ہیں، اب ایک ساعت کی بھی مہلت نہیں ملے گی، اس کے بعد اس پر توبہ کا دروازہ بند کر دیا جاتا ہے، موت آگے بڑھتی ہے، روح تمام جسم سے نکل کر سینے میں آجاتی ہے، سانس بے ترتیب ہونے لگتے ہیں، اور وہ عمر ضائع کرنے کے صدمے اور طانی ماقات سے مایوس کے ساتھ روح نکلنے کا مہر و دیکھتا ہے، انجام کے خوف، حال کی تکلیف اور ماضی کے صدمے اسے اس قدر مضطرب اور بے چین کرتے ہیں کہ اصل ایمان میں اضطراب آجاتا ہے، جب روح نکلنے لگتی ہے، اگر اس کی تقدیر میں خدا نے خیر لکھا ہے تو ایمان پر خاتمہ ہوتا ہے، یہی حسن خاتمہ ہے، ورنہ شک اور اضطراب پر خاتمہ ہوتا ہے، یہ سوء خاتمہ ہے، یہ ان لوگوں کے حصے میں آتا ہے، جن کی قسمت میں دائمی شکاف و کھ دی گئی ہے، اسی خاتمے کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السَّيِّئَاتِ حَتَّىٰ إِذَا حَضَرَ أَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ إِنِّي تُبْتُ الْإِن (پ ۳۳ ر ۱۳ آیت ۱۸)

اور ایسے لوگوں کی توبہ نہیں جو گناہ کرتے رہتے ہیں، یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کی موت آگھڑی ہوئی تو کہنے لگا کہ میں اب توبہ کرتا ہوں۔

توبہ گناہ کے متعلق ہونی چاہئے۔ قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا۔

إِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللَّهِ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ الشُّوْعَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوبُونَ مِنْ قَرِيبٍ (پ ۳۳ ر ۱۴ آیت ۱۷)

توبہ جس کا قبول کرنا اللہ کے ذمہ ہے وہ تو ان ہی کی ہے جو حماقت سے کوئی گناہ کر بیٹھتے ہیں پھر قریب ہی وقت میں توبہ کر لیتے ہیں۔

اس آیت کے معنی یہ ہیں کہ گناہ سے متصل زمانے میں توبہ ہونی چاہیے، یعنی اگر گناہ سرزد ہو تو فوراً اس پر نام ہو، اور اسکے معاصیہ بعد کوئی عمل خیر کرے جس سے اس عمل بد کا تذکرہ ہو سکے، ایسا نہ ہو کہ زیادہ وقت گزر جائے سے دل پر اس گناہ کے اثرات زیادہ ہو جائیں، اور وہ زائل نہ ہو سکیں اسی لئے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اتبعم السببۃ الی حسنۃ گناہ کے بعد ایسی نیکی کر کہ جس سے وہ گناہ ختم ہو جائے حضرت لقمان کی اس وصیت کے بھی یہی معنی ہیں جو انھوں نے اپنے صاحبزادے کو فرمائی تھی کہ اے بیٹے! توبہ کرنے میں تاخیر نہ کر، اس لئے کہ موت اچانک آتی ہے، جو شخص ٹال مٹول سے کام لیتا ہے، اور توبہ کی طرف سبقت نہیں کرتا وہ دو عظیم خطروں کے درمیان ہے، ایک تو یہ کہ معاصی کی ظلمت دل پر چھا جاتی ہے، اور آہستہ آہستہ وہ زندگ کی صورت اختیار کر لیتی ہے، اور طبیعت فانیہ بن جاتی ہے، پھر مٹانے کی کوشش کامیاب نہیں ہوتی، دوسرے یہ کہ بعض اوقات مرض یا موت اچانک زرخے میں لے لیتی ہے اور آدمی کو اپنی مہلت نہیں ملتی کہ وہ اپنے دل سے گناہوں کا زنگ دور کر سکے، اسی لئے حدیث شریف میں وارد ہوا ہے کہ

إِنَّ أَكْثَرَ أَهْلِ النَّارِ مِنَ التَّسَوُّفِ (۱)
اکثر دوزخی ٹال مٹول کے باعث دوزخ میں جائیں گے

اکثر لوگوں کی ہلاکت کا سبب یہی ہے کہ وہ نیک کاموں یا گناہوں سے توبہ کرنے میں ٹال مٹول سے کام لیتے ہیں گناہوں سے دلوں کا سیاہ ہو جانا نقد ہے، اور انھیں نیک اعمال یا توبہ کے ذریعہ جلا وطنیتا و دھار ہے یہاں تک کہ موت آجاتی ہے اور سیاہ دل کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے یہاں پیش ہونا پڑتا ہے، حالانکہ نجات کے اصل مستحق وہی لوگ ہیں جن کے دل گناہوں کی سیاہی سے خالی ہوں۔

کسی عارف کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے ہر بندے سے بطور الہام دو باتیں ارشاد فرماتا ہے، ایک اس وقت جب وہ اپنی ماں کے پیٹ سے نکلتا ہے، اس وقت اس کے کان میں فرماتا ہے، اے بندے! میں تجھے دنیا میں پاک و صاف بھیج رہا ہوں میں نے تجھے تیری عمر بطور امانت دی ہے، اور تجھے امین مقرر کیا ہے، اب میں دیکھتا ہوں کہ تو اس امانت کی کیسے حفاظت کرے گا، اور دوسری اس وقت جب اس کے جسم سے روح نکلتی ہے، اس وقت ارشاد فرماتا ہے، اے بندے میرے پاس میری ایک امانت تھی، تو نے اس کی حفاظت کی ہے یا نہیں؟ اگر کی ہے تو میں بھی اپنا وعدہ پورا کروں۔ اور نہیں کی تو میں بھی اپنی وعید کی تکمیل کروں، قرآن کہہ ایم کی ان دونوں آیتوں میں اسی حمد کی طرف اشارہ ہے۔

وَأَوْفُوا بَعْدَیْ أَوْفِیْ بَعْدَکُمْ (پ ۴۲ آیت ۳۰)
اور پورا کرو تم میرے عہد کو پورا کروں گا میں تمہارے عہد کو۔
وَالَّذِیْنَ هُمْ لَا مَانَا بَیْہُمْ وَعَہْدِہُمْ لَعْنُوْنَ (پ ۲۹ آیت ۳۲)
اور جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کا خیال رکھنے والے ہیں۔

قبول توبہ شرائط کی صحت پر منحصر ہے

اگر تم نے قبولیت کے معنی سمجھ لئے ہیں تو ہمیں اس امر میں شک نہ کرنا چاہئے کہ ہر صحیح توبہ قبول کر لی جاتی ہے، جو لوگ نور بصیرت سے دیکھتے ہیں اور قرآنی انوار سے فیض پاتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ ہر قلب سلیم اللہ تعالیٰ کے یہاں مقبول ہے، وہ آخرت میں اللہ تعالیٰ کے قریب کی لذتیں پائیں گے اور اپنی فیر قانی آنکھوں سے اللہ تعالیٰ کا دیدار کرے گا۔ یہ لوگ اس حقیقت سے بھی واقف ہیں کہ ہر

قلب انبی اصل کے اعتبار سے سلیم پیدا کیا گیا ہے، جیسا کہ حدیث شریف میں ہے کہ ہر بچہ فطرت پر پیدا کیا جاتا ہے، دل کی سلامتی، گناہوں کی تاریکی، اور سینات کے غبار سے ختم ہو جاتی ہے، وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ ندامت کی آگ اس غبار کو جلا کر راکھ کر دیتی ہے، نیکی کا نور دل کے چہرے سے گناہوں کی سیاہی زائل کر دیتا ہے، معاصی کی تاریکی کو یہ تاب ہی نہیں کہ وہ نیکیوں کے نور کے سامنے ٹھہر سکیں، جس طرح رات کی تاریکی دن کی روشنی کے سامنے نہیں ٹھہر سکتی بلکہ جس طرح صابون کے سامنے میل پچیل نہیں ٹھہر سکتا، نیز جس طرح بادشاہ میلا کچلا کپڑا اپنے لباس کے لئے پسند نہیں کرتا، اسی طرح بادشاہ حقیقی بھی گندے دلوں کو اپنے قرب کے لئے منتخب نہیں کرتا پھر جس طرح گندے کاموں میں کپڑوں کا استعمال انھیں میلا کر دیتا ہے اور وہ صابون اور گرم پانی سے دھوئے بغیر صاف نہیں ہوتے اسی طرح شہوات میں قلوب کا استعمال انھیں اتنا گندہ کر دیتا ہے کہ وہ آنسوؤں کے پانی اور ندامت کے بغیر پاک و صاف نہیں ہوتے، ہر پاک و صاف دل اسی طرح مقبول و پسندیدہ ہے جس طرح صاف کپڑا پسند کیا جاتا ہے، اسلئے کہ تم پر ترکیہ و تفسیر واجب ہے تاکہ قضاۃ الہی کے بموجب اسے شرف قبولیت حاصل ہو جائے، اسی قبولیت کا نام فلاح ہے، جیسا کہ قرآن کہہ رہا ہے۔

قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكَّاهَا (پ ۳۰ ر ۲۱ آیت ۹)

یقیناً وہ مراد کو پہنچا جس نے اس کو پاک کر لیا۔

اطاعت و معصیت کی تاثیر : یہ ایک واقعہ ہے کہ قلب پر معصیت اور اطاعت کے اثرات بڑے مختلف ہیں ان میں سے معصیت کے اثرات کو مجازاً "ظلمت" کہہ سکتے ہیں، اور اطاعت کو نور سے تعبیر کر سکتے ہیں، جیسے جمالت کو بطور مجاز تاریکی اور علم کو روشنی کہتے ہیں، ظاہر ہے کہ نور اور ظلمت دونوں ایک دوسرے کی ضد ہوتے ہیں جو شخص اس حقیقت سے واقف نہیں وہ گویا صرف پلست اور جھلکے پر قانع ہے مغز سے جو اصل دین ہے واقف نہیں ہے، بلکہ دین کی طرف سے عقل پر دبیز پردہ پڑا ہوا ہے، اگر غور کیا جائے تو ایسا شخص اپنے نفس کی حقیقت اور اس کی صفات کا علم بھی نہیں رکھتا، جو شخص اپنے نفس سے واقف نہ ہو وہ کسی دوسری چیز سے کیا واقف ہوگا، کیونکہ نفس سے ہی دوسری چیز کی معرفت حاصل ہوتی ہے، جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ توبہ اگر درست اور صحیح ہو تب بھی قبول نہیں ہوتی وہ ایسا ہے جیسے کوئی شخص یہ وہم کرے کہ آفتاب کی روشنی سے اندھیرا دور نہیں ہوتا یا صابون سے کپڑے کی نجاست زائل نہیں ہوتی، البتہ اگر میل اتنا تہ بہ تہہ ہو جائے کہ کپڑے میں اور اس میں کوئی فرق ہی نہ رہے تو وہ صابون سے بھی نہیں دھلتا، اسی طرح اگر گناہ پے بہ پے ہوں تو دل پر اتنا گراؤ لگ ہو جائے گا کہ آسانی سے دور نہ ہو سکے گا، بلکہ بد بختی کی مر لگ جائے گی۔ ایسا دل نہ کبھی توبہ کر سکے گا، اور نہ رجوع الی اللہ کی طرف مائل ہوگا، زبان سے ہزار بار توبہ کہے تب بھی کچھ حاصل نہ ہوگا، یہ ایسا ہی ہے جیسے دھوئی زبان سے یہ کہے کہ میں نے کپڑا دھویا، کیا زبان سے کہنے سے کپڑا دھل جائے گا ہرگز نہیں، جب تک کپڑے کا میل پچیل دور کرنے کیلئے تدبیر نہ کی جائے اور اسے پانی اور صابون کے ذریعہ دور کرنے کی کوشش نہ کی جائے اس وقت تک میل بدستور باقی رہے گا، یہی حال ان لوگوں کا ہے جو اصل توبہ سے باز رہتے ہیں، بلکہ اکثر لوگوں کا جو دنیا پر کتوں کی طرح گرے ہوئے ہیں، اور باری تعالیٰ سے بالکل منحرف ہیں، یہی حال ہے کہ ان کے دل کا میل دور نہیں ہوتا کیونکہ وہ محض زبان سے توبہ کرتے ہیں دل سے نہیں کرتے۔

قبولیت توبہ کے دلائل : قبولیت کے متعلق اب تک جو کچھ ہم نے لکھا ہے وہ اہل بصیرت کے نزدیک کافی دانی ہے، تاہم عوام الناس اس وقت تک کفایت محسوس کریں گے جب تک ہم اپنے دعویٰ کو دلائل کا پیرہن نہ پہنادیں گے اسلئے کہ جس دعویٰ کے لئے کتاب و سنت سے کوئی دلیل نہیں ہوتی وہ عام طور پر لائق اعتماد نہیں ہوتا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وَهُوَ الَّذِي يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهِمْ وَيُغْفِرُ عَنِ السَّيِّئَاتِ (پ ۲۵ ر ۴ آیت ۲۵)

اور وہ ایسا ہے کہ اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور ان کے گناہ معاف فرماتا ہے۔

غَافِرُ الذَّنْبِ وَقَابِلُ التَّوْبِ (پ ۲۴ آیت ۳)

گناہ معاف کرنے والا اور توبہ قبول کرنے والا

انکے علاوہ بھی قبول توبہ کے باب میں بے شمار آیات وارد ہیں۔ اس سے پہلے ایک حدیث لکھی گئی ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بندے کی توبہ سے بہت خوش ہوتا ہے، ظاہر ہے کہ خوشی قبولیت کے بعد ہے، اور یہ حدیث بھی قبولیت توبہ پر دلالت کرتی ہے۔ ایک حدیث میں ہے

إِنَّ اللَّهَ عَزَّ وَجَلَّ يَبْسُطُ يَدَهُ بِالتَّوْبَةِ لِمَنْ يَسِيءُ اللَّيْلُ إِلَى النَّهَارِ وَلِمَنْ يَسِيءُ النَّهَارُ إِلَى اللَّيْلِ حَتَّى تَطْلُعَ الشَّمْسُ مِنْ مَغْرِبِهَا (مسلم۔ ابو موسیٰ۔ ملتقى آخر)

اللہ تعالیٰ اس شخص کی توبہ کے لئے ہاتھ پھیلائے رکھتا ہے جو رات سے دن تک اور دن سے رات تک

گناہ کرے یہاں تک کہ سورج مغرب سے طلوع ہو۔

ہاتھ پھیلانے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے ان بندوں سے جو سر تپا گناہوں میں آلودہ رہتے ہیں، توبہ کا طالب رہتا ہے، طلب کا درجہ قبول کے بعد ہے، یہ ممکن ہے کہ قبول کرنے والا طالب نہ ہو، لیکن طالب قبول کرنے والا ضرور ہوگا۔ ایک حدیث میں ہے

لَوْ عَمِلْتُمْ الْخَطَايَا حَتَّى تَبْلُغَ السَّمَاءَ ثُمَّ نَدِمْتُمْ لَنَابِ اللَّهُ عَلَيْكُمْ (ابن ماجہ۔ ابو ہریرہ)

اگر تم اتنے گناہ کرو کہ آسمان تک پہنچ جائیں، پھر ان پر نادم ہو تو اللہ تعالیٰ تمہاری توبہ قبول فرمایگا۔

ایک حدیث میں ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ بندہ گناہ کرتا ہے اور اس کی وجہ سے جنت میں داخل ہوتا ہے۔ لوگوں نے عرض کیا ایسا کس طرح ہو سکتا ہے کہ ایک شخص گناہ بھی کرے اور جنت میں بھی جائے، فرمایا وہ شخص اس گناہ سے توبہ کرتا ہے اور اس سے گریز کرتا ہے یہاں تک کہ جنت میں داخل ہو جاتا ہے (ابن المبارک فی الزہد، عن الحسن مرسل) ایک حدیث کے الفاظ یہ ہیں۔

كَفَّارَةُ الذَّنْبِ النَّدَامَةُ (احمد، طبرانی۔ ابن عباس)

گناہ کا کفارہ ندامت ہے۔

ایک روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں التَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَا ذَنْبَ لَهُ گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہے جیسے اس کا کوئی گناہ ہی نہ ہو۔ ایک روایت ہے کہ کسی حبشی نے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا یا رسول اللہ میں برے عمل کرتا تھا، اگر میں ان سے توبہ کر لوں تو کیا میری توبہ قبول ہو جائے گی؟ آپ نے ارشاد فرمایا کیوں نہیں؟ وہ شخص چلا گیا، پھر واپس آیا اور کہنے لگا کہ جب میں برے کام کرتا تھا تو کیا میرا اللہ مجھے دیکھتا تھا، آپ نے فرمایا: یقیناً وہ تجھے دیکھتا تھا، یہ سن کر اس حبشی نے دلدادہ ہو کر کہا: اور جان جان آفریں کے سپرد کوئی؟

روایت ہے کہ جب شیطان کو بارگاہِ خداوندی سے نکالا گیا تو اس نے مصلحت کی درخواست کی، اللہ تعالیٰ نے اسے قیامت تک کے لئے مصلحت سے نوازا، اس نے عرض کیا مجھے قسم ہے تیری عزت و جلال کی میں اس وقت تک ابن آدم کے دل سے نہیں نکلوں گا جب تک اسکے جسم میں روح رہے گی، اللہ تعالیٰ نے فرمایا میں اپنی عزت و جلال کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ جب تک ابن آدم کے جسم میں روح رہے گی اس پر قبولیت توبہ کے دروازے بند نہیں کروں گا (احمد، ابو حاتم، ابو سعید) ایک حدیث میں ہے۔

إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ كَمَا يُذْهِبُ لَمَاءُ الْوَسَخِ

لے مجھے اس روایت کی اصل نہیں ملی، لہٰذا ان الفاظ میں یہ روایت نہیں کی البتہ اس معنی کی روایت ترمذی کے حوالوں سے ابھی گزری ہے

نیکیاں برائیاں کو اس طرح مٹا دیتی ہیں جس طرح پانی نجاست کو دور کرتا ہے۔

حضرت سعید بن المسیبؓ ارشاد فرماتے ہیں کہ قرآن کریم کی یہ آیت اِنَّهٗ كَانَ لَیْلًا وَّابَسًا غَفُوْرًا ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی جو گناہ کرتے ہیں توبہ کرتے ہیں پھر گناہ کرتے ہیں پھر توبہ کرتے ہیں، فضیلؓ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ گناہ گاروں کو خوشخبری سناؤ کہ اگر انھوں نے توبہ کی تو میں ان کی توبہ قبول کروں گا، اور صدیقین کو تنبیہ کر دو کہ اگر میں نے ان پر عدل کیا تو میں انھیں عذاب دوں گا، علی ابن حبیب کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے حقوق ایسے عظیم ہیں کہ لوگ انھیں ادا نہیں کھاتے، بلکہ گناہ گار ہوتے ہیں، اگر وہ صبح و شام توبہ نہ کریں تو معاملہ دشوار ہو جائے، حضرت عبد اللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ جو بندہ اپنے قصور پر نادم ہوتا ہے اسکا وہ قصور نامہ اعمال سے محو ہو جاتا ہے۔ روایت ہے کہ بنی اسرائیل کے ایک پیغمبر سے کوئی غلطی سرزد ہو گئی اس پر اللہ تعالیٰ نے وحی نازل فرمائی کہ اگر تو نے یہ غلطی دوبارہ کی تو میں عذاب دوں گا، انھوں نے عرض کیا اے اللہ! تو تو ہے میں میں ہوں، تیری عزت کی قسم اگر تو مجھے نہ بچائے گا میں اس قصور کے ارتکاب سے محفوظ نہ رہ سکوں گا، تو ہی مجھے اس غلطی سے محفوظ رکھ، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انھیں دوبارہ اس قصور سے محفوظ رکھا، ایک بزرگ کا قول ہے کہ بندہ گناہ کرتا ہے اور زندگی بھر اس گناہ پر نادم رہتا ہے یہاں تک کہ وہ موت کے بعد جنت میں داخل ہو جاتا ہے، اس وقت شیطان کہتا ہے کاش میں اسے اس گناہ میں مبتلا ہی نہ کرتا، حبیب ابن ثابت کہتے ہیں کہ قیامت کے دن بندے پر اس کے گناہ پیش ہوں گے، اس کے سامنے جب بھی کوئی گناہ آئے گا وہ کہے گا کہ میں اسی سے خوف زدہ تھا، اس کے کہنے سے وہ قصور معاف کر دیا جائیگا، ایک شخص نے حضرت عبد اللہ ابن مسعودؓ کی خدمت میں عرض کیا کہ میں نے ایک گناہ کیا ہے، اگر میں توبہ کروں تو اللہ تعالیٰ کے یہاں قبول ہو جائیگی یا نہیں؟ پہلے آپ نے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا، پھر آنسو بہاتے ہوئے فرمایا کہ جنت کے آٹھ دروازے ہیں جو کبھی بند ہوتے ہیں اور کبھی کھول دئے جاتے ہیں، صرف توبہ کا ایک دروازہ ایسا ہے جو بند نہیں ہوتا، تم عمل کرتے رہو اور اللہ کی رحمت سے مایوس مت ہو، عبد الرحمن بن ابوالقاسم سے روایت ہے کہ ایک بار عبد الرحمنؓ کی مجلس میں کافر کی توبہ کا ذکر ہوا، اور اس آیت پر بھی گفتگو ہوئی۔ ان یسئروا یغفر لہم ما قلدسلف۔ انھوں نے فرمایا کہ مجھے تو یقین ہے کہ مسلمان کا حال اللہ کے نزدیک زیادہ اچھا ہو گا۔ کیوں کہ مجھے یہ روایت ملی ہے کہ مسلمان کا توبہ کرنا ایسا ہے جیسے اسلام کے بعد پھر اسلام لانا، عبد اللہ ابن سلام فرماتے ہیں کہ میں تم سے جو روایت بیان کرتا ہوں وہ یا تو نبی مبعوث آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہوئی یا آسمان سے نازل شدہ کتاب قرآن کریم میں دیکھی ہوئی ہے، اور وہ یہ ہے کہ بندہ گناہ کرنے کے بعد ایک لمحہ کیلئے توبہ کر لیتا ہے تو اس سے کم عرصے میں وہ گناہ اس سے ساقط ہو جاتا ہے۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ توبہ کرنے والوں کے پاس بیٹھا کرو، اس لئے کہ وہ نرم خوار و نرم دل ہوتے ہیں، ایک بزرگ نے کہا کہ میں یہ بات جانتا ہوں کہ میری مغفرت اللہ کب کریگا، کسی نے پوچھا کب کرے گا؟ فرمایا جب وہ میری توبہ قبول کرے گا۔ ایک بزرگ کا قول ہے کہ میں توبہ سے محروم رہوں اس سے زیادہ خوفناک بات یہ ہے کہ میں مغفرت سے محروم رہوں اس لئے کہ مغفرت توبہ کے لئے لازم ہے، اگر توبہ نہ ہوگی تو مغفرت بھی نہ ہوگی، روایت ہے کہ بنی اسرائیل میں ایک شخص تھا جس نے بیس برس تک اللہ تعالیٰ کی عبادت کی، پھر بیس برس تک اس کی نافرمانی کی، ایک دن آئینے میں چہرہ دیکھا تو سراور داڑھی کے بالوں میں سفیدی نظر آئی، یہ دیکھ کر اسے بڑی تکلیف ہوئی، اس نے جناب الہی میں عرض کیا کہ اے اللہ میں نے تیری بیس برس تک عبادت کی ہے، اور پھر بیس برس تک نافرمانی کی ہے، اب اگر میں تیری طرف رجوع کروں تو تو میری توبہ قبول کرے گا، غیب سے آواز آئی کہ اے شخص تو ہم سے محبت کرتا تھا ہم تجھ سے محبت کرتے تھے، تو نے ہمیں چھوڑا ہم نے تجھے چھوڑ دیا، تو نے نافرمانی کی، ہم نے تجھے سہلت دی، اب اگر تو ہماری طرف رجوع کرے گا تو ہم تجھے اپنے سایہ رحمت میں جگہ دیں گے، حضرت ذوالنون مصریؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے کچھ بندے ایسے ہیں جنھوں نے گناہوں کے درخت لگائے اور انھیں توبہ کے پانی سے سیراب کیا پھر ان پر بد امت و حزن کے پھل لگے، یہاں تک کہ بغیر جنون کے دیوانے ہو گئے اور بغیر عاجزی و گونگتے پن کے جی بن گئے، حالانکہ یہ لوگ بڑے فصیح و بلیغ، اور

اللہ و رسول کی معرفت رکھنے والے ہیں، پھر انھوں نے جامِ صفا نوش کیا، اور طولِ مشقت کے باوجود صبر کے خور کئے، پھر ان کے دل عالمِ ملکوت کی سیاحت کی مشتاق ہوئے اور انھوں نے اپنی فکر کی کندیں پردہ ہائے جہوت کے مخفی اسرار پر بھیکنی شروع کیں نہامت کے شجر سایہ دار کے نیچے بیٹھ کر انھوں نے اپنے گناہوں کا صحیفہ پڑھا اور اپنے نفوس پر خوف طاری کیا، یہاں تک کہ تقویٰ کی میٹھی لگا کر زہد کی بلندیوں تک جا پہنچے، دنیا کی تنگی بھی شیریں ہو گئی، اور بستر کی تنگی بھی نرمی سے بدل گئی نجات اور سلامتی کے دے میسر آئے، اور ان کی روحیں اتنی بلند ہوئیں کہ جناتِ جہنم کو ٹھکانہ بنالیا، یہ لوگ دریائے حیات میں محو سفر ہوئے، انھوں نے مایوسی اور خوف کی خندقوں کو عبور کیا نفسانی خواہشات کے پلوں سے گزرے، یہاں تک کہ علم کے وسیع میدان میں فروکش ہوئے، حکمت کے چشموں سے سیراب ہوئے، ذہانت کی کشتی کو ذریعہ سفر بنالیا، اس پر نجات کے بادبان تانے، اور سلامتی کے سمندروں میں کشتی کو آگے بڑھایا، ساحلِ مراد تک پہنچے، راحت کے خیمے لگائے، اور عزت و کرامت کے معدن سے فیض اٹھایا۔

اب تک جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس سے یہ بات پوری طرح ثابت ہو جاتی ہے کہ اگر توبہ اپنی صحت کی شرائط رکھتی ہو تو اسکی قبولیت کے لئے کوئی چیز مانع نہیں ہے۔

کیا اللہ تعالیٰ پر توبہ قبول کرنا واجب ہے؟ : یہاں ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ گزشتہ طور سے پتہ چلتا ہے کہ اگر کوئی شخص شرائط کا لحاظ رکھتے ہوئے توبہ کرے تو اللہ تعالیٰ پر اسکا قبول کرنا واجب ہے، یہ بات معتزلہ کے مسلک کے مطابق ہے کیونکہ وہی لوگ یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ پر توبہ قبول کرنا واجب ہے، ہمارا جواب یہ ہے کہ معتزلہ نے وجوب کے جو معنی لئے ہیں وہ ہماری مراد سے مختلف ہیں، ہمارے نزدیک قبولِ توبہ کا وجوب ایسا ہے جیسے کوئی یہ کہے کہ اگر گناہ کبیرا صابون سے دھویا جائے تو اس کا صاف ہونا واجب ہے، یا پیاسا آدمی پانی پی لے تو اس کی تشنگی دور ہونا واجب ہے، یا اگر کسی شخص کو پانی سے محروم کر دیا جائے تو اس کا پیاس کی شدت سے مر جانا واجب ہے، ظاہر ہے یہاں وجوب کے معنی ضروری کے ہیں، معتزلہ کے نزدیک وجوب کے جو معنی ہیں وہ ان میں سے کسی ایک میں بھی نہیں پائے جاتے، ہم صرف یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اطاعت کو گناہ کا کفارہ بنالیا ہے اور نیکی کو برائی مٹانے والی چیز قرار دیا ہے، جیسا کہ پانی کو پیاس بجھانے والی شئی قرار دیا ہے، البتہ اس کی قدرت سے اس کے خلاف بھی ہو سکتا ہے کہ پانی کو پیاس دور نہ ہو، اطاعت ہو گناہ کا کفارہ نہ بنے، نیکی ہو لیکن اس سے برائی نہ ملے، خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ پر کوئی چیز واجب نہیں ہے، ہاں اگر کسی چیز کے وجود یا عدم وجود کا فیصلہ ازل میں ہو چکا ہے اس کا ہونا بلاشبہ واجب ہے۔

قبولِ توبہ میں شک کی وجہ : یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر کوئی توبہ کرنے والا یقین سے یہ بات نہیں کہہ سکتا کہ میری توبہ قبول ہوگی، وہ شک میں رہتا ہے، جبکہ پانی پینے والے کو تشنگی دور ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہوتا، اسکی وجہ کیا ہے اسکا جواب یہ ہے کہ توبہ کے قبول ہونے میں کوئی شک نہیں ہوتا بلکہ ان شرائط کی صحیح طور پر ادائیگی میں شک ہوتا ہے جو قبولِ توبہ کے لئے ضروری ہیں، ان شرائط کا بیان بہت جلد آئے گا انشاء اللہ کیونکہ بعدہ عاجز و مسکین تمام شرائط ادا کرنے سے قاصر رہتا ہے، اس لئے وہ اپنی توبہ کے بارے میں یقین سے یہ بات نہیں کہہ سکتا کہ وہ قبول ہوگی، جیسا کہ جلاب لینے والا یقین سے یہ بات نہیں کہہ سکتا کہ دست آئیں گے کیونکہ یہ بات ممکن ہے کہ موسم، مریض کے مزاج اور ماحول کے اعتبار سے جلاب کی جو شرائط ہیں وہ پوری نہ ہوتی ہوں یا دست آور دوا کو اس طرح جوش نہ دیا گیا ہو جس طرح دیا جانا چاہئے، نیز اس سال کی مفرد دوائیں اصلی بھی ہیں یا نہیں اسی طرح کے اندیشے آدمی کے دل میں یہ دوسرے پیدا کرتے ہیں کہ اس کی توبہ قبول نہیں ہوتی۔

دوسرا باب

گناہوں کا بیان

جاننا چاہئے کہ توبہ کے معنی ہیں گناہ ترک کرنا۔ اور کسی چیز کو ترک کرنا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک اس کی معرفت نہ

ہو، پھر کیونکہ توبہ واجب ہے اس لئے وہ چیز بھی واجب ہے جس کے ذریعے توبہ کے درجہ تک پہنچا جائے، اس سے معلوم ہوا کہ گناہوں کی معرفت واجب ہے۔

گناہ کی تعریف : گناہ کے معنی ہیں کسی فعل یا ترک فعل میں اللہ کے اوامر کی مخالفت کرنا، اس کی تفصیل کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے تمام احکام اول سے آخر تک بیان کریں لیکن یہ ہمارے مقصد سے خارج ہے، البتہ ہم گناہوں کی اقسام اور ان کے باہمی روابط کی طرف کچھ اشارہ کرتے ہیں، اللہ ہی اپنی رحمت سے ہدایت کی توفیق عطا کرنے والا ہے۔

بندوں کے اوصاف کے لحاظ سے گناہوں کی قسمیں : انسان کے بے شمار اخلاق اور اوصاف ہیں، جیسا کہ عجائب قلب کے ابواب میں ان کی شرح ہو چکی ہے، البتہ وہ اوصاف و اخلاق جن سے گناہوں کو تحریک ملتی ہے چار قسموں میں منحصر ہیں، ربانی اوصاف، شیطانی اوصاف، ہیمنہ اوصاف اور سببی اوصاف، اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کا خیر مختلف اخلاط سے تیار کیا گیا ہے، اس لئے ہر غلط انسان کے اندر اپنا الگ اثر چاہتا ہے جیسا کہ سنجین میں شکر، سرکہ اور زعفران کی آمیزش کی جائے تو ان میں سے ہر ایک کا اثر جدا گانہ ہوتا ہے، اسی طرح انسان کے یہ چاروں اوصاف الگ الگ اثر دکھاتے ہیں، مثلاً ربانی صفت کا تقاضا یہ ہے کہ اس میں کبر اور فخر ہو، وہ جبر پسند ہو، مدح و ثنا، دولت و عزت، اور سطوت و اقتدار کا خواہاں ہو، اور یہ چاہتا ہو کہ تمام مخلوق پر سر بلند ہو جائے، اس کا وجود زبان حال سے یہ کہتا ہوا نظر آتا ہے، انار یکم الاعلیٰ (میں تم سب کا رب اعلیٰ ہوں) اس صفت کے پہلو سے ایسے ایسے گناہ جنم لیتے ہیں کہ لوگوں کو ان کا احساس بھی نہیں ہوتا، اور نہ انھیں گناہوں میں شمار کرتے ہیں، حالانکہ وہ انتہائی مسلک ہیں، اور بے شمار گناہوں کا منبع ہیں، جلد ثالث میں ہم ایسے تمام گناہوں پر بڑی تفصیلی گفتگو کر چکے ہیں، دوسرا وصف شیطانی ہے، اس سے حسد، سرکشی، حیلے، فریب، مکر، جھگڑے، فساد جنم لیتے ہیں، اسی وصف کی بنا پر آدمی منکرات کا حکم دیتا ہے، فحاشا بدعت، بے ایمانی اور دوسری خرافات کی طرف بلاتا ہے، تیسری صفت یہی ہے، اس صفت سے بھی بے شمار برائیاں پیدا ہوتی ہیں، جیسے حرص، طمع، شکم و شرمگاہ کی شہوت، زنا، لواطت، چوری، قیہوں کے مال میں تصرف اور غیر شرعی کاموں کے لئے دولت اکٹھا کرنے کی خواہش وغیرہ جو سبھی صفت سببی ہے، اسکے پہلو سے بھی لاتعداد قباحتیں نکلتی ہیں، جیسے غصہ، حسد، کینہ، لوگوں کو مارنا بیٹنا، انھیں گالیاں دینا، قتل کرنا اور ان کا مال جاہ و برباد کرنا، پھر ان گناہوں سے بھی بے شمار گناہ متفرع ہوتے ہیں۔

اوصاف اربعہ کی فطری ترتیب : پیدائش کے لحاظ سے یہ چاروں اوصاف بتدریج پیدا ہوتے ہیں پہلے یہی صفت غالب آتی ہے، اسکے بعد سببی صفت کا غلبہ ہوتا ہے پھر یہ دونوں صفتیں جمع ہو کر عقل کو کمزور فریب اور حیلے کی راہ پر ڈال دیتی ہیں، یہیں سے شیطانی وصف سر اٹھاتا ہے، آخر میں ربوبیت کی اوصاف ابھرتے ہیں یعنی آدمی یہ قصد کرنے لگتا ہے کہ وہ تمام مخلوق پر تفوق حاصل کر لے، چنانچہ بات بے بات فخر کرتا ہے، عقل اور کبر کا مظاہرہ کرتا ہے، اپنی عزت و عظمت کے اظہار کے لئے دوسروں کی اہانت کرتا ہے، خلاصہ یہ ہے کہ تمام گناہوں کا منبع اور سرچشمہ یہی چار صفتیں ہیں، ان سے گناہ نکلتے ہیں تو اعضاء پر منتشر ہو جاتے ہیں، بعض گناہ دل سے متعلق ہو جاتے ہیں، جیسے کفر، بدعت، اور فحاشا، اور بعض وحسد کا تعلق آگے اور کان سے ہوتا ہے، بعض شکم اور شرمگاہ سے متعلق ہوتے ہیں، اور بعض گناہ ہاتھ، پاؤں اور بدن کے دوسرے حصوں سے سرزد ہوتے ہیں، کیوں کہ یہ تمام گناہ واضح ہیں اس لئے ان کی تفصیل کی ضرورت نہیں۔

حقوق اللہ اور حقوق العباد : گناہوں کی ایک اور تقسیم ہے، بعض گناہ وہ ہیں جو بندے اور اسکے خدا کے درمیان ہیں، اور بعض گناہ ایسے ہیں جن کا تعلق بندگان خدا کے حقوق سے ہے، جن گناہوں کا تعلق اللہ تعالیٰ کے حقوق سے ہے وہ یہ ہیں جیسے نماز روزہ اور دوسرے فرائض و واجبات ترک کر دینا اور جو بندوں کے حقوق سے متعلق ہیں وہ یہ ہیں جیسے زکوٰۃ نہ دینا، کسی کو ہلاک کرنا،

الْكَبَائِرُ إِلَّا شِرَاكُ بِاللَّهِ وَحَقُّوْا الْوَالِدَيْنِ وَقَتْلُ النَّفْسِ وَالْيَمِيْنُ الْغَمُوسُ
(بخاری)

اللہ کا شریک ٹھہرانا، والدین کی نافرمانی کرنا، قتل نفس کرنا اور جھوٹی قسم کھانا بڑے گناہ ہیں۔

صحابہ تابعین کے نزدیک کبائر کی تعداد مختلف فیہ ہے، یہ اختلاف چار سے سات، نو اور دس تک بلکہ اس سے زیادہ تک ہے، حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ کبائر چار ہیں، ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ ان کی تعداد سات ہے، حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کہتے ہیں، جب حضرت عبداللہ ابن عباسؓ نے یہ سنا کہ ابن عمرؓ نے کبائر کی تعداد سات بتلائی ہے تو انھوں نے فرمایا کہ سات کے بجائے ستر گنا زیادہ قرین ثواب ہے، ایک مرتبہ انھوں نے فرمایا کہ جس بات سے اللہ نے منع فرمایا اس پر عمل کرنا کبیرہ گناہ ہے، ایک بزرگ کی رائے یہ ہے کہ جس گناہ پر دوزخ کے عذاب کی وعید سنائی گئی ہے، وہ کبیرہ ہیں جن کے ارتکاب پر حد واجب ہوتی ہے، بعض لوگوں نے یہ بھی کہا ہے کہ کبائر بمبم ہیں، ان کی تعداد متعین نہیں کی جاسکتی، جس طرح شب قدر متعین نہیں ہے، یا جمعہ کی وہ ساعت معلوم و مخصوص نہیں ہے جس میں دعائیں قبول ہوتی ہیں، حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ سے کسی نے کبائر کے بارے میں دریافت کیا، آپ نے فرمایا، سورۃ نساء کے شروع سے تیسویں آیت تک پڑھو، جب سائل نے یہ الفاظ پڑھے۔ ”لَنْ تَجْزِيَنَّهُمْ اَوْ كِبَايَرُ مَا نَسْنَهُمْ عَنْهُ“ تو آپ نے فرمایا اس سورت میں یہاں تک اللہ تعالیٰ نے جن امور سے منع فرمایا ہے، وہ کبائر ہیں، ابو طالب مکیؓ فرماتے ہیں، کبائر سترہ ہیں، میں نے یہ تعداد حدیث سے اخذ کی ہے، البتہ اگر حضرت عبداللہ ابن عباسؓ ابن مسعودؓ اور ابن عمرؓ کے مختلف اقوال جمع کئے جائیں تو ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ چار کبیرہ گناہ دل میں ہوتے ہیں، شرک باللہ، اس کی معصیت پر اصرار، اسکی رحمت سے ناامیدی اور اسکی پکڑ سے بے غنی، چار کا تعلق زبان سے ہے، جھوٹی گواہی دینا، پاکہاز (عورت یا مرد) پر زنا کی تصدیق لگانا، اور جھوٹی قسم کھانا، جھوٹی کے معنی یہ ہیں کہ اس کے ذریعہ باطل کو حق اور حق کو باطل بنا کر پیش کیا جائے، اور بعض کے نزدیک اس کی تعریف یہ ہے کہ جس کے ذریعہ کسی مسلمان کا مال ناحق قبضہ کیا جائے، خواہ وہ پیلو کی سواک ہی کیوں نہ ہو، جھوٹی قسم کو غس اس لئے کہتے ہیں کہ اپنے مرتکب کو دوزخ میں ڈال دیتی ہے، اور غس کے معنی ہیں غوطہ دینا، زبان سے متعلق چوتھا کبیرہ گناہ محر ہے، اس سے ہر وہ کلام مراد ہے جو انسان کو یا اس کے اعضاء کو اصل خلقت سے بدل دے، تین کبیرہ پیٹ سے متعلق ہیں، شراب اور دیگر نشہ آور چیزیں استعمال کرنی، یتیم پر ظلم و تشدد کر کے ان کا مال کھانا، جان بوجھ کر سود کھانا، دو گناہوں کا تعلق شرمگاہ سے ہے، زنا اور لواطت، دو ہاتھ سے متعلق ہیں، قتل اور چوری، ایک کا تعلق پاؤں سے ہے، میدان جنگ سے فرار، اس طرح کہ ایک دو کے مقابلے سے اور دس بیس کے مقابلے سے فرار ہو جائیں، ایک گناہ پورے جسم سے متعلق رکھتا ہے، والدین کی نافرمانی، والدین کی نافرمانی یہ ہے کہ اگر وہ کسی چیز کی قسم کھائیں تو بیٹا ان کی قسم پوری نہ کرے، یا وہ اپنی کوئی ضرورت سامنے رکھیں تو اس کی تکمیل نہ کرے یا وہ برا بھلا کہیں تو بیٹا مرنے مارنے پر آمادہ ہو جائے، اگر وہ بھوکے ہوں تو انھیں کھانے کو نہ دے، یہ رائے اگرچہ قریب فہم ہے لیکن پوری تشفی اس سے بھی نہیں ہوتی کیونکہ اس تعداد میں کمی بیشی کی گنجائش ہے، مثلاً اس میں سود اور یتیم کا مال کھانے کو کبیرہ گناہ کہا گیا ہے، حالانکہ یہ گناہ اموال سے متعلق ہیں، اسی طرح صرف قتل نفس کو کبیرہ گناہ کہا گیا ہے، آنکھ پھوڑنے، ہاتھ کاٹنے اور مسلمان کو اسی طرح جسمانی تکلیفیں پہنچانے کا کہیں ذکر نہیں ہے، یتیم کو مارنا، اس کو تکلیف پہنچانا، اس کا ہاتھ وغیرہ کاٹنا اسکا مال کھانے سے بھی بڑا گناہ ہے، حدیث میں ایک گالی کے جواب میں دو گالی دینے کو بھی کبیرہ گناہ کہا گیا ہے، اور کسی مسلمان کی عزت پر حملہ کرنے کو بھی کبائر میں شمار کیا گیا ہے (احمد، ابوداؤد، ابن زید) یہ گناہ پارسا پر زنا کی تصدیق سے الگ ایک گناہ ہے، حضرت ابو سعید الخدریؓ اور بعض دوسرے صحابہ فرماتے ہیں کہ تم بعض کاموں کو بال سے سے زیادہ باریک (معمولی) تصور کرتے ہو، حالانکہ ہم سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارکہ میں انھیں کبائر سمجھتے تھے (احمد، بزار باختلاف یسر، بخاری۔ النس) ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ ہر وہ گناہ جو قصداً کیا جائے کبیرہ ہے اسی طرح ہر وہ گناہ کبیرہ ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے۔

کبیرہ کے معنی : یہ تمام اقوال اپنی جگہ درست ہیں، لیکن ہم یہ کہتے ہیں کہ اس تفصیل سے کبیرہ یا صغیرہ گناہ کی تعریف واضح

نہیں ہوتی، ایک شخص چوری کے متعلق دریافت کرتا ہے کہ یہ گناہ کبیرہ ہے یا نہیں، ظاہر ہے وہ اس وقت قطعیت کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتا جب تک اسے کبیرہ کے معنی نہ معلوم ہوں یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص سرتے کے متعلق سوال کرے کہ یہ حرام ہے یا نہیں ظاہر ہے اس کی حرمت یا عدم حرمت کے بارے میں صحیح فیصلہ وہی شخص کر سکتا ہے کہ جسے حرمت کے معنی معلوم ہوں یا یہ معلوم نہ ہو کہ جو گناہ حرام میں ہوتا ہے وہی چوری میں ہوتا ہے، اس صورت میں وہ شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ چوری حرام ہے ہمارے خیال میں تو کبیرہ ایک مبہم لفظ ہے نہ لغت میں اس کے مخصوص معنی ہیں، اور نہ شرع میں اس لئے کہ کبیرہ صغیرہ اضافی امور ہیں ہر گناہ اپنے چھوٹے کی نسبت بڑا اور بڑے کی نسبت چھوٹا ہے، مثلاً کسی اجنبی عورت کے ساتھ لیٹنا اس کی طرف دیکھنے کی نسبت بڑا گناہ ہے، اور اس کے ساتھ زنا کرنے کی نسبت چھوٹا گناہ ہے، البتہ اگر کوئی شخص ان گناہوں کو کبیرہ کہنے لگے جن پر دوزخ کے عذاب کی وعید ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے کیونکہ وہ یہ وجہ بیان کر سکتا ہے کہ دوزخ کا عذاب خوفناک سزا ہے یہ سزا انہیں گناہوں پر مل سکتی ہے جو بڑے ہوں یا یہ کہے کہ جن گناہوں پر حدود واجب ہوتی ہیں وہ کبیرہ ہیں، کیونکہ دنیا میں ان کے لئے جو سزائیں واجب کی گئی ہیں وہ زبردست ہیں، اسی طرح ان گناہوں کو بھی یقین کے ساتھ کبیرہ کہا جاسکتا ہے جن کو کتاب و سنت میں خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے، کتاب و سنت میں ان کے ذکر کی تخصیص ان کی عظمت پر دلالت کرتی ہے، پھر ان کی عظمت میں بھی تفاوت ہو گا کیوں کہ قرآن کریم میں جو گناہ منصوص ہیں ان میں بھی درجات کا تفاوت ہے، بہر حال ان اطلاقات میں کوئی حرج نہیں ہے، صحابہ کرام سے کبیرہ کی تعریف و تحدید میں جو اقوال وارد ہیں وہ بھی اسی نوع کے ہیں، اور ان میں بھی اس طرح کے احتمالات نکل سکتے ہیں۔

کیونکہ قرآن کریم کی اس آیت ”إِنْ تَحِبُّوا كَبَائِرَ مَا تَنْهَوْنَ عَنْهُ فَقَدْ عَنِتُمْ سَبِيْلَكُمْ“ اور سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد ”أَلَمْ تَرَ أَنَّ الْكَبَائِرَ لَا تَبْنِيَنَّ إِلَّا الْكَبَائِرَ“ میں کبیرہ کا ذکر ہے اس لئے یہ ضروری ہے کہ ہم کبیرہ کی تحقیق کریں اور اس کے معنی جاننے کی کوشش کریں، ورنہ ہم کبار سے اجتناب کیسے کر سکیں گے۔

اس سلسلے میں تحقیقی بات یہ ہے کہ شرعی نقطہ نظر سے گناہوں کی تین قسمیں ہیں، ایک وہ جن کا بڑا ہونا معلوم ہے، دوسرے وہ جو صغائر میں شمار کئے جاتے ہیں اور تیسرے وہ جن کے شرعی احکام معلوم نہیں، ان کے صغیرہ یا کبیرہ ہونے میں شک ہے، اس طرح کے شکوک اور مبہم گناہوں کی کوئی جامع مانع تعریف ممکن نہیں ہے، یہ بات اس وقت ممکن تھی جب شارع علیہ السلام سے اس سلسلے میں کوئی تفصیلی حکم معقول ہوتا، یعنی آپ یہ فرما دیتے کہ کبار سے ہماری مراد فلاں فلاں گناہ ہیں، اور وہ دس یا پانچ ہیں، لیکن کیونکہ روایات میں یہ تفصیلات مذکور نہیں ہیں بلکہ بعض روایات میں تین گناہوں کو کبار کہا گیا ہے، (بخاری و مسلم ابو جعفر) اور بعض میں سات کو (طبرانی اوسط، ابوسعید) پھر ایک روایت میں یہ بھی مذکور ہے کہ ایک گالی کے جواب میں دو گالی دینا بھی کبیرہ گناہ ہے حالانکہ نہ اسے تین میں شمار کیا گیا ہے اور نہ سات میں اس سے معلوم ہوا کہ، آپ نے کبار کی ایسی تعداد بیان نہیں فرمائی جس میں حصر کیا گیا ہو، جب شارع ہی نے حصر کا قصد نہیں فرمایا تو دوسرے لوگ اس کی توقع کیسے کر سکتے ہیں، غالباً شارع علیہ السلام نے کبیرہ گناہوں کا عدد اسی لئے مبہم رکھا ہے تاکہ لوگ ڈرتے رہیں، جیسے شب قدر کو اس لئے مبہم رکھا گیا ہے تاکہ لوگ اس کی تلاش و جستجو میں محنت کریں۔

کبار کی تقسیم : تاہم ایک اصول کی روشنی میں کبار کی قسمیں تحقیق کے ساتھ بیان کر سکتے ہیں اور عن و تحقیق سے ان کی جزئیات بھی احاطہ تحریر میں لاسکتے ہیں، اور یہ بھی بتلا سکتے ہیں کہ سب سے بڑا گناہ کونسا ہے لیکن یہ بتانا بڑا مشکل ہے کہ سب سے چھوٹا گناہ کونسا ہے اس کی تفصیل یہ ہے کہ ہم شرعی شواہد اور انوار بصیرت سے یہ بات جانتے ہیں کہ تمام شرائع کا مقصد مخلوق کو اللہ تعالیٰ کے قریب کرنا ہے، اور اس کے دیدار کی سعادت سے بہرہ اندوز کرنا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کی قربت اور دیدار کی سعادت کے لئے ضروری ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات اس کی کتابوں اور رسولوں کی معرفت حاصل کرے، قرآن کریم کی اس آیت میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ (پ ۲۷ ر ۲ آیت ۵۶)

میں نے جن و انس کو صرف اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا ہے

یعنی جن و انس کی تخلیق کا مقصد یہ ہے کہ یہ میرے بندے بن جائیں اور بندہ صحیح معنوں میں بندہ اس وقت تک نہیں ہوتا جب تک وہ اپنے رب کی ربوبیت اور اپنے نفس کی عبودیت کی معرفت حاصل نہ کر لے اور یہ نہ جان لے کہ رب کے کئے ہیں اور نفس کیا ہے رسول اسی اعلیٰ اور اصل مقصد کے لئے بھیجے جاتے ہیں لیکن دنیوی زندگی کے بعد اس مقصد کی تکمیل نہیں ہوتی اسی لئے حدیث شریف میں دنیا کو آخرت کی کھیتی کہا گیا ہے اس سے معلوم ہوا کہ دنیا کی حفاظت بھی دین کی اتباع میں مقصود ہے اسلئے کہ دنیا دین کا وسیلہ ہے دنیا میں جو چیز آخرت سے متعلق ہے وہ دو ہیں نفس اور مال اس طرح یہاں تین درجات ہوئے ایک معرفت الہی کا درجہ ہے جس کی حفاظت دلوں میں ہوتی ہے ایک نفس کی حفاظت ہے جس کا تعلق جسوں سے ہے اور ایک مال کی حفاظت ہے جس کا تعلق لوگوں سے ہے اسی اعتبار سے گناہ کی تقسیم بھی ہے یعنی سب سے بڑا گناہ وہ ہے جو معرفت الہی کا دروازہ بند کر دے اور اس کے بعد وہ گناہ ہے جو لوگوں پر ان کی زندگی تک کر دے اور اسکے بعد وہ گناہ ہے جس سے لوگوں پر معاش کے دروازے بند ہو جائیں بہ ہر حال یہ تین درجات ہیں قلوب میں معرفت الہی کی حفاظت جسوں میں زندگی کی حفاظت اور بندگان خدا کے پاس اموال کی حفاظت یہ تینوں چیزیں تمام شرائع میں مقصود ہیں اور کسی قوم کے بارے میں یہ تصور نہیں کیا جاسکتا کہ وہ اس سے اختلاف کرے گی اس لئے کہ یہ بات عقل تسلیم ہی نہیں کر سکتی کہ اللہ تعالیٰ کسی پیغمبر کو دین و دنیا کے معاملات میں مخلوق کی اصلاح کے لئے مبعوث کرے پھر انھیں ایسے کاموں کا حکم دے جو اس کی اور اسکے رسولوں کی معرفت کی راہ میں رکاوٹ ڈالیں لوگوں کی جانوں اور مالوں کو ضائع کریں۔

کبار کے تین مراتب : اس سے معلوم ہوا کہ کبار کے تین مراتب ہیں ایک وہ ہے جو اللہ اور اس کی معرفت کے مابین ہے یہ کفر ہے اور کفر سے بڑھ کر کوئی کبیرہ نہیں ہے اللہ اور اسکے درمیان جو حجاب ہے وہ جہل ہے اور جس ذریعہ سے اللہ کا تقرب حاصل ہوتا ہے وہ علم و معرفت ہے آدمی کے پاس جس قدر معرفت ہوتی ہے اسی قدر وہ اللہ کے قریب ہوتا ہے اور جس قدر جہالت ہوتی ہے اسی قدر وہ اللہ سے دور ہوتا ہے جہالت سے قریب تر جسے کفر بھی کہتے ہیں یہ بات بھی ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بے خوف ہو جائے اور اس کی رحمت سے مایوس ہو جائے عذاب الہی سے بے خوفی اور اس کی رحمت سے ناامیدی بھی جہل محض ہے اس لئے کہ جو اللہ تعالیٰ کی معرفت رکھتا ہے وہ نہ اسکے عذاب سے بے خوف ہوتا ہے اور نہ اس کی رحمت سے مایوس اور ناامید بدعت کی وہ تمام قسمیں کبیرہ گناہ کے اسی مرتبے کے قریب ہیں جو اللہ تعالیٰ کی ذات اوصاف اور افعال سے متعلق ہیں تاہم ان میں سے بعض بدعتیں بعض بدعتوں سے شدید تر ہیں یہ تفاوت اسی قدر ہے جس قدر ان سے جہالت ہے یا جس قدر ان کی معرفت ہے ان کے مراتب بھی بے شمار ہیں لیکن بحیثیت مجموعی انہیں تین درجوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے کچھ وہ ہیں جو قرآن کریم میں مذکور کبار میں داخل ہیں اور کچھ وہ ہیں جو داخل نہیں ہیں اور کچھ وہ ہیں جن کا قرآن کریم میں مذکور کبار میں داخل ہونا محکوک ہے۔

کہاؤں کے دوسرے مرتبے کا تعلق نفوس سے ہے، ان کے تحفظ اور بقاء سے حیات باقی رہتی ہے، اور حیات سے معرفت الہی حاصل ہوتی ہے۔ کسی کو جان سے مار دینا بلاشبہ کبیرہ گناہ ہے، لیکن اس کا درجہ کفر سے کم ہے، اس لئے کہ کفر کا براہ راست اصل مقصد (معرفت الہی) سے ٹکراؤ ہے، اور قتل سے ذریعہ معرفت پر مرتب ہوتا ہے۔ اس لئے کہ دنیا کی زندگی آخرت کے لئے مقصود ہے اور آخرت تک پہنچنا معرفت الہی کے بغیر ممکن نہیں، ہاتھ پاؤں کاٹنا، یا کوئی ایسا کام کرنا جو ہلاکت کا باعث ہو، خواہ معمولی زد و کوب ہی سے آدمی ہلاک ہو جائے، قتل سے قریب ہیں، اور کبیرہ گناہ ہیں، تاہم ہلاکت کا باعث بننے والے افعال متفاوت ہیں، بعض میں شدت زیادہ ہے، اور بعض میں کم ہے، اسی مرتبے میں زنا اور لواطت بھی داخل ہے، لواطت کو قتل کے مرتبے میں اس لئے رکھا گیا ہے کہ اگر بالفرض تمام انسان اپنے ہم جنسوں سے شہوت پوری کرنے لگیں تو نسل انسانی کا سلسلہ ہی منقطع ہو جائے، جس طرح وجود کا ختم کرنا گناہ ہے اسی طرح وجود کا سلسلہ منقطع کرنا بھی گناہ ہے۔ اگرچہ زنا سے انسانی نسل کا سلسلہ ختم نہیں ہوتا، لیکن لب میں انتشار پیدا ہو جاتا ہے، اور وراثت کا نظام ختم ہو جاتا ہے، ایک دوسرے کی مدد اور تعاون سے چلنے والے امور درہم برہم ہو جاتے ہیں، اگر زنا مباح کر دیا جائے تو دنیا کا نظام کس طرح صحیح طور پر قائم رہ سکتا ہے، یہی وجہ ہے کہ بہائم میں کوئی نظام نہیں، کیونکہ ان کے ز مخصوص مادہ کے ساتھ علیحدہ نہیں ہوتے، اس سے معلوم ہوا کہ کسی ایسی شریعت میں جس سے اصلاح مقصود ہو زنا مباح ہو ہی نہیں سکتا، پھر زنا جیسا "قتل سے رجبے میں کم ہے" کیوں کہ زنا سے نہ وجود ختم ہوتا ہے اور نہ دوام وجود کا سلسلہ متاثر ہوتا ہے، صرف لب کا اختیار ختم ہوتا ہے، اور ایسے حوالے کا محرک ہوتا ہے جن سے زندگی کا نظام درہم برہم ہو۔ اور فساد بپا ہو، لیکن زنا لواطت سے بڑا گناہ ہے، کیونکہ اس میں جانین سے شہوت کے دوائی ہوتے ہیں، اس لئے زنا لواطت کی نسبت کثیر الوقوع ہے۔

تیسرے مرتبے میں اموال ہیں، اموال سے انسانی زندگی کے معاشی مسائل حل ہوتے ہیں اس لئے کسی انسان کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ کسی دوسرے کا مال چوری، غصب یا کسی اور ذریعہ سے چھینے، بلکہ مال کی حفاظت ضروری ہے کیونکہ نفوس مال ہی سے باقی رہتے ہیں لیکن کیونکہ مال چھین کر بیینہ واپس کیا جاسکتا ہے، اور ضائع ہو جانے کی صورت میں اس کا معاوضہ دیا جاسکتا ہے اس لئے ہر اس کی کوئی اہمیت نہیں معلوم ہوتی، تاہم اگر مال اس طرح لیا جائے کہ اس کا تدارک نہ کیا جاسکے تو اس وقت اس عمل کے کبیرہ ہونے میں کوئی شبہ نہیں، اور اس طرح لینے کی چار صورتیں ہو سکتی ہیں، ایک یہ کہ چھپا کر لے، اسے چوری کہتے ہیں، کیونکہ اس میں صاحب مال کو اطلاع نہیں ہوتی اس لئے تدارک نہیں ہو پاتا، دوسرے یتیم کا مال کھانا، یہ بھی عقلی رہتا ہے، مثلاً کوئی دلی اگر اسکے مال کا ٹکرا لے اور وہ اسے استعمال کر لے تو دوسرا اس سے باخبر نہیں ہوتا اس مال کا حقدار صرف یتیم ہے اور وہ اپنی بے خبری یا نا طاقی کے باعث اپنا حق وصول کرنے پر قادر نہیں ہے، یتیم کا مال کھانا غصب اور خیانت سے مختلف ہے، غصب تو عقلی الاعلان ہوتا ہے، اور خیانت بھی ظاہر ہو جاتی ہے۔ ان دونوں صورتوں میں مالک مال دعوے کے ذریعہ اپنا حق حاصل کر سکتا ہے۔ تیسری صورت یہ ہے کہ جموئی گواہی سے کسی کا مال ضائع کر دیا جائے، اور چوتھی صورت یہ ہے کہ جموئی قسم کھا کر امانت پر قبضہ کر لیا جائے، یہ چاروں صورتیں ایسی ہیں کہ ان کا تدارک ممکن نہیں ہے، ان تمام صورتوں کی حرمت میں شریعتیں مختلف بھی نہیں ہیں ان میں سے بعض صورتیں بعض کی نسبت سخت ہیں، مگر مرتبہ دوم سے کم ہیں جس کا تعلق نفوس سے ہے یہ چاروں مرتبے کبیرہ کھلانے کے مستحق ہیں اگرچہ شریعت نے ان میں سے بعض کے اندر حدود واجب نہیں کی ہے لیکن وعید کی کثرت اور دنیاوی

مصلح میں اپنے اثرات کے اعتبار سے انھیں کہاں میں شمار کیا جانا چاہئے۔

سود کھانا کبیرہ ہے یا نہیں : سود کا مال کھانا دراصل دوسرے کا مال اس کی رضامندی سے کھانا ہے اگرچہ اس میں وہ شرط مفقود ہے جو شریعت نے عائد کی ہے، اسلئے یہ ممکن ہے کہ اس کی حرمت میں شرائع کا اختلاف بھی ہو۔ اور کیوں کہ فحش کو ان دو باتوں کی موجودگی کے باوجود کبیرہ نہیں کہا گیا کہ اس میں غیر کا مال اس کی رضا کے بغیر لیا جاتا ہے، اور شریعت کی رضا کے خلاف بھی ہے تو سود کھانے کو کبیرہ کیسے کہا جاسکتا ہے، جس میں مالک کی رضا موجود ہے، صرف شریعت کی رضا مفقود ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ سود کے سلسلے میں شریعت نے بڑی شدت سے کام لیا ہے اور اس ذیل میں سخت ترین وعیدیں وارد ہیں تو فحش وغیرہ کے مظالم اور خیانت کے سلسلے میں بھی کچھ کم وعیدیں منقول نہیں ہیں، اسلئے انھیں بھی کبیرہ کہنا چاہئے، اور یہ کہنا کہ خیانت و فحش کا ایک وسیلہ بھی کبیرہ ہے غور و فکر کا محتاج ہے، غالب ظن یہی کہتا ہے کہ اسے کہاں کے ذیل میں داخل نہ کیا جائے، بلکہ مناسب یہ ہے کہ کبیرہ صرف ان گناہوں کو قرار دیا جائے جن میں شرائع مختلف نہ ہوں تاکہ دین کے ضروری امور شامل ہو سکیں۔

گالی دینا اور شراب خوری وغیرہ : ابوطالب مکی نے متعدد کہاں بیان کئے ہیں، ان میں سے گالی دینا شراب پینا، سحر، میدان جنگ سے فرار اور والدین کی نافرمانی جیسے گناہ باقی رہ جاتے ہیں۔

جہاں تک شراب نوشی کا معاملہ ہے، اس سے عقل زائل ہو جاتی ہے، اس اعتبار سے اس کا کبیرہ ہونا مناسب ہے، شریعت کی وعیدیں بھی اس کے کبیرہ ہونے پر دلالت کرتی ہیں، اور عقلی دلائل سے بھی کچھ ایسا ہی ثابت ہوتا ہے، عقلی دلیل یہ ہے کہ جس طرح نفس کی حفاظت ضروری ہے اسی طرح عقل کی بھی حفاظت ضروری ہے بلکہ اگر عقل نہ ہو تو جسم و جان بیکار ہیں، اس سے ثابت ہوا کہ کسی کی عقل ختم کرنا بھی کبیرہ گناہ ہے۔

لیکن یہ دلیل صرف اتنی شراب نوشی پر جاری ہوتی ہے جس سے عقل زائل ہو جائے، ایک قطرہ شراب کو اس پر قیاس نہیں کیا جاسکتا کیونکہ اس سے عقل زائل نہیں ہوتی، مثلاً اگر کوئی شخص پانی پئے اور اس میں شراب کا ایک قطرہ بھی ہو تو عقل کا نقصان یہ ہے کہ اسے کبیرہ نہ کہا جائے بلکہ یہ کہا جائے کہ اس نے نفس پانی پیا ہے لیکن کیونکہ شریعت نے شراب کے ایک قطرے پر بھی حد واجب کی ہے اس سے معلوم ہوا کہ شریعت کی نظر میں ایک قطرے کا معاملہ بھی سخت ہے، اسی لئے اسے کبیرہ کہا جاتا ہے، شریعت نے اسے کبیرہ کیوں قرار دیا یہ اسرار ہیں، اور آدمی کے بس سے باہر ہے کہ وہ شریعت کے تمام اسرار سے واقف ہو جائے، بہر حال اگر اس طرح کے امور کے کبیرہ ہونے پر اجماع ہو تو اجتہاد واجب ہوگا ورنہ توقف کی گنجائش ہے۔

قذف میں آبرو پر حملہ ہوتا ہے، اس کا رتبہ مال کے رتبہ سے کم ہے، پھر اسکے بے شمار مراتب ہیں، ان میں سب سے بڑا مرتبہ اسکا ہے کہ کسی پر زنا کی تہمت لگائی جائے، شریعت نے تہمت زنا کو بہت بڑا جانا ہے، یہاں تک کہ حد بھی واجب کی ہے، غالب گمان یہی ہے کہ صحابہ کرام ان گناہوں کو کبیرہ قرار دیا کرتے تھے جن پر شریعت نے حد واجب کی ہے، اس لحاظ سے قذف بھی گناہ کبیرہ ہے، یعنی ایسا گناہ ہے جو بیچ وقتہ نمازوں سے معاف نہیں ہوتا کبیرہ سے، ہم ایسے ہی گناہ مراد لیتے ہیں جن کا کفارہ فرض نمازوں سے نہیں ہوتا لیکن کیونکہ اسکے کبیرہ ہونے میں شرائع مختلف ہیں اس لحاظ سے اس میں کچھ سنگینی محسوس نہیں ہوتی، بلکہ ہو سکتا تھا کہ شریعت کا حکم یہ ہوتا کہ اگر ایک معتبر آدمی کسی شخص کو زنا کرتے ہوئے دیکھ لے تو اسے اسکے خلاف گواہی دینے کا حق ہوتا ہے، اگر اس کی شہادت قابل قبول نہ ہوتی تو دنیاوی مصالح کے اعتبار سے بھی اس پر حد جاری کرنا ضروری نہ ہوتا، اگرچہ بظاہر وہ مصالح حاجات کے رتبہ میں ہوتے، مگر اس صورت میں صرف اس شخص کے حق میں قذف کبیرہ گناہ ہوتا ہے، جسے شریعت کا حکم معلوم ہے مگر جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ محض میرے لئے گواہی دینی جائز ہے یا یہ سمجھتا ہے کہ دوسرا میری گواہی میں میری مدد کرے گا تو اسکے حق میں کبیرہ قرار نہیں دینا چاہیے۔

جادو کی بات یہ ہے کہ اگر اس میں گفر ہے تو وہ کبیرہ ہے ورنہ اس کی سنگینی اتنی ہی ہوگی جتنا اس کا ضرر ہوگا مثلاً جان چلی جائے

یا بیماری وغیرہ پیدا ہو جائے۔ میدان جہاد سے فرار اور والدین کی نافرمانی کے متعلق بھی قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ ان میں توقف کیا جانا چاہیے جیسا کہ یہ بات قطعی طور پر ثابت ہو چکی کہ صرف کبیرہ گناہ ہے، گناہ دینا مارنا، ظلم کرنا (یعنی مال چھین لینا) گھروں سے نکال دینا اور وطن سے بے وطن کر دینا یہ تمام گناہ کبیرہ میں داخل نہیں ہیں، کیونکہ کبیرہ گناہوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد سترہ معقول ہے، اور یہ گناہ ان سترہ میں شمار نہیں کئے گئے ہیں کہ اس لحاظ سے اگر والدین کی نافرمانی اور میدان جنگ سے فرار کو بھی کبیرہ نہ کہا جائے تو کوئی حرج نظر نہیں آتا، لیکن کیونکہ حدیث میں انھیں کبیرہ قرار دیا گیا اس لئے یہ دونوں گناہ کبیرہ ہیں۔

اس مسئلہ کا حاصل یہ نکلا کہ جن گناہوں کو کبیرہ کہا جاتا ہے اس سے ہماری مراد وہ گناہ ہیں جن کا تدارک فرض نمازوں سے نہ ہو سکے، اور ایسے گناہوں کی تین قسمیں ہیں، کچھ وہ ہیں جن کے بارے میں قطعی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ پنج وقتہ نمازوں سے ان کا تدارک ہو جاتا ہے، اور کچھ وہ ہیں جن کے بارے میں یہ گمان ہے کہ پنج وقتہ نمازیں ان کے لئے کفارہ بن جانی چاہیے، اور کچھ وہ ہیں جن کے سلسلے میں توقف کیا جاتا ہے، ایسے گناہوں کی بھی دو قسمیں ہیں کچھ وہ ہیں جن کے بارے میں غالب گمان یہی ہے کہ وہ کبیرہ ہے، اور کچھ وہ ہیں جن کا حکم مشکوک ہے، پھر یہ شک ایسا ہے کہ کتاب و سنت کی نصوص کے بغیر اسکا ازالہ ممکن نہیں، اور کیونکہ اب کوئی جدید نص نہیں آئے کی اس لئے یہ شک بھی طور پر اپنی جگہ باقی رہے گا۔

ایک اعتراض کا جواب : یہاں ایک اعتراض یہ کیا جاسکتا ہے کہ ہمارے دلائل سے ثابت ہوتا ہے کہ کبیرہ کی تعریف معلوم کرنا محال ہے پھر شریعت کسی ایسی چیز پر کوئی حکم کیسے لگا سکتی ہے جس کی تعریف ہی معلوم نہ ہو، اس کے جواب میں کہا جاسکتا ہے کہ دنیا میں جتنے بھی گناہوں سے کوئی حکم متعلق ہے ان سب میں کچھ نہ کچھ ابہام ضرور پایا جاتا ہے، دنیا ہی ایک ایسی جگہ ہے جہاں شرعی احکام نافذ ہو سکتے ہیں، کبیرہ کے متعلق کوئی مخصوص حکم شریعت میں نہیں ہے، بلکہ کچھ گناہ ہیں جن پر حدود واجب ہیں، اور ان کے نام الگ الگ ہیں جیسے چوری اور زنا وغیرہ، اور پھر ہر ایک کی الگ الگ سزا ہے، البتہ کبیرہ ہی ایک ایسا حکم ہو سکتا ہے جو مشترک ہو یعنی نماز و ہجگاہ سے انکا کفارہ نہیں ہوتا، یہ حکم آخرت سے متعلق ہے دنیا سے متعلق نہیں ہے کہ کبیرہ کی صحیح صحیح تعریف جاننے کی ضرورت پیش آئے بلکہ اسکا مبہم رہنا ہی مناسب ہے تاکہ لوگ ہر وقت خوفزدہ رہیں اور پنج وقتہ نمازوں پر اکتفا کر کے صغیرہ گناہوں پر جری نہ ہو جائیں۔

ایک آیت کی تشریح : قرآن کریم میں ایک آیت کہائز سے متعلق یہ ہے۔

إِنْ تَجْتَنِبُوا كِبَارَهُنَّ فَآتَيْنَكُمْ عَنْهُمْ مِثْرَهُنَّ مَا تَكْتُمُونَ عَنْهُمْ مِثْرَهُنَّ عَنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ (پ ۲۵ آیت ۳۱)

جن کاموں سے تمکو منع کیا جاتا ہے ان میں جو بڑے بڑے کام ہیں اگر تم ان سے بچتے رہو تو تمہاری

خفیا برائیاں تم سے دور فرما دیں گے۔

بظاہر اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر کہائز سے اجتناب کیا جائے تو یہ عمل صغائر کے لئے کفارہ بن جاتا ہے، لیکن یہ بات ہر صورت میں نہیں ہے، بلکہ قدرت اور ارادے کے ساتھ مشروط ہے کہ کوئی شخص اپنے ارادے اور قدرت کے باوجود کبیرہ گناہ سے اجتناب کرے، مثلاً ایک شخص کسی عورت پر قدرت رکھتا ہو، اور وہ اس کے ساتھ مباشرت کا خواہش مند بھی ہو، لیکن زنا کے خوف سے محض ہاتھ سے چھوئے اور آنکھ سے دیکھنے پر اکتفا کرے، اس صورت میں چھوئے اور دیکھنے سے جو ظلمت دل میں پیدا ہوگی، وہ زنا نہ کرنے کے نود سے زائل ہو جائے گی، یہی معنی کفارہ کے ہیں کہ ایک سے دوسرا زائل ہو جاتا ہے، اور ایک دوسرے کا عوض بن جاتا ہے، لیکن اگر کوئی شخص نامرغوبے یا کسی اور وجہ سے مثلاً کسی کے دیکھنے کے خوف سے جماع نہ کر سکا تو یہ صورت چھوئے اور دیکھنے کے گناہ کا کفارہ نہیں ہے، اسی طرح ایک شخص شراب پینے کا عادی نہیں ہے، اور طبیعت شراب کو قبول کرتی ہے، اس صورت میں اگر اسے شراب میسر آجائے اور وہ پینے سے باز رہے تو یہ عمل ان چھوئے گناہوں کا کفارہ نہ بن سکے گا جو شراب نوشی کی مجلسوں میں عام طور پر ہوا کرتے ہیں، جیسے موسیقی وغیرہ سے دل بھلا نا۔ ہاں اگر وہ شخص شراب کا عادی بھی

ہے اور موسیقی سے بھی شغف رکھتا ہے اور اپنے نفس پر مجاہدہ کر کے شراب سے باز رہتا ہے اور موسیقی سے دل بہلاتا ہے تو یہ ہو سکتا ہے کہ مجاہدے کے ذریعہ نفس کو شراب پینے سے روکنے کا عمل اسکے دل سے اس تاریکی کا خاتمہ کر دے جو موسیقی کے سننے سے پیدا ہوتی ہے یہ تمام احکام آخرت سے متعلق ہیں ہو سکتا ہے ان میں سے بعض مشکوک رہیں اور تشابہات میں شمار کئے جائیں جن کے بارے میں کوئی فیصلہ کسی قطعی نص کے بغیر نہیں کیا جاسکتا۔

کبیرہ کی جامع تعریف : کبیرہ گناہ کی کوئی ایسی تعریف جسے جامع کہا جاسکے وارد نہیں ہوئی ہے بلکہ روایات میں مختلف الفاظ منقول ہیں مثلاً ایک روایت میں جو حضرت ابو ہریرہ سے مروی یہ الفاظ ہیں۔

الْصَّلَاةُ إِلَى الصَّلَاةِ كُفَّارَةٌ وَرَمَضَانُ إِلَى رَمَضَانَ كُفَّارَةٌ إِلَّا مِنْ ثَلَاثٍ إِشْرَاكَ بِاللَّهِ وَكُزْرُكَ وَلِسْتَوْ وَتَكْتُ الصَّفَقَةَ قَبْلَ مَا تَرَكَ الشَّيْءَ قَبْلَ الْخُرُوجِ عَنِ الْجَمَاعَةِ وَتَكْتُ الصَّفَقَةَ أَنْ يَتَابِعَ رَجُلًا ثُمَّ يَخْرُجُ عَلَيْهِ بِالسَّيْفِ يُقَاتِلُهُ (ماہم ابو ہریرہ)

ایک نماز دوسری نماز تک کا کفارہ ہوتی ہے ایک رمضان دوسرے رمضان تک کا کفارہ ہوتا ہے مگر نماز اور رمضان سے تین چیزوں کا کفارہ نہیں ہوتا شرک باللہ ترک سنت اور نقص عمدہ لوگوں نے عرض کیا ترک سنت اور نقص عمدہ سے آپ کی مراد کیا ہے فرمایا جماعت سے لگتا ترک سنت ہے اور نقص عمدہ یہ ہے کہ کوئی معین آدمی کسی کے ہاتھ پر بیعت کرے پھر تلواریں کر اس سے لڑنے کیلئے کل آئے۔

اسی طرح کی روایات ہیں نہ ان سے کہا کہ احاطہ ہوتا ہے اور نہ کوئی جامع تعریف سامنے آئی ہے اسلئے کبیرہ بمسمیٰ رہے گا البتہ یہاں آپ ایک اعتراض کر سکتے ہیں کہ شہادت ان لوگوں کی قبول کی جاتی ہے جو کبیرہ گناہوں سے اجتناب کرتے ہیں صغائر سے اجتناب قبول شہادت کے لئے شرط نہیں ہے تم پہلے یہ لکھ چکے ہو کہ کبیرہ سے کوئی دفعی حکم متعلق نہیں بلکہ اسکا تعلق آخرت سے ہے جب کہ شہادت و فیوہ کے احکام دفعی ہیں اور کہا کہ سے اجتناب ان احکام کے نفاذ کے لئے ایک اہم شرط کی حیثیت رکھتا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ کسی کی شہادت محض اس لئے قابل رد نہیں ہوتی کہ وہ کہا کہ کار تکلیف کرتا ہے بلکہ بعض دوسرے اسباب کی بنا پر بھی رد کردی جاتی ہے مثلاً اس شخص کی گواہی بلا اتفاق مودد ہے جو موسیقی سننے پر شہم کا لباس پہنے سونے کا انگٹھی پہنے اور چاندی سونے کے برتنوں میں کھائے پئے حالانکہ یہ تمام گناہ مضموم ہیں کسی بھی عالم نے ان کو کبیرہ نہیں کہا ہے امام شافعی نے تو یہاں تک کہا ہے کہ اگر کسی خفی نے نیذی لی تو میں اس پر حد جاری کروں گا لیکن اسکی شہادت رد نہیں کروں گا گویا انھوں نے حد جاری کرنے کے اعتبار سے نیذی پنے کو کبیرہ قرار دیا لیکن اسے شہادت رد کرنے کا باعث نہیں سمجھا اس سے معلوم ہوا کہ شہادت کا رد قبول صغائر و کبائر پر منحصر نہیں ہے بلکہ تمام گناہوں سے عدالت مجموعہ ہوتی ہے سوائے ان باتوں کے جن سے آدمی علاناً اجتناب نہیں کہلاتے جیسے فیبت، تجسس، بدگمانی، بعض باتوں میں کذب بیانی، فیبت سنتا، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ترک کرنا، مشتبه مال کھانا بچوں اور غلاموں کو گالی دینا اور غصے کے وقت ضرورت اور مصلحت سے زیادہ ان کو زندہ کوب کرنا، ظالم بادشاہوں کی تعظیم کرنا، برے لوگوں سے تعلق رکھنا اور اپنے بیوی بچوں کو دینی تعلیم دینے میں سستی کرنا یہ تمام گناہ ایسے ہیں کہ ہر گواہ میں یہ تمام گناہ یا ان میں سے کچھ یا انکے تھوڑے بہت اثرات ضرور پائے جاتے ہیں البتہ صرف وہ شخص اس نوع کے گناہوں سے پوری طرح محفوظ رہ سکتا ہے جو کچھ عرصے کے لئے لوگوں سے کنارہ کش ہو جائے اور صرف آخرت پیش نظر رکھے ایک عرصہ دلائل تک نفس کے ساتھ مجاہدہ کرے اور اس قدر کامل ہو جائے کہ اگر لوگوں کے ساتھ اختلاط بھی ہو تو کوئی فرق نہ پڑے بلکہ ایسا ہی رہے جیسا خلوت میں تھا اگر شہادت کے لئے ایسے ہی لوگوں کی شرط ہو تو ان کا ملنا مشکل ہی نہیں محال ہو جائے اور شہادت و فیوہ کے تمام احکام ضائع ہو جائیں۔

بہر حال ریشتی لباس پہننے موسیقی سننے، نہ کھیلنے شراب خوری کے وقت سے نوشوں کے ساتھ بیٹھنے اجنبی عورتوں کے ساتھ خلوت میں رہنے سے شہادت کی اہلیت ختم نہیں ہوتی، اور کسی شخص کی گواہی کے رد قبول کا معیار یہ رہتا چاہیے جو بیان کیا گیا، کبیرہ و صغیرہ پر نظر نہ رکھنی چاہیے، البتہ ان صفات میں سے بھی کسی ایک پر کوئی شخص مواظبت کرے گا اور مسلسل اسکا ارتکاب کرتا رہے گا تو اس کا یہ عمل بھی رد شہادت میں مؤثر ہو سکتا ہے جیسے کوئی شخص غیبت اور عیب گوئی کو اپنی عادت ثانیہ بنالے یا مستقل بد کاموں کی مجلسوں میں بیٹھا رہے، اور ان سے دوستی رکھے، مواظبت اور تسلسل سے صفات بھی کبائر ہو جاتے ہیں جیسا کہ بعض مباح امور مواظبت سے صغیرہ بن جاتے ہیں مثلاً شریعہ کھانا (۱) اور ترنم سے گانا وغیرہ۔

اخروی درجات کی تقسیم دنیاوی اعمال میں

جاننا چاہیے کہ دنیا عالم ظاہری کو کہتے ہیں، اور آخرت عالم غیب کا نام ہے، دنیا سے ہماری مراد تمہاری وہ حالت ہے جو موت سے پہلے ہے۔ اور آخرت سے مراد وہ حالت ہے جو موت کے بعد ہے، گویا دنیا اور آخرت ہماری صفات ہیں جن میں سے ان صفات کو جو قریب میں واقع ہیں دنیا کہتے ہیں اور جو دیر میں آنے والی ہیں انہیں آخرت سے تعبیر کیا جاتا ہے، اس وقت ہم دنیا کے ذکر سے آخرت میں پہنچنے کا قصد رکھتے ہیں، یعنی اگرچہ ہم دنیا میں کلام کریں گے، لیکن ہمارا مقصد یہ ہے کہ اس عالم اسرار کا بیان کریں جسے آخرت کہتے ہیں، اور عالم ملک (دنیا) میں عالم ملکوت (آخرت) کی تشریح بغیر مثال کے ممکن نہیں ہے، جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد ہے۔

وَنَبْلُكَ الْأَمْثَالَ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ وَمَا يَعْقِلُهَا إِلَّا الْعَالِمُونَ (پ ۲۰ ر ۲۲ آیت ۴۳)

اور یہ مثالیں ہیں جنہیں ہم بیان کرتے ہیں لوگوں کے لئے اور انہیں صرف اہل علم سمجھتے ہیں۔

دنیا کے مقابلے میں آخرت کی زندگی ایسی ہے، جیسے آدمی سوئے ہوئے خواب دیکھ رہا ہو، جس طرح خواب کا عالم جاگنے کے مقابلے میں غفلت ہوتا ہے، اس طرح دنیا کی زندگی بھی آخرت کی زندگی سے غفلت ہے، حدیث شریف سے بھی یہ مضمون ثابت ہوتا ہے۔ ارشاد فرمایا۔

النَّاسُ يَنَامُونَ فَإِنَّمَا تَوَاقَاتُ أَنْبَهُوا

لوگ سوئے ہوئے ہیں، جب مراحمیں گے تو جاگیں گے۔ (۲)

جو کچھ بیداری کے عالم میں وقوع پزیر ہوتا ہے، وہ خواب کے عالم میں بطور مثال نظر آتا ہے، اسی لئے اسکی تعبیر پوچھی جاتی ہے، اسی طرح آخرت کی بیداری میں جو واقعات رونما ہوں گے وہ دنیا کی خوابیدہ زندگی میں بطور مثال ہی ظاہر ہو سکتے ہیں یعنی اس طرح جیسے تم خواب میں غفلت متاخر دیکھتے ہو اور علم التنبیر سے ان واقعات کی معرفت حاصل کرتے ہیں۔

تعبیر خواب کی حقیقت : خواب کی تعبیر ایک معتبر فن ہے اور اس فن کے نکتہ شناس اور رمز آشنای اس کے ساتھ انصاف کرتے ہیں، یہاں ہم بطور نمونہ تین واقعات بیان کرتے ہیں، ان سے معلوم ہو گا کہ خواب میں اصل بات کس طرح معلوم ہو جاتی ہے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ ایک شخص ابن سیرین کے پاس آیا، اور کہنے لگا کہ میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میرے ہاتھ میں مرہ ہے،

(۱) احتاف طریغ کھیلنے سے منع کرتے ہیں، اور ان احادیث سے استدلال کرتے ہیں کہ حضرت علیؑ سے عقل ہے فرماتے تھے کہ طریغ ہمیں کاجا ہے ابو موسیٰ اشعریؓ سے عقل ہے کہ طریغ سے صرف غلام کھیلے ہیں، ابو موسیٰ اشعریؓ سے طریغ کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ یہ باطل ہے اور اللہ تعالیٰ باطل کو پسند نہیں فرماتا (۲) مجھے یہ روایت مرفوع میں ملی، البتہ اس قول کی بہت حدت علیؑ ابن ابی طالب کی طرف کی جاتی ہے

اور میں وہ مہر لوگوں کے چہوں اور ان کی شرمگاہوں پر لگا رہا ہوں، آپ نے یہ تعبیر دی کہ تو مؤذن ہے اور رمضان میں صبح صادق سے پہلے اذان دیتا ہے، اس نے عرض کیا کہ آپ سچ فرماتے ہیں، ایک اور شخص آیا اور کہنے لگا کہ میں نے خواب دیکھا ہے کہ میں تل ڈال رہا ہوں، ابن سیرین نے فرمایا کہ تو نے کوئی باندی خریدی ہے، اسکے متعلق تحقیق کر، غالباً وہ حیرتی ماں ہے، کیونکہ حمل کی اصل تل ہیں، معلوم ہوا کہ تو اپنی ماں کے پاس جاتا ہے، اس نے تحقیق کی، پتہ چلا کہ وہ واقعی اسکی ماں ہے، اسکی صغریٰ میں گرفتار کر لی گئی تھی۔ ایک شخص نے اپنا یہ خواب بتلایا کہ میں نے اپنے آپ کو خنزیر کے گلے میں موتیوں کے ہار ڈالتے ہوئے دیکھا ہے، آپ نے فرمایا کہ تم حکمت کی باتیں نا اہلوں کو بتلاتے ہو، حقیقتاً وہ ایسے لوگوں کو تعلیم دینے پر مامور تھا جو اسکے اہل نہ تھے۔

یہ تعبیریں مثالیں ہیں اور ان سے معلوم ہوتا ہے کہ مثالیں کس طرح بیان کی جاتی ہیں، مثال سے ہماری مراد یہ ہے کہ معنی کو کسی ایسے پیرائے میں بیان کیا جائے جو اپنے مفہوم کے اعتبار سے صحیح ہو اور ظاہری صورت کے اعتبار سے غلط ہو، مثلاً مؤذن نے انگوٹھی دیکھی کہ وہ اس سے شرمگاہوں پر مہر لگا رہا ہے، اب اگر وہ انگوٹھی اور مہر کو ظاہر پر رکھتا تو یہ بات حقیقت کے خلاف ہوتی کیونکہ اس نے کبھی انگوٹھی سے شرمگاہ پر یا چہرے پر مہر نہیں لگائی، لیکن جب اسکے معنی و مفہوم پر نظر ڈالی تو بات درست نکلی، اس سے مہر لگانے کا فعل سرزد ہوا، جس کی معنی ہیں کسی کام سے روک دینا، گویا رمضان میں صبح صادق سے پہلے اذان دے کر وہ لوگوں کو کھانے پینے اور بیویوں کے ساتھ ہم بستری کرنے سے روک دیتا ہے۔

انبیاء علیہم السلام کا کلام : انبیاء علیہم السلام کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ لوگوں کے ساتھ ان کی عقل و فہم کے مطابق گفتگو کریں، اور لوگوں کی عقل کا عالم یہ ہے کہ وہ دنیاوی زندگی میں ایسے ہیں جسے حالت خواب کہا گیا ہے، سونے والے پر جو واقعات منکشف ہوتے ہیں وہ بطور مثال ہوتے ہیں ہو سہو نہیں ہوتے، جب مرعاشیں گے تب وہ ان مثالوں کی صداقت نہیں گئے، سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں۔

قُلُوبُ الْمُؤْمِنِينَ أَضْطَبِعِينَ مِنْ أَصَابِعِ الرَّحْمَنِ (۱)

مومن کا دل اللہ تعالیٰ کی انگلیوں میں سے دو انگلیوں کے درمیان ہے۔

یہ ایک مثال ہے اسے صرف اہل علم ہی سمجھ سکتے ہیں، جاہل آدمی صرف اسی قدر سمجھ سکتا ہے جتنا حدیث کے ظاہر الفاظ سے مفہوم ہوتا ہے، کیونکہ وہ اس تفسیر سے واقفیت نہیں رکھتا جسے تاویل کہتے ہیں، جس فن سے خواب کی تفسیر ہوتی ہے اسے تعبیر کہتے ہیں اور جس سے قرآن و حدیث کے معانی سمجھ میں آتے ہیں اسے تاویل کہا جاتا ہے، جاہل آدمی اس حدیث کو اسکے ظاہری الفاظ پر رہتا ہے، اور وہی معنی مراد لیتا ہے جو بظاہر اس سے سمجھ میں آتے ہیں یعنی اللہ تعالیٰ کے لئے ہاتھ پاؤں ثابت کرنے بیٹھ جاتا ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ ان چیزوں سے منزہ اور پاک ہے۔ اسی طرح ایک روایت ہے۔

إِنَّ اللَّهَ خَلَقَ آدَمَ عَلَى صُورَتِهِ (۲)

اللہ تعالیٰ نے آدم کو اپنی صورت پر بنایا۔

جاہل آدمی صورت سے، تنگ، بے مت اور شکل کے علاوہ اور کچھ سمجھ ہی نہیں سکتا، چنانچہ وہ اللہ تعالیٰ کے لئے یہ چیزیں اعتقاد کر لیتا ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ ان مادی چیزوں سے پاک اور بلند و بالا ہے، بعض لوگ اسی بنا پر اللہ تعالیٰ کی صفات کے باب میں لغزش کھا گئے ہیں، یہاں تک کہ کلام الہی کو بھی اپنی نادانی کے باعث آواز اور حروف کی قبیل سے سمجھنے لگے، اسی طرح کی دوسری صفات میں بھی بعض مدعیان علم نے ٹھوکریں کھائی ہیں، اور عقل و فہم کا نام کیا ہے۔

آخرت کے سلسلے میں وارد مثالیں : روایات میں آخرت سے متعلق جو مثالیں وارد ہیں محدثین ان کی اسی لئے تکذیب و

تردید کرتے ہیں کہ ان کی نظر محض الفاظ پر ٹھہر جاتی ہے، اور الفاظ میں تاقض پایا جاتا ہے، وہ کم فہمی کے باعث الفاظ کا تاقض دور نہیں کہاتے، مثلاً حدیث شریف میں ہے، 'سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

يَوْمَ تَبْيَضُّ بَيَاضُ الْقَبْرِ بِمَنْشُورِهِ وَتَكْتَبُ بِأَصْلَحِ كِتَابِهِ (بخاری و مسلم۔ ابوسعید الخدری)

قیامت کے دن موت کو ایک سفید مینڈھے کی شکل میں لایا جائے گا اور اسے ذبح کر دیا جائے گا۔

ناوان طہر یہ بات نہیں مانتا، اور سنتے ہی تردید کر دیتا ہے، اور دلیل یہ دیتا ہے کہ موت ایک عرض یعنی قائم یا غیر چیز ہے، جب کہ مینڈھا ہمہ ہر بلا عرض جسم کیسے بن سکتا ہے، یہ ایک محال بات ہے ان احمقوں کو معلوم نہیں کہ ان کی کوتاہ عقلیں اللہ تعالیٰ کے اسرار و رموز کا ادراک کرنے سے قاصر ہیں، قرآن میں کھلے طور پر اعلان کر دیا گیا ہے۔

وَمَا يَعْزِلُهَا إِلَّا الْعَالَمُونَ

اور ان باتوں کو صرف اہل علم سمجھتے ہیں۔

ان بے چاروں کو تو یہ معلوم نہیں کہ اگر کسی نے خواب میں یہ دیکھا کہ ایک مینڈھا اس کے پاس لایا گیا ہے اسے لوگ وہاں کہتے ہیں، پھر اسے ذبح کر دیا گیا، تعبیر کو اسے بتلائے گا کہ تو نے اچھا خواب دیکھا ہے، معلوم ہوتا ہے اب وہاں ختم ہو جائے گی، کیونکہ وہاں کو مینڈھے کی شکل میں ذبح کر دیا گیا ہے، اور جو جانور ذبح ہو جائے وہ زندہ نہیں ہوتا، اس مثال میں خواب دیکھنے والا بھی سچا ہے، اور تعبیر دینے والا بھی سچا ہے حالانکہ طہرین یہ بات نہیں سمجھتے۔

خواب سچے کیوں ہوتے ہیں؟ : اس میں شک نہیں کہ بعض خواب سچے ہوتے ہیں، اور ان کی تعبیر صحیح نکلتی ہے، اس کی حقیقت یہ ہے کہ جو فرشتہ خواب پر مقرر کیا گیا ہے وہ روحوں کو ان حقائق سے مطلع کر دیتا ہے جو لوحِ آسمان پر محفوظ ہیں، لیکن یہ حقائق مثالوں کی صورت میں منکشف کئے جاتے ہیں، سونے والا مثال کے بغیر سمجھنے کا محتمل نہیں ہوتا، اسکی مثال صحیح ہوتی ہے۔ اسی لئے معنی بھی صحیح ہوتے ہیں، اسی طرح انبیاءِ عظیم السلام بھی دنیا میں لوگوں کے ساتھ مثالوں کے ذریعہ گفتگو کرتے ہیں، کیونکہ دنیا آخرت کی نسبت نیند کی حالت ہے، اس لئے وہ اللہ تعالیٰ کی حکمتیں بندوں کی عقلوں تک مثالوں کے ذریعے پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں، اس میں اللہ تعالیٰ کی حکمت بھی ہے۔

بندوں پر اسکی شفقت و کرم بھی ہے، اور ادراک کے سلسلے کو سل ترہانا بھی ہے، بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں کہ انکا صحیح ادراک مثالوں کے ذریعہ ہی ہو سکتا ہے، قیامت کے روز موت کو سفید مینڈھے کی صورت میں لا کر ذبح کرنا بھی ایک مثال ہے، اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ اس وقت موت کا سلسلہ منقطع ہو جائیگا۔ دل فطرتاً مثالوں کے ذریعہ معانی کا جلد ادراک کر لیتے ہیں، مثالوں کو اثر انگیزی میں پیدا کر دیتا ہے، ایک عام بات اگر کسی بلخ مثال کے ذریعہ ادا کی جائے تو دل اس سے متاثر ہوتے ہیں، اور اس کا اثر دیر تک رہتا ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے دو نظموں "کن فیکون" کے ذریعہ اپنی قدرت کی انتہا بیان کی ہے، اور دل کی تغیر پذیر کیفیت کو سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے، کہ بندہ کا دل اللہ تعالیٰ کی انگلیوں میں سے دو انگلیوں کے درمیان ہے۔ ہم نے جلد اول کی کتاب قواعد العقائد میں اس حکمت پر کچھ روشنی ڈالی ہے، یہاں اسی قدر گفتگو پر اکتفا کرتے ہیں، اور اپنے اصل مقصد کی طرف واپس چلتے ہیں۔

بندوں پر آخرت کے درجات کس طرح تقسیم ہوں گے؟ : ہمارے بیان کا مقصد یہی ہے کہ بندوں پر دوزخ اور جنت کے درجات کی تقسیم مثل کے ذریعہ ہی سمجھی جاسکتی ہے، اسلئے ہم اولاً "مثال بیان کرتے ہیں، جو مثال بیان کی جائے اسکے معنی و مفہوم پر نظر رکھی جائے، صورت اور الفاظ سے فرض نہ رکھی جائے۔

ہم کہتے ہیں لوگوں کی آخرت میں ست سی قسمیں ہوں گی، اور ان کے درجات و درجات میں ناقابل بیان تفاوت ہو گا، یہ فرق

ایسا ہی ہے جیسے دنیا کی مشقتوں اور سعادتوں میں فرق پایا جاتا ہے، اس سلسلے میں دنیا و آخرت میں کوئی فرق نہیں ہے، عالم ملک اور عالم ملکوت دونوں کا مدبر اور منتقم اللہ تعالیٰ ہے، جس کا کوئی شریک نہیں ہے، اسکے ارادہ الہی سے ان دونوں عالموں میں جو سخت الہیہ جاری ہے وہ بھی یکساں ہے، نہ اس میں تبدیلی ہوئی ہے، اور نہ تبدیلی کا امکان ہے، لیکن کہیں کہ ہم مختلف درجات کے افراد کا احاطہ کرنے سے عاجز ہیں اس لئے اجناس لکھتے ہیں، اور ان کا حصر کرتے ہیں۔

قیامت میں لوگوں کی قسمیں : قیامت کے روز لوگ چار قسموں میں منقسم ہوں گے، ایک ہلاکت پانے والے، دوم عذاب پانے والے، سوم نجات پانے والے، اور چہارم کامیاب دنیا میں اس تقسیم کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی بادشاہ کسی ملک پر قابض ہو جائے، اور اس کے بعض باشندوں کو قتل کرادے، وہ ملکین کھلائیں گے، کیونکہ بادشاہ نے انھیں ہلاک کر دیا ہے، بعض کو کچھ عرصہ کے لئے انڈیا میں دے، قتل نہ کرے، یہ معظنین ہیں، بادشاہ نے انھیں تکلیف دینا منظور کیا ہے، ان کے قتل کا حکم صادر نہیں کیا، بعض لوگوں کو کچھ نہ کہے، یہ زموں جہنم میں ہیں، انھیں قتل، اور عذاب دونوں سے نجات ملی ہے، اور بعض کو خلعت فاخرہ سے نوازے، یہ فائزین کی صف میں ہیں۔ یہ لوگ نہ صرف یہ کہ بادشاہ کے عذاب و عتاب سے بچے ہیں، بلکہ انھوں نے نزدیک ایسا ہی معاملہ کیا ہے کہ بادشاہ سے انعام و اکرام بھی پایا ہے، اگر بادشاہ ملل ہے تو یہ تقسیم ہی ہوا ہے، جس سلوک کا مستحق ہوگا، اسکے ساتھ وہی سلوک کرے گا، قتل کی سزا ان لوگوں کو دے گا جو اسکی حکومت کے باغی ہوں گے اور اسکے دشمنوں کے ساتھ مل کر اسے اقتدار سے محروم کرنے کی سازش کریں گے، جسائی یا ذہنی اذیتیں ان لوگوں کو دے گا جو اس کی بالادستی تسلیم کرتے ہوئے بھی اس کی خدمت سے گریز کریں گے ان لوگوں سے کوئی تعرض نہ کرے گا جنہوں نے اس کی بالادستی تسلیم کی اور اس کی مناسب طور پر خدمت بھی انجام دی، اور خلعت سے ان لوگوں کو سرفراز کرے گا جنہوں نے اسکی وفاداری کا پورا پورا حق ادا کیا اور زندگی بھر اسکی خدمت انجام دی، پھر اعزاز و اکرام میں بھی فرق ہوگا، جس نے جیسی خدمت کی ہوگی اسی کے مطابق خلعت پانے کا قتل کے درجات میں بھی فرق ہوگا، بعض کی صرف گردن اڑا دی جائیگی اور بعض کی سرکشی اتنی خطرناک ہوگی کہ انھیں ہاتھ پاؤں اور ناک کان کاٹ کر دردناک طریقے سے ہلاک کیا جائے گا، جن کو عذاب دیا جائے گا ان کے درجات بھی مختلف ہوں گے، کسی کو کم عذاب دیا جائے گا کسی کو زیادہ عرصے تک عذاب دیا جاتا رہے گا، اور کسی کو محدود مدت تک عذاب کے مرحلے سے گزرنا ہوگا۔

اس سے معلوم ہوا کہ ان چاروں میں سے ہر درجہ بے شمار درجات پر منقسم ہے، اسی طرح قیامت کے دن بھی ان چاروں گروہوں کے بے شمار درجات ہوں گے، مثال کی طور پر آخری گروہ کے جسے فائزین کہا گیا ہے بعض افراد کو جنت عدن میں جگہ ملے گی، بعض کو جنت ماویٰ میں، کسی کو جنت الفردوس میں، کسی کو جنت فییم میں، اس طرح جن لوگوں کو عذاب ہوگا ان میں سے بعض کے عذاب کی مدت بے حد مختصر ہوگی، بعض کو ہزار برس، بعض کو سات ہزار برس عذاب دیا جائیگا، یہ آخری مدت عذاب ہوگی، دوزخ سے سب سے آخر میں جو شخص باہر آئے گا وہ سات ہزار برس کے عذاب سے نجات پا کر ہر نکلے گا، جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے

إِنْ أَخْرَجَ مَنْ دُخْرَجَ مِنَ النَّارِ يُعَذِّبُ سَبْعَةَ أَلْفٍ سَنَةً (تکبیر الترمذی فی لا در الاصول)

آخر میں جو شخص دوزخ سے نکلے گا اسے سات ہزار برس عذاب دیا جائیگا۔

اسی طرح ان لوگوں کے درجات بھی مختلف ہوں گے جن کی قسمت میں ازل سے ابد تک کی بد بختی لکھ دی گئی ہے، اور اللہ تعالیٰ کی رحمت کی ایک ہلکی سی کرن بھی ان کے نماں خالوں میں روشنی نہیں کر سکتی، اب ہم یہ بیان کرتے ہیں کہ ان چاروں فرقوں پر درجات کی یہ تقسیم کس طرح ہوگی؟

پہلا درجہ۔ ہا لیکن سے وہ لوگ مراد ہیں جو اللہ کی رحمت سے مایوس ہیں، مثال مذکورہ بالا میں بادشاہ نے جس شخص کو قتل کیا تھا یہ وہی تھا جو بادشاہ کی خوشنودی اور اسکے اکرام سے مایوس تھا مثال کے معنی و مفہوم کو سامنے ضرور رکھیں، اس اعتبار سے یہ درجہ ان لوگوں کا ہوگا جو مکرین خدا ہیں، اس سے اعراض کرنے والے ہیں، انھوں نے اپنے آپ کو دنیا کے لئے وقف

کر دیا ہے، وہ اللہ اور اس کے رسولوں کی، ان پر نازل شدہ کتابوں کی تکذیب کرتے ہیں، آخر وہی سعادت اللہ کی قربت اور اس کے دیدار میں ہے، اور یہ سعادت اس معرفت کے بغیر قطعاً حاصل نہیں ہوتی جسے ایمان اور تصدیق کہتے ہیں، مگرین اللہ تعالیٰ سے اعراض کرنے والے، اسے جھٹلانے والے ہیں، وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس رہیں گے، اللہ تعالیٰ کے انکار، پیغمبروں اور آسمانی کتابوں کی تکذیب کی پاداش میں وہ قیامت کے روز اس کے دیدار کے شرف سے محروم رہیں گے، جیسا کہ قرآن کریم میں ہے:

إِنَّهُمْ عَنْ رَبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَمَّحْجُوبُونَ (پ ۸۳۰ آیت ۱۵)

اس روز یہ لوگ اپنے رب کریم (کا دیدار کرنے) سے روک دئے جائیں گے۔

اور ظاہر ہے جو شخص اپنے محبوب سے دور رہتا ہے اس کے اور اس کی آرزوؤں کے درمیان پردہ حائل رہتا ہے، اسلئے مگرین خدا اللہ تعالیٰ سے جدائی کی آگ میں جلیں گے، اسلئے عارفین خدا کہتے ہیں کہ نہ ہمیں حور عین کی خواہش ہے، اور نہ دونوں کے عذاب کا خوف، ہمارا مقصد اصلی تو اللہ تعالیٰ سے ملاقات اور اس کا دیدار ہے، اور اس حجاب سے بچنا ہے جو گناہوں کی بدولت بندے اور اس کے رب کے درمیان حائل ہو جاتا ہے، عارفین یہ بھی کہتے ہیں کہ جو شخص کسی عوض کے لئے اللہ کی عبادت کرتا ہے، وہ کینہ ہے، گویا جنت کے حصول اور دونوں سے نجات کے لئے عبادت نہ کرنی چاہیے۔ بلکہ عارف حقیقی وہی ہے جو ذات الہی کے لئے عبادت کرے، صرف ذات الہی کا طالب ہو، نہ حور عین کی خواہش رکھے، اور نہ پہلوں میووں کی تمنا کرے، نہ وہابی کی آگ سے ڈرے، اور نہ اس کے مصائب سے فرار ہو کر عبادت میں پناہ ڈھونڈے، آتش فراق کا سوز بیا اوقات دونوں کی آگ کے سوز سے بڑھ جاتا ہے، آگ جسموں کو خاکستر کرتی ہے، اور نار فراق وہ ہے جس کے بارے میں یہ ارشاد فرمایا گیا ہے۔

نَارُ اللَّهِ الْمُوقَدَةُ الَّتِي تَطْلُعُ عَلَى الْأَقْنَدَةِ (پ ۲۹۳۰ آیت ۶۷)

وہ اللہ کی آگ ہے جو سلگائی گئی ہے (یہ آگ) دلوں تک جا پہنچے گی۔

(جسموں کی آگ دلوں کی آگ سے ہلکی ہوتی ہے، ایک شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔

وفی فوادالمحب نار جوی۔ احرنار الحب حیم ابر دھا

(عاشق کے دل میں جو آگ بھڑک رہی ہے وہ دونوں کی آگ سے زیادہ گرم ہے۔ اور دونوں کی آگ اس

سے سرد تر ہے)

آتش فراق کی شدت سے آخرت میں کیا انکار کیا جاسکتا ہے جب کہ دنیا میں اس کا مشاہدہ عام ہے، جس شخص پر عشق کا غلبہ ہوتا ہے وہ آگ کے دھکتے ہوئے انگاروں پر لوٹتا ہے، اور کانٹوں پر چلتا ہے، اور فہم کی شدت کا عالم یہ ہوتا ہے کہ جسم و جان پر جو کچھ گزرتا ہے وہ اس کا ذرا بھی احساس نہیں کرتا، یہی حال اس شخص کا ہوتا ہے جس پر غم غالب آجائے، غیظ و غضب کی شدت سے مغلوب ہو کر لڑنے والے انسان کا جسم زخموں سے چھلکی بھی بن جائے تو اسے اس وقت ذرا بھی احساس نہیں ہوتا، اس لئے کہ غضب بھی دل ہی کی ایک آگ ہے، جیسا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

الْغَضَبُ قُطْعُ قُطْعِ النَّارِ (الحکیم الترمذی۔ ابو ہریرہ)

غمہ آگ کا ایک ٹکڑا ہے۔

دل کی سوزش جسم کی سوزش سے زیادہ ہوتی ہے، اور شدید تر ضعیف تر کا احساس ختم کر دیتا ہے، جیسا کہ اس کا عام مشاہدہ ہے۔ آدمی تلواریا آگ سے ہلاک ہوتا ہے، اس کے نتیجے میں اس کے جسم کو جو تکلیف پہنچتی ہے، اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ جسم کے وہ اعضاء جو آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ مربوط تھے، آگ کی حرارت یا تلوار کی حدت سے علیحدہ ہو جاتے ہیں، لہذا اس چیز کی تکلیف محسوس نہ کی جائے گی، جس سے آدمی کے دل اور اس کے محبوب کے مابین تفریق ہو جائے جب کہ دل اور محبوب کے درمیان جسم کے اعضاء سے زیادہ اتصال اور ارتباط ہوتا ہے، اس صورت میں تکلیف بھی جسم کی نسبت زیادہ ہوتی چاہیے، بشرطیکہ معاملہ

اربابِ قلوب اور اصحابِ بصیرت کا ہو جس کے دل ہی نہ ہو وہ رنج و الم کی شدت کس طرح محسوس کر سکتا ہے بلکہ جسم کی تکلیف کو وہ زیادہ ترجیح دے گا اور جسم کی تکلیف کے مقابلے میں دل کی تکلیف کو معمولی سمجھ کر نظر انداز کر دے گا چنانچہ اگر بچے سے ایک طرف اسکی گیند ہلاتے ہیں اور دوسری طرف بادشاہ کی قربت سے محروم کر دیا جائے تو اسے گیند بٹے کی جدائی کا افسوس ہوگا بادشاہ کی قربت سے محرومی کا احساس بھی نہیں ہوگا چہ جائیکہ اسے غم تصور کرے اور یہ کہے کہ میرے نزدیک گیند کے پیچھے میدان میں ہلاتے کر دو ڈنا شاہی مسند پر بادشاہ کے ساتھ بیٹھنے سے زیادہ محبوب ہے بلکہ جس شخص پر شہوتِ بطن کا غلبہ ہے اگر اسے ایک طرف ہر سہ اور حلوا کھانے کے لئے دیا جائے اور دوسری طرف یہ مطالبہ کیا جائے کہ وہ کوئی ایسا کام کرے جس سے دشمنوں کو شکست دے سکے اور دوستوں کے دل جیت سکے تو وہ حلوہ اور ہر سہ کھانے کو ترجیح دے گا کیونکہ اس پر ہیبت غالب ہے وہ ان لذتوں کے سامنے کسی اعلیٰ سے اعلیٰ منصب کی بھی پروا نہیں کرے گا لیکن یہ صرف ان لوگوں کا حال ہے جنہوں نے ہیمانہ اوصاف اپنالے ہیں اور ملائکہ کے ان اوصاف سے محروم ہیں جو ان کی ضد ہیں اگر آدمی پر ملکوتی صفات غالب آجائیں تو وہ صرف قربِ الہی میں لذت پاتا ہے اور اس کے لئے سب سے زیادہ رنج اور تکلیف کا باعث وہ حجاب ہوتا ہے جو اس کے اور محبوب کے درمیان حائل ہو جائے۔

لطیفہ قلب : ہر عضو کے لئے ایک مخصوص وصف ہے کان کے لئے سنا، آنکھ کے لئے دیکھنا وغیرہ اسی طرح قلب کے لئے ایک مخصوص وصف ہے یعنی قربِ الہی سے لذت پانا جس کے قلب نہ ہوگا اسے قرب کی لذت اور بعد کی تکلیف کا احساس ہی نہیں ہوگا جیسے اگر کسی شخص کے کان نہ ہو تو وہ سننے کی قوت سے محروم رہتا ہے اور آنکھ نہ ہو تو وہ دیکھنے کی لذت سے محروم رہتا ہے ہر انسان کے پاس قلب نہیں ہوتا اگر ایسا ہوتا تو اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان صحیح نہ ہوتا۔

إِن فِیْ ذٰلِکَ لَکَرۡوٰی لِّمَنۡ کَانَ لَہٗ قَلۡبٌ (پ ۳۱ ر ۱۷ آیت ۳)

اس میں اس شخص کے لئے بڑی عبرت ہے جس کے پاس دل ہو یا وہ متوجہ ہو کر (بات کی طرف) کان لگا رہتا ہو۔ جو شخص قرآن پاک سے وعظ و نصیحت حاصل نہیں کرتا اسے قلب کا مفلس قرار دیا گیا ہے قلب سے ہماری مراد وہ مخصوص عضو نہیں ہے جو سینے اور پشت کی ہڈیوں کے درمیان دھرتا ہے بلکہ یہ ایک سر ہے جس کا تعلق عالمِ امر سے ہے اور سینے کا دل گوشت کا ایک ٹکڑا ہے جس کا تعلق عالمِ خلق سے ہے گوشت کا یہ ٹکڑا قلب کا عرش ہے سینہ اس کی کرسی ہے اور جسم کے دوسرے اعضاء اس کی مملکت ہیں اگرچہ خلق اور امردوں اللہ ہی کے حکم سے وجود میں آئے ہیں اور اسی کے محکوم ہیں لیکن جس قلب کو سر اور لطیفہ کہا گیا ہے اور جس کا ذکر قرآن کریم کی اس آیت میں ہے۔

قُلِ الرُّوۡحُ مِنْۢ أَمْرِ رَبِّیْ (پ ۱۵ ر ۱۰ آیت ۸۵)

آپ فرمادیجئے کہ روح میرے رب کے حکم سے ہے۔

وہ اس مملکت جسم کا امیر اور سلطان ہے عالمِ امر اور عالمِ خلق دونوں میں ایک خاص ترتیب ہے اول کو دوسرے پر حاکم بنایا گیا ہے قلب ایک ایسا لطیفہ ہے کہ اگر وہ صحیح ہو تو تمام بدن صحیح ہو وہ بیمار ہو تو تمام بدن بیمار ہو جو شخص اس لطیفے کی معرفت حاصل کر لیتا ہے وہ اپنے نفس کی بھی معرفت پالیتا ہے اس وقت بندہ ان معانی کی خوشبوئیں سونگنے کا اہل ہو جاتا ہے جو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشادِ گرامی میں پوشیدہ ہیں۔

إِنَّ اللّٰہَ خَلَقَ آدَمَ عَلٰی صُوَرَتِہٖ

اللہ تعالیٰ نے آدم کو اپنی صورت میں پیدا کیا ہے۔

جو لوگ اس حدیث کے ظاہری الفاظ پر نظر رکھتے ہیں اور اس کی تاویل کے طریقوں میں الجھتے ہوئے ہیں اللہ ان پر رحم کرے گا جو خاص طور سے ان لوگوں پر جو الفاظ ظاہری پر عمل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں کیونکہ رحمِ قادرِ معیت ہوتا ہے ظاہر میں الجھ کر وہ

جانے والوں کی معصیت تاویل کی وادیوں میں بھگ کر رہ جانے والے سے کم ہے۔

امر اللہ تعالیٰ کا فضل اور اسکا انعام ہے، جسے چاہے توڑتا ہے، جسے چاہے محروم رکھتا ہے اس میں کسی کو اختیار نہیں ہے نہ ایک حکمت ہے اور قرآن کریم میں ہے۔ **وَمَنْ يُؤْتِنِ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا** جسے حکمت دی گئی اسے خیر کثیر دیا گیا۔

قلم کا رخ ان مطالب کی طرف مڑ گیا تھا جو علم معاملات سے اٹلی ہیں، ہم اس کتاب میں معاملات سے تعلق رکھنے والے علوم ہی بیان کرنا چاہتے ہیں، اسلئے اصل مقصود کی طرف چلتے ہیں، اس تفصیل سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ ممکن کے درجے میں وہ لوگ ہیں جو جاہل محض ہیں، اللہ تعالیٰ کے مکر، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کذب ہیں، قرآن وحدیث میں اس کی بے شمار دلیلیں ہیں، یہاں ان کے ذکر کی ضرورت نہیں ہے۔

دوسرا درجہ معذبین : ایک درجہ ان لوگوں کا ہے جنہیں عذاب ہوگا، یہ وہ لوگ ہیں جو اصل ایمان رکھتے ہیں، لیکن ایمان کے تحقیقات پر عمل کرنے سے قاصر ہیں، مثلاً اصل ایمان توحید ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو وحدہ لا شریک مانے اور صرف اسی کی عبادت کرے، اب اگر کوئی شخص نفس کی خواہشات کی اتباع کرتا ہے تو کہا جائے گا کہ وہ توحید کے تقاضوں پر عمل پیرا نہیں ہے، وہ صرف زبان سے توحید کا اعتراف کرتا ہے، اسکی روح کو نہیں سمجھتا، توحید کی روح یہ ہے کہ کلمہ توحید "لا الہ الا اللہ" کو ان آیات کے ساتھ مربوط سمجھے۔

قُلِ اللّٰهُ ثُمَّ ذَرْهُمْ فِیْ خَوْضِهِمْ یَلْعَبُوْنَ (پ ۷ ر ۷ آیت ۳)

آپ کہہ دیجئے کہ اللہ نے نازل فرمایا ہے، پھر ان کو انکے مشغلے میں بے ہودگی کے ساتھ لگا رہنے دیجئے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَفْصَمُوْا (پ ۱۸ ر ۲۳ آیت ۳۰)

جن لوگوں نے اقرار کر لیا کہ ہمارا رب اللہ ہے پھر مستقیم رہے۔

اس دوسری آیت میں توحید بھی ہے، اور اس راستے پر استقامت کا اظہار بھی ہے، جس پر نبوی اللہ کو ایک ماننے کے بعد چلا ہے، یہ صراط مستقیم جس کے بغیر توحید مکمل نہیں ہوتی، ہال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہے، آخرت میں اسکی مثال پہلی صراط ہے۔ بظاہر ایسا کوئی آدمی نظر نہیں آتا جو راہ استقامت سے تھوڑا ہی سہی۔ اور ہر آدمی مانگ لے کہ خواہشات نفسانی سب میں ہیں، اور سب ہی لوگ ان خواہشات پر عمل کرتے ہیں، فرق یہ ہے کہ بعض صرف خواہشات کے تابع ہوتے ہیں، اور بعض لوگ احکام الہی کے تابع ہوتے ہوئے بھی اپنے نفس کی کسی خواہش پر عمل کر لیتے ہیں، خواہ وہ خواہش ان کے پاؤں چسے اعمال خیر کے مقابلے میں ذمہ برابری کہیں نہ ہو، خواہش نفس کے اتباع سے توحید کا کمال متاثر ہوتا ہے، جس قدر آدمی راہ راست سے منحرف ہوگا، اسی قدر اسکی توحید ناقص ہوگی، قرب کے درجات میں نقصان اسی لئے ہوتا ہے، اور ہر نقصان کے ساتھ دو آگ ہیں، ایک اس فراق کی آگ ہے، جو کمال توحید میں نقص کے باعث حاصل ہوتی ہے، اور ایک دوزخ کی آگ ہے، جس کا ذکر قرآن کریم میں موجود ہے اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص راہ راست سے منحرف ہوگا، اسے دو طرح کا عذاب ہوگا، لیکن اس عذاب کی نوعیت و کیفیت شدت و ضعف کا مدار ایمان کی قوت و ضعف اور اتباع نفس کی قلت و کثرت پر ہے عام طور پر آدمی ان دو میں سے ایک سے خالی نہیں ہوتا، اسی لئے قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا۔

وَلَنْ مِنْكُمْ اِلَّا وَاِلٰہُکُمْ اَنَّ عَلٰی رَبِّکُمْ حَتْمًا مَّقْضٰیًا ثُمَّ تُنْجٰی الَّذِیْنَ اتَّقَوْا وَنَزَّلَ

الْظَّالِمِیْنَ فِیْہَا جِثِیًا (پ ۱۸ ر ۲۴ آیت ۷)

اور تم میں سے کوئی بھی نہیں جس کا اس پر سے گزرنہ ہو، پھر ہم ان لوگوں کو نجات دیں گے جو خدا سے ڈر کر ایمان لاتے تھے اور ظالموں کو اس میں گھٹنوں کے بل پڑا رہنے دیدگے۔

اسی لئے بعض وہ سلف صالحین جن پر خوف کا غلبہ تھا کہا کرتے تھے کہ ہم اسلئے ڈرتے ہیں کہ دوزخ کی آگ پر سے گزرنا ہر شخص کے لئے یقینی ہے، لیکن اس سے نجات پانا مشکوک ہے، حضرت حسن بصریؒ نے وہ روایات بیان کی جس میں اس شخص کا ذکر ہے جو ایک ہزار برس کے بعد دوزخ سے یا حنان یا منان نکلا ہوا نکلے گا (احمد، ابو حلیہ، النسائی) اسکے بعد آپ نے فرمایا کتنا اچھا ہو اگر وہ شخص میں ہوں۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ اس شخص کا دوزخ سے نکلنا یقینی ہے، اگرچہ ایک طویل مدت تک سزا بھگتنے کے بعد نکلے گا، لیکن اودوں کا نکلنا تو مشکوک ہے۔

آخرت کے عذاب کی مدت، شدت اور کیفیت میں اختلاف: روایات میں ہے کہ سب سے آخر میں جو شخص دوزخ سے نکلے گا وہ سات ہزار برس کے بعد نکلے گا، بعض لوگ بجلی کی طرح ایک لمحے میں گزر جائیں گے، ایک لمحہ اور سات ہزار برس کے عذاب کے مختلف درجات کی ابتداء اور انتہا کے دوسرے ہیں، ان کے درمیان بے شمار درجات ہیں مثلاً منٹ، گھنٹہ، دن، ہفتہ، مہینہ، سال وغیرہ یہ عذاب کی مدت کا حساب ہے جسکی بظاہر کوئی انتہا نہیں ہے، یہی حال عذاب کی کی زیادتی کا ہے، زیادتی کی کوئی انتہا نہیں ہے، کم سے کم عذاب یہ ہے کہ آدمی کو حساب کتاب میں الجھا دیا جائے، جیسے دنیا کے حکام اپنے محکومین کو کوئی جنسائی سزا نہیں دیتے، بلکہ حساب کتاب میں سخت گیری کر کے ان پر دائم حیات تک کر دیتے ہیں، پھر معاف کر دیتے ہیں، بعض کو ہلکے پھلکے کوڑے لگوا کر چھوڑ دیا جاتا ہے، عذاب میں مدت اور شدت کی کمی بیشی کا اختلاف تو ہے ہی ایک اختلاط نوعیت کا بھی ہے، سزا ایک طرح کی نہیں ہوتی، اس کی بھی لاتعداد قسمیں ہیں، دنیا ہی کے معاملات میں دیکھ لیجئے، بعض خطاکاروں پر جرمانہ کیا جاتا ہے، کسی کا مال ضبط کر لیا جاتا ہے کسی کی بیوی بچے قید یا قتل کر دئے جاتے ہیں، کسی کے رشتہ داروں کو تکلیفیں دی جاتی ہیں، کسی کے ہاتھ پاؤں وغیرہ کاٹ لئے جاتے ہیں، اسی طرح آخرت کے عذاب میں بھی نوعیت کا اختلاف ہوگا، جیسا کہ شرعی دلائل سے ثابت ہے، لیکن عذاب کا یہ اختلاف ایمان کی قوت و ضعف، اعمال کی کثرت و قلت اور گناہوں کی شدت و عفت پر موقوف ہے، چنانچہ جس قدر گناہوں کی برائی زیادہ ہوگی اسی قدر عذاب بھی زیادہ ہوگا، اور جس نوع کی ظلمی ہوگی، اسی نوع کی سزا دی جائے گی۔

عذاب عدل کے ساتھ ہوگا: ارباب قلوب پر یہ حقائق قرآن و سنت کے شواہد ہی کے ذریعہ نہیں بلکہ نور ایمان سے بھی منکشف ہوئے ہیں، قرآن کریم کی ان آیات سے یہی حقائق معلوم ہوتے ہیں۔

وَمَا زَكَّيْكُمْ بِظُلَامٍ لِّلْعَيْنِيد (پ ۲۳ آیت ۳۶)

اور آپ کا رب بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہے۔

الْيَوْمَ نَجْزِي كُلَّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ (پ ۲۴ آیت ۱۷)

آج ہر شخص کو اسکے کئے کا بدلہ دیا جائے گا

وَأَن لَّيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَأَلَ (پ ۲۷ آیت ۳۹)

اور یہ کہ انسان کو صرف اپنی ہی کمالی ملے گی۔

فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ (پ ۲۴ آیت ۸)

سو جو شخص دنیا میں ذرہ برابر نیکی کرے گا وہ اسکو دیکھ لے گا اور جو شخص ذرہ برابر بدی کرے گا وہ اسکو دیکھ لے گا۔

ان کے علاوہ بھی بے شمار آیات و احادیث ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اعمال صالحہ کی جو جزا آخرت میں عذاب یا ثواب کی صورت میں دی جائے گی وہ عادلانہ ہوگی، اس میں ظلم نہ ہوگا، بلکہ ترجیح رحمت کے پہلو کو حاصل رہے گی، جیسا کہ حدیث قدسی میں ارشاد ہے۔

مَبْقُوتُ رَحْمَتِي غَضَبِي (مسلم، ابو ہریرہ)

میری رحمت میرے غضب پر سبقت کر گئی ہے۔

قرآن کریم میں فرمایا گیا۔

وَلَنْ تَكُ حَسَنَةً قَبِيضًا عَفْهَا وَيُؤْتِيَنَّكَ مِنْ لَدُنْكَ خَيْرًا عَظِيمًا (پ ۵ ر ۴ آیت ۳)
اور اگر نیکی ہوگی تو اس کو کئی گنا کر دیں گے اور اپنے پاس سے اجر عظیم دیں گے۔

اس سے معلوم ہوا کہ درجات و درجات حسنات سے اور درجات کا تعلق سینات سے بحیثیت مجموعی نہ صرف یہ کہ شری دلائل سے ثابت ہے بلکہ نور معرفت سے بھی ثابت ہے، تاہم تفصیل عن سے معلوم ہوتی ہے، جس کا مدار ظاہری حدیثوں پر بھی ہے اور ایک نوع کے الہام پر بھی جو واقعات کو چشمِ مہر سے دیکھنے کے نور سے حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ تمام روایات پر نظر ڈالنے سے جو نتائج سامنے آتے ہیں وہ یہ ہیں کہ اگر کسی نے اصل ایمان کو مضبوط پکڑے رکھا، کبار سے اجتناب کیا، اور فرائض یعنی ارکانِ خمسہ اچھی طرح ادا کئے اور اس سے صرف چند متفرق صغیر گناہ سرزد ہوئے جن پر اس نے اصرار بھی نہیں کیا تو ایسا لگتا ہے کہ اسے صرف حسابِ نعمی کا عذاب دیا جائیگا اور جب حساب ہوگا تو اس کی حسنات کا پلڑا سینات کے مقابلے میں بھاری ہوگا، جیسا روایات میں ہے کہ بیخ گانہ نمازیں جمعہ اور رمضان کے روزے درمیان کے گناہوں کا کفارہ ہیں، اسی طرح کبار سے بچنا بھی صغائر کے لئے کفارہ جیسا کہ قرآن کریم میں ہے، اور کفارہ کا کم سے کم درجہ یہ ہے کہ آدمی عذابِ دفع کب دیا جائے، اگر حسابِ دفع نہ کیا جائے، جس کا حال یہ ہوتا ہے کہ اس کے اعمال ناسے

بھاری ہوتے ہیں، اسکے بارے میں امید کی جاسکتی ہے کہ وہ نیکیوں کا پلڑا بھاری ہونے کے بعد، اور حساب سے فراغت کے بعد مزید زندگی گزارے، البتہ مقربین یا اصحابِ یمن کے زمرے میں شامل ہونا اور جناتِ عدن یا جناتِ فردوس میں داخل ہونے کا انحصار ایمان کی قسموں پر ہے۔

ایمان کی دو قسمیں : ایمان کی دو قسمیں ہیں ایک قہیدی جیسے عوام کا ایمان، یہ لوگ جو کچھ سنتے ہیں، اسے سچ سمجھتے ہیں اور ہمیشہ اسی پر قائم رہتے ہیں، دوسرا کشفی، یہ ایمان اس وقت تک حاصل ہوتا ہے جب نور الہی سے سینہ کھل جائے، اور اس میں تمام موجودات اپنی اصل حالت میں منکشف ہو جائیں جو لوگ اس ایمان کی دولت سے مالا مال ہیں وہ یہ بات جانتے ہیں کہ تمام چیزوں کا مرجع اللہ کی ذات ہے اور موجود صرف اللہ تعالیٰ کی ذات، صفات، اور افعال ہیں، باقی سب فنا ہو بیوالی چیزیں ہیں، ایسے لوگوں کو تقرب کا اعلیٰ درجہ ملے گا، یہ لوگ ملا اعلیٰ میں فروکش ہوں گے، اور فردوس اعلیٰ میں ٹھکانہ پانچنے پھر ان کی بھی بے شمار قسمیں ہیں، بعض آگے پیچھے ہوئے ہوں گے، بعض ان سے پیچھے ہوں گے جتنی جس کی معرفت کم ہوگی اسی قدر وہ تقرب میں کم ہوگا، اللہ تعالیٰ کی معرفت رکھنے والے کے درجے اتنے زیادہ ہیں کہ ان کا احاطہ نہیں کیا جاسکتا، اسلئے کہ جلالِ خداوندی کی حقیقت معلوم کرنا ناممکن ہے اور معرفتِ الہی ایک وسیع سمندر ہے، نہ اسکا کنارہ ہے، اور نہ گہرائی جو لوگ سحر معرفت میں غوطہ لگاتے ہیں وہ اپنی ہمت اور وسعت کے بقدر نیچے تک پہنچتے ہیں، اور اسی منزل تک رسائی حاصل کرتے ہیں جو ازل میں ان کی قسمت میں لکھ دی گئی ہے، جس طرح راہِ آخرت کی منزلیں بے شمار ہیں اسی طرح اس راستے کے چلنے والوں کے درجات بھی بے شمار ہیں۔

ایمان قہیدی رکھنے والا مومن اصحابِ یمن کے زمرے میں شامل ہے، لیکن اس کا درجہ مقربین کے درجے سے کم ہے، پھر اصحابِ یمن کے بھی بے شمار درجے ہیں، ان میں سے اعلیٰ درجہ وہ ہے جو مقربین کے درجے سے قریب تر ہو۔

بعض ارکان کا تارک : اب تک اس شخص کا حال بیان کیا جا رہا تھا جس نے تمام کبار سے اجتناب کیا، اور تمام فرائض یعنی پانچوں ارکان ادا کئے، پانچوں ارکان سے مراد یہ ہے کہ کلمہ شہادت پڑھا، نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج ادا کئے، جو شخص ایک یا چند گناہ کا ارتکاب کرتا ہے، یعنی اسلام کے بعض ارکان ترک کرتا ہے، اگر وہ موت سے پہلے غلوں دل کے ساتھ توبہ کر لے تو اس کا انجام بھی ان ہی لوگوں میں ہوگا جنہوں نے گناہوں کا ارتکاب نہیں کیا اور ارکانِ اسلام ادا کئے اسلئے کہ حدیث شریف کے مطابق گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہے جیسے اس سے کوئی گناہ سرزد نہ ہوا، چنانچہ اگر نجاست آلود کپڑا دھویا جائے تو وہ پاک ہو جاتا ہے اور اس پر نجاست کا اثر باقی نہیں رہتا، اور اگر توبہ سے پہلے مر جائے تو موت کے وقت اسکی حالت باعثِ تشریف ہے کیونکہ موت اگر گناہ پر

اصرار کی حالت میں واقع ہوئی تو ایمان اپنے ضعف کے باعث حائل بھی ہو سکتا ہے اس صورت میں سوء خاتمہ کا خوف ہے خاص طور پر اس وقت جب کہ ایمان تقلیدی ہو تقلیدی ایمان بختہ ضرور ہوتا ہے لیکن معمولی شہادت سے متاثر ہو جاتا ہے معرفت و بصیرت رکھنے والوں پر سوء خاتمہ کا اندیشہ نہیں ہوتا تاہم اگر یہ دونوں توبہ سے پہلے ایمان پر جاں بحق ہوئے تو بشرطیکہ اللہ تعالیٰ معاف نہ فرمائے عذاب دیا جائیگا اور یہ عذاب حساب جہنم کے عذاب سے الگ ہوگا اور اس عذاب کی کمی و زیادتی گناہ پر اصرار کی مدت کی کمی یا زیادتی پر موقوف ہوگی اسی طرح گناہوں کی قباحیت اور نوعیت کے اختلاف پر بھی موقوف ہوگی اور عذاب کی مدت گزر جانے کے بعد سادہ لوح مقلدین اصحاب یمن کی صف میں داخل ہو جائیں گے اور اہل بصیرت عارف اعلیٰ علیین میں ٹھکانہ پائیں گے حدیث شریف میں ہے

أَخْرَجَ مِنْ النَّارِ يُعْطَىٰ مِثْلَ الدُّنْيَا كُلِّهَا عَشْرَةَ أَضْعَافٍ (بخاری و مسلم۔ ابن مسعود) جو شخص سب کے بعد دوزخ سے باہر نکلے گا اسے دنیا کے برابر دس گنا ملے گا۔

اضعاف کی حقیقت : اس سے اجسام کی ہمائش مراد نہیں ہے یعنی یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ اگر دنیا ایک ہزار کوس کی ہے تو اسے دس ہزار کوس ملیں گے اگر کوئی ایسا سمجھتا ہے تو یہ مثال بیان کرنے کے طریقے سے ناواقفیت کی دلیل ہے بلکہ اسے اس طرح سمجھنا چاہیے کہ کوئی شخص مثلاً یہ کہے کہ اس نے اونٹ لیا اور دس گنا دیا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اگر اونٹ دس روپے کا تھا تو اس نے سو روپے دیئے اگر اس سے مثل مراد لیا جائے تو ظاہر ہے کہ سو روپے اونٹ کے سودیں جسے کے برابر بھی نہیں ہے مثالوں میں اجسام و ارواح کے معانی کا موازنہ ہوتا ہے ان کے وجود اور اشکال کا موازنہ نہیں ہوتا مذکورہ بالا مثال میں اونٹ سے اسکا وزن طول اور عرض مقصود نہیں ہے بلکہ مالیت ہے اس سے معلوم ہوا کہ اونٹ کی مالیت روح ہے اسلئے سو روپے کو اونٹ کا دس گنا کہا جاسکتا ہے بلکہ اگر سو روپے نہ دے اور اس کی قیمت کا ایک موٹی دیدے تب بھی یہی کہا جائے گا کہ اس اونٹ (کی قیمت) کا دس گنا دیا کیونکہ مالیت کی روح سونا چاندی اور جواہرات ہیں اس حقیقت سے صرف جوہری واقف ہیں وہ یہ جانتے ہیں کہ ایک چھوٹا سا موٹی دس جسیم اونٹوں کے برابر کیسے ہو سکتا ہے جوہری جوہریت آنکھ سے نظر آنے والی چیز نہیں ہے بلکہ اس کے لئے ظاہری نظر کے علاوہ عقل و خرد کی بھی ضرورت ہے یہی وجہ ہے کہ جاہل آدمی اور بچہ یہ بات تسلیم نہیں کرے گا کہ ایک چھوٹا سا موٹی دس اونٹوں کے برابر ہو سکتا ہے وہ یہی کہیں گے کہ موٹی کا وزن چند ماشے بھی نہیں ہوتا اور اونٹ اس سے ہزاروں لاکھوں گنا زیادہ ہے اس لئے جو شخص یہ کہتا ہے کہ میں نے ایک اونٹ کے عوض دس گنا دیا وہ جھوٹا ہے حالانکہ حقیقت میں جھوٹا وہ بچہ ہے یا وہ جاہل دیہاتی ہے جو اپنی جمالت کے باعث جوہر اور اونٹ کی قیمت میں موازنہ نہ کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے یہ دونوں اس قول کو اسی وقت صحیح تسلیم کر سکتے ہیں جب انکے دل میں وہ نور پیدا ہو جائے جس سے اس طرح کے حقائق کا اور اک کیا جاسکتا ہے اور یہ نور لڑکے کے دل میں بلوغ کے بعد اور جاہل دیہاتی کے دل میں تعلیم کے بعد پیدا ہو سکتا ہے اسی طرح عارف بھی کسی مقلد محض کو مثالوں کی حقیقت نہیں سمجھا سکتا اور نہ وہ اسے اس طرح کی روایات کی صداقت تسلیم کرنے پر مجبور کر سکتا ہے کہ مومن کو دنیا کی دس گنی جنت عطا کی جائے گی مقلد یہ تقریر کرتا ہے کہ احادیث کے مطابق جنت آسمانوں میں ہے (بخاری۔ ابو ہریرہ) اور آسمان دنیا میں شمار ہوتے ہیں پھر دنیا سے دس گنی بڑی دنیا کیسے مل سکے گی جس طرح کوئی عاقل بالغ شخص کسی بچے کو یہ فرق نہیں سمجھا سکتا اسی طرح جوہری بھی اس وقت عاجز نظر آتا ہے جب اس سے کہا جائے کہ وہ دیہاتی کو جوہر اور اونٹ کا فرق سمجھا دے یہی حال عارف کا بھی ہے کہ وہ سادہ لوح مقلد کو اس موازنے کا طریق نہیں سمجھا پاتا اسی لئے حدیث شریف میں ارشاد فرمایا گیا۔ اِرْحَمُوا اَئِلَةَ الْعَالَمِ ابْنِ الْجَاهِلِ وَعَنْتِي قَوْمٌ افْتَقَرُوا عَزِيزٌ قَوْمٌ ذَلَالٌ (ابن حبان۔ ابن) تین آدمی قابل رحم ہیں جاہلوں کے درمیان عالم کسی قوم کا مالدار جب تنگ دست ہو جائے کسی قوم کا عزت و آزادی جیذلیل ہو جائے۔

انبیاء و انبیاء کی آزمائش : انبیاء کرام بھی اپنی امت کے درمیان اسی لئے قابل رحم ہیں کہ جس قوم کی طرف ان کی بعثت ہوتی تھی وہ اپنی کم عقلی اور سچائی کے باعث انہیں پہچانی نہیں دیتے۔ یہ اذیتیں ان کے حق میں اللہ کی طرف سے امتحان اور آزمائش تھیں۔ حدیث شریف میں بھی مراد ہے۔

الْبَلَاءُ مَوْكَلٌ بِالْأَنْبِيَاءِ ثُمَّ لَا مَثِيلَ فَلَا مَثِيلَ (ترمذی، نسائی، ابن ماجہ۔ سعد بن ابی وقاص)

آزمائش مصلحت ہے انبیاء اور اولیاء پر جو انبیاء و اولیاء کے مشابہ ہوں۔

اس آزمائش سے صرف وہی آزمائش مراد نہیں ہے جو حضرت ایوب علیہ السلام کے جسم پر نازل ہوئی، بلکہ اس سے وہ معصیت اور اذیت بھی مراد ہے جو حضرت نوح علیہ السلام کو اپنی قوم سے اس وقت پہنچی جب انھوں نے قوم کو اللہ کی طرف بلایا، اور وہ نفرت سے دور ہٹ گئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بعض لوگوں کے کلام سے اذیت ہوئی، تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ میرے بھائی موسیٰ علیہ السلام پر رحم کرے کہ لوگوں نے انھیں ستایا مگر انھوں نے صبر کیا (بخاری۔ ابن مسعود)

انبیاء اپنی نبوت کے معجزات کی وجہ سے آزمائش میں مبتلا کئے جاتے تھے، اولیاء اور علماء کو جاہلوں کی وجہ سے مبتلا کیا جاتا ہے جس طرح انبیاء کو آزمائش کے صبر آزمائے سے گزرنا پڑتا ہے، اسی طرح اولیاء اللہ اور علماء ربانی سخت امتحان کا سامنا کرتے ہیں۔ کبھی شہر چھوڑنے پر مجبور کئے جاتے ہیں، کبھی سلاطین وقت کے درباروں میں انکی چٹل ہوئی ہے، اور وہ حق گوئی کی پاداش میں ہر طرح کے مظالم برداشت کرتے ہیں کچھ لوگ انھیں کافروں اور طغیانوں کے ہاتھوں میں پھنسا دیتے ہیں، کچھ بددین اور فاسق و فاجر کہہ کر ستاتے ہیں اس میں شک نہیں کہ جاہلوں کے نزدیک اہل علم و معرفت کافروں سے کم نہیں ہیں جیسے کوئی اگر ایک موتی کے عوض اپنا اونٹ دیدے تو بے وقوف لوگ اسے پاگل کہیں گے کہ اس نے اتنا لہا چڑا جانور اتنے چھوٹے سے بچر کے عوض دیدیا۔

اس وضاحت کے بعد ہمیں حدیث شریف کے اس مضمون پر ایمان لانا چاہئے کہ سب کے بعد دو رخ سے نکلنے والے شخص کو دنیا سے دس گنی بڑی جنت عطا کی جائے گی، یہ ایک سچا وعدہ ہے اور بلاشبہ اس پر عمل کیا جائے گا۔ تصدیق صرف ان چیزوں کے ساتھ مخصوص نہیں ہوتی جو اس غم سے پہچانے جاتے ہیں اگر تم نے محض ایسی ہی چیزوں کے ساتھ تصدیق کو مخصوص جانا تو تم میں اور گدھے میں کیا فرق ہو گا جو اس غم سے لوگدھا بھی چیزوں کا ادراک کر لیتا ہے، تم گدھے سے اسی لطیفہ کی وجہ سے ممتاز ہو جو پہلے آسمانوں، زمینوں اور پہاڑوں پر پیش ہوا، جب انھوں نے اس لطیفہ کا بوجھ سنبھالنے سے اپنی معذوری ظاہر کی تو یہ لطیفہ انسان پر پیش کیا گیا، یہ وہی لطیفہ ہے جس سے حواس کے دائرے سے خارج چیزوں کا ادراک کیا جاتا ہے حیوانات کو یہ لطیفہ میسر نہیں ہے جو محض اس لطیفہ سے کام نہ لے اور اسے ضائع کر دے اور اپنی معلومات کی حد صرف محسوسات ہی کو قرار دے وہ انھی حیوانات میں شامل ہے۔

معرفت الہی حواس کے دائرے سے خارج ہے : براہِ دران اسلام ہمیں ایسا نہ ہونا چاہئے۔ جو محض صرف محسوسات کے ذریعہ چیزوں کا ادراک کرنا ہے وہ اللہ تعالیٰ کو بھول جاتا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات کا ادراک محاسن سے نہیں ہوتا جو شخص اللہ تعالیٰ کو بھول دیتا ہے۔ اللہ اسے اس کا نفس بھلا دیتا ہے۔ پھر افاقہ صلی تک ترقی نہیں کرپاتا اور بہائم کے مرتبے میں پہنچ جاتا ہے، اور اسی مرتبے پر قانع ہو جاتا ہے، ایسا محض دراصل اس امانت میں خیانت کرنے والا ہے جو اسے اللہ کی طرف سے دینے ہوئی، اور اس کی نعمتوں کا منکر ہے اور خود کو اس کے انتقام کا نشانہ بنانے والا ہے، ایسے محض کا حال تو بہائم کے حال سے بھی بدتر ہے، بہائم تو موت کے ذریعہ چھٹکارہ پالیتے ہیں، اسے موت کے بعد بھی چھٹکارا نہیں ملتا، بلکہ اسے وہ امانت جو اسکے سپرد کی گئی تھی لا محالہ مالک امانت کو واپس کرنی ہوگی، کیوں کہ امانت اسی کی طرف رجوع کرے گی، اسی کے پاس اس کا ٹھکانہ ہے۔

یہ امانت کیسی ہے؟ : یہ امانت ایک روشن آفتاب کی طرح ہے، جو ازل کے افق سے طلوع ہوئی ہے اور اسی فانی جسم میں

غروب ہو گئی ہے، جب اس جسمانی قالب کا نظام درہم برہم ہو گا تب یہ آفتاب اپنے مغرب سے طلوع ہو گا اور اپنے خالق و باری کے حضور پہنچے گا یا تو گناہ کیا خوب روشن ہو کر، روشن آفتاب تو بلا حجاب رب کریم کے دربار میں پہنچے گا، پہنچے گا تو گناہ ہوا آفتاب بھی، کیونکہ تمام کا مرجع اللہ تعالیٰ کی ذات ہی ہے، لیکن اوندھے منہ پہنچے گا، اس کا رخ اعلیٰ ملین کے بجائے اسفل السافلین کی طرف پھرا ہوا ہو گا۔ قرآن شریف میں ارشاد ہے۔

وَلَوْ تَرَىٰ إِذِ الْمُنْجَرُونَ نَاكِسُو رُءُوسِهِمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ (پ ۱۱ ر ۱۵ آیت ۲)

اور اگر آپ دیکھیں حال دیکھیں جب کہ یہ مجرم لوگ اپنے رب کے سامنے سر جھکائے ہوں گے۔ اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ قیامت کے دن گناہ گار بھی دربار الہی میں حاضر ہوں گے، لیکن اطاعت گزاروں کی طرح نہیں، بلکہ ان کے چہرے الٹے ہوئے ہوں گے یعنی بجائے پیٹ کے ان کا رخ پشت کی طرف ہو گا، اور اوپر اٹھنے کے بجائے وہ زمین کی طرف مائل ہوں گے اس میں بندے کو کوئی اختیار نہیں ہے، جو شخص توفیق الہی سے محروم ہے اس پر حکم الہی اسی طرح نافذ ہو گا کہ وہ ہدایت کے راستے پر قدم نہ اٹھائے گا، اور گمراہی کی وادیوں میں بھٹکا رہے گا ہم گمراہی سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں، اور اس بات سے بھی اللہ کی پناہ چاہتے ہیں کہ ہمیں جاہلوں کے درجے میں شمار کیا جائے۔

دوزخ سے صرف موحّد نکلیں گے : یہاں تک ان لوگوں کے بارے میں محسوس تھی جو دوزخ سے نکل کر دنیا سے دس گنا یا اس سے زیادہ پائیں گے، اب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ دوزخ سے صرف موحّد نکلیں گے، موحّد سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے صرف زبان سے لا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰہُ کہنے پر اکتفا کیا، اس لئے کہ زبان عالم ظاہر سے ہے، اسکا فائدہ صرف دنیا میں ہے کہ نہ اس کی گردن ماری جاتی ہے اور نہ اسکا مال لوٹا جاتا ہے، ظاہر ہے جان اور مال کا معاملہ صرف زندگی تک ہے، جہاں نہ جان ہوگی اور نہ مال وہاں زبان سے لا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰہُ کہنے کا کوئی فائدہ نہ ہو گا، وہاں توحید کا کمال اور اس کی صداقت کام آئے گی، توحید کا کمال یہ ہے کہ بندہ تمام امور کا منبع اور مرجع اللہ تعالیٰ کی ذات کو قرار دے، اس کی علامت یہ ہے کہ کسی مخلوق کی بدسلوکی پر ناراض نہ ہو، کیونکہ اس اعتراف کے بعد کہ تمام امور اللہ تعالیٰ سے ہیں یہ بدسلوکی بھی اللہ ہی کا حکم قرار دی جائے گی، مخلوق تو محض اس حکم کے نفاذ کا ذریعہ بنی ہے، اس کی مزید تحقیق تو کل کے باب میں آئے گی۔

اس توحید میں بھی لوگوں کے مختلف درجات ہیں، بعض کی توحید پہاڑ کے برابر ہے، اور بعض کی رانی برابر، چنانچہ جس کے پاس شقال برابر توحید ہوگی وہ پہلے دوزخ سے باہر آئے گا، جیسا کہ حدیث شریف میں ہے۔

اَخْبِرْ جُوْا مِنْ النَّارِ مَنْ فِيْ قَلْبِهِمْ شَقَالٌ دِيْنًا مِنْ اِيْمَانٍ (۱)

اس شخص کو دوزخ سے نکالو جس کے دل میں دینار کے برابر ایمان ہے۔ اور آخر میں وہ شخص باہر نکلے گا جس کے دل میں رانی کے برابر ایمان ہو گا، شقال اور رانی کے درمیان بے شمار درجات ہیں، ان درجات کی لوگ شقال کے بعد اور رانی سے پہلے علی الترتیب باہر آئیں گے، شقال اور ذرہ یہ دونوں چیزیں مثال ہیں جیسا کہ اعیان اور اموال کے ضمن میں اسکی وضاحت کر دی گئی ہے کہ اس طرح کے امور بطور مثال بیان کئے جاتے ہیں، ان سے وہ حقیقت مراد نہیں ہوتی جو بظاہر سمجھ میں آتی ہے۔

ظلم و دخول جہنم کا بڑا سبب : عام طور پر موحّدین بندوں پر اپنے مظالم کے باعث دوزخ میں جائیں گے، بندوں کے حقوق نظر انداز نہیں کئے جاسکتے۔

دوسری نوعیت کے گناہوں میں غلو و بخشش کی گنجائش ہے، چنانچہ روایات میں ہے کہ بندہ اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑا کیا جائے گا، اس کے پاس پہاڑوں کے برابر نیک اعمال ہوں گے، اگر وہ تمام اعمال تسلیم کر لئے جائیں تو اس کے جنتی ہونے میں کوئی شبہ نہ

ہو، لیکن وہ تمام لوگ اپنی اپنی فریاد لیکر کھڑے ہوں گے جن پر اس نے مظالم کئے ہوں گے، بعض کو گالی دی ہوگی، بعض کا مال لوٹا ہوگا، بعض کو مارا ہو یہ تمام حق تلفیاں اسکے نیک اعمال کا قصہ تمام کر دیں گی، یہاں تک کہ اس کے پاس ایک نیکی بھی باقی نہ رہے گی، ملائکہ کہیں گے، پروردگار عالم، یہ شخص اعمال خیر کا ذخیرہ رکھتا تھا لیکن وہ تمام ذخیرہ ختم ہو چکا ہے، اس کی تمام نیکیاں مطالبہ کرنے والوں پر تقسیم کر دی گئی ہیں، لیکن ابھی ان لوگوں کی بڑی تعداد باقی ہے جن کے مطالبے نیکیاں نہ ہونے کے باعث پورے نہیں کئے جاسکے، حکم ہو گا کہ ان مطالبہ کرنے والوں کے گناہ اس کے اعمال نامے میں لکھ دئے جائیں، اور اسکے لئے دوزخ کے نام ایک تحریر لکھ دو، جس طرح آدمی نیک اعمال رکھتے ہوئے بھی دوسروں کی حق تلفیوں کے باعث ہلاک ہو جاتا ہے، اسی طرح مظلوم کے پاس جب ظالم کی نیکیاں آجاتی ہیں تو وہ اپنے گناہوں کے باوجود بخش دیا جاتا ہے۔ ابن جلاء صوفی منش انسان تھے، ان کے متعلق کسی کتاب میں لکھا ہے کہ ان کے کسی بھائی نے ان کی غیبت کی، پھر وہ اپنے اس فعل پر نادم ہوئے، اور ایک قاصد بھیج کر اس غلطی کی معافی چاہی، ابن الجلاء نے کہا کہ میں معاف کرنے سے قاصر ہوں، میرے اعمال نامے گناہوں سے سیاہ ہیں، ان میں ایک نیکی بھی نظر آتی ہے، بھلا میں اپنے اعمال نامے کو اس سے کیوں زینت نہ دوں؟

یہ احکام ظاہر رہتی ہیں : اب تک ہم اس موضوع پر گفتگو کرتے رہے کہ آخرت میں سعادت اور شقاوت کے اعتبار سے لوگوں کے حالات مختلف ہوں گے، ہم نے ہر فرقے کا حکم بیان کیا ہے، مگر یہ تمام احکام ظاہری اسباب کے اعتبار سے ہیں، جیسے ڈاکٹر کسی مریض کے بارے میں کہہ دیتا ہے کہ اس کا مرض خطرناک ہے اسلئے چٹا ممکن نہیں ہے، اور کسی مریض کے متعلق یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس کا مرض معمولی نوعیت کا ہے اسلئے اسکی زندگی کو کوئی خطرہ نہیں ہے یہ محض اندازے ہیں، بسا اوقات صحیح ہو جاتے ہیں، اور بعض اوقات غلط، یہاں تک کہ وہ مریض جو بظاہر موت سے ہم کنار ہے، اچھا ہو جاتا ہے اور معمولی نوعیت کا مریض دیکھتے ہی دیکھتے ختم ہو جاتا ہے، یہ اللہ تعالیٰ کے مخفی اسرار ہیں، جو اس نے زندہ لوگوں کی رگوں میں ودیعت کر دیے ہیں، اور ایسے دقیق اسباب ہیں جنہیں اللہ رب العزت نے ایک مقررہ اندازے پر مرتب کر رکھا ہے، کسی بندے کے لئے ممکن نہیں ہے کہ وہ ان کی حقیقت پر مطلع ہو سکے، اسی طرح نجات اور کامیابی کے اسباب بھی مخفی ہیں، کسی انسان کے بس میں نہیں کہ وہ انکی حقیقت کا علم حاصل کر سکے جس سبب سے نجات ہوتی ہے اسے عفو اور رضا کہتے ہیں، اور جس سے آدمی ہلاک ہوتا ہے اسے غضب یا انتقام کہتے ہیں، اسکے پیچھے ایک راز اور ہے جسے اللہ تعالیٰ کی ازلی مشیت سے تعبیر کرتے ہیں، مخلوق کو ازلی مشیت کا علم نہیں ہوتا، اسلئے ہمیں یہ سوچنا ہو گا کہ گنہ گار کی مغفرت ممکن ہے، اگرچہ اس کے ظاہری گناہ بے شمار ہوں، اور مطیع کے لئے عذاب ممکن ہے، اگرچہ اسکی ظاہری نیکیاں بے حساب ہوں، اس لئے کہ اعتبار تقویٰ کا ہے، اور تقویٰ دل میں ہوتا ہے، یہ ایک ایسا دقیق معاملہ ہے کہ خود متقی کو اس کی اطلاع نہیں ہوتی، دوسرے کو کس طرح ہو سکتی ہے؟ ارباب قلوب پر یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ بندہ کو عفو اسی وقت حاصل ہوتا ہے جب اس کے باطن میں کوئی مخفی سبب اسکا مقتضی ہو، اس طرح وہ غضب کا مستحق بھی اسی وقت ٹھہرتا ہے، جب اسکے باطن میں کوئی مخفی سبب غضب کا محرک بنتا ہے، اگر ایسا نہ ہو تو اعمال و اوصاف کی جزاء عفو غضب نہ ہو، اور اگر جزاء نہ ہو تو عدل بھی نہ ہو، اور عدل نہ ہو تو اللہ تعالیٰ کے یہ ارشادات بھی صحیح نہ ہوں۔

وَمَا زَكَّيْكُمْ إِلَّا بِالْعَمَلِ (پ ۲۳ آیت ۴۶)

اور آپ کا رب بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہے۔

إِنَّ اللَّهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ (پ ۲۵ آیت ۴۰)

اللہ تعالیٰ ذرہ برابر بھی ظلم نہیں فرمائے گا۔

حالانکہ یہ سب اقوال درست ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ انسان کو خود اپنی کاوش و کوشش کا صلہ ملتا ہے، جیسا کہ ارشاد فرمایا گیا

وَأَنْ لَّيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَى (پ ۲۷ آیت ۳۹)

اور یہ کہ انسان کو صرف اپنی ہی کمائی ملے گی۔

كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ (پ ۲۹ آیت ۳۸)

ہر شخص اپنے اعمال کے بدلے میں محبوس ہوگا۔

جب کوئی شخص کج روی اختیار کرے گا، اللہ تعالیٰ اسے بکرو کر دے گا، جو شخص اپنے نفس کو بدلنے کی کوشش کرے گا اللہ تعالیٰ

اسکا حال بدل دے گا، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ (پ ۸۳ آیت ۱۱)

واقعی اللہ تعالیٰ کسی قوم کی حالت میں تغیر نہیں کرتا جب تک کہ وہ خود اپنی حالت کو نہیں بدل دیتے۔

یہ تمام باتیں دل والوں پر اتنی صاف اور واضح منکشف ہوتی ہیں کہ دیر دربار کھنے والے بھی اتنا کھلا مشاہدہ نہیں کر پاتے، آنکھ غلطی کر سکتی ہے کہ دور سے کسی چیز کو دیکھے اور کچھ کا کچھ سمجھ بیٹھے، یا چھوٹے کو بڑا اور بڑے کو چھوٹا تصور کرے، قلب کے ذریعہ مشاہدہ کرنے میں غلطی کا کوئی امکان نہیں ہے، لیکن یہ صلاحیت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب بصیرت کے بند دروازے اچھی طرح کھل جائیں، اس کے بعد جو حقائق منکشف ہوتے ہیں، ان میں غلطی کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا، اللہ تعالیٰ کے اس قول میں اسی امر کی طرف اشارہ ہے۔ مَا كُنْتُمْ لِقَافٍ اَوْ مَارِآءِی (پ ۵۷ آیت ۱۱)

قلب نے دیکھی ہوئی چیز میں کوئی غلطی نہیں کی۔

تیسرا درجہ نجات یافتگان : نجات سے ہماری مراد سلامتی ہے، سعادت اور نفع و فلاح نہیں ہے

نجات یافتہ وہ لوگ ہوتے جنہوں نے نہ کوئی خدمت کی کہ انھیں خلعت کا خرہ سے نوازہ جائے اور نہ کوئی کوتاہی کی کہ عذاب دیا جائے غالباً یہ حال کافر بچوں اور دیوانوں کا ہوگا، ان میں وہ لوگ بھی ہیں جو بے ہوش رہے یا ان تک اسلامی دعوت نہیں پہنچی، اور انھوں نے شہری تمدن سے دور رہ کر غفلت اور جمالت کے ساتھ زندگی گزار دی، نہ انکے پاس معرفت تھی، نہ انکار، نہ اطاعت تھی اور نہ معصیت، نہ کوئی وسیلہ تھا جو انھیں اللہ تعالیٰ سے قریب کرنا اور نہ ایسا گناہ تھا جو بعد کا سبب بننا، نہ وہ جنت میں جا بیٹھے، اور نہ دوزخ میں بلکہ ان دونوں کے درمیان ایک ایسے مقام پر رہیں گے جسے شریعت نے اعراف سے تعبیر کیا ہے، مخلوق کے بعض گروہوں کا اعراف پر رہنا آیات اور روایات سے یقینی طور پر معلوم ہے، (۱) تاہم کسی فرقے کے بارے میں قطعی طور پر یہ کہنا کہ وہ اعراف میں رہے گا غلط ہے بلکہ یہ ایک غلطی امر ہے، مثلاً کافروں کی نابالغ اولاد کا اعراف میں رہنے کا حکم غلطی ہے، یعنی نہیں ہے اس کی صحیح اصلاح صرف نبوت ہی کے ذریعہ ممکن ہے، علماء اور اولیاء بھی اس درجے تک رسائی سے محروم ہیں، بچوں کے بارے میں روایات مختلف ہیں، چنانچہ ایک مرتبہ کوئی بچہ مر گیا، حضرت عائشہؓ نے فرمایا یہ بچہ تو جنت کی چیزوں میں سے ایک چیز ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے دریافت فرمایا تمہیں یہ بات کیسے معلوم ہوئی؟ (مسلم شریف) اس سے معلوم ہوا کہ ان مقامات میں اشکال اور اشتباہ کو غلبہ ہے۔

چوتھا درجہ۔ اصحاب فلاح : یہ وہ لوگ ہیں جنہیں تقلید کے بغیر معرفت حاصل ہوتی ہے، یہ مقررین سابقین ہیں، مقلدین کو اگرچہ فی الجملہ کامیابی حاصل ہوگی اور وہ جنت میں کوئی درجہ پائیں گے، لیکن انھیں اصحاب یقین ہی کہا جائیگا، جب کہ وہ مقررین ہوں گے جو کچھ اجرو ثواب انھیں حاصل ہوگا، وہ حد بیان سے باہر ہوگا، بس انکے بارے میں اتنا ہی کہا جائے گا جو قرآن کریم میں مذکور ہے، اللہ تعالیٰ نے بطور اجمال ارشاد فرمایا ہے۔ فرمایا:

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا أُخْفِيَ لَهُمْ مِنْ قَرَّةٍ اَعْيَنَ (پ ۲۱ آیت ۱۷)

(۱) چنانچہ ہزار میں حضرت ابوسعید الخدریؓ سے عقل ہے کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے اہل اعراف کے حقائق دریافت کیا گیا، آپ نے فرمایا یہ وہ لوگ ہوں گے جنہوں نے اللہ کی راہ میں شہادت پائی، لیکن وہ اپنے آپ کو ان کے نافرمان تھے، شہادت نے انھیں عفو بخش دیا، اہل اعراف نے ان سے روک دیا اور معصیت نے جنت میں۔

سو کسی شخص کو خبر نہیں، جو جو آنکھوں کی ٹھنڈک کا سامانِ فرائضِ غیب میں موجود ہے۔

ایک حدیث قدسی میں فرمایا گیا۔

أَعَدْتُ لِعِبَادِي الصَّالِحِينَ مَا لَا عَيْنٌ رَأَتْ وَلَا أُذُنٌ سَمِعَتْ وَلَا خَطَرَ عَلَى قَلْبِ
بَشَرٍ (۱)

میں نے اپنے نیک بندوں کے لئے ایسی چیزیں تیار کی ہیں جنہیں نہ کسی آنکھ نے دیکھا نہ کسی کان نے سنا اور نہ کسی انسان کے دل پر اس کا خیال گزرا۔

عارفین کو وہی حالت مطلوب ہوتی ہے جو کسی انسان کے دل پر نہ گزری ہو، وہ حوروِ قصور، میوے، دودھ، شہد اور شراب، زہور اور لباس وغیرہ جنت کی اشیاء کے حریص نہیں ہوتے، اگر انہیں یہ چیزیں عطا بھی کی گئیں تو وہ ان پر قناعت نہ کریں گے، بلکہ اللہ تعالیٰ کے دیدار کی لذت کے طالب ہوں گے، جو سعادت کی قناعت اور لذت کی انتہا ہے۔ حضرت دراجہ بھڑیؒ سے کسی نے دریافت کیا کہ جنت میں آپ کو کس چیز سے رغبت ہوگی؟ فرمایا، پہلے صاحبِ خانہ سے پھر خانہ سے یہ وہ لوگ تھے جنہیں صاحبِ دار کی محبت نے دار سے بے نیاز کر دیا تھا، بلکہ اس کے علاوہ ہر چیز سے بے پروا بنا دیا تھا، یہاں تک کہ انہیں اپنی ذات سے بھی کوئی تعلق نہ تھا، ان کی مثال ایسے عاشق کی تھی جسے معشوق کا چہرہ دیکھنے کی آرزو ہو، اور وہ اس آرزو میں اس قدر مستغرق ہو کہ اس کے علاوہ کوئی فکر، کوئی آرزو، اور کوئی خواہش اس کے دل میں نہ ہو، نہ اپنے نفس کی خبر ہو، بلکہ ہر چیز سے بے نیاز ہو کر بلکہ اپنے جسم کے ہر ذمہ سے بے پروا ہو کر وہ معشوق کے چہرے سے شبابِ اشعے کا منظر ہو، اس حالت کو خفائی الحب کہتے ہیں، یعنی وہ اپنے محبوب کی محبت میں اتنا غرق ہو گیا ہے کہ اسے سوائے محبوب کے کوئی دوسری چیز نظر نہیں آتی، اس کے تمام افکار و تصورات کا صرف ایک مرکز ہے، اس کے دل اور ذہن میں کسی دوسرے کے لئے کوئی محفائش ہی نہیں ہے، اللہ کی یاد میں جس کی یہ حالت ہوتی ہے اسے آخرت میں وہ چیز عطا کی جاتی ہے جس کا تصور تک کسی بشر کے دل میں نہیں گزرتا، جیسے ہرے اندھے آدمی کو رنگ کی صورت اور آواز کی کیفیت معلوم نہیں ہوتی، لیکن اگر اس کے کان اور آنکھ کے حجابات دور کر دئے جائیں تو رنگ اور آواز کی صورت و کیفیت معلوم ہو جائے گی، اور یہ بات جان لے گا کہ اس سے پہلے دل میں ان کا تصور بھی نہیں آسکتا تھا۔ یہ دنیا بھی ایک حجاب ہے، جب یہ حجاب اٹھے گا تو بہت سی ایسی چیزیں منکشف ہوں گی، جن کا دنیوی زندگی میں تصور بھی ممکن نہیں ہے، اور حیاتِ طیبہ کی لذت حاصل ہوگی، اور پھر اس آیت کریمہ کا مضمون واضح ہو گا۔

وَأَنَّ النَّارَ الْآخِرَةَ لَهِیَ الْحَيَوَانُ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ (پ ۲۱، آیت ۷۳)
اور آخرت کی زندگی ہی ہوتی رہنے والی ہے اگر وہ لوگ جان لیں۔

صغیرہ گناہ کبیرہ کیسے بنتا ہے

جاننا چاہیے کہ صفاتِ چند اسباب سے کہاں تک جاتے ہیں۔

پہلا سبب۔ اصرار و موافقت : پہلا سبب یہ ہے کہ صغیرہ گناہ پر اصرار اور مداومت کی جائے اسی لئے مثل مشہور ہے کہ اصرار کے ساتھ کوئی گناہ صغیرہ نہیں اور استغفار کے ساتھ کوئی گناہ کبیرہ نہیں، اس مثل کا حاصل یہ ہے کہ اگر کوئی شخص ایک کبیرہ کر کے باز رہے، اور دوسرے کبیرہ کا ارتکاب نہ کرے تو امید یہ ہے کہ اس کا گناہ معاف کر دیا جائے گا، اسکے برعکس اس صغیرہ کا معاملہ سخت ہے جس پر مداومت کی جائے، اس کی مثال ایسی ہے جیسے پتھر پانی قطرہ قطرہ گرتا ہے تو اس لئے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

(۱) یہ روایت پہلے بھی گزر چکی ہے

خَيْرُ الْأُمُورِ أَنْتُمْ هَاوِينَ قَدْ (بخاری و مسلم مائتہ)

بہترین امور وہ ہیں جن پر مداومت کی جائے اگرچہ وہ تھوڑے ہوں۔

کیونکہ اشیاء اپنی امداد سے پہچانی جاتی ہیں، اسلئے جب اس حدیث سے یہ ثابت ہوا کہ وہ تھوڑا عمل جس پر مداومت کی جائے زیادہ مفید ہے تو یہ بھی ثابت ہوا کہ بہت سا عمل اگر ایک وقت میں کر لیا جائے تو وہ نفس کی تطہیر اور قلب کے تزکیہ میں اتنا مفید نہیں ہے، اسی طرح جب چھوٹے چھوٹے گناہوں پر مداومت اختیار کر لی جاتی ہے، تو قلب کو تارک کرنے میں ان کی تاثیر زیادہ ہو جاتی ہے، تاہم یہ بات صحیح ہے کہ آدمی اس وقت تک کسی کبیرہ کا مرتکب نہیں ہوتا جب تک سابق میں مغائر نہ ہوں، مثلاً زانی اچانک زنا نہیں کرتا بلکہ زنا سے پہلے قصد و ارادہ بھی ہوتا ہے، اسی طرح قاتل ایک دم قتل نہیں کرتا بلکہ پہلے دشمنی اور عداوت ہوتی ہے، تمام کبائر کا یہی حال ہے کہ ان کی ابتداء اور انتہا میں مغائر پائے جاتے ہیں، اگر کوئی ایسا کبیرہ فرض کر لیا جائے جو بغیر کسی ساطعہ یا لاحقہ کے اچانک وجود میں آجائے، اور اس کی طرف دوبارہ واپسی کا امکان نہ ہو تو اس کی بخشش کی زیادہ امید کی جاسکتی ہے نسبت اس صغیرہ کے جس پر آدمی نے زندگی بھر مداومت کی ہو۔

دوسرا سبب گناہ کو معمولی سمجھنا : دوسرا سبب جس سے صغیرہ گناہ کبیرہ بن جاتا ہے، یہ ہے کہ آدمی اپنے گناہ کو معمولی سمجھے، ہر وہ گناہ جسے بندہ اپنے دل میں بڑا تصور کرتا ہے، اللہ تعالیٰ کے نزدیک معمولی ہو جاتا ہے، اور جسے معمولی سمجھتا ہے وہ اللہ کے یہاں بڑا بن جاتا ہے، اسلئے کسی گناہ کو عظیم سمجھنے کا مطلب یہ ہے کہ مرتکب دل سے اپنے فعل کو برا جانتا ہے، اور اسے بنظر کراہت دیکھتا ہے، چنانچہ وہ اپنی اس نفرت اور کراہت کے باعث گناہ کے زیادہ اثرات قبول نہیں کرتا، اسکے برعکس کسی گناہ کو معمولی سمجھنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے دل میں اس گناہ سے محبت اور رغبت ہے، اس لیے وہ اپنے دل پر اس گناہ کے زیادہ اثرات قبول کرتا ہے، قلب کو اطاعت کے ذریعہ روشن کرنا مطلوب ہے، اور اسے معصیت سے تارک کرنا ممنوع ہے، اسلئے غفلت میں آدمی جن برائیوں کا مرتکب ہو جاتا ہے ان پر مواخذہ نہیں ہوگا، اسلئے کہ آدمی کا دل اس عمل سے متاثر نہیں ہوتا جو بے خبری میں ہو گیا ہو جیسا کہ حدیث شریف میں ہے۔

الْمُؤْمِنُ يَرَى ذَنْبَهُ كَالْجَبَلِ فَوْقَهُ يَخَافُ أَنْ يَقَعَ عَلَيْهِ وَالْمُنَافِقُ يَرَى ذَنْبَهُ كَذَنْبَابٍ مَرَّ عَلَى أَنْفٍ غَاطَّارَةٍ (بخاری۔ حرث بن یزید ابن مسعود)

مومن اپنے گناہ کو ایسا سمجھتا ہے جیسے سر پہ معلق پہاڑ جس کے گرنے کا خطرہ ہو، اور منافق اپنے گناہ کو

کمی سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا کہ ناک پر سے گزری اور اس نے اڑا دی۔

بعض اکابر کا قول ہے کہ آدمی کے جس گناہ کی بخشش نہیں ہوتی وہ یہ ہے کہ کوئی گناہ کرے، اور اس کے بعد یہ کہے کاش! جو گناہ

ہم نے کئے ہیں وہ اسی گناہ کی طرح (ہلکے پھلکے) ہوتے۔

مومن گناہ کو بڑا سمجھتا ہے : مومن چھوٹے سے چھوٹے گناہ کو بڑا تصور کرتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کو اللہ تعالیٰ کی جلالت اور سلطنت و قدرت کا علم ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنے کسی نبی پر وحی بھیجی کہ ہدیہ کی کمی پر نظر مت کر، بلکہ اسکی عظمت پر نظر رکھ جس نے یہ ہدیہ تمیں بھیجا ہے، اپنے گناہ کو معمولی مت سمجھ، بلکہ اس ذات کی عظمت و جلالت پیش نظر رکھ جس کا تو نے اس گناہ سے مقابلہ کیا ہے، بعض عارفین نے اسی لئے مغائر کے وجود کا انکار کیا ہے ان کے نزدیک اللہ تعالیٰ کے ہر حکم کی مخالفت کبیرہ گناہ ہے، اسی طرح بعض صحابہ رضوان اللہ علیہم نے تابعین سے فرمایا کہ تم ایسے عمل کرتے ہو جو تمہاری نگاہ میں ہال سے زیادہ باریک ہیں حالانکہ ہم انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور مبارک میں مملکت تصور کرتے تھے، اس کی وجہ یہ ہے کہ صحابہ کرام اللہ تعالیٰ کے جلال سے پورے طور پر واقف تھے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کے جلال کی نسبت سے ان کے نزدیک مغائر بھی کبائر سے کم نہ تھے، یہی وجہ ہے کہ جاہل جس چیز کو معمولی سمجھ کر نظر انداز کرتا ہے، عالم اسی چیز کو اہم سمجھتا ہے، عام آدمی سے بعض باتیں نظر انداز کر دی جاتی

ہیں جب کہ وہی باتیں عارف سے درگزر نہیں کی جاتیں کیونکہ گناہ اور مخالفت کا کم یا زیادہ ہونا گناہ گار اور مخالفت کرنے والے کی معرفت کی کمی یا زیادتی پر موقوف ہے۔

تیسرا سبب گناہ سے خوشی : تیسرا سبب جس سے صغیرہ گناہ کبیرہ بن جاتا ہے یہ ہے کہ گناہ کر کے خوش ہو اس پر غر کرے اور یہ سمجھے کہ مجھ سے یہ فعل سرزد ہوا ہے اللہ کے خاص انعام اور فضل سے ہوا ہے، نیز اس امر سے بھی غافل ہو کر یہ عمل کو تابی ہے اور اللہ تعالیٰ کی ناراضگی اور مرگب کی بد بختی کا سبب ہے، آدمی کو جس قدر صغیرہ میں لذت معلوم ہوتی ہے اسی قدر وہ کبیرہ ہو جاتا ہے اور اسی قدر دل میں اسکی سیاہی اثر انداز ہوتی ہے، بعض گناہ گاروں کو دیکھا گیا ہے کہ وہ اپنے گناہ پر تعریف کے خواہاں ہوتے ہیں اتراتے ہیں اور لاف نئی کرتے ہیں، مثلاً اپنے مخاطب سے کہتے ہیں کیا تو نے دیکھا میں نے اس کی دجیاں کس طرح بکھیریں، مناظر کتنا ہے تو نے دیکھا نہیں میں نے اپنے حریف کو کیسے رسوا کیا، اس کے محبوب بیان کر کے شرمندہ کیا، بھرے مجمع میں اسکی ذلت ہوئی پھر میں نے اس مناظرے میں ایسا فریب دیا جس کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا، آج کرتا ہے دیکھا میں نے اسے کھوٹے سکے دیکر بے وقوف بنا دیا اور ایسا دھوکہ دیا اتنا نقصان پہنچایا، بے چارہ احق بھی بنا، اور گھائے میں بھی رہا، یہ اور اس طرح کی باتیں ہیں جن سے معمولی گناہ بھی غیر معمولی بن جاتے ہیں گناہ مملکت ہیں اگر آدمی ان میں جھلا ہو جائے اور نادانی سے شیطان بن آئے اور وہ تمہیں گناہ کے ارتکاب پر مجبور کر دے تو یہ رنج و غم کا مقام ہے، خوشی کا مقام نہیں کیا تم نے کسی شخص کو دیکھا ہے کہ وہ دشمن سے مغلوب ہونے میں بیٹائی سمجھتا ہو، اور اپنی شکست پر نازاں ہو، نیز کیا کوئی ذی ہوش انسان ایسی حرکتیں کر کے خوش رہ سکتا ہے جن سے محبوب ناراض ہو، اسکی مثال ایسے مریض کی سی ہے جو دوا کی بوتل نوٹنے پر خوش ہو گیا یہ مریض دوا کے بغیر شفا کا امیدوار ہے۔

چوتھا سبب اللہ تعالیٰ کے حکم کا سہارا لینا : ایک اور سبب جس سے صغیرہ گناہ کبیرہ بن جاتا ہے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی پردہ پوشی حلم اور ڈھیل کا سہارا لے، اور یہ نہ جانے کے ڈھیل ناراضگی کے باعث ہوتی ہے، تاکہ مہلت ملنے سے وہ گناہ زیادہ کرے، اور زیادہ مبغوض بنے اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ میرا گناہ کرنا بھی اللہ تعالیٰ کی عنایت اور رحمت کا مظہر ہے تو یہ اسکی جہالت، غرور کے مواقع سے اس کی ناواقفیت، اور اللہ کی پکار سے جراتمندانہ بے خوفی کی دلیل ہے، ایسے لوگوں کے مزاج کی حکایت ذیل کی آیت کریمہ میں کی گئی ہے۔

وَيَقُولُونَ فِيْ اَنْفُسِهِمْ لَوْلَا يُعَذِّبُنَا اللّٰهُ بِمَا نَقُوْلُ حَسْبُهُمْ جَهَنَّمُ يَصْلُوْنَهَا فَاِمْسَ الْمُصْنِرُ (پ ۲۸ آیت ۸)

اور اپنے دل میں کہتے ہیں کہ ہم کو ہمارے اس کہنے پر سزا کیوں نہیں دیتا، ان کے لئے جہنم کافی ہے اس میں یہ لوگ داخل ہوں گے، سو وہ برا ٹھکانہ ہے۔

پانچواں سبب گناہ کا اظہار و اعلان : صغیرہ کے کبیرہ بن جانے کا ایک سبب یہ ہے کہ آدمی گناہ کرے اور پھر لوگوں کو بتلائے کہ میں نے فلاں گناہ کیا ہے، یا جان بوجھ کر ایسی جگہ کرے جہاں لوگ اسے دیکھ رہے ہوں، جو شخص ایسا کرتا ہے وہ گویا اللہ تعالیٰ کا ڈالا ہوا پردہ چاک کرنا چاہتا ہے، اور ان لوگوں کو گناہ پر اس کے لئے کاراوار رکھتا ہے جنہیں اپنے گناہ کی اطلاع دی ہے، یا جن کی موجودگی میں گناہ کا ارتکاب کیا ہے ایک گناہ پہلے سے تھا اس میں وہ گناہ مزید شامل ہو گئے، اسلئے یہ گناہ غیر معمولی بن جائیگا، اور اگر کوئی شخص اپنے گناہ کے اظہار کے ساتھ ساتھ لوگوں کو اس گناہ کی ترغیب دے اور ان کے لئے اس گناہ کی راہ ہموار کرے تو یہ چوتھا گناہ ہوگا، اور اس سے وہ گناہ انتہائی عظیم بن جائے گا، حدیث شریف میں ہے۔

كُلُّ النَّاسِ مُعَافِيٌّ اِلَّا الْمُجَاهِرِيْنَ يَبِيْتُ اَحَدُهُمْ عَلٰى ذَنْبٍ قَدْ سَتَرَهُ اللّٰهُ عَلَيْهِ فَيُضْبِحُ فِيْكَشْفِ سِتْرِ اللّٰهِ وَتُخْلَبُ عَيْنُهُ (بخاری و مسلم۔ ابو ہریرہ)

تمام لوگ معاف کر دیئے جائیں گے مگر ان کی بخشش نہیں ہوگی جو اپنے گناہ ظاہر کرتے پھرتے ہیں، ایک

مغض گناہ کر کے بستر لیتا ہے اللہ تعالیٰ اس کا گناہ رات کے اندھیروں میں چھپا دیتا ہے، لیکن جب صبح ہوتی ہے تو وہ اللہ کا چھپایا ہوا گناہ ظاہر کر دیتا ہے اور لوگوں کو بخلا دیتا ہے۔

اس کی وجہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کی صفات و انعامات میں سے ایک یہ بھی کہ وہ اچھا نہیں کو ظاہر کرتا ہے اور برائیوں کو چھپاتا ہے اور کسی کاراز آشکارا نہیں کرتا جو مغض اپنے عیب ظاہر کرتا ہے وہ گویا اس نعمت کی ناشکری کا کرتا ہے اور عملاً اس صفت الہیہ کا انکار کرتا ہے اکابرین میں سے کسی کا قول ہے کہ اول تو بندہ گناہ ہی نہ کرے اور کرے تو دوسروں کو ترفیع نہ دے ورنہ دو گناہوں کا مرکب ہو گا۔ یہ وصف منافقین کا ہے کہ وہ ایک دوسرے کو برائیوں کی ترفیع دیتے ہیں قرآن کریم میں ہے۔

الْمُنَافِقُونَ وَالْمُنَافِقَاتُ بَعْضُهُمْ مِنْ بَعْضٍ يَمُرُّونَ بِالْمُنْكَرِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوفِ (پ ۱۵ آیت ۶۷)

منافق مرد اور منافق عورتیں ان میں سے بعض بعض کو برائی کا حکم دیتے ہیں اور بھلائی سے روکتے ہیں۔ ایک بزرگ نے ارشاد فرمایا کہ آدمی اپنے بھائی کی اس سے بدھ کر پردہ دہری نہیں کرنا کہ پہلے اس کی گناہ پر اعانت کرے اور پھر اسے یہ باور کرادے کہ وہ گناہ کوئی زیادہ سنگین نہیں ہے۔

چھٹا۔ مقتدی کا گناہ کرنا : بعض گناہ اسلئے بھی کبیرہ بن جاتے ہیں کہ ان کا ارتکاب کسی ایسی شخصیت نے کیا ہے جس کی لوگ شرعی امور میں اقتداء کرتے ہیں کیونکہ لوگ اسے دیکھ کر اقتدار کریں گے اسلئے اس کا گناہ بھی بڑا ہے جیسے کسی عالم کا ریشم پہننا یا سونے کی سواریوں پر سوار ہونا یا بادشاہوں کا محکوک مال لینا یا ان کے پاس آنا جانا ان کے برے اعمال پر انکار نہ کر کے ان کی مدد کرنا مسلمانوں کی آہو سے کھینا کسی مسلمان کو مناظرہ وغیرہ میں زبان یا تحریر سے ایذا پہنچانا یا ان کی تحقیر کرنا اور ایسے علوم میں مشغول ہونا جن سے صرف جاہ حاصل ہوتی ہو جیسے علم مناظرہ وغیرہ یہ وہ گناہ ہیں کہ سادہ لوح مسلمان انکی تقلید کر سکتے ہیں یہ علماء مرجائیں گے لیکن ان کا شرمساری دنیا میں پھیلتا رہے گا ایسا مغض کتنا خوش قسمت ہے جس کے گناہ اسکے ساتھ دفن ہو جائیں حدیث شریف میں ہے۔

مَنْ سَنَّ سُنَّةً سَيِّئَةً فَعَلَيْهِ عِوِزُ رَهْا وَوزُرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا لَا يَنْقُصُ مِنْ أَوْزَارِهِمْ شَيْئًا (بخاری و مسلم۔ ابو ہریرہ)

جس نے کوئی برا طریقہ جاری کیا اس کا وبال جاری کرنے والے پر ہے نیز اس کا وبال بھی اس پر ہے جو اس پر عمل کرے حالانکہ ان کے وبال میں سے ذرا کم نہ کیا جائے گا۔

وَنُكْتِبُ مَا قَلَّمُوا وَآثَارَهُمْ (پ ۱۸ آیت ۳)

اور ہم لکھتے جاتے ہیں انکے وہ اعمال بھی جن کو وہ آگے بھیجے ہیں اور وہ اعمال بھی جن کو پیچھے چھوڑ جاتے ہیں۔ آثار ان اعمال کو کہتے ہیں جو عمل اور عامل کے فنا ہو جانے کے بعد عامل تک پہنچتے ہیں حضرت عبد اللہ ابن عباس فرماتے ہیں کہ عالم کی بربادی کا باعث یہ ہے کہ لوگ اسکی اتباع کرتے ہیں وہ لغزش کرتا ہے تو توبہ کر لیتا ہے لیکن لوگ اسکی لغزش کو حکم شرعی سمجھ کر دنیا جہان میں پھیلا دیتے ہیں اور اسکی تقلید کرتے ہیں کسی کا مقولہ ہے کہ عالم کے قصور کا حال یہ ہے کہ جیسے سمندر کے بیچ میں کشتی ٹوٹ جائے خود بھی ڈوبے اور اپنی سواریوں کو بھی غرق کرے اسرائیلی روایات میں ہے کہ ایک عالم بدعت میں پڑ کر گمراہ ہوا پھر اسے اپنی گمراہی کا احساس ہوا اور اس نے توبہ کی اور ایک عرصے تک مخلوق خدا کی اصلاح کے کام میں مشغول رہا اس دور کے نبی پر وحی نازل ہوئی کہ اس سے کہہ دیجئے کہ اگر تو نے صرف میرا قصور کیا ہوتا تو معاملہ میرے اور تیرے درمیان رہتا لیکن تو نے میرے بندوں کو گمراہ کیا ہے اور وہ تیری گمراہی کے باعث دوزخ میں گئے ہیں اسلئے میں تجھے کیسے معاف کر سکتا ہوں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ علماء کا معاملہ خطرناک ہے انکی بڑی ذمہ داریاں ہوتی ہیں اسی طرح اعمال خیر کی وجہ سے انکے اجر و ثواب میں بھی اضافہ ہوتا ہے اگر کوئی اعمال خیر میں اسکی اتباع کرے اگر کسی عالم نے دنیاوی نسیب و نصبت ترک کی اس سے تنفر رہا اور صرف بقدر

ضرورت مال پر قناعت کی، قوت لایموت پر استغنا کیا اور پرانے کپڑے پسند کئے، اور لوگوں نے ان کی عادات صالحہ میں اسکی اقتدا کی تو اسے نہ صرف اپنے عمل کا ثواب ملے گا، بلکہ وہ اقتداء کرنے والوں کے برابر ثواب سے بھی نوازا جائے گا، اور اگر دنیاوی زیب و زینت کی طرف راغب رہا تو جو اس سے کم درجے کے لوگ ہیں وہ اس کی مشابہت اختیار کرنے کی کوشش کریں گے، اور وہ اپنے مالی حالات کے بنا پر اس میں کامیاب نہ ہو سکیں گے، مجبوراً انھیں یاد شاہوں کی خدمت کر کے اور حرام ذرائع سے مال حاصل کر کے اپنی خواہشات پوری کرنی ہوں گی، اس طرح وہ تمام ان سب کے اعمال کا سبب قرار پائے گا، دونوں حالتوں میں، عالم کی بذات سے جس طرح نفع پہنچتا ہے اسی طرح نقصان بھی پہنچتا ہے، اور دونوں کے ہی آثار مرتب ہوتے ہیں، ہمارے خیال میں ان گناہوں کے لئے اس قدر تفصیل کافی ہے جن سے توبہ واجب ہے۔

تیسرا باب کمال توبہ کی شرائط اور اخیر عمر تک اس کی بقا

کمال توبہ : ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ توبہ اس ندامت کا نام ہے، جو عزم اور قصد کا موجب ہو، اور یہ ندامت عاصی کے اس علم سے حاصل ہوتی ہے کہ اسکے گناہ محبوب کے اور اس کے درمیان حجاب بن گئے ہیں، اس طرح تین چیزیں ذکر کی گئی تھیں، 'علم'، 'ندامت' اور 'عزم'، ان میں سے ہر ایک کے لئے دوام اور کمال ہے، کمال کے لئے ایک علامت ہے، اور دوام کی چند شرائط ہیں جن کا یہاں ذکر کر دینا نہایت ضروری ہے، 'علم' کا بیان تو گویا توبہ کے اسباب کا بیان ہے، اس موضوع پر عنقریب گفتگو ہوگی، اس لئے اولاً "ندامت پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔"

ندامت کی پہچان اور کمال و دوام : ندامت دل کے درد کا نام ہے، یہ درد اس وقت ہوتا ہے جب اسے یہ اطلاع دی جاتی ہے کہ اس کا محبوب اس کے ہاتھوں سے نکلا جا رہا ہے، ندامت کی پہچان یہ ہے کہ دل میں بے پناہ غم ہو، چہرے پر اس کے اثرات نمایاں ہوں، اور آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہوں، فکر میں اشتقاق کی سی کیفیت ہو، نادم کی کیفیت اس شخص کی سی ہو جاتی ہے جسے اسکے عزیز، اذجان بیٹے پر یا کسی رشتہ دار پر نازل ہونے والی کسی مصیبت کا علم ہو، ایسے شخص کے رنج و غم کا صحیح اندازہ نہیں کیا جاسکتا، اب ہم پوچھتے ہیں کہ انسان کے لئے اس کے نفس سے بڑھ کر کون عزیز ہو سکتا ہے، دوزخ کے عذاب سے بڑھ کر کون سی مصیبت ہو سکتی ہے، اس مصیبت پر گناہوں سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہو سکتی ہے، اور اللہ رسول سے زیادہ سچا خبر کون ہو سکتا ہے، جنہوں نے عاصی کے عذاب کی خبر دی ہے، اگر ایک شخص جسے طیب کہتے ہیں یہ اطلاع دے کہ تمہارا بھائی یا بیٹا صحت یاب نہ ہو سکے گا اور مرجائے گا، تو تم اسی لئے رنجیدہ ہو جاتے ہو، گویا تم پر مصیبتوں کا کدہ گراں آ رہا ہے حالانکہ نہ بیٹا نفس سے عزیز ہے نہ طیب اللہ و رسول سے زیادہ صادق و عالم ہے، نہ موت دوزخ کے عذاب سے سخت تر ہے، معاصی اللہ تعالیٰ کی ناراضگی اور عذاب شدید پر جس قدر دلالت کرتے ہیں اس قدر دلالت بیماری سے موت پر نہیں ہوتی، پھر کیا وجہ ہے کہ لوگ بیماری سے ڈرتے ہیں گناہ سے نہیں ڈرتے، بہر حال ندامت کی آگ جس قدر تیز ہوگی اسی قدر گناہ راکھ کا ڈھیر بن جائیں گے، ندامت کے صحیح ہونے کی علامت یہ ہے کہ آدمی کامل رقیق ہو، آنکھ میں آنسوؤں کی فراوانی ہو، حدیث شریف میں ہے، زیادہ توبہ کرنے والوں کے پاس بیٹھا کو اس لئے کہ ان کے دل نہایت نرم ہوتے ہیں (۱)

گناہوں کی لذت کیسے دور ہو : یہاں یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ گناہ انسان کو جہاں مرغوب ہوتے ہیں، مہلا ان کی رغبت کیسے زائل ہوگی، اور رغبت کی جگہ حلاوت کیسے پیدا ہوگی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص شدہ کھائے اور اس میں ذہری آمیزش ہو، ذائقے سے معلوم نہ ہوتا ہو کہ اس میں ذہر ملا ہوا ہے، ذہر ملا کھانا کھا کر بیمار پڑ جائے، اور بیماری اس قدر طول پکڑے کہ بال جھڑ جائیں، اعضاء مفلوج ہو جائیں، اور جسم میں مٹی پیدا ہو جائے، اب اگر اسکے سامنے وہی ذہر ملا شدہ دوبارہ پیش کیا جائے، اور اسے

(۱) مجھے یہ روایت مرفوع نہیں ملی، ابن ابی الدیانی نے اسی مضمون سے ملتا ہوا ایک مضمون عن ابن عبد اللہ کے قول کے منیض سے ذکر کیا ہے

بھوک بھی لگ رہی ہو، اور حلاوت کی خواہش بھی ہو اس صورت میں وہ شخص شمد سے نفرت کرے گا یا نہیں؟ اگر تم یہ کہتے ہو کہ وہ نفرت نہیں کرے گا تو یہ مشاہدے کی بھی نفی ہے، اور فطرت کے بھی خلاف ہے بلکہ تجربہ تو یہ ہے کہ ایسا شخص خالص شمد سے بھی نفرت کرتا ہے چنانچہ توبہ کرنے والے کے دل میں گناہ کی نفرت اور کراہت کی وجہ یہی ہے، وہ یہ بات جانتا ہے کہ ہر گناہ شمد کی طرح بیٹھا ہے، لیکن اسکی تاثیر ایسی ہے جیسے زہر کی، جب تک مومن کے دل میں گناہ کے متعلق یہ تصورات نہ ہوں اس وقت تک اس کی توبہ نہ صحیح ہوتی ہے اور نہ ہی ہوتی ہے، کیونکہ اس طرح کے ایمان کا وجود تقریباً ناپید ہے، اس لئے اس طرح کی توبہ بھی ناپید ہے، اور توبہ کرنے والے بھی ناپید ہیں۔ ہر طرف وہی لوگ نظر آتے ہیں جو اللہ تعالیٰ سے اعراض کرتے ہیں گناہوں کو معمولی سمجھتے ہیں، اور ان پر اصرار کرتے ہیں۔

بہر حال کمالِ ندامت کی یہ شرط ہے جو اوپر ذکر کی گئی، موت تک اس پر مداومت ضروری ہے پھر یہ بھی ضروری ہے کہ تمام گناہوں سے یکساں کراہت کرے، خواہ ان کا ارتکاب نہ کیا ہو، یہ ایسا ہی ہے جیسے کسی شخص نے زہر آلود شمد کھایا ہو، پھر اسے پتہ چلے کہ پانی میں بھی اسی طرح کے زہر کی آمیزش ہے تو یقیناً وہ پانی سے بھی اسی قدر نفرت کرے گا کیونکہ اسے شمد سے نقصان نہیں پہنچا تھا بلکہ شمد میں جو چیز تھی اس سے نقصان ہوا تھا، اور وہی ضرر رساں چیز پانی میں موجود ہے، اسی طرح تائب اگر کسی گناہ سے اپنا نقصان محسوس کرتا ہے تو اسلئے نہیں کہ وہ گناہ اس سے سرزد ہوا ہے، بلکہ اس کی وجہ یہ کہ گناہ سے اللہ تعالیٰ کے احکام کی خلاف ورزی ہوئی ہے، اور یہ وجہ تمام گناہوں میں موجود ہے خواہ وہ چوری ہو یا زنا وغیرہ۔

قصد کا تعلق تینوں زمانوں سے ہے : اب رہا قصد جس کے معنی ہیں تدارک کا ارادہ، اس کا تعلق تینوں زمانوں سے ہے، حال سے اس طرح کہ جو ممنوع عمل کر رہا ہو اسے ترک کر دے اور وہ فرض بجلائے جس کی طرف اس وقت متوجہ ہے، قصد کا تعلق ماضی سے یہ ہے کہ اب سے پہلے جو کوتاہیاں اس سے سرزد ہوئی ہیں ان کی تلافی کرے، اور مستقبل سے اس طرح ہے کہ موت تک اطاعت اور ترک معصیت پر مداومت کرے۔

اطاعت میں قصور کا تدارک : ماضی کے اعتبار سے توبہ کی صحت کی یہ شرط ہے کہ اپنے فکر کی عین اس دن کی طرف موڑے جس دن بلوغ کی دہلیز پر قدم رکھا، خواہ عمر کے اعتبار سے یا احتلام کی رو سے، پھر اپنی عمر کے سال، مہینے، دن اور لمحے گنے، اور یہ دیکھے کہ اس عرصے میں کس قدر اطاعتیں ایسی ہیں جن میں مجھ سے کوتاہی ہوئی ہے، اور کتنے گناہ ایسے ہیں جو مجھ سے سرزد ہوئے ہیں مثلاً اس نے نماز نہیں پڑھی تھی یا نجس کپڑے میں پڑھی تھی، یا نماز کی نیت صحیح طریقے سے نہیں کی تھی کیونکہ اسے نیت کا صحیح طریقہ معلوم نہ تھا، ان تمام صورتوں میں نماز کا اعادہ کرے، اور اگر فوت شدہ نمازوں کی صحیح تعداد معلوم نہ ہو تو ان نمازوں کو شمار کرے جن کی ادائیگی یقینی ہو، اور انکے علاوہ جس قدر نمازیں بلوغ سے اس وقت تک باقی بچتی ہوں، ان سب کا اعادہ کرے، باقی نمازوں کی تعداد ظن اور تخمینے سے کر لینی چاہیے۔ اسی طرح روزوں کا معاملہ ہے اگر کسی شخص نے حالت سفر میں روزہ اظہار کیا، اور واپس آکر اس کی قضا نہیں کی، یا جان بوجھ کر روزہ چھوڑا اور بعد میں نہیں رکھا، یا رات میں نیت کرنا بھول گیا ان تمام صورتوں میں اعادہ ضروری ہے، نماز کی طرح ایسے تمام روزوں کی صحیح تعداد تحریری اور اجتہاد سے متعین کرے جن کی قضا واجب ہے، پھر ان کی قضا میں مشغول ہو، زکوٰۃ کا معاملہ یہ ہے کہ اس وقت سے مال کا حساب لگانا چاہیے جس وقت سے وہ مالک بنا ہے، کیونکہ زکوٰۃ صرف بلوغ سے واجب نہیں ہوتی، بلکہ نابالغ کے مال میں بھی واجب ہوتی ہے، (۱) اس طرح جس قدر زکوٰۃ اسکے مال میں واجب ہے اسی قدر ادا کرے، اسی طرح اگر کسی شخص نے زکوٰۃ ادا کر دی تھی لیکن جس طرح اسکے امام نے تلافی تھی اس طرح ادا نہیں کی تھی مثلاً ایک شافعی مسلک کے لئے ضروری ہے کہ وہ زکوٰۃ کے آٹھوں مصارف میں زکوٰۃ کا مال تقسیم کرے، مگر اس نے ایسا نہ کیا، یا زکوٰۃ جنس مال سے ادا نہ کی (شافعی مسلک کی رو سے اس کے لئے) ضروری ہے کہ وہ دوبارہ زکوٰۃ ادا کرے، کیونکہ اس کی زکوٰۃ ادا ہی نہیں

ہوتی ہے، البتہ زکوٰۃ کے حساب میں جو تفصیلات ہیں وہ وقت طلب ہیں، اس لئے علماء سے رابطہ قائم کیا جائے، اور ان کے بیان کردہ مسائل کی روشنی میں زکوٰۃ ادا کی جائے جیسا کہ معاملہ یہ ہے کہ اگر ماضی کے کچھ برسوں میں اس پر حج واجب رہا ہے، اور وہ اس وقت ادا نہ کر سکا، اور اب مفلس ہو گیا تب بھی اس کے لئے اس فرض حج کی ادائیگی ضروری ہے، اقل اس کی وجہ سے اگر حج پر قادر نہ ہو تو جائزہ ذرائع سے اتنا کمائے جو سفر حج کے لئے کافی ہو، اگر کمائے کی ہمت نہ ہو تو لوگوں سے کہے کہ مجھے اپنی زکوٰۃ اور صدقات میں سے اتنا دے جس سے میں اپنا حج ادا کر سکوں، اگر یہ شخص حج کے بغیر مر جائے گا تو گناہگار ہو گا۔ حدیث شریف میں ہے۔

مَنْ مَاتَ وَلَمْ يَحْجْ فَلَيْسَ مِنْ شَأْنِهِمْ وَدِيَّانٌ شَاءَ عَصَرَ انْبِثَا (۱)

جو شخص حج کے بغیر مر گیا وہ چاہے یہودی مرے یا نصرانی مرے۔

قدرت کے بعد عاجز ہونے سے حج کی فرضیت ساقط نہیں ہوتی، اطاعت کی تقیث اور ان میں کوتاہیوں کی طغیانی کا یہی طریقہ ہے۔ جو بیان کیا گیا۔

معاصی کا تذکرہ : معاصی کی تحقیق اور ان کے تذکرہ کا طریقہ یہ ہے کہ بلوغ کے آغاز سے توبہ کے دن تک اپنے تمام اعضاء کان، آنکھ، زبان، اور پیٹ ہاتھ پاؤں اور شرمگاہوں وغیرہ کے تمام چھوئے ہوئے گناہوں کے بارے میں سوچے کہ فلاں وقت فلاں عضو سے فلاں گناہ سرزد ہوا ہے معاصی کا رجسٹر کھول کر گناہ کا الگ الگ جائزہ لے، پھر یہ دیکھے کہ کتنے گناہ ایسے ہیں جن کا تعلق اللہ تعالیٰ کے حقوق سے ہے، مثلاً غیر محرم کی طرف دیکھنا، ٹاپا کی کی حالت میں مسجد کے اندر بیٹھنا، قرآن کریم کو بلا وضو ہاتھ لگانا، کسی بدعت کا معتقد ہونا، شراب پینا اور مزامیر سننا وغیرہ یہ تمام گناہ اللہ تعالیٰ کے حقوق سے متعلق ہیں، انکے تذکرہ کی صورت یہ ہے کہ ان پر ندامت اور حسرت ظاہر کرے، پھر ہر ایک گناہ کے بڑے ہونے کی مقدار اور وقت کی تحدید کرے، اور کوئی ایک ایسی نیکی کرے جو مقدار اور وقت میں اس گناہ کی تباہی ہو سکے، اور وہ نیک اعمال اس کی سیئات کی طغیانی کر سکیں جیسا کہ حدیث شریف میں ہے۔

رَأَيْتُ اللَّحْمَ خَيْثُ كُنْتُ وَأَتَّبِعُ السَّبِيلَ فَالْحَسَنَةُ تَمْحُوهَُا

جہاں بھی رہو اللہ سے ڈرو اور برائی کے بعد بھلائی ضرور کر لو تاکہ نیکی بدی کو مٹا دے۔

بلکہ یہ مضمون قرآن کریم سے بھی ماخوذ ہے۔ فرمایا۔

إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ (پ ۱۲ ر ۱۰ آیت ۱۵)

واقعی نیکیاں برائیوں کو مٹا دیتی ہیں۔

چنانچہ مزامیر سننے کے گناہ کا کفارہ قرآن کریم کی تلاوت سننے اور ذکر کی مجالس میں بیٹھنے سے ہو سکتا ہے ٹاپا کی حالت میں مسجد کے اندر بیٹھنے کا گناہ معکف ہو کر مسجد میں بیٹھنے اور عبادات میں مشغول ہونے سے ہو سکتا ہے، قرآن کریم کو بلا وضو چھونے کے گناہ کا کفارہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ قرآن کریم کی تعظیم کرے اسے کثرت سے چومے اور زیادہ سے زیادہ تلاوت کرے، ایک مصحف اپنے ہاتھ سے لکھ کر (اس دور میں خرید کر) عام تلاوت کے لئے وقف کر دے، شراب پینے کا کفارہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ کوئی ایسا حلال شربت غریبوں کو خیرات کرے جو اس سے زیادہ پاکیزہ لذیذ اور مرغوب ہو۔ تمام گناہوں کا شمار ممکن نہیں ہے، مقصود یہ ہے کہ جو طریقہ گناہوں کے خلاف ہو اس پر چلتا چاہیے۔ کیونکہ مرض کا علاج اس کی ضد سے ہوتا ہے گناہ کی وجہ سے دل پر جو تاریکی چھا گئی ہے وہ اس نیکی کے علاوہ کسی چیز سے دور نہ ہوگی جو اس گناہ کے مقابل ہو، ضد بین میں باہم مناسبت ہوتی ہے، اسلئے کسی گناہ کے اثرات اس جیسی کسی نیکی سے زائل کئے جاسکتے ہیں، مگر یہ نیکی اس گناہ کی ضد ہونی چاہیے، اس لئے کہ سیاہی سفیدی سے دور ہوتی ہے گرمی یا سردی سے دور نہیں ہوتی۔ ہمارے خیال میں گناہوں کے ازالے کے لئے تدریج اور تحقیق کا یہ طریقہ نہایت مناسب ہے، امید ہے کہ اس طریقہ پر عمل کرنے سے گناہ جلد زائل ہوں گے، نسبت اس کے کہ ایک ہی نوع کی عبادتوں کا التزام کیا جائے

اور ان پر مداومت کی جائے، گوان کی تاثیر سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔

ہر طرح کی عبادتیں گناہوں کا کفارہ بنتی ہیں۔ اب رہا یہ سوال کہ گناہ اپنی ضد سے کیوں دور ہو جاتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ دنیا کی محبت تمام گناہوں کی جڑ ہے، اور دنیا کی اجتناب کا اثر یہ ہوتا ہے کہ دل دنیا سے خوش ہو اور اس کی طرف مائل ہو اسلئے اگر کسی مسلمان پر کوئی ایسی مصیبت آپڑے، جس سے اس کا دل رنجیدہ ہو جائے اور دنیا سے اچھا ہو جائے تو یہ بھی اسکے حق میں کفارہ ہوگا کیونکہ رنج و غم کی وجہ سے دل دنیا کے ہنگاموں سے گھبرا جاتا ہے، حدیث شریف میں ہے۔
 مِنَ الذُّنُوبِ ذُنُوبٌ لَا يَكْفِرُهَا إِلَّا الْهُمُومُ (ابو نعیم۔ ابو ہریرہ)
 بعض گناہ ایسے ہیں جن کا کفارہ صرف رنج سے ہوتا ہے۔

ایک حدیث میں یہ الفاظ ہیں **إِلَّا اللَّهُمَّ بِطَلَبِ الْمَعْيِشَةِ** یعنی بعض گناہ کا کفارہ صرف طلب معیشت کی فکر سے ہوتا ہے، ایک روایت حضرت عائشہ سے مروی ہے **إِنَّكَ الْفَاطِيَةُ** ہیں۔
وَإِنَّا كَثَرَتْ ذُنُوبُ الْعَبْدِ وَلَمْ يَكُنْ لَهُ أَعْمَالٌ يُكَفِّرُهَا دَخَلَ اللَّهُ عَلَيْهِ الْغَمُومُ فَتَكُونُ كَفَّارَةً لِّلذُّنُوبِ (احمد عائشہ)

جب بندے کے گناہ زیادہ ہو جاتے ہیں، اور اس کے پاس ایسے اعمال خیر نہیں ہوتے جو ان گناہوں کا کفارہ بن سکیں تو اللہ تعالیٰ ان پر غم ڈال دیتا ہے جو اسکے گناہ کے کفارہ بن جاتے ہیں۔
 بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ جو رنج بندے کے دل میں پیدا ہوتا ہے اور وہ اسے نہیں جانتا وہ گناہوں کی تاریکی ہے، اور گناہوں سے رنج کرنے کے معنی یہ ہیں کہ دل وقفہ حساب اور میدان حشر کی دہشت کا احساس کرے۔
 اگر کوئی شخص یہ سوال کرے کہ عام طور آدمی کو مال، اولاد اور جاہ کا رنج ہوتا ہے اور یہ رنج گناہ ہے، اس صورت میں ایک گناہ دوسرے گناہ کا کفارہ کیسے بن سکتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ان چیزوں کی محبت گناہ ہے، اور ان سے محروم رہنے کا رنج کفارہ ہے، اگر کوئی شخص اپنی محبت کے بموجب ان چیزوں سے قانع ہو تو اس کا گناہ کامل ہوگا، چنانچہ روایت ہے کہ حضرت جبریل علیہ السلام حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس قید خانے میں تشریف لے گئے، آپ نے ان سے دریافت کیا تم نے غم زندہ بوڑھے (مراد حضرت یعقوب علیہ السلام ہیں) کو کس حال میں چھوڑا ہے۔ حضرت جبریل علیہ السلام نے جواب دیا کہ انھوں نے تمہاری گمشدگی پر اتنا رنج کیا جتنا رنج وہ سو عورتیں کرتی ہیں جن کے بچے مر گئے ہوں، آپ نے دریافت کیا اس رنج کا انھیں کتنا ثواب ملے گا، فرمایا سو شہیدوں کے برابر، اس سے معلوم ہوا کہ رنج و غم بھی اللہ تعالیٰ کے حقوق کا کفارہ بن جاتے ہیں۔

حقوق العباد میں کوتاہی کا تدارک : اب تک ان گناہوں کا ذکر تھا جن کا تعلق اللہ تعالیٰ کے حقوق سے ہے، اب حقوق العباد پر نظر ڈالئے، حقوق العباد میں کوتاہی کرنا بھی اللہ تعالیٰ کے حق میں کوتاہی کرنا ہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے بندوں پر ظلم کرنے سے منع فرمایا ہے، جو شخص دوسرے پر ظلم کرتا ہے وہ پہلے اللہ تعالیٰ کے حکم کی خلاف ورزی کرتا ہے، حکم الہی کی مخالفت کے گناہ ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے جو گناہ اس طرح کے ہوں ان میں حقوق خدا میں کوتاہی کا تدارک تو اس طرح ہو سکتا ہے کہ ان پر ندامت ظاہر کرے، رنج و انوس کرے، آئندہ اس طرح کے افعال سے باز رہے، اور ایسے اعمال خیر کرے جو ان گناہوں کی ضد ہوں، چنانچہ اگر کسی کو ایذا پہنچائی ہو تو اس پر احسان کرے، کسی کا مال چھین لیا ہو تو اپنی جائز ملکیت سے صدقہ کرے، کسی کی غیبت کی ہو یا کسی پر طعنہ زنی کی ہو تو اس کی تعریف کرے بشرطیکہ دیندار ہو، اپنے ہم عصروں اور برادر کے لوگوں کی اچھائیاں ظاہر کرے، اگر قتل کیا ہو تو غلام آزاد کرے، اس میں بھی ایک طرح سے زندہ کرنے کا عمل پایا جاتا ہے، کیونکہ غلام اپنے نفس کے اعتبار سے نابود ہے، اس کا وجود صرف مالک کے وجود سے ہے، اسے صرف آزادی سے زندگی ملتی ہے، اور وہی زندگی اسکے نفس کے لئے خاص ہوتی ہے، اسلئے آزاد کرنا ایک طرح سے وجود دینے کے برابر ہے، اور یہی عمل صحیح معنی میں اس گناہ کا کفارہ بن سکتا ہے، جس سے کوئی وجود عدم میں تبدیل ہوا ہو۔

کفارہ اعمال کے سلسلے میں ہم نے مخالفت راستے پر چلنے کا طریقہ تجویز کیا ہے، شریعت میں اس کی نظیر موجود ہے، کفارہ قتل میں غلام آزاد کیا جاتا ہے، اس کی وجہ یہی ہے کہ قتل کے مقابلے میں ایجاد آجائے، بندوں کے حقوق میں تلافی کے لئے صرف اتنا ہی کافی نہیں ہے کہ محض ندامت ظاہر کرے یا اسکے مقابلے میں کوئی نیکی کر لے، ندامت یا عمل خیر سے نجات نہیں ہوگی، بلکہ نجات کے لئے ضروری ہے کہ بندوں کے حقوق سے بھی عہدہ بر آہو۔

حقوق العباد کی تفصیل : پھر حقوق العباد یا جان سے متعلق ہیں، یا مال سے یا عزت سے یا دل سے، دل سے متعلق حقوق سے ہماری مراد وہ اعمال ہیں جن سے ایذا پہنچے، یہاں ان تمام حقوق کی تفصیل کی جاتی ہے۔

نفس سے متعلق حقوق : اگر کسی نے نفس پر ظلم کیا ہے، اس طرح کہ قتل خطا کا مرتکب ہو اس کی توبہ یہ ہے کہ مستحق کو خزانہ بہاؤ کر دے، خواہ اپنے پاس سے دے یا اپنے رشتے داروں سے لے کر دے، جب تک مستحق کو مقتول کا خوں بہانہ ملے گا وہ اپنی ذمہ داری سے بری نہیں ہوگا، اور اگر قتل عمد کیا تھا تو قصاص ضروری ہوگا، اسکے بغیر توبہ قبول نہیں ہوگی، اگر قتل کا حال معلوم نہ ہو، اور حکومت قصاص لینے میں ناکام رہے تو خود قاتل کے لئے ضروری ہے کہ وہ مقتول کے دلی کے پاس پہنچے، اور اپنی جان اسکے سپرد کر دے، چاہے وہ اسے معاف کر دے یا قتل کر دے۔ اپنی جان سپرد کئے بغیر اس کا گناہ معاف نہیں ہوگا، اس گناہ کا چھپانا کسی بھی طرح مناسب نہیں ہے، قتل کا معاملہ چوری، زنا، شراب خوری، راہزنی، اور دوسرے موجب حد افعال سے بالکل الگ ہے، ان صورتوں میں توبہ کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ اپنے آپ کو ظاہر کرے اور رسوا ہو، اور ولی سے اللہ کا حق لینے کا مطالبہ کرے، بلکہ واجب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح اسکے گناہوں کا پردہ رکھا ہے، اسی طرح پردہ رکھے اور تلافی کے لئے طرح طرح کے مجاہدے کر کے اپنے نفس کو سزا دے جو گناہ اللہ تعالیٰ کے حقوق سے متعلق ہیں وہ محض توبہ اور ندامت سے معاف ہو سکے ہیں، اس طرح کے معاملات میں اگر حاکم کی عدالت سے سزا ہو جائے اور حد قائم ہو جائے تو توبہ صحیح ہوگی، اور عند اللہ مقبول ہوگی، جیسا کہ روایت میں ہے کہ عز ابن مالکؓ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہنے لگے کہ میں نے اپنے نفس پر ظلم کیا ہے، میں زنا کا مرتکب ہوا ہوں، اب میں پاک ہونے کے لئے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں، آپ نے ان کی درخواست مسترد کر دی، اگلے روز بھی وہ صحابی پھر حاضر ہوئے اور اپنے زنا کا اقرار کیا۔ آپ نے دوسری بار بھی حد جاری کرنے سے منع فرمایا، جب تیسری بار وہ اعتراف گناہ کے ساتھ حاضر ہوئے تو آپ نے ایک گڑھا کھودنے کا حکم فرمایا (جب وہ گڑھا تیار ہو گیا تو) ماعزؓ کو حکم دیا (کہ وہ اس گڑھے میں کھڑے ہو جائیں) چنانچہ (وہ کھڑے ہو گئے) اور لوگوں نے ان پر پتھر مارے، اس واقعے کے بعد صحابہ میں دو گروہ ہو گئے، بعض کی رائے تھی کہ اتنا گناہ معاف نہیں ہوا وہ گناہ کے ساتھ ہلاک ہوئے ہیں، اور بعض کی رائے یہ تھی کہ ان کی توبہ نہایت سچی تھی، ان سے زیادہ صحیح اور مقبول توبہ کسی کی ہوئی نہیں سکتی، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس اختلاف کا علم ہوا تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ اس کی توبہ ایسی سچی تھی کہ اگر تمام امت پر تقسیم کر دی جاتی تو سب کے لئے کافی ہو جاتی (۱) اسی طرح عادیہ کا واقعہ مشہور ہے، وہ بھی زنا کے اعتراف اور تعلیم کی درخواست کے ساتھ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضر ہوئیں، آپ نے انھیں واپس کر دیا، دوسرے دن وہ پھر حاضر ہوئیں اور کہنے لگیں کہ آپ مجھے کیوں لوٹا رہے ہیں غالباً آپ مجھے ماعز کی طرح لوٹانا چاہتے ہیں، میں تو بخدا اس زنا سے حاملہ بھی ہو گئی ہوں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، اس وقت گھبراؤ، جب وضع حمل ہو جائے تب آنا، جب بچہ پیدا ہوا تو عادیہ اسے ایک کپڑے میں لپیٹ کر لائیں اور کہنے لگیں یہ ہے وہ بچہ جو میں نے جتا ہے، آپ نے فرمایا اسے لیجاؤ اور دودھ پلاؤ، جب اس کا دودھ پھٹ جائے تب آنا، جب دودھ کی مدت ختم ہو گئی تو عادیہ بچے کو اس بل میں لے کر آئیں کہ اسکے ہاتھ میں روٹی کا ٹکڑا تھا، اور عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میں نے بچے کا دودھ چمڑا لیا ہے، اور اب یہ روٹی کھاتا ہے، آپ نے وہ بچہ کسی مسلمان کے سپرد کر دیا، اور عادیہ کے لئے ایک گڑھا کھودنے کا حکم دیا، اور گڑھا کھود کر عادیہ کیاس میں سینے

تک کھڑا کر دیا اور پھر لوگوں کو حکم دیا کہ وہ اس پر پتھر برسائیں، اسی اثناء میں خالد بن ولید آئے اور انھوں نے ایک پتھر غامدیہ کے سر پر مارا اس ضرب سے ان کے خون کی کچھ بچھٹیں اڑ کر خالد بن ولید کے چہرے پر پڑیں، انھوں نے غامدیہ کو برا کہا، سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، خالد گالی مت دو، اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے اس نے ایسی توبہ کی ہے کہ اگر ایسی توبہ صاحب کس (۱) کرے تو وہ قبول ہو جائے، اسکے بعد آپ نے غامدیہ کی نماز جنازہ پڑھی اور دفن کیا (۲)

قصاص اور حد قذف وغیرہ : اوپر ان حقوق کی تفصیل تھی جو نفس سے متعلق ہیں، لیکن قصاص اور حد قذف میں مستحق قصص کو اپنے اوپر اختیار دینا ضروری ہے، یہی حال مال کا ہے، اگر کسی نے غصب، خیانت یا تعین کے ذریعہ کسی کا مال لے لیا ہو، مثلاً کھوٹا سکہ چلا دیا ہو، یا اپنی بیعت کا عیب پوشیدہ رکھا ہو، یا مزدور کی اجرت کم دی ہو، یا بالکل نہ دی ہو، ان تمام صورتوں میں تحقیق و تلاش ضروری ہے، پھر اس میں بلوغ کی بھی کوئی قید نہیں بلکہ روزِ ازل سے مالی معاملات میں جو خرابیاں پیدا ہوئیں ہیں، ان کی تحقیق کرنا اور پھر ان کا تدارک کرنا ضروری ہے، اگر کسی نابالغ بچے کے مال میں خراب اور ناجائز مال مل جائے تو بلوغ کے بعد اس مال کا نکالنا واجب ہے بشرطیکہ بچے کے دلی نے کو تباہی کی ہو، اگر لڑکے نے بلوغ کے بعد ایسا نہ کیا تو ظالم و گناہ گار ٹھہرے گا، اس لئے کہ مالی حقوق میں بالغ اور نابالغ دونوں برابر ہیں، پھر محاسبہ بددیانتی کے پہلے دن سے توبہ تک پائی پائی اور پیسے پیسے کا ہونا چاہیے، آدمی کو اپنا حساب خود کر لینا چاہیے اس سے پہلے کہ قیامت کے دن حساب دینا پڑے جو محض دنیا میں اپنا حساب نہیں کرنا قیامت کے دن اسکے حساب کا مرحلہ طویل تر ہو جاتا ہے، حساب کا طریقہ یہ ہے کہ اپنے ظن غالب اور اجتہاد سے کام لے کر تمام فروگزاشتیں تحریر کر لے، اور متعلقہ لوگوں کے نام اور ظلم کی نوعیت الگ الگ لکھ لے، پھر دنیا بھر میں بھرے، جہاں جہاں اسکے ظلم و ستم کا نشانہ بننے والے لوگ جیتے ہیں، وہاں وہاں پہنچے، انھیں تلاش کرے، یا تو ان سے معاف کرائے یا ان کے حقوق ادا کرے، ظالموں اور تاجروں کے لئے یہ توبہ نہایت دشوار ہے اس لئے کہ ان کا بے شمار لوگوں سے ساتھ پڑتا ہے، اور سب کا تلاش کرنا ممکن نہیں رہتا، نہ ان کے ورغاء کی تلاش ممکن رہتی ہے، تاہم ان کے لئے ضروری ہے کہ وہ مقدور بھر کوشش کریں، اور جہاں تک ممکن ہو مظلومین یا ان کے ورغاء کو تلاش کریں اگر تمام ترکوششوں کے باوجود ناکامی ہو تو پھر اسکا علاج صرف یہ ہے کہ اچھے اعمال بکثرت کرے تاکہ قیامت کے روز نیکیوں کے ذریعہ مستحقین کے حقوق ادا کر سکے، اس سے معلوم ہوا کہ لوگوں کے جس قدر حقوق اپنے ذمے ہیں انھیں کے مطابق نیکیاں بھی ہونی چاہئیں تاکہ ہر مستحق کا حق پورے پورے طور پر ادا کیا جاسکے اور اپنی بخشش کا سامان بھی رہے اگر نیکیاں کم ہوں تو اس اور مطالبہ کرنے والوں کے حقوق صحیح طور پر ادا نہیں ہوئے تو ان کے گناہوں سے یہ کمی پوری کی جائے گی، اور مستحقین کے گناہ اس کے نامہ اعمال میں لکھ دئے جائیں گے، اس سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ ایسے آدمی کو اپنی باقی زندگی نیک اعمال میں بسر کرنی چاہیے، بشرطیکہ اتنی عمر ہو جتنی حق دہانے میں گزری ہے لیکن کیونکہ عمر کا حال معلوم نہیں ہو سکتا ہے کہ باقی زندگی کا وقفہ ظالمانہ زندگی کے وقفے سے کم ہو، اور نیکیوں کے ذریعہ تدارک نہ ہو سکے، اس صورت میں بھی مایوس نہ ہونا چاہیے، بلکہ گناہوں کے لئے جس قدر مستعد رہا کرتا تھا اس سے زیادہ اعمال خیر کے لئے مستعد رہنا چاہیے، جو مال ظالم کے پاس بیچ رہا ہے، اور وہ اب توبہ پر آمادہ ہے، اگر اس کا مالک معلوم ہے تو اسے موجودہ مال مالک کے سپرد کر دینا چاہیے، اور معلوم نہ ہو تو خیرات کر دینا چاہیے، اور اگر جائز مال میں ناجائز مال مل گیا ہو تو اندازے سے وہ مال نکال دینا چاہیے جو ناجائز ہے، حلال و حرام کے باب میں اس کی تفصیل مکرر چکی ہے۔

دلوں کو ایذا دینے کا جرم : بہت سے لوگ محض دلوں کو ایذا پہنچاتے ہیں، مثلاً مخاطب کے سامنے ایسی باتیں کرتے ہیں جن سے انھیں تکلیف ہو، یا کسی کی غیبت کرتے ہیں، اس جرم کا تدارک صرف اس طرح ہو سکتا ہے کہ جس جس کا دل دکھایا اور غیبت کی ہو ان میں سے ایک ایک کو تلاش کرے اور ان سے اپنی غلطی معاف کرائے، اگر ان میں سے کوئی مر گیا ہو، یا غائب ہو گیا ہو تو اس کی تلاشی کی اس کے علاوہ اور کوئی صورت نہیں کہ بہت زیادہ نیک اعمال کرے، تاکہ قیامت کے دن اس غلطی کے بدلے نیکیاں دے۔

(۱) کس ایک طرح کا جرمانہ ہے جو مائین مشرود ذکوة لوگوں سے ناحق اور زبردستی وصول کرتے ہیں (۲) یہ واقعہ بھی کچھلی روایت میں مذکور ہے۔

کر چھٹکارا پاسکے اور اگر کوئی مل جائے اور خوشی سے معاف کر دے تو یہ معافی اسکے گناہ کا کفارہ بن جائے گی، لیکن اسکے لئے شرط یہ ہے کہ جس سے قصور معاف کرائے اسکے سامنے اپنے قصور کی پوری تفصیل رکھ دے، ہمہ طور پر یہ کہہ دینا کافی نہیں کہ میرا قصور معاف کر دو، کیونکہ بعض اوقات آدمی ایذا پہنچانے میں حد سے گزر جاتا ہے، اور ایسی باتیں کہہ دیتا ہے جنہیں معاف کرنے کو دل نہیں چاہتا بلکہ قیامت پر اٹھار کھنے کو دل چاہتا ہے تاکہ قصور وار کی نیکیاں حاصل کی جاسکیں، یا اپنے گناہ اسکے اعمال نامے میں درج کرائے جاسکیں۔ تاہم بعض گناہ ایسے بھی ہیں کہ اگر متعلقہ افراد کے سامنے ذکر کئے جائیں تو انہیں بہت زیادہ تکلیف ہو، اور غصہ و رگز کی راہ مسدود ہو جائے، مثلاً ”کسی سے یہ کہنا کہ میں تیری باندی سے یا تیری بیوی سے زنا کیا ہے یا یہ بیان کرنا کہ میں نے تیرا فلاں غلطی عیب لوگوں پر ظاہر کیا تھا“ ظاہر ہے کہ یہ باتیں اگر کسی پر ظاہر کی جائیں گی تو اسے بے حد تکلیف ہوگی۔ اور وہ ہرگز معاف نہیں کرے گا اس صورت میں یہی بہتر ہے کہ مجمل طور پر اپنا گناہ بیان کر کے معاف کرایا جائے، پھر گناہ باقی رہ جائے نیکیوں کے ذریعہ اسکی تلافی کر دی جائے، جس طرح مردہ یا غائب شخص سے متعلق گناہ کا تذکرہ کیا جاتا ہے، پھر ذکر کرنا اور بیان کرنا ایک الگ اور نیا قصور ہے، اسے معاف کرنا بھی ضروری ہے اگر کسی ایسے شخص کے سامنے جس کا قصور کیا ہے اپنے قصور کا ذکر کیا، اور وہ معاف کرنے پر تیار نہیں ہے، تو اس کا وہاں قصور وار پر ہے، کیونکہ معاف کرنا یا نہ کرنا اس کا حق ہے، اس صورت میں غلطی کرنے والے کو چاہیے کہ وہ اس کے ساتھ نرمی اور محبت سے پیش آئے، اس کی خدمت کرے تاکہ اسکا دل خطا کار کی طرف مائل ہو جائے، اسلئے کہ انسان احسان سے دیتا ہے، ہو سکتا ہے کہ وہ مسلسل احسانات سے مجبور ہو کر معاف کرنے پر راضی ہو جائے، اگر ان تمام کوششوں کے باوجود وہ معاف نہ کرنے پر مصر ہے تو مجرم کا سلوک، احسان، خدمت اور محبت و شفقت کے تمام معاملات ان احسانات میں شامل ہوں گے، جن سے قیامت کے روز گناہوں کی تلافی کی جائے گی، لیکن مستحقین کی دلجوئی، رضامندی اور ان کے ساتھ نرمی و محبت میں اسی قدر کوشش کرے جس قدر ایذا پہنچائی تھی، تاکہ قیامت کے روز اس قصور کی اچھی طرح تلافی ہو سکے، اور یہ تلافی اللہ کے حکم سے ہوگی، جیسے اگر کوئی شخص دنیا میں کسی کا مال ضائع کر دے اور وہ مالک کو اتنا ہی مال لا کر دے جتنا اس نے ضائع کیا ہے اور مالک لینے سے انکار کرے تو دنیاوی حکام اسے لینے کا حکم دیں گے، خواہ اس کی مرضی ہو یا نہ ہو، اسی طرح آخرت میں بھی قصور وار کی نیکیاں تذکرہ میں کام آئیں گی خواہ صاحب حق اسے پسند کرے یا نہ کرے۔

چھپلی امتوں کے ایک شخص کا قصہ : بخاری و مسلم میں حضرت ابو سعید الخدریؓ سے منقول ہے کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ گزشتہ امتوں میں ایک شخص تھا جس نے ننانوے قتل کئے تھے، اس نے کسی شخص سے پوچھا کہ دنیا میں سب سے بڑا عالم کون ہے، لوگوں نے ایک عالم کا نام لیا وہ اس کے پاس گیا اور کہنے لگا کہ میں نے ننانوے قتل کئے ہیں، آیا توبہ کی کوئی صورت ہے، اس عالم نے جواب دیا اب توبہ کی کوئی صورت نہیں، اس نے اس عالم کو بھی قتل کر دیا، اور اس طرح سو قتل مکمل کر لئے، اس کے بعد پھر کسی سے دریافت کیا کہ دنیا میں بڑا عالم کون ہے، لوگوں نے ایک اور عالم کی طرف اس کی رہنمائی کی، وہ وہاں گیا اور اس سے دریافت کیا کہ میں نے سو قتل کئے ہیں، کیا میری توبہ قبول ہو سکتی ہے، اس نے جواب دیا یقیناً، لیکن اس کے لئے ہمیں اپنے وطن کو خیر آباد کہہ کر فلاں مقام پر جانا ہوگا، وہاں کچھ لوگ عبادت میں مشغول ہوں گے، ان کے ساتھ عبادت کرنا، اور اپنے وطن ہرگز واپس مت آنا، اسلئے کہ یہ بری جگہ ہے، وہ ان لوگوں کے ساتھ عبادت کرنے کے ارادے سے چلا لیکن راستے ہی میں تھا کہ موت نے آیا، اس سوال پر کہ یہ روح رحمت کی مستحق ہے یا عذاب کی رحمت اور عذاب کے فرشتوں کے درمیان اختلاف ہوا، رحمت کے فرشتے کہتے تھے کہ یہ تائب ہو کر آ رہا تھا، اور دل سے اللہ کی طرف متوجہ تھا، عذاب کے فرشتوں کا یہ دعویٰ تھا کہ اس نے اب تک کوئی نیک عمل نہیں کیا تھا اسلئے اسکی روح ہم لے جائیں گے، اسی اثناء میں ایک فرشتہ بصورت انسان وہاں آیا، انھوں نے اسے حکم بنالیا، اس نے یہ فیصلہ دیا کہ زمین کی پیمائش کرنی چاہیے، اگر وہ خیر کی زمین سے قریب تر تھا تو رحمت کے فرشتے اسلئے مستحق ہیں، اور شر کی زمین سے قریب تر تھا تو عذاب کے فرشتوں کا دعویٰ صحیح ہے، جب پیمائش کی گئی تو معلوم ہوا کہ وہ کافی فاصلہ طے کر چکا

ہے اور اس زمین سے قریب تر ہے جہاں پہنچ کر عبادت میں مشغول ہونا چاہتا تھا، چنانچہ ملائکہ رحمت نے اس کی روح پر قبضہ کر لیا، ایک روایت میں ہے کہ وہ شخص صالح بستی سے بالکل قریب پہنچ چکا تھا، صرف ایک بالشت کا فاصلہ باقی رہ گیا تھا، اس لئے معاف کر دیا گیا، اس سے معلوم ہوا کہ نجات کی صرف ایک صورت ہے اور وہ یہ کہ نیک اعمال کا پلڑا جھکا رہے خواہ تھوڑا ہی ہو، اسی لئے تجربہ کرنے والوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ کثرت سے نیک اعمال کریں تاکہ ان کی نیکیاں گناہوں کا عوض بننے کے بعد بھی نجات کے لئے کافی رہیں۔

مستقبل سے متعلق قصد : اب تک اس قصد کا بیان تھا جس کا تعلق زمانہ ماضی سے ہے، اب اس قصد کا بیان ہے جس کا تعلق مستقبل سے ہے، تائب کو چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ یہ محکم عہد اور معہم عزم کرے کہ آئندہ کبھی ان گناہوں کی طرف رجوع نہیں کرے گا، اور نہ ان جیسے دوسرے گناہوں کا ارتکاب کرے گا یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی مریض اپنی بیماری کے دوران یہ بات جانے کہ فلاں پھل یا میوہ اس کے لئے انتہائی نقصان دہ ہے اسلئے وہ یہ سطرے کرے کہ میں جب تک بیماری سے شفا پایا نہ ہو جاؤں اس وقت تک یہ پھل نہ کھاؤں گا، یہ ارادہ اس وقت تو پختہ ہی ہوتا ہے لیکن یہ ممکن ہے کہ کسی دوسرے وقت اس پر شہوت غالب آجائے اور وہ پھل کھا بیٹھے لیکن آدمی تائب اسی وقت کھلائے گا جب ترک فعل پر اس کا عزم ٹوٹ نہ ہو اور اس عزم پر مستقبل میں عمل پیرا ہونے کے لئے ضروری ہے کہ گوشہ نشینی اختیار کرے، سکوت کو ترجیح دے، کم کھائے اور کم سونے کے اصول پر کاربند ہو، اور حلال غذا کھائے، اگر کسی شخص کے پاس کوئی جائز موروثی جائیداد یا ذریعہ آمدنی ہے، یا وہ کوئی ایسا جائز پیشہ کرتا ہے جس سے بیوی بچوں کے ساتھ گزر بسر ہو جاتی ہے، تو اسی پر اکتفاء کرے، کیونکہ حرام کھانا تمام گناہوں کی جڑ ہے، اگر حرام غذا پر اصرار کرتا رہا تو توبہ کیسے قبول ہوگی، جو شخص لباس اور غذا میں اپنی خواہشات ترک نہیں کر سکتا، وہ حلال پر قانع نہ سکتا ہے، اور نہ شہوات سے دامن بچا سکتا ہے۔

بعض اکابرین کا قول ہے کہ جو شخص ترک خواہشات میں سچا ہو اور اپنے نفس کے ساتھ سات مرتبہ جہاد کر چکا ہو وہ انشاء اللہ ان میں جہلانہ ہوگا اور نفس سے فریب نہ کھائے گا، ایک بزرگ کہتے ہیں کہ جو شخص گناہ سے توبہ کر کے سات برس تک اس کی پابندی کرے اس سے وہ گناہ کبھی سرزد نہ ہوگا۔ تائب کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ مستقبل میں اسے جس راستے پر چلنا ہے اگر وہ راستہ معلوم نہ ہو تو اس کا علم حاصل کرے، تاکہ راہ راست پر چلنا سہل ہو جائے، اور استقامت نصیب ہو، اگر اس نے عزت اختیار نہ کی تو استقامت بھی کامل نہ ہوگی، صرف یہ ہوگا کہ چند گناہوں سے تائب ہو جائے گا جیسے شراب زنا اور غصب وغیرہ سے، لیکن وہ توبہ نہیں کرے گا جسے مطلق کہتے ہیں، اور جو تمام گناہوں کو شامل ہے، بعض لوگوں کے نزدیک تو ایسی توبہ صحیح ہی نہیں ہے، بعض لوگ صحیح کہتے ہیں لیکن لفظ صحت مجمل ہے اسکی تفصیل کی ضرورت ہے۔

صحت کے اجمال کی تفصیل : ہم پہلے ان لوگوں سے پوچھتے ہیں جو بعض گناہوں سے توبہ کو صحیح نہیں ماننے لگے کہ اگر اس سے تمہارا مقصد یہ ہے کہ بعض گناہوں کا چھوڑنا آدمی کے لئے مفید نہیں ہے، لیکن ان گناہوں کی موجودگی میں جن کا ارتکاب جاری ہے، دوسرے گناہوں سے توبہ کوئی معنی نہیں رکھتی، اگر تمہارا مقصد یہ ہے تو یہ صریح غلطی ہے، اس لئے کہ گناہوں کی کثرت عذاب کی کثرت کا سبب ہے، اور گناہوں کی کمی عذاب میں کمی کا باعث ہے، پھر ہم ان سے سوال کرتے ہیں، جو توبہ کو صحیح مانتے ہیں کہ ان کی مراد کیا ہے، اگر ان کی مراد یہ ہے کہ بعض گناہوں سے توبہ باقی تمام گناہوں سے توبہ کیلئے کافی ہو جائے گی، اور اس سے آدمی نجات اور کامیابی کے مطلوبہ درجے تک پہنچ جائے گا تو یہ بھی ایک واضح غلطی ہے، اسلئے کہ نجات اور کامیابی بظاہر اسی صورت میں حاصل ہوتی ہے، جب آدمی تمام گناہ چھوڑ دیتا ہے، مغوا الہی کے غفلت اسرار میں زیر بحث نہیں ہیں، یہاں صرف ظاہر پر حکم لگایا جاتا ہے، اور ظاہر کے اعتبار سے قرین قیاس یہی ہے کہ تمام گناہوں کے تارک غفلتی اور قانز کما جائے۔

فرق اول یہ کہ سکتا ہے کہ توبہ کے صحیح نہ ہونے سے ہماری مراد یہ ہے کہ توبہ ندامت کا نام ہے، گناہ پر آدمی اس لئے ندامت

کرتا ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی محصیت اور نافرمانی ہے مثلاً چوری پر ندامت کرتا ہے اس لئے نہیں کہ اس سے چوری کا فعل سرزد ہوا ہے بلکہ اس لئے کہ اس نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی ہے اس سے معلوم ہوا کہ ندامت کی علت محصیت ہے کوئی مخصوص گناہ نہیں لہذا یہ ممکن نہیں کہ آدمی چوری پر توبہ نام ہو لیکن زنا پر ندامت نہ کرے جب کہ چوری اور زنا دونوں میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی موجود ہے جس طرح وہ چوری پر نادم ہوا ہے اسی طرح اسے زنا پر بھی نادم ہونا چاہیے مثلاً جو شخص بیٹے کی تلوار سے قتل ہونے میں درود محسوس کرتا ہے اسی طرح اسے کسی دوسرے کی چمڑی سے قتل ہونے میں بھی تکلیف ہوگی یا تکلیف چمڑی یا تلوار میں نہیں ہے بلکہ محبوب (جان) کے جانے کا ہے جو تلوار سے بھی ضائع ہوا اور چمڑی سے بھی اسی طرح بڑے کو بھی اپنے محبوب کے چھٹنے کا افسوس ہوتا ہے اور یہ محبوب نافرمانی سے جدا ہوتا ہے خواہ وہ کوئی سی بھی نافرمانی ہو اور ندامت بھی سب پر برابر ہونی چاہیے آدمی اسی علم و یقین کے بعد توبہ کرتا ہے کہ نافرمانی سے محبوب جدا ہو جاتا ہے اس میں یہ قید نہیں کہ فلاں گناہ سے محبوب ناراض نہیں ہوتا اور فلاں گناہ سے ہو جاتا ہے اس لئے یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ آدمی بعض گناہوں پر نادم ہو اور بعض پر ندامت نہ کرے اگر یہ بات ممکن ہے تو پھر اس شخص کی توبہ کو بھی صحیح کہنا ہو گا جو شراب کے دو مشکوں میں سے ایک مشک سے توبہ کرے اور دوسرے سے نہ کرے مگر اس شخص کی توبہ اس لئے قبول نہیں ہوتی کہ دونوں مشکوں کی شراب میں نافرمانی برابر ہے مشکے صرف طرف ہیں انکے بدلنے سے شراب کا حکم نہیں بدلتا اسی طرح چوری زنا وغیرہ گناہوں کا معاملہ ہے یہ تمام گناہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کا موجب ہیں اور یہ نافرمانی تمام گناہوں میں مشترک ہے۔

ہم نے ایسی توبہ کو غیر صحیح کہا ہے جو بعض گناہوں سے ہو اور بعض سے نہ ہو اس توبہ کے غیر صحیح ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے توبہ کرنے والوں کے لئے جس مرتبہ کا وعدہ کیا ہے وہ ندامت کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا اور جو چیزیں برابر ہوں ان میں یہ ممکن نہیں کہ ایک پر ندامت ہو اور ایک پر نہ ہو ندامت کے بعد توبہ کا حصول ایسا ہے جیسے ایجاب و قبول کے بعد کوئی چیز ملکیت میں آجاتی ہے جب تک ایجاب و قبول نہیں ہوتا اس وقت تک ملکیت بھی تمام نہیں ہوتی اور معاملہ صحیح نہیں ہوتا ایجاب و قبول پر ملک کا ثمر ہونا چاہیے جب ایجاب و قبول ہی مکمل نہ ہو تو اس پر ملکیت کا ثمر کیسے مرتب ہو سکتا ہے اسی طرح جب تک ندامت کا محرک یہ حقیقت نہ ہوگی کہ گناہ نافرمانی کا باعث ہیں اس وقت تک ندامت کا ثمر توبہ بھی حاصل نہ ہو گا اور گناہوں کا اللہ تعالیٰ کی محصیت ہونا تمام معاصی کو شامل ہے اس میں کسی ایک گناہ کی تخصیص نہیں ہے۔

ترک اور ندامت کا فرق : اس سلسلے میں تحقیقی بات یہ ہے کہ ترک اور ندامت میں فرق ہے ترک گناہ کا مطلب توبہ ہے کہ جو گناہ اس نے چھوڑا ہے اس کا عذاب آئندہ کے لئے منقطع ہو جائے گا جب کہ ندامت پچھلے گناہ کا کفارہ بھی بنتی ہے مثلاً ایک شخص چوری ترک کرتا ہے اس شخص کو یقیناً وہ عذاب نہیں ہو گا جو چوری کرنے پر ہوتا ہے لیکن جو چوری وہ زمانہ ماضی میں کر چکا ہے یہ ترک گناہ اس گناہ کا کفارہ نہیں بنے گا بلکہ ماضی کی چوری کے کفارے کے لئے ندامت ضروری ہے یہ تفصیل سنجیدہ اور قابل فہم ہے ہر منصف شخص کو ایسی ہی تفصیل بیان کرنی چاہیے جس سے مطلب صاف سمجھ میں آجائے۔

بعض گناہوں سے توبہ کرنے کی تین صورتیں : اس لئے ہم یہ کہتے ہیں کہ بعض گناہوں سے توبہ کرنے کی تین صورتیں ہیں ایک یہ کہ صرف کبیرہ گناہوں سے توبہ ہو صغیرہ سے نہ ہو دوسری یہ کہ صغیرہ سے توبہ ہو کبیرہ سے نہ ہو تیسری یہ کہ بعض کبائر سے ہو اور بعض سے نہ ہو ان میں سے پہلی صورت ممکن ہے اسلئے کہ گناہ کا رتبہ بات جانتا ہے کہ کبائر اللہ کے یہاں سخت ناپسندیدہ اور اسکے شدید تر غیظ و غضب کا باعث ہیں جب کہ معاذ خود درگزر سے قریب تر ہیں اسلئے ہو سکتا ہے وہ شخص محض بڑے گناہوں سے توبہ کرے اور انہی پر نادم ہو اسکی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص بادشاہ کی ملکہ کے ساتھ نازیبا سلوک کرے اور اس کے جانور بھی مارے پھر ایسے شخص کو ملکہ کے ساتھ نازیبا سلوک کرنے کا خوف ہو گا جانور کو مارنے کا معاملہ اسکی نظر میں نہایت حقیر ہو گا اور یہ سمجھے گا کہ اگر ملکہ کے ساتھ بد سلوکی کا جرم معاف ہو گیا تو جانور کے مارنے کے جرم کی پریشانی نہ ہوگی پھر جس قدر بڑا

گناہ ہوتا ہے اور اس گناہ کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی دوری کا جس قدر احساس ہوتا ہے اسی قدر ندامت بھی زیادہ ہوتی ہے شریعت میں ایسا ہونا ممکن ہے، پہلے زمانوں میں بہت سے توبہ کرنے والے ایسے گزرے ہیں جو معصوم نہ تھے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ توبہ کے لئے معصوم ہونا شرط نہیں ہے، ڈاکٹر مریض کو شہد کھانے سے روکتا ہے کیونکہ اس کا ضرر زیادہ ہے شکر سے منع نہیں کرتا کیونکہ اس کا نقصان کم ہے، چنانچہ مریض شہد سے توبہ کر لیتا ہے اور شکر سے نہیں کرتا، اگر شہوت سے مغلوب ہو کر دونوں کھالے گا تو شہد کھانے پر نادم ہوگا، شکر پر اسے کوئی افسوس نہ ہوگا کیونکہ اسکے خیال میں اصل نقصان شہد سے ہوتا ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ بعض کبائر سے توبہ کرے اور بعض سے نہ کرے، یہ بھی ممکن ہے کہ گناہ گار یہ اعتقاد کرتا ہے کہ بعض گناہ اللہ کے نزدیک بعض سے زیادہ غلیظ اور شدید ہیں مثلاً وہ قتل، لوٹ مار، ظلم اور بدوں کی حق تلفی سے توبہ کر لیتا ہے کیونکہ وہ یہ بات جانتا ہے کہ بدوں کے حقوق ہرگز معاف نہ ہو سکتے البتہ ان حقوق میں معافی ممکن ہے جو اللہ تعالیٰ کے اور اسکے مابین ہیں، بہر حال جس طرح صغائر اور کبائر میں تفاوت ہے اسی طرح کبائر بھی ایک دوسرے سے متفاوت ہیں حقیقت میں بھی اور گناہ گار کے اعتقاد میں بھی، اسلئے آدمی کبھی ان گناہوں سے توبہ کر لیتا ہے جو بدوں سے متعلق نہیں ہوتے مثلاً شراب پینے سے توبہ کر لیتا ہے، زنا سے نہیں کرتا کیونکہ وہ یہ خیال کرتا ہے کہ شراب تمام برائیوں کی جڑ ہے اس سے عقل و اقل ہو جاتی ہے اور جب عقل و اقل ہو جاتی ہے تو اعضاء سے گناہ سرزد ہونے لگتے ہیں اور مرکب کو اس کا احساس بھی نہیں ہوتا جس قدر اسکے ذہن میں شراب کی برائی راسخ ہوتی ہے اسی قدر وہ توبہ میں شدت کرتا ہے۔

تیسری صورت یہ ہے کہ ایک صغیرہ یا چند صغائر سے توبہ کرے مگر کبائر پر اصرار کرتا رہے، جب کہ یہ بھی جانتا ہو کہ یہ کبائر ہیں اور ان کا عذاب صغائر سے زیادہ ہے، مثلاً ایک شخص شراب پینے پر اصرار کرتا رہے لیکن غیبت کرنے یا غیر عرم کی طرف دیکھنے سے توبہ کر لیتا ہے، یہ صورت بھی ممکن ہے، اور امکان کی وجہ یہ ہے کہ ہر مومن اپنے معاصی سے خائف اور اپنے افعال پر نادم رہتا ہے، یہ اور بات ہے کہ اس کا خوف یا ندامت ضعیف ہو یا قوی، لیکن گناہ میں اسے جس قدر لذت ملتی ہے اتنا زیادہ خوف نہیں ہوتا، جمل غفلت اور دوسرے اسباب کی بنا پر خوف و ندامت کا محرک کمزور اور شہوت کا محرک طاقتور ہوتا ہے، اگرچہ ندامت رہتی ہے لیکن وہ اتنی مضبوط نہیں ہوتی کہ شہوت پر غالب آسکے، اگر آدمی شہوت کی طاقت سے بچا رہے اور خوف کے مقابلہ میں شہوت ضعف پر جائے تو خوف شہوت پر غالب آجائے گا اور نتیجہ یہ ہوگا کہ آدمی معصیت ترک کر دے گا۔

کبھی فاسق کو شراب کی اتنی زبردست خواہش ہوتی ہے کہ وہ اس سے مبرا نہیں کہتا، لیکن غیبت میب جوئی، اور نامحرم عورتوں کی طرف دیکھنے اور اسی طرح کے دوسرے گناہوں کی طرف ذرا میلان نہیں رکھتا، اسکے دل میں خوف بھی ہوتا ہے، لیکن اتنا قوی نہیں ہوتا کہ شراب جیسے گناہوں کا استعمال کر سکے البتہ اس درجے کا خوف ضرور ہوتا ہے کہ ضعیف رغبتوں اور شہوتوں پر قابو پاسکے اور ان گناہوں کا استعمال کر سکے جن کی رغبت کم ہوتی ہے، ایسا شخص یہ سوچتا ہے کہ اگر شیطان غلبہ شہوت کی وجہ سے مجھ پر غالب ہو گیا ہے اور اس کی تحریک سے بعض بڑے گناہ مجھ سے سرزد ہو جاتے ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں اپنے نفس کی حمان پورے طور پر اس کے سپرد کر دوں، بلکہ بعض گناہ ایسے ہیں جن کے سلسلے میں میں نفس سے مجاہدہ کر سکتا ہوں، اور اپنے مجاہدے سے شیطان پر غلبہ پاسکتا ہوں، ہو سکتا ہے بعض معمولی گناہوں کے خلاف میرا مجاہدہ ہی بعض بڑے گناہوں کا کفارہ بن جائے، اگر فاسق اس طرح نہ سوچے تو پھر اس کے لئے نماز اور روزے میں بھی کوئی رغبت نہ ہو، اگر اس سے یہ کہا جائے کہ تو نماز روزہ کرتا ہے اگر یہ غیر اللہ کیلئے ہے تو ناجائز ہے، اور اللہ کے لئے ہے تو ترک فسق بھی اللہ کے لئے ہے، جب تو نماز پڑھتا ہے تو تجھے گناہ بھی نہ کرنے چاہئیں، کیونکہ جس طرح اللہ نے نماز پڑھنے اور روزہ رکھنے کا حکم دیا ہے اسی طرح گناہ نہ کرنے کا حکم بھی دیا ہے، یہ عجیب بات ہے کہ تو نماز سے اللہ کا تقرب حاصل کرتا ہے، اور ترک فسق سے حاصل نہیں کرتا، اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر وہ حکم نازل کئے ہیں، ایک اطاعت کا دوسرے ترک معصیت کا، اگر میں دونوں حکم نہ مانوں تو مجھ پر بیک وقت دو عذاب ہوں گے، ایک

اطاعت نہ کرنے کا، دوسرا معصیت کرنے کا، جب کہ میں ان میں سے ایک عذاب دفع کرنے پر قادر ہوں اور اطاعت کر کے ایک معاملے میں شیطان کو شکست دینے کی قدرت رکھتا ہوں، مجھے امید ہے کہ ایک معاملے میں میرا مجاہدہ دوسرے معاملے میں میری تقصیر کا کفارہ بن جائے گا، اس جواب کے درست ہونے میں کوئی شبہ نہیں، ہر مسلمان کا یہی حال ہے، ہمیں کوئی ایسا مسلمان نظر نہیں آتا جو معصیت و طاعت کا جامع نہ ہو، اس کی وجہ یہی ہے، جو ہم نے بیان کیا کہ طاعت معصیت کا کفارہ بن جاتی ہے، اگر یہ بات سمجھ میں آگئی تو پھر یہ حقیقت بھی سمجھ میں آجانی چاہیے کہ بعض گناہوں میں خوف کا شہوت پر غالب آنا، اور بعض میں خوف پر شہوت کا غالب آنا ممکن ہے، نیز یہ کہ خوف اگر ماضی کے فعل پر ہو تو یہ نہ امت کا موجب ہوتا ہے، اور نہ امت سے عزم پیدا ہوتا ہے، حدیث شریف میں ہے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ اَلْتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَا ذَنْبَ لَهُ (۱) نہ امت توبہ ہے۔

اس حدیث میں یہ شرط نہیں کہ تمام گناہوں پر نادم ہونا چاہیے۔ اسی طرح ایک حدیث میں ہے۔

اَلْتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَا ذَنْبَ لَهُ (۲)

گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہے جیسے وہ شخص جس نے کوئی گناہ نہ کیا ہو۔

اس حدیث میں بھی تمام گناہوں سے توبہ کرنے کا ذکر نہیں ہے، اس تفصیل سے مذکور بالا قول ساقط ہو جاتا ہے کہ دو ملکوں میں سے ایک ملک کی شراب سے توبہ کرنی غیر ممکن ہے، کیونکہ ان دونوں کا حال شہوت اور اللہ تعالیٰ کی ناراضگی میں گرفتار کرنے میں یکساں ہے، البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ آدمی شراب سے توبہ کر لے اور نیزہ سے نہ کرے، اسلئے کہ اللہ تعالیٰ کے غضب کے اعتبار سے دونوں میں فرق ہے، اسی طرح یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بہت سے گناہوں سے توبہ کرے، اور تھوڑے گناہوں سے نہ کرے، کیونکہ گناہوں کی زیادتی عذاب کی زیادتی میں مؤثر ہوتی ہے، اس لئے جب عذاب کی زیادتی کا خوف ہوتا ہے تو بعض شہوتیں چھوڑ دیتا ہے اور وہ خواہشیں نہیں چھوڑتا جن میں خوف خدا غالب نہیں ہوتا، جیسے کوئی ڈاکٹر اپنے کسی مریض کو کوئی مخصوص پھل کھانے سے روک دے تو وہ تھوڑا سا کھانے پر جرأت کر لیتا ہے، البتہ زیادہ کھانے سے ڈرتا ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ یہ بات غیر ممکن ہی ہے کہ آدمی ایک چیز سے توبہ کرے اور اس جیسی دوسری چیز سے توبہ نہ کرے، بلکہ یہ ضروری ہے کہ جس چیز سے توبہ کی ہے وہ اس چیز کے مخالف ہو جس سے توبہ نہیں کی، خواہ یہ مخالفت شدت معصیت میں ہو یا قلیۃ شہوت میں اور جب یہ فرق توبہ کرنے والے کے اعتقاد میں موجود ہے تو اسی کے مطابق خوف اور نہ امت میں اس کا حال بھی مختلف ہوتا ہے، اور اسی بنیاد پر ترک عمل کا حال بھی مختلف ہوتا ہے، بہر حال اگر کوئی شخص اپنے گناہ پر نادم ہو، اسے ترک کرنے کا عزم کرے، اور اس عزم کو مکمل کر دے تو وہ ان لوگوں کے دائرے میں آجائے گا جن سے وہ گناہ سرزد نہیں ہوا ہے، اگرچہ اس نے باقی تمام ادا امر و نواہی میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت نہ کی ہو۔

عنین کی زنا سے توبہ : یہاں یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ کیا اس عنین کی توبہ صحیح مانی جائے گی، جس نے یہ مرض لاحق ہونے سے پہلے زنا کیا تھا اور یہ مرض لاحق ہونے کے بعد توبہ کر رہا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس کی توبہ صحیح نہ ہوگی، اسلئے کہ توبہ اس نہ امت کو کہتے ہیں جس سے ایسے افعال کے ترک کا عزم ہو، جن پر قدرت ہے، جن افعال پر قدرت ہی نہیں رہی وہ اسکے توبہ کرنے سے نہیں چھوٹے، بلکہ خود بخود معدوم ہو گئے، البتہ میں یہ کہتا ہوں کہ اگر نامروی کا مرض لاحق ہونے کے بعد اس پر زنا کے نقصانات اس طرح واضح ہوئے کہ اگر تندرستی کی حالت میں اس طرح واضح ہوتے تو وہ شدت شہوت اور غلبہ خواہش کے باوجود اس فعل شنیع سے بچتا تو امید یہ ہے کہ اس کی توبہ قبول ہوگی اور اس گناہ کا کفارہ بن جائے گی، اس لئے کہ اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ اگر وہ نامروی سے پہلے زنا کے بعد اس حال میں توبہ کرنا کہ نہ اسے قضاء شہوت کے اسباب میسر ہوتے اور نہ نفس میں شہوت کی آگ شعلہ زن ہوتی ہے اور توبہ کے بعد مر جاتا تو یقیناً نائبین میں شمار ہوتا اس لحاظ سے کہ اس کی نہ امت اس درجے پر ہوتی جہاں آدمی فعل کے قصد سے رک

جاتا ہے، اور قصد ہو تو اس پر عمل سے باز رہتا ہے، ہو سکتا ہے نامرد کے حق میں بھی ندامت اس درجے کو پہنچ جائے، اگرچہ اسے معلوم نہ ہو، عام طور پر آدمی جس فعل پر قادر نہیں ہو تا وہ اپنے دل کے معمولی خوف سے یہ سمجھ لیتا ہے کہ اسکے ترک میں میرے عزم یا ندامت کو دخل ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ اسکے دل کی کیفیات، اور ندامت کی مقدار سے اچھی طرح واقف ہے، ہو سکتا ہے کہ عین کی توبہ قبول ہو جائے ظاہر تو یہی ہوتا ہے کہ توبہ قبول ہو جائے کی حقیقت سے اللہ واقف ہے۔

دل نے معصیت کی ظلمت کیسے دور ہو : اس تمام محکمہ کا حاصل یہ ہے کہ دل سے معصیت کی ظلمت دو چیزوں سے دور ہوتی ہے، ایک آتش ندامت سے، اور دوسری مستقبل میں ترک عمل پر مجاہدے کی شدت سے، اور عین کی جو صورت فرض کی گئی ہے، اس میں عدم شہوت کی وجہ سے مجاہدے کا پہلو کمزور ہے، البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ اس کی ندامت قوی ہو، اور اتنی قوی ہو کہ مجاہدے کے بغیر ہی دل سے گناہ کی تاریکی زائل کر دے۔ اگر ایسا نہ ہو تو پھر یہ کہنا پڑے گا کہ توبہ کرنے والے کی توبہ اس وقت قبول ہوتی ہے جب گناہ کرنے کے بعد وہ کچھ دنوں تک زندہ رہے، اور اس عرصے میں اس گناہ کا چند بار تصور کر کے مجاہدے کے ذریعہ اپنے نفس کو اس سے روکے، حالانکہ شریعت نے یہ شرط عائد نہیں کی ہے۔

دونوں میں سے کون افضل ہے : اس تفصیل کے بعد دو ایسے شخص تصور کئے جاسکتے ہیں جن میں سے ایک کا دل گناہ کی رغبت سے خالی ہو چکا ہے، اور دوسرے کے دل میں شہوت باقی ہے، لیکن وہ نفس پر مجاہدہ کرتا ہے اور اسے شہوت پر عمل نہیں کرنے دیتا، ان دونوں میں کون افضل ہے، وہ شخص جس کے دل میں شہوت باقی نہیں رہیں، وہ محض پچھلے گناہوں پر نادم ہے یا وہ شخص جو شہوات کے ہتھیار سے مسلح ہونے کے باوجود نفس کو گناہ کے دوبارہ ارتکاب سے روکتا ہے؟ اس سوال کے جواب میں اختلاف ہے، احمد ابن ابی الحواری، اور ابو سلیمان دارانی اور ان کے رفقاء مجاہدے کی فضیلت کے قائل ہیں، کیونکہ اس کی توبہ میں مجاہدے کی آمیزش ہے، علماء بصرہ کے نزدیک شخص افضل ہے، اسلئے کہ اگر وہ توبہ میں کسی وجہ سے سستی بھی کرے تب بھی وہ گناہ پر قادر نہ ہونے کی وجہ سے نجات و سلامتی سے زیادہ قریب ہے، جب کہ دوسرے تائب کے ساتھ مجاہدے کی شرط ہے اگر وہ اس میں سستی کر بیٹھا تو کہیں کا نہ رہے گا، یہ دو قول ہیں، کچھ نہ کچھ سچائی دونوں میں ہے، لیکن کمال حقیقت کسی ایک قول میں بھی نہیں۔

اس سلسلے میں تحقیقی بات یہ ہے کہ جس شخص کے دل میں گناہ کی خواہش اور رغبت باقی نہیں رہی اس کی دو صورتیں ہیں، ایک تو یہ کہ نفس شہوت میں ضعف کی وجہ سے گناہ کی طرف میل نہیں رہا، اس شخص سے مجاہدہ کرنے والا ہر صورت افضل ہے کہ اس سے اپنے نفس پر مجاہدہ کر کے گناہ ترک کیا ہے جب کہ دل گناہ پر آمادہ ہے، یہ مجاہدہ اس کی قوت نفس اور شہوت پر دین کی حکومت پر دلالت کرتا ہے، یہ عین اور قوت دین دونوں کی دلیل بھی ہے قوت دین سے ہماری مراد وہ قوت ارادی ہے جو قوت عین کے پہلو سے جنم لیتی ہے، اور اس شہوت کا قلع قمع کر دیتی ہے، جو شیطان کی تحریک اور اس کے اشارے پر سر اٹھاتی ہے، یہ مجاہدہ ان دونوں قوتوں پر دلالت کرتا ہے، کہنے والے کا یہ کہنا صحیح ہو سکتا ہے کہ وہ گناہ پر قادر نہ ہونے کی وجہ سے سلامتی سے قریب ہے، لیکن اس کے لئے افضل کا معنی استعمال کرنا مناسب نہیں، گناہ پر قادر نہ ہونے والے کو گناہ پر قدرت رکھنے والے سے افضل کہنا ایسا ہی ہے جیسے نامرد کو مرد پر فضیلت دی جائے کیونکہ وہ شہوات کے خطرے سے محفوظ ہے، یا بچے کو بالغ پر فوقیت دی جائے، کیونکہ اسے گناہوں کا کوئی خطرہ نہیں ہے، یا مفلس کو اس بادشاہ سے افضل کہا جائے جو اپنی قوت و شوکت سے دشمنوں کو شکست دیدے، اور دلیل دی جائے کہ مفلس کا کوئی دشمن ہی نہیں ہو تا کہ شکست و فتح کے مرحلے سے گزرے، جب کہ بادشاہ اپنی تمام تر قوت و شوکت کے باوجود کبھی شکست سے بھی ہم کنار ہو سکتا ہے، یہ باتیں وہ لوگ کرتے ہیں جو سیدھا سچا دل رکھتے ہوں، ان کی نظر صرف ظاہر ہو، وہ حقائق کی معرفت نہ رکھتے ہوں، اور یہ نہ جانتے ہوں کہ عزت و خطرات سے دوچار ہونے میں ہے، اور بلندی اس وقت حاصل ہوتی ہے جب آدمی خوفناک وادیوں سے بچ کر منزل پر پہنچ جائے، اگر تم عاجز کو مجاہدے فضل کہتے ہو تو تمہیں یہ بھی کہنا چاہیے کہ وہ شخص جس کے پاس شکار کے لئے نہ کتا ہے اور نہ گھوڑا وہ فن شکار میں اس شکاری سے افضل ہے جس کے پاس کتا بھی ہے اور گھوڑا بھی، کیونکہ وہ

گھوڑے کی سرکشی اور اس پر سوار ہو کر زمین پر گرنے اور اپنی ہڈیاں تروانے کے خطرے سے محفوظ ہے، نیز اسے کتے کے کاٹنے اور حملہ آور ہونے کا بھی کوئی خطرہ نہیں ہے، ایسا گنا محض نادانی ہے بلکہ وہ شکاری جو گھوڑا اور کتا رکھتا ہو، طاقتور ہو، ان جانوروں کی تربیت اور انھیں اپنے مقاصد میں استعمال کرنے کے طریقے سے واقف ہے وہ یقیناً شکار کے فن میں اس سے اعلیٰ ہوگا۔

گناہ پر قدرت رکھنے والے کی دو سری حالت یہ ہے کہ اسکے دل سے گناہ کی رغبت، مشغولیت کے ضعف کی وجہ سے دور نہ ہوئی ہو، بلکہ اس میں زبردست قوت یقین ہو، یا ماضی میں اتنا شدید مجاہدہ اس نے کیا ہو کہ اب شہوات میں بیجان اور اشتعال ہی نہ ہوتا ہو، اس کی تمام تر شہوات اور خواہشات شریعت کے بنائے ہوئے سانچوں میں ڈھل گئی ہوں، شریعت کے اشارے پر حرکت میں آتی ہوں، اور اسی اشارے پر پرسکون ہو جاتی ہوں، یہ محض یقیناً اس مجاہد سے افضل ہے جو شہوت کا قلع قمع کرنے اور اس کے بیجان پر قابو پانے کے لئے سخت ترین جدوجہد کرتا ہے۔

مجاہدہ مقصود نہیں ہے : جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ مجاہد کے ساتھ مجاہدے کی زیادتی ہے ایسے لوگوں کو مجاہدے کے مقصد سے واقفیت نہیں ہوتی ہے، ورنہ ایسا نہ کہتے، حقیقت یہ ہے مجاہدہ بذات خود مقصود نہیں ہے، بلکہ اس کے ذریعہ دشمن سے نفس کا دفاع کیا جاتا ہے، تاکہ وہ نفس کو اپنی طرف نہ کھینچ سکے اور اگر کھینچنے سے عاجز ہو تو دین کا راستہ مسدود نہ کر سکے، بہر حال اگر کسی نے مجاہدہ کیا اور دشمن پر غلبہ پالیا تو یہ اس کی فتح ہے، لیکن اگر اس پر غلبہ پانے کی جدوجہد جاری ہے تو فتح کا مرحلہ دور ہے اسکی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص دشمن پر غالب آجائے، اور اسے اپنا غلام بنائے، اسکے برعکس دو سرا شخص اپنے دشمن سے ابھی بڑھیکار ہے، اور یہ نہیں جانتا کہ میں اس سے کس طرح نجات پاؤں گا ظاہر ہے اس مثال میں پہلا شخص دوسرے سے افضل ہے کہ اس نے اپنے دشمن کو مقہور کر لیا ہے دو سرا جہاد میں مصروف ہے، اسی قسم کی دو سری مثال یہ ہے کہ ایک شخص اپنے کتے اور گھوڑے کو اتنا سدھارے کہ اسے ان کی سرکشی سے کوئی خطرہ نہ ہو، جب کہ دو سرا شخص انھیں تربیت دینے اور سدھانے میں مشغول ہو۔ ظاہر ہے ان دونوں میں بھی پہلا افضل ہے۔

اصل میں یہاں قسم کی غلطی ہوئی ہے، لوگ یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ مقصود صرف مجاہدہ کرتا ہے، جب کہ مقصود یہ ہے کہ مجاہدے کے ذریعہ راہ راست کی رکاوٹیں دور کی جاسکیں، اسی طرح بعض لوگوں نے یہ گمان کیا کہ مجاہدے سے مقصود یہ ہے کہ شہوات کا قلع قمع کر دیا جائے اور انھیں نفس کی سطح سے کھینچ کر پھینک دیا جائے، انھوں نے اپنے نفسوں کی اسی نقطہ نظر سے آزمائش کی، اور جب انھیں آزمائش میں ناکام پایا تو یہ کہنے لگے کہ نفسوں سے شہوات کا دور ہونا ایک محال بات ہے، نادانی میں شریعت کو جھوٹا کہنے لگے، اباحت کی راہ پر چلنے لگے اور شہوات کی اتباع میں نفس کی عنان پورے طور پر ڈھیلی کر بیٹھے، یہ تمام باتیں جہالت اور گمراہی کی ہیں، کتاب ریاضۃ نفس میں ہم نے اس موضوع پر تفصیل سے گفتگو کی ہے۔

افضلیت میں ایک اور اختلاف : یہاں ایک اختلاف اور ہے، اور وہ یہ ہے کہ ایک شخص توبہ کر کے اپنا گناہ بھول جاتا ہے، اسے کبھی یاد نہیں آتا کہ ماضی میں اس سے کوئی گناہ سرزد ہوا ہے، ایک اور شخص ہے وہ بھی اپنے گناہ سے تاب ہو چکا ہے لیکن اسے اپنا گناہ اکثر یاد آتا ہے، اور جب بھی یاد آتا ہے دل میں عراست کی آگ روشن کر دیتا ہے، ان دونوں میں کون سا شخص افضل ہے؟ اسکے جواب میں بھی علماء کا اختلاف ہے، بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ توبہ کی حقیقت یہ ہے کہ گناہ ہر وقت تمہارے سامنے رہے، بعض لوگوں کے نزدیک گناہ کو بھول جانے اور مٹا دینے کا نام توبہ ہے، ہمارے نزدیک یہ دونوں رانیں حق ہیں مگر یہ دونوں دو حالتوں سے متعلق ہیں، صوفیوں کے کلام میں ہمیشہ قصور رہتا ہے، کیونکہ عام طور پر وہ لوگ اپنے نفسوں کا حال بیان کرتے ہیں، دوسروں کے حالات سے انھیں کوئی غرض نہیں ہوتی، جب کہ احوال کے اختلاف سے جواب بھی مختلف ہو جاتے ہیں، علمی نقطہ نظر سے صوفیوں کی یہ عادت مناسب نہیں ہے، بلکہ نقصان کا باعث ہے، آدمی جب کسی بات کا جواب دے، تو اس کی نظر اس مسئلے کے تمام پہلوؤں پر

ہونی چاہیے، تاکہ سامع کا ذہن غل نہ ہو، یہ علمی نقطہ نظر کی بات ہے، اگر صحت اور ارادے کے پہلو سے غور کیا جائے تو یہ عادت مناسب لگتی ہے، کیونکہ جب آدمی کی نظر اپنے نفس پر ہوگی، تو وہ کسی دوسرے کے حال پر متوجہ نہیں ہوگا، اسکا نفس اللہ تک پہنچنے کا راستہ ہے، اور اسکے مختلف حالات و کیفیات راستے کی منزلیں ہیں، جب آدمی کسی منزل کیلئے پایہ رکاب ہوتا ہے، تو اسے دوسرے کے حال سے دلچسپی نہیں ہوتی، بلکہ اس کی تمام تر توجہ اپنے سفر، اپنی منزل، راستے کی صعوبتوں اور دشواریوں پر رہتی ہے، کبھی اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کا راستہ علم ہوتا ہے، کیونکہ اس کی طرف جانے کے راستے بے شمار ہیں، بعض میں اختصار ہے، اور بعض میں طوالت، لیکن اصل ہدایت سب میں ہے، اور یہ اللہ جانتا ہے کہ سب سے زیادہ ہدایت کا راستہ کون سا ہے۔

اس تمہید کے بعد ہم کہتے ہیں کہ گناہ کا تصور، اسکا ذکر اور اس پر تکلیف کا احساس مبتدی کے حق میں کمال ہے، اسلئے کہ اگر وہ گناہ بھول گیا تو نفس میں سوزش بھی نہیں ہوگی، اور اسکی وجہ سے اسکا ارادہ بھی قوی نہ ہوگا اور نہ راہ سلوک طے کرنے کا شوق پیدا ہوگا، اگر گناہ یاد رہے گا تو کم از کم یہ خیال ضرور رہے گا کہ اس کا اعادہ نہ ہو، یاد رکھنا کامل کیلئے نہ صرف یہ کہ بہتر نہیں ہے، بلکہ باعث نقصان ہے۔ اسلئے کہ یاد رکھنا بھی ایک مشغل ہے جو راہ حق پر چلنے میں رکاوٹ بن سکتا ہے، سالک کی تمام تر توجہ اپنے سفر پر مرکوز رہنی چاہیے، جب اسے منزل پر پہنچنے کی علامات نظر آنے لگیں، اور مطلع غیب سے معرفت کے انوار پھوٹنے لگیں گے، تو وہ اپنے پورے وجود کے ساتھ ان میں مستغرق ہو جائے گا، پھر اسکی توجہ اپنے سابقہ احوال پر نہیں رہے گی، اور نہ منزل پر پہنچنے کے بعد اسکی گنجائش رہتی ہے، کمال کے معنی یہ ہیں کہ آدمی اپنے موجودہ حال میں اتنا مستغرق ہو کہ کسی دوسری جانب توجہ ہی نہ رہے، بلکہ اگر مسافر کے راستے میں کوئی ایسی نہر پڑے جس کا پل خود اس نے توڑ دیا تھا، اب وہاں حیران و پریشان کھڑا ہے، کیا کرے، کس طرح یہ نہر عبور کرے، مایوس ہو کر روئے بیٹھ جائے، اور اپنے سابقہ روئے پر نادم ہو کہ اگر پل نہ توڑا ہوتا تو میں آج کسی دشواری کے بغیر دوسرے کنارے پر پہنچ جاتا، مسافر کے لئے یہ روٹا دھوٹا، اور پل توڑنے پر افسوس کر کے بیٹھنا بھی ایک امر مانع ہے، اس سے خواہ مخواہ سفر میں تاخیر ہوگی اور منزل تک دیر سے پہنچے گا، ہاں اگر ایسا وقت ہے کہ اب سفر جاری نہیں رکھا جاسکتا، مثلاً رات کا وقت ہے جس میں سفر کرنا خطرناک ہے یا کوئی اور دشواری ہے جو سفر جاری رکھنے میں مانع ہے، اس صورت میں ٹوٹے ہوئے پل کے پاس بیٹھ کر روئے میں کوئی مضائقہ نہیں، تاکہ گریہ و زاری سے اسکا یہ عزم مزید بخت ہو جائے کہ آئندہ پل نہ توڑوں گا۔ یہ امور ہم نے کتاب العلم میں اور احیاء العلوم کی جلد ثالث میں بیان کئے ہیں۔

ہمارے نزدیک وہ امر تبرک ہے کہ یہ مشغل بھلا آدمی آخرت کی نعمتوں کے بارے میں یاد کو زیادہ سوچتا ہے، تاکہ اسکی غربت شوق میں اضافہ ہو جائے، لیکن جانا آدمی کیلئے آخرت کی نعمتوں کے لئے یہ مشغل بھلا آدمی آخرت کی نعمتوں کے بارے میں یاد کو زیادہ سوچتا ہے، تاکہ اسکی غربت شوق میں اضافہ ہو جائے، لیکن جانا آدمی کیلئے حقیقت سے مجازی کی طرف بھی مڑ سکتا ہے، اس کے لئے زیادہ بہتر یہ ہے کہ صرف اللہ تعالیٰ کے دیدار کی لذت کو اپنے فکر کا محور بنائے، کیونکہ یہ ہی ایک نعمت ایسی ہے جس کی دنیا میں کوئی نظیر نہیں ہے، جس طرح آخرت کی نعمتوں میں زیادہ غورو فکر کرنے سے مبتدی دنیاوی نعمتوں میں الجھ سکتا ہے، اسی طرح مبتدی کے حق میں گناہوں کو زیادہ یاد کرنا بھی نقصان کا باعث بن سکتا ہے، اس طرح اس کے شہوانی جذبات بھڑک سکتے ہیں اور گناہوں کی طرف میلان ہو سکتا ہے، اس اعتبار سے مبتدی کے حق میں بھی بھول جانا ہی بہتر ہے۔

حضرت داؤد علیہ السلام کے واقعے سے استدلال : ہو سکتا ہے کہ تم ہماری اس تحقیق کو تسلیم کرنے سے انکار کر دو، اور حضرت داؤد علیہ السلام کے واقعے سے استدلال کرو کہ انھوں نے اپنے گناہ پر گریہ کیا تھا، ہم یہ کہتے ہیں کہ انبیاء کے نفوس کو اپنے نفوس پر قیاس کرنا کم عقلی اور کم فہمی کی دلیل ہے، کیونکہ انبیاء علیہم السلام بعض اوقات اپنے اقوال و افعال میں وہ اسلوب اختیار کرتے ہیں، جو ان کی امت کے حال کے مناسب ہو، کیونکہ وہ امت کی رہنمائی اور اس کی تربیت کے لئے مبعوث ہوتے ہیں، اسلئے وہ اپنے قول و فعل میں اپنی شان سے اتر کر اتنی کمی کر دیتے ہیں، جو امت کی شان کے مطابق اور اس کے لئے مفید ہو، ہم نے بہت سے مشائخ ایسے دیکھے ہیں جو اپنے مرید کو وہ ریاضت نہیں بتلاتے جو خود کرتے ہیں، جب کہ انھیں اسکی ضرورت بھی نہیں

ہوتی کہ کوئی ریاضت کریں، کیونکہ وہ مجاہدہ نفس سے فراغت پانچے تھے، مگر وہ ایسا اس لئے کرتے تھے تاکہ مرید کے لئے سلوک کا معاملہ سہل ہو جائے۔ اسی بنا پر حدیث شریف میں ہے، سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

أَمَّا أَنِّي لَا أَتَنَسَّى وَلَكِنِّي أَتَنَسَّى لِأَشْرَعِ (مؤطا امام مالک مرسل)

میں خود نہیں بھولتا بھلا دیا جاتا ہوں تاکہ امت کے لئے سہل ہو جائے۔

یہ روایت نماز وغیرہ کے متعلق ہے کہ کبھی کبھی آپ رکوع، سجدہ یا قعدہ وغیرہ بھول جاتے تھے، پھر اس کی سجدہ سہو اور اعادہ نماز سے طہائی کیا کرتے تھے، ایک روایت میں ہے۔

إِنَّمَا أَسْهَوُ لَا أُنْسَى (بخاری۔ ابو ہریرہ)

میں اس لئے بھولتا ہوں تاکہ سنت مقرر کروں۔

ظاہر ہے اگر آپ کو نماز میں سہو نہ ہوتا تو ہمیں سو کے مسائل کیسے معلوم ہوتے اور امت پریشانی میں مبتلا ہو جاتی جب کہ امت اپنے نبی کے سایہ رحمت میں ایک بچے کی طرح ہوتی ہے جیسے اپنے باپ کا سایہ عاطفت حاصل ہو یا اس چوپائے کی طرح ہوتی ہے جسے چرواہے کی حفاظت و حمایت میں سر ہو، عام طور پر مشاہدہ کیا جاتا ہے کہ جب باپ اپنے بچے کو بولنا سکھاتا ہے تو خود بھی اسی طرح کی آواز نکالتا ہے، عام حالات میں اگر وہ اس طرح کی آوازیں نکالے تو لوگ اسکی نفی اڑائیں گے اور بے وقوف کہیں، ایک مرتبہ حضرت حسنؑ نے صدقے میں آیا ہوا چھوڑا ہوا اٹھا کر منہ میں رکھ لیا آپ نے ان سے فرمایا کرا (جھی جھی) حالانکہ یہ الفاظ فصاحت نبوی کے خلاف تھے، اگر حسنؑ بچے نہ ہوتے اور ان کے فہم کے مطابق کلام مقصود ہوتا تو آپ ان سے کرا کے بجائے یہ فرماتے کہ یہ چھوڑا پھینک دو کیونکہ یہ صدقہ کا ہے اور صدقہ ہمارے لئے حرام ہے، لیکن آپ جانتے تھے کہ حسنؑ اپنی صغیر کے باعث یہ بات نہیں سمجھ سکتے، اسلئے آپ نے اپنے درجہ فصاحت سے اتر کر تو تلی زبان میں خطاب فرمایا۔ اسی طرح جب بکری یا پرندے وغیرہ کو کوئی بات سکھانی ہوتی ہے تو معلم کو جانوروں ہی کے لہجے میں بولنا پڑتا ہے، یہ اہم ترین دقائق ہیں اس طرح کے مقامات میں عارفین کے قدم لغزش کھاجاتے ہیں، فافلوں کی تو کیا حیثیت ہے، اس لئے تم غفلت سے بچو، ہم اللہ تعالیٰ سے حسن توفیق کے طالب ہیں۔

دوامِ توبہ میں لوگوں کی قسمیں

پہلی قسم : جاننا چاہیے کہ توبہ کرنے والوں کے چار طبقے ہیں، ان میں سے پہلا طبقہ ان گنہگاروں کا ہے جو گناہ سے تائب ہوں، اور اخیر عمر تک اپنی توبہ پر قائم رہیں، ماضی میں جو قصور واقع ہوا ہے، اس کی طہائی کریں، اور دوبارہ اس گناہ کے ارتکاب کا تصور تک نہ کریں، سوائے ان لغزشوں کے جن سے نبی کے علاوہ کوئی انسان محفوظ نہیں ہے، یہ استقامت علی التوبہ ہے، اس طبقے کے تائبین کے بارے میں کہا جائے گا کہ یہ اپنی استقامت اور ثبات قدمی سے نیک کاموں میں آگے نکل گئے، اور انھوں نے گناہوں کے عوض نیکیاں حاصل کر لیں، اس توبہ کا نام توبتا المنوح ہے اور ایسے تائب کو نفس مطمئنہ کہتے ہیں، جو اپنے رب کی طرف اس حال میں جائے گا کہ رب اس سے خوش ہوگا، اور وہ رب سے خوش ہوگا، حدیث شریف میں ایسے ہی نیک نفوس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

سَبَقَ الْمُفْتَرُونَ الْمُسْتَهْزِئُونَ بِذِكْرِ اللَّهِ تَعَالَى، وَضَعِ الذِّكْرُ عَنْهُمْ أَوْزَارَهُمْ
فَوَرَدُوا الْقِيَامَةَ خِيفًا (ترمذی۔ ابو ہریرہ)

مفتر یعنی اللہ تعالیٰ کے ذکر کے شائق آگے بڑھ گئے ذکر کرنے کے بوجھ (گناہوں کے) اتار دیئے ہیں چنانچہ

وہ لوگ قیامت کے دن ہلکے ہلکے ہونگے۔

اس حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ ان پر گناہوں کا بوجھ تھا، لیکن ذکر کی کثرت اور اس عمل پر استقامت نے ان کا بوجھ ہلکا کر دیا، اب وہ ہلکے ہلکے ہو چکے ہیں، اور قیامت کے دن اسی حال میں وارد ہوں گے، پھر اس طبقے میں بھی شہوات کی طرف میلان کے اعتبار سے مختلف مراتب ہوں گے، بعض وہ لوگ ہوں گے جن کی شہوات معرفت کے قبر میں دب گئیں، اب ان کے دلوں میں شہوات کا

کوئی نزاع نہ رہا، اور نہ راہ سلوک میں ان سے مزاحمت باقی رہی، بعض وہ ہیں جن کے نفس سے شہوات کا نزاع باقی ہے، اور وہ ان کے خلاف مجاہدہ کرنے اور انہیں دور کرنے میں دیر تک کوشاں رہتے ہیں، پھر نزاع کی کیفیات بھی قلت و کثرت مدت اور نوع لے اعتبار سے مختلف ہیں، عمر کی بیشی سے بھی درجات مختلف ہو جاتے ہیں، بعض ایسے ہیں جو توبہ کرتے ہی موت کی آغوش میں پہنچ جاتے ہیں، ان کا حال اسلئے قابل رشک ہوتا ہے کہ انتہائی سلامتی کے ساتھ راستے کے کانٹوں میں الجھے بغیر رخصت ہو گئے، اور توبہ میں کوئی رخنہ نہ پڑا، بعض لوگ توبہ کے بعد بھی مہلت نفس پاتے ہیں، ان کا جہاد اور صبر طویل ہو جاتا ہے، توبہ پر استقامت سے ان کی حسرت بڑھتی ہیں، ان کی حالت انتہائی اعلیٰ ہے کہ جتنے گناہ تھے نیکوں سے محو ہو گئے، بعض علماء کہتے ہیں کہ کسی گناہ کی توبہ اس وقت تک قبول نہیں ہوتی جب تک گناہ کرنے والا اس پر دس بار قدرت نہ پائے اور ہر بار اللہ کے خوف کی بنیاد پر اسکے ارتکاب سے نہ رکے، اگرچہ یہ شرط بعید از قیاس ہے، لیکن اگر لوگ اس سچ پر مجاہدہ کرنے لگیں تو اس کے اثرات دور رس اور دیر پا ہوں گے، پھر بھی کمزور مرید کے لئے مناسب نہیں کہ وہ یہ طریقہ اختیار کرے کہ پہلے تصورات کے ذریعے شہوات میں پہچان بپا کرے پھر ان پر قابو پائے، ہو سکتا ہے کہ کمزوری کے باعث اسکے قدم ڈکھا جائیں، اور معاملہ اسکے اختیار سے باہر نکل جائے، اور توبہ توڑ کر گناہ میں مبتلا ہو جائے بلکہ ایسے شخص کو جسے ممکنہ کا خطرہ ہو ابتداء میں یہ کوشش کرنی چاہیے کہ جو اسباب گناہ کی تحریک کرتے ہوں، ان سے گریز کرے، اور نفس پر ان کے راستے مسدود کر دے اور اسکے ساتھ شہوت توڑنے کی کوشش کرے تاکہ اس کی توبہ ابتداء ہی میں محفوظ ہو جائے۔

دوسری قسم : ان توبہ کرنے والوں کی ہے جو اہم ترین اطاعت میں استقامت کا راستہ اپناتے ہیں اور تمام کبیرہ گناہ ترک کر دیتے ہیں، تاہم ایسے گناہوں سے دامن نہیں بچا پاتے جو ان سے قصد و ارادہ کے بغیر سرزد ہوتے ہیں، اگرچہ پہلے سے ان کے ارتکاب کا عزم نہیں ہوتا، لیکن جب بھی ان سے کوئی گناہ سرزد ہوتا ہے وہ اپنے نفس کو ملامت کرتے ہیں، شرمندہ ہوتے ہیں، اور یہ عزم کرتے ہیں کہ ہم ان اسباب سے محفوظ رہنے کی کوشش کریں گے جو گناہ پر آمادہ کرتے ہیں، ایسے نفس کو نفسِ توامہ کہتے ہیں، کیونکہ یہ ان احوال ذمہ پر اپنے نفس کو ہدف ملامت بناتا ہے، جو اس پر قصد و ارادہ کے بغیر طاری ہو جاتے ہیں، پہلے طبقے کے لوگ ہر حیثیت سے اعلیٰ تھے، لیکن اس طبقے کے افضل ہونے میں بھی کوئی شبہ نہیں ہے، اگرچہ پہلے طبقے سے رتبے میں کم ہے، اکثر تائبین کا حال ایسا ہی ہوتا ہے، اسلئے کہ شر آدمی کی سرشت میں داخل ہے، اور اس کے خیر میں شامل ہے، اس سے بچتا قریب قریب محال ہے، تاہم انسان اتنا کر سکتا ہے کہ شر کے مقابلے میں خیر کے کام زیادہ کرے، تاکہ نیکوں کا پلڑا بھاری ہو جائے، اس سے معلوم ہوا کہ نیکوں کا پلڑا بھاری تو ہو سکتا ہے، لیکن برائی کا پلڑا بالکل خالی ہو جائے ایسا ہونا مشکل ہے، ایسے لوگوں کے لئے اللہ رب العزت نے مغفرت کا وعدہ فرمایا ہے۔

الَّذِينَ يَجْتَنِبُونَ كَبَائِرَ الْإِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ إِلَّا اللَّهَمَّ إِنَّ رَبَّكَ وَاسِعُ الْمَغْفِرَةِ (پ ۶۲ آیت ۳۲)

وہ لوگ ایسے ہیں کہ کبیرہ گناہوں سے اور بے حیائی کی باتوں سے بچتے ہیں، بلاشبہ آپ کے رب کی مغفرت

بڑی وسیع ہے۔

جو صفات آدمی سے بلا قصد و ارادہ سرزد ہو جاتے ہیں، وہ لم ہیں، جو کھائے سے بچتے ہیں، ان کے صفات معاف کر دئے جاتے ہیں،

ایک جگہ ارشاد فرمایا۔

وَالَّذِينَ إِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً أَوْ ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللَّهَ فَاسْتَغْفَرُوا لِذُنُوبِهِمْ (پ ۴۳ آیت ۳۵)

اور ایسے لوگ کہ جب کوئی ایسا کام کر گزرتے ہیں جس میں زیادتی ہو یا اپنی ذات پر نقصان اٹھاتے ہیں،

پھر اپنے گناہوں کی معافی چاہنے لگتے ہیں۔

انہوں نے گناہ کر کے اپنے نفسوں پر ظلم کیا اسکے باوجود اللہ نے ان کی مدد فرمائی ہے، اسکی وجہ یہی ہے کہ وہ گناہ کے بعد تادم

ہوئے اور انھوں نے اپنے نفسوں کو طاعت کیا اور اپنے گناہوں کے لئے بخشش کی دعا مانگی، حضرت علیؑ کی اس روایت میں توبہ کرنے والوں کی یہی قسم مراد ہے، ارشاد فرمایا: **خِيَارُكُمْ كُلُّ مُقْتِنٍ تَوَابٍ** (بیہقی)
تم میں سب سے بہتر وہ لوگ ہیں جو معصیت میں مبتلا ہو کر توبہ کر لیں۔
ایک حدیث میں فرمایا گیا۔

الْمُؤْمِنُ كَالسَّنْبَلَةِ فِي أَحْيَانًا وَتَمِيلُ أَحْيَانًا (ابو جلی، ابن حبان، انس)
مومن کیسوں کی ہالی کی طرح ہے، کبھی گناہ کی طرف جھٹکے، کبھی نیکی کی طرف لوٹتا ہے۔
ایک حدیث میں یہ مضمون وارد ہے۔

لَا بَدَلُ الْمُؤْمِنِ مِنْ ذَنْبٍ يَأْتِيهِ بِالْفَيْنَةِ بَعْدَ الْفَيْنَةِ (طبرانی، بیہقی، ابن عباس)
مومن کے لئے ضروری ہے کہ کبھی کبھی گناہ کا ارتکاب کر لے۔

ان تمام روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر کسی سے کوئی اکاذ گناہ سرزد ہو جائے تو اس سے توبہ ساقط نہیں ہوتی، اور نہ اس قسم کا گناہ گار ان لوگوں کے ذمے میں شامل ہوتا ہے جو گناہ پر اصرار کرتے ہیں، جو شخص ایسے لوگوں کو تائبین کے درجے میں شمار کرتا ہے، وہ اس ڈاکٹر کی طرح ہے جو اپنے تندرست مریض کو صحت سے مایوس کر دے، اور وجہ یہ بتائے کہ تم کبھی کبھی گرم میوے اور غذائیں کھاتے ہو یا اس فقیہ کی طرح ہے جو اپنے شاگرد کو فقیہ بننے سے مایوس کر دے، اور دلیل یہ دے کہ تم کبھی کبھی اپنا سبق نہیں دہراتے، حالانکہ ایسا محض اتفاقاً ہوتا ہے، ورنہ عام طور پر وہ اپنے اوقات کو فقہ کے تکرار و اعادے اور حفظ و ذکر میں مشغول رکھتا ہے، اگر کوئی طیب یا فقیہ ایسا کرتا ہے تو یہ اس کے نقص کی علامت ہے، فقیہ فی الدین کے لئے توبہ بات ضروری ہے کہ وہ کبھی ان لوگوں کو سعادتوں کے حصول سے مایوس نہ کرے جن سے گاہے بگاہے کوئی گناہ سرزد ہو جائے، حدیث شریف میں ہے کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

كُلُّ بَنِي آدَمَ خَطَّاءُونَ وَخَيْرُ الْخَطَّائِينَ التَّوَّابُونَ (ترمذی، انس)

تمام انسان خطا کار ہیں، بہترین خطا کار وہ لوگ ہیں جو توبہ کرتے ہیں اور اپنی خطاؤں کی مغفرت چاہتے ہیں۔
ایک حدیث میں ارشاد فرمایا۔

الْمُؤْمِنُ وَإِذَا وَقَعَ فَخَيْرُهُمْ مَنْ مَاتَ عَلَى رِقْعَةٍ (طبرانی، بیہقی، جابر)
مومن پھاڑنے والا اور پوند لگانے والا ہے، بہتر ہے وہ شخص جو پوند لگا کر مرے۔

پھاڑنے والے سے مراد گناہ گار اور پوند لگانے والے سے مراد توبہ کرنے والا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

أُولَئِكَ يَتُوبُونَ آجْرَهُمْ مَرَّتَيْنِ بِمَا صَابَرُوا (لَوْ يَلْتَمِزُونَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةِ) (پ ۲۰ آیت ۵۴)

ان لوگوں کو ان کی پچھلی کی وجہ سے دو ہر اواب ملے گا اور وہ لوگ نیکی سے بدی کا دفعہ کر دیتے ہیں۔

اسمیں مومنین کا یہ وصف بیان کیا گیا ہے کہ وہ گناہ کے بعد نیکی کرتے ہیں، یہ نہیں فرمایا کہ وہ کوئی گناہ ہی نہیں کرتے۔

تیسری قسم : اس میں وہ لوگ شامل ہیں جو توبہ کر کے کچھ عرصے اس پر مستقیم رہتے ہیں، پھر کسی گناہ کی خواہش ان پر غالب ہو جاتی ہے، اور وہ اسے قصد و ارادے کے ساتھ کر بیٹھتے ہیں، کیونکہ ان میں اتنی قوت نہیں ہوتی کہ شہوات کو مغلوب کر سکیں، مگر نیک اعمال کی پابندی کرتے ہیں اور اطاعت بجالاتے ہیں، عام طور پر گناہوں سے بھی بچتے ہیں، لیکن دو چار خواہشوں سے مجبور ہوتے ہیں، جب تحریک ہوتی ہے تو نفس پر ان کا اختیار باقی نہیں رہتا اور وہ خواہشات کے بموجب عمل کر بیٹھتے ہیں، دل میں اسے برا سمجھتے ہیں اور یہ آرزو کرتے ہیں کہ جس طرح ہمیں اطاعت کی توفیق میسر ہے، اور جس طرح ہم بے شمار گناہوں سے محفوظ ہیں، اسی طرح اگر ان دو چار گناہوں سے بھی بچے رہیں تو کتنا اچھا ہو، معصیت سے پہلے یہ آرزو کرتے ہیں، اور معصیت کے بعد اس پر نادم ہوتے

ہیں، اور یہ عمد کرتے ہیں کہ آئندہ ہم اس مصیبت پر قابو پانے کے لئے نفس کے ساتھ سخت مجاہدہ کریں گے، لیکن انکے نفس ٹال مٹول سے کام لیتے ہیں، اور وہ اپنے عمد کی تکمیل نہیں کھاتے، ایسے نفس کو مسومہ کہا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ نے ایسے ہی لوگوں کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے۔

وَاٰخِرُوْنَ اَغْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخِرَ سَيِّئًا (پ ۲۸ آیت ۱۴۳)

اور کچھ اور لوگ ہیں جو اپنی خطا کے مقرب ہو گئے جنہوں نے طے جلے عمل کے حق، کچھ بھلے اور کچھ برے۔

اس قسم کے تائبین چونکہ اپنی عمل کو برا سمجھتے ہیں، اور نیک اعمال کی پابندی کرتے ہیں، اسلئے یہ امید کی جاسکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی توبہ کو شرف قبولیت سے نوازے گا، البتہ ایسے لوگوں کو اپنے نفس کے ٹال مٹول کی وجہ سے ایک خطبہ لاحق ہے، اور وہ یہ ہے کہ موت توبہ سے پہلے بھی آسکتی ہے، اس صورت میں انجام خراب ہونے کا اندیشہ ہے، اگر اللہ تعالیٰ نے اپنا فضل کرم کیا اور توبہ کے ذریعہ انہیں تدارک کا موقع بخشا تو یقیناً وہ سابقین سے ملحق ہوں گے، اور اگر بد قسمتی غالب آئی، اور شہوت نے اتنا مقہور کیا کہ طلاق کی نوبت ہی نہ آنے دی تو سوہ خاتمہ کا خوف ہے، یہ بات عام طور پر مشاہدے میں آئی ہے کہ کوئی طالب علم تحصیل علم کے لئے مانع امور سے اجتناب نہ کرے تو اس کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ اس کی قسمت میں علم نہیں ہے، اور جو طالب حصول علم کے تمام تقاضے پورے کرتا ہے، اسکے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ کاتب تقدیر نے اس کا نام عالموں میں لکھ دیا ہے۔

مسبب الاسباب نے آخرت کی سعادتوں اور شقاوتوں کو نیکیوں اور گناہوں کے ساتھ اس طرح مربوط کیا ہے جس طرح صحت و مرض، غذا و دواء کے استعمال کے ساتھ مربوط ہیں، یا جس طرح دنیا میں فلاح کا اعلیٰ منصب حاصل کرنے کا عمل، کامیابی ترک کرنے، اور نفس کو فلاح کا عادی بنانے کے ساتھ مربوط ہے، جس طرح ریاست قضاء اور دوسرے علمی مراتب کے لئے صرف وہ لوگ اہل ہیں جن کے نفوس فقیہی علوم میں مسلسل مشغول رہنے کی وجہ سے فقیہ بن گئے ہوں، اسی طرح آخرت کی نعمتوں اور اللہ تعالیٰ کے قرب کی سعادتوں کے لئے صرف وہ لوگ اہل ہیں جن کے پہلو میں تزکیہ و تطہیر کے طویل اور مسلسل عمل سے دھلے دھلائے پاکیزہ اور سلیم قلب ہوں، اللہ تعالیٰ نے ازل سے اپنی تدبیر اسی طرح مقرر فرمائی۔

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوَّاهَا فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكَّاهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ كَسَّاهَا (پ ۲۸ آیت ۷۰-۷۱)

اور قسم ہے (انسان کی) جان کی اور اس ذات کی جس نے اسے درست بنایا، پھر اسکی بد کرداری اور پرہیزگاری دونوں باتوں کا اس کو القا کیا، یقیناً وہ مراد کو پہنچا جس نے اس (جان) کو پاک کیا اور نامراد ہوا، جس نے اسکو (فجور میں) دبا دیا۔

خلاصہ یہ ہے کہ اگر کسی سے گناہ سرزد ہو گیا، اور وہ توبہ میں تاخیر کرے تو یہ اسکی بد بختی اور رسوائی کی علامت ہے، اس سے معلوم ہوا کہ گناہ کرنے کے بعد توبہ کرنی چاہیے، اس میں تاخیر سے ناقابل نقصان بچ سکتا ہے۔ ایک حدیث میں ہے۔

اِنَّ الْعَبْدَ لَيَعْمَلُ بِعَمَلِ اَهْلِ الْجَنَّةِ سِتِّعِينَ سَنَةً حَتَّى يَقُولَ النَّاسُ اِنَّ مَعْنِ اَهْلِهَا وَاَلَا يَبْقَى بَيْنَهُ وَبَيْنَ الْجَنَّةِ اِلَّا شِبْرٌ فَيَسْبِقُ عَلَيْهِ الْكِتَابُ فَيَعْمَلُ بِعَمَلِ اَهْلِ النَّارِ فَيَدْخُلُهَا (بخاری و مسلم۔ سل بن سعد)

بندہ ستر برس تک جنت والوں کے سے عمل کرتا ہے، یہاں تک کہ لوگ اسے جنتی کہنے لگتے ہیں، اس میں اور جنت میں صرف ایک بالشت کا فاصلہ رہ جاتا ہے کہ اس پر تقدیر ازلی غالب آتی ہے، پھر وہ دوزخیوں کے سے عمل کرتا ہے اور دوزخ میں داخل ہو جاتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ سوہ خاتمہ کا خوف توبہ سے پہلے بھی ہے اور بعد میں بھی، اور آدمی کا ہر سانس اپنے سے پہلے سانس کا خاتمہ

کوئی بھی عقل مند انسان اس شخص کی بے وقوفی میں شبہ نہیں کرتا جو اپنا گھر بھاڑ کر دے، اپنا مال ضائع کر دے، اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو فائدہ کشی پر مجبور کر دے، محض اس توقع پر کہ اللہ تعالیٰ مجھے اپنے فضل سے زیر زمین مدفون خزانہ عطا کرے گا، اگرچہ یہ فضل خداوندی غیر ممکن نہیں ہے۔ لیکن اس کی امید میں بیٹھ رہنا سراسر حماقت ہے، اسی طرح اس شخص کی جہالت اور نادانی میں بھی کوئی شبہ نہیں کیا جاسکتا جو اطاعات میں قصور کرے، مغفرت کے راستے سے گریز کرے، گناہوں پر اصرار کرے، اور ان تمام کوتاہیوں کے باوجود بخشش کا امیدوار ہو، یا تعجب اس نادان کی نادانی پر ہے جو اپنی بے عملی اور بدمعاشی کو اس خوب صورت پیرائے میں بیان کرے کہ اللہ تعالیٰ کریم ہے، اسکی جنت اس قدر وسیع ہے کہ مجھ جیسے معمولی شخص کے لئے تک نہیں ہو سکتی اور نہ میری نافرمانی اسے نقصان پہنچا سکتی ہے۔ ایک طرف وہ اپنی گناہ آلود زندگی کی یہ تاویل کرنا ہے وہ ساری طرف تم اسے طلب رزق کے لئے سندھ روں کا سینہ چیرتے ہوئے اور میدانی خطروں سے الجھتے ہوئے دیکھتے ہو، اگر اس سے یہ کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ کریم ہے، اسکے خزانہ غیب میں زرو جو اہر کی کوئی کمی نہیں، اور نہ تجھ جیسے شخص کے لئے اس میں کمی ہے اگر تو تجارت ترک کر کے گھر کے کسی گوشے میں بیٹھ رہے تو یہ ہو سکتا ہے کہ تجھے ایسے ذرائع سے رزق پہنچے جن کا تجھے گمان بھی نہ ہو، اگر اس سے یہ تمام باتیں کہی جائیں تو وہ کہنے والے کا منہ فوج لے، اور اس مشورے پر اسکا مذاق اڑائے، اسے بے وقوف سمجھے اور کہے کہ آسمان سے سونا چاندی نہیں برستا، یہ چیزیں محنت سے حاصل ہوتی ہیں، سبب الاسباب نے رزق کمانے کا یہی طریقہ مقرر فرمایا ہے اور یہی سنت جاری فرمادی ہے، اللہ کی سنت میں کسی تبدیلی کی گنجائش نہیں ہے۔ انسان کا یہ دوہرا معیار سمجھ میں نہیں آتا، اس احمق کو معلوم نہیں کہ دنیا اور آخرت

دونوں کا رب ایک ہے، اور ان دونوں میں جو سنت جاری کر دی ہے وہ ناقابلِ ترمیم ہے اس نے یہ اصول بتا دیا ہے۔
وَكَانَ لَيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَى (پ ۲۷ آیت ۳۹)

اور یہ کہ انسان کو صرف اپنی ہی کمائی ملے گی۔

جب دنیا و آخرت کا ایک رب ہے، ایک اصول اور ایک ذریعہ ہے، پھر کیا وجہ ہے کہ وہ اللہ کو آخرت میں کریم سمجھتا ہے، دنیا میں کریم نہیں سمجھتا، اگر کریم کا مقتضی یہ ہے کہ آدمی عمل سے رک جائے اور عمل کے بغیر اخروی نعمتوں کا امیدوار ہو تو کرم کا تقاضا یہ بھی ہونا چاہیے کہ آدمی پیسہ کمانے سے رک جائے اور کمائے بغیر ہی حصولِ رزق کا خواہاں ہو، یہ کیسے ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی بے بہا اور لازوال دولت، آخرت کا اجر و ثواب، بلا عمل، اور بغیرِ صدمہ و عطا کر دے گا، اور دنیا کی تپا نندار، اور فانی نعمتیں بغیر عمل کے عطا نہیں کرے گا، کیا قرآن کریم میں یہ آیت موجود نہیں ہے۔

وَفِي السَّمَاءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تَوَعَّدُونَ (پ ۱۸۳۱ آیت ۲۲)

اور تمہارا رزق اور جو تم سے وعدہ کیا جاتا ہے (سب) آسمان میں ہے۔

ہم اس جمالت و گمراہی سے اللہ کی پناہ چاہتے ہیں، جو غرض اس طرح کے معقولات کا حامل ہے وہ گویا اپنے آپ کو اندھے منہ کنویں میں گرا کر ہلاک کرنے کے درپے ہے، اور اس آیت کے تحت داخل ہے جس میں ارشاد فرمایا گیا۔

وَلَوْ تَرَىٰ إِذَا الْمُجْرِمُونَ نَاكِسُو أَرْسُلِهِمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ رَبَّنَا أَبْغَضْنَا وَاسْتَعْصَمْنَا فَارْجِعْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا (پ ۱۵۳۱ آیت ۲)

اور اگر آپ دیکھیں تو عجب حال دیکھیں جب کہ یہ مجرم لوگ اپنے رب کے سامنے سر جھکائے ہوں گے،

کہ اے ہمارے پروردگار بس ہماری آنکھیں اور کان کھل گئے، سو ہم کو پھر بھیج دیجئے ہم نیک کام کریں گے۔

یعنی یہ کہیں گے کہ ہمیں یقین آیا، حیرانہ قول واقعی سچا تھا، ”وان لیس للانسان الا ما سعی“ ہم وعدہ کرتے ہیں کہ اگر ہمیں دنیا میں واپس جانے کا موقع دیا گیا تو ہم تیرے قول کی صداقت پر عملاً ایمان لائیں گے، اور کوشش میں کوتاہی نہ کریں گے، یہ درخواست اس وقت کی جائے گی، جب واپسی کا کوئی راستہ باقی نہ رہے گا، اور تقدیر انہی اپنا عمل مکمل کر چکی ہوگی، اور اس کی قسمت پر عذاب کی سر لگ چکی ہوگی، ہم اس جمالت، شک، اور شبہ سے کے دعائی سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں، جو انجام کی خرابی کا باعث ہیں۔

ارتکابِ معصیت کے بعد

اس عنوان کے تحت یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ اگر تائب اتفاقاً یا قصداً کسی گناہ کا مرتکب ہو جائے تو اسے کیا کرنا چاہیے؟ جاننا چاہیے کہ اس پر توبہ، ندامت اور نیکی کے ذریعہ اس گناہ کو زائل کرنا واجب ہے، جیسا کہ ہم نے اسکا طریقہ گزشتہ صفحات میں تفصیل سے لکھ دیا ہے، اگر نفس غلبہ، شہوت کی وجہ سے ترک گناہ پر معاونت نہ کرے تو سمجھا جائے گا کہ وہ دو واجبوں میں سے ایک پر عمل کرنے سے قاصر ہے، اس صورت میں دوسرے واجب پر عمل کرنے میں کوتاہی نہ کرنی چاہیے، اور وہ یہ کہ گناہ کو نیکی سے زائل کرنے کے لئے کوئی اچھا سا عمل کرے تاکہ ان لوگوں کے زمرے میں آجائے جو اپنے اعمال سے میں نیک اور بد دونوں طرح کے اعمال رکھتے ہیں۔

نیک عمل کرنے کا طریقہ : وہ نیک اعمال جو گناہوں کا کفارہ بنتے ہیں، دل سے متعلق ہیں، یا زبان سے، یا اعضاء سے، بہتر یہی ہے کہ جس جگہ سے گناہ کا ارتکاب کیا ہے، یا جس جگہ سے گناہ پیدا ہوا ہے، اسی جگہ سے نیک عمل کرے۔ چنانچہ اگر دل سے گناہ کا ظہور ہو تو اسکا ازالہ اللہ تعالیٰ کی جناب میں تضرع اور گریہ و زاری سے کرے، نیز اس سے غم و مغفرت کا طلب گار ہو، جس طرح بھگوڑا غلام اپنے عمل پر نادم ہوتا ہے، اور اپنے آپ کو ذلیل سمجھتا ہے، اسی طرح خود کو ذلیل سمجھے، بلکہ ذلیل بن کر کھائے تاکہ تمام

ایک اعتراض کا جواب : یہاں ایک حدیث کے حوالے سے ہماری گفتگو پر اعتراض کیا جاسکتا ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ جو شخص گناہ سے استغفار بھی کر لے اور اس پر اصرار بھی کرنا رہے وہ گویا اللہ تعالیٰ کی آیات کے ساتھ استہزاء کرنے والا ہے (یعنی۔ ابن عباس) ایک طرف تم یہ کہتے ہو کہ آدمی کتنے بھی گناہ کر لے استغفار سے سب ختم ہو جاتے ہیں دوسری طرف یہ حدیث ہے کہ بار بار گناہ کر کے بار بار استغفار کرنے والا اللہ کی آیات کے ساتھ کھلواڑ کرنے والا ہے ایک بزرگ کے نزدیک زبان سے استغفار کی کوئی حقیقت ہی نہیں ہے، ایک بزرگ کے قول کے مطابق زبان سے استغفار کی ضرورت ہے۔ ان اقوال میں کون سا استغفار مراد ہے، اور تم کس استغفار کی بات کر رہے ہو؟ آخر اس تضاد کا حل کیا ہے؟ اس کے جواب کی تفصیل یہ ہے کہ استغفار کی فضیلت میں بے شمار روایات وارد ہیں، ہم نے ان میں سے بہت سی روایات کتاب الاذکار والدعوات میں نقل کی ہیں، استغفار کی فضیلت کے لئے صرف اتنا جان لینا ہی کافی ہے کہ قرآن پاک میں اس کی تائید اور کسی قوم میں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی

موجودگی کا اثر ایک ہی بیان کیا گیا ہے۔

وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَأَنْتَ فِيهِمْ وَمَا كَانَ اللَّهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُونَ
(پ ۱۸ آیت ۳۳)

اور اللہ تعالیٰ ایسا نہ کریں گے کہ ان میں آپ کے ہوتے ہوئے ان کو (ایسا) عذاب نہ دیں گے جس حالت میں کہ وہ استغفار بھی کرتے رہتے ہیں۔

اسی لئے بعض صحابہ فرمایا کرتے تھے کہ ہماری دنیا گاہیں نہیں، ایک پناہ گاہ رخصت ہو گئی، یعنی سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ہم سے پردہ فرما گئے، دوسری پناہ گاہ باقی ہے، یعنی استغفار موجود ہے، اگر یہ بھی نہ رہا تو ہم ہلاک ہو جائیں گے، اس تمہید کے بعد یہ جاننا چاہیے کہ جس استغفار کو جھوٹوں کی توبہ کہا گیا ہے وہ محض زبانی استغفار ہے، اس میں قلب شریک نہیں ہوتا، جیسے بہت سے لوگ مایوس آتے استغفار اللہ کہہ دیتے ہیں، نہ دل سے اسکی تحریک ہوتی ہے، اور نہ ذہن میں یہ بات ہوتی ہے کہ ہماری زبان پر استغفار ہے، بعض لوگ دونوں کے عذاب کا ذکر سن کر نعوذ باللہ منہ کہہ دیتے ہیں، جب کہ دل میں ذرا خوف نہیں ہوتا، محض زبان حرکت کرتی ہے، حالانکہ محض زبان کو حرکت دینے میں کوئی فائدہ نہیں، جب تک دل میں اثر نہ ہو، حقیقی استغفار یہ ہے کہ زبان کے ساتھ دل میں تضرع اور خشیت ہو، مغفرت کی طلب میں صدق ارادت اور خلوص نیت بھی ہو، یہ استغفار بجائے خود ایک نیکی ہے، اور گناہ مٹانے میں مؤثر ہو سکتی ہے، استغفار کی فضیلت میں جو روایات وارد ہیں، ان میں یہی استغفار مراد ہے، اگر کوئی محض استغفار کا حق ادا کرے، اور پھر گناہ کا ارتکاب کر بیٹھے تو اسے گناہ پر اصرار کرنے والا نہیں کہا جائے گا، جیسا کہ حدیث شریف میں ہے۔

مَنْ آصَرَتْ مِنْ اسْتِغْفَارٍ وَلَوْ عَادَ فِي السَّيِّئِ مِثْبَعِينَ مَرَّةً (۱)

جو شخص استغفار کرتا ہے وہ گناہ پر اصرار کرنے والا نہیں ہے، اگرچہ دن میں ستر بار اس گناہ کا اعادہ کرے۔

توبہ استغفار کے درجات : توبہ اور استغفار کے بے شمار درجات ہیں، ان کے ابتدائی درجات بھی فوائد سے لبریز ہیں، انتہائی کا تو ذکر ہی کیا ہے، اسی لئے حضرت سہیلؒ فرماتے ہیں کہ بندے کو ہر حال میں اپنے پروندہ گار کی ضرورت ہوتی ہے، اور یہی اس کے حق میں بہتر بھی ہے کہ ہر حال میں اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرے خواہ اچھا ہو یا برا، مثلاً گناہ کا مرتکب ہو تو یہ دعا کرے کہ اے اللہ! میرے گناہ کا پردہ رکھ، معصیت سے فارغ ہو تو یہ دعا کرے کہ اے اللہ میری خطا معاف فرما، توبہ کے بعد یہ دعا کرے کہ اے اللہ! گناہ سے میری حفاظت کر، کوئی اچھا کام کرے تو یہ کہے کہ اے اللہ میرے اس عمل کو شرف قبولیت سے نواز، ان سے کسی نے دریافت کیا کہ وہ استغفار کون سا ہے جس سے گناہ معاف ہوتے ہیں، آپ نے جواب دیا استغفار کی ابتدا استجاب ہے، پھر اثابت اسکے بعد توبہ، استجاب سے اعضاء کے اعمال مراد ہیں اور اثابت سے قلوب کے، توبہ یہ ہے کہ مخلوق سے لاپرواہ ہو کر اللہ کی طرف متوجہ ہو جائے، اور جس گناہ میں مبتلا ہے اسکی مغفرت طلب کرے، نیز کفرانِ نعت اور ترکِ شکر جیسی خطاؤں کی بھی بخشش چاہے، امید ہے اسکے بعد مغفرت ہو جائے گی، اور رب العالمین کے پاس ٹھکانہ مل جائے گا توبہ کے بعد بھی مراحل ہیں، پہلا مرحلہ تمنا ہے، پھر ثبات، اسکے بعد بیان، پھر فکر، پھر مغفرت، پھر مناجات، اسکے بعد مصافات، پھر موالات، پھر راد کی کنگھو جسے علت کہتے ہیں، لیکن یہ تمام احوال اس بندے کے دل پر گزرتے ہیں جس کی غذا علم، جس کا قوام ذکر، جس کا زاد راہ رضائے الہی، جس کا رفیق توکل ہو، ایسے دل پر اللہ تعالیٰ اپنی خاص توجہ ڈالتے ہیں، اور اسے عرش پر اٹھالیتے ہیں، جہاں اسے عالمین عرش کے درمیان جگہ ملتی ہے، ان سے کسی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشادِ گرامی کے بارے میں دریافت کیا۔

الثَّابِتُ حَبِيبُ اللَّهِ (۲)

توبہ کرنے والا اللہ کا حبیب ہے۔

(۱) یہ روایت کتاب الدعوات میں گزری ہے (۲) یہ روایت اسی کتاب کے شروع میں گزر چکی ہے

آپ نے فرمایا کہ توبہ کرنے والا اللہ تعالیٰ کا حبیب اسی وقت ہو گا جب اس میں مندرجہ ذیل اوصاف پائے جائیں گے۔
 الثَّائِبُونَ الْعَابِدُونَ الْحَامِدُونَ السَّائِحُونَ الزَّكَوُونَ السَّاجِدُونَ الْآمِنُونَ
 بِالْمَعْرُوفِ وَالنَّاهُونَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحَافِظُونَ لِحُدُودِ اللَّهِ (پ ۱۸، ص ۱۳)
 وہ ایسے ہیں جو توبہ کرنے والے ہیں (اور) اللہ کی عبادت کرنے والے ہیں (اور) حمد کرنے والے، روزہ
 رکھنے والے، زکوٰۃ کرنے والے (اور) سجدہ کرنے والے، نیک باتوں کی تعلیم کرنے والے، اور بری باتوں سے
 باز رکھنے والے ہیں۔

یہ بھی فرمایا کہ حبیب اسے کہتے ہیں جو اپنے محبوب کا اس حد تک اطاعت گزار ہو کہ جو بات اسے بری لگتی ہو اس کے قریب
 بھی نہ بھٹکتا ہو۔ اس تمام تفصیل سے یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ توبہ کے دو ثمرے ہیں، پہلا ثمرہ توبہ ہے کہ گناہ مٹ جائے، اور ایسا
 ہو جائے گویا کبھی گناہ کا اثر نکال دیا گیا ہے، دوسرا ثمرہ یہ ہے کہ توبہ کے ذریعہ قرب کے درجات حاصل کرے، یہاں تک کہ
 حبیب بن جائے، پھر کفارہ ذنوب کے مختلف درجات ہیں، بعض گناہ اس طرح مٹ جاتے ہیں گویا کبھی وہ جو وہی میں نہیں آئے تھے،
 بعض گناہوں میں صرف تخفیف ہوتی ہے، جیسی توبہ ہوتی ہے، ازالہ مصیبت میں ویسا ہی اس کا اثر ہوتا ہے۔

توبہ ہر حال میں مؤثر ہے : آثار سے ثابت ہوتا ہے کہ توبہ واستغفار اگر دل سے ہو تو یہ ہر حال میں مؤثر ہے، اگرچہ تائب
 گناہ پر اصرار کرتا رہے، ہو سکتا ہے ایسی توبہ کچھ زیادہ مؤثر نہ ہو، لیکن جس حد تک مؤثر ہوگی مفید ثابت ہوگی، اور اگر استغفار کے
 ساتھ گناہ کے تدارک کے لئے حسنات کا اضافہ کر دیا جائے، توبہ سونے پر سنا کہ والی بات ہے، جو شخص استغفار اور حسنات کے ساتھ
 ساتھ گناہ بھی کرتا ہو، اس کے بارے میں یہ گمان کرنا مناسب نہیں کہ اس کا استغفار اور نیکیاں سب بیکار ہیں، ارباب بصیرت اور
 اصحاب قلوب کشف و مشاہدے کے ذریعے اس آیت کی صداقت پر یقین رکھتے ہیں۔

فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ (پ ۳۰، ص ۲۳ آیت ۷)

جو شخص ذرہ برابر نیکی کرے گا وہ وہاں اس کو دیکھ لے گا۔

اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ ہر ذرہ خیر میں اثر ہے، جیسے ترازو کے ایک پلڑے میں چاول کا ایک دانہ ڈال دیا جائے تو وہ
 دوسرے پلڑے سے کچھ نہ کچھ ضرور جھک جائے گا، اگر ایک دانہ چاول پلڑے کو جھکانے میں مؤثر نہ ہو تو دوسرا دانہ بھی مؤثر نہ ہوتا
 چاہیے، بلکہ اس سے توبہ لازم آتا ہے کہ مٹھی بھر چاول بھی اثر انداز نہ ہوں گے، حالانکہ یہ بات مشاہدے کے خلاف ہے، یہی حال
 حسنات کی ترازو کا ہے، اس کا پلڑا بھی خیر کے ذرے سے جھک جاتا ہے، خواہ توڑا ہی جھکے کہ دیکھنے والا محسوس بھی نہ کر سکے، اگر خیر
 کے چند ذرات مل جائیں تو یقیناً پلڑا زیادہ جھکے گا، ہو سکتا ہے اتنا جھکے کہ سینات کا پلڑا اوپر اٹھ جائے، ذرات خیر کو حقیر نہ جانو، اگر تم
 بڑے گناہ چھوڑنے پر قادر نہیں ہو تو چھوٹے چھوٹے کاموں سے گریز نہ کرو، ہو سکتا ہے کہ یہی چھوٹے چھوٹے عمل تمہاری بخشش کا
 سامان کر دیں، اسی طرح اگر تم بڑے گناہ چھوڑنے پر قادر نہیں ہو تو چھوٹے چھوٹے گناہوں کو معمولی نہ سمجھو، بلکہ انہیں ہی ترک
 کر دو، ہو سکتا ہے اس طرح تمہاری ترازو کا پلڑا کچھ ہلکا رہ جائے، جس میں برائیاں رکھی جائیں گی تمہارا حال اس احمق عورت جیسا نہ ہو
 جو سوت کا تھن سے بھاگتی ہے، اور دیکھ لے رہی ہے کہ میں دن بھر میں ایک دو تار کات پاتی ہوں، ان سے کون سامان جمع ہو گا، اس بے
 چاری کو معلوم نہیں کہ دنیا بھر کے کپڑے تاروں سے بنے ہیں، اگر ہر روز دو دو تار بھی کاتے گئے تو کسی مرحلے پر یہ اتنے زیادہ ہو جائیں
 گے کہ ان سے وسیع و عریض کپڑا بنایا جاسکے گا۔ غرض یہ ہے کہ دل سے توبہ واستغفار کرنا ایک ایسی نیکی ہے جو اللہ کے یہاں ہرگز
 ضائع نہ ہوگی، بلکہ میں توبہ کرتا ہوں کہ استغفار کے لئے زبان کو حرکت دینا بھی ایک نیکی ہے، اسلئے کہ زبان کو کلمات استغفار کے
 ساتھ بحالت غفلت حرکت دینا، کسی مسلمان کی غیبت کرنے یا لغو کلام کرنے سے ہر حال افضل ہے، بلکہ یہ خاموشی سے بھی بہتر ہے،
 اگرچہ قلب کے عمل سے بہتر نہیں ہے، لیکن سکوت اور لغو کلام سے بہر حال افضل ہے، حضرت ابو عثمان مغربی کی خدمت میں ان

کے کسی مرتب نے عرض کیا کہ بعض اوقات میرا قلب غافل ہوتا ہے اور زبان کلمات ذکر اور آیات قرآنی کا ورد کرتی ہے انہوں نے جواب دیا کہ اللہ کا شکر ادا کرو کہ اس نے ایک عضو کو خیر کے کام میں لگا رکھا ہے اور اسے ذکر کی عادت ڈال دی ہے شر میں استعمال نہیں کیا اور نہ اسے فضولیات کا عادی بنایا ابو عثمان مغربی نے ہاں لکل صحیح بات کہی ہے اعضاء کو اعمال خیر کا اس قدر عادی بنانا کہ وہ انکی طبع ثانیہ بن جائیں معاصی کے ازالے میں بھی مفید ہے چنانچہ اگر وہ شخص جس کی زبان استغفار کی عادی ہے کسی سے کوئی معمولی بات سنے تو برجستہ ہی کہے گا۔ استغفر اللہ جبکہ فضولیات بجئے والا افضل محض سمجھئے والے کو احمق کا کذب اور مفتری کہہ کر جھٹلائے گا اسی طرح وہ شخص جس کی زبان تعویذ کی عادی ہے کسی قسم کی غلطی یا غلط فہمی دیکھ کر اللہ کی پناہ چاہے گا جبکہ فضول کلام کا عادی انسان کے کا اللہ اس پر لعنت کرے ان میں سے ایک کلمہ خیر کہہ کر ثواب حاصل کرے گا دوسرا کلمہ شر کہہ کر گناہ گار ہوگا اس سے معلوم ہوا کہ سلامتی زبان کو خیر کا عادی بنانے میں ہے قرآن کریم کی ان آیات میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

إِنَّ لِلَّهِ لَا يُضَيِّعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ (پ ۳۱ ر ۳ آیت ۴۰)

یقیناً اللہ تعالیٰ محسین کا اجر ضائع نہیں کرتے۔

وَأَنْ تَكُ حَسَنَةً قَبِيضًا عَفْوَ يُؤْتِيكَ مِنْ لَدُنْكَ أَجْرًا عَظِيمًا (پ ۳۵ ر ۳ آیت ۴۰)

اور اگر ایک نیکی ہوگی تو اسکو کافی گنا کر دیں گے اور اپنے پاس سے اجر عظیم دیں گے۔

ذکورہ بالا صورت پر غور کرو کس طرح ایک نیکی کو دو چند کیا ہے نیکی یہ تھی کہ زبان کلمہ خیر کی عادی تھی اس کا ثواب اپنی جگہ اس نیکی کے نتیجے میں دوسری نیکی یہ ہوئی کہ فضول گوئی اور غیبت کے گناہ سے محفوظ رکھا نیکی پر نیکی کا اضافہ تو دنیا میں ہے آخرت میں کس قدر اجر و ثواب ملے گا اسکا کچھ اندازہ نہیں کیا جاسکتا نیکی تھی ہی معمولی اور غیر اہم کیوں نہ ہو اسے معمولی یا غیر اہم سمجھ کر نظر انداز نہ کرنا چاہیے جو لوگ ایسا کرتے ہیں وہ دراصل شیطان کے فریب میں مبتلا ہیں شیطان انہیں بتلاتا ہے کہ تم صاحب بصیرت، عقل مند اور دانا انسان ہو، مخفی اور پوشیدہ باتوں کا علم رکھتے ہو، تم جیسے لائق اور فاضل و کامل انسان کو مخفی زبان سے ذکر کرنا زیب نہیں دیتا، تم خود یہ بات اچھی طرح جانتے ہو کہ قلب کی غفلت کے ساتھ زبان کو ذکر سے متحرک کرنا مفید نہیں ہے۔

مخلوق کی تین قسمیں

اس شیطانی کمزوری یا غلطی پر مخلوق کی تین قسمیں ہو گئیں (۱) وہ جنہوں نے اپنی جان پر ظلم کیا (۲) میمانہ رو (۳) خیر میں سبقت کرنے والے۔ خیر میں سبقت کرنے والے شیطان کے جواب میں کہتے ہیں کہ اگرچہ تمرا قول درست ہے لیکن تمرا مقصد درست نہیں ہے تو کلمہ حق سے معنی باطل پر استدلال کر رہا ہے ہم تجھے دوبار ایذا دیں گے اور دو مرتبہ ذلیل کریں گے پھر وہ شخص زبان کی حرکت پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ اس کے ساتھ دل کا اخلاص بھی شامل کر لیتے ہیں تاکہ شیطان کو زبان کی حرکت سے بھی تکلیف پہنچے اور دل کے خلوص سے بھی ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جو شیطان کے زخم دل پر مرہم رکھنے کے بجائے نمک چھڑک دے۔ اپنے نفس پر ظلم کرنے والے وہ لوگ ہیں جو شیطان کی تائید کرتے ہیں اور اس غلط فہمی میں مبتلا ہو کر کہ اسرار الہی سے واقف ہیں زبانی ذکر بھی چھوڑ دیتے ہیں شیطان کے زخم کا مرہم یہی لوگ بنتے ہیں ان لوگوں میں اور شیطان میں اس حد تک موافقت ہوتی ہے کہ باہم شیعرو شکر ہو جاتے ہیں۔

میمانہ رو وہ لوگ ہوتے ہیں جو شیطان کی خواہش کے برخلاف دل کو تو ذکر میں شریک نہیں کہاتے لیکن زبان کو بھی اس عمل سے نہیں روکتے بلکہ یہ سمجھتے ہیں کہ زبانی ذکر اگرچہ قلبی ذکر کے مقابلے میں ناقص ہے لیکن سکوت اور یا وہ گوئی کی نسبت بہر حال افضل ہے یہ لوگ زبانی ذکر نہیں چھوڑتے اور ساتھ ہی یہ دعا بھی کرتے ہیں کہ جس طرح تو نے ہماری زبان کو کلمات خیر کا عادی بنایا ہے اسی طرح ہمارے دل کو بھی عادی بنا ان تینوں میں سابق بالخیرات کی مثال اس جولا ہے کی سی ہے جو اپنے پیچھے کو برا سمجھے اور کاتب بن جائے اور ظالم نفس کی مثال اس جولا ہے کی سی ہے جو اپنے پیچھے کو برا سمجھ کر یعنی بن جائے اور مقصد کی مثال اس جولا ہے کی

سی ہے جو یہ کہے کہ اگرچہ کتابت پارچہ بانی سے افضل ہے، لیکن کیونکہ میں اپنے معذور کم علمی کی بنا پر یہ پیشہ اختیار نہیں کر سکا اسلئے اپنے پیشے میں رہوں گا جو یقیناً پاخانہ صاف کرنے سے افضل ہے۔

اس کلام کے بعد حضرت رابعہ عدویہ کے قول کی تفسیر سہل ہے، انھوں نے فرمایا کہ ہمارے استغفار کو بھی استغفار کی ضرورت ہے، ان کا مقصد یہ ہے کہ جب ہم استغفار کرتے ہیں تو ہمارا دل غافل رہتا ہے، صرف زبان حرکت کرتی ہے، اگرچہ زبان کی حرکت اپنی جگہ مستحسن ہے، لیکن دل کی غفلت بھی اپنی جگہ قبیح ہے، ہمیں اپنے دل کی قیاحت سے بھی استغفار کی ضرورت ہے، حضرت رابعہ بصریہ نے زبانی استغفار کی مذمت نہیں فرمائی، بلکہ دل کی غفلت کی مذمت فرمائی ہے، اب اگر کوئی شخص زبان سے بھی استغفار نہیں کرتا اسے دو استغفار کی ضرورت ہے ایک زبان سے استغفار نہ کرنے پر دوسرے قلب کی غفلت پر، غرض یہ کہ اس قول میں عمدہ چیز (زبانی استغفار) کی تعریف اور مذموم چیز (دل کی غفلت) کی مذمت ہے، اگر ہم نے یہ قول اس طرح نہیں سمجھا تو پھر ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد گرامی کا مطلب بھی نہیں سمجھ پائیں گے۔

حَسَنَاتُ الْأَنْبِرِ لَا تَنْتَفِئُ إِلَّا بِمَقَرِّ بَيْنِ

نیک لوگوں کی نیکیاں مقررین کی برائیاں ہیں۔

یہ امور اضافی ہیں، انھیں اضافت کے ساتھ ہی سمجھنا چاہیے، بہر حال کسی معمولی سی معمولی اطاعت کو بھی حقیر نہ سمجھنا چاہیے، اور نہ کسی چھوٹے سے چھوٹے گناہ کو معمولی سمجھ کر نظر انداز کرنا چاہیے۔ حضرت جعفر الصادقؑ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے چار باتیں چار میں مخفی رکھی ہیں، رضا کو اطاعت میں، اس لئے کسی چھوٹی سی طاعت کو بھی حقیر مت جانو، ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا اسی میں پوشیدہ ہو، غضب کو معصیت میں، اسلئے کسی چھوٹے سے گناہ کو بھی حقیر مت سمجھو، ہو سکتا ہے وہی گناہ اللہ کے غضب کا باعث ہو، ولایت کو بندوں میں، اسلئے کسی بندے کو حقیر مت سمجھو ہو سکتا ہے وہی ولی اللہ ہو۔ قبولت کو دعائیں، اس لئے کسی بھی موقع پر دعائے چھوٹو ہو سکتا ہے اس میں قبولیت ہو۔

چوتھا باب

دوائے توبہ اور گناہ پر اصرار کا طریق علاج

آدمی کی دو قسمیں : جاننا چاہیے کہ لوگوں کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ جو ان جس میں برائی کی رغبت نہ ہو، اس نے خیر پرورش پائی ہو، اور شر سے اجتناب کرنا اس کی سرشت میں داخل ہو، ایسے شخص کے بارے میں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

يُحِبُّ جَبْرُكَ كَمِنْ الشَّابِّ لَيْسَتْ لَهُ مَخْبَرَةٌ (احمد، طبرانی۔ تہذیب ابن عاصم)

خیرا پروردگار ایسے نوجوانوں پر محب کرتا ہے جسے میل و رغبت نہ ہو۔

مگر ایسے لوگ شاذ و نادر ہی ملتے ہیں۔

دوسری قسم میں وہ لوگ ہیں جو گناہ کا ارتکاب کرتے ہیں۔ پھر ان کی بھی دو قسمیں ہیں، توبہ کرنے والے، اور گناہ پر اصرار کرنے والے، اس باب میں ہم یہ بیان کرنا چاہتے ہیں کہ گناہ گار پر اصرار کا علاج کیا ہے، اور اس مرض کے ازالے میں کون سی دوا مؤثر اور شفا بخش ثابت ہو سکتی ہے۔

یہ بات اچھی طرح جان لینی چاہیے کہ توبہ شفا ہے، اور یہ شفا دوا سے حاصل ہوتی ہے، اور دوا سے واقف ہونے کے لئے ضروری ہے کہ آدمی مرض سے بھی واقف ہو، دوا کے معنی ہیں ان اسباب کے خلاف کرنا جو کسی مرض کے وجود کا باعث بنے ہیں، اگر کسی مرض کا علاج کرنا ہو تو اس سبب کا ازالہ کیا جائے جس سے وہ مرض پیدا ہوا ہے، پھر یہ بات بھی مسلم ہے کہ ہر چیز اپنی ضد سے

باطل ہوتی ہے، اس اصول کی روشنی میں دیکھا جائے تو گناہ پر اصرار کا سبب غفلت اور شہوت ہے، غفلت کی ضد علم ہے، اور شہوت کی ضد یہ ہے کہ آدمی شہوات میں بیجاں پیدا کرنے والے اسباب پر صبر کرے، غفلت گناہوں کی جڑ ہے اللہ تعالیٰ نے غفلتوں کے انجام کی ان الفاظ میں خبر دی ہے۔

لَا جَزَاءَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ وَهُمْ لَخَاسِرُونَ (پ ۲۳ آیت ۲۲)

بلاشبہ وہ آخرت میں سخت خسارے میں ہیں۔

غفلت کے علاج کے لئے جو مجموعہ تیار کی جائے گی، اس میں علم کی حلاوت اور صبر کی تقویٰ کی آمیزش کی جائے گی، جس طرح مسکن جبین میں شکر کی حلاوت اور سر کے کاٹنا بن ہوتا ہے، مگر دونوں کا مجموعہ مقصود ہوتا ہے، اور صغریٰ امراض کے علاج میں اسے استعمال کیا جاتا ہے، اسی طرح قلب کے مرض اصرار میں جو مجموعہ استعمال کی جاتی ہے اس میں علم اور صبر دونوں کے فوائد مقصود ہوتے ہیں، اب رہا یہ سوال کہ ازالہ غفلت کے لئے ہر علم مفید ہے یا کوئی مخصوص علم ہے جس کے ذریعہ اسکا علاج کیا جاتا ہے، اسکا جواب یہ ہے تمام علوم دل کے امراض کا علاج ہیں، لیکن یہ ضروری نہیں کہ ایک علم ہر مرض میں مفید ہو، البتہ ہر مرض کے لئے ایک الگ اور خاص علم ہے، یہی صورت گناہوں پر اصرار کے مرض میں ہے، ذیل میں ہم وہی مخصوص علم بیان کرتے ہیں، جو اس مرض کے لئے مفید ہے، اور فہم سے قریب تر کرنے کے لئے بدن کے امراض کی مثال بھی بیان کرتے ہیں۔

غفلت کی ضد علم : مریض کو علاج سے پہلے متعدد امور کی تصدیق کرنی پڑتی ہے، ان میں سے پہلا امر اس حقیقت کو ماننا ہے کہ مرض و صحت کے کچھ نہ کچھ اسباب ہوتے ہیں، یہ اسباب اللہ تعالیٰ نے ہمارے اختیار میں رکھ دیے ہیں، اس حقیقت کا اعتراف دراصل طب کی اصل پر ایمان لانے کے مترادف ہے، جو نقص اصل طب پر ایمان نہیں رکھتا، وہ علاج نہیں کرتا، اور موت کے منہ میں چلا جاتا ہے، زیر بحث مسئلے میں اسکے موازنے کی صورت یہ ہے کہ اصرار کا مریض اصل شریعت پر ایمان لائے یعنی اس حقیقت کا اعتراف کرے کہ آخرت میں سعادت و شقاوت کے کچھ اسباب ہیں، سعادت کا سبب اطاعت ہے، اور شقاوت کا سبب معصیت ہے، اس حقیقت کا ماننا ہی اصل شریعت پر ایمان لانا ہے، خواہ یہ علم بطور تحقیق حاصل ہو، یا بطور تقلید، دوسرا امر جس کا مریض کو علاج سے پہلے تصدیق کرنی پڑتی ہے یہ ہے کسی خاص طبیب کے بارے میں یہ اعتقاد رکھے کہ وہ فن طب میں ماہر ہے، نبض شناس ہے، اور اللہ تعالیٰ نے اسکے ہاتھ میں شفا دی ہے، جو دوا وہ تجویز کرتا ہے مفید ہوتی ہے، جو مرض وہ مٹاتا ہے وہی واقع میں ہوتا ہے، وہ ہر بات بے لاگ طریقے پر کہہ دیتا ہے، نہ کوئی بات چھپاتا ہے، اور نہ غلط بیانی کرتا ہے، اسی طرح اصرار کرنے والے کو چاہیے کہ وہ صادق و امین سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت پر ایمان لائے، اور یہ یقین کرے کہ جو کچھ آپ ارشاد فرماتے ہیں وہ حق اور درست ہوتا ہے، اس میں جھوٹ اور غلط بیانی کی آمیزش نہیں ہوتی، تیسرا امر جس کی تصدیق مریض کے لئے ضروری ہے یہ ہے کہ طبیب کی تشخیص و تجویز پر دھیان دے، اور جو کچھ وہ کہے غور سے سنے، تاکہ مریض کے دل میں مرض کی سنگینی کا خوف سا جائے اور وہ اسکی ہدایت کے مطابق عمل کر سکے، اسی طرح روحانی مریض کے لئے ضروری ہے کہ وہ ان آیات و روایات کو غور سے سنے جن میں تقویٰ کی ترغیب دی گئی ہے، اور ارتکاب ذنوب، اور اتباع ہونے سے ڈرایا گیا ہے، جو کچھ اس سلسلے میں سنے اسے بلا چون و چرا تسلیم کرے، کسی طرح کا کوئی شک نہ کرے، تاکہ اس سے خوف پیدا ہو، اسی خوف سے دوا کی تقویٰ اور علاج کی شدت پر صبر کرنے کی قوت پیدا ہوتی ہے، چوتھا امر یہ ہے کہ مریض ہر اس بات پر دھیان دے جو طبیب اس کے مرض کے متعلق بتلائے، خواہ وہ دوا سے متعلق ہو یا دوا سے ناکہ اسے اپنے احوال، اقوال اور اکل و شرب کی ہر تفصیل معلوم ہو جائے اور یہ بات بھی جان لے کہ اس کے لئے کون سی دوا نفع بخش ہے اور کون سی مضر ہے، کیونکہ دوائیں بے شمار ہیں، اور ہر دوا ہر مرض میں مفید نہیں ہوتی، اسی طرح یہ بات معلوم کر لے کہ اس مرض میں کون کون سی غذائیں مفید ہیں، اور کون کون سی مضر ہیں، مریض کے لئے جس طرح ہر دوا مفید نہیں ہے اسی طرح اس کے لئے ہر چیز سے پرہیز بھی ضروری نہیں ہے، اسی طرح ہر انسان بیک وقت تمام معاصی اور شہوات میں مبتلا نہیں ہوتا

بلکہ ہر مومن کے لئے ایک یا ایک سے زیادہ گناہ مخصوص ہوتے ہیں، اسلئے اصرار کرنے والے کے لئے سرمدت یہ ضروری ہے کہ وہ گناہوں کو جان لے، پھر ان کی آفات کا علم حاصل کرے اور یہ دیکھے کہ دین میں ان سے کس قدر نقصان ہو سکتا ہے، پھر ان پر مہر کرنے کا طریقہ دریافت کرے اور یہ جانے کہ جو گناہ مجھ سے سرزد ہو چکے ہیں، ان کا ازالہ کیسے ہو۔ یہ وہ علوم ہیں جن سے اطمینان دین یعنی انبیاء کے وارث علماء ہی واقف ہیں۔

علماء کا فرض : جب عامی کو یہ معلوم ہو جائے کہ اس سے فلاں گناہ سرزد ہوا ہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ کسی طبیب (عالم) سے اپنا علاج کرائے، اور اگر اسے اپنے مرض کی پہچان نہ ہو تو عالم کو چاہیے کہ وہ اس کے مرض کی نشاندہی کرے، اور اس کی صورت یہ ہے کہ ہر عالم کسی ایک ملک، شہر، محلے، مسجد، یا مجمع کا تکفیل ہو جائے، اور انھیں دین کی تعلیم دینے، جو چیزیں ان کے لئے مضر ہیں، وہ بتلائے، جو مفید ہیں ان کی خبر دے، سعادت اور شقاوت کے تمام اسباب پوری وضاحت سے بیان کر دے، عالم کو یہ انتظار نہ کرنا چاہیے کہ لوگ مجھ سے دریافت کریں تو میں انھیں بتلاؤں، بلکہ خود لوگوں کو اپنے پاس بلائے، یا ان کے پاس جائے، اور انھیں صحیح راستہ بتلائے، کیونکہ وہ انبیاء کرام کے وارث ہیں، اور دعوت و تبلیغ میں انبیاء کرام کا اصول یہ رہا ہے کہ خود ہی لوگوں کو پکارتے پھرتے تھے، مگر گھر جاتے تھے، اور راہ حق کی دعوت دیتے تھے، ایک ایک کو تلاش کر کے اسے دین کی تلقین کرتے تھے، عام طور پر لوگ اپنے دلوں کے امراض سے واقف نہیں ہوتے، اسلئے علماء کو از خود ان کی رہنمائی کرنی چاہیے، ظاہری امراض میں تو آدمی خود بھی طبیب کی طرف رجوع کر سکتا ہے، مثلاً کوئی شخص برص میں مبتلا ہو یا اس کے چہرے پر داغ ہوں تو وہ آئینہ دیکھ کر اپنے مرض کا حال جان سکتا ہے، مگر آئینہ ہر شخص کے پاس نہیں ہوتا، جسکے پاس آئینہ نہیں اسے اپنا مرض اس وقت تک معلوم نہ ہو گا جب تک کہ کوئی دوسرا اسے نہ بتلا دے، یہ تمام علماء کا فرض عین ہے، سلاطین کو چاہیے کہ وہ ہر ہستی اور ہر محلے میں ایک دیندار فقیہ مقرر کرے جو لوگوں کو ان کے دین کی تعلیم دے سکے، لوگ جاہلی پیدا ہوتے ہیں، اس لئے اصول و فروع میں دین کی دعوت ان تک پہنچانا ضروری ہے، دنیا ایک بیمار خانہ ہے، جو زیر زمین ہے وہ مروجہ ہے، اور جو بالائے زمین ہے وہ بیمار ہے، دل کی بیماریاں جسم کی بیماریوں سے زیادہ ہیں، اس لئے دنیا کے ہسپتال میں جسمانی مریضوں کی نسبت روحانی مریضوں کی کثرت ہے، علماء اس ہسپتال کے ڈاکٹر ہیں، اور سلاطین اسکے منتظم ہیں، اگر کوئی مریض اپنے طبیب کا مشورہ قبول نہ کرے، اور اس کی تجویز کو وہ داند لے تو اسے سلاطین کے سپرد کر دینا چاہیے، تاکہ وہ لوگوں کو اسکے شر سے محفوظ رکھ سکے، جس طرح کوئی مریض پرہیز نہیں کرتا یا دوا نہ ہو جاتا ہے، تو اسے دوا دینا، زنداں کے حوالے کر دیا جاتا ہے، تاکہ وہ اسے زنجیروں میں قید کر سکے، اور لوگوں کو اور خود اسکو اس کے شر سے بچا سکے۔

دل کے امراض زیادہ کیوں ہیں : دل کے امراض جسم کے امراض کی نسبت زیادہ ہیں، اس کی تین وجہیں ہیں، پہلی وجہ تو یہ ہے کہ مریض یہ نہیں جان پاتا کہ وہ کسی مرض میں مبتلا ہے، دوسری وجہ یہ ہے کہ اس مرض کا انجام دنیا میں مشاہد نہیں ہے، جب کہ جسمانی امراض کا انجام دنیا ہی میں سامنے آ جاتا ہے، یعنی موت آ جاتی ہے، اسی لئے لوگ جسمانی امراض سے ڈرتے ہیں کیونکہ وہ یہ جانتے ہیں کہ اگر ہم نے علاج نہیں کیا تو موت ہمیں ملے، ہستی سے مٹا دے گی، دل کے گناہوں کا انجام دل کی موت ہے، لیکن دنیا میں اسکا پتہ نہیں چلتا، اسی لئے گناہوں سے نفرت کم ہوتی ہے، اگرچہ انسان کو معلوم ہوتا ہے کہ میں گناہ گار ہوں، لیکن وہ اپنے گناہ کو کوئی خاص اہمیت نہیں دیتا، اور غفلت و بخشش کے معاملات میں اللہ پر توکل کرتا ہے، جب کہ جسمانی امراض میں توکل نہیں کرتا، بلکہ ایک طبیب سے دوسرے طبیب تک بھاگا بھاگا پھرتا ہے، تیسری وجہ سب سے اہم اور بنیادی ہے، بلکہ بجائے خود ایک سنگین اور ناقابل علاج مرض ہے، وہ یہ ہے کہ اطمینان قلب مفقود ہیں، ان امراض میں جن لوگوں کی طرف رجوع کیا جاسکتا ہے وہ علماء ہیں، لیکن آج کے دور میں وہ خود سخت ترین امراض کا شکار ہیں، وہ خود کو علاج کیا کریں، خود اپنے علاج سے غرور کریں، کیونکہ یہ امراض عام ہیں، اور شاذ و نادر ہی کوئی شخص ان سے بچا ہوا ہے، اس لئے علماء کا عیب ظاہر نہیں ہو پاتا، اور وہ مخلوق کو بھگاتے رہتے ہیں، اور انھیں ایسی ایسی باتیں بتلاتے ہیں جن سے ان کے مرض میں اضافہ ہو، سب سے زیادہ ہلاکت آفریں مرض دنیا کی محبت ہے، اور اطمینان دین پر اسی کا غلبہ ہے، یہی

وجہ ہے کہ تم دوسروں کے لئے علاج کی تجویز کرتے ہو، اور خود اسی مرض میں مبتلا ہو، اسی وجہ سے یہ مرض عام ہو گیا، بلکہ ایک وہابی نے کہا، ہر شخص اسی ناقابل علاج مرض میں گرفتار نظر آتا ہے، اطباء کے فقدان کی وجہ سے عموماً خدا ہلاکت اور تباہی سے دوچار ہو رہی ہے، جنہیں طبیب بننا چاہیے، تھوڑے اللہ کے سادہ لوح بندوں کو لٹنے کے لئے طرح طرح کے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں اور مختلف طریقے سے گمراہ کرتے ہیں، اگر ان کے لئے بھلائی نہیں کر سکتے تو بددینا حتیٰ بھی نہ کریں اصلاح نہیں کر سکتے تو انہیں بگاڑیں بھی نہیں، بلکہ اگر چپ رہیں تو یہی بہتر ہے، کیونکہ جب بھی یہ زبان کھولتے ہیں، ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ ان کی طرف رجوع کریں، اور یہ مقصد صرف اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے کہ انہیں مغفرت کی جھوٹی امیدیں دلائیں، رجاء کے اسباب کو ترجیح دیں، رحمت کے دلائل ذکر کریں، اور جان بوجھ کر ایسی روایات و آثار سے گریز کریں، جن میں عذاب سے ڈرایا گیا ہے، اور اللہ کے غضب کا ذکر کیا گیا ہے، لوگوں کو ان کے مواظبت میں بڑا سکون ملتا ہے، ان کی باتیں کانوں میں رس گھولتی ہیں اور دلوں کو سرمایہ فراہم کرتی ہیں، چنانچہ جب وہ ان نام نہاد عالموں کی محفلوں سے لٹتے ہیں تو گناہ پر ان کی جرأت کچھ اور بڑھ جاتی ہے، اور اللہ کے فضل پر توکل میں کچھ اور اضافہ ہو جاتا ہے۔

یہ ایک مسلہ حقیقت ہے کہ اگر طبیب جاہل یا بددیانت ہو تو وہ اپنے مریض کو مسلک دوا دے دیتا ہے، اور بجائے تندرست کرنے کے موت کے منہ میں دھکا دیدیتا ہے، کیوں کہ اسے وہ دوا انہیں دی جاتی جس کی اسے ضرورت ہے، اور اس طریقے سے نہیں دی جاتی جس طریقہ سے دی جانی چاہیے۔

رجاء اور خوف : رجاء اور خوف دو الگ الگ دوائیں ہیں، اور دونوں دوا ایسے مریضوں کے لئے مفید ہیں جن کا مرض ایک دوسرے سے مختلف ہو، جس شخص پر خوف کا قلب ہو، یہاں تک کہ اس نے دنیا سے مکمل کنارہ کشی اختیار کر لی ہو، اور اپنے نفس کو ایسے امور کا ملکت بنالیا ہو جو اس کی حد استطاعت سے باہر ہیں یہاں تک کہ زندگی کا پھر بن اسکے وجود پر تنگ ہو گیا ہو تو اس کے علاج کے لئے رجاء کی ضرورت ہے، اسے رجاء کے مضامین سنائے جائیں گے، تاکہ خوف میں اسکی انتہا پسندی کا خاتمہ ہو، اور اس کی طبیعت اعتدال پر آئے، اسی طرح وہ شخص جو گناہوں پر اصرار کرتا ہے، اگرچہ اسکے دل میں توبہ کی خواہش ہے، لیکن وہ اپنے گناہوں کی کثرت اور سنگینی کے پیش نظر قبولیت سے مایوس ہے، اور یہ سمجھتا ہے کہ میں گناہوں کے دلدل میں اس قدر ڈوب چکا ہوں کہ اب باہر نکلتا ممکن نہیں رہا۔ میں اتنا سیاہ کار ہوں کہ اللہ تعالیٰ کی نظر رحمت مجھ پر پڑی نہیں سکتی، ایسے شخص کے لئے دوائے رجاء کی ضرورت ہے، تاکہ وہ قبولیت توبہ کی امید رکھے، اور بارگاہِ خودندی میں اپنے گناہوں سے توبہ کرے، اس کے برعکس جو شخص فریب خوردہ ہو، اور آزادی کے ساتھ گناہوں میں مبتلا ہو، اس کا علاج اسباب رجاء کے ذکر سے کرنا ایسا ہے جیسے کسی گرم مزاج انسان کو شہد کھانے کے لئے دیا جائے، اور یہ امید رکھی جائے کہ وہ شہد کے استعمال سے تندرست ہو جائے گا۔ یہ جاہلوں اور غیبیوں کا شیوہ ہے، عقل مند طبیب ایسا نہیں کر سکتا، خلاصہ یہ ہے کہ طبیبوں کے فساد سے عوام الناس کی بیماری ناقابل علاج ہو چکی ہے۔

وعظ کا صحیح طریقہ : اب ہم وعظ کا صحیح طریقہ بیان کرتے ہیں، گناہ پر اصرار کرنے والوں کے لئے یہی طریقہ نفع بخش ہو سکتا ہے، اگرچہ اسکا بیان بڑا تفصیلی ہے، اور اس کے تمام پہلوؤں کا استقصاء نہایت دشوار ہے، لیکن ہم وہ اقسام ضرور بیان کریں گے جن سے لوگوں کو ترک گناہ پر آمادہ کیا جاسکتا ہے۔ یہ چار انواع ہیں، ان میں سے ہر نوع کا الگ الگ ذکر کیا جاتا ہے۔

پہلی قسم : یہ ہے کہ قرآن کریم میں جو آیات گنہ گاروں اور بدکاروں کو ڈرانے اور خوف دلانے کے لئے مذکور ہیں، انہیں بیان کرے، اسی طرح اس موضوع کی روایات بھی ذکر کرے، مثلاً اس طرح بیان کرے کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا

مَّا مِنْ يَوْمٍ طَلَعَ فَحْرُهُ وَلَا كَيْدٌ غَابَ شَفَقُهَا إِلَّا وَمَلَكَانِ يَتَحَاوِيَانِ بَارِعَةً
أَصْوَابٍ يَقُولُ أَحَدُهُمَا يَا لَيْتَ لَهَذَا الْخَلْقُ لَمْ يَخْلُقُوا وَيَقُولُ الْآخَرُ يَا لَيْتَهُمْ

اذْخُلُوا عَلِيمُوا لِمَا ذَا خَلِقُوا فَيَقُولُ الْآخَرُ يَا لَيْتَنَّهُمْ اِذْخُلُوا عَلِيمُوا لِمَا ذَا خَلِقُوا
عَمِلُوا اِيْمًا عَمِلُوا

ہر روز جب فجر طلوع ہوتی ہے اور ہر رات جب فتنہ ڈھلے ہے دو فرشتے چار آوازوں میں ایک دوسرے کا جواب دیتے ہیں 'ان میں سے ایک کہتا ہے کاش یہ لوگ پیدا ہی نہ ہوتے دو سرا کہتا ہے کیا اچھا ہوتا اگر یہ لوگ پیدا ہونے کے بعد یہ جان لیتے کہ کس لئے پیدا ہوئے ہیں پھر سلا کہتا ہے کیا اچھا ہوتا کہ جب انھیں اپنے پیدا ہونے کی وجہ معلوم نہیں تو جو بات معلوم ہے اسکے مطابق عمل کرتے۔

ایک روایت میں یہ مکالمہ اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ ایک فرشتہ کہتا ہے کہ کیا اچھا ہوتا اگر یہ لوگ آپس میں چلتے اور جو کچھ جانتے ہیں ایک دوسرے کو بتلاتے دو سرا کہتا ہے کہ کیا خوب ہوتا اگر یہ لوگ اپنے علم کے مطابق عمل نہ کرتے تو اپنے اعمال سے توبہ ہی کر لیتے۔ (۱)

ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ جب بندہ کوئی گناہ کرتا ہے تو دائیں طرف کا فرشتہ بائیں طرف کے فرشتے سے (بہلا دوسرے کا حاکم ہے) کہتا ہے کہ ابھی چھ ساعت یہ گناہ درج نہ کرنا چنانچہ اگر وہ اس عرصے میں توبہ و استغفار کر لیتا ہے تو نہیں لکھتا ورنہ لکھ لیتا ہے ایک بزرگ کا ارشاد ہے کہ جب بندہ کوئی گناہ کرتا ہے تو اس جگہ کی زمین جہاں وہ گناہ سرزد ہوا ہوتا ہے جناب باری میں عرض کرتی ہے کہ اگر حکم ہو تو میں شق ہو جاؤں اور اس گناہ گار کو دھنسا دوں نیز اسکے اوپر کا آسمان عرض کرتا ہے کہ اگر حکم ہو تو میں اس پر ٹوٹ پڑوں مگر اللہ تعالیٰ دونوں کی درخواست مسترد کر دیتا ہے اور فرماتا ہے کہ میرے بندے سے باز رہو تم نے اسے پیدا نہیں کیا ہے اگر تم اسے پیدا کرتے تو شاید اسکے حال پر رحم کرتے ہو سکتا ہے یہ توبہ کر لے اور میں اسکی بخشش کر دوں یا کوئی نیک عمل کرے اور وہ اس گناہ کا بدلہ نہ جائے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں یہی بات بیان کی گئی ہے فرمایا۔

اِنَّ اللّٰهَ يُمْسِكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَنْ تَنزُوْا وَلٰكِنْ زَالَتَا اِنْ اَمْسَكَهُمَا مِنْ اَحَدٍ قُوَّةٍ
بَعْدُ (پ ۲۲ آیت ۴۱)

یعنی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمین کو تھامے ہوئے ہے کہ وہ موجودہ حالت کو چھوڑ نہ دیں اور اگر موجودہ حالت کو چھوڑ بھی دیں تو پھر خدا کے سوا اور کوئی ان کو تھام بھی نہیں سکتا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے حدیث مروی ہے کہ مہر لگانے والا عرش الہی سے چلے ہے جب بے حرمیاں ہوتی ہیں اور حرام چیزوں کو حلال سمجھا جانے لگتا ہے تو اللہ تعالیٰ مہر لگانے والے کو بھیج دیتے ہیں وہ دلوں پر مہر لگاتا ہے چنانچہ جو چیزیں دلوں کے اندر ہوتی ہیں وہ دلوں میں رہ جاتی ہیں (ابن عدی ابن حبان۔ ابن عمر)

حضرت مجاہد سے ایک حدیث منقول ہے کہ دل کھلی پھیلی کی طرح ہوتا ہے جب آدمی ایک گناہ کرتا ہے تو اسکی ایک انگلی بند ہو جاتی ہے یہاں تک کہ تمام انگلیاں بند ہو جاتی ہیں پھر دل بند ہو جاتا ہے اور یہی اسکی مرہ ہے حضرت حسن بصری ارشاد فرماتے ہیں کہ بندے اور اس کے رب کے درمیان معاصی کی ایک معلوم حد ہے جب بندہ اس حد پر پہنچتا ہے اللہ تعالیٰ اسکے دل پر مہر لگاتا ہے پھر اسے عمل خیر کی توفیق نہیں ہوتی معاصی کی مذمت اور تائید میں بے شمار آثار و اخبار مروی ہیں اگر وہ اعتدال و وارث رسول ہے تو اسے یہ اخبار و آثار بکثرت ذکر کرنے چاہئیں اسلئے کہ یہی روایات مہر کا رد عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ورثہ ہیں حدیث شریف میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے درہم و دینار نہیں چھوڑے بلکہ علم و حکمت کا ورثہ چھوڑا ہے ہر عالم کو اس

(۱) یہ روایت ان الفاظ میں فریب ہے مجھے کہیں نہیں ملی البتہ ابو منصور علی نے مسند الفردوس میں حضرت ابن عمر سے ایک روایت نقل کی ہے جس میں فرشتوں کا ایک مکالمہ ذکر کیا گیا ہے

دورے میں سے اسی قدر ملتا ہے جس قدر اس نے لینا چاہا ہے (بخاری۔ محمود بن الحارث)

دوسری قسم : یہ ہے کہ انبیاء اور سلف صالحین کے واقعات ذکر کرے اور یہ بتلائے کہ اگر ان سے گناہ سرزد ہوا تو اس کی سزا میں انھیں کتنے زبردست مصائب برداشت کرنے پڑے اس طرح کے واقعات قلوب پر اثر انداز ہوتے ہیں اور ان کا نفع محسوس ہوتا ہے سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام کا واقعہ ہے کہ انھیں ایک نافرمانی کی بنا پر جنت سے نکلتا پڑا، روایات میں یہاں تک بیان کیا گیا ہے کہ جب انھوں نے حجر منومہ کا پھل کھایا تو ان کے جسم کی تمام گرہیں کھل گئیں، ستر ظاہر ہو گیا صرف تاج سر پر اور اکیلے چہرے پر باقی رہ گیا، حضرت جبریل نے آکر تاج اور اکیلے سر اور چہرے سے جدا کیا، آسمان سے آواز آئی، تم دونوں مجھ سے دور ہو جاؤ، نافرمانوں کے لیے یہاں کوئی گنجائش نہیں ہے، حضرت آدم علیہ السلام نے روتے ہوئے حضرت حوا علیہ السلام سے کہا کہ معصیت کی پہلی نحوست یہ ہے کہ ہم محبوب کی قربت سے محروم کئے گئے، حضرت سلیمان ابن داؤد علیہ السلام کا واقعہ بھی مشہور ہے کہ انھیں اس بت کی وجہ سے سزا دی گئی تھی جو چالیس روز تک انکے محل میں پوجا گیا۔ بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ ایک عورت نے آپ سے درخواست کی تھی کہ میرے باپ کی خواہش کے مطابق فیصلہ کرنا مگر آپ نے ایسا نہ کیا، بعض لوگوں کی رائے یہ ہے کہ انھوں نے ایک عورت کے باپ کے حق میں فیصلہ دے دیا تھا کیونکہ اس عورت کے لئے آپ کے دل میں کوئی جگہ تھی، وجہ جو بھی ہو، بہر حال آپ سے غلطی سرزد ہوئی، اور اسکی سزایہ دی گئی کہ چالیس روز کے لئے سلطنت سے محروم کر دئے گئے، سلطنت سے ہی نہیں بلکہ کھانے پینے سے بھی محروم ہو گئے، ادھر، ادھر بھاگے بھاگے پھرتے، لوگوں سے کہتے کہ میں داؤد کا بیٹا سلیمان ہوں، مجھے کھانا دو، مگر لوگ انھیں ڈانٹ کر بھاگ دیتے، ایک بڑھیا سے آپ نے کھانا مانگا تو اس نے منہ پر تھوک دیا، ایک بڑھیا نے پیشاب سے لبریز برتن آپ کے سر پر الٹ دیا، یہاں تک کہ آپکی انگوٹھی ایک مچھلی کے پیٹ سے ٹکلی، اور آپ نے چالیس روز بعد یہ انگوٹھی اپنی تو پر بندے آپ کے سر پر آکر بیٹھ گئے، شیاطین، جنات، اور درندوں نے آپ کے ارد گرد اجتماع کیا، ان میں سے بعض نے اپنی بدسلوکی کی معذرت کی تو آپ نے فرمایا میں آج سے پہلے تمہیں اس بدسلوکی کے لئے عطا کی گئی تھی، اور نہ آج میں معذرت پر تمہاری تعریف کروں گا، یہ ایک آسمانی حکم تھا، جسے ہر حال میں ظاہر ہونا تھا۔

اسرائیلی روایات میں یہ واقعہ مذکور ہے کہ بنی اسرائیل کے ایک شخص نے کسی دوسرے شہر میں نکاح کیا تھا، خود کسی وجہ سے اس عورت کو ساتھ نہ لاسکا، اپنے غلام کو لینے کے لئے بھیجا، راستے میں نفسانی خواہشات نے سر ہمارا اور اسکا دل چاہا کہ میں اس سے اپنا قصد پورا کر لوں لیکن اس نے اپنے نفس پر مجاہدہ کیا، اور نفس کو اسکی خواہش سے روکے رکھا، اللہ تعالیٰ نے اس مجاہدے کا یہ صلہ عطا فرمایا کہ اسے پیغمبر بنا دیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت خضر علیہ السلام سے دریافت کیا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو علم غیب کس بنا پر عطا فرمایا؟ انھوں نے جواب دیا کہ اس وجہ سے کہ میں نے اللہ کے واسطے تمام گناہ ترک کر دیے ہیں، روایات میں ہے کہ ہوا بھی حضرت سلیمان علیہ السلام کے حکم کے تابع تھی، ایک مرتبہ آپ کو اپنی نئی قمیض اچھی معلوم ہوئی، آپ نے نظر بھر کر اسے دیکھا، ہوائے اسے نیچے گرا دیا، آپ نے ہوائے پوچھا تو نے ایسا کیوں کیا، میں نے تجھے گرانے کا حکم نہیں دیا تھا، ہوائے عرض کیا کہ ہم آپ کی اطاعت اسی وقت کرتے ہیں جب آپ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتے ہیں، روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت یعقوب علیہ السلام سے پوچھا کہ کیا تم جانتے ہو میں نے تمہیں یوسف سے جدا کیوں کیا انھوں نے عرض کیا نہیں۔ جواب ملا کہ تم نے ایک مرتبہ یوسف کے بھائیوں سے یہ کہا تھا۔

وَآخَافُ أَنْ يَأْكُلُوا لَدُنِّي وَأَنْتُمْ عَنْهُ غَافِلُونَ (پ ۳۳ ر ۳۳ آیت ۳)

اور میں یہ اندیشہ کرتا ہوں کہ اسکو کوئی بھیڑیا کھا جائے اور تم اس سے بے خبر ہو۔

تم نے بھیڑیے کا خوف کیا، مجھ سے امید نہ رکھی، تم نے یوسف کے بھائیوں کی غفلت پر نظری، میری حفاظت پر نظر نہ ڈالی، انکے

بعد ارشاد ہوا کہ کیا تم جانتے ہو میں نے یوسف کو تمہارے پاس واپس کیوں بھیجا، عرض کیا نہیں، جواب ملا، اس لئے کہ تم نے ایک مرتبہ یہ کہا تھا۔

عَسَىٰ اللَّهُ أَنْ يَأْتِيَنِي بِهِمْ جَمِيعًا (پ ۳۳ ر ۴ آیت ۸۳)
اللہ سے امید ہے کہ ان سب کو مجھ تک پہنچا دے گا۔

نیز یہ بھی کہا تھا۔

اَنْهَبُوا فَتَخَسَّوْا مِنْ يُّوسُفَ وَآخِيهِ وَلَا تَبْأَسُوا مِنْ دُورِ اللَّهِ (پ ۳۳ ر ۴ آیت ۸۷)
جاؤ اور یوسف اور اس کے بھائی کی تلاش کرو، اور اللہ کی رحمت سے ناامید مت ہو۔

حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ ہے کہ انہوں نے بادشاہ کے مصاحب سے کہا تھلاؤ کُرُوفِي عِنْدَ رَبِّكَ (اپنے رب کے پاس ہمارا ذکر کرنا) اللہ تعالیٰ نے اس واقعے کا ان الفاظ میں ذکر فرمایا۔

فَأَنسَاكَ الشَّيْطَانُ ذِكْرَ رَبِّهِ فَلَبِثَ فِي السِّجْنِ بِضْعَ سِنِينَ (پ ۳۳ ر ۴ آیت ۹۲)
پھر اس کو اپنے آقا سے تذکرہ کرنا شیطان نے بھلا دیا تو قید خانے میں اور بھی چند سال ان کا رہنا ہوا۔

اس طرح کے واقعات بے شمار ہیں، قرآن و حدیث میں ان کا ذکر قصہ کمانی کے طور پر نہیں آیا، بلکہ عبرت کے لئے آیا ہے، جنہیں اللہ نے عقل اور بصیرت سے نوازا ہے انہیں اس طرح کے واقعات سے عبرت پکڑنی چاہیے اور یہ سوچنا چاہیے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں۔ جو محبوب خدا ہوتے ہیں۔ کے مغائر معاف نہیں فرمائے تو ہم جیسے لوگوں کے کبائر کس طرح معاف ہو سکتے ہیں، البتہ یہ ان کی سعادت اور نیک بختی تھی کہ دنیا ہی میں سزا دیدی گئی، ان کا معاملہ آخرت پر نہیں رکھا گیا، جب کہ بد بختوں کو چھوٹ دی جائے گی، تاکہ ان کے گناہوں میں اضافہ ہو، یا اس لئے کہ آخرت کا عذاب زیادہ بڑا اور زیادہ شدید ہوتا ہے، اگر اس طرح کی باتیں گناہ پر اصرار کرنے والوں کے سامنے کی جائیں تو امید یہ ہے کہ انہیں نفع ہوگا، اور ان کے دلوں میں توبہ کی تحریک پیدا ہوگی۔

تیسری قسم : گناہ پر اصرار کرنے والوں کو بتلایا جائے کہ یہ خیال نہ کرنا چاہیے کہ صرف آخرت ہی میں گناہوں کی سزا ملے گی، بلکہ دنیا میں بھی مل سکتی ہے، چنانچہ بندوں پر جو مصائب نازل ہوتے ہیں، ان کا سبب وہ گناہ ہیں جن کے وہ مرتکب ہوتے ہیں، بعض لوگوں کو دیکھا گیا ہے کہ وہ آخرت کے معاملے میں تسال برتتے ہیں، اور اخروی عذاب کے مقابلے میں دنیا کے عذاب سے زیادہ خوف زدہ رہتے ہیں، یہ ان کی انتہائی جمالت ہے، انہیں دنیا کے عذاب سے بھی ڈرایا جانا چاہیے، ضروری نہیں کہ عذاب کی شکلیں اور فو میتیں وہی ہوں جو آخرت میں ہوں گی، بلکہ دنیا کی مصیبتیں، پریشانیاں اور تفکرات سب گناہوں کا نتیجہ ہیں، اور عام طور پر لوگ اس نتیجے کا سامنا کرتے رہتے ہیں، اکثر یہی ہوتا ہے کہ دنیا میں گناہوں کی نعمت سامنے آجاتی ہے، جیسا کہ داؤد علیہ السلام کے قصے میں بیان کیا گیا ہے، یہاں تک کہ گناہ کے باعث گنہ گاروں پر رزق کا دروازہ نکل ہو جاتا ہے، بعض بد کردار لوگ عزت و وقار کھودیتے ہیں، اور دشمن ان پر غلبہ حاصل کر لیتے ہیں، حدیث شریف میں ہے۔

إِنَّ الْعَبْدَ لَيُحْرَمُ الرِّزْقَ مِنْ الذَّنْبِ يَصِيبُهُ (ابن ماجہ، حاکم، ڈھان)

بندہ کبھی گناہ کے سبب رزق سے محروم ہو جاتا ہے۔

حضرت عبد اللہ ابن مسعود فرماتے ہیں میرے خیال سے آدمی گناہ کے باعث علم بھول جاتا ہے، اس حدیث شریف میں یہی مراد

ہے، فرمایا۔

مَنْ قَارَفَ ذَنْبًا فَارَقَهُ عَقْلٌ لَا يَعُودُ إِلَيْهِ أَبَدًا (۱)

جو شخص گناہ کا ارتکاب کرتا ہے اس سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محلِ رحمت ہو جاتی ہے۔

ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ لعنت یہی نہیں کہ آدمی رویہ ہو جائے یا اس کا مال ضائع ہو جائے، بلکہ لعنت یہ بھی ہے کہ آدمی ایک گناہ سے نکلے اور اسی جیسے یا اس سے شدید تر گناہ میں لوٹ ہو جائے، حقیقت یہی ہے اس لئے کہ لعنت کے معنی ہیں 'دھتکارنا' اور دور کرنا، جب آدمی کو خیر کی توفیق نہیں ہوتی۔ اور شر کے بعد مایا ہو جاتے ہیں تو وہ رحمت سے دور ہو جاتا ہے، ہر گناہ دوسرے گناہ کا داعی ہے، اس طرح گناہ بڑھتے رہتے ہیں، اور گناہوں کے ساتھ ساتھ اس رزق سے محرومی بھی بڑھتی رہتی ہے، جو علماء اور صلحاء کی ہم نشینی سے حاصل ہوتا ہے، خدا کا مبغوض بننے کی وجہ سے وہ بزرگوں کی نظروں سے گر جاتا ہے، اور ان کی پاکیزہ مجلسوں میں بیٹھنے کا اہل نہیں رہتا۔ ایک عارف کا واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ کچھ میں اپنے پانچٹھ اٹھائے چلے جا رہے تھے، اور قدم احتیاط سے جما کر رکھتے تھے تاکہ پھسل نہ جائیں، مگر سوء اتفاق سے پاؤں پھسل گیا، اور موصوف گر پڑے، اس کے بعد اٹھے، اور کچھ کے درمیان چلنے لگے، اس حالت میں دوتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے کہ یہ اس شخص کا حال ہوتا ہے جو گناہوں سے اجتناب کرتا ہے، لیکن ایک آدمہ بار لغزش کھا کر گناہوں میں دھنس جاتا ہے، ان بزرگ نے گویا یہ بھی فرمایا کہ گناہ کی عقوبت میں یہ بھی داخل ہے کہ دوسرے گناہ کا ارتکاب کرے۔ عارفین کے نزدیک دنیا کی تمام مصیبتیں گناہوں کی عقوبتیں ہیں، حضرت قتیل ابن عیاض فرماتے ہیں کہ تم پر رہانے کی گردش آئے یا تمہارے دوست تم پر ستم و حائنیں، ان سب کو اپنے گناہوں کا ورثہ سمجھو۔ ایک بزرگ یہ کہتے ہیں کہ جب میرا گدھا سرکش اور بدخلق ہو جاتا ہے تو میں جان لیتا ہوں کہ یہ میرے کسی گناہ کی سزا ہے۔ ایک بزرگ کہتے ہیں کہ میں گھر کے چوہوں کے روپ میں عقوبت پہچان لیتا ہوں، شام کے ایک صوفی کہتے ہیں کہ میں نے ایک خوب دوفصرانی غلام دیکھا، اور چند لمحے دیکھا رہا، اسی انشاء میں میرے پاس ابن الجلاء دمشقی گزرے، اور انھوں نے میرا ہاتھ پکڑ لیا، میں سخت شرمندہ ہوا، اور کہنے لگا، سبحان اللہ! قربان جائیے اللہ تعالیٰ کی محکم صنعت پر، دوزخ کی آگ میں جلائے کے لئے کیا حسین صورت بنائی ہے، انھوں نے میرا ہاتھ دہرایا، اور فرمایا چند روز کے بعد تمہیں اسکی سزا ملے گی، صاحب واقعہ کہتے ہیں کہ تیس برس بعد مجھے اس گناہ کی سزا ملی، ابو سلیمان دارانی کہتے ہیں کہ احتلام ہونا بھی سزا ہے، نیز کسی کا جماعت سے محروم ہو جانا بھی ایک عقوبت ہے، جو اسے کسی گناہ پر دی جاتی ہے، حدیث شریف میں ہے۔

مَا أَتَاكُمْ مِنْ زَمَانٍ كُمْ فِيْهِ مَا غَيَّرَ نَفْسَ مِنْ أَعْمَالِكُمْ (یعنی فی الزہد۔ ابو الدرداء)

زمانے کی جو بات تمہیں بری معلوم ہو اسے اپنے اعمال کے تغیر کا نتیجہ سمجھو۔

ایک روایت میں ہے کہ جب کوئی بندہ اپنی شہوت کو میری اطاعت پر ترجیح دیتا ہے تو میں اسے معمولی سے معمولی سزا یہ دیتا ہوں کہ اپنی مناجات کی لذت سے محروم کر دیتا ہوں۔ (۱) ابو عمران ابن علوان سے ایک طویل قصہ نقل کیا گیا ہے اسکا ایک ٹکڑا یہ ہے کہ میں ایک روز نماز پڑھ رہا تھا کہ میرے دل میں ایک خواہش نے انگڑائی لی، اور میں دیر تک اسکے بارے میں سوچتا رہا، یہاں تک کہ اس سے لواطت کی خواہش پیدا ہوئی، میں فوراً ہی زمین پر گر پڑا، اور میرا تمام جسم سیاہ پڑ گیا، میں تین دن گھر میں چھپا رہا، اس عرصے میں صابن مل مل کر نہاتا، لیکن جسم کی سیاہی دور نہ ہوتی، بلکہ بڑھتی رہی، تین روز کے بعد رنگ صاف ہوا، اسکے بعد حضرت جنید کی خدمت میں انکی دعوت پر عازم بغداد ہوا، جب انکے سامنے حاضر ہوا تو انھوں نے فرمایا، تمہیں اللہ سے شرم نہ آئی کہ نماز کی حالت میں ایسا غلط خیال آیا، اگر میں تمہارے لئے دعا نہ کرتا، اور تمہاری طرف سے توبہ نہ کرتا تو تم اسی سیاہ رنگ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے یہاں جاتے، مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ انھیں میرا حال کیسے معلوم ہو گیا، جب کہ میں رقتہ میں تھا اور وہ بغداد میں تشریف رکھتے تھے۔

جاننا چاہیے کہ جب کوئی بندہ گناہ کا ارتکاب کرتا ہے، اس کا چروہل سیاہ پڑ جاتا ہے، اگر وہ خوش بخت ہو تو دل کی سیاہی چہرے پر نمایاں ہو جاتی ہے، تاکہ وہ متنبہ ہو جائے، اور بد عمل سے رک جائے، اور بد بخت ہوتا ہے تو پھر کوئی اثر چہرے پر نہیں آتا، تاکہ وہ گناہوں میں منہمک رہے اور عذاب کا مستحق ہو۔ ہر حال دنیا میں گناہوں کے بے شمار آفات ہیں جیسے فقر اور مرض وغیرہ دنیا میں گناہوں کی یہ نحوست کیا کم ہے کہ آدمی گناہ کے بعد اسکے اثرات کا شکار رہے، یعنی گناہ کی سزا میں مصیبت کا شکار ہو۔ اور اس مصیبت پر اچھی طرح مبر کرنے سے بھی محروم رہے، تاکہ بد بختی اور بد بختی سے محفوظ رہے اور اگر مصیبت سے مصلحت دیکر کوئی نعمت اسے دی جائے تو پر شکر کی توفیق نہ ہو، اور ناشکری پر الگ سزائے، مطیع کا حال اس کے برعکس ہوتا ہے، اسکی اطاعت کی یہ برکت ہوتی ہے کہ ہر نعمت اسکے حق میں جزا بن جاتی ہے، اور شکر کی توفیق دیئے جانے سے وہ مزید اجر و ثواب کا مستحق ہو جاتا ہے، ہر مصیبت اسکے گناہوں کا کفارہ اور اسکے درجات کی بلندی کا باعث بن جاتی ہے۔

چوتھی قسم : یہ ہے کہ ان عقوبتوں کا ذکر کرے جو الگ الگ گناہوں کے سلسلے میں مذکور ہیں، اور ہر گناہ کی الگ الگ مذمت کرے، مثلاً شراب خوری، زنا چوری، قتل، غیبت، کبر، حد وغیرہ گناہوں کی الگ الگ برائی بیان کرے، اور جو سزائیں شریعت نے ان گناہوں پر مقرر کی ہیں انھیں بتلائے، ہر گناہ کے سلسلے میں بے شمار روایات وارد ہیں، لیکن اتنا خیال رکھنا چاہیے کہ ہر شخص کے سامنے وہی روایات بیان کرے جو اس سے متعلق ہوں، اور اسکے حال پر منطبق ہوتی ہوں غیر متعلق روایات ذکر کرنا ایسا ہے جیسے کسی کو مرض کچھ ہو اور دوا کچھ دیدی جائے، عالم کو طبیب حاذق کی طرح ہونا چاہیے۔ جو پہلے نبض دیکھتا ہے، پھر رنگ اور حرکات و سکنات سے باطن کی پوشیدہ بیماریوں کو پتہ چلاتا ہے، اور ان کا علاج تجویز کرتا ہے، اسی طرح عالم کو بھی قرآن احوال سے آدمی کی پوشیدہ صفات پر استدلال کرنا چاہیے۔ اور انھیں بیان کرنا چاہیے کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی پورے طور پر اقتداء ہو سکے۔ ایک صحابی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا، یا رسول اللہ! مجھے کوئی نصیحت فرمائیے، مگر لمبی چوڑی نہ ہو، فرمایا، غصہ مت کیا کرو، اسی طرح ایک اور صحابی نے نصیحت کی درخواست کی، آپ نے اس سے ارشاد فرمایا۔

عَلَيْكَ بِالْيَأْسِ مِمَّا فِيْ اَيْدِي النَّاسِ فَلَنْ ذَلِيْكَ هُوَ الْوَيْسُ، وَ اِيَّاكَ وَالطَّمَعِ فَلَنْهُ
الْفَقْرُ اِلَيَّ ضَرَوْصَلِّ صَلَاةَ مُؤَدِّعٍ وَ اِيَّاكَ كَمَا تَعْتَذِرُ

لوگوں کے پاس جو (مال و متاع) ہے اس سے مایوس رہو، یہی مالداری ہے، لالچ سے بچو، یہ فوری مفلسی

ہے، اور نماز رخصت ہونے کی طرح پڑھنا اور ایسی بات سے اپنے آپ کو بچانا جس سے عذر کرنا پڑے۔

ایک شخص نے محمد ابن واسع سے عرض کیا کہ مجھے وصیت کیجئے، آپ نے فرمایا، میں تمہیں وصیت کرتا ہوں کہ تم دنیا و آخرت میں بادشاہ بن کر رہنا، اس نے عرض کیا، میں یہ منصب کس طرح حاصل کروں گا، فرمایا دنیا میں زہد اختیار کرنا۔ پہلی روایت کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے شخص میں غصہ کی علامات دیکھیں تو اسے یہ ہدایت فرمائی کہ تم غصہ سے بچو، دوسرے شخص میں حرص اور لالچ کی علامتیں دیکھیں تو اسے ہدایت فرمائی کہ وہ حرص سے بچے، ان لوگوں کے مال میں طمع نہ کرے، اسی طرح محمد ابن الواسع نے مسائل میں حرص دنیا کی علامات پائیں تو اسے زہد فی الدنیا کی وصیت فرمائی، ایک شخص نے حضرت معاذ ابن جبلؓ سے وصیت کی درخواست کی، فرمایا تم رحم اختیار کرو میں تمہارے لئے جنت کا خا من ہوں، گویا انھوں نے سوال کرنے والے میں سخت گیری، اور سخت مزاجی دیکھی اس لئے اسے نرم خو بننے کا مشورہ دیا ایک شخص نے حضرت ابراہیم ابن اویہم سے عرض کیا کہ مجھے وصیت فرمائیں، آپ نے اس سے ارشاد فرمایا، لوگوں سے بچو، اور لوگوں کے ساتھ رہو، لوگوں کی ضرورت اس لئے ہے کہ آدمی بھول چوک کا پتلا ہے، ہر آدمی آدمی نہیں ہوتا، آدمی چلے گئے، بھوت رہ گئے، انھیں آدمی کیسے سمجھا جائے، وہ تو یاس کے سمندر میں غوطہ زن ہیں گویا حضرت ابن اویہم نے اپنی فراست ایمانی سے یہ بات جان لی کہ وہ شخص لوگوں سے اختلاط کے باعث آفات میں مبتلا ہے، اس لئے اسے ترک اختلاط کرنے، اور اس حد تک مل جل کر رہنے کا مشورہ دیا جس حد تک دنیاوی معاملات میں ان کی ضرورت

ہو۔ خلاصہ یہ ہے کہ عالم کو سائل کی طلب اور حالت کا لحاظ رکھ کر گفتگو کرنی چاہیے۔ خود اپنی حالت اور شان کے مطابق گفتگو نہ کرنی چاہیے۔ حضرت معاویہؓ نے حضرت عائشہؓ کی خدمت میں تحریر کیا کہ مجھے کوئی مختصر وصیت نامہ لکھ کر بھجوا دیجئے، آپ نے اس خط کے جواب میں لکھا، ”حمود صلاۃ کے بعد واضح ہو کہ میں نے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے، آپ فرماتے تھے۔“

مَنْ طَلَبَ رِضَاَ اللّٰهِ فِيْ سَخَطِ النَّاسِ كَفَّاهُ اللّٰهُ مَوْنَةَ النَّاسِ وَمَنْ النَّمَسَ سَخَطَ اللّٰهِ رِضَاَ النَّاسِ وَكَلَّاهُ اللّٰهُ اِلَى النَّاسِ وَلَسَلَامٌ عَلَيْكَ (تذی۔ حاکم)

جو شخص لوگوں کی ناراضگی میں اللہ کی رضا چاہتا ہے اللہ اسے لوگوں کی مشقت سے بچاتا ہے اور جو اللہ کو ناراض کر کے لوگوں کی رضامندی تلاش کرتا ہے اللہ اسے لوگوں کے سپرد کردیتا ہے، فقط والسلام۔

غور کیجئے حضرت عائشہؓ کی فہم و فراست پر، آپ نے اسی آفت پر قلم اٹھایا جس میں حکام و سلاطین مبتلا ہوتے ہیں، ”اور وہ لوگوں کی رضا جوئی، اور ان کی پاسداری ہے، خواہ معاملہ جائز حدود میں ہو یا ان سے تجاوز ہو، ایک مرتبہ انھوں نے یہ لکھا کہ اللہ سے ڈرو، اگر تم اللہ سے ڈرتے رہے تو وہ تمہیں لوگوں کی دست برد سے محفوظ رکھے گا، اور لوگوں سے ڈرو گے تو وہ تمہیں ذرا فائدہ نہیں پہنچائیں گے غرض یہ ہے کہ ناسخ کی تمام تر توجہ اس امر پر ہونی چاہیے کہ وہ جن لوگوں کو نصیحت کرنے میں مصروف ہے انکے مخفی اوصاف اور باطن احوال کا پتہ لگائے، تاکہ ان ہی کے مطابق نصیحت کی جاسکے، ورنہ ایک شخص کو بیک وقت تمام نصیحتیں نہیں کی جاسکتیں، اور نہ وہ اتنی بہت سی نصیحتیں قبول کر سکتا ہے، پھر جو بات اہم ہو اسے چھوڑ کر غیر اہم بات میں مشغول ہونا وقت ضائع کرنے کے برابر بھی ہے۔“

ایک سوال کا جواب : یہاں ایک سوال یہ ہو سکتا ہے کہ اگر کوئی داعی کسی مجمع سے خطاب کر رہا ہو یا کسی ایسے شخص سے مخاطب ہو جس کے باطن کا حال معلوم نہیں، اس صورت میں کیا کرے، اسکا جواب یہ ہے کہ اس صورت میں داعی کو ایسا وعظ کرنا چاہیے جس میں تمام مخلوق شریک ہو، یا ایسی باتیں کرنی چاہیں جن کی عام طور پر لوگوں کو ضرورت رہتی ہے، خواہ ہر وقت یا اکثر اوقات، اور شرعی علوم میں اسکی گنجائش ہے، اس لئے کہ علوم شرعیہ غذا بھی ہیں اور دوا بھی، غذا سب کے لئے ہیں، اور دوا ان لوگوں کے لئے جو کسی مرض میں مبتلا ہیں۔ اس کی مثال یہ روایت ہے کہ ایک شخص نے حضرت ابوسعید الخدریؓ سے درخواست کی کہ مجھے نصیحت فرمائیں، انھوں نے فرمایا کہ تقویٰ اختیار کرو، اسلئے کہ تقویٰ ہر خیر کی جڑ ہے، ”جماد کرو، اسلام کی رہبانیت جماد ہے۔ قرآن پڑھو، اہل زمین میں قرآن تمہارے لئے نور ہے، اور اہل آسمان میں ذکر کا باعث ہے، سکوت اختیار کرو، مگر حق بات سے نہیں، اس طرح تم شیطان پر غالب آ جاؤ گے، ایک شخص نے حضرت حسن بصریؒ سے نصیحت کی درخواست کی، آپ نے اسے یہ نصیحت فرمائی کہ احکام الہی کی تعظیم کر، اللہ تجھے عزت سے نوازے گا، حضرت لقمانؑ نے اپنے بیٹے سے فرمایا، اے بیٹے! علماء کے زانو پر زانو رکھ، لیکن ان سے مجادلہ نہ کر، ورنہ وہ تجھے برا سمجھیں گے، دنیا میں سے اتار رکھ لے جو تیری بقا کے لئے کافی ہو، اور اپنی زائد آمدنی اپنی آخرت کے لئے خرچ کر دے، دنیا کو بالکل مت ترک کر کہ دوسروں پر اپنا بوجھ ڈال دے، اور ان کے لئے دیوال بن جائے۔ روزہ رکھ مگر ایسا جس سے تو اپنی شہوت کا زور توڑ سکے، ایسا نہیں جس سے نماز میں خلل واقع ہو، اسلئے کہ نماز روزے سے الفضل ہے، بے وقوف کے پاس مت بیٹھ، اور نہ منافق سے میل جول رکھ۔ انھوں نے اپنے بیٹے کو یہ نصیحت بھی فرمائی۔ اے بیٹے! بلا تعجب مت ہنس، اور بلا ضرورت مت پھر، اور جس چیز سے تجھے فائدہ نہ ہو اس کے بارے میں دریافت مت کر۔ اپنا مال کھو کر دوسرے کے مال کی حفاظت مت کر، تیرا مال وہ ہے جو تو نے آگے بھیدیا ہے، اور دوسروں کا مال وہ ہے جو باقی بچا ہے، اے بیٹے! جو رحم کرتا ہے اس پر رحم کیا جاتا ہے، جو خاموش رہتا ہے وہ سلامتی پاتا ہے، جو کلمہ خیر کہتا ہے، وہ فائدہ اٹھاتا ہے، اور جو کلمہ شر کہتا ہے، وہ گناہ کھاتا ہے، جو شخص اپنی زبان پر قابو نہیں رکھتا وہ نادب ہوتا ہے۔ ایک شخص نے ابو حازم کی خدمت میں عرض کیا کہ مجھے نصیحت فرمائیں۔ انھوں نے فرمایا۔ ”اگر کوئی کام ایسا ہو کہ تجھے اس پر موت آجائے اور وہ اچھی معلوم ہو تو وہ کام ضرور کر، اگر کوئی کام ایسا ہو کہ جس پر تجھے موت آجائے اور وہ بری معلوم ہو تو اس سے اجتناب کر۔“

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت خضر علیہ السلام سے وصیت کی درخواست کی، انہوں نے فرمایا: خندہ دور ہو، بہت زیادہ غصہ مت کیا کرو، ایسے ہو جس سے لوگ نفع اٹھائیں، اسے نہ ہو جس سے لوگ نقصان پائیں، جھگڑوں سے بچو، بلا ضرورت مت بھڑکنا، تعجب مت نہسو، جن سے قصور ہو گیا ہو انہیں انکے قصور اور عیب کا طعنہ دے کر شرمندہ مت کرو، بلکہ اے عمران کے بیٹے اپنی خطاؤں پر نادم ہو، اور ان پر آنسو بہاؤ۔ ایک شخص نے محمد ابن کرام سے نصیحت کی درخواست کی انہوں نے فرمایا، تمہیں اپنے خالق کی رضامندی کے لئے اس قدر کوشش کرنی چاہیے، جس قدر تم اپنے نفس کو راضی کرنے کے لئے کرتے ہو۔ ایک شخص نے حامد لغاف سے نصیحت کی درخواست کی، انہوں نے فرمایا تم اپنے دین کے لئے ایک خلاف بنالو جس طرح قرآن کریم کے لئے خلاف بنایا جاتا ہے، تاکہ وہ گرد آلود نہ ہو، مسائل نے عرض کیا دین کے خلاف سے آپ کی مراد کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: دنیا کی طلب ترک کرنا، الایہ کہ جتنی ضرورت ہو، اسی طرح فضول کلام اور بلا ضرورت لوگوں سے اختلاف ترک کرنا دین کا خلاف ہے حضرت حسن بصریؒ نے حضرت عمر ابن عبدالعزیزؒ کو ایک خط لکھا، اس کا مضمون یہ تھا ”جن چیزوں سے اللہ تعالیٰ ڈرتا ہے، ان میں اللہ سے ڈرو، اللہ جو مال تمہارے پاس اس وقت موجود ہے، اس میں سے آگے کے لئے کچھ لے لو، موت کے وقت تمہیں یقینی خبر ملے گی“ ایک مرتبہ حضرت عمر ابن عبدالعزیزؒ نے ان کی خدمت میں ایک عریضہ تحریر کیا اور درخواست کی کہ وہ کچھ ناصحانہ کلمات تحریر فرمائیں، انہوں نے جواب میں لکھا ”سب سے زیادہ دہشتناک اور ہولناک مناظر عقرب سانسے آنے والے ہیں، تمہیں انہیں دیکھنا ہو گا، خواہ نجات کے ساتھ دیکھو، یا بربادی کے ساتھ، یہ بات یاد رکھو جو شخص اپنے نفس کا محاسبہ کرتا ہے وہ نفع اٹھاتا ہے، اور جو نفس سے غفلت برتتا ہے وہ نقصان اٹھاتا ہے، جو انجام پر نظر رکھتا ہے وہ نجات پاتا ہے، جو اپنی خواہشات کی پیروی کرتا ہے، وہ گمراہ ہوتا ہے، جو بدبادی اختیار کرتا ہے، وہ نفع اٹھاتا ہے، جو ڈرتا ہے وہ بچ جاتا ہے، اور جو بچ جاتا ہے وہ عبرت پکڑتا ہے، اور جو عبرت پکڑتا ہے وہ صاحب بصیرت ہوتا ہے، اور جو صاحب بصیرت ہوتا ہے وہ فہم رکھتا ہے، اور جو فہم رکھتا ہے وہ غم بھی رکھتا ہے، اگر تم سے کوئی خطا سرزد ہو جائے تو اس سے باز رہنے کی کوشش کرو، جب ندامت کرو تو اس گناہ کو بڑے اکھاڑ پیچنک دو، اگر تمہیں کوئی بات معلوم نہ ہو تو دریافت کر لو، اور غصہ آجائے تو اپنے آپ پر قابو رکھو۔“

مطرف ابن عبداللہ نے حضرت عمر ابن عبدالعزیزؒ کو ایک خط تحریر کیا، جس کا مضمون یہ تھا ”دنیا سزا کا گھر ہے، اس کے لئے وہی جمع کرتا ہے جسے عقل نہیں ہوتی، اس سے وہی فریب کھاتا جو علم سے محروم ہوتا ہے، اے امیر المؤمنین! آپ اس میں اس طرح زندگی بسر کریں جس طرح کوئی زخمی اپنے زخم کا علاج کرتا ہے، اور انجام کی خرابی کے خوف سے دوا کی شدت پر صبر کرتا ہے۔“

حضرت عمر ابن عبدالعزیزؒ نے عدی ابن ارطاط کو لکھا کہ دنیا اللہ کے دوستوں اور اس کے دشمنوں دونوں کی دشمن ہے، اس کے دوستوں کو رنج پہنچاتی ہے، اور اس کے دشمنوں کو فریب دیتی ہے۔ حضرت عمر ابن عبدالعزیزؒ نے اپنے ایک عامل کو لکھا کہ میں نے تمہیں عامل مقرر کیا ہے اس طرح تمہیں مخلوق خدا پر ظلم کرنے کی قدرت حاصل ہو گئی ہے، لیکن جب تم کسی پر ظلم کرنے کا ارادہ کرو تو یہ یاد رکھو کہ تم پر کسی کو قدرت حاصل ہے، تم لوگوں کے ساتھ جو زیادتی کرو گے وہ ان سے زائل ہو جائے گی، لیکن تم پر باقی رہ جائے گی، اور یہ بات بھی یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ ظالموں سے مظلوموں کا انتقام ضرور لے گا۔

حاصل گفتگو یہ ہے کہ مجمع عام میں وعظ اسی طرح ہونا چاہیے، جس مسائل کا حال معلوم نہ ہو اس کو نصیحت کرنے کا اسلوب بھی یہی ہونا چاہیے، یہ مواظظ غذاؤں کی طرح ہیں جن سے فائدہ اٹھانے میں تمام مخلوق شریک ہے، لیکن کیونکہ اس طرح کے واعظ موجود نہیں ہیں، اس لئے وعظ کا دروازہ بند ہو گیا ہے لوگوں پر محاصی غالب آچکے ہیں، فساد پھیل گیا ہے، اور مخلوق خدا ایسے واعظوں کی وجہ سے فتنے میں مبتلا ہو گئے ہیں، جو مسیح اور متقی باتیں کرتے ہیں، وعظ کے دوران عجب اخلاق اشعار سناتے ہیں، اور ایسے علمی موضوعات پر زبان کھولتے ہیں جو ان کی علمی پرواز سے بلند ہیں۔ مختلف وعظ کی کوششیں کی جاتی ہیں مگر وہ ہے کہ عوام کی نظموں میں ان کا وقار گر چکا ہے، ان کا کلام سننے والوں کے دلوں پر اثر انداز نہیں ہوتا، کیونکہ وہ خود دل سے کلام نہیں کرتے، نہ دل سے کلام

ہے اور نہ دل تک پہنچتا ہے، وعظ کہنے والے لاف و گزاف ہاںکتے ہیں، اور سننے والے صاف دلی سے نہیں سنتے، دونوں ہی راہ حق سے ہٹے ہوئے ہیں۔

صبر سے علاج : ہم نے بتلایا تھا کہ گناہ پر اصرار ایک سنگین مرض ہے، اور اس کے علاج کے دور کن ہیں، ایک علم، اس کی تفصیل گزر چکی ہے، دوسرا کن صبر ہے، جس طرح آدمی جسمانی امراض میں پہلے طبیب کو تلاش کرتا ہے، اسی طرح روحانی امراض میں عالم کو تلاش کرنا چاہیے، اسکے بعد علاج کا مرحلہ پیش آتا ہے، علاج کے دوران صبر کی ضرورت اسلئے ہے کہ بیماری معرغہ اؤں کے استعمال سے طویل ہو جاتی ہے، اور مریض یہ غذاؤں و دوا سے کھاتا ہے یا تو اس لئے کہ اسے ان غذاؤں کی معصرت کا علم نہیں ہوتا، یا اسلئے کہ کھانے کی خواہش شدید ہوتی ہے، اب تک ہم نے جو کچھ بیان کیا اس سے غفلت کا علاج کیا جاسکتا ہے، اب رہا دوسرا سبب یعنی شدت شہوت تو اس کا علاج ہم نے کتاب ریاضۃ النفس میں بیان کیا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جب مریض کو کسی نقصان دہ چیز کی خواہش ہو تو یہ سوچے کہ اسکے کھانے سے کیا نقصان ہو سکتا ہے، پہلے اس نقصان کا تصور کرے، پھر وہ چیز اس کی نگاہوں کے سامنے سے دور کر دی جائے اور کبھی نہ لائی جائے بلکہ وہ خواہش اس طرح پوری کرے کہ اسی سے ملتی جلتی کوئی چیز جس میں ضرر کم ہو استعمال کرے، پھر اسے ترک کر دے اور خوف کی طاقت سے اس تکلیف پر صبر کرے جو من پسند چیز چھوڑنے کی وجہ سے حاصل ہونی والی ہے، بہر حال صبر کی تلقین ناگزیر ہے، اسی طرح معاصی میں شہوت کا علاج کیا جاسکتا ہے، مثلاً ایک نوجوان ہے، جس پر شہوت غالب آچکی ہے، اور اب وہ اپنی آنکھوں، اپنے دل اور اعضاء کو اس شہوت سے محفوظ رکھنے پر قادر نہیں ہے، اس صورت میں اسکے لئے مناسب یہ ہے کہ پہلے اس گناہ کے نقصان کا تصور کرے، اس طرح کہ کتاب و سنت میں جو آیات یا روایات اس گناہ سے ڈرانے والی موجود ہیں ان کی تلاوت کرے، جب خوف شدید ہو جائے تو ان اسباب سے راہ فرار اختیار کرے جو شہوت میں بھجان پیدا کرنے والی ہیں۔

جوش شہوت کے دو سبب : شہوت کے بھجان کے دو سبب ہیں، ایک خارجی، دوسرا داخلی، خارجی سبب اس شخص کا سامنے موجود ہونا ہے، جس کی خواہش ہو، اس سبب کا علاج یہ ہے کہ اس کے قریب نہ رہے، دور بھاگے، اور تمنا کی اختیار کرے، شہوت کا داخلی سبب لذیذ اور مقوی غذاؤں کھانا ہے، اس کا علاج یہ ہے کہ بھوکا رہے یا مسلسل روزے رکھے، لیکن یہ دونوں علاج صبر کے محتاج ہیں، اور صبر کے لئے خوف کی ضرورت ہے، خوف علم کے بغیر نہیں ہوتا، علم زیادہ تر بصیرت و تامل سے حاصل ہوتا ہے، یوں سمجھو اور تقلید سے بھی علم میسر ہو سکتا ہے، ان تمام باتوں سے بھی پہلے یہ ضروری ہے کہ ذکر کی مجلسوں میں حاضر ہو، اور علماء کے مواظف اس طرح سننے کہ دل تمام مشاغل سے خالی ہو، جو سننے سے پوری طرح دل و دماغ میں اتارنے کی کوشش کرے، اس تدبیر پر عمل کرنے سے انشاء اللہ خوف پیدا ہوگا، اور جس قدر قوی ہوگا اسی قدر صبر پر اعانت ہوگی اسکے بعد اللہ تعالیٰ کی توفیق و تیسیر شامل ہوگی۔ جو شخص دل لگا کر سنے گا، اللہ سے ڈرے گا، ثواب کا منتظر ہوگا، اور اچھی باتوں کی تصدیق کرے گا، اللہ تعالیٰ اسے عمل کرنے میں سہولت بخشے گا، اور جو شخص سننے میں غلغلہ کرے گا، لاپرواہی برتے گا، اور اچھی باتوں کو جھٹلائے گا، اللہ اسے تنگی میں مبتلا کرے گا اس وقت دنیا کی لذتیں کچھ کام نہ آئیں گی، خواہ ہلاک ہو یا برباد ہو، انبیاء کرام صرف ہدایت کا راستہ دکھاتے ہیں فی الحقیقت دنیا و آخرت اللہ کے ہیں، وہ جسے چاہتا ہے دنیا دیتا ہے، اور جسے چاہتا ہے آخرت سے نوازتا ہے۔

مصر علی المعصیت کا ایمان : یہاں ایک اعتراض یہ کیا جاسکتا ہے کہ تم نے گذشتہ سطور میں جو تقریر کی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ ایمان ہی اصل ہے، تمہاری تقریر کی ابتداء یہاں سے ہوئی تھی کہ صبر کے بغیر گناہ ترک نہیں کئے جاسکتے، اور صبر بغیر خوف کے ممکن نہیں، خوف علم سے پیدا ہوتا ہے، اور علم اس وقت حاصل ہوتا ہے جب آدمی گناہوں کے ضرر کی تصدیق کرے، اور گناہوں کے ضرر کی تصدیق کے معنی ہیں اللہ اور رسول کی تصدیق، جسے ایمان کہتے ہیں، اس سے یہ ثابت ہوا کہ جو شخص گناہ پر اصرار کرتا ہے وہ ایمان سے محرومی کی بناء پر کرتا ہے حالانکہ بڑے سے بڑے گناہ گار کو بھی مومن کہتے ہیں، گناہ کے ارتکاب سے آدمی ایمان سے محروم نہیں ہوتا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ آدمی گناہ پر ایمان سے محرومی کی بناء پر اصرار نہیں کرتا بلکہ ایمان سے کمزوری کی بناء پر کرتا ہے، اس لئے کہ ہر صاحب ایمان اس کی تصدیق کرتا ہے کہ معصیت اللہ تعالیٰ سے دوری کا باعث، اور آخرت میں عذاب کا سبب ہے، اس کے باوجود وہ گناہ میں ملوث ہو جاتا ہے، اس کی چند وجوہات ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ آدمی گناہ پر ایمان سے محرومی کی بناء پر اصرار نہیں کرتا بلکہ ایمان سے کمزوری کی بناء پر کرتا ہے، اس لئے کہ ہر صاحب ایمان کی تصدیق کرتا ہے معصیت اللہ تعالیٰ سے دوری کا باعث، اور آخرت میں عذاب کا سبب ہے، اس کے باوجود وہ گناہ میں ملوث ہو جاتا ہے، اس کی چند وجوہات ہیں۔

مومن گناہ کیوں کرتا ہے؟ : پہلی وجہ یہ ہے کہ گناہ پر جس عذاب کی وعید وارد ہے وہ نگاہوں سے اوچھل ہے، سامنے نہیں ہے، اور نفس فطرتاً موجود سے متاثر ہوتا ہے، اس لئے موعودہ عذاب سے اس کا تاثر موجود عذاب کے تاثر کی نسبت ضعیف ہوتا ہے دوسری وجہ یہ ہے کہ جو شہوات گناہوں پر آمادہ کرتی ہیں وہ دراصل نفسانی لذات ہیں، نقد ہیں، اور ہر دم آدمی کے ساتھ ہیں عادت اور رجحان کی بناء پر مزید قوت اور غلبہ پاتی ہیں، عادت بجائے خود ایک طبیعت ہے، آئندہ کی تکلیف کے خوف سے حال کی لذت چھوڑنا نفس کے لئے نہایت دشوار ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

كَالْأَبْلِ نُجَبِّئُونَ الْعَا حِلَمُونَ نَذَرُونَ إِلَّا خِزْوَةً (پ ۲۹، آیت ۲۰-۲۱)

ہرگز ایسا نہیں بلکہ تم دنیا سے محبت رکھتے ہو اور آخرت کو چھوڑ بیٹھتے ہو۔

بَلْ تُؤْثِرُونَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا (پ ۳۰، آیت ۶)

مگر اے مکروہ تم آخرت کا سامان نہیں کرتے (بلکہ) تم دنیوی زندگی کو مقدم رکھتے ہو۔

بلکہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادِ گرامی سے اس معاملے کی شدت کا احساس ہوتا ہے، فرمایا۔

حُفَّتِ الْجَنَّةُ بِالْمَكَارِ وَ حُفَّتِ النَّارُ بِالشَّهَوَاتِ (بخاری و مسلم۔ ابو ہریرہ)

جنت ناپسندیدہ چیزوں (نہیتوں) سے گھری ہوئی ہے، اور دوزخ شہوتوں سے۔

ایک حدیث میں ہے۔

إِنَّ اللَّهَ خَلَقَ النَّارَ فَقَالَ لِحَبْرٍ نَبِيلٍ عَلَيْهِ السَّلَامُ اذْهَبْ فَاَنْظُرِ الْيَهَا فَنَظَرَ الْيَهَا فَقَالَ وَعِزَّتِكَ لَا يَسْمَعُ بِهَا أَحَدٌ فَلَا يَدْخُلُهَا فَحَقَّقَهَا بِالشَّهَوَاتِ ثُمَّ قَالَ اذْهَبْ فَاَنْظُرِ الْيَهَا فَنَظَرَ الْيَهَا فَقَالَ وَعِزَّتِكَ لَا يَسْمَعُ بِهَا أَحَدٌ إِلَّا دَخَلُهَا وَخَلَقَ الْجَنَّةَ فَقَالَ لِحَبْرٍ نَبِيلٍ عَلَيْهِ السَّلَامُ اِنْهَتْ فَاَنْظُرِ الْيَهَا فَنَظَرَ الْيَهَا فَقَالَ وَعِزَّتِكَ لَا يَسْمَعُ بِهَا أَحَدٌ إِلَّا دَخَلُهَا فَحَقَّقَهَا بِالْمَكَارِهِ ثُمَّ قَالَ اذْهَبْ فَاَنْظُرِ الْيَهَا فَنَظَرَ الْيَهَا فَقَالَ وَعِزَّتِكَ لَقَدْ خَشِيتُ أَنْ لَا يَدْخُلُهَا أَحَدٌ (ابوداؤد و ترمذی، حاکم۔ ابو ہریرہ)

اللہ تعالیٰ نے دوزخ پیدا فرمائی اور جبرئیل علیہ السلام سے فرمایا جاؤ اسے دیکھو، انھوں نے دوزخ دیکھی اور عرض کیا قسم ہے تیری عزت کی، جو اس کا حال سنے گا وہ کبھی اس میں نہ جائے گا، اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے دوزخ کو شہوات سے گھیر دیا پھر حضرت جبرئیل علیہ السلام سے فرمایا جاؤ اسے جا کر دیکھو انھوں نے دیکھا اور عرض کیا قسم ہے تیری عزت کی جو اس بارے میں سنے گا وہ اس میں داخل ہوئے بغیر نہ رہے گا، اسکے بعد جنت پیدا کی اور جبرئیل کو اسے دیکھنے کا حکم ہوا، جبرئیل نے جنت دیکھا اور عرض کیا قسم تیری عزت کی جو اس کا حال سنے گا وہ ضرور اس میں جائے گا، پھر اسے نہیتوں سے گھیر دیا، اسکے بعد دیکھنے کا حکم ہوا انھوں نے اسے دیکھا اور عرض کیا، تیری عزت کی قسم مجھے ڈر ہے کہ اس میں کوئی نہ جاسکے گا۔

بہر حال شہوت کافی الوقت موجود ہونا اور عذاب کا مؤخر ہونا گناہوں پر اصرار کے واضح سبب ہیں، اگرچہ اصل ایمان اپنی جگہ باقی رہتا ہے، لیکن صاحب ایمان گناہ نہیں چھوڑتا گناہ کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ وہ ایمان کا منکر ہے، یا گناہوں کی معصرت کا یقین نہیں رکھتا، مثلاً ایک شخص بحالت مرض پیاس کی شدت سے مغلوب ہو کر برف کا پانی پیتا ہے کیا اسکے بارے میں یہ کہا جائے گا کہ اصل طب منکر ہے، یا اس بات کا یقین نہیں رکھتا کہ برف کا پانی اسکے حق میں معصرت ہے نہ وہ طب کا منکر ہے اور نہ اسکی معصرت سے ناواقف، لیکن اس پر شہوت غالب ہے، اور صبر کرنے جو تکلیف ہوگی وہ سامنے موجود ہے، اسلئے آئندہ کی تکلیف یا نقصان کا یا تو دھیان نہیں ہے، یا وہ آسان معلوم ہوتی ہے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ عام طور پر گناہ گار مومن توبہ کا عزم اور حسنت کے ذریعہ سیئات کی تکفیر کا عزم رکھتے ہیں، کیونکہ ان سے یہ وعدہ کیا گیا ہے، کہ توبہ اور حسنت سے گناہوں کے نقصان کی تلافی ہو جاتی ہے، لیکن طبعیتوں پر طول آمل کا غلبہ ہے، اسلئے توبہ و تکفیر کے باب میں ٹال مٹول سے کام لیتے ہیں معلوم ہوا کہ بندہ مومن ایمان کی موجودگی میں توبہ کی امید پر گناہ کا ارتکاب کرتا ہے۔ چوتھی وجہ یہ ہے کہ ہر مومن کو یہ یقین اور اعتقاد ہے کہ گناہوں کی پاداش میں جو عذاب دیا جائیگا وہ ایسا نہیں جو معاف نہ ہو سکے، اسلئے وہ گناہ کرتا ہے، اور معافی کے لئے اللہ کے فضل و کرم پر اس لگائے بیٹھا رہتا ہے۔

یہ وہ چار اسباب ہیں جن کی بناء پر گناہ گار اصل ایمان کی موجودگی میں اصرار کرتا ہے، ہاں ایک وجہ اور ہو سکتی ہے، لیکن اس سے اصل ایمان مجروح ہو جاتا ہے اور وہ وجہ یہ ہے کہ کوئی شخص انبیاء کرام کی صداقت میں شک کرتا ہو، اور اسے یہ یقین نہ ہو کہ حقوت کے بارے میں جو کچھ انبیاء فرماتے ہیں وہ حق ہے، یہ شک کفر ہے، یہ ایسا ہے جیسے کوئی طبیب کسی مریض سے کہے کہ فلاں چیز مت کھانا کیونکہ یہ معصرت ہے اگر مریض اس طبیب کا معتقد نہیں اور یہ سمجھتا ہے کہ اسے طب کی ایجاد بھی نہیں آتی تو وہ اس کی تنبیہ کی پروا نہیں کرتا، بلکہ اسکی تکذیب کرتا ہے، اسی کا نام کفر ہے۔

مذکورہ اسباب کا علاج : بہر حال یہ اسباب ہیں جن کی وجہ سے آدمی گناہ پر اصرار کرتا ہے، اب ان تمام اسباب کا علاج بیان کیا جاتا ہے، پہلے سبب یعنی ”عذاب نظروں کے سامنے نہیں ہے“ کا علاج یہ سوچنا ہے کہ جو چیز آنے والی ہے اگر کرے گی اور یہ کہ کل آنے میں زیادہ دور نہیں ہے، بلکہ دیکھنے والے کے لئے بہت قریب ہے، نیز موت آدمی سے اتنی قریب ہے جس قدر قریب جوتے کا تسمہ، کیا معلوم قیامت قریب ہو، اور بس دو چار لمحے میں واقع ہونے والی ہو، یہ بھی سوچے کہ آدمی فطرتاً مستقبل کی خوش حالی کے لئے حال میں محنت و مشقت کرتا ہے اور تکلیفیں اٹھاتا ہے مثلاً سندھوں کا سفر کرتا ہے، صحراؤں کی خاک چھانتا ہے اس امید پر کہ ان اسفار کے ذریعہ جو نفع حاصل ہو گا وہ آنے والی زندگی میں کام آئے گا، یہی نہیں بلکہ اگر وہ بیمار پڑ جائے، اور کوئی نصرانی (غیر مسلم) طبیب اسے یہ خبر دے کہ ٹھنڈا پانی تیرے لئے سخت معصرت کا باعث ہے، یہ تجھے موت سے ہم کنار کر سکتا ہے، حالانکہ ٹھنڈا پانی اسکے لئے انتہائی لذیذ شے ہے، لیکن وہ اسے ہاتھ بھی نہیں لگاتا، جبکہ موت کی تکلیف ایک لمحے کی ہے، بشرطیکہ مابعد الموت کی زندگی کا خوف نہ ہو، اور دنیا سے جدائی کی تکلیف نہ ہو، غور و فکر کا مقام ہے کہ آدمی ایک نصرانی کے کہنے سے لذت ترک کر دیتا ہے، ہو سکتا ہے وہ طبیب ہو، لیکن اسکی مہارت طب پر کوئی معجزہ تو قائم نہیں ہے جب کہ انبیاء کی حقانیت پر معجزات بھی قائم ہیں، وہ دل میں یہ سوچے کہ میں ایک غیر مسلم کی بات تو مان سکتا ہوں، لیکن پیغمبروں کی خبر کا یقین نہیں کرتا، کس قدر عجیب بات ہے، کیا میں یہ بات سمجھتا ہوں کہ دوزخ کا عذاب میرے لئے مرض کی تکلیف یا موت کی مشقت سے ہلکا ہو گا، جب کہ انبیاء صادقین یہ خبر دیتے ہیں کہ آخرت کا ایک دن دنیا کے پچاس ہزار دنوں کے برابر ہو گا۔

دوسرے سبب کا علاج بھی اسی طرح ہو سکتا ہے، اگر گناہ پر اصرار لذت کا غلبہ ہو تو اسے زہدستی ترک کرے، اور یہ سوچے کہ جب میں اس چند روزہ زندگی میں یہ لذت ترک نہیں کر سکتا تو پھر ابد الابد کی لذت مجھ سے کیسے چھینے گی، اگر مجھ سے یہ چند روزہ تکلیف برداشت نہیں ہو سکتی اور میں اس معمولی مشقت پر صبر نہیں کر سکتا تو دوزخ کی تکلیف کس طرح برداشت کروں گا، نیز جب میں دنیا کی

نعتوں پر صبر نہیں کر سکتا جو کدورتوں سے لبریز ہوتی ہیں تو میں آخرت کی پاکیزہ اور صاف و شفاف نعمتوں پر کیسے صبر کر سکوں گا۔ تیسرے سبب یعنی قبولیتِ توبہ کی امید میں توبہ سے ٹال مٹول کرنے کے علاج کے لئے اس طرح سوچے کہ اکثر وہ ذخیوں کی جھج و پکار کا سبب یہی تاخیر ہوگی، کیونکہ وہ گناہ سے توبہ کرنے میں تاخیر کریں گے اور یہ تاخیر موت پر جا کر منتہی ہوگی، اسکے بعد توبہ کا وقت نہیں رہے گا، دراصل ٹالنے والا اپنے کام کی بنیاد ایسے امر پر رکھتا ہے جو اس کے اختیار میں نہیں ہے یعنی آئندہ زندگی پر، اور یہ کہتا ہے میں زندہ رہوں گا اور توبہ کر لوں گا لیکن کیا اسے یقین سے معلوم ہے کہ وہ زندہ رہے گا، ہو سکتا ہے توبہ سے پہلے مرجائے، اور اگر زندہ بھی رہا تو کسے معلوم کہ وہ گناہ ترک کر دے گا، جس طرح وہ اس وقت گناہ ترک کرنے پر قادر نہیں ہے، ہو سکتا ہے آئندہ بھی نہ رہے، کیونکہ ترک نہ کرنے کا جو سبب آج موجود ہے وہ آئندہ بھی ہوگا، بلکہ یہ بھی ممکن ہے وہ سبب مسلسل عمل کرنے اور عادی ہونے کی وجہ سے اور پختہ ہو جائے، جسے عادت نہیں ہوتی وہ اگر کوئی کام چھوڑنا چاہے تو چھوڑ سکتا ہے، لیکن جسے عادت ہوتی ہے وہ خواہش کے باوجود نہیں چھوڑ پاتا، ہم رات دن اسکا مشاہدہ کرتے رہتے ہیں، ٹالنے والوں کی ہلاکت کا اصل سبب یہی ہے کہ وہ ایک ہی طرح کی دو چیزوں میں فرق سمجھتے ہیں، جیسے آج شب و روز ہیں وہی آئندہ بھی ہوں گے، جب وہ آج گناہ کے ترک پر قادر نہیں ہیں تو آئندہ یہ قدرت انہیں کیسے حاصل ہوگی، ٹالنے والے کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص درخت اکھاڑ کر پھینکنا چاہے، لیکن وہ مضبوط ہو اور آسانی سے اکھاڑا نہ جاسکے تو یہ سوچ کر چھوڑ دے کہ آئندہ سال کو خشک کروں گا، وہ یہ بات اچھی طرح جانتا ہے کہ درخت جتنی دیر زمین میں رہتا ہے اس کی جڑیں اتنی وسیع اور مضبوط ہوتی ہیں، اور اس پر جتنے ماہ و سال گزرتے ہیں قوی میں انضمام پیدا ہوتا ہے، اس سے بڑھ کر کیا حماقت ہو سکتی ہے جب وہ اپنی طاقت کے باوجود ایک نسبتاً کمزور درخت اکھاڑنے سے عاجز ہے، تو وہ اپنے ضعف کی حالت میں ایک مضبوط درخت کیلئے اکھاڑ سکتا ہے۔

چوتھی وجہ یعنی اللہ تعالیٰ کے حقوق و کرم کے شکر رہنے کا علاج وہی ہے جو پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔ اسکی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص اپنا تمام مال و متاع خیرات کر دے، اپنے اہل و عیال کو تنگدست بنا دے، اور شکر رہے کہ اللہ تعالیٰ فیض سے رزق بھیجے گا، اور کسی غمزدمن کے سینے سے خزانہ ہاتھ لگ جائے گا گناہ کی بخشش کا امکان ایسا ہی ہے جیسے خزانہ پانے کا امکان یا اس شخص کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص اس شہر میں جہاں دن وھاڑے خزانہ لوٹ لیا جاتا ہو اپنا سامان صحن میں ڈال دے، اور یہ کہے کہ مجھے اللہ کے فضل پر بھروسہ ہے، وہ میرے سامان کی حفاظت کرے گا، حالانکہ خود اسے اپنے سامان کو محفوظ جگہ پر رکھنے کی قدرت حاصل ہے، ان مثالوں میں خزانے کا دستیاب ہو جانا، اور مال کا لٹیروں سے بچ جانا ناممکن ہے، اور بعض اوقات ایسا ہو بھی گیا ہے، لیکن جو شخص محض اسی بھروسے پر کمانا چھوڑ دے، یا مال کو لاپرواہی سے ڈال دے وہ بڑا احمق ہے، اسی طرح گناہ کی بخشش ممکن ہے لیکن بخشش کی توقع پر گناہ کئے جانا اور توبہ نہ کرنا سخت جہالت ہے۔

پانچویں وجہ یعنی انبیاء کرام کی صداقت میں شک کرنے کا علاج وہ اسباب ہیں جن سے انبیاء کی حقانیت ثابت ہوتی ہے، یہ اسباب اگرچہ طویل ہیں، لیکن ان کا ذکر مفید ہے اور عقل سے قریب لوگوں کا ان سے علاج ہو سکتا ہے، مثال کے طور پر اس شک رکھنے والے انسان سے یہ کہا جائے کہ انبیاء کرام نے جن سے معجزات صادر ہوتے ہیں اور جو ان کے حق ہونے کی دلیل ہیں یہ خبر دی ہے کہ ایک عالم آخرت ہے، جو اس عالم سے الگ ہے اور موت کے بعد آدمی اس عالم سے حلق ہو جاتا ہے، کیا تو اس خبر کی صداقت پر یقین رکھتا ہے، یا تیرے خیال میں یہ اسی طرح محال ہے جس طرح ایک آدمی کا بیک وقت دو جگہ ہونا محال ہے، اگر وہ یہ کہے کہ میں اسے محال سمجھتا ہوں، تو اس سے بحث کرنا بیکار ہے ایسے شخص کا حال عقل سے محروم دیوانے کا سا ہے، جس طرح ان مسائل میں دیوانے کو مخاطب نہیں بنا یا جاسکتا اسی طرح اسے بھی مخاطب نہ بنا نا چاہیے، البتہ اگر وہ یہ کہے کہ مجھے شک ہے تو اس سے یہ پوچھا جائے کہ اگر تجھے ایک اجنبی شخص یہ خبر دے کہ جب تو اپنے گھر میں کھانا چھوڑ کر باہر گیا تھا تو ایک سانپ نے تیرے کھانے میں منہ ڈال دیا تھا اور اپنا زہر ملا دیا تھا، اگر اس کی صداقت کا امکان ہو تو کیا توبہ کھانا کھائے گا یا چھوڑ دے گا، اگرچہ وہ کھانا

لذیر ترین کھانا ہی کیوں نہ ہو، یقیناً ”وہ اس کے جواب میں کہے گا کہ میں کھانا نہیں کھاؤں گا“ اس لئے کہ میں یہ کوں گا، اگر وہ شخص جھوٹ بول رہا ہے، تب بھی ازارہ احتیاط مجھے یہ کھانا نہیں کھانا چاہیے، زیادہ سے زیادہ اس صورت میں یہ ہو سکتا ہے کہ لذیذ کھانا ضائع ہو جائے، لیکن اگر وہ سچ کہتا ہے تو یہ کھانا میرے لئے ہلاکت کا باعث ہوگا، اب اس سے کہا جائے کہ تو ایک بھول اجنبی کا کھانا مانتا ہے، اور اس کی خبر پر یقین کر کے کھانا ضائع کر دیتا ہے، جب کہ اس کے پاس نہ کوئی دلیل ہے نہ ثبوت ہے، پھر یہ گمان موجود ہے کہ اس نے حسد میں کہلایا ہو، یا پریشان کرنے کی خاطر کہا ہو، دوسری طرف انبیاء کرام کے اقوال ہیں، جنہیں معجزات کی تائید حاصل ہے، اولیاء، علماء، حکماء اور عقلاء کا اجماع ہے، مگر تو نہ انبیاء کا قول مانتا ہے اور نہ ان کی خبر تسلیم کرتا ہے، جاہل عوام زیر بحث نہیں ہیں، عقل مندوں میں اگر کوئی ایسا شخص موجود ہو تو بتلاؤ جو یوم آخرت پر یقین نہ رکھتا ہو، اور ثواب و عذاب کا قائل نہ ہو، عیفت میں اختلاف ہو سکتا ہے لیکن وجود پر تمام اہل عقل کا اتفاق ہے، اگر ان کی خبر سچ ہے تو تو ایک ایسے عذاب کے قریب پہنچ چکا جو ہمیشہ پیشہ رہنے والا ہے اور اگر جھوٹ بول رہے ہیں، تب بھی تیرا کوئی خاص نقصان نہیں ہے، صرف اتنا نقصان ہے کہ دنیا کی چند لذتیں تجھے حاصل نہ ہو سکیں گی، اگر مخاطب میں تھوڑی سی بھی عقل ہے تو وہ اس تقریر کے بعد توبہ میں ذرا توقف نہ کرے گا اسلئے کہ دنیا کی زندگی خواہ کتنی ہی طویل کیوں نہ ہو ابد الابد کی زندگی کے برابر نہیں ہو سکتی، اگر ہم دنیا کو غلے کے دانوں سے بھرا ہوا تصور کریں، اور یہ فرض کریں کہ ایک پرندہ دس لاکھ سال بعد ایک دانہ اٹھائے اور ٹھہر جائے، پھر دس لاکھ سال بعد اٹھائے اور رک جائے، اس صورت میں دانے ختم ہو جائیں گے، لیکن ابد الابد میں کمی نہ آئے گی، اس لئے عقل رکھنے والا انسان دنیا کی چند روزہ زندگی میں شہوات سے صبر کر کے ابد الابد کی سعادت حاصل کرنے میں سستی کیسے کرے گا ابو الطاء مصری کہتا ہے۔

قَالَ الْمُنْتَجِعُ وَالطَّبِيبُ كَلَّا هُمَا لَا تَبْنَعُ الْأَمْوَاطُ قُلْتُ إِنْ كُنَّا
إِنْ مَضَى قَوْلُكُمْ فَلَسْتُ بِعَاسٍ أَوْ مَضَى قَوْلِي فَالْخَسَاءُ عَلَى كُنَّا

(نجومی اور طبیب دونوں نے کہا مردے زندہ نہیں کئے جائیں گے، میں نے کہا کہ اگر تمہارا قول درست ہے تو پھر میں نقصان میں نہیں ہوں، اور اگر میرا قول صحیح ہے تو پھر تم سراسر نقصان میں ہو) اسی لئے حضرت علیؑ نے اس شخص سے جس کی عقل اس طرح کے امور کی تحقیق اور فہم سے قاصر تھی فرمایا کہ اگر تو سچ کہتا ہے تو میں اور تو دونوں سچ جائیں گے، اور اگر میں سچ کہتا ہوں تو تو ہلاک ہوگا، اور میں نجات پاؤں گا، بہر حال عقل مند انسان کو تمام حالات میں امن اور احتیاط کی راہ چلنی چاہیے۔

ایک سوال کا جواب : یہاں یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ یہ امور نہایت واضح ہیں، اور معمولی غور و فکر سے سمجھ میں آجاتے ہیں، لیکن لوگوں کے دلوں کو کیا ہو گیا ہے کہ انہوں نے اس طرح کے امور میں غور و فکر کرنا چھوڑ دیا، اور اسے گراں سمجھنے لگے، ایسے قلوب کا علاج کیسے ہو، اور انہیں کس طرح فکر کے راستے پر ڈالا جائے، خاص طور پر ان لوگوں کو جو اصل شریعت پر ایمان رکھتے ہیں۔ اسکے جواب کی تفصیل یہ ہے کہ اس فکر کی مانع دو باتیں ہیں، ایک تو یہ کہ آخرت کے عذاب، اس کی ہولناکیوں، سختیوں اور جنت فصیم سے محرومی پر گنہ گاروں کی حسرتوں کا تصور انتہائی تکلیف دہ، اور المناک تصور ہے، قلب اس طرح کے تصورات سے نفرت کرتا ہے، بلکہ اسکی دلچسپی کا سامان دنیا کی لذتوں میں ہے، یہاں کے عیش و آرام، اور راحت و عشرت کے بارے میں فکر کرتا ہے۔ اور خوش ہوتا ہے، دوسری بات یہ ہے کہ فکر دنیاوی لذات کے حصول، اور شہوات نفسانی کے تحمیل کے لئے مانع عقل ہے، کوئی انسان ایسا نہیں ہے جس پر ہر لمحہ کوئی نہ کوئی شہوت مسلط نہ رہتی ہو، اسلئے عموماً آدمی کا تمام تروت شہوات کی تحمیل کرنے کی تدبیر میں صرف ہوتا ہے، اس کی عقل شہوت کی اسیر ہوتی ہے اور وہ اسی کے تصور، یا اس کے تحمیل کے چیلے ہی میں لذت پاتا ہے، آخرت کے عذاب کی فکر کرنا اس لذت کیلئے مانع ہے۔

ان دونوں مانع امور کا علاج یہ ہے کہ اپنے دل کو سمجھائے اور اس سے پوچھے کہ جب تو موت اور مابعد الموت کے واقعات میں

فکر نہیں کر سکتا اور تجھے آخرت کے عذاب کے تصور ہی سے تکلیف ہوتی ہے، اس وقت کا عالم کیا ہو گا جب موت اچانک آئے گی، اور پھر وہ عذاب جس کے تصور سے تودل بڑا شتہ ہو جاتا ہے خود تجھ پر واقع ہو گا، اس وقت تو صبر بھی نہ کر سکے گا۔ دوسرے فکر کا علاج اس طرح ہو سکتا ہے کہ دل کو سمجھائے کہ تجھے دنیا کی لذتیں ضائع جانے کا افسوس نہ کرنا چاہیے، آخرت کی لذتیں دنیا کی لذتوں سے زیادہ اہم اور بڑی ہیں، اور اتنی ہیں کہ ان کی انتہا نہیں ہے، ان میں کسی طرح کی کدورت بھی نہیں ہے، جب کہ دنیا کی لذتیں جلد فنا ہو جانے والی ہیں، اور ان میں کدورتوں کی آمیزش بھی ہے، دنیا کی کوئی لذت ایسی نہیں ہے جو کدورت سے خالی ہو، تاہم گناہوں سے تائب ہو کر اللہ کی اطاعت کرنے، اور اسکی مناجات میں مشغول ہونے میں جو لذت ہے اس سے بڑھ کر کوئی لذت نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کی اطاعت و معرفت میں جو راحت ہے وہ کسی کام میں نہیں ہے، اگر مطیع کو اس لذت، حلاوت اور راحت کے علاوہ کوئی اور جزا نہ ملتی تب بھی کافی تھی۔ لیکن اللہ نے اسکے علاوہ بھی دوسری نعمتیں دینے کا وعدہ کر رکھا ہے، کس قدر بے وقوف ہیں وہ لوگ جو فانی لذتوں کے پیچھے دائمی نعمتیں چھوڑتے ہیں۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ یہ لذت و حلاوت توبہ کی ابتداء میں حاصل نہیں ہوتی، لیکن جب آدمی توبہ پر کچھ عرصے صبر کر لیتا ہے اور خیر اس کی طبیعت میں داخل ہو جاتا ہے تب وہ لذت حاصل ہوتی ہے۔ جس طرح شر آدمی کا مزاج بن جاتا ہے، اسی طرح خیر کی بھی عادت ہو جاتی ہے، اور آدمی کو خیر ہی کے کاموں میں لذت ملنے لگتی ہے یہ افکار خوف کے لئے محرک ہیں اور انسان کے اندر لذات سے صبر کرنے کی قوت پیدا کرتے ہیں، لیکن خود افکار کو دماغوں کے مواضع اور تنبیہی بیانات سے تحریک ملتی ہے، جب یہ افکار طبیعت کے موافق ہوتے ہیں تو قلب انکی طرف مائل ہوتا ہے، اس سبب کو جو طبع اور فکر کے درمیان موافقت پیدا کرتا ہے توفیق کہتے ہیں، توفیق اس موافقت کا نام ہے جو ارادے اور اطاعت کے درمیان ہوتی ہے، ایک طویل حدیث میں بیان کیا گیا ہے کہ عمار ابن یاسر نے کھڑے ہو کر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خدمت میں عرض کیا، امیر المؤمنین یہ بتلائیں کہ کفر کس چیز پر مبنی ہے؟ حضرت علیؑ نے ارشاد فرمایا کفر کی عمارت چار ستونوں پر قائم ہے، جفا، اندھا پن، غفلت، اور شک، جو جفا کریگا وہ حق کو حقیر جانے گا، باطل کا بول بالا کرے گا، اور علماء کو برا بھلا کہے گا، جو ناپسند ہو گا وہ ذکر بھول جائے گا، جو غفلت کرے گا وہ راہ راست سے ہٹے گا، اور جو شک کرے گا اسے اس کی آرزوئیں فریب دیں گی، حسرت و ندامت اس پر چھا جائے گی، اور جس کا اسے گمان بھی نہیں ہے وہ دیکھ لے گا فکر سے غفلت کی یہ چند آفتیں ہیں جو ذکر کی گئیں، توبہ کے باب میں اسی قدر بیان کافی ہے، اب ہم صبر کا ذکر کرتے ہیں، توبہ کے علاج کے لئے دو رکھوں کی ضرورت ہے، ان میں سے ایک رکن علم ہے اس کا بیان ہو چکا، اب دوسرے رکن صبر ایک مستقل کتاب کے تحت روشنی ڈالی جاتی ہے۔

کتاب الصبر و الشکر

صبر اور شکر کا بیان

ایمان کے دو حصے ہیں نصف صبر اور نصف شکر، جیسا کہ آثار و روایات سے پتہ چلتا ہے، (ابو منصور دہلی۔ النہج) نیز یہ دونوں اللہ تعالیٰ کے اوصاف میں سے دو وصف ہیں اور اسکے اسمائے حسنیٰ میں سے دو اسم ہیں، یعنی صبور اور شکور۔ صبر اور شکر کی حقیقت سے ناواقف ہو نا دراصل ایمان کے دونوں نصف حصوں سے ناواقف ہونا ہے، اور اللہ تعالیٰ کے دو صفوں سے جاہل رہنا ہے، جب کہ ایمان کے بغیر اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل نہیں ہوتا، اور ایمان کا راستہ یہ جانے بغیر طے نہیں ہوتا کہ کس چیز پر اور کس ذات پر ایمان لانا ہے، جو یہ بات نہیں جانتا وہ صبر اور شکر سے کیا واقف ہو گا، اس سے معلوم ہوا کہ ایمان کے دونوں حصوں پر روشنی ڈالنا نہایت ضروری ہے، لیکن کیونکہ یہ دونوں حصے ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہیں اس لئے ہم ایک ہی کتاب کے سات ابواب میں ان دونوں کی وضاحت کریں گے۔

پہلا باب

صبر کا بیان

صبر کی فضیلت : اللہ تعالیٰ نے صابرین کے بے شمار اوصاف بیان کئے ہیں، قرآن کریم میں ستر سے زائد جگہوں پر صبر کا ذکر ہے، ان آیات میں بہت سے بلند درجات اور خیرات کی نسبت صبر کی طرف کی گئی ہے اور انھیں صبر کا ثمر قرار دیا گیا ہے، چنانچہ ارشاد فرمایا۔ وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اِثْمًا قَتْلُوْنَ بِاَمْرِ نَا لِمَا صَبَرُوا (پ ۲۱ آیت ۲۳)

اور ہم نے ان میں جب کہ انھوں نے صبر کیا بہت سے پیشوا بنا لئے تھے جو ہمارے حکم سے ہدایت کرتے تھے۔ وَتَمَتَّ كَلِمَةً تَكَدُّ الْحُسْنٰی عَلٰی نَبِیِّ اِسْرَآئِیْلَ لِمَا صَبَرُوا (پ ۹ آیت ۳۷)

اور آپ کے رب کا نیک وعدہ نبی اسرائیل کے حق میں ان کے صبر کی وجہ سے پورا ہو گیا۔

وَلَنَجْزِیَنَ الَّذِیْنَ صَبَرُوا اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ (پ ۱۳ آیت ۹۶)

اور جو لوگ ثابت قدم ہیں، ہم ان کے اچھے کاموں کے عوض میں ان کا اجر ضرور دیں گے۔

اُولٰٓئِکَ یُؤْتُوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَیْنِ لِمَا صَبَرُوا (پ ۲۰ آیت ۵۲)

ان لوگوں کو ان کی پختگی کی وجہ سے دو ہر ثواب ملے گا۔

اِنَّمَا یُوقِی الصَّابِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَیْرِ حِسَابٍ (پ ۲۳ آیت ۱۰)

مستقل مزاج والوں کو ان کا صلہ بے شمار ہی ملے گا۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے صبر کا اجر بلا حساب دینے کا وعدہ کیا ہے، نیکوں میں صرف ایک نیکی یہی ہے کہ جس کا ثواب بے حساب دیا جائے گا، کیونکہ روزہ بھی صبر میں داخل ہے، بلکہ اسے نصف صبر کہا جاتا ہے، اسلئے اللہ تعالیٰ نے اسے بھی اپنی طرف منسوب فرمایا، دوسری کوئی عبادت ایسی نہیں ہے جس کے اجر کو اللہ تعالیٰ نے اپنے لئے مخصوص فرمایا ہو، حدیث قدسی ہے۔

الصَّوْمُ لِيْ وَ اَنَا اَجْزِيْهِ

روزہ میرے لئے ہے اور میں اسکی جزا دوں گا۔

صابرین کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے یہ وعدہ فرمایا ہے کہ وہ ان کے ساتھ ہے۔

وَاصْبِرْ وَاِنَّ اللَّمَعَ الصَّابِرِیْنَ (پ ۱۰ آیت ۳۶)

اور صبر کرو، بلاشبہ اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

ایک جگہ اپنی مدد و نصرت کو صبر پر معلق فرمایا۔ ارشاد ہوتا ہے۔

بَلٰی اِنْ اَنْصَبِرُوْا وَ اَتَّقُوا وَاٰتٰوْكُمْ مِنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا یُمَدِّدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اَلْفِ مِیْنِ

الْمَلٰٓئِکَةِ مُقْسُوْۤتِیْنِ (پ ۳ آیت ۴۵)

ہاں کیوں نہیں، اگر مستقل رہو گے، اور متقی رہو گے اور وہ لوگ تم پر ایک دم سے آئیں گے تو تمہارا

رب تمہاری امداد فرمائے گا پانچ ہزار فرشتوں سے جو ایک خاص وضع بنائے ہوئے ہوں گے۔

ایک جگہ صابرین کے لئے رحمت مصلوٰۃ اور ہدایت تینوں وصف یکجا بیان کئے گئے ہیں، کسی دوسرے عابد کے لئے یہ اوصاف

ایک جگہ بیان نہیں کئے گئے۔ اُولٰٓئِکَ عَلَیْهِمْ صَلَوٰتٌ مِنْ رَبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ (پ ۲ آیت ۱۵۷)

ان لوگوں پر خاص خاص رحمتیں بھی ان کے پروردگار کی طرف سے ہوں گی، اور عام رحمت بھی ہوگی۔

احادیث : صبر کے سلسلے میں بے شمار آیات ہیں، اگر یہ سب لکھی جائیں تو صفحات کا تنگ دامانی مانع آجائے، روایات بھی بکثرت

ہیں، چنانچہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں۔

الصَّبْرُ نِصْفُ الْإِيمَانِ (ابو نعیم، خطیب۔ ابن مسعود) صبر آدھا ایمان ہے۔

اسکے نصف ایمان ہونے کی وجہ عنقریب بیان کی جائے گی، ایک روایت میں ہے کہ جو چیزیں ہمیں کم دی گئی ہیں، ان میں یقین اور صبر ہیں جسے ان دونوں میں سے زیادہ حصہ ملا ہے اسے اگر تہجد اور نفل روزے نہ ملیں تو کوئی پروا نہیں کرے گا جس حال پر اب تم ہو اگر اس پر صبر کو توبہ بات میرے نزدیک اسکی نسبت زیادہ پسندیدہ ہے کہ تم میں سے ہر ایک میرے پاس اس قدر عمل لے کر آئے جس قدر عمل تم سب کرتے ہو، لیکن مجھے ڈر ہے کہ تم پر میرے بعد دنیا فتح ہوگی، اور تم ایک دوسرے کو برا جانو گے اور اس وقت آسمان والے ہمیں برا جانیں گے، جو شخص اس حال پر صبر کرے گا اور احتساب کرے گا اسے پورا پورا ثواب ملے گا، اسکے بعد آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔

مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللَّهِ بَاقٍ وَلَنَجْزِيَنَّ الَّذِينَ صَبَرُوا أَجْرَهُمْ (پ ۱۳ ر ۱۹ آیت ۴۴)

اور جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ ختم ہو جائے گا اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ دائم رہے گا۔

حضرت جابر سے مروی ہے کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایمان کے حلق سوال کیا گیا، آپ نے ارشاد فرمایا۔
”الصَّبْرُ وَالسَّمَاحَةُ“ (طبرانی، ابن حبان۔ عبد اللہ ابن عبید ابن عیمر، من ابیہ عن جده) یعنی صبر اور عفو۔ ایک مرتبہ ارشاد فرمایا ”الصَّبْرُ كَنْزٌ مِنَ كُنُوزِ الْجَنَّةِ“ صبر جنت کے خزانوں میں سے ایک خزانہ ہے (۲) ایک مرتبہ کسی نے ایمان کے بارے میں دریافت کیا، آپ نے ارشاد فرمایا، صبر (دینی) آپ کا یہ ارشاد دراصل اس حدیث کے مشابہ ہے جس میں آپ نے فرمایا ”الْحَيَجُ عَرَفَةٌ“ (۳) (حج عرفہ ہے) یعنی حج کا بڑا حصہ عرفہ ہے ایک روایت میں ارشاد فرمایا ”أَفْعَلُ الْفَعَالِ مَا كَرِهَتْ طَائِفَةٌ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ“ (۴) (اعمال میں افضل عمل وہ ہے جس پر نفسوں کو جبر ہو) روایات میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر حضرت داؤد علیہ السلام کو وحی بھیجی کہ میرے اخلاق اختیار کر، اور میرا ایک خلق یہ ہے کہ میں نہایت صبر کرنے والا ہوں، عطاء کی روایت میں حضرت عبد اللہ ابن عباس سے مروی ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم انصار کے پاس تشریف لائے تو ان سے دریافت فرمایا کہ کیا تم مومن ہو، تمام حاضرین خاموش رہے، پھر حضرت عمرؓ نے عرض کیا، جی ہاں، ہم مومن ہیں، آپ نے پوچھا تمہارے ایمان کی علامت کیا ہے۔ انصار نے عرض کیا ہم خوش حالی میں شاکر پریشانی میں صابر اور فیصلوں پر راضی رہتے ہیں، آپ نے ارشاد فرمایا ”مُؤْمِنُونَ وَرَبِّ الْكَعْبَةِ“ (طبرانی) رب کعبہ کی قسم تم مومن ہو۔

ایک حدیث میں یہ الفاظ ہیں ”فی الصبر علی ماتکرہ خیر کثیر“ (ترمذی۔ ابن عباس) ناپسندیدہ چیز پر صبر کرنا بڑا خیر ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں، جس چیز کو تم پسند کرتے ہو وہ ہمیں اسی وقت حاصل ہوگی جب تم ناپسندیدہ چیزوں پر صبر کرو گے۔ ایک روایت میں ہے کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

لَوْ كَانَ الصَّبْرُ رَجُلًا لَكَانَ كَرِيمًا وَاللَّيْثُ حُبُّ الصَّابِرِينَ (طبرانی۔ حاکم)

اگر صبر کوئی آدمی ہو تا تو کریم ہو تا اور اللہ صبر کرنے والوں کو محبوب رکھتا ہے۔

یہ شے نمونے از خود ارے ہے، ورنہ صبر کی فضیلت میں لا تعداد روایات ہیں، ان سب کے ذکر کی یہاں مجالش نہیں ہے۔

آثار: حضرت عمر ابن الخطاب نے حضرت ابو موسیٰ اشعری کو ایک تفصیلی خط لکھا تھا، اس میں بھی یہ تحریر فرمایا تھا کہ صبر اختیار کرو، اور یہ بات یاد رکھو کہ صبر کی دو قسمیں ہیں، ایک دوسرے سے افضل ہے، مصیبتوں پر صبر کرنا افضل ہے، اور اس سے زیادہ افضل یہ ہے کہ جو چیزیں اللہ نے حرام کی ہیں ان پر صبر کیا جائے، جان لو کہ صبر ایمان کا خلاصہ ہے، اور وہ اس طرح کہ تقویٰ افضل ترین نیکی ہے، اور تقویٰ صبر سے ہے، حضرت علی کرم اللہ وجہہ ارشاد فرماتے ہیں کہ ایمان کی بناء چار ستونوں پر ہے، یقین، صبر، جہاد

(۱) مجھے یہ روایت اس تفصیل کے ساتھ نہیں ملی، البتہ اسکا اختصار کتاب العلم میں گزر چکا ہے (۲) یہ روایت مجھے نہیں ملی (۳) یہ

روایت کتاب الحج میں گزری ہے (۴) یہ مرفوع روایت نہیں ہے، بلکہ حضرت عمر ابن عبد العزیز کا قول ہے، جس ابن ابی الدنایہ نقل کیا ہے۔

اور عدل، آپ نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ صبر ایمان کے لئے ایسا ہے جیسے جسم کے لئے سرجس طرح بغیر سر کے جسم نہیں ہوتا، اسی طرح صبر کے بغیر ایمان بھی نہیں ہوتا، حضرت عمر کا قول ہے کہ دونوں گٹھریاں بھی عمدہ ہیں، اور ان کے علاوہ زائد گٹھری بھی دونوں گٹھریوں سے مراد صلاۃ اور رحمت ہے، اور زائد گٹھری سے مراد ہدایت ہے، اس قول میں حد لینا و بطلان و قیود و لفظ مذکور ہیں عدلین سے وہ دو گٹھریاں مراد ہیں جو سواری کے اونٹ کے دائیں بائیں لٹکادی جاتی ہیں، اور علاوہ سے وہ گٹھری مراد ہے جو ان پر سے رکھ دی جاتی ہے، حضرت عمرؓ نے اس قول سے قرآن کریم کی اس آیت کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

اُولٰٓئِكَ عَلٰیہُمْ صَلَّوْا تَمِنْ رَبِّہُمْ وَرَحْمَۃُ وَاٰلِکَہِمُ الْمُهْتَدُوْنَ (پ ۲۲ ر ۳ آیت ۵۷)

ان لوگوں پر خاص خاص رحمتیں بھی لگے پروردگار کی طرف سے ہوں گی اور عام رحمت بھی۔

حبیب ابن حبیب اس آیت کریمہ کی تلاوت کیا کرتے تھے تو یہ کہہ کر دیا کرتے تھے سبحان اللہ خود ہی صبر دینے والا ہے، اور خود ہی تعریف کرنے والا ہے، یعنی خود بھی کی قوت دیتا ہے، اور خود ہی صبر کرنے پر تعریف فرماتا ہے۔

اِنَّا وَجَدْنَاهُ صَابِرًا نِّعْمَ الْعَبْدُ اِنَّہٗ لَکَاۤءِبٌ (پ ۲۳ ر ۳ آیت ۴۴)

بے شک ہم نے ان کو صابر پایا، اچھے بندے تھے کہ بہت رجوع ہوتے تھے۔

ابو الدرداء فرماتے ہیں کہ ایمان کی بلندی، فیصلے پر صبر کرنا، اور تقدیر پر راضی رہنا ہے، یہ صبر کی فضیلت کا بیان تھا، اس ضمن میں کتاب و سنت کے منقول و دلائل بیان کئے گئے ہیں محفل کے اعتبار سے بھی صبر ایک عمدہ وصف ہے، لیکن ہمارا یہ دعویٰ اس وقت تک صحیح نہیں سمجھا جاسکتا جب تک ہم صبر کی حقیقت اور اسکے معنی بیان نہ کر دیں، اس لئے کہ حقیقت کی معرفت حاصل کرنا صفت کی معرفت حاصل کرنا ہے، جو موصوف کی معرفت سے پہلے حاصل نہیں ہوتی اسلئے ہم پہلے صبر کی حقیقت اور اسکے معنی بیان کرتے ہیں۔

صبر کی حقیقت اور اسکے معنی

صبر، مقام دین، منزل سلوک : جاننا چاہیے کہ صبر دین کے مقامات میں سے ایک مقام اور سا لکین کی منزلوں میں سے ایک منزل ہے۔ دین کے تمام مقامات تین امور سے ترتیب پاتے ہیں، اول معارف، دوم احوال، سوم اعمال، ان میں معارف بنیادی امر ہے، ان سے احوال جنم لیتے ہیں، اور احوال سے اعمال ظاہر ہوتے ہیں، ان تینوں میں معارف کو درختوں، احوال کو شاخوں اور اعمال کو پھلوں سے مشابہت حاصل ہے، سا لکین کی تمام منزلوں کا یہی حال ہے، ایمان کا اطلاق کبھی صرف معارف پر ہوتا ہے اور کبھی معارف، احوال اور اعمال سب پر، اس اختلاف کی وہی نوعیت ہے جو کتاب قواعد العقائد میں ایمان و اسلام کے باب میں گزر چکی ہے، صبر بھی ایمان کی طرح ہے اسکے لئے بھی ضروری ہے کہ پہلے معرفت حاصل ہو، پھر ایک حالت اس پر واقع ہو، بلکہ حقیقی بات یہ ہے کہ صبر نام ہی معرفت اور حالت کے مجموعے کا ہے، محل تو ایک ٹھوہے جو ان دونوں کے وجود میں آتا ہے، اب ہم تینوں امور پر روشنی ڈالتے ہیں۔

معرفت : فرشتوں، انسانوں، اور جانوروں میں جو ترتیب ہے اس کی معرفت کے بغیر صبر کی معرفت حاصل نہیں ہوتی، صبر انسان کی خصوصیت ہے، جانوروں اور فرشتوں میں صبر کا تصور نہیں کیا جاسکتا، جانوروں میں ان کے نقص کی بناء پر، اور فرشتوں میں ان کے کمال کی وجہ سے، اس کی تفصیل یہ ہے کہ بہائم پر شہوات مسلط کی گئی ہیں، اور وہ انکے لئے اس حد تک مغرور ہو کر رہ گئے ہیں کہ انکی حرکت و سکون کا باعث صرف شہوت ہوتا ہے، ان کے اندر کوئی ایسی قوت نہیں ہوتی جو اس شہوت کے مزاحم ہو، اور اسے اس کے مقتضی سے روک سکے، شہوت کے مقابلے میں اس قوت مزاحمہ کا باقی رہنا ہی صبر ہے، ملائکہ علیہم السلام صرف اسلئے پیدا کئے گئے ان میں رب عظیم کا شوق ہو اور وہ اسکے قرب کے درجات سے خوش رہیں، ان میں شہوت نہیں رکھی گئی ہیں کہ جو انھیں قرب کے درجات اور رب عظیم کے شوق سے دور کر سکے، اور نہ انھیں ایسے لشکر کی ضرورت ہے جو ان کو حضرت ربوبیت سے باز رکھنے والی قوتوں پر غالب کر سکے۔ اسلئے کہ جو قوتیں حضرت ربوبیت سے باز رکھتی ہیں، وہ شہوات ہیں، اور ان میں شہوات پیدا ہی نہیں کی گئیں۔

جب کہ انسان کو شہوت بھی دی گئی ہے، اور وہ قوت بھی جس کے ذریعے وہ شہوت پر قابو پا سکے، ابتداء میں وہ جانور کی طرح ناقص پیدا کیا گیا کہ اس میں سوائے اس غذا کی شہوت کے کوئی اور شہوت نہ تھی جس کا وہ محتاج تھا، پھر کچھ عرصہ بعد اس میں کھیل اور زیب و زینت کی شہوت پیدا ہوئی، اسکے بعد نکاح کی شہوت نے جنم لیا، یہ شہوت بہ ترتیب ظاہر ہوتی ہیں، شروع میں اس کے اندر صبر کی قوت بالکل نہیں ہوتی، اس لئے کہ صبر نام ہے ایک لشکر کا دوسرے لشکر کے مقابلے میں ٹھہرنے اور ثابت قدم رہنے کا، جب کہ ان دونوں میں متعینات اور مطالب کے تضاد کی بنا پر جنگ بپا ہو، بچے میں صرف خواہشات کا لشکر ہوتا ہے، جیسے جانوروں میں، لیکن کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے انسان کا درجہ اعلیٰ بنایا ہے اور اس کا درجہ بہائم کے درجہ سے بلند رکھا ہے، اس لئے جب اس کا وجود مکمل ہو جاتا ہے، اور وہ بلوغ کی دہلیز پر قدم رکھتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس پر دو فرشتے متعین کرتے ہیں، ان میں سے ایک سے اسے صحیح راستہ بتلاتا ہے اور دوسرا صحیح راستے پر چلنے میں اس کی اعانت کرتا ہے، انہی دو فرشتوں کی وجہ سے انسان جانوروں سے ممتاز اس کے علاوہ بھی انسان کے اندر اور مخصوص وصف ہیں، ایک اللہ اور اسکے رسول کی معرفت کا وصف، اور دوسرا عواقب سے متعلق مصلحتوں کی معرفت کا وصف۔ یہ دونوں وصف بھی اس فرشتے سے حاصل ہوتے ہیں جس کے سپرد ہدایت اور رہنمائی کا کام ہے، جانوروں کو نہ اللہ اور رسول کی معرفت ہے اور نہ وہ یہ جانتے ہیں کہ ان کا انجام کیا ہوگا، بلکہ انہیں صرف وہی راستہ نظر آتا ہے جس کی انہیں اس وقت خواہش ہوتی ہے، وہ صرف لذت چیزوں کے شہرے چھتے ہیں، یہاں تک کہ اگر انہیں کوئی مرض ہو اور کوئی طرح مگر مفید وہ انہیں دی جائے تو وہ اسے قبول نہ کریں، اور نہ اس کی افادیت تسلیم کریں۔

انسان نور ہدایت سے یہ بات جانتے ہیں کہ شہوت کی اتباع کرنا اس کے حق میں انجام کے اعتبار سے مضر ہے، لیکن اسکے لئے صرف اتنا جان لینا کافی نہیں ہے، بلکہ جتنی ضرر رساں چیزیں ہیں انکے ترک پر قدرت بھی ہونی چاہیے، انسان بہت سی ایسی چیزوں سے واقف ہوتا ہے جو اسے ضرر دیتی ہیں لیکن وہ ان کے ترک یا دفع پر قدرت نہیں رکھتا، جیسے مرض و فیہ، اس صورت میں اسے ایک ایسی قدرت اور ایک ایسی قوت کی ضرورت پڑتی ہے جس کے ذریعہ وہ شہوت کو دور کر سکے۔ اور ان کے ساتھ اس قدر مجاہدہ کر سکے کہ نفس سے ان کی مزاحمت منقطع ہو جائے، اس مقصد کے لئے اللہ تعالیٰ نے ایک اور فرشتہ مقرر فرمایا ہے جو اسے راہ راست پر رکھتا ہے، اور ایسے لشکروں سے اس کی تائید اور توثیق کرتا ہے جو نظر نہیں آتے، ان لشکروں کا فریضہ یہ ہے کہ وہ شہوت کے لشکروں کے ساتھ صف آرا ہوں، اور انہیں مقابلہ میں پسپا کریں، کبھی یہ لشکر کمزور پڑ جاتے ہیں، اور کبھی طاقت بن کر ابھرتے ہیں، ان کا کمزور یا طاقت ور ہونا دراصل اس امر پر موقوف ہے کہ بندے کو اللہ عزوجل کی طرف سے کس قدر مدد اور اعانت ملی ہے، یہ ایسا ہی ہے جیسے مخلوق میں ہدایت کا نور بھی کم و بیش ہوتا ہے۔

باعث دین اور باعث شہوت : سہولت تنہیم کے لئے ہم اس وصف کا نام جس کے ذریعے شہوت پر غلبہ پانے میں انسان کو حیوان پر فوقیت ہے باعث دین کہتے ہیں، اور شہوت کا اپنے متعینات کی طلب کو باعث شہوت کہتے ہیں۔ اب یہ سمجھئے کہ باعث دین اور باعث شہوت میں جنگ بپا ہے، کبھی پہلا دوسرے پر غالب آجاتا ہے، اور کبھی دوسرا پہلے کو شکست دے دیتا ہے، اس جنگ کا میدان بندے کا دل ہے، باعث دین کو فرشتوں سے مدد پہنچتی ہے، جو اللہ تعالیٰ کی جماعت کے معانین ہیں، اور باعث شہوت کو شیطان کی مدد حاصل ہے جو اللہ تعالیٰ کے دشمنوں کے مددگار ہیں، صبر یہ ہے کہ باعث دین باعث شہوت کے مقابلے میں ثابت قدم رہے، اگر بندے نے ثابت قدم رہ کر حریف کو شکست دیدی، اور اس کی مخالفت پر بیٹھ کر بہت رہا تو گویا اس نے اللہ تعالیٰ کے گروہ کی مدد کی، اور زمرہ صابرین میں شامل ہوا، اور اگر کمزور پڑا، اور شکست سے دوچار ہوا یہاں تک کہ شہوت اس پر غالب آگئی، اور صبر کا یار نہ رہا تو شیطان کے متبعین میں داخل ہوا۔

حالت اور نمرہ : اس تفصیل کا حاصل یہ ہے کہ شہوت ترک کرنا ایک ایسا عمل ہے جو حالت صبر سے وجود میں آتا ہے، یعنی حالت صبر کا نمرہ یہ ہے کہ آدمی شہوت ترک کر دے، اور صبر باعث شہوت کے مقابلے میں باعث دین کے ثابت قدم رہنے کو کہتے

قیامت کبریٰ میں جو تمام مخلوق کو جامع ہوتی ہے آدمی تنہا نہیں ہوتا، بلکہ بعض اوقات اس کا اقتساب بھرے مجمع میں کیا جاتا

ہے 'اس قیامت میں متعین جنت اور جہنم دونوں میں جہنم درجہ میں بھیجے جائیں گے، تنہا نہیں بھیجے جائیں گے، قیامت صغریٰ کی سب سے پہلی دہشت ہے، اسکے بعد جس قدر وہیشیں قیامت کبریٰ میں طاری ہوں گی قیامت صغریٰ میں ان سب کی نظیریں موجود ہیں، مثلاً زمین کا ہلنا، یہ ہولناک حادثہ قیامت کبریٰ میں پیش آئے گا، قیامت صغریٰ میں اسکی نظیر آدی کا بدن ہے، جو روح کے لئے زمین کی مانند ہے، موت سے زمین ڈگمگانے لگتی ہے، یہ بات اچھی طرح معلوم ہے کہ جب کسی جگہ زلزلہ آتا ہے تو یہ کہا جاتا ہے فلاں ملک میں زلزلہ آیا، خواہ پاس پڑوس والوں کو اس سے کوئی نقصان نہ پہنچا ہو، بلکہ اگر کسی انسان کا گھر متزلزل ہو جائے اور باقی زمین محفوظ رہے تو وہ انسان زلزلہ کا شکار مانا جائے گا، کسی کے حق میں زلزلہ کا تصور اسی وقت ہوتا ہے جب اسے نقصان پہنچا ہو، خواہ پوری دنیا زلزلہ کا شکار ہوئی ہو، یا خاص طور پر اس کے گھر میں زلزلہ آیا ہو، اب موت کے بارے میں تصور کیجئے، بدن پر اس کے اثرات زلزلے کے اثرات سے کسی بھی طرح کم نہیں ہیں بلکہ کچھ زیادہ ہی ہیں۔

بدن کی زمین سے مشابہت : بدن کو زمین سے اس لئے تشبیہ دی گئی ہے کہ آدی مٹی سے بنا ہے، اسکے حصے میں جس قدر مٹی آئی ہے اس سے اس کا بدن تخلیق پایا ہے، دوسرے کا بدن اس کا حصہ نہیں ہے۔ وہ زمین جس پر تم بیٹھے ہو تمہارے جسم کا ظرف اور مکان ہے، تم زمین کے زلزلے سے اسی لئے ڈرتے ہو کہ کہیں تمہارا جسم متزلزل نہ ہو جائے ورنہ ہوا گردش میں رہتی ہے، تم اس سے خوف نہیں کھاتے، کیونکہ ہوا سے تمہارا جسم نہیں لرزتا اس سے معلوم ہوا کہ تمام زمین کے زلزلے سے آدی کا صرف اسی قدر حصہ ہے جس قدر اس کا جسم جھٹکے کھائے، جو اس کی مٹی اور مخصوص زمین ہے، جس طرح زمین کے مخصوص اجزاء ہیں اسی طرح تمہارے جسم خاکی کے بھی اجزاء ہیں، اور وہ زلزلہ اجزاء کی نظیریں ہیں، ہڈیوں کی نظیر ہاڑی ہیں، سر کی مثال آسمان ہے، دل آفتاب کی حیثیت رکھتا ہے، آنکھ کان، ناک اور دوسرے حواس کی مثال ایسی مانند ہے جیسے سیارے اور ستارے جسم سے پسینہ بتا ہے جیسے زمین پر دیا پھرتے ہیں، پال سبز کی مانند ہیں، ہاتھ اور پاؤں درخت ہیں، تمام اجزاء کو اسی طرح قیاس کرنا چاہیے، جب موت کی وجہ سے تمہارے بدن کے یہ ارکان معدوم ہو جاتے ہیں تو اس حالت پر یہ قول صادق آتا ہے۔

إِنَّا زَلَّزْنَا لَآرْضَ زَلْزَالًا (پ ۳۰ ر ۲۳ آیت ۱)

جب زمین اپنی سخت جنبش سے ہلائی جائے گی۔

جب تمہارا گوشت ہڈیوں سے جدا ہو گا تو اس پر یہ مضمون مطبق ہو گا۔

وَحُمِلَتِ الْآرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَاحِدَةً (پ ۲۹ ر ۲۵ آیت ۱۳)

اور اس وقت زمین اور پہاڑ (اپنی جگہ سے) اٹھائے جائیں گے پھر دونوں ایک ہی دفعہ میں ریزہ ریزہ

کردئے جائیں گے۔

جب ہڈیاں گل جائیں گی تو یہ مضمون صادق آئے گا۔

وَإِذَا الْجِبَالُ نُسِفَتْ (پ ۲۹ ر ۲۲ آیت ۱۰)

اور جب پہاڑ اڑتے پھریں گے۔

داغ پھٹے گا تو یہ آیت مطبق ہوگی۔

إِنَّا لَنَسْمَعُ أَنشَقَّتْ (پ ۳۰ ر ۲۹ آیت ۱)

جب آسمان پھٹ جائے گا۔

موت کے وقت دل پر تاریکی چھائے گی، اس منظر کے لئے قرآن کریم میں یہ آیت ہے۔

إِنَّا لَنَسْمَعُ كُورَتِ (پ ۳۰ ر ۲۹ آیت ۱)

جب آفتاب بے نور ہو جائے گا۔

کان، آگہ اور دوسرے حواس کے بیکار ہونے کے لئے یہ مضمون ہے ۔

وَإِذَا النُّجُومُ انْكَثَرَتْ (پ ۶۳۰ آیت ۲)

اور جب ستارے ٹوٹ ٹوٹ کر گر پڑیں گے۔

موت کے خوف کی وجہ سے پیشانی پر پینہ آنے کی مٹھکشی اس آیت سے ہوتی ہے ۔

وَإِذَا الْبِحَارُ فَجُورَتْ (پ ۶۳۰ آیت ۳)

اور جب سب دریا بہہ جا پڑیں گے۔

ایک پٹلی دو سری پٹلی سے لپٹ جائے گی۔ قرآن کریم میں ہے ۔

وَإِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ (پ ۶۳۰ آیت ۴)

اور جب دس مینے کی گاجن اونٹیاں چھٹی پھریں گی۔

جسم سے روح کی مفارقت کا مٹھرا اس آیت سے بیان کیا جاسکتا ہے ۔

وَإِذَا الْأَرْضُ مُدَّتْ وَأَلْقَتْ مَا فِيهَا وَتَخَلَّتْ (پ ۶۳۰ آیت ۵)

اور زمین سمجھ کر بڑھادی جائے گی (وہ زمین) اپنے اندر کی چیزوں کو (یعنی مردوں کو) باہر اگل دے گی اور

خالی ہو جائے گی۔

قیامت کے احوال اور احوال کے سلسلے میں جو واقعات قرآن کریم نے بیان کئے ہیں انسان کی موت میں ان سب کی نظیریں موجود ہیں ان تمام کا بیان تفصیل طلب ہے۔ مجملہ "اتاکہ کہہ سکتے ہیں کہ موت کے ساتھ ہی انسان پر چھوٹی قیامت ٹوٹ پڑتی ہے۔ قیامت کبریٰ میں جو چیزیں ہمارے ساتھ مخصوص ہیں وہ قیامت صغریٰ میں بھی تم سے فوت نہ ہوں گی، البتہ جو چیزیں دوسروں کے لئے خاص ہیں وہ فوت ہو جائیں گی، مثلاً دوسروں کے حق میں ستاروں کا باقی رہنا تمہیں کیا نفع پہنچا سکتا ہے جب کہ تمہارے وہ حواس جن سے تم ستاروں کا نظارہ کرتے ہو بیکار ہو جائیں، اندھے کے نزدیک دن رات برابر ہوتے ہیں، سورج اپنی تابانی کے ساتھ روشن ہو یا گھٹایا ہوا ہو اندھا ان دونوں میں کوئی فرق نہیں کرتا۔ اسلئے کہ اس کے حق میں تو وہ بیک وقت گھٹایا ہے اب اگر آفتاب روشن بھی ہو تو وہ دوسرے کا حصہ ہوگا، جس کا سرچھٹ جائے گویا اس پر آسمان ٹوٹ پڑا، کیونکہ آسمان اسی کو کہتے ہیں جو سر کی جانب ہو، اگر اس کا سرچھٹ جائے تو وہ سرے کے حق میں آسمان کے باقی رہنے یا نہ رہنے سے کیا فائدہ ہوگا یہ تو قیامت صغریٰ کا حال ہے، اصل خوف اور دہشت کے منظر اس وقت دیکھنے میں آئیں گے جب قیامت کبریٰ برپا ہوگی، خصوصیت کسی کی باقی نہ رہے گی، آسمان اور زمین بیکار ہو جائیں گے، پہاڑ ریزہ ریزہ بکھر جائیں گے، خوف و دہشت درجہ نکال کو پہنچ جائے گا۔

قیامت صغریٰ اور قیامت کبریٰ کا فرق : جاننا چاہیے کہ قیامت صغریٰ کے سلسلے میں اگرچہ ہم نے بہت کچھ لکھا ہے لیکن یہ اس کا عشرِ عشر بھی نہیں جو لکھا نہیں گیا۔ قیامت صغریٰ قیامت کبریٰ کے سامنے ایسی ہے جیسے ولادت صغریٰ ولادت کبریٰ کے سامنے۔ انسان کی دو ولادتیں ہیں۔ ایک ولادت تو یہ ہے کہ آدمی باپ کی پشت سے ماں کی رحم میں منتقل ہو اور وہاں ایک مقررہ مدت تک قیام کرے، اس مدت قیام میں اس پر مختلف حالتیں طاری ہوتی ہیں۔ یہ حالتیں اسکے حق میں کمال کی منزلیں ہیں، پہلے نطفہ ہوتا ہے، پھر جما ہوا خون، پھر گوشت کا لوتھڑا، اسی طرح وہ ایک مکمل بچے کی صورت میں ماں کے تنگ رحم سے نکل کر وسیع و عریض دنیا کی آبادی میں اضافہ کرتا ہے۔ یہ ولادت کبریٰ ہے۔ قیامت کبریٰ کے عموم کی نسبت قیامت صغریٰ کے مخصوص کے ساتھ وہی ہے جو فقہائے عالم کی وسعت کو رحم مادر کی وسعت سے ہے۔ بندہ موت کے بعد جس عالم میں قدم رکھے گا اس کی وسعت کا دنیا کی وسعت سے وہی تعلق ہے جو عالم کی وسعت کو رحم مادر کی وسعت سے ہے، بلکہ وہ انتہائی عظیم وسعت ہے۔ آخرت کو دنیا پر اسی طرح قیاس کیا جاسکتا ہے۔ قرآن کریم میں ہے۔

خَلَقَكُمْ وَلَا يَعْثُبُكُمْ إِلَّا كَنْفُسِكُمْ وَأَیْحَکُمۡ (پ ۲۱ آیت ۲۸)

تم سب کا پیدا کرنا اور زندہ کرنا ہی ایسا ہی ہے جیسا ایک شخص کا۔

دوسری دفعہ کا پیدا کرنا بھی ایسا ہی ہے جیسے پہلی دفعہ کا پیدا کرنا، بلکہ اگر غور کیا جائے تو پیدائش دو میں منحصر نہیں ہو سکتی، بلکہ آدمی دو سے زائد بار اس اس مرحلے سے گزرتا ہے۔ قرآن کریم میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

وَنُشْرُکُمْ فِیۡهَا لَنَعْلَمَنَّ (پ ۲۵ آیت ۶)

اور تم کو ایسی صورت میں بنادیں گے جسکو تم جانتے ہی نہیں۔

جو شخص دونوں قیامتوں کا معترف ہے وہ عالم ظاہر اور عالم باطن دونوں پر ایمان رکھتا ہے، ملک اور ملکوت دونوں کا اعتقاد رکھتا ہے، اور جو شخص صرف قیامت صغریٰ کا قائل ہے، قیامت کبریٰ کو نہیں مانتا وہ گویا ایک آنکھ سے محروم ہے، اور ایک ہی عالم کو دیکھنے پر قادر ہے، یہ جمالت اور گمراہی ہے، کالے و جال کی اقتداء اور بیہوشی ہے، بے جا وہ کس قدر غافل ہے۔ اس غفلت کا فکارتی شخص نہیں ہے، بلکہ ہم سب اسی غفلت میں مبتلا ہیں، خطرات تیرے سامنے ہیں، اگر تو اپنی نادانی، جمالت اور گمراہی کے باعث قیامت کبریٰ پر ایمان نہیں رکھتا تو کیا قیامت صغریٰ کی دلالت تیرے لئے کافی نہیں ہے، کیا تو نے سید الانبیاء سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گمراہی نہیں سنا: کَفَىٰ بِالْمَوْتِ وَاعْظَا (الاستیغاثۃ فی الشعب۔ عائشہ) موت نصیحت کے لئے کافی ہے۔ کیا تو نے وفات کے وقت سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے کرب کا حال نہیں سنا، یہاں تک کہ آپ نے اس اذیت کے عالم میں ارشاد فرمایا:۔

اَللّٰهُمَّ هَوِّنْ عَلٰی مُحَمَّدٍ سَكَرَاتِ الْمَوْتِ (ترمذی، ابن ماجہ۔ عائشہ)

اے اللہ! محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر موت کی سکرات آسان فرما۔

کیا تجھے اس بات پر شرم نہیں آتی کہ تو موت کی تاخیر سے غفلت کا شکار ہو جاتا ہے، اور ان غافل گمراہوں کی بیہوشی کرنے لگتا ہے جن کے بارے میں ارشاد فرمایا گیا:۔

مَا يَنْظُرُونَ إِلَّا صَيْحَةً وَاحِدَةً تَأْخُذُهُمْ وَهُمْ يَخِصِّمُونَ فَلَا يَسْتَطِيعُونَ تَوْصِيَةً

وَلَا إِلَىٰ أَهْلِهِمْ يَرْجِعُونَ (پ ۲۳ آیت ۵۰)

یہ لوگ بس ایک آواز سخت کے منتظر ہیں جو ان کو پکڑے گی، اور وہ سب باہم لڑجھگڑ رہے ہوں گے، سو نہ تو وصیت کرنے کی فرصت ہوگی اور نہ اپنے گھر والوں کے پاس لوٹ کر جا سکیں گے

مرض تیرے پاس موت کا نذیر (ڈرانے والا) بن کر آتا ہے، لیکن تجھے خوف نہیں آتا، بالوں میں سفیدی موت کا پیغام برہوتی ہے، لیکن تو یہ پیغام قبول نہیں کرتا، بلکہ تیری مثال ان لوگوں کی سی ہوتی ہے جن کے بارے میں اللہ رب العزت کا ارشاد ہے:۔

يَحْزَنُوا عَلَى الْعِبَادِ مَا يَأْتِيهِمْ مِنْ رَسُولٍ إِلَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِؤْنَ (پ ۲۳ آیت ۳۰)

افسوس ایسے بندوں کے حال پر بھی ان کے پاس کوئی رسول نہیں آیا جس کی انھوں نے ہنسی نہ اڑائی ہو

کیا تو سمجھتا ہے کہ تجھے دنیا میں ہمیشہ رہنا ہے کیا تو نے یہ آیت نہیں پڑھی:۔

اَوَلَمْ يَرَوْا كَمَا اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِنَ الْقُرُونِ اَنَّهُمْ اِلَيْهِمْ لَا يَرْجِعُونَ (پ ۲۳ آیت ۳۰)

کیا ان لوگوں نے اس پر نظر نہ کیا کہ ہم ان سے پہلے بت سی امتیں غارت کر چکے کہ وہ انکی طرف لوٹ کر نہیں آئے۔

اگر تیرا خیال یہ ہے کہ موعود معدوم ہو گئے، ان کا وجود باقی نہیں رہا تو یہ تیری خام خیالی ہے، قرآن کریم نے اس سلسلے میں ارشاد

فَرَمَا:۔ وَانۡ كُلَّ لَمَّا جَمِيعٌ لَّيۡدِنَا مُخۡصِرُونَ (پ ۲۳ آیت ۳۲)

اور ان میں سے کوئی ایسا نہیں کہ جو مجتمع طور پر ہمارے روبرو حاضر نہ کیا جائے۔

یہ لوگ اپنے رب کی آیات سے اعراض کرتے ہیں اس کی وجہ اس آیت میں بیان کی گئی ہے :-
 وَجَعَلْنَا بَيْنَ آيَاتِهِمْ سَبَاطًا وَمِنْ خَلْفِهِمْ سَبَاطًا فَأَعْثَبْنَا هُمُ لَا يُبْصِرُونَ وَسَوَاءٌ عَلَيْهِمْ
 أَعَانَدْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ (پ ۲۲ آیت ۱۰-۹)

اور ہم نے ایک آزان کے سامنے کر دی اور ایک آزان کے پیچھے کر دی جس سے ہم نے ان کو گمراہ کر دیا سو وہ

نہیں دیکھ سکتے اور ان کے حق میں آپ کا ڈر اٹایا نہ ڈر اٹاؤںوں برابر ہیں یہ ایمان نہ لائیں گے

مقصد کی طرف واپسی : اب ہم مقصد کی طرف واپس چلتے ہیں۔ اب تک جو کچھ عرض کیا گیا اس کا مقصد ان کی طرف اشارہ کرنا ہے جو علوم معاملہ سے اعلا ہیں چنانچہ ہم کہتے ہیں کہ صبرا و عبرا میں باعث دینی کے ثبات کا نام ہے یہ مقابلہ انسان کی خصوصیت ہے اسلئے کہ اس پر کرانا کتابیں مقرر ہیں فرشتے دیوانوں اور بچوں پر مقرر نہیں ہوتے اور نہ ان کے اعمال ضبط تحریر میں لاتے ہیں ہم یہ بات پہلے لکھ چکے ہیں کہ اگر ان فرشتوں کی طرف استفادے کی غرض سے توجہ کی جاتی تو وہ حسد لکھتے ہیں اور اعراض کیا جائے تو یہ نہ لکھتے ہیں۔ بچوں اور دیوانوں میں استفادے کی صلاحیت نہیں ہوتی اس لئے ان سے توجہ یا روگردانی کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا اور کرانا کا تین سوائے اقبال اور اعراض کے کچھ نہیں لکھتے اور صرف ان لوگوں کا لکھتے ہیں جو اقبال اور اعراض پر قادر ہوتے ہیں۔ البتہ بعض اوقات نور ہدایت کا آغاز سن قیصر سے ہی ہو جاتا ہے اور سن بلوغ تک پہنچتے پہنچتے یہ نور مکمل ہو جاتا ہے جیسے صبح کی روشنی ابتدا میں کم رہتی ہے جوں ہی آفتاب طلوع ہوتا ہے یہ روشنی مکمل ہو جاتی ہے لیکن یہ ہدایت ناقص ہے اگر اس کے بموجب عمل نہ کیا جائے تو آخرت میں کوئی ضرر نہ ہوگا البتہ دنیا کے ضرر سے محفوظ نہیں رہے گا یہی وجہ ہے کہ نابالغ بچے کو نماز ترک کرنے پر زور کو بکھا جاتا ہے لیکن آخرت میں اسکو کوئی عذاب نہ ہوگا اور نہ اس کے اعمال غلے میں نماز ترک کرنے کا یہ عمل بطور گناہ درج کیا جاتا ہے جو شخص کسی بچے کا تکلیف یا مہلکی ہو اور اس پر شفیق اور مہربان بھی ہو اور کرانا کتابیں کی طرح نیک بخت بھی اسے چاہیے کہ وہ بچے کے صحیفہ دل پر نیکی اور بدی کے تمام تصورات نقش کر دے پھر اس صحیفے کا پھیلا نا یہ ہے کہ اگر وہ بچہ اچھا کام کرے تو اسکی تعریف کرے اور برا کام کرے تو اسے سزا دے خواہ مارنا پیٹنا پڑے جس مہلکی کا اپنے زیر تربیت بچے کے ساتھ یہ معاملہ ہو گا وہ فرشتوں کی عادات کا وارث اور ان کے اخلاق کا امین ہے بچے کے حق میں ملکوتی اخلاق و عادات کے استعمال سے وہ فرشتوں کی طرح اللہ تعالیٰ کی قوت حاصل کرے گا اور انبیاء صدیقین اور مقربین کی جماعت میں شامل ہوگا۔ حدیث شریف میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے :-

أَنَا وَكَافِلُ الْيَتِيمِ كَهَاتَيْنِ (بخاری۔ سیل ابن سعد)

میں اور یتیم کا تکلیف ان دو انگلیوں کی طرح قریب قریب ہوں گے۔

صبر نصف ایمان کیوں ہے؟

: جاننا چاہیے کہ ایمان کا اطلاق کبھی اصول دین کی تصدیقات پر ہوتا ہے اور کبھی ان نیک اعمال پر جو ان تصدیقات کے نتیجے میں ظہور پزیر ہوتے ہیں۔ اور کبھی ان دونوں کے مجموعے پر اس لفظ کا اطلاق ہوتا ہے۔ کیونکہ معارف کی بھی متعدد قسمیں ہیں۔ اور اعمال کی بھی بے شمار قسمیں ہیں ایمان کا لفظ ان سب پر بولا جاتا ہے اسلئے ایمان کی ستر سے زیادہ قسمیں ہیں باب قواعد العقائد میں اس موضوع پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

صبر کو دو اعتبار سے نصف ایمان کہتے ہیں اور ایمان کے دوسری معنی اسے نصف ایمان کہنے کے مقتضی ہیں۔ ایک تو یہ کہ ایمان کا اطلاق تصدیقات اور اعمال دونوں پر ہو اس صورت میں ایمان کے دو رکن ہوں گے ایک یقین اور دوسرا صبر یقین سے مراد قطعی اصول دین کی معرفت ہے جو بندے کو اللہ تعالیٰ کی ہدایت سے حاصل ہوئی ہے اور صبر سے مراد یہ ہے کہ یقین کے موجب پر عمل کیا

جائے یقین آدمی کو یہ بتلاتا ہے کہ معصیت معز ہے، اور طاقت مفید ہے، ترک معصیت اور اطاعت پر مداومت صبر کے بغیر ممکن نہیں، یعنی جب تک آدمی کا باعث دینی اسکے باعث ہو اور پوری طرح غالب نہ ہو اس وقت تک نہ معصیت ترک کی جاسکتی ہے اور نہ طاعت پر عمل کیا جاسکتا ہے، اسی کا نام صبر ہے، اس اعتبار سے صبر کو نصف ایمان قرار دیا جاسکتا ہے اسی لئے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے یقین اور صبر کو ایک جگہ ذکر فرمایا :-

مِنْ أَقْلٍ مَا وَثِقْتُمْ بِالْيَقِينِ وَغَيْرِ يَمَّةِ الصَّبْرِ (۱)

تمہیں جو چیزیں کم دی گئی ہیں ان میں سے یقین اور قصد صبر ہے۔

دوسرے یہ کہ ایمان کا اطلاق ان احوال پر ہو جو اعمال کا موجب ہیں نہ اعمال پر ہو، اور نہ معارف پر بندے کے تمام احوال دو طرح کے ہیں، ایک یہ کہ وہ دنیا اور آخرت میں اسکے لئے نفع بخش ہوں۔ اور دوسرے یہ کہ وہ دنیا و آخرت میں اسکے لئے نقصان دہ ہوں، اگر معجزوں کا اعتبار کیا جائے تو بندہ کی حالت کو صبر کا نام دیا جائے گا، اور مفید چیزوں کا اعتبار کیا جائے تو اسے شکر کہا جائے گا۔ اس صورت میں شکر ایمان کا نصف ہے، جیسا کہ پہلے معنی کے اعتبار سے یقین ایمان کا نصف تھا۔ اسی لئے حضرت عبداللہ ابن مسعود سے روایت ہے کہ ایمان کے دو نصف ہیں، ایک نصف صبر ہے اور ایک نصف شکر ہے، یہ روایت سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے مرفوع بھی نقل کی گئی ہے (۲)

باعث ہوی کی دو قسمیں : جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے کہ صبر باعث دینی کا باعث ہوی کے مقابلے میں صبرنا اور ثابت قدم رہنا ہے۔ باعث ہوی کی دو قسمیں ہیں ایک باعث وہ ہے جو شہوت کی جہت سے پیدا ہو، اور دوسرا وہ ہے جو غضب کی جہت سے سامنے آئے، کیونکہ لذت چیز کی طلب کیلئے ہو تو شہوت کی طرف سے ہوگا، اور ایذا دینے والی تکلیف سے فرار کے لئے ہو تو غضب کی طرف سے ہوگا دوزے میں کیونکہ حکم اور فرج کی شہوت سے رکنا ہوتا ہے اسلئے اسے مکمل صبر نہیں کیا گیا، کیونکہ اس میں غضب سے صبر کا داخل نہیں ہے حدیث شریف میں ہے :-

الصَّوْمُ نِصْفُ الصَّبْرِ (۳) روزہ نصف صبر ہے۔

اس لئے کہ صبر اس وقت مکمل ہوتا ہے جب شہوت اور غضب دونوں کے داعی سے باز رہا جائے، اس اعتبار سے روزہ ایمان کا چوتھائی حصہ ہوگا

شریعت نے بعض اعمال کی حدود مقرر کی ہیں اور انکو ایمان کا آدھا، یا چوتھائی حصہ قرار دیا ہے ان شرعی تقذیرات کو سمجھنے کا یہی طریقہ ہے جو بیان کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں اصل بات یہ ہے کہ پہلے ایمان کی قسمیں معلوم کی جائیں، تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ ایمان کے کس معنی کی رو سے یہ نسبت بیان کی گئی ہے، اس کے بغیر اعمال کی حدود کے سلسلے میں شریعت کی بیان کردہ تقذیرات کا سمجھنا دشوار ہے، ایمان کسی ایک مفہوم یا معنی کے لئے مخصوص نہیں ہے، بلکہ بہت سے مختلف معانی پر اسکا اطلاق ہوتا ہے

صبر کے مختلف مفہوم مختلف نام

جاننا چاہیے کہ صبر کی دو قسمیں ہیں، ایک تو یہ کہ بدن سے صبر کیا جائے جیسے جسم پر مشقتیں سہتا، اور ثابت قدم رہنا پھر اس کی دو قسمیں ہیں، ایک تو یہ کہ اپنے جسم پر خودی مشقتیں ڈھائے، دوسری یہ کہ اپنے علاوہ کسی دوسرے شخص کی جسمانی ایذا سے اور برداشت کرے۔ پہلے کی مثال یہ ہے جیسے کوئی مشکل کام یا سخت ترین عبادت بجالائے، اور دوسرے کی مثال یہ ہے کہ کسی کی مار برداشت کرے۔ شدید مرض اور سبک زدن، صبر پر تحمل سے کام لے، یہ قسم بھی عمدہ ہے، بشرطیکہ شریعت کے موافق ہو، لیکن پورے طور پر پسندیدہ قسم یہ ہے کہ طبیعت کی شہوتوں اور ہوائے نفس کے تقاضوں سے باز رہے۔ اس صورت میں اگر حکم اور شرمگاہ کی شہوت سے صبر ہوگا تو اس کا نام صفت ہے، اور اگر کسی بری بات سے صبر ہو تو یہ دیکھا جائے گا کہ وہ بری بات کون سی ہے، اس لئے

(۱) یہ روایت ابھی چند صفحات پہلے گزری ہے (۲) یہ روایت بھی ابھی گزری ہے (۳) یہ روایت کتاب الصوم میں گزری ہے

کہ ہر بری بات سے صبر کے لئے الگ نام ہے۔ مثلاً اگر کسی مصیبت پر صبر ہو تو اسے صبری کہا جائے گا اس کی متضاد حالت وہ ہے جسے جزع اور بعل کہتے ہیں، یعنی ہوا کے دوائی کو پورے طور پر آزاد چھوڑ دے، جھٹکے چلائے، سینہ کو پی کرے، گریبان پھاڑے وغیرہ۔ اگر مالدار برداشت کرنے میں صبر ہو تو اسے ضبط نفس کہتے ہیں اسکی ضد اترانا ہے، اگر صبر میدان جنگ میں ہو تو اسے شجاعت کہتے ہیں، اس کے مقابلے میں نامردی اور بزدلی ہے، اگر صبر غصہ پینے میں ہو تو اسے حلم کہتے ہیں، اسکے مقابلے میں طغیانی ہے، اگر زمانے کی آفات میں سے کسی آفت پر صبر کیا جائے تو اسے وسعت ظرفی اور فراخ حوصلگی کہا جاتا ہے، اس کی ضد تنگ ظرفی اور کم حوصلگی ہے، اگر کسی کی بات چھپانے میں صبر ہو تو اسے رازداری کہتے ہیں اور بات چھپانے والے کو رزادار کہا جاتا ہے، اگر زندگی کی زائد ضروریات سے صبر ہو تو اسے زہد کہتے ہیں، اسکے مقابلے میں حرص ہے، اگر بقدر ضرورت پر صبر کیا جائے اور جو کچھ حاصل ہو اس پر راضی رہا جائے تو اسے قناعت کہتے ہیں، اسکے مقابلے میں ہوس ہے۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ اکثر ایمانی اخلاق صبر کے اندر داخل ہیں اسی لئے جب سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایمان کے متعلق دریافت کیا گیا آپ نے فرمایا ایمان صبر ہے۔ اس لئے کہ ایمان کے اکثر اور بڑے اعمال صبری میں منحصر ہیں، اسی لحاظ سے آپ نے حج کو عرفہ قرار دیا کہ حج کے ارکان میں عرفہ بیدار کن ہے۔

اللہ تعالیٰ نے یہ تمام اقسام جو اوپر کی طور میں بیان کی گئی ہیں قرآن کریم میں یکجا بیان فرمائی ہیں۔

وَالصَّابِرِينَ فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَاءِ وَحِينَ الْبَأْسِ أُولَئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ (پ ۲۶ آیت ۱۷۷)

اور (وہ لوگ) مستقل رہنے والے ہیں تنگ دستی میں اور بیماری میں اور قتال میں، یہ لوگ ہیں جو سچے ہیں

اور یہی لوگ ہیں جو (سچے) متقی (کے جاسکتے) ہیں

ہاں ساء سے مراد مصیبت کے وقت صبر کرنا ہے، ضراء سے مراد افلاس کے وقت، اور حین الباس سے مراد حوا کے میدان میں صبر کی یہ قسمیں ہیں، تعلقات کے اختلاف کی بنا پر ان کے نام بھی مختلف ہو گئے ہیں، جو شخص الفاظ کے معنی سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہے، وہ یہ بات بھی جانتا ہے کہ الفاظ کے اختلاف سے معنی بھی مختلف ہو جاتے ہیں، یعنی صبر کی مختلف حالتوں کے لئے جو مختلف نام وضع کئے گئے ہیں انکا تقاضا یہ ہے کہ ہر حالت کی ذات اور ماہیت دوسری حالت کی ذات اور ماہیت سے مختلف ہو۔ صراطِ مستقیم پر چلنے والے اور نورانی سے دیکھنے والوں کی نظر پہلے معانی پر جاتی ہے، پھر الفاظ پر، اس لئے کہ الفاظ معانی پر دلالت کے لئے وضع کئے جاتے ہیں، معانی اصل ہیں اور الفاظ ان کے تابع ہیں، جو شخص توابع سے اصول کو سمجھتا چاہے گا وہ لغزش سے اپنا دامن نہ بچا سکے گا قرآن کریم نے دونوں فریقوں کی طرف اشارہ فرمایا ہے

أَفَمَنْ يَمْشِي مُكِبًّا عَلَى وَجْهِهِ أَهْلَى أَمَنٍ يَمْشِي سَوِيًّا عَلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ (پ ۲۲ آیت ۲۲)

سو جس کافر کا حال اوپر سنا ہے اسکو سن کر سوچو کہ کیا وہ شخص منہ کے بل گرنا ہوا چل رہا ہو وہ حیل

مقصود پر زیادہ پہنچنے والا ہو گا یا وہ شخص جو سیدھا ایک ہموار سڑک پر چلا جا رہا ہو

اگر غور کیا جائے تو یہ بات واضح ہو جائے کہ کفار نے سب سے پہلے جو غلطی کی ہے وہ اسی طرح کے امور میں قوی

قوت اور ضعف کے اعتبار سے صبر کی قسمیں

باعثِ دینی کو باعثِ ہوی کے مقابلے میں رکھ کر دیکھیں تو اسکے تین احوال ہوتے ہیں، ایک حال یہ ہے کہ داعمیہ ہوی کو اس قدر مقبور کر دیا جائے کہ مزاحمت کی کوئی قوت باقی نہ رہے، یہ حالت مسلسل صبر کرنے سے حاصل ہوتی ہے، یہ جملہ اسی صورت میں کہا جاتا ہے مَنْ صَبَرَ ظَفَرَ (جس نے صبر کیا اس نے کامیابی حاصل کی)

اس مرتبے پر پہنچنے والے لوگ بہت کم ہیں، جو لوگ ہیں وہ صدیق اور مقرب ہیں، جنہوں نے اللہ کو اپنا رب کہا، پھر اپنے کسے پر ثابت قدم رہے، یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے سیدھے راستے کو لازم پکڑا، اور اس سے انحراف نہیں کیا۔ باعثِ دین پر ان کے نفوس

راضی اور مطمئن ہیں، ایسے ہی لوگوں کو یہ ندا دی جائے گی :-

يَا أَيُّهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً (پ ۳۰ آیت ۲۸)

اے اطمینان والی روح تو اپنے پروردگار (کے جو ارادت) کی طرف چل اس طرح سے کہ تو اس سے خوش اور وہ تجھ سے خوش

دوسری حالت یہ ہے کہ ہوی کے دواغی غالب ہو جائیں اور ہاٹ دین کی منازعت بالکل ختم ہو جائے یہ لوگ اپنے نفسوں کو شیطانوں کے حوالے کر دیتے ہیں، اور مجاہدے کے نتائج سے مایوس ہو کر کوشش ترک کر دیتے ہیں یہ لوگ غافلین کے زمرے میں ہیں، اور ان کی تعداد بہت زیادہ ہے، ایسے ہی لوگ شہوات کے غلام اور نفس کے بندے ہیں، جب ان پر بد بختی غالب آئی تو انھوں نے اپنے دلوں پر جو اللہ تعالیٰ کے اسرار سے قطع رکھتے ہیں اللہ کے دشمنوں کو غالب کر لیا۔ قرآن کریم کی اس آیت میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے :-

وَلَوْ شِئْنَا لَآتَيْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدَاهَا وَلَكِنْ حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّي لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ (پ ۲۱ آیت ۳)

اور اگر ہم کو منظور ہوتا تو ہم ہر شخص کو اس کا راستہ عطا فرماتے اور لیکن میری یہ بات محقق ہو چکی ہے کہ میں جہنم کو جنات اور انسان دونوں سے ضرور بھروں گا۔

یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے آخرت کے عوض دنیا کی زندگی خریدی ہے، اور اس خرید و فروخت میں نقصان اٹھایا ہے، جو نیک لوگ ایسے کم کردہ راہ لوگوں کو ہدایت کا راستہ دکھانا چاہتے ہیں ان کے بارے میں ارشاد کیا جاتا ہے :-

فَاعْرِضْ عَنْ مَن تَوَلَّىٰ عَنْ ذِكْرِنَا وَلَمْ يُزِدْ إِلَّا الْخِيبَةَ اللَّهُ يَذَلِّكَ مَنبَلُهُمْ مِنَ الْعِلْمِ (پ ۲ آیت ۳۰)

تو آپ ایسے شخص سے اپنا خیال ہٹا کیجئے جو ہماری نصیحت کا خیال نہ کرے، اور بجز دنیاوی زندگی کے اسکو کچھ مقصود نہ ہو، ان لوگوں کی قسم کی رسائی کی حد بس یہی ہے۔

اس حالت کی پہچان یہ ہے کہ آدمی مجاہدے سے مایوس اور ناامید ہو، اور آرزوں سے فریب خوردہ ہو، اور یہ انتہائی درجے کی

حالت ہے۔ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں :-

الْكَيْدُ مَنْ كَانَ نَفْسُهُ وَغَيْرُهَا لِمَا بَعْدَ الْمَوْتِ وَالْأَخْمَقُ مَنْ اتَّبَعَ هَوَاهَا وَتَمَنَّى عَلَى اللَّهِ (۱)

تھوڑا وہ ہے جو اپنے نفس کو ڈرائے اور موت کے بعد کی زندگی کے لئے عمل کرے، اور احمق وہ ہے جو

اپنے نفس کی اتباع کرے، اور اللہ پر تمنا کرے

اس حالت والے کو جب نصیحت کی جاتی ہے تو وہ یہ جواب دیتا ہے کہ میں توبہ کرنے کا حتمی تھا، لیکن کسی وجہ سے میں توبہ نہیں کر پایا اس لئے اب اس کی خواہش بھی نہیں رہی، یا یہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ غفور رحیم اور کریم ہے، اس لئے توبہ کی ضرورت ہی کیا ہے؟ اس بے چارہ کی عقل شہوات کی اسیر ہے، وہ اپنی عقل کو اسی طرح کے خیلے بھانے تراشنے میں استعمال کرتا ہے جن سے اپنی نفسانی خواہشات پوری کر سکے۔ اسکی عقل شہوات کے ہاتھوں میں اس طرح مقید ہوتی ہے جس طرح مسلمان کفار کے ہاتھوں میں قید ہوتا ہے کہ اسے جس طرح چاہتے ہیں استعمال کرتے ہیں، اس سے خیر چھوڑتے ہیں، شراب پواتے ہیں، اور اسکی گمراہی اور حمل و نقل پر مامور کرتے ہیں، اور اسی طرح کے دوسرے ناجائز کام لیتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے یہاں اس شخص کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص کسی مسلمان کو کفار کے حوالے کر دے، اس کا گناہ یہی ہے کہ اس نے ایک ایسے شخص کو مغلوب بنایا جسے غالب ہونا چاہیے تھا، اور ایک ایسے شخص کے لئے مسخر کیا ہے جسے مسخر اور مغلوب رہنا چاہیے تھا۔ مسلمان کا حق تو یہ ہے کہ وہ غالب ہو، کیونکہ اس میں

معرفت الہی اور باعث دینی ہے، کافر کا حق یہ ہے کہ وہ مغلوب ہو، کیونکہ اس میں دین ہے جمالت اور شیطانی باعث ہے۔ مسلمان کا حق اپنے نفس پر دو سروں کی نسبت زیادہ واجب ہے۔ چنانچہ اگر کوئی شخص اس شریف شے کو جو اللہ کی جماعت اور فرشتوں کے گروہ سے تعلق رکھتی ہے یعنی عقل کو کسی ایسی رذیل شے کے لئے معز کردے جو شیطانی گروہ سے متعلق ہو اور اللہ تعالیٰ سے دور کرتی ہو وہ ایسا ہے جیسے کوئی شخص کسی مسلمان کو کافر کا غلام بنادے، بلکہ جیسے کوئی شخص کسی محسن اور منعم بادشاہ کے عزیز ترین بیٹے کو گرفتار کر کے اس کے بدترین دشمن کے حوالے کر دے۔ غور کیجئے یہ شخص کتنا بڑا احسان فراموش ہے، اور اسے کس قدر کڑی سزا ملنی چاہیے کہ اس نے اپنے محسن کو تکلیف پہنچائی، یہ مثال اس مقام کے لئے اس لئے موزوں ہے کہ ہوائے نفس بدترین معبود ہے جسکی زمین پر پرستش کی جاتی ہے، اور عقل انتہائی پیاری اور قیمتی چیز ہے جو دنیا میں پیدا کی گئی ہے خود سوچنے اس شخص کو قیمتی بیڑی سزا ملنی چاہیے جو عقل جیسی قیمتی چیز کو ہوائے نفس جیسی بدترین شے کے حوالے کر دے۔

تیسری حالت یہ ہے کہ جنگ برابر کی ہو، کبھی باعث دین غالب آجائے اور کبھی باعث ہوی، ایسے شخص کا شمار مجاہدین کے دمرے میں ہوتا ہے، فتح پانے والوں میں نہیں ہوتا۔ اس قسم کے لوگوں کا حال قرآن کریم کی اس آیت میں مذکور ہے :-
 خَلَطُوا عَمَلًا صَالِحًا وَآخَرَ سَيِّئًا عَسَى اللَّهُ أَنْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ (پ ۱۱۸ آیت ۳۲)
 جنہوں نے طے جلے عمل کئے تھے کچھ بھلے اور کچھ برے شاید اللہ تعالیٰ ان کی دعا قبول کرے۔

یہ تینوں حالتیں قوت و ضعف کے اعتبار سے ہیں جن چیزوں پر مبر کیا جائے ان کے اعتبار سے بھی آدمی کی تین حالتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ آدمی تمام شہوات پر غالب ہو جائے، دوسری یہ کہ کسی شہوت پر غالب نہ ہو، تیسری یہ کہ کسی شہوت پر غالب ہو اور کسی پر نہ ہو۔ اوپر جو آیت ذکر کی گئی ہے وہ اسی تیسری حالت والوں کے بارے میں ہے۔ جو لوگ صرف شہوات پر عمل کرتے ہیں مجاہدہ نہیں کرتے وہ چوپایوں کی مانند ہیں، بلکہ ان سے بھی زیادہ کم گشتہ راہ ہیں چوپایوں کے لئے معرفت اور قدرت پیدا نہیں کی گئی جس سے وہ شہوات کے مقتضی کے خلاف جہاد کر سکیں، انسان کے لئے پیدا کی گئی ہے، لیکن وہ اسے بیکار رکھتا ہے، ایسا شخص بلاشبہ ناقص اور بد بخت ہے جو قدرت کے باوجود کمال حاصل نہ کرے، بقول شاعر :-

وَلَمْ أَرِ فِي عُيُوبِ النَّاسِ عَيْبًا كَنَقْصِ الْقَادِرِينَ عَلَيَّ التَّكَمُّلِ
 (میں نے لوگوں کے عیوب میں کوئی عیب ایسا نہیں دیکھا جیسے کمال قدرت رکھنے والوں کا نقص)

صبر کی دو اور قسمیں : آسانی اور دشواری کے اعتبار سے بھی صبر کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ صبر ہے جو نفس پر شاق ہو اور بغیر مشقت اور جدوجہد کے اس پر مداومت مشکل ہو، اس کا نام صبر (زبردستی صبر کرنا) ہے۔ دوسرا صبر وہ ہے جس میں کوئی خاص مشقت یا محنت نہ ہو، بلکہ نفس پر معمولی دباؤ ڈالنا کافی ہو جائے، اس قسم کا نام صبر ہے۔ اگر تقویٰ پر مداومت ہو، اور یقین میں، جنگل ہو تو صبر آسان ہو جاتا ہے، خواہ بظاہر کتنا ہی مشکل کیوں نہ ہو، پاری تعالیٰ کا ارشاد ہے :-

فَأَمَّا مَنْ أَعْطَى وَاتَّقَى وَصَلَّى بِحَالٍ حُسْنٍ فَسَنِيَسِّرُهُ لِلْيُسْرَى (پ ۱۳۰ آیت ۷)

سو جس نے اللہ کی راہ میں مال دیا اور اللہ سے ڈرا اور اچھی بات کو سچا سمجھا تو ہم اسکو راحت کی چیز کے

لئے سامان دیں گے۔

اس تقسیم کی مثال ایسی ہے جیسے پہلوان اپنے مقابل حریف کے مقابلے میں، اگر وہ کمزور ہے یا زیادہ طاقتور اور چست نہیں ہے تو معمولی جھگڑے سے زمین پر آ رہتا ہے، اسکے برخلاف اگر مقابلے میں کوئی مضبوط اور طاقتور پہلوان ہے تو اسے شکست دینے کے لئے بڑی زبردست جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ باعث دینی اور باعث ہوی کی کشش کا حال بھی یہی ہے، یہ مقابلہ شیاطین اور ملائکہ کے لشکروں میں ہے ان میں جو طاقتور اور اسلحہ سے لیس ہو گا وہ اپنے مقابل کو مار بھگائے گا۔

مقام رضا : جب شہوات ختم ہو جاتی ہیں، اور باعث دینی غالب آ جاتا ہے، اور مسلسل جدوجہد اور طول مواظبت سے صبر آسان

ہو جاتا ہے تو بندے کو وہ مقام حاصل ہو جاتا ہے جسے رضا کہتے ہیں، جیسا کہ مغرب کتاب الرضا میں اسکی تفصیل آئی ہے۔ رضا صبر سے اعلیٰ درجہ ہے۔ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔

أَعْبَدُ اللَّهَ عَلَى الرَّضَا فَإِنْ لَمْ تَسْتَطِعْ فَفِي الصَّبْرِ عَلَى مَا كُنْكَ حَسْبُكَ كَيْفَ تَدْرِي۔
(ابن عباس)

اللہ کی عبادت رضا سے کر، اگر یہ ممکن نہ ہو تو جو چیز میں لگے اس پر صبر کرنے میں بڑی بھلائی ہے۔

صابرین کے تین درجے : بعض عارفین کا کہنا ہے کہ صبر کرنے والوں کے تین درجے ہیں۔ ایک درجہ ترکِ شہوت ہے یا ناستین کا درجہ ہے، دوسرا تقدیر پر راضی رہنا ہے، یہ زاہدین کا درجہ ہے۔ تیسرا اس سلوک سے محبت کرنا ہے جو اللہ تعالیٰ اسکے ساتھ کرے یہ صدیقین کا درجہ ہے۔ کتاب الحب میں ہم بیان کریں گے کہ مقام محبت مقام رضا سے اعلیٰ ہے، جس طرح مقام رضا مقام صبر سے بلند ہے۔

صبر کا حکم : جانا چاہیے کہ صبر اپنے شرعی احکام کے اعتبار سے بھی مختلف قسموں پر تقسیم ہو سکتا ہے جیسے فرض، مکروہ اور حرام۔ چنانچہ محرمات پر صبر کرنا فرض ہے، اور مکروہات پر صبر کرنا نفل ہے۔ جو ایذا شرعاً منع ہو اس پر صبر کرنا حرام ہے، جیسے کوئی شخص کسی کا ہاتھ کاٹنا چاہے اور وہ اس پر خاموش رہ کر صبر کرے تو یہ جائز نہ ہوگا، اسی طرح اگر کوئی شخص اسکی بیوی پر ہاتھ ڈالے، یہاں تک کہ اسکی غیرت میں اشتعال پیدا ہو، لیکن صبر کی وجہ سے غیرت کا اظہار نہ کر سکے، اور جو کچھ بیوی کے ساتھ ہو رہا ہو اس پر خاموش تماشا بازی بنا رہے، یہ صبر بھی حرام ہے۔ مکروہ صبر وہ ہے جو کسی ایسی اذیت پر کیا جائے جو شرعاً مکروہ ہو۔ اس تقسیم کے بیان سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ صبر کے باب میں بھی شریعت کو کوئی سمجھنا چاہیے۔ حدیث شریف میں صبر کو نصف ایمان قرار دیا گیا ہے اسکا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ ہر قسم کا صبر قابلِ تعریف ہے، بلکہ صبر وہی اچھا ہے جو شریعت کی نظر میں اچھا ہو، ورنہ خواہ مخواہ جسم کو تکلیف دینا ہے جس کا کوئی اجر نہیں ہے۔

بندہ ہر حال میں صبر کا محتاج ہے

جاننا چاہیے کہ زندگی میں بندے کو جن حالات سے سابقہ پیش آتا ہے وہ دو طرح کے ہوتے ہیں، یا تو اس کی خواہش کے موافق ہوتے ہیں، یا موافق نہیں ہوتے بلکہ وہ انھیں ناپسند کرتا ہے۔ بندہ ان دونوں حالتوں میں صبر کا محتاج ہے۔

خواہش کے موافق احوال : یہ ہیں کہ جیسے صحت، تندرستی، مال، جاہ، احباب، اقارب اور متبعین و معادین کی کثرت، مال و متاع کی زیادتی، اور دنیا کی تمام لذتیں اور نعمتیں، ان حالات میں بندے کو صبر کی بڑی سخت ضرورت ہے، اسلئے کہ اگر اس نے ضبط نفس سے کام نہیں لیا، اور نفس کو ان تمام دنیاوی لذتوں میں آزاد چھوڑ دیا خواہ وہ لذتیں مباح ہی کیوں نہ ہوں تو اس کا اندیشہ ہے کہ وہ سرکش بن جائے گا، اور اترا نہ لگے گا۔ قرآن کریم کے ارشاد کے مطابق یہ انسانی طبیعت کی خصوصیت ہے کہ جب وہ فنی ہو تا ہے تو سرکشی پر کمر بستہ ہو جاتا ہے۔

إِنَّ الْإِنْسَانَ لِرَبِّهِ لَظَلْفٌ لِّئَلَّا يُكْفِّرَ بِمَا كُفِّرَ (پ ۳۰ آیت ۷)

بے شک (کافر) آدمی خدا سے کفر کرنا پسند کرتا ہے کہ اپنے آپ کو مستحق دیکھتا ہے۔

اس لئے بعض اللہ والے فرماتے ہیں کہ مصیبت پر مومنین صبر کرتا ہے، اور سلامتی پر صدیق کرتا ہے حضرت سہیل تشری کا ارشاد ہے کہ سلامتی پر صبر کرنا مصیبت پر صبر کرنے سے زیادہ سخت ہے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین پر جب دنیاوی مال و متاع کے دروازے کھولے گئے تو انھوں نے فرمایا کہ جب جگہ سنی اور مغلّی کے درپے ہماری آزمائش کی گئی تو ہم نے صبر کیا، اور

اس آزمائش میں پورے اترے، لیکن اب مالدار اور فاسق الہابی کے قتلے کے ذریعے ہمارا امتحان لیا جا رہا ہے۔ اب ہم صبر نہ کر سکیں گے، اور ناکام ہو جائیں گے۔ قرآن کریم میں اسی لئے مال، اولاد اور پیسوں کے قتلے سے ڈرایا گیا ہے۔
يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُلْهِكُمْ أَمْوَالُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ (پ ۲۸ ر ۱۳ آیت ۹)

اے ایمان والو! تم کو تمہارے مال اور اولاد اللہ کی یاد سے غافل نہ کرنے پائیں۔
إِنَّ مِنْ أَرْوَاحِكُمْ وَأَوْلَادِكُمْ عَنْوَالَكُمْ فَاحْذَرُوهُمْ (پ ۲۸ ر ۱۳ آیت ۱۴)

تمہاری بعض بیسیاں اور اولاد تمہارے (دین کی) دشمن ہیں۔ سو تم ان سے ہوشیار رہو۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :-

أَلْوَلَدُكُمْ خَلْقٌ جَبَنَةٌ مَخْرُؤَةٌ (ابو حلی۔ ابوسعید)

لو کہ بچل، بزدلی اور غم میں مبتلا کرتا ہے۔

ایک مرتبہ آپ نے اپنے نواسے حضرت حسن کو دیکھا کہ وہ کرتے میں الجھ کر گرنا چاہتے ہیں، آپ انھیں اٹھانے کے لئے منبر سے اترے، اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا قول برحق ہے :-

إِنَّمَا أَمْوَالُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ (پ ۲۸ ر ۱۴ آیت ۱۵)

تمہارے اموال اور اولاد تمہارے لئے ایک آزمائش کی چیز ہے۔

جب میں نے اپنے بیٹے کو لڑکھڑاتے ہوئے دیکھا تو اپنے آپ کو نہ روک سکا اور اسے اٹھانے کے لئے منبر سے اتر پڑا (۱) یہ مقام اصحاب بصیرت کے لئے عبرت کا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کامل وہی ہے جو عافیت پر صبر کرے اور عافیت پر صبر کرنے کے معنی یہ ہیں کہ اس کی طرف مائل نہ ہو، اور یہ اعتقاد رکھے کہ یہ عافیت اور سلامتی چند روز کے لئے میرے پاس بطور امانت ہے، بہت جلد مجھ سے واپس لے لی جائے گی، یا اسے پاکر خوش ہونا، اور ان نعمتوں لذتوں اور لہو لعب میں ڈوب رہنا کسی عقلمند کے شایان شان نہیں ہے بلکہ بہتر یہ ہے کہ اس پر اللہ تعالیٰ کے جو حقوق ہیں ان نعمتوں کے ذریعے وہ حقوق ادا کرے، مثلاً مال کا حق یہ ہے کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرے، بدن کا حق یہ ہے کہ اس کے ذریعے دوسروں کی مدد کرے، زبان کا حق یہ ہے کہ سچ بولے، اگر آدمی اس طرح صبر کرے گا تو اس کا یہ صبر شکر سے قریب تر ہوگا، جب تک آدمی شکر ادا نہ کرے اس وقت تک صبر مکمل نہیں ہوتا جیسا کہ عنقریب یہ بیان آئے گا۔ عافیت اور سلامتی پر صبر کرنا اسلئے دشوار تر ہے کہ اس میں قدرت موجود ہوتی ہے ورنہ جسے قدرت نہ ہو بے چارہ صبر نہ کرے تو کیا کرے، حقیقت میں صبر وہی ہے جو قدرت رکھنے کے بعد ہو، اسکی مثال ایسی ہے جیسے کوئی دو سرا تمہارے پیچھے لگائے، یا فصد کھولے اس صورت میں صبر کرنا پہلے کی نسبت دشوار ہے، اسی طرح اگر بھوکے کے سامنے کھانا نہ ہو تو صبر آسانی سے کر سکتا ہے، لیکن اگر اسکے سامنے عمدہ اور لذیذ کھانا رکھا ہو، اور اس سے صبر کرنے لئے کہا جائے تو یقیناً اس کے لئے صبر کرنا دشوار ہوگا۔

ناموافق حالات : دوسری قسم میں وہ حالات ہیں جو خواہش سے موافقت نہ رکھتے ہوں، یہ حالات تین طرح کے ہوتے ہیں، ایک وہ ہیں جو بندے کے اختیار میں ہوں جیسے اچھے اور برے اعمال، دوسرے وہ ہیں جو اس کے اختیار میں نہ ہوں جیسے مصیبتیں، لوہ حادثے، اور تیسرے وہ ہیں کہ ابتداء ان کے اختیار میں نہ ہو، لیکن بعد میں اختیار ممکن ہو جیسے موزی سے انتقام لینا۔

پہلی قسم۔ اختیاری احوال : پہلی قسم یعنی وہ احوال جن میں بندے کے اختیار کو دخل ہے اسکی بھی دو قسمیں ہیں، پہلی قسم

طاعت اور دوسری قسم معصیت بندہ ان دونوں میں مبر کا محتاج ہے۔

اطاعت پر صبر: اطاعت پر مبر کرنا ایک سخت اور دشوار گزار مرحلہ ہے، اس لئے کہ نفس بے "اطاعت سے گریز کرتا ہے عیوب سے بھرتا ہے، اس کا میلان ربوبیت کی طرف رہتا ہے، اس لئے بعض عارفین کا مقولہ ہے کہ کوئی نفس ایسا نہیں جس میں وہ بات پوشیدہ نہ ہو جو فرعون نے ظاہر کر دی تھی، یعنی اس کا یہ دعویٰ۔

أَنَّا رُكِّمُكَمُ الْاَعْلٰی (پ ۳۰ ر ۳ آیت ۲۳)

میں تمہارا رب اعلیٰ ہوں۔

فرعون کو اس دعویٰ کا یا اپنی دل کی پوشیدہ بات ظاہر کرنے کا موقع اس لئے مل گیا تھا کہ اسکی قوم حنجر تھی، کنزور تھی، اس نے فرعون کی طاقت کے سامنے سر تسلیم خم کیا، اور اسکی اطاعت قبول کی، یوں ہر شخص کے دل میں یہ جذبہ پوشیدہ ہے کہ وہ رب کہلائے، اسکی پرستش کی جائے، یہی وجہ ہے کہ اکثر لوگ اپنے سے چھوٹوں، خادموں، نوکروں، اور غلاموں کے سامنے اس طرح کا رویہ رکھتے ہیں جس سے ان کے اس جذبہ برتری کی تسکین ہو جاتی ہے، نیز یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی خادم یا نوکر اپنے مالک یا آقا کی خدمت میں ذرا سی کوتاہی کر بیٹھا ہے تو اسے یہ بات بعد معلوم ہوتی ہے، اس وقت اس کے غصے اور غیظ و غضب کا عالم دیدنی ہوتا ہے، اسکی وجہ اگر وہ بات نہیں جسے اس نے اپنے دل کے کسی گوشے میں چھپا رکھی ہے تو اس کے علاوہ کیا ہے؟

بہر حال عیوب و مطلقاً نفس پر شاق ہے، پھر عبادات میں سے بعض وہ عبادتیں ہیں جو سستی کی بنا پر شاق گزرتی ہیں جیسے نماز، اور بعض بخل کی وجہ سے دشوار ہیں جیسے زکوٰۃ، اور بعض سستی اور بخل دونوں وجہ سے گراں گزرتی ہیں جیسے حج اور جہاد۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اطاعات پر مبر کرنا ایسا ہے جیسے مصائب پر مبر کرنا۔ پھر مطیع کو اپنی اطاعت پر تین احوال میں مبر کرنا پڑتا ہے، "اولاً" اطاعت سے پہلے، اور اخلاص نیت کی صحیح اور اخلاص کے عزم کے سلسلے میں، اور اپنے اخلاص کو ریا کے شوائب اور آفات کے دوائی سے بچانے کے سلسلے میں انتہائی مبر کی ضرورت ہے، جو لوگ غلوں کی اہمیت جانتے ہیں، اور راہ وقار پر ثابت قدم رہنا جزو ایمان سمجھتے ہیں وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ اس طرح کے امور میں مبر کرنا کس قدر دشوار ہے۔ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں نیت کی اہمیت اور عظمت واضح فرمائی ہے۔

اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ وَلِكُلِّ امْرِئٍ بِمَا نَوَىٰ (بخاری و مسلم۔ عن)

اعمال کا دار و مدار نیتوں پر ہے، ہر شخص کے لئے وہی ہے جس کی وہ نیت کرے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وَمَا اَمْرُوْا اِلَّا لِيَعْبُدُوْا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ (پ ۳۰ ر ۲۳ آیت ۵)

حالانکہ ان لوگوں کو یہی حکم ہوا تھا کہ اللہ کی اس طرح عبادت کریں کہ عبادت اسی کے لئے خاص

رکھیں۔

اسی اللہ تعالیٰ نے مبر کو عمل پر مقدم فرمایا :-

اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (پ ۲۳ ر ۲ آیت ۱۱)

مگر وہ لوگ جنہوں نے صبر کیا اور نیک اعمال کئے۔

دوسری حالت عمل کی حالت ہے، اس حالت میں بھی مبر کا التزام بے حد ضروری ہے تاکہ عمل کے دوران اللہ سے غافل نہ رہے، اس کے مقرر کردہ آداب و سنن کی پابندی کرے، اور عمل کے آغاز سے آخر تک ہر ہر ادب کی رعایت کرے، اور عمل سے فائدہ ہونے تک ان تمام دوائی سے مبر کرے جن سے عمل میں نقص پیدا ہوتا ہے یہ مبر بھی نہایت سخت ہے، غالباً قرآن کریم کی اس آیت میں یہی لوگ مراد ہیں :-

وَنِعْمَ أَجْرُ الْعَامِلِينَ الَّذِينَ صَبَرُوا (پ ۵۳ ر ۵ آیت ۳۶)
اور بہت خوب ہے ان عمل کرنے والوں کا اجر جنہوں نے صبر کیا۔
یعنی وہ لوگ ہیں جنہوں نے عمل کی ابتداء سے انتہا تک صبر کیا۔

تیسری حالت وہ ہے جو عمل سے قاصر ہونے کے بعد طاری ہو اس وقت بھی بندہ صبر کا محتاج ہے کہ وہ اپنی عبادت کو ناموری اور رہا کے لئے ظاہر نہ کرے اور نہ اسے پسندیدگی کی نظر سے دیکھے اور نہ کوئی ایسا کام کرے جس کا اس عبادت کا اجر و ثواب ختم ہو جائے یا وہ عمل باطل ہو جائے۔ ارشاد ربانی ہے۔

وَلَا تَبْطُلُوا أَعْمَالَكُمْ (پ ۸۳ ر ۸ آیت ۳۳)

اور اپنے اعمال کو برباد مت کرو

ایک جگہ ارشاد فرمایا :-

لَا تَبْطُلُوا صِدْقَاتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْأَذَى (پ ۲۳ ر ۲ آیت ۲۷)

تم احسان جتلا کر یا ایذا پہنچا کر اپنی خیرات کو برباد مت کرو۔

جو شخص صدقہ دے کر من و لؤی (احسان جتلائے اور ایذا دینے) سے صبر نہ کر سکے گا وہ کوہ اپنا عمل ضائع کر دے گا اور بجائے ثواب کے گناہ کمائے گا۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے طاعات کی دو قسمیں ہیں 'فرض اور نفل'، مطیع اپنی نفل اور فرض ہر طرح کی اطاعت میں صبر کا محتاج ہے قرآن کریم نے ان دونوں طرح کی عبادتوں کو اس آیت میں جمع کیا ہے :-

إِنَّ اللَّهَ كَرَّمَ بِالْعَنَاءِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَاءِ ذِي الْقُرْبَىٰ (پ ۱۳ ر ۱۹ آیت ۹۰)

بے شک اللہ تعالیٰ اعتدال اور احسان اور اہل قرابت کو دینے کا حکم فرماتے ہیں۔

عدل سے مراد فرض اور احسان سے مراد نفل ہے 'قرابت داروں کو دینا موت اور صلہ رحمی ہے' ان سب میں صبر کی ضرورت

ہے۔

معصیت پر صبر : معاصی پر صبر کرنا بھی نہایت ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ نے معاصی کی تمام قسموں کو اس آیت میں جمع فرمادیا ہے

وَنَهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ (پ ۱۳ ر ۱۹ آیت ۹۰)

اور اللہ تعالیٰ کھلی برائی اور مطلق برائی اور ظلم کرنے سے منع فرماتے ہیں۔

سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں :-

الْمُهَاجِرُ مَنْ هَاجَرَ الشُّعُورَ الْمَجَاهِلَةَ بَاجِلِهِمْ وَأَهْلَ بَاغٍ نَسَائِيٍّ فَضَالَهُ ابْنُ عَمِيٍّ

ہجرت کرنے والا وہ ہے جو برائی چھوڑ دے اور مجاہدہ ہے جو خواہش نفس سے جملہ کرے۔

معاصی باعث ہوی کے لوازم ہیں اور معاصی پر صبر کرنا بھی دشوار ہے خاص طور پر ان معاصی پر صبر کرنا نہایت دشوار ہے جو مسلسل عمل کے باعث عادت بن گئے ہوں عادت بھی ایک طرح کی طبیعت ہی ہے جب عادت اور خواہش نفس دونوں مل جاتی ہیں تو گویا دو شیطانی لشکر ایک جگہ جمع ہو جاتے ہیں اور اپنے مشترکہ دشمن کے خلاف جنگ میں ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں یہ مقابلہ باعث دینی سے ہوتا ہے نتیجہ وہ باعث ہوی کو شکست نہیں دے پاتا اور خود شکست کھا جاتا ہے اگر ان گناہوں کا تعلق ان اعمال سے ہو جن کا کرنا سہل ہے تو ان میں صبر کرنا اور زیادہ دشوار ہے مثلاً زبان کے گناہوں جیسے غیبت، جھوٹ، عداوت، اشاروں یا واضح لفظوں میں اپنی تعریف، ایسے مذاق جس سے دلوں کو تکلیف ہو، تحقیر آمیز کلمات، مردوں کی عیب جوئی اور انکے علم و عمل اور منصب کی تحقیر و مذمت وغیرہ یہ امور بظاہر غیبت ہیں لیکن فی الحقیقت اپنی تعریف ہیں اس طرح کے گناہوں میں دو سروں کی نفی اور

اپنی ذات کا اثبات ہوتا ہے، اس لئے نفس ان کی طرف زیادہ مائل ہوتا ہے، ان ہی دونوں باتوں سے ربوبیت کی تکمیل ہوتی ہے، جو نفس کا نصب العین ہے، جب کہ ربوبیت عبودیت کی ضد ہے، انسان کو عبودیت کا حکم دیا گیا ہے۔

ربوبیت کا حکم نہیں دیا گیا۔ کیوں کہ نفس میں یہ دونوں شوقیں جمع رہتی ہیں، اور زبان کو حرکت دینا آسان ہوتا ہے، بلکہ عام زندگی میں اس طرح کی فضول باتوں کو عادت سمجھ لیا گیا ہے اور اس کے حسن و قبح پر کوئی کلام کرنا بیکار سمجھا جاتا ہے اس لئے ان گناہوں پر مبر کرنا نہایت دشوار ہے حالانکہ ملکات میں ان کا شمار سرفہرست ہے، عجیب بات ہے اگر کوئی شخص ریشمی لباس پہن لے تو اسے نہایت برا تصور کرتے ہیں، غالباً ان کے سامنے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نہیں ہے۔

إِنَّ الْعَيْبَةَ أَشَدَّ مِنَ الزِّنَا (۱) غیبت زنا سے شدید تر ہے۔

جو شخص گفتگو میں زبان پر قابو نہ رکھ سکے، اور ان معاصی سے مبر کرنا قادر نہ ہو اس پر عزت نشینی اور تمنا واجب ہے، اسکے لئے نجات کی کوئی دوسری صورت نہیں ہے، کیونکہ تمنا میں مبر کرنا لوگوں کے درمیان رہ کر مبر کرنے کی بہ نسبت زیادہ آسان ہے۔ خیال رہے کہ معاصی کا سبب جس قدر قوی یا ضعیف ہو گا اسی قدر ان پر مبر کرنا بھی دشوار یا آسان ہو گا، وسوسے دلوں میں خلجان ہوتا ہے، یہ عمل زبان ہلانے کے عمل سے زیادہ سہل ہے اس آفت سے تمنا میں بھی مفر نہیں ہے، بظاہر وسوسوں سے مبر کرنا ممکن ہے، لہذا یہ کہ دل پر دین کی کوئی فکر غالب ہو جائے، اور ذہن ہر طرف سے یکسو ہو کر اسی فکر میں لگ جائے، جب تک دل و دماغ کسی مخصوص فکر میں مشغول نہ ہوں گے وسوسوں چھٹکارا نہ پائیں گے۔

دوسری قسم۔ ابتدا میں غیر اختیاری، پھر اختیاری: یہ وہ احوال ہیں جن کا آنا اپنے اختیار میں نہیں ہوتا، لیکن ان کا دفع کرنا اختیار میں ہوتا ہے، مثال کے طور پر کسی کو قول یا فعل سے ایذا دی گئی، یا اس کے نفس اور مال میں کوئی قصور کیا گیا ان امور پر مبر کرنا، اور بدلہ نہ لیتا، کبھی واجب ہوتا ہے، اور کبھی فضیلت کا باعث بعض صحابہ فرماتے تھے کہ ہم اس شخص کے ایمان کو ایمان ہی نہیں سمجھتے جو ایذا پر مبر نہ کرے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وَلَنْصَبِرَنَّ عَلَىٰ مَا آذَيْنَاوْا وَعَلَى اللَّوْثِلَيْنَا كُلَّ الْمُنْثَوِ كَلُّونَ (پ ۳۳ ر ۳۳ آیت ۴)

اور (تم نے جو کچھ ہم کو ایذا پہنچائی ہے) ہم اس پر مبر کریں گے اور اللہ ہی پر بھروسہ رکھنے والوں کو بھروسہ

رکھنا چاہیے۔

ایک مرتبہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے مالِ تقسیم فرمایا، ایک مسلمان اعرابی نے کہا یہ ایسی تقسیم نہیں ہے جس سے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی مقصود ہو، اعرابی کا یہ قول آپ تک پہنچا، آپ کے رخسار مبارک سرخ ہو گئے اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ میرے بھائی نبی علیہ السلام پر رحم کرے کہ لوگوں نے انھیں اس سے بھی زیادہ ستایا مگر انھوں نے مبر کیا (بخاری و مسلم۔ ابن مسعود) قرآن کریم میں متعدد مواقع پر مبر کی تلقین کی گئی ہے فرمایا۔

وَدَعْ أَذَاهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ (پ ۲۲ ر ۳۲ آیت ۳۸)

اور ان کی طرف سے جو ایذا پہنچے اس کا خیال نہ کیجئے، اور اللہ پر بھروسہ کیجئے۔

وَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيلًا (پ ۲۹ ر ۳۰ آیت ۴)

اور یہ لوگ جو باتیں کرتے ہیں ان پر مبر کرو، اور خوبصورتی کے ساتھ ان سے الگ رہو۔

وَلَقَدْ نَعْلَمُ أَنَّكَ يَصْنِقُ صَلْرَكَ بِمَا يَقُولُونَ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَكُنْ مِنَ السَّاجِدِينَ (پ ۱۳ ر ۶ آیت ۹۸-۹۹)

اور واقعی ہم کو معلوم ہے کہ یہ لوگ جو باتیں کہتے ہیں ان سے آپ تنگ دل ہوتے ہیں تو آپ اپنے پروردگار کی تسبیح و تحمید کرتے رہے اور نمازیں پڑھنے والوں میں رہے۔

وَلْتَسْمَعْنَ مِنَ الَّذِينَ أَوْتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِينَ أَشْرَكُوا أَذَى كَثِيرًا وَلَئِنْ تَصَبَّرُوا وَاتَّقُوا فَإِنَّ ذَلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ (پ ۱۲۳ آیت ۱۸۶)

اور البتہ آگے کو اور سونگے بہت سی باتیں دل آؤمیری کی ان لوگوں سے جو تم سے پہلے کتاب دے گئے ہیں اور ان لوگوں سے جو مشرک ہیں اور اگر مبرک ہو گئے اور پرہیز رکھو گے تو یہ تاکید احکام میں سے ہیں۔

ان تمام آیات کا مقصد یہی ہے کہ بدلہ لینے کے بجائے مبرک کیا جائے اس کا بڑا اجر ہے جو لوگ قصاص وغیرہ میں اپنا حق معاف کر دیتے ہیں اللہ تعالیٰ نے ان کی توصیف فرمائی ہے ارشاد فرمایا -

وَإِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهِ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِلصَّابِرِينَ (پ ۱۳ آیت ۲۲)

اور اگر بدلہ لینے لگو تو اتنا ہی بدلہ لو جتنا تمہارے ساتھ برتاؤ کیا گیا اور اگر مبرک ہو تو وہ مبرک کرنے والوں کے حق میں بہت ہی اچھی بات ہے۔

سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں ت-

صَلِّ مَنْ قَطَعَكَ وَاعْطِ مَنْ حَرَمَكَ وَاعْفُ عَمَّنْ ظَلَمَكَ (۱)

جو تجھے چھوڑ دے اس سے مل جو تجھے نہ دے اسے دے اور جو تجھ پر ظلم کرے اسے معاف کر۔

میں نے انجیل میں لکھا ہوا دیکھا ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے حواریوں سے فرمایا کہ تمہیں پہلے سے یہ حکم ہے دانت کے بدلے دانت اور ناک کے بدلے ناک یعنی تمہیں جس قدر ایذا پہنچے تم بھی اسی قدر پہنچاؤ لیکن میں یہ کہتا ہوں کہ شر کا جواب شر سے مت دو بلکہ جو تمہارے دانتیں رخسار پر مارے تم اپنا پایاں رخسار بھی پیش کر دو جو تمہاری چادر چھین لے تم اپنا تہبند بھی اسے دیدو جو تمہیں زبردستی ایک میل لے جائے تم دو میل تک اس کیساتھ چلے جاؤ یہ سب روایات اذیت اور تکلیف پر مبرک باب میں ہیں۔ یہ مبرک کا اعلا مرتبہ ہے اس لئے کہ اس صورت میں باعثِ دینی کے مقابلے میں غضب اور شہوت دونوں ہوتے ہیں ان دونوں پر قابو پانا بڑے حوصلے کا کام ہے۔

تیسری قسم۔ اختیاری احوال : یہ وہ احوال ہیں جو نہ ابتداء میں اختیار ہی ہیں اور نہ انتہا میں جیسے مصائب اور حادثات وغیرہ مثلاً کسی عزیز کی موت مال کی ہلاکت صحت کا زوال بینائی کا ضیاع اعضاء کا بگاڑ اسی طرح کی دوسری معیبتیں ان پر مبرک کرنا بھی مبرک کے مقامات میں انتہائی اعلیٰ ہے حضرت عبداللہ ابن عباس ارشاد فرماتے ہیں کہ قرآن کریم میں مبرکی تین صورتیں مذکور ہیں اول ادائے فرض پر مبرک اس کے تین سو درجے ہیں دوم اللہ تعالیٰ کی حرام کردہ چیزوں پر مبرک اسکے چھ سو درجے ہیں۔ سوم پہلے صدے پر مبرک اس کے نو سو درجے ہیں۔ معیبت پر مبرک کرنا اگرچہ فضائل میں سے ہے پر جب کہ محرمات پر مبرک کرنا فرائض میں سے ہے مگر اس کے باوجود معیبت پر مبرک کرنے کو جو فضیلت حاصل ہے وہ محرمات پر مبرک کرنے کو نہیں ہے اسکی وجہ یہی ہے کہ محرمات پر مبرک کرنے کی طاقت ہر مومن رکھتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ معیبتوں پر مبرک کرنے کی قوت صرف انبیاء علیہم السلام میں ہوتی ہے یا ان میں جنہیں صدیقین کے اخلاق میسر ہوں یہ مبرک نفس پر انتہائی شاق ہے اسی لئے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک دعا میں یہ الفاظ تھے۔

أَسْأَلُكُمْ مِنَ الْيَقِينِ مَا تَهْتُونَ عَلَيَّ بِمَعْصَايَ الْتَنِيَا (ترمذی، نسائی، ابن عمر)

میں تجھ سے اس یقین (مبراگی) درخواست کرتا ہوں جس سے تو مجھ پر دنیا کی معیجیں آسان کر دے۔

اس دعا سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ مبرا حسن یقین کے درجے میں ہے۔ حضرت ابو سلیمان دارانی کہتے ہیں، بخدا ہم ان چیزوں پر مبرا نہیں کر سکتے جنہیں ہم اچھا سمجھتے ہیں، مہلان چیزوں پر مبرا کیسے کر سکتے ہیں جو ناپسندیدہ ہیں؟ ایک حدیث قدسی میں یہ الفاظ ہیں :-

إِذَا وَجَّهْتُ إِلَى عَبْدٍ مِنْ عِبِيدِي مُصِيبَةً فِي بَدَنِهِ أَوْ مَالِهِ أَوْ وَلَدِهِ ثُمَّ اسْتَقْبَلَ ذَلِكَ بِصَبْرٍ جَمِيلٍ اسْتَحْبَبْتُ لَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَنْ أَصْصَ لِعَمِيرٍ أَنَا أَوْ أَشْرَكَ لَهُ دِينًا (ابن عمری۔ انس)

جب میں اپنے بندوں میں سے کسی بندے پر اس کے بدن، مال یا اولاد میں کوئی مصیبت بھیجتا ہوں اور وہ مبرا جمیل سے اسکا استقبال کرتا ہے تو مجھے قیامت کے روز اس سے شرم آتی ہے کہ میں اس کے لئے ترازو کمزری کروں یا اس کے اعمال نامے پھیلاؤں۔

ایک حدیث میں ہے :-

أَنْتَظَرُ الْفَرَجَ بِالْصَّبْرِ عِبَادُ مَنْدُ الشَّابِ (ابن عمر)

مبرا کے ساتھ فراخی کا انتظار عبادت ہے۔

ایک حدیث میں ہے جب کسی مسلمان کو کوئی تکلیف پہنچے اور وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق یہ کلمات کہے ”إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاغِبُونَ“ اللہمَّ اجْزِنِي فِي مُصِيبَتِي وَأَعْصِنِي خَيْرَ امْتِنَانٍ“ تو اللہ تعالیٰ اس کی دعا قبول کرتا ہے اور جو وہ چاہتا ہے اسے عطا کرتا ہے (مسلم، ام سلمہ) حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت جبریل علیہ السلام سے فرمایا: اے جبریل! میں جس بندے کی دونوں آنکھیں چھین لوں اسکا اجر کیا ہے؟ جبریل نے عرض کیا: شجاعت، لہجہ، علم، نفاذ، عطاء، عفو، ارشاد فرمایا: اس کا اجر یہ ہے کہ وہ ہمیشہ میرے گھر میں رہے، اور میرے دیدار سے بہرہ مند ہو (طبرانی اوسط۔ ہلال ابن میمون) ایک حدیث قدسی میں ہے کہ جب میں اپنے کسی بندے کو مصیبت میں مبتلا کرتا ہوں اور وہ مبرا کرتا ہے اور اپنی عیادت کرنے والوں سے شکوہ نہیں کرتا تو میں اسکا گوشت بہتر گوشت سے بدل دیتا ہوں، اور اسکا خون بہتر خون سے تبدیل کر دیتا ہوں، اور جب اسے سحر درست کرتا ہوں تو اس حال میں کرتا ہوں کہ اس کے ذمے کوئی گناہ باقی نہیں رہتا، اور جب موت دیتا ہوں تو اسے اپنی رحمت سے ڈھانپ لیتا ہوں (موطا امام مالک۔ ابو سعید)

حضرت داؤد علیہ السلام نے عرض کیا اے اللہ اس غمزدہ کا اجر کیا ہے جو صرف تیری رضا کے لئے مصائب پر مبرا کرے، ارشاد فرمایا اس کا اجر یہ ہے کہ میں اسے ایمان کا ایسا لباس فاقہ پر سناؤں جو اس کے جسم سے کبھی جدا نہ ہو، ایک مرتبہ حضرت عمر ابن عبدالعزیزؓ نے اپنے خطبے میں ارشاد فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندے کو کوئی نعمت عطا کرتا ہے، پھر اسے چھین لیتا ہے، اور وہ بندہ اس نعمت سے محرومی پر مبرا کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے پہلی نعمت سے اعلا اور افضل نعمت سے نوازتا ہے، اس کے بعد آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی:-

إِنَّمَا يُوفِي الصَّابِرُونَ أَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ (پ ۲۳، آیت ۱۰)

مستقل رہنے والوں کو ان کا صلہ بے شمار ہی ملے گا۔

حضرت فضیل ابن عیاضؒ سے مبرا کی حقیقت دریافت کی گئی، آپ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر راضی ہونے کا نام مبرا ہے لوگوں نے دریافت کیا یہ کیسے؟ فرمایا جو شخص راضی رہتا ہے وہ اپنی حیثیت سے زیادہ کا طالب نہیں ہوتا۔ حضرت ثعلبیؒ شفا خانے

میں محبوس ہوئے تو کچھ لوگ آپ کی عبادت کے لئے آئے، آپ نے ان سے دریافت فرمایا کیوں آئے ہو، انہوں نے عرض کیا کہ ہم لوگ آپ کی زیارت کے لئے آئے ہیں آپ کے احباب ہیں، آپ نے انہیں ڈھیلوں سے مارنا شروع کر دیا، وہ لوگ مارے خوف کے بھاگنے لگے، آپ نے فرمایا اگر تم میرے دوست ہوئے تو میری مصیبت پر صبر کرتے۔ ایک عارف اپنی جیب میں پرچہ رکھ کر پھر اگرتے تھے، اور بار بار نکال کر اس کا مطالعہ کیا کرتے تھے، اس پرچے میں لکھا ہوا تھا۔

وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا (پ ۲۲ آیت ۳۸)

اور آپ اپنے رب کی (اس) تجویز پر صبر سے بیٹھے رہئے کہ آپ ہماری حفاظت میں ہیں۔

بیان کیا جاتا ہے کہ حق موصول کی بیوی ٹھوکر کھا کر گر پڑیں مگر نے سے ان کا ناخن ٹوٹ گیا، مگر وہ ہنسنے لگیں، لوگوں نے عرض کیا کہ کیا آپ تکلیف محسوس نہیں کرتیں، کہنے لگیں میں اس تکلیف پر صبر کے ثواب کے خیال سے فس رہی ہوں، اس خیال نے میری تکلیف زائل کر دی ہے۔ حضرت داؤد نے حضرت سلیمان علیہ السلام سے ارشاد فرمایا مومن کے تقویٰ پر تین چیزوں سے استدلال کیا جاتا ہے، جو چیز حاصل نہ ہو اس میں حسن توکل، جو حاصل ہو جائے اس پر حسن رضا، جو دے کر چین لی جائے اس پر حسن صبر۔ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں۔

مِنْ إِخْلَالِ اللَّهِ مُعْرِفَةَ حَقِّهِ أَنْ لَا تَشْكُوْا وَجَعَكَ وَلَا تَذْكُرُ مُصِيبَتَكَ (ابن ابی الدنیا موقوفاً۔ سفیان)

خدا کی تعالیٰ کی تعظیم اور اس کے حق کی معرفت یہ ہے کہ تم اپنے درد کا شکوہ نہ کرو اور نہ اپنی مصیبت کا ذکر کرو۔

ایک بزرگ تھیلے میں کچھ روپے لیکر نکلتے، آگے جا کر تھیلا غائب تھا، کہنے لگے جس نے لیا ہے، اللہ اسے ان روپوں میں برکت عطا کرے، ہو سکتا ہے اسے ان روپوں کی مجھ سے زیادہ ضرورت ہو۔ ایک بزرگ روایت کرتے ہیں کہ میں سالم مولیٰ ابی حنیفہ کے پاس اس حال میں گیا کہ ان کی زندگی کی چند سائیں باقی رہ گئیں تھیں، میں نے ان سے عرض کیا کیا میں آپ کو پانی پلاؤں، کہنے لگے مجھے تھوڑا سا کھینچ کر دشمن کی طرف پہنچا دو، (تاکہ میں آخری سانس تک ان سے لڑ سکوں) اور پانی میری ڈھال میں رکھ دو، اگر شام تک زندہ رہا پانی لوں گا میں اس وقت روزے سے ہوں۔

راہ آخرت کے سالکین کا صبر ہی تھا، وہ مصائب پر شکوہ تو کیا اللہ کا شکر ادا کرتے تھے کہ اس نے انہیں آزمائش کے قابل سمجھا اور اجر و ثواب کا موقع عنایت فرمایا۔

کیا صبر اضطراری ہے یا اختیاری؟ : یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ صابر کو مصائب پر صبر کرنے میں یہ درجہ کس طرح حاصل ہوتا ہے جب کہ معاملہ اسکے اختیار میں نہیں ہوتا، مصائب سب غیر اختیاری ہیں، وہ چاہے نہ چاہے اسے یہ مصیبتیں برداشت کرنی ہوں گی، اگر اس صبر سے مراد یہ ہے کہ اسکے دل میں ذرا سی کراہیت بھی نہ ہو تو یہ آدمی کے اختیار میں داخل نہیں ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جو لوگ مصائب پر واہلا کرتے ہیں، چیختے چلاتے ہیں، سینہ کو پی کرتے ہیں، کپڑے پھاڑتے ہیں، فحاشیت اور تکلیف کے اظہار میں مبالغہ کرتے ہیں، اور مارے غم کے کھاتے، پینے، پھینے اور سونے میں اپنی عادت ترک کر دیتے ہیں وہ صابرین کے درجے میں شمار نہیں ہوتے۔ جب کہ یہ تمام اختیار کے تحت آتے ہیں، اس لئے صبر کرنے والے کہنے ان سب سے بچتا اور اللہ کے فیصلے پر راضی رہنا ضروری ہے، ہزار مصائب تو نہیں لیکن بندے کو اپنی عادات میں تبدیلی نہ کرنی چاہیے، اور یہ اعتقاد رکھنا چاہیے کہ جو نعمت اس سے سلب ہوئی ہے وہ اس کے پاس امانت کے طور پر تھی، جس نے یہ امانت رکھوائی تھی اس نے واپس لے لی، جیسا کہ ربیعہ ام سلیم سے مروی ہے کہ میرے ایک لڑکے کا انتقال اس حال میں ہوا کہ اس کے والد موجود نہیں تھے میں نے اسے گھر کے ایک گوشے میں لٹایا اور اس پر کپڑا ڈال دیا کچھ دیر بعد ابو طلحہ تشریف لائے، میں نے اٹھ کر ان کے لئے کھانا تیار کیا، اور ان کے سامنے

رکھا وہ کھانے لگے، اسی دوران انھوں نے لڑکے کے بارے میں دریافت کیا میں نے کہا الحمد للہ اچھے حال میں ہے یہ اس لئے کہا کہ جیسا سکون اسے اس رات میسر ہوا بیماری کے بعد اتنا سکون کبھی نہ ملا تھا، پھر میں نے اچھے کپڑے پہنے اور اپنے آپ کو خوب بنایا سنوارا، یہاں تک کہ وہ مجھ سے ہم بستر ہوئے، پھر میں نے ان سے کہا کہ ہمارے ہمسائے کو ایک چیز مانگنے سے ملی تھی، جب دینے والے نے وہ چیز اس سے واپس لے لی تو وہ شور مچانے لگا، انھوں نے کہا ہمسائے نے اچھا نہیں کیا، اسے ایسا نہ کرنا چاہیے تھا، اسکے بعد میں نے ان سے کہا کہ تمہارا بیٹا ہمارے پاس اللہ کی طرف سے امانت تھا، اس نے اپنی امانت واپس لے لی، انھوں نے اللہ کا شکر ادا کیا اور انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھا، صبح کو وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور پورا واقعہ عرض کیا، آپ نے فرمایا۔

اللَّهُمَّ بَارِكْ لَهُمَا فَنِي لَيْلَتِهِمَا (بخاری و مسلم۔ انس)

اے اللہ ان دونوں کو رات کے معاملے میں برکت دے۔

راوی کہتے ہیں اس دعا کا یہ اثر ہوا کہ اللہ نے انھیں سات لڑکے عطا کئے، جو سب کے سب قرآن کریم کے حافظ اور قاری ہوئے۔ حضرت جابر ابن عبد اللہ راوی ہیں کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا میں نے خود کو جنت میں دیکھا وہاں میری ملاقات ابو طلحہ کی بیوی ریمعہ سے ہوئی۔ بعض عارفین فرماتے ہیں کہ مہرِ جمیل یہ ہے کہ مصیبت والا دوسروں سے ممتاز نہ ہو، یعنی اسکے چہرے پر کوئی ایسی علامت نہ پائی جائے جس سے وہ مصیبت زدہ معلوم ہو۔

مردے پر رونا صبر کے خلاف نہیں : مردے پر آنسو بہانا یا دل کا غمزدہ ہونا صبر کے خلاف نہیں ہے، اس لئے کہ یہ بشریت کے تقاضے ہیں، انسان زندگی میں خود کو ان سے جدا نہیں کر سکتا، اسی لئے جب سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی وفات ہوئی تو آپ کی آنکھوں میں آنسو آگئے، صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! آپ تو ہمیں رونے سے منع کرتے ہیں، آپ نے جواب میں ارشاد فرمایا۔

إِنِّي هُنَا رَحِمًا مَوَاتًا يَزَحُمُ اللَّعْمُ عِبَادِيَ الرَّحِمَاءَ

یہ رحمت ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے رحم کرنے والوں پر رحم کرتا ہے۔

مرنے والے کے غم میں رونے سے آدمی مقامِ رضا سے بھی دور نہیں ہوتا، آدمی فصد کھلواتا ہے، بچنے لگواتا ہے، کیا وہ اس پر راضی نہیں ہوتا، یقیناً راضی ہوتا ہے اگرچہ تکلیف بھی محسوس کرتا ہے بلکہ اگر تکلیف زیادہ ہو تو رونے لگتا ہے، یہاں اس کے رونے کا یہ نتیجہ نکالا جائے کہ وہ خوشی سے فصد نہیں کھلوا رہا ہے۔ ہم اس کی مزید تحقیق کتاب الرضا میں کریں گے انشاء اللہ۔

ابنِ نجیح نے کسی خلیفہ کی موت پر تعزیتی خط میں لکھا جو شخص یہ بات جانتا ہے کہ جو چیز اللہ نے اس سے لی ہے وہ اس کا حق ہے وہ اس بات کا زیادہ مستحق ہے کہ جو چیز اللہ نے اسکے لئے باقی رکھی ہے اس میں اس کے حق کی عظمت کا احساس کرے، جان لو کہ جو تم سے پہلے چلا گیا ہے وہ تمہارے لئے باقی ہے، اور جو تمہارے بعد باقی ہے اسکو تمہارے ہاب میں (صبر کرنے کا) ثواب ملے گا، یہ بات بھی یاد رکھو کہ صابرین کو مصیبت پر صبر کرنے کا جو ثواب ملتا ہے وہ اس نعمت کی بہ نسبت زیادہ عمدہ اور اعلا ہے جو مصائب سے بچنے رہنے کی صورت میں انھیں حاصل ہوئی ہے۔

مصیبتوں کو چھپانا کمالِ صبر ہے : کمالِ صبر یہ ہے کہ آدمی اپنے مرض، تنگدستی اور دوسری تمام مصیبتیں پوشیدہ رکھے، ایک بزرگ کا قول ہے کہ مصائب، آلام اور صدقات کا اخفاء احسان کے خزانوں میں سے ایک قیمتی خزانہ ہے۔

صبر کی ان تقسیمات سے پتہ چلتا ہے کہ صبر تمام احوال اور افعال میں واجب ہے، جو شخص شہوات سے بچنے کے لئے گوشہ نشین ہو جائے، وہ صبر سے بے نیاز نہیں ہو سکتا، خواہ کتنا ہی تمنا کیوں نہ رہے اس لئے کہ شیطانی وسوسے قلب پر اثر انداز ہوتے ہیں،

وساوس کا غلبان تمنا میں بھی چین نہیں لینے دیتا، دل میں دو طرح کی باتیں آتی ہیں، یا تو ان چیزوں سے متعلق آتی ہیں جو فوت ہو چکی ہیں اور اب ان کا تدارک ممکن نہیں، یا ان چیزوں سے متعلق آتی ہیں جن کا مستقبل میں ملنا ممکن ہے، بشرطیکہ قسمت میں ہو، خیالات خواہ فوت شدہ چیزوں کے باب میں ہوں یا مستقبل میں حاصل ہونے والی چیزوں کے متعلق، دونوں صورتوں میں وقت ضائع ہوتا ہے، دل انسان کا آلہ ہے، اور عمر اسکی پونجی ہے، اگر اس کا دل ایک لمحے کے لئے بھی ذکر اور فکر سے غافل رہ گیا تو یہ بڑے خسارے کی بات ہے، ذکر سے مراد قلب کا وہ عمل ہے جس سے اللہ سے انسیت حاصل ہو، اور فکر سے مراد وہ عمل ہے جس کے ذریعے بندہ اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کرے، اور اس معرفت کو اللہ کی محبت کا وسیلہ بنائے اور یہ صورت بھی اس وقت ہے جب کہ قلب کے وساوس مباح امور میں ہوں، لیکن اکثر ایسا نہیں ہوتا، عام طور پر دلوں کے خیالات کا محور شہوات ہوتی ہیں، اور ان کی تکمیل کی تدبیریں سوچی جاتی ہیں، یہ شخص ہمیشہ ان لوگوں سے نزاع میں مبتلا رہتا ہے جو ایک مرتبہ بھی اسکے منشاء کے خلاف عمل کے مرتکب ہوئے ہوں یا اسے اس کا وہم ہو گیا ہو کہ وہ اسکے خلاف جاسکتے ہیں، بلکہ جو لوگ اسکے لئے انتہائی مخلص، جاں نثار اور فدا کی ہوتے ہیں، اور عمر بھر اسکی خوشنودی میں لگے رہتے ہیں، یہ شخص انھیں بھی اپنا مخالف فرض کر لیتا ہے، اور ایسی تدبیریں سوچتا ہے، جن سے انھیں زیر کر سکے، اور ان کے دلوں سے اختلاف کا خیال بھی مٹا سکے غرضیکہ مستقل یہی مشغلہ رہتا ہے، شب و روز اسی فکر میں گزرتے ہیں۔

شیطان کے دو لشکر : یہ سب شیطان کی کرشمہ سازیاں ہیں، دراصل شیطان کے دو لشکر ہیں ایک اڑنے والا لشکر، دوسرا چلنے والا لشکر، اڑنے والے لشکر سے مراد وساوس ہیں، اور چلنے والے لشکر سے مراد شہوات ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ شیطان کی تخلیق آگ سے ہوئی ہے، اور انسان تکلفاتی ہوئی مٹی سے پیدا کیا گیا ہے، اس مٹی میں آگ بھی ہے، مٹی کی طبیعت میں سکون ہے، اور آگ کی سرشت میں حرکت۔ چنانچہ بھڑکتی ہوئی آگ کے بارے میں یہ تصور نہیں کیا جاسکتا کہ وہ حرکت نہیں کرے گی بلکہ وہ اپنی سرشت کے مطابق مسلسل حرکت میں رہتی ہے، شیطان ملعون کو جو آگ سے پیدا کیا گیا ہے، یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ سکون پر رہے اور اپنی اور اس مخلوق کو سجدہ کرے جسے اللہ نے مٹی سے پیدا کیا ہے، لیکن اس نے یہ حکم ماننے سے انکار کر دیا، تکبر کیا، نافرمانی کی، اور اپنی حکم عدولی کی یہ توجیہ بیان کی کہ میں آگ سے پیدا کیا گیا ہوں، اور انسان مٹی سے پیدا کیا گیا ہے چنانچہ جب اس خبیث نے ہمارے جد امجد حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ نہیں کیا تو وہ انکی اولاد کو کیسے سجدہ کرے گا اولاد کو سجدہ کرنے سے مقصود یہی ہے کہ انکے دلوں میں جو وساوس پیدا کرتا ہے ان سے باز رہے، اگر شیطان اپنی حرکتوں سے باز رہا تو گویا وہ انسان کا مطیع اور تابع بنا کہ اس نے اس کے خوف سے وہ حرکتیں چھوڑ دیں، سجدے کی روح بھی اطاعت اور انقیاد ہی ہے، زمین پر پیشانی رکھنا تو اس کا جسم ہے، زمین پر پیشانی رکھنے کے عمل کو اصطلاحاً سجدہ کہا جاتا ہے، اگر یہ عمل تحقیق و تدبیر کے لئے بطور استعمال وضع ہوتا تو اسی کا تصور ہوتا، چنانچہ کسی محترم شخصیت کے سامنے منہ کے بل گر پڑنے کو عاداً گستاخی تصور کیا جاتا ہے۔

بہر حال ہمیں صدف موتی سے، قالب روح سے اور چمکا مغز سے غافل نہ کرے، اس کا خیال رہنا ضروری ہے، ایسا نہ ہو کہ تم صرف عالم ظاہر میں مقید ہو کر رہ جاؤ، اور عالم غیب سے غفلت برتنے لگو۔ تم یہ بات جانتے ہو کہ شیطان تمہارا ازلی دشمن ہے، اسے ہمیں گمراہ کرنے کی مہلت دی گئی ہے، اب قیامت تک یہ تصور نہیں کیا جاسکتا کہ وہ تمہاری اطاعت قبول کرے گا، یا تمہارے دل میں وسوسہ پیدا کرنے سے باز رہے گا، الّا یہ کہ تمہارے تمام افکار کا مرکزی نقطہ ایک ہو، اور تم ہمہ تن اللہ کی فکر میں مشغول ہوں، اس صورت میں یقیناً یہ شیطان ملعون تم تک پہنچنے کا کوئی راستہ نہ پائے گا، اور تم اللہ کے ان بندوں میں شامل ہو جاؤ گے جو مخلص ہیں، اور اس ملعون کی سلطنت سے باہر ہیں، یہ ممکن نہیں کہ تمہارے دل میں فکر الہی بھی نہ ہو، اور شیطانی وسوسے بھی نہ ہوں، یہ شیطان ایک سیال عنصر ہے، انسان کی رگوں میں اس طرح گردش کرتا ہے جس طرح خون گردش کرتا ہے، یہ ایسا ہے جیسے پیالے میں کوئی رقیق چیز بھری ہوئی ہو، اب اگر کوئی یہ چاہے کہ پیالے میں یہ سیال بھی باقی رہے اور ہوا بھی رہے تو یہ ممکن نہیں، یا یہ کہ پیالے میں

ہوا بھی نہ بھری جائے اور یہ سیال مادہ بھی نہ ہو، بظاہر یہ بھی ممکن نہیں بلکہ جس قدر یہاں لے میں سیال چیز کم ہوگی اسی قدر اس میں ہوا بھر جائے گی۔ یہی حال دل کا ہے، اگر وہ کسی عمدہ فکر سے بھرا ہوا ہوگا تو شیطان کی مداخلت سے محفوظ رہے گا ورنہ جس قدر غافل ہوگا اسی قدر شیطان بھی مداخلت کرے گا، یہاں تک کہ اگر ایک لمحے کے لئے بھی غافل ہوا تو غفلت کے اس لمحے میں شیطان کے علاوہ اس کا کوئی جلیس نہ ہوگا چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وَمَنْ يَغْتَسِبْ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمَنِ نَقِيضٌ لِّشَيْطَانٍ أَفْهَوْ لَمَقَرِّنْ (پ ۲۵ ر ۱۰ آیت ۳۶)
اور جو شخص اللہ کی نصیحت سے اندھا بن جائے ہم اس پر ایک شیطان مسلط کر دیتے ہیں۔ سورہ (ہرقت)

اسکے ساتھ رہتا ہے۔

سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں :-
إِنَّ اللَّهَ تَعَالَى يُبْغِضُ الشَّابَّ الْفَارِغَ (۱)
اللہ تعالیٰ خالی نوجوان کو ناپسند کرتا ہے۔

خالی نوجوان کو ناپسند کرنے کی وجہ یہ ہے کہ جب وہ کوئی ایسا کام نہ کرے گا جس سے اس کا دل کسی امرِ مباح میں مشغول ہو یا کسی دینی فکر میں منہمک ہو تو بظاہر وہ خالی نظر آئے گا، لیکن فی الحقیقت اسکے دل میں شیطان اپنا آشیانہ بنائے ہوئے ہوگا، اور اس میں اپنی نسل بڑھانے کے درپے ہوگا۔ تمام حیوانات کے مقابلے میں شیطان کی نسل سب سے زیادہ بڑھتی ہے کیوں کہ اس کی سرشت میں آگ ہے اور آگ کے سامنے اگر کوئی سوکھی چیز آجائے تو وہ رکنے کا نام نہیں لیتی، بلکہ تیزی سے بڑھتی چلی جاتی ہے، نوجوان آدمی کے دل میں شہوت کا وجود ایسا ہی ہے جیسے آگ کے سامنے سوکھی ہوئی گھاس آجائے۔ پھر جس طرح آگ کی غذا (لکڑی) نہ رہنے سے آگ خاموش ہو جاتی ہے، اسی طرح اگر شہوت باقی نہ رہے تو شیطان کو دم مارنے کی بھی مجال نہیں ہوتی، اور وہ اپنا آشیانہ خود اپنے ہاتھوں سے جلائے پر مجبور ہو جاتا ہے، اگر تم غور کرو تو یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ تمہارا بدترین دشمن خود تمہارے دل کا وہ وصف ہے جسے تم شہوت کہتے ہو۔ حسین ابن منصور علاج کو جس وقت سولی پر چڑھایا جا رہا تھا اس وقت ان سے کسی نے تصوف کے بارے میں سوال کیا، آپ نے فرمایا تصوف خود تمہارا افس ہے اگر وہ کسی نوجوان میں مشغول نہ ہو۔

صبر کی دوا اور اس پر اعانت کی صورت

جاننا چاہیے کہ جس نے بیماری دی ہے اس نے دوا بھی بتلائی ہے، اور شفا کا وعدہ بھی کیا ہے، مگر اگرچہ نہایت دشوار اور مشکل عمل ہے، لیکن قلم و عمل کے معجون کے ذریعے اس کا حصول ممکن ہے، علم و عمل ہی دوا ایسی مفود دوائیں ہیں جن سے قلوب کے تمام امراض کی دوائیں تیار کی جاتی ہیں لیکن ہر مرض کے لئے یکساں علم و عمل مفید نہیں ہے، بلکہ جیسا مرض ہوگا ویسے ہی علم اور عمل کی ضرورت پیش آئے گی۔

مانع صبر اسباب : جس طرح صبر کی شہد اور مختلف قسمیں ہیں، اسی طرح وہ ملتیں اور اسباب بھی مختلف اور متعدد ہیں، جو صبر کے لئے مانع ہیں، اس لئے علاج بھی مختلف ہے، کیونکہ ہر صبر کا علاج اس کی ضد سے کیا جاتا ہے، اور کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ سبب ہی باقی نہ رہے جو اس بیماری کا باعث بنا ہے، ہم صبر کی تمام قسموں کے اسباب اور ان کے اضداد کا تجزیہ تو نہیں کر سکتے لیکن بعض مثالوں میں طریقہ علاج کی نشاندہی کئے دیتے ہیں، مثلاً ایک شخص شہوتِ زنا سے صبر کا خواہاں ہے، لیکن اسے اپنی شرمگاہ پر قابو نہیں ہے، یا شرمگاہ پر قابو ہے لیکن آنکھ پر اختیار نہیں ہے، یا آنکھ پر قابو ہے لیکن دل پر قابو نہیں ہے، ہر وقت شہوتوں کی جولان گاہ

بناتا ہے، اور اسے ذکر و فکر اور نیک اعمال پر مواصلت سے باز رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ ایک مرض ہے، اس کے علاج کی تفصیل یہ ہے جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں کہ صبر باعث دین اور باعث ہوی کے گمراہ کا نام ہے، اگر ہم ان دونوں سے کسی ایک کو غالب دیکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں اسکو تقویت دینی ہوگی تاکہ وہ غالب آسکے، اور دوسرے کو کمزور کرنا ہوگا تاکہ وہ مغلوب ہو سکے، پیش نظر معاملے میں ہم یہ چاہیں گے کہ باعث دین غالب ہو، اور باعث شہوت کمزور پڑے۔

باعث شہوت کس طرح کمزور ہو : باعث شہوت کو کمزور بنانے کی تین صورتیں ہیں، ایک تو یہ کہ اسکی قوت اصلی کا جائزہ لیں، اور یہ دیکھیں کہ اسے کہاں سے قوت ملتی ہے، غور کیا جائے تو یہ معلوم ہوگا کہ شہوت کو عمدہ غذاؤں سے تقویت حاصل ہوتی ہے اس کا علاج یہ ہے کہ مسلسل روزے رکھے جائیں، اور اظہار کے وقت ایسی غذا معمولی مقدار میں کھائی جائے جس سے شہوت کو تحریک نہ ہو، مثلاً گوشت وغیرہ استعمال نہ کیا جائے، دوسری صورت یہ ہے کہ وہ اسباب ترک کئے جائیں جن سے شہوت میں فوری طور پر بھان بھان ہوتا ہے، شہوت میں بھان بھان نظر کے باعث ہوتا ہے، نظر قلب کو حرکت دیتی ہے، اور قلب شہوت کو تحریک دیتا ہے، اس لئے سب سے پہلے نظر کے امکانات کو معدوم کرنا ہے، اور اسکی شکل یہ ہے کہ تھائی اختیار کی جائے، اور ان مواقع سے دور رہا جائے جہاں خوبصورت چہروں پر نظر پڑنے کا موقع ہو، سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

النَّظَرُ سَهْمٌ مَسْمُومٌ مِّنْ سِهَامِ ابْلِیْسَ (۱)

نظر ابلیس کے تیروں میں سے ایک زہریلا تیر ہے۔

شیطان یہ تیر کچھ اس طرح پھینکتا ہے کہ نشانہ خطا نہیں ہوتا، اس کی کوئی ڈھال بھی نہیں کہ تیروں کی پورش اس پر روکی جاسکے، لہذا یہ کہ آنکھیں بند کر لی جائیں، یا اس کے نشانے سے ہٹ کر کھڑا ہوا جائے۔ شیطان یہ تیر خوبصورت چہروں کے چشمِ ابرو کے ذریعے برساتا ہے، اگر آدمی حسین چہروں کی زد سے نکل جائے تو ان زہریلے تیروں سے محفوظ رہ سکے گا۔ تیسری صورت یہ ہے کہ شہوت کی تسکین کے لیے مباح طریقے اختیار کئے جائیں، زنا سے بچنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ نکاح کر لیا جائے، اور اس طرح نفس کو تسلی دی جائے، اس لئے کہ جس چیز کی نفس کو خواہش ہے وہ مباح میں موجود ہے، پھر منہج و وسائل اختیار کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ اکثر لوگوں کے حق میں یہی مفید ترین طریقہ علاج ہے، اس لئے کہ عمدہ غذاؤں سے بچے جاتے اور باقی غذاؤں میں کمی سے صحت متاثر ہوگی، اور باقی اعمال میں بھی سستی کو راہ ملے گی۔ اسکے باوجود بعض مردوں سے شہوت کئی طور پر ختم نہیں ہوتی، اسی لئے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

عَلَيْكُمْ بِالْبَاقِئَاتِ لَمْ يَسْتَطِعْ فَعَلَيْهِمِ الصَّوْمُ، فَإِنَّ الصَّوْمَ لَمَوْجَادٌ (۲)

اپنے آپ کو نکاح کو لازم نہ کہو، جس کو نکاح کی استطاعت نہ ہو اس پر روزے رکھنا ضروری ہیں روزہ رکھنا

اس کے حق میں خفی ہو جاتا ہے۔

یہ تین اسباب علاج ہیں، پہلے علاج یعنی غذا کا سلسلہ منقطع کرنے کی مثال ایسی ہے جیسے سرخس جانور یا کٹ کٹے کتے کی غذا موقوف کر دی جائے تاکہ وہ کمزور ہو جائیں، اور اگلی طاقت زائل ہو جائے دوسرے علاج کی مثال ایسی ہے جیسے کتے کے سامنے سے گوشت اور جانور کے سامنے سے گھاس وغیرہ ہٹا لی جائے تاکہ گوشت دیکھ کر کتے اور گھاس دیکھ کر جانور کے باطن میں تحریک نہ ہو، اور تیسرے کی مثال ایسی ہے جیسے کتے کو کوئی ایسی چیز دے کر تسلی دینے کی کوشش کی جائے جس کی طرف اس کے طبیعت کا میلان ہو تاکہ اتنی قوت اس میں باقی رہ جائے، جس کے ذریعے وہ تائب و مبرا ہو سکے۔

باعث دین کی تقویت : یہ گفتگو باعث شہوت کو کمزور کرنے کے باب میں تھی۔ اب ہم باعث دین کی تقویت کو موضوع گفتگو

(۱) یہ حدیث کی بارگزر ہوئی ہے (۲) یہ حدیث کتاب النکاح میں گزری ہے

بناتے ہیں باعث دین دو طریقوں سے مضبوط ہو سکتا ہے، ایک تو یہ کہ نفس کو مجاہدے کے فوائد اور دین و دنیا میں اسکے ثمرات کی ترغیب دی جائے، اور ترغیب دینے کی صورت یہ ہے کہ صبر کی فضیلت میں جو روایات وارد ہیں، اور دین و دنیا میں اس کے انجام کی خوبی کے متعلق جو کچھ ہم نے لکھا ہے انہیں زیادہ سے زیادہ غور و فکر کرے، روایت میں ہے کہ مصیبت کا ثواب فوت شدہ چیز سے زیادہ ہے، یہی وجہ ہے کہ ایسی مصیبتوں پر ایجاب بصیرت غبطہ کرتے ہیں۔ اس لئے کہ مصیبت زندہ کے پاس سے ایسی چیز گئی ہے جو آج نہیں توکل ضرور جاتی، وہ ہمیشہ رہنے والی نہیں تھی، لیکن اس کے عوض اسے وہ چیز حاصل ہوئی جو موت کے بعد بھی ابد الابد تک اسکے ساتھ رہے گی۔ اسکی مثال ایسی ہے جیسے کوئی خراب چیز دے کر بیچ سلم کرے اور عوض میں بہترین چیز لینے کی شرط لگائے ظاہر ہے اسے اس خراب شے پر افسوس نہ کرنا چاہیے۔ اس کا تعلق معرفت سے ہے، اور معرفت ایمان کی قبیل سے ہے، یہی یہ معرفت ضعیف ہوتی ہے، اور کبھی قوی، اگر قوی ہو تو باعث دین بھی قوی ہوتا ہے اور اس میں زبردست ایمان پیدا ہو جاتا ہے، اور اگر کمزور ہو تو باعث دین بھی کمزور ہوتا ہے، اس معرفت یعنی قوت ایمان کا نام یقین بھی ہے، یہ یقین عزیمت صبر کا محرک ہے، لیکن لوگوں میں بہت کم ایسے ہیں جنہیں یقین اور صبر کی عزیمتیں عطا کی گئی ہیں۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ باعث دین کو باعث ہو ہی پر بند ریج غالب لانے کی کوشش کرے، اور آہستہ آہستہ اس مقابلے کا عادی بنائے، یہاں تک کہ جب فتح کی لذت سے ہم کنار ہو تو دفعہ جری ہو کر اس پر غلبہ حاصل کرے، اس طرح غلبہ پانا کوئی مشکل کام نہیں ہے، محنت طلب کاموں کی عادت اور مشق سے وہ اعضاء مضبوط ہو جاتے ہیں جن سے وہ اعمال صادر ہوں، یہی وجہ ہے کہ بوجہ اٹھانے والوں، کاشتکاروں اور سپاہیوں میں قوت زیادہ ہوتی ہے، نیز جسمانی محنت کا کام کرنے والوں کی طاقت درزیوں، عطر فروشوں، قتیوں اور صوفیوں سے زیادہ ہوتی ہے، ان کے قوی مشق اور عادت نہ ہونے سے کمزور رہتے ہیں۔

ان دونوں طریقے ہائے علاج میں سے پہلے طریقے کی مثال ایسی ہے جیسے پہلوان کو کشتی لڑنے پر یہ کہہ کر آمادہ کیا جائے کہ کامیابی کی صورت میں تمہیں غلعت قاعدہ سے نوازا جائے گا، اور تمہارا نامیات اعزاء و اکرام کیا جائے گا، جیسے فرعون نے جادو گروں سے کہا تھا کہ اگر تم نے موسیٰ کو شکست دیدی تو میں تمہیں اپنا مقرب بنالوں گا۔ دوسرے طریقے کی مثال ایسی ہے جیسے کسی ایسے لڑکے کو جسے پہلوان یا سپاہی بنانا مقصود ہو فہم سپہ گری کی تعلیم دی جائے، اور پہلوانی کے داؤچ سکھائے جائیں، یہاں تک کہ وہ ان فنون سے مانوس ہو جائے اور اسکی قوت و جرأت میں بکین ہی سے اضافہ ہوتا رہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ جو شخص بالکل ہی صبر کی طاقت نہ رکھے، اور ذرا بھی مجاہدہ نہ کرے اس میں باعث دین کمزور پڑ جاتا ہے، یہاں تک کہ وہ ضعیف شہوت پر غلبہ نہیں پاسکتا۔ اور جو شخص اپنے نفس کو شہوت کی مخالفت کا عادی بنالیتا ہے، وہ جب چاہتا ہے شہوت پر غالب آجاتا ہے۔ یہ ہے صبر کی مختلف قسموں میں علاج کا طریقہ، کار۔ ان تمام قسموں کا لحاظ بہت مشکل ہے، ان سب میں دشوار ترین قسم باطن کو مدد عث نفس سے روکنا ہے، خاص طور پر ایسے شخص کے لئے جو تمام شہوات ترک کر کے عریض ہو جائے، اور ذکر و فکر کے مراتب میں مشغول ہو جائے، ایسے شخص کو دس او ستر سے اوپر کچھ بھرتے ہیں، بظاہر اسکا کوئی علاج نہیں، الا یہ کہ اللہ و محال، مال جاہ و دوست اور احباب سے راہ فرار اختیار کر کے تمام ظاہری اور باطنی رنجے منقطع کر لئے جائیں، اور فدا کی معمولی مقدار پر قناعت کر کے کسی گوشہ عسائی کو اپنا مکان بنالیا جائے، لیکن اس طریقے سے اسی وقت فائدہ ہو گا جب تمام افکار کا محور ایک ہو، یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات، پھر قلب پر فکر الہی کا لہجہ بھی کافی نہیں ہے، جب تک وہ آسمان و زمین کے ملکوت، اللہ تعالیٰ کے عجائب صفت، اور اسکے معارف کو اپنے فکر کی جولان گاہ اور باطن کی سیر گاہ نہ بنائے، اس صورت میں یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ شیطان رسد کئی سے باز آجائے، اور آدمی کے دل کو دس او ستر کا افکار نہ کرے، اگر سیر باطن کی صلاحیت نہیں تو نہایت کی صورت، بجز اسکے کوئی نہیں کہ اور او دو خاکف پر مداومت کرے، یعنی بہادری کا کوئی لمحہ ایسا نہ گزرنے دے جس میں ناز یا ملاوت، یا کوئی ذکر نہ ہو، اور اوراد و خاکف میں صرف زبان کی حرکت کافی نہیں ہے، بلکہ دل کو مختلف حاضر کرنا بھی ضروری ہے، اس منصوبہ پر طریقے کے بعد عام طور سلاطین قلب کی امید کی جاسکتی ہے، البتہ بعض اوقات کا فکر

جائے گا۔ اس لئے کہ بعض اوقات ایسے ہو سکتے ہیں جن میں ذکر و فکر سے مانع حادثات پیش آئیں گے، مثلاً خوف، مرض، کسی انسان کی طرف سے پہنچنے والی ایذا یا جن لوگوں سے تنہائی کے باوجود اسباب معیشت میں سابقہ پڑے انکی سرکشی یا نافرمانی، یہ وہ تمام اسباب ہیں جن سے قلب کی مشغولیت متاثر ہو سکتی ہے۔

انکے علاوہ بھی بعض اور مانع بن سکتے ہیں، مثلاً کھانا، پینا، پہننا اور معیشت کے وسائل اختیار کرنا، ظاہر ہے معاش کے لئے بھی وقت کی ضرورت ہے بشرطیکہ اپنی معاش کا خود کفیل ہو، لیکن کوئی دو سرافض کفیل ہو تو ہو سکتا ہے معاش کے مسائل سے فارغ رہے، لیکن لباس اور طعام کے لئے وقت لگانے پر ضرور مجبور ہوگا۔ اس طرح یہ امور بھی قلب کے اشتغال میں رکاوٹ کا باعث بنیں گے، لیکن امید یہ ہے کہ تمام دنیاوی علائق منقطع کرنے کے بعد آدمی اکثر اوقات سلامت رہ سکتا ہے، بشرطیکہ کوئی حادثہ پیش نہ آئے، یا مصیبت نازل نہ ہو، ان اوقات میں دل صاف رہتا ہے، اور فکر آسان ہو جاتا ہے، آسمان و زمین کے ملکوتی اسرار اس قدر منکشف ہوتے ہیں کہ اس شخص کے دل پر افکاد سواں حصہ بھی منکشف نہیں ہوتا، جو علائق میں گرفتار ہو، عارف کا اس مرتبے پر پہنچنا ممکن ہے، یہ انتہائی مرتبہ ہے انسان اپنی کوشش سے یہ مرتبہ حاصل کر سکتا ہے، جہاں تک قلب کے تصفیئے اور اس پر اسرار الہی کے انکشاف کا معاملہ ہے وہ تقدیر پر منحصر ہے، اسکی مثال ایسی ہے جیسے شکار اور رزق کہ جتنا جس کی قسمت میں ہوتا ہے اسی قدر ملتا ہے۔ بعض اوقات ذرا سی محنت سے بہت سا شکار ہاتھ آ جاتا ہے، اور کبھی دن بھر کی محنت کے بعد تھوڑا سا شکار ملتا ہے۔ اس میں بندے کے اختیار کو کچھ دخل نہیں، یہ تمام معاملات اللہ کے ہاتھ میں ہیں اور تمام دعوہ دار کشش الہی پر ہے، البتہ بندے کے اختیار میں یہ ہے کہ اس کشش کے لئے جدوجہد کرتا رہے، اس طرح کہ ان تمام باتوں سے دل کا تعلق منقطع کر لے جو دنیا کی طرف کھینچتے ہیں، اوپر کی طرف کشش اسی وقت ہوگی جب نیچے کی کشش منقطع ہو جائے گی، اس حدیث شریف میں انہی دنیاوی علائق کو قطع کرنے کا حکم وارد ہے فرمایا:

إِنَّ لِرَبِّكُمْ فِي أَيَّامٍ مَّذْهَرٍ كَمْ نَفَحَاتٍ لَا تَفْتَعَرُ صُؤَالَهَا (۱)

تمہارے رب کے تمہارے زمانہ کے دنوں میں نغمات ہیں، یاد رکھو تم ان نغمات کے سامنے ہو جاؤ۔

اسکی وجہ یہ ہے کہ ان نغمات الہیہ اور جذبات خاقیہ کے آسمانی اسباب ہیں، چنانچہ ارشاد ربانی ہے:

وَفِي السَّمَاءِ عِزٌّ قَكُمُ مَا تَوْعَلُونَ (پ ۳۱، آیت ۲۲)

اور تمہارا رزق اور جو تم سے وعدہ کیا جاتا ہے (ان) سب کا (محین وقت) آسمان میں ہے۔

معرفت سے زیادہ اعلیٰ اور افضل کو نسا رزق ہو سکتا ہے۔ جہاں تک آسمانی اسباب کا معاملہ ہے یہ ہماری نگاہوں سے پوشیدہ ہیں، ہمیں نہیں معلوم کہ اللہ تعالیٰ کس وقت ہمارے لئے رزق کے اسباب آسان کرے گا۔ اس لئے ہمارے لئے انکے علاوہ کوئی چارہ نہیں کہ جگہ خالی رکھ کر نزول رحمت کا انتظار کریں، اور اس وقت محین کے فطر رہیں، جس میں رحمت الہی کا نزول ہوتا ہے، اس کی مثال کسان کی سی ہے، کسان زمین ہموار کرتا ہے، اس میں بیج ڈالتا ہے، اسے کھا دیتا ہے، حالانکہ وہ جانتا ہے کہ اسکی تمام محنت رائیگاں جائے گی اگر بارش نہ ہوگی، وہ یہ بھی نہیں جانتا کہ بارش کب ہوگی، لیکن اسے اللہ کی رحمت پر اعتماد ہوتا ہے، وہ یہ دیکھتا ہے کہ کوئی برس بھی باران رحمت سے خالی نہیں گیا، اس توقع پر وہ سخت سے سخت محنت کرتا ہے، اسی طرح کوئی سال، کوئی مہینہ، بلکہ کوئی دن بھی ایسا نہیں گزر تا جو جذبہ الہی اور نفوذ رحمانی سے خالی ہو، اس لئے بندے کو چاہیے کہ وہ اپنے قلب کی زمین کو شہوات کی خود رو گھاس سے صاف کرے، اس میں ارادت و اخلاص کے بیج ڈالے، اور باران رحمت کا انتظار کرے، خاص طور پر جو بہترین اوقات ہوں، ان میں ضرور انتظار کرے اور یہ توقع کرے کہ میرے دل کی زمین پر نغمات الہیہ کی ہوائیں چلیں گی، اور جذبات الہیہ کی بارشیں ہوں گی، جس طرح کسان آسمان کو ابر آلود دیکھ کر بارش کی توقع کیا کرتا ہے، یا موسم برسات میں اسے بارش کی امید رہتی ہے، بہترین اوقات سے ہماری مراد جمعہ یا عرفہ یا رمضان وغیرہ کے مبارک ایام ہیں۔ ان ایام میں قبولیت کی ساتتیں پوشیدہ ہیں، اور ان

میں ہمتیں جمع ہوتی ہیں اور قلوب ایک دوسرے کی مسامتہ کرتے ہیں، ہمتیں اور اغناس بھی رحمت اللہ کے نزول کے اسباب ہیں، ان کے طویل قطب سالی کے زمانے میں بارش نازل ہوتی ہے، جب ان کے حوالے سے پہاڑوں اور سمندروں کے اطراف و جوانب سے گھٹائیں اٹھنے اور برسنے کی دعائیں ہو سکتی ہیں، تو ملکوت کے خزانوں سے مکاشفات اور معارف کی بارش کی دعائیں نہیں کی جاسکتی بلکہ یہ وہ جلد قبول ہو سکتی ہے اس لئے کہ گھٹائیں تو سمندروں سے اٹھیں گی اور پہاڑوں سے ٹکرا کر برسیں گی، احوال اور معارف کے خزانے تو خود ہمارے دل میں موجود ہیں، یہ اور بات ہے کہ دنیاوی تعلقات اور شہوات کی وجہ سے ان پر حجاب پڑ گیا ہو۔ اس لئے اب آدمی کے کرنے کا کام صرف یہ ہے کہ وہ حجاب دور کر دے تاکہ معارف کے انوار روشن ہو جائیں۔ ظاہر ہے زمین کھود کر پانی نکالنا زیادہ سہل ہے بہ نسبت اسکے کہ کسی دور دراز جگہ سے پانی اس میں لا کر ڈالا جائے۔

یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ معارف ایمانی ہر وقت دل میں موجود رہتے ہیں، انسان انھیں بھولا ہوا ہے، یا ان کی طرف سے لاپرواہ ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں متعدد جگہوں پر لفظ تذکر استعمال فرمایا ہے، اور اس امر کی طرف اشارہ کیا کہ ان معارف کو یاد کیا جائے، اور ان سے لاپرواہی نہ برتی جائے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

وَلْيَتَذَكَّرْ أُولَٰئِكَ الْكِتَابَ (پ ۱۳۳ آیت ۵۲)

اور تاکہ دانشمند لوگ نصیحت حاصل کریں۔

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُدَكِّرٍ (پ ۸۲ آیت ۱۷)

اور ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لئے آسان کر دیا ہے، سو کیا کوئی نصیحت حاصل کرنے والا ہے۔

یہ ہے وسوس کے علاج کی تفصیل، یہ درجہ مبر کا انتہائی درجہ ہے، اور تمام علاقے سے مبر کرنا خواطر اور وسوس پر مبر کرنے سے مقدم ہے۔ حضرت جنیدؒ فرماتے ہیں کہ دنیا سے آخرت کی طرف چلنا مومن کے لئے آسان ہے، اور حق کی محبت میں مخلوق سے جدائی اختیار کرنا دشوار ہے، نفس سے فرار اختیار کر کے اللہ کی طرف جانا بھی کچھ کم سخت نہیں ہے، لیکن سب سے زیادہ سخت اور دشوار امر یہ ہے کہ آدمی اللہ کے ساتھ مبر کرے۔ حضرت جنیدؒ نے اولاً اس مبر کی شدت کا ذکر کیا جو دل کے شواغل ترک کرنے کی صورت میں کیا جاتا ہے۔ اسکے بعد مخلوق سے ترک تعلق کی شدت بیان فرمائی۔

ربوبیت مطلوب ہے : نفس کو سب سے زیادہ تعلق خلق اور جاہ سے ہوتا ہے، اقتدار، غلبہ، حاکمیت اور بالائری میں جودلت ہے وہ دنیا کی کسی چیز میں نہیں ہے، اچھے اچھے عقلمند اس لذت کے اسیر ہیں، اور ان کے نزدیک اس سے بڑھ کر کوئی دوسری لذت نہیں ہے اور یہ اعلیٰ ترین لذت کیوں نہ ہو جب کہ یہ اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ایک صفت ہے یعنی ربوبیت، اور قلب کو یہ صفت اس لئے محبوب ہے کہ اس میں امور ربوبیت کی مناسبت پائی جاتی ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے ۔

فَلِلرَّوْحِ مِنْ أَمْرِ رَبِّي (پ ۱۵۵ آیت ۸۵)

آپ فرماتے تھے کہ روح میرے رب کے حکم سے بنی ہے۔

قلب کے لئے ربوبیت کی محبت معیوب نہیں ہے، بلکہ اسکی ذمہ داری وجہ محض شیطان ہے، کیونکہ شیطان اسے عالم امر سے دور کرتا ہے، اسے فریب دیتا ہے، اور اسے اس کے اصل راستے سے ہٹاتا ہے، شیطان کے حسد کی وجہ ظاہر ہے، اسے یہ گوارا نہیں کہ آدمی کا دل عالم امر سے ہوا، اسی لئے اسے گمراہ کرنے کے ورپے ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ طلب ربوبیت مذموم نہیں ہے، بلکہ یہ تو عین سعادت ہے، کیونکہ اس طرح وہ ربوبیت کا طلبگار بن کر آخرت کی سعادتوں کا خواہاں ہے، یعنی ایسی بات چاہتا ہے جس میں فنا نہیں، ایسی عزت چاہتا ہے جس میں نقص نہیں، ایسا امن چاہتا ہے جس میں کوئی خوف نہیں، ایسی مالداری چاہتا ہے جس میں فقر نہیں، ایسا کمال چاہتا ہے جس میں نقص نہیں، یہ تمام اوصاف ربوبیت کے اوصاف ہیں، اور ان کا طلب کرنا مذموم نہیں ہے، بلکہ ہر بندے کو اس کا حق ہے کہ وہ اپنے لئے لامحدود سلطنت چاہے، اور جو ملک طلب کرتا ہے، وہ سرملندی، عزت اور کمال کا طالب پہلے ہوتا ہے۔

لیکن یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ ملک دو قسم کے ہیں۔ ایک ملک وہ ہے جو طرح طرح کی معیتوں سے گمراہ ہوا ہے، اور بہت جلد حاصل ہو جاتا ہے، اور بہت جلد فنا ہو جاتا ہے، یہ ملک دنیا میں ہے، اور ایک ملک وہ ہے جو ہمیشہ رہنے والا ہے، اس میں نہ کوئی رنج ہے، اور نہ مصیبت ہے، نہ کوئی غصہ اس ملک پر حملہ آور ہو سکتا ہے، اور نہ اسے تباہ و برباد کر سکتا ہے، لیکن یہ ملک جلد ہاتھ آنے والا نہیں۔ یہ ملک آخرت میں ہے۔ لیکن کیونکہ انسان فطرتاً جلد باز ہوتا ہے اس لئے وہ حال کو مال پر ترجیح دیتا ہے۔ شیطان اسکی فطرت کے اس پہلو سے آشنا ہے۔ اس لئے اس نے اس کا رخ ملک دنیا کی طرف موڑ دیا۔ اس دنیا کو اس کے لئے آراستہ کیا، آخرت کے مالک بھی بن سکتے ہیں، یہ مغالطہ شیطان نے اسے احمق سمجھتے ہوئے دیا، چنانچہ حدیث شریف میں ہے۔

وَالْأَحْمَقُ مَنْ أَنْبَعَ نَفْسَهُ هَؤُلَاءِ وَتَمَنَّى عَلَى اللَّهِ (۱)

احمق وہ ہے جو اپنے نفس کو اسکی خواہش کا تابع کر دے اور اللہ تعالیٰ پر تمنا کرے۔

جس کی قسمت میں ذلت اور رسوائی لکھ دی گئی ہے وہ شیطان کے فریب میں آکر دنیا کی عزت و سلطنت کا طالب بن جاتا ہے، اور اسکے حصول میں ہمہ تن مشغول ہو جاتا ہے، لیکن جس کے حصے میں توفیق ارزانی ہے وہ اس فریب کا شکار نہیں ہوتا، حال کی سلطنت سے روگردانی کرتا ہے اور مال کی سلطنت کے حصول میں مشغول رہتا ہے۔ پہلی قسم کے لوگوں کا حال قرآن کریم میں اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

كَلَّا بَلْ تُحِبُّونَ الْعَاجِلَاتِ تَذَرُونَ الْآخِرَةَ (پ ۲۹، آیت ۲۴۲۰)

ہرگز ایسا نہیں بلکہ (صرف بات یہ ہے) تم دنیا سے محبت رکھتے ہو اور آخرت چھوڑ بیٹھے ہو۔

إِنْ هُوَ إِلَّا يُجِتُّونَ الْعَاجِلَاتِ تَذَرُونَ الْآخِرَةَ (پ ۲۹، آیت ۲۷)

یہ لوگ دنیا سے محبت رکھتے ہیں اور اپنے آگے (آئے والے) ایک ہماری دن کو چھوڑ بیٹھے ہیں۔

فَاعْرِضْ عَنْ نَوْلِي عَنِ ذِكْرِ نَاوَلَمْ يَرِ إِلَّا الْحَيَاةَ الدُّنْيَا ذَلِكُمْ مَبْلَغُهُمْ مِنَ الْعِلْمِ (پ ۲، آیت ۳۰، ۳۱)

تو آپ ایسے غصے سے اپنا خیال ہٹائیے جو ہماری سمیت کا خیال نہ کرے اور مجرئیوی زندگی کے اساکوئی مقصود نہ ہو ان لوگوں کی قسم کی رسائی کی حد بس یہی ہے۔

جب شیطان کا مکر تمام مخلوق میں پھیل گیا اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام کے پاس فرشتے بھیجے، اور انھیں دشمن کو ہلاک کرنے کے طریقے سے آگاہ کیا، چنانچہ انبیاء کرام مخلوق کو ملک مجازی سے ملک حقیقی کی طرف ہلاتے ہیں، اور اسے اس حقیقت سے آگاہ کرتے ہیں کہ ملک مجازی کی کوئی اصل نہیں ہے، نہ اسے دوام ہے نہ ہٹا، یہ ایک ٹاپا نادر اور قافی ملک ہے، چنانچہ وہ مخلوق کو اس طرح دعوت دیتے ہیں :-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَالَكُمْ إِنْ أَقِيلَ لَكُمْ أَنْفُسُ وَأَفِي سَبِيلِ اللَّهِ إِنَّا قُلْنَا إِلَى الْأَرْضِ ارْضَيْتُمْ بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا مِنَ الْآخِرَةِ فَمَا مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا فِي الْآخِرَةِ إِلَّا قَلِيلٌ

(پ ۱۰، آیت ۳۸)

اے ایمان والوں تم لوگوں کو کیا ہوا کہ جب تم سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کی راہ میں (جہاد کے لئے) نکلو تو تم زمین کو لگے جاتے ہو کیا تم نے آخرت کے عوض دنیوی زندگی پر قناعت کر لی؟ سو دنیوی زندگی کا متاع تو آخرت کے مقابلے میں بہت قلیل ہے۔

دنیا و آخرت کی بادشاہی : تورات، انجیل، زبور، قرآن اور موسیٰ اور ابراہیم علیہم السلام کے صحیفے، اور دوسری تمام آسمانی کتابیں اسی لئے نازل ہوئی ہیں کہ مخلوق کو دائمی ملک کی طرف دعوت دیں، اور انھیں یہ تلقین کریں کہ وہ دنیا میں بھی بادشاہ بن کر رہیں اور آخرت میں بھی بادشاہ ہوں، دنیا کی بادشاہی یہ ہے کہ اس میں زہد اختیار کریں، تھوڑے مال پر قناعت کریں، اور آخرت کی بادشاہی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کر کے وہ ہٹا پائیں جسے فنا نہ ہو، اور وہ عزت پائیں جس پر ذلت کا اثر نہ پڑے، اور آنکھوں کی

وہ ٹھنڈک حاصل کریں جو اس عالم میں حقیقی کروی مٹی ہے اور کوئی نفس اس سے واقف نہیں ہے۔ شیطان مخلوق کو دنیا کی سلطنت کی طرف اس لئے بلاتا ہے کیوں کہ وہ یہ بات جانتا ہے جو لوگ دنیا کی سلطنت کے درپے ہوتے ہیں انھیں آخرت کی سلطنت نہیں ملتی، اس لئے کہ دنیا و آخرت دو ستونوں کی طرح ہیں ایک کی موجودگی میں دوسری نہیں رہ سکتی نیز شیطان یہ بھی جانتا ہے کہ دنیا اگر کسی کو مل جائے تو باقی رہنے والی نہیں ہے، اسی لئے وہ دنیا کی ترغیب دیتا ہے، پھر یہی نہیں کہ اگر کسی کو دنیا مل جائے تو اسے سکون سے رہنے دے، بلکہ اس پر حسد کرتا ہے، طرح طرح سے پریشان کرتا ہے، جھگڑنے کھڑے کرتا ہے، دنیا کے تمام مال و متاع کا یہی حال ہے، اول تو مشکل سے حاصل ہوتا ہے، مل بھی جائے تو اسے باقی رکھنے کے لئے بڑی تدبیریں کرنی پڑتی ہیں، شدید مستغنیہ برداشت کرنی پڑتی ہیں، اور باقی بھی رہ جائے تو کب تک؟ فنا ہو جائے گی، موت سے کسی کو منہ نہیں، خواہ وہ حاکم ہو یا محکوم۔ قرآن حکیم نے ان دنیا داروں کی صحیح تصویر کھینچی ہے۔

حَتَّىٰ إِنَّا أَخَذْنَا الْأَرْضَ زُخْرُفَهَا وَازْبَيَّنَّا وَظَنَّا أَنَّهُمْ قَادِرُونَ عَلَيْهَا أَنَا هَا
أَمْرًا لَّيْلًا أَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنَاهَا حَصِيدًا كَأَن لَّمْ تَغْنَبِ الْأَمْشِ (پ ۸۸ آیت ۲۳)

یہاں تک کہ جب وہ زمین اپنی رونق کا (پورا حصہ) لے چکی اور اسکی خوب زیبائش ہو گئی اور اس کے مالکوں نے سمجھ لیا کہ اب ہم اس پر بالکل قابض ہو چکے تو دن میں یا رات میں اس پر ہماری طرف سے کوئی حادثہ آپڑا، سو ہم نے اس کو ایسا کر دیا گویا کل وہ موجود ہی نہ تھی۔

ایک مثال ان لوگوں کی یہ بیان کی گئی ہے۔

وَاضْرِبْ لَهُم مَّثَلًا الْحَيَاةِ الدُّنْيَا كَمَا هِيَ آتْرَافَةٌ مِنَ السَّمَاءِ فَاخْتَلَطَ نَبَاتُ الْأَرْضِ
فَأَصْبَحَ هَشِيمًا تَذْرُوهُ الْزَيَّاحُ (پ ۱۵ آیت ۳۵)

اور آپ ان لوگوں سے دنیوی زندگی کی حالت بیان فرمائیے (کہ وہ ایسی ہے) جیسے آسمان سے ہم نے پانی برسایا ہو پھر اسکے ذریعے سے زمین کی نباتات خوب گنجان ہو گئی ہو، پھر وہ ریزہ ریزہ ہو جائے اور اسکو ہوا اڑائے لئے پھرتی ہو۔

زہد سلطنت کیوں ہے؟ : زہد کے معنی یہ ہیں کہ آدمی اپنی شہوت اور غضب پر قابو پالے، اور یہ دونوں چیزیں باعثِ دین اور اشارہ ایمان کے تابع ہو جائیں یہ حقیقی سلطنت ہے، حقیقی سلطنت کے معنی ہیں مکمل آزادی، غضب اور شہوت سے بچ کر ہی انسان آزاد کہلائے کا مستحق ہو سکتا ہے، ورنہ اگر شہوت کا اسیر ہو تو کبھی وہ بندہ، حکم بن جائے گا، کبھی بندہ، شرمگاہ بن جائے گا، کبھی کسی اور غرض کا بندہ بن جائے گا، بلکہ ایک جانور کی طرح ہو جائے گا جسے اپنی ذات پر ذرا اختیار نہیں ہوتا، بلکہ دوسروں کے ہاتھوں مسخر ہوتا ہے، جو جس طرح چاہتا ہے، جہاں چاہتا ہے گردن میں رسی ڈال کر لے جاتا ہے۔ انسان کس قدر دھوکے میں ہے، بے چارہ مملوک بن کر یہ سمجھتا ہے کہ میں مالک ہوں، اور خواہشات کا غلام بن کر یہ سمجھتا ہے کہ مجھ میں ربوبیت کے اوصاف پیدا ہو گئے ہیں، ایسا شخص دنیا میں بھی ذلیل ہے، اور آخرت میں بھی ذلیل۔ ایک بادشاہ نے کسی زہد سے دریافت کیا تمہیں کوئی ضرورت ہے؟ زہاد نے جواب دیا میں تم سے کیا مانگوں میری سلطنت تمہاری سلطنت سے زیادہ وسیع ہے۔ بادشاہ نے پوچھا وہ کیسے؟ زہاد نے جواب دیا کہ جس کے تم غلام ہو وہ میرا غلام ہے، بادشاہ کو اس جواب پر بڑی حیرت ہوئی اس نے وضاحت چاہی، زہاد نے کہا کہ تم اپنی شہوت، غضب، حکم اور شرمگاہ کے غلام ہو، جب کہ میں ان سب کا مالک ہوں، حقیقت یہی ہے کہ زہد ہی اصل سلطنت ہے، اسی سلطنت کے باعث اخروی سلطنت ملتی ہے، جو لوگ شیطان کے فریب میں آگئے، وہ دنیا و آخرت دونوں جگہ خسارے میں رہے، اور جنہیں راہِ راست پر ثابت قدم رہنے کی توفیق ملی، دنیا و آخرت دونوں جگہ کامیاب رہے۔

اب جب کہ تم ملک، ربوبیت، تغیر، اور ربوبیت کے معنی سمجھ گئے ہو، اور ان امور میں مطالعے کی راہ سے واقف ہو گئے ہو، نیز

یہ بات جان گئے ہو کہ شیطان کس طرح تمہیں بہکا تا ہے اور راہ حق سے بھٹکا تا ہے تو تمہارے لئے سلطنت اور جاہ سے راہ فرار اختیار کرنا اس سے اعراض کرنا اور ان کے فوت ہونے پر صبر کرنا آسان ہے۔ اس طرح تم ایک ملک کی امید میں دوسرا ملک چھوڑتے ہو اگر کسی کا دل جاہ سے مانوس ہو جائے اور اقتدار کی محبت اس کے اسباب پر عمل پیرا ہونے کی وجہ سے دل میں پوری طرح راسخ ہو جائے تو چھٹن ان امور کا جاننا کافی نہیں ہے بلکہ عمل بھی ضروری ہے۔

علم کے ساتھ تین عمل : اور یہ عمل تین امور میں ہو گا۔ ایک تو یہ کہ جاہ کی جگہ سے فرار ہو جائے تاکہ جاہ کے اسباب مشاہدہ میں نہ آسکیں اسباب سامنے ہوں تو مبرود شوار ہوتا ہے جس طرح غلبہ شہوت کا علاج یہ بیان کیا گیا تھا کہ جو اسباب شہوت میں بھگان پیدا کرنے والے ہوں ان سے دور رہا جائے مثلاً خوبصورت چہرے جو محض جاہ سے بچنے کیلئے راہ فرار اختیار نہیں کرنا وہ گویا اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا انکار کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :-

اَلَمْ تَكُنْ اَرْضًا مَّاءً مَّعْقُوتًا حَرُّوا فِيْهَا (پ ۵ سورہ آیت ۷۹)

کیا خدا کی زمین وسیع نہ تھی تم کو ترکہ طین کر کے اس میں پلے جانا چاہئے تھا۔

دوسرا عمل یہ ہو گا کہ اپنے نفس کو ان اعمال کا ملک کرے جو اس کے ساتھ اعمال کے خلاف ہوں جن کا وہ عادی ہے مثلاً اگر ملکات کا عادی ہو تو انہیں ترک کر دے اور سادگی اختیار کرے متواضع بنے بلکہ دلہلوں کا سا شہوہ اختیار کرے۔ یہ تبدیلی ہر معاملے میں ہونی چاہئے رہنے سنے کھانے پینے پہننے اور اٹھنے بیٹھنے ہر معاملے میں وہ عمل کرنا چاہئے جو سابقہ عادت کے خلاف ہو تاکہ یہ نئے افعال دل میں اچھی طرح راسخ ہو جائیں۔ تیسرا عمل یہ ہے کہ تبدیلی کے اس مرحلے میں نرمی اور تدریج کا رویہ اختیار کرے ایک دم کوئی عادت ترک کر کے اسکے مخالف عادت کو یک لخت ختم نہیں کیا جاسکتا تدریج ہر اہل جاہ سے ضروری ہے اس طرح کہ عادت کا ایک حصہ چھوڑ دے اور نفس کو اس ایک حصے کے لئے تسلیم دے پھر جب نفس اس پر قانع ہو جائے تو دوسرے حصے پر توجہ دے اور اسے ترک کرے اسی طرح تھوڑا تھوڑا حصہ چھوڑے یہاں تک کہ ان تمام صفات کا قلع قمع ہو جائے جو دل میں راسخ ہو چکی ہیں اسی تدریج کی طرف سرکارِ دہ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے۔

اِنَّ هَٰذَا الَّذِيْنَ مَنِيْنٌ فَاَوْغَلَ فِيْمِهٖ فَقِيْ وَلَا تَبْغِضْ اِلَيَّ نَفْسِيْكَ عِبَادَةَ اللّٰهِ (احمد۔ المزمع)

یہ دین مضبوط ہے اس میں نرمی سے داخل ہو اور اپنے نفس کے لئے مہلت کو ناپسندیدہ مت کر۔

اس حدیث میں بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے :-

لَا تُشَادُّوْا هَٰذَا الَّذِيْنَ فَاِنَّ مِنْ شَادِّهٖ غَلْبَهُ (۱)

اس دین کا مقابلہ مت کرو جو اس کا مقابلہ کرے گا اس پر یہ غالب ہو جائے گا۔

دسواں مشہوات اور جاہ و اقتدار سے صبر کرنے کے سلسلے میں جو کچھ ہم نے لکھا ہے اس میں ان قوانین کا اضافہ بھی کرلو جو باب ریاضت نفس میں بیان کئے گئے ہیں ان قوانین سے طریق مجاہدہ کا علم ہوتا ہے۔ امید یہ ہے کہ اس طرح صبر کی تمام قسموں کا علاج بالتفصیل معلوم ہو جائے گا۔ ورنہ ہر ایک قسم کی تفصیل کرنی پڑے گی۔

جو محض تدریج کے پہلو پر نظر رکھے گا وہ اس حال پر پہنچ جائے گا اسے صبر کے بغیر سکون نہ ملے گا پہلے اسے ان چیزوں کے بغیر چین نہ ملتا تھا جن سے صبر کیا ہے اور اب صبر ہی میں سکون تلاش کرتا ہے گویا معاملہ بالکل الٹا ہو جائے گا جو چیز پہلے پسندیدہ تھی اب ناپسندیدہ ہو جائے گی اور جو پہلے ناپسندیدہ تھی وہ اب پسندیدہ بن جائے گی۔ مزاج کی اس تبدیلی پر تجزیہ اور مشاہدہ بھی دال ہے بچے کی مثال ہمارے سامنے ہے پہلے اسے زبردستی پڑھنے پڑھانے ہوں وہ بادل نا خواستہ تعلیم حاصل کرتا ہے تکمیل سے صبر کرنا اسے نہایت شاق مگزرتا ہے نیز وہ تعلیم کی مشقت پر صبر نہیں کر سکتا لیکن جب اس میں شعور پیدا ہوتا ہے اور علم سے انیت پیدا ہوتی ہے تو

معاملہ اس کے برعکس ہو جاتا ہے۔ اب پڑھنے سے مبرکنا دو بھر ہو جاتا ہے، کھیل پر مبرکنا، سہل نظر آتا ہے بعض عارفین سے روایت ہے کہ انھوں نے حضرت شعیؒ سے سوال کیا کہ کون سا مبرک شہید تر ہے، انھوں نے کہا اللہ تعالیٰ کے باب میں مبرکنا، عارف نے کہا نہیں یہ مبرکنا تر نہیں حضرت شعیؒ نے کہا اللہ کے لئے مبرکنا، عارف نے اس کی بھی نفی کی، حضرت شعیؒ نے کہا اللہ کے ساتھ مبرکنا عارف نے کہا نہیں اللہ تعالیٰ کے لئے مبرکنا، عارف نے اس کی بھی نفی کی، حضرت شعیؒ نے پوچھا پھر کون سا مبرکنا، عارف نے کہا اللہ سے مبرکنا۔ یہ سن کر حضرت شعیؒ نے ایک زہدست چیچ ماری، قریب تھا کہ روح جسم کا ساتھ چھوڑ دیتی، اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے متعلق ”اصبر و اوصابر و اوابطو“ کہا گیا ہے خدا کے باب میں مبرکنا، خدا کے ساتھ مبرکنا، اور خدا کے ساتھ لگے رہو۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اللہ کے لئے مبرکنا خفاء ہے، اللہ کے ساتھ مبرکنا ہے، اللہ کے ساتھ مبرکنا ہے، اور خدا سے مبرکنا ہے۔ اسی مفہوم میں یہ دو شعر کے گئے ہیں :-

وَالصَّبْرُ عَنْكَ فَمَذْمُومٌ عَوَاقِبُهُ - وَالصَّبْرُ فِي سَائِرِ الْأَشْيَاءِ مَحْمُودُ
الصَّبْرُ يَجْمَلُ فِي الْمَوَاطِنِ كُلِّهَا - إِلَّا عَلَيْكَ فَإِنَّهُ لَا يَجْمَلُ

(ترجمہ :- تجھ سے مبرکنا، انجام کے اعتبار سے مذموم ہے، باقی تمام چیزوں میں مبرکنا پسندیدہ عمل ہے۔ مبرکنا مواقع میں پسندیدہ ہے مگر تجھ پر مبرکنا پسندیدہ نہیں ہے)

دوسرا باب

شکر کا بیان

اس باب کے تین ارکان ہیں، ایک شکر کی فضیلت، اسکی حقیقت، اقسام اور احکام کے ذکر میں ہے۔ دوسرا نعمت کی حقیقت اور اسکی خاص و عام قسموں کے بیان میں ہے۔ تیسرا رکن اس بیان میں ہے کہ شکر اور مبرکنا سے کون سی قسم افضل ہے۔

پہلا رکن

نفس شکر

شکر کی فضیلت :- ایک طرف تو قرآن کریم نے ذکر کی یہ تعریف کی ہے :-

وَلَذِكْرُ اللَّهِ أَكْبَرُ (پ ۲۱، آیت ۳۵)

اور اللہ کی یاد بہت بڑی چیز ہے۔

دوسری طرف شکر کو یہ اعزاز بخشا ہے کہ اسے ذکر کے پہلو پہ پہلو ذکر کیا ہے، چنانچہ ارشاد فرمایا :-

فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوا لِي وَلَا تَكْفُرُونِ (پ ۲۲، آیت ۱۵۲)

تو (ان نعمتوں پر) مجھ کو یاد کرو میں تم کو یاد رکھوں گا اور میری (نعمت کی) شکر گزاری کرو اور میری ناپاسی مت کرو۔

ذکر جیسی عظیم شئی کے ساتھ اس کا ذکر اس کے کمال فضیلت پر دلالت کرتا ہے، قرآن کریم میں ہے :-

مَا يَفْعَلُ الْمُتَعَذِّلُ كَمَا يَنْ شُكْرُكُمْ تَمْوَأَمْنُكُمْ (پ ۵۵، آیت ۴۳)

اللہ تعالیٰ کو سزا دے کر کیا کریں گے اگر تم پاس گزاری کرو اور ایمان لے آؤ۔

وَسَنَجْزِي الشَّاكِرِينَ (پ ۶۳، آیت ۴۳)

اپنے اس قول ان الفاظ میں نقل کیا گیا ہے۔

لَا قُعْدَةَ لَكُمْ صِرَاطُكَ الْمُسْتَقِيمِ میں قسم کھاتا ہوں کہ میں ان کے لئے آپ کی سیدھی راہ پر

بیٹھوں گا۔ (پ ۸-۹، آیت ۱۶)

اس میں صراطِ مستقیم کے معنی بعض مفسرین نے صراطِ الشاکرین یعنی "شکر گزاروں کا راستہ" لکھے ہیں کیوں کہ شکر کا مرتبہ عالی ہے اس لئے اسے مخلوق پر یہ طعن کیا ہے۔ ایک جگہ ارشاد فرمایا :-

وَلَا تَحْسَبُ أَنَّ كَثْرَ هُمْ شَاكِرِينَ (پ ۸ ر ۹ آیت ۱۷)

اور آپ ان میں اکثروں کو احسان ماننے والا نہ پائیے گا۔

ایک اور موقع پر ارشاد فرمایا :-

وَقَلِيلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّاكِرُونَ (پ ۸ ر ۲۲ آیت ۳)

اور میرے بندوں میں شکر گزار کم ہی ہوتے ہیں۔

ایک جگہ شکر نعمت پر زیادتی نعمت کو قطعیت کے ساتھ ذکر فرمایا "اس میں استثناء نہیں ہے" جب کہ دوسری نعمتوں میں استثناء

موجود ہے، چنانچہ غنی کرنے، دعا قبول کرنے، روزی دینے، مغفرت عطا کرنے اور توبہ قبول کرنے میں استثناء کا ذکر موجود ہے۔ ان سب کو اپنی مشیت پر موقوف فرمایا ہے، ارشاد ہے :-

فَسَوْفَ يَغْنِيْكُمْ اللّٰهُمِّنْ فَضْلِهِ اِنْ شَاءَ (پ ۱۰ ر ۱۰ آیت ۲۸)

خدا تم کو اپنے فضل سے اگر چاہے گا تو محتاج نہ رکھے گا۔

فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ اِلَيْهِ اِنْ شَاءَ (پ ۱۰ ر ۱۰ آیت ۳۰)

پھر جس کے لئے تم پکارو اگر وہ چاہے تو اس کو ہٹا بھی دے۔

يَرْزُقْ مَنْ يَّشَاءُ غَيْرِ حِسَابٍ (پ ۳ ر ۱۱ آیت ۲۷)

اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے بے شمار رزق عطا فرماتا ہے۔

وَيَغْفِرُ مَا تُؤْنِ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَاءُ (پ ۵ ر ۳ آیت ۳۸)

اور اسے سوا جتنے گناہ ہیں جس کے لئے منظور ہو گا وہ بخش دے گا۔

وَيَتَوَبُّ اللّٰهُ عَلٰى مَنْ يَّشَاءُ (پ ۸ ر ۱۰ آیت ۱۵)

اور جس پر منظور ہو گا اللہ تعالیٰ توبہ فرمائے گا۔

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ شکر ایک عمدہ شئی ہے، اسی لئے اس میں باری تعالیٰ نے اپنی مشیت کی قید نہیں لگائی بلکہ

زیادتی نعمت کا قطعی وعدہ فرمایا۔ شکر کے عمدہ وصف ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے، یہ اخلاق ربوبیت میں سے ایک خلق ہے، چنانچہ اللہ

تعالیٰ نے خود اپنے لئے اس وصف کا ذکر فرمایا ہے :-

وَاللّٰهُ شَكُوْرٌ حَلِيْمٌ

اور اللہ نہایت شکر گزار اور حلیم ہے۔

نیز قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل جنت اپنی گفتگو کا آغاز شکر سے کریں گے۔

وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ صَدَقْنَا وَوَعَدَهُ (پ ۲۳ ر ۵ آیت ۷۴)

اور اللہ کا (لاکھ لاکھ) شکر ہے جس نے ہم سے اپنا وعدہ سچا کیا۔

وَآخِرُ دَعْوَاهُمْ اِنَّ الْحَمْدَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ (پ ۱۱ ر ۶ آیت ۱۰)

اور ان کی آخری بات یہ ہوگی الحمد للہ رب العالمین۔

شکر کی فضیلت میں بے شمار روایات اور آثار وارد ہیں، سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں :-

اَلطَّاعِمُ الشَّاكِرُ يَمْنُزُ لِمَا لَصَّائِمُ الصَّابِرِ (بخاری تعلقاً - ترمذی ابن ماجہ - ابو ہریرہ)

کھانے والا شکر گزار صابر روزہ دار کے برابر ہے۔

عطاء سے روایت ہے کہ میں حضرت عائشہؓ کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے عرض کیا کہ آپ نے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی جو سب سے عجیب و غریب حالت دیکھی ہو وہ بیان فرمائیے یہ سن کر حضرت عائشہؓ رونے لگیں اور کہنے لگیں کہ ان کا کون سا حال عجیب نہیں تھا ایک رات آپ میرے پاس تشریف لائے اور میرے ساتھ میرے بستر میں یا میرے لحاف میں لیٹے یہاں تک کہ آپ کا جسم مبارک میرے جسم سے مس ہوا اس کے بعد آپ نے فرمایا اے ابو بکر کی بیٹی! مجھے چھوڑ دے تاکہ میں اپنے رب کی عبادت کر سکوں میں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میں تو آپ کی قربت چاہتی ہوں ویسے آپ کی مرضی پھر میں نے اجازت دیدی آپ پانی کے ایک مشکینے کی طرف تشریف لے گئے وضو فرمایا آپ نے وضو میں زیادہ پانی نہیں بہایا اس کے بعد آپ نماز پڑھنے کھڑے ہو گئے نماز کے دوران رونے لگے یہاں تک کہ آپ کے آنسو سینہ مبارک پر بہنے لگے پھر آپ نے رکوع کیا رکوع میں بھی رونے پھر سجدہ کیا اس میں بھی رونے سجدہ سے سر اٹھا کر بھی رونے آپ اسی طرح روتے رہے یہاں تک کہ صبح ہو گئی اور بلال نے آپ کو نماز فجر کے وقت اطلاع دی میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! آپ اس قدر کیوں روتے ہیں جبکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے اگلے پچھلے گناہ معاف فرمادیے ہیں آپ نے فرمایا کیا میں شکر گزار بندہ نہ ہوں؟ اور کیسے نہ روؤں جب کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں یہ آیت نازل فرمائی ہے (۱)

إِن فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاٰخِرَیْنَ الدِّیْنِ اٰیٰتٍ لِّمَنْ عَلِمَ

بلاشبہ آسمانوں کے اور زمین کے بنانے میں اور یکے بعد دیگرے رات اور دن کے آنے میں اچ

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ رونا کسی بھی حالت میں موقوف نہ ہونا چاہئے اللہ کا خوف تو پتھروں کو رونے پر مجبور کر دیتا ہے کیا انسان پتھروں سے بھی زیادہ سخت ہے؟ روایات میں ہے کہ ایک پیغمبر کہیں سے گزر رہے تھے کہ راستے میں دیکھا کہ ایک چھوٹے سے پتھر سے کافی مقدار میں پانی نکل رہا ہے انہیں بڑی حیرت ہوئی اللہ تعالیٰ نے پتھر کو زبان عطا کی اس نے عرض کیا کہ جب سے میں نے یہ آیت سنی ہے وَتَوَدُّهَا النَّاسُ وَالْجِبَالُ (اور جنم کا اجد من آدمی اور پتھر ہوں گے) میں اس خوف سے مسلسل رونا ہوں۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ اسے آگ سے نجات دے ہمارا گاہ الہی میں دعا قبول ہوئی کچھ دنوں کے بعد اُدھر سے دوبارہ گزر ہوا دیکھا پتھر پہلے کی طرح رو رہا ہے اس سے دریافت کیا اب کیا بات ہے؟ پتھر نے عرض کیا کہ پہلے خوف کی وجہ سے رو رہا تھا اب شکر اور خوشی کے آنسو بہا رہا ہوں۔ بندے کامل پتھر کی طرح سخت ہے بلکہ سختی میں اس سے کچھ زیادہ ہی ہے یہ سختی صرف رونے سے دور ہوتی ہے خواہ آدمی خوف کی حالت میں رونے یا شکر کی حالت میں نیز ایک روایت میں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :-

یٰۤاٰدَمُ یَوْمَ الْقِیَامَةِ لَیْقَمُ الْحَمَادُوْنَ فَنَقُوْمُ رُمْرَةً فَبِیْنَصَبْ لَهُمْ اِلٰهًا فَبِیْذْ خُلُوْنَ
الْبَحْثَةُ قَبِلَ وَمِنْ الْحَمَادُوْنَ قَالَ الَّذِیْنَ یَشْكُرُوْنَ لِلّٰهِ تَعَالٰی عَلٰی كُلِّ حَالٍ (دفعی
لفظ آخر) الَّذِیْنَ یَشْكُرُوْنَ لِلّٰهِ عَلٰی الشُّرَایِغِ وَالصُّرُایِغِ (طبرانی ابو نعیم بیہقی ابن عباس)

قیامت کے روز اعلان کیا جائے گا کہ بہت زیادہ حمد کرنے والے کھڑے ہو جائیں ایک گروہ کھڑا ہو گا ان کے لئے ایک جعزہ انصب کیا جائے گا وہ جنت میں داخل ہوں گے عرض کیا گیا حمد کرنے والے کون لوگ ہیں؟ فرمایا یہ لوگ وہ ہیں جو ہر حال میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں (ایک روایت میں ہے) جو سچی اور فراخی دونوں حالتوں میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں۔

ایک مرتبہ آپ نے ارشاد فرمایا :-

الْحَمْدُ لِلّٰهِ كَمَا لَرَحْمٰنٍ (۲) شکر خدا کی چادر ہے۔

(۱) ابن حبان۔ عودہ مفصلاً۔ مسلم۔ عودہ مختصراً (۲) مجھے اس کی اصل نہیں ملی بخاری میں حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے

اللہ تعالیٰ نے حضرت ابوب علیہ السلام پر وحی نازل فرمائی کہ میں اپنے دوستوں کی مکافات میں شکر سے راضی ہوتا ہوں یہ وحی بھی انہی پر نازل ہوئی کہ صابریں کا گمروار السلام ہے جب وہ اس میں داخل ہوں گے تو میں ان کو شکر کے کلمات کی تلقین کروں گا یہ بہترین کلمات ہیں شکر ادا کرنے کے وقت میں اور زیادہ کا طالب ہوں اور جب وہ میری طرف دیکھیں گے تو میں ان کے مرتبے میں اضافہ کروں گا۔ جب زمین مدفون خزانوں کے متعلق قرآن کریم میں یہ آیت نازل ہوئی تھی۔

الَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ (پ ۱۸، آیت ۳۴) جو لوگ سونا چاندی جمع کر کے رکھتے ہیں۔

تو حضرت مڑے عرض کیا کہ ہم اپنے پاس کون سا مال رکھیں آپ نے ارشاد فرمایا :-

لِيَتَّخِذَ أَخَذَكُمْ لِسَانًا ذَاكِرًا وَقَلْبًا شَاكِرًا (۱)

تم میں سے کوئی ذکر کرنے والی زبان اور شکر کرنے والا دل حاصل کرے۔

اس میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ تم مال جمع کرنے کے بجائے شکر گزار دل پر قناعت کرو۔ حضرت عبداللہ ابن مسعود فرماتے ہیں کہ

شکر نصف ایمان ہے۔

شکر کی حقیقت : شکر سا کلین کے مقامات میں سے ایک مقام ہے۔ یہ مقام بھی علم، عمل اور حالت سے ترتیب پاتا ہے، ان تینوں میں علم اصل ہے، علم سے حال اور حال سے عمل پیدا ہوتا ہے علم کے معنی ہیں منعم کی جانب سے عطا کی جانے والی نعمت کو پہچانا، اور حال اس خوشی کا نام ہے جو نعمت پا کر حاصل ہوتی ہے، اور عمل نعمت دینے والے کی رضا کے مطابق کام کرنا ہے، یہ عمل قلب، اعضاء اور زبان تینوں سے متعلق ہے۔ یہاں ان سب کا بیان ضروری ہے تاکہ شکر کی حقیقت مکمل طور پر واضح ہو سکے۔ اب تک جو کچھ شکر کی تعریف میں کہا جاتا ہے رہا ہے وہ شکر کے معانی، فہم و کمال ظاہر نہیں کرتا۔

پہلی اصل علم : اس سلسلے میں تین امور کا علم ہونا چاہئے ایک نعمت کا دوسرے اس امر کا کہ یہ نعمت اسکے حق میں نعمت ہے، تیسرے منعم کی ذات، اور ان صفات کا جن سے انعام صادر ہوتا ہے، اور مکمل ہوتا ہے۔ نعمت کے لئے ان تین چیزوں کا وجود ضروری ہے، ایک نعمت کا دوسرے نعمت دینے والے کا، اور تیسرے اس شخص کا جسے منعم کے قصد و ارادے سے نعمت پہنچتی ہے، لیکن ان تمام باتوں کا تعلق غیر خدا سے ہے، اللہ کے سلسلے میں یہ علم ہونا چاہئے کہ تمام نعمتیں اللہ کی طرف سے ہیں، وہی منعم حقیقی ہے، درمیان کے تمام واسطے اس کے قبضہ قدرت اور دست تغیر میں ہیں، یہ معرفت تقدیس۔ اور توحید کے بعد ہے، اور مرتبے میں ان دونوں معرفتوں سے اعلا ہے، ایمان کی معرفتوں میں سے سب سے پہلے تقدیس ہے جس کے معنی ہیں اللہ تعالیٰ کو پاک جاننا، اس کے بعد توحید ہے، یعنی جس ذات کو پاک سمجھا گیا ہے وہ ایک ہے، اس کا کوئی شریک نہیں ہے، اسکے بعد یہ جاننا ہے کہ عالم میں جتنی بھی چیزیں موجود ہیں وہ سب اسی ذات واحد کی ایجاد سے وجود پذیر ہوئی ہیں اور اسی کی طرف سے بطور انعام عطا ہوئی ہیں، ظاہر ہے یہ معرفت سابقہ دونوں معرفتوں کے بعد آئی ہے، اس لئے اس کا مرتبہ ان دونوں سے اعلا ہے، کیوں کہ اس میں تقدس اور وحدانیت کے اعتراف کے علاوہ کمال قدرت، اور کمال ایجاد کا اعتراف بھی ہے۔ اسی لئے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ جو شخص سبحان اللہ کہتا ہے اسے دس نیکیاں ملتی ہیں، جو لا الہ الا اللہ کہتا ہے اسے بیس نیکیاں عطا کی جاتی ہیں، اور جو الحمد للہ کہتا ہے اسے تیس

نیکیاں دی جاتی ہیں۔ (۲) ایک حدیث میں یہ الفاظ ہیں:-

أَفْضَلُ الذِّكْرِ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَأَفْضَلُ الدُّعَاءِ الْحَمْدُ لِلَّهِ (ترمذی، نسائی، ابن ماجہ۔ جابر)

بہترین ذکر لا الہ الا اللہ ہے اور بہترین دعا الحمد للہ ہے۔

یہ خیال کرنا غلط ہے کہ یہ نیکیاں جو اوپر بیان کی گئی ہیں ان کلمات کو محض زبان سے ادا کرنے پر مل جائیں گی، خواہ انکے معانی دل میں آئیں یا نہ آئیں۔ حقیقت یہ ہے کہ سبحان اللہ کلمہ تقدیس ہے لا الہ الا اللہ کلمہ توحید ہے، اور الحمد للہ وہ کلمہ ہے جس سے یہ

(۱) یہ روایت کتاب النکاح میں گزری ہے (۲) یہ روایت جلد اول میں گزری ہے

معلوم ہوتا ہے کہ تمام نعمتیں اللہ کی عطا کردہ ہیں، یہ نیکیاں ان تین امور کے اعتراف و اقرار کی بدولت حاصل ہوتی ہیں، محض زبان کو حرکت دینے سے نہیں بنتیں، یہ تینوں امور ایمان و یقین کے ابواب ہیں۔

توحید سے شرک کی نفی : یہاں یہ بات جان لینا بھی ضروری ہے کہ یہ معرفت اس وقت تک مکمل نہیں ہوتی۔ جب تک منعم کی ذات سے شرکت کی نفی نہ کی جائے، مثال کے طور پر کوئی بادشاہ ہمیں انعام دیتا ہے، اور تم یہ سمجھتے ہو کہ یہ انعام تمہارا بادشاہ کا نہیں ہے، بلکہ اس میں اسکے وزیر یا وکیل وغیرہ بھی شریک ہیں، اس لحاظ سے کہ انہوں نے انعام دینے کی سفارش کی، یا وہ انعام اس تک پہنچایا، یا انعام پانے میں اسکی مدد کی، یہ نعمت میں غیر کو شریک کرنے والی بات ہے، اسکا مطلب یہ ہوا کہ وہ تمہارا بادشاہ کو بہر طور منعم نہیں سمجھتا، بلکہ ایک اعتبار سے اسے، اور ایک اعتبار سے اسکے وزیر کو منعم گردانتا ہے، اسی لحاظ سے اسکی خوشی بھی ان دونوں پر تقسیم ہو جائے گی، اس طرح وہ بادشاہ کے حق میں موحد نہیں کہا جاسکتا۔ البتہ اگر وہ یہ سمجھے کہ جو نعمت مجھے حاصل ہوئی ہے، وہ بادشاہ کے حکم سے حاصل ہوئی ہے، بادشاہ کی اس تحریر سے ملی ہے، جو اسنے اپنے قلم سے لکھی، اپنے کاغذ پر لکھی، تو یقیناً وہ موحد کہلائے گا، اس صورت میں وہ قلم کاغذ سے خوش نہیں ہوتا اور نہ ان کا شکر گزار ہوتا ہے، کیوں کہ وہ حصول انعام میں ان دونوں کا کوئی دخل نہیں سمجھتا، اگر ان کا کوئی دخل ہے تو صرف اس قدر کہ یہ دونوں چیزیں بادشاہ کے لئے مسخر ہیں۔ اسی طرح وزیر اور وکیل بھی بادشاہ کی مرضی کے پابند اور اسکے احکام کی بجا آوری پر مجبور ہیں، بادشاہ نے انھیں حکم دیا تو وہ دے رہے ہیں، ورنہ اگر دینے کا معاملہ صرف انکے اختیار پر موقوف ہو تا یا بادشاہ کی نافرمانی کا ذرہ نہ ہو تا تو وہ ہرگز نہ دیتے۔ اگر بادشاہ کی نعمتوں کے بارے میں یہ گمان ہو تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ تمہارا بادشاہ کو منعم نہیں سمجھتا۔ اسی طرح جو محض اللہ تعالیٰ کی ذات اور افعال کی معرفت رکھتا ہے، اور اس حقیقت سے واقف ہے کہ چاند، سورج اور ستارے سب اسکے لئے اسی طرح مسخر ہیں، جس طرح قلم لکھنے والے کے ہاتھ میں مسخر ہے۔ جن حیوانات کو اختیار حاصل ہے وہ دراصل اپنے نفسوں کے زیر اختیار ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان پر افعال کے دوائی مسلط کر دیے ہیں، وہ ان افعال پر مجبور ہیں خواہ ان کی مرضی ہو یا نہ ہو جیسے خازن کہ وہ بادشاہ کا حکم پڑھ کر دینے پر مجبور ہے خواہ وہ دینا چاہتا ہو یا نہ چاہتا ہو، اگر دینے نہ دینے کا اختیار خازن کو دیدیا جائے تو وہ کسی کو ایک پیسہ بھی دینے کا روادار نہ ہو۔

درمیانی واسطے مضطر ہیں : بہر حال اگر کسی محض کو اللہ تعالیٰ کی نعمت کسی دوسرے ذریعہ سے پہنچتی ہے تو اسے یہ سمجھنا چاہئے کہ یہ دوسرا محض اس نعمت کو اس تک پہنچانے کے لئے مجبور تھا۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے اس پر اپنا ارادہ مسلط کر دیا تھا اور وہ تمام دوائی پیدا کر دئے تھے جن کی بنا پر وہ دینے پر مجبور تھا۔ اسکے دل میں یہ بات ڈال دی تھی کہ دنیا و آخرت میں میری بھلائی صرف اسی صورت میں ہے کہ میں اسے دوں۔ جب دل میں خدا کی طرف سے یہ تصویر پیدا ہو جاتا ہے تو اسکے متقاضی پر عمل کرنے کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں رہتا۔ چنانچہ یہ سمجھنا چاہئے کہ وہ محض اگر تمہیں کچھ دے رہا ہے تو اپنی غرض کے لئے دے رہا ہے، تمہاری غرض کے لئے نہیں دے رہا ہے، اگر دینے میں اسکی غرض نہ ہوتی تو وہ ہرگز نہ دیتا، اور اگر اسے یہ بات معلوم نہ ہوتی کہ اس کا نفع تیرے نفع میں مضمر ہے تو تجھے ہرگز نفع نہ پہنچاتا۔ اب تو وہ تمہیں نفع پہنچا کر اپنے نفس کے لئے نفع کا طالب ہے، وہ تمہارا منعم یا محسن نہیں ہے، بلکہ اس نے تمہیں ایک متوقع نعمت کے لئے وسیلہ بنایا ہے، اصل منعم دوسرا ہے، اس نے ظاہری منعم کو تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے، اور اس کے دل میں میں ایسے اعتقادات اور ارادے القاء کر دئے ہیں جن کی بنا پر وہ اس نعمت کو تم تک پہنچانے پر مجبور ہو گیا ہے۔

اگر تم نے یہ امور اس طریقے پر سمجھے تو تم اللہ تعالیٰ کی ذات و افعال کی معرفت حاصل کر لو گے اور تم موحد بن جاؤ گے، شکر پر تمہیں قدرت حاصل ہو جائے گی، بلکہ محض اس معرفت سے تم بندہ شکور کہلاؤ گے، چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مناجات کے دوران عرض کیا: یا اللہ! آپ نے آدم کو اپنے ہاتھ سے پیدا کیا ہے، پھر اس پر بے شمار احسانات کئے ہیں، اس نے آپ کا شکر کس طرح ادا کیا؟ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اس نے تمام امور کا مرجع مجھے قرار دیا، یہی اعتراف اس کا شکر تھا۔ اس سوال و جواب سے یہ

حقیقت اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ شکرگزاری کے لئے یہ معرفت ضروری ہے کہ تمام نعمتیں اللہ کی طرف سے ہیں، اگر اس معرفت میں ذرا بھی شک ہو تو نہ وہ نعمت کا حق ادا کرائے گا، اور نہ نعمت دینے والے کا، انسان کو صرف ظاہری منعم ہی پر بھروسہ نہ کرنا چاہئے، اور نہ اس پر اکتنا اترنا چاہئے، حقیقی منعم کا بھی دھیان رکھنا چاہئے، ورنہ علم کا نقصان لازم آئے گا، اور علم کے نقصان سے عمل کے نقصانات کا اندیشہ ہے۔

دوسری اصل۔ حال : یہ حال اصل نعمت کی معرفت سے حاصل ہوتا ہے، اسکے معنی ہیں خشوع و خضوع اور مجرود تواضع کی ہیئت کے ساتھ منعم سے خوش ہونا۔ یہ حال بھی شکر ہے، جیسا کہ معرفت کو شکر کہا گیا ہے، لیکن حال اسی وقت شکر کلائے گا جب اپنی تمام شرائط کو حاوی ہو گا۔ ان میں سے اہم ترین شرط یہ ہے کہ خوشی صرف منعم سے ہو، نہ نعمت سے ہو اور نہ انعام سے۔ غالباً تم یہ بات مشکل سے سمجھ پاؤ گے اس لئے ہم ایک مثال بیان کرتے ہیں۔ مثلاً ایک بادشاہ سفر کے لئے پہاڑ کا پہاڑ ہے، اس نے کسی شخص کو گھوڑا انعام میں بخشا، یہ شخص گھوڑا پا کر تین وجہ سے خوش ہو سکتا ہے۔ ایک وجہ یہ ہے کہ صرف انعام یعنی گھوڑے سے خوش ہو، یہ ایک قیمتی انعام ہے، اس پر اچھی طرح سواری کی جاسکتی ہے، اصل ہے، اور منشاء کے مطابق ہے، ظاہر ہے کہ خوشی صرف اس شخص کو ہو سکتی ہے جسے بادشاہ سے کوئی غرض نہ ہو، بلکہ اس کا مطمح نظر صرف گھوڑا ہو، بالفرض اگر اسے یہ گھوڑا جنگل میں ملا ہو تا تب بھی وہ اسی قدر خوش ہوتا۔ دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ وہ صرف گھوڑا پانے پر خوش نہ ہو، بلکہ اس لئے خوش ہو کہ یہ گھوڑا بادشاہ کی عنایات اور الطاف کی دلیل ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ بادشاہ کے دل میں اسکے لئے جگہ ہے۔ اگر اسے یہ گھوڑا کسی جنگل میں ملا ہوتا یا بادشاہ کے علاوہ کسی اور نے دیا ہو تا تو اسے ذرا خوشی نہ ہوتی، کیونکہ وہ گھوڑے کا محتاج نہیں ہے، یا وہ جس چیز کا محتاج ہے یعنی بادشاہ کے دل میں جگہ پانے کا وہ گھوڑے سے کہیں زیادہ بلند ہے، تیسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ وہ گھوڑا پا کر اس لئے خوش ہو کہ میں سوار ہو کر بادشاہ کی خدمت کروں گا، یا اس پر سفر کی مشقت برداشت کر کے بادشاہ کی قربت حاصل کروں گا، ہو سکتا ہے مسلسل محنت سے وزارت تک ترقی کر جاؤں یہ شخص شخص اس پر قانع نہیں ہے کہ بادشاہ کے دل میں اسکے لئے جگہ ہے، وہ اس عنایت کو زیادہ لائق اعتناء نہیں سمجھتا، بلکہ وہ تو اس قدر قربت کا طالب ہے کہ بادشاہ لوگوں کو جو کچھ بھی عطا کرے اسے ہی واسطہ بنائے، ظاہر ہے یہ مرتبہ صرف انتہائی قربی اور معتد لوگوں کو دیا جاتا ہے پھر وہ وزارت کا خواہاں بھی نہیں ہے بلکہ محض بادشاہ کی قربت، اس کا اعتماد اور اسکے مسلسل دیدار کا شرف چاہتا ہے، اگر اسے وزارت اور قربت میں اختیار دیا جائے تو وہ قربت اختیار کرے۔

یہ تین درجے ہیں، ان میں سے پہلے درجے میں تو کا کوئی پہلو سرے سے ہے ہی نہیں، اس لئے کہ اس کی تمام توجہات کا مرکز صرف گھوڑا ہے، وہ گھوڑا پا کر خوش ہے، اسے دینے والے سے کوئی غرض نہیں خواہ وہ بادشاہ ہے یا کوئی کم حیثیت آدمی۔ اسی طرح جو شخص نعمت پا کر اس کی لذت میں کھو جاتا ہے، اور اسے مطلب کے موافق پا کر خوش ہوتا ہے وہ بھی شکر سے بعید تر ہے، دوسرا درجہ شکر کے معنی میں داخل ہے، اس لحاظ سے کہ اس میں نعمت پانے والا نعمت دینے والے سے خوش ہے، لیکن یہ خوشی منعم کی ذات سے نہیں ہے، بلکہ اس اعتبار سے ہے کہ اس نے اپنی عنایت کا مستحق سمجھا، اس سے مستقبل میں بھی عنایت کی امید کی جاسکتی ہے یہ حال ان نیک بندوں کا ہے جو عذاب کے خوف اور ثواب کی امید میں اچھے عمل کرتے ہیں، اور شکر ادا کرتے ہیں مکمل شکر تیسرے درجے میں ہے۔ یعنی انعام پانے والے کا یہ سوچ کر خوش ہونا کہ میں اسے اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرنے کا وسیلہ بناؤں گا، اسکی ملامت یہ ہے کہ وہ دنیا سے خوش نہ ہو، بلکہ صرف اتنی دنیا پر قانع ہو جس کے بارے میں زبان رسالت سے یہ ارشاد ہوا ہے "اَللّٰهُنَّبَا اَمْرًا زَعَةً" (دنیا آخرت کی کھیتی ہے) اور جس سے دنیوی زندگی پر مدلل سکے، دنیا کی ان نعمتوں پر رنجیدہ ہو جو عبادت سے غافل کرتی ہیں، اور اسے حق کے راستے سے ہٹاتی ہیں، کیوں کہ نعمت اس حیثیت سے اس کا مقصود نہیں ہے کہ اس میں لذت ہے جس طرح گھوڑا پانے والا گھوڑے سے اس لئے خوش نہیں تھا کہ وہ اصل یا مبارک تھا، بلکہ وہ اسے بادشاہ کی خدمت میں پہنچنے کا وسیلہ سمجھتا تھا کہ وہ ہر وقت اسکے دیدار اور قربت کا شرف حاصل کرتا رہے۔ اسی لئے حضرت شبلیؒ نے ارشاد فرمایا کہ شکر منعم کا دیدار ہے، نعمت کا مشاہدہ نہیں ہے۔ خواص ارشاد فرماتے ہیں کہ عام لوگوں کو خورد و نوش کی اشیاء اور لباس پر شکر ادا کرنا چاہیے، اور خواص کو

واردات قلبی پر۔

یہ وجہ بلند وہ شخص حاصل نہیں کر سکتا جس کے نزدیک دنیا کی تمام لذتیں شکم اور شرمگاہ میں محصور ہو کر رہ گئی ہوں اور خواہ کاوانہ اور اک رنگ اور آواز تک محدود ہو، دل ہر لذت سے خالی، اور ہر اور اک سے نا آشنا ہو، اگر قلب صحیح ہو تو وہ صرف اللہ کے ذکر اس کی معرفت اس کی ملاقات سے لذت پاتا ہے، وہ قلب ان چیزوں سے لذت نہیں پاتا جو عادات کی خرابی کا شکار ہو، چنانچہ بعض لوگ مٹی کا ٹاپند کرتے ہیں یا بعض لوگوں کو میٹھی چیزیں ذرا نہیں بھاتیں بلکہ وہ تلخ چیزوں میں لذت پاتے ہیں۔

وَمَنْ يَكُفَّ حَافِيَةً مَرِيضٍ يَجْلُمُ زَايِدًا لِمَا عَالَمُ لَا لَا

(جس کی زبان ہی کڑی ہو وہ آب شیریں کو بھی کڑوا پاتا ہے)

اللہ تعالیٰ کی نعمت کا شکر اسی طرح ادا کرنا چاہیے جس طرح اوپر مذکور ہوا۔ اگر اس درجے میں شکر ادا نہ کر سکے تو دوسرے درجے پر قناعت کرنی چاہیے، پہلے درجے کی کوئی اہمیت نہیں ہے، دوسرے اور تیسرے درجے میں بھی بڑا فرق ہے، دوسرے درجے والے کا مطلوب بادشاہ ہے تاکہ گھوڑا دے، اور دوسرے درجے میں مطلوب گھوڑا ہے تاکہ اسے بادشاہ کی قربت کا وسیلہ بنا سکے۔ کتنا بڑا فرق ہو گا ان دونوں میں جن میں سے ایک اللہ کا طالب ہو اس لئے کہ وہ اس پر نعمتیں نازل کرے اور دوسرا نعمتوں کا طالب ہو تاکہ ان کے ذریعے اللہ تک پہنچ سکے۔

تیسری اصل۔ فرح کے بموجب عمل : شمع کی معرفت سے جو فرحت حاصل ہوتی ہے اس کے بموجب عمل کرنا یہ تیسری اصل ہے، یہ عمل دل، زبان اور اعضاء تینوں سے متعلق ہے۔ قلب کے عمل کے معنی یہ ہیں کہ بندہ خیر کا قصد کرے اور تمام مخلوق کے لئے خیر کا جذبہ پوشیدہ رکھے، زبان کے ذریعے عمل کا مطلب یہ ہے کہ ان حمیدات کے ذریعے جو شکر ہر دلالت کرتی ہوں اللہ کا شکر ادا کرے، اور اعضاء کے ذریعے عمل کے معنی یہ ہیں کہ اللہ کی نعمتوں کو اس کی اطاعت میں استعمال کرے، اور ان سے ترک معصیت پر مدد لے، چنانچہ آنکھوں کے ذریعے شکر یہ ہے کہ مسلمان کا ہر وہ عیب چھپائے جس پر نظر پڑ جائے، کانوں کا شکر یہ ہے کہ مسلمان کے ان تمام عیوب کی پردہ پوشی کرے جو سماعت کے ذریعے معلوم ہوں، زبان کے ذریعے شکر یہ ہے کہ ایسے الفاظ زبان سے نکالے جس سے اللہ تعالیٰ خوش ہو اگر اعضاء کو اس طرح استعمال کیا جائے تو ان نعمتوں کا شکر ادا ہوتا ہے، اور اسی کا حکم بھی دیا گیا ہے، چنانچہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص سے دریافت فرمایا کیا حال ہے؟ اس نے عرض کیا ٹھیک ہے، آپ نے دوسری بار یہی سوال کیا، اس نے پھر یہی جواب دیا۔ تیسری بار سوال کرنے پر اسے جواب دیا اللہ کا شکر ہے میں بخیر ہوں، اس پر آپ نے ارشاد فرمایا: هَذَا الَّذِي أَرَدْتُ مِنْكَ (طہرانی۔ تفسیر ابن عربی) یہ ہے وہ بات جو میں تم سے چاہ رہا تھا

سلف صالحین ایک دوسرے کی خیریت اس لئے دریافت کیا کرتے تھے کہ وہ جواب میں کلمہ شکر ادا کریں، اور ان کے نامہ اعمال میں شکر کی اطاعت کا اضافہ ہو جائے، کلمہ شکر زبان سے نکالنے والا اطاعت گزار ہے، اظہار شوق سے ان کا مقصد دیرا کاری نہیں تھا۔ جس شخص سے اس کا حال دریافت کیا جاسکتا ہے وہ جواب میں شکر بھی ادا کر سکتا ہے، شکوہ بھی کر سکتا ہے، اور خاموش بھی رہ سکتا ہے، شکر اطاعت ہے، شکایت بدترین معصیت ہے۔ اس فلام کی شکایت کے کیا معنی جس کے ہاتھ میں کچھ بھی نہیں ہے، اس ملک الملوک سے جس کے بغیر قدرت میں سب کچھ ہے۔ اگر بندہ معصیت پر اچھی طرح مہربان کر سکے، یا قضاء الہی پر قانع نہ ہو سکے، اور پست ہمتی اسے شکوہ بہ لب ہونے پر مجبور کر دے تو مناسب یہ ہے کہ وہ صرف اللہ تعالیٰ سے شکایت کرے، اس لئے کہ معصیت دینے والا بھی وہی ہے، اور معصیت دور کرنے والا بھی وہی ہے۔ فلام اگر اپنے آقا کے سامنے سرگول ہے تو یہ اس کے لئے عزت کی بات ہے۔ اپنی معصیت کا اظہار اس کے سامنے کرنا ہے تو اس میں بھی کوئی ذلت کی بات نہیں ہے، ذلت کی بات تو یہ ہے کہ فلام کسی دوسرے کے سامنے اپنی ذلت کا اظہار کرے، ہر خود بھی فلام ہے، اور عزت دینے پر قادر نہیں ہے، ارشاد خداوندی ہے۔

إِنَّ الْإِنْسَانَ لِرَبِّهِ لَكَنُفٍ ۚ قُلْ إِنَّمَا أَعِظُكُمْ عَلَىٰ أَنْفُسِكُمْ وَلَٰكُمُ الْوَسْطَىٰ ۚ

وَأَشْكُرُ وَاللَّهُ (پ ۲۰ ر ۳۰ آیت ۱۷)

تم خدا کو چھوڑ کر جن کو پوج رہے ہو وہ تم کو کچھ بھی رزق دینے کا اختیار نہیں رکھتے سو تم رزق خدا کے پاس سے تلاش کرو اور اسی کی عبادت کرو اسی کا شکر کرو۔

إِنَّ الَّذِينَ يَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ عِبَادًا مِمَّا لَمْ يَكُنْ لَهُمْ (پ ۲۰ ر ۳۰ آیت ۱۸)

واقعی تم خدا کو چھوڑ کر جن کی عبادت کرتے ہو وہ بھی تم ہی جیسے بندے ہیں۔

زبان سے شکر ادا کرنا بھی شکر ہے، روایت ہے کہ ایک وفد حضرت عمر ابن عبد العزیز کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ان میں سے ایک

نوجوان اپنی بات کہنے کے لئے کھڑا ہوا، آپ نے فرمایا پہلے تم میں سے وہ شخص بولے جو عمر میں سب سے بڑا ہو، اسکے بعد اس سے چھوٹا، یہاں تک کہ تمہارا نمبر آئے۔ اس نے عرض کیا امیر المؤمنین! اگر معاملہ عمر پر منحصر ہوتا تو مسلمانوں کا امیر کوئی ایسا شخص ہوتا جو عمر میں آپ سے بڑا ہوتا، آپ نے فرمایا اچھا تم ہی بولو! اس نے عرض کیا! ہم لوگ نہ مانگتے آئے ہیں اور نہ کسی خوف سے حاضر ہوئے ہیں، مانگنے کی ہمیں اس لئے ضرورت نہیں کہ آپ عدل پرور ہیں، عادل سے ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے، ہم تو اس لئے آئے ہیں کہ زبان کے ذریعے آپ کا شکر ادا کریں اور واپس چلے جائیں۔

شکر کی مختلف تشریحات : جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ شکر منعم کی نعمت کا متواضعانہ اعتراف ہے، ان کے پیش نظر بعض قلبی احوال کے ساتھ زبان کا اظہار ہے۔ جن کے نزدیک شکر محسن کے احسان کے حوالے سے اسکی تعریف کرنا ہے وہ صرف زبان کے اظہار کے قائل ہیں بعض لوگوں کے خیال میں شکر کے معنی یہ ہیں کہ بندہ ہر وقت مشاہدہ کے عالم میں رہے، اور منعم کی حرمت طوط رکھے۔ یہ تعریف شکر کے اکثر پہلوؤں کو محیط ہے، صرف زبانی عمل اس سے خارج ہو جاتا ہے۔ حمد و دعویٰ کے خیال میں شکر نعمت یہ ہے کہ آدمی شکر کرنے میں خود کو طفیلی جانے۔ اس قول میں اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ شکر میں معرفت بھی پائی جاتی ہے۔ حضرت جنیدؒ کے نزدیک شکر یہ ہے کہ تم اپنے آپ کو اس نعمت کا اہل نہ سمجھو، اس میں خاص طور پر قلب کے احوال کا لحاظ کیا گیا ہے، جن لوگوں کے اقوال یہ ہیں انھوں نے دراصل اپنے احوال کی عکاسی کی ہے۔ اسی لئے یہ اختلاف نظر آتا ہے۔ بعض مرتبہ ایک ہی شخص کے دو مختلف قول ملتے ہیں، دراصل یہ اختلاف حالتوں کے اختلاف پر مبنی ہے، بعض اوقات ان کا جواب اپنی موجودہ حالت کے پیش نظر ہوتا ہے، اور کبھی مسائل کی حالت ان کے سامنے ہوتی ہے، اور وہ اسی کو ملحوظ رکھ کر جواب دیتے ہیں، صرف اسی قدر جواب دیتے ہیں، جتنی اسے ضرورت ہوتی ہے، اسکی ضرورت سے زائد ایک لفظ نہیں بولتے۔ اس وضاحت سے ہمارا ہرگز یہ مقصد نہیں کہ ان پر طعن کیا جائے، بلکہ اگر انکے سامنے شکر کی یہ مختلف تشریحات پیش کی جائیں تو وہ ان کی بھی تصدیق کریں گے، کسی بھی صاحب بصیرت سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ شکر کی ان مختلف تعریفوں میں سے کسی تعریف کا انکار کرے گا، اگر کوئی نزاع ہوا بھی تو وہ صرف لفظی ہو گا۔ لفظ شکر وضع کے اظہار سے ان تمام معانی کو شامل ہو گا یا صرف بعض معانی کو باظہار مقصود شامل ہو گا اور باقی کو توابع اور لوازم کی حیثیت سے یہاں ہم لغوی تحقیقات بیان نہیں کرنا چاہتے، کیونکہ حقیقی نعمت کا تعلق علوم آخرت سے نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ کے حق میں شکر کے معنی کی وضاحت

ہو سکتا ہے تمہارے دل میں یہ خیال آئے کہ شکر ایسی جگہ متصور ہونا چاہئے جہاں منعم کو شکر سے کوئی فائدہ ہو، مثال کے طور پر ہم دنیا کے بادشاہوں کا شکر کرتے ہیں، اور اسکے لئے متعدد طریقے اختیار کرتے ہیں، ان میں سے ہر طریقے میں بادشاہ کا کوئی نہ کوئی فائدہ مضمر ہوتا ہے۔ مثلاً تعریف کے ذریعے شکر کرتے ہیں، اس میں بادشاہوں کا فائدہ یہ ہے کہ عوام کے دلوں میں ان کے لئے جگہ زیادہ ہوتی ہے، اور مخلوق میں ان کے جود و کرم کی تفسیر ہوتی ہے، اس طرح ان کی شہرت اور جاودہ مرتبے میں اضافہ ہوتا ہے، شکر کے لئے ایک طریقہ ہم یہ اختیار کرتے ہیں کہ ان کی خدمت اہتمام دیتے ہیں، اس میں بعض اغراض پر ان کی اعانت ہے، تیسرا طریقہ یہ

ہے کہ غلاموں اور خادموں کی طرح ان کے سامنے کھڑے ہوتے ہیں۔ یہ صورت ان کے جتنے کی تقویت اور جاہ میں اضافے کا باعث ہے۔ فرضیکہ شکر کا کوئی طریقہ اختیار کیا جائے اس کا کچھ نہ کچھ فائدہ ضرور ہوگا۔ یہ تمام فوائد دو وجہوں سے اللہ تعالیٰ کے حق میں محال ہیں۔ ایک وجہ تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ حظوظ اور اغراض سے منزہ، خد مت، حاجت، اعانت، تعریف و توصیف کے ذریعے جو دو کرم کی تشییر، خدام کی دست بستہ حاضری، ان کے رکوع و سجود، معاونین و انصار کی کثرت سے بے نیاز ہے، اس صورت میں اللہ تعالیٰ کے لئے ہمارا شکر کرنا ایسا ہے جیسے ہم اپنے معصوم بادشاہوں کا شکر ادا کرنے کے لئے گھروں میں گھس جائیں، اور بند دروازوں کے پیچھے سجود رکوع میں مشغول رہیں ظاہر ہے نہ اس سے بادشاہ کو معلوم ہوگا، اور نہ وہ کوئی فائدہ اٹھائے گا، اسے علم غیب نہیں ہے کہ وہ ہمارے گھریلو احوال سے واقف ہو۔ دوسری وجہ اللہ تعالیٰ کے لئے شکر نہ ہونے کی یہ ہے کہ اپنے اختیار سے جس قدر اعمال ہم انجام دیتے ہیں، وہ بھی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے۔ چنانچہ ہمارے اعضاء، ہماری قدرت، ارادہ و داعیہ اور وہ تمام امور جو ہماری حرکت کے اسباب ہیں اور خود ہماری حرکت یہ سب چیزیں اللہ تعالیٰ کی نعمت ہیں بھلا ہم اسکی نعمت سے اس کی نعمت کا شکر کس طرح ادا کریں؟ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی بادشاہ نے تمہیں ایک گھوڑا دیا، اور تم نے اسی کا گھوڑا لیکر اسپر سواری شروع کر دی یا دو سرا گھوڑا بھی اسی بادشاہ نے عطا کیا، ظاہر ہے اس صورت میں دو سرا گھوڑا پہلے گھوڑے کا شکر نہ ہوگا، بلکہ تمہارے لیے دو کھوٹوں کا شکر ادا کرنا ضروری ہوگا پھر اس دوسری نعمت کا شکر ادا کرنا بھی ضروری ہوگا۔ وہ شکر بھی ایک نعمت میں مجسم ہوگا، اسی طرح تیسری نعمت کے لئے چوتھی نعمت ہوگی یہ سلسلہ یونہی دراز سے دراز تر ہوتا رہے گا معلوم ہوا کہ ان دونوں وجوہات کی بنا پر اللہ تعالیٰ کے حق میں شکر محال ہے۔ اور ہمیں ان دونوں وجہوں کی صحت میں بھی کوئی شک نہیں ہے، کیونکہ شرع میں ان دونوں کا ثبوت ملتا ہے۔ کوئی ایسی صورت ہونی چاہیے کہ شکر بھی ادا ہو جائے اور ان دونوں وجہوں کی بنیاد پر جو اشکال لازم آ رہا ہے وہ بھی باقی نہ رہے۔

جاننا چاہیے کہ یہ اشکال جو تمہیں پیش آ رہا ہے حضرت داؤد علیہ السلام کو بھی پیش آیا تھا، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھی، ان دونوں تنبیہوں نے باری تعالیٰ کی جناب میں عرض کیا تھا الہا! ہم تیرا شکر کس طرح ادا کریں، کیونکہ جب بھی تیرا شکر ادا کریں گے تیری نعمتوں سے کریں گے، ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ ہمارا شکر تیری دوسری نعمت ہے اس پر بھی شکر ادا کرنا واجب ہے۔ اسکے جواب میں اللہ تعالیٰ نے وحی نازل فرمائی کہ اگر تم یہ بات جان گئے ہو تو تم نے شکر ادا کر دیا، دوسری روایت میں وحی کے یہ الفاظ بیان کئے گئے ہیں کہ اگر تم یہ بات جان گئے کہ نعمت میں نے عطا کی ہے تو میں تم سے شکر کے بدلے میں اس بات سے خوش ہوا۔

یہاں تم یہ کہہ سکتے ہو کہ جہاں تک انبیاء کرام علیہم السلام کے سوال کا تعلق ہے وہ ہم سمجھ گئے ہیں، لیکن وحی کے ذریعے جو جواب دیا گیا وہ ہم اپنے قصور فہم کے باعث سمجھ نہیں سکے، یعنی یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آسکی کہ خدا تعالیٰ کی جناب میں شکر کو محال سمجھنا شکر کیسے ہے، کیونکہ اسے محال سمجھنا بھی ایک نعمت ہے، یہ نعمت ہے، یہ نعمت شکر کس طرح بن جائے گی، اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ آدمی شکر ادا کرے بغیر شکر گزار کہلا سکتا ہے، یا جو شخص بادشاہ سے دوسری نعمت قبول کر لے وہ پہلی نعمت کا شکر کہلانے کا مستحق ہے۔ یہ ایک عجیبہ بات ہے، اور بظاہر ناقابل فہم ہے، اگر کسی مثال کے ذریعے اسے سمجھایا جائے تو شاید سمجھ میں آجائے، ویسے بھی اسکا سمجھنا بے حد ضروری ہے۔

جاننا چاہیے کہ یہ بحث معارف کے دروازہ پر دستک دینے کے حوالہ ہے، جو علوم معاملہ میں سرفہرست ہے، یہاں ان علوم کا بیان مناسب نہیں ہے، تاہم بطور اشارہ کچھ بیان کئے دیتے ہیں۔

نظریۂ وحدت یا فناء نفس : اس سلسلے میں دو اقہارات ہیں، ایک اقہار کا نام نظریۂ وحدت ہے۔ اس نظریے کے جو لوگ کامل ہیں ان کے نزدیک شاکر اور مقصور محبوب اور محبوب دونوں ایک ہی وجود کے دو نام ہیں، ان کے خیال میں اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی موجود ہی نہیں ہے۔ کُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ (پ ۲۰ آیت ۸۸) سب چیزیں فنا ہونے والی ہیں، بجز اس کی ذات کے۔ ان کے دل کی آواز ہے، یہ نظریۂ حقیقت پر مبنی ہے، اس میں الہی اور ابدی دونوں طرح کی صداقتیں موجود ہیں۔ اس لئے کہ

اللہ کے سوا اس ذات کا وجود ہو سکتا ہے جو بذات خود قائم ہو اور اس طرح کی کوئی ذات نہیں بلکہ اس کا وجود محال ہے وجود حقیقی صرف وہ ہے جو اپنی ذات سے قائم ہو جو اپنی ذات سے قائم نہ ہو اس کا وجود ذاتی نہ ہوگا بلکہ غیر کے ساتھ وابستہ ہوگا یہاں تک کہ اگر صرف اسکی ذات کا اعتبار کیا جائے اور غیر کی طرف التفات نہ کیا جائے تو اس کا وجود یقینی نہ ہوگا۔ موجود وہ ہے جو اپنی ذات سے قائم ہو اور ذات سے قائم وہ وجود ہے کہ اگر اس کا غیر معدوم ہو جائے تو اس کے وجود پر اثر نہ پڑے۔ اگر کوئی ایسا وجود ہے جو اپنی ذات سے قائم ہو اور غیر کا وجود بھی اسکی ذات سے قائم ہو تو اس کو قوم کہتے ہیں اور قوم اس ذات واحد کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا اس لئے کہ وہ حی قوم ہوگا یہ وصف صرف ذات واحد کا ہے۔ اگر تم نقطہ نظر سے دیکھو تو یہ بات واضح ہے کہ تمام چیزوں کا مصدر اور مرجع وہی ایک ذات واحد ہے۔ اس لئے وہی شاکر ہے وہی مشکور ہے وہی محب ہے اور وہی محبوب ہے چنانچہ حبیب ابن حبیب نے جب یہ آیت تلاوت کی۔ اِنَّا وَجَدْنَاهُ حَاصِرًا نِعْمَ الْعَبْدُ اِنَّا اَوْبَ (پ ۲۳ آیت ۴۲) بے شک ہم نے ان کو صابہ پایا اچھے بندے تھے بہت رجوع ہوتے تھے۔

تو فرمایا سبحان اللہ! اس قدر حیرت کی بات ہے اسی نے مبرکی طاقت بخشی اور وہی تعریف کرتا ہے گویا اس نے اپنی تعریف کی ہے وہ خود ہی تعریف کرنے والا ہے اور سچ ابو سعید المہسنی کے سامنے یہ آیت تلاوت کی گئی۔

وَيُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ (پ ۲ ر آیت) اور وہ ان سے محبت کرتا ہے اور وہ ان سے محبت کرتے ہیں۔

انہوں نے کہا بلاشبہ وہ انہیں چاہتا ہے اسے چاہنے دو وہ حق کو چاہتا ہے اس لئے کہ وہ خود اپنی ذات کو چاہتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ وہ محبت بھی ہے اور محبوب بھی ہے یہ ایک عالی مرتبہ ہے تم اسے کسی ایسی مثال کے ذریعے سمجھ سکتے ہو جو تمہاری حد عقل سے قریب تر ہو۔ اور وہ مثال یہ ہے کہ جب کوئی مصنف اپنی تعریف پسند کرتا ہے تو اس کے بارے میں یہی کہا جاتا ہے کہ اس نے اپنا نفس پسند کیا ہے اسی طرح جب کوئی صالح اپنی صنعت کو پسند کرتا ہے تو گویا اپنے نفس کو پسند کرتا ہے یا کوئی باپ اس حیثیت سے اپنے بیٹے کو پسند کرتا ہے تو وہ اس کی اولاد ہے تو گویا اپنی ذات کو پسند کرتا ہے۔ دنیا میں اللہ تعالیٰ کے سوا جتنی بھی چیزیں ہیں وہ سب اللہ تعالیٰ کی تعریف اور اسکی تخلیق ہیں اگر وہ اپنی تعریف یا تخلیق سے محبت کرتا ہے تو گویا اپنی ذات سے محبت کرتا ہے۔ یہ نظریہ توحید کی تفصیل ہے حضرات صوفیاء اسے فنائے نفس سے تعبیر کرتے ہیں اس کے معنی یہ ہے کہ بندہ اپنی ذات سے اور ماسوی اللہ سے فنا ہو گیا وہ ہر طرف ذات حق کا مشاہدہ کرتا ہے جو محض یہ حقائق نہیں سمجھتا وہ اس کا انکار کرتا ہے اور کہتا ہے آوی فنا کس طرح ہو گیا چار گز لہا سایہ رکھتا ہے دن بھر میں کلو دو کلو آٹا کھا جاتا ہے جاں اپنی جمالت کے باعث فنائے نفس کے دعویٰ پر ہنستے ہیں بے چارے عارفین کی قسمت میں یہی ہے کہ جاں ان کا کلام نہیں سمجھتے ان کی ہنسی اڑاتے ہیں اور ان کے سینے طرے کے تیروں سے چھلنی کرتے ہیں قرآن کریم نے اسکی طرف اشارہ کیا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰخَرُوْا كَانُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَضْحَكُوْنَ وَاِذَا مَرُّوْا بِهِمْ يَتَغَامَرُوْنَ وَاِذَا اُنْقَلَبُوْا اِلَىٰ اَهْلِهِمْ اُنْقَلَبُوْا فَاَفْكِهِمْ وَاِذَا رَاوْهُمْ قَالُوْا اِنَّ هٰؤُلَاءِ لَصَالَتُوْنَ وَمَا اَرْسَلُوْا عَلَيْهِمْ خٰفِظِيْنَ (پ ۲۸ آیت ۲۹ تا ۳۳)

جو لوگ ہجرم تھے وہ ایمان والوں سے (تحقیر) ہنسا کرتے تھے اور یہ جب ان کے سامنے سے گزرتے تھے تو آپس میں آنکھوں سے اشارے کرتے تھے اور جب اپنے گھروں میں جاتے تھے تو دل لگیاں کرتے اور جب ان کو دیکھتے تو یوں کہا کرتے کہ یہ لوگ یقیناً غلطی میں ہیں حالانکہ یہ لوگ ان پر نگرانی کرنے والے بنا کر نہیں بھیجے گئے۔

ایک جگہ عارفین کی تسل کے لئے ارشاد فرمایا۔

فَالْيَوْمَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنَ الْكُفَّارِ يَضْحَكُوْنَ (پ ۲۸ آیت ۳۳)

طوفان نوح سے پہلے حضرت نوح علیہ السلام نے ایک لمبی چوڑی کشتی بھائی شہر کی توان کی قوم نے ہنسی اڑائی، حضرت نوح علیہ السلام نے فرمایا تم ہماری ہنسی اڑاتے ہو، ہم بھی تمہاری ہنسی اڑائیں گے۔

كُلِّمَ مِنْ عَلَيْهَا فَإِنْ وَبِقِي وَجَعَلْتُمْ كَذِبًا جَلِيلًا وَالْأَكْرَامِ (٢٤-٢٦ آيت)

دوسری قسم میں جو لوگ ہیں وہ دونوں آنکھوں سے اندھے نہیں ہیں، بلکہ کانے ہیں، یعنی ایک آنکھ سے موجود حقیقی کا وجود دیکھتے ہیں، اس کا انکار نہیں کرتے، کیونکہ دوسری آنکھ میں ذرا بیٹائی نہیں اس لئے وہ یہ نہیں دیکھتے کہ موجود حقیقی کے سوا جتنے بھی مصنوعی وجود ہیں وہ سب فنا ہونے والے ہیں، اس لئے وہ اللہ کے ساتھ دوسرے وجود بھی مانتے ہیں، یہ مشرک ہیں، اس سے پہلی قسم کے لوگ منکر تھے، اگر آدمی اندھا نہ ہو صرف چند ماہ تو دونوں موجودوں میں فرق کر سکتا ہے، اور اسی فرق کی بنیاد پر ایک کو رب اور دوسرے کو بندہ کہہ سکتا ہے، اور اسی فرق کے اثبات اور ایک وجود کو رب اور ایک کو عبد ماننے سے آدمی توحید کی حدود میں داخل ہو جاتا ہے، پھر اگر وہ آنکھوں میں سرمہ لگائے، اپنی بیٹائی بڑھائے اور چند ماہین دور کرے تو جس قدر آنکھوں کا نقص دور ہو گا اسی قدر وہ اللہ کے سوا دوسرے وجود سے انکار کرے گا، جب نظریا ناکل ٹھیک ہو جائے اور آنکھ میں کوئی عیب باقی نہ رہے تو اسی ذات واحد کی سوا کوئی وجود نظر نہ آئے گا، اس وقت کہا جائے گا کہ وہ محض موجد کامل بن چکا ہے۔ توحید کی ابتدا اور انتہا کے درمیان بے شمار درجات ہیں، ان ہی درجات کی بنیاد پر موجدین کے درجات بھی متفاوت ہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء علیہم السلام پر جو کتابیں نازل فرمائی ہیں وہ سرمہ ہیں جن سے نور بڑھایا جاتا ہے۔ اور انبیاء علیہم السلام سرمہ لگانے والے ہیں۔ یہ حضرات اللہ کے بندوں کو اس توحید کی دعوت دیتے ہیں جو کلمہ لا الہ الا اللہ میں مضمر ہے، اس کلمے کے معنی ہیں کہ وجود حق کے سوا کوئی وجود نظر نہ آئے کمال توحید تک پہنچنے والے لوگ بہت کم ہیں، مشرک اور منکر بھی زیادہ نہیں ہیں یہ لوگ توحید کے انتہائی درجے کے بالکل مقابل درجے پر ہیں، کیونکہ یہ بت پرست ہیں، اور اپنی بت پرستی کی یہ توجیہ کرتے ہیں۔

مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللَّهِ زُلْفَى (پ ۲۳، ۱۵، ۲۰، ۳)

ہم تو ان کی پرستش صرف اس لئے کرتے ہیں کہ ہم کو خدا کا مقرب بنادیں۔

یہ لوگ ابواب توحید کے اوائل میں داخل ہیں، درمیان میں لوگ زیادہ ہیں، ان میں وہ لوگ بھی ہیں، جن کی بصیرت کے درجے کبھی کبھی کھل جاتے ہیں، اور ان پر توحید کے حقائق منکشف ہو جاتے ہیں، لیکن یہ انکشاف ایسا ہوتا ہے، جیسے آسمان میں بجلی سی لپک

جائے یہ انکشاف دریا نہیں ہوتا۔ بعض لوگوں کیلئے توحید کے حقائق منکشف ہوتے ہیں، اور کچھ دیر تک انکشاف حق کی کیفیت رہتی ہے لیکن دائمی نہیں ہوتی۔

لِكُلِّ إِلَى شَأْنٍ الْعَلَا حَرَكَاتٍ وَلَكِنْ عَزَّ وَفُيَ التَّجَالِ ثَبَاتٍ
(ترجمہ۔ بلندی کی طرف سب ہی حرکت کرتے ہیں لیکن وہ لوگ مدت کم ہیں جنہیں اس میں ثبات ہو
رسول خدا کی توحید: جب اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم دیا۔
وَاسْجُدُوا فَقَرَّبَ (پ ۳۳ آیت ۱۹)
اور نماز پڑھتے رہنے اور قرب حاصل کرتے رہنے۔

تو آپ نے سجدہ کیا اور یہ دعا کی۔

أَعُوذُ بِعَفْوِكَ مِنْ عِقَابِكَ وَأَعُوذُ بِرِضَاكَ مِنْ سَخَطِكَ وَأَعُوذُ بِكَ مِنْكَ
لَا أَحْصِي ثَنَاءً عَلَيْكَ أَنْتَ كَمَا أَتَيْنَيْتَ عَلَيَّ نَفْسِيكَ (سلمہ مائتہ بفرق سیم)

میں پناہ چاہتا ہوں تیرے عذاب سے تیرے عفو کی، اور پناہ چاہتا ہوں تیری ناراضگی سے تیری رضا کی، اور پناہ چاہتا ہوں تجھ سے تیری عیب کی تعریف کا احاطہ نہیں کر سکتا تو ایسا ہے جیسی تو نے اپنی تعریف کی ہے۔
اس دعا کا پہل جملہ ”أَعُوذُ بِكَ بِعَفْوِكَ مِنْ عِقَابِكَ“ اس بات کی دلیل ہے کہ اولاً ”سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے افعال خداوندی پر نظر فرمائی، اور انہی کے حوالے سے اپنی دعا کا آغاز فرمایا، یعنی اس کے فعل سے اسی کے فعل کی پناہ مانگی، پھر اس درجے سے ترقی کی، اور افعال کے معذور کا حوالہ دیا، یعنی صفات ذکر فرمائیں اور یہ دعا کی ”أَعُوذُ بِرِضَاكَ مِنْ سَخَطِكَ“ رضا اور عفو دونوں صفتیں ہیں۔ اس درجے کو بھی توحید میں نقصان کا باعث تصور کیا، کچھ اور قریب ہوئے، کچھ اور ترقی کی، اور مشاہدہ صفات سے مشاہدہ ذات تک تجاوز فرمایا، اور دعائیں یہ کلمات ادا فرمائے ”أَعُوذُ بِكَ مِنْكَ“ اس میں صرف ذات حق ملحوظ ہے۔ کسی صفت کا حوالہ نہیں ہے، پھر اس میں بھی اپنے وجود کا اظہار تھا، دنیا کے طلب گار تھے، اُسے بھی توحید کے لئے باعث نقص سمجھتے ہوئے، آگے بڑھے، اور عرض کیا ”لَا أَحْصِي ثَنَاءً عَلَيْكَ أَنْتَ كَمَا أَتَيْنَيْتَ عَلَيَّ نَفْسِيكَ“ اس میں پہلا جملہ آپ کے فائے نفس، اور مشاہدہ نفس سے تجاوز کی خبر ہے، اور دوسرے جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ شاگرد، اور لائق شاگردوں ایک ہی ذات ہیں، انکے سوا جو کچھ ہے اس کا مصدر بھی وہی ہے، مرجع بھی وہی ہے، وہی ہوتی رہنے والا ہے، انکے سوا ہر وجود فنا کے دروازے پر دستک دے رہا ہے۔

موجودین کے مقامات جہاں ختم ہوتے ہیں وہاں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مقام توحید کی ابتدا کی، یعنی پہلے ہی مرحلے میں آپ کی یہ کیفیت ہوئی، سوائے افعال خدا کے اور کچھ آپ کو نظر نہ آیا، آپ کے مقام کی امتحانات حق تک پہنچ کر ہوئی، سوائے ذات حق کے کوئی شئی آپ کے مشاہدے میں نہیں رہی، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک درجے سے دوسرے درجے تک ترقی فرماتے ہیں تو پہلے درجے کو دوسرے کی نسبت ناقص، اور توحید کے لئے باعث نقصان تصور فرماتے، اور پہلے درجے سے استغفار فرماتے، چنانچہ ایک حدیث میں اسی امر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

أَتَلَبَّيْغَانِ عَلَى قَلْبِي حَتَّى اسْتَغْفَرَ اللَّهُمَّ الْيَوْمَ وَاللَّيْلَةَ سَبْعِينَ مَرَّةً (۱)

میرے قلب پر میل آجاتا ہے، یہاں تک کہ میں اللہ تعالیٰ سے رات دن میں ستر مرتبہ استغفار کرتا ہوں۔

ستر کا عدد اس لئے ذکر فرمایا کہ آپ ہر روز ستر درجے ترقی فرماتے تھے، ان میں سے ہر درجہ اپنے سابقہ درجے سے اعلا ہوتا تھا۔ ان میں سے پہلا درجہ بھی مخلوق کی پہنچ سے باہر تھا، لیکن آپ کی نظر میں وہ بھی نقصان کا باعث تھا، اس لئے آپ اس سے استغفار فرماتے، اور دوسرے درجے پر قدم رکھتے تھے، ایک مرتبہ حضرت عائشہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ! کیا اللہ تعالیٰ نے آپ کے اگلے پچھلے گناہ معاف نہیں فرمادئے؟ پھر آپ سجدوں میں اس قدر کیوں دوبا کرتے ہیں؟ اور اس قدر توبہ کیوں اٹھاتے ہیں؟ آپ نے ارشاد فرمایا کیا میں شکر گزار بندہ نہ ہوں؟ (۲)

(۱) یہ روایت کتاب التوبہ میں گزری ہے (۲) مسلم، موطا، بخاری و مسلم، معجم ابن عبد

اسکے معنی یہ ہیں کیا میں مقامات میں زیادتی کا طالب نہ ہوں۔ اس لئے کہ شکر زیادتی کا سبب ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے :-

لَنْ يَشْكُرَ لَكُمْ وَلَآ زَنْدُكُمْ (پ ۳۳ ر ۳۳ آیت ۷) اگر تم شکر کرو گے تو تم کو زیادہ نعمت (دوں گا)۔

مقصد کی طرف رجوع : اب تک ہم علوم مکاشفہ کے بحر پیدائش میں غوطہ زن تھے، اب کلام کی عتاق اپنے اصل موضوع یعنی علوم معاملہ کی طرف موڑتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا مقصد یہ تھا کہ وہ مخلوق کو کمال توحید کی طرف بلائیں، لیکن جو راہ کمال توحید تک پہنچاتی ہے اس میں بے شمار رکاوٹیں ہیں، اور بڑی طویل اور جاں نسیں مسافت ہے، شریعت اس سخت راہ پر چلنے، اور یہ صبر آزا مسافت طے کرنے کا طریقہ بتلاتی ہے، اس دوسرے نقطہ نظر کے مطابق شاکر اور مشکور، محب اور محبوب جدا جدا ہیں، رہا یہ سوال کہ شکر سے اللہ تعالیٰ کو کیا فائدہ ہوتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو کوئی فائدہ نہیں ہوتا، یہ خالص بندوں کے منفعت کی بات ہے۔ اس بات کو ہم ایک مثال کے ذریعے سمجھاتے ہیں، فرض کرو کوئی بادشاہ اپنے کسی غلام کو جو کسی دور دراز علاقے میں مقیم ہے سواری، لباس اور زاد راہ بھجواتا ہے، تاکہ وہ سفر کے دربار شاہی سے قریب ہو جائے، اسے اپنے قریب کرنے کے سلسلے میں بادشاہ کی ودعائیں ہو سکتی ہیں، ایک تو یہ کہ اسے بلانے کا مقصد یہ ہو کہ وہ اس کی خدمت انجام دے گا، اور کسی مہم میں شریک ہو کر سلطنت کی پابنداری کا باعث بنے گا، دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ بادشاہ کا اپنا فائدہ کچھ نہ ہو، اور نہ وہ کوئی ایسی خدمت انجام دینے کے قابل ہو جس سے بادشاہ کو بے فکری ہو جائے، غرضیکہ وہ ایک ایسا وجود ہے جس سے نہ سلطنت میں چاند لگیں، نہ کوئی کمی واقع ہو، ایسی صورت میں اگر بادشاہ اسے سواری، لباس اور زاد راہ فراہم کرتا ہے تو یہ اس کی عنایت خسروانہ ہے، مقصد صرف یہ ہو سکتا ہے کہ وہ ان وسائل کو قریب تر ہونے کے لئے استعمال کرے، اور ماضی کی سعادت سے مشرف ہو، بادشاہ کو اپنا نفع مقصود نہیں ہے۔ بندوں کا حال بھی یہی ہے جو کچھ انھیں اللہ کی طرف سے حاصل ہوتا ہے وہ خود ان کے درجات کی بلندی کے لئے ہے، خود اس کا کوئی فائدہ نہیں۔

مفروضہ مثال کی پہلی صورت میں بادشاہ کے پاس چلے آنے سے بندہ شاکر نہیں ہو سکتا، جب تک وہ خدمت نہ بجالائے، جو اس سے لینی مقصود ہے۔ دوسری صورت میں اگرچہ بادشاہ کو خدمت کی ضرورت نہیں، لیکن بندہ پھر بھی شاکر یا کافر ہو سکتا ہے، شکر گزاری کی صورت یہ ہے کہ بادشاہ نے جن انعامات سے اسے نوازا ہے انھیں اسکے پسندیدہ معارف میں استعمال کرے، اپنی مرضی کے مطابق خرچ نہ کرے، اور کفر کی صورت یہ ہے کہ بادشاہ کی عطا کردہ نعمتوں کو ایسی جگہوں پر صرف کرے جو بادشاہ کو پسند نہیں ہیں، یا ایسے سفر میں خرچ کرے جو بادشاہ سے دور کرنے والا ہے چنانچہ اگر غلام نے بادشاہ کا عطا کردہ لباس پٹنا، گھوڑے پر سوار ہوا، اور زاد راہ صرف راہ میں خرچ کیا تو کہا جائے گا کہ اس نے اپنے آقا کا شکر ادا کیا ہے، کیونکہ اس نے ان چیزوں کو آقا کے پسندیدہ کاموں میں صرف کیا ہے، یعنی ان کاموں میں جو خود غلام کے لئے پسند تھے، اپنے لئے پسند نہیں تھے، اور اگر لباس شاہی زیب تن کرے اور سواری پر سوار ہو کر راہ میں چلا، لیکن اس راہ کا انتخاب کیا جو بادشاہ کی مخالف سمت میں ہے، اور اسے بادشاہ سے قریب تر کرنے کے بجائے بعید تر کرتی ہے تو کہا جائے گا کہ اس نے کفران نعمت کیا، کیونکہ اس نے ان نعمتوں کو اپنے آقا کی مرضی کے خلاف اس مقصد میں خرچ کیا جو اس نے خود اسکے لئے پسند کیا تھا، نہ کہ اپنے لئے پسند کیا تھا۔ اسی طرح وہ شخص بھی کفران نعمت کا مرتکب ہے جو بادشاہ کے عطایا سے فائدہ نہ اٹھائے اور انھیں بیکار پڑا رہنے دے، نہ لباس پہنے، نہ سواری پر سوار ہو، نہ راستے کا زاد سفر لے کے چلے، اس شخص کا کفر پہلے کی بہ نسبت کم ہے۔

یہی حال مخلوق کا ہے، اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا فرمایا، ابتداء میں یہ شہوات کے استعمال کے محتاج ہیں، تاکہ ان کے جسم تکمیل پائیں، شہوات کے استعمال سے وہ قرب الہی سے بعید ہو جاتے ہیں، جب کہ ان کی سعادت صرف قربت میں ہے اس لئے ان کے لئے ایسی نعمتیں بھی پیدا فرمائیں جو انھیں اللہ تعالیٰ سے قریب کرتی ہیں اور ان کے استعمال کی قدرت بھی پیدا فرمائی، قرآن کریم نے انسانوں کے بعد و قرب کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے :-

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ (پ ۳۰ ر ۲۰ آیت ۴)

ہم نے انسان کو بہت خوبصورت سہانے میں ڈھالا ہے۔
 ثُمَّ رَحْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَلَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ
 مَمْنُونٍ (پ ۲۰۳۰ آیت ۶۵)

پھر ہم اس کو بہت سی کی حالت والوں سے بھی بہت تر کر دیتے ہیں (ان میں سے جو یو ڈھال دیا جاتا ہے) لیکن جو
 لوگ ایمان لائے اور اچھے کام کئے تو ان کیلئے اس قدر ثواب ہے جو کبھی منقطع نہ ہوگا۔

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ایسے آلات ہیں جن کے ذریعے بندہ اسفل السافلین سے ترقی کر کے سعادت کے
 درجے تک پہنچ سکتا ہے، اللہ تعالیٰ نے یہ آلات بندوں کے لئے پیدا کئے ہیں، اسے اس کی پودا نہیں کہ بندہ اس کے قریب ہوتا ہے۔
 تاہم بندے کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ چاہے تو ان آلات سے اطاعت پر مدد لے، اور چاہے تو معصیت پر، اطاعت کرے گا تو شکر
 گزار کھلائے گا، کیونکہ اس نے اپنے آقا کی رضا چاہی ہے، معصیت کا مرتکب ہو گا تو کافر کھلائے گا، کیونکہ اس نے ان امور کا
 ارتکاب کیا ہے جو اسکے آقا کو پسند نہیں ہیں۔ قرآن کریم میں ارشاد فرمایا :-

وَلَا يَرْضَىٰ لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ (پ ۲۳۵ آیت ۶) اور وہ اپنے بندوں کے لئے کفر پسند نہیں کرتا۔

اگر بندے نے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو معطل رکھا، نہ انھیں طاعت میں استعمال کیا اور نہ معصیت میں، یہ بھی کفرانِ نعمت ہے، دنیا
 میں جتنی بھی چیزیں پیدا کی گئی ہیں وہ بندوں کے لئے آلات کے حکم میں ہیں، ان کے ذریعے بندہ کو آخرت کی سعادت، اور اللہ تعالیٰ
 کا قرب حاصل ہو سکتا ہے۔ ہر مصلحت اپنی اطاعت کے بہ قدر اللہ کی نعمت کا شکر ہے، اور ہر وہ شخص جس نے نعمتیں استعمال نہیں کیں،
 یا ہر وہ گناہ گار جس نے بعد کی راہ میں انھیں استعمال کیا کافر ہے، اور غیر خدا کی محبت میں تجاوز کرنے والا ہے، معصیت اور اطاعت
 دونوں مشیت کی پابند ہیں، لیکن محبت و کراہت مشیت سے الگ ہیں، یہ تقدیر کی بحث ہے، اس لئے ہم موضوع پر زیادہ کلام نہیں کرتا
 چاہے تقدیر کا راز انشاء کرنے کا حکم نہیں ہے۔

فعل۔ عطاۓ خداوندی : اس تفصیل سے دونوں اشکال حل ہو جاتے ہیں۔ جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ شکر سے ہماری
 مراد یہ ہے کہ اللہ کی نعمت کو اس طرح خرچ کیا جائے جس طرح اسے پسند ہو، چنانچہ اگر اللہ تعالیٰ کی نعمت اسی کے فعل سے اسکی
 پسندیدہ جگہ صرف ہوئی تو مراد حاصل ہے۔ آدمی کا فعل اللہ تعالیٰ کی عطا ہے، کیونکہ تم اس فعل کے محل ہو اس لئے تمہاری تعریف کی
 جاتی ہے اور ثناء اسکی دوسری نعمت ہے جس سے تمہیں نوازا گیا ہے، اسی نے ثنائی، اسی کے دو کاموں میں سے ایک کام اس امر کا
 باعث بنا کہ دوسرا فعل محبت کی جہت میں ہو، بہر حال اسکے لئے ہر حالت میں شکر ہے اور تم شاکر کے وصف سے متصف ہو جس کا
 مطلب یہ ہے کہ اس معنی کے محل ہو جسے شکر کہتے ہیں، یہ مطلب نئی کہ تم اپنی لئے وصف کے موجد ہو، یہ ایسا ہی ہے جیسے تمہیں عالم
 اور عارف کہا جائے، کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہاری بھی کچھ حیثیت ہے، یہ حیثیت بھی اس لئے ہے کہ جس نے تمہیں بنایا ہے اسی
 نے تمہارے لئے حیثیت بھی بنائی ہے، اگر کوئی یہ گمان کرتا ہے کہ مجھے اپنی ذات یا وصف کی بنا پر یہ حیثیت ملی ہے تو یہ اسکی خام خیالی
 ہے۔ بہر حال جو کچھ ہے خواہ تم ہو یا تمہارا عمل سب اللہ کی مخلوق ہیں۔ اور انکے اچھے یا برے ہونے کا فیصلہ ازل میں ہو چکا ہے۔
 صحابہ کرام نے ایک مرتبہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ عمل کس لئے کیا جائے جب کہ تمام چیزوں کے
 فیصلے پہلے ہی ہو چکے ہیں۔ آپ نے جواب میں ارشاد فرمایا۔

إِعْمَلُوا فَاكُلْ مِمَّنْ شَرَحَ لِحَافِلِ لِقَ (بخاری و مسلم۔ علی عمران ابن حصین)

عمل کرو، ہر شخص کو اسی کام کی سولت دی جائے گی جس کے لئے وہ پیدا ہوا ہے۔

خلق۔ خدا کے عمل کا محل ہے : اس سے معلوم ہوا کہ مخلوق خدا کی قدرت کے جاری ہونے کی جگہ اور اس کے افعال کا

محل ہے، اگرچہ مخلوق خود بھی اللہ تعالیٰ کے افعال میں سے ہے، لیکن اسکے بعض افعال بعض کا محل بن سکتے ہیں، اب یہی جملہ لیجئے
 اعملو، یہ جملہ اگرچہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے نکلا ہے، لیکن یہ بھی افعالِ الہی میں سے ہے، اور مخلوق کو یہ

بتلانے کا سبب ہے کہ عمل کرنا مفید ہے، مخلوق کا جاننا بھی ایک عمل ہے، اور یہ عمل اعضاء کی حرکات کا سبب بنتا ہے جب کہ اعضاء کی حرکات بھی اللہ کے افعال ہیں، معلوم ہوا کہ بعض افعال اپنی بعض کا سبب بنتے ہیں، یعنی ایک سبب دوسرے کے لئے شرط ہوتا ہے۔ جیسے جسم کی تخلیق عرض کے لئے شرط ہے یعنی عرض جسم کی پیدائش سے پہلے نہیں ہوتا، زندگی علم کے لئے شرط ہے، علم ارادے کے لئے شرط ہے، حالانکہ یہ سبب اللہ کے افعال ہیں اور بعض بعض کے لئے سبب اور شرط ہیں۔ اس اعتبار سے نہیں کہ وہ ایک دوسرے کے ایجاد کرنے والے ہیں، بلکہ مقصود یہ ہے کہ ان میں سے ایک دوسرے کے حصول کا سبب اور شرط ہے یعنی ایک واقع ہو جائے تو دوسرا وجود میں آئے، جیسے پہلے جو ہر وجود میں آتا ہے، پھر اس میں زندگی کی حرارت دوڑتی ہے، اسی طرح پہلے زندگی پیدا کی ہوتی ہے پھر اس میں قبول علم کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے، علم پہلے وجود میں آتا ہے پھر ارادہ پیدا ہوتا ہے، اگر تحقیق کی جائے تو یہ سلسلہ دراز سے دراز تر ہوتا چلا جائے گا۔ اور جس قدر یہ سلسلہ دراز ہوگا اسی قدر مرتبہ توحید میں ترقی ہوگی۔

اختیار نہیں تو عمل کا حکم کیوں: یہاں ایک سوال اور پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ جب ہمارے اختیار میں کچھ نہیں تو ہمیں یہ حکم کیوں دیا گیا ہے کہ عمل کرو ورنہ ہمیں عذاب دیا جائے گا، اور نافرمانی پر تمہاری مذمت کی جائے گی، مہلّا ہمیں عذاب کیوں دیا جائے گا اور ہماری مذمت کیوں کی جائے گی جب کہ ہمیں کوئی اختیار ہی نہیں ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ قول عمل کرو ہمارے اندر ایک اعتقاد کی پیدائش کا سبب بنتا ہے، اور اعتقاد سے خوف کو تحریک ہوتی ہے، اور خوف کی تحریک ترک شہوات، اور دنیاوی فریب سے فرار کا باعث بنتی ہے، اور یہ ترک و فرار جو ارادہ رحمت میں جگہ پالنے کا سبب بنتے ہیں۔ یہ علق اسباب ہیں، اللہ تعالیٰ ان تمام اسباب کا مرتب اور مسبب ہے، جس کے لئے ازل میں سعادت مقدر ہو چکی ہے اسکے لئے یہ اسباب سل بنائے جاتے ہیں، یہاں تک کہ وہ درجہ بدرجہ ترقی کر کے جنت میں ٹھکانہ بنالیتا ہے، اور جو حدیث بیان کی گئی ہے اس کا مفہوم بھی یہی ہے کہ بندوں کی تقدیر میں جو اعمال لکھ دئے گئے ہیں اسکے لئے ان اعمال کے اسباب سل کر دئے جاتے ہیں، اور جن کی تقدیر میں اذلی ظلم سے نیکی نہیں لکھی گئی وہ اللہ، اسکے رسول، اور علماء کے کلام سے دور بھاگتے ہیں، جب وہ ان کا کلام نہیں سنیں گے تو شریعت کی منہاج کا علم نہیں ہوگا، اور جب علم نہیں ہوگا تو وہ ڈریں گے نہیں اور جب ڈریں گے نہیں تو دنیا پر ان کا اعتماد حوصلہ نہیں ہوگا، اور جب دنیا میں مشغول رہیں گے، تو شیطان کے گروہ میں شامل ہونے سے انہیں کوئی نہ بچا سکے گا، اور شیطان گروہ کے تمام افراد کا ٹھکانہ جہنم ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایک قوم جنت میں پایہ سلاسل داخل ہوگی، اور ایک قوم دوزخ میں زنجیروں میں گرفتار ہو کر جائے گی، اہل جنت کے لئے وہ زنجیریں علم اور خوف کی ہیں، اور اہل دوزخ کے لئے غفلت اور خدا کے عذاب کی، زنجیروں میں مقید کرنے والا اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں، اور نہ اسکے سوا کسی کو اس کی قدرت حاصل ہے۔ مگر غفلتوں کی آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا ہے، جس روز یہ پردہ اٹھ جائے گا حقیقت منکشف ہو جائے گی، اس وقت وہ منادی کی آواز سنیں گے۔

لَمَنْ الْمُلْكُ الْيَوْمَ لِلَّهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ (پ ۲۳ ر آیت ۲۱)

آج کے روز کس کی حکومت ہوگی؟ بس اللہ ہی کی ہوگی جو یکتا غالب ہے۔

اگرچہ ملک اور سلطنت ازل سے ابد تک ہر دن، ہر لمحہ اللہ ہی کی ہے، خاص طور پر اسی دن نہیں ہوگی، لیکن غفلتوں کی سماعت سے یہ آواز اسی دن ٹکرائے گی، اس وقت وہ ہوش و غم سے بیدار ہو جائیں گے، ان کی سمجھ میں نہیں آئے گا کہ اپنے بچاؤ کے لئے کیا تدبیریں کریں، تاکہ تدبیر کریں مگر کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ہلاکت کے اصل اسباب جہالت اور غفلت سے محفوظ رکھے۔

اللہ تعالیٰ کی پسندیدہ اور ناپسندیدہ چیزیں

اللہ تعالیٰ کا شکر اس وقت تک ادا نہیں ہو سکتا جب تک شکر کرنے والے بندے کو یہ معلوم نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ کو کیا پسند ہے اور کیا نہیں ہے، کیونکہ شکر کے معنی ہیں اللہ کی نعمتوں کو اسکی مرضی اور پسند کے مطابق خرچ کرنا۔ اور کفر کے معنی ہیں اللہ کی نعمتوں کو ایسی جگہوں پر صرف کرنا جو اسے ناپسند ہوں، یا انہیں بیکار محض پر نہ رہنے دینا۔ اللہ تعالیٰ کی محبوب چیزوں کو غیر محبوب چیزوں سے ممتاز

کرنے والے دودھ رک ہیں، ایک سماعت، جس کا مستند آیات اور روایات ہیں، وہ مراد رک قلب کی بصیرت ہے، اس کے معنی ہیں چشم مہرت سے دیکھنا، یہ دودھ رک دھوا ہے، اسی لئے اس کا وجود امتحانی نادر اور کم باب ہے، اور اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے انبیاء بھیجے، اور ان کے ذریعے راہ سل بنائی، اس راہ کی پہچان یہ ہے کہ بندہ ان تمام احکام شریعہ سے واقف ہو جو اس سے متعلق ہیں، جو شخص اپنے تمام افعال میں شریعت کے احکام سے واقف نہیں ہو گا وہ شرک کی ذمہ داری سے برہنہ قرار نہ دیا جاسکے گا۔

چشم مہرت سے دیکھنے کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی تمام موجودہ مخلوقات میں حکمت کے پہلو تلاش کرے، اس لئے کہ دنیا میں کوئی ایسی چیز پیدا نہیں کی گئی جس میں کوئی نہ کوئی حکمت نہ ہو، ہر حکمت سے کچھ نہ کچھ مقصود ہے، اور وہی مقصود خدا تعالیٰ کو محبوب ہے۔

حکمت کی دو قسمیں : حکمت کی دو قسمیں ہیں جلی اور خفی۔ جلی جیسے یہ جاننا کہ آفتاب کی تخلیق میں یہ حکمت ہے کہ اس سے دن اور رات میں فرق کیا جاتا ہے، یعنی دن میں روزی کمائی جاتی ہے، اور رات کو آرام کیا جاتا ہے، میوں کہ حرکت کے لئے اجالے کی ضرورت ہے اندھیرے میں صرف پر سکون رہا جاسکتا ہے۔ دن اور رات کا فرق آفتاب کی حکمتوں میں سے ایک ہے، اس کے علاوہ بھی بے شمار حکمتیں ہیں جن میں سے کچھ ہمیں معلوم ہیں، اور بہت سی ابھی تک پردہ خفایں ہیں۔ اسی طرح ابد ہماراں کی حکمتیں بھی معلوم کرنی چاہئیں، ان کی حکمتوں میں سے ایک یہ ہے کہ ان سے زمین کا سینہ پھلتا ہے، اور اس میں سے طرح طرح کے لہلہاتے ہوئے پودے نکلتے ہیں جن میں سے کچھ انسانوں کی غذا بننے ہیں، اور کچھ حیوانوں کے لئے چارہ بننے ہیں۔ قرآن کریم نے اسی طرح کی بہت سے جلی حکمتیں بیان کی ہیں جنہیں لوگ اپنی کوتاہ عقل کے باوجود سمجھ لیں، دقت حکمتیں بیان نہیں فرمائیں، کیونکہ لوگ انہیں سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ ارشاد فرماتے ہیں :-

فَلْيَنْظُرِ الْإِنْسَانُ إِلَى طَعَامِهِ أَنَّا صَبَبْنَا الْمَاءَ صَبًّا ثُمَّ شَقَقْنَا الْأَرْضَ شَقًّا فَنَبْتُنَا فِيهَا حَبًّا وَعَنْبًا وَقَضَبًا وَزَيْتُونًا وَنَخْلًا وَحَدَائِقَ غُلْبًا وَفَاكِهَةً وَأَبًّا مَنَّا عَالِكُمْ وَلَا نَعَامِكُمْ (پ ۳۰ ر ۵ آیت ۳۲ تا ۳۴)

سو انسان کو چاہیے کہ اپنے کھانے کی طرف نظر کرے کہ ہم نے عجیب طور پر پانی برسایا پھر عجیب طور پر زمین کو چھاڑا پھر ہم نے اس میں غلہ اور انگور اور ترکاری اور زیتون اور کھجور اور گنجان باغ اور میوے اور چارہ پیدا کیا تمہارے اور تمہارے مویشی کے فوائد کے لئے۔

ثوابت اور سیار ستاروں میں بھی بہت سی حکمتیں ہیں، لیکن وہ خفی ہیں، عام لوگ ان سے واقف نہیں ہوتے، تاہم وہ اتنے چمکتے ہیں کہ یہ ستارے آسمان کے لئے زینت ہیں، آنکھیں انہیں دیکھ کر لطف اندوز ہوتی ہیں، قرآن کریم نے بھی اسی حکمت کی طرف اشارہ کیا ہے :-

إِنَّا زَيْنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِزَيْنٍ لَّا يَكُونُ لَكُم (پ ۲۳ ر ۵ آیت ۶)

ہم ہی نے رونق دی ہے اس طرف والے آسمان کو ایک عجیب آرائش یعنی ستاروں کے ساتھ۔

دنیا کے تمام اجزاء آسمان، ستارے، ہوا، پہاڑ، معاون، نبات، حیوانات، ان کے اعضاء وغیرہ سب حکمتوں سے لبریز ہیں، ان اجزاء کے ذمہ ذمہ میں بے شمار حکمتوں کے خزانے مدفون ہیں، بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ ہر ذمہ میں ایک سے ایک ہزار اور دس ہزار حکمتیں پوشیدہ ہیں، تو ذرا مبالغہ نہ ہو گا۔ اعضاء انسانی ہی کو سچے، ان میں بہت سی حکمتیں ہیں بعض ان میں سے خفی ہیں، اور بعض ہمیں معلوم ہیں جیسے یہ کہ آنکھ دیکھنے کے لئے ہے، اس سے پکڑنے کا کام نہیں لیا جاسکتا، ہاتھ پکڑنے کیلئے ہے، اس سے چلنے کا کام نہیں لیا جاسکتا، پاؤں سو گھسنے کے لئے نہیں ہیں، یہ صرف چلنے میں کام آتے ہیں، یہی حال اندرونی اعضاء، آنت، پتے، جگر، گردہ، پٹھے اور رگ کا ہے، ان میں سے بعض میں خلاء ہے، بعض پیچیدہ ہیں، بعض ایک دوسرے میں گھسے ہوئے ہیں، بعض مزے ہوئے ہیں، بعض باریک ہیں، بعض موٹے ہیں، اس طرح کی بے شمار صفات ہیں انکی حکمتوں سے عام لوگ واقف نہیں ہیں، جو لوگ واقف ہیں وہ بھی بہت تھوڑی واقعیت رکھتے ہیں، ان کے علم کو اللہ کے علم سے اتنی نسبت بھی نہیں ہے، جتنی ذمہ کو آفتاب سے ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا

ارشاد ہے - وَمَا لَوْ يَسْتَفْهِمُ مِنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا (پ ۱۵ ر ۱۰ آیت ۸۵) اور تم کو بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے۔

منذورہ بالا تفصیل سے معلوم ہوا کہ جو شخص کسی نعمت کو اس جگہ میں خرچ نہ کرے گا جس کے لئے وہ پیدا کی گئی ہے اور اس طرح ہر خرچ نہ کرے گا جو اس سے مقصود ہے تو وہ اس نعمت میں اللہ تعالیٰ کی ناشکری کا مرتکب ہوگا مثلاً اگر کسی نے کسی کو ہاتھ مارا تو وہ ہاتھ کی نعمت میں اللہ تعالیٰ کی ناشکری کرے گا اس لئے کہ ہاتھ ملک چیز کو دفع کرنے اور مفید چیز لینے کے لئے بنایا گیا ہے اسی طرح جو شخص نامحرم کی طرف دیکھے گا وہ آنکھ اور آفتاب دونوں میں اللہ تعالیٰ کی ناشکری کرے گا کیونکہ آنکھ اور آفتاب کی روشنی جو اسے مل کر بصارت کمل ہوتی ہے انسان کو آنکھوں سے اس لئے نوازا گیا ہے کہ وہ ان کے ذریعے دین و دنیا میں نفع دینے والی چیزوں کا مشاہدہ کر سکے اور ان چیزوں سے محفوظ رہ سکے جو دین و دنیا میں اسکے لئے نقصان دہ ہیں جو شخص غیر محرم کو دیکھتا ہے وہ انھیں اس کام میں استعمال کرتا ہے جو اس سے مقصود نہیں ہے اس سلسلے میں اصولی بات یہ ہے کہ دنیا اور اس کے تمام مال و متاع کی تخلیق کا اصل مقصد یہ ہے کہ انسان ان سے وصول الی اللہ میں مدد لے اور وصول الی اللہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک اس سے دنیا میں انس و محبت نہ ہو اور اس سے دور کرنے والی چیزوں سے نفرت نہ ہو حصول انس کا طریقہ یہ ہے کہ ذکر پر مواظبت کی جائے اور محبت معرفت سے پیدا ہوتی ہے اور دوام بدن یعنی جسم کی بقا و غذا پر موقوف ہے اور غذا زمین پانی اور ہوا سے تشکیل پاتی ہے اور ان چیزوں کی تکمیل کے لئے آسمان و زمین اور تمام ظاہری اور باطنی اعضاء کی تخلیق ناگزیر ہے یہ تمام دنیا بدن کے لئے ہے بدن نفس کی سواری ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف لوہے والا فسر وہ ہے جو طویل عبادت اور کمال معرفت سے مطمئن ہو اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا - وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ مَا لَكُمْ مِنْهُمْ مِنْ رِزْقٍ (پ ۲۲ ر ۲ آیت ۵۵)

اور میں نے جن اور انسان کو اسی واسطے پیدا کیا ہے کہ میری عبادت کیا کریں میں ان سے رزق کی درخواست نہیں کرتا۔

بہر حال جو شخص کسی چیز کو اللہ تعالیٰ کی معصیت میں استعمال کرے گا وہ گویا ان تمام اسباب میں اللہ تعالیٰ کی ناشکری کا مرتکب ہوگا جو معصیت کے لئے ضروری ہیں۔

مخفی حکمتوں کی مثال : یہاں ہم ان عقلی حکمتوں کی ایک مثال بیان کرتے ہیں جو زیادہ عقلی نہیں ہیں اس مثال کی ضرورت اس لئے پیش آتی تاکہ اس سے سبق لیا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ ہمارے کس عمل سے نعمتوں کی ناشکری ہوتی ہے اور کونسا عمل نعمتوں کے لئے شکر بن جاتا ہے مثال یہ ہے کہ اللہ نے ذرہم و دینار پیدا کئے ہیں ان سے دنیا کا انتظام قائم ہے بظاہر یہ دو پتھر ہیں جن میں فی نفسہ کوئی منفعت نہیں ہے لیکن مخلوق خدا ان کے لئے مجبور ہے اس لئے کہ ہر انسان کو اپنے طعام لباس اور دوسری ضروریات زندگی کے لئے بہت سی چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے بعض اوقات اسکی ملکیت میں وہ چیزیں ہوتی ہیں جن کی اسے ضرورت نہیں ہوتی اور ان چیزوں سے محروم ہوتا ہے جن کی اسے ضرورت ہوتی ہے مثلاً ایک شخص زعفران کا مالک ہے لیکن زعفران اسکی ضرورت نہیں ہے وہ سواری کا محتاج ہے اور جس کے پاس سواری ہے ہو سکتا ہے اسے زعفران کی ضرورت نہ ہو اس لئے ان دونوں میں معاوضہ بھی ہونا چاہیے اور عوض کے مقدار کی محسوس بھی ہونی چاہیے۔ کیونکہ یہ ممکن نہیں کہ زعفران کی ہر مقدار کے عوض اونٹ دیا جائے اونٹ اور زعفران میں کوئی مناسبت نہیں ہے کہ جتنے وزن کا اونٹ ہو اسی وزن کی زعفران دی جائے گی اسی طرح اگر کوئی شخص کپڑے کر گھر موزہ دے کر غلام اور گدھا دے کر آٹا خریدے تو ظاہر ہے ان میں کوئی مناسبت نہیں ہے اس صورت میں یہ جاننا مشکل ہو جائے گا کہ کس قدر زعفران کے عوض میں کھل اونٹ دیا جائے گا؟ اس طرح معاملات یعنی طور پر دشوار ہو جائیں گے۔

ذرہم و دینار کی تخلیق کا مقصد : دنیا کا انتظام کسی دشواری کے بغیر صحیح طور پر چلانے کے لئے ایک ایسی درمیانی چیز کی ضرورت ہے جو مختلف غیر متناسب چیزوں میں مساوات پیدا کر سکے اور اسے اپنے سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو مساوی اور غیر مساوی کا فرق

معلوم ہو جائے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے درہم و دینار پیدا کئے تاکہ یہ تمام اموال میں مساوات پیدا کر سکیں، اور ان کے ذریعے قیمت کی تعین ہو سکے، یعنی یہ کہا جاسکے کہ یہ اونٹ سو دینار کا ہے، اور زعفران کی یہ مقدار سو دینار ہے، اس طرح یہ دونوں درمیان کی ایک چیز کے مساوی بن جائیں گے، اور ان دونوں میں بھی مساوات ہو جائے گی، درہم و دینار کے ذریعے ان دونوں غیر متناسب چیزوں کا مبادلہ اس طرح ممکن ہے کہ یہ دونوں (درہم و دینار) اپنی ذات سے مقصود نہیں ہیں، اگر یہ بذات خود مقصود ہوتے (مثلاً کھانے پینے میں انکی ضرورت پڑتی) تو صرف اسی مقصد کے لئے استعمال ہوتے، دنیا کا نظم ان سے وابستہ نہ ہوتا، اللہ نے انھیں اس لئے پیدا فرمایا ہے کہ لوگوں کے ہاتھوں میں آتے جاتے ہیں، اور غیر متناسب اعمال میں مناسبت پیدا کریں، درہم و دینار میں ایک حکمت یہ بھی رکھی گئی کہ ان کے ذریعے دوسری تمام چیزیں حاصل ہو جاتی ہیں۔ یہ دونوں اگرچہ محبوب ہیں، لیکن بذات خود مقصود نہیں ہیں، تاہم دوسرے تمام اموال کی طرف ان کی نسبت یکساں ہے اس لئے جو شخص ان دونوں چیزوں کا مالک ہوتا ہے وہ گویا تمام چیزوں کا مالک ہوتا ہے، جو شخص صرف کپڑے کا مالک ہوتا ہے اس کے ہارے میں یہ نہیں کہا جاسکتا ہے کہ وہ تمام چیزوں کا مالک ہے۔ اس لئے کہ اگر اسے غلے کی ضرورت پیش آئے اور وہ کپڑے کے عوض میں غلہ لینے کے لئے جائے تو ممکن ہے کہ غلہ والا کپڑے کا ضرورت مند نہ ہو بلکہ اسے سواری کی ضرورت ہو۔ اس لئے ہر شخص کو کسی ایسی چیز کی ضرورت پیش آتی ہے جو ظاہر میں کچھ بھی نہ ہو، اور باطن میں سب کچھ ہو، ایسی کوئی چیز جو بظاہر خاص نہ ہو، دوسری مختلف چیزوں کی طرف اسکی نسبت یکساں ہوتی ہے، مثلاً آئینے میں کوئی خاص رنگ نہیں ہوتا، لیکن اس میں ہر رنگ معکوس ہو جاتا ہے، ایسی حال درہم و دینار کا ہے، یہ بذات خود مقصود نہیں ہیں، لیکن ہر مقصود کا وسیلہ ہیں، اسکی ایک مثال حرف ہے، اس کے کوئی مستقل اور مخصوص معنی نہیں ہیں، لیکن اس کے ذریعے دوسرے کلمات کے معنی ظاہر ہوتے ہیں۔

درہم و دینار میں بھی حکمتیں نہیں ہیں، اس کے علاوہ بھی دوسری حکمتیں ہیں، لیکن یہاں ان کا ذکر طوالت کا باعث ہو گا۔ فی الحال انہی دو حکمتوں کو سامنے رکھتے، اور غور کیجئے کہ اگر کوئی شخص ان دونوں چیزوں سے وہ کام نہیں لیتا جن کے لئے یہ وضع کئے گئے ہیں یا وہ کام کرتا ہے جو ان کی حکمتوں کے خلاف ہے تو گویا وہ ان چیزوں میں اللہ تعالیٰ کی ناشکری کرتا ہے، مثلاً ایک شخص انھیں چھپا کر رکھتا ہے خرچ نہیں کرتا وہ ان کی حکمت باطل کرتا ہے، اور ان کے ساتھ نا انصافی کرتا ہے، اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی مسلمانوں کے حاکم کو قید خانے میں ڈال دے، یہاں تک کہ وہ حکومت کا کام نہ چلا سکے تو یہی کہا جائے گا کہ اس نے نا انصافی کی ہے، یہی حکم حاکم نظم حکومت پر قرار رکھنے کے لئے ہے قید میں ڈالے جانے کے لئے نہیں ہے، درہم و دینار بھی شخص اموال میں مساوات قائم کرنے کے اعتبار سے حاکم ہیں، انھیں چھپا کر رکھنا حاکم کو چھپا کر رکھنے کے مرادف ہے۔ وہ شخص دنیاوی نظم میں بگاڑ کا باعث ہو گا، اور جو غرض ان سے وابستہ ہے اسے ضائع کرنے کا سبب بنے گا، یہ چیزیں نوع انسان کے کسی مخصوص اور متعین فرد کے لئے وجود میں نہیں آئیں، یا یہ چیزیں کھانے پینے میں کام نہیں آتیں اس لئے فی نفسہ مقصود نہیں ہیں یہ صرف پتھر ہیں انھیں اس لئے پیدا کیا گیا ہے کہ مخلوق میں دائروں ساثر رہیں، اور ان کے درمیان معاملات میں مساوات قائم کریں۔

موجودات عالم میں یہ حکمتیں پنہاں ہیں، جس طرح کتاب کے صفحے پر الفاظ و نقوش مرتب رہتے ہیں اسی طرح ان موجودات کے صفحات پر یہ حکمتیں مرقوم ہیں، یہ قدرت ازلہ کے قلم سے لکھی گئی ہیں، ان میں نہ آواز ہے نہ رنگ ہے نہ حرف ہے، ظاہری آنکھوں سے ان ”مرقوم حکمتوں“ کا ادراک نہیں کیا جاسکتا، بلکہ بصیرت کی آنکھیں انھیں پڑھ سکتی ہیں، تاہم جو لوگ ان حکمتوں کے مشاہدے سے محروم ہیں، ان کے لئے کلام نبوت ایک آئینے کی مانند ہے، وہ اس کے ذریعے مشاہدہ کر سکتے ہیں، اللہ نے ان غیر محسوس حکمتوں کو الفاظ میں مقید فرمادیا ہے اب یہ ظاہری آنکھوں سے بھی دیکھی جاسکتی ہیں۔ ارشاد باری ہے :-

وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يَنْفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ

الیمیم (پ ۱۴۰ آیت ۳۴)

اور جو لوگ سونا چاندی جمع کر کے رکھتے ہیں، اور ان کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے سو آپ ان کو ایک

بڑی دردناک سزا کی خبر سنا دیجئے۔

چاندی سونے کے برتن : درہم و دینار پگھلا کر سونے چاندی کے برتن بنانے والا بھی اللہ تعالیٰ کی نعمت کا کافر ہے بلکہ اسکا حال کچھ زیادہ ہی برا ہے اس لئے کہ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص حاکم شہر کو قید میں رکھ کر پارچہ بانی یا جادوب کئی جیسے کام کرنے پر مجبور کرے جو معاشرے کے پس ماندہ افراد کرتے ہیں قید اس طرح کے ذیل کام کرنے کے مقابلے میں یقیناً معمولی ہے چاندی اور سونے کے برتن بنانے اور استعمال کرنے سے اس لئے منع کیا گیا ہے کہ برتن صرف اشیاء کی حفاظت اور سیال چیزوں کو بننے سے روکنے کے لئے بنائے گئے ہیں اور یہ مقصد مٹی لوہے جست اور تانبے کے برتنوں سے بھی لیا جاسکتا ہے لیکن سونے چاندی سے جو مقصود ہے وہ ان چیزوں سے پورا نہیں ہو سکتا۔ جس شخص نے اس طرح حکمت کی معرفت حاصل کی اسے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام سے آگاہ کیا گیا آپ نے ارشاد فرمایا۔

مِنْ شَرِّ بَفِیْ آئِنَةٍ مِنْ ذَهَبٍ أَوْ فِضَّةٍ فَكَأَنَّمَا یَجْرُ جُرْفُیْ بِطُنْدٍ نَارٍ جَهَنَّمَ (بخاری و مسلم۔ ام سلمہ)

جو شخص سونے یا چاندی کے برتن میں پانی پیتا ہے وہ گویا اپنے پیٹ میں جنم کی آگ اٹھاتا ہے۔

سوادی کاروبار : اسی طرح وہ شخص بھی کافر نعمت ہے جو دینار و درہم کو سوادی لین میں استعمال کرتا ہے اس لئے کہ یہ دونوں دوسری چیزوں کے لئے ذریعہ حصول بنائے گئے ہیں فی غنہ مقصود نہیں ہیں جو شخص ان دونوں ہی میں تجارت کرتا ہے وہ انھیں خلاف وضع حکمت استعمال کرتا ہے اور یہ ظلم ہے کیونکہ نقد کو کسی ایسی چیز کے واسطے لینا ظلم ہے جسکے لئے وہ وضع نہیں کیا گیا ہے۔ ایک شخص کے پاس کپڑا ہے نقد نہیں ہے اب اسے غذا یا سواری کی ضرورت ہے لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ جس کے پاس غذا یا سواری ہے وہ کپڑا لے کر یہ چیزیں فروخت کرے گا اس لئے کپڑے والا اپنا کپڑا نقد کے عوض بیچنے پر مجبور ہے تاکہ نقد کے ذریعے غذا اور سواری خرید سکے کیونکہ نقد سے اغراض پوری ہوتی ہے اور مقاصد حاصل ہوتے ہیں وہ اپنی ذات سے مقصود نہیں ہوتا اموال میں اسکا مقام ایسا ہے جیسا کلام میں حرف کا حال ہے نحوی کہتے ہیں حرف وہ ہے جو غیر میں موجود معنی کے لئے آئے نقد آئینے کی طرح ہے جس طرح اس میں تمام رنگ جھلکتے ہیں اسی طرح نقد سے بھی تمام اغراض پوری ہوتی ہیں اب اگر کوئی شخص اپنے نقد مال کو نقد مال کے عوض فروخت کرے اور اسی کو اپنا کاروبار بنالے تو گویا وہ نقد کو مقید رکھنا چاہتا ہے اور اسے ذخیرہ کرنے کا ارادہ رکھتا ہے حاکم یا قاصد کو قید کرنا اسی لئے ظلم اور نا انصافی ہے کہ انھیں دینار و دینار سائر رہنا چاہیے تاکہ ظلم میں غلط واقع نہ ہو اور ان کی وضع سے جو مقصود ہے وہ پورا ہو۔

یہاں یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ اگر نقد میں بیع جائز نہیں تو درہم کی بیع و دینار کے عوض خود درہم کی بیع درہم کے عوض کیسے جائز ہے یا وہ عمل کیسے جائز ہے جسے روپیہ بھنانا کہتے ہیں اسکا جواب یہ ہے کہ ہر نقد کا الگ الگ مقصد ہے اور ہر ایک سے جدا جدا اغراض پوری ہوتی ہے مثلاً دینار اپنی قیمت کے باعث بہت سی چھوٹی چھوٹی ضرورتوں میں کام نہیں آسکتا اسکے برعکس درہم کم قیمت ہوتے ہیں اسکے ذریعے معمولی حاجتیں پوری کی جاسکتی ہیں پھر دینار کے عوض درہم کی بیع اور درہم کے عوض درہم کی بیع صورتاً بیع ہے حقیقت میں بیع نہیں ہے اس لئے کہ اس بیع میں کسی فرق کو کوئی فلع حاصل نہیں ہوتا بلکہ درہم کی بیع اسی قیمت کے درہم سے ہوگی یا دینار کی بیع اسی قیمت کے درہم سے ہوگی۔ اسی لئے اس بیع سے فلع نہ کوئل جی نہیں ہے نہ ہم نے کسی تاجر کو اس میں مشغول دیکھا ہے یہ ایک بیکار کام ہے اور اس میں لگنا وقت ضائع کرنا ہے یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص زمین پر درہم پھینک دے اور پھر اٹھالے ظاہر ہے کون فلع نہ ہو گا جو اس میں اپنا حقیقی وقت ضائع کرے گا البتہ کھرے اور کھوٹے سکوں کی بیع میں فرق ہو سکتا ہے لیکن ہم اس میں بھی فرق نہیں کرتے ہمارے نزدیک قیمت کے اعتبار سے کھرا اور کھوٹا دونوں کے برابر ہیں اس لئے اگر کوئی کھوٹا سک لے کر کھرا لینا چاہے تو اسے برابر لینا ہو گا کم و بیش کی اس میں بھی اجازت نہیں ہے۔ جب حال یہ ہو تو کوئی بے وقوف ہی ہو گا جو کھرے سکے دے کر کھوٹے لے گا۔ کھرے کھوٹے کا لحاظ ان چیزوں میں کیا جائے گا جو بذات خود مقصود ہیں جو چیزیں اپنی ذات سے مقصود نہیں ہیں ان میں ایسی ہار یک باتوں کا اعتبار نہیں کیا جائے گا یہ ظلم اس شخص کا ہے جس نے بعض سکے کھرے اور بعض سکے کھوٹے بنائے یہاں تک کہ بذات خود مقصود ہو گئے جب کہ ان کا حق یہ ہے کہ مقصود نہ ہوں۔ نقد کے بدلے نقد کی ادھار بیع صرف

وہی شخص کر سکتا ہے جو احسان کے پہلو کو نظر انداز کرنا چاہتا ہے۔ یہ بیچ بھی جائز نہیں بلکہ اس کی ضرورت بھی نہیں ہے اگر روپیہ ادھاری دینا ہے تو بیچ کی صورت کیوں اختیار کی جائے قرض کی صورت کیوں نہ اپنائی جائے جس میں احسان بھی ہے اور اجر و ثواب بھی بیچ کی صورت میں نہ احسان ہے نہ ثواب۔ اس لئے وہ ظلم میں داخل ہے یہی حال ظلوں کا ہے۔ یہ اس لئے پیدا کئے گئے ہیں کہ ان سے غذائیں اور دوائیں تیار کی جاسکیں اس لئے انھیں جنت مقصود سے منحرف کرنا مناسب نہیں اور جنت مقصود سے انحراف یہ ہے کہ ان میں تجارت شروع کر دی جائے کہ غلہ دے کر غلہ لیا جائے پھر اس غلے سے دو سراقلہ لیا جائے یہاں تک کہ غلہ ہی دائرو سائر رہے کھانے میں استعمال نہ ہو اس طرح غلے بھی قید ہو جائیں گے اور ان سے جو اہر مقصود ہے وہ حاصل نہ ہو سکے گا غلے کھانے کے لئے پیدا کئے گئے ہیں اور بقاء انسانی کے لئے غذا کی ضرورت سخت ہے اس لئے یہ ضروری ہے کہ جس شخص کو غلے کی ضرورت نہ ہو اس کے پاس غلہ نہ رہنے دیا جائے اور غلے کا کاروبار ہی کرے جسے غلے کی ضرورت نہ ہو اس لئے کہ اگر اسے غلے کی ضرورت ہے تو وہ کھاکوں نہیں لیتا تجارت کیوں کرتا ہے اور اگر اس سے تجارت کرتا ہے تو جو لوگ غلے کے طالب بن کر آئیں اور غلے کے علاوہ کسی دوسری چیز کے عوض غلہ خریدنا چاہیں تو اسے ان کے ہاتھ غلہ فروخت کر دینا چاہیے اگر وہ غلے کے عوض ویسے ہی غلے کا طالب ہے تو یہ کیا جائے گا کہ وہ تجارت نہیں کرنا چاہتا بلکہ غلے کی ذخیرہ اندوزی کرنا چاہتا ہے شریعت میں ذخیرہ اندوزی کرنے والے پر لعنت کی گئی ہے اس سلسلے میں بہت سی سخت وعیدیں وارد ہیں باب آداب کسب میں کچھ وعیدیں لکھی بھی گئی ہیں۔

البتہ جو شخص گیسوں کو چھوہارے کے ذریعے فروخت کرتا ہے اسے معذور سمجھنا چاہیے اس لئے کہ جو مقصد گیسوں سے حاصل ہوتا ہے وہ چھوہارے سے نہیں ہوتا گیسوں کو گیسوں کے عوض برابر برابر فروخت کرنے والا معذور نہیں کیونکہ وہ ایک لغو حرکت کرتا ہے اسی لئے شریعت نے اس سے منع نہیں کیا منع کی ضرورت اس لئے پیش نہیں آئی کہ سلیم العقل انسان اس طرح کی حرکتیں خود بھی گوارا نہیں کرتا البتہ دونوں طرح کے گیسوں میں اچھے بڑے کا فرق ہوتا ہے تب کوئی عقلمند ازان ایک کے عوض دوسرے کی فروخت کر سکتا ہے لیکن اس میں برابر برابر کا تصور نہیں کیا جاسکتا کیونکہ ایسا کون عقلمند ہو گا جو ایک کلو خراب گیسوں لے کر ایک ہی کلو اچھا گیسوں دیدے گا ہاں کم و بیش ہونے کی صورت میں یہ بیچ چل سکتی ہے لیکن شریعت نے جس کو معیار قرار دیا ہے اور وجہ معیار غذا نیست ہے رنگ ذائقہ وغیر معیار نہیں ہے اس لئے ایک کلو گیسوں کے بدلے ایک ہی کلو گیسوں دیا جاسکتا ہے زیادہ یا کم ہونے کی صورت میں سود لازم آئے گا سود کی حرمت کی ایک حکمت یہ بھی ہے لیکن ہم پہلی جگہ میں فقہ کے ابواب لکھ چکے ہیں اور یہ حکمت اب ہمارے ذہن میں آئی ہے اس لئے اسے بھی ہم فقہ کے ابواب میں داخل کئے رہتے ہیں۔ غذائیات کے ذیل میں سود کی حرمت کے متعلق جس قدر حکمتیں ہم نے لکھی ہیں ان میں یہ سب سے زیادہ مضبوط حکمت ہے۔ اسی سے حضرت امام شافعی کے اس رجحان کی وجہ سمجھ میں آتی ہے کہ انھوں نے سود کے باب میں غلے کی تخصیص کی ہے کیلالت کی تخصیص نہیں کی اس لئے کہ کیلالت میں چونا بھی داخل ہے اگر چہ اسے میں رہا ہو سکتا ہے تو پھر کپڑے اور جانور میں بھی ہونا چاہیے اگر حدیث میں نمک کا ذکر نہ ہوتا تو حضرت امام مالک کی رائے زیادہ صحیح ہوتی (۱) کیونکہ انھوں نے قوت کی تخصیص کی ہے شرع جس معنی کی رعایت کرتی ہے اس کا کسی حد یا تحدید سے منضبط ہونا ضروری ہے یہاں قوت سے بھی تحدید ہو سکتی ہے اور غلے کے ذریعے بھی شریعت نے یہ مناسب سمجھا کہ جس مطعوم سے تحدید کی جائے کیونکہ بقاء کی ضرورت کے لئے یہ ناگزیر ہے۔

حدود شرع: کبھی شرعی تحدیدات ایسے اطراف کو محیط ہوتی ہیں جن میں وہ اصل معنی جو حکم کا باعث بنتے ہیں قوی نہیں ہوتے لیکن ضرورتاً ان کی بھی تحدید کرنی پڑتی ہے ورنہ مخلوق کے لئے اصل معنی کی اتباع بڑی دشوار ہو جاتی ہے کیونکہ ایک ہی حکم اسوال اور اشخاص کے اختلاف سے مختلف ہو جاتا ہے اس لئے حد مقرر کرنی ضروری ہے۔

حدود شرع کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :-

وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُودَ اللَّهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ (پ ۲۸ آیت ۱)

(۱) یہ ایک اختلافی بحث ہے رہا کی بحث میں اس پر تفصیل سے گفتگو ہو چکی ہے

اور جو شخص احکام خداوندی سے تجاوز کرے گا اس نے اپنے آپ پر ظلم کیا۔

اصل احکام میں شرائع مختلف نہیں ہوتیں، بلکہ حدود کی وجہ میں مختلف ہو جاتی ہیں، مثلاً شراب شریعت مصطفوی اور شریعت عیسوی دونوں میں حرام ہے، لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں حرمت کی حد نشہ ہے، اس لئے اگر کسی نے اس قدر شراب پی جس سے نشہ نہیں ہوا تو یہ حرام نہیں ہے، جب کہ ہماری شریعت میں جس مسکر حد ہے، خواہ وہ تھوڑی ہو یا زیادہ، کیونکہ تھوڑی چیز سے زیادہ کی رغبت ہوتی ہے۔

درہم و دینار کی مخفی حکمت کی تفہیم کے لئے یہ ایک مثال دی گئی ہے۔ شکر اور کفران نعت کو اس مثال کے آئینے میں سمجھنا چاہیے۔ لیکن یہ بات بھی وہی شخص سمجھ سکتا ہے جسے حکمت کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔ حکمت ایک گراں قدر جوہر ہے، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

وَمَنْ يَتُوبَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ تَوَّابٍ خَيْرٌ أَكْثَرًا (پ ۵۳ آیت ۲۶۹)

اور جس کو دین کا فہم مل جائے اس کو بڑی خیر کی چیز مل گئی۔

لیکن حکمت کے جوہر ان دلوں میں نہیں ٹھہرتے جہاں شہوتوں کے ڈبیر ہوں۔ اور شیطان لہو و لہب میں مشغول رہتا ہو، صرف اہل دل اور اہل عقل ہی حکمت کی باتیں سمجھ سکتے ہیں، اسی لئے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

لَوْلَا أَنَّ الشَّيَاطِينَ يَخُومُونَ عَلَى قُلُوبِ بَنِي آدَمَ لَنَظَرُوا إِلَى مَلَائِكَةِ السَّمَاءِ (۱)

اگر شیاطین بنی آدم کے دلوں پر گشت نہ لگائیں تو وہ آسمانی ملکوت کا مشاہدہ کرنے لگیں۔

اگر تم یہ مثال سمجھ گئے ہو تو ہمیں اس پر اپنی حرکت، سکون، نفق، سکوت اور ہر اس فعل کو قیاس کرنا چاہیے جو تم سے صادر ہوتا ہے کہ وہ شکر ہے یا کفر۔ ہر فعل کی دو حالتیں ہو سکتی ہیں شکر کی یا کفر کی۔ ناشکری کی بعض حالتوں کو فقہ کی زبان میں ہم مکروہ اور بعض کو حرام کہتے ہیں۔ اگرچہ ارباب قلوب کے نزدیک مکروہ اور حرام میں کوئی فرق نہیں ہے، حرام تو حرام ہی ہے ہی مکروہ بھی حرام ہے۔ مثال کے طور پر اگر تم دائیں ہاتھ سے استنجا کرو گے تو اس نعت میں اللہ کی ناشکری کرو گے، کیونکہ اللہ نے ہمیں دو ہاتھ دئے ہیں، اور ان میں سے ایک کو دوسرے پر قوی تر بنایا ہے، جو زیادہ قوی ہے وہ زیادہ فضیلت اور شرف کا مستحق بھی ہے، کم تر کو فضیلت و تعادل کے خلاف ہے، جب کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

إِنَّ الْبِرَّ لِمَنْ أَمْرٌ بِالْعَدْلِ (پ ۱۸۳ آیت ۹۰)

بے شک اللہ تعالیٰ عدل کا حکم فرماتے ہیں۔

عدل کے تقاضے: پھر جس نے دو ہاتھ دئے ہیں اسی نے ایسے اعمال کا محتاج بھی بنایا ہے جن میں سے بعض شریف ہیں، جیسے قرآن کریم اٹھانا، اور بعض خفیس ہیں، جیسے نجاست زائل کرنا۔ اب اگر تم بائیں ہاتھ سے قرآن کریم اٹھاؤ اور دائیں سے نجاست صاف کرو تو لازم آئے گا کہ تم نے شریف چیز سے خفیس کام لیا۔ اور وہ جس مرتبے کا مستحق تھا اسے اس سے کم مرتبہ دیا، اس طرح تم نے عدل سے انحراف کیا، اور ظلم کا ارتکاب کیا، اسی طرح اگر تم نے قیلے کی سمت میں تھوکا، یا قصائے حاجت کے وقت قیلے کا استقبال کیا تو تم نے جہات اور وسعت عالم میں اللہ کی ناشکری کی۔ اس لئے کہ اللہ نے عالم کو وسیع بنایا ہے تاکہ تم اپنی حرکات میں عقلی محسوس نہ کرو، اور جہر چاہے حرکت کر سکو، پھر عالم کو مختلف جہتوں اور سمتوں میں تقسیم کیا اور ان میں سے بعض کو شرف و فضیلت سے نوازا، اور اس سمت میں ایک گھر بنایا، اور اسے اپنی طرف منسوب فرمایا تاکہ تمہارا دل اپنے پروردگار کی طرف مائل ہو، اور جب تم عبادت کرو تو تمہارا قلب ایک ہی سمت میں مقید رہے، اور قلب کے باعث تمہارا تمام بدن سکون و وقار کے ساتھ عبادت میں مشغول رہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے تمہارے افعال بھی تقسیم کئے ہیں، بعض شریف ہیں جیسے اطاعت، اور بعض خفیس جیسے استنجا کرنا، اور تھوکنا۔ چنانچہ اگر تم قیلے کی طرف تھوکو گے تو یہ قبلہ پر ظلم ہو گا اور اس نعت کی ناشکری ہو گی جو اللہ تعالیٰ نے عبادت کی مجاہد کے لئے بنائی ہے، اسی طرح اگر تم نے بائیں پاؤں سے موزے پہننے کا آغاز کیا تو یہ بھی ظلم ہے، اس لئے کہ موزے پاؤں کی

(۱) یہ روایت کتاب الصوم میں گزری ہے

حفاظت کے لئے وضع کئے گئے ہیں گویا پاؤں کے لئے موزے میں حظ ہے اور حلقہ میں اشرف کا لحاظ ضروری ہے، اگر لحاظ کرو گے تو عدل اور حکمت کے مطابق عمل کرو گے ورنہ ظلم ہوگا، موزے اور پاؤں کی ناشکری ہوگی۔ عارفین کے نزدیک تو یہ عمل (بائیں پاؤں سے موزہ یا جو تا پہننا) حرام ہے، اگرچہ فقہاء اسے مکروہ کہتے ہیں، بعض اللہ والوں کو دیکھا گیا کہ وہ گیسوں کے سینکڑوں ہزاروں پینے جمع کرتے ہیں، اور انھیں اللہ کی راہ میں صدقہ کر دیتے ہیں، لوگوں نے اس کا سبب دریافت کیا، فرمایا کہ میں نے غلطی سے بائیں پاؤں میں جو تا پہننا تھا، میں خیرات کے ذریعہ اس غلطی کا تدارک کرنا چاہتا ہوں۔

فقہاء کا منصب : فقہاء کا یہ منصب نہیں ہے کہ وہ اس طرح کے امور کو کبیرہ قرار دیں، کیونکہ ان پجاریوں کو تو عوام کے اصلاح کی ذمہ داری سپرد کی گئی ہے جو چوپایوں جیسے ہیں، اور ایسے ایسے گناہوں میں سر سے پاؤں تک ڈوبے ہوئے ہیں جن کے سامنے ان معمولی گناہوں کی کوئی حقیقت نہیں ہے، چنانچہ اگر ایک عام آدمی بائیں ہاتھ سے شراب کا جام اٹھائے گا تو یہ نہ کہا جائے گا اس نے دو گناہ کئے ہیں، ایک یہ کہ شراب کا جام لیا ہے، اور دوسرا یہ ہے کہ بائیں ہاتھ سے لیا ہے، اسی طرح اگر کسی شخص نے جمعہ کے دن اذان کے وقت شراب فروخت کی تو یہ کتنا مناسب نہ ہوگا کہ اس نے دو گناہ کئے ہیں شراب فروخت کی ہے، اور اذان جمعہ کے وقت خرید و فروخت کا مشغلہ اختیار کیا ہے، اس طرح اگر ایک شخص نے محراب مسجد میں قبلہ رو ہو کر قضائے حاجت کی تو یہ نہیں کہا جائے گا کہ اس نے دو عمل خلاف شرع کئے ایک تو مسجد میں قضائے حاجت کی، دوسرے قبلہ رو ہو کر بیٹھا۔ گناہ خواہ جمعہ ہو یا بڑے ظلمات (تاریکیاں) ہیں، یہ اور بات ہے کہ جمعہ گناہ کی تاریکی بڑے گناہ میں چھپ جاتی ہے، اگر کوئی غلام اپنے آقا کی چھری اسکی اجازت کے بغیر استعمال کرتا ہے تو آقا اسے اس پر ملامت کرتا ہے، لیکن اگر وہ اسکی چھری لے کر اسکے عزیز بیٹے کو قتل کر دے تو کیا وہ اس پر بھی تنبیہ کرے گا کہ اس نے اجازت کے بغیر چھری کیوں استعمال کی یا بچے کو قتل کرنے کی سزا دے گا۔

انبیائے علیہ السلام اور اولیاء اللہ نے جن آداب اور مستحبات کی رعایت کی ہے، اور فقہاء نے عوام کے حق میں ان سے تسامح برتا ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ عوام بڑے بڑے گناہوں کے دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں، اس طرح کے معمولی گناہوں سے کیا بچ پائیں گے، ورنہ جتنے بھی مکروہ اعمال ہیں ان سب سے نعمتوں کی ناشکری ہوتی ہے، عدل کی تقاضوں سے انحراف ہوتا ہے، اور قرب الہی کے درجات میں نقصان ہوتا ہے۔ تاہم بعض گناہ (اگر وہ امور مکروہہ میں ہوں) صرف قرب کی حدود سے نکال کر بعد کی اس دنیا میں پہنچا دیتے ہیں جہاں شیاطین کا مسکن ہے۔ یہ ایک جملہ معترضہ تھا۔ اب پھر ہم شکر نعمت اور کفران نعمت کے بحث کی طرف رجعت کرتے ہیں۔

درخت کی شاخ توڑنا : اگر کوئی شخص بغیر کسی اہم مکمل ضرورت اور صحیح غرض کے درخت کی شاخ توڑتا ہے تو وہ درختوں اور ہاتھوں کی تخلیق میں اللہ تعالیٰ کی ناشکری کرتا ہے، ہاتھوں کی نعمت میں اللہ تعالیٰ کی ناشکری یہ ہے کہ اس نے انھیں غیر اطاعت میں استعمال کیا، یہ ہاتھ بیکار پیدا نہیں کئے گئے ہیں، بلکہ اطاعت، اور خیر پر معاون اعمال کے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔ درختوں کا حالی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں پیدا کیا ہے، ان میں رگیں پیدا کی ہے، پھر انھیں پانی دیا ہے، اور ان میں غذا حاصل کرنے اور نمو پانے کی صلاحیت پیدا فرمائی ہے تاکہ وہ پوری طرح نشوونما پائیں، اور اللہ کے بندے اس سے نفع اٹھا سکیں، جو شخص بلا ضرورت توڑتا ہے، وہ گویا اس کو مکمل طور پر نمو پذیر ہونے سے روکتا ہے، حالانکہ مکمل ہونے کے بعد یہ درخت ہنگام خدا کے لئے بہتر اور مکمل صورت میں قابل انتفاع ہوتا، قبل از وقت اور صحیح مقصد کے بغیر شاخ توڑنے کا عمل حکمت کے مقصود کے خلاف اور عدل سے انحراف ہے، اگر مقصد صحیح ہو تا تو کوئی حرج نہیں تھا اس لئے کہ نباتات اور حیوانات سب انسان ہی کے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔ یہ سب فانی ہیں، انسان بھی فانی ہے، اگر انسان کی خاطر جو مخلوقات میں اشرف ہے، احسن چیزیں پہلے فنا ہو جائیں تو یہ عدل سے زیادہ قریب ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس قول میں اسی امر کی طرف اشارہ ہے۔

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَافِي السَّمَوَاتِ وَمَافِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مِّنْهُ (پ ۲۵، آیت ۳)

اور جتنی چیزیں آسمانوں میں ہیں اور جتنی چیزیں زمین میں ہیں ان سب کو اپنی طرف سے مسخر بنایا۔

ہاں اگر کوئی صحیح ضرورت اور واقعی مقصد ہے، لیکن جس درخت سے توڑتا ہے وہ غیر مملوکہ ہے اس صورت میں بھی اس کا یہ عمل ظلم ہوگا۔ اس لئے کہ درخت اگرچہ انسان کے لئے پیدا کئے گئے ہیں، لیکن جس طرح تمام درخت ایک انسان کے لئے نہیں ہیں اسی طرح ایک درخت بھی تمام انسانوں کے لئے نہیں ہے، بلکہ ایک درخت سے ایک انسان کی ضرورت پوری ہو سکتی ہے۔ اب اگر ایک شخص کو کسی ترجیح یا اختصاص کے بغیر ایک درخت سے خاص کر دیا جائے تو یہ ظلم ہوگا۔ اختصاص ترجیح اس شخص کو ہے جس نے زمین میں بیج ڈالا، اسے پانی دیا، اس کی نگہداشت کی، یہ شخص اس درخت سے فائدہ اٹھانے کا حق رکھتا ہے۔ اگر درخت کسی غیر مملوکہ زمین میں از خود پیدا ہوا ہے، نہ کسی نے بیج ڈالا نہ پانی دیا نہ نگہداشت کی، اس کے لئے وجہ اختصاص سبقت سے، جو پہلے سبقت کرے گا اسے مستغنی ہونے کا حق ہوگا، یہی عمل کا تقاضا ہے۔ اس اختصاص کے لئے فقہاء نے ملک کی تعبیر استعمال کی ہے، یہ ایک مجازی استعمال ہے، ورنہ حقیقی ملکیت تو صرف مالک الملوک کے لئے ہے، جس کے لئے تمام آسمان اور زمین ہیں، بندہ مالک کیسے ہو سکتا ہے جب کہ وہ خود اپنے نفس کا مالک نہیں ہے، اس کا نفس غیر یعنی اللہ کی ملکیت ہے، ہاں تمام افراد انسانی اللہ کے بندے ہیں، اور زمین اس کا دسترخوان ہے اس نے انھیں اپنے دسترخوان سے ضرورت کے بقدر کھانے کی اجازت دی ہے۔ اسکی مثال ایسی ہے جیسے کوئی بادشاہ اپنے غلاموں کے لئے دسترخوان بچھائے، ان میں سے ایک غلام لقمہ ہاتھ میں لے لے آتے ہیں دو سر غلام آئے اور وہ لقمہ اس سے چھیننا چاہے تو اسے اس کی اجازت نہیں دی جائے گی، اس لئے کہ لقمہ ہاتھ میں لینے کے باعث اس کا ہوجکا ہے، اس لئے نہیں کہ لقمہ اٹھانے سے وہ غلام کی ملکیت میں آیا، لقمہ اور صاحب لقمہ دونوں ہی اللہ کی ملکیت ہیں، لیکن کیونکہ ایک مخصوص لقمہ سب کی ضرورت پوری نہیں کر سکتا، اس لئے تخصیص کی ضرورت پیش آئی، اور تخصیص وجہ ترجیح میں سے کوئی ایک وجہ حاصل ہونے سے ہوتی ہے، یہاں لقمہ اٹھانے میں سبقت کرنا ایک وجہ ترجیح ہے، اب کسی دوسرے کو اس کا حق حاصل نہیں ہے کہ اس کے ہاتھ سے لقمہ چھینے، بندوں کے ساتھ بھی اللہ تعالیٰ کا یہی معاملہ ہے، اسی لئے ہم یہ کہتے ہیں کہ جو شخص دنیا کا مال ضرورت سے زائد لے، اور اسے چھپا کر رکھے، اس سے اللہ کے بندوں کو محروم کرے، جب کہ ان میں سے بہت سے اس کے محتاج ہوں تو وہ ظالم ہے، قرآن کہہ میں ہے۔

وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يَنْفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ
الْبَئِیمِ (پ ۱۱۰ آیت ۳۴)

اور جو لوگ سونا چاندی جمع کرتے ہیں اور ان کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے سو آپ ان کو ایک دزد

ناک عذاب کی خبر سنا دیجئے۔

اللہ کا راستہ اس کی اطاعت ہے، اس راستے کا توشہ مال ہے جس سے بندگان خدا کی ضرورتیں پوری ہوتی ہیں، تاہم یہ بات فقہی حکم میں داخل نہیں ہے، اس لئے ضرورتوں کی مقدار عقلی ہے، اور مستقبل میں متوقع فقر و العیال کے بارے میں مختلف لوگوں کے مختلف احساسات ہیں، نیز عمر کے آخری ماہ و سال بھی پردہ خفا میں ہیں، اب اگر ہر شخص کو مال کے سلسلے میں یکساں مقدار کا ملکت قرار دیا گیا تو یہ ایسا ہوگا جیسے کسی بچے کو باوقار اور پرسکون رہنے کا پابند کر دیا جائے، اور اسے حکم دیا جائے کہ وہ ہر غیر اہم کلام سے سکوت اختیار کرے، بچے اپنی نا سمجھی اور کم عقلی کے باعث ان احکام کے پابند اور ان امور کے متحمل نہیں ہو سکتے، یہی وجہ ہے کہ ہم نے ان کے تھیل کو دیر اعتراف نہیں کیا، بلکہ انھیں اس کی اجازت دی لیکن ان کے لئے اس اجازت کا یہ مطلب نہیں کہ لہو لعب فی نفسہ حق ہے، اسی طرح اگر ہم نے عوام کو یہ اجازت دی ہے کہ وہ اپنے مال کو زکوٰۃ نکال کر محفوظ رکھ سکتے ہیں، تو یہ نہیں کہا جاسکتا کہ مال بچا کر رکھنا حق ہے۔ ہم نے یہ حکم اس لئے دیا ہے کہ عوام فطری طور پر بغیل، کم حوصلہ اور بے ہمت ہوتے ہیں، انھیں اللہ پر اتنا توکل نہیں ہوتا کہ وہ اس کے سارے اپنا تمام تر مال و اسباب اسکی راہ میں خرچ کر سکیں، قرآن کریم نے بھی اس فطرت کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

إِنْ تَسْأَلُكُمْ مَوْهَا فَيُخْفِكُمْ تَبْخُلُوا (پ ۸۲۱ آیت ۳۷)
اگر تم سے تمہارے مال طلب کرتے پھر تم سے طلب کرتا رہے تو تم بخل کرنے لگو۔

ہر کدورت سے خالی حق اور ہر ظلم سے محفوظ عدل یہ ہے کہ انسان اللہ کے مال میں سے صرف اتنا لے جتنا ایک مخصوص سفر کے مسافر کو لینا چاہیے۔ ہر شخص اپنے جسم کا سوار ہے، اور راہ آخرت کا سفر درپیش ہے، باری تعالیٰ کا دیدار، اور اس کے حضور شرف باریابی اسکی منزل ہے، جو شخص راستے کی ضرورت سے زائد مال لے، اور وہ سرے مسافر کو محروم رکھے وہ ظالم ہے، تارک عدل ہے، مقصود حکمت کی خلاف ورزی کرنے والا ہے، اور نعمت خدا کی ناشکری کرنے والا ہے، اس کا علم ہمیں اللہ اور اس کے رسول کے کلام سے بھی ہوتا ہے، اور عقل کی رو سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ ضرورت سے زیادہ مال حاصل کرنا دنیا و آخرت دونوں میں اس کے لئے باعث وبال ہے۔

جو شخص موجودات عالم کی تمام اقسام میں اللہ تعالیٰ کی حکمت سمجھ لیتا ہے وہ حق شکر ادا کرنے پر قدرت رکھتا ہے، حق شکر کیا ہے؟ اس سوال کے جواب کے لئے یہ صفات کم ہیں، ہم جتنا بھی لکھیں گے کم ہی ہوگا، یہاں ہم نے جو کچھ لکھا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کریم کی اس آیت کی صداقت واضح ہو جائے۔

وَقَلِيلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّاكِرُونَ (پ ۸۲۲ آیت ۳)

اور میرے بندوں میں شکر گزار کم ہی ہوتے ہیں۔

اور یہ بات سمجھ میں آجائے کہ اہلس لعین اپنے اس قول سے کس لئے خوش ہوتا ہے۔

وَلَا تَحْزَنْ كَثْرَهُمْ شَاكِرِينَ (پ ۸۲۲ آیت ۱۷)

اور آپ ان میں سے اکثروں کو احسان والا نہ پائیے گا۔

مذکورہ بالا صفات میں جو کچھ بیان کیا گیا اسے سمجھنے کی کوشش کیجئے، جو شخص یہ تمام باتیں نہ سمجھے گا وہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کا مفہوم بھی نہیں سمجھے گا۔ جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے اس کے علاوہ بھی بے شمار باتیں ہیں جن کے او آخر تو خیر کیا بیان ہوں گے مبادی ہی میں عمریں ختم ہو جائیں گی، جہاں تک آیت کا تعلق ہے اس کے معنی ہر وہ شخص جانتا ہے جو عملی زبان سے واقف ہے، لیکن تفسیر سے ہر شخص واقف نہیں، اس سے نہیں تفسیر اور معنی کا فرق بھی معلوم ہو گیا۔

ایک اعتراض اور اس کا جواب : ہماری اس تقریر پر ایک اعتراض یہ بھی وارد ہوتا ہے کہ اس کا حاصل یہ ہے کہ ہر شئی میں اللہ کے لئے ایک مخصوص حکمت ہے، اور یہ کہ اسے اپنے بندوں کے بعض افعال کو اس حکمت کے کمال اور حکمت کی غایت مراد تک پہنچنے کا ذریعہ بنایا، اور بعض افعال کو کمال حکمت کے لئے مانع بنایا، اس سے ثابت ہوا کہ ہر وہ فعل جو مقصود حکمت کے موافق ہو، یہاں تک کہ حکمت اپنی غایت تک پہنچ جائے تو یہ شکر ہے، اور جو اس کے مخالف ہو یعنی اسباب کو حکمت کی غایت مراد تک نہ پہنچنے دے وہ کفر ہے یہ تمام باتیں سمجھ میں آئیں، لیکن اصل اشکال ابھی باقی ہے، اور وہ یہ کہ بندہ کا فعل کمال حکمت کا باعث بھی ہے، اور نقصان حکمت کا سبب بھی، اور یہ دونوں فعل اللہ تعالیٰ کے ہیں، پھر بندہ درمیان میں کہاں سے آگیا کہ کبھی وہ شاکر بننا ہے، اور کبھی کافر؟

اللہ تعالیٰ کی صفت و قدرت : اس اعتراض کے جواب کے لئے علوم مکاشفہ کا ایک بحرِ غار بھی ناکافی ہے، ماقبل کی سطور میں ہم اس کے مبادی مجملہ بیان کر چکے ہیں، اب ہم اسکی غایت اختصار کے ساتھ لکھیں، جو شخص پر بندوں کی گفتگو سمجھ لیتا ہے وہ یہ بات بھی سمجھ لے گا، اور جو اس میدان میں تیز رفتاری سے نہیں چل سکتا وہ اس کے انکار پر بھی مجبور ہو گا، چہ جائیکہ وہ پر بندوں کی طرح ملکوت کی فضاؤں میں اڑتا ہے پھر۔

اللہ تعالیٰ کی جلالت اور کبریائی میں ایک صفت ہے جس سے خلق اور اختراع کا فعل صادر ہوتا ہے، یہ صفت انتہائی اعلیٰ اور اعظم ہے، یہاں تک کہ کسی واضح نعمت کا نظر ایسے لفظ پر نہیں پڑتی جو اس صفت کی عظمت اور حقیقت کو پوری طرح واضح کر سکے، اس صفت کی حقیقت اس قدر اعلا ہے، اور واضحین نعمت کے فہم و عقل کا دائرہ اس قدر تنگ ہے کہ وہ اسکے مبادی کا نور بھی نہیں دیکھ پاتے کہ اسکے لئے کوئی شایان شان لفظ وضع کر سکیں، اسی لئے دنیا میں اس صفت کے لئے کوئی مناسب لفظ موجود نہیں ہے، واضحین نعمت اس صفت کی روشنی سے اس طرح محروم رہتے ہیں، جس طرح شہرک سورج سے محروم رہتی ہے، اس کی وجہ یہ نہیں ہوتی کہ سورج کی روشنی میں کوئی نقص ہے، بلکہ یہ شہرک کی نگاہ کا قصور ہوتا ہے۔ جن لوگوں نے اس صفت کی عظمت کا مشاہدہ کرنے کے لئے اپنی آنکھیں کھولیں وہ اس بات کے لئے مجبور ہوئے کہ اس کے خالق کے مبادی میں سے کچھ سمجھنے کے لئے بولنے والوں کی زبان سے کوئی لفظ بطور استعارہ لیں، اور اس صفت کے لئے اصطلاح مقرر کریں، چنانچہ انھوں نے لفظ قدرت وضع کیا، اسی بناء پر ہمیں بھی کچھ جرات ہوئی اور ہم نے بھی اس موضوع پر کچھ لکھنے کی کوشش کی۔

اس تمہید کے بعد عرض ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ایک صفت ہے قدرت، جس سے تخلیق اور ایجاد کا فعل صادر ہوتا ہے پھر مخلوق وجود میں آکر بہت سی قسموں میں منقسم ہو جاتی ہے، تقسیم کا یہ عمل، اور مختلف و مخصوص صفات پر لوگوں کا منقسم ہونا دوسری صفت کے تابع ہے جس کے لئے ضرور نا لفظ مشیت مستعار لیا گیا ہے۔ یہ لفظ ان کے لئے اس صفت کا کچھ مفہوم آشکار کرتا ہے جو زبان یعنی حرف و آواز سے گفتگو کرتے ہیں، اور بات سمجھتے ہیں، ورنہ حقیقتاً مشیت کا لفظ اس صفت کی حقیقت بیان کرنے سے اتنا ہی قاصر ہے جتنا قاصر خلق و اختراع کی حقیقت واضح کرنے سے لفظ قدرت ہے۔

قدرت سے جو افعال صادر ہوتے ہیں ان میں سے بعض وہ ہیں جو منتہا تک پہنچیں جو غایت حکمت ہے۔ اور بعض منتہا سے نیچے رہ جائیں ان میں سے ہر ایک کو مشیت کا تناسب معلوم ہو گا، اور غایت کو پہنچنے کی نسبت کیلئے جو لفظ مستعار لیا گیا ہے، ہر مرتبہ ایک نسبت کیلئے کلام مقرر کیا گیا، اور یہی کہا گیا ہے کہ یہ دونوں لفظ مشیت میں داخل ہیں لیکن ان میں سے ہر ایک میں نسبت کے اعتبار سے جو خصوصیت ہے وہ محبت اور کراہت جیسے الفاظ سے مجملاً مفہوم ہوتی ہے، پھر وہ ہندے بھی دو قسم کے ہیں جو اس کے خلق و اختراع سے وجود پذیر ہوئے، بعض وہ ہیں جن کے حق میں مشیت ازلٰی اس طرح ہوئی کہ وہ ایسے کام کریں جن سے حکمت اپنی غایت کو نہ پہنچے، یہ بات ان کے حق میں بطور قہر ہوئی ہے، ان پر اسی طرح کے دوائی اور بواہٹ مسلط کر دئے جاتے ہیں جن سے مجبور ہو کر وہ حکمت کے خلاف کام کرنے پر مجبور ہوتے ہیں کچھ وہ ہیں جن کے حق میں مشیت ازلٰی اس طرح ثابت ہوئی کہ وہ ایسے کام کریں جن سے حکمت بعض امور میں اپنی غایت کو پہنچے، دونوں فریقوں کو مشیت کی طرف ایک خاص نسبت حاصل ہے، جو نسبت غایت کو پہنچنے والے فریق کو ہے اس کا نام رضا رکھ دیا گیا ہے، اور جو غایت سے پیچھے رہ جانے والے کو ہے اسکے لئے لفظ غضب مستعار لیا گیا ہے، جس شخص پر ازل میں غضب ہوا اور اس سے کوئی ایسا فعل سرزد ہوا جو حکمت کے خلاف تھا یعنی اس فعل کی وجہ سے حکمت اپنی غایت کو نہیں پہنچی، اسکے لئے کفران کہا جانے لگا، اور اس کے لئے لعنت، ملامت اور مذمت، عقوبت میں اضافے کے بطور زیادہ کی گئی، اور جس کے لئے ازل میں رضا لکھ دی گئی اس سے کوئی ایسا فعل انجام پایا جس سے حکمت اپنی غایت کو پہنچی اسکے لئے لفظ شکر مستعار لیا گیا، اور شکر سے رضا میں اضافے کے لئے تعریف و توصیف زیادہ کی گئی۔

حاصل کلام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جمال بھی عطا کیا ہے، اور اس پر تعریف بھی کی ہے، اسی طرح بد بخت بھی بنایا گیا ہے، اور بد بختی پر اسے برا بھی کہا ہے، اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی بادشاہ اپنے غلام کو مٹلائے و حملائے، اسکے جسم سے میل کچل دو کرے، پھر اسے عمدہ کپڑے پہنائے، جب اسکی آرائش مکمل ہو جائے تو اس سے کہے تو کتنا حسین اور کس قدر خوبصورت ہے، اس مثال میں بادشاہ خود ہی خوبصورت بنانے والا ہے، اور خود ہی اپنی تعریف کرنے والا ہے، گویا وہ اپنی تعریف کرتا ہے، بظاہر غلام تعریف کا عمل ہے، لیکن حقیقت میں وہ خود ہی تعریف کر رہا ہے، اسی طرح امور ازیلہ کا حال ہے، اسباب اور میثبات کا مسلسل اسی طرح ظہور ہو رہا ہے

جو رب ارباب اور مسبب اسباب نے مقرر کر دیا ہے، یہ امور اتفاقی نہیں ہیں نہ کوئی واقعہ بلا سبب اور اچانک پیش آتا ہے، بلکہ ہر واقعے کے پس پردہ ایک امر محکم، یقینی حکمت اور ارادہ جازم ہے، اس کے لئے اہل زبان نے لفظ قضاء مستعار لیا ہے، کہتے ہیں کہ کسی امر کا فیصلہ پلک جھپکنے سے بھی کم وقفے میں ہو جاتا ہے، تقدیر کے مسندوں میں اسی قضاء سے مد جزر اور روانی و طغیانی ہے، واقعات کی اسی ترتیب کے لئے قدر کا لفظ بولا جاتا ہے، گویا لفظ قضاء امر واحد کلی ہے، اور قدر وہ تمام تفصیلات ہیں جن کا لامتناہی سلسلہ ہماری آنکھوں کے سامنے جاری ہے، کہتے ہیں کہ امور دنیا میں کوئی امر قضاء و قدر سے خالی نہیں ہے، اس لئے بعض عابدین کو یہ وہم ہوا کہ قسمت اس تفصیل کی مقتضی کیوں ہوتی ہے، اور اس تفاوت کے باوجود عدل کیسے برقرار رہ سکا؟ بعض لوگ اپنے قصور قسم، اور عجز اور اک کے باعث اس امر کی حقیقت نہیں سمجھ سکتے تھے، اور نہ اس کی تمام تفصیلات سے واقف ہونے کی صلاحیت رکھتے تھے اس لئے انھیں اس موضوع پر گفتگو کرنے سے روک دیا گیا، حکم ہوا تم خاموش رہو، تمہاری تخلیق اس لئے نہیں ہوئی کہ اس سلسلے میں زبان کھولو۔ لَا یَسْئَلُ عَمَّا یَفْعَلُ وَهُمْ یَسْئَلُونَ (پ ۲ ار ۲ آیت ۲۳)

وہ جو کچھ کرتا ہے اس سے کوئی باز پرس نہیں کر سکتا اور وہ اسے باز پرس کی جا سکتی ہے۔

بعض لوگوں کے دلوں میں نور الہی کی شمع روشن ہوئی، ان کے قلوب میں پہلے ہی اس نور کو قبول کرنے کی صلاحیت تھی، اس لئے جب ان پر تجلیات ربانی منکشف ہوئیں تو وہ نور علی نور بن گئے، ان کے نگاہوں کے سامنے آسمانوں اور زمین کے ملکوت واضح ہو گئے، انھوں نے ان تمام امور کو ایسا ہی پایا جیسے وہ حقیقت میں ہیں، ان کے لئے بھی یہ حکم ہوا کہ آداب الیہ کے زیور سے آراستہ ہو، اور چپ رہو، جب تقدیر کا ذکر آئے تو خاموشی اختیار کرو، اس لئے کہ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں، اور تمہارے ارد گرد کم نگاہوں کی کثرت ہے، تم اگرچہ دیدہ و نیاز رکھتے ہو، لیکن ایسے رہو جس سے معلوم ہو کہ تم بھی نگاہوں کے ضعف میں مبتلا ہو، شہر و چشم لوگوں کے لئے آفتاب پر پڑا ہوا حجاب نہ بناؤ، ایسا نہ ہو کہ وہ اس کے نور کی تاب نہ لاسکیں اور ہلاک ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ کے اخلاق اپناؤ، اور اپنی بلندی سے نیچے اترو، تاکہ نا تو اں لوگ تم سے مانوس ہوں، اور تمہارے دلوں کے نور سے فیضان حاصل کریں، اگرچہ اس پر حجاب ہی کیوں نہ پڑا ہوا ہو، چلن سے بھی روشنی جھلکتی ہے، اور اندھیروں کا سینہ چیر کر راہ رو کو راستہ دکھلاتی ہے، جس طرح شہرک دن کے اجالے کی تاب نہیں لاتی لیکن جب رات ڈیرے ڈال دیتی ہے اور سورج کی باقی ماندہ روشنی اور کواکب کے اجالے سے قائمہ انھائی ہے، تو وہ زیادہ روشنی کے محفل نہیں ہو سکتی، صرف اتنی روشنی اخذ کرتی ہے جو اس کا وجود مدد داشت کر سکتا ہے، ان لوگوں جیسے بنو جن کے بارے میں کسی شاعر نے کہا ہے۔

شَرِبْنَا شَرَابًا طَیِّبًا عِنْدَ طَیِّبٍ - كَزَاكَ شَرَابُ الطَّيِّبِينَ يَطِيبُ
شَرِبْنَا وَلَهَرَ قَنَا عَلَى الْأَرْضِ فَضْلُهُ - وَلِلْأَرْضِ مِنْ كَأْسِ الْكَرِيمِ نَصِيبُ

(ہم نے پاکیزہ لوگوں کے پاس شراب پی، پاکیزہ لوگوں کی شراب بھی پاکیزہ ہوتی ہے، ہم نے شراب پی، اور باقی ماندہ زمین پر گرا دی، سخاوت پیشہ لوگوں کے گلاس میں زمین کا حصہ بھی ہوتا ہے)

خلق و اختراع کے اول و آخر یہ ہے جو بیان کیا گیا، لیکن اسے وہی سمجھ سکتا ہے جو سمجھنے کا اہل ہوگا، اگر تم اس کے اہل ہوئے تو خود آنکھیں کھول کر دیکھ لو گے، تمہیں کسی راہ نما کی ضرورت پیش نہ آئے گی، یہ صحیح ہے کہ اندھے کو راستہ بتایا جاتا ہے، بلکہ اس کا ہاتھ پکڑ کر چلا جاتا ہے، لیکن کس حد تک؟ بعض راستے اس قدر تنگ ہوتے ہیں کہ ان پر تلواریں زیادہ عزیز اور ہال سے زائد باریک کا گمان ہوتا ہے، اس پر سے پرندہ اڑ کر گزر سکتا ہے، لیکن کسی اندھے کو انہی پکڑ کر پار نہیں کرایا جاسکتا، بعض اوقات راستے میں دریا بہتے ہیں، جنہیں صرف وہی لوگ عبور کر سکتے ہیں، جو تیرنا جانتے ہوں، ایسے میں خود تیر کر کنارے لگتا اور کسی ناواقف کو اپنے ساتھ کھینچ کر پار لگانا بجا اوقات بڑا مشکل ہو جاتا ہے۔

جو لوگ اس میدان کے شہسوار ہیں عوام الناس کے مقابلے میں ان کی نسبت ایسی ہے جیسے پانی پر چلنے والے کو زمین پر چلنے والے سے ہے، تیراکی تو ایک فن ہے، محقق سے ہر شخص یہ فن حاصل کر سکتا ہے، لیکن پانی پر چلتا ہر کسی کو ناس کے بس کا لوگ نہیں ہے، اسکے لئے یقین کی قوت ضروری ہے۔ ہر کار و عالم علی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں کسی صحابی نے عرض کیا یا رسول اللہ! سنا ہے حضرت میثی علیہ السلام پانی پر چلتے تھے، فرمایا اگر یقین اور زیادہ ہو تا تو ہوا پر چلتے۔

محبت، گمراہی، رضا، غضب، شکر اور کفران کے معانی کے سلسلے میں یہ باتیں رموز اشارات ہیں، علم معاملہ میں اس سے زیادہ کی گنجائش بھی نہیں ہے۔

عبادت - غایت تحقیق : لوگوں کی قسم سے قریب تر کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے بطور مثال ارشاد فرمایا ہے۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ (پ ۲۲ آیت ۵۶)

اور میں نے جن اور انسان کو اسی واسطے پیدا کیا ہے کہ میری عبادت کیا کریں۔

گویا بندوں کی عبادت ان کے حق میں غایت حکمت ہے، گمراہی بتلایا کہ میرے دو بندے ہیں، ان میں سے ایک مجھے محبوب ہے اسکا نام جبرئیل، روح القدس، اور امین ہے، وہ میرے نزدیک محبوب، مطاع، امین اور مکین ہے، دوسرا بندہ مبغوض ہے اس کا نام ابلیس ہے، اس پر دن رات لعنتیں بھیجی جاتی ہیں، اسے قیامت کے دن تک سہلت دی گئی ہے، اس کے بعد یہ بیان فرمایا کہ جبرئیل حق کا راستہ دکھاتے ہیں۔

قُلْ نَزَّلَهُ رُوحُ الْقُدُّسِ مِنْ رَبِّكَ بِالْحَقِّ (پ ۲۰ آیت ۱۰۲)

آپ فرمادیجئے کہ اسکو روح القدس آپ کے رب کی طرف سے حکمت کے موافق لائے ہیں۔

يُلْقِي الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ مَوْلَىٰ مَنْ تَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ (پ ۲۳ آیت ۱۵)

وہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے وحی بھیجتا ہے۔

ابلیس گمراہی کا راستہ دکھاتا ہے۔

لِيُضِلَّوْا عَنْ سَبِيلِهِ (پ ۲۳ آیت ۳۰)

تاکہ دو سروں کو بھی اس (اللہ) کی راہ سے گمراہ کریں۔

گمراہ کرنے کے معنی ہیں بندوں کو غایت حکمت تک پہنچنے سے روک دینا، غور کیجئے اللہ تعالیٰ نے گمراہ کرنے کے فعل کو کس طرح اس بندے کی طرف منسوب فرمایا جو مبغوض ہے، ہدایت کی راہ دکھلانے کے معنی یہ ہیں کہ بندوں کو غایت حکمت تک پہنچانا۔ یہاں بھی قابل غور بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رہنمائی کے عمل کی اپنے اپنے بندے کی طرف نسبت فرمائی جو محبوب ہے، عادات میں بھی اس طرح کی نسبتوں کی مثال ملتی ہے۔ مثلاً بادشاہ کو دو آدمیوں کی ضرورت ہے، ایک پانی پلانے والے کی، دوسرے پیچھے لگانے والے اور جھانڈ دینے والے کی۔ اگر انکے پاس دو غلام ہوں تو وہ پیچھے لگانے اور مہاست صاف کرنے کا کام اس غلام کے سپرد کرے گا جو ان میں کم تر اور بدتر ہوگا، جب کہ پانی پلانے کا کام اس غلام کے سپرد ہوگا جو ان دونوں میں خوب رو، حسن خلق سے آراستہ، مکمل اور محبوب ہوگا۔

فعل کی نسبت : اب اگر تم سے کوئی برا فعل سرزد ہو تو یہ ہرگز نہ کہو کہ یہ میرا فعل ہے، اللہ کا فعل نہیں ہے، ایسا کہنا غلطی ہے، ہر فعل خدا کا ہے، خواہ وہ اچھا ہو یا برا یہ جو تم اچھے فعل کو اچھے آدمیوں کی طرف اور برے فعل کو برے انسانوں کی طرف منسوب کرتے ہو یہ بھی اللہ ہی کا فعل ہے کہ وہ آدمی کے ارادے کا رخ بدل دیتا ہے، اور وہ برائی کی نسبت برے آدمی اور اچھائی کی نسبت اچھے آدمی کی طرف کرنے لگتا ہے۔ یہ بھی اسکا کمال عدل ہے، کبھی اسکا عدل ان امور میں کامل ہوتا ہے جن میں بندوں کو کوئی دخل نہیں ہوتا اور کبھی خود تمہارے وجود میں مکمل ہوتا ہے، جس طرح تمہارا وجود اسکا فعل ہے اسی طرح تمہارے وجود سے نکلنے والا ہر

فضل بھی اسی کا فعل ہے، تمہارا ارادہ، تمہاری قدرت، تمہارا عمل اور تمہاری تمام حرکات سب اسی کے افعال ہیں، اس نے ان تمام کو عدل کے ساتھ مرتب کیا ہے تب ہی تو تم سے معقول اعمال سرزد ہوتے ہیں، لیکن تمہارے سامنے صرف تمہارا نفس رہتا ہے، اس لئے تم یہ سمجھتے ہو کہ جو کچھ عالم ظاہر میں وقوع پذیر ہو رہا ہے اس کا عالم غیب و ملکوت میں کوئی سبب نہیں ہے۔ اس لئے تم ہر فعل کی نسبت اپنی طرف کرتے ہو۔

تمہاری مثال ان لوگوں کی سی ہے جو رات میں کٹ پتلیوں کا تماشا دیکھتے ہیں، ان کی آنکھوں کے سامنے پکڑے کی بنی ہوئی چند پتلیاں پروے کے پیچھے سے نکلتی ہیں، اور رقص کرتی ہیں، اچھلتی ہیں کودتی ہیں، کبھی اٹھتی ہیں، کبھی بیٹھتی ہیں، بچے اپنی سادہ لوحی اور کم فہمی کے باعث یہ سمجھتے ہیں کہ یہ پتلیاں از خود حرکت کر رہی ہیں، ان بے چاروں کو کیا معلوم کہ پروے کے پیچھے کوئی بیٹھا ہوا انھیں حرکت دے رہا ہے، یہ پتلیاں چند ایسے باریک تاروں یا ہالوں سے بندھی ہوئی ہیں جو ان بچوں کو نظر نہیں آتے، اگر کوئی بچہ اس راز سے واقف بھی ہے تو اسے اتنی واقفیت نہیں ہوتی جتنی تماشا دکھانے والے کو ہوتی ہے۔ دنیا کے لوگوں کی مثال ایسی ہی ہے، علماء کے علاوہ سب بچوں کے مانند ہیں، جب یہ خود کو اور اپنے جیسے دوسرے انسانوں کو حرکت کرتے ہوئے دیکھتے ہیں تو یہ سمجھتے ہیں کہ یہی حرکت کر رہے ہیں، اور علماء جانتے ہیں کہ انھیں کوئی حرکت دینے والا ہے، یہ خود بخود حرکت نہیں کرتے مگر علماء بھی عام طور پر تحریک کی کیفیت سے واقف نہیں ہوتے، اس حکم سے وہ علماء اور عارفین مستثنیٰ کئے جاسکتے ہیں، جنھیں علم اور معرفت میں رسوخ حاصل ہے، یہ لوگ اس تحریک کی کیفیت بھی ملاحظہ کر لیتے ہیں، وہ دیکھتے ہیں کہ کئی کے جال سے زیادہ باریک تاروں کا ایک سلسلہ آسمان سے زمین کی طرف لٹکا ہوا ہے، اور ان تاروں میں زمین والوں کے سر بندھے ہوئے ہیں، وہ تار اس قدر صہین اور باریک ہے کہ ظاہری آنکھوں سے نظر ہی نہیں آتے، پھر وہ یہ دیکھتے ہیں کہ ان تاروں کے سرے ان فرشتوں کے ہاتھوں میں ہیں جو آسمانوں کو حرکت دیتے ہیں، وہ یہ بھی مشاہدہ کرتے ہیں کہ ان فرشتوں کی ٹاپیں حالمینِ عرش کی طرف لگی ہوئی ہیں، اور وہ اس بات کے غصہ ہیں کہ حضرت ربوبیت سے ان پر کیا حکم نازل ہوتا ہے، تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کے ہر حکم کی اسی طرح تعمیل کریں جس طرح مطلوب ہے، اسکے کسی حکم میں تاخیر نہ ہو۔

لَا يَعْصُونَ لِلْعَمَّا مَرَهُمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ (پ ۲۸، آیت ۶)

جو کسی بات میں خدا کی نافرمانی نہیں کرتے، اور جو کچھ ان کو حکم دیا جاتا ہے وہ کرتے ہیں۔

قرآن کریم نے بھی ان مشاہدات کی طرف اشارہ فرمایا :-

وَفِي السَّمَاءِ رُفُكُهُمْ وَمَا تَوْعَدُونَ (پ ۳۱، آیت ۲۳)

اور تمہارا رزق اور جو تم سے وعدہ کیا جاتا ہے سب کاسب آسمان میں ہے۔

قدر اور امر کا جو انتظار کرتے ہیں، یہ بات قرآن کریم نے ان الفاظ میں بیان فرمائی ہے :-

خَلَقَ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ وَمِنَ الْأَرْضِ مِثْلَهُنَّ يَتَنَزَّلُ الْأَمْرُ بَيْنَهُنَّ لِتَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ عَلَىٰ

كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ وَأَنَّ اللَّهَ قَدْ أَحَاطَ بِكُلِّ شَيْءٍ عِلْمًا (پ ۲۸، آیت ۴)

جس نے سات آسمان پیدا کئے ہیں اور ان ہی کی طرح زمین بھی (اور) ان سب میں (اللہ کے) احکام نازل

ہوتے رہتے ہیں کہ تم کو معلوم ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ ہر شے پر قادر ہے اور اللہ ہر شے کو احاطہ علی میں لئے

ہوئے ہے۔

یہ وہ امور ہیں جن کی تاویل صرف اللہ جانتا ہے، یا علم میں رسوخ رکھنے والے علماء حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کے نزدیک راہِ عین فی العلم وہ لوگ ہیں جو ان علوم کے حامل ہوں جنھیں مخلوق کی ناقص عقلیں نہ سمجھ سکیں، ایک مرتبہ آپ کے سامنے قرآن کریم کی یہ آیت پڑھی گئی یَتَنَزَّلُ الْأَمْرُ بَيْنَهُنَّ اور اس آیت کے معنی دریافت کئے گئے فرمایا اگر میں اس آیت کے معنی بیان

کروں تو تم مجھے پتھروں سے مارو، ایک روایت میں ہے کہ اس آیت کی معنی بیان کرنے پر تم مجھے کافر کہو۔ اب ہم اس منکھو کو ہمیں ختم کرتے ہیں، بات کافی طویل ہوئی، کلام کی باگ دوڑ سرکش گھوڑے کی طرح قبضہ اختیار سے نکل گئی، اور علم معاملہ کے ساتھ کچھ ایسے علوم مغلط ہو گئے جو اس میں سے نہیں ہیں اس لئے اب ہم بحث کی طرف رجوع کرنے ہیں جسے پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔

مقاصد شکر : بات مقاصد شکر کی ہو رہی تھی، ہم یہ بیان کر رہے تھے کہ شکر کی حقیقت یہ ہے کہ بندہ ایسے عمل کرے جن سے اللہ کی حکمت پوری ہو، بندوں میں جو سب سے زیادہ شاکر ہو گا وہی جو سب سے زیادہ محبوب ہو گا، اور وہی اللہ تعالیٰ سے زیادہ قریب بھی ہو گا۔ اللہ تعالیٰ سے اسکے بندوں میں سب سے زیادہ قریب فرشتے ہیں، ان میں بھی درجات کی ترتیب ہے۔

بعض فرشتوں کا درجہ بعض سے بلند ہے، سب سے زیادہ اعلیٰ مرتبہ کے حامل حضرت اسماعیل علیہ السلام ہیں، فرشتوں کے درجات اس لئے بلند ہیں کہ وہ اپنی ذات سے کریم اور نیک ہیں۔ ان کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے حضرات انبیاء علیہم السلام کو صلاح عطا فرمائی، اور یہ دین پر تمام مخلوق میں اشرف ہیں، ملائکہ کے درجے سے قریب تر درجہ حضرات انبیاء علیہم السلام کا ہے، اس لئے کہ یہ بھی اپنی ذات میں بہتر ہیں، ان کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوق تک ہدایت پہنچائی، اور اپنی حکمت پوری کی، ان تمام پیغمبروں میں بلند ترین مرتبہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے، آپ پر دین کی تکمیل ہوئی، اور انبیاء کرام علیہم السلام کا سلسلہ ختمی ہوا۔ انبیاء کرام کے درجے سے قریب تر درجہ علماء کا ہے جو انبیاء کرام کے وارث ہیں، یہ بھی بذات خود صالح ہیں، ان کے ذریعے بھی اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوق کی اصلاح فرمائی، تاہم تمام علماء کے درجات برابر نہیں ہیں۔ بلکہ ہر شخص کا درجہ اس کی صلاح نفس اور غیر کے اعتبار سے بلند ہے، علماء سے قریب تر درجہ منصف مزاج بادشاہوں کا ہے، اس لئے کہ علماء لوگوں کے دین کی اصلاح کرتے ہیں، اور عادل بادشاہ ان کے دین کی اصلاح کرتے ہیں۔ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس دین بھی تھا، اور سلطنت بھی تمام انبیاء پر آپ کی فضیلت کی وجہ بھی یہ ہے کہ آپ کے ذریعے دین اور دنیا دونوں کی اصلاح ہوئی اس سے پہلے جو انبیاء تشریف لائے انھیں سلطنت اور سیف عطا نہیں کی گئی، علماء اور نیک دل بادشاہوں سے قریب تر وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے دین اور نفس کی اصلاح کی، یہ وہ لوگ ہیں جن کے ذریعے حکمت الہی کی تکمیل نہیں ہوئی، بلکہ خود ان کی ذات میں ہوتی ہے، ان کے علاوہ جو لوگ ہیں وہ کسی شمار قطار میں نہیں ہیں۔

سلاطین دین کی تقویت کا باعث ہیں : مسلمان بادشاہ دین محمدی کی تقویت کا باعث ہوتے ہیں، اس لئے ان کی تعزیر نہ کرنی چاہیے خواہ وہ ظالم اور فاسق ہی کیوں نہ ہوں، حضرت عمو ابن العاص ارشاد فرماتے ہیں کہ ظالم امام داعی حق سے بہتر ہے۔ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں۔

سَيَكُونُ بَعْدِي عَلَيْكُمْ أَمْرٌ لَهُ تَغْيِرُ فُؤَادَ مِنْهُمْ وَتَنَكَّرُونَ وَيَفْسِلُونَ وَمَا يُصْلِحُ
اللَّهُ بِهِمْ أَكْثَرُ فَإِنْ أَحْسَنُوا فَلَهُمْ الْأَجْرُ وَعَلَيْكُمْ الشُّكْرُ وَلِنْ أَسَاؤُوا فَعَلَيْهِمُ الْيُوزُرُ
وَعَلَيْكُمْ الْعَنْبَرُ (مسلم امام مسلم)

عقرب میرے بعد تم پر کچھ حکمران ہوں گے جن میں سے بعض کو تم جانتے ہو گے، اور بعض کو نہیں جانتے ہو گے، وہ فساد کریں گے (ناہم) جس قدر ان کے ذریعے اللہ تعالیٰ اصلاح فرمائے گا وہ زیادہ ہو گا اسلئے اگر وہ اچھا کام کریں گے تو ان کے لیے اجر ہو گا اور اگر وہ برا کام کریں گے تو ان پر گناہ ہو گا اور تم پر میرا ہو گا۔

حضرت سبیل ارشاد فرماتے ہیں کہ جو شخص سلطان کی امامت کا انکار کرے وہ زعمیق ہے جسے سلطان ہلائے اور وہ اس کے پاس نہ جائے تو وہ بد متی ہے، اور جو بغیر ہلائے چلا جائے وہ جاہل ہے، آپ سے دریافت کیا گیا کہ لوگوں میں سب سے بہتر کون ہے، فرمایا سلطان، لوگوں نے عرض کیا ہم یہ سمجھتے تھے کہ سلطان بدترین انسان ہے، آپ نے فرمایا ایسا نہ کہو، اللہ تعالیٰ ہر روز اسکی بد باتیں دیکھتا

ہے ایک تو یہ کہ اسکی وجہ سے مسلمانوں کے اموال سلامت ہیں دوسرے یہ کہ اسکی وجہ سے مسلمانوں کی جانیں سلامت ہیں۔ یہ دونوں باتیں اسکے نامہ اعمال میں پاتا ہے اور اسکے تمام گناہ معاف فرماتا ہے حضرت سہیل یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ سلاطین کے دروازوں پر لٹکی ہوئی سیاح کھڑیاں شہزادوں سے بہتر ہیں جو وعظ کریں۔

لائق شکر نعمتیں

دوسرا رکن

شکر کا دوسرا رکن وہ نعمتیں ہیں جن پر شکر ادا کیا جاتا ہے، یہاں نعمت کی حقیقت، اسکے اقسام اور درجات بیان کئے جائیں گے اور یہ بتا دیا جائے گا کہ کس چیز میں نعمت خاص ہے اور کس میں عام ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو اتنی نعمتوں سے نوازا ہے کہ انھیں احاطہ شمار میں بھی نہیں لایا جاسکتا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :-

وَلَنْ نَعْلَمَوا نِعْمَتَکَ لَوْ کُلُّوا لَا نَحْصُوہَا (پ ۳۳ ر ۳۴ آیت ۳۴)

اور اللہ تعالیٰ کی نعمتیں اگر شمار کرنے لگے تو شمار میں نہیں لاسکتے۔

پہلے ہم چند کلی امور ذکر کرتے ہیں تاکہ وہ نعمتوں کی معرفت میں توانمیں کے قائم مقام بن جائیں، پھر ہر نعمت کا الگ الگ ذکر کریں گے اس رکن میں تین بیان ہیں۔

نعمت کی حقیقت اور اسکی اقسام

جاننا چاہیے کہ ہر خیر، ہر لذت، ہر سعادت بلکہ ہر مطلوب اور ہر مؤثر نعمت ہے، لیکن حقیقی نعمت اخروی سعادت ہے، سعادت اخروی کے علاوہ جن چیزوں کو نعمت کہا جاتا ہے یا تو ایسا کہنا غلط ہے، یا یہ استعمال بطور مجاز ہے۔ مثلاً دنیوی سعادت کو جس سے آخرت پر مدد ملے نعمت کہنا قطعاً غلط ہے، بعض اوقات کسی شئی کو نعمت کہنا صحیح ہوتا ہے، لیکن زیادہ صحیح یہ ہے کہ نعمت کا اطلاق اخروی سعادت پر ہو، ہر اس شئی پر نعمت کا اطلاق صحیح ہے جو ایک واسطے سے یا ایک سے زائد واسطوں سے سعادت اخروی تک پہنچنے میں معاون ہو، اس لئے کہ یہ شئی حقیقی کے حصول کا سبب ہے جو نعمتیں اور لذتیں اخروی سعادت کے حصول کا ذریعہ اور اس پر معین ہوتی ہیں ان کی تشریح کے لئے ہم نعمتوں کی کئی قسمیں کرتے ہیں۔

پہلی تقسیم : اگر ہم تمام امور کی نسبت اپنی طرف کر کے دیکھیں تو ان کی چار قسمیں ہوتی ہیں۔ اول وہ امور جو دنیا اور آخرت دونوں میں نافع ہوں جیسے علم اور حسن اخلاق، دوم وہ جو دونوں میں غیر مفید ہوں جیسے جمالت اور بد اخلاقی، سوم وہ جو دنیا میں مفید ہوں اور آخرت میں غیر مفید جیسے شہوات سے تلذذ حاصل کرنا، چہارم وہ جو دنیا میں نقصان دہ ہوں اور آخرت میں نفع بخش جیسے شہوات پر قابو پانا اور نفس کی مخالفت کرنا۔ ان میں سے پہلی قسم جو دنیا و آخرت دونوں میں نافع ہے وہ نعمت حقیقی ہے یعنی علم اور حسن خلق، اور جو دونوں میں مضرب ہے وہ حقیقی مصیبت ہے، یہ علم کی ضد جمالت اور حسن خلق کی ضد بد خلقی ہے، اور جو دنیا میں نفع بخش اور آخرت میں مضرب رساں ہے اسے اہل بصیرت خالص مصیبت کہتے ہیں، اور جاہل لوگ نعمت سمجھتے ہیں، اسکی مثال ایسی ہے جیسے کسی بھوکے کو زہر آلود شہد مل جائے، اگر وہ زہر سے واقف ہو گا تو اس شہد کو مصیبت سمجھے گا، اور ناواقف ہو گا تو اسے نعمت قرار دے گا۔ جو چیز آخرت میں نافع اور دنیا میں مضرب ہے وہ اہل عقل کے نزدیک نعمت اور جاہلوں کے نزدیک مصیبت ہے، اس کی مثال ایسی جیسے کڑوی دوا کہ اس کا ذائقہ برا ہے، لیکن اس کا اثر واقعی ہوتا ہے، جب کہ اس سے ملنے والی شفا خوش آئند اور دیرپا ہے، اگر کسی بچے کو تلخ دوا پینے کے لئے دی جائے تو وہ اسے مصیبت تصور کرے اور اسے پینے پر کبھی راضی نہ ہوگا، الا یہ کہ زبردستی پلا دی جائے، جب کہ ہاشمور انسان نہ صرف یہ کہ کڑوی سے کڑوی دوا بخوشی پی لیتا ہے بلکہ جو شخص اسے یہ دوا دیتا ہے یا اس کا سامان فراہم کرتا ہے، یا اسکی تیاری میں مدد کرتا ہے اس کا شکر گزار اور ممنون احسان بھی ہوتا ہے کہ احسان شناسی اور منفعت کشی کے طور پر اس کی قربت

حاصل کرتا ہے، اور اسے ہدایا سے نوازتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ماں اپنے بچے کا کندہ خون نہیں ٹکوانے دیتی، جب کہ باپ اس پر رضا مند ہو جاتا ہے، اس لئے کہ باپ اپنے کمال عقل کے باعث انجم پر نظر رکھتا ہے، اور ماں اپنی شدت محبت کے باعث صرف حال پر نظر رکھتی ہے، اور بچہ اپنی جمالت کے باعث ماں کو اپنی محسن تصور کرتا ہے، اور اس شفقت اور محبت سے مانوس ہو جاتا ہے اور باپ کو اپنا دشمن سمجھتا ہے، اگر اس میں ذرا بھی عقل ہوتی تو یہ بات جان لیتا کہ ماں دوست کی صورت میں دشمن ہے، اس لئے کہ خون ٹکوانے سے منع کرنا اسے ایسے امراض میں مبتلا کرے گا جو خون ٹکانے کے عمل سے زیادہ تکلیف کا باعث ہوں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ جاہل دوست محمد دشمن سے زیادہ نقصان دہ ہے، ہر انسان اپنے نفس کا دوست ہے، لیکن وہ جاہل دوست ہے، اس لئے وہ اس کے ساتھ وہ سلوک کرتا ہے، جو دشمن بھی نہیں کرتا۔

دوسری تقسیم : دنیوی اسباب میں خیر اور شر دونوں کی آمیزش ہے، بہت کم اسباب ایسے ہیں جن میں صرف خیری خیر ہے شر نہیں ہے۔ مال، جاہ، اولاد، اقربہ، اور دوسرے تمام اسباب ایسے ہیں کہ ان میں خیر بھی ہے اور شر بھی۔ تاہم ایسے اسباب کی تین قسمیں ہیں، پہلی قسم وہ اسباب ہیں جن کا نفع ان کے ضرر کے مقابلے میں زیادہ ہے جیسے بقدر کفایت مال اور جاہ وغیرہ اسباب، دوسری قسم میں وہ اسباب ہیں جن کا ضرر اکثر لوگوں کے حق میں ان کے نفع سے زیادہ ہے جیسے بہت سال، اور وسیع تر جاہ، تیسری قسم وہ اسباب ہیں جن کا نفع و ضرر برابر ہے یہ وہ امور ہیں جو اشخاص کے اعتبار سے مختلف ہوتے ہیں، مثلاً ایک آدمی اچھے مال سے اگرچہ وہ زیادہ ہی کیوں نہ ہو نفع اٹھاتا ہے، اللہ کی راہ میں خرچ کرتا ہے، مدد و خیرات کرتا ہے، اگر کسی کو یہ توفیق ہو تو مال کی کثرت اس کے حق میں نعمت ہے، بعض بد بخت لوگ تھوڑے مال سے بھی نقصان اٹھاتے ہیں، یعنی اسے حقیر سمجھتے ہیں اور ہر وقت اپنے رب سے شکوہ کناں رہتے ہیں، اور زیادتی کی ہوس کرتے ہیں، ایسے شخص کے حق میں بلائیہ مال ذلت اور مصیبت کا باعث ہے۔

تیسری تقسیم : خیر کے جس قدر امور ہیں وہ ایک اعتبار سے عین قسم کے ہیں، ایک وہ جو لذت مطلوب ہوں دوسرے وہ جو خیر کے لئے مطلوب ہوں، تیسرے وہ جو لذت بھی مطلوب ہوں اور خیر بھی۔ پہلی قسم یعنی ان امور کی مثال جو لذت مطلوب و محبوب ہوں دیدار فی کی لذت، اور اس کی ملاقات کی سعادت ہے۔ یہ اخروی سعادت ہے، اس کا سلسلہ کبھی منقطع نہیں ہو گا، یہ سعادت اس لئے مطلوب نہیں ہوتی کہ اس کے ذریعے دوسری حاصل کی جاتی ہے، بلکہ اپنی ذات سے مطلوب اور مقصود ہوتی ہے۔ دوسری قسم یعنی ان امور کی مثال جو اپنی ذات سے مقصود نہیں ہوتے بلکہ خیر کے لئے مقصود ہوتے ہیں درہم و دینار ہیں، اگر دنیا کی ضرورتیں پوری کرنے کے لئے کوئی اور چیز مقرر ہوتی تو سونا چاندی اور اینٹ پتھر میں کوئی فرق نہ ہوتا، لیکن کیونکہ یہ لذت کے حصول کے ذریعہ ہیں، اور ان کے ذریعے دنیاوی راحتیں، سہولت اور سرعت حاصل ہو جاتی ہیں، اس لئے جاہلوں کے نزدیک یہ لذت محبوب ہو گئیں یہاں تک کہ وہ انھیں جمع کرتے ہیں، زمین میں دفن کرتے ہیں، نما کا راندہ طریقے پر خرچ کرتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ درہم و دینار ہی مقصود ہیں، ان لوگوں کی مثال اس شخص کی سی ہے جو کسی سے محبت کرے، اس کی وجہ سے اس قاصد سے بھی محبت کرے جو ان دونوں کے درمیان پیغام رسانی یا ملاقات کا وسیلہ بنتا ہے، پھر قاصد کی محبت یہاں تک بڑھے کہ اصل محبوب کو فراموش کر دے، اور زندگی بھر اس کا نام نہ لے، بلکہ اس کے بجائے قاصد کی محبت میں مشغول رہے اس کی خاطر بدارت میں لگا رہے، یہ انتہائی جمالت اور کھلی گمراہی ہے۔ تیسری قسم میں وہ امور تھے جو اپنی ذات سے بھی مطلوب ہیں اور خیر کے لئے بھی مقصود ہیں، جیسے صحت اور سلامتی۔ یہ اس لئے بھی مقصود ہے کہ انسان صحت پاکر دیکر اور فکر پر قدرت حاصل کرتا ہے، اور ذکر و فکر سے اللہ تک پہنچاتے ہیں، نیز ان کے ذریعے انسان دنیاوی لذات بھی حاصل کرتا ہے۔ صحت اپنی ذات سے بھی مقصود ہے، اس لئے کہ بعض اوقات آدمی پیدل نہیں چلنا چاہتا اس کے باوجود یہ چاہتا ہے کہ اس کے دونوں پاؤں سلامت رہیں، حالانکہ پاؤں کی سلامتی اس لئے مقصود ہونی چاہیے کہ یہ چلنے کا ذریعہ ہیں، لیکن کیونکہ سلامتی بذات خود بھی محبوب ہے اس لئے اس کی طلب کی جاتی ہے۔

ان تینوں قسموں میں حقیقی نعمت پہلی قسم ہے، یعنی اخروی سعادت جو لذت مقصود ہوتی ہے، جو چیز لذت بھی مقصود ہو، اور غیرہ

بھی وہ بھی نعمت ہے مگر پہلی قسم کے مقابلے میں اس کا درجہ کم ہے اور جو چیز اپنی ذات سے مقصود نہ ہو بلکہ فیر کے لئے مقصود ہو جیسے درہم و دینار انھیں اس اعتبار سے نعمت نہیں کہا جائے گا کہ یہ نعمت ہیں بلکہ اس لحاظ سے نعمت کہا جائے گا کہ یہ وسیلہ ہیں اس لئے یہ صرف اس شخص کے حق میں نعمت ہوں گے جو اپنی ضرورت اس کے بغیر پوری نہ کر سکتا ہو اگر کسی شخص کا مقصد علم اور عبادت ہے اور اس کے پاس بقدر کفایت مال ہے جس سے اس کی ضروریات پوری ہو سکتی ہیں تو اس کے نزدیک سونا اور پتھر دونوں برابر ہیں اسے نہ ان کے وجود سے دل ہنسی ہوگی اور نہ ان کے عدم سے اور اگر وہ اسے لغو عبادت سے مشغول رکھیں تو یہ اس کے حق میں معیبت ہوں گے نعمت نہیں ہوں گے۔

چوتھی تقسیم : خبر کی ایک اور تقسیم کی جاسکتی ہے اس اعتبار سے بھی خبر کی تین قسمیں ہیں 'نافع' 'لذیہ' 'میل'۔ لذیہ وہ ہے جس کا نفع فوری طور پر معلوم ہو 'نافع' وہ ہے جو انجام کے اعتبار سے مفید ہو اور 'میل' وہ ہے جو تمام حالات میں عمدہ ہو 'شرکی' بھی تین قسمیں ہیں ضرر رساں 'فحج' اور ابرہہ۔ پھر ان دونوں کی دو قسمیں ہیں 'مطلق' اور 'مشید'۔ مطلق وہ ہے جس میں مذکورہ بالا تینوں وصف جمع ہو جائیں خبر میں اس کی مثال علم و حکمت ہے یہ اہل علم و حکمت کے نزدیک نفع بخش بھی ہیں 'لذیہ' بھی ہیں اور 'میل' بھی۔ شر میں اس کی مثال جمالت ہے یہ نقصان دہ بھی ہے ایذا رساں بھی ہے اور 'فحج' بھی 'میل' آوی اس وقت اذیت محسوس کرتا ہے جب وہ یہ دیکھتا ہے کہ جاہل ہوں اور وہ سراغ شخص عالم ہے اس وقت اپنے نقص کا اور اک کرتا ہے اور تکلیف اٹھاتا ہے 'میل' اسکے اندر علم کی لذیہ شہوت سرا بھارتی ہے 'بکمی حد' کبر اور جسمانی شہوت تعلیم کے لئے نافع بن جاتی ہیں اس طرح ہلکی کے دوپالوں کے درمیان آجاتا ہے یا دو متضاد قوتیں اسے اپنی اپنی طرف کھینچنے لگتی ہیں اس کی جان سخت ضیق میں آجاتی ہے ہر صورت میں اذیت میں مبتلا ہوتا ہے علم حاصل کرنے میں بھی کہ اس صورت میں کبر چھوڑنا پڑتا ہے تعلیم کی ذلت برداشت کرنی پڑتی ہے سب سے بڑھ کر یہ کہ شہوات ترک کرنی پڑتی ہے علم حاصل نہ کرنے میں اپنے نقص کا احساس ہوتا ہے ایسا شخص ایک مشکل عذاب میں گرفتار رہتا ہے۔

خیر و شر کی دو سری قسم مفید ہے یہ وہ قسم ہے جو بعض اوصاف کو جامع ہو اور بعض کو نہ ہو چنانچہ بعض باتیں نفع بخش ہوتی ہیں ساتھ ہی ایذا دینے والی بھی جیسے کوئی کینسر زدہ اٹلی کٹاؤے یا جسم سے خراب مادہ نکلواوے اور کبھی ایک چیز نافع ہونے کے باوجود بری ہوتی ہے جیسے حماقت یہ وصف بعض حالات میں سود مند ہے اس لئے یہ قول مشہور ہے *أشکرک لک ما آتاکک لک* (جسے عقل نہیں ہوتی وہ آرام سے رہتا ہے) اسکی وجہ یہ ہے کہ وہ انجام پر نظر نہیں رکھتا نہ مستقبل کے اندیشے اسے پریشان کرتے ہیں وہ ہر وقت سکون سے رہتا یہاں تک کہ موت آجائے بظاہر یہ ایک مفید وصف ہے لیکن اس کی قیاحت سے انکار نہیں کیا جاسکتا بعض چیزیں ایک پہلو سے نافع اور ایک پہلو سے ضار ہوتی ہیں جیسے ڈوبے ہوئے آدمی کا اپنا مال دوبا میں غرق کر دینا مال ضائع کرنا ایک اعتبار سے نقصان دہ ہے لیکن دوسرے اعتبار سے نفع بخش بھی ہے کہ جسم سے مال و اسباب کا بوجھ کم ہو گا تو تھکر کٹارے تک پہنچنے میں سہولت ہوگی۔ نافع کی دو قسمیں ہیں 'ایک ضروری جیسے ایمان اور اخلاق حسنہ جو انسان کو سعادت اخروی تک پہنچانے میں مفید ہیں ان دونوں سے ہماری مراد علم اور عمل ہے یہ دونوں اس لئے ضروری ہیں کہ کوئی چیز ان دونوں کے قائم مقام نہیں ہو سکتی دوسری غیر ضروری جیسے سکین صغریٰ مادہ کے ازالے کے لئے استعمال کی جاتی ہے لیکن اس مادے کا ازالہ دوسری چیزوں سے بھی ہو جاتا ہے اس لئے سکین ضروری نہیں ہے۔

پانچویں تقسیم : ہر لذت پر نعمت کا اطلاق ہوتا ہے اور لذتیں انسان کے لئے مخصوص ہونے کے اعتبار سے یا انسان اور غیر انسان میں مشترک ہونے کے لحاظ سے تین طرح کی ہیں 'اول عقلی' دوم بدنی مخصوص مشترک ان میں انسان کے ساتھ بعض حیوانات بھی شریک ہیں سوم بدنی عام مشترک ان میں انسان کے ساتھ تمام حیوانات شریک ہیں۔ عقلی لذتوں کی مثال علم و حکمت ہے اس

لئے کہ علم و حکمت کی لذت کا ادراک نہ کان کرتے ہیں نہ آنکھ نہ ناک نہ ذائقہ نہ پیٹ اور نہ شرمگاہ اس کی لذت صرف قلب محسوس کرتا ہے کیونکہ ایسی صفت کے ساتھ مخصوص ہے جسے عقل کہتے ہیں لذات میں سب سے کم تر کی پائی جاتی ہے اگرچہ سب سے اعلیٰ ہے اس کی قلت کی وجہ یہ ہے کہ علم کی لذت کا ادراک صرف عالم کر سکتے ہیں اور حکمت کی لذات صرف علماء محسوس کر سکتے ہیں اور اہل علم و حکمت کی تعداد کتنی ہے یہ سب جانتے ہیں زیادہ تر لوگ وہ ہیں جو علماء اور حکماء کا نام اختیار کئے ہوئے ہیں اور ان کی ہیئت اپنائے ہوئے ہیں علم کے شرف کی وجہ یہ ہے کہ لذت آدمی کے ساتھ پیشہ رہتی ہے، کبھی ذوال پذیر نہیں ہوتی نہ دنیا میں اور نہ آخرت میں۔ یہ ہر دم ساتھ رہنے والا رفیق ہے اس کی دائمی رفاقت کے باوجود اہل علم و حکمت اس سے آگاہ نہیں کرتے۔ باقی تمام لذتیں آدمی کو تھکا دیتی ہیں مثلاً حکم سیر ہو کر کھانے سے جسم میں سستی پیدا ہوتی ہے، جماع سے فراغت کے بعد محسن اور گرانی کا احساس ہوتا ہے، علم و حکمت کے سمندر میں جتنی چاہے شکاری کو غوطے لگاؤ نہ بصیحت پر گرانی ہوتی ہے نہ جسم سستی کا شکار ہوتا ہے۔ جو شخص اس قدر اشرف و اعلا شے حاصل کرنے پر قدرت رکھنے کے باوجود اپنی اہمیت پر قناعت کرے اور چند روزہ لذت کے پیچھے بار بار ابھرے اس کے پاگل پن میں اور بد قسمتی میں کون ہوشمند شبہ کر سکتا ہے؟

علم کا ادنیٰ شرف یہ ہے کہ صاحب علم کو اپنے علم کے خزانوں کی حفاظت نہیں کرنی پڑتی جب کہ زور جو اہر کی حفاظت میں دن رات کا سکون غارت ہو جاتا ہے، مالدار آدمی ہزار چوکیدار مقرر کر لے اور اپنے خزانوں پر پہرے بٹھالے لیکن کبھی بھی مطمئن ہو کر نہیں سو سکتا۔ علم آدمی کی حفاظت کرتا ہے جب کہ آدمی کو مال کی حفاظت کرنی پڑتی ہے، علم خرچ کرنے سے بڑھتا ہے، مال کم ہوتا ہے، مال چوری ہو جاتا ہے، مناسب حکمرانوں کی تلاش میں بھرنے سے ختم ہو جاتے ہیں لیکن علم تنگ نہ چوروں کے ہاتھ چٹختے ہیں اور نہ بادشاہوں کے عالم پیشہ امن و سکون سے رہتا ہے۔ مالدار خوف کے کرب میں مبتلا رہتا ہے، پھر علم بیک وقت نافع بھی ہے، لذیذ اور جلیل بھی ہے، جب کہ مال کبھی ہمیں نجات دیتا ہے، اور کبھی ہلاکت میں مبتلا کر دیتا ہے اسی لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں مال کی خدمت فرمائی ہے، اگرچہ بعض مواقع پر مال کو خیر بھی قرار دیتا ہے۔

جہاں تک یہ سوال ہے کہ عام لوگ علم کی لذت کا ادراک کیوں نہیں کہتے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں ذوق ہی نہیں ہوتا، اور جسے ذوق نہیں ہوتا اس میں نہ معرفت ہوتی ہے اور نہ شوق ہوتا ہے، شوق ذوق کے تابع ہے، اگر ذوق ہی نہ ہو تو شوق کیا ہو گا، یا شہوات کی ابتلا کے باعث ان کے مزاج میں فساد ہوتا ہے، اور قلوب میں مرض۔ جیسے مریض کو شہد میں بھی حلاوت نہیں ملتی، بلکہ وہ اسے ایلوے کی طرح کڑوا سمجھتا ہے، یا اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ انکی ذہانت کی کمی ہوتی ہے جیسے دودھ پیتے بچے کو جو لذات ماں کے دودھ میں ملتی ہے وہ نہ شہد میں ملتی ہے نہ پرندے کے گوشت میں اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ شہد یا پرندے کا گوشت لذیذ نہیں ہے یا دودھ کی طرف اس کی رغبت سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ دودھ سے زیادہ کوئی چیز لذیذ نہیں ہے۔ ہر حال جو لوگ علم کی لذت سے محروم ہیں وہ تین طرح کے ہیں ایک وہ جن کا باطن ابھی تک زندگی سے ہم کنار نہیں ہوا، جیسے بچہ اس کا باطن مردہ ہوتا ہے، دوسرے وہ شخص جس کا باطن زندہ ہو چکا تھا لیکن شہوات کی ابتلا سے مردہ ہو گیا۔ تیسرے وہ شخص جس کا دل شہوات کی ابتلا سے بیمار ہو گیا، اللہ تعالیٰ کے اس قول ”فَلْيَنْذِرْ مَنْ كَانَ حَيًّا“ میں اس شخص کی طرف اشارہ ہے، جو شخص بدن سے زندہ ہو، اور سینے میں دل مردہ رکھتا ہو وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مردہ ہے، اگرچہ جاہل لوگ انہیں زندہ شمار کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شہداء زندہ ہیں، اپنے رب کی طرف سے رزق پاتے ہیں، کھاتے اور خوش ہوتے ہیں، اگرچہ ان کے جسم مردہ ہیں دوسری لذت بدنی مخصوص مشترک ہے، اس میں انسان کے ساتھ بعض حیوانات بھی شریک ہیں جیسے اقتدار، برتری، اور تفوق کی لذت، اس میں انسان کے ساتھ شیر، چیتا اور دوسرے طاقتور جانور بھی شریک ہیں۔ تیسری بدنی عام مشترک ہے انسان کے ساتھ حیوانات شریک ہیں جیسے حکم اور شرمگاہ کی لذت، یہ لذت زیادہ پائی جاتی ہے، اگرچہ تمام لذتوں میں یہ انتہائی ادنیٰ اور غیس لذت ہے اسی لئے دوسرے زمین پر جتنے ذی روح جانور ہیں سب اس میں شریک ہیں۔

یہاں تک کہ کیرے کوڑے بھی اس لذت سے لطف اٹھاتے ہیں۔ جو شخص اس لذت سے تہاؤ کرتا ہے وہ غلبے اور اقتدار کی لذت کا شکار ہو جاتا ہے، یہ لذت غفلت شعاردوں کو اپنے بچوں میں زیادہ جکڑتی ہے جو شخص اس لذت سے بھی آگے بڑھ جاتا ہے وہ تیسری لذت میں مشغول ہوتا ہے، یہاں تک کہ علم و حکمت کی لذت اس پر غالب آجاتی ہے خاص طور پر اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات کی معرفت میں اسے جو لذت ملتی ہے وہ کسی دوسری چیز میں نہیں ملتی، لیکن یہ صدیقین کا مرتبہ ہے، اور اس لذت کا حصول صرف اسی وقت ہوتا ہے جب دل سے غلبہ و اقتدار کی خواہش پوری طرح نکل جائے چنانچہ صدیقین کے سروں سے آخر میں جو محبت نکلتی ہے وہ ریاست اور اقتدار کی محبت ہوتی ہے۔ جہاں تک پہنچ اور شرمگاہوں کی شہوتوں کا سوال ہے وہ سبے صالحین بھی ان کا قلع قمع کر سکتے ہیں، اس میں صدیقین ہی کی تخصیص نہیں ہے، تاہم اقتدار کی شہوت پر صرف صدیقین ہی قابو پا سکتے ہیں۔ غلبہ و اقتدار کی شہوت پر اس طرح قابو پانا کہ کبھی یہ فتنہ سرنہ اٹھائے انسان کی طاقت سے باہر ہے۔ تاہم بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی معرفت قلب پر غالب ہو جاتی ہے، اور اسکی موجودگی میں کسی دوسری لذت کا احساس نہیں ہوتا، لیکن یہ دائمی حالت نہیں ہوتی، وقتی حالات اور کیفیات کی بنا پر کم و بیش ہوتی رہتی ہے، جب اس معرفت کے غلبے میں کمی واقع ہوتی ہے تو بشری صفات سر اہمارے لگتی ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ بشری صفات اور فتنے موجود رہتے ہیں، لیکن غلبہ معرفت میں دبے رہتے ہیں، ان کا وجود اتنا مؤثر نہیں رہتا جس کو عدل سے منحرف کر سکے۔

قلب کی چار قسمیں : اس تفصیل کی رو سے قلب کی چار قسمیں ہوتی ہیں، ایک قلب وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے سوا کسی سے محبت نہیں کرتا، اور نہ اس وقت تک قرار پاتا ہے جب تک معرفت الہی میں زیادتی کا عمل جاری نہ رہے، دوسرا قلب وہ ہے جسے یہ معلوم ہی نہیں کہ معرفت میں کیا لذات ہوتی ہے، وہ صرف جاہ، ریاست، مال، اور تمام جسمانی شہوات میں لذت پاتا ہے۔ تیسرا وہ قلب ہے جو اکثر حالات میں اللہ تعالیٰ کے ذکر و فکر اور معرفت سے الٹ پاتا ہے، مگر کبھی کبھی اس پر انسانی اوصاف بھی اثر انداز ہو جاتے ہیں۔ چوتھا قلب وہ ہے جس پر اکثر اوقات انسانی صفات غالب رہتی ہیں، لیکن کبھی کبھی وہ علم اور معرفت کے چشموں سے بھی فیض اٹھا لیتا ہے۔ ان میں سے پہلے دل کا وجود ممکن نہیں ہے، بالفرض اگر ممکن ہو تو پھر یہ اتنی کم تعداد میں ہیں کہ نہ ہونے کے برابر ہیں، دوسری طرح کے دلوں سے دنیا پر ہے، تیسرے اور چوتھے دل موجود ہیں لیکن بہت کمی کے ساتھ، بلکہ نادر کے جائیں تو زیادہ بہتر ہے۔ پھر جو تھوڑے بہت قلب اس طرح کے موجود ہیں، وہ بھی قلت و کثرت میں متفاوت ہیں، انبیاء علیہم السلام کے زمانے سے قریب تر زمانوں میں اس طرح کے قلب کی کثرت تھی، جنوں میں عدد رسالت دور ہوتا گیا اس طرح کے قلب کم ہوتے گئے، قیامت تک کی کا یہ عمل مسلسل جاری رہے گا۔

اس طرح کے قلب کی کمی کی وجہ یہ ہے کہ لوگ ان قلب کے حامل ہوتے ہیں وہ گویا اغروی سلطنت کا آغاز کرتے ہیں، لیکن کیوں کہ ہر شخص کو سلطنت حاصل نہیں ہوتی اسی لئے بادشاہ کم ہوتے ہیں، بلکہ اچھی صورتیں بھی زیادہ نہیں ہوتیں، اکثر لوگ محال میں بہت پیچھے ہوتے ہیں، دنیا آخرت کا عکس ہے، جس طرح دنیا میں فائق زیادہ نہیں ہوتے، اسی طرح آخرت میں بھی کم ہوں گے، اس لئے کہ جو چیزیں دنیا میں پیش آتی ہیں وہ سب آخرت کا نمونہ ہیں، دنیا نام ہے عالم ظاہر کا اور آخرت نام ہے عالم غیب کا۔ عالم ظاہر عالم غیب کے تابع ہے، آئینے کے اندر جو تصویر نظر آتی ہے وہ اگرچہ دیکھنے والے کے تابع ہوتی ہے، اور اس اعتبار سے مرتبہ ثانی میں ہونی چاہیے، لیکن تمہارے دیکھنے کے اعتبار سے یہ مرتبہ اول میں ہے، اس لئے جب تم آئینہ دیکھتے ہو تو تمہیں اپنی صورت نظر نہیں آتی، بلکہ تم اپنا عکس دیکھتے ہو، اسکے ذریعے تم اپنی اصل صورت کی معرفت حاصل کرتے ہو، چنانچہ جو چیز وجود میں تابع تھی یعنی عکس وہ معرفت کے باب میں مقدم ہو گئی، اور جو چیز وجود میں مقدم تھی وہ مؤخر ہو گئی، لیکن اس طرح کے اختلافات اور تغیرات اسی عالم میں رونما ہو سکتے ہیں۔ صورت اور عکس صورت کی مثال بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ عالم الملک والاشیاء (عالم ظاہری) عالم الغیب والملكوت کی نقل ہے۔ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے چشم عبرت سے نوازا ہے وہ جب بھی دنیا کی کسی چیز کو دیکھتے ہیں اسے عالم

آخرت پر قیاس کرتے ہیں، اور اس سے عبرت حاصل کرتے ہیں۔ خدا تعالیٰ نے ایسے ہی لوگوں کو یہ ہدایت فرمائی۔
فَاغْتَبِرُوا يٰۤاُولٰٓئِی الْاَبْصَارِ (پ ۲۸ ر ۴ آیت ۲)
 سوائے دانش مندوں! عبرت حاصل کرو۔

بعض لوگوں کی بصیرت پر حجاب رہتا ہے، اس لئے وہ کوئی عبرت حاصل نہیں کرتے، اور عالم ظاہری میں محسوس و مقید رہتے ہیں، اس قید سے لگتا نصیب نہ ہو گا ان پر جہنم کے دروازے کھل جائیں گے اور یہ قید خانہ آگ سے پر ہے، اور یہ آگ دلوں پر جمائیں ہے، لوگ اس آگ کی حرارت اس لئے محسوس نہیں کرتے کہ انکے اور آگ کے درمیان ایک رکاوٹ ہے، یہ رکاوٹ موت سے دور ہو جائے گی، اس وقت وہ آگ کی تکلیف محسوس کریں گے، اور جس حقیقت کا یہاں انکار کرتے ہیں وہاں اعتراف کریں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ جنت اور دوزخ دو مخلوق ہیں، لیکن کبھی دوزخ کا ادراک ایسے ذریعہ علم سے ہوتا ہے جسے علم الیقین کہتے ہیں اور کبھی ایسے ذریعہ علم سے جسے عین الیقین کہتے ہیں، لیکن عین الیقین کا تعلق صرف عالم آخرت سے ہے، جب کہ علم الیقین دنیا میں بھی حاصل ہو جاتا ہے، لیکن صرف ان لوگوں کو جو یورقین رکھتے ہوں، ارشاد ربانی ہے۔

كَلَّا لَوْ نَعْلَمُونَ عَلٰمَ الْبَاقِیْنَ لَنَرُوْنَ الْحٰجِیْنَہِم (پ ۳۰ ر ۲ آیت ۱۵)
 ہرگز نہیں! اگر تم لوگ یقینی طور پر جان لیتے واللہ تم لوگ ضرور دوزخ کو دیکھو گے۔

اس کا تعلق دنیا سے ہے پھر ارشاد فرمایا :-

ثُمَّ لَنَرَوْنَّهَا عَیْنَ الْبَاقِیْنَ (پ ۳۰ ر ۲ آیت ۷)

پھر واللہ تم لوگ اس کو ایسا دیکھنا دیکھو گے جو یورقین ہے۔

اس یقین کا تعلق آخرت سے ہے، اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ جو قلب آخرت میں سلطنت کریں گے وہ بہت کم ہوں گے، جس طرح وہ لوگ بہت کم ہوتے ہیں، جو دنیا میں سلطنت کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

چھٹی تقسیم : یہ تقسیم تمام نعمتوں کو حاوی ہے، اس تقسیم کا حاصل یہ ہے کہ نعمتیں دو قسم کی ہیں، یا تو وہ نعمت جو بذات خود غایت مطلوب ہیں، اخروی سعادت ہے، اور اسمیں چار امور شامل ہیں وہ بقاء و قناعت ہو، وہ سرور جس میں کوئی غم نہ ہو، وہ علم جسکے ساتھ کوئی جمل نہ ہو، وہ مالداری جس میں فقر نہ ہو، سعادت اخروی ہی حقیقی نعمت ہے۔ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

لَا عَیْشَ الْاٰخِرَةِ بَخَارٍ وَّسَلٰمٍ (نس) آخرت کی زندگی کے سوا کوئی زندگی نہیں۔
 یہ قول آپ نے نفس کی تسلی کے لئے شدت اور سختی کے ماحول میں فرمایا، ان دنوں آپ اپنے رفقاء کے ساتھ خندق کھودنے میں مصروف تھے، اور ایک ایک لمحہ سخت گزر رہا تھا، ایک مرتبہ آپ نے یہ الفاظ خوشی کے موقع پر بھی فرمایا تاکہ نفس اس خوشی پر قانع نہ ہو جائے، اور اسے یہ خیال رہے کہ اس زندگی کے بعد بھی ایک زندگی ہے جسے فنا نہیں ہے، وہاں صرف سرور ہو گا جو کبھی غم میں تبدیل نہ ہو گا، یہ حج الوداع کا موقع تھا، لوگ آپ کے چاروں طرف جمع تھے (حاکم) ایک مرتبہ ایک شخص نے یہ دعا مانگی :-

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْأَلُكَ نَمَامَ النَّعْمَةِ اے اللہ! میں آپ سے کمال نعمت کی درخواست کرتا ہوں۔

آپ نے اس شخص سے دریافت کیا کیا تم جانتے ہو کمال نعمت کیا ہے۔ اس نے عرض کیا نہیں! آپ نے فرمایا جنت میں داخل ہونا کمال نعمت ہے۔

وسائل کی قسمیں : غایت مطلوب کے وسائل کی چار قسمیں ہیں، ایک مخصوص تر قریب تر جیسے فضائل نفس، دوسرے جو قرب میں فضائل نفس سے قریب ہوں جیسے بدن کے فضائل، تیسرے وہ جو خارج از بدن ہوں، لیکن قرب میں فضائل بدن سے قریب جیسے بدن سے متعلقہ اسباب مال، بیوی بچے اور اغزوہ۔ چوتھے وہ جو نفس سے خارج اور نفس کے لئے حاصل اسباب کے جامع

ہوں جیسے تعلق اور ہدایت۔ چار قسمیں ہیں ذیل میں ہم ان پر الگ الگ بحث کرتے ہیں۔

پہلی قسم مخصوص تر و سائل : ان سے مراد فضائل نفس ہیں، اگرچہ فضائل نفس کے فروغ بے شمار ہیں، لیکن انہیں دو اصولوں میں سمیٹا جاسکتا ہے، ایمان اور حسن خلق، پھر ایمان کی دو قسمیں ہیں علم مکاشفہ اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات، صفات اس کے ملائکہ اور پیغمبروں کا علم ہے، دوسری قسم علم معاملہ ہے۔ حسن خلق کی بھی دو قسمیں ہیں۔ اول شہوات اور غضب کے متقیات ترک کرنا، اس کا نام صفت ہے، دوم شہوات کے ارتکاب اور ترک ارتکاب میں عدل کی رعایت کرنا، یہ نہ ہو کہ جہاں دل چاہے اقدام کرے اور جہاں دل نہ چاہے وہاں اقدام سے باز رہے، بندہ کو اپنے اقدام اور ترک دونوں میں اس عدل کو مد نظر رکھنا چاہیے کہ جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی ہے۔

أَنْ لَا تَطْغَوْا فِي الْمِيزَانِ وَأَقِيمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيزَانَ (پ ۲۷ آیت ۸۸)

تاکہ تم تولے میں کی بیشی نہ کرو اور انصاف کے ساتھ وزن کو ٹھیک رکھو۔

اس صورت میں ہر وہ شخص میزان عدل سے منحرف ہو گا جو نکاح سے بچنے کے لئے اپنی شہوت زائل کر دے، یا قدرت رکھنے اور تمام آفات سے محفوظ رہنے کے باوجود نکاح نہ کرے، یا کھانا پینا ترک کر دے یہاں تک کہ عبادت اور ذکر و فکر کی سکت باقی نہ رہے۔ اسی طرح وہ شخص بھی عادل نہیں جو شکم اور شرمگاہ کی شہوات میں سر سے پاؤں تک ڈوب جائے، عدل یہ ہے کہ میزان عدل کے دونوں پلے برابر رہیں، ایسا نہ ہو کہ ایک پلہ خالی ہو جائے اور دوسرا وزن کی وجہ سے جھک جائے، معلوم ہوا کہ وہ فضائل جو نفس کے ساتھ مخصوص ہیں اور اللہ تعالیٰ سے قریب کرنے والے ہیں، چار قسم کے ہیں علم مکاشفہ، علم معاملہ، صفت اور عدالت، فضائل نفس کی تکمیل کے لئے فضائل بدن بھی ناگزیر ہیں اس لئے ذیل میں ان کا ذکر کیا جاتا ہے۔

دوسری قسم فضائل بدنی : اس کی بھی چار قسمیں ہیں صحت، جمال اور طول عمر۔ یہ فضائل تیسری قسم کی فضائل سے خاص ہوتے ہیں جو بدن سے خارج اور اسکے محیط ہیں ان کی بھی چار قسمیں ہیں۔

تیسری قسم فضائل غیر بدنی : ان فضائل سے بھی آدمی اس وقت تک منقطع نہیں ہو سکتا جب تک جو تھی قسم کے فضائل حاصل نہ ہوں جو بدنی، خارجی اور نفسی تمام فضائل کو جامع ہیں۔

چوتھی قسم جامع فضائل : اسکی بھی قسمیں ہیں، اللہ کی ہدایت، ارشاد، تسدید اور تائید، اس طرح اگر ہم تمام نعمتوں کو چار میں، پھر ان چاروں میں سے ہر قسم کو چار پر تقسیم کریں تو کل قسموں کی تعداد سولہ ہوتی ہے۔ اس تقسیم کے ضمن میں یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ ان قسموں میں سے بعض بعض کی طرف محتاج ہیں، خواہ یہ احتیاج ضروری ہو یا نافع ہو۔ ضروری احتیاج کی مثال یہ ہے کہ سعادت اخروی ایک نعمت ہے، اور یہ نعمت ایمان اور حسن اخلاق کی ہر صورت محتاج ہے، کیوں کہ ایمان اور حسن اخلاق کے بغیر آخرت کی سعادت حاصل ہی نہیں ہو سکتی، انسان کو آخرت میں وہی حاصل ہو گا جو وہ دنیا میں کمائے گا، ہر شخص کو آخرت میں وہی ملتا ہے جو وہ دنیا میں توڑ کر لے کر آیا ہے، اسی طرح فضائل نفسی کو کسب علوم کی ضرورت ہے، اور تہذیب اخلاق کے لئے جسمانی صحت ضروری ہے۔ لیکن جو حاجت صرف نافع ہو اس کا ضروری ہونا ضروری نہیں ہے۔ اسکی مثال ایسی ہے جیسے نفسی اور بدنی فضائل کو خارج کی حاجت ہوتی ہے، جیسے مال، جاہ اور اہل و عیال کی، مگر یہ حاجت ضروری نہیں ہے، صرف نافع ہے، اگر یہ حاجت پوری ہو تو اس سے بہت سے کام تکمیل پائیں، اور پوری نہ ہو تو یہ ممکن ہے کہ بعض فضائل نفسی اور بدنی میں خلل واقع ہو۔

طریق آخرت کے لئے خارجی نعمتوں کی ضرورت : سوال یہ ہے کہ طریق آخرت کے لئے مال، جاہ، اولاد وغیرہ جیسی خارجی نعمتوں کی کیا ضرورت ہے۔ اسکا جواب یہ ہے کہ اسباب کی مثال ایسی ہے جیسے ہانڈو جو منزل مقصود تک پہنچائیں یا آلہ جس سے

مقصد کا حصول سہل ہو مثلاً مال ہی کو لیجئے یہ ایک بڑی نعمت ہے مال ہو تو آدمی دشمنان پریشانیوں سے محفوظ رہتا ہے، تنگدست انسان تو صحیح طور پر نہ علم حاصل کر سکتا ہے نہ کسی فن میں کمال پیدا کر سکتا ہے، الا ماشاء اللہ۔ بلکہ مال کے بغیر کسب علم اور اکتساب کمال کرنے والا انسان ایسا ہے جیسے بغیر ہتھیار کے لڑنے والا یا بازوؤں سے محروم فکری پرندہ۔ مال کی تعریف میں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :-

نِعْمَ الْمَالُ الصَّالِحُ لِلزَّجَلِ الصَّالِحِ (احمد ابو حلی، طبرانی۔ معواہن العام ۲)

کتنا اچھا ہے بہترین مال نیک آدمی کے لئے۔

نِعْمَ الْعَوْنُ عَلَى تَقْوَى اللَّهِ الْمَالُ (ابو منصور علی۔ جامع اللہ کے خوف پر بہترین معاون مال ہے۔)

مال کی اس قدر اہمیت کیوں نہ ہو ہم دیکھتے ہیں کہ مفلس انسان اپنے بہترین اوقات کو ذکر و فکر میں مشغول رکھنے کے بجائے معاش کی جستجو اور لباس و مسکن کی فکر میں صرف کرتا ہے، صحیح طریقے پر عبادت نہیں کرتا، حج، زکوٰۃ اور خیرات و صدقات جیسے اعمال خیر سے محروم رہتا ہے، کسی دانشور سے دریافت کیا گیا نعمت چیز کیا ہے؟ اس نے جواب دیا کہ مالدار کی، کیوں کہ میرے نزدیک تنگدست کی کوئی زندگی نہیں ہے، مسائل نے کہا کہ کچھ اور بتلائیں، دانشور نے کہا اسن، اس لئے کہ میرے خیال میں خوفِ زدہ کی کوئی زندگی نہیں، مسائل نے کہا مزید بتلائیں، اس نے کہا تندرستی اس لئے کہ مریض کی زندگی زندگی نہیں، مسائل نے مزید درخواست کی دانشور نے جواب دیا کہ جوانی اس لئے کہ بوجھاپے کی زندگی بے لطف ہے، گویا دانشور نے دنیا کی ان تمام نعمتوں کی طرف اشارہ کیا جو آخرت پر معاون ہیں، حدیث شریف میں ہے۔

وَمَنْ أَصْبَحَ مَعَافًى فِي بَدَنِهِ آمِنًا فِي سِرِّهِ عِنْدَهُ قُوَّةٌ يَوْمَهُ فَكَأَنَّمَا خَيْرَتُ لَهُ
الْتَنِيَابِ يَخْلُفُ فِيهَا (ترمذی، ابن ماجہ۔ عید اللہ)

جو شخص اس حال میں صبح کرے کہ اسکے بدن کو صحت، اور نفس کو امن ہو، اور اسے اس روز کی غذا میسر

ہو گویا اسے پوری دنیا حاصل ہے۔

جس طرح انسان کو مال کی ضرورت ہے اسی طرح بیوی اور بچوں کی ضرورت بھی ہے، بیوی کے سلسلے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ

وسلم کا ارشاد گرامی ہے -

نِعْمَ الْعَوْنُ عَلَى الدِّينِ الْمَرْأَةُ الصَّالِحَةُ (۱) نیک عورت دین پر بہترین معاون ہے۔

اولاد کے متعلق آپ نے فرمایا:-

إِذَا مَاتَ الْعَبْدُ انْقَطَعَ عَمَلُهُ إِلَّا مِنْ ثَلَاثٍ وَلَدٍ صَالِحٍ يَدْعُو لَهُ (مسلم۔ ابو ہریرہ)

جب آدمی مر جاتا ہے تو اسکے اعمال کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے مگر تین (چیزیں) باقی رہتی ہیں ان میں سے

ایک (نیک) لڑکا ہے جو اسکے لئے دعائے خیر کرتا ہے۔

بیوی اور بچوں کے فوائد ہم کتاب النکاح میں لکھ چکے ہیں یہاں ان کے اعادے کے ضرورت نہیں ہے۔

اقارب کا وجود بھی کسی نعمت سے کم نہیں، آدمی کے لئے اسکے بچے اور اقارب آگہ اور ہاتھ کے مانند ہیں، ان کی وجہ سے بہت سے وہ کام سہل ہو جاتے ہیں جو آخرت کے لئے ضروری ہیں، بالفرض اگر وہ تمام ہوتا تو انھیں انجام نہ دے پاتا یا انجام دے لیتا تو کافی وقت ان کی نذر کرتا، اولاد، اور اقارب سے بہت سے دینی امور پر مدد ملتی ہے، اور جن چیزوں سے دین پر مدد ملے ان کے نعمت ہونے میں کوئی شبہ نہیں کیا جاسکتا۔

عزت اور جاہ کے ذریعے انسان اپنے نفس سے ظلم اور ذلت دور کرتا ہے، جاہ و عزت سے کوئی مسلمان بے نیاز نہیں رہ سکتا، اس

(۱) مسلم میں اس مضمون کی ایک روایت ہے، مگر الفاظ مختلف ہیں

لئے کہ جو انسان اسلام کا حلقہ مجوش ہو جاتا ہے ایک بڑی دنیا اس کے درپے آزار ہو جاتی ہے، اور اس کی عزت و آہود پر حملہ کرنا اپنا شعار بناتی ہے اس طرح مسلمان جمیعت قلبی اور سکون دہلی سے عبادت نہیں کہتا، قلب تفکرات اور پریشانیوں کی آماجگاہ بن جاتا ہے، قلب ہی انسان کا اصل سرمایہ ہے اگر یہی خطو میں پڑ جائے تو وہ آخرت کیلئے کیا کمپائے گا؟ اس لئے قلب کی حفاظت کے لئے عزت و جاہ بھی ضروری ہے، بعض اکابر نے دین و سلطنت کو دو جزواں بچے قرار دیا ہے، ان میں سے ایک دوسرے سے جدا نہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:-

وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُمُ بَعْضًا لَفَسَدَتِ الْأَرْضُ (پ ۱۷۲ آیت ۲۵)
اور اگر یہ بات نہ ہوتی کہ اللہ تعالیٰ بعض آدمیوں کو بعض کے ذریعے سے دفع کرتے رہا کرتے تو (تمام)
زمین فساد سے پر ہو جاتی۔

جاہ کے معنی ہیں دلوں کا مالک ہونا، جس طرح آدمی روپے پیسے کا مالک بن سکتا ہے، اسی طرح دلوں کا مالک بھی بن سکتا ہے بہت سے کام ایسے ہیں جو دولت سے پورے نہیں ہوتے، بلکہ دلوں کا مالک ہونا ضروری ہوتا ہے، جب تم کسی پریشانی میں مبتلا ہوتے ہو یا کسی خطرے سے دوچار ہوتے ہو، تو وہ لوگ تمہارے لئے سینہ سپر ہو جاتے ہیں جن کے دلوں پر تمہارا سکہ چلتا ہے، جس طرح تمہیں بارش سے حفاظت کے لئے چھت کی، سڑکی سے تھنڈے کے لئے کپڑوں کی، مال کی حفاظت کے لئے فکارتی کتے کی ضرورت پیش آتی ہے اسی طرح شر سے مدافعت کے لئے بھی تمہیں کسی شخص کی ضرورت ہے، اسی لئے وہ انبیاء کرام جو کسی ملک کے حکمران نہیں تھے، اپنے دور کے حکمرانوں کے ساتھ رعایت کا معاملہ کرتے تھے، اور ان کے دلوں میں اپنے لئے جگہ بناتے تھے، تاکہ وہ ان کے ساتھ شر کا معاملہ نہ کر سکیں، علماء دین کا بھی یہی معمول رہا، ان حضرات کا خفاہ یہ نہیں ہوتا کہ بادشاہوں کے خزانوں سے اپنی جیبیں بھریں یا ان کے اختیارات سے ناجائز فائدہ اٹھائیں، اور دنیا داریوں پر حکمرانی کریں۔ تمہیں یہ گمان نہ کرنا چاہیے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر اس وقت نعمت زیادہ تھی جب کہ مکرمہ فتح ہوا، اس وقت نہ صرف یہ کہ اللہ نے آپ کی نصرت فرمائی، دشمنوں پر آپ کو فتح دی، اگلے دلوں میں آپ کی محبت اور حبیب پیدا فرمائی اور عزت و جاہ میں اضافہ فرمایا، بلکہ اس دن اپنے دین کی تکمیل فرمائی، اور آپ کے ذریعے اس کا اعلان و اظہار فرمایا، اور اس وقت اللہ کی نعمت آپ پر کم تھی جب آپ اسلام کے ابتدائی دنوں میں مکرمہ میں تھے، اور دشمنان خدا آپ کو ایذا پہنچا رہے تھے، ان کے شر سے بچنے کے لئے آپ نے مدینہ منورہ ہجرت فرمائی۔ تمہارا یہ گمان صحیح نہیں ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دونوں زمانوں میں یکساں نعمت حاصل رہی ہے۔ نسب کی عمدگی اور خاندانی شرافت بھی اپنی جگہ ایک اہم ترین نعمت ہے۔ حدیث شریف میں ہے:-

الْأَتْقَى قَرْنَيْش (نسائی، حاکم، السنن) سردار قریش میں سے ہیں۔

اس لحاظ سے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم عرب کے اعلاء اور اشرف قبیلے کے ایک فرد ہوئے (۱) ایک حدیث میں ہے آپ نے ارشاد فرمایا:- تَخْبِرُوا النَّطُوفُكُمْ (ابن ماجہ، ترمذی) اپنے غطفوں کے لئے اچھا انتخاب کرو۔ ایک حدیث میں ہے آپ نے فرمایا:- إِيَّاكُمْ وَخَصْرَ الْعَلَمِ کوڑی کے بزرے سے بچو۔

لوگوں نے عرض کیا کوڑی کے بزرے سے کیا مراد ہے؟ فرمایا:- وہ خوبصورت عورت جو غراب نسب رکھتی ہو (۲) خاندانی شرافت سے ہماری یہ مراد نہیں کہ تم خالوں اور دنیا داریوں سے اپنی رشتہ داری قائم کرو، بلکہ خفاہ یہ ہے کہ وہ گھرانہ تلاش کرو جس کا سلسلہ نسب سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملتا ہو، یا صالحین، علماء اور بزرگان دین اور علم و عمل میں شہرت رکھنے والوں پر ختمی ہو تا ہو۔

فضائلِ بدنی کی ضرورت :- خارجی فضائل کی طرح بدنی فضائل کی بھی ضرورت پڑتی ہے، جیسے صحت، قوت، اور طولِ عمران

(۱) اس مضمون کی ایک روایت مسلم میں واقع ابن اسحق سے مرفوعہ منقول ہے (۲) یہ روایت کتاب النکاح میں گزری ہے

کی ضرورت اس لئے ہے کہ علم و عمل کی تکمیل ان ہی سے ہوتی ہے، سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشادِ مبارک سے طولِ عمر کے نعمت ہونے پر روشنی پڑتی ہے، فرمایا :-
أَفْضَلُ السَّعَادَةِ طَوْلُ الْعُمْرِ فِي عِبَادَةِ اللَّهِ (۱) بہترین سعادت یہ ہے کہ اللہ کی عبادت میں دیر تک زندہ رہے۔

ان تمام نعمتوں میں جمال کا پہلو ذرا کمزور ہے، بعض لوگ تو یہ کہتے ہیں کہ عبادت کے لئے بدن کا امراض سے خالی ہونا ہی کافی ہے، لیکن ہمارے خیال میں اگرچہ ذکر و فکر اور دوسرے اعمالِ حسنہ کے لئے جمال کی ضرورت نہیں ہے مگر اسکے باوجود اسکے نعمت ہونے میں کوئی شبہ نہیں کیا جاسکتا، جہاں تک دنیا کا تعلق ہے، اس میں اس کا نفع عقلی نہیں ہے، اور آخرت میں بھی وہ اعتبار سے منفید ہے، ایک تو اس لئے کہ لوگ برے کی مذمت کرتے ہیں اور طہالغ اس سے نفرت کرتی ہیں، خوبصورت آدمی کی ضرورتیں جلد پوری کی جاتی ہیں، دلوں میں اسکے لئے محبت اور احرام کے جذبات ہوتے ہیں، گویا جمال بھی مال اور دیگر ذرائع کی طرح ایک وسیلہ ہے، اسکے ذریعہ انسان منزلِ مقصود تک پہنچتا ہے، خوبصورتی میں بھی ایک طرح کی قدردانی پائی جاتی ہے، خوبصورت آدمی بد صورت آدمی کے مقابلے میں اپنی حاجات کی تکمیل پر زیادہ قادر ہوتا ہے، اپنی اس خوبی سے وہ ایسے کاموں میں بھی فائدہ اٹھا سکتا ہے جو آخرت کے لئے مفید ہوں۔ خوبصورتی آخرت میں اس اعتبار سے بھی مفید ہے کہ ظاہر کا حسن باطن کے حسن پر دلالت کرتا ہے، اس لئے کہ جب نفس کا نور کھل ہو جاتا ہے تو اس کا اجالا ظاہری اعضاء پر پھیلنے لگتا ہے، اکثر ظاہر و باطن یکساں ہوتے ہیں، اسی لئے زیرک لوگ شرافت نفس کی معرفت کیلئے ظاہر کو دلیل بنایا کرتے تھے، چنانچہ یہ ایک حقیقت ہے کہ اندرونی کرب اور مسرت کا اظہار آدمی کے چہرے اور آنکھ سے ہوتا ہے، کہتے ہیں کہ کشادہ پیشانی آدمی کی بلند اقبالی اور اولوالعزہی پر دلالت کرتی ہے، بد صورت انسان کا چہرہ اپنے باطن کا اظہار کر دیتا ہے۔ ایک مرتبہ خلیفہ مامون نے اپنی فوج کا معائنہ کیا، اس دوران اسکے سامنے ایک بد صورت آدمی پیش کیا گیا، جب مامون نے اس سے گفتگو کی تو پتہ چلا کہ وہ بھلا بھی ہے، یہ دیکھ کر مامون نے اسے فوجی خدمات سے محضول کر دیا اور لوگوں سے کہا کہ جب روح کی چمک چہرے پر نمودار ہوتی ہے تو خوبصورتی کا باعث بنتی ہے، اور باطن پر عیاں ہوتی ہے، تو فصاحت کا روپ اختیار کرتی ہے، یہ شخص ظاہر و باطن دونوں کے حسن سے محروم ہے۔ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:-

أَطْلُبُوا الْخَيْرَ عِنْدَ صَبَاحِ الْوُجُوهِ (بخاری- ابن عمر) خیر خوبصورتوں کے پاس تلاش کرو۔

حضرت عمر ارشاد فرماتے ہیں کہ جب تم کسی شخص کو قاصد بنا کر بھیجو تو یہ دیکھو کہ وہ اچھے چہرے اور خوبصورت نام والا ہے یا نہیں، فقہاء کے نزدیک اگر چند لوگ ایسے جمع ہو جائیں جو یکساں طور پر امامت کے مستحق ہوں تو خوب رو کو ترجیح دی جائے گی۔ اللہ تعالیٰ نے ایک جگہ جمال کو بطور احسان ذکر فرمایا :-

وَرَزَقْنَاهُ سَطْفَى الْعِلْمِ وَالْحُسْبَى (پ ۲۷۲ آیت ۲۴)

اور علم اور حسانت میں ان کو زیادتی دی ہے۔

خوبصورتی سے ہماری مراد انسان کا وہ وصف نہیں ہے جس سے شہوت میں تحریک ہو، یہ تو زنا نہ پن ہے جمالِ بلند قامت، معتدل جسامت، اور متناسب اعضاء کے مجموعے کا نام ہے ساتھ ہی چہرے کے نقوش بھی اچھے ہوں تاکہ دیکھنے والے کو نفرت نہ ہو۔

نعمت بھی مذمت بھی : یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ماں، باپ، اولاد، اور نسب وغیرہ نعمتیں ہیں تو اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ان کی مذمت کیوں فرمائی ہے۔ ارشاد فرمائی ہے :-

إِنَّ مِنْ أَرْوَاحِكُمْ وَأَوْلَادِكُمْ عَلَيْكُمْ فَاحْذَرُوهُمْ (پ ۲۷۲ آیت ۱۳)

تمہاری بعض بیویاں اور اولاد تمہارے (دین کی) دشمن ہیں سو تم ان سے ہوشیار رہو۔

إِنَّمَا آمَنُوا لَكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فَتَنَتْكُمْ (پ ۲۷۲ آیت ۱۵)

(۱) یہ روایت ان الفاظ میں قریب ہے۔ البتہ تفسیر میں اسی مضمون کی ایک روایت ابو یوسف سے منقول ہے

تمہارے اموال اور اولاد بس تمہارے لئے آزمائش کی چیز ہے۔

سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی مال و جاہ کی مذمت فرمائی ہے، مگر صحابہ و علماء نے بھی حضرت علیؑ نے نسب کی مذمت میں ارشاد فرمایا کہ آدمی اپنے اعمال خیر کا پٹا ہے، اور ہر شخص کی قیمت اسکے اعمالِ حسنہ کو سامنے رکھ کر مقرر کی جاتی ہے، کہا جاتا ہے کہ آدمی اپنی ذات سے ہوتا ہے نہ کہ اپنے باپ سے، ان آیات و روایات اور آثار کی موجودگی میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر مال، جاہ وغیرہ نعمتیں ہیں تو ان کی مذمت کیوں کی جاتی ہے، اور اگر یہ چیزیں قابلِ مذمت ہیں تو پھر انھیں نعمت کیسے کہا جاسکتا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ جو شخص موڈل اور مقبول الفاظ، اور عام مخصوص منہ البطل سے علوم اخذ کرتا ہے اس پر عموماً گمراہی غالب رہتی ہے، یہاں تک کہ وہ اللہ تعالیٰ کے نورِ ہدایت کی روشنی میں علوم کو ان کی اصل ماہیت اور حقیقت پر حاصل نہ کر لے، اور پھر مقول کو کبھی تاویل اور کبھی تخصیص کے ساتھ اس حقیقت کے ساتھ ہم آہنگ نہ کرے، اس تمہید کے بعد عرض ہے کہ اوپر جن چیزوں کو نعمت قرار دیا گیا ہے، ان کے نعمت ہونے میں، یا راہِ آخرت پر معین ہونے میں کسی شبہ سے یا انکار کی گنجائش نہیں ہے، لیکن ساتھ ہی اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ ان نعمتوں میں حقے بھی ہیں، مثلاً مال کو بچے، ایک ایسے سانپ کی مانند ہے جس میں مسلکِ زہر بھی ہے، اور نافعِ تریاق بھی۔ اب کوئی ایسا شخص سانپ پکڑتا ہے جسے زہر سے بچنا بھی آتا ہے اور تریاق نکالنا بھی تو سانپ اسکے حق میں نعمت ہے، اور اگر کسی کو یہ معلوم نہیں کہ سانپ کا تریاق کیسے نکالا جاتا ہے تو یہ اسکے حق میں مصیبت اور باعثِ ہلاکت ہے یا مال ایک سمندر کی طرح ہے جس کی تہ میں قیمتی موتی اور جواہر چھپے ہوئے ہیں، جو شخص تیرتا جانتا ہے، اور سمندر میں گمراہی تک ڈوب کر ابھرنے کے فن سے واقف ہے، اور سمندر کے خطرات سے بچو، آنا ہونے کا حوصلہ رکھتا ہے تو یہ اسکے حق میں نعمت ہے، اگر کوئی ایسا شخص زرد جواہر کے لالچ میں سمندر کی تہ کو پامال کرنے کے ارادے سے کودے گا جو تیرائی کے فن سے نا آشنا ہے تو اس کا انجام اسکے سوا کچھ نہ ہوگا کہ سمندر کے خطروں میں گھر کر جان سے ہاتھ دھو بیٹھے، خلاصہ یہ ہے کہ ایسا شخص ہلاک ہوگا، سمندر اسکے حق میں یقیناً نعمت نہیں ہے، بلکہ ایک زحمت ہے۔ ہر حال اللہ اور اسکے رسول نے اسی لئے مال کی تعریف فرمائی ہے اور اسے خیر فرمایا ہے، سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے مال کو خوفِ پرہیزگارن معاون قرار دیا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے جاہ اور عزت کی بھی مدح فرمائی ہے کہ اپنے رسول کو جاہ و عزت سے نوازا، اسکے لائے ہوئے دین کو تمام ادیان پر غلبہ عطا کیا، اور بندوں کے دلوں میں اگلی عظمت اور حبیبیت پیدا فرمائی، جاہ سے یہی مقصود بھی ہے، تاہم اتنی بات سمجھ ہے کہ جاہ و مال کی مدح اتنی نہیں کی ہے جتنی مذمت کی ہے، شریعت میں جہاں جہاں ریا کی مذمت کی گئی ہے وہ بھی جاہ ہی کی مذمت ہے، اس لئے کہ ریا کا مطلب ہے دلوں کو اپنی طرف کھینچنا، اور جاہ کے معنی ہیں دلوں کا مالک ہونا۔ ان دونوں کا مفہوم ایک ہی ہے۔

قلمتِ مدح اور کثرتِ ذم کی وجہ : رہا یہ سوال کہ مال و جاہ کی مدح کم اور مذمت زیادہ کیوں ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اکثر لوگ سانپ کو قابو میں کر کے تریاق نکالنے کے فن سے ناواقف ہیں، اسی طرح کثرتِ ایسے لوگوں کی ہے جو سمندر میں غوطہ لگانا نہیں جانتے اسی لئے انھیں سانپ اور سمندر میں غوطہ لگانے سے ڈرانا ضروری ہے کیونکہ ناواقف آدمی سانپ کو ہاتھ لگاتے ہی زہر کا شکار ہو جاتا ہے، اور تریاق ملنے سے پہلے ہی ہلاک ہو جاتا ہے، اسی طرح فنِ شکاری کا شکار زرد جواہر حاصل کرنے سے پہلے ہی سمندر کے جانوروں کی غذا بن جاتا ہے۔ اگر مال و جاہ ہر شخص کے لئے اور ہر زمانے میں قابلِ مذمت ہوتے تو سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت کے ساتھ جاہ نہ ملتی، اور نہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو سلطنت عطا کی جاتی دراصل عام لوگ نادان اور نو عمر لڑکے کی طرح ہیں، جو عاقبت کی ہوا کئے بغیر ہر سنہری اور چمکیلی چیز کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہیں، جب کہ انبیاء علیہ السلام ان بالغ فطروں کی طرح ہیں جو تیرائی کے فن سے آشنا ہوتے ہیں اور سانپ کو قابو میں کرنے کے طریقے جانتے ہیں، جن چیزوں سے بچوں کو ضرر ہوتا ہے، ان بالغ فطروں کو ان چیزوں سے ضرر نہیں پہنچتا۔

البتہ ایک شخص سانپ کو قابو کرنے کے فن سے واقف ہے، اور اسے تریاق کی ضرورت بھی ہے، وہ سری طرف اسکے گھر میں ایک پیارا سا بچہ بھی ہے جو اسے دل و جان سے محبوب ہے، لیکن خطرویہ ہے کہ اگر وہ سانپ کو تریاق نکالنے کی غرض سے اپنے گھر

لے گیا تو ہو سکتا ہے بچہ اسے پکڑنا چاہے اور اسکے ساتھ کھیلنے کا ارادہ کرے، اگر اس نے ایسا کیا تو وہ یعنی طور پر ہلاک ہو جائے گا اس صورت میں اس شخص کو اپنے مقصد تریاق اور بچے کی بھائی میں موازنہ کرنا چاہیے، ان دونوں میں کیا چیز ضروری ہے۔ اگر اس کا خیال یہ ہو کہ تریاق میرے لئے زیادہ ضروری نہیں ہے، بلکہ بچے کا وجود زیادہ ضروری ہے تو اسے سانپ سے دور بھاگنا چاہیے، اور بچے کو بھی اس سے دور رکھنا چاہیے، اور اسکے علم میں یہ بات لے آئی چاہیے کہ وہ کوئی کھیل نہیں ہے، بلکہ ایک زہر جو جسم کے اندر پہنچنے ہی ہلاک کر دیتا ہے، اسے تریاق کے نفع سے ہرگز آگاہ نہ کرنا چاہیے، ایسا نہ ہو کہ وہ مکمل واقفیت کے بغیر اسکے پکڑنے کے لیے قدم اٹھائے اور ہلاک ہو جائے، یہی حال فواص کا ہے اسے اپنے بیٹے کے سامنے ہرگز سمندر میں غوطہ نہ لگانا چاہیے، ہو سکتا ہے کہ باپ کی اتباع میں وہ بھی سمندر میں کود پڑے اور ہلاک ہو جائے، بچے کو سمندر اور دریا کے ساحل سے دور رکھے، اگر بچہ منع کرنے سے باز نہ آئے، اور ساحل کے قرب و جوار میں دوڑتا پھرے تو ہر ماں باپ کی ذمہ داری ہے کہ بچے کو لیکر خود بھی ساحل سمندر سے دور چلا جائے اور جب تک وہ آنکھوں کے سامنے رہے ساحل پر قدم نہ رکھے۔

امت کی مثال : امت کی مثال ایسی ہے جیسے اپنے آباء کی گود میں بچے معصوم اور ناتجربہ ہوتے ہیں۔ اسی لئے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :-

إِنَّمَا أَنَا لَكُمْ مِثْلُ الْوَالِدِ لِوَلَدِهِ (مسلم ابو ہریرہ۔ معلقہ آخر)

میں تمہارے لئے ایسا ہوں جیسے باپ اپنے بیٹے کے لئے ہوتا ہے۔

ایک حدیث میں ہے ارشاد فرمایا :-

أَنْتُمْ تَنْتَهَاقَتُونَ عَلَى النَّارِ نَهَاَفَتِ الْفِرَاشِ وَأَنَا آخِذٌ بِحُجَزِكُمْ (بخاری و مسلم ابو ہریرہ۔ معلقہ آخر)

تم لوگ آگ پر پودانوں کی طرح گرتے ہو اور میں تمہاری کمریں پکڑے کھینچتا ہوں۔

انبیاء کرام علیہم السلام کی بعثت کا اہم ترین مقصد اپنی اولاد یعنی امت کو ہلاکت سے بچانا تھا، مال سے انھیں کوئی دلچسپی نہیں تھی، مال میں سے صرف اتنا لیتے جتنا قوت کے لئے کافی ہوتا، اگر زائد مال آجاتا تو اسے اپنے پاس نہ رکھتے بلکہ خیرات کر دیتے، کیونکہ مال کا خیرات کر دینا ہی تریاق ہے، نوکناز ہر ہے، اگر لوگوں کے لئے کسب مال کا دوازہ کھول دیا جائے اور انھیں مال جمع کرنے اور بچانے کی ترغیب دی جائے تو وہ روکنے کے زہر کی طرف مائل ہو جائیں، اور خیرات کے تریاق کی طرف دھیان نہ دیں۔

زاو سفر کرتا ہو : ہر مسافر کے لئے ضروری ہے کہ صرف اسی قدر زاد راہ اپنے ساتھ لے جتنی اسے ضرورت ہو، بشرطیکہ یہ ارادہ رکھتا ہو کہ یہ زاد راہ صرف اپنی ذات پر خرچ کرنے کا ہاں، اگر یہ عزم ہو کہ اپنے سفر کے رفیقوں اور ساتھیوں پر بھی خرچ کرے گا تو ضرورت سے زیادہ زاد راہ لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اگرچہ حدیث شریف میں یہ تلقین کی گئی ہے :-

لَيْسَ كُنْ يَلَاغِ أَحَدُكُمْ مِنَ التَّنْبِيَا كَزَادِ الرَّكْبِ (ابن ماجہ، حاکم، مسلم)

دنیا میں سے تمہارا توڑ اتنا ہونا چاہیے جتنا مسافر کا ہوتا ہے۔

اس حدیث کے معنی یہ ہیں کہ اپنے نفسوں کے لئے صرف اس قدر لیں، جتنی ضرورت ہو، ورنہ اسی حدیث کی روایت کرنے والوں اور اس پر عمل کرنے والوں میں سے بعض ایسے تھے جو ایک ایک لاکھ درہم لیتے اور اسی جگہ خرچ کر دالتے، اس میں سے ایک حصہ بھی بچا کر نہ رکھتے، حضرت عبدالرحمن ابن عوف نے جب یہ روایت سنی کہ مالدار سختی کے ساتھ جنت میں داخل ہوں گے تو انھوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت چاہی کہ جو کچھ میرے پاس ہے وہ سب میں فقراء کے حوالے کر دوں، آپ نے اجازت عطا فرمادی، اسی وقت حضرت جبریل علیہ السلام تشریف لائے اور فرمایا کہ انھیں بھوکوں کو کھانا کھانا، تنگوں کی ستر پوشی کرنے اور مہمانوں کی نیافت کرنے کا حکم فرمائیے (حاکم، عبدالرحمن ابن عوف)۔

دنیا کی تمام نعمتوں میں احتیاج ہے، دواؤں میں مرض کی آمیزش ہے، نفع میں ضرر ملا ہوا ہے، جو شخص اپنی بصیرت اور کمال

معرفت پر اعتماد رکھتا ہوا اسکے لئے اجازت ہے کہ وہ مرض سے بچ کر دواء حاصل کر لے اور ضرر سے محفوظ رکھ کر نفع اٹھائے جسے اعتماد نہ ہوا اسکے لئے دور رہنا اور خطرات کی جگہوں سے فرار اختیار کرنا ہی بہتر ہے اگر کوئی شخص سلامت رہ جائے تو یہ اسکے حق میں بڑی نعمت ہے عام طور پر لوگ محفوظ نہیں رہ پاتے صرف وہ لوگ سلامتی پاتے ہیں جنہیں اللہ سلامت رکھے اور اپنے راستے کی ہدایت سے نوازے۔

توفیقی نعمتوں کی حاجت : دنیا میں کوئی شخص ایسا نہیں ہے جسے توفیقی نعمتوں کی حاجت نہ ہو توفیقی کے معنی ہیں بندے کے ارادے اور اللہ تعالیٰ کی قضاء و قدر کے درمیان موافقت ہونا۔ یہ خیر کو بھی شامل ہے اور شر کو بھی سعادت کو بھی اور شقاوت کو بھی لیکن عرف میں توفیق کا لفظ امور سعادت میں بندے کے ارادے کے ساتھ قضاء الہی کی موافقت کے لئے بولا جائے لگا ہے جیسا کہ لغت میں الحاد کے معنی ہیں میلان کے اور اصطلاح میں حق سے انحراف کر کے باطل کی طرف مائل ہونے کو الحاد کہتے ہیں یہی حال ارتداد کا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ توفیق کی ہر حال ضرورت ہے۔ ایک شعر ہے۔

إِذَا لَمْ يَكُنْ عَوْنُ مِنَ اللَّهِ لِفَتْحِي فَكَيْفَ مَا يَجْنِي عَلَيْهِ إِجْنَاهُ

(اگر انسان کو اللہ کی مدد نہ ملے تو اسکی کوشش خیر بھی گناہ کا سبب بن جاتی ہے)

ہدایت ایک ایسی حقیقت ہے جس کے بغیر کوئی شخص سعادت کا طالب نہیں ہو سکتا، ایک انسان کسی ایسی چیز کا خواہاں ہو سکتا ہے جس میں اسکی آخرت کی فلاح ہو لیکن جب وہ یہی نہ جانتا ہو کہ اسکی فلاح کس امر میں مضمر ہے اور نساد کو صلاح سمجھ لیتا ہو تو اسے محض ارادہ کر لینے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا اگر ہدایت نہ ہو تو ارادے قدرت اور اسباب کسی چیز میں کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

رَبَّنَا الَّذِي أَعْطَى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهُ ثُمَّ هَدَىٰ (پ ۱۸ ر ۵۰ آیت ۵۰)

ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو اسکے مناسب بناوٹ عطا فرمائی پھر رہنمائی فرمائی۔

وَلَوْ لَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْنَا لَكُنَّا مِنَ الْخَاسِرِينَ (پ ۱۸ ر ۵۰ آیت ۲۱)

تم میں سے کوئی بھی پاک و صاف نہ ہوتا لیکن اللہ جس کو چاہتا ہے پاک و صاف کر دیتا ہے۔

حدیث شریف میں ہے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

لَنْ يَدْخُلَ أَحَدُكُمْ الْجَنَّةَ إِلَّا عَمَلُهُ

تم میں سے ہر شخص کو صرف اسکا عمل جنت میں لے جائے گا۔

صحابہ نے عرض کیا نہ آپ یا رسول اللہ! فرمایا نہ میں (بخاری و مسلم۔ ابو ہریرہ)

منازل ہدایت : ہدایت کی تین منزلیں ہیں پہلی منزل خیر و شر کی معرفت ہے قرآن کریم کی اس آیت سے یہی حقل مراد ہے۔

وَهَدَيْنَا مَا لَتَجِدَنَّ (پ ۳۰ ر ۵۰ آیت ۱۰)

اور ہم نے اسکو دو نوں راستے بتلا دئے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے تمام بندوں کو ہدایت کی اس نعمت سے نوازا ہے بعض لوگوں کو عقل عطا کر کے اور بعض کو انبیاء کے ذریعے

پیغام پہنچا کر چنانچہ قوم محمود کے بارے میں ارشاد فرمایا۔

وَأَمَّا تَمُودُ فَهَدَيْنَاهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمَىٰ عَلَى الْهُدَىٰ (پ ۲۳ ر ۱۷ آیت ۱۷)

اور وہ جو قوم تہم نے انکو راستہ بتلایا سو انھوں نے ہدایت کے مقابلے میں گمراہی کو پسند کیا۔

آسمانی کتابیں، انبیاء کرام، اور بصیرتیں ہدایت کے اسباب ہیں، یہ اسباب تمام مخلوق کو میسر ہیں، ان سے کسی کو روکا نہیں جاتا، صرف وہ لوگ ان اسباب کے حصول اور ان کے موجب پر عمل کرتے ہیں، جن کے دلوں میں کبر، حسد، اور دنیا کی محبت ہو، یا ایسے اسباب میں گرفتار ہوں جن سے بصیرت پر پردے پڑ جاتے ہیں، اگرچہ آنکھیں روشن ہوں، ارشاد ربانی ہے:-

فَاِنَّهَا لَا تَعْمَىٰ الْاَبْصَارَ وَلٰكِنْ تَعْمَىٰ الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّلُوفِ (پ ۷۷ آیت ۳۶)

بات یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہو جایا کرتیں بلکہ دل جو سینوں میں ہیں وہ اندھے ہو جایا کرتے ہیں۔

جن چیزوں سے عقل و خود پر پردہ پڑتا ہے ان میں عادت، روایات سے انس، اور اپنے آپ کو اجداد کے ورثے کو سنبھال کر رکھنے کی خواہش بھی ہے، قرآن کریم نے اسکی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے:-

اِنَّا وَجَدْنَا اٰبَاءَنَا عَلٰی لَهْفٍ وَاِنَّا عَلٰی اٰثَارِهِمْ مُقْتَلُونَ (پ ۸۷ آیت ۲۳)

ہم نے اپنے باپ دادوں کو ایک طریقے پر پایا ہے اور ہم بھی انکے پیچھے پیچھے چلے جا رہے ہیں۔

کبر اور حسد بھی قبول ہدایت کے لئے زبردست رکاوٹ ہیں، قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا:-

وَقَالُوا لَوْلَا نَزَلَ هٰذَا الْقُرْآنُ عَلٰی رَجُلٍ مِّنَ الْقُرْآنَيْنِ عَظِيْمٍ (پ ۹۷ آیت ۳۱)

اور کہنے لگے کہ یہ قرآن ان دونوں بستیوں میں سے کسی بڑے آدمی پر کیوں نازل نہیں کیا گیا۔

اَبَشِّرْ اٰمِنًا وَاَجَلًا نَّيْبَعُهُ (پ ۹۷ آیت ۲۳)

کیا ہم ایسے شخص کا اجماع کریں گے جو ہماری جنس کا آدمی ہے۔

کبر، حسد اور برتری کا احساس یہ ایسے امور ہیں جو دلوں کو اندھا کر دیتے ہیں، اور انھیں ہدایت کے راستے پر چلنے سے باز رکھتے ہیں، ہدایت کی دوسری منزل پہلی منزل کے بعد ہے، اور وہ حاصل ہوتی ہے، مجاہدے کے نتیجے میں۔ اللہ تعالیٰ اسے ہر حال میں ہدایت سے نوازتا ہے۔ ارشاد فرمایا:-

الَّذِيْنَ جَاهَلُوْا فَاٰمَنَّا لَنَهْدِيْهُمْ سُبُلَنَا (پ ۳۱ آیت ۶)

اور جو لوگ ہماری راہ میں متوجہ ہو گئے ہیں ہم ان کو اپنے راستے ضرور دکھائیں گے۔

اس آیت میں بھی یہی مراد ہے:-

وَالَّذِيْنَ اٰهْتَنَوْا رَاٰهُمْ هٰدِيْنَ (پ ۶۲ آیت ۱)

اور جو لوگ راہ پر ہیں اللہ تعالیٰ ان کو اور زیادہ ہدایت دیتا ہے۔

ہدایت کی تیسری منزل اس دوسری منزل کے بعد ہے، یہ ہدایت ایک ایسا نور ہے جو کمال مجاہدہ کے بعد عالم نبوت اور عالم ہدایت میں چمکتا ہے، اور اس نور کی وجہ سے آدمی کو وہ باتیں معلوم ہو جاتی ہیں جو عقل سے معلوم نہیں ہوتیں جس پر شرعی اور امر و نواہی کا مدار ہے، اور جس کے ذریعے علوم کی تحصیل ممکن ہوتی ہے، اس ہدایت کا نام مطلق ہدایت ہے۔ اس کے علاوہ عقلی ہدایتیں ہیں وہ سب اسی کے مقدمات اور حجابات ہیں، یہی ہدایت ایسی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر اپنی طرف منسوب فرمایا ہے، اگرچہ تمام ہدایتوں کا مرجع اللہ ہی کی ذات ہے، ارشاد ربانی:-

قُلْ اِنَّ هٰدِيَ اللّٰهُ هُوَ الْهٰدِيَ (پ ۱۳ آیت ۳۰)

آپ کہہ دیجئے حقیقت میں ہدایت کا راستہ وہی ہے جو خدا نے بتلایا ہے۔

اسی کا نام حیات ہے جیسا کہ قرآن کریم کی اس آیت میں ہے:-

اَوْ مِّنْ كٰنَ مَبِيْنًا فَاَخْبَيْنَا هُوَ جَعَلْنَا لِمَنْ شِئْنٰهُ مِشْرٰى (پ ۲۸ آیت ۲۲)

ایسا شخص جو کہ پہلے مودہ تھا، پھر ہم نے اس کو زعمہ بنا دیا، اور ہم نے اسکو ایسا نور دیدیا کہ وہ اسکو لے ہوئے

آدمیوں میں چلتا ہے۔

اس آیت میں بھی یہی مراد ہے :-

أَقَمْنِ شَرَحَ الْمَصْنَعِ لِمَا لَمْ يَفْهَمُوهُ عَلَى نُورٍ مِّنْ زَيْدٍ (پ ۲۳ ر ۲ آیت ۱۲)
سو جس شخص کا سینہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کے لئے کھول دیا اور وہ اپنے پروردگار کے نور پر ہے۔

رشد کے معنی : رشد سے ہماری مراد وہ عنایت الہی ہے جو انسان کی اس وقت مدد کرتی ہے جب وہ مقاصد کی طرف متوجہ ہوتا ہے، اگر وہ مقاصد خیر ہوتے ہیں تو اس کے ارادوں کو تقویت دی جاتی ہے، اور برے ہوتے ہیں تو ارادوں میں اضطلال پیدا کر دیا جاتا ہے تقویت دینے اور اضطلال پیدا کرنے کا یہ عمل باطن سے ہوتا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :-
وَلَقَدْ آتَيْنَا إِبْرَاهِيمَ نُورًا شَهِدَ شَمْعُومَ قَبْلُ وَكُنَّا بِعَالَمِ الْعَمِينَ (پ ۵۷ ر ۵ آیت ۵۸)
اور ہم نے پہلے ابراہیم کو ان کی خوش فہمی عطا فرمائی تھی اور ہم ان کو خوب جانتے تھے۔

حاصل یہ ہے کہ رشد ایسی ہدایت کو کہتے ہیں جو جانب سعادت کو قریب تر کرنے کا باعث اور محرک ہو، چنانچہ اگر کوئی لڑکا اس حال میں بالغ ہو کہ وہ مال کی حفاظت، اور اسکو نمونہ بننے کے طریقوں سے واقف ہو، اور تجارت کی تمام تدبیریں جانتا ہو، لیکن اسکے باوجود اسراف کرتا ہو، اور مال بے حسائی کی فکر نہ کرتا ہو تو یہ کہا جائے گا کہ اسے رشد میسر نہیں ہے، اگرچہ اسے خیر و شر کے طریق معلوم ہیں، لیکن اسکی ہدایت اس لحاظ سے ناقص ہے کہ اس سے اسکے ارادہ خیر کو تحریک نہیں ہوتی، اسی لئے وہ صاحب رشد بھی نہیں ہوا۔ اسی طرح ایک شخص جان بوجھ کر ایسا عمل کرتا ہے جس میں اس کا نقصان ہے تو کہا جائے گا کہ اسے رشد حاصل نہیں ہے، اسے صرف وہ ہدایت حاصل ہے جو خیر کے راستوں سے ناواقف انسان سے متاثر ہوتی ہیں، معلوم ہوا کہ رشد ہدایت سے بڑی نعمت ہے، اس لئے کہ ہدایت میں صرف اعمال خیر کے راستوں کا علم ہوتا ہے، جب کہ رشد سے ان راستوں پر چلنے کی تحریک ہوتی ہے۔ ظاہر ہے اس نعمت میں کمال زیادہ ہے۔

تسدید کی تعریف : تسدید کے معنی ہیں بندے کی حرکات کو مطلوب کی طرف متوجہ کرنا، اور اس پر ان حرکات کو سل بنانا تاکہ وہ جلد سے جلد اور صواب کی طرف پہنچنے کے ساتھ متوجہ ہو جائے۔ جس طرح تباہ ہدایت کافی نہیں ہے، بلکہ اس کے لئے مرشد کی ضرورت ہے جس سے ارادے کو تحریک ہوتی ہے، اسی طرح رشد بھی کافی نہیں ہے، بلکہ اس کے لیے اعضاء کی مساعدت ضروری ہے تاکہ حرکات سل ہو جائیں، اور جس امر خیر کی طرف تحریک ہوئی ہے وہ پورا ہو جائے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہدایت محض تعریف (خیر و شر کا علم دینا) ہے، رشد کے معنی ہیں ہدایت کے لئے ارادے کو تحریک دینا اور اسے بیدار کرنا، اور خیر کی طرف اعضاء کو حرکت کرنے میں مدد دینے کا نام تسدید ہے۔

تائید اور عصمت کے معنی : تائید گویا ان تمام امور کو جامع ہے۔ اسکے معنی یہ ہیں کہ بندے کے باطن میں اسکے ارادہ خیر کو بصیرت کے باعث تقویت ملے، اور خارج میں اسباب اور لوازم کی اعانت سے قوت پہنچے، اس آیت میں بھی یہی مراد ہے :-
إِذَا يَدْعُوكَ بِرُوحِ الْقُدُسِ (پ ۵ ر ۵ آیت ۱۰)
جب کہ میں نے تم کو روح القدس سے تائید دی۔

تائید سے قریب عصمت ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ آدمی کے باطن میں عنایت الہی موجود ہے جس کے باعث وہ خیر پر اقدام کرنے اور شر سے باز رہنے پر قادر ہے، گویا باطن میں کوئی ایسا غیر محسوس وجود ہو جو اسے شر سے باز رکھے، اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے یہی مراد ہے۔

وَلَقَدْ هَمَّتْ بِوَهَبٍهَا لَوْلَا نَزَايُ بَرُّهَا نَزِيدٍ (پ ۱۳ ر ۱۳ آیت ۲۳)

اور اس عورت کے دل میں تو ان کا خیال جم ہی رہا تھا اور ان کو بھی اس عورت کا کچھ خیال ہو چلا تھا اگر اپنے رب کی دلیل کو انھوں نے نہ دیکھا ہوتا۔

یہ تمام نعمتیں اسی شخص کو عطا کی جاتی ہیں جسے اللہ نے ذہن کی صفائی، قوت سامعہ کی حیوی، اور قلب کی آگہی سے نوازا ہو، اسکا باطن تواضع کے ہذبات سے معمور ہو، اسکا دل خیر خواہ استلا کا فرض ادا کرتا ہو، اسے اتقا مال بھی میسر ہو کہ وہ کبھی باعث دین کی سمات میں مشغول نہ ہو سکے اور کثرت کے باعث امور خیر سے اعراض کرے، اسے وہ عزت بھی حاصل ہو جو بے وقوفوں کی زیادتی، اور دشمنوں کے ظلم سے اسکی حفاظت کر سکے۔ یہ کل سلسلہ اسباب ہیں، ان میں سے ہر سبب شہد اسباب کا متقاضی ہے، پھر ان میں سے ہر سبب کو بے شمار اسباب چاہئیں، یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہتا ہے۔ یہاں تک کہ مسبب الاسباب پر جا کر ختمی ہو جاتا ہے جو کرم کردہ راہوں کا راہ نما، مجبوروں کا سارا اور پریشان حالوں کا آسرا ہے، کیونکہ ان تمام اسباب کا استغناء ممکن نہیں ہے، اس لئے کہ ہم بطور نمونہ کچھ ذکر کرتے ہیں، تاکہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے معنی واضح ہو جائیں۔

وَلَنْ تَعْلُوا نِعْمَةً كَلَّا لَئِنْ لَمْ نَخْصُصْكُمْهَا (پ ۸۱۳ آیت ۱۸)

اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کو کتنے گنو تو گن نہ سکو۔

اللہ تعالیٰ کی بے شمار نعمتیں، اور ان کا تسلسل

جاننا چاہیے کہ ہم نے نعمت کی سولہ قسمیں کی ہیں، تدرستی بھی ان ہی نعمتوں میں سے ایک ہے، اگرچہ مرتبے میں مؤخر ہے، اگر تمنا اس نعمت کے ان اسباب کا احاطہ کرنے میں جہنہ جائیں جن سے یہ نعمت تمام ہوتی ہے تو ہمیں ناکامی کا منہ دیکنا پڑے، اس لئے صرف ایک سبب کا ذکر کرتے ہیں، اور وہ ہے کھانا۔ یہ بھی صحت اور تدرستی کے بے شمار اسباب میں سے ایک سبب ہے، یہ سبب یعنی کھانا کتنے اسباب سے مکمل ہوتا ہے، ذیل میں ہم اس پر روشنی ڈالتے ہیں۔ کھانا ایک فعل ہے، اور اس نوع کے تمام فعل حرکت کہلاتے ہیں۔ اور ہر حرکت کے لئے ایک متحرک جسم کی ضرورت ہے جسے اسکا آلہ کھنا چاہیے، پھر حرکت پر قدرت ضروری ہے، اور حرکت کے لئے ارادہ بھی چاہیے، اپنی مراد کا علم اور ادراک بھی ضروری ہے، کھانے کے لئے غذا بھی چاہیے، اور غذا کے لئے کوئی ایسی چیز ہونی ضروری ہے جس سے غذا حاصل کی جاسکے، پھر غذا کے لئے ایک مصلح بھی چاہیے، اس لئے ہم پہلے ادراک کے اسباب بیان کرتے ہیں، پھر ارادہ، قدرت اور غذا کے اسباب علی الترتیب بیان کریں گے، مصلحت کی تک وافی کے باعث ہم انتہائی اجمال کے ساتھ لکھنے کی کوشش کریں گے، سہولت تفہیم کے لئے ہم اس موضوع کو آٹھ بنیادی عنوانات پر تقسیم کرتے ہیں۔

اسباب ادراک کی تخلیق میں اللہ کی نعمتیں

جاننا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے نباتات پیدا کیں، اور انھیں پھر ذریعے، لوسے، تانے اور دوسرے جواہر کے مقابلے میں زیادہ مکمل وجود عطا کیا، ان جواہرات میں قوت نمو نہیں ہے، اور نہ یہ غذا حاصل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، جب کہ نباتات میں ایسی قوت پیدا کی گئی ہے جس کے ذریعے وہ اپنی طرف غذا کھینچتی ہیں، اور اس عمل کے لئے اپنی جڑ اور رگوں اور ریشوں کا استعمال کرتی ہیں، یہ رگیں اور جڑیں زمین میں پھیلتی رہتی ہیں، یہ رگیں پہلے باریک ہوتی ہیں، پھر موٹی ہو جاتی ہیں، پھر ان سے اور رگیں پھوٹتی ہیں، یہاں تک کہ ان کا سلسلہ جوں پر ختمی ہو جاتا ہے، اور وہاں تک پہنچتے پہنچتے یہ رگیں اتنی باریک ہو جاتی ہیں کہ نظر نہیں آتیں، معدنیات کے مقابلے میں اگرچہ نباتات میں کمال نمو ہے، لیکن یہ کمال بھی نقص سے خللی نہیں ہے، اس لئے کہ اگر نباتات کی غذا جڑوں میں نہیں پہنچے گی، اور رگوں سے مس نہیں کرے گی تو درخت سوکھ جائیں گے، پودے مر جھکا جائیں گے، ان کے لئے یہ ممکن نہ ہو گا کہ اپنی غذا کسی اور جگہ سے حاصل کر سکیں، اس لئے کہ کسی چیز کی طلب اسی وقت ممکن ہے جب مطلوب معلوم ہو، اور اس تک پہنچنا ممکن ہو، نباتات ان دونوں ہی چیزوں سے عاجز ہے، نہ اسے یہ معلوم ہے کہ اس کی غذا کیا ہے؟ اور اسے کیسے حاصل کیا جاسکتا ہے؟ یہ انسان پر

اللہ کا پیدا انعام ہے کہ اس نے احساس اور حرکت کے آلات پیدا کر کے اسکے لئے حصول غذا کے طریقے آسان کر دیے ہیں۔

حواس خمسہ کی ترتیب میں حکمت : حواس خمسہ کی ترتیب میں بھی اللہ تعالیٰ کی بڑی حکمت نظر آتی ہے۔ یہ تمام حواس اور اک کے آلات ہیں، ان میں پہلا لمس (چھونے) کا حواس ہے، یہ حواس اس لئے پیدا کیا گیا ہے کہ جب ہمارے ہاتھ پر کوئی چنگاری کرے، یا بھڑکنے تو تم فوراً اسکی پیش یا سوزش محسوس کر لو اور اس سے بچنے کی کوشش کرو۔ یہ پہلی حس ہے جو حیوان کے اندر پیدا کی گئی ہے، کوئی ایسا حیوان تصور نہیں کیا جاسکتا جس کے اندر چھونے کی حس موجود نہ ہو، اگر کسی میں یہ حس ہی نہ ہو تو اسے حیوان کہنا صحیح نہ ہوگا حواس لمس کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ اگر جسم سے کوئی چیز مس کرے یا محسوس ہو جائے تو اسکا احساس ہو، دور کی چیز کا احساس کرنا درجہ کمال ہے، اور ادنیٰ درجے کی حس تو ہر حیوان میں موجود ہے، یہاں تک کہ مٹی کے اندر رہنے والا کبوتر بھی اس سے محروم نہیں ہے، اگر اسکے جسم میں سوئی چھو دی جائے تو وہ بھی سنٹ سٹ کر اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کرتا ہے، نبات کا یہ حال نہیں ہے، تم اسے کاش ڈالو نہ وہ سڑے گی نہ سٹے گی نہ تم سے دور بھاگے گی، اس لئے کہ نبات میں حس نہیں ہے۔

اگر آدمی میں صرف یہی قوت لامہ ہوتی تو اس کا حال بھی کیڑے جیسا ہوتا جیسے کیڑا ناقص ہوتا ہے اسی طرح آدمی بھی ناقص ہوتا کہ جو چیز اسکے جسم سے مس کرتی صرف اسے اپنی طرف کھینچتا اور اسی کو اپنی غذا بناتا، اس کے لئے یہ ممکن نہ ہوتا کہ کسی ایسی چیز کو غذا بناتا جو اس سے دور ہوتی، اس لئے ایک ایسی حس کی ضرورت پیش آئی جس کی مدد سے دور کی چیز کا ادراک ممکن ہو چنانچہ ہمارے اندر سونگھنے کی قوت پیدا کی گئی، اس سے آدمی دور کی چیز بھی معلوم کر لیتا ہے، لیکن کیونکہ محسوس سونگھنے سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ بوسے کس طرف سے آ رہی ہے، اس لئے تم بوسے کچھ کر چاندوں طرف دوڑتے پھرتے، اس تک دوڑ کے نتیجے میں یہ ہو سکتا تھا کہ تمہیں غذا مل جاتی، اور یہ ممکن بھی تھا نہ ملتی، اس لئے تمہارے اندر دیکھنے کی قوت رکھی گئی، تاکہ جو چیز تم سے دور ہو اور سونگھ کر تم اسکی جست اور دوری محسوس نہ کر سکو اسے دیکھ لو اور صرف اسی سمت کا قصد کرو، پھر اگر تمہارے پاس یہی دو قوتیں ہوتیں تب بھی تم ناقص ہوتے اس لئے کہ تمہیں دو قوتوں کے ذریعے صرف انہی چیزوں کا ادراک کر سکتے ہو جو تمہاری نگاہوں کے سامنے ہیں، جو چیزیں دلوادلوں کے پیچھے ہیں یا جن چیزوں کے درمیان کوئی چیز مائل ہے تم ان کا ادراک نہیں کر سکتے، اگر غذا دیوار کے پیچھے ہوئی تو تم اسکا ادراک نہ کر پاتے، اسی طرح صرف اس دشمن کا ادراک کر سکتے تھے جو تمہاری آنکھوں کے سامنے ہوتا، اگر دشمن پس پردہ ہوتا تو تم اسے قہیب ہو کر محسوس کر سکتے، اور قہیب ہونے کی صورت میں یہ ممکن تھا کہ دشمن تم پر قابو پا لیتا اور تم اپنے بچاؤ کی کوئی تدبیر نہ کر پاتے۔ اس لئے تمہارے اندر حس سمع (سننے کی قوت) پیدا کی گئی، اسکے ذریعے تم ان آوازوں کا ادراک کر لیتے ہو جو پردوں اور دیواروں کے پیچھے ہونے والی حرکات کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہیں، آنکھ کے ذریعے تم موجود کا ادراک کر سکتے ہو، غائب کا ادراک محسوس اس کام سے ممکن ہے جو حس سمع سے ادراک کی گئی، اور کلام سمجھنے کی صلاحیت دے کر تمہیں دوسرے حیوانات سے ممتاز بنایا گیا۔

پھر یہ تمام حواس بھی ناکافی ہوتے، اگر تمہارے اندر قوت ذائقہ نہ ہوتی۔ اس صورت میں تم غذا کھا لیتے، تمہیں یہ معلوم نہ ہوتا کہ جو غذا تم کھا رہے ہو وہ تمہارے مخالف ہے یا موافق، کبھی ایسا بھی ہوتا کہ تم ناموافق غذا کھا کر ہلاک ہو جاتے، جس طرح درخت میں قوت ذائقہ نہیں ہوتی، وہ اپنی جڑوں میں کھینچنے والے پانی سے غذا حاصل کرتا ہے، اور سرسبز و شاداب رہتا ہے، بعض اوقات یہ پانی اسکے خشکی کا باعث بن جاتا ہے، یہ تمام حواس تمہارے لئے ناکافی تھے اگر تمہارے دماغ کے اگلے حصے میں قوت ادراک نہ پیدا کی جاتی جسے حس مشترک کہتے ہیں، اس میں حواس خمسہ کے ذریعے حاصل ہونے والے محسوسات جمع رہتے ہیں۔ اگر آدمی میں یہ حس مشترک نہ ہوتی تو اسے بڑی دشواری کا سامنا کرنا پڑتا۔ مثال کے طور پر اگر وہ زرد رنگ کی کوئی چیز کھاتا اور اسے اپنی بیعت کے ناموافق دیکھ کر چھوڑ دیتا، پھر وہ چیز اس کے سامنے آتی تو یہ نہ جان پاتا کہ یہ چیز مسخر ہے، جب تک اسے جگہ نہ لیتا، اس لئے کہ آنکھ زردی دیکھتی ہے، تلخی کا احساس نہیں کرتی، اسی طرح ذائقہ سے تلخی کا احساس ہوتا ہے، زردی کا پتہ نہیں چلتا، اس لئے کہ کسی ایسی حس مشترک کا وجود ضروری ہے جسے زردی اور تلخی دونوں کا احساس ہو، یہاں تک کہ جب زردی نظر آئے تو حس مشترک اسکی تلخی کا

حکم دے، اور دوسری مرتبہ کھانے سے باز رکھے۔

خصوصیت عقل : اگر تمہارے پاس صرف یہی حواس ہوتے جن میں حس مشترک بھی شامل ہے تب بھی تمہاری کوئی خصوصیت نہ ہوتی اس لئے کہ یہ حواس تو تمام حیوانات کے پاس بھی ہیں، یہاں تک کہ ایک حیرتی بکری بھی یہ حواس رکھتی ہے، اگر تم یہی حواس رکھتے تو بکری اور دیگر جانوروں کی طرح ناقص ہی رہتے۔ چنانچہ اگر جانور کسی حیلے سے گرفتار ہو جائیں تو وہ یہ نہیں جان پاتے کہ اس قید سے آزادی کے لئے کیا تدبیر کی جائے، اسی طرح اگر وہ کوئی نہیں کر جائیں تو انھیں یہ نہیں معلوم ہو پاتا کہ کنویں میں گرنے سے ہلاک ہو جاتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ جانور وہ چیزیں کسی خوف و خطر کے بغیر کھا لیتے ہیں جو فی الحال انھیں لذت دیتی ہیں خواہ بعد میں نقصان دہ ثابت ہوں، اور ان کی بیماری یا موت کا باعث بن جائیں، انھیں صرف حاضر کا احساس رہتا ہے، اس کے علاوہ کچھ نہیں سوچتا، حواقب کا اور اک ایک ایسی خصوصیت ہے جو اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر جنہیں بخشی ہے، اللہ تعالیٰ نے جنہیں حیوانات سے ممتاز کیا اور ایک ایسی صفت سے نوازا جو تمام صفات سے اعلاء و اشرف ہے، اور وہ صفت عقل ہے، اس کے ذریعے تم حال اور مال کے اعتبار سے غذا کے منفعت اور مضرت کا علم حاصل کرتے ہو، اور یہ جاننے ہو کہ غذا کیسے پکائی جاتی ہے، مختلف چیزوں سے کس طرح ترکیب دی جاتی ہے، اور ان کے اسباب کس طرح مہیا کئے جاتے ہیں، غور کرو، صرف غذا کے سلسلے میں عقل کے کس قدر فوائد ہیں، جو انسانی صحت و سستی کے بے شمار اسباب میں سے ایک سبب ہے حالانکہ عقل کا یہ ایک ادنیٰ فائدہ اور معمولی حکمت ہے، عقل میں بڑی حکمت اللہ تعالیٰ کی معرفت، اس کے صفات، اس کے افعال، اور عالم میں اس کی حکمت کا جاننا ہے، اگر آدمی اپنی عقل کو اس اعلا ترین فائدے اور عظیم ترین حکمت میں استعمال کر لے تو اس کے فوائد کچھ اور ہو جاتے ہیں، اس صورت میں حواس غصہ تمہاری لئے جاسوس اور خبر رساں افراد بن جائیں گے جو ملک کے اطراف میں پھیلے رہتے ہیں، اور حاکم وقت کو پہل پہل کی خبریں فراہم کرتے ہیں، ان میں سے ہر جاسوس کو مخصوص ذمہ داری سپرد کی جاتی ہے، اس طرح ایک ہی وقت میں حاکم طرح طرح کی خبریں حاصل کر لیتا ہے، جو حکومت کا نظام چلانے میں اس کے لئے نہایت مفید ثابت ہوتی ہیں، حواس غصہ کو بھی انہی جاسوسوں پر قیاس کرو، ان میں سے ایک حاسہ رنگوں کی خبریں فراہم کر رہا ہے، دوسرا آوازوں کی خبریں دے رہا ہے، تیسرا خوشبوؤں کا خبر رساں ہے، چوتھا ذائقے کی خبریں فراہم کرنے پر مامور ہے، پانچواں حاسہ سرد گرم، سخت و نرم، اور نشیب و فراز کے امور کا انکشاف ہے اور ان سے تعلق رکھنے والی خبریں حاصل کرتا ہے، اور متعلقہ شعبے کی طرف منتقل کر دیتا ہے۔ یہ جاسوس حواس جسم کی سلفنت میں پھیل جاتے ہیں، اور گوشے گوشے سے خبریں فراہم کر کے حس مشترک کے پاس پہنچ دیتے ہیں، یہ حس مشترک دماغ کی دہلیز پر بیٹھی ہوئی ہے۔ جیسے بادشاہ کے دروازوں پر عرض نویس، اور کارندے جنہیں آج کل کی اصطلاح میں چڑی کہا جاتا ہے، بیٹھے رہتے ہیں، یہ لوگ ملک کے اطراف سے آنے والے مراسلات اکٹھے کرتے ہیں، یہ مراسلات سر بہ سر ہوتے ہیں کارندے ان مراسلات کو شاہی دربار میں پہنچا دیتے ہیں، وہاں سے احکامات صادر ہوتے ہیں ان کارندوں اور درباریوں کو صرف اتنا اختیار حاصل ہے کہ وہ ان مراسلات کو مکمل حفاظت کے ساتھ بادشاہ تک پہنچا دیں، یہ مراسلات کن حقائق پر مبنی ہیں، اور لکھنے والوں نے ان میں کیا کیا معلومات و دیعت کی ہیں یہ جاننا ان کے فرائض میں شامل نہیں ہے، حس مشترک بھی حواس غصہ کے ذریعے حاصل ہونے والی خبروں کو دل کے سپرد کرتی ہے، جو جسم کی سلطنت کے لئے امیر اور بادشاہ کے درجے میں ہے اگر دل عاقل ہوتا ہے تو ان اخبار و معلومات کی تحقیق کرتا ہے، اور ان کے ذریعے ملک کے اسرار و رموز پر مطلع ہوتا ہے اور ان کے مطابق ایسے ایسے عجیب و غریب احکامات صادر کرتا ہے جن کا اس موقع پر احاطہ نہیں کیا جاسکتا پھر جس موقع اور مصلحت کو مناسب سمجھتا ہے ان کے مطابق اپنے فکر کو حرکت دیتا ہے، ان کے فکر اعضاء ہیں، کبھی انھیں تلاش پر مامور کرتا ہے، کبھی فرار کا حکم دیتا ہے، کبھی ان منصوبوں اور تدبیروں کے لئے ان سے مدد لیتا ہے جو انتظام حکومت کے لئے اسے درپیش ہیں۔ اور احکامات کے باب میں اللہ تعالیٰ کی نصرت پر یہ ایک اجمالی گفتگو ہے، اور یہ گفتگو اپنی موضوع کے تمام پہلوؤں کو محیط بھی نہیں ہے، اگر ہم ظاہری حواس کا ہی استقصاء کرنے بیٹھ جائیں تو صفات کے صفات سیاہ ہو جائیں، اور موضوع تمام نہ

ارادوں کی تخلیق میں اللہ تعالیٰ کی نعمتیں

اللہ کی قدرت دیکھئے اس نے تمہارے اندر صرف شہوت طعام ہی پیدا نہیں کی، بلکہ اس میں ایک مرحلے پر پہنچ کر فہرہ اور سکون بھی پیدا کیا، اگر شہوت یوں ہی بے مہار رہتی، اور پیٹ بھرنے کے باوجود کھانے سے ہاتھ نہ رکھتا تو آدمی ہلاک ہو جاتا جیسے کھیتی پانی کی ایک مخصوص مقدار جذب کرتی ہے، جب یہ مقدار ضرورت سے تجاوز کر جاتی ہے، تو پودے گھٹنے گھٹنے لگتے ہیں، اور کھیتی برباد ہوتی ہے، اس لئے کاشتکار کو چاہیے کہ جو ضرورت کے مطابق ہے، اس قدر کھائے، اور کھانے کے بعد باقی بچا ہوا کھانا باقی ہو جاتی ہے، اس دشواری کے ازالے کے لئے حکم سیری اور سیرابی کا اندازہ کس طرح ہو، اللہ تعالیٰ نے آدمی کے اندر فہرہ پیدا کی، تاکہ جب پیٹ بھرنے کے بعد کھانے سے متفر ہو جائے، اور ہاتھ رک جائے، جس طرح اللہ تعالیٰ نے آدمی کے اندر کھانے کی شہوت پیدا کی ہے، جب یہ شہوت سرا بھارتی ہے تو طبیعت خود بخود کھانے کی طرف مائل ہو جاتی ہے، اسی طرح اس میں جماع کی شہوت بھی پیدا کی ہے، جب یہ شہوت سرا بھارتی ہے تو آدمی جماع کرتا ہے، اور نسل انسانی کی بقاء کا باعث بنتا ہے، اگر ہم انسانی تخلیق کی ابتداء پر روشنی ڈالیں، اور اس سلسلے میں واقع ہونے والے عجائبات پر گفتگو کریں تو تم حیران رہ جاؤ، رحم کی بناوٹ کیسی ہے، حیض کا نظام کس طرح قائم ہے، جو پشت کی ہڈیوں سے وابستہ ہیں جن میں غلفہ رہتا ہے، عورت کی منی بننے کی رگوں سے نیچے کس طرح گرتی ہے، رحم میں کس طرح کے سانچے ہیں کہ کبھی منی کے قطروں سے موبین جاتا ہے، اور کبھی عورت بھریہ معنی کتنے مراحل سے گزرتی ہے، پھنسی ہے، کوٹھڑے میں تبدیل ہوتی ہے، ہڈیاں بنتی ہیں، گوشت تشکیل پاتا ہے، خون بنتا ہے، ہمارا سمیں اجزاء کی تقسیم ہوتی ہے، سر ہاتھ پاؤں، پیٹ، پشت، اور دوسرے اعضاء تخلیق پاتے ہیں، اگر تمہارے سامنے یہ سب کچھ بیان لیا جائے تو تمہاری حیرت کا عالم دیکھنے

کے قابل ہوگا جب ابتدائے آفرینش میں اللہ تعالیٰ کی عجیب و غریب نعمتوں کا یہ حال ہے تو اس وقت کیا حال ہوگا جب تمہارا وجود مکمل ہو چکا ہوگا، لیکن فی الحال یہ موضوع زیر بحث نہیں ہے، ہم صرف کھانے کی نعمتوں پر روشنی ڈالنا چاہتے ہیں

شہوت طعام : خلاصہ یہ ہے کہ کھانے کی شہوت انسانی ارادوں میں سے ایک ہے، لیکن تمنا یہ شہوت کافی نہیں ہے اس لئے کہ چاروں طرف سے تم پر ملکات کی بیلخار رہتی ہے، اگر تمہارے اندر غضب پیدا نہ کیا جاتا جس کی ذریعے تم ہر اس چیز کو دفع کرتے ہو جو تمہارے خلاف ہے یا تمہارے مزاج سے موافقت نہیں رکھتی تو تم آفتوں کا ہدف بن کر رہ جاتے، جو غذا تم حاصل کرتے وہ چھین لی جاتی، کیونکہ ہر شخص کو غذا کی خواہش ہے، اگر تم میں مدافعت یا حفاظت کی قوت نہیں تو تم اپنی غذا لوگوں کی دست برد سے محفوظ نہیں رکھ سکتے۔

پھر غذا کے استعمال اور اسکے تحفظ کے لئے محض شہوت اور غضب ہی کی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ ان دونوں کا قائمہ حال سے تعلق رکھتا ہے، ہاں میں یہ دونوں ارادے کافی نہیں ہیں، اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے ایک اور ارادہ پیدا فرمایا جو عقل کے اشارے پر چلتا ہے، اور جنہیں انجام پر نظر رکھنے پر مجبور کرتا ہے، شہوت اور غضب دونوں کو اس حس کے ادراک کا محکوم بنایا جس سے موجودہ حالت معلوم ہوتی ہے، اس ارادے سے انسان کو پورا نفع حاصل ہوتا ہے، اسکے لئے محض یہ جان لینا کافی نہیں ہے کہ فلاں چیز مضر ہے، مثلاً شہوت اسکے لئے نقصان دہ ہے، جب تک اس معرفت کے مطابق عمل کرنے کی رغبت نہ ہو، اس طرح کے ارادوں کو صرف انسان کے ساتھ مخصوص کیا گیا، بہائم میں یہ ارادے پیدا نہیں کئے گئے، یہ تخصیص دراصل بنی آدم کا امتیاز اور اس کی حکمت و کرامت کا اظہار ہے، انجام کی معرفت بھی صرف انسانوں میں ہے، اس ارادے کا نام ہم نے باعث رہتی رکھا ہے، اور صبر کے بیان میں تفصیل کے ساتھ اس پر روشنی ڈالی ہے۔

قدرت اور آلات حرکت کی تخلیق میں اللہ کی نعمتیں

: جاننا چاہیے کہ حس سے صرف ادراک ہوتا ہے، اور ارادے کے معنی ہیں کسی شے کی طلب یا اس سے گریز کی طرف میلان ہونا۔ کسی کام کے لئے ادراک و ارادہ کافی نہیں ہیں جب تک تمہارے اندر کسی شے کی طلب یا اس سے فرار کے آلات موجود نہ ہوں، بہت سے مریض ایسے ہیں جو درد کی چیز دیکھ کر اس کے مشتاق ہوتے ہیں، لیکن پاؤں نہ ہونے کے باعث اس چیز تک پہنچ نہیں پاتے، یا اس تک پہنچ جاتے ہیں لیکن ہاتھ نہ ہونے کی وجہ سے اسے اٹھا نہیں پاتے، بعض اوقات ہاتھ موجود ہوتے ہیں لیکن وہ قانع زدہ ہوتے ہیں، یا کسی مرض کے زیر اثر بن جاتے ہیں گویا ان میں جان ہی نہیں ہوتی، اس لئے حرکت کے لئے آلات ضروری ہیں۔ اور ان آلات میں حرکت پر قدرت کا وجود ضروری ہے تاکہ وہ آلات شہوت کے تقاضے پر عمل کرتے ہوئے طلب پر اور کراہیت کے تقاضے پر عمل کرتے ہوئے فرار پر قادر ہو سکیں، اسی حکمت کی تکمیل کے لئے اللہ تعالیٰ نے جنہیں ایسے اعضاء سے نوازا جو بظاہر جنہیں نظر آتے ہیں، لیکن تم ان کے اسرار سے واقف نہیں ہوتے، ان میں سے بعض طلب کے لئے ہوتے ہیں، بعض گریز کے لئے، جیسے انسان کے لئے پاؤں پر ندوں کے لئے ہانڈ، چھپاؤں کیلئے ٹانگیں اور بعض مدافعت کے لئے ہیں، جیسے انسان کے لئے ہتھیار، اور حیوانوں کے لئے سینک، مدافعت کے ہاں میں حیوانات کے احوال بہت زیادہ مختلف ہیں، بعض حیوانات کے دشمن زیادہ ہوتے ہیں، اور ان کی غذا بھی دور ہوتی ہے، اس لئے وہ دشمن سے بچنے، اور کم سے کم وقت کے اندر غذا تک پہنچنے میں سرعت حرکت کے محتاج ہیں، انھیں پر حطائے گئے تاکہ وہ جبری کے ساتھ اڑ سکیں، بعض حیوانات کی چار ٹانگیں ہیں بعض کی دو ہیں، بعض زمین پر چلتے ہیں۔ اس اختلاف کا ذکر تفصیل طلب ہے اس لئے ہم صرف ان اعضاء کا ذکر کرتے ہیں جن سے کھانے کا عمل پورا ہوتا ہے تاکہ اس پر دوسرے اعضاء کو قیاس کیا جاسکے۔

کھانے کے عمل میں اعضاء کا حصہ : تم دور سے کھانا دیکھتے ہو، اور اس کی طرف حرکت کرتے ہو، لیکن صرف حرکت ہی

کافی نہیں ہے بلکہ اسے لینا، اور پکڑنا بھی ضروری ہے، اسکے لئے ایک ایسے آلے کی ضرورت ہے جس کے ذریعے تم پکڑ سکو، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں وہ ہاتھ عطا کئے ہیں، یہ دونوں ہاتھ لیے ہیں، اور ہر طرف پھیلے ہیں، ان میں متحدہ جوڑ ہیں تاکہ تم انھیں سہولت کے ساتھ چاروں طرف حرکت دے سکو، ہر چاہے پھیلا سکو، موڑ سکو، سیدھی کٹائی کی طرح نہیں بنائے جس میں مڑنے پھیلنے، سکڑنے اور سینٹنے کی صلاحیت نہیں ہوتی، پھر ہاتھ کا اگلا سرا جوڑا بنایا، یعنی پھیلی پیدا کی، پھیلی کو پانچ حصوں یعنی انگلیوں پر تقسیم کیا، اور انگلیوں کی دو صفیں بنائیں، انگوٹھے کو ایک جانب رکھا تاکہ باقی چاروں انگلیوں پر محکم سکے، اگر یہ پانچوں انگلیاں ایک جانب میں ہوتیں یا ایک دوسرے سے جڑی ہوئی ہوتیں تو مطلب پورا نہ ہوتا، یہ انگلیاں ایسی بنائیں کہ اگر انھیں پھیلا لیا جائے تو پیلے بن جائے، سمیٹ لیا جائے تو چھ کی شکل اختیار کر جائے، اگر انھیں اندر کی طرف موڑ لیا جائے تو مارنے کا آلہ یعنی گھونسا بن جائے، کسی چیز پر پھیلا کر بند کیا جائے تو پکڑنے کا آلہ بن جائے، ان انگلیوں میں ناخن پیدا کئے، اور انھیں سروں پر بنایا، تاکہ انگلیاں ٹوٹنے نہ پائیں، اور جو باریک چیزیں انگلیوں سے نہ اٹھیں وہ ناخنوں کے ذریعے پکڑے جاسکیں۔

اگر تم نے ہاتھوں میں غذا اٹھالی تو اب مسئلہ اسے معدے میں پہنچانے کا ہے، معدہ جسم کے اندر ہے، اس تک پہنچنے کا کوئی نہ کوئی راستہ ہونا ضروری ہے، کیونکہ غذا براہ راست معدے میں نہیں پہنچائی جاسکتی، اس لئے منہ پیدا کیا، جس کے ذریعے غذا معدے کے اندر تک پہنچتی ہے، منہ سے صرف یہی ایک فائدہ نہیں کہ وہ معدے میں کھانا پہنچنے کا ذریعہ بننا ہے، بلکہ اسکے علاوہ بھی بے شمار فائدے ہیں، پھر منہ میں غذا رکھ لینا ہی کافی نہیں ہے، اس طرح تم کھانا نہیں گل سکتے، بلکہ ایک ایسی چٹکی کی بھی ضرورت ہے جس سے یہ کھانا پس سکے، اور باریک ہو کر معدے میں پہنچ سکے، اسکے لئے دہریوں کے دو جڑے بنائے، ان میں دانت پیدا کئے، اوپر نیچے ڈاڑھیں بنائیں، انھیں ایک دوسرے کے اوپر اور برابر رکھا، بعض غذا میں ٹوڑنے کی محتاج ہوتی ہیں، بعض کاٹی جاتی ہیں، اسکے بعد پسے کا نمبر آتا ہے، اس لئے تین طرح کے دانت بنائے گئے، تاکہ یہ تینوں مقاصد حاصل کئے جاسکیں، ڈاڑھیں بنائیں جو غذا کو دھتی ہیں، آگے کے دانت بنائے جو چیز ہوتے ہیں اور غذا کو کاٹنے ہیں، پگھلیاں بنائیں جن سے غذا کو توڑا جاسکے اور جدا کیا جاسکے، پھر جڑے پیلے بنائے تاکہ نیچے کا جڑا اوپر نیچے ہو سکے، اور اوپر کی جڑے پر اس طرح محکم سکے جس طرح چٹکی گردش کرتی ہے، اگر ایسا نہ ہوتا تو دونوں جڑے ایک دوسرے پر ٹکرا کر رہ جاتے، اور دونوں کے ٹکراؤ سے ایسی آواز نکلتی جیسے تالی بجتی ہے، اس سے دانتوں کی تخلیق کا مقصد پورا نہ ہوتا، یہ بھی اللہ تعالیٰ کی عجیب و غریب صنعت ہے کہ اسے اوپر کے جڑے کو گھونسنے والی حرکت بخشی، اور نیچے کے جڑے کو پرسکون اور اپنی جگہ بجا رہنے والا بنایا، ذرا ملاحظہ کیجئے، اس صنعت کا حیرت انگیز پہلو دنیا کی تمام چٹکیوں میں اوپر کا پاٹ گھومتا ہے، اور نیچے کا اپنی جگہ برقرار رہتا ہے، صرف یہ چٹکی ایسی ہے جس میں نیچے کا پاٹ گردش کرتا ہے اور اوپر کا پاٹ اپنی جگہ برقرار رہتا ہے، یہ اللہ کی قدرت و عظمت اور جلالت کی ایک روشن دلیل ہے۔

اب یہ فرض کر لیا جائے کہ تم نے کھانا منہ میں رکھ لیا ہے، اور دانت اپنے اپنے فرض کی ادائیگی کے لئے مستعد ہیں لیکن اب یہ دشواری درپیش ہے کہ کھانے کو دانتوں کے نیچے کیسے لایا جائے، دانتوں میں یہ طاقت نہیں کہ وہ کھانے کو کھینچ سکیں، یا ادھر ادھر کر سکیں، اسی طرح یہ بھی مشکل ہے کہ بار بار انگلی منہ میں ڈالی جائے اور کھانے کو ادھر سے ادھر منتقل کیا جائے، اس دشواری کو اللہ تعالیٰ نے زبان کی تخلیق سے حل فرمایا کہ یہ منہ کے طرف گھومتی ہے، کھانے کو حسب ضرورت درمیان سے دانتوں کے نیچے لاتی ہے، جیسے چمچ یا مٹھی سے تھوڑا تھوڑا گیہوں یا چٹائی میں ڈالتے ہیں، یہ زبان کا ایک فائدہ ہے، اسکے علاوہ بھی بے شمار فائدے ہیں، مثلاً کھانے کو بولنے، رموز حکمت آشکار کرنے، بلاغت و فصاحت کے گہر لٹانے کی قوت زبان کے وہ فائدے ہیں جو یہاں زیر بحث نہیں ہیں۔

فرض کرو تم نے کھانا منہ میں رکھ لیا ہے، اسے توڑ بھی لیا ہے، اور پس بھی لیا ہے، لیکن کھانا خشک ہے، تم اسے وقت تک نگھنے پر قادر نہیں ہو جب تک اس میں کوئی ایسی رطوبت شامل نہ ہو جائے جس سے غذا پھسل کر حلق کے اندر چلی جائے، اسکے لئے اللہ تعالیٰ

نے زبان کے نیچے ایک چشمہ رکھا ہے جس میں لعاب بتا رہتا ہے اور بقدر ضرورت زبان پر آکر کھانے میں ملتا ہے اور کھانا اس میں آمیز ہو کر تر ہو جاتا ہے زبان کتنی بڑی نعمت ہے تمہاری خدمت کے لئے ہر وقت مستعد ہمہ وقت کمر بستہ ابھی تم نے کھانے پر نظری ڈالی ہے کہ یہ پھاری تمہاری خدمت کے لئے پر تولی لگتی ہے اور لعاب کے چشمے کا منہ کھول دیتی ہے بعض اوقات اس لعاب سے تمہاری ہاتھیں تر ہو جاتی ہیں حالانکہ کھانا تم سے بہت دور ہوتا ہے پھر اگر کھانا لعاب میں گوندھ لیا جائے تب بھی ذہ از خود حلق سے نیچے نہیں اتر سکتا ہاتھ سے نیچے اتارنا مشکل ہے پیٹ کے اندر بھی کوئی ہاتھ نہیں کہ وہ منہ میں آکر کھانے کا ٹوٹا لے نیچے لے جائے اس لئے اللہ تعالیٰ نے زخیرہ پیدا کیا اور اسکے اوپر کئی درجے بنائے جو غذا کو اپنے کے لئے کھل جاتے ہیں اور جب غذا اندر چلی جاتی ہے تو بند ہو جاتے ہیں اور غذا کو اس قدر پیچھے ہیں کہ وہ پس کر نیچے چلی جاتی ہے غذا کا معدہ میں پہنچنا ہی کافی ہے بلکہ غذا کے لئے ضروری ہے کہ وہ معدہ میں پہنچ کر جزو بدن بنے یعنی خون اور گوشت وغیرہ تیار ہو فرض کرو کہ تم نے دعویٰ اور میوے کے ٹکڑے کھائے ہیں اور یہ چیزیں پس کر معدہ میں پہنچ چکی ہیں معدہ دراصل انہیں گوشت اور خون میں تبدیل کرنے کا ایک کارخانہ ہے معدے کی مثال ہانڈی کی سی ہے جس میں مختلف قسم کی چیزیں ڈالی جاتی ہیں اور اس کا منہ بند کر کے چولہے پر رکھ دیا جاتا ہے آگ پر رکھنے کے بعد وہ مختلف اجزاء اس طرح ایک دوسرے میں آمیز ہو جاتے ہیں کہ کوئی فرق باقی نہیں رہتا معدہ بھی ایک ہانڈی کی طرح ہے اس کے دائیں جانب جگر بائیں جانب تلی ہے آگے کی طرف جہزی اور پیچھے کی سمت پشت ہے چاروں طرف کے اعضاء کی حرارت معدے کو پہنچتی ہے اس حرارت سے وہ مختلف غذاؤں جو معدے میں پہنچتی ہیں اچھی طرح پک جاتی ہیں اور سیال مادہ بن جاتی ہیں تاکہ وہ معدے سے نکل کر رگوں میں گردش کر سکیں ابھی ان میں یہ صلاحیت پیدا نہیں ہوئی کہ جزو بدن بن سکیں اللہ تعالیٰ نے معدے سے جگر تک کے راستے میں رگوں کے متحدہ راستے بنائے ہیں اور ان میں منہ رکھے ہیں ان لوگوں کے ذریعے وہ غذا اچھی سیال جگر میں منتقل ہو جاتا ہے جگر کا غیر خون سے بنایا جاتا ہے بلکہ یہ کتنا زیادہ صحیح ہے کہ یہ جمہا ہوا خون ہے اس میں بے شمار ہار یک رگیں ہیں جو پورے جگر میں پھیلی ہوئی ہیں یہ سیال غذا ان رگوں میں پہنچتی ہے اور پورے جگر میں پھیل جاتی ہے یہاں تک کہ جگر اس غذا پر حاوی ہو جاتا ہے اور اسے بھی اپنے رنگ میں رنگ لیتا ہے یعنی خون بناتا ہے یہ غذا خون بن کر کچھ وقفے کے لئے جگر میں ٹھہرتی ہے یہاں اسے لُج (پکنے اور پختہ ہونے) کے ایک اور عمل سے گزرنا پڑتا ہے اس عمل کے نتیجے میں دو فاضل مادے پیدا ہوتے ہیں جیسا کہ عام طور پر ہر سیال چیز کو پکانے میں کچھ نہ کچھ فاضل مادہ پیدا ہوا کرتا ہے ایک مادہ ایسا ہوتا ہے جیسے گدلا پانی اسے سوداوی کہتے ہیں اور ایک جھاگ جیسا ہوتا ہے اسے صفراوی مادہ کہا جاتا ہے اگر یہ دونوں مادے خون سے جدا نہ ہوں تو اعضاء کا راجح فاسد ہو جائے اس لئے اللہ تعالیٰ نے نکل اور پتہ لگائے ہیں ان دونوں کی گہرائی ایسی بنائی کہ جگر کے اندر کسی بھی چیز یا پتھر وغیرہ کے لئے نہ تو ایسی سڑاوی مادہ جذب کر لیتی ہے نہ اس عمل کے نتیجے میں صحت خطر خون باقی و جاتا ہے جس میں رقت اور رطوبت پہلے کی نسبت کچھ زیادہ ہی ہوتی ہے کیونکہ فاسد اجزاء کے اخراج کے بعد مائی اجزاء باقی رہ گئے ہیں اگر خون پتلانہ ہو تو جسم میں پھیلی ہوئی پتلی رگوں میں گردش نہ کرے اور نہ اعضاء میں منتقل ہو سکے خون کا زیادہ رقیق ہونا بھی جسم کے مصالح کے خلاف ہے اسکے لئے اللہ تعالیٰ نے دو گروے پیدا فرمائے ہیں اور ان دونوں گرووں کو بھی تلی اور پتے کی طرح دو طویل رگیں دی ہیں جو جگر تک متصل ہیں یہ بھی اللہ کی صنعت و حکمت کا ایک عجوبہ ہے کہ یہ دونوں رگیں جگر کے اندر تک نہیں پہنچیں بلکہ ان رگوں سے متصل ہیں جو جگر کے اوپر نکلتی رہتی ہیں یہ گروے خون کی رطوبت اس وقت جذب کرتے ہیں جب خون جگر کی پتلی رگوں سے نکل آتا ہے اگر اس سے پہلے جذب کریں تو خون کا زہا ہو جائے گا اور رگوں سے نکل نہیں پائے گا۔ رطوبت کے جذب ہونے کے ساتھ ساتھ خون سے تینوں فاسد اور زائد مادے نکل جاتے ہیں اور خون خالص باقی رہ جاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے جگر میں سے بے شمار رگیں باہر نکالی ہیں پھر ہر رگ کو بہت سی رگوں پر تقسیم کیا ہے اور ان رگوں کا جال سر سے پاؤں تک تمام اعضاء بدن میں پھیلا دیا ہے جگر سے صاف خون ان رگوں میں منتقل ہوتا ہے اور ان رگوں سے ذیلی رگوں کے ذریعے

جسم کے تمام اعضاء میں چلا جاتا ہے۔ بعض ذیلی رگیں اتنی پتلی ہوتی ہیں کہ آنکھوں سے نظر نہیں آتیں، جس طرح درخت کی شنی میں رگیں نظر آتی ہیں، اور جب وہ شنی تباہ بن جاتی ہے تو رگیں ٹکڑوں سے اور جھل ہو جاتی ہیں، بالکل معدوم نہیں ہوتیں، بلکہ پانی کے جذب و کشش کا عمل جاری رکھتی ہیں، اسی سے درخت کی سرسبزی و شادابی قائم رہتی ہے یہی حال جسم کی رگوں کا ہے، اگر یہ اپنا عمل بند کر دیں تو جسم کی آب و تاب ختم ہو جائے۔

اگرچہ ہر کوئی آفت نازل ہوتی ہے تو وہ اپنا عمل ترک کر دیتا ہے، یعنی صفراوی مادہ جذب نہیں کرتا، اس سے خون فاسد ہو جاتا ہے اور جسم میں صفراوی امراض پیدا ہو جاتے ہیں جیسے برقان، پھنسیاں، اور سرخ والے وغیرہ، اور تلی متاثر ہوتی ہے تو سوداوی امراض پیدا ہوتے ہیں جیسے برص، ہڈام اور مالعیولیا، مگر وہ متاثر ہوتا ہے تو خون کی زائد رطوبت جذب نہیں ہوتی اور استقامت وغیرہ پیدا ہو جاتے ہیں۔

حکیم کامل اور مبرا عظیم کی صنعت کے عجائب دیکھو، اس نے ان تینوں فاضل مادوں میں بھی جسمانی فوائد مضمر کر دیے، پتا اپنی ایک رگ سے جگر کا صفراوی مادہ نکلتا ہے، اور دوسری رگ سے وہ مادہ آنتوں میں ڈال دیتا ہے تاکہ آنتوں میں چکناٹا پیدا ہو جائے، اور غذا کی آمد رفت سہولت سے چلتی رہے، اور آنتوں میں ایسی غلٹ پیدا ہو جائے جس سے بیعت قضاے حاجت کا تقاضا کرے، اور چکناٹ کی وجہ سے قضاے حاجت کے وقت ضد جلد نکلے، انسانی فضلے میں زردی کی وجہ یہی صفراوی مادہ ہے۔ تلی کے ذریعے جو فاضل مادہ جگر سے نکلتا ہے اس میں تلی کے اثرات سے ترشی اور جھاڑ پیدا ہو جاتا ہے، پھر اس میں ہر روزیہ اجزاء ضرورت کے بقدر نرم معده تک پہنچتے ہیں، اور بھوک کی خواہش پیدا کرتے ہیں، اور باقی اجزاء پاخانے کے ساتھ باہر آ جاتے ہیں، گروے جو رطوبت جگر سے حاصل کرتے ہیں، اس کا صرف وہ حصہ جذب کرتے ہیں جو خون ہوتا ہے، اور باقی حصوں کو مٹانے کی طرف منتقل کر دیتے ہیں۔

اگرچہ ہم غذا کے اسباب بہت کچھ لکھ چکے ہیں، لیکن اسکے باوجود یہ موضوع نقشہ ہے، اس سلسلے میں ابھی بہت کچھ کہنے کی محفالتیں ہیں، اور بہت سے ایسے سوالات ہیں جن کے اجمالی جوابات بھی دئے جائیں تو صفحے سیاہ ہو جائیں، اور بات ادھوری رہے، مثلاً جگر کو دل و دماغ کی ضرورت ہے، اور پھر ان تینوں اعضاء نے ریشہ میں سے ہر ایک کو دوسرے کی ضرورت ہے، دل سے بے شمار رگیں نکلتی ہیں، اور ہر حصہ بدن میں پہنچتی ہیں، ان کے ذریعے اعضاء میں احساس پیدا ہوتا ہے جگر سے بھی متعدد رگیں نکلتی ہیں، ان کے ذریعے تمام جسم میں غذا منتقل ہوتی ہے، پھر اعضاء بننے میں ہڈیاں، پٹھے، رگیں، اور تار اور رباط تیار ہوتے ہیں، پھر ہڈیوں میں نرم چمک دار اور سخت ہڈیاں پیدا ہوتی ہیں، ان میں سے ہر عضو، ہر حصہ بدن کی غذا کے سلسلے میں ضرورت پڑتی ہے۔ اگر ہم ان تمام امور کو اپنی بحث کا موضوع بنالیں تو بات طویل سے طویل تر ہو جائے، پھر یہ اعضاء غذا کے علاوہ بھی دوسرے مقاصد میں کام آتے ہیں، یہی نہیں بلکہ انسان کے جسم کا کوئی بوے سے بڑا اور چھوٹے سے چھوٹا حصہ ایسا نہیں ہے جس میں ایک، دو، تین، چار بلکہ دس اور اس سے زیادہ حکمتیں نہ ہوں، ان میں سے ہر حکمت اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے۔ انسانی نظام جسم کی وقت اور نزاکت کا حال یہ ہے کہ اگر اس کی ایک متحرک رگ ساکن، اور ایک ساکن رگ متحرک ہو جائے تو یہ پورا کارخانہ ٹھیک ہو جائے، اس لئے پہلے تم ان نعمتوں پر نظر ڈالو جو چاروں طرف سے تم پر برس رہی ہیں تاکہ تم اس منعم حقیقی کے شکر پر قادر ہو سکو۔

اللہ تعالیٰ کی بے شمار نعمتیں ہیں، مگر تم صرف ایک نعمت یعنی کھانے سے واقف ہو، حالانکہ یہ ایک ادنیٰ نعمت ہے، اور اس نعمت سے بھی تم صرف اس قدر واقف ہو کہ بھوک لگتی ہے کھا لیتے ہو، اس کے علاوہ تم کسی چیز سے واقف نہیں، اتنی بات تو ایک گدھا بھی جانتا ہے، جب اسے بھوک لگتی ہے کھا لیتا ہے، بوجھ اٹھاتا ہے اور تھک کر سو جاتا ہے، شہوت ہوتی ہے تو جماع کر لیتا ہے، اور دو لتیاں جھاڑتا پھرتا ہے، جب تم اپنے نفس کے بارے میں صرف اس قدر جانتے ہو جتنا ایک گدھا جانتا ہے، پھر تم اسکا شکر کیسے ادا کر سکتے ہو؟

اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے متعلق ہم نے جو کچھ عرض کیا ہے، انتہائی اجماز و اختصار کے ساتھ کیا ہے، بلکہ اگر یہ کہا جائے تو بہتر ہوگا

کہ ہماری گفتگو مجمل اشارہ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی، اللہ تعالیٰ کی بے پایاں نعمتوں کے وسیع تر سمندر کا صرف ایک قطبہ ہم نے تمہیں دکھلایا ہے اسی قطرے پر پورے سمندر کو قیاس کر لینا چاہیے جس قدر نعمتیں ہم نے بیان کی ہیں یا لوگ جانتے ہیں، اگر انہیں ان نعمتوں کے مقابلے میں رکھ کر دیکھا جائے جو بیان نہیں کیں یا جنہیں لوگ نہیں جانتے تو بحرِ غار کے ایک معمولی قطرے سے بھی کم نظر آئیں گی، تاہم لوگ اس قطرے سے واقف ہیں، وہ اس سمندر کی وسعت اور گہرائی کا کچھ اندازہ کر لیتے ہیں، اور اس آیت کے کچھ حقائق سمجھ لیتے ہیں۔

وَأِنْ تَعْلُوا نِعْمَةً مِّنَ اللَّهِ لَا تَحْصُوهَا (پ ۸۷۳ آیت ۱۸)
اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کو گننے لگو تو گن نہ سکو۔

روح ایک عظیم تر نعمت : پھر یہ دیکھو کہ اللہ تعالیٰ نے ان اعضاء کا ان کے منافع، اور اک اور قوت کا اور ایک ایسے لطیف بخار پر رکھا ہے، جو اخلاط اربعہ سے نکلتا ہے، اس کا مستقر قلب ہے، یہ بخار قلب کی رگوں کے ذریعے تمام بدن میں پھیلتا ہے، جیسے ہی بدن کے اجزاء میں سے کسی جزو میں یہ بخار پہنچتا ہے، اس میں حس و ادراک اور حرکت و قوت پیدا ہو جاتی ہے، جیسے چراغ کو اگر پورے گھر میں پھرایا جائے تو جہاں جہاں یہ چراغ پہنچے گا وہاں وہاں روشنی پہنچ جائے گی، گویا گھر کے کسی گوشے میں چراغ کا پہنچنا اس میں روشنی پھیلنے کا باعث ہو گا، اگرچہ یہ روشنی اللہ کی تخلیق اور اسکی اختراع ہے، لیکن اس نے اپنی حکمت سے چراغ کو روشنی کا سبب بنا دیا ہے، یہ لطیف بخار اطباء کی اصطلاح میں روح کہلاتا ہے، اس کا محل قلب ہے، چراغ کے ساتھ اسکی تمثیل اس طرح ہے کہ روح کو چراغ کی لو سے تشبیہ دی جائے، اور قلب کو عرف کہا جائے جس طرح چراغ ہو تا ہے، دل کے اندر جو سیاہ خون ہو تا ہے، وہ جی کی مانند ہے، اور غذا اسکے لیے ایسی ہے جیسے چراغ کے لئے تیل، اور اس کے باعث تمام بدن میں پائی جانے والی حیات ایسی ہے جیسے چراغ کی وجہ سے مکان کے اندر کی روشنی، جس طرح تیل ختم ہو جانے کی وجہ سے چراغ بجھ جاتا ہے، اسی طرح روح کا چراغ اس وقت بجھ جاتا ہے جب اس کی غذا کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے، نیز جس طرح کبھی کبھی جی جل جاتی ہے، اور راکھ بن جاتی ہے، یعنی اس میں تیل مذب کرنے کی صلاحیت باقی نہیں رہتی حالانکہ چراغ تیل سے لبریز ہو تا ہے، اس طرح وہ خون بھی جو دل میں ہے دل کی حرارت کی شدت سے جل جاتا ہے، اور غذا کے باوجود روح کا چراغ بجھ جاتا ہے، کیونکہ اس میں قبول کی غذا کی استعداد ہی ہوتی نہیں رہتی کہ اس سے روح کا وجود برقرار ہے جیسے راکھ میں تیل اس طرح مذب نہیں ہو تا کہ اس میں آگ قبول کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے پھر جس طرح چراغ کبھی داخلی سبب (مثلاً تیل نہ رہنے یا جی جل جانے) کے باعث بجھ جاتا ہے، اسی طرح خارجی سبب سے بھی بجھ جاتا ہے، مثلاً ہوا سے، اسی طرح روح کبھی اپنے داخلی سبب سے فنا ہو جاتی ہے، اور کبھی خارجی سبب یعنی قتل کرنے سے معدوم ہو جاتی ہے۔ چراغ چاہے تیل ختم ہونے سے بجھے یا جی جلنے سے، یا کسی انسان کے پھونک مارنے سے یا ہوا کی زوئیں آجانے سے، کسی بھی طرح بجھے اللہ کے حکم سے بجھتا ہے، اور یہ تمام امور تقدیر الہی کے مطابق عمل میں آتے ہیں، اسی طرح انسانی روح کا معاملہ بھی ہے، یہ کسی بھی طرح فنا ہو، کسی بھی سبب سے معدوم ہو، اللہ کے علم میں ہے، اسکی تقدیر ازلی کے بموجب ہے، ام الکتاب میں ہر روح کی انتہائی مدت مقرر ہو چکی ہے، جب یہ مدت پوری ہوگی روح کا رشتہ جسم سے منقطع ہو جائے گا، اور یہ انقطاع اسی صورت میں ہو گا جس طرح کاتب ازل نے لکھ دیا ہے۔

جس طرح چراغ بجھ جائے تو مکان تاریک ہو جاتا ہے، اسی طرح روح نکل جائے تو تمام بدن میں تاریکی پھیل جاتی ہے اور ان انوار کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے جو روح سے حاصل کئے جا رہے تھے، یعنی احساس، ادراک، ارادے، اور ان تمام امور کے الوارجن کو لفظ حیات شامل ہے، روح بھی ایک رمز ہے، اللہ کی نعمتوں کی طرف ایک طبع اشارہ ہے، اور اس مضمون کی صداقت کا اعلان

ہے ۔

لَوْ كَانَ الْبَحْرُ مِثْلًا لِّكَلِمَاتِ رَبِّي لَنَفَذَ الْبَحْرُ قَبْلَ أَنْ تَنْفَذَ كَلِمَاتِ رَبِّي (پ ۸۷۴ آیت ۳)

(آیت ۱۸۹)

اگر میرے رب کی باتیں لکھنے کے لئے سمندر (کا پانی) دوشٹائی ہو تو میرے رب کی باتیں ختم ہونے سے پہلے سمندر ختم ہو جائے۔

جو شخص یہ تمام باتیں جاننے کے باوجود اسکی نعمتوں کا منکر ہو، اور شکر ادا نہ کرے وہ کس قدر بد قسمت ہے، اللہ تعالیٰ کی رحمت سے کس قدر دور ہے اور اسکے عذاب سے کتنا قریب ہے۔

روح کی مثال پر اعتراض : یہاں ہماری اس مثال پر اعتراض کیا جاسکتا ہے، ہم نے روح کو چراغ سے تشبیہ دی ہے، بعض لوگ اسے ہماری جسارت سمجھا کہہ سکتے ہیں، کیونکہ جب سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے روح کے متعلق سوال کیا گیا تو آپؐ ارشاد فرمایا *الروح من امر ربی* ”آپ نے روح کی یہ صفت بیان نہیں فرمائی جو ہم نے بیان کی ہے“ اسکا جواب یہ ہے کہ اس طرح کے اعتراضات اس وقت پیدا ہوتے ہیں جب کسی لفظ کے مشترک معانی پر توجہ دی جاتی۔ روح ایک ایسا لفظ ہے جو بہت سے معنوں کے لئے استعمال کیا جاتا ہے، یہاں ان تمام معانی کا ذکر طوالت کا باعث ہے ہم نے روح کو ایک جسم لطیف کہا ہے، اسے اطباء روح کہتے ہیں، انہوں نے اس کی صفت، اسکا وجود اعضاء میں اسکے جاری ہونے کی کیفیت، اور اسکے ذریعے اعضاء اور قویٰ میں حاصل ہونے والے احساس کی معرفت حاصل کی ہے، یہاں تک کہ اگر کوئی عضو من ہو جاتا ہے تو وہ یہ کہتے ہیں کہ روح کے جاری ہونے کی جگہ کوئی سدّہ پڑ گیا ہے، اس لئے وہ سن ہو جانے والے عضو کا علاج نہیں کرتے بلکہ ان کی جگہوں پر توجہ دیتے ہیں، جہاں سے اعضاء جنم لیتے ہیں، اور جہاں سدّہ واقع ہوئے ہیں، اور وہ دوائیں تجویز کرتے ہیں، جن سے سدّے کھل جائیں یہ روح اپنی لطافت کی بنا پر پھول کے جال سے گزرتی ہے، اور پھول کے ذریعے دل سے گزر کر تمام جسم میں پھیلتی ہے، اطباء نے روح کے جو معنی بیان کئے ہیں وہ اتنے پیچیدہ نہیں کہ سمجھ میں نہ آئیں، لیکن جہاں تک اس اصل روح کا سوال ہے جس کے فساد سے تمام بدن فاسد ہو جاتا ہے، وہ اللہ تعالیٰ کے اسرار میں سے ایک سر ہے، جس کی صفت بیان کرنا ہمارے لئے ممکن نہیں ہے، اور نہ ہمیں اس کی اجازت ہے، اس روح کے متعلق اگر کوئی سوال کیا جائے تو یہی کہا جائے گا کہ یہ ایک امر ربانی ہے، اور عقلیں ان امور کا ادراک نہیں کر سکتیں، بلکہ عام طور پر لوگ اس معاملے میں حیران رہ جاتے ہیں، اوہام اور خیالات تو اس کی حقیقت تک پہنچنے سے بہر صورت قاصر نظر آتے ہیں جیسے آنکھ آواز کا ادراک کرنے سے قاصر رہتی ہے، عقلیں جو ہر عرض کی قید میں گرفتار ہیں وہ ان امور کے اوصاف کا تحمل نہیں کر سکتیں، اس ادراک کے لئے ایک اور نور کی ضرورت ہے، جو عقل سے اعلا اور اشرف ہے، یہ نور صرف عالم نبوت اور عالم ولایت کے ساتھ مخصوص ہے، عقل کے ساتھ اس نور کی نسبت ایسی ہے جیسے وہم و خیال کے ساتھ عقل کی نسبت، اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو یکساں پیدا نہیں کیا، جس طرح ایک بچہ صرف محسوسات کا ادراک کر سکتا ہے، معقولات کا ادراک نہیں کر سکتا، اس لئے کہ ابھی وہ اس عقل پر نہیں پہنچا جہاں معقولات سے آگے کی چیزوں کا ادراک کر سکے، ماوراء معقولات کا ادراک کرنا ایک اعلا عقل، اور اشرف مرتبہ ہے، یہاں سے آدمی اپنے ایمان و یقین کے نور سے بارگاہ حق کا ادراک کر لیتا ہے، یہ مرتبہ اتنا بلند ہے کہ ہر کسی کو حاصل نہیں ہوتا، بلکہ ایک کے بعد دوسرا حاصل کرتا ہے، اس بارگاہ حق کا ایک صدر مقام ہے، اور اسکے اوپر ایک نہایت وسیع و عریض میدان ہے اور اس میدان کے آغاز میں ایک دیوانہ ہے جس پر ایک پاسان متعین ہے، یہ پاسان امر ربانی ہے، اور جو شخص اس دیوانے تک نہ پہنچے، یا اسکے پاسان کا دیدار نہ کرے وہ میدان تک کیسے پہنچ سکے گا، اور ان مشاہدات سے بہرہ اندوز کیسے ہو گا جو اس میدان میں قدم رکھنے کے بعد ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ اسی لئے اکابرِ علماء ارشاد فرماتے ہیں کہ جس نے اپنے نفس کو نہیں پہچانا اس فہدوب کو نہیں پہچانا۔ یہ امور جو ہم نے بیان کئے ہیں اطباء کے موضوع سے خارج ہیں اسی لئے ان کی کتابوں میں ان کا ذکر نہیں ملتا۔ اطباء جس معنی کو روح کہتے ہیں امر ربانی کے مقابلے میں اس کی حقیقت اس گیند سے زیادہ نہیں جسے بادشاہ اپنے بلے سے حرکت دے، اور دیکھنے والا گیند دیکھ کر یہ کہے کہ میں نے بادشاہ کو دیکھ لیا ہے، ظاہر ہے اسکا یہ کہنا خطا و ہم اور خام خیالی ہے بلکہ طبی روح کو وہ روح سمجھنا

جسے امر ربانی کہتے ہیں، محض خطا ہے۔ کیونکہ وہ انسانی عقلیں جن کے باعث اوامر ربانی صادر ہوتے ہیں اور جن سے دنیاوی مصالح معلوم ہوتے ہیں ان امور ربانیہ کے حقائق کا ادراک کرنے سے قاصر ہیں، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو مدح کی حقیقت بتلانے کی اجازت نہیں دی، بلکہ آپ کو یہ حکم دیا کہ لوگوں سے ان کی عقلوں کے مطابق گفتگو کریں، اللہ تعالیٰ نے بھی اپنی کتاب میں اسکی حقیقت بیان نہیں فرمائی بلکہ اس کی نسبت اور فعل کا تذکرہ فرمایا، اس کی ذات یا وصف بیان نہیں فرمایا، نسبت ان الفاظ میں بیان فرمائی :-

قُلِ الزُّرُوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي (پ ۱۵، آیت ۸۵)
آپ کہہ دیجئے کہ مدح میری رب کے حکم سے ہے۔

اور فعل کا ذکر ان الفاظ میں فرمایا۔

يَا أَيُّهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً فَادْخُلِي فِي عِبَادِي
وَادْخُلِي جَنَّاتِي (پ ۳۰، آیت ۳۰)

اے اطمینان والی مدح تو اپنے پروردگار کی طرف چل اس طرح کہ تو اس سے خوش اور وہ تجھ سے خوش،

پھر تو میرے بندوں میں شامل ہو جا۔ اور میری جنت میں داخل ہو جا۔

اب ہم پھر اپنے مقصود کی طرف واپس چلتے ہیں، ہم کھانے کے متعلق اللہ تعالیٰ کی نصیحتیں بیان کر رہے تھے، اور گفتگو کھانے کے آلات کی چل رہی تھی۔

وہ اصولی نعمتیں جن سے غذا حاصل ہوتی ہے۔

جاننا چاہیے کہ غذائیں بے شمار ہیں، اور ان کی تخلیق میں اللہ تعالیٰ کے عجائبات شمار ہے، باہر ہیں، پھر ہر غذا کے اسباب کا سلسلہ بھی لامتناہی ہے، ان تمام عجائبات اور اسباب کا ذکر طوالت کا باعث ہے، اس لئے ہم اختصار کے ساتھ کچھ بیان کرتے ہیں۔

کھانے کی تین قسمیں : کھانے کی تین قسمیں ہیں، دوائیں، میوے، غذاائیں، ہم ان تینوں میں سے صرف غذا کا ذکر کرتے ہیں، یہی اصل بھی ہے، اور غذائیں بھی گیہوں کو لے لیتے ہیں، طوالت کے خوف سے باقی تمام غذاائیں نظر انداز کرتے ہیں۔ اب ہم کہتے ہیں کہ اگر ہمیں گیہوں کا ایک دانہ یا چند دانے مل جائیں اور تم انہیں کھاؤ تو آجھ کے لئے کچھ باقی نہ بچے گا، اور چند دانوں سے پیٹ بھی نہ بھر پائے گا، اس لئے ضرورت پیش آئی کہ گیہوں کے دانوں میں بڑھنے اور نمو پانے کی صلاحیت ہو، تاکہ وہ ہماری تمام ضرورت پوری کر سکیں، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے گیہوں کے دانے میں بھی غذا حاصل کرنے کی قوت پیدا کی ہے، جس طرح ہمارے اندر پیدا کی ہے۔ تم میں اور نباتات میں صرف حس اور حرکت کا فرق ہے، جہاں تک غذا حاصل کرنے کا سوال ہے اس میں تم اور نبات دونوں مشترک ہو، نبات پانی سے غذا حاصل کرتی ہے، اور انہی رگوں اور جڑوں کے ذریعے پانی اپنے باطن میں جذب کرتی، جس طرح تم غذا حاصل کرتے ہو، اور رگوں کے ذریعے جسم میں جذب کر لیتے ہو، ہم ان آلات کا ذکر کر کے کلام کو طول نہیں دینا چاہتے جن کے ذریعے نبات پانی جذب کرتی ہے، مگر اسکی غذا ضرور بیان کرتے ہیں۔

ہر چیز کی غذا مخصوص ہے : جس طرح تم مٹی اور گھڑی سے غذا حاصل نہیں کر سکتے اور اس سے پیٹ نہیں بھر سکتے بلکہ ایک مخصوص کھانے کے محتاج رہتے ہو اسی طرح گیہوں کا دانہ بھی ہر چیز سے غذا حاصل نہیں کر سکتا، بلکہ ایک مخصوص چیز کا قیام ہے، اسکی دلیل یہ ہے کہ اگر تم گھر میں کہیں ایک دانہ رکھ دو تو وہ بڑھے گا نہیں کیونکہ وہاں اسے صرف ہوا گھیرے رہتی ہے، اور صرف ہوا اس کے لئے غذا بننے کی صلاحیت نہیں رکھتی، اسی طرح اگر تم پانی میں ڈال دو گے تب بھی نہیں بڑھے گا، بلکہ اگر کسی زمین میں چھوڑ دو گے جہاں پانی نہیں ہوتا تب بھی نہیں بڑھے گا، بلکہ اسکی نمو اور بڑھوتری کے لئے ایسی زمین کا ہونا ضروری ہے جس میں پانی ہو، اور وہ

پانی مٹی میں مل گیا ہو، قرآن کریم نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔
 فَلْيَنْظُرِ الْإِنْسَانُ إِلَى طَعَامِهِ أَنَا صَبَبْنَا الْمَاءَ صَبَابًا ثُمَّ شَقَقْنَا الْأَرْضَ شَقَاقًا فَنَبْتُنَا
 فِيهَا حَبًّا وَعُشْبًا وَقَضْبًا وَزَيْتُونًا (پ ۳۰ ۵ آیت ۲۹)

سو انسان کو چاہیے کہ اپنے کھانے کی طرف نظر کرے کہ ہم نے عجیب طور پر پانی بربھریا پھر عجیب طور پر
 زمین کو بچھاڑا، پھر ہم نے اس میں غلہ اور انگور اور ترکاری اور زیتون پیدا کئے۔

پھر کیوں کی کاشت کیلئے محض پانی اور مٹی کافی نہیں ہے، اگر تم کسی تر، سخت اور ٹھوس زمین میں دانہ ڈال دو گے تو وہ اگ نہیں
 سکے گا کیونکہ ہوا موجود نہیں ہے، اس لئے کسی ایسی زمین میں دانہ ڈالنا چاہیے جو گیلی ہو اور اس حد تک نرم ہو کہ اس میں ہوا
 گزر سکے، پھر ہوا خود بخود اندر نہیں پہنچتی، جب تک آندھی کے ذریعے اسے حرکت نہ دی جائے، اور اس طرح نہ مارا جائے کہ ہوا
 خود بخود زمین کے اندر گھسٹی چلی جائے، قرآن کریم کی اس آیت میں اسی امر کی طرف اشارہ ہے۔

وَأَرْسَلْنَا الرِّيَّاحَ لَوَاحٍ (۲۳ آیت ۲۲)

اور ہم ہی ہواؤں کو بھیجتے ہیں جو کہ بادلوں کو پانی سے بھر دیتی ہیں۔

اس سے مراد یہ ہے کہ یہ تیز ہوا میں پانی، ہوا اور زمین کو ایک دوسرے میں غلط طوط کر دیتی ہیں، پھر اگر تم نے یہ کاشت سخت
 سردی کے موسم میں شروع کی ہے تو تم کامیاب نہ ہو سکو گے، اس کے لئے موسم ریح اور موسم صیف کی حرارت ضروری ہے، گویا
 تمہاری غذا گیوں کو چار چیزوں کی ضرورت ہے پانی، ہوا، مٹی اور حرارت۔

ان میں سے ہر چیز مختلف چیزوں کی محتاج ہے، تم خود غور کر سکتے ہو، مثلاً پانی کے لئے دریاؤں، نہروں، چشموں اور تالابوں کی
 ضرورت ہے، ان سے پانی حاصل کیا جاتا ہے، اور کھیتوں میں پہنچایا جاتا ہے، تمہاری سولت کے لئے اللہ نے دریا پیدا فرمائے، چشمے
 نکالے، اور ان سے نہریں جاری کیں، اگر یہ آبی وسائل نہ ہوتے تو کھیتی کرنا کس قدر مشکل ہوتا، اگر زمین اتنی بلندی پر واقع ہو
 جہاں نہروں وغیرہ سے پانی نہیں پہنچایا جاسکتا اس کے لئے بادل پیدا فرمائے، ہوائیں پانی سے بھرے ہوئے بادلوں کو ان کے بے پناہ
 وزن کے باوجود اپنے کاندھوں پر لئے پھرتی ہیں، اور ریح و خریف کے موسموں میں جس قدر پانی کی ضرورت ہوتی ہے یہ بادل حکم الہی
 سے اسی قدر برہتے ہیں۔

یہ بھی دیکھو کہ اللہ تعالیٰ نے پہاڑوں پر چشمے پیدا فرمائے اور پہاڑوں کو ان چشموں کا محافظ بنایا، یہ چشمے سبک روی سے بہتے ہیں،
 اور نصیب میں رہنے والوں کو فیضیاب کرتے ہیں، اگر یہ چشمے اپنی پوری رفتار سے بہیں تو جل ٹھل کر دیں، تمام آبادیاں تہ آب
 ہو جائیں، پہاڑوں، دریاؤں، بادلوں اور بارشوں میں اللہ تعالیٰ کی نعمتیں احاطہ شمار سے باہر ہیں۔

پھر کیونکہ پانی اور مٹی دونوں بامد ہیں اس لئے ان دونوں کے اختلاط سے حرارت پیدا نہیں ہو سکتی، اس لئے سورج کو مسخر فرمایا،
 اور اسے کھیتوں کو گرم کرنے کی ذمہ داری تفویض کی سورج کھیتوں میں درجہ سے، یہ خدا تعالیٰ کی قدرت ہے کہ وہ اتنی دور واقع
 ہونے کے باوجود حرارت فراہم کرتا ہے، پھر اسے وہ فاصلہ دیا جس سے دونوں موسموں سرد و گرم کا امتیاز باقی رہ سکے، آفتاب کی تخلیق
 میں بھی بے شمار حکمتیں ہیں ہم نے صرف اس حکمت کا ذکر کیا ہے جس کا تعلق تمہاری کاشت سے ہے۔ جب پودے زمین سے
 اونچے اٹھ جاتے ہیں اور ان پر پھل لگنے لگتے ہیں تو وہ ابتداء میں سخت سبز اور کچے ہوتے ہیں، انہیں نرم کرنے، ان کو فطری رنگ
 دینے اور پکانے کے سلسلے میں ایک رطوبت کی ضرورت ہے، اس مقصد کے لئے اللہ تعالیٰ نے چاند پیدا فرمایا، اور اس میں رطوبت کی
 صلاحیت پیدا فرمائی، جیسا کہ سورج میں گرم کرنے کی خاصیت پیدا کی، چاند پھلوں اور میوؤں کو پکاتا ہے اور انہیں ان کا قدرتی رنگ
 دیتا ہے، اسیلئے اگر کوئی درخت کسی ایسی جگہ واقع ہو جہاں چاند اور سورج کی روشنی نہ پہنچ سکے تو وہ درخت بیکار ہو جاتا ہے، چنانچہ
 بنے درختوں کے سائے میں اگنے والے پھولے پودے جو روشنی سے محروم رہتے ہیں، اپنے نشوونما کے کمال کو نہیں پہنچتے۔ چاند کی

اس خاصیت سے کہ وہ رطوبت بخشتا ہے۔ کا اندازہ تم اس طرح کر سکتے ہو کہ چاندنی راتوں کو طبل دینے سے کوئی قاندہ نہیں یہ موضوع اس قدر تفصیل ہے کہ کبھی تمام نہ ہو پائے گا، اصولی اور بنیادی بات یہ ہے کہ آسمان میں کوئی ستارہ ایسا نہیں جس سے کوئی قاندہ نہ ہو، جس طرح چاند میں رطوبت اور سورج میں حرارت ہوتی ہے اسی طرح باقی ستاروں میں بھی کوئی نہ کوئی اقلیت موجود ہے ستاروں میں اس قدر نعمتیں پنہاں ہیں کہ انسان ان کا احاطہ کرنے سے قاصر ہے، اگر یہ نعمتیں نہ ہوتیں تو گویا ان کا پیدا کرنا لغو ہوتا اور قرآن کریم کا یہ دعویٰ صحیح نہ ہوتا۔

رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هَذَا بَاطِلًا (پ ۳۴ آیت ۱۹)

اے ہمارے پروردگار آپ نے اس کو لایعنی نہیں پیدا کیا ہے۔

مَا خَلَقْنَا السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا إِلَّا عَجَبًا (پ ۲۵ آیت ۳۸)

اور ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان میں ہے اس کو اس طور پر نہیں بنایا کہ ہم عجب فعل کرنے والے ہوں۔

دنیا کی کوئی چیز بیکار نہیں : جس طرح تمہارے جسم کا کوئی عضو بیکار نہیں ہے، بلکہ ہر عضو کے ساتھ فوائد وابستہ ہیں اسی طرح عالم کے جسم کا کوئی عضو بھی بیکار نہیں ہے، بلکہ ہر عضو سے کچھ نہ کچھ قاندہ بنتا ہے، عالم کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص، اور اس کے آحاد کی مثال ایسی ہے جیسے اس شخص کے اعضاء۔ جس طرح تمہیں اپنے اعضاء سے تقویت ملتی ہے، اسی طرح عالم کو بھی اپنے اعضاء سے تعاون ملتا ہے۔ اس ایمجاز کو تفسیر میں بدلنے کی محفائش نہیں ورنہ اس موضوع پر بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے۔

یہاں یہ کہنا صحیح نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے چاند، سورج اور ستاروں کو جن حکم اور مصالح کے لئے مقرر کیا ہے ان کی تفسیر پر ایمان لانا شریعت کے خلاف ہے، کیونکہ شریعت نے نجومیوں، اور علم نجوم کی تصدیق سے منع فرمایا ہے، تمہارا کہنا اس لئے صحیح نہیں کہ علم نجوم کی تصدیق سے شریعت نے ان دو باتوں کی وجہ سے مخالفت کی ہے، ایک تو یہ کہ جو لوگ ان علوم کی تصدیق کرتے ہیں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ نجوم اپنے آثار کے لئے خودی مؤثر اور اپنے افعال کے خودی قائل ہیں، وہ اپنے خالق، اور کائنات کے مدد سے مقبور اور مقرر نہیں ہوئے، ظاہر ہے یہ عقیدہ کفر ہے، اس لئے اس سے منع کیا گیا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ جو کچھ منجمین کہتے ہیں اگر ان کو من و عن صحیح جانا جائے، اور ان کی تصدیق کی جائے تو یہ بھی صحیح نہیں ہے، بلکہ یہ علم اندازوں پر مبنی ہے، حقائق پر نہیں ہے، ضروری نہیں کہ جو کچھ وہ کہتے ہیں حقیقت میں بھی وہی ہو، احکام نجوم کا علم بعض انبیاء کرام کو بطور خطا ہوا تھا بعد میں یہ علم باقی نہیں رہا۔ جو کچھ صحیح تھا اس میں غلطی کی آمیزش ہو گئی۔ عام لوگ اپنے قصور عقل اور محروم کے باعث غلط اور صحیح میں تیز نہیں کر سکتے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص ان آثار کو صحیح مانتا ہے جو ان کو اکب کے عمل سے ظہور پذیر ہوتے ہیں اور یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ ان آثار کا ظہور دراصل خالق کائنات کی حکمت کے مظاہر ہیں تو یہ صحیح ہے، اس سے دین میں کوئی غلط واقع نہیں ہوتا، لیکن نہ جاننے کے باوجود یہ دعویٰ کرنا کہ ہم ان کو اکب کے تمام آثار سے واقف ہیں غلط ہے، اور دین کے لئے نقصان دہ ہے۔ اگر تم نے اپنے کپڑے دھوئے ہوں اور تم انہیں سکھانے کا ارادہ رکھتے ہو، اور کوئی شخص تم سے یہ کہہ دے کہ دھوپ پھیل ہوئی ہے ہوا چل رہی ہے تم اپنے کپڑے دھوپ میں پھیلا دو سوکھ جائیں گے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم اسکی تکذیب کرنے بیٹھ جاؤ، اور اسے جموٹا ثابت کرو، اسی طرح اگر کسی شخص کا رنگ سیاہ سیاہ سا نظر آ رہا ہو اور تمہارے پوچھنے پر وہ یہ بتائے کہ میں دھوپ میں چل کر آ رہا ہوں اس لئے میرے چہرے کے رنگ میں تغیر ہو گیا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم اسے دودھ کو کہو، اور اس سے پوچھو کہ تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ سورج رنگ کے تغیر میں مؤثر ہے۔ اسی پر دوسرے آثار کو قیاس کیا جاسکتا ہے، تاہم بعض آثار معلوم ہوتے ہیں اور بعض مجہول۔ جو مجہول ہیں ان کے بارے میں یہ دعویٰ کرنا صحیح نہیں کہ وہ ہمارے علم میں ہیں، جو معلوم ہیں وہ بھی دو طرح کے ہیں بعض وہ ہیں جو عام طور پر لوگوں کو معلوم ہیں جیسے سورج سے دھوپ اور گرمی کا اثر، اور بعض ایسے ہیں جو سب کو معلوم نہیں جیسے

چاندنی سے زکام ہو جانا۔ بہر حال کو اکب بیکار پیدا نہیں کئے گئے۔ ان میں بے شمار حکمتیں مخفی ہیں، سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم رات کے وقت آسمان کی طرف دیکھتے اور یہ تلاوت فرماتے تھے۔
 رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هَذَا بَاطِلًا، سُبْحَانَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ (پ ۴ ر ۱۱ آیت ۱۹)
 اے ہمارے پروردگار آپ نے اس کو لایعنی پیدا نہیں کیا ہے ہم آپ کو منہ نہ سمجھتے ہیں سو آپ ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچائیے۔

ایک مرتبہ آپ نے یہ آیت تلاوت کرنے کے بعد فرمایا ہلاکت ہے اس شخص کے لئے جو یہ آیت پڑھے اور ان میں رہے (مجلسی۔ ابن عباس) اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اس آیت کی تلاوت کرنے والے کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس کے معانی پر غور و فکر کرے، آسمان و زمین کے ملکوت پر اس کی نظر صرف رنگ و بویت، عرض و طول تک محدود نہ ہو، یہ باتیں تو چوہائے بھی معلوم کر لیتے ہیں، انسان کی نظر اس سے آگے جانی چاہیے اسے انکی حکمتوں پر غور کرنا چاہیے، اور ان حکمتوں کے ذریعے حکیم مطلق کی عظمت اور جلالت کا احساس کرنا چاہیے، آسمانوں کے ملکوت (چاند سورج ستاروں) ہیں، آفاق و انفس اور حیوانات میں اللہ تعالیٰ کی صنعت و حکمت کے بے شمار عجائب ہیں ان کی معرفت صرف وہ لوگ حاصل کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہیں، چنانچہ یہ عام مشاہدہ ہے کہ اگر کسی مخصوص عالم سے تعلق ہوتا ہے تو وہ اسکی تصانیف کی تلاش میں رہتا ہے، جب بھی کوئی تصنیف ملتی ہے، اسکا نہایت شوق و ذوق سے مطالعہ کرتا ہے، ساتھ ہی پرانی کتابوں میں بھی پوری دلچسپی لیتا ہے، اپنے محبوب عالم کی تحقیقات ذہن نشین کرتا ہے، اور سارے زمانے میں گاتا پھرتا ہے، یہ دنیا بھی تو اللہ تعالیٰ کی تصنیف ہے، اور وہ مصنفین بھی اللہ کی تصنیف ہیں جو عجیب و غریب تصانیف منظر عام پر لاتے ہیں، اگر تمہیں کوئی کتاب پسند آئے تو تم اس کے مصنف کی شان میں مدح سراہی نہ کرو بلکہ اس ذات کا شکر ادا کرو جس نے ایسا مصنف بنایا اور اس کے ذریعے علوم کے مخفی خزانوں سے پردہ ہٹایا۔ اگر تمہیں کہیں کچھ چلتیاں ناچتی ہوئی، اور اپنی عجیب و غریب حرکتوں سے ناظرین کی دل بٹگی کا سامان فراہم کرتی ہوئیں نظر آئیں تو تمہیں ان پر حیرت نہ کرنی چاہیے، یہ تو کپڑے سے بنی ہوئی بے جان سورتیاں ہیں، اصل تماشہ وہ دکھلا رہا ہے جو پردے کے پیچھے سے انھیں کنٹرول کر رہا ہے، اور ان کو نظر نہ آنے والے دھاگوں اور بالوں کے ذریعے حرکت دے رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے محبت کرنے والے بھی دنیا کی ہر حرکت میں اسکا پر تو دیکھتے ہیں۔ کوئی بھی چیز ہو، اس کے اسباب کا سلسلہ سبب الاسباب پر ختمی ہو گا۔ چنانچہ نباتات کی غذا پانی ہوا، سورج اور چاند کی روشنی ہے۔ چاند سورج کے لئے افلاک ہیں جن سے یہ وابستہ ہیں، افلاک کے لئے حرکتیں ہیں، آسمانی فرشتے انھیں حرکت دینے پر مامور ہیں، اور یہ فرشتے اللہ کے حکم و اشارے پر منوضہ فرائض انجام دیتے ہیں، غرضیکہ ایک عمل دوسرے کا سبب بنتا ہے، اور دوسرا تیسرے کا، یہاں تک کہ سلسلہ خدائے واحد تک جا پہنچتا ہے۔

غذاؤں کے نقل و حمل میں اللہ کی نعمتیں

یہ غذائیں ہر جگہ نہیں ملتیں، بلکہ ان کے وجود کی مخصوص شرائط ہیں، بعض جگہوں پر دستیاب ہوتی ہیں اور بعض جگہوں پر دستیاب نہیں ہوتیں، جب کہ ان غذاؤں کے استعمال کرنے والے تمام دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں، بعض لوگ ایسے ہیں جن تک غذاؤں کے نقل و حمل میں اللہ تعالیٰ کی نعمتیں نہ ہوتیں تو یہ بیچارے بھوکے مر جاتے۔

ان لوگوں تک غذائیں پہنچانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے تاجروں کو مقرر فرمایا، ان کے دلوں پر مال کی حرص، اور نفع کی خواہش مسلط فرمائی، جب کہ اکثر اوقات انھیں اس مال سے کوئی خاص فائدہ نہیں ہوتا جسے وہ زندگی بھر کماتے ہیں اور جمع کرتے ہیں، کبھی وہ اپنی مال بردار کشتیوں سمیت سمندروں میں غرق ہو جاتے ہیں، کبھی ریزن انھیں لوٹ لیتے ہیں، کبھی دشت و صحرا کی سختیاں برداشت نہیں کر پاتے اور ہلاک ہو جاتے ہیں، اور جو کچھ وہ چھوڑتے ہیں لاوارث مال سمجھا جاتا ہے اور حکومت کے خزانوں میں جمع ہو جاتا ہے، تمہاری اسفار کامیاب ہو بھی جائیں تو جمع پونجی و رٹام کے ہاتھ لگتی ہے اور وہ خوب داد عیش دیتے ہیں، دیکھو اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر

غفلت اور جہالت کے پردے ڈال دئے ہیں، آنکھیں کھلی ہیں لیکن پیسے کی محبت انھیں خطروں اور مشقتوں کو جھیلنے پر آمادہ کر لیتی ہے، وہ نفع کی طلب میں سختیاں جھیلنے میں خطروں سے کھیتے ہیں، سمندر کے سفر میں ہواؤں سے لڑتے ہیں، اور ضرورت کی چیزیں مغرب سے مشرق تک پہنچاتے ہیں۔ یہ بھی دیکھو کہ اللہ تعالیٰ نے بحریہ میں سفر کرنے کے ذرائع پیدا کئے، اور ان ذرائع کی فراہمی کا طریقہ سکھلایا، مثلاً یہ سکھلایا کہ کشتیاں کیسے بنائی جاتی ہیں، ان پر کس طرح سواری کرتے ہیں، کیسے مال لادتے ہیں، پھر حیوانات پیدا کئے اور انھیں باربرداری کے لئے مسخر کیا، پھر جو جانور باربرداری اور سواری کے لئے موزوں ہیں انھیں انکے مناسب اوصاف عطا کئے، مثلاً گھوڑے کو برق رفتاری دی، گدھے کو صبر و تحمل دیا، اونٹ میں کم کھانے اور زیادہ سے زیادہ مشقت برداشت کرنے کی قوت بخشی، تم ہی میں سے بہت سے انسانوں کو وہ بحریہ میں کشتیوں اور ان جانوروں کے ذریعے دنیا کے اس کوئے سے اس کوئے تک بھراتا ہے تاکہ وہ تمہاری ضرورت کی چیزیں تمہیں فراہم کر سکیں، اور جو چیزیں تم سے زائد ہیں اور تم سے دور رہنے والے انکے محتاج ہیں ان تک پہنچا سکیں، پھر حیوانات کی غذا ان میں بھی پیدا کی، یعنی انکے آب و دانہ اور دیگر ضروریات کا انتظام بھی کیا، اور وہ چیزیں بھی پیدا فرمائیں جن سے کشتیاں بنتی ہیں، بہر حال غذاؤں کے نقل و حمل کے سلسلے میں جن نعمتوں سے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو نوازا ہے، وہ بھی ناقابل شمار ہیں۔

غذا کی تیاری میں اللہ تعالیٰ کی نعمتیں

دنیا میں جو چیزیں نباتات یا حیوانات میں سے کھانے کے لئے پیدا کی گئی ہیں وہ جوں کی توں کھائی نہیں جاتیں، اور نہ انھیں اس طرح کھانا ممکن ہے، بلکہ کھانے کے لئے انھیں اس قابل کرنا ضروری ہے کہ ایک سلیم الفطرت انسان اسے حلق سے اتار سکے، پھر یہ بھی ممکن نہیں کہ جتنی چیزیں کھانے کی ہیں ان کے تمام اجزاء کھائے جائیں، بلکہ بعض اجزاء پیچیدہ دئے جاتے ہیں اور بعض استعمال کئے جاتے ہیں۔ ہم تمام غذاؤں کا الگ الگ جائزہ نہیں لے سکتے، اس لئے صرف ایک غذا کا ذکر کرتے ہیں اور وہ ہے روٹی، یہ غذا اپنی پیدائش سے ہمارا نوالہ بننے تک کتنے مراحل سے گزرتی ہے، اسکا اندازہ مندرجہ ذیل سطور سے کیا جاسکتا ہے۔

جب تم روٹی کی اصل گیہوں کو کاشت کرنے کا ارادہ کرتے ہو تو سب سے پہلے زمین کی درستی کا مسئلہ سامنے آتا ہے، یعنی پہلے زمین میں جوتے ہو، اور اسکے لئے بیل استعمال کرتے ہو، پھر دانہ ڈالتے ہو، پھر ایک مدت تک اسکی آبیاری کرتے ہو، خود دو پودوں سے بچاتے ہو، اس میں کھاڈا ڈالتے ہو، جب کھیتی تیار ہو جاتی ہے تو اسے کاٹتے ہو، گاچے ہو، اناج کے دانے الگ الگ کرتے ہو، پھر پیٹتے ہو، گوندھتے ہو، اسکے بعد آگ پر پکاتے ہو، اس سلسلے میں جتنے مرحلے ہم نے بیان کئے ہیں، اور جتنے جھوڑے ہیں انھیں شمار کرو، اور ان لوگوں کی تعداد بھی شمار کرو جو ان مختلف مراحل سے تمہاری غذا کو بے سلاہت گزارنے پر مامور ہیں، لوہے، لکڑی اور پتھر کے وہ آلات بھی گنو جو ان تمام مراحل میں کام آتے ہیں، پھر ان کاریگروں پر نظر ڈالو جو کرنے، پینے اور روٹی پکانے کے سلسلے میں استعمال ہونے والے آلات بناتے، اور ان کی اصلاح و مرمت کا کام کرتے ہیں، گویا تم ایک روٹی حاصل کرنے کے لئے لوہار اور بڑھئی تک کے محتاج ہوتے ہو، پھر لوہار لوہے، تانبے اور سیسے کی ضرورت محسوس کرتا ہے، اس ضرورت کی تکمیل کے لئے پہاڑ پیدا کئے، پتھر بنائے، کانیں پیدا کیں، پھر زمینیں بھی مختلف بنائیں، بعض زمینیں غذاؤں کے لئے مخصوص بنائیں، اگر تحقیق کی جائے تو ہمیں یہ بات معلوم ہو جائے گی کہ گیہوں کے دانے گول روٹی بننے تک اور تمہاری غذا کی صلاحیت پانے تک کم از کم ایک ہزار افراد کے ہاتھوں سے گزرتے ہیں، ابتداء اس فرشتے سے ہوتی ہے جو ہادل ہنکائے پر مامور ہے، جب فرشتے اپنے اعمال سے فارغ ہوتے ہیں، تب انسانوں کا عمل شروع ہوتا ہے، پھر جب وہ گول ہو جاتی ہے تو اسکے طلبکار سات ہزار کاریگر ہوتے ہیں جن میں سے ہر کاریگر ایسی اصل چیزیں بناتا ہے جن سے خلق کی مصالح پوری ہوتی ہیں، پھر آلات میں انسانی اعمال کی کثرت پر غور کرو، سوئی ایک چھوٹا سا آلہ ہے جو لباس سینے کے کام آتا ہے، اور لباس تمہیں سردی سے بچاتا ہے، یہ چھوٹی سی سوئی لوہے کے ٹکڑے سے جس سے سوئی بنائی جاسکتی ہو مکمل ہونے تک کم از کم چھ مہینے مرتبہ کاریگر کے ہاتھوں سے گزرتی ہے اور ہر مرتبہ وہ اس میں کوئی نہ کوئی کام کرتا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ شیعوں میں اجتماعیت پیدا نہ کرتا اور بندوں کو مسخر نہ کرتا تو کوئی بھی انسانی ضرورت پوری نہ ہوتی، مثلاً تمہیں کھیتی کاٹنے کے لئے درختی کی

ضرورت ہوتی ہے، لیکن تم عمر تمام کر دیتے یہ درانتی نہ بناتے، کس قدر عظیم ہے وہ ذات جس نے منی کے ایک گندے قطرے سے انسان کو پیدا کیا، پھر اسے عجیب و غریب چیزیں بنانے کی عقل عطا کی، مثلاً قبینہ ایک حقیر سا آلہ ہے، اس کی دو پٹیاں ایک دوسرے پر رہتی ہیں، مگر کپڑا کاغذ وغیرہ چیزیں تیزی سے کاٹ دیتی ہیں، اگر اللہ تعالیٰ پہلے زمانے کے لوگوں پر قبینہ بنانے کا طریقہ واضح نہ کرتا، اور اب ہمیں اس کی ضرورت پیش آتی تو ہم سوچتے ہی رہ جاتے کیا کریں، اگر ہمیں عقل مکمل ملتی، اور حضرت نوح علیہ السلام کی عمر عطا کی جاتی تب بھی ہم محض یہ آلہ بنانے سے قاصر رہتے چہ جائیکہ دوسرے آلات بناتے، پاک ہے وہ ذات جس نے اندھوں کو بیناؤں کے ساتھ کر دیا کہ وہ انھیں راہ دکھاسکیں۔

یہ آلات، یہ کاریگر تمہارے لئے کتنے ضروری ہیں یہ تم خوب اچھی طرح جانتے ہو۔ فرض کرو تمہارے شرمیں کوئی طحان (آٹا پیسنے والا) لوہار، جو لایا ہوا جام وغیرہ نہ ہو تو تمہیں کتنی زبردست مشکلات برداشت کرنی ہوں گی، اور کیسی اذیت کا سامنا کرنا پڑے گا، اور ان لوگوں سے متعلقہ معاملات میں تم کس قدر پریشان ہو گے، پاک ہے وہ ذات جس نے اپنے بعض بندوں کو بعض کے لئے مسخر کر دیا، یہاں تک کہ اسکی شیت پوری ہوئی، اس کی حکمت تمام ہوئی۔

غذا تیار کرنے والوں میں اللہ کی نعمتیں

اگر یہ تمام اہل حرفت، اور غذا تیار کرنے والے رائے، اور طبیعت میں مختلف ہو جائیں تو ایک دوسرے سے دور رہیں، جس طرح دو وحشی ایک دوسرے سے دور رہتے ہیں، نہ ایک دوسرے سے استفادہ کرتے ہیں، نہ حریف کی رائے سے اتفاق کرتے ہیں، نہ یہ لوگ ایک مقصد پر، ایک غرض پر متحد ہو سکتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے دلوں میں الفت پیدا کی، ان میں انس و محبت کے جذبات پیدا کیے۔ قرآن کریم میں ہے :-

لَوْ أَنفَقْتَ مِثْقَالَ رَيْسٍ جَمِيعًا مَا آتَيْنَا لَكَ خَيْرًا مِنْهُ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ (پ ۳۱۲ آیت ۳۳)

اگر آپ دنیا بھر کا مال خرچ کرتے تب بھی انکے قلوب میں اتفاق پیدا نہ کر سکتے لیکن اللہ ہی نے ان میں باہم اتفاق پیدا کر دیا۔

چنانچہ اسی الفت، یگانگت، اور اتحاد و طمانع کے باعث لوگ جمع ہوئے، انھوں نے ویرانوں کو آبادیوں میں تبدیل کیا، شہر بسائے، بستیاں آباد کیں، رہنے کے لئے گھر تعمیر کئے، ایک دوسرے سے متصل، ایک دوسرے کی دیوار کے سائے میں بازار بنائے، ان میں قریب قریب دکانیں رکھیں، غلق کی تمام مصالح پوری کرنے کے لئے کارخانے قائم کئے، غرضیکہ ایک انسان سے دوسرے کی اور دوسرے سے تیسرے کی ضرورت وابستہ کی۔

پھر کیوں کہ انسانوں کی طبیعت میں حرص و حسد بھی ہے، غصب اور غضب بھی ہے، اس لئے وہ ایک دوسرے سے لڑ بھی پڑتے ہیں، خاص طور پر وہ دو آدمی ضرور لڑ پڑتے ہیں جن کے مقاصد میں اشتراک ہوتا ہے، بعض اوقات یہ جھگڑے ہلاکت کا باعث بن جاتے ہیں، ان جھگڑوں سے بچنے کے لئے، اور لوگوں کو امن و سکون سے زندہ رکھنے کے لئے اللہ نے ان پر حکمران مقرر کئے، انھیں قوت دی، سوتیلیں فراہم کیں، رعایا کے دلوں میں ان کا رعب اور دبدبہ پیدا فرمایا، تاکہ وہ ان کے احکام پر عمل کریں، اور سرکشی کر کے ملکی نظم کو درہم برہم نہ کریں۔ پھر اسی پر بس نہیں کیا بلکہ ان سلاطین اور حکمرانوں کو ملکوں کا نظم و نسق صحیح رکھنے کا سلیقہ سکھایا، انھوں نے ملک کو مختلف حصوں میں، اور ان حصوں کو متحدہ بڑے شہروں، بستیوں اور قریوں میں تقسیم کر دیا، گویا ہر شہر ایک مستقل ملک ہے، ہر حصہ اپنی جگہ مستقل ہے، یہ تمام حصے اور شہر ایک دوسرے سے تعاون کرتے ہیں، جیسے ایک شخص کے اعضاء، ان میں سے بعض کو بعض سے نفع ہوتا ہے، پھر ان حکام نے ہر شہر میں اپنا ماتحت ایک حاکم، ایک قاضی اور ایک کوتوال مقرر کیا، اور لوگوں کو زبردستی امن اور عدل کے قوانین کا پابند بنایا، اور ان میں باہمی موافقت اور ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کا جذبہ پیدا کیا، چنانچہ ایک معمولی قصاب، اور ایک حقیر ناہائی شہر کے تمام اہل حرفت اور اصحاب پیشہ سے نفع اٹھاتا ہے، اور تمام ہنرمند، اور پیشہ ور اس

سے منتفع ہوتے ہیں، حجام کسان سے، اور کسان حجام سے فائدہ اٹھاتا ہے، اور سب سلطان کی قائم کردہ ترتیب کے تحت مرتب، اسکے ضبط کے تحت منضبط اور اسکی جمع کے تحت مجتمع رہتے ہیں، عام زندگی پر کوئی خلل نہیں پڑتا، ایک ضابطے اور اصول کے مطابق سب اپنی روش اپنی ذکر پر کامزن رہتے ہیں، جس طرح اعضاء بدن میں سے ہر عضو اپنا اپنا فرض ادا کرتا ہے، اور دوسرے اعضاء کے ساتھ تعاون کرتا ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ کا انعام، اسکا کرم اور احسان دیکھئے کہ اس نے صرف سلاطین کو سلطنت، اور حکمرانوں کو حکمرانی دے کر مطلق العنان نہیں بنایا بلکہ انبیاء علیہم السلام کو مبعوث فرمایا، تاکہ سلاطین کی اصلاح کریں، انبیاء علیہم السلام نے انھیں اپنی رعایا کے ساتھ منصفانہ برتاؤ کرنے کے طریقے بتلائے، سیاسی قوانین سے آگاہ کیا، امامت اور سلطنت کے ضابطے بیان فرمائے، اور فقہ کے ان مسائل سے مطلع کیا جن کے ذریعے وہ اپنے دین اور دنیا کی اصلاح کر سکتے ہیں۔

فرشتوں کے ذریعہ انبیاء کرام کی اصلاح فرمائی، اور فرشتوں میں سے ایک کو دوسرے کا مصلح بنایا، اور انتہا اس مقرب فرشتے پر ہوئی جس کے اور رب العالمین کے درمیان کوئی واسطہ نہیں رہتا۔ گویا دنیا اصلاح اعمال کی ایک فطری ترتیب ہے، نانہائی رونی پکاتا ہے پیسے والا گیوں کی اصلاح کرتا ہے، یعنی اسے پیتا ہے، کاشتکار غلے کی اصلاح کاٹنے کرتا ہے، لوہار کاشتکاری کے آلات کی اصلاح کرتا ہے، بڑھئی لوہار کے آلات کی اصلاح کرتا ہے، دوسرے ان تمام پیشہ وروں، اور کاریگروں کا یہی حال ہے کہ وہ ایک دوسرے کے استعمال میں آنے والے آلات کی اصلاح کرتے ہیں، بادشاہ ان سبکی اصلاح کرتا ہے، انبیاء علماء کی اصلاح کرتے ہیں جو انکے وارث ہیں، اور علماء سلاطین کی اصلاح کرتے ہیں، ملائکہ انبیاء کی اصلاح کرتے ہیں، یہ سلسلہ رب کائنات پر منتہی ہوتا ہے جو ہر نظام کا سرچشمہ ہے، ہر حسن ہر خوبی کا مطلع ہے، اور ہر ترتیب و تالیف کا مظہر ہے۔

یہ تمام چیزیں اسی رب الارباب اور مسبب الاسباب کی نعمتیں ہیں، اگر اس کا کرم اور فضل شامل حال نہ ہوتا اور وہ اپنی کتاب میں یہ ارشاد نہ فرماتا نہ۔

وَالَّذِينَ جَاهَلُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (پ ۲۱ آیت ۶۹)

اور جو لوگ ہماری راہ میں متعین برداشت کرتے ہیں ہم ان کو اپنے راستے ضرور دکھائیں گے۔

تو ہمیں یہ نعمتیں بھی میسر نہ ہوتیں، جو اسکی نعمتوں کی بحرناپید کنار کا ایک قطرہ ہیں، اگر اس نے اپنے اس اعلان کے ذریعے وِلَانِ نَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تَحْصُوْهَا سے ہمارے حوصلے پست نہ کر دئے ہوتے تو ہمیں بھی نعمت شاری کا شوق چراتا، اچھائی ہو جو اس نے ہمارے اس شوق کو ہمیز نہیں کیا، ورنہ سمندر کو کون عبور کر سکتا ہے جس کا کنار ا معدوم ہو، پھر نعمت شاری سے فائدہ بھی کیا؟ کیا اس طرح وہ نعمتیں ہمیں مل جائیں گی جو ہماری قسمت میں نہیں ہیں، یا وہ نعمتیں ہم سے چھن جائیں گی جو ہمیں ملنی ہے جو چیز وہ عطا کرتا ہے اسے کوئی روک نہیں سکتا، اور جو چیز وہ نہیں دیتا اسے کوئی دے نہیں سکتا۔ ہم تو اپنی زندگی کے ہر لمحے میں اپنے دل کی یہ آواز سنتے ہیں نہ۔

لَمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ (پ ۲۴ آیت ۸۶)

آج کے روز کس کی حکومت ہوگی، بس اللہ کی ہوگی جو یکا اور غالب ہے۔

اللہ کا شکر ہے کہ اس نے ہمیں کافروں سے ممتاز کیا، اور عمریں گزرنے سے پہلے یہ آواز سنا دی۔

فرشتوں کی تخلیق میں اللہ کی نعمتیں

تمہارے علم میں یہ بات آچکی ہے کہ فرشتوں کے ذریعہ انبیاء علیہم السلام کی اصلاح ہوتی ہے، وحی اور ہدایت کے لئے انھیں واسطہ بنایا جاتا ہے، لیکن تمہیں یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ فرشتوں کا صرف یہی کام ہے کہ وہ انبیاء تک وحی پہنچاتے ہیں، اور انھیں ہدایت کی راہ دکھاتے ہیں، ملائکہ اپنی کثرت تعداد، اور کثرت مراتب کے باوجود بحیثیت مجموعی تین طبقوں میں تقسیم کئے جاسکتے ہیں،

زمین کے فرشتے آسمانی فرشتے، عرش کے حاملین فرشتے۔ ان طبقات میں سے ہم صرف ان فرشتوں کا ذکر کریں گے جو تمہاری غذا پر متعین ہیں، رشد و ہدایت کے فرشتے یہاں زیر بحث نہیں ہیں۔

یاد رہے کہ انسانی بدن کا کوئی جزو یا نباتات کے جسم کا کوئی حصہ اس وقت تک غذا نہیں پاتا جب تک اسپر کم سے کم سات یا دس یا سو فرشتے متعین نہ ہوں۔ غذا کے معنی یہ ہیں کہ اسکا جزو اس جزو کے قائم مقام بنے جو ضائع ہو گیا، یہ غذا آخر میں خون بن جاتی ہے، پھر ہڈی اور گوشت کی شکل اختیار کر لیتی ہے، اس عمل کے بعد غذا مکمل ہوتی ہے، خون اور گوشت دونوں اجسام ہیں، انھیں قدرت، معرفت اور اختیار حاصل نہیں ہے، یہ نہ اپنے آپ حرکت کر سکتے ہیں، نہ خود متغیر ہو سکتے ہیں، محض طبیعت سے غذا مختلف شکلوں میں تبدیل نہیں ہو سکتی، جیسے گیہوں نہ خود پتا ہے، نہ گندھتا ہے، نہ روٹی ہوتا ہے، جب تک کوئی طاحن اسے نہ پیسے کوئی عاجن اسے نہ گوندھے کوئی خباز اسکی روٹی نہ بنائے، اسی طرح خون خود بخود گوشت، ہڈی، پٹھوں اور رگوں میں تبدیل نہیں ہوتا، جب تک کوئی صانع نہ ہو، اور باطن میں صانع فرشتے ہیں، جس طرح ظاہر میں شر کے افراد صانع ہیں۔ اللہ نے تم پر ظاہری و باطنی نعمتیں نازل کی ہیں، پہلے ظاہر میں غذا کے تمام اسباب مہیا فرمائے، پھر باطن میں فرشتوں کو متعین کیا کہ وہ تمہاری غذا کو بدن کے مختلف حصوں میں پہنچادیں۔ تمہیں جس طرح ظاہری نعمتوں کی قدر کرنی چاہیے اسی طرح باطنی نعمتوں پر بھی اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے اور ان سے غفلت نہ برتنی چاہیے۔

غذا کو تحلیل ہونے اور جزو بدن بننے کے لئے مختلف فرشتوں کی اعانت کی ضرورت ہے۔ ایک فرشتہ وہ ہے جو غذا کو گوشت اور ہڈی کے پاس پہنچاتا ہے، کیونکہ غذا خود بخود حرکت نہیں کر سکتی، دوسرا فرشتہ غذا کو وہیں روکے رکھنے پر مامور ہے، تیسرا فرشتہ وہ ہے جو غذا سے خون کی شکل دور کرتا ہے، چوتھا وہ ہے جو غذا کو گوشت یا ہڈی یا رگ وغیرہ کی صورت میں بدل دیتا ہے، پانچواں وہ ہے جو غذا ضرورت سے زائد ہو اسے جسم سے دور کرے، چھٹا وہ ہے جو غذا کو اس کے مناسب مقام پر پہنچائے، مثلاً غذا کے اس حصے کو جس میں گوشت بننے کی اہلیت ہو گوشت سے ملحق کرے اور جس میں ہڈی بننے کی صلاحیت ہو اسی ہڈی سے ملائے تاکہ علیحدہ نہ رہ جائے، ساتویں فرشتے کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اس اتصال میں اصل مقدار کی رعایت کرے، یعنی جو چیز گول ہے اسے اتنی غذا فراہم کرے کہ اس گولائی پر اثر انداز نہ ہو، جو عضو عریض ہے، اس کا عرض اپنی جگہ برقرار رہے جو عضو کی ہیئت بدنائی کی حد تک تبدیل نہ ہو، مثلاً ناک میں اگر ران کے برابر گوشت رکھ دیا جائے تو ناک بڑی ہو جائے گی، چروخوناک حد تک کریمہ ہو جائے گا، بلکہ جس عضو کو جس قدر گوشت کی ضرورت ہے اسی قدر ملے، مثلاً ناک کا ستواں پن، اس کا ابھار، اس کے قنوں کی چوڑائی، اندرونی خلاء سب جوں کے توں رہیں، یا تمام اعضاء کی جسامت کے ساتھ ساتھ بڑھیں، جیسے بچے کی ناک اسکے بدن کے باقی حصوں کے ساتھ ساتھ بڑھتی رہتی ہے، اسی طرح پلکیں باریک رہنی چاہیں، ڈھیلے میں صفائی ہونی چاہیے، رانیں موٹی، ہڈیاں سخت ہونی چاہئیں، یعنی ہر عضو کے پاس غذا کی مقدار پہنچنی چاہیے، جس کی اس کی ہیئت، شکل، اور جسامت وغیرہ متقاضی ہو، ورنہ صورت مسخ ہو کر رہ جائے گی، بعض اعضاء بڑھ جائیں گے، بعض کمزور رہ جائیں گے، اگر یہ فرشتہ تقسیم و تفریق میں عدل ملحوظ نہ رکھے، اور بہت سا گوشت مثلاً سر اور اسکے متصل اعضاء میں ملا دے اور ایک پاؤں کو محروم کر دے تو وہ پاؤں ایسا ہی رہ جائے جیسا بچپن میں پتلا اور کمزور تھا، اور باقی اعضاء بدن بڑھ جائیں گے، گویا ایک ایسا شخص معرض وجود میں آجائے گا جس کا ایک پاؤں بچوں کا ہے، اور باقی اعضاء مکمل مرد کے ہیں۔

خون اپنی سرشت سے متغیر نہیں : تمہیں یہ خیال کرنا چاہیے کہ خون اپنی طبیعت کے باعث خود اپنی شکل تبدیل کر لیتا ہے، جو شخص جسمانی تبدیلی کو خون پر یا طبیعت پر محمول کرتا ہے، وہ جاہل ہے وہ یہ نہیں جانتا کہ کیا کہہ رہا ہے۔ فرشتے تمہارے جسمانی نظام میں تبدیلیوں پر متعین ہیں، یہ زمینی ملائکہ جب تم خواب خرگوش کے مزے لوٹتے ہو تمہارے ساتھ مشغول ہوتے ہیں، اور تمہارے باطن میں غذا اصلاح کرتے ہیں، تمہیں ان کے اصلاح و تغیر کی اطلاع بھی نہیں ہوتی، حالانکہ وہ تمہارے ہر جزو بدن میں داخل رہتے ہیں، اور منوطہ فرض ادا کرتے ہیں، چاہے وہ جزو کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو، دل اور آنکھ جیسے بعض اجزاء کو سو سے زائد فرشتوں

کی ضرورت رہتی ہے، اختصار کے پیش نظر ہم اس ضرورت کی تفصیل ترک کئے دیتے ہیں۔

زمین کے فرشتوں کو آسمانی فرشتوں سے مدد ملتی ہے، اس میں کیا ترتیب ہے، اور اس مدد کا کیا طریقہ ہے یہ اللہ ہی کو معلوم ہے۔ آسمانی فرشتے حاملین عرش سے مدد پاتے ہیں، ان سب کو خالق کائنات، رب الارباب قاضی الحاجات کی بارگاہ سے تائید، ہدایت، تسدید اور توفیق کی نعمتیں ہر لمحے ہر آن حاصل رہتی ہیں۔

روایات سے اس کی تائید ہوتی ہے کہ فرشتے آسمانوں، زمینوں کے نباتات اور حیوانات کے اجزاء پر مامور ہیں، بلکہ ایوب باراں پر بھی خدا کے حکم سے ان کا حکم چلتا ہے، یہاں تک کہ آسمان سے جو ایک قطرہ بارش کا ٹپکتا ہے، وہ بھی فرشتہ باراں کے عمل کے بغیر نہیں ٹپکتا، یہ روایات بے شمار ہیں، اور مشہور ہیں اس لئے ہم یہاں بطور دلیل انکے ذکر کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔

فرشتوں کی کثرت پر اعتراض : یہاں ایک اعتراض وارد ہو سکتا ہے، تم کہہ سکتے ہو کہ آدمی کے باطن میں غذائی تغیر و اصلاح کا عمل ایک ہی فرشتے کے سپرد کیوں نہیں کیا گیا، سات فرشتوں کی ضرورت کیوں پیش آئی، ہم دیکھتے ہیں کہ گیہوں کو غذا بنانے میں بہت سے مرحلے پیش آتے ہیں، پینا، گوندنا، روٹی بنانا، وغیرہ، لیکن ایک ہی شخص یہ تمام مراحل طے کر لیتا ہے، کیا ایک فرشتہ غذائی تغیر و اصلاح کے یہ تمام مراحل تمام نہیں کر سکتا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ انسان کی پیدائش اور فرشتوں کی پیدائش میں بڑا فرق ہے۔ ہر فرشتہ ایک وصف کا حامل ہے، انسان کی طرح سے مختلف اوصاف نہیں دئے گئے اس لئے اس سے صرف وہی کام لیا جاتا ہے، جو اسکے وصف کے مطابق ہے۔ قرآن کریم میں ہے۔

وَمَا مِنَّا إِلَّا لَهُم مَّعْلُومٌ (پ ۹۲۳ آیت ۱۶۳) اور ہم میں سے ہر ایک کا ایک معین درجہ ہے۔

یہی وجہ ہے کہ وہ نہ ایک دوسرے سے نفرت کرتے ہیں، نہ ان میں ایک دوسرے سے بغض یا حسد کا جذبہ ہے، نہ مقابلہ آرائی کی خواہش ہے، وہ جس کام پر مامور کر دئے گئے ہیں، فز و شب اسی میں مشغول ہیں، ان کی مثال ایسی ہے جیسے حواس خمسہ اپنے اپنے عمل میں مشغول رہتے ہیں، ایک دوسرے سے مزاحمت نہیں کرتے، مثلاً آنکھ آواز کے اور اک میں کان سے مزاحمت نہیں کرتی، اور نہ قوت شامہ آنکھ سے متصادم ہوتی ہے، اور نہ کان نہ گلنے میں قوت شامہ سے مزاحمت کرتا ہے، ہر حواس اپنے اپنے فرض کی ادائیگی میں مشغول نظر آتا ہے، فرشتوں کا حال اعضاء جیسا نہیں ہے، کہ ایک عضو کبھی دوسرے عضو کا کام کر لیتا ہے، مثلاً ہاتھ کا کام پکڑنا ہے، لیکن کبھی تم پاؤں سے بھی پکڑنے کا کام لیتے ہو، تو اسکی گرفت مضبوط نہیں ہوتی، مگر ہاتھ کے کام میں شریک اور مزاحم ضرور ہو جاتا ہے، اسی طرح جانے کا کام ہاتھ کا ہے، لیکن کبھی کبھی وہ یہ کام سر سے کرتا ہے، حواس خمسہ کا حال انسان جیسا بھی نہیں، ایک انسان دس میں طرح کے کام کر سکتا ہے، آنا بھی چل سکتا ہے، گوندھ سکتا ہے، پیڑے بنا سکتا ہے، روٹی پکا سکتا ہے، جب کہ حواس صرف ایک کام کر سکتا ہے، مثلاً آنکھ سے دیکھا جاسکتا ہے، سنا نہیں جاسکتا۔ دراصل انسان کا یہ وصف ان کی کجی، عدل سے اسکے انحراف پر دلالت کرتا ہے، اسکی وجہ یہ ہے کہ اسے مختلف صفات اور مختلف قسم کے دوائی و محرکات دئے گئے ہیں، وہ وحدانی الصفۃ (ایک صفت کا) نہیں ہے اس لئے وحدانی الفعل (ایک فعل کا) بھی نہیں ہے، اس لئے تم دیکھتے ہو کہ ایک انسان ایک وقت میں اللہ کی اطاعت کرتا ہے، اور دوسرے وقت میں اسکی معصیت پر کمر بستہ ہو جاتا ہے، ملائکہ سے اس اختلاف کا تصور بھی ممکن نہیں ہے، انکی تخلیق اطاعت پر ہوتی ہے، ان کی فطرت میں اطاعت ہے، انکے حق میں معصیت کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔ ان کے اوصاف قرآن کریم میں بیان کئے گئے ہیں۔

لَا يَعْصُونَ لِلْعَمَامَةِ هُمْ يَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ (پ ۹۲۸ آیت ۶)

(جو) کسی بات میں خدا کی نافرمانی نہیں کرتے جو کچھ ان کو حکم دیا جاتا اس کو بجالاتے ہیں۔

يَسْبَحُونَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُونَ (پ ۲۷ آیت ۲۰)

رات دن اللہ کی پاکی بیان کرتے ہیں اور سستی نہیں کرتے۔

ان میں جو رکوع کرنے والا ہے وہ ہمیشہ رکوع میں پہنچتا ہے جو رکوع کرنے والا ہے ہمیشہ پہنچتا ہے ان کے افعال میں اختلاف واقع ہوتا ہے زنان پر کابلی اور سستی چھاتی ہے ہر فرشتے کا تھمن مقام ہے وہ اس سے تجاوز نہیں کرتا، ان کی اطاعت صرف اللہ کے لئے ہے، ان سے امر الہی میں کسی مخالفت کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا، فرشتوں کی اطاعت کی مثال ایسی ہے جیسے تمہارے اعضاء تمہاری اطاعت کرتے ہیں، چنانچہ جب تم اپنی پلکیں کھولنے کا پختہ عزم کرتے ہو اور وہ صحیح سلامت ہوتی ہیں تو پلکوں میں مخالفت کا یا را نہیں ہوتا، ایسا بھی نہیں ہوتا کہ ایک مرتبہ وہ تمہارا کتنا مان لیں، اور دوسری مرتبہ نافرمانی کریں، بلکہ یہ تو ہر وقت تمہارے اشاروں کی خاطر رہتی ہیں، خواہ وہ امر میں ہوں یا نہی میں جب بھی تم کھولنے کا ارادہ کرتے ہو لکھت کھل جاتی ہیں، بند کرنا چاہتے ہو ارادے کے ساتھ ہی بند ہو جاتی ہیں، اس لحاظ سے فرشتوں میں اور تمہارے اعضاء بدن میں مشابہت ہے، لیکن ایک اعتبار سے دونوں میں فرق بھی ہے، اس لئے کہ پلکوں سے کھلنے اور بند ہونے کا جو فعل سرزد ہوتا ہے، انہیں اسکی خبر نہیں ہوتی، جب کہ فرشتے حیات ہیں اور اپنے اعمال کی علم و اطلاع رکھتے ہیں۔ یہ نعمتیں ہیں جو زمینی اور آسمانی فرشتوں کے سلسلے میں تمہیں عطا کی گئی ہیں اور غذا کے سلسلے میں تمہاری وہ ضرورتیں ان کے ذریعے پوری ہوتی ہیں جو ہم نے بیان کی ہیں، کھانے کے علاوہ تمہاری جو حاجات اور حرکات ہیں اور ان میں جہاں جہاں فرشتوں کی ضرورت ہوتی ہے ہم ان کا ذکر کر کے کتاب کی ضخامت نہیں بڑھانا چاہتے، اس لئے کہ یہ نعمتوں کا دوسرا طبقہ ہے اور تمام طبقات کا احاطہ دشواری نہیں ناممکن بھی ہے، بلکہ ایک طبقے کی نعمتوں کا احاطہ بھی نہیں کیا جاسکتا۔

ظاہری و باطنی نعمتوں کا شکر : اللہ تعالیٰ نے تمہیں ظاہری اور باطنی ہر طرح کی نعمتوں سے نوازا ہے، جیسا کہ قرآن کریم میں

ہے ۔ وَاسْبِغْ عَلَيْنَا نِعْمَةً ظَاهِرَةً وَبَاطِنَةً (پ ۲۱ آیت ۲۰)

اور اس نے تم پر اپنی ظاہری اور باطنی نعمتیں پوری کر رکھی ہیں۔

اسکے بعد ارشاد فرمایا ۔ وَذَرُوا ظَاهِرَ الْأَشْجِبِ وَبَاطِنَهُ (پ ۸ آیت ۳۱) اور تم ظاہری گناہ کو بھی چھوڑو اور باطنی گناہ کو بھی۔

باطنی گناہوں سے وہ گناہ مراد ہیں جنہیں لوگ نہیں جانتے، جیسے حسد، بدظنی، بدعت، لوگوں کے لئے ارادہ، شر و فیر۔ یہ دل کے گناہ ہیں، ان گناہوں سے تائب ہونا دراصل باطنی نعمتوں کا شکر ہے، اور ظاہری گناہوں کا چھوڑنا ظاہری نعمتوں کا شکر ہے، بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ اگر کس شخص نے پلک جھپکنے میں اللہ کی نافرمانی کی، یعنی جہاں آنکھیں بند کرنی چاہئیں تمہیں وہاں کھلی رکھیں تو گویا اس نے تمام نعمتوں کی ناشکری کی جو اسکے لئے آسمانوں اور زمین میں ہیں، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے جتنی بھی چیزیں پیدا کی ہیں، ملائکہ، آسمان، زمین، حیوانات اور نباتات سب اللہ تعالیٰ کے بندوں میں سے ہر ایک کے لئے نعمتیں ہیں، اسکا نفع ان تمام چیزوں سے وابستہ ہے، گو وہ سرے بھی ان سے فائدہ اٹھاتے ہوں۔

پلک جھپکنے میں اللہ کی نعمت

اب پلک جھپکنے ہی کا معاملہ لیجئے، یہ ایک ذرا سا عمل ہے، بظاہر اسکی کوئی اہمیت نہیں لیکن اس میں بھی اللہ کی بہت سی نعمتیں ہیں، دو نعمتیں پلکوں میں ہیں، اللہ نے ہر ایک کے نیچے عضلات رکھے ہیں، ان میں اتار اور رباط ہیں جو دماغ کے پتھوں سے متصل ہیں، انکے ذریعے اوپر کی پلک نیچے آتی ہے، اور نیچے کی پلک اوپر کی طرف جاتی ہے، ہر پلک پر سیاہ بال ہیں، سیاہ بالوں میں اللہ کی نعمت یہ ہے کہ وہ آنکھ کی روشنی کو مجتمع رکھتے ہیں، سفیدی روشنی کو منتشر کر دیتی ہے، اور سیاہی جمع رکھتی ہے، پھر ان بالوں کو ایک وصف میں رکھا، یہ بھی ایک نعمت ہے، اس سے تمہاری نگاہیں محفوظ رہتی ہیں، اور ہوا میں اڑنے والے تنکے اور چھوٹے موٹے کیڑے اندر نہیں جاتے۔ پھر پلکوں کے ہر بال میں دو مستقل نعمتیں ہیں، ایک تو یہ کہ بالوں کی جڑیں نرم ہیں، اور دوسری یہ کہ اس نرمی کے باوجود بال کھڑا ہے۔ اور نیچے کی پلکیں مل کر ایک جال کی صورت اختیار کئے ہوئے ہیں، یہ بھی اللہ کی بڑی نعمت ہے، بعض اوقات ہوا میں اڑتا ہوا غبار آنکھ کھلنے میں مانع ہوتا ہے، اس صورت میں اگر آنکھیں بند کر لی جائیں تو کچھ بھائی نہ دے، آدمی اپنی آنکھیں اس طرح بند کر سکتا ہے کہ اوپر نیچے کی پلکوں کو ملا کر جال بنالے، اس طرح نظر بھی آتا رہتا ہے، اور گرد و غبار سے آنکھیں بھی محفوظ رہتی ہیں،

إِنَّ الْبُقْعَةَ الَّتِي يَجْتَمِعُ فِيهَا النَّاسُ إِنَّمَا نَلْعَنُهَا إِنْ أَتَوْا بِقَوْلٍ وَاسْتَغْفَرُوا لَهُمْ (١)

اسی طرح ایک حدیث میں وارد ہے کہ عالم کے لئے عالم کی ہر چیز مغفرت کی دعا کرتی ہے یہاں تک کہ پانی میں مچھلیاں بھی دعا کرتی ہیں (۲) ایک حدیث میں ہے کہ فرشتے گناہ گاروں پر لعنت بھیجتے ہیں (۳) اس طرح کی بے شمار روایتیں ہیں، ان سب کا حاصل یہ ہے کہ جو شخص پلک جھپکنے میں بھی اللہ کی نافرمانی کرے گادہ گویا ملک اور ملکوت کی تمام چیزوں کا قصور وار ہوگا، اور اپنے نفس کو ہلاکت میں ڈالے گا، الا یہ کہ اس گناہ کے بعد کوئی ایسا عمل کر لے جو اسے مٹا دے، اس صورت میں امید ہے کہ لعنت و دعائے مغفرت سے بدل جائے گی، اور اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول کر لے گا اور اسے معاف فرما دے گا۔

سائنس میں اللہ کی نعمتیں : جس طرح پلکوں میں اللہ کی بہت سی نعمتیں ہیں، اسی طرح سائنس لینے میں بھی اللہ کی دو نعمتیں ہیں، جب تم اندر کا سائنس باہر نکالتے ہو قلب کا دھواں باہر نکل جاتا ہے، اگر یہ دھواں باہر نہ نکلے تو آدمی ہلاک ہو جائے اسی طرح جب تم اندر کی طرف سائنس لیتے ہو تو باہر کی نازہ ہوا دل میں پہنچتی ہے، اگر یہ ہوا اندر نہ پہنچے تو دل اپنے اندر کی تپش سے خاکستر ہو جائے، اور تم ہلاک ہو جاؤ، دن میں چوبیس گھنٹے ہیں، اور ہر گھنٹے میں تم کم از کم ایک ہزار مرتبہ سائنس لیتے ہو، اور ہر سائنس میں تقریباً دس لحظے صرف ہوتے ہیں، گویا تم پر اللہ کی طرف سے ہر لحظے میں ہزار نعمتیں نازل ہوتی ہیں، تم پر ہی نہیں بلکہ تمہارے ہر جزو بدن پر بلکہ اجزائے عالم پر۔ کیا ان نعمتوں کو شمار کرنا ممکن ہے؟ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اللہ تعالیٰ کے ارشاد ”وَلَنْ نَعْلُوَ اَنْعَمَ اللّٰهُ لَا تَحْصُوْهَا“ کی حقیقت منکشف ہوئی عرض کیا اے اللہ! میں تیری نعمتوں کا شکر کیسے ادا کروں، میرے ہر موئے بدن میں تیری دو نعمتیں ہیں، تو نے ان کی جڑ نرم بنائی اور سراوٹ چھانٹا، حدیث شریف میں ہے کہ جو شخص اللہ کی نعمتوں کو کھانے پینے کی اشیاء تک محدود سمجھتا ہے، وہ کم علم ہے، اس کا ورد ناک انجام قریب ہے۔ (۴)

(۱) اسکی سند مجھے نہیں ملی (۲) یہ روایت کتاب العلم میں گزری ہے (۳) مسلم ابو ہریرہ (۴) حدیث مجھے نہیں ملی

جاسکتا ہے، عقلمند انسان کی نگاہ جب بھی کسی چیز پر پڑتی ہے یا جب بھی اسکے دل میں کسی شے کا خیال گزرتا ہے وہ اس میں اللہ کی نعمتیں تلاش کرتا ہے۔

لوگ شکر کیوں نہیں کرتے

: جاننا چاہیے کہ لوگ جہالت اور غفلت کے باعث اللہ تعالیٰ کا شکر ادا نہیں کرتے، کیونکہ جن لوگوں کے دل و نگاہ پر غفلت و جہالت کے دھندے پردے پڑے رہتے ہیں، وہ اللہ کی کسی نعمت کو نعمت نہیں سمجھتے، جب وہ نعمت ہی نہ جانیں گے تو اس کا شکر کیسے ادا کریں گے، پھر اگر انھیں نعمت کی معرفت حاصل بھی ہے تو اسکے شکر کا طریقہ یہ جانتے ہیں کہ زبان سے الحمد للہ یا الشکر للہ کہہ دینا کافی ہے، وہ یہ نہیں جانتے کہ شکر کے معنی ہیں نعمت کو اس سے متعلق حکمت کی تکمیل میں استعمال کرنا، اور وہ حکمت اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے، اگر لوگوں کو یہ دونوں معرقتیں حاصل ہوں اور اسکے بورہ اللہ کا شکر ادا نہ کریں تو اس کا سبب اسکے علاوہ کچھ نہیں کہ اس پر شیطان کا تسلط ہے اور شہوات غالب ہیں۔

نعمت سے غفلت کے اسباب : نعمت سے غفلت کے بہت سے اسباب ہیں، ان میں سے ایک سبب یہ ہے کہ لوگ اپنی جہالت کے باعث ان نعمتوں کو جو عام طور پر لوگوں کو حاصل ہیں نعمت نہیں سمجھتے، اسی لئے ان کا شکر بھی ادا نہیں کرتے، ان کے نزدیک نعمت کے لئے تخصیص ضروری ہے، یعنی جو چیز خاص طور پر کسی کو حاصل ہو وہ نعمت کی جاسکتی ہے، جہاں تک کھانے پینے کی اشیاء کا سوال ہے یا جسمانی نظام کے محاسن کی بات ہے ان امور میں بڑا چھوٹا، امیر غریب، ذلیل عزیز سب مشترک ہیں، اس لئے یہ چیزیں نعمت کس طرح ہو سکتی ہیں، یہی وجہ ہے کہ وہ تازہ ہوا کو بھی نعمت نہیں سمجھتے، حالانکہ یہ ایک عظیم ترین نعمت ہے، اگر ایک لمحے کے لئے کسی کا گلہ دبایا جائے، یہاں تک کہ ہوا کی آمد و رفت کا سلسلہ منقطع ہو جائے تو تازہ ہوا نہ پانے کی وجہ سے موت کی آغوش میں چلا جائے اسی طرح اگر اسے کسی ایسے حمام میں قید کر دیا جائے جہاں صرف گرم ہوا کا گزر ہو یا کسی گھرے کنویں میں گر جائے جہاں رطوبت کے باعث ہوا بوجھل ہو تو دم گھٹنے کے باعث مر جائے، بالفرض اگر کسی کو گرم حمام، اور گھرے کنویں کی قید سے نکلتا نصیب ہو جائے تو اس سے تازہ ہوا کی قدر و قیمت پوچھو، وہ اسے نعمت سمجھے گا اور شکر بھی کرے گا، یہ انتہائی جہالت ہے کہ لوگ نعمت کو اسی وقت نعمت سمجھتے ہیں، جب وہ ان سے طلب کر لی جاتی ہے۔ بعض اوقات

وہ نعمت دوبارہ مل جاتی ہے، اور کبھی ملتی ہی نہیں، حالانکہ نعمتوں کا ہر حال میں شکر ادا کرنا چاہیے۔ تم نے کسی بیٹا آدمی کو نہیں دیکھا ہو گا کہ وہ اپنی آنکھوں پر اللہ کا شکر ادا کرتا ہو، حالانکہ یہ ایک بڑی نعمت ہیں۔ لیکن جب اس کی آنکھوں کی روشنی ختم ہو جاتی ہے اور وہ اندھا ہو جاتا ہے تب اس نعمت کی قدر کرتا ہے، اور اگر خوش قسمتی سے دوبارہ بینائی مل جاتی ہے تو اس نعمت کا شکر بھی ادا کرتا ہے، لیکن جب تک دیدہ بینا رہتا ہے اسے نعمت نہیں سمجھتا کیونکہ دنیا میں عام طور پر لوگ آنکھیں رکھتے ہیں، اسکے خیال میں جو چیز اس قدر عام ہو وہ نعمت کیسے ہو سکتی ہے، اس کی مثال ایسی جیسے کوئی بد تمیز اور ادب ناشناس غلام جس پر ہر وقت مار پڑتی رہتی چاہیے، اگر کچھ دیر کے لئے اس کو زد و کوب کرنے کا سلسلہ منقطع کر دیا جائے تو وہ اسے نعمت سمجھے گا، اور اگر بالکل ہی موقوف کر دیا جائے تو اڑ جائے گا اور شکر ترک کر دے گا۔ لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ صرف اس دولت پر شکر کرتے ہیں، جس میں انھیں ارد گرد کے لوگوں کی بہ نسبت کچھ خصوصیت یا کوئی امتیاز حاصل ہوتا ہے، خواہ وہ دولت کم ہو یا زیادہ۔ اس کے علاوہ جنسی نعمتیں ہیں ان سب کو فراموش کر دیتے ہیں۔

ایک تنگدست کی شکایت کا قصہ : ایک مفلس نے کسی صاحب دل انسان سے اپنی تنگدستی، اور کثیر العیالی کا شکوہ کیا، اور عرض کیا کہ میں اپنے ناگفتہ بہ حالت کی بنا پر سخت مضطرب اور پریشان ہوں، بزرگ نے اس سے پوچھا کہ کیا تو دس ہزار درہم لیکر اندھا بننا پسند کرتا ہے؟ اس نے عرض کیا نہیں آپ نے دریافت کیا کیا دس ہزار درہم کے عوض کوٹکا بننا منظور ہے؟ اس نے کہا نہیں، بزرگ نے پھر پوچھا کیا تو یہ بات پسند کرتا ہے کہ دس ہزار درہم لے لے اور لنگڑا ہو جائے، اس نے یہ پیش کش بھی مسترد کر دی، آپ نے پوچھا کیا تو دس ہزار کے بدلے میں لوہا بننا پسند کرتا ہے؟ اس نے یہ بات بھی منظور نہیں کی، پھر پوچھا کیا تو دس ہزار کے عوض دیوانہ بننا پسند کرتا ہے؟ اس نے کہا نہیں! فرمایا تیرے آقا نے تجھے پچاس ہزار درہم کی دولت سے نوازا ہے، اسکے باوجود تو اپنی مفلسی اور تنگدستی کا رونا روتا ہے، اسی طرح کا ایک قصہ کسی حافظ قاری کے متعلق مشہور ہے، روایت ہے کہ یہ اپنی تنگدستی، اور مفلسی کے

بڑے شاکی تھے، ایک رات خواب میں دیکھا کہ کوئی کہنے والا کہتا ہے، ہم تمہیں دس ہزار دینار دیتے ہیں، لیکن سورۃ انعام بھلا دیں گے، قاری صاحب نے انکار کر دیا، کہنے والے نے سورۃ ہود کے عوض دس ہزار دینار کی پیش کش کی، انھوں نے یہ پیش کش بھی ٹھکرا دی، اس نے سورۃ یوسف کے عوض بھی دس ہزار دینار دینے چاہے، مگر قاری صاحب نے یہ بھی گوارا نہ کیا، غرضیکہ اس منادی نے دس سو روپے کا نام لیا، اور ہر سورت کے عوض دس ہزار دینار مقرر کئے، مگر قاری صاحب ہر مرتبہ انکار کرتے رہے، آخر میں اس نے کہا کہ تم ایک لاکھ دینار کے مالک ہو، اس کے باوجود مظلومی کا روٹا دوتے ہو، صبح اٹھے تو دن کا اضطراب رخصت ہو چکا تھا، اور وہ اپنے حال پر مطمئن تھے۔

حضرت ابن السماک کسی خلیفہ کے پاس تشریف لے گئے، وہ اس وقت پانی کا گلاس لئے ہوئے تھا، اس نے عرض کیا کہ مجھے کچھ نصیحت فرمائیں، ابن السماک نے اس سے پوچھا فرض کرو اگر تمہیں سخت پیاس لگی ہو، اور تم سے یہ گلاس لیا جائے اور کھا جائے کہ جب تک تم اپنے تمام اموال ہمیں نہیں دے گئے، ہم تمہیں پانی نہیں دیں گے، کیا تم گلاس بھر پانی کے عوض انھیں ساری دولت دے ڈالو گے، خلیفہ نے کہا بے شک تمام دولت دے دوں گا، ابن السماک نے دریافت کیا اور اگر تمام ملک دینے کی شرط لگائی جائے تو! خلیفہ نے کہا میں تمام ملک دینے میں بھی تجھک محسوس نہ کروں گا، فرمایا جس ملک کا یہ حال ہو کہ ایک گھونٹ پانی کے عوض دیا جائے، تمہیں اس پر چند ان خوش نہ ہونا چاہیے، اس سے معلوم ہوا کہ پیاس کے وقت ایک گھونٹ پانی اتنی عظیم نعمت ہے کہ تمام دنیا کی سلطنت اسکے حصول پر قربان کی جاسکتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کی خاص نعمتیں: کیونکہ طبعاً عینیں ان نعمتوں کو نعمت سمجھتی ہیں جو کسی نہ کسی طور پر ان کے ساتھ مخصوص ہوں، عام نعمتوں کو نعمت ہی نہیں سمجھتیں اس لئے ہم بطور اشارہ ان نعمتوں کا ذکر بھی کرتے ہیں جو کسی نہ کسی اعتبار سے صرف تمہارے ساتھ مخصوص ہیں، کوئی انسان ایسا نہیں ہے جس کے ساتھ ایک یا دو یا چند نعمتیں مخصوص نہ ہوں وہ نعمتیں تمام لوگوں میں نہیں پائی جاتیں، صرف اسی کے پاس ہوتی ہیں، یا بہت کم لوگ ان میں شریک ہوتے، چنانچہ تین امور ایسے ہیں جن میں ہر شخص اپنی تخصیص کا متعرف نظر آتا ہے، عقل، اخلاق اور علم۔

جہاں تک عقل کا تعلق ہے، اس سلسلے میں ہر شخص اللہ تعالیٰ سے راضی نظر آتا ہے کہ اس نے دنیا کا انتہائی عقلمند انسان بنا کر پیدا کیا، بہت کم لوگ ایسے ہیں جو اللہ تعالیٰ سے عقل ملتے ہیں، ورنہ عام طور پر لوگ عقل کی اس مقدار پر جو انھیں میسر ہے مطمئن نظر آتے ہیں، یہ بھی عقل ہی کی خصوصیت ہے کہ جو اس سے خالی ہے وہ بھی مطمئن نظر آتا ہے اور جو اس سے متصف ہے وہ بھی خوش رہتا ہے۔ بہر حال اگر کسی شخص کا خیال یہ ہے کہ وہ لوگوں میں سب سے زیادہ عقلمند ہے اور حقیقت بھی یہی ہے تو اس خدائے وحدہ لا شریک کا شکر ادا کرنا چاہیے جس نے اسے اس عظیم ترین نعمت سے نوازا، اور اگر واقع میں وہ دنیا کا عقلمند ترین انسان نہیں ہے تب بھی اس پر شکرو واجب ہے، کیونکہ اسکے حق میں نعمت موجود ہے جیسے کوئی شخص زمین میں خزانہ کا ڈرے اور خوش رہے، تو وہ اپنے علم کے مطابق خوش بھی رہے گا اور شکر بھی ادا کرے گا، کیونکہ اسکے اعتقاد میں خزانہ موجود ہے۔

اخلاق کا حال یہ ہے کہ کوئی بھی شخص ایسا نہیں جو دوسرے کے محبوب پر نظر نہ رکھتا ہو، اور ان پر اپنی ناپسندیدگی ظاہر نہ کرتا ہو، خواہ وہ محبوب خود اسکے اندر کیوں نہ موجود ہوں، لیکن دوسرے کے محبوب کی مذمت اس لئے کرتا ہے کہ خود کو ان محبوب سے خالی سمجھتا ہے، اگر کوئی شخص واقعی اس عیب سے بری ہے جس میں دوسرا جھلکا ہے تو اسے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اس نے اسے اس برائی سے محفوظ رکھا، اور دوسرے کو جھلکا لیا۔

جہاں تک علم کا معاملہ ہے ہر شخص اپنی باطن کے عقلی احوال اور دل کے پوشیدہ خیالات سے واقف ہوتا ہے، اور وہ احوال و خیالات ایسے ہوتے ہیں کہ اگر لوگوں پر منکشف ہو جائیں تو ساری عزت خاک میں مل جائے، اس طرح گویا ہر شخص کو چند ایسے امور کا علم ہے جو اسکے علاوہ کوئی نہیں جانتا، اس صورت میں ہر شخص کو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اس نے محبوب کی پردہ پوشی کی ہے، اور اسکی اچھائیوں کو نمایاں کیا ہے۔ یہ تین امور ہیں ان میں ہر شخص اپنی خصوصیت کا اقرار و اعتراف کرتا ہے۔

نعمتوں میں تخصیص کی ایک اور صورت: ہمارے خیال میں تخصیص ان ہی تین چیزوں میں نہیں ہے، بلکہ اسکی عام نعمتوں میں بھی خصوصیت کا پلو پایا جاتا ہے۔ ہمیں دنیا میں کوئی ایسا شخص نظر نہیں آتا جسے اللہ تعالیٰ نے صورت، کردار، اخلاق و اوصاف، اہل، اولاد، گھر، شہر، رتقاء، عزیز، اقارب، جاہ منصب وغیرہ میں کوئی نعمت نہ دی ہو، اگر وہ نعمت اس سے سلب کر لی جائے اور دوسرے شخص کے پاس جو نعمتیں ہیں وہ عوض میں دی جائیں تو وہ ہرگز راضی نہ ہو، مثلاً اللہ تعالیٰ نے کسی شخص کو مومن بنایا، کافر نہیں بنایا، زندہ بنایا پھر نہیں بنایا، انسان بنایا حیوان نہیں بنایا، مرد بنایا عورت نہیں بنایا، بیمار بنایا بیمار نہیں بنایا، صحیح سالم بنایا عیب دار نہیں بنایا، یہ نعمتیں اگرچہ عام ہیں، بہت سے لوگوں کو حاصل ہیں لیکن اس اعتبار سے مخصوص بھی ہیں اگر اس شخص سے کہا جائے کہ تم ان احوال کے مخالف احوال قبول کرلو، مثلاً صحت کے عوض بیماری لے لو، ایمان کے بجائے کفر قبول کرلو تو وہ ہرگز راضی نہ ہوگا، بلکہ بعض حالتیں ایسی ہوتی ہیں کہ کوئی شخص اپنی ان حالتوں کے عوض بہتر حالتیں بھی قبول نہیں کرتا، مثلاً اولاد، بیوی، مال، باپ، عزیز و اقارب وغیرہ۔ اگر کوئی تم سے تمہارے بچے لینا چاہے اور عوض میں دوسرے بچے دے اور وہ بچے تمہارے بچوں سے بہتر ہوں حسن میں، ذہانت میں، صحت میں، کیا تم یہ تبادلہ کرلو گے؟ ظاہر ہے اس کا جواب نفی ہی میں ہو سکتا ہے معلوم ہوا کہ جو نعمتیں تمہیں میسر ہیں وہ اگرچہ دوسروں کو بھی حاصل ہیں مگر تم ان نعمتوں کو اپنے لئے مخصوص سمجھتے ہو، اسی لئے تم انکے عوض دوسری نعمتیں قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہو۔ اگر کوئی شخص اپنے حال کو دوسرے کے مجموعی حال سے بدلتا نہیں چاہتا۔ یا کسی خاص بات میں بدلتا نہیں چاہتا تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ اسے اللہ کی ایسی نعمت حاصل ہے جو اسکے علاوہ کسی بندے کو حاصل نہیں ہے، اور اگر کوئی شخص اپنا حال دوسرے سے بدلنے پر راضی ہے تو دیکھنا چاہیے کہ ایسے لوگوں کی تعداد کیا ہے جن کے احوال سے یہ شخص اپنے احوال بدلتا چاہتا ہے، ظاہر ہے ایسے لوگ تعداد میں کم ہوں گے، اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جو لوگ اسکی بہ نسبت کم ہیں وہ تعداد میں زیادہ ہیں اور جو اس سے آگے ہیں وہ تعداد میں کم ہیں، بڑے تعجب کی بات ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ کی نعمت کی تحقیر کے لئے اپنے سے بہتر کی طرف دیکھے، اپنے سے کم تر کی طرف نہ دیکھے، اور دین کے معاملے کو دنیا کے برابر نہ سمجھے، ہم دیکھتے ہیں کہ اگر کسی شخص سے کوئی خطا سرزد ہو جاتی ہے تو وہ یہ کہہ کر شرمندگی سے دامن بچانا چاہتا ہے کہ اس طرح کی خطا بے شمار لوگوں سے سرزد ہوتی ہے، اگر مجھ سے یہ غلطی سرزد ہو گئی تو کیا ہوا، یہ دینی معاملات ہیں ان میں آدمی کی نظر پینے سے کم تر ہے، اور جہاں دنیوی مسائل پیش آتے ہیں، جاہ و منصب اور مال و دولت کی بات آتی ہے تو نظر اپنی سے بہتر پر پڑتی ہے، حالانکہ اسکے پاس دولت نہیں تو اسے اپنے سے زیادہ مالدار کی طرف دیکھنے کے بجائے ان لوگوں کی طرف دیکھنا چاہیے جو اس سے زیادہ غریب اور مفلوک الحال ہیں۔ بھلا ایسے شخص پر شکر کیسے واجب نہ ہوگا جس کا حال دنیا میں اکثر سے بہتر اور دین میں اکثر سے کم تر ہو، اسی لئے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:-

مَنْ نَظَرَ فِي النَّبِيَاِ الَّتِي مَنْ هُوَ دُونَ نَظَرٍ فِي الدِّينِ اِلَى مَنْ هُوَ فَوْقَهُ كَتَبَ اللَّهُ صَابِرًا
شَاكِرًا وَمَنْ نَظَرَ فِي النَّبِيَاِ الَّتِي مَنْ هُوَ فَوْقَهُ فَوِي الدِّينِ اِلَى مَنْ هُوَ دُونَ نَظَرٍ اِلَى مَنْ هُوَ فَوْقَهُ كَتَبَ اللَّهُ
صَابِرًا وَلَا شَاكِرًا (ترمذی - عبد اللہ ابن عمر)

جو شخص دنیا میں اپنے سے کم تر اور دین میں اپنے سے برتر کی طرف دیکھتا ہے اللہ تعالیٰ اسے صابر و شاکر لکھتے ہیں، اور جو شخص دنیا میں اپنے سے برتر اور دین میں اپنے سے کم تر کی طرف دیکھتا ہے اللہ تعالیٰ اسے نہ صابر لکھتے ہیں اور نہ شاکر۔

اگر ہر شخص اپنے نفس کا جائزہ لے، اور ان نعمتوں کی تحقیق و جستجو کرے جو خاص طور پر اللہ تعالیٰ نے اسے عطا کی ہیں تو وہ یہ دیکھے گا کہ اس طرح کی نعمتیں دو چار نہیں بلکہ بی شمار ہیں، خاص طور پر وہ لوگ جنہیں سنت، ایمان، علم، قرآن، فارغ البالی اور صحت جیسی نعمتوں کے خزانے ملے ہوئے ہوں، ایک شاعر نے مذکورہ بالا حدیث شریف کی کتنی اچھی تفسیر کی ہے۔

مَنْ شَاءَ عَيْشًا رَغِيْبًا يَسْتَطِيْعُ بِهِ فِي دِيْنِهِ ثُمَّ فِي دُنْيَاهُ اِقْبَالًا

فَلْيَنْظُرْنَ إِلَىٰ مَنْ فَوْقَهُ وَرَعَا وَلْيَنْظُرْنَ إِلَىٰ مَنْ كُنُوهُ مَالًا
(جو شخص من پسند زندگی کا طالب ہو، دین میں عزت اور دنیا میں سر بلندی کا خواہاں ہو اسے دین میں اپنے سے بہتر لوگوں کی طرف دیکھنا چاہیے اور مال میں اپنے سے کم تر کی طرف)

جو لوگ دین کی دولت پا کر بھی قانع نہیں ہیں ان کے بارے میں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں :-
مَنْ لَمْ يَسْتَعْنِ بِآيَاتِ اللَّهِ فَلَا أَغْنَاهُ اللَّهُ (۱)

جو شخص اللہ تعالیٰ کی آیات پا کر مستغنی نہیں ہے اللہ تعالیٰ اسے غنی نہ کرے۔

اِنَّ الْقُرْآنَ هُوَ الْغَنَى الَّذِي لَا غِنًى يَغْلُوْهُ لَا فَقْرَ مَعَهُ (ابو جلی، طبرانی۔ انس)

قرآن ہی تو غمگری ہے اس کے بعد نہ کوئی تو غمگری ہے اور نہ اسکی موجودگی میں غمگسی ہے۔

مَنْ اَتَاهُ الْقُرْآنُ فَظَنَّ اَنْ اَحَدًا اَغْنٰى مِنْهُ فَقَدْ اسْتَهْزَا آيَاتُ اللَّهِ (ابو جلی، طبرانی۔ انس)

جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے قرآن کی دولت دی ہو اور وہ یہ گمان کرے کہ کوئی شخص مجھ سے زیادہ دولت مند ہے وہ اللہ تعالیٰ کی آیات کی نفی اڑاتا ہے۔

لَيْسَ مِنْهُمْ مَنْ لَمْ يَتَغَنَّ بِالْقُرْآنِ كَفَىٰ بِالْبَاقِيْنَ غِنًى (۲) (طبرانی۔ عتبہ ابن عامر)

جو شخص قرآن سے غنا حاصل نہ کرے وہ ہم میں سے نہیں ہے، مالدار کی کے لئے یقین کافی ہے۔

ایک بزرگ ارشاد فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی بعض آسمانی کتابوں میں فرمایا ہے کہ میں اپنے جس بندے کو تین چیزوں سے بے نیاز کر دیتا ہوں اس پر میری نعمت تمام ہوتی ہے، ایک یہ کہ اسے کسی بادشاہ کی ضرورت نہ رہے، دوسرے کسی محتاج کی تیسرے کسی کے مال کی۔ اس شعر میں یہی مضمون بیان کیا گیا ہے :-

اِذَا مَا الْقُوَّةُ يَا زَيْدُكَ كُنَّا الْقَصْحَةُ وَالْأَمْنُ وَاصْبَحْتَ أَخَا حَرْبٍ فَلَا فَارَقَكَ الْحُزْنُ

اگر تجھے غنا حاصل ہے اور صحت و امن بھی (اس کے باوجود تو غم میں مبتلا ہے تو تجھ میں غم کبھی دور نہ ہو گا۔ یہ مضمون سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے فصیح و بلیغ کلمات کی روشنی میں اس طرح واقع ہوا ہے۔

مَنْ أَصْبَحَ آمِنًا فِي سِرِّهِ مُكَافَىٰ فِي بَلَدِهِ عَنْهُ قُوَّةٌ يَوْمَهُ فَكَانَتْ مَا حِزْنَتْ لَهُ
الْكُنْيَا بِحُكْمٍ فَيُرْهَا (۳)

جو شخص بدن کی صحت اور نفس کے امن کی حالت میں صبح کرے اور اسکے پاس دنیا کی غذا ہو گیا اسے تمام دنیا حاصل ہے۔ لیکن دیکھا جائے تو لوگ ان تینوں نعمتوں پر شکر ادا کرنے کے بجائے ان نعمتوں کا شکوہ کرتے نظر آتے ہیں جو انھیں حاصل نہیں ہیں، حالانکہ اگر وہ نعمتیں حاصل ہو جائیں تو مصیبت کا باعث بن جائیں، سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ ایمان جیسی عظیم نعمت کا شکر ادا نہیں کرتے جس کی وجہ سے وہ ابدی دنیا یعنی آخرت میں جنت نعیم کے مستحق ہوں گے۔

ایمان و یقین ہی اصل دولت ہے : جس شخص کو اللہ نے بصیرت سے نوازا ہو اسے صرف معرفت، یقین اور ایمان ہی کی دولت پر خوش ہونا چاہیے بلکہ ہم ایسے علماء کو جانتے ہیں جنھیں اگر وہ تمام اموال انصار اور اہل عداوت دینے جائیں جو مغرب سے مشرق تک بادشاہوں کی قبضے میں ہیں اور ان سے کہا جائے کہ وہ یہ تمام مال واسباب اپنے علم کے عوض قبول کر لیں اگر تمام علم نہ دیتا چاہیں تو اسکا عشر عشری دیدیں تو وہ یہ پیشکش قبول نہیں کریں گے، کیونکہ وہ یہ بات جانتے ہیں کہ علم کی نعمت آخرت میں اللہ تعالیٰ سے قریب کرنے والی ہے، بلکہ اگر ان سے یہ کہا جائے کہ آخرت میں تمہیں جس کمال کی توقع ہے وہ بہر حال حاصل ہو گا، اسمیں کسی کمی کی توقع نہیں ہے، لیکن ہم یہ چاہتے ہیں کہ علم میں اشغال کے باعث جو لذت تمہیں ملتی ہے وہ ہمیں دیدو اور دنیا کی لذتیں لے لو وہ

(۱) یہ روایت مجھے ان الفاظ میں نہیں ملی (۲) یہ روایت کتاب آداب علماء القرآن میں گزری ہے (۳) یہ حدیث کی بار گزر چکی ہے

یہ بتاؤ کہ بھی منظور نہیں کریں گے، اس لئے کہ انھیں یہ بات معلوم ہے کہ علم کی لذت دائمی ہے، یہ کبھی منقطع نہیں ہوگی، بیشہ باقی رہتی ہے، چوری نہیں کی جاسکتی ہے، اسے چھینا نہیں جاسکتا، نہ اس میں منافست کی جاسکتی ہے، یہ ایک صاف ستھری لذت ہے اس میں کسی طرح کی کوئی کدورت نہیں ہے، جب کہ دنیا کی لذتیں ناقص ہیں، ان میں کدورتیں ہیں، پریشانیاں ہیں، اس کا خوف اس سکون سے زائد ہے جو اس سے حاصل ہوتا ہے، اس کا غم اس کی لذت سے زیادہ ہے، اس کا رنج اس کی راحت سے زیادہ ہے، یہ لذت اب تک ایسی ہی رہی ہے جیسی ہم نے بیان کی ہے، اور آئندہ بھی ایسی ہی رہے گی، دنیا کی لذتیں صرف اس لئے پیدا ہوئی ہیں کہ ناقص عقل رکھنے والے لوگ ان کے جال میں پھنس جائیں، اور ان کے فریب میں جٹا ہو جائیں، جب وہ ان کے قریب کا شکار ہو جاتے ہیں تب یہ لذتیں ان سے دور بھاگتی ہیں، ان کی قربت سے انکار کرتی ہیں جیسے کوئی خوبصورت عورت کسی مالدار جو ان کے لئے اپنے آپ کو سنوارے، جب وہ اس کی زلفوں کا اسیر ہو جائے تو نگاہوں سے اوٹ چل ہو جائے، اسکے صبر کا امتحان لے، دور رہ کر اس کی آتش شوق بھڑکائے، اسکے جذبات پر انگلیاں بکھینچ کرے، اور پردے کے پیچھے سے اسے مانی بے آب کی طرح تڑپتا دیکھ کر خوش ہو، یہ تمام پریشانیاں اور مصیبتیں اس لئے حملہ آور ہوئی ہیں کہ وہ نظر کے فریب میں آگیا، اگر عقل سے کام لیتا، نگاہ نیچی رکھتا، اور اس لذت دیدار کو حقیر سمجھتا تو تمام عمر سلامت رہتا، اسی طرح دنیا والے دنیا کے جال میں پھنس گئے ہیں، اور اس کے ہتھکنڈوں کا شکار ہو گئے ہیں، یہ کتنا کسی طرح بھی صحیح نہیں کہ دنیا سے امراض کرنے والے ممبر کی تکلیف میں جٹا ہیں اس لئے کہ حقیقت میں وہ لوگ زیادہ شدید اذیت کا شکار ہیں جو دنیا کی طرف مائل ہیں، کبھی وہ دنیا چاہتے ہیں مگر دنیا ان سے دور بھاگتی ہے، کبھی وہ بھاگ دوڑ کر دنیا حاصل کر لیتے ہیں، لیکن اس کی حفاظت کے لئے پریشان رہتے ہیں، دنیا سے امراض کرنے والوں کو ممبر کی تکلیف تسلیم، لیکن اس تکلیف کے بعد جو راحت ملنے والی ہے تم اسے کیوں بھولتے ہو، دنیا کی لذتوں کے پیچھے دوڑنے والے یہاں بھی تکلیف میں ہیں، اور آخرت کی تکلیف بھی ان کی نظر سے اٹھ کر ہے، انھیں تو اپنے نفس پر یہ آیت پڑھنی چاہیے۔

وَلَا تَهِنُوا فِي ابْتِغَاءِ الْقَوْمِ إِنْ تَكُونُوا تَأْلَمُونَ فَإِنَّهُمْ يَأْلَمُونَ كَمَا تَأْلَمُونَ وَتَرْجُونَ مِنَ اللَّعْنَةِ لَا يَرْجُونَ (پ ۵ ر ۳ آیت ۱۴۳)

اور ہمت مت ہارو اس مخالف قوم کا تعاقب کرنے میں، اگر تم الم رسیدہ ہو تو وہ بھی الم رسیدہ ہیں، جیسے تم الم رسیدہ ہو، اور تم اللہ تعالیٰ سے ایسی ایسی چیزوں کی امید رکھتے ہو کہ وہ لوگ امید نہیں رکھتے۔

غافل قلوب کا علاج : اس تفصیل سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ لوگوں پر شکر کا راستہ اس لئے محدود ہو گیا ہے کہ وہ ظاہری و باطنی اور عام و خاص نعمتوں سے ناواقف ہیں یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس غفلت کا علاج کیا ہے، کوئی ایسا علاج ضرور تجویز کرنا چاہیے جس سے ان غافل دلوں کی غفلت دور ہو جائے، اور یہ لوگ اللہ کی نعمتوں کو محسوس کرنے لگیں، ہو سکتا ہے اس احساس کے بعد وہ شکر بھی کرنے لگیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ جو دل بصیرت سے محروم نہیں ہیں ان کا علاج یہ ہے کہ وہ عام نعمتوں کی ان اقسام میں غور و فکر کیا کریں جن کی طرف ہم نے گذشتہ صفحات میں اشارہ کیا ہے، غبی دل رکھنے والے اس نعمت کو نعمت ہی نہیں سمجھتے جو ان کے ساتھ مخصوص نہ ہو، یا وہ ان سے سلب کر کے دوبارہ نہ دی جائے ایسے دلوں کا علاج یہ ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے سے کم تر لوگوں کی طرف دیکھیں، اور ان صوفیائے کرام کی اقتداء کیا کریں جن کا معمول یہ تھا کہ وہ روزانہ ہسپتالوں، قبرستانوں اور زندانوں کا گشت لگایا کرتے تھے، ہسپتالوں کا اس لئے کہ جو مریض وہاں زیر علاج ہیں ان کے امراض معلوم کریں، اور یہ دیکھیں کہ وہ امراض خود ان کے جسموں میں تو نہیں ہیں اگر نہ ہوں تو اپنی سلامتی اور تندرستی پر اللہ کا شکر ادا کریں، زندانوں میں اس لئے جایا کرتے تھے کہ وہاں مجرمین کو دی جانے والی سزاؤں کا مشاہدہ کریں، کسی مجرم کا ہاتھ کاٹا جا رہا ہے، کسی کے جسم پر کوڑے برسائے جا رہے ہیں، کسی کی گردن اڑانی جا رہی ہے یہ مناظر دیکھ کر اللہ کا شکر ادا کریں کہ اس نے انھیں گناہوں سے محفوظ رکھا، ورنہ ان مجرمین کی جگہ وہ خود بھی ہو سکتے تھے، قبرستانوں میں اس لیے جاتے تھے کہ وہاں پر موجود قبروں کو دیکھ کر ان کے باشندوں کا تصور آئے، جن کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب بات یہ ہے کہ

وہ کسی طرح دنیا میں لوٹ جائیں خواہ ایک ہی دن کے لئے لوٹیں مگر اس لئے واپسی کی آرزو کرتے ہیں کہ زندگی کی حالت میں جو گناہ اس سے سرزد ہوئے ہیں ان کا تدارک کر سکیں، اور اطاعت گزار اس لئے واپسی چاہتے ہیں کہ اپنی نیکیوں میں اضافہ کر سکیں، قیامت کا دن خسارے کا دن ہے، مطلع اس وقت اپنے خسارے کا احساس کریں گے جب وہ یہ دیکھیں گے کہ ہم ان اعمال سے زیادہ اعمال پر قادر تھے جو آج لیکر آئے ہیں، افسوس ہم نے اپنا قیمتی وقت ضائع کیا، اور اپنی عمر عزیز کے ہزار ہا لمحات مباحات میں صرف کردئے مگر ہمارا خسارہ تو واضح ہے۔

جب آدمی قبرستان جائے اور قبروں کی زیارت کرے تو ذہن میں یہ بات رکھے کہ ان قبروں میں جتنے لوگ ہیں خواہ نیک ہوں یا بد سب کے سب دنیا میں لوٹنے کے خواہشمند ہیں، تاکہ اپنے اعمال کا تدارک کر سکیں، یا ان میں اضافہ کر سکیں، یہ میری خوش قسمتی ہے کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے گزشتہ ایام کے تدارک کا اور اطاعت میں اضافہ کا موقع دے رکھا ہے، مجھے اپنی زندگی کے باقی دن اللہ کی اطاعت میں صرف کرنے چاہئیں، میرا ایک ایک سانس اللہ کی نعمت ہے، مجھے اس نعمت کی قدر کرنی چاہیے، آدمی نعمت کی معرفت کے بعد ہی شکر کرتا ہے، چنانچہ اگر اس نے زندگی کو نعمت سمجھ لیا ہے تو عمر کے باقی دن یقیناً ان کاموں میں صرف کرے گا جن کے لئے اس کی تخلیق ہوئی ہے، زندگی دراصل آخرت کے لئے زادِ راه لینے کے لئے بنائی گئی ہے، اگر آدمی نعمت کا قدر شناس ہو گا تو کبھی اس مقصد سے غافل نہ ہوگا۔

یہ غافلوں کا علاج ہے، امید ہے اس علاج سے وہ لوگ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی قدر کریں گے، اور اسکا شکر ادا کریں گے، حضرت ربیع ابن خثیمہ اپنی بزرگی، جلالت شان، اور کمال عقل و آگہی کے بعد ہی طریقہ اختیار کرتے تھے تاکہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی معرفت میں کمال پیدا ہو جائے، انھوں نے اپنے گھر میں ایک قبر کھود رکھی تھی، ہر روز ایک بار اس میں لیٹ جاتے، اور گلے میں ایک طوق ڈال لیتے، پھر یہ آیت پڑھتے۔

رَبِّ ارْجِعُونِي لَعَلِّي أَعْمَلُ صَالِحًا (پ ۱۸، آیت ۹۹-۱۰۰)

اے میرے رب مجھ کو پھر واپس بھیج دیجئے تاکہ میں نیک اعمال کروں۔

اسکے بعد یہ کہتے ہوئے کھڑے ہو جاتے ربیع تیسرا سوال پورا ہوا، تجھے موقع نصیب ہوا، اب اس وقت کے لئے عمل کر جب تیری درخواست قبول نہیں ہوگی، اور تجھے عمل کرنے کا موقع نہیں عطا کیا جائے گا۔ جو لوگ شکر ادا کرتے ہیں ان کا علاج یہ ہے کہ وہ اس حقیقت کو ہر وقت دل و نگاہ میں رکھیں کہ جو لوگ شکر نہیں کرتے ان سے نعمت سلب کر لی جاتی ہے، اور پھر واپس نہیں دی جاتی، اسی لئے حضرت فضیل ابن عیاضؒ فرمایا کرتے تھے کہ نعت پر شکر کرنا سیکھو، اور اسے لازم پکڑو، بہت کم ایسا ہوا ہے کہ کسی قوم سے نعمت چھین لی گئی ہو، اور دوبارہ دے دی گئی ہو، ایک حدیث میں ہے :-

مَا عَظُمَتْ نِعْمَةُ اللَّهِ عَلَى عَبْدٍ إِلَّا كَثُرَتْ حَوَائِجُ النَّاسِ إِلَيْهِ فَمَنْ نَهَاوْنَهُمْ عَرَضَ نِلْكَ النِّعْمَةِ تِلْكَ زَوَالُ (ابن عدی، ابن حبان، معاذ ابن جبل)

جب کسی بندے پر اللہ کی نعمت زیادہ ہوتی ہے تو اس سے لوگوں کی ضرورتیں بھی زیادہ وابستہ ہو جاتی ہیں، جو شخص ان سے سستی برتتا ہے وہ اس نعمت کو زوال کے سپرد کر دیتا ہے۔

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا :-

إِنَّ اللَّهَ لَا يَغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا أَمَانًا أَنْفُسَهُمْ (پ ۸۳، آیت ۱۱)

واقعی اللہ تعالیٰ کسی قوم کی حالت میں تغیر نہیں کرنا جب تک وہ لوگ خود ہی اپنی حالت کو نہیں بدل

دیتے۔

صبر و شکر کا ارتباط

ایک چیز میں صبر و شکر کا اجتماع اور اس کی وجہ : اب تک ہم نے جو گفتگو کی ہے اس سے تم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہو کہ ہر موجود چیز میں اللہ تعالیٰ کی نعمت پائی جاتی ہے، دنیا میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو اللہ تعالیٰ کی نعمت سے خالی ہو، اس سے یہ ثابت ہوا کہ مصیبت کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں ہے، اس لئے کہ اگر مصیبت موجود ہے تو اس پر شکر کے کیا معنی؟ اور مصیبت نہیں تو پھر صبر کس پر کیا جائے گا؟ بعض لوگ یہ دعویٰ کرتے دیکھتے گئے ہیں کہ ہم تو مصیبت پر بھی اللہ کا شکر کرتے ہیں، نعمت کا تو ذکر ہی کیا ہے، کوئی ان سے پوچھے کہ تم اس چیز پر شکر کیسے کرتے ہو جس پر صبر کیا جاتا ہے، اس لئے کہ صبر تکلیف کا مقتضی ہے، اور شکر میں خوشی کا عنصر ہے، اور یہ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں، حالانکہ تمہاری تقریر سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جتنی چیزیں ایجاد کی ہیں سب میں نعمتیں موجود ہیں، اس کا کیا مطلب ہے؟

نعمت و مصیبت کی تقسیم : اس کا جواب یہ ہے کہ جس طرح نعمت موجود ہے اسی طرح مصیبت بھی موجود ہے، اگر تم نعمت کو مانتے ہو تو مصیبت کا وجود بھی تسلیم کرنا پڑے گا کیونکہ یہ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں، نعمت ان مصیبت نعمت ہے، اور نعمت ان مصیبت ہے۔ تاہم یہ بات پہلے بیان کی جا چکی ہے کہ نعمت کی دو قسمیں ہیں ایک تو نعمت مطلقہ یعنی ہر اعتبار سے نعمت ہو جیسے آخرت میں اللہ تعالیٰ کی قربت کا شرف اور سعادت، اور دنیا میں ایمان اور حسن اخلاق اور وہ چیزیں جو ان دونوں کے لئے معاون ہوں، اور دوسری نعمت مقیدہ، یعنی ایک اعتبار سے نعمت ہو اور دوسرے اعتبار سے نہ ہو، جیسے مال جس سے دین میں بھلائی بھی ہو سکتی ہے، اور فساد بھی پیدا ہو سکتا ہے، اسی طرح مصیبت کی بھی دو قسمیں ہیں مطلق اور مقید، آخرت میں مطلق مصیبت کی مثال اللہ سے بعد ہے خواہ وہ کچھ مدت کے لئے ہو یا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اور دنیا میں اسکی مثال کفر، مصیبت اور بد خلقی ہے، ان ہی چیزوں سے آدمی آخرت میں مطلق مصیبت میں گرفتار ہوتا ہے، اور مقید مصیبت کی مثال میں فقر، مرض، خوف وغیرہ مصیبتوں کے نام لئے جاسکتے ہیں، یہ دینی مصائب نہیں ہیں بلکہ دنیاوی ہیں۔

نعمت پر شکر کی صورت یہ ہے کہ جو نعمت مطلق ہے اس پر شکر بھی مطلق ہونا چاہیے لیکن دنیا میں جو مصیبتیں مطلق ہیں ان پر صبر کی اجازت نہیں ہے، کفر ایک مصیبت ہے، لیکن کیا اس پر صبر کرنا صحیح ہے، یہی حال مصیبت کا بھی ہے، کافر کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنا کفر ترک کرے، گناہگار پر بھی گناہ چھوڑنا لازم ہے، البتہ یہ بات صحیح ہے کہ کافر کو بعض اوقات اپنے کفر کا علم نہیں ہوتا، اسکی مثال اس مریض کی سی ہے جسے کوئی بیماری لاحق ہو، اور اسکی اذیت سے محفوظ رکھنے کے لئے اسے بے ہوشی کی دوا دیدی گئی ہو، ظاہر ہے جب اسے تکلیف ہی نہیں تو وہ صبر کیا کرے گا، گناہگار یہ بات جانتا ہے کہ میں گناہ کر رہا ہوں، اس لئے اس پر گناہ ترک کرنا واجب ہے، صبر کے سلسلے میں اصل بات یہ ہے کہ جن مصائب کے ازالے پر انسان کو قدرت حاصل ہو اسے ان پر صبر کرنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی، مثلاً ایک آدمی شدت کے باوجود پانی نہ پئے، یہاں تک کہ اس کی تکلیف شدید ہو جائے، تو اس سے یہ نہیں کہا جائے گا کہ اس تکلیف پر صبر کر، بلکہ اس سے کہا جائے گا کہ وہ پانی پئے، اور اس خود ساختہ مصیبت سے چھٹکارا پائے، صبر اس تکلیف پر کیا جاتا ہے جس کا زائل کرنا انسان کی استطاعت سے باہر ہو، اس سے معلوم ہوا کہ دنیا میں مطلق مصیبت پر صبر نہیں ہے، بلکہ یہ ممکن ہے کہ جس مصیبت پر صبر کیا جائے وہ من وجہ نعمت بھی ہو، اس طرح ایک ہی چیز میں صبر اور شکر دونوں کا اجتماع ہو سکتا ہے، مثلاً دولت انسان کی ہلاکت کا سبب بھی ہو سکتی ہے کہ کچھ لوگ اگر اسے اور اسکی اولاد کو قتل کر ڈالیں، اور مال لے کر فرار ہو جائیں، اسی طرح صحت اور تندرستی جہاں نعمت ہے وہاں مصیبت کا باعث بھی ہو سکتی ہے کہ کوئی حسد کی وجہ سے اسے ہلاک کر دے۔

بعض نعمتیں مصیبت ہیں

حاصل یہ ہے کہ دنیا کی جتنی نعمتیں ہیں وہ نعمت والے کے لئے مصیبت ہو سکتی ہیں، اسی طرح بعض دنیاوی مصیبتیں بھی اہل مصیبت کے احوال کا اعتبار کرتے ہوئے نعمت ہو سکتی ہیں، مثلاً اکثر لوگ ایسے ہیں جن کے لئے فقر اور مرض ہی بہتر ہیں، ان دونوں چیزوں کے مصیبت ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے، لیکن اس لحاظ سے اس کے حق میں نعمت بھی ہیں کہ بالفرض وہ مالدار اور صحت مند ہوتا تو سرکشی اختیار کرتا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :-

وَلَوْ نَسَطَ اللَّهُ الْمَرْزُقَ لِعِبَادِهِ لَبَغَوْا فِي الْأَرْضِ (پ ۲۵ ر ۴ آیت ۲۷)
اور اگر اللہ تعالیٰ سب بندوں کے لئے روزی فراخ کر دیتا تو وہ دنیا میں شرارت کرنے لگتے۔ حقیقتاً بلاشبہ (کافر) آدمی حد (آدمیت) سے نکل جاتا ہے اس لئے کہ اپنے آپ کو مستثنیٰ دیکھتا ہے۔

سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :-

إِنَّ اللَّهَ لَا يَخْشِي عِبْدَهُ الْمُؤْمِنِينَ مِنَ الدُّنْيَا وَهُوَ يُجِبُّهُ كَمَا يَخْشِي أَحَدَكُمْ مَرِيضَةً (ترمذی، حاکم)
اللہ تعالیٰ اپنے مومن بندے کو دنیا سے بچاتا ہے اور وہ بندہ اسے محبوب بھی ہوتا ہے جس طرح تم میں سے کوئی اپنے مریض کو بچاتا ہے۔

یہی حال بیوی، بچوں، اور اقرباء وغیرہ نعمتوں کا ہے، اور ان نعمتوں کا ہے جو نعمتوں کی سولہ قسموں کے ضمن میں مذکور ہیں، اس حکم سے ایمان اور حسن خلق جیسی نعمتیں مستثنیٰ ہیں، باقی نعمتوں کے بارے میں یہ امکان ہے کہ وہ بعض لوگوں کے حق میں مصیبت ہوں اس صورت میں ان نعمتوں کی اخذ ان کے لئے نعمت ہوں گی۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ معرفت ایک کمال ہے، اور اس اعتبار سے ایک نعمت بھی ہے، کیونکہ یہ اللہ کی صفات میں سے ایک صفت ہے۔ لیکن بعض امور میں یہ صفت اس سے متصف شخص کے لئے مصیبت بھی ہو سکتی ہے، اس صورت میں یہی کہا جائے گا کہ اس نعمت کا فقدان یعنی جہالت اسکے حق میں نعمت ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ انسان اپنی موت کے وقت سے ناواقف ہے، اور یہ ناواقفیت اسکے حق میں نعمت ہے، کیونکہ اگر وہ اس بات سے واقف ہو تاکہ اسکی موت کب آئے گی تو زندگی کا سارا الحظ خاک میں مل جاتا ہے، کوئی لمحہ سکون سے نہ گزر پاتا۔ اس طرح لوگوں کے مافی الضمیر پر مطلع نہ ہونا بھی نعمت ہے، کیونکہ اس طرح انسان لوگوں کے ان خیالات سے واقف نہیں ہوتا جو وہ اسکے بارے میں اور اسکے احباب و اقارب کے بارے میں رکھتے ہیں، کیونکہ اگر لوگوں کے خیالات جاننے کی نعمت پاتا تو ساری زندگی عذاب میں گزرتی، اگر وہ لوگ طاقتور ہوتے تو ان سے حسد کرتا اور انتقام نہ لینے کے باعث دل ہی دل میں کڑھتا، اور کمزور ہوتے تو ان سے انتقام لیتا، اور فساد برپا کرنے کا سبب بنتا، اس طرح دوسروں کی مذموم صفات سے واقف نہ ہونا بھی ایک نعمت ہے، کیونکہ اگر تم کسی کی مذموم صفات پر مطلع ہو گئے تو اس سے خواہ مخواہ بغض رکھو گے، اور اسے اپنے روپیے سے تکلیف پہنچاؤ گے، اور اس طرح دنیا و آخرت میں اپنے لئے وبال اور مصیبت کا سبب بنو گے، بلکہ بعض اوقات کسی کی اچھی صفات سے جا مل رہنا بھی ایک نعمت ہے، کیونکہ بعض اوقات آدمی دوسرے کو خواہ مخواہ تکلیف پہنچانا چاہتا ہے، اب اگر وہ شخص دلی ہے اور تم نادانستہ طور پر اسے تکلیف پہنچا رہے ہو تو تم پر اتنا بڑا گناہ نہیں ہے جتنا بڑا گناہ اس وقت ہے جب تم اس کے مرتبہ و مقام سے واقف ہوئے بعد ایدہ پہنچاتے ہو، یہ تو بدیہی بات ہے کہ جو شخص کسی نبی کو اسکے مرتبہ نبوت سے واقف ہونے کے بعد، اور دلی کو اسکے منصب ولایت سے متعارف ہونے کے بعد ایدہ پہنچائے تو اس کا گناہ اس شخص سے زیادہ سنگین ہے جو کسی عام آدمی کو تکلیف پہنچاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قیامت، یلہ القدر، ساعت جمعہ اور بعض کبار کو ہم رکھا ہے، یہ ابہام بھی ایک نعمت ہے، کیونکہ اس طرح تم شب قدر، اور ساعت جمعہ کے فضائل حاصل کرنے میں زیادہ سے زیادہ تنگ و دو کرتے ہو، اور زیادہ سے زیادہ معاصی سے بچتے ہو، جب جل میں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا یہ حال ہے تو علم میں کیا حال ہو گا؟

ہر وجود میں اللہ کی نعمت ہے : ہم یہ بات پہلے بھی بیان کر چکے ہیں کہ ہر وجود میں اللہ کی نعمت موجود ہے یہ ایک حقیقت ہے اور اسکا اطلاق ہر شخص کے حق میں عام ہے اس سے کوئی شخص بھی خارج نہیں البتہ وہ تکلیفیں اس سے مستثنیٰ ہیں جو اللہ تعالیٰ نے بعض لوگوں میں پیدا کی ہیں اگرچہ وہ اپنے اپنے والے کے حق میں نعمت نہیں ہوتیں لیکن دوسرے کے حق میں نعمت ہوتی ہیں جیسے کوئی شخص خود اپنا ہاتھ کاٹ لے یا چوڑھی کر دے اس فعل سے وہ گناہ کا مرتکب بھی ہوگا اور تکلیف بھی پائے گا لیکن اس تکلیف سے دیکھنے والے عبرت حاصل کریں گے اس لئے یہ تکلیف ان کے حق میں نعمت ہوگی کافروں کو دوزخ کا عذاب دیا جائے گا یہ عذاب اگرچہ ان کے حق میں نعمت نہیں ہوگا لیکن فیروں کے حق میں ضرور ہوگا یہ خدا کا قانون ہے کہ وہ ایک قوم کی مصیبت سے دوسری قوم کو فائدہ پہنچاتا ہے بالفرض اگر اللہ تعالیٰ عذاب پیدا نہ فرماتا اور کسی قوم کو اس عذاب میں مبتلا نہ کرتا تو نعمت پانے والے نعمت کی قدر نہ جانتے اور نعمت پا کر خوش ہوتے اہل جنت کی خوشی اس وقت دوچند ہوتی ہے جب وہ اہل جہنم کی تکلیفوں کے بارے میں سوچتے ہیں۔

دیکھو نعمتیں تمام موجودات میں ہیں لیکن ضروری نہیں کہ ہم اہل دنیا ان نعمتوں کی قدر کریں یا انھیں دیکھ کر خوش ہوں چنانچہ ہم سورج کی روشنی پاکر بہت زیادہ خوش نہیں ہوتے کیوں کہ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ روشنی سب کے لئے عام ہے اسی طرح ہمیں تابوں بھرا آسمان دیکھ کر فرحت نہیں ہوتی حالانکہ اسکا خوبصورت منظر ہمارے ان بانحوں کے متاع سے کہیں زیادہ دلفریب حسین اور جاذب نظر ہوتا ہے جنھیں ہم سالہا سال کی محنت سے تعمیر کرتے ہیں کیونکہ ہم یہ جانتے ہیں کہ آسمان کا حسن سب کے لئے عام ہے اس میں کسی کی تخصیص نہیں ہے۔ ہر حال یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کوئی چیز ایسی پیدا نہیں کی جو حکمت سے خالی ہو اور نہ کوئی ایسی چیز پیدا کی ہے جس میں نعمت موجود نہ ہو یا تو وہ نعمت تمام لوگوں کے لئے عام ہوتی ہے یا بعض لوگوں کے لئے مخصوص ہوتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے جو مصیبتیں دنیا میں پیدا کی ہیں وہ بھی نعمت سے خالی نہیں ہیں خواہ وہ مصیبت زدہ کے حق میں ہوں یا فیروں کے حق میں۔ غرضیکہ بعض حالات کو نہ مطلق مصیبت کہا جاسکتا ہے اور نہ مطلق نعمت اس طرح کے حالات میں ہمیں پر مبر اور شکر دونوں واجب ہیں۔ اب اگر تم یہ کہو کہ مبر و شکر دو متضاد کیفیتیں ہیں یہ دونوں جمع کیسے ہو سکتی ہیں اس لئے کہ مبر غم پر ہوتا ہے اور شکر خوشی پر۔ اس کا جواب یہ ہے کہ بعض حالتیں ایسی بھی ہیں جو ایک اعتبار سے خوشی کا اور دوسرے اعتبار سے غم کا باعث ہوتی ہیں اس لئے مبر غم پر اور شکر خوشی پر ہوگا اور دونوں چیزیں ایک ہی شے سے متعلق ہوں گی۔

دنیا کی مصیبتوں کے پانچ پہلو : دنیا کی جتنی مصیبتیں ہیں جیسے فقر مرض اور خوف وغیرہ ان میں پانچ امور ایسے ہیں جن پر غمزدہ انسان کو خوش ہونا چاہیے اور شکر کرنا چاہیے۔

ان میں سے ایک یہ ہے کہ جو مصیبت یا مرض اس وقت نازل ہوا ہے اس سے زیادہ سخت مصیبت اور سنگین مرض بھی ممکن ہے اس لئے کہ اللہ کی تقدیرات میں کسی کو دخل نہیں ہے بالفرض وہ کسی مصیبت کو دو گنا کر دے اور کسی مرض کو پیدھا دے تو کوئی کیا کر سکتا ہے؟ نہ منع کر سکتا ہے اور نہ کاٹ بن سکتا ہے اس لئے یہ سوچ کر شکر کرنا چاہیے کہ اس نے اپنے فضل و کرم سے اس سے بڑی مصیبت نازل نہیں فرمائی۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ یہ مصیبت دنیاوی امور میں نازل ہوئی ہے یہ بھی ممکن تھا کہ کوئی ایسی مصیبت نازل ہوتی جو ہمارے دین میں نقصانات کا باعث ہوتی۔ چنانچہ ایک شخص نے حضرت سل سے عرض کیا کہ چور میرے گھر میں گھس آئے اور مال و متاع لوٹ کر فرار ہو گئے سل نے فرمایا کہ اللہ کا شکر ادا کرو اگرچہ ر کے بجائے شیطان داخل ہوتا اور تمہارے گھر کے بجائے تمہارے دل میں داخل ہوتا اور توحید کو فاسد کر دیتا تب تم کیا کرتے اسی لئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے استغاثہ میں یہ الفاظ کہا کرتے تھے اے اللہ مجھ پر کوئی ایسی مصیبت نہ ڈال جس کا تعلق دین سے ہو حضرت عمر ابن الخطاب ارشاد فرماتے ہیں کہ مجھ پر کوئی ایسی مصیبت نازل نہیں ہوئی جس میں اللہ کی چار نعمتیں نہ ہوں ایک یہ کہ وہ میرے دین میں نہیں ہوتی دوسری یہ کہ مقدار میں اس سے زیادہ نہیں

ہوتی تیری یہ کہ مجھے اس مصیبت پر راضی رہنے سے محروم نہیں کیا جاتا، چوتھی یہ کہ مجھے اس پر ثواب کی توقع رہتی ہے۔ کسی بزرگ کا ایک دوست تھا جسے بادشاہ نے قید خانے میں ڈالوا، اس شخص نے اپنے بزرگ دوست کو اپنی قید کی خبر دی، اور اس سے شکایت کی، بزرگ نے اس سے کہلایا کہ وہ اللہ کا شکر کرے، بادشاہ نے اسے پڑایا، اس نے اپنے دوست کے پاس یہ داستان درد و غم بھی لکھ کر بھیجی، بزرگ نے پھر بھی کہلایا کہ وہ خدا کا شکر ادا کرے، بادشاہ نے ایک مجوسی کو بھی اس کے پاس قید کر دیا، اور دونوں کو ایک زنجیر میں باندھ دیا۔ قیدی نے یہ حالات بھی کہلائی، اور دوست سے اعانت کی درخواست کی، دوست نے پھر شکر ادا کرنے کی نصیحت پر اکتفا کیا، وہ مجوسی دستوں کے مرض میں مبتلا تھا، بار بار رفع حاجت کے لئے جاتا، اور ایک زنجیر میں بندھے ہوئے ہونے کی وجہ سے مجوسی کے ساتھ اسے بھی جانا پڑتا اور جب تک وہ قضاے حاجت سے فارغ نہ ہوتا وہیں کھڑا رہتا، قیدی نے اپنی یہ دنگلدار کیفیت بھی گوش گزار کرانی، جواب بھی ملا شکر کرو، قیدی نے چکر کہلایا، آخر کہاں تک شکر کروں، بزرگ نے اس سے کہلایا ذرا سوچو اگر وہ زنا جو مجوسی کی کمر میں پڑی ہوئی ہے تمہاری کمر میں ہوئی تب کیا ہوتا، اس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی انسان کسی مصیبت میں گرفتار ہو تو اسے سوچنا چاہیے کہ آخر میرے وہ کونسے اعمال بد ہیں جن کی وجہ سے میں اس مصیبت میں گرفتار ہوا ہوں، اگر اچھی طرح غور کیے گا تو یہ چیزیں بھی نکلا کر دیکھ سکے گا کہ وہ مصیبت کے اعمال ہیں جن سے بھارت میں ہوتا ہے، میرا اس سے زیادہ سخت سزا کا حق تھا، میرا یہ سزا کتنا کم ہے، خدا مجھ سے کتنا مہربان ہے، یہ سزا مجھ سے کتنا کم ہے، خدا مجھ سے کتنا مہربان ہے، لیکن ایک ہی ہاتھ کا گناہ کیا، ظاہر ہے اس صورت میں اللہ کا شکر ادا کرنا ضروری ہے، حضرت ابو یزید سلاطی کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ وہ کسی گلی سے گزر رہے تھے کہ اوپر سے کسی نے راکھ کا برتن ان پر الٹ دیا، وہ ناراض نہیں ہوئے، بلکہ اللہ کے حضور سجدہ ریز ہو گئے، لوگوں نے حیرت سے انہیں دیکھا اور انکی وجہ دریافت کی، فرمایا میں تو اس کا شکر تھا کہ اوپر سے آگ برستی، اور مجھے خاکستر کر جاتی، یہاں تو راکھ پر بیت گئی، کیا یہ نعمت نہیں ہے کہ میں اپرا اللہ کا شکر ادا نہ کروں؟ کسی بزرگ نے ان سے درخواست کی کہ نماز استسقاء کے لئے تشریف لے چلیں، فرمایا تم یہ سمجھ رہے ہو کہ پانی برسنے میں تاخیر ہو رہی ہے، میں یہ سمجھ رہا ہوں کہ پھر برسنے میں تاخیر ہو رہی ہے۔

اب اگر کوئی یہ کہے کہ ہم مصیبت پر کیسے خوش ہوں، تو یہ دیکھتے ہیں کہ جو لوگ ہم سے زیادہ گناہ کرتے ہیں وہ پیش و آرام کی زندگی گزارتے ہیں، عفاری کو کہتے، وہ اپنے گھر کے باوجود نعمتیں سمیٹ رہے ہیں، اس کا جواب یہ ہے کہ کفار کے لئے تو اتنا سخت عذاب اور اتنی شدید معیبتیں ہیں کہ تم ان کا تصور بھی نہیں کر سکتے، مگر یہ عذاب قیامت کے دن دیا جائے گا، دنیا میں انہیں اس لئے مہلت دی گئی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ گناہ کر لیں تاکہ طویل عذاب کے مستحق قرار پائیں، قرآن کریم میں ہے :-

اِنَّمَا نَمْلِكُنِي لَهُمْ لِيُبْتَزَّ ذَاكُمُ الْاِنْعَامُ (پ ۳۷ آیت ۸۷)

ہم ان کو صرف اس لئے مہلت دے رہے ہیں تاکہ جرم میں ان کو اور ترقی ہو جائے۔

جہاں تک ان گناہ گاروں کی بات ہے جنہیں تم اپنے سے بڑا گناہ گار سمجھتے ہو تو ہم یہ پوچھتے ہیں کہ یہ بات تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ فلاں شخص کے گناہ تم سے زیادہ ہیں، اللہ تعالیٰ کی ذات میں ہونے والی بدگمانی، سوء ادبی اور اس کی صفات و افعال کے بارے میں برے خیالات کا گناہ اتنا شدید ہوتا ہے کہ اس کے سامنے ظاہری شراب نوشی اور زنا و فحشو کے گناہ ماند پڑ جاتے ہیں، ایسے ہی لوگوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :-

وَلَوْ حَسِبْتُمْ اَنَّكُمْ اَوْ هُوَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمٌ (پ ۸۸ آیت ۱۵)

اور تم اسکو بھلی بات سمجھ رہے تھے حالانکہ وہ اللہ کے نزدیک بہت بھاری بات ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ کوئی شخص یہ نہیں جان سکتا کہ اس کا گناہ معمولی اور دوسرے کا گناہ عظیم ہے، پھر اگر کسی کو اس کے گناہوں کی سزا نہیں مل رہی ہے تو تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو کہ تم میں اور اس میں فرق کیا جا رہا ہے اگرچہ اسے اس فرق کا اختیار ہے وہ جسے چاہے معاف کر دے، جسے چاہے سزا دے ہو سکتا ہے، ہمیں دنیا میں سزا دی جا رہی ہو، اور اسے آخرت میں دی جائے، یہ بھی مقام شکر ہے

کہ تم آخرت کے مواخذے سے بچ گئے یہ مصیبت پر شکر کی تیسری وجہ ہے کہ ہر گناہ کی سزا آخرت تک مؤخر ہو سکتی ہے یہ اللہ کا کرم ہے کہ اس نے دنیا میں مصیبت دے کر اس گناہ کی عطا کی کڑی پھر دنیاوی مصائب تو بعض حالات میں خفیف اور ہلکے بھی ہو جاتے ہیں لیکن آخرت کی عقوبت اول تو دائمی ہوتی ہے دائمی نہ ہو تو اس میں تخفیف نہیں ہوتی۔ دنیا میں نسل کا کچھ نہ کچھ سامان ہو جاتا ہے لیکن آخرت میں اہل مذاب سے نسل کے تمام اسباب منقطع ہو جاتے ہیں اس لئے وہاں تخفیف نہیں ہوگی حدیث سے یہ بھی ثابت ہے کہ جس شخص کو دنیا میں عذاب دیدیا جائے گا اسے آخرت میں نہیں ہوگا چنانچہ ارشاد فرمایا ۔

إِنَّ الْعَبْدَ إِذَا أَذْنَبَ أَصَابَتْهُ شِدَّةٌ أَوْ بَلَاءٌ فِي الدُّنْيَا وَاللَّهُ أَكْرَمُ مِنْ أَنْ يَعْذِبَهُ نَارِيَا
(ترمذی، ابن ماجہ۔ علی)

جب بندہ کوئی گناہ کرنا ہے اور اس پر کوئی شدت یا مصیبت دنیا میں پہنچ جاتی ہے تو اللہ اس بات سے بے نیاز ہے کہ اسے دوبارہ عذاب دے۔

مصیبت پر شکر کی چوتھی وجہ یہ ہے کہ جب کوئی مصیبت نازل ہو تو اس طرح ہوسکتی ہے کہ جس مصیبت میں گرفتار ہوا ہوں وہ لوح محفوظ میں لکھی ہوئی تھی اسے اتنا ہی تھا سو اب ابھی ہے ہو سکتا تھا یہ مصیبت اس سے بڑی ہوتی اس لئے جو نہیں آئی وہ میرے لئے نعمت ہے مجھے اس پر اللہ کا شکر کرنا چاہیے شکر کیا نعمتیں وہ ہیں کہ مصیبت کا ثواب مصیبت سے بڑا ہوا ہے۔

دنیا کے مصائب آخرت کے راستے ہیں

اس لئے کہ دنیا کے مصائب دو وجہ سے آخرت کے راستے ہیں پہلی وجہ وہی ہے کہ جس کی بنیاد پر مریض کو علاج اور کڑوی دوائیں دی جاتی ہیں اور بچوں کو کھیلنے کودنے سے منع کیا جاتا ہے مریض کے حق میں کڑوی دوا نعمت ہے کیونکہ اسی مصیبت کے بعد وہ راحت پاسکتا ہے اسی طرح کھیلنے سے منع کرنا بچے کے حق میں نعمت ہے کیونکہ اگر اسے کھیل کود کی پوری آزادی دی گئی تو وہ علم و ادب سے محروم رہ جائے گا اور تمام عمر نقصان میں رہے گا یہی حال مال، اہل، دھمال، اقارب اور اصحاب و فیوض و چیزوں کا ہے یہ تمام چیزیں انسان کو عزیز ہوتی ہیں بعض دفعہ انسان ان کے باعث ہلاک ہو جاتا ہے حالانکہ محل امتحانی پیش قیمت اور اعلا چیز ہے لیکن اس کی وجہ سے بھی آدمی کو ہلاکت کے مرتلے سے گزرتا پڑتا ہے قیامت کے دن طہرین تمنا کریں گی کہ کاش وہ بھجوں یا بچے ہوتے تاکہ وہ اللہ کہ دین میں اپنی مخلوقوں سے تصرف نہ کراتے ضروری نہیں کہ ان اسباب میں صرف شرم ہو ان میں انسان کے لئے دینی بہتری بھی ہو سکتی ہے اس لئے اگر کوئی شخص اللہ کے ساتھ حسن ظن کے پہلو کو ترجیح دے اور یہ مان لے کہ ان امور میں میرے لئے دین کی بہتری ہے تب بھی ان پر شکر ادا کرنا چاہیے اس لئے کہ اسکی حکمت نہایت وسیع ہے اور بندوں کی مصیبتوں سے ان سے بہتر طریقے پر واقف ہے قیامت کے دن جب بندے یہ دیکھیں گے کہ وہ دنیا میں جن مصائب میں جلا تھے ان پر کج ثواب دیا جا رہا ہے تب شکر ادا کریں گے جس طرح بچہ بلوغ اور شعور کے بعد اپنے استاد اور والدین کا شکر ادا کرتا ہے کہ انہوں نے اسے زود کوب کیا اسے کھیلنے سے روکا اور اسکی تعلیم و تربیت میں سختی اختیار کی ورنہ اگر نرمی سے کام لیتے تو یہ ممکن تھا کہ میں علم و ادب سے محروم رہتا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہونے والی مصیبتیں اور عقوبتیں بھی تادیب کے طریقے ہیں بندوں پر اللہ کی عنایت اور مہربانی اولاد پر والدین کی عنایت اور مہربانی سے کہیں زیادہ مکمل اور دیرپا ہے روایت ہے کہ ایک شخص نے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ مجھے کوئی وصیت فرمائیے آپ نے فرمایا : اللہ کا جو حکم تم پر ہوا ہے اس میں تم اسے مستم نہ کرو (احمد، طبرانی۔ عبادہ) ایک مرتبہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم آسمان کی طرف دیکھ کر کہنے لگے لوگوں نے کہنے کی وجہ دیوافت کی فرمایا مجھے مومن کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر تعجب ہوا جب اس کے حق میں قاضی الہی کا فیصلہ ہوتا ہے تو وہ خوش رہتا ہے اور وہ فیصلہ اسکے حق میں مفید رہتا ہے اور جب غلی کا فیصلہ ہوتا ہے تب وہ راضی رہتا ہے اور یہ فیصلہ بھی اسکے حق میں مفید ہو سکتا ہے دوسری وجہ یہ ہے کہ مملکتِ خطاؤں میں سرپرست دنیا کی محبت ہے اور اسبابِ نجات میں سرپرست یہ ہے کہ دل دنیا کی محبت

سے دور رہے، اگر دنیا کی نعمتیں بلا طلب ملنے لگیں اور ان کے حصول کی راہ میں کوئی مصیبت بھی پیش نہ آئے تو دل دنیا کی طرف مائل ہو جاتے ہیں، اور اس کے اسباب سے مانوس ہو جاتے ہیں، یہاں تک کہ دنیا اس کے حق میں جنت کی طرح ہو جاتی ہے، جب موت آتی ہے اور جدائی کے لمحات قریب آتے ہیں تب دل اس جدائی کی تاب نہیں لایاتا، اور اگر وقتاً فوقتاً مصیبتیں آتی رہیں، پریشانیوں سے ساتھ بڑا رہے تو دل دنیا سے اکتا جاتا ہے، اور وہ اس سے مانوس نہیں ہو پاتا، بلکہ بے درپے حوادث سے دنیا کو قید خانہ تصور کرتا ہے، یہاں سے رخصت ہو ناگوار قید خانے سے رہائی پاتا ہے۔ اسی لئے حدیث شریف میں ہے۔

الدُّنْيَا سِجْنُ الْمُؤْمِنِ وَجَنَّةُ الْكَافِرِ (مسلم ابو ہریرہ) دنیا مومن کا قید خانہ ہے اور کافر کی جنت ہے۔

کافر اس محض کو کہتے ہیں کہ جو اللہ تعالیٰ سے اعراض کرے، اور صرف دنیا کی زندگی کا طالب ہو، اسے پاکر مطمئن، اور اس کی لذتیں پاکر خوش ہو، اور مومن وہ ہے جس کا دل دنیا سے بیگانہ ہو، اور اس تک وہ دلوں میں مصروف ہو کہ کس طرح اس قید خانے سے آزاد ہو جائے، کفر ظاہر بھی ہوتا ہے اور خفی بھی، دل میں دنیا کی جس قدر محبت رہتی ہے اسی قدر شرک خفی بھی رہتا ہے، مومن مطلق وہ ہے جو صرف واحد مطلق کو اپنا محبوب جانے۔

یہ دو بات ہیں جن کی وجہ سے مصیبتوں پر خوشی ہونی چاہیے مصیبتوں پر غم ہونا تو فطری بات ہے، اس کی مثال ایسی ہے جیسے بچے کھانے کی ضرورت پیش آئے، اور کوئی محض تمہارا یہ کام مفت کر دے یا کسی مرض میں کڑوی دوا پینے کی ضرورت پیش آئے، ظاہر ہے بچے کھانے میں بھی تکلیف ہے، اور دوا پینے میں بھی، لیکن اس کے باوجود آدمی بچے لگانے والے، اور طبیب کا شکر ادا کرتا ہے، وجہ اس کی یہی ہے کہ اس مصیبت کے پہلو میں خوشی ہے، یعنی آدمی اپنے مرض سے نجات پاتا ہے، اس لئے بچے کھانا اور دوا کھانا کرمیں خوشی ہوتی ہے وہاں تکلیف بھی ہوتی ہے۔ اسی طرح دنیا کی مصیبتوں کو بھی سمجھنا چاہیے یہ کڑوی دواؤں اور جسم پر عمل جراحی کے مشابہ ہیں، ان سے وقتی طور پر تکلیف ہوتی ہے لیکن انجام میں راحت ملتی ہے۔

دنیا سے رغبت رکھنے والے کی مثال : دنیا سے محبت کرنے والے کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی محض سید تفریح کے لئے شاہی محل میں جائے، اور وہاں کسی خوبصورت عورت کو دیکھ کر دل کھو بیٹھے، اس پر عاشق ہو جائے، اور یہ جانے کے باوجود کہ شاہی محل میں اس کے رہنے کی گنجائش نہیں ہے وہیں فروکش ہو جائے، ظاہر ہے اس کی یہ جسارت معاف نہیں ہو سکتی، محل میں رہنا اسکے لئے مصیبتوں کا باعث بن سکتا ہے، کوئی الوقت وہ آرام سے رہ رہا ہو لیکن انجام کار اسے اس محل سے باہر لگانا ہوگا، تب اس محل میں رہنے کی سزا پائے گا لیکن اگر جانے والے کو دل میں یہ خیال رہے کہ یہ محل ہم جیسے لوگوں کے لئے نہیں بنائے گئے، ہم یہاں نہیں رہ سکتے، اگر رہیں گے تو شہنشاہ کے جلال و عتاب سے محظوظ نہ رہ سکیں گے، ظاہر میں یہ سوچنا اس کے لئے تکلیف دہ ہوگا، اور اس سے زیادہ باعث اذیت بات یہ ہوگی کہ وہ محل کے رنگین نگاروں سے محظوظ نہ ہو سکے گا لیکن یہ تکلیف اسکے حق میں نعمت سے کم نہ ہوگی۔ یہ دنیا بھی ایک مکان کی طرح ہے، اس میں لوگ رحم کے دروازے سے داخل ہوتے ہیں اور لحد کے دروازے سے نکلے ہیں، یہ ایک مارضی قیام گاہ ہے جو محض اس عارضی قیام گاہ سے جس قدر مانوس ہو جاتا ہے اسی قدر وہ انیت اسکے لئے مصیبت کا باعث بنتی ہے، اور جس قدر طبیعت اس سے منحرف رہتی ہے اسی قدر وہ انحراف اسکے لئے نعمت کی صورت اختیار کرتا ہے۔ جو محض اس حقیقت سے واقف ہے وہ مصیبتوں میں بھی نعمتیں تلاش کرتا ہے اور دل پر شکر گزار ہوتا ہے، اور جو ان نعمتوں سے واقف نہیں ہوتا وہ شکر گزار بھی نہیں ہوتا اس لئے کہ شکر نعمت معرفت نعمت کے بعد ہی ممکن ہے، ورنہ مصیبت کو مصیبت سمجھنے والا تو ہر وقت ہونٹوں پر شکوہ سہائے رہتا ہے۔

مصائب پر صبر کی فضیلت : روایت ہے کہ ایک اعرابی نے حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کو ان کے والد حضرت عباسؓ کی وفات پر بطور تعزیت یہ قلعہ لکھ کر بھیجا۔

اَضْبِرْ نَكْنُ يَكْ صَابِرِينَ فَاِنَّمَا صَبْرُ الرَّعِيَةِ بَعْدَ صَبْرٍ لِّرَأْسِ

خَيْرُ قَبِيلٍ الْعَبَّاسِ أَخْرَجَكَ بَعْدَهُ - وَاللَّهُ خَيْرٌ مِنْكَ لِلْعَبَّاسِ
(میرے بچے، ہم بھی آپ کو دیکھ کر میرے کریں گے، اس لئے کہ رعایا کا میرا سوا رکھنے کے میرے بعد ہوتا، حضرت عباسؓ کے بعد آپ کے
میر کا ثواب ان سے بہتر ہوگا، اور اللہ تعالیٰ حضرت عباسؓ کے لئے آپ سے بہتر ہیں۔)

حضرت عبداللہ ابن عباسؓ نے ارشاد فرمایا کہ کسی شخص نے اس سے بہتر شہادت نہیں کی، مصائب پر میرے کرنے کے سلسلے میں بے شمار
روایات ہیں، ایک حدیث میں ہے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :-
مَنْ زُيِّرَ بِاللَّغْوِ خَيْرٌ اِنْصَبَّ مِنْهُ (بخاری، ابوداؤد)

اللہ تعالیٰ جس شخص کی بھلائی چاہتا ہے اسے مصیبت میں مبتلا کرتا ہے۔

ایک حدیث قدسی میں روایت ہے، اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے، کہ جب میں اپنے بندے پر مال، اولاد یا بدن و فیرو میں کوئی
مصیبت ڈالوں تو مجھے قیامت کے دن اس بات سے شرم آتی ہے کہ اس کے لئے ترانہ کھڑی کروں، اور اس کے اعمال اچھے کھلوں، ایک
حدیث میں ہے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس بندے پر مصیبت نازل ہوتی ہے، اور وہ اللہ تعالیٰ کے بتلائے
ہوئے طریقے پر اپنا اللہ و انبیا الیہم اجمعون کہتا ہے، اور یہ دعا کرتا ہے :-

اَللّٰهُمَّ اَحْزَنْنِيْ مِنْ مَّصِيْبَتِيْ وَ اَغْقِبْنِيْ خَيْرًا مِنْهَا

اے اللہ تعالیٰ مجھے میری مصیبت سے نجات دے، اور اس کا بہتر عوض عطا کر۔

تو اس کی دعا قبول ہوتی ہے، اور اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ وہی معاملہ کرتے ہیں، جیسا وہ چاہتا ہے، ایک حدیث میں یہ بھی ہے کہ
اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ میں جس شخص کی دونوں آنکھوں میں لیتا ہوں اسے یہ جزا دیتا ہوں کہ وہ ہمیشہ میرے کمر میں رہے گا
اور میرے دیدار سے مشرف ہوگا۔ روایت ہے کہ ایک شخص نے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا میرا مال
ضائع ہو گیا اور میرا جسم بیماریوں میں گرفتار ہے، سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :-

لَا خَيْرَ فِيْ عَبْدٍ لَا يَنْهَبُ مَالَهُ وَلَا يَسْقُمُ جِسْمَهُ اِنَّ اللَّهَ اِذَا أَحَبَّ عَبْدًا ابْتَلَاهُ وَ اِذَا
ابْتَلَاهُ صَبَّرَهُ (ابن ابی الدنیا، ابوسعید الخدری)

اس بندے میں کوئی خیر نہیں جس کا مال ضائع نہ ہو اور جس کا جسم بیمار نہ ہو، جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کو
محبوب رکھتا ہے تو اسے (مصیبت میں) مبتلا کرتا ہے، اور جب جلا کرتا ہے تو صابر بنا دیتا ہے۔

ایک حدیث میں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا گیا ہے :-
اِنَّ الرَّجُلَ لَيَكُوْنُ لَهُ الدَّرَجَةُ عِنْدَ اللّٰهِ تَعَالٰی لَا يَبْلُغُهَا بِعَمَلٍ حَسَنٍ يَّبْتَليْ بِبَلَاءٍ فِيْ
جَسْمِهِ فَيَبْلُغُهَا بِذَلِكِ (ابوداؤد، محمد ابن خالد)

بندہ کا اللہ کے نزدیک ایک درجہ ہوتا ہے جس پر وہ اپنے عمل سے نہیں پہنچتا یا یہاں تک کہ اسے کسی
جسمانی مصیبت میں مبتلا کر دیا جاتا ہے پھر وہ اس درجے پر فائز ہو جاتا ہے۔

حضرت ابن الاثرؒ روایت کرتے ہیں کہ ہم سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے آپ دیوار کعبہ
کے سائے میں ٹکے سے سہارا لئے ہوئے تشریف فرماتے، ہم نے آپ کی خدمت میں اپنی شکایتیں پیش کیں اور عرض کیا یا رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم! کیا آپ ہمارے لئے اللہ سے دعا نہیں کرتے کہ وہ ہماری مدد فرمائے، آپ اٹھ کر بیٹھ گئے، اور جو ہمارے کھسے سے
سرخ ہو گیا، اسی حالت میں آپ نے ارشاد فرمایا :-

اِنَّ مِنْ كَانَ قَبْلَكُمْ لَيُوْتُنِيْ بِالرَّجُلِ فَيَحْفَرُ لَهُ فِي الْاَرْضِ حَوْفِيْرَةً وَيَجَاءُ

بِالْمِشَارِ فَيُوضَعُ عَلَى رَأْسِهِ فَيَجْعَلُ فِيهِ قَتْنَيْنِ مَا يَصْنَعُ فَمَنْ لَكَ عَنْ دِينِهِ (۱)
 تم سے پہلے لوگ ایسے تھے کہ (ان میں سے) ایک آدمی کو لایا جاتا اس کے لئے کڑھا کھودا جاتا اور آدمی
 لائی جاتی اور سر پر رکھ کر سر کے دو کھوٹے کوئے جاتے تو یہ (مزار بھی) اسے دین سے منحرف نہ کہتی۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ جس شخص کو بادشاہ ظالم قید کر دے اور وہ قید کی حالت میں مر جائے تو
 شہید ہوگا اور وہ شخص بھی شہید ہوگا جسے بادشاہ کی طرف سے اتنی جسمانی سزا دی جائے کہ مر جائے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم
 ارشاد فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ کے احرام اور تعظیم کا تقاضا یہ ہے کہ نہ تم اپنے درد کا شکوہ کرو اور نہ اپنی مصیبت کا ذکر کرو (۲)
 حضرت ابو الدرداء ارشاد فرماتے ہیں کہ تم موت کے لئے پیدا ہوئے ہو تجھ کو بے لئے خیر کرے تم جو چیزیں کھاوے والی ہیں ان کی
 حرص کرتے ہو اور جو چیزیں باقی رہنے والی ہیں انھیں چھوڑتے ہو یاد رکھو یہ تینوں پندرہ چیزیں بہت عمدہ ہیں فقر مرض اور موت
 حضرت انس روایت کرتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ کو کسی بندے کی بھڑکی منظور
 ہوتی ہے اور وہ اسے دوست نانا چاہتا ہے تو اس پر مصائب ڈالتا ہے اور حوادث کی بارگاہ کر دیتا ہے پھر جب بندہ اپنے رب کو پکارنا
 ہے تو ملائکہ کہتے ہیں آواز جانی پہچانی گئی ہے اور جب وہ پکارنا ہے اور کہتا ہے یا رب! اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں اے بندے میں
 حاضر ہوں جو مانگے گا وہ دوں گا اگر میں نے دنیا میں کسی خیر سے محروم رکھا ہے تو یہاں آخرت میں اس سے بہتر عوض دیکھو گے ہوئے
 ہوں جب قیامت کا دن ہوگا تو اہل عمل حاضر ہوں گے ان کے اعمال نماز روزہ صدقہ اور حج وغیرہ تراویح میں تو لے جائیں گے پھر
 وہ لوگ آئیں گے جو دنیا میں مصائب کا شکار رہے تو ان کے لئے نہ ترانہ لگائی جائے گی نہ ان کے اعمال ان کے کھولے جائیں گے بلکہ
 ان کے اوپر اجر و ثواب کی بارش اس طرح ہوگی کہ ہر شخص میں مصائب کی بارش ہوئی تھی اس وقت وہ لوگ جنہیں دنیا میں مالیت ملی
 تھی یہ تمنا کریں گے کہ کاش ان کے جسم فیچہوں سے تراشے جاتے اور جو اجر و ثواب انھیں ملا ہے ہمیں بھی ملتا اسی لئے قرآن کریم
 میں فرمایا گیا (۳)

إِنَّمَا يَوْفَى الصَّابِرُونَ أَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ (پ ۲۷۳ آیت ۵)
 مستقل رہنے والوں کو ان کا صلہ بے شمار ملے گا۔

حضرت عبداللہ ابن عباس سے روایت ہے کہ کسی خطیب نے بارگاہ الہی میں عرض کیا: اے اللہ! بندہ مومن تیری اطاعت کرتا
 ہے تیرے معاصی سے اجتناب کرتا ہے مگر اسے اسکی جزا یہ ملتی ہے کہ دنیا اس سے دور رہا کرتی ہے مصائب اس کے ارد گرد منڈلاتے
 ہیں اور بندہ کافر تیری نافرمانی کرتا ہے تجھ پر اور میرے معاصی پر جرات کرتا ہے اس سے مصیبتیں دور رہتی ہیں دنیا کی دولت اس کے
 قدم چومتی ہے یہ التجاس کہ اللہ تعالیٰ نے وحی نازل فرمائی کہ بندے بھی میرے ہیں اور مصائب بھی میرے ہیں یہ مصیبت زبان حال
 سے میری حمد کرتی ہے بندہ مومن پر میں اس لئے مصیبت نازل کرنا ہوں کہ اس کے گناہوں کا کفارہ بن جائے یہاں تک کہ وہ مجھ سے
 نیکیوں کے ساتھ ملاقات کرے اور میں ان کی جزا دوں بندہ کافر سے مصیبتیں اس لئے دور رکھتا ہوں کہ اگر دنیا میں وہ کچھ نیک عمل
 کر رہا ہے تو رزق میں کشادگی کے ذریعے اسکا اجر ہمیں دیدیا جائے۔ جب وہ میرے پاس آئے تو اس کے پاس صرف گناہوں کا ذخیرہ
 ہو اور میں ان کی سزا دوں ایک روایت میں ہے کہ جب قرآن کریم کی یہ آیت نازل ہوئی :-

وَمَنْ يَعْمَلْ سُوءًا يُجْزَ بِهِ (پ ۵۳ آیت ۵۳)

جو شخص کوئی برا کام کرے گا اسے اس کی سزا دی جائے گی۔

تو حضرت ابو بکر صدیق نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! اس آیت کے بعد کوئی کیسے خوش رہ سکتا ہے آپ نے
 فرمایا: اے ابو بکر! اللہ تمہاری معفرت فرمائے کیا تم تیار نہیں ہو گے کیا تمہیں کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی کیا تمہیں غم نہیں ہوگا یہی
 تمہارے اعمال (بہ) کی جزاء ہے یعنی تمہاری تکلیفیں تیار ہوں اور حزن و غم تمہارے سینات کا کفارہ بن جائیں گے (احمد ترمذی)

(۱) یہ دونوں روایتیں پہلے گورجل ہیں (۲) (ابن ابی الدنیا۔ السنن)

دار قطنی۔ عمر عقبہ ابن عامر سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں، آپ نے ارشاد فرمایا: جب تم کسی شخص کو دیکھو کہ اسے اس کی پسندیدہ چیزیں مل رہی ہیں تو سمجھ لو کہ اسے جھوٹ دی جا رہی ہے، اس کے بعد آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی :-
فَلَمَّا نَسُوا مَا ذُكِّرُوا بِهِ فَتَحْنَا عَلَيْهِمُ ابْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ حَتَّىٰ إِذَا فَرَّجُوا بِمَآئِئًا أَوْ نَوًْا
أَحْنَأْنَا لَهُمْ نَجْعَتًا (آیت ۴۴)
 پھر جب وہ لوگ ان چیزوں کو بھولے رہے جن کی ان کو مصیبت کی جاتی تھی تو ہم نے ان پر ہر چیز کے دروازے کھلا دیے یہاں تک کہ جب ان چیزوں پر جو کہ ان کو ملی تھیں وہ خوب اتر آئے تو ہم نے ان کو نصیب کر دیا

یعنی جب انھوں نے ہمارے احکام پر عمل کرنا ترک کر دیا تو ہم نے ان پر خیر (مال و دولت اور صحت و فیو) کے دروازے کھول دیے پھر جب وہ ہماری عطا پر خوش ہوئے اور مال و دولت پا کر اتر آئے لگے تو ہم نے انھیں اچانک گرفت میں لے لیا (احمد طبرانی، بیہقی) حضرت حسن بھری روایت کرتے ہیں کہ ایک صحابی نے کسی ایک عورت کو دیکھا جسے وہ نہانہ مہالیت سے جانتے تھے انھوں نے کچھ دیر ٹھہر کر اس سے بات چیت کی، اس کے بعد آگے بڑھ گئے، لیکن آگے بڑھتے بڑھتے وہ اچانک مڑنے اور عورت پر ایک نظر ڈال کر پھر آگے بڑھ جاتے یہاں تک کہ ایک دیوار سے ٹکرائے اور چہرے پر ذم کا نشان بن گیا، سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور پورا واقعہ عرض کیا، آپ نے فرمایا :-

إِنَّا رَأَيْنَاكَ مَعْبُودًا خَيْرًا عَجَلًا لَمْ تُعْقِرْ بَعْدَ ذَلِكَ فِي الدُّنْيَا (احمد طبرانی۔ عبد اللہ ابن مسعود مرویاً)

جب اللہ تعالیٰ اپنے بندے کے ساتھ خیر کا ارادہ کرتا ہے تو دنیا ہی میں اس کے گناہ کی سزا دیتا ہے۔

حضرت علیؑ ارشاد فرماتے ہیں کہ میں تمہیں ایک ایسی آیت بتلاتا ہوں جو نہایت امید افزا ہے لوگوں نے عرض کیا بتائیے، آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی :-

وَمَا أَصَابَكُمْ مِنْ مُّصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ يُؤْخَفُ عَنْكُمْ كَثِيرٌ (پ ۲۵، ۵۰ آیت ۳۰)

اور تم کو جو کچھ مصیبت پہنچتی ہے تو وہ تمہارے ہی ہاتھوں کے کئے ہوئے کاموں سے (پہنچتی ہے) اور بہت سے تو درگزر ہی کرتا ہے۔

جیسا کہ ہم پہلے بھی لکھ چکے ہیں کہ مصائب گناہوں کی وجہ سے ہوتے ہیں، جب کسی گناہ کی سزا کے طور پر کوئی مصیبت نازل ہو جاتی ہے تو اللہ اس بات سے بے نیاز ہے کہ مرنے کے بعد اسے دوبارہ عذاب دے، حضرت انسؓ راوی ہیں کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں بندے کے دو گھونٹ بہت زیادہ محبوب ہیں، ایک غصہ کا گھونٹ جو علم کے باعث پیا جائے، دوسرا مصیبت کا گھونٹ جو صبر کے باعث پیا جائے اور نہ کوئی قطرہ دو قطروں سے زیادہ محبوب ہے ایک قطرہ خون جو اللہ کی راہ میں گرتا ہے، دوسرا وہ قطرہ ایک جو رات کی تاریکی میں اور سجدے کی حالت میں بندے کی آنکھ سے ٹپکتا ہے، اور نہ کوئی قدم دو قدموں سے زیادہ محبوب ہے ایک وہ قدم جو فرض نماز کے لئے اٹھے، اور دوسرا وہ قدم جو دو رشتہ داروں میں صلح کرانے کے لئے اٹھے (ابن ماجہ۔ ابن عمر بلفظ آخر) حضرت ابو الدرداءؓ روایت کرتے ہیں کہ حضرت سلیمان ابن داؤد علیہ السلام کے ایک صاحبزادے کی وفات ہوئی، اس کا آپ پر بہت زیادہ اثر ہوا، آپ کے پاس دو فرشتے آئے اور دو زانوں ہو کر سامنے بیٹھ گئے گویا دو حریف ہوں ان میں سے ایک نے عرض کیا کہ میں نے کھیت میں بیج ڈالے تھے، جب بیج اُگ آئے اور کھیتی ہری بھری ہو گئی تو اس نے اپنے قدموں سے تمام پودے روئے ڈالے، آپ نے دعا علیہ سے پوچھا تم کیا کہتے ہو، اس نے عرض کیا کہ میں اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھا، اچانک ایک جگہ راستہ ختم ہو گیا، میں نے اوپر اور دیکھا کہ کہیں راستہ نہ ملا، سوائے اس کے کھیت کے، اس لئے مجبوراً مجھے اس کے کھیت میں سے گزرنا پڑا۔ حضرت سلیمان نے مدی سے دریافت کیا کہ تو نے راستے میں بیج کیوں بوئے، کیا تجھے معلوم نہیں کہ لوگوں کو راستے کی ضرورت ہے، اس نے عرض کیا اگر ایسا ہے تو پھر آپ اپنے بیٹے کی وفات پر اتنے رنجیدہ کیوں ہیں، موت بھی تو آخرت کا راستہ

ہے یہ سن کر حضرت سلیمان علیہ السلام نے جناب باری تعالیٰ میں توبہ کی اور بچے پر مزید غم نہیں کیا۔ موی ہے کہ حضرت عمر ابن عبد العزیز اپنے ایک بیمار صاحبزادے کی پاس تشریف لے گئے اور فرمایا کہ تو میری تراندہ میں ہو میرے نزدیک یہ اس سے بہتر ہے کہ میں میری تراندہ میں ہوں صاحبزادے نے فرمایا کہ جو بات آپ کو پسند ہے وہ مجھے اپنی پسند کے مقابلے میں زیادہ محبوب ہے راوی کہتے ہیں کہ حضرت عمر ابن عبد العزیز کا فشاء یہ تھا کہ اگر تو پہلے مر جائے تو مجھے تجھ پر صبر کرنے کا ثواب ملے گا اور یہ ثواب میرے پلاڑے میں رکھا جائے گا اور میں تجھ سے پہلے مر جاؤں تو میری وفات پر صبر کرنے کا ثواب تجھے ملے گا اور یہ ثواب میرے ہی پلاڑے میں رکھا جائے گا حضرت عمر نے اپنی خواہش ظاہر کر دی بیٹے نے بھی اس خواہش کی تکمیل ہی کو ترجیح دی اور وہی بات پسند کی جو باپ کو پسند

تھی حضرت عبد اللہ ابن عباسؓ کو کسی نے ان کے بیٹے کی وفات کی خبر دی آپ نے ۱۲ سالہ وانا الیہ راجعون پڑھا اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ایک عیب کو چھپایا ایک مشقت سے بچایا اور ایک اجر عطا کیا اسکے بعد آپ اپنی جگہ سے اٹھے اور دو رکعت نماز ادا کی اسکے بعد فرمایا کہ جو حکم ہم سے متعلق تھا وہ ہم بجالائے یعنی ہمیں ایسے موقع پر یہ حکم ہے کہ لا تشیعوا ثوبا لقیبر ولا لثما (میرا اور نماز سے مدد لو) اس لئے ہم نے صبر کیا اور نماز بھی پڑھی حضرت عبد اللہ ابن مبارکؓ کے ایک صاحبزادے کے انتقال پر ایک بخوشی تعویذ کے لئے آیا اور اس نے یہ کہا کہ حلقہ انسان کو آج وہ کام کرنا چاہیے جو بے وقوف آدمی چند روز بعد کرے گا یعنی موت پر خواہی خواہی صبر کرنا ہی پڑتا ہے آج نہیں کرو گے چند دن بعد کرو گے کیوں نہ آج ہی کر لیا جائے ابن المبارکؓ نے ارشاد فرمایا اس شخص نے بڑے بچے کی بات کہی ہے اسکا یہ جملہ لکھ لو۔ ایک عالم فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے پر پے در پے مصیبتیں ڈالتا ہے یہاں تک کہ وہ زمین پر اس حال میں قدم اٹھاتا ہے کہ اس کے ذمے کوئی گناہ باقی نہیں رہتا۔ حضرت فضیل ابن عیاضؒ ارشاد فرماتے ہیں جس طرح تم اپنے گمراہوں کے لئے بھلائی کے کفیل ہوتے ہو اسی طرح اللہ تعالیٰ اپنے بندہ مومن کے لئے مصیبت کا کفیل ہوتا ہے جو اسکے حق میں صلاح ہوتی ہے۔ حضرت حاتم اصمؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن چار طرح کے آدمیوں پر چار طرح سے محبت کرے گا مالداروں پر حضرت سلیمان علیہ السلام سے، خیراء پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے، غلاموں پر حضرت یوسف علیہ السلام سے اور مریموں پر حضرت ایوب علیہ السلام سے۔ حضرت ذکریا علیہ السلام کا قصہ بیان کیا جاتا ہے کہ جب وہ بنی اسرائیل کے خوف سے ایک درخت کے غلاء میں روپوش ہو گئے اور دشمن انھیں تلاش کرتے ہوئے اس درخت تک آپہنچے اور انھیں یہ یقین ہو گیا کہ حضرت ذکریا علیہ السلام اس درخت کے اندر چھپے ہوئے ہیں انھوں نے ایک آہ منگوایا اور درخت کو کاٹنا شروع کر دیا جب آہ حضرت ذکریا علیہ السلام کے سر کے قریب پہنچا تو بے ساختہ جھج اٹھے وحی آئی کہ اگر دوبارہ آواز نکلی تو تہمارا نام انبیاء کی فہرست سے حذف کر دیا جائے گا اس تہدید کے بعد حضرت ذکریا علیہ السلام نے اپنی زبان دانوں تلے دھالی اور یہاں تک ضبط کیا کہ زبان کے دو ٹکڑے ہو گئے حضرت ابو مسعودؓ فرماتے ہیں کہ اگر کسی شخص پر کوئی مصیبت نازل ہو اور وہ ضبط نہ کرائے بلکہ سینہ کو پی کرے یا کپڑے پھاڑے وہ ایسا ہے گویا اس نے اپنے پروردگار سے لڑنے کے لئے حیران ہاتھ میں لے لئے ہوں۔ حضرت لقمان علیہ السلام نے اپنے صاحبزادے سے فرمایا بیٹے سونے کی کسوٹی آگ ہے اور انسان کی کسوٹی مصیبت ہے جب اللہ کسی قوم سے محبت کرتا ہے تو اسے آزمائش میں ڈال دیتا ہے جو اس آزمائش میں ثابت قدم رہتے ہیں ان سے خوش ہوتا ہے اور جن کے پاؤں میں لغزش آجاتی ہے ان سے ناراض ہوتا ہے احسان ابن قیسؒ فرماتے ہیں کہ ایک دن میری ڈاڑھ میں شدید تکلیف تھی میں اس تکلیف کے باعث رات بھر سو نہیں پایا صبح اٹھ کر میں نے اپنے پیچھے سے کہا کہ رات میں ڈاڑھ کے درد کی وجہ سے سو نہیں پایا یہ بات میں نے تین بار کہی پچھانے فرمایا تمہیں ایک رات تکلیف رہی تم نے اسکا بار بار ذکر کیا میری یہ آنکھ تیس سال پہلے ضائع ہوئی تھی لیکن آج تک کسی کو علم نہیں کہ مجھ پر کیا گزری ہے اللہ تعالیٰ نے حضرت عزیر علیہ السلام پر وحی نازل فرمائی کہ جب تم پر کوئی مصیبت نازل ہو تو تم میری شکایت میرے بندوں سے مت کرنا میں بھی تو تمہاری شکایت اپنے بندوں سے نہیں کرتا جب تمہارے گناہ اور محبوب میرے سامنے آتے ہیں۔

(۱) یہ حدیث کتاب الدعوات میں گزر چکی ہے

لحاتی کیفیت اور وقتی حالت کا عکاس ہے، اس لئے اگر تم عشاق خدا کی زبان سے اس طرح کی باتیں سنو تو انہیں عاشقانہ کلام پر محمول کرو، ان کی باتیں سننے میں اچھی لگتی ہیں، لیکن وہ حقیقت سے بعید ہوتی ہیں، ایک نرفاختہ کا قصہ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ اپنی مادہ سے صحبت کرنا چاہتا تھا مگر وہ انکار کر رہی تھی نرفاختہ نے اس سے کہا کہ تو کیوں انکار کرتی ہے اگر میں چاہوں تو تیرے لئے حضرت سلیمان علیہ السلام کی سلطنت زیر و زبر کر دوں، حضرت سلیمان علیہ السلام نے فاختہ کی یہ گفتگو سنی تو اسے بلایا، اور ڈانٹ پلائی، فاختہ نے عرض کیا اے اللہ کے نبی! عشاق کی گفتگو قابل اعتبار نہیں ہوتی، آپ اس کا اثر نہ لیں، یہ ایک حقیقت ہے، اکثر عشاق بذب و سرمستی کے عالم میں ایسی باتیں کہہ جاتے ہیں کہ ہوش میں ہوں تو ہرگز نہ کہیں۔ ایک شاعر کہتا ہے۔

أَرِنْدُو صَالِمًا مَوَدِّرَ نَدْبِ جَبْرِئِ فَأَنْتَرُكُمْ مَالًا نَدْبِ مَائِرِ نَدْبِ

(میں اسکا وصال چاہتا ہوں اور وہ میری جدائی چاہتا ہے۔ اس لئے میں اسکی خواہش کے لئے اپنی خواہش ترک کرتا ہوں)۔

یہ ایک محال بات ہے، اس لئے کہ شاعر نے پہلے وصال کی خواہش کی، پھر محبوب کے ارادے کو اپنی خواہش بنالیا، حالانکہ دونوں خواہشیں ایک دوسرے کی ضد ہیں، جو وصال کا آرزو مند ہو گا، وہ جدائی کی خواہش کیسے کرے گا۔ تاہم اگر اس کلام کی دو تاویلیں کی جائیں تب اسے صحیح تسلیم کیا جاسکتا ہے، ایک تو یہ کہ مصورت بعض حالات میں پیش آتی ہو، اور مقصد یہ ہو کہ اس طرح محبوب کی رضا حاصل کر لی جائے، اس طرح مستقبل میں اسکا وصال بھی ہو سکتا ہے، اس صورت میں جدائی رضامندی کا وسیلہ ہے، اور رضا مندی وصال محبوب کا ذریعہ ہے، اور جو چیز محبوب کا وسیلہ ہوتی ہے وہ خود بھی محبوب ہوتی ہے، اسکی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص دو درہم کے وعدے پر ایک درہم چھوڑ دے، حالانکہ اسے ایک درہم سے بھی محبت ہے، مگر وہ اسے چھوڑنے پر رضامند ہے، اسی طرح عاشق بھی وصال کا آرزو مند ہے، مگر فی الحال معشوق کی خواہش کے احترام میں وہ یہ وصال ترک کرنے پر راضی ہے، کیونکہ اسے توقع ہے کہ مستقبل میں حاصل ہونے والا وصال مکمل اور پائیدار ہو گا، دوسری تاویل یہ ہے کہ عاشق کو صرف محبوب کی رضا مقصود ہے، وصال وغیرہ اسے کوئی غرض نہیں، اگر اسے یہ معلوم ہو جائے کہ اسکا محبوب اس سے راضی ہے تو اسے وہ لذت ملتی ہے جو دیدار میں بھی نہیں ملتی، اس لئے وہ ایسے کام کرتا ہے جس سے اس کا محبوب خوش ہو، اگر اس کی خوشی بھر میں ہے تو وہ اسے بھی محبوب کا تحفہ سمجھ کر قبول کر لیتا ہے۔ اسی لئے بعض عاشقان خدا کی حالت یہ تھی کہ وہ مصائب میں گرفتار ہو کر خوش رہتے تھے، اور تکالیف میں لذت پاتے تھے، کیونکہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ یہ تکلیفیں اور مصیبتیں اللہ کی رضامندی پر دلالت کرتی ہیں، غلبہ عشق میں اس مرحلے کا آنا بعید نہیں ہے، لیکن یہ مرحلہ بہت مختصر ہوتا ہے، یہ حالت زیادہ دیر تک طاری نہیں رہتی، اور اگر یہ دیر تک رہ جاتی ہے تو پھر صحیح حالت مشتبه ہو جاتی ہے، اور یہ معلوم کرنا مشکل ہو جاتا ہے، کہ اس حالت نے دل کو اعتدال سے منحرف کر دیا ہے، یا وہ اپنی جگہ پر قائم ہے، یہ ایک الگ بحث ہے، اس کی تحقیق اپنی جگہ ذکر کی جائے گی، یہاں اس کی گنجائش نہیں ہے، یہاں صرف یہ موضوع زیر گفتگو ہے کہ عافیت مصیبت سے بہتر ہے، ہم اللہ تعالیٰ سے دین و دنیا میں محمود عافیت کے طالب ہیں۔

صبر افضل ہے یا شکر؟

جاننا چاہیے کہ اس سلسلے میں مختلف لوگوں کے مختلف اقوال ہیں، بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ صبر شکر سے افضل ہے، بعض کی رائے یہ ہے کہ شکر افضل ہے، بعض کہتے ہیں کہ یہ دونوں برابر ہیں، کچھ لوگ کہتے ہیں ان کی فعلیت احوال کے اختلاف پر مبنی ہے، بعض حالات میں شکر افضل ہے، اور بعض میں صبر، پھر ہر فرقہ نے استدلال میں کچھ ایسی گفتگو کی ہے کہ اس میں پیدا اضطراب ہے، اور مقصد سے نہایت بعید ہے۔ اس لئے ہم یہاں ان کے دلائل نقل کرنے کے بجائے حق بات عرض کرتے ہیں، اس سلسلے میں دو بحثیں ہیں۔

پہلی بحث عوامی : یہ بحث تسامیل کے طور پر ہے، یعنی اس میں صرف ظاہر اسرار نظر کی جاتی ہے، تلاش حقیقت مقصود نہیں ہوتی، اس بحث میں ہمارے مخاطب عوام ہیں، کیونکہ ان کی عقلیں قاصر و قائل اور مبہم حقائق کی متحمل نہیں ہو سکتیں، دافین بھی اسی کلام پر اعتماد کر سکتے ہیں، کیونکہ وہ بھی عوام سے خطاب کرتے ہیں، اور ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ان کی اصلاح ہو جائے، وہ لوگ سدھریا میں، جیسے دارمہوان اپنے بچے کی پرورش چکے، پچھلے دودھ سے کھتی ہے، اسے مرغی غذا میں، اور انواع و اقسام کے کھانے نہیں کھلاتی، مناسب یہی ہے کہ وہ یہ غذا میں بچے کو کھلاتا تو کھا سکے پاس بھی نہ لائے مبادا وہ چکھ لے اور بیمار ہو جائے، یا ہلاک ہو جائے، یہ غذا میں وہ اسی وقت مبہم کر سکتا ہے جب اس کا ضعف دور ہو جائے گا اور وہ جسمانی طور پر تندرست و توانا ہو جائے گا اسی طرح یہ بحثیں بھی عوام کے لائق نہیں ہیں، انہیں تو صرف وہ باتیں بتلانی چاہیں جو شرعی دلائل سے مفہوم ہوتی ہیں۔

جہاں تک ظاہر کا تعلق ہے اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مبرا افضل ہے، اگرچہ شکر کے فضائل بھی بے شمار ہیں لیکن جب ان کا مبرا کے فضائل سے مقابل کرتے ہو تو معلوم ہوتا ہے کہ فضائل مبرا کے زیادہ ہیں، اور بعض روایات میں اسکی صراحت بھی موجود ہے کہ مبرا افضل ہے، جیسا کہ ایک حدیث میں ہے :-

مِنْ أَفْضَلِ مَا لَوْ تَبَيَّنَ الْيَقِينُ وَعَزَّ نِعْمَةُ الصَّبْرِ

جو افضل چیزیں تھیں عطا کی گئی ہیں ان میں یقین اور مبرا کے عزیمت ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ قیامت کے دن دوئے زمین کے استغاثی شکر گزار بندے کو بلایا جائے گا اور اسے شاکرین کے ثواب سے نوازا جائے گا، پھر اس شخص کو بلایا جائے گا جو دوئے زمین پر سب سے زیادہ صابر ہوگا اور اس سے پوچھا جائے گا کہ اگر تجھے شاکر کے برابر ثواب عطا کیا جائے تو کیا تجھے منظور ہے، وہ عرض کرے گا بے شک منظور ہے، ارشاد ہوگا، ہرگز نہیں! ہم نے تجھ پر نعمت نازل کی تو تو نے شکر کیا اور تجھے مصائب میں مبتلا کیا کیا تو مبرا کیا ہم تجھے دو گنا ثواب عطایت کریں گے، پھر اسے دو گنا ثواب عطا کیا جائے گا (۱) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :-

أَنَّمَا يُوقِى الصَّابِرُونَ أَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ (پ ۱۲۳ آیت ۱۰) مبرا کرنے والوں کو انکا اجر بے حساب ملے گا۔

ایک حدیث میں ہے :-

الْطَّاعِمُ الشَّاكِرُ يَمْنَنُ لَوِ الصَّائِمِ الصَّابِرِ (ترمذی، ابن ماجہ، ابو ہریرہ)

کھانے والا شکر گزار بندہ مبرا کرنے والے روزہ دار کے برابر ہے۔

اس حدیث سے بھی صابر کی فضیلت ثابت ہوتی ہے، کیونکہ اس میں شکر کا درجہ مبرا سے تشبیہ دے کر بڑھایا گیا ہے، تشبیہ میں عموماً یہ ہوتا ہے کہ شبہ بہ شبہ سے افضل ہوتا ہے، اس لئے اگر مبرا افضل نہ ہوتا تو شکر کو اسکے ساتھ تشبیہ نہ دی جاتی، یہ تشبیہ ایسی ہے جیسی ان روایات میں وارد ہے۔

الْجُمُعَةُ حَجَّ الْمَسَاكِينِ وَجَهَادُ الْمَرْأَةِ حُسْنُ التَّبَعْلِ (عارف بن ابی اسامہ۔ ابن عباس)

جمعہ مساکین کا حج ہے، اور عورت کا جہاد ہے کہ اپنے شوہر کے ساتھ اچھی طرح رہے۔

شَارِبُ الْخَمْرِ كَعَابِدِ الْوَثْنِ (عارف بن ابی اسامہ۔ عبد اللہ ابن عمر)

شراب پینے والا بتوں کی عبادت کرنے والا جیسا ہے۔

ایک حدیث میں ہے :-

الصَّبْرُ نِصْفُ الْإِيمَانِ (۲) مبرا نصف ایمان ہے۔

لیکن اسکا مطلب یہ نہیں کہ شکر کا حال بھی یہی ہے، اسے بھی ایمان کہا جائے گا، بلکہ یہ فرمانا، ایسا ہے کہ اس حدیث

شَرَفٌ فِي فَرَايَا كَمَا :- الصَّبْرُ نِصْفُ الصَّبْرِ (۳)

(۱) اس حدیث کی اصل مجھے نہیں ملی (۲) یہ روایت پہلے گزر چکی ہے (۳) یہ روایت پہلے گزر چکی ہے

روزہ نصف ایمان ہے۔

اس سلسلے میں اصل یہ ہے کہ جس چیز کی دو قسمیں ہوتی ہیں ان میں سے ایک کو اس چیز کا نصف کہہ دیتے ہیں، اگرچہ دونوں میں فرق ہو، مثلاً کہتے ہیں ایمان علم و عمل کا نام ہے، اس سے معلوم ہوا کہ عمل نصف ایمان ہے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ علم اور عمل دونوں درجے میں برابر ہیں۔ ایک حدیث میں ہے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ انبیاء علیہم السلام میں سے حضرت سلیمان علیہ السلام اپنی سلطنت کی وجہ سے سب کے بعد جنت میں داخل ہوں گے، اور میرے اصحاب میں سے عبدالرحمن ابن عرف اپنی مالداری کے باعث سب کے آخر میں جنت میں جائیں گے، (طبرانی۔ معاذ ابن جبل) ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام تمام انبیاء علیہم السلام کے چالیس برس بعد جنت میں جائیں گے (ابو منصور دہلی۔ الس ابن مالک) یہ مالداروں کا حال ہے، دوسری طرف فقراء اور معیبت زدوں کے متعلق ارشاد فرمایا کہ جنت کے تمام دروازوں میں دو دو کواڑ ہیں مگر میرے دو دروازے میں صرف ایک کواڑ ہے، اس دروازے سے سب سے پہلے اہل معیبت جنت میں جائیں گے اور حضرت ابوب علیہ السلام ان کے قائد ہوں گے۔ فخری فضیلت میں جو کچھ وارد ہے اس سے بھی مبرکی فضیلت ثابت ہوتی ہے، اس لئے کہ فقر مبر کا حال ہے، اور مالدار شکر کا حال ہے، یہ جو کچھ عرض کیا گیا ہے عوام اس پر قناعت کر سکتے ہیں، اور ان کے شایان شان بھی یہی ہے کہ وہ اس مختصر بیان پر اکتفا کریں جس میں ان کے دین کی بھلائی ہو۔

استدلال کا دو سرا رخ : دو سرا بیان ارباب بصیرت اور اہل علم کے لئے ہے اس بیان سے انھیں بطریق کشف حقائق امور پر مطلع کرنا مقصود ہوتا ہے، اس ذیل میں ہم یہ کہتے ہیں کہ اگر دو امر ہم ہوں تو ابہام کی موجودگی میں ان دونوں کے اندر موازنہ نہیں ہو سکتا جب تک کہ ان دونوں میں سے ہر ایک کی حقیقت واضح نہ ہو، اور اگر وہ حقیقت واضح ہو جائے چند قسموں پر مشتمل ہوں تو ان میں بحیثیت مجموعی موازنہ ممکن نہیں، بلکہ ضروری ہے کہ ان قسموں کے ایک ایک فرد کا موازنہ کیا جائے تاکہ زیادتی اور رجحان واضح ہو سکے اس اصولی گفتگو کی روشنی میں مبر اور شکر پر نظر ڈالئے، ان میں سے ہر ایک کی بے شمار اقسام اور فروغ ہیں اس لئے ان دونوں میں کمی اور زیادتی جملہ ایمان نہیں کی جاسکتی، بلکہ دونوں کے ہر فرد کا مقابلہ ضروری ہے۔

صبر و شکر وغیرہ مقامات کے افراد : یہ بات پہلے بیان کی جا چکی ہے کہ مبر و شکر وغیرہ مقامات کے تین افراد ہیں، علوم، احوال اور اعمال، اگر ان تینوں افراد میں موازنہ کیا جائے تو ظاہر میں محض یہی کہہ گا کہ علوم سے احوال مقصود ہیں اور احوال سے مقصود ہیں، اس لئے ان تینوں میں اعمال افضل ہیں۔ اہل بصیرت کی رائے اس کے بالکل برعکس ہے وہ یہ کہتے ہیں کہ اعمال سے احوال کے لئے غرض ہے، اور احوال علوم کے لئے مقصود ہیں، ان کے نزدیک علوم کو ترجیح حاصل ہے، علوم کے بعد احوال ہیں، اور احوال کے بعد اعمال ہیں، اس لئے کہ جو چیز کسی دوسری چیز کے لئے مقصود ہوتی ہے وہ یقینی طور پر افضل ہوتی ہے جہاں تک ان تینوں کے افراد و آحاد کا تعلق ہے وہ کبھی مساوی ہوتے ہیں اور کبھی متفاوت، یہ مساوات اور تفاوت اس وقت نمایاں ہوتا ہے جب ان افراد و آحاد میں سے بعض کی نسبت بعض کی طرف جاتی ہے، یہی حال احوال اور علوم کا ہے۔

معارف کی کونسی قسم افضل ہے : معارف میں علوم مکاشفہ علوم معاملہ سے افضل ہیں، بلکہ علوم معاملہ معاملہ سے کمتر ہیں کیونکہ یہ علوم معاملے کے لئے مقصود ہیں، اور ان سے اصلاح عمل کا قاعدہ حاصل کیا جاتا ہے۔ حدیث شریف میں عالم کو عابد سے افضل کہا گیا ہے، اس سے مراد وہ عالم ہے جس کے علم کا نفع عام ہو ایسا عالم یقیناً کسی خاص عبادت کرنے والے کی بہ نسبت افضل ہو گا، ورنہ کسی کا علم عمل سے خالی ہے تو وہ محض علم سے اچھا نہیں ہو سکتا۔

اصلاح عمل کا قاعدہ یہ ہے کہ قلب کے احوال کی اصلاح ہو، اور قلب کی اصلاح کا قاعدہ یہ ہے کہ اس پر اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات اور افعال کا جمال منکشف ہو، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ علوم مکاشفہ میں اللہ تعالیٰ کی معرفت افضل ہے، معرفت الہی عبادت

مقصود ہے، اور اپنی ذات سے مطلوب ہے اس لئے کہ سعادت اخروی اسی کے ذریعے حاصل کی جاتی ہے، بلکہ یہی عین سعادت ہے، مگر دل کو بعض اوقات دنیا میں یہ احساس نہیں ہوتا کہ اللہ تعالیٰ کی معرفت میں سعادت ہے بلکہ آخرت میں اس کا علم ہوتا ہے۔ بہر حال معرفت الہی تمام معارف میں افضل و اعلا ہے، اس پر کوئی رکاوٹ نہیں ہے، اور نہ یہ فیر کے ساتھ مقید ہے، جب کہ یہ تمام معرفتیں اس کے تابع اور خادم ہیں، یہ معارف اس لئے مطلوب ہوتے ہیں کہ ان کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کی جائے۔ جب یہ حقیقت سامنے آگئی کہ تمام معرفتیں معرفت الہی کے لئے مطلوب اور مقصود ہیں تو یہ دیکھا جائے گا کہ معرفت الہی کے حصول میں کون سی معرفت کس قدر مفید اور معاون ہے۔ جو معرفت جس قدر معاون ہوگی اسی قدر وہ دوسری معرفت سے فضیلت میں متفاوت ہوگی، چنانچہ بعض معارف اور معرفت الہی میں ایک واسطہ اور بعض میں بہت سے واسطوں کی ضرورت پیش آتی ہے، اس لئے جس معرفت میں واسطے کم ہوں گے اسی قدر وہ معرفت دوسری معرفتوں سے افضل ہوگی۔

احوال قلب کی کیفیت : احوال قلب سے ہم قلب کے وہ احوال مراد لیتے ہیں جو مخلوق کے مشاغل، اور دنیا کی کدورتوں سے قلب کی تطہیر کر دیں، یہاں تک کہ جب قلب بالکل پاک و صاف ہو جائے تو اس پر حق کی حقیقت منکشف ہو اس سے معلوم ہوا کہ احوال قلب میں اسی قدر فضیلت ہوگی جس قدر وہ قلب کے تزکیہ و تطہیر میں مؤثر ہوں گے، اور جس قدر اس میں انکشاف حق کی صلاحیت پیدا کریں گے، قلب کی مثال آئینہ کی سی ہے، جس طرح آئینے کو میٹل کرنے اور چمکانے سے پہلے کچھ احوال واقع ہوتے ہیں، جن میں بعض احوال آئینے کو زیادہ چمکاتے ہیں، اور بعض کم، یہی حال دل کا ہے، اس لئے جو حالت قلب کے صحنے میں زیادہ قریب ہوگی اسی قدر وہ دوسری حالتوں سے افضل ہوگی، کیونکہ وہ حالت اصل مقصود ہے زیادہ قریب ہوتی ہے، اعمال میں بھی اس ترتیب کا لحاظ کیا جائے گا، اعمال ہی سے قلب کا تصفیہ یقینی ہوتا ہے اور انہی کی بدولت قلب پر احوال طاری ہوتے ہیں۔

عمل۔ معصیت یا طاعت : اعمال دو حال سے خالی نہیں، یا تو وہ دل پر ایسے احوال طاری کرتے ہیں جو علوم مکاشفہ کے لئے مانع ہوں، اور جن سے دل پر تاریکی چھا جائے، اور اس میں کمزوریات کی خواہش اور رغبت پیدا کریں، یا ایسے احوال طاری ہوتے ہیں جن سے دل میں علوم مکاشفہ کی صلاحیت اور استعداد پیدا ہو جائے، دنیاوی کدورتوں، آلائشوں، اور مخلوق کے علائق سے اس کا تعلق منقطع ہو جائے، پہلی قسم کی احوال کا نام معصیت ہے، اور دوسری قسم کے احوال کو طاعت کہتے ہیں، پھر معاصی اور طاعات دونوں اپنے اپنے اثرات میں مختلف اور متفاوت ہیں، بعض معاصی دل کو زیادہ تاریک اور زیادہ سخت بناتے ہیں، اور بعض کم اسی طرح بعض طاعات سے دل زیادہ روشن اور محلی ہوتا ہے اور بعض سے کم، گویا معاصی اور طاعات کے درجات میں تفاوت ان کے اثرات کے تفاوت پر مبنی ہے، اور یہ تفاوت احوال کے اختلاط سے ظہور پذیر ہوتا ہے۔ مثلاً ہم یہ کہتے ہیں کہ نفل نماز تمام نفل عبادتوں سے افضل ہے، اور صبح کی عبادت صدقہ سے بہتر ہے، اور تہجد کی نماز دوسری نمازوں سے اعلا ہے، لیکن تحقیقی بات یہ ہے کہ جس شخص پر مال کی محبت اور نفل غالب ہو، اور وہ ایک درہم اللہ کی راہ میں خیرات کرے، اس کا یہ عمل بہت سی شب بیداریوں اور روزوں سے افضل ہے، اس لئے کہ روزے اس شخص کے لئے موزوں ہیں جس پر شہوت غلبہ غالب ہو اور وہ اس کا خاتمہ چاہتا ہو یا جسے حکم سیری نے ذکر و فکر سے روک دیا ہو اور وہ بھوک کے ذریعے اس سے مملو ہونے کا خواہشمند ہو، بخیل کا یہ حال نہیں ہے، وہ دوسرے عرض میں جتا ہے اس کا علاج بھوک سے نہیں بلکہ صدقہ و خیرات کے ذریعے ہوگا، اس پر ہیبت کی شہوت غالب نہیں ہے، اور نہ وہ کسی ایسے فکر میں مشغول ہے جس سے حکم سیری مانع ہو، پھر اس کا روزے رکھنا اپنی حالت ترک کر کے دوسرے ہی حالت اختیار کرنے کے مشابہ ہے، اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی شخص کے پیٹ میں درد ہو اور وہ سر کے درد کی دوا کرے، یقیناً اسے اس علاج سے کوئی فائدہ نہ ہوگا، اسکے لئے تو اس ملک بیمار یا معصیت کا قلع قمع کرنا ضروری ہے جو اس پر بلائے ناگمانی کی طرح مسلط ہو گئی ہے۔ نفل ایک سنگین اور ملک مرض ہے، اگر کوئی شخص مسلسل سو سال تک روزے رکھے اور ہزار راتیں سجدے میں گزارے تو اس مرض کا ایک ذرہ بھی کم نہ ہو، اس کا علاج صرف مال نکالنا ہے، بخیل کو چاہیے کہ وہ جو کچھ اسکے پاس ہے اسے اللہ کی راہ میں دے ڈالے۔ احیاء العلوم جلد

سوم کے متعلقہ باب میں ہم صدقہ و خیرات کے ذریعے بھل کے علاج پر مفصل کلام کہ چکے ہیں۔

اس مثال کے ذریعے یہ بات واضح ہو چکی ہے اور اطاعات کی تاخیر حالات کے اختلاف سے مختلف ہوتی ہے اہل بصیرت یہ بات جان چکے ہیں کہ افضلیت وغیرہ کی بحث میں مطلق جواب کسی بھی طرح صحیح نہیں ہے بلکہ سراسر غلط ہے مثلاً اگر تم سے یہ پوچھا جائے کہ روٹی افضل ہے یا پانی تم کے افضل کو گے ظاہر ہے روٹی بھوکے کے لئے افضل ہے اور پانی پیاسے کے لئے افضل ہے اگر بھوک اور پیاس دونوں موجود ہوں تو یہ دیکھا جائے گا کہ ان دونوں میں سے کون سی حالت غالب ہے اگر پیاس زیادہ غالب ہے تو پانی افضل ہے اور بھوک غالب ہے تو روٹی افضل ہے اور اگر بھوک اور پیاس دونوں برابر ہیں تو روٹی اور پانی میں بھی افضلیت کا سوال بیکار ہے یہ دونوں بھی برابر ہوں گے۔ اسی طرح اگر یہ سوال کیا جائے کہ سنگین افضل ہے یا صغیر ای ماڈے کا عدم وجود؟ تب ہم اسکے جواب میں قطعیت کے ساتھ یہ بات کہیں گی کہ صغیر ای ماڈے کا نہ ہونا بہتر ہے اس لئے کہ صغیر کے مرض میں گرفتار شخص ہی کو سنگین کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ مسئلہ اصول ہے کہ جو چیز غیر کے لئے مطلوب ہوتی ہے تو غیر اس سے افضل ہوتا ہے۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ مذکورہ شخص کے لئے مال کا خیرات کرنا بہتر ہے کیونکہ مال خیرات کرنا ایک عمل ہے اس سے دل میں ایک حالت پیدا ہوتی ہے جسے ہم بھل کا ذوال اور دنیا کی محبت کا دل سے نکلنے کا عمل کہہ سکتے ہیں پھر جب دل سے بھل زائل ہو جاتا ہے اور دنیا کی محبت نکل جاتی ہے تو اس میں معرفت الہی کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور اسکے بعد عمل کا نمبر آتا ہے۔

ایک اعتراض کا جواب : اب اگر کوئی شخص یہ کہے کہ تم نے عمل کا درجہ آخری رکھا ہے حالانکہ کتاب و سنت میں اعمال کی ترقیب موجود ہے اور ان کے فضائل میں بے شمار آیات و روایات وارد ہیں۔ یہاں تک کہ خود رسالت اب سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقات طلب فرمائے اور علی الاعلان یہ ترقیب دی نہ

مَنْ ذَا الَّذِي يُقْرِضُ الْفَقِيرَ ضَاحِكًا (پ ۱۲۲ آیت ۲۳۵)

کون شخص ہے ایسا جو اللہ تعالیٰ کو اچھے طور پر قرض دے۔

ایک جگہ ارشاد فرمایا نہ

وَأَخْذُ الصَّدَقَاتِ (پ ۲۱۸ آیت ۲۴۳)

اور وہی صدقات کو قبول کرنا ہے۔

ان ترقیبات اور فضائل کی موجودگی میں تم اعمال کی افضلیت کا انکار کیسے کر سکتے ہو؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر ڈاکٹر کسی دوا کی تعریف کرے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ دوا ہر حال میں بہتر ہے یا وہ اپنی ذات سے مقصود ہے یا اس شفاء اور صحت سے افضل ہے جو اس دوا کے استعمال سے حاصل ہوئی ہے۔ ڈاکٹر دوا کی تعریف اس لئے کرتا ہے کہ تاکہ مریض کو ترقیب ہو اور وہ اسکے استعمال سے صحت حاصل کرے یہی حال دل کے اعمال کا ہے یہ دل کی بیماریوں کی دوا ہیں اور دل کی بیماریاں محسوس نہیں ہوتیں جیسے کسی کے چہرے پر برص کے داغ ہوں اور اسکے پاس آئینہ نہ ہو تو اسے خبر ہی نہیں ہو پاتی کہ میں کس مرض میں مبتلا ہو گیا ہوں اگر کوئی شخص اسے اس کے عیب سے آگاہ کرے گا تو تسلیم نہیں کرے گا ایسے شخص کا علاج یہی ہے کہ اس کے سامنے ان دواؤں کی تعریف میں بے حد مبالغہ کیا جائے جن سے برص کی داغ دور ہوتے ہیں مثلاً اگر عرق گلاب میں یہ وصف ہو تو اسکی بے پناہ تعریف کی جائے اور مریض کو ترقیب دی جائے کہ وہ عرق گلاب سے اپنا چہرہ بار بار دھوئے تاکہ بہت زیادہ تعریف کرنے سے اسکے دل میں ترقیب پیدا ہو اور وہ عرق گلاب سے چہرہ دھونے پر مداومت کر لے اور اس کا مرض دور ہو جائے۔ اگر اس سے پہلے ہی مرطے میں یہ کہہ دیا گیا کہ عرق گلاب برص کے ازالے میں مؤثر ہے اور میرے چہرے کے داغ اسی سے دور ہو سکتے ہیں تو وہ سختی سے اس بات کی تردید کرے گا کہ میرے چہرے پر برص کے داغ ہیں۔

اس سے بھی قریب تر ایک مثال ہے مثلاً ایک شخص نے اپنے بیٹے کو قرآن کریم کی تعلیم دی ہے اور اسے علم کے زیور سے

آراستہ کیا ہے، اب وہ یہ چاہتا ہے کہ جو علوم اس نے حاصل کئے ہیں وہ اسکے پاس محفوظ رہیں، لیکن وہ بیٹے کا مزاج آشنا ہے اور یہ جانتا ہے کہ اگر میں نے بار بار مطالعہ تکرار اور اعلیٰ کی نائید کی تو وہ یہ کہہ گا کہ مجھے اس کی ذرا ضرورت نہیں ہے کیونکہ جو علوم میں نے حاصل کئے ہیں وہ میرے سینے میں محفوظ ہیں، باپ حکمت عملی سے کام لیتا ہے، اور اس سے کہتا ہے کہ وہ میرے نوکروں اور غلاموں کو تعلیم دیا کرے، اس کے عرض میں اسے عمدہ عمدہ چیزوں سے نوازا جائے گا چنانچہ وہ اس خدمت کے معاوضے کے طور پر بہت سے اچھے اچھے وعدے کر لیتا ہے، تاکہ وہ اسکی تجویز پر عمل کرے، اصل میں نوکروں کو تعلیم دینا مقصود نہیں ہے، بلکہ وہ رسوخ اور پختگی مقصود ہے جو نوکروں کو تعلیم دینے سے اسکے علم میں پیدا ہوگی، اس صورت میں اگر لوگ کام محض اور نادان ہے تو وہ یہ سمجھتا ہے کہ میرا باپ مجھ سے اپنے نوکروں کی خدمت کرانا چاہتا ہے، حالانکہ وہ میرے مقابلے میں حقیر ہیں، پھر ان نوکروں کی تعلیم اس قدر ضروری بھی نہیں کہ میرا وقت ضائع کیا جائے، اور مجھے اس خدمت پر نامور کیا جائے اگر یہ لوگ جاہل رہ گئے تو میرے ماں باپ کو کیا نقصان پہنچ سکتا ہے، پھر یہ کام دوسرے بھی کر سکتے ہیں مجھے ہی کیوں مجبور کیا جا رہا ہے، اس طرح کے خیالات اسے پریشان کرتے ہیں، چنانچہ وہ توجہ دلچسپی اور دل جمعی سے نہیں پڑھتا، سستی کرتا ہے، اور محض رسمی کارروائی پر اکتفا کرتا ہے تاکہ باپ کے حکم کی تعمیل ہو سکے، بد بختی اسے آتی ہے اور جو کچھ اس نے پڑھا ہے اسے ضائع کر دیتی ہے۔

بعض لوگ اسی طرح کے خیالات سے دھوکا کھا گئے اور اباحت پسندی کی راہ پر چل پڑے، وہ یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ظاہری عبادتوں سے بے نیاز ہے، اسے ہم سے فرض لینے کی ضرورت نہیں ہے، پھر اس آیت کے کیا معنی ہیں؟

مَنْ ذَا الَّذِي يُقْرِضُ اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا ۚ وَآرَئِیْكَ مَا تَصِفُّ أَعْمٰیۤہُ ۚ وَآرَئِیْكَ مَا تَصِفُّ أَعْمٰیۤہُ ۚ وَآرَئِیْكَ مَا تَصِفُّ أَعْمٰیۤہُ ۚ وَآرَئِیْكَ مَا تَصِفُّ أَعْمٰیۤہُ ۚ

ضروری ہے کہ ہم انھیں کھانا کھلانے کے لئے اپنا مال خرچ کریں، قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے کافروں کا ایک قول فرمایا جس میں بیہیہ کی بات کہی گئی ہے :-

وَإِنَّا قَبِیلٌ لَّهُمْ أَنْفَقُوا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللَّهُ قَالِیْنَ كَفَرُوا ۖ وَاللَّذِیْنَ آمَنُوا أَنْتَطَعُ ۖ مَنْ لَّوْ شَاءَ اللَّهُ لَمُطَعَمٌ ۖ (پ ۲۲۳ آیت ۷۷)

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو کچھ تم کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرو تو یہ کفار (ان) مسلمانوں سے یہ کہتے ہیں کہ کیا ہم ایسے لوگوں کو کھانے کو دیں جن کو اگر خدا چاہے تو کھلا دے۔

ایک جگہ ان کا یہ قول بیان فرمایا :-

لَوْ شَاءَ اللَّهُ لَمُطَعَمٌ ۖ كُنَّا وَلَا آبَاؤُنَا (پ ۵۸ آیت ۷۹)

اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا تو نہ ہم شرک کرتے اور نہ ہمارے باپ دادا۔

حالانکہ کفار کی یہ باتیں سچ تھیں، واقعی سب کچھ اللہ تعالیٰ کی مشیت پر موقوف ہے، غمروہ اپنے سچ سے جاہ ہو گئے، خدا کی شان عجیب ہے وہ جسے چاہے سچ کی وجہ سے ہلاک کر دے، اور جسے چاہے جمالت پر بخش دے، قرآن کریم میں ہے

يُضِلُّ مَن يَشَاءُ ۚ وَهُدًى ۖ وَكَثِیْرٌ مِّنْهُم كَافِرٌ (پ ۳۲ آیت ۲۶)

اللہ تعالیٰ اس مثال کی وجہ سے بہت سوں کو گمراہ فرماتے ہیں، اور بہت سوں کو ہدایت سے نوازتے ہیں۔

ان لوگوں نے جب یہ گمان کیا کہ ان سے مساکین اور فقراء کی خدمت لی جاتی ہے، اور اللہ تعالیٰ کے نام پر صدقہ و خیرات کا حکم دیا جاتا ہے حالانکہ ہمیں مساکین سے کوئی فرض نہیں، اور نہ اللہ تعالیٰ کو ہم سے یا ہمارے اموال سے کچھ مطلب ہے، ہمارا خرچ کرنا نہ کرنا اسکے لئے برابر ہے، یہ لوگ ہلاک ہو گئے جس طرح وہ لاکھ لاکھ ہوا تھا جس نے یہ بد گمانی کی تھی کہ میرے والد کا مقصد یہ ہے کہ میں تعلیم کے ذریعے ان نوکروں، غلاموں، اور غلاموں کی خدمت کروں، اسے یہ خیال نہیں آیا کہ باپ کا مقصد یہ نہیں ہے، بلکہ اس کے نفس و قلب میں صفت علم کو رائج اور منوکر کرنا ہے، تاکہ وہ اس کے ذریعے دین اور دنیا کی سعادتیں حاصل کر سکے، اسکے

باپ کا یہ سوچنا کہ لوگوں کو تعلیم دینے سے اس کا علم بچنے اور معلومات تازہ رہیں گی اس کی محبت اور شفقت کی علامت ہیں، کیونکہ وہ اس طرح اسے سعادت سے قریب اور ہلاکت سے دور کر رہا ہے۔ اس مثال سے ان لوگوں کی ہلاکت کی وجہ واضح ہو جاتی ہے جو اباحت کا راستہ اختیار کرتے ہیں۔

مال لینا فقراء کا احسان ہے : فقراء اور مساکین تمہارا مال صدقہ، زکوٰۃ اور خیرات کی صورت میں لیتے ہیں، اس لئے کہ اس طرح وہ تمہارے باطن سے نکل اور حب دنیا کا خبث دور کرتے ہیں، یہ خبث تمہارے لئے مسلک ہے۔ مسکین کی مثال حجام کی سی ہے، جو تمہارے جسم سے خون نکالتا ہے تاکہ خون نکلنے کے ساتھ ہی وہ بیماری بھی باہر آجائے جو تمہارے باطن میں پوشیدہ ہے اور تمہیں ہلاکت کرنے کے پے در پے ہے، حجام تمہارا خادم ہے، تمہیں کے خادم نہیں ہو، بالفرض اگر خون نکالنے سے حجام کا کوئی مقصد ہو اگر تا مثلاً خون میں کپڑے رنگنا وغیرہ تب بھی وہ تمہارے خادموں کی فہرست سے نہ نکلا، پھر یہ مسکین تمہارا خادم کیوں نہ ہو گا جو تمہیں باطنی امراض سے نجات دیتا ہے، اگرچہ وہ تمہارے اموال سے قائم اٹھاتا ہے۔ کیونکہ صدقات باطن کو پاک کرنے والے اور اس کی نجاشی دور کرنے والے ہیں اسی لئے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقات استعمال نہیں فرمائے، اور اپنے اہل بیت کو بھی ان سے بچنے کی تاکید فرمائی اور انھیں لوگوں کے اموال کا میل قرار دیا (مسلم۔ عبد المطلب ابن ربیعہ) اسی بنا پر حجامت کی مزدوری لینے سے بھی منع فرمایا۔ اس پوری تقریر کا حاصل یہ ہے کہ اعمالِ قلب کے احوال پر اثر انداز ہوتے ہیں، جیسا کہ اس کتاب کی تیسری جلد میں بیان کیا گیا، پھر قلب پر اعمال کے جتنے اثرات ہوتے ہیں اتنا ہی وہ ہدایت قبول کرنے، اور معرفت کا نور جذب کرنے کی صلاحیت حاصل کرتا ہے، اعمال، احوال اور معارف کے فضائل کے سلسلے میں یہ ایک اصولی اور کلی قاعدہ ہے، کسی عمل یا حال یا معرفت کی فضیلت معلوم کرنے کے لئے اسی قاعدے کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ اب ہم پھر اپنے اصل موضوع مبروہ شکر کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

مبروہ شکر میں تینوں مقامات کا وجود اور باہمی تقابلی : ان دونوں میں سے ہر ایک میں معرفت، حال اور عمل موجود ہے، اور یہ بات کسی بھی طرح صحیح نہیں ہوگی کہ ایک کی معرفت کا دوسرے کے حال یا عمل سے موازنہ کیا جائے، بلکہ نظیر کا نظیر سے مقابلہ ہونا چاہیے، تاکہ تناسب نمایاں ہو، اور تناسب کے بعد ایک کی دوسرے پر فضیلت واضح ہو۔

اب اگر صابر کی معرفت کا تقابل شاکر کی معرفت سے کیا جائے تو نتیجہ ایک ہی نکلا ہے، مثلاً آنکھ کے سلسلے میں شاکر کی معرفت یہ ہے کہ اس نعمت کا منبع اللہ تعالیٰ کو جانے، اور صابر کی معرفت یہ ہے کہ اس نعمت کا مرجع اسی ذات کو قرار دے۔ اس طرح دونوں معرفتیں ایک دوسرے کے لئے لازم اور مساوی ہوں گی۔ لیکن یہ اس صورت میں ہے جب کہ مبروہ کو بلا اور مصیبت میں لیا جائے۔ بعض اوقات مبروہ طاعات پر بھی ہوتا ہے، اور کبھی مصیبت سے مبروہ ہوتا ہے، ایسے مواقع پر مبروہ اور شکر دونوں ایک ہوتے ہیں، کیونکہ اطاعت پر مبروہ کرنا مین شکر اطاعت ہے، ان کے اتحاد کی وجہ یہ ہے کہ شکر کی معنی ہیں اللہ تعالیٰ کی نعمت کو اس حکمت میں صرف کرنا جو اس سے مقصود ہے، اور مبروہ کی معنی یہ ہیں کہ باعث ہوئی کے مقابلے میں باعثِ ربی ثابت قدم رہے، اس معنی میں مبروہ اور شکر دونوں ایک ہی معنی کے دو نام اور ایک ہی معنی کی دو تعبیریں ہیں صرف اظہار اور الفاظ کا اختلاف ہے۔ باعثِ ربی کے مقابلے میں باعثِ ربی کا ثبوت مبروہ ہے اگر نسبت باعث کی طرف ہو، اور شکر ہے اگر نسبت باعثِ ربی کی طرف ہو، باعثِ ربی ایک حکمت کے لئے تخلیق کیا گیا ہے، اور وہ ایک حکمت یہ ہے کہ اسکے ذریعے باعثِ شہوت کو شکست دی جائے، شکر کی صورت میں تو یہ حکمت حاصل ہوتی ہے، مبروہ کی صورت میں بھی یہ حکمت اپنے مقصود کو پہنچ جاتی ہے جب کہ باعثِ ربی کے مقابلے میں باعثِ ربی باقی رہ جائے۔ اس طرح کو یاد دونوں کا مدلول ایک ہوا۔ اس لئے دونوں کی معرفتوں میں کمی زیادتی کا سوال بیکار ہے۔

مبروہ کے تین مقامات : جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے کہ مبروہ طاعت میں بھی ہوتا ہے، اور مصیبت سے بھی، اور مصیبت پر بھی۔ طاعت اور مصیبت کا حکم معلوم ہو چکا ہے کہ ان دونوں میں مبروہ شکر کا مقصود ایک ہے۔ اس لئے یہ دونوں ایک ہی معنی کے دو اسم

ہیں، اور اس اعتبار سے دونوں کی معرفت مساوی ہے، اب مصیبت کا حکم ملاحظہ کیجئے۔

مصیبت فقدانِ نعمت کا نام ہے، اور نعمت یا تو ضروری ہوتی ہے جیسے آنکھیں، یا عملِ حاجت میں ہوتی ہے، یعنی اسکی ضرورت پڑتی ہے، جیسے قدر کفایت سے مال کا زیادہ ہونا۔ آنکھوں کے سلسلے میں مصیبت یہ ہے کہ ان کی بیٹائی سلب ہو جائے اس صورت میں ناپیدنا کو مبر کرنا چاہیے، اور اسکا مبر یہ ہے کہ اس مصیبت پر شکوہ نہ کرے، بلکہ اللہ تعالیٰ کے فیصلے کو خوشی سے تسلیم کرے اور یہ نہ سمجھے کہ مجھے اس مصیبت کی وجہ سے بعض معاصی میں چھوٹ مل گئی ہے۔ بیٹا اس نعمت پر عمل کے ذریعے دو طرح سے شکر ادا کرتا ہے، ایک تو یہ کہ ان کے ذریعے مصیبت پر مدونہ لے، اور دوسرے یہ کہ انھیں اطاعت میں استعمال کرے، اور ان دونوں اعمول میں سے ایک بھی مبر سے خالی نہیں ہے، ناپیدنا آدمی اچھی صورتیں دیکھنے سے مبر کرتا ہے کیونکہ وہ انھیں دیکھ نہیں پاتا، اور بیٹا آدمی اس وقت مبر کرتا ہے جب اسکی نگاہ حسین چہرے پر پڑ جاتی ہے، اور وہ دوبارہ دیکھنے سے گریز کرتا ہے تاکہ مصیبت نہ ہو، اس طرح گویا وہ اس نعمت کا شکر بھی ادا کرتا ہے جو آنکھوں کی صورت میں اسے عطا کی گئی ہے۔ اگر وہ دوبارہ دیکھے گا تو اس نعمت کا کافر ہوگا۔ کیونکہ دوبارہ دیکھنا مصیبت ہے، اس سے معلوم ہوا کہ مبر میں شکر داخل ہے، اسی طرح آنکھوں کو اطاعت میں استعمال کرنا بھی مبر سے خالی نہیں ہے، کیونکہ اطاعت میں مشقت ہے، اور اسے بجالانا مبر ہی سے ممکن ہے، بعض اوقات آدمی آنکھوں کا شکر ادا کرتا ہے کہ دنیا میں اللہ تعالیٰ نے اپنی صنعت و قدرت کے جو عجائبات بکھیرے ہیں انھیں دیکھتا ہے، اور ان سے خالق کائنات کی معرفت حاصل کرتا ہے، یہ شکر مبر سے افضل ہے۔ اگر اس صورت میں شکر افضل نہ ہو تو حضرت شعیب علیہ السلام کا مرتبہ حضرت موسیٰ اور دوسرے انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام سے بڑھا ہوا ہونا چاہیے، کیونکہ وہ ناپیدنا تھے، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام بیٹا تھے، انھوں نے بیٹائی سے محرومی پر مبر کیا، اور دوسرے حضرات انبیاء نے نہیں کیا، بلکہ اس سے تو یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ آدمی کو درجہ کمال اسی وقت حاصل ہوتا ہے جب اسکے تمام اعضاء ضائع ہو جائیں، اور وہ گوشت کے ایک ٹوٹنے کی شکل اختیار کر لے۔ حالانکہ یہ ایک خلافِ عقل امر ہے، آدمی کے تمام اعضاء دین کے آلات ہیں، جب کوئی عضو بیکار ہوتا ہے تو دین کا ایک آلہ بیکار ہوتا ہے، اور وہ رکن متاثر ہوتا ہے جس پر اس آلے سے مدد لی جاتی ہے، جب کہ ہر عضو کا شکر یہ ہے کہ جس مقصد کے لئے وہ پیدا کیا گیا ہے اس میں اسے استعمال کیا جائے، یہ استعمال بھی مبر کے بغیر نہیں ہوگا۔

اور جو چیز عقلِ حاجت میں واقع ہوتی ہے جیسے قدر کفایت سے مال کا زیادہ ہونا اس کا حال یہ ہے کہ اگر آدمی کو صرف اسی قدر مال ملا جتنا اسکے لئے بہوری تھا اور اسے زائد مال کی حاجت بھی ہے تو اس سے مبر کرنا مجاہدہ ہے، اور یہ فقرام کا جادہ ہے، اور زیادہ مال کا ملنا نعمت ہے اور اسکا شکر یہ ہے کہ اس مال کو خیر کے کاموں میں صرف کیا جائے اور مصیبت میں استعمال نہ کیا جائے، اگر مبر کو اس شکر کے مقابلے میں رکھ کر دیکھا جائے جس سے مقصود مال کا خیر کے کاموں میں صرف کرنا ہے تو شکر افضل ہے، کیونکہ ایسے شکر میں مبر بھی پایا جاتا ہے، اس لئے کہ اسکے معنی یہ ہیں کہ آدمی اللہ تعالیٰ کی نعمت پر خوش ہوا اور اس نے اپنا مال فقرام پر صرف کرنے کی تکلیف کو اراکی، اور اسے مباح عیش میں خرچ نہیں کیا، حالانکہ وہ ایسا کر سکتا تھا۔ اس طرح اس عمل میں مبر بھی موجود ہے کہ آدمی دوسرے کو مال دینے کی تکلیف اٹھاتا ہے، اور شکر بھی ہے کہ مال جس حکمت کے لئے وضع کیا گیا ہے وہ اسے اسی میں استعمال کرتا ہے، لیکن اس عمل میں شکر کل ہے اور مبر جزو ہے، اور یہ ایک اصولی بات ہے کہ گل اپنے جزو کا مقابلہ صحیح نہ ہوگا، ہاں اگر شکر کی صورت یہ ہو کہ اس مال سے مصیبت پر مدونہ لے، بلکہ جائز عیش میں صرف کرے تو یہاں مبر شکر سے افضل ہوگا، اور صابر فقیر کو مال روکنے والے اور اسی مباحات میں خرچ کرنے والے پر فضیلت حاصل ہوگی، لیکن اس مالدار پر فضیلت نہ ہوگی جو اپنا مال خیرات میں صرف کرتا ہے اس لئے کہ فقیر نے اپنے نفس پر مجاہدہ کیا، اسکی ہوس کا بت توڑا، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہونے والی آزمائش میں ثابت قدم رہا۔ نفس پر مجاہدہ کرنا ایک زبردست قوت کا طالب ہے، جبکہ غنی اپنی حرص کا اتباع کرتا ہے اور شہوات کے راستے پر چلتا ہے، تاہم وہ مباحات پر استغنا کرتا ہے، اور حرام سے بچتا ہے، اگرچہ حرام سے بچنے میں بھی مبر کی قوت ضروری ہے، مگر فقیر کے مبر کے

لئے جس قوت کی ضرورت ہوتی ہے وہ اس قوت سے کہیں زیادہ اطلاق جس کی ضرورت مالدار کو حرام امور کے ارتکاب سے بچنے کے لئے پڑتی ہے۔ اصل میں شرف اور فضیلت اسی قوت کو حاصل ہے جس پر عمل دلالت کرتا ہے اس لئے کہ اعمال صرف اسی لئے مطلوب ہوتے ہیں کہ ان سے قلب کے احوال حاصل ہوں یہ قوت بھی فقیر کے قلب کی ایک حالت ہے جس قدر ایمان اور یقین میں قوت اور پختگی ہوگی اسی قدر اس میں بھی ہوگی اس لئے جو حج ایمان کی قوت پر دلالت کرے وہ دوسری چیزوں سے افضل ہوگی۔

صبر بر شکر کی فضیلت : بعض آیات اور روایات میں صبر کو شکر سے افضل قرار دیا گیا ہے ان میں ہی خاص مرتبہ مراد ہے۔ اس لئے کہ جب لفظ نعمت کلموں میں پڑتا ہے تو ذہن اس امر کی طرف بہت کرتا ہے کہ نعمت سے مراد مال اور اس سے نفع اٹھانا ہے اور شکر کا یہ مفہوم سمجھا جاتا ہے کہ آدمی نعمت پا کر زبان سے الحمد للہ کے اور اس سے مصیبت پر مدد نہ لے شکر کا یہ مطلب کوئی نہیں سمجھتا کہ اللہ کی نعمتوں کو اطاعات میں استعمال کرے اس اعتبار سے صبر شکر سے افضل ہے۔ یعنی وہ صبر جسے عوام سمجھتے ہیں اس شکر سے افضل ہے جو عوام کے نزدیک شکر ہے اور اسی مخصوص معنی کی طرف حضرت جنید بغدادیؒ نے اشارہ کیا ہے۔ ایک مرتبہ ان سے دریافت کیا گیا کہ صبر اور شکر میں افضل کیا ہے انھوں نے فرمایا کہ نہ مالدار اس لئے قائل تعریف ہے کہ اس کے پاس مال ہے اور مفلس اس لئے قائل تعریف ہے کہ وہ مال سے محروم ہے بلکہ دونوں اس صورت میں قائل تعریف ہوتے ہیں جب وہ اپنی مفلسی اور مالدار کی شرائط پوری کریں۔ تاہم مالدار کی شرائط نفس کے مناسب ہیں اور ان سے نفس لطف اور لذت حاصل کرتا ہے جب کہ فقیر کی شرائط نفس کو اذیت پہنچتی ہیں اور اسے پریشان رکھتی ہیں۔ صابر و شاکر دونوں ہی اپنی شرائط پر عمل کرتے ہیں اور اللہ کے لئے صبر و شکر کرتے ہیں اس لئے قدرتی طور پر وہ نفس کو مشقت میں ڈالتا ہے اور مضطرب رکھتا ہے اس شخص سے افضل ہے جو اسے عیش اور قابض البالی میں رکھتا ہے حقیقت بھی یہی ہے جو حضرت جنید نے بیان فرمائی لیکن اسکا اطلاق صبر کی قسموں میں سے تیسری قسم پر ہوتا ہے اور یہ قسم ہم نے ابھی بیان کی ہے حضرت جنید بھی نے صبر کی یہی قسم مراد لی ہے کہا جاتا ہے کہ ابو العباس ابن عطاء اس معاملے میں حضرت جنید کے خلاف تھے اور کہا کرتے تھے کہ مالدار شاکر صابر فقیر سے افضل ہے ان کے خلاف حضرت جنید نے بددعا کی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ زبردست جاہی کا شکار ہوئے سارا مال ضائع ہو گیا اولاد قتل ہوئی اور چودہ برس تک محل و خود سے بیگانہ بنے پھرتے رہے جب صحیح حالات میں آئے تو کہا کرتے تھے کہ مجھے جنید کی بددعا نے تباہ کر دیا پھر اپنے قول سے باز آئے اور فقیر صابر کو مالدار شاکر پر ترجیح دینے لگے۔

اگر ان امور پر غور کیا جائے جو ہم نے بیان کئے ہیں تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ صابر و شاکر کی فضیلت میں وارد یہ دونوں اختلافی اقوال اپنی جگہ صحیح ہو سکتے ہیں اس لئے کہ جس طرح بہت سے صابر فقیر شاکر مالدار سے افضل ہوتے ہیں اسی طرح بہت سے مالدار شاکر فقیر صابر سے بھی افضل ہوتے ہیں یہ وہ مالدار ہیں جو اپنے آپ کو فقیر تصور کرتے ہیں اور اپنے لئے قدر ضرورت سے زائد مال بچا کر نہیں رکھتے باقی مال خیر کے کاموں میں خرچ کر دیتے ہیں اگر کچھ مال بچا کر رکھتے بھی ہیں تو یہ سمجھتے ہیں کہ ہم مفلسوں اور محتاجوں کے خازن ہیں وہ صرف ایسے موقع کے منتظر رہتے ہیں جس میں مال خرچ کر سکیں پھر اگر خرچ بھی کرتے ہیں تو صرف اللہ کے لئے خرچ کرتے ہیں طلب جاہ اور طلب شہرت کے لئے خرچ نہیں کرتے اور نہ اس لئے خرچ کرتے ہیں کہ فہرام کو دیر بار احسان کر سکیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا حق ادا کرنے کے لئے ضرورت مند بندگان خدا کی جستجو کرتے ہیں۔ ایسے مالدار یقیناً صابر فہرام سے افضل ہیں۔

اب اگر تم یہ کہو کہ مال خرچ کرنا مالدار کے نفس پر اتنا شاق نہیں مگر تاہم شاکر و شوار فقیر کے لئے صبر کرنا ہوتا ہے اس لئے کہ مالدار کو قدرت کی لذت حاصل رہتی ہے جب کہ فقیر کے حصے میں صرف صبر کی تکلیف آتی ہے مالدار کو اگرچہ مال سے جدائی کی تکلیف پہنچتی ہے لیکن اس تکلیف کا تدارک اس وقت ہو جاتا ہے جب وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ اسے خرچ کرنے پر قدرت میسر ہے اسکا جواب یہ ہے کہ ہمارے خیال میں صرف وہ مالدار افضل ہے جو برضا و رغبت اور بخلیت خاطر مال خرچ کرے اس کے نفس کو مال

خرج کرنے میں تکلیف نہ ہو، جو شخص بخیل ہو، اور نفس سے متکلف مال جدا کرتا ہو ایسا شخص کا زیادہ اچھا نہیں ہے۔ اسکی تفصیل ہم کتاب التوبہ میں بیان کر چکے ہیں، اصل میں نفس کو تکلیف پہنچانا مقصود نہیں ہے۔ ایسا صرف تادیب اور تربیت کے ضمن میں ہوتا ہے، اس کی مثال ایسی ہے جیسے شکاری کتے کو اولاً تربیت دی جاتی ہے، اور اس مقصد کے لئے اسے مارا بھی جاتا ہے۔ اس کے مقابلے میں ایک تربیت یافتہ کتا ہے جو اپنے مالک کی مار نہیں سہتا اور اسکے چشم وایمو کے اشاروں کی اجاہ کرتا ہے، تم ان دونوں کتوں میں سے کس کتے کو ترجیح دو گے، ظاہر ہے دوسرے کتے کو ترجیح دی جائے گی، کیونکہ وہ پہلے کتے کے مقابلے میں کھل ہے، اگرچہ پہلا کتا ضرب کی اذیت برداشت کرتا ہے، اور اس پر مبر کی تکلیف سہتا ہے۔ اسی لئے اولاً تکلیف پہنچانے اور مجاہدہ کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، بعد میں ان چیزوں کی ضرورت نہیں رہتی، بلکہ ابتدا میں جو مشقت اور مجاہدہ نفس کو ناگوار گزرتا ہے انتہا میں اسی مجاہدے میں لذت ملنے لگتی ہے، جیسا کہ پڑھنا محنت سے کا محبوب مشغلہ ہو جاتا ہے، جب کہ شروع میں اس تعلیم سے زیادہ اذیت ناک مشغلہ اس کے لئے کوئی دوسرا نہیں ہوتا۔ مگر کیونکہ عام طور پر لوگوں کی حالت ابتدا میں بچوں کے مشابہ ہوتی ہے، اس لئے حضرت جنیدؒ مطلقاً فرمادیا کہ جو وصف نفس کو تکلیف پہنچائے وہ افضل ہے، عوام کے حق میں حضرت جنیدؒ کا یہ ارشاد اپنی جگہ نہایت درست ہے، اگر کسی شخص کو مبرو شکر میں افضلیت کے سوال کا تفصیلی جواب دینا منظور نہ ہو اور عوام الناس کو سامنے رکھ کر جواب دینا ہو تو یہی کہنا چاہیے کہ مبرو شکر سے افضل ہے، اس لئے مبرو شکر کے جو معنی عوام کے ذہنوں میں رائج ہیں ان کی رو سے یہ جواب صحیح ہے، لیکن اگر تحقیق منظور ہو تو یہ جواب کافی نہ ہو گا بلکہ اس میں کسی قدر تفصیل ہوگی۔

مبرو شکر کے درجات : مطلق اور تفصیلی جواب میں فرق کی وجہ یہ ہے کہ مبر کے بہت سے درجات ہیں، جن میں سب سے پہلا درجہ یہ ہے کہ معصیت کو برا سمجھے اور اس پر شکوہ نہ کرے، مبر کے ادنیٰ و اعلیٰ تمام درجات کے بعد رضا کا مقام ہے، رضا کے بعد معصیت پر شکر کا درجہ ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ مبر میں تکلیف کا احساس رہتا ہے، رضا میں یہ نہیں ہے کہ نہ تکلیف ہو اور نہ خوشی، جب کہ شکر خوشی سے خالی نہیں ہو سکتا، جس طرح مبر کے بہت سے درجات ہیں اسی طرح شکر کے بھی بے شمار درجات ہیں، ہم نے اس کا اعلیٰ درجہ بیان کیا ہے۔ بہت سے درجات ایسے ہیں جو اس درجہ کی یہ نسبت کم تر ہیں، لیکن ہم نے انھیں بیان نہیں کیا، جیسے اپنے اوپر اللہ تعالیٰ کی مسلسل نعمتوں سے شکرانا، اور یہ سمجھنا کہ میں ان نعمتوں کا شکر ادا کرنے سے عاجز ہوں، اور کم شکر پر عذر کرنا، اور اللہ تعالیٰ کی علم اور اسکی صفت شہادت کی معرفت حاصل کرنا، اس حقیقت کا اعتراف کرنا کہ تمام نعمتیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے بلا استحقاق حاصل ہوتی ہیں، یہ جاننا کہ اللہ کا شکر ادا کرنا بھی اسی کی ایک نعمت ہے، نعمتوں سے مواضع اور منکسر رہنا، یہ تمام امور شکر ہیں، اور درجات ہیں ایک دوسرے سے مختلف ہیں، جس شخص کے واسطے سے نعمتیں ملتی ہیں اور شکر گزار ہونا، بھی ایک نعمت ہے، جیسا کہ حدیث شریف میں ہے۔

مَنْ لَمْ يَشْكُرِ النَّاسَ لَمْ يَشْكُرِ اللَّهَ (۱)

جو شخص لوگوں کا شکر ادا نہیں کرتا وہ اللہ تعالیٰ کا شکر بھی ادا نہیں کرے گا۔

اسی طرح اعتراض کم کرنا، منعم کے ساتھ حسن ادب سے پیش آنا، نعمتیں، اچھی طرح قبول کرنا، اور چھوٹی سی نعمت کو بڑی سمجھنا وغیرہ سب شکر ہیں۔ خلاصہ یہ ہیکہ جتنے اعمال و احوال مبر اور شکر میں داخل ہیں وہ بے شمار ہیں، اور ہر ایک کا الگ الگ درجہ ہے، اس صورت میں ایک کو دوسرے پر کس طرح ترجیح دی جاسکتی ہے، الایہ کہ عام لفظ سے خاص مبر اور شکر مراد نہ لیا جائے، جیسا کہ اخبار و روایات میں وارد ہے۔

ایک بوڑھے کا قصہ : ایک بزرگ بیان کرتے ہیں کہ میں نے سفر میں ایک نہایت عمر رسیدہ اور ضعیف و ناتواں بوڑھے کو

دیکھا اور اس سے اس کا حال دریافت کیا، بوڑھے نے کہا کہ میں نوجوانی کے زمانے میں اپنے چچا کی بیٹی پر عاشق تھا اور وہ بھی مجھ سے اسی طرح محبت کرتی تھی، آخر کو ہم دونوں کی شادی ہو گئی، پہلی رات میں جب ہم دونوں ملے تو میں نے اس سے کہا کہ آؤ ہم اس نعمت پر اللہ کا شکر بجالائیں اور نوافل پڑھیں، چنانچہ اس رات ہم دونوں نے بے شمار نوافل پڑھے اور اسی طرح صبح کو دی، اگلے روز بھی ہم دونوں نے نماز شکر پڑھی، اسی طرح ستر یا اسی برس گزر چکے ہیں، ہم دونوں ہر رات اپنی نیکیاں پر اللہ کا شکر ادا کرنے کے لئے صبح تک نمازیں پڑھتے ہیں۔ راوی کہتے ہیں کہ میں نے اس کی بیوی سے اس واقعے کی حقیقت دریافت کی، بوڑھی نے کہا حقیقت میں یہی بات ہے جو اسکے شوہر نے کہی ہے۔ فرض کیجئے کہ اگر اللہ تعالیٰ ان دونوں کو نہ ملاتا اور انھیں جدائی کی تکلیف پر مبر کر پڑتا تو کیا ان کا ممبر اس درجے کا ہوتا جس درجے کا ان کا شکر تھا جو انھوں نے اپنے وصال پر کیا، ظاہر ہے شکر کا یہ درجہ نہایت اعلیٰ ہے اور میرے افضل ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مشکل حقائق تفصیل کے بغیر سمجھ میں نہیں آتے۔

کتاب الخوف والرجاء

خوف اور رجاء کا بیان

جاننا چاہیے کہ خوف اور رجاء دونوں ایسے باند ہیں جن کی مدد سے مہربان خدا اعلیٰ مقامات تک پرواز کرتے ہیں یا ایسی دو سواریاں ہیں جن پر سوار ہو کر آخرت کے بڑے خطر راستے طے کئے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے قرب کی منزل، اور جنات نعیم کا ٹھکانہ نہایت دوری پر واقع ہے، ان کے راستے خطرات سے گزر ہیں، اپنے چلنے والوں کو تھکا دینے والے ہیں، اور اعضاء و جوارح کو مشقت میں ڈالنے والے ہیں، اس منزل اور ٹھکانے تک پہنچنے کے لئے رجاء کی سواری ناگزیر ہے، اسی طرہ و ذریعہ کی خوفناک آگ اور الناک عذاب سے بچنا بھی خوف کے بغیر ممکن نہیں، اس لئے ان دونوں کی حقیقت، ان کے فضائل اور ان دونوں میں تضاد اور اختلاف کے بعد جمع کی صورت بیان کرنا نہایت ضروری ہے، اس لئے ہم اس کتاب کو دو ابواب میں تقسیم کرتے ہیں، پہلے باب میں رجاء کا حال بیان کریں گے، اور دوسرے باب میں خوف کا حال لکھیں گے۔

پہلا باب

رجاء کی حقیقت، فضائل، دوائے رجا، اور طریقہ حصول

رجاء کی حقیقت : جاننا چاہیے کہ رجاء سا لکین کے مقامات میں سے ایک مقام اور طالبین کے احوال میں سے ایک حال ہے، اگر کسی شخص کا کوئی وصف قائم اور باقی رہ جائے تو اسے مقام کہتے ہیں، اور اگر وصف عارضی اور جلد زائل ہونے والا ہو تو اسے حال کہا جاتا ہے جس طرح زردی کئی طرح کی ہوتی ہے، ایک سونے کی زردی ہے یہ باقی رہنے والی ہے، دوسری زردی جلد زائل ہو جانے والی ہے جیسے خوف کی زردی، اور ایک زردی ان دونوں کی درمیان ہے جیسے مریض کے جسم کی زردی، اسی طرح قلب کی صفات میں بھی یہ تقسیم ہے، جو وصف غیر ثابت ہو اسے حال کہتے ہیں، اس لئے کہ یہ وصف جلد خفیہ ہو جاتا ہے، اور یہ صورت تمام اوصاف قلبیہ میں پیش آتی ہے، یہاں ہمارا مقصد رجاء کی حقیقت بیان کرنا ہے، رجاء اگرچہ حال، علم، اور عمل تینوں سے تشکیل پاتا ہے، یعنی علم حال کا باعث ہوتا ہے اور حال عمل کا سبب بنتا ہے مگر بحیثیت مجموعی رجاء صرف حال کا نام ہے، اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جس چیز کو تم کمزور یا محبوب سمجھتے ہو، وہ تین حال سے خالی ہے یا تو حال میں موجود ہوگی، یا ماضی میں اس کا وجود ہو چکا ہوگا، یا مستقبل میں اس کا انتظار ہوگا، اگر تمہارے دل میں کسی ایسے وجود کا خیال آئے جو ماضی میں واقع ہو چکی ہے اسے ذکر تذکر کرتے ہیں، اور اگر وہ چیز جو تمہارے دل میں آئی ہے فی الحال موجود ہے تو اسے وجد لائق اور ادراک کہتے ہیں۔ اسے وجد اس لئے کہتے ہیں کہ یہ ایک ایسی حالت ہے جسے تم اپنے نفس میں موجود پاتے ہو اور اگر تمہارے دل میں کسی شے کا خیال آئے جس کا وجود مستقبل میں متوقع ہے، اور

وہ شے تمہارے دل پر غالب آجائے اسے توقع اور انتظار کہتے ہیں اگر وہ چیز جس کا تمہیں انتظار ہے مکروہ ہو اور اس کے خیال سے دل کو تکلیف ہو تو اسے خوف کہتے ہیں اور اگر وہ چیز محبوب ہو اور تمہیں اسکے انتظار سے خوشی اور لذت حاصل ہو تو اسے رجاء کہا جاتا ہے۔ معلوم ہوا کہ رجاء اس چیز کے انتظار سے خوش ہونے کا نام ہے جو تمہیں محبوب ہے۔ لیکن اگر تمہیں کسی محبوب شے کا انتظار ہے اور تم اسکے ملنے کے خیال سے خوش ہوتے ہو تو یقیناً تمہارے پاس ایسے وسائل ہوں گے جن کے ذریعے تم اپنے محبوب تک پہنچ سکتے ہو، اگر ایسا ہے تو یہ رجاء ہے اور اگر تمہارے پاس کوئی ایسا وسیلہ نہیں اور خواہ مخواہ محبوب کے وصال کی آس لگائے بیٹھے ہو تو یہ فریب خوردگی اور بے وقوفی ہے اور اگر وسائل کا وجود اور عدم وجود معلوم نہ ہو تو ایسے انتظار کو حتمی کہتے ہیں کیونکہ اس میں بلا سبب انتظار پایا جاتا ہے۔

رجاء کا اطلاق کہاں ہوگا : رجاء اور خوف کا اطلاق ان اشیاء پر ہوگا جن کا وجود یقینی نہ ہو، بلکہ مشتبہ ہو اور جن چیزوں کا وجود یقینی ہو ان پر رجاء کا اطلاق صحیح نہیں ہے مثلاً طلوع آفتاب کے لئے یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ مجھے آفتاب طلوع ہونے کی امید ہے کیونکہ طلوع اور غروب دونوں کا وجود یقینی ہے البتہ یہ کہنا صحیح ہے کہ بارش ہونے کی رجاء ہے یا خشک سالی کا خوف ہے۔

اربابِ قلوب پر یہ حقیقت منکشف ہے کہ دنیا آخرت کی کھیتی ہے اور قلب کی مثال ایسی ہے جیسے زمین اور ایمان ایسا ہے جیسے زمین کے لئے بیج، طاعات کی مثال ایسی ہے جیسے زمین میں بل چلانا، اسکی مٹائی کرنا، سرس کھودنا اور ان سے کھیتی کی تیاری کرنا جو دل دنیا میں غرق اور اس کی لذت میں منہمک ہو اس کی مثال ایسی ہے جیسے غجر زمین جس میں کوئی بیج نہیں جتا، آخرت کا دل کاٹنے کا دن ہے اس لئے تم اس دن وہی کاٹو گے جو دنیا کی زندگی میں بوؤ گے آخرت کی کھیتی ایمان کے بیج کے بغیر ممکن نہیں اور ایمان قلب کے خبث اور سوء اخلاق کی موجودگی میں کم ہی نفع پہنچاتا ہے جس طرح غجر زمین میں کوئی بیج نہیں جتا، خواہ اسکی کتنی ہی تیاری کیوں نہ کی جائے۔ اس لئے اگر کسی بندے کو مغفرت کی رجاء ہے تو اسے اپنی رجاء کو کاشتکار کی رجاء پر قیاس کرنا چاہیے۔ چنانچہ جو کاشتکار اچھی زمین منتخب کرتا ہے اور اس میں عمدہ بیج ڈالتا ہے اور وہ تمام طریقے اختیار کرتا ہے جن سے بیج پودوں کی صورت میں زمین کے نیچے سے ابھرسں اور اکی نشوونما ہو، یعنی وقت پر پانی دیتا ہے، خود روگھاس صاف کرتا ہے، اور وہ تمام رکاوٹیں دور کرتا ہے جن سے پودوں کی بڑھوتری متاثر ہو یا کھیتی میں بگاڑ پیدا ہو جائے، اسکے بعد اللہ تعالیٰ سے یہ آس لگا کر بیٹھ جائے کہ وہ آسانی اور زمینی آفات سے اسکی کھیتی کو محفوظ رکھے گا، اس انتظار اور توقع کو رجاء کہتے ہیں اور اگر کسی شخص نے سخت پھربلی زمین میں بیج ڈالے جو بلندی پر واقع تھی اور جہاں پانی پہنچنے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا، پھر اس کی نگہداشت نہیں کی، بلکہ کھیتی کٹنے کے انتظار میں بیٹھ گیا یہ انتظار نہیں حماقت اور غرور ہے، رجاء نہیں ہے، اسی طرح اگر کسی نے اچھی زمین میں بیج ڈالے، لیکن اس کے بعد تمام مراحل سے غفلت برتی، پانی نہیں دیا، بلکہ آسان سے پانی برسنے کا انتظار رہا، اور ایسے موسم میں یا ایسے مقامات پر بارش کی آس لگائے بیٹھا رہا جہاں بارش نہیں ہوتی یا ہوتی تو ہے لیکن وہ اتنی نہیں ہوتی کہ کھیتی کی تمام ضرورتیں پوری کر سکے۔ اس انتظار کو حتمی کہتے ہیں رجاء نہیں کہتے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ رجاء کا اطلاق صرف اس محبوب کے انتظار پر ہوتا ہے جس کے لئے وہ تمام اسباب مہیا ہوں جو بندے کے دائرہ اختیار میں ہیں اور صرف وہ اسباب باقی رہ گئے ہوں جو بندے کے اختیار سے خارج ہیں اور وہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے جو اگر شامل حال ہو تو تمام موانع اور منکرات دور رہیں۔ یہی حال بندہ مومن کا ہے، اگر وہ دل کی زمین پر ایمان کا بیج ڈالے اور اسے عبادات کا پانی دے، بدظنی کے کاتھوں سے بچائے اور اللہ تعالیٰ کے فضل سے یہ توقع رکھے کہ اس کا ایمان موت تک باقی رہے گا، اور اسکے دل کی کھیتی اچھی طرح پک جائے گی تاکہ قیامت کے دن کاٹی جاسکے، اگر ایسا ہے تو اس کا انتظار صحیح معنوں میں رجاء ہے، اور عمدہ وصف ہے، یہ رجاء اسے ایمان کو باقی رکھنے اور اسے نشوونما دینے کے تمام اسباب پر مسلسل عمل کرنے کا پابند بنائے گی، تاکہ معرفت کے وقت مغفرت یقینی ہو، اور اگر کسی نے زمین دل میں بیج تو ڈال دئے، لیکن اسکے بعد کوئی خبر نہیں لی کہ وہ پانی نہ لٹنے کے

باعث خشک ہو گئے ہیں، یا بارش کی زیادتی کے سبب گل گئے ہیں، یا اخلاق فاسدہ کے کانٹوں اور خود رو پودوں نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا ہے، یا بندوی لذات کے کیڑوں نے حملہ کر دیا ہے اور ان تمام غفلتوں اور کوتاہیوں کے باوجود مغفرت کا عطر اور متوقع ہو تو یہ انتظار اور توقع حماقت اور غرور ہے، چنانچہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

الْأَحْمَقُ مَنْ اتَّبَعَ نَفْسَهُ هَوَاهَا وَنَمَسَى عَلَى اللَّهِ (۱)

احمق وہ شخص ہے جو اپنے نفس کو اپنی خواہشات کے تابع بنادے اور اللہ پر تمنا کرے۔

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے :-

فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ أَضَاعُوا الصَّلَاةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوَاتِ فَسُوفَ يَلْقَوْنَ غِيَا (پ ۲۷ آیت ۵۹)

پھر ان کے بعد ایسے ناخلف پیدا ہوئے جنہوں نے نماز برباد کی، اور نفسانی خواہشوں کی اتباع کی، سو یہ لوگ عنقریب خرابی دیکھیں گے۔

فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ وَرِثُوا الْكِتَابَ يَأْخُذُونَ عَرَضَ هَذَا الْأَدْنَىٰ وَيَقُولُونَ سَيُغْفَرُ لَنَا (پ ۲۷ آیت ۶۹)

پھر ان کے بعد ایسے لوگ جا لیں ہوئے جو کتاب کے وارث ہوئے (اور جو) دنیا کے مال لے لیتے اور کہتے ہیں کہ ہماری مغفرت ہو جائے گی۔

ایک جگہ باغ والے کی مذمت فرمائی جب اس نے یہ الفاظ کہے :-

مَا أَظُنُّ أَنْ تَبِيدَ هَذِهِ أَبَدًا وَمَا أَظُنُّ السَّاعَةَ قَائِمَةً وَلَئِنْ رُذِّقْتُ إِلَىٰ رَبِّي لَأَجِدَنَّ خَيْرًا مِنْهَا مُنْقَلَبًا (پ ۵۷ آیت ۳۵-۳۶)

میرے خیال میں یہ (باغ) کبھی جاہ نہیں ہوگا، اور نہ میرے خیال میں قیامت آنے والی ہے، اور اگر میں اپنے رب کے پاس پہنچا گیا تو اس سے اچھی جگہ مجھے ضرور حاصل ہوگی۔

بہر حال وہ بندہ جو طاعات میں کوشش کرتا ہے، اور محاسن سے اجتناب کرتا ہے، اس بات کا مستحق ہے کہ اللہ کے فضل و کرم سے تمام نعمت کی امید کرے، اور تمام نعمت یہ ہے کہ جنت میں داخل ہو، اور وہ گناہ گار جو توبہ کر لیتا ہے، اور جو کچھ قصور اس سے سرزد ہوا اس کا تدارک کرتا ہے، اسے اس بات کا حق ہے کہ وہ اپنی توبہ کی قبولیت کی امید رکھے، اور اگر توبہ سے پہلے گناہ کو برا سمجھتا ہے، نیک اعمال سے خوش ہوتا ہے، اپنے نفس کی مذمت کرتا ہے، اور توبہ کا متحی ہے تب اسے توفیق توبہ کی امید رکھنی چاہیے، کیونکہ گناہ کو برا سمجھتا، اور توبہ کی خواہش کرنا توبہ تک پہنچانے والے اسباب ہیں، رجاء کا مرحلہ اسباب کی پہنچل کے بعد ہے، جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا ہے :-

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَلَوْ جَاهِدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ لَوْ لَكَبِيرٌ جُؤُنَ دَحْمَةً لِلَّهِ (پ ۲۷ آیت ۲۸)

جیسا کہ لوگ ایمان لائے ہوں اور جن لوگوں نے راہِ خدا میں ترک وطن کیا ہو اور جہاد کیا ہو ایسے لوگ حقیقتاً جو لوگ ایمان لائے ہوں اور جن لوگوں نے راہِ خدا میں ترک وطن کیا ہو اور جہاد کیا ہو ایسے لوگ (ہی) رحمتِ خداوندی کے امیدوار ہو کر رہتے ہیں۔

اس آیت کے معنی یہ ہیں کہ یہی لوگ رحمتِ الہی کی رجاء کا استحقاق رکھتے ہیں، یہ معنی نہیں کہ رجاء صرف ان ہی لوگوں کے

ساتھ مخصوص ہے۔ اس لئے کہ ان کے علاوہ بھی لوگ رجاہ کرتے ہیں حالانکہ ان میں رجاہ کا استحقاق نہیں ہوتا، استحقاق صرف انہی لوگوں کو حاصل ہے۔ لیکن جو شخص از سر تباہی مکتوبات میں غرق ہو، اور اپنے نفس کو برا بھی نہ سمجھتا ہو، اور نہ اس کے دل میں توبہ اور اللہ کی طرف واپسی کا عزم ہو ایسا شخص اگر مغفرت کی رجاہ کرتا ہے تو یہ ایسا ہے جیسے کوئی نادان غمر زمین میں بیج بوسے، اور یہ عزم کرے کہ وہ نہ پانی دے گا، اور نہ صفائی و فیوض کا اہتمام کرے گا۔

حضرت یحییٰ ابن معاذ فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک بدترین فریب خوردگی یہ ہے کہ آدمی غلو کی امید میں نہ امت کے بغیر گناہ کئے جائے، اللہ تعالیٰ سے کسی اطاعت کے بغیر قربت کی توقع رکھے، اور آگ کا بیج بکریوں کا پھل کھا کر رہے، اور معاصی کے ذریعے اطاعت مکراروں کا گمراہ کئے بغیر عمل کے جزاء کا طالب ہو، اور ظلم و زیادتی کے باوجود اللہ سے کسی اچھے معاملے کا منتہی ہو۔ بقول شافعی:

نَزَجُوا النَّجَاةَ وَلَمْ تَسْلُكُوا مَسْلَكَهَا
إِنَّ السَّفِينَةَ لَا تَجْرِي عَلَى الْيُبُسِ
(تو نجات کی توقع رکھتا ہے حالانکہ اس کے راستے پر نہیں چلتا، کشتی خشکی پر نہیں چلا سکتی)

رجاء کے بعد جدوجہد : ہم نے رجاہ کی حقیقت پر خاصی روشنی ڈالی ہے، اگر اس کا خلاصہ کیا جائے تو یہ حاصل نکلے گا کہ یہ ایک حالت ہے، جو علم کے نتیجے میں اکثر اسباب کے وقوع کے بعد پیدا ہوتی ہے۔ اس حالت کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ جو اسباب باقی رہ گئے ہیں ان کی تکمیل کے لئے ہر ممکن جدوجہد کی جائے کاشت کی مثال میں جو شخص اچھی زمین میں عمدہ بیج بوتا ہے، اور ضرورت کے مطابق پانی دیتا ہے اس کی رجاہ صادق ہوگی، اور اسے اس بات پر آمادہ کرے گی کہ وہ زمین کی گمرانی رکھے، جو گھاس اور کانٹے وغیرہ پیدا ہو جائیں انہیں صاف کرے، وقتاً فوقتاً پانی دیتا رہے، اور کھیتی کٹنے تک کسی بھی وقت غفلت نہ کرے، اس کی وجہ یہ ہے کہ رجاہ کی ضد یاس اور ناامیدی ہے، اگر آدمی کسی چیز سے مایوس ہو تو وہ اس کے لئے جدوجہد کر کے اپنے آپ کو مشقت میں نہیں ڈالتا، جدوجہد وہی کرتا ہے جسے ملنے کی امید ہوتی ہے، چنانچہ جو شخص یہ بات جانتا ہے کہ اس کی زمین خمر ہے، اس کے بیج بیکار ہیں، اور پانی کی پہنچ سے باہر ہے تو وہ یقینی طور پر زمین کی گمرانی سے دور رہے گا، رجاہ اس لئے محمود ہے کہ وہ عمل پر اکتفا ہے، اور ناامیدی اس لئے مذموم ہے کہ اس سے عمل میں سستی پیدا ہوتی ہے، خوف رجاہ کی ضد نہیں ہے بلکہ سفر سلوک میں اس کا رفق ہے، جیسا کہ مغربیہ بیان کریں گے، بلکہ یہ بھی عمل کا محرک ہے، البتہ اس کا طریقہ دوسرا ہے، رجاہ میں رغبت ہے، اور خوف میں رہبت۔

اگر کسی کو رجاہ کی حالت میسر ہے تو یہ اس امر کی مقتضی ہے کہ اعمال میں زیادہ سے زیادہ مجاہدہ کرے اور طاعات پر موانعت کرے، خواہ احوال میں تبدیلی ہوتی رہے۔ طول مجاہدہ اور موانعت اعمال سے اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونے میں اور اس سے مناجات کرنے میں لذت حاصل ہوگی، اور وہ نرمی اور تعلقی کے ساتھ دامن سوال دراز کرے گا، یہ صورت حال اس شخص کو بھی پیش آتی ہے جو کسی بادشاہ سے یا کسی اور شخص سے رجاہ کرے، اگر کسی شخص کو یہ حالت پیش نہ آئے تو سمجھ لو کہ وہ ابھی مقام رجاہ سے دور ہے، اور غرور و تمنا کی گھاٹی میں گرا ہوا ہے، یہ ہے تفصیل رجاہ کی۔ اور اس علم کی جس سے رجاہ پیدا ہوتی ہے اور اس عمل کی جو رجاہ سے پیدا ہوتا ہے۔ رجاہ سے ان اعمال کا پیدا ہونا حدیث شریف سے ثابت ہے۔ زید خیل روایت کرتے ہیں کہ میں نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ جس شخص کے ساتھ اللہ تعالیٰ بہتری کا ارادہ کرتا ہے اس کی کیا پہچان ہے اور جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ خیریت نہیں فرماتا اس کی کیا علامت ہے؟ آپ نے ان سے دریافت کیا تیری کیا حالت ہے؟ عرض کیا کہ میں خیر اور اہل خیر سے محبت کرتا ہوں، جب کسی عمل پر قدرت پاتا ہوں تو اس کی طرف سبقت کرتا ہوں، اور یہ یقین رکھتا ہوں کہ مجھے اس عمل کا ثواب حاصل ہوگا، اور جب کوئی چیز مجھ سے فوت ہو جاتی ہے تو میں اس کے لئے غمزدہ ہو جاتا ہوں، اور اسے پانے کی خواہش کرتا ہوں، آپ نے فرمایا یہ اس شخص کی علامت ہے جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ بھلائی کا ارادہ کرتا ہے، اگر تیرے لئے برائی کا ارادہ کرتا تو تجھے اسی میں لگا رہتا، پھر تجھے یہ بات بھی معلوم نہ ہو پاتی کہ تیری ہلاکت کس وادی میں واقع ہونے والی ہے (طبرانی۔ ابن مسعود) اس

حدیث میں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کی علامات بیان فرمادی ہیں جس کے لئے خیر کا ارادہ کیا گیا ہے۔ اب اگر کسی شخص میں یہ علامات مفقود ہوں اور وہ یہ سمجھتا ہو کہ میرے لئے خیر کا ارادہ کیا گیا ہے وہ فریب خوردہ ہے۔

رجاء کے فضائل اور ترغیبات : جانا چاہیے کہ رجاء کے ساتھ عمل کرنا خوف کے ساتھ عمل کرنے سے اعلیٰ ہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ سے قریب تر بندہ وہی ہوتا ہے جو اس سے زیادہ محبت کرتا ہو، اور محبت رجاء سے زیادہ ہوتی ہے، اس کی مثال ایسی ہے جیسے دو بادشاہ ہوں، اور ان میں سے ایک کی خدمت اسکے احسان کی امید میں اور دوسرے کی خدمت اسکے خوف کی بنا پر کی جاتی ہوں تو ظاہر ہے دوسرے ہی کے ساتھ محبت زیادہ ہوگی۔ اسی لئے رجاء اور حسن ظن کے سلسلے میں خاص طور پر موت کے وقت سے متعلق شریعت بہت سی ترغیبات موجود ہیں، ارشاد باری ہے :-

لَا تَقْنَطُوا مِنْ رَحْمَةِ اللَّهِ (پ ۳۲۳ آیت ۵۳)

اس آیت کریمہ میں ناامیدی کو قطعاً حرام قرار دیا گیا ہے، حضرت یعقوب علیہ السلام کے حالات میں درج

ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر وحی نازل فرمائی کہ تم جانتے ہو کہ میں نے تم میں اور یوسف میں جدائی کیوں کی؟ اس

لئے کہ تم نے یوسف کی کشمکش کی خبر سن کر اسکے بھائیوں سے یہ کہا تھا :-

اَكْثَرُ اَنْ يَأْتِيَ كَلَّهُ الْيَتِيمُ دَا فَنُتَمَّ عَنْهُ عَخَا فِلَوْنَ (پ ۳۲۴ آیت ۱۳)

اور میں یہ اندیشہ کرتا ہوں کہ اسکو کوئی بھیڑیا کھا جائے اور تم اس سے بے خبر ہو۔

تم نے بھیڑیے سے خوف کیوں کیا، مجھ سے رجاء کیوں نہ کیا، یوسف کے بھائیوں کی غفلت پر نظریوں کی، میری حفاظت پر نظر کیوں نہ کی؟ ایک حدیث میں ہے :-

لَا يَمُوتَنَّ أَحَدُكُمْ إِلَّا وَهُوَ يُحْسِنُ الظَّنَّ بِاللَّهِ تَعَالَى (مسلم۔ جابر)

تم سے جو شخص مرے اللہ کے ساتھ حسن ظن رکھے۔

ایک حدیث قدسی میں ہے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا :-

أَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِي بِي فَلْيُظَنِّ بِي مَا شَاءَ (ابن الجمان۔ واثلہ ابن الاسقع)

میں اپنے بندے کے گمان کے ساتھ ہوں، وہ مرے ساتھ جو چاہے گمان رکھے۔

ایک مرتبہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ایک شخص کے پاس تشریف لے گئے، اس پر نزع کا عالم طاری تھا، آپ نے اس سے دریافت کیا کہ تمہاری کیا کیفیت ہے؟ اس نے عرض کیا میں اپنے دل میں گناہوں کا خوف، اور رحمت رب کی امید پاتا ہوں، آپ نے ارشاد فرمایا جس شخص کے دل میں یہ دونوں چیزیں جمع ہو جاتی ہیں اسے اللہ تعالیٰ اس کی رجاء کے مطابق عطا کرتا ہے، اور جس چیز سے ڈرتا ہے اس سے مامون رکھتا ہے، (ترمذی، نسائی، ابن ماجہ۔ انس) ایک شخص اپنے گناہوں کی کثرت کے باعث سخت مایوسی کا شکار تھا، حضرت علیؑ نے اس سے ارشاد فرمایا کہ حیر اسب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ تو اللہ کی رحمت سے مایوس ہے۔ حضرت سفیان ثوریؒ ارشاد فرماتے ہیں کہ جو شخص کوئی گناہ کرے اور یہ سمجھے کہ مجھے اس پر اللہ تعالیٰ نے قدرت دی ہے، اور مغفرت کی امید رکھے تو اللہ تعالیٰ اسکے گناہ بخش دیتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک قوم کا عیب ان الفاظ میں ذکر فرمایا :-

وَذَلِكُمْ ظَنُّكُمُ الَّذِي ظَنَنْتُمْ بِرَبِّكُمْ اَنْ كَاكُمْ (پ ۳۲۳ آیت ۲۳)

اور تمہارے اسی گمان نے جو تم نے اپنے رب کے ساتھ کیا تھا تم کو برباد کیا۔

وَوَظَنْتُمْ ظَنَّ السَّوْءِ وَكُنْتُمْ قَوْمًا بُورًا (پ ۳۲۶ آیت ۱۴)

اور تم نے برے برے گمان کئے اور تم برباد ہونے والے لوگ ہو۔

ایک حدیث میں ہے کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندہ سے سوال کرے گا کہ تو نے ظاں برائی دیکھی، مگر اس سے منع

کرنے سے کس چیز نے روکا تھا؟ اگر اللہ تعالیٰ اس کے ذہن میں جواب القاء فرمادے گا تو وہ عرض کرے گا کہ میں تیری رحمت سے پر امید رہا، اور لوگوں سے خوف زدہ، ارشاد ہو گا ہم نے تیرا قصور معاف کر دیا۔ ابن ماجہ۔ ابو سعید الخدریؓ ایک صحیح حدیث میں وارد ہے کہ ایک شخص لوگوں کو قرض دیا کرتا تھا پھر بالداروں کو سہولت دیتا اور مفلسوں کو معاف کر دیتا، جب موت آئی، اور اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضر ہوا تو اسکے پاس کوئی ایسا عمل نہ تھا جسے اطاعت کہا جاسکتا ہو، تاہم وہ اللہ تعالیٰ سے حسن ظن اور رجاء رکھتا تھا، اس کے لئے معافی کا حکم صادر ہوا، اور فرمایا گیا کہ ہم سے زیادہ اسکا مستحق کون ہے (مسلم۔ ابن مسعودؓ) قرآن کریم میں ارشاد ہے:

إِنَّ الَّذِينَ يَتْلُونَ كِتَابَ اللَّهِ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَأَنفَقُوا مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ سِرًّا وَعَلَانِيَةً يَرْجُونَ تِجَارَةً لَّنْ تَبُورَ (پ ۲۲، آیت ۲۹)

جو لوگ کتاب اللہ کی تلاوت کرتے ہیں، اور نماز کی پابندی رکھتے ہیں، اور جو رزق ہم نے انھیں عطا کیا ہے اس میں سے پوشیدہ اور علانیہ خرچ کرتے ہیں اور ایسی تجارت کے امیدوار ہیں جو کبھی تباہ نہ ہوگی۔

ایک مرتبہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام سے فرمایا اگر تم وہ باتیں جان لو جو میں جانتا ہوں تو کم ہنو اور زیادہ روؤ، اور سینہ کوبی کرتے ہوئے، اپنے رب کی پناہ گاہ کی تلاش میں دشت صحرا کی طرف جانکو، اسی وقت حضرت جبرئیل علیہ السلام تشریف لائے اور فرمایا کہ آپ کا رب فرماتا ہے میرے بندوں کو مایوس کیوں کرتے ہو، اس کے بعد آپ باہر تشریف لائے اور انھیں شوق و رجاء کا مضمون سنایا (ابن حبان۔ ابو ہریرہؓ) ایک حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام پر وحی نازل فرمائی کہ مجھ سے محبت کر، اور جو مجھ سے محبت کرے اس سے بھی محبت کر، اور لوگوں میں مجھے محبوب بنا، داؤد علیہ السلام نے عرض کیا لوگوں میں محبوب کیسے بنائوں؟ ارشاد ہوا کہ میرا ذکر اچھی طرح کیا کر، اور ان کے سامنے میرے انعامات اور احسانات کا تذکرہ کیا کر، اور انھیں یاد دلایا کہ اس لئے کہ وہ صرف میرے احسان سے واقف ہیں۔ (۱) ابان ابن ابی عیاشؓ کو ان کی وفات کے بعد خواب میں دیکھا گیا، یہ زندگی میں لوگوں کی رجاء کی تلقین کیا کرتے تھے، خواب میں انھوں نے کہا کہ میری رب نے مجھے اپنے سامنے کھڑا کیا اور پوچھا کہ تو ایسا کیوں کرتا تھا، میں نے عرض کیا اس لئے کہ تجھے مخلوق میں محبوب کدوں حکم ہوا تیری مغفرت کدوی مٹی، یحییٰ ابن اکثمؓ بھی اپنی موت کے بعد لوگوں کے خواب میں آئے، ان سے دریافت کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا ہے، فرمایا اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنے سامنے کھڑا کیا اور فرمایا اے بدترین بوڑھے تو نے فلاں فلاں گناہ کئے ہیں، اپنا اعمال نامہ من کر مجھ پر بے پناہ رحمت غالب ہوا، پھر میں نے عرض کیا یا اللہ! حدیث میں تیرے متعلق اس طرح بیان نہیں کیا گیا، فرمایا! کیا بیان کیا گیا ہے؟ میں نے عرض کیا مجھ سے عبدالرزاق نے روایت کی ہے، انھوں نے معرے، معمرؓ زہریؓ سے، اور زہریؓ نے حضرت انسؓ سے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں، اور آپ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام سے سنا ہے کہ تیرا ارشاد ہے انا عند ظن عبدی بی فلیظن بی ماشاء اور میں یہ گمان رکھتا تھا کہ تو مجھے عذاب نہیں دے گا، اللہ عزوجل نے ارشاد فرمایا جبرئیل علیہ السلام نے سچ کہا میرے نبی نے سچ فرمایا، انسؓ، معمرؓ زہریؓ سب سچ کہتے ہیں، تو بھی سچ کہتا ہے، پھر مجھے غلت عطا کیا گیا، اور جنت تک غلاموں نے میری رہنمائی کی، اس وقت میں نے کہا خوشی اسے کہتے ہیں۔

حدیث شریف میں ہے کہ بنی اسرائیل کا ایک شخص لوگوں کو مایوس کن باتیں بتلایا کرتا تھا، اور انھیں ازیت پہنچاتا تھا، قیامت لے دن اللہ تعالیٰ اس سے فرمائیں گے کہ میں تجھے اپنی رحمت سے اسی طرح مایوس کدوں گا جیسے تو نے میرے بندوں کو مایوس کیا ہے (تہذیبی، زید ابن اسلم۔ منقولاً) ایک حدیث میں ہے کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ایک شخص دونوں میں جائے گا اور وہاں ہزار برس تک یا حاتان یا مٹان پکارتا رہے گا، اللہ تعالیٰ جبرئیل سے فرمائے گا کہ جاؤ میرے بندے کو لے کر آؤ، چنانچہ

جبرئیل علیہ السلام اسے لیکر آئیں گے، اور رب کریم کے سامنے پیش کریں گے، اللہ تعالیٰ اس شخص سے دریافت کرے گا کہ تو نے اپنا ٹھکانہ کیسا پایا، وہ عرض کرے گا نہایت برا، ارشاد ہو گا اسے واپس واپس لے جاؤ جہاں سے لائے ہو، فرشتے اسے لے چلیں گے، اور وہ بار بار پیچھے مڑ مڑ کر دیکھے گا، اس سے پوچھا جائے گا کہ تو بار بار پیچھے مڑ مڑ کیا دیکھتا ہے، وہ عرض کرے گا کہ مجھے یہ توقع تھی کہ ایک مرجہ دوزخ سے نکالنے کے بعد مجھے دوبارہ وہاں نہیں بھیجا جائے گا، حکم ہو گا اسے جنت میں لے جاؤ (بیہقی، النسخ) اس سے معلوم ہوا کہ شخص رجاء اس کی بخشش کا سبب بن گئی۔

رجاء کی تدبیر اور حصول کا طریقہ

جاننا چاہیے کہ رجاء کی ضرورت دو آدمیوں کو پڑتی ہے، ایک اس شخص کو جس پر یاس کا غلبہ ہو، اور وہ عبادت ترک کر دے، دوسرا وہ شخص جس پر خوف غالب ہو، اور وہ عبادت پر اس قدر مواظبت کرے کہ خود بھی پریشان ہو جائے اور اپنے اہل و عیال کو بھی پریشان کرے، یہ دونوں شخص حد اعتدال سے تجاوز اور افراط و تفریط کی طرف مائل ہیں، ان دونوں ہی کو ایسے علاج کی ضرورت ہے جس سے وہ اعتدال پر آجائیں، لیکن وہ فریب خوردہ گناہ گار جو ترک اطاعت کے باوجود اللہ تعالیٰ سے مغفرت کا خواہاں ہو، اور کوئی عمل ایسا نہ کرتا ہو جس سے یہ سمجھا جائے کہ وہ مغفرت کا مستحق ہے اسکے حق میں رجاء ستم قاتل ہے، جیسے شد ٹھنڈا، مزاج رکھنے والوں کے لئے شفا ہے لیکن ان لوگوں کے لئے مملک زہر ہے جن کے مزاج میں حرارت و حدت ہو، ایسے شخص کے لئے صرف خوف مفید ہے یا وہ اسباب جن سے خوف پیدا ہوتا ہو، یہی وجہ ہے کہ جو شخص وعظ و نصیحت کرتا ہو اسے مرض اور اسباب مرض پر نظر رکھنی چاہیے، نیز اسے یہ بھی چاہیے کہ ہر مرض کا علاج اسکی ضد سے کرے، کسی ایسی چیز سے ہرگز نہ کرے جس سے مرض میں افادہ ہونے کے بجائے اضافہ ہو جائے، اسلئے کہ مطلوب اعتدال ہے، ہر صفت اور ہر خلق میں درجہ اعتدال کو پسند کیا گیا ہے، یہی درجہ سب سے اچھا ہے، اگر کوئی وصف یا خلق اس درجے سے مائل ہے خواہ افراط کی جانب یا تفریط کی طرف وہیں علاج کی ضرورت ہے تاکہ پھر درجہ اعتدال پر آجائے، ایسے علاج کی ضرورت نہیں جو اسے درجہ اعتدال سے اور زیادہ دور کرے۔

آج کے دور میں رجاء کسی بھی طرح مناسب نہیں، آج خوف کی ضرورت ہے، بلکہ اس میں بھی مبالغہ نہایت ضروری ہے، ہمارے خیال میں تو مبالغہ بھی راہ راست پر لانے میں مؤثر نہیں، چہ جائیکہ رجاء پیدا کیا جائے، اس سے تو انسان بالکل ہی تباہ و برباد ہو جاتا ہے، لیکن کیونکہ رجاء دلوں کے لئے خفیف تر، اور نفسوں کے لئے لذیذ تر ہے، اور وعظ صرف یہ چاہتے ہیں کہ لوگ ان کے وعظ کی طرف مائل ہوں، اور کلمات حسین بلند کریں، انھیں اس سے یہ مطلب نہیں کہ سننے والوں کے لئے ان کا وعظ مفید ہے یا نہیں وہ صرف اپنی تعریف کے خواہشمند نظر آتے ہیں، رجاء پر اتنا زور اسلئے دیا جاتا ہے کہ سننے والے اس موضوع سے زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں، ان واعظوں کی نادانی نے ہر طرف فساد برپا کر دیا ہے، لوگوں کی سرکشی بیحدادی ہے، اور گناہوں کی سیاحت میں اضافہ کر دیا ہے، حضرت علیؓ ارشاد فرماتے ہیں کہ عالم وہ ہے جو نہ لوگوں کو اللہ کی رحمت سے مایوس کرے اور نہ انھیں اللہ کی پکڑ سے ڈر رہائے۔ ہم رجاء کے اسباب بیان کرنے کے قاتل ہیں، لیکن ہر شخص کے لئے نہیں بلکہ صرف اس شخص کے لئے جو اللہ کی رحمت سے قطعاً مایوس ہو یا اس شخص کے لئے جس پر اللہ کا خوف غالب ہو۔ قرآن کریم اور حدیث شریف سے بھی یہی مفہوم ہوتا ہے، یہ دونوں ماخذ رجاء اور خوف دونوں پر مشتمل ہیں، اور ایسے تمام اسباب کو جامع ہیں جن سے عقلمند قسم کے مریضوں کو شفا حاصل ہو سکے، ان اسباب کا علم اور انھیں استعمال کرنے کا طریقہ طلاء کو بتلایا گیا ہے جو انبیاء عظیم السلام کے وارث ہیں، تاکہ وہ ضرورت کے مطابق دانا اور تجربہ کار طبیب کی طرح ان اسباب کو استعمال کر سکیں اور مریض کے لئے مناسب علاج تجویز کر سکیں، نادان اور جاہل حکیم کی طرح نہیں جو یہ سمجھتا ہے کہ تمام دوائیں ہر مرض کے لئے مفید ہوتی ہیں خواہ وہ کیسا ہی مرض کیوں نہ ہو۔

حال رجاء کیسے پیدا ہو؟ : رجاء کا حال دو چیزوں سے غالب آتا ہے، ایک اعتبار سے، اور دوسری آیات و روایات اور آثار

اعتبار کی صورت : یہ پہلی صورت ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ کتاب الفکر میں جو نعمتیں ہم نے بیان کی ہیں ان پر اچھی طرح غور و فکر کرے جہاں تک کہ وہ دنیا میں بندوں کو دی گئی نعمتوں کے لحاظ سے آگاہ ہو جائے اور جو عجیب و غریب نعمتیں اس نے انسان کی فطرت میں ملحوظ رکھی ہیں ان سے واقف ہو جائے، اللہ تعالیٰ نے انسان کو ہر وہ چیز عطا کی ہے جو دوام وجود کے لئے ضروری ہے جیسے غذا کے آلات، اور وہ چیزیں جن سے ان آلات کو استعمال کیا جاتا ہے جیسے ہاتھ، انگلیاں اور ناخن وغیرہ پھر یہی نہیں بلکہ اسے نعمت کی چیزیں بھی بخشیں جیسے ابو کا خمر اور ہونا، آنکھوں میں رنگ کا اختلاف، اور ہونٹوں کی سرخی وغیرہ، اگر یہ چیزیں نہ ہوتیں تب بھی انسان کا وجود باقی رہتا، صرف حسن و جمال متاثر ہوتا جو انسان کی خصوصیت ہے، یہ اللہ تعالیٰ کی عنایت ہے کہ اس نے اپنے بندوں کے سلسلے میں اس طرح کے دقیق امور بھی نظر انداز نہیں کئے، اور انھیں نصیب و نعمت کی زائد خصوصیات سے بھی نوازا جب انسانوں پر اسکی عنایت اور کرم کا یہ حال ہے تو وہ انھیں آخرت میں دائمی ہلاکت میں ڈالنے پر کیسے راضی ہو گا۔

اگر اچھی طرح غور کیا جائے تو یہ بات واضح ہو جائے کہ اکثر لوگوں کو دنیا میں سعادت کے اسباب حاصل ہیں، اسی لئے وہ دنیا سے جدا کی پسند نہیں کرتے اگرچہ انھیں یہ بتلادیا جائے کہ مرنے کی بعد ابد تک انھیں کوئی عذاب نہیں دیا جائے گا، وہ عدم کو برا نہیں جانتے بلکہ اسباب عیش و سعادت سے جدا کی کو برا سمجھتے ہیں جو انھیں میسر ہیں، اور جن کے بارے میں انھیں یہ خوف ہے کہ وہ موت کے ساتھ فنا ہو جائیں گے، بہت کم لوگ ایسے ہیں جو موت کی تمنا کرتے ہیں، وہ بھی عام حالات میں نہیں بلکہ کسی حادثے سے متاثر ہو کر یا کسی لاعلاج مرض سے مایوس ہو کر، جب دنیا میں اکثر لوگوں پر خیر اور سلامتی کا قلبہ ہے تو سنۃ اللہ لا تجد لہا تبدیلیا کی رو سے آخرت میں بھی خیر و سلامتی ہی غالب رہے گی، اسلئے کہ دنیا و آخرت دونوں کا مالک اور مدبر ایک ہے اور وہ ہے مغفرت کرنے والا۔ جب اس طرح غور و فکر کیا جائے تو بلاشبہ رجاء کے اسباب غالب آجائیں گے، اعتبار ہی کی ایک صورت یہ ہے کہ شریعت کی حکمتوں، اور سنن شرع میں مخفی دبیوی مصلحتوں پر نظر ڈالے کہ اللہ تعالیٰ نے رحمت کے کیا کیا بہانے وضع لئے ہیں اور کس کس طرح سعادت کے اسباب میلا کئے ہیں۔

ایک بزرگ نے سورہ بقرہ کی آیت مدائن (قرض لینے دینے سے متعلق احکام کی آیت) کو رجاء کا قوی تر سبب قرار دیا ہے، جب ان سے اسکی وجہ دریافت کی گئی تو انھوں نے کہا کہ دنیا اپنی تمام تر وسعت کے باوجود مختصر ہے اور بندوں کا رزق اس میں مزید مختص ہے پھر دین (قرض) کے مقابلے میں نہایت کم ہے، مگر اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے اس موضوع پر طویل تر آیت نازل فرمائی تاکہ اسکے بندے دین کے باب میں احتیاط کر سکیں، جب اس نے دین کے حفاظت کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا ہے تو دین کی حفاظت کیسے نہیں فرمائے گا جس کا کوئی عوض نہیں ہے۔

آیات و روایات کا استقراء : دوسری صورت یہ ہے کہ رجاء کے سلسلے میں جو آیات و روایات اور آثار وارد ہیں وہ تلاش کی جائیں اور ان میں غور کیا جائے، اس سلسلے میں بے شمار آیات ہیں جن میں سے چند یہ ہیں :-

قُلْ بِاعْبَادِيَ الَّذِينَ أَسْرَفُوا عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوا مِنْ رَحْمَةِ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ يَغْفِرُ
الذُّنُوبَ جَمِيعًا إِنَّهُمْ هُمُ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ (پ ۲۳ آیت ۵۳)

آپ کہہ دیجئے کہ اے میرے بندوں! جنہوں نے اپنے آپ پر زیادتیاں کی ہیں، تم خدا کی رحمت سے ناامید

مت ہو، یقیناً خدا تعالیٰ تمام گناہ معاف فرمادے گا وہ بڑا بخشنے والا اور بڑی رحمت والا ہے۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قرأت میں یہ الفاظ ہیں :-

وَلَا يُبَالِي إِنَّهُمْ هُمُ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ (ترمذی - اسماء بنت یزید)

اور اسے پروا نہیں ہے، بلاشبہ وہ مغفرت کرنے والا رحم کرنے والا ہے۔

وَالْمَلَائِكَةُ يُسَبِّحُونَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيَسْتَغْفِرُونَ لِمَنْ فِي الْأَرْضِ (پ ۲۵ آیت ۵)

اور فرشتے اپنے رب کی تسبیح و تحمید کرتے ہیں اور اہل زمین کے لئے معافی مانگتے ہیں۔

ایک جگہ یہ ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے دوزخ کی آگ اپنے دشمنوں کے لئے تیاری کی ہے، دوستوں کو اس سے ڈراتا ہے :-

لَهُمْ مِنْ فَوْقِهِمْ ظُلَلٌ مِنَ النَّارِ وَمِنْ تَحْتِهِمْ ظُلَلٌ ذَلِكَ يُخَوِّفُ اللَّعْنَةِ عَلَيْهِمْ (پ ۲۳ آیت ۱۶)

ان کے لئے آگ کے اوپر سے بھی آگ کے محیطہ طے ہوں گے، یہ وہی (عذاب) ہے جس سے اللہ اپنے

بندوں کو ڈراتا ہے۔

وَأَنفِقُوا النَّارَ الَّتِي أُعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ (پ ۳۴ آیت ۱۳)

اور اس آگ سے بچو کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے۔

فَأَنزَلْنَاكُمْ نَارًا تَلْظِي لَا يَصْلَاهَا إِلَّا الْأَشْقَى الَّذِي كَذَّبَ وَتَوَلَّى (پ ۳۰ آیت ۱۷)

(۱۷-۳۰)

میں تم کو ایک بھڑکتی ہوئی آگ سے ڈرا چکا ہوں، اس میں وہی بد بخت داخل ہو گا جس نے (دین حق کو)

جھٹلایا، اور اس سے روگردانی کی۔

وَأَنزَلْنَاكَ لَنُؤَمِّقِرَ لِلنَّاسِ عَلَى ظُلْمِهِمْ (پ ۳۳ آیت ۶)

اور یہ بات بھی یقینی ہے کہ آپ کا رب لوگوں کی خطائیں ان کی بجاہرکتوں کے باوجود معاف کر دیتا ہے۔

ایک حدیث میں ہے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی دعاؤں میں ہمیشہ اپنی امت کی مغفرت کا سوال فرماتے تھے، اس پر مذکورہ

بالا آیت نازل ہوئی، اور دریافت کیا گیا کیا آپ اب بھی راضی نہیں ہیں (۱)

وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ كَرَّتُكَ فَنُفِثَ فِيْهِ (پ ۳۰ آیت ۵)

اور عنقریب اللہ تعالیٰ آپ کو (آخرت میں نعمتیں) دے گا سو آپ خوش ہو جائیں گے۔

اس حدیث کی تفسیر میں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرماتے کہ اگر امت محمدیہ میں سے ایک شخص بھی دوزخ میں

رہا تو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کبھی راضی نہ ہو گا۔ ابو جعفر ابن محمد ابن علی نے اہل عراق سے فرمایا کہ تم یہ کہتے ہو کہ قرآن کریم میں

سب سے زیادہ توقع اور امید کی آیت یہ ہے :-

قُلْ يَا عِبَادِيَ الَّذِينَ أَسْرَفُوا عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوا مِنْ رَّحْمَةِ اللَّهِ (پ ۲۳ آیت ۳۱)

(۵۳)

آپ فرما دیجئے! اے میرے بندو جنہوں نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا تم اللہ کی رحمت سے ناامید مت ہو۔

اور ہم اہل بیت کما کرتے تھے کہ سب سے زیادہ امید افزاء آیت یہ ہے "وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ كَرَّتُكَ فَنُفِثَ فِيْهِ" رجاء

کے سلسلے میں روایات بھی بے شمار ہیں جن میں سے چند درج کی جاتی ہیں۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم

سے روایت کرتے ہیں :-

(۱) مجھے ان الفاظ میں یہ روایت نہیں ملی "اللہ ابن ابی حاتم اور علی نے اپنی تفسیروں میں حضرت سعید ابن المسیب سے یہ حدیث روایت کی ہے کہ اگر

اللہ تعالیٰ کی مغفرت نہ ہوتی تو یہاں کوئی شخص خوش ہاں نہ ہوتا

أَمْتَنِي مَرْحُومَةً لَا عَذَابَ عَلَيْهَا فِي الْآخِرَةِ عَجَّلَ اللَّهُ عِقَابَهَا فِي الدُّنْيَا الزَّلَازِلُ
وَالْفَيْسَنُ فَإِنَّا كَانَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ رُفِعَ إِلَى كُلِّ رَجُلٍ مِنْ أَمْتِنِي رَجُلٌ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ
فَقِيلَ هَذَا فِدَاءُ كَمِنْ النَّارِ (ابوداؤد - ابن ماجہ - النس)

حضرت موسیٰ اشعریؑ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ میری امت پر رحمت نازل کی
گئی ہے اس پر آخرت میں کوئی عذاب نہ ہوگا اللہ نے زلزلوں اور فتنوں کی صورت میں اس کو دنیا میں عذاب
دیدیا ہے قیامت کے دن میری امت کے ہر فرد کو اہل کتاب میں سے ایک آدمی دیا جائے گا اور کہا جائے گا کہ
یہ آگ سے تیرا فدیہ ہے۔

ایک روایت میں یہ ہے کہ میری امت کا ہر فرد ایک یہودی یا نصرانی کو پکڑ کر لائے گا اور اسے دوزخ کے کنارے کھڑا کر کے کہے
گا کہ یہ آگ سے میرا فدیہ ہے اور یہ کہہ کر اسے دوزخ میں دھکا دیدے گا (مسلم - ابوموسیٰ) ایک روایت میں ہے :-
الْحَمْدُ مِنْ فَيْسَجٍ جَهَنَّمُ وَهِيَ حَظُّ الْمُؤْمِنِ مِنَ النَّارِ (احمد - ابوامامہ)
بخار دوزخ کی پلٹ ہے اور وہ دوزخ میں سے مومن کا حصہ ہے۔

قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا :-
يَوْمَ لَا يُخْزِي اللَّهُ النَّبِيَّ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ (پط، رد، آیت ۸)

جس دن کہ اللہ تعالیٰ نبی کو اور جو ان کے ساتھ ایمان لائے ہیں ان کو رسوا نہ کرے گا۔

اس آیت کی تفسیر میں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک روایت نقل کی جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ
وسلم پر وحی نازل فرمائی کہ میں آپ کی امت کا حساب آپ کے سپرد کرتا ہوں آپ نے عرض کیا ایسا نہ کیجئے آپ میری بہ نسبت
میری امت کے حق میں زیادہ رحم کرنے والے ہیں اللہ تعالیٰ نے فرمایا اب ہم آپ کو امت کے سلسلے میں رسوا نہ کریں گے (ابن ابی
الدنیا) حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی میری امت کے گناہوں کا حساب
میرے سپرد کر دیجئے تاکہ ان کی برائیوں پر میرے علاوہ کوئی مطلع نہ ہو اللہ تعالیٰ نے وحی نازل فرمائی کہ یہ لوگ آپ کی امت ہیں اور
میرے بندے ہیں میں ان پر آپ کی نسبت زیادہ رحم کرنے والا ہوں ان کا حساب میں خود اپنے پاس رکھوں گا تاکہ ان پر نہ آپ کو
مطلع ہوں اور نہ کوئی اور شخص (۱) ایک روایت میں ہے :-

حَيَاتِي خَيْرٌ لَكُمْ وَمَوْتِي خَيْرٌ لَكُمْ أَمَا حَيَاتِي فَأَسْنُ لَكُمْ اللَّهُ نَنْ وَأَشْرَعُ لَكُمْ
الشَّرَائِعَ وَأَمَّا مَوْتِي فَإِنَّا أَعْمَا لَكُمْ نَعْرِضُ عَلَيْكَ فَمَا رَأَيْتُ مِنْهَا حَسَنًا حَمِدْتُ
اللَّهَ عَلَيْهِ وَمَا رَأَيْتُ مِنْهَا سَيِّئًا اسْتَغْفَرْتُ اللَّهَ لَكُمْ (بخار - عبد اللہ ابن مسعود)

میری زندگی بھی تمہارے لئے خیر ہے اور میری موت بھی میری زندگی اس لئے کہ میں تمہارے لئے سنن
اور احکام شرع بیان کرتا ہوں اور موت اسلئے کہ تمہارے اعمال میرے سامنے پیش کئے جائیں گے ان میں
سے جو اچھا عمل ہوگا اس پر اللہ کا شکر کروں گا اور جو برا ہوگا اس پر تمہارے لئے اللہ سے مغفرت کی درخواست
کروں گا۔

ایک مرتبہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے یا کریم الغفر (اب کریم) عاف فرما) کہا حضرت جبریل علیہ السلام نے آپ سے
سوال کیا کہ آپ کو اس جملے کی تفسیر معلوم ہے اسلئے معنی یہ ہیں کہ اگر اس نے اپنی رحمت سے گناہ معاف کر دیئے تو اپنے کرم سے

انہیں نیکیوں سے تبدیل کرے گا۔ (۱) ایک مرتبہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی شخص کو یہ کہتے ہوئے سنا اے اللہ میں آپ سے تمام نعمت کا سوال کرتا ہوں، آپ نے اس سے دریافت فرمایا کہ کیا تم تمام نعمت سے واقف ہو، اس نے عرض کیا، نہیں۔ آپ نے فرمایا تمام نعمت ہے جنت میں داخل ہونا۔ (۲) علماء کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے اسلام پسند کر کے ہم پر اپنی نعمت مکمل فرمائی ہے، جیسا کہ خود ارشاد فرمایا :-

وَأَنَّمَتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيْتُ لَكُمْ الْإِسْلَامَ دِينًا (پ ۵۶، آیت ۳)

اور میں نے تم پر اپنا انعام تمام کر دیا اور میں نے اسلام کو تمہارا دین بننے کے لئے پسند کر لیا۔

ایک حدیث میں ہے کہ جب کوئی بندہ گناہ کرتا ہے، اور اللہ سے مغفرت چاہتا ہے تو اللہ تعالیٰ اپنے ملائکہ سے فرماتا ہیکہ میرے بندے کو دیکھو کہ گناہ کیا پھر اس نے یہ جانا کہ اسکا ایک رب ہے جو گناہ معاف بھی کرتا ہے اور ان پر مواخذہ بھی کرتا ہے، تم کو اہر ہو میں نے اسکا گناہ معاف کر دیا ہے (بخاری و مسلم ابو ہریرہ) ایک حدیث قدسی میں ہے کہ اے انسان! اگر تیرے گناہ آسمان تک پہنچ جائیں اور مجھ سے مغفرت کی درخواست کرے اور امید رکھے تو میں معاف کر دوں گا (ترمذی - نسائی) اسی طرح کی ایک روایت یہ ہے کہ جو بندہ مجھ سے اس حال میں ملاقات کرے گا کہ اس کے پاس زمین کی وسعت کے بقدر گناہ ہوں گے مگر شکر نہ ہو گا تو میں بھی اسی قدر وسیع مغفرت کے ساتھ اس سے ملوں گا (مسلم - ابودرد) ایک روایت میں ہے کہ جب بندہ کوئی گناہ کرتا ہے تو فرشتہ چھ گھڑی تک وہ گناہ اعمال نامے میں نہیں لکھتا، اگر اس عرصے میں وہ توبہ و استغفار کر لیتا ہے تو اسے نہیں لکھتا ورنہ لکھ لیتا ہے۔ یہ روایت دوسرے الفاظ میں اس طرح ہے کہ جب وہ فرشتہ پرانی لکھ لیتا ہے پھر وہ بندہ کوئی نیک عمل کرتا ہے تو دائیں طرف کا فرشتہ جو حاکم ہے بائیں طرف کے فرشتہ سے جو محکوم ہے کہتا ہے کہ تو نے جو برائی ابھی درج کی ہے اسے حذف کر دے، میں بھی ایک نیک اسکے بدلے میں کم کئے دیتا ہوں یعنی بجائے دس نیکیوں کے نو نیکیاں لکھتا ہوں۔ (۳) حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب کوئی بندہ گناہ ترک کرتا ہے تو اس کے اعمال نامے میں درج کر لیا جاتا ہے، ایک اعرابی نے عرض کیا اگر وہ توبہ کر لے، آپ نے فرمایا دوبارہ لکھ لیا جاتا ہے، اس نے عرض کیا اگر دوبارہ توبہ کرے، آپ نے فرمایا دوبارہ حذف کر دیا جاتا ہے، اس نے عرض کیا ایسا کب تک ہوتا ہے آپ نے ارشاد فرمایا جب تک وہ توبہ و استغفار کرتا رہے گا، اللہ تعالیٰ اس وقت تک مغفرت سے نہیں آکتا تا جب تک بندہ خود ہی استغفار سے نہ آکتا جائے، جب بندہ کسی نیک عمل کا قصد کرتا ہے تو دائیں جانب کا فرشتہ عمل سے پہلے ہی ایک نیک لکھ لیتا ہے، اور جب عمل کرتا ہے تو دس نیکیاں لکھتا ہے، پھر اللہ تعالیٰ ان دس نیکیوں کو سات سو تک کر دیتا ہے، اور جب کسی گناہ کا قصد کرتا ہے تو کچھ نہیں لکھتا، جب اس پر عمل کرتا ہے تو ایک گناہ لکھتا ہے، اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ کا حسنِ حق ہے (یعنی - بتبیر میر) ایک شخص سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا اور کہنے لگا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں ایک مہینہ سے زیادہ روزے نہیں رکھتا، اور نہ نماز کی مقدار سے زیادہ نماز پڑھتا ہوں، نہ میرے مال میں کوئی صدقہ ہے، نہ مجھے ہرج اور خیرات ہے، اگر میں مہاجروں کو میرا مکان نہ کماں ہو گا۔ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم مسکرائے اور فرمایا جنت میں، اس نے عرض کیا آپ کے ساتھ، آپ نے فرمایا ہاں میرے ساتھ بشرطیکہ تم اپنے دل کو دو چیزوں سے جدا کر دے، کبسنے سے بچاؤ، اور زبان کو دو چیزوں سے ضبط اور محفوظ رکھو، اور اپنی آنکھوں کو دو چیزوں سے بچاؤ یعنی اللہ تعالیٰ نے جو چیزوں حرام کی ہیں ان کی طرف نظر نہ کرو، اور ان کے ذریعے کسی مسلمان کی اہانت نہ کرو، اگر تم نے ایسا کیا تو تم میرے ساتھ ان دو تہلیلوں

(۱) یہ کلمہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت جبرئیل علیہ السلام کے درمیان میں ہوا، بلکہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ اور حضرت جبرئیل علیہ

السلام کے مابین ہوا جیسا کہ یحییٰ نے جب ابن ابی ولید سے روایت کیا ہے۔ (۲) یہ روایت پہلے بھی گزر چکی ہے (۳) یہ دونوں روایتیں یحییٰ میں

حضرت ابوالہدٰ سے مروی ہیں

پر جنت میں جاؤ گے (۱) حضرت انسؓ اپنی ایک طویل حدیث میں روایت کرتے ہیں کہ ایک اعرابی نے عرض کیا کہ مخلوق کے حساب کا کفیل کون ہوگا آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اس نے عرض کیا وہ خود حساب لے گا، آپ نے فرمایا ہاں! یہ سن کر اعرابی مسکرایا، آپ نے ہنسنے کی وجہ دریافت کی اس نے عرض کیا اللہ تعالیٰ کریم ہے جب قدرت پاتا ہے معاف کرتا ہے، اور حساب لیتا ہے تو چشم پوشی کرتا ہے، سرکارِ دو عالم صلی نے ارشاد فرمایا اعرابی نے سچ کہا، اللہ تعالیٰ کریم ہے، اور وہ تمام اہل کرم سے زیادہ کرم والا ہے، اس کے بعد آپ نے فرمایا اعرابی سمجھ گیا، اس حدیث میں یہ بھی فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے کعبہ مکرمہ کو شرف اور فضیلت سے نوازا ہے، اگر کوئی بندہ خدا اس گھر کا ایک ایک پتھر گرا دے اور پھر اسے جلاؤالے تو اس قدر گناہ نہیں ہوگا جس قدر گناہ کسی بدی اللہ کی تحقیر سے ہوتا ہے، ایک اعرابی نے عرض کیا اللہ کے اولیاء کون ہیں، آپ نے فرمایا تمام مومن اللہ کے دوست ہیں، کیا تو نے یہ آیت نہیں پڑھی نہ

الْمُؤْمِنَاتِ الْيَتِيمَاتِ آمَنُوا يُخْرِجُهُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ (۲) (پ ۲۳۳ آیت ۲۵۷)

اللہ تعالیٰ سامع ہے ان لوگوں کا جو ایمان لائے ان کو تاریکیوں سے نکال کر نور (اسلام) کی طرف لاتا ہے۔

اس روایت کی بے شمار احادیث سے تائید ہوتی ہے جن میں سے بعض یہ ہیں نہ

الْمُؤْمِنِينَ أَفْضَلُ مِنَ الْكُفَّةِ (ابن ماجہ۔ ابن عمر)

مومن کعبہ سے افضل ہے

الْمُؤْمِنِينَ طَيِّبٌ طَاهِرٌ (۳)

مومن پاک و طاهر ہے

الْمُؤْمِنِينَ أَكْرَمُ عَلَى اللَّهِ تَعَالَى مِنَ الْمَلَائِكَةِ (ابن ماجہ۔ ابو ہریرہ)

مومن اللہ کے نزدیک ملائکہ سے افضل ہے

یہ تو فضیلت مومن کی حدیثیں ہیں ان سے بھی رجاہ کا مضمون ثابت ہوتا ہے، خاص رجاہ کی کچھ احادیث یہ ہیں نہ

ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے دونوں کو ایک کو ڈال دیا جس سے وہ اپنے بندوں کو جنت کی طرف ہٹاتا ہے۔ (۴)

ایک حدیث قدسی میں ہے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ میں نے مخلوق کو اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ مجھ سے نفع اٹھائیں اسلئے پیدا نہیں کیا کہ میں ان سے نفع اٹھاؤں۔ (۵) حضرت ابو سعید الخدریؓ روایت کرتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے کوئی چیز ایسی پیدا نہیں کی جس پر کوئی دوسری چیز غالب نہ ہو، اور اپنی رحمت کو اپنے غمے پر غالب بنایا (ابن حبان) ایک مشہور

حدیث میں ہے نہ

إِنَّ اللَّهَ تَعَالَى كَتَبَ عَلَى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ قَبْلَ أَنْ يَخْلُقَ الْخَلْقَ إِنَّ رَحْمَتِي تَغْلِبُ

عَظَمَتِي (بخاری و مسلم۔ ابو ہریرہ)

اللہ تعالیٰ نے مخلوق کی تخلیق سے پہلے ہی اپنے اوپر یہ جملہ لکھ لیا ہے ”بلاشبہ میری رحمت میرے غضب پر

غالب ہے۔“

حضرت معاذ بن جبلؓ اور حضرت انسؓ مالک روایت کرتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا نہ

مَنْ قَالَ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ دَخَلَ الْجَنَّةَ (طبرانی نسائی)

(۱) یہ حدیث پہلے ہی گزر چکی ہے (۲) اس روایت کی کوئی اصل مجھے نہیں ملی (۳) یہ روایت ان الفاظ میں نہیں ہے بخاری و مسلم میں یہ الفاظ ہیں المومن لا تنس مومن بھی ناپاک نہیں ہوتا (۴) یہ روایت بخاری و مسلم میں ابو ہریرہؓ سے ان الفاظ میں موی ہے ”عجب رہنما من قوم یحییٰ بعالی الحق“ (۵) اس روایت کی کوئی اصل مجھے نہیں ملی

جس شخص نے لا الہ الا اللہ کہا وہ جنت میں داخل ہوگا۔
 مَنْ كَانَ آخِرَ كَلَامِهِ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ لَمْ تَحْمِسْهُ النَّارُ (ابوداؤد، حاکم، معاذ بلقذ آخر)
 جس کا آخری کلام لا الہ الا اللہ ہوگا اسے دوزخ کی آگ میں نہیں کرے گی۔
 مَنْ لَقِيَ اللَّهَ لَا يَشِيرُ كِبَاشِيَةً آخِرَ مَثَ عَلَيْهِ النَّارُ (بخاری و مسلم۔ انسؓ بخیر قلیل)
 جو شخص اس حال میں اللہ سے ملے کہ اس نے شرک نہ کیا ہو تو اس پر دوزخ کی آگ حرام ہوگی۔
 لَا يَدْخُلُهَا مَنْ فِي قَلْبِهِ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِنْ إِيْمَانٍ (بخاری و مسلم۔ ابوسعید الخدری بلقذ آخر)
 دوزخ میں وہ شخص داخل نہیں ہوگا جس کے دل میں ذرہ برابر بھی ایمان ہوگا۔
 لَوْ عَلِمَ الْكَافِرُ سَعَتَ رَحْمَةِ الْعَالَمِينَ لَإِيْسَ مِنْ جَنَّةٍ لَعَدُ (بخاری و مسلم۔ ابو ہریرہ)
 اگر کافر اللہ کی رحمت کی وسعت معلوم ہو جائے تو اس کی جنت سے مایوس نہ ہو۔
 ایک حدیث میں ہے کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔
 إِنْ زُلْزِلَ السَّاعَةُ شَيْءٌ عَظِيمٌ (پ ۸ عار ۸ آیت ۱)
 قیامت کا زلزلہ بڑی بھاری چیز ہوگی۔

تو صحابہ سے دریافت فرمایا کہ تم جانتے ہو کہ کون سا دن ہوگا؟ یہ وہ دن ہوگا کہ حضرت آدم علیہ السلام سے کہا جائے گا جاؤ اور اپنی
 ذریت میں سے دوزخ کے لئے نکال لو، حضرت آدم علیہ السلام عرض کریں گے کتنے؟ حکم ہوگا ہزار میں سے نو سو ننانوے اور صرف ایک
 جنت میں جائے گا، یہ فرا کر سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے گئے اور صحابہ کرام نے دوتا شروع کر دیا۔ اس روز کسی نے کوئی
 کام نہیں کیا، سب بیٹھے روتے رہے (یہاں تک کہ) سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور صحابہ سے پوچھا تمہیں کیا ہوا تم
 نے آج کام کیوں نہیں کیا؟ انہوں نے عرض کیا جو حدیث آپ نے بیان فرمائی ہے اسے سننے کے بعد کون کام کر سکتا تھا؟ آپ نے دریافت
 فرمایا قوموں میں تمہاری تعداد کتنی ہے؟ تاویل: تاویل شک، یا جوج باجوج وغیرہ قومیں اتنی ہیں کہ ان کی صحیح تعداد اللہ ہی جانتا ہے، تمام
 قوموں میں تمہاری حیثیت صرف اتنی ہے جتنی حیثیت سیاہ رنگ تیل کے جسم پر سفید بال کی ہوتی ہے، یا جانور کے پاؤں میں سفید داغ کی
 ہوتی ہے، (ترمذی۔ عمران ابن حصین) فور کچھ پہلے آپ نے صحابہ کرام کو خوف کے کوٹوں سے ہٹا دیا اور جب وہ حد اعتدال سے تجاوز
 کرنے لگے اور مایوسی کی حدود کو چھونے لگے تو انہیں رجاء کی لگام پستا کر اعتدال کی طرف کھینچا، یہاں دو سرا قول پہلے قول کے خلاف
 نہیں تھا، پہلے آپ نے وہ بات بیان کی جسے آپ نے مخاطب کے لئے شفا جانا، پھر جب دوسرے موقع پر دوسرے علاج کی ضرورت پیش
 آئی تو دو سرا قول بیان فرمایا، چنانچہ واعظین کے لئے ضروری ہے کہ وہ سید الوعاظ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتداء کریں، اور
 خوف و رجاء کی روایات بیان کرنے میں احتیاط کا پہلو اختیار کریں، اگر ایسا نہیں کریں گے تو ان کے مواعظ سے اصلاح کے بجائے فساد کا
 اندیشہ ہے، رجاء کے سلسلے میں مزید روایات یہ ہیں، فرمایا نہ۔

لَوْ كُنْتُمْ تُذِنُّوْنَ لَخَلَقَ اللَّهُ مَخْلَقًا يَذْنِبُونَ فَيَغْفِرَ لَهُمْ (مسلم۔ ابو ہریرہ)

اگر تم نے گناہ نہ کئے تو اللہ تعالیٰ دوسری مخلوق پیدا کرے گا جو گناہ کریں گے پھر اللہ ان کی مغفرت فرمائے گا۔

اس روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ تمہیں فنا کر دے گا اور تمہاری جگہ ایسی مخلوق لے آئے گا جو گناہ کرے گی، پھر وہ ان کی
 مغفرت فرمائے گا۔ بلاشبہ وہ مغفرت کرنے والا رحم کرنے والا ہے (مسلم۔ ابویوب) ایک حدیث میں ہے کہ اگر تم نے گناہ نہ کئے تو مجھے
 اس امر کا خدشہ ہے جو گناہ سے بدتر ہے، صحابہ نے عرض کیا وہ کیا چیز ہے؟ فرمایا عجب اور خود پسندی (بزار، ابن حبان۔ انسؓ) ایک جگہ
 ارشاد فرمایا، اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے اللہ تعالیٰ اپنے بندہ مومن پر اس ماں سے زیادہ رحم کرنے والا ہے جو اپنے
 بچے پر مہربان ہوتی ہے (بخاری و مسلم۔ عمرؓ) ایک حدیث میں ہے فرمایا اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ایسی مغفرت فرمائے گا کہ کسی کے دل

پر نہ گزری ہوگی یہاں تک کہ ابلیس بھی اس مغفرت کا مظہر ہو گا کہ شاید اٹکے جسے میں آجائے (ابن ابی الدنیا۔ السنن) فرمایا اللہ تعالیٰ کی سورتیں ہیں جن میں سے اسے ننانوے رحمتیں محفوظ رکھی ہیں اور ایک رحمت دنیا میں ظاہر فرمائی ہے اسی رحمت کے باعث لوگ ایک دوسرے سے رحم کا برتاؤ کرتے ہیں ماں اپنے بچے پر شفقت کرتی ہے چاچا اور اپنے بچوں پر معوان ہوتا ہے جب قیامت برپا ہوگی تو یہ رحمت بھی ان ننانوے رحمتوں میں شامل کر دی جائے گی پھر یہ رحمتیں تمام عقلمند پر عام کی جائیں گی اور ہر رحمت اس قدر وسیع ہوگی کہ تمام آسمان وزمین بھر جائیں گے اس دن بد قسمت تلوہ کا رے علاوہ کوئی ہلاک نہ ہو گا (بخاری و مسلم۔ ابو ہریرہ) فرمایا نہ

مَا مِنْكُمْ مِنْ أَحَدٍ يُدْخِلُهُ عَمَلُهُ الْجَنَّةَ وَلَا يُنْجِيهِ مِنَ النَّارِ قَالُوا لَا أَنْتَ يَا رَسُولَ اللَّهِ قَالَ لَا إِلَّا أَنْ يَتَغَمَّدَنِي اللَّهُ بِرَحْمَةٍ وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ

تم میں سے کوئی ایسا نہیں جسے اسکا عمل جنت میں پہنچا دے یا دوزخ سے بچائے لوگوں نے عرض کیا آپ کو

بھی یا رسول اللہ! فرمایا نہ مجھے الایہ کہ اللہ کی رحمت میرے شامل حال ہو۔

اعْمَلُوا وَأَنْبِشِرُوا وَأَعْلَمُوا إِنَّ أَحَدًا لَمْ يَسْجُدْ عَمَلُهُ (۱)

عمل کرو خوشخبری حاصل کرو اور یہ بات جان لو کہ کسی کو اس کا عمل نجات نہیں دے گا۔

ایک روایت میں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میں نے اپنی شفاعت اپنی امت کے اہل کھار کے لئے پوشیدہ رکھی ہے کیا تم اسی اہل تقویٰ اور اطاعت گزاریوں کے لئے سمجھتے ہو بلکہ وہ گناہوں میں آلودہ ہو جانے والوں کے لئے ہے (بخاری و مسلم۔ ابو ہریرہ) (آخر فرمایا میں خالص اور آسان دین جہنمی کے ساتھ سمجھا گیا ہوں) (احمد۔ ابوامامہ) فرمایا میں چاہتا ہوں کہ دونوں کتابوں والے یعنی یہود و نصاریٰ یہ بات جان لیں کہ ہمارے دین میں وسعت و فراخی ہے۔ (احمد) چنانچہ اس کی تائید اس دعا سے ہوتی ہے جو بارگاہ الہی سے قبول ہوئی، مومنین نے یہ دعا کی تھی نہ

وَلَا تُحْمِلْ عَلَيْنَا أَصْرًا (پ ۸۳ آیت ۲۸۶) اور ہم پر کوئی سخت بھگہ نہ بھیجے

اسکے جواب میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا نہ

وَنَضْعُ عَنْهُمْ أَصْرَهُمْ وَلَا غَلَالَ الشَّيْءِ كَانَتْ عَلَيْهِمْ (پ ۸۴ آیت ۵۵)

اور ان لوگوں پر جو بوجھ اور طوق تھے ان کو دور کرتے ہیں۔

محمد ابن الحنفیہ حضرت علیؑ سے روایت کرتے ہیں کہ جب قرآن کریم کی یہ آیت نازل ہوئی نہ

فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِيلَ (پ ۸۳ آیت ۸۵) سو آپ غمیل کے ساتھ درگزر کیجئے۔

تو سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبریل علیہ السلام سے دریافت فرمایا کہ صغ جمیل کسے کہتے ہیں حضرت جبریل علیہ السلام نے جواب دیا کہ اگر کسی شخص نے تم پر ظلم کیا ہو اور تم نے اسے معاف کر دیا ہو تو پھر تم اس پر عتاب بھی نہ کرو یہ صغ جمیل ہے آپ نے ارشاد فرمایا اے جبریل! اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ جسے معاف کر دے گا اس پر عتاب بھی نہ کرے گا یہ بات سن کر حضرت جبریل رونے لگے اور سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم بھی رونے لگے اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کے پاس حضرت میکائیل علیہ السلام کو بھیجا انھوں نے آکر کہا کہ اللہ تعالیٰ تم دونوں کو سلام کہتا ہے اور فرماتا ہے کہ جس کو میں معاف کر دوں گا اس پر عتاب کیسے کروں گا؟ ایسا کرنا میرے کرم کے شایان شان نہیں (ابن مودہ یہ موقوفاً علی علیؑ کے رجاء کے سلسلے میں بے شمار روایات ہیں ہم ان ہی پر اکتفا کرتے ہیں اور آثار بیان کرتے ہیں۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ جس شخص نے کوئی گناہ کیا اور اللہ تعالیٰ نے دنیا میں اسکی پردہ پوشی فرمائی تو اللہ تعالیٰ کے کرم کا تقاضا یہ نہیں ہے کہ آخرت میں اس کا راز ظاہر کرے اور جس شخص کو دنیا میں اس کے گناہ کی سزا دیدی گئی ہو اللہ تعالیٰ کے صل و انصاف کا

تقصایہ نہیں ہے کہ اسے آخرت میں بھی سزا دی جائے۔ حضرت سفیان ثوریؒ فرماتے ہیں کہ مجھے یہ پسند نہیں کہ میرا حساب میرے والدین کے حوالے کیا جائے اسلئے کہ اللہ تعالیٰ میرے والدین سے زیادہ مجھ پر مہمان اور رحم کرنے والا ہے۔ ایک بزرگ فرماتے ہیں جب کوئی بندہ گناہ کرتا ہے تو اسے فرشتوں کی نگاہوں سے اوچھل کر دیتا ہے تاکہ وہ اسے دیکھ کر گواہی نہ دیں سکیں۔ محمد ابن صعب نے اسود ابن سالم کو اپنے قلم سے لکھا کہ جب بندہ اپنے نفس پر ظلم کرتا ہے (گناہ کرتا ہے) اور ہاتھ اٹھا کر اللہ اکبر کہتا ہے تو فرشتے اسکی آواز روک دیتے ہیں وہ دوبارہ یا اللہ کہتا ہے فرشتے دوسری بار بھی اس کی آواز اوپر نہیں جاتے دیتے تیسری بار بھی ایسا ہی ہوتا ہے جب چوتھی بار بندہ اپنے خدا کو آواز دیتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرشتوں سے فرماتا ہے کہ میرے بندے کی آواز کب تک مجھ سے چھپاؤ گے وہ یہ بات جان گیا ہے کہ میرے سوا کوئی اسکے گناہوں کی مغفرت نہیں کر سکتا میں تمہیں گواہ بنا ہوں کہ میں نے اس کے گناہ بخش دیے ہیں حضرت ابراہیم ابن اویم فرماتے ہیں کہ ایک رات مجھے خانہ کعبہ کا طواف تھا کہ نے کی سعادت نصیب ہوئی یہ ایک تاریک رات تھی میں دروازہ کعبہ کے نزدیک ملہزم میں کھڑا ہو گیا اور یہ دعا کرنے لگا اے اللہ! مجھے اپنی حفاظت میں رکھے تاکہ میں حیرانی یا فراموشی نہ کر سکوں اسی دوران بیت اللہ کی طرف سے آواز آئی اے ابراہیم تم گناہوں سے حفاظت چاہتے ہو میرے قیام مومن بندے بھی یہی دعا کرتے ہیں اگر میں سب کو گناہوں سے محفوظ کر دوں اور معصوم بندوں کو اپنا فضل اور مغفرت کس پر کر دوں؟ حضرت حسن البصریؒ فرمایا کرتے تھے کہ اگر مومن گناہ نہ کرے تو آسمانی ملکوت میں اذان میرے لیکن اللہ تعالیٰ نے گناہوں کے ذریعے اسکے پرکھ دئے ہیں حضرت جنیدؒ فرماتے ہیں اگر ایک نظر عنایت ہوگئی تو نیک و بد ایک ہو جائیں گے حضرت مالک ابن دینار نے اپنا سے دریافت کیا کہ تم لوگوں کو رخصت کی حد میں کب تک سناؤ گے انھوں نے جواب دیا اے ابو یحییٰ! مجھے امید ہے کہ قیامت کے روز تم خدا تعالیٰ کے مخلوق کرم کے اتنے متاثر دیکھو گے کہ برداشت نہ کر پاؤ گے رومی ابن حرمث اپنے بھائی کے متعلق جو مشہور نامہ ہی ہیں اور جنھوں نے موت کے بعد گھنگھوکی ہے بیان کرتے ہیں کہ جب میرے بھائی کا انتقال ہوا اور انھیں کفن پر سنا دیا گیا اور ایک خادمہ ان کی نعش پر ڈال دی گئی تو انھوں نے اپنے چہرے سے کپڑا ہٹایا اور سیدھے ہو کر بیٹھ گئے اور کہنے لگے میں نے اپنے رب سے ملاقات کی اور اس نے روح و بدن سے میرا استقبال کیا میرا رب ناراض نہیں تھا میں نے اپنا معاملہ اتنا آسان پایا جتنا تمہیں ممکن بھی نہیں تھا اس لئے سستی نہ کرو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی اصحاب سب میرے فخر ہیں کہ میں ان کے پاس دلچسپ چاؤں ہے کہ نہ کر نہ کر پڑے گناہ و گنہگاری ہوں جو کسی طشت میں گر پڑی ہو ہم نے ان کا جنازہ اٹھایا اور نعش دفن کردی ایک حدیث میں بنی اسرائیل کے دو آدمیوں کا قصہ بیان کیا گیا ہے ان دونوں نے آپس میں اخوت کا رشتہ قائم کیا تھا ان میں سے ایک اپنے نفس پر گناہوں کے ذریعے ظلم کرتا تھا اور دوسرا انتہائی عبادت گزار تھا یہ دوسرا شخص اپنے بھائی کو اس سرکشی اور غافلانی پر زبردست توبہ کیا کرتا تھا اور اسکے جواب میں یہ کہتا تھا کہ تو میرا بھائی نہیں ہے میں جانوں اور میرا خدا جانے تو میرے معاملات میں دخل نہ دے ایک دن عابد نے اسے گناہ کبیرہ کا ارتکاب کرتے ہوئے دیکھ لیا اس بات پر اسے سخت غصہ آیا اور کہنے لگا کم بخت اللہ حیرانی مغفرت نہ کرے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس سے فرمائیں گے کہ کیا کوئی شخص میری رحمت کو پامال کر سکتا ہے؟ اسے میرے بندوں سے روک سکتا ہے؟ پھر گناہ گار بندے سے فرمائیں گے جا میں نے تجھے بخش دیا اور عابد سے کہیں گے تو نے اپنے لئے آگ واجب کر لی ہے اسکے بعد سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس ذات کی قسم جسکے قبضے میں میری جان ہے اس نے ایسی بات کہی تھی جو دنیا و آخرت میں اسکی ہلاکت کا باعث بن گئی (ابوداؤد۔ ابو ہریرہؓ)

بنی اسرائیل کا ایک شخص رہنمی کیا کرتا تھا وہ چالیس برس تک اس کمرہ مشغلہ میں رہا۔ ایک مرتبہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اسکے پاس سے گزرے ان کے پیچھے آپ کے حواریوں میں ایک شخص تھے جو نہایت عبادت گزار تھے اس رہزن نے ان حضرات کو دیکھ کر اپنے دل میں سوچا کہ یہ اللہ کے نبی یہاں سے گزر رہے ہیں اور ان کے برابر میں ایک حواری ہیں اگر میں بھی ان کے ساتھ ہو لوں تو وہ سے تین افراد ہو جائیں گے یہ سوچ کر آگے بڑھا اور اس کے ساتھ چلنے کا ارادہ کیا لیکن حواری کی عظمت شان کی پیش نظر آگے بڑھنے کی

بہت نہیں ہوئی، اور دل میں یہ خیال کیا کہ میں گناہ گار ہوں اور یہ بزرگ ہستی ہیں، مجھ جیسے برے آدمی کا ان کے پہلو پہ پہلو چلنا مناسب نہیں ہے، پھر کچھ سوچ کر نہ امت اور شرمندگی کے ساتھ پیچھے پیچھے چلنے لگا، دوسری حواری کے دل میں یہ خیال آیا کہ ایک برا آدمی جو رہنری کرتا ہے مجھ جیسی متقی اور پرہیزگار شخص کے برابر چل رہا ہے اس لئے وہ حضرت میثی علیہ السلام سے کچھ اور قریب ہو کر چلنے لگا، وہ رہن پیچھے پیچھے چلا رہا، اسی دوران حضرت میثی علیہ السلام پر وحی نازل ہوئی کہ ان دونوں سے کہہ دو کہ جو اعمال انہوں نے کئے ہیں وہ سب ضائع ہو گئے، اب از سر نو عمل شروع کریں، حواری کے اعمال حسد اس کے عجب کی وجہ سے ضائع چلے گئے، اور راہزن کے اعمال سب اس کی تواضع اور اپنے نفس کو حقیر سمجھنے کی وجہ سے محو ہو گئے، آپ نے ان دونوں کو اس وحی سے مطلع کیا، اور اس راہزن کو اپنا ہم سفر بنالیا اور اسے اپنے حواریوں میں شامل کر لیا۔ حضرت مسوق روایت کرتے ہیں کہ ایک پیغمبر اللہ تعالیٰ کے سامنے سجدہ ریز تھے کہ کوئی بدست شرابی ان کی گردن اپنے پاؤں سے روندتا ہوا گزر گیا یہاں تک کہ زمین پر پڑی ہوئی ٹکڑیاں ان کی پیشانی زخمی کر گئیں، پیغمبر نے سجدے سے سر اٹھایا اور غصے سے کہا دفع ہو جاؤ اللہ کی قسم تیری مغفرت نہیں ہوگی، اس پر اللہ تعالیٰ نے وحی نازل فرمائی کہ اے پیغمبر تو ہمارے بندوں پر قسم کھاتا ہے، میں نے اس کی مغفرت کر دی ہے۔ اسی سے ملتی جلتی ایک روایت حضرت عبداللہ ابن عباس سے مروی ہے، وہ روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں مشرکین کے لئے بددعا کیا کرتے تھے اور ان پر لعنت بھیجتے تھے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی: لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ أَوْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ أَوْ يُعَذِّبُهُمْ (پ ۳۴ آیت ۴۸)

آپ کو کوئی دخل نہیں یہاں تک کہ خدا نے تعالیٰ یا تو ان پر متوجہ ہو جائیں یا ان کو کوئی سزا دیدیں۔

اس آیت کے بعد آپ نے بددعا ترک فرمادی اور اللہ تعالیٰ نے ان میں سے اکثر کو شرف ہدایت سے نوازا۔ بخاری۔ ابن عمر۔ ایک اثر اس مضمون کا منقول ہے کہ دو آدمی تھے اور دونوں عبادت میں برابر درجہ رکھتے تھے، جب وہ دونوں جنت میں گئے تو ایک کو دوسرے کے مقابلے میں بلند درجات عطا کئے گئے، اس پر دوسرے عابد نے عرض کیا اللہ! ہم دونوں عبادت میں مساوی تھے پھر کیا وجہ ہے میرے رفیق کو بلند درجات ملے، فرمایا تو دنیا میں دوزخ سے نجات کی دعا مانگا تھا اور تیرا ساتھی بلند درجات کا طالب تھا، اس لئے دونوں کو ان کے سوال کے مطابق عطا کیا گیا ہے۔ اس اثر سے ثابت ہوتا ہے کہ رجاہ کے ساتھ عبادت کرنا افضل ہے، اس لئے کہ خائف کے مقابلے میں راجی پر اللہ تعالیٰ کی محبت زیادہ غالب ہوتی ہے، چنانچہ شاہان دنیا اپنے ان خاموشوں میں فرق کرتے ہیں جن میں سے بعض خوف کی بنا پر خدمت کرتے ہیں، اور بعض انعام و اکرام کی امید میں۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے حسن ظن کا حکم دیا ہے، اور اسی بنا پر سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا:۔

سَلُّوا إِلَٰهَ الْكَرْبَاتِ الْعُلَىٰ فَإِنَّمَا تَسْأَلُونَ كَرِيْمًا (۱)

اللہ تعالیٰ سے بلند درجات کا سوال کرو کیونکہ تم کریم سے سوال کرتے ہو۔

ایک حدیث میں ہے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔

إِذَا سَأَلْتُمُو اللَّهَ فَأَعْظَمُوا الرَّغْبَةَ وَاسْأَلُوا الْفَرْدَوْسَ الْأَعْلَىٰ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يَتَعَاطَمُهُ شَيْءٌ (بخاری و مسلم ابو ہریرہ باختلاف لیر)

جب تم اللہ تعالیٰ سے مانگو تو نہایت رغبت سے مانگو اور فردوس اس کا سوال کرو، اس لئے کہ اللہ کے نزدیک کوئی

بڑی چیز نہیں ہے۔

بکر ابن سلیم صوف کہتے ہیں کہ جس رات حضرت مالک ابن انس کی وفات ہوئی، ہم ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا آپ کا کیا حال ہے؟ انہوں نے جواب دیا مجھے نہیں معلوم کہ میں اس سوال کے جواب میں کیا کہوں، مگر بہت جلد تم اللہ تعالیٰ کے اتنے بڑے فضل و حقو کا مشاہدہ کرو گے جس کا جہیں گمان بھی نہیں ہوگا اس سوال و جواب کو چند ہی لمحے گزرے تھے کہ آپ وفات فرما گئے یہاں

(۱) یہ روایت ان الفاظ میں نہیں لی، ترمذی ابن مسعود سے یہ الفاظ منقول ہیں: سَلُّوا إِلَٰهَ الْفَرْدَوْسِ الْأَعْلَىٰ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يَتَعَاطَمُهُ شَيْءٌ

تک کہ آپ کی آنکھیں ہم ہی نے بند کیں۔ یہی ابن عباسؓ اپنی مناجات میں کہا کرتے تھے اے الہی مکتاہوں کے ساتھ جو توفیق مجھے تیری ذات سے ہے وہ اعمال کے ساتھ نہیں ہے، اسلئے کہ اعمال میں اخلاص پر اعتقاد ہوتا ہے جب کہ میں اخلاص کی نعمت سے محروم ہوں میں آفت میں مبتلا ہوں، اور خود کو گناہوں میں غوطہ پاتا ہوں، اسلئے میرا اعتقاد صرف تیرے حضور کرم پر ہے، تو میرے گناہ کیسے معاف نہیں کرے گا جب کہ تو جو دو کرم سے متصف ہے روایت ہے کہ ایک مجوسی نے حضرت ابراہیم خلیل اللہ کے یہاں مسلمان بننے کی خواہش کی، حضرت ابراہیم نے فرمایا اگر تو ایمان لے آئے تو میں تجھے اپنا مسلمان بنا لوں گا، وہ مجوسی چلا گیا، اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام پر وحی نازل فرمائی کہ تم نے دین کے اختلاف کی بنا پر اسے ایک وقت کا کھانا نہیں کھلایا، جب کہ میں اس کفر کے باوجود ستر برس سے کھانا کھلا رہا ہوں۔ اگر تم ایک رات اسے مسلمان بنا لیتے تو کیا ہو جاتا۔ حضرت ابراہیم خلیل اللہ اس مجوسی کے پیچھے دوڑے اسے واپس لے کر آئے اور اسکی ممانداری کی، مجوسی نے ان سے دریافت کیا کہ اس تبدیلی کی وجہ کیا ہے آپ اچانک اس قدر مہمان کیوں ہو گئے؟ حضرت ابراہیم نے وحی کا ذکر فرمایا، مجوسی نے کہا کیا خدا تعالیٰ میرے ساتھ یہ معاملہ فرماتا ہے، پھر اس نے حضرت ابراہیم کے دست حق پرست کی اور مسلمان ہو گیا۔ استاذ ابو سہل معلوکی نے جو بہت زیادہ ذرا یاد کرتے تھے ابو سہل زجاجی کو خواب میں دیکھا اور دریافت کیا تمہارا کیا حال ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ جس قدر تم ہمیں خوف دے کرتے تھے معاملہ اس سے کہیں زیادہ سل نکلا، کسی شخص نے ابو سہل معلوکی کو ان کے انتقال کے بعد خواب میں نہایت عمدہ حال پر دیکھا، اور ان سے دریافت کیا کہ آپ کو یہ اچھی حالت کس عمل کے نتیجے میں حاصل ہوئی انھوں نے جواب دیا باری تعالیٰ کے ساتھ حسن ظن کے نتیجے میں۔ روایت ہے کہ ابو العباس ابن سہب نے اپنے مرض موت کے دوران خواب میں دیکھا گیا قیامت بپا ہے، اور جبار سبحانہ و تعالیٰ فرما رہے ہیں علماء کہاں ہیں؟ علماء آئے اور باری تعالیٰ نے ان سے دریافت کیا کہ تم نے اپنے علم کے مطابق کیا عمل کیا ہے؟ انھوں نے عرض کیا رب کریم! ہم نے کو تاہی کی ہے، ہم نے برے عمل کئے ہیں، باری تعالیٰ اپنا سوال پھر وہ ہر اکس کے گویا وہ اس جواب سے راضی نہیں ہیں، اور وہ اس جواب چاہتے ہیں چنانچہ میں نے عرض کیا جہاں تک میرا تعلق ہے میرے اعمال نامے میں شرک نہیں ہے اور آپ نے وعدہ فرمایا ہے کہ شرک کے سوا جتنے گناہ ہیں آپ وہ سب معاف کر دیں گے، اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ اسے لے جاؤ، میں نے اسکے گناہ معاف کر دیے ہیں، اس خواب کے بعد وہ تین دن زندہ رہے، پھر تھے دن انتقال فرما گئے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ ایک شخص بہت زیادہ شراب پیا کرتا تھا، ایک دن اس نے اپنے ہم نشینوں کو جمع کیا، اور غلام کو چار درہم دے کر بازار بھیجا کہ وہ اہل مجلس کے لئے کچھ پھل فروٹ خرید لائے، غلام اس مقصد کے لئے چلا، اور منصور ابن عمار کے دروازے سے گزرا، منصور اس وقت کسی ماحتمند کے لئے کچھ مانگ رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ اگر کسی نے مجھے چار درہم دے تو میں اس کے لئے دعائیں کروں گا، غلام نے انھیں چار درہم دے دئے، منصور نے ان سے دریافت کیا تم اپنے لئے کیا دعا کرنا چاہتے ہو؟ اس نے عرض کیا میں اپنے آقا سے نجات کا طالب ہوں، منصور نے اس کے لئے آزادی کی دعا کی، اور پوچھا کہ وہ سری دعا کیا ہے؟ اس نے عرض کیا دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ مجھے ان چار درہم کا عرض عنایت فرمائے، منصور نے یہ دعا بھی کی، اور دریافت کیا تیسری دعا کیا ہے؟ اس نے عرض کیا دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ میرے آقا کو توبہ کی توفیق دے، منصور نے اس کے آقا کے لئے بھی دعا فرمائی، غلام نے عرض کیا یہ دعا بھی فرما دیجئے کہ اللہ تعالیٰ میری میرے آقا کی، آپ کی اور حاضرین مجلس کی مغفرت فرمائے، غلام بدی تاخیر سے واپس پہنچا، آقا نے تاخیر کا سبب دریافت کیا، غلام نے تمام واقعہ من و عن بیان کر دیا، آقا نے دریافت کیا کہ تم نے کیا کیا دعائیں کرائی ہیں؟ غلام نے بتلایا میری پہلی دعا یہ تھی کہ مجھے آزادی مل جائے، آقا نے کہا جا میں نے تجھے آزاد کیا، غلام نے عرض کیا وہ سری دعا میں نے یہ کرائی ہے کہ جو چار درہم میں خرچ کر رہا ہوں مجھے ان کا عوض مل جائے، آقا نے چار درہم نکال کر اسے دیدئے اور اس سے پوچھا کہ تیسری دعا کیا تھی؟ غلام نے جواب دیا کہ تیسری دعا یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ آپ کو توبہ کی توفیق بخشے، آقا نے کہا میں اللہ رب العزت کے سامنے توبہ کرتا ہوں، چوتھی دعا کیا تھا؟ غلام نے بتلایا کہ میری چوتھی دعا تھی کہ اللہ تعالیٰ میری، آپ کی، اور حاضرین کی بخشش فرمائے، آقا نے جواب دیا یہ چوتھی بات میرے بس سے باہر ہے، جب رات ہوئی اور وہ نیند کی آغوش میں پہنچا تو خواب میں دیکھا کہ ایک شخص یہ کہہ رہا ہے تیرے اختیار میں جو کچھ تھا وہ تو نے کیا، کیا توبہ

سمجھتا ہے کہ جو ہمارے اختیار میں ہے وہ ہم نہیں کریں گے، جاؤ ہم نے تمہیں غلام کو، منصور ابن عمار کو اور حاضرین مجلس کو بخش دیا۔ عبد الوہاب ابن عبد الحمید الثقفی سے مروی ہے کہ میں نے تین مردوں اور ایک عورت کو جنازہ اٹھا کر لے جاتے ہوئے دیکھا میں نے عورت کو ہٹایا اور اسکی جگہ خود سنبھال لی، پھر ہم چاروں اس جنازے کو قبرستان لے گئے اور میت کو دفن کیا میں نے عورت سے دریافت کیا کہ مرحوم سے تیرا کیا رشتہ ہے، عورت نے کہا یہ میرا بیٹا ہے میں نے اس سے پوچھا کیا تیرے بڑوں میں ایسے لوگ نہیں رہتے جو جنازے کی مشاعت کرتے، عورت نے جواب دیا کہ لوگ میرے بیٹے سے نفرت کرتے تھے میں نے اسکی وجہ دریافت کی، عورت نے بتلایا کہ میرا بیٹا غنٹ تھا راوی کہتے ہیں کہ مجھے اس عورت سے ہمدردی ہوئی میں اسے اپنے گھر لے کر آیا اسے روپے، کپڑے اور قلمہ وغیرہ دیا رات کو سواتو میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک شخص میرے پاس آیا اس کا چہرہ چوہو میں کے چاند کی طرح روشن تھا اس پر سفید کپڑے تھے وہ میرا شکر ادا کرنے لگا میں نے اس سے دریافت کیا کہ وہ کون ہے، اور کس لئے میرا شکر ادا کرتا ہے، اس نے جواب دیا کہ وہ وہی غنٹ ہے جسے آج دن میں تم لوگوں نے دفن کیا ہے، آج میرے رب نے لوگوں کی حقارت آمیز نظروں کی وجہ سے جو وہ مجھ پر ڈالتے تھے مجھے رحمت کا مستحق سمجھا۔

ابراہیم اطروش کہتے ہیں کہ ہم بغداد میں وجہ کے کنارے حضرت معروف کرخؒ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ کچھ نوجوان لڑکے ایک کشتی میں نظر آئے جو اچھلتے کودتے، دف بجاتے اور شراب پیتے ہوئے جا رہے تھے، لوگوں نے حضرت معروف کرخؒ سے کہا کیا آپ انھیں دیکھ رہے ہیں، کس طرح بے شری کے ساتھ علی الاعلان اللہ تعالیٰ کی نافرمانی پر کمر بستہ نظر آتے ہیں، آپ ان کے لئے بدعا فرمائیں، آپ نے اپنے ہاتھ اٹھائے اور دعا کی اے اللہ جیسے تو نے انھیں دنیا میں خوشی بخشی ہے اسی طرح آخرت میں بھی مسور کرنا تو لوگوں نے حیرت سے کہا آپ ان کے لئے ایسی دعا کرتے ہیں، فرمایا اگر ان کی قسمت میں آخرت کی خوشیاں ہوں تو انھیں تو بہ کی توفیق ہوگی، بعض اکابر اپنی دعاؤں میں یہ عرض کیا کرتے تھے، الہی! ان کو ایسا ہے جو تیری نافرمانی نہ کرنا ہو مگر تمام اہل دنیا پر تیری نعمت نازل ہو اور سب کو تیرا رزق میسر ہے، تیرا علم اور تیری عظمت لامحدود ہے، لوگ سرکش کرتے ہیں تو پھر بھی انھیں نعمتوں سے نوازنا ہے اور رزق عطا کرنا ہے، گویا تجھے غصہ آتا ہی نہیں ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ یہ روایتیں حدیثیں اور آثار مایوس اور خائف قلوب میں رجا پیدا کرتے ہیں، لیکن مغرور احق کو اس طرح کی باتیں نہ سنانا چاہئیں، بلکہ انھیں وہ مضامین پڑھنے چاہیے جو ہم کتاب الخوف میں لکھ رہے ہیں۔ اس لئے کہ اکثر لوگوں کی اصلاح صرف خوف سے ہوتی ہے، ایسے لوگوں کی مثال ایسی ہے جیسے بد اطوار اور سرکش غلام، یا شریر لڑکا، ان کی اصلاح کے لئے کوڑے کی ضرورت ہے، نرمی سے یہ اور بگڑ جائیں گے، اور ان پر دین و دنیا میں اصلاح کا دروازہ بند ہو جائے گا۔

خوف کی حقیقت : جاننا چاہیے کہ خوف قلب کی اس تکلیف اور سوزش کو کہتے ہیں جو مستقبل میں کسی متوقع مصیبت کے خیال میں پیدا ہو، رجا کی حقیقت کے ضمن میں خوف کی حقیقت بھی واضح ہو چکی ہے، جو شخص اللہ تعالیٰ سے مانوس ہوتا ہے، اور حق اس کے دل پر محیط ہو جاتا ہے، اور وہ ہر وقت جمال حق کے مشاہدے میں مستغرق رہتا ہے اسے مستقبل کا وہیمان نہیں رہتا، اسلئے کہ اس کے دل میں خوف ہوتا ہے اور نہ رجا، بلکہ اسکی حالت خوف و رجا دونوں حالتوں سے اظہار و ابرح ہو جاتی ہے۔ اسلئے کہ یہ دونوں حالتیں دو بائیں ہیں جو نفس کے سرکش گھوڑے کو اعتدال سے ہٹنے نہیں دیتی اور دل میں خوف و رجا کا نہ ہونا دراصل نفس کو مکمل طور سے مطیع ہونے پر دلالت کرتا ہے، واسطیٰ فرماتے ہیں کہ خوف اللہ اور اس کے بندے کے درمیان حجاب ہے، یہ بھی فرمایا کہ اگر دونوں پر حق مشکف ہو جائے تو ان میں نہ رجا کی گنجائش رہے، اور نہ خوف کی چنانچہ اگر کسی عاشق کے دل میں مشاہدہ مشفق کے وہ دن فراق کا خوف ہو تو وہ اس کے جمال کے مشاہدے سے صحیح طور پر لطف اندوز نہیں ہو سکے گا، بلکہ اسکا مشاہدہ ناقص رہے گا، حالانکہ عقائد کی انتہا یہ ہے کہ مشاہدہ دائمی ہو، اور اسے کسی منفعت کی امید اور مضرت کا خوف منقطع نہ کرے۔

خوف کے اجزائے ترکیبی : رجا کی طرح خوف کی حالت بھی تین چیزوں سے مرکب ہے، علم، حال، اور عمل۔ علم سے مراد اس

سبب کا اور اک ہے جو برائی پہنچائے مثلاً ایک شخص نے بادشاہ کی شان میں گستاخی کی یا اسکے حکم سے سرتابی کی پھر وہ گرفتار کر لیا گیا اور بادشاہ کے سامنے پیش کیا گیا اس صورت میں اسے یقیناً اپنے قتل کئے جانے کا خوف ہوگا اگرچہ بھی ممکن ہے کہ بادشاہ اسے معاف کر دے یا کسی طرح قید سے رہا ہو جائے لیکن اسکے قلب میں قتل کا خوف ضرور ہوگا۔ پھر وہ خوف اسی قدر قوی ہوگا جس قدر قوی قتل کے اسباب ہوں گے مثلاً جرم کا سنگین ہونا یا بادشاہ کا دین کے تئیں کینہ اور حسد رکھنا یا اس کا مستقیم مزاج ہونا اور ایسے لوگوں میں گھرا ہوا ہونا جو اسے انتقام لینے پر اکسائیں کسی سفارش کرنے والے سے محروم ہونا اور ان تمام وسائل سے حمی دست ہونا جو بادشاہ کی ناراضگی ختم کر سکتے ہیں یا اس کی آتش انتقام کو سرد کر سکتے ہیں اگر یہ تمام اسباب مجتمع ہوں اور مجرم کو ان کا علم بھی ہو تو بلاشبہ اسکے دل میں اپنے قتل کئے جانے کا خوف بہت زیادہ ہوگا۔ جس قدر یہ اسباب ضعیف ہوں گے یا کم ہوں گے اسی قدر خوف کی تکلیف کم ہوگی۔

کبھی خائف اسلئے خوف زدہ نہیں ہوتا کہ اس نے کوئی جرم کیا ہے بلکہ ڈرانے والے کا کوئی وصف اسے ڈرنے پر آمادہ کرتا ہے جیسے کوئی شخص کسی درندے کے بچوں میں پھنس جائے وہ یقیناً درندے سے خوف کرے گا کیونکہ اسے اسکے وصف درندگی کا علم ہے اور وہ یہ جانتا ہے کہ چرچھا کرنا اسکا محبوب مشغلہ ہے لہذا اس کا یہ وصف اختیار ہی ہے اسی لئے بعض اوقات درندے اپنے شکار کو نقصان پہنچائے بغیر گزر جاتے ہیں بعض اوقات ایسے وصف سے خوف ہوتا ہے جو اختیار میں نہیں ہوتا بلکہ خوف کی سرشت میں ہوتا ہے جیسے کوئی شخص پانی کے تیز بہاؤ میں گر جائے یا ایسی جگہ عبور ہو جائے جہاں آگ لگ رہی ہو آدی پانی اور آگ سے اس لئے ڈرتا ہے کہ پانی کی فطرت خف کرنا ہے اور آگ کی فطرت جلا نا۔

غرضیکہ برائی کے اسباب کی معرفت سے دل میں سوزش اور باطن میں تکلیف ہوتی ہے اسی سوزش و دون اور دود باطن کا نام خوف ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ سے خوف کرنا کبھی تو اس کی ذات و صفات کی معرفت سے ہوتا ہے کہ اگر وہ تمام عالم کو ہلاک کر دے تو اسے ذرا پیدا نہ ہو نہ اسے کوئی روک سکتا ہے اور نہ ہلاک کرنے پر ملامت کر سکتا ہے اور کبھی بندہ اپنے گناہوں کی کثرت کی وجہ سے خوف کرتا ہے اور کبھی یہ دونوں باتیں جمع ہو جاتی ہیں۔ پھر جس قدر یہ یقین بچتے ہوگا کہ اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے جو کچھ ہے وہ بے نیاز ہے وہ جو کچھ کرتا ہے کوئی اس پر گرفت کرنے والا نہیں ہے جب کہ بندے ہر حال میں وارو گیر کے مرحلے سے گزریں گے جس قدر یہ اعتقاد بڑھے گا اسی قدر خوف بھی زائد ہوگا۔ اس سے یہ نتیجہ نکلا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے زیادہ خوف اس شخص کو ہوتا ہے جو اپنے نفس سے زیادہ واقف ہوتا ہے اسی لئے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :-

وَاللَّيْظِي لَا خَشْيَةَ لِلَّهِ وَاتَّقَاكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ (النجم)

بخدا میں خدا تعالیٰ سے تم سب میں زیادہ ڈرنے والا اور خوف کرنے والا ہوں۔

اور اسی بناء پر قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا :-

إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ (طہ ۱۷۴ آیت ۲۸)

اللہ تعالیٰ سے اس کے بندوں میں سے صرف اہل علم ہی ڈرتے ہیں۔

خوف کے اثرات : ہر حال جب یہ معرفت (باری تعالیٰ کی صفات اور اپنے گناہوں کی) مکمل ہوتی ہے تو اس سے دل میں خوف

پیدا ہوتا ہے اور باطن میں سوزش ہوتی ہے پھر اس سوزش کے اثرات دل سے پھیل جاتے ہیں بدن کے دوسرے اعضاء تک پہنچتے ہیں بدن میں اس سوزش و خوف سے کمزوری لاغری زردی و غیوہ و دونا ہوتی ہے بندہ دوتا اور چلتا ہے بعض اوقات اس سوزش کی وجہ سے پتہ پھٹ جاتا ہے اور ہلاکت کا سبب بنتا ہے کبھی یہ حرارت صاعق پر حملہ آور ہوتی ہے اور اسے فاسد کر دیتی ہے اور کبھی یہ حرارت اس قدر اثر انداز ہوتی ہے کہ مایوسی اور ناامیدی کی حالت میں مبتلا کر دیتی ہے اعضاء میں اس خوف کا اثر یہ ہوتا ہے کہ اسے گناہوں سے روک دیتا ہے اور اطلاعات کا پابند بنادیتا ہے تاکہ ماضی میں جو تقصیر ہو چکی ہے اسکی تلافی ہو جائے اور مستقبل کی اچھی طرح تیاری ہو سکے اسی لئے کہا جاتا ہے کہ خائف اس شخص کو نہیں کہتے جو روئے اور اپنے دامن سے آنکھیں پونچھ لے بلکہ خائف وہ ہے کہ جس چیز سے سزا کا خوف ہے اسے ترک کر دے۔ ابوالقاسم حکیم کہتے ہیں جو شخص کسی چیز سے ڈرتا ہے اس سے دور بھاگتا ہے مگر جو شخص خدا سے

اعمال میں خوف کے مراتب : پھر جس قدر خوف قوی ہوتا ہے اور جس قدر اللہ تعالیٰ کی صفات جلال اور اپنے نفس کے عیوب کی معرفت قوی ہوتی ہے اسی قدر مراتب کا نامہ اور پلہ قوی ہوتا ہے۔ اعمال میں خوف کے اثرات کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ آدمی شرعی محرمات کے ارتکاب سے باز رہے۔ شریعت کے صیغہ کو اور سے بچے کو شروع کئے ہیں۔ اگر خوف بہت ہو تو آدمی ان امور سے بھی احتیاط کرے گا جن میں حرمت کا امکان ہے۔ یعنی وہ امور جو یقینی طور پر حرام نہیں ہیں بلکہ ان کی حرمت و حلت مشتبہ ہے ان سے بھی بچے گا۔ اس وجہ کا نام تقویٰ ہے۔ تقویٰ کے معنی یہ ہیں کہ آدمی مشبہات ترک نہ کرے اور یقینی امور پر عمل کرے۔ بعض اوقات آدمی وہ امور بھی ترک کر دیتا ہے جن میں کوئی حرج نہیں ہوتا مگر انہیں بھی اس خوف سے چھوڑ دیتا ہے کہ انہیں یہ مشتبہ نہ ہوں۔ اس درجے کا نام مطلق فی التقویٰ ہے اور اگر اس درجے پر محدود معتد ہو یعنی صرف وہی چیزیں استعمال کرنا ہو جو اسکی ضرورت کی ہیں مثلاً جس گھر میں نہ رہتا ہو اسے تعمیر نہ کرے اور جو چیز نہ کھانا ہو اسے بیچ نہ کرے اور دنیا کی طرف ادا التفات نہ کرے اور یہ جانے کہ دنیا جدا ہو جانے والی چیز ہے اور اپنے ایک بھی سائل کو غیر اللہ کے تصور میں مشائخ نہ کرے یہ فہم ہے اور ایسے شخص کو صدیق کہنا بالکل موزوں ہے اس ترتیب کے لحاظ سے صدق میں تقویٰ داخل ہے اور تقویٰ میں ورع داخل ہے اور ورع میں عفت داخل ہے اس لئے کہ عفت شہوات کے تقاضے سے بچنے کا نام ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ خوفِ اعمال پر دونوں اعتبار سے مؤثر ہوتا ہے 'اقدام' کے اعتبار سے بھی 'اور باز رہنے کے اعتبار سے بھی' لیکن باز رہنے میں ان چیزوں کے اعتبار سے جن سے باز رہنا جائے اعمال کے نام مختلف ہو جاتے ہیں مثلاً شہوات سے رکنے کو عفت کہتے ہیں اس سے اعلا مرتبہ 'دفع' ہے 'یہ عفت کی نسبت عام ہے' کیونکہ 'دفع' ہر ممنوع اور حرام چیز سے باز رہنے کو کہتے ہیں اس میں شہوت کی تخصیص نہیں ہے 'دفع' سے اعلا درجہ 'تقویٰ' کا ہے 'اس لئے کہ تقویٰ ممنوع اور مشتبہ دونوں چیزوں سے بچنے کا نام ہے' 'تقویٰ' سے اعلا درجہ 'صدق' کا ہے۔ اس کے معنی ہیں شبہ سے گھر سے مہلج پر بھی اقدام نہ کرے 'جیسا کہ ظاہر ہے ان درجات میں سے ہر درجہ اپنے سے پہلے درجہ کے مقابلے میں اعلا ہے 'اس لئے قدرتی طور پر آخری درجہ یعنی صدق اپنے سے پہلے تمام درجات کو شامل ہوگا مثلاً یہ کہاجائے کہ انسانی علی ہے یا جمعی 'اور عربی قریشی ہے یا نہیں' اور قریشی ہاشمی ہے یا نہیں' اور ہاشمی طلوی ہے یا نہیں اور طلوی حسنی ہے یا حسینی اگر تم یہ کہو کہ حسنی ہے تو گویا تم نے اس سے پہلے کے تمام اوصاف شامل کر لئے 'یعنی وہ طلوی بھی ہے ہاشمی قریشی اور عربی بھی ہے' لیکن اگر تم نے طلوی کہا تو بچے کے تمام اوصاف شامل ہوں گے 'اور کا وصف شامل نہیں ہوگا' یعنی وہ عربی قریشی ہاشمی ہوگا' لیکن حسنی نہیں ہوگا۔

اسی طرح اگر تم نے کسی شخص کو صدیق کہا تو گویا اسے متقی صاحبِ دین اور عقیق کہا۔ یہ خیال نہ کرنا چاہیے کہ ان درجات کے لئے الگ الگ الفاظ ہیں اسلئے ان کے معانی بھی ایک دوسرے سے مختلف اور جدا گانہ ہوں گے۔ اگر یہ خیال کیا گیا تو امر حق کو سمجھنا مشکل ہو جائے گا، چنانچہ جو لوگ محض الفاظ سے معانی کی جستجو کرتے ہیں ان پر امر حق واضح نہیں ہوتا۔ اگر الفاظ کو معانی کے تابع کریں تو شبہ میں مبتلا نہ ہوں۔ یہ ہے خوف کا اجمالی بیان، اس میں محنت کی حقیقت بیان کی گئی ہے اور اس میں مغفرت کا ذکر بھی ہے جو خوف کا موجب ہے اور ان اعمال کا بھی ذکر ہے جو خوف کی وجہ سے ترک کئے جاتے ہیں اور عیوب کی وجہ سے کئے جاتے ہیں۔

خوف کے درجات اور قوت و ضعف کا اختلاف

جاننا چاہیے کہ خوف ایک عمدہ چیز ہے، اور کبھی قیاس کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ اچھی چیز کا قوی اور زیادہ ہونا بھی ایک عمدہ وصف ہو، اس لحاظ سے یہ بات طے شدہ ہونی چاہیے کہ خوف جتنا قوی اور شدید ہوگا اسی قدر بہتر ہوگا، حالانکہ یہ غلط ہے بلکہ خوف ایک کوڑا ہے جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو ظلم و عمل پر موانعت کی طرف متوجہ کرتا ہے تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کی قربت کے درجے پر فائز ہوں، چوہائے اور بچے ہر حال میں اسکوڑے کے محتاج ہیں، لیکن اس کا مطلب نہیں کہ انھیں بہت زیادہ مارا جائے، یا زیادہ مارنا کوئی اچھی بات ہے، بلکہ جس طرح شریعت نے مختلف چیزوں کی حدود متعین کر دی ہیں اسی طرح خوف کی بھی ایک حد مقرر ہے، ایسی حد اعتدال ہے ورنہ ایک طرف تعزید کی مثال عورتوں کا دونا ہے، عورتیں جب بھی قرآن کریم کی کوئی ایسی آیت سنتی ہیں جو وعید پر مشتمل ہوتی ہے تو ان کی آنکھوں سے آنسو بننے لگتے ہیں، لیکن جب دل اس آیت سے غافل ہوتا ہے تو پھر پہلی جیسی حالت کی طرف لوٹ جاتی ہیں گویا اس آیت کا ان کے دلوں پر کوئی اثر ہوا ہی نہیں تھا۔ اس طرح کا خوف حد اعتدال سے کم ہے، اور اس سے فائدہ بھی بہت کم ہے اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی نومند اور سخت جان جانور کو کسی نرم و نازک شئی کی ضرب لگائی جائے، مہلک اس ہلکی مار کا اسکے جسم پر کیا اثر ہوگا؟ جب اثر ہی نہ ہوگا تو وہ ہماری مرضی کے مطابق کیا کرے گا۔ عام طور پر جو لوگ خوف کرتے ہیں ان کا خوف اسی نوعیت کا ہوتا ہے، البتہ عارفین اور علماء اس نکتے سے مستثنیٰ ہیں، مگر علماء سے ہماری مراد وہ عالم نہیں ہیں جو علماء کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں، اور ان کے القاب اپنا لیتے ہیں، ایسے لوگ تو خوف میں بہت پیچھے ہوتے ہیں، بلکہ اگر یہ کیا جائے کہ ان میں ذرا خوف نہیں ہوتا تو صحیح ہوگا علماء سے ہماری مراد اربابِ علم و آگہی ہیں جو اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات، اسکے ایام اور اسکے افعال کا علم رکھتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس طرح کے علماء ناپید ہیں۔ حضرت فضیل ابن عیاض فرمایا کرتے تھے کہ اگر کوئی شخص تجھ سے پوچھے کہ کیا تو اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے تو خاموشی اختیار کر، اسلئے کہ اگر تو نے اس سوال کے جواب میں ”نہیں“ کہا تو یہ کفر ہوگا اور ”ہاں“ کہا تو یہ جھوٹ ہوگا۔ حضرت فضیل کا منشاء یہ بتانا ہے کہ خوف وہ ہے جو اعضاء کو معاصی سے روک دے اور انھیں اطاعت کا پابند کر دے، جس خوف کا اعضاء پر اثر نہ ہو وہ محض دوسرے اور خیال ہے اس کو خوف کہنا کسی بھی طرح صحیح نہیں ہے۔

حد اعتدال سے تجاوز خوف جسے افراط کہہ سکتے ہیں کہ آدمی قطعی مایوسی اور ناامیدی کا شکار ہو جائے، یہ بھی ممنوع ہے کیوں کہ اس سے بھی عمل میں رکاوٹ ہوتی ہے، جب کہ خوف محض ایک تاویز ہے جس سے بندہ عمل کی طرف راغب ہے، اگر خوف کی بنا پر عمل ہی ترک کر دے تو ایسے خوف سے کیا فائدہ۔ بلکہ یہ تو خالص نقصان کی بات ہے، یہ نقصان جہل اور عجز کی وجہ سے ہے، جہل یہ ہے کہ وہ اپنی عاقبت سے واقف نہیں ہے، اگر واقف ہوتا تو ہرگز مایوسی نہ ہوتا اور نہ اس قدر خوف کرتا، کیوں کہ خائف ہی انجام میں متردد رہتا ہے اور عجز یہ ہے کہ وہ ایک امر ممنوع میں مبتلا ہے اور اسے دفع کرنے پر قادر نہیں ہے۔ اگر آدمی کے نقص کو سامنے رکھا جائے تو اس قسم کا خوف اچھا ہے، اور یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس خوف کا ہونا نہ ہونے سے بہتر ہے، مگر حقیقت میں علم، قدرت و فیہ و اوصاف ہی قابلِ تعریف ہیں، اسلئے کہ ان سے اللہ تعالیٰ کا وصف بیان کیا جاسکتا ہے۔ جن چیزوں سے اللہ تعالیٰ کا وصف بیان نہیں کیا جاسکتا وہ فی نفسہ قابلِ تعریف نہیں ہیں، تاہم انھیں اس نقصان کے مقابلے میں بہتر کہہ سکتے ہیں جو ان اوصاف کی نسبت کم تر ہے، جیسے دوا کی مشقت

برداشت کرنا فی نفسہ کوئی پسندیدہ بات نہیں ہے، لیکن مرض اور موت کے مقابلے میں یہ شقت بہر حال آسان ہے اور اس اعتبار سے بہتر بھی ہے۔ بہر حال جو خوف کہ مایوسی پر ہنسی ہو وہ مذموم ہے، کبھی خوف سے مرض 'ضعف' حیرانی، بے ہوشی اور دیوانگی جیسی کیفیات پیدا ہو جاتی ہیں یہ خوف بھی پسندیدہ نہیں ہے، جیسے وہ مایوسہ نوم ہے جس سے بچے کی جان ضائع ہو جائے یا وہ ضرب جس سے جانور ہلاک ہو جائے یا بیمار بڑ جائے یا ناکارہ ہو جائے۔

سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے بکثرت رجاء کے اسباب بیان فرمائے ہیں، تاکہ ان کے ذریعے اس صدمہ خوف کا علاج کیا جائے جو مایوسی تک پہنچا دے اور ہلاکت سے قریب تر کر دے اس سلسلے میں یہ قاعدہ یاد رکھنا چاہیے کہ جو چیز کسی دوسرے کے لئے مقصود ہوتی ہے اس میں صرف وہی حصہ محمود ہوتا ہے جس سے مطلوب حاصل ہو، جس سے مطلوب حاصل نہ ہو وہ مذموم ہوتا ہے۔ اس قاعدے کی روشنی میں دیکھئے خوف کا فائدہ یہ ہے کہ آدمی ممنوعات و محرمات سے بچے، تقویٰ اور پرہیزگاری اختیار کرے، مجاہدے، عبادت اور ذکر و فکر میں مشغول ہو اور وہ تمام اسباب حاصل کرنے کی کوشش کرے جو اسے اللہ تعالیٰ تک پہنچا دیں۔ ان میں سے ہر امر زندگی تندرستی اور عقل کی سلامتی پر موقوف ہے، اسلئے وہ مذموم ہو گا جو ان تینوں میں سے کسی ایک کو یا سب کو متاثر کرے۔

خوف سے مرنے والے کی فضیلت : یہاں تم یہ کہہ سکتے ہو کہ جو شخص خدا تعالیٰ کے خوف سے مرجاتا ہے وہ شہید ہوتا ہے اس صورت میں زیادتی خوف کو مذموم کیسے کہا جاسکتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس شخص کو خوف کے باعث مرنے کی بنا پر ایسا مرتبہ حاصل ہو گا کہ اگر اس وقت خوف کی وجہ سے نہ مرتا تو یہ مرتبہ حاصل نہ ہوتا جو اس وقت حاصل ہوا ہے اس اعتبار سے دیکھا جائے تو ایسا شخص واقعی فضیلت کا حامل ہے۔ لیکن اگر یہ خیال کیا جائے کہ بالفرض یہ شخص خوف کی وجہ سے نہ مرتا، اور دیر تک زندہ رہ کر اللہ کی اطاعت کرتا، اور راہ سلوک طے کرنے میں مصروف رہتا تو یقیناً اسے زیادہ فضیلت حاصل ہوتی۔ اس لئے کہ جو شخص فکر اور مجاہدے میں مشغول رہتا اور اللہ تعالیٰ کی معارف میں ترقی کرتا ہے اسے ہر لمحہ اور ہر آن ایک شہید کا نہیں بلکہ بہت سے شہداء کی فضیلت حاصل ہوتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو وہ بھونچے کوئی درندہ لقمہ بنالے یا وہ بچہ جو کسی ظالم کے ہاتھوں قتل ہو جائے ایسے انبیاء اور اولیاء سے افضل ہونا چاہیے جو اپنی موت انتقال کریں، حالانکہ یہ ایک ناممکن اور محال بات ہے۔ اسی طرح یہاں یہ بھی نہ سمجھنا چاہیے کہ خوف کے باعث مرنے والا شخص افضل ہے، بلکہ افضل ترین سعادت ہے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں عمر زیادہ ہو، جس چیز سے بھی عمر ختم ہوگی یا عقل اور صحت برباد ہوگی وہ نقصان ہے، اگرچہ بعض امور کے اعتبار سے اس میں فائدہ بھی ہو، جیسے شہادت گناہ پر خاتمے کے مقابلے میں یقیناً ایک زبردست فضیلت ہے، لیکن شہداء کو یقیناً وہ درجہ حاصل نہیں ہوتا جو متعین اور صدیقین کو حاصل ہوتا ہے۔

اس تفصیل سے ثابت ہوا کہ اگر خوف اعمال پر اثر انداز نہ ہو تو اس کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے وہ کوڑا جو جانور پر استعمال ہو لیکن اسکی چال پر اثر انداز نہ ہو۔ لیکن اگر خوف مؤثر ہو تو اس کی اثرات کے مختلف اور متحد مراتب ہیں، مثلاً وہ خوف عفت پر آمادہ کرے، یعنی محض شہوات کے تقاضوں پر عمل کرنے سے روکے، یہ بھی ایک اور درجہ ہے، درجہ اس سے اعلا درجہ ہے، اور انتہائی درجہ صدیقین کا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ بندہ کا ظاہر و باطن صرف اللہ تعالیٰ کے لئے وقف ہو، یہاں تک کہ فیہ اللہ کے لئے اس میں کوئی گنجائش ہی باقی نہ رہے، خوف کا یہ درجہ انتہائی پسندیدہ اور محبوب ہے۔ لیکن اس کا حصول صحت و عقل کی سلامتی کے ساتھ مربوط ہے، اگر کسی کا خوف اس قدر بڑھ جائے کہ صحت ضائع ہو جائے اور عقل جاتی رہے تو یہ مرض ہے اور اس کا علاج ضروری ہے، اگر یہ صورت پسندیدہ ہوتی کہ خوف کی وجہ سے آدمی فاجر العقل ہو جائے اور اس کا جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ بن جائے تو اسباب رجاء کی کیا ضرورت تھی، حضرت سہیل تستریؒ اپنے ان مریدین سے جو کئی کئی دن بھوکے رہ کر ریاضت کیا کرتے تھے فرماتے تھے کہ اپنی عقلوں کی حفاظت کرتے رہنا اسلئے کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی دلی ناقص العقل نہیں ہوتا۔

خوف کی اقسام : (ان چیزوں کی نسبت جن سے خوف کیا جائے)۔

جاننا چاہیے کہ خوف کسی بری چیز کے انتظار اور توقع سے ہوتا ہے، اور بری چیز کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جو خود اپنی ذات سے بری ہو جیسے دوزخ کی آگ، اور دوسری وہ جو کسی بری چیز کا ذریعہ بنتی ہو جیسے گناہوں کو اس خیال سے برا سمجھنا کہ وہ آخرت میں عذاب کا باعث

نہیں گے، اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی مریض خوش ذائقہ میوے سے اسلئے نفرت کرے کہ وہ اس کے مرض میں اضافہ کا سبب بنیں گے، اور اسے ہلاک کر دیں گے، ہر خائف کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے دل میں ان دونوں قسموں کا یا ان میں سے ایک کا تصور رائج کر لے، اور ان دونوں برائیوں کے انتظار کو اپنے قلب میں اس قدر پختہ کر لے کہ دل جلنے لگے۔

خانہ کی مختلف حالتیں : خانہ کا حال اس امر مکروہ کے اعتبار سے مختلف ہوتا ہے جو ان کے دلوں پر غالب آجاتا ہے، ان میں ایک گروہ وہ ہے جن کے دل پر کوئی ایسی حالت غالب آجائے جو بذات خود مکروہ نہیں ہوتی، بلکہ کسی امر مکروہ کا ذریعہ ہونے کے باعث مکروہ ہوتی ہے، اس گروہ کے بعض افراد پر یہ خوف غالب ہوتا ہے کہیں توبہ سے پہلے ہی نہ مرجائیں، بعض لوگ توبہ کر لیتے ہیں اور انھیں توبہ شکنی کا خوف رہتا ہے، وہ عمدہ فحش سے ڈرتے ہیں یا اس لئے ڈرتے ہیں کہ کہیں قلب کی رقت سختی سے نہ بدل جائے، بعض لوگ پائے استقامت میں لغزش سے خوف کھاتے ہیں بہمت سے اسلئے ڈرتے ہیں کہ کہیں وہ اتباع شہوات کے بات میں اپنی عادات کے اسیر نہ ہو جائیں، یا اسلئے خوف کرتے ہیں کہیں اللہ تعالیٰ ہمیں ہماری ان حسنت کے حوالے نہ کر دے جن پر ہمیں بحسب سہ اور جن کی وجہ سے بندوں میں ہماری عزت قائم ہے، یا اللہ تعالیٰ کی نعمتوں پر اترانے سے ڈرتے ہیں، یا اللہ تعالیٰ سے اعراض کر کے غیر اللہ میں مشغول ہونے کا خوف کھاتے ہیں، یا اسلئے ڈرتے ہیں کہ اطاعت کے سلسلے میں جو کچھ مکروہ فریب ہم کرتے ہیں وہ اللہ پر مشکف ہے، اور اس پر ہماری گرفت ہو سکتی ہے، یا اسلئے خوف کھاتے ہیں کہ ہم کچھ غیبت، خیانت، اور بد معاملہ گسی کرتے ہیں ان سب سے اللہ تعالیٰ باخبر ہیں، اور ان پر سزا مل سکتی ہے، بعض لوگوں کو یہ خوف ہوتا ہے کہ نہ جانے باقی زندگی میں ہم سے کیا کیا قصور سرزد ہوں، اور ہم کن کن گناہوں میں مبتلا ہوں، بعض لوگوں کو دنیا میں حقیریت کی تجلیل کا خوف ہوتا ہے، بعض اسلئے ڈرتے ہیں کہ کہیں موت سے پہلے ہی ان کی رسوائی کا سامان نہ ہو جائے، بعض لوگ دنیاوی لذات کا شکار ہونے سے ڈرتے ہیں، بعض اسلئے ڈرتے ہیں کہ غفلت کے عالم میں ہمارے دل کی جو کیفیت ہوتی ہے اس سے اللہ تعالیٰ باخبر ہے، بعض کو سوء خاتمہ کا خوف ستاتا ہے، اور بعض تقدیر انہی سے خوف زدہ رہتے ہیں کہ نہ جانے ہماری قسمت میں کاتب ازل نے کیا لکھا ہے، یہ سب امور وہ ہیں جن سے اللہ کی معرفت رکھنے والے خوف زدہ رہتے ہیں، ان میں سے ہر خوف کا ایک خاص فائدہ ہے، چنانچہ جو شخص کسی چیز سے ڈرتا ہے اس سے بچتا بھی ہے، مثلاً اگر کسی شخص کو یہ خوف ہو کہ وہ فلاں برائی کا عادی ہو جائے گا تو اس برائی کو ترک کرے گا، اور اس ترک پر موانعت کرے گا، اسی طرح اگر کسی شخص کو یہ خوف ہو کہ اللہ تعالیٰ غفلت کی حالت میں میرے دل کی حالت سے باخبر ہے تو وہ اپنے دل کو دوسروں سے پاک کرے گا، اسی طرح دوسرے مخاوف کو بھی قیاس کرنا چاہیے۔

حقین پر ان سب مخاوف میں سوء خاتمہ کا خوف زیادہ رہتا ہے، اسلئے کہ خاتمے کا معاملہ سب سے زیادہ خطرناک ہے، خوف کی اعلیٰ قسم جو کمال معرفت کی دلیل ہے، وہ تقدیر انہی کا خوف ہے، خاتمہ اسی تقدیر انہی کا تقہ، اسکی فرع اور ثمر ہے، درمیان میں چند چیزیں حائل ہو گئی ہیں، تقدیر انہی میں جو کچھ لکھا ہوا ہے وہ خاتمے سے ظاہر ہو جاتا ہے، خاتمہ اور سابقہ سے ڈرنے والوں کی مثال ایسی ہے جیسے دو شخصوں کے بارے میں بادشاہ کوئی حکم تحریر کرے، یہ بھی ممکن ہے کہ اس حکم کی رو سے ان دونوں کو خلعت سے نوازا جائے اور انعام و اکرام عطا کیا جائے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ دونوں سزا کے مستحق ہوں، اور سولی پر چڑھائے جائیں، ان دونوں کو یہ تو معلوم ہے کہ بادشاہ نے ان کے متعلق کوئی فرمان جاری کیا ہے، لیکن وہ یہ نہیں جانتے کہ اس فرمان کی رو سے انھیں کیا ملنے والا ہے، سزا یا انعام، ایک شخص کا دل اس وقت میں لگا ہوا ہے جب وہ فرمان اسلئے پاس آئے گا اور اسے کھول کر دیکھے گا، اور دوسرے کا دل اس وقت کا تصور کئے ہوئے ہے جس وقت وہ فرمان لکھا گیا، معلوم نہیں اس وقت بادشاہ کا دل غیظ و غضب سے لبریز تھا یا رحم و کرم سے معمور تھا۔ اس دوسرے شخص کی تمام تر توجہ حکم کے سبب پر ہے، جبکہ پہلے کا التفات اسکی فرع یعنی حکم پر ہے، ظاہر ہے دوسرے کا التفات پہلے کے التفات سے اعلیٰ ہو گا۔ اسی طرح اس تقدیر کا خیال کرنا جو کاتب ازل نے لوح محفوظ پر لکھ دی ہے اس امر کے خیال سے افضل ہو گا جو خاتمے کے وقت ظاہر ہونے والا ہے۔ چنانچہ ایک روایت میں اس امر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

موسیٰ ہے کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر تشریف فرما تھے کہ آپ نے اپنی دائیں مٹھی بند کی اور فرمایا یہ نوشتہ الہی ہے اس میں اہل جنت کے اور ان کے آباء کے نام لکھے ہوئے ہیں نہ ان میں سے کوئی نام ہو گا اور نہ زیادہ ہو گا پھر آپ نے بائیں مٹھی بند کی اور ارشاد فرمایا کہ یہ نوشتہ الہی ہے اس میں اہل جہنم کے نام اور ان کے آباء کے نام درج ہیں نہ ان میں سے کوئی نام ہو گا اور نہ زیادہ ہو گا اور جو لوگ اہل سعادت ہیں اہل شقاوت کے سے اگر لکھے یہاں تک کہ لوگ کہیں گے یہ لکھی نہیں ہیں پھر اللہ تعالیٰ ہر ایک کو جسے چاہے عذاب کرے یا عفو کرے اور جو لوگ ایک ہی لمحہ مشیتِ کبیرہ سے عاجز رہیں وہ بھی اللہ تعالیٰ سزا دے گا اور جو لوگ کہیں گے کہ یہ سعادت مندوں میں سے ہیں بلکہ سعادت مندی ہیں لیکن اللہ تعالیٰ موت سے قبل انھیں نیک بخت لوگوں کے زمرے سے نکال دے گا گو ایک لمحہ پہلے ہی کیوں نہ نکالے سعید وہی ہے جو قضاء الہی میں سعید ہو چکا ہے اور شقی وہ ہے جو قضاء الہی میں شقی قرار پا چکا ہے اور اعمال (کی قبولیت یا عدم قبولیت) کا دار خاتمے پر ہے (ترمذی۔ عبد اللہ ابن عمرو ابن العاص)

سابقہ اور خاتمہ سے خوف کرنے والے ان شخصوں کے لئے دوسری مثال یہ دی جاسکتی ہے کہ ان کا خوف ایسا ہے جیسے وہ شخص کہ ان میں سے ایک اپنے گناہوں سے ڈرتا ہو اور دوسرا اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہو کیونکہ وہ اس کی صفت جلال کی معرفت رکھتا ہے اور ان اوصاف سے واقف ہے جو اسکی حیثیت کے مقتضی ہیں ظاہر ہے یہ دوسرا شخص مرتبے میں اعلیٰ ہو گا اسی لئے یہ خوف باقی بھی رہتا ہے اگرچہ وہ اطاعت پر مواظبت کرے تو اس فریب سے محفوظ بھی رہ سکتا ہے۔ بہر حال معصیت سے ڈرنا نیک لوگوں کا ڈرنا ہے اللہ سے ڈرنا موحدین و صدیقین کا ڈرنا ہے اور یہ ڈر معرفت الہی کا ثمر ہے جو شخص اللہ کی معرفت رکھتا ہے اور اسکی صفات کا علم رکھتا ہے اسے یقیناً ان اوصاف کا علم بھی ہو گا جو اسکے خوف کے مقتضی ہیں اگرچہ اس شخص سے کوئی گناہ سرزد نہ ہوا ہو بلکہ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی گناہ گار اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کر لے تو وہ اللہ سے ڈرے گناہ کا خوف نہ کرے۔

خوف خدا مقصود ہے : اصل میں اللہ سے ڈرنا ہی مقصود ہے اگر اللہ تعالیٰ کو اپنی ذات سے ڈرنا مقصود نہ ہوتا تو وہ اپنے بندوں کو گناہ کے لئے معز نہ کرتا اور نہ ان پر گناہوں کی راہ سل کرتا نہ ان کے اسباب مہیا فرماتا اسلئے کہ معصیت کے اسباب فراہم کرنا بھی تو اپنی رحمت سے دور کرنا ہے پھر معصیت سے پہلے بندہ سے کوئی ایسی معصیت سرزد نہیں ہوتی تھی جس کی بنا پر اسے گناہ کا مستحق قرار دیا جاتا اور اس پر گناہ کے اسباب جاری کئے جاتے اسی طرح طاعت سے پہلے بندے کی پاس کوئی ایسی نیکی نہیں تھی کہ اسکی وجہ سے وہ نیک اعمال کا مستحق قرار پاتا اور اس پر نیکی کی راہ روشن کی جاتی یہ سب قضاء الہی کے اسرار ہیں گناہ گار پر گناہ کا حکم ہو چکا ہے خواہ وہ اس پر راضی ہو یا نہ ہو اسی طرح طاعت گزار کے مقدر میں نیکی لکھی جا چکی ہے خواہ وہ چاہے یا نہ چاہے اس ذات کی بے نیازی کا عالم یہ ہے کہ وہ بغیر کسی وجہ سابق سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو اتنا اونچا مرتبہ عنایت کرتا ہے کہ مخلوق میں سے کوئی ان کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتا دوسری طرف بلا کسی تقصیر کے ابو جہل کو اسفل السافلین میں پہنچاتا ہے جس ذات کی بے نیازی کا یہ عالم ہے اس کے جلال سے ڈرنا ضروری ہے۔

مطیع و عاصی دونوں پابند ہیں : جب بھی کوئی بندہ طاعت کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پر ارادہ طاعت مسلط کیا جاتا ہے اور اس کو اس طاعت پر قدرت عطا کی جاتی ہے چنانچہ ان دونوں اسباب کی فراہمی کے بعد اس طاعت کا وقوع ضروری ہو جاتا ہے اسی طرح جب کوئی بندہ نافرمانی کرتا ہے تو اس لئے کرتا ہے کہ اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نافرمانی کا ارادہ مسلط کر دیا گیا تھا اور اسے اس نافرمانی پر قدرت دی گئی تھی۔ اب ہمیں اس کی وجہ معلوم نہیں کہ ایک شخص کو خیر کے اسباب کیوں مہیا کئے گئے اور اس کے جوارح کو طاعات پر کس لئے مجبور کیا گیا اور اسے دوسرے شخص کے مقابلے میں فلاح و سعادت کا مستحق کیوں سمجھا گیا جب کہ اس دوسرے پر گناہ کے دوائی مسلط کر کے اسے رحمت الہی سے دور کیا گیا اور ذلت و اہانت کا مستحق قرار دیا گیا یہ اسرار الہی ہیں ہم ان سے واقفیت کا دعویٰ نہیں کر سکتے نیز ہم ان امور۔ معصیت و طاعت۔ کو بندوں پر بھی محمول نہیں کر سکتے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ بندہ مجبور ہے وہ جو کچھ کرتا ہے قضاء الہی سے کرتا ہے جب باری تعالیٰ کی ذات ایسی ہے تو عقل مندی کا تقاضا یہ ہے کہ اس سے خوف کیا جائے۔

اس موضوع پر بھی گفتگو کی جاسکتی ہے، اس کے بعد تقدیر کے مسائل ہیں، اور ان پر کلام کرنا درست نہیں ہے، جہاں تک اس امر کا تعلق ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات جلال سے خوف کیا جائے ہم اسے ایک مثال کے ذریعے سمجھا سکتے ہیں، اگر اذن شرع نہ ہوتا تو بڑے سے بڑے مدبر اور صاحب بصیرت کی بھی یہ ہمت نہ ہوتی کہ وہ اس سلسلے میں کوئی مثال ذکر کرے، لیکن حدیث شریف میں اس کی مثال مذکور ہے اسلئے ہم تقسیم کے لئے اسے نقل کرنا مناسب سمجھتے ہیں، چنانچہ روایت کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام پر وحی نازل فرمائی کہ اے داؤد مجھ سے اس طرح ڈرا کر جس طرح تو کسی خونخوار درندے سے ڈرتا ہے۔ (۱) اس مثال سے تم مطلب کی بات سمجھ سکتے ہو اگرچہ سبب پر مطلع نہیں ہو سکتے، اسلئے کہ سبب پر مطلع ہونا ایسا ہے جیسے تقدیر مطلع ہونا، اور یہ ایک ایسا راز ہے جس کا امین صرف اس کا اہل ہی ہو سکتا ہے، اس مثال کا مفہوم یہ ہے کہ درندے سے تم اسلئے نہیں ڈرتے کہ تم سے اس کے حق میں کوئی قصور سرزد ہوا ہے، کوئی غلطی واقع ہوئی ہے، بلکہ اس لئے ڈرتے ہو کہ حملہ کرنا اور گرفت میں لینا اسکی خصوصیت ہے، اسکی یہ صفت اور ظاہری ہیبت خوف زدہ کرنے کے لئے کافی ہے۔ یہ درندہ جو چاہتا ہے کہ بیعتا ہے، ڈرا پڑا نہیں کرتا، اگر تمہیں ہلاک کر دے تو اسکے دل میں ذرا رقت پیدا نہیں ہوتی اور نہ وہ تمہاری ہلاکت پر تکلیف محسوس کرتا ہے، اور اگر وہ تمہیں چھوڑ دیتا ہے، تو اسلئے نہیں کہ اس کے دل میں تمہارے لئے ہمدردی کا کوئی احساس پیدا ہوا ہے، یا وہ تم پر رحم کرنا چاہتا ہے، بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کی نظروں میں تمہاری کوئی ایسی وقعت نہیں ہے کہ وہ خاص طور پر تمہیں ہلاک کرے، اس کی نظر میں ایک ہزار آدمیوں کی ہلاکت اور ایک چوٹی کی ہلاکت برابر ہے۔ وہ دونوں حالتوں میں اپنی درندگی برقرار رکھتا ہے، اور یکساں طور پر حملہ آور ہوتا ہے، تمہیں چھوڑنا یا مار ڈالنا اسکی مرضی پر منحصر ہے یہ تو مثال کا ایک مطلب ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کے خوف کی مثال اس سے کہیں زیادہ اعلیٰ و ارفع ہے، خود اسکا ارشاد ہے۔

وَلِلّٰهِ الْمَثَلُ الْأَعْلٰی (پ ر آیت) اور اللہ کے لئے اعلا مثال ہے۔

جس شخص نے ذات الہی کی معرفت حاصل کر لی، اور مشاہدہ باطنی سے جو مشاہدہ ظاہری سے اعلا و اوق ہے اسکی صفات کا علم حاصل کر لیا اس نے اس حدیث قدسی کی صداقت کا بھی علم حاصل کر لیا ہے۔

هُوَ لَا فِی الْجَنَّةِ وَلَا اَبَالِیْ وَهُوَ لَا فِی النَّارِ وَلَا اَبَالِیْ (احمد۔ ابوالدرداء)

یہ لوگ جنت میں ہیں اور مجھے (اس کی) پروا نہیں، اور یہ لوگ دوزخ میں ہیں اور مجھے (اسکی) پروا نہیں۔

اس استغناء اور بے نیازی میں ہیبت و خوف کے بے شمار اسباب جمع ہیں، اللہ سے خوف کے لئے یہ استغناء ہی کافی ہے۔

خائنیں میں ایک گروہ ان لوگوں کا ہے جن کے دلوں میں خود کمزور کا خوف راجح ہو جائے، مثلاً سکران موت یا منکر کبیر کے سوالات، عذاب قبر، اور بعث بعد الموت وغیرہ کی دہشت، یا باری تعالیٰ کے سامنے کھڑے ہونے کا خوف، اور اس بات کا ڈر کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے پردہ فاش ہوگا، اور اس بات کا خوف، تنگے تنگے سے سوال ہوگا، پل صراط کی حدت، اسے عبور کرنے کا خوف، دوزخ کی آگ، اور اس کی خطرناک گھائیوں کا خوف، یا اس بات کا ڈر کہ کہیں درجات کم نہ ہو جائیں یا اس امر کا خوف کہ جنت کی نعمتوں اور رزاقوں سے محروم نہ ہو جائیں، یا خدا تعالیٰ اور ان کی درمیان حجاب نہ ہو جائے۔ یہ سب امور بذات خود بڑے ہیں، اسلئے دہشت زدہ کرنے والے بھی ہیں۔ اس گروہ میں بھی مختلف مراتب ہیں، سب سے اعلا مرتبہ ان لوگوں کا ہے جنہیں باری تعالیٰ کے اور اپنے مابین حجاب کا خوف ہے، یہ عارفین کا خوف ہے، اس سے پہلے کے تمام مخاوف کا تعلق علماء، صلحاء، عابدین اور زاہدین سے ہے، اصلی میں وصال کی لذت اور فراق کے رنج و تکلیف سے صرف وہی لوگ آگاہ ہوتے ہیں جن کی معرفت مکمل ہوتی ہے، اور جس کی معرفت مکمل نہیں ہوتی اسکی بصیرت پر پردہ پڑا رہتا ہے وہ نہ وصال کی لذت محسوس کرتا ہے اور نہ فراق کی تکلیف سے آگاہ ہوتا ہے، بلکہ جب اسکے سامنے یہ بات ذکر کی جاتی ہے کہ عارف دوزخ کی آگ سے نہیں ڈرتا بلکہ حجاب سے ڈرتا ہے تو اسے بڑی حیرت ہوتی ہے بلکہ اسے دل میں برا جانتا ہے، یہی نہیں بلکہ یہ کور چشم انسان کبھی دیدار الہی کی لذت کا بھی منکر ہو جاتا ہے، اگر شریعت کی طرف سے اس انکار کی اجازت ہوتی تو وہ زبان ہی سے

انکار کر بیٹھتا، لیکن کیوں کہ شریعت کی طرف سے اس کی اجازت نہیں ہے اس لئے وہ زبان سے توبیدار الہی کی لذت کا اعتراف کرتا ہے، مگر دل میں یقین نہیں رکھتا، کیونکہ وہ تو صرف حکم و فرج کی لذت سے واقف ہے یا آنکھ کی لذت سے واقف ہے کہ خوبصورت رنگ دیکھ لئے اور اچھے چروں پر نظر ڈال لی وہ صرف ایسی لذت سے واقف ہوتا ہے جس میں ہمارے بھی شریک ہوتے ہیں، عارفین کی لذت صرف ان ہی کے ساتھ مخصوص ہے غیر عارفین اس لذت کا ادراک نہیں کر سکتے، جو لوگ اس لذت کے اہل نہیں ان کے رب وہ اس کی حقیقت بیان کرنا حرام ہے، اور جو لوگ اہل ہیں وہ خود جان لیتے ہیں کہ یہ لذت کیا ہے؟ اس لئے بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

خوف کے فضائل اور ترغیبات کا ذکر

جاننا چاہیے کہ خوف کی فضیلت قیاس سے بھی ثابت ہوتی ہے اور آیات و روایات سے بھی قیاس کی صورت یہ ہے کہ کسی چیز کی فضیلت کے لئے یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ دیدار الہی کی سعادت تک پہنچانے میں کس قدر مدد کرتی ہے، کیونکہ بندہ مومن کا اصل مقصد یہی سعادت ہے، اس لئے جو چیز بندے کو اس سعادت تک پہنچانے میں جس قدر مدد کرے گی اسی قدر اس کی فضیلت ہوگی۔

اور یہ بات پہلے بیان کی جا چکی ہے کہ آخرت میں اللہ تعالیٰ کی ملاقات اور سعادت کا حصول اس کی محبت و انس کے بغیر ممکن نہیں ہے، اور محبت بغیر معرفت کے حاصل نہیں ہوتی، اور معرفت کا حصول دوام ذکر کے بغیر ممکن نہیں ہے، اور ذکر و فکر پر مواظبت کے لئے قلب کا دنیا سے لا تعلق ہونا ضروری ہے اور دنیا سے قلب کا تعلق اسی وقت منقطع ہو سکتا ہے جب بندہ دنیا کی لذات اور اس کی شہوات ترک کر دے، اور شہوات کا ترک کرنا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ ان کا قلع قمع نہ ہو جائے، اور شہوات کا قلع قمع کرنے کے لئے آتش خوف کی ضرورت ہے۔ خوف وہ آگ ہے جس سے شہوتیں خاکستر ہو جاتی ہیں اس لئے خوف ہی افضل ہو گا جو شہوات جلائے گا، مگر انہوں سے محفوظ رکھے گا، اور طاعات کی ترغیب دے گا، پھر خوف سے جس قدر شہوتیں جلیں گی اسی قدر گناہ کم ہوں گے اور جس قدر طاعات ظاہر ہوں گی اسی قدر وہ افضل ہو گا۔ درجات خوف کے اختلاف میں یہی اصل ہے، یہ اختلاف پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔ جہاں تک خوف کی نفس فضیلت کا سوال ہے تو یہ شبہ کرنا ہی بیکار ہے کہ خوف افضل کیوں ہے، جب کہ اس کی وجہ سے بندے کو عفت، ورع، تقویٰ اور مجاہدے جیسے اوصاف حاصل ہوتے ہیں، اور ان اوصاف کی فضیلت میں شبہ نہیں کیا جاسکتا ہے قیاس سے بھی خوف کی فضیلت ثابت ہوتی ہے اور آیات و روایات سے بھی۔

آیات و روایات سے فضیلت خوف کا ثبوت : خوف کے فضائل میں بے شمار روایات اور آثار وارد ہیں، خوف کی فضیلت کے لئے محض اتنا جان لینا کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جنت کے چاروں مقامات ہدایت، رحمت، علم اور رضا کو ان تین آیات میں جمع فرمادیا ہے۔

هُدًى وَرَحْمَةً لِّلَّذِينَ هُمْ لِرَبِّهِمْ بَرٌّ حَبُونَ (پہرہ آیت ۱۵۳)

ان لوگوں کے جو اپنے رب سے ڈرتے تھے ہدایت اور رحمت تھی۔

إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ (پ ۲۲ آیت ۲۸)

خدا سے اس کی وہی بندے ڈرتے ہیں جو اس کی عظمت کا علم رکھتے ہیں۔

رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُمْ ذَلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهُ (پ ۲۳ آیت ۸)

اللہ تعالیٰ ان سے خوش رہے گا اور وہ اللہ سے خوش رہیں گے یہ اس شخص کے لئے ہے جو اپنے رب سے ڈرتا ہے۔ پہلی آیت میں ہدایت و رحمت، دوسری میں علم، اور تیسری آیت میں رضا کو خائنین کے لئے مخصوص کیا گیا ہے، علاوہ ازیں جن آیات یا روایات سے علم کی فضیلت ثابت ہوتی ہے انہی سے خوف کی فضیلت کا ثبوت بھی ملتا ہے اس لئے کہ علم خوف ہی کا ثمر ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں کہ خائنین کو رفیق اعلا کی رفاقت حاصل ہوگی اور اس مرتبے میں ان کا کوئی شریک نہیں ہوگا۔ یہ رفاقت انہیں اس لئے حاصل ہوگی کہ خوف صرف اہل علم کرتے ہیں، اور اہل علم کو انبیاء کا وارث ہونے کی حیثیت سے ان کی رفاقت کا حق حاصل ہے، اور انبیاء کو رفیق اعلا کی رفاقت نصیب ہوگی۔ چنانچہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو مرض وفات کے

دوران یہ اختیار دیا گیا کہ وہ دنیا میں رہنا چاہیں تو دنیا میں رہیں اور ہمارے پاس آنا چاہیں تو ہمارے پاس آجائیں تو آپ نے یہی فرمایا۔
اسالک الرفیق الاعلیٰ (بخاری و مسلم - عائشہ) مجھ سے رفق اعلا کا سوال کرتا ہوں۔

خوف ایک ایسی قابل قدر شے ہے کہ اسکی اصل علم ہے اور اس کا شروع و تقویٰ ہے۔ اور ان تینوں اوصاف کے بے شمار فضائل وارد ہیں یہاں تک کہ عاقبت کو تقویٰ کے ساتھ مخصوص کیا گیا ہے۔ جیسا کہ حمد خدا کے وحدۃ لا شریک کے ساتھ اور دہود و سلام سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص ہیں۔ یہاں تک کہ خطبے کے آغاز میں اس طرح کہا جاتا ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِیْنَ وَالصَّلَاۃُ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ اٰجْمَعِیْنَ اللہ تعالیٰ نے تقویٰ کو اپنے ساتھ اس طرح بھی مخصوص فرمایا ہے۔

لَنْ نَبَالَہُ لِحُومِہَا وَلَا دِمَآءِہَا وَلَکِنْ نَبَالَہُ لَتَقْوٰی مِنْکُمْ (پ ۴۲ ع ۳ آیت ۳)

اللہ کے پاس نہ ان کا گوشت پہنچتا ہے اور نہ ان کا خون، لیکن اس کے پاس تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے۔

تقویٰ کے معنی یہ ہیں کہ آدمی خوف خدا کے باعث اعمالِ بد اور مشبہات سے باز رہے۔ اس کی فضیلت کا عالم یہ ہے فرمایا۔
اِنْ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اتَّقَاکُمْ (پ ۳۱ ع ۳۲ آیت ۳)

اللہ کے نزدیک تم سب میں بڑا شریف وہی ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہو۔

اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اولین و آخرین کو تقویٰ کی وصیت فرمائی ارشاد فرمایا۔

وَلَقَدْ نَوْصِیْنَا الذِّیْنَ اُوْتُوا الْکِتَابَ مِنْ قَبْلِکُمْ وَاِنَّا نَقُوْا اللّٰہَ (پ ۲۵ ع ۳۱ آیت ۳۱)

اور واقعی ہم نے ان لوگوں کو بھی حکم دیا تھا جن کو تم سے پہلے کتاب ملی تھی اور تم کو بھی کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرو۔

ایک آیت میں خوف کو بیضاء امر بیان کیا گیا ہے جو خوب پر دلالت کرتا ہے اور اسے ایمان کے ساتھ مشروط کیا ہے۔

وَخَافُوْنَ اِنْ کُنْتُمْ مُؤْمِنِیْنَ (پ ۳۲ ع ۳۲ آیت ۳۲)

کسی ایسے مومن کا تصور نہیں کیا جاسکتا جسے خوف میر نہ ہو، خواہ وہ کتنا ہی ضعیف الایمان کیل نہ ہو اگر اس کا ایمان ضعیف ہو تو

خوف بھی ضعیف ہوگا، یہ نہیں ہو سکتا کہ کوئی شخص ایمان بھی رکھتا ہو اور اللہ تعالیٰ سے خوف نہ بھی نہ ہو۔ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ

وسلم تقویٰ کی فضیلت میں ارشاد فرماتے ہیں ”جس روز اللہ تعالیٰ اپنے وعدہ معلوم کے مطابق اولین و آخرین کو جمع فرمائے گا تو اچانک

ایک آواز آئے گی، یہ آواز در نزدیک کے تمام لوگ سنیں گے، اور اس آواز کا خطاب یہ ہوگا کہ اے لوگو! جب سے میں نے تمہیں پیدا

کیا ہے آج کہنے میں تم کا مشورہ ہا آج تمہاری علم ہی کا دن ہے، تمہارے اعمال تمہارے سامنے آج آئے ہیں، اگر تمہیں اپنے گناہوں سے اپنے لئے نصیب تیل لکھا

اور یا عطا کر دیا ہے کہ یہاں تک کہ تمہارا حق ان کے لئے ہے، اللہ ان کے لئے ہے، تم نے اس پر عمل نہیں کیا، اور کہنے لگے کہ فلاں ابن فلاں، فلاں ابن فلاں

سے زیادہ صاحب ثروت ہے، آج میں تمہارا نسب گراؤں گا، اور اپنا نسب اونچا کروں گا، متعین کہاں ہیں؟ پھر تمام اہل تقویٰ کے لئے

ایک مخصوص جعزہ انصاف کیا جائے گا اور وہ سب اس جعزہ سے تلے اکٹھے ہو جائیں گے، اور جعزہ اٹھا کر جنت میں داخل ہوں گے اور

اپنے مکانوں کی سمت بڑھ جائیں (طبرانی اوسط، حاکم معتدرک، صحیح فی التفسیر، ابو ہریرہ) سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے

ہیں۔ رَأْسُ الْحِکْمَةِ مَخَا فَاللّٰہُ (یعنی۔ ابن مسعود) اصل حکمت اللہ سے ڈرنا ہے۔

ایک مرتبہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ ابن مسعود سے ارشاد فرمایا کہ اگر تمہیں مجھ سے ملنا منظور ہو تو میرے

بعد بکثرت خوف کرنا۔ (۱) حضرت فضیل ابن عیاض ارشاد فرماتے ہیں کہ جو شخص اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے خوف ہر طرح کی بہتری کی

طرف اسکی رہنمائی کرتا ہے۔ حضرت شبلی فرماتے ہیں کہ میں نے جب بھی اللہ تعالیٰ سے خوف کیا ہے میرے سامنے حکمت اور مہرت کا

ایک ایسا دروا ہوا ہے جو میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ حضرت یحییٰ ابن معاذ فرماتے ہیں کہ اگر مومن کوئی غلطی کرتا ہے اور اس کے ساتھ

عذاب کا خوف اور بخشش کی امید ہوتی ہے تو وہ غلطی ان دونوں کے درمیان ایسی ہو جاتی ہے جیسے دو شیروں کے درمیان لومڑی، ظاہر ہے لومڑی کو کسی ایک کا یا دونوں کا لقمہ بنانا ہی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی روایات میں ہے کہ قیامت کے دن باری تعالیٰ فرمائے گا کہ آج کے دن کوئی ایسا نہیں ہے جس کا میں حساب نہیں لوں گا۔ لیکن اہل ورع اس سے مستثنیٰ ہیں، مجھے شرم آتی ہے کہ میں ان کا محاسبہ کروں، وہ جس مرتبے پر فائز ہیں وہ حساب و کتاب سے بہت بلند ہے۔ ورع و تقویٰ دو ایسے الفاظ ہیں جن کا اشتقاق ایسے معنی سے ہوا ہے جن میں خوف کی شرط ہے، اگر خوف کی شرط نہ ہوتی تو ان معانی کا نام ورع و تقویٰ نہ رکھا جاتا۔

ذکر کی فضیلت میں بھی جو آیات و روایات وارد ہیں وہ بھی خوف کی فضیلت پر دلالت کرتے ہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ذکر کو خوف کے ساتھ مخصوص فرمایا ہے: **سَيَذَكِّرْهُمْ مِنْ نَحْشٍ** (پ ۳۰ ر ۴ آیت ۴۰) وہی شخص نصیحت مانتا ہے جو (خدا سے) ڈرتا ہے۔

ایک جگہ خوف کی فضیلت میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:۔

وَلِيَمِّنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ جَنَّاتٍ (پ ۳۲ ر ۳ آیت ۳۶)

اور جو شخص اپنے رب کے سامنے گھڑے ہونے سے ڈرتا ہے اسکے لئے (جنت میں) دو باغ ہوں گے۔ ایک حدیث قدسی میں وارد ہے، فرمایا: ”مجھے اپنی عزت کی قسم ہے میں اپنے بندے پر دو خوف اور دو امن جمع نہیں کروں گا، اگر وہ دنیا میں مامون رہا تو آخرت میں ڈراؤں گا اور دنیا میں خوف زدہ رہا تو آخرت میں امن دوں گا (ابن حبان، بیہقی۔ ابو ہریرہ) ایک حدیث میں ہے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص اللہ سے ڈرتا ہے اس سے ہر چیز ڈرتی ہے، اور جو غیر اللہ سے ڈرتا ہے اللہ اسے ہر چیز سے ڈرتا ہے (ابن حبان، ابو امامہ) ایک مرتبہ ارشاد فرمایا کہ تم میں کمال حاصل لیسواصل ہے جو اللہ تعالیٰ سے زیادہ ڈرتا ہے اور ان امور کو اچھی طرح سمجھتا ہے جن کا اللہ نے حکم دیا ہے، اور ان امور سے اچھی طرح رکتا ہے جن سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے۔ (۱)

یہی ابن معاذ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ بندہ مسکین پر رحم فرمائے اگر یہ دونوں خے بھی اسی طرح ڈرے جس طرح فقرے ڈرتا ہے تو جنت میں داخل ہو۔ حضرت ذوالنون مصریٰ نے ارشاد فرمایا جو شخص اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے اس کا دل نرم ہو جاتا ہے، اللہ تعالیٰ سے اس کی محبت میں شدت پیدا ہو جاتی ہے، اور اس کی عقل درست رہتی ہے، موصوف نے یہ بھی فرمایا کہ رجاء کے مقابلے میں خوف زیادہ بہتر ہے، اس لئے کہ جب رجاء غالب ہوتی ہے تو دل پریشان ہو جاتا ہے۔ حضرت ابوالحسن نایبنا فرمایا کرتے تھے کہ سعادت کی علامت یہ ہے کہ بندے کو شکاوت کا خوف ہو، خوف بندے اور رب کے درمیان ایک باگ ہے، جب یہ باگ منقطع ہو جاتی ہے تو بندہ تباہ ہو جاتا ہے۔ یہی ابن معاذ سے دریافت کیا گیا کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے عذاب سے کون مامون ہوگا؟ انھوں نے جواب دیا وہ شخص جو دنیا میں زیادہ ڈرتا ہے۔ حضرت سہیل ستیری ارشاد فرماتے ہیں کہ خوف خدا کے لئے اکل حلال شرط ہے۔ حضرت حسنؒ سے بعض لوگوں نے عرض کیا کہ ہم ایسے لوگوں میں اٹھتے بیٹھتے ہیں جو ہمیں بہت زیادہ خوف زدہ کرتے ہیں، یہاں تک کہ ہمارے دل اڑنے لگتے ہیں، بتلائیے ہم کیا کریں، فرمایا تمہارا ایسے لوگوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا جو تمہیں ڈراتے رہیں اور ایک دن مامون کر دیں ایسے لوگوں میں اٹھنے بیٹھنے سے بہتر ہے جو تمہیں بے خوف کر دیں یہاں تک کہ ایک دن تمہیں خوف گھیر لے۔ حضرت ابوسلیمان دارانی کہتے ہیں کہ جس شخص کے دل سے خوف اٹھ جاتا ہے وہ تباہ ہو جاتا ہے۔ ایک مرتبہ حضرت عائشہؓ نے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! اس آیت میں وہ لوگ مراد ہیں جو چوری کرتے ہیں یا وہ لوگ مراد ہیں جو زنا کرتے ہیں۔

وَالَّذِينَ يُوْتُونَ مَا آتَوْا وَقُلُوبُهُمْ وَجِلَةٌ (پ ۳۸ ر ۴ آیت ۴۰)

اور جو لوگ (راہِ خدا میں) دیتے ہیں جو کچھ دیتے ہیں اور ان کے دل (دینے کے باوجود) خوف زدہ ہوتے ہیں۔

فرمایا اس میں وہ لوگ مراد ہیں جو روزے رکھتے ہیں، نماز پڑھتے ہیں، اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور ڈرتے ہیں کہ کہیں یہ عبادتیں روکنے ہو جائیں (ترمذی، ابن ماجہ، حاکم) اللہ تعالیٰ کی پکڑ اور اس کے عذاب سے بے خوف رہنے والوں کے سلسلے میں سخت وعیدیں وارد ہیں، اور یہ تمام وعیدیں ایک طرح سے خوف کے فضا کل ہیں، کہیں کہ کسی شے کی مذمت اس کی ضد کی تعریف سے ہو ا کرتی ہے خوف کی ضد

اگرچہ جس طرح جہاں کی منہ سے جہاں کی فضیلت ثابت کرتی ہے طرح اس کی مدت خوف کی فضیلت پر دلالت کرتی ہے اس لئے کہ خوف رجاہ دونوں لازم ملزوم ہیں جو شخص بھی کسی محبوب کی آس رکھے گا اسے اس کی جدائی کا خوف بھی ہوگا اگر اسے محبوب کے نہ ملنے کا خوف نہیں تو کہا جائے گا کہ وہ شے اسکی محبوب نہیں ہے اس لئے وہ اسکا شہر بھی نہیں خوف و رجاہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح ہم آہنگ ہیں کہ انھیں ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا اور نہ یہ تصور کیا جاسکتا ہے کہ قلب ان میں سے ایک کے ساتھ مشغول ہو اور دوسرے سے غافل ہو ان دونوں میں تلازم کی اور اس درجہ گہرے ربط کی وجہ یہ ہے کہ دونوں کے لئے یہ شرط ہے کہ جس چیز میں شک ہو اس سے متعلق ہوں اس لئے معلوم چیز کی نہ رجاہ کی جاتی ہے اور نہ خوف چنانچہ اگر تم کسی محبوب شے کا تصور کرو اور کا وجود ممکن ہو تو اس کا عدم بھی ممکن ہوگا وجود فرض کرنے کی صورت میں دل کو راحت ہوگی اس کا نام رجاہ سے اور عدم فرض کرنے کی صورت میں دل کو صدمہ ہوگا اس کا نام خوف ہے یہ دونوں صورتیں ایک دوسرے کی ضد ہیں بشرطیکہ وہ شے جس کا انتظار یا توقع ہے مشکوک ہو۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ شک کے دونوں طرفوں میں سے ایک طرف کو بعض اوقات کسی سبب کے پائے جانے کی بنا پر ترجیح حاصل ہو جاتی ہے اس کا نام ظن ہے ظن کی بنیاد پر خوف و رجاہ ایک دوسرے پر غالب آسکتے ہیں جب ظن پر محبوب کے وجوب کا غلبہ ہوتا ہے تو رجاہ کا پہلو بھاری ہوتا ہے اور جب محبوب کے عدم کا غلبہ ہوتا ہے تو خوف کا پہلو مضبوط ہوتا ہے پہلی صورت میں خوف اور دوسری صورت میں رجاہ کمزور پڑ جاتی ہے جہاں تک ان دونوں کے مابین لزوم کا تعلق ہے یہ ایک حقیقت ہے اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کو ایک ساتھ ذکر فرمایا ہے ۔ وَ يَدْعُونَ نَارَ عَذَابٍ وَرَهْبًا (پ ۶۷ آیت ۹) اور امید و بیم کے ساتھ ہماری عبادت کیا کرتے تھے يَدْعُونَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَطَمَعًا (پ ۱۸ آیت ۱۸) اپنے رب کو امید سے اور خوف سے پکارتے ہیں۔ اسی لئے عربی زبان میں بعض اوقات خوف کے لئے رجاہ کو سیلہ تعبیر بنایا گیا ہے۔ قرآن کریم میں ہے ۔ مَا لَكُمْ لَا تَرْجُونَ لِلْيَوْقَارِ (پ ۹۲ آیت ۳) تم کو کیا ہوا کہ تم اللہ کی عظمت کے معقد نہیں ہو۔

اس میں لا ترجون کے معنی لا تحافون ہیں۔ قرآن کریم میں بہت سے مواقع پر رجاہ کو خوف کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے اور وجہ یہی ہے کہ یہ دونوں لازم ملزوم ہیں معمولوں کی یہ عادت ہے کہ وہ ایک لفظ سے کبھی لازم مراد لے لیتے ہیں اور کبھی ملزوم رجاہ کو خوف کے معنی میں اسی بنیاد پر لیا جاتا ہے۔ بلکہ قرآن پاک میں متعدد مواقع پر خوف کے باعث رونے کی تحسین کی ہے اور اس کی ترغیب دی ہے اس سے بھی خوف کی فضیلت ثابت ہوتی ہے فرمایا ۔

فَلْيَضْحَكُوا قَلِيلًا وَلْيَبْكُوا كَثِيرًا (پ ۱۸ آیت ۸۷) سو قہوڑا نہیں اور بہت روئیں۔
يَبْكُونَ وَيَزِيدُهُمْ خُشُوعًا (پ ۱۸ آیت ۸۷) روتے ہیں اور رونا ان کے خشوع کو بڑھاتا ہے۔
أَفَمِنْ هَذَا الْحَلِيِّثِ تَجْجِبُونَ وَتَضْحَكُونَ وَلَا تَبْكُونَ وَأَنْتُمْ سَامِعُونَ (پ ۲۷ آیت ۶۰-۶۱)

سو کیا تم اس کلام (الہی) سے تعجب کرتے ہو اور ہنستے ہو اور (خوف عذاب سے) روتے نہیں ہو اور تم تکبر کرتے ہو۔
احادیث بھی روئے کے فعال سے لبریز ہیں ایک حدیث میں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ کوئی بندہ مومن ایسا نہیں ہے جس کی آنکھ سے خوف خدا میں آنسو ٹپکے خواہ وہ کسی کے سر کے برابر ہی کیوں نہ ہو اور وہ خسارے پرے پھر اللہ تعالیٰ اسے دوزخ پر حرام نہ کرے (طبرانی بیہقی۔ ابن مسعود ایک حدیث میں ہے فرمایا ۔

إِذَا أَقْشَعَتْ قُلُوبُ الْمُؤْمِنِينَ خَشْيَةُ اللَّهِ تَوَحَّاتَتْ عَنْهُ خَطَايَاهُ كَمَا يَتَحَّاتُ مِنَ الشَّجَرَةِ وَرَقُهَا (طبرانی بیہقی۔ ابن مسعود)

جب مومن کا دل اللہ کی خشیت سے لرزتا ہے تو اس کے منہ اس طرح جم جاتے ہیں جس طرح درخت سے پتے لایلیج النار عبد بکسی من خشيته الله حتى يعود اللين في الضرع (ترمذی ابن ماجہ۔

ابو ہریرہ

وہ بندہ دونوں میں داخل نہیں ہوگا جو خشیت الہی کی وجہ سے رویا ہو یہاں تک کہ دودھ پستان میں لوٹ جائے۔

یعنی دودھ کا پستانوں میں واپس جانا محال ہے، اسلئے یہ بھی محال ہے کہ کسی ایسے بندے کو دونوں میں داخل کیا جائے، جو اللہ کے ڈر سے رویا کرتا ہو، حضرت عقبہ ابن عامر روایت کرتے ہیں کہ میں نے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا یا رسول اللہ! نجات کی کیا صورت ہے؟ آپ نے فرمایا اپنی زبان بند رکھ، اپنے گھر میں محدودہ اور اپنی غلطی پر آنسو بہا، (۱) حضرت عائشہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! آپ کی امت میں سے کوئی شخص بلا حساب بھی جنت میں جائے گا، فرمایا، ہاں وہ شخص بلا حساب جنت میں جائے گا جو اپنے گناہوں پر روتا ہے۔ (۲) ایک حدیث میں ہے فرمایا نہ۔

مِمَّا مِنْ قَطْرَةٍ أَحَبَّ إِلَى اللَّهِ تَعَالَى مِنْ قَطْرَةٍ تَمْنَعُ مِنْ خَشْيَةِ اللَّهِ تَعَالَى أَوْ قَطْرَةٍ دِمٍ أَهْرَ نَقَتْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ (ترمذی - ابوالامامہ)

اللہ تعالیٰ کے نزدیک دو قطرے زیادہ محبوب ہیں، ایک وہ قطرہ الحک جو اللہ تعالیٰ کے خوف سے نکلے اور

دوسرے وہ قطرہ خون جو راہِ خدا میں بہایا جائے۔

روایت میں ہے کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا فرمایا کرتے تھے نہ۔

اللَّهُمَّ ارْزُقْنِي عَيْنَيْنِ هَاطَتَيْنِ تَسْقِيَانِ يَنْزُوفِ التَّمْنَعِ قَبْلَ أَنْ تَصِيرَ التَّمْنُوعُ دَعَاؤَ الْأَضْرَامِ جَمْرًا (طبرانی - ابوالقاسم - ابن عمر)

اے اللہ مجھے کثرت سے پانی بہانے والی آنکھیں عطا کر جو آنسو بہا کر (قلب کی کھیتی کو) سنبھلیں اس سے پہلے

کہ آنسو خون ہو جائیں اور اورادِ وحیں چنگاریاں۔

ایک روایت میں ہے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ سات آدمی ایسے ہیں جنہیں اس دن اللہ تعالیٰ سایہ رحمت عطا فرمائے گا جس روز اس کے سائے کے سوا کوئی سایہ نہ ہوگا، پھر آپ نے ان سات کے نام گنائے جن میں سے ایک وہ شخص ہے جو تنہائی میں اللہ تعالیٰ کو یاد کر کے روتا ہے۔ (بخاری و مسلم - ابو ہریرہ) حضرت ابوبکر الصدیق فرماتے ہیں کہ جو شخص دیکھے وہ روئے اور جسے رونانہ آتا ہو وہ دونی صورت ہی بنا لے حضرت محمد ابن منکدر اگر آنسوؤں سے روئے تو اپنا چہرہ اور داڑھی بھگو لیتے، فرماتے تھے کہ میں نے سنا ہے جہاں جہاں آنسوؤں کی تری پہنچتی ہے وہاں دونوں کی آگ حرام ہو جاتی ہے۔ حضرت عبداللہ ابن عمر فرماتے ہیں رویا کو اگر رونانہ آتا ہو تو ایسی صورت بنا لو جس سے دیکھنے والا یہ سمجھے کہ تم رو رہے ہو، اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہی اگر تم حقیقت حال جان لو تو اتنا روؤ کہ دم نکل جائے، اور اتنی نمازیں پڑھو کہ پینے کی ہڈی چٹ جائے، حضرت سلیمان دارانی فرماتے ہیں کہ جس کی آنکھوں میں آنسو آئیں گے اس کا چہرہ قیامت کے روز ذلت اور رسوائی سے فہار آلودہ نہ ہوگا، اور اگر وہ آنسو آنکھوں سے بہہ پڑے تو آگ کے بہت سے سمندر سرو ہو جائیں گے، اور اگر کوئی شخص کسی مجلس میں روئے گا تو اس مجلس کے تمام شرکاء عذابِ آخرت سے مامون رہیں گے، حضرت دارانی یہ بھی فرماتے ہیں کہ روننا خوف سے ہوتا ہے، اور رجاء و طرب شوق سے حضرت کعب الاخبار فرماتے ہیں کہ اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے اگر میں گریہ کروں اور میرے آنسو دونوں رخساروں پر رواں ہوں یہ اس سے بہتر ہے کہ سونے کی ایک سلاخ اللہ کی راہ میں خیرات کروں حضرت عبداللہ ابن عمر فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کے خوف سے ایک آنسو بہانا راہِ خدا میں ایک ہزار دینار صدقہ کرنے سے افضل ہے۔ حضرت حنظلہ روایت کرتے ہیں کہ ہم ایک دن سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ

وسلم کی خدمت میں حاضر تھے، آپ نے ہمیں کچھ نصائح فرمائیں، انھیں سن کر ہمارے دل بھر آئے، اور آنکھوں سے آنسو بہنے لگے، اور ہم نے اپنی نفسوں کو جان لیا، اسکے بعد میں اپنے گھر آیا، اور گھروالوں سے ملا، ہمارے درمیان دنیا داری کی باتیں ہوئیں، یہاں تک کہ جو کچھ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے میں نے سنا تھا وہ ذہن سے نکل گیا، اور وہ رقت و خوف بھی دل میں نہ رہا جو سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضری کے وقت تھا، چنانچہ میں نے اپنے دل میں کہا کہ حنظلہ مطلق ہو گیا، اور یہ خیال لے کر گھر سے نکلا، ادھر آکر کہنے لگا کہ حنظلہ حاضری ہو گیا، اتنے میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے تشریف لائے، انہوں نے فرمایا کہ حنظلہ ہرگز منافق نہیں ہوا، اور سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، اور میں نے آپ سے یہی بات عرض کی، آپ نے ارشاد فرمایا کہ حنظلہ منافق نہیں ہوا۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! ہم آپ کی خدمت میں حاضر تھے، آپ نے ہمیں نصیحت فرمائی جس سے ہمارے دل نرم ہو گئے، اب تک بہنے لگے، اور ہم نے اپنے نفسوں کو پہچان لیا، پھر میں اپنے گھروالوں کے پاس پہنچا، اور ہم نے دنیاوی امور میں مشغول ہو گئے، اور جو کچھ میں نے آپ سے سنا تھا وہ بھول گیا، آپ نے فرمایا اے حنظلہ اگر تم ہمیشہ اسی حالت پر رہے تو فرشتے راہوں میں اور تمہارے بستروں پر تم سے مصافحہ کرتے، لیکن اے حنظلہ یہ کیفیت بس تھوڑی دیر ہو کر تھی ہے، پھر تم اسی سابقہ کیفیت پر آجایا کرتے ہو۔

بہر حال جو آیات اور روایات رجاء، بقاء، تقویٰ، ورع، اور علم کی فضیلت میں اور امن کی مذمت میں وارد ہوئی ہیں ان سب سے خوف کی فضیلت ثابت ہوتی ہے، اس لئے کہ ان سب کا کسی نہ کسی طریقہ پر خوف سے تعلق ہے، بعض کا سبب ہونے کی حیثیت سے اور بعض کا سبب ہونے کی حیثیت سے۔

غلبہ خوف افضل ہے، یا غلبہ رجاء یا ان دونوں کا اعتدال افضل ہے

جاننا چاہیے کہ خوف اور رجاء کے فضائل میں بے شمار روایات وارد ہیں، پڑھنے والا یہ روایات پڑھتا ہے اور اس تردد میں پڑ جاتا ہے کہ ان دونوں میں سے کونسا وصف افضل ہے؟ لیکن ہماری خیال میں یہ ایک بے بنیاد سوال ہے، اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص یہ پوچھے دعویٰ افضل ہے یا پانی؟ ظاہر ہے اس کا جواب بھی دیا جائے گا کہ بھوک کے لئے دعویٰ افضل ہے اور پیاس کے لئے پانی، اگر یہ دونوں جمع ہو جائیں تو دیکھا جائے گا کہ غلبہ بھوک کو حاصل ہے یا پیاس کو، بھوک کی صورت میں دعویٰ افضل ہوگی اور پیاس کی صورت میں پانی افضل ہوگا، اگر دونوں ضرورتیں برابر ہوں تو یہ دونوں چیزیں بھی برابر ہوں گی۔ اگر کسی چیز کے فضل و کمال کا اندازہ کرنا ہو تو یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ چیز کسی مقصود کے لئے تو مطلوب نہیں، اگر ایسا ہے تو اس مقصود کا جائزہ لینا چاہیے، جو فضیلت اس مقصود کو حاصل ہوگی وہی فضیلت اس چیز کے لئے بھی ہوگی کوئی چیز اپنی ذات سے افضل نہیں ہوتی۔ رجاء اور خوف دونوں میں ہیں ان سے دلوں کا علاج ہوتا ہے، ان دونوں میں بذات خود کوئی خوبی نہیں ہے بلکہ جس قدر وہ امراض کے لئے مفید ہوں گی اسی قدر ان میں خوبی ہوگی، چنانچہ اگر دل میں بے خوفی کا مرض ہے، اور یہ اندیشہ ہے کہ وہ شخص اللہ کے عذاب سے اپنے آپ کو محفوظ جان کر دنیاوی لذات میں مستغرق رہے گا تو اس صورت میں خوف افضل ہے، اور اگر دل پر نا امیدی اور مایوسی غالب ہے تو رجاء افضل ہوگی، اسی طرح اگر بندے پر گناہ غالب ہوں تب بھی خوف افضل ہوگا۔

یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ خوف مطلقاً افضل ہے جیسے یہ کہا جائے کہ دعویٰ مسکننجین سے افضل ہے اسلئے کہ دعویٰ سے بھوک کے مرض کا علاج ہوتا ہے، اور مسکننجین سے صفراوی مادے کا، اور بھوک کا مرض غالب ہے، اور اسکے لئے دعویٰ کی ضرورت زیادہ پڑتی ہے، اس لئے دعویٰ افضل ہے، اس اعتبار سے ہم خوف کو بھی علی الاطلاق افضل کہہ سکتے ہیں اسلئے کہ لوگوں پر معاصی اور خود فریبی غالب ہے، اور اگر خوف و رجاء کے سرچشموں پر نظر ڈالی جائے تو رجاء کو افضل کہنا پڑے گا اس لئے کہ رجاء کا سرچشمہ رحمت ہے، اور خوف کا مفع غصب ہے، اور جو شخص ان صفات میں غور و فکر کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم کو محقق ہیں تو اسکے دل میں اللہ کی محبت زیادہ پیدا ہوتی ہے، اور محبت کے بعد کوئی مقام نہیں ہے، اور خوف کی صورت میں بندے کی توجہ باری تعالیٰ کی ان صفات پر ہوتی ہے جو غیظ و غضب اور ناراضگی پر دلالت کرتی ہیں، ان صفات کے نتیجے میں بیعت زیادہ ہوتی ہے، اتنی محبت اور انس حاصل نہیں ہوتا جتنی

حضرت عمرؓ کے خوف ورجاء میں مساوات : یہاں یہ امتزاع کیا جاسکتا ہے کہ حضرت عمرؓ کے خوف ورجاء میں پرامنی نہیں ہونی چاہیے بلکہ ان پر رجاء غالب ہونا چاہیے۔ جیسا کہ کتاب الرجاء کی ابتدا میں گزر چکا ہے کہ رجاء کی قوت اسباب کی قوت کے اعتبار سے ہوتی ہے۔ محمد بن علی نے بھی اور بیچ کی مثال دی مگر حق اُور یہ بات واضح ہے کہ نہ شخص صحیح فہم میں ذالما ہے اور اس کی گمرانی کرنا ہے اور نہ کھیتی کی تمام شرائط پوری کرتا ہے اس کے دل میں یہ توقع غالب رہتی ہے کہ محنت بار آور ہوگی اور کھیتی پک جائے گی مستحق کا حاصل بھی ملے گا۔ لیکن اگر شخص ایسی عمدہ زمین میں بہترین بیج بوائے ہیں اور وہ اپنی کھیتی کی گمرانی میں غفلت نہیں کرتے نہ کاشتکارانہ کاموں سے کوتاہی کرتے نہ ہٹ کر محض الفاظ سے مطالب اخذ کرتے ہیں وہ اکثر لغزش کھا جاتے ہیں کتاب الرجاء کے آغاز میں ہم نے جو مثال بیان کی ہے وہ اگرچہ مستحق کے بعض احوال پر منطبق ہوتی ہے لیکن تمام احوال پر بالیقہ طور پر منطبق نہیں ہوتی۔ اصل میں مذکور رجاء کا سبب علم ہے، نور علم تجربہ سے حاصل ہوتا ہے، نہ کوہِ مثل میں تجربہ سے یہ بات معلوم ہو سکتی ہے کہ زمین اچھی اور صاف ہے، بیج عمدہ ہے، ہوا صاف ہے، اور کھیتی کو بہاد کرنے والی، بجلیاں اس علاقے میں شاذ و نادر ہی گرتی ہیں، لیکن زیر بحث مسئلے میں بیج کی آفاتش نہیں ہوتی کہ وہ اچھا ہے یا خراب، پھر وہ ایک اجنبی زمین میں ڈال دیا گیا اس کے بعد کاشت کار نے اس کی گمرانی کی نہ کوئی خبر ملی، اور وہ زمین بھی ایسے علاقے میں واقع ہے جس کے بارے میں نہیں کہا جاسکتا کہ وہاں بجلیاں گرتی ہیں یا نہیں، ایسے کسان پر خوف کے مقابلے میں رجاء غالب ہی نہیں آسکتی خواہ وہ کتنی ہی عمدہ اور خوش کھیل نہ کرے، زیر بحث مسئلے میں بیج ایمان ہے اور اس کی عمدگی کی شرائط دستیاب ہیں، زمین قلب ہے، اور قلب کی طبائش اور مغلت شرک مخفی تغافل اور ریا و فیوضیات عامص اور پوشیدہ ہیں، اور اس کھیتی کے لئے دنیاوی سموات و ارضیات ولی کا موجودہ زمانے میں ان کا تلفیت ہونا یا مستقبل میں اسکے التقات کا امکان ہونا ایسی باتیں ہیں جو انسانی حواس کھیتی کو تباہ کر سکتی ہیں ان میں سے کوئی بھی چیز ایسی نہیں جو تجربہ سے معلوم ہو سکے، اسلئے کہ بعض اوقات ایسے حالات پیش آتے ہیں جو آدمی کی طاقت سے باہر ہوتے ہیں، پھر صوامعن (بجلیوں) کا خطرہ بھی اپنی جگہ ہے یہ صوامعن سکرات موت کی دہشتیں ہیں، اس وقت عقیدے مضطرب ہو جاتے ہیں، اور عزائم کے عمل چکنا چور ہو جاتے ہیں، ان صوامعن کا علم بھی تجربہ کے دائرے سے خارج ہے، پھر یہ کھیتی دنیاوی کھیتی کی طرح جلدی نہیں لگتی، بلکہ اس کا وقت دور ہے جب قیامت برپا ہوگی،

اس دن کا بھی تجربہ نہیں ہے۔ اب اگر کوئی شخص کنور دل ہے تو اس پر خوف غالب ہوتا ہے، جیسا کہ بعض ایسے صحابہ و تابعین کے احوال مذکور ہوں گے جن کے دل کنور تھے، اور جو لوگ مضبوط دل کے ہوتے ہیں، اور معرفت میں کامل ہوتے ہیں ان کا خوف ورجاء برابر ہوتا ہے، اور ان پر صرف رجاء غالب نہیں ہوتا حضرت عمرؓ کا عالم تو یہ تھا کہ وہ ہر وقت اپنے دل کی جستجو کیا کرتے تھے، اور اسکے غفلتی امراض کا پتہ لگانے کے لئے شخص سے کام لیتے تھے یہاں تک کہ حضرت حذیفہؓ سے دریافت فرماتے تھے کہ میرے امیر حمیس غفلت کی کوئی علامت تو نظر نہیں آئی، حضرت حذیفہؓ سے دریافت کرنے کی کیا وجہ یہ تھی کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں مہاتمین کی علامات سے آگاہ فرمایا تھا۔ (۱) آج کل ہے جو اپنے دل کو غفلت اور شرک غفلت سے اس طرح پاک کرنا ہو، اور اگر کسی نے یہ سمجھ لیا کہ میرا دل صاف ہے تو اللہ تعالیٰ کی پکار سے کہاں تک سامان رہے گا، ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے دل میں مغالطی کا خیال ڈال دیا ہو اور حقیقت اسکے برعکس ہو، اور اگر کسی شخص کو واقع میں بھی دل کا تزکیہ اور اس کی مغالطی حاصل ہو اور وہ یہ اعتقاد بھی رکھتا ہے کہ میرا دل پاک و صاف ہے تو اس نے یہ بات کیسے جان لی کہ وہ خاتمے کے وقت تک اسی حال پر رہے گا، جب کہ حدیث شریف میں ارشاد فرمایا گیا ہے :-

إِنَّ الرَّجُلَ لَيَعْمَلُ الزَّمَنَ أَطْوَيْلَ يَعْمَلُ أَهْلُ الْجَنَّةِ ثُمَّ يُخْتَمُ لَهُ بِعَمَلِ أَهْلِ النَّارِ
(مسلم ابو ہریرہ)

آدمی طویل عرصے تک جنت والوں کے سے عمل کرتا ہے، پھر اس کا خاتمہ اہل دوزخ کے عمل پر ہوتا ہے۔ بعض روایات میں آیا ہے کہ آدمی زندگی بھر اچھے اعمال کرتا ہے، لیکن جب اس میں اور موت میں ایک بالشت کا فاصلہ رہ جاتا ہے اور بعض روایات کے مطابق اتنا وقفہ رہ جاتا ہے جتنا وقفہ اونٹنی کا دودھ دینے کے وقت دودھ دودھ نکالنے کے درمیان ہوتا ہے تو نوشتہ ازلی سبقت کرتا ہے اور اس کا خاتمہ دوزخیوں کے عمل پر ہوتا ہے۔ یہ ایک مختصر وقفہ ہے، اس میں آدمی اعضاء سے عمل نہیں کر سکتا، لیکن اس وقفے میں دل ایسے تصورات اور وساوس کا آماجگاہ بن سکتا ہے جو اسکی بد بختی کا باعث بن جائیں، اور وہ تمام راس المال ضائع کر دیں جو اس نے عمر بھر کی ریاضتوں سے ذخیرہ کیا ہے، جب صورت حال یہ ہو تو آدمی بے خوف کس طرح رہ سکتا ہے، اس لئے مومن کے لئے خوف اور رجاء دونوں کا وجود ضروری ہے، بلکہ ان دونوں میں مساوات بھی ضروری ہے۔ عام لوگوں پر رجاء کا غالب ہونا ان کی غلط فہمی اور کم علمی کی دلیل ہے اسی لئے قرآن کریم نے جہاں جہاں اپنے بندوں کے اوصاف ذکر فرمائے ہیں ان دونوں کو یکجا بیان فرمایا ہے :-

يَدْعُونَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَطَمَعًا (پ ۱۵، آیت ۹۸)

اپنے رب کو امید سے اور خوف سے پکارتے ہیں۔

وَيَدْعُونَ نَارَ عَذَابٍ وَرَهْبًا (پ ۱۷، آیت ۹۰)

اور امید ہم کے ساتھ ہمیں پکارا کرتے تھے

لیکن اب حضرت عمرؓ جیسے صاحب عزیمت انسان کہاں ہیں جو رجاء اور خوف میں مساوات برقرار رکھ سکیں، اسلئے موجودہ دور میں تو لوگوں کے لئے خوف زیادہ مناسب ہے، بشرطیکہ یہ خوف انھیں بلاویں ترک عمل اور ناامیدی تک نہ پہنچائے، بعض لوگ اس خوف سے کہ ہم گنہگار ہیں، ہماری مغفرت کی کوئی امید نہیں ہے، عمل ترک کر دیتے ہیں اور گناہوں میں غرق رہتے ہیں، ایسا خوف مفید ہونے کے بجائے نقصان دہ ہے، ایسے خوف کی شریعت میں کہاں گنجائش ہو سکتی ہے جو عمل ترک کرادے، خوف وہی مفید ہے جس سے عمل پر ترقیب ہو، مشوات سے غرور ہو، اور جو دنیا کی طرف متکنت نہ ہونے دے۔ خوف یہ نہیں ہے کہ دل میں ایک خیال آیا، اور گزر گیا،

اعضاء پر اسکا ذرا بھی اثر نہیں ہوا، نہ اعمال بد سے نفرت ہوئی اور نہ اعمال حسنة کی ترغیب ہوئی یا اس کا نام بھی خوف نہیں جس سے ناامیدی جنم لے، حضرت یحییٰ ابن معمر فرماتے ہیں کہ جو شخص محض خوف سے اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا ہے وہ فکر کے سمندروں میں غرق ہو جاتا ہے اور جو صرف رجاء کے ساتھ اللہ کی عبادت کرتا ہے وہ مقابلے کی دلدلی میں گم ہو جاتا ہے، صرف وہ شخص ذکر کی راہ میں مستقیم رہتا ہے جو خوف اور رجاء کے ساتھ عبادت کرے، مکمل و مطلق فرماتے ہیں جو شخص خوف کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا ہے وہ خارجی ہے اور جو خوف رجاء اور محبت کے ساتھ کرتا ہے وہ مرنی ہے اور جو محبت کے ساتھ کرتا ہے وہ زندیق ہے اور جو شخص خوف رجاء اور محبت کے ساتھ کرتا ہے وہ موجد ہے۔ ان سب اقوال کا خلاصہ یہ ہے کہ اگرچہ ان تمام چیزوں کا اجتماع پسندیدہ ہے لیکن جب تک موت نہ آئے زیادہ مفید اور مناسب خوف ہے، موت کے وقت رجاء اور رحمت الہی کے ساتھ حسن ظن زیادہ موندل ہے۔ اسلئے کہ خوف تو ایک نازیبا نہ ہے جو بندے کو عمل پر اکساتا ہے اور عمل کا وقت گزر چکا ہے جو شخص موت سے ہم کنار نہ ہونے والا ہے وہ عمل پر قدرت نہیں رکھتا اور نہ اسکی سکت رکھتا ہے کہ خوف کے اسباب برداشت کر سکے، خوف سے دل اور دودے گا اور موت سے اور زیادہ قریب ہو گا جب کہ رجاء سے قلب کو تقویت حاصل ہوتی ہے، اور اللہ تعالیٰ کی محبت رگ و پے میں سہا جاتی ہے، بندے کے لئے سعادت اسی میں ہے کہ وہ دنیا سے رخصت ہو تو اسکے دل میں اللہ کی محبت کے چراغ روشن ہوں، اور وہ باری تعالیٰ سے ملاقات کا حقیقی ہو، جو شخص اللہ سے ملاقات چاہتا ہے اللہ اس سے ملاقات چاہتا ہے اور یہ اس و محبت، شوق ملاقات اور تمنائے دیدار علوم اور اعمال سے مقصود اللہ تعالیٰ کی معرفت ہے، اور معرفت کا شمو محبت ہے، مرنے کے بعد ہر ذی مدح کو اسکے پاس پہنچتا ہے، وہیں اس کا اصل ٹھکانہ ہے جو شخص اپنے محبوب سے ملتا ہے اسے اسی قدر خوشی ہوتی ہے جس قدر محبت ہوتی ہے اور جو شخص اپنے محبوب سے جدا ہوتا ہے اسے اسی قدر اذیت ہوتی ہے جس قدر محبت ہوتی ہے اب اگر کسی شخص کے دل پر محبت کے وقت بیوی بچوں کی، مل، مکان، زمین جائیداد، دوست احباب اور اقارب کی محبت غالب ہے تو یہ ایسا شخص ہے جس کی تمام محبوب چیزیں دنیا میں ہیں، دنیا اس کی جنت ہے، اسلئے کہ جنت اسی مخصوص مکان کا نام ہے جو تمام محبوب اور پسندیدہ چیزوں کو جامع ہے، ایسے شخص کا مرنا ایسا ہے جیسے جنت سے نکلنا، موت اسکے اور اسکی محبوب چیزوں کے درمیان حجاب بن جاتی ہے اور یہ ایک ایسی تکلیف ہے جسے مشکل ہی سے برداشت کیا جاسکتا ہے، اس لئے دنیا دار لوگ موت سے خوف کھاتے ہیں، اور اس زندگی کو چھوڑ کر جانا پسند نہیں کرتے، جب کہ وہ شخص جس کا محبوب اللہ ہے، اور جس کو دنیا کی زندگی میں صرف ذکر، فکر اور معرفت سے اللہ رہا ہے، اور وہ دنیاوی علائق اور روایہ کو اپنے لئے معرطور کرتا ہے اسکے لئے یہ دنیا ایک قید خانہ ہے، یہاں اسے ایک لمحے کے لئے بھی سکون نہیں ملتا، ہر وقت اس کو شش میں رہتا ہے کہ قید خانے سے نجات پائے اور اپنے محبوب سے ملاقات کرے، اب تم اس کیفیت کا تصور کرو جو ایک قیدی کو قید خانے سے رہا ہونے کے بعد اس وقت حاصل ہوتی ہے جب وہ اپنے محبوب سے ملاقات کرتا ہے، یہ وہ خوشی ہے جو بندہ مومن جسم کی قید سے نجات پانے کے بعد پہلے پہل پاتا ہے، یہ اس ثواب سے الگ ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لئے رکھ چھوڑا ہے، یہ ثواب کیا ہے، اسے نہ کسی آنکھ نے دیکھا ہے، نہ کسی کان نے سنا ہے اور نہ کسی کے دل میں اس کا خیال گزرا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ ثواب ان لوگوں کے لئے تیار رکھا ہے جو آخرت کی زندگی کو دنیا کی زندگی پر ترجیح دیتے ہیں، اسی پر راضی رہتے ہیں، اور اسی سے تسلیم پاتے ہیں اسی طرح کافر کو دنیا چھوڑنے پر جو تکلیف ہوتی ہے وہ اس عذاب سے جدا ہے جو اللہ تعالیٰ نے نافرمان بندوں کے لئے رکھ چھوڑا ہے، اس میں طرح طرح کے مصائب ہیں، زنجیریں ہیں، طوق ہیں، رسوائی اور ذلت کے سامان ہیں۔ ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ ہمیں بحالت اسلام موت دے، اور ہمیں صلوات کے ساتھ ملائے، اور اس دعا کی قبولیت کی رجاء اللہ تعالیٰ کی محبت حاصل کئے بغیر نہیں ہے، اور اللہ تعالیٰ کی محبت اس وقت تک حاصل نہیں ہوتی جب تک دل سے غیر اللہ کی محبت نہ نکل جائے، اور ان تمام علائق سے دل کا تعلق منقطع نہ ہو جائے جو اللہ کی محبت کے حصول میں حارج ہیں جیسے مال، جاہ، وطن وغیرہ ہمارے لئے بہتر یہ ہے کہ ہم اللہ رب العزت کے حضور وہ دعا کریں جو ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مانگی ہے۔

الَّتِي مِنَ الْمَاءِ الْبَارِدِ (تمضي - معاك)

کہو میں محبت عطا کرو اور اپنی محبت کو میرے لئے ٹھنڈے پانی سے زیادہ عطا

ہے گوشتوں سے دنیا کی محبت کا پانی ہے۔ سر کا پید عالم علی اللہ علیہ السلام شکر اللہ علیہ ہے۔

لَا يَمُوتُنَّ أَحَدُكُمْ وَالْأُخْرَىٰ يُحْسِنُ الظَّنَّ بِرَبِّهِ

تم میں سے جو شخص بھی مرے بعد اپنے رب سے حسن عمل رکھے

ایک حدیث قدسی میں لاری تعالیٰ کا یہ ارشاد منقول ہے: **ثُمَّ اَعْنَدُ ظَنِّي عَبْدِي عِيسَى عَلَيْهِ ظَنِّي مَا شَاءَ مِنْ اَمْرِ عِبَادِي**

مکمل کے مطابق ہوں وہ جو چاہے میرے پاس میں مکمل رہ سکے۔ حضرت سلیمان ایسی ہی کی روایات کا وقت قریب آیا تو انھوں نے اپنے

صاحبزادوں سے فرمایا کہ میرے سامنے رہیں بیان کرتے رہو اور جب تک میں نہ مر جاؤں رہا جاؤ گا اور کہے ہو کہ موت کے بعد میں

اپنے مولیٰ سے حسن من کے ساتھ ملاقات ہوئی اسی طرح حضرت سیدان موری کی وفات کا وقت فریب آیا اور ان کا سہراب بندہ کیا

بہت سے علماء ان کے پاس آئے اور ان سے رجاء ایمان کرنے کے سبب امام کو برکت ملی جس کے وقت آپ کا مبرا ہوا۔

وہاں سے لے کر آج تک ہرگز نہیں ملے۔

۹۶ فرمایا ان کے سامنے میرے احوالات اور احاطت بیان کہ

ظاہر یہ ہے کہ آدمی کی سعادت اسی میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت میں بہت سے کم کلمہ ہو اور جو کلمہ حق سے حاصل ہوگی

ہے محبت ہے، اور دل سے دنیا کی محبت نکالنے سے یہاں تک کہ دنیا نکالنے کے محبوب کے طور اس کے بعد اس کی محبت کی حیثیت

اختیار کر جائے، ایک بزرگ نے سلیمان و دارال کو خواب میں دکھا کہ اڑھ سو ہیں زوجہ وراثت کی اولیاء اس میں قید سے رہا ہوں۔

ائمہ کراموں نے سلیمان دارانی کے حلقہ دیہات کیا لوگوں نے مثلاً رات ابن کاغزل ہو گیا۔

خوف کی حالت حاصل کرنے کی تدبیر

جاننا چاہیے کہ صبر کے باب میں ہم نے صبر کی دعا اور اس کا اعلان جناباں دستور تحصیل سے پڑھ لیا ہے وہی علاج یہاں بھی

منہ پر ہوگا۔ اس لئے کہ میرا ہی دقت ممکن ہے جب سب سے خوف نواز رجاء ہو اس کی وجہ یہ ہے کہ دین کے مقلات میں سے پہلا مقام تقیہ

ہے جسکے معنی ہیں اللہ تعالیٰ پر ایمان آخرت پر یقین اور خیر و صلاح و نیکوئی پر عمل اس اعتقاد سے کہ وہی خدا ہے جو ہم نے پہلے سمجھا تھا۔

کی راہ پر حرکت میں آئی ہے اور یہ لوگوں سے مل کر قیامت کی ہے جس کے بعد ان کے ملک کی حالت سبکیں اور صاحب ہیں ان کے

[illegible]

نئے تعمیر میں ہے۔ انیسویں صدی کے شروع میں یہاں ایک مسلمان آباد تھا جس کا نام مولانا محمد علی تھا۔

[illegible]

کا درجہ ہے اور محنت کے پورے رضاء و کمال اور فخر و عظمت اور ہر دین کے راستے پر چلنے میں مثال کی کہ ہر تہیب سے سب سے پہلے یقین

سے اُنکے بعد خوف و رام ہے۔ خوف و رام کے بعد صبر کا درجہ ہے اور صبر کے بعد ہمتی اور اللہ کے لئے فدا ہری وہاںشی طور پر تجو

کا مقام ہے، مجاہدے کے بعد اگر کسی کے لئے راستہ واضح نہ کیا جاتا ہے تو ہدایت اور معرفت ہے، اور معرفت کے بعد انس و محبت کا درجہ

ہے محبت کا قضا و رضا ہے، رضا کے معنی ہیں محبوب کے فعل پر راضی رہنا، اسکی محبت پر اعتماد کرنا اور توکل کرنا۔

خوف کی دو صورتیں : اس تفصیل کا حاصل یہ ہے کہ مبرک کے علاج میں جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے وہ یہاں خوف کے علاج کے لئے بھی کافی ہے، اور اس سلسلے میں مزید کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تاہم خوف کا علاج ہم الگ مختصر طور پر ذکر کرتے ہیں۔ اصل میں خوف کی دو صورتیں ہیں، ان میں سے ایک وہ سری کے بہ نسبت افضل ہے۔ ان دونوں صورتوں کی ایک مثال دی جاتی ہے۔ فرض کیجئے ایک بچہ کسی مکان میں موجود ہے، اچانک اس مکان میں کوئی درندہ یا سانپ وغیرہ کھس آتا ہے، ہو سکتا ہے وہ بچہ اس درندے یا سانپ سے محظوظ نہ ہو، بلکہ اسے بڑھنے کی کوشش کرے، اور اس مقصد کے لئے ہاتھ بڑھائے، لیکن اگر اس کے ساتھ اس کا باپ بھی ہو اور قتل وغیرہ سے محروم نہ ہو اور سانپ کو دیکھ کر ڈرے یا بھاگنے کی کوشش کرے تو بچہ بھی اسکی تقلید میں بھاگے گا، اور باپ کو دیکھ اس پر بھی خوف چھانے گا، اب دیکھئے یہاں ایک خوف باپ کا ہے، اور ایک بچے کا۔ سانپ کی خاصیت سے واقف ہے، اور اسکے ذہن کے اثرات کا علم رکھتا ہے، اسے یہ بھی معلوم ہے کہ درندہ اچانک کر حملہ کرتا ہے، اور اپنے شکار کو بے رحمی سے ہلاک کرتا ہے، ایک خوف بچے کا ہے، اسے سانپ یا درندے کا کوئی ظم نہیں، نہ وہ یہ جانتا ہے کہ سانپ زہریلا ہے، نہ وہ یہ جانتا ہے کہ درندہ چیرھاڑ کر ہلاک کر دیتا ہے، وہ صرف باپ کی حرکات و سکنات پر نظر رکھتا ہے، اور جس طرح باپ ڈر کر بھاگتا ہے اسی طرح وہ بھی بھاگنے کی کوشش کرتا ہے، اور سانپ یا درندے سے ڈرنے لگتا ہے، لیکن سانپ اور درندہ خطرناک ہیں اسے اس کی وجہ معلوم نہیں ہوتی، اس مثال کے بعد یہ بات جان لینی چاہیے کہ جس طرح اس خوف کی دو صورتیں ہیں اسی طرح باری تعالیٰ سے خوف کی بھی دو صورتیں ہیں، ایک اس کے عذاب کا خوف اور دوسرا اسکی ذات سے خوف۔ وہ سری قسم کا خوف ان لوگوں کو ہوتا ہے جو اہل علم ہیں، ارباب قلوب ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی ان صفات سے واقف ہیں جو بہت عظیم و بزرگ ہیں، اور اللہ تعالیٰ کے ان ارشادات کے راز پر مطلع ہیں :-

وَيُخَوِّضُكُمْ فِي الْمَوَاطِنِ (پ ۳۳ آیت ۲۸) اِنْفِذُوا اللّٰهَ سَخِّ تَقَاتُوا رِبِّكُمْ (پ ۲ آیت ۱۲)

اور اللہ تعالیٰ تم کو اپنی ذات سے ڈراتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے ڈرا کرو (جو لازم ہے کا حق ہے۔

اور پہلی قسم کا خوف عام خلق کو ہوتا ہے، یہ اسلئے ہوتا ہے کہ وہ جنت اور دوزخ پر ایمان لاتے ہیں اور یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ مطاعت کا صلہ جنت ہے اور معصیت کی سزا جہنم ہے، عام خلق میں یہ خوف غفلت کے باعث، اور ایمان کی کمزوری کی بناء پر اتنا قوی نہیں ہوتا جتنا ہونا چاہیے، اگر کوئی شخص دعوہ و نصیحت سنتا ہے، اور قیامت کے ہولناک مظاہر کا تصور کرتا ہے، اور آخرت کے مختلف مذاہب کے بارے میں سوچتا ہے تو یہ غفلت ختم بھی ہو جاتی ہے، بلکہ اس غفلت کے خاتمے کے لئے خائفین کو دیکھنا ان کے پاس بیٹھنا، اور ان کے احوال کا مشاہدہ کرنا بھی نہایت مفید ہے، بلکہ اگر مشاہدہ نہ ہو تو صرف سنتا بھی مؤثر ہے، وہ سری قسم کا خوف اعلا ہے، اس خوف کے معنی یہ ہیں کہ اس سے دوری اور حجاب سے ڈرا جائے، اور قرب کی رجاء کی جائے۔ حضرت ذوالنون مصری فرماتے ہیں کہ دوزخ کے خوف کے مقابلے میں باری تعالیٰ کی جدائی کا خوف ایسا ہے جیسے سمندر کے مقابلے میں پانی کا قطروہ، لیکن عام لوگوں کو یہ خوف نہیں ہوتا، بلکہ یہ خوف صرف علماء کے ساتھ مخصوص ہے :-

اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ الْعِبَادُ الْعُلَمَاءُ (پ ۳۲ آیت ۲۸)

اللہ تعالیٰ سے اسکے بندوں میں صرف علماء ڈرتے ہیں۔

اس خشیت کا کچھ حصہ عام مومنین کو بھی میسر ہے، لیکن علم اور تجربے کی راہ سے نہیں، بلکہ محض تقلید سے، جیسے بچہ اپنے باپ کی تقلید میں سانپ سے ڈرتا ہے، اس کا تعلق بصیرت سے نہیں ہوتا، اس لئے یہ خوف ضعیف بھی ہوتا ہے، اور بہت جلد اسکے اثرات زائل بھی ہو جاتے ہیں، بچہ جس طرح باپ کی تقلید میں خوف زدہ ہوتا ہے اسی طرح اسکی تقلید میں جری بھی ہو جاتا ہے، مثال کے طور پر کسی بچے کا باپ پیڑا ہے اور وہ اکثر و بیشتر سانپ پکڑتا ہے، اور انھیں ہاتھ پر لپیٹتا ہے، یا گلے میں لٹکاتا ہے تو باپ کی دیکھا دیکھی وہ بھی ایسا ہی کرنے لگتا ہے، اسے یہ خوف نہیں ہوتا کہ یہ سانپ اسے ہلاک کر دے گا۔ اکثر و بیشتر تقلیدی عقائد ضعیف ہوتے ہیں، آلا یہ کہ ان کے

اسباب کا مستقل طور پر مشاہدہ ہوتا ہے، اور ان اسباب کے مطابق طاعت پر اقدام اور معصیت سے اجتناب رہے اور مدت دراز ہونے تک اس پر مواظبت ہو تو یہ عقائد پختہ اور راسخ ہو جاتے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ جو لوگ اوج معرفت پر ہیں، اور اللہ تعالیٰ کو پہچانتے ہیں وہ ہر حال میں خوف کرتے ہیں، ان کے لئے علاج کی ضرورت نہیں ہے، جب کوئی مرض ہی نہیں ہے تو علاج کیا ہوگا، جیسے کوئی شخص درندے سے ڈرتا ہو، اور چشم تصور سے اپنے جسم کو اس کے بچوں میں گرفتار دیکھ کر مضطرب ہو اسے حصول خوف کے لئے کسی اور سبب کی کیا ضرورت ہے، وہ تو ہر حال میں خوف زدہ ہوگا، خواہ خوف کا ارادہ کرے یا نہ کرے، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام پر وحی بھیجی کہ مجھ سے ایسا ڈر جس طرح خو خوار درندے سے ڈرا جاتا ہے، کسی خو خوار درندے سے ڈرنے کے لئے اس کے علاوہ کسی تہیہ یا خلیے کی ضرورت نہیں ہے، کہ درندگی کی خصلت سے واقف ہو، اور اس کے بچوں میں گرفتار ہو کر ہلاکت کا یقین رکھتا ہو، اگر کسی کو یہ دونوں باتیں معلوم ہوں تو پھر اسے خوف کے لئے کسی خارجی سبب یعنی لوگوں کے سمجھانے وغیرہ کی ضرورت نہیں ہے، وہ خود اس سے ڈرے گا اور اسے دیکھ کر راہ فرار اختیار کرے گا۔ اس طرح جو شخص اللہ تعالیٰ کو پہچانتا ہے اور یہ بات جانتا ہے کہ وہ جو چاہے کر سکتا ہے، اسے کوئی روکنے والا نہیں ہے، وہ جو چاہتا ہے فیصلہ کرتا ہے کسی سے ڈرتا نہیں، اس نے بلا کسی وسیلہ سابق کے ملا، کہ کو مقرب بنایا، اور بلا کسی قصور سبق کے شیطان کو مودود ٹھہرایا ہے، اس کا وصف تو یہ ہے :-

هُوَ لَا يَغْنَى الْجَنَّةَ وَلَا الْبَالِيَّ وَهُوَ لَا يَغْنَى النَّارَ وَلَا الْبَالِيَّ

یہ لوگ جنت میں ہیں کہ مجھے اسکی پیدا نہیں، اور یہ لوگ دوزخ میں ہیں مجھے اس کی پیدا نہیں۔

عذاب و ثواب اطاعت و معصیت پر موقوف نہیں

تمہارے ذہن میں یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ صرف معصیت پر سزا دیتا ہے، اور صرف اطاعت پر جزاء سے نوازتا ہے، چنانچہ وہ جسے جزا دینا چاہتا ہے اسکی اطاعت کے اسباب سے اعانت کرتا ہے، پھر وہ چاہے نہ چاہے اس سے وہی اعمال سرزد ہوتے ہیں جنہیں اطاعت کہا جاتا ہے اور جن سے معصیت کا ارتکاب منظور ہوتا ہے انہیں معصیت کے اسباب فراہم کرتا ہے، پھر وہ چاہیں یا نہ چاہیں ان سے وہی اعمال سرزد ہوتے ہیں جن پر معصیت کا اطلاق ہوتا ہے، اسی لئے اللہ تعالیٰ بغیر اطاعت کے سزا نہیں دیتا، اور بغیر معصیت کے عذاب نہیں دیتا۔ جب اطاعت و معصیت کے اسباب مہیا ہوتے ہیں تو بندہ کو طوعاً و کرہاً وہ عمل کرنا ہی پڑتا ہے جو اسکی قسمت میں لکھ دیا گیا ہے، اور جب وہ عمل ظہور میں آتا ہے، تو اس کے مطابق جزاء یا سزا بھی پڑتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ جزاء و سزا اطاعت و معصیت پر ہے، لیکن ہم یہ کہتے ہیں کہ بندہ کو گناہ پر قدرت کسی سبب سے دی جاتی ہے، اگر یہ کہا جائے کہ سابقہ معصیت کی بناء پر، تو ہم یہ کہیں گے کہ اگر کسی شخص سے پہلی مرتبہ کوئی گناہ سرزد ہو تو اس کا سبب کیا ہوتا ہے، ظاہر ہے اس کے جواب میں یہی کہا جائے گا کہ انزل سے ہی اس کی قسمت میں یہ لکھا ہوا تھا، اس لئے اس سے وہ گناہ سرزد ہوا، یہی بات سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں بیان فرمائی ہے کہ ایک مرتبہ حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے درمیان باری تعالیٰ کے سامنے گفتگو ہوئی، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت آدم علیہ السلام سے دریافت کیا کہ کیا آپ وہی آدم ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھ سے پیدا فرمایا اور جن میں اپنی روح ڈالی، پھر جنہیں فرشتوں سے سجدہ کرایا اور اپنی جنت میں ٹھہرایا پھر آپ کے قصور کے باعث زمین پر اتار دیا گیا، حضرت آدم علیہ السلام نے جواب دیا کہ کیا تم وہی موسیٰ ہو جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی رسالت اور کلام کے لئے منتخب فرمایا، اور جسے تختیاں صطا کی گئیں جن میں ہر چیز کا بیان تھا، اور جسے سرگوشی کے لئے قریب کیا؟ ذرا یہ بتاؤ کہ اللہ تعالیٰ نے میری تخلیق سے کتنی مدت پہلے تورات ایجاد فرمائی، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا چالیس برس پہلے، حضرت آدم علیہ السلام نے دریافت کیا تمہیں اس میں یہ آیت بھی ملی ہے، و عصی آدم بعفغوی، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا جی ہاں! اس میں یہ آیت موجود ہے، حضرت آدم علیہ السلام نے فرمایا کیا تم مجھے ایسے عمل پر ملامت کرتے ہو جو اللہ تعالیٰ نے میری تخلیق سے چالیس برس پہلے مجھ پر لکھ دیا

تھا، سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اس تقریر سے حضرت آدم علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام پر غالب آگئے (مسلم ابو ہریرہ) یہ ہے ثواب و عذاب کا سبب جو شخص نورِ ہدایت سے اس سبب پر مطلع ہوگا اس کا شمار اللہ تعالیٰ کی خاص معرفت رکھنے والوں میں ہوگا، یہ لوگ تقدیر کے راز سے واقف ہوتے ہیں، اور جو لوگ سختی ہی ایمان لے آتے ہیں، اور یقین کر لیتے ہیں وہ عام مومنین کے دائرے میں ہیں، ان دونوں فریقوں میں سے ہر ایک کے لئے خوف ہے، اگرچہ دونوں کے خوف میں وہ فرق ہے جو درندے اور بچے کی مثال میں واضح کیا گیا ہے۔

قبضہ قدرت میں انسان کی حیثیت : ہر انسان قبضہ قدرت میں ایسا ہے جیسے کوئی کمزور بچہ درندے کے پنجوں میں پھنس جائے، درندہ بھی تو اتفاق سے غافل ہوتا ہے، اور اسے آزاد کر دیتا ہے، اور کبھی حملہ آور ہوتا ہے، اور جرح بھاڑ کھلاک کر دیتا ہے، یہ دونوں صورتیں حسب اتفاق ہوتی ہیں، لیکن ان اتفاقات کے لئے مرتب اور معلوم اسباب ہیں، اس لئے جسے عام آدمی اتفاق کہتا ہے اسے وہ لوگ تقدیر قرار دیتے ہیں، جو ہر معاملے کو قطعاً ثانی کے پس منظر میں دیکھتے ہیں، پھر درندے کے پنجوں میں گرفتار شخص اگر معرفت میں کامل ہے، اور وہ ہر شئی کو تقدیرِ الہی سے مربوط سمجھتا ہے تو اس گرفتاری سے خائف نہیں ہوگا، اور نہ درندے سے ڈرے گا، اس لئے کہ وہ یہ بات جانتا ہے کہ درندہ اللہ کے لئے مسخر ہے، اگر اس پر بھوک مسلط کی گئی تو وہ شکار کرے گا، اور غفلت مسلط کی گئی تو چھوڑ دے گا، بلکہ ایسا شخص درندے اور اس کی صفتِ سبعیت کے خالق سے ڈرتا ہے، اس لئے ہم یہ نہیں کہتے کہ اللہ تعالیٰ سے خوف کی مثال ایسی ہی جیسے درندے سے ڈرنا، بلکہ اگر دیکھا جائے تو درندے سے ڈرنا بعینہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنا ہے، اس لئے کہ درندے کے ذریعے ہلاک کرنے والا وہی ہے۔

اس تفصیل کے بعد یہ بات جان لینی چاہیے کہ آخرت کے درندے دنیا کے درندوں کی طرح ہیں اور یہ کہ اللہ تعالیٰ نے عذاب کے اسباب بھی پیدا فرمائے ہیں، اور ثواب کے اسباب بھی پیدا فرمائے ہیں، جو جس چیز کا اہل ہے وہ تقدیرِ الہی کے ذریعے اسی کی سمت کھینچا جاتا ہے، چنانچہ جنت پیدا فرمائی، اور اسکے اہل پیدا فرمائے جو اسبابِ جنت کے لئے مسخر ہیں خواہ وہ چاہیں یا نہ چاہیں، اسی طرح اس نے دوزخ پیدا کی اور اس کے اہل پیدا کئے جو اسبابِ جہنم کے لئے مسخر ہیں خواہ وہ اس پر راضی ہوں یا نہ ہوں۔ معرفت رکھنے والا شخص ہی تقدیر کے اسرار پر مطلع ہو سکتا ہے، اور وہی شخص حقیقی معنی میں خائف کھلا سکتا ہے جو اپنے آپ کو قصاصِ قدرت کے سمندر میں ایک حقیر ذرہ سمجھتا ہو جسے تیز و تند موجیں کبھی ادھر پہنچا دیتی ہیں کبھی ادھر۔ ہر حال جو لوگ عارف ہیں انھیں خوف کا راستہ بتلانے کی ضرورت نہیں ہے، البتہ جو لوگ بصیرت کے مرتبے پر نہیں ہیں اور معرفت کے کمال سے محروم ہیں انھیں واقعی علاج کی ضرورت ہے۔ اور اس کی صورت یہ ہے کہ وہ اخبار و آثار سنیں، خائنین اور عارفین کے احوال کا علم حاصل کریں، اور ان لوگوں کا ان مغرور اور خود پسند لوگوں سے احتیاط کریں جو رجاء کے گھوڑے پر سوار ہیں، اگر اس نے موازنہ کیا تو نتیجہ اسکے علاوہ کچھ نہ نکلے گا کہ پہلے فرقے کی اقتداء ہر حال میں مناسب ہے اس لئے کہ اس گروہ میں انبیاء اولیاء اور علماء ہیں، اور دوسرے گروہ میں فراعنہ، جملاء اور خرماء لوگ ہیں۔

ایسے لوگوں کو سوچنا چاہیے کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اولین و آخرین کے سردار ہونے کے باوجود تمام لوگوں میں اللہ تعالیٰ کے زیادہ ڈرنے والے تھے۔ (۱) روایت ہے کہ ایک مرتبہ آپ کسی بچے کی نماز جنازہ پڑھا رہے تھے کہ کسی شخص کو یہ کہتے سنا ”اللَّهُمَّ قِهِ عَذَابَ الْقَبْرِ وَعَذَابَ النَّارِ“ (اے اللہ اس بچے کو عذابِ قبر اور دوزخ سے بچائیے) ایک روایت میں ہے کہ آپ نے کسی کو یہ الفاظ کہتے ہوئے سنا ”هَنِيئًا لَكَ عَصْفُورٌ مِنْ عَصَا فَيْزِ الْجَنَّةِ“ (مبارک ہو تجھے تو جنت کی چڑیوں میں سے ایک چڑیا ہے) آپ یہ سن کر خفا ہو گئے، اور کہنے والے سے فرمایا تو کیا جانے یہ ایسا ہی ہے بخدا میں اللہ کا رسول ہوں، لیکن مجھے نہیں معلوم کہ میرے ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا، اللہ تعالیٰ نے جنت پیدا فرمائی ہے، پھر اس کے لئے اہل پیدا فرمائے ہیں، جن کی تعداد میں نہ زیادتی ہوگی اور نہ کمی (۲) حضرت عثمان ابن مظعون ان صحابہ میں میں تھے جنہوں نے سب سے پہلے ہجرت فرمائی، روایت ہے کہ

(۱) یہ روایت پہلے بھی گزر چکی ہے (۲) اس میں پہلا جملہ طبرانی واسطی میں حضرت انس سے موسیٰ سے اور دوسرا جملہ حضرت عائشہ سے۔

جب ابن جلیل القدر صحابی کی وفات ہوئی اور حضرت ام سلمہؓ نے ان کے جنازے پر یہ فرمایا ”هَنِيئًا لَكَ الْجَنَّةُ“ (تجہ جنت مبارک ہو) اس پر سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ناراضگی کا اظہار فرمایا اور وہی بات ارشاد فرمائی جو اس سے پہلے روایت میں گزر چکی ہے اس واقعے کے بعد حضرت ام سلمہؓ فرمایا کرتی تھیں کہ حنن کے بعد میں کسی کو پاک نہ کہوں گی (یعنی اسکے بارے میں کوئی ایسی بات نہ کہوں گی جس قطعیت کے ساتھ اسکے لئے جنت ثابت ہو) بخاری۔ (ابو اسحاق)۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے صاحبزادے محمد ابن خولہ الحنفیہ فرماتے ہیں کہ بخدا میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی کو پاک نہیں کہتا نہ اپنے باپ کو جن سے میں پیدا ہوا ہوں، راوی کہتے ہیں کہ جب اس بچے کی وجہ سے شیعوں نے ابن جلیل کی تو انھوں نے حضرت علیؓ کے منقب بیان کرنے شروع کر دیے۔ ایک روایت میں ابی صہبہ سے ایک گامال مذکور ہے کہ جب انھوں نے شہادت پائی تو ان کی والدہ نے گناہ مبارک ہو تو جنت کی چیزوں میں سے ایک چیز ہے تو نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں شہید ہوا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی والدہ سے فرمایا تجھے کیا معلوم ہو سکتا ہے یہ شخص غیر مفید نکلتا ہو اور جو چیز اسکے لئے معجزہ ہو وہ نہ دیا کرتا ہو (یعنی ترقی۔ الن۔ باختلاف تفسیر ایک اور حدیث میں ہے کہ ایک مرتبہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے کسی صحابی کے پاس تشریف لے گئے جو بیمار تھے آپ نے ایک عورت کو یہ کہتے ہوئے سنا ”تجہ جنت مبارک ہو“ آپ نے دریافت فرمایا یہ کون عورت ہے جو خدا پر حکم چلاتی ہے؟ مریض نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایہ میری والدہ ماجدہ ہیں آپ نے ارشاد فرمایا تجھے کیا معلوم شاید فلاں شخص لایق کلام کرتا ہو اور ایسی چیز میں بخل کرتا ہو جسے اپنے پاس رکھنے سے مالدار نہ ہوتا۔ (۱)

خوف کا ثبوت قرآن و حدیث سے

مومنوں کو تو ہر حال میں خوف کرنا چاہیے کیا انھوں نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد مبارک نہیں سنا نہ
 شَيْبَتُنِي هُوَ وَاخْوَانُهُ اسْوَرُ قُلُوبَهُمْ وَاذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ وَنَسَاءُ لَوْنٍ (تندہ)
 ابن عباسؓ

مجھے ہود اور اسکی بہنوں سورۃ اقصیٰ سورۃ کوثر اور سورۃ نجم۔ تسالون نے پوچھا کہ کیا ہے۔

طالع کرام کہتے ہیں کہ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ سورۃ ہود میں دھکار نے اور دود کرنے کے مضامین زیادہ وارد ہوئے ہیں جیسے نہ

الْأَبْعَادُ الْعَادِيَةُ قَوْمٌ هُوْدٌ (پ ۵۴ آیت ۳)

خوب سن اور رحمت سے دوری ہوئی ماد کو جو کہ ہودی قوم تھی

الْأَبْعَادُ الشُّمُودُ (پ ۵۴ آیت ۶۸)

خوب سن اور رحمت سے شمو کو دوری ہوئی۔

الْأَبْعَادُ الْمَنِيْنُ كَمَا بَعْدَتْ شُمُودُ (پ ۵۴ آیت ۹۵)

خوب سن لو کہ دین کو رحمت سے دوری ہوئی جیسا کہ شمو رحمت سے دور ہوئے تھے۔

آپ ان مضامین سے بہت زیادہ متاثر ہوئے، حالانکہ آپ کو معلوم تھا کہ اللہ تعالیٰ چاہتا تو یہ قومیں شرک نہ کرتیں اسلئے کہ ان

سب کو راستے پر چلانا اسکے لئے آسان تھا۔ سورۃ اقصیٰ میں یہ مضمون بیان کیا گیا ہے نہ

لَيْسَ لَوْ قَعَتْهَا كَاذِبَةً ضَلَّتْ رَايَةً (پ ۵۴ آیت ۲۳-۲۴)

جس کے واقع ہونے میں کوئی خلاف نہیں ہے وہ (بعض کو) پست کر دے گی (اور بعض کو) بلند کر دے گی۔

یعنی جو کچھ اللہ نے لکھ دیا ہے وہ ہو کر رہے گا اسے کوئی جھٹلانے والا نہیں ہے یہ واقعہ قیامت ہے جو ہر حال میں ظہور پذیر ہوگا

پھر قیامت یا تو ان لوگوں کو پست کرنے والی ہوگی جو دنیا میں بہت اونچے تھے یا ان لوگوں کو اوپر اٹھانے والی ہوگی جو دنیا میں پست تھے

تم حشامہاں میں بھی کچھ اسی طرح کا مضمون دیا ہے ۔

جس دن ہر شخص ان اعمال کو دیکھے گا جو اس نے اپنے ہاتھوں سے کیے ہوں گے

(اس روز) کوئی نہ بھل سکے گا۔ مجھ اس کے جس کور ممکن (بولنے کی) اجازت دیدے، اور وہ مفصل بات بھی کہے۔

فَبِمَا نَفَعْنَا لَعِقْفَارٍ لِّمَنِ نَأْتِي وَآمَنَ وَاعْمَلْ صَالِحًا إِنَّمَا يُنذِرُكَ (پہر ۱۳ آیت ۸۷)

مجلس

فَأَمَّا مَنْ تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَعَسَىٰ أَنْ يَكُونَ مِنَ الْمُفْلِحِينَ (پ ۲۰، آیت ۶۷)

پانے والوں میں سے ہوں گے۔

لِيَسْئَلَ الصَّادِقِينَ عَنْ صَلَاتِهِمْ (پاک آیت ۸)

سَفَرُ غُلَكْبِيَّتِهَا الشَّقْلَانِ (پہ ۲۲، ۳۱ امت ۲)

اقاموا مكر الله (پارہ ۲ آیت ۹)

وَكُلِّمْنَا خَنْزِيرًا أَخَذْتُمُونَا فَظَاهِمَةٌ لَكُمْ فِي ظِلْمٍ (پ ۹۳ آیت ۱۲)

جواب اسکی پکڑی ہوئی الم رساں اور سخت ہے

یَوْمَ نَخْسِرُ الْمُتَّقِينَ إِلَى الرَّحْمَنِ وَفَلَّوْا نَسُوقُ الْمُجْرِمِينَ إِلَى جَهَنَّمَ وَرِثَافًا ۝

جس روزہ متعین کو رخصت کی طرف ممانعہ کر جمع کریں گے اور ہجر میں کو دلہن کی طرف (یاسا) ہائیں

وَأَنْ مِنْكُمْ إِلَّا وَارِدُهَا كَانَ عَلَىٰ ذَنْبِكُمْ حَتْمًا مَقْضِيًّا (پ ۸۸ آیت ۷۷)

اور تم میں سے کوئی بھی نہیں جس کا اس (دلہن) پر سے گزرنہ ہو یہ آپ کے رب کی طرف سے ضروری ہے جو پورا ہو کر رہے گا۔

اعْمَلُوا مَا شِئْتُمْ إِنَّا جَمَعْنَا لَكُمُ الْيَوْمَ الْأَخِيرَ (پ ۲۲۳ آیت ۴۰)

جوئی چاہے کر لوہ تمہارا سب کیا ہوا دیکھ رہا ہے۔

مَنْ كَانَ يَرْجُوا لِقَاءَ اللَّهِ فَإِنْ أَجَّرَ قَوْمًا فَلَهُ فِي حَرْبِهِمْ مِمَّنْ كَانَ يَرْجُوا لِقَاءَ اللَّهِ أَتَيْنَهُ مِنْهَا وَمَا لَهُ فِي الْأَجْرِ مِنْ فَتْرٍ (پ ۲۲۵ آیت ۲)

جو شخص آخرت کی کھیتی کا طالب ہو ہم اس کو اس کھیتی میں ترقی دیں گے اور جو دنیا کی کھیتی کا طالب ہو تو ہم اس کو دنیا دے دیں گے اور آخرت میں اس کا کچھ حصہ نہیں۔

فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ (پ ۲۲۳ آیت ۷۷)

سو جو شخص دنیا میں ذرہ برابر نیکی کرے گا وہ (وہاں) اس کو دیکھ لے گا اور جو شخص ذرہ برابر بدی کرے گا وہ اس کو دیکھ لے گا۔

وَقُلْنَا لِلَّذِينَ آمَنُوا عَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَعَلَّكُمْ تَخْشَوْنَ (پ ۲۲۳ آیت ۷۷)

اور ہم ان (کفار) کے اعمال کی طرف متوجہ ہوں گے سو ان کو ایمان بکار کر دیں گے جیسے پریشان غبار۔

وَالْعَصْرِ إِنَّ الْإِنْسَانَ لِرَبِّهِ لَكَنُفٍ (پ ۲۲۳ آیت ۷۷)

نہم ہے نہانے کی انسان بدے خسارے میں ہے۔ مگر جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اچھے کام کئے اور ایک دوسرے کو اعتقاد حق کی نمائش کرتے رہے اور ایک دوسرے کو پابندی کی نمائش کرتے رہے۔

اس سورت میں خسران سے بچنے کے لئے چار شرطیں بیان کی گئی ہیں "انبیاء علیہم السلام بھی اللہ تعالیٰ کے مکر سے بے خوف نہ تھے" اسلئے وہ بھی انعام و احسان کے باوجود اس سے ڈرتے تھے اس لئے کہ وہ اس حقیقت سے واقف تھے :-

فَلَا يَأْمُرُ الْمُكَرَّ إِلَّا الْقَوْمُ الْخَاسِرُونَ (پ ۲۲۳ آیت ۷۷)

سو خدا تعالیٰ کی پکڑ سے سوائے ان کے جو خسار پانے والے ہوں کوئی محفوظ نہیں رہتا۔

ایک روایت میں ہے سرکارِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت جبریل علیہ السلام دونوں اللہ کے خوف سے روئے اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کے پاس وحی بھیجی کہ تم کیوں روئے ہو میں نے تمہیں اپنے خوف سے مامون کر دیا دونوں نے عرض کیا کہ یا اللہ! حیرے مکر سے بے خوف کون ہو سکتا ہے؟ (ابن شاہین۔ عز) ان دونوں کو یہ بات معلوم تھی کہ اللہ تعالیٰ علام الغیوب ہے اور وہ اپنے انجام سے واقف نہیں ہیں اسلئے وہ اس بات سے بے خوف نہیں رہ سکتے کہ کہیں اللہ کا یہ قول کہ میں نے تمہیں اپنے خوف سے مامون کر دیا محض اظہار اور آزمائش کے لئے نہ ہو یہاں تک کہ جب وہ پرسکون ہو جائیں اور اللہ تعالیٰ کی پکڑ کا خوف باقی نہ رہے تب ان سے یہ دریافت کیا جائے کہ تم نے اپنا قول کیوں نہیں نبھایا چنانچہ جب حضرت امیر ایم علیہ السلام کو نمود نے یمن میں رکھ دیا تو انہوں نے فرمایا "حَسْبِيَ اللَّهُ" (اللہ میرے لئے کافی ہے) یہ ایک بہت بڑا دعویٰ تھا اس لئے ان کا احسان لیا گیا اور حضرت جبریل علیہ السلام کو ان کے پاس بھیجا گیا وہاں جا کر انہوں نے دریافت کیا کہ آپ کو میری ضرورت تو نہیں انہوں نے جواب دیا نہیں تمہاری کوئی ضرورت نہیں

ہے یہ جواب واقعہ ان کے اس دعویٰ کی صداقت کا ثبوت تھا جو انہوں نے کیا تھا کہ میری لئے میرا اللہ کافی ہے اس واقعے کو اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے :-

وَرَبُّكَ الْغَنِيُّ الَّذِي يَدْفَعُ رِبَّكَ ۖ رِبُّكَ ۖ آیت ۳۷

اور ہمارے رب نے انہیں اپنی پوری بجا آوری کی۔

اسی طرح کا ایک واقعہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مذکور ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جناب الہی میں عرض کیا۔

إِنِّي أَخَافُ أَنْ يُغْفِرَ طَعْنِي أَوْ أَنْ يَنْظُرَ قَالِ لَا تَخَافُ إِنِّي مَعَكُمْ أَسْمَعُ وَلَوْ رَى (پ ۱۸ آیت ۳۵)

اے ہمارے پروردگار ہمیں یہ اندیشہ ہے کہ وہ ہم پر زیادتی (نہ) کر بیٹھے یا یہ کہ زیادہ شرارت نہ کرنے لگے ارشاد ہوا کہ تم اندیشہ نہ کرو میں تم دونوں کے ساتھ ہوں سب سنتا ہوں دیکھتا ہوں۔

یہ اطمینان دلانے کے باوجود تم دونوں کے ساتھ ہوں اور تمہیں دیکھ رہا ہوں اور تمہاری باتیں سن رہا ہوں جب جاؤ گروں نے اپنے جاؤ کا مظاہرہ کیا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام ڈر گئے اس لئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی پکڑ سے بے خوف نہیں تھے اور ان پر بے غوثی کا معاملہ مشتبہ ہو گیا تھا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں سے سرے سے اطمینان دلایا :-

لَا تَخَفُ أَنْتَ أَغْلَى (پ ۱۸ آیت ۶۸)

تم ڈرو نہیں تم ہی غالب رہو گے

جب بدر کے دن مسلمانوں کے پاؤں اکٹڑ گئے اور ان کی شوکت کمزور پڑ گئی تو رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا فرمائی کہ اے اللہ! اگر تو نے یہ جماعت ہلاک کر دی تو دئے زمین پر کوئی شخص میری عبادت کرنے والا باقی نہیں رہے گا یہ دعا سن کر حضرت ابو بکر نے ارشاد فرمایا یہ دعا چھوڑے اللہ تعالیٰ وہ وعدہ ضرور پورا کرے گا جو اس نے آپ سے کیا ہے (بخاری۔ ابن عباس) اس واقعے میں حضرت ابو بکر کا مقام یہ ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے وعدہ پر اکتفا کیا اور سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام یہ ہے کہ آپ اس کے کمرے بے خوف نہیں ہوئے یہ بڑا اعلا اور مکمل مقام ہے اس مقام پر وہی لوگ فائز ہوتے ہیں جنہیں اسرار الہی اس کے عقلی افعال اور صفات کے رموز کی معرفت حاصل ہوتی ہے ان صفات میں بعض سے کچھ افعال صادر ہوتے ہیں انہیں مکر کہا جاتا ہے اللہ تعالیٰ کی صفات کی حقیقت پر مطلع ہونا کسی عام انسان کے بس کی بات نہیں ہے جو شخص معرفت کی حقیقت سمجھتا ہے اور یہ بھی جانتا ہے کہ میری معرفت حقائق امور کے اور اس کے قاصر ہے اس کا خوف لا محالہ زیادہ ہوتا ہے اسی لئے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام سے یہ سوال کیا گیا :-

أَأَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُونِي وَأَقْبِلِي الْهَيْبِينَ مِنْ ذُنُوبِ اللَّهِ (پ ۶ آیت ۶۸)

کیا تم نے ان لوگوں سے کہہ دیا تھا کہ مجھ کو اور میری ماں کو بھی خدا کے علاوہ معبود قرار دے لو۔

انہوں نے جواب میں فرمایا :-

إِنْ كُنْتُ قُلْتُ فَقَدْ عَلِمْتُمْ تَعْلَمُونَ مَا فِي نَفْسِي وَلَا أَعْلَمُ مَا فِي نَفْسِكَ (پ ۶ آیت ۶۸)

اگر میں نے یہ کہا ہو گا تو آپ کو اس کا علم ہو گا آپ تو میرے دل کے اندر کی بات بھی جانتے ہیں اور میں آپ کے علم میں جو کچھ ہے اس کو نہیں جانتا۔

آخر میں ارشاد فرمایا :-

إِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَإِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَإِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَإِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ (پ ۶ آیت ۶۸)

اگر آپ ان کو سزا دیں تو یہ آپ کے بندے ہیں اور اگر آپ ان کو معاف کر دیں تو آپ زہد و حکمت

والے ہیں۔

ایک جگہ مارٹن فرمایا۔

ان کے رب کا مذاہب خوف ہونے کے لئے نہیں ہے۔

عارفین کو سوء خاتمہ کا خوف

ان تمام آیات و روایات کو سننے کے بعد کوئی مدون جاہل ہی ایسا ہو سکتا ہے جو بے خوف و ہراس ہو۔ مگر خدا تعالیٰ کا احسان عظیم ہے کہ ان کے قلوب کو رجاہ کے نرم جموگوں سے تازہ رکھتی ہے، اگر ایسا نہ ہوتا تو خوف کی آگ سے ان کے دل جلتے، جس طرح خواص کے لئے رجاہ کے اسباب رحمت ہیں اسی طرح عوام الناس کے لئے غفلت کے اسباب رحمت کا باعث ہیں، اس لئے کہ اگر عام لوگوں پر حقیقت حال منکشف ہو جائے تو مدح جسم کا ساتھ چھوڑ دے، اور مقلب القلوب کے خوف سے دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے ایک بزرگ کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص پچاس برس تک توحید کے ساتھ معروف رہے، اور پھر ایک ستون کی آڑ میں مر جائے تو میں اسکی

توحید پر یقین نہ کروں۔ اس لئے کہ مجھے کیا معلوم اس وقفے میں اسکے قلب کے اندر کیا تبدیلی آئی۔ ایک بزرگ کہتے ہیں کہ اگر گھر کے دروازے پر مجھے شہادت ملے اور کمرے کے دروازے پر اسلام کی حالت میں موت ملے تو میں کمرے کے دروازے پر مرنے کو ترجیح دوں، اس لئے کہ مجھے اپنے قلب کا اطمینان نہیں ہے، ہو سکتا ہے کہ کمرے سے باہر دروازے تک پہنچنے پہلے جائے، حضرت ابولہروداء فرماتے ہیں کہ بخدا اس شخص کا ایمان سلب ہو جاتا ہے جو موت کے وقت ایمان سلب ہونے سے بے خوف ہو، حضرت سہیل تستری فرماتے ہیں کہ صدیقین کو ہر قدم پر یہ دوسرہ رہتا ہے کہ کہیں ان کا خاتمہ نہ ہو، اللہ تعالیٰ نے بھی ان کا یہ وصف بیان فرمایا ہے

وَقُلُوبُهُمْ حُلَّةٌ (پ ۱۸ ص ۴۰ آیت ۲۸)

اور ان کے دل خوف زدہ ہوتے ہیں۔

جب حضرت سفیان ثوری کی وفات کا وقت قریب آیا تو رونے لگے، وہ اس وقت انتہائی خوف زدہ تھے، لوگوں نے عرض کیا، آپ خوف نہ کریں، رجاہ کریں، اللہ تعالیٰ کا عضو آپ کے گناہوں سے بچھ کر ہے، فرمایا میں گناہوں کی وجہ سے نہیں رونا، اگر مجھے یہ یقین ہو جائے کہ میرا خاتمہ توحید پر ہو گا تو مجھے گناہوں کی ذرا پروا نہ ہوں، خواہ وہ پٹاؤں کے برابر ہی کیوں نہ ہوں۔

ایک بزرگ کی وصیت : ایک بزرگ نے اپنے بھائی کو وصیت کی کہ جب میری وفات کا وقت قریب آئے تو میرے سرہانے بیٹھ جانا، اور یہ دیکھتے رہتا کہ میں کس حال پر مرتا ہوں، اگر میرا انتقال توحید پر ہو تو جو کچھ مال میرے پاس موجود ہے اس کی مطاعی اور ہادام غریہ کر شہر کے بچوں میں تقسیم کر دینا، اور کہنا کہ ایک شخص قید خانے سے رہا ہوا ہے، مطاعی اس کی آزادی کی خوشی میں ہے، اور اگر غیر توحید پر انتقال کروں تو لوگوں کو میرے حال سے مطلع کر دینا، ایسا نہ ہو کہ لوگ دھوکے میں مبتلا ہو کر میرے جنازے پر آئیں، اور مجھ سے ریاء لاحق ہو، اگر تم لوگوں کو میرے حال سے مطلع کر دو گے تو لوگ سوچ سمجھ کر آئیں گے، ریاء کی وجہ سے کوئی نہیں آئے گا، ان کے بھائی نے دریافت کیا مجھے کیسے معلوم ہو گا کہ آپ کا انتقال توحید پر ہوا ہے یا غیر توحید پر؟ انھوں نے اس کی کچھ علامات بتلا دیں، راوی کہتے ہیں کہ انھوں نے توحید پر وفات پائی اور ان کے بھائی نے وصیت کی مطابق مطاعی وغیرہ غریہ کر بچوں میں تقسیم کی۔ حضرت سہیل تستری فرماتے ہیں کہ سر پہ گتہ میں مبتلا ہونے سے ڈرتا ہے، اور طرف کفر میں مبتلا ہونے سے خوف زدہ رہتا ہے۔ ابو یزید کما کہتے تھے کہ جب میں مسجد کے لئے گھر سے نکلتا ہوں تو مجھے ایسا لگتا ہے گویا میری گھر سے زنا رنڈ چلا ہو، اس بات سے ڈرتا ہوں کہ کہیں یہ زنا رنڈ مجھے گرجا گھر یا آٹل کدے میں نہ لے جائے، جب تک مسجد میں داخل نہیں ہو جاتا زنا رنڈ کا خیال دامنگیر رہتا ہے، یہ صورت حال شبہ و دوس میں پانچ مرتبہ پیش آتی ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے حواریین سے ارشاد فرمایا کہ اے گروہ حواریین! تم گناہوں سے ڈرتے ہو، اور ہم انبیاء و رسل کفر سے ڈرتے ہیں، ایک نبی کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے برسوں تک بھوک، کھل اور برہنگی کی شکایت کرتے رہے، ان کا لباس اون کا ہوا کرتا تھا، اللہ تعالیٰ نے وحی نازل فرمائی کہ اے بندے! ہم نے تجھے کفر سے بچایا، کیا تیرے لئے یہ نعمت کافی نہیں ہے، کہ وہ سری نعمتیں مانگتا ہے، یہ سن کر انھوں نے اپنے سر پر خاک ڈالی، اور عرض کیا اے اللہ! میں راضی ہوں مجھے کفر سے محفوظ رکھ، جب عارفین اپنی قوت ایمانیہ، اور راہ خدا پر اپنی ثبات قدمی کے باوجود سوہ خاتمہ سے ڈرتے ہیں، تو کمزور لوگوں کو اور بھی زیادہ ڈرنا چاہیے۔

سوہ خاتمہ کے چند اسباب : جانا چاہیے کہ سوہ خاتمہ کے چند اسباب ہیں جو موت سے پہلے ظہور پذیر ہوتے ہیں، جیسے بدعت، نفاق، کبر اور دوسرے اوصاف ذمہ۔ ان میں نفاق سرفہرست ہے، اسی لئے صحابہ کرام نفاق سے بہت زیادہ ڈرتے تھے، حضرت حسن فرماتے ہیں کہ اگر مجھے یہ معلوم ہو جائے کہ میں نفاق سے بری ہوں تو یہ بات میرے لئے سورج نکلنے سے زیادہ محبوب ہے، پھر ہاں نفاق سے مراد وہ نہیں ہے جو اصل ایمان کی ضد ہو، اگر تپے بلکہ اس سے مراد وہ وصف ہے جو ایمان کے ساتھ بھی جمع ہو سکتا ہے، یعنی آدمی بیک وقت مسلمان بھی ہو سکتا ہے اور منافق بھی۔ اور اسکی بہت سی علامتیں ہیں۔ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں۔

اَزْبَعَ مَنْ كُنْ فِيْهِ فَهُوَ مُنَافِقٌ خَالِصٌ وَاِنْ صَلَّى وَصَامَ وَزَعَمَ اَنَّهُ مُسْلِمٌ وَاِنْ كَانَتْ

خَصْلَةً مِنْهُمْ فَفِيهِ شُعْبَةٌ مِنَ النِّفَاقِ حَتَّى يَدْعَهَا مَنْ إِذَا حَدَّثَ كَذِبَ وَإِذَا وَعَدَ أَخْلَفَ وَإِذَا اتَّخَذَ خَانًا وَإِذَا خَاصَمَ فَجَرَ۔ (بخاری و مسلم۔ عبد اللہ ابن عمر)

چار باتیں ایسی ہیں کہ اگر کسی میں یہاں جاسں تو وہ خالص منافق ہے، اگرچہ نماز روزہ کرے، اور مسلمان ہوئے کا دم رکھے، اور اگر ان میں سے ایک پائی جائے تو اس میں نفاق کا ایک شعبہ ہے یہاں تک کہ اس سے باز آجائے۔ جو شخص جب بھی بولے جھوٹ بولے، وعدہ کرے تو وعدہ شکنی کرے، اسکے پاس امانت رکھوائی جائے تو خیانت کرے، جھگڑا کرے تو گالیوں پر اتر آئے۔

ایک روایت میں اذا وعد اخلف کی جگہ اذا عاهد غادر کے الفاظ ہیں۔ صحابہ کرام اور تابعین نے نفاق کی ایسی تفسیر بیان کی ہے کہ صدیق کے علاوہ شاید ہی کوئی شخص اس سے محفوظ رہ سکتا ہو، حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ ظاہر و باطن، دل و زبان، اور اندر و باہر کا مختلف ہونا بھی نفاق ہے، کون ہے جو اس اختلاف سے خالی ہو، بلکہ یہ تو انسان کی فطرت کا نتیجہ بن گیا ہے، اور ان امور میں شمار ہونے لگا ہے جنہیں لوگ عادی بنا کر لیتے ہیں، ان کی برائی لوگوں کے ذہنوں سے کھل چکی ہے، بلکہ زمانہ نبوت سے متصل زمانوں میں بھی لوگ اس طرح کے امور کی برائی کو برائی نہیں سمجھتے تھے، ہمارے زمانے کا تو ذکر ہی کیا ہے، حضرت حذیفہؓ فرماتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور مبارک میں آدمی ایک کلمہ کہتا تھا اور منافق قرار پاتا تھا، جب کہ میں تم میں سے بعض لوگوں کی زبان سے وہ کلمہ دن میں دس مرتبہ سنتا ہوں، (احمد، حذیفہ) صحابہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ تم بہت سے ایسے عمل کرتے ہو جو تمہاری نگاہوں میں بال سے زیادہ باریک (غیر اہم) ہوتے ہیں جب کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں ہم ان امور کو کبائر سمجھتے تھے (بخاری۔ النسخ)۔ بعض بزرگن دین کہتے ہیں نفاق یہ ہے کہ جو عمل تم کرتے ہو اگر وہ کسی دوسرے سے سرزد ہو جائے تو تم اسے برا سمجھو، اور ایک شخص سے اس لئے محبت کرو کہ وہ ظالم ہے، اور دوسرے سے اس لئے نفرت نہ کرو کہ وہ حق بات کہتا ہے۔ یہ بھی نفاق ہے کہ کوئی شخص تمہاری تعریف کرے اور تم اس تعریف کے مستحق رہنے کے باوجود اسے پسند نہ کرو، ایک شخص نے حضرت عبد اللہ ابن عمرؓ کی خدمت عرض کیا کہ ہم امراء و حکام کی محفلوں میں جاتے ہیں، اور جو کچھ وہ کہتے ہیں اسکی تائید کرتے ہیں، لیکن باہر نکل کر ان پر تنقید کرتے ہیں، فرمایا ہم اسے نفاق کہتے تھے (احمد، طبرانی) حضرت عبد اللہ ابن عمرؓ نے ایک شخص کو حجاج کی خدمت کرتے ہوئے سنا آپ نے اس سے دریافت کیا اگر حجاج یہاں موجود ہو تا تب بھی تم اسے ایسا ہی کہتے؟ اس نے عرض کیا نہیں! فرمایا ہم عہد رسالت میں اسے نفاق کہتے تھے، ان تمام روایات سے سخت تر روایت یہ ہے کہ کچھ لوگ حضرت حذیفہؓ کے دروازے پر جمع ان کے باہر نکلنے کے منتظر تھے، اور آپ کے متعلق کچھ گفتگو کر رہے تھے، جب آپ باہر تشریف لائے تو وہ لوگ شرم کی وجہ چپ ہو گئے، آپ نے ان سے فرمایا تم اپنی گفتگو جاری رکھو، وہ لوگ چپ رہے، آپ نے فرمایا ہم لوگ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اسے نفاق سمجھتے تھے۔ (۱) یہ حضرت حذیفہؓ وہ صحابی ہیں جنہیں منافقین اور اسبابِ نفاق کا علم خاص طور پر عطا کیا گیا تھا، فرمایا کرتے تھے کہ ایک وقت ایسا آتا ہے کہ دل ایمان سے لبریز ہو جاتا ہے یہاں تک کہ نفاق کے لئے سوئی برابر بھی گھمانش باقی نہیں رہتی، پھر ایک وقت ایسا آتا ہے کہ دل نفاق سے بھر جاتا ہے یہاں تک کہ ایمان کے لئے سوئی برابر بھی گھمانش باقی نہیں رہتی۔ اس تفصیل سے تم یہ بات جان گئے ہو گے کہ عارفینِ سوء خاتمہ سے خوف زدہ کیوں رہا کرتے ہیں۔

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے کہ سوء خاتمہ کے چند اسباب ہیں، جو خاتمے سے پہلے ظہور میں آتے ہیں، جیسے بدعتیں، معاصی، اور نفاق۔ انسان ان امور سے کب خالی رہ سکتا ہے، بلکہ یہ گمان رکھنا بھی نفاق ہے کہ میں نفاق سے خالی ہوں، یہ قول بے حد مشہور ہے کہ جو شخص نفاق سے خائف نہ ہو وہ منافق ہے۔ ایک شخص نے کسی عارف سے کہا کہ میں اپنے نفس پر نفاق کے تیلے سے خوف زدہ ہوں،

انہوں نے کہا کہ اگر تم منافق ہوتے تو کبھی نفاق کا خوف نہ کرے۔ عارف کی نظر کبھی سناٹے پر رہتی ہے اور کبھی خاتمے پر اور وہ ان دونوں ہی سے خائف رہتا ہے، سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

الْعَبْدُ الْمُؤْمِنُ بَيْنَ مَخَافَتَيْنِ بَيْنَ أَجَلٍ قَدْ مَضَى لَا يَذُرِي مَا لِلَّهِ صَانِعٌ بِهِ وَبَيْنَ أَجَلٍ قَدْ بَقِيَ لَا يَذُرِي مَا لِلَّهِ قَاضٍ فِيهِ فَوَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ مَا بَعْدَ الْمَوْتِ مِنْ مُسْتَغْنَبٍ وَلَا بَعْدَ الْكُنْيَا كَلَّا إِلَّا الْجَنَّةُ وَالنَّارُ (یعنی فی الشعب)

بندہ مومن دو خوفوں کے درمیان ہے۔ ایک وہ مدت جو گزر گئی وہ نہیں جانتا کہ اللہ تعالیٰ اس مدت میں اسکے ساتھ کیا کرتا ہے اور ایک وہ مدت جو باقی ہے وہ نہیں جانتا کہ اس میں اللہ تعالیٰ اس کے سلسلے میں کیا فیصلہ کرنے والا ہے اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے کہ مرنے کے بعد رضا حاصل کرنے کی کوئی صورت نہیں ہے اور دنیا کے بعد جنت و دوزخ کے علاوہ کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔

سوء خاتمہ کے معنی : سوء خاتمہ کی دو درجے ہیں جن میں سے ایک دوسرے کی بہ نسبت سخت تر ہے پہلا درجہ جو شدید تر ہے یہ ہے کہ جس وقت قلب پر موت کے سکرات اور اس کا غلبہ ہو وہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں شک یا انکار میں مبتلا ہو جائے اور اسی حالت میں مرجائے یہ شک اور انکار ایک ایسی گرہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے اور اس کے مابین ہمیشہ ہمیشہ کے لئے حجاب پیدا کر دیتی ہے اور حجاب دائمی دوری اور عذاب کو متقاضی ہے سوء خاتمہ کی دوسری صورت جو درجے میں اس سے کم تر ہے یہ ہے کہ بندہ کے دل پر موت کے وقت دنیاوی امور میں سے کوئی امر یا اسکی شہوات میں سے کوئی شہوت غالب آئے اور دل و دماغ پر چھا جائے یہاں تک کہ اس کے تمام حواس اسی شہوت میں مشغول ہو جائیں اس صورت میں غیر شہوت کی گنجائش ہی نہیں رہیگی اور اگر اتفاق سے اسی حالت میں مدح قبض ہو جائے تو وہ غیر اللہ میں اپنے قلب کے استغراق کی بناء پر متوجہ ہوگا اور یہ صورت اللہ تعالیٰ کے اور اسکے درمیان حجاب کی صورت ہے حجاب سے عذاب نازل ہوتا ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے جو آگ بھڑکانی ہے وہ صرف مجاہدین کو خاستہ کرتی ہے وہ مومن جو قلب سلیم رکھتا ہو دنیا سے غافل ہو اور ہمہ تن اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو اس سے آگ یہ کہتی ہے کہ اے مومن گزر جاتیرے نور نے میرے شعلے بجھا دیے ہیں۔ دنیا کی محبت غالب ہونے کی حالت میں جان لگنا بھی ایک خطرناک معاملہ ہے یہیوں کہ آدمی اسی صفت پر مرتا ہے جس پر وہ زندہ تھا اور موت کے بعد کسی ایسی صفت کے اکساب کی گنجائش نہیں ہے جو غالب رہنے والی صفت کے برعکس ہو یہیوں کہ قلوب میں اعمال کی گنجائش ہی نہیں رہی۔ نہ اب عمل کی طرح کی جاسکتی ہے اور نہ دنیا میں واپسی کی امید کی جاسکتی ہے کہ تدارک کر لیا جائے اس وقت بندہ شدید حسرت سے دوچار ہوتا ہے لیکن یہیوں کہ اصل ایمان اور اللہ تعالیٰ کی محبت ایک طویل مدت تک اس کے دل میں راسخ رہی تھی اور اعمال سے اسے بچسکی حاصل ہوئی تھی اس لئے وہ حالت جو بندے پر موت کے وقت طاری ہوئی تھی ان دونوں یعنی ایمان اور اعمال صالحہ کے اثر سے ختم ہو جائے گی اگر اس کا ایمان قوت میں ایک شعلہ کے برابر بھی ہو گا تو اسے جلد سے جلد دوزخ سے نکال لے گا اور اگر ایک شعلہ سے بھی کم ہو تو اسے دیر تک دوزخ میں رہنا ہوگا یہاں تک کہ اگر ایک رائی کے برابر بھی ہو تب بھی دوزخ سے ضرور نکلے گا خواہ ہزاروں لاکھوں سال کے بعد نکلے۔

دوزخ کا عذاب آخرت میں : یہاں تم یہ کہہ سکتے ہو تمہاری گفتگو سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ اس حالت میں مرنے والے کو دوزخ کا عذاب فوراً ہونا چاہیے مگر ایسا ہے تو پھر یہ عذاب قیامت پر کیوں موقوف ہوتا ہے اور اس میں قدرت تاخیر کیوں کی جاتی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جو شخص عذاب قبر کا منکر ہو وہ بدعتی ہے نور خدا نور ایمان اور نور قرآن سے محبوب ہے مرنے کے بعد کافروں اور بعض گنہگار مومنوں کو عذاب قبر میں مبتلا کیا جائے گا یہ بھی دوزخ کے عذاب ہی کی ایک قسم ہے۔ اس سلسلے میں صحیح روایات وارد ہیں چنانچہ موی ہے۔

الْقَبْرِ إِمَّا حَفْرَةً مِنْ حَقَرِ النَّارِ أَوْ رُضْغَةً مِنْ رِيَاضِ الْجَنَّةِ (ترمذی۔ ابوسعید)

قبر یا تو دونوں کے گڑھوں میں سے ایک گڑھ ہے یا جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے۔

یہ بھی روایت ہے کہ بعض اوقات اس قبر پر جس میں مومے کو عذاب دیا جاتا ہے دونوں کے ستر دو اڑے کھل جاتے ہیں صحیح روایات سے ثابت ہے کہ اگر کوئی شخص بد بخت ہے اور سوء خاتمہ میں مبتلا ہو کر مرے تو اس پر صبح قبض ہوتے ہی مصائب کا زہول شروع ہو جاتا ہے اگرچہ اوقات کے اختلاف کے اعتبار سے عذاب کی شکلیں مختلف ہوتی ہیں مثلاً جب میت کو قبر میں رکھا جاتا ہے تو مگر کفیر کے سوالات کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اس کے بعد عذاب ہوتا ہے پھر حساب کتاب میں الجھایا جاتا ہے اس کے بعد قیامت کے دن برسر عام رسوا کیا جاتا ہے اس کے بعد ہل صراط عبور کرنے کا خطرہ ہے اس کے بعد دونوں کے فرشتوں کی ہیبت کا سلسلہ ہے اس سلسلے میں دیشمار روایات و اخبار وارد ہیں جو اپنے اپنے مواقع پر دیکھے جاسکتے ہیں (۱) بد بخت انسان مرنے کے بعد اپنے تمام حالات میں اسی طرح عذابوں کا نشانہ بناتا رہتا ہے، اللہ رب العزت اسے اپنے سایہ رحمت میں ڈھانپ لے۔ یہ خیال نہ کرنا چاہیے کہ جس محل میں ایمان ہوتا ہے اسے مٹی کھالتی ہے بلکہ مٹی تمام ظاہری اعضاء کو کھالتی ہے اور انہیں منتشر کر دیتی ہے یہاں تک کہ وقت مقرر آجائے اس وقت تمام متفرق اجزاء جمع کئے جائیں گے اور ان میں روح پھونکی جائے گی جو محل ایمان ہے اور جو موت کے بعد سے دوبارہ جسم میں لوٹائے جانے تک ان سبز جانوروں کے پوتوں میں رہتی ہے جو عرش کے نیچے لٹکے رہتے ہیں بشرطیکہ وہ روح سعید ہو اور اگر بد بخت ہو تو اس کے برعکس حالت میں رہتی ہے۔

سوء خاتمہ کے موجب اسباب : وہ اسباب جو آدمی کو سوء خاتمہ تک پہنچاتے ہیں بے شمار ہیں ان کا احاطہ نہیں کیا جاسکتا لیکن بحیثیت مجموعی ان کی طرف اشارہ کیا جاسکتا ہے۔

پہلا سبب۔ شک و انکار : جہاں تک شک اور انکار پر خاتمہ کا معاملہ ہے تو اس کا سبب دو صورتوں میں منحصر ہے ان میں سے ایک صورت کا تصور اس شخص کے لئے بھی ممکن ہے جو دوسرے اور زندہ میں کامل ہو اور اعمال صالحہ رکھتا ہو جیسے زاہد بدعتی اس کا انجام بھی بے حد خطرناک ہے اگرچہ اس کے اعمال نیک ہی کیوں نہ ہو بدعت سے ہماری مراد کوئی خاص مذہب نہیں ہے اس کے لئے ایک طویل بحث کی ضرورت ہے بلکہ ہمارے نزدیک بدعت سے مراد یہ ہے کہ کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی ذات صفات اور افعال میں خلاف حق اعتقاد کرے اور یہ غیر حق کا اعتقاد یا تو اپنی رائے عقل اور قیاس سے ہو جب بھی اپنے حریف سے مجادلہ کرے اپنی عقل پر اکتفا کرے اور اپنی رائے اور قیاس کو سامنے رکھے یا ان لوگوں کی تقلید سے ہو جن کا یہ حال ہو اس صورت میں جب موت اس کے قریب آتی ہے اور ملک الموت کی پیشانی نمایاں ہونے لگتی ہے اور قلب اپنے خیالات سے گھبرانے لگتا ہے تو بعض اوقات سکرات موت کی حالت میں اس پر یہ واضح ہو جاتا ہے کہ جو اعتقادات میں نے اختیار کر رکھے ہیں وہ جہالت پر مبنی ہیں اور باطل محض ہیں یہ انکشاف سکرات موت کی حالت میں اس لئے ہوتا ہے کہ موت دراصل رفع حجاب یعنی پردہ اٹھ جانے کا نام ہے اور موت کے بعد امور اپنی حقیقت پر منکشف ہوتے ہیں اور سکرات موت کے مہادی بھی گویا موت ہی میں شامل ہیں اس لئے اس حالت میں مرنے والے پر حقائق منکشف ہونے لگتے ہیں جب اس پر کسی ایسے اعتقاد کا بطلان منکشف ہوتا ہے جسے اس نے زندگی بھر اپنائے رکھا اور جسے وہ اپنے دل میں صحیح اور یقینی تصور کرتا رہا تو یہ سمجھتا ہے کہ جس طرح میرے اعتقادات باطل ہیں اسی طرح دوسرے اعتقادات بھی باطل ہیں وہ تمام عقائد کو باطل سمجھنے لگتا ہے یہاں تک کہ جو معتقدات صحیح ہیں انہیں بھی غلط کہتا ہے یا ان کی صحت میں شک کرتا ہے اور اسی حالت میں مرجاتا ہے ظاہر ہے اس کا خاتمہ برا ہوگا اور اس کی روح شرک پر قبض ہوگی اس آیت کریمہ سے یہی لوگ مراد ہیں۔ فرمایا :-

وَبَدَّلَهُمْ مِنَ الْمَعَالِمِ يُكُونُوا يَحْتَسِبُونَ (پ ۲۲۳ آیت ۴)

اور خدا کی طرف سے ان کو وہ معاملہ پیش آئے گا جس کا انھیں گمان بھی نہیں تھا۔

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا الَّذِينَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ

يَحْسِبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا (پ ۲۳ آیت ۳۳-۳۴)

(۱) اس سلسلے میں کتاب قواعد الاعتقاد میں بہت سی روایات تحریک کی گئی ہیں

آپ کہتے کہ کیا ہم تم کو ایسے لوگ بتلائیں جو اعمال کے اعتبار سے بالکل خسارے میں ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی دنیا میں کی گئی محنت اکارت گئی اور وہ یہ سمجھ رہے ہیں کہ وہ اچھا کام کر رہے ہیں۔

خواب میں بہت سے ایسی امور منکشف ہو جاتے ہیں جن کا تعلق مستقبل سے ہوتا ہے، اسکی وجہ یہ ہوتی ہے کہ سونے کے وقت دنیا کے اشغال کم رہتے ہیں، اسی طرح سکرات موت کے وقت بھی بعض امور منکشف ہو جاتے ہیں، دنیا کا کامدیار اور جسمانی شہوات قلب کو سکوت کا مشاہدہ اور لوح محفوظ پر لکھے ہوئے حقائق کا ادراک نہیں کرنے دیتی، تاکہ جو امور جس طرح پر واقع ہیں اسی طرح منکشف ہو جائیں، لیکن سکرات کے عالم میں قلب کی یہ استعداد واپس آ جاتی ہے، اور اس پر بعض حقائق منکشف ہو جاتے ہیں، یہ انکشاف حق میں شک کا باعث بن جاتا ہے۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات اور افعال میں کسی غیر حقیقی امر کا معتقد ہو اسکے لئے شک اور انکار کا خطرہ ہے اور زہد و صلاح سے یہ خطرہ زائل نہیں ہوتا۔ یہ خطرہ خوف اسی صورت میں دور ہوتا ہے کہ بندہ امر کا حق کا معتقد ہو جائے، البتہ سادہ لوح بندے اس خطرے سے دور ہیں، سادہ لوح بندوں سے ہماری مراد وہ لوگ ہیں جو اللہ اس کے رسول اور یوم آخرت پر مجمل مگر پختہ ایمان لاتے ہیں، جیسے دیہاتی بدو اور دوسرے عوام جو بحث و اعتراض میں نہیں پڑتے، اور نہ کلام کو مقصود بالذات سمجھتے ہیں، اور نہ متکلمین کے مختلف اقوال میں اپنا وقت ضائع کرتے ہیں۔ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں نہ

أَكْثَرُ أَهْلِ الْحَنَفَةِ الْبَلَاءُ (بزار۔ انس) اکثر اہل حنفیہ سادہ لوح لوگ ہوں گے۔

اکابرین سلف اسی لئے لوگوں کو عقائد کے باب میں بحث و نظر، کلام و تقریر اور تحقیق و جستجو سے بچنے کی تلقین کیا کرتے تھے، اور کہتے تھے کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمایا ہے اسے من و عن قبول کرلو، اور جو کچھ ظاہر الفاظ سے سمجھ میں آتا ہے اسے صحیح سمجھو، نہ تشبیہ کا عقیدہ رکھو، نہ تاویلات کے دواوازے کھولو، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات کے باب میں بحث کرنا ایک عظیم خطرہ ہے، اسکی گھائیاں سخت ہیں، اسکے راستے دشوار گزار ہیں، اللہ تعالیٰ کے جلال کا ادراک کرنے سے عقلیں قاصر رہ جاتی ہیں، قلوب دنیا کی محبت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی ہدایت اور یقین کے نور سے محجوب ہیں، اس لئے وہ حق کا احساس نہیں کھاتے، پھر متکلمین اور اہل بحث نے اپنی عقل پر اعتماد کر کے جو کچھ کہا ہے، وہ اتنا مختلف، متضاد اور عجیب ہے کہ ان کے درمیان سے حق کا گوہر ابداً رجح لینا اس صورت میں جب کہ ہزاروں طبع کئے ہوئے گھینے بھرے ہوئے ہوں نہایت دشوار ہے، ہر شخص امر حق تلاش نہیں کر سکتا، اسکے علاوہ دل ان امور کے عادی ہوتے ہیں جن پر انھوں نے ابتداء سے نشوونما پائی ہے، وہ ان امور میں اس قدر پختہ ہوتے ہیں کہ تعصبات کی حدود تک جا پہنچتے ہیں، بلکہ وہ حدود بھی تجاوز کر جاتے ہیں، مودنی عقائد کی جڑیں اس قدر گہرائی میں راسخ ہوتی ہیں کہ انھیں اپنی جگہ سے ہلانا بھی دشوار ہو جاتا ہے، پھر طبع دنیا کی محبت میں مشغول ہیں اور انہی میں لگی ہوئی ہیں۔ دنیا کی شہوات ان کا گلا دھائے ہوئے ہیں اور انھیں کمال فکر سے باز رکھے ہوئے ہیں، جب یہ مختلف بیعتوں کے حامل لوگ اللہ تعالیٰ کی ذات اسکی صفات و افعال میں اپنی رائے سے کلام کرتے ہیں تو اس کلام میں بھی اختلاف ہو جاتا ہے، اور ہر شخص یہی دعویٰ کرتا ہے کہ اسکا کلام حق ہے، اسکی رائے درست ہے، باقی تمام خیالات اور آراء لغو و باطل ہیں ان حالات میں کسی عام انسان کے بس کی بات نہیں کہ وہ ان مختلف خیالات کے درمیان سے حق بات تلاش کر لے۔

بندگانِ خدا کی سلامتی اسی میں ہے کہ وہ اعمالِ صالحہ میں مشغول ہوں، اور جو بات ان کی حد استطاعت سے خارج ہے اسکے درپے نہ ہوں، لیکن افسوس! اب حالات بدل گئے ہیں آزاد خیالی بیہ گئی ہے، بے ہودگی عام ہو چکی ہے، اور ہر جاہل اپنے علم و گمان کے مطابق عمل کرنے لگا ہے، اور اپنے خیالات میں مست رہنے لگا ہے، وہ اپنے وہم و غم کو علم اور خیال کو تحقیق سمجھتا ہے، اور اپنے قلب کو ایمان کے نور سے مچلی اور نفس کو اعمالِ صالحہ سے مزنی تصور کرتا ہے، وہ دعویٰ کرتا ہے کہ جس نتیجے تک میں اپنے علم اور تحقیق کی روشنی میں پہنچا ہوں، یہی علم یقین اور عین یقین ہے حالانکہ چند روز بعد اس دعوے کی قطعی کھلی گئی، اور اس وقت یہ شعر پڑھنے کوئی چاہے گا۔

وَلَمْ نَخَفْ سَوْعَاءَ يَأْتِيهِ بِالْفَكْرِ

أَحْسَنْتَ ظَنَّنَا لَا يَأْتِيهِ إِلَّا حَسَنَاتٌ

وَسَأَلَمْتُكَ الْإِلَهِي فَأَعْتَرَزْتَنِي بِهَا وَعِنْدَكَ صِفُو الْإِلَهِي بَخْلُكَ الْكَدْرُ

(تو نے دنوں کے بارے میں اچھا گمان رکھا جب کہ وہ (ظاہر) اچھے تھے اور تو اس برائی سے نہیں ڈرا جو مقدر لائے والا تھا اور راتیں سلامت رہیں تو تو فریب میں مبتلا ہو گیا حالانکہ راتوں کی سیاسی دور ہوتی ہے تب کدورت نمایاں ہوتی ہے۔)

یہ بات یقین سے جان لو کہ جو شخص اللہ کے رسول اور اسکی کتابوں پر سادہ ایمان سے محروم ہو جاتا ہے اور بحث و تحقیق میں پر جاتا ہے وہ اس خطرے کا سامنا کرتا ہے جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے اس کی مثال اس شخص کی سی ہوتی ہے جس کی کشتی ٹوٹ گئی ہو اور وہ سمندروں کی سرکش لہروں کے درمیان ہو، کوئی لہر اسے اوھر کھینچتی ہے اور کوئی اوھر ایسا اتفاق بہت کم ہوتا ہے کہ آدمی صحیح سلامت کنارے پر پہنچ جائے، زیادہ تر ہلاک ہوتا ہے اس لئے ذات و صفات کی حقیقت تلاش کرنا سراسر جہالت ہے اور اپنے آپ کو خطرات کے سمندر میں دھکیلنا ہے۔

پھر جو لوگ دوسروں کو عقیدے بتلاتے ہیں اور وہ دوسرے ان کی اتباع کرتے ہیں وہ دو حال سے خالی نہیں یا تو ان کے پاس ان عقیدوں کی کوئی ہوگی دلیل جو بتلاتے ہیں اور لوگ ان کے دلائل سے متاثر ہو کر انکے عقائد قبول کرتے ہیں یا بلا دلیل مانتے ہیں اب اگر وہ ان کے بتائے ہوئے عقیدوں میں شک کرتے ہیں تو ان کا دین فاسد ہے اور اگر ان پر بھروسہ کرتے ہیں تو یہ اپنی ناقص عقلوں پر مغرور ہوتا ہے یہی بحث کرنے والوں کا بھی ہے مگر وہ لوگ اس حکم سے مستثنیٰ ہیں جو عقل کی حدود سے نکل جائیں اور ان کی رسائی اس نور مکاشفہ تک ہو جائے جو نبوت اور ولایت کے افق پر چمکتا ہے لیکن اس کمال تک پہنچنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں ہے بہت کم لوگوں کو یہ درجہ حاصل ہوتا ہے اس لئے بحث و تکرار کی راہ میں خطرات ہی خطرات ہیں صرف وہ لوگ ان خطرات سے محفوظ ہیں جو سادہ لوح ہیں اور دوزخ کی آگ کے خوف سے اللہ کی اطاعت میں لگے ہوئے ہیں وہ بحث کا فتنہ لیاٹ میں اپنا وقت ضائع نہیں کرتے۔

شک و انکار پر خاتمے کے سبب کی دوسری صورت یہ ہے کہ ایمان اصل میں ضعیف ہوتا ہے اور دنیا کی محبت دل پر غالب ہوتی ہے جس قدر ایمان ضعیف ہوگا اسی قدر اللہ کی محبت بھی ضعیف ہوگی۔ اور اسی قدر دنیا کی محبت قوی ہوگی اور یہ قوت اس درجے کی ہوگی کہ دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت کے لئے کوئی گنجائش ہی نہیں ہوگی بلکہ یہ محبت ایک سرسری خیال کی حیثیت اختیار کر جائے گی جو چند لمحوں کے لئے پیدا ہوتا ہے اور ختم ہو جاتا ہے اس کا اتنا اثر نہیں ہوتا کہ نفس کی مخالفت کر سکے یا اسے شیطانی راہ سے منحرف کر سکے اس صورت حال کا قدرتی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ آدمی از سر تپا شہوات میں غرق ہو جاتا ہے یہاں تک کہ اس کا دل سیاہ اور سخت ہو جاتا ہے پھر یہ تاریکی اور سختی گناہوں کے ہندو بڑھتی رہتی ہے یہاں تک کہ ایمان کا وہ چراغ جو بہت مدہم روشنی دے رہا تھا یکفخت بجھ جاتا ہے اور وہ محسوس بھی نہیں کر پاتا کہ اب اسکے دل میں ایمان کی روشنی باقی نہیں رہی ہے تاریکی اس کی طبیعت اسکا مزاج اور اس کا مقصد بن جاتی ہے جب موت کے سحرات طاری ہوتے ہیں تب اللہ کی محبت کا یہ ضعف اور بڑھتا ہے کیوں کہ اسے یہ محسوس ہو جاتا ہے کہ وہ دنیا سے جدا ہونے والا ہے جو اسکی محبوب ہے اور اسکے دل پر غالب ہے وہ جدائی کے احساس سے تکلیف محسوس کرتا ہے اور اس وقت اسکے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ میرے اور دنیا کے درمیان جدائی موت سے پیدا ہوگی اور موت اللہ کی طرف سے ہے چنانچہ وہ موت کو برا سمجھتا ہے یہاں یہ خطرہ ہوتا ہے کہ دنیا کی محبت کے جوش میں خدا تعالیٰ سے بغض نہ کرنے لگے جیسے کوئی شخص اپنے بیٹے سے معمولی محبت کرتا ہے اور مال سے زیادہ اس صورت میں اگر بیٹا مال ضائع کر دے تو جو تھوڑی محبت اسے بیٹے سے تھی وہ نفرت میں بدل جاتی ہے اور وہ اسے اپنا دشمن تصور کرنے لگتا ہے اب اگر کسی شخص کی روح اسی لمحے قبض ہو جب اسکے دل میں اللہ تعالیٰ سے نفرت یا بغض کا جذبہ ابھر رہا ہو تو ظاہر ہے اسکا خاتمہ برا ہوگا اور وہ ہمیشہ کے لئے تباہ و برباد ہو جائے گا۔ اس تفصیل سے ثابت ہوا کہ صورت مذکورہ میں اس شخص کا برا خاتمہ اس لئے ہوا کہ اسکے دل پر دنیا کی محبت غالب تھی اسکا میلان اسباب دنیا کی طرف تھا اور حال یہ تھا کہ اسکے ایمان میں ضعف تھا جس کی وجہ سے اللہ کی محبت بھی ضعیف تھی۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص اپنے دل میں دنیا کی محبت کو مغلوب اور اللہ کی محبت کو غالب پائے اگرچہ دنیا کی محبت موجود ہو تو وہ اس خطرے سے دور ہے۔

دنیا کی محبت ایک لاعلاج مرض ہے : ہم اب تک اسی نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اصل مرض دنیا کی محبت ہے، اور یہ ایک لاعلاج مرض ہے، تمام مخلوق اس میں مبتلا ہے، اس مرض میں ابتلائے عام کی وجہ یہ ہے کہ لوگ اللہ تعالیٰ کو کماحقہ نہیں پہچانتے، اگر اسے صحیح طور پر پہچانتے تو اس سے محبت کرتے، جو شخص اسے پہچانتا ہے، اس سے محبت ضرور کرتا ہے۔ ارشاد ربانی ہے نہ

قُلْ إِنْ كَانَ آبَاءُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ وَأَخَوَانُكُمْ مُوَافِقُونَكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ وَأَمْوَالٌ اقْتَرَبَتْ فَتَمُوهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسَاكِينُ تُرْضَوْنَهَا أَحَبَّ إِلَيْكُمْ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ فَتَرَبَّصُوا حَتَّى يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرٍ (پ ۱۲، آیت ۲۳)

آپ کہہ دیجئے کہ اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہارا اکنبہ اور وہ مال جو تم نے کمایا ہے اور وہ تجارت جس میں تمہیں کسادبازاری کا اندیشہ ہے، اور وہ گھر جن کو تم پسند کرتے ہو تم کو اللہ سے اور اس کے رسول سے، اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ پیارے ہوں تو تم غفلت رہو یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنا حکم سنائے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جس شخص کی روح اس طرح نکلے کہ وہ دل سے اللہ تعالیٰ کا منکر ہو، اور اسکے اس فعل موت کو برا جانتا ہو جس سے اسکے اور اسکی محبوب چیزوں، مال، دولت، بیوی بچوں وغیرہ کے درمیان جدائی ہو گئی ہے تو ایسا شخص اسی بغض کے ساتھ مرے گا، اور اسی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہوگا، اس کی مثال اس مفور غلام کی سی ہوگی جسے پابہ زنجیر آقا کے سامنے لایا گیا ہو، ظاہر ہے اس غلام کے دل میں اپنے آقا کے لئے بغض ہوگا نفرت ہوگی، اور اسکے نتیجے میں آقا اسکے ساتھ جو سلوک کرے گا، اور جس سزا کا مستحق ٹھہرائے گا وہ صاف ظاہر ہے۔ اور جس شخص کی موت اللہ کی محبت پر ہوگی وہ باری تعالیٰ کے سامنے اس غلام کی طرح حاضر ہوگا جو اپنے آقا کا وفادار خدمت گزار اور چاہنے والا ہو، اور اسکی خدمت میں کسی طرح کی کوئی کوتاہی نہ کرنا ہو، بلکہ ہر اذیت اور مشقت برداشت کر کے اسے راحت پہنچاتا ہو، ظاہر ہے وہ غلام اپنے آقا کے دیدار سے بے حد خوش ہوگا، اور خود آقا بھی اس سے مل کر مسرور ہوگا، اور اسے طرح طرح کے انعامات سے نوازے گا۔

دوسرا سبب - معاصی : اب سوء خاتمہ کے دوسرے سبب کا ذکر کیا جاتا ہے۔ یہ سبب پہلے سبب یعنی شک اور انکار کی حالت میں مرنے کی بہ نسبت ہلکا ہے، اور ہمیشہ دوزخ میں رہنے کو متعقی نہیں ہے، اس خاتمے کے بھی دو سبب ہیں، ایک معاصی کی کثرت اگرچہ ایمان قوی ہو، دوسرے ایمان کا ضعف اگرچہ معاصی کم ہوں۔

پہلی صورت - یعنی کثرت معاصی کی تفصیل یہ ہے کہ آدمی گناہوں کا ارتکاب اس لئے کرتا ہے کہ اس پر شہوات غالب ہوتی ہیں اور انس و عادت کی وجہ سے شہوات دل میں راسخ ہو جاتی ہیں، آدمی زندگی بھر جن باتوں کا عادی رہتا ہے وہ باتیں اسی کے وقت ضرور یاد آتی ہیں، چنانچہ اگر کسی شخص کا میلان اطاعت کی طرف تھا تو وہ موت کے وقت بھی اطاعت الہی کی طرف متوجہ رہتا ہے، اسی کو یاد کرتا ہے، اور اسی کے ذکر میں مشغول رہتا ہے، اور جس کا میلان معاصی کی طرف ہوتا ہے تو موت کے وقت دل پر معاصی ہی غالب رہتی ہے، پھر ایسا بھی ہوتا ہے کہ آدمی کی روح اسی حالت پر قبض کر لی جاتی ہے، جب اسکے دل میں کسی دنیوی شہوت یا کسی معصیت کا غلبہ ہوتا ہے، اس طرح وہ اللہ تعالیٰ سے محجوب ہو جاتا ہے، چنانچہ جو شخص کبھی کبھی گناہ کرتا ہے، وہ اس ذات سے بہت دور ہے، اور جو شخص بالکل گناہ نہیں کرتا وہ ہر طرح مامون و محفوظ ہے، لیکن جس شخص پر معاصی غالب ہیں۔ اور طاعات کی بہ نسبت زیادہ ہیں اور وہ ان سے خوش بھی ہوتا ہے اسکے حق میں سوء خاتمہ کا خطرہ بہت زیادہ ہے، اسے ہم ایک مثال کے ذریعے سمجھ سکتے ہیں۔

خواب کے واقعات کے مثال : اسکی صحیح اور مکمل مثال خواب کے واقعات ہیں۔ ہم خواب میں عام طور پر وہی مناظر وہی واقعات اور وہی باتیں دیکھتے ہیں جن میں ہم زندگی بسر کرتے ہیں، یہاں تک کہ سن بلوغ کو پہنچنے والا کوئی بچہ خواب میں اس وقت تک جماع سے محظوم نہیں ہو سکتا جب تک اس نے بیداری کی حالت میں جماع نہ کیا ہو، اسی طرح اگر کوئی شخص اپنی تمام عمر فقہ کی

تحصیل میں صرف کروے تو وہ خواب میں ایسے حالات کا مشاہدہ کرے گا جو علم اور علماء سے متعلق ہوں دوسری طرف تاجر ایسے واقعات دیکھے گا جو اسکی تجارت سے تعلق رکھتے ہوں، قبیہ کو علم کے احوال تاجر سے زیادہ، اور تاجر کو تجارت کے واقعات قبیہ سے زیادہ نظر آئیں گے، کیوں کہ دل پر نیند کی حالت میں وہی باتیں ظاہر ہوتی ہیں جن سے دل بوجہ کثرت اشتغال مانوس ہو جاتا ہے، موت نیند کے مشابہ ہے، اگرچہ اس سے کچھ بڑھ کر ہے، سکرات موت، اور اس سے پہلے طاری ہونے والی بے ہوشی نیند کے قریب قریب ہے، جب یہ بات ثابت ہوگئی تو نتیجہ نکلا کہ جس طرح نیند کی حالت میں وہ ان مناظر کا مشاہدہ کرتے ہیں جن سے بیداری کے عالم میں ہمارا تعلق رہا ہے، اسی طرح سکرات میں بھی ہم ان واقعات کا مشاہدہ کریں گے جو زندگی میں ہم سے متعلق رہے ہیں، گناہ گار بندے معاصی کو یاد کریں گے، اور نیک بندے طاعات کو یاد کریں گے، صلحاء اور فساق کے خوابوں میں بھی یہی فرق ہوتا ہے، بہر حال کسی چیز سے زیادہ انس ہونا بھی ایک سبب ہے، اس انس سے اس چیز کی برائی دل میں نقش ہو جاتی ہے، اور نفس اسکی طرف مائل رہتا ہے، اب اگر اسی حالت میں جب کہ کوئی بمعیت دل میں نقش ہو، اور نفس اسکی طرف راغب ہو روح پرواز کر جائے تو خاتمہ اچھا نہیں ہوگا، اگرچہ اصل ایمان پائی رہے گا، اور اس سے تجارت کی امید کی جائے گی۔

یہاں ایک بات یہ بھی ذہن نشین کرنی چاہیے کہ جس طرح بیداری کی حالت میں دل پر کوئی خیال گزرتا ہے اسکا کوئی نہ کوئی سبب ہوتا ہے، اسی طرح خواب کی حالت میں جو واقعات پیش آتے ہیں ان کے بھی اسباب ہوتے ہیں جو اللہ کے علم میں ہوتے ہیں ان میں سے بعض اسباب ہمیں معلوم ہوتے ہیں اور بعض نہیں

خوف خدا میں انبیائے کرام اور ملائکہ علیہم السلام کے حالات

حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ جب ہوا بدلتی تھی اور تیز آمد می چلتی تھی تو سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ مبارک کارمک خنجر ہو جاتا تھا، آپ کھڑے ہو جاتے تھے، اور کمرے میں پھرنے لگتے تھے، کبھی اندر تشریف لے جاتے، اور کبھی باہر تشریف لے جاتے (بخاری و مسلم۔ عائشہؓ) سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ مبارک پر تغیر اور یہ اضطرابی حرکات دراصل اللہ تعالیٰ کے خوف سے تھیں۔ ایک مرتبہ آپ نے سورۃ الحاقہ کی ایک آیت تلاوت فرمائی، اور بے ہوش ہو گئے، (ابن عدی۔ بیہقی) اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :-

وَحَرَّ مُوسَىٰ صَعِقًا (پ ۹، ر ۱ آیت ۱۳۳) اور موسیٰؑ بے ہوش ہو کر گر پڑے۔

ایک مرتبہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے بلخا میں حضرت جبرئیل علیہ السلام کی صورت دیکھی اور بے ہوش ہو گئے (بزار۔ ابن عباسؓ) ایک روایت میں ہے کہ جب آپ نماز میں مشغول ہوتے تو آپ کے سینے کے جوش کی آواز اس طرح سنائی دیتی جیسے ہانڈی میں ابال کی آواز آتی ہے (ابوداؤد، ترمذی۔ عبد اللہ ابن الثمرین) سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام جب بھی میرے پاس آتے ہیں خوف خدا سے لرزے ہوئے آتے ہیں۔ (۱)

روایت ہے کہ جب شیطان لعین کی نافرمانی کا واقعہ پیش آیا تو حضرت جبرئیل اور حضرت میکائیل علیہما السلام رونے لگے، ارشاد ہوا کیوں روتے ہو؟ عرض کیا اہل اہم تیری جگہ سے بے خوف نہیں ہیں، فرمایا اسی طرح رہو، میرے کمرے سے بے خوف مت ہو، محمد ابن المنکدر ارشاد فرماتے ہیں کہ جب دونوں پیدائی گئی تو فرشتوں کے دل ان کے سینوں سے باہر آ گئے، اور جب انسان پیدا کیا گیا تو وہ اپنی جگہ والپس آئے، حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبرئیل علیہ السلام سے دریافت کیا کہ میکائیل بھٹے کیوں نہیں ہیں، انہوں نے جواب دیا کہ جب سے دونوں کی تخلیق ہوئی میکائیل نے مسکراتا ہند کر دیا (احمد، ابن ابی الدنیا) یہ بھی روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بے شمار فرشتے ہیں، ان میں سے کوئی بھی اس وقت سے نہیں ہنسا جب سے

(۱) یہ روایت ابو النبیخ نے دوسرے الفاظ میں نقل کی ہے کہ قیامت کے روز حضرت جبرئیل علیہ السلام جبار تعالیٰ کے حضور اس حال میں کھڑے ہوں گے

کہ خوف خدا سے کانپ رہے ہوں گے۔

دوزخ پیدا کی گئی، اس خوف سے کہ کہیں اللہ تعالیٰ اس سے خفا نہ ہو جائیں اور اسے دوزخ کے عذاب میں نہ ڈال دیں۔ حضرت عبداللہ ابن عمر روایت کرتے ہیں کہ میں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ باہر نکلا، یہاں تک کہ آپ ایک انصاری کے باغ میں داخل ہو گئے، اور کھجوریں جن جن کر کھانے لگے، فرمایا: اے ابن عمر! تم کیوں نہیں کھاتے، میں نے عرض کیا یا رسول اللہ مجھے خواہش نہیں ہے، فرمایا مجھے تو خواہش ہے، یہ جو تھی صبح ہے کہ میں نے کھانا نہیں کھایا، اور نہ مجھے کھانے کی کوئی چیز ملی، حالانکہ اگر میں اپنے پروردگار سے مانگتا تو وہ مجھے روم اور فارس کی سلطنت عنایت فرمادیتا، اے ابن عمر! تمہارا کیا حال ہو گا جب تم ایسے لوگوں میں رہو گے جو اپنے سال بھر کا رزق چھپا کر رکھیں گے، ان کے دلوں میں یقین کمزور ہو گا، حضرت عبداللہ ابن عمر فرماتے ہیں کہ بخدا ہم وہاں سے بچے بھی نہیں تھے کہ یہ آیت نازل ہوئی :-

وَكَايْنِ مَنْ كَايْنٍ لَا تَحْتَمِلُ رِزْقَهَا اللَّهُ يَنْزِلُ رِزْقَهَا وَإِنَّا كُفْرًا لَّعَلَّيْكُمْ (پ ۲۱ آیت ۶۰)

اور بہت سے جانور ایسے ہیں جو اپنی غذا اٹھا کر نہیں رکھتے اللہ ہی ان کو روزی پہنچاتا ہے اور تم کو بھی اور وہ

سب کچھ سنتا ہے اور سب کچھ جانتا ہے۔

سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں مال ذخیرہ کرنے اور شہوات کی اتباع کرنے کا حکم نہیں دیا، جو شخص خالی زندگی کے لئے دینار جمع کرتا ہے (تو اسے یاد رکھنا چاہیے کہ) زندگی اللہ تعالیٰ کے قبضے میں ہے، آگاہ رہو، نہ میں درہم و دینار جمع کرتا ہوں، اور نہ آنے والے کل کے لئے رزق چھپا کر رکھتا ہوں (ابن مروجہ فی التفسیر، بیہقی) حضرت ابوالدرداء روایت کرتے ہیں کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نماز کے لئے کھڑے ہوتے تو خوفِ خدا سے ان کے سینے میں پیدا ہونے والے جوش کی آواز ایک میل کے فاصلے سے سنی جاتی تھی، حضرت مجاہد روایت کرتے ہیں کہ حضرت داؤد علیہ السلام چالیس دن تک مسلسل سجدے میں پڑے رہے اور روتے رہے، یہاں تک کہ ان کے آنسوؤں سے سبزہ آگ آیا اور اس سے ان کا سر چھپ گیا، آواز آئی کہ اے داؤد اگر تم بھوکے ہو تو تمہیں کھانا دیا جائے، پیاسے ہو تو پانی پلایا جائے، ٹھکے ہو تو کپڑا عطا کیا جائے، آپ اس قدر تڑپ کر روئے کہ آپ کی سوزش دل کی حرارت سے لکڑی جل گئی، پھر اللہ تعالیٰ نے ان پر توبہ اور مغفرت نازل فرمائی، آپ نے عرض کیا یا اللہ! میرا گناہ میرے ہاتھ میں کر دے، چنانچہ ان کی خطا ان کی تھیلی پر لکھ دی گئی، آپ جب بھی کھانے پینے یا کوئی چیز اٹھانے کے لئے ہاتھ بڑھاتے تو آپ کی نظر اس لکھے ہوئے پر ضرور پڑتی، اور آپ اپنی خطا کے تصور سے رونے لگتے روایت ہے کہ جب آپ کے پاس پینے کے لئے پانی کا برتن لایا جاتا تو وہ تھائی لبریز ہوتا، اور ہونٹوں تک لے جانے کے وقفے میں آنسوؤں سے بھر جاتا، آپ کے حالات میں یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ آپ نے زندگی بھر حیا کی وجہ سے آسمان کی طرف سر نہیں اٹھایا، آپ اپنی مناجات میں عرض کیا کرتے تھے! اے اللہ! جب میں اپنا گناہ یاد کرتا ہوں تو یہ زمین اپنی وسعت کے باوجود تنگ نظر آتی ہے، اور جب میں تیری رحمت کا تصور کرتا ہوں تو جسم میں جان پڑ جاتی ہے، الہا! تو پاک ہے، تیرے بندوں میں سے جو لوگ طیب ہیں میں اپنے مرض کے علاج کے لئے ان کے پاس گیا انہوں نے تیرا ہی حوالہ دیا، بڑی عجیبی ہے اس شخص کے لئے جو تیری رحمت سے مایوس ہو۔ حضرت فضیل ابن عیاض فرماتے ہیں کہ مجھے یہ روایت پہنچی ہے کہ ایک روز حضرت داؤد علیہ السلام کو اپنا گناہ یاد آیا تو چیخے ہوئے کھڑے ہو گئے، اور اپنے سر پر ہاتھ رکھ کر پہاڑوں کی طرف نکل گئے، آپ کے پاس کچھ درندے جمع ہو گئے، آپ نے فرمایا تم جاؤ، مجھے تم سے غرض نہیں، مجھے وہ چاہیے جو اپنی خطا پر روئے، اور جب بھی میرے پاس آئے روتا ہوا آئے جو شخص خطاوار نہیں ہے اس کا مجھ خطا کار کے پاس کیا کام ہے، جب لوگ کثرتِ بکام پر آپ کو ٹوکے تو آپ ان سے فرماتے مجھے رونے دو، اس سے پہلے کہ رونے کا دن گزر جائے، اس سے پہلے کہ ہڈیاں جل اٹھیں، اور آنتیں سلگنے لگیں، اس سے پہلے کہ مجھے ایسے فرشتوں کے حوالے کر دیا جائے جن کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :-

مَلَائِكَةٌ غِلَاطٌ شِدَادٌ لَا يَعْصُونَ اللَّهَ مَا أَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ۔ (پ ۲۸ ر ۴ آیت ۶)

تند خور مغبوط فرشتے ہیں جو خدا کی ذرا نافرمانی نہیں کرتے کسی بات میں جو ان کو حکم دیتا ہے اور جو کچھ ان کو حکم دیا جاتا ہے اسے فوراً بجالاتے ہیں

حضرت عبدالعزیز ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ جب حضرت داؤد علیہ السلام سے خطا سرزد ہوئی تو آپ کی آواز بیٹھ گئی، آپ نے عرض کیا یا اللہ! صدیقین کی آواز صاف ہے اور میرا گلا بیٹھ گیا ہے، یہ بھی روایت ہے کہ جب آپ بت روئے اور کوئی قائد نہ ہوا تو آپ بد دل ہو گئے، آپ کا رنج و غم بڑھ گیا، آپ نے عرض کیا یا اللہ! کیا آپ میرے رونے پر رحم نہیں فرمائیں گے؟ وحی آئی کہ اے داؤد! تجھے اپنا رونایا دے، گناہ یاد نہیں ہے، عرض کیا: یا اللہ! میں اپنا گناہ کیسے فراموش کر سکتا ہوں، میرا حال تو یہ تھا کہ جب میں زبور کی تلاوت کرتا تھا تو بہتا ہوا پانی ٹھہر جایا کرتا تھا، اور چلتی ہوئی ہوا رک جایا کرتی تھی، پرندے میرے سر پر سایہ افکن ہو جایا کرتے تھے، اور وحشی جانور میری محراب میں جمع ہو جاتے تھے، اہل! یہ کیسی وحشت ہے جو میرے اور میرے درمیان پیدا ہو گئی ہے، اس پر اللہ تعالیٰ نے وحی نازل فرمائی کہ اے داؤد وہ طاعت کا انس تھا اور یہ معصیت کی وحشت ہے، اے داؤد! آدم میری مخلوقات میں سے ایک مخلوق ہے، میں نے اسے اپنے ہاتھ سے پیدا کیا ہے، اور اس میں اپنی روح پھونکی ہے، اور اسے فرشتوں کا مسبود بنایا ہے اور اسے اپنے اکرام کا خلعت پہنایا ہے، اور اپنے تاج کا وقار اس کے سر پر رکھا ہے، پھر جب اس نے تمنا کی کاٹھکھو کیا تو میں نے اپنی باندی خواہ اسے اس کا جوڑا بنایا اور اسے اپنی جنت میں رہنے کا شرف بخشا، پھر اس نے نافرمانی کی تو میں نے اسے ذلیل اور بے رحم کر کے اپنے سے دور کر دیا، اے داؤد! میری بات سن، میں حق کہتا ہوں، اگر تو نے ہماری اطاعت کی تو ہم تیری اطاعت کریں گے جو تو مانگے گا وہ دیں گے، اور اگر تو نے ہماری نافرمانی کی تو ہم تجھے نظر انداز کر دیں گے، اس کے باوجود اگر تو نے ہماری طرف رجوع کیا تو ہم تجھے قبول کریں گے۔

حضرت یحییٰ ابن کثیر روایت کرتے ہیں کہ جب حضرت داؤد علیہ السلام نوحہ کرنے کا ارادہ فرماتے تو سات دن پہلے سے کھانا پینا ترک کر دیتے، اور عورتوں کے پاس بھی نہ جاتے، پھر جب ایک دن باقی رہ جاتا تو ان کے لئے ایک منبر جنگل میں نکالا جاتا، آپ حضرت سلیمان علیہ السلام کو حکم فرماتے تھے کہ وہ باؤ واز بلند اعلان کریں یہاں تک کہ وہ آواز شہروں اور اطراف میں پھیل جائے، اس آواز سے جنگل، پہاڑ، ٹیلے، بنگلے اور عبادت خانے گونج اٹھیں، حضرت سلیمان علیہ السلام یہ اعلان فرماتے کہ جو شخص حضرت داؤد علیہ السلام کا نوحہ سنا چاہتا ہے وہ آئے، چنانچہ جنگلوں سے وحشی جانور، پہاڑوں سے درندے، گھوسلوں سے پرندے، اور گھروں میں رہنے والی پردہ نشین خواتین آئیں، اور لوگ بھی جمع ہوئے، اس کے بعد حضرت داؤد علیہ السلام تشریف لاتے، منبر پر تشریف رکھتے، بنی اسرائیل کے لوگ ان کے منبر کو گھیر لیتے، ہر صنف کے افراد الگ الگ رہتے، حضرت سلیمان علیہ السلام آپ کے سر پر کھڑے ہوتے، پہلے آپ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء بیان فرماتے، لوگ چیخنے چلانے لگتے، پھر جنت اور دوزخ کا تذکرہ فرماتے، اس سے زمین کے اندر رہنے والے جانور، کچھ وحشی اور درندے اور کچھ انسان مرجاتے پھر قیامت کی وحشتوں کا ذکر ہوتا اور اپنے نفس پر گریہ فرماتے، اس سے ہر صنف کے بہت سے افراد مرجاتے، جب حضرت سلیمان علیہ السلام یہ دیکھتے کہ مرنے والوں کی کثرت ہو گئی ہے تو عرض کرتے اہا جان! آپ نے سننے والوں کے گلے گلے کر دیے ہیں، بنی اسرائیل کے بہت سے گروہ مرج چکے ہیں، اور بے شمار وحشی، درندے اور حشرات الارض بھی ہلاک ہو چکے ہیں، آپ یہ سن کر دعاما گئے لگتے، اسی اثناء میں بنی اسرائیل کا کوئی عابد باؤ واز بلند کہتا، اے داؤد! تو نے جزا مانگنے میں جلدی کی ہے، راوی کہتے ہیں اتنا سنتے ہی آپ بے ہوش ہو کر گر جاتے۔ جب حضرت سلیمان علیہ السلام یہ کیفیت دیکھتے تو ایک چارپائی منگواتے، اور انہیں اس پر لٹاتے، اور یہ منادی کراتے کہ اگر کسی کا دوست، عزیز، یا شامسا داؤد کے اجتماع میں تھا تو وہ چارپائی لے کر جائے اور اسے اٹھالائے اس لئے کہ جنت اور دوزخ کے ذکر نے اسے ہلاک کر ڈالا ہے، ایک عورت چارپائی لے کر آئی، اور اس پر اپنے شوہر کو یہ کہتے ہوئے لٹاتی اے وہ شخص جسے دوزخ کے ذکر نے ہلاک کر دیا، اے وہ شخص جسے خوف خدا نے قتل کر دیا، جب حضرت داؤد علیہ السلام کو افاقہ ہوتا تو آپ کھڑے ہوتے اور سر پر ہاتھ رکھ کر اپنے عبادت خانے میں چلے جاتے، اندر سے دوازا بند کر لیتے، اور عرض کرتے اے داؤد کے مالک! کیا تو داؤد سے

ناراض ہے، حضرت داؤد علیہ السلام اسی طرح اپنے رب کے ساتھ مناجات میں مشغول رہتے، یہاں تک کہ حضرت سلیمان علیہ السلام دیوازے پر دستک دیتے، اور عرض کرتے کہ میں جو کی ایک روٹی لے کر حاضر ہوا ہوں، آپ کچھ تناول فرمائیں، اور اپنے مقصد پر تقویت حاصل فرمائیں آپ اس روٹی میں سے کسی قدر کھاتے، اور پھر یہی اسرائیل میں تشریف لے جاتے۔

بیزیر قاشی فرماتے ہیں کہ ایک روز حضرت داؤد علیہ السلام چالیس ہزار افراد سے خطاب کرنے کے لئے تشریف لے گئے، آپ نے انہیں وعظ و نصیحت فرمائی، اللہ سے ڈرایا، یہاں تک کہ ان میں سے تیس ہزار آدمی ہلاک ہو گئے، صرف دس ہزار افراد کے ساتھ آپ واپس تشریف لائے، یہ بھی روایت ہے کہ آپ کے پاس دو ہانڈیاں تھیں جن کے سپرد یہ کام تھا کہ جب حضرت داؤد خوف خدا کی وجہ سے ترپنے لگیں اور بے ہوش ہو جائیں تو یہ دونوں ہانڈیاں آپ کے اعضاء کو پٹ جائیں تاکہ آپ کے جسم کے جوڑ سلامت رہیں۔

حضرت عبداللہ ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ حضرت یحییٰ ابن زکریا علیہما السلام آٹھ برس کے تھے جب وہ بیت المقدس میں گئے، وہاں انہوں نے عابدین کو دیکھا کہ وہ ہال اور اون کے کپڑے پہنے ہوئے ہیں، ان میں بھی جو اعلا درجے کے عابد ہیں انہوں نے اپنے گلے کی ہڈیاں چیر کر ان میں زنجیریں ڈال رکھی ہیں، اور ان زنجیروں کے ذریعے اپنے جسموں کو بیت المقدس کے ستونوں سے باندھ رکھا ہے، حضرت یحییٰ عبادت اور مجاہدے کے یہ مناظر دیکھ کر خوف سے کانپ اٹھے، جب وہ اپنے والدین کے پاس لوٹے گئے تو راستے میں انہیں بہت سے بچے مختلف کھیلوں میں مشغول نظر آئے، ان بچوں نے انہیں بھی اپنے ساتھ کھیلنے کی دعوت دی، لیکن انہوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میں کھیلنے کے لئے پیدا نہیں ہوا ہوں، اس کے بعد اپنے والدین کے پاس پہنچے، اور ان سے درخواست کی کہ وہ انہیں بالوں کا لباس بنا کر دیں، ماں باپ نے ان کی مرضی کے مطابق لباس تیار کرادیا، یہ لباس پہن کر آپ بیت المقدس تشریف لے آئے، دن کو اس کی خدمت کرتے، اور رات بھی وہاں بسر کرتے، اسی حالت میں آپ نے پندرہ برس گزار دیے، اس کے بعد آپ وہاں سے نکلے، اور بہانوں اور گھائیوں میں رہنے لگے، ان کے والدین انہیں ڈھونڈنے نکلے کافی جستجو کے بعد وہ بحر اردن کے کنارے اس حال میں ملے کہ اپنے دو پاؤں پانی میں ڈالے ہوئے تھے، اور پیاس کی شدت سے پریشان تھے، لیکن پی نہیں رہے تھے، اور کہہ رہے تھے کہ قسم ہے تیری عزت اور عظمت کی میں اس وقت تک ٹھنڈا پانی نہیں پیوں گا جب تک مجھے یہ معلوم نہیں ہو گا کہ تیرے نزدیک میرا مقام کیا ہے، آپ کے والدین کے پاس جو کی ایک روٹی تھی، انہوں نے زور دیا کہ وہ روٹی کھائیں اور پانی پئیں، انہوں نے اپنے والدین کی خواہش کا احترام کیا، ان کی دی ہوئی روٹی کھائی، اور ٹھنڈا پانی پیا بعد میں اپنی قسم کا کفارہ ادا کیا اللہ تعالیٰ نے ان کے اس وصف کو بھی سراہا ہے کہ وہ اپنے والدین کے مطیع تھے، فرمایا :-

وَبَرَّ أَبُوالْكَیْفِ (پ ۴۲ آیت ۳۷) اور اپنے والدین کے اطاعت گزار تھے۔

ابن عمرؓ نے فرمایا کہ اس واقعے کے بعد حضرت یحییٰ کے والدین انہیں بیت المقدس سے لے آئے، آپ نے گھر پر عبادت شروع کر دی، جب آپ نماز کے لئے کھڑے ہوتے تو اس قدر روتے کہ شجر و حجر بھی رونے لگتے، حضرت زکریا علیہ السلام بھی ان کے رونے سے اس قدر روتے کہ بیہوش ہو جاتے، آپ اس قدر رویا کرتے تھے کہ آنسوؤں کی حرارت سے آپ کے دونوں رخساروں کا گوشت جل گیا تھا، اور منہ کے اندر کی داڑھیں نظر آنے لگی تھیں، یہ حال دیکھ کر ان کی والدہ نے کہا کہ اگر تمہاری اجازت ہو تو میں کوئی ایسی چیز بنا دوں سے جس تمہارا گوشت چھپ جائے اور داڑھیں نظر نہ آئیں، چنانچہ انہوں نے غدے کے دو ٹکڑے لے کر ان کے رخساروں پر چپکا دیے، اس کے بعد آپ جب بھی نماز کے لئے کھڑے ہوتے، اور آنسو بہاتے تو وہ دونوں ٹکڑے گلیے ہو جاتے، اور ان کی والدہ وہ ٹکڑے نچوڑ کر پھر ان کے رخساروں پر چپکا دیتیں، ایسے موقع پر اپنے آنسو دیکھ کر آپ فرماتے اے اللہ! یہ میرے آنسو ہیں، اور یہ میری والدہ ہیں، اور میں تیرا بندہ ہوں اور تو ارحم الراحمین ہے۔ ایک دن حضرت زکریا علیہ السلام نے ان سے فرمایا اے بیٹے! میں نے تو اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کی تھی کہ تجھے میری آنکھوں کی ٹھنڈک بنادے جب کہ تو روتا ہی رہتا ہے، انہوں نے عرض کیا ابا جان! مجھے حضرت جبرئیل علیہ السلام نے یہ خبر دی ہے کہ جنت اور دوزخ کے درمیان ایک گھاٹی ہے جسے وہی شخص

عبور کر سکتا ہے جو بہت زیادہ رونے والا ہو۔ یہ سن کر حضرت زکریا علیہ السلام نے فرمایا اے بیٹے! تب تمہیں ضرور رونہ چاہیے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ارشاد فرمایا : اے گروہ حواریین! اللہ کا خوف اور جنت کی محبت آدمی کو مشقت پر صبر کرنے کا حوصلہ دیتی ہے اور دنیا سے دور کرتی ہے، میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جو کھانا اور نالیوں پر کتوں کے ساتھ سوتا۔ روایت ہے کہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ کو جب اپنا قصور یاد آتا تو بیہوش ہو جاتے اور ان کے قلب کے اضطراب کی آواز ایک میل کے فاصلے سے سنی جاتی، حضرت جبرئیل علیہ السلام آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور عرض کرتے کہ آپ کا رب آپ کو سلام کہلاتا ہے اور فرماتا ہے کہ کیا دوست دوست سے ڈرتا ہے، حضرت ابراہیم نے فرمایا : اے جبرئیل جب مجھے اپنا گناہ یاد آتا ہے تو دوستی بھول جاتا ہوں۔ یہ ہیں انبیاء علیہم السلام کے احوال، تمہیں ان کے احوال میں غور کرنا چاہیے۔ یہ حضرات اللہ تعالیٰ کی صفات سے اس کی دوسری مخلوق کے مقابلے میں زیادہ واقف ہیں۔ ان بزرگوں پر اور اللہ تعالیٰ کے تمام مقرب بندوں پر اس کی رحمتیں نازل ہوں۔

شدت خوف میں صحابہ کرام، تابعین اور سلف صالحین کے حالات : روایت ہے کہ حضرت ابو بکر الصديق نے ایک پرندے سے فرمایا کاش میں تیرے جیسا پرندہ ہوتا، آدمی نہ ہوتا۔ حضرت ابو ذر ارشاد فرمایا کرتے تھے کاش میں درخت ہوتا جسے کاٹ دیا جاتا، یہی بات حضرت طلحہؓ فرمایا کرتے تھے، حضرت عثمانؓ فرماتے تھے میری خواہش یہ ہے کہ مرنے کے بعد اٹھایا نہ جاؤں، حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں میری خواہش ہے کہ میں بالکل نیست و نابود ہو جاؤں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت عمرؓ خوف کے مضامین پر مشتمل کوئی آیت قرآنی سنتے تو مارے خوف کے بے ہوش ہو جاتے اور بیمار پڑ جاتے، پھر کئی دن تک ان کی عیادت کی جاتی، ایک روز انہوں نے زمین سے ایک ٹکڑا اٹھایا اور کہنے لگے کاش میں یہ ٹکڑا ہوتا، کاش میں کوئی قابل ذکر چیز نہ ہوتا، کاش میں نسیا نہ ہوتا، کاش مجھے میری ماں نہ جنتی، حضرت عمرؓ کے چہرے پر آنسوؤں کی دوسیاہ لکیریں تھیں، حضرت عمرؓ یہ بھی فرمایا کرتے کہ جو شخص اللہ سے ڈرتا ہے وہ غصہ نہیں کرتا اور اپنی مرضی کے مطابق عمل نہیں کرتا، اگر قیامت نہ ہوتی تو تم کچھ اور ہی منہ دیکھتے۔ ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے یہ سورت تلاوت فرمائی ”وَإِذَا السَّمَاسُ كُوِّرَتْ“ جب آپ اس آیت پر پہنچے ”وَإِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ“ تو فٹ کھا کر گر پڑے، ایک مرتبہ آپ کسی شخص کے گھر کے پاس سے گزرے، وہ شخص اس وقت سورہ النور کی تلاوت کر رہا تھا، آپ ٹھہر کر اس کی تلاوت سننے لگے، جب وہ شخص اس آیت پر پہنچا۔

إِنْ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ مَّا لَ الْمُؤْمِنُ كَافِيعٌ (پ ۳۲ آیت ۷)

بے شک آپ کے رب کا عذاب ضرور ہو کر رہے گا اور اسے کوئی دور نہ کر سکے گا۔

تو آپ اپنے گھر سے اتر پڑے اور دیوار سے سارا لگا کر کھڑے رہ گئے، دیر تک اسی حالت پر رہے، پھر گھر واپس تشریف لے گئے اور بیمار پڑ گئے، لوگ ایک مہینے تک ان کی عیادت کے لئے آتے رہے، لیکن کسی کو یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ ان کو کیا مرض لاحق ہوا ہے۔ ایک مرتبہ حضرت علیؓ نے فجر کی نماز کا سلام پھیرا تو طبیعت کچھ بوجھل تھی، اور آپ اضطرابی کیفیت میں جھلا تھے، اسی حالت میں آپ نے لوگوں سے فرمایا : میں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کو دیکھا ہے، میں آج کوئی ایسی بات نہیں دیکھتا جن میں ان کی مشابہت پائی جاتی ہو، وہ لوگ پر آئندہ بال زرد ہو، اور غبار آلود تھے، ان کی دونوں آنکھوں کے درمیان بکری کے زانو کے برابر نشانات تھے، راتوں کو اللہ کے لئے سر سجدہ رہتے، قیام کرتے، اور اللہ کی کتاب کی تلاوت کرتے، عبادت میں پیشانی اور پاؤں پر باری باری زور ڈالتے، صبح ہوتی تو اس طرح لرزتے جس طرح تیز ہوا میں درخت ہلے ہیں، ان کی آنکھیں اس قدر اشک بہا تھیں کہ دامن تر ہو جاتے، بخدا اب مجھے ایسا لگتا ہے کہ میں ان لوگوں کے ساتھ ہوں جو غفلت کی نیند سوتے ہیں، یہ کہہ کر آپ کھڑے ہو گئے، اس تقریر کے بعد آپ کو کسی نے مسکراتے ہوئے نہیں دیکھا، یہاں تک کہ ابن مسلم نے انہیں زخمی کر دیا، عمران ابن حصین کہتے ہیں میری خواہش یہ ہے کہ میں راکھ بن جاؤں جسے ہوائیں اُدھر سے اُدھر لئے پھریں، اور میرے اجزاء بکھیر دیں، حضرت ابو عبیدہ ابن الجراحؓ فرماتے ہیں میری تمنا یہ ہے کہ میں مینڈھا بن جاؤں میرے گھروالے مجھے ذبح کریں اور میرا گوشت

کہا میں اور شور بہ پی لیں، حضرت علی ابن الحسین وضو کرتے تو آپ کا چہرہ زرد ہو جاتا، گھروالے دریافت کرنے کہ آخر وضو کے وقت آپ کا یہ حال کیوں ہو جاتا ہے آپ جواب دیتے کیا تمہیں معلوم نہیں میں کس کے ربوہ کھڑا ہونا چاہتا ہوں۔ حضرت موسیٰ ابن مسعود فرماتے ہیں کہ جب ہم حضرت سفیان ثوری کی خدمت میں حاضر ہوتے تو ایسا محسوس ہوتا گویا آگ گھیرے ہوئے ہو، کیوں کہ ثوری پر جزع و فزع کی کچھ ایسی ہی کیفیت طاری رہتی تھی، ایک مرتبہ منبر القاری نے یہ آیت تلاوت کی :-

هَذَا كِتَابُنَا يَنْطِقُ عَلَيْكُمْ بِالْحَقِّ اِنَّا كُنَّا نَسْتَنْسِخُ مَا كُنْتُمْ نَعْمَلُونَ۔ (پ ۲۵ ر ۲۰ آیت ۲۹)

یہ ہمارا دفتر ہے جو تمہارے مقابلے میں بالکل ٹھیک بول رہا ہے اور ہم تمہارے اعمال کو لکھواتے جاتے تھے۔ یہ آیت سن کر حضرت عبدالواحد ابن زید رونے لگے، اور اتنا رونے کہ بے ہوش ہو گئے، جب افادہ ہوا تو کہنے لگے قسم ہے تیری عزت کی جہاں تک مجھ سے ہو سکے گا میں تیری نافرمانی نہیں کروں گا تو اطاعت پر میری مدد فرما، اور مجھے توفیق عطا کر۔ مسور ابن محزمہ اپنے خوف کی شدت کی بناء پر قرآن کریم کی تلاوت نہ سن سکتے تھے، جب بھی کوئی شخص ان کے سامنے ایک لفظ یا ایک آیت پڑھتا تو پیچھے چلائے لگتے، حواس باختہ ہو جاتے، اور کئی روز تک اسی حال پر رہتے، ایک مرتبہ قبیلہ خثعم کا ایک شخص ان کے پاس آیا اور اس نے یہ آیت تلاوت کی :-

يَوْمَ نَحْشُرُ الْمُتَّقِينَ إِلَى الرَّحْمَنِ وَفِدًا وَنَسُوقُ الْمُجْرِمِينَ إِلَى جَهَنَّمَ وَرُكَّاءَ۔ (پ ۱۱ ر ۹ آیت ۸۶)

جس روز ہم متقیوں کو رحمن کی طرف سمان بنا کر جمع کریں گے اور مجرموں کو دوزخ کی طرف ہانکیں گے۔ یہ آیت سن کر کہنے لگے میں مجرمین میں سے ہوں، متقین میں سے نہیں ہوں، اس کے بعد قاری سے کہا کہ اس آیت کو دوبارہ پڑھو، اس نے دوبارہ تلاوت کی، دوسری بار یہ آیت سنی تو بے اختیار ہو کر چیخ پڑے، اور اسی حال میں اپنے مولیٰ سے جا ملے، بچی کے سامنے جنہیں لوگ ان کے زیادہ رونے کی بنا پر بکاء کہا کرتے تھے یہ آیت پڑھی گئی :-

وَلَوْ تَرَىٰ اِذْ ذُقْتُمْ اَعْلَى النَّارِ۔ (پ ۷ ر ۹ آیت ۲۱)

آپ (اس وقت) دیکھیں جب کہ یہ دوزخ کے پاس کھڑے کئے جائیں گے۔

یہ آیت سن کر چیخ اٹھے، اور تقریباً چار ماہ تک صاحب فراش رہے، پھر کے اطراف سے لوگ ان کی عیادت کے لئے آیا کرتے تھے۔ حضرت مالک ابن دینار کہتے ہیں ایک مرتبہ میں خانہ کعبہ کا طواف کر رہا تھا کہ میری نگاہ ایک جوان عورت پر پڑی جو کعبہ کا پردہ تھامے ہوئے یہ کہہ رہی تھی : رب العالمین! بہت سی شہوتوں کی لذتیں جاتی رہیں، صرف ان کا عذاب باقی رہ گیا یا اللہ! کیا آگ، اور دوزخ کے علاوہ کوئی اور چیز ایسی نہیں ہے جسے تو بطور سزا تجویز کرتا، یا جس سے تو کٹنا ہکا بدوں کی تادیب کرتا، وہ عورت اسی طرح روتی رہی یہاں تک کہ فجر کا وقت آگیا، مالک کہتے ہیں میں نے اس عورت کا یہ حال اور اس کی یہ گریہ و زاری دیکھ کر ایک چیخ ماری اور اپنی زندگی پر لعنت بھیجی۔ روایت ہے کہ فضیل ابن عیاض کو عرفے کے روز دھاڑیں مار مار کر روتے ہوئے دیکھا گیا، وہ صبح سے شام تک اس طرح روتے رہے جیسے کوئی ماں اپنے بچے کے فراق میں روتی ہو، لوگ دعا کرتے رہے، غروب آفتاب کے وقت انہوں نے اپنی دائرہ می پکڑی اور آسمان کی طرف منہ کر کے فرمایا اگر تو نے مجھے بخش بھی دیا تب بھی مجھے اپنے آپ پر شرم آئے گی، پھر وہ لوگوں کے ساتھ لوٹ آئے، حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے خائفین کے متعلق دریافت کیا گیا، انہوں نے جواب دیا خائفین وہ لوگ ہیں جن کے دل زخمی ہوتے ہیں، اور آنکھیں گریاں، وہ لوگ یہ کہتے ہیں ہم کیسے نہیں جب کہ موت ہمارے پیچھے ہے، قبر ہمارے سامنے ہے، قیامت ہمارا وعدہ گاہ ہے، جہنم ہماری گذر گاہ ہے، اور باری تعالیٰ کے سامنے ہمیں کھڑا ہونا ہے۔ حضرت حسن ایک ایسے نوجوان کے پاس سے گذرے جو کچھ لوگوں کے درمیان بیٹھا ہوا بے تحاشا ہنس رہا تھا، آپ نے اس سے دریافت کیا اے نوجوان! کیا تو پہل صراط سے گذرا ہے؟ اس نے عرض کیا نہیں! آپ نے سوال کیا تجھے معلوم ہے کہ پہل صراط سے گذر کر تو جنت میں جائے گا یا دوزخ میں؟ اس نے اس سوال کا جواب بھی نفی میں دیا، آپ نے فرمایا جب تیری لاعلمی کا حال یہ ہے تو پھر یہ قہقہے کیسے

ہیں، راوی کہتے ہیں کہ اس تنبیہ کے بعد اس نوجوان کو ہشتے ہوئے نہیں دیکھا گیا۔ حماد ابن عبد ربیع بھی بیٹھے اس طرح بیٹھے جیسے ابھی کھڑے ہو جائیں گے، لوگ عرض کرتے اطمینان سے تشریف رکھیں، فرماتے اطمینان کے ساتھ تو وہ شخص بیٹھ سکتا ہے جسے خوف نہ ہو، میں نے اللہ کی نافرمانی کی ہے اس لئے میرے دل میں سزا کا خوف ہے۔ حضرت عمر ابن عبد العزیز فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے بندوں کے دلوں کی غفلت کو ان کے لئے رحمت بنا دیا ہے تاکہ وہ اس کے خوف سے ہلاک نہ ہو جائیں۔ حضرت مالک ابن دینار کہتے ہیں کہ میرا ارادہ یہ ہے کہ لوگوں سے کہہ دوں کہ جب میں مراؤں تو مجھے زنجیروں میں باندھ دیں، اور گلے میں طوق ڈال کر اس طرح لے جائیں جس طرح بھاگے ہوئے غلام کو پکڑ کر آقا کے سامنے لے جایا جاتا ہے۔ حضرت حاتم اصم فرماتے ہیں کہ اگر تمہیں کوئی اچھی جگہ مل جائے تو اس پر نازاں مت ہو اس لئے کہ جنت سے زیادہ اچھی جگہ کوئی دوسری نہیں ہے، اور اس میں حضرت آدم علیہ السلام کا جو حال ہوا وہ تم پر عیاں ہے، اسی طرح کثرت عبادت پر بھی غور نہ کرو اس لئے کہ طویل ترین عبادت کے بعد ابلیس کا کیا حشر ہوا اس سے تم واقف ہو، کثرت علم پر بھی نہ اتراؤ، اس لئے کہ بلعام اسم اعظم اچھی طرح جانتا تھا مگر اس کا انجام کیا ہوا، اور نہ صالحین کی زیارت پر اکڑو، اس لئے کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کوئی شخص جلیل القدر نہیں ہو سکتا لیکن آپ کے بہت سے دشمنوں اور قریبی عزیزوں کو بھی آپ کی زیارت سے فائدہ نہیں ہوا۔ حضرت سری ستمی فرماتے ہیں میں دن بھر میں کئی مرتبہ اپنی ناک پر نظر ڈالتا ہوں کہ کہیں میرا چہرہ سیاہ نہ پڑ گیا ہو، ابو شخص کہتے ہیں کہ بچے چالیس سال سے میرے دل میں یہ اعتقاد راسخ ہے کہ اللہ تعالیٰ میری طرف غصے سے دیکھتے ہیں، اور میرے اعمال میں بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔ ایک مرتبہ حضرت عبد اللہ ابن المبارک اپنے رفقاء میں تشریف لائے اور کہنے لگے کہ رات میں نے اپنے رب پر جرات کی ہے یعنی اس سے جنت کا سوال کر بیٹھا ہوں۔ محمد ابن کعب القرظی کی والدہ نے ان سے کہا: بیٹے! میں تجھے دیکھتی ہوں تو بچپن سے بھی پاکباز اور نیک تھا، اور بڑا ہو کر بھی پاکباز اور نیک رہا، پھر یہ رات دن کی عبادت کیوں کرتا ہے، میرے خیال سے تو یہ ایک مشقت ہے جو تو نے اپنے اوپر ڈال لی ہے، انہوں نے عرض کیا: ائی جان! بھلا میں کیسے بے خوف ہو جاؤں؟ ہو سکتا ہے اللہ تعالیٰ میرے کسی گناہ پر مطلع ہو گیا ہو اور وہ ناراض ہو کر یہ فرمادے کہ مجھے اپنی عزت و جلال کی قسم ہے میں تیری مغفرت نہیں کروں گا۔

حضرت فضیل ابن عیاض فرماتے ہیں کہ میں نے کسی تغیر پر رشک کرتا ہوں، نہ کسی مقرب فرشتے پر رشک کرتا ہوں اور نہ کسی بندے پر رشک کرتا ہوں، کیا یہ لوگ قیامت کے روز باری تعالیٰ کا سامنا نہیں کریں گے، میں صرف ان لوگوں پر رشک کرتا ہوں جو پیدا نہیں کئے گئے۔ روایات میں ہے کہ ایک انصاری نوجوان کے دل میں دونخ کا خوف سا گیا، وہ اس خوف سے مسلسل روتا رہتا، یہاں تک کہ گھر میں قید ہو کر رہ گیا، اس کا حال سن کر سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اس کے پاس تشریف لے گئے اور اسے اپنے گلے سے لگایا، وہ اسی وقت مردہ ہو کر گر پڑا، سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے فرمایا اپنے ساتھی کی تجبیز و تکفین کرو، دونخ کے خوف نے اس کے دل کو پاؤں پارہ کر دیا ہے (ابن ابی الدنیا۔ ابو حذیفہ، بیہقی۔ سل ابن سعد)۔ ابن ابی میسرۃ سے مروی ہے کہ وہ جب اپنے بستر پر جاتے تو یہ کہتے کاش میری ماں نے مجھے نہ جنا ہوتا، ایک روز ان کی والدہ نے فرمایا: بیٹے اللہ تعالیٰ نے تجھے بہتر حال میں رکھا ہے، تجھے اسلام کی ہدایت سے نوازا ہے، میسرۃ نے عرض کیا آپ کی بات صحیح ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے یہ بات صاف طور پر بیان فرمائی ہے کہ ہم دونخ پر وارد ہوں گے، لیکن یہ نہیں فرمایا کہ ہم دونخ سے نکل بھی آئیں گے، فرقہ سخی سے کسی نے دریافت کیا کہ اگر تمہیں بنی اسرائیل کا کوئی عجیب و غریب واقعہ معلوم ہو تو ہمیں ضرور بتلاؤ، انہوں نے کہا مجھے یہ واقعہ بتلایا گیا ہے کہ ایک دن بیت المقدس میں پانچ سو عورتیں پہنچیں، ان سب کا لباس کھل اور ٹاٹ کا تھا، انہوں نے اللہ تعالیٰ کے ثواب و عذاب اور جنت و دونخ پر مذاکرہ کیا، اور سب کی سب اسی روز مرگئیں، عطاء سلمیٰ کے خوف کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے کبھی جنت کی دعا نہیں مانگی، جب بھی دعا مانگی غم و مغفرت کی مانگی، مرض الوفا کے دوران ان سے عرض کیا گیا کہ آپ کو کسی چیز کی خواہش تو نہیں؟ انہوں نے فرمایا کہ جہنم کے خوف نے میرے دل میں کسی خواہش کی جگہ ہی نہیں چھوڑی ہے، کہا جاتا ہے کہ انہوں نے کبھی

آسمان کی طرف سر نہیں اٹھایا، اور نہ چالیس برس تک ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دیکھی گئی، ایک روز ان کی نظر اتفاقاً آسمان کی طرف اٹھ گئی، اسی وقت دل خوف سے لرز گیا، گر پڑے، اور جسم کی ایک آنٹ چھٹ گئی، آپ کا یہ بھی معمول تھا کہ رات میں اپنا جسم ٹٹول ٹٹول کر دیکھتے کہ کہیں مسخ نہ ہو گیا ہو، اگر کبھی آندھی چلتی یا بجلی چمکتی، یا غلے کے دام بڑھتے تو فرماتے کہ یہ مصائب میری وجہ سے نازل ہوئے ہیں، اگر عطاء مرجائے تو لوگ چین کا سانس لیں۔ فرماتے تھے کہ ایک مرتبہ ہم عقبہ غلام کے ساتھ نکلے، ہم میں بوڑھے بھی تھے اور جوان بھی، ان سب کی عبادت و ریاضت کا عالم یہ تھا کہ عشاء کی وضو سے صبح کی نماز پڑھا کرتے تھے، ان کے پاؤں طول قیام کی وجہ سے روتا جاتے تھے، ان کی آنکھیں اندر کودھٹس جاتی تھیں اور ان کی کھالیں ہڈیوں سے چپک جاتی تھیں، اور ان کی رگیں اس طرح سوکھ جاتی تھیں گویا تار ہوں، اور ان کا حال یہ ہو جاتا تھا گویا خرپوزے کے چھلکے ہوں، جسوں میں جان باقی نہیں رہتی تھی، گلتا تھا ابھی قبروں سے باہر نکلے ہیں یہ لوگ کہا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے اطاعت گزاروں کو عزت بخشی ہے، اور گناہگاروں کو رسوا کیا ہے۔ ان ہی بزرگوں میں سے ایک شخص کا واقعہ ہے کہ وہ ایک دن کہیں چلے جا رہے تھے کہ راستے میں بے ہوش کر کر پڑے، حالانکہ سردی شدید تھی مگر ان کی پیشانی پسینے سے تر ہو رہی تھی ان کے رفقاء یہ حالت دیکھ کر رونے لگے، ان کے چہرے پر پانی وغیرہ ڈالا گیا تاکہ ہوش میں آجائیں، جب ہوش میں آئے تو ان سے کیفیت دریافت کی گئی، کہنے لگے کہ مجھے یہ بات یاد آگئی کہ میں نے اس جگہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی تھی، صالح مری کہتے ہیں کہ ایک روز میں نے ایک بزرگ کے روبرو یہ آیت پڑھی: **يَوْمَ تَقْلُبُ وُجُوهُهُمْ فِي النَّارِ يَقُولُونَ يَا لَيْتَنَا أَطَعْنَا اللَّهَ وَأَطَعْنَا الرَّسُولَ**۔ (پ ۵۲ آیت ۲۱) جس روز ان کے چہرے دوزخ میں الٹ پلٹ کئے جائیں گے یوں کہتے ہوں گے اے کاش ہم نے اللہ کی اطاعت کی ہوتی اور ہم نے رسول کی اطاعت کی ہوتی۔

وہ بزرگ یہ آیت سن کر بے ہوش ہو گئے، کچھ دیر بعد ہوش میں آئے تو کہنے لگے اے صالح! کچھ اور پڑھو، مجھے تکلیف محسوس ہو رہی ہے میں نے یہ آیت تلاوت کی۔

كَلِمَاتٍ اَرْادُوا اَنْ يَخْرُجُوا مِنْهَا اَعْيَنُوا فَاِيفِيهَا۔ (پ ۷۹ آیت ۷۷)

وہ لوگ جب تکلیف سے (گھبرا جائیں گے اور) اس سے باہر نکلنا چاہیں گے تو پھر اسی میں دھکیل دیے جائیں گے۔

یہ آیت سن کر وہ بزرگ انتقال کر گئے، زرارہ ابن ابی اوفیٰ نے ایک روز صبح کی نماز پڑھائی، جب اس آیت پر پہنچے۔

فَاِنَّا نَقِرُ فِي النَّاقُورِ۔ (پ ۲۹ آیت ۸) پھر جب سور پھونکا جائے گا۔

تو بے ہوش ہو کر گر پڑے، اور اسی حالت میں انتقال کر گئے۔ یزید الرقاشی حضرت عمر ابن عبدالعزیز کے پاس تشریف لے گئے، حضرت عمرؓ نے ان سے فرمایا یزید! مجھے کچھ نصیحت کیجئے، انہوں نے فرمایا: امیر المومنین! آپ پہلے خلیفہ نہیں ہیں جو مرے گئے، حضرت عمرؓ نے فرمایا کچھ اور کہئے، فرمایا: امیر المومنین! حضرت آدم کے اور آپ کے درمیان آپ کا کوئی جدا امجد ایسا نہیں جو رخصت نہ ہوا ہو، حضرت عمرؓ نے فرمایا کچھ اور نصیحت فرمائیں، فرمایا: امیر المومنین! آپ کے اور جنت و دوزخ کے درمیان کوئی منزل نہیں ہے، یہ سن کر حضرت عمر ابن عبدالعزیز بے ہوش ہو گئے۔ میمون ابن مہران کہتے ہیں کہ جب قرآن کریم کی یہ آیت نازل ہوئی: **وَالَّذِينَ فِي جَهَنَّمَ لَمَوْعِدُهُمْ أَجْمَعِينَ** (پ ۳۳ آیت ۳۳) اور ان سب سے جہنم کا وعدہ ہے۔

تو حضرت سلمان الفارسی کی چیخ نکل گئی، اور سر پیٹتے ہوئے بھاگ نکلے، اس واقعے کے بعد تین دن تک نظر نہیں آئے۔ (۱) داؤد طائی نے ایک عورت کو دیکھا کہ اپنے بیٹے کی قبر کے سرہانے کھڑی ہوئی رو رہی ہے، اور کہہ رہی ہے اے بیٹے نہ جانے تیرے کون سے رخسار کو کیرنوں نے پہلے کھایا، داؤد طائی یہ سنتے ہی بے ہوش ہو کر پڑے۔ ایک مرتبہ حضرت سفیان ثوری بیمار پڑے تو ان کا قارورہ ایک ذمی طبیب کو دکھلایا گیا، طبیب نے کہا اس شخص کا جگر خوف کی وجہ سے کھڑے کھڑے ہو گیا ہے، اس کے بعد ان کی

نبض دکھائی گئی، طیب نے نبض دیکھ کر کہا اس جیسا شخص ملت اسلامیہ میں مجھے نہیں ملا، حضرت امام احمد ابن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ میں نے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کی کہ مجھ پر خوف کا دروازہ کھول دیجئے، اس کے بعد میرے دل میں اس قدر خوف پیدا ہوا کہ مجھے اپنی عقل میں فتور پیدا ہونے کا اندیشہ ہو گیا، اس کے بعد میں نے یہ دعا کی اے اللہ مجھے اتنا خوف دیجئے جو میری طاقت سے باہر نہ ہو، تب جا کر کہیں میری حالت درست ہوئی، اور دل میں سکون پیدا ہوا، حضرت عبداللہ ابن عمرو بن العاصؓ فرماتے ہیں روؤ، اگر نہ رو سکو تو رونی صورت بنالو، اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے اگر تم میں سے کوئی حقیقت جان لے تو اتنا روئے کہ آواز بند ہو جائے، اس قدر نماز پڑھے کہ کمر ٹوٹ جائے، گویا انہوں نے اس حدیث کی طرف اشارہ کیا :-

لَوْ تَعْلَمُونَ مَا عَلِمَ لَصَاحِبُكُمْ قَلِيلًا وَلَكِنَّكُمْ كَثِيرًا (۱)

اگر تم وہ بات جان لو جو میں جانتا ہوں تو کم ہوں اور زیادہ روؤ۔

مذہبی روایت کرتے ہیں کہ بہت سے ارباب حدیث حضرت قتیل ابن عیاض سے ملاقات کے لئے انکے دروازے پر جمع ہوئے، آپ نے ایک روشندان سے سر نکالا، آپ کے رخساروں پر آنسو رواں تھے، اور داڑھی لرز رہی تھی، فرمایا : لوگو! قرآن کریم کو لازم پکڑ لو، نماز کی پابندی کرو، یہ حدیث کا زمانہ نہیں ہے، بلکہ خوف و خشیت آہ و بکا، اور دعا کا زمانہ ہے، ڈوبنے والوں کی طرح دعا کرو اس زمانے میں اپنی زبان کی حفاظت کرو، اپنے آپ کو پوشیدہ رکھو، اپنے قلب کا علاج کرو، جو جانتے ہو اس پر عمل کرو، جو نہ جانتے ہو اسے ترک کرو، ایک مرتبہ آپ تیز تیز قدم اٹھائے چلے جا رہے تھے، لوگوں نے دریافت کیا کہاں تشریف لے جا رہے ہیں، فرمایا مجھے نہیں معلوم، بعد میں معلوم ہوا اس وقت ان پر خوف طاری تھا، اور وہ اضطراب کے عالم میں بھاگ رہے تھے۔ ذرا بہن عمرؓ نے اپنے والد عمر ابن ذرؓ سے دریافت کیا کہ کیا بات ہے کہ جب دوسرے بولتے ہیں تو کوئی نہیں روٹا اور جب آپ بولتے ہیں تو ہر سمت سے رونے چلانے کی آوازیں آتی ہیں۔ آپ نے فرمایا بیٹے اس عورت کا روٹا جس کا بچہ مرجائے اور اس عورت کا روٹا جو اجرت لے کر روئے برابر نہیں ہوتا۔

بیان کیا جاتا ہے کہ کچھ لوگوں نے ایک عابد سے جو رو رہا تھا دریافت کیا کیوں روتے ہو، عابد نے کہا ایک پھوڑا ہے جو خانہ میں دلوں میں پیدا ہو جاتا ہے، اس پھوڑے نے مجھے بے چین کر رکھا ہے، لوگوں نے دریافت کیا تمہیں کس بات کا خوف ہے؟ انہوں نے کہا اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضری کے لئے پکارے جانے کا خوف۔ حضرت خواص روتے تھے اور اپنی مناجات میں کہتے تھے : اب میں بوڑھا ہو گیا ہوں، میرا جسم کمزور پڑ گیا ہے اس لئے مجھے اپنی خدمت سے آزاد کرو۔ صالح مری کہتے ہیں ایک مرتبہ ابن السماک ہمارے یہاں تشریف لائے، اور کہنے لگے کہ تم اپنے دیار کے عابدین کے عجائبات دکھاؤ، میں انہیں ایک شخص کے پاس لے کر گیا، وہ ایک محلے کی بوسیدہ سی جموئری میں مقیم تھا، ہم نے ان سے داخلے کی اجازت چاہی، اندر داخل ہوئے تو دیکھا ایک شخص چٹائی بنا رہا ہے، میں نے اس کے سامنے یہ آیت تلاوت کی :-

إِذَا الْأَغْلَاقُ فِي أَعْنَاقِهِمْ وَالسَّلَاسِلُ يُسْحَبُونَ فِي الْحَمِيمِ ثُمَّ فِي النَّارِ

يَسْجَرُونَ۔ (پ ۲۴ ر ۳۳ آیت ۱۷)

جب طوق ان کی گردنوں میں ہوں گے اور زنجیریں۔ ان کو تھپتھپتے ہوئے کھولتے پانی میں لے جائیں گے پھر یہ

آگ میں جمونک دیے جائیں گے۔

وہ شخص ایک چیخ مار کر بے ہوش ہو گیا، ہم اسے اسی حالت میں چھوڑ کر باہر نکل آئے، اور ایک دوسرے شخص کے پاس پہنچے، اس کے سامنے بھی میں نے یہی آیت تلاوت کی، وہ بھی چیخ مار کر بے ہوش ہو گیا، اسے بھی ہم نے اس کے حال پر چھوڑا اور تیسرے شخص کے پاس پہنچے، اور اندر داخل ہونے کی اجازت مانگی، اس نے کہا اگر تم ہمیں ہمارے رب سے غافل نہ کرو تو آ جاؤ، ہم اندر پہنچے، اور اس کے سامنے میں نے یہ آیت پڑھی :-

(۱) یہ روایت کتاب العلم میں گزری ہے۔

ذَلِكَلِمَنْ خَافَ مَقَامِي وَخَافَ وَعِيدَ (پ ۳۳ ر ۱۳ آیت ۱۴)

یہ ہر اس شخص کے لئے ہے جو میرے روبرو کھڑے ہونے سے ڈرے اور میری وعید سے ڈرے۔

یہ آیت سن کر وہ شخص چیخ اٹھا، اس کے منتوں سے خون بہنے لگا، اور اسی خون میں تڑپنے لگا، یہاں تک کہ خون ٹپکتا بند ہو گیا، ہم نے اسے اس کے حال پر چھوڑا، اور باہر نکل آئے، اس دن میں ابن السہاک کو چھ آدمیوں کے پاس لے کر گیا، اور سب اسی کیفیت سے دوچار ہوئے، آخر میں ہم ساتویں فرد کے پاس پہنچے، اندر آنے کی اجازت طلب کی، اندر سے کسی عورت نے جواب دیا آ جاؤ، ہم اندر پہنچے، اور دیکھا ایک شخص و نزار بوڑھا مٹلی بچھائے بیٹھا ہے، ہم نے اسے سلام کیا، مگر اسے کوئی احساس نہ ہوا، میں نے بلند آواز سے کہا آگاہ رہو کل لوگوں کو کھڑا ہونا ہے، یہ سن کر اس بوڑھے نے پوچھا: کبخت کس کے سامنے کھڑا ہونا ہے؟ اس سوال کے بعد وہ مبہوت ہو کر رہ گیا، منہ کھل گیا، آنکھیں اوپر کو چڑھ گئیں، اور آہ آہ کرنے لگا، یہاں تک کہ آواز بند ہو گئی، یہ حال دیکھ کر عورت نے کہا اب تم لوگ جاؤ، اب تم ان سے کوئی نفع نہ پاسکو گے، اس واقعہ کے کچھ روز بعد میں نے لوگوں سے ان ساتویں بزرگوں کے متعلق پوچھا لوگوں نے بتلایا کہ ان میں سے تین اچھے ہو گئے ہیں، اور تین جاں بحق ہو گئے ہیں، اور وہ بڑے میاں تین دن تک اسی طرح مبہوت اور سکت رہے یہاں تک کہ فرض نمازیں بھی نہ پڑھ سکے، تین روز کے بعد اصل حالت پر واپس آئے۔ یزید ابن الاسود جن کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ ابدال تھے انہوں نے یہ قسم کھائی تھی کہ نہ کبھی وہ نہیں گئے، نہ پیٹ پر سوتیں گے، اور نہ کھی کھائیں گے، یہ بزرگ اپنی قسم پر زندگی بھر قائم رہے، حجاج نے سعید ابن جبیر سے کہا میں نے سنا ہے کہ تم کبھی بھتے نہیں ہو؟ انہوں نے جواب دیا کیسے نہیں، جنم بھڑک رہی ہے، طوق تیار ہیں، اور دونوں کے فرشتے مستعد کھڑے ہوئے ہیں، ایک شخص نے حضرت حسن سے پوچھا: اے ابوسعید! آپ کا کیا حال ہے فرمایا ٹھیک ہے، اس کے بعد آپ مسکرائے اور فرمایا تم میرا حال کیا پوچھتے ہو، تمہارا ان لوگوں کے بارے میں کیا احساس ہے جو کشتی پر سوار ہوں اور جب ان کی کشتی سمندر کے بیچ میں پہنچ جائے تو لہروں میں طغیانی آجائے، اور کشتی ٹوٹ جائے، پھر ہر شخص ٹوٹی ہوئی کشتی کا ایک ایک تختہ لے کر سفر شروع کر دے، تمہارے خیال میں کیا حال ہو گا؟ اس شخص نے عرض کیا یہ لوگ بدترین حالت سے دوچار ہیں، فرمایا میرا حال ان سے بھی زیادہ خراب ہے۔

حضرت عمر ابن عبدالعزیز کی ایک باندی ان کے کمرے میں داخل ہوئی، انہیں سلام کیا، اور اس جگہ جا کر نماز کی نیت باندھ لی جو نماز کے لئے مخصوص تھی، دو رکعت نماز پڑھی، پھر سو گئی، اچانک خواب کی حالت میں رونے لگے جب بیدار ہوئی تو امیر المومنین کی خدمت میں عرض کیا کہ میں نے اس وقت عجیب و غریب خواب دیکھا ہے، حضرت عمر ابن عبدالعزیز نے دریافت کیا وہ کیا خواب ہے، باندی نے عرض کیا میں نے دیکھا کہ دونوں بھڑک رہی ہے، اور پھر ایک پل لایا گیا اور دونوں کے اوپر رکھا گیا، حضرت عمر نے فرمایا، اور باندی نے عرض کیا اسکے بعد عبدالملک ابن مروان کو لایا گیا، اور اسے اس پل کے اوپر سے گزارا گیا، وہ ابھی اس پر چھ قدم ہی چل پایا تھا کہ پل الٹ گیا اور وہ جہنم میں گر پڑا، حضرت عمر نے ایک آہ بھری اور پوچھا پھر کیا ہوا، باندی نے عرض کیا پھر ولید ابن عبدالملک کو لایا گیا اور اسے اس پل کے اوپر سے گزارا گیا، ابھی چند ہی قدم چل پایا تھا کہ پل ٹیڑھا ہو گیا اور وہ بھی جہنم میں گر گیا، حضرت عمر نے پھر ایک سرد آہ بھری اور دریافت کیا پھر کیا ہوا، باندی نے اپنا خواب جاری رکھا کہ پھر سلیمان ابن عبدالملک کو لایا گیا وہ بھی زیادہ دور نہ چل پایا تھا کہ گر پڑا، حضرت عمر نے دریافت کیا پھر کیا ہوا، باندی نے عرض کیا پھر امیر المومنین آپ کو لایا گیا، ابھی وہ باندی اتنی ہی کہہ پائی تھی کہ حضرت عمر ابن عبدالعزیز چیخ اٹھے، اور شدت غم کے باعث بے ہوش ہو گئے، وہ باندی ان کے پاس آئی، ان کے کان میں چیخ چیخ کر کہنے لگے واللہ! امیر المومنین! آپ نے میری پوری بات نہیں سنی ہے میں یہ کہہ رہی تھی کہ آپ پل پر سے گزرے اور اسے عبور کر گئے، لیکن حضرت عمر ابن عبدالعزیز دیر تک ہوش میں نہیں آئے، حالانکہ وہ اپنا خواب دہرائی رہی، ہوش میں آنے کے بعد بھی وہ دیر تک روتے رہے، اور اپنے پاؤں بچھتے رہے، حضرت اولیں قرتی قاسم کے پاس آیا کرتے تھے اور ان کے مواعظ سنا کرتے تھے، جب کبھی گفتگو کے دوران دونوں کا تذکرہ ہوتا چیخ مارتے، اور روتے چلاتے بھاگ

جاتے، لوگ ان پر آوازیں کستے اور انہیں بھنوں کہہ کر پریشان کرتے۔ حضرت معاذ ابن جبلؓ فرماتے ہیں کہ مومن کا خوف اس وقت تک دور نہیں ہوتا جب تک وہ پل صراط کو اپنے پیچھے نہ چھوڑ دے۔ حضرت طاؤس کے لئے بستر کیا جاتا تو وہ اس پر اس طرح لیٹتے جس طرح گرم ریت میں پنے کا دانہ ڈال دیا جائے کہ اوہرا دھر پھدکتا پھرتا ہے، چنانچہ وہ کچھ دیر بستر پر اوہرا دھر کو نہیں بدلتے پھر اٹھ کر بیٹھ جاتے اور قبلہ کی طرف رخ کر کے نماز شروع کر دیتے، فرماتے تھے کہ دوزخ کے ذکر نے خائفین کی آنکھوں سے نیند اڑادی ہے۔

حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ ایک شخص دوزخ میں سے ہزار برس کے بعد نکلے گا، کیا ہی اچھا ہوتا کہ وہ شخص میں ہوں، یہ بات انہوں نے اس لئے فرمائی تھی کہ انہیں یہ خوف تھا کہ کہیں وہ جہنم میں ہمیشہ کے لئے نہ ڈال دیے جائیں، ان کے بارے میں یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ وہ چالیس برس تک نہیں ہنستے، راوی کہتے ہیں کہ جب میں انہیں بیٹھے ہوئے دیکھتا تو ایسا لگتا جیسے قیدی ہوں، اور گردن مارنے کے لئے پکڑ کر لائے گئے ہوں، اور وعظ فرماتے تو ایسا لگتا تھا گویا دوزخ کے مناظر ان کی نگاہوں کے سامنے ہوں، اور خاموش ہوتے تو ایسا محسوس ہوتا گویا ان کی آنکھوں کے سامنے آگ بھڑک رہی ہو، بعض لوگوں نے انہیں شدت خوف اور کثرت غم پر معتب کیا تو فرمایا میں کیسے بے خوف ہو جاؤں تمہیں کیا معلوم میرے رب نے مجھے کوئی برائی کرتے ہوئے دیکھ لیا ہے، اور آخرت میں اس برائی کے باعث مجھ سے یہ کہا جائے کہ تجھے بخشا نہیں جائے گا، گویا میرے یہ تمام اعمال بے کار ہیں۔ ابن السماک فرماتے ہیں ایک روز میں نے ایک مجلس میں تقریر کی، تقریر کے دوران ایک نوجوان کھڑا ہوا اور کہنے لگا اے ابو العباس! آج تم نے اپنی تقریر میں ایک جملہ کہا ہے، ہمارے لئے صرف یہ ایک جملہ ہی کافی ہے، اگر تم اس کے علاوہ کچھ نہ کہتے تو ہمیں کچھ پروا نہ ہوتی۔ میں نے اس سے دریافت کیا وہ جملہ کیا ہے، اس نوجوان نے کہا کہ تم نے یہ کہا ہے کہ خائفین کے دلوں کو دو غلوں (بیشہ رہنے) نے گلڑے گلڑے کر دیا ہے، اور وہ دو غلوں یہ ہیں جنت میں ہمیشہ رہنا ہے یا دوزخ میں ہمیشہ رہنا ہے، یہ بات کہہ کر رخصت ہو گیا، اگلی مرتبہ جب میں نے تقریر کی تو وہ نوجوان موجود نہیں تھا، میں نے حاضرین سے اس کے متعلق دریافت کیا انہوں نے بتلایا کہ وہ بیمار ہے، میں یہ سن کر اس کی عیادت کو گیا اور اس سے کہنے لگا یہ تمہارا کیا حال ہو گیا ہے؟ وہ کہنے لگا اے ابو العباس! تم نے اس دن دوزخ میں یا جنت میں ہمیشہ رہنے کی بات کہی تھی، تمہارے اس جملے نے میرے دل کے گلڑے گلڑے کر دیے ہیں، چند روز بعد وہ نوجوان مر گیا، ایک رات میں نے خواب میں اسے دیکھا اور اس سے دریافت کیا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا ہے؟ اس نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے میری مغفرت فرمادی، مجھ پر رحم کیا اور مجھے جنت میں داخل کر دیا، میں نے پوچھا تم پر یہ کرم کس لئے ہوا اس نے جواب دیا اسی جملے سے متاثر ہونے کی وجہ سے جو تم نے کہا تھا۔

یہ انبیائے کرام، اولیاء اللہ، علماء اور صالحین کے مخاوف کی تفصیل ہے، دیکھو یہ لوگ کس قدر خوف کرتے تھے جب کہ خوف کی ضرورت ہم لوگوں کو زیادہ ہے۔ پھر یہ ضروری نہیں ہے کہ خوف گناہوں کی کثرت پر ہو، بلکہ صفائے قلب اور کمال معرفت کی موجودگی میں اللہ تعالیٰ سے ڈرنا اتنا ہی ضروری ہے جتنا ضروری گناہوں کی حالت میں ڈرنا ہے، اگر آدمی کے دل میں خوف نہ ہو تو اس کی وجہ یہ نہیں ہوتی کہ اس کے معاصی زیادہ ہیں، اور گناہ کم ہیں، بلکہ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اس کا دل شہوات سے خالی نہیں ہوتا، بلکہ وہ خواہشات نفس کا تابع ہوتا ہے، بد بختی اس پر غالب ہوتی ہے اور اسے اپنے قلب کی غفلت کا مشاہدہ نہیں کرنے دیتی، نہ موت کی قربت اسے بیدار کرتی ہے، اور نہ گناہوں کی کثرت سے اس کے باطن میں اپہل ہوتی ہے، نہ خائفین کے احوال کا مشاہدہ اس کے قلب پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اور سوء خاتمہ کا خوف اسے سیات کے ارتکاب سے باز رکھتا ہے، ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ اپنے فضل و کرم سے ہماری اس کوتاہی کو معاف فرمادے، اس لئے کہ اس غفلت کے عالم میں صرف دعائی ایک ذریعہ رہ جاتا ہے، بشرطیکہ عمل کے بغیر دعا قبول ہو سکتی ہو۔

عجیب بات یہ ہے کہ جب ہم دنیا میں مال جمع کرنا چاہتے ہیں تو کاشت کرتے ہیں، پودے لگاتے ہیں، تجارت کرتے ہیں،

سمندروں پر کشتیاں چلاتے ہیں، صحراؤں میں گھوڑے دوڑاتے ہیں، اور سفر کی مشقتیں اور صعوبتیں برداشت کرتے ہیں، اسی طرح جب ہم کوئی عملی منصب چاہتے ہیں تو علم حاصل کرتے ہیں، رات رات بھر بیدار رہ کر حفظ و تکرار کرتے ہیں، اور اپنے رزق تلاش کرنے میں جدوجہد کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے رزق عطا کرنے کا جو وعدہ کیا ہے اس پر اکتفا نہیں کرتے، اور نہ اس رزق کے انتظار میں گھروں کے اندر بیٹھتے ہیں، اور نہ محض یہ دعا کرتے ہیں: اے اللہ! ہمیں رزق عطا کر۔ لیکن جب ہمارے سامنے ابدی سلطنت (آخرت) کا سوال آتا ہے، اور جنت کی بات آتی ہے تو ہم صرف زبان سے اکتفا کر دیتے ہیں پر اکتفا کرتے ہیں اے اللہ! ہماری مغفرت فرما، ہم پر رحم کر، حالانکہ جس ذات گرامی کو ہم نہ دیتے ہیں، اور جس پر ہمارا بھروسہ ہے وہ علی الاعلان یہ کہتا ہے۔

وَأَنْ لِّیْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ۔ (پ ۷۲ آیت ۳۹)

اور یہ کہ انسان کو صرف اپنی ہی کمائی ملے گی۔

وَلَا یَغْنَیْکُمْ بِاللّٰهِ الْغُرُورُ۔ (پ ۱۲ آیت ۵)

اور ایسا نہ ہو کہ تم کو دھوکہ باز شیطان اللہ سے دھوکہ میں ڈال دے۔

يَا أَيُّهَا الْإِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيمِ۔ (پ ۷۳ آیت ۶)

اے انسان! تجھ کو کس چیز نے اپنے رب کریم کے ساتھ بھول میں ڈال رکھا ہے۔

یہ تمام آیات بھی ہمیں متنبہ نہیں کرتیں، اور نہ ہمیں غرور اور آرزوؤں کی وادیوں سے نکالتی ہیں حقیقت میں تو بغیر عمل کے نجات کی امید رکھنا، اور عمل کے بعد بھی یہ یقین رکھنا کہ ہم نجات یافتہ ہیں بڑے خسارے کی بات ہے، الا یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنا فضل و کرم فرمائے، اور توبہ نصوح کی توفیق سے نوازے۔ ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ ہماری توبہ قبول فرمائے بلکہ ہم یہ دعا کرتے ہیں کہ ہمارے دلوں میں توبہ کا شوق پیدا فرمائے اور یہ کہ ہم محض زبان سے توبہ کے الفاظ ادا کرنے پر تکیہ نہ کریں، ورنہ ہم ان لوگوں میں سے ہو جائیں گے جو کہتے ہیں کرتے نہیں ہیں، سنتے ہیں قبول نہیں کرتے، جب ہم وعظ سنتے ہیں تو روتے ہیں اور جب سنے ہوئے وعظ کے مطابق عمل کرنے کا وقت آتا ہے تو عمل نہ کر کے گناہ کا ارتکاب کرتے ہیں، اس سے بڑھ کر رسوائی کی اور کیا علامت ہو گی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے فضل و کرم سے ہدایت، توفیق اور رشد سے نوازے۔ ہم خائنین کے صرف اسی قدر احوال پر اکتفا کرتے ہیں جو ہم نے بیان کئے ہیں، اس لئے یہ احوال اپنے اختصار کے باوجود قبول کرنے والے دلوں پر اثر انداز ہوں گے، اور جن دلوں میں قبول حق کی صلاحیت نہیں ان کے سامنے اگر صفحے کے صفحے بھی سیاہ کر دیے جائیں تو انہیں کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔

میسلی ابن مالک غولانی جن کا شمار عابدین میں ہوتا ہے ایک راہب کے بارے میں بیان کرتے ہیں کہ میں نے اسے بیت المقدس کے دیوارے پر ٹھگین صورت بنائے کھڑے ہوئے دیکھا، وہ انتہائی مضطرب، بے چین اور ٹھگین نظر آتا تھا، لگتا تھا کہ ابھی اس کی آنکھوں سے آنسو پینے لگیں گے، میں نے اس سے کہا اے راہب! اگر تم کچھ وصیت کرنا چاہتے ہو تو ضرور کہو، میں یاد رکھوں گا، اس نے کہا اے عزیز! میں تجھے کیا نصیحت کروں، اگر تجھ سے ممکن ہو تو اس شخص کی طرح رہنا جسے چاروں طرف سے درندے اور حشرات الارض گھیرے ہوئے ہوں، وہ شخص ہر وقت خوف زدہ رہتا ہے اور ڈرتا ہے کہ اگر میں ایک لمحے کے لئے بھی غافل ہو گیا تو یہ درندے اور حشرات الارض میری جان لے لیں گے۔ ایسے شخص کی رات بھی خوف میں گذرتی ہے کہ غافل سکون کی نیند سوئیں، اور دن بھی اضطراب میں کستا ہے اگرچہ ناکارہ لوگ عیش میں بسر کریں۔ پھر وہ راہب مجھے میرے حال پر چھوڑ کر چلے گا، میں نے اس سے کہا اگر تم کچھ اور بھی کہتے تو مجھے کچھ زیادہ ہی فلع ہو تا، وہ کہنے لگا کہ پیاسے کو جس قدر بھی پانی مل جائے غنیمت ہوتا ہے، یہ بات اس راہب نے بالکل صحیح کہی ہے اس لئے کہ صاف قلوب پر معمولی خوف بھی بہت زیادہ اثر انداز ہوتا ہے، اور غافلوں کو خواہ کتنا ہی ڈراؤ وہ اپنے حال پر رہتے ہیں اور ذرا نہیں بدلتے۔ راہب نے جو مثال بیان کی ہے وہ فرضی نہیں ہے، بلکہ حقیقت میں یہی صورت ہے، اگر آدمی غور سے دیکھے اور اپنے باطن کا جائزہ لے تو اسے معلوم ہو گا کہ وہ مختلف قسم کے

درندوں اور زہریلے جانوروں سے لبرز ہے، مثلاً غضب، شہوت، حقد، حسد، کبر، عجب اور ریاء وغیرہ۔ یہ تمام اوصاف درندے ہی تو ہیں جو ہر وقت اسے چرتے پھاڑتے رہتے ہیں، بشرطیکہ وہ عاقل ہو، تاہم انسان کو ان باطنی درندوں کی درندگی، اور موزی جانوروں کی اذیت کا احساس نہیں ہو پاتا، جب پردہ اٹھایا جائے گا اور بے جان جسم کے ساتھ قبر میں لٹایا جائے گا جب دیکھے گا کہ ان درندوں نے تجھے کس قدر نقصان پہنچایا ہے، اور ان کیڑوں نے تیری روح کو کس قدر زہریلی بنا دیا ہے، اس وقت یہ سب اوصاف اجسام بن کر قبر میں آئیں گے، اور سانپ پھوپھو بن کر اس کے جسم کو گھیر لیں گے۔ اس وقت معلوم ہو گا کہ باطن کے درندوں سے بچنے کی تاکید کیوں کی جاتی تھی۔ اگر تو یہ چاہتا ہے کہ ان درندوں پر قابو پالے یا ان موزی جانوروں کو ہلاک کر دے تو تجھے موت سے پہلے ان پر قابو پانا ہو گا، اور دنیا سے رخصت ہونے سے پہلے ان کے قتل کا سامان کرنا ہو گا، اگر تو نے ایسا نہ کیا تو یاد رکھ یہ درندے اور کیڑے تجھے نوح نوح کر کھالیں گے۔

کتاب الفقیر والزہد زہد اور فقر کے بیان میں

جاننا چاہیے کہ دنیا اللہ تعالیٰ کی دشمن ہے، بہت سے لوگ اس کے قریب میں مبتلا ہو کر گمراہ ہوئے ہیں، اور اس کے عکس میں آ کر بہت سے لوگوں نے لغزش کھائی ہے، اس کی دوستی گناہوں اور برائیوں کی جڑ ہے، اور اس کی دشمنی نیکیوں اور اچھائیوں کی اصل ہے۔ ہم نے دنیا کا حال ”اور اس کی دوستی کی حقیقت اور مذمت ذم الدنیا میں بیان کی ہے۔ یہاں ہم دنیا سے بغض رکھنے اور اس میں زہد اختیار کرنے کے فضائل بیان کرتے ہیں، اس لیے کہ منجات میں اصل یہی ہے۔ اس وقت تک نجات کی امید نہیں کی جاسکتی جب تک کہ دل بالیقہ طور پر دنیا سے علیحدہ نہ ہو اور دل کے دنیا سے علیحدہ ہونے کی دو صورتیں ہیں یا تو وہ خود آدمی سے الگ رہے اسے فکر کتے ہیں یا آدمی اس سے دور رہے اسے زہد کہتے ہیں، ان دونوں صورتوں کو حصول سعادت اور کامیابی اور نجات کے حصول کے لئے ذریعہ اعانت بننے میں الگ الگ درجہ حاصل ہے۔ پہلے ہم فقر اور زہد کی حقیقت، ان دونوں کی قسمیں، شرائط اور احکام بیان کرتے ہیں، پہلے باب میں فقر پر گفتگو کریں گے، اور دوسرے باب میں زہد پر گفتگو زیر بحث آئے گی۔

پہلا باب

فقر کی حقیقت اور فقیر کے احوال و اسماء کا اختلاف

فقران چیزوں کے فقدان کا نام ہے جن کی ضرورت ہے، ان چیزوں کے فقدان کو فقر نہیں کہتے جن کی ضرورت نہیں ہے، اسی طرح اگر ضرورت کی چیز موجود ہے، اور محتاج کو اس پر قدرت بھی ہے تو اسے فقیر نہیں کہا جائے گا، اگر تم نے یہ بات سمجھ لی تو تم اس حقیقت میں شک نہیں کرو گے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا ہر وجود فقیر ہے کیوں کہ اسے دوسرے وقت موجود رہنے کی حاجت ہے، اور کسی چیز کا ہمیشہ موجود رہنا محض اللہ کے فضل اور اس کی حیثیت پر موقوف ہے، اگر عالم وجود میں ہے جس کا وجود کسی دوسرے وجود کا رہن منت نہیں تو وہ غنی مطلق ہے اور اس طرح کا وجود صرف ایک ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کا وجود، جو غنی ہے، اس کا وجود کسی سے مستفاد نہیں ہے، اس کے علاوہ تمام موجودات اپنے دوام وجود کے لئے اسی ایک ذات کے محتاج ہیں، قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے اسی حقیقت کی طرف ارشاد فرمایا ہے۔

وَاللَّهُ الْغَنِيُّ وَأَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ

(پ ۳۱، آیت ۳۸)

اور اللہ تو کسی کا محتاج نہیں اور تم سب محتاج ہو۔

لیکن فقر کے یہ مطلق معنی نہیں ہیں، جب کہ ہمارا موضوع فقر کے مطلق معنی بیان کرنا نہیں ہے، بلکہ خاص مال کا فقیر بیان کرنا

مقصود ہے، ورنہ دیکھا جائے تو بندے کی بے شمار حاجات اور لاتعداد ضروریات ہیں، ان میں سے بعض حاجات وہ ہیں جو مال سے پوری ہوتی ہیں، اور انہی کا بیان یہاں مقصود ہے، چنانچہ ہم یہ کہتے ہیں کہ جو شخص مال نہیں رکھتا وہ اس مال کے اعتبار سے فقیر ہے جو اس کے پاس نہیں ہے بشرطیکہ اسے اس کی احتیاج بھی ہو، پھر اگر غور کیا جائے تو فقیر میں آدمی کے پانچ احوال ہیں۔ سہولت تقسیم اور تمیز کے لیے ہم ہر حالت کا الگ الگ نام رکھتے ہیں، اور الگ الگ بیان کرتے ہیں۔

پہلی حالت یہ بہترین حالت ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ اگر آدمی کے پاس مال آئے تو اسے برا لگے، اور اس کی موجودگی سے اذیت محسوس کرے، اسے قبول کرنے سے گہرائے اسے برا لگے، اور اس کے شر سے بچنے کی کوشش کرے، اس حالت کو زہد کہتے ہیں، اور جس شخص کا یہ حال ہو وہ زاہد ہے۔

دوسری حالت یہ ہے کہ مال کی رغبت اتنی نہ ہو کہ اس کے ملنے سے خوش ہو، اور نہ اس قدر نفرت ہو کہ ملنے سے تکلیف محسوس کرے، بلکہ دل میں اس قدر ہمت ہو کہ اگر مال مل جائے تو اسے چھوڑ بھی سکے، اس حالت والے کو راضی کہتے ہیں۔

تیسری حالت یہ ہے کہ اسے مال ملنا نہ ملنے کی بہ نسبت محبوب ہو، کیوں کہ دل میں اس کی کچھ رغبت ہے، مگر یہ رغبت اتنی زیادہ نہیں ہے کہ اس کے حصول کے لئے جدوجہد کرے، بلکہ اگر خیر مشقت اور محنت کے مل جائے تو خوش ہو، اور اگر اس کے حصول میں کچھ مشقت پیش آئے، تو اس کی طلب میں مشغول نہ ہو، جس کی یہ حالت ہو اسے قانع کہتے ہیں، اس لئے کہ اس نے موجود قناعت کی ہے، اور رغبت رکھنے کے باوجود غیر موجود کے حصول کے لئے جدوجہد نہیں کی ہے۔

چوتھی حالت یہ ہے کہ اپنے مجرکی بنا پر مال طلب نہ کرے، ورنہ دل میں رغبت موجود ہے، اور ہر اس تدبیر پر عمل کرتا ہے جس سے مال حاصل ہو، خواہ اس تدبیر پر عمل کرنے میں مشقت ہی کیوں نہ ہو، یا وہ مال کی طلب میں مشغول ہے، لیکن کوشش کے باوجود مال نہیں پاتا، اس حالت کو حریص کہتے ہیں۔

پانچویں حالت یہ ہے کہ جس مال سے وہ شخص محروم ہے اس کا وہ اضطراب محتاج ہو، جیسے بھوکے کے پاس روٹی نہ ہو، یا ننگے کے پاس کپڑا نہ ہو، جس کی یہ حالت ہو اسے مضطرب کہتے ہیں، چاہے طلب میں اس کی رغبت ضعیف ہو یا قوی، ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ آدمی اضطراب کی حالت میں ہو، اور جس چیز کی طرف مضطرب ہو اس کی رغبت نہ رکھتا ہو۔

غنی اور مستغنی یہ پانچ حالتیں ہیں، ان میں اعلا حالت زہد ہے، اور اگر اضطراب کے ساتھ زہد بھی ہو تو یہ انتہائی اعلا اور آخری درجے کی حالت ہے، جیسا کہ اس کا بیان عنقریب آئے گا۔ پھر ان پانچ حالتوں سے افضل بھی ایک حالت ہے، اور وہ یہ ہے کہ بندے کے لئے مال کا عدم وجود دونوں برابر ہوں، اگر مال مل جائے تو نہ دل خوش ہو، اور نہ اذیت پائے، اسی طرح اگر مال نہ ملے تب بھی نہ دل خوش ہو اور نہ تکلیف محسوس کرے، بلکہ اس کی حالت حضرت عائشہؓ کی حالت کے مشابہ ہے، ایک مرتبہ آپ کے پاس ایک ہزار درہم آئے، آپ نے وہ تمام درہم تقسیم کر دیے، خادمہ نے عرض کیا کہ اگر آپ ہمارے لئے ایک درہم کا گوشت خرید لیتیں تو ہم اس سے روزہ افطار کر لیتے، آپ نے فرمایا اگر تو مجھے یاد دلا دیتی تو میں ایسا کر لیتی۔ جس شخص کا یہ حال ہو اگر پوری دنیا کے خزانے سمیٹ کر اس کے دامن میں رکھ دیے جائیں تو اسے ذرا نقصان نہ ہو، اس لئے کہ وہ یہ سمجھتا ہے کہ تمام خزانے اللہ کے ہیں اگرچہ اس کے قبضے میں ہیں، آج وہ اس کے پاس ہیں، کل اگر دوسرے کے پاس چلے جائیں تو ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے، ایسے شخص کا نام مستغنی ہونا چاہیے، کیوں کہ وہ مال کے وجود اور عدم دونوں سے مستغنی اور بے نیاز ہے۔ مستغنی اور غنی دو الگ الگ مفہوم رکھنے والے لفظ ہیں جیسا کہ اس حالت سے واضح ہوتا ہے جو مستغنی کی بیان کی گئی ہے۔ غنی کا اطلاق اللہ تعالیٰ پر ہوتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے ان بندوں کے لئے اس لفظ کا استعمال ہے جو بہت سا مال رکھتے ہیں۔ یہ لوگ مال کی زیادتی

سے خوش ہوتے ہیں اس لئے اس بات کے محتاج ہیں کہ یہ مال ان کے پاس باقی رہے۔ اس اعتبار سے انہیں فقیر بھی کہا جاسکتا ہے۔ لیکن مستغنی کو نہ اس کی پروا ہے کہ مال اس کے قبضے میں آئے اور نہ وہ اس بات کی پروا کرتا ہے کہ مال اس کے قبضے سے نکل جائے۔ کیوں کہ نہ وہ مال سے تکلیف محسوس کرتا ہے کہ اسے نکلنے کا محتاج ہو اور نہ اس سے خوش ہوتا ہے کہ رکھنے پر مجبور ہو اور نہ یہ بات ہے کہ اس کے پاس مال نہیں ہے اس لئے وہ اسے اپنے قبضے میں رکھنے کا خواہشمند ہے۔ اس مستغنی کی غنا عام ہے اور اس اعتبار سے وہ اس غنی سے قریب تر ہے جو اللہ تعالیٰ کا وصف ہے۔ بدمذات میں اللہ تعالیٰ سے قریب ہو سکتا ہے مکان میں قریب نہیں ہو سکتا لیکن اس حالت والے کو ہم مستغنی کہتے ہیں تاکہ یہ نام اسی ذات واحد کے ساتھ مخصوص رہے جو حقیقت میں غنی ہے ہر چیز سے بے نیاز ہے جب کہ یہ بدمذہب اگرچہ مال سے بے نیاز ہے لیکن بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن سے وہ کسی بھی حالت میں بے نیاز نہیں ہو سکتا مثلاً وہ توفیق الہی کی اعانت سے بے نیاز نہیں ہے اس کے ذریعے وہ اپنے دل کا استغناء باقی رکھتا ہے۔ قلب مال کی محبت میں گرفتار ہے۔ اور وہ مستغنی اس کی محبت سے آزاد ہے اللہ تعالیٰ نے اسے اس غلامی سے آزاد کیا ہے اور وہ اپنی آزادی پر قرار رکھنے میں اللہ تعالیٰ کی مدد کا محتاج ہے۔ جبکہ دل غلامی اور آزادی میں بدلتے رہتے ہیں کیوں کہ تمام قلوب اللہ تعالیٰ کی دو انگلیوں کے درمیان ہیں۔ اس لئے مستغنی کو غنی کہنا مناسب نہیں ہے کیوں کہ وہ اپنے استغناء کے باوجود بہت سی چیزوں میں محتاج ہے۔

زائد اور مستغنی زہد ایک بڑا درجہ ہے بلکہ اسے ابرار کا انتہائی درجہ کہا جاسکتا ہے جبکہ مستغنی مقررین میں سے ہے اس اعتبار سے زہد اس کے حق میں نقصان دہ ہے اس لئے کہ ابرار کے حسنات مقررین کے سیئات ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ زہد میں دنیا سے نفرت پائی جاتی ہے اور دنیا سے نفرت کرنا بھی اسی میں مشغول ہونے کے برابر ہے جیسا کہ دنیا سے محبت کرنے والا دنیا میں مشغول ہے اور ماسوی اللہ کے ساتھ مشغولیت اللہ تعالیٰ سے محاب ہے اللہ تعالیٰ کے اور تمہارے درمیان کوئی دوری نہیں ہے کہ دوری کو محاب کہا جائے بلکہ وہ تو رگ جاں سے بھی زیادہ تمہارے قریب ہے اور نہ وہ کسی مکان میں محصور ہے کہ آسمان اور زمین تمہارے اور اللہ کے درمیان محاب بنیں بلکہ تمہارے وہ مشاغل جن کا تعلق غیر اللہ سے ہے محاب ہیں اپنے نفس اور شہوات کے ساتھ مشغول ہونا بھی غیر اللہ کے ساتھ مشغول ہونا ہے کیونکہ تم ہمیشہ اپنے نفس اور شہوات میں مشغول رہتے ہو اس لئے ہمیشہ اللہ تعالیٰ سے محاب رہتے ہو غلامی یہ ہے کہ جو شخص اپنے نفس کی محبت میں مشغول ہے وہ اللہ سے منحرف ہے اسی طرح اگر اپنے نفس کی نفرت میں لگا ہوا ہے تو وہ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ نہیں ہے اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی مجلس میں عاشق اور معشوق دونوں جمع ہوں اور وہاں رقیب بھی آجائے اب اگر عاشق کا دل رقیب کی طرف ملتفت ہو گیا یعنی وہاں اس کی موجودگی پر دل ہی دل میں برا فروخت ہوا اور اسے برا سمجھنے لگا تو یہ کہا جائے گا کہ وہ اس حال میں جب کہ رقیب سے نفرت کرنے میں مشغول ہے معشوق کے مشاہدے کی لذت سے ہم کنار نہیں ہے حالانکہ اگر وہ عشق میں مستغرق ہوتا تو غیر معشوق کی طرف ذرا بھی التفات نہ کرتا نہ رقیب کی دخل اندازی پر توجہ دیتا۔ اور نہ اس کے سینے اپنی نفرت ظاہر کرنے میں وقت ضائع کرتا۔ چنانچہ جس طرح معشوق کی موجودگی میں غیر معشوق کو نظر محبت دیکھنا اور اس کی طرف متوجہ ہونا عشق میں شرک اور اس کے لئے نقص و عیب کی بات ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ان میں سے ایک دوسرے سے خفیف تر ہے کمال یہ ہے کہ قلب غیر محبوب کی طرف نہ بغض میں متوجہ ہو اور نہ حب میں۔ جس طرح دل میں بیک وقت دو محبتیں یکجا نہیں ہو سکتیں اسی طرح ایک ہی وقت میں بغض اور محبت کا اجتماع بھی نہیں ہو سکتا۔

اس تفصیل کے بعد یہ وضاحت ضروری نہیں ہے کہ جو شخص بغض دنیا میں مشغول ہے وہ اللہ تعالیٰ سے غافل ہے جیسے وہ اللہ تعالیٰ سے غافل ہے جس کے دل میں دنیا کی محبت ہو۔ تاہم جو شخص دنیا کی محبت میں مشغول ہے وہ اپنی غفلت میں بعد کے راستے پر گامزن ہے اور جو شخص اس سے نفرت کرتا ہے وہ اپنی غفلت میں قرب کے راستے پر چل رہا ہے اس لئے کہ اس شخص کے حق

میں یہ امید کی جاسکتی ہے کہ دنیا سے نفرت کی صورت میں جو غفلت اس کے دل میں ہے وہ زائل ہو جائے گی، اور شہود کی کیفیت پیدا ہو جائے گی۔ اور درجہ کمال حاصل کر لے گا، کیوں کہ دنیا سے نفرت کا عمل ایک ایسی سواری ہے جو اللہ تعالیٰ تک پہنچاتی ہے۔ دنیا سے محبت کرنے والوں، اور نفرت کرنے والوں کی مثال ایسی ہے جیسے دو مسافر حج کے راستے میں ہوں، اور اپنے جانوروں پر سواری کرتے اور ان کا دانہ پانی کرنے میں مشغول ہوں، لیکن ایک کا سرخ کبجے کی طرف ہو، اور دوسرا مخالف سمت میں چل رہا ہو، یہ دونوں مسافر اس اعتبار سے کعبہ مکرمہ سے محجوب ہیں کہ غیر کعبہ یعنی سواری کی گمراہی کی گمراہی اور اس کے دانہ پانی میں لگے ہوئے ہیں، لیکن اس شخص کا حال اچھا ہے جس کا سرخ کعبہ کی سمت ہے، کیوں کہ وہ اپنی غفلت کے باوجود کعبے سے قریب ہو رہا ہے، اور توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ کسی نہ کسی دن منزل مقصود پر پہنچ جائے گا، مگر اس شخص سے بہتر نہیں ہے جو کعبے میں محکمت ہے، اور اسی میں رہ رہا ہے، کبھی باہر نہیں نکلتا کہ سواری پر سوار ہونے اور اس کی خبر گیری کرنے کی نوبت پیش آئے۔ اس لئے ہمیں یہ گمان نہ کرنا چاہیے کہ بغض دنیا مقصود ہے، بلکہ دنیا اللہ تعالیٰ سے روکنے والی ہے، اور اس تک پہنچنا اس وقت ممکن نہیں ہے جب تک یہ رکاوٹ دور نہ ہو جائے، اسی لئے ابو سلیمان دارانی فرماتے ہیں جو شخص دنیا میں زندہ کرتا ہے اور اسی پر اتکا کرتا ہے وہ گویا جلد از جلد راحت پانے کا طالب ہے اسے دنیا میں زندہ کرنے کے بعد آخرت میں بھی تو مشغول ہونا چاہیے، آخری خط تو یہی ہے۔ اس طرح ابو سلیمان دارانی نے بتلایا ہے کہ آخرت کے راستے پر چلنے کا مرحلہ زندہ کے بعد ہے، جس طرح حج کے راستے پر چلنا الگ ہے، اور حج کے موانع کا ازالہ الگ ہے۔

بہر حال اگر زہد فی الدنیا سے یہ مراد لیا جائے کہ نہ دنیا کے وجود سے رغبت ہو اور نہ اس کے عدم سے، تو یہ قایت کمال ہے اور اگر اس سے مراد یہ لیا جائے کہ دنیا کے عدم کی رغبت ہو تو یہ راضی، قانع اور حریص کی بہ نسبت کمال ہے، اور مستغنی کی بہ نسبت نقص ہے، بلکہ مال کے سلسلے میں درجہ تکمال یہ ہے کہ تمہارے نزدیک مال اور ماہ (پانی) دونوں برابر ہیں۔ اگر تم سمندر کے کنارے پر ہو تو ہمیں پانی کی کثرت سے کوئی نقصان نہیں ہوتا، اسی طرح اگر تمہاری پیاس و فیو کی ضرورتیں پوری ہوتی رہیں تو پانی کی قلت تمہارے لئے مضر نہیں ہے، جس طرح تم بھدر ضرورت پانی کی احتیاج رکھتے ہو، اسی طرح بھدر ضرورت مال کے بھی محتاج ہو، چنانچہ جس طرح تم بہت سا پانی دیکھ کر راہ فرار اختیار نہیں کرتے، بلکہ یہ کہتے ہو کہ میں خود بھی اس میں سے ضرورت کے بھدر استعمال کروں گا، اور اللہ کے بندوں کو بھی پلاؤں گا، اسی طرح مال کا حال بھی ہونا چاہیے۔ اس لئے کہ روٹی اور پانی دونوں ضرورت کے اعتبار سے ایک ہیں، فرق صرف ایک کی قلت اور دوسرے کی کثرت کا ہے۔

جب بندہ اللہ تعالیٰ کو پہچان لیتا ہے، اور عالم کے سلسلے میں اس کی تدبیروں کا علم حاصل کر لیتا ہے تو یہ بات بھی جان لیتا ہے کہ جس طرح اسے ضرورت کے بھدر پانی ملتا ہے اسی طرح زندگی بھر ضرورت کے مطابق روٹی ملتی رہے گی، جیسا کہ مغربیوں کو کل کے ابواب میں یہ بحث آئے گی احمد ابن ابی الحواری کہتے ہیں کہ میں نے ابو سلیمان دارانی سے کہا کہ مالک ابن دینار نے منجھو سے کہا کہ گھر میں جا کر وہ کوزہ لے لو جو تم نے مجھے ہدیہ میں دیا تھا۔ اس لئے کہ شیطان میرے دل میں یہ وسوسہ ڈالتا ہے کہ چور لے لے گا۔ ابو سلیمان نے کہا کہ یہ صوفیائے کدوں کا ضعف ہے، اگر کوئی شخص یہ کوزہ لے جاتا تو انہیں پروا نہ ہوتی چاہیے تھی، گویا دل میں یہ خیال آنا بھی برا ہے کہ گھر میں کوزہ موجود ہے، اور اس کی طرف التفات بھی ضعف اور نقصان کا باعث ہے۔ اب اگر تم یہ سوال کرو کہ انبیاء اور اولیاء مال سے کیوں بھاگتے تھے اور اس سے نفرت کیوں کرتے تھے تو ہم یہ کہیں گے کہ مال سے ان کا فرار ایسا تھا جیسا پانی سے فرار، یعنی ضرورت سے زائد نہیں لیتے تھے، اور جو باقی بچتا تھا اسے منگیروں اور برتنوں میں جمع نہیں کرتے تھے، اس خیال سے کہ بعد میں کام آئے گا، بلکہ محتاجین کے لئے منوں، کنوؤں، اور تالابوں میں چھوڑ دیا کرتے تھے اس لئے نہیں کہ ان کے دل پانی کی محبت یا نفرت میں مشغول تھے، دنیا کے خزانے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم، اور آپ کے دونوں اجل صحابہ حضرت ابو بکر الصدیق اور حضرت عمرؓ کے پاس آئے، آپ نے وہ خزانے لئے جہاں ان کی ضرورت تھی وہاں خرچ کر دیے، آپ حضرات نے ان

سے راہ فرار اختیار نہیں کی، اس لئے کہ ان کے نزدیک مال اور پانی سونا اور پھر دونوں برابر تھے، ان حضرات سے کوئی مخالفت بھی مقول نہیں ہے، جن لوگوں نے منع کیا ہے انہیں یہ خوف تھا کہ اگر انہوں نے مال لیا تو وہ فریب کا شکار ہو جائیں گے، مال ان کے دل کو اپنا قیدی بنالے گا، اور وہ شہوات میں مبتلا ہو جائیں گے، لیکن یہ عطفاء کا حال ہے، اور ان کے حق میں مال سے نفرت کرنا اور اس سے دور بھاگنا ہی کمال ہے، تمام مخلوق کا یہی حکم ہے صرف انبیاء اور اولیاء اس سے مستثنیٰ ہیں، اگر کسی ایسے قوی شخص سے جو درجہ کمال کو پہنچا ہوا ہو یہ مقول ہو کہ وہ مال سے بھاگا تھا یا اس سے نفرت کی تھی تو یہ کہا جائے گا کہ اس نے عطفاء کے درجے پر اتر کر ایسا کیا ہو گا تاکہ لوگ ترک میں اس کی اقتداء کریں۔ اگر اخذ میں اس کی اقتداء کریں گے تو ہلاک ہو جائیں گے، اگرچہ وہ خود محفوظ رہے گا۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی سپرد اپنے بچوں کے سامنے سانپ پکڑنے سے باز رہے، وہ ان کی موجودگی میں سانپ نہیں پکڑتا اس لئے نہیں کہ اس میں کچھ ضعف ہے یا وہ سانپ پکڑنے پر قدرت نہیں رکھتا، لیکن وہ یہ جانتا ہے کہ اگر میں نے سانپ پکڑا اور بچوں نے دیکھ لیا تو وہ بھی پکڑیں گے اور ہلاک ہو جائیں گے۔ انبیاء اور اولیاء بھی عطفاء کے سامنے انہی احکام پر عمل کرتے ہیں جن کے وہ پابند ہیں تاکہ ان کی اقتداء کریں، جو چیزیں خود ان کے ساتھ مخصوص ہیں ان پر عوام الناس کی موجودگی میں عمل نہیں کرتے۔

اس تفصیل سے تم یہ بات جان گئے ہوں گے کہ کل چھ مراتب ہیں جن میں سب سے اعلیٰ مرتبہ مستثنیٰ کا ہے، پھر زائد کا ہے، پھر راضی کا ہے، اس کے بعد قانع کا ہے، آخر میں حریص ہے۔ جہاں تک مضر کا سوال ہے اس کے خلاف میں زہد، رضا اور قناعت کا تصور کیا جاسکتا ہے، اور اسی اعتبار سے اس کا درجہ بھی مختلف ہوتا ہے، البتہ فقیر کا اطلاق ان پانچوں مراتب کے لوگوں پر ہو سکتا ہے۔ مستثنیٰ کو فقیر کہنا اس معنی میں تو صحیح نہیں ہے جس معنی میں یہ مشہور ہے البتہ اس معنی میں صحیح کہا جاسکتا ہے کہ مستثنیٰ کو یہ معرفت حاصل ہے کہ وہ اپنے تمام امور میں عام طور پر، اور مال سے استغناء رکھنے میں خاص طور پر اللہ تعالیٰ کا محتاج ہے، مستثنیٰ کو فقیر کہنا ایسا ہی ہے جیسے کسی ایسے شخص کو جو اپنے نفس کے لئے عبودیت کا معترف ہو عہد کہہ دیا جائے، اگرچہ بندے کا لفظ تمام مخلوق کے لئے عام ہے، مگر ایسے شخص پر اس کا اطلاق مطلق کی بہ نسبت زیادہ مناسب ہے جو خود اپنے فقر و احتیاج کی معرفت رکھتا ہو وہ اس لفظ کا زیادہ مستحق ہے، گویا لفظ فقیر ان دونوں معنوں میں مشترک ہے، اور اگر تم یہ بات جان گئے کہ لفظ فقیر دونوں معنوں میں مشترک ہے تو تمہیں یہ بات سمجھنے میں بھی کوئی دشواری نہ ہوگی کہ ایک مرتبہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فقر کے سلسلے میں یہ ارشاد فرمایا۔

اللَّهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنَ الْفَقْرِ كَأَدَا الْفَقْرُ لِي يُكُونُ كَفْرًا۔

اے اللہ! میں فقر سے حیرتِ پناہ مانگتا ہوں۔ قریب ہے کہ فقر کفر ہو جائے۔

اور دوسری طرف سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا۔

اللَّهُمَّ أَحْبِبْنِي مِسْكِينًا وَأَمْسِكْنِي مِسْكِينًا۔ (ترمذی۔ النس)

اے اللہ! مجھے مسکین بنا کر زندہ رکھ، اور مسکینی کی حالت میں موت دے۔

یہ دونوں روایات ایک دوسرے سے متصادم نہیں ہیں، کیوں کہ پہلی دونوں روایتوں میں مضر کا فقر مراد ہے، اس سے آپ نے پناہ مانگی ہے، اور آخری روایت میں وہ فقر مراد ہے جس کے معنی ہیں اپنی مسکنت، دولت اور احتیاج کا اعتراف۔

فقر کے فضائل قرآن کریم کی متعدد آیات سے فقر کی فضیلت ثابت ہے۔ مثلاً۔

لِلْفَقْرِ وَالْمُهَاجِرِينَ الْبَيْتُ الْآخِرُ جَوْ مِنْ دِيَارِهِمْ وَأَمَّا إِلَهُمُ يَسْتَعُونَ فَضْلًا مِنَ اللَّهِ وَرِضْوَانًا وَيَنْصُرُونَ الْمَوْرَ سَوْكُمَ (پ ۲۸، آیت ۸)

ان مہمند مہاجرین کا حق ہے جو اپنے گھروں سے اور اپنے مالوں سے جدا کر دیے گئے، وہ اللہ کے فضل اور

رضامندی کے طالب ہیں اور وہ اللہ اور اس کے رسول (کے دین) کی مدد کرتے ہیں۔

لِلْفُقَرَاءِ الَّذِينَ أَخْصِرُوا فِی سَبِيلِ اللَّهِ لَا یَسْتَطِیْعُونَ ضَرْبًا فِی الْأَرْضِ - (پ ۵۳ آیت ۲۷۳)

اصل حق ان مایتمندوں کا ہے جو اللہ کی راہ میں مقید ہو گئے ہوں وہ لوگ کہیں ملک میں چلے پھرے کی طاقت نہیں رکھتے۔ ان دونوں آجوں میں کلام کی ابتدا مدح کے ساتھ کی گئی ہے اور پھر فقر کو بھرت اور محصور کئے جانے کے ساتھ ذکر فرمایا گیا ہے اور ان دونوں صفتوں پر فقر کی صفت کو مقدم کیا گیا ہے یہ تقدیم فقر کی فضیلت پر دلالت کرتی ہے احادیث میں بھی فقر کی تعریف کی گئی ہے حضرت عبد اللہ ابن عمر فرماتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام سے دریافت کیا کہ لوگوں میں کون زیادہ اچھا ہے؟ صحابہ نے عرض کیا وہ مالدار شخص جو اپنے نفس اور مال میں اللہ تعالیٰ کا حق ادا کرتا ہو آپ نے ارشاد فرمایا : یہ شخص بھی اچھا ہے، لیکن میں جس شخص کے متعلق دریافت کر رہا ہوں وہ یہ نہیں ہے صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! پھر کون شخص بہتر ہے؟ فرمایا : فَقَیْرٌ یُعْطِی جُھْدَهُ (ابو منور سلیمی) وہ فقیر جو اپنی محنت کی چیز دے۔

ایک مرتبہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلالؓ سے ارشاد فرمایا :
إِنِّی اللَّهُ فَقِیْرٌ أَوْ لَا تَلْصِقْهُ غَنَیًّا۔ (حاکم - بلال) اللہ تعالیٰ سے فقیر ہو کر مل، غنی ہو کر نہ مل۔

ایک حدیث میں ارشاد فرمایا :۔

إِنِّی اللَّهُ یُحِبُّ الْفَقِیْرَ الْمُتَعَفِّفَ أَبَا الْعَبَّاسِ۔ (ابن ماجہ - عمران ابن حصین)

اللہ تعالیٰ سوال نہ کرنے والے عیالدار تکدست کو محبوب رکھتا ہے۔

ایک مشہور روایت میں وارد ہے فرمایا :۔

یَدْخُلُ فُقَرَاءُ أَمْنِی الْجَنَّةِ قَبْلَ اغْنِیَائِهِمْ بِخَمْسِ مَائَةِ عَامٍ (ترمذی - ابو ہریرہ)

میری امت کے فقراء افضیاء سے پانچ سو برس پہلے جنت میں جائیں گے۔

ایک روایت میں اربعین غریبوں کے الفاظ ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حریص فقیر حریص غنی کے مقابلے میں چالیس برس پہلے جنت میں داخل ہو گا (مسلم - عبد اللہ ابن عمر) اور پہلی روایت کا مفہوم یہ ہے کہ فقیر زاہد غنی راغب کی بہ نسبت پانچ سو برس پہلے جنت میں داخل ہو گا۔ اس سے پہلے ہم نے فقر کے درجات کا اختلاف بیان کیا ہے۔ اس سے تم نے یہ بات جان لی ہو گی کہ فقراء کے درجات میں تفاوت ہے اور گویا فقیر حریص کا درجہ فقیر زاہد کے مقابلے میں ساڑھے بارہ درجے کم ہے چالیس کو پانچ سو سے یہی نسبت ہے یہاں یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ آپ نے مقدار کی تحدید فرمائی ہے یہ تحدید ایسی نہیں ہے کہ اتفاقاً زبان سے نکل گئی ہو اور حقیقت میں اس کا کوئی وجود نہ ہو بلکہ آپ تو ہر بات میں حق کا اظہار فرماتے تھے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :۔

وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْیٌ یُّوحِی۔ (پ ۵۲ آیت ۴)

اور نہ آپ اپنی خواہش نفسانی سے باتیں بناتے ہیں ان کا ارشاد صرف وحی ہے۔

درجات فقر کے اختلاف میں اس یقین و تقدیر کی مثال ایسی ہے جیسی روایہ صالحہ کے باب میں ہے آپ نے ارشاد فرمایا :۔

الرُّؤْبَا الصَّالِحَةُ جُزْءٌ مِّنْ سِتِّیْنَ أَوْ ثَلَاثِیْنَ جُزْءٍ مِّنَ النَّبُوَّةِ (بخاری - ابو سعید)

سچا خواب نبوت کا پچیس یا سو اسی حصہ ہے۔

یہ ایک صحیح اور واقعی تقدیر ہے لیکن سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کسی اور شخص کے لئے اتنی منجائش نہیں ہے کہ وہ اس نسبت کی علت جان لے، محض اندازے سے کچھ کہہ سکتا ہے جس کا صحیح ہونا ضروری نہیں ہے نبوت اس امر کا نام ہے جو صرف نبی کے ساتھ مخصوص ہے اور اسی اختصاص کی بنا پر نبی اپنے علاوہ دوسرے لوگوں سے مختلف اور ممتاز ہے۔ نبی کو بہت سی خصوصیات حاصل ہوتی ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ وہ ان امور کے حقائق سے واقف ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات

ملا کہ اور آخرت سے متعلق ہیں یہ واقعیت ایسی نہیں ہوتی جیسی دوسروں کی ہوتی ہے، بلکہ معلومات کی کثرت، تحقیق، یقین اور کشف کی زیادتی کے اعتبار سے نبی کی معرفت عام لوگوں کی معرفت سے مختلف ہوتی ہے، نبی کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اسکے نفس میں ایک صفت ہوتی ہے جس سے خارق عادات اعمال ظہور پذیر ہوتے ہیں جیسے ہمارے لئے ایک صفت ہے جس سے وہ حرکات سرزد ہوتی ہیں جو ہمارے ارادے اور اختیار سے جسے قدرت بھی کہہ سکتے ہیں متعلق ہیں، اگرچہ قدرت اور مقدر دونوں کا تعلق اللہ تعالیٰ سے ہے، تیسری خصوصیت یہ ہے کہ نبی کو ایک ایسی صفت حاصل ہے جس کے ذریعے وہ مَلَائِکَہ کو دیکھتا ہے اور ان کا مشاہدہ کرتا ہے، جیسے بیٹائی رکھنے والے شخص میں ایک ایسی صفت ہے جو ٹاپیا میں نہیں ہے اور وہ یہ ہے کہ بیٹا آدمی محسوسات کو دیکھ لیتا ہے، اور نبی کی چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ اسے ایک صفت حاصل ہے جس کے ذریعے وہ غیب کے واقعات کا مشاہدہ کر لیتا ہے خواہ بیداری کے عالم میں یا نیند کے دوران، اس صفت کے ذریعے وہ لوح محفوظ کا مشاہدہ کرتا ہے، اور غیب کی جو باتیں اس میں درج ہیں انہیں پڑھ لیتا ہے۔ یہ وہ صفات اور کمالات ہیں جن کا انبیاء کے لئے ثابت ہونا ظاہر ہے، اور یہ بھی واضح ہے کہ ان میں سے ہر صفت کی متعدد قسمیں ہو سکتی ہیں، بلکہ یہ ممکن ہے کہ ہم ان تمام خصوصیات کو چالیس، پچاس یا ساٹھ قسموں میں تقسیم کر دیں، بلکہ تکلف سے کام لیں تو یہ قسمیں چھیالیس بھی ہو سکتی ہیں، اور اس صورت میں یہ ثابت کیا جاسکتا ہے کہ روئے صالحہ نبوت کا چھیالیسواں حصہ ہے، لیکن کیوں کہ یہ تقسیم صرف ظن اور تخمین سے ہو سکتی ہے، اس لئے یقین کے ساتھ یہ بات نہیں کہی جاسکتی کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی روئے صالحہ کو نبوت کا چھیالیسواں حصہ اسی تقسیم کی رو سے قرار دیا ہے، البتہ ہم ان صفات کلیہ سے واقف ہیں جن سے نبوت مکمل ہوتی ہے، اور اس تقسیم کی اصل سے بھی واقف ہیں، لیکن اس سے یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ مخصوص مقدار مقرر کرنے کی وجہ کیا ہے۔ اسی طرح ہم یہ بات جانتے ہیں کہ فقراء کے بہت سے درجے ہیں، لیکن یہ بات نہیں جانتے کہ فقیر زاہد فقیر حریص کے مقابلے میں چالیس برس پہلے اور فقیر غنی کے مقابلے میں پانچ سو برس پہلے جنت میں جائے گا، اس کی علت کیا ہے؟ اس کا صحیح جواب صرف انبیاءِ علیہم السلام ہی دے سکتے ہیں، انبیاء کے علاوہ اگر کوئی شخص کچھ کہے گا تو وہ محض اندازے سے کہے گا جس پر پورے طور پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔

یہ جملہ مترضہ ہم نے اس لئے بیان کیا ہے کہ ان تقریرات کو بعض ضعیف الاعتقاد لوگ یہ نہ سمجھ بیٹھیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے محض اتفاقیہ بات کہہ دی ہے، حالانکہ محض اتفاقی طور پر کوئی بات کہہ دینا منصب نبوت کے شایان شان نہیں ہے، اب پھر ہم روایات نقل کرتے ہیں، سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :-

خَيْرٌ هَذَا لِمَا مَقَرَّ لَهُمْ وَأَسْرَعُ عَنْهَا تَصَبُّعًا فِي الْجَنَّةِ ضَعْفًا هَا۔

اس امت کے بہترین لوگ اس کے فقراء ہیں اور جنت میں جلد تر لوث لگائے والے اس امت کے کمزور لوگ ہیں۔

ایک جگہ ارشاد فرمایا :-

إِنِّي لِنِي حَزْرَتَيْنِ اثْنَتَيْنِ فَمَنْ أَحَبَّهُمَا فَقَدْ أَحَبَّنِي وَمَنْ أَبْغَضَهُمَا فَقَدْ أَبْغَضَنِي
الْفَقْرُ وَالْجِهَادُ

میرے دو چہرے ہیں جس نے انہیں پسند کیا اس نے مجھے پسند کیا اور جس نے انہیں ناپسند کیا اس نے مجھے

ناپسند کیا فقراور جہاد۔

ایک روایت میں ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ کو اللہ تعالیٰ کا یہ پیغام پہنچایا کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ آپ کو سلام کہتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ میں پہاڑوں کو سونے کا بنا دوں، جہاں تم رہو یہ پہاڑ وہاں رہا کریں، سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے سر جھکا لیا، اسکے بعد فرمایا :-

يَا جِبْرِئِيلُ إِنَّ التَّنْيَا كَارُ مَنْ لَا كَلَرَ لَهُ وَمَالٌ مَنْ لَا مَالَ لَهُ وَلَهَا يَجْمَعُ مَنْ لَا عَقْلَ لَهُ

فَقَالَ يَا مُحَمَّدُ ثَبِّتْكَ اللَّهُ بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ (۱)

اے جبرئیل! دنیا اس شخص کا گھر ہے جس کا کوئی گھر نہ ہو، اور اس کا مال ہے جس کا کوئی مال نہ ہو، اور اس کو وہ جمع کرتا ہے جس کے پاس محل نہ ہو، حضرت جبرئیلؑ نے فرمایا اے محمد! اللہ تعالیٰ نے آپ کو قول محکم پر ثابت قدم کر دیا۔

ایک روایت میں ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے سفر کے دوران ایک ایسے شخص کے قریب سے گزرے جو اپنی عہاء میں لیٹا ہوا سو رہا تھا، آپ نے اسے جگا دیا اور فرمایا اے سونے والے اٹھ اور اللہ تعالیٰ کا ذکر کر، اس نے عرض کیا آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں میں نے دنیا دنیا والوں کے لئے چھوڑ دی ہے، آپ نے فرمایا تب اے دوست تم سوتے رہو۔ اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کا گذر ایک ایسے شخص کے پاس سے ہوا جو زمین پر سو رہا تھا اور اس کے سر کے نیچے اینٹ رکھی ہوئی تھی، اس کا چہرہ اور داڑھی کے بال گرد میں اٹھے ہوئے تھے، اور وہ ایک چادر باندھے ہوئے تھا آپ نے اللہ تعالیٰ کی جناب میں عرض کیا: الہاتیر! یہ بندہ دنیا میں ضائع ہو گیا، وحی آئی کہ اے موسیٰ! کیا آپ کو یہ بات معلوم نہیں کہ جب میں کسی بندے کی طرف پوری طرح متوجہ ہوتا ہوں تو اس سے تمام دنیا کو ملکھ کر دیتا ہوں۔ حضرت ابورافعؓ روایت کرتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں ایک مہمان وارد ہوا، اس وقت آپ کے گھر میں کوئی ایسی چیز نہیں تھی جس سے آپ اس کی تواضع فرماتے، آپ نے مجھے خیر کے یہودیوں میں سے ایک شخص کے پاس بھیجا، اور فرمایا کہ اس سے کہنا کہ محمد یہ کہتے ہیں کہ رجب کے مہینے تک یا تو آنا ہمیں ادھار دیدے یا فروخت کر دے اور مقررہ وقت پر اس کی قیمت وصول کر لے، میں نے اس یہودی تک سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام پہنچایا، یہودی نے جواب دیا واللہ میں صرف رہن رکھ کر ہی آنا دے سکتا ہوں، میں نے اس کی اطلاع آپ کو دی ہے، آپ نے فرمایا گواہ رہنا میں آسمان والوں میں بھی امین ہوں اور زمین والوں میں بھی امین ہوں، اگر وہ شخص میرے ہاتھ فروخت کرتا یا ادھار دیتا تو میں اسے ضرور ادا کرتا، جا میری یہ ذمہ لے جا اور اسے رہن رکھ دے، جب میں باہر نکلا تو یہ آیت نازل ہوئی (طبرانی) :-

وَلَا تَمْلِكُ عَيْنُكَ إِلَى مَا مَتَّعْنَاهُمْ بِأَرْوَاحِهِمْ زُحْرَةَ الْحَيَاةِ النَّبِيَّاتِ لِنَفْتِنَهُمْ فِيهِ
وَرَزَقْنَاكَ خَيْرٌ وَأَبْقَى (پ ۸۷ آیت ۳۱)

اور ہرگز ان چیزوں کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھتے جن سے ہم نے ان (نکات) کے مختلف گروہوں کو ان کی آزمائش کے لئے متعین کر رکھا ہے کہ وہ (مصل) دنیوی زندگی کی رونق ہے، اور آپ کے رب کا رزق بدرجہا بہتر ہے اور دیرپا ہے۔

یہ آیت سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی دل جوئی اور تسلی کے لئے نازل ہوئی۔ ایک حدیث میں ہے آپ نے فرمایا :-
الْفَقْرُ أَزْنٌ بِالْمُؤْمِنِ مِنَ الْحِنْدِ الْحَسَنِ عَلَى خَيْلِ الْفَرَسِ - (طبرانی - شداد ابن اوس)
فقر مومن کے لئے گھوڑے کے رخسار پر واضح خوبصورت پوزی کے مقابلے میں زیادہ اچھا ہے۔

ایک حدیث میں ہے :-

مَنْ أَصْبَحَ مِنْكُمْ مَعَافِي فِي جَسْمِهِ آمِنًا فِي سِرِّهِ عِنْدَهُ قُوَّةٌ يَوْمَهُ فَكَأَنَّمَا
خَيْرُ شَيْءٍ مِنَ النَّبِيَّاتِ بِخِلَافٍ هَذَا - (*)

جو شخص بدن کی سلامتی کے ساتھ صبح کرے اپنے نفس میں امان ہو، اور اس کے پاس اس روز کی غذا ہو تو گویا اسے تمام دنیا حاصل ہے۔

حضرت کعب الانبار فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا اے موسیٰ! جب تم فقر کو آتا ہوا دیکھو تو یہ کہو کہ صلوات کے شعار کی آمد خوب ہے۔ صلوات خراسانی بیان کرتے ہیں کہ ایک پیغمبر کسی دریا کے کنارے تشریف فرماتے تھے کہ ایک شخص

(۱) یہ عبارت دو حدیثوں سے مرکب ہے۔ پہلی حدیث ترمذی نے ابوامامہ سے نقل کی ہے اور دوسری حدیث الدیلمی دارمن ارج سے آخر تک احمد نے نقل کیا ہے۔ (*) یہ روایت پہلے بھی گذری ہے۔

آیا اور بسم اللہ کہہ کر دریا میں جال پھینکا مگر کچھ ہاتھ نہ آیا، اتنے میں دو سرا محض آیا اور اس نے بھی بسم اللہ کہہ کر جال ڈالا۔ اس جال میں اس قدر مچھلیاں آئیں کہ جال نکالنا مشکل ہو گیا، پیغمبر نے باری تعالیٰ کی جناب میں عرض کیا : اے اللہ! یہ فرق کیوں ہے میں جانتا ہوں کہ یہ سب کچھ تیرے قبضہ قدرت میں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ملائکہ سے فرمایا میرے بندے پر ان دونوں کے احوال مکشف کرو، جب انہوں نے دیکھا کہ جس محض کا جال خالی تھا اس کے لئے کس قدر کراہیں اور کھینچیں ہیں اور جس کا جال مچھلیوں سے لبریز تھا اس کے لئے کس قدر ذلتیں اور رسوائیاں ہیں تو فرمایا اب میں مطمئن ہوں۔ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ میں نے جنت میں جھانکا تو یہ دیکھا کہ اس کے اکثر رہنے والے مالدار اور عورتیں ہیں (احمد۔ عبد اللہ ابن عمر) ایک روایت میں ہے کہ میں نے پوچھا کہ مالدار کہاں ہیں، ارشاد ہوا کہ مالدار یہی (انہیں جنت سے) روک دیا ہے، ایک حدیث میں ہے کہ دو بیخ میں اکثر عورتیں ہوں گی (راوی کہتے ہیں) میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! ان کا کیا قصور ہے، فرمایا : ان کے دو سرخ چیزوں یعنی سونے اور عفران میں لگے رہنے کی وجہ سے (۲) ایک حدیث میں ہے :-

تَحْقُقُ الْمُؤْمِنُ فِي النَّبَاِ الْفَقْرُ - (ابو منصور دہلی۔ معاذ ابن جبل) دنیا میں مومن کا تحقہ فقر ہے

ایک روایت میں ہے کہ انبیائے کرام علیہم السلام میں حضرت سلیمان علیہ السلام اپنی سلطنت کی بنا پر سب کے بعد جنت میں جائیں گے، اور صحابہ کرام میں حضرت عبدالرحمن ابن عوف اپنی مالداری کی وجہ سے سب کے بعد جنت میں داخل ہوں گے (۳) (۲) ایک حدیث میں ہے آپ نے ارشاد فرمایا کہ میں نے دیکھا کہ عبدالرحمن ابن عوف گھٹ گھٹ کر جنت میں داخل ہو رہے ہیں۔ (۴) حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے موسیٰ سے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :-

اِذَا أَحَبَّ إِلَهُ عِبْدَانِ الْإِنْسَانِ فَإِنَّ أَحَبَّ النَّبَاِ إِلَيْهِ الْفَقْرُ وَالْإِسْنَاءُ قَبِيلٌ وَمَا أَهْنَاهُ قَالَ لَمْ يَشْرِكْ لَمْ أَهْلًا وَلَا مَالًا (طبرانی۔ ابن حبہ الخولانی)

جب اللہ تعالیٰ کسی بندہ سے محبت کرتا ہے تو اسے محبت میں جھٹا کرتا ہے، اور جب بہت زیادہ محبت کرتا ہے تو اسے تنگ کر لیتا ہے، لوگوں نے عرض کیا انتخاب کا کیا مطلب ہے، فرمایا اس کے لئے نہ ال چھوڑتا ہے اور نہ مال چھوڑتا ہے۔

ایک مرتبہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب تو فقر کو آتا ہو دیکھے تو اس وقت یہ کہہ کہ صالحین کے شعار کی آمد خوب ہے اور جب تو گمراہی کو دیکھے تو یہ کہہ کہ کسی گمراہ کا عذاب جلد آگیا ہے (ابو منصور دہلی۔ کھول عن الدردام)۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کیا : یا اللہ! مخلوق میں کون لوگ تیرے دوست ہیں، اگر مجھے ان کا علم ہو جائے تو تیری رضا کی خاطر میں بھی انہیں دوست رکھوں، جواب ملا اے موسیٰ ہر محتاج فقیر میرا دوست ہے۔ جواب میں کل فقیر فقیر فرمایا گیا۔ یعنی لفظ فقیر دوبار لایا گیا، یا تو اس کے لئے اعادے سے تاکید ہوتی ہے، یا دوسرے لفظ سے مراد سخت مصیبت والا ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں کہ میں مسکنت پسند کرتا ہوں اور دولت کو برا جانتا ہوں، ان کے نزدیک بہترین بات یہ تھی کہ کوئی انہیں یا مسکین کہہ کر آواز دے۔ ایک مرتبہ عرب کے سرداروں اور دو تہذیبوں نے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ آپ ایک دن ہمارے لئے حصین فرمائیں، اور ایک دن دوسروں کے لئے، اس دن وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوں گے، ہم نہیں آئیں گے، اور دوسرے دن ہم حاضر ہوں گے وہ لوگ نہیں آئیں گے، دوسرے لوگوں سے ان کی مراد حضرت بلال، سلیمان، صیب، ابوذر، خطاب ابن الارث، عمار ابن یاسر، ابو ہریرہ اور دوسرے جنگدست اصحاب صفہ رضوان اللہ علیہم اجمعین سے تھی، اور جن لوگوں نے یہ درخواست کی تھی ان میں اقرع ابن حابس حبشی، مینہ ابن حن الطواری، عباس ابن مرداس سلمی وغیرہ تھے، ان لوگوں نے الگ الگ دنوں کی تعیینیں اس لئے کرائی چاہی تھی کہ یہ فریب اور مجلس صحابہ اولن کا لباس پہنا کرتے تھے، اور گرمی کی شدت کی وجہ سے جو پسینہ ان کے جسموں سے بہا کرتا تھا وہ اپنی کپڑوں میں جذب ہو جایا کرتا تھا

اور اس سے جسم میں بدلو ہو جاتی تھی، اور یہ بات ان مالدار لوگوں کے لئے تکلیف دہ تھی، سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی درخواست قبول فرمائی اور وعدہ کیا کہ وہ دونوں طبقوں کا اجتماع ایک دن نہیں کریں گے اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی :-

وَاصْبِرْ نَفْسَکَ مَعَ الَّذِینَ یَدْعُونَ رَبَّهُمْ بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِیِّ ۚ یُرِیْنَوْنَ وَجْهَهُ وَ لَا تَعْلَعَلْ فِیْکَ عَنْهُمْ تَرِیْذِنَةُ الْحَیَاةِ الدُّنْیَا ۚ وَلَا تَطْغَمَنَّ اَعْقَلُنَا فَلَیْکُمْ عَنْ ذِکْرِ نَا۔

(پ ۱۵ آیت ۲۸)

اور آپ اپنے کو ان لوگوں کے ساتھ مقید رکھا کیجئے جو صبح و شام اپنے رب کی عبادت محض اس کی رضا جوئی کے لئے کرتے ہیں اور دنیوی زندگی کی رونق کے خیال سے آپ کی آنکھیں ان سے بٹنے نہ پائیں، اور اپنے محض کا کمانہ ماننے جس کے قلب کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر رکھا ہے۔

”ایمانہ الدنیا“ سے مالداروں مراد ہے، اور جن لوگوں کے دلوں پر غفلت کا پردہ ڈالا گیا ہے وہ مالدار ہیں، ایک جگہ ارشاد فرمایا :
وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رِیْکُمْ فَمَنْ شَاءَ فَلْیُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلْیُکْفُرْ۔ (پ ۱۵ آیت ۲۹)
اور آپ کہہ دیجئے کہ (یہ دین) حق تمہارے رب کی طرف سے (آیا) ہے سو جس کا حق چاہے ایمان لائے اور جس کا کرے۔

ایک مرتبہ عبداللہ ابن ام مکتوم نے آپ کی خدمت میں باموایی کی اجازت چاہی، اس وقت آپ کے پاس اشراف قریش میں سے ایک شخص بیٹھا ہوا تھا، آپ کو اس موقع پر ابن مکتوم کی آمد گراں گزری اس وقت یہ آیات نازل ہوئیں :-
عَبَسَ وَتَوَلَّى اَنْ حَآءَہُ الْاَعْمٰی وَمَا یَذُرْ نِکَ لَعَلَّہُ یَرْکٰی لَوْ یَذْکُرُ فَتَنْفَعُہُ الذِّکْرٰی لَتَأْمِنُ اسْتَغْنٰی فَاَنْتَ لَہُ نَصْلٰی۔ (پ ۳۰ آیت ۱-۲)

خبر (صلی اللہ علیہ وسلم) میں بھیجیں ہو گئے، اور متوجہ نہ ہوئے اس بات سے کہ ان کے پاس اندھا آیا، اور آپ کو کیا خبر شاید غایب (آپ کی تعلیم سے پوری طرح) سنور جاتا، یا (کسی خاص دین) صیحت قبول کرتا، سو اس کو صیحت کرنا فائدہ پہنچاتا، جو محض دین سے بے پروائی کرتا ہے آپ اس کی فکر میں پڑتے ہیں۔

اس آیت کریمہ میں اس شخص سے مراد جسے وعدہ و تکبر سود مند ہوگی ابن ام مکتوم ہیں، اور جو استغناء برتا ہے اس سے قریش کا وہ سردار مراد ہے جو اس وقت آپ کی خدمت میں موجود تھا۔ ایک روایت میں ہے کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا قیامت کے روز بندے کو بلایا جائے گا اور اس سے اللہ تعالیٰ اس طرح معذرت کرے گا جس طرح دنیا میں ایک آدمی دوسرے آدمی سے معذرت کرتا ہے، اللہ تعالیٰ فرمائے گا میری عزت و جلال کی قسم! میں نے تجھ سے دین کو اس لئے دور نہیں کیا کہ تو میرے نزدیک ذلیل ہے، بلکہ میں نے تیرے لئے جو عظمت اور فضیلت رکھی ہے، اس کی بناء پر میں نے تجھے دین سے دور رکھا، اے بندے! اب تو ان صفوں میں جا اور اس شخص کو پہچان جس نے تجھے محض میری رضا کی خاطر کھلایا یا پلایا ہو یا کپڑے پہنائے ہوں اور اس کا ہاتھ پکڑے میں نے تجھے اس کا اختیار دیا۔ اس دن لوگوں کا یہ عالم ہو گا کہ پیچھے ان کے چروں تک آیا ہو گا، وہ شخص ان صفوں کے درمیان جائے گا اور اس شخص کو تلاش کرے گا جس نے اس کے ساتھ یہ سلوک کیا ہو گا اور اسے جنت میں لے جائے گا (ابو الشیخ - ابن انس) سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا : فقیروں کو اچھی طرح پہچان لو۔ اور ان سے زیادہ سے زیادہ نعمتیں حاصل کرو اس لئے کہ ان کے پاس بڑی دولت ہے لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! ان کے پاس کون سی دولت ہے؟ فرمایا : قیامت کے دن ان سے کہا جائے گا کہ ان لوگوں کو تلاش کر لیں جنہوں نے ہمیں روٹی کا ایک ٹکڑا کھلایا ہو یا پانی کا ایک گھونٹ پلایا ہو یا لباس پہنایا ہو، اور ان کا ہاتھ پکڑ کر جنت میں لے جاؤ (ابو ہیم فی الجلیہ - حسین ابن علی)

سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ میں جنت میں داخل ہوا تو میں نے اپنے سامنے پاؤں کی آہٹ محسوس کی،

میں نے دیکھا کہ بلال چلے جاتے ہیں، پھر میں نے جنت کے اعلا حصے پر نظر ڈالی تو وہاں میری امت کے فقراء اور بچے نظر آئے اور نیچے دیکھا تو مالدار عورتیں نظر آئیں، جن کی تعداد کم تھی، میں نے عرض کیا یا اللہ! ان کی تعداد کیوں کم ہے؟ فرمایا کہ عورتوں کو دودھ سرخ چیزوں سونے اور ریشم نے جنت سے روک دیا ہے، اور مالداروں کو حساب کتاب کی طوالت نے نہیں آئے دیا ہے، میں نے اپنے اصحاب پر نظر ڈالی تو عبدالرحمن ابن عوف نہیں ملے، پھر وہ میرے پاس روٹے ہوئے آئے میں نے ان سے پوچھا کہ تم مجھ سے پیچھے کیوں رہ گئے تھے؟ انہوں نے کہا یا رسول اللہ! میں آپ کے پاس اس وقت تک نہیں پہنچا جب تک میں نے تمام مشیات ملے نہ کر لیں، میں یہ سمجھ رہا تھا کہ شاید آپ کی زیارت نہیں کر پاؤں گا، میں نے پوچھا ایسا کیوں؟ انہوں نے کہا کہ میرے مال کا حساب لیا جا رہا تھا (طبرانی۔ ابو امامہ) غور کیجئے حضرت عبدالرحمن ابن عوف السائبیون الاولون میں سے ہیں اور ان دس صحابہ کرام میں شامل ہیں جن کے بارے میں یہ بشارت دنیا ہی میں سنا دی گئی کہ یہ حضرات یقینی طور پر جنتی ہیں (ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ۔ سعید ابن زید) اور ان کا شمار مالداروں کے اس گروہ میں ہوتا ہے جس کے متعلق سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی معقول ہے۔ **إِلَّا مَنْ قَالَ بِأَلْمَالِ هَلْ كُنَّا وَهَلْ كُنَّا** یعنی جو اللہ کی راہ میں زیادہ سے زیادہ مال دیا کرتے تھے (بخاری و مسلم۔ ابودرد) اس کے باوجود انہوں نے مالداروں کی بنا پر یہ نقصان اٹھایا کہ تمام صحابہ کرام کے بعد حساب کے مراحل سے گذر کر جنت میں داخل ہوئے، ایک مرتبہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ایک فقیر کے پاس تشریف لے گئے، اس کے پاس کچھ نہ تھا، آپ نے فرمایا : اگر اس کا نور تمام زمین والوں کو تقسیم کر دیا جائے تو سب منور ہو جائیں (۱) ایک حدیث میں ہے، سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام سے فرمایا کیا میں تمہیں جنت کے بادشاہوں کی خبر نہ دوں؟ صحابہ نے عرض کیا کیوں نہیں یا رسول اللہ! ضرور بتلائیں، فرمایا ہر وہ ضعیف شخص جسے لوگ بھی ضعیف سمجھیں غبارِ آلود پریشان حال، دو چادریں رکھنے والا جس کی لوگوں کے نزدیک کوئی قیمت نہ ہو، اگر وہ اللہ کی قسم کھالے تو اللہ تعالیٰ اس کی قسم ضرور پوری کرے (بخاری و مسلم۔ جاریہ ابن وہب) حضرت عمران ابن حصین فرماتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں میری بڑی قدر و منزلت تھی، ایک مرتبہ آپ نے مجھ سے فرمایا کہ اے عمران! ہم تیری عزت کرتے ہیں، اور قدر کرتے ہیں کیا تو قاطعہ بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کے لئے چل سکتا ہے؟ میں نے عرض کیا : یا رسول اللہ! میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں میں ضرور چلوں گا، چنانچہ آپ کھڑے ہوئے، میں بھی آپ کے ہمراہ چلا، یہاں تک کہ آپ نے حضرت قاطعہ کے دروازے پر پہنچ کر دستک دی اور سلام کیا، اور اندر آنے کی اجازت چاہی، حضرت قاطعہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! تشریف لائیں، آپ نے دریافت کیا، میں اور جو شخص میرے ساتھ آیا ہے دونوں آئیں؟

حضرت قاطعہ نے پوچھا یا رسول اللہ! آپ کے ساتھ کون ہے؟ آپ نے جواب دیا : عمران! حضرت قاطعہ نے عرض کیا : اس ذات کی قسم! جس نے آپ کو حق کے ساتھ نبی بنا کر مبعوث کیا میرے بدن پر صرف ایک عمامہ ہے، آپ نے ہاتھ سے اشارہ کر کے فرمایا کہ اس کو اس طرح بدن پر لپیٹ لو، حضرت قاطعہ نے عرض کیا : میں نے اپنا جسم ڈھانپ لیا ہے، لیکن اپنا سر کیسے چھپاؤں؟ آپ کے پاس ایک پرانی چادر تھی، آپ نے وہ چادر ان کی طرف بھینکی اور فرمایا اسے اپنے سر پر لپیٹ لو، اس کے بعد حضرت قاطعہ نے اندر آنے کی اجازت دی، آپ اندر تشریف لے گئے، سلام کیا اور ان کی مزاج پرسی کی، حضرت قاطعہ نے عرض کیا بخدا میں بھوکی ہوں، اور اس پر مستزاد یہ حالت ہے، میرے پاس کھانے کے لئے کچھ نہیں ہے، بھوک نے مجھے پریشان کر رکھا ہے، یہ سن کر سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم رونے لگے، اور فرمایا : اے نبی! گھبرا مت، خدا کی قسم میں نے تین دن سے کھانا نہیں چکھا، حالانکہ میں اللہ کے نزدیک تجھ سے زیادہ مکرم ہوں، اگر میں اپنے رب سے سوال کرتا تو وہ مجھے ضرور کھانا کھاتا مگر میں نے آخرت کو ترجیح دی ہے، پھر آپ نے اپنا دست مبارک حضرت قاطعہ کے شانے پر مارا اور فرمایا تجھے خوشخبری ہو کہ تو جنت کی عورتوں کی سردار ہے، انہوں نے عرض کیا فرعون کی بیوی آسیہ اور عمران کی بیٹی مریم کا درجہ کہاں ہے؟ آپ نے فرمایا آسیہ اپنے

نمانے کی عورتوں کی سردار ہوں گی، مریم اپنے نمانے کی عورتوں کی سردار ہوں گی، اور تو اپنے نمانے کی عورتوں کی سردار ہوگی، تم جنت کے ایسے مکانوں میں رہو گی جو زبرد اور باقوت سے بنے ہوئے ہوں گے، نہ ان میں کسی طرح کی تکلیف ہوگی، نہ شور ہوگا، پھر فرمایا: اپنے چچا کے بیٹے پر قانع رہنا، میں نے تیرا نکاح ایسے شخص سے کیا ہے جو دنیا میں بھی سردار ہے اور آخرت میں بھی سردار ہے (۱) حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ جب لوگ اپنے فقیروں کو برا جاننے لگیں گے، دنیا کی امارت ظاہر کرنے لگیں گے اور درہم جمع کرنے میں منہمک ہو جائیں گے تو اللہ تعالیٰ انہیں چار خصلتوں کا نشانہ بنا دے گا، خط، بادشاہ کی طرف سے ظلم، حکام کی طرف سے خیانت، اور دشمنوں کا زور۔ (ابو منصور، دہلی)۔

حضرت ابو الدرداء فرماتے ہیں کہ دو درہم والا ایک درہم والے کی بہ نسبت سخت دھکا جائے گا یا اس سے سختی کے ساتھ حساب لیا جائے گا، حضرت عمرؓ نے سعید ابن عامر کے پاس ایک ہزار دینار بیچے، وہ کبیدہ خاطر، اور غمگین گھر میں داخل ہوئے ان کی اہلیہ نے دریافت کیا کہ کیا کوئی نئی بات پیش آئی ہے، انہوں نے جواب دیا اس سے بھی بدتر ایک واقعہ ہے، پھر آپ نے فرمایا ذرا اپنا پرانا دوپٹہ دینا (اہلیہ نے اپنا دوپٹہ دیدیا) آپ نے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کئے، ان کی قصیدیاں بنائیں، (اور ان قصیدوں میں درہم بھر کر) تقسیم کر دیے، پھر نماز کے لئے کھڑے ہو گئے، اور صبح تک روتے رہے اس کے بعد فرمایا کہ میں نے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ میری امت کے فقراء مالداروں سے پانچ سو برس پہلے جنت میں جائیں گے، یہاں تک کہ اگر کوئی مالدار فقراء کی جماعت میں گھس جائے تو اس کا ہاتھ پکڑ کر نکال دیا جائے گا۔ حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ تین آدمی جنت میں بلا حساب داخل ہوں گے، ایک وہ شخص جو اپنے کپڑے دھونا چاہے تو اس کے پاس کوئی پرانا لباس نہ ہو جسے پن کر کپڑے دھو سکے، دو سرا وہ شخص جو اپنے چمچے پر بیک وقت دو دیکھاں نہ چھائے، تیسرا وہ شخص جو پانی طلب کرے تو اس سے یہ نہ پوچھا جائے کہ وہ کس قسم کا پانی چاہتا ہے؟ (یعنی کھانے پینے کی اشیاء میں اس کے یہاں تنوع اور کثرت نہ ہو) روایت ہے کہ ایک شخص حضرت سفیان ثوری کی مجلس میں آیا، آپ نے اس سے فرمایا قریب آ، اگر تو مالدار ہوتا تو میں تجھے ہرگز اپنے قریب نہ بلاتا۔ ان کے رفقاء میں سے وہ حضرات جو صاحب ثروت تھے یہ تمنا کرتے تھے کہ کاش وہ غریب ہوتے، کیوں کہ آپ فقراء کو اپنے قریب بٹھایا کرتے تھے، اور اعرام سے اعراض کرتے تھے، مول کہتے ہیں کہ میں نے مالدار آدمی کو سفیان ثوری کی مجلس سے زیادہ ذلیل کیس نہیں دیکھا، اور نہ کسی محتاج کو ان کی مجلس سے زیادہ کیس باعزت پایا، ایک حکیم کہتے ہیں اگر یہ چھوٹا انسان دولخ سے بھی اسی طرح ڈرتا جس طرح فقرے ڈرتا ہے تو دونوں سے نجات پالیتا، اور اگر جنت میں بھی اسی طرح راض رہتا جس طرح تو گمری کی طرف راض رہتا ہے تو دونوں چیزیں حاصل کر لیتا، اور اگر باطن میں اللہ تعالیٰ سے اس طرح ڈرتا جس طرح ظاہر میں اس کی مخلوق سے ڈرتا ہے تو دونوں جہانوں کی سعادتیں میشتا، حضرت عبداللہ ابن عباسؓ فرماتے ہیں وہ شخص ملعون ہے جو مالدار کا اکرام کرے، اور حکومت کی اہانت کرے، حضرت لقمان علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو نصیحت فرمائی کہ کسی ایسے شخص کی جس کے کپڑے بوسیدہ ہوں، تحقیر مت کرنا اس لئے کہ تمہارا اور اس کا رب ایک ہے۔ یحییٰ ابن معاذؓ فرماتے ہیں کہ فقراء سے محبت کرنا فقیروں کا اخلاق ہے، اور ان کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا صلحاء کا شعار ہے، اور ان کی ہم نشینی سے اجتناب کرنا منافقین کی علامت ہے، پچھلی آسمانی کتابوں سے نقل کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کسی پیغمبر پر وحی بھیجی کہ اس بات سے ڈر کہ میں تجھ سے ناراض ہوں، پھر تو میری نگاہ سے گر جائے اور میں تجھ پر دنیا اڑیل دوں۔ حضرت عائشہؓ ایک دن میں ہزار ہزار درہم خیرات کر دیتی تھیں، یہ درہم ان کی خدمت میں حضرت معاویہؓ اور ابو عامر وغیرہ بھیجا کرتے تھے، جب کہ آپ کا دوپٹہ پیوندہ زندہ رہا، اور آپ کی پابندی یہ کہا کرتی کہ اگر آپ ایک درہم سے گوشت منگو لیتیں تو اسی سے روزہ افطار کر لیا جاتا، خود آپ کا بھی روزہ ہوتا، لیکن اس کا خیال نہ آتا کہ اپنے لئے کچھ منگو لیں، پابندی کے توجہ دلانے پر ارشاد فرماتیں کہ اگر تو یاد دلاؤں تو میں ایسا کر لیتی، سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو وصیت فرمائی تھی کہ اگر تو مجھ سے ملنا چاہتی ہے تو فقیرانہ زندگی بسر کرنا، مالداروں کی ہم نشینی سے اجتناب کرنا، اور اپنا دوپٹہ اس وقت تک مت اتارنا جب (۱) یہ روایت پہلے گزر چکی ہے۔

تک تو اس میں پونہ لاکھ (ترقی) ایک شخص دس ہزار درہم لے کر حضرت ابراہیم ابن اویس کی خدمت میں حاضر ہوا، آپ نے یہ مال قبول کرنے سے انکار کر دیا، اس شخص نے اصرار کیا، حضرت ابراہیم نے اس سے پوچھا کہ کیا تو میرا نام فقراء کی فہرست سے نکلوانا چاہتا ہے، میں ایسا ہرگز نہیں ہونے دوں گا۔

مخصوص فقراء یعنی راضین، قانعین اور صادقین کے فضائل

سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں :-

طُوبَى لِمَنْ هَبَتْ إِلَى الْإِسْلَامِ مَوَازِينُ كِفَافًا وَقَنَعَ بِمَا (ترقی - فضائل ابن عیینہ)

اس شخص کے لئے خوشخبری ہو جسے اسلام کی پدایت ہو اس کی معیشت بقدر ضرورت ہو، اور وہ اسی پر قانع ہو۔

ایک حدیث میں ہے، ارشاد فرمایا :-

يَا مَعْشَرَ الْفُقَرَاءِ اعْطُوا اللَّهَ الرِّضَى مِنْ قُلُوبِكُمْ تَنْظُرُوا بِثَوَابِ فَقِيرٍ كَمَا الْآفَلَاحُ۔

(ابو منصور علی - ابو ہریرہ)

اے فقیروں کے گروہ! اللہ تعالیٰ سے اپنے دلوں میں راضی رہو کہ تمہیں تمہارے فقر کا ثواب ملے گا، ورنہ نہیں ملے گا۔

پہلی حدیث میں قانع کی فضیلت ہے، اور دوسری حدیث میں راضی کی، اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حبس کو اس کے فقر کا اجر نہیں ملے گا، لیکن فقر کی فضیلت میں جو روایات عام طور پر وارد ہیں ان سے ثابت ہوتا ہے کہ حبس کو بھی اجر ملے گا، عنقریب اس کی تحقیق بیان کی جائے گی، غالباً یہاں عدم رضا سے مراد یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اس عمل کو پسند نہ کرے کہ اس سے دنیا کو محبوس کر دیا گیا ہے، اس کراہت کی بنا پر یقیناً حبس فقر کے ثواب سے محروم رہے گا، البتہ بہت سے مال کے حبس ایسے ہیں جن کے دل میں اللہ تعالیٰ کے فعل پر انکار کا تصور بھی نہیں آتا، اور نہ وہ اسے برا سمجھتے ہیں، اگر کوئی شخص اس طرح کا حرص رکھتا ہے تو اس سے فقر کا اجر و ثواب ضائع نہیں ہوگا۔ حضرت عمر ابن الخطابؓ سے مروی ہے کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :-

إِنَّ لِكُلِّ شَيْءٍ مِفْتَاحًا وَمِفْتَاحُ الْجَنَّةِ حُبُّ الْمَسْكِينِ، وَالْفَقْرَاءُ لِيَصْبِرَ هُمْ

حُلَسَاءُ اللَّهِ تَعَالَى يَوْمَ الْقِيَامَةِ (دار قطنی، ابن عساکر، ابن حبان)

ہر چیز کی ایک کئی ہوتی ہے جنت کی کئی مسکین سے محبت ہے، اور فقراء اپنے صبر کی بناء پر قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کے ہم کشین ہوں گے۔

حضرت علیؓ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ روایت نقل فرماتے ہیں :-

أَحَبُّ الْعِبَادِ إِلَى اللَّهِ تَعَالَى الْفَقِيرُ الْقَانِعُ بِرِزْقِ اللَّهِ تَعَالَى (۱)

اللہ تعالیٰ کے نزدیک بندوں میں محبوب تر وہ فقیر ہے جو اپنے رزق پر قانع ہو، اور اللہ تعالیٰ سے راضی ہو۔

سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا فرمایا کرتے تھے :-

اللَّهُمَّ اجْعَلْ قُوَّتَ آلِ مُحَمَّدٍ كَقُوَّتِ آلِ إِبْرَاهِيمَ (۲) اے اللہ! آل محمد کا رزق بقدر گذران کر۔

ایک حدیث میں ہے، ارشاد فرمایا :-

مَا مِنْ أَحَدٍ غَنِيَ وَلَا فَقِيرٍ إِلَّا وَدَّيَوْمَ الْقِيَامَةِ كَانَ لَوْنِي قُوَّتَا فِي النَّبِيَا۔ (ابن ماجہ - ابن)

(۱) یہ روایت ابن الفلاح میں نہیں لی، ابن ماجہ کی ایک حدیث اس مضمون کی ابھی گزری ہے۔ (۲) یہ روایت ابھی گزری ہے۔

کوئی مالدار یا محکومت ایسا نہیں ہے جو قیامت کے دن یہ تمنا نہیں کرے گا کہ (کاش) اسے دنیا میں بقدر ضرورت رزق دیا جاتا۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت اسماعیل علیہ السلام پر وحی نازل فرمائی کہ مجھے ٹوٹے ہوئے دل والوں کے پاس تلاش کرنا، انہوں نے عرض کیا وہ کون ہیں؟ فرمایا وہ فقراء صادقین ہیں، ایک حدیث میں ہے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔

لَا آخِذَ أَفْضَلُ مِنَ الْفَقِيرِ إِذَا كَانَ زَاهِيًا (۱) فقیر اگر راضی ہو تو اس سے افضل کوئی نہیں ہے۔

سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے روز فرمائے گا کہ میری مخلوق کے چیدہ چیدہ لوگ کہاں ہیں، فرشتے عرض کریں گے اے ہمارے پروردگار! وہ کون ہیں؟ فرمائے گا کہ مسلمانوں کے وہ فقراء جو میری عطا پر قانع ہوں، اور میری عطا پر راضی ہوں، انہیں جنت میں پہنچا دو، چنانچہ وہ لوگ جنت میں جا کر کھائیں گے، پئیں گے، اور لوگ حساب (کی الجھنوں) میں گرفتار ہو جائیں گے، یہ قانع اور راضی کے فضائل ہیں، زاہد کے فضائل اس کتاب کے دوسرے باب میں ذکر کر کے جائیں گے انشاء اللہ۔

رضا اور قناعت کے باب میں بے شمار آثار بھی وارد ہیں، یہ بات عقلی نہیں ہے کہ قناعت کی ضد طمع ہے، اور حضرت عمرؓ ارشاد فرماتے ہیں کہ طمع فقر ہے، اور لوگوں سے ناامید ہونا مالداری ہے، جو شخص لوگوں کے مال و دولت سے مایوس رہتا ہے اور قناعت اختیار کرتا ہے وہ ان سے مستثنیٰ رہتا ہے حضرت ابو مسعودؓ فرماتے ہیں کہ ہر روز ایک فرشتہ عرش کے نیچے سے یہ آواز لگاتا ہے اے ابن آدم! وہ تھوڑی چیز جو تجھے کفایت کر جائے اس زیادہ سے بہتر ہے جو تجھے سرکش بنادے، حضرت ابو الدرداءؓ فرماتے ہیں کہ کوئی شخص ایسا نہیں ہے جس کی عقل میں نقص نہ ہو، چنانچہ جب اس کی دنیا میں اضافہ ہوتا ہے تو وہ بے حد خوش ہوتا ہے، حالانکہ رات اور دن دونوں اس کی عمر کا عمل گرانے میں مصروف ہیں اسے اس کا غم نہیں ہوتا۔ اس بد بخت کو معلوم نہیں کہ اگر عمر کم ہوتی رہے گی تو مال کی زیادتی سے کیا فائدہ ہوگا۔ کسی دانشور سے دریافت کیا گیا کہ تو عمری کیا ہے؟ اس نے جواب دیا کہ تیرا کم سے کم آرزو کرنا، اور بقدر کفایت پر قناعت کرنا۔ بیان کیا گیا ہے کہ ابراہیم ابن ادہم کا شمار خراسان کے دولتمندوں میں ہوا کرتا تھا، ایک مرتبہ وہ اپنے محل کے بالا خانے سے نیچے جھانک رہے تھے کہ ان کی نظر محل کے صحن میں موجود ایک شخص پر پڑی، اس کے ہاتھ میں روٹی تھی، روٹی کھا کر وہ شخص سو گیا، حضرت ابراہیم ابن ادہم نے اپنے خادم سے کہا کہ جب یہ شخص بیدار ہو جائے تو اسے میرے پاس لے کر آنا، چنانچہ جب وہ شخص نیند سے بیدار ہوا تو غلام اسے لے کر ابن ادہم کے پاس آیا، ابن ادہم نے اس سے دریافت کیا کہ تو نے روٹی کھائی تھی کیا تو بھوکا تھا؟ اس نے جواب دیا ہاں! پھر پوچھا کہ ایک روٹی کھا کر تیرا پیٹ بھر گیا، اس نے کہا بالکل، انہوں نے پوچھا کہ پھر تجھے نیند آئی؟ اس نے کہا ہاں، سکون کی نیند سو یا، حضرت ابراہیم ابن ادہم نے اپنے دل میں سوچا کہ میں دنیا لے کر کیا کروں گا، جب کہ جس ایک روٹی پر قناعت کر سکتا ہے۔ ایک شخص عامر ابن عبد القیس کے پاس سے گذرا، اس وقت آپ نمک سے ساگ کھا رہے تھے، اس شخص نے حیرت سے دریافت کیا کہ آپ اس قدر دنیا پر راضی ہو گئے؟ عامر نے جواب دیا میں تمہیں ایسے شخص کے بارے میں نہ بتاؤں جو اس سے بھی زیادہ بری چیز پر راضی ہوا؟ اس نے کہا ضرور بتلائیں! عامر نے کہا وہ شخص جو آخرت کے عوض دنیا پر راضی ہوا، عمر ابن الواسع کو بھوک لگتی تو روٹی نکالتے، اور پانی میں بھگو کر نمک سے کھا لیتے، اور فرماتے کہ جو شخص اس قدر دنیا پر راضی ہو وہ کسی کا محتاج نہیں ہو سکتا حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ ان لوگوں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو جن کے لئے اللہ تعالیٰ نے قسم کھائی مگر اسے انہوں نے بچ نہ جانا، پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی:۔

وَفِي السَّمَاءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تَوْعَدُونَ فَوَرَبِّ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ إِنَّهُ لَحَقٌّ۔ (پ ۳۱، آیت ۲۳)

اور تمہارا رزق اور جو تم سے وعدہ کیا جاتا ہے آسمان میں ہے تو قسم ہے آسمان اور زمین کے پروردگار کی کہ وہ برحق ہے۔

ایک دن حضرت ابو ذرؓ کو لوگوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے کہ ان کی اہلیہ شریف لائیں اور کہنے لگیں آپ یہاں بیٹھے ہیں خدا کی

(۳) روایت ان الفاظ میں نہیں لی۔

قسم نہ گھر میں ایک چچہ سالن ہے اور نہ ایک مٹھی ستو، حضرت ابو ذرؓ نے فرمایا : بیگم! ہمارے سامنے ایک دشوار گزار گھاٹی ہے اسے وہی شخص عبور کر سکتا ہے جو ہلکا پھلکا ہو، یہ سن کر وہ خوشی خوشی واپس چل گئیں۔ حضرت ذوالنون مصریؒ فرماتے ہیں وہ شخص کفر سے قریب تر ہے جو قاتل سے ہو اور مہر کی قوت سے محروم ہو، ایک دانشور سے کسی شخص نے دریافت کیا کہ آپ کا مال کیا ہے۔ اس نے جواب دیا ظاہر کی زینت، باطن کا اعتدال، اور لوگوں کی دولت سے طمع کا اختلاط۔ روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کسی آسمانی کتاب میں ابن آدم کو اس طرح خطاب فرمایا ہے : اے انسان! اگر پوری دنیا حیرے لئے ہوئی تب بھی تجھے اتنی ہی ملتا جتنی تیری غذا ہے، اگر میں تجھے تیری غذا کے بھڑو دیتا رہوں اور اس کا حساب تجھ پر نہ رکھوں تو یہ میرا احسان ہو گا۔ قناعت کے باب میں یہ اشعار کہے گئے ہیں :-

اَجْزَعْ إِلَى اللّٰهٖ لَا تَضْرَعْ إِلَى النَّاسِ وَتَقْنَعُ بِبَاسٍ فَإِنَّ الْعَزْفَ فِي الْبَاسِ
وَأَسْتَعِزُّ عَنْ كُلِّ ذِي قُرْبَىٰ وَفِي ذِي حِمٍ إِنَّ الْغِنَىٰ مَنْ اسْتَعْفَىٰ عَنِ النَّاسِ
(اللہ کے حضور گڑ گڑاؤ، لوگوں کے سامنے آہ و زاری مت کرو، محرومی پر قانع رہو، اس لئے کہ عزت اسی میں ہے، ہر عزیز رشتے دار سے بے نیاز رہو، اس لئے کہ غنی حقیقت میں وہی شخص ہے جو لوگوں سے مستغنی ہو۔)

اس عنوان پر یہ اشعار بھی بہت عمدہ اور سبق آموز ہیں۔

يَا حَامِعًا مَانِعًا وَاللَّهْوَ يَرْمُقُهُ - مُقْبِرًا أَيُّ بَابٍ مِنْهُ يُغْلِقُهُ
مُفَكِّرًا كَيْفَ تَأْتِيهِ مَنِيتُهُ - غَادِيًا أَمْ بِهَا يَسْرِي فَتُطْرَقُهُ
جَمَعْتَ مَالًا فَقُلْ لِي هَلْ جَمَعْتَ لَهُ - يَا حَامِعَ الْمَالِ أَيُّ مَالًا تَفْرَقُهُ
الْمَالِ عِنْدَكَ مَخْزُونٌ لِوَارِثِهِ - مَالُ الْمَالِ مَالِكٌ إِلَّا يَوْمَ تَنْفَعُهُ
أَرْقَهُ بِبَالٍ فَتَنِي يَغْدُو عَلَى ثِقَةٍ - إِنَّ الَّذِي قَسَمَ الْأَرْزَقَ يَزْرُقُهُ
فَالْعَرَضُ مِنْهُ مَصُونٌ مَا يَنْبَسُهُ - وَالْوَجْهَ سِنَّهُ جَلِيدٌ كَيْسَ يَخْلُقُهُ
إِنَّ الْقِنَاعَةَ مَنْ يَحْلُلُ بِسَاحَتِهَا - لَمْ يَبْقَ فِي ظِلِّهَا هُمْ يُوْرِقُهُ
(اے دولت کو جمع کرنے والے اور روکنے والے زمانہ ناک لگائے بیٹھا ہے، اور اس خیال میں ہے کہ کونسا دوازدہ بند کرے اور یہ سوچ رہا ہے کہ وہ کون سی صبح یا شام ہوگی جب موت اس کے دوازدہ پر دستک دے گی۔ تو نے مال جمع کیا ہے، مجھے بتلایا تو نے زمانے کے لئے جمع کیا ہے اے مال جمع کرنے والے، یہ شب و روز حیرانم مال حقیق کر دیں گے، مال حیرے پاس حیرے و رواء کا خزانہ ہے، حیرا مال صرف وہ ہے جو تجھے قیامت کے روز طمع پہچائے گا، وہ جو ان مطمئن ہے جو اس یقین پر زندہ ہو کہ جس ذات نے رزق تقسیم کئے ہیں، اسی سے اے بھی رزق ملے گا، اس کی آیم و انذار نہیں ہوتی، اس کا چہرہ سوال کی ذلت سے زخمی نہیں ہوتا، جس شخص کے دل میں قناعت بھرا کر لیتی ہے وہ ہر فکر سے آزاد ہو جاتا ہے۔)

غنی پر فقر کی فضیلت اس سلسلے میں لوگوں کا اختلاف ہے، حضرت جنیدؒ حضرت خواصؒ اور اکثر حضرات فقر کی فضیلت کے قائل ہیں، اور ابن عطاءؒ کہتے ہیں کہ وہ شکر گزار مالدار جو مال کا حق ادا کرتا ہو مہر کرنے والے فقیر سے افضل ہے، کہتے ہیں کہ حضرت جنیدؒ نے عطاءؒ کے لئے ان کی اس رائے پر ناراض ہو کر بددعا کی تھی، اس بددعا کی وجہ سے انہیں بڑی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا تھا، کتاب الصبر میں ہم نے یہ واقعہ نقل کیا ہے، وہاں ہم نے صبر اور شکر کے درمیان فرق کے اسباب پر بھی روشنی ڈالی ہے، اور یہ بھی بیان کیا ہے کہ اعمال و احوال میں فضیلت تفصیل کے بغیر معلوم نہیں ہو سکتی۔ اب اگر فقر اور غنا مطلق لئے جائیں تو جو شخص اختیار و آثار پر نظر رکھتا ہے وہ اس حقیقت میں شک نہیں کرے گا کہ فقر افضل ہے، لیکن اس میں کچھ تفصیل ہے۔ یہاں دو مقام ایسے ہیں جن میں شک پڑ سکتا ہے کہ کسے افضل کہا جائے، ایک تو یہ کہ فقیر صابر ہو، مال کی طلب پر حریص نہ ہو، بلکہ اس پر قانع ہو یا

راضی ہو، اس کا مقابلہ ایسے غنی سے کیا جائے جو مال روکنے پر حریص نہ ہو بلکہ اپنا مال خیر کے کاموں میں صرف کرتا ہو۔ دوسرا مقام یہ ہے کہ فقیر حریص سے کیا جائے۔ اس میں شک نہیں کہ قانع فقیر اس حریص غنی سے افضل ہے جو اپنا مال روکتا ہو، اسی طرح وہ مالدار بھی جو خیر کے کاموں میں اپنا مال خرچ کرتا ہو فقیر حریص سے افضل ہے لیکن پہلے مقام میں یہ گمان ہوتا ہے کہ غنی فقیر سے افضل ہے کیوں کہ جہاں تک مال میں ضعف حرم کا سوال ہے اس میں دونوں برابر ہیں، لیکن غنی صدقات و خیرات کے ذریعے تقریب حاصل کرتا ہے، اور فقیر اس سے عاجز ہے ہمارے خیال میں ابن عطاء نے ایسے ہی غنی کو افضل کہا ہے، تاہم وہ غنی جو مال سے متمتع ہوتا ہے اگرچہ مباح امور ہی میں کیوں نہ ہو اس فقیر سے افضل نہیں ہو سکتا جو قانع ہو۔ جیسا کہ حدیث میں وارد ہے کہ فقراء نے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں یہ شکایت کی کہ اغنیاء خیرات، صدقات، حج اور جہاد کے ذریعے ان سے سبقت لے جاتے ہیں، اس پر آپ نے انہیں تسبیح کے چند کلمات تلقین فرمائے، اور ارشاد فرمایا کہ ان کلمات کے ذریعہ اغنیاء سے زیادہ اجر و ثواب حاصل کرو گے چنانچہ فقراء نے یہ کلمات سیکھ لئے اور پڑھنے لگے، اس کے بعد یہ لوگ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور اپنے معمول کی خبر دی، آپ نے فرمایا :

ذَلِكُمْ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ

(بخاری و مسلم - ابو ہریرہ)

یہ فضل خداوندی ہے، اللہ جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔

ابن عطاء نے اپنے دعویٰ کے لئے ایک اور استدلال بھی کیا ہے، جب ان سے دریافت کیا گیا کہ آپ غنی کو فقیر سے افضل کیوں کہتے ہیں تو آپ نے جواب دیا اس لئے کہ غنی اللہ تعالیٰ کا وصف ہے۔ لیکن ان کی یہ دونوں دلیلیں محل نظر ہیں، پہلی دلیل اس لئے محل نظر ہے کہ اس میں وہ بات پائی جاتی ہے جو عطاء کے مقصود کے خلاف ہے، اور وہ یہ کہ اس میں تسبیح کے ثواب کو صدقات و خیرات کے اجر سے افضل قرار دیا گیا ہے، اور فقراء کا یہ ثواب حاصل کرنا فضل خداوندی بتلایا گیا ہے، اللہ جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے، چنانچہ زید ابن اسلم حضرت انس ابن مالک سے روایت کرتے ہیں کہ فقراء نے اپنا ایک قاصد سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیجا، اس شخص نے (آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر) عرض کیا کہ میں آپ کی جناب میں فقراء کا قاصد بنا کر بھیجا گیا ہوں، آپ نے ارشاد فرمایا میں تجھے بھی مرعوب کرتا ہوں اور ان لوگوں کو بھی جن کے پاس سے تو آیا ہے، وہ ایسی قوم ہے جس سے میں محبت کرتا ہوں، قاصد نے عرض کیا : یا رسول اللہ! فقراء کہتے ہیں کہ اغنیاء تمام خیر سمیٹ لیتے ہیں، وہ حج کرتے ہیں، ہمیں اس پر قدرت نہیں ہے، وہ عمرہ کرتے ہیں، ہم اس سے عاجز ہیں اور جب بیمار پڑتے ہیں تو اپنا زائد مال آخرت کے لئے ذخیرہ بنا کر خرچ کر دیتے ہیں، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا میری طرف سے فقراء کو یہ پیغام پہنچا دینا کہ جو شخص تم میں سے صبر کرے گا اور آخرت کے ثواب کا طالب ہو گا اس میں تین تین باتیں ایسی ہوں گی جو مالداروں کو حاصل نہیں ہوں گی، پہلی بات تو یہ کہ جنت میں بہت سی کھڑکیاں ایسی ہیں جنہیں جنت والے اس طرح دیکھیں گے جس طرح زمین والے آسمان کے تاروں کو دیکھتے ہیں، ان میں فقیر پیغمبر، فقیر شہید، اور فقیر مومن کے علاوہ اور کوئی نہیں جائے گا، اور دوسری بات یہ ہے کہ فقراء اغنیاء سے نصف روز یعنی پانچ سو برس پہلے جنت میں داخل ہوں گے، تیسری بات یہ ہے کہ جب مالدار یہ کلمہ کہتا ہے سُبْحَانَ اللَّهِ وَالْحَمْدُ لِلَّهِ وَلَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَاللَّهُ أَكْبَرُ اور فقیر بھی یہ کلمہ کہتا ہے تو فقیر کو جو ثواب ملتا ہے مالدار کو اس قدر ثواب نہیں ملتا اگرچہ وہ اس کے لئے دس ہزار درہم خرچ کرے، باقی تمام نیک اعمال کو بھی اسی پر قیاس کرنا چاہیے، قاصد یہ پیغام لے کر واپس چلا گیا، اور فقراء تک پہنچایا، سب نے کہا ہم راضی ہیں، ہم راضی ہیں۔ (ابن ماجہ - تہذیبیہ) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اوپر کی حدیث میں ذَلِكُمْ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ سے فقراء کے ثواب کی زیادتی مراد ہے، یہ ثواب انہیں ذکر پر ملتا ہے، جب کہ اغنیاء کو اسی ذکر پر کم ثواب حاصل ہوتا ہے۔ یہ پہلی دلیل کا جواب ہے۔

ابن عطاء کی دوسری دلیل یہ تھی کہ غنی اللہ تعالیٰ کا وصف ہے، اس کا جواب بعض مشائخ نے یہ دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے غنی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ تمام اسباب و اعراض سے مستغنی ہے، اس صورت میں بتلائے انسان کے غنی کو اللہ تعالیٰ کے غنی سے کیا نسبت ہے؟ یہ سن کر ابن عطاء چپ رہ گئے، وہ اس اعتراض کا جواب نہ دے سکے۔ بعض لوگوں نے اس دلیل کا جواب یہ دیا ہے کہ تکبر اللہ تعالیٰ کا وصف ہے، اس اعتبار سے تکبر کو متواضع سے افضل ہونا چاہیے، ان مشائخ کا کہنا یہ ہے کہ فقر افضل ہے اس لئے کہ تمام صفات عبودیت بندے کے لئے افضل ہیں جیسے خوف، رجا و غیرہ، صفات ربوبیت میں نزاع نہ ہونا چاہیے، جیسا کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک حدیث قدسی میں منقول ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :-

الْكِبَرُ يَا عَزِيزُ ذَاتِي الْعِظَمَةِ اَرَارِيْ فَمَنْ نَارَ عَيْتِيْ وَاحِدًا مِنْهُمَا قَصَمْتُهُ (۱)

کبریا میری چادر ہے، اور عظمت میرا ازار ہے، جو ان دونوں میں سے کسی میں مجھ سے نزاع کرے گا میں اسے توڑ دوں گا۔

حضرت سہیل تستریؒ فرماتے ہیں کہ عزت اور بقاء کی محبت ربوبیت میں شرک کے مترادف ہے، اور ان دو صفات میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ منازعت کے ہم معنی ہے۔

فقر و غنی میں فضیلت کی حقیقت یہ ہے فقر و سائیں انضیلت کی بحث، اور اس سلسلے میں مختلف آراء، ان میں سے ہر رائے کی بنیاد عام روایات پر ہے، جن میں تاویل کی گنجائش ہے، اور ہر ایک رائے میں ایسے کلمات پائے جاتے ہیں جن سے مخالف مفہوم ثابت ہو سکتا ہے چنانچہ جس طرح ابن عطاء کی اس دلیل کا کہ غنی باری تعالیٰ کا وصف ہے یہ جواب دیا گیا ہے کہ تکبر باری تعالیٰ کا وصف ہے، لیکن بندہ کا متواضع ہونا افضل ہے اسی طرح یہ جواب بھی اعتراض سے خالی نہیں ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ علم اور معرفت دو ایسے وصف ہیں جن کی نسبت باری تعالیٰ کی طرف کی جاتی ہے اور جہل و غفلت دو ایسی صفات ہیں جو بندوں کی طرف منسوب ہوتی ہیں، اس اعتبار سے کسی بندے کو عارف یا عالم کہنا بہتر نہ ہو گا کیوں کہ علم و معرفت صفات ربوبیت ہیں بلکہ جاہل و غافل کہنا بہتر ہو گا کیوں کہ جہل و غفلت ہی عبودیت کے لئے موزوں ہیں، حالانکہ اس روئے زمین پر کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں ملے گا جو غفلت کو علم کے مقابلے میں افضل کہتا ہو۔

اس سلسلے میں حق بات وہی ہے جو ہم نے کتاب الصبر میں بیان کی ہے، وہاں یہ اصول بیان کیا گیا ہے کہ جو شے اپنی ذات سے مقصود نہیں ہوتی بلکہ غیر کے لئے مقصود ہوتی ہے اس کے فضل و کمال کا اندازہ مقصود کے فضل و کمال سے لگایا جاتا ہے، جیسا مقصود ہو گا ایسی ہی وہ شے بھی ہوگی جو اس مقصود کے حصول کا وسیلہ ہے۔ چنانچہ دنیاوی مال و دولت کی اس لئے ممانعت ملی گئی ہے کہ اس کی وجہ سے بندہ خدا تک پہنچنے سے قاصر رہتا ہے، اسی طرح فقر بھی بذات خود مطلوب نہیں ہے بلکہ اس لئے مطلوب ہے کہ اس کے باعث وہ رکاوٹ دور ہو جاتی ہے جو خدا تک پہنچنے سے مانع ہے لیکن بہت سے اغیاء ایسے بھی ہیں جنہیں ان کے غنا نے اللہ تعالیٰ سے دور نہیں کیا جیسے حضرت سلیمان علیہ السلام، حضرت عثمان غنیؓ اور حضرت عبدالرحمن ابن عوفؓ۔ دوسری طرف بہت سے فقراء ایسے بھی ہیں جنہیں فقر نے ان کے اصل مقصد سے ہٹا دیا ہے۔ دنیا میں اصل مقصد یہ ہے کہ بندہ کو اللہ تعالیٰ سے محبت ہو، اور اس کے ساتھ انس ہو، اور یہ مقصد اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جبکہ بندے کو اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہو جائے، اور معرفت کی وادی میں یہ قدم رکھنا اور اسے عبور کرنا شواغل کی موجودگی میں ممکن نہیں ہے، جس طرح آدمی کے لئے غنی مانع بن سکتا ہے اسی طرح فقر بھی مانع ہو سکتا ہے، فی الحقیقت معرفت و انس کے لئے اصل مانع دنیا کی محبت ہے، اس کا اجتماع محبت الہی کے ساتھ ممکن نہیں ہے، جس کے دل میں کسی چیز کی محبت ہوتی ہے وہ اسی میں مشغول رہتا ہے خواہ اس کے فراق میں مشغول ہو یا وصال میں۔ پھر بعض لوگ فراق میں زیادہ مشغول ہوتے ہیں اور بعض لوگ وصال میں، یہ لوگوں کے حالات اور رجحانات کے (۱) یہ حدیث پہلے بھی گذری ہے۔

اختلاف پر موقوف ہے۔ دنیا غفلتوں کی محبوب ہے، جن سے ان کا محبوب جدا ہے وہ اس کے حصول کی فکر میں مشغول ہیں، اور جنہیں محبوب کا قرب میسر ہے وہ اس کی حفاظت، اور اس کی قربت سے زیادہ سے زیادہ لطف اندوز ہونے میں لگے ہوئے ہیں۔

مال اور پانی کو برابر سمجھنے والا غنی اگر کوئی ایسا شخص فرض کیا جائے جو مال کی محبت سے خالی ہو اس طرح کہ اس کے نزدیک مال اور پانی دونوں برابر ہوں یعنی مال کی صرف اسی قدر ضرورت سمجھتا ہو جو زندگی کے لئے ناگزیر ہے، باقی مال خواہ موجود ہو یا نہ ہو، اسے نہ اس کے وجود کی پروا ہے، اور نہ اس کے عدم سے دلچسپی ہے، یہ غنا یقیناً افضل ہے، پھر مقدار حاجت کا موجود ہونا اس کے نہ ہونے سے بہتر اس لئے ہے کہ فائدہ غرض محض موت کی طرف قدم بڑھاتا ہے، معرفت کا راستہ طے نہیں کرتا۔ تاہم اکثر لوگوں کے حق میں فقیر افضل ہے، کیوں کہ فقیر خطرے سے زیادہ دور ہوتا ہے، جب کہ خوشحالی کا فتنہ مغلی کے فتنے سے سخت تر ہے، اور اس فتنے سے محفوظ رہنے کا طریقہ یہی ہے کہ اس پر قدرت نہ ہو، اسی لئے حضرات صحابہؓ فرمایا کرتے تھے کہ ہم مغلی کے امتحان میں ثابت قدم رہے، مالدار کی آزمائش میں صبر نہ کر سکے، یہ ہر انسان کا فطری تقاضا ہے، شاذ و نادر ہی کوئی شخص ایسا ہو گا جسے اس فتنے سے مستثنیٰ کیا جاسکے ہو، جب کہ شریعت کے مخاطب عام انسان ہیں، وہ شاذ و نادر خصوصیتیں نہیں ہیں جو کبھی کبھی ظاہر ہوتی ہیں، اس لئے مغلی اور غریبی سب کے لئے مناسب ہے، اگرچہ بعض نادر لوگوں کے لئے تو فکری مناسب ہو، اسی لئے شریعت نے غنی سے منع فرمایا ہے، اس کی مذمت کی ہے، اور فقر کی مدحت بیان کی ہے، چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں کہ اہل دنیا کی دولت کی طرف مت دیکھو، اس کی چمک تمہارے ایمان کا نور سلب کر لے گی، کسی صاحب علم کا قول ہے کہ اموال کی آمد و رفت سے ایمان کی علالت ضائع ہو جاتی ہے، حدیث شریف میں ہے :-

لِكُلِّ أُمَّةٍ عَجَلٌ وَأُولَئِكَ هُمُ الَّذِينَ يُرَىٰ بُزُورُهُمْ

(ابو منصور دہلی۔ ابو عبد الرحمن السلمی)

ہر امت کا ایک عجز ہے، میری امت کا عجز اور ہم دونوں برابر۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے اپنا عجز سونے چاندی سے تراشا تھا۔ مال اور پانی سونے اور پتھر میں مساوات صرف انبیاء علیہم السلام اور اولیاء اللہ ہی کے نزدیک ممکن ہے، اور ان حضرات کو بھی اس درجے تک پہنچنا اللہ تعالیٰ کے فضل سے اور طول طویل مجاہدے کے بعد ہی نصیب ہوتا، سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم دنیا سے فرمایا کرتے تھے :-

إِنَّكَ غَنِيٌّ (حاکم)

مجھ سے دور رہے۔

آپ یہ بات اس وقت فرمایا کرتے تھے جب دنیا مجسم زینت بن کر آپ کے سامنے آئی تھی۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرمایا کرتے تھے اے زرد و میرے علاوہ کسی اور کو فریب دے، اے سفید و میرے سوا کسی اور کو دھوکا دے، زرد و سفید سے مراد سونا ہے اور سفید رو سے مراد چاندی ہے، یہ بات آپ اس وقت فرماتے جب اپنے نفس میں سیم و زر سے فریب کے آثار ملاحظہ فرمایا کرتے تھے۔

غنا مطلق کیا ہے؟ غنا مطلق مال اور پانی کے برابر ہونے کو کہتے ہیں، چنانچہ حدیث شریف میں ہے کہ آدمی ساز و سامان کی کثرت سے مالدار نہیں ہوتا بلکہ اصل غنا یہ ہے کہ آدمی کا نفس غنی ہو (بخاری و مسلم۔ ابو ہریرہؓ) لیکن کیوں کہ یہ درجہ حاصل کرنا نہایت مشکل ہے، اس لئے عام مخلوق کے حق میں مناسب تر یہ ہے کہ وہ مال سے محروم ہوں، اگرچہ مال کی موجودگی میں اسے خیر کے کاموں میں صرف بھی کرتے ہوں، اس کے باوجود مال کا نہ ہونا ہی بہتر ہے، کیوں کہ مال پر قدرت رکھنے کے بعد اس سے انیت ہوتا، اس سے مستفید ہونے کی خواہش کرنا، اور اسے وسیلہٴ راحت بنانے کا حتمی ہونا ناگزیر ہے اور یہ تمام امور دل میں دینائے دنی سے محبت اور تعلق پیدا کرتے ہیں، پھر جس قدر وہ اپنی صفت سے قریب ہوتا ہے اسی قدر وہ اللہ تعالیٰ سے اور اس کی

دوستی سے وحشت کرتا ہے، آدمی دنیا کے اسباب سے جس قدر لائق ہو گا اسی قدر اس کا دل دنیا سے تنفر ہو گا، پھر جب دل دنیا کی محبت سے خالی ہوتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی محبت کی آماجگاہ بن جاتا ہے بشرطیکہ اللہ پر ایمان رکھتا ہو، اور اس کی محبت کو سرمایہ آخرت تصور کرتا ہو، دل خالی نہیں رہتا، اس میں دنیا کی محبت رہتی ہے، یا اللہ کی، جس کا دل غیر کی طرف متوجہ ہوتا ہے اس میں اللہ کی محبت جگہ نہیں پاتی، اور جو اللہ تعالیٰ کی طرف مائل ہوتا ہے اس میں غیر کے لئے مجبائش نہیں ہوتی۔ پھر آدمی جس قدر ایک کی طرف متوجہ ہو گا اسی قدر وہ دوسرے سے منحرف ہو گا، اور جتنا ایک کے قریب ہو گا اتنا ہی دوسرے سے دور ہو گا، ان دونوں کی مثال ایسی ہے جیسے مشرق و مغرب، یہ دو مخالف جہتیں ہیں، اب جو شخص ان دونوں کے درمیان ہے وہ جس قدر ایک جہت سے دور ہو گا اسی قدر دوسری جہت سے قریب ہو گا، بلکہ ان میں سے ایک کے ساتھ عین قرب دوسرے سے عین بُعد ہو گا، اس مثال کی روشنی میں دیکھا جائے تو عین حب دنیا عین بغض الہی ہے۔ عارف کی نگاہ اپنے دل پر ہونی چاہیے کہ وہ دنیا سے منحرف ہے یا اس کے ساتھ بالوس ہے۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ فقیر اور غنی کی فعالیت مال کے ساتھ ان کے قلوب کے تعلق کے لحاظ سے ہوگی۔ اگر وہ دونوں مال سے تعلق رکھنے میں برابر ہیں تو ان کا درجہ بھی برابر ہو گا، لیکن یہ دعوے کی جگہ ہے، یہاں قدم لغزش کھا جاتے ہیں اس لئے کہ غنی کبھی یہ گمان کرتا ہے کہ اس کا دل مال سے لائق ہے، حالانکہ دل میں اس کی محبت پوشیدہ رہتی ہے، اگرچہ اسے اس کے وجود کا علم نہیں ہوتا، اور علم اس وقت ہوتا ہے جب وہ مال کسی وجہ سے اسکی ملکیت میں باقی نہیں رہتا۔ اس لئے غنی کو چاہیے کہ وہ اپنے قلب کی آزمائش کرے، یا تو اس طرح کہ اپنا تمام مال راہ خدا میں دیدے، یا اس وقت جب وہ چوری ہو جائے، اگر اس صورت میں دل کو مال کی طرف ملتفت پائے تو سمجھ لے کہ میں غلط فہمی میں مبتلا تھا، اور یہ سمجھ بیٹھا تھا کہ میرا دل مال سے تنفر ہے، اس کے ضائع جانے سے احساس ہوا کہ دل کو مال سے کتنی انیسیت تھی، بعض لوگ اس خیال سے اپنی باندی فروخت کر دیتے ہیں کہ ان کے دل میں باندی کی ذرا چاہت نہیں ہے، لیکن جب وہ اسے فروخت کر دیتے ہیں تب دل میں حزن و ملال کی چنگاری بھڑکتی ہے، یہ محبت کی چنگاری پہلے سے دل کے اندر پوشیدہ تھی، اس وقت یہ خیال ہوتا ہے کہ ہمارے دل میں باندی کی محبت نہیں ہے، اور یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس کا عشق دل میں اس طرح پوشیدہ تھا جس طرح آگ کی چنگاری راکھ کے ڈھیر میں پوشیدہ رہتی ہے۔ تمام اغنیاء کا یہی حال ہے، صرف انبیاء اور اولیاء اس حکم سے مستثنیٰ ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ مطلق غنا کا حاصل ہونا محال یا انتہائی دشوار ہے اس لئے ہم مطلقاً یہ کہتے ہیں کہ فقر تمام مخلوق کے لئے موزوں تر اور افضل ہے، اس لئے کہ دنیا کے ساتھ فقیر کا تعلق اور اس کی انیسیت ضعیف ہوتی ہے، اور اسی ضعف کی نسبت سے اس کی تسمیحات، اور عبادات کا ثواب بھی بڑھتا رہتا ہے، کیوں کہ محض زبان کو حرکت دینا مقصود نہیں ہے، بلکہ مقصود یہ ہے کہ جو ذکر زبان پر ہے اس سے اس پختہ ہو جائے، ظاہر ہے یہ اس صورت میں زیادہ ہو سکتا ہے جب دل خالی ہو، مشغول دل پر ذکر اتنا اثر انداز نہیں ہوتا۔ اسی لئے بعض بزرگان دین فرماتے ہیں جو شخص عبادت کرے اور اس کا دل دنیا کی طلب میں مشغول ہو اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص گھاس ڈال کر آگ بجھانے کی کوشش کرے، یا چربی زائل کرنے کے لئے گھی سے ہاتھ دھوئے، حضرت ابو سلیمان دارانی فرماتے ہیں کہ فقیر کا ایسی شہوت کے بغیر جس پر اسے قدرت نہ ہو سانس لینا غنی کی ہزار برس کی عبادت سے افضل ہے، ضحاک فرماتے ہیں جو شخص بازار جائے اور وہاں کوئی من پسند چیز دیکھ کر صبر کرے اور ثواب کا طالب ہو اس کو اللہ کی راہ میں ہزار و ہزار خرچ کرنے کا ثواب ملے گا۔ ایک شخص نے بشارین حادث کی خدمت میں عرض کیا کہ مجھے میرے عیال نے پریشان کر رکھا ہے آپ میرے لئے دعا فرمائیں آپ نے فرمایا کہ جس وقت تجھے تیرے عیال پریشان کریں اور روٹی وغیرہ کا تقاضا کریں اس وقت اللہ سے دعا کرنا، تیری اس وقت کی دعا میری دعا سے ہزار درجہ افضل ہوگی، فرمایا کرتے تھے کہ غنی متعبد کی مثال ایسی ہے جیسے گھوڑے پر سبزہ آگ آئے، اور فقیر متعبد کی مثال ایسی ہے جیسے بیش قیمت موتیوں کا ہار کسی نادک اندام حینہ کے گلے میں ڈال دیا جائے۔ اکابرین سلف

مالداروں سے معرفت کی باتیں سننا پسند نہیں کرتے تھے۔ حضرت ابو بکر الصديقؓ کی دعا یہ تھی نہ
 اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْأَلُكَ الذِّكْرَ عِنْدَ التَّصَفِّیِّ مِنْ نَفْسِیْ وَالرَّهْضَ فِیْ مَا جَاوَزَ الْكَفَافَ
 اے اللہ! میں تجھ سے ذلت کا سوال کرتا ہوں اس صورت میں کہ میرا نفس پورا حق مانگے، اور زہد کا اس
 مقدار میں جو قدر کفایت سے آگے بڑھ جائے۔

جب حضرت صدیق جیسی بزرگ ہستی کو اپنے کمال زہد کے باوجود دنیا سے خوف تھا تو یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ مال کا ہونا نہ ہونے سے
 بہتر ہے، علاوہ ازیں مالداروں کے لئے اہم ترین شرط یہ ہے کہ تمام مال حلال و طیب ہو، اور جائز و مباح مواقع پر خرچ کیا جائے، اس
 شرط پر عمل پیرا ہونے کے باوجود اغنیاء کو میدان قیامت میں حساب و کتاب کے جس طویل مرحلے سے گزرنا ہو گا اس کی شدت کا
 اندازہ نہیں کیا جاسکتا، یہ انتظار کا ایک سخت ترین مرحلہ ہو گا، اسی لئے کہا جاتا ہے کہ جس کو حساب میں الجھایا جائے گا، اس کو
 عذاب دیا جائے گا، حضرت عبدالرحمن ابن عوفؓ کو جنت کے اندر پہنچنے میں دیر لگی، اس کی وجہ یہی تھی کہ وہ اپنے اموال کا حساب
 دینے میں مشغول تھے، حضرت ابو الدرداءؓ فرماتے ہیں کہ میری خواہش یہ ہے کہ مسجد کے دروازے پر میری ایک دوکان ہو، اور وہاں
 رہ کر میری کوئی نماز اور ذکر فوت نہ ہو مجھے اس دوکان سے ہر روز پچاس دینار کا نفع ہو جنہیں میں اللہ کی راہ میں صدقہ کر دوں، لوگوں
 نے سوال کیا اس میں آپ کس چیز سے خائف ہیں، فرمایا حساب کی سختی سے، حضرت سفیان ثوریؓ فرماتے ہیں کہ فقراء نے تین
 چیزیں اختیار کی ہیں، اور اغنیاء نے بھی تین ہی چیزوں کو ترجیح دی ہے، فقراء جن تین چیزوں کو پسند کرتے ہیں وہ یہ ہیں نفس کا سکون،
 قلب کی یکسوئی، اور حساب کی خف، اور اغنیاء نے یہ تین چیزیں اختیار کی ہیں نفس پر مشقت، دل کی مشغولیت، اور حساب کی
 شدت، ابن عطاءؓ نے غنی کو اللہ تعالیٰ کا وصف کہا ہے، اور اسی لحاظ سے اس کو فقر کے مقابلے میں افضل بھی کہا ہے، لیکن ان کی یہ
 بات اسی وقت صحیح ہو سکتی ہے جب کہ بندوں کی نظر میں مال کا وجود اور عدم دونوں برابر ہوں، یعنی وہ دونوں سے غنی ہو، لیکن اگر وہ
 مال کے وجود کی صورت میں غنی ہے، اور عدم کی صورت میں محتاج ہے تو یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ اس کا غنی باری تعالیٰ کے غنا سے
 مشابہ ہے، اللہ تعالیٰ اپنی ذات سے غنی ہے، وہ کسی ایسی شے سے غنی نہیں ہے جو زوال پذیر ہو، مال کا تعلق ان اشیاء سے ہے جو
 چوری کی وجہ سے یا کسی آفت ناگہانی کے باعث، یا خرچ کرنے کی بناء پر ضائع ہو جاتی ہیں، کسی نے ابن عطاءؓ کے قول پر اعتراض
 کرتے ہوئے کہا تھا کہ اللہ تعالیٰ اعراض یعنی اموال و اسباب کے باعث غنی نہیں ہے۔ یہ ایسی غنا کی مذمت میں صحیح ہے جس کا
 مقصد مال کی بقا ہو، بعض لوگوں نے ابن عطاءؓ کے قول کا جواب دیتے ہوئے یہ کہا ہے کہ بندے کے لئے صرف وہی صفات مناسب
 ہیں جن سے عبودیت پر دلالت ہوتی ہے۔ جو صفات باری تعالیٰ کے لئے ہیں وہ بندے کے شایان شان نہیں۔ لیکن یہ درست معلوم
 نہیں ہوتا، اس لئے کہ علم بھی باری تعالیٰ کی ایک صفت ہے، اور صفت سے متعفف ہونا بھی بندے کے لئے احتمالی محمود ہے، بلکہ
 بندے کی عبودیت کا انتہائی درجہ یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اخلاق کا حامل ہو، بعض مشائخ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی راہ کا سالک
 اس وقت تک راستہ مکمل نہیں کرتا جب تک کہ اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام اس کے اوصاف نہ ہو جائیں، یعنی اللہ تعالیٰ کے ہر
 وصف میں سے اسکو کچھ حصہ نہ مل جائے البتہ تکبر بندے کے لائق نہیں ہے، یعنی غیر مستحق پر تکبر کرنا باری تعالیٰ کا وصف
 نہیں ہے، البتہ وہ تکبر بندے کے شایان شان ہو سکتا ہے جو مستحق پر ہو، جیسے مومن کا تکبر کافر پر، عالم کا تکبر جاہل پر، اور مطہج کا تکبر
 گنہگار پر۔ بعض اوقات آدمی تکبر سے فخر و دعویٰ، اور ایذا رسانی تک جا پہنچا ہے یہ تکبر اللہ تعالیٰ کا وصف نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کا
 وصف تکبر تو صرف یہ ہے کہ وہ ہر شے سے بڑا ہے، اور اسے خود اپنی بڑائی کا علم ہے، بندے کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ اعلیٰ مرتبے کی جستجو
 کرے اگر اس پر قدرت رکھتا ہو، اور اس اعلیٰ مرتبہ کا مستحق بھی ہو، بصوٹ، قریب، اور غلط بیانی سے اپنے آپ کو مستحق نہ بنائے،
 گویا بندے کو یہ اعتقاد رکھنے کا حق حاصل ہے کہ مومن کافر سے بڑا ہے، مطہج عاصی سے بڑا ہے، عالم جاہل سے بڑا ہے، انسان
 حیوان، جماد اور نبات سے اعلا و ارفع ہے اور اللہ تعالیٰ سے قریب تر ہے، اگر بندے کو اپنے کسی وصف کا غیبنی طور پر علم ہو تو بلاشبہ

اسے تکبر کا وصف حاصل ہو گا۔ اور یہ وصف اس کے لائق بھی ہو گا اور اس کے حق میں فضیلت بھی قرار پائے گا، لیکن اپنے لئے کسی ایسے وصف کے معلوم ہونے کی کوئی صورت نہیں ہے، کیوں کہ انسان کو اپنے خاتے کا حال معلوم نہیں ہے، اسے کیا پتا خاتمہ اس وصف پر ہو سکے گا یا نہیں جس پر تکبر کرتا ہے، اس لئے انسان کو چاہیے کہ وہ اپنے لئے کسی ایسے مرتبے کا اعتقاد نہ کرے جو کافر کے مرتبے سے بڑھ کر ہو، اس لئے کہ یہ ممکن ہے کافر کا خاتمہ ایمان پر ہو اور وہ خود کفر پر موت پائے ایسے شخص کے لئے جسے اپنے انجام کی خبر نہ ہو تکبر کرنا مناسب نہیں ہے۔

علم کا کمال یہ ہے کہ آدمی شئی کو اس کی حقیقت اور ماہیت کے ساتھ جان لے، اس طرح کا علم بھی اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ہے، لیکن کیوں کہ بعض اشیاء کی معرفت سے اسے نقصان پہنچ سکتا ہے۔ اس لئے یہ علم بھی اس کے حق میں نقص ہے۔ اللہ تعالیٰ جس علم سے موصوف ہے وہ ایسا نہیں ہے کہ ضرر کا باعث بن سکے۔ اس سے ثابت ہوا کہ بندے کو جن امور کی معرفت سے کسی ضرر کا اندیشہ نہیں ہو سکتا وہ اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں، گویا مستائے فضیلت یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اوصاف کی معرفت حاصل کی جائے، انبیاء، اولیاء اللہ اور علماء کو اسی بناء پر فضیلت حاصل ہے۔

گذشتہ طور سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو چکی ہے کہ اگر آدمی کے نزدیک مال کا وجود اور عدم دونوں برابر ہوں تو یہ حقیقی غنا ہے، اور اس غنا سے مشابہ ہو سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ کا وصف ہے، اسی غنا کی فضیلت ہے، وہ غنا افضل نہیں ہے جو صرف مال کے وجود سے حاصل ہو۔ اب تک ہم فقیر قانع اور غنی شاکر کے فرق، اور ایک کی دوسرے پر فضیلت کو موضوع بحث بنائے ہوئے تھے، اب ہم دوسرا موضوع لیتے ہیں۔

فقیر حریص اور غنی حریص یہاں بھی یہی منگوا ہے کہ ان دونوں میں سے کون افضل ہے، چنانچہ ہم ایک شخص فرض کرتے ہیں جو مال کے لئے جدوجہد کرتا ہے اور حاصل نہیں کر پاتا، پھر وہ مال پالیتا ہے، اس کے لئے دونوں حالتیں ثابت ہیں مال کے وجود کی بھی، اور اس کے فقدان کی بھی، سوال یہ ہے کہ ان دونوں حالتوں میں سے کون سی حالت افضل ہے؟ اس کے جواب کی تفصیل یہ ہے کہ اگر اس کا مطلوب صرف اس قدر مال ہے جو معیشت کے لئے ناگزیر ہے، اور اس کا فناء یہ ہے کہ وہ اس کے ذریعہ دین کا راستہ طے کرے گا، اور اللہ تک پہنچے، اس سے مدد حاصل کرے گا تو مال کا وجود افضل ہے، کیوں کہ فقر انسان کو طلب میں مشغول کرتا ہے، اور رزق کا طالب ذکر و فکر پر قادر نہیں ہوتا، اگر ذکر و فکر ہوتا ہے تو اس میں دوسرے امور بھی مداخلت کر بیٹھتے ہیں، یعنی وہ فارغ البالی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ نہیں ہو پاتا، بلکہ اسے فکر معاش بے چین اور مضطرب رکھتا ہے، جب کہ ذکر و فکر کے لئے بقدر کفایت قوت ضروری ہے، اسی لئے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا فرمایا کرتے تھے :-

اللَّهُمَّ اجْعَلْ قُوَّتِي مُحْتَمِدَةً كَقُوَّتِ الْفَقِيرِ (۳۱۱)

اے اللہ! مجھ کی اولاد کا رزق بقدر کفایت فرما۔

ایک مرتبہ ارشاد فرمایا :-

كَذَا الْفَقِيرُ أَنْ يَكُونَ كُفْرًا (۲) قریب ہے کہ فقر کفر ہو جائے۔

اس میں فقر سے مراد یہ ہے کہ آدمی ضروریات زندگی کے لئے مضطرب ہو، اور اگر اس شخص کا مطلوب ضرورت سے زائد مال حاصل کرنا ہے، یا بقدر ضرورت مال پانا ہے، لیکن زائد از ضرورت یا بقدر ضرورت مال سے یہ مقصود نہیں ہے کہ اس سے دین کا راستہ طے کرنے پر مدد ملے تو اس صورت میں فقر کی حالت افضل اور اصال ہے۔ اس لئے کہ اس صورت میں فقیر اور غنی دونوں حرص اور مال کی محبت میں برابر ہیں، اسی طرح وہ دونوں اس امر میں بھی برابر ہیں کہ ان میں سے کسی کا مقصد بھی دین پر مدد لینا نہیں ہے۔ اور نہ ان میں سے کوئی کسی محبت سے متعرض ہے، لیکن ان دونوں میں ایک فرق ہے، اور وہ یہ ہے کہ جس کے پاس موجود ہے وہ

(۳۱۱) یہ تین روایتیں پہلے بھی گذری ہیں۔

اس سے انس بھی رکھتا ہے، اسی طرح موجود مال کی محبت اس کے دل میں رائج ہو جاتی ہے، وہ دنیا پر اطمینان کرنے لگتا ہے اور جس کے پاس نہیں ہوتا وہ مجبوراً ہی سہی دنیا سے کنارہ کش رہتا ہے، اس کے نزدیک دنیا ایک قید خانے کی طرح ہوتی ہے جس سے آزاد ہونا چاہتا ہے، اس مثال میں یہ دونوں شخص متعدد امور میں برابر ہیں، لیکن دنیا سے انس اور میل کے معاملے میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں، ظاہر ہے جو شخص دنیا کی طرف مائل ہو گا اس کا دل دوسرے کی بہ نسبت سخت تر ہو گا، جس قدر اسے دنیا سے انیت اور محبت ہو گی اسی قدر آخرت سے وحشت اور نفرت ہو گی، حدیث شریف میں ہے: رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :-

إِنَّ رُوحَ الْقُدْسِ نَفَثَ فِي رَوْعِي أَحَبُّ مَنَ أَحَبَّتْ فَإِنَّكَ مُفَارِقُهُ (۳)

روح القدس نے میرے دل میں یہ بات ڈالی ہے کہ جس سے چاہے محبت کر لے تو اس سے جدا ضرور ہو گا۔

اس حدیث میں یہ بتلایا گیا ہے کہ محبوب کا فراق بڑا جاں نسل اور شدید تر واقعہ ہوتا ہے، اس لئے تو ایسے شخص سے محبت کر جس سے جدا نہ ہونا پڑے، اور ایسا محبوب صرف اللہ تعالیٰ ہی ہو سکتا ہے جو کبھی جدا نہ ہو گا، اور ایسے شخص سے محبت نہ کرنے ہر حال میں تجھ سے جدا ہونا ہے، اور وہ دنیا ہے، اگر تو نے دنیا سے محبت کی تو تجھے اللہ سے ملنا پسند نہیں ہو گا، اسی طرح حیرت موت اس حال پر ہو گی جسے تو برا سمجھتا ہو گا، اور موت کی وجہ سے تیرا تعلق تیرے محبوب سے منقطع ہو جائے گا۔

پھر محبوب کی جدائی سے اسی قدر تکلیف ہوتی ہے جس قدر دل میں انس اور محبت ہوتی ہے، جسے دنیا میرے، اور وہ اس سے مانوس بھی ہے ظاہر ہے اسے اس شخص کی بہ نسبت دنیا کی جدائی سے زیادہ تکلیف اور درد ہو گا، جس کے پاس دنیا موجود ہی نہیں ہے، اگرچہ وہ اس کی طلب پر حریص ہے، اس تفصیل سے ہمارا یہ مطلوب اچھی طرح واضح ہو چکا ہے کہ فخری اشرف والفضل، اور تمام مخلوق کے لئے مناسب تر ہے، آلائے کہ دو مواقع اس سے مستثنیٰ کئے جاسکتے ہیں، ایک تو یہ کہ کسی کا غنا حضرت عائشہؓ کے خنکی طرح ہو کہ ان کے نزدیک مال کا وجود اور عدم دونوں برابر ہیں۔ یہ غنا زیادتی کا باعث بنتی ہے، یعنی اس کی وجہ سے فقراء اور مساکین کی دعائیں حاصل ہوتی ہیں، اور ان کی ہستیں عبادت میں مجتمع رکھنے کا شرف حاصل ہوتا ہے، دوسرا موقع جسے مستثنیٰ کیا جاسکتا ہے یہ ہے کہ آدمی قدر ضرورت بھی مفلس ہو، ایسے ہی فقر کے سلسلے میں یہ حدیث بھی وارد ہوئی ہے کہ ادا الفقرا ان یکون کفراً، قریب ہے کہ فقر کفر ہو جائے، اس فقر میں کوئی چیز نہیں ہے مگر اس وقت یہ فقر خیر ہو سکتا ہے جب کہ آدمی ضرورت کے بقدر رزق سے بٹائے حیات میں مدد لے، اور اس حیات کو کفر و معصیت میں بسر نہ کرے، اگر اس فقر میں مبتلا ہو کر وہ شخص مر جائے تو یہ بات اس کے حق میں زیادہ بہتر ہے، یہ فقر و غنا میں افضلیت کی بحث ہے، اب صرف یہ صورت رہ گئی ہے کہ ایک فقیر ایسا جو ہمہ تن طلب میں مشغول ہو، اور اس ایک کام کے سوا اس کے پاس دوسرا کوئی کام نہ ہو، دوسری طرف ایک ایسا فنی ہو جسے مال کی حرص فقیر کی بہ نسبت کم ہو، اور نہ اس کی حفاظت میں اتنا منہمک ہو جتنا حرص مال نہ لٹنے پر محسوس کرتا ہے، ان دونوں کے حال میں اختلاف ہے بظاہر ایسا لگتا ہے کہ ان دونوں کو اللہ تعالیٰ سے اسی قدر نفع ہو گا جس قدر وہ مال کے نہ ہونے سے تکلیف محسوس کریں گے اور جس قدر درد کم ہو گا اسی قدر دوری بھی کم ہو گی۔

حالت فقر میں فقیر کے آداب فقیر کے لئے کچھ باطنی اور کچھ ظاہری آداب ہیں، ان کا تعلق اس کے افعال سے بھی ہے، اور لوگوں کے ساتھ اجتماع اور مخالفت سے بھی، ہر فقیر کے لئے ضروری ہے کہ وہ ان آداب کی رعایت کرے۔

باطنی آداب : باطن کا ادب یہ ہے کہ اس حال کو دل سے کمزور نہ جانے، جس میں اسے جلا کیا گیا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کے فضل کو برانہ سمجھے، اس حیثیت سے کہ وہ اس کا قائل ہے، نفس فعل یعنی فقر کو برا سمجھ سکتا ہے، جیسے بچے لکوانے والا بچنے لگانے کے

عمل کو اس لئے برا سمجھتا ہے کہ اس سے تکلیف ہوتی ہے، اس لئے برا نہیں سمجھتا کہ یہ بچنے لگانے والے کا عمل ہے، یا بچنے لگانے والا برا ہے، بلکہ بسا اوقات اس کا احسان مند ہوتا ہے، یہ کم سے کم درجہ ہے، اور فقیر کے لئے اس پر عمل کرنا واجب ہے، اور اس کے خلاف پر عمل کرنا حرام ہے، اور فقر کے ثواب کو ضائع کر دیتا ہے۔

سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد مبارک کے یہی معنی ہیں :-
يَا مَعْشَرَ الْفُقَرَاءِ اعْطُوا اللَّهَ لِرِضَائِهِمْ تَنْظُرُوا بِشَوَابٍ فَقِيرٌ كُنْهُوَ إِلَّا فَلَا -
اے گروہِ فقراء تم اللہ کو اپنے دلوں سے رضامندی دو تاکہ اپنے فقر کا اجر و ثواب پاؤ، ورنہ نہیں۔

اس سے بلند تر درجہ یہ ہے کہ اپنے فقر پر راضی ہو، اور اس سے بھی اونچا درجہ یہ ہے کہ فقر کا طالب ہو اور اس سے خوش ہو، فقر کی طلب، اور اسے پاکر خوش ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ مال کی آفات اور اس کے نقصانات سے واقف ہوتا ہے، اور اسے اللہ تعالیٰ کی ذات پر پورا بھروسہ ہوتا ہے، اور یہ یقین رکھتا ہے کہ اسے اس کے حصے کا رزق ضرور ملے گا، نہ وہ ضرورت سے زیادہ طلب کرتا ہے، اور نہ اسے پسند کرتا ہے کہ اس کے پاس مقدارِ ضرورت سے زائد مال ہو۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ ارشاد فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فقر سے عذاب بھی دیتا ہے اور ثواب بھی، اگر کسی فقر سے ثواب دینا منظور ہو تو اس کی علامات یہ ہیں کہ اس کے اخلاق اچھے ہوتے ہیں، وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتا ہے، اپنے حال کا شکوہ نہیں کرتا، بلکہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہے کہ اس نے اسے فقیر بنایا، اور کسی کو فقر کے ذریعے عذاب دیا جاتا ہے تو اس کی علامات یہ ہوتی ہیں کہ وہ بد خلق، اور تند خو ہو جاتا ہے، اپنے رب کی اطاعت ترک کر کے اس کی نافرمانی کرتا ہے، اپنی حال پر شکوہ کرتا ہے، اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر اپنی ناراضگی اور ناپسندیدگی کا اظہار کرتا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہر فقیر اچھا نہیں ہوتا، بلکہ صرف وہ فقیر قابلِ تعریف ہوتا ہے جو اپنے فقر پر ناراض نہ ہو، بلکہ خوش ہو اور اس کے ثمرات پر مطمئن ہو۔ یہ قول مشہور ہے کہ جب بندے کو دنیا کی کوئی چیز عطا کی جاتی ہے تو اس سے کہا جاتا ہے کہ اسے تین باتوں کے ساتھ قبول کر، مصروفیت، فکر و تردد، اور طویل حساب۔

ظاہری آداب

فقیر کو جن ظاہری آداب کی رعایت کرنی چاہئیں وہ یہ ہیں کہ کسی کے سامنے دست سوال دراز نہ کرے، اپنے ظاہر کو اچھا رکھے تاکہ لوگ ضرورت مند تصور نہ کریں، کسی سے اپنے حال کی شکایت نہ کرے، نہ اپنے افلاس کا مظاہرہ کرے، بلکہ جہاں تک ممکن ہو اسے پوشیدہ رکھے، اور یہ بات بھی چھپائے کہ میں اپنا فقر پوشیدہ رکھتا ہوں۔ حدیث شریف میں ہے :-

إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْفَقِيرَ الْمُتَعَفِّفَ أَبَا الْعَبَّاسِ
اللہ تعالیٰ سوال نہ کرنے والے عیالدار فقیر کو دوست رکھتا ہے۔

ایسے لوگوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :-
يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ أَغْنِيَائًا مِنَ التَّعَفُّفِ -
(پ ۳ آیت ۲۷۳)

ناواقف ان کو تو فکر خیال کرتا ہے ان کے سوال سے بچنے کی وجہ سے۔

حضرت سفیان ثوری ارشاد فرماتے ہیں کہ بہترین عمل احتیاج کی حالت میں قنل ہے، ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ فقر کی پردہ پوشی کرنا نیکی کا خزانہ ہے، اعمال میں ادب یہ ہے کہ کبھی مالدار کے سامنے اس لئے تواضع اور عاجزی نہ کرے کہ وہ صاحب ثروت ہے، بلکہ اس سے انکڑ کر رہے، حضرت علی کرم اللہ وجہہ ارشاد ہے کہ فقیر کے لئے ثواب کی رغبت سے مالدار کا تواضع ہونا بہت عمدہ ہے، اور اس سے بھی عمدہ تر بات یہ ہے کہ فقیر غنی پر اللہ کے فضل پر بھروسہ رکھتے ہوئے تکبر کرے۔ فقیر کا اگر یہ حال ہو تو یہ ایک بلند درجہ ہے، لیکن اس کا کم سے کم درجہ یہ ہے کہ نہ اغنیاء کے پاس بیٹھے، اور نہ انہیں اپنے پاس بٹھانے کی آرزو کرے، طمع و

حرص کے مبادی یہی چیزیں ہیں، حضرت سفیان ثوری ارشاد فرماتے ہیں اگر فقیر مالداروں سے ملاقات کے لئے جائے تو سمجھو کہ وہ ریا کار ہے، اور بادشاہوں کے پاس جائے تو سمجھو کہ وہ چور ہے۔ ایک بزرگ کا قول ہے کہ جب فقیر اغنیاء کی ہم نشینی اختیار کرتا ہے تو اس کا اعتماد مجموع ہو جاتا ہے، اور جب ان سے لالچ کرنے لگتا ہے تو آہ کو ہوتا ہے، اور جب انہی میں بود و باش اختیار کر لیتا ہے تو گمراہ ہو جاتا ہے، فقیر کو چاہیے کہ وہ مالداروں کی خوشامد میں یا ان کے عطایا کی خاطر حق کہنے سے باز نہ رہے، بلکہ جو بات حق ہو وہی کہے، خواہ تمام دولت مند ناراض ہو جائیں، یہ بھی اعمال ہی کا ادب ہے کہ فقر کے باعث عبادت میں سستی نہ کرے، اور اگر کچھ مال بچ جائے تو اسے خرچ کرنے سے دریغ نہ کرے، کیوں کہ غریب کا صدقہ یہی ہے، اور اسے اس معمولی صدقہ کا جس قدر اجر و ثواب ملتا ہے اس قدر ثواب مالداروں کو بہت سا مال خرچ کرنے میں نہیں ملتا۔ حضرت زید ابن اسلم روایت کرتے ہیں، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: صدقہ کا ایک درہم اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایک لاکھ درہموں سے افضل ہے، صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ کس طرح؟ فرمایا ایک شخص اپنے وسیع خزانے سے ایک لاکھ درہم نکالتا ہے، اور خیرات کرتا ہے، دوسرا شخص اپنے دو درہموں میں سے ایک درہم والا شخص ایک لاکھ درہم والے سے بہتر ہے۔ (۱) فقیر کو چاہیے کہ وہ مال ذخیرہ نہ کرے، اول ضرورت سے زائد مال نہ لے، اگر مل جائے تو اسے اٹھا کر نہ رکھے، بلکہ صدقہ کر دے۔

ذخیرہ کرنے کے تین درجے: پھر ذخیرہ کرنے کے بھی تین درجے ہیں، ایک درجہ تو یہ ہے کہ ایک دن اور ایک رات کے لئے بھی ذخیرہ نہ کرے، یہ صدقین کا درجہ ہے، دوسرا درجہ یہ ہے کہ چالیس روز کے لئے ذخیرہ کرے، اس کے بعد کی مدت طول اہل میں داخل ہے۔ عطاء نے چالیس دن کی مدت کا تعین حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعے کی روشنی میں کیا ہے، اللہ تعالیٰ نے آپ کے لئے چالیس دن کی مدت متعین کی، اس سے علماء نے یہ مفہوم نکالا ہے کہ چالیس دن تک زندہ رہنے کی توقع کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، یہ متعین کا درجہ ہے، اور تیسرا درجہ یہ ہے کہ ایک سال کے لئے ذخیرہ کرے، یہ صالحین کا درجہ ہے، اور اہل درجہ ہے، ایک سال سے زیادہ عرصے کے لئے ذخیرہ کرنے والا عوام میں داخل ہے، خواص سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے، صلحاء کی غنا یہ ہے کہ وہ ایک سال کی مدت کے لئے ذخیرہ کر لیں، اور خواص کی غنا یہ ہے کہ وہ چالیس دن کے لئے ذخیرہ کر لیں، خواص میں جو لوگ انتہائی خاص ہیں ان کی غنا ایک دن ایک رات کے ذخیرے میں ہے۔ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ازواجِ مطہرات میں غذا اسی طرح تقسیم فرمایا کرتے تھے، بعض ازواجِ مطہرات کو سال بھر کی غذا عطا فرماتے تھے، بعض کو چالیس دن کی اور بعض کو ایک دن ایک رات کی، ایک دن ایک رات کی غذا جن ازواجِ مطہرات کو ملا کرتی تھی وہ ہیں حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ

بلا طلب عطایا قبول کرنے میں فقیر کے آداب: اگر فقیر کے پاس کہیں سے کوئی ہدیہ وغیرہ آئے تو اسے چاہیے کہ وہ قبول کرنے سے پہلے تین امور پر توجہ دے، ایک یہ کہ نفس مال کیسا ہے، دوسرے یہ کہ دینے والے کا مقصد کیا ہے، تیسرے یہ کہ لینے والے کی غرض کیا ہے۔ نفس مال پر توجہ دینے کا مطلب یہ دیکھنا ہے کہ وہ مال حلال ذرائع سے حاصل کیا ہوا ہے یا نہیں، اور تمام شبہات سے خالی ہے یا نہیں، اگر یقین ہو کہ مال جائز ہے، اور ہر طرح کے شبہات سے خالی ہے تو قبول کر لے، ورنہ لینے سے منع کر دے، کتاب الحلال والحرام میں ہم اس موضوع پر تفصیل سے لکھ چکے ہیں۔

معطلی کی اغراض: مال دینے والے کی کئی اغراض ہو سکتی ہیں، ہو سکتا ہے اس نے محض فقیر کا دل خوش کرنے اور اس کی محبت حاصل کرنے کے لئے کچھ دیا ہو، یا ہدیہ ہے، یا بہ نیت ثواب دیا ہو، یہ صدقہ اور زکوٰۃ ہے، یا شہرت، ناموری اور ریا کاری کے

لئے دیا ہو، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دینے والے کا مقصد محض ریا ہو، اور یہ بھی ممکن ہے کہ ریا کاری کے ساتھ اس کی دوسری اغراض بھی ہوں۔

جہاں تک ہدیے کا سوال ہے، اس کے قبول کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، ہدیہ قبول کرنا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت طیبہ ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ ہدیہ دینے میں احسان کا پہلو پیش نظر نہ ہو، اگر یہ معلوم ہو جائے کہ ہدیے کے بعض اجزاء میں احسان ہے تو اس قدر اجزاء واپس کر دے باقی قبول کر لے، چنانچہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں کئی 'نخیر' اور مینڈھا ہدیہ پیش کیا گیا، آپ نے کئی اور 'نخیر' رکھ لیا، اور مینڈھا واپس کر دیا (احمد - حلی ابن حرقہ)۔ اسی طرح سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بھی معقول ہے کہ آپ بعض لوگوں کے ہدایا قبول کر لیتے تھے اور بعض لوگوں کے ہدایا واپس فرما دیا کرتے تھے (ابوداؤد، ترمذی - ابو ہریرہ) ایک حدیث میں ہے آپ نے ارشاد فرمایا :-

لَقَدْ هَمَمْتُ أَنْ لَا آتَهُبَّ إِلَّا مِنْ قُرْشِي لَوْ تَقَفَنِي لَوْ أَنْصَارِي لَوْ دُونِي - (ترمذی - ابو ہریرہ)

میں نے ارادہ کیا ہے کہ میں قرشی، ثقفی، انصاری اور دوسرے کے علاوہ کسی سے ہدیہ نہ لوں۔

بعض تابعین کا بھی یہی معمول رہا ہے، چنانچہ فتح موصلی کے پاس ایک قبیلہ آئی جس میں پچاس درہم تھے آپ نے فرمایا، ہم سے حطاء نے حدیث بیان کی ہے، وہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں، آپ نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص کے پاس بغیر مانگے رزق آئے، اور وہ اسے لوٹا دے تو گویا اللہ کو لوٹا تا ہے (۱) اس کے بعد آپ نے قبیلہ 'لی' اس میں سے ایک درہم نکال کر رکھا، باقی درہم واپس کر دیے۔ حضرت حسن بصریؒ بھی یہ روایت بیان فرماتے تھے، لیکن ایک مرتبہ کسی شخص نے ان کی خدمت میں ایک قبیلہ، اور خراسان کے بنے ہوئے باریک کپڑوں کا ایک تھان پیش کیا، آپ نے اس شخص کا یہ ہدیہ لوٹا دیا اور فرمایا جو شخص میری جگہ بیٹھے اور اس طرح کے ہدایا قبول کرے، وہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملاقات کرے گا کہ اس کے پاس برائے نام بھی اجر و ثواب نہ ہو گا۔ حضرت حسنؒ کے اس ارشاد سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حطایا قبول کرنے کے باب میں عالم اور واعظ کا معاملہ سخت تر ہے۔ حضرت حسنؒ اپنے رفقاء کے ہدایا قبول کر لیا کرتے تھے، اسی طرح حضرت ابراہیم الیهی اپنے ساتھیوں سے ایک درہم یا دو درہم مانگ لیا کرتے تھے، لیکن اگر کوئی دوسرا شخص انہیں سینکڑوں درہم دیتا تو قبول نہ کرتے۔ بعض حضرات کا معمول یہ تھا کہ اگر کوئی دوست انہیں کچھ دیتا تو وہ اس سے فرماتے کہ یہ چیز اپنے پاس رکھو اور یہ دیکھو کہ اب تمہارے دل میں میرے لئے کیا جگہ ہے۔ اگر میں تمہارے نزدیک پہلے سے افضل ہوں تو مجھ سے کہہ دینا میں تمہارا ہدیہ قبول کر لوں گا، ورنہ انکار کر دوں گا، اور اس کی علامت یہ ہے کہ دینے والے پر ہدیہ واپس کر دینا گراں گزرے، اور قبول کرنے پر خوش ہو، اور اسے اپنے اوپر احسان تصور کرے، اگر ہدیہ لینے والے کو یہ علم ہو جائے کہ اس میں کسی قدر احسان کی آمیزش بھی ہے تو ہدیہ قبول کرنا مباح ہے، لیکن فقہائے صالحین کے نزدیک اس طرح کے ہدایا قبول کرنے میں کراہت ہے۔ حضرت بشارؒ فرماتے ہیں کہ میں نے سری سنی کے علاوہ کسی سے کچھ نہیں مانگا، سری سنی سے بھی اس لئے مانگا کہ میرے نزدیک ان کا نہد صحیح ہے، اگر کوئی چیز ان کے پاس سے چلی جاتی تھی تو اس پر خوش ہوتے تھے، اور باقی رہتی تھی تو بد دل رہا کرتے تھے، چنانچہ وہ جس بات کو پسند کرتے تھے میں اس پر ان کی مدد کرتا تھا، ایک خراسانی کچھ مال لے کر حضرت جنید بغدادی کے پاس آیا، اور ان سے درخواست کی کہ آپ اسے اپنے اوپر خرچ کریں، حضرت جنید نے فرمایا فقراء میں تقسیم کر دوں گا۔ انہوں نے فرمایا میں یہ نہیں چاہتا کہ آپ فقراء میں تقسیم کریں، آپ نے فرمایا میں کب تک زندہ رہوں گا کہ اس مال کو اپنے اوپر صرف کروں اس نے کہا میں یہ کب کہتا ہوں کہ آپ یہ مال سبزی اور سر کے میں خرچ کریں بلکہ مٹھائی اور عمدہ عمدہ چیزوں میں صرف کریں، حضرت جنید نے خراسانی کا ہدیہ قبول کر لیا، خراسانی نے کا بغداد میں

آپ سے زیادہ کسی نے مجھ پر احسان نہیں کیا، آپ نے فرمایا تیرے ہی جیسے شخص کے ہدایا قبول کرنے چاہئیں۔

صدقہ و زکوٰۃ معنی کی ایک فرض یہ ہو سکتی ہے کہ وہ ثواب کے لئے کچھ دے، ایسا مال صدقہ ہے یا زکوٰۃ ہے، اگر کوئی شخص کسی فقیر کو پس طرح کا مال دیتا ہے تو اسے اپنے نفس کی صفات پر نظر ڈالنی چاہیے کہ وہ زکوٰۃ کا مستحق ہے یا نہیں، اگر استحقاق یقینی ہے تو کوئی مضائقہ نہیں، اور مشتبہ ہے تو یہ صورت محل شبہ میں ہے اس کے احکام ہم کتب الزکوٰۃ میں بیان کر چکے ہیں، اور اگر وہ مال صدقہ ہو، اور دینے والا اس کے بدترین کے پیش نظر دے رہا ہو تو فقیر کو اپنے باطن کی طرف دیکھنا چاہیے، اگر وہ پھسپ کر کوئی ایسا گناہ کرتا ہے جس کے بارے میں اسے یہ یقین ہو کہ اس گناہ کا ظلم معنی کو ہو جائے تو وہ اس سے نفرت کرنے لگے، اور اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرنے کے لئے اسے صدقات نہ دے، اگر ایسا ہو تو یہ صدقہ قبول کرنا حرام ہے یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص کسی کو عالم یا ملوی سمجھ کر کچھ دے اور وہ ایسا نہ ہو، اس صورت میں اگر وہ ہدیہ قبول کرے گا تو یہ جائز نہ ہوگا۔

طلب شہرت اور ریا کاری معنی کی ایک فرض یہ ہو سکتی ہے کہ وہ طلب شہرت، ناموری اور ریا کاری کے لئے کسی کو کچھ دے، اس صورت میں فقیر کو چاہیے کہ اس کا دیا ہوا مال واپس کر دے اور اسے اس کے غلط مقصد میں کامیاب نہ ہونے دے، اگر قبول کرے گا تو اس کی غرض فاسد پر مدگار ہونا لازم آئے گا، حضرت سفیان ثوری کی خدمت میں اگر کوئی ہدیہ پیش کیا جاتا تو آپ اسے واپس کر دیتے اور فرماتے اگر مجھے یہ علم ہوتا کہ دینے والے اپنے عطایا کا تذکرہ بطور فخر نہیں کرتے ہیں تو میں قبول کر لیتا۔ ایک بزرگ کا یہی معمول تھا، بعض لوگوں نے انہیں ملامت کی، اور ان کے اس فعل کو اچھا نہیں سمجھا کہ وہ خلوص سے دیے گئے ہدایا رد کر دیتے ہیں، انہوں نے جواب دیا کہ میں دینے والوں پر منفعت اور ان سے تعلق خاطر کی بنا پر ایسا کرتا ہوں کیوں کہ وہ مال دے کر ذکر کر دیتے ہیں اس طرح ان کا اجر و ثواب ضائع چلا جاتا ہے، میں نہیں چاہتا کہ ان کا مال ضائع ہو۔

لینے والے کی اغراض لینے والے کو بھی اپنی اغراض پر نظر رکھنی چاہیے، اگر کوئی شخص کچھ دے تو لینے سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ اس کا محتاج ہے یا نہیں، اگر وہ اس کا محتاج ہو اور ان شہادت و آفات سے خالی ہو جن کا ذکر ابھی ہوا ہے تو اس کا قبول کرنا بہتر ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے نہ

مَا الْمُعْطَىٰ مِنْ سَعْيٍ عَظِيمٍ أَجْرًا مِّنَ الْآخِرِ لِذَا كَانَ مُحْتَاجًا۔
(طبرانی۔ ابن عمر)

دینے والا وسعت کے باوجود لینے والے سے زیادہ اجر والا نہیں ہے اگر وہ محتاج ہو۔

ایک حدیث میں فرمایا نہ

مَنْ أَنَاهُ شَيْءٌ مِّنْ هَذَا الْمَالِ مِنْ غَيْرِ مَسْأَلَةٍ وَلَا اسْتِشْرَافٍ فَإِنَّمَا هُوَ رِزْقُ سَاقَةِ اللَّهِ الْيَتِيمِ (ابو حنیفہ۔ طبرانی۔ خالد ابن عدی)

جس شخص کے پاس اس مال میں سے بغیر سوال اور بلا انتظار کے کچھ آئے تو وہ رزق ہے جسے اللہ نے اس کی طرف بھیجا ہے۔

ایک روایت میں ہے کہ اسے واپس نہ کرے۔ بعض علماء کہتے ہیں اگر کسی کو کچھ دیا جائے اور وہ نہ لے تو ایک وقت ایسا آئے گا کہ وہ سوال کرے گا اور اسے دیا نہ جائے گا۔ سری سقلی حضرت امام احمد کے پاس ہدایا بھیجا کرتے تھے، ایک مرتبہ کوئی ہدیہ بھیجا تو انہوں نے واپس کر دیا، سری سقلی نے ان سے فرمایا اے احمد! ہدیہ رد کرنے کی آفت سے ڈرو، یہ قبول کرنے کی آفت سے سخت تر ہے، امام صاحب نے فرمایا آپ دوبارہ کہیں، سری سقلی نے یہ بات پھر دہرائی، امام صاحب نے فرمایا کہ میں نے آپ کا ہدیہ اس لئے واپس کر دیا تھا کہ میرے پاس ایک ماہ کے بقدر غذا موجود تھی، آپ اسے اپنے پاس رہنے دیں، مجھے ابھی اس کی ضرورت نہیں ہے، ایک ماہ بعد بھیج دینا، بعض علماء کہتے ہیں کہ ضرورت کے باوجود آیا ہوا مال واپس کر دینے میں اس کا خطرہ ہے کہ کہیں حرص

میں یا مشبہات میں جھلا نہ کر دیا جائے۔

اگر کسی کو ضرورت سے زائد مال مل رہا ہے تو وہ دو حال سے خالی نہیں ہے، یا تو وہ خود اپنے حال میں مشغول ہو، یا فقراء کا کثیر اور ان کے اخراجات کا ذمہ دار ہو، اور اسے اپنی نرم مزاجی اور سخاوت کی بنا پر ضرورت مندوں پر خرچ کرتا ہو، پہلی صورت میں کچھ لینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا بشرطیکہ آخرت کا طالب، اور اس کی راہ کا مسافر ہو، اس لئے کہ اس صورت میں کچھ لینا محض خواہش نفس کی اتباع ہے، اور جو عمل اللہ کے لئے نہیں ہوتا وہ شیطان کے لئے ہوتا ہے۔ پھر اس لینے کی بھی دو صورتیں ہیں، ایک تو یہ کہ اعلانیہ لے لے، اور خفیہ طور پر واپس کر دے، یا پوشیدہ طور پر فقراء میں تقسیم کر دے یہ صدیقین کا مقام ہے، اور نفس پر انتہائی شاک ہے، صرف وہی لوگ ایسا کر سکتے ہیں جن کے قلوب ریاضت پر مطمئن ہوں، دوسری صورت یہ ہے کہ نہ لے، تاکہ مالک کو دوسرے ضرورت مند کو دیدے، یا خود لے کر کسی ایسے شخص کو دیدے جو اس سے زیادہ ضرورت مند ہو، یہ دونوں کام یا تو اعلانیہ کرے، یا پوشیدہ طور پر کرے۔ کتاب اسرار الزکوٰۃ میں ہم نے اس سلسلے کے کچھ احکام بیان کئے ہیں، وہاں یہ موضوع بھی زیر بحث آیا ہے کہ اس صورت میں اظہار الفضل ہے یا اخفاء۔ وہاں فقراء کے کچھ احکام لکھے گئے ہیں، وہ بھی دیکھ لئے جائیں۔

حضرت امام احمد ابن حنبلؒ نے سری سنی کا ہدیہ واپس کر دیا، اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ انہیں اس کی ضرورت نہیں تھی کیوں کہ ایک ماہ کی غذا ان کے پاس موجود تھی، انہوں نے اپنے لئے یہ صورت پسند نہیں کی کہ وہ یہ ہدیہ قبول کر لیں، اور پھر دوسرے مستحقین کو دیدیں، کیوں کہ اس میں بہت سے خطرات اور آفات تھیں، جب کہ دین کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی آفات کے امکانات سے بھی احتراز کرے، اگر یہ خیال ہو کہ وہ شیطان سے اپنی حفاظت نہیں کر سکتا، اور شیطان سے بچنا بڑا دشوار ہے۔ مکرمہ کے ایک مجاور کہتے ہیں کہ میرے پاس چند دراہم تھے جو میں نے اللہ کے راستے میں خرچ کرنے کے لئے محفوظ کر رکھے تھے۔ ایک دن میں طواف کر رہا تھا کہ ایک فقیر کی آواز آئی، وہ طواف سے فارغ ہو کر آہستہ آہستہ یہ کہہ رہا تھا اے اللہ تو دیکھ رہا ہے میرا بھوکا ہوں، تو دیکھ رہا ہے میں نگاہوں، اس صورت حال میں تجھے کیا منظور ہے، اے اللہ! تو میرے بارے میں سب کچھ جانتا ہے، مگر نظر انداز کرتا ہے، راوی کہتے ہیں میں نے اس پر نظر ڈالی اس کے جسم پر پٹے پرانے کپڑے تھے جن سے جسم بھی نہیں چھپتا تھا، میں نے اپنے دل میں سوچا کہ مجھے ان دراہم کو خرچ کرنے کے لئے جو میرے پاس ہیں اس سے بہتر موقع نہیں مل سکتا، چنانچہ میں نے وہ تمام دراہم اس کے سامنے پیش کر دیے، اس نے پانچ درہم اٹھائے اور کہنے لگا کہ یہ چار درہم لباس کے لئے کافی ہیں، اور ایک درہم سے تین دن تک کھانا پینا ہو جائے گا، باقی کی مجھے ضرورت نہیں ہے، چنانچہ وہ درہم اس نے مجھے واپس کر دیے، دوسری شب میں نے اسے دیکھا اس کے بدن پر دو نئی چادریں تھیں، اس وقت میرے دل میں اس کی طرف سے کچھ بدگمانی پیدا ہوئی، اچانک وہ مختصر میری طرف متوجہ ہوا اور میرا ہاتھ پکڑ کر طواف کرنے لگا، اس حالت میں ہم نے سات طواف کئے، ہمارا ہر طواف زمین کے مختلف جواہر میں سے ایک جو ہر ہوتا تھا، اور وہ جو ہر ہمارے پاؤں سے فٹنوں تک آجاتا تھا، چنانچہ ہم سونے، چاندی، یا قوت، موتی اور گو وغیرہ پر سے گزرے کہ دوسرے لوگوں کو پتا بھی نہیں چل سکا۔ پھر کہنے لگا یہ تمام خزانے اللہ تعالیٰ نے مجھے عطا کئے ہیں، لیکن میں ان میں زہد کرتا ہوں، اور مخلوق کے ہاتھوں سے لینا پسند کرتا ہوں، یہ خزانے بوجھ ہیں، اور فتنہ ہیں، جب کہ لوگوں کے ذریعہ پہنچنے والا مال رحمت اور نعمت ہے، اس پوری تفصیل کا حاصل یہ ہے کہ اگر ہمیں ضرورت سے زیادہ کوئی چیز ملتی ہے تو وہ ہمارے لئے فتنہ اور ابتلاء ہے، اللہ تعالیٰ ہمیں زائد از ضرورت مال دے کر یہ دیکھتا ہے کہ تم اس میں کیا کرتے ہو، اور جو مال مقدار ضرورت کے مطابق ملتا ہے وہ رفق ہے، ہمیں رفق اور ابتلاء کے فرق سے غفلت نہ کرنی چاہیے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:-

إِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْأَرْضِ زِينَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ أَيُّهُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا۔

(پ ۱۵، آیت ۷)

ہم نے زمین کی چیزوں کو اس لئے باعث رونق بنایا تاکہ ہم لوگوں کی آزمائش کریں کہ ان میں زیادہ اچھا عمل کون کرتا ہے۔

سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں :-
 لَا حَقَّ لِبَنِي آدَمَ إِلَّا فِي ثَلَاثٍ طَعَامٌ يَقْبِمْ صَلَواتُ ثَوْبٌ يُؤَارِي عَوْرَتَهُ وَبَيْتٌ يَكُنُّهُ
 فَمَا زَادَهُمْ حِسَابٌ (ترمذی - عثمان ابن عفان)

ابن آدم کا حق صرف تین چیزوں میں ہے، 'اتکا کھانا جس سے کمر سیدھی نہ سکے، 'اتکا پڑنا جس سے ستر عورت ہو اور ایسا گھر جس میں سکونت اختیار کرے، 'اس سے زائد کا عذاب ہو گا۔

ان نصوص کا مطلب یہ ہے کہ اگر آدمی ان تینوں چیزوں میں سے بقدر ضرورت لے گا تو ثواب پائے گا اور زیادہ لینے کی صورت میں اگر اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہیں کرتا تو اپنے آپ کو حساب کے لئے پیش کرتا ہے، اور نافرمانی کرتا ہے تو سزا کا مستحق قرار دیتا ہے، امتحان اور آزمائش کی ایک صورت یہ ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور اس کے تقرب کے لئے کوئی لذت ترک کرے، اس کا عزم مصمم کرے، اور اپنے نفس کو توڑ ڈالے، پھر وہ لذت بلا طلب، صاف، بے کدورت اس کے پاس آئے تاکہ اس کی عقل کا امتحان لیا جاسکے۔ اس صورت میں بہتری ہے کہ اس لذت سے باز رہے، اس لئے کہ اگر اس نے اپنے نفس کو عمدہ نشی کی اجازت دی تو وہ عمدہ نشینیوں کا عادی بن جائے گا، پھر اسے دہانا مشکل ہو جائے گا، اس لئے بہتری ہے کہ ایسی لذت کو اپنے سے دور کر دے، یہی زہد ہے، اور غایت زہد یہ ہے کہ وہ لذت لے کر کسی محتاج کو دیدے، لیکن اس پر صرف صدیقین ہی قادر ہیں، لیکن اگر کسی شخص کی طبیعت میں جو دو خفاء ہو، اور وہ فقراء کے حقوق ادا کرتا ہو، صلحاء کی جماعت کے طعام وغیرہ کا منتخل ہو تو اپنی ضرورت سے زائد بھی لے سکتا ہے یہ اگرچہ اس کی ضرورت سے زائد ہو گا لیکن ان فقراء کی ضرورت سے زائد نہیں ہو گا جن کا وہ کفیل ہے، تاہم اس صورت میں مال لے کر خرچ کرنے میں سبقت کرنی چاہیے، اسے بچا کر نہ رکھے، ایک رات کے لئے بھی اپنے پاس مال روکنا فتنے کا باعث بن سکتا ہے اور آزمائش میں ڈال سکتا ہے، شاید دل میں یہ خیال پیدا ہو جائے کہ اس مال کو اپنے پاس رکھنا چاہیے، خرچ نہ کرنا چاہیے، بعض لوگوں نے ابتداء یہ عمدہ کیا کہ وہ فقراء کی خدمت کریں گے، اور ان کے اخراجات کا تکفل کریں گے، لیکن بعد میں انہوں نے اسے اپنی معیشت، رہن سہن، اور کھانے پینے میں توسع کا وسیلہ بنا لیا، اور ہلاکت کے راستہ پر چل پڑے، جس شخص کا مقصد رفیق اور اس کے ذریعے اجر و ثواب کی طلب ہو وہ اللہ کے ساتھ حسن ظن رکھتے ہوئے قرض بھی لے سکتا ہے، بس شرط یہ ہے کہ وہ اس سلسلے میں ظالم بادشاہوں پر بھروسہ نہ کرے، بعد میں اگر اللہ تعالیٰ اسے حلال رزق عطا کر دے تو وہ قرض اس میں سے ادا کرے، اور اگر ادائیگی سے پہلے مر جائے تو اللہ تعالیٰ اس کی طرف سے ادا کر دے گا، اور اس کے قرض خواہ کو راضی کر دے گا، بشرطیکہ وہ اپنے قرض خواہ کی نظر میں کھلی کتاب کی طرح ہو، قرض لینے کے لئے انہیں فریب نہ دے، اور نہ جھوٹے وعدے کرے، بلکہ اپنا حال من و عن بیان کر دے، تاکہ قرض دینے والے سوچ سمجھ کر اقدام کریں، ایسے شخص کے قرض کی ادائیگی بیت المال کے ذمے ہے، اور وہ زکوٰۃ کے اموال سے بھی ادا کیا جاسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :-

وَمَنْ قَدَّرَ عَلَيْهِمْ رُفْعًا فَلْيَنْفِقْ مِمَّا آتَاهُ اللَّهُ
 (پ ۲۸، آیت ۷)

اور جس کی آمدنی کم ہو اس کو چاہیے کہ اللہ نے جتنا اس کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرے۔
 اس آیت کی تفسیر میں بعض علماء یہ کہتے ہیں کہ اپنے کپڑے فروخت کر دے، اور بعض یہ کہتے ہیں کہ اپنے اہتمام پر قرض حاصل کرے، قرض بھی اللہ تعالیٰ ہی کا عطیہ ہے، ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے بعض بندے اپنے مال کے مطابق خرچ کرتے ہیں، اور بعض ایسے بھی ہیں جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنے حسن ظن کے مطابق صرف کرتے ہیں۔ ایک بزرگ نے مرلے سے پہلے یہ وصیت فرمائی کہ ان کا مال اقویاء، اسخیاہ اور اغنیاء میں تقسیم کر دیا جائے، لوگوں نے سوال کیا، یہ کون لوگ ہیں؟ فرمایا اقویاء سے مراد وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ پر توکل کرتے ہیں، اغنیاء سے مراد وہ لوگ ہیں جو اللہ پر حسن ظن رکھتے ہیں، اور اغنیاء وہ ہیں جو صرف اللہ کے ہو کر رہ گئے ہیں۔

یہ ہیں ہدایا اور صدقات وغیرہ قبول کرنے کی شرائط دینے والے اور لینے والے کے آداب اور مال کی مقدار۔ یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ جو مال ملے اسے یہ نہ سمجھے کہ معنی نے دیا ہے، بلکہ یہ سمجھے کہ اس مال کا عطا کرنے والا اللہ ہے، معنی صرف واسطہ ہے، اور دینے کے لئے مسخر کیا گیا ہے، کیوں کہ اس پر دو اعمیٰ ارادے اور اعتقادات مسلط کئے گئے ہیں اس لئے وہ دینے پر مجبور ہے، حضرت شعیبؑ علیہ السلام کا واقعہ ہے، کسی شخص نے ان کو ان کے پچاس رقتہ سمیت کھانے پر مدعو کیا، اور عمدہ عمدہ کھانے بنوائے، اور دعوت کا زبردست اہتمام کیا، جب تمام مہمان دسترخوان پر بیٹھ گئے، اور کھانا چن دیا گیا تو شعیبؑ علیہ السلام نے اپنے مریدین سے فرمایا کہ جس شخص نے دعوت کی ہے اس کا خیال یہ ہے کہ کھانا میں نے تیار کیا ہے، اور میں نے سامنے رکھا ہے، جو شخص میرے اس خیال سے اتفاق نہیں کرتا اس کے لئے میرا کھانا حرام ہے، یہ سن کر ان کے تمام مریدین کھانا چھوڑ کر چلے گئے، صرف ایک نوجوان باقی رہ گیا جو درجے میں ان سے کم تھا، میزبان نے شعیبؑ سے دریافت کیا کہ آپ نے ایسا کیوں کیا، انہوں نے کہا کہ میں رقتہ کے توحید کا امتحان کرنا چاہتا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کیا، یا اللہ! آپ نے میرا رزق بنی اسرائیل کے ہاتھوں میں کر دیا ہے، آج یہ کھلا رہا ہے، کل وہ کھلا رہا ہے، صبح ایک شخص کے یہاں کھاتا ہوں، شام کو دوسرے شخص کے یہاں۔ اللہ تعالیٰ نے وحی نازل فرمائی کہ میں اپنے دوستوں کے ساتھ ایسا ہی کرتا ہوں میں اپنے بندوں میں سے خراب لوگوں کے ذریعے انہیں رزق بہم پہنچاتا ہوں تاکہ اس بہانے انہیں ثواب حاصل ہو جائے۔ بہر حال اگر کسی فقیر کو اللہ کے کسی بندے کے ذریعہ کچھ ملے تو اسے بندے کی عطا نہ سمجھے، بلکہ یہ اعتقاد کرے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کام کے لئے اسے مسخر کیا ہے۔

بلا ضرورت سوال کی حرمت اور سوال کے سلسلے میں فقیر مضطر کے آداب جاننا چاہیے کہ سوال کے سلسلے میں بہت سی روایات ایسی وارد ہیں جن میں سختی کے ساتھ کسی کے سامنے دست سوال دراز کرنے سے منع کیا گیا ہے، دوسری طرف بعض احادیث ایسی بھی وارد ہیں جن میں سوال کی اجازت ہے۔ چنانچہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں :-

لِلسَّائِلِ حَقٌّ وَلَوْ جَاءَ عَلَى فَرْسٍ - (ابوداؤد - حسین ابن علی)

مانگنے والے کا ایک حق ہے اگرچہ وہ کھوڑے پر سوار ہو کر آئے۔

ایک جگہ ارشاد فرمایا :-

رَكُّوا السَّائِلَ وَلَوْ بَظْلَفٍ مُحْتَرَقٍ - (ابوداؤد - ترمذی - نسائی - ام عبد)

سائل کو ہٹاؤ اگرچہ جل ہوئی لکڑی دے کر ہٹانا پڑے۔

ان دونوں روایتوں سے اجازت ثابت ہوتی ہے، اس لئے کہ اگر سوال مطلقاً حرام ہوتا تو دینے والے کو ہرگز دینے کی اجازت نہ دی جاتی کیوں کہ حرمت پر اعانت بھی حرام ہے، اس سے ثابت ہوا کہ سوال اصلاً حرام ہے، صرف ضرورت یا اہم حاجت کی بنا پر اس کی اجازت دی گئی ہے اگر سوال کے بغیر کام چل سکتا ہو تو سوال کرنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ سوال کے اصلاً حرام ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس میں تین باتیں حرام ہوتی ہیں، اول اللہ تعالیٰ کی شکایت کرنا، کیونکہ سوال کا مطلب یہ ہے کہ سائل مسئلہ کے سامنے اپنے فقر کا اظہار کرتا ہے، اور یہ شکایت کرنا ہے کہ مجھ پر اللہ کی نعمتیں نہایت کم ہیں، جس طرح کوئی غلام اپنے آقا کے علاوہ کسی دوسرے شخص سے کچھ مانگتا ہے تو یہ اس کے آقا کی توہین ہوتی ہے، اسی طرح بندہ کا اپنے مولیٰ کے علاوہ کسی دوسرے کے سامنے ہاتھ پھیلاتا بھی باری تعالیٰ کی بے ادبی ہے، ظاہر ہے یہ حرام ہے، اور صرف ضرورت کے وقت اس کی اجازت دی جاسکتی ہے، ضرورت کے وقت تو مردار بھی حلال ہے، دوسرے یہ کہ مانگنے میں سائل کا اپنے نفس کو ذلیل کرنا ہے، اور کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں کہ وہ اپنے نفس کو غیر اللہ کے سامنے ذلیل کرے، بلکہ اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ صرف اللہ تعالیٰ کے سامنے ذلیل اور رسوا ہو، اسی میں اس کی عزت ہے، باقی تمام افراد انسانی اسی کی طرح بندگان خدا ہیں، اس لئے ان کے سامنے بلا ضرورت خود کو ذلیل کرنا جائز نہیں سوال کرنے میں سائل کے لئے مسئلہ کے مقابلے میں جو ذلت ہے وہ کسی پر غفلت نہیں ہے، تیسرے یہ کہ سوال کرنے سے بعض اوقات مسئلہ کو تکلیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے، ضروری نہیں کہ سائل مسئلہ کے سامنے ضرورت رکھے تو وہ

بخوشی اس کی ضرورت پوری کرنے کے لئے تیار ہو جائے ہو سکتا ہے وہ دل سے نہ چاہتا ہو اور سائل کی شرم، خوف یا اپنی ریا کی وجہ سے دینے پر مجبور ہو جائے اس صورت میں اگر مسئول نے کچھ دیا تو وہ حرام ہے نہ دینے کی صورت میں اسے ندامت ہوتی ہے اور وہ اپنے دل میں یہ سوچ کر اذیت محسوس کرتا ہے کہ خواہ مخواہ اسے بخیل کہا جائے گا اس بھارے کو دینے میں مال کا نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے اور نہ دینے میں جاہ کا۔ دونوں ہی صورتیں تکلیف کا باعث ہیں اور کسی مسلمان کو بلا ضرورت ایذا پہنچانی حرام ہے۔

بہر حال سوال کرنے میں یہ تین برائیاں ہیں، آپ ان تینوں برائیوں کی روشنی میں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد مبارک کے معنی بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔ فرمایا :-

مَسْأَلَةُ النَّاسِ مِنَ الْفَوَاحِشِ مَا أَحَلَّ مِنَ الْفَوَاحِشِ (۱)

لوگوں سے مانگنا بڑا گناہ ہے اور بڑے گناہوں میں سے صرف یہی گناہ جائز ہے۔

آپ نے اس کا نام فاحشہ رکھا ہے جس کے معنی ہیں گناہ کبیرہ اور کباریلا ضرورت مباح نہیں ہیں جیسے شراب پینا اس شخص کے لئے جائز ہے جس کے حلق میں لقمہ اٹک جائے اور اسے شراب کے علاوہ کوئی چیز پینے کے لئے نہ ملے۔ ایک حدیث میں ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا :-

مَنْ سَأَلَ عَنْ غَنَى فَإِنَّمَا يَسْتَكْثِرُ مِنْ جُمُرِ جَهَنَّمَ

(ابوداؤد۔ ابن حبان۔ سل ابن حنظلیہ)

جو شخص تو کمتری کے باوجود سوال کرتا ہے وہ جہنم کے انگارے اپنے لئے زیادہ کرتا ہے۔

ایک حدیث میں ہے آپ نے ارشاد فرمایا :-

وَمَنْ سَأَلَ وَلَهُ مَا يَغْنِيهِ جَاءَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَوَجْهُهُ عَظُمَ يَتَفَقَّعُ وَلَيْسَ عَلَيْهِ لَحْمٌ (اصحاب السنن۔ ابن مسعود)

جو شخص غنا کے باوجود سوال کرتا ہے وہ قیامت کے روز اس حال میں آئے گا کہ اس کا چہرہ ایک ہتھی ہوئی ہڈی ہو گا اور اس پر گوشت نہیں ہو گا۔

ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں ”كَانَتْ مَسْأَلَتُهُ خَلُوشًا وَكَلُوحًا فِي وَجْهِهِ“ اس کا سوال اس کے چہرے پر خراشوں کا نشان اور داغ ہو گا۔ ان روایات سے سوال کی قطعی حرمت اور ممانعت ثابت ہوتی ہے۔ روایت ہے کہ ایک مرتبہ آپ نے کچھ لوگوں کو مسلمان کیا اور ان سے سب دعا و طاعت پر بیعت لی اسی ضمن میں آپ نے ارشاد فرمایا :-

لَا تَسْأَلُوا النَّاسَ شَيْئًا (مسلم۔ عوف ابن مالک)

لوگوں سے کچھ مت مانگنا۔

متعدد روایات سے ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو معفت اختیار کرنے یعنی سوال سے باز رہنے کی تلقین فرمائی چنانچہ ایک مرتبہ آپ نے سوال سے منع کرتے ہوئے ارشاد فرمایا :-

مَنْ سَأَلَنَا أَعْطَيْنَاهُ وَمَنْ اسْتَعْنَى أَغْنَاهُ اللَّهُ وَمَنْ لَمْ يَسْأَلْنَا فَهُوَ أَحَبُّ إِلَيْنَا۔

(ابن ابی الدنیا۔ ابو سعید الخدری)

جو ہم سے مانگے گا ہم اسے دیں گے اور جو استغناء کرے گا اللہ اسے مستغنی بنادے گا اور جو ہم سے نہیں مانگے گا وہ ہمیں زیادہ محبوب ہو گا۔

ایک حدیث میں ارشاد فرمایا نہ
رَأْسُكَ فَوَاعِنِ النَّاسِ وَمَا قَلَّ مِنَ السُّؤَالِ فَهُوَ خَيْرٌ
(بزار، طبرانی۔ ابن عباس)

لوگوں سے سوال مت کرو، سوال جتنا کم ہوتا ہے، بہتر ہے۔

لوگوں نے عرض کیا آپ سے سوال کریں تو اس کا حکم کیا ہے؟ فرمایا مجھ سے بھی سوال کم کرنا بہتر ہے۔

حضرت عمر کا ایک اہم اقدام : حضرت عمرؓ نے نماز مغرب کے بعد ایک شخص کو آواز لگاتے سنا، آپ نے فرمایا اگر اس کی قوم کا کوئی شخص اسے کھانا کھلا سکے تو بہتر ہے، چنانچہ ایک شخص نے اسے کھانا کھلادیا، آپ نے دوبارہ اس کی آواز سنی، لوگوں سے فرمایا میں نے تم سے کما تھا اسے کھانا کھلا دو، ایک شخص نے عرض کیا میں نے آپ کے حکم کی تعمیل میں اسے کھانا کھلادیا ہے، آپ نے سائل کو بلایا، دیکھا تو اس کی جھولی روٹیوں سے بھری ہوئی تھی، آپ نے فرمایا تو سائل نہیں تاجر ہے، پھر اس کی جھولی، اور تمام روٹیاں صدقے کے اونٹوں کے آگے ڈال دیں، اور اس کی دوتہ سے خبر لی اور فرمایا آئندہ یہ حرکت مت کرنا۔ اس سے ثابت ہوا کہ بلا ضرورت سوال کرنا حرام ہے، اگر سوال حرام نہ ہوتا تو آپ کبھی سائل کو زد و کوب نہ کرتے، اور نہ اس کی روٹیاں چھین کر اونٹوں کو کھلاتے، یہاں بعض ضعیف کم عقل، اور تنگ نظر فقہاء حضرت عمرؓ کے اس موقف پر تنقید کر سکتے ہیں، اور کہہ سکتے ہیں کہ تادیب کے لئے سائل کو مارنا صحیح ہو سکتا ہے، سیاسی مصالح کے لئے شریعت نے اس کی اجازت دی ہے، لیکن اس کا مال چھیننا ایک تاوان ہے، اور شریعت نے اس طرح کے تاوان وصول کرنے کی اجازت نہیں دی ہے، ان فقہاء کو یہ اشکال ان کی کم علمی کے باعث ہو سکتا ہے، ورنہ حضرت عمرؓ کا عقد اتنا عمیق، اور علم اتنا وسیع ہے کہ تمام فقہاء مل کر بھی ان کی گرد کو نہیں پہنچ سکتے، آپ کو جس قدر دین الہی کے اسرار و رموز اور بندگان خدا کی مصالح کا علم تھا اتنا علم انہیں کہاں ہو سکتا ہے، کیا حضرت عمرؓ کو معلوم نہیں تھا کہ کسی کا مال ضبط کرنا اور تاوان لینا جائز نہیں ہے، یقیناً آپ شریعت کے اس حکم سے واقف تھے، اس کے باوجود آپ نے سائل کی روٹیاں ضبط کر لیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ نے اسے سوال سے مستثنیٰ پایا، اور اچھی طرح تحقیق کر کے یہ بات جان لی کہ جن لوگوں نے اسے کھانا دیا ہے یہ سمجھ کر دیا ہے کہ وہ محتاج ہے حالانکہ وہ سچ نہیں بول رہا تھا، اسکا مطلب یہ ہوا کہ اس شخص نے فریب دے کر مال حاصل کیا تھا اور فریب دے کر حاصل کیا جانے والا ملک نہیں بن سکتا، پھر کیوں کہ وہ روٹیاں مختلف گھروں سے حاصل کی گئی تھیں اور یہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ کون سی روٹی کس کے گھر کی ہے اس لئے یہ مال لاوارث ٹھہرا، اور ایسے مال کا اہل اسلام کی مصالح میں خرچ کرنا واجب ہے، زکوٰۃ کے اونٹوں کی غذا اسلام کے مصالح میں سے ہے، اس لئے حضرت عمرؓ نے وہ روٹیاں اس سائل سے لے کر زکوٰۃ کے اونٹوں کے سامنے ڈال دیں۔ سائل نے اپنی ضرورت کے اظہار میں کذب بیانی کی تھی۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص یہ جھوٹا دعویٰ کرے کہ میں حضرت علیؓ کی اولاد ہوں، اور لوگ اسے کچھ مال دیدیں، اس صورت میں وہ مال اس کی ملکیت میں نہیں آتا، اسی طرح وہ صوفی بھی ان عطایا کا مالک نہیں بنتا جو اسے نیک، دیندار اور متقی سمجھ کر دیے جاتے ہیں، جب کہ وہ باطن میں ایسا نہیں ہوتا، ایسے لوگوں کو مال لینا حرام ہے، اور جو مال جس سے لیا ہوا ہے واپس کرنا واجب ہے، حضرت عمرؓ کے اسوہ سے اس مسئلے کا علم ہوا ہے، بہت سے فقہاء اس مسئلے سے واقفیت نہیں رکھتے، اور اپنی جہالت کے باعث حضرت عمرؓ کے اس اقدام پر شک کرتے ہیں۔

ضرورت کے لئے سوال کی اباحت جیسا کہ بیان کیا گیا ہے کہ سوال صرف ضرورت کے لئے مباح ہے۔ یہاں یہ جاننا چاہیے کہ یا تو آدمی کسی چیز کی طرف مضطر ہوتا ہے، یا اس چیز کی اسے شدید حاجت ہوتی ہے، یا خفیف ہوتی ہے، یا بالکل نہیں ہوتی، اور پورے طور پر مستثنیٰ ہوتا ہے، یہ چار صورتیں ہیں۔ اب ہم انہیں الگ الگ بیان کرتے ہیں، اضطراب کی صورت یہ ہے کہ کوئی

اس قدر بھوکا ہو کہ اگر کھانا میسر نہ ہو تو ہلاک ہو جائے یا بیمار پڑ جائے یا اس قدر کپڑے نہ رکھنا ہو کہ بدن ڈھانپ سکے۔ اس صورت میں سوال کرنا جائز ہے بشرطیکہ تمام شرائط پائی جائیں مثلاً یہ کہ جس چیز کے بارے میں سوال کیا جائے وہ مباح ہو جس سے سوال کیا جائے وہ دل سے راضی ہو اور سوال کرنے والا اکتساب سے عاجز ہو اس لئے کہ اگر کوئی شخص کسب پر قدرت رکھتا ہو اس کے لئے سوال کرنا جائز نہیں ہے الا یہ کہ تحصیل علم میں مشغول ہو اور علم کی طلب نے اس کے تمام اوقات گھیر لئے ہوں جو شخص لکھنا جانتا ہو وہ کتابت کے ذریعے کمانے پر قادر ہے مستغنی وہ ہے جو ایسی چیز مانگے جس کی ایک مثل یا کئی مثل اس کے پاس ہوں مثلاً کوئی شخص ایک روپیہ مانگے اور اس کے پاس ایک روپیہ یا کئی روپے موجود ہوں یہ سوال بھی قطعی طور پر حرام ہے جہاں تک ان دونوں صورتوں کا سوال ہے ان کی حرمت بالکل واضح ہے جس شخص کی حاجت اہم ہے اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص مریض ہو وہ دوا کی احتیاج رکھتا ہو اور یہ احتیاج ایسی ہو کہ اگر نہ ملے تو زیادہ خوف نہیں لیکن کچھ نہ کچھ خوف ضرور ہے یا کوئی شخص ہے جس نے جبہ پہن رکھا ہو لیکن اس کے پاس سردی سے بچاؤ کے لئے قمیض نہ ہو اسے خالی جیبے میں سردی اذیت دیتی ہے لیکن خطرناک حد تک نہیں اسی طرح وہ شخص بھی جو کرائے کے لئے پیسوں کا سوال کرے حالانکہ اگر وہ چاہے تو اتنا فاصلہ پیدل چل کر بھی ملے کر سکتا ہے اگرچہ اس میں مشقت ہے لیکن اتنی نہیں کہ برداشت نہ کی جاسکے اگر اس طرح کی حاجتیں ہوں تو ان میں بھی سوال کرنے کی گنجائش ہے لیکن صبر کرنا زیادہ بہتر ہے سوال کرنے سے ترک ادنیٰ لازم آتا ہے اگر کوئی شخص اپنی حاجت میں سچا ہے تو اس کے سوال کو مکروہ نہیں کہا جائے گا مثلاً اگر وہ یہ کہے کہ میرے جیبے کی قمیض نہیں ہے اور مجھے سردی تکلیف دیتی ہے اگرچہ میں اسے برداشت کر سکتا ہوں لیکن برداشت کرنے کا عمل مشقت طلب ہے تو اس کی تصدیق کی جائے گی اور اس کی صداقت اس کے سوال کا کفارہ بن جائے گی۔ معمولی حاجت کی مثال یہ ہے کہ کوئی شخص قمیض کا سوال کرے تاکہ اسے اپنے پیوند زدہ کپڑوں کے اوپر پہن لیا کرے اور لوگوں سے اپنی خستہ حالی چھپا سکے یا کسی شخص کے پاس روٹی موجود ہے اور وہ سالن کے لئے سوال کرے یا اس قدر کرایہ کی رقم موجود ہے کہ گدھے پر بیٹھ کر اپنی منزل تک پہنچ سکتا ہے لیکن جلدی پہنچنے کے لئے گھوڑے کے کرائے کا سوال کرے یا کرایہ کی رقم موجود ہے مگر حمل و فیو کے لئے سوال کرے تاکہ آرام سے سفر کر سکے یہ تمام حاجتیں معمولی ہیں اگر کوئی شخص اپنی ان حاجتوں کو صحیح صحیح بیان نہیں کرتا اور مسئلہ کو فریب میں جھلا کرتا ہے تو یہ قطعاً حرام ہے اور اگر غلط بیانی نہیں کرتا فریب نہیں دیتا مگر مذکورہ بالا تین برائیاں پائی جاتی ہیں یعنی باری تعالیٰ کی شکایت اپنی تذلیل اور مسئلہ کی تکلیف اس صورت میں بھی سوال حرام ہے کیوں کہ یہ حاجتیں اتنی شدید نہیں ہیں کہ ان کی وجہ سے مذکورہ امور مباح کر دیے جائیں لیکن اگر فریب نہ ہو اور مذکورہ خرابیوں میں سے بھی کوئی خرابی نہ پائی جائے تو کراہت کے ساتھ سوال کرنے کی اجازت دی جاسکتی ہے۔

سوال کو مذکورہ بالا عیوب سے محفوظ رکھنے کا طریقہ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ سوال کو مذکورہ بالا تین خرابیوں سے کس طرح محفوظ رکھا جاسکتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ پہلی خرابی یعنی باری تعالیٰ کی شکایت کا ازالہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لئے شکر کا اظہار کرے مخلوق سے استغناء برتے اور کسی محتاج کی طرح دست سوال دراز نہ کرے بلکہ یہ کہے کہ جو کچھ میرے پاس ہے میں اس کی موجودگی میں مستغنی ہوں لیکن میرے نفس کی رعونت مجھ سے ایک ایسے کپڑے کا مطالبہ کرتی ہے جسے میں اپنے موجودہ لباس کے اوپر پہن سکوں حالانکہ یہ کپڑا ضرورت سے زائد ہو گا یہ صرف نفس کی فضولیات میں سے ہے اس طرح مانگتے سے یہ سوال شکایت نہ کرے بلکہ خود اپنے نفس کی شکایت بن جائے گا کہ وہ قانع ہے اور جو کچھ اسے میسر ہے اس پر صبر نہیں کرتا۔ ذلت کی خرابی اس طرح دور کی جاسکتی ہے کہ ہر کس و نا کس سے سوال نہ کرے بلکہ اپنے باپ دوست یا کسی ایسے قریبی عزیز سے مانگے جس کے بارے میں یہ یقین ہو کہ وہ اپنی نظموں سے ہمیں گرلے گا اور نہ سوال کرنے کے باعث اسے حقیر سمجھے گا یا کسی ایسے سخاوت پیشہ شخص سے سوال کرے جس نے اپنی تمام دولت اس طرح کے بیش قیمت کاموں کے لئے وقف کر

رکھی ہو جو لوگوں کی حاجت بر آری کر کے خوش ہوتا ہو، اور ماحتمندوں کا اپنی ذات پر احسان سمجھتا ہو کہ وہ اس کے عطایا قبول کر لیتے ہیں، ذلت انہی دو صورتوں میں ساقط ہو سکتی ہے، کیوں کہ ان دونوں صورتوں میں احسان نہیں ہے، احسان جہاں ہوتا ہے وہاں ذلت پائی جاتی ہے۔ ایذا سے بچنے کا طریقہ یہ ہے کہ اپنا سوال کسی متعین شخص سے نہ کرے، بلکہ اپنا حال سب کو سنا دے، سننے والوں میں جو شخص بھی نیک دل، اور صاحب سقام ہو گا وہ اعانت پر سبقت کرے گا، ایسی مجلس میں کسی متعین فرد کی طرف نگاہ بھی نہ اٹھائے ورنہ نہ دینے پر وہ ہدف ملامت بنے گا، اور دل ہی دل میں غمت محسوس کرے گا، یا دینے پر مجبور ہو گا اور ایذا پائے گا۔ اور اگر کسی وجہ سے شخص متعین سے ہی مانگنا پڑ جائے تو اس کے نام کی صراحت نہ کرے بلکہ کنایہ کہہ دے، تاکہ اگر وہ تغافل برتنا چاہے تو برت سکے، اگر دینے والا اس صورت میں دے گا تو یہ اس بات کی علامت ہوگی کہ وہ دینے پر خوش ہے، حالانکہ وہ چاہتا تو اس کا سوال نظر انداز بھی کر سکتا تھا۔ بہتر یہ ہے کہ کسی ایسے شخص سے سوال کرے جسے انکار کرنے پر شرمندگی نہ ہو، اس لئے کہ شرمندگی سے بھی اذیت ہوتی ہے۔

اب اگر سائل یہ بات جان لے کہ دینے والے نے شخص انکار کی ندامت سے بچنے کے لئے سوال پورا کیا ہے، ورنہ اگر مجلس خالی ہوتی، اور سائل نے اسے مخاطب نہ کیا ہو تا تو وہ نہ دینا اس صورت میں دینے والے نے کچھ دیا ہے تو اس کا لینا قطعی طور پر حرام ہے، امت کے کسی طبقے کو اس پر شبہ نہیں ہے۔ اور اس طرح مال لینا ایسا ہے جیسے کسی کو زکوٰۃ کو بکر کے مال لے لیا جائے، یا اس سے زبردستی تاوان وصول کیا جائے، ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے، خواہ ظاہری جسم پر کوڑے لگائے جائیں یا باطن پر ندامت اور خوف ملامت کے تازیانے برسائے جائیں، بلکہ عقلمندوں کے نزدیک باطن کی چوٹ زیادہ خطرناک ہوتی ہے، وہ ظاہری جسم کے زخموں کی اس قدر پروا نہیں کرتے۔

ایک اعتراض کا جواب یہاں تم یہ اعتراض کرو گے کہ جب دینے والا دیتا ہے تو اس سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ وہ شخص ظاہر میں دینے پر راضی ہے، اور شریعت میں ظاہر کا اعتبار ہوتا ہے، جیسا کہ حدیث شریف میں ہے۔
 إِنَّمَا الْحُكْمُ بِالظَّاهِرِ وَاللَّهُ يَنْتَوَلَّى السَّرَائِرَ (۱)
 میں ظاہر پر حکم لگاتا ہوں، باطن کا مالک اللہ تعالیٰ ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ظاہر پر حکم لگانا خصوصیات کے باب میں قاضیوں کی ضرورت ہے، اس لئے کہ وہ باطنی امور پر، اور قرائن احوال پر نظر کر کے فیصلہ کرنے پر قادر نہیں ہوتے، چنانچہ وہ لوگ مجبوراً زبانی قول کے ظاہر پر حکم لگا دیتے ہیں، حالانکہ زبان بسا اوقات دل کی صحیح ترجمانی نہیں کرتی، لیکن ضرور اس پر مجبور کرتی ہے کہ زبان کا اعتبار کیا جائے، اور زیر بحث معاملہ بندے اور اس کے خالق کے درمیان ہے، وہی اس معاملے میں حاکم الحاکمین ہے، دل اس کے نزدیک ایسے ہیں جیسے دنیاوی حکام کے نزدیک زبانیں، یعنی وہ دلوں کا اعتبار کرتا ہے، اور دنیا کے حکام زبانوں پر اعتماد کرتے ہیں، اس لئے تم اس طرح کے معاملات میں صرف اپنے دل کو ٹٹولو، اگرچہ مفتیان کرام خمیس فتویٰ دیدیں، تم دل کے فتویٰ پر عمل کرو، مفتی قاضی اور سلطان کو پڑھانے والے ہیں تاکہ وہ عالم ظاہر کے رہنے والوں پر حکم کریں، دلوں کے مفتی علمائے آخرت ہیں جس طرح فقیہ کے فتوؤں سے دنیا کے بادشاہ کی گرفت سے نجات ملتی ہے، اسی طرح علمائے آخرت کے فتوؤں سے آخرت کے شہنشاہ کی پکڑ سے نجات حاصل ہوتی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اگر تم نے کسی سے کوئی چیز اس طرح حاصل کی ہے کہ وہ دل سے دینے پر راضی نہیں تھا تو فیما بینہ اور بین اللہ اس کا مالک نہیں بنے گا، ایسی چیز کا مالک کو لوٹا دینا واجب ہے اور اگر دینے والا واپس لینے میں غمت محسوس کرے، اور واپس نہ لے تو اسی مالیت کی کوئی چیز اس کی دی ہوئی چیز کے عوض میں ہدیہ کر دینی چاہیے، تاکہ اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو جائے، اور اگر وہ

ہدیہ بھی قبول نہ کرے تو اس کے ورعاً کو دیدے، اگر اس نے وہ چیز واپس نہیں کی اور اس کے قبضے میں ضائع ہو گئی تو فیما بینہ و بین اللہ اس کا ضامن ہو گا، اور اس میں تصرف کرنے اور سوال کے ذریعے مسئول کو اذیت پہنچانے کا مجرم قرار دیا جائے گا۔

اگر تم یہ کہو کہ یہ ایک باطنی معاملہ ہے، اور اس پر مطلع ہونا نہایت دشوار ہے، اس صورت میں نجات کیسے حاصل کی جائے گی، عام طور پر لینے والا یہی سمجھتا ہے کہ دینے والے نے دل کی رضامندی کے ساتھ دیا ہے، جب کہ وہ دل میں راضی نہیں ہوتا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ متقین نے اسی لئے سوال سے مکمل اجتناب کیا ہے، وہ کسی سے قطعاً کوئی چیز قبول نہیں کرتے، چنانچہ حضرت بشر کا کسی کا ہدیہ بھی قبول نہیں کرتے تھے، صرف سری سقلی اس سے مستثنیٰ تھے، اور ان کے ہدایا بھی اس یقین کے بعد قبول کرتے تھے کہ وہ اپنے قبضے سے مال نکلنے پر خوش ہوتے ہیں، احادیث میں سختی کے ساتھ سوال کرنے سے منع کیا گیا ہے، اور متعفف بننے کی تاکید کی گئی ہے، اس کی وجہ یہی ہے کہ سوال سے مسئول کو اذیت ہوتی ہے، اور یہ صرف ضرورت کے لئے مباح قرار دی گئی ہے، اور ضرورت یہ ہے کہ مسائل موت کے قریب پہنچ گیا ہو اور اس کے لئے سوال کے سوا بچاؤ کا کوئی راستہ باقی نہ رہا ہے، اور نہ کوئی ایسا شخص موجود ہو جو کراہت کے بغیر اسے کچھ دے سکا ہو، اور دینے میں اذیت محسوس نہ کرتا ہو، اس صورت میں سوال مباح ہے، یہ اباحت ایسی ہی ہے جیسے کسی مضطر کو خنزیر اور مردار کا گوشت کھانے کی اجازت دے دی جائے۔ بہر حال سوال نہ کرنا متقین کا معمول رہا ہے، ارباب قلوب میں بعض لوگوں کو اپنی اس بصیرت پر اعتماد تھا کہ وہ قرائن احوال پر مطلع ہو جاتے تھے اور دلوں کے احساسات کا اندازہ کر لیا کرتے تھے، اسی لئے وہ حضرات بعض لوگوں کے ہدایا قبول کر لیتے تھے، اور بعض کے ہدایا واپس کر دیتے تھے، بعض حضرات ایسے بھی تھے جو صرف دوستوں سے قبول کرتے تھے، اور بعض حضرات دی ہوئی چیز میں سے کچھ رکھ لیا کرتے تھے، اور کچھ واپس کر دیتے تھے، جیسا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اور بنیر رکھ لیا، اور مینڈھالوٹا دیا، اور یہ صورت ان ہدایا میں تھی جو بلا طلب ملا کرتے تھے، اور کسی کو مانگے بغیر کچھ دینا رغبت کے بغیر ہو ہی نہیں سکتا، لیکن بعض مرتبہ دینے والا طلب جاہ، حصول شہرت، ریا، تفاخر یا کسی اور غرض کی تکمیل کے لئے دیتا ہے اس لئے ارباب قلوب ان امور میں شدید احتیاط کرتے تھے، اور سوال سے قطعاً گریز فرماتے تھے، صرف دو مواقع پر سوال کرتے تھے ایک ضرورت پر جیسا کہ تین انبیائے کرام حضرات سلیمان، موسیٰ، اور خضر علیہم السلام نے سوال کیا، اس میں شک نہیں کہ ان حضرات نے صرف ان لوگوں سے سوال کیا جن کے بارے میں انہیں علم تھا کہ وہ انہیں دینے میں رغبت رکھتے ہیں، اور دو سرا بے تکلفی میں، اور بے تکلفی صرف دوستوں اور بھائیوں سے ہو سکتی ہے، اہل دل اپنے دوستوں اور بھائیوں سے ان کی چیزیں خود ہی لے لیا کرتے تھے، مانگنا اور اجازت لینا بھی ضروری نہیں سمجھتے تھے اس لئے کہ وہ یہ بات جانتے تھے کہ مطلوب دل کی رضا ہے، زبان سے اظہار نہیں ہے، انہیں یہ بھی یقین تھا کہ ان کے دوست اس بے تکلفی پر خوش ہوں گے برا نہیں مانیں گے، اور اگر یہ احساس ہوتا تھا کہ اجازت کے بغیر لینے پر ان کے بھائی ناراض ہو جائیں گے تو اجازت سے لے لیا کرتے تھے یا مانگ لیا کرتے تھے۔

اباحت سوال کی حد : سوال کے مباح ہونے کی حد یہ ہے کہ سوال کرنے والا یہ بات جان لے کہ میں جس شخص سے سوال کر رہا ہوں اگر اسے میری ضرورت کا علم ہو جائے تو سوال کی نوبت ہی نہ آئے، اور میرے سوال کے بغیر ہی میری ضرورت پوری کر دے، ایسے شخص سے صرف سوال کرنا کافی ہے، حیاء سے حیلے سے تحریک دینے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔

سوال کے بعد اگر مسئول نے کچھ دیدیا تو مسائل کے تین احوال ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ اسے یقین ہو کہ دینے والے نے دل کی مکمل رضا سے دیا ہے، اور دوسری یہ کہ قرائن سے اس کے باطن کی ناراضگی ظاہر ہو جائے، اور یہ یقین ہو جائے کہ دینے والے نے خوف ملامت، یا شرم کی وجہ سے دیا ہے خوش ہو کر نہیں دیا، ان میں پہلی صورت جائز ہے، اور دوسری صورت حرام ہے۔ اب رہی تیسری صورت، اور وہ یہ ہے کہ اسے دینے والے کے بارے میں تردد ہو، اور یہ بات واضح نہ ہو سکی ہو کہ وہ دینے سے خوش ہے، یا ناراض، اس صورت میں اپنے دل سے فتویٰ لے، اور اس تردد سے نکلے اور دل جو فیصلہ دے اس کے مطابق عمل کرے، اگر

تردد میں مبتلا رہنا گناہ ہے۔

اب رہا یہ سوال کہ قرآن احوال سے دل کی رضامندی کیسے معلوم کی جائے، تو یہ کوئی مشکل بات نہیں ہے، اگر تمہاری عقل پختہ اور حرص کمزور ہے، اور شہوت کا داعیہ ضعیف ہے تو پآسانی صحیح کیفیت دریافت کر سکتے ہو، اور اگر اس کے برعکس معاملہ ہو کہ شہوت پختہ، حرص مضبوط اور عقل کمزور ہو تو وہی فیصلہ کر دے جو تمہاری غرض کے مطابق، اور تمہاری منشاء سے ہم آہنگ ہو گا، اور تمہاری غرض یہ ہوگی کہ مال حاصل ہو اس صورت میں تمہیں دینے والے کی ناراضگی کا علم ہو ہی نہیں سکے گا، یہ وہ باریک نکات ہیں جن سے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد مبارک کے رموز سمجھ میں آتے ہیں، ارشاد فرمایا :-

إِنَّ أَطْيَبَ مَا أَكَلَ الرَّجُلُ مِنْ كَسْبِهِ (۱)

آدی کا اپنی آمدنی میں سے کھانا کتنا عمدہ ہے۔

یہ حدیث آپ کے جو امح الکلم میں سے ہے، غور کیجئے اس میں کس قدر حکمت پوشیدہ ہے، جس شخص کے پاس اس کا کمایا ہوا مال نہیں ہوتا اور نہ ایسا مال ہوتا ہے جو اس کے باپ کی کمائی سے، یا کسی قربت دار کی آمدنی سے بطور وراثت ملا ہو، تو وہ لوگوں کے ہاتھوں کی کمائی کھاتا ہے، اگر اسے کوئی بلا طلب مال دیتا ہے تو اس کی دینداری کی وجہ سے دیتا ہے، اگر اسے معلوم ہو جائے کہ اس کا باطن ایسا نہیں ہے جیسا وہ خیال کرتا ہے تو کبھی نہ دے، اس صورت میں جو کچھ لے گا حرام ہو گا، اور اگر سوال کرنے سے ملے تو ایسا شخص کہاں ہے جو سوال کرنے پر خوش ہو کر دے۔ اور ایسا سائل کہاں ملے گا جو سوال میں حد ضرورت پر اکتفا کرے، اگر تم ان لوگوں کے حالات کی تفتیش کرو جو دوسروں کی کمائی کھاتے ہیں تو تمہیں معلوم ہو جائے کہ وہ تمام یا اکثر غذا جو ان کے جزو بدن بنتی ہے حرام ہے، حلال اور پاکیزہ تر غذا وہی ہے جسے تم یا تمہارے مورث حلال ذرائع سے حاصل کریں۔ بظاہر کھانے کے ساتھ درع و احتیاط کا اجتماع بے حد دشوار لگتا ہے، ہم اللہ تعالیٰ سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ غیر سے ہماری طمع منقطع فرمائے، اور حلال رزق عطا کر کے حرام سے دور رکھے۔

غنا کی وہ مقدار جس سے سوال حرام ہو جاتا ہے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی پہلے بھی نقل کیا جا چکا ہے، فرمایا :-

مَنْ سَأَلَ عَنْ ظَهْرِ غَنَى فَإِنَّمَا يَسْأَلُ حُمْرًا فَلْيَسْتَقْلِلْ مِنْهُ وَأَوْ يَسْتَكْثِرْ۔

جو شخص مالدار کی کے باوجود سوال کرتا ہے وہ گویا انگ کے شعلے مانگتا ہے، اب چاہے کم مانگے یا زیادہ مانگے۔

یہ حدیث سوال کی حرمت میں بالکل واضح ہے، بشرطیکہ آدی غنی ہو، یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ غنا کیا ہے، اور اس کی حد کیا ہے، لیکن ہم اس کا جواب اپنی جانب سے نہیں دے سکتے نہ یہ بات ہمارے اختیار کی ہے کہ ہم غنا کی حدود مقرر کریں اس لئے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات میں اس کا جواب تلاش کرتے ہیں، ایک حدیث میں ہے، فرمایا :-

اسْتَغْنُوا بِغَنَى اللَّهِ تَعَالَى عَنْ غَيْرِهِ قَالُوا وَمَا هُوَ قَالَ غَدَاءُ يَوْمٍ وَعِشَاءُ لَيْلَةٍ (ابو منصور دہلی - ابو ہریرہ)

اللہ تعالیٰ سے غیر سے استغناء مانگو، صحابہ نے عرض کیا استغناء کیا ہے؟ فرمایا ایک دن اور ایک رات کا کھانا۔

ایک حدیث میں یہ ارشاد فرمایا :-

عَنْ سَأَلَ وَلَهُ خُمْسُونَ دِرْهُمًا أَوْ عِثْلَاهَا مِنَ النَّهَبِ فَقَدْ سَأَلَ الْخَافَا (۲)

جو شخص بچاس درہم یا اس کے برابر سونا رکھے کے باوجود سوال کرے تو وہ پلٹ کر سوال کرتا ہے۔

ایک روایت میں خمسوں کے بجائے اربعوں ہے، روایات میں تعداد و فیو کا اختلاف مختلف اوقات پر محمول ہو سکتا ہے، تاہم ان سب سے ایک تخمینہ مقدار کا علم ہوتا ہے جس کی موجودگی میں مانگنے کو برا سمجھایا گیا ہے، بچاس اور چالیس درہم تو ایک علامت ہیں ورنہ اس سے مراد یہ ہے کہ جس کے پاس ضرورت کی چیزیں موجود ہیں اس کو سوال نہ کرنا چاہیے، یعنی اگر وہ محتاج نہ ہو تو اس کا مانگنا اچھا نہیں ہے، پھر بھی کیوں کہ حدیث شریف میں بچاس اور چالیس درہم کے الفاظ ہیں اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ اس مقدار میں کیا حکمت ہے۔ ایک حدیث میں ہے نہ

لَا حَقَّ لِابْنِ آدَمَ إِلَّا فِي ثَلَاثٍ طَعَامٌ يُقَيِّمُ صُلْبَهُ، وَتَوْبٌ يُوَارِي بِهِ عَوْرَتَهُ وَبَيْتٌ يَكْنُهُ فَمَارِادُفَهُوَ حِسَابٌ (۱)

آدی کا حق صرف تین چیزوں میں ہے، ایسے کھانے میں جو اس کی کمرید می رکھ سکے، اتنا کپڑا جو اس کا ستر ڈھانپ سکے، اور ایک گھر جس میں وہ رہ سکے، اس سے زائد کا محاسبہ ہوگا۔

اس حدیث میں تین چیزیں مذکور ہیں ہم ان تینوں کو حاجات کی اصل قرار دیتے ہیں، تاکہ حاجات کی اجتناس ذکر کریں، پھر مقادیر اور اوقات بیان کریں، جہاں تک حاجات کی اجتناس کا سوال ہے وہ یہی تین چیزیں ہیں، اور جو اس طرح کی ہیں وہ بھی ان ہی تین چیزوں کے ساتھ ملحق کر دی جائیں گی، جیسے مسافر کے لئے کرایہ بشرطیکہ وہ پیدل چلے پر قادر نہ ہو، اسی طرح کی دوسری ضروری حاجتیں بھی انہیں تین میں داخل ہوں گی، پھر آدی سے تھا ایک فرد مراد نہیں ہے بلکہ اس کا خاندان یعنی بیوی، بچے، اور وہ تمام افراد مراد ہیں جن کی کفالت کا بوجھ اس کے کندھوں پر ہے سواری کے جانور بھی اسی کے زیر کفالت تصور کئے جائیں گے۔

اب مقدار کا حال سنئے، کپڑے میں اس مقدار کو ملحوظ رکھا جائے گا جو دیندار، اور متدین حضرات کے لئے موزوں ہو، یعنی کرتا، رومال (یا ٹوپی اور ڈوپٹہ) پاجامہ اور جوتے، صرف ایک ایک عدد کافی ہیں، اس جنس کا دوسرا فرد ہونا ضروری نہیں ہے، اسی پر گھر کے دوسرے ساز و سامان کو قیاس کیا جاسکتا ہے، کپڑے میں باریک کپڑا تلاش نہ کرنا چاہیے، اسی طرح اگر مٹی کے بنے ہوئے برتن کافی ہو جائیں تو تانبے اور پتیل کے برتن غیر ضروری ہیں، گویا عدد میں ایک پر، اور نوع میں ادنیٰ جنس پر اکتفا کیا جائے گا بشرطیکہ عادت سے نہایت درجے دوری نہ ہو جائے، اب غذا کی مقدار لیجئے، ایک انسان کو شب و روز میں ایک مد یعنی ڈیڑھ پاؤ کے قریب کھانا چاہیے، شریعت میں یہی مقدار وارد ہوئی ہے، غذا کی نوع وہ ہونی چاہیے جسے کھاتے ہیں خواہ جو کی روٹی ہو، سالن کا ہونا ضروری نہیں ہے، کیوں کہ یہ حاجت سے زائد ہے، ہر کھانے کے وقت موجود ہونا بھی ضروری نہیں ہے، کیوں کہ یہ حاجت سے زائد ہے، تاہم اسے پورے طور پر چھوڑنا بھی ضرر کا باعث ہے، اس لئے اگر کبھی کبھی روٹی سالن سے کھالی جائے تو کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ مسکن کی کم سے کم مقدار یہ ہے کہ رہنے کے لئے کافی ہو، اس میں آرائش کی قید نہیں ہے، چنانچہ مکان کی آرائش یا کشادگی کے لئے دست سوال دراز کرنا زائد از حاجت سوال ہے، اور اس کی حرمت حدیث سے منصوص ہے۔

جہاں تک اوقات کا سوال ہے تو آدی کو فوری طور پر جس چیز کی ضرورت ہے وہ ایک دن ایک رات کا کھانا، ستر ڈھانچنے کے لئے لباس، اور سر چھپانے کے لئے ٹھکانا ہے، اور اس ضرورت میں کوئی شک نہیں ہو سکتا، اب اگر کوئی شخص مستقبل کے لئے سوال کرتا ہے تو اس کے تین درجے ہیں ایک تو یہ کہ اس چیز کا سوال کرے جس کا وہ آنے والے کل میں محتاج ہے، دوسرا یہ کہ وہ چیز مانگے جس کا وہ چالیس بچاس دن میں محتاج ہو گا تیسرا یہ کہ اس چیز کا سوال کرے جس کی ضرورت سال بھر میں پیش آئے گی۔ یہاں قطعی طور پر یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ جس شخص کے پاس اس قدر مال ہے کہ اسے اور اس کے افراد خاندان کو ایک برس کے

لئے کافی ہو تو اس کے لئے سوال کرنا جائز نہیں ہے، کیوں کہ یہ انتہائی درجے کا غنا ہے، حدیث میں پچاس درہم کی مقدار سے بھی غنا مراد ہے، چنانچہ تنہا آدمی کے لئے غنا پچاس درہم بعض پانچ و تار پورے سال کفایت کر جائیں گے، عیالدار آدمی شاید اس مقدار میں گذر نہ کر پائے، اب اگر کسی کے پاس اتنا مال ہے کہ سال گذرنے سے پہلے ہی سوال کرنے کی ضرورت پیش آسکتی ہے تو دیکھنا چاہیے کہ وہ شخص اس وقت سوال کر سکتا ہے یا نہیں جس وقت ضرورت پیش آئے گی، اگر اس وقت سوال کا موقع اور گنجائش ہے تو اس وقت سوال نہ کرے کیوں کہ اس وقت وہ اس سے مستثنیٰ ہے اور کل کے متعلق اسے معلوم نہیں کہ وہ زندہ بھی رہے گا یا نہیں، اگر وہ سوال کرے گا تو اس کا سوال ایسی چیز کے متعلق ہو گا جس کا وہ محتاج نہیں ہے، گویا اس کے پاس اگر ایک دن رات کی غذا موجود ہے تو بہت کافی ہے، ایک حدیث میں غنا کی مقدار ایک دن رات کی غذا بھی بیان کی گئی ہے، اور اگر وہ سائل ایسا ہے کہ اسے پھر سوال کرنے کا موقع نہیں ملے گا تو اس صورت میں اس کے لئے سوال کرنا مباح ہے، کیوں کہ ایک سال تک زندہ رہنے کی توقع کرنا خلاف عقل نہیں ہے، اور سوال نہ کرنے سے یہ اندیشہ ہے کہ مضطر اور عاجز رہ جائے گا، کوئی اعانت کرنے والا نہیں ملے گا، اگر مستقبل میں سوال سے عاجز رہ جانے کا خوف ضعیف ہو، اور جس چیز کا سوال کر رہا ہو وہ محل ضرورت سے خارج ہو تو سوال کرنا کراہیت سے خالی نہیں ہو گا، اور کراہت قوت و ضعف میں اسی قدر کم و بیش ہوگی جس قدر اضطراب کا خوف، موقع سوال کے فوت ہونے کا ڈر، اور زمانہ سوال میں تاخیر کم و بیش ہوگی۔ یہ تمام باتیں تحریر میں درج نہیں کی جاسکتیں، بلکہ ان امور میں بندے کو خود اپنے قیاس پر عمل کرنا چاہیے، یعنی اپنے نفس کا جائزہ لے اور یہ دیکھے کہ اس کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان کیا معاملہ ہے، دل سے فتویٰ لے اور اس کے مطابق عمل کرے، بشرطیکہ اس کی منزل آخرت ہو، جس شخص کا یقین قوی ہوتا ہے اور وہ مستقبل میں اللہ کے رزق کی آمد پر پختہ اعتماد رکھتا ہے، اور ایک وقت کی غذا پر قناعت کا حوصلہ رکھتا ہے اس کا درجہ اللہ تعالیٰ کے یہاں انتہائی بلند ہے، وہ مستقبل کے خوف سے پریشان نہیں ہوتا، اگر تم اپنے لئے، اور اپنے اہل و عیال کے لئے ایک وقت کا رزق رکھنے کے باوجود دوسرے وقت کے لئے پریشان ہو تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ تمہارا یقین کمزور ہے، اور شیطان تم پر حادی ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :-

فَلَا تَخَافُوهُمْ وَخَافُواْ اِن كُنْتُمْ مُّؤْمِنِينَ۔ (پ ۳۴ آیت ۱۷۵)

سو تم ان سے مت ڈرنا اور مجھ ہی سے ڈرنا اگر ایمان والے ہو۔

الشَّيْطَانُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَأْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَاءِ وَاللّٰهُ يَعِدُكُم مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَقَضَاءً۔

(پ ۵۳ آیت ۲۶۸)

شیطان تم کو فقر سے ڈراتا ہے، اور تم کو بری بات (بخل) کا مشورہ دیتا ہے، اور اللہ تم سے وعدہ کرتا ہے اور اپنی

طرف سے گناہ معاف کر دینے کا اور زیادہ دیتے گا۔

سوال فشاء ہے، ایک برائی ہے، جسے صرف ضرورت کے لئے مباح قرار دیا گیا ہے، جو شخص اپنی کسی ایسی ضرورت کے لئے سوال کرے جو اس روز نہ رکھتا ہو، بلکہ سال بھر کے اندر کسی وقت اس کی ضرورت پیش آسکتی ہے اس کا حال اس شخص سے بھی بدتر ہے جو مال موروث کا مالک بنے اور اسے سال بھر کی ضرورتوں کے لئے ذخیرہ کر لے، اگرچہ یہ دونوں باتیں ظاہر شریعت کے فتویٰ کے رو سے صحیح ہیں، لیکن ان سے دنیا کی محبت، اور طول آرزو کا پتا چلتا ہے، اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں کو اللہ کے فضل پر اعتماد نہیں ہے، اور یہ خصلت ملکات میں سرفہرست ہے۔ ہم اللہ سے حسن توفیق کے خواہاں ہیں۔

سائلین کے احوال حضرت بشر فرماتے ہیں کہ فقراء تین طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ فقیر ہے جو سوال نہیں کرتا اور اگر اسے کچھ دیا جائے تو قبول نہیں کرتا، یہ شخص عیالین میں روحانیت والوں کے ساتھ ہوگا، دوسرا فقیر وہ ہے جو سوال تو نہیں کرتا لیکن اگر کوئی شخص اسے کچھ دیتا ہے تو لے لیتا ہے، یہ شخص مقربین کے ساتھ جنات الفردوس میں ہوگا، تیسرا فقیر وہ ہے جو ضرورت کے

وقت سوال کرتا ہے یہ شخص اصحاب یمن میں سے صادقین کے ساتھ ہو گا، تمام بزرگوں کا اتفاق اس پر ہے کہ سوال کرنا مذموم ہے، اور یہ کہ فائق کے ساتھ مرتبہ اور درجہ کم ہو جاتا ہے، شقیق بلخی نے ابراہیم ابن ادہم سے جب وہ خراسان سے تشریف لائے دریافت کیا کہ تم نے اپنے ساتھی فقراء کو کس حال پر چھوڑا، انہوں نے کہا میں نے انہیں اس حال پر چھوڑا کہ جب انہیں کوئی شخص کچھ دیتا ہے تو شکر کرتے ہیں اور نہیں دیتا تو صبر کرتے ہیں۔ شقیق بلخی نے گویا یہ بات اپنے رفقاء کی تعریف میں کہی، اور یہ ہے بھی کہ ایک قابل تعریف وصف کہ وہ سوال سے گریز کرتے ہیں، اور شکر و صبر سے کام لیتے ہیں، شقیق نے کہا تم نے بلخ کے کتوں کو ہمارے لئے اس طرح چھوڑا ہے، ابراہیم نے ان سے دریافت کیا کہ آپ کے یہاں فقراء کا کیا حال ہے، انہوں نے جواب دیا ہمارے فقراء تو ایسے ہیں کہ اگر انہیں کوئی کچھ نہیں دیتا تو وہ شکر کرتے ہیں اور دیتا ہے تو اپنی ذات پر دو سروں کو ترجیح دیتے ہیں، یہ سن کر حضرت ابراہیم ابن ادہم نے ان کے سر کو بوسہ دیا اور عرض کیا کہ استاذ محترم آپ سچ کہتے ہیں فقراء کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔

ارباب احوال کے مختلف احوال رضا، صبر، شکر اور سوال وغیرہ کے باب میں ارباب احوال کے بہت سے درجات ہیں، راہ آخرت کے سالک کو ان تمام درجات کی معرفت حاصل کرنی چاہیے، اور ان درجات کی مختلف قسموں کا علم حاصل کرنا چاہیے، اگر اسے ان امور کی معرفت نہیں ہے تو وہ کبھی پستی سے بلندی تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا، انسان کو پہلے احسن تقویم میں پیدا کیا گیا، پھر اسفل سافلین میں اتارا گیا، اس کے بعد اسے حکم دیا گیا کہ وہ اعلا علیین تک ترقی کرے، جو شخص پستی اور بلندی میں تمیز نہیں کر سکتا وہ کسی بھی طرح بلندی تک نہیں پہنچ سکتا، بلکہ یہاں تو وہ لوگ بھی نیچے رہ جاتے ہیں جو ان درجات کی معرفت رکھتے ہیں، اور مسائل سلوک پر ان کی گہری نظر ہوتی ہے۔ ارباب احوال کے حالات مختلف ہیں، بعض اوقات ان پر ایسی حالت غالب ہوتی ہے جس کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ سوال کرنا ان کے درجات میں ترقی کا باعث ہو، اصل میں اس کا مدار نیوٹوں پر ہوتا ہے، چنانچہ ایک بزرگ نے حضرت ابو اسحاق نوریؒ کو دیکھا کہ وہ بعض مواقع پر لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلا دیتے ہیں، وہ بزرگ کہتے ہیں کہ مجھے ان کی یہ حرکت پسند نہیں آئی، اور میں نے اسے بہت زیادہ برا سمجھا، ایک مرتبہ میں حضرت جنیدؒ کی خدمت میں حاضر ہوا تو میں نے یہ قصہ ان کے سامنے بھی رکھا، حضرت جنیدؒ نے فرمایا تم نوریؒ کی اس بات کو برا مت جانو، وہ لوگوں کے سامنے اس لئے ہاتھ نہیں پھیلاتے کہ انہیں کچھ ملے بلکہ اس لئے ہاتھ پھیلاتے ہیں کہ ان کی وجہ سے دینے والوں کو اجر و ثواب مل جائے، سر کا وہ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشاد گرامی میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا :-

يَدُ الْمُعْطَى هِيَ الْعُلْيَا۔ (مسلم۔ ابو ہریرہؓ) دینے والے کا ہاتھ بلند ہے۔

اس حدیث میں معطی سے بعض لوگوں نے وہ شخص مراد نہیں لیا ہے جو مال دیتا ہے، بلکہ لینے والا مراد لیا ہے، اور کہا ہے کہ اگرچہ وہ ظاہر میں لینے والا ہے، لیکن حقیقت میں اجر و ثواب میں دینے والا ہے، ظاہر میں اس کا ہاتھ نیچے ہے، لیکن حقیقت میں اس کا ہاتھ اوپر ہے، اعتبار ثواب کا ہے، مال کا نہیں۔ اتنا کہنے کے بعد حضرت جنیدؒ نے ترازو منکوائی، اور جب ترازو آگئی تو آپ نے سو درہم تولے، اور ان میں کچھ درہم بغیر تولے ملا دیے، اور مجھ سے فرمایا کہ یہ درہم نوریؒ کے پاس لے جاؤ، اور انہیں دیدو، میں دل میں سوچ رہا تھا کہ انہوں نے سو درہم تولے ہیں، اور اس طرح مقدار معین کی ہے، لیکن پھر اس میں کچھ درہم بغیر تولے ملا دیے۔ حضرت جنیدؒ حکیم ہیں، اور ان کا یہ عمل بھی حکمت سے خالی نہ ہو گا، مجھے اس سے پوچھتے ہوئے شرم محسوس ہوئی، اس لئے میں وہ درہم لے کر حضرت نوریؒ کی خدمت میں پہنچا، انہوں نے فرمایا ترازو لاؤ، میں نے ترازو پیش کر دی، انہوں نے سو درہم وزن کر کے علیحدہ کئے، اور فرمایا یہ واپس لے جاؤ، ان سے کہہ دینا کہ میں تم سے کچھ لینا نہیں چاہتا، جو درہم سو سے زائد تھے وہ رکھ لیتا ہو، راوی کہتے ہیں مجھے نوریؒ کی یہ بات سن کر بڑا تعجب ہوا، اور عرض کیا کہ مجھے بتائیں کہ اس میں کیا مصلحت ہے، فرمایا جنیدؒ ایک مرد وانا ہے وہ رستی کو دو دونوں سروں سے پکڑنا چاہتا ہے، اس نے سو درہم اس لئے تولے تھے کہ وہ ان سے آخرت کا ثواب اپنے لئے چاہتا تھا، اور بلا وزن درہم اس نے اللہ کے لئے ڈالے تھے، سو میں نے اس کے درہم واپس کر دیے، اور جو درہم اللہ کے لئے تھے وہ رکھ

لئے چنانچہ میں وہ درہم حضرت جنیدؒ کے پاس لے آیا، آپ واپس شدہ درہم دیکھ کر رونے لگے، اور فرمایا اپنے درہم لے لے اور ہمارے واپس کر دیے۔

ان واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان بزرگوں کے قلوب صاف تھے، اور احوال اللہ کے لئے خاص تھے، یہی وجہ ہے کہ وہ حضرات کسی کٹنگو اور اٹھار کے بغیر ہی ایک دو سرے کے اسرار پر مطلع ہو جاتے تھے، یہ نتیجہ تھا اس بات کا کہ وہ لوگ حلال غذا کی طرف متوجہ رہتے تھے، جو شخص اس راہ میں قدم رکھے بغیر ان حقائق کا انکار کرے وہ جاہل محض ہے، اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص مسهل شربت پینے سے پہلے ہی یہ فیصلہ کر دے کہ یہ شربت مسهل نہیں ہے، بعض لوگ طویل مجاہدہ کے بعد بھی اس منزل تک نہیں پہنچ پاتے یہ لوگ بھی ان امور میں انکار ہی کرتے نظر آتے ہیں، ان کی مثال ایسی ہے جیسے کسی شخص کو مسهل دوا دی جائے اور وہ استعمال بھی کر لے، لیکن کسی اندرونی بیماری کے باعث وہ دوا اس کے حق میں مفید ثابت نہ ہو، اس صورت میں وہ یہ کہنے لگے کہ دوا مسهل نہیں ہے یہ شخص اگرچہ جمالت میں پہلے شخص سے کم ہے، لیکن ایسا بھی نہیں کہ اسے جمالت سے خالی کہا جاسکے، بلکہ صاحب بصیرت ان دو شخصوں میں سے ایک ہے، ایک وہ جو سلوک کا راستہ طے کرے اور اس پر وہ باتیں ظاہر ہوں جو ان بزرگوں پر ظاہر ہوئی تھیں، یہ شخص صاحب ذوق و معرفت ہے، اور عین یقین کے درجے کو پہنچا ہوا ہے، دوسرا شخص وہ ہے جو راہ تو نہیں چلا، یا چلا تو ہے مگر منزل تک نہیں پہنچا، لیکن اس منزل کا یقین رکھتا ہے اور اس مرتبے کی تصدیق کرتا ہے جس پر وہ حضرات پہنچتے ہیں، یہ شخص صاحب علم یقین ہے، اور اگرچہ عین یقین تک نہیں پہنچ سکا، مگر علم یقین کا بھی ایک مرتبہ ہے اگرچہ وہ عین یقین سے کم ہے، جو شخص عین یقین اور علم یقین دونوں سے محروم ہے وہ مومنین کے زمرے سے خارج ہے، قیامت کے روز اس کا حشر منکر متکبرین کے ساتھ ہو گا، ان کے دل مروہ ہیں، اور شیطان کے تابع ہیں، ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ ہمیں ان لوگوں میں سے کر دے جو علم میں رسوخ رکھتے ہیں اور یہ کہتے ہیں :-

أَمَّنَابِهِ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا أُولُو الْأَلْبَابِ (پ ۳۹ آیت ۷)

ہم اس پر یقین رکھتے ہیں (یہ) سب ہمارے پروردگار کی طرف سے ہیں اور صحت وہی لوگ قبول کرتے ہیں جو اہل عقل ہیں۔

زہد کا بیان

زہد کی حقیقت : جاننا چاہیے کہ زہد سا لکین کے مقامات میں سے ایک اہم مقام ہے، اور یہ مقام بھی، دوسرے مقامات کی طرح، علم، حال اور عمل سے ترتیب پاتا ہے، اس لئے کہ سلف کے قول کے مطابق ایمان کے تمام ابواب عقد، قول، اور عمل ہی کی طرف راجع ہیں، یہاں حال کی جگہ قول رکھا گیا ہے، کیوں کہ یہ ظاہر ہوتا ہے، اور اس سے باطن کا حال منکشف ہو جاتا ہے، ورنہ قول خود مقصود بالذات نہیں ہے، اور اگر قول حال کے ساتھ صادر نہ ہو یعنی باطن سے نہ ہو تو اسے اسلام کہتے ہیں ایمان نہیں کہتے، علم حال کا سبب ہوتا ہے، یعنی حال اس کا ثمر ہوتا ہے، اور حال کا ثمر عمل ہوتا ہے، گویا حال کی دو طرف ہیں، ایک طرف علم اور دوسری طرف عمل ہے۔

حال کے معنی حال سے مراد وہ کیفیت ہے جسے زہد کہتے ہیں، اور زہد کے معنی یہ ہیں کہ کسی چیز سے رغبت باقی نہ رہے، اور کسی ایسی چیز میں ہو جائے جو اس سے بہتر ہو، ایک شے سے رغبت ختم کر کے دوسری شے کی طرف راغب ہونے کا عمل کبھی معاوضہ سے ہوتا ہے اور کبھی بیع و فیو کے ذریعے، جس چیز سے آدمی رغبت ختم کرتا ہے اس سے منہ پھیر لیتا ہے، اور جس چیز میں خواہش رکھتا ہے اس کی طرف راغب ہوتا ہے، اس شے کے اعتبار سے جس سے اس نے انحراف کیا ہے اس کے حال کو زہد کہیں گے، اور اس شے کی نسبت سے جس کی طرف وہ راغب ہوا ہے اس کے حال کو محبت کہیں گے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ زہد کے لئے دو چیزوں کی ضرورت ہے، ایک اس چیز کی جس سے انحراف کیا جائے، اور دوسری اس چیز کی جس کی طرف رغبت کی جائے، اور یہ

بھی ضروری ہے کہ جس چیز سے رغبت ختم کی جائے وہ اس لائق ہو کہ اس کی رغبت کی جائے چنانچہ اس شخص کو زاہد نہیں کہہ سکتے جو غیر مطلوب شئی سے منحرف ہو جیسے اینٹ پتھر سے انحراف کرنے کو زہد نہیں کہہ سکتے زاہد صرف وہ ہو گا جو درہم و دینار کا تارک ہو اینٹ پتھر کی طرف رغبت ہو ہی نہیں سکتی۔ یہاں یہ بھی ضروری ہے کہ دوسری چیز پہلی سے بہتر ہو تاکہ رغبت غالب ہو سکے چنانچہ بائع اس وقت تک بیع پر راضی نہیں ہوتا جب تک مشتری (قیمت) بیع (فروخت کی جانے والی چیز) سے بہتر نہ ہو اس طرح بیع کے تعلق سے بائع کی حالت کو زہد کہہ سکتے ہیں اور بیع کے عوض کی نسبت سے رغبت اور محبت کہہ سکتے ہیں۔ اسی لئے قرآن حکیم میں ارشاد فرمایا گیا ہے :-

وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ دَرَاهِمَ مَعْلُودَةٍ وَكَانُوا فِيهِ مِنَ الزَّاهِدِينَ۔ (پ ۲۳ آیت ۲۰)

اور ان کو بہت ہی کم قیمت میں فروخت کر ڈالا اور وہ لوگ ان میں زہد کرنے والوں میں سے تھے۔

اس آیت میں لفظ شرأ کا اطلاق بیع پر ہوا ہے قرآن کریم نے اس آیت کریمہ کے ذریعے حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کا حال بیان کیا ہے کہ انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام میں زہد کیا تھا یعنی یہ طبع کی تھی کہ یوسف کہیں چلے جائیں اور انہیں ان کے والد کی تمام توجہات حاصل ہو جائیں ان لوگوں کو یوسف سے زیادہ باپ کی توجہ میں دل چسپی تھی اسی عوض کی طبع میں انہوں نے یوسف کو چند سکوت میں فروخت کر ڈالا۔ اس تعریف سے معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص دنیا کو آخرت کے عوض فروخت کر دے وہ دنیا کا زاہد ہے اور جو شخص آخرت کے عوض دنیا خرید لے وہ بھی زاہد ہے مگر دنیا کا لیکن عادتاً زہد کا لفظ صرف اس شخص کے ساتھ مخصوص ہے جو دنیا میں زہد کرتا ہے جیسے الحاد کا لفظ اس شخص کے ساتھ خاص ہے جو باطل کی طرف مائل ہو اگرچہ لغت میں مطلق میلان کو زہد کہتے ہیں جب یہ بات ثابت ہوئی کہ زہد محبوب کو چھوڑنا ہے تو یہ بات خود بخود ثابت ہوتی ہے کہ چھوڑنے والے کو اس محبوب سے بھی زیادہ دل پسند چیز حاصل ہوتی ہے ورنہ یہ بات کیسے ممکن تھی کہ وہ محبوب ترک کرے بغیر محبوب کو ترک کر دیتا۔

زاہد کے مختلف درجات جو شخص اللہ تعالیٰ کے سوا ہر چیز سے کنارہ کش ہے یہاں تک کہ اسے جنات الفردوس کی بھی طمع نہیں ہے وہ صرف اللہ تعالیٰ سے محبت کرتا ہے ایسے شخص کو زاہد مطلق کہا جائے گا اور جو شخص دنیا کی ہر لذت سے کنارہ کش رہتا ہے لیکن آخرت کے لذائذ میں رغبت رکھتا ہے یعنی حور، قصور، نسوں اور میوؤں کی طمع کرتا ہے ایسا شخص بھی زاہد ہے لیکن اس کا درجہ پہلے کے مقابلے میں کم ہے اور جو شخص دنیا کی بعض لذتیں ترک کرتا ہے بعض نہیں کرتا مثلاً مال کی طمع نہیں کرتا جاہ کی حرص کرتا ہے یا کھانے میں توسع نہیں کرتا بلکہ نسیب و نسیبت خوب کرتا ہے ایسا شخص مطلق زاہد کہلائے گا مستحق نہیں ہے زاہدین میں اس کا درجہ ایسا ہے جیسے تائبین میں اس شخص کا درجہ جو بعض معاصی سے توبہ کر لے اور بعض سے نہ کرے یہ زہد بھی صحیح ہے جیسے بعض معاصی سے توبہ صحیح ہے اس لئے کہ توبہ کے معنی ہیں محظورات ترک کرنا اور زہد کے معنی ہیں وہ مباحات ترک کرنا جن سے نفس حظ پاتا ہے جس طرح یہ بات بعید از قیاس نہیں کہ آدمی بعض ممنوعہ امور چھوڑ دے اسی طرح یہ بھی خلاف عقل نہیں ہے کہ وہ بعض مباحات ترک کر دے البتہ صرف محظورات پر اکتفا کرنے والے کو زاہد نہیں کہا جاسکتا اگرچہ اس نے محظورات میں زہد کیا ہے اور ان سے انحراف کیا ہے لیکن عادتاً یہ لفظ ترک مباحات کے ساتھ مخصوص ہے اس سے معلوم ہوا کہ اصطلاح میں زہد کے معنی ہیں دنیا سے رغبت ہٹا کر آخرت کی طرف مائل ہونا یا غیر اللہ سے تعلق منقطع کر کے اللہ سے تعلق قائم کرنا یہ درجہ بہت بلند ہے۔

ہم نے پہلے کہیں یہ بات لکھی ہے کہ جس چیز کی طرف رغبت کی جائے وہ زاہد کے نزدیک اس چیز سے بہتر ہو جس سے رغبت ختم کی گئی ہے اسی طرح یہ بات بھی ضروری ہے کہ جس چیز سے رغبت منقطع کی جائے اس پر زاہد کو قدرت بھی ہو اس لئے کہ جس چیز پر قدرت ہی نہ ہو اسے چھوڑنے کے کوئی معنی ہی نہیں ہیں اور رغبت کا زوال اسی وقت ہوتا ہے جب کوئی چیز چھوڑی جائے۔ ابن المبارک کو کسی نے زاہد کہہ کر مخاطب کیا آپ نے ارشاد فرمایا زاہد تو عمر ابن عبد العزیز ہیں کہ ان کے پاس دنیا دست بستہ آئی مگر انہوں نے اس کی طرف رخ بھی نہیں کیا مہلا میں نے کس چیز میں زہد کیا ہے۔

علم کے معنی علم جو حال کا سبب ہے، اور حال جس کا ثبوت وہ یہ ہے کہ زاہد اس حقیقت سے واقف ہو کہ جو چیز ترک کی جا رہی ہے وہ اس چیز کے مقابلے میں جس کی رغبت کی جا رہی ہے، جیسے تاجر یہ بات جانتا ہے کہ بیچ کی بہ نسبت عوض بہتر ہے، یہی جاننے کے بعد وہ بیچ میں دل جمعی لیتا ہے، اگر اسے تحقیق سے یہ بات معلوم نہ ہو تو یہ تصور ہی نہیں کیا جاسکتا کہ وہ بیچ سے دست بردار ہو جائے گا اسی طرح جو شخص یہ جان لیتا ہے کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ کے پاس ہے وہ باقی رہنے والا ہے، یہ کہ آخرت بہتر اور پائدار ہے، یعنی اس کی لذتیں اپنی ذات سے عمدہ ہیں، اور باقی رہنے والی ہیں جیسے جواہر عمدہ ہوتے ہیں اور برف کے خوبصورت ٹکڑوں کے مقابلے میں پائدار ہوتے ہیں، اور برف کے مالک کے لئے یہ بات مشکل نہیں ہے کہ وہ جواہر اور لالی کے عوض برف کے ٹکڑے فروخت کر ڈالے، مطلب یہ ہے کہ اگر اسے یہ پیش کش کی جائے کہ وہ جواہر قبول کر لے اور برف کے ٹکڑے دیدے تو وہ بخوشی تیار ہو جائے گا، دنیا اور آخرت کی یہی مثال ہے، دنیا اس برف کی طرح ہے جو دھوپ میں رکھا ہوا ہو، اور پگھل پگھل کر ختم ہونے کے قریب ہو، اور آخرت اس جوہر کی طرح ہے جسے فنا نہیں ہے، جو شخص جس قدر دنیا و آخرت میں اس فرق کی حقیقت سے واقف ہے وہ اسی قدر بیچ اور معاملات میں رغبت رکھتا ہے، یہاں تک کہ جو شخص اس آیت کے مطابق اپنے مال اور نفس کو فروخت کرنے پر یقین رکھتا ہے :-

إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنْ الْمُؤْمِنِينَ أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِأَنْ لَهُمُ الْجَنَّةَ (پ ۱۱ ر ۳ آیت ۱۱)

بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے ان کی جانوں اور مالوں کو اس بات کے عوض خرید لیا ہے کہ ان کو جنت ملے گی۔

اسے یہ خوشخبری سنا دی گئی ہے :- فَاسْتَبْشِرُوا بِبَيْعِكُمُ الَّذِي بَايَعْتُمْ بِهِ (پ ۱۱ ر ۳ آیت ۱۱)

تو تم لوگ اپنی اس بیچ پر جس کا تم نے اس سے معاملہ ٹھہرایا ہے خوشی مناد۔

زہد میں علم کی اسی قدر ضرورت ہے، یعنی یہ بات جان لینا کافی ہے کہ آخرت بہتر اور پائدار رہنے والی ہے، بعض اوقات اس حقیقت سے وہ لوگ بھی واقف ہوتے ہیں جو اپنے علم و یقین کے ضعف، یا غلبہ شہوت کے باعث، یا شیطان کے ہاتھوں مغمور ہوتے، اور اس کے وعدوں سے فریب کھانے کی بنا پر دنیا چھوڑنے پر قادر نہیں ہوتے، یہ لوگ شیطان کے دیے ہوئے مغاللوں میں رہتے ہیں یہاں تک کہ موت انہیں اچک لیتی ہے، اور پھر اس کے علاوہ کوئی راستہ باقی نہیں رہتا کہ حسرت کریں، اور جو کچھ کھو چکے ہیں اس پر ماتم کریں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں جا بجا دنیا کی حقارت بیان فرمائی ہے، ارشاد فرمایا :-

قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيلٌ (پ ۵ ر ۷ آیت ۷)

آپ فرمادیجئے کہ دنیا کا متاع محض چند روزہ ہے۔

اور آخرت کی بہتری پر اس آیت کریمہ میں اشارہ فرمایا گیا ہے :-

وَقَالَ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ وَيُؤْتِكُمْ ثَوَابُ اللَّهِ خَيْرٌ (پ ۲۰ ر ۸ آیت ۸)

اور جن لوگوں کو فہم عطا ہوئی تھی وہ کہنے لگے اے تمہارا ناس ہو اللہ تعالیٰ کے گھر کا ثواب ہزار درجہ بہتر ہے۔

اس آیت میں اس حقیقت پر تنبیہ کی گئی ہے کہ جسے آخرت کی حمد کی کا علم ہوتا ہے اس کا دل اس کے عوض سے منحرف ہوتا ہے کیوں کہ زہد کا تصور اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ محبوب تر چیز محبوب کا عوض نہ بنے، چنانچہ روایات میں ہے کہ ایک صحابی یہ دعا کیا کرتے تھے :-

اللَّهُمَّ ارْزِنِي الدُّنْيَا كَمَا تَرَاهَا۔ اے اللہ! میرے نزدیک دنیا ایسی کر دے جیسی تیرے نزدیک ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے ارشاد فرمایا :-

لَا تَقُلْ هَكَذَا وَلَكِنْ قُلْ ارْزِنِي الدُّنْيَا كَمَا ارْتَبْتُهَا الصَّالِحِينَ مِنْ عِبَادِكَ

(صاحب القردوس۔ ابوالقاسم)

ایسا مت کہو، بلکہ اس طرح کہو کہ مجھے دنیا اس طرح دکھا جس طرح تو اپنے نیک بندوں کو دکھاتا ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ دنیا کو ایسی سمجھتا ہے جیسی وہ حقیقت میں ہے، ہر مخلوق اس کی عظمت کے مقابلے میں حقیر ہے، اور بندہ اسے اس شے کی بہ نسبت حقیر سمجھتا ہے جو اس سے بہتر ہے چنانچہ اگر گھوڑے بیچنے والے کو گھوڑے میں رغبت نہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ گھوڑوں کو حشرات الارض کی طرح حقیر سمجھتا ہے، یہ شخص اگرچہ حشرات الارض سے مستغنی ہے، لیکن گھوڑوں سے مستغنی نہیں ہو سکتا، اور اللہ تعالیٰ بذاتہ ہر چیز سے بے نیاز ہے اس لئے اپنی عظمت کے مقابلے میں سب کو ایک ہی درجے میں رکھتا ہے، اگرچہ ایک دوسرے کی بہ نسبت ان میں تفاوت ہو، زاہد وہی ہے جو اشیاء کا تفاوت اپنے نفس کے اعتبار سے جانتا ہو، نہ کہ دوسرے کے اعتبار سے۔

عمل کے معنی اب وہ عمل بیان کیا جاتا ہے جو زہد کی حالت سے صادر ہوتا ہے، اس عمل کا حاصل ایک چیز کو چھوڑنا ہے، اور ایک چیز کو اختیار کرنا ہے جو چھوڑی ہوئی چیز کے مقابلے میں بہتر ہے، زہد دراصل جمع اور معاملات کی ایک صورت ہے، جس طرح اس عمل کے معنی جو عقد بیع سے صادر ہو یہ ہیں کہ بیع ترک کر دی جائے، اور اسے اپنے قبضے سے نکال دیا جائے، اور اس کا عوض لے لیا جائے، اسی طرح زہد کا تقاضا یہ ہے کہ جس چیز میں زہد کیا جائے، اسے بالکل طور پر ترک کر دیا جائے، اور وہ چیز جس میں زہد کرنا چاہیے دنیا ہے اپنے تمام تر اسباب، مقدمات اور علامات سمیت، زاہد کو اس دنیا کی محبت اپنے دل سے نکال دینی چاہیے اور اس کی جگہ طاعات کی محبت داخل کرنی چاہیے، پھر جو چیز دل سے نکالے وہی چیز آگے، ہاتھ اور باقی تمام اعضاء سے نکال دے، اور ان تمام اعضاء کے ذریعہ اطاعت پر موانعت کرے، محض دنیا کی محبت نکالنا کافی نہیں ہے، بلکہ اطاعت بھی ضروری ہے، ورنہ اس بیع کو بیع مسلم کہیں گے جس میں بیع دیدی جاتی ہے، اور ثمن نہیں لیا جاتا۔ اگر جانیں سے لین دین کی تمام شرائط مکمل ہو جائیں تو عاقد کو اس بات پر خوش ہونا چاہیے کہ اس نے نفع کا معاملہ کیا ہے۔ یہاں زہد کے باب میں اگرچہ بیع مسلم کی صورت ہے لیکن جس ذات سے معاملہ ہے وہ اپنے عہد کا نیک اور وعدے کا سچا ہے، اور دینے پر قادر ہے، اس لئے معاملہ کرنے والے کو مطمئن ہو کر معاملہ کرنا چاہیے اور سمجھنا چاہیے کہ ثمن قبضے میں آچکا ہے، جیسے دنیاوی کاروبار میں ایک فریق دوسرے فریق کی دیانت اور راستی پر اعتماد کرتے ہوئے مال دیتا ہے، اور ثمن کی پروا نہیں کرتا، وہ یہ سمجھتا ہے کہ ثمن اس سے قریب ہے، جب چاہے گا اپنے قبضے میں لے لے گا، جب دنیاوی معاملات میں باہمی اعتماد اور اس سے حاصل ہونے والے منافع کا یہ حال ہے تو اس تجارت کے نفع میں کیسے شبہ ہو سکتا ہے جسے زہد کہتے ہیں۔

یہاں اس حقیقت کی وضاحت ضروری ہے کہ جو شخص دنیا کو اپنے پاس رکھے گا وہ کبھی زہد کی صفت سے متصف نہیں ہو سکے گا، چنانچہ برادران یوسف کے قصے میں اللہ تعالیٰ نے انہیں صرف حضرت یوسف علیہ السلام کے سلسلے میں زاہد کہا، ان کے بھائی ابن یامین کے باب میں زاہد نہیں کہا، حالانکہ جس طرح وہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو حضرت یوسف علیہ السلام کی قربت سے محروم کرنا چاہتے تھے اسی طرح وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ بن یامین بھی دور چلے جائیں، لیکن انہوں نے صرف حضرت یوسف علیہ السلام کی دوری پر اتفاق کیا، اور اکثریت کی خواہش کے باوجود بن یامین کو دور نہ کر سکے، اس لئے ان کے باب میں زاہد نہیں کہلائے، اسی طرح وہ لوگ اس وقت کے زہد کے وصف سے متصف نہیں ہوئے، جب انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو نکالنے کا ارادہ کیا تھا، بلکہ جب نکال چکے تب ان پر زاہدین کا اطلاق ہوا، اسی طرح دنیا کا زہد بھی ہے، اگر تمہارے پاس دنیا ہے تو تم زاہد نہیں ہو، اور اگر دنیا فروخت کر چکے ہو تو زاہد ہو، اس سے معلوم ہوا کہ رغبت کی علامت روکنا ہے، اور زہد کی علامت نکالنا ہے۔ اگر تم نے دنیا کی بعض چیزیں نکال دیں اور بعض روک لیں تو تم ان بعض چیزوں میں زاہد کہلاؤ گے جو تم نے نکالی ہیں، مطلق زاہد نہیں کہلاؤ گے، اسی طرح اگر تمہارے پاس مال نہیں ہے، اور دنیا تمہاری ہمنوا نہیں ہے تو تم زاہد نہیں کہلا سکتے، اس لئے کہ جس چیز پر تمہیں قدرت نہیں تم اس کے ترک پر بھی قادر نہیں ہو، تمہیں شیطان اس فریب میں مبتلا کر سکتا ہے کہ اگرچہ تمہارے پاس دنیا نہیں ہے اس کے باوجود تم زاہد ہو۔ یہ ایک شیطانی دوسرہ ہے، اور اس کا خوب صورت فریب ہے، تمہیں اس فریب میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے

زہد میں اصل چیز قدرت کا امتحان ہے، جب ہمیں قدرت ہی نہیں ہے تو اس کا امتحان کیا دو گے، بہت سے لوگ ایسے ہیں جو معاصی کو اس وقت تک برا سمجھتے ہیں جب تک وہ ان کی دسترس میں نہیں ہوتے، اور جب ان کے اسباب مہیا ہو جاتے ہیں، اور کسی کا خوف یا ڈر، یا تنہا میں رہنا تو گناہوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں، جب گناہوں میں اس فریب کا شکار ہوتے ہیں تو مباحات میں ان کے وعدوں کا اعتبار کیسے کیا جاسکتا ہے۔ نفس پر صرف اس صورت میں اعتماد کیا جاسکتا ہے جب وہ بار بار تجربات کی بھٹی سے گزر کر کنکرن بن جائے، پہلے اسے مباحات پر قدرت دو، پھر دیکھو کہ وہ ترک کرتا ہے یا نہیں، اگر ترک کر دیتا ہے، اور ہر بار قدرت ملنے پر ترک کرتا ہی اس کی عادت بن جاتا ہے تو اس پر کچھ اعتماد کر لو، لیکن اس کے بدلنے سے ڈرتے بھی رہو، اس لئے کہ یہ بہت جلد عود شکنی کر بیٹھتا ہے، اور طبیعت کے مستغنی کی طرف سرعت کے ساتھ رجوع کرتا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ نفس سے آدمی صرف اسی وقت مامون رہ سکتا ہے جب کہ وہ کسی چیز کو ترک کر دے اور یہ امن بھی صرف اس چیز میں ہو گا جسے اس نے قدرت پانے کے بعد ترک کیا ہو۔

ابن ابی لیلیٰ نے ابن شبرمہ سے کہا کہ تم اس جولاہے کے بیٹے کو دیکھتے ہو ان کی مراد امام ابو حنیفہ سے تھی۔ جب ہم کسی مسئلے میں کوئی فتویٰ دیتے ہیں تو یہ رد کر دیتا ہے، ابن شبرمہ نے فرمایا: میں نہیں جانتا کہ ابو حنیفہ جولاہے کے بیٹے ہیں یا نہیں لیکن اتنی بات جانتا ہوں کہ دنیا ان کے پاس آئی تو وہ اس سے بھاگے، اور ہم سے دور بھاگی تو ہم اس کی طلب میں پیچھے پیچھے دوڑے گویا امام ابو حنیفہ کی دنیا پر قدرت تھی، مگر انہوں نے زہد کیا۔ چند صحابہؓ نے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ ہم اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہیں، اگر ہمیں یہ پتا چل جائے کہ فلاں کام اللہ تعالیٰ کی محبت کی علامت ہے تو وہ ہی کام کریں، اسی وقت قرآن کریم کی یہ آیت نازل ہوئی :-

وَلَوْ اَنَّا كَتَمْنَا عَلَيْهِمُ اَنِ اقْتُلُوا اَنفُسَكُمْ اَوْ اخْرَجُوا مِنْ دِيَارِكُمْ مَا فَعَلُوهُ اِلَّا قَلِيلًا مِّنْهُمْ (پ ۶۵ آیت ۶۶)

اور ہم اگر لوگوں پر یہ بات فرض کر دیتے کہ تم خود کشی کیا کرو یا اپنے وطن سے بے وطن ہو جایا کرو، تو بجز معدودے چند لوگوں کے اس حکم کو کوئی بھی نہ بجالاتا۔

حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے ارشاد فرمایا تو انہیں تھوڑے لوگوں میں سے ہے۔ (۱) حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ سے مروی ہے فرماتے ہیں مجھے یہ بات معلوم نہیں تھی کہ ہم میں سے بعض لوگ دنیا سے محبت کرنے والے بھی ہیں، جب یہ آیت نازل ہوئی تب مجھے اس کا علم ہوا :-

مِنْكُمْ مِنْ يُرِيدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَنْ يُرِيدُ الْآخِرَةَ۔ (پ ۴۷ آیت ۱۵۲)

تم میں سے بعض وہ تھے جو دنیا چاہتے تھے اور بعض وہ تھے جو آخرت کے طلبکار تھے۔

زہد سخاوت نہیں: یہاں یہ بات بھی جان لینی چاہیے کہ ہمت اور سخاوت کے ساتھ مال خرچ کرنا، لوگوں کے دلوں کو رجمانے کے لئے، اور کسی چیز کی طمع میں مال چھوڑنا زہد نہیں ہے، یہ سب امور اگرچہ محاسن میں شمار ہوں گے، لیکن زہد سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے، زہد یہ ہے کہ تم دنیا کو حقیر سمجھ کر ترک کر دو، اور آخرت کی نفاست کو پیش نظر رکھو، زہد کے علاوہ ہر نوع کا ترک ان لوگوں سے بھی ممکن ہے جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، اس ترک کو شرافت، سخاوت، بہادری، اور خوش خلقی کہہ سکتے ہیں، لیکن زہد نہیں کہہ سکتے، اس لئے کہ ناموری، اور لوگوں کے دلوں کا رجحان دنیاوی حظوظ ہیں، اور مال سے زیادہ لذت ہیں، جس طرح مال کو مسلم کے طور پر ترک کرنا اور عوض کی طمع رکھنا زہد نہیں ہے، اسی طرح یہ بھی زہد نہیں کہ ذکر، تعریف، اور جرات و سخاوت کی شہرت کے لالچ میں مال چھوڑنا بھی زہد نہیں ہے، اسی طرح یہ بھی زہد نہیں ہے کہ مال اس لئے چھوڑ دے کہ اسے سنبھال

(۱) مجھے اس روایت کی اصل نہیں ملی۔

کر رکھنے میں مشقت ہے، یا اسے حاصل کرنے میں دشواری ہوتی ہے، بادشاہوں اور امیروں کے دروازوں پر جانے، اور ان کے سامنے سر جھکانے کی ذلت برداشت کرنی پڑتی ہے، کیوں کہ اس میں ایک لذت چھوڑی جا رہی ہے، اور اس کے عوض میں دوسری لذت حاصل کی جا رہی ہے، حقیقت میں زاہد وہ شخص ہے جس کے پاس دنیا ذلیل و خوار ہو کر آئے، اور وہ اس سے جاہ کے نقصانات، یا بدنامی کے بغیر متعین ہونے پر قادر ہو، اور یہ سوچ کر ترک کر دے کہ اگر میں اس سے مانوس ہو گیا تو یہ غیر اللہ سے انیت ہوگی، اور ماسوی اللہ سے محبت یا انیت اللہ کی محبت میں شرک ہے، یا آخرت کے ثواب کی امیدیں ترک کر دے، گویا اس امید میں کہ جنت میں شراہیں ملیں گی دنیا کے خوش ذائقہ شربت چھوڑ دے، اور اس امید میں کہ جنت میں حوریں عطا کی جائیں گی، عورتوں اور باندیوں کی طرف راغب نہ ہو، اور اس توقع پر کہ جنت میں باغات ہوں گے، ان میں خوبصورت اور سرسبز و شاداب درخت ہوں گے دنیا کے باغوں سے دل نہ ہلایے، اور اس لالچ میں کہ جنت میں آرائش اور زیب و زینت کا سامان ہو گا دنیا میں زینت نہ کرے، جنت کے پھلوں اور میوؤں کے شوق میں دنیا کے لذیذ کھانے ترک کر دے، اور یہ سوچ کر کہ کہیں قیامت کے روز اس سے یہ نہ کہہ دیا جائے :-

اَذْهَبْتُمْ طَيْبَاتِكُمْ فِي حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا - (پ ۲۳۱ ر ۲۰ آیت ۲۰)

تم اپنی لذت کی چیزیں اپنی دنیوی زندگی میں حاصل کر چکے۔

جنت کی موعودہ چیزوں کو ان تمام راحتوں پر ترجیح دے جو اسے دنیا میں میسر ہیں، کیوں کہ وہ یہ بات جانتا ہے کہ آخرت بہتر اور باقی رہنے والی ہے۔

زہد کے فضائل

آیات اللہ تعالیٰ نے متعدد مواقع پر زہد کی تعریف کی ہے، اور اپنے بندوں کو اس کی ترقیب دی ہے، فرمایا :-

وَقَالَ الَّذِينَ اٰتُوا الْعِلْمَ وَيْلَكُمْ ثَوَابُ اللَّهِ خَيْرٌ لِّمَنْ اٰمَنَ - (پ ۲۰ ر ۱۱ آیت ۸۰)

اور جن لوگوں کو فہم عطا ہوئی تھی وہ کہنے لگے ارے تمہارا ٹاس ہو اللہ کا ثواب ہزار درجہ بہتر ہے اس شخص کے لئے جو ایمان لایا۔

اس آیت میں زہد کو علماء کی طرف منسوب کیا ہے، اور زاہدین کو علم کے وصف سے متصف قرار دیا ہے، یہ انتہائی تعریف ہے، ایک جگہ ارشاد فرمایا :-

اُولٰٓئِكَ يُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَيْنِ بِمَا صَبَرُوا - (پ ۲۰ ر ۹ آیت ۵۳)

ان لوگوں کو ان کے صبر کی وجہ سے دو ہر ثواب ملے گا۔

مفسرین نے اس کی تفسیر اس طرح کی ہے کہ جن لوگوں نے دنیا میں زہد کرنے پر صبر کیا ایک جگہ ارشاد فرمایا :-

اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِينَةً لِّهَا لِيَبْلُوَهُمْ اَيُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا - (پ ۱۵ ر ۱۳ آیت ۷)

ہم نے زمین کے اوپر کی چیزوں کو اس کے لئے باعث رونق بنایا تاکہ ہم لوگوں کی آزمائش کریں کہ ان میں زیادہ اچھا عمل کون کرتا ہے۔

بعض مفسرین کے نزدیک اس کے معنی یہ ہیں کہ جو دنیا میں زیادہ زہد کرنے والا ہے، پھر اس کے زہد کو احسن اعمال قرار دیا گیا۔ ایک موقع پر ارشاد فرمایا :-

مَنْ كَانَ يُرِيدُ حَرْثَ الْآخِرَةِ نَزِدْ لَهُ فِي حَرْثِهِ وَمَنْ كَانَ يُرِيدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهِ مِنْهَا

وَمَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ نَصِيبٍ - (پ ۲۵ ر ۲۰ آیت ۲۰)

اور جو آخرت کی کھیتی چاہے گا ہم اس کی کھیتی میں اضافہ کریں گے اور جو دنیا کی کھیتی کا طالب ہو تو ہم اس کو

کچھ دنیا (اگر چاہیں) دے دیں گے اور آخرت میں اس کا کچھ حصہ نہیں ہے۔
 وَلَا تَمْلِكْ عَيْنُكَ إِلَى مَا مَتَّعْنَاهُ زُجْرًا مِنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا لِنَفْتِنَهُمْ فِيهِ
 وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَأَبْقَى۔ (پ ۲۱ ر ۱۷ آیت ۳۱)

اور ہرگز ان چیزوں کی طرف آپ آنکھ اٹھا کر نہ دیکھیں جن سے ہم نے ان کے مختلف گروہوں کو ان کی
 آزمائش کے لئے متعین کر رکھا ہے کہ وہ (محض) دنیوی زندگی کی رونق ہے، اور آپ کے رب کا رزق بدرجہا
 بہتر اور پائدار ہے۔

الَّذِينَ يَسْتَحِبُّونَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا عَلَى الْآخِرَةِ۔ (پ ۳۳ ر ۳۳ آیت ۳)
 ان کو جو دنیوی زندگی کو آخرت پر ترجیح دیتے ہیں۔

اس آیت میں کفار کا وصف بیان کیا گیا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ مومن وہ ہے جو اس وصف کے برعکس ہو، یعنی دنیا کے مقابلے
 میں آخرت سے محبت کرتا ہو۔

روایات : دنیا کی مذمت میں بے شمار روایات وارد ہیں، ان میں سے بہت سی روایات ہم نے کتاب ذم الدنیا میں ذکر کی
 ہیں، دنیا کی محبت ملکات میں سے ہے، اور احیاء العلوم جلد ثالث میں ملکات کا بیان ہے، یہاں ہم دنیا سے بغض رکھنے کے فضائل
 ذکر کرتے ہیں، بغض دنیا منیحات میں سے ہے، اور اس جلد میں منیحات ہی مذکور ہیں، بغض دنیا سے یہی مراد ہے۔ اس سلسلے میں
 بہت سی احادیث وارد ہیں، ان میں سے چند حسب ذیل ہیں :-

وَمَنْ أَصْبَحَ وَهَمُّهُ الدُّنْيَا شَتَّ اللَّهُ عَلَيْهِ أَمْرُهُ وَفَرَّقَ عَلَيْهِ ضَبْعَتَهُ وَحَلَّ فَقْرَهُ
 بَيْنَ عَيْنَيْهِ وَلَمْ يَأْتِهِ مِنَ الدُّنْيَا إِلَّا مَا كَتَبَ لَهُ وَمَنْ أَصْبَحَ وَهَمُّهُ الْآخِرَةُ جَمَعَ اللَّهُ
 لَهُ هَمَّهُ وَحَفِظَ عَلَيْهِ ضَبْعَتَهُ وَجَعَلَ غِنَاهُ فِي قَلْبِهِ وَأَتَتْهُ الدُّنْيَا وَهِيَ رَاغِمَةٌ
 (ابن ماجہ - زید ابن ثابت)

جو شخص دنیا کی فکر میں مستغرق رہتا ہے اللہ تعالیٰ اس کا کام منتشر، اور اس کا نظام معیشت درہم برہم کر دیتا
 ہے، اور اس کے فقر کو اس کی آنکھوں کے سامنے کر دیتا ہے اور اسے دنیا میں سے صرف اسی قدر ملتا ہے جتنا
 اس کے لئے لکھا ہوا ہے، اور جو شخص فکر آخرت میں مستغرق رہتا ہے اللہ اس کی بہت جمع کر دیتا ہے، اور
 اس کی معیشت محفوظ رکھتا ہے، اور اس کے دل میں مالداری ڈال دیتا ہے، اور دنیا اس کے پاس ذلیل و خوار
 ہو کر آتی ہے۔

إِذَا رَأَيْتُمُ الْعَبْدَ وَقَدْ أُعْطِيَ صَمْتًا وَزُهْدًا فِي الدُّنْيَا فَاقْتَرِبُوا إِلَيْهِ فَإِنَّهُ يُلْقَى
 الْحِكْمَةَ (ابن ماجہ - ابو خلاؤ)
 جب تم بندے کو دیکھو کہ اسے سکوت، اور دنیا میں زہد عطا ہوا ہے تو تم اس سے قریب ہو جاؤ اس لئے کہ
 اسے حکمت سکھائی جاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :-

وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا۔ (پ ۳۵ ر ۵ آیت ۳۶)
 اور جس کو دین کا نعم مل جائے اس کو بڑے خیر کی چیز مل گئی۔

اسی لئے یہ قولہ مشہور ہے کہ جو شخص چالیس برس تک دنیا میں زہد کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے دل میں حکمت کے چشمے جاری کر دیتا
 ہے، اور وہی حکمت کی باتیں اس کی زبان سے ظاہر کرتا ہے۔ بعض اصحاب رسول روایت کرتے ہیں کہ ہم نے سرکارِ دو عالم صلی
 اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں عرض کیا : یا رسول اللہ! کونسا شخص بہتر ہے؟ فرمایا :-

كُلُّ مُؤْمِنٍ مَخْمُومٌ الْقَلْبُ صُلُوقُ اللِّسَانِ

ہر وہ مومن جو دل کا صاف اور زبان کا سچا ہو۔

ہم نے عرض کیا : یا رسول اللہ! مخموم القلب سے کون مراد ہے؟ آپ نے ارشاد فرمایا : وہ پرہیزگار اور صاف دل انسان ہے جس میں نہ خیانت ہو نہ فریب ہو نہ کھوٹا پن ہو نہ سرکشی ہو اور نہ حسد ہو ہم نے عرض کیا اس کے بعد کون مخموم القلب زیادہ اچھا ہے؟ فرمایا :-

الَّذِي يَشْنَأُ الدُّنْيَا وَيُحِبُّ الْآخِرَةَ۔ (ابن ماجہ۔ عبد اللہ ابن عمر)

جو دنیا سے نفرت کرتا ہے اور آخرت سے محبت کرتا ہے۔

اس حدیث کا مفہوم مخالف یہ ہے کہ جو شخص دنیا سے محبت کرے وہ برا آدمی ہے۔ ایک حدیث میں ارشاد فرمایا :-

إِنْ أَرَدْتَ أَنْ يُحِبَّكَ اللَّهُ فَارْزُقْ الدُّنْيَا۔ (ابن ماجہ۔ سل ابن سعد)

اگر تم یہ چاہتے ہو کہ اللہ تم سے محبت کرے تو تم دنیا میں زہد کرو۔

اس حدیث میں زہد کو محبت کا سبب قرار دیا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ کے محبوبین کے لئے بلند درجات ہیں اس لئے دنیا میں زہد کرنا افضل ترین مقامات میں سے ایک مقام ہے اس حدیث کا مفہوم مخالف یہ ہے کہ دنیا سے محبت کرنے والا اللہ تعالیٰ کے بغض کا نشانہ بنتا ہے۔ اہل بیت سے مروی ایک روایت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ الفاظ ہیں :-

الزُّهْدُ وَالْوَرَعُ يَجْعَلَانِ فِي الْقَلْبِ كَلَّ لَيْلَةٍ فَإِنْ صَادَقَا قَلْبًا فَبِهِ الْإِيمَانُ
وَالْحَيَاءُ أَقَامَا فِيهِمْ إِلَّا إِزْنًا تَحَلَّاهُ (۱)

زہد اور ورع ہر شب دل میں گشت کرتے ہیں اگر انہیں کوئی ایسا دل مل جاتا ہے جس میں ایمان اور حیا ہو تو

وہ اس میں قیام کرتے ہیں ورنہ کوچ کر جاتے ہیں۔

حضرت حارثؓ نے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ میں یقیناً مومن ہوں آپ نے ان سے دریافت فرمایا تمہارے ایمان کی حقیقت کیا ہے؟ عرض کیا میں نے اپنے دل کو دنیا سے علیحدہ کر لیا ہے چنانچہ میرے نزدیک دنیا کا پتھر اور سونا دونوں برابر ہیں اور مجھے ایسا لگتا ہے گویا میں جنت اور دوزخ میں ہوں اور گویا میں اپنے رب کے عرش کے قریب ظاہر ہوں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تم نے (اپنا ایمان) پہچان لیا اس لئے اسے لازم پکڑے رہو (اس کے بعد صحابہ سے مخاطب ہو کر فرمایا) اس بندے کا دل اللہ تعالیٰ نے ایمان سے منور کر دیا ہے (بزار۔ السنن طبرانی۔ حارث ابن مالک) دیکھئے اس حدیث میں پہلے حارثؓ نے دنیا سے اپنی دوری کی وضاحت کی۔ اور اسے یقین کا لباس پہنایا اس کے بعد سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تعریف فرمائی اور ارشاد فرمایا کہ اس بندے کا دل اللہ تعالیٰ نے ایمان سے روشن کر دیا ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :-

فَمَنْ يَرِدِ اللَّهُ أَنْ يَهْدِيَهُ يَشْرَحْ صَدْرَهُ لِلْإِسْلَامِ (پ ۲۸ آیت ۲۶)

سو جس شخص کو اللہ تعالیٰ رستے پر ڈالنا چاہتا ہے اس کا سینہ اسلام کے لئے کشادہ کر دیتا ہے۔

صحابہ نے عرض کیا : یا رسول اللہ! شرح صدر سے کیا مراد ہے؟ فرمایا :-

إِنَّ النُّورَ إِذَا دَخَلَ فِي الْقَلْبِ انْشَرَحَ لَهُ الصَّدْرُ وَانْفَسَحَ قَبِيلٌ : يَارَسُولَ اللَّهِ
وَهَلْ لَكَ مِنْ عِلْمٍ؟ قَالَ : التَّجَافِي عَنْ ذَلِّ الْغُرُورِ وَالْإِنَابَةُ إِلَى ذَلِّ الْخُلُودِ
وَالِاسْتِعْنَادُ لِلْمَوْتِ قَبْلَ نَزْوَلِهِ (حاکم)

(۱) مجھے اس روایت کی اصل نہیں ملی۔

جب دل میں نور داخل ہوتا ہے تو اس کے لئے سینہ کھل جاتا ہے، اور کشادہ ہو جاتا ہے، عرض کیا گیا :
یا رسول اللہ! کیا اس کی کوئی علامت بھی ہے؟ فرمایا : دھوکے کے گھر سے دور رہنا اور موت آنے سے پہلے
اس کے لئے مستعد رہنا۔

اس حدیث میں زہد کو اسلام کے لئے شرط قرار دیا گیا ہے، یعنی صحیح معنی میں اسلام کے لئے اسی کا دل کشادہ ہوتا ہے جو دنیا سے
کنارہ کش رہتا ہے، ایک مرتبہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام سے ارشاد فرمایا :
اِسْتَحْيُوا مِنْ اللّٰهِ حَقَّ الْحَيَاءِ قَالُوا اِنَّا نَسْتَحْيِي مِنْهُ نَعَالِي فَقَالَ لَيْسَ كَذَلِكَ
تَبْنُونَ مَا لَا تَسْكُنُونَ وَتَجْمَعُونَ مَا لَا تَأْكُلُونَ۔ (طبرانی۔ ام وید)
اللہ سے شرم کرو جیسا کہ اس سے شرم کرنے کا حق ہے، صحابہ نے عرض کیا ہم تو اللہ تعالیٰ سے شرم کرتے
ہی ہیں، فرمایا یہ بات نہیں ہے تم وہ عمارتیں بناتے ہو جن میں رہنا نہیں ہے، اور وہ اموال جمع کرتے ہو جو
کھانے نہیں ہیں۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مکانات کی تعمیر، اور اموال کی ذخیرہ اندوزی دونوں حیا کے منافی ہیں۔ ایک روایت میں ہے کہ
کچھ لوگ وفد کی صورت میں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور کہنے لگے کہ ہم لوگ مومن ہیں، آپ
نے دریافت فرمایا کہ تمہارے ایمان کی کیا علامت ہے؟ عرض کیا : مصیبت پر صبر، فراخی پر شکر، قضائے الہی پر رضا، اور دشمنوں پر
نزول مصیبت کے وقت شاکت نہ کرنا، سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :
اِنْ كُنْتُمْ كَذَلِكَ فَلَا تَجْمَعُوا مَا لَا تَأْكُلُونَ وَلَا تَبْنُوا مَا لَا تَسْكُنُونَ وَلَا تُنَافِسُوا
فِيْمَا عَنْتُمْ تَزَحَلُونَ۔ (خطیب، ابن مساکر۔ جابن)

اگر تم ایسے ہی ہو تو جو چیزیں کھانی نہیں وہ جمع مت کرو، جن مکانوں میں رہنا نہیں ہے وہ مت بناؤ، اور جن
چیزوں کو چھوڑنا ہے ان میں منافست مت کرو۔

اس حدیث میں زہد کو ایمان کے لئے تکمیل کی شرط قرار دیا گیا ہے۔ حضرت جابر روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ سرکارِ دو عالم
صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبے کے دوران ارشاد فرمایا کہ جو شخص لا الہ الا اللہ کہے گا اور اس میں کسی چیز کی آمیزش نہیں کرے گا اس
کے لئے جنت واجب ہوگی، یہ سن کر حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے کھڑے ہو کر عرض کیا : یا رسول اللہ! میرے ماں باپ آپ پر
قریان ہوں، آپ ہمارے لئے اپنے اس ارشاد کی وضاحت فرمائیں (کہ لا الہ الا اللہ میں کسی چیز کی آمیزش کس طرح ہو سکتی ہے؟)
سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :۔

حُبُّ الدُّنْيَا طَلَبُهَا وَاتِّبَاعُهَا وَقَوْمٌ يَقُولُونَ قَوْلَ الْأَنْبِيَاءِ وَيَعْمَلُونَ عَمَلَهُ
الْجَنَابِزِ قَوْمٌ جَاءَ بِكَ إِلَهُ إِلَّا اللَّهُ لَيْسَ فِيْهَا شَيْءٌ مِنْ هَذَا وَجَبَتْ لَهُ الْجَنَّةُ (۱)
دنیا کی محبت اس کی طلب اور اتباع کے لئے، اور بعض لوگ باتیں انبیاء کی سی کرتے ہیں، اور عمل ظالموں
جیسے جو شخص اس طرح کہہ لا الہ الا اللہ کہے کہ اس میں ان امور میں سے کچھ نہ ہو تو اس کے لئے جنت
واجب ہے۔

حدیث شریف میں ہے، سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :۔
السَّخَاءُ مِنَ الْيَقِيْنِ وَلَا يَدْخُلُ النَّارَ مُؤْمِنٌ وَالْبُخْلُ مِنَ الشَّكِّ وَلَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ
مَنْ شَكَّ۔ (مسند القرووس۔ ابو الدرداء)

سقاوت یقین میں سے ہے، اور کوئی صاحب یقین دوزخ میں نہیں جائے گا، اور بخل شک میں سے ہے اور

(۱) مجھے یہ روایت حضرت جابر سے نہیں ملی، البتہ حکیم ترمذی نے "نوادیر" میں اسے زہد ابن ارقم سے نقل کیا ہے۔

کوئی شک کرنے والا جنت میں داخل نہیں ہوگا۔

السَّخِيُّ قَرِيبٌ مِّنَ اللَّهِ قَرِيبٌ مِّنَ النَّاسِ قَرِيبٌ مِّنَ الْجَنَّةِ وَالْبَخِيلُ بَعِيدٌ مِّنَ اللَّهِ بَعِيدٌ مِّنَ النَّاسِ قَرِيبٌ مِّنَ النَّارِ (تفہیم - ابو ہریرہ)

خفی اللہ سے قریب ہوتا ہے لوگوں سے قریب ہوتا ہے اور جنت سے قریب ہوتا ہے اور بخیل اللہ سے دور ہوتا ہے لوگوں سے دور ہوتا ہے اور دوزخ سے قریب ہوتا ہے۔

اس حدیث میں بخل کی مذمت کی گئی ہے جو دنیا میں رغبت کا ثمر ہے اور سخاوت کی تہلیل کی گئی ہے جو زہد فی الدنیا کا ثمر ہے اور شموکی مدح و مذمت سے لاعلم مشرک کی مدح و مذمت ہوتی ہے۔ ابن السیبؒ ابو ذرؓ سے روایت کرتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا : جو شخص دنیا میں زہد کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے دل میں حکمت داخل کر دیتا ہے اور اس کی زبان سے حکمت ہی ظاہر فرماتا ہے اسے دنیا کا مرض اور اس کی دوا دونوں سے آگاہ کر دیتا ہے اور اسے دنیا سے دارالسلام کی طرف سلامتی کے ساتھ نکالتا ہے (۱) ایک روایت میں ہے کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اصحاب کے ساتھ ایسی اونٹنیوں کے پاس سے گذرے جو دودھ بہت دیتی تھیں اور حاملہ تھیں عرب کے لوگ ان اونٹنیوں کو بے حد پسند کرتے تھے اور نہایت نفیس جانتے تھے کیوں کہ ان سے متعدد قائدے تھے سواری کے کام بھی آتی تھی ان سے گوشت اور دودھ کا قادمہ بھی تھا عربوں کے قلوب میں اونٹنیوں کی اسی عظمت کے پیش نظر اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ارشاد فرمایا :-

وَإِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ (پ ۶۳۰ آیت ۴) اور جب دوس مینے کی گامین اونٹنیاں چھٹی پھریں گی۔

راوی کہتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان اونٹنیوں سے اعراض فرمایا اور ٹکاہیں پیچھے کر لیں صحابہ نے عرض کیا : یا رسول اللہ! یہ تو ہماری بہترین دولت ہیں آپ ان کی طرف کیوں نہیں دیکھ رہے ہیں؟ آپ نے ارشاد فرمایا کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے اس سے منع فرمادیا ہے پھر آپ نے قرآن کریم کی یہ آیت تلاوت فرمائی :-

وَلَا تَمْلِكُنَّ عُيُنُنَكُمْ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَاهُ بِهِ (۲) (پ ۱۷۱ آیت ۳۱)

اور ہرگز ان چیزوں کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھئے جن سے ہم نے (کفار کو) متنع کر رکھا ہے۔

حضرت مسروقؒ ام المومنین حضرت عائشہؓ سے نقل کرتے ہیں فرماتی ہیں : میں نے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں غرض کیا یا رسول اللہ! آپ اللہ تعالیٰ سے کھانے کی درخواست کیوں نہیں کرتے کہ وہ آپ کو کھلا دے میں بھوک میں آپ کی حالت دیکھ کر رونے لگی آپ نے ارشاد فرمایا : اے عائشہ! اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے اگر میں اپنے رب سے یہ درخواست کرنا کہ وہ دنیا کے پہاڑوں کو سونٹنا کر میرے مقدم کر دے تو وہ زمین پر جہاں چاہتا انہیں میرے ساتھ کر دیتا لیکن میں نے دنیا کی بھوک کو اس کی حکم میری پر اس کے فقر کو اس کی مالدار پر اور اس کے غم کو اس کی خوشی پر ترجیح دی اے عائشہ! دنیا نہ محمد کے لئے مناسب ہے اور نہ آل محمد کے لئے اے عائشہ! اللہ تعالیٰ اپنے اولوالعزم پیغمبروں کے لئے صرف یہ پسند کرتا ہے کہ وہ دنیا کے مصائب پر بھی صبر کریں اور اس کی محبوب چیزوں سے بھی صبر کریں پھر میرے لئے بھی یہی بات پسند کی کہ جن چیزوں کا انہیں ملنے بتایا ہے انہی چیزوں کا مجھے بھی ملنے بتائے چنانچہ فرماتا ہے :-

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُو الْعُرْمِ مِنَ الرُّسُلِ (پ ۳۶ آیت ۳۵)

تو آپ صبر کیجئے جس طرح ہمت والے پیغمبروں نے صبر کیا تھا۔

خدا کی قسم میرے لئے اس کی اطاعت کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں ہے میں بخدا اپنی طاقت کے بقدر صبر ضرور کروں گا اور قوت کی

توفیق بھی اللہ ہی کی طرف سے ہے۔ (۲)

(۱) مجھے یہ روایت ابو ذرؓ سے نہیں ملی، ابن ابی الدنیا نے عنوان ابن سلیم سے اس مضمون کی ایک حدیث نقل کی ہے۔ (۲) مجھے اس روایت کی اصل نہیں ملی۔ (۳) مجھے اس روایت کی کوئی اصل نہیں ملی۔

روایت ہے کہ جب حضرت عمرؓ فتوحات کے دہوازے کھلے تو ان کی صاحبزادی حضرت حفصہؓ نے عرض کیا کہ جب دنیا بھر سے وفود آپ کے پاس آیا کریں تو آپ نرم کپڑے پہن لیا کریں، اور کھانے کے لئے کچھ بھالیا کریں، آپ بھی کھایا کریں اور حاضرین کو بھی کھلایا کریں، حضرت عمرؓ نے ان سے فرمایا : اے حفصہ کیا تم یہ بات جانتی ہو کہ بیوی اپنے شوہر کے حال سے زیادہ واقف ہوتی ہے، انہوں نے عرض کیا : جی ہاں! فرمایا میں تمہیں اللہ تعالیٰ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کیا تم جانتی ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اتنے برس نبی رہے اور آپ نے اور آپ کے گھروالوں نے اگر صبح کا کھانا کھالیا تو رات کو بھوکے رہے، اور رات کو کھالیا تو صبح کو بھوکے رہے، تم جانتی ہو کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اتنا عرصہ پیغمبری کا دنیا میں گزارا، مگر آپ نے یا آپ کے گھر والوں نے کبھی کبھووں سے پیٹ نہیں بھرا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے خیر پر حق صفا فرمائی، تم جانتی ہو کہ ایک روز تم نے قدرے بلندی پر دسترخوان بچھا دیا، آپ کو یہ بات ناگوار گذری، اور آپ کے چہرہ انور کا رنگ خفیر ہو گیا، اس کے بعد آپ نے وہ دسترخوان اٹھوا دیا اور کھانا اس سے قدرے نیچے یا زمین پر رکھا گیا، تم جانتی ہو کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عہد کی دو تہہ کر کے اس پر آرام فرمایا کرتے تھے، ایک روز کسی نے اس کی چار تمیں کر دیں، اور آپ نے اس پر آرام فرمایا، جب بیدار ہوئے تو ارشاد فرمایا کہ تم نے اس عہد کے ذریعے مجھے تہجد کی نماز سے روک دیا، تم اس کی دو تہہ کر دیا جیسا کہ کرتے رہے ہو، تم جانتی ہو کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے کپڑے دھونے کے لئے اتارتے تھے، اتنے میں بلال آپ کو نماز کے لئے اطلاع دیتے تو آپ کے پاس کوئی دو سرا کپڑا نہیں ہوتا تھا جسے پہن کر نماز کے لئے تشریف لے جاسکیں، جب وہ کپڑے سوکتے تھے تو انہیں پہن کر تشریف لے جاتے، تم جانتی ہو کہ بنی ظفر کی ایک عورت نے آپ کے لئے دو کپڑے تیار کئے، ایک ازار، اور ایک چادر، اور ان میں سے ایک کپڑا پہلے بھیج دیا، آپ، وہی ایک کپڑا پہن کر نماز کے لئے تشریف لے گئے، اور اس کپڑے کے دونوں کناروں میں گردن کے پاس گرہ لگائی، اور اسی ایک کپڑے میں نماز ادا فرمائی، غرضیکہ حضرت عمرؓ نے اس قدر واقعات بیان فرمائے کہ حضرت حفصہؓ رونے لگیں، اور خود آپ بھی رونے، اور اتنا رونے کی جھپٹیں کھل گئیں یہاں تک کہ ہم یہ سمجھے کہ شاید اسی حالت میں فوت ہو جائیں گے^(۱) بعض روایات میں حضرت عمرؓ کی طرف اس قول کی نسبت بھی کی گئی ہے کہ میرے دو ساتھی تھے، جو ایک مخصوص منج پر چلے، اگر میں ان سے مختلف راستے پر چلا تو بھگ جاؤں گا، خدا کی قسم! میں ان حضرات کی پُر مشقت زندگی پر مبرکوں کا تاکہ ان کے ساتھ پُر آسائش زندگی پاؤں۔ حضرت ابوسعید الخدریؓ روایت کرتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا : مجھ سے پہلے بعض انبیاءِ فہر میں جلا کئے جاتے تھے، اور ان کا لباس صرف ایک کپڑا ہوتا تھا، اور جوڑوں سے ان کی آدھائیں کی جاتی تھی، اور ان کے جسم میں اس قدر جوڑیں ہو جاتی تھیں کہ ان کے کانٹے سے ہلاکت کا اندیشہ ہو جاتا تھا، مگر یہ زندگی ان حضرات کے نزدیک اس زندگی سے جسے تم پسند کرتے ہو زیادہ محبوب تھی (ابن ماجہ)۔ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام مدین کے پانی پر پہنچے تو لاغری کی بنا پر سبزی کا رنگ ان کے پیٹ سے جھلکا تھا، اصل میں حضرات انبیاء کرام اللہ تعالیٰ سے اس کے دوسرے بندوں کی بہ نسبت زیادہ واقف تھے، اور یہ بات جانتے تھے کہ آخرت کی فلاح کس زندگی میں مضمر ہے، اسی لئے ان کے ذہد کا یہ عالم تھا۔

حضرت عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ جب قرآن کریم کی یہ آیت نازل ہوئی۔

وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يَنْفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ (پ ۱۰ ر ۳۳)

اور جو لوگ سونا چاندی جمع کر کے رکھتے ہیں اور ان کو اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔

تو سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا : دنیا کے لئے ہلاکت ہو، دہم و دہار کے لئے تباہی ہو، ہم نے عرض

(۱) یہ روایت اس شرح و بسط کے ساتھ کہیں نہیں ملی، البتہ اس کے تمام اجزاء مختلف کتابوں میں متعدد صحابہ سے منقول ہیں، خاص طور پر عائشہ رضی اللہ عنہا میں اس نوع کے متعدد واقعات منقول ہیں۔

کیا : یا رسول اللہ! ہمیں اللہ تعالیٰ نے سونا چاندی ذخیرہ کرنے سے منع کر دیا ہے، اب ہم کیا چیز ذخیرہ کریں؟ آپ نے ارشاد فرمایا : تم ذکر کرنے والی زبان، شکر کرنے والا دل، اور آخرت پر مدد کرنے والی نیک یہودی اختیار کرو (ترمذی، ابن ماجہ۔ ثوبان)

حضرت حذیفہؓ کی روایت میں ہے کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :
 مَنْ أَثَرَ الدُّنْيَا عَلَى الْآخِرَةِ ابْتَلَاهُ اللَّهُ بِشَاكٍ هَتَأَ لَا يُغَارِقُ قَلْبَهُ ابْنَتَا وَفَقْرًا
 لَا يَسْتَغْنِي ابْنَتَا وَجَزْ صَالًا لَا يَشْبَعُ ابْنَتَا (۱)
 جو شخص دنیا کو آخرت پر ترجیح دے اللہ تعالیٰ اسے تین چیزوں میں مبتلا کرتا ہے، ایسے غم میں جو کبھی دل سے جدا نہیں ہوتا، ایسی مفلسی میں جو کبھی مالداری میں تبدیل نہ ہو، اور ایسے حرص میں جو کبھی حکم سیر نہ ہونے دے۔

ایک روایت میں ہے آپ نے ارشاد فرمایا : بندے کا ایمان اس وقت تک مکمل نہیں ہوتا جب تک کہ اسے گناہی شہرت سے زیادہ، قلتِ شئی کثرتِ شئی سے زیادہ محبوب نہ ہو (مسند الفردوس۔ علی ابن طلحہ مرسلًا بتغییر بسیر۔) حضرت عیسیٰ علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں کہ دنیا ایک ہل ہے اس کے اوپر سے گذر جاؤ، اس پر عمارت مت بنناؤ، لوگوں نے عرض کیا : اے اللہ کے نبی! ہمیں اجازت دیجئے کہ ہم اللہ کی عبادت کے لئے کوئی مکان تعمیر کر لیں، فرمایا : جاؤ! پانی پر گھر بناؤ، لوگوں نے عرض کیا پانی پر گھر کیسے بنائیں گے، فرمایا اللہ کی محبت کے ساتھ دنیا کی محبت کیسے جمع ہوگی۔ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میرے اللہ نے مجھے اس اختیار سے نوازا تھا کہ اگر میں چاہوں تو مکہ کی وادی بھلاؤ کو سونے کا بنا دیا جائے، میں نے عرض کیا : یا اللہ میں چاہتا ہوں کہ ایک دن بھوکا رہوں، اور ایک دن پیٹ بھریں، جس دن بھوکا رہوں، اس دن تیری بارگاہ میں تفرقہ کروں، اور جس دن پیٹ بھریں اس دن تیری حمد و ثناء کروں۔ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے منقول ہے کہ ایک روز سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کہیں تشریف لے جا رہے تھے، حضرت جبریلؑ آپ کے ہمراہ تھے، جب آپ کوہ صفا پر پہنچے تو حضرت جبریلؑ سے ارشاد فرمایا کہ اے جبریلؑ! اس ذات کی قسم جس نے تجھیں حق کے ساتھ بھیجا ہے آلِ محمدؐ نے اس حال میں بھی شام کی ہے کہ نہ اس کے پاس مفتی بھرستو تھا اور نہ آٹا، ابھی آپ اتنا ہی کہہ پائے تھے کہ آسمان کی جانب سے ایک کڑکدار آواز آئی جسے سن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خوب دھڑک اٹھے، آپ نے حضرت جبریلؑ علیہ السلام سے دریافت کیا (یہ کیسی آواز ہے) کیا اللہ تعالیٰ نے قیامت بپا ہونے کا حکم دیدیا ہے، حضرت جبریلؑ نے عرض کیا : نہیں، بلکہ یہ اسرائیلؑ علیہ السلام ہیں جو آپ کا کلام سن کر نیچے آئے ہیں، چنانچہ حضرت اسرائیلؑ علیہ السلام نے آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا : آپ نے جو کچھ فرمایا ہے وہ اللہ عزوجل نے سنا ہے اور مجھے زمین کی کنجیاں لے کر بھیجا ہے اور مجھے حکم دیا ہے کہ میں آپ سے یہ عرض کروں کہ اگر آپ چاہیں تو میں تمامہ کے پھانڈوں کو ذخرو، یا قوت اور سونے چاندی کا بنا کر آپ کے ساتھ چلا دوں، اور آپ چاہیں تو پیغمبرِ بادشاہ بن جائیں، اور چاہیں تو پیغمبرِ بندے بنے رہیں، حضرت جبریلؑ نے اشارہ کیا کہ اللہ کے لئے تواضع فرمائیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تین مرتبہ ارشاد فرمایا : میں نبی اور بندہ رہنا چاہتا ہوں (۲)

ارشادِ نبوی ہے :-
 إِذَا رَاكَ اللَّهُ مُعْبِدًا خَيْرَ أَرْزَاقٍ لَكَ فِي الدُّنْيَا وَرَغْبَةٍ فِي الْآخِرَةِ وَوَصْرٍ مَبْعُودٍ نَفْسٍ
 (مسند الفردوس۔ محذوف و زیادة)

(۱) مجھے یہ روایت حضرت حذیفہؓ سے نہیں ملی، البتہ اسی مضمون کی ایک حدیث طبرانی نے ابن مسعودؓ سے روایت کی ہے۔ (۲) یہ حدیث صحیح

پہلے ہی گذری ہے۔

جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کے لئے خیر کا ارادہ کرتا ہے تو اسے دنیا میں زاہد اور آخرت میں راغب کر دیتا ہے، اور اس کے نفس کے میوہ سے آگاہ فرما دیتا ہے۔

اسی طرح ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں :-

إِزْهَدْنِي النَّيَا يُجِبْكَ اللَّهُ وَإِزْهَدْنِي مَا أَلَيْكَ النَّاسُ يُجِبْكَ النَّاسُ - (۱)

دنیا میں زہد کرو اللہ تم سے محبت کرے گا اور لوگوں کے اموال میں زہد کرو لوگ تم سے محبت کریں گے۔

ایک روایت میں ہے آپ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص محکم کے بغیر علم، اور رہنمائی کے بغیر ہدایت چاہتا ہے اسے دنیا میں زہد اختیار کرنا چاہیے (۲) ایک حدیث میں آپ سے یہ الفاظ نقل کئے گئے ہیں :-

مَنْ أَشْتَقَّ إِلَى الْجَنَّةِ سَأَلَ إِلَى الْخَيْرَاتِ وَمَنْ خَافَ مِنَ النَّارِ لَهَا عَنِ الشَّهَوَاتِ وَمَنْ تَرَقَّبَ الْمَوْتَ تَرَكَ اللَّذَاتِ وَمَنْ زَهَدْنِي النَّيَا هَانَتْ عَلَيْهِ الْمَصِيبَاتُ - (ابن حبان - علی ابن ابی طالب)

جو جنت کا مشتاق ہوتا ہے خیر کے امور کی طرف سبقت کرتا ہے، اور جو دوزخ سے ڈرتا ہے وہ شہوات فراموش کر دیتا ہے اور جو موت کا خطرہ رہتا ہے وہ لذات ترک کر دیتا ہے، اور جو دنیا میں زہد کرتا ہے اس پر مصیبتیں سہل ہو جاتی ہیں۔

ہمارے نبی سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام سے موی ہے :-

أَرْبَعٌ لَا يُلْزَمُ كَنْزُ الْإِبْتِغَاءِ الْقَصَمْتُ وَهُوَ أَوَّلُ الْعِبَادَةِ وَالْتَوَاضُعُ وَكَثْرَةُ الذِّكْرِ وَقَوْلَةُ الشَّيْءِ - (طبرانی - حاکم - النس)

چار چیزیں مشقت کے بغیر حاصل نہیں ہوتیں ایک سکوت جو عبادت کی ابتدا ہے، دوسرے تواضع، تیسرے ذکر کی کثرت، چوتھے کسی شئی کی قلت۔

حب دنیا کی مذمت، اور بغض دنیا کی مدحت میں اس قدر روایات و اخبار وارد ہیں کہ ان سب کا استقصاء نہیں کیا جاسکتا، اس لئے کہ انبیائے کرام کی بعثت کا اول و آخر مقصد ہی یہ تھا کہ وہ لوگوں کو دنیا سے آخرت کی طرف پھیریں، ان کا اکثر کلام اسی مقصد کی تکمیل کرتا ہے۔ ہم نے جو کچھ بیان کر دیا ہے وہ صاحبِ محل کے لئے بہت کافی ہے، اور اللہ ہی توفیق دینے والا ہے۔

آثار : ایک اثر میں وارد ہے کہ کلمہ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ بندوں سے اللہ تعالیٰ کا غیظ و غضب برابر دور کرتا رہتا ہے، جب تک کہ بندے وہ چیز نہ مانگیں جو ان کی دنیا میں سے کم ہو گئی ہو۔ اور ایک روایت ہے کہ جب تک وہ دنیا کے کامیاب کو دین پر ترجیح نہ دیں، جب وہ ایسا کرتے ہیں اور اس کے بعد لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ کہتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان سے فرماتا ہے تم نے جھوٹ کہا، تم یہ کلمہ کہنے میں سچے نہیں ہو۔ بعض صحابہؓ سے منقول ہے کہ ہم نے تمام اعمال کا جائزہ لیا، ہمیں آخرت کے باب میں زہد فی الدنیا سے زیادہ کوئی عمل مؤثر نظر نہیں آیا۔ بعض صحابہؓ نے کبار تابعین سے فرمایا کہ تم اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ عمل کرنے والے اور محنت کرنے والے ہو، حالانکہ وہ تم سے زیادہ اچھے تھے، تابعین نے اس کی وجہ دریافت کی، فرمایا اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ تم سے زیادہ دنیا میں زہد کرنے والے تھے۔ حضرت عمارؓ ارشاد فرماتے ہیں کہ دنیا میں زہد دل اور جسم دونوں کے لئے باعثِ راحت ہے، بلال ابن سعدؓ فرماتے ہیں کہ ہمارے گناہ گار ہونے کے لئے صرف اتنی بہت کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں دنیا میں زہد کا حکم دیتا ہے اور ہم اس کی رغبت کرتے ہیں، ایک شخص نے حضرت سفیانؓ کی خدمت میں عرض کیا کہ میں ایک زاہد عالم دیکھنے کا حتمی ہوں، انہوں نے

فرمایا کم بخت! یہ ایک گم شدہ چیز ہے جو ملتی نہیں ہے۔ وہ اب ابن منبہ فرماتے ہیں کہ جنت کے آٹھ دروازے ہیں، جب اہل جنت ان دروازوں سے داخل ہوتا چاہیں گے تو دربان فرشتے ان سے کہیں گے رب کریم کی قسم! دنیا کے زاہدین اور جنت کے عاشقین سے پہلے کوئی شخص جنت میں نہیں جائے گا۔ یوسف ابن اسباط کہتے ہیں کہ میں اللہ تعالیٰ سے تین باتوں کا خواہشمند ہوں، ایک یہ کہ میں اس حالت میں مریں کہ میری ملکیت میں ایک بھی درہم نہ ہو، دوسرے یہ کہ میرے اوپر قرض نہ ہو، تیسرے یہ کہ میری ہڈی پر گوشت نہ ہو، راوی کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ تینوں خواہشیں پوری فرمائی۔ روایت ہے کہ کسی خلیفہ نے فقہاء کو نذرانے بھجوائے، سب نے قبول کر لئے، فضیل ابن عیاض کی خدمت میں بھی دس ہزار درہم کا ہدیہ آیا، لیکن انہوں نے قبول کرنے سے انکار کر دیا، بیٹوں نے عرض کیا فقہاء نے نذرانے قبول کر لئے ہیں، اور آپ اپنی مفلسی کے باوجود رو کر رہے ہیں، فضیل نے یہ سنا تو خوب روئے اور کہنے لگے کہ میری اور تمہاری مثال ان لوگوں کی سی ہے جن کے پاس ایک گائے تھی، مدتوں وہ اس سے کھیتی میں قائدہ اٹھاتے رہے، جب وہ بوڑھی ہو گئی اور کھیت جوڑنے کے قابل نہ رہی تو انہوں نے اسے ذبح کر ڈالا، تاکہ اس کی کھال سے نفع اٹھا سکیں، یہی حال تمہارا ہے، تم لوگ بھی مجھے اس بڑھاپے میں ذبح کرنا چاہتے ہو، پھر تمہارے لئے بھوک سے مرجانا فضیل کو ذبح کرنے سے بہتر ہے۔

فضیل ابن عمیر کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اون پہنچتے تھے، اور درختوں کے پتے کھاتے تھے، ان کا کوئی بیٹا نہ تھا جو مرتا، نہ گھر تھا جو دیر ان ہوتا، وہ آلے والے کل کے لئے کچھ بچا کر نہ رکھتے تھے، جہاں رات ہوتی سو جاتے، ابو حازم کی اہلیہ نے اپنے شوہر سے کہا شدید سردی ہو رہی ہے، اس موسم میں ہمیں کھانوں، کپڑوں اور لکڑیوں کی ضرورت پیش آئے گی، ابو حازم نے بیوی کی اس فرمائش کے جواب میں کہا کہ ہم ان چیزوں سے بھٹکارہ پاسکتے ہیں لیکن موت سے رستگاری نہیں ہے، پہلے موت آئے گی، پھر قبروں سے اٹھنا ہو گا، پھر اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑا ہونا پڑے گا، اس کے بعد جنت ہوگی یا دوزخ۔ کسی نے حضرت حسنؑ سے کہا کہ آپ اپنے کپڑے کیوں نہیں دھو لیتے، فرمایا موت اس سے بھی زیادہ جلد آسکتی ہے۔ ابراہیم ابن ادہم کہتے ہیں کہ ہمارے دلوں پر تین پردے پڑے ہوئے ہیں، یہ پردے اس وقت تک پڑے رہیں گے جب تک بندے پر یقین منکشف نہیں ہوتا۔ ایک موجود چیز سے خوش ہونا، دوسرے مقتود پر تمکین ہونا، تیسرے تعریف پر خوش ہونا، اگر تم موجود پر خوش ہوتے ہو تو حریص ہو، مقتود پر تمکین ہوتے ہو تو غصہ کرنے والے ہو، اور غصہ کرنے والے کو عذاب ہوتا ہے، اور جب تعریف پر خوش ہوتے ہو تو تعجب کرتے ہو، اور عجب سے عمل باطل ہو جاتا ہے، حضرت عبد اللہ ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ ایسے شخص کی دور رسئیں جس کا دل زاہد ہو اللہ کے نزدیک ان متعبدین کی عبادتوں سے بہتر اور پسندیدہ ہیں جو وہ مدتوں کرتے ہیں، ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جو چیزیں ہمیں نہیں دیں وہ ان چیزوں کے مقابلے میں ہمارے لئے زیادہ باعث رحمت ہیں جو ہمیں دی گئی ہیں۔ ان بزرگ کے پیش نظر سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے ۔

إِنَّ اللَّهَ يَخْبِي عِبْدَهُ الْمُؤْمِنِينَ مِنَ النَّبَا وَهُوَ يُجِبُهُ كَمَا تَحْمُونَ مَرِيضَكُمْ الطَّعَامَ
الشَّرَابَ تَخَافُونَ عَلَيْهِ
(گذر چکی)

اللہ تعالیٰ اپنے بندہ مومن کو دنیا سے اس طرح بچاتا ہے جس طرح تم اپنے مریض کو کھانے اور پینے سے بچاتے ہو، اس پر (زیادتی مرض یا موت کے) خوف کی وجہ سے۔

اگر مریض یہ جان لے کہ وہ ممانعت جو صحت کا باعث ہے اس حلا سے زیادہ بہتر ہے جس کا نتیجہ مرض ہے تو وہ ممانعت کو ترجیح دے۔ حضرت سفیان ثوری فرمایا کرتے تھے کہ دنیا بچیدگی کا گھر ہے، راستی کا گھر نہیں، غم کا گھر ہے، خوشی کا گھر نہیں، جو یہ بات جان لیتا ہے وہ دنیا کی خوشحالی سے خوش نہیں ہوتا، اور یہاں کے مصائب پر غم زدہ نہیں ہوتا۔ حضرت سل فرماتے ہیں کہ کسی

عبادت گزار کا عمل اس تک وقت خالص نہیں ہوتا جب کہ وہ چار چیزوں سے قاصر نہ ہو، بھوک، بھگلی، فخر اور ذلت۔ حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ میں ایسے لوگوں کی صحبت میں رہا ہوں، اور ایسے افراد کے ساتھ میں نے وقت گزارا ہے جو دنیا کی کسی چیز کو پا کر خوش نہ ہوتے تھے، اور کسی چیز کو کھو کر رنجیدہ نہ ہوتے تھے، ان کی نظروں میں دنیا کی حیثیت اتنی بھی نہیں تھی جتنی مٹی کی ہوئی ہے، ان میں سے بعض حضرات پچاس پچاس سال یا ساٹھ ساٹھ برس اس حالت میں زندہ رہے کہ نہ ان کے لئے کپڑا تہہ کیا گیا، نہ دیکھی چڑھائی گئی، اور نہ ان کے اور زمین کے مابین کوئی چیز بچھائی گئی، نہ انہوں نے اپنے گھروالوں سے کھانا پکانے کی فرمائش کی، جب رات آتی تو وہ حضرات اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جاتے، اپنی پیشانیوں زمین پر بچھالیتے، ان کی آنکھوں سے ان کے رخساروں پر آنسو بہتے رہتے، اور وہ اپنے رب کے سامنے اس طرح آہ و زاری کرتے کہ سننے والے کا جگر پھٹ پھٹ جاتا، اگر کوئی اچھا عمل کرتے تو اس کا شکر ادا کرتے، اور اللہ تعالیٰ سے یہ درخواست کرتے کہ وہ ان کے اس عمل کو قبول کر لیں، اور اگر کوئی غلطی سرزد ہو جاتی تو تمکین ہوتے، اور اللہ تعالیٰ سے عفو مغفرت کی درخواست کرتے، ان کا یہی معمول تھا۔ بخدا وہ اللہ کی رحمت کے بغیر گناہوں سے محفوظ نہیں رہے، اور نہ انہوں نے اللہ کی مغفرت کے بغیر نجات پائی۔

زہد کے درجات اور اقسام

زہد کی تین قسمیں کی جاسکتی ہیں، ایک نفس زہد کی، دوسری اس چیز کے اعتبار سے جس کی رغبت سے زہد ہوتا ہے، تیسری اس چیز کے اعتبار سے جس سے زہد کرتے ہیں۔

پہلی تقسیم۔ نفس زہد کے اعتبار سے : جانتا چاہیے کہ ذہنی نفس اپنی قوت میں تفاوت کے لحاظ سے تین درجے رکھتا ہے پہلا درجہ جو سب سے اونچی درجہ ہے یہ ہے کہ دنیا میں زہد کرے، مگر اس کی خواہش بھی رکھے، نفس کا اس کی طرف میلان بھی ہو، دل دنیا کی طرف راغب بھی ہو، اگرچہ وہ اپنے مجاہدے کے ذریعہ نفس کو قابو میں رکھتا ہے اور اسے دنیا میں مشغول ہونے سے روکتا ہو، ایسے شخص کو حور کہتے ہیں، یہ درجہ اس شخص کے حق میں زہد کا نقطہ آغاز ہے جو کسب و اجتہاد سے درجہ زہد تک پہنچنا چاہے، حور پہلے اپنے نفس کو یکھلاتا ہے، پھر اپنے کسرِ زر کو، جب کہ زہد پہلے کسرِ زر کو یکھلاتا ہے پھر طاعات میں اپنے نفس کو، ایسا نہیں ہے کہ جو چیز اس سے جدا ہو گئی ہو اس کے فراق میں نفس کو گائے، حور ہر وقت خطرے میں گھرا رہتا ہے، کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس کا نفس اس پر غالب آجاتا ہے، اور شہوت اسے اپنی طرف کھینچتی ہے، اور وہ دنیا کی طرف اس سے راحت پانے کے لئے مراجعت کرتا ہے خواہ تھوڑی چیز میں یا زائد میں۔

دوسرا درجہ اس شخص کا ہے جو دنیا کو اپنی رضا و رغبت سے چھوڑ دیتا ہے، اور اسے آخرت کے مقابلے میں حقیر سمجھتا ہے، ایسا ہے جیسے کوئی شخص دو درہموں کی وجہ سے ایک درہم چھوڑ دے، اس لئے کہ ایسا کرنا اس کے لئے دشوار نہیں ہوتا، اگرچہ اسے کچھ انتہا ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ یہ زہد اپنے نفس سے اچھی طرح واقف ہوتا ہے، اور اس کی طرف ملکت رہتا ہے جیسے بائع اپنے معیج کی طرف متوجہ رہتا ہے، اس صورت میں یہ ہو سکتا ہے کہ اس کے نفس میں عجب پیدا ہو جائے اور یہ گمان کرے کہ میں نے ایک قابل قدر چیز اس سے گراں قدر چیز کے لئے ترک کر دی، یہ درجہ بھی نقصان کا ہے۔

تیسرا درجہ جو انتہائی اعلیٰ ہے یہ ہے کہ اپنی رغبت سے زہد کرے، اور اپنے زہد میں بھی زہد اختیار کرے، یعنی یہ خیال نہ کرے کہ اس نے کوئی چیز ترک کی ہے، لیکن یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ اس کی نظر میں دنیا کی کوئی حیثیت نہ ہو، اس درجے پر فائز زہد کی مثال ایسی ہوگی جیسے کوئی ٹھیکر اوسے کر موتی لے لے، ظاہر ہے موتی کے مقابلے میں ٹھیکرے کی کوئی قدر قیمت نہیں ہے، یہ کمال زہد ہے، اور اس کا سبب کمال معرفت ہے، یہ زہد دنیا کی طرف التفات کے خوف سے مامون ہو سکتا ہے، جیسے وہ شخص بیچ میں اقالہ کا تصور بھی نہیں کرتا جس نے موتی کے عوض ٹھیکر اویا ہو، ابو یزیدؒ نے مری علیٰ عبد الرحمن سے پوچھا کہ تم کس موضوع پر گفتگو کر رہے ہو انہوں نے کہا زہد کے متعلق، ابو یزیدؒ نے پوچھا کہ کس چیز میں زہد کے متعلق، ابو یزیدؒ نے کہا دنیا میں زہد کے متعلق، ابو یزیدؒ نے اپنے دونوں ہاتھ جھائے اور فرمایا میں کچھ بات

کہ تم کسی چیز کے متعلق گفتگو کر رہے ہوں گے دنیا تو لاشی ہے اس میں زندہ کیا ہو گا۔ اہل معرفت اور مشاہدات سے معمور قلوب رکھنے والے بزرگوں کے نزدیک اس شخص کی مثال جو آخرت کے لئے دنیا ترک کر دے ایسی ہے جیسے کوئی شخص بادشاہ کے دیہار میں داخل ہونا چاہے اور دروازے پر ایک کتا موجود ہو جو اسے اندر نہ جانے دے تو وہ اس کے آگے روٹی کا ٹکڑا ڈال دے کتا اس میں مشغول ہو جائے اور وہ دیہار شاہی میں پہنچ کر بادشاہ سلامت کے تقرب سے مستفید ہو۔ یہاں تک کہ انتظام سلطنت میں اسے ایک خاص مقام حاصل ہو جائے، بلکہ تمام امور سلطنت ہی اس کے سپرد کر دیے جائیں، یعنی طور پر یہ شخص بادشاہ کے بے کراں انعامات اور توجہات کا مرکز بن جائے، لیکن کیا اسے ان وسیع تر انعامات کے مقابلے میں بطور احسان یہ کہنے کا حق حاصل ہے کہ میں نے کتے کو روٹی کا ٹکڑا دے کر یہ منصب حاصل کیا ہے۔ اسی طرح شیطان بھی اللہ تعالیٰ کے دروازے کا کتا ہے، وہ لوگوں کو اندر جانے سے روکتا ہے، حالانکہ دروازہ کھلا ہوا ہے، دنیا روٹی کے ایک ٹکڑے کی طرح ہے، اس کی لذت صرف اس وقت تک محدود رہتی ہے جب تک تم اسے دانٹوں سے چباتے ہو، حلق سے نیچے اترنے کے بعد اس کا کوئی ذائقہ برقرار نہیں رہتا بلکہ وہ معدے کے لئے ایک بوجھ بن جاتا ہے، اور ایک بدبودار نجاست کی شکل اختیار کر لیتا ہے یہاں تک کہ اسے جسم سے باہر نکالنے کی ضرورت پیش آتی ہے، جو شخص اسے بادشاہ کے یہاں عزت اور مرتبت حاصل کرنے کے لئے روٹی ترک کر دے گا اس کی نگاہوں میں اس ایک ٹکڑے کی کیا قیمت ہو سکتی ہے۔ دنیا کی حقیقت اگر وہ کسی شخص کو سو برس تک سلامتی کے ساتھ حاصل رہی ہو آخرت کی نعمتوں کے مقابلے میں ایک لقمے سے بھی کم ہے اس لئے کہ مٹائی کو اس شئی سے کوئی نسبت نہیں ہوتی جو لامتناہی ہو، دنیا ہر حال میں مٹائی ہے اگرچہ کوئی شخص ہزار برس تک زندہ رہے، اور بلا کم و کاست دنیا پائے، اس دنیا کو آخرت سے جو ایک عالم پائندہ ہے کوئی نسبت نہیں ہے، دنیا کی زندگی اپنی طوالت کے باوجود مختصر اور محدود ہے، اور اس کی نعمتیں بھی کدورت سے خالی نہیں ہیں، پھر اسے آخرت کی نعمتوں کے ساتھ کیا نسبت ہو سکتی ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ زاہد اپنے زندہ کو اسی وقت اہمیت دیتا ہے جب وہ اس شے کی طرف التفات کرے جس میں زندہ کرتا ہے، اور یہ التفات اسی وقت ہو گا جب اس شے کی اس کے نزدیک کوئی قدر و قیمت اسی وقت ہوگی جب معرفت میں نقصان ہو گا، اس کا مطلب یہ ہوا کہ زندہ میں نقص کا سبب معرفت کا نقص بنتا ہے، یہ ہیں زندہ کے درجات، ان میں سے ہر درجہ کے متعدد درجات ہیں، اس لئے کہ متعدد کا سمبر مشقت میں کم و بیش کے اعتبار سے متفاوت ہوتا ہے، اسی درجہ میں اگر کوئی زاہد معجب ہو تو اس کا اعجاب بھی زندہ کی طرف اس کے التفات کے اعتبار سے مختلف اور متفاوت ہو گا۔

دوسری تقسیم۔ مرغوب فیہ کے اعتبار سے زندہ کی ایک تقسیم مرغوب فیہ کے اعتبار سے ہوگی، یعنی اس چیز کے اعتبار سے جس کی رغبت کے باعث زندہ کیا جاتا ہے، اس تقسیم کی رو سے بھی زندہ کے تین درجے ہیں۔

پہلا درجہ جو ادنیٰ درجہ ہے یہ ہے کہ مرغوب فیہ دوزخ کا عذاب، اور تمام تکالیف سے نجات ہو جیسے مذاب، قبر، حساب کتاب، پل صراط، اور وہ تمام اہوال جن کا روایات میں ذکر ہے، چنانچہ ایک حدیث میں مذکور ہے کہ آدمی کو حساب کے لئے اتنی دیر کھڑا کیا جائے گا کہ اگر اس کے پسینے سے سوانٹ پیاں بجھانا چاہیں تو سب کا پھٹ بھر جائے (احمد۔ ابن عباس) ان اہوال سے نجات پانے کی رغبت زندہ ہے، لیکن یہ خائفانہ کا زندہ ہے، وہ لوگ گویا عدم پر راضی ہیں اگر انہیں نیست و نابود کر دیا جائے، کیوں کہ تکلیف سے نجات محض عدم سے حاصل ہو جاتی ہے۔

دوسرا درجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ثواب اور اس کی ان نعمتوں، اور لذتوں کی رغبت کی وجہ سے زندہ کی جائے جن کا اس نے اپنی جنت میں عطا کرنے کا وعدہ کر رکھا ہے، یہ امید رکھنے والوں کا خوف ہے، انہوں نے عدم پر اور الم سے نجات پر قناعت کرتے ہوئے دنیا ترک نہیں کی، بلکہ وہ وجود ابدی اور حیات سرمدی کی طمع بھی رکھتے ہیں۔

تیسرا درجہ انتہائی اعلا ہے اور وہ یہ ہے کہ زاہد کی رغبت صرف اللہ تعالیٰ کی ذات، اور اس کے دیدار و ملاقات میں ہو، اس

کامل نہ آلام سے نجات کی طرف ملکت ہوتا ہے اور نہ لذات کے حصول کی طرف متوجہ ہوتا ہے بلکہ وہ اپنے تمام فکر و بہت کے ساتھ اللہ تعالیٰ میں مستغرق رہتا ہے اس کے تمام افکار کا مرکز اور خفی صرف ایک ذات ہوتی ہے یہ شخص موصوفہ حقیقی ہے اس کے یہاں غیر اللہ کی طلب نہیں ہے کیوں کہ وہ یہ بات جانتا ہے کہ جو شخص غیر اللہ کا طالب ہوتا ہے وہ اس کی مہاوت کرتا ہے ہر طالب عابد ہے اور ہر مطلوب معبود ہے اور ہر طالب اپنے مطلوب کی نسبت سے عہد ہے اس کے نزدیک غیر اللہ کی طلب شرک خفی ہے یہ عین کا زید ہے اور یہی لوگ حقیقی معنی میں عارف ہیں کیوں کہ اللہ تعالیٰ سے وہی لوگ محبت کرتے ہیں جو اس کی معرفت رکھتے ہیں جو شخص درہم و دینار سے واقف ہوتا ہے اور یہ بات جانتا ہے کہ میں ان دونوں کو جمع نہیں کر سکتا تو وہ دینار سے محبت کرتا ہے اسی طرح جو شخص اللہ کی ذات اور اس کے رب کہیم کے دیدار کی لذت کی معرفت رکھتا ہے اور یہ بات جانتا ہے کہ لذت دیدار اور لذت حورو و قصور میں اجتماع ناممکن ہے تو وہ صرف لذت دیدار الہی کو ترجیح دیتا ہے یہاں یہ گمان نہ کرنا چاہیے کہ اہل جنت کے دلوں میں جس وقت وہ دیدار الہی کی لذت سے ہم کنار ہوں گے حورو و قصور کی لذت بھی ہوگی ایسا ہرگز نہیں ہے دیدار الہی کی لذت کو جنت کی نعمتوں اور لذتوں سے وہی نسبت ہے جو ایک کمزور پرندے پر قابو پانے اور اس سے کھیل کر لطف اندوز ہونے کو زمین کے وسیع تر رقبوں اور ان میں رہنے والوں پر اقتدار سے ہے جو لوگ جنت کے طالب ہیں وہ اہل دل کے نزدیک اس بچے کی طرح ہیں جو سلطنت کی لذت چھوڑ کر پرندے کے ساتھ کھیلنے کو ترجیح دیتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اقتدار کی لذت سے ناواقف ہے یہ بات نہیں کہ پرندے کے ساتھ کھیلنے میں لذت زیادہ ہے اور اقتدار میں کم ہے۔

تیسری تقسیم۔ مرغوب عنہ کے اعتبار سے : زہد کی ایک تقسیم مرغوب عنہ کے اعتبار سے ہے یعنی ان چیزوں کے اعتبار سے جن سے زہد کرتے ہیں اس سلسلے میں علماء سے بہت سے اقوال منقول ہیں اگر ان کا احاطہ کیا جائے تو غالباً ان کی تعداد سو سے تجاوز کر جائے گی یہاں ہم اقوال نقل کرنے میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہتے بلکہ ایک ایسی جامع گفتگو کرنا چاہتے ہیں جو ان تمام اقوال کو محیط ہو اس سے یہ بات بھی ظاہر ہو جائے گی کہ ازہ اقوال میں سے کوئی قول ایسا نہیں ہے جو نقص سے خالی ہو اور تمام امور کا احاطہ کرتا ہو۔

اصل میں جس چیز سے زہد کیا جائے وہ یا تو مجمل ہے یا مفصل اور مفصل میں بھی چند مراتب ہیں ان میں سے بعض میں افراد کی تفصیل زیادہ ہے اور بعض میں اجمال کے ساتھ تفصیل ہے۔

درجہ اول میں اجمال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا ہر چیز سے زہد کیا جائے یہاں تک کہ اپنے نفس میں بھی زہد کیا جائے اور دوسرے درجے میں اجمال یہ ہے کہ اپنے نفس کو ہر ایسی صفت میں زہد کیا جائے جس میں نفس کو نفع ہو اس میں طبیعت کے تمام متغیبات جیسے شہوت، غضب، کبر، اقتدار، مال اور جاہ وغیرہ شامل ہیں تیسرے درجے کا اجمال یہ ہے کہ مال اور جاہ اور ان کے لوازم و اسباب میں زہد کرے کیوں کہ تمام نفسانی حظوظ کا مرجع یہی دو چیزیں ہیں چوتھے درجے میں اجمال یہ ہے کہ علم، قدرت، دینار، درہم اور جاہ میں زہد کرے کیوں کہ اموال کی خواہ جتنی قسمیں ہوں سب درہم و دینار میں آجاتی ہیں اور جاہ کے خواہ بہت سے اسباب ہوں وہ سب علم اور قدرت کے ضمن میں آجاتے ہیں اور علم و قدرت سے ہماری مراد وہ ہے جس کا مقصود دلوں کا مالک بننا ہو جاہ کا مقصد بھی یہی ہوا ہے کہ دلوں کا مالک بن جائے اور ان پر قدرت حاصل ہو جائے اب اگر اس اجمال کی تفصیل کی جائے تو یہ چیزیں شمار سے باہر بھی ہو سکتی ہیں۔ قرآن کہیم کی آیت میں یہ چیزیں سات بیان کی گئی ہیں :-

زَيْنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِينَ وَالْقَنَاطِيرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ
الْكَهْبِ وَالْأَفْصَىٰ مِنَ الْغَيْبِ الْمَسْئُومَةُ الْأَنْعَامِ وَالْعَزِيزَةُ ذَلِكُمْ مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا۔

(پ ۳۴ آیت ۱۳)

غرضنا معلوم ہوئی ہے (اکثر لوگوں کو مرغوب چیزوں کی محبت (مثلاً) عورتیں، بیٹے، بٹے ہوئے، لکے ہوئے

ڈھیر ہوئے، سونے اور چاندی کے نمبر (نشان) لگے ہوئے گھوڑے (یا دوسرے) مویشی ہوئے اور زراعت ہوئی، یہ سب استغالی چیزیں ہیں دنیوی زندگی کی۔

اس کے بعد ایک آیت میں پانچ چیزیں بیان کی ہیں :-
 اَعْلَمُوا اَنَّهَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا الْعَبَثُ وَلَهُمْ وَزِينَةٌ وَتَفَاخُرٌ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ
 وَالْاَوْلَادِ (پ ۲۷ آیت ۲۰)

تم خوب جان لو کہ دنیوی زندگی محض لہو لعب اور (ظاہری) نعمت اور باہم ایک دوسرے پر فخر کرنا اور اموال و اولاد میں ایک کا دوسرے سے اپنے کو زیادہ ملانا ہے۔

ایک جگہ دو کا ذکر ہے، فرمایا :-

اِنَّمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا الْعَبَثُ وَلَهُمْ (پ ۳۱ آیت ۸۷)

دنیوی زندگی تو محض ایک لہو لعب ہے۔

پھر ایک آیت میں ان سب کو ایک ہی چیز میں منظر کر کے فرمایا :-

وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوَىٰ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ - الْمَاوٰی

(پ ۳۰ آیت ۴۰-۴۱)

اور (جس نے) نفس کو حرام کی خواہش سے روکا سو جنت اس کا مکان ہوگا۔

لفظ ”ہوی“ تمام نفسانی حظوظ کو شامل ہے، اس لئے جو محض ”ہوی“ میں نہہ کرتا ہے وہ گویا تمام نفسانی خواہشات اور لذات میں نہہ کرتا ہے، اس اجمال اور اس کے بعد تفصیل سے ہمیں یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیے کہ ان میں سے بعض چیزیں بعض کی مخالف ہیں یہ سب امور ایک ہیں، ایک فرق ہے تو صرف اس قدر کہ کہیں یہ امور مفصل مذکور ہیں، اور کہیں مجمل۔ خلاصہ یہ ہے کہ بندے کو تمام حظوظ نفسانی سے اپنا رشتہ منقطع کر لینا چاہیے، نفسانی حظوظ سے قطع تعلق کے ساتھ ہی دل سے یہ خواہش بھی نکل جاتی ہے کہ دنیا میں باقی رہے، اس طرح لامحالہ امیدیں مختصر ہو جائیں گی، بلکہ ان کا وجود ہی نہیں رہے گا، آدمی کو اپنی زندگی کی بقاء اسی لئے مطلوب ہوتی ہے کہ دنیا سے مستفید ہو، اور اس کی نعمتوں سے فتنہ حاصل کرے، زندگی کی محبت کے معنی یہی ہیں ہمیشہ دل میں رہے، اگر اس کی محبت باقی نہیں رہے گی تو زندگی کی محبت بھی باقی نہیں رہے گی، اسی لئے جب لوگوں پر جہاد فرض ہوا تو انہوں نے کہا :-

رَبَّنَا لَمَّا كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ لَوْلَا أَخَّرْتَنَا إِلَىٰ أَجَلٍ قَرِيبٍ

(پ ۵ آیت ۷۷)

اے ہمارے پروردگار آپ نے ہم پر جہاد کیوں فرض فرمایا ہم کو اور تھوڑی مدت مہلت دے دی ہوئی۔

اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا :-

قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيلٌ (پ ۵ آیت ۷۷)

آپ کہہ دیجئے کہ دنیا کا متاع محض چند روزہ ہے۔

اس جواب کا حاصل یہ ہے کہ تم اس لئے بھا جا رہے ہو کہ دنیا کی لذات سے فائدہ اٹھا سکو، اور وہ بہت مختصر ہیں، بہت معمولی ہیں، اس آیت کے نزول کے بعد زاہدین اور متائقین کل کر سامنے آ گئے، وہ زاہدین جو اللہ سے محبت رکھتے تھے اللہ کی راہ میں پوری جان بازی کے ساتھ لڑے، اور کفار کے مقابلے میں بیسہ پلائی ہوئی دیوار بن گئے، اور وہ عمدہ باتوں میں سے ایک کے متحمل ہوئے، ان حضرات کا یہ حال تھا کہ جب انہیں جہاد کی دعوت دی جاتی تھی تو ان کے دل و دماغ میں جنت کی خوشبو بس جاتی تھی، اور وہ میدان جہاد کی

طرف اس طرح دوڑے تھے جس طرح یا سائنس کی طرف دوڑتا ہے، انہیں اللہ کے دین کے لئے نصرت اور شہادت حاصل کرنے کا جذبہ کفار کے ساتھ لڑنے پر مجبور کرتا تھا، اگر ان میں سے کوئی عام انسانوں کی طرح بہتر مرتبہ تھا تو اسے شہادت نصیب نہ ہونے کی حسرت رہتی تھی، چنانچہ جب حضرت خالد ابن الولید کی وفات کا وقت قریب آیا، اور نزاع کا عالم طاری ہوا تو کہنے لگے کہ میں شہادت کی توقع میں اپنی جان ہتھیلی پر لئے بھرا، اور کفار کی غلوں پر حملہ آور ہوا، لیکن آج بوزخوں کی طرح مر رہا ہوں، روایت ہے کہ جب آپ کی وفات ہوئی تو آپ کے جسموں پر زخموں کے آٹھ سو نشانے تھے، یہ حال تھا پختہ تھیں، اور سچے ایمان والوں کا۔ دوسری طرف منافقین تھے، یہ لوگ موت کے خوف سے جہاد کا نام سن کر لرزے لگتے تھے، چنانچہ ان سے کہا گیا :-

إِنَّ الْمَوْتَ الَّذِي تَفِرُّونَ مِنْهُ فَإِنَّهُ مُلَاقِيكُمْ (پ ۲۸ ر ۸ آیت ۸)

آپ کہہ دیجئے کہ جس موت سے تم بھاگتے ہو وہ تم کو آچکے گی۔

ان لوگوں نے زندہ رہنے کو شہادت پر ترجیح دی، گویا اعلا کے بدلے میں ادنیٰ چیز قبول کی، قرآن کریم میں ایسے ہی لوگوں کے متعلق کہا گیا ہے :-

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَالََةَ بِالْهَدٰی فَمَا رَبُّ حَتَّٰ نَبَحًا لَهُمْ وَمَا كَانُوا لَهُمْ قٰتِلِیْنَ۔

(پ ۲ ر ۲ آیت ۲۹)

یہ وہ لوگ ہیں کہ انہوں نے گمراہی لے لی بجائے ہدایت کے تو سود مند نہ ہوئی ان کی یہ تجارت اور نہ یہ

ٹھیک طریقہ پر چلے۔

جب کہ مخلصین اللہ تعالیٰ کے ہاتھ اپنی جان اور مال اس وعدے پر فروخت کر چکے ہیں کہ ان کے لئے جنت ہے، جب وہ یہ دیکھیں گے کہ میں اور میں برس تک دنیاوی لذات چھوڑنے کے نتیجے میں انہیں ہمیشہ کی زندگی اور عیش ملی ہے تو اپنے اس معاملے سے خوش ہوں گے جو انہوں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کیا تھا۔

زہد کے سلسلے میں مختلف اقوال : اس وضاحت کے بعد تم زہد کی تفصیل جان چکے ہو اور یہ بات بھی تمہارے علم میں آ گئی ہے کہ زہد کے سلسلے میں ہرگز کوں کے جتنے بھی اقوال وارد ہیں وہ زہد کی بعض اقسام پر مشتمل ہیں، ہر شخص نے زہد کی تعریف بیان کرنے میں یا تو مخاطب کے احوال کی رعایت کی ہے، یا نفس پر جس وصف کا قلبہ دیکھا ہے وہ بیان کر دیا ہے، چنانچہ حضرت بشر فرماتے ہیں دنیا کا زہد یہ ہے کہ دنیا میں زہد کرو، اس قول میں انہوں نے خاص طور پر جاہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ قاسم جوئی کہتے ہیں کہ زہد پیٹ کا زہد ہے، جس قدر تم اپنے پیٹ پر قادر ہو گے اسی قدر تمہارے پاس زہد ہو گا، اس میں ایک مخصوص خواہش کی طرف اشارہ ہے، حقیقت میں پیٹ کی شہوت تمام شہوات سے زیادہ شرانگیز ہے، اور اکثر شہوات کا سرچشمہ یہی ایک شہوت ہے، حضرت فضیلؒ فرماتے ہیں کہ زہد سے مراد قناعت ہے۔ اس قول میں مال کے زہد کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ حضرت سفیان ثوریؒ فرماتے ہیں کہ زہد امیدوں کو مخفیہ کرنے کا نام ہے، یہ قول تمام شہوات کو محیط ہے، کیوں کہ جب کسی شخص کے دل میں کوئی شہوت پیدا ہوتی ہے تو وہ اس کی پھان کا آرزو مند ہوتا ہے، جس کے دل میں کوئی آرزو نہیں ہوتی وہ شہوات سے محفوظ رہتا ہے، حضرت اویسؒ فرماتے ہیں کہ زہد کے زہد کے لئے طلب معیشت تم قائل ہے، اس قول میں زہد کے لئے توکل کی شرط لگائی گئی ہے۔ محدثین کے نزدیک دنیا رائے اور عقل کے بموجب عمل کرنے کا نام ہے، اور زہد علم اور سنت کی اتباع کو کہتے ہیں، اس قول میں اگر رائے سے فاسد رائے، اور عقل سے وہ عقل مراد لی جائے جس سے دنیا میں جاہ طلب کی جاتی ہے تو یہ قول درست ہے، لیکن اس میں جاہ کے صرف بعض اسباب کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، یا ایسی شہوات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو فضول ہیں، مثلاً بعض علوم سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا، اور لوگوں نے انہیں اتنا مفصل کر دیا ہے کہ اگر تمام عمر ان علوم کی تحصیل میں مصروف رہا جائے تو عمر تمام ہو جائے، علوم حاصل نہ ہوں، ظاہر ہے کہ یہ علوم فضول ہیں، اور زہد کا ان سے بچنا ضروری ہے۔ حضرت حسن بصریؒ کہتے ہیں کہ زہد وہ ہے جو

اپنے علاوہ کسی کو دیکھے تو یہ کہے کہ مجھ سے بہتر ہے۔ گویا انہوں نے تواضع کو زہد کہا ہے، اس قول میں عجب اور جاہ پسندی کی ممانعت ہے جو زہد کی ایک قسم ہے۔ بعض لوگوں کا قول ہے کہ زہد طلب حلال کا نام ہے، اس قول کی نسبت حضرت اولیس کی طرف کی گئی ہے، حالانکہ ان کے قول سے اس کو ذرا مناسبت نہیں ہے، ان کا کہنا یہ ہے کہ زہد ترک طلب کو کہتے ہیں ان کا منشاء یہ ہے کہ زہد کو طلب حلال میں بھی مشغول نہ ہونا چاہیے۔ یوسف ابن اسباط کہتے ہیں کہ جو شخص اذیت پر صبر کرے، شہوات ترک کر دے، اور حلال ذرائع سے رزق حاصل کرے وہ حقیقت میں زہد ہے۔

اقوال میں اختلاف کی نوعیت زہد کے سلسلے میں ان کے علاوہ بھی بے شمار اقوال ہیں۔ یہاں ان کا احاطہ کرنے سے کوئی قاعدہ نہیں ہے، بلکہ نقصان ہے، کیوں کہ جو شخص حقائق امور کی طلب میں مشغول ہے وہ اتنے بہت سے اقوال دیکھ کر حیران اور پریشان ہو جائے گا، اور یہ نہیں جان پائے گا کہ ان میں سے کون سا قول زہد کی حقیقت کو جامع ہے، الّا یہ کہ کوئی شخص مشاہدہ باطنی سے حقیقت واقفہ کا اور اک کر لے، اس صورت میں سنی سنائی باتیں اس کے حق میں مفید ثابت نہیں ہوں گی، وہ امر حق دریافت کر چکا ہے، تاہم یہ ہو سکتا ہے کہ وہ ان اقوال کی نشاندہی کر دے جن میں کہنے والوں نے کوتاہی کی ہے، یا اس قدر بیان کیا ہے جس قدر بیان کرنے کی حاجت تھی، اگرچہ انہیں کمال معرفت تھا اور وہ زہد کی حقیقت بیان کر سکتے تھے۔ لیکن انہوں نے اختصار پر اکتفا کیا، اس کی وجہ یہی تھی کہ وہ مخاطب کے حالات کی رعایت کرتے ہوئے گفتگو کرتے تھے، اور ان کے سامنے ضرورت ہوتی تھی، اور ضرورتیں مختلف اوقات میں مختلف ہو سکتی ہیں، اس لئے ان کے اقوال مختلف نظر آتے ہیں۔

بعض اوقات ان بزرگوں کے اقوال میں اس لئے بھی اختصار ہوتا ہے کہ ان کا مقصد ان اقوال کے ذریعے اس حال کی خبر دینا ہے جو دائمی ہوتا ہے، یہ حال بھی بندے کا ایک مقام ہے اور ہر بندہ کا حال مختلف ہوتا ہے، اس لئے جن کلمات کے ذریعے اس حال کی خبر دی جائے گی وہ بھی مختلف ہوں گے۔ لیکن حقیقت میں امر حق ایک ہو گا، اس کا مختلف ہونا ممکن نہیں ہے۔

امر حق کیا ہے؟ ان مختلف اقوال میں جامع ترین قول حضرت ابو سلیمان دارانی کا ہے، اگرچہ اس قول میں تفصیل نہیں ہے، لیکن یہ اپنے موضوع کے تمام گوشوں کا محیط ہے، فرماتے ہیں کہ ہم نے زہد کے متعلق بہت کچھ باتیں سنی ہیں لیکن ہمارے نزدیک زہد ہر ایسی چیز کو ترک کر دینا ہے جو اللہ تعالیٰ سے دور کرے، ایک مرتبہ انہوں نے اس اجمال کی تفصیل بھی فرمائی کہ جو شخص شادی کرتا ہے، یا طلب معیشت کے لئے سفر کرتا ہے یا حدیث لگتا ہے وہ دنیا کی طرف مائل ہوتا ہے، گویا انہوں نے ان تمام امور کو زہد کی ضد قرار دیا ہے، ایک مرتبہ انہوں نے قرآن کریم کی یہ آیت تلاوت کی :-

اَلَا مَنْ اَتَى اللّٰهَ يَطْلُبُ سَلٰمًا (پ ۱۹ ر ۹ آیت ۸۹)

مگر ہاں جو اللہ کے پاس پاک دل لے کر آئے گا۔

اور فرمایا کہ اس آیت میں دل سے مراد وہ دل ہے جس میں اللہ تعالیٰ کے سوا کچھ نہ ہو، انہوں نے یہ بھی کہا کہ جن لوگوں نے زہد کیا ہے ان کا مقصد یہ تھا کہ ان کے قلوب تمام دنیوی افکار اور خیالات سے آزاد ہو کر آخرت کی فکر میں مشغول ہو جائیں۔

زہد کے احکام : اب تک زہد کی تین تقسیمیں کی گئی ہیں، اور ہر تقسیم کے مختلف درجات بیان کئے گئے ہیں، اب اس کی ایک اور تقسیم بیان کی جاتی ہے، اس کا تعلق زہد کے احکام سے ہے۔ چنانچہ احکام کی رو سے بھی زہد کی تین قسمیں ہیں، فرض، نفل اور سلامت۔ یہ تقسیم حضرت ابن ادہم سے منقول ہے۔ فرض زہد کا تعلق حرام سے ہے، اور نفل کا تعلق حلال سے ہے، اور سلامت کا تعلق مشہات سے ہے۔ اس کی تفصیل حلال و حرام کے باب میں درجات و درجہ کے ضمن میں لکھی گئی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ درجہ بھی زہد ہے۔ جیسا کہ حضرت مالک ابن انس سے دریافت کیا گیا کہ زہد کیا چیز ہے؟ فرمایا : تقویٰ ہے۔ اگر زہد کو محض امور کے لحاظ سے دیکھا جائے تو ان کی کوئی انتہا نہیں ہے، نفس جن خطرات، لحظات اور حالات سے متعصم ہوا ہے وہ بے شمار ہیں،

خاص طور پر ریا کے عقلی امور نہ صرف یہ کہ لامتناہی ہیں بلکہ انتہائی پیچید اور دقیق بھی ہیں، ان پر صرف اونچے درجے کے علماء ہی مطلع ہو سکتے ہیں، ظاہری اموال میں بھی زہد کے درجات بے شمار ہیں اور ان میں اعلیٰ ترین درجہ حضرت میسئ علیہ السلام کے زہد کا ہے وہ ایک مرتبہ سر کے نیچے پتھر رکھ کر سو گئے تو شیطان نے ان پر دنیا ترک نہ کرنے کا الزام لگایا اور کہنے لگا کہ آپ نے تو دنیا ترک کر دی تھی، پھر یہ کیا ہے؟ حضرت میسئ علیہ السلام نے اس سے دریافت کیا کہ تو نے میرے کس عمل سے یہ اندازہ لگایا کہ میں طالب دنیا ہوں؟ اس نے کہا کہ اس پتھر سے جو آپ نے سر کے نیچے رکھ لیا ہے، کیا یہ دنیا طلبی نہیں ہے کہ سراونچار ہے اور آرام ملے، آپ نے فواۓ پتھر نکال کر دور پھینک دیا اور فرمایا کہ اپنی دنیا اور پھر دونوں کو لے جا۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ وہ ٹاٹ کے کپڑے پہنا کرتے تھے، یہاں تک کہ ان کے جسم پر ٹاٹ کے نشان بن گئے تھے، بلکہ وہ نشان زخم کی صورت اختیار کر گئے تھے۔ ٹاٹ کے لباس کو وہ اس لئے پسند کرتے تھے کہ جسم سختی کا عادی رہے، اور لباس کی نرمی سے جسم کو راحت نہ ملے ایک روز ان کی والدہ نے کہا کہ تم اون کیوں نہیں پہن لیتے، حضرت یحییٰ نے ماں کے حکم پر اون کا لباس پہن لیا، اسی وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی آئی کہ تو نے مجھ پر دنیا کو ترجیح دی ہے یہ سن کر حضرت یحییٰ رونے لگے، انہوں نے اپنی لباس اتار پھینکا، اور حسب سابق ٹاٹ کے کپڑے پہن لئے، حضرت امام احمد فرماتے ہیں کہ زہد تو ایس کا تھا کہ برہنگی سے یہ عالم ہو گیا تھا کہ ستر چھپانے کے لئے ٹاٹ کی ایک بوری میں پناہ لیتی پڑی۔ حضرت میسئ علیہ السلام ایک دیوار کے سائے میں کچھ دیر کے لئے بیٹھ گئے، دیوار کے مالک نے انہیں وہاں سے اٹھا دیا، حضرت میسئ علیہ السلام نے فرمایا کہ تو نے مجھے نہیں اٹھایا بلکہ اس نے اٹھایا ہے جسے یہ منظور نہیں کہ میں سائے کی راحت حاصل کروں۔

بہر حال ظاہر و باطن میں زہد کے بے شمار درجات ہیں، ان میں سے اعلیٰ ترین درجہ ابھی بیان کیا گیا ہے، زہد کا کم سے کم درجہ یہ ہے کہ آدمی حرام اور مشتبہ چیزوں میں زہد کرے۔ بعض لوگ حلال چیزوں میں زہد کو معتبر جانتے ہیں، حرام اور مشتبہ چیزوں میں زہد کو زہد نہیں کہتے، اس کے بعد انہوں نے یہ دیکھا کہ اس زمانے میں طال کا وجود نہیں ہے اس لئے ان کے نزدیک زہد ناممکن ہے۔

ماسوی اللہ کے ترک کا مطلب جیسا کہ حضرت ابو سلیمان دارانی کے حوالے سے بیان کیا گیا ہے کہ ماسوی اللہ کو ترک کر دینا زہد ہے ہم نے زہد کی اس تعریف کو مکمل اور جامع کہا ہے۔ اس پر یہ اعتراض وارد ہو سکتا ہے کہ تمہاری تعریف کی رو سے کھانے پینے میں، لباس پہننے میں، اور لوگوں کے ساتھ بات چیت کرنے میں مشغول ہونا غیر اللہ کے ساتھ مشغول ہونا ہے، اور یہ چیزیں ناگزیر ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ کوئی شخص زاہد نہیں ہو سکتا، کیوں کہ کسی ایسے شخص کا تصور ممکن نہیں جو کھائے پئے بغیر زندہ رہ سکے، لباس پہنے بغیر اپنی عریانی چھپا سکے، اور لوگوں سے گفتگو کے بغیر زندہ رہ سکے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ دنیا سے منحرف ہو کر اللہ تعالیٰ کی طرف سے دل کی پوری توجہ کے ساتھ ذکر اور فکر کے ذریعے متوجہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی ماسوی اللہ کا تارک اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ مشغول ہے، اور یہ ترک و اشتغال، خیر زندگی کے ممکن نہیں ہے، اور زندگی کے لئے ضروریات زندگی ناگزیر ہیں، چنانچہ اگر تم بدن کو مملکت بدن سے محفوظ رکھتے ہو، اور تمہارا مقصد اس بدن سے عبادت پر مہم دلنا ہے تو یہ نہیں کہا جائے گا کہ تم غیر اللہ میں مشغول ہو، اس لئے کہ جو چیز ایسی ہو کہ اس کے بغیر مقصد کا حصول ممکن نہ ہو تو اسے مقصود ہی کہا جائے گا۔ مثلاً اگر ایک شخص حج کے راستے میں ہے اور اپنی سواری کے داند پانی میں مشغول ہوتا ہے تو یہ نہیں کہا جائے گا کہ وہ حج کے علاوہ کسی دوسری چیز میں مشغول ہے، بلکہ سواری کی نگہداشت بھی حج ہی کا ایک جزء ہے۔ لیکن اللہ کے راستے میں تمہارا بدن ایسا ہی ہونا چاہیے جیسے اونٹنی حج کے سفر میں، اونٹنی کی نگہداشت سے تمہارا مقصد حصول حرم نہیں ہے، بلکہ قطع مسافت ہے، اسی طرح تمہیں اپنے جسم کی اسی حد تک نگہداشت کرنی چاہیے کہ تم اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ کا راستہ ملے کر سکو۔ سواری کو تم طرح طرح کی غذا میں نہیں کھلاتے، بلکہ صرف اسی حد تک اس کا آب و دانہ کرتے ہو کہ وہ زندہ رہ کر تمہاری مدد کر سکے، اسی طرح تمہیں اپنی ضروریات زندگی یعنی کھانے، پینے، پہننے، اور رہنے میں بھی مقدار ضرورت پر اکتفا

کرنا چاہیے۔ مقصد لذت اندوزی اور حصول آسائش نہ ہو، صرف طاقت الٰہی پر قوت کا حصول مقصود ہو، اور یہ چیز زندہ کے خلاف نہیں ہے، بلکہ زندہ کے لئے شرط ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ جب آدمی بھوک کے وقت کھانا کھائے گا تو اسے لافضل لذت حاصل ہوگی، ہم یہ کہتے ہیں کہ اس طرح کی لذت معرض نہیں ہے، چنانچہ اگر کوئی شخص اپنی پیتا ہے اور اسے اس میں لذت ملتی ہے تو یہ نہیں کہا جائے گا کہ اس کا مقصد لذت ہے بلکہ پیاس کی تکلیف دور کرنا اس کا مقصد ہے، جیسے کوئی شخص قصائے حاجت کرتا ہے اس میں بھی راحت ملتی ہے، لیکن اس راحت کو مقصود نہیں سمجھا جاسکتا، اسی لئے دل اس کی طرف مائل نہیں ہوتا، اسی طرح اگر کوئی شخص تہجد کے لئے اٹھتا ہے، اور اس وقت کی خوشگوار اور تازہ ہوا اسے اچھی لگتی ہے، یا پرندوں کے دل کش نغمے اس کے کانوں کو بھلے معلوم ہوتے ہیں تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے، بشرطیکہ مقصد ٹھنڈی ہوا کھانا اور پرندوں کے نغمے سننا نہ ہو، یہ چیزیں اس وقت مقصد میں داخل ہوں گی جب تہجد کے لئے اٹھنے والا خاص طور پر ایسی جگہ منتخب کرے گا جہاں کی ہوا خوشگوار ہو، اور جہاں پرندوں کے نغمے گونجتے ہوں، اگر قصد ارادے کے بغیر کوئی ایسی جگہ ہاتھ آجائے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے حالانکہ خائفین میں ایسے لوگ بھی تھے جنہوں نے تہجد کی نماز کے لئے ایسی جگہ منتخب کی جہاں خوش گوار ہوا، اور خوش الحانی پرندوں کا گزرنہ ہو، اس خوف سے کہ کہیں دل ان چیزوں سے مانوس نہ ہو جائیں، ان کے ساتھ دل کا مانوس ہونا دنیا کے ساتھ مانوس ہونا ہے، اور جس قدر آدمی غیر اللہ سے مانوس ہوتا ہے اسی قدر اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس کی انسیت میں خلل واقع ہوتا ہے۔ حضرت داؤد طائی اپنے لئے پینے کا پانی کھلے ہوئے منہ کے گھڑے میں رکھتے، اور اسے دھوپ میں رہنے دیتے، گرم پانی پینا ان کے معمولات میں داخل تھا، فرماتے تھے کہ جو شخص ٹھنڈا پانی پیتا ہے اس کے لئے دنیا ترک کرنا مشکل ہو جاتا ہے، یہ خوف صرف احتیاط پسند حضرات کے ساتھ مخصوص ہے، یہ احتیاط ٹھنڈی کی دلیل ہے، اگرچہ اس میں سخت دشواریاں ہیں، ہر شخص ان دشواریوں کا تحمل نہیں ہو سکتا، لیکن جو شخص طبیعت پر جبر کر کے دشواریوں کا عادی ہو جاتا ہے وہ فائدے میں رہتا ہے، کیوں کہ اس میں چند روزہ لذت کا ترک ہے، اور اسکے نتیجے میں عیش جاوداں حاصل ہوتی ہے، اہل معرفت ان مشکلات کو انگیز کرتے ہیں، اور نفس کو شریعت کے تھلائے ہوئے طریقہ تدبیر سے دہائے رکھتے ہیں، اور یقین کی مضبوطی سی قہارے رہتے ہیں۔

ضروریات زندگی میں زہد کی تفصیل

جاننا چاہیے کہ جن چیزوں میں لوگ مشغول رہتے ہیں وہ دو طرح کی ہیں، بعض فضول ہیں، اور بعض وہم، فضول کی مثال ایسی ہے جیسے فریہ و توانا گھوڑے، عام طور پر لوگ سواری میں راحت پانے کے لئے گھوڑوں کی پرورش کرتے ہیں، حالانکہ وہ چاہیں تو پیادل چل کر بھی اپنی ضرورتیں پوری کر سکتے ہیں، اور اہم چیزوں کی مثال کھانا پینا ہے۔ جہاں تک فضولیات کا تعلق ہے ہم ان کی تفصیل نہیں کر سکتے، اس لئے کہ یہ بے شمار ہیں، البتہ ضروری چیزوں کا شمار سہولت سے ہو سکتا ہے، ان ضروری چیزوں کی مقادیر، اجناس اور اوقات میں فضولیات کا دخل ممکن ہے، لہذا ان میں زہد کا طریقہ بیان کرتے ہیں۔

ضروریات زندگی زندگی کے لئے جن چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے وہ چھ ہیں، غذا، لباس، مسکن، خانہ داری کے اسباب، اہل و عیال اور مال۔ پھر ان چھ چیزوں کے حصول کے لئے جاہ کی بھی ضرورت ہے، یہاں جاہ سے کیا مراد ہے، اور وہ کون سے اسباب ہیں جن کی وجہ سے مخلوق کو محبت ہوتی ہے اور وہ اغراض کی تکمیل میں تعاون کرتے ہیں، اس موضوع پر ہم نے تیسری جلد کی کتاب الریاء میں گفتگو کی ہے۔ اس لئے یہاں صرف مذکورہ بالا چھ چیزوں پر گفتگو کرتے ہیں۔

پہلی ضرورت غذا ان میں پہلی ضرورت غذا ہے، اور آدمی کے لئے اسی قدر غذا کی ضرورت ہے جو اس کی جسمانی طاقت و توانائی بحال رکھ سکے، لیکن زہد کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی اس کا طول و عرض کم کرے، طول عمر کے اعتبار سے ہے، عام طور پر یہ دیکھا

جاتا ہے کہ جو شخص ایک دن کی غذا رکھتا ہے وہ اس پر قناعت نہیں کرتا، بلکہ مزید کی ہوس کرتا ہے، عرض کی تعلق غذا کی مقدار، نوعیت اور وقت سے ہے۔

غذا کا طول امیدوں کو مختصر کر کے کم کیا جاسکتا ہے، اور زہد کا کم سے کم درجہ یہ ہے کہ جب شدت کی بھوک محسوس ہو اور مرض کا اندیشہ ہو تو مقدار کفایت پر اکتفا کر کے بھوک کا تذکرہ کرے، جس شخص کا یہ حال ہو گا وہ دن کی غذا میں سے رات کے لئے بچا کر نہیں رکھے گا، یہ درجہ انتہائی اعلا درجہ ہے، دو سرا درجہ یہ ہے کہ ایک مہینے یا چالیس دن کے لئے غذا کا ذخیرہ کرے، اور تیسرا درجہ یہ ہے کہ ایک سال کے لئے ذخیرہ کرے، یہ کمزور قسم کے زاہدین کا حال ہے، جو لوگ ایک برس سے بھی زیادہ مدت کے لئے ذخیرہ کرتے ہیں انہیں کسی بھی درجے میں زاہد نہیں کہا جاسکتا۔ اس لئے کہ وہ ایک سال سے زیادہ جینے کی توقع رکھتا ہے، یہ طول اہل ہے، اور طول اہل رکھنے والا شخص زاہد نہیں ہو سکتا۔ ہاں اگر کسی شخص کے پاس مستقل آمدنی کا ذریعہ نہیں ہے، اور لوگوں کا مال لینے پر اس کی طبیعت آمادہ نہ ہو تب ایک برس سے زائد عرصے کے لئے بھی مال لینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، جیسے حضرت داؤد طائی کو وراثت میں بیس دینار ملے، آپ نے وہ دینار ایک طرف رکھ دیے، بیس برس کے بعد انہیں اپنی ضرورت میں استعمال کیا، ان کا یہ فعل نفس زہد کے خلاف نہیں ہے، البتہ وہ لوگ اسے صحیح نہیں کہتے جو زہد میں توکل کی شرط لگاتے ہیں۔

جیسا کہ بیان کیا گیا ہے کہ عرض کا تعلق مقدار، جس اور وقت سے ہے، مقدار میں کمی کی صورت یہ ہے کہ ایک دن رات میں نصف رطل (پاؤنڈ) سے زیادہ نہ کھائے، یہ مقدار غذا کا کم تر درجہ ہے، اور اوسط درجہ ایک رطل ہے۔ اور اعلا درجہ ایک مد ہے یہ وہ مقدار ہے جو اللہ تعالیٰ نے کفارے وغیرہ میں مساکین کو کھلانے کے لئے مقرر فرمائی ہے اگر کسی کی خوراک اس سے زیادہ ہے تو یہ حکم پرستی، ہوس گیری اور بسیار خوری ہے جو شخص ایک مد پر قناعت نہیں سکتا اسے پیٹ کا زہد نصیب نہیں ہو سکتا، جس کے اعتبار سے کم تر غذا بھوسی کی روٹی بھی ہو سکتی ہے، اور اوسط درجے کی غذا جو اور پنے کی روٹی ہے، اور اعلا درجے میں بغیر چھنے آنے کی روٹی ہے، اگر کسی نے چھنے ہوئے آنے کی روٹی کھائی تو یہ بیش کوشی ہوگی، اور اسے زہد کا ابتداء ہی حصہ بھی نصیب نہیں ہوگا، چہ جائیکہ اعلا حصہ ملے۔ سالن میں اقل درجہ نمک، سبزی اور سرکہ ہے، اوسط درجہ میں زیتون یا دوسری چکنائی ہے جو مقدار میں برائے نام ہو اور اعلا درجے میں گوشت ہے، خواہ کسی بھی قسم کا ہو، لیکن یہ بھنے میں ایک دو روز ہونا چاہیے، اس سے زیادہ ہو گا تو زہد کی تمام قسموں سے خارج کر دیا جائے گا۔ وقت کی کمی کا کم سے کم درجہ یہ ہے کہ رات دن میں صرف ایک بار کھائے، اور اس پر عمل اس صورت میں ہو سکتا ہے کہ دن میں روزے سے رہے اور اوسط درجہ یہ ہے کہ ایک دن روزہ رکھے رات کو کھانا نہ کھائے پانی پی لے، اور دوسرے دن بھی روزہ رکھے، اس دن کھانا کھائے پانی نہ پیئے، اور اعلا درجہ یہ ہے کہ تین دن یا ہفتہ بھر یا اس سے زیادہ مدت تک کے لئے روزہ رکھے، ہم نے جلد ثالث میں اس موضوع پر گفتگو کی ہے کہ خوراک کی مقدار کیسے کم کی جائے اور اس کی حرص کا خاتمہ کس طرح کیا جائے۔ زاہدین کو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے حالات بھی اپنے سامنے رکھنے چاہئیں کہ انہوں نے کھانے میں کس طرح زہد کیا، اور کس طرح سالن کا استعمال ترک کیا، حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ ہم پر چالیس راتیں اس طرح گزر جاتی تھیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں نہ چراغ جلتا تھا، اور نہ آگ روشن ہوتی تھی، لوگوں نے سوال کیا پھر آپ کیا چیز کھا کر زندہ رہتے تھے؟ انہوں نے جواب دیا دو سیاہ چیزیں۔ گھور اور پانی۔ سے زندگی گزارتے تھے (ابن ماجہ۔ عائشہؓ) اس حدیث سے گوشت، شوربا اور سالن کا ترک ثابت ہوتا ہے، حضرت حسنؓ فرماتے ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم گدھے کی سواری کرتے تھے، اون پہنٹے تھے، پیوند لگے ہوئے جوتے پہنا کرتے تھے، کھانے کے بعد اپنی انگلیاں چاٹتے تھے، زمین پر بیٹھ کر کھانا تناول فرمایا کرتے تھے، اور ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ میں بندہ ہوں، بندوں کی طرح کھاتا ہوں، اور بندوں کی طرح بیٹھتا ہوں (۱)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں کہ میں تم سے سچ کہتا ہوں جو شخص جنت کا طالبگار ہو اس کے لئے جو کی روٹی اور کتوں کے ماتھے ٹالیوں پر سونا بہت ہے۔ حضرت قتیبہؒ فرماتے ہیں جب سے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ تشریف لائے آپ نے کبھی تین روز تک شکم سیر ہو کر گیہوں کی روٹی نہیں کھائی۔ (۲) (یہ روایت گذشتہ صفحہ کے حاشیہ پر ملاحظہ فرمائیں) (حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنی قوم سے ارشاد فرماتے تھے: اے بنی اسرائیل! خالص پانی پیو، جنگل کی سبزی کھاؤ، جو کی روٹی استعمال کرو، گیہوں کی روٹی ہرگز نہ کھاؤ اس لئے کہ تم اس کا شکر ادا نہ کر سکو گے، ہم نے کھانے پینے میں انبیاءِ صادقین اور سلفِ صالحین کے حالات اور واقعات تیسری جلد میں لکھے ہیں، یہاں ان کا اعادہ غیر ضروری ہے، روایات میں ہے کہ جب سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم قباء میں تشریف لائے تو لوگوں نے آپ کی خدمت میں شہد کا شربت پیش کیا، آپ نے شربت کا پیالہ ہاتھ سے رکھ دیا، اور فرمایا کہ میں اسے حرام نہیں کرتا، البتہ اللہ تعالیٰ کے لئے بطور تواضع اس کا پینا ترک کرتا ہوں۔ (۳) (یہ روایت گذشتہ صفحہ کے حاشیہ پر ملاحظہ فرمائیں) ایک مرتبہ کچھ لوگوں نے حضرت عمرؓ کی خدمت میں شہد کا ٹھنڈا شربت پیش کیا، گرمی کے دن تھے، آپ نے شربت لانے والوں سے فرمایا کہ اس کا حساب مجھ سے دور کرو۔ حضرت یحییٰ ابن معاذ رازی فرماتے ہیں کہ زاہد صادق وہ ہے جو میرغذا پر قناعت کرے، ستر عورت کے بقدر لباس پہنے، اور جمال جگہ ملے وہاں رہے، دنیا اس کے لئے قہر خانہ ہو، قبر کو آرام گاہ تصور کرے، خاک کو بستر، اور تقویٰ کو زارِ داہ سمجھے، سکوت کو قیمت، صبر کو تکیہ، توکل کو حسب، محض کو راہِ نما، عبادت کو پیشہ اور جنت کو منزل قرار دے۔

دوسری ضرورت لباس انسان کی دوسری ضرورت لباس ہے، اس میں کم سے کم درجہ اس لباس کا ہے جو سردی اور گرمی سے حفاظت کرے، ستر عورت کے لئے کافی ہو، ان دونوں مقاصد کے لئے ایک چادر ہونی چاہیے جو پورا جسم ڈھانپ سکے، اور اوسط درجہ یہ ہے کہ ایک قمیض، ایک ٹوپی، اور ایک جوڑا جو تھوڑا سا ہو، اعلا درجہ یہ ہے کہ ان تینوں چیزوں کے ساتھ ایک رومال، اور پاجامے کا بھی اضافہ کر لیا جائے۔ جو کپڑا اس مقدار سے زائد ہو گا وہ زہد کی حدود سے تجاوز سمجھا جائے گا۔ زہد کی شرط یہ ہے کہ جب وہ کپڑے دھوئے تو ان کی جگہ پہننے کے لئے اس کے پاس دوسرے کپڑے نہ ہوں، بلکہ جب تک کپڑے نہ سوکھیں وہ گھر میں مقید رہنے پر مجبور ہو۔ اگر کسی شخص کے پاس دو قمیضیں، دو پاجامے اور دو عمامے ہوں تو وہ مقدارِ لباس میں زہد کے تمام ابواب سے خارج ہے۔ جس لباس میں ادنیٰ درجہ کھردرا ٹاٹ ہے، اور متوسط درجہ موٹا کپڑا ہے، اور اعلا درجہ روٹی کا موٹا کپڑا ہے، اور وقت کے اعتبار سے اعلا درجہ یہ ہے کہ ایک برس کی مدت کے لئے کافی ہو جائے، اور کم سے کم درجہ یہ ہے کہ ایک دن کے لئے کافی ہو، چنانچہ بعض لوگ اپنے کپڑوں میں پتوں کا بیوند لگایا کرتے تھے، یہ اگرچہ بہت جلد خشک ہو کر ٹوٹ جاتے ہیں، لیکن وقتی طور پر ان سے جسم چھپایا جاسکتا ہے، اوسط درجہ میں وہ لباس ہے جو جسم پر تقریباً ایک ماہ تک برقرار رہ سکے، ایسا لباس تلاش کرنا جو سال بھر سے زیادہ چلے طول اہل ہے، اور زہد کے خلاف ہے، لہذا یہ کہ مقصود موٹا کپڑا ہو، اور موٹا کپڑا واٹھنا دیرپا ہوتا ہے، جس شخص کے پاس اس مقدار سے زائد کپڑا آئے اسے صدقہ کر دینا چاہیے، اگر اس نے یہ کپڑا اپنے پاس باقی رکھا تو یہ زہد نہیں ہو گا، بلکہ دنیا سے محبت ہو گی، ہمیں انبیائے کرام اور صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے حالات پر نظر رکھنی چاہیے کہ انہوں نے عمدہ لباس کس طرح ترک کر دیا تھا۔ ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت عائشہؓ ہمارے سامنے نمدے کی ایک چادر اور ایک موٹا تہبند نکال کر لائیں اور فرماتے لگیں کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دو کپڑوں میں انتقال فرمایا (بخاری و مسلم) ایک حدیث میں ہے کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ مبتذل سے محبت کرتا ہے جسے یہ پروا نہ ہو کہ وہ کیا پہن رہا ہے (۱) حضرت عمو ابن الاسود العنسی فرماتے ہیں کہ میں کبھی مشہور کپڑا نہیں پہنوں گا اور نہ رات میں کپڑے پر آرام کروں گا، نہ عمدہ سواری پر سوار ہوں گا اور نہ کبھی پیٹ بھر کر کھانا کھاؤں گا، حضرت عمرؓ نے یہ سن کر ارشاد فرمایا کہ جو شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت و کردار کا مشاہدہ کرنا چاہتا ہو وہ عمو ابن الاسود کو دیکھ لے (احمد)۔ ایک روایت میں ہے، ارشاد

مَا مِنْ عَبْدٍ لَيْسَ ثَوْبُ شَهْرَةٍ إِلَّا أَعْرَضَ اللَّهُ عَنْهُ حَتَّى يَنْتَهِ عَمَلُهُ كَانَ عِنْدَهُ حَبِيبًا
(ابن ماجہ - ابوزر)

جو بندہ شہرت کا لباس پہنتا ہے اللہ تعالیٰ اس سے منہ پھیر لیتا ہے یہاں تک کہ وہ اسے جسم سے نہ اتار ڈالے خواہ اسے وہ لباس محبوب ہی کیوں نہ ہو۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے چار درہم کا ایک کپڑا خریدا (ابو ہریرہ) آپ کے دو کپڑوں کی قیمت دس درہم تھی (۱) آپ کا ازار ساڑھے چار ہاتھ کا تھا (ابو الشیخ - عروۃ ابن الزہرہ مرسلہ) آپ نے ایک پاجامہ تین درہم میں خریدا فرمایا (۲) آپ دو شلے سفید اون کے پہنا کرتے تھے ان دو کپڑوں کا نام ملہ تھا کہیں کہ دونوں ایک ہی جنس سے تھے (بخاری و مسلم - براہ) بعض اوقات دو کمانی یا کوئی چادرین جو موٹی بھی ہوتی تھیں پہنا کرتے تھے (ترمذی - نسائی - ابو اریضہ) ایک حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قمیص ایسی گتھی تھی جیسے تیلی کی قمیض ہو (ترمذی - النسائی) اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ سر اور واڑھی کے کپڑوں میں کثرت سے تیل لگا یا کرتے تھے اور اس کے اثرات قمیص پر نمایاں رہتے تھے (ایک دن سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے سندھ کا ایک ریٹھی کپڑا جس پر زرد رنگ کی دھاریاں تھیں زیب تن فرمایا، اس کی قیمت دو سو درہم تھی، صحابہ کرام اس کپڑے کو چھو چھو کر دیکھتے تھے اور حیرت سے کہتے یا رسول اللہ! کیا یہ کپڑا آپ کے پاس جنت سے آیا ہے، اس کو یہ کپڑا اسکندریہ کے بادشاہ متوقس نے ہدیے میں بھیجا تھا، آپ نے یہ ارادہ کیا کہ اسے پن کر بادشاہ کا اعزاز کریں، پھر آپ نے وہ کپڑا اتارا اور مشرکین میں سے ایک ایسے شخص کو بھیج دیا جس کے ساتھ صلہ رحمی کرنا منظور تھا، پھر ریشم اور دیباغ کو (مردوں کے لئے) حرام کر دیا (مسلم - جابر)۔ گویا اولاً آپ نے حرمت کی تاکید کے لئے یہ لباس پہنا، جیسے آپ نے ایک مرتبہ سونے کی انگوٹھی پہنی، پھر اسے اتار ڈالی اور مردوں کے لئے اس کا پہننا حرام فرما دیا (بخاری و مسلم) یا جیسے حضرت عائشہؓ سے لہن کی ہانڈی برہنہ کے متعلق پہلے تو یہ ارشاد فرمایا کہ مالک کے لئے ولای کی شرط لگاؤ، جب انہوں نے شرط لگائی تو آپ منبر پر چڑھے اور آپ نے اس عمل کو حرام قرار دے دیا (بخاری و مسلم - عائشہؓ) اسی طرح آپ نے ابتدا میں عین دن کے لئے حہ مباح فرمایا، اس کے بعد نکاح کی تاکید کے لئے اس کو حرام قرار دے دیا (مسلم - سلتہ ابن الاکوح) ایک مرتبہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے سیاہ رنگ کی دھاری دار چادر میں نماز پڑھی، سلام پھیرنے کے بعد فرمایا کہ اس چادر کی طرف دیکھنے نے مجھے نماز سے مشغول کیا ہے، اسے ابو ہریرہ کے پاس جاؤ اور اس کی چادر مجھے لاؤ (بخاری و مسلم) گویا آپ نے اپنی عمدہ اور خوبصورت چادر ابو ہریرہ کو دیدی اور ان کی معمولی چادر خود اوڑھی۔ ایک مرتبہ آپ کے جوتے کا قسمہ پڑا ہوا تھا تو آپ نے نیا قسمہ لگا کر نماز پڑھی، نماز کے بعد فرمایا اس میں وہی پرانا قسمہ لگاؤ، اور یہ نیا قسمہ نکال دو، نماز کے دوران میری نگاہ اس پر پڑتی ہے (۳) تا (۵) ایک مرتبہ آپ نے سونے کی انگوٹھی پہنی، اس کے بعد منبر پر تشریف لائے گئے، انگوٹھی پر نظر پڑی تو اسے نکال کر دوڑ پھینک دیا اور فرمایا کہ اس نے مجھے تم سے روک دیا ہے، کبھی اسے دیکھتا ہوں اور کبھی دیکھتا ہوں (۶) ایک مرتبہ آپ نے نئے جوتے پہنے، آپ کو پھر جوتے اچھے معلوم ہوئے، (چنانچہ بطور شکر آپ نے سجدہ فرمایا، اور لوگوں سے کہا کہ مجھے یہ جتنے اچھے لگے اس لئے میں نے اس خوف سے سجدہ کیا کہ خدا تعالیٰ مجھ سے ناراض نہ ہو، اس کے بعد آپ نے وہ جوتے اتارے اور جو پہلا مسکین نظر پڑا اسے دیدیے (۵) سنن ابن سعد کہتے ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ایک اونٹنی جبہ جس پر سیاہ اور سفید دھاریاں تھیں تیار کیا گیا، اس کے کنارے سیاہ رکھے گئے، جب آپ نے یہ جبہ زیب تن فرمایا تو لوگوں سے ارشاد فرمایا دیکھو یہ کس قدر عمدہ اور نرم ہے، ابن سعد کہتے ہیں کہ ایک اعرابی

(۱) اس کی اصل نہیں ملی۔ (۲) مشہور یہ ہے کہ چار درہم میں عرق، جیسا کہ منہ الیٰہی صلی علیہ وسلم ہے، سنن اربعہ میں پاجامہ کی خریداری کا ذکر ہے۔

یعین قیمت کا ذکر نہیں ہے۔ (۳) تا (۵) یہ سب روایتیں کتاب الصلوٰۃ میں گزری ہیں۔

نے کھڑے ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ! یہ جب مجھے عطا کر دیجے، آپ کا معمول یہ تھا کہ جب کوئی شخص آپ سے کوئی چیز مانگتا تو آپ اسے دینے میں ہل نہ فرماتے، چنانچہ آپ وہ جبہ امرابی کو دے دیا، اور صحابہ سے کہا کہ ایسا ہی ایک جبہ اور تیار کیا جائے، ابھی وہ جبہ تیاری کے مراحل میں تھا کہ آپ نے دنیا سے پردہ فرمایا (طبرانی - سل ابن سعد) حضرت جابر روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت فاطمہ کے گھر تشریف لے گئے، وہ اس وقت اونٹ کے بالوں کی چادر اوڑھے ہوئے بجلی سے آٹا پیس رہی تھیں، آپ نے اپنی لخت جگر کو اس حال میں دیکھا تو رونے لگے، اور فرمایا اے فاطمہ! بیش جاوداں کے لئے دنیا کے تلخ گھونٹ پی لے، اس کے بعد یہ آیت نازل ہوئی: (ابوبکر ابن لال مکارم اخلاق)

وَلَسَوْفَ يَعْطِيكَ كَثْرَتُكَ فَتَنْزِلُ ضِلْسِي - (پ ۳۰ ر ۱۸ آیت ۵)

اور عنقریب اللہ تعالیٰ آپ کو (بکثرت نعمتیں) دے گا سو آپ خوش ہو جائیں گے۔

ایک حدیث میں ہے کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مجھے ملا اعلیٰ نے خبر دی ہے کہ میری امت میں بہترین لوگ وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی وسعت رحمت کے باعث ظاہر میں ہنستے ہیں اور اس کے عذاب کے خوف سے دل میں روتے ہیں، لوگوں پر ان کا بوجھ کم اور خود ان کے اوپر بھاری ہے، پرانے کپڑے پہنتے ہیں، اور راتین کی اجراع کرتے ہیں، ان کے جسم زمین پر ہیں اور دل عرش بریں پر (حاکم، بیہقی) یہ تھا لباس کے سلسلے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ، آپ نے اپنی امت کو اپنے اسوے کی اتباع کی بابر و وصیت فرمائی ہے، چنانچہ ارشاد فرمایا:

مَنْ أَحْبَبَنِي فَلَيْسَتْ بِيُسْتَنْبِي عَلَيْكُمْ بِيُسْتَنْبِي وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِينَ مِنْ بَعْدِي
عَصَوْا عَلَيْهَا بِالتَّوَّاجِدِ - (ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ - العراض ابن ساریہ)

جو مجھ سے محبت کرتا ہے اسے چاہیے کہ وہ میری سنت کی پیروی کرے اپنے اوپر میری سنت اور میرے بعد میرے خلفائے راشدین کی سنت لازم پکڑ لو، اور اسے داعیوں سے قحطام لو۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ (پ ۳ ر ۳۱ آیت ۳۱)

آپ کہ دیجئے کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری اتباع کرو اللہ تم سے محبت کرے گا۔

ایک مرتبہ آپ نے حضرت عائشہؓ کو بطور خاص یہ نصیحت فرمائی کہ اگر تو مجھ سے ملنا چاہے تو مالِ دلوں کی ہم نشینی سے گریز کر، اور کوئی کپڑا اس وقت تک نہ اتار جب تک تو اس میں پیوند نہ لگا لے (ترمذی، حاکم) روایت بھی ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ قیص میں لگے ہوئے پیوند شمار کئے گئے تو ان کی تعداد بارہ تھی، ان میں بعض پیوند چوڑے کے تھے، حضرت علیؓ ابن ابی طالبؓ نے ایک کپڑا تین درہم میں خریدا اور اسے خلافت کے زمانے میں زیب تن کیا، اور اس کی آستینیں کنٹیوں کے پر سے کاٹ ڈالیں، اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے مجھے اس لباس کی صورت میں اپنے خلعت سے سرفراز فرمایا۔ حضرت سفیان ثوریؒ فرماتے ہیں کہ لباس ایسا پہنتا جس سے طلاء کے نزدیک شہرت نہ ہو اور جلاء کے نزدیک ذلت نہ ہو، یہ بھی فرماتے تھے کہ فقیر میرے قریب سے گذر جائے اور میں نماز میں ہوں تو اسے گذر جائے دتا ہوں، اور اگر دنیا دلوں میں سے کوئی شخص گذرنا ہے اور اس کے جسم پر عمدہ لباس ہوتا ہے تو میں اس سے ناراض ہوتا ہوں اور اسے اپنے قریب سے نہیں گذرنے دیتا۔ ایک بزرگ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت سفیان ثوریؒ کے دونوں کپڑوں اور جوتوں کی قیمت کا اندازہ کیا تو وہ ایک درہم اور چار دانق سے زیادہ کے نہیں تھے، ابن شبرمہ کہتے ہیں کہ میرا بہترین لباس وہ ہے جو میری خدمت کرے، اور بدترین لباس وہ ہے جس کی میں خدمت کروں۔ بعض بزرگان دین کہتے ہیں کہ لباس ایسا پہنتا چاہیے جس سے تمہارا شمار بازاری لوگوں میں ہو، ایسا لباس مت پہنو جس سے تمہیں شہرت ملے اور لوگ تمہیں دیکھیں۔ ابو سلیمان دارانیؒ فرماتے ہیں کہ کپڑے تین طرح کے ہوتے ہیں، ایک جو صرف اللہ کے لئے ہو، یہ وہ کپڑا ہے

جس سے ستر پوشی کی جاتی ہے وہ سراوہ جو نفس کے لئے جو اس سے وہ کپڑا مراد ہے جس کی نرمی مقصود ہو اور تیسرا کپڑا وہ ہے جو لوگوں کے لئے ہو اس سے وہ کپڑا مراد ہے جس کا ظاہری حسن، خوبصورتی، اور دل کشی مقصود ہو، ایک بزرگ کا مقولہ ہے کہ جس کا کپڑا پتلا ہوتا ہے اس کا دین بھی پتلا ہوتا ہے۔ اکثر علماء تابعین کے لباس کی قیمت میں سے تیس درہم تک ہوتی تھی۔ حضرت خواص دو کپڑوں سے زیادہ نہیں پہنتے تھے، ایک قمیص، دو سرائلی، اور کبھی اپنی قمیص کا دامن موڑ کر سر پر ڈال لیا کرتے تھے، کسی بزرگ کا مقولہ ہے کہ اولین زہد لباس کا زہد ہے، ایک حدیث میں ہے اَلْبَسَادَةُ مِنَ الْإِيمَانِ کِیڑوں کا پرانا ہونا ایمان میں سے ہے۔ ایک اور روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ جو شخص خوبصورت لباس پہنے کی قدرت رکھنے کے باوجود محض تواضع کے لئے اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے چھوڑ دیتا ہے تو اللہ تعالیٰ پر یہ حق ہوتا ہے کہ وہ اس کے لئے جنت کے غلعت یا قوت کی جامہ دانیوں میں محفوظ رکھے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک پیغمبر روحی نازل فرمائی کہ میرے دوستوں سے کہدو کہ وہ میرے دشمنوں کا لباس نہ پہنا کریں، اور نہ دشمنوں کے گھروں میں جایا کریں، اگر ایسا کریں گے تو ان کی طرح وہ بھی میرے دشمن ہو جائیں گے، رافع ابن خدیج نے براہین مروان کو کوفے کے منبر پر وعظ کرتے ہوئے دیکھ کر کہا کہ اپنے امیر کو دیکھو کہ فساق کا لباس پہن کر لوگوں کو وعظ و نصیحت کرتا ہے، بشر ابن مروان اس وقت نہایت باریک لباس پہنے ہوئے تھا۔ عبد اللہ ابن عامر ابن ربیعہ اپنے مخصوص عمدہ لباس میں حضرت ابوذر غفاریؓ کی خدمت میں پہنچا اور ان سے زہد کے سلسلے میں گفتگو کرنے لگا، ابوذر نے اپنے پر ہاتھ رکھ کر ہنسی اڑائی، ابن عامر کو ان کا یہ رویہ ناگوار گذرا اور اس نے حضرت عمرؓ سے اس کی شکایت کی، حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ تم نے خود ہی ایسی حرکت کی ہے کہ یہ لباس پہن کر ان کے سامنے زہد کے متعلق گفتگو کرنے بیٹھ گئے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ائمہ ہدئی سے یہ عہد لیا ہے کہ وہ لوگوں کی حالتوں میں سے ادنیٰ حالت پر رہا کریں، تاکہ بالداران کی تقلید کریں، اور فقراء کی فقر کی وجہ سے اہانت نہ ہو، حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے کسی نے عرض کیا کہ آپ ایسا سخت اور کمزور لباس کیوں پہنتے ہیں، فرمایا یہ لباس تواضع سے قریب تر اور متواضع کے لئے انتہائی موزوں ہے، مسلمان کو چاہیے کہ اس لباس کی اتباع کرے۔ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے راحت طلبی اور عیش کوشی سے منع فرمایا، اور ارشاد فرمایا :-

إِنَّ لِلَّهِ تَعَالَى عِبَادًا كَبَسُوا بِالْمُتَنَعِّمِينَ (احمد - معاذ)
اللہ تعالیٰ کے کچھ بندے ایسے ہیں جو آرام طلبی نہیں کرتے۔

روایت میں ہے کہ فضالہ ابن عبیدوالی مصر ہونے کے باوجود پرانندہ بال اور برہنہ پارہا کرتے تھے، کوئی شخص ان سے کہتا کہ آپ امیر ہونے کے باوجود اس حال میں رہتے ہیں، وہ جواب میں کہتے کہ میں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ترقہ (آرام طلبی) سے منع فرمایا ہے اور حکم دیا ہے کہ ہم کبھی برہنہ پارہا بھی پہرا کریں (ابو داؤد) حضرت علیؓ نے حضرت عمرؓ سے فرمایا کہ اگر آپ اپنے دونوں ساتھیوں سے ملنا چاہتے ہوں تو اپنے کتے میں بچہ نہ لگائیے، اور تہجد کو سرنگوں رکھیے، اور ٹکی ہوئی جوتی پہنئے، اور خواہش سے کم کھانا کھائیے۔ حضرت عمر ارشاد فرماتے ہیں کہ موٹا اور کمزور کپڑا پہنا کرو، اور جمیوں کے لباس سے پرہیز کرو، حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ جو شخص کسی قوم کا لباس اختیار کرتا ہے وہ انہی میں سے ہو جاتا ہے۔ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :-

إِنَّ مِنْ شَرِّ أُمَّتِي الَّذِينَ غَنَوْا بِالنَّعِيمِ يَطْلُبُونَ الْوَلْنَ الطَّعَامِ وَالْوَلْنَ الْتِيَابِ
وَيَتَشَفَّقُونَ فِي الْكَلَامِ (طبرانی - ابوامامہ)

میری امت کے بدترین لوگ وہ ہیں جو دولت میں پلٹے ہیں، طرح طرح کے کھانوں، اور مختلف قسم کے کپڑوں کے حلاشی رہتے ہیں، اور (انہماق فضاہت کے لئے) منہ پھاڑ پھاڑ کر بولتے ہیں۔
سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :-

اِنَّ رَزَقَ الْمُؤْمِنِ اِلٰی اَنْصَافٍ سَاقِيَةٍ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ فِيمَا بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ الْكَفَرِ بَيْنَ وَمَا
اَسْفَلَ مِنْ ذَلِكَ فَفِي النَّارِ وَلَا يَنْظُرُ اللَّهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ اِلٰی مَنْ جَرَّ لَازِجًا مَبْطُورًا۔
(مالک، ابو داؤد، نسائی، ابن حبان، ابو سعید)

مومن کا ازار نصف ساق تک ہونا چاہیے، اگر ٹخنوں اور پنڈلی کے درمیان ہو تب بھی کوئی گناہ نہیں لیکن اس کے نیچے ہو تو دوزخ میں ہے، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس شخص پر نظر نہیں ڈالے گا جو اپنے ازار کو تکبیر کے طور پر لٹکائے۔

ابو سلیمان دارانی کہتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :-
لَا يَلْبَسُ الشَّعْرَ مِنْ اَمْتِنِي اِلَّا مَرًا اَوْ اَحْمَقًا۔

میری امت میں سے ریاکار اور بے وقوف کے علاوہ کوئی شخص بال نہیں پنے گا۔

اس سے مراد بالوں کا بنا ہوا قیمتی کپڑا ہے، اوزائی فرماتے ہیں کہ اون پنٹنا سفر میں سنت ہے اور حضرت بدعت ہے، محمد ابن واسع عقیبہ ابن مسلم کے پاس گئے، وہ اس وقت ادنیٰ جبہ پہنے ہوئے تھے، عقیبہ نے ان سے کہا کہ اس جبے کی تمہیں کیا ضرورت پیش آگئی؟ وہ یہ سوال سن کر خاموش رہے، عقیبہ نے کہا کہ میں تم سے گفتگو کر رہا ہوں اور تم خاموش ہو، انہوں نے جواب دیا کہ اگر میں اس کے جواب میں یہ کہوں کہ میں نے زہد کے لئے یہ جبہ پہنا ہے تو یہ اپنے نفس کی پاکیزگی کا اظہار ہو گا، اور اگر یہ کہوں کہ فخر کی وجہ سے پہنا ہے تو یہ اپنے رب کی شکایت ہو گی، ابو سلیمان کہتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنا دوست بنایا تو یہ وحی نازل فرمائی کہ زمین سے اپنا ستر پوشیدہ رکھ، چنانچہ آپ کا معمول یہ تھا کہ ہر چیز میں سے ایک لیتے تھے، مگر باجائے دو بناتے تھے۔ جب ایک دھو کر ڈالتے تو دوسرا پہن لیتے، تاکہ کوئی لمحہ ایسا نہ گزرے کہ آپ کا ستر کھلا ہو، حضرت سلمان الفارسیؓ سے کسی شخص نے دریافت کیا کہ آپ عمدہ لباس کیوں نہیں پہنتے، انہوں نے جواب دیا کہ بھلا ظلام کو اچھے کپڑوں کی کیا ضرورت ہے البتہ جب وہ آزاد ہو گا تو خدا کی قسم اسے ایسے عمدہ کپڑے عطا کئے جائیں گے جو کبھی پرانے نہیں ہوں گے حضرت عمر ابن عبدالعزیز کے حلق بیان کیا جاتا ہے کہ ان کے پاس بالوں کا بنا ہوا ایک جبہ اور ایک چادر تھی، یہ دونوں کپڑے آپ رات کو تہجد کے لئے اٹھنے پر استعمال کرتے تھے، حضرت حسن بصری نے فرقد سخی سے کہا کہ تم یہ سمجھتے ہو گے کہ کبیل پوشی کی وجہ سے لوگوں پر فضیلت رکھتے ہو، حالانکہ مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ اکثر اہل دوزخ کبیل پوش ہوں گے اپنے خفاق کے باعث، یحییٰ ابن معین کہتے ہیں کہ میں نے ابو معاویہ الاسود کو دیکھا کہ وہ کوڑیوں کے ڈھیر میں پٹھے پرانے کپڑے تلاش کرتے ہیں، انہیں دھوئے ہیں، اور انہیں جوڑ کر لباس تیار کرتے ہیں، میں نے ان سے کہا کہ آپ اس سے ہتر کپڑے پہنا کریں، انہوں نے فرمایا اس لباس میں ہمارا کیا نقصان ہے دنیا میں فقیروں کو جو مصیبت اٹھانی پڑتی ہے جنت میں اس کا صلہ انہیں مل جائے گا، یحییٰ ابن معین ابو معاویہ کا یہ قول بیان کر کے بدیا کرتے تھے۔

مسکن اس میں بھی زہد کے تین درجے ہیں، ان میں اعلیٰ ترین درجہ یہ ہے کہ اپنے لئے کوئی مخصوص جگہ تلاش نہ کرے، بلکہ مساجد کے گوشوں پر قناعت کرے، جیسا کہ اصحاب صفہ کیا کرتے تھے، اوسط درجہ یہ ہے کہ اپنے کے لئے کوئی خاص جگہ تلاش کر لے جیسے جمہور پڑی یا چھرو فیرو، اور ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ کوئی کمرہ خرید لے یا کرائے پر حاصل کر لے۔ اگر مسکن کی وسعت ضرورت کے بقدر ہے، اور اس میں کوئی آرائش نہیں ہے تو ایسا مسکن اختیار کرنے سے زہد کے آخری درجات سے نہیں ٹکے گا۔ لیکن مکان کا پختہ ہونا، ضرورت سے زائد کشادہ ہونا، اور چھت کا چھ ہاتھ سے زیادہ لمبا ہونا آدمی کو زہد کی حدود سے خارج کر دیتا ہے۔

مکان کی جنس میں اختلاف ہو سکتا ہے کہ وہ سچ کا ہو، یا کھاس کا ہو، یا مٹی کا ہو، یا پختہ اینٹ کا ہو۔ اسی طرح وسعت میں بھی اختلاف ہو سکتا ہے، اور اوقات کے لحاظ سے بھی ملکیت کا اختلاف ہو سکتا ہے مثلاً یہ کہ اپنی ملک میں ہو، یا کرایہ پر ہو، یا مستعار ہو،

حدیث میں ہے کہ ہمہ کو اس کے نفع پر اجر دیا جائے گا لیکن جو یہ اس نے پانی اور مٹی میں خرچ کیا ہے اس پر کوئی اجر نہیں ملے گا (ابن ماجہ - خواب ابن الارثم)
قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :-

تِلْكَ الدَّارُ الْآخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِينَ لَا يُرِيدُونَ عُلُوًّا فِي الْأَرْضِ وَلَا فَسَادًا۔ (پ ۲۰ آیت ۸۳)

یہ عالم آخرت ہم ان ہی لوگوں کے لئے خاص کرتے ہیں جو دنیا میں نہ بڑا بننا چاہتے ہیں اور نہ لٹا کرنا۔
مفسرین کے بقول اس آیت میں طوسے مراد جاہ و اقتدار کے مکانات کی بلندی ہے۔ ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :-

كُلُّ بِنَاءٍ عَوَّالٍ عَلَى صَاحِبِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِلَّا مَا أَكُنَّ مِنْ حَيْرٍ وَبَرْقٍ الْبَرِّ الْوَادِعِ۔ (الس)

ہر تعمیر قیامت کے دن اپنے مالک کے لئے وہاں ہے مگر وہ تعمیر جو سردی اور گرمی سے بچائے۔

ایک شخص نے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے مکان کی شکل کا شکوہ کیا۔ آپ نے فرمایا ”اتسع فی السماء“ آسمان میں وسعت طلب کر۔ حضرت عمر ابن الخطاب نے ایک مرتبہ شام کے راستے میں ایک قلعہ دیکھا جو چوڑے اور اینٹ کا بنایا ہوا تھا، آپ نے اللہ اکبر کہا، اور فرمایا : مجھے اندازہ بھی نہ تھا کہ اس امت میں ایسے لوگ بھی ہوں گے جو ہمان کی طرح فرعون کے لئے پختہ عمارتیں بنائیں گے، انہوں نے قرآن کریم کی اس آیت کی طرف اشارہ فرمایا :-

فَأَوْقَذَلِيْ يٰٰهَآمَانُ عَلٰى الطَّيْنِ۔ (پ ۳۰ آیت ۳۸)

تو اے ہمان تم ہمارے لئے مٹی (کی اینٹیں) بنا کر ان کو آگ میں پکواؤ۔

کہتے ہیں کہ فرعون پہلا شخص ہے جس کے لئے چوڑے اور اینٹ سے عمارت بنائی گئی اور سب سے پہلے یہ کام ہمان نے انجام دیا۔ اس کے بعد دوسرے جاہل بادشاہوں اور ظالم حکمرانوں نے اس کی اتباع کی یہ سب فحش ہے، اور فضول عمری ہے، ایک بزرگ نے کسی شہر میں واقع جامع مسجد دیکھ کر کہا کہ پہلے یہ مسجد کجور کی ٹہنیوں سے بنی ہوئی تھی، اس کے بعد یہ گارے مٹی سے تعمیر کی گئی، اور اب پختہ اینٹوں سے بنائی گئی ہے، لیکن ٹہنیوں والے گارے والوں سے بہتر تھے اور گارے والے اینٹوں والوں سے اچھے تھے، بہت سے اکابرین سلف اپنے مکانات زندگی میں کئی بار بنایا کرتے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہوتی تھی کہ وہ حضرات ان مکانات کو کمزور رکھتے تھے تاکہ تعمیرات کے باب میں زہد کے تقاضوں پر عمل پیرا ہو سکیں، ان میں بہت سے حضرات ایسے بھی تھے کہ جو حج کے لئے یا جماد میں شرکت کے لئے پاہ رکاب ہونے سے پہلے اپنے مکانات خالی کر دیتے یا اپنے پڑوسیوں کو یہ کر دیتے، وہاں سے واپس آکر دو سرانیا لیتے انکے گھر کھاس پھوس اور چڑے کے ہوا کرتے تھے، جیسا کہ آج بھی یمن میں لوگ اسی طرح کے مکانات بناتے ہیں، ان مکانات کی بلندی آدمی کے قد سے ایک بالشت اونچی ہوتی تھی۔ حضرت حسن فرماتے ہیں کہ جب میں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے مکانات میں جاتا تھا تو اپنا ہاتھ چھت سے لگا دیا کرتا تھا، عمرو ابن دینار کہتے ہیں کہ جب بندہ اپنا مکان چھ ہاتھ سے زیادہ بلند کرتا ہے تو ایک فرشتہ اس سے کہتا ہے کہ اے فاسقوں کے فاسق تو اسے کہاں تک لے جائے گا۔ حضرت سفیان بلند عمارات کی طرف دیکھنے سے منع فرمایا کرتے تھے، اور کہتے تھے کہ اگر لوگ دیکھنا چھوڑ دیں تو یہ عمارتیں بلند نہ ہوں، گویا ان کی طرف دیکھنا تعمیر پر اعانت کرنے کے برابر ہے، حضرت فضیل کہتے ہیں کہ مجھے اس شخص پر حیرت نہیں ہوتی جو عمارت بناتا ہے اور رخصت ہو جاتا ہے، بلکہ اس شخص پر حیرت ہوتی ہے جو بلند عمارتیں دیکھ کر حیرت حاصل نہیں کرتا، حضرت عبداللہ ابن مسعود فرماتے ہیں کہ کچھ لوگ ایسے آئیں گے جو مٹی کو اونچا کریں گے، تری گھوڑے استعمال کریں گے، تمہارے قلعے کی طرف رخ کر کے نماز پڑھیں گے اور تمہارے دین کے علاوہ دین پر مریں گے۔

چوتھی ضرورت۔ گھریلو سامان اس میں بھی زہد کے بہت سے درجے ہیں، اعلیٰ ترین درجے میں وہ حال ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا تھا کہ ان کے پاس صرف کنگھی اور پیالہ رہتا تھا، ایک مرتبہ کسی شخص کو دیکھا کہ وہ اپنی داڑھی میں انگلیوں سے کنگھی کر رہا ہے، آپ نے کنگھی پھینک دی، دوسری مرتبہ کسی شخص کو دیکھا کہ وہ نہر سے چلو بھر بھر کر پانی پیتا ہے، آپ نے پیالہ بھی پھینک دیا، آپ کے خیال میں ان کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی، چنانچہ گھریلو زندگی سے متعلق تمام ساز و سامان کا یہی حال ہے، ہر

چیز کسی نہ کسی مطلوب کے لئے مقصود ہوتی ہے، اگر کسی چیز سے کوئی مقصد وابستہ نہ ہو اور اس کے بغیر بھی ضرورت پوری ہو سکتی ہو تو وہ اس کے لئے دنیا اور آخرت دونوں جہانوں کے لئے باعث مصیبت ہے اور جس سامان کے بغیر چارہ کار نہیں ہے اس میں ادنیٰ درجے پر اکتفا کیا جاسکتا ہے، اور ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ مٹی کے برتن استعمال کئے جائیں، اور اس بات کی پروا نہ کی جائے کہ انکے کنارے ٹوٹے ہوئے ہیں، صرف یہ دیکھا جائے کہ وہ مقصد کے لئے کافی ہیں یا نہیں، اور اوسط درجہ یہ ہے کہ آدمی کے پاس ضرورت کے بقدر سامان ہو اور صحیح حالت میں ہو، لیکن ایک چیز سے بہت کام لئے جائیں، مثلاً اگر کسی کے پاس صحیح سالم پیالہ موجود ہو تو اس میں سالن ڈال کر بھی کھانا جاہیے پانی بھی پینا چاہیے، اور اپنی چھوٹی مٹی کی چیزیں بھی اس میں رکھ لینی چاہئیں، چنانچہ سلف صالحین آسانی اور سہولت کے لئے بہت سی چیزوں میں ایک آلے کا استعمال پسند کرتے تھے اور اعلا درجہ یہ ہے کہ ہر کام کے لئے الگ آلہ ہو، لیکن یہ آلہ ادنیٰ جنس سے ہونا چاہیے اگر ایک مطلب کے لئے متعدد آلے ہوئے، یا عمدہ جنس سے ہوئے تو زہد کے تمام ابواب سے خارج ہو گا، اور فضولیات میں جھلا سمجھا جائے گا۔ اس سلسلے میں بھی سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے گرامی قدر اصحاب کے اسوۂ حسنہ پر نظر رکھنی چاہیے، اور اسی پر عمل کرنا چاہیے چنانچہ حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم جس بستر پر آرام فرماتے تھے وہ چڑے کا بنا ہوا تھا، اور اس میں مجبور کی درخت کی چھال بھری ہوئی تھی (ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ) حضرت فضیل فرماتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا بستر وہی عبا اور مجبور کی درخت کی چھال سے بھرے ہوئے گدے پر مشتمل تھا (شمائل ترمذی)۔ روایت ہے کہ حضرت عمر ابن الخطابؓ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے آپ اس وقت مجبور کی چھال سے بنی ہوئی چارپائی پر سو رہے تھے، حضرت عمرؓ نے چھال کے نشانات آپ کے پہلوئے مبارک پر دیکھے، یہ دیکھ کر آپ رونے لگے، سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے دریافت کیا اے ابن الخطاب! تم کس لئے روتے ہو؟ انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! مجھے کسریٰ و قیصر کا خیال آگیا کہ ان کے پاس کتنے بڑے بڑے ملک ہیں، پھر آپ کا خیال آگیا کہ آپ اللہ کے مقدس پیغمبر اور محبوب دوست ہو کر مجبور کی چھال سے بنی ہوئی چارپائی پر سوتے ہیں، سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے دریافت کیا کہ اے عمر کیا تم اس بات سے غرض نہیں ہو کہ قیصر و کسریٰ کے لئے دنیا ہو، اور ہمارے لئے آخرت ہو، حضرت عمرؓ نے عرض کیا: کیوں نہیں یا رسول اللہ! آپ نے فرمایا پھر یہ بات ایسی ہی ہے (بخاری و مسلم) ایک شخص حمر۔ ابوذر غفاری کے گھر میں داخل ہوا، اور اصرار و حرد کو کہہ کر کہنے لگا کہ ابوذر تمہارے گھر میں کوئی ساز و سامان نظر نہیں آتا، حضرت ابوذر نے جواب دیا کہ ہمارا ایک اور گھر ہے وہاں ہم نے اپنا اچھا سامان بچھل کر دیا ہے، اس شخص نے کہا کہ جب تک تم یہاں ہو گھر میں کچھ نہ کچھ ضرور ہونا چاہیے، انہوں نے فرمایا کہ صاحب خانہ ہمیں اس گھر میں نہیں رہنے دے گا، حمر کے امیر حضرت عمیر ابن سعید حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے آپ نے ان سے دریافت کیا کہ دنیا کی چیزوں میں سے تمہارے پاس کیا کیا ہے، انہوں نے جواب دیا ایک لاٹھی جس سے میں سہارا لیتا ہوں، اور اگر راستے میں سانپ مل جائے تو اسے ہلاک کر دیتا ہوں، ایک تھیلا ہے جس میں اپنا کھانا رکھتا ہوں، ایک پیالہ ہے جس میں کھانا کھاتا ہوں، اپنا سراور کپڑے دھوتا ہوں، ایک لوٹا ہے جس میں پینے کے لئے اور وضو کے لئے پانی رکھتا ہوں، ان کے علاوہ دنیا میں جتنی بھی چیزیں ہیں وہ انہی کے تابع ہیں۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا تم سچ کہتے ہو۔

روایت ہے کہ ایک مرتبہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کسی سفر سے واپسی پر حضرت فاطمہؓ کے گھر تشریف لے گئے، آپ نے دیکھا کہ ان کے دروازے پر ایک پردہ پڑا ہے، اور ان کے ہاتھوں میں چاندی کے دو کڑے ہیں، آپ یہ دیکھ کر واپس تشریف لے گئے، کچھ دیر بعد حضرت ابو رافع حضرت فاطمہؓ کے گھر آئے تو دیکھا کہ وہ بیٹھی ہوئی رو رہی ہیں، ابو رافع کے پوچھنے پر انہوں نے بتلایا کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم واپس تشریف لے گئے، انہوں نے پوچھا کس لئے؟ حضرت فاطمہؓ نے جواب دیا کہ اس پردے اور ان دو کنگٹوں کی وجہ سے، پھر حضرت فاطمہؓ نے وہ پردہ اور دونوں کنگٹن اتارے اور حضرت بلالؓ کے ذریعے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیج دیے اور عرض کیا کہ میں نے یہ دونوں چیزیں صدقہ کر دی ہیں آپ جہاں چاہیں خرچ فرمادیں آپ نے

ارشاد فرمایا کہ انہیں لے جا کر فروخت کر دو، اور ان کی قیمت اہل صفہ کو دیدو، چنانچہ دونوں نکلن ڈھائی درہم کے فروخت ہو گئے، آپ نے انہیں صدقہ کر دیا، اور حضرت فاطمہ کے پاس تشریف لے گئے اور ان سے فرمایا کہ یہ تو نے اچھا کیا ہے (۱) ایک مرتبہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہؓ کے دروازے پر پردہ لٹکا ہوا دیکھا تو اسے پھاڑ ڈالا، اور فرمایا جب میں اسے دیکھتا ہوں تو مجھے دنیا یاد آتی ہے، یہ فلاں کی اولاد کو دیدو (تمہاری نسائی) ایک شب حضرت عائشہؓ نے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے نیا بستر بچھادیا جب کہ آپ کا معمول دوہری عہام پر سونے کا تھا، آپ رات بھر اس بستر پر کوئیں بدلتے رہے، صبح ہوئی تو آپ نے حضرت عائشہؓ سے ارشاد فرمایا ہمارا وہی پرانا بستر لاؤ، اور یہ بستر مٹاؤ کہ اس نے مجھے رات بھر چنگایا ہے (ابن حبان۔ عائشہؓ) ایک رات آپ کے پاس سات یا چھ دینار آئے، آپ نے رات میں یہ دینار یونہی رہنے دیے، لیکن آپ کو نیند نہیں آئی، یہاں تک کہ آخر رات میں آپ نے انہیں مستحقین میں تقسیم کر دیا۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ دینار لٹکانے کے بعد آپ سو گئے یہاں تک کہ میں نے آپ کے خزانوں کی آواز سنی، پھر فرمایا میرا گمان اپنے رب کے ساتھ کیا ہوتا اگر میں (وفات پا کر) اپنے رب سے اس حال میں ملتا کہ یہ دینار میرے پاس ہوتے (احمد۔ عائشہؓ قریباً منہ) حضرت حسنؓ فرماتے ہیں کہ میں نے تقریباً ستر ہزار روگوں کو دیکھا ہے کہ ان کے پاس ایک کپڑے کے علاوہ دو سرا کپڑا نہ تھا، اور انہوں نے کبھی اپنے اور زمین کے درمیان کوئی کپڑا نہیں بچھایا، جب نیند آتی تو زمین پر لیٹ جاتے اور جسم پر کپڑا ڈال لیتے۔

پانچویں ضرورت۔ نکاح کچھ لوگوں کی رائے ہے کہ اصل نکاح اور کثرت نکاح میں زہد کے کوئی معنی نہیں ہیں، یہ رائے حضرت اسماعیل ابن عبد اللہ کی ہے، وہ کہتے ہیں کہ سید الزاہدین سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو عورتیں محبوب تھیں، ہم ان میں زہد کیوں کریں، ابن عیینہ نے بھی ان کی اس رائے کی موافقت کی ہے، وہ کہتے ہیں کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی جو زاہدین صحابہ میں سر فرست تھے چار بیویاں، اور اس سے زائد باعریاں تھیں۔ اس سلسلے میں ابو سلیمان دارانی کا قول صحیح ہے، وہ کہتے ہیں کہ جو چیز جس میں اللہ تعالیٰ سے روک دے خواہ وہ بیوی ہو، یا مال ہو یا اولاد ہو یہی ہے۔ عورت بھی کبھی ہمیں اللہ سے غافل کر دیتی ہے۔ حق بات یہ ہے کہ بعض حالات میں نکاح نہ کرنا افضل ہے، جیسا کہ ہم نے کتاب النکاح میں اس کی تفصیل بیان کی ہے، اس صورت میں نکاح نہ کرنا ہی زہد ہے۔ اور جہاں شہوت غالب ہو، اور نکاح کے بغیر اس کا تدارک نہ ہو سکے تو نکاح کرنا واجب ہے، اس صورت میں نکاح نہ کرنا زہد کہیے ہو گا، البتہ اگر نکاح نہ کرنے میں کوئی قباحت نہ ہو اور نہ نکاح کرنے پر کوئی مصیبت نازل ہو، محض اس لئے نکاح نہ کرے کہ خواہ مخواہ دل عورتوں کی طرف مائل ہو گا، اور ان سے مانوس ہو گا اور اللہ کے ذکر سے غافل ہو گا اس صورت میں نہ کرنا زہد ہے۔ اگر یہ یقین ہو کہ عورت اسے اللہ کے ذکر سے غافل نہیں کرے گی، لیکن وہ نظر، صحبت اور ہم بستری کی لذت سے بچنے کے لئے نکاح نہیں کرتا، ایسا کرنا قطعاً زہد نہیں ہے۔ اس لئے کہ اولاد بھلے نسل، اور امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں بکھیر کے لئے نہ صرف مقصود ہے، بلکہ عبادت ہے، اور وہ لذت جو انسان کو ہم بستری میں ملتی ہے نقصان دہ نہیں ہے، بشرطیکہ وہی لذت مطلوب اور مقصود نہ ہو، یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص کھانا پینا چھوڑ دے کہ کھانے پینے سے لذت ملتی ہے، ظاہر ہے یہ زہد نہیں ہے، کیوں کہ اس میں بدن کا ضیاع ہے۔ جس طرح نکاح نہ کرنے میں نسل انسانی کا ضیاع ہے۔ اس لئے یہ جائز نہیں کہ محض صحبت کی لذت سے بچنے کے لئے نکاح نہ کیا جائے، ہاں اگر کسی اور آفت کا خوف ہو تو بات دوسری ہے، یعنی طور پر حضرت سہل کا مقصود بھی یہی ہو گا، اور اسی لئے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی نکاح کئے ہیں۔

چنانچہ اگر کوئی شخص ایسا ہے جس کا حال سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے حال سے مشابہ ہو کہ عورتوں کی کثرت سے آپ

(۱) یہ روایت اس تفصیل کے ساتھ کہیں نہیں ملی، البتہ ابو داؤد اور ابن ماجہ نے سفینہ کی حدیث بیان کی ہے کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت فاطمہ کے مکان پر تشریف لائے، آپ نے گھر کے ایک کونے میں ایک منقش کپڑا دیکھا اور واپس تشریف لے گئے، اسی طرح نسائی نے ثوبان سے روایت کیا ہے کہ آپ نے حضرت فاطمہ کے ہاتھ میں سونے کی زنجیر دیکھ کر فرمایا کہ لوگ کہیں کے محمد کی بیٹی نے آگ پن رکھی ہے، آپ یہ کہہ کر واپس تشریف لے گئے، حضرت فاطمہؓ نے زنجیر فروخت کر کے اس کی قیمت سے ایک غلام آزاد کیا۔

کا قلب ذکر اللہ سے غافل نہیں ہوتا تھا اور ان کی اصلاح اور ان کے نان نفقہ کے مسائل آپ کے لئے اس حد تک پریشان کن نہیں تھے کہ آپ اپنے فرائض سے چشم پوشی کرنے لگیں، اگر کوئی شخص ایسا ہے تو اس کے لئے نکاح میں زہد کرنے کے کوئی معنی نہیں ہیں، اس خیال سے کہ عورتوں کو دیکھنے اور ان سے ہم بستر ہونے میں لذت ہے، البتہ انبیاء اور اولیاء کے علاوہ یہ حالت کے نصیب ہو سکتی ہے، اکثر لوگوں کا حال یہ ہے کہ عورتوں کی کثرت انہیں مشغول کر دیتی ہے اگر شخص عورت کا وجود اسے اللہ سے غافل کر دے تو اسے نکاح کرنا ہی نہیں چاہیے اور اگر عورتوں کی کثرت یا ان کی خوبصورتی سے غفلت کا اندیشہ ہو تو کسی ایک عورت سے نکاح کرنا چاہیے بشرطیکہ وہ حسین نہ ہو، اس سلسلے میں اپنے دل کا جائزہ لینا چاہیے اور اس کے فیصلے پر عمل کرنا چاہیے، اس لئے کہ یہ خاصہ اس کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان معاملہ ہے، ابو سلیمان دارانی کہتے ہیں کہ عورتوں میں زہد یہ ہے کہ حقیر اور یتیم اور معمولی شکل و صورت رکھنے والی عورت سے شادی کرے اور اسے شریف اور خوبصورت عورت پر ترجیح دے۔ حضرت جنید بغدادی ارشاد فرماتے ہیں کہ مبتدی مرید کے لئے یہ پسند کرنا ہوں کہ وہ اپنا دل تین چیزوں میں نہ لگائے ورنہ اس کا حال بدل جائے گا، ایک پیشے میں، دوسرے طلب حدیث میں، تیسرے نکاح میں۔ یہ بھی فرماتے ہیں کہ میں صوفی کے لئے یہ بات پسند کرتا ہوں کہ نہ وہ لکھے اور نہ پڑھے، کیوں کہ اس نے ہمت جمع رہتی ہے۔ اس تفصیل سے ثابت ہوا کہ نکاح کی لذت غذا کی لذت جیسی ہے۔ اسی لئے جس طرح اس میں بقدر ضرورت کی اجازت ہے اسی طرح اس میں بھی ہے، اور جس طرح وہ لذت غذا جو اللہ تعالیٰ سے روکنے والی ہو ممنوع ہے اسی طرح وہ لذت نکاح بھی ممنوع ہے جو اللہ سے دور کرنے والی ہو۔

چھٹی ضرورت۔ مال اور جاہ : یہ دونوں چیزیں سابقہ پانچوں ضرورتوں کے لئے وسیلے کی حیثیت رکھتی ہیں، جاہ کے معنی ہیں دلوں کا مالک ہونا، یعنی لوگوں کے دلوں میں اپنے لئے جگہ بنانا تاکہ وہ اس کے اعمال و اغراض میں معاون ہو سکیں، جو شخص اپنی تمام ضرورتیں خود پوری کرنے پر قادر نہیں ہوتا اسے لامحالہ خادم کی ضرورت پڑتی ہے، اور اسے خدمت پر مائل کرنے کے لئے اس کے دل میں جگہ بنانے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اگر خادم کے دل میں مہموم کے لئے قدر و منزلت نہیں ہوگی تو وہ اس کی خدمت نہ کر سکے گا، خادم کے دل میں قدر و منزلت کا ہونا یہی جاہ ہے، جاہ کی ابتدا ایسی نہیں کہ مملکت ہو سکے، لیکن اس کا انجام ایسے گڑھے پر ہوتا ہے جس میں گر کر بچ نکلنے کی صورت نہیں ہے اور جو کونہیں کے گرد منڈلاتا ہے اگر اس میں گر جائے تو یہ کوئی تعجب خیز بات نہیں ہے۔

جاہ یعنی دلوں میں جگہ بنانے کی ضرورت یا تو جلب منفعت کے لئے پیش آتی ہے یا دفع معرت کے لئے، یا کسی کے ظلم سے نجات پانے کے لئے۔ جہاں تک نفع اٹھانے کا معاملہ ہے اگر کسی شخص کے پاس مال ہے تو اس مقصد کے لئے اسے جاہ کی ضرورت نہیں ہے، کیوں کہ وہ اپنی تمام ضرورتوں کی تکمیل کے لئے خدام اجرت اور معاوضے پر حاصل کر سکتا ہے، خواہ ان کے دلوں میں اسکی منزلت ہو یا نہ ہو وہ معاوضہ حاصل کرنے کے لئے اس کی خدمت ضرور کریں گے، ان لوگوں کے دلوں میں جاہ کی حاجت ہے جو بغیر اجرت کے خدمت کرتے ہیں، اب دفع معرت کا مسئلہ ہے یعنی جاہ کا اس لئے محتاج ہونا کہ متوقع نقصانات سے اپنی حفاظت کر سکے دفع معرت کی ضرورت اس ملک میں پڑتی ہے جہاں بدل و انصاف کے قاضیوں پر عمل نہ کیا جاتا ہو، یا ایسے پڑوسیوں کے درمیان گھرا ہوا جو اس پر ظلم کرتے ہوں، اور جن کے ظلم سے بچنا اس کے لئے دشوار ہو، خاص طور پر جب کہ ضرورت میں انجام کا خوف اور سوء ظن کی آمیزش بھی ہو۔ جاہ کی طلب میں مشغول ہونے والا شخص ہلاکت کے راستے کا مسافر ہے، زاہد کا حق یہ ہے کہ وہ کسی کے دل میں بھی جگہ بنانے کے لئے جدوجہد نہ کرے، عبادت اور دین میں اس کی مسلسل مشغولیت خود لوگوں کو اس کی طرف متوجہ کرے گی، اور ان کے دلوں میں اس کی عزت اور منزلت پیدا کرے گی اور وہ لوگوں کی اذیت اور ان کے ظلم و ستم سے محفوظ رہے گا، مسلمانوں کی تو خیریات ہی اور ہے غیر مسلموں کے دلوں میں بھی اس کے لئے محبت اور احترام کے جذبات ہوں گے، جہاں تک ان توہمات اور خیالات کا تعلق ہے جو طلب جاہ میں زیادتی پر اکساتے ہیں وہ محض مفروضہ خیالات اور بدگمانیاں ہیں، یوں

بھی کوئی شخص ایسا نہیں ہے جو عزت اور جاہ رکھنے کے باوجود لوگوں کی ایذا رسانی سے پوری طرح محفوظ ہو، ظاہر ہے اس صورت میں تحمل اور صبر کے بغیر چارہ کار نہیں ہے، بلکہ اذیت پر صبر کرنا جاہ کے ذریعے اسے دور کرنے سے بہتر ہے۔ اس لئے کہ دلوں میں جگہ بنانے کی اجازت نہیں ہے اور جاہ کی تھوڑی مقدار زیادہ کی متقاضی ہوتی ہے، بلکہ اس کا نشہ شراب کے نشے سے زیادہ بہتر ہے، اور اس کی عادت شراب نوشی کی عادت سے زیادہ سخت تر ہے، اس لئے اس کی گت اور کثرت دونوں سے اجتناب کرنا چاہیے۔

اب مال کا معاملہ لیجئے، معیشت کے لئے اس کا وجود ناگزیر ہے، مگر اس کے لئے انتظام کافی ہے جو متعلقہ ضرورتوں کی (جن کی تفصیل گذر چکی ہے) تکمیل کر سکے۔ چنانچہ اگر کوئی شخص پیشہ ور ہے اور اس نے ایک روز کی ضرورت کے بقدر مال حاصل کر لیا ہے تو اب اسے اگلے روز کے لئے کمانے کی ضرورت نہیں ہے، بعض اکابر اگر دوسرے کمالیئے کو کام چھوڑ کر کھڑے ہو جاتے ہیں، یہ زہد کی شرط ہے، اگر کوئی شخص اس قدر مال کما تا ہے جو ایک سال کی ضرورت سے بھی زائد ہو تو وہ ضعیف زاہدوں میں بھی شمار نہیں کیا جاسکتا ہے۔ جالبکہ اسے اعلا زاہدین میں شمار کیا جائے، اگر اس کے پاس زمین جائیداد ہو، اور وہ توکل پر کامل یقین نہ رکھتا ہو اور اس زمین کی پیداوار میں سے انتظامہ وغیرہ بچا کر رکھ لے جو ایک سال کے لئے کافی ہو جائے تو یہ زہد کے خلاف نہیں ہے، بشرطیکہ سال بھر کی ضرورت پوری کرنے کے بعد جو غلہ وغیرہ بچ جائے اس صدقہ کر دے، لیکن اس کا شمار ضعیف زاہدین میں ہو گا، بلکہ اگر حضرت اویس القرنیؓ کے قول پر عمل کیا جائے اور زہد کے لئے توکل کو شرط قرار دیا جائے تو اسے زاہد نہیں کہا جاسکتا۔ لیکن اس کے زاہد نہ ہونے کے معنی یہ ہیں کہ زاہدین کے لئے آخرت میں جن اعلا مقامات کا وعدہ کیا گیا ہے وہ اسے حاصل نہیں ہوں گے، ورنہ وہ ان فضولیات کی نسبت سے زائد کھلانے کا مستحق ہے جنہیں اس نے چھوڑا ہے۔ زہد کے باب میں منفقہ کا معاملہ صاحب عیال کے مقابلے میں زیادہ سہل ہے، اس لئے کہ تنہا شخص نہایت آسانی سے زہد کے تقاضے پورا کر سکتا ہے، جب کہ عیالدار پر دوسرے نفوس کی ذمہ داریوں میں ضروری نہیں ہے کہ وہ بھی اسی کی طرح زہد پر مائل ہوں۔ ابو سلیمان دارانیؒ کہتے ہیں کہ کسی شخص کے لئے یہ مناسب نہ ہو گا کہ وہ اپنے بیوی بچوں کو زہد پر مجبور کرے، البتہ وہ انہیں زہد کی ترغیب دے سکتا ہے، اگر وہ اس کی بات مان لیں تو ٹھیک ہے ورنہ انہیں ان کے حال پر چھوڑ دے، اور خود جو چاہے کرے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ زہد میں یہ تنگی خود زاہد کی ذات کے ساتھ مخصوص ہے، اپنے عیال کے لئے تنگی کرنا اس کے لئے ضروری نہیں ہے، تاہم ان کا ایسا مطالبہ تسلیم کرنا بھی مناسب نہیں ہے جو اعتدال کی حدود سے تجاوز ہو، چنانچہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ سے سبق حاصل کرنا چاہیے کہ آپ پر وہ اور کنگن دیکھ کر حضرت فاطمہؓ کے مکان سے واپس تشریف لے گئے، اس لئے کہ یہ دونوں چیزیں نعمت میں داخل ہیں، ضرورت میں داخل نہیں ہیں۔

اس تفصیل کا حاصل یہ ہے کہ آدمی مال اور جاہ کی جس مقدار کے لئے مضطر ہے وہ ممنوع نہیں ہے بلکہ ضرورت سے زائد مال اور جاہ دونوں ملک زہر ہیں، ان دونوں چیزوں کا نفع اسی صورت میں ہے یا ان دونوں کو دوائے نافع اسی وقت کما جاسکتا ہے جب کہ وہ ضرورت کی حدود سے تجاوز نہ ہوں، البتہ وہ مال اور جاہ جو زیادتی سے قریب وہ زہر قاتل تو نہیں ہے لیکن نقصان دہ ضرور ہے، اگرچہ اس کا ضرر کم ہے۔ زہر پینا حرام ہے اور دوا پینا فرض ہے، اور ان دونوں کے درمیان جو درجات ہیں وہ مشتبہ ہیں، اب اگر کوئی شخص احتیاط کرنا چاہے تو اس احتیاط کا نفع خود اسے ہو گا، اور جو سستی کرے وہ خود اس کا خیال نہ بھگتے گا جو شخص اپنے دین کو خالص رکھتا ہے اور مشبہات سے پہلو تھم کر کے نفسیات پر عمل کرتا ہے اور اپنے نفس کو ضرورتوں کے جنگنائے میں محصور رکھتا ہے وہ حزم و احتیاط کی روش پر ہے اور بالیقین نجات پانے والے فرقے میں سے ہے۔

جو شخص اہم ترین ضرورتوں پر قدر ضرورت کے مطابق اکتفا کرتا ہے دنیا کی طرف اس کی نسبت کرنا صحیح نہیں ہے، بلکہ یہ تو عین دین ہے، کیوں کہ دین کے لئے شرط ہے، اور شرط مشروط میں داخل ہوتی ہے، اور اس کی دلیل یہ ہے کہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ کو ایک مرتبہ ضرورت پیش آئی تو آپ اپنے کسی دوست کے پاس قرض لینے کے لئے تشریف لے گئے، لیکن اس نے قرض نہیں دیا، غم زدہ پریشان اور متفکر واپس تشریف لائے، اللہ تعالیٰ نے وحی نازل فرمائی کہ اگر آپ خلیل (اللہ تعالیٰ) سے مانگتے تو وہ ضرور

آپ کو دیتا، آپ نے عرض کیا یا اللہ! تو دنیا کو پسند نہیں کرتا اس لئے دنیا کی چیز طلب کرتے ہوئے مجھے خوف محسوس ہوا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ مقدار ضرورت دیتا نہیں ہے، اس سے ثابت ہوا کہ ضرورت کے مطابق مال دین ہے، البتہ مقدار ضرورت سے زائد مال آخرت میں وبال کا باعث ہو گا، بلکہ ایسا مال تو دنیا میں بھی باعث مصیبت بن جاتا ہے، جو لوگ اغنیاء کے احوال سے اچھی طرح واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ انہیں مال کمانے کے لئے کتنی مشقت برداشت کرنی پڑتی ہے، پھر مال کی حفاظت بھی مسئلہ ہے، فرضیکہ اس راہ میں بڑی ذلتیں، رسوائیاں اور آفتیں ہیں، اور انجام یہ ہوتا ہے کہ تمام جمع شدہ سرمایہ ورغاء کے ہاتھ لگتا ہے، وہ کھاتے ہیں، اور موج اڑاتے ہیں، بلکہ بعض اوقات مال حاصل کرنے کے لئے اس کی موت کے درپے ہوتے ہیں، بہت سے درغاس کے مال کا غلط استعمال کرتے ہیں، اور اسے معاصی میں خرچ کرتے ہیں، اس طرح گویا وہ معاصی پر ان کا معین و مددگار بن جاتا ہے۔ اسی لئے دنیا جمع کرنے والے اور شہوات کی اتباع کرنے والے شخص کو ریشم کے کپڑے سے شبیہ دی گئی ہے کہ وہ اپنے ارد گرد ریشم بنتا جاتا ہے اور جب اس میں سے لکھنا چاہتا ہے تو نکل نہیں پاتا، اور اسی ریشمی جال میں پھنس کر ہلاک ہو جاتا ہے، گویا وہ خود اپنی ہلاکت کا سامان کرتا ہے۔ یہی حال ان لوگوں کا ہے جو شہوات کی اتباع کرتے ہیں، یہ لوگ اپنے قلب کی خواہشات کی زنجیروں میں جکڑ رہے ہیں، مال، جاہ، بیوی، بچے، دشمنوں سے دشمنی، دوستوں سے ریا کاری اور تمام دنیاوی حظوظ زنجیریں ہیں، انسان لمحہ بہ لمحہ ان زنجیروں میں گرفتار ہوتا جاتا ہے، اب اگر کسی وقت خطرات کا احساس ہوا، اور اس نے قید سے آزاد ہونا چاہا تو آزاد نہ ہو پائے گا، اس کا دل خواہشات کی زنجیروں میں اتنا جکڑا جا چکا ہو گا کہ وہ کوشش کے باوجود انہیں کاٹ نہیں پائے گا، اگر اس نے خود اپنے اختیار و ارادے سے کوئی محبوب چیز ترک کی تو خود اپنے ہاتھوں ہلاک ہو گا کیوں کہ وہ اپنے محبوب کی جدائی برداشت نہ کر پائے گا، اور اس کے فراق میں گھل گھل کر مرجائے گا، یا اس کی یاد میں مایہ سبے آپ کی طرح تڑپے گا، یہاں تک کہ ملک الموت اسے تمام محبوب چیزوں سے جدا کر دے۔ اس وقت حالت یہ ہو گی کہ دل دنیا کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہو گا، فطری طور پر وہ اسے اپنی طرف کھینچنے کی، اور موت کے زبردست ہاتھ اسے آخرت کی طرف کھینچیں گے۔ موت کے وقت اس کی کم سے کم حالت اس شخص کے مشابہ ہوتی ہے جسے آہ سے چرا جاتا ہے پہلے تکلیف اس کے جسم کو ہوتی ہے، پھر جسم سے دل میں سرایت کرتی ہے، تمہارا اس شخص کے بارے میں کیا خیال ہے جسکے دل پر درد و غم براہ راست اثر انداز ہوتا ہو، جسم کے واسطے سے سرایت نہ کرتا ہو۔ پہلا عذاب جو دنیا دار شخص کو ہو گا، اعلا ملین اور جوار رب العالمین میں جگہ نہ ملنے کی حسرت اس کے بعد کا عذاب ہے۔

دنیا میں رغبت رکھنے کی وجہ سے بعد اللہ تعالیٰ کی ملاقات اور اس کے دیدار سے محجوب ہوتا ہے، اور جب وہ لقاء خداوندی سے محجوب ہوتا ہے تو اس پر دونخ کی آگ مسلط کر دی جاتی ہے، اس لئے کہ دونخ صرف مجتہدین پر مسلط ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے نہ

كَذَلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ۚ يَوْمَئِذٍ يُنْفَخُ الْكِتَابُ وَنُفِثَ رُوحُهُمْ فِي مَقَامٍ مَّا هُمْ فِيهِ مُشْتَرِكُونَ ۚ ثُمَّ إِنَّهُمْ لَصَالُوا الْجَحِيمِ (پ ۸۳۰ آیت ۲۵)

ہرگز (ایسا) نہیں یہ لوگ اس روز اپنے رب کے دیدار سے روک دیے جائیں گے مگر یہ دونخ میں داخل ہوں گے۔

یہاں حجاب کا عذاب ہی کیا تم تھا کہ اس پر دونخ کا عذاب مستزاد ہے۔ جس شخص پر یہ دونوں عذاب ایک ساتھ نازل ہوں گے اس کا کیا حال ہو گا، ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ ہمارے دلوں میں وہی بات راج کر دے جو تو نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمائی تھی نہ

أَحْسِبُ مَنْ أَحْبَبْتَ فَإِنَّكَ مُفَارِقُهُ ۚ جَسَّاسٌ لَا يَخْلُفُ ۚ جَسَّاسٌ لَا يَخْلُفُ ۚ جَسَّاسٌ لَا يَخْلُفُ ۚ

اوپر ریشم کے کپڑے کی مثال بیان کی گئی ہے، ایک شاعر نے بھی اچھے انداز میں یہ مفہوم ادا کیا ہے نہ

كَلِّدُ كَلِّدُ الْفَرْسِ يَنْسُجُ كَانِمًا ۚ وَبِهَلِكْ غَمًّا وَسَطَمًا هُوَ نَاسِجُهُ ۚ

(دنیا دار آدمی ریشم کے کپڑے کی طرح ہے جو ہمیشہ بنتا رہتا ہے، اور اپنے بنے ہوئے ریشم میں پھنس کر

ہلاک ہو جاتا ہے۔

اولیاء اللہ پر یہ بات منکشف ہو گئی تھی کہ بندہ اپنے اعمال کے باعث، اور خواہش نفس کی اتباع کی وجہ سے خود اپنے آپ کو ہلاک کر ڈالتا ہے، اور اس سلسلے میں اسکی مثال ریشم کے کیڑے کی طرح ہے، اسی لئے انہوں نے دنیا کو بالکل طور پر ترک کر دیا تھا۔ حضرت حسن بصری فرماتے ہیں کہ میں نے ستر اصحاب بدر ایسے دیکھے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی حلال کردہ چیزوں میں اس قدر زہد کرتے تھے کہ تم اس کی حرام کی ہوئی چیزوں میں بھی اتنا زہد نہیں کرتے، ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ وہ مصائب پر اس قدر خوش ہوتے تھے کہ تم خوشحالی اور فاسخ البالی پر اتنے خوش نہیں ہوتے، اگر تم انہیں دیکھتے تو بھجوں اور پاگل قرار دیتے، اور اگر وہ تمہارے اچھوں کو دیکھ لیں تو یہ کہیں کہ انہیں دین سے ذرا بھی واسطہ نہیں ہے، اور یہوں کو دیکھ لیں تو کہیں کہ انہیں قیامت کے دن امن نصیب نہ ہو گا، وہ لوگ ایسے تھے کہ اگر کوئی انہیں حلال مال بھی دیتا تو لینے سے انکار کر دیتے، اور کہتے کہ ہم اپنے قلب کے فساد سے ڈرتے ہیں۔ اور یہ حقیقت بھی ہے جو لوگ دل رکھتے ہیں وہ ان کے کھڑے سے خائف رہتے ہیں، اور جن کے دل دنیا کی محبت نے فاکر ڈالے ہوں ان کا حال تو قرآن کریم کے الفاظ میں یہ ہے :-

وَرَضُوا بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَاطْمَأَنَّنُوا بِهَا وَالَّذِينَ هُمْ عَنْ آيَاتِنَا غَافِلُونَ۔ (پ ۱۸ آیت ۷)

اور وہ دنیوی زندگی پر راضی ہو گئے ہیں اور اس میں جی لگا کر بیٹھے ہیں اور جو لوگ ہماری آیتوں سے ہانکل

غافل ہیں۔

ایک جگہ ارشاد فرمایا :-

وَلَا تَطْغَوْا مَنْ أَغْفَلْنَا قُلُوبَهُ عَنْ ذِكْرِ نَاوَاتَّبَعْ هَوَاؤُكَ إِنْ أَمَرَ مُفْرَطًا۔ (پ ۱۵ آیت ۲۸)

اور ایسے شخص کا کہنا نہ مانئے جس کے قلب کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر رکھا ہے۔

ایک جگہ فرمایا گیا :-

فَاعْرِضْ عَنْ مَنْ تَوَلَّى عَنْ ذِكْرِ نَاوَلَمْ يَزِدْ إِلَّا الْحَيَاةَ الدُّنْيَا ذَلِكَ مَبْلَغُهُمْ مِنَ الْعِلْمِ (پ ۲۲ آیت ۲۹-۳۰)

تو آپ ایسے شخص سے اپنا خیال ہٹا لیجئے۔ جو ہماری نصیحت کا خیال نہ کرے اور بجز دنیوی زندگی کے اس کو کوئی

(اعزوی طلب) مقصود نہ ہو، ان لوگوں کی فہم کی رسائی کی حد بس یہی ہے۔

ان تمام آیتوں میں دنیا کی طرف ان کی توجہ اور میلان کو ان کی غفلت اور جہالت پر محمل کیا گیا ہے۔ روایت یہ ہے کہ ایک شخص نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا کہ آپ مجھے اپنی ہمراہی کا موقع عنایت فرمائیں، حضرت عیسیٰ نے فرمایا اپنا تمام مال خیرات کرو، اور میرے ساتھ آجاؤ، اس نے عرض کیا ایسا کرنا میرے لئے مشکل ہے، فرمایا : مجھے غنی کے جنت میں جانے پر حیرت ہے، ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ مالدار آدمی سختی کے ساتھ جنت میں داخل ہو گا، ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ ہر روز طلوع آفتاب کے وقت چار فرشتے آواز بلند کرتے ہیں، ان میں سے دو مشرق کی جنت میں ہوتے ہیں، اور دو مغرب کی طرف مشرق کے فرشتوں میں سے ایک کہتا ہے اے طالب خیر آگے بڑھ، اور اے طالب شریحے ہٹ، دو سرا کہتا ہے اے اللہ! دینے والے کو بہترین عوض عطا فرماتا، اور مغرب کے فرشتوں میں سے ایک کہتا ہے موت کے واسطے پیدا ہو، اور اجڑنے کے لئے تعمیر کرو، اور دو سرا کہتا ہے طویل حساب کے لئے کھاؤ پیو اور دنیا کی لذات سے فائدہ اٹھاؤ۔

زہد کی علامات

بعض اوقات یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ مال کا تارک زاہد ہے، حالانکہ یہ کوئی قاعدہ کلیہ نہیں ہے، اس لئے کہ جو شخص زہد پر تعریف کا خواہاں ہوتا ہے اس کے لئے مال کا ترک کرنا اور تنگ زندگی گزارنا سہل ہو جاتا ہے، بہت سے راسخ ایسے نظر آئیں گے

جنہوں نے اپنے آپ کو انتہائی معمولی غذا کا عادی بنا لیا ہے، اور خود کو ایسے عبادت خانوں میں مقید کر لیا ہے جہاں سے باہر آنے کا کوئی راستہ نہیں ہے، لیکن وہ اس مسرت کے سہارے زندہ ہیں جو انہیں اس وقت میسر آتی ہے جب لوگ ان کے نزل و دریافت کرتے ہیں، عقیدت و محبت کے ساتھ ان کی زیارت کرتے ہیں، اور ان پر تعریف و توصیف کے پھول برساتے ہیں، مال ترک کر کے یکسو ہو جانا زہد کی قطعی دلیل نہیں ہے، بلکہ زہد مال اور جاہ دونوں میں ہونا چاہیے، تاکہ تمام دنیاوی حظوظ سے لافلتق ہونا ثابت ہو سکے، ورنہ ایسے ایسے لوگ زہد کا دعویٰ کرتے دیکھے گئے ہیں جو عمدہ قسم کے اولیٰ لباس اور قیمتی پوشاکیں نصب تن کرتے ہیں، جیسا کہ خواص نے ان لوگوں کی حقیقت بیان فرمائی ہے، فرماتے ہیں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو زہد کا دعویٰ کرتے ہیں، اور بہترین لباس پہنتے ہیں، اس طرح وہ لوگوں کو دھوکا دیتے ہیں اور انہیں خاموش طریقے پر یہ ہدایت کرنا چاہتے ہیں کہ اگر انہیں ہدایا دیے جائیں تو اسی نوعیت کے ہوں، انہیں فقیر تصور نہ کیا جائے، اور نہ ان کے ساتھ قیمیوں اور مسکینوں جیسا سلوک کیا جائے، بلکہ انہیں فخری اقلیم کا نائب تاج بادشاہ سمجھا جائے، اور ان کے ساتھ احترام کا وہی معاملہ کیا جائے جو بادشاہوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ یہ لوگ اپنے آپ کو علم کا قبیح کہتے ہیں اور یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ سنت پر عمل پیرا ہیں، دنیا ہمارے پاس دست بستہ حاضر رہتی ہے، ہم اس سے کوئی تعلق نہیں رکھتے اور نہ اس کے پیچھے دوڑتے ہیں۔ یہ سب دین کے بدلے دنیا کمانے والے ہیں، نہ انہیں اپنے باطنی اوصاف کی تطہیر کا خیال ہے، اور نہ ظاہری اخلاق کی تہذیب کا، یہ لوگ دنیا کی طرف مائل اور ہوائے نفس کے قبیح ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ زہد کی معرفت ایک مشکل مرحلہ ہے، بلکہ خود زاہد بھی اپنی حالت زہد پر صحیح طریقے سے مطلع نہیں ہو پاتا۔ اس لئے ہم ذیل میں زہد کی علامات بیان کرتے ہیں، زاہد کو اپنے زہد کی معرفت کے لئے ان علامات پر احاطہ کرنا چاہیے، یہ کل تین علامتیں ہیں۔

پہلی علامت یہ ہے کہ موجود پر خوش نہ ہو، اور مفقود سے ممکن نہ ہو، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا :-

لِكَيْلَا تَأْسَوْا عَلَىٰ مَافَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوا بِمَا آتَاكُمْ (پ ۲۷، آیت ۲۳)

تاکہ جو چیز تم سے جاتی رہے تم اس پر رنج نہ کرو اور تاکہ جو چیز تم کو عطا فرمائی ہے اس پر اتراؤ نہیں۔

بلکہ معاملہ اس کے برعکس ہونا چاہیے کہ مال کے وجود سے ممکن ہو، اور اس کے فقدان سے خوش ہو، دوسری علامت یہ ہے کہ اس کے نزدیک مذمت کرنے والا اور مدح کرنے والا دونوں برابر ہوں، ان دونوں میں سے پہلی علامت زہد فی المال کی ہے اور دوسری علامت زہد فی الجاہ کی ہے، تیسری علامت یہ ہے کہ اے اللہ تعالیٰ سے انیت ہو، اس کے دل پر اطاعت کی حلاوت غالب ہو، دل محبت کی حلاوت سے خالی نہیں رہتا، یا تو اس میں دنیا کی محبت رہتی ہے یا اللہ کی محبت۔ ان دونوں کی مثال دل کے لئے ایسی ہے جیسے پیالے کے لئے پانی اور ہوا کہ اگر پیالے میں پانی بھر جائے تو ہوا باقی نہیں رہ سکتی، یہ ممکن نہیں ہے کہ ہوا اور پانی دونوں کا اجتماع ہو جائے۔ چنانچہ جو شخص اللہ تعالیٰ سے مانوس ہوتا ہے وہ اسی کے ساتھ مشغول رہتا ہے، غیر کے ساتھ مشغول نہیں ہوتا۔ کسی بزرگ سے دریافت کیا گیا کہ زہد نے زاہدوں کو کس حال پر پہنچا دیا۔ انہوں نے جواب دیا اللہ کے ساتھ انس تک۔ بہر حال انس باللہ اور انس بالذہن دونوں ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتے، اہل معرفت کہتے ہیں کہ جب ایمان ظاہر قلب سے متعلق ہوتا ہے تو آدمی دنیا اور آخرت دونوں سے محبت کرتا ہے، اور دونوں کے لئے عمل کرتا ہے، اور جب دل کے سیاہ نقطے میں ترسکر ہو جاتا ہے تو وہ خود بخود دنیا سے متنفر ہو جاتا ہے، اس کے حسن و جمال کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ اور نہ اس کے لئے عمل کرتا ہے۔ چنانچہ حضرت آدم علیہ السلام یہ دعا کیا کرتے تھے کہ اے اللہ مجھے ایسا ایمان عطا فرما جو میرے قلب کے ساتھ رہے۔ حضرت ابو سلیمان دارانی کہتے ہیں جو شخص اپنے نفس میں مشغول رہتا ہے اسے لوگوں کی خبر نہیں رہتی، یہ عمل کرنے والوں کا مقام ہے، اور جو اپنے رب میں مشغول ہوتا ہے وہ اپنے نفس کی خبر نہیں رکھتا، یہ عارفین کا مقام ہے۔ زاہد کے لئے ضروری ہے کہ وہ ان دونوں مقاموں میں سے ایک میں رہے۔

پہلا مقام یہ ہے کہ اپنے نفس میں مشغول رہے، اس صورت میں اس کے نزدیک مدح و ذم، اور مال کا عدم و وجود دونوں برابر

ہوتے ہیں، لیکن اگر اس کے پاس تھوڑا مال موجود ہے تو یہ اس کے عدم زہد کی دلیل نہیں ہوگی۔ ابن ابی الحواری کہتے ہیں کہ میں نے ابو سلیمان دارانی سے پوچھا کہ کیا داؤد طائی زاہد تھے؟ انہوں نے جواب دیا ہاں! میں نے کہا مجھے یہ بتلایا گیا ہے کہ انہیں ان کے باپ کی وراثت میں بیس دینار ملے تھے؟ انہوں نے یہ دینار بیس برس کے بعد خرچ کئے، وہ کیسے زاہد تھے کہ دینار رکھتے تھے؟ ابو سلیمان نے کہا کہ تمہارا مطلب یہ ہے کہ وہ زہد کی حقیقت تک پہنچنے، حقیقت زہد سے انہوں نے زہد کی انتہا مراد لی ہے، اور زہد کی کوئی انتہا نہیں ہے، کیوں کہ نفس کے بے شمار اوصاف ہیں، اور زہد اسی وقت مکمل ہوتا ہے جب ان تمام اوصاف میں زہد کیا جائے۔

در حقیقت جو شخص دنیا کی کوئی چیز اس پر قدرت رکھنے کے باوجود محض اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے دل اور دین پر خوف کے باعث چھوڑ دیتا ہے اسے زہد میں انتہائی دخل ہے۔ جتنا اس نے چھوڑا ہے، اور آخری درجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا ہر چیز چھوڑ دے، یہاں تک کہ سر کے نیچے رکھا ہوا پتھر بھی اٹھا کر پھینک دے جیسا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کیا تھا، ہم اللہ تعالیٰ سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ ہمیں زہد کے ابتدائی درجات ہی نصیب فرما دے، ہم جیسے گنہگار اور حرم و ہوس کے بندے انتہائی درجات کی طمع کیسے کر سکتے ہیں، اگرچہ ناامید ہونا بھی صحیح نہیں ہے، اگر اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے عجائب پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ اللہ کے لئے بڑی سے بڑی چیز بھی معمولی ہے اور حقیر ہے، اگر ہم اس کے فضل و احسان اور جود و کرم پر اعتماد کرتے ہوئے اس سے کسی بڑی چیز کا سوال کر بیٹھیں تو یہ کوئی تعجب خیز بات نہ ہوگی۔

اس تفصیل سے یہ بات ثابت ہوئی کہ زہد کی علامت یہ ہے کہ زاہد کے نزدیک فقر و غنا، عزت و ذلت اور مدح و ذم برابر ہوں، اور ایسا اس وقت ہوتا ہے جب دل پر اللہ تعالیٰ کی انیت غالب ہو جاتی ہے۔ ان علامات سے دوسری علامات بھی قطع ہوتی ہیں، مثلاً یہ کہ دنیا ترک کر دے اور یہ پروا نہ کرے کہ کس نے لی ہے، بعض لوگ کہتے ہیں کہ زہد یہ ہے کہ دنیا جیسی بھی ہے چھوڑ دے، یہ نہ کہے کہ میں سرائے فقیر کروں گا، یا مسہر بناؤں گا۔ بیٹھی ابن معاذ کہتے ہیں کہ زہد کی علامت موجود مال میں سخاوت کرنا ہے۔ ابن خیف کہتے ہیں کہ زہد کی علامت یہ ہے کہ دنیا ہاتھ سے نکل جائے تو راحت کا احساس ہو، ان کا ایک قول یہ بھی ہے کہ دنیا سے بلا تکلف کنارہ کش ہونے کا نام زہد ہے، ابو سلیمان دارانی فرماتے ہیں کہ اون زہد کی علامتوں میں سے ایک علامت ہے، لیکن یہ مناسب نہیں کہ تین درہم کی مٹی پینے اور دل میں پانچ درہم کی کملی کی رغبت ہو، حضرت امام احمد ابن حنبلؒ اور حضرت سفیان ثوریؒ فرماتے ہیں کہ زہد کی علامت آرزو کو مختصر کرنا ہے۔ سری کہتے ہیں کہ زہد کی زندگی اچھی نہیں گذرتی جب کہ وہ اپنے نفس سے غافل ہو، اور عارف کو سکون نہیں ملتا جب کہ وہ اپنے نفس میں مشغول ہو، نصر آبادی کہتے ہیں کہ زاہد دنیا میں مسافر ہے اور عارف آخرت میں مسافر ہے، بیٹھی ابن معاذ فرماتے ہیں کہ زہد کی تین علامتیں ہیں، علاقے کے بغیر عمل، طمع کے بغیر قول اور ریاست کے بغیر عزت۔ یہ بھی فرماتے ہیں کہ زاہد تمہیں سر کرے اور رائی سکھاتا ہے اور عارف مٹک و مہر۔ ایک شخص نے ان سے دریافت کیا کہ میں تو کل کی دوکان میں داخل ہو کر زہد کی چادر کب اوڑھوں گا، اور زاہدین کے ساتھ کب بیٹھوں گا، انہوں نے جواب دیا جب تم اپنے باطن کی ریاضت میں اس حد تک پہنچ جاؤ گے کہ اگر اللہ تعالیٰ تمہیں تین دن تک رزق عطا نہ کرے، تو تمہارا یقین کمزور نہ ہو، اگر تم اس درجے تک نہیں پہنچ پاتے تو زاہدین کی مسند پر بیٹھنا تمہیں زیب نہیں دے گا، بلکہ مجھے اندیشہ ہے کہ اگر تم بیٹھ گئے تو رسوا نہ ہو جاؤ۔ انہوں نے یہ بھی فرمایا کہ دنیا کی مثال ایک دلہن کی سی ہے جو اسے طلب کرتا ہے وہ اس کے لئے مشاطہ کی مانند ہے کہ اس کی زلفیں سنواری رہی ہے، اور جو اس میں زہد کرتا ہے وہ اس کے چہرے پر سیاہی ملنے والا، اس کے پال لوج کر پھینکنے والا، اور اس کے کپڑے پھاڑنے والا ہے۔ عارف اللہ تعالیٰ میں مشغول رہتا ہے وہ اس کی طرف ملتفت نہیں ہوتا۔ سری ستمی کہتے ہیں کہ میں نے زہد میں جو چیز چاہی وہ مجھے حاصل ہوئی، لیکن لوگوں میں زہد کرنا نصیب نہ ہو سکا، نہ مجھے اس کی طاقت ہے کہ لوگوں میں زہد کر سکوں۔ فیصل فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تمام برائیوں کو ایک کمرے میں مقفل کر دیا ہے، اور حب دنیا کو اس کی چابی قرار دیدیا ہے، اسی طرح خیر کو ایک کمرے میں مقفل کر کے زہد کو اس کی کچی بنا دیا ہے۔

یہ ہے نہی کی حقیقت اور اس کے احکام و اقسام پر ایک مختصر کلام اب ہم توکل کی بحث شروع کرتے ہیں کیوں کہ توکل کے بغیر نہ عمل نہیں ہوتا۔

کتاب التوحید والتوکل

توحید اور توکل کے بیان میں جاننا چاہیے کہ توکل دین کے منازل میں سے ایک منزل، اور مؤمنین کے مقامات میں سے ایک مقام ہے۔ بلکہ یہ مقررین کے بلند درجات میں سے ایک ہے، توکل علم کی رو سے نہایت غامض اور عمل کے اعتبار سے انتہائی دشوار ہے۔ فہم کی رو سے اس کے اغماض کی وجہ یہ ہے کہ اسباب کا لحاظ کرنا اور ان پر اعتماد کرنا توحید میں شرک ہے، اور ان سے بالکل طور پر تعاطل برتنا سنت اور شریعت پر طعن ہے، اور یہ بات مشکل ہی سے سمجھ میں آتی ہے کہ آدمی اسباب پر اعتماد بھی کرے اور ان کا لحاظ بھی نہ کرے۔

توکل کا مفہوم اس طرح سمجھنا کہ وہ توحید کے مفروض کے مطابق بھی ہو اور عقل و شرع کے خلاف بھی نہ ہو نہایت دشوار اور دقیق ہے، اس کے اسی وقت اور خفاء کی وجہ سے وہی لوگ اس کی حقیقت پر مطلع ہو سکتے ہیں جو علم کی دولت سے مالا مال ہوں اور جن کی آنکھوں میں حق کا نور ہو، دوسرے لوگوں کو اس کی طاقت نہیں کہ وہ ان امور کے حقائق کا ادراک کر سکیں، تمہار علماء پر حقائق منکشف ہوتے ہیں، اور وہ اللہ کے دوسرے بندوں سے بیان کرتے ہیں۔

اس باب میں پہلے ہم مقدمے کے طور پر توکل کے فضائل بیان کرتے ہیں۔ اس کے بعد اس کتاب کے پہلے باب میں ہم توحید کا ذکر کریں گے اور دوسرے باب میں توکل کے موضوع پر گفتگو کریں گے۔

توکل کے فضائل آیات اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں :-

وَعَلَى اللَّهِ فَعَلُوا كُلَّ شَيْءٍ مِّنْهُ يَكْفِيهِمْ

(پ ۸۶ آیت ۲۳) اور اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرو اگر تم ایمان رکھتے ہو۔

وَعَلَى اللَّهِ فَعَلَيْتُمْ كُلَّ شَيْءٍ مِّنْهُ يَكْفِيكُمْ

(پ ۸۳ آیت ۴) اور اللہ ہی پر بھروسہ کرنے والوں کو بھروسہ کرنا چاہیے۔

وَمَنْ يَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ فَهُوَ حَسْبُهُ

(پ ۲۸ آیت ۳) اور جو شخص اللہ پر توکل کرے گا تو اللہ اس کے لئے کافی ہے۔

إِنَّ اللَّهَ يُجِيبُ الْمُتَوَكِّلِينَ

(پ ۸۳ آیت ۱۵۹) بے شک اللہ تعالیٰ اعتماد کرنے والوں سے محبت فرماتے ہیں۔

اس مقام کی عظمت کا کیا کہنا جس پر فائز ہونے والے شخص کو اللہ تعالیٰ کی محبت حاصل ہوتی ہے، اور اللہ تعالیٰ اس کا کفیل ہوتا ہے، جس شخص کے لئے اللہ کافی ہو، محبت کرنے والا اور محافظ ہو وہ بڑا کامیاب ہے، اس لئے کہ محبوب کو نہ عذاب دیا جائے گا، نہ دور کیا جائے گا، نہ وہ محجوب ہو گا، قرآن کریم میں ہے :-

أَلَيْسَ اللَّهُ بِكَافٍ عَبْدَهُ

(پ ۲۳ آیت ۳۵) کیا اللہ تعالیٰ اپنے بندے کے لئے کافی نہیں ہے۔

جو شخص غیر اللہ سے کفایت طلب کرتا ہے وہ توکل کا تارک ہے، اور اس آیت کی تکذیب کرنے والا ہے، اس لئے کہ یہ سوال استفہام اقراری کے طور پر واقع ہوا ہے، جیسا کہ ذیل کی آیت میں وارد ہے :-

هَٰذَا عَلَى الْإِنْسَانِ حِينٌ مِّنَ النَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُورًا

(پ ۲۹ آیت ۱) ہاں! انسان کی حالت یہ ہے کہ وہ توکل کرنے والا ہے، اس لئے کہ یہ سوال استفہام اقراری کے طور پر واقع ہوا ہے، جیسا کہ ذیل کی آیت میں وارد ہے :-

بے شک انسان پر زمانے میں ایک ایسا وقت بھی آچکا ہے جس میں وہ کوئی چر قابل نہ کر نہ تھا۔
ایک جگہ ارشاد فرمایا :-

وَمِنْ نُّتَوُكُلْ عَلَى اللّٰهِ عَزِيزٌ حَكِيمٌ (پ ۲۸ آیت ۳۹)

اور جو شخص اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرتا ہے تو بلاشبہ اللہ تعالیٰ زبردست ہیں اور حکمت والے ہیں۔
یعنی ایسا عزیز ہے کہ جو اس کی پناہ میں آجاتا ہے اسے ذلیل نہیں کرتا اور جو اس کی بارگاہ میں التجا کرتا ہے اسے رو نہیں فرماتا اور ایسا حکیم ہے کہ جو شخص اس کی تدبیر پر اعتماد کرتا ہے اس کی تدبیر سے تعادل نہیں کرتا۔ ایک موقع پر ارشاد فرمایا :-
إِنَّ الدِّينَ تَذَعُونَ مِنْ دُونِ اللّٰهِ عِبَادُ أُنْمِثَالِكُمْ (پ ۳۹ آیت ۴۳)

واقعی تم خدا کو چھوڑ کر جن کی عبادت کرتے ہو وہ بھی تم ہی جیسے بندے ہیں سو تم ان کو پکارو۔
اس آیت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا ہر شئی مسخر ہے تمام بندے اسی طرح اس کے محتاج ہیں جس طرح تم ہو اس لئے ان پر بھروسہ کیسے کیا جاسکتا ہے ایک آیت میں ہے :-
إِنَّ الَّذِينَ تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللّٰهِ لَا يَمْلِكُونَ رِزْقًا فَامْتَعُوا بِرِزْقِ اللّٰهِ الرَّزْقُ وَاعْبُدُوهُ (پ ۳۹ آیت ۲۵)

تم خدا کو چھوڑ کر جن کو پوج رہے ہو وہ تم کو کچھ بھی رزق دینے کا اختیار نہیں رکھتے سو تم رزق خدا کے پاس تلاش کرو اور اس کی عبادت کرو۔

وَلِلّٰهِ خَزَائِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنْ الْمُنَافِقِينَ لَا يَفْقَهُوْنَ (پ ۲۸ آیت ۷)

اور اللہ ہی کے ہیں سب خزانے آسمانوں کے اور زمین کے لیکن منافقین جانتے نہیں۔
يَكْبُرُ الْاَمْرَ مَا مِنْ شَفِيعٍ اِلَّا مِنْ بَعْدِ اِذْنِهٖ (پ ۶ آیت ۳)

وہ ہر کام کی تدبیر کرتا ہے کوئی سفارش کرنے والا نہیں بغیر اس کی اجازت کے۔

قرآن پاک میں توحید کے موضوع پر جو کچھ فرمایا گیا ہے اس میں اس امر پر تنبیہ کی گئی ہے کہ اغیار کا لحاظ نہ کیا جائے اور صرف الواحد القہار پر بھروسہ کیا جائے۔

روایات ابن مسعود کی روایت میں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد مبارک نقل کیا گیا ہے : ”مجھے حج کے موسم میں امتیں دکھلائی گئیں میں نے اپنی امت کو دیکھا کہ ان سے زمین کے لٹھی اور پہاڑی علاقے بھر گئے ہیں مجھے ان کی کثرت و ہیبت سے خوشی ہوئی مجھ سے کہا گیا کہ کیا تم اس سے خوش ہوئے میں نے کہا ہاں! حکم ہوا کہ ان کے ساتھ اور ستر ہزار افراد جنت میں بلا حساب داخل ہوں گے صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! وہ کون لوگ ہوں گے؟ فرمایا یہ وہ لوگ ہوں گے جو نہ داغ لگواتے ہیں نہ ٹھکون لیتے ہیں نہ منتر پڑھتے پڑھاتے ہیں اور اپنے رب پر توکل کرتے ہیں یہ سن کر عکاشہ کھڑے ہوئے اور انہوں نے عرض کیا : یا رسول اللہ! اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ وہ مجھے انہی میں سے کر دے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی کہ اے اللہ! عکاشہ کو ان میں سے کر دے اس کے بعد دوسرا شخص کھڑا ہوا اور اس نے بھی دعا کی درخواست کی آپ نے ارشاد فرمایا عکاشہ تم پر سبقت لے گئے (بخاری و مسلم۔ ابن عباس) ایک حدیث میں ہے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :

اگر تم اللہ تعالیٰ پر ایسا توکل کرو جیسا کہ اس کا حق ہے تو خدا تعالیٰ تمہیں اس طرح رزق عطا کرے گا جس طرح وہ پرندوں کو رزق دیتا ہے کہ صبح کو بھوکے اٹھتے ہیں اور شام کو شکم سیر ہو جاتے ہیں (ترمذی حاکم۔ عمن) ایک مرتبہ ارشاد فرمایا کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کا ہو کر رہتا ہے اسے اللہ تعالیٰ ہر تکلیف اور مشقت سے بچا دیتا ہے اور اسے ایسی جگہ سے روزی دیتا ہے جہاں سے اسے روزی ملنے کا گمان بھی نہیں ہوتا اور جو شخص دنیا کا ہو کر رہ جاتا ہے اسے اللہ تعالیٰ دنیا کے سپرد کر دیتا ہے (طبرانی صغیر۔ عمران ابن حصین) فرمایا : جو شخص یہ چاہے کہ وہ لوگوں میں سب سے زیادہ مالدار بنے تو اسے اپنے سامنے کی چیز سے زیادہ اللہ تعالیٰ پر اعتماد کرنا

چاہیے (حاکم، بیہقی۔ ابن عباس) روایت ہے کہ جب سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل خاندان کو (فروغِ قادِی) بجلی کا سامنا ہوتا تو آپ انہیں نماز پڑھنے کا حکم دیتے اور فرماتے کہ اس کا حکم مجھے میرے پروردگار نے دیا ہے، چنانچہ ارشادِ خداوندی ہے (طبرانی اوسط۔ محمد ابن حمزہ عن عبد اللہ ابن سلام)۔
وَأْمُرْ أَهْلَكَ بِالصَّلَاةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا۔

(پ ۱۷۷ آیت ۳۲)

اور اپنے اہل خاندان کو بھی نماز کا حکم کرتے رہے، اور خود بھی اس کے پابند رہے۔
ایک حدیث میں ارشاد فرمایا: جس شخص نے منتر پڑھوایا یا داغ لگوایا اس نے توکل نہیں کیا۔ (ترمذی، نسائی، طبرانی، مغویہ ابن شعبہ) روایت ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مخفیق کے ذریعے آب میں پھینکا گیا تو حضرت جبریل علیہ السلام نے عرض کیا کہ آپ کو کوئی ضرورت تو نہیں؟ انہوں نے جواب فرمایا: حَسْبِيَ اللَّهُ نِعْمَ الْوَكِيلُ (میرے لئے اللہ کافی ہے اور وہ بہترین کفیل ہے) حضرت ابراہیم علیہ السلام سے یہی کہلواتا تھا، اور اس قول کے ذریعہ کوئی وعدہ وفا کرنا تھا، قرآن کریم کی اس آیت میں اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

وَأَبْرَأَهُنِمْ الْذِي يُوقِي۔ (پ ۲۷۷ آیت ۳۷)

اور ابراہیم (کے بچے) جنہوں نے احکام کی پوری بجا آوری کی۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام پر وحی نازل فرمائی کہ جو بندہ مخلوق کے بجائے میری رسی تھامتا ہے تو میں اسے زمین و آسمان کے مکر و فریب سے نجات دیتا ہوں۔

آثار حضرت سعید ابن جبیرؓ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میرے ہاتھ میں پتھو نے کاٹ لیا، میری ماں نے مجھ سے قسم دے کر کہا کہ میں جھاڑ پھونک کرنے والے سے اپنا ہاتھ جھڑواؤں، میں ماں کی خاطر اس کے پاس گیا لیکن اس کے ہاتھ میں اپنا وہ ہاتھ پکڑا دیا جس میں پتھو نے نہیں کاٹا تھا۔ حضرت خواصؓ نے قرآن کریم کی یہ آیت تلاوت کی۔
وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِي لَا يَمُوت۔ (پ ۱۸۳ آیت ۵۸)
اور اس حق لایموت پر توکل رکھئے۔

اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ بندے کو اس آیت کی روشنی میں صرف اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرنا چاہیے، اللہ کے سوا کسی سے التجا کرنا اسے زیب نہیں دیتا، ایک بزرگ نے خواب میں کسی شخص کو یہ جملہ کہتے ہوئے سنا کہ جس نے اللہ تعالیٰ پر اعتماد کیا اس نے اپنے لئے رزق جمع کر لیا۔ ایک عالم کہتے ہیں ایسا نہ ہو کہ آدمی اس رزق کی تلاش میں جس کا اس سے وعدہ کیا گیا ہے فرائض سے غافل ہو جائے، اور آخرت کے معاملات نظر انداز کر دے، حالانکہ اسے دنیا میں اسی قدر ملے گا جتنا اس کی قسمت میں لکھا گیا ہے۔ یحییٰ ابن معاذ فرماتے ہیں کہ آدمی کے پاس بلا طلب رزق آنے کا مطلب یہ ہے کہ رزق کو یہ حکم دیا جاتا ہے کہ وہ آدمی تلاش کرے اور اس کے پاس جائے۔ حضرت ابراہیم ابن ابراہیمؓ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک راہب سے دریافت کیا کہ تو کہاں سے کھاتا ہے؟ اس نے جواب دیا یہ میرا درد سر نہیں، تم میرے پروردگار سے دریافت کرو کہ وہ مجھے کہاں سے کھاتا ہے۔ ہرم ابن حیان نے حضرت اولیس القرنی سے دریافت کیا کہ میں کہاں رہوں؟ انہوں نے شام کی طرف اشارہ کر دیا، انہوں نے دریافت کیا اور کس چیز کو وسیلہ معاش بناؤں؟ حضرت اولیس نے ارشاد فرمایا: ان قلوب پر الفسوس ہوتا ہے جن میں شک کی آمیزش ہے، ایسے دلوں کو وہ غلط نصیحت سے کوئی فائدہ نہ ہوگا، ایک بزرگ کا قول ہے کہ جب میں نے اللہ تعالیٰ کو اپنا وکیل بنا لیا تو ہر خیر کی راہ پائی۔

اصل توکل توحید کی حقیقت

جاننا چاہیے کہ توکل ایمان کے ابواب میں سے ہے اور ایمان کے تمام ب جیسا کہ پہلے بھی بیان کیا جا چکا ہے تین چیزوں سے ترتیب پاتے ہیں 'علم' 'حال' اور 'عمل'۔ اسی طرح توکل بھی انہی تین چیزوں سے حاصل ہوتا ہے 'علم' سے جو اصل ہے 'عمل' سے جو ثمر ہے 'اور حال' سے جو لفظ توکل کی مراد ہے۔

علم پہلے ہم علم کا بیان شروع کرتے ہیں جو اصل ہے اور لغت کی رو سے اسی کو ایمان کہا جاتا ہے کیوں کہ ایمان کے معنی ہیں تصدیق اور قلوب کی ہر تصدیق کو علم کہتے ہیں اور اگر یہ علم قوی ہو جائے تو اسے یقین کا نام دیا جاتا ہے یقین کی بہت سی قسمیں ہیں لیکن ہم یہاں صرف وہی قسم زیر بحث لائیں گے جس پر توکل کا مدار ہے اور وہ قسم ہے توحید جو ہمارے اس قول سے مفہوم ہوتی ہے "لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ" اس میں باری تعالیٰ کی وحدانیت کا اعتراف ہے اسی قسم میں قدرت باری کی تصدیق بھی ہے جس پر یہ قول دلالت کرتا ہے "وَلَهُ الْمُلْكُ" اور اسی میں باری تعالیٰ کے وجود اور حکمت پر ایمان بھی ہے اس کا ثبوت "وَلَهُ الْحَمْدُ" سے ملتا ہے۔ چنانچہ اگر کسی شخص نے یہ کلمہ کہا "لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ لَهُ الْمُلْكُ وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ" تو اس کا وہ ایمان جو توکل کی اصل ہے پورا ہو گیا۔ یہاں ایمان کے پورا ہونے کے معنی یہ ہیں کہ یہ قول اس کے قلب کا ایک وصف لازم ہے اور وصف غالب بن جائے۔ جہاں تک توحید کا تعلق ہے وہ اصل اصول ہے لیکن اس میں بہت طویل مشکوک ہے اور اس کا تعلق علم مکاشفہ سے ہے لیکن کیوں کہ بعض علوم مکاشفہ احوال کے واسطے سے اعمال کے ساتھ متعلق ہیں اور ان کے بغیر علوم معاملہ مکمل نہیں ہوتے اس لئے ہم صرف توحید کا اسی قدر بیان کریں گے جو علم معاملہ سے متعلق ہے ورنہ توحید تو ایک ناپید کنار سمندر ہے۔

توحید کے چار مراتب اب ہم کہتے ہیں کہ توحید کے چار مراتب ہیں پہلا مرتبہ مغز کا ہے دوسرا مرتبہ مغز کے مغز کا ہے تیسرا اندرونی چٹکے کا ہے اور چوتھا وہی چٹکے کا ہے کم فہموں کے لئے ہم اخوت کی مثال بیان کرتے ہیں اس کے اوپر دو چٹکے ہوتے ہیں پھر مغز ہوتا ہے پھر مغز میں روغن ہوتا ہے جسے مغز کا مغز کہا جاتا ہے۔ توحید کا پہلا مرتبہ یہ ہے کہ بندہ زبان سے لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ کہے اور اس کا دل اس سے غافل ہو یا اس کا منکر ہو جیسے منافقین کی توحید دوسرا مرتبہ یہ ہے کہ اس کلمہ کے معنی کی تصدیق کرے جیسا کہ عام مسلمان اس کی تصدیق کرتے ہیں۔ یہ عوام کی توحید اور ان کا اعتقاد ہے تیسرا مرتبہ یہ ہے کہ نور حق کے ذریعے اس کے معنی منکشف ہو کر مشاہدے میں آجائیں یہ معرین کا مقام ہے اور اس انکشاف کے معنی یہ ہیں کہ بہت سی اشیاء دیکھے اور ان کا علم حاصل کرے لیکن ان سب کا منبع واحد قہار کی ذات کو سمجھے اور چوتھا مرتبہ یہ ہے کہ وہ صرف وارث واحد کے وجود کا مشاہدہ کرے تمام اشیاء میں اسے صرف اسی کا وجود نظر آئے یہ معرین کی توحید ہے اور صوفیاء اسے فانی التوحید کہتے ہیں یعنی یہ لوگ اپنے نفوس کو اور مخلوق کو باری تعالیٰ کے وجود کے سامنے فانی سمجھتے ہیں ان میں سے پہلا شخص محض زبان کا موجد ہے اور ایسا شخص یہ کلمہ کہہ کر دنیا میں سیف و ستان سے محفوظ رہتا ہے اور دوسرا شخص اس اعتبار سے موجد ہے کہ اس کا دل لفظ کے مفہوم کی تصدیق کرتا ہے اور قلب میں جو اعتقادات موجود ہیں ان کی تکذیب سے خالی ہے اس طرح کی توحید قلب کے لئے ایک گرہ ہے اس میں اشراخ اور کشادگی نہیں ہوتی لیکن جس شخص کے دل میں یہ گرہ ہوتی ہے وہ شہوت کے عذاب سے مامون اور محفوظ رہتا ہے بشرطیکہ اسی گرہ پر خاتمہ ہو اور گناہوں کی وجہ سے وہ وصل نہ پڑھتی ہو۔

پھر بعض اوقات اس گرہ کو ڈھیلا کر دیا جاتا ہے اور اس کے لئے مختلف تدبیریں اختیار کی جاتی ہیں ان تدبیروں کو بدعت کہتے ہیں اور بعض تدبیروں کے ذریعے اس گرہ کو مضبوط بنایا جاتا ہے ان تدبیروں کو علم کلام کہتے ہیں جو شخص علم کلام جانتا ہے وہ علم کلام کہتا ہے اور اس کے مقابل کو مبتدع کہتے ہیں حکم کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ مبتدع عوام کے دلوں سے یہ گرہ کھولنے نہ پائے نہ اسے کسی درجے میں کمزور کر سکے۔ حکم کے لئے کبھی خاص طور پر موجد کا لفظ بھی استعمال ہوتا ہے اس لحاظ سے کہ وہ عوام

دلوں میں کلمہ لا الہ الا اللہ کا مفہوم و معنی کی حفاظت کرتا ہے، یہاں تک کہ اس کے اعتقاد کی گرہ کھل نہیں پاتی۔ تیسرا مرتبہ اس موحد کا ہے جو صرف ایک فاعل کا مشاہدہ کرتا ہے، یعنی اس پر امر حق واضح ہوتا ہے اور اسے تمام اشیاء کا ایک ہی فاعل نظر آتا ہے، اور جو حقیقت ہوتی ہے وہی ظاہر ہوتی ہے، لیکن وہ اپنے دل کو لفظ حقیقت کے معنی و مفہوم کے اعتقاد کا پابند نہاتا ہے، یہ مرتبہ بھی عوام اور متکلمین کا ہے، اعتقاد کے معاملے میں عام آدمی اور حکم میں کوئی فرق نہیں ہوتا، فرق صرف یہ ہوتا ہے کہ عالی مبتدع کے ان جملوں سے دفاع کرنے پر قادر ہے جو اس کے اعتقاد کی گرہ کھولنے کے درپے ہوتا ہے۔ چوتھا مرتبہ اس شخص کا ہے جو ہر چیز میں ایک ہی ذات کا مشاہدہ کرتا ہے، اسے اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی وجود نظر نہیں آتا، وہ دنیا کی اشیاء کو کثرت کی راہ سے نہیں دیکھتا، بلکہ وحدت کی راہ سے دیکھتا ہے، یہ توحید کا انتہائی اعلا مرتبہ ہے۔

چنانچہ ان مراتب میں ایسا مرتبہ پہلا ہے جیسے اخوت کا خارجی چھلکا، اور وہ سرا مرتبہ باطنی چھلکے کے مانند ہے جو مغز کے ساتھ متصل رہتا ہے، اور تیسرا مرتبہ مغز کی حیثیت رکھتا ہے، اور چوتھا مرتبہ مغز کے مغز کا ہے، یعنی وہ روغن جو اخوت کے مغز سے کشید کیا جاتا ہے۔ جس طرح اخوت کا خارجی چھلکا بیکار شخص ہے کہ اگر کھایا جائے تو کڑوا معلوم ہو، دیکھا جائے تو آنکھوں کو برا لگے، اور آگ جلانے میں استعمال کیا جائے تو بجائے آگ جلانے کے اسے بجھاوے، یا دھواں کر دے، اور اگر کسی جگہ رکھا جائے تو محض جگہ گھیرنے کے علاوہ کسی کام میں مفید نہ ہو، سوائے اس کے کہ وہ چند روز مغز کی حفاظت کرتا ہے، اور اسے ہوا اور بارش وغیرہ کی دست و برد سے محفوظ رکھتا ہے، اسی طرح محض زبان سے اللہ تعالیٰ کی الوہیت اور وحدانیت کا اقرار کرنا بھی مفید نہیں ہے، بلکہ اس میں بہت زیادہ نقصانات ہیں، اور ظاہر و باطن ہر اعتبار سے مذموم ہے۔ اس ظاہری تصدیق کا صرف یہ فائدہ ہو سکتا ہے کہ چند روز تک نیچے کے چھلکے یعنی قلب اور بدن کو سیف و شان سے محفوظ رکھے یہاں تک کہ موت آکر فنا کر ڈالے، چنانچہ مجاہدین کی تلواریں منافقین کے جسموں پر نہیں اٹھیں، کیوں کہ انہیں دل چیر کر دیکھنے کا حکم نہیں ہے، وہ ظاہر کے اسلام پر نظر رکھتے ہیں، جب موت آجاتی ہے تو جسم خود بخود فنا ہو جاتا ہے، اور ظاہری توحید کا فائدہ بھی باقی نہیں رہتا۔ پھر جس طرح اندرونی چھلکا بیرونی چھلکے کے مقابلے میں زیادہ نفع پہنچاتا ہے کہ مغز کی حفاظت کرتا ہے، ذریعہ کئے جانے کے دوران سڑنے اور خراب ہونے بچاتا ہے، اور اگر اس چھلکے کو مغز سے جدا کر دیا جائے تو جلانے کے کام بھی آتا ہے، ان تمام منافع کے باوجود اس چھلکے کی حیثیت مغز کے مقابلے میں بہت کم ہے، یہی حال کشف حقائق کے بغیر اعتقاد قلب کا ہے۔ اگرچہ یہ اعتقاد زبانی قول کی بہ نسبت بہت سی منفعات کا حامل ہے، لیکن کشف و مشاہدہ کے مقابلے میں جو دل کے انشراح اور اس میں نور حق کی تجلی کے نتیجے میں حاصل ہوتا ہے اس اعتقاد کی کوئی حیثیت نہیں ہے، ان آیات میں یہی ”شرح“ مراد ہے۔

فَمَنْ كَرِهَ دَالَةَ اَنْ يَّهْدِيَهُمْ سِرَاجٌ صَلَوٰةٌ لِّاِسْلَامٍ (پ ۸ ر ۲ آیت ۱۶)

جو جس شخص کو اللہ تعالیٰ ہدایت دینا چاہتا ہے اس کے سینے کو اسلام کے لئے کشادہ کر دیتا ہے۔

اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صُلُوٰةً لِّاِسْلَامٍ فَهُوَ عَلٰی نُوْرٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ (پ ۱۳ ر ۱۶ آیت ۲۲)

جو جس شخص کا سینہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کے لئے کھول دیا ہے وہ اپنے پروردگار کے نور پر ہے۔

اگرچہ مغز ذات خود نہایت عمدہ اور نفیس چیز اور دیکھا جائے تو مقصود و مطلوب بھی یہی مغز ہے، لیکن پھر بھی کچھ نہ کچھ زائد عناصر اس میں موجود ہیں جو روغن کشید کرنے کی صورت میں سامنے آتے ہیں، اس لئے روغن مغز کے مقابلے میں زیادہ خالص اور عمدہ ہوتا ہے، اسی طرح فاعل کو ایک جاننا بھی سا لکین کے حق میں ایک اعلا ترین مقصد ہے، لیکن کیوں کہ اس میں کچھ نہ کچھ القات غیر کی طرف پایا جاتا ہے، اور وہ اس شخص کے مقابلے میں کم موحد ہے جو صرف ایک ذات کو دیکھتا ہے کیونکہ اس کی نظر کثرت سے وحدت کی طرف جاتی ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ صرف ایک ذات کا مشاہدہ کرنا کیسے ممکن ہے، جب کہ انسان آسمان زمین اور تمام محسوس اجسام کا مشاہدہ

کرتا ہے، اور یہ محسوس اجسام ناقابل شمار ہیں، اس لئے یہ ایک کیسے ہو جائیں گے، اور دیکھنے والا ہر شئی کو ایک کیسے سمجھے گا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ علوم مکاشفات کی انتہا ہیں، اور اس کے علم کے اسرار و رموز کا کسی کتاب میں درج کرنا جائز نہیں، عارفین کہتے ہیں کہ رویت کا راز افشاء کرنا کفر ہے، پھر کیوں کہ اس امر کا تعلق علم معاملہ سے نہیں ہے، اس لئے ہم مناسب نہیں سمجھتے کہ اس سوال کا مفصل جواب دیا جائے اور یہ بتلایا جائے کہ آدمی بہت سی چیزوں کو ایک کیسے سمجھ لیتا ہے، تاہم ایک بدیہی مثال کے ذریعے ہم صرف اشارہ کئے دیتے ہیں، دیکھنے دنیا میں بہت سی چیزیں ایسی ہیں کہ اگر انہیں کسی خاص طریقے سے دیکھا جائے تو بہت معلوم ہوں، اور دوسرے رخ سے دیکھا جائے تو ایک لکین، مثلاً انسان ہی کو لیجئے، اگر اس کی روح، جسم، اعضاء، رگوں، ہڈیوں اور آسمان کے اعتبار سے دیکھا جائے تو وہ بہت ہے، اور اگر انسانیت کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو وہ ایک ہے، بہت سے لوگ ایسے ہیں جو انسان کو دیکھتے ہیں مگر ان کے دلوں میں اس کی رگوں، ہڈیوں اور دوسرے اعضاء کا خیال تک نہیں آتا، نہ وہ روح اور جسم کے متعلق سوچتے ہیں، اور نہ ان دونوں میں فرق کرتے ہیں، وہ ایک کی حالت میں مستغرق رہتا ہے، اور اس حالت میں اس کے دل پر صرف ایک ہی کا خیال حاوی رہتا ہے، وہ ان میں افتراق اور جدائی کا تصور نہیں کرتا۔ جتنے بھی موجودات ہیں خواہ وہ خالق ہو یا مخلوق سب کے لئے متحد اور مختلف اعتبارات ہیں، کسی اعتبار سے وہ ایک ہیں، اور کسی دوسرے اعتبار سے کثیر ہیں، پھر بعض کی کثرت بعض کے مقابلے میں زیادہ ہے، انسان کی مثال سے ان اعتبارات کا فرق واضح ہو جاتا ہے، اگرچہ یہ مثال ہماری غرض سے پوری طرح مطابق نہیں ہے، لیکن اس مثال سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ بعض اوقات مشاہدے سے کثرت وحدت میں بدل جاتی ہے۔

اس گفتگو سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس مقام کا انکار نہیں کیا جاسکتا جو ہماری پہنچ سے باہر ہے، یا جو ہماری منزل نہیں بنا، اگر ہمیں کوئی مقام میسر نہ ہو اور تم اس کی تصدیق کرو تو اس تصدیق کی بدولت ہمیں اطلاع کی توحید سے اسی قدر بہرہ ہو گا جس قدر تمہارا ایمان قوی ہو گا اگرچہ وہ چیز جس پر تم ایمان لائے ہو تمہارا وصف یا صفت نہ بنی ہو، جیسے اگر تم نبوت پر ایمان لائے تو یہ ضروری نہیں ہے کہ تم نبی بھی ہو، لیکن اسے نبوت سے اسی قدر بہرہ ہو گا جس قدر نبوت پر اس کا ایمان قوی ہو گا۔ یہ مشاہدہ جس میں ہمہ کو واحد مطلق کی ذات کے سوا کچھ نظر نہیں آتا کبھی پیشہ رہتا ہے، اور کبھی اتنا مختصر اور لمبائی ہوتا ہے جیسے پلک جھپک جائے یا بالکل گونہ جائے، اکثر ایسا ہی ہوتا ہے، اس حالت کا دوام بہت کم واقع ہوتا ہے۔

حسین ابن منصور طلاج نے حضرت ابراہیم خواص کو سفر میں سرگرداں دیکھ کر پوچھا کہ تم کس فکر میں مبتلا ہو، انہوں نے جواب دیا کہ میں توکل کے سلسلے میں اپنے حال کی اصلاح کے لئے پابہ رکاب پھرتا ہوں، حضرت خواص کا تعلق باجہ متکلمین میں سے تھا، حسین ابن منصور نے ان سے کہا کہ تم نے تمام عمر اپنے باطن کی تعمیر میں صرف کی ہے، ثنائی التوحید رہے ہو، وہ ریاضت کماں گئی، گویا خواص توحید کے تیسرے مقام کی تعمیر و اصلاح میں مصروف رہے، ابن منصور نے ان سے چوتھے مقام کا مطالبہ کیا۔

توحید اور موحدین کے یہ چار مراتب اور مقامات ہیں، اب ہم اس توحید پر گفتگو کرتے ہیں جس پر توکل مبنی ہے، جہاں تک چوتھے مقام کا تعلق ہے اسے موضوع بحث بنانا ہی بیکار ہے، وہ علم معاملہ سے خارج ہے، اور توکل اس پر مبنی بھی نہیں ہے، بلکہ توکل کی حالت تیسری قسم کی توحید سے حاصل ہوتی ہے۔ پہلی قسم کی توحید غفلت ہے، اور دوسری محض تصدیق ہے، اور عام مسلمانوں میں پائی جاتی ہے، کلام کے ذریعے اسے مضبوط بنانے کا طریقہ اور مبتدعین کے خیالوں سے بچنے کی تدبیریں علم الکلام میں مذکور ہیں، اور کتاب الاعتقادی الاعتقاد میں ہم نے اس سلسلے کے بعض اہم نکات بیان بھی کئے ہیں، اب صرف تیسری قسم ہائی رہ جاتی ہے، توکل اسی پر مبنی ہے، اس لئے کہ توکل کے لئے محض تصدیق قلبی کافی نہیں ہے، بلکہ کچھ کشف و مشاہدہ بھی ضروری ہے، لیکن ہم یہاں ذریعہ بحث توحید کا صرف اسی قدر حصہ بیان کریں گے جو ہمارے موضوع توکل کے ساتھ براہ راست متعلق ہے، ہم ایسی تفصیل کے درپے نہیں ہیں جس کی اس کتاب میں گنجائش نہیں ہے۔

بحر حال تیسرے درجے کی توحید یہ ہے کہ تم پر یہ بات منکشف ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی قائل نہیں ہے، اور خلق، رزق، عطاء، منع، حیات، موت، فنی اور فہر وغیرہ امور جنہیں کوئی نام دیا جاسکتا ہے ان کا ایجاد کرنے والا اور پیدا کرنے والا صرف اللہ ہے، اللہ کے سوا کوئی نہیں ہے، اگر تم پر یہ امر منکشف ہو جائے تو پھر تم اللہ کے سوا کسی کی طرف نہیں دیکھو گے، اسی سے ڈرو گے، اسی سے امید رکھو گے، اسی پر اعتماد کرو گے، اسی پر بھروسہ رکھو گے، اس لئے کہ وہ قائل ہے، وہی مہدے اور موجد ہے اس کے سوا تمام موجودات مستغریں، ان میں یہ طاقت نہیں کہ وہ اپنے خالق کی مرضی کے علی الرغم زمین و آسمان کے ملکوت میں سے ایک حقیر ذرہ کو بھی حرکت دے سکیں۔ جب کسی شخص پر مکاشفات کے دروازے کھل جاتے ہیں تو اس پر یہ اور مشاہدے سے بھی زیادہ واضح ہو جاتے ہیں۔ یہاں یہ بات بھی جان لینی چاہیے کہ شیطان انسان کو توحید سے ایسے مقام پر روک دیتا ہے جہاں وہ یہ دیکھتا ہے کہ اس کے دل پر شک کا وار موثر ہو سکتا ہے، اور یہ شک دو صورتوں سے ڈالتا ہے، ایک حیوانات کے اعتبار کی طرف التفات کرانے کے باعث، اور دوسرے جمادات کی طرف متوجہ کرنے کی وجہ سے، جمادات کی طرف التفات کی صورت یہ ہے کہ تم کھیتی کی نشوونما میں بارش پر اعتماد کرو، اور بارش کے لئے بادلوں پر نظر رکھو، اور بادلوں کے لئے سردی پر بھروسہ کرو، سمندر کے سینے پر کشتی چلنے اور سیدھی رکنے کے سلسلے میں ہوا پر اعتماد کرو، یہ تمام امور توحید میں شرک ہیں، اور حقائق امور سے جہل کی علامت ہیں، اسی لئے اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے نہ

فَإِنَّا نَكُونُ فِي الْفُلْكِ دَعْوَالَهُ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ، فَلَمَّا نَجَّاهُمْ إِلَى الْبَرِّ إِذَا هُمْ يُشْرِكُونَ۔ (پ ۲۱ آیت ۹۵)

پھر جب یہ لوگ کشتی پر سوار ہوتے ہیں تو خالص اعتقاد کر کے اللہ ہی کو پکارنے لگتے ہیں، پھر جب ان کو نجات دے کر خشکی کی طرف لے آتا ہے تو وہ فوراً ہی شرک کرنے لگتے ہیں۔

بعض مفسرین نے اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ بعض کشتی سوار منزل پر صحیح سلامت پہنچنے کے بعد یہ کہتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ اگر ہوا موافق نہ ہوتی تو ہم ہرگز ساحل پر نہ پہنچتے، لیکن جس شخص پر عالم کے حقائق منکشف ہیں، اور وہ یہ جانتا ہے کہ موافق ہوا بھی ہوا ہے، اور یہ خود متحرک نہیں ہوتی، بلکہ اسے ایک محرک حرکت دیتا ہے، پھر اس محرک کے لئے ایک محرک ہے، اگر اس طرح دیکھا جائے تو یہ سلسلہ محرک حقیقی پر جا کر ختم ہوتا ہے، جس کا نہ کوئی محرک ہے، اور نہ بذات خود محرک ہے۔ بندہ کا ہوا کی طرف التفات ایسا ہے جیسے کسی شخص کے متعلق یہ فیصلہ کیا گیا ہو کہ اسے قتل کر دیا جائے، اچانک بادشاہ اس کے لئے معافی کا حکم نامہ جاری کر دے، اور اس کے نتیجے میں قتل کے فیصلے پر عمل رک جائے، وہ شخص بادشاہ کی قدرت اور عظمت کا قائل ہونے کے بجائے قلم، دوات، اور کاغذ کو اس کا ذمہ دار قرار دے، اور ان بے جان اور معمولی چیزوں کو اپنا محسن تصور کرے، اور یہ کہے کہ اگر قلم نہ ہوتا تو مجھے نجات حاصل نہ ہوتی، یا کاغذ نہ ہوتا تو مجھے قتل کر دیا جاتا، یہ انتہائی نادانی اور جہالت کی بات ہے، جو شخص یہ بات جانتا ہے کہ حقیقت میں قلم کو ذرا بھی قدرت نہیں ہے وہ محض کاتب کے قلم میں مسخر ہے، وہ جس طرح چاہتا ہے اسے استعمال کرتا ہے، ایسا شخص قلم کی طرف التفات نہیں کرتا اور نہ کاتب کے سوا کسی کا شکر گزار ہوتا ہے، بعض اوقات اسے نجات سے اس قدر خوشی ہوتی ہے کہ بادشاہ اور کاتب کے شکر میں دل کو قلم، کاغذ اور روشنائی کا خیال بھی نہیں ہوتا۔ چاند، سورج، ستارے، اہم باران، زمین، اور تمام حیوانات اور جمادات باری تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں اس طرح مسخر ہیں جیسے قلم کاتب کے ہاتھ میں مسخر ہوتا ہے، یہ مثال تمہیں سمجھانے کے لئے دی گئی ہے، کیوں کہ عام طور پر تم کی سمجھت ہو کہ بادشاہ صرف دستور کرتا ہے، کاتب حقیقی اللہ تعالیٰ ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے خود بھی ارشاد فرمایا نہ

وَمَا رَمَيْتُ إِذْ رَمَيْتُ وَلَكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ۔ (پ ۲۹ آیت ۷۵)

اور آپ نے نہیں پھینکی (خاک)، جس وقت میں پھینکی تھی، بلکہ اللہ تعالیٰ نے پھینکی۔

بہر حال اگر تم پر یہ حقیقت منکشف ہو جائے کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے، وہ سب اللہ کے لئے مسخر ہے تو شیطان تم سے مایوس ہو کر بھاگ جائے، اور یہ یقین کر لے کہ وہ تمہارے عقیدہ توحید میں شرک کی آمیزش نہیں کر سکتا۔ یہ جمادات کی طرف التفات کی صورت ہے۔ اب حیوانات کے اختیار کی طرف التفات کا حال سنئے، اس صورت میں شیطان تم سے کہتا ہے کہ یہ بات تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ تمام افعال اللہ کے ہیں، اس انسان کو دیکھو وہ تمہیں اپنے اختیار سے رزق دیتا ہے، اگر وہ چاہے تو ہمیں رزق دیدے اور چاہے تو محروم کر دے، اور یہ شخص تیری گردن پر قدرت رکھتا ہے، چاہے تو اپنی تلوار سے تیری گردن اڑا دے، اور چاہے تو تجھے معاف کر دے، اس لئے تجھے پہلے شخص سے رزق کی امید رکھنی چاہیے، اور دوسرے شخص سے خوف کرنا چاہیے، انہیں پورا پورا اختیار ہے، جیسا کہ تم اس کا مشاہدہ بھی کرتے ہو، اور اس کا یقین رکھتے ہو کہ رزق دینے اور معاف کرنے کے اعمال ان لوگوں سے صادر ہو رہے ہیں، شیطان اس سے یہ بھی کہتا کہ اگر تم قلم کو کاتب نہیں سمجھتے، بلکہ اسے لکھنے والے کے ہاتھ میں مسخر قرار دیتے ہو تو لکھنے والے کو کاتب کیوں نہیں کہتے جب کہ وہ خود اپنے اختیار سے لکھنے والا ہے۔ اس معاملے میں اللہ تعالیٰ کے ان قلم بندوں کے علاوہ جن پر شیطان کا بس نہیں چلا اکثر لوگ لغزش کھا جاتے ہیں، چنانچہ یہ بدگمان خدا اپنی بصیرت کی آنکھوں سے دیکھ لیتے ہیں کہ بظاہر کاتب اپنے اختیار سے لکھتا ہوا نظر آتا ہے، لیکن فی الحقیقت وہ مسخر اور مجبور ہے، ان کا مشاہدہ ایسا ہی ہے جیسے قلم کم اور ضعیف نظر لوگوں کا یہ مشاہدہ کہ قلم کاتب کے ہاتھ میں مسخر ہے، اس معاملے میں ضعف کی مثال اس چوٹی کی سی ہے جو کانڈ پر بھرتی ہو اور اس کی نگاہ قلم کی نوک پر ہو، وہ اپنی کم نظری کے باعث کاتب کی انگلیوں اور ہاتھ کو نہ دیکھ سکے، ظاہر ہے یہ چوٹی اس کے علاوہ کچھ نہیں سمجھ سکتی کہ کانڈ کو سیاہ کرنے میں نوک قلم ہی مؤثر ہے، اس چوٹی کی نظر قلم کی نوک سے تجاوز کر کے ہاتھ اور انگلیوں تک نہیں پہنچتی کیوں کہ اس کی نگاہ کا دائرہ نہایت تنگ اور محدود ہے، یہی حال اس شخص کا ہے جس کا سینہ اللہ کے نور سے روشن اور منور نہ ہو، وہ زمین و آسمان کے جبار کو نہیں دیکھ پاتا، اور نہ یہ سمجھ پاتا ہے کہ وہ قمار واحد تمام موجودات پر غالب ہے، اس کی نگاہ کاتب پر ٹھہر جاتی ہے اس سے آگے نہیں بڑھ پاتی، یہ صرف نادانی اور جہالت ہے ارباب قلوب اور اصحاب مشاہدات کے قلم اور مشاہدے کے لئے اللہ تعالیٰ نے آسمان و زمین کے ذمہ ذرہ کو نطق و گویائی بخشی ہے، چنانچہ وہ ہرزہ کی زبان سے اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تقدیس سنتے ہیں، اور ان کے مجز کا مشاہدہ کرتے ہیں، ہر شئی اپنی عاجزی، مقہوری، اور واپمانگی کا اعتراف کرتی نظر آتی ہے، اگرچہ وہ اس اعتراف کے لئے کوئی حرف استعمال نہیں کرتی نہ صورت کو ذریعہ اظہار بناتی ہے، جنہیں اللہ تعالیٰ نے دور بین نگاہیں نہیں دی ہیں وہ اس کا مشاہدہ نہیں کر سکتے اور جنہیں حق سننے والے کان نہیں بخشے وہ ان کا اعتراف اور تقدیس و تحمید کی آوازیں نہیں سن سکتے۔ کان سے ہماری مراد یہ کان نہیں یہ کان تو صرف آوازیں کا اور اک کرتے ہیں، ان کانوں میں انسان ہی کی کیا تخصیص ہے، ایسے کان تو مگدھوں کے بھی ہوتے ہیں، ایسی چیزوں کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہوتی جن میں حیوان بھی تمہارے شریک ہوں۔ ہم وہ کان مراد لے رہے ہیں جو ایسا کلام سنیں جس میں نہ حرف ہو، نہ صورت ہو، نہ وہ کلام عربی ہو اور نہ عجی ہو۔

اشیاء کی تسبیح و تقدیس کو رہیں اور کم قلم لوگ ہماری اس بات پر تعجب کا اظہار کر سکتے ہیں، اور اسے عقل کے لئے ناقابل قبول قرار دے سکتے ہیں، اور یہ سوال کر سکتے ہیں کہ اگر ان اشیاء کا کلام حرف و صورت سے عبارت نہیں ہے تو پھر یہ کیسے بولتی ہیں، اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تقدیس کس طرح کرتی ہیں، اور اپنے نفسوں پر مجز و قصور کی گواہی کس طرح دیتی ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ آسمان اور زمین کا ہرزہ ارباب قلوب کے ساتھ عقلی طور پر راز و نیاز کرتا ہے، اور اس کی کوئی انتہا نہیں ہے، یہ مناجات ایسے کلمات پر مشتمل ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ کے کلام کے ناپید کنار سمندر سے حاصل کئے جاتے ہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :-

قُلْ لَوْ كَانَ الْبَحْرُ مِثْلًا لِكَلِمَاتِ رَبِّي لَنَفَذَ الْبَحْرُ قَبْلَ أَنْ تَنْفَذَ كَلِمَاتُ رَبِّي

وَلَوْ جُنَّابِئِمْنَالْمَعَكَدَا (پ ۱۲ ر ۳ آیت ۱۰۹)

آپ کہہ دیجئے کہ اگر میرے رب کی باتیں کہنے کے لئے سمندر (کاپانی) روشنائی ہو تو میرے رب کی باتیں ختم ہونے سے پہلے سمندر ختم ہو جائے، اگرچہ اس جیسا (ایک اور سمندر) مدد کے لئے لایا جائے۔

یہ ذرات ملک اور ملکوت کے اسرار بیان کرتے ہیں، اور راز انشاء کرنا کینگی ہے، شریہوں کے سینے اسرار کی قبریں ہوتی ہیں، تم نے کبھی کوئی ایسا شخص نہ دیکھا ہو گا جسے بادشاہ نے اپنا راز دار مقرر کیا ہو، اور وہ لوگوں سے بادشاہ کے راز بیان کرنا پھرنا ہو۔ اگر راز انشاء کرنا جائز ہوتا تو سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم یہ ارشاد نہ فرماتے نہ۔

لَوْ نَعْلَمُونَ مَا الْعَلَمُ لَصَحَّحَكُنْمُ قَلِيلًا وَلَبَكَيْتُمْ كَثِيرًا (۱)

اگر تم وہ باتیں جان لیتے جو میں جانتا ہوں تو کم ہتے اور زیادہ ہوتے۔

بلکہ بیان فرما دیتے تاکہ زیادہ ہوتے اور کم ہتے۔ اسی طرح آپ صحابہ کرام کو تقدیر کا راز انشاء کرنے سے بھی منع نہ فرماتے

(۲) اور نہ یہ ارشاد فرماتے نہ۔

إِذَا ذَكَرَ النَّجْوَى فَمَنْ سَكَا وَإِذَا ذَكَرَ الْقَدْرَ فَمَنْ سَكَا۔

(طبرانی۔ ابن حبان)

جب ستاروں کا ذکر ہو تو خاموش رہو، جب تقدیر کا ذکر ہو تو خاموش رہو۔

حضرت حذیفہؓ وہ واحد صحابی ہیں جنہیں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض اسرار کے ساتھ خصوصی فرمایا تھا۔

(۳) اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ تمام لوگوں کا اسرار پر مطلع ہونا مناسب نہیں ہے۔ ہر حال آسمان و زمین کے ذرات ارباب

قلوب سے جو راز و نیاز کی باتیں کرتے ہیں وہ دو ہیں، ایک تو یہ کہ انشاء راز حال ہے، اور دوسرے

یہ کہ راز و نیاز کی باتیں اور حکایتیں لامحدود ہیں۔ ہم نے ماقبل کے صفحات میں قلم کی مثال بیان کی ہے، ہم بلور مثال اس کی

مناجات اور ارباب قلوب کے ساتھ اس کی گفتگو کا اس قدر حصہ بیان کرتے ہیں جس سے طور و جمال یہ سمجھا جاسکے کہ اس پر توکل

کس طرح مبنی ہے، اگرچہ یہ گفتگو حروف اور آواز کے متعلق نہیں ہے، لیکن ہم ضرورت تقسیم کے لئے حروف اور آواز فرض کے

لیتے ہیں۔

قلم کی اہل دل سے گفتگو ایک سالک نے جس کے دل میں نور الہی کی شمع روشن تھی کانڈ کو دیکھا کہ وہ پہلے سفید تھا، پھر سیاہ ہو گیا

اس نے کانڈ سے پوچھا کہ تیرا چو سفید سے سیاہ کیوں ہو گیا، اس نے جواب دیا تمہارا یہ سوال انصاف پر مبنی نہیں ہے، میں نے اپنا

چو خود سیاہ نہیں کیا، تم روشنائی سے دریافت کرو، وہ دوات میں قیام پذیر تھی جو اس کا مسکن اور وطن ہے، پھر اس نے وطن سے

کو کوچ کیا، اور میرے چہرے کو اپنی حلقہ ٹھہرایا، اور قلم و زبردستی کے ساتھ اس میں قیام پذیر ہو گئی، سالک نے کہا تو جی کہتی ہے، اس

کے بعد اس نے روشنائی سے دریافت کیا کہ تو نے کانڈ کو سیاہ کیوں کر دیا، اس نے جواب دیا کہ تم نے میرے ساتھ انصاف نہیں کیا،

میں دوات میں پُر سکون بیٹھی ہوئی تھی، اور اس سے باہر نکلنے کا میرا کوئی ارادہ نہیں تھا، قلم نے مجھ پر اپنی طبع فاسد کی بنا پر قلم کیا، اور

مجھے اپنے وطن سے نکلنے پر مجبور کر دیا، مجھے بے گھر کر دیا، میرا شیرازہ بکھیر دیا، اور مجھے اس سفید میدان میں بکھیر کر چاہو دیکھو کر دیا،

اس لئے تم میرے بجائے قلم سے سوال کرو، سالک نے کہا تو جی کہتی ہے، اس کے بعد اس نے قلم سے اس کے قلم و جسم کے

متعلق دریافت کیا اور پوچھا کہ تو نے روشنائی کو اس کے وطن سے کیوں نکالا، اور اسے انہوں سے کس لئے جدا کیا؟ اس نے جواب

دیا کہ تم ہاتھ اور انگلیوں سے سوال کرو، میں تو ایک سبز نرسل کے روپ میں نسوں کے کنارے کھڑا ہوا تھا، ایک شخص ہاتھ میں

چھری لے کر میرے پاس پہنچا میرا چمکا اتارا میرے کپڑے پھاڑے مجھے جڑ سے اکھاڑا اور مجھے کلنے کلنے کر دیا پھر ایک کلوا لیا اسے تراشا اس کا سرچرا پھر مجھے تلخ اور سیاہ روشنائی میں ڈبوایا وہ مجھ سے خدمت لیتا ہے اور مجھے سر کے بل چلنے پر مجبور کرتا ہے یہاں تو پہلے ہی پورا بدن اس ہاتھ کی نوازشوں سے چھلنی ہے اب تم اپنے سوالات کا تک چھڑک کر اس میں اور زیادہ سوزش پیدا کر رہے ہو اس لئے مجھ سے دور رہو اور یہ سوال اس شخص سے کرو جس نے مجھے بے دست دیا کیا ہے سالک نے قلم کی بھی تصدیق کی پھر ہاتھ سے پوچھا کہ آخر وہ قلم پر اس قدر مظالم کیوں ڈھاتا ہے اور اسے اس کی مرضی کے علی الرغم اپنی خواہشات میں کیوں استعمال کرتا ہے ہاتھ نے جواب دیا کہ میں صرف گوشت ہڈی اور خون کا مجموعہ ہوں کیا تم نے گوشت کا کوئی ایسا لو تھڑا دیکھا ہے جو قلم کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو یا کوئی ایسا جسم دیکھا ہے جو خود بخود حرکت کرتا ہو میں تو محض ایک سواری ہوں جس پر ایک شہسوار سوار ہے جسے قدرت اور عزت کہتے ہیں وہ شہسوار مجھے پھراتا ہے اور زمین کے مختلف گوشوں میں گشت لگانے پر مجبور کرتا ہے دیکھو شہسوار جبرانی جگہ سے خود نہیں ہلتے اور نہ حرکت کرتے ہیں جب تک کوئی انہیں حرکت نہ دے میرے ہاتھ اور مردوں کے ہاتھ شکل و صورت اور طول و عرض میں یکساں ہیں پھر کیا بات ہے کہ مردوں کے ہاتھ قلم نہیں اٹھاتے اور میرا ہاتھ اٹھاتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ میرا قلم سے کوئی رشتہ نہیں ہے تم یہ سوال قدرت سے کرو میں محض سواری ہوں جسے سوار اپنے چابک کے زور پر چلنے پر مجبور کرتا ہے سالک قلم کے جواب پر یقین کرتا ہے اور قدرت سے پوچھتا ہے کہ آخر اسے ہاتھ کو استعمال کرنے کا کیا حق ہے وہ اسے اپنی اغراض میں کیوں استعمال کرتی ہے اور کیوں اسے حرکت پر مجبور کرتی ہے قدرت نے جواب دیا کہ مجھے معلوم نہ کہو بسا اوقات طامت کرنے والا خود اس قابل ہوتا ہے کہ اس پر طامت کی جائے اور جس پر طامت کی جاتی ہے وہ بے گناہ ثابت ہوتا ہے تم پر میری حالت منکشف نہیں ہے تم یہ بات کیسے کہہ سکتے ہو کہ میں نے ہاتھ کو سوار ہو کر زیادتی کی ہے میں تو اس پر حرکت سے پہلے بھی سوار تھی مگر خاموش سو رہی تھی میری خاموشی اور نیند کا عالم یہ تھا کہ لوگ مجھے مردہ یا معدوم تصور کرتے تھے یعنی میں نہ خود متحرک تھی اور نہ دوسرے کو حرکت دیتی تھی یہاں تک کہ ایک سوکل آیا اس نے مجھے حرکت دی اور زہدستی اس کام پر مجبور کیا جس پر تم مجھے طامت کا ہدف بنا رہے ہو میرے اندر یہ طاقت نہیں تھی کہ میں اس کے حکم سے سرنمائی کروں میں اس کی مرضی کے مطابق کام کرنے پر مجبور تھی اس سوکل کا نام ارادہ ہے میں اسے صرف اس کے نام سے جانتی ہوں اور اس کے اس عمل سے جانتی ہوں کہ ایک روز وہ مجھ پر حملہ آور ہوا اور مجھے گہری نیند سے بیدار کر کے مجبور کیا کہ میں ہاتھ کو حرکت دوں مجھے اس کے حکم پر عمل کرنے کے سوا کوئی راستہ نظر نہیں آتا سالک نے کہا تو سچ کہتی ہے اس کے بعد اس نے ارادہ سے پوچھا کہ تجھے کیا ہوا تھا کہ تو نے پُر سکون اور مطمئن قدرت کو پریشان کیا اور اسے حرکت کرنے پر اس طرح مجبور کیا کہ اس کے سامنے تیرے حکم کی تعمیل کے سوا کوئی راہ باقی نہیں رہی ارادے نے کہا کہ مجھ پر حکم لگانے میں جلدی نہ کرو ہو سکتا ہے میں ایسا کرنے میں معذور ہوں اور تم بلاوجہ ہی مجھے طامت کر رہے ہو میں خود نہیں اٹھا بلکہ اٹھایا گیا ہوں میں خود بیدار نہیں ہوا بلکہ مجھے ایک زبردست قوت نے اٹھایا ہے ورنہ میں اس سے پہلے پُر سکون تھا اور اپنی جگہ ٹھہرا ہوا تھا میرے پاس قلب کی بارگاہ سے وصل کی زبانی علم کا قاصد آیا اور اس نے مجھے حکم دیا کہ میں قدرت کو اٹھا دوں چنانچہ میں نے مجبوراً قدرت کو اٹھا دیا میں تو علم اور وصل کے لئے مسخر ہوں اور مجھے معلوم نہیں کہ کس جرم کی سزا میں مجھے علم و وصل کا تال اور اس کے زبردست قرار دیا گیا اور مجھے اس کی اطاعت پر مجبور کیا گیا جب تک یہ زبردست قاصد میرے پاس نہیں آیا تھا میں خاموش اور پُر سکون تھا اب یہی میرا حاکم ہے خواہ عادل ہے یا ظالم ہے میں اس کا حکم ماننے پر مجبور ہوں جب یہ کوئی حکم کرتا ہے تو میرے اندر یہ طاقت نہیں رہتی کہ میں اس کی مخالفت کر سکوں میں اپنی جان کی قسم کھا کر کہتا ہوں جب تک وہ کسی معاملے میں متروک اور پریشان رہتا ہے میں خاموش رہتا ہوں لیکن میرا وحمیان اسی کی طرف لگا رہتا ہے اور جب وہ کوئی قطعی فیصلہ کرتا ہے تو میں اپنی فطرت کے تقاضوں کے تحت اس کی اطاعت کے لئے مجبور ہو جاتا ہوں اور قدرت کو اڑا دیتا ہوں اب تم علم سے استفسار کرو اور اپنا عتاب

مجھ سے دور رکھو؛ جیسا کہ ایک شاعر کہتا ہے نہ

مَنْ نَزَحَلَتْ عَنْ قَوْمٍ قَدْ قَدَّرُوا لَنْ لَا تُفَارِقَهُمْ فَالْزَاحِلُونَ هُمْ

سالک نے کہا تو چھوٹتا ہے، پھر وہ علم، عقل اور قلب کی طرف متوجہ ہوا اور انہیں اس بات پر لعنت ملاست کی کہ وہ ارادہ کو قدرت کی تحریک کے لئے متحرک نہ ہوئے ہیں، عقل نے جواب دیا کہ میں ایک چراغ ہوں جو خود روشن نہیں ہوا ہے بلکہ اسے کسی دوسرے نے روشن کیا ہے، دل نے جواب دیا کہ میں ایک لوح ہوں جو خود نہیں پھیل بلکہ اسے کسی اور نے پھیلایا ہے، علم نے کہا کہ میں ایک نقش ہوں جو لوح قلب کی سفیدی پر عقل کا چراغ روشن ہونے کے بعد محو ہوتا ہے، میں خود بخود محو نہیں ہوتا بلکہ کوئی دوسرا نقش کرتا ہے، اس لئے تم اس قلم سے پہچو جس نے مجھے نقش کیا ہے۔ اس تک دود کے باوجود سالک کو کوئی ایسا جواب نہیں ملا جس پر وہ قانع ہو سکے، چنانچہ حیران پریشان رہ جاتا ہے اور کہتا ہے کہ میں اس راہ پر بڑی دیر سے گامزن ہوں اور بہت سی منزلیں طے کرتے ہوئے یہاں تک پہنچا ہوں، راستے میں مجھے جو بھی ملا میں نے اسی سے سوال کیا، ہر ایک نے مجھے دوسرے کے حوالے کیا، اگرچہ میں اس تک دود سے خوش تھا اس لئے کہ ہر جواب معقول تھا، اور دل میں گھر کرنے والا تھا، لیکن یہ آخری جواب میری سمجھ سے باہر ہے، علم کہتا ہے کہ میں ایک نقش ہوں جو قلم کے نتیجے میں ظہور پذیر ہوا ہے، حالانکہ میں قلم صرف ہانس کا سمجھتا ہوں، حقیقی لوسہ یا لکڑی کی ہوتی ہے، اور نقش سیاہ یا سرخ روشنائی کا ہوتا ہے، اور چراغ آگ سے روشن ہوتا ہے یہاں میں لوح، چراغ اور نقش کی متشکک رہا ہوں، حالانکہ ان میں سے کوئی چیز مجھے نظر نہیں آتی، چکی کی آواز سنتا ہوں مگر چکی نظر نہیں آتی، اس کے جواب میں علم کہتا ہے تو جو کچھ کہہ رہا ہے سچ ہے، تیرا اس المال کم ہے، اور زاد راہ مختصر ہے، تیری سواری کمزور ہے، اور تو جس راستے کا مسافر ہے اس کے خطرات بے شمار ہیں، اس لئے تیرے حق میں بہتری ہے کہ تو یہ راستہ چھوڑ دے، اور دوسرا راستہ اختیار کر، تو اس کا اہل نہیں ہے، جو جس چیز کا اہل ہوتا ہے اسے اس تک پہنچنے کے وسائل فراہم کئے جاتے ہیں، اگر تم واقف ہو، اس راہ کا سفر پورا ہی کرنا چاہے ہو تو کان لگا کر سنو۔

تین عالم یاد رکھو کہ ہمارے اس سفر کے تین عالم ہیں، ایک عالم ملک و شہادت ہے، کاغذ، روشنائی، قلم اور ہاتھ وغیرہ کا تعلق اسی عالم سے ہے، تم ان چیزوں سے بتدریج بیحد آئے، اور دوسرا عالم ملکوت ہے، وہ میرے بعد ہے، جب تم مجھ سے تجاوز کرو گے تو اس عالم کی منزلوں میں پہنچ جاؤ گے، اس عالم میں وسیع تر جنگل بڑے بڑے دریا اور بلند پہاڑ ہیں، مجھے نہیں معلوم کہ تم ان میں سلامت کیسے رہو گے تیسرا عالم حیوت ہے، یہ ملک اور ملکوت کے مابین ایک عالم ہے، تم نے اس کی تین ابتدائی منزلیں طے کی ہیں، یعنی قدر، ارادہ اور علم۔ یہ عالم عالم ملک اور عالم ملکوت کے درمیان واسطے کی حیثیت رکھتا ہے، عالم ملک کا راستہ اس کی نسبت سے سہل اور عالم ملکوت کا راستہ اس کے لحاظ سے دشوار گزار ہے۔ عالم ملک اور عالم ملکوت کے درمیان عالم حیوت ایسی کشتی سے مشابہت رکھتا ہے جو پانی اور زمین کے درمیان حرکت کرتی ہو، یعنی نہ تو وہ پانی کی طرح مضطرب ہوتی ہے، اور نہ زمین کی طرح ساکن۔ جو شخص زمین پر چلتا ہے وہ عالم ملک و شہادت میں چلنے والا ہے، اور اگر اس کی قوت تجاوز ہو، یہاں تک کہ وہ کشتی پر سوار ہونے پر قادر ہو جائے تو ایسا ہو گا جیسے وہ عالم حیوت کی سیر کر رہا ہو، اور اگر اس کی قوت یہاں تک پہنچ جائے کہ کشتی کے بغیر پانی پر چلنے لگے تو کہا جائے گا کہ یہ شخص عالم ملکوت کی سیر کرنے والا ہے، اگر تم کشتی کے بغیر پانی پر سفر نہیں کر سکتے تو جاؤ، تم زمین سے تجاوز کر چکے ہو، اور کشتی کو پیچھے چھوڑ چکے ہو، اب تمہارے سامنے صرف پانی رہ گیا ہے، اب دیکھو تو تم اس پر چل سکتے ہو یا نہیں۔

عالم ملکوت کی ابتدا عالم ملکوت کی ابتدا یہ ہے کہ تم اس قلم کا مشاہدہ کرو جس سے دل کی حقیقی پرکھنا جاتا ہے، اور وہ یقین حاصل کرو جس کی مدد سے پانی پر چلا جاتا ہے۔ تم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تعلق سرکار دوسرا عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد

ضرور سنا ہو گا کہ جب آپ کے سامنے یہ بیان کیا گیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پانی پر چلا کرتے تھے تو آپ نے ارشاد فرمایا :-

لَوْ اِنَّكَ اَدْبَيْتُنَا لَمَشَيْ عَلَى الْهَوَاءِ (۱)

اگر ان کو اور زیادہ یقین ہوتا تو ہوا پہ چلتے۔

علم کی یہ تقریر سننے کے بعد سالک نے کہا کہ میں اپنے معاملے میں حیران ہوں اور تو نے راستے کے جن خطرات کی نشاندہی کی ہے ان سے میرا دل لرزہ بر اندام ہے تو نے جن دہشت ناک اور وسیع ترین جنگوں کی نشاندہی کی ہے مجھے نہیں معلوم میں انہیں قطع کر سکتا ہوں یا نہیں کیا تو اس کی کوئی علامت بیان کر سکتا ہے؟ علم نے کہا اس کے علامت بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ تم اپنی آنکھیں کھولو اور ان کی روشنی مجتمع کر کے میری طرف غور سے دیکھو اگر جس وہ قلم نظر آجائے جس سے دل کی حقیقت پر کوئی عبارت رقم کی جاتی ہے تو تم عالم ملکوت کے اہل قرار پاؤ گے کیوں کہ جو شخص عالم نبوت سے تجاوز کر کے عالم ملکوت میں قدم رکھتا ہے اسے وہ قلم نظر آنے لگتا ہے چنانچہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت کی ابتدا میں جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی اس قلم کا مشاہدہ فرمایا تھا :-

اَقْرَأْ اَوْرَتُكَ اَلَا كَرَّمَ الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ

(پ ۳۰ آیت ۳-۴)

آپ قرآن پڑھا رکھے اور آپ کا رب بڑا کریم ہے جس نے قلم سے تعلیم دی جن سے وہ واقف نہیں تھا۔

سالک نے کہا میں نے خوب اچھی طرح آنکھیں کھولی ہیں اور غور سے دیکھنے کی کوشش کی ہے مجھے نہ قلم نظر آیا اور نہ لکڑی میں نے اگر قلم دیکھے ہیں تو یہی ظاہری قلم دیکھے ہیں جن سے لکھا جاتا ہے علم نے کہا تم عجیب بات کہتے ہو کیا تم نے نہیں سنا کہ جیسا مالک مکان ہوتا ہے ویسا ہی اس کے مکان کا سامان ہوتا ہے کیا تم نہیں جانتے کہ نہ اللہ تعالیٰ کی ذات کسی کی ذات سے مشابہ ہے نہ اس کا ہاتھ دوسرے ہاتھوں جیسا ہے اور نہ اس کا قلم دوسرے قلموں سے مشابہت رکھتا ہے اور نہ اس کے کلام کو دوسرے کے کلام سے کوئی مناسبت ہے اور نہ اس کا خط دوسرے خطوط جیسا ہے یہ امور اعلیٰ ہیں اور ان کا تعلق عالم ملکوت سے ہے اللہ تعالیٰ نہ جسم ہے اور نہ وہ کسی مکان میں ہے جب کہ باقی تمام چیزیں اجسام بھی ہیں اور مکان میں بھی ہیں اس کا ہاتھ نہ گوشت ہے نہ خون ہے اور نہ ہڈی برخلاف دوسرے ہاتھوں کے کہ وہ گوشت خوف اور ہڈی کا مجموعہ ہیں نہ اس کا قلم نرسل کا ہے نہ اس کی حقیقت لکڑی کی ہے نہ اس کا کلام حرف و صوت سے عبارت ہے نہ اس کا خط نقش و نگار ہے اور نہ اس کی روشنائی چمکری اور مازو سے مرکب ہے اگر تم ان امور کو ایسا نہیں دیکھتے جیسا کہ وہ واقع میں ہیں تو تم نامرد ہو حقیقت میں مردود ہی ہیں جو اللہ تعالیٰ کو اجسام سے متوہ اور پاک سمجھتے ہیں اور متوہ وہ ہیں جو اسے اجسام سے تشبیہ دیتے ہیں اور تم ان دونوں کے درمیان محض ہو نہ ادھر ہو اور نہ ادھر ہو تم یہ بتاؤ کہ تم نے اللہ تعالیٰ کو اجسام و صفات سے کس طرح متوہ کیا اور اس کے کلام کو حرف و صوت سے کیسے پاک سمجھا تم تو اس کے ہاتھ قلم اور لوح میں توقف کرتے ہو اگر تم سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد مبارک سے :-

اِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ اٰدَمَ عَلٰی صُوْرَتِهِ

اللہ تعالیٰ نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا ہے۔

یہ سمجھتے ہو کہ اللہ تعالیٰ نے آدم کو جس ظاہری شکل و صورت پر پیدا کیا ہے وہ اس کی شکل و صورت ہے تو یہ تشبیہ مطلق ہے جیسے کہتے ہیں صرف یہودی ہو جاؤ ورنہ تورات سے مت کھیلو اس کا مطلب یہ ہے کہ تورات سے کھیلنا خالص یہودی ہونے پر دلالت کرتا

ہے اسی طرح جو شخص اللہ تعالیٰ کو اجسام ظاہری جیسا سمجھتا ہے وہ محض تشبیہ دینے والا ہے اور جو شخص اس سے وہ باطنی صورت مراد لیتا ہے جو صرف چشم بصیرت سے مشاہدہ میں آتی ہے تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو پاک اور حق سمجھتا ہے اور تزییمہ و تقدیس کے میدان کا راہ رو ہے اب اسے راستے طے کرنا چاہیے کہ وہ وادی مقدس طوبیٰ میں ہے اور سرِ تقیٰ سے اللہ کے احکامات سننے چاہیں ہو سکتا ہے کہ اسے تجلی کی راہ مل جائے اور بارگاہ حق سے اسے بھی وہی آواز سنائی دے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سنی تھی ۔

إِنِّي أَنَارُ لَكَ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ (پ ۲۲ آیت ۲)

میں ہی تمہارا رہبر ہوں پس تم اپنی جوتاں اتار ڈالو۔

جب سالک نے یہ علم کی بصیرت انگیز گفتگو سنی تو اپنی ظلمی پر آگاہ ہوا اور اسے پتا چلا کہ وہ تشبیہ اور تزییمہ کے درمیان معلق ہے یعنی محنت ہے اس اطلاع کے ساتھ ہی اس کے دل میں اپنے آپ پر غیظ و غضب کی آگ بجھنے لگی اور کیوں کے اس کے دل کے چراغ میں اس قدر صاف و شفاف اور پاکیزہ تر تل تھا جو آگ کے بغیر ہی جلنے کے لئے تیار تھا اس لئے جب اسے علم کی آگ لگی تو نور علی نور بن گیا یہ دیکھ کر علم نے کہا کہ اس موقع کو قیمت سمجھو اور اپنی آنکھیں کھول کر دیکھ لو ہو سکتا ہے جنہیں آگ پر ہدایت مل جائے چنانچہ اس نے آنکھیں کھولیں تو اس پر اللہ تعالیٰ کا قلم ان تمام تر اوصاف کے اعتبار سے منکشف ہو گیا جو تزییمہ کے لئے ناگزیر ہیں نہ وہ نرسل سے بنایا گیا ہے اور نہ ٹکڑی سے نہ اس کی نوک ہے اور نہ سرا ہے وہ انسانی دلوں میں ہر وقت مختلف نوع کے علوم تحریر کرنے میں مشغول رہتا ہے اس کی نوک ہر دل کی سطح پر ہے اگرچہ بظاہر اس کی کوئی نوک نہیں ہے سالک کو یہ سن کر حیرت ہوئی اور اس نے کہا وا تعجب علم بہترین رفیق ہے اللہ تعالیٰ اسے میری طرف سے جزائے خیر عطا کرے اس نے قلم کے جو اوصاف مجھے بتلائے تھے وہ سب ظاہر ہو گئے اب میرے نزدیک وہ قلم عام قلموں جیسا نہیں ہے اس کے بعد سالک نے علم کو الوداع کہتے ہوئے اس کا شکریہ ادا کیا اور اس سے کہا کہ میں حیرے پاس دیر تک ٹھہرا رہا اب میں قلم کی بارگاہ میں پہنچنے کا عزم رکھتا ہوں اور کچھ اس کا حال پوچھنا چاہتا ہوں۔

سالک اور قلم کی گفتگو چنانچہ سالک قلم کے پاس پہنچا اور اس سے کہنے لگا کہ اے قلم! تو کب ہر وقت لوگوں کے دلوں میں علوم رقم کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ ان علوم سے ارادوں کو تحریک ہوتی ہے اور قدرت بیدار ہوتی ہے اور اختیاری افعال سرزد ہونے لگتے ہیں؟ قلم نے جواب دیا کہ کیا تم وہ مہر بھول گئے ہو جو عالم ملک و شہادت میں تم نے دیکھا تھا اور وہ جواب فراموش کر بیٹھے جو قلم سے سنا تھا جہاں تک مجھے یاد ہے اس نے تحریر کی ذمہ داری قبول نہیں کی تھی بلکہ اسے اللہ تعالیٰ پر محول کر دیا تھا سالک نے کہا میں وہ مہر بھولا نہیں ہوں اور نہ میں نے قلم کا جواب فراموش کیا ہے قلم نے کہا تب میرا جواب وہی ہے سالک نے کہا تیرا یہ جواب کیسے ہو سکتا ہے جب کہ تو اس سے مشابہت نہیں رکھتا قلم نے کہا کیا تو نے یہ نہیں سنا کہ اللہ تعالیٰ نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا ہے سالک نے جواب دیا ہاں میں نے سنا ہے قلم نے کہا تم میرا حال بادشاہ کے دائیں ہاتھ سے دریافت کرو میں اسی کے قبضہ قدرت میں رہتا ہوں وہی مجھے چلاتا ہے میں اس کی دسترس میں ہوں اور وہ ہر طرح مجھ پر قابو پائے ہوئے ہے مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے قلم اور آدمی کے قلم میں اس اعتبار سے کوئی فرق نہیں کہ دونوں معجز ہیں اگر فرق ہے تو صرف ظاہری صورت کا ہے سالک نے دریافت کیا کہ بادشاہ کے دائیں ہاتھ سے کیا مراد ہے؟ قلم نے جواب دیا کہ اس سے وہ مراد ہے جو مندرجہ ذیل آیت کریمہ میں مذکور ہے ۔

وَالسَّمَوَاتِ مَطْوِيَّاتٌ بِيَمِينِهِ (پ ۲۲ آیت ۲)

اور آسمان اس کے دائیں ہاتھ میں لپٹے ہوئے ہے۔

اسی طرح قلم بھی اس کے دائیں ہاتھ میں ہیں وہ جس طرح چاہتا ہے انہیں پھیرتا ہے۔

سالک کا سفر یمین کی طرف اس گفتگو کے بعد سالک نے یمین کی طرف رخت فرماندہا وہاں اس نے محیر العقول عجائبات دیکھے، قلم میں ان کا عشر عشر بھی نہیں تھا، اور یہ تمام عجائبات ایسے تھے کہ الفاظ میں ان کا وصف بھی نہیں ہو سکتا تھا، بلکہ اگر ہزار ہادفتروں میں ان کی شرح کی جائے تو ان کے سوویں حصے میں بھی شرح نہ ہو سکے۔ غرض یہ کہ وہ دایاں ہاتھ ہے لیکن ایسا نہیں ہے جیسے اور دائیں ہاتھ ہوتے ہیں اس کا بازو ہے مگر عام بازوؤں کی طرح نہیں، انگلیاں ہیں لیکن عام انگلیوں سے انہیں ذرا بھی مشابہت نہیں ہے، سالک نے قلم کو دائیں ہاتھ میں حرکت کرتے ہوئے دیکھا تو یہ بات سمجھ میں آئی کہ قلم جو اعذار بیان کرتا ہے وہ درست ہیں، اصل میں یہ سارا تماشا دائیں ہاتھ کا ہے، چنانچہ اس نے دائیں ہاتھ سے سوال کیا کہ تو قلم کو کیوں حرکت دیتا ہے، اس نے جواب دیا کہ میرا وہی جواب ہے جو عالم شہادت کے ہاتھ نے دیا تھا، یعنی اس نے اس حرکت کو قدرت پر محمول کیا تھا، میں بھی یہی کہتا ہوں کہ یہ تمام کھیل قدرت کا ہے، سالک یہ سن کر قدرت کے پاس گیا وہاں اس نے وہ عجائبات دیکھے کہ اس سے پہلے ان کا عشر عشر بھی نہیں دیکھا تھا، ڈرتے ڈرتے قدرت سے پوچھا کہ آخر تو یمین کو کیوں حرکت دیتی ہے، اس نے جواب دیا کہ میں تو ایک صفت ہوں، تم موصوف یعنی قادر سے پوچھو، موصوف ہی تمہیں اس کے سبب سے آگاہ کر سکتا ہے، صفت بھاری تو تال ہو ا کرتی ہے، قریب تھا کہ قدرت کا یہ جواب سن کر سالک کے قدم لڑکڑا جاتے، اور قادر مطلق سے سوال کرنے کی جرأت کر بیٹھا کہ اے ثبات قدی نصیب ہوئی، اور قادر مطلق کی بارگاہ سے یہ آواز آئی نہ۔

لَا يُسْأَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْأَلُونَ۔ (پ ۷۲ آیت ۲۳)

وہ جو کچھ کرتا ہے اس سے کوئی باز پرس نہیں کر سکتا اور اوروں سے باز پرس کی جاسکتی ہے۔

یہ آواز سن کر سالک پر لرزہ طاری ہو گیا، اس کے دل پر دہشت چھا گئی، اور وہ بے ہوش ہو کر گر پڑا، دیر تک اسی عالم میں ترپتا رہا، جب ہوش آیا تو کہنے لگا کہ اے اللہ! تو پاک ہے، تیری شان عظیم ہے، میں تیری بارگاہ میں توبہ کرتا ہوں، اور تجھ پر بھروسہ کرتا ہوں، اور اس حقیقت پر ایمان لاتا ہوں کہ تو ملک جبار اور واحد قہار ہے، نہ میں تیرے سوا کسی سے ڈرتا ہوں، اور نہ کسی سے امید کرتا ہوں، میں میرے محتاب سے میرے ملوکی، اور میرے فیتہ و غصب سے تیری رضا کی پناہ کا طلب گار ہوں، اب میرے سامنے اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں کہ میرے سامنے نہایت عاجزی کے ساتھ یہ دعا کروں کہ اے اللہ! میرا سینہ کھول دے تاکہ میں تجھے پہچان لوں، اور میری زبان کی گروہ دور کر دے تاکہ میں تیری حمد و ثناء کر سکوں، اس کے جواب میں حضرت حق سے اعلان ہوا کہ خوارا! اس سے آگے مت بڑھ، حمد و ثناء میں طمع مت کر، غر الانبیاء سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضری دے جو کچھ وہ تجھے حکا کریں لے لے، اور جس چیز سے وہ تجھے منع فرمائیں اس سے باز آ، اور جو تجھ سے فرمائیں وہ کہہ دیکھ انہوں نے بارگاہ الہی میں یہ التجا کی ہے نہ۔

سُبْحَانَكَ لَا أُخْصِي ثَنَاءً عَلَيْكَ أَنْتَ كَمَا أَتَنَيْتَ عَلَيَّ نَفْسِي كَكَ

پاک ہے تو میں تیری پوری تعریف نہیں کر سکتا، تو ایسا ہے جیسا کہ تو نے خود اپنے نفس کی تعریف کی ہے۔

سالک نے غرض کیا! یا رب العالمین! اگر زبان کو اس حد سے تجاوز کرنے کی اجازت نہیں تو کیا دل تیری معرفت کی طمع کر سکتا ہے۔ ارشاد ہوا کہ کیا تو صدیقین سے سبقت کرنا چاہتا ہے، صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہو، اور ان کی اقتداء کر، سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام اصحاب ستاروں کی طرح ہیں، تو ان میں سے جس ستارے کی بھی اتباع کرے گا ہدایت کی راہ پائے گا۔ کیا تو نے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا یہ مقولہ نہیں سنا نہ۔

الْبَعْزُ عَنْكَ كَبَلٌ لَا فَرْكَ لَهُ فَرَاكَ

ادراک کی دریافت سے عاجز رہتا ہی ادراک ہے۔

ہمارے دربار میں تیرا حصہ صرف اس قدر ہے کہ تو یہ جان لے کہ تو اس دربار سے محروم ہے اور تجھے اتنی طاقت نہیں کہ جلال اور جمال کا مشاہدہ کر سکے۔ یہ سن کر سالک اپنے راستے پر واپس چلا، 'علم'، 'ارادہ' اور 'قدرت' وغیرہ سے اس نے جو سوالات کئے تھے ان پر عذر خواہی کی اور اپنے قصور کا اعتراف کیا اور کہنے لگا کہ مجھے معاف کر دو میں اس راہ میں اجنبی تھا، جو اجنبی ہوتا ہے اسے دہشت ہو ہی جاتی ہے، میں نے تمہارا انکار کیا، یہ محض میرا قصور تھا اور میری جہالت تھی، اب میں تمہارے اعذار پر اطلاع پا چکا ہوں، اور اس حقیقت سے آگاہ ہو چکا ہوں ملک و ملکوت اور عزت و جہوت میں صرف تمہارا واحد کا حکم چلتا ہے تم سب اسی کے حرکت دینے سے متحرک ہوتے ہو، اور اسی کے قبضہ قدرت میں محروم ہو، وہی اول ہے، وہی آخر ہے، وہی ظاہر ہے وہی باطن ہے۔

اول و آخر اور ظاہر و باطن میں تضاد جب سالک نے عالم ملک و شہادت یعنی عالم ظاہر سے تعلق رکھنے والوں کے سامنے یہ تفصیلات بیان کیں تو وہ حیرت زدہ رہ گئے اور کہنے لگے کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہی اول ہو اور وہی آخر ہو، یا وہی باطن ہو اور وہی ظاہر ہو، کیوں کہ یہ دونوں وصف ایک دوسرے کی ضد ہیں، جو اول ہو گا وہ آخر نہ ہو گا اور جو باطن ہو گا وہ ظاہر نہ ہو گا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ وہ موجودات کی بہ نسبت افضل ہے، اس لئے کہ تمام موجودات بالترتیب یکے بعد دیگرے اسی ذات واحد کے وجود میں آئی ہیں، اور آخر اس اعتبار سے ہے کہ چلنے والوں کی انتہائی منزل اسی کی ذات ہے، اگرچہ وہ راستے میں ایک منزل سے دوسری منزل تک ترقی کرتے چلے جاتے ہیں، لیکن انتہا اسی پر ہوتی ہے، سفر کا اختتام اسی کی ذات پر ہوتا ہے، اس طرح وہ گویا مشاہدے میں آخر ہے، اور وجود میں اول ہے، یہی حال اس کے باطن و ظاہر ہونے کا ہے، جو لوگ عالم شہادت میں رہ کر حواس خمسہ سے اس کا ادراک کرنا چاہتے ہیں، ان کے لئے وہ باطن ہے، اور جو لوگ اسے اپنے دل کے چراغ کی روشنی میں تلاش کرتے ہیں ان کے لئے وہ ظاہر ہے۔ یہ ہے سالکین کی توحید فعلی کی حقیقت۔ یعنی جن لوگوں پر یہ حقیقت منکشف ہو گئی تھی کہ قائل صرف ایک ذات ہے ان کی توحید کا طریقہ یہ تھا۔

تم یہ کہہ سکتے ہو کہ اس توحید کا حاصل عالم ملکوت پر ایمان لانا ہے، اب اگر کوئی شخص اس عالم کی حقیقت سے ناواقف ہو، یا اس کا انکار کرتا ہو تو اس کا کیا طریقہ ہو گا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ انکار کرنے والے کا کوئی علاج نہیں ہے۔ اس سے تو صرف اتنا کہا جائے گا کہ تیرا عالم ملکوت سے منکر ہونا ایسا ہے جیسے فرقہ، منیہ عالم جہوت کا منکر ہے، یہ فرقہ عالم کو حواس خمسہ میں منحصر سمجھتا ہے، اور قدرت، ارادہ اور علم کا انکار کرتا ہے۔ کیوں کہ حواس خمسہ سے ان کا ادراک نہیں ہوتا گویا وہ عالم شہادت کے پست پہلوؤں کو لازم پکڑے ہوئے ہے، اسی کی چیزوں کی معرفت رکھتا، اور عالم شہادت سے ماوراء کی چیزوں سے واقف نہیں ہوتا۔ اگر منکر یہ کہے کہ میں بھی انھی لوگوں میں سے ہوں، یعنی صرف عالم شہادت کو جانتا ہوں، یہی حواس خمسہ سے بھی معلوم ہوتا ہے، اس سے یہ کہا جائے گا کہ تو ماوراء حواس چیزوں کا انکار کرتا ہے جب کہ ہم نے ان کا مشاہدہ کر لیا ہے، تیرا انکار ایسا ہے جیسے سونپٹائی فرقہ کا انکار، یہ فرقہ حواس خمسہ کا انکار کرتا ہے، اور کہتا ہے کہ جو کچھ ان سے محسوس ہوتا ہے وہ قابل اعتبار نہیں ہے، ہو سکتا ہے ہم خواب دیکھتے ہیں، اگر منکر یہ کہے کہ میں بھی سونپٹائی ہوں، اور مجھے بھی محسوسات میں شک ہے تو کہا جائے گا کہ اس شخص کا مزاج فاسد ہو چکا ہے، اور اب اس کے لئے کوئی علاج کارگر نہیں ہو گا، اسے چند روز اس کے حال پر چھوڑ دینا چاہیے، بہت سے مریض ایسے ہوتے ہیں کہ اطباء تمام تر کوششوں کے باوجود ان کے علاج میں ناکام رہ جاتے ہیں، یہ معاملہ اس شخص کے ساتھ ہو گا جو جامد یا منکر ہے، اور جو شخص منکر تو نہیں ہے، لیکن عالم ملکوت کی حقیقت اس کی سمجھ میں نہیں آتی تو سالکین کا اس کے ساتھ یہ موقف ہونا چاہیے کہ اس کی وہ آنکھ دیکھی جائے جس سے عالم ملکوت کا مشاہدہ ہوتا ہے، اگر وہ صحیح یا سدرست ہے، یا اس میں سیاہ پانی کی صرف معمولی مقدار ہے اور اس کا ازالہ یا حتیہ ممکن ہے تو اس کی آنکھ کی اصلاح کی جائے گی، جیسے ماہرین امراض چشم

ظاہری آنکھوں کے امراض کا علاج کرتے ہیں، جب اس کی بڑھائی درست اور آگے روشن اور عجل ہو جاتی ہے تو اسے عالم ملکوت تک پہنچنے کا راستہ بتلایا جاتا ہے۔ چنانچہ سرکارِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مخصوص صحابہ کے سلسلے میں یہ تدبیر استعمال فرمائی ہے۔ اگر اس کا مرض ناقابل علاج ہے تو توحید کے باب میں جو طریقہ ہم نے لکھا ہے اس پر اس کا چلنا ممکن نہیں ہے، اور نہ یہ ممکن ہے کہ وہ توحید پر ملک اور ملکوت کے ذرات کی شہادت سنے، ایسے شخص کو حروف اور آواز کے ذریعے توحید کی حقیقت سمجھانی چاہیے، اور ایسی معمولی درجے کی تقریر کرنی چاہیے جو اس کی فہم کے مطابق ہو، چنانچہ اس سے کہا جائے کہ ہر شخص یہ بات جانتا ہے کہ ایک گھروں سربراہوں، اور ایک گھروں حاکموں سے تباہ ہو جاتا ہے، اس سے یہ ثابت ہوا کہ عالم کا معبود اور اس کا مدبر اور خاتم ایک ہی ہے، اس لئے کہ اگر آسمان و زمین میں ایک سے زیادہ خدا ہوتے تو آسمانوں اور زمین کی جہتی لازمی تھی۔ یہ تقریر عالم شہادت میں اس کے دل میں راسخ ہو جائے گی۔ حضرات انبیائے کرام علیہم السلام کو اس لئے یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ لوگوں سے ان کی عقلوں کے مطابق گفتگو کریں۔ اور یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم اس زبان میں نازل ہوا جو مخاطبوں کی زبان تھی۔

اب اگر یہ سوال کیا جائے تو کُل اس اعتقادی توحید پر مبنی ہو سکتا ہے، بالفاظ دیگر کیا اس طرح کی توحید میں یہ صلاحیت ہے کہ اس پر تو کُل کی بنا رکھی جاسکے، ہم کہیں گے کہ اس اعتقاد کے اندر بھی یہ صلاحیت موجود ہے کہ تو کُل کا مبنی قرار پاسکے۔ اس لئے کہ یہ اعتقاد جب اپنی پوری قوت کے ساتھ بپا ہوتا ہے تو احوال کو اسی طرح برا سمجھتا کرتا ہے جس طرح کشف سے برا سمجھتا ہوتے ہیں، لیکن ایسا بہت کم ہوتا ہے، عام طور پر اس طرح کے اعتقادات ضعیف ہوتے ہیں، اور وہ متزلزل بھی ہو جاتے ہیں، اسی لئے اس طرح کی اعتقادی توحید رکھنے والوں کو ہمیشہ ایک حکم کی ضرورت رہتی ہے جو اپنی تقریر کے ذریعے اس کے ان اعتقادات کا تحفظ کرتا ہے، جو اس نے اپنے استاذ، اپنے والدین، اور اپنے ہم وطنوں سے حاصل کئے ہیں، البتہ جو شخص اپنا راستہ خود دیکھ کر چلے گا اسے متزلزل کا خوف نہیں ہوگا، لیکن اگر اس شخص کی نگاہوں سے پردہ اٹھا لیا جائے تو اس کا یقین بدستور رہے گا، تاہم وضاحت میں زیادتی ہو سکتی ہے، جیسے اگر کوئی شخص کسی کو طلوع آفتاب کے وقت دیکھے اور دو سری بار اس وقت دیکھے جب کہ آفتاب طلوع ہو چکا ہو تو دو سری بار دیکھنے سے اس آدمی کے آدمی ہونے کے یقین میں اضافہ نہ ہوگا، البتہ اس کے خدو خال زیادہ وضاحت کے ساتھ سامنے آجائیں گے گویا اہل مکاشفہ کی توحید کا یقین ایسا ہوتا ہے کہ اس میں متزلزل نہیں ہوتا، اہل کشف اور عام معتقدین کی مثال ایسی ہے جیسے فرعون کے جادو گر اور ساحری کے جادو کار فرعون کے جادو گر اپنے طویل مشاہدے اور تجربے کے باعث یہ بات جانتے تھے کہ سحر کے اثرات کی انتہا کیا ہے، جب انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے وہ بات دیکھی جو سحر کی حدود سے تجاوز تھی تو ان پر امر حق واضح ہو گیا، اور انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے میں فرعون کی اس دھمکی کی پروا نہیں کی۔

فَلَا قُطْعَنَ آيَاتِكُمْ وَلَا جُلُكُم مِّنْ خِلَافٍ وَلَا صَلْبَتُكُمْ فِي جُلُوعِ النَّحْلِ۔

(پ ۴۲ ر ۱۷ آیت ۱۷)

میں تم سب کے ہاتھ پاؤں کٹواتا ہوں ایک طرف کا ہاتھ اور ایک طرف کا پاؤں اور تم سب کو سمجھوؤں کے درختوں پر لٹکواتا ہوں۔

بلکہ انہوں نے پوری جرأت کے ساتھ یہ اعلان کر دیا :-

لَنْ نُؤْثِرَكَ عَلَىٰ مَا حَاءَ نَاِمِنَ الْبَيْتَاتِ وَالَّذِي فَطَرَ نَاَفَاقِصَ مَا اَنْتَ قَاِصٌ اِنَّمَا نَقْضِي هٰذِهِ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا۔ (پ ۴۲ ر ۱۷ آیت ۱۷)

ہم تجھ کو بھی ترجیح نہ دیں گے ان دلائل کے مقابلے میں جو ہم کو ملے ہیں اور اس ذات کے مقابلے میں جس نے ہم کو پیدا کیا ہے، تجھ کو جو کچھ کرنا ہو کر ڈال تو اس کے سوا کہ دنیاوی زندگی ختم کروے اور کیا کر سکتا ہے۔

حاصل یہ ہے کہ کشف و وضاحت کے بعد آدمی جس نتیجے تک پہنچتا ہے اس میں تغیر نہیں ہوتا، یہی حال اہل کشف کی توحید کا بھی ہے، اس میں تزلزل واقع نہیں ہوتا، اس کے برخلاف توحید اعتقادی میں بہت جلد تغیر ہو جاتا ہے جیسے سامری کے جیوکار تھے، انہوں نے کیوں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس معجزہ کو دیکھ کر ایمان قبول کیا تھا کہ جیسے ہی انہوں نے اپنا عصا زمین میں ڈالا وہ سانپ گیا، ان کا ایمان کشف کے نتیجے میں نہیں تھا، بلکہ صرف ظاہری مشاہدے پر تھا، اس لئے جب سامری نے ایک خوبصورت مچھڑ بنا کر یہ اعلان کیا :-

هَذَا إِلَهُكُمْ وَالْمُؤَسَّسِ - (پ ۱۸ ر ۳ آیت ۸۸)

تمہارا اور موسیٰ کا مبعود تو یہ ہے۔

تو وہ اس کی بات کو سچ سمجھ بیٹھے، انہوں نے یہ نہ دیکھا کہ یہ مچھڑ نہ کسی بات کا جواب دیتا ہے نہ قطع پہنچاتا ہے، اور نہ نقصان پہنچانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ فرض یہ ہے کہ جو شخص صرف سانپوں کو دیکھ کر ایمان لاتا ہے وہ مچھڑے کو دیکھ کر اپنے ایمان سے منحرف ہو سکتا ہے، کیوں کہ ان دونوں چیزوں کا تعلق عالم شہادت سے ہے، اور عالم شہادت کی چیزوں میں اختلاف و تغیر کی بڑی گنجائش ہے، اور کیوں کہ عالم ملکوت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اس لئے اس میں نہ اختلاف پایا جاتا ہے اور نہ تضاد کی گنجائش ہے۔

انسان کس طرح مستحضر ہے؟ یہاں یہ کہا جاسکتا ہے کہ تم نے جس توحید کا ذکر کیا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اسباب اور وسائل سب مستحضر ہیں، ہم یہ بات تسلیم کر سکتے ہیں، لیکن انسان کے علاوہ دوسری چیزوں میں جہاں تک انسان کا تعلق ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ اس کی حرکات اختیار ہی ہوتی ہیں وہ جب چاہتا ہے حرکت کرتا ہے اور جب چاہتا ہے ٹپ سکون ہو جاتا ہے، اس لئے انسان مستحضر کیسے ہو سکتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر صورت حال یہ ہوتی کہ اسے اپنی خواہشات پر کنٹرول ہوتا یعنی جب چاہتا کوئی خواہش کرتا، اور جب چاہتا کسی خواہش کا ارادہ نہ کرتا تو فطری کامکان تھا، اور قدم ڈگماکتے تھے، لیکن تم یہ بات جان چکے ہو کہ انسان فعل جب کرتا ہے جب چاہتا ہے، مگر چاہتا اس کے اختیار میں نہیں ہوتا، اگر مشیت اس کے اختیار میں ہوتی تو اس کے لئے دوسری مشیت کی ضرورت ہوتی ہے، اور دوسری کے لئے تیسری مشیت کی، یہاں تک کہ یہ سلسلہ اسی طرح دراز ہوتا، کیوں کہ انسان کی مشیت اس کے اختیار میں نہیں ہے، اس لئے جب وہ قدرت کو مقدر کی طرف مائل کرتی ہے تو قدرت وہی عمل کرے گی جو اس کے سپرد کیا جائے گا، اس کے خلاف کرنے کی طاقت اس میں نہیں ہوگی۔ اس سلسلے میں ایک ترکیب ہے، اور یہ تمام امور اسی ترتیب کے ساتھ ظہور پذیر ہوتے ہیں قدرت ہوگی تو حرکت ضرور ہوگی، اور مشیت مکمل ہوگی تو قدرت میں تحریک ضروری ہوگی، پھر مشیت کامل میں ہے اختیار پیدا ہونا بھی ضروری ہے، کسی بندے کے اختیار میں نہیں ہے کہ وہ خواہش کو روک دے نہ یہ اختیار ہے کہ مشیت کے بعد قدرت کو مقدر کی طرف مائل ہونے سے منع کر دے، نہ یہ اختیار ہے کہ جب مشیت قدرت کو حرکت دے تو اس میں حرکت نہ ہونے دے، ان تمام امور میں بندہ مجبور محض ہے اور یہی اس کی تسخیر ہے۔

جبر و اختیار کی بحث یہاں تم یہ کہہ سکتے ہو کہ یہ جبر محض ہے، اور جبر اختیار کے خلاف ہے، جب کہ ہم اختیار کو مسترد نہیں کرتے، بلکہ انسان کو مختار مانتے ہیں، اس لئے یہ کیسے ممکن ہے کہ بندہ اس قدر مجبور ہونے کے باوجود مختار کہلائے، ہم اس کے جواب میں کہیں گے کہ اگر حقیقت منکشف کر دی جائے تو معلوم ہو کہ بندہ عین اختیار میں مجبور ہے، لیکن یہ بات وہی شخص سمجھ سکتا ہے جو اختیار کو سمجھتا ہے اس لئے پہلے ہم حکمیں کے اسلوب میں اختیار کی تشریح کرتے ہیں۔

فعل کے تین اطلاقات اصل میں فقط فعل انسان میں تین طرح سے بولا جاتا ہے، مثلا کہتے ہیں انسان الفکیوں سے لگتا

ہے گلے اور ہمسفرے سے سانس لیتا ہے، اور جب پانی چڑھتا ہوتا ہے تو اسے چیرتا ہے، یہاں انسان کی طرف تین چیزوں کی نسبت کی گئی ہے پانی چیرنے کی، سانس لینے کی، اور یہ تینوں فعل جبر و اضطرار میں برابر ہیں، مگر اس کے علاوہ دوسری باتوں میں الگ الگ ہیں، جنہیں ہم تین عبارتوں میں بیان کرتے ہیں، اس کے اس فعل کو کہ وہ پانی کی سطح پر کھڑا ہو کر اسے چیرتا ہے طبعی کہتے ہیں، اور سانس لینے کے فعل کو ارادی کہتے ہیں اور کتابت کو فعل اختیار کہتے ہیں۔ جہاں تک فعل طبعی کا تعلق ہے اس میں جبر بالکل واضح ہے، اس لئے کہ جب کوئی انسان پانی کی سطح پر کھڑا ہو گا، یا ہوا میں چلے گا تو پانی اور ہوا دونوں پیش کی۔ سانس لیتا بھی ایسا ہی ہے اس لئے کہ سانس لینے کے ارادہ کی طرف وہی نسبت ہے جو بدن کے بوجھ سے پانی کے پھٹنے کو ہے، چنانچہ جب پانی کی سطح پر بوجھ ہو گا تو وہ پھٹے گا ضرور لیکن یہ بوجھ اور فعل آدمی کے اختیار میں نہیں ہے، اسی طرح فعل ارادی کا ارادہ بھی آدمی کے اختیار سے باہر ہے، اسی لئے تم یہ دیکھتے ہو کہ جب کوئی شخص کسی کی آنکھوں کی طرف سوئی لے کر بڑھتا ہے تو بے اختیار اس کی آنکھیں بند ہو جاتی ہیں، وہ انھیں کھلی رکھنا بھی چاہے تو نہیں رکھ سکتا، حالانکہ بند کرنا فعل ارادی ہے، کیوں کہ جب سوئی کی صورت اور اس کے چپٹے سے ہونے والی تکلیف اور اک میں آجاتی ہے تو آنکھ بند کرنے کا ارادہ ضرور پیدا ہوتا ہے اور اسی ارادے سے حرکت پیدا ہوتی ہے، لیکن اگر کوئی شخص اس حرکت کو روکنا چاہے تو یہ ممکن نہیں ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح کے افعال بھی افعال طبعیہ میں داخل ہیں۔

اب صرف فعل اختیاری باقی رہ جاتا ہے اور وہی عمل شبہ میں ہے، جیسے لکھنا اور بولنا وغیرہ، کہ چاہے تو لکھے اور چاہے تو نہ لکھے، چاہے تو کلام کرے اور چاہے تو نہ کرے، کبھی آدمی ان افعال کی خواہش کرتا ہے اور کبھی خواہش نہیں کرتا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ افعال انسان کو تفویض کر دیے گئے ہیں لیکن یہ گمان اختیار کے معنی سے ناواقف ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ اس لئے ہم اس کی وضاحت کرتے ہیں۔

فعل اختیار میں جبر جانتا چاہیے کہ ارادہ اس علم کے تابع ہوتا ہے جو انسان کے لئے یہ حکم کرتا ہے کہ فلاں چیز اس کے موافق ہے، اور فلاں موافق نہیں ہے۔ اس اعتبار سے اشیاء کی دو قسمیں ہیں۔ ایک قسم میں وہ چیزیں شامل ہیں کہ آدمی کا ظاہری یا باطنی مشاہدہ کسی تردد کے بغیر ان کے متعلق یہ رائے قائم کر لیتا ہے کہ یہ موافق ہیں، اور دوسری قسم میں وہ چیزیں ہیں جن کے موافق ہونے یا نہ ہونے کے متعلق عقل تردد رہتی ہے۔ پہلی کی مثال یہ ہے جیسے کوئی شخص تمہاری آنکھ میں سوئی چھوئے گا ارادہ کرے یا تلواری سوئے کر تمہاری طرف بڑھے تو تمہارے ذہن میں فوراً یہ خیال آجائے گا کہ اس مصیبت سے دفاع میرے لئے مناسب اور موافق ہے، چنانچہ تم اس دفاع میں کوئی تردد نہ کرو گے اور اس کے ساتھ ہی تمہارے دل میں ارادہ پیدا ہو گا۔ اس کے باعث قدرت متحرک ہوگی، اور سوئی سے آنکھ کو بچانے کے لئے پلکیں بند ہو جائیں گی اور تلواری سے جسم کو محفوظ رکھنے کے لئے ہاتھ اٹھ جائیں گے اگرچہ ان باتوں کا تعلق ارادے سے ہے، لیکن یہ فکر اور تامل کے بغیر واقع ہوتی ہیں، اور جن امور میں عقل اور تمیز کو دخل ہوتا ہے وہاں تامل کی ضرورت پڑتی ہے، تاکہ عقل پر یہ واضح ہو جائے کہ وہ امور موافق ہیں یا نہیں، اور ان کا کرنا اچھا ہے یا نہیں۔ چنانچہ جب فکر و تدبر سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ فلاں امر بہتر ہے تو وہ بھی پہلی قسم کے اور اک کے ساتھ ملحق ہو جاتا ہے، اور یہاں بھی علم سے ارادے کو تحریک ہوتی ہے، جیسے وہاں تلواری اور سوئی سے مدافعت کے لئے ارادے کو تحریک ہوتی تھی، بہر حال جب یہ ارادہ کسی ایسے فعل کے لئے اٹھتا ہے جس کی بہتری عقل کو معلوم ہو چکی ہو تو اس کے ارادے کو اختیار کہتے ہیں اور یہ خیر سے مشتق ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ مذکورہ فعل اس کے حق میں بہتری کا باعث ہے، اگرچہ یہ خیر تلواری سے دفاع کرنے میں بدلتا ظاہر ہو جاتا ہے، اور یہاں فکر و تامل و تدبیر ہے، اس سے ثابت ہوا کہ عقل ایک مخصوص ارادے کا نام ہے، اور وہ ان امور میں متحرک ہوتا ہے جن میں عقل تامل کرتی ہے، اسی لئے یہ کہا گیا ہے کہ اختیار میں عقل کے لئے یہ بات ضروری ہوتی

ہے کہ وہ دو بہتر چیزوں میں سے زیادہ بہتر چیز کو اختیار کرے اور دو بری چیزوں میں سے کم بری چیز کو۔

ارادہ کب حرکت کرتا ہے۔ یہاں یہ بات بھی واضح رہے کہ ارادہ حس و خیال کے حکم اور ناطق محل کے امر کے بغیر حرکت نہیں کر سکتا چنانچہ اگر کوئی شخص اپنے ہاتھ سے اپنی گردن کاٹنا چاہے تو ایسا نہیں کر سکے گا۔ اس لئے نہیں کہ اس کے ہاتھ میں چھری نہیں ہے، یا وہ کاٹنا نہیں جانتا، یا ہاتھ میں قوت نہیں ہے، بلکہ اس لئے نہیں کاٹ سکتا کہ یہاں وہ ارادہ موجود نہیں ہے جو قوت کو تحریک دیتا ہے۔ اور ارادے کے نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ارادہ اس وقت ہوتا ہے جب حس اور محل سے یہ بات معلوم ہو جائے کہ فلاں فعل موافق اور بہتر ہے۔ کیوں کہ خود کشی موافق نہیں ہوتی اس لئے اعضاء کی قوت کے باوجود انسان اپنا سر تن سے جدا نہیں کر پاتا، الا یہ کہ کوئی شخص ناقابلِ برداشت اذیت سے دوچار ہو، یہاں محل کوئی فیصلہ کرنے میں متروک رہتی ہے، اور یہ تردد دو برائیوں میں ہوتا ہے یعنی خود کشی بھی بری ہے، اور اس مصیبت میں گرفتار رہنا بھی برا ہے۔ اب اگر غور و فکر کے بعد یہ واضح ہو جائے کہ خود کشی نہ کرنے میں برائی کم ہے تو وہ اپنے آپ کو قتل نہیں کرے گا، اور اگر محل یہ فیصلہ کرے کہ قتل نفس میں برائی کم ہے، اور یہ حکم قطعی اور آخری ہو تو اس کے نتیجے میں ارادہ اور قوت پیدا ہوگی اور وہ شخص اپنے آپ کو ہلاک کر ڈالے گا۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص کسی کے پیچھے تلوار لے کر دوڑے اور وہ خوف کی وجہ سے ہٹاگ کھڑا ہو یہاں تک کہ چھت سے گر کر مر جائے یا کنویں میں ڈوب کر ہلاک ہو جائے، حالانکہ جان و دونوں صورتوں میں ضائع ہوتی ہے، مگر وہ اس کی پروا نہیں کرتا، اور چھت سے گر کر مر جاتا ہے، لیکن اگر کوئی شخص محض ہلکی مار مار رہا ہو، اور وہ چٹا ہوا چھت کے اس حصے تک جا پہنچے جہاں سے نیچے گر سکتا ہے تو وہاں محل یہ فیصلہ کرتی ہے کہ پٹنا کر ہلاک ہو جانے کے مقابلے میں معمولی ہے، محل کے اس فیصلے کے بعد اس کے اعضاء ٹھہر جاتے ہیں، پھر یہ ممکن نہیں رہتا کہ وہ خود اپنے آپ کو نیچے گرا دے۔ اس کا ارادہ بھی پیدا نہیں ہوتا۔ کیوں کہ ارادہ محل اور حس کے حکم کے تابع ہوا کرتا ہے، اور قدرت ارادے کی اتباع کرتی ہے، اور اعضاء کی حرکت قدرت کے تابع ہوتی ہے۔ یہ تمام امور آدمی میں اسی ترتیب سے پائے جاتے ہیں، اور اسے اس کی خبر بھی نہیں ہوتی، آدمی ان امور کا عمل ہے، یہ امور اس سے صادر نہیں ہوتے۔

اس تفصیل سے ثابت ہوتا ہے کہ آدمی کے اندر یہ تمام افعال غیر سے حاصل ہوتے ہیں، خود اس سے نہیں ہوتے، اور غبار ہونے کے معنی یہ ہیں کہ وہ اس ارادے کا عمل ہے جو اس کے اندر محل کے فیصلے کے بعد کہ فلاں کام خیر محل اور موافق ہے جبرا پیدا ہوا ہے، یہ حکم جبرا ہوا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ آدمی اختیار پر مجبور ہے۔ یہ بات اس طرح زیادہ واضح طریقے سے سمجھ میں آئے گی کہ آگ کا فعل جلا نا جبر محض ہے، اور اللہ تعالیٰ کا فعل اختیار محض ہے، اور انسان کا فعل دونوں کے درمیان ہے یعنی اس کا فعل اختیار پر جبر ہے کیوں کہ یہ تیسری قسم ہے اسلئے اہل حق نے اس کا نام بھی الگ رکھا ہے اور اس سلسلے میں قرآن کریم کی اتباع کی ہے، اور انسان کے فعل کو کب کہا ہے۔ اس میں نہ جبر کی مخالفت ہے اور نہ اختیار کی، بلکہ اہل محل کے نزدیک کب میں دونوں باتوں کا اجتماع ہے۔ جہاں تک اللہ تعالیٰ کا اختیار ہے وہ اللہ تعالیٰ کا مخصوص فعل ہے اور اس میں شرط یہ ہے کہ وہ اختیار نہ ہو جو حیرت و تردد کے بعد ارادے کی صورت میں ہوتا ہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کے حق میں ایسا اختیار محال ہے۔ اللہ تعالیٰ کے لئے لغت میں جس قدر الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں وہ مجاز اور استعارے کے طور پر ہیں، یہ موضوع تفصیلی ہے اور اس مقام کے قابل نہیں ہے اس لئے ہم یہاں صرف اشارہ کئے دیتے ہیں۔

قدرت ازلہ کے شاخسانے اگر یہ کہا جائے کہ علم ارادہ پیدا کرتا ہے، ارادہ قدرت، اور قدرت حرکت، یعنی ہر دوسری چیز پہلی چیز سے پیدا ہوتی ہے، اگر اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے اذن و قدرت کے بغیر ایک چیز نے دوسری چیز کو پیدا کیا ہے تو یہ

ممکن نہیں اور اگر یہ مقصد نہیں تو پھر یہ ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح کیوں مرتب نہیں اور اگر یہ مقصد نہیں تو پھر ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح کیوں مرتب ہیں؟ اس کا جواب یہ دیا جائے گا کہ اگر اس ترتیب سے تم یہ گماں کرتے ہو کہ بعض نے بعض کو پیدا کیا ہے تو یہ جہالت ہے بلکہ یہ تمام امور دراصل قدرت ازیلہ کے جہاں سے ہیں اس سلسلے میں اصل وہی ہے بلکہ یہ تمام رسوم رکھنے والے لوگ اس حقیقت سے ابھی طرح واقف ہیں عوام یہ بات نہیں سمجھتے عوام صرف ظاہری لفظ میں پھنسے رہتے ہیں لفظ قدرت سے دھوکا کھاتے ہیں اور اس میں انسانی قدرت سے ایک نوع کی مشابہت پا کر غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں امر حق کیا ہے؟ یہ ایک تفصیلی بحث ہے یہاں صرف اتنا جان لینا کافی ہے کہ بعض مقدرات بعض پر اس طرح مرتب ہوتے ہیں جس طرح مشروط شرط پر مرتب ہوتا ہے چنانچہ قدرت ازیلہ سے ارادہ کا صدور اسی وقت ہوتا ہے جب علم آ جاتا ہے اور علم حیات کے بعد آتا ہے اور حیات عمل کے بعد پائی جاتی ہے لیکن یہ نہیں کہہ سکتے کہ حیات کا حصول جسم کے وجود پر موقوف ہے جو حیات کی شرط ہے ترتیب کے تمام درجہ میں یہی صورت ہے۔ پھر بعض شرطیں تو ایسی ہیں جو اکثر لوگوں پر ظاہر ہو جاتی ہیں اور بعض صرف ان لوگوں پر ظاہر ہوتی ہیں جو طوامس کے دائرے میں آتے ہیں اور حق کے نور سے مشاہدہ کرتے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہر حقدوم حق کے ساتھ حقدوم ہوتا ہے اور ہر مخرق حق کے ساتھ مخرق ہوتا ہے خود سے نہ کوئی چیز پہلے ہوتی ہے اور نہ بعد میں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو افعال میں تاخیر و تقدیر ہوا لوگوں کے افعال جیسی ہوتی جن میں کوئی ترتیب نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ نے صاف لفظوں میں اس کی تردید فرمائی ہے :-

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا لَاعِبِينَ مَا خَلَقْنَاهُمْ إِلَّا بِالْحَقِّ - (پ ۲۵ آیت ۳۹)

اور ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان میں ہے اس طرح پیدا نہیں کیا کہ ہم کھیل کرنے والے ہوں ہم نے ان دونوں کو کسی حکمت سے ہی بنایا ہے۔

گویا آسمان اور زمین میں جتنی بھی چیزیں ہیں سب کی سب ایک ترتیب واجب اور حق لازم کے ساتھ ظہور پذیر ہوتی ہیں ان کے بارے میں یہ تصویر ہی نہیں کیا جاسکتا کہ وہ کسی دوسری ترتیب کے ساتھ بھی معرض وجود میں آسکتی تھیں جو چیز مخرق ہے وہ اپنے شرط کی انتظار میں ہے اور مشروط کا وجود شرط سے پہلے محال ہے اور مشروط مقدر سے منتصف نہیں کیا جاسکتا۔ علم نطفے کے بعد اس لئے ہوتا ہے کہ حیات کی شرط مفقود ہوتی ہے اور ارادہ اس لئے پیچھے رہتا ہے کہ علم کی شرط نہیں پائی جاتی۔ یہ تمام چیزیں اپنی اپنی شرطوں کے ساتھ اسی ترتیب کے ساتھ موجود ہوتی ہیں اس ترتیب کو اتفاقی نہیں کہہ سکتے بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت اور تدبیر کے تمام تقاضے پوری کرتی ہے۔ اگرچہ یہ سمجھنا ہے حد و شمار کام ہے کہ شرط کے بغیر مشروط نہیں پایا جاسکتا تاہم کم نظروں کے لئے ہم ایک مثال بیان کرتے ہیں اس سے معلوم ہو گا کہ قدرت کے باوجود فعل مقدر اپنی شرط پر موقوف رہتا ہے۔

اور وہ مثال یہ ہے کہ ایک بے وضو آدمی گردن تک پانی میں ڈوبا ہوا ہے حالانکہ پانی نطفے اور اسے استعمال کرنے سے آدمی بے وضو نہیں رہتا لیکن کیوں کہ شرط کی تکمیل نہیں ہوئی اس لئے وہ اپنی سابقہ حالت پر رہے گا اور وہ شرط یہ ہے کہ منہ دھویا جائے۔ اسلئے جب تک منہ نہیں دھلے گا اس کے اعضاء سے حادثہ دور نہیں ہو گا اسی طرح یہ بات سمجھی جاسکتی ہے کہ تمام مقدرات کے ساتھ قدرت ازیلہ کا اتصال اسی طریقے پر ہے جس طریقے پر بے وضو آدمی کے جسم سے پانی کا اتصال تھا مگر مقدر اسی وقت وجود میں آئے گا جب اس کی شرط پائی جائے گی جیسے مذکورہ بالا مثال میں ازالہ حادثہ کا وجود منہ دھلنے پر موقوف ہے۔

شرط کے بغیر مشروط کا وجود ممکن نہیں اب اگر کوئی شخص پانی میں کھڑا ہوا ہے اور وہ اپنا چہرہ پانی کی سطح پر رکھ دے اور پانی تمام اعضاء میں مؤثر ہو کر حادثہ زائل کر دے تو جلاء یہ گمان کرتے ہیں کہ ہاتھوں سے حادثہ اس لئے دور ہوا کہ چہرے سے

دور ہو گیا تھا یہ لوگ چرے سے دفعِ حدث کو ہاتھوں میں مؤثر سمجھتے ہیں، پانی کو رافعِ حدث نہیں کہتے، کیوں کہ ان کے بقول پانی تو پہلے بھی ان اعضاء سے متصل تھا، اس وقت رافعِ حدث نہیں تھا، جب چہرہ وصل گیا تو ان اعضاء سے بھی حدث جاتا رہا، حالانکہ پانی اب بھی وہی ہے جو پہلے تھا، پہلے اس سے حدث دور نہیں ہو سکا تو اب کیسے ہو گا، مگر کیوں کہ چہرہ دھلنے سے حدث دور ہوا ہے، اسی لئے ہم یہی کہیں گے کہ چہرہ کا دھلنا ہی رافعِ حدث ہے، پانی سے دفعِ حدث نہیں ہوا یہ خیال محض جمالت اور کم علمی پر مبنی ہے، یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی یہ خیال کرے کہ حرکتِ قدرت سے حاصل ہوئی ہے، اور قدرت ارادے سے، اور ارادہ علم سے، حالانکہ یہ خیال غلط ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جب چرے سے حدث دور ہوا تو ہاتھوں کا حدث بھی اس پانی سے دور ہو گیا جو ہاتھوں سے ملا ہوا تھا، محض منہ دھونے سے دور نہیں ہوا۔ ان لوگوں کی یہ بات صحیح ہے کہ پانی پہلے بھی وہی تھا اور اب بھی وہی ہے، اور ہاتھوں میں تبدیلی نہیں ہوئی، مگر ہم یہ کہتے ہیں کہ جو شرط مفقود تھی وہ وجود میں آئی، اور اپنے اثرات کے ساتھ وجود میں آئی۔ قدرت ازلیہ سے تمام مقدمات اسی طرح صادر ہوتے ہیں، حالانکہ قدرت ازلیہ قدیم ہے، اور تمام مقدمات حادث ہیں۔ یہ ایک نئی بحث ہے، اس بحث میں پڑیں گے تو یہ ایسا ہو گا جیسے عالمِ کاشفات کے دروازے پر دستک دے رہے ہیں، اس لئے یہ بحث ہم ہمیں ختم کرتے ہیں۔ ہمارا مقصد صرف فعلی توحید کے حقائق بیان کرنا ہے اور یہ واضح کرنا ہے کہ قائلِ حقیقی صرف ایک ذات ہے، وہی خوف کے قائل ہے، اور وہی رجا کا اہل ہے، اسی پر توکل کرنا چاہیے۔ اس عنوان کے تحت ہم نے جو کچھ لکھا ہے وہ توحید کے ناپیدا کنارِ سمندوں میں سے بھی تیسری قسم کے سمندوں کا ایک معمولی قطبہ ہے، توحید کے مکمل بیان کے لئے تو عمر و روح بھی کافی نہ ہو گی۔ توحید کے مضامین اور حقائق بیان کرنا ایسا ہے جیسے سمندر سے قطرہ قطرہ کر کے پانی لیا جائے، ظاہر ہے عمریں ختم ہو جائیں گی، لیکن سمندر اپنی جگہ باقی رہے گا۔ یہ تمام سمندر کلمہ لا الہ الا اللہ میں موجود ہیں، زبان پر یہ کلمہ انتہائی ہلکا ہے، قلب کے اعتقاد کے لئے سہل ہے، لیکن علمائے راہین ہی جانتے ہیں کہ اس ایک کلمے میں کتنے حقائق پوشیدہ ہیں۔

اللہ اور بندہ دونوں قائل ہیں ہم نے سابق میں یہ لکھا ہے کہ توحید کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی قائل نہیں ہے، اس پر یہ اعتراض وارد ہو سکتا ہے کہ ایک طرف تم صرف اللہ کے لئے قائلیت ثابت کرتے ہو، اور دوسری طرف شرع سے ثابت ہوتا ہے کہ بندہ بھی قائل ہے۔ بظاہر ان دونوں باتوں میں تضاد ہے۔ کیوں کہ اگر بندہ قائل ہو گا تو اللہ تعالیٰ کیسے قائل ہو گا، اور اگر اللہ کو قائل کہو گے تو پھر بندہ قائل کیسے قرار پائے گا۔ اور اگر دونوں قائل ہیں تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک ہی فعل کے دو قائل ہوں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اگر قائل کے ایک ہی معنی لئے جائیں تو یہ اعتراض وارد ہو سکتا ہے اور یہ کہا جاسکتا ہے کہ ایک فعل کے دو قائل نہیں ہو سکتے، لیکن اگر قائل کے دو معنی ہوں، اور لفظ میں اجمال ہو، یہاں تک کہ اس کا اطلاق دونوں معنوں پر ہو سکتا ہے، تو اس اعتراض کی محجاش نہیں رہے گی۔ چنانچہ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ حاکم نے فلاں شخص کو قتل کر ڈالا۔ اور یہ بھی کہتے ہیں کہ جلاد نے فلاں شخص کو قتل کر ڈالا۔ یہاں حاکم ایک اعتبار سے قائل ہے، اور جلاد دوسرے اعتبار سے۔ اسی طرح بندہ اپنے فعل کا ایک اعتبار سے قائل ہے، اور اللہ تعالیٰ اس فعل کا دوسرے اعتبار سے قائل ہے۔ اللہ تعالیٰ کے قائل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ فعل کا موجود اور مختار ہے، اور بندے کے قائل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ عمل ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے قدرت پیدا فرمائی، اس سے پہلے ارادہ پیدا فرمایا اور ارادہ سے پہلے علم پیدا کیا۔ مطلب یہ ہے کہ قدرت، ارادہ اور حرکت کا ارتباط قدرت سے ایسا ہے جیسے شرط کا ارتباط مشروط سے ہوتا ہے، اور قدرت الہی سے ایسا ہے جیسے معلول کا ارتباط علت سے اور موجد کا ارتباط اس چیز سے ہوتا ہے جسے اس نے ایجاد کیا ہو۔ قدرت کے ساتھ ارتباط ہونے کی صورت میں عملِ قدرت کو بھی قائل کہہ دیا جاتا ہے، خواہ وہ ارتباط کسی بھی طرح کا ہو، جیسا کہ مذکورہ بالا مثال میں حاکم اور جلاد دونوں کی طرف قتل کی نسبت کی گئی ہے، کیوں کہ قتل

دونوں کی قدرت سے مرتبط ہے، اگرچہ یہ ارتباط ایسا نہیں ہے، مگر فعل دونوں کا کھلتا ہے، اسی طرح کا ارتباط مقدمات کا دو قدرتوں سے ہوتا ہے، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں بعض افعال کو بھی فرشتوں کی طرف اور کبھی بندوں کی طرف اور کبھی خود اپنی طرف منسوب فرمایا ہے، چنانچہ موت کے سلسلہ میں ارشاد فرمایا :-

قُلْ يَتَوَفَّكُم مَّلَكُ الْمَوْتِ (پ ۲۱ آیت ۱۱)

آپ فرمادیجئے کہ تمہاری جان موت کا فرشتہ قبض کرتا ہے۔

ایک جگہ اس فعل کی نسبت اپنی طرف فرمائی ہے :-

الَّذِينَ يَتَوَفَّوْنَ أَنْفُسَهُمْ حِينَ مَوْتِهِمْ (پ ۲۳ آیت ۴۲)

اللہ ہی قبض کرتا ہے جانوں کو ان کی موت کے وقت۔

ایک جگہ کاشتکاری کی نسبت بندوں کی طرف کی گئی ہے، چنانچہ فرمایا :-

أَفَرَأَيْتُمْ مَا تَحْرُثُونَ أَأَنْتُمْ تَزْرَعُونَهُ (پ ۲۷ آیت ۳۳)

اچھا پھر یہ بتلاؤ کہ تم جو کچھ بولتے ہو کیا تم اسے اگاتے ہو۔

دوسری جگہ اس فعل کو اپنی طرف منسوب فرمایا ہے :-

أَنَا صَبَّبْنَا الْمَاءَ صَبًّا ثُمَّ شَقَقْنَا الْأَرْضَ شَقًّا فَأَنْبَتْنَا فِيهَا حَبًّا وَعَيْنَبًا (پ ۳۰ آیت ۲۸)

ہم نے عجیب طور پر پانی برسایا، پھر عجیب طور پر زمین کو پھاڑا پھر ہم نے اس میں فلفلہ اور انجور اگائے۔

ایک جگہ ارشاد فرمایا :-

فَأَرْسَلْنَا إِلَيْهَا رُوحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا (پ ۵۱ آیت ۱۷)

ہم نے ان کے پاس اپنے فرشتے کو بھیجا، اور وہ ان کے سامنے ایک پورا آدمی بن کر ظاہر ہوا۔

اس کے بعد ارشاد فرمایا :-

فَتَنَفَّخْنَا فِيهِمَا مِنْ رُوحِنَا (پ ۶۱ آیت ۹)

پھر ہم نے ان میں روح پھونک دی۔

حالانکہ پھونکنے والے حضرت جبرئیل علیہ السلام تھے۔ ایک جگہ ارشاد فرمایا :-

فَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ وَاسْتَغْنِ (پ ۲۹ آیت ۱۸)

تو جب ہم اس کو پڑھنے لگا کریں تو آپ اس کے تابع ہو جایا کیجئے۔

مفسرین نے اس کے یہ معنی لکھے ہیں کہ جب جبرئیل تم پر قرآن کریم پڑھیں۔ ایک موقع پر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا :-

قَاتِلُوهُمْ يُعَذِّبُهُمُ اللَّهُ بِمَا يُدْبِرُكُمْ (پ ۸ آیت ۱۳)

ان سے لڑو اللہ تعالیٰ انہیں تمہارے ہاتھوں سے عذاب دے گا۔

اس آیت میں قتل کی نسبت مسلمانوں کی طرف کی گئی ہے، اور عذاب دینے کے فعل کو اپنی طرف منسوب فرمایا ہے، اور یہ تعجب

کیا ہے عین قتل ہی تو ہے، جیسا کہ ایک آیت میں اس کی صراحت کی گئی ہے :-

فَلَمْ نَقْتُلْهُمْ وَلَكِنَّ اللَّهَ قَتَلَهُمْ (پ ۹ آیت ۱۷)

سو تم نے ان کو قتل نہیں کیا لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو قتل کیا ہے۔

ایک جگہ ارشاد فرمایا :-

وَمَآزَنِي مَا لَمْ يَحْزَنْكَ لِكَيْ لَا تَكُونَ مِنَ الْخَاسِرِينَ (پ ۲۹ آیت ۱۷)

اور آپ نے (خاک کی مٹی) نہیں بھیگی جس وقت آپ نے بھیگی تھی، لیکن اللہ تعالیٰ نے بھیگی تھی۔

اس آیت میں بظاہر نفی اور اثبات کا اجتماع ہے مگر حقیقت میں نفی اس لحاظ سے ہے کہ اللہ تعالیٰ فاعل ہو اور اثبات اس لحاظ سے کہ بندہ فاعل ہو۔ یہاں کہ یہ دونوں دو مختلف امور ہیں۔ اس سلسلے میں کچھ قرآنی آیات یہ ہیں :-

الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ (پ ۲۱ آیت ۴-۵)

جس نے قلم سے تعلیم دی انسان کو ان چیزوں کی تعلیم دی جن کو وہ جانتا نہیں تھا۔

الرَّحْمَنُ عَلَّمَ الْقُرْآنَ خَلَقَ الْإِنْسَانَ عَلَّمَ الْبَيَانَ (پ ۲۷ آیت ۱-۴)

رحمن نے قرآن کی تعلیم دی اس نے انسان کو پیدا کیا اس کو گویائی سکھائی۔

ثُمَّ إِنِّي عَلَّمْنَاهُ بَيِّنَاتٍ (پ ۲۹ آیت ۱۸)

پھر اس کا بیان کر دیا بھی ہمارے ذمے ہے۔

أَفَرَأَيْتُمْ مَا تَدْعُونَ لَكُمْ تَخْلُقُونَ تَخْلُقُونَ (پ ۲۵ آیت ۵۹)

اچھا پھر یہ بتاؤ کہ تم جو (مورتوں کے زخم میں) مٹی پہناتے ہو اس کو تم آدمی بناتے ہو یا ہم بناتے ہیں۔

ارحام کے فرشتوں کے حلقی سرکارِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ وہ رحم میں جاتے ہیں اور نطفے کو ہاتھ میں لے کر جسم کی صورت ڈھالتے ہیں اور باری تعالیٰ کی خدمت میں عرض کرتے ہیں یا اللہ! اسے مود بنائیں یا عورت، ٹیڑھا بنائیں یا سیدھا۔ اللہ تعالیٰ اس کے جواب میں اپنی مرضی سے آگاہ فرما دیتا ہے اور فرشتے اس نطفے کو اسی طرح ڈھال دیتے ہیں جس طرح وہ چاہتا ہے (بخاری و مسلم۔ ابن مسعود) ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ فرشتہ صورت بنا کر اس میں مدح پھونک دیتا ہے سعادت کے ساتھ یا فساد کے ساتھ۔ ایک بزرگ کا ارشاد ہے کہ جس فرشتے کا نام مدح ہے وہ جسموں میں مدح ڈالتا ہے وہ اپنے خاص انداز میں سانس لیتا ہے اور اس کا ہر سانس مدح میں کر جسم میں داخل ہو جاتا ہے اسی لئے اس فرشتے کا نام مدح رکھا گیا ہے۔ ان بزرگ نے اس فرشتے کے حلقی جو کچھ ارشاد فرمایا ہے وہ درست ہے اور بعض ارباب قلوب نے اپنی بصیرت کے آئینے میں اس کا مشاہدہ بھی کیا ہے مگر ان کا یہ کہنا کہ اس فرشتے کا نام مدح ہے نقلی ثبوت کا محتاج ہے کسی نقلی دلیل کے بغیر اسے مدح کہہ دینا صرف قیاس آرائی ہے۔ ایک جگہ اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان میں اپنی نشانوں کا ذکر فرمایا اور اس کے بعد ارشاد فرمایا :-

لَوْ لَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ أَنْ يَكْفِ بِرَبِّكَ أَنْ يَكْفِ بِرَبِّكَ (پ ۲۵ آیت ۵۳)

کیا آپ کے رب کی بات کافی نہیں ہے کہ وہ ہر چیز کا شاہد ہے۔

ایک موقع پر یہ ارشاد فرمایا :-

شَهِدَ اللَّهُ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ (پ ۲۳ آیت ۱۸)

گو اسی ہی اللہ تعالیٰ نے اس کی بھجواس ذات کے کوئی معبود نہیں۔

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کو اپنی دلیل قرار دیا ہے اور یہ کوئی حیرت کی بات نہیں ہے بلکہ استدلال کے بے شمار طریقے ہیں اور مختلف انداز کے ہیں۔ چنانچہ بہت سے طالبانِ خدا اللہ تعالیٰ کو موجودات کے مشاہدے سے پہچانتے ہیں اور بہت سے تمام موجودات کو اللہ تعالیٰ کے ذریعے پہچانتے ہیں۔ ایک بزرگ نے اس کا اعتراف بھی کیا ہے کہ میں نے اپنے رب کو اس کی ذات سے پہچانا اگر میرا رب نہ ہوتا تو میں اسے ہرگز نہ پہچانتا اس آیت میں یہی مراد ہے لَوْ لَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ أَنْ يَكْفِ بِرَبِّكَ أَنْ يَكْفِ بِرَبِّكَ شَهِدَ اللَّهُ

شہید ایک طرف قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نفس کا یہ وصف بیان فرمایا ہے کہ میں مارنے والا ہوں، میں زندہ کرنے والا ہوں، دوسری طرف موت و حیات کو دو فرشتوں کے سپرد فرمایا ہے، جیسا کہ ایک حدیث میں مودی ہے کہ موت و حیات کے دو فرشتوں نے آپس میں مناظرہ کیا، موت کے فرشتے نے کہا کہ میں زندوں کو مارتا ہوں، اور زندگی کے فرشتے نے کہا کہ میں مودوں کو زندہ کرتا ہوں (گویا یہ دونوں فرشتے بطور فخر اپنے اپنے اعمال بیان کر رہے تھے) اللہ تعالیٰ نے وحی فانی فرمائی کہ تم دونوں اپنے اپنے کام میں مشغول رہو، اور جس کام کے لئے میں نے تمہیں مقرر کیا ہے وہ کرتے رہو، موت اور زندگی دینے والا میں ہوں، نہ میرے سوا کوئی مارتا ہے اور نہ کوئی جلاتا ہے (۱) اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ فعل کا استعمال کلی طرح سے ہوتا ہے، اگر گہرائی سے دیکھا جائے تو ان مختلف استعمالات میں کوئی تاقص نہیں ہے۔ ایک مرتبہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو سمجھو عنایت کرتے ہوئے فرمایا :-

خُذْهَا لَوْ لَمْ تَأْتِهَا لَا تَشْكُ (طہرانی۔ ابنِ عرب)

اے لے لو، اگر تم اس کے پاس نہ آتے تو یہ تمہارے پاس آتی۔

اس روایت میں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے آنے کو سمجھو اور انسان دونوں کی طرف منسوب فرمایا ہے، حالانکہ یہ بات بالکل واضح ہے کہ جس طرح انسان سمجھو کے پاس آتا ہے، اس طرح سمجھو اس کے پاس نہیں آتی۔ ایک روایت میں ہے کہ کسی صحابی نے توبہ کے دوران یہ الفاظ کہے اَتُوبُ اِلَى اللّٰهِ لَا اِلٰهَ اِلَّا مَعْنٰی اللّٰہ کی طرف توبہ کرتا ہوں نہ کہ مجھ کی طرف (یہ سن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اس شخص نے حق کو صاحب حق کے لئے جان لیا (۲) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص تمام امور کی رضاغت اللہ تعالیٰ کی طرف کرتا وہ محقق ہے، اس نے حق اور حقیقت کی معرفت حاصل کرلی ہے اور جو غیر کی طرف کرتا ہے وہ اپنے کلام میں مجاز اور استعارہ استعمال کرنے والا ہے، اس استعمال کی بھی کوئی نہ کوئی وجہ ہوتی ہے جس طرح حقیقت کی وجہ ہوتی ہے لفظ قائل لغویین نے ایجاد اور اختراع کرنے والے کے لئے وضع کیا ہے، لیکن کیوں کہ اس نے یہ خیال کیا کہ انسان بھی اپنی قدرت سے مخرج اور موجد ہے اس لئے اسے بھی اپنی حرکت اور اپنے فعل کا قائل کہہ دیا، اور اس کے معنی کو حقیقی معنی پر محمول کر بیٹھا، اور اس لفظ جنسی میں جلا ہو گیا کہ اس فعل کو خدا کی طرف مجازاً منسوب کیا جاتا ہے، جیسے حاکم کی طرف قتل کی نسبت مجازاً کی جاتی ہے اور جلا کی طرف حقیقت میں۔ مگر اربابِ قلوب نے معاملہ اس کے بالکل برخلاف دیکھا، اور واضحین لغت سے کہا کہ تم نے لفظ قائل مخرج کے لئے وضع کیا ہے، اور قائل صرف اللہ تعالیٰ ہے، اللہ کے سوا کوئی نہیں ہے۔ ان کے نزدیک قائل حقیقی کے معنی صرف اللہ تعالیٰ کے لئے خاص ہیں، اور دوسرے پر اس کا اطلاقی مجاز کے طور پر ہے، اور اس کے حقیقی معنی کسی عربی کی زبان سے قصداً یا اتفاقاً ظاہر ہو گئے تو سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تحسین و تصدیق فرمائی، چنانچہ ارشاد فرمایا کہ شاعروں نے جو کچھ کہا ہے اس میں بے حد سچا شعر لہیدہ گایہ قول ہے۔

اَلَا كَيْلُ شَيْءٍ مَا خَلَا لَوْ بَاطِلٌ وَكُلُّ نَعِيمٍ لَا مَحَالَةَ لَزَائِلٌ

(جان لو کہ اللہ کے سوا ہر چیز باطل ہے، اور ہر نعمت لامحالہ زائل ہونے والی ہے)

یعنی جس چیز کو اپنی ذات سے قیام نہیں ہے، بلکہ وہ دوسرے کے ساتھ قائم ہے وہ اپنی ذات سے باطل ہے اس کی حقیقت اور حقیقت غیر سے ہے، خود اس سے نہیں ہے بلکہ حقیقت کا زیادہ حد آرتی قوم کے سوا کوئی نہیں ہے، اس کے سوا کسی کو حق نہیں ہے کہ وہ اپنی ذات سے قائم ہو، باقی تمام چیزیں اسی کی قدرت سے قائم ہیں، وہی حق ہے باقی تمام چیزیں باطل ہیں۔ حضرت سہیل

فرماتے ہیں اے مسکین! اللہ تعالیٰ موجود تھا اور تو موجود نہیں تھا اور وہ باقی رہے گا اور تو باقی نہیں رہے گا۔ اب جب کہ تو ہو گیا تو یہ کہنے لگا ہے میں میں! تو اب بھی ویسا ہی ہو جا جیسا کہ نہیں تھا، اس لئے کہ تو آج بھی ویسا ہی ہے جیسے پہلے تھا یعنی نہ تیرا پہلے کوئی وجود تھا اور نہ حقیقت میں آج ہے۔

ثواب و عقاب چہ معنی دارد؟ اس پوری گفتگو کے بعد یقیناً یہ اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ اگر بندہ اس قدر مجبور ہے کہ ہم اس کے جس عمل کو اختیار سمجھتے ہیں وہ بھی جبر ہے تو پھر اس عذاب اور ثواب کے کیا معنی ہیں جو بندوں کے ان گناہوں پر یا اعمال خیر پر دیا جاتا ہے، اور اس سے بڑھ کر یہ کہ غیظ و رضا کے کیا معنی ہیں، کی اللہ تعالیٰ خود ہی اپنے فضل پر ناراض اور خود اپنے ہی فضل سے راضی ہو جاتا ہے؟ اس کا جواب ہم کتاب الفکر میں پوری وضاحت سے لکھ چکے ہیں۔ وہاں دیکھ لیا جائے اب یہاں دوبارہ لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔

یہ ہے وہ مقدار توحید جو ہم نے بطور مزینان کی ہے اور جس سے توکل کا حال پیدا ہوتا ہے، اور یہ توحید رحمت و حکمت پر ایمان کے بغیر مکمل نہیں ہوتی، اس لئے کہ توحید سے یہ لازم آتا ہے کہ مسبب الاسباب پر نظر ہو، اور وسعت رحمت پر ایمان کا حاصل یہ ہے کہ مسبب الاسباب پر اعتماد اور بھروسہ ہو۔ توکل کا حال اسی وقت مکمل ہوتا ہے جیسا کہ آئندہ صفحات میں اس کا بیان ہو گا جب وکیل پر متوکل کا پورا پورا اعتماد ہوتا ہے، اور اس کا دل وکیل کی شفقت اور مہربان پر پورے طور پر مطمئن ہوتا ہے۔ ایمان کی یہ قسم بھی انتہائی اعلیٰ ہے۔ اور اس میں اہل کشف کے طریقے کی حکایت بہت زیادہ تفصیل طلب ہے، اس لئے ہم اس کا حاصل بیان کئے دیتے ہیں تاکہ طالبان توکل اس مقام کا اس طرح اعتقاد کر سکیں تو انہیں کسی قسم کا کوئی شک باقی نہ رہے۔

متوکل کا وکیل پر اعتماد کامل اور وہ یہ ہے کہ پورے پورے یقین کے ساتھ اس امر کی تصدیق کرے کہ اگر اللہ تعالیٰ اپنی تمام مخلوق کو سب سے زیادہ عظیم شخص کے برابر محض اور سب سے بڑے عالم کے برابر علم عطا کرتا، اور انہیں اس قدر علم سے نوازتا جنہیں ان کے نفوس برداشت کر سکتے، اور انہیں اس قدر حکمت عطا کرتا جس کی کوئی انتہا نہ ہوتی، پھر جیسے جیسے ان کی تعداد بڑھتی ان کے علم، عقل اور حکمت میں بھی اسی قدر اضافہ فرماتا، پھر ان امور کے عواقب مشکف فرماتا، انہیں ملکوت کے اسرار سے آگاہ کرتا، اور مخلوقات کے غلطی پہلوؤں اور لطیف دقائق سے واقف فرماتا یہاں تک کہ وہ خیر و شر اور نفع و ضرر سے آگاہ ہو جاتے پھر ان سے ارشاد فرماتا کہ وہ ان علوم و حکم کے ذریعے جو انہیں عطا کئے گئے ہیں ملک و ملکوت کا نظام چلائیں، اگر وہ تمام لوگ اپنے باہمی تعاون اور مکمل منصوبہ بندی کے ساتھ اس عالم کا نظام سنبھالتے تو اللہ تعالیٰ کی اس تدبیر کو بھی نہ پہنچنے جو اس نے دنیا و آخرت میں روار کھی ہے، اور اس نظام میں نہ ایک چھتر کے پر کے برابر کمی کر پاتے اور نہ ایک ذرہ کے برابر زیادتی کر پاتے نہ مریض کا مرض دور کرتے، نہ عیب دار کا عیب زائل کر پاتے، نہ فقیر کا فقر ختم کرتے، اور نہ معصیت زدہ کو راحت پہنچاتے، نہ کسی کی صحت زائل کرتے، نہ کسی مالدار کو حیلہ دست بناتے، نہ کسی شخص سے اللہ کی نعمتیں سلب کر پاتے۔ غرض یہ کہ اللہ تعالیٰ نے زمین اور آسمان میں جو کچھ پیدا کیا ہے اس میں ایک نقطے کی گنجائش بھی نہ پاتے، اگرچہ وہ اس پورے نظام میں عیب یا نقص یا فرق تلاش کرنے کے لئے اپنی تمام عمریں اپنے تمام علوم اور اپنے تمام تجربے ضائع کر دیتے۔ آخر میں اسی نتیجے پر پہنچتے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں میں رزق، عمر، خوشی، غم، عجز، قدرت، ایمان، کفر، طاعت اور معصیت کی جو تقسیم روار کھی ہے وہ سراسر عدل پر مبنی ہے، حق ہے، اس میں کوئی ظلم یا نا انصافی نہیں ہے، ہر چیز اسی ترتیب پر قائم ہے جس پر اسے ہونا چاہیے تھا، اور اسی مقدار کے ساتھ ہے جو اس کے لئے مناسب ہے، کسی چیز کا اس سے بڑھ کر ہونا بھی وہ ہے یا اس سے زیادہ مکمل ہونا بھی وہ نظر آتی ہے ممکن ہی نہیں ہے، اور اگر یہ فرض کیا جائے کہ کوئی چیز اس سے بہتر اسلوب میں مل سکتی تھی اور اللہ تعالیٰ نے قدرت کے باوجود اسے اس اسلوب میں

پیدا نہیں فرمایا تو یہ بکل ہے، 'جود نہیں ہے، 'ظلم ہے عدل نہیں ہے، 'اور اگر یہ کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ کو قدرت نہ تھی تو اس سے مجز لازم آتا ہے، 'اور معبود عاجز نہیں ہوتا۔

اصل میں فقر و ضرر دنیا کے لئے نقصان یا عیب ہیں، مگر آخرت میں باعث فضیلت ہیں، 'اسی طرح آخرت میں اگر کوئی چیز کسی کے لئے نقصان ہے تو دوسرے کے لئے باعث راحت ہے، 'مثال کے طور پر اگر اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے رات پیدا نہ فرماتا تو دن کی قدر کیسے معلوم ہوتی، 'اور مرض نہ ہوتا تو سندرست لوگ صحت کی لذت سے کیسے ہم کنار ہوتے، 'اگر دوزخ نہ ہوتی تو جنت والے اس نعمت کی قدر کہاں کرتے جو انہیں عطا ہوئی ہے، 'جس طرح انسانوں کی ہمت و تحفظ کے لئے جانوروں کا خون بہانا ظلم نہیں ہے، 'بلکہ کامل کو ناقص پر ترجیح دینا عدل ہے، 'اسی طرح اہل جنت کی نعمتوں میں اضافہ کرنے کے لئے اہل دوزخ کو عذاب دینا اور کافروں کو مومنوں کا فدیہ بنانا بھی عدل ہے، 'اگر ناقص نہ ہوتا تو کامل کی معرفت کیسے ہوتی، 'اسی طرح اگر بہائم نہ پیدا کئے جاتے تو انسان کے شرف کا اظہار کیسے ہوتا، 'کمال اور نقص ایک دوسرے کی نسبت سے نمایاں ہوتے ہیں۔ ہود و کرم اور حکمت و دانش کا تقاضا یہی ہے کہ کامل اور ناقص دونوں طرح کی چیزیں پیدا کی جائیں بعض اوقات آدمی کے جسم کے تحفظ کے لئے اس کا ہاتھ کاٹ دیا جاتا ہے، 'یعنی ناقص کو کامل پر قربان کر دیا جاتا ہے، 'اور کوئی ذی ہوش اسے ظلم نہیں کہتا۔ یہی حال دنیا و آخرت میں مخلوق کے درمیان تفاوت کا ہے، 'یہ فرق بہر حال عدل ہے، 'ظلم نہیں ہے، 'حق ہے کھیل نہیں ہے۔

یہ بیان بھی نہایت مستم بالشان ہے، 'انتہائی وسیع ہے، 'اور ایک ایسا ناپید کنار سمندر ہے جس کی موجیں مضطرب ہیں، 'یہ سمندر بھی توحید کے سمندر سے کم نہیں ہے، 'ہمت سے کم عقل، 'کم فہم اور نادان لوگ اس کی لہروں میں ایسے الجھے کہ نام و نشان کھو بیٹھے، 'وہ اس سمندر میں اترنے سے پہلے یہ نہیں سمجھتے تھے کہ اس کی موجیں انتہائی سرکش ہے، 'یہ بات صرف اہل عقل ہی سمجھ سکتے تھے۔ اس سمندر کے اس طرف تقدیر کے راز ہیں، 'جن کے سلسلے میں اکثر لوگ پریشان ہیں، 'صرف اہل کشف ان پر مطلع ہیں، 'لیکن انہیں افشائے راز سے منع کر دیا گیا ہے۔

حاصل گفتگو یہ ہے کہ خیر و شر دونوں کا فیصلہ ازل میں ہو چکا ہے، 'اور جن چیزوں کا فیصلہ ہو جاتا ہے وہ ہر حال میں واقع ہوتی ہیں انہیں روکا نہیں جاسکتا۔ تقدیر ایک ان مٹ نہیں سکتا، 'اور ایک ابدی تحریر ہے، 'کوئی اسے مٹا نہیں سکتا، 'دنیا میں جتنی بھی چیزیں واقع ہوں گی، 'یا ہو چکی ہیں خواہ وہ چھوٹی ہوں یا بڑی سب کی تحریر کی قید میں ہیں، 'ہر چیز اپنی مدت حید پر واقع ہوگی، 'ہر واقعہ اپنی مدت کا منظر ہے، 'جو چیز تجھے پہنچنے والی ہے وہ پہنچ کر رہے گی، 'خواہ اس کی راہ میں رکاوٹیں کیوں نہ کھڑے کر دی جائیں، 'اور جو چیز تجھے ملنے والی نہیں ہے وہ کسی حال میں نہیں ملے گی، 'خواہ تو اس کے لئے کتنی ہی جدوجہد کیوں نہ کرے۔

دو سرا باب

توکل کے ال و اعمال

توکل کا حال ہم نے کتاب التوکل کی ابتدا میں یہ بات بیان کی ہے کہ توکل کا مقام علم، حال اور عمل سے ترتیب پاتا ہے، 'ان میں سے علم کا ذکر ہو چکا ہے، 'اب حال کا حال سنئے جو واقع میں توکل ہے، 'علم اس کی اصل ہے اور عمل اس کا ثمر ہے۔

توکل کی تعریف میں لوگوں نے بہت کچھ کہا ہے، 'اس سلسلے میں ان کے اقوال بڑے حد تک مختلف بھی ہیں، 'اور اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ ہر شخص نے اپنے اپنے فکر، 'کا حال لکھا ہے، 'اور اسی کو توکل کی تعریف قرار دیا ہے، 'ان ایو اب میں صوفیا کی یہی عادت

رہی ہے۔ ہم یہ اقوال نقل کر کے محکمہ کو طویل نہیں دینا چاہتے۔ اس لئے صرف امر واقعہ بیان کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

توکل کی حقیقت جاننا چاہیے کہ توکل وکالت سے مشتق ہے کہتے ہیں وکیل امر مالی فلان یعنی اس نے اپنا کام فلاں شخص کے سپرد کیا اور اس معاملے میں اس پر اعتماد کیا جس کے سپرد کام کیا جاتا ہے اس کو وکیل کہتے ہیں اور جو کام سپرد کرتا ہے اس کو مؤکل اور مؤکل کہتے ہیں لیکن اس سلسلے میں شرط یہ ہے کہ مؤکل کو وکیل پر پورا اطمینان اور اس کا پورا اعتقاد ہو اور اسے عاجز نہ سمجھتا ہو۔ گویا توکل میں وکیل پر قلبی اعتماد ضروری ہے۔ دنیاوی خصوصیات میں عام طور پر جو کلام مقرر کئے جاتے ہیں ان کے لئے بھی یہی شرط ہے چنانچہ اگر کوئی شخص تم پر کوئی جموٹا الزام عائد کرے یا زبردستی تمہاری کوئی چیز جھٹالے تو تم اس کے فریب اور ظلم کے ازالے کے لئے اپنا وکیل مقرر کرتے ہو یہ وکیل قاضی کی عدالت میں تمہاری زبان بٹاتا ہے اور تمہیں مدعا علیہ کے ظلم و فریب سے نجات دلانے کی کوشش کرتا ہے۔ تم اس وقت تک اپنے وکیل پر اعتماد کرنے والے اور اس کی وکالت پر مطمئن نہیں کھلاؤ گے جب تک کہ اس کے سلسلے میں چار امور کا اعتقاد نہیں کرو گے ایک اطلاع درجہ کی ہدایت دوم قدرت سوم انتہائی درجہ کی فصاحت اور چہارم تمام شفقت و رحمت۔ ہدایت اس لئے ضروری ہے تاکہ فریب کے مواقع سے آگاہ رہے یہاں تک کہ وہ باریک حیلے بھی اس کی نظر میں آجائیں جو عام طور پر نگاہوں سے اوچھل جاتے ہیں قدرت اور قوت اس لئے ضروری ہے تاکہ پوری جرأت کے ساتھ حق بات کا اعلان کر سکے اور اس سلسلے میں کسی مدانت سے کام نہ لے نہ کسی سے ڈرے نہ کسی سے شرم کرے اور نہ بزدلی سے کام لے۔ اگر ایسا ہوتا ہے کہ وکیل کو فریق ثانی کے فریب کی وجہ معلوم ہو جاتی ہے لیکن وہ خوف بزدلی حیا یا کسی اور سبب سے اس کا اظہار نہیں کر پاتا اور حق کے اعلان میں کمزور پڑ جاتا ہے۔ فصاحت اس لئے ضروری ہے کہ اس سے اپنی بات مؤثر انداز میں بیان کی جاسکتی ہے یہ بھی ایک طرح کی قدرت ہی ہے اگرچہ اس کا تعلق زبان سے ہے فصاحت کے ذریعے انسان اپنے دل کی بات اس طرح بیان کر سکتا ہے کہ سامع متاثر ہو ورنہ ضروری نہیں ہے کہ کوئی شخص فریق مخالف کے فریب سے آگاہ ہو کر اس کے فریب کا پردہ چاک کر سکے اور حق بات اس اسلوب سے کر سکے کہ سننے والا قائل ہو جائے۔ شفقت اس لئے ضروری ہے کہ وکیل اپنے مؤکل کے حق میں پوری پوری کوشش کر سکے۔ اور جو کچھ اس سے ہو سکتا ہے اس سے دریغ نہ کرے لیکن کہ صرف مواقع فریب سے آگاہ ہونا اظہار حق پر قادر ہونا اور فصاحت و بلاغت کے گوہر بکھیرنا مقدمے کی کامیابی کے لئے کافی نہیں ہے جب تک وکیل کو اپنے مؤکل کی ذات اور حالات سے انتہائی دل چسپی نہ ہو اور اس کے معاملات کو اپنے معاملات نہ سمجھے اگر مقصد صرف حصول زر ہے تو اسے یہ پروا نہیں ہوگی کہ اس کا مؤکل حق پاتا ہے یا ہزیمت اٹھاتا ہے یا اس کا حق ملتا ہے یا اپنا حق گنوا تا ہے۔

اگر مؤکل کو ان چاروں میں سے ایک امر میں بھی شک ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ اس کا وکیل اس امر میں کمزور ہے یا فریق ثانی ان چاروں امور میں اس کے وکیل سے آگے ہے تو اسے اپنے وکیل پر اچھی طرح اطمینان نہیں ہو سکتا۔ وہ ہر وقت دل میں حوروں رہے گا اور یہ کوشش کرے گا کہ کس طرح اس کے وکیل کا یہ عیب دور ہو جائے اور فریق ثانی کا تفوق باقی نہ رہے۔ مؤکل کو ان چاروں امور میں اپنے وکیل کا جس قدر اعتقاد ہو گا اسی قدر اس کے دل میں اعتماد اور اطمینان ہو گا۔ جہاں تک لوگوں کے اعتقادات اور نظروں کا تعلق ہے وہ قوت و ضعف میں یکساں نہیں رہتے بلکہ ان میں ناقابل بیان تفاوت رہتا ہے اسی لئے اگر متوکلین کے اعتقاد اور اس کے نتیجے میں حاصل ہونے والے احوال و طہائیت میں بھی تفاوت ہو تو یہ کوئی حیرت انگیز بات نہیں ہے ہو سکتا ہے کسی کو اپنے وکیل پر ذرا اعتماد نہ ہو اور کسی کا یقین اس درجہ کو پہنچ جائے کہ اس میں کسی طرح کا کوئی ضعف باقی نہ رہے۔ مثلاً اگر مؤکل کا وکیل اس کا باپ ہے اور وہ اپنے بیٹے کے لئے ذخیرہ کرنے میں حلال و حرام میں بھی فرق نہیں کرتا تو ظاہر ہے کون بیٹا ہو سکتا ہے جو ایسے باپ کی شفقت و محبت میں شبہ کرے گا اس طرح ان چار امور میں سے ایک امر قطعی ہو جائے گا۔ باقی اور بھی اسی

طرح قطعی ہو سکتے ہیں، مثلاً اگر مؤکل کو طویل تجربات کے بعد یا تو اتارے سن کر یہ بات معلوم ہو کہ فلاں شخص انتہائی فصیح اللسان، خوش بیان، اور حق پرست ہے، تو وہ اس کی اس خصلت کو قطعی سمجھ کر اسے اپنا دوکیل بنا لیتا ہے۔ اگر تم اس مثال کے ذریعے توکل کی حقیقت جان گئے ہو تو اسی پر اللہ تعالیٰ پر توکل کو بھی قیاس کر لو، اگر اعتقاد یا کشف کے ذریعے تمہارے دل میں یہ بات راسخ ہو جائے کہ اللہ کے سوا کوئی قائل نہیں ہے، اور اس کے ساتھ ہی تم یہ اعتقاد بھی کرو کہ اللہ تعالیٰ بندوں کے احوال پر اچھی طرح مطلع ہے، اور ان کے لئے کافی ہونے پر قادر ہے، اور اس کی رحمت تمام مخلوقات کو محیط اور آسمان وزمین کے ذریعے ذریعے کو شامل اور عام ہے، اور یہ اعتقاد بھی رکھو کہ اس کی متبائے قدرت کے بعد کوئی قدرت نہیں، اس کے متبائے علم کے بعد کوئی علم نہیں، اس کے متبائے رحمت و حمایت کے بعد کوئی رحمت و حمایت نہیں ہے، اگر اللہ تعالیٰ کے بارے میں تمہارے یہ پختہ خیالات اور اعتقادات ہیں تو تم اس پر یقیناً توکل کر دو گے، اور ہر حال میں اسی کی طرف توجہ کرتے رہو گے، نہ غیر کی طرف توجہ کر دو گے، نہ اپنی ذات پر، اور نہ اپنی قوت اور طاقت پر، بلکہ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہے، جیسا کہ ہم بار بار یہ اعلان کرتے ہیں۔

لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ

نہیں ہے گناہ سے باز رہنے کی طاقت، اور عبادت کی قوت مگر اللہ سے۔

اس میں حول سے حرکت مراد ہے، اور قوت سے حرکت پر قدرت۔

عدم توکل کے دو سبب اگر کسی شخص کے دل میں توکل کا یہ حال نہ ہو تو اس کے دو سبب ہو سکتے ہیں، یا تو یہ کہ ان چاروں امور میں سے کسی پر اس کا یقین کمزور ہو گا، یا اس کے سبب قلب کا ضعف، بزدلی اور پریشان خیالی ہو گی، بعض اوقات یقین کمزور نہیں ہوتا لیکن دل پر ادھام غالب ہوتے ہیں، اور وہ اس کی طبیعت میں انحراف اور کجی پیدا کرتے ہیں، جیسے اگر کوئی شخص شہد کھا رہا ہو اور اس کے سامنے اسے پاخانے سے تشبیہ دیدی جائے تو اس کے دل میں نفرت پیدا ہو جائے گی، اور کھا نہیں پائے گا۔ اسی طرح اگر کسی صاحب عقل انسان سے کہا جائے کہ وہ کسی مردے کے ساتھ اس کی قبر میں، یا اس کے کمرے میں یا اس کے بستر پر لیٹ جائے تو وہ اس کے لئے کبھی آمادہ نہیں ہوتا، حالانکہ وہ یہ بات اچھی طرح جانتا ہے کہ مردہ پتھر کی طرح بے جان اور بے حس ہے، اور نقصان پہنچانے پر قادر نہیں ہے، اور نہ یہ اللہ تعالیٰ کی عادت ہے کہ وہ کسی شخص کو مارنے کے بعد زندہ فرما دے۔ اگرچہ زندہ کرنے پر قدرت رکھتا ہے، یہ ایسا ہی ہے جیسے اللہ تعالیٰ کاتب کے ہاتھ میں قلم کو سانپ نہیں بناتا، یا کسی بلی کو شیر نہیں بناتا، حالانکہ وہ قلم کو سانپ اور بلی کو شیر بنانے پر قدرت رکھتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگرچہ ہر صاحب عقل کو یہ یقین ہے کہ مردہ نقصان نہیں پہنچا سکتا مگر وہ اس کے ساتھ اس کے بستر پر، یا اس کی قبر میں تنہا کر دے گا، گزارنے پر آمادہ نہیں ہے، حالانکہ اسے باقی تمام جمادات سے خوف نہیں آتا، دراصل یہ بزدلی اور نامروی ہے، اور ایک طرح کا ضعف ہے، بہت کم لوگ اس طرح کے ضعف سے خالی ہوتے ہیں، بعض لوگ کچھ زیادہ ہی بزل ہوتے ہیں، یہاں تک کہ بزدلی ان کے لئے مرض کی صوت اختیار کر لیتی ہے، اور وہ تنہائی کے تصور سے بھی متوحش ہو جاتے ہیں، چہ جائیکہ کسی مردے کے ساتھ تنہا ہوں۔

اطمینان اور یقین حاصل کلام یہ ہے کہ کمال توکل کے لئے دل اور یقین دونوں کی قوت ضروری ہے، اسی وقت دل کو اطمینان اور سکون نصیب ہوتا ہے، پھر عقل یقین کی قوت کافی نہیں ہے، اور نہ وہ تنہا باعث اطمینان ہو سکتا ہے جب تک کہ دل میں قوت ہو، دراصل دل کا اطمینان ایک الگ چیز ہے، اور یقین ایک الگ چیز ہے، بعض اوقات آدمی میں یقین ہوتا ہے لیکن اسے اطمینان نہیں ہوتا، جیسے حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بارگاہِ ایزدی میں یہ دعا کی کہ انھیں مودوں کو زندہ کرنے کی کیفیت

دکھادی جائے، باری تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اولم تو من؟ (کیا آپ نے یقین نہیں کیا) حضرت ابراہیم نے جواب میں عرض کیا :-
 بَلَىٰ وَلَٰكِنْ لَّيَظْمَرُنَّ قُلُوبُنِي - (پ ۳ ر ۳ آیت ۳۱)
 کیوں نہیں! لیکن تاکہ میرا دل مطمئن ہو جائے۔

مطلب یہ ہے کہ یقین تو ہے، لیکن مشاہدے سے دل کو جو قرار اور اطمینان حاصل ہوتا ہے وہ میسر نہیں ہے، ابتدا میں یقین اطمینان کا باعث نہیں بنتا، لیکن آہستہ آہستہ اس سے نفس مطمئنہ تشکیل پا جاتا ہے۔ بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جنہیں یقین نہیں ہوتا، لیکن اطمینان ہوتا ہے۔ جیسے یہودی اور عیسائی اپنے اپنے مذہب پر مطمئن ہیں حالانکہ اس کی حقانیت پر یقین نہیں رکھتے، صرف ہٹ دھرمی کی بنیاد پر اپنے مذہب کی یہودی کرتے ہیں، اور ان احکامات سے انحراف کرتے ہیں جو ان کے مذہب کی تنسیخ سے متعلق خدا کے پاس سے نازل ہو چکے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ بزدلی اور جرأت انسانی طبائع میں داخل ہیں اور ان کی موجودگی میں یقین مفید نہیں ہوتا، یہ بھی توکل کے مخالف اسباب میں سے ایک سبب ہے، جیسے ایک سبب یہ ہے کہ مذکورہ بالا چار امور میں سے کسی ایک پر یقین کمزور ہو، جب یقین اور اطمینان کے تمام اسباب مجتمع ہو جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ پر یقین کامل ہو جاتا ہے۔
 توراۃ میں یہ روایت بیان کی گئی ہے کہ جو شخص اپنے جیسے کسی انسان پر توکل کرتا ہے وہ لعنت کا مستحق ہے، ایک حدیث میں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص بندوں سے عزت چاہتا ہے، اللہ اسے ذلیل و رسوا کرتا ہے (ابو نعیم - عمر فاروق)

حالت توکل کے تین درجے گذشتہ صفحات میں توکل کی حقیقت بیان کی گئی ہے، اور توکل کے حال پر روشنی ڈالی گئی ہے، اب ہم اس حال کے درجات بیان کرتے ہیں، یہ تین درجے ہیں، اور حالت توکل کی قوت و ضعف پر مبنی ہیں۔ پہلا درجہ وہ ہے جو ابھی بیان کیا گیا ہے کہ بندہ کا توکل اپنے مولیٰ پر ایسا ہو جیسے متوکل کا اپنے وکیل پر ہوتا ہے، اور دوسرا درجہ جو اس سے اعلا ہے یہ ہے کہ متوکل کا حال اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایسا ہو جیسے بچے کا اپنی ماں کے ساتھ ہوتا ہے، نہ وہ اپنی ماں کے علاوہ کسی کو جانتا پہچانتا ہے، نہ اس کے سوا کسی سے فریاد کرتا ہے، اور نہ اس کے علاوہ کسی پر اعتماد کرتا ہے، جب اسے دیکھتا ہے تو اس کے بدن سے لپٹ جاتا ہے، وہ مارتی بھی ہے تو اسی کے دامن میں پناہ لینے کی کوشش کرتا ہے، اس کی موجودگی میں یا عدم موجودگی میں کوئی تکلیف وہ واقعہ پیش آتا ہے تو زبان پر سب سے پہلے ماں ہی کا نام آتا ہے، اور سب سے پہلے اسی کا خیال دل میں آتا ہے، ماں کی گود ہی اس کا ٹھکانہ ہے، بچے کو ماں کی کفالت، کفایت اور شفقت پر جو اعتماد اور یقین ہوتا ہے وہ ادراک سے خالی نہیں ہوتا، جس قدر اسے تیز ہوتی ہے اسی قدر وہ ادراک کرتا ہے، ایسا لگتا ہے کہ ماں پر اعتماد اور یقین بچے کی فطرت بن چکی ہے، لیکن اگر اس سے اس کی عادت اور فطرت کے متعلق پوچھا جائے تو وہ اس کی وضاحت نہیں کر سکتا، اور نہ اس کی تفصیل ذہن میں حاضر کر سکتا ہے، جس شخص کا دل اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو گا، اور اس کی نظر صرف اسی کے کرم پر ہوگی، اور اس کی حظ و بخشش پر اعتماد رکھتا ہو گا وہ اس سے اسی طرح عشق کرے گا جس طرح بچہ اپنی ماں سے کرتا ہے، حقیقت میں یہی شخص متوکل ہو گا، بچہ بھی اپنی ماں پر متوکل ہوتا ہے۔ اس درجے اور سابقہ درجے میں فرق یہ ہے کہ اس درجے والا اس حد تک توکل پر عمل پیرا ہے کہ توکل میں فنا ہو کر رہ گیا ہے، وہ توکل اور اس کی حقیقت کی طرف ملتفت نہیں ہوتا، بلکہ صرف اس ذات کی طرف ملتفت رہتا ہے جس پر توکل کیا جاتا ہے، اس کے سوا اس کے دل میں کسی کی گنجائش نہیں ہوتی، جب کہ پہلے درجے والا شخص شک و توکل کرتا ہے، یہ شخص کب سے متوکل ہے جب کہ پہلا شخص فطرتاً متوکل ہے، یہ شخص اپنے توکل سے فنا نہیں ہے، اس لئے کہ اس کے دل میں توکل کی طرف التفات اور اس کا شعور ہوتا ہے، اور یہ امر شخص متوکل علیہ کی ذات پر نظر کرنے سے مانع ہے حضرت سہیل ستیریؒ نے اپنے قول میں اسی درجے کی

طرف اشارہ فرمایا ہے، جب ان سے دریافت کیا گیا کہ توکل کا اپنی درجہ کیا ہے انہوں نے فرمایا آرزو ترک کرنا، سائل نے دریافت کیا اور اوسط درجہ کیا ہے؟ انہوں نے فرمایا اختیار ترک کرنا، یہ دوسرے درجے کی طرف اشارہ تھا، سائل نے پھر پوچھا کہ اعلا درجہ کیا ہے، انہوں نے اس کا ذکر نہیں کیا اور فرمایا اسے وہی جانتا ہے جو اوسط درجے پر ہے۔

توکل کا تیسرا درجہ جو سب سے اعلا ہے یہ ہے کہ متوکل اپنی حرکات و سکنات میں اللہ تعالیٰ کے سامنے ایسا ہو جیسے مردہ فصل دینے والے کے ہاتھوں میں ہوتا ہے، یعنی اپنے نفس کو مردہ تصور کر لے جسے قدرت ازلہ سے تحریک ملتی ہے جس طرح فصل دینے والے کا ہاتھ مردے کو حرکت کرواتا ہے، اس متوکل کو اس امر کا پختہ یقین ہوتا ہے کہ حرکت، قدرت، ارادہ، علم اور تمام صفات کا سرچشمہ صرف ایک ذات ہے۔ اور یہ کہ ہر چیز جبراً پیدا ہوتی ہے، یہ شخص اس انتظار میں رہتا ہے کہ نہ جانے کیا پیش آنے والا ہے، ایسا شخص اس بچے سے مختلف ہے جو اپنی ماں کے پیچھے دوڑتا ہے، اس کا دامن پکڑ کر کھینچتا ہے، اور اس سے فریاد کرتا ہے، جب کہ یہ شخص اس بچے کی طرح ہے جسے یہ آس ہو کہ آستے آس کی ماں خود ڈھونڈ لے گی، اور اگر وہ اس کا دامن نہ تھامے گا تب بھی وہ اسے گود میں اٹھالے گی، اور اگر دودھ نہ مانگے گا تو ماں خود پھل کر کے اسے دودھ پلا دے گی، توکل کے اس درجے کا تقاضا یہ ہے کہ متوکل اللہ تعالیٰ کے کرم اور اس کی توجہات پر اعتماد کر کے اپنے لئے کوئی سوال نہ کرے، اور یقین رکھے کہ وہ مانگے بغیر ہی عطا کرنے والا ہے، بلکہ جو چیز مانگی جاتی ہے وہ بلا مانگے اس سے بہتر عطا کرتا ہے۔ چنانچہ اس نے پہلے ہی بے شمار نعمتیں بلا طلب اور بلا استحقاق عطا کر رکھی ہیں۔ یہ آخری اور انتہائی درجے کا تقاضا ہے، جبکہ دوسرے درجے کا تقاضا یہ ہے کہ غیر اللہ کے سامنے دست سوال پھیلانے سے باز رہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ توکل کے ان اعلا احوال اور درجات کا وجود بھی ہے یا نہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ان احوال کا وجود ناممکن اور محال نہیں ہے، البتہ انتہائی نادر اور کم یاب ضرور ہے، جبکہ دوسرے اور تیسرے درجے کو تو منقہ ہی کہا جائے تو بہتر ہے، البتہ پہلا درجہ امکان سے زیادہ قریب ہے، دوسرا اور تیسرا درجہ اگر پایا بھی جائے تو اس کا باقی رہنا انتہائی دشوار ہے، بلکہ تیسرے درجے کا حال وجود میں ایسا ہے جیسے چہرے پر خوف سے پیدا ہونے والی زردی کہ لمحہ بھر کے لئے پیدا ہوتی ہے اور ختم ہو جاتی ہے، دل کا اپنی حرکت اور قدرت سے کشادہ رہنا ایک طبعی امر ہے، اور سنا سکرنا ایک عارضی امر ہے، اسی طرح جسم کے تمام اطراف میں خون کا گردش کرنا ایک طبعی معاملہ ہے، اور اس کا ٹھہر جانا ایک عارضی معاملہ ہے، خوف کے معنی یہ ہیں کہ آدمی کی ظاہری جلد سے خون باطن میں سمٹ جائے۔ یہاں تک کہ وہ سرفی جو جلد کے مبین پردے سے بھٹکتی ہے ختم ہو جائے، اور اس کی جگہ زردی آجائے۔ یہ صورت ہمیشہ یا دیر تک برقرار نہیں رہتی، بلکہ لحاقی اور وقتی ہوتی ہے، جیسے ہی انسان کے ذہن سے خوف کے اثرات کا ازالہ ہوتا ہے زردی ختم ہو جاتی ہے اور اس کی جگہ حسب سابق سرفی آجاتی ہے۔ اسی طرح یہ امر بھی عارضی ہے کہ دل اپنی حرکت و قدرت سے سمٹ جائے، اور کبھی اسباب کی طرف التفات نہ کرے۔ دوسرے درجے کا دوام ایسا ہے جیسے بخار زدہ کے جسم پر چھا جانے والی زردی، یہ زردی دو چار روز دیر قرار رہ جاتی ہے، زیادہ دن باقی نہیں رہتی، اور پہلے درجے کا دوام اس بیمار کی زردی کی طرح ہے، جس کا مرض پرانا ہو گیا ہے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ مرض ہمیشہ برقرار رہے اور یہ بھی ناممکن نہیں کہ مرض ختم ہو جائے۔

احوال توکل میں مدبر اور اسباب ظاہر سے تعلق یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ان احوال میں بندہ کا تعلق تدبیر اور اسباب ظاہری سے باقی رہتا ہے یا نہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ تیسرے درجے میں تدبیر بالکل نہیں رہتی، جب تک یہ حالت برقرار رہتی ہے اس کی حالت دیوانوں کی سی رہتی ہے، دوسرے مقام میں بھی بظاہر کوئی تدبیر نہیں ہوتی، البتہ بندہ اس حالت میں اللہ تعالیٰ سے اتجا کرتا ہے، اور اس کے سامنے اپنی احتیاج رکھتا ہے، جیسے بچہ اپنی ماں سے صرف لپٹنے وغیرہ کی تدبیر کرتا ہے،

پہلے درجے میں اصل تدبیر اور اختیار باقی رہتا ہے، البتہ بعض تدبیرات کی اجازت نہیں رہتی، جیسے متوکل مقدمات میں اپنے وکیل پر اعتماد کرتے ہوئے وہ تدابیر نہیں کرتا جو غیر وکیل سے متعلق ہوں۔ لیکن اس تدبیر سے گریز بھی نہیں کرتا جو وکیل ہلاتا ہے، یا اس کے تجربے اور عادت کی روشنی میں معلوم ہوتی ہے۔ مثلاً اگر وکیل یہ کہے کہ میں حیرتی وکالت اسی وقت کروں گا جب تو مقدمہ کی سماعت کے وقت عدالت میں موجود رہے گا، چنانچہ متوکل حاضر رہنے کی تدبیر کرتا ہے، اس طرح کی تدابیر عمل کرنے کو وکالت کے خلاف نہیں کہا جاسکتا، یعنی یہ نہیں کہا جاسکتا کہ متوکل اپنے وکیل سے مخرب ہے، اور اظہار جہت میں محض عزت و حرمت پر بھروسہ کرتا ہے، بلکہ تمام توکل کے لئے ضروری ہے کہ وکیل نے جو زاہ اس کے لئے مضمین کر دی ہے اس پر چلے، اگر بالفرض اسے اپنے وکیل پر توکل اور اعتماد نہ ہوتا تو اس کے کہنے سے عدالت میں کیوں حاضر ہوتا۔ وکیل کی ساہتہ عادتیں بھی رہنا ہوتی ہیں، اور ان سے بھی متوکل کو ہدایات ملتی ہیں جن پر عمل کرنا مقدمہ کی کامیابی کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ مثلاً اگر متوکل کو یہ معلوم ہو کہ میرا وکیل دستاویز کے بغیر مقدمہ نہیں لڑتا۔ اس صورت میں توکل کی تکمیل کے لئے ضروری ہے کہ اپنے وکیل کی عادت کے مطابق دستاویز تیار کرے، اور اس طرح اس پر اپنے اعتماد کا اظہار کرے۔ خلاصہ یہ ہے کہ پہلی صورت میں وکیل کے کہنے پر حاضر ہونا اور دوسری صورت میں وکیل کی عادت کے مطابق دستاویز تیار کر کے لے جانا تدبیر میں داخل ہے، اگر ان میں سے کوئی صورت اختیار نہیں کرے گا تو یہ امر توکل میں نقصان کا باعث ہوگا۔

بعض اوقات وکیل کے کہنے پر حاضر ہونے اور اس کی عادت کے ہیں، نظروں دستاویز ساتھ رکھنے، اور اس کی بحث پر دھیان دینے سے متوکل دوسرے اور تیسرے مقام تک بھی پہنچا دیتا ہے، یہاں تک کہ پیشی کے وقت حیران و پریشان رہ جاتا ہے، اپنی حرکت اور قوت پر اعتماد باقی نہیں رہتا، بلکہ حرکت و قدرت ہی باقی نہیں رہتی، ہاں یہ بات ذہن میں رہتی ہے کہ میری حرکت و قدرت کی انتہا یہی تھی کہ جو کچھ وکیل نے مجھ سے کہا میں نے اس پر عمل کیا۔ اب وہ وقت آ پہنچا ہے کہ صرف وکیل پر اعتماد اور نفس کا اطمینان باقی نہ گیا ہے یا یہ انتظار باقی نہ گیا ہے کہ عدالت میرے حق میں کیا فیصلہ کرتی ہے۔

تدابیر خلاف توکل نہیں اس تفصیل سے توکل پر ہونے والے اعتراضات غرض بخود ختم ہو جاتے ہیں۔ اور یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ توکل کے لئے تمام تدابیر ترک کرنا شرط نہیں ہے۔ ویسے یہ بحث الگ ہے کہ کون سے اعمال یا تدابیر توکل کے ممانی ہیں، اور کون سے جائز اور ضروری ہیں، توکل کے اعمال کے باب میں ہم یہ بحث کریں گے۔ یہاں صرف یہ بات واضح کرنی ہے کہ اگر متوکل اپنے وکیل کے کہنے پر عدالت میں حاضر ہو، یا اس کی عادت کے پیش نظر دستاویزات ساتھ لے کر آئے تو یہ امر توکل کے خلاف نہیں ہے، کیوں کہ وہ اس حقیقت سے واقف ہے کہ اگر وکیل نہ ہوتا تو میرا حاضر ہونا اور دستاویزات ساتھ لے کر آنا کسی بھی طرح مفید نہیں تھا، وہ ان دونوں باتوں کو اپنی تدبیر یا اپنی قوت و قدرت سے مؤثر و مفید نہیں سمجھتا، بلکہ اس اعتبار سے مفید سمجھتا ہے کہ وکیل نے ان دونوں کو مقدمے کے لئے مفید سمجھا ہے۔

اگر وہ مفید نہ سمجھتا تو ہرگز مفید نہ ہوتیں، اس لئے قوت و قدرت جو کچھ ہے وہ صرف وکیل کے لئے ہے، مگر دنیاوی وکیل کے لئے یہ جملہ کہنا اچھا نہیں ہے، اور نہ وکیل کے حق میں اس کلمے کے معنی پورے ہوتے ہیں، کیوں کہ وہ وکیل کی اس قوت و قدرت کا خالق نہیں ہے، بلکہ انہیں مفید بنانے میں مؤثر ہے، اور اگر وہ مفید نہ بناتا تو کبھی مفید نہ ہوتیں، البتہ ہم یہ کلمہ وکیل مطلق خدا کے برحق کی شان میں استعمال کر سکتے ہیں، اور وہاں اس کے معنی مکمل ہوں گے، کیوں کہ قوت و قدرت کا خالق وہی ہے جیسا کہ توحید کے بیان میں یہ بحث گذر چکی ہے، اور اسی نے ان دونوں معنوں کو مفید اور مؤثر بھی بنایا، اور ان فوائد کے لئے شرط بھی جو ان دونوں کے بعد معرض وجود میں آنے والے ہیں۔

اس منہگو سے کلمہ ملاحول ولا قوۃ الا باللہ کی صداقت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے، چنانچہ اگر کوئی شخص ان الفاظ کی روشنی میں

مذکورہ بالا امور کا مشاہدہ کرے گا اسے بالیقین وہ اجر و ثواب ملے گا جس کا وعدہ احادیث میں کیا گیا ہے، یہ اجر و ثواب انتہائی عظیم ہے، اور ایسے ہی کسی عمل پر دیا جاسکتا ہے جو متم بالظن ہو، ورنہ محض زبان سے یہ کلمات ادا کرنا، اور دل میں سولت کے ساتھ ان کا اعتقاد کر لینا اتنے عظیم ثواب کا باعث نہیں ہو سکتا، معلوم ہوتا ہے کہ یہ ثواب اس مشاہدے پر ملتا ہے جس کا بیان توحید میں ہوا۔

یہ ایک کلمہ ہے، اور کلمہ لا الہ الا اللہ کے لفظ و معنی کے ساتھ اس کے ثواب کی نسبت ایسی ہے جیسے ایک کے معنی کو دوسرے کے معنی سے نسبت ہے، چنانچہ کلمہ لا حول ولا قوۃ الا باللہ میں صرف دو چیزوں یعنی حول اور قوت کی نسبت سے اللہ تعالیٰ کی طرف کی گئی ہے، جب کہ کلمہ لا الہ الا اللہ میں تمام چیزوں کی نسبت اسی کی طرف کی گئی ہے۔ ان دونوں کلموں میں کل اور جزء کا فرق ہے۔ بعینہ ہی فرق ان دونوں کے اجر و ثواب میں بھی ہے۔ ہم نے پہلے بھی تفصیل کے ساتھ لکھا ہے کہ توحید کے دو چھلکے اور دو مظہر ہوتے ہیں۔ اس کلمے اور تمام کلمات کے لئے بھی یہی بات ہے۔ لیکن عام طور پر لوگ دونوں چھلکوں میں الجھ کر رہ جاتے ہیں، مظہر تک نہیں پہنچ پاتے، حالانکہ اصل مظہر ہے، اور احادیث میں اجر و ثواب کا وعدہ ان ہی لوگوں کے لئے ہے جو مظہر اختیار کرتے ہیں۔ جیسا کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :-

مَنْ قَالَ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ تَقَرَّبَ مِنْ قَلْبِهِ مِائَةَ خَيْرٍ وَأَجَبَتْ لَهُ أَلْبَتُهُ (طبرانی۔ تہذیب ابن ارقم)

جس شخص نے دل کی سہائی اور خلوص کے ساتھ لا الہ الا اللہ کہا اس کے لئے جنت واجب ہو گئی۔

بعض روایات میں کلمہ لا الہ الا اللہ کے ساتھ اخلاص اور صدق کی قید نہیں ہے، وہاں مطلق سے مقید مراد ہے، بعض جگہ مغفرت کو ایمان اور عمل صالح پر موقوف فرمایا ہے، اور بعض جگہ صرف ایمان ہی کو، اور مغفرت قرار دیا گیا ہے، ایسے تمام مواقع پر ایمان سے مطلق ایمان مراد نہیں ہے، بلکہ عمل صالح کی قید ہر جگہ موجود تصور کی جائے گی (۱)۔ اخلاص اور صدق کی قید اس لئے لگائی گئی ہے کہ آخرت محض زبان سے گفتگو سے ملنے والی نہیں ہے، زبان سے گفتگو کیا ہے محض زبان بھانا مل، کا اعتقاد بھی ایک گفتگو ہے، گوئیس کی گفتگو ہے، لیکن صدق و اخلاص زبان اور دل کی گفتگو سے الگ چیز ہے۔ سلطنتِ اعزوی کے تخت پر صرف مقربین جملہ افراد ہوں گے، اور مقربین وہ لوگ ہیں جن میں اخلاص ہو، مرتبے میں ان سے قریب تر اصحاب یکتین ہوں گے، ان کے لئے بھی اللہ تعالیٰ کے یہاں بے شمار اعلیٰ ترین درجات ہیں مگر مقربین فاضلین کا درجہ انہیں نصیب نہ ہوگا، چنانچہ قرآن کریم کی سورۃ واقعہ میں اللہ تعالیٰ نے جہاں مقربین سابقین کا ذکر فرمایا ہے وہاں اس تخت کا بھی ذکر ہے جس پر وہ متمکن ہوں گے :-

عَلَى سُرُرٍ مَوْضُوعَةٍ مِّنْ تَحْتِهَا مِائَاتُ مِائَاتٍ (پ ۲۷، ۲۸، ۲۹، ۳۰، ۳۱)

سوئے کے تہوں سے بٹے ہوئے تختوں پر نگہ لگائے ہوئے آئنے سامنے بیٹھے ہوں گے۔

اور جہاں اصحاب یکتین کا ذکر فرمایا گیا وہاں اس تخت کا بیان نہیں ہے، البتہ دوسری بہت سی نعمتوں کا ذکر ہے، یعنی یہ کہ وہ جنابِ نعیم میں اکل و شرب، نکاح، بیٹوں، پانی، سایہ، باغات اور حرموں سے لطف اندوز ہوں گے، یہ لذات تو بہائم کو بھی میسر رہتی ہیں، مہملا ان لذات کو جن میں حیوانات بھی شریک ہیں، اعزوی سلطنت اور قرب خداوندی کی لالہ وال نعمت سے کیا نسبت۔ اگر یہ لذات کچھ ایسی قابل قدر چیز ہوتیں تو بہائم کو نصیب نہ ہوتیں، اور فرشتوں کو ان سے محروم نہ کیا جاتا، اور نہ انہیں بہائم کے مقابلے میں اعلیٰ درجات سے نوازا جاتا۔ بہائم کو یہ تمام نعمتیں عموماً حاصل رہتی ہیں، باغات کی سیر کرتے ہیں، چشمہ آب رواں سے سیراب ہوتے ہیں، درختوں کی سرسبزی اور شادابی کا مشاہدہ کرتے ہیں، طرح طرح کی غذائیں کھاتے ہیں، اور مادہ بہائم سے جماعت کرتے ہیں۔

کیا یہ لذات اتنی اعلا اور عمدہ ہیں کہ اہل کمال انہیں ملائکہ پر ترجیح دیں، اور اس لذت کے درپے نہ ہوں جو فرشتوں کو قرب الہی میں میسر رہتی ہے، بلکہ بہائم کی لذات کے طالب ہوں، کیا کسی ذی ہوش سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو گدھے کے روپ میں دیکھنا پسند کرے گا اگر اسے دو باتوں میں سے ایک کو اختیار کرنے کے لئے کہا جائے کہ وہ چاہے تو گدھا بن جائے اور چاہے تو وہ مرتبہ پالے جو حضرت جبرئیل علیہ السلام کو حاصل ہے۔

یہاں یہ امر بھی واضح کر دینا خالی از فائدہ نہیں ہے کہ جو شخص کسی چیز کے مشابہ ہوتا ہے وہ اسی کی طرف مائل ہوتا ہے، مثلاً اگر کسی شخص کا میلان کتابت کے بجائے کش دوزی کی طرف زیادہ ہو گیا تو وہ اپنے جوہر کی رو سے کش دوزی کی صفت سے زیادہ مشابہ ہو گا، یعنی اس پر وہی پیشہ چمے گا، اسی طرح جس شخص کا میلان بہائم کی لذات کی طرف ہو گا وہ انہی کے زیادہ مشابہ ہو گا، اسی لئے قرآن کریم میں ایسے لوگوں کے متعلق ارشاد فرمایا گیا :-

اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلَّوْهُمْ اُضْلُ - (پ ۹ ص ۱۷ آیت ۷۹)

یہ چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ یہ لوگ زیادہ بے راہ ہیں۔

ان لوگوں کو اُضْل اس لئے کہا گیا ہے کہ جانور تو تجارتی جانور ہیں، ان میں یہ صلاحیت کہاں ہے کہ ملائکہ کے درجات تلاش کریں، اور ان کے حصول کی کوشش کریں، انسان کو اس کی قوت دی گئی ہے، وہ اس شرف و کمال کے حصول پر قادر ہے۔ اس لئے وہ اس بات کا زیادہ مستحق ہے کہ اس کی خدمت کی جائے، وہ گمراہی سے زیادہ قریب ہے۔ یہ ایک جملہ معترضہ تھا۔ اب ہم اصل مقصد کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

ہم نے لا الہ الا اللہ اور لا حول ولا قوۃ کے معنی بیان کئے ہیں، اور یہ واضح کیا ہے کہ جو شخص اس مشاہدے کے بغیر جس کی تفصیل گذر چکی ہے یہ کلمات کہتا ہے وہ متوکل نہیں ہو سکتا۔ اگر تم یہ کہو کہ لا حول ولا قوۃ الا باللہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف دو چیزوں کی نسبت کی گئی ہے۔ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ میں کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان پیدا کئے ہیں، آیا اس شخص کو بھی اتنا ہی اجر و ثواب ملے گا جتنا ثواب لا حول ولا قوۃ کہنے والے کو ملتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ثواب اس چیز کے مرتبے کے مطابق ملتا ہے جس پر ثواب دینا مقصود ہے۔ اور یہاں مگر لا حول کہنے اور خدا تعالیٰ کو ارض و سما کا خالق کہنے میں کوئی مساوات نہیں ہے، دونوں درجے بالکل الگ الگ ہیں، اگر درجات کی بلندی پستی کا مدار ضخامت، اور حجم پر ہوتا تو یقیناً آسمان و زمین کے خالق ہونے کا اعتراف بلند درجے کا باعث ہوتا، کیوں کہ آسمان انتہائی عظیم الشان ہے، زمین انتہائی کشادہ اور وسیع ہے، جب کہ حول اور قوۃ دو مختصر لفظ ہیں، لیکن عظمت کا مدار ضخامت پر نہیں ہے۔ یہ تو ہر شخص جانتا ہے کہ زمین و آسمان کی تخلیق انسانی کارنامہ نہیں ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ ان کا خالق ہے، جب کہ حول اور قوت کو ہر شخص نہیں سمجھتا، معجزہ اور فلاسفہ نے اس معاملے کو کچھ زیادہ ہی الجھا دیا ہے۔ حالانکہ وہ خود کو بڑا وقیعہ رس اور کلمہ سنا سمجھتے ہیں، مگر ان کی عقلیں اس معاملے میں دنگ ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ یہ دونوں انتہائی مسلک ہیں خطرناک ہیں، اچھے خاصے لوگ یہاں لغزش کھا سکتے ہیں، چنانچہ بہت سے عاقل لوگ اس لئے تباہ و برباد ہوئے کہ انہوں نے اپنے لئے حول اور قوت ثابت کی، حالانکہ یہ توحید میں شرک ہے، اور غیر اللہ کو خالق ٹھہرانا ہے۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کی حسن توفیق سے اس گھاٹی کو عبور کرتا ہے، اس کا رجب بلند اور عظمت دو چند ہوتی ہے، اور یہی شخص لا حول ولا قوۃ الا باللہ کا صدقہ ملانے کا اعتراف بھی کرتا ہے۔

توحید کی دو گھاٹیاں ہم یہ بات پہلے بھی بیان کر چکے ہیں کہ توحید کی دو گھاٹیاں ہیں ایک گھاٹی یہ ہے کہ زمین، آسمان، چاند، سورج، ستاروں، ایوبار اور تمام جمادات پر نظری جائے، اور دوسری گھاٹی یہ ہے کہ حیوانات کے اختیار پر نظری جائے، یہ گھاٹی زیادہ مسلک اور خطرناک ہے۔ جو شخص اسے عبور کر لیتا ہے وہ سر توحید سے آشنا ہو جاتا ہے۔ اسی لئے اس کے کلمے کا بڑا ثواب ہے۔

ثواب صرف الفاظ کا نہیں ہے بلکہ اس مشاہدہ کا ہے جو اس کلمے کے معنی و مہموم کی روشنی میں ہوتا ہے۔

توکل کے سلسلے میں مشائخ کے اقوال

اس سلسلے میں بزرگان دین نے جو کچھ فرمایا ہے وہ تمام ان درجات میں مذکور ہے جو ہم نے گذشتہ صفحات میں بیان کئے ہیں۔ اب ہم ان میں سے بعض اقوال لکھتے ہیں، تاکہ ہمارے اس دعویٰ کا ثبوت ہو سکے کہ ہر قول میں توکل کے کسی نہ کسی حال کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے۔ ابو موسیٰ دہلیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے ابو یزید سہامیؒ سے پوچھا کہ توکل کیا ہے؟ انہوں نے فرمایا: تم اس سلسلے میں کیا کہتے ہو؟ میں نے کہا کہ ہمارے اصحاب فرمایا کرتے تھے کہ اگر درندے اور اژدھے تیرے دائیں بائیں ہوں تو تیرے باطن میں ذرا حرکت نہ ہو، انہوں نے کہا ہاں توکل اسی کے قریب ہے، اور فرض کرو کہ متوکل اس امر میں تمییز کرے کہ دوزخ والوں کو عذاب دیا جاتا ہے، اور جنت والے راحت و آرام پاتے ہیں تو قطعاً متوکل کھلانے کا مستحق نہیں رہے گا۔ یہاں ابو موسیٰ دہلیؒ نے توکل کے احوال میں سے عمدہ حال بیان فرمایا ہے جسے ہم نے تیسرے درجے میں رکھا ہے، اور ابو یزید سہامیؒ نے علم کی وہ بہترین جہیم بیان فرمائی ہے جو توکل کے اصول میں سے ہے، اور وہ علم حکمت ہے اور یہ بات جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو فعل جس طرح کیا ہے وہ اسی طرح ہونا چاہیے تھا۔ اس لئے اس کے عدل اور حکمت کی رو سے دوزخیوں اور جنتیوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ یہ انتہائی غامض اور پیچیدہ علم ہے، اس کے بعد سر تقدیر کی حدود ہیں۔ حضرت ابو یزید عام طور پر مقامات کی بلندیوں پر بولتے تھے، ان سے کم تر درجات کے متعلق کم ہی سنا گیا ہے۔ توکل کے ابتدائی درجے میں یہ شرط نہیں ہے کہ سانپوں سے حفاظت کی تدبیر نہ کرے، اس لئے کہ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے غارتوں میں سانپوں کی راہیں مسدود فرمائی تھیں، اگر سانپوں سے احتیاط نہ کرنا داخل توکل نہ ہوتا تو آپ ان کے راستے بند کیوں فرماتے، البتہ اتنا کہا جاسکتا ہے کہ یہ ممکن ہے کہ انہوں نے پاؤں سے راستہ بند کر دیا ہو، اور باطن میں ان کے خوف سے کوئی تغیر رونما نہ ہوا ہو، یا یہ کہا جاسکتا ہے کہ انہوں نے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور شفقت کے نقطہ نظر سے ایسا کیا ہو۔ اپنے نفس کا حق ان کے پیش نظر نہ رہا ہو، توکل باطن کی ایسی تحریک یا تغیر سے ضائع ہو جاتا ہے جس سے صرف اپنے نفس کی منفعت مقصود ہو۔ بہر حال حضرت ابو بکرؓ کے واقعے میں تاویلات کی جاسکتی ہیں۔ لیکن ہم یہ کہتے ہیں کہ اس طرح کے امور توکل کے خلاف نہیں ہیں۔ اس لئے کہ سانپوں کو دیکھ کر باطن کا جنبش کرنا خوف ہے، اور متوکل کو سانپوں کو مسلط کرنے والے سے ڈرنے کا حق پہنچتا ہے، اس لئے کہ سانپوں کو صرف اللہ ہی سے حرکت و قدرت ملی ہے۔ اس لئے اگر کوئی شخص سانپوں سے احتراز کرے تو اپنی تدبیر، حول اور قدرت پر بھروسہ نہ کرے، بلکہ اللہ تعالیٰ کے حول و قوت اور تدبیر پر اعتماد کرے، حضرت ذوالنون مصریؒ سے توکل کے متعلق دریافت کیا گیا تو انہوں نے فرمایا ارباب سے لا تعلقی، اور اسباب کا ترک۔ ارباب سے لا تعلقی کے ذریعے علم التوحید کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، اور ترک اسباب سے اعمال کی طرف اشارہ ہے۔ اس قول میں صراحت کے ساتھ حال کا ذکر نہیں ہے، اگرچہ ضمناً اس کی تعریف بیان کی گئی ہے۔ اس کے بعد لوگوں نے ان سے عرض کیا کہ کچھ اور زیادہ بیان کیجئے، انہوں نے فرمایا نفس کو عبودیت میں ڈالنا اور ربوبیت سے نکالنا، اس قول میں ہر طرح کے حول اور قوت سے براعت کا اظہار ہے۔

حمودن قنار سے توکل کے متعلق دریافت کیا گیا، انہوں نے فرمایا کہ اگر کسی شخص کے پاس دس ہزار درہم موجود ہوں اور اس پر ایک دمڑی قرض ہو تو اس بات سے بے خوف نہ رہے کہ مر جاؤں گا اور یہ قرض ادا نہ ہو پائے گا، اور اگر دس ہزار درہم کا قرض ہو اور ملکیت میں ایک دمڑی بھی نہ ہو تو اللہ تعالیٰ سے اسکی ادائیگی کی امید رکھے۔ اس قول میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی وسیع ترین قدرت پر ایمان لاؤ، اور یہ یقین رکھو کہ مقدرات کے لئے ظاہری اسباب کے علاوہ خفی اسباب بھی ہیں، عبد اللہ القرشی سے توکل کے متعلق دریافت کیا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ ہر حال میں اللہ تعالیٰ سے تعلق رکھنا توکل ہے، مسائل نے مزید کی

درخواست کی جواب میں فرمایا کہ ہر اس سبب کا ترک جو ہمیں کسی سبب تک پہنچا دے اور صرف یہ اعتقاد کہ تمہارے تمام معاملات کا متولی صرف ایک ہے عبد اللہ القرشی کا پہلا جواب تینوں مقامات کے لئے عام ہے اور دوسرا جواب صرف تیسرے مقام کی طرف خاص طور سے اشارہ کرتا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسی حضرت ابراہیم علیہ السلام کا توکل کہ جب ان سے حضرت جبرئیل علیہ السلام نے دریافت کیا کہ کیا آپ کوئی حاجت رکھتے ہیں اس کے جواب میں آپ نے فرمایا حاجت تو ہے لیکن تمہاری طرف نہیں ہے۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام کی درخواست ایک ایسا سبب تھی جو دوسرے سبب کا باعث بنتی اور وہ یہ کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام آپ کے حفظ کے لئے اقدامات کریں لیکن حضرت ابراہیم نے اپنی ضرورت کو اس احتیاطی وجہ سے اظہار نہیں کیا کہ اگر اللہ تعالیٰ کو میری حفاظت منظور ہوگی تو جبرئیل کو مستر فرما دے گا اور منظور نہیں ہوگی تو میرے سینے سے کوئی فائدہ نہ ہو گا۔ اللہ ہی اس معاملے کا ذمہ دار ہے۔ یہ حال ہر شخص کا نہیں ہوتا بلکہ مبہومین کا ہوتا ہے یعنی ان لوگوں کا جو اللہ تعالیٰ کے احتیاط کی بنا پر اپنے نفس سے غافل ہو جاتے ہیں لیکن اول تو اس حال کا وجود مشکل ہے اور اگر اس حال کا وجود ہے بھی تو بڑی مشکل سے اور بہت کم۔

حضرت ابو سعید خدریؓ فرماتے ہیں کہ توکل دو چیزوں کا نام ہے اضطراب بلا سکون اور سکون بلا اضطراب۔ غالباً انھوں نے توکل کے تمام حانی کی طرف اشارہ فرمایا ہے اضطراب بلا سکون سے مراد یہ ہے کہ الخواء، التضرع اور فریاد صرف اللہ ہی سے ہو جیسے بچہ اپنے ہاتھوں سے ماں کا دامن پکڑ کر اپنے اضطراب کا اظہار کرتا ہے اور دل اس کی کمال شفقت سے پُر سکون ہوتا ہے اور سکون بلا اضطراب سے مراد یہ ہے کہ متوکل کو اپنے وکیل پر قلبی اطمینان و اعتماد ہو۔ ابو علی دقاق کہتے ہیں کہ توکل کے تین درجے ہیں توکل، تسلیم، تقویٰ، متوکل اللہ تعالیٰ کے وعدے پر پُر سکون ہو جاتا ہے، صاحب تسلیم اس کی معرفت پر ہی قناعت کرتا ہے اور منفی اس کے فیصلے پر راضی رہتا ہے۔ اس قول میں متوکل کے ان احوال کا بیان ہے جو وکیل کی غنیمت کے مشاہدے سے اس کے دل پر طاری ہوتے ہیں ان میں علم اصل ہے، وعدہ اس کے تابع ہے، اور حکم وعدے کے بعد ہے، ان میں سے کوئی نہ کوئی حالت متوکل کے دل پر غالب رہتی ہی ہے۔

توکل کے باب میں مشائخ اور بزرگوں کے اور بھی بہت سے اقوال ہیں مگر ان کا لکھنا طوالت سے خالی نہیں ہے اس لئے جو کچھ عرض کیا گیا ہے اسی پر اتکا کرتے ہیں اور یہی مفید بھی ہے۔

متوکل کے اعمال

جاننا چاہیے کہ علم کا ثمر حال ہے اور حال کا ثمر عمل ہے یہ گمان کیا جاتا ہے کہ توکل بدن کے ذریعے ترک کسب، قلب کے ذریعے ترک تدبیر اور زمین پر چھوڑنے کی طرح تیسرے رتبے کا نام ہے یہ بالوں کا گمان ہے، شرح میں ایسا کرنا حرام ہے اللہ تعالیٰ نے متوکلین کی تعریف فرمائی ہے اگر وہ محظورات اور محرکات کے ارتکاب سے توکل کے مقامات پر فائز ہوتے تو ان کی تعریف کیوں کی جاتی۔ اب ہم حقیقت واقعہ عرض کرتے ہیں۔

بدن کی حرکت و سستی میں توکل کے اثرات اس وقت نمایاں ہوتے ہیں جب اسے مقاصد کا علم ہوتا ہے، بدنہ اپنے اختیار سے جو کوشش کرتا ہے اس کا دائرہ کار چار مقاصد تک محدود ہے یا تو وہ جلب منفعت کے لئے کرتا ہے جو اس کے پاس موجود نہ ہو جیسے کسب یا حفظ منفعت کے لئے کرتا ہے جو اس کے پاس موجود ہو جیسے ذخیرہ کرنا یا دفع مضرت کے لئے کرتا ہے جو اس پر ابھی واقع نہیں ہوئی جیسے ڈاکوؤں، چوروں اور درندوں سے دفاع یا دفع مصیبت کے لئے کرتا ہے جو اس پر ناظر ہو چکی ہو جیسے علاج معالجہ، بدنہ کی حرکات کا دائرہ کار ان چار مقاصد سے تجاوز نہیں کرتا یعنی جلب منفعت، حفظ منفعت، دفع مضرت اور قطع مضرت۔ اب ہم ان چاروں میں توکل کی شرائط اور درجات کا الگ الگ جائزہ لیتے ہیں اور ہر دعویٰ کے لئے شرعی دلائل پیش

کرتے ہیں۔

پہلا مقصد۔ جلب منفعت جن اسباب کے ذریعے آدمی تک نافع چیز پہنچتی ہے وہ تین طرح کے ہیں، ایک وہ جو یقینی ہیں، دوسرے وہ جن میں قابل اعتماد قن کا غلبہ ہے، اور تیسرے وہ جو مہوم ہیں، فلس ان سے پوری طرح مطمئن نہیں ہوتا۔

پہلی قسم۔ قطعی اسباب یہ وہ اسباب ہیں جن کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے حکم و مشیت سے مسیات کا ارتباط ہے، ہمیشہ اسی طرح ہوتا ہے اس کے خلاف نہیں ہوتا، جیسے تمہارے سامنے کھانا رکھا ہوا ہو، اور تم بھوکے اور حاجت مند بھی ہو، لیکن اس لئے ہاتھ نہیں پڑھاتے ہو کہ خود کو متوکل کہتے ہو، اور یہ سمجھتے ہو کہ ترک سنی توکل کی شرط ہے، اور کھانے کی طرف ہاتھ پڑھانا سنی و حرکت ہے، اسی طرح داعیوں سے چبانا، اور لگنا وغیرہ بھی حرکات ہیں، اور توکل کے متانی ہیں، حالانکہ یہ محض پاگل بن ہے، توکل سے اسے کوئی مناسبت نہیں ہے، اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ اللہ تعالیٰ بغیر روٹی کے تمہارا پیٹ بھر دے گا یا روٹی کے اندر حرکت پیدا فرمائے گا کہ وہ تمہارے منہ کی طرف بڑھے اور لقمہ بن کر تمہارے معدے میں پہنچ جائے، یا کوئی فرشتہ مسخر کیا جائے گا جو تمہارے لئے روٹی چبائے اور تمہارے معدے میں پہنچائے تو ان میں سے کچھ ہونے والا نہیں ہے۔ یہ سب امور اللہ تعالیٰ کی سنت جاریہ کے خلاف ہیں، یہ مسیات اسی طرح واقع ہوتے رہیں گے جس طرح واقع ہوتے رہے ہیں، اسی طرح اگر تم کاشت نہیں کرتے، اور یہ توقع کرتے ہو کہ اللہ تعالیٰ تمہارے لئے غلہ پیدا فرمائے گا یا تم بیوی سے ہم بستر نہیں ہو گے، اور یہ امید کرتے ہو کہ تمہاری بیوی بچہ بنے گی جس طرح حضرت مریم علیہا السلام نے شوہر کے بغیر بچہ جنا تھا تو یہ تمام باتیں جنہوں اور پاگل پن ہیں۔ ان مواقع پر عمل ترک کرنے کا نام توکل نہیں ہے، بلکہ توکل علم اور حال دونوں سے عبارت ہونا چاہیے۔ علم اس بات کا ہو کہ اللہ تعالیٰ نے کھانا ہاتھ، دانت اور حرکت کی قوت پیدا کی ہے، اور وہی ہے جو تمہیں کھانا اور پلانا ہے، اور عمل یہ ہے کہ تمہارے قلب کا قرار اور اعتماد اللہ تعالیٰ پر ہو، ہاتھ اور کھانے پر نہ ہو، تم اپنے ہاتھ کی صحت پر کیسے اعتماد کر سکتے ہو، ہو سکتا ہے وہ فی الحال خشک ہو جائے یا فالج کا شکار ہو جائے، اسی طرح تم اپنی قوت و قدرت پر کیسے اعتماد کر سکتے ہو، ہو سکتا ہے تم پر کوئی ایسی کیفیت طاری ہو جس سے تمہاری عقل زائل ہو جائے، اور تمہاری حرکت کرنے کی قوت ختم ہو جائے، اسی طرح تم کھانے کی موجودگی پر اطمینان کیسے کر سکتے ہو، ہو سکتا ہے اللہ تعالیٰ تم پر کوئی ایسی معصیت مسلط کر دے جو کھانے سے تمہیں غافل کر دے، یا سانپ بھیج کر تمہیں بھانسنے پر مجبور کر دے اور اس طرح تمہارے اور کھانے کے درمیان دوری واقع ہو جائے۔ یہ احتمالات ہیں، اور ان سے محفوظ رہنا فضل خداوندی کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ جب یہ صورت حال ہو تو آدمی کو اسی ذات پر بھروسہ کرنا چاہیے جو اسے محفوظ رکھتا ہے، اگر اس کے علم اور حال کا عالم یہ ہے تو اسے کھانے کی طرف ہاتھ پڑھانا چاہیے، اس حرکت سے بھی وہ متوکل ہی رہے گا۔

دوسری قسم۔ ظنی اسباب دوسری قسم میں وہ اسباب شامل ہیں جو یقینی نہیں ہیں، لیکن غالب یہ ہے کہ مسیات ان کے بغیر حاصل نہیں ہوتے، اور ان کے بغیر مسیات کا حصول بسا اوقات مشکل ہو جاتا ہے، مثلاً اگر کوئی شخص شہروں اور قلعوں سے جدا ہو کر ایسے جنگلوں میں سفر کرے جن میں انسانوں کی آمد و رفت بہت کم ہو، اور اس سفر میں زادراہ ساتھ نہ لے۔ زادراہ ساتھ لے کر اس طرح کے اسفار کرنا توکل کے لئے شرط نہیں ہے، بلکہ بزرگوں کا اسوہ یہ رہا ہے کہ وہ اپنے ساتھ توشہ رکھتے تھے اور اسے توکل کے خلاف نہیں سمجھتے تھے بشرطیکہ مسافر کو اپنے اللہ کے فضل پر کامل اعتماد ہو، تاہم اگر کوئی توشہ لے کر نہ چلے تو اس میں بھی کوئی مضائقہ نہیں، اور یہ توکل کے مقامات میں سے انتہائی اعلیٰ مقام ہے خواص وغیرہ بزرگان دین اسی مقام پر فائز تھے۔

یہ کتنا صحیح نہ ہو گا کہ توشہ نہ لے کر چلنا اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالتا، اور موت کی طرف قدم پڑھانا، اور یہ حرام ہے۔ ہم اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ اگر دو شرطیں پائی جائیں تو ایسا کرنا حرام نہیں ہو گا۔ ایک تو یہ کہ اس شخص نے اپنے نفس کی ریاضت اور مجاہدے سے یہ عادت بنائی ہو کہ ہفتہ دس روز کھانے سے صبر کر سکتا ہو، اور صبر کرنے میں اس کا دل مشغول اور قلب پریشان نہ ہوتا

ہو، اور نہ ذکر الہی سے مانع بنتا ہو، اور دوسری شرط یہ ہے کہ گھاس پھوس اور اسی جیسی دوسری چیزیں کھا کر بھی پیٹ بھر سکتا ہو، اگر کوئی شخص یہ دو شرطیں پوری کرتا ہو، اور اس نے توشہ لئے بغیر سفر شروع کر دیا ہے تو امید یہی ہے کہ اسے ہفتہ میں ایک بار کسی انسان کا سامنا ضرور ہو گا یا کسی گاؤں اور بستی سے گزر ہو گا یا جنگل میں ایسی گھاس اور سبزی مل جائے گی جسے کھا کر زندہ رہ سکے گا، لیکن یہ عادت مجاہدے سے بنتی ہے، اور مجاہدہ ہی توکل کا ستون ہے۔ خواص اور ان جیسے لوگ اسی پر اعتماد کرتے تھے، اور اس کی دلیل یہ کہ خواص اپنے ساتھ سوئی، قینچی، رتی، اور ڈول ضرور رکھتے تھے، اور فرماتے تھے کہ اس سے توکل میں فرق نہیں آیا، اور یہ چیزیں ساتھ رکھنے کی وجہ یہ تھی کہ وہ جانتے تھے کہ جنگلوں میں زمین کے اوپر پانی نہیں ملتا، گہرے کنوؤں میں ہوتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی سنت یہ نہیں ہے کہ کنوئیں سے پانی خود بخود چڑھ کر اوپر آجائے، اور ڈول رتی کے استعمال کی ضرورت نہ پڑے، پھر جنگلوں میں عام طور پر ڈول اور رتی نہیں پائے جاتے، ہاں گھاس عموماً پانی جاتی ہے، پھر پانی کے لئے اس اہتمام کی ضرورت یوں بھی ہے کہ مسافر کو وضو کے لئے شب و روز میں کئی بار، اور پینے کے لئے ایک دن یا دو دن میں کم از کم ایک بار پانی کی ضرورت ضرور پڑتی ہے، حرکت سے جسم میں حرارت پیدا ہوتی ہے، اور حرارت کی موجودگی میں آدمی کھانے سے مبرا کر سکتا ہے، لیکن پانی سے مبرا نہیں کر سکتا۔ اسی طرح اگر کسی کے پاس ایک کپڑا ہو اور وہ بچٹ جائے تو اس کا ستر کھل جائے گا اور جنگل میں سوئی قینچی نہیں ملے گی۔ جن کے ذریعے ستر عورت کے بقدر کپڑا ہی کر نماز ادا کر سکے، اور نہ کوئی ایسی چیز مل سکے گی جو سینے اور کانٹے میں سوئی اور قینچی کے قائم مقام بن سکے۔

اس منہگو کا حاصل یہ ہے کہ جو چیزیں ان چاروں جیسی ہیں، یعنی ان سے وہی ضرورت پوری ہوتی ہو جو ڈول اور سوئی اور قینچی سے پوری ہوتی ہے، انہیں پہلی قسم سے ملحق قرار دیا جائے گا۔ ملحق اس لئے کہا ہے کہ ان میں احتمالات ہو سکتے ہیں: مثلاً یہ کپڑا نہ پھٹے، یا کوئی شخص مل جائے، اور دوسرا کپڑا ویسے، یا کنوئیں کی منڈیر پر کوئی ایسا شخص مل جائے جو اسے پانی پلا دے، جب کہ پہلی قسم میں اس طرح کے احتمالات نہیں ہیں مثلاً یہ کہ کھانا خود بخود تمہارے منہ میں اور منہ سے معدے میں نہیں پہنچ سکتا، اس لئے ان دونوں میں بڑا فرق ہے، اور اسی بنا پر ہم نے سوئی وغیرہ کو اس قسم میں داخل نہیں کیا بلکہ تابع اور ملحق کہا ہے۔ اس دوسری قسم کی چیزیں معنی پہلی قسم کے ساتھ شریک ہیں، اس لئے ان چیزوں کو توکل کی وجہ سے ترک کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ اور اسی سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ اگر کوئی شخص پہاڑ کی کسی ایسی کھوہ میں جا کر رہنے لگے جہاں نہ دانہ پانی ہو اور نہ کوئی ایسا ذریعہ جس سے کھانے پینے کی اشیاء فراہم ہو سکیں تو یہ فعل جائز نہ ہو گا، اور ایسا شخص خود کشی کا مرتکب ہو گا کسی زاہد کا واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ آبادی سے نکل کر پہاڑی کی کھوہ میں جا بیٹھا، اور سات روز تک بھوکا سا ساواہیں مقیم رہا، اس نے یہ عہد کیا تھا کہ میں کسی سے کچھ نہیں مانگوں گا، وہاں رہ کر اپنے رزق کا انتظار کروں گا، لیکن رزق نہیں آتا، اور بھوک پیاس کی شدت نے اسے بے حال کر دیا، قریب تھا کہ ہلاک ہو جائے، اچانک اس کے دل میں دعا کا خیال آیا اور کہنے لگا یا اللہ! اگر تو مجھے زندہ رکھنا چاہتا ہے تو وہ رزق بھیج جو تو نے میری قسمت میں لکھا ہے ورنہ میری روح قبض کر لے، ندا آئی کہ مجھے میری عزت کی قسم ہے میں تجھے اس وقت تک رزق نہیں دوں گا جب تک تو آبادی کا رخ نہیں کرے گا اور لوگوں میں جا کر نہیں بیٹھے گا۔ چنانچہ وہ شخص شہر گیا اور لوگوں کے پاس جا کر بیٹھا، کوئی اس کے لئے کھانا لے کر آیا، کسی نے پانی پیش کیا، اس نے کھایا پیا، اور دل میں دوسرے کا شکار ہو گیا، آواز آئی کہ کیا تو اپنے زہد سے میری حکمت ضائع کرنا چاہتا ہے۔ کیا تجھے یہ بات معلوم نہیں ہے کہ میں اپنے بندوں کو بندوں ہی کے ذریعے رزق پہنچاتا ہوں، اس سے بہتر سمجھتا ہوں کہ اپنے دست قدرت سے پہنچاؤں۔

خلاصہ یہ ہے کہ اسباب سے دوری باری تعالیٰ کی حکمت کے خلاف ہے، اور اللہ تعالیٰ کی سنت سے ناواقفیت ہے، اور اللہ تعالیٰ کی سنت مقررہ کے مطابق اس طرح عمل کرنا کہ اس پر اعتماد ہو اسباب پر نہ ہو توکل کے خلاف نہیں ہے، جیسا کہ ہم نے مقدمات کے وکیل کی مثال دے کر یہ بات واضح کر دی ہے۔

اسباب ظاہری اور مخفی اسباب لیکن یہاں اسباب کی دو قسمیں ہیں ظاہری اور مخفی، بندہ کو چاہئے کہ وہ ظاہری اسباب سے اعراض کرے، اور مخفی اسباب پر استغنا کرے، ساتھ ہی اس کا دل مستبب الاسباب پر مطمئن ہو، اسباب پر مطمئن نہ ہو۔

کسب اور توکل یہاں ایک بحث اور پیدا ہوتی ہے، اور وہ یہ کہ آدمی کا بغیر کسی چپے اور ذریعہ آمدنی کے شہر میں بیٹھے رہنے کا حکم ہے، حرام ہے یا مباح ہے یا مستحب ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ایسا کرنا حرام نہیں ہے اس لئے کہ جب جنگل میں زاد راہ کے بغیر کھونے والا اپنی جان تلف کرنے والا نہیں مانا گیا تو یہ شخص اپنے نفس کو ہلاک کرنے والا کیسے کہا جائے گا، اور اس کے عمل کو حرام کس لئے کہا جائے گا، ہو سکتا ہے اسے کسی ایسی جگہ سے رزق مل جائے جس کا اسے گمان بھی نہ ہو تاہم اس میں تاخیر ہو سکتی ہے، اور اس کے لئے اس وقت تک صبر کرنا ممکن ہے کہ کوئی اسے کھانے پینے کا سامان دے۔ لیکن اگر کوئی شخص گھر کا دیوا ذہ اس طرح بند کر کے بیٹھ جائے کہ نہ خود باہر نکلے اور نہ کسی دوسرے کو اندر آنے دے تو یہ حرام ہے۔ البتہ اگر وہ گھر کا دیوا ذہ کھولے بیکار بیٹھا ہے، عبادت میں مشغول نہیں ہے تو اس سے بہتر یہ ہے کہ باہر نکلے اور کوئی ذریعہ آمدنی تلاش کرے، حرام اس کے فضل کو بھی نہیں کہا جاسکتا، البتہ کہ موت سے قریب ہو جائے، اس صورت میں گھر سے باہر نکل کر سوال کرنا اور کمانا ضروری ہے۔ اگر کوئی شخص اپنے قلب کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے مشغول ہو، اور لوگوں پر نظر نہ رکھتا ہو، اور نہ کسی ایسے شخص کا ہتھکڑ ہو جو اس کے لئے کھانا لے کر آئے، بلکہ اس کی نظر صرف اللہ تعالیٰ پر ہو، اور اس کی عبادت میں مشغول ہو، یہ توکل کے مقامات میں سے افضل ترین مقام ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ذکر و فکر میں مشغول بعض علماء نے بڑے صحیح بات کی ہے کہ جو بندہ اپنے رزق سے راہ فرار اختیار کرتا ہے رزق اسے تلاش کر لیتا ہے جیسے موت سے فرار ہونے والے کو موت ڈھونڈ لیتی ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ جو شخص یہ دعا کرے گا کہ اے اللہ مجھے رزق عطا نہ کر، اس کی دعا قبول نہیں ہوگی، گناہ گار ہو گا اور ہار کر ایزدی سے اسے یہ خطاب ہو گا کہ اے جاہل یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تجھے پیدا کروں اور رزق نہ دوں۔ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ لوگ ہر معاملے میں مختلف نظر آتے ہیں، لیکن رزق اور موت کے سلسلے میں ان کا اتفاق ہے کہ وہی رزق دینے والا ہے اور وہی موت دینے والا ہے۔ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں نہ۔

لَوْ تَوَكَّلْتُمْ عَلَى اللَّهِ حَقَّ تَوَكُّلِهِ لَرَزَقَكُمْ كَمَا يَرْزُقُ الْغَائِمَ تَرَعُونَ خِمَاصًا وَ تَرُوحُ بِطُلُوكِ لَازِلًا يَمْكُكُمْ الْحِجَابُ۔ (امام محمد ابن نصر۔ معاذ ابن جبل)

اگر تم اللہ تعالیٰ پر ایسا توکل کرو جیسا کہ اس کا حق ہے تو تم کو ایسی روزی دے جیسے پرندوں کو دیتا ہے کہ صبح کو بموکے اٹھتے ہیں اور شام کو غم سے پر ہو جاتے ہیں، اور تمہاری دعا سے پھاڑ مل جاتیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں کہ پرندوں کی طرف دیکھو کہ نہ یہ بولتے ہیں نہ کاتے ہیں اور نہ ذخیرہ کرتے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ انہیں ہر روز رزق عطا فرماتا ہے، اگر تم یہ کہو کہ تمہارے پیٹ بڑے ہیں تو ان چھپایوں کو دیکھ لو کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو رزق بہم پہنچانے کے لئے اس مخلوق کو مقرر فرما دیا ہے۔ ابو یعقوب موسیٰ کہتے ہیں کہ توکل کرنے والوں کا رزق ان کی مشقت کے بغیر بندوں کے ہاتھوں میں گردش کرتا رہتا ہے، اور دوسرے لوگ رزق کی فکر میں مشغول رہتے ہیں اور مشقت اٹھاتے ہیں۔ ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ تمام بندوں کو اللہ تعالیٰ کی مشیت سے رزق ملتا ہے، لیکن بعض لوگ سوال کی ذات اٹھا کر رزق پاتے ہیں، بعض لوگوں کو تاجروں کی طرح تعجب اور انتظار کرنا پڑتا ہے۔ بعض غن میند ایک کر کے کھاتے ہیں جیسے دست کار، اور مزدور، اور بعض لوگ عزت کے ساتھ رزق حاصل کرتے ہیں جیسے صوفیاء کہ حاکم وقت کے پاس گئے، اور اس سے اپنا رزق لے کر چلے آئے، درمیان واسطوں کی ان کے یہاں کوئی اہمیت نہیں ہے۔

تیسری قسم۔ وہی اسباب یہ وہ اسباب ہیں کہ ان سے مشیت تک پہنچنا وہی ہوتا ہے۔ ضروری نہیں کہ تم کوئی تدبیر

اعتیار کرو اور اس میں کامیاب ہو جاؤ، عام طور پر لوگ مال کے حصول کے لئے بڑی بڑی تدبیریں کرتے ہیں، اور وسیع تر منصوبے بناتے ہیں، حالانکہ یہ ضروری نہیں ہوتا کہ انھیں ان کے منصوبے اور تدبیر کے مطابق مال مل جائے۔ ان اسباب کو استعمال کرنے والا قطعی طور پر توکل کے درجات سے نکل جاتا ہے، اگر لوگ اسی میں مبتلا ہیں مہل حال حاصل کرنے کے لئے زبردست جدوجہد کرتے ہیں، اور ہزاروں تدبیریں کرتے ہیں، شہتہ مالی لینے یا شہتہ ذرائع سے مالی حاصل کرنے سے توکل بدرجہ اولیٰ باطل ہو جاتا ہے، کیوں کہ یہ اس بات کی علامت ہے کہ بندہ دنیا میں اذیت پاتا ہے، اور اسباب پر پورا بھروسہ کرتا ہے۔ جلب منفعت سے ان اسباب کو وہی نسبت ہے، جو جادو، فال اور داغ لگانے کو دفعِ محرت سے ہے، یعنی جس طرح دفعِ محرت کے لئے جادو معتبر استعمال کرنا صحیح نہیں ہے، بلکہ بدعتیہ کی ہے اسی طرح جلبِ منفعت کے لئے اس تیسری قسم کے اسباب کا استعمال بھی صحیح نہیں ہے اور توکل کے روح کے متافی ہے، سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے متوکلین کا یہ وصف بیان فرمایا ہے کہ وہ ان اسباب پر بھروسہ نہیں کرتے، لیکن کہیں بھی یہ ارشاد نہیں فرمایا کہ وہ کسب نہیں کرتے یا وہ شہوں میں نہیں رہتے یا لوگوں سے کچھ نہیں لیتے، بلکہ روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ متوکلین یہ تمام کام کرتے ہیں۔

تیسری قسم کے اسباب جن سے منیات کا حصول یعنی یا قالب ظنی نہیں ہوتا بے شمار ہیں۔ حضرت سہیل ستیری فرماتے ہیں کہ تدبیر نہ کرنا توکل ہے، اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا فرمایا اور انھیں اپنے نفس سے محجوب نہیں رکھا، ان کا حجاب ان کی تدبیری تو ہے، غالباً حضرت سہیل ستیری کی مراد بعید ترین اسباب کی تدبیر ہے، انہی میں گھرو تدبیر کی ضرورت ہوتی ہے، ظاہری اسباب میں اس کی ضرورت نہیں پڑتی۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اسباب کی دو قسمیں ہیں، بعض اسباب وہ ہیں کہ ان پر عمل کرنے سے آدمی توکل نہیں رہتا، اور بعض وہ ہیں جن پر عمل پیرا ہونے سے توکل پر اثر نہیں پڑتا اس دوسری قسم کی پھر دو قسمیں ہیں قطعی، اور ظنی۔ قطعی قسم کے اسباب پر عمل کرنے سے آدمی توکل سے نہیں نکلتا بشرطیکہ توکل کا حال اور علم دونوں موجود ہوں، اور صرف سببِ الاسباب پر اعتماد ہو۔ گویا اس قسم میں توکل حال اور علم کے اعتبار سے ہے، عمل کے اعتبار سے نہیں، اور ظنی میں حال، علم اور عمل سب کے اعتبار سے ہے۔

متوکلین کے تین درجات مذکورہ بالا اسباب پر عمل کرنے کے اعتبار سے متوکل کے تین مقامات ہیں :- پہلا مقام خواص اور ان جیسے بزرگوں کا ہے، یہ لوگ زوردار لے بغیر محض فضلِ الہی پر اعتماد کے ساتھ جنگوں میں کھڑے پھرتے تھے، اور یہ یقین رکھتے تھے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں ایک ہفتہ یا اس سے زیادہ مہر کرنے کی طاقت عطا فرمائے گا، اور اس دوران جنگ میں کوئی گھاس یا سبزی ایسی مل جائے گی جس سے ہم اپنا پیٹ بھر سکیں گے، اور اگر کوئی چیز نہ ملی تو نباتاتِ قدی اور رخصا کے ساتھ مرجائیں گے، بعض اوقات وہ لوگ بھی قاتلے سے مر جاتے ہیں، جو توشہ لے کر چلتے ہیں، کبھی توشہ ضائع ہو جاتا ہے، اور کبھی راہ دور سے سے بھٹک جاتے ہیں، اور توشہ ختم ہو جاتا ہے، سو خدا تعالیٰ حقیقت ہے، وہ ان لوگوں پر بھی آتی ہے جو توشہ رکھتے ہیں، اور وہ لوگ بھی مرتے ہیں جو توشہ نہیں رکھتے، اس لئے اللہ تعالیٰ کے فضل پر تکیہ کر کے مر جائے تو یہ زیادہ بہتر ہے۔

دوسرا مقام یہ ہے کہ اپنے گھر کے اندر یا مسجد میں محصور ہو جائے، اور وہیں رہ کر ذکر و تلاوت مشغول ہو، لیکن یہ صورت کسی گاؤں یا شہر میں ہونی چاہیے، یہ مقام مرتبے میں پہلے مقام سے کم ہے، لیکن یہ بھی توکل ہی ہے، کیوں کہ وہ محض معیشت اور رزق کے ظاہری اسباب ترک کر کے محض اللہ کے فضل پر اعتماد کرتا ہے، اور یہ یقین رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ غلی اسباب سے میری ضرورتیں پوری فرمائے گا، اگرچہ یہ محض آبادی کے درمیان بیٹھا ہوا ہے، اور معیشت کے ظاہری اسباب کا تارک ہے، حالانکہ آبادی میں قیام پذیر ہونا بھی حصولِ رزق کا ایک سبب ہے، تاہم ایسا کرنے سے اس محض کا توکل باطل نہیں ہوتا، بشرطیکہ اس کی نظر شر کے لوگوں پر نہ ہو، بلکہ اس ذات پر ہو جو اسے شر کے لوگوں سے رزق دلاتا ہے، یہ بھی ممکن تھا کہ لوگ اس سے غافل ہو

جاتے اور کوئی غصہ بھی اسے رزق فراہم نہ کرتا، یہ بھی تو اللہ ہی کا فضل ہے کہ وہ لوگوں کو اس کی طرف متوجہ رکھتا ہے، اسی لئے وہ اس کی خبر گیری کرتے ہیں۔

تیسرا مقام یہ ہے کہ گھر میں مقید ہو کر نہ رہے، باہر نکلے، ان تمام شرائط کے مطابق کمائے جو کتاب آداب الکسب کے تیسرے اور چوتھے باب میں مذکور ہیں، اس کسب و سعی سے بھی وہ توکل کے مقامات سے خارج نہیں ہوگا، بشرطیکہ اسے اپنی کفایت، قوت، وجاہت اور بغضاعت پر بھروسہ نہ ہو، اس لئے کہ یہ چیزیں تو ایک لمحے میں فنا ہو جاتی ہیں، بلکہ اس کی نظر کفیل برحق پر ہو کہ اسی نے ان چیزوں کی حفاظت کی ہے، اور اس کے لئے یہ اسباب آسان فرماتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی نسبت سے اپنی کفایت، قدرت اور کسب کی قوت کو ایسا سمجھے جیسے قلم بادشاہ کے ہاتھ میں ہو، اگر آپ اپنے بادشاہ کے مصاحب کی نظر اس کے قلم پر نہیں ہوتی، بلکہ اس کے دل پر ہوتی ہے کہ نہ جانے اس کے دل میں کیا خیال سمجھ گاہ، نہ کس کی طرف مائل ہو گا اور کیا فیصلہ کرے گا۔

اولاد اور فقراء کے لئے کسب معیشت جو غرض اولاد کے لئے کمائے یا فقراء اور مساکین پر خرچ کرنے کے لئے کمائے وہ جسم سے کمائے والا اور دل سے لافتن ہے۔ اس کا حال اس شخص سے بہتر اور قابل تعریف ہے جو اپنے گھر میں بیٹھا رہتا ہے، اور اس کی دلیل یہ ہے کہ کسب خلاف توکل نہیں ہے، اگر اس میں شرائط کی رعایت کی جائے، اور علم و معرفت کا لحاظ رکھا جائے۔ روایات میں ہے کہ جب حضرت ابو بکر الصدیقؓ غلیظہ مقرر کئے گئے تو کپڑوں کی پونلی بغل میں دھا کر اور گز ہاتھ میں لے کر بازار تشریف لے گئے، یہ بات مسلمانوں کو بری معلوم ہوئی اور وہ کہنے لگے کہ اب آپ نبوت کی خلافت پر متمکن ہیں : بازار نہ جایا کریں، حضرت ابو بکر الصدیقؓ نے ارشاد فرمایا کہ اگر میں اولاد کے لئے کوئی فضل نہ کروں گا تو انھیں ضائع کر دوں گا، اور جب اپنی اولاد کو تباہ کروں گا تو دوسروں کو ضرور تباہ کرنے والا ہوں گا، مسلمانوں نے ان کے لئے مسلم گھرانوں کے مطابق روزیہ مقرر کر دیا، جب حضرت ابو بکرؓ نے دیکھا کہ لوگ مجھے بازار کے کاموں میں مشغول دیکھنا پسند نہیں کرتے تو انھوں نے روزیہ قبول فرمایا اور خود کو مسلمانوں کی مصالحت کے لئے وقف کر دیا، یہاں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ حضرت ابو بکرؓ توکل کے مقام پر فائز نہ تھے بھلا ان سے بیوہ کر امت محمدیہ میں متوکل کون ہو سکتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ حضرت ابو بکر الصدیقؓ کا توکل یہ نہیں تھا کہ وہ کسب و سعی ترک کر دیتے، بلکہ ان کا توکل غیر اللہ سے قطع التفات کی صورت میں تھا، وہ اپنی قوت، اور کفایت پر ملکت نہیں تھے، صرف اللہ تعالیٰ کو سبب الاسباب اور مقسم الارزاق جانتے تھے کسب کی شرائط ملحوظ رکھتے تھے، یعنی وہ صرف مقدار ضرورت پر انکشاف کرتے تھے نہ زیادہ کی ہوس تھی، اور نہ اس پر فخر تھا، نہ ذخیرہ اندوزی کا خیال تھا، اور نہ یہ تصور تھا کہ میرا مال غیر کے مال سے بہتر ہے، کیوں کہ یہ تصور ہی دنیا کی حرص اور محبت کو جنم دیتا ہے۔ توکل دنیا میں زہد کے بغیر نہیں ہو سکتا، جب کہ زہد کے لئے توکل ضروری نہیں ہے۔ توکل کا مقام زہد کے بعد ہے۔

حضرت ابو جعفر الہادیؑ جو حضرت جعید کے مجدد مرشد تھے، اور جن کا شمار انتہائی متوکلین میں کیا جاتا ہے فرمایا کرتے تھے کہ میں نے بیس برس تک اپنا توکل محض رکھا، میں ہر روز بازار جایا کرتا تھا، اور ایک درہم کما کر لایا کرتا تھا، لیکن رات میں ایک دھڑی بھی باقی نہیں رکھتا تھا، اور نہ اپنی راحت کے لئے اس میں سے کچھ خرچ کرتا تھا کہ کچھ بچے دے کر حرام میں غسل ہی کر لوں، رات آنے سے پہلے پہلے وہ درہم خرچ کر دیا کرتا تھا۔ حضرت جعیدؑ ان کی موجودگی میں توکل کے سلسلے میں گفتگو نہیں کرتے تھے، فرماتے تھے کہ مجھے شرم آتی ہے کہ وہ تشریف فرما ہوں اور میں توکل کے باب میں گفتگو کروں۔

خانقاہوں میں توکل صوفیاء کی خانقاہوں میں فقر رقم لے کر بیٹھنا اور اس سے بھروسے پر توکل کرنا درست نہیں ہے، یہی حال وقف جائیدادوں کا ہے، ہاں اگر فقر رقم بھی نہ ہو، اور وقف بھی نہ ہو، صرف خدام ہوں جو باہر جا کر کمالایا کریں۔ اس صورت میں توکل ضعف کے ساتھ درست ہو جاتا ہے اور علم و حال سے مضبوط بھی ہو جاتا ہے، جیسے کمائے والے کا توکل۔ اگر صوفیاء

خافا ہوں میں بیٹھ جائیں اور سوال نہ کریں بلکہ جو انھیں میرا آجائے اس پر قناعت کریں تو یہ ان کے توکل کے لئے نہایت مضبوط امر ہے، لیکن اب تو خافا ہوں کہ اس قدر شہرت ملے گی ہے کہ یہ خافا ہیں نہیں رہیں بلکہ بازار بن جاتی ہیں۔ اس لئے جو شخص اس طرح کی مشہور خافا ہوں میں جائے وہ ایسا ہے جیسے کوئی شخص کسب کے لئے بازار میں داخل ہو جس طرح بازار جائے والا شخص بہت سی شرائط کی تکمیل کے بعد متوکل بنتا ہے اسی طرح یہ شخص بھی اسی وقت متوکل بنے گا جب کسب و سعی کی تمام شرائط پوری کرے گا۔

ترک کسب افضل ہے یا کسب؟ رہا یہ سوال کہ آدمی کے لئے گھر میں بیٹھ رہنا افضل ہے یا بازار جا کر کمانا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر کسی شخص کو ترک کسب سے فکر ذکر، انظام اور محبت میں اشتغاق کے لئے وقت مل جائے اور کسب سے دل مشوش ہو اور ان امور کو صحیح طور پر انجام دینے سے عاجز ہو تو گھر میں بیٹھنا بہتر ہے بشرطیکہ اس کے دل میں لوگوں کی آمد اور ان کے ذریعے پہنچنے والی اشیاء کا انتظار نہ ہو بلکہ میر کرنے اور اللہ تعالیٰ پر متوکل رہنے میں مضبوط دل رکھتا ہو اور اگر گھر میں بیٹھ کر دل گھبراتا ہو اور معیشت کی طرف سے بے چین و مضطرب رہتا ہو اور لوگوں کا انتظار کرتا ہو تو کمانا بہتر ہے اس لئے کہ دل سے لوگوں کا بھٹک رہنا ایسا ہے جیسے دل سے سوال کرتا ہو اور یہ کیفیت ترک کرنا ترک کسب سے زیادہ بہتر ہے۔ متوکلین کا حال یہ تھا کہ اگر انھیں کوئی ایسی چیز ملتی جس کے وہ بھٹک رہے اور لوگوں سے توقع رکھتے تھے تو لینے سے انکار کر دیتے۔ ایک مرتبہ حضرت امام احمد ابن حنبلؒ نے ابو بکر موزی سے فرمایا کہ فلاں فقیر کو مقررہ مقدار سے زائد اجرت دیدنا انھوں نے حکم کی تعمیل میں فقر کو زائد اجرت دینی چاہی تو اس نے نہیں لی اور چھوڑ کر چلا گیا امام احمدؒ نے فرمایا اب جا کر دیدو چنانچہ وہ پیچھے پیچھے گئے اور اسے وہ زائد اجرت دیدی اس نے لے لی ابو بکر الموزی کو اس پر بڑی حیرت ہوئی کہ پہلی مرتبہ لینے سے انکار کر دیا اور دوسری مرتبہ لینے سے انکار نہیں کیا حضرت ابن حنبلؒ نے فرمایا کہ پہلی مرتبہ جب تم نے اسے زائد اجرت دی تھی تو اسے اس کا انتظار تھا اور اس کی طمع تھی اس لئے اس نے لینے سے انکار کر دیا جب تم نے دوبارہ دی تو اس کا نفس مایوس اور ناامید ہو چکا تھا اس لئے اس نے وہ اجرت قبول کر لی۔ حضرت خواصؒ اپنے نفس کو کسی شخص کی طرف مائل اور اس کی عطا کی طرف راغب دیکھتے یا یہ دیکھتے کہ فلاں شخص کی عطا قبول کرنے سے ان کا نفس ملای ہو جائے گا تو وہ کوئی چیز قبول نہ فرماتے کسی شخص نے ان سے دریافت کیا کہ انھیں ان کے سفر میں عجیب ترین بات کون سی پیش آئی انھوں نے جواب دیا کہ میں نے حضرت فخر علیہ السلام کو دیکھا کہ وہ میری رفاقت اور محبت پر راضی تھے لیکن میں نے یہ سوچ کر ان سے جدائی اختیار کی کہ کہیں ان کی رفاقت میں میرے نفس کو قرار نہ ملے گئے اور اس طرح ان کی صحت میرے توکل کے لئے نقصان کا باعث نہ بن جائے۔

بہر حال اگر کوئی شخص کسب کے ان تمام آداب اور شرائط کی رعایت کرتا ہے جو کتاب آداب الکسب میں مذکور ہیں یعنی اس کا حصول مال کی کثرت نہ ہو اور نہ اسے اپنی بے ضابطہ اور کثافت پر اکتفا ہو تو ایسا شخص بھی متوکل ہو گا رہا یہ سوال کہ اس بات کی علامت کیا ہے کہ اسے اپنی بے ضابطہ اور کثافت پر مجبور نہ ہو؟ اس کی علامت یہ ہے کہ اگر اس کا مال چوری ہلا جائے یا تجارت میں نقصان ہو جائے یا کوئی اور دشواری پیش آجائے تو اس پر راضی رہے اس کا سکون اپنی جگہ برقرار رہے اور قلب مضطرب نہ ہو بلکہ مال کے چوری ہونے یا تجارت میں نقصان ہونے سے پہلے دل کی جو حالت تھی وہی رہے اس لئے کہ جو شخص کسی چیز میں دل نہیں لگاتا وہ اس کے ضائع ہو جانے سے پریشان نہیں ہوتا اور جو شخص کسی چیز کے ضائع ہونے سے پریشان ہوا ہے وہ اس سے دل لگانے والا ہوتا ہے۔ بشرسوت کا حق ہے چرغے بنایا کرتے تھے پھر انھوں نے یہ کام ترک کر دیا اس لئے کہ حطل نے انھیں لکھا تھا میں نے سنا ہے تم چرغے بنا کر اپنے رزق پر مدد لیتے ہو ذرا یہ تلاؤ کہ اگر اللہ تعالیٰ تمہیں اندھا بنا کر دے تو تمہارے رزق کی ذمہ داری کس پر ہوگی۔ حطل کی بات ان کے دل کو لگ گئی اور انھوں نے چرغے بنانے والے آلات ضائع کر کے یہ پیشہ ترک کر دیا بعض روایات میں یہ ہے کہ انھوں نے یہ مشغلہ اس وقت ترک کیا جب ان کی اس صنعت کو شہرت ملنے لگی اور

لوگ چرے بنوانے کے لئے ان کے پاس آئے گئے، اور بعض لوگ کہتے ہیں کہ جب ان کے خیال مر گئے تو انہوں نے یہ کام چھوڑ دیا۔ حضرت سفیان ثوری کے پاس پچاس دینار تھے جن سے وہ تجارت کرتے تھے، جب ان کے گھروالوں کا انتقال ہوا تو انہوں نے یہ تمام دینار تقسیم فرما دیے۔

تم یہ کہہ سکتے ہو کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ آدمی کے پاس مال ہو اور اس سے دل بٹگی یا تعلق نہ ہو؟ اس کا جواب یہ دیا جائے کہ جس شخص کا مال ضائع ہو جائے اسے یہ سوچنا چاہیے کہ دنیا میں بے شمار لوگ ایسے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ بضاعہ کے بغیر رزق عطا کرتا ہے، اور ایسے لوگوں کی تعداد بھی کچھ کم نہیں جن کے پاس بضاعہ تھی مگر چوری ہو گئی یا ضائع ہو گئی، اس کے باوجود وہ رزق سے محروم نہیں رکھے گئے، اللہ تعالیٰ میرے ساتھ وہی سلوک کرے گا جو اس کے نزدیک میرے حق میں بہتر ہو گا، اگر اس نے میرا مال ضائع کر دیا تو یقیناً اس میں میرے لئے بھلائی ہے، ہو سکتا ہے کہ یہ مال میرے دین کے لئے فساد کا موجب بن جاتا۔ یہ اللہ کا احساس ہے کہ اس نے میرے دین کو تجاہی سے محفوظ رکھا، اسی طرح اگر وہ انتہائی مفلس ہے، اور قریب ہے کہ مفلسی کے باعث جان سے ہاتھ دھو بیٹھے تب بھی یہی اعتقاد رکھے کہ مفلس ہونا اور بھوک کے باعث ہلاک ہو جانا یقیناً میرے حق میں بہتر ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے میری کسی تنقیر کے بغیر میرے لئے اس کا فیصلہ فرمایا ہے۔ اگر یہ شخص ان امور کا اعتقاد رکھے گا تو اس کے نزدیک بضاعہ کا ہونا نہ ہونا برابر ہو گا۔ ایک حدیث میں ہے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ بدھ رات کو اپنے تجارتی معاملات میں سے کسی معاملے میں غور کرتا ہے، اور وہ معاملہ ایسا ہوتا ہے کہ اگر اسے انجام دے تو ہلاک ہو جائے، اللہ تعالیٰ اسے عرش کے اوپر سے دیکھتا ہے اور اس پر عمل کرنے سے روک دیتا ہے، وہ شخص غمگین اور کبیدہ خاطر ہوتا ہے، اور اپنی اس ناکامی کو اپنے پڑوسی یا اپنے چچا زاد بھائی پر ڈال دیتا ہے کہ یہ مصیبت ان کی وجہ سے نازل ہوئی ہے حالانکہ وہ اللہ کی رحمت ہوتی ہے (ابو نعیم۔ ابن عباس) حضرت عمر ابن الخطاب فرمایا کرتے تھے کہ مجھے اس کی کوئی پروا نہیں کہ میں مالدار ہوں یا فقیر، اس لئے کہ میں نہیں جانتا کہ میرے حق میں مالدارتی بہتر ہے یا شکستہ۔ جو شخص ان امور پر یقین نہیں رکھتا وہ توکل نہیں کر سکتا، توکل کی وادی انتہائی خاردار ہے، بڑے بڑے متوکلین اس وادی میں اپنے آپ کو بہت پیچھے چھٹے ہیں۔ چنانچہ حضرت ابو سلیمان دارانی نے احمد ابن الحارثی سے فرمایا کہ مجھے ہر مقام سے کچھ نہ کچھ تعلق ہے لیکن توکل کے مقام سے ذرا بھی بہرہ نہیں، میں نے اس کی خوشبو بھی نہیں سونگھی یہ قول ان کی تواضع کا مظہر ہے ورنہ وہ اس میدان میں بھی بہت آگے تھے، انہوں نے مقام توکل کو ناممکن الحصول نہیں فرمایا، بلکہ یہ کہا کہ میں نے یہ مقام حاصل نہیں کیا، غالباً ان کی مراد توکل کے اعلا درجہات سے ہے۔

بہر حال اس وقت تک توکل کا حال مکمل نہیں ہو گا جب تک بدھ کا ایمان اس بات پر نہ ہو کہ اللہ کے سوانہ کوئی قائل ہے، اور نہ رازق ہے، جو کچھ اس کی تقدیر میں لکھا ہوا ہے خواہ وہ فقر ہو یا مالدار، زندگی ہو یا موت اس کے حق میں وہی بہتر ہے، جو تمنا وہ رکھتا وہ بظاہر خوب صورت ہو سکتی ہے لیکن اگر وہ اللہ کی مرضی کے خلاف ہے تو اس کے لئے بہتر نہیں ہے۔ اس تفصیل کا حاصل یہ ہے کہ توکل ان امور پر مکمل ایمان کے ساتھ مربوط ہے، اس کے علاوہ بھی دین کے جتنے مقامات ہیں وہ بھی اپنے اصول ایمان کے ساتھ اسی طرح مربوط ہوتے ہیں۔ توکل کا مقام ناقابل فہم نہیں ہے مگر اس کے لئے دل کی قوت، اور یقین کی طاقت ضروری ہے، حضرت سہیل ستیری فرماتے ہیں کہ جو شخص کسب کو برا کہتا ہے وہ سخت کو برا کہتا ہے، اور جو ترک کسب کو برا کہتا ہے وہ توحید کو برا کہتا ہے۔

دل کو اسباب ظاہری سے اسباب باطنی کی طرف مائل کرنے کا طریقہ اب ہم وہ طریقہ بیان کرتے ہیں جس سے دل ظاہری اسباب سے منحرف ہو کر باطنی اسباب کی طرف مائل ہو جائے، اور اس میں یہ یقین پیدا ہو جائے کہ جو کچھ باطنی اسباب کے ذریعے ہوتا ہے وہی حق ہوتا ہے اس سلسلے میں دل کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ حسن عمن بھی ہونا چاہیے۔ اور حسن عمن پیدا کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ یہ خیال کرے کہ سوء عمن شیطانی تعلیم ہے، اور حسن عمن خدائی تعلیم ہے، چنانچہ ارشادِ ربانی ہے نہ

الشَّيْطَانُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَأْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَاءِ وَاللَّهُ يَعِدُكُم مَّغْفِرَةً مِنْهُ وَفَضْلًا۔
(پ ۳۵ آیت ۳۸)

شیطان تم کو فقر سے ڈراتا ہے، اور تم کو بری بات (کلم) کا مشورہ دیتا ہے، اور اللہ تم سے وعدہ کرتا ہے اپنی طرف سے گناہ معاف کر دینے کا اور زیادہ دینے کا۔

انسان طبعی طور پر شیطان کے ڈرانے کو زیادہ اہمیت دیتا ہے اور اس کی باتیں زیادہ غور سے سنتا ہے۔ کہتے ہیں کہ جو شخص سوہ عن کی بنیاد پر ڈرے وہ حریص ہے اور اگر سوہ عن کے ساتھ بزدلی اور ضعف قلب بھی ہو، اور ان مشککین کا مشاہدہ بھی جو ظاہری اسباب کے پابند ہیں اور انہی کی ترغیب دینے والے ہیں تو توکل بالکل ختم ہو جاتا ہے، اور سوہ عن غالب آجاتا ہے، بلکہ رزق کو مخفی اسباب سے مربوط سمجھنا بھی توکل کو باطل کر دیتا ہے۔ ایک بزرگ کا واقعہ ہے کہ وہ اللہ کی عبادت کے لئے کسی مسجد میں جا بیٹھے، ان کے پاس مال نہیں تھا، مسجد کے امام نے ان سے کہا کہ اگر تم کماؤ تو یہ زیادہ بہتر ہے، وہ خاموش رہے، دوسری مرتبہ بھی امام صاحب نے انہیں کمانے کی ترغیب دی، وہ اس بار بھی خاموشی کے ساتھ اپنے کام میں لگے رہے، جب تیسری دفعہ بھی امام صاحب نے یہی کہا تو انہوں نے فرمایا کہ مسجد کے برابر میں ایک یہودی رہتا ہے اس نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ وہ ہر روز دو روٹی مجھے پہنچا دیا کرے گا، یہ سن کر امام صاحب نے کہا کہ اگر وہ یہ ذمہ داری صدقہ کی کے ساتھ قبول کر لیتا ہے تو تمہارے مسجد میں مشکلٹ رہنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، بزرگ نے فرمایا کہ اگر تم امامت نہ کرو تو زیادہ بہتر ہے، تم اس ناقص توحید کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے اور بندوں کے سامنے کھڑے ہوتے ہو، تم نے یہودی کے وعدہ رزق کو اللہ تعالیٰ پر ترجیح دی ہے۔ کبھی مسجد کے امام نے ایک نمازی سے دریافت کیا کہ تم کہاں سے کھاتے ہو، نمازی نے جواب دیا ذرا ٹھہرو، پہلے میں یہ نماز دوبارہ پڑھ لوں جو میں نے تمہارے پیچھے ادا کی ہے، پھر جواب دوں گا۔

عطائے رزق اور منع رزق کے عجیب و غریب واقعات مخفی اسباب کے ذریعے رزق بھیجنے کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم پر حسن ظن کے لئے ان حکایات اور واقعات کا سنا مفید رہے گا جن میں عطائے رزق کے متعلق اللہ تعالیٰ کے عجیب و غریب الطاف مذکور ہیں، کہ بعض تنگدستوں کو لمحوں میں مالا مال فرمادیا، اور بعض تاجروں اور مالداروں سے ان کی دولت چھین کر بھوکوں ہلاک کر دیا۔ حذیفہ مرثی سے جو ابراہیم ابن اویم کے خدام میں سے ہیں کہا گیا کہ اگر انہوں نے کوئی عجیب ترس واقعہ دیکھا ہو تو بیان کریں، انہوں نے کہا کہ ایک مرتبہ ہم مکہ معظمہ کے راستے میں چند روز تک بھوکے رہے اس دوران ہم کو نے میں پہنچے، اور ایک دیر ان مسجد میں داخل ہوئے، حضرت ابراہیم نے میری طرف دیکھا اور فرمایا اے حذیفہ غالباً تجھے بھوک لگ رہی ہے، میں نے عرض کیا کہ آپ کا خیال صحیح ہے، انہوں نے فرمایا مجھے کاغذ قلم دو، چنانچہ میں نے دونوں چیزیں پیش کیں، انہوں نے کاغذ پر یہ عبارت تحریر فرمائی ”اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان اور نہایت رحم والا ہے، تو ہر حال میں مقصود ہے، اور ہر بات میں مطلوب ہے۔“ اس کے بعد آپ نے یہ تین شعر لکھے :-

أَنَا حَامِدٌ أَنَا شَاكِرٌ أَنَا كَاكِرٌ - أَنَا جَائِعٌ أَنَا ضَائِعٌ أَنَا عَارِي
هِيَ سَنَةٌ وَأَنَا الضَّمِيمُ لِنُصْفِهَا - فَكُنِ الضَّمِيمُ لِنُصْفِهَا يَا بَارِي
مَدْحِي لِعَبِيرِكَ لَهَبُ نَارٍ خُصِّنَهَا - فَاجِرُ عُبَيْدِكَ مِنْ دُخُولِ النَّارِ

(میں تعریف کرنے والا ہوں، شکر کرنے والا ہوں اور ذکر کرنے والا ہوں، میں بھوکا، پیاسا ہوں، اور برہنہ ہوں، یہ کل چھ چیزیں ہیں، جن میں سے تین کا میں ضامن ہوں اے اللہ! باقی تین کا ضامن تو ہیں جا۔ غیر کے لئے میری تعریف آگ کی لپٹ ہے، اپنے حقیر بندے کو آگ میں جلنے سے بچاؤ۔)

اس کے بعد آپ نے یہ تحریر بھی دی، اور فرمایا اسے لے کر جاؤ، اور غیر خدا کے ساتھ اپنے قلب کو قطعاً وابستہ نہ کرو، باہر نکلنے کے

بعد سب سے پہلے جو شخص ہمیں نظر آئے اسے یہ دیدہ چنانچہ میں مسجد سے باہر نکلا سب سے پہلے جو شخص مجھے ملا وہ ایک غریب سوار تھا میں نے اسے یہ رقم دیدیا وہ یہ رقم دیکھ کر رونے لگا اور مجھ سے پوچھنے لگا کہ جنھوں نے یہ رقم لکھا ہے وہ کہاں ہیں میں نے کہا کہ وہ فلاں مسجد میں ہیں اس نے مجھے ایک قبیل دی جس میں چھ سو بیٹے تھے اس کے بعد میری ملاقات ایک اور شخص سے ہوئی جس سے میں نے پوچھا کہ وہ غریب سوار کون تھا اس نے بتلایا کہ یہ ایک نصرانی تھا میں قبیل لے کر حضرت ابراہیم کے پاس آیا اور انھیں پورا واقعہ سنایا انھوں نے فرمایا کہ یہ قبیل مت چھوٹا جس شخص نے ہمیں قبیل دی ہے وہ ابھی آئے والا ہے چنانچہ تھوڑی دیر کے بعد نصرانی آیا اور اس نے ابراہیم کے سر کو بوسہ دیا اور اسلام لے آیا۔ ابو یعقوب الاقطع بصری کہتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ حرم شریف میں دس دن تک بھوکا رہا مسلسل بھوکا رہنے کی وجہ سے مجھے ضعف لاحق ہو گیا اس وقت دل میں خیال آیا کہ مجھے باہر نکلتا چاہیے چنانچہ میں جنگل کی طرف یہ سوچ کر نکلا کہ شاید کوئی ایسی چیز مل جائے جس سے یہ کمزوری رفع ہو سکے میں نے جنگل کے اندر زمین پر ایک شلجم پڑا ہوا دیکھا میں نے اسے اٹھالیا لیکن دل میں عجیب سی وحشت پیدا ہوئی اور ایسا لگا کہ جیسے کوئی شخص یہ کہہ رہا ہوں کہ تو دس روز تک بھوکا رہا اور اب اس بھوک کا خاتمہ ایک سڑے ہوئے شلجم سے کرنا چاہتا ہے میں نے وہ شلجم وہیں ڈالا اور حرم شریف میں آکر بیٹھ گیا ابھی اس واقعہ کو تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ ایک عجیب شخص نظر آیا جس کے ہاتھوں میں خوان پوش تھا وہ میرے قریب آکر بیٹھ گیا اور کہنے لگا کہ یہ تمہارے لئے ہے میں نے اس سے پوچھا کہ آخر تم نے میری شخصیت کیوں کی ہے اس شخص نے جواب دیا کہ ہم دس روز سے سمندر میں سفر کر رہے تھے اچانک طوفان آیا قریب تھا کہ ہماری کشتی غرق ہو جاتی اس وقت میں نے یہ عمد کیا تھا کہ اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے اس طوفان سے محفوظ رکھا تو میں یہ چیزیں حرم شریف کے مجاورین میں سے اس شخص کو دوں گا جو مجھے سب سے پہلے نظر آئے گا چنانچہ میری نگاہ سب سے پہلے تم پر پڑی ابو یعقوب کہتے ہیں کہ میں نے اس سے کہا کہ یہ خوان ہٹاؤ اس نے خوان ہٹا دیا اس میں مصری طوطہ چلے ہوئے بادام اور بنی کے ٹکڑے تھے میں نے تینوں چیزوں میں سے ایک ایک مٹھی لے لی اور باقی چیزیں اسے واپس کر دیں اور اس سے کہا کہ وہ یہ چیزیں اپنے ساتھیوں میں تقسیم کر دے میں نے تمہارا صدقہ قبول کر لیا ہے اس کے جانے کے بعد میں نے دل میں سوچا کہ تیرا رزق دس منزل کی دوری سے تیرے پاس آ رہا تھا اور تو جنگل میں اسے تلاش کر رہا تھا۔

مشاد بخوری کہتے ہیں کہ مجھ پر کچھ قرض تھا جس کی وجہ سے میری طبیعت پریشان رہتی تھی ایک رات میں نے خواب میں دیکھا کہ کوئی شخص کہہ رہا ہے کہ اے بخیل! تو نے ہم پر اتنا قرض کر دیا ہے لیتا رہے تیرا کام لینا ہے اور ہمارا کام دینا ہے اس واقعے کے بعد میں نے کسی ہاتھ یا قصاب کا حساب نہیں کیا بنان الحمال کہتے ہیں کہ میں مصر سے عازم مکہ تھا اور اپنے ساتھ زاد راہ لے کر سفر کر رہا تھا ایک روز ایک عورت میرے پاس آئی اور کہنے لگی کہ اے بنان تو حامل (بوجہ اٹھانے والا) ہے اپنی پیٹھ پر زاد راہ لے کر چل رہا ہے اور یہ گمان رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تجھے رزق نہ دے گا بنان کہتے ہیں کہ میں نے اپنا زاد راہ پیٹھ سے ہٹا کر زمین پر لیٹی چاہئے ہو سکتا ہے کہ اس پانزیب کا مالک مل جائے اور میں کچھ لے کر اسے یہ پانزیب دیدوں ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ وہی عورت پھر آئی اور کہنے لگی کہ کیا تو تاجر ہے جو یہ کہتا ہے کہ شاید اس پانزیب کا مالک مل جائے اور تو کچھ رقم کے عوض یہ پانزیب اسے دیدے اس کے بعد اس عورت نے کچھ درہم میری طرف پیچھے اور کہنے لگی کہ انھیں خرچ کر میں نے وہ درہم لے لئے اور مکہ مکرمہ پہنچے تک انھیں خرچ کرتا رہا۔ ایک مرتبہ بنان کو خدمت کے لئے ایک باندی کی ضرورت پیش آئی انھوں نے اپنے دوستوں سے ذکر کیا سب نے مل کر چندہ کیا اور کہنے لگے کہ قافلہ آنے والا ہے ان کی باندیوں میں سے جو باندی مناسب ہو وہ لے لیں گے جب قافلہ آیا تو وہ سب باندی کی تلاش میں نکلے اور ایک باندی پر حلق ہو گئے انھوں نے اس باندی کے مالک سے قیمت دریافت کی مالک نے کہا یہ باندی فروخت کے لئے نہیں ہے بلکہ یہ بنان الحمال کے لئے ہے سرمد کی ایک خاتون نے یہ

باندی انھیں ہسپے میں بھیجی ہے چنانچہ وہ باندی لے کر بنان المال کے پاس پہنچے اور ان سے پورا واقعہ بیان کیا۔ ایک شخص کے متعلق بیان کیا گیا ہے کہ وہ ایک روٹی لے کر سفر میں نکلا اور یہ سوچتا رہا کہ اگر میں نے یہ روٹی کھالی تو ہلاک ہو جاؤں گا! اللہ تعالیٰ نے اس پر ایک فرشتہ مقرر فرما دیا اور اسے حکم دیا کہ اگر یہ شخص روٹی کھائے تو اسے رزق دینا اور نہ کھائے تو اس روٹی کے علاوہ کوئی روٹی مت دینا وہ روٹی اس شخص کے پاس رہی یہاں تک کہ وہ کھائے بغیر مر گیا ابو سعید الخدری کہتے ہیں کہ میں زاد راہ لئے بغیر جنگل میں سفر کر رہا تھا اسی دوران مجھے فاقے سے دوچار ہونا پڑا ایک روز مجھے دور سے منظر نظر آئی اسے دیکھ کر بہت زیادہ خوشی ہوئی۔ اس کے بعد دل میں خیال پیدا ہوا کہ میں نے غیر بھروسہ کیا اور اس کے ملنے پر خوش ہوا چنانچہ میں نے قسم کھائی کہ میں اس منزل میں داخل نہیں ہوں گا یہاں تک کہ اگر کوئی آکر مجھے لے جائے میں نے اپنے لئے ریت میں ایک گڑھا کھودا اور اپنا جسم سینے تک اس میں چھپا لیا میں نے آدھی رات گزرنے پر ایک بلند آواز سنی کوئی شخص گاؤں والوں سے کہہ رہا تھا : اے لوگو! اللہ کے ایک دوست نے اپنے آپ کو اس ریت میں محبوس کر لیا ہے اس سے ملو چنانچہ کچھ لوگ آئے اور مجھے نکال کر گاؤں میں لے گئے ایک شخص کا واقعہ بیان کیا گیا ہے کہ اس نے حضرت عمر کا دواؤہ لازم پکڑ لیا تھا رات دن وہاں پڑا رہتا ایک روز اس نے سنا کہ کوئی شخص اس سے کہہ رہا تھا کہ اے شخص تو نے حضرت عمر کی طرف ہجرت کی ہے یا اللہ کی طرف یہاں سے اٹھ اور قرآن کی تعلیم حاصل کر قرآن تجھے عمر کے دواؤہ سے بے نیاز کر دے گا وہ شخص یہ سن کر غائب ہو گیا حضرت عمرؓ نے اسے ڈھونڈا معلوم ہوا کہ وہ گوشہ نشین ہو گیا ہے اور عبادت میں مشغول ہے حضرت عمرؓ اس کے پاس آئے اور فرمانے لگے کہ میں تجھے دیکھنے کا متنی تھا تجھے ہم سے کس چیز نے غافل کر دیا اس نے عرض کیا کہ قرآن کریم کی تلاوت نے مجھے عمر اور آل عمر سے بے نیاز کر دیا ہے حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ تو نے قرآن میں کیا پایا اس نے عرض کیا کہ میں نے قرآن کریم میں یہ آیت تلاوت کی ہے :-

وَفِي السَّمَاءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوعْلُونَ (پ ۳۱، ۱۸ آیت ۲۲)

اور تمہارا رزق اور جو تم سے وعدہ کیا جاتا ہے آسمان میں ہے۔

یہ آیت پڑھ کر میں نے سوچا کہ میرا رزق آسمان میں ہے اور میں زمین میں تلاش کر رہا ہوں۔ حضرت عمرؓ یہ سن کر رونے لگے اور کہنے لگے کہ توجہ کتنا ہے اس واقعے کے بعد حضرت عمرؓ اس کے پاس تشریف لے جاتے تھے اور کچھ دیر اس کے پاس بیٹھا کرتے تھے ابو حمزہ الخراسانی فرماتے ہیں کہ میں نے ایک سال حج کیا سفر کے دوران میں ایک جگہ سے گزر رہا تھا کہ راہ میں کنواں آیا میرا پاؤں پھسلا اور میں اس میں گر پڑا دل میں خیال آیا کہ مجھے مدد کے لئے کسی کو آواز دینی چاہیے پھر میں نے کہا کہ میں کسی کو آواز نہیں دوں گا اور اس بات پر قسم بھی کھائی میں ابھی اسی ادھیڑ میں تھا کہ اچانک دو آمدنی کنویں کی منڈیر پر آئے ان میں سے ایک دوسرے سے کہنے لگا آؤ اس کنویں کو بند کر دیں ایسا نہ ہو کہ کوئی آنے والے والا اس میں گر کر ہلاک ہو جائے چنانچہ وہ دونوں ہانس اور چٹائی لے کر آئے اور کنویں کا دہانہ بند کرنے لگے اس وقت میرا ارادہ ہوا کہ میں حج کر آؤں دوں پھر میں نے دل میں سوچا کہ میں جس ذات سے فریاد کروں گا وہ ان دونوں سے زیادہ قریب ہے چنانچہ میں پُر سکون بیٹھا رہا کچھ دیر بعد کوئی چیز آئی اور کنویں کا منہ کھول کر اس میں پاؤں لٹکا کر بیٹھ گئی اور کچھ گنگناہٹ کے سے انداز میں مجھ سے کہنے لگی کہ میرے پاؤں پکڑ لے میں سمجھ گیا کہ وہ چیز کیا چاہتی ہے چنانچہ میں اس کے پاؤں سے لپٹ گیا اور اس نے مجھے کنویں سے باہر کھینچ لیا میں نے دیکھا کہ وہ ایک درندہ تھا ہاتھ ٹھیک سے آواز آئی کہ اے ابو حمزہ کیا یہ اچھا نہیں ہوا کہ ہم نے تجھے موت (درندے) کے ذریعے موت سے نجات دی میں یہ آواز سن کر وہاں سے چل پڑا میری زبان پر یہ اشعار خود بخود جاری ہو گئے۔

نَهَانِي حَيَاتِي مِنْكَ أَنْ أَكْشِفَ الْهَوَىٰ - وَأَغْنِيَنِي بِالْفَقْرِ مِنْكَ عَنِ الْكَشْفِ
تَلَطَّفْتُ فِي أَمْرِي فَأَبْنَيْتُ شَاهِدِي - إِلَى غَائِبِي وَاللَّطْفُ يُنَرِّكُ بِاللَّطْفِ

تَرَأَيْتَ لِيْ بِالْغَيْبِ حَتَّى كَانَمَا تُبَشِّرُنِيْ بِالْغَيْبِ أَنْكَ فِي الْكَفِّ
أَرَاكَ وَبِيْ مِنْ هَيْبَتِيْ لَكَ وَخَشْيَةُ فَتَوَسَّسْنِيْ بِاللَّطْفِ مِنْكَ وَبِالْعَطْفِ
وَتُحْيِيْنِيْ مُحِبَّتًا أَنْتَ فِي الْحُبِّ حَتْفُهُ وَكَأَنَّكَ كَوْنُ الْحَيَاةِ مَعَ الْحَتْفِ

(مجھے اس بات سے شرم آئی کہ میں اپنی خواہش کا اظہار کر دیا، میں اس لئے بھی بے پروا رہا کہ مجھ پر میرا حال مشکف ہے، تو نے مجھ پر مہمانی کی، اور میرا حال اس پر ظاہر کر دیا جو مجھ سے اوچھل تھا، یہ مہمانی تیرے لطف و کرم کی مظہر ہے، تو میرے لئے غیب سے ظاہر ہوا گویا مجھے یہ بشارت دے رہا ہو کہ تو محفوظ ہے، میں تجھے دیکھ کر گھبرا جاتا ہوں، اور وحشت زدہ ہو جاتا ہوں، تو مجھے اپنے لطف و کرم سے انیسیت بخشتا ہے، اور میری وحشت دور کرتا ہے، تو اپنے دوست کو زندگی دیتا ہے، اور اس کی موت بھی تیری محبت میں ہے (یعنی اور زندگی

تیرے ہی ہاتھ میں ہے) کس قدر حیرت کی بات ہے کہ تو موت سے زندگی دیتا ہے۔

اس طرح کے واقعات بے شمار ہیں، اگر کسی شخص کے پاس مضبوط ایمان ہو، اور وہ کسی پریشانی اور تنگدلی کے ساتھ ایک ہفتہ کے بقدر بھوکا رہنے پر قدرت بھی رکھتا ہو، اور اس کا اس بات پر مکمل اعتقاد ہو کہ اگر مجھے ہفتہ گزرنے کے بعد بھی رزق نہیں ملا تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک میرا مرنا میرے جینے سے بہتر ہے، اس لئے تو اس نے مجھ پر اپنے رزق کے دووازے بند کر دیئے ہیں، امید یہ ہے کہ ایسے شخص کا توکل مکمل اور دیر پا ہو گا۔

عیال دار کا توکل جاننا چاہیے کہ توکل کے باب میں عیالدار کا حکم تھا شخص کے حکم سے مختلف ہے، اس لئے کہ تمام شخص کا توکل دو باتوں سے مکمل ہوتا ہے، ایک یہ کہ وہ کسی انتظار، اور ضیق نفس کے بغیر ہفتہ بھر تک بھوکا رہنے پر قادر ہو، اور دوسرے یہ کہ ایمان کے ان شعبوں پر عمل پیرا ہو جو ابھی مذکور ہوئے، جن میں سے ایک یہ ہے کہ اگر رزق میسر نہ ہو تو موت پر راضی رہے، اور یہ جانے کہ موت اور بھوک ہی اس کا رزق ہے، یہ اگرچہ دنیا کے اعتبار سے نقص ہے، لیکن آخرت میں زیادتی اور اجر کا باعث ہے، یہ اعتقاد کرے کہ اسے دو رزقوں میں سے بہتر رزق دیا گیا ہے، اور وہ آخرت کا رزق ہے، بھوک اس کے لئے مرض الموت ہے، اسے اس پر راضی رہنا چاہیے، تقدیر میں اسی طرح لکھا ہے، ان دو باتوں پر عمل کرنے سے تمام شخص کا توکل مکمل ہو جائے گا۔ لیکن اہل و عیال کو بھوک پر صبر کرنے کا مکتب بنانا صحیح نہیں ہے، اور نہ یہ بات درست ہے کہ ان کے رو بہو توحید پر لکھ دیا ہے، اور انہیں بتلایا جائے کہ بھوک ایک ایسا رزق ہے جس پر رکھ کرنا چاہیے، یہ رزق شاذ و ناوردی کسی کو ملتا ہے۔ ایمان کے باقی ابواب کے لئے بھی یہی حکم ہے، اہل و عیال کے دل و دماغ میں یہ اعتقادات زہد و سستی راسخ نہیں کئے جاسکتے، اس لئے عیالدار آدمی کا توکل کمانے والے کا توکل ہو گا۔ یہ توکل کا تیسرا مقام ہے۔ اور اس کی مثال حضرت ابو بکر الصدیق کا توکل ہے کہ وہ کمانے کے لئے بازار تشریف لے جایا کرتے تھے، عیالدار شخص کے لئے جائز نہیں کہ وہ اپنے عیال کو متوکل بنانے کے لئے جنگل کا رخ کرے اور ان پر توجہ نہ دے، اور نہ ان کے رزق کا اہتمام کرے، اس کا یہ عمل انہیں ہلاک کر سکتا ہے، اس صورت میں ان کی موت کی ذمہ داری اس پر ہوگی، اور وہ آخرت میں مواخذے سے بچ نہیں پائے گا۔

تحقیقی بات یہ ہے کہ اس سلسلے میں عیالدار اور عیال دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے، اگر اس کی عیال میں کچھ روز بھوکا رہنے اور بھوک پر صبر کرنے کی قوت ہو اور وہ بھوک کی وجہ سے حاصل ہونے والی موت کو گلے لگانے کے لئے تیار ہوں، اور اس موت کو آخرت کا رزق اور اجر تصور کرتے ہوں تو اس کے لئے ان کے حق میں بھی توکل کرنا جائز ہے، جس طرح بیوی بچے عیال ہوتے ہیں، اسی طرح آدمی کا نفس بھی اس کے لئے عیال ہے، اس کے لئے یہ جائز نہ ہو گا کہ وہ اپنے نفس کو ہلاک کر ڈالے، الایہ کہ وہ بھوک پر صبر کر کے اس کے ساتھ تعاون پر آمادہ ہو، لیکن اگر بھوک کی وجہ سے دل میں اضطراب پیدا ہوتا ہے، اور عبادت میں خلل واقع ہوتا ہو تو، تمام شخص کے لئے بھی توکل جائز نہ ہو گا، روایت ہے کہ ابو تراب غشی نے ایک صوفی کو دیکھا جو تین دن بھوکا رہنے

کے بعد خربوزے کے چھلکے کی طرف ہاتھ بڑھا رہا تھا انہوں نے فرمایا کہ یہ تصوف تجھے زیب نہیں دیتا، تجھے تو بازار میں ہونا چاہیے، ان کا مطلب یہ تھا کہ تصوف توکل کے ساتھ سمجھ ہوتا ہے، اور توکل اس وقت تک درست نہیں ہوتا جب تک آدمی تین دن سے زائد عرصے تک بھوک پر مبرنہ کر سکتا ہو، ابو علی روزبہاری کہتے ہیں کہ اگر کوئی فقیر پانچ دن کے بعد بھوک کی شکایت کرے تو اسے بازار کی راہ دکھاؤ اور یہ کہو کہ وہ محنت کرے، اور رزق کمائے، اس کا جسم اس کا خیال ہے، ایسا توکل درست نہیں ہے جس سے خیال کو نقصان ہو، اور خیال میں صرف ایک فرق ہے، اور وہ یہ کہ آدمی اپنے نفس پر تشدد کر سکتا ہے، اور اسے صبر کا عادی بنا سکتا ہے، لیکن خیال پر تشدد نہیں کر سکتا۔

اس تفصیل سے تم پر یہ بات واضح ہو چکی ہوگی کہ توکل اسباب سے لا تعلق ہونے کا نام نہیں ہے، بلکہ کچھ عرصے تک بھوک پر صبر کرنے اور موت پر راضی رہنے کا نام ہے، رزق میں تاخیر شاذ و نادر ہی ہوتی ہے، شہروں اور بستیوں میں رہنا یا جنگلوں میں بودو باش اختیار کرنا جہاں عادات کا گھاس اور سبزیاں مل جاتی ہیں بھاکے اسباب میں سے ہے۔ تاہم اس زندگی میں تھوڑی سی اذیت ہے، کیوں کہ ہمیشہ گھاس کھانے پر نفس راضی نہیں ہو سکتا، اللہ یہ کہ صبر کرے، اور شہروں میں توکل کرنا جنگل میں توکل کرنے کے مقابلے میں اسباب سے قریب تر ہے، بہر حال شہری زندگی ہو یا جنگلی زندگی یہ سب بھاکے اسباب ہیں، لیکن لوگ ان اسباب کی طرف زیادہ مائل ہیں جو واضح حیثیت رکھتے ہیں، ان اسباب کو وہ اسباب ہی نہیں سمجھتے، اس لئے کہ ان کا ایمان کمزور ہے، ان کی حرص زیادہ ہے، آخرت کے لئے دنیا میں تکلیف اٹھانے پر صبر کرنے کی طاقت کم ہے، طول اہل، اور سوء خلقی کے باعث ان کے دلوں پر بزدلی غالب ہے، جو شخص آسمان و زمین کے ملکوت پر نظر ڈالتا ہے اس پر یہ بات اچھی طرح منکشف ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ملک اور ملکوت کا نظام ایسا رکھا ہے کہ کوئی بندہ اپنے رزق سے محروم نہیں رہ سکتا خواہ وہ اس کی فکر کرے یا نہ کرے۔ دیکھو ماں کے پیٹ میں رہنے والا بچہ اپنی غذا فراہم نہیں کر سکتا، اور نہ وہ اس کی فکر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے، لیکن اللہ نے اس کی ناف ماں کی ناف سے مربوط کر کے کچھ ایسا نظام بنا دیا ہے کہ ماں کی غذا کا ایک حصہ بچے کو بھی ملتا ہے۔ پھر جب وہ ماں کے پیٹ سے باہر آتا ہے تب بھی فکر و تردد کے بغیر رزق پاتا ہے، ماں کے دل میں اس کی محبت اس طرح ڈال دی گئی ہے کہ وہ خواہ مخواہ اس کی فکر کرتی ہے، اور وہ اس کے لئے مجبور ہے اس کے دل میں اللہ تعالیٰ نے محبت کی ایسی آگ روشن کر دی ہے جو بجھ نہیں سکتی، پھر جب بچہ پیدا ہو جاتا ہے تو اس کی غذا ماں کا دودھ ہوتی ہے، جب تک کہ اس کے دانت نہیں نکلتے اور وہ روٹی چبا کر کھانے کا عادی نہیں ہوتا، اس عمر کے لئے دودھ کو اس لئے بھی غذا بنایا گیا کہ وہ اپنے ضعف اور نرمی کے باعث ٹھنڈی غذا کا تحمل نہیں ہو سکتا، مثلاً ماں کی چھاتی سے دودھ پیدا کرنے اور حسب ضرورت باہر نکالنے میں بچے کی کسی تدبیر کو دخل ہے، یا ماں اس سلسلے میں کوئی تدبیر کرتی ہے؟ پھر جب بچہ اس قابل ہو جاتا ہے تو ٹھنڈی غذا ہضم کر سکے تو اس کے منہ میں دانت پکلیاں اور ڈاڑھیں پیدا کر دی جاتی ہیں، چنانچہ جب کچھ اور بڑا ہو جاتا ہے تو اس کے لئے تعلیم اور راہ آخرت پر سلوک کے اسباب پیدا کر دیے جاتے ہیں، اب بلوغ کے بعد ناموس بننا عین جمالت ہے۔ بلوغ سے اسباب معیشت کچھ کم نہیں ہوتے بلکہ زیادہ ہی ہوتے ہیں پہلے کمانے پر قادر نہیں تھا، اب قادر ہو گیا، یعنی قدرت بطور سبب معیشت زیادہ صفا کی گئی، البتہ پہلے اس پر ایک مشفق شخص کا سایہ تھا یا باپ کا۔ اور اس کی شفقت و امداد زیادہ تھی، وہ اسے دن میں ایک یا دو بار کھانا پلاتا تھا، اور یہ اس لئے تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے دل میں شفقت اور محبت پیدا کر دی تھی، اب یہ شفقت اور محبت ایک دل سے نکال کر مسلمانوں بلکہ تمام اہل شہر کے دلوں میں پیدا کر دی گئی ہے، یہاں تک کہ جب ان میں سے کوئی کسی محتاج اور تنگدست کو دکھتا ہے تو اس کا دل رنجیدہ ہوتا ہے، اور اس کے باطن میں یہ داعیہ پیدا ہوتا ہے کہ کسی طرح اس کی یہ حاجت دور کر دی جائے، پہلے ایک مشفق تھا، اب ہزاروں مشفق پیدا ہو گئے، پہلے یہ لوگ اس پر اس لئے شفیق نہیں تھے کہ اسے ماں باپ کی کفالت میں پرورش پاتے ہوئے دیکھتے تھے، ان کے لئے ان کی شفقت مخصوص تھی، اس لئے عام لوگوں نے یہ ضرورت محسوس نہیں کی کہ اس پر خود بھی شفقت کریں اگر وہ یتیم ہوتا تو یقیناً اللہ تعالیٰ اس کے لئے لوگوں کے دلوں میں جذبہ

سید اکرتا یا کسی ایک کو یا چند مسلمانوں کو اس کی دھیری اور کفالت پر مجبور کرنا۔ اس ارذانی کے دور میں آج تک کہیں یہ نہیں کہ فلاں جگہ کوئی یتیم بچہ بھوک کی وجہ سے ہلاک ہو گیا ہو، حالانکہ وہ بچہ اپنے لئے شکر بھی نہیں ہو سکتا نہ اس کا کوئی مس کفیل ہوتا ہے، صرف اللہ تعالیٰ اس شفقت کے واسطے سے اس کا کفیل ہوتا ہے جو اس نے اپنے بندوں کے دلوں میں پیدا فرمائی ہے۔

جب صورت حال یہ ہے تو پھر کیا ضرورت ہے کہ بلوغ کے بعد رزق کے لئے فکر مند ہو، جب کہ بچپن میں کوئی فکر نہ تھا، حالانکہ پہلے صرف ایک مشفق تھا، اب ہزاروں مشفق موجود ہیں، اگرچہ ماں کی شفقت مضبوط اور وسیع تھی مگر ایک تھی، اور اب ہزاروں کی شفقتیں ہیں، جو بظاہر تھوڑی تھوڑی ہیں، لیکن بحیثیت مجموعی نہایت وسیع اور قوی تر ہیں، یتیم سے یتیم اس قدر خوش گوار زندگی گزارتے ہیں کہ وہ بچے بھی نہیں گذار پاتے جن کے سروں پر والدین کا سایہ ہے۔ بہر حال لوگوں کی شفقت میں کمی کا ازالہ ان کی کثرت اور مقدار ضرورت کے مطابق قسم سے ہو جاتا ہے۔ شاعر کے یہ دو شعر کتنے عمدہ ہیں۔

جَرَى قَلَمُ الْقَضَاءِ بِمَا يَكُونُ - فَسَيَبَانُ النَحْرُكَ وَالسَّكُونُ
جُنُونٌ مِنْكَ أَنْ تَسْعَى لِلرِّزْقِ - وَتُزْرَقَ فِي غَشَاوَةِ الْجَنِينِ

(جو ہونے والا ہے اس کے لئے فیصلے کا قلم چل چکا ہے، اب حرکت و سکون دونوں برابر ہیں، یہ تیرا پاگل پن ہے کہ تو رزق کے لئے کوشاں ہے، حالانکہ بچے کو رحم مادر میں رزق عطا کیا جاتا ہے۔)

کیا یتیم اور بالغ برابر ہیں یہاں یہ اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ لوگ یتیم کی اس لئے کفالت کرتے ہیں کہ اس کی کم عمری کے باعث اسے کسب و سعی سے عاجز سمجھتے ہیں، جب کہ یہ شخص بالغ ہے اور کسب پر قدرت رکھتا ہے، ایسے شخص کی طرف عوام التفات نہیں کریں گے، بلکہ یہ کہیں گے کہ یہ شخص تو ہماری طرح ہے، اسے خود جدوجہد کرنی چاہیے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ لوگ اس طرح کی باتیں اس وقت کریں گے جب یہ شخص بیکار بیٹھے گا، اس صورت میں ان کا کہنا صحیح ہو گا، ورنہ اس شخص کو کمانا چاہیے، بیکاری اور توکل میں کوئی مناسبت نہیں ہے، توکل تو دین کے مقامات میں سے ایک اہم ترین مقام ہے، اس سے اللہ تعالیٰ کے لئے فارغ ہونے پر مدد ملی جاتی ہے۔ ہاں اگر وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ مشغول ہو، مگر یا مسجد کو لازم پکڑے علم اور عبادت پر موانعت کرے تو لوگ اسے ترک کسب پر ملامت نہیں کریں گے، اور نہ اسے کمانے کا ملگت کریں گے، بلکہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس کا اشتغال لوگوں کے دلوں میں اس کے لئے محبت اور عظمت پیدا کر دے گا، یہاں تک کہ وہ اس کی ضرورت سے زیادہ لے کر آئیں گے۔ تاہم یہ ضروری ہے کہ وہ گھر کے دواڑے بند نہ کرے اور نہ لوگوں سے راہ فرار اختیار کر کے پھاٹوں پر پناہ گزین ہو۔ آج تک کسی ایسے عالم یا عابد کے بارے میں جس نے اپنے اوقات اللہ تعالیٰ کے لئے وقف کر دیے ہوں یہ نہیں سنا گیا کہ وہ بھوک سے بے تاب ہو کر مر گیا ہو، اور نہ ایسی بات کوئی نے گا، بلکہ اسے لوگ اس قدر دیتے ہیں کہ اگر وہ ایک بڑے جماعت کو کھلانے کا ارادہ کرے تو ہآسانی ایسا کر سکے جو شخص اللہ کے لئے ہوتا ہے اللہ اس کے لئے ہوتا ہے، اور جو اللہ کے ساتھ مشغول ہوتا ہے اللہ تعالیٰ لوگوں کے دلوں میں اس کی محبت پیدا کر دیتا ہے، اور انہیں اس کے لئے مسخر کر دیتا ہے جیسے ماں کا دل بچے کے لئے مسخر کر دیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت و قدرت سے ملک اور ملکوت کے لئے ایسا نظام ترتیب دیا ہے جو ملک اور ملکوت والوں کو پوری طرح کفایت کرتا ہے، جو شخص اس نظام کا مشاہدہ کرتا ہے وہ ختم اور مدبر کی عظمت پر اتماد کرتا ہے اس کے ساتھ اشتغال رکھتا ہے، اس پر ایمان رکھتا ہے، اس کی نظر مدبر اسباب پر رہتی ہے، اسباب پر نہیں رہتی، یہ صحیح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایسا نظام جاری نہیں کیا کہ جو بندہ اس کے ساتھ اشتغال رکھتا ہے اسے ہمیشہ طوع پر بندوں کے گوشت، عمدہ لباس، اور بہترین گھوڑے عطا کئے جائیں، اگرچہ کبھی کبھی یہ چیزیں عطا بھی کر دی جاتی ہیں، تاہم اس نے جو نظام بنایا ہے اس کے مطابق ہر اس شخص کو جو اللہ کی عبادت میں مشغول رہتا ہو ہفتہ میں ایک مرتبہ جو کی ایک روٹے یا گھاس کی چند پتیاں کھانے کے لئے ضرور ملتی ہیں۔ یہ تو کم سے کم درجہ ہے،

ورنہ عموماً اس مقدار سے کچھ زیادہ ہی ملتا ہے، بلکہ بعض اوقات اس قدر مل جاتا ہے جو قدر حاجت سے بھی زیادہ ہوتا ہے، جو لوگ توکل نہیں کرتے اس کا سبب سوائے اس کے کیا ہو سکتا ہے کہ ان کے نفس بیش کوشی کی طرف مائل ہیں، اور وہ یہ چاہتے ہیں وہ انہیں بیشہ عمدہ اور نرم لباس اور مرغین غذا میں ملتی رہیں۔ یہ چیزیں راہ آخرت سے تعلق نہیں رکھتیں، اور نہ تردد اور اضطراب کے بغیر حاصل ہوتی ہیں، بلکہ بعض اوقات تردد و اضطراب سے بھی حاصل نہیں ہوتیں، شاذ و نادر ہی ایسا ہوتا ہے کہ لوگوں کو یہ تمام نعمتیں حاصل ہو جائیں۔ جس شخص کی چشم بصیرت وا ہے وہ اپنی سعی و تردد پر مطمئن نہیں ہوتا، بلکہ یہ سمجھتا ہے کہ اس کے اثرات ضعیف ہیں، یہ شخص صرف ملک اور ملکوت کے مدبر پر اطمینان کرتا ہے جس نے اپنی مخلوق کے لئے ایسا نظام قائم کر رکھا ہے کہ کوئی بندہ رزق سے محروم نہیں رہتا، اگرچہ تاخیر ہو جاتی ہے، اور یہ تاخیر بھی بہت کم ہوتی ہے۔

بہر حال جس شخص پر یہ امور منکشف ہوں گے، اور ساتھ ہی اس کے دل میں قوت اور نفس میں شجاعت ہوگی تو اس کا وہ ثمر ہو گا جس کی طرف حضرت امام حسن بصریؒ نے اپنے اس قول میں ارشاد فرمایا ہے کہ میرا دل یہ چاہتا ہے کہ تمام اہل بعرو میرے حوالہ ہوں اور ایک ایک دانہ ایک اشرفی کا ملتا ہو۔ وہیب ابن الورد کہتے ہیں کہ اگر آسمان تاجے کا بن جائے اور زمین پیسے کی اور میں رزق کے لئے کوشش کروں تو یہ میرے خیال میں شرک ہے۔

اس تفصیل سے ثابت ہو چکا ہے کہ توکل ایک سمجھ میں آنے والا مقام ہے، اور اس مقام تک پہنچنا ہر اس شخص کے لئے ممکن ہے جو جدوجہد کرے اور نفس پر سختی روا رکھے۔ اس تفصیل سے تم نے یہ بات بھی جان لی ہے کہ جو شخص اصل توکل یا اس کے امکان کا مفکر ہے وہ جاہل محض ہے، اور اس کا انکار عناد پر مبنی ہے۔ جس طرح ذوق کی راہ سے مقام توکل تک نہ پہنچنا افلاس ہے، اسی طرح یہ بھی افلاس ہے کہ تم اس مقام کا انکار کرو، تم ان دونوں باتوں کو جمع نہ کرو یعنی ایسا نہ کرو کہ اس مقام تک بھی نہ پہنچ پاؤ، اور اس کو ممکن بھی نہ سمجھو۔ اگر تم نے یہ مباحث غور سے سنے ہیں، اور عمل کرنے کا ارادہ رکھتے ہو تو تھوڑے پر قاعدت کرو، بقدر ضرورت پر راضی رہو، یہ چیز تمہیں ضرور ملے گی، اگرچہ تم اس سے فراری کیوں نہ اختیار کرو، اگر تم نے ان ہدایات پر عمل کیا جو توکل کے باب میں لکھی گئی ہیں تو تمہارا رزق ایسے ذرائع سے تم تک پہنچے گا کہ تمہیں اس کا گمان بھی نہ ہو گا۔ تقویٰ اور توکل کو اپناؤ، تمہیں خود اس آیت کی صداقت کا تجربہ ہو جائے گا۔

وَمَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ لِّمَخْرَجًا وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ
(پ ۲۸ ر ۱۷ آیت ۳)

اور جو شخص اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لئے نجات کی شکل نکال دیتا ہے اور اس کو ایسی جگہ سے رزق پہنچاتا ہے، جہاں اس کا گمان بھی نہیں ہوتا۔

اللہ تعالیٰ اس امر کا متکفل نہیں ہے کہ تمہیں مرغ و مای عطا کرے، بلکہ اس نے اس رزق کا وعدہ کیا ہے جس سے زندگی قائم رہے یہ رزق ہو اس شخص کو عطا کیا جاتا ہے جو اپنے کفیل سے متعلق رہے، اور اس پر ایمان رکھے۔ تمہیں یہ بات جان لینی چاہیے کہ رزق کے وہ اسباب جو بظاہر تمہیں نظر آتے ہیں ان سے کہیں زیادہ وہ اسباب ہیں جو تمہاری نظروں سے اوچل ہیں، رزق کے بے شمار راستے ہیں، اور لامحدود راہیں ہیں، ان کی نشاندہی نہیں کی جاسکتی کیوں کہ یہ راہیں آسمان سے نکلتی ہیں، اور تمام روئے زمین پر پہنچتی ہیں۔ قرآن کریم میں ہے:-

وَفِي السَّمَاءِ عِزٌّ لِّكُمْ وَمَا تَوْعَلُّونَ
(پ ۳۱ ر ۱۸ آیت ۲۲)

اور تمہارا رزق اور جو تم سے وعدہ کیا جاتا ہے آسمان میں ہے۔

آسمان کے اسرار سے کوئی واقف نہیں ہے۔ روایت ہے کہ کچھ لوگ حضرت جنید بغدادیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے، آپ نے ان

سے دریافت فرمایا کہ تم کسی چیز کی تلاش میں ہو، انہوں نے عرض کیا کہ ہم رزق تلاش کر رہے ہیں فرمایا : اگر تمہیں رزق ملنے کی جگہ معلوم ہو تو تلاش کرو، ہم نے عرض کیا کہ ہم اللہ سے مانگیں گے، فرمایا : اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ وہ تمہیں بھول گیا ہے تو ضرور مانگو، انہوں نے عرض کیا : اگر یہ بات ہے تو ہم گھر میں جا کر بیٹھتے ہیں اور توکل کرتے ہیں، اور دیکھتے ہیں کہ رزق کہاں سے آئے گا۔ حضرت جنیدؒ نے فرمایا : تجربے کے لئے توکل کرنا مشکوک ہے، انہوں نے عرض کیا : اچھا آپ ہی کوئی تدبیر بتلائیں فرمایا : تدبیر نہ کرو، احمد ابن میسۃ الحمران کہتے ہیں کہ میں جنگل میں تھا، مجھے بہت زیادہ بھوک لگی، میرے نفس نے شدت سے اس امر کا تقاضا کیا کہ میں اللہ تعالیٰ سے کھانے کی درخواست کروں، مگر پھر مجھے خیال آیا کہ یہ متوکلین کا شیوہ نہیں ہے، تب نفس نے یہ خواہش کی کہ اللہ تعالیٰ سے مبرکی درخواست کروں، ابھی میں دعا کے الفاظ زبان پر لانا ہی چاہتا تھا کہ کسی غیبی آواز نے مجھ سے اس طرح خطاب کیا :-

وَنَزَعْمُ أَنَّهُ مِنَّا قَرِيبٌ - وَإِنَّا لَأَنْضِيعُ مَنْ أَمَّا
وَنَسْأَلُنَا عَلَى الْاِقْتَارِ جَهَنَّا - كَأَنَّ لَا تَرَاهُ وَلَا يَرَانَا

(وہ ہم سے قریب ہونے کا گمان کرتا ہے، جو ہمارے پاس آجاتا ہے، ہم اسے جاہ نہیں کرتے، وہ مفلسی میں مبر کا سوال کرتا ہے، گویا نہ ہم اسے دیکھ رہے ہیں اور نہ وہ ہمیں دیکھ رہا ہے)۔

تم نے یہ بات جان لی ہو گی کہ جس شخص کا دل منکسر اور قلب مضبوط ہوتا ہے، اور جس کا باطن بدلی کے باعث ضعیف نہیں ہوتا، اور جو اللہ تعالیٰ کی تدبیر پر پختہ یقین اور اعتقاد رکھتا ہے اس کا نفس ہمیشہ مطمئن رہتا ہے، اس کا حال یہ ہے کہ اسے موت آئے گی اور موت کسی سے رک نہیں سکتی، اس شخص کو بھی موت کے حادثے سے دوچار ہونا ہے جیسے اللہ تعالیٰ پر اطمینان نہیں ہے۔ بہر حال تمام توکل یہ ہے کہ بندے کی طرف سے قاعدت ہو، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس وعدہ رزق کی تکمیل جو اس نے اپنے بندوں سے کیا ہے۔ اس نے قاعدت کرنے والوں تک رزق پہنچانے کا ایک نظام بنایا ہے، اور اس کی ضمانت لی ہے، جو تجربہ کرنا چاہے اس کا تجربہ کر لے وہ اپنی ضمانت میں سچا ہے، تم قانع بن کر تو دیکھو اس ضمانت کی صداقت کا مشاہدہ کر لو گے، ایسی ایسی جگہوں سے رزق پاؤ گے کہ تمہارے وہم و گمان میں بھی نہ ہو گا کہ فلاں جگہ سے رزق پہنچ سکتا ہے، مگر شرط یہی ہے کہ آدمی توکل میں اسباب کا ٹھکر نہ رہے، نہ ان سے امید وابستہ کرے، اس کا تمام تر التفات سبب الاسباب کی طرف ہو، جیسے لکھنے میں قلم پر نظر نہیں کی جاتی، بلکہ لکھنے والوں کے دل کا خیال کیا جاتا ہے، قلم کی اصل حرکت کا تعلق دل سے ہے، اور کیوں کہ وہی اصل محرک ہے اس لئے یہ مناسب نہیں کہ اسے چھوڑ کر کسی دوسرے محرک کی طرف التفات کیا جائے، توکل کی یہ شرط اس شخص کے لئے جو زاد راہ لئے بغیر جنگلوں میں گھومتا ہے یا شہروں میں گمائی کی زندگی گزارتا ہے۔ لیکن وہ لوگ جو علم اور عبادت میں شہرت رکھتے ہیں جب دن رات میں ایک مرتبہ کھانے پر قاعدت کریں اگرچہ وہ لذت مند ہو، اور وہ موٹا پکڑا پنہیں جو اہل دین کی شان کے مطابق ہے تو انہیں یہ چیزیں ایسی جنگلوں سے ملتی رہتی ہیں جہاں سے انہیں گمان بھی نہیں ہوتا بلکہ بسا اوقات یہ چیزیں مقدار میں کئی گنی زیادہ ملتی ہیں ایسے لوگوں کا توکل نہ کرنا، اور حصول رزق کے لئے جدوجہد کرنا نہایت ضعف اور کوتاہی کی بات ہے۔ ان کی شہرت حصول رزق کا ایک بڑا ظاہری سبب ہے، انہیں اپنی شہرت کے باعث اتنا رزق مل جاتا ہے کہ اگر کوئی گناہ آدمی شہروں میں جا کر رہے اور رزق کمائے تو اسے اتنا رزق نہیں مل پاتا اس سے معلوم ہوا کہ اہل دین کے لئے رزق کا اہتمام کرنا برا ہے، اور اس سے بھی زیادہ برا اہتمام رزق ان علماء اور عابدین کا ہے جو علم و عبادت کے باعث شہرت رکھتے ہیں، انہیں تو قانع ہونا چاہیے، قانع عالم کو نہ صرف اس کا رزق ملتا ہے، بلکہ ان لوگوں کا بھی رزق ملتا ہے جو اس کے ساتھ رہتے ہیں۔

اگر کوئی عالم لوگوں سے لینا پسند نہیں کرتا، بلکہ اپنے دست و بازو سے کما کر کھانا چاہتا ہے تو یہ صورت اس عالم کی شان کے مطابق ہے جو علم و عمل کے ظاہر و باطنی میر سے محروم ہے، اس لئے کہ کسب کی مشغولیت بندہ کو باطن کی سیر سے

روک دیتی ہے، اس لئے علماء کے لئے بہتر یہی ہے کہ وہ سیراط میں مشغول ہوں، اور اپنی ضرورت کے لئے ان لوگوں کے ہدایا قبول کر لیا کریں جو ان ہدایا کے ذریعے اللہ کے تقرب کے خواہاں ہیں۔ اس طرح فکر معیشت سے یکسوئی رہے گی، اور اللہ کے لئے ہو کر رہنے میں کوئی چیز مانع نہیں ہوگی، اور ان لوگوں کے اجر و ثواب پر بھی اعانت ہوگی جو ان کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی قربت چاہتے ہیں۔

جو شخص اللہ تعالیٰ کی عادات جاریہ پر نظر رکھتا ہے وہ یہ بات جانتا ہے کہ رزق بقدر اسباب و وسائل عطا نہیں کیا جاتا، چنانچہ کسی بادشاہ نے ایک دانشور سے پوچھا کہ ایسا کیوں ہوتا ہے کہ احق کو رزق عطا کر دیا جاتا ہے اور جھنڈ محروم رہتا ہے۔ دانشور نے جواب دیا کہ اس طرح اللہ تعالیٰ اپنے وجود کا ثبوت دیتا چاہتا ہے، اگر ہر جھنڈ کو رزق عطا کیا جاتا ہے اور ہر احق کو محروم رکھا جاتا تو لوگ یہ کہہ سکتے تھے کہ جھنڈ کو اس کی عقل نے رزق دلایا ہے، اور جب معاملہ اس کے برعکس ہے تو ثابت ہوا کہ رازق عقل نہیں ہے، بلکہ کوئی اور ہی ہے، یہاں ظاہری اسباب معتبر نہیں ہیں بقول شاعر:-

وَلَوْ كَانَتْ الْأَرْزَاقُ تَجْرِي عَلَى الْحِجَابِ هَلَكُنْ لِأَمْرِ جَهْلِيهِنَّ الْبَهَائِمُ
(اگر رزق عقل پر عطا کئے جاتے تو پھر بے ہائم تو اپنی جمالت کی وجہ سے ہلاک ہی ہو گئے ہوتے۔)

اسباب سے تعلق میں متوکلیں کے احوال کی مثال جاننا چاہیے کہ مخلوق کی مثال اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایسی ہے جیسے کچھ سائل قصر شاہی کے دروازے سے متصل میدان میں جمع ہو جائیں، ان سب کو کھانے کی ضرورت ہو، اور اسی ضرورت کی تکمیل کے لئے وہاں اکٹھے ہوئے ہیں، چنانچہ بادشاہ بہت سے غلاموں کو روٹیاں دے کر دروازے پر بھیجے، اور انہیں حکم دے کہ وہ بعض لوگوں کو دو دو روٹیاں دیں، اور بعض کو ایک ایک روٹی دیں، اور کوشش یہ کریں کہ ان سائلین میں سے کوئی محروم نہ رہ جائے، پھر ایک شخص کو بھیج کر یہ اعلان کرائے کہ تمام سائلین پُر سکون رہیں، جب میرے غلام روٹیاں لے کر آئیں تو ان سے نہ چنیں، بلکہ ہر شخص اپنی جگہ اطمینان کے ساتھ کھڑا رہے، تمام غلام مسخر ہیں، اور حکم کے پابند ہیں، انہیں حکم دیا گیا ہے کہ وہ تم تک روٹیاں پہنچائیں، وہ لامحالہ اس حکم پر عمل کریں گے، تم میں سے جو شخص غلاموں سے چمے گا، اور انہیں تکلیف پہنچا کر دو روٹیاں لے گا اور میدان کا دروازہ کھلنے پر باہر نکلے گا تو میں اس پر ایک غلام مقرر کروں گا، یہاں تک کہ میں اسے اس دن سزا دوں جو میں نے اپنے نزدیک مقرر کر لیا ہے، وہ دن مجھے معلوم ہے لیکن میں اسے پوشیدہ رکھتا ہوں، اور جو شخص غلاموں کو تکلیف نہیں دے گا بلکہ خاموشی کے ساتھ ان کے ہاتھوں سے ایک روٹی لے لے گا اور اسی پر قناعت کرے گا میں اسے اسی مقرر دن پر جس میں دوسرے کو سزا دوں گا ایک قیمتی خلعت سے سرفراز کروں گا، اور جو سائل اپنی جگہ ٹھہرا رہے گا اور دو روٹیاں حاصل کرے گا نہ اسے سزا ہوگی اور نہ خلعت عطا کیا جائے گا، اور جو شخص محروم رہے گا، اور رات بھر بھوکا سوئے گا، نہ میرے غلاموں پر ناراض ہو گا، نہ بھوک کا شکوہ کرے گا میں اسے اپنا وزیر بناؤں گا، اور سلطنت کا نظم و نسق اس کے حوالے کروں گا۔

اس اعلان کے بعد سائلین کی چار قسمیں ہو گئیں، ایک قسم ان لوگوں کی ہے جن پر پیٹ کی شمتیں غالب ہیں، جب غلام روٹیاں لے کر آتے ہیں تو یہ لوگ اس حقوبت کی پروا نہیں کرتے جن سے انہیں ڈرایا گیا ہے، بلکہ ان پر ٹوٹ پڑتے ہیں، اور ٹر جھگڑ کر دو روٹیاں حاصل کر لیتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ کل میں بڑا فاصلہ ہے، ہمیں اب بھول لگ رہی ہے چنانچہ یہ دو روٹیاں لے کر نکل جاتے ہیں اور موعودہ سزا سے بچ نہیں پاتے، اس وقت حسرت و ندامت سے ہاتھ ملتے ہیں، لیکن اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ دوسری قسم میں وہ لوگ ہیں جنہوں نے سزا کے خوف سے غلاموں کو تکلیف نہیں پہنچائی، لیکن جب انہیں دو روٹیاں دی گئیں تو انہوں نے قبول کر لیں، کیوں کہ ان پر بھوک کا غلبہ تھا، یہ لوگ سزا سے تو محفوظ رہے، لیکن خلعت نہ پاسکے، تیسری قسم میں وہ لوگ ہیں جنہوں نے یہ سوچا کہ ہمیں کھلی جگہ پر بیٹھنا چاہیے، تاکہ جب غلام روٹیاں لے کر آئیں تو ہمیں نظر انداز نہ کر سکیں، تاہم جب وہ روٹی لے کر آئیں گے تو ہم دو کے بجائے ایک روٹی لیں گے اور اسی پر قناعت کریں گے، شاید ہم خلعت کا غرہ

سے سرفراز کر دیے جائیں۔ جو قحطی قسم میں وہ لوگ ہیں جو میدان کے کونوں میں چھپ گئے اور لوگوں سے ہٹ کر ایسی جگہ جا بیٹھے جہاں نظر نہ آسکیں انہوں نے کہا کہ اگر غلاموں نے ہمیں ڈھونڈ نکالا اور روٹیاں دینی چاہیں تو ہم صرف ایک روٹی لیں گے اور اسی پر قناعت کریں گے اور اگر وہ لوگ ہمیں نہ پائیں گے تو ہم بھوک کی تکلیف برداشت کریں گے اور اس پر صبر کریں گے شاید رات کٹ جائے اور غلاموں پر غصہ بھی نہ آئے تو وزارت کے منصب پر فائز ہو جائیں گے اور بادشاہ کا تقرب حاصل کر لیں گے۔ لیکن ان کا منصوبہ کامیاب نہیں ہوا اور غلاموں نے انہیں ڈھونڈ نکالا اور جہاں جہاں بھی وہ پائے گئے انہیں ایک ایک روٹے دیدی مسلسل کئی روز تک ایسا ہی ہوتا رہا ایک دن تین افراد کسی ایسی جگہ جا چکے جہاں غلاموں کی نظر نہیں پہنچ سکی۔ اور اس طرح وہ روٹی سے محروم رہے۔ انہیں اسی بھوک کے عالم میں رات گزاری پڑی۔ ان تین میں سے دو افراد نے رات کو بھوک کا شکوہ کیا اور غلاموں کی اس کوتاہی پر غصے سے غلغلہ مچا دیا اور خواہ مخواہ انہیں بھوکا سوتا پڑ رہا ہے صرف ایک شخص خاموش رہا۔ یہاں تک کہ صبح ہو گئی اس شخص کو قرب اور وزارت کا منصب ملا۔

اس مثال میں میدان سے مراد دنیوی زندگی ہے میدان کا دروازہ موت ہے اور نامعلوم مدت قیامت ہے اور منصب وزارت وہ وعدہ شہادت ہے جو متوکل کے لئے کیا گیا ہے اگر وہ بھوک سے مر جائے اور اس موت پر راضی ہو اس وعدے کی تکمیل میں قیامت تک تاخیر نہیں ہوگی کیونکہ شہداء اللہ تعالیٰ کے پاس زندہ رہتے ہیں اور انہیں رزق عطا کیا جاتا ہے جو لوگ دست و گرباں سمجھتے ہیں وہ ہیں جو اسباب میں حدود سے تجاوز کرتے ہیں اور منظر غلاموں سے مراد اسباب ہیں اور میدان کے کھلے حصے ہیں غلاموں کی نظروں کے سامنے بیٹھے والے وہ لوگ ہیں جو شہروں کی مسجدوں اور خانقاہوں میں خاموش اور پُر سکون بیٹھے رہتے ہیں اور گوشوں میں چھپنے والے لوگ وہ ہیں جو زاد راہ لئے غیر جنگلوں میں گھس گئے ہیں اسباب ان کی جستجو میں ہیں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ انہیں رزق مل جاتا ہے کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ رزق نہیں مل پاتا وہ اس حال پر بھی راضی رہتے ہیں اور کسی شکوے کے بغیر موت کو گلے لگا لیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو شہادت اور قرب الہی کی سعادت نصیب ہوتی ہے۔

مخلوق ان چار طبقوں پر منقسم ہے اگر دیکھا جائے تو سو میں سے نوٹے ایسے ہیں جو اسباب کے پیچھے پڑے رہتے ہیں اور سات ایسے ہیں جو شہروں میں مقیم رہ کر اپنی شہرت کے لئے تجاوز کرتے ہیں اور تین ایسے ہیں جو جنگلوں میں پھرتے ہیں ان تین میں سے دو رزق سے محروم پر شکوہ کرتے ہیں اور اسباب سے غصہ کرتے ہیں صرف ایک شخص ایسا رہ جاتا ہے جو بھوک کی اذیت پر صبر کرتا ہے اور اس حالت میں صبر پسند کرتا ہے یہی شخص قرب کے مرتبے تک پہنچتا ہے۔ سو میں ایک کی یہ نسبت بھی گزشتہ دور میں رہی ہوگی اب تو دس ہزار میں ایک شخص بھی ایسا نہیں ملے گا جو اسباب کا تارک ہو اور شخص اللہ تعالیٰ پر اعتماد کرے۔

دوسرا مقصد۔ حفظ منفعت جس شخص کو رزق کسب یا سوال یا کسی اور ذریعے سے مال حاصل ہو ہے اس شخص کے لئے اس مال کو ذخیرہ کرنے میں تین حال ہیں۔ پہلی حالت یہ ہے کہ فی الوقت ضرورت کے بقدر ملے لے لیے اگر بھوکا ہو تو کھالے نکالے ہو تو پین لے اور مکان کی ضرورت ہو تو مختصر مکان خرید لے اور باقی مال اسی وقت تقسیم کر ڈالے اس میں سے اور کچھ نہ لے نہ اس مقدار کے علاوہ بچا کر رکھے جس کی کسی کو ضرورت یا استحقاق ہے اسی نیت کے ساتھ بچا کر رکھے۔ ایسا شخص حقیقت توکل کے منتقصی پر عمل کرنے والا ہے اور یہ درجہ سب سے اعلیٰ ہے۔ دوسری حالت جو اس کے بالکل برعکس ہے اور توکل کی حدود سے خارج ہے یہ ہے کہ ایک سال یا اس سے زائد کے لئے بچا کر رکھے ایسا شخص کسی بھی حالت میں متوکل نہیں مانا جائے گا چنانچہ کہا جاتا ہے کہ صرف تین جانور ذخیرہ کرتے ہیں چوہا، چوہنی اور انسان۔ تیسری حالت یہ ہے کہ چالیس روز یا اس سے کم مدت کے لئے ذخیرہ کرے لیکن اس سلسلے میں علماء کا اختلاف ہے کہ یہ حالت آدمی کو اس درجے سے محروم کرتی ہے یا نہیں جس کا وعدہ متوکلین سے کیا گیا ہے۔ سبیل تشریٰ فرماتے ہیں کہ یہ شخص توکل کی حدود سے خارج ہو جائے گا خواص فرماتے ہیں کہ اگر اس نے چالیس روز کے لئے ذخیرہ کیا تو توکل کی حدود سے خارج نہیں۔ گاہ ابو طالب کی فرماتے ہیں کہ چالیس روز کی مدت سے زیادہ ذخیرہ کرنے سے بھی بندہ توکل سے خارج نہیں ہوتا۔ جب اصل ادخار (ذخیرہ کرنا) جائز ہے تو پھر اس اختلاف کے کوئی معنی نہیں

ہیں، مگر کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ ذخیرہ کرنا ہی توکل کے مترادف ہے، اس صورت میں میعاد مقرر کرنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی، اللہ تعالیٰ نے جو ثواب جس مرتبے پر رکھا ہے وہ اپنی برکت سے ہوتا ہے، اس کا ایک آغاز ہے، اور ایک انجام ہے، درمیان میں بہت سے درجات ہیں، جو لوگ اس کے انجام پر ہیں وہ سابقین اور آغاز والے اصحاب یحییٰ کہلاتے ہیں، پھر اصحاب یحییٰ کے بھی بہت سے درجات ہیں، اسی طرح سابقین کے بھی درجات ہیں، اصحاب یحییٰ کا بلند ترین درجہ وہاں سے شروع ہوتا ہے جہاں سابقین کے کم تر درجے کی انتہا ہوتی ہے اس صورت میں مدت مقرر کرنے کے کیا معنی ہیں۔

تحقیق بات یہ ہے کہ ذخیرہ نہ کرنے سے توکل اس وقت پورا ہوتا ہے جب اہل کوتاہ ہو، لیکن یہ قید لگانا صحیح نہ ہو گا کہ زیست کی بالکل امید نہ ہو، اس لئے کہ ایسا ہونا ممکن نہیں ہے، زیست کی امید ضرور ہوگی خواہ ایک ہی لمحے کے لئے کیوں نہ ہو، پھر طول اہل اور قصر اہل میں لوگ متفاوت ہیں۔ اہل کاکم تر درجہ ایک دن رات یا اس سے کم ساتتیں ہیں، اور انتہائی درجہ اس قدر ہے جس قدر انسان کی عمر ہوتی ہے۔ ان دونوں کے درمیان بیشار درجہ ہوتا ہے۔ جو شخص ایک مہینے سے زیادہ چھینے کی توقع نہ رکھے وہ اس شخص کے مقابلے میں مقصود سے قریب تر ہے جو ایک سال سے زیادہ چھینے کی امید رکھتا ہے۔ جن لوگوں نے چالیس دن کی قید لگائی ہے ان کے پیش نظر اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی میعاد ہے تو یہ غلط ہے، اس لئے کہ ان کی میعاد سے وہ مقدار بیان کرنی مقصود نہیں تھی جس میں اہل کی رخصت ہے، بلکہ یہ میعاد اس لئے مقرر کی گئی تھی تاکہ وہ اس موعودہ شی کے مستحق ہو جائیں جو چالیس دن گزرے بغیر نہیں مل سکتی۔ چالیس روز کے بعد اس موعودہ شی کے استحقاق کی بات آئے، ابہاراز ہے جو اللہ تعالیٰ عادی اپنے امور میں رکھتا ہے۔ چنانچہ حدیث شریف میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی مٹی کو اپنے ہاتھ سے چالیس روز تک خمیر کیا (ابو منصور و سلمیٰ۔ ابن مسعودؓ سلمانؓ) گویا اس مٹی کو خمیر کا استحقاق پانے میں چالیس روز کی مدت درکار تھی۔

جو شخص ایک برس سے زیادہ کے لئے جمع کرے گا وہ ضعیف القلب ہو گا، اور ظاہری اسباب کی طرف میلان رکھتا ہو گا ایسا شخص توکل کے مقام سے بہت دور ہے، اور اس نظام الہی کا معتقد نہیں ہے جو اس نے رزق کے لئے حتمی اسباب کی صورت میں قائم کر رکھا ہے، ایک سال سے زیادہ مدت کے لئے ذخیرہ کرنا اس لئے خلاف توکل ہے کہ پیداوار اور زکوٰۃ وغیرہ میں داخلی اسباب سے متاثر ہوتے ہیں، جو شخص ایک سال سے کم کے لئے ذخیرہ کرتا ہے اس کے لئے اس کے قصر اہل کے مطابق درجہ ہے، جس کا اہل دو مہینوں کا ہوتا ہے اس کا درجہ اس شخص سے کم ہوتا ہے جس کا اہل ایک ماہ کا ہوتا ہے، اور اس سے زیادہ ہوتا ہے جس کا اہل تین ماہ کا ہوتا ہے، گویا اس کا درجہ ان دونوں کے درمیان ہو گا، کوتاہی اہل کے علاوہ کوئی چیز ذخیرہ اندوزی سے مانع نہیں ہے۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ آدمی بالکل ذخیرہ نہ کرے، اگر قلب ضعیف ہو تو جس قدر ذخیرہ کم کرے گا اسی قدر افضل ہو گا۔ اس فقیر کا قصہ قابل غور ہے جس کو قسمل دینے کے لئے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور حضرت اسماءؓ کو حکم دیا تھا، چنانچہ ان دونوں حضرات نے اسے قسمل دیا، اور ایک چادر میں کفنا دیا، جب اسے قبر میں اتار گیا تو سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب سے فرمایا کہ یہ شخص قیامت کے دن اس حال میں اٹھے گا کہ اس کا چہرہ چودھویں رات کے چاند کی طرف چمکتا ہو گا، اور اگر اس میں ایک خصلت نہ ہوتی تو یہ شخص اس حالت میں اٹھتا کہ اس کا چہرہ آفتاب کی طرح روشن ہوتا، ہم (صحابہ) نے عرض کیا یا رسول اللہ! وہ خصلت کیا ہے؟ آپ نے ارشاد فرمایا وہ بہت زیادہ روزے رکھتا تھا، بدلتا تھا، گزارتا تھا، اللہ تعالیٰ کا بہت زیادہ ذکر کرنے والا تھا، مگر اس میں یہ عادت تھی کہ جب سردی کا موسم آتا تو گرمی کے کپڑے آنے والی گرمی کے لئے رکھ دیتا، اور گرمی کا موسم آتا تو سردی کے کپڑے آنے والی سردی کے لئے اٹھا کر رکھ دیتا۔ اس کے بعد سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مَنْ أَقْبَلَ مَا لَوْ تَنَبَّهَ الْيَقِينُ وَعَنِ نِعْمَةِ الصَّبْرِ (۱)

جو چیزیں تمہیں کم عطائی گئی ہیں ان میں یقین اور صبر کی عزیمت ہے۔

(۱) یہ روایت اس تفصیل کے ساتھ کہیں میں لی، البتہ اس کا آخری حصہ ابھی گزرا ہے۔

کوزہ دسترخوان اور اسی طرح وہ چیزیں جن کی عام طور پر ضرورت رہتی ہے اس حکم میں نہیں ہے۔ ان چیزوں کو ذخیرہ کرنے سے توکل کا درجہ کم نہیں ہوگا البتہ سردی کے کپڑوں کی ضرورت گرمی میں ہاتی نہیں رہتی اس لئے انہیں اٹھا کر رکھنا توکل کے درجہ کو کم کرتا ہے لیکن یہ اس شخص کے حق میں ہے جس کا دل ذخیرہ نہ کرنے سے پریشان نہ ہوتا ہو اس کی نظر لوگوں کے ہاتھوں پر نہ رہتی ہو بلکہ اس کا نفس وکیل برحق کے علاوہ کسی کی طرف متلفت نہ ہوتا ہو لیکن اگر ذخیرہ نہ کرنے سے دل مضطرب اور پریشان ہوتا ہو اور عبادت کرنے یا ذکر و فکر کرنے میں خلل واقع ہوتا ہو تو اس کے لئے ذخیرہ کرنا ہی بہتر ہے بلکہ اگر اس کے پاس کوئی ایسی جائیداد ہو جس کی آمدنی اس کی گذر بسر کے لئے کافی ہو اور اس کا دل اس کے بغیر عبادت کے لئے فارغ نہ ہوتا ہو تو اس جائیداد کو باقی رکھنا ہی اس کے حق میں بہتر ہے اس لئے کہ مقصد قلب کی اصلاح ہے تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کے ذکر کے لئے فارغ ہو جائے۔ مختلف مزاج کے لوگ ہیں بعض لوگ مال رکھ کر پریشان ہوتے ہیں اور بعض لوگ مال نہ رکھنے کے باعث مضطرب رہتے ہیں ممنوع وہ امر ہے جو دل کو اللہ کی عبادت سے غافل کر دے ورنہ دنیائی نفسا ممنوع نہیں ہے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم مخلوق کی تمام اصناف کی طرف مبعوث ہوئے ہیں ان میں تاجر بھی ہیں پیشہ ور بھی ہیں اور اہل صنعت بھی ہیں۔ آپ نے نہ کسی تاجر کو ترک تجارت کا حکم دیا نہ پیشہ ور کو اپنا پیشہ چھوڑنے کے لئے فرمایا اور نہ ان لوگوں سے تجارت کرنے یا پیشہ اختیار کرنے کے لئے کہا جو ان میں مشغول نہیں تھے بلکہ ان تمام طبقوں کو اللہ کی طرف بلایا اور انہیں بتلایا کہ ان کی کامیابی اور نجات صرف اس بات میں مضمر ہے کہ ان کے قلوب دنیا سے محروک ہو کر اللہ تعالیٰ کی طرف مائل ہوں اور اس کے ذکر و فکر میں مشغول ہوں۔ اشتغال کا بہترین ذریعہ قلب ہے۔ اس لئے جس شخص کا دل کمزور ہے اس کے لئے ضرورت کے بقدر ذخیرہ کر لینا بہتر ہے اور جس کا دل قوی ہے اسکے لئے ذخیرہ نہ کرنا اچھا ہے لیکن یہ تھا آدمی کا حکم ہے عیالدار کا حکم یہ ہے کہ اگر اس نے اپنے عیال کے ضعف قلوب کے پیش نظر اور ان کی تسکین و تسلی کے لئے سال بھر کے لئے رزق کا ذخیرہ کیا تو توکل کی حد سے خارج نہیں ہوگا البتہ ایک برس سے زائد مدت کے لئے ذخیرہ کرنا توکل کے مستثنیٰ ہے کیوں کہ ہر سال اسباب مکرر ہوتے ہیں۔ اس سے زیادہ ذخیرہ کرنا قلب کے انتہائی ضعف پر دلالت کرتا ہے جو توکل کی قوت کے خلاف ہے توکل اس شخص کو کہتے ہیں جو موجودہ دل رکھتا ہو اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم پر مطمئن ہو۔ اور ظاہری اسباب کے بجائے اس کے انتظام پر یقین رکھتا ہو روایات میں ہے کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عیال کے لئے ایک سال کی غذا جمع فرمائیں (بخاری و مسلم) دوسری طرف آپ نے حضرت ام ایمنہؓ وغیرہ کو فرمایا کہ وہ کل کے لئے کوئی چیز اٹھا کر نہ رکھیں (۱) ایک مرتبہ حضرت بلال حبشیؓ نے مدنی کا ایک کھڑا اظہار کے لئے بچا کر رکھ دیا آپ نے ان سے ارشاد فرمایا نہ

أَنْفَقَ بِلَالًا وَلَا تَخْشَ مِنْ ذِي الْعَرْشِ إِبْلَالَ۔ (بخاری۔ ابن مسعودؓ ابو ہریرہؓ)

اے بلال! اسے خرچ کر دے اور عرش والے سے مفلسی کا خوف نہ کر۔

ایک مرتبہ آپ نے انہی سے یہ ارشاد فرمایا نہ

إِذَا سَأَلْتُمْ فَلَا تَمْنَعُوا وَإِذَا عَطِيتُمْ فَلَا تَخْبُوا۔ (طبرانی حاکم۔ ابو سعید ققیہ)

جب تم سے مانگا جائے تو انکار مت کر اور جب تم کو دیا جائے تو پوشیدہ مت رکھ۔

ہم لوگوں کو سید امتہ کلین سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتدا کرنی چاہیے ایک طرف آپ کے قعر اہل کا یہ عالم تھا کہ پیشاب کرنے کے بعد فوراً تیمم فرما لیتے حالانکہ پانی قریب ہوتا ارشاد فرماتے کیا معلوم میں پانی تک پہنچ بھی پاؤں گا (ابن ابی الدینا۔ ابن عباس) دوسری طرف آپ نے ذخیرہ فرمایا اس سے آپ کے توکل میں کمی واقع نہیں ہوئی اس لئے کہ آپ کو اپنے ذخیرے پر اعتماد نہ تھا بلکہ اس ذات پر اعتماد تھا جو رزق عطا کرتا ہے اگر آپ نے ذخیرہ فرمایا تو اس لئے تاکہ امت کے لئے اس عمل کی مجائش نکل آئے ہو سکتا ہے آپ کی امت میں قوت رکھنے والے لوگ بھی ہوں لیکن وہ ہر حال آپ کے مقابلے میں ضعیف تر ہوں گے۔ (۱) یہ روایت پہلے بھی گذری ہے۔

آپ نے ایک برس کا ذخیرہ اس لئے نہیں فرمایا تھا کہ آپ میں یا آپ کے عیال میں ضعف تھا یا آپ کا اور آپ کے عیال کا اعتماد کمزور تھا بلکہ ذخیرہ کرنے کی وجہ یہی تھی کہ امت کے ضعیف اور کمزور لوگوں کے لئے یہ طریقہ مستون ہو جائے اور وہ اپنے قلوب کی تسلی کے لئے ذخیرہ کر سکیں۔ ایک حدیث میں ہے :-

إِنَّ اللَّهَ تَعَالَى يُحِبُّ أَنْ تُؤْتَى رُخْصَةً كَمَا يُحِبُّ أَنْ تُؤْتَى عَزَائِمُهُ (احمد، طبرانی، بیہقی۔ ابن عمر)

اللہ تعالیٰ جیسے یہ پسند کرتا ہے کہ عزا تم پر عمل کیا جائے اسی طرح یہ بھی پسند کرتا ہے کہ رخصت پر عمل کیا جائے۔

یہ ارشاد بھی دراصل ضعفاء کی دل جوئی اور تسلی کے لئے ہے تاکہ ان کا ضعف یا اس اور ناامیدی پر غمت نہ ہو اور وہ یہ سوچ کر اعمال خیر سے باز نہ رہیں کہ اعلا درجات تک پہنچنا ان کے بس میں نہیں ہے۔ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم تمام جہانوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ یاس اور ناامیدی پیدا کرنے کے لئے مبعوث نہیں فرمائے گئے۔

اس پوری گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ ذخیرہ کرنا بعض لوگوں کے لئے مضر ہے اور بعض لوگوں کے لئے معر نہیں ہے۔ اور اس پر حضرت ابو امامہ الباہلی کی یہ روایت دلالت کرتی ہے کہ اصحاب صفہ میں سے ایک صحابی کی وفات ہوئی تو اسکے لئے کفن کا انتظام نہ ہو سکا۔ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے ارشاد فرمایا کہ ان کے کپڑوں کی تلاش کرو۔ لوگوں نے جیسے ٹولیں تو ان میں دو دینار تھے آپ نے ارشاد فرمایا یہ دوداغ ہیں (احمد۔ شراہین حوشب) یہ بات آپ نے صرف ان صحابی کے متعلق ارشاد فرمائی حالانکہ بہت سے صحابہ کرام کافی مال و دولت چھوڑتے ہیں آپ نے کسی کے متعلق بھی یہ بات ارشاد نہیں فرمائی کیوں کہ ان صحابی کا حال دو احتمال رکھتا ہے اس لئے ارشاد نبوی کے بھی دو معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک معنی تو یہ ہو سکتے ہیں کہ یہ دودینار دوزخ کی آگ کے دوداغ ہیں قرآن کریم میں اس کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے :-

تُكُونُ فِيهَا حِبَابُهُمْ وَجُنُودُهُمْ يُؤْذِهِمْ وَظُهُورُهُمْ (پ ۱۴ آیت ۳۵)

ان سے ان لوگوں کی پیشانیوں اور ان کی کمریوں اور ان کی پشتوں کو داغ دیا جائے گا۔

یہ معنی اس صورت میں ہیں جب کہ وہ اپنے حال سے زہد، فقر اور توکل کا اظہار کریں حالانکہ حقیقت میں وہ ایسے نہیں تھے بلکہ دودینار رکھتے تھے یہ ایک طرح کا فریب تھا اور اس کی سزا وہ ہو سکتی ہے جس کی طرف مذکورہ بالا حدیث شریف میں اشارہ کیا گیا اور دوسرے معنی یہ ہیں کہ تلبیس اور فریب نہ ہو اس صورت میں معنی یہ ہوں گے کہ ان کا درجہ کمال ناقص تھا جیسے اگر خوبصورت چہرے پر دوداغ لگا دیے جائیں تو چہرہ کا کمال ناقص ہو جاتا ہے دنیا میں انسان جو کچھ چھوڑتا ہے وہ اس کے اخروی درجات میں نقصان کا باعث ہوتا ہے اس لئے کہ کسی شخص کو جس قدر دنیا عطا کی جاتی ہے اسی قدر اس کی آخرت میں سے کم کر دیا جاتا ہے۔

رہا یہ سوال کہ اگر آدمی فارغ قلبی اور سکون دلی کے باوجود ذخیرہ کرے تو اس سے توکل کیوں نہیں باطل ہوتا؟ اس کی دلیل وہ روایت ہے جو حضرت بشر کے متعلق منقول ہے حسین المغانلی جو آپ کے رفقاء میں سے ہیں روایت کرتے ہیں کہ میں چاشت کے وقت حضرت بشر کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ ایک بزرگ آپ کے پاس تشریف لائے وہ ادھیڑ عمر کے تھے انکا رنگ گندمی اور عارض چمکے ہوئے تھے حضرت بشر انہیں دیکھ کر اپنی جگہ سے کھڑے ہو گئے میں نے نہیں دیکھا کہ آپ کسی شخص کی تعظیم میں کھڑے ہوئے ہوں اس کے بعد آپ نے مجھے چند درہم دیے اور فرمایا کہ تم ہمارے لئے بہترین کھانا اور خوشبو خرید کر لاؤ آپ نے اس سے پہلے بھی اس طرح کا کوئی حکم نہیں دیا تھا چنانچہ میں کھانا لے کر آیا اور آپ کے سامنے رکھا آپ نے ان بزرگ کے ساتھ کھانا تناول فرمایا میں نے نہیں دیکھا کہ آپ نے کسی دوسرے کے ساتھ اس طرح کھانا کھایا ہو جب کھانے سے فراغت ہو گئی اور کھانا خالی کیا تو وہ بزرگ کھڑے ہوئے اور جس قدر کھانا بچا تھا اپنے ساتھ باندھ کر لے گئے مجھے یہ دیکھ کر یوں تعجب ہوا اور ان کا یہ طریقہ برا معلوم ہوا حضرت بشر نے مجھ سے فرمایا : ایسا لگا ہے کہ ہمیں ان کی یہ حرکت پسند نہیں آئی میں نے عرض کیا جی

ہاں! یہی بات ہے، وہ آپ کی اجازت کے بغیر کھانے گئے، حضرت بشار نے فرمایا یہ ہمارے بھائی فتح موصلی ہیں، ہم سے ملاقات کرنے کے لئے موصول سے تشریف لائے ہیں، انہوں نے اپنے اس عمل سے لوگوں کو یہ تعلیم دی ہے کہ اگر توکل صحیح ہو تو ذخیرہ کرنا نقصان دہ نہیں ہوتا۔

تیسرا مقصد دفع مضرت جاننا چاہیے کہ بعض اوقات نفس یا مال میں ضرر کا خوف ہوتا ہے، توکل کی شرط یہ نہیں ہے کہ واضح ضرر اسباب اختیار ہی نہ کئے جائیں مثلاً کسی ایسی جگہ سونا یا رہتا جہاں درندے بست ہوں یا سیلاب آتا ہو یا دیوار شکستہ ہو یا ٹوٹی ہوئی چھت ہو توکل نہیں ہے، بلکہ یہ تمام امور ممنوع ہیں، جو شخص ایسا کرتا ہے وہ بلا فائدہ اپنی جان کو ہلاکت میں ڈالتا ہے۔

اسباب واقعہ کی قسمیں یہ اسباب واقعہ بھی تین طرح کے ہیں، قطعی، ظنی، وہی۔ ان میں سے وہی اسباب کا ترک کرنا توکل کے لئے شرط ہے، اور وہی اسباب وہ ہیں جن کی نسبت دفع ضرر کی طرف ایسی ہو جیسے واضح و منفرد وغیرہ کو ہے۔ یہ دونوں چیزیں بعض اوقات کسی خوفناک چیز کی آمد سے پہلے کی جاتی ہیں، اور بعض اوقات ان کی آمد کے بعد، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے متوکلین کا وصف اس کے علاوہ کچھ بیان نہیں فرمایا کہ وہ واضح اور منفرد وغیرہ نہیں کرتے، یہ نہیں فرمایا کہ جب وہ لوگ کسی ٹھنڈے علاقے میں جاتے ہیں تو گرم کپڑے یا جبہ وغیرہ نہیں پہنتے، حالانکہ جبہ وغیرہ سردی سے تحفظ کے لئے پہنا جاتا ہے۔ اسی طرح کی اور چیزوں کا بھی یہی حکم ہے، ہاں اگر کوئی شخص سردی کے موسم میں باہر نکلنے سے پہلے لسن وغیرہ اس لئے کھائے کہ جسم میں جا کر گرمی پیدا کرے گا تو یہ امر واضح کے قریب ہو سکتا ہے، جب کہ جب اس معنی میں نہیں ہے، تاہم انسان کے ضرر پہنچنے کی صورت میں اسباب واقعہ کا ترک کرنا بہتر ہے، اور داخل توکل ہے، کیوں کہ ان اسباب کا ترک کرنا اصل اذیت پر مبر کرنا ہے، اور مبر کرنا توکل کی اہم شرط ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :-

وَأَضْمِرْ عَلَىٰ مَا يَتَقُولُونَ وَأَهْجِرْهُمْ هَجْرًا جَمِيلًا۔ (پ ۲۹ ر ۳ آیت ۱۰)

اور یہ لوگ جو باتیں کرتے ہیں ان پر مبر کرو اور خوبصورتی کے ساتھ ان سے الگ رہو۔

وَلَنَضْمِرْ عَلَىٰ مَا أَدْبَيْتُمْوْنَا وَعَلَىٰ اللَّيْلِ نَتَوَكَّلُ الْمُتَوَكِّلُونَ۔ (پ ۳ ر ۳ آیت ۴)

اور تم نے جو کچھ ہم کو ایذا پہنچائی، ہم اس پر مبر کریں گے، اور اللہ ہی پر بھروسہ کرنے والوں کو بھروسہ کرنا چاہیے۔

وَدَعْ أَذَاهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ۔ (پ ۳ ر ۳ آیت ۷۸)

اور ان کی طرف سے جو ایذا پہنچے اس کا خیال نہ رکھے، اور اللہ پر توکل کیجئے۔

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُو الْعَرْشِ مِنَ الرُّسُلِ۔ (پ ۳ ر ۳ آیت ۳۵)

آپ مبر کیجئے جیسے اور ہمت والے پیغمبروں نے کیا تھا۔

نِعْمَ أَجْرُ الْعَامِلِينَ الَّذِينَ صَبَرُوا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ۔ (پ ۲ ر ۲ آیت ۵۹)

(نیک) کام کرنے والوں کا کیا اچھا اجر ہے جنہوں نے مبر کیا اور وہ اپنے رب پر توکل کیا کرتے تھے۔

اذیت پر مبر کرنا انسان کے سلسلے میں ہے، سانپ، بچھو اور درندوں وغیرہ کی اذیت پر مبر کرنا توکل نہیں ہے، کیوں کہ اس میں کوئی فائدہ نہیں ہے، سالک جب بھی کسی شے کے ترک یا عمل کا ارادہ کرتا ہے اس کا مقصد دین پر اعانت ہوتا ہے، یہاں دفع ضرر میں اسباب کا ترتیب ایسا ہی ہے جیسے پہلے مقصد کا ذیل میں کب معیشت اور مفید اشیاء کے حصول کے اسباب پر گفتگو کے دوران مذکور ہوا ہے۔ اس لئے یہاں دوبارہ لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔

اسی طرح مال کو محفوظ رکھنے کے اسباب بھی ہیں، ان کا بھی یہی حکم ہے، چنانچہ اگر کوئی شخص کمرو سے باہر نکلے ہوئے تالا لگا دے، یا جانور کو زنجیر پٹنا دے تو یہ توکل کے خلاف نہیں ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ کی سنت جاریہ سے ان اسباب کا قطعی یا ظنی ہونا معلوم ہو چکا ہے، اس لئے اگر کوئی شخص ان اسباب پر عمل پیرا ہو تو اسے حد توکل سے خارج قرار نہیں دیا جائے گا۔ چنانچہ ایک اعرابی

نے جب اپنا اونٹ کھلا چھوڑ دیا اور یہ کہا کہ میں اللہ پر توکل کرتا ہوں تو سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :-
 اِعْقِلْهَا وَتَوَكَّلْ - (ترمذی - السنن) اسے باندھ دے اور توکل کر۔
 قرآن کریم میں ہے :-

خُذُوا حِذْرَكُمْ (پ ۵ ر ۳ آیت ۱۰۲) اور اپنا بچاؤ لے لو۔

نماز خوف کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :-

وَلْيَاخُذُوا حِذْرَهُمْ وَأَسْلِحُ حَتَّهُمْ (پ ۵ ر ۳ آیت ۱۰۲)

اور یہ لوگ بھی اپنے بچاؤ کا سامان اور ہتھیار لے لیں۔

وَأَعِزُّوْا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَمِنْ رِزْقِ الْخَبْلِ - (پ ۱۰ ر ۳ آیت ۶۰)

اور جس قدر تم سے ہو سکے قوت (ہتھیار) سے اور لپے ہوئے گھوڑوں سے سامان درست رکھو۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خطاب فرمایا گیا :-

فَأَسْرِ بِعَبَادِي لَيْلًا - (پ ۲۵ ر ۳ آیت ۲۳) تو اب میرے بندوں کو تم رات ہی رات میں لے کر چلے جاؤ۔

رات کو جانے میں مصیبت یہ ہے کہ دشمنوں کی نظروں سے بچ کر نکلا جاسکتا ہے گویا یہ بھی دفعِ ضرر کا ایک سبب ہے، سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے دشمنوں سے تحفظ کے لئے غارِ ثور میں قیام فرمایا، نماز خوف کے ذکر میں یہ بیان کیا گیا کہ اپنے اپنے اسلحے لے کر نماز ادا کی جائے، اسلحے لے کر نماز پڑھنا قطعی سببِ دفع نہیں ہے، جیسے سانپ چھو کر مارا لانا قطعی سبب ہے، تاہم ہتھیاروں کا لینا ایک ظنی سبب ہے، اور ہم پہلے مقصد کے ضمن میں یہ بیان کر چکے ہیں کہ ظنی بھی قطعی کی طرح ہے۔ اب صرف وہی اسباب باقی رہ جاتے ہیں، توکل کا تقاضا یہی ہے کہ آدمی ان اسباب کو ترک کر دے۔ ایک بزرگ کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ ان کے شانے پر ایک شیر نے اپنا بچہ رکھ دیا اور انہوں نے حرکت بھی نہیں کی، ایک اور بزرگ کے حلق مشہور ہے کہ انہوں نے شیر کو مسخر کر کے اپنا تالیاں بنا لیا تھا اور وہ اس پر سواری کرتے تھے۔ اب اگر کوئی شخص ان روایات کو سامنے رکھے اور یہ کہے کہ شیر سے اپنا دفاع کرنا بھی ضروری ہے، پھر کیا وجہ ہے کہ ان بزرگوں نے شیر سے اپنا تحفظ نہیں کیا، اس کا جواب یہ ہے کہ یہ روایات اگرچہ صحیح ہیں، لیکن ان کی اقتداء کرنا صحیح نہیں ہے، اس لئے کہ یہ قوت ہر شخص کو نصیب نہیں ہوتی کہ وہ درندوں کو اپنا تالیاں بنا سکے، یہ کرامات کا ایک اعلیٰ مقام ہے، اور توکل کی شرائط سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے، یہ مقام بھی ایک سرائی ہے، اس پر صرف وہی شخص مطلع ہوتا ہے جو اس کی سیر کرتا ہے، رہا یہ سوال کہ اس مقام تک پہنچنے کی علامات کیا ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جو شخص اس مقام تک پہنچ جاتا ہے اسے کسی علامت کی ضرورت باقی نہیں رہتی وہ خود یہ بات جان لیتا ہے کہ میں اس مقام پر پہنچ گیا ہوں۔ البتہ اس مقام سے پہلے کی ایک علامت ہے وہ ہم ذکر کئے دیتے ہیں اور وہ علامت یہ ہے کہ جو کتا ہر وقت انسان کے پیلوں میں رہتا ہے، اور جو خود مالک کو، اور دوسروں کو کاٹتا ہے وہ مسخر اور تالیاں بن جاتے، یہ غضب کا کتا ہے، اگر یہ کتا آدمی کا فرما چھوڑ دے اور مطلع ہو جائے، یہاں تک کہ اس کی مرضی اور اشارے کے بغیر اپنی جگہ سے جنبش بھی نہ کرے تو یہ ممکن ہے کہ یہ شخص ترقی کرتے کرتے ایسے درجے پر پہنچ جائے کہ خارجی درندے اس کے تالیاں ہو جائیں، اور درندوں کا یا در شاہ شیر جسے ہم جنگل کا کتا بھی کہہ سکتے ہیں اس کی مرضی پر چلنے لگے۔ کمال کی بات یہ نہیں ہے کہ جنگلی کتے ہمارے تالیاں ہو جائیں کمال کی بات یہ ہے کہ گھر کے کتے ہمارے تالیاں رہیں چنانچہ اگر باطن کا کتا ہمارے تالیاں نہیں ہے تو ہمیں یہ توقع نہ کرنی چاہیے کہ ظاہر کا کتا ہماری اجازت کرے گا۔

حفاظتی تدابیر کے بعد توکل یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جو دشمن کے خوف سے گھر میں ملاؤالے، یا اونٹ کو بھاگنے سے بچانے کے لئے کھوٹے سے باندھتے، اور دشمن کے ڈر سے ہتھیار لینے میں توکل کی کیا صورت ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ شخص علم اور حال کی رو سے متوکل کہلائے گا۔ علم کی صورت یہ ہے کہ متوکل اس کا تین کرے کہ چرے سے مکان اس لئے محفوظ نہیں رہا کہ میں

نے اس میں قتل لگا دیا تھا، بلکہ صرف خدا تعالیٰ کی حفاظت کام آئی، اور چور اس کے دفع کرتے سے دفع ہوئے، ورنہ بہت سے واقعات ایسے ہوتے ہیں کہ چور مضبوط سے مضبوط تالے توڑ کر سامان لے جاتے ہیں، اسی طرح اونٹ کا باندھنا موثر نہیں ہے، بسا اوقات اونٹ رستی توڑ کر بھاگ جاتے ہیں، یا ہلاک ہو جاتے ہیں، صرف اللہ ہی اونٹ کی کھونٹے پر حفاظت کرتا ہے۔ اسی طرح ہتھیار پہننا بھی کافی نہیں ہے، بہت سے لوگ ہتھیار پہن کر بھی دشمن کے ہاتھوں مقتول یا مغلوب ہو جاتے ہیں، اس لئے میں نے ان اسباب پر بھروسہ نہیں کیا، بلکہ میرا بھروسہ مستبب الاسباب پر ہے، جیسے وکیل خصومت کی مثال دی گئی ہے کہ اگر متوکل اس کے کہنے سے عدالت میں حاضری دیتا ہے یا دستاویز لے کر آتا ہے تو اپنی حاضری اور دستاویز پر اعتماد نہیں کرتا، بلکہ وکیل کی قوت اور کفایت پر بھروسہ کرتا ہے، حال کی صورت یہ ہے کہ اس کے گھر اور گھر میں اللہ تعالیٰ جو فیصلہ فرمائے اس پر راضی رہے، اور یہ کہے کہ اے اللہ اگر تو نے میرے گھر کے سامان پر کسی ایسے شخص کو مسلط کر دیا جو اسے لے جائے تو یہ میری راہ میں ہے، میں تیرے فیصلے پر راضی ہوں، میں نہیں جانتا کہ جو چیزیں تو نے مجھے دے رکھی ہیں وہ میرے لئے ہیں جو تو مجھ سے واپس نہیں لے گا۔ یا امانت اور عاریت ہیں کہ واپس لے لے گا، مجھے نہیں معلوم کہ یہ چیزیں میرا رزق ہیں یا میری قسمت ہیں یا ازل میں کسی اور کے لئے، ان کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ بہر حال تو نے جو فیصلہ بھی کیا ہو میں اس پر راضی ہوں، میں نے دواۓ اس لئے بند نہیں کیا کہ میں تیرے فیصلے سے بچنا چاہتا تھا یا اس کی مخالفت پر آمادہ تھا، بلکہ میں ترتیب اسباب میں حیرتی سنن جاریہ کے تقاضوں پر عمل کرنا چاہتا تھا، میرا بھروسہ اسباب پر نہیں ہے، اے مستبب الاسباب میں حیرتی ذات پر بھروسہ رکھتا ہوں۔

اگر کسی شخص کا ظم یا حال یہ ہو تو امید یہ ہے کہ وہ اونٹ کو پاب نہ ٹھہر کر، دواۓ کو مقتول کرنے اور ہتھیار لینے سے توکل کی حدود سے خارج نہیں ہو گا، پھر اگر گھروا نہیں آکر یہ دیکھے کہ گھر کا سامان اپنی سابقہ حالت پر موجود ہے تو اسے اللہ تعالیٰ کی ایک نئی نعمت تصور کرے، اور اگر یہ دیکھے کہ سامان اپنی جگہ موجود نہیں ہے بلکہ چوری ہو گیا ہے تو اپنے دل پر نظر ڈالے، اگر وہ اس واقعے پر شواہد و فرماں ہو، اور یہ سمجھتا ہو کہ اللہ تعالیٰ نے میرا یہ دنیاوی رزق اس لئے لیا ہے تاکہ آخرت کے رزق میں اضافہ فرمائے۔ اگر دل کی حالت واقعی یہ ہو، کسی طرح کا کوئی ملال اور تکلیف دل میں نہ ہو تو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ توکل میں اس کا مقام صحیح ہے اور وہ اپنے دعویٰ توکل میں سچا ہے، اور اگر اس کا دل تکلیف محسوس کرے، اور اس پر صبر کرے تو کہا جائے گا کہ یہ شخص توکل کے دعویٰ میں سچا نہیں ہے اس لئے کہ توکل کا مقام زہد کے بعد ہے اور زہد اس شخص کا صحیح ہوتا ہے جسے نہ کوئی چیز یا کر خوشی ہوتی ہے، اور نہ کھو کر رنج ہوتا ہے، بلکہ کبھی کبھی معاملہ برعکس بھی ہوتا ہے کہ کھو کر خوشی ہوتی ہے اور یا کر رنج ہوتا ہے چنانچہ اس شخص کا تو زہد بھی صحیح نہیں ہے، چنانچہ توکل درست ہو، ہاں ایسے شخص کو صبر کا مقام ضرور حاصل ہو سکتا ہے، بشرطیکہ اپنا رنج اور تکلیف پوشیدہ رکھے، مال چوری جانے پر کسی سے شکوہ نہ کرے، نہ تلاش و جستجو میں بہت زیادہ دودھ و دھوپ کرے، اگر کوئی شخص ان امور پر قادر نہیں ہے، بلکہ چوری پر دل میں تکلیف بھی محسوس کرتا ہے، زبان سے اظہار بھی کرتا ہے، اور بہت زیادہ تلاش کرتا ہے ایسے شخص کے بارے میں کہا جائے گا کہ چوری اس کے گناہ میں زیادتی کا سبب بن رہی ہے، کیوں کہ اس کے عمل سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ صبر زہد، توکل وغیرہ مقامات سے عاجز ہے، اور اپنے تمام دعووں میں مجھوتا ہے، ایسے شخص کو اپنے نفس پر زیادہ سے زیادہ مجاہدہ کرنے کی ضرورت ہے، اسے چاہیے کہ وہ اپنے نفس کی کوئی بات حلیم نہ کرے، اور نہ اس کے کمر و فریب کے جال میں پھنسے، اس لئے کہ نفس دھوکا دینے والا ہے، برائی کا حکم کرنے والا ہے، اور خیر کا دعویٰ کرنے والا ہے، حالانکہ وہ خیر سے باز رکھتا ہے، اور شر کی دعوت دیتا ہے۔

ایک اشکال کا جواب رہا یہ اشکال کہ متوکل کہتے ہی اس شخص کو ہیں جس کے پاس مال نہ ہو، اور آپ چوری کے مفروضے سے اس کے لئے ایسا مال فرض کئے لے رہے ہیں جو چوری ہو سکے، متوکل کے پاس مال ہوتا ہی کہاں ہے جو چوری ہو سکے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ متوکل کے گھر میں بھی کچھ نہ کچھ سامان ضرور ہوتا ہے جیسے کھانے کا پیالہ، پانی پینے کا گلاس، وضو کا لوٹا، تھیلہ جس میں زاد راہ محفوظ رکھا جاسکے، عصا جس کے ذریعے دشمن سے دفاع کیا جاسکے اور اسی طرح ضرورت کی دوسری چیزیں

اور گھریلو سامان بعض اوقات متوکل کے پاس مال آتا ہے تو وہ اپنی ذات پر خرچ کرنے کے لئے نہیں بلکہ محتاج اور ضرورت مند لوگوں پر خرچ کرنے کے لئے محفوظ کر لیتا ہے۔ جیسا کہ پہلے بھی بیان کیا جا چکا ہے کہ اس نیت کے ساتھ ذخیرہ کرنے سے توکل باطل نہیں ہوتا۔ توکل کی شرط یہ نہیں ہے کہ کھانے پینے کے برتن و ضو کا لونا اور عصا وغیرہ بھی ضرورت مندوں کو دیدئے جائیں، کھانے پینے کی ان چیزوں کو دینے کا حکم ہے جو ضرورت سے زیادہ ہوں اور کھانے پینے کے بعد بچ گئی ہوں، اللہ تعالیٰ کی عادت یہ ہے کہ وہ متوکل فقراء کو گھروں میں اور مسکینوں میں مدد دیتا ہے، لیکن یہ عادت نہیں ہے کہ وہ ہر روز انہیں پلٹ گھاس اور لوٹے بھی مہیا کرتا ہے، توکل میں یہ ضروری نہیں ہے کہ آدمی عادت الہی سے نکل جائے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت خواص سفر کے دوران رتی، ڈول اور سوئی دھاگالے کر چلتے تھے، کھانے پینے کی اشیاء لے کر نہیں چلتے تھے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ عادیان دونوں چیزوں میں فرق کرتا ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آدمی کی ضرورت کی چیز چوری ہو جائے یا ضائع چلی جائے اور وہ اس پر تکلیف بھی محسوس نہ کرے، اگر وہ چیز اس کی خواہش اور پسند کی نہیں تھی تو اس نے گھر میں کیوں رکھی تھی، اور دواؤں کو کس لئے مقفل کیا تھا، اور اگر وہ ضرورت کے باعث پسندیدہ تھی تو یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ چیز چھین جائے اور دل رنجیدہ نہ ہو، اس کا جواب یہ ہے کہ متوکل ان چیزوں کی حفاظت اس لئے کرتا ہے کہ وہ انہیں اپنے دین پر بذریعہ اعانت تصور کرتا ہے، اور یہ گمان کرتا ہے کہ اس سامان میں میرے لئے خیر اور بہتری ہے، کیوں کہ اگر ایسا نہ ہو تا تو اللہ تعالیٰ مجھے یہ سامان عطافہ فرماتا۔ ہر حال اس نے اس خیر کے ملنے سے خیر پر استدلال کیا، اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ حسن ظن کیا کہ میری بہتری ہی کی وجہ سے یہ چیز مجھے عطا کی گئی ہے، ساتھ ہی اس نے یہ گمان بھی کیا کہ یہ سامان میرے دین پر معین و مددگار بھی ہے، لیکن اس کا یہ ظن قطعی نہیں تھا۔ کیوں کہ یہ احتمال اپنی جگہ موجود تھا کہ ہو سکتا ہے اس سامان کا وجود اس کے حق میں بہتر نہ ہو، بلکہ اس کا فقدان بہتر ہو، اور اس کی بھلائی اسی میں ہو کہ یہ سامان ضائع چلا جائے، اور جو ضرورتیں اس سامان کے ذریعے تکمیل پاری تھیں وہ اب مشقت اور تکلیف کے ساتھ تکمیل پائیں، اور اس مشقت و تکلیف پر اسے ثواب بھی ملے۔ جب اللہ تعالیٰ نے چور کے ذریعے اس کا سامان واپس لے لیا تو اس کا پہلا ظن ختم ہو گیا، اور اس کی جگہ اس ظن نے لے لی کہ میرے لئے اس سامان کا نہ ہونا بہتر ہے، اگر مجھ سے یہ سامان واپس لیتا تو اللہ تعالیٰ بہتر نہ سمجھتا تو واپس نہ لیتا، متوکل وہ ہے جو ہر حال میں اللہ کے ساتھ حسن ظن رکھتا ہے، اور عجب نہیں کہ جس کا حال یہ ہو اسے سامان کی چوری سے تکلیف نہ ہو کیوں کہ وہ اس لئے خوش نہیں ہوتا کہ اس کے پاس سامان ہے، بلکہ اس لئے خوش ہوتا ہے کہ منسوب الاسباب کی مرضی یہی ہے کہ یہ سامان میرے پاس نہ ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی بیمار کسی مہمان حکیم کے زیر علاج ہو، اور مریض اپنے معالج کے متعلق یہ حسن ظن رکھتا ہو کہ وہ جو کچھ دوا یا غذا اس کے لئے تجویز کرے گا اسی میں اسکی بہتری ہوگی۔ چنانچہ جب معالج اس کے لئے کوئی غذا تجویز کرتا ہے تو اس سے خوش ہوتا ہے، اور وہ یہ سمجھتا ہے کہ یہی غذا میرے لئے مفید ہے، اگر حکیم اسے میرے لئے مفید نہ سمجھتا یا میرے جسم میں اس غذا کو برداشت کرنے کی طاقت نہ ہوتی تو ہرگز نہ دیتا، اور اگر کوئی غذا دے کر واپس لے لے تب بھی خوش ہو اور یہ سمجھے کہ اگر یہ غذا میرے لئے معتر نہ ہوتی تو میرا معالج اسے کبھی واپس نہ لیتا۔ اگر کوئی شخص اللہ کے لطف و کرم کو حکیم کے لطف و کرم کے برابر بھی نہ سمجھے، نہیں کا اعتقاد اس کا مریض رکھتا ہے تو اس کا توکل کسی بھی حالت میں درست نہیں ہو سکتا۔

جو شخص بندوں کی اصلاح کے باب میں اللہ تعالیٰ کی سنن، افعال اور عادات سے واقفیت رکھتا ہے وہ اسباب سے خوش نہیں ہوتا، کیوں کہ وہ یہ نہیں جانتا کہ کون سا سبب اس کے لئے باعث خیر ہے، چنانچہ حضرت عمر ابن الخطابؓ ارشاد فرماتے ہیں کہ میں فقیر ہو جاؤں یا مالدار مجھے اس کی پروا نہیں، اور نہ میں یہ جانتا ہوں کہ میرے لئے فہر بہتر ہے یا غنا، اسی طرح متوکل کو چاہیے کہ نہ وہ اس کی پروا کرے کہ اس کا مال چوری چلا گیا، اور نہ اس بات کی کہ اس کا سامان اپنی جگہ موجود ہے اس لئے کہ وہ یہ نہیں جانتا کہ دنیا و آخرت میں اس کے لئے کیا بہتر ہے اور کیا نہیں ہے دنیا کا بہت سا ساز و سامان انسان کی ہلاکت کا باعث بن جاتا ہے، اور بہت

سے دولت مند اپنی دولت کی وجہ سے ایسی مصیبتوں کا شکار ہو جاتے ہیں کہ وہ فقر و افلاس کی آرزو کرنے لگتے ہیں۔

سامان کی چوری کے بعد متوکلین کے آداب

گھر سے نکلے پر سامان کے سلسلے میں متوکلین کو چند آداب کی رعایت کرنی چاہیے۔ اور وہ آداب یہ ہیں :-
پہلا آداب یہ ہے کہ دواوہ متقل کر دے، لیکن سامان کی حفاظت کے لئے بہت زیادہ اہتمام نہ کرے، مثلاً یہ کہ پڑوسیوں سے تلاش لگانے کے بعد گھر کی گھرائی اور خیال رکھنے کی درخواست نہ کرے، اور نہ کئی مالے لگائے۔ حضرت مالک ابن دینار اپنے گھر کے دونوں دواوے رستی سے باندھ دیا کرتے تھے، اور فرماتے تھے کہ اگر سخت نہ ہوتے تو یہ رستی بھی نہ باندھتا۔

دوسرا آداب یہ ہے کہ گھر میں کوئی ایسی چیز نہ چھوڑے جسے دیکھ کر چوروں کے دل میں چوری کی خواہش پیدا ہو، اور اس طرح ان کی مصیبت کا سبب بنے، چنانچہ جب حضرت مغیوہ ابن شعبہ نے حضرت مالک ابن دینار کی خدمت میں ایک لوٹا بطور ہدیہ پیش کیا تو آپ نے ان سے فرمایا کہ اسے واپس لے لو، مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے، مغیوہ نے پوچھا آپ یہ لوٹا کس لئے واپس کر رہے ہیں، فرمایا میرے دل میں دشمن یہ وسوسہ ڈال رہا ہے کہ یہ لوٹا چور لے گئے، گویا حضرت مالک ابن دینار نے یہ مناسب نہیں سمجھا کہ وہ چوروں کی مصیبت کا سبب بنیں، یا انہوں نے یہ بات اپنے لئے نقصان کا باعث سمجھی کہ ان کے دل میں وسوسہ رہے کہ لوٹا چوری چلا جائے گا، حضرت ابو سلیمان دارانی نے یہ واقعہ سنا تو فرمایا کہ یہ صوفیوں کے قلوب کا ضعف ہے، انہوں نے تو زہد کیا تھا، انہیں اس کی فکر کیوں لاحق ہوئی کہ اسے چور لے کر جائیں گے۔

تیسرا آداب اگر کسی چیز کو بحالت مجبوری گھر میں چھوڑ کر جانا پڑے تو جانے سے پہلے یہ نیت کر لینی چاہیے کہ اس چیز کے بارے میں اللہ تعالیٰ جو فیصلہ فرمائے گا میں اس پر راضی ہوں۔ اگر اس نے کسی چور کو اس پر مسلط کیا اور وہ اسے چور کر لے گیا تو یہ چیز اس کے لئے حلال ہے، یا یہ چیز اللہ کے لئے وقف ہے، اگر لینے والا فقیر ہے تو اس پر صدقہ ہے، اور اگر فخری شرط نہ لگائے تو بہتر ہے، اس صورت میں اسے دو نہیں کرنی چاہئیں، ایک یہ کہ اس مال کو فقیر لے یا غنی لے تو وہ اس مال کے باعث مصیبت سے بچا رہے، یعنی اگر چوری سے اتنا مال مل جائے اور وہ اسے ذریعہ آمدنی بنائے یہاں تک کہ وہی چوری کا مال اس کے لئے ذریعہ معاش بن جائے تو یہ مال ہمیشہ ہمیشہ کے لئے حرام نہ رہے، بلکہ حلال بن جائے، اور حرام مال کھانے کی مصیبت سے محفوظ رہے، اور دوسری نیت یہ ہے کہ وہ مجھ پر ظلم کرنے کے بعد کسی دوسرے مسلمان کو اپنے ظلم کا نشانہ نہیں بنائے گا، گویا اس کا مال دوسرے مسلمان کے حق میں ذر فدیہ بن گیا۔ بہر حال نیت کوئی بھی ہو، دونوں عمدہ ہیں، ایک نیت کی رو سے وہ اپنے مال کو دوسرے شخص کے مال کی حفاظت کا ذریعہ سمجھے گا، اور دوسری نیت کی رو سے فقیر کو مصیبت سے بچانے کا سبب تصور کرے گا، یہ دونوں ہی باتیں خیر خواہی پر دلالت کرتی ہیں، اور اس حدیث شریف پر عمل کراتی ہیں :-

أَنْصُرَ أَخَاكَ ظَالِمًا أَوْ مَظْلُومًا۔ (بخاری و مسلم۔ النحر) اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم۔

مظلوم کی مدد بالکل واضح ہے، ظالم کی مدد یہ ہے کہ اسے ظلم سے باز رکھے، ظلم معاف کر دینا بھی ایک اعتبار سے اس کو آئندہ ظلم سے باز رکھنے کی کوشش ہے، اور اس میں سزا سے بچانا بھی ہے، اس سے بڑھ کر نصرت اور مدد کیا ہو سکتی ہے۔ متوکل کے لئے یہ نیت کسی بھی حالت میں معز نہیں ہے، خواہ مال چوری جائے یا نہ جائے، کیوں کہ نیت قصائے الہی کو بدلنے میں مؤثر نہیں ہوتی، البتہ نیت کا ثواب الگ ملتا ہے، اگر مال چوری چلا جائے تو ہر درہم کے عوض سات درہم ملیں گے، کیوں کہ اس نے اس اجر و ثواب کی نیت کی ہے، اور چوری نہ بھی ہوا، تب بھی یہ اجر ضائع نہ ہو گا۔ کیوں کہ نیتوں پر ہی اعمال کا مدار ہوتا ہے۔ جیسا کہ ایک روایت میں ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی سے عزل نہ کرے اور نطفہ اپنے مقام میں گرے تو اس کے لئے اتنا اجر و ثواب ہے کہ بالفرض اس صحبت کے نتیجے میں ایک لڑکا پیدا ہو، اور وہ بڑا ہو کر حماد کرے یہاں تک کہ اللہ کی راہ میں شہید ہو جائے (۱) اگرچہ واقع

میں اس کا لڑکانہ ہو، یا ہو تو وہ بڑا ہو کر مجاہد نہ بنے مگر اسے اس کے جہاد اور شہادت کا ثواب ملے گا۔ کیوں کہ باپ کا کام صرف محبت ہے تخلیق، حیات، رزق اور بقا اس کے اختیار میں نہیں ہے، اگر لڑکانہ ہو تا تب بھی اسے اس فعل کا ثواب ملتا۔

چوتھا ادب یہ ہے کہ جب مال چوری ہونے کا علم ہو تو اس پر غمگین نہ ہو، بلکہ خوش ہونے کی کوشش کرے، اور یہ کہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کو مال چوری ہونے میں میری بھلائی مقصود نہ ہوتی تو مال اپنی جگہ باقی رہتا۔ اب اگر اس نے جانے سے پہلے مال وقف نہیں کیا تھا تو اس کی زیادہ جستجو نہ کرے، اور بلا وجہ مسلمانوں سے بدظن نہ ہو، اور نہ کسی مخصوص فرد کو متہم کرے، اور اگر وقف کر دیا تھا تو بالکل تلاش نہ کرے، کیوں کہ وہ پہلے ہی اسے وقف کر کے اپنے لئے ذریعہ نجات اور ذریعہ آخرت بنا چکا ہے، اب اگر وہ چیز بھی مل جائے تو نہ لے، کیوں کہ وہ اس میں وقف کی نیت کر چکا تھا۔ لیکن اگر واپس لے لے تب بھی وہ چیز اس کی ملکیت میں آ جائے گی، کیوں کہ اس طرح کی مشروط نیتوں سے ظاہر شریعت میں ملکیت باطل نہیں ہوتی تاہم متوکلین اسے پسند نہیں کرتے کہ موقوفہ شئی کو پھر اپنی ملکیت بنالیا جائے چنانچہ حضرت عمر ابن الخطاب سے مروی ہے کہ ان کی اونٹنی گم ہو گئی، آپ نے بہت زیادہ تلاش و جستجو کی یہاں تک کہ تھک کر بیٹھ گئے، اس کے بعد فرمایا کہ یہ اونٹنی اللہ کی راہ میں ہے، یہ کہہ کر مسجد میں چلے گئے اور دو رکعت نماز ادا کی اس کے بعد ایک شخص نے آکر یہ اطلاع دی کہ آپ کی اونٹنی فلاں جگہ موجود ہے، آپ اپنی جگہ سے کھڑے ہوئے، جوتے پن کر چلنے کا ارادہ کیا، اس کے بعد اپنی جگہ بیٹھ گئے لوگوں نے دریافت کیا کہ آپ اونٹنی لینے نہیں چلیں گے، فرمایا میں نے اس کے بارے میں یہ کہہ دیا تھا کہ وہ اللہ کی راہ میں صدقہ ہے، ایک بزرگ کہتے ہیں کہ میں نے اپنے ایک بھائی کو ان کی وفات کے بعد خواب میں دیکھا، اور ان سے دریافت کیا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا؟ انہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے میری مغفرت فرمائی اور مجھے جنت میں داخل کیا، میرے لئے اس میں جو مکانات ہیں وہ مجھے دکھائے، راوی کہتے ہیں کہ اس کے باوجود میں نے انہیں غمگین اور رنجیدہ پایا، میں نے ان سے پوچھا کہ آخر اس کی کیا وجہ ہے اللہ تعالیٰ نے آپ کی بخشش فرمادی اور آپ کو جنت میں داخل فرمایا اس کے باوجود آپ غمگین اور پریشان نظر آتے ہیں۔ انہوں نے ایک سرد آہ بھر کر کہا کہ میں قیامت تک اسی طرح مضطرب اور غمگین رہوں گا، میں نے دریافت کیا کہ اس کی کیا وجہ ہے؟ فرمایا اس کی وجہ یہ ہے کہ میں نے جنت میں اپنے مکانات دیکھے، غمگین میں میرے مقامات اس قدر بلند کئے گئے تھے کہ میں نے اس سے پہلے اتنے بلند مقامات نہیں دیکھے تھے، میں یہ مقامات دیکھ کر بے حد خوش ہوا، لیکن جب میں ان میں داخل ہونے کے لئے آگے بڑھا تو اوپر سے کسی شخص نے کہا کہ اسے روکو، اندر نہ جانے دو، یہ مکانات اس کے لئے نہیں ہیں، بلکہ اس شخص کے لئے ہیں جو سبیل کو پورا کرتا ہے، میں نے پوچھا سبیل کو پورا کرنے کے کیا معنی ہیں، انہوں نے کہا کہ تم پہلے تو کسی چیز کو اللہ کی راہ میں دیدیا کرتے تھے اور پھر اسے واپس لے لیتے تھے اگر تم بھی سبیل کو پورا کرتے تو ہم تمہارا راستہ روکتے۔

ایک شخص کا قصہ ہے کہ وہ مکہ مکرمہ میں کسی شخص کے برابر میں سو رہا تھا، اس کے پاس دینار کی ایک قھیل تھی، جب نیند سے بیدار ہوا تو وہ قھیل موجود نہیں تھی، اس نے برابر والے شخص کو اس کا ذمہ دار قرار دیا اور اس سے مطالبہ کیا کہ وہ اس کی قھیل واپس کرے اس شخص نے دریافت کیا کہ اس کی قھیل میں کس قدر مال موجود تھا، اس نے مال کی مقدار بتلائی وہ اسے اپنے گھر لے گیا، اور جو مقدار اس نے بتلائی تھی وہ دیدی، بعد میں اس شخص کے دوستوں نے جس کی قھیل گم ہوئی تھی بتلایا کہ ہم نے مذاق میں قھیلی غائب کی تھی، وہ شخص بڑا ناام ہوا، اور اپنے دوستوں کے ساتھ اس شخص کے پاس آیا جس پر اس نے قھیل چرانے کا الزام لگایا تھا، اور جو مال اس نے دیا تھا وہ اسے واپس کرنا چاہا، لیکن اس نے اپنے سے انکار کر دیا اور کہنے لگا کہ یہ مال حلال طیب ہے اسے پاس رکھو، میں تمہیں خوشی سے دیتا ہوں، اور جو مال میں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے نکالتا ہوں اسے واپس نہیں لیتا، جب ان لوگوں نے واپس پر بہت زیادہ اصرار کیا تو انہوں نے اپنے بیٹے سے کہا کہ وہ اس مال کو مختلف قھیلوں میں رکھ کر فقراء کو بھجوا دے، اس نے حکم کی قھیل کی یہاں تک کہ تمام مال ختم ہو گیا۔ سلف صالحین کا معمول اور طریقہ یہی تھا کہ وہ جس چیز کو اللہ تعالیٰ کی راہ

میں خرچ کرنے کی نیت کر لیتے تھے وہ اسے واپس نہیں لیتے تھے چنانچہ اگر وہ فقیر کو دینے کے لئے ایک روٹی لے کر گھر سے نکلے اور فقیر روٹی لئے بغیر آگے بڑھ جاتا تو انہیں یہ بات بری معلوم ہوتی تھی کہ روٹی لے کر واپس آئیں چنانچہ وہ روٹی کسی اور فقیر کو دیدیتے تھے ان کا یہ طریقہ صرف روٹی وغیرہ ہی میں نہیں تھا بلکہ درہم و دینار اور دوسرے اموال میں بھی وہ لوگ یہی کرتے تھے۔

پانچواں ادب یہ ہے کہ چور کے خلاف بددعا نہ کرے اگر بددعا کرے گا تو اس کا توکل باطل ہو جائے گا اور اس سے ثابت ہو گا کہ اسے مال چوری ہونے کا افسوس ہے یا اسے یہ بات بری معلوم ہوتی ہے کہ کوئی شخص اس کا مال چوری کر لے اس بددعا سے زہد بھی باطل ہو جاتا ہے اور اگر اس معاملے میں بہت زیادہ مبالغے سے کام لے گا تو یہ اندیشہ بھی ہے کہ کہیں اس مصیبت پر ملنے والا اجر و ثواب ہی ضائع نہ ہو جائے۔ حدیث شریف میں ہے نہ

مَنْ دَعَا عَلَى ظَلَمٍ فَقَدْ اِنْتَصَرَ (۱) جو شخص اپنے ظالم کے خلاف بددعا کرتا ہے وہ بدلہ لے لیتا ہے۔ ربیع ابن خثیم کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ ان کا ایک گھوڑا جس کی قیمت چوبیس ہزار درہم تھی چوری ہو گیا آپ اس وقت نماز میں مشغول تھے نہ آپ نے نماز منقطع کی نہ اس کی تلاش میں نکلے نہ کسی اضطراب اور بے چینی کا اظہار کیا کچھ لوگ قتل اور تعزیت کے لئے آپ کے پاس آئی آپ نے ان سے کہا کہ جس وقت چور گھوڑا کھول رہا تھا میں اس کو دیکھ رہا تھا لوگوں نے عرض کیا کہ اگر یہ بات ہے تو آپ نے اسے ٹوکا کیوں نہیں فرمایا میں اس سے زیادہ بہتر اور محبوب چیز میں مشغول تھا یعنی نماز پڑھ رہا تھا لوگ چور کے خلاف بددعا کرنے لگے آپ نے فرمایا اسے کچھ مت کہو اگر کہتا ہے تو اس کے حق میں بہتر کلمات کہو اس لئے کہ میں نے وہ گھوڑا اسے صدقہ کر دیا ہے ایک بزرگ کی کوئی چیز چوری ہو گئی کسی نے ان سے کہا کہ میں یہ بات اچھی نہیں جانتا کہ اس پر شیطان کی اعانت کروں لوگوں نے کہا کہ اگر وہ شخص آپ کی مسودہ چیز واپس لے کر آیا تو قبول کریں گے یا نہیں انہوں نے فرمایا قبول کرنا تو دور کی بات ہے میں اس کی طرف دیکھوں گا بھی میں نے وہ چیز اسے معاف کر دی ہے ایک بزرگ سے کسی نے کہا کہ اس شخص کے خلاف بددعا کیجئے جس نے آپ پر ظلم کیا ہے انہوں نے کہا کہ مجھ پر کسی نے ظلم نہیں کیا اس بھارے نے تو اپنے آپ پر ظلم کیا ہے اب میں اس کے خلاف بددعا کر کے اس بھارے پر مزید ظلم ڈھاؤں یہ مجھ سے نہ ہو گا کسی شخص نے ایک بزرگ کے سامنے حجاج ابن یوسف کو بہت زیادہ برا بھلا کہا انہوں نے فرمایا کہ تو حجاج کو برا مت کہہ قیامت کے روز جس طرح اللہ تعالیٰ حجاج سے ان مظالم کا بدلہ لے گا جو اس نے لوگوں پر ڈھائے ہیں اسی طرح لوگوں سے ان برائیوں کا بدلہ بھی لے گا جو وہ حجاج ابن یوسف کے خلاف کرتے ہیں۔ حدیث شریف میں ہے نہ

إِنَّ الْعَبْدَ لَيُظْلَمُ الْمَظْلَمَةَ فَلَا يَزَالُ يَشْتُمُ ظَالِمَهُ وَيَسْتَبِهُ حَتَّى يَكُونَ بِمَقْتَلِ مَا ظَلَمَهُ ثُمَّ يَبْقَى لِلظَّالِمِ عَلَيْهِمُ ظَالِمًا يَبْتِمَارُ أَدْعَالِيَهُ يُفْتَضُّ لَعْنُ الْمَظْلُومِ (۲)

بندہ برا ظلم کرتا ہے کہ اپنے ظالم کو برا بھلا کہتا رہتا ہے اور گالیاں دیتا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ گالیاں اس ظلم سے سوا ہو جاتی ہیں پھر اس کے ذمے ظالم کا مطالبہ باقی رہ جاتا ہے ظالم کو اس کا عوض مظلوم سے دیدیا جائے گا۔ **چھٹا ادب** یہ ہے کہ چور اس عمل پر تمکین ہو کہ اس نے چوری کی ہے گناہ کا ارتکاب کیا ہے اور اللہ تعالیٰ کے عذاب کا مستحق بنا ہے اور اس بات پر اللہ کا شکر ادا کرے کہ اس نے مجھے مظلوم بنایا ظالم نہیں بنایا میری دنیا کا نقصان ہوا دین کا نقصان نہیں ہوا ایک شخص نے کسی عالم سے شکایت کی کہ راجزوں نے اس کا مال و اسباب لوٹ لیا ہے عالم نے کہا تمہیں اپنے مال و متاع سے زیادہ غم اس کا ہونا چاہیے کہ مسلمانوں میں رہتی کہنے والے اور لوٹ کے مال کو حلال سمجھنے والے بھی ہیں اگر تمہیں صرف اپنے مال کا غم ہے اور مسلمان گناہوں کا غم نہیں ہے تو تم مسلمانوں کے ہی خواہ نہیں ہو علی ابن فضیل کے کچھ دینار عین اس وقت چوری ہو گئے جب وہ طواف میں مصروف تھے جب انہیں دینار کی چوری کا علم ہوا تو رونے لگے ان کے والد نے حیرت

(۱) یہ روایت پہلے ہی گذری ہے۔ (۲) یہ روایت بھی گذر چکی ہے۔

چوتھا مقصد ازالہ مضرت (موجودہ)

میں فرشتوں کی جس جماعت کے پاس سے بھی گذرا اس نے یہی کہا کہ اپنی امت کو پہچنے لگوانے کا حکم دیجئے۔ ایک حدیث میں واضح طور پر پہچنے لگوانے کا حکم دیا اور اس کی علت بھی بیان فرمائی چنانچہ ارشاد فرمایا :-

اِحْتَجِمُوا السَّبْعَ عَشْرَةَ وَتِسْعَ عَشْرَةَ وَاحِدِي وَعَشْرَيْنَ لَا يَنْتَبِعُ بِكُمْ الدَّمُ
فَيَقْتُلُكُمْ (بزار۔ ابن عباس۔ ترمذی رحمہ)

سترہ، انیس، اور اکیس برس کی عمر میں بچنے لگوؤ تاکہ خون جوش میں آکر تمہیں ہلاک نہ کر دے۔

اس ارشاد مبارک میں دو باتیں بطور خاص قابل غور ہیں، ایک تو یہ کہ خون کے پھجان کو اللہ کے حکم سے ملک اور قاتل قرار دیا گیا ہے، اور دوسری یہ ہے کہ جسم سے خون کا اخراج اس ہلاکت سے محکم الٰہی نجات دیتا ہے، جسم سے ملک خون نکالنے، کپڑوں سے بچھو جھاڑنے، اور گھر میں سانپ کو باہر نکالنے میں کوئی فرق نہیں ہے اور نہ ان مذاہب کا ترک داخل توکل ہے، یہ ایسا ہے جیسے گھر میں آگ لگ جائے اور اسے بجھانے کے لئے پانی ڈال دیا جائے، وکیل برحق کی سنن جاریہ کے خلاف کرنا توکل نہیں ہے۔ ایک حدیث میں ہے :-

مَنْ احْتَجَمَ يَوْمَ الثَّلَاثِ لِسَبْعِ عَشْرَةَ مِنَ الشَّهْرِ كَانَ لَهُ دَوَاءٌ مِنْ دَاءٍ وَسَنْتَدٍ طِبْرَانِي۔ (معتقل ابن یسار)

جو شخص مہینے کی سترہویں تاریخ منگل کے روز بچھے لگوائے، اس کے لئے (یہ طریقہ) ایک سال کی بیماری کا علاج ہوگا۔

سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان عمومی خطابات کے علاوہ بعض صحابہ کرام کو بطور خاص بھی دواء کرنے کا حکم دیا ہے، چنانچہ حضرت سعد ابن معاذ کی فصد کھلائی۔ (مسلم۔ جابر) سعد ابن زرارہ کے داغ لگوا یا (طبرانی۔ سیل ابن حنیف) حضرت علیؓ آشوب چشم میں مبتلا تھے ان سے فرمایا کہ وہ کھجور نہ کھائیں (اور جو کے آٹے میں ملا کر پکائے گئے ساگ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ) یہ چیز کھاؤ یہ چیز تمہارے مزاج کے مناسب ہے (ابو داؤد، ترمذی، ابن ماجہ۔ اُمّ المنذر) حضرت سبب کی آنکھ میں درد تھا، اور وہ کھجوروں سے شوق کر رہے تھے۔ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ تم کھجوریں کھا رہے ہو اور تمہاری آنکھ میں درد ہے، سبب نے عرض کیا کہ میں اس آنکھ کی طرف سے کھا رہا ہوں جس میں درد نہیں ہے آپ یہ سن کر مسکرا دیے۔ (۱)

اب کچھ فعلی روایات ملاحظہ کیجئے۔ ایک حدیث میں جو اہل بیت سے مروی ہے یہ بیان کیا گیا ہے کہ آپ ہر شب سرمہ لگایا کرتے تھے، ہر مہینے بچھے لگواتے تھے، اور ہر سال سنا کا جلاب لیا کرتے تھے (ابن عدی۔ عائشہ) کئی مرتبہ آپ نے بچھو کے کانے کا علاج بھی کروایا (طبرانی۔ جلد ابن الارزق) ایک روایت میں ہے کہ نزول وحی کے وقت آپ کے سر مبارک میں شدید درد ہو جاتا تھا، آپ نے اس کے ازالے کے لئے کئی مرتبہ مندی کالیپ کرایا (بزار، ابن عدی۔ ابو ہریرہ) ایک روایت میں ہے کہ جب کبھی آپ کے جسم مبارک کے کسی حصے میں کوئی پھنسی یا پھوڑا نکل آتا تھا تو آپ اس پر مندی لگا لیتے تھے (ترمذی، ابن ماجہ) بعض روایات میں وارد ہے کہ آپ زخم پر مٹی لگاتے تھے (بخاری و مسلم۔ عائشہ)

اس سلسلے میں بے شمار روایات ہیں، ہم نے بطور نمونہ صرف چند روایات بیان کی ہیں اس موضوع پر کتابیں بھی لکھی گئی ہیں، جن میں ایک کتاب بہت زیادہ مشہور ہے جس کا نام ”طب نبوی“ ہے۔ بنی اسرائیل کی روایات میں مذکور ہے کہ ایک مرتبہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کوئی مرض لاحق ہو گیا۔ آپ کے پاس بنی اسرائیل میں سے کچھ لوگ آئے اور انہوں نے آپ کے مرض کی تشخیص کی، اور ایک دواء تجویز کرنے کے بعد کہا کہ اگر آپ یہ دوا استعمال کریں گے تو صحت یاب ہو جائیں گے، آپ نے فرمایا میں یہ دوا ہرگز استعمال نہیں کروں گا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ مجھے بغیر دواء کے اچھا کر دے، وہ مرض بڑھ گیا، لوگوں نے پھر اصرار کیا کہ آپ یہ دوا ضرور استعمال کریں، اس کی یہی دوا ہے، نہایت مؤثر اور مفید ہے اور ہم نے متعدد بار اس کا تجربہ کیا ہے، آپ نے اس کے باوجود انکار فرمادیا، وحی آئی اللہ تعالیٰ نے فرمایا مجھ اپنی عزت و جلال کی قسم ہے میں تمہیں صحت یاب نہیں کروں گا، یہاں تک

کہ تم بھی دواء استعمال نہ کرو جو لوگوں نے تمہارے لئے تجویز کی ہے، چنانچہ آپ نے لوگوں کو بلایا اور ان سے وہ دوائے کرکھائی، صحت یاب ہو گئے، لیکن دل میں ایک کائنا کلکتا رہا۔ وحی آئی کہ اے موسیٰ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ میری ذات پر اس طرح کا توکل کر کے میرا نظام حکمت درہم برہم کر دو؟ ذرا یہ تو بتاؤ کہ اس دواء میں جسے کھا کر تم صحت یاب ہوئے ہو شفا کس نے رکھی ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ کسی چیمبر نے اپنے مرض کی شکایت کی، انہیں بذریعہ وحی مطلع کیا گیا کہ وہ اٹھ کر کھایا کریں۔ ایک نبی نے ضعف باہ کی شکایت کی ان کے لئے دودھ اور گوشت تجویز کیا گیا ہے کہ ان میں قوت ہوتی ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ کسی قوم نے اپنے نبی سے شکایت کی کہ ہمارے بچے خوبصورت نہیں ہوتے، انہیں بذریعہ وحی اطلاع دی گئی کہ وہ اپنی حاملہ عورتوں کو بھی کھلایا کریں، اس سے بچے خوبصورت ہوں گے۔ لیکن اس پر عمل اس وقت کرنا چاہیے جب ان کی عورتیں تین چار ماہ کی حاملہ ہو جائیں، بچوں کے چہرے اللہ تعالیٰ انہی میٹوں میں بناتے ہیں، چنانچہ وہ لوگ حاملہ عورتوں کو بھی کھلاتے تھے، اور بچے کی پیدائش کے بعد تانہ کھجوریں کھلاتے تھے۔

اس تفصیل سے ثابت ہوا کہ مسبب الاسباب کی سقت یہی ہے کہ اس نے اپنی حکمت کے اظہار کے لئے مسبات کو اسباب کے ساتھ مربوط کر دیا ہے۔ دوائیں بھی اسباب ہیں اور باقی تمام اسباب کی طرح اللہ تعالیٰ کے لئے مسخر ہیں، جس طرح روٹی بھوک کی دوا ہے، اور پانی پیاس کی دوا ہے، اسی طرح سنگین صفراء کی دوا ہے، اور سقمونیادستوں کی دوا ہے، اگر ان دونوں میں کوئی فرق ہے تو صرف دو باتوں میں، ایک یہ کہ روٹی سے بھوک اور پانی سے پیاس کا علاج ایک بدنسی امر ہے، سب لوگ اس علاج کا علم رکھتے ہیں جب کہ سنگین سے صفراء کا علاج صرف خاص خاص لوگوں کے علم میں ہوتا ہے، پھر جو لوگ تجربے کے ذریعے اس حقیقت کو پایا لیتے ہیں کہ صفراء کے مرض میں سنگین مفید ہے اس کے لئے سنگین بھی روٹی اور پانی کے حکم میں ہوتی ہے، دوسرا فرق یہ ہے کہ مسلسل دوا، اور صفراوی مادے کو تسکین دینے والی سنگین کے لئے باطن میں کچھ اور شریں بھی ہیں، اور ان کی افادت کے لئے کچھ مزاجی اسباب بھی مطلوب ہیں، بعض اوقات انسان ان شرائط اور اسباب سے آگاہ نہیں ہوتا تو سناوست نہیں لاتی، اور سنگین صفراوت کو قابو میں نہیں کرتی، لیکن پیاس کو دور کرنے کے لئے سوائے پانی کے نہ کوئی شرط ہے اور نہ سبب، ہاں بعض اوقات آدمی بہت زیادہ پانی پی کر بھی سیراب نہیں ہوتا، لیکن ایسا بہت کم ہوتا ہے۔ ہر حال اسباب میں انہی دو باتوں سے ظلل واقع ہوتا ہے، ورنہ سبب کے بعد سبب ضرور ہو گا۔ بشرطیکہ تمام شریں اپنی جگہ موجود ہوں۔ سبب اور سبب کا یہ باہمی ارتباط مسبب الاسباب کی حکمت، تدبیر، قدرت، تغیر اور ترتیب کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے۔ اس لئے اگر متوکل اس اعتقاد کے ساتھ نہ کہ وہ اسباب سے استفادہ کرتا ہے تو یہ توکل کے خلاف نہیں ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی خدمت میں عرض کیا پروردگار عالم! مرض اور دوا کس کے ہاتھ میں ہے، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا میرے ہاتھ میں ہے، آپ نے عرض کیا پھر پیسوں کا مصرف کیا ہے، ارشاد ہوا کہ اپنا رزق کما تے ہیں، اور میرے بندوں کا دل خوش کرتے ہیں، یہاں تک کہ میرے بندوں میں کسی پر شفا یا قضا آ جائے۔ ہر حال دواء کے ساتھ علم اور حال میں توکل مطلوب ہے، عمل کا توکل مطلوب نہیں، چنانچہ دوا نہ کرنا توکل کے لئے شرط نہیں ہے۔

دواء اور داغ میں فرق یہاں تم یہ کہہ سکتے ہو کہ داغ بھی ایک طریقہ علاج ہے اور اس کی افادت بھی مسلم ہے، پھر اس سے کیوں منع کیا جاتا ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ داغ ایسا نہیں ہے، جیسے اور طریقے علاج ہیں، جیسے فصد کھلوانا، پیچنے لگوانا، مسلسل دوا پینا، حرارت کو بروقت سے اور بروقت کو حرارت سے دور کرنا، یہ تمام اسباب ظاہری ہیں، اگر داغ بھی ان ہی جیسا ہوتا تو تقریباً تمام ہی ملکوں میں اس کا دواج ہوتا حالانکہ یہ طریقہ علاج صرف عربوں اور ترکوں میں متوج ہے، یہ بھی متزاور جادو ٹونے کی طرح وہی سبب ہے، اگر فرق ہے تو صرف اس قدر کہ داغ آگ سے لگایا جاتا ہے، اور بظاہر اس کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی، کیوں کہ آگ کا داغ لگانے سے جس درد کا علاج کیا جاتا ہے اس کے لئے اور بھی دوائیں ہیں، اور علاج کے دوسرے طریقے

ہیں جن میں جلانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ آگ سے جلانا جسم کو خراب کرتا اور زخم کو پھیلاتا ہے۔ اس میں یہ اندیشہ رہتا ہے کہ گھسیں اس کے اثرات جسم کے دوسرے حصوں میں سرایت نہ کر جائیں۔ اس کے برعکس فصد اور حجامت کے زخم پھیلتے نہیں ہیں اور نہ ان سے فلفہ اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ پھر ان دونوں کے قائم مقام کوئی اور طریقہ بھی نہیں ہے۔ اسی لئے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے داغ دینے سے منع فرمایا (بخاری - ابن عباس) منتر (جھاڑ پھونک شرعی حدود میں روک کر) سے منع نہیں فرمایا (بخاری و مسلم - مائتہ) حالانکہ توکل سے دونوں بچتے ہیں۔

حضرت عمران ابن حصین کے بارے میں روایت ہے کہ جب وہ کسی مرض میں گرفتار ہوئے تو لوگوں نے ان سے کہا کہ آپ داغ لگوائیں، مگر انہوں نے ان لوگوں کا یہ مشورہ قبول کرنے سے انکار کر دیا، لوگوں نے اصرار کیا، یہاں تک کہ امیر نے قسم دے کر کہا کہ آپ داغ ضرور لگوائیں، مجبوراً آپ نے داغ لگوا لیا، اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ میں نور دیکھا کرتا تھا، اور آواز سناتا کرتا تھا، یہاں تک کہ فرشتے بھی مجھے سلام کیا کرتے تھے، داغ لگوانے کے بعد یہ تمام باتیں ختم ہو گئیں، چند داغ لگوانے تھے وہ لگوائے، تکلیف اٹھائی اور ہاتھ کچھ نہ آیا، جو کچھ پاس تھا وہ بھی چھین گیا، اس کے بعد آپ نے توبہ واستغفار کیا، اور الحاح و زاری کے ساتھ دعا کی، اللہ تعالیٰ نے وہ معاملات ان کے ساتھ پھر جاری فرما دیے اس واقعے کے بعد انہوں نے مطرف ابن عبد اللہ سے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے جس دولت سے پہلے نوازا رکھا تھا وہ پھر عطا فرمادی ہے، وہ ان کے علم میں یہ بھی لاپکے تھے کہ داغ لگوانے سے ان کی کون سی دولت ختم ہوئی ہے۔

بہر حال داغ اور اس طرح کی دوسری چیزیں متوکل کی شان کے خلاف ہیں، کیوں کہ ان میں تدبیر کی ضرورت پیش آتی ہے اور متوکل کے لئے تدبیر مناسب نہیں ہے، اس میں اسباب کی طرف زیادہ التفات اور میلان بھی پایا جاتا ہے۔

بعض حالات میں دوا نہ کرنا جانتا چاہیے کہ سلف صالحین میں سے بے شمار افراد نے دواؤں کے ذریعے اپنے امراض کا علاج کیا ہے، بعض اکابرین سلف ایسے بھی ہیں جنہوں نے کبھی دوا نہیں کی، اس سے یہ گمان نہ کرنا چاہیے کہ دوا نہ کرنا ان کے لئے باعث نقص ہے، اس لئے کہ اگر ترک دوا یہ کمال ہوتا تو سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم بھی ایسا کرتے، اس لئے کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں کسی دوسرے کا حال زیادہ مکمل نہیں ہو سکتا۔ حضرت ابوبکر الصدیقؓ کی خدمت میں کسی نے بیماری کے دوران یہ عرض کیا کہ اگر آپ کا حکم ہو تو آپ کے لئے حکیم کو بلا لیا جائے، آپ نے فرمایا مجھ پر حکیم کی نظر ہے اور وہ یہ کہتا ہے نہ: **فَعَالٌ لِّمَآ يُرِيدُ** (پ ۳۰ ر ۱۰ آیت ۱۶) جو چاہتا ہے کر گذرتا ہے۔

حضرت ابو الدرداءؓ سے کسی نے پوچھا کہ آپ کو کیا مرض لاحق ہو گیا ہے، انہوں نے فرمایا گناہوں کا مرض۔ لوگوں نے عرض کیا کہ اب آپ کس چیز کی خواہش رکھتے ہیں، فرمایا مغفرت کی، لوگوں نے کہا اگر آپ کی مرضی ہو تو ہم حکیم کو بلا کر لے آئیں، فرمایا مجھے حکیم ہی نے بیمار کیا ہے۔ حضرت ابو ذرؓ کی آنکھیں دکھ رہی تھیں، لوگوں نے ان سے کہا کہ آپ اس مرض کا علاج کرائیں، انہوں نے جواب دیا کہ میں ان کی پروا نہیں کرتا، لوگوں نے کہا تب آپ اللہ تعالیٰ سے دعائے صحت کریں، فرمایا میں اس سے زیادہ اہم اور مفید دعا مانگوں گا۔ ربیع ابن خثیم فالج میں مبتلا ہو گئے، لوگوں نے ان سے دوا کے لئے کہا، انہوں نے فرمایا کہ میں نے ارادہ تو کیا تھا کہ کسی حکیم کو دکھا دوں، ورنہ اس سے کوئی دوا لے لوں، مگر پھر عباد اور ثمود اور دوسری قوموں کا خیال آگیا، ان میں بڑے بڑے ماہر اور حاذق طبیب تھے، لیکن آج نہ طبیب موجود ہیں نہ دوا کارگر ہوئی اور نہ جھاڑ پھونک ہی کام آئی۔ حضرت امام احمد ابن حنبلؓ فرماتے ہیں کہ جو شخص توکل کا راستہ اختیار کرنا چاہتا ہے میں اس کے لئے دوا سے زیادہ ترک دوا پسند کرتا ہوں۔ امام صاحب بعض بیماریوں میں مبتلا تھے لیکن طبیب کے پوچھنے پر بھی اپنے یہ امراض نہ بتلاتے۔ حضرت سہل تستریؒ سے دریافت کیا کہ بندے کا توکل کب مکمل ہوتا ہے، فرمایا جب اس کے جسم اور مال میں ضرر لاحق ہو اور وہ ان کی طرف التفات نہ کرے، اپنے حال میں مشغول رہے، اور یہ خیال رکھے کہ اللہ میرے احوال کا نگران ہے۔ بہر حال دوا ترک کرنے والوں کی تعداد

بھی اچھی خاصی ہے اور ان کا یہ طریقہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے افعال و ارشادات سے متقاض ہے، اس لئے ذیل میں ہم مانعِ دوا سبب بیان کرتے ہیں، تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ یہ حضرات دوا کیوں ہیں کرتے تھے اور یہ کہ ان کا دوا نہ کرنا سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادِ عمل سے مطابقت رکھتا ہے، ہر حال دوا نہ کرنے کے چند اسباب ہیں۔

مانع اسباب۔ پہلا سبب یہ ہے کہ مریض اہل کشف میں سے ہو، اور اس پر بذریعہ کشف یہ حقیقت منکشف ہو گئی ہو کہ ان کا وقت قریب آچکا ہے، اور اب کوئی دوا انہیں فائدہ نہیں دے گی، بعض اوقات موت کا قرب رویا و صادق سے، کبھی غلبہٴ عقل سے، اور کبھی حقیقت کشف کے ذریعہ معلوم ہو جاتا ہے۔ غالباً حضرت ابو بکر صدیقؓ نے علاج اسی لئے نہیں کرایا تھا کہ آپ صاحب کشف تھے، چنانچہ آپ نے وراثت کے سلسلے میں ایک مرتبہ حضرت عائشہؓ سے فرمایا کہ تیری دو بہنیں ہیں، حالانکہ اس وقت ایک ہی بہن تھی، البتہ آپ کی اہلیہ حل سے تھیں اور بعد میں لڑکی پیدا ہوئی۔ اس سے معلوم ہوا کہ آپ نے پیدائش سے پہلے ہی بذریعہ کشف یہ بات معلوم کر لی تھی کہ لڑکی پیدا ہوگی، ہو سکتا ہے آپ پر موت کا وقت بھی منکشف ہو گیا ہو، اور اسی بنا پر دوا نہ کرنے سے منع کر دیا ہو، ورنہ یہ کیسے ممکن تھا کہ آپ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو دوا استعمال کرتے ہوئے اور دوسروں کو اس کا حکم کرتے ہوئے دیکھتے اور خود انکار فرما دیتے، حضرت ابو بکر صدیقؓ سے یہ امر بعید معلوم ہوتا ہے۔

دوسرا سبب یہ ہے کہ مریض اپنے حال میں، خوفِ عاقبت میں، اور اپنے حال پر خدا تعالیٰ کے علم و اطلاع میں اس قدر مستغرق اور مشغول ہو کہ مرض کی تکلیف کا احساس ہی نہ رہے، اور حال میں اشتغال کے بعد قلب کو دوا و علاج کی فرصت نہ ہو چنانچہ حضرت ابو ذرؓ نے واضح طور پر یہ اعلان کر دیا تھا کہ مجھے اپنی آنکھوں کے علاج کی فرصت نہیں ہے۔ حضرت ابو الدرداءؓ فرماتے تھے کہ مجھے گناہوں کا مرض لاحق ہے، اور ان کی وجہ سے دل میں جو تکلیف اور اذیت ہوتی ہے وہ اتنی زیادہ ہے کہ جسم کو مرض کی تکلیف کا احساس ہی نہیں رہتا۔ ایسے مریض کو اس شخص سے تشبیہ دی جاسکتی ہے جس کا کوئی عزیز دوست یا رشتہ دار ہلاک ہو گیا ہو، یا اس شخص سے جس کے بارے میں دربارِ شاهی سے یہ حکم جاری ہو چکا ہو کہ اسے پھانسی دیدی جائے، اب اگر ان دونوں سے یہ کہا جائے کہ تم کھانا کیوں نہیں کھاتے، تم بھوکے ہو، ظاہر ہے وہ اس کے جواب میں یہی کہیں گے، ہم اس غم اور صدمے سے اس قدر غمگین ہیں کہ بھوک اور پیاس کا احساس ہی باقی نہیں رہا۔ ظاہر ہے ان کے جواب کو ان کی حالت کی روشنی میں دیکھا جائے گا، یہ نہیں کہا جائے گا کہ وہ شخص بھوک کی حالت میں کھانے کی ضرورت اور منفعت کا انکار کر رہا ہے، اور کھانے والوں پر طعن کر رہا ہے۔ حضرت سل سترتیؓ نے بعض سوالات کے جواب میں جو کچھ فرمایا دراصل وہ بھی ایک خاص استثنائی کیفیت کا آئینہ دار ہے، وہ اس وقت اپنے حال میں مشغول تھے جب ان سے کسی نے سوال کیا کہ قوت کیا چیز ہے؟ فرمایا جی، قیوم کا ذکر کرنا قوت ہے، مسائل نے عرض کیا کہ میرا سوال قوامِ انسانی کے متعلق ہے، انہوں نے جواب دیا کہ قوامِ انسانی علم ہے، مسائل نے کہا کہ میں غذا کے متعلق دریافت کرتا ہوں انہوں نے جواب دیا کہ غذا اگر ہے، مسائل نے لہجہ ہو کر کہا کہ میں ظاہری جسم کے کھانے کے بارے میں سوال کر رہا ہوں، انہوں نے فرمایا تو جسم ظاہر کے متعلق کیوں فکر مند ہے، اسے اسی کے حوالے کر جس نے اسے پیدا کیا ہے، اور جس نے پہلے بھی اس کی کفالت کی ہے اور آئندہ بھی وہی اس کی کفالت کرے گا، مگر اس میں کوئی مرض آجائے تب بھی اسے اس کے بنانے والے کے حوالے کر دے کیا تو نہیں جانتا کہ جب کسی چیز میں کوئی نقص پیدا ہو جاتا ہے تو اسے اس کے صانع کے حوالے کر دیا جاتا ہے تاکہ وہ اصلاح کر دے اور اس کا عیب دور کر دے۔

تیسرا سبب یہ ہے کہ بیماری انتہائی پرانی ہو، اور اس کے لئے لوگ جو دوائیں تجویز کرتے ہوں ان کی افادیت وہی ہو، چھپے داغ اور منتر کا فائدہ وہی ہوا کرتا ہے، اس صورت میں بھی متوکل دوا نہیں کرتا۔ ربیع ابن خثیم کے اس قول میں غالباً اسی امر کی طرف اشارہ ہے کہ مجھے عداور و ثمود کی قومیں یاد آئیں، جن میں بے شمار ماہر طبیب تھے لیکن اب نہ طبیب باقی ہیں اور نہ مریض۔ غالباً وہ یہ کہتا چاہتے تھے کہ دوا کوئی زیادہ قابلِ اعتماد چیز نہیں ہے، اور یہ امر کبھی تو واقع میں ایسا ہی ہوتا ہے اور کبھی مریض کے

نزدیک متحقق ہوتا ہے، کیوں کہ اسے علم طب میں مہارت نہیں ہوتی، اور دواؤں کی افادیت میں اس کے تجربات بہت کم ہوتے ہیں، اسی لئے اس دوا کی افادیت کے متعلق عن غالب نہیں ہوتا، جب کہ طبیب کو زیادہ تجربہ اور اس کی افادیت کا زیادہ اعتقاد ہوتا ہے جن بزرگوں نے دوا استعمال نہیں کی ان میں سے بیشتر کے نزدیک دوا ایک وہی اور ناقابل اعتبار و اعتماد چیز رہی ہے، جو لوگ علوم طب میں مہارت رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ بعض دوائیں واقعی ایسی ہی ہیں کہ ان کی منفعت یقینی نہیں ہوتی، صرف وہی ہوتی ہے، اور بعض دوائیں مؤثر اور مفید ہیں، لیکن ان میں اطباء کو جس قدر اعتماد اور عن غالب ہوتا ہے اتنا عوام کو نہیں ہوتا اس لئے وہ مفید اور مجرب دواؤں کے متعلق بھی اچھی رائے نہیں رکھتے۔

جو تھا سبب اللہ کے نیک بندوں کو یہ خواہش ہوتی ہے کہ ان کا مرض باقی رہے اور وہ اس کی اذیت پر صبر کر کے اجر و ثواب کے مستحق ہوں، یا وہ اپنے نفس کا امتحان لیتے ہیں اور یہ دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جو مصیبت اس پر نازل کی ہے اس میں وہ ثابت قدم بھی رہتا ہے یا نہیں۔

جہاں تک مرض پر ثواب ملنے کی بات ہے اس سلسلے میں بہت سی روایات وارد ہیں۔ ایک حدیث میں ہے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ہم انبیاء کی جماعت پر دوسرے لوگوں کے مقابلے میں سخت مصیبت نازل ہوتی ہے، پھر درجہ بہ درجہ کم ہوتی رہتی ہے بندے پر اس کے ایمان کے بقدر مصیبت نازل ہوتی ہے، اگر اس کا ایمان مضبوط اور پختہ ہوتا ہے تو مصیبت بھی انتہائی سخت اور شدید ہوتی ہے، اور ایمان میں ضعف ہوتا ہے تو مصیبت بھی ہلکی اور معمولی ہوتی ہے (طبرانی۔ ابوامامہ) ایک حدیث میں وارد ہے ۔

إِنَّ اللَّهَ تَعَالَى يُجْزِبُ عَبْدَهُ بِالْبَلَاءِ كَمَا يُجْزِبُ أَحَدَكُمْ ذَهَبَهُ بِالنَّارِ، فَمِنْهُمْ مَنْ يَخْرُجُ كَالنَّهَبِ الْأَبْرَزِ لَا يَزِيدُ مِنْهُمْ كُنُوفٌ ذَلِكَ وَمِنْهُمْ مَنْ يَخْرُجُ أَسْوَدَ مُحَنَرِّقًا۔ (طبرانی۔ ابوامامہ)

اللہ تعالیٰ مصیبت کے ذریعے اپنے بندے کو اس طرح آنا تا ہے جیسے تم میں سے کوئی اپنے سونے کو آگ سے پرکھتا ہے، بعض لوگ کند بن کر نکلتے ہیں، بعض اس سے کم، اور بعض سیاہ اور چلے ہوئے نکلتے ہیں۔

ایک حدیث میں جو اہل بیت سے مروی ہے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندے سے محبت کرتا ہے تو اسے مصیبت میں مبتلا کرتا ہے اگر وہ اس مصیبت پر صبر کرتا ہے تو اسے جنتی کرتا ہے اور وہ اس پر راضی رہتا ہے تو مصطفیٰ کرتا ہے (طبرانی۔ ابوجنید) ایک حدیث شریف میں ہے تم یہ چاہتے ہو کہ آوارہ گدھوں کی طرح ہو جاؤ، تم بیمار پڑو، اور نہ طویل ہو، (ابو نعیم۔ ابن عبد البر، بیہقی۔ ابوفاطمہ) حضرت عبداللہ ابن مسعود فرماتے ہیں کہ جب تم کسی مومن کو دیکھو گے تو اسے قلب کے اعتبار سے صبح اور جسم کے اعتبار سے مریض پاؤ گے، اور منافق کو جسم کے اعتبار سے صحت مند اور قلب کے اعتبار سے بیمار پاؤ گے۔ جب لوگوں نے مرض اور مصیبت کی اس قدر تعریف سنی تو انہوں نے مرض کو پسند کیا اور اسے قیمت جانا تاکہ اس پر صبر کا ثواب حاصل کر سکیں۔ بعض بزرگان دین کا حال یہ تھا کہ اگر انہیں کوئی مرض ہوتا تو اسے چھپانے کی کوشش کرتے، یہاں تک کہ طبیب سے بھی ذکر نہ کرتے، مرض کی اذیت برداشت کرتے، اللہ کے حکم پر راضی رہتے، اور جانتے کہ دل پر حق اتنا غالب ہے کہ اسے جسم پر اثر انداز ہونے والے مرض کا احساس ہی نہیں ہوتا، مرض سے صرف جوارح متاثر ہو سکتے ہیں، اور جوارح کا متاثر ہونا دل کو مشغول نہیں کرتا، صرف یہ ہو سکتا ہے کہ بیٹھ کر نماز پڑھیں، اور اللہ کے فیصلے پر صبر کے ساتھ بیٹھ کر نماز ادا کرنا صحت و عافیت کے ساتھ کھڑے ہو کر نماز پڑھنے سے بہتر ہے۔ ایک حدیث میں ہے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :

إِنَّ اللَّهَ تَعَالَى يَقُولُ لِلْمَلَائِكَةِ أَكْتُبُوا الْعَبْدِي صَالِحَ مَا كَانَ يَعْمَلُهُ فَإِنَّهُ نَافِقٌ إِنْ أَطْلَقْتَهُ أَبْلَغْتَهُ لَحْمًا خَيْرًا مِنْ لَحْمِهِ وَمَا خَيْرًا مِنْ قِيَمِهِ وَإِنْ تَوَقَّيْتَهُ تَوَقَّيْتَهُ إِلَى رَحْمَتِي۔ (طبرانی۔ عبداللہ ابن عمر)

اللہ تعالیٰ ملائکہ سے کہتا ہے کہ میرے بندے کے لئے وہی نیک اعمال لکھو جو وہ کرتا تھا، اس لئے کہ یہ میری قید میں ہے، اگر میں اسے رہا کروں گا تو گوشت کے بدلے اچھا گوشت اور خون کے بدلے اچھا خون دوں گا اور اگر وفات دوں گا تو اپنی رحمت کی طرف دوں گا۔

ایک روایت میں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی مذکور ہے :-

أَفْضَلُ الْأَعْمَالِ مَا أَكْرَهْتَ عَلَيْهِ النَّفْسُ - بہترین عمل وہ ہے جس پر نفس مجبور کئے جائیں۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ ان بہت زیادہ مصائب اور امراض نازل ہوں۔ قرآن کریم کی اس آیت میں اسی کی طرف اشارہ ہے :-

وَعَسَى أَنْ تَكْرَهُهُ وَاشْتِئَاءَهُ وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ (پ ۲۲ آیت ۲۲)

اور یہ بات ممکن ہے کہ تم کسی امر کو گراں سمجھو اور وہ تمہارے حق میں خیر ہو۔

حضرت سہیل ستیریؒ فرماتے ہیں کہ اگرچہ آدمی طاعات سے ضعیف اور فرائض کی ادائیگی سے قاصر ہو جائے مگر وہ انہ کرنا طاعات کے لئے دوا کرنے سے بہتر ہے۔ انہیں ایک سنگین مرض لاحق تھا، لیکن وہ اس کا علاج نہیں کرتے تھے، تاہم اگر کوئی دوسرا شخص اس مرض میں مبتلا ہوتا تو اس کا علاج ضرور کرتے۔ اگر کسی شخص کو پیٹھ پر نماز پڑھتے ہوئے دیکھتے اور انہیں یہ پتا چلتا کہ یہ شخص کھڑے ہو کر نماز پڑھنے کے لئے علاج کرا رہا ہے تو پیدا تعجب کرتے، اور کہتے کہ اس شخص کا پیٹھ پر نماز پڑھنا اور اپنے حال پر راضی رہنا اس سے بہتر ہے کہ صرف کھڑے ہو کر نماز پڑھنے کی قوت پانے کے لئے دوا کرے۔ کسی شخص نے ان سے دوا پینے کے متعلق سوال کیا، انہوں نے جواب دیا کہ جو شخص دوا کرتا ہے تو اس میں بہر حال اللہ تعالیٰ نے ضعیفوں کے لئے گنجائش رکھی ہے، لیکن افضل یہی ہے کہ دوا نہ کرے، اس لئے کہ اگر وہ کوئی چیز دوا کے بطور استعمال کرے گا خواہ وہ ٹھنڈا پانی ہی کیوں نہ ہو، اس سے اس کے متعلق سوال کیا جائے گا اور جو استعمال ہی نہیں کرے گا اس سے کوئی سوال بھی نہ ہوگا، حضرت سہیل اور علماء بصرین کا مسلک یہ تھا کہ نفس کو بھوک سے کمزور کرنا اور شہوات کی قوت ختم کرنا بہتر ہے، اس لئے کہ اعمالِ قلوب یعنی صبر، رضا اور توکل وغیرہ کا ایک ذرہ جو اس کے پاؤں پر اعمال سے افضل ہے اور مرضِ قلوب کے اعمال کے لئے مانع نہیں ہے، الایہ ہے کہ وہ مرض اس قدر شدید اور تکلیف دہ ہو کہ آدمی بے ہوش ہو جائے۔

یہ سبب - یہ ہے کہ بندے کے سابقہ گناہ بہت ہو جائیں اور وہ ان سے خائف ہو اور اپنے آپ کو ان ذنوب کی تکفیر سے عاجز سمجھتا ہو، اس کے خیال میں ان گناہوں کی تکفیر کی ایک صورت یہی ہے کہ مرض طویل ہو جائے، اس لئے وہ اپنے مرض کا علاج نہیں کرتا کہ کہیں دوا کے استعمال سے مرض جلد زائل نہ ہو جائے۔ مرض سے گناہوں کے ازالے کا ثبوت حدیث شریف سے ملتا ہے۔ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :-

لَا تَزَالُ الْخُمُشَى وَالْمَلِيْلَةُ الْقَبْدُ حَتَّى يَمْشِيَ عَلَى الْأَرْضِ كَالْبَرْدَةِ عَلَيْهِ ذَنْبٌ وَلَا

خَطِيئَةٌ (طبرانی - ابوالدرداء - ابوسلمہ بن عبدی - ابویوسف)

بندہ پر بخار اور چپ لڑھکھ اس لئے رہتے ہیں کہ وہ زمین پر ایسا ہو جائے جیسے اولہ کہ نہ اس پر کوئی گناہ ہو نہ خطا۔

ایک حدیث میں ہے :-

خُمُشَى يَوْمَ كَفَّارَةٍ سَنَةٍ (مسند اشاب - ابن مسعود) ایک دن کا بخار ایک سال کا کفارہ ہے۔

بعض لوگوں نے اس کی یہ حکمت بیان کی ہے کہ ایک دن کے بخار سے انسان کی ایک سال کی قوت ضائع ہو جاتی ہے، بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ انسان کے تین سوساٹھ جوڑ ہیں اور بخار ان سب میں گھس جاتا ہے، تمام جوڑ تکلیف محسوس کرتے ہیں، چنانچہ ہر جوڑ کی تکلیف ایک دن کے گناہوں کا کفارہ بن جاتی ہے۔ ایک مرتبہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بخار ذنوب کا کفارہ ہے، حضرت زید ابن ثابتؓ نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ مجھے ہمیشہ کے لئے بخار عطا کیجئے، چنانچہ وہ زندگی بھر بخار میں مبتلا رہے یہاں

تک کہ اسی مرض میں وفات پائے، بعض انصاری صحابہ نے بھی یہی دعا کی وہ بھی ہمیشہ بخار میں مبتلا رہے (احمد، ابو یوسف، ابو سعید الخدری) ایک مرتبہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :-

مَنْ أَذْهَبَ اللَّهُ كَرِيْمَتِيْهِ لَمْ يَزِمْ طَعْمًا تَوَلَّاهَا تَوَلَّى الْجَنَّةَ قَالَ فَلَقَدْ كَانَ مِنَ الْأَنْصَارِ مَنْ يَتَمَنَّى الْعَمَى (۱)

اللہ تعالیٰ جس شخص کی دونوں آنکھیں سلب کر لیتا ہے اس کے لئے جنت سے کم ثواب پر راضی نہیں ہوتا۔
راوی کہتے ہیں کہ انصار میں بعض لوگ ایسے بھی تھے جو ناپاک ہونے کی تمنا کیا کرتے تھے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں کہ جو شخص مال میں مصائب اور جسم میں امراض پاکر خوش نہ ہو اور یہ نہ جائے کہ مصائب اور امراض اس کے گناہوں کے لئے کفارہ ہیں وہ عالم نہیں ہو سکتا۔ روایت ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک شدید مصیبت زدہ انسان کو دیکھ کر اس کے لئے رحم کی دعا کی، وحی آئی کہ اے موسیٰ! اس پر اور کیسے رحم کروں، جس مصیبت میں یہ مبتلا ہے یہ بھی اس کے لئے رحم ہی ہے، میں اس کے درجات اسی مصیبت کی وجہ سے بلند کروں گا۔

چھٹا سبب یہ ہے کہ اس کے نفس کو زیادہ دیر تک صحت مند اور تندرست رہنے سے کبر، غور، اور سرکشی کا خوف ہو، اس لئے وہ مرض کا علاج نہیں کرانا کہ کہیں مرض کے زوال کے بعد نفس میں غفلت، اہل، غلو اور تکبر نہ پیدا ہو جائے اور طاقت کے تدارک کے لئے وہ لیت و لعل نہ کرنے لگے اور خیر کے کاموں کو ٹالنے نہ لگے، صحت صفات انسانی کی قوت کا نام ہے اور جب صفات قوی ہوتی ہے تو جسم میں شہوات اور خواہشات کو تحریک ہوتی ہے اور معاصی کی طرف میلان ہوتا ہے، اگر یہ سب کچھ نہیں ہوتا تب بھی اتنا ضرور ہوتا ہے کہ مباحات سے لطف اندوزی کی خواہش پیدا ہوتی ہے اس خواہش پر عمل کرنے سے وقت بھی ضائع ہوتا ہے، اور نفس کی مخالفت اور اسے طاعت کا پابند بنانے میں جو عظیم قائدہ ہونے والا تھا وہ بھی ختم ہو جاتا ہے، اللہ تعالیٰ جب کسی بندے کے لئے خیر کا ارادہ کرتا ہے تو اسے امراض اور مصائب کے ذریعے تنبیہ کرتا رہتا ہے، اسی لئے یہ کہا جاتا ہے کہ مومن، طاعت، قلت یا ذلت سے خالی نہیں ہوتا۔ ایک حدیث قدسی میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ مفلس میرا قید خانہ ہے، اور مرض میری زنجیر ہے، میں (مرض کی زنجیر سے مفلس کے قید خانے میں) اس شخص کو قید کرتا ہوں جسے میں اپنی مخلوق میں سب سے زیادہ پسند کرتا ہوں۔ اس سے معلوم ہوا کہ مرض اور مفلس سے بڑھ کر بندہ مومن کے لئے خیر کی بات کوئی دوسری نہیں ہے، کیوں کہ وہ دونوں کے ذریعے سرکشی اور ارتکابِ مصیبت سے بچا رہتا ہے، جس شخص کو اپنے نفس پر خوف ہو اسے اپنے مرض کا علاج نہ کرانا چاہیے اس لئے کہ اصل عافیت یہ ہے کہ آدمی گناہوں سے بچا رہے۔ ایک بزرگ نے کسی شخص سے دریافت کیا کہ تم میرے بعد کیسے رہے، اس نے کہا خیریت سے، بزرگ نے کہا اگر تم نے کسی مصیبت کا ارتکاب نہیں کیا تو واقعی خیریت سے رہے ہو، اور اگر تم نے گناہ کیا ہے تو اس سے بڑھ کر اور مرض کیا ہو سکتا ہے، اس مرض کے بعد تم خیریت سے رہنے کا دعویٰ کیسے کر سکتے ہو۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے عراق میں دیکھا کہ عید کے دن چل پل، نسب و نعت، اور خوشی و مسرت کے آثار ہیں، آپ نے لوگوں سے دریافت کیا کہ ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے، لوگوں نے مرض کیا کہ ان کی عید کا دن ہے، حضرت علیؑ نے فرمایا جس دن ہم کوئی نافرمانی کریں گے وہ دن ہمارے لئے عید کا دن ہو گا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :-

وَعَصَيْبُكُمْ مِنْ بَعْدِ مَا لَكُمْ مَا تَحِبُّونَ۔ (پ ۳۷ آیت ۱۵۲)

اور تم کہنے پر نہ چلے اس کے بعد کہ تم کو تمہاری دل خواہ بات دکھلا دی تھی۔

ماتحبون سے مراد عافیت ہے۔ ایک جگہ ارشاد فرمایا :-

إِنَّ الْإِنْسَانَ لِرَبِّهِ لَكَا سَتَغْفِي۔ (پ ۳۰ آیت ۷)

مجھے بے شک (کافر) آدمی حد (آدمیت) سے نکل جاتا ہے اس واسطے کہ اپنے آپ کو مستغنی دیکھتا ہے۔

(۱) اس روایت کا پہلا حصہ مرفوع ہے، اور اس کا احوال پہلے گذر چکا ہے البتہ لفظ کان الھی زیادتی کی سند مجھے نہیں ملی۔

اس میں اگرچہ مال کا استغناء مراد ہے، لیکن صحت کے استغناء سے بھی آدمی سرکش ہو جاتا ہے، بعض علماء کی رائے ہے کہ فرعون نے اَنَّا رَبُّكُمْ الْاَعْلٰی (میں تمہارا خدا ہے برتر ہوں) اسی لئے کہا تھا کہ وہ ایک طویل زمانے سے راحت و سکون کے ساتھ زندگی گزار رہا تھا، چار گیس تک زندہ رہا، اور اس عرصے میں نہ اس کے سر میں درد ہوا، نہ جسم گرم ہوا، اور نہ نبض تیز چلی، اس لئے خدائی کا دعویٰ کر بیٹھا، اللہ تعالیٰ اس پر لعنت کرے، اگر ایک ہی روز کے لئے اس کے آدمے سر میں درد ہو جاتا تو دعویٰ خدائی تو کیا دوسری لغویات سے بھی باز رہتا۔ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں :-
اَكْثَرُ وَاَمِنْ ذِكْرِ هَادِمِ اللَّذَاتِ (ترغی، نسائی، ابن ماجہ۔ ابو ہریرہ)
 لذتوں کو ڈھالنے والے کا ذکر بکثرت کیا کرو۔

کہتے ہیں کہ بخار موت کا قاصد ہے، اس لئے کہ وہ واقعہ موت کو یاد دلانے والا ہے، اور اطاعات میں غل مٹول کو دور کرنے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :-

اُولَٰئِكَ يَدْرُوْنَ اَنَّهُمْ يُفْتَنُوْنَ فِي كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً اَوْ مَرَّتَيْنِ ثُمَّ لَا يَتُوبُوْنَ وَلَا هُمْ يَذْكُرُوْنَ (پ ۱۱۵ آیت ۳۶)

اور کیا ان کو دکھائی نہیں دیتا کہ یہ لوگ ہر سال میں ایک بار یا دو بار کسی نہ کسی آفت میں پھنسے رہتے ہیں، پھر بھی باز نہیں آتے اور نہ وہ کچھ سمجھتے ہیں۔

اس آیت کی تفسیر میں بعض علماء یہ کہتے ہیں کہ امراض میں مبتلا کر کے ان کا امتحان لیا جاتا ہے کہتے ہیں کہ جب بندہ دو مرتبہ بیمار ہونے کے باوجود توبہ نہیں کرتا تو ملک الموت اس سے کہتے ہیں کہ اے غافل میرا قاصد تیرے پاس دو مرتبہ آیا لیکن تو نے میرے پیغام کا جواب نہیں دیا۔ پچھلے دور میں اگر کوئی ایسا سال گذر جاتا جس میں جان و مال پر کوئی مصیبت نازل ہوتی تو سلف صالحین وحشت زدہ ہو جاتے، اور فرماتے کہ ہر مومن پر ہر چالیس دن میں کوئی نہ کوئی مصیبت ایسی ضرور آتی ہے جس سے وہ خوف زدہ ہو جائے۔ ایک روایت میں ہے کہ حضرت عمار ابن یاسرؓ نے ایک عورت سے نکاح کیا، وہ بھی بیمار نہیں ہوتی تھی، آپ نے اسے طلاق دیدی۔ ایک مرتبہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کسی عورت کا تذکرہ ہوا، بعض صحابہ نے اس کی بیوی تعریف کی، یہاں تک کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے شرفِ زوجیت بخشے، کارادہ فرمایا، اسی دوران کسی صحابی نے عرض کیا کہ وہ کبھی بیمار نہیں ہوئی، آپ نے ارشاد فرمایا اگر ایسا ہے تو مجھے اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے (احمد۔ النسائی) ایک مرتبہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں مرض اور درد کا موضوع زیر بحث تھا، اسی اثناء میں آپ نے ارشاد فرمایا کہ درد سراپا ہے اور فلاں مرض ایسا ہے، حاضرین میں سے ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ درد سر کسے کہتے ہیں، میں تو اس سے واقف ہی نہیں، آپ نے ارشاد فرمایا : تو مجھ سے دور رہ۔ اس کے بعد لوگوں سے ارشاد فرمایا کہ جو شخص کسی دوزخی کو دیکھنا چاہے وہ اسے دیکھ لے (ابوداؤد۔ عامر)۔ آپ نے اس شخص کو دوزخی اس لئے کہا کہ ایک حدیث میں یہ مذکور ہے :-

الْحُمَّى حَقٌّ كُلُّ مُؤْمِنٍ مِنَ النَّارِ (بخاری۔ عائشہؓ۔ احمد۔ ابوامامہ)

بخار دوزخ میں سے ہر مومن کا حصہ ہے۔

حضرت انس اور حضرت عائشہؓ کی روایت میں ہے کہ کسی شخص نے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ قیامت کے دن شداء کے ساتھ اور بھی کوئی ہوگا، فرمایا : ہاں وہ شخص جو ہر روز موت کو بیس مرتبہ یاد کیا کرے، ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ جو شخص اپنے گناہ یاد کر کے دل گیر ہوتا ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ موت بیماری میں زیادہ یاد آتی ہے۔ بہر حال یہ فوائد ہیں جن کی بنا پر بعض اکابرین سلف نے یہ بہتر سمجھا کہ دوا استعمال نہ کی جائے ان کے خیال میں بیماری سے درجات بلند ہوتے ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ دوا کرنا نقص ہے، یہ بات وہ کس طرح کہہ سکتے ہیں جب کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی دوا کی ہے، اور دوسروں کو بھی دوا کرنے کا حکم دیا ہے۔

دوانہ کرنا ہر حال میں افضل نہیں اگر کوئی شخص یہ کہے کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے دوا اس لئے کی ہے کہ دوسروں کے لئے سنت بن جائے، ورنہ دوا کرنا ضعفاء کا حال ہے، اقرباء کے درجے میں ترک دوا کے ساتھ توکل واجب ہے۔ اس کے جواب میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس طرح جو شش خون کے وقت ترک حاجت اور ترک قصد کو بھی توکل کی شرط ہونا چاہیے۔ اگر کہنے والا اسے بھی شرط قرار دے تو ہم یہ کہیں گے کہ اس طرح تو متوکل کے لئے یہ بھی ضروری ہو گا کہ اگر اسے بچھو، اور سانپ وغیرہ کاٹ لے تو اس کے اثرات داخل نہ کرے کیوں کہ خون باطن جسم کو دھستار ہے، اور بچھو ظاہر جسم پر کاٹتا ہے، بظاہر ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اگر کہنے والا اسے بھی داخل توکل کرے تو اس سے کہا جائے گا کہ پھر تو یہ بھی ضرور ہو گا کہ آدمی پیاس کے کانٹے کو پانی سے، بھوک کے کانٹے کو روٹی سے اور سردی کے کانٹے کو جبہ سے دفع نہ کرے، حالانکہ اس کا کوئی بھی قائل نہیں ہے، پانی روٹی اور جبے کے استعمال کو سب لوگ توکل سے الگ سمجھتے ہیں، جب کہ ہمارے نزدیک ان درجات میں کوئی فرق نہیں ہے۔ بلکہ یہ تمام اسباب ہیں جنہیں مستبب الاسباب نے اسی طرح مرتب کیا ہے اور اسی طرح اپنی سنت قرار دی ہے۔

حضرت عمرؓ کا واقعہ اپنے اس دعویٰ کی دلیل میں کہ اس طرح کے امور داخل توکل نہیں ہم حضرت عمر ابن الخطاب کا یہ واقعہ پیش کر سکتے ہیں، آپ نے ایک مرتبہ حضرات صحابہ کے ساتھ شام کا سفر کیا، جب دمشق کے قریب جا بیٹے تک پہنچے تو صحابہ کو معلوم ہوا کہ شام میں سخت دبا اور طاعون پھیلا ہوا ہے، اب یہاں یہ سوال پیدا ہوا کہ آیا شام میں داخل ہوا جائے یا نہیں، اس سوال کو لے کر دو گروہ ہو گئے، ایک گروہ نے کہا کہ ہم دبا اور طاعون میں نہیں جائیں گی، کیوں کہ یہ ایسا ہے جیسے کوئی شخص اپنے آپ کو جلتی ہوئی آگ میں گرادے، ایک گروہ نے کہا کہ ہم جائیں گے، اللہ پر توکل کریں گے، اور جو کچھ ہماری تقدیر میں ہے اس سے گریز نہیں کریں گے، نہ موت سے خوف کھائیں گے، اور نہ ان لوگوں کے زمرے میں داخل ہوں گے جن کے حلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے نہ۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ خَرَجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ أُلُوفٌ حَصَرَالْمَوْتِ (پ ۲۲ آیت ۲۴۳)
کیا تم کو ان لوگوں کا قصہ معلوم نہیں جو کہ اپنے گروہوں سے کل گئے تھے اور وہ لوگ ہزاروں تھے موت سے بچنے کے لئے۔

دونوں گروہ حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور اس سلسلے میں آپ کی رائے دریافت کی، جو لوگ شام میں داخلے پر مصر تھے، انہوں نے کہا کہ ہمیں اللہ تعالیٰ کی تقدیر سے بھی بھاگنا چاہیے، حضرت عمرؓ نے جواب دیا ہاں! ہم اللہ کی تقدیر سے اللہ ہی کی تقدیر کی طرف فرار اختیار کریں گے۔ اس کے بعد آپ نے ایک مثال بیان کی کہ فرض کرو کہ تم میں سے کسی شخص کے پاس بکریاں ہوں اور انہیں چرانے کے لئے دو دواہاں موجود ہوں۔ ان میں سے ایک سرسبز و شاداب ہو، اور دوسری بے آب و گیاہ ہو، اب اگر اس شخص نے سرسبز و شاداب دواہی اختیار کی تب بھی وہ اللہ کی تقدیر اور حکم پر بے اثر نہ رہے گا، اور خشک و بنجر دواہی میں گیا تب بھی اللہ کے حکم اور تقدیر سے جانے والا ہو گا۔ صحابہ نے اس کی تائید کی۔ اس کے بعد آپ نے حضرت عبدالرحمن ابن عوف کو قاصد بھیج کر بلوایا وہ ایک روز بعد تشریف لائے، ان کے سامنے بھی یہ اختلافی موضوع رکھا گیا، حضرت عبدالرحمن ابن عوف نے فرمایا کہ اس معاملے میں میری رائے وہ ہے جو میں نے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہے، حضرت عمرؓ نے فرمایا سبحان اللہ! اگر آپ کا ارشاد موجود ہے تو پھر اس اختلاف کی گنجائش نہیں ہے۔ آپ بیان کریں، ابن عوف نے فرمایا کہ میں نے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے یہ ارشاد سنا ہے نہ۔

إِنَّا سَمِعْنَاهُ بِالْوَبَاءِ فِي الْأَرْضِ فَلَا تُقْلِعُوا عَلَيْهِ وَإِنَّا وَقَعْنَا وَانْتُمُ بِهَا قَلَّا تَخْرُجُوا
فِرَارًا مِنْهَا۔ (۱)

(۱) بخاری۔ اس روایت سے پہلے حضرت عمرؓ کا واقعہ تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

جب تم یہ سنو کہ کسی جگہ دبا پھیلی ہوئی ہے تو اس پر اقدام مت کرو اور اگر کسی ایسی جگہ جہاں تم پہلے سے موجود ہو دو واقع ہو جائے تو اس سے فرار اختیار مت کرو۔

یہ حدیث سن کر حضرت عمرؓ نے حد خوش ہوئے اور انہوں نے حدیث سے اپنی رائے کی مطابقت پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا اور صحابہ کو جابیہ سے واپس لے آئے۔

دیکھئے یہاں تمام صحابہ کرام نے ترک توکل پر اتفاق کیا، معلوم ہوا کہ اس طرح کے امور توکل کے لئے شرط نہیں ہیں ورنہ صحابہ کرام اس پر اتفاق کیسے کرتے، کیوں کہ اس سے ترک توکل لازم آتا ہے جو اعلیٰ مقامات میں سے ہے۔

وبائی علاقوں سے فرار نہ ہونے کا حکم یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر معمرینوں سے بچنا داخل توکل نہیں تو پھر اس زمین سے نکلنے کی ممانعت کیوں کی گئی جہاں تم محکم ہو اور دبا پھوٹ پڑے، طب میں دہام کا باعث ہوا کو قرار دیا گیا ہے، ظاہر ہے ہوا معمر ہے، اور معمرینوں سے گریز کرنا ہی بہترین علاج ہے، پھر اس کی اجازت کیوں نہیں دی گئی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ معمرینوں سے بچنا بالاتفاق خلاف توکل نہیں ہے، جیسے معمرینوں سے بچنے کے لئے بچنے لگوائے جاتے ہیں، اور ضد کھلائی جاتی ہے، لیکن ایسا لگتا ہے کہ وبائی علاقے سے باہر نکلنے کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ یہ صحیح ہے کہ دہام کا سبب ہوا ہے، لیکن محض ظاہر جسم کو ہوا لگتا اس کا سبب نہیں ہو سکتا، بلکہ جب متعفن اور بدبودار ہوا سانس کے ذریعے جسم میں جاتی ہے تو دل، ہیمہٹروں اور اندرونی جسم کے پردوں پر اپنے مضر اثرات چھوڑتی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ دہام جسم کے ظاہری حصوں پر اثر انداز نہیں ہوتی، بلکہ جسم کے اندرونی نظام کو متاثر کرتی ہے۔ اس لئے اگر کوئی محض کسی شہر میں رہتا ہے، اور وہاں دہام پھیلتی ہے تو غالب گمان یہی ہے کہ وہ اس کے اثرات سے محفوظ نہ رہ سکا ہو گا، تاہم یہ احتمال بھی ہے کہ اس پر یہ دہام اس قدر اثر انداز نہ ہوئی ہو، اس صورت میں دہام سے فرار اختیار کرنا محتاط کا ایک وہی سبب ہوا جیسے جھاڑ پھونک اور قال وغیرہ۔ تاہم اگر صرف یہی بات وہاں سے نکلنے کا سبب ہوتی تب بھی کوئی مضائقہ نہ تھا، لیکن اس کی ممانعت ایک اور وجہ سے بھی کی گئی ہے، اور وہ یہ ہے کہ اگر تندرست اور صحتمند لوگوں کو وبائی علاقے سے نکلنے کی اجازت دیدی جائے تو شہر میں سوائے بیماروں، اور مریضوں کے اور کوئی باقی نہیں رہے گا۔ اور کوئی محض ایسا نہیں بچ سکے گا جو انہیں کھانا، پانی اور دوا دے سکے، اور وہ خود اپنی بیماری کے باعث یہ ضرورتیں پوری نہیں کر سکتے، اس صورت میں صحت مند لوگوں کا اس شہر سے نکلنا مریضوں کو ہلاک کرنا ہے، اس لئے کہ ان کی زندگی کا احتمال موجود ہے بشرطیکہ صحیحہ معرولہ رہیں رہیں، اور ان کی مناسب نگہداشت کریں۔ مسلمانوں کو ایک عمارت کی مثال کہا گیا ہے کہ ایک کی تقویت دوسرے سے ہوتی ہے یا ایک جسم کے اعضاء قرار دیا گیا ہے کہ اگر ایک عضو کو تکلیف ہوتی ہے تو باقی تمام اعضاء اس کی تکلیف محسوس کرتے ہیں۔ ہمارے نزدیک نکلنے کی ممانعت کی وجہ یہی تعاون، ہمدردی، اور اخوت ہے، ہو سکتا ہے اور بھی وجوہات ہوں جو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ البتہ جو لوگ ابھی شہر میں داخل نہیں ہوئے ان کے لئے یہی حکم ہے کہ وہ باہر ہی رہیں کیوں کہ ابھی تک متعفن اور زہریلی ہوا ان پر حملہ آور نہیں ہوئی ہے، اور نہ شہر کے بیماروں کو ان کی ضرورت ہے کہ اگر یہ لوگ داخل نہ ہوئے تو وہ لوگ ہلاک ہو جائیں گے، وہاں پہلے ہی سے ان کی دیکھ بھال کرنے والے موجود ہیں، ہاں اگر شہر میں کوئی ایسا نہ بچا ہو کہ مریضوں کی دیکھ بھال کر سکے، اور ان کے کھانے، پانی اور دوا کا تکفل ہو سکے، اور اس صورت میں کہ لوگ ان بیماروں کی امانت کے لئے شہر میں داخل ہوں تو عجب نہیں ان کا یہ عمل مستحب قرار پائے، کیوں کہ ضرر کا لاحق ہونا ایک وہی امر ہے، اور مسلمانوں کو ضرر سے بچنا ایک عینی معاملہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حدیث شریف میں طاعون اور دہام کے علاقوں سے بھاگنے کو میدان جہاد سے فرار ہونا قرار دیا گیا ہے۔ (احمد۔ عاتقہ) کیوں کہ جس طرح میدان جہاد سے بھاگنا مسلمانوں کو جہاد کہا اور انہیں دشمنوں کے سپرد کر دینا ہے اسی طرح شہر دبا سے فرار اختیار کرنا بھی مسلمانوں کو جہاد کرنا اور ہلاک کرنا ہے۔

یہ دقیق امور ہیں، جو محض انہیں نظر انداز کرتا ہے اور صرف احادیث و آثار کے خواہر پر نظر رکھتا ہے اسے اکثر ان امور میں

مخالط ہو جاتا ہے، عابدوں اور زاہدوں کو اس طرح کے مخالطوں سے بڑا سائقہ پڑتا ہے، اسی لئے وہ اپنی کم علمی اور کم نظری کے باعث غلطی کر بیٹھتے ہیں، علم کا شرف یہی ہے کہ اس طرح کے مخالطات میں صاحب علم فریب نظر کا شکار نہیں ہوتا، بلکہ وہ بظاہر مختلف باتوں کو ایک کر کے صحیح راہ تلاش کر لیتا ہے۔

اس تفصیل سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا اسباب اور وجوہات کی بنا پر دوا کرنا افضل ہے، اس پر اگر کوئی شخص یہ شبہ وارد کرے کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے دوا کیوں ترک نہیں فرمائی، تاکہ اور فضائل کی طرح یہ فضیلت بھی آپ کو حاصل ہو جاتی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ دوا نہ کرنے کی فضیلت ان لوگوں کے لئے ہے جو مرض کو معاصی کا کفارہ بنانا چاہتے ہوں، یا صحت کی حالت میں نفس کی سرکشی اور شہوات کے تسلط سے خوف زدہ ہوں، یا غفلت سے نجات پانا اور موت کو یاد رکھنا چاہتے ہوں، یا راضین اور متوکلین کے مقامات سے عاجز ہونے کے بعد صابرین کا ثواب حاصل کرنا چاہتے ہوں، یا ان لطائف اور فوائد پر مطلع نہ ہوں جو اللہ تعالیٰ نے دواؤں میں ودیعت فرمائے ہیں، بلکہ اس کے نزدیک دوائیں بھی جھاڑ پھونک کی طرح وہی ہوں، یا ایسے احوال میں مشغول ہوں کہ دوا نہ کر سکتے ہوں، کیوں کہ دوا کریں گے تو یہ احوال باقی نہ رہ جائیں گے اور ضعف کے باعث ان دونوں۔ صحت اور بقاء احوال۔ میں جمع کرنا ان کے بس میں نہیں ہے۔ لیکن یہ تمام امور جنہیں ہم دوا کے استعمال کے لئے مانع اسباب کہہ سکتے ہیں، عام لوگوں کے لئے وجہ کمال ہیں، جب کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس کے لئے باعث نقصان ہیں، کیوں کہ آپ کی ذات گرامی ان تمام مقامات سے بلند اور برتر تھی، آپ کی شان کے لائق یہی امر تھا کہ اسباب کے وجود اور عدم دونوں میں آپ کا مشاہدہ یکساں رہے، کیوں کہ آپ کا التفات صرف مسبب الاسباب کی طرف تھا۔ جس شخص کا یہ مرتبہ ہوتا ہے اسے اسباب سے نقصان نہیں پہنچتا، جیسے مال کی رفعت ایک نقص ہے، اور اس سے نفرت کرنا کو کمال ہے لیکن اس شخص کے لئے نقص ہے جس کے نزدیک مال کا وجود اور عدم دونوں برابر ہوں، سونے اور پتھر کو برابر سمجھنے کا مقام اس سے زیادہ کمال ہے کہ سونے سے بچا جائے پتھر سے نہ بچا جائے۔ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک سونا اور پتھر دونوں برابر تھے، لیکن مخلوق کو زندگی تعلیم دینے کے لئے آپ اپنے پاس سونا نہیں رکھتے تھے، کیوں کہ مخلوق کی مستائے قوت زندہ ہے آپ کو سونا رکھنے سے اپنے نفس پر خوف نہیں تھا، کیوں کہ آپ کا مرتبہ اس سے بلند تھا کہ دنیا آپ کو فریب دے سکے چنانچہ آپ پر زمین کے خزانے پیش کیے گئے لیکن آپ نے قبول کرنے سے انکار فرما دیا۔ ہر حال اسباب کے عدم و وجود کے اسی یکساں مشاہدے کی بنا پر آپ کے نزدیک اسباب کا استعمال کرنا یا استعمال نہ کرنا دونوں برابر تھے۔ لیکن آپ نے دوا اس لئے استعمال فرمائی کہ اللہ تعالیٰ کی سنت و عادت اسی طرح جاری ہے، آپ نے امت کے لئے بھی اس کی گنجائش رکھی تھی، کیوں کہ اس میں کوئی ضرر بھی نہیں تھا، مال اس لئے جمع نہ فرمایا کہ اس میں بے شمار نقصانات ہیں۔

تاہم دوا کرنا اس صورت میں ضرر ہو سکتا ہے کہ خالق دوا کے بجائے صرف دوا کو نافع سمجھا جائے، یا دوا اس لئے استعمال کی جائے کہ اس سے حاصل ہونے والی صحت کو معاصی کے ارتکاب کا ذریعہ بنایا جائے گا۔ اور یہ دونوں صورتیں ممنوع ہیں، لیکن ان دونوں ہی صورتوں کا وقوع شاذ و نادر ہوتا ہے، اکثر مومنین معصیت کے لئے صحت حاصل نہیں کرتے، اور نہ محض دوا کو مفید و مؤثر سمجھتے ہیں، بلکہ اس لئے مفید سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان میں افادیت، تاثیر اور نفع مضمّن کر دیا ہے، جس طرح پانی بذات خود پیاس زائل کرنے والا یا روٹی اپنے ذات سے بھوک مٹانے والی نہیں ہے۔ دوا کا حکم کب کے حکم کی طرح ہے، اگر کوئی شخص طاعت یا معصیت پر مدد حاصل کرنے کے لئے کماتا ہے تو اس کا حکم الگ ہے، اور مباحات سے حتم حاصل کرنے کے لئے کماتا ہے تو اس کا حکم جدا ہے۔

ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ بعض حالات میں دوا نہ کرنا افضل ہے، اور بعض میں دوا کرنا بہتر ہے، اور افضلیت کا یہ اختلاف احوال، اشخاص اور نبات کے اختلاف پر مبنی ہے، توکل میں دوا کا استعمال شرط ہے، اور نہ ترک دوا شرط ہے۔ صرف وہیات کا ترک شرط ہے جیسے داغ لگوانا اور جھاڑ پھونک کرنا کیونکہ وہیات پر عمل کرنا ایسی تدبیرات اختیار کرنا ہے جو متوکلین کے شایان

شان نہیں ہیں۔

مرض کے اظہار اور کتمان میں متوکلیں کے احوال جاننا چاہیے کہ مرض کا کتمان، فقر، اور دوسرے تمام مصائب کا اخفاء نیکی کے خزانوں میں سے ایک بڑا خزانہ ہے، اور یہ ایک اعلیٰ مقام ہے، کیوں کہ اللہ کے حکم پر راضی رہنا، اور اس کی عطا کردہ مصیبتوں پر صبر کرنا ایک ایسا معاملہ ہے جو صرف اس کے اور اللہ کے درمیان ہوتا ہے، اس لئے اگر اپنا حال پوشیدہ رکھا جائے تو اس میں بہت سی آفات سے سلامتی ہے، تاہم اگر نیت اور مقصد صحیح ہو تو اظہار میں کوئی مضائقہ بھی نہیں ہے۔

اظہار کے تین مقاصد پہلا مقصد علاج کرانا ہے، ظاہر ہے اس صورت میں طبیب کو اپنے حال سے آگاہ کرنا ہوگا، یہ آگاہی بطور شکایت نہیں ہوتی، بلکہ بطور حکایت ہوتی ہے کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ کی قدرت اس پر واقع ہوتی ہے اسے من و عن نقل کر دیتا ہے۔ چنانچہ حضرت بشر حکیم عبدالرحمن کے دو بھائی اپنا حال کہہ دیا کرتے تھے اسی طرح حضرت امام احمد ابن حنبلؒ بھی اپنا مرض بیان کر دیا کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت مجھ میں جو اثر کرتی ہے میں صرف وہ بیان کرتا ہوں، دوسرا مقصد یہ ہے کہ مریض حقیقی ہو اور معرفت میں کامل ہو، اور وہ طبیب کے علاوہ دوسرے لوگوں سے اس لئے اظہار کرتا ہو کہ انہیں مرض میں حسن ممبر بلکہ حسن فکر کی تعلیم دے سکے، اور یہ بتا سکے کہ مرض بھی ایک نعمت ہے، جس طرح اور نعمتوں پر شکر ادا کیا جاتا ہے، اسی طرح اس پر بھی شکر کرنا چاہیے، حسن بصریؒ کہتے ہیں کہ اگر مریض اللہ تعالیٰ کی تعریف اور شکر نعمت کے بعد اپنی تکلیف اور درد کا اظہار کرے تو یہ شکوہ نہیں ہے۔ تیسرا مقصد یہ ہے کہ مرض کے اظہار سے اپنا عجز، اور اللہ تعالیٰ کی طرف اپنی احتیاج ظاہر کرے، اور یہ صورت اس شخص کے لئے زیادہ مناسب ہے جو قوت اور شجاعت رکھتا ہو، اور جس سے مجزوا انکسار مستبعد ہو، جیسے کسی شخص نے حضرت علیؓ کرم اللہ وجہ سے ان کی بیماری کے دوران پوچھا کہ آپ کیسے ہیں؟ فرمایا: میں برا ہوں۔ لوگ یہ جواب سن کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے، گویا انہوں نے اس جواب کو اچھا تصور نہیں کیا بلکہ شکایت جانا۔ آپ نے فرمایا کیا میں اپنے رب کے سامنے بہادر ہوں؟ حضرت علیؓ نے اپنی قوت اور شجاعت کے باوجود یہ بہتر سمجھا کہ اپنے عجز، اور اللہ تعالیٰ کی طرف اپنی احتیاج ظاہر کریں، اس سلسلے میں آپ نے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم اور ہدایت کے مطابق عمل کیا تھا۔ ایک مرتبہ آپ بیمار ہوئے تو یہ دعا مانگی کہ اے اللہ! مجھے مصیبت پر صبر عطا کر، سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مصیبت کا سوال تم خود کر رہے ہو صحت کی دعا کرو (۱) یہ تین مقاصد ہو سکتے ہیں جن کی بنیاد پر مرض کے اظہار کی اجازت دی جاسکتی ہے، اظہار کے لئے ان مقاصد کی شرط اس لئے ضروری ہے کہ مرض کا ذکر کرنا شکایت ہے، اور اللہ تعالیٰ کی شکایت کرنا حرام ہے جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ بلا ضرورت سوال کرنے میں اللہ تعالیٰ کی شکایت ہے، اس لئے ضرورت کے بغیر مانگنا جائز نہیں ہے۔

مرض کا ذکر جس میں خفگی بھی پائی جاتی ہو، اور اللہ تعالیٰ کے فضل پر ناپسندیدگی بھی شکایت بن جاتی ہے، لیکن اگر مذکورہ بالا مقاصد بھی نہ ہوں، اور خفگی بھی نہ ہو، تو نہی ذکر کیا کرتا ہو تو اسے ناجائز نہیں کہا جائے گا، لیکن یہ کہا جائے گا کہ اگر ذکر نہ کرنا تو بہتر تھا، کیوں کہ بلا وجہ ذکر کرنے میں بھی شکایت کا وہم ہو جاتا ہے، مثلاً جس قدر مرض ہوتا ہے اس سے کہیں زیادہ بیان کر دیا جاتا ہے، یا روانہ کرنے میں توکل کو جس قدر دخل ہوتا ہے اس سے کہیں زیادہ بیان کیا جاتا ہے، ان مقاصد کے علاوہ اظہار کی کوئی اور وجہ سمجھ میں نہیں آتی، اظہار سے بہتر تو یہ ہے کہ دعا کرے اور صحت پائے۔ ایک بزرگ کہتے ہیں کہ جس نے مرض ظاہر کر دیا اس نے صبر نہیں کیا۔ بعض مفسرین نے قرآن کریم کی اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے کہ یہاں وہ صبر مراد ہے جس میں شکوہ نہ ہو۔

فَصَبِّرْ جَمِیْلٌ (پ ۳۳ ر ۱۸) سو صبری کروں گا جس میں شکایت کا نام نہ ہو گا۔

حضرت یعقوب علیہ السلام سے کسی شخص نے دریافت کیا کہ آپ کی آنکھیں کس چیز سے ضائع ہو گئیں فرمایا زمانے کے غم و اندوہ سے، وحی آئی کہ اے یعقوب تم ہمارے بندوں کے سامنے ہماری شکایت کر رہے ہو، حضرت یعقوب علیہ السلام نے عرض کیا اے

(۱) یہ روایت پہنچے گذری ہے۔

اللہ! میں اپنی غلطی پر توبہ کرتا ہوں۔ ملاؤ اس اور مجاہد کہتے ہیں کہ بیمار پر اس کا آہ آہ کرنا لکھا جاتا ہے۔ اکابرین سلف بیمار کی آہ کو برا سمجھتے تھے، کیوں کہ اس میں بھی ایک طرح کی شکایت کی جاتی ہے۔ بعض لوگوں کا قول ہے کہ حضرت ابوب علیہ السلام پر شیطان صرف اس لئے حاوی ہوا کہ انہوں نے اپنے مرض میں آہ کی تھی۔ ایک حدیث میں ہے کہ جب بندہ بیمار ہوا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے دونوں فرشتوں سے فرماتا ہے کہ دیکھو یہ اپنے عبادت کرنے والوں سے کیا کہتا ہے، چنانچہ اگر وہ عبادت کرنے والوں سے خدا کا شکر اور تشریف کرتا ہے تو فرشتے اس کے لئے دعا۔ نہ خیر کرتے ہیں، اور اگر وہ شکایت کرتا ہے، یا برائی کرتا ہے تو فرشتے کہتے ہیں کہ تو ایسا ہی رہے گا (۱) بعض بزرگان دین اس خوف سے کہ کہیں کوئی حرف شکایت زبان سے نہ نکل جائے، یا اظہار مرض میں مبالغہ نہ ہو جائے یہ مناسب نہ سمجھتے تھے کہ ان کی عبادت کی جائے، چنانچہ وہ لوگ بیمار پڑتے تو اپنے گھر کا دروازہ بند کر لیتے تاکہ کوئی ان کے پاس نہ آئے، جب صحت یاب ہوتے تو خود باہر نکل کر لوگوں سے ملاقات کرتے۔ فضیل ابن عیاض، وہیب ابن الورد اور شمر ابن الحارث کا یہی معمول تھا۔ حضرت فضیل فرمایا کرتے تھے کہ میں بیمار ہونا چاہتا ہوں، مگر مجھے یہ اچھا نہیں لگتا کہ لوگ عبادت کے لئے آئیں، میں بیماری کو صرف عبادت کرنے والوں کے باعث ناپسند کرتا ہوں۔

کتاب المحبة والشوق والانس والرضا

محبت، شوق، انس اور رضا کے بیان میں

محبت تمام مقامات میں انتہائی بلند مرتبہ رکھتی ہے، اس لئے کہ محبت کے بعد جتنے بھی مقامات ہیں وہ سب اس کے قائل ہیں جیسے شوق، انس اور رضا، اور اس سے پہلے جتنے مقامات ہیں وہ سب محبت کے مقدمات ہیں جیسے توبہ، صبر، اور زہد۔ محبت کے علاوہ جتنے بھی مقامات ہیں اگرچہ ان کا وجود نادر ہے لیکن مومنین کے قلوب ان پر ایمان کے امکان سے خالی نہیں ہوتے۔ لیکن محبت الہی پر ایمان لانا مشکل ہے، اسی لئے بعض علماء نے اس کے امکان کی نفی کی ہے اور محبت الہی کے یہ معنی بیان کئے ہیں کہ اس کی اطاعت و عبادت پر موانعت کی جائے، جہاں تک حقیقی محبت کا سوال ہے وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ محال ہے، کیوں کہ ایسی محبت صرف اپنی جنس اور مثل سے کی جاتی ہے، ان علماء نے صرف محبت ہی کا انکار نہیں کیا بلکہ انس، شوق، لذت مناجات، اور محبت کے باقی تمام لوازم کی نفی بھی کی ہے، اس لئے یہ ضروری ہوا کہ ہم حقیقت حال بیان کریں۔

اس کتاب میں پہلے ہم محبت کے شرعی شواہد بیان کریں گے، پھر اس کی حقیقت اور اسباب پر روشنی ڈالیں گے، اس کے بعد یہ بتلائیں گے کہ محبت کا استحقاق صرف اللہ تعالیٰ کے لئے ہے، اور سب سے بڑی لذت اللہ تعالیٰ کے دیدار کی لذت ہے، اور یہ لذت آخرت میں ان لوگوں کے لئے دوچند ہوگی جو دنیا میں اس کی معرفت رکھتے ہیں اس کے بعد یہ بیان کریں گے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت میں قوت پیدا کرنے والے اسباب کون سے ہیں، اور اس کی وجہ کیا ہے کہ لوگ محبت کے باب میں مختلف نظر آتے ہیں، پھر یہ بیان کیا جائے گا کہ لوگ اللہ تعالیٰ کی معرفت سے قاصر ہیں، محبت پر اس تفصیلی بحث کے بعد ہم شوق کے معنی بتلائیں گے، اور اللہ تعالیٰ سے بندے کی محبت کی علامات بیان کریں گے، پھر انس باللہ کے معنی مذکور ہوں گے، اس کے بعد رضا کے معنی اور اس کے فضائل کا ذکر ہوگا۔ آخر میں عسین کی حکایات اور ان کے اقوال تحریر کئے جائیں گے۔

محبت الہی کے شرعی دلائل تمام امت اس امر پر متفق ہے کہ بندے پر اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت فرض ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر محبت فرض ہے تو اس کے وجود کا انکار کیسے کیا جاسکتا ہے، اور جن لوگوں نے محبت کی تفسیر اطاعت پر موانعت سے کی ہے وہ کیسے صحیح ہو سکتی ہے، اس لئے کہ طاعت تو محبت کا ثمر ہے اور اس کا تابع ہے، پہلے محبت ہوتی ہے، پھر

محبوب کی اطاعت ہوتی ہے۔ پہلے ہم دلائل بیان کرتے ہیں :-

آیات و روایات اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :-

يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ (پ ۲۲ آیت ۵۳) جن سے اس کو محبت ہوگی اور ان کو اس سے محبت ہوگی۔

وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدَّ حُبًّا لِلَّهِ (پ ۲۲ آیت ۱۵۶) اور جو مومن ہیں ان کو اللہ کے ساتھ قوی محبت ہے۔

ان دونوں آیات سے نہ صرف یہ کہ محبت کا وجود ثابت ہوتا ہے بلکہ اسکی شدت اور محبت کے تفاوت کا ثبوت بھی ملتا ہے۔ بہت سی روایات میں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے محبت الہی کو ایمان کی شرط قرار دیا ہے۔ ایک روایات میں ہے کہ ابو ذر میں عقلی نے عرض کیا یا رسول اللہ! ایمان کیا ہے فرمایا :-

أَنْ يَكُونَ لِلْمُؤْمَرِ سُؤْلُ مَا حَبَّ إِلَيْهِمْ مِمَّا سِوَاهُمَا۔ (احمد)

یہ کہ اللہ اور اس کا رسول بندہ کے نزدیک ان دونوں کے سوا سے محبوب تر ہوں۔

ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں :-

لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتَّى يَكُونَ لِلْمُؤْمَرِ سُؤْلُ مَا حَبَّ إِلَيْهِمْ مِمَّا سِوَاهُمَا۔ (بخاری و مسلم۔ انس رضی اللہ عنہ آخر)

تم میں سے کوئی اس وقت تک مومن نہ ہو گا جب تک اللہ اور اس کا رسول اس کے نزدیک غیر سے محبوب تر نہ ہوں۔

ایک جگہ یہ حقیقت ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے :-

لَا يُؤْمِنُ الْعَبْدُ حَتَّى أَكُونَ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنْ أَهْلِ مَوْلَاهُ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ۔ (بخاری و مسلم۔ انس رضی اللہ عنہ)

بندہ اس وقت تک مومن نہیں ہوتا جب تک میں اس کے نزدیک اس کے اہل مال اور تمام لوگوں سے

محبوب تر نہ ہوں۔

ایک روایت میں مومن غنہ کے الفاظ بھی ہیں۔ قرآن کریم میں ہے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا :-

قُلْ إِنْ كَانَ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ وَإِخْوَانُكُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ وَأَمْوَالٌ
بِقَاتَرْتُمْ مَوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسَاكِينُ تُرْضُونَهَا أَحَبَّ إِلَيْكُمْ مِنَ اللَّهِ
وَرَسُولِهِ وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ فَتَرْتَصُّوا حَتَّى يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرٍ۔ (پ ۲۲ آیت ۲۳)

آپ کہہ دیجئے کہ اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہارا کنبہ اور

وہ مال جو تم نے کمائے ہیں اور وہ تجارت جس کی کساد بازاری کا تم کو اندیشہ ہو اور وہ گھرجن کو تم پسند کرتے

ہو تم کو اللہ سے اور اس کے رسول سے اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ پیارے ہوں تو تم ہٹ کر رہو

یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم بھیج دے۔

یہ خطاب تہدید اور انکار کے اسلوب میں ہے۔ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی محبت کا حکم فرمایا ہے ارشاد ہے :-

أَحِبُّوا اللَّهَ لِمَا يَغْنُو كُمْ بِهِ مِنْ نِعْمَتِهِ وَأَحِبُّوا نَفْسِي لِحُبِّ الْمَلَائِكَةِ۔ (ترمذی۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما)

اللہ سے محبت کرو اس نعمت کے لئے جو وہ تمہیں ہر لمحہ عطا کرنا ہے اور مجھ سے محبت کرو اللہ بھی مجھ سے

محبت کرتا ہے۔

ایک شخص نے آپ کی خدمت میں عرض کیا یا رسول اللہ! میں آپ سے محبت کرتا ہوں آپ نے ارشاد فرمایا مغلسی کے لئے تیار

رہو اس نے عرض کیا کہ میں اللہ سے محبت رکھتا ہوں آپ نے فرمایا معیبت کے لئے تیار رہو (ترمذی۔ عبد اللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہما)

حضرت عمر روایت کرتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حبیب ابن عزیز کو دیکھا جو میٹھے کی کھال اپنی کمر سے لپیٹے

ہوئے آ رہے ہیں آپ نے لوگوں سے ارشاد فرمایا کہ اس شخص کو دیکھو اللہ نے اس کا دل روشن کر دیا ہے میں نے اسے اس کے

والدین کے پاس دیکھا ہے جو اسے عمدہ عمدہ چیزیں کھلایا پلایا کرتے تھے۔ اور اب اللہ اور اس کے رسول کی محبت نے اس کا یہ حال بنا دیا ہے (ابو نعیم) ایک مشہور حدیث میں ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ملک الموت سے اس وقت تک جب وہ ان کی روح قبض کرنے کے لئے آئے کہا کہ کیا تم نے کوئی ایسا دوست دیکھا ہے جو اپنے دوست کو ہلاک کر دیتا ہو، اللہ تعالیٰ نے وحی نازل فرمائی کہ اے ابراہیم کیا تم نے کوئی ایسا محب دیکھا ہے جو اپنے محبوب سے ملاقات کرنا پسند نہ کرتا ہو۔ حضرت ابراہیم نے ملک الموت سے فرمایا کہ اب تم روح قبض کرلو (۱) لیکن یہ امر صرف انہی بندگان خدا کے قلوب پر منکشف ہوتا ہے جو دل سے اللہ تعالیٰ کو چاہتے ہیں، اور اس سے محبت کرتے ہیں، جب انہیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ موت ملاقات کا سبب ہے تو ان کا دل اس کی طرف کھینچتا ہے، ان کا کوئی اور محبوب نہیں ہوتا کہ اس کی کشش محسوس کریں۔ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دعا میں فرمایا :-

اللَّهُمَّ ارْزُقْنِي حُبَّكَ وَحُبَّ مَنْ أَحَبَّكَ وَحُبَّ مَا يَقَرُّ بِنَبِيِّ رَأَيْتُ حُبَّكَ أَحَبَّ إِلَيَّ مِنَ الْمَاءِ الْبَارِدِ (۲)

اے اللہ! مجھے اپنی محبت عطا کر، اور ان لوگوں کی محبت عطا کر جو تجھ سے محبت کرتے ہیں، اور ان چیزوں کی محبت بھی جو مجھے تیری محبت سے قریب کر دیں اور اپنی محبت کو میرے نزدیک ٹھنڈے پانی سے بھی زیادہ محبوب کر۔ ایک اعرابی آپ کی خدمت میں حاضر ہوا، اور اس نے عرض کیا یا رسول اللہ قیامت کب آئے گی، آپ نے اس سے دریافت فرمایا کہ تو نے قیامت کے لئے کیا تیاری کی ہے، اس نے عرض کیا کہ نہ میں نے بہت زیادہ نمازیں پڑھی ہیں، اور نہ بہت زیادہ روزے رکھے ہیں، لیکن مجھے اللہ اور اس کے رسول سے محبت ہے۔ آپ نے فرمایا :-

الْمَرْءُ مَعَ مَنْ أَحَبَّ

آدمی اس کے ساتھ ہے جس سے وہ محبت کرے۔

حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ میں نے مسلمانوں کو اتنا خوش کبھی نہیں دیکھا، جتنا خوش وہ یہ سن کر پھلے (بخاری و مسلم۔ انس) حضرت ابو بکر الصدیقؓ کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ سے محبت کرنے والے کو جو ذائقہ ملتا ہے وہ اسے دنیا کی طلب سے روک دیتا ہے، اور تمام انسانوں سے اسے وحشت زدہ کر دیتا ہے۔ حضرت حسنؓ فرماتے ہیں کہ جو شخص اللہ کی معرفت رکھتا ہے اس سے محبت کرتا ہے، اور جو دنیا کی معرفت رکھتا ہے وہ اس میں زندہ کرتا ہے مومن لمہ میں مشغول نہیں ہوتا کہ دنیا سے غافل ہو جائے، وہ جب فکر کرتا ہے غم کرتا ہے۔ حضرت ابو سلیمان دارانیؓ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جنہیں جنت اور اس کی نعمتیں اللہ تعالیٰ سے نہیں روکتیں، دنیا کے باعث وہ کیسے رک سکتے ہیں، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا گذر تین ایسے شخصوں پر ہوا جن کے بدن کمزور اور رنگ خفیر تھا، آپ نے دریافت کیا کہ تمہارا یہ حال کیسے ہوا، انہوں نے عرض کیا کہ دوزخ کے عذاب کے خوف سے، آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ خائفین کو ضرور محفوظ رکھے گا، آپ کچھ اور آگے بڑھے، وہاں تین ایسے شخص ملے جو پہلے والوں سے بھی کمزور اور زرد و دھڑکے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان سے دریافت کیا کہ تمہارا یہ حال کیسے ہو گیا انہوں نے عرض کیا کہ جنت کے شوق میں ہم لوگوں کا یہ حال ہو گیا ہے، آپ نے ان سے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں وہ چیز ضرور عنایت فرمائے گا جس کے تم مشتاق ہو، آپ اور آگے بڑھے وہاں تین ایسے شخص ملے جو پچھلے لوگوں سے زیادہ کمزور تھے، اور جن کا رنگ پہلوں سے زیادہ خفیر تھا، نور کا یہ عالم ہو گیا تھا گویا چہروں پر آئینے لگے ہوئے ہیں، آپ نے ان سے پوچھا کہ تمہارا یہ حال کیسے ہوا، انہوں نے جواب دیا کہ ہم اللہ تعالیٰ سے محبت رکھتے ہیں، آپ نے فرمایا تم ہی لوگ مقرب ہو، تم ہی لوگ مقرب ہو۔ عبدالواحد ابن زید کہتے ہیں کہ میں نے ایک شخص کو دیکھا جو برف پر سویا کرتا تھا، میں نے اس سے پوچھا کہ تجھے سردی محسوس نہیں ہوتی۔ اس نے کہا کہ جو شخص محبت

(۱) مجھے اس کی اصل روایت میں ملی (۲) یہ روایت کتاب الدعوات میں گذری ہے۔

الہی میں گرم ہو اس پر سردی کا اثر نہیں ہوتا۔ سری سقلیٰ فرماتے ہیں کہ قیامت کے روز امتوں کو ان کے انبیاء کے ناموں کے ساتھ پکارا جائے گا، یعنی اس طرح کہا جائے گا اے امت موسیٰ، اے امت عیسیٰ، اے امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم، لیکن جو لوگ اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہیں انہیں اس طرح آواز دی جائے گی کہ اے اللہ کے دوستو! اللہ کی طرف آؤ، یہ آواز سن کر ان کے دل خوشی سے جموم اٹھیں گے۔ ہرم ابن حیان کہتے ہیں کہ مومن جب اپنے رب کو پہچان لیتا ہے تو اس سے محبت کرتا ہے، اور جب محبت کرتا ہے تو اس کی طرف متوجہ ہوتا ہے، اور جب اس توجہ کی حلاوت پاتا ہے تو پھر نہ دنیا پر خواہش کی نگاہ ڈالتا ہے، اور نہ آخرت پر کالی کی نگاہ ڈالتا ہے، وہ اپنے جسم سے دنیا میں رہتا ہے اور روح سے آخرت میں۔ یحییٰ ابن معاذ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا عفو تمام گناہوں کو سمیٹ لیتا ہے، اس کی رضا کا کیا حال ہو گا، اور رضا تمام امیدوں پر محیط ہوتی ہے، اس کی محبت کا عالم کیا ہو گا، اس کی محبت عقل و خرد سے بیگانہ کر دیتی ہے اس کی موت کا عالم کیا ہو گا، اس کی شہادت غیر اللہ کو بھلا دیتی ہے، اس کے لطف کا کیا عالم ہو گا۔ بعض آسمانی کتابوں میں لکھا ہوا ہے کہ اے میرے بندے! مجھے تیرے حق کی قسم ہے میں تجھ سے محبت کرتا ہوں، اور تجھے میرے حق کی قسم ہے تو بھی مجھ سے محبت کر۔ یحییٰ ابن معاذ فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک اللہ تعالیٰ کی ذمہ بھر محبت ستر برس کی اس عبادت سے بہتر ہے جو محبت سے خالی ہو، یہ بھی فرماتے ہیں کہ اے اللہ میں تیرے معن میں مقیم اور تیری شائیں مشغول ہوں، تو نے مجھے کم عمری ہی سے اپنی طرف کھینچ رکھا ہے اور اپنی معرفت کا لباس پہنا رکھا ہے، اور اپنے لطف سے نوازا رکھا ہے، اور تو مجھے احوال، اعمال، ستر، توبہ، زہد، شوق، رضا اور محبت میں بدلتا رہا ہے، تو مجھے اپنی غوضوں سے سیراب کرتا ہے، اپنے باغوں میں گھماتا ہے، میں تیرے حکم کا پابند ہوں، اب جب کہ میری مونچھیں نکل آئی ہیں، اور کچھ قدرت حاصل ہو گئی ہے تو میں آج بڑا ہو کر تجھ سے کیسے منحرف ہو جاؤں جب کہ تو بچپن ہی سے مجھے اپنا مالوس بنائے ہوئے ہے، اور اب میں ان امور کا عادی ہو گیا ہوں، جب تک زندہ رہوں گا تیرے ہی گرد منڈلاؤں گا، اور تیرے ہی سامنے آؤ زاری کروں گا، کیوں کہ میں محب ہوں، اور ہر محب کو اپنے حبیب سے شغف ہوتا ہے، اور غیر سے نفرت ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ کی محبت میں بے شمار آیات، روایات اور آثار ہیں۔ اور اتنی واضح ہیں کہ بیان کی محتاج نہیں، اگر کچھ پیچیدگی ہے تو محبت کے معنی میں ہے۔ اس لئے اب ہم محبت کی حقیقت پر گفتگو کرتے ہیں۔

محبت کی حقیقت، اس کے اسباب اور اللہ کے لئے بندے کی محبت کے معنی یہ موضوع اس وقت تک پوری طرح واضح اور قابل فہم نہیں ہو گا جب تک یہ بیان نہ کیا جائے کہ محبت کی حقیقت کیا ہے، اس کے اسباب اور شرائط کیا ہیں، اور اللہ کے لئے بندے کی محبت کے معنی کیا ہیں، پہلے ہم کچھ بنیادی امور لکھتے ہیں۔

محبت کی حقیقت پہلی بات تو یہ ہے کہ محبت کا تصور اس وقت تک ممکن نہیں جب تک معرفت اور ادراک نہ ہو، اس لئے کہ انسان صرف اس چیز سے محبت کر سکتا ہے جس کا ادراک رکھتا ہو، اسی لئے یہ وصف جمادات میں نہیں پایا جاتا، کیونکہ نہ ان میں ادراک ہوتا ہے اور نہ معرفت، بلکہ یہ زندہ اور اک رکھنے والے کا وصف ہے پھر مدرکات یا تو مدرک کی طبیعت کے موافق اور مطابق ہوتے ہیں اور اسے لذت دیتے ہیں یا اس کی طبیعت کے مخالف ہوتے ہیں، اور اسے نقصان پہنچاتے ہیں، یا مدرک پر نہ لذت کے اعتبار سے اثر انداز ہوتے ہیں اور نہ اذیت کے اعتبار سے۔ اس طرح مدرکات کی تین قسمیں ہو جاتی ہیں، پہلی قسم کے مدرکات سے جو مدرک کی طبیعت کے موافق اور اس کے لئے لذت بخش ہوتے ہیں۔ مدرک کو محبت ہوتی ہے، اور جن کے ادراک سے مدرک کو نفرت یا تکلیف ہوتی ہے، وہ اس کے نزدیک مبغوض ہوتے ہیں، اور جن مدرکات سے نہ لذت ملتی ہے اور نہ تکلیف ہوتی ہے وہ نہ محبوب ہوتے ہیں اور نہ مبغوض۔ خلاصہ یہ ہے کہ جس چیز سے مدرک کو لذت ملتی ہے وہ اس کے نزدیک محبوب ہوتی ہے۔ اور اس کے محبوب ہونے کے معنی یہ ہیں کہ طبیعت میں اس کی طرف رغبت اور میلان ہوتا ہے، اور مبغوض ہونے کے معنی یہ ہیں کہ طبیعت کو اس سے نفرت ہے، مگر محبت یہ ہے کہ طبیعت اس چیز کی طرف مائل ہو جس سے اسے لذت ملتی ہے، اگر یہ

میلان شدید اور پختہ ہو جاتا ہے تو اسے عشق کہتے ہیں، اسی طرح بغض یہ ہے کہ طبیعت اس چیز سے متنفر ہو جس سے اسے تکلیف پہنچتی ہے، اور جب یہ نفرت شدید ہو جاتی ہے تو اسے نفرت کہتے ہیں۔

مدرکات حواس اور محبت دوسری بات یہ ہے کہ جب محبت اور اک اور معرفت کے تابع ہوتی تو اس کی تقسیم بھی اسی طرح ہوگی جس طرح مدرکات اور حواس کی ہوتی ہے، اس لئے کہ ہر حس کے لئے مدرکات میں سے مخصوص چیز کا ادراک ہے، اور ہر حس کو بعض مدرکات سے لذت ملتی ہے، اور اسی لذت کی بنا پر طبیعت اس کی طرف مائل ہوتی ہے، اور طبع سلیم کے نزدیک وہ مدرکات محبوب ہوتی ہیں، مثلاً آنکھ کی لذت ان مدرکات سے ہے جو آنکھ سے محسوس ہوتی ہے جیسے خوبصورت چیزیں اور حسین و جمیل چہرے، اور کان کی لذت ان مدرکات سے ہے جو کان سے محسوس ہوتی ہیں جیسے سحر کن نغمے، اور فرحت بخش آوازیں، ناک کی لذت، ان مدرکات سے ہے جو ناک سے محسوس ہوتی ہیں جیسے عمدہ خوشبوئیں، اسی طرح ذائقے کی لذت غذاؤں میں ہے، پس کی لذت گداز اور نرم چیزوں میں ہے، کیوں کہ یہ مدرکات حواس کو لذت دیتے ہیں اس لئے محبوب سمجھے جاتے ہیں اور طبع سلیم کو ان کی طرف رغبت ہوتی ہے، چنانچہ ایک حدیث میں ہے: سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :-

حُبِّبَ إِلَيَّ مِنْ دُنْيَاكُمْ ثَلَاثُ أَطْيَبُ النَّسَاءِ وَ قُرَّةُ عَيْنِي فِي الصَّلَاةِ - (نسائی۔ انس)

میرے نزدیک تمہاری تین چیزیں محبوب ہیں خوشبو، عورتیں اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے۔

اس حدیث شریف میں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے خوشبو کو محبوب قرار دیا، جس کا تعلق صرف سونگھنے سے ہے، آنکھ اور کان کو اس سے کوئی واسطہ نہیں ہے، اسی طرح آپ نے نماز کو آنکھوں کی ٹھنڈک قرار دیا ہے، اور اسے انتہائی محبوب فرمایا ہے، ظاہر ہے کہ نماز کا ادراک حواسِ خمسہ سے نہیں ہوتا بلکہ اس کے لئے چھٹی حس کی ضرورت پڑتی ہے، اس کا ادراک وہی کر سکتا ہے جس کے پاس دل ہو۔ جہاں تک حواسِ خمسہ کی لذات کا تعلق ہے ان میں حیوانات بھی انسان کے شریک ہیں، اس لئے اگر کوئی شخص محبت کو حواسِ خمسہ کے مدرکات پر منحصر کر کے یہ کہے کہ اللہ تعالیٰ کا حواس سے ادراک نہیں ہوتا اس لئے اس کی محبت بھی نہیں ہو سکتی، اس صورت میں ہم انسان کے لئے جو خصوصیت فرض کر رہے ہیں وہ غلط ہوگی، اور چھٹی حس لغو ہو جائے گی جس کی بنیاد پر انسان حیوانات سے ممتاز ہے، اور جس کو عقل، نور، قلب یا کسی اور لفظ سے تعبیر کر سکتے ہیں، لیکن ایسا کتنا صحیح نہ ہو گا کیوں کہ باطن کی بصیرت ظاہر کی بصیرت سے زیادہ مضبوط اور قوی ہوتی ہے، آنکھ کی بہ نسبت قلب زیادہ ادراک کر لیتا ہے، اور ان معانی کا جمال جن کا ادراک عقل سے ہوتا ہے، ان صورتوں کے جمال سے کہیں زیادہ ہے جو آنکھ سے محسوس کی جاتی ہیں۔ اس لئے قلب کو ان امور شریفہ الہیہ کے ادراک سے زیادہ مکمل لذت ملے گی جو حواس کے دائرہ ادراک سے خارج ہیں، اور ان کی طرف طبع سلیم، اور عقل صحیح کا میلان زیادہ قوی ہو گا، اور محبت کے معنی ہی یہ ہیں کہ قلب اس چیز کی طرف مائل ہو جس کے ادراک میں لذت ہوتی ہے، اس کی تفصیل ہم عنقریب بیان کریں گے، حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت سے صرف وہی شخص انکار کر سکتا ہے جو بہائم کے درجے میں ہو، اور حواس کے ادراک سے تجاوز نہ کر سکتا ہو۔

محبت کے اسباب تیسری بات یہ ہے کہ انسان اپنے نفس سے محبت کرتا ہے اور کبھی اپنے نفس کی خاطر غیر سے بھی محبت کرتا ہے، اب رہا یہ سوال کہ کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی شخص غیر سے اس کی ذات کی خاطر محبت کرے، اپنے نفس کے لئے نہ کرے؟ جہاں تک ضعفاء کا سوال ہے وہ اس کا جواب نفی میں دیتے ہیں، ان کے نزدیک یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ کوئی انسان غیر سے صرف اس کی ذات کے لئے محبت کرے اور اپنی ذات سے اس کی محبت کا کوئی تعلق نہ ہو، لیکن حق بات یہ ہے کہ ایسی محبت ممکن بھی ہے اور موجود بھی ہے۔ اس لئے ہم محبت کے اسباب اور اس کی اقسام بیان کرتے ہیں۔

جاننا چاہیے کہ ہر زندہ کے نزدیک اس کا پہلا محبوب خود اس کا نفس اور اس کی ذات ہے اور نفس سے محبت کے معنی یہ ہیں کہ

اس کی طبیعت اپنے وجود کے دوام کی طرف مائل ہے، اور اپنے عدم اور ہلاکت سے متفر ہے۔ فطرتاً محبوب وہی چیز ہوتی ہے جو محبت کرنے والے کے لئے مناسب ہو، اور نفس کے لئے دوام وجود سے زیادہ کیا چیز موافق ہو سکتی ہے اور عدم و ہلاکت سے بڑھ کر کیا چیز مخالف ہو سکتی ہے۔ اس لئے انسان کو زندگی سے محبت ہے، اور موت سے نفرت ہے، نفرت کی وجہ یہ نہیں ہوتی کہ اسے مرنے کے بعد ہونے والے عذاب کا خوف ہوتا ہے یا اس تکلیف سے ڈرتا ہے جو روح نکلنے کے وقت ہوتی ہے، بلکہ اگر کوئی شخص اس طرح مرے کہ جاں کنی کی کوئی اذیت نہ ہو، اور نہ عذاب کا خوف ہو، تب بھی وہ موت پر آمادہ نہیں ہوگا، اور موت ہی کو برا سمجھے گا۔ ہاں اگر کوئی شخص زندگی میں سختیاں اور مصیبتیں برداشت کرتا ہے تو وہ دائم موت کو محبوب رکھتا ہے لیکن یہ محبت اس لئے نہیں ہوتی کہ وہ مرنے کو محبوب رکھتا ہے، بلکہ اس لئے ہوتی ہے کہ اس کے ذریعے اپنے مصائب اور شدائد کا خاتمہ کرنا چاہتا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ انسان بالطبع ہلاکت اور عدم سے نفرت کرتا ہے، اور دوام وجود سے محبت کرتا ہے، اور جس طرح دوام وجود محبت ہے اسی طرح کمال وجود بھی محبوب ہے، اس لئے کہ ناقص میں کمال نہیں ہوتا، اور نقصان بھی کمال کی بہ نسبت عدم ہے، اور عدم خواہ صفات کا ہو یا وجود کا، قابل نفرت چیز ہے۔ جس طرح اصل وجود کا دوام محبوب ہے اسی طرح صفات کمال کا وجود بھی محبوب ہے۔ یہ ایک فطری امر ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی سنت کے مطابق انسانی سرشت میں ودیعت فرما دیا ہے، اور اللہ کی سنت بدلنے والی چیز نہیں ہے۔

حاصل یہ ہے کہ انسان کا محبوب اول اس کی ذات ہے، پھر اعضاء کی سلامتی، مال، اولاد، اہل خاندان، اور احباب کی سلامتی محبوب ہوتی ہے، اعضاء کی سلامتی اس لئے محبوب ہوتی ہے کہ کمال وجود اور دوام وجود ان پر موقوف ہے، مال اس لئے محبوب ہوتا ہے کہ یہ دوام وجود کا آلہ ہے، باقی تمام چیزوں کو بھی اسی طرح قیاس کیا جاسکتا ہے۔

اصولی بات یہ ہے کہ انسان ان اشیاء سے خود ان کی ذات کی وجہ سے محبت نہیں کرتا، بلکہ اس لئے محبت کرتا ہے کہ ان کا تعلق اس کے دوام وجود اور کمال وجود سے ہے، اپنے لڑکے سے محبت کرتا ہے، اگرچہ اسے کوئی فائدہ نہیں ہوتا، بلکہ اس کی خاطر مشقتیں اٹھانی پڑتی ہیں، اس کے باوجود محبت کرتا ہے، کیوں کہ وہ اس کے مرنے کے بعد خود بھی اس کا قائم مقام بننے والا ہے، نسل کا باقی رہنا بھی ایک طرح سے وجود کا بھا ہے، اور کیوں کہ دائمی بھا ملنے والی شئی نہیں ہے، اور وہ اس کی بہت زیادہ خواہش رکھتا ہے، اس نے اپنی نسل کی بھا میں اس خواہش کی تکمیل کی صورت تلاش کی، اور ایسے شخص کی بھا کو محبوب جانا جو آئندہ اس کا قائم مقام ہوگا، اور وہ اس کا لڑکا ہے، اسے جسم کا ٹکڑا بھی کہہ سکتے ہیں۔ تاہم اگر اس شخص کو اپنے نفس، اور لڑکے کے قتل میں اختیار دیا جائے تو وہ اپنے نفس کی بھا کو لڑکے کی بھا پر ترجیح دے گا، بشرطیکہ اس کی طبیعت معتدل ہو، اس لئے کہ لڑکے کی بھا بظاہر اس کی بھا ہے لیکن حقیقت میں اس کی بھا نہیں ہے، یہی حال اقارب اور اہل خاندان کا ہے وہ ان سے صرف اپنے نفس کے کمال کی خاطر محبت کرتا ہے، کیوں کہ وہ ان کے ذریعے اپنے نفس کو بہت اور قوی سمجھتا ہے، اور ان کے کمال کو اپنے لئے باعث فخر، مال، عیال اور خارجی اسباب انسان کے لئے بازوؤں کی طرح ہیں جن سے انسان کی تکمیل ہوتی ہے، اور وجود کا کمال اور دوام بعباً محبوب ہوتا ہے۔ اس کھنگو کا حاصل یہ ہے کہ ہر شخص کو اپنی ذات، اپنی ذات کا کمال اور دوام محبوب ہوتا ہے، اور ان امور کے برعکس امور کمزور ہیں۔ یہ ہے محبت کے اسباب میں سے پہلا سبب۔

محبت کا دوسرا سبب احسان ہے، انسان بندہ احسان ہے، اور قلوب کی سرشت میں یہ بات داخل کر دی گئی ہے کہ وہ اپنے احسان کرنے والوں سے محبت کرتے ہیں، اور ظلم کرنے والوں سے نفرت کرتے ہیں۔ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی دعائیں ارشاد فرماتے ہیں:-

اللَّهُمَّ لَا تَجْعَلْ لِفَاحِرٍ عَلَيَّ رِندًا قَبِيحًا مَقْلَبِي۔ (ابو منصور علیہ۔ معاذ ابن جبل)
اے اللہ! مجھ پر کسی فاجر کا احسان نہ رکھنا کہ میرا دل اس سے محبت کرنے لگے۔

اس حدیث میں اس امر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ محسن کے لئے دل کی محبت فطری اور اضطراری ہوتی ہے نہ اسے دفع کر سکتے ہیں، اور نہ اس کو نفرت سے تبدیل کر سکتے ہیں۔ اس لئے انسان کبھی ایسے شخص سے محبت کرتا ہے جس سے اس کا کوئی رشتہ یا تعلق نہیں ہوتا۔ وہ اس کے لئے اجنبی ہوتا ہے، مگر اس کا احسان اس سے محبت کرنے پر مجبور کرتا ہے، اگر دیکھا جائے تو محبت کے اس سبب کا مال بھی وہی ہے جو پہلے سبب کا ہے، اس لئے کہ محسن اس شخص کو کہتے جو کسی کی مال یا دوسرے ایسے اسباب سے اعانت کرے جو دوام وجود یا کمال وجود تک پہنچانے والے ہوں، یا ان لذائذ کے حصول میں معین ہو جن سے وجود تیار ہوتا ہے۔ ہاں اگر فرق ہے تو صرف یہ کہ احیاء انسان اس لئے محبوب ہوتے ہیں کہ ان سے کمال وجود ہوتا ہے، اور یہی مطلوب عین کمال ہے، جب کہ محسن مطلوب عین کمال نہیں ہے، بلکہ کبھی کبھی وہ اس کا سبب بنتا ہے، جیسے طیب صحت اعضاء کے دوام کا سبب بنتا ہے، یہاں دو محبتیں ہیں ایک صحت اعضاء کی محبت، اور دوسرے اس طیب کی محبت جو صحت اعضاء کا باعث ہے، اور ان دونوں محبتوں میں فرق ہے، اس لئے کہ صحت اپنی ذات سے محبوب ہوتی ہے، اور طیب اپنی ذات سے محبوب نہیں ہوتا بلکہ اس لئے محبوب ہوتا ہے کہ وہ صحت کا سبب ہے، اسی طرح علم اور استاذ دونوں محبوب ہوتے ہیں، مگر علم اپنی ذات سے محبوب ہوتا ہے، اور استاذ اس لئے محبوب ہوتا ہے کہ وہ محبوب علم کے حصول کا سبب ہے۔ اسی طرح کھانے پینے کی اشیاء بھی محبوب ہوتی ہے، اور درہم و دینار بھی محبوب ہوتے ہیں، لیکن کھانے پینے کی اشیاء سے محبت ذاتی ہوتی ہے، اور درہم و دینار سے محبت اس لئے کی جاتی ہے کہ وہ ان اشیاء کے حصول کا ذریعہ ہیں۔ ان دونوں میں صرف مرتبہ کا فرق ہے ایک پہلے ہے، اور دوسری بعد میں، جہاں تک اپنے نفس کی محبت کا سوال ہے وہ دونوں میں پائی جاتی ہے، مطلب یہ ہے کہ جو شخص محسن سے اس کے احسان کے باعث محبت کرتا ہے وہ اس کی ذات سے محبت نہیں کرتا بلکہ اس کے احسان سے محبت کرتا ہے، احسان محسن کا ایک فعل ہے، اگر محسن یہ فعل انجام نہ دے تو محبت باقی نہ رہے، اگرچہ محسن کی ذات اپنی جگہ موجود ہے۔ پھر جس قدر احسان کم ہوتا ہے اسی قدر محبت بھی کم ہوتی ہے، اور جس قدر زیادہ ہوتا ہے اسی قدر محبت بھی زیادہ ہو جاتی ہے، گویا محبت کی کمی یا زیادتی احسان کی کمی یا زیادتی پر موقوف ہے۔

محبت کا تیسرا سبب یہ ہے کہ کسی چیز سے اس کی ذات کی وجہ سے محبت کی جائے نہ کہ کسی ایسے خطہ اور منفعت کے لئے جو اس کی ذات سے حاصل ہونے والا ہے، بلکہ اس کی ذات ہی عین منفعت ہو، اور یہی وہ حقیقی اور دائمی محبت ہے جس کے متعلق پورے وثوق کے ساتھ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ یہ محبت دائمی رہنے والی ہے، اور یہ ایسا ہے جیسے حسن و جمال کی محبت، ہر جمال جمال کا ادراک کرنے والے کے نزدیک محبوب ہوتا ہے، اور یہ محبت صرف عین جمال سے ہوتی ہے، کیوں کہ اس میں جمال کا ادراک ہی عین لذت ہے، اور لذت اپنی ذات سے محبوب ہوتی ہے، غیر سے محبوب نہیں ہوتی، تم یہ گمان مت کرو کہ اچھی صورتوں کی محبت صرف قضاء شہوت کے لئے ہوتی ہے، اس کے علاوہ کسی چیز کے لئے نہیں ہوتی، تمہارا یہ خیال غلط ہے، قضاء شہوت ایک الگ لذت ہے۔ بعض اوقات اس کے لئے بھی اچھی صورتوں سے محبت کی جاتی ہے، اور خود جمال کا ادراک بھی لذت ہے، اس لئے یہ ممکن ہے کہ وہ لذت بھی محبوب ہو، اس کا انکار اس لئے نہیں کیا جاسکتا کہ سبزہ زار اور آبِ رواں کے مناظر محبوب ہوتے ہیں اس لئے نہیں کہ سبزہ کھایا جاتا ہے، اور پانی پیا جاتا ہے یا دیکھنے کے علاوہ بھی ان سے کوئی منفعت حاصل کی جاتی ہے، چنانچہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو سبزہ اور آبِ رواں اچھا لگتا تھا۔ (ابو نعیم - ابن عباس) تمام طبائع سلیمہ خوبصورت پھولوں، فنجوں، عمدہ تصویروں، اور خوش رنگ، خوش آواز پرندوں سے لذت حاصل کرتی ہیں، اور بہت سے ان کے ذریعے اپنا دل بھلاتے ہیں، اور انہیں دیکھ کر لطف اندوز ہوتے ہیں، بہر حال یہ تمام چیزیں لذت ہیں، اور ہر لذت چیز محبوب ہوتی ہے، ہر حسن و جمال کے ادراک میں لذت ہے، کوئی شخص اس بات سے انکار نہیں کر سکتا کہ جمال بالطبع محبوب نہیں، اس لئے اگر یہ ثابت ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ جمیل ہے تو لامحالہ وہ اس شخص کے نزدیک محبوب ہو گا جس پر اس کا جلال و جمال منکشف ہو۔ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں :-

إِنَّ اللَّمَّ جَمِيلٌ يُحِبُّ الْجَمَالَ (مسلم۔ ابن مسعود)
اللہ تعالیٰ جمیل ہے جمال کو محبوب رکھتا ہے۔

چوتھا سبب۔ حسن و جمال حسن و جمال بھی محبت کا ایک اہم سبب ہے، لیکن حسن و جمال ہے کیا چیز؟ اس کے لئے ضروری ہے کہ ہم حسن و جمال کی صحیح تفسیر کریں۔ جو لوگ ظاہر پر نظر رکھتے ہیں، اور محسوسات و درکات کے اسیر ہیں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ حسن یہ ہے کہ آدمی کے اعضاء متناسب ہوں، شکل عمدہ ہو، رنگ سرخ و سفید ہو، قد و قامت رکھتا ہو، عام طور پر لوگ ایسے ہی انسان کو حسین اور خوبصورت کہتے ہیں، کیوں کہ یہ اوصاف انہیں آنکھوں سے نظر آتے ہیں، اسی لئے ان کا کمان یہ ہوتا ہے کہ جو چیز آنکھ سے محسوس نہ ہو، خیال کے دائرے میں نہ آئے، اور رنگ و روپ سے محروم ہو وہ حسین نہیں ہوتی اسے درجہ محبوبیت بھی حاصل نہیں ہوتا۔ حالانکہ یہ ایک غلط خیال ہے، حسن آنکھ سے نظر آنے والی چیزوں میں منحصر نہیں ہے اور نہ خلقت کے تناسب پر منحصر ہے، اور نہ سفیدی میں سرخی کی آمیزش پر، ہم کہتے ہیں یہ تحریر خوبصورت ہے، یہ آواز حسین ہے، یہ گھوڑا عمدہ ہے، بلکہ یہاں تک کہ کہتے ہیں کہ یہ خوبصورت کپڑا ہے، یہ حسین برتن ہے، آخر آواز، تحریر اور دوسری تمام چیزوں کے حسین ہونے کے معنی کیا ہیں؟ اگر حسن صرف صورت میں ہوتا ہے۔ حالانکہ یہ بات سب جانتے ہیں کہ اچھی تحریر سے آنکھ لذت حاصل کرتی ہے، اور خوبصورت نعمات سے کان لذت اندوز ہوتے ہیں، دنیا میں جتنے بھی درکات ہیں وہ اچھے ہوتے ہیں یا برے، آخر حسن کے وہ معنی کون سے ہیں جس میں یہ تمام اشیاء مشترک ہوتی ہیں، یہ ایک طویل بحث ہے، اور علم معاملہ کے مناسب نہیں ہے۔ تاہم حق کی تصریح کے لئے ہم اس پر کچھ روشنی ڈالتے ہیں۔

ہر شئی کا حسن و جمال اس امر میں ہوتا ہے کہ جس قدر کمال اس کے لائق ہو یا اس کے لئے ممکن ہو وہ اس میں جمع ہو جائے، اگر کسی چیز میں اس کے تمام ممکن کمالات جمع ہو جائیں تو وہ انتہائی حسین اور جمیل کھلانے کا مستحق ہے، اور اگر بعض کمالات ہوں، بعض نہ ہوں تو وہ اسی قدر حسین ہوگی جس قدر اس میں کمالات ہوں گے۔ مثال کے طور پر ہر گھوڑے کو خوبصورت نہیں کہا جا سکتا، بلکہ اس گھوڑے کو حسین کہا جائے گا جس میں وہ تمام اوصاف پائے جائیں جو ایک اچھے گھوڑے کے لئے ضروری ہیں، شکل، ہیئت، رنگ، تیز رفتاری، خوش لگامی وغیرہ، اور خوبصورت تحریر وہ ہے جس میں خط سے متعلق تمام کمالات جمع ہوں، جیسے حروف کا تناسب اور توازن، استقامت ترتیب اور حسن انتظام۔ ہر چیز کے لئے ایک کمال ہے جو صرف اسی کے لائق ہوتا ہے، کسی دوسری چیز کے لائق نہیں ہوتا، بلکہ دوسری چیز میں اس کمال کا نہ ہونا حسن کھلاتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ہر چیز کا حسن اسی کمال میں ہوگا جو اس کے شایان شان ہو، چنانچہ جن کمالات کی وجہ سے گھوڑے کو اچھا کہتے ہیں ان کی وجہ سے آدمی کو اچھا نہیں کہیں گے، اور جن اوصاف کے باعث تحریر اچھی کھلانے کی ان کی وجہ سے گھوڑے کو عمدہ نہیں کہیں گے، جن امور کی وجہ سے برتن اچھے کھلائیں گے ان کی وجہ سے کپڑے اچھے نہیں کھلائیں گے۔ تمام امور کو اسی اصل پر قیاس کرنا چاہیے۔

یہاں تم یہ کہہ سکتے ہو کہ جو چیزیں تم نے بیان کی ہیں وہ سب اگرچہ آنکھ سے محسوس نہیں ہوتیں جیسے آواز اور ذائقہ وغیرہ سے متعلق اشیاء، لیکن کسی نہ کسی حس سے درک ہوتی ہیں، مثلاً آواز کان سے، اور ذائقہ منہ سے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حسن و جمال کا تعلق محسوسات سے ہے، اور ہم اس سے انکار نہیں کرتے اور نہ اس بات سے انکار کرتے ہیں کہ محسوسات کے اور اک سے لذت نہیں ہوتی، تاہم ان اشیاء کا جمال سمجھ میں نہیں آتا جو اس سے درک نہ ہوں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ حسن و جمال صرف محسوسات ہی میں منحصر نہیں ہے، بلکہ غیر محسوسات میں بھی حسن و جمال ہوتا ہے، مثال کے طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ یہ خلق حسن ہے، یہ علم عمدہ ہے، یہ خصلت اچھی ہے، یہ اخلاق بہترین ہیں، اور اخلاق جمیلہ سے مراد علم، عقل، صفت، شہادت، تقویٰ، کرم، مروت اور دوسری بہترین عادات ہیں۔ اور ان میں سے کسی صفت یا عادت کا اور اک جو اس خصلت سے نہیں ہوتا، بلکہ باطنی نور بصیرت سے ہوتا ہے، یہ تمام عادات حسن محبوب ہیں، اور جو ان عادات کا حامل ہوتا ہے وہ بھی محبوب ہوتا ہے، اس شخص

کے نزدیک جو ان عادات سے واقف ہو۔ اور اس کی دلیل یہ ہے کہ انسانی جبلت میں یہ بات داخل کر دی گئی ہے کہ وہ اپنے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے محبت کریں، حالانکہ انہوں نے ان کا مشاہدہ نہیں کیا، یہی نہیں بلکہ لوگوں کو اپنے ائمہ مذاہب شافعی، ابو حنیفہ، اور مالک سے بھی محبت ہوتی ہے، یہاں تک کہ بعض لوگوں کو اپنے امام سے اس قدر محبت ہوتی ہے کہ اسے عشق کہہ سکتے ہیں، اس عشق کی وجہ سے وہ لوگ اپنے مذہب کی نصرت اور دفاع میں اپنا تمام مال خرچ کر دیتے ہیں، اور اس شخص سے مقابلہ کرنے میں، سردھڑکی بازی لگا دیتے ہیں جو ان کے امام پر طعن کرتا ہے، ارباب مذاہب کی تائید و نصرت کے لئے کافی خون بہایا گیا ہے، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جو شخص۔ مثلاً۔ امام شافعیؒ سے محبت کرتا ہے وہ ان سے کیوں محبت کرتا ہے جب کہ اس نے انہیں دیکھا نہیں ہے، بلکہ اگر دیکھ لیتا تو شاید اسے ان کی شکل و صورت پسند نہ آتی اس سے معلوم ہوا کہ اس شخص نے ان سے ظاہری شکل و صورت کی وجہ سے محبت نہیں کی، بلکہ باطنی صورت کے مشاہدے نے اسے اس عشق پر مجبور کیا، ان کی ظاہری صورت تو مٹی میں مٹی کر مٹی ہو گئی ہے، وہ ان کے باطنی اوصاف یعنی دین، تقویٰ، وسعت علم، مدارک دین سے ان کی واقفیت، علوم شرعیہ کی اشاعت کے لئے ان کی جدوجہد پر فدا ہے، یہ تمام امور خوب صورت اور تمام اوصاف عمدہ ہیں، ان کے حسن و جمال کا ادراک صرف نور بصیرت سے ہوتا ہے، حواس ان کے ادراک سے قاصر ہیں۔ یہی حال ان لوگوں کا ہے جو حضرت ابوبکر الصدیق سے محبت کرتے ہیں، اور انہیں دوسرے اصحاب پر فضیلت دیتے ہیں، یا ان کے سلسلے میں تعصب کرتے ہیں، یا ان لوگوں کا ہے جو حضرت علیؑ سے محبت کرتے ہیں، اور انہیں حضرات متین اور دوسرے صحابہ کرام پر فوقیت دیتے ہیں۔ ان کی یہ محبت اور تعصب صرف باطنی امور کی وجہ سے ہے یعنی علم، دین، تقویٰ، شجاعت، کرم و فیروا، اوصاف نے انہیں ان حضرات سے محبت پر مجبور کیا ہے، ظاہر ہے جو شخص حضرت ابوبکر الصدیقؓ سے محبت کرتا ہے وہ ان کی ہڈی، گوشت، جلد، اعضاء اور شکل و صورت سے محبت نہیں کرتا، اس لئے کہ یہ چیزیں زائل ہو چکی ہیں، تبدیل ہو چکی ہیں اور فنا ہو چکی ہیں، لیکن وہ چیزیں باقی ہیں جن کی وجہ سے حضرت ابوبکرؓ پر عظمت و مدح و ستائش ہوئے، یعنی صفات محمودہ اور عادات حسنہ باقی ہیں، اور ان کی محبت انہی صفات کے باقی رہنے کی وجہ سے ہے، اگرچہ مدھم مٹی فنا ہو چکی ہیں۔

ان تمام صفات حسنہ کا نفس اور جوہر علم اور قدرت ہے، یعنی ان حضرات سے حقائق امور کا علم حاصل کیا، اور اپنے نفس کی شوائب کو جلا میں کرنے کے بعد اسے صفات حسنہ سے مزین کرنے پر قادر ہوئے، باقی تمام عادات حسنہ اسی علم اور قدرت کے پہلو سے جنم لیتی ہیں، اور یہ دونوں کسی ظاہری حس سے مدد رک نہیں ہوتے، ان کا عمل تمام بدن میں ایک جزء لا تجزئی ہے جو حقیقت میں محبوب ہے، اور اس جزء کی جو تجزی نہیں ہوتا کوئی شکل و صورت یا رنگ نہیں ہوتا کہ آنکھ پر اس کا اظہار ہو، اور اسی وجہ سے وہ محبوب قرار پائے، معلوم ہوا کہ یہ جزء کسی حس ظاہر سے مدد رک نہیں ہوتا۔ خلاصہ یہ ہے کہ سیرت اور عادات میں جمال موجود ہے اگر علم اور قدرت سیرت و جملہ کا سرچشمہ نہ ہوتے تو یہ بات موجب محبت نہ ہوتی، اس سے ثابت ہوا کہ اصل محبوب سیرت و جملہ کا مصدر ہے جسے اخلاق حمیدہ، اور اوصاف حسنہ کہتے ہیں، اور جن کا مرجع کمال علم اور کمال قدرت ہے، اور یہ مصدر بعباً محبوب ہوتا ہے جب کہ حواس کے ذریعے اس کا ادراک نہیں ہوتا۔ یہاں تک کہ اگر ہم خالی الذہن، اور خالی الطبع بچے کے دل میں کسی غائب یا حاضر کسی زندہ یا مردہ کی محبت پیدا کرنا چاہیں تو ہمارے سامنے اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں ہوتا کہ ہم اس کی شجاعت، کرم، علم اور دوسرے اوصاف حسنہ کی تعریف میں مبالغے سے کام لیں، جب وہ بچہ ہمارے کہنے سے اس کا اعتقاد کر لیتا ہے تو اس کے سامنے اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں رہتا کہ وہ اس شخص سے محبت کرے۔ چنانچہ ہمارے دلوں میں صحابہ کی محبت و عظمت اور شیطان طہین سے نفرت و عداوت اسی لئے رائج ہوئی ہے کہ ہم نے صحابہ کی تعریف اور شیطان کی مذمت میں بہت کچھ سنا ہے، اس میں وجہ کا ادراک حواس غصہ سے نہیں ہوتا۔ بلکہ جب لوگ حاتم کے لئے سخاوت اور خالد کے لئے شجاعت ثابت کرتے ہیں تو سننے والوں کو لا محالہ ان سے محبت ہو جاتی ہے، حالانکہ نہ حاتم کا وصف سخاوت آنکھ سے محسوس ہوتا ہے اور نہ خالد کا

دعویٰ بارے میں ہے، ہم آنے والے صفات میں یہ ثابت کریں گے۔ یہ اسباب کا اجتماع صرف اللہ تعالیٰ کی ذات میں ہے، غیر اللہ میں ان کا اجتماع محصور نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ ایک یا دو سبب پائے جاتے ہیں اور وہ بھی بطور مجاز، بلکہ بطور وہم و خیال۔ جب کہ اللہ تعالیٰ میں ان اسباب کا وجود اور اجتماع حقیقی ہے جب ہم اس امر کو پوری شرح و بسط کے ساتھ بیان کر دیں گے تو اہل بصیرت پر واضح ہو جائے گا کہ بے وقوفوں اور نادانوں کا یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ محبت الہی محال ہے، بلکہ اس کے برعکس حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی سے محبت نہ کی جائے۔ اب ہم تمام اسباب کا الگ الگ جائزہ لیتے ہیں۔

سبب سبب پہلا سبب یہ بیان کیا گیا ہے کہ انسان اپنے نفس کو محبوب سمجھتا ہے اور اس کے لئے دوام و بھلائی اور کمال کی خواہش رکھتا ہے، اسے ہلاکت، عدم، نقص، اور موانع کمال سے نفرت ہے، ذلّت، محض کی نفرت میں یہ باتیں پائی جاتی ہیں، کسی کا ان سے خالی رہنا ممکن نہیں ہے، جو محض اپنے نفس کی معرفت رکھتا ہے اور اپنے رب کو پہچانتا ہے وہ یہ بات اچھی طرح جانتا ہے کہ اس کا وجود ذاتی نہیں ہے، بلکہ اس کی ذات کا وجود دوام اور کمال سبب اللہ سے ہے، اسی کے باعث ہے وہی وجود کا خالق ہے، وہی اس کو باقی رکھنے والا ہے، وہی کمال کی صفات پیدا کر کے اسے مکمل بناتا ہے، اور وہ اسباب پیدا کرتا ہے جو کمال کی طرف لے جانے والے ہیں، اور وہ ہدایت پیدا کرتا ہے جس سے اسباب کے استعمال میں رہنمائی حاصل کی جاسکے، ورنہ بندے کا اپنا وجود کچھ نہیں ہے، وہ محض عدم ہے، اگر اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے پیدائش کرے، اور پیدا کرنے کے بعد اس کا فضل شامل حال نہ ہو تو ہلاک ہو جائے اور اپنے فضل و کرم سے مکمل نہ کرے تو ناقص رہے۔ حاصل یہ ہے کہ دنیا میں کوئی ایسا وجود نہیں ہے جو اپنی ذات سے قائم ہو، ہر وجود اسی حق تعالیٰ سے قائم ہے جس کا وجود ذاتی ہے، اگر عارف کو اپنی ذات سے محبت ہوگی تو اس ذات سے بھی ہوگی جس سے اس کا وجود مستفاد ہے اور جس سے اس کے وجود کو بھلائی ہے، بشرطیکہ وہ اسے خالق، موجود، مخترع، مبتنی، اور قائم بنفسہ اور مقوم بغیرہ مانے، اور اگر ایسی ذات سے محبت نہ رکھے تو یہ کہا جائے گا کہ نہ اسے اپنے نفس کی معرفت حاصل ہے اور نہ اپنے رب کی۔ محبت معرفت ہی کا تو ثمر ہے، جب محبت نہ ہوگی تو معرفت بھی نہیں ہوگی، اور جس قدر معرفت ضعیف ہوگی اسی قدر محبت بھی ضعیف ہوگی، اور جس قدر معرفت قوی ہوگی اور اسی قدر محبت بھی قوی ہوگی۔ اسی لئے حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ جو محض اللہ تعالیٰ کو پہچانتا ہے وہ اس سے محبت کرتا ہے، اس میں زہد کرتا ہے، یہ کیسے ممکن ہے کہ آدمی کو اپنے نفس سے محبت ہو، اور اپنے رب سے نہ ہو، دیکھو جو محض دھوپ کی سختی برداشت کرتا ہے اسے سائے سے محبت ہوتی ہے، اور جو سائے سے محبت کرتا ہے اسے ان درختوں سے بھی محبت ہوتی ہے، جن سے سایہ قائم ہے، اور جن سے سائے کا وجود ہے، ہر موجود شئی کی نسبت اللہ تعالیٰ کی قدرت کی طرف ایسی ہے جیسے سائے کو درختوں سے ہوتی ہے، سائے کا وجود درختوں سے ہے، اور نور کا وجود آفتاب سے ہے، یعنی سایہ اپنے وجود میں درختوں کے تابع ہے اور نور کا وجود آفتاب کے تابع ہے، اسی طرح تمام موجودات کا وجود اسی ذات واحد کے تابع ہے، سب اس کی قدرت اور صنعت کے نمونے ہیں۔

نور و آفتاب کی مثال عوام کے فہم سے زیادہ قریب ہے، کیوں کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ نور آفتاب کا اثر ہے، اور اسی سے ظہور پذیر ہوتا ہے، حالانکہ حقیقت میں یہ خیال صحیح نہیں ہے، آفتاب قلوب پر جو چشم بصیرت سے دیکھتے ہیں یہ بات ان لوگوں سے زیادہ مشکف ہے جو ظاہر کی آنکھوں سے مشاہدہ کرتے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ نور کا مبداء اور مصدر بھی اللہ تعالیٰ کی قدرت ہے، پہلے اللہ تعالیٰ نے آفتاب بنایا، اس کو موجودہ شکل و صورت عطا کی، اور اس میں نور پیدا کیا، جب یہ آفتاب اجسام کثیفہ کے مقابل آتا ہے تو اس کا نور دوسری اشیاء پر منعکس ہوتا ہے، یہ سب اللہ تعالیٰ کی اختراع، ایجاد اور قدرت سے ہوتا ہے، لیکن کیوں کہ ہم سہولت تفہیم کے لئے مثالیں پیش کرتے ہیں، اس لئے یہاں حقائق سے بحث نہیں ہے۔ یہاں صرف یہ جان کرنا ہے کہ اگر انسان کے لئے اپنے نفس کی محبت ضروری ہے تو اس ذات کی محبت بھی ضروری ہے جس سے اس کو پہلے قیام ملا، پھر اصل صفات، ظاہر و باطن اور جو اہر و امراض میں دوام عطا ہوا، لیکن یہ محبت اسی محض کو ہو سکتی ہے جو کہ وہ بلا حقائق کو اسی طرح جان لے جس طرح وہ بیان کئے گئے ہیں۔ جس محض کا دل نفس کی شہوات میں مشغول ہوتا ہے، اور وہ اپنے خالق اور رب سے غافل ہوتا ہے اس کے دل میں

اللہ تعالیٰ کی محبت نہیں ہوتی، وہ صرف شہوات اور محسوسات پر نظر رکھتا ہے، یعنی عالم شہوات میں اسیر رہتا ہے، جس میں اس کی کوئی خصوصیت نہیں ہوتی۔ بلکہ ہم نام بھی شریک رہتے ہیں، عالم ملکوت کی زمین اپنے پاؤں سے وہی شخص روند سکتا ہے جس کو فرشتوں سے مشابہت ہوتی ہے، جو شخص عالم ہائیم میں جس قدر کم ہوگا اسی قدر عالم ملکوت سے دور ہوگا۔

دوسرا سبب محبت کا دوسرا سبب یہ تھا کہ اس شخص سے محبت کی جائے جو اس پر احسان کرتا ہے، مال سے اس کی مدد کرتا ہے، نرم گفتگو کرتا ہے، اور ہر معاملے میں اس کی اعانت کرتا ہے، ہر وقت اس کی مدد کے لئے تیار رہتا ہے، دشمنوں سے اس کی حفاظت کرتا ہے، حاسدوں کے شر سے بچاتا ہے، اور نفس، اولاد اور اقارب سے متعلق تمام اغراض اور مظلوظ کی تکمیل میں مدد کرتا ہے، ایسا شخص ہر حال محبوب ہوتا ہے، اور اس سبب کا تقاضا بھی یہ ہے کہ اللہ کے سوا کسی سے محبت نہ کی جائے، اگر اللہ تعالیٰ کے حق کی اس طرح معرفت حاصل کی جائے جیسا کہ اس کا حق ہے تو صاف ظاہر ہو جائے کہ احسان کرنے والا صرف وہی ہے، جہاں تک بندوں پر اس کے احسانات کا تعلق ہے۔ یہاں انہیں احاطہ تحریر میں لانا مقصود نہیں ہے، یہ احسانات بشار اور لاتعداویں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ خود ارشاد فرماتا ہے :-

وَلَا يَنفَعُكَ اَنْ تَعْلَمَ مَا لَكَ مِنْ خُصُوْعٍ هَٰذَا۔ (پ ۳۴ ر ۱۷ آیت ۳۴)

اور اللہ تعالیٰ کی نعمتیں اگر شمار کرنے لگو تو شمار میں نہیں آسکتیں۔

کتاب الفکر میں ہم یہ بات بیان بھی کر چکے ہیں کہ ایک ایک چیز میں اللہ تعالیٰ کے اتنے احسانات ہیں کہ انہیں شمار نہیں کیا جاسکتا، یہاں صرف یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ بندوں کی طرف صرف مجازاً ہی احسان کی نسبت کی جاسکتی ہے، حقیقی محسن صرف اللہ تعالیٰ ہے، فرض کرو کسی شخص نے ہمیں اپنے تمام خزانے دیے، اور انہیں خرچ کرنے کا مکمل اختیار دیدیا، اب اگر تم یہ سمجھنے لگو کہ خزانے سپرد کر دینے اور اختیارات تفویض کرنے میں اس شخص کے تم پر زبردست احسانات ہیں تو یہ خیال غلط ہوگا، پہلے تم ان چار امور پر غور کرو، تم پر اس کے احسان کی حقیقت واضح ہو جائے گی۔

اول اس شخص کا وجود جو ہمیں خزانہ دے رہا ہے، دوم اس کے پاس مال کا ہونا، سوم اس پر قادر ہونا، چہارم اس کے دل میں یہ ارادہ پیدا ہونا کہ مال ہمیں دیدیا جائے، اب ہم تم سے یہ پوچھتے ہیں کہ اس کو کس نے پیدا کیا، اسے مال کس نے عطا کیا، پھر مال پر قدرت کس نے بخشی اور اس کے دل میں یہ ارادہ کس نے پیدا کیا کہ وہ مال دینے کے لئے تمہارا انتخاب کرے، تمہارے لئے اس کے دل میں محبت کس نے پیدا کی، اسے یہ خیال کیسے آیا کہ اس کے دین اور دنیا کی بھلائی تمہارے ساتھ احسان کرنے میں پوشیدہ ہے، وہ ہمیں مال دینے کے اپنے قلبی تقاضے پر عمل کرنے کا ہاتھ ہے، اس کی مخالفت نہیں کر سکتا آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ اگر غور کرو تو ہمیں ان تمام سوالات کا جواب مل جائے، اور یہ بات واضح ہو جائے کہ اصل محسن وہی ہے جس نے اسے احسان کرنے پر مجبور کیا ہے، تمہارے لئے مقرر کیا ہے، اور وہ اس پر فعل احسان کے دوائی مسئلہ کے ہیں، اس کا ہاتھ صرف ایک واسطہ ہے، اس کے ذریعے وہ بندوں تک اللہ کے احسانات پہنچاتا ہے، اس معاملے میں وہ اس طرح مجبور ہے جیسے پر تلا پانی بہانے پر مجبور ہے، کیا کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے پانی بہانے میں اصل پر تلا ہے، جیسا کہ نہیں، پر تلا تو ایک واسطہ ہے، یہی حال یہاں ہے، اب اگر تم اس درمیان میں شخص کو محسن سمجھ بیٹھو، اور اس کا شکر کرنے لگو تو یہ اس بات کی غلامت ہے کہ تم حقیقت سے ناواقف ہو، انسان جب بھی احسان کرتا ہے اپنے نفس پر کرتا ہے، کسی مخلوق پر اس کا احسان کرنا ممکن نہیں ہے، اگر بلا ہر وہ احسان کی صورت اپناتا ہے تو اس کا عوض پہلے تلاش کر لیتا ہے، خواہ دنیا میں کہ وہ اس کے لئے مغرور و تابع ہو جائے اور اس کی تعریف میں رطب اللسان ہو، اس کی شہادت کے چرچے ہوں، اور لوگ اپنی اطاعت اور محبت کے پھول اس پر نچھاور کریں، یا آخرت میں کہ زیادہ سے زیادہ اجر و ثواب حاصل ہو۔ جس طرح کوئی شخص اپنا مال کسی مقصد کے بغیر دنیا میں نہیں ڈالتا، اسی طرح کسی غرض کے بغیر کسی آدمی کے ہاتھ میں نہیں ڈالتا، اور وہی غرض اس کا مقصود ہوتی ہے، اگر ہمیں کسی شخص نے کچھ مال دیا ہے تو تم اس کے مقصود نہیں ہو، بلکہ مقصود کچھ اور ہے، تم صرف اس مقصود کی تکمیل کا وسیلہ ہو، خواہ اس کا مقصود دنیا میں ذکر و شہرت اور عزت و عظمت ہو یا آخرت میں اجر و ثواب،

تمہیں اس شخص نے اپنے مال پر قابض کرنے سے اپنا یہ مقصد پورا کیا ہے اس لئے وہ تمہارا محسن نہیں ہے، بلکہ خود اپنے نفس کا محسن ہے، وہ مال کے عوض میں ایسی چیز لیتا چاہتا ہے جو اس کے خیال میں اس سے عمدہ ہے، اگر عمدہ نہ ہوتی تو تمہارے لئے اپنا مال ہرگز خرچ نہ کرتا، اس لئے دیکھا جائے تو وہ اس بات کا مستحق نہیں کہ تم اس کا شکر کرو، یا اس سے محبت کرو اور اس کی دوزمیں ہیں۔ ایک وجہ تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے دوائی مسلط ہو جانے کے بعد وہ یہ مال تمہیں دینے پر مجبور تھا، وہ مخالفت کریں نہیں سکتا تھا، اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی بادشاہ کا خاندان۔ ظاہر ہے اگر بادشاہ کسی شخص سے خلعت حلائے جانے کا حکم جاری کرے تو خلعت پانے والا اسے اپنا محسن نہیں سمجھ سکتا، کیوں کہ خاندان بادشاہ کا تسلیم پانے کے بعد اطاعت پر مجبور تھا، اس میں مخالفت کی بات نہیں تھی، اگر بادشاہ اس معاملے کو خاندان کی مرضی پر چھوڑ دے تو ہرگز نہ دے۔ اسی طرح اگر اللہ تعالیٰ بھی محسن کو اس کی طبیعت پر چھوڑ دے تو ایک کھوٹا سکتہ بھی خرچ کرنے پر آمادہ نہ ہو، لیکن پہلے اس نے محسن کے دل میں مال دینے کے باعث اور لوازم پیدا کئے، پھر اس کے دل میں یہ خیال پیدا کیا کہ اس کا دینی اور دنیوی فائدہ مال دینے میں مضمر ہے، اس لئے وہ مال دیتا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ مال دیتا ہے اور اس کے عوض میں وہ چیز لیتا ہے جو اس کے نزدیک مال سے زیادہ بہتر ہے، اس کی مثال تو بائع کی سی ہے، جس طرح ہم بائع کو محسن نہیں کہہ سکتے کہ وہ مال لے کر بیع دیتا ہے ایسے ہی اس شخص کو بھی محسن نہیں کہہ سکتے اس لئے کہ عوض لے کر مال دے رہا ہے، اب یہ الگ بات ہے کہ اس نے عوض میں حمد و ثناء قبول کی ہے یا اجر و ثواب کو ترجیح دی ہے، عوض کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ مال محسوس ہو، بلکہ لہذا نڈ اور فوائد بھی مال کے قائم مقام بن جاسکتے ہیں، بلکہ بعض اوقات مال کا بہترین عوض بن جاتے ہیں۔

حقیقت میں احسان یہ ہے کہ اس سے کوئی عوض منظور نہ ہو، یعنی دینے والا مال اس طرح دے کہ نہ وہ اس کے عوض میں کوئی لذت اٹھائے نہ کوئی حلائے جانے اور نہ کسی قسم کا فائدہ حاصل کرے، اور یہ احسان کسی انسان سے وجود میں آتا ممکن نہیں ہے، صرف اللہ تعالیٰ ہی اس کا مصدر اور منبع ہے، مخلوق پر اس نے جس قدر احسانات کئے ہیں ان میں اس کا کوئی فائدہ پوشیدہ نہیں ہے تمام فوائد مخلوق کو حاصل ہوتے ہیں۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ غیر اللہ کے لئے احسان کا لفظ استعمال کرنا یا کذب ہے یا مجاز۔ غیر اللہ میں حقیقی احسان کا وجود محال اور ممکن ہے جس طرح سیاہی اور سفیدی کا یکجا ہونا محال ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی تمام صفات ہی کی طرح اس صفت میں بھی یکساں و یکگانہ ہے۔ معلوم ہوا کہ عارف کو اس ظاہری محسن کے بجائے اللہ تعالیٰ سے محبت کرنی چاہیے، کیوں کہ وہ احسان کریں نہیں سکتا، اس سے احسان کا معرض وجود میں آنا محال ہے، صاحب احسان صرف اللہ تعالیٰ ہے، وہی اس محبت کا مستحق بھی ہے، اگر کوئی شخص غیر اللہ کو محسن سمجھ کر اس کے احسان سے محبت کرتا ہے تو یہ اس کی جہالت اور احسان کے معنی و مقصد سے اس کی ناواقفیت کی دلیل ہے۔

تیسرا سبب یہ تھا کہ انسان محسن سے محبت کرے اگرچہ اس کا احسان خود اس پر نہ ہو، بلکہ غیر ہو، یہ چیز طبیعتوں میں پائی جاتی ہے، مثلاً اگر تمہیں کسی ایسے بادشاہ کے بارے میں بتلایا جائے جو عدل کرتا ہو، باخبر ہو، لوگوں کے ساتھ نرمی اور مہربانی سے پیش آتا ہو ان کے ساتھ تواضع کرتا ہو، اگرچہ وہ بادشاہ تم سے ہزاروں میل کے فاصلے پر کسی جگہ ہوتا ہے، لیکن تم اس سے دلی ہی دلی میں محبت کرنے لگتے ہو، دوسری طرف تمہیں کسی بادشاہ کی اطلاع ملتی ہے جو ظلم و ستم میں مصروف ہو، تکبر، فاسق اور فتنہ پرداز ہو، اور وہ بھی تم سے کسی بعید ترین ملک کا حکمران ہو تو تم اس دوری اور فاصلے کے باوجود اس سے نفرت کرتے ہو، تمہارے دل میں ان دونوں بادشاہوں کے لئے مختلف جذبات ہوتے ہیں، اور یہ اختلاف انتہائی نمایاں ہوتا ہے، تم پہلے بادشاہ کی طرف انتہائی میلان رکھتے ہو، اور دوسرے سے انتہائی نفرت کرتے ہو، اور محبت و نفرت کا یہ حال اس وقت ہے جب کہ تم پہلے بادشاہ کی عنایات سے محروم ہو، اور دوسرے بادشاہ کے مظالم سے مامون ہو، پھر ہر تمہارا اس ملک میں جلتا بھی شکل بھی نظر آتا ہے جہاں وہ عادل بادشاہ یا جابر بادشاہ حکومت کرتا ہے، لیکن رحم و دل بادشاہ سے تمہاری یہ محبت تمہیں اس لئے ہے کہ وہ محسن ہے، اس لئے نہیں کہ اس نے

تم پر کوئی احسان کیا ہے، یہ سب بھی اس بات کا متقاضی ہے کہ تم اللہ سے محبت کرو، بلکہ اس کے سوا کسی سے محبت نہ کرو، الّا یہ کہ وہ غیر اللہ سے تعلق کا کوئی سبب رکھتا ہو، اس لئے کہ تمام مخلوق پر احسان کرنے والا، اور ہر وجود کو اپنے فضل و انعام سے نوازنے والا وہی ہے، اس کے علاوہ کوئی نہیں ہے، پہلے انہیں وجود کی دولت بخشی، پھر انہیں اعضاء دے کر، اور ان اسباب سے نواز کر مکمل کیا، جو ان کے لئے ضروری ہیں، پھر انہیں آرام و آسائش کے وہ اسباب عطا کئے جو صورت کے دائرے میں نہیں آتے تاہم ان میں حاجت کا شائبہ پایا جاتا ہے، پھر انہیں ذائقہ سے مزین کیا جو نہ ان کی ضرورتوں میں داخل تھے اور نہ حاجتوں میں ان کا شمار تھا۔ انسانی جسم میں ضروری چیزوں کی مثال دلی، جگر اور سر ہے، اور حاجت کے اعضاء آنکھ، پاؤں اور ہاتھ ہیں، اور نعمت کی چیزیں یہ ہیں کہ ایمونہ دار ہوں، لب و رخسار شفق کول ہوں، آنکھیں بادامی ہوں، دفیوہ دفیوہ۔ یہ وہ چیزیں ہیں کہ اگر ان میں سے کوئی چیز موجود نہ ہو تو حاجت یا ضرورت پر اس کا اثر نہیں پڑتا یہ چیزیں صرف آرائش سے متعلق ہیں، غیر جسمانی نعمتوں میں ضروری کی مثال پانی اور غذا ہے، اور حاجت کی مثال دوا گوشت، اور میوے ہیں اور ذائقہ کی مثال درختوں کی سرسبزی اور شادابی، فنجوں، اور پھولوں کی خوبصورتی، غذاؤں، اور میووں کی لذت ہے، یہ وہ چیزیں ہیں کہ اگر موجود نہ ہوں تو ان سے نہ حاجت پوری ہوتی ہے اور نہ ضرورت۔ نعمتوں کی یہ تینوں قسمیں ہر جائز امر میں پائی جاتی ہیں، بلکہ فرش کے ذرے سے عرش کی ابتدا تک پائی جانے والی تمام مخلوق میں موجود ہیں اس لئے محسن صرف اللہ ہے، اس کے سوا کوئی دوسرا محض محسن ہو ہی نہیں سکتا، اگر کوئی انسان محسن ہے تو اس کا احسان بھی اللہ ہی کی قدرت کے حسانت میں سے ایک حسنت ہے، وہی حسن کا خالق ہے اور وہی محسن کا خالق ہے، وہی اسباب احسان کا خالق ہے، اس لحاظ سے فیہر خدا سے محبت کرنا محض جہالت اور غلوئی ہے، جو محض یہ بات جانتا ہے کہ اللہ کے سوا کسی سے محبت نہیں کرتا۔

چوتھا سبب یہ ہے کہ آدمی کسی چیز سے محض اس لئے محبت کرے کہ وہ جمیل ہے، جمال کے علاوہ بھی اس کا کوئی دوسرا مقصد نہیں ہوتا۔ جیسا کہ ہم نے سابق میں بیان کیا ہے کہ یہ بھی مخلوق کی مرثیت میں داخل ہے، جمال کی دو قسمیں کی گئی ہیں، ایک وہ جمال جس کا ادراک آنکھ سے کیا جاتا ہے، اور دوسرا وہ جمال جس کے لئے نور بصیرت کا ہونا ضروری ہے، پہلے جمال کا ادراک سچے حقی کی جانور اور پرندے بھی کر لیتے ہیں، جب کہ دوسرے جمال کا ادراک صرف وہی لوگ کرتے ہیں جن پر اہل دل کا اطلاق ہوتا ہے، اس میں ان کے ساتھ وہ لوگ شریک نہیں ہوتے جن جو صرف دنیوی زندگی کے ظاہری پہلوؤں پر نظر رکھتے ہیں، اور ظاہر کے علاوہ کسی چیز کو نہیں دیکھتے۔ جمال ہر اس شخص کے نزدیک محبوب ہوتا ہے جو اس کا ادراک کرتا ہے، جو لوگ قلب سے جمال کا ادراک کرتے ہیں، وہ قلب سے اس جمال کو محبوب جانتے ہیں، اس کی مثال انبیائے کرام، علماء اور اہل اخلاق و اوصاف کے حامل لوگوں کی محبت ہے، ان کی محبت دلوں میں ہوتی ہے، ان کی صورتیں اور دیگر ظاہری اعضاء نگاہوں سے اوچھل جاتے ہیں، باطنی صورت کے حسن سے یہی مراد ہے، جس سے اس کا ادراک نہیں ہوتا، ہاں ان آثار کا ادراک ضرور ہوتا ہے جو ان کے اخلاق پر دلالت کرتے ہیں، پھر جب قلب کی ان پر دلالت ہوتی ہے تب قلب ان کی طرف مائل ہوتا ہے، اور ان سے محبت کرتا ہے، چنانچہ جو شخص سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرتا ہے، یا حضرت ابو بکر الصدیقؓ سے محبت کرتا ہے یا حضرت امام شافعیؒ سے محبت کرتا ہے وہ اس امر کی وجہ سے کرتا ہے جو اسے اچھا معلوم ہوتا ہے، ان کے حسن صورت یا حسن سیرت کی بنا پر محبت نہیں کرتا، البتہ ان کے اعمال کا حسن ان صفات عالیہ پر دلالت کرتا ہے جس سے وہ افعال طور پر پذیر ہوئے ہیں، چنانچہ جو شخص کسی مصنف کی تصنیف، یا کسی شاعر کا شعر، یا کسی صوفی کی تصوف، یا کسی معمار کی تعمیر دیکھتا ہے تو اس پر اس مصنف، شاعر، معمار اور معمار کی وہ صفات باطنی منکشف ہو جاتی ہیں جن سے یہ افعال صلوہ ہوئے ہیں، اور جن کا حاصل علم و قدرت ہے، پھر معلوم جس قدر اعلا اشرف اور جمال و عظمت کے اعتبار سے مکمل ہو گا اسی قدر اس کا علم بھی اشرف و مکمل ہو گا، یہی حال مقدور کا ہے، مقدور جس قدر اعلا مرتبت اور منزلت کا حامل ہو گا اسی قدر قدرت بھی اعلا و اکمل ہو گی۔ کیوں کہ معلومات میں اعلا ترین معلوم اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، اس لئے علوم میں سب سے اعلا و اشرف اللہ تعالیٰ کی معرفت ہے، پھر درجہ بدرجہ وہ چیزیں شرف و فضیلت رکھتی ہیں جو

معرفت الہی کے ساتھ مخصوص یا اس سے قریب تر ہیں جو جز اللہ تعالیٰ کی معرفت کے ساتھ جس قدر مخلوق ہوگی اسی قدر وہ عظیم ہوگی۔

صدیقین کی ان صفات کا جمال جن سے طبعی طور پر قلوب محبت کرتے ہیں، عین امویہ کی طرف راجع ہے، ایک قویہ کہ وہ لوگ اللہ تعالیٰ کا محبوب و رسول اور شریعہ الہیہ کا علم رکھتے ہیں، وہ سب سے پہلے کہ انہیں اپنے اور بندگان خدا کے نفوس کی اصلاح و رہنمائی پر قدرت حاصل ہے، تیسرے یہ کہ وہ ان مذاکر، تجربات اور مشاہدات سے پاک ہیں جو انسان کو خیر کی راہوں سے ہٹا کر شر کے راستوں پر چلنے پر مجبور کر دیتی ہیں۔ انہی امور کے باعث لوگ انبیاء، علماء، خلفاء اور عادل اور نیک بادشاہوں سے محبت کرتے ہیں۔

علم، قدرت، اور پاکیزگی، آئیے اب ہم ان تینوں امور کو اللہ تعالیٰ کی صفات کی نسبت سے دیکھتے ہیں۔ علم کا حال یہ ہے کہ اولین و آخرین کے تمام علوم کو اللہ تعالیٰ کے علم سے کوئی نسبت نہیں ہے، اس کا علم تمام اشیاء کو اس قدر محیط ہے کہ کوئی چیز اس سے باہر نہیں ہے، قرآن کریم میں ہے:-

لَا يَغْزِبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ فِى السَّمٰوٰتِ وَلَا فِى الْاَرْضِ (پ ۲۲ آیت ۳)

اس (کے علم) سے کوئی ذرہ برابر بھی غائب نہیں نہ آسمانوں میں اور نہ زمین میں۔

ایک آیت میں تمام مخلوق کو غلیب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:-

وَمَا لَوْ نَبِئْتُمْ مِنْهُمْ اِلَّا قَلِيْلًا (پ ۲۸ آیت ۸۵)

بلکہ اگر تمام اہل آسمان اور تمام اہل زمین تمہارے بارگاہ نبی یا مہم کی مخلوق میں اس کے علم و حکمت کا احاطہ کرنے کی کوشش کریں تو اس کے معر مشیر بھی مطلع نہ ہوں، اور صرف اسی قدر علم حاصل کر پائیں جتنا چاہتا ہے، مخلوق کو جو تصور اہمیت علم ملا ہے وہ اسی کی تعلیم سے ہے قرآن کریم میں فرمایا:-

خَلَقَ الْاِنْسَانَ عَلَّمَہٗ الْبَيَانَ (پ ۲۸ آیت ۳-۴)

مطلوبہ یہ ہے کہ اگر علم کا جمال اور شرف کوئی امر محبوب ہے، یا وہ فی نفسہ اس شخص کے حق میں نعمت و کمال ہے جو اس سے مستفید ہے تو اس لحاظ سے بھی انسان کو صرف اللہ ہی سے محبت کرنی چاہیے، علماء کے علوم اس کے علم کی نسبت سے جہل محض ہیں، اگر کوئی شخص اپنے زمانے کے سب سے بڑے عالم ہے، اسی واقعہ ہے کہ اگر سب سے بڑے عالم کو بھی جانتا ہے تو یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ اجمل کو اس کے علم کے باعث محبوب جانے اور اہم کو چھوڑ دے، ظاہر ہے اجمل بھی یہ کہہ نہ سکے کہ علم ضرور رکھتا ہے خواہ وہ اسباب معیشت ہی کا علم کیوں نہ ہو، ان دونوں مضمون کے علم میں جو فرق ہے اس سے کہیں زیادہ فرق اللہ تعالیٰ کے اور مخلوق کے علم میں ہے۔ اس لئے کہ اہم و اجمل کے مقابلے میں محض ان چند محدود اور متناهی معلومات کی بنیاد پر فیصلہ رکھتا ہے جن کا حصول کسب اور اجتہاد کے ذریعے اجمل کے لئے بھی ممکن ہے اور اللہ تعالیٰ کے علم کو تمام مخلوق کے علوم پر ناقابل تصور فیصلہ حاصل ہے۔ اس لئے کہ اس کی معلومات کی کوئی انتہا نہیں ہے جب کہ مخلوق کی معلومات محدود اور متناهی ہیں۔

قدرت بھی ایک صفت کمال ہے، اور اس کے مقابلے میں بحر نقص ہے، ہر کمال، عظمت، نفیست اور برتری محبوب ہوتی ہے اور اس کے ادراک میں لذت پائی جاتی ہے، چنانچہ انسان حضرت علی اور حضرت خالد رضی اللہ عنہما وغیرہ کی بہادری، دلیری، جوانمردی، اور ہمسوں پر ان کے تفوق اور غلبے کے قہقہے سنتا ہے، اور اس کے دل میں خوشی و مسرت کے جذبات ابھل چلا دیتے ہیں، وہ شخص محض واقعات سن کر اتنا مسرور ہوتا ہے اگر اپنی آنکھوں سے ان کے بہادرانہ کارناموں کا مشاہدہ کر لیتا تو اس کی خوشی کا کیا ٹھکانہ ہوتا۔ وہ یہ واقعات سن کر ان لوگوں کے لئے اپنے دل میں محبت کے جذبات امنڈتے ہوئے دیکھتا ہے جن کی طرف وہ واقعات منسوب ہیں، اب ذرا بندوں کی قدرت اور شجاعت کا مقابلہ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے کیجئے، مخلوق میں اس شخص کو کیجئے جو سب سے

زیادہ قوت رکھتا ہو، ملک اور اقتدار کے اعتبار سے وسیع تر ہو، شہوات کا قلع قمع کرنے، اور خباثت نفس کا ازالہ کرنے پر تمام لوگوں میں سب سے زیادہ قدرت رکھتا ہو، اپنے اور دوسروں کے نفوس کے معاملات پر وسیع تر نظر رکھتا ہو، اور انہیں قابو میں کرنے پر پوری طرح قدرت رکھتا ہو، ایسے شخص کو لیجئے، اور پھر دیکھئے کہ وہ اپنی احتمالی طاقت، قوت، وسعت اور قدرت کے باوجود نہ اپنی موت کا اختیار رکھتا ہے، اور نہ زندگی کا نہ بحث بعد الموت پر قادر ہے، نہ نفع و نقصان پر قدرت رکھتا ہے، یہاں تک کہ وہ اپنی آنکھ کی پٹائی باقی رکھنے، اپنی زبان کو گونگے پن سے بچانے، اپنے کان کی سماعت کو برقرار رکھنے، اور جسم کو امراض سے دور رکھنے پر بھی قادر نہیں ہے۔ بے شمار معاملات ایسے ہیں کہ انسان ان میں نہ اپنے لئے کچھ کر سکتا ہے اور نہ غیر کے لئے، اور یہ معاملات وہ ہیں جو اس کی قدرت سے متعلق ہیں، اور جن کا تعلق اس کی قدرت سے نہیں ہے ان میں وہ کسی کے پر کے برابر بھی کچھ نہیں کر سکتا، جیسے آسمانوں کے ملکوت، کو اکب، زمین کے پہاڑ، سمندر، ہوائیں، بجلیاں، معدنیات، نباتات، اور ان کے تمام اجزاء، پھر جو قدرت اسے اپنے نفس پر یا غیر پر حاصل ہے وہ بھی نہ اس سے ہے، اور نہ اس کے ساتھ قائم ہے، بلکہ جس طرح اللہ نے اسے پیدا فرمایا ہے اسی طرح اس کی قدرت، اور اسباب کو بھی پیدا کیا ہے، اسی نے اس کو متعلقہ کاموں پر قادر کیا ہے، اس کی قدرت کا عالم یہ ہے کہ اگر وہ کسی زبوست بادشاہ، یا قوی تر انسان پر ایک حقیر پتھر کو مسلط کر دے تو وہ پتھر اسے ہلاک کر دے، بندے کو جس قدر قوت یا قدرت حاصل ہے وہ سب اسی کی بخشش اور حطا ہے، جیسا کہ اس نے خود دنیا کے عظیم ترین بادشاہ کے ہارسے میں ارشاد فرمایا: نہ

إِنَّا مَكْنُتُكَ لَعَفِیْ الْأَرْضِیْنَ۔ (پ ۲۲ آیت ۸۳) ہم نے ان کو دئے زمین پر حکومت دی تھی۔

ذوالقرنین کو دنیا کی حکومت اور سلطنت صرف اللہ تعالیٰ کے کرم سے ملی تھی، انہیں اللہ نے زمین کے ایک معمولی جزیرہ پر قادر کر دیا تھا، ورنہ زمین انتہائی وسیع ہے، اور دوسرے اجسام عالم کی بہ نسبت یہ زمین ایک ڈھیلے سے زیادہ مضبوط نہیں رکھتی، اور وہ تمام ولایتیں جو دئے زمین پر انسان کو حاصل ہوتی ہیں اس ڈھیلے کے مقابلے میں ایک ٹنگری ہیں، اور یہ ٹنگری بھی اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی قدرت سے بندوں کے تصرف میں آتی ہے۔ اس لئے یہ محال ہے کہ کوئی شخص اللہ تعالیٰ کے بندوں میں سے کسی بندے سے اس لئے محبت کرے کہ وہ قدرت، سیاست، طلبہ، اقتدار، اور کمال قوت رکھتا ہے، اور اللہ تعالیٰ سے محبت نہ کرے، حالانہ قوت اور طاقت صرف اللہ ہی کو زیب دیتی ہے جو برتر اور عظیم ہے، وہی بخار، تبار، عظیم اور قادر ہے، آسمان اس کے دائیں ہاتھ میں لئے ہوئے ہیں، زمین اور جو کچھ زمین کے اوپر یا اندر ہے وہ سب اس کے قبضہ تصرف میں ہے، تمام مخلوق کی لگام اس کے دست قدرت میں ہے، اگر وہ دئے زمین پر بسنے والی تمام مخلوق کو ہلاک کر دے تو اس کی سلطنت اور ملک سے ایک ذرہ کم نہ ہو، اور اگر اس جیسی مخلوق ہزار بار پیدا کرے تو ان کی مخلوق سے عاجز نہ ہو، بندوں میں جہاں بھی قدرت ہے، یا جو شخص بھی قادر ہے وہ سب اسی کی قدرت کے آثار میں سے ہے، اسی کے لئے جمال، حسن، جلال، عظمت، کبریائی، قہر، برتری ہے، اس لئے اگر کسی شخص کو اس کے کمال قدرت کے باعث محبوب رکھا جاتا ممکن ہے تو اس محبت کا مستحق صرف قادر مطلق اللہ ہے۔

محبوب سے نفس کا پاک ہونا اور رذائل و خباثت سے دور ہونا بھی ایک صفت ہے جو محبت کی مقتضی ہے، یہ بھی حسن و جمال ہے، اور باطنی صورتوں سے تعلق رکھتی ہے، اگرچہ تمام انبیائے کرام اور مدقین محبوب، محاسنی اور رذائل سے محفوظ تھے مگر تقدس اور تنہ کا کمال صرف اسی ذات واحد کے لئے ممکن ہے جو قدوس ہے، اور صاحب الجلال والا کرام ہے، ورنہ باقی تمام مخلوق میں کوئی نہ کوئی نقص پایا جاتا ہے، بلکہ بیشتر مخلوق ناقص کا مجموعہ نظر آتی ہے، بلکہ اس کا مخلوق ہونا، عاجز، مسخر اور مجبور ہونا بھی عیب اور نقص ہی ہے، اس لئے کمال صرف اللہ کے لئے ہے، خیر کو اگر کوئی کمال حاصل ہے تو وہ اسی کا حطا کر دہ ہے، اس کے اختیار میں نہیں ہے کہ متنائے کمال تک پہنچ سکے، اس لئے کہ اختنائے کمال کا اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ بندہ مسخر اور قائم بالغیر نہ ہو، اور یہ وصف باری تعالیٰ کے علاوہ کسی کو حاصل نہیں، بلکہ غیر خدا کے حق میں اس وصف کا حصول محال ہے، وہی کمال کے ساتھ منقو ہے، وہی ناقص سے منقو ہے، وہی محبوب سے پاک ہے، لیکن تقدس اور تنہ کی وجہ کا بیان نہ صرف یہ کہ احتمالی طویل ہے بلکہ علوم

خلاصہ کلام یہ ہے کہ جمیل محبوب ہوتا ہے، اور جمیل مطلق اللہ کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا جو یکساں ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، جو یگانہ ہے جس کی کوئی ضد نہیں، جو پاک ہے جس کا کوئی مزاحم نہیں، جو بے نیاز ہے جس کی کوئی حاجت نہیں، وہ قادر ہے جو چاہتا ہے کرتا ہے اور جس چیز کا چاہتا ہے حکم دیتا ہے، کوئی اس کا حکم روک نہ کرے والا نہیں ہے، نہ کوئی اس کے فیصلے کو پس پشت ڈالنے والا ہے، وہ عالم ہے جس کے علم سے زمین و آسمان کی ذرہ برابر چیز بھی باہر نہیں ہے، وہ قاہر ہے اس کے دست قدرت میں دنیا کی انتہائی جابر اور سرکش مخلوق کی گردنیں ہیں، بیسے بیسے بادشاہ، اور سلاطین اس کی گرفت میں ہیں، وہ اذلی ہے اس کے وجود کی انتہا نہیں، وہ اپنی ذات میں ایسا ضروری ہے کہ فنا کا تصور بھی اس کے لئے ممکن نہیں، وہ قیوم ہے یعنی خود قائم ہے جب کہ تمام موجودات اس سے قائم ہیں، وہ آسمانوں اور زمین کا بنبار ہے، بھادات و حیوانات و نباتات کا خالق ہے، وہ عزت و جہوت میں مغرور ہے، ملک اور ملکوت میں وحید ہے، فضل، جلال، کبریائی اور جمال تمام اوصاف اسی کے لئے ہیں، اس کی جلال کی معرفت میں عقلیں حیران ہیں، اس کی تعریف کے باب میں زبانیں گونگی ہو جاتی ہیں، عارفین کی معرفت کا کمال یہی ہے کہ اس کی معرفت سے اپنے عجز کا اعتراف کریں، اور انبیاء کی نبوت کی انتہائی ہے کہ اس کی تعریف سے اپنی عاجزی کے معترف ہوں، جیسا کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :-

میں تیری تعریف پوری نہیں کر سکتا تو ایسا ہے جیسا کہ تو نے خود اپنی تعریف کی ہے۔

الْعِجْرُ عَنْ ذَرْكِ الْإِذْرَاقِ اِدْرَاكُ اِدْرَاكِ كے ادراک سے عاجز رہنا ہی ادراک ہے۔

پاک ہے وہ ذات جس نے اپنی معرفت کا طریقہ بھی بتلایا ہے کہ اس کی معرفت سے عاجز رہا جائے ہمیں نہیں معلوم کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی محبت کو حقیقی نہیں سمجھتے بلکہ مجازی کہتے ہیں، ان کے نزدیک یہ اوصاف جمال اور کمال کے اوصاف ہیں، یا وہ اس بات کے منکر ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان اوصاف سے متصف ہے، یا وہ یہ کہتے ہیں کہ کمال، جمال، اور عظمت و بلندی، بے‌محابوب نہیں ہوتی، پاک ہے وہ ذات جو اپنی غیرت جمال اور جلال کے باعث اندھوں کی نگاہوں سے اوچھل رہا ہے، صرف ان لوگوں پر اس کی تجلی ہوتی ہے جن کی قسمت میں نیکی اور آتش ناز سے دوری لکھ دی گئی ہے، اس نے خسارہ اٹھانے والوں کو تاریکیوں میں چھوڑ دیا ہے، جن میں وہ بھٹکتے پھرتے ہیں، اور ہیمنہ شہادت و محسوسات میں گرفتار رہتے ہیں، وہ دنیاوی زندگی کو زندگی سمجھتے ہیں، اور آخرت سے غفلت و اعراض برتتے ہیں، افسوس یہ لوگ کچھ نہیں جانتے۔ اس سبب سے محبت احسان کے باعث محبت سے قوی تر ہوتی ہے، اس لئے کہ احسان کم و بیش ہوتا رہتا ہے، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام پر وحی بھیجی کہ میرے نزدیک سب سے زیادہ محبوب وہ شخص ہے جو مجھ سے کسی عطاء کے بغیر محبت کرے، لیکن ربوبیت اپنا حق ضرور ادا کرتی ہے زور میں ہے کہ اس شخص سے بڑا ظالم کوئی نہیں جو مجھ سے جنت یا دوزخ کے لئے محبت کرے، اگر میں جنت اور دوزخ پرانہ کرنا تو کیا میں اطاعت کا مستحق نہ ہوتا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا گذر چند ایسے افراد کے پاس سے ہوا جن کے جسم کمزور ہو گئے تھے، انہوں نے عرض کیا کہ ہم دوزخ سے ڈرتے ہیں، اور جنت کی امید رکھتے ہیں، فرمایا تم ایک مخلوق سے ڈرتے ہو، اور ایک مخلوق سے امید رکھتے ہو، اس کے بعد آپ کا

(۱) یہ روایت پہلے گذر چکی ہے۔

گذر ایک ایسی قوم پر ہوا جنہوں نے عرض کیا کہ ہم اللہ کی محبت اور عظمت کے لئے اس کی عبادت کرتے ہیں، آپ نے فرمایا کہ تم حقیقت میں اللہ کے دوست ہو، مجھے تمہارے ہی ساتھ رہنے کا حکم دیا گیا ہے، ابو حازم فرماتے ہیں کہ مجھے ثواب و عذاب کے لئے عبادت کرنے میں شرم آتی ہے، میں نہیں چاہتا کہ بدترین ظلام بنوں جو اگر ڈر محسوس نہیں کرتا تو عمل بھی نہیں کرتا، اور نہ میں برا مزدور بننا پسند کرتا ہوں کہ اگر مزدوری نہ دی جائے تو کام نہ کرے ایک حدیث شریف میں بھی یہ مضمون وارد ہے، فرمایا :-

لَا يَكُونَنَّ أَحَدُكُمْ كَالْأَحْبَرِ السَّوْعَاءِ لَمْ يُعْطَ أَجْرًا لَمْ يَعْمَلْ وَلَا كَالْعَبْدِ الشَّوْعَرِ لَمْ يَخَفْ لَمْ يَعْمَلْ (۱)

تم میں سے کوئی شخص بدترین مزدور نہ بنے جسے اگر اجرت نہ دی جائے تو وہ کام نہ کرے۔ اور نہ بدترین غلام بنے کہ اگر اسے ڈر نہ ہو تو وہ کام ترک کر دے۔

پانچواں سبب محبت کا پانچواں سبب مناسبت اور ہم شکل ہے۔ اس لئے کہ جو چیز جس کے مشابہ ہوتی ہے، اسی کی طرف مائل ہوتی ہے، چنانچہ تم دیکھتے ہو کہ بچے کی طرف مائل ہوتا ہے، اور بڑا بڑے کی طرف، ہر جانور اپنی جنس کی طرف کھینچتا ہے اور غیر جنس سے بھاگتا ہے، ہر صاحب علم اپنے ہی جیسے تعلیم یافتہ شخص سے زیادہ مانوس ہوتا ہے، بڑھتی کا شکار کی بہ نسبت اپنے ہی جیسے دوسرے بڑھتی سے مانوس ہوتا ہے، یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس پر کوئی دلیل قائم کرنے کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ تجربہ اور مشاہدہ اس کا واضح ثبوت ہے اور اخبار و آثار سے بھی اس کی شہادت ملتی ہے، ہم نے کتاب آداب العبت کے باب الاخوة فی اللہ میں اس سلسلے کے بعض آثار اور روایات جمع کی ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ مناسبت بھی محبت کا ایک سبب ہے، تاہم مناسبت کبھی ظاہر میں ہوتی ہے، جیسے بچپن میں بچہ کو دوسرے بچے سے مناسبت ہوتی ہے، اور کبھی یہ مناسبت کسی ایسے غفلت میں ہوتی ہے جس پر دوسرے کو اطلاع نہیں ہوتی۔ جیسے دو شخصوں میں اتفاقاً اتحاد ہو جاتا ہے، حالانکہ نہ وہ ایک دوسرے کے جمال کا مشاہدہ کرتے ہیں، اور نہ ایک دوسرے کے مال کی طمع کرتے ہیں، جیسا کہ ایک حدیث میں ہے، سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :-

الْأَرْوَاحُ جُنُودٌ مُجْتَنِدَةٌ فَمَا تَعَارَفَ مِنْهَا اِتْتَلَفَ وَمَا تَنَّا كَرَّ مِنْهَا اِخْتَلَفَ (۲)

روحیں ایک مجتمع فکر ہیں، ان میں سے جو آشنائی رکھتی ہیں وہ اکٹھی ہو جاتی ہیں، اور جو نا آشنا ہوتی ہیں وہ جدا رہتی ہیں۔

اس حدیث میں تعارف سے تناسب مراد ہے، اور تنافر سے غیر تناسب۔ ہر حال مناسبت بھی بندے اور خدا تعالیٰ کے مابین محبت کا ایک اہم سبب ہے، یہ مناسبت ظاہری نہیں ہوتی کہ دونوں کی شکل و صورت یکساں ہو، بلکہ دونوں کے مابین ایک باطنی مناسبت ہوتی ہے، اور یہ مناسبت کبھی ایسے امور میں ہوتی ہے جو کتابوں میں لکھے جاسکتے ہیں اور کبھی ایسے امور میں جن کا کتابوں میں لکھنا اور درج کرنا ممکن نہیں ہوتا، بلکہ وہ ہمدردی و غیرت میں چھپے رہتے ہیں اور ان کا غفلت رہنا ہی درست ہے، تاکہ جب راہ معرفت کے سارے گھٹن اپنی منزل پر پہنچ جائیں تو ان پر یہ امور از خود منکشف ہو جائیں۔

وہ امور جن میں باری تعالیٰ اور بندے کے درمیان مناسبت ہے اور کتابوں میں لکھے جاسکتے ہیں ان میں سے ایک مراد یہ ہے کہ بندہ ان صفات میں اللہ تعالیٰ سے قریب ہو جن میں اس کے لئے اللہ کا حکم ہے، جیسا کہ حدیث شریف میں ہے :-

تَحَلَّقُوا بِأَخْلَاقِ اللّٰهِ (۳)

اللہ تعالیٰ کے اخلاق اختیار کرو۔

یعنی وہ عمدہ اوصاف اختیار کئے جائیں جو اوصاف الہی میں سے ہیں، جیسے علم، نیکی، احسان، مہربانی، دوسروں کے ساتھ بھلائی اور رحم کا معاملہ کرنا، ان کو نصیحت کرنا، ہدایت کی راہ دکھانا، باطل سے روکنا، یہ سب مکارم شریعت ہیں، اور ان کے حصول سے بندہ اللہ (۱) مجھے اس روایت کی اصل نہیں ملی۔ (۲) یہ روایت بھی پہلے گزری ہے۔ (۳) یہ روایت پہلے بھی گزری ہے۔

تعالیٰ کی قربت حاصل کرتا ہے یہ قربت مکان اور جسم کی نہیں ہوتی بلکہ ان صفات کی ہوتی ہے جن سے اللہ تعالیٰ متصف ہے اور مناسبت کے جن امور کا کتابوں میں لکھنا جائز نہیں ہے ان کی طرف اللہ تعالیٰ نے اپنے اس ارشاد میں اشارہ فرمایا ہے۔

وَسَاءَ لَوْ تَكُونُكَ عَنِ الرُّوحِ قُلُ الرُّوحِ مِنْ أَمْرِ رَبِّي۔ (پ ۱۵ ص ۸۵ آیت ۸۵)

اور یہ لوگ آپ سے روح کے بارے میں پوچھتے ہیں آپ فرمادیجئے روح میرے رب کے حکم سے بنی ہے۔

اس آیت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ روح ایک زبانی امر ہے اور مخلوق کی مدد حاصل سے خارج ہے اور اس سے زیادہ واضح آیت یہ ہے۔

فَإِذَا سَوَّيْتُهُمْ نَفَخْتُ فِيهِمْ مِنْ رُوحِي۔ (پ ۱۳ ص ۳۹ آیت ۲۹)

پس جب میں اس کو پوار بنا چکوں اور اس میں اپنی طرف سے جان ڈال دوں۔

اسی لئے آدم کو فرشتوں کا سمجھو بنایا جیسا کہ قرآن کریم کی اس آیت میں فرمایا گیا۔

إِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ۔ (پ ۲۳ ص ۳۱ آیت ۳۱) ہم نے تم کو زمین پر حاکم بنایا ہے۔

اس لئے کہ آدمی صرف اسی مناسبت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی خلافت کا مستحق بنا اور اسی امر کی طرف سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ

وسلم کے اس ارشاد میں اشارہ کیا گیا ہے۔

إِنَّ اللَّهَ خَلَقَ آدَمَ عَلَى صُورِ رَبِّهِ۔ اللہ تعالیٰ نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا فرمایا ہے۔

اس حدیث کی بنا پر کم عقولوں نے یہ خیال کیا کہ صورت صرف ظاہری شکل کو کہتے ہیں اور ظاہری شکل حواس سے مدد رکھتی ہے اپنے اس گمان کی بنیاد پر انہوں نے اللہ تعالیٰ کے لئے جسم اور اعضاء تصور کر لئے اور اسے دوسری اشیاء سے تشبیہ دینے لگے

اللہ تعالیٰ ہمیں اس کم عقلی سے اپنی ہٹا دے اور ہمیں ہدایت دے اسی مناسبت کی طرف اس حدیث قدسی میں اشارہ ہے

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا کہ میں پیار ہوا تو نے میری عبادت نہیں کی حضرت موسیٰ نے عرض کیا : یا اللہ!

تیری عبادت کیسے کرتا؟ فرمایا : میرا ملاں بندہ پیار ہوا تو نے اس کی عبادت نہیں کی اگر تو اس کی عبادت کرتا تو مجھے اس کے پاس

پاتا۔ لیکن یہ مناسبت اسی وقت ظاہر ہوتی ہے جب آدمی فرائض کی بجا آوری کے بعد نوافل کی پابندی کرتا ہے ایک حدیث قدسی

میں وارد ہے اللہ فرماتا ہے۔

لَا يَزَالُ الْعَبْدُ يَتَقَرَّبُ إِلَيَّ بِالنَّوَافِلِ حَتَّى أَحْبَبُهُ فَإِذَا أَحْبَبْتُهُ كُنْتُ سَمْعَهُ الَّذِي

يَسْمَعُ بِمَنْصُورٍ وَالَّذِي يَنْصُرُهُ وَلِسَانَهُ الَّذِي يَنْطِقُ بِهِ۔ (بخاری۔ ابو ہریرہ)

بندہ نوافل کے ذریعے میرا تقرب حاصل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں جب

میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں تو اس کا کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے اور آنکھ بن جاتا ہوں جس

سے وہ دیکھتا ہے اور زبان بن جاتا ہوں جس سے وہ بولتا ہے۔

اب ہم اس مقام پر پہنچ گئے ہیں جہاں عتقانِ قلم کو روک دینا ضروری ہے اس لئے کہ اس مقام پر بڑا اختلاف واقع ہوا ہے بعض کم

فہم اور کور چشم لوگ ظاہری تشبیہ کی طرف مائل ہو گئے اور بعض غلو پسند حضرات مناسبت کی حد سے تجاوز کر کے اتحاد کا دعویٰ کر

بیٹھے اور یہ کہنے لگے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں حلول کرتا ہے ان میں سے بعض انا الحق کہنے لگے نصاریٰ حضرت عیسیٰ علیہ

السلام کے سلسلے میں گمراہ ہوئے کہ انہیں معبود بنا بیٹھے بعض لوگ کہنے لگے کہ عالم ناموس نے لاہوت کا لباس پہن لیا ہے اور

بعض یہ کہنے لگے کہ عالم لاہوت اور عالم ناموس دونوں متحد ہیں جن لوگوں پر یہ امر مشکف ہے کہ تشبیہ و تمثیل محال ہے اور اتحاد

و حلول ممتنع ہیں اور اس کے باوجود ان پر حقیقت سراج ہے ایسے لوگ بہت کم ہیں۔ شاید ابو الحسن نوری کو یہ مقام حاصل تھا

اس لئے کہ جب آپ کے سامنے یہ شعر بڑھا گیا :

لَا رُبَّ نَفْسٍ لَمِنْ وَرَادِكُمْ مَنَزَلًا۔ تَخْتَبِرُ الْأَلْبَابَ عِنْدَ نَزْوَالِهِ۔

(میں تیری محبت میں ہر دم ایک ایسی منزل پر اترتا ہوں جہاں اتر کر مقیم و ٹنگ رہ جاتی ہیں)

تو ان پر اس قدر وجد غالب ہوا کہ جنگل کی راہ کی کھیتوں میں دوڑتے پھرتے تھے، اسی عالم میں ایسے کھیتوں میں نکل گئے جن کے گئے توڑے جا چکے تھے لیکن ان کی جڑیں باقی تھیں، پاؤں میں یہ جڑیں جھیں، اور انہیں زخمی کر گئیں، دونوں پاؤں ورم آلود ہو گئے، اسی عالم میں انتقال ہو گیا۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ مناسبت بھی محبت کے اسباب میں ایک اہم ترین سبب ہے، اگرچہ یہ سبب بہت عمدہ اور بڑا مضبوط ہے لیکن اس کا وجود بہت کم ہے۔ غور کیا جائے تو یہ پانچوں اسباب اللہ تعالیٰ میں حقیقتہً جمع ہیں، نہ کہ بطور مجاز و کنایہ۔ اور تمام اسباب اعلا و درجات میں ہیں نہ کہ اوئی درجات میں، اس لئے اہل بصیرت کے نزدیک مقبول اور مقبول محبت صرف اللہ تعالیٰ کی ہے، جب کہ کور چشموں کے نزدیک غیر اللہ ہی کی محبت اصل ہے۔

یہاں یہ امر بھی قابل غور ہے کہ مخلوق کی محبت میں شرکت ہو سکتی ہے، کیوں کہ یہ ممکن ہے کہ تم کسی شخص کو کسی خاص سبب کے باعث محبوب رکھو، اور اس سبب میں کوئی دوسرا شخص بھی اس کا شریک ہو اس لئے اسے بھی محبوب جانو، محبت میں شرکت ایک طرح کا نقصان ہے، اور محبوب کے کمال سے اعراض کا ثبوت ہے، یہ بھی ممکن ہے کہ تمہارا محبوب کسی وصف میں یکساں ہو، اور بظاہر کوئی شخص اس وصف میں اس کا شریک نظر نہ آتا ہو، اگر کوئی شخص ایسا موجود بھی ہے تب بھی یہ ممکن ہے کہ اس کا شریک موجود ہو اور تمہیں اس کی خبر نہ ہو، یا آئندہ پایا جانا ممکن نہ ہو، لیکن اللہ تعالیٰ کی تمام صفات اعلا و درجے کی ہیں، اور ان صفات جلال و جمال میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے، نہ فی الوقت موجود ہے اور نہ آئندہ اس کا امکان ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اس کی محبت میں شرکت نہیں ہو سکتی، اسی لئے وہ نقصان سے بھی خالی ہے، یہ ایسا ہی ہے جیسے اس کی صفات عالیہ میں بھی شرکت نہیں ہو سکتی، اس سے معلوم ہوا کہ اصل محبت، اور کمال محبت کا مستحق صرف اللہ ہے، اور یہ استحقاق ایسا ہے جس میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔

معرفت الہی اور دیدار الہی کی لذت

اس عنوان کے تحت ہم یہ بیان کریں گے کہ اعلا ترین لذت اللہ تعالیٰ کی معرفت، اور اس کے وجہ کریم کا دیدار ہے، اور یہ کہ اس پر کسی دوسری لذت کو ترجیح دینا ممکن نہیں ہے، یہ ترجیح صرف وہ شخص دے سکتا ہے جو اس لذت سے محروم ہو۔

انسانی طبائع اور ان کی لذتیں جاننا چاہیے کہ تمام لذتیں اور اکات کے تابع ہیں اور انسان میں بہت سی قوتیں اور طبیعتیں جمع ہیں، اور ہر قوت و لذت کے لئے جداگانہ لذت ہے، اور اس لذت کے معنی ہیں کہ ہر طبیعت کو اس کا وہ مقتضی حاصل ہو جائے جس کے لئے وہ تخلیق کی گئی ہے، انسان کے اندر یہ طبیعت بیکار اور مہذبہ پیدا نہیں کی گئیں، بلکہ ہر طبیعت ایسے امر کے لئے وضع کی گئی ہے جو اس کا مقتضی ہے مثلاً غضب کی طبیعت نفسی اور انتقام کے لئے پیدا کی گئی ہے، بلاشبہ اس کی لذت یہ ہے کہ وہ غلبہ پائے اور انتقام حاصل کرے، یہی غلبہ اور انتقام اس کا مقتضی ہے، خواہش طعام کی طبیعت اس لئے پیدا کی گئی ہے کہ غذا حاصل کرے، اور اس سے وجود کی بچائے، لا محالہ اس کی لذت اسی غذا میں ہوگی جو اس کا مقتضی ہے، یہی حال سننے، دیکھنے، اور سو گھنے کی طبیعتوں کا ہے، ہر طبع کو اپنے مقتضی کے حصول میں لذت ملتی ہے، ان طبائع میں کوئی ایسی طبیعت نہیں ہے جسے اپنی درکات سے تکلیف یا لذت نہ ملتی ہو۔ اسی طرح دل کی بھی ایک طبیعت ہے جسے نور الہی کہتے ہیں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :-

أَفَمَنْ شَرَحَ اللَّهُ صَدْرَهُ لِلْإِسْلَامِ فَهُوَ عَلَى نُورٍ مِنْ رَبِّهِ (پ ۳۳ آیت ۲۲)

سو جس شخص کا سینہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کے لئے کھول دیا اور وہ اپنے ہر دم و گار کے نور پر ہے۔

اس طبیعت کو بصیرت باند، نور ایمانی، اور یقین بھی کہتے ہیں، لیکن ناموں میں کیا رکھا ہے، اصطلاحات مختلف ہو سکتی ہیں، ضعیف عقل کے لوگ اس اختلاف کو معانی اور حقائق کے اختلاف پر محمول کرتے ہیں، کیوں کہ یہ لوگ الفاظ سے معانی طلب کرتے ہیں،

اور یہ عکس واجب ہے معانی اصل ہیں، الفاظ تابع ہوا کرتے ہیں۔ ہر حال دل اپنی ایک ایسی صفت کی بنا پر جس سے وہ معانی کا ادراک کرتا ہے، بدن کے تمام دوسرے اعضاء سے مختلف حیثیت رکھتا ہے، یہ معانی نہ خیالی ہوتے ہیں، اور نہ محسوس کئے جاسکتے ہیں، مثلاً عالم کی تخلیق، اور ایک خالق قدیم اور مدبر حکیم کی طرف اس کی احتیاج جو صفات الہیہ کے ساتھ متصف ہو، اس طبیعت کو ہم عقل بھی کہتے ہیں بشرطیکہ کوئی شخص عقل سے وہ قوت نہ سمجھے جس سے محاذ لے اور مناظرے کے طریقوں کا ادراک ہوتا ہے، کیوں کہ عام طور پر لوگ عقل کو انہی معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔ اسی لئے بعض صوفیاء عقل کو برا کہتے ہیں، ورنہ ایسی صفت کو کیسے برا کہا جاسکتا ہے جس کے باعث انسان بہائم سے ممتاز ہو جائے، اور اس کے ذریعے معرفت الہی کا ادراک کرے، ظاہر ہے یہ ایک عمدہ صفت ہے، اور ایسی عمدہ صفت کو برا نہیں کہا جاسکتا۔

طبع قلب یہ طبیعت اس لئے پیدا کی گئی ہے کہ اس کے ذریعے تمام امور کے حقائق کا ادراک کر سکے۔ اس طبیعت کا مقصد معرفت اور علم ہے، اور اسی میں اس کی لذت ہے، جیسے اور طبائع کی لذت ان امور میں ہے جو ان کے مقصدی ہیں۔ جہاں تک علم و معرفت کی لذت کا معاملہ ہے کوئی شخص بھی اس سے انکار نہیں کر سکتا یہاں تک کہ اگر کوئی شخص کسی معمولی بات کی معرفت یا علم حاصل کر لیتا ہے وہ اس پر خوش ہوتا ہے، اور کسی امر سے ناواقف رہ جانے والا اگرچہ وہ معمولی ہی کیوں نہ ہو رنجیدہ ہوتا ہے، لوگ حقیر امور کی معرفت پر اترتے ہیں، طمع جاننے والے اس کھیل کی خست کے باوجود غر کرتے ہیں، اور اس سلسلے میں تعلیم سے سکوت اختیار نہیں کر پاتے بلکہ ان کی زبان وہ تمام باتیں ظاہر کر رہی رہتی ہے جو وہ جانتے ہیں، اور یہ اس لئے ہوتا ہے کہ وہ اس علم میں بڑی لذت پاتے ہیں اور اسے اپنی ذات کا کمال سمجھتے ہیں، علم ربوبیت کی صفات میں سے اعلیٰ ترین صفت ہے، اور انتہائے کمال ہے اسی لئے جب کسی شخص کی علم کے حوالے سے تعریف کی جاتی ہے تو وہ بڑا خوش ہوتا ہے، کیوں کہ اس طرح وہ اپنے کمال ذات اور کمال علم کی تعریف سنتا ہے، اپنے اوپر ناز کرتا ہے، اور اس میں لذت پاتا ہے۔ پھر یہ لذت ملتی اور سیاسی تدابیر کے علم میں جس قدر ہوتی ہے اتنی لذت زراعت، اور باغبانی کے علم میں نہیں ہوتی، اسی طرح اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات، ملائکہ اور زمین و آسمان کے اسرار کے علم میں جس قدر لذت ہوتی ہے اس قدر لذت نحو اور شعر کے علم میں نہیں ہوتی، اس سلسلے میں اصل بات یہ ہے کہ علم کی لذت اس کے شرف و فضیلت کے اعتبار سے ہے، اور علم کا شرف معلوم کے شرف سے پہچانا جاتا ہے، جو شخص لوگوں کے باطنی احوال کا محض کرتا ہے، اور انہیں بتلاتا ہے اس میں اسے بڑی لذت ملتی ہے، اور اگر وہ احوال دریافت نہیں کرتا تو اس کی طبیعت کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ شخص کرنے، پھر کا شکار اور جولا ہے کے دل کے احوال جاننے میں اس قدر لذت نہیں ملتی جتنی لذت اسے حاکم شرع کے دل کا حال جاننے میں ملتی ہے، خاص طور پر اس وقت کے احوال جب کہ وہ ملکی تدابیر اور انتظامی امور میں مصروف ہو، پھر وزیر مملکت کے احوال جاننے میں اسے جس قدر لذت نصیب ہوتی ہے اس قدر لذت حاکم شرع کے احوال جاننے میں نہیں ملتی، اور اگر خوش قسمتی سے بادشاہ کے دل کے اسرار جان لے تو پھر اس کی خوشی کا کیا ٹھکانہ۔ اس واقعیت پر وہ اپنی زیادہ سے زیادہ تعریف اور مدح پسند کرے گا، اور زیادہ سے زیادہ اس معاملے میں بحث کرنا چاہے گا، اسی ذکر کو محبوب سمجھے گا، کیوں کہ اسے اسی ذکر میں لذت ملے گی حاصل یہ ہے کہ علوم و معارف میں اشرف ترین معرفت یا علم وہ ہے جس میں لذت زیادہ ہو، اور علوم و معارف کا اشرف معلومات کے شرف پر مبنی ہے، اگر معلومات میں کوئی معلوم اشرف و اعلیٰ ہے تو اس کا علم دوسرے علوم سے زیادہ لذت دے گا۔ ہم نہیں جانتے کہ دنیا میں کوئی چیز اللہ تعالیٰ سے زیادہ اشرف، اعلیٰ، اکرم، اور اعلیٰ ہو سکتی ہے جو تمام اشیاء کا خالق ہے، انہیں مکمل کرنے والا ہے، انہیں زینت بخشنے والا ہے، اس نے انہیں از سر نو پیدا کیا، پھر فنا کیا، پھر پیدا کرے گا، ان تمام اشیاء کا مدبر اور مرتب وہی ہے کیا یہ ممکن ہے کہ دربار الہی کے علاوہ بھی کوئی دربار ایسا ہو جو ملک، جمال، کمال اور جلال کی تمام بلندیوں کو جامع ہو، نہ اس کے مہادی جلال کا تصور ممکن ہے، اور نہ عجائب احوال کا احاطہ ممکن ہے تعریف کرنے والوں کی زبانیں خاموش اور قلم خشک محسوس نظر آتے ہیں۔ اگر تم اس حقیقت میں شک نہیں کرتے تو ہمیں اس امر میں شک نہیں کرنا چاہیے کہ ربوبیت کے اسرار کی

اطلاع اور ان تمام امور الہیہ کے ترتیب کا علم جو تمام موجودات عالم کو محیط ہیں معارف میں سب سے اعلیٰ سب سے زیادہ لذیذ اور سب سے زیادہ پاکیزہ ہے، اگر کسی شخص کو یہ علم حاصل ہو جائے تو اسے بجا طور پر حق ہے کہ وہ اپنی ذات کو فضل و کمال سے متصف سمجھے اور اس پر فخر کرے، خوش ہو، معلوم ہو کہ علم لذیذ ہے اور علوم میں سب سے زیادہ لذیذ اللہ تعالیٰ کی ذات، صفات، افعال اور عرش سے فرش تک پھیلی ہوئی وسیع تر مملکت کی تدبیر کا علم ہے۔ معرفت کی لذت تمام لذتوں سے زیادہ قوی ہے، یعنی شہوت، غضب اور دوسرے حواس کی لذتوں سے کہیں زیادہ موثر، پختہ اور دیرپا۔

لذات میں تفاوت ہے جہاں تک لذات کا سوال ہے ان میں نوعیت کا اختلاف بھی ہے، جیسے جماع کی لذت سماع کی لذت سے مختلف ہے، اور معرفت کی لذت اقتدار کی لذت سے جداگانہ ہے، نوعیت کے علاوہ ضعف و قوت کے اعتبار سے بھی یہ لذتیں مختلف ہوتی ہیں جیسے مجرّد اور کامل الشہوت نوجوان کو جماع میں جو لذت ملتی ہے وہ اس شخص کو نہیں ملتی جو جماع پر حریص نہیں ہوتا، اسی طرح جو شخص نہایت خوبصورت اور حسین ہوتا ہے اس کی طرف دیکھنے کی لذت اس شخص کی طرف دیکھنے کی لذت سے مختلف ہوتی ہے جو زیادہ خوبصورت نہیں ہوتا لذات میں قوت و ضعف کی علامت یہ ہے کہ کسی مخصوص لذت کی موجودگی میں دوسری لذت کی طرف دھیان نہ جائے، اور نہ اسے اختیار کرنے کی خواہش ہو، مثال کے طور پر اگر کسی شخص کو یہ اختیار دیا جائے کہ وہ یا تو خوشبو سونگھے یا حسین چہرے کی طرف دیکھے، اور وہ ان دونوں میں سے دوسری صورت اختیار کرے تو کہا جائے گا کہ اس کے نزدیک حسین صورت خوشبو سے زیادہ لذت بخش ہے، اسی طرح اگر کھانا حاضر ہو، اور طہن کا کھلاڑی ہر چیز سے بے نیاز اپنے کھیل میں مصروف ہو تو کہا جائے گا کہ اس کے نزدیک کھیل کی لذت کھانے کی لذت سے زیادہ ہے۔ لذات میں ترجیح کا یہ ایک کمر

معیار ہے۔
لذات کی قسمیں اب ہم پھر اپنے موضوع کی طرف واپس چلتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ لذات ظاہری بھی ہوتی ہیں جیسے حواس خمسہ کی لذت، اور باطنی بھی جیسے اقتدار غلبے، شرافت اور علم کی لذت۔ یہ لذت نہ آئیم کو حاصل ہوتی ہے، اور نہ کان لطف اعموز ہوتا ہے نہ ناک کو لذت ملتی ہے، اور نہ ذائقہ اور لیس کو۔ باطنی لذات اہل کمال پر ظاہری لذات کے مقابلے میں زیادہ غالب ہوتی ہیں، اگر کسی شخص کو یہ اختیار دیا جائے کہ وہ یا تو مرغ مسلم اور طوطی کھائے یا ریاست و اقتدار کے ذریعے دشمنوں پر غلبہ پائے، اب اگر وہ شخص حوصلہ مند، اور عالی ہمت ہو گا تو مرغ اور طوطی کے بجائے اقتدار کو ترجیح دے گا، اور یہ لذت کی لذت پر صبر کرنا اس کے لئے آسان ہو گا، اور سمجھا جائے گا کہ اس کے نزدیک ریاست و اقتدار میں عمدہ غذاؤں کی بہ نسبت زیادہ لذت ہے، البتہ وہ ناقص شخص جس کے باطنی معانی ہنوز کھل نہ ہوئے ہوں، اور وہ بچے کے مانند ہو، یا ایسے شخص کے مانند ہو جس کے باطنی قوی بیکار ہو چکے ہوں بلکہ فنا ہو چکے ہوں، یقیناً باطنی لذات کے مقابلے میں کھانے کی لذت کو ترجیح دے گا، جو شخص بچپن کی کم عقلی، غداہی اور نقص سے تجاوز کر کے داناہی کی حدود میں قدم رکھ چکا ہو جس طرح اس پر غذاؤں کے بجائے ریاست و اقتدار کی لذت غالب ہوتی ہے اسی طرح اس حکم پر جو ظاہر سے تجاوز کر کے باطن تک پہنچ چکا ہو، معرفت الہی، جمال حضرت ربوبیت کے مشاہدے، اور اسرار الہی کی دریافت کی لذت زیادہ غالب ہوتی ہے، اور وہ اسے ریاست و اقتدار کی لذت پر بھی ترجیح دیتا ہے، حالانکہ یہ لذت حلق پر غالب ہے۔ جمال الہی کی لذت کیا ہے اس کی تعبیر اس آیت کریمہ سے کی جاسکتی ہے :-

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا أُخْفِيَ لَهُم مِّن قُرَّةِ أَعْيُنٍ (پ ۲۱، ص ۷۸ آیت ۷۸)

سو کسی شخص کو خبر نہیں جو آنکھوں کی لٹکڑ کا سامان خزانہ عیب میں کیا گیا ہے۔

ایسے لوگوں کے لئے وہ لذتیں ہیں جو آنکھوں نے دیکھی ہیں، نہ کانوں نے سنی ہیں، اور نہ کسی انسان کے دل میں ان کا خیال گذرا ہے۔ ان لذتوں کا صحیح اور اک وہی کر سکے گا جس نے دونوں طرح کی لذتیں چکھی ہوں، وہ شخص یقیناً تجو غلوت، اور ذکر و فکر میں مشغول ہونے اور بحر معرفت میں غوطہ زن ہونے کو ترجیح دے گا، اور اس لذت کے مقابلے میں ریاست و اقتدار کی تمام لذتوں کو حیر سمجھ کر ترک کر دے گا۔ کیوں کہ وہ یہ بات جانتا ہے کہ ریاست پائدار رہنے والی چیز نہیں ہے، اور یہ کہ جس پر اس کی ریاست قائم

ہے وہ بھی فنا ہونے والی ہے، پھر اس لذت میں ہے شمار کدورتیں ہیں اور ان کدورتوں سے لذت کا خالی ہونا ممکن نہیں ہے، اگر یہ ریاست دیر تک باقی رہی تب بھی بیش بہا رہنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ بالآخر اسے موت پر فنا ہونا ہے، اور موت یقینی ہے، قرآن کریم میں ہے :-

حَتَّىٰ إِذَا أَخَذَتِ الْأَرْضُ زُخْرُفَهَا وَاتَّزِنَتْ وَظَنَّ أَهْلُهَا أَنَّهُمْ قَادِرُونَ عَلَيْهَا أَنَّهُمْ آمَرُونَا
لَيْلًا أَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنَاهَا حَصِيدًا كَأَن لَّمْ تَغْنَبِ بِالْأَمْنِ (پ ۸۸ آیت ۲۴)
یہاں تک کہ جب وہ زمین اپنی رونق کا (پورا حصہ) لے چکی اور اس کی پوری زیبائش ہو گئی اور اس کے مالکوں نے سمجھ لیا کہ اب ہم اس پر بالکل قابض ہو چکے تو دن میں یا رات میں اس پر ہماری طرف سے کوئی حادثہ آچڑھا، سو ہم نے اس کو ایسا صاف کر دیا گویا وہ کل یہاں موجود ہی نہ تھی۔

یہ دنیاوی لذت ہے، اور اس لذت کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ کی معرفت، اس کی صفات، افعال اور اعلیٰ مقصد سے اسل سافلین تک اس کی مملکت کے نظام کے مشاہدے اور سیرِ باطنی کی لذت کو بہر حال ترجیح حاصل ہے۔ اس لئے کہ اس لذت میں کسی سے مزاحمت نہیں ہے نہ کسی قسم کی کوئی کدورت ہے۔ جو اس نظام کی سیر کرنا چاہے یہ جہاں اس کے لئے انتہائی وسیع ہے آسمان سے زمین تک پھیلا ہوا ہے، اور آسمان و زمین کے حدود سے تجاوز کرے تو بھی ایک لاکھ سو دو دنیا آباد ہے۔ جو عارف بیش بہا اس دنیا کے مطالعے میں رہتا ہے وہ اس جنت میں رہتا ہے جس کا طول و عرض آسمان و زمین کے برابر ہے، اس کے باغوں کی سیر کرتا ہے اس کے پھل توڑتا ہے، اس کے چشموں سے سیراب ہوتا ہے، اسے یہ غم نہیں ہوتا کہ ان پھلوں کا سلسلہ موقوف ہو جائے گا، یا وہ باغ مرجعاً جائیں گے، یا قحطی خشک ہو جائیں گے جنت اپنی تمام تر راحتوں اور آسائشوں کے ساتھ ایک ابدی اور سرمدی حقیقت ہے، یہ موت سے منقطع نہیں ہوگی، اس لئے کہ موت معرفتِ الہی کے محل کو ختم نہیں کرتی، معرفتِ الہی کا محل روح ہے، اور روح ایک امر ربانی ہے، موت اس کے احوال بدلتی ہے، اس کے مشاغل منقطع کرتی ہے، اسے جسم کے قید خانے سے آزاد کرتی ہے، اس کی راہ کی راہیں دور کرتی ہے، لیکن اسے فنا نہیں کرتی، ارشادِ باری تعالیٰ ہے :-

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتًا بَلْ أَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ
فَإِذْ حِينٌ بِمَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ وَنَسْتَبْشِرُونَ بِالَّذِينَ لَمْ يَلْحَقُوا بِهِمْ مِنْ خَلْفِهِمْ
أَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (پ ۸۸ آیت ۴۸)

اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل کئے گئے ان کو مردہ مت خیال کرو بلکہ وہ تو زندہ ہیں اپنے پروردگار کے مقرب ہیں ان کو رزق بھی ملتا ہے، وہ خوش ہیں اس چیز سے جو ان کو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے عطا فرمائی ہے اور جو لوگ ان کے پاس نہیں پہنچے ان سے پیچھے رہ گئے ہیں ان کی بھی اس حالت پر وہ خوش ہوتے ہیں کہ ان پر بھی کسی طرح کا خوف واقع ہونے والا نہیں اور نہ وہ غموم ہوں گے۔

یہاں یہ اعتراض نہ کرنا کہ وہ بلا آیت ان لوگوں کے متعلق ہے جو کفار کے خلاف معرکے میں شہید ہو گئے ہوں تو اس کا جواب یہ ہے کہ عارف حقیقی بھی کسی شہید سے کم نہیں ہے، بلکہ ایسے ہر لمحے ایک ہزار شہداء کا ثواب ملتا ہے، جیسا کہ حدیث شریف میں وارد ہے :-
إِنَّ الشَّهِيدَ يَتَمَنَّى أَنْ يُرَدَّ فِي الْأَخِرَةِ إِلَى النَّبَا لِيُقْتَلَ مَرَّةً أُخْرَى لِعَظِيمِ مَا يَرَاهُ
مِنْ ثَوَابِ الشَّهَادَةِ وَإِنَّ الشَّهِيدَ يَتَمَنَّى أَنْ لَوْ كَانُوا عُلَمَاءَ لِمَا يَرَوْنَهُ مِنْ عُلُوِّ دَرَجَةِ الْعُلَمَاءِ (۱)

شہید آخرت میں یہ تمنا کرے گا کہ وہ دنیا میں واپس بھیج دیا جائے اس عظیم ثواب کی وجہ سے جو وہ دیکھے گا اور شہداء یہ تمنا کریں گے کہ کاش وہ علماء ہوتے کہیں کہ وہ علماء کے درجات کی بلندی دیکھیں گے۔

(۱) یہ روایت بخاری و مسلم میں حضرت انسؓ سے ہے لیکن اس میں وان الشہداء الی آخرہ نہیں ہے۔

خلاصہ مقام یہ ہے کہ آسمان و زمین کے تمام ملکوت عارف کے میدان ہیں، وہ جہاں چاہے سیر کر سکتا ہے، مگھوم پھر سکتا ہے، اپنے جسم کو حرکت دے کر بغیر وہ جہاں دل چاہے پہنچ سکتا ہے، وہ جمال ملکوت کے مطالعے سے ایک ایسی جنت میں آباد ہوتا ہے جس کی وسعت و زمین و آسمان کے برابر ہے، اور ہر عارف کو اتنی ہی کشادہ جنت ملے گی، ایسا نہیں ہو گا کہ کسی کے حصے کی جنت تنگ کر کے کسی کی وسیع کر دی جائے۔ البتہ اگر وسعت میں کوئی فرق ہو گا تو وہ اس لئے ہو گا کہ ان کی معرفتیں بھی ایک دوسرے سے مختلف اور متفاوت ہوں گی، جس قدر جس کی معرفت وسیع ہوگی اسی قدر اسے وسیع جنت ملے گی، اللہ تعالیٰ کے یہاں ان کے درجات مختلف ہوں گے، اور یہ درجات اتنے ہوں گے کہ انہیں شمار نہیں کیا جاسکتا۔

بہر حال ریاست کی لذت باطنی ہے، اور صرف اہل کمال کو ملتی ہے، جانوروں اور بچوں کو نصیب نہیں ہوتی، اہل کمال کے نزدیک یہ لذت تمام لذتوں سے زیادہ ہے، اگرچہ ان میں محسوسات اور خواہشات کی لذتیں بھی ہوتی ہیں، مگر وہ ان تمام لذتوں پر قدر کی لذت کو ترجیح دیتے ہیں، یہی حال اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات، اور آسمانوں کے ملکوت و اسرار کی معرفت کا ہے، یہ لذت صرف ان لوگوں کو ملتی ہے جو معرفت کا مرتبہ حاصل کر لیتے ہیں، اور اس کا ذائقہ چکھ لیتے ہیں، اس لذت کا اثبات ان لوگوں کے لئے ممکن نہیں جن کے پاس دل نہ ہو، اس لئے کہ قلب ہی اس قوت کا معدن ہے، جس کے پاس دل نہ ہو گا وہ کبھی اس لذت کو دوسری لذتوں پر ترجیح نہ دے سکے گا، یہ ایسا ہی ہے جیسے کسی بچے سے یہ توقع نہیں رکھی جاسکتی کہ وہ جماع کو کھیل کو پر ترجیح دے گا، یا ناموہم بستر کی کو عطر سونگھنے پر ترجیح دے گا۔ کیوں کہ بچے اور ناموہم وہ قوت ہی نہیں ہے جس سے وہ جماع کی لذت پاسکیں، البتہ وہ شخص ان دونوں لذتوں میں واضح فرق محسوس کرے گا جو ناموہم کے عذاب سے بھی محفوظ ہو، اور اس کی سونگھنے کی قوت بھی سلامت ہو، بس یہی کہنا چاہیے کہ اس لذت کی کیفیت بیان نہیں کی جاسکتی۔ جو یہ لذت چمکتا ہے وہی اسے پہچانتا ہے۔ البتہ طالب علم اگر امور الہیہ کی تحصیل میں مشغول نہیں ہوتے پھر بھی وہ معرفت الہیہ کی لذت سے آشنا ہو جاتے ہیں، کیوں کہ انہیں مشکلات اور شبہات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اور جب وہ ان کے حل کے لئے جدوجہد کرتے ہیں تب ان پر حل منکشف ہوتے ہیں، یہ بھی علوم و معارف ہی ہیں، اگرچہ یہ علوم اتنے اعلیٰ نہیں ہیں جتنے اعلیٰ معرفت الہی سے تعلق رکھنے والے علوم ہوتے ہیں۔

جو شخص اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی ذات و صفات میں بیٹھ کر رہتا ہے، اور اس فکر کے نتیجے میں اس پر ملک الہی کے کچھ اسرار منکشف ہو جاتے ہیں تو وہ خوشی سے پھولا نہیں ساتا، اس کا دل بلیوں اچھلتا ہے، اور وہ اپنے دل کی اس کیفیت پر تعجب کرتا ہے کہ اسرار الہی کے سامنے کیسے ثابت قدم رہا، اور اس کے اندر برداشت کی قوت کہاں سے آگئی، یہ لذتیں اور اک سے تعلق رکھتی ہیں جن کا مزید بیان کچھ زیادہ مفید نہیں ہے، اس گفتگو سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی معرفت لذت ترین شے ہے، اور اس سے بڑھ کر کوئی دوسری لذت نہیں ہو سکتی۔ حضرت ابو سلیمان دارانی کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے بعض بندے ایسے ہیں جنہیں اللہ سے نہ جنت کی امید ہو سکتی ہے، اور نہ دوزخ کا خوف، بھلا انہیں دنیا کیسے روک سکتی ہے، حضرت معروف کرخی کے کسی بھائی نے ان سے دریافت کیا کہ تمہیں کس چیز نے عبادت پر اکسایا ہے اور کس چیز نے دنیا سے لاطیفی اختیار کرنے پر مجبور کیا ہے، آپ خاموش رہے، سائل نے خود ہی کہا کیا موت کے خوف نے؟ فرمایا موت کی حقیقت کیا ہے؟ اس نے پوچھا قبر اور دوزخ کے تصور نے؟ فرمایا قبر کیا چیز ہے؟ اس نے دریافت کیا کیا دوزخ کے خوف اور جنت کی امید میں؟ انہوں نے جواب دیا یہ جنت و دوزخ کیا چیز ہے؟ یہ تمام چیزیں جن کا تم نے حوالہ دیا ہے ایک بادشاہ کے قبضے میں ہیں، اگر تم اس بادشاہ کو یاد رکھو تو تمہیں ان میں سے کوئی چیز یاد نہ رہے، اور اگر تمہیں اس کی معرفت حاصل ہو جائے پھر تمہیں کسی چیز کی ضرورت نہ رہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں کہ جب تم کسی شخص کو اللہ تعالیٰ کی جستجو میں سرگرداں دیکھو تو یہ سمجھ لو کہ اس نے اسے تمام چیزوں سے بے نیاز کر دیا ہے، کسی بزرگ نے حضرت بشر ابن الحارث کو خواب میں دیکھا اور ان سے دریافت کیا کہ ابو نصر تمہارا، اور عبد الوہاب دراق کا کیا حال ہے فرمایا میں نے انہیں ابھی اللہ تعالیٰ کے سامنے اس حالت میں چھوڑا ہے کہ وہ کھاپی رہے تھے، انہوں نے پوچھا اور آپ کا کیا حال ہے؟ فرمایا

کہ اللہ تعالیٰ نے میرے اندر کھانے پینے کی رغبت کم پائی تو مجھے اس کے عوض اپنے دیدار کی اجازت عطا فرمادی، علی ابن الموفق کہتے ہیں کہ میں نے خواب میں دیکھا گویا جنت میں داخل ہوا ہوں وہاں میں نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ دسترخوان پر بیٹھا ہوا ہے اور فرشتے اس کے دائیں بائیں جانب کھڑے ہیں اور اسے قلعے بنانا کرکھلا رہے ہیں اور ان کے ہاتھوں سے طرح طرح کی نعمتیں کھا رہا ہے ایک شخص جنت کے دروازے پر کھڑا ہوا لوگوں کے چہرے دیکھ رہا تھا بعض لوگوں کو وہ اندر آنے کی اجازت دے دیتا تھا اور بعض کو واپس کر دیتا تھا پھر میں ان دونوں آدمیوں سے گذر کر حلیہ و قدس کی طرف چلا وہاں عرش کے شامیانوں میں میں نے ایک شخص کو دیکھا کہ مسلسل اللہ تعالیٰ کی طرف دیکھ رہا ہے وہ کسی طرف نہیں دیکھتا تھا میں نے رضوان سے پوچھا کہ یہ شخص کون ہے اس نے جواب دیا کہ یہ معروف کرخی ہیں ان کی یہ حالت دوزخ کے خوف سے یا جنت کے شوق میں نہیں ہے بلکہ اس کی محبت کی وجہ سے ہے اللہ نے انہیں اپنے وجہ کریم کی طرف دیکھنے کی اجازت دیدی ہے راوی نے یہ بھی بیان کیا کہ باقی دونوں آدمیوں میں سے ایک بشر ابن الحارث تھے اور دوسرے احمد ابن حنبل۔ حضرت ابو سلیمان دارانی فرماتے ہیں کہ جو شخص آج اپنے نفس میں مشغول ہو گا وہ کل کو بھی اسی میں مشغول رہے گا اور جو آج اپنے رب میں مشغول ہو گا وہ کل کو بھی اسی میں مشغول ہو گا۔ حضرت سفیان ثوری نے حضرت رابعہ بصریہ سے پوچھا کہ تیرے ایمان کی حقیقت کیا ہے انہوں نے جواب دیا کہ میں نے تو اللہ کی عبادت نہ دوزخ کے خوف سے کی ہے اور نہ جنت کے شوق میں۔ اگر میں ایسا کرتی تو میری مثال برے مزدور کی سی ہوتی میں نے تو اس کی عبادت اس کی محبت اور شوق میں کی ہے انہوں نے محبت کے سلسلے میں یہ چند اشعار بھی کہے تھے۔

أَحِبُّكَ حُبِّينَ حُبِّ الْهَوَىٰ وَحُبَّنَا لِإِنِّكَ أَهْلُ لَنَا
فَأَمَّا الَّذِي هُوَ حُبُّ الْهَوَىٰ فَشَغْلِي بِذِكْرِكَ عَمَّنْ سِوَاكَ
وَأَمَّا الَّذِي أَنْتَ أَهْلُ لَهُ فَكَشْفُكَ لِي الْحُجُبِ حَتَّىٰ لَأَاكَ
فَلَا الْحَمْدُ فِي ذَاوَلَا ذَاكَ لِي وَلَكِنْ لَكَ التَّحَمُّدُ فِي كَا وَ كَاكَ

(میں تجھ سے دو طرح کی محبتیں کرتی ہوں ایک محبت عشق کی وجہ سے ہے اور دوسری محبت اس لئے ہے کہ تو اس کا اہل ہے، عشق کی بنا پر جو محبت ہے اس کے باعث میں تیرے سوا ہر چیز سے بے نیاز ہو کر تیرے ذکر میں مشغول ہوں، اور وہ محبت جو تیرے شایان شان ہے اس کے باعث تو نے پردے کھول دیے ہیں تاکہ میں تجھے دیکھ سکوں، میرے لئے نہ اس محبت میں کوئی تعریف ہے اور نہ اس محبت میں دونوں محبتوں میں تعریف تیرے ہی لئے ہے)

شاید حضرت رابعہ نے محبت عشق سے وہ محبت مراد لی ہو جو اس کے احسانات اور انعامات کے باعث بندے کو اللہ سے ہوتی چاہیے اور دوسری محبت سے وہ محبت مراد لی ہو جو صرف اس کے جلال و جمال کے باعث ہو، اور یہ جلال و جمال دوام ذکر کے باعث ان پر منکشف ہو گیا ہو، یہ دونوں محبتوں میں اعلا و ارفع محبت ہے۔

ویدار الہی کی لذت اللہ تعالیٰ کے جمال کے مشاہدے میں جو لذت پنہاں ہے وہ اللہ تعالیٰ نے اس حدیث قدسی میں بیان فرمائی ہے۔

أَعَدَّتْ لِعِبَادِي الصَّالِحِينَ مَا لَا عَيْنٌ رَأَتْ وَلَا أُذُنٌ سَمِعَتْ وَلَا خَطَرَ عَلَى قَلْبٍ
بَشَرٍ (بخاری۔ ابو ہریرہ)

میرے نیک بندوں کے لئے وہ (لذت) تیار کی گئی ہے جسے نہ کسی آنکھ نے دیکھا نہ کان نے سنا، اور نہ کسی انسان کے دل پر اس کا گذر ہوا۔

جس شخص کا قلب نہایت مجلی اور اتمائی روشن اور پاکیزہ ہو جاتا ہے وہ بعض لذتوں کا ادراک دیتا ہی میں کر لیتا ہے، ایک بزرگ

فرماتے ہیں کہ میں اپنے اللہ کو بھی یا اللہ! یا رب نہیں کتا کیوں کہ ان الفاظ سے میرے دل پر زبردست بوجھ پڑتا ہے، آواز تو اسے دی جاتی ہے جو آڑ میں ہو، یا دور ہو، کیا تم نے کوئی ایسا شخص دیکھا ہے جو اپنے ہم نشین کو آواز دیتا ہو۔ ایک بزرگ کا مقولہ ہے کہ جب آدمی اس علم میں اعتما کو پہنچ جاتا ہے تو لوگ اس کو چہرہ مارنے لگتے ہیں، اس کی گفتگو ان کی سمجھ سے باہر ہوتی ہے، اور جب اس کی کوئی بات ان کے سمجھ میں نہیں آتی تو وہ اسے دیوانہ اور پاگل کہنے لگتے ہیں، یا اس کے قول کو کفر کہہ دیتے ہیں۔ بہر حال تمام عارفین کا مقصد اللہ تعالیٰ سے وصال اور ملاقات ہے، وہی ان کے دلوں کی راحت، اور آنکھوں کی ٹھنڈک ہے، وہ نہیں جانتے کہ اس میں ان کے لئے کیا چھپا ہوا ہے، جب یہ مقصد پورا ہو جاتا ہے تو پھر کسی لذت کی طرف دل مائل نہیں ہوتا۔ تمام افکار، مشغولات اور لذات فنا ہو جاتی ہیں، دل اسی ایک لذت میں مصطفیٰ ہو جاتا ہے، یہاں تک کہ اگر اسے آگ میں ڈال دیا جائے تو اسے اس کا احساس نہیں ہوتا کہ وہ ایک خوفناک اور دردناک عذاب میں مبتلا کیا جا رہا ہے، اور اگر اسے جنت کی نعمتیں عطا کی جاتی ہیں تو یہ احساس نہیں ہوتا کہ اسے آرام و آسائش سے نوازا جا رہا ہے، وہ تو ایک لذت میں گمن ہے، اور اس لذت کے سامنے تمام تکالیف اور تمام نعمتیں بے سمجھا ہے، مجھے نہیں معلوم کہ جو لوگ صرف محسوسات کی محبت کو محبت سمجھتے ہیں وہ اس عقیدے پر کیسے ایمان لاتے ہیں کہ قیامت کے دن باری تعالیٰ کے دیدار کی سعادت عطا کی جائے گی۔ اس کی کوئی شکل و صورت نہیں ہے، پھر اس وعدے کے کیا معنی ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں سے کیا ہے، اور اسے عظیم ترین نعمت قرار دیا ہے، اصل بات یہ ہے کہ جو شخص اللہ کی معرفت رکھتا ہے وہ یہ بات بھی جانتا ہے کہ یہ ایک لذت تمام لذات کو جامع ہے، جیسا کہ اک شاعر کہتا ہے :-

كَانَتْ لِقَائِيْ اَهْوَاؤًا مُّفَرَّقَةً فَاسْتَجْمَعْتُ مُنْذَرَاتِكَ اَلْعَيْنُ اَهْوَاؤِيْ
فَصَارَ يَحْسُدُ نَبِيٌّ مِّنْ كُنْتُ اَحْسَنَهُ وَصِرْتُ مَوْلٰى اَلْوَرٰى مُنْصِرْتُ مَوْلَا نَبِيِّ
تَرَكْتُ لِلنَّاسِ دُنْيَاهُمْ وَدِيْنَهُمْ شَغْلًا بِذِكْرِكَ يَا رِبِّنِيْ وَدُنْيَا نَبِيِّ

(میرے دل کی مختلف خواہشیں تھیں، جب آگے نے تجھے دیکھا تو میں نے اپنی تمام خواہشیں سمیٹ لیں، اور وہ

فصل مجھ سے حسد کرنے لگا جس سے میں حسد کرتا تھا، اور میں مخلوق کا آقا بن گیا جب سے تو میرا آقا بنا، میں

نے لوگوں کے لئے ان کی دنیا اور دین سب کچھ چھوڑ دیا، تاکہ اے میری دنیا و دین! میں تیرے ساتھ مشغول رہ سکوں)۔

ایک شاعر کہتا ہے :-

وَهَبْ خَيْرَ مَا عَظُمَ مِنْ نَّارِهِ وَوَصِّلْ مَا طَلِبَ مِنْ جَنَّتِهِ

(اس کا جہنم آتش و نیر سے زیادہ بڑا ہے، اور اس کا وصال جنت سے زیادہ عمدہ ہے)۔

ان تمام مقولوں کا حاصل یہ ہے کہ وہ لوگ کھائے، پئے اور نکاح کرنے کی لذتوں پر اللہ تعالیٰ کی معرفت میں قلب کو حاصل ہونے والی لذت کو ترجیح دیتے ہیں، جنت جو اس کے لطف اندوز ہونے کی جگہ ہے جب کہ قلب کو صرف اللہ کی ملاقات میں لذت ملتی ہے۔

لذت کے سلسلے میں مخلوق کے حالات لذت کے سلسلے میں مختلف لوگوں کے مختلف احوال کو اس مثال کے ذریعے سمجھنا چاہیے کہ ابتدا میں بچے کے اندر حرکت اور گیمز کی ایک قوت رونما ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ کھیل کود میں لذت پاتا ہے، یہاں تک کہ وہ کھیل کود اس کے نزدیک تمام چیزوں سے زیادہ لذت بخش بن جاتا ہے، بچپن کا دور گزرنے کے بعد لڑکے کو زینت، لباس، جانور کی سواری میں لذت ملتی ہے، اس وقت وہ کھیل کود کی لذت کو تصور کرتا ہے، اس کے بعد جماع اور عورتوں کی مشغولیت کی لذت سے آشنا ہوتا ہے، اور اس وقت ساتھ تمام لذتیں ترک کر دیتا ہے اور انہیں بے تصور کرتا ہے، پھر اقتدار، بالادستی، کثرت پسندی میں لذت ملتی ہے۔ یہ دنیا کی لذتوں میں آخری لذت ہے اور نہایت اعلیٰ و ارفع ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :-

اَعْلَمُوْا اَنَّهَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا الْغَيْبُ وَلَهُوْكُمْ نِعْمَتٌ تَّخْتَفُوْنَ بِهَا خَيْرٌ مِّنْكُمْ وَنَكَاةٌ - (پ ۱۸۲، آیت ۲۰)

تم خوب جان لو کہ (آخرت کے مقابلے میں) دنیاوی زندگی محض لہو و لعب اور زینت اور ایک دوسرے پر غر

کرنا اور (اموال اور اولاد میں ایک دوسرے سے اپنے کو) زیادہ ملانا ہے۔

اس کے بعد ایک اور قوت پیدا ہوتی ہے جس سے وہ معرفت الہی کی لذت کا اور اک کرتا ہے، اس لذت کے بعد وہ تمام لذتوں کو حقیر سمجھتا ہے، اور انہیں ترک کر دیتا ہے، گویا باہر آنے والی لذت اپنے سے پہلے کی لذت سے زیادہ قوی اور دیرپا ہوتی ہے، اور معرفت الہی کی لذت کیوں کہ سب کے بعد ہے اس لئے یہ تمام لذتوں سے زیادہ پختہ ہوگی۔ کھیل کی محبت سن خمیر میں پیدا ہوتی ہے، عورتوں اور زیب و زینت کی محبت بلوغ کے وقت پیدا ہوتی ہے، ریاست و اقتدار کی خواہش بیس سال کے بعد پیدا ہوتی ہے، اور علوم کی محبت چالیس برس کی عمر میں پیدا ہوا کرتی ہے۔ یہ انتہائی درجہ ہے۔ جس طرح بچہ اس شخص کی ہنسی اڑاتا ہے جو کھیل کود چھوڑ کر لباس اور زینت میں منہمک ہو، یا عورتوں میں دلچسپی لے، اسی طرح دوسرا بھی ان لوگوں پر ہنستے ہیں جو ریاست ترک کر کے اللہ تعالیٰ کی معرفت میں مشغول ہوتے ہیں، اور عارف انہیں بڑا معقول جواب دیتے ہیں۔

إِنْ تُسَخَّرُوا مِنْكُمْ فَاِنَّا نَسَخِّرُ مِنْكُمْ كَمَا نَسَخِّرُ مَنْ فَسَوْفَ نَعْلَمُونَ۔ (پ ۳۳ آیت ۳۸)

اگر تم ہم پر ہنستے ہو تو ہم تم پر ہنستے ہیں جیسا تم (ہم پر) ہنستے ہو۔

دیدار الہی کی لذت معرفت الہی سے زیادہ ہوگی آئیے اب ہم اس سوال کا جائزہ لیتے ہیں دنیاوی معرفت کے مقابلے میں آخرت میں ہونے والے دیدار الہی کی لذت زیادہ کیوں ہوگی؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ مدرکات کی دو تقسیم ہیں، بعض وہ ہیں جو خیال کے دائرے میں آجاتی ہیں جیسے خیالی صورتیں، رنگارنگ اجسام، اور شکل رکھنے والے حیوانات اور نباتات، اور بعض وہ ہیں جو خیال میں نہیں آتے جیسے اللہ تعالیٰ کی ذات، اور وہ تمام چیزیں جو جسم نہیں رکھتیں جیسے علم، قدرت، اور ارادہ وغیرہ۔ اس تقسیم کو ایک مثال کے ذریعے سمجھئے، اگر کوئی شخص کسی انسان کو دیکھ کر اپنی آنکھیں بند کر لے تو اس کی صورت خیال میں موجود ملے گی، اور ایسا محسوس ہوگا گویا وہ اسے دیکھ رہا ہے، اور جب آنکھ کھول کر دیکھے گا تب بھی کوئی فرق نہیں ہوگا، کیوں کہ رویت اور خیال دونوں حالتوں میں اس شخص کی صورت یکساں ہوگی، اگر کچھ فرق ہوگا تو صرف اس قدر کہ آنکھ بند کر کے دیکھنے میں انکشاف اور وضوح خوب نہیں ہوتا، جب اسے آنکھ سے دیکھا تو وضوح خوب ہو گیا، یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص سورج کی روشنی پھیلنے سے پہلے اسفار کے وقت دیکھے پھر اس وقت دیکھے جب دھوپ پوری طرح پھیل چکی ہو، دونوں مرتبہ دیکھنے میں اس کے علاوہ کوئی فرق نہیں ہوگا کہ دوسری صورت میں انکشاف اور وضوح زیادہ ہوگا۔

خیال اور رویت اصل میں خیال پہلے اور اک کو کہتے ہیں، اور رویت اور اک خیال کی تکمیل کا نام ہے، اور یہی کشف کی انتہا ہے، اس کا نام رویت اس لئے رکھا گیا ہے کہ اس میں غایت درجے کا کشف ہوتا ہے، اس لئے نہیں کہ رویت کا تعلق آنکھ سے ہے، بلکہ اگر اللہ تعالیٰ اس کمال اور کشف اور اک کو سینے یا پیشانی میں رکھ دیتا تب بھی اسے رویت ہی کہا جاتا۔ اس تقریر کے بعد یہ جان لینا بہتر ہوگا کہ ان معلومات کے اور اک کی بھی دو صورتیں ہیں جو خیال میں نہیں آتیں، ایک کو اور اک اول اور دوسرے کو اور اک ثانی کہہ سکتے ہیں، دوسرا اور اک پہلے کے لئے تکمیل کا درجہ رکھتا ہے، ان دونوں اور اکات میں کشف اور وضوح کی زیادتی کا اتنا ہی فرق ہے جتنا فرق کسی صورت کے خیال کے دائرے میں آنے اور آنکھ سے دیکھنے میں ہوتا ہے، اسی لئے دوسرے اور اک کو پہلے اور اک کے مقابلے میں مشاہدہ، لقاء اور رویت کہتے ہیں، اور یہ نام بالکل صحیح ہے، کیوں کہ رویت کو رویت اسی لئے کہتے ہیں کہ اس میں کشف و وضوح کی زیادتی ہوتی ہے۔ پھر جس طرح اللہ تعالیٰ کی سنت جاریہ یہ ہے کہ اگر آنکھیں بند کر لی جائیں تو پوری طرح انکشاف نہیں ہوتا، بلکہ رویت کے لئے ضروری ہے کہ آنکھ اور مٹی (جس چیز کو دیکھا جا رہا ہے) کے درمیان سے حجاب دور ہو، اگر حجاب باقی رہا تو اس اور اک کو تکمیل کہیں گے، رویت نہیں کہیں گے، اسی طرح یہ بھی سنت الہیہ ہے کہ جب تک نفس جسم کے عوارض، شہوات کے متعقبات، اور بشری صفات میں مجبور رہے گا اس وقت تک اسے ان معلومات کا مشاہدہ نہیں

ہو گا جو خیال سے باہر ہیں، بلکہ یہ زندگی بذات خود ایک حجاب ہے، جیسے پتھروں کا بند ہونا دیکھنے کے لئے حجاب ہوتا، زندگی حجاب کیوں ہے؟ اس کے اسباب طوالت طلب ہیں، اور یہ بات اس موضوع کے لئے مناسب نہیں ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے باری تعالیٰ سے رویت کی استدعا کی تو جواب میں ارشاد فرمایا گیا :-

لَنْ نَرَاکَ - (پ ۹ ر ۷ آیت ۱۳۳)

تو ہرگز مجھے نہیں دیکھے گا۔

مطلب یہی ہے کہ تمہاری حیات ہماری رویت سے مانع ہے۔ اسی طرح ایک جگہ ارشاد فرمایا گیا :-

لَا تَنْزِرُکُمْ اَلَا بَصَارًا - (پ ۹ ر ۱۸ آیت ۱۳۳)

اس کو تو کسی کی نگاہ محیط نہیں ہو سکتی۔

اس آیت سے بھی یہی مراد ہے کہ دنیا میں رویت الہی نہیں ہے، چنانچہ صحیح ترین قول کے مطابق معراج کی رات میں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے رویت الہی کا شرف حاصل نہیں کیا (۱) البتہ جب موت کی وجہ سے زندگی کا حجاب دور ہو جاتا ہے تب رویت ہوتی ہے۔ لیکن کیونکہ نفس کے کدورتوں میں پڑنے کے باعث آلودگی باقی رہ جاتی ہے، بعض دل زدہ آلودہ ہوتے ہیں، اور ان کی مثال ایسی ہوتی ہے جیسے آئینہ ایک عرصہ دراز تک زنگ آلود رہے، اور اس قابل ہی نہ رہے کہ اس میں عکس دیکھا جاسکے، خواہ اسے کتنا ہی صیقل کیوں نہ کیا جائے، اور کتنا ہی کیوں نہ چمکایا جائے، ایسے لوگ اللہ تعالیٰ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محجوب رہیں گے۔ ہم اس حجاب سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں، اور بعض قلوب پر آلودگی اتنی نہیں ہوتی کہ دور نہ ہو سکے، بلکہ ان میں یہ صلاحیت رہتی ہے کہ اگر صیقل کیا جائے تو وہ پھر اپنی سابقہ حالت پر واپس آجائیں، ایسے لوگ کچھ عرصے کے لئے دوزخ پر پیش کئے جائیں گے، اور انہیں اسی قدر دوزخ کا سامنا کرنا ہو گا جس قدر تزکیہ کی ضرورت ہوگی، مومنین کے لئے اس کی کم سے کم مدت ایک لمحہ اور زیادہ سے زیادہ مدت سات ہزار سال ہے، جیسا کہ روایات سے ثابت ہوتا ہے (حکیم ترمذی فی نوادر الاصول - ابو ہریرہؓ) اس دنیا سے کوئی شخص ایسا نہیں جاتا جس کے دل میں کدورت نہ ہو، چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :-

وَإِنْ مِنْكُمْ إِلَّا وَارِدُهَا كَانَ عَلَى رَبِّکَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا ثُمَّ نُنْجِي الْأَنِینَ اتَّقُوا وَنَزَرُ الظَّالِمِینَ فِیْهَا جَذِیًّا - (پ ۸ ر ۸ آیت ۷۷)

اور تم میں سے کوئی بھی نہیں جس کا اس پر سے گذر نہ ہو اور یہ آپ کے رب پر لازم ہے جو پورا ہو کر رہے گا۔ پھر ہم ان لوگوں کو نجات دے دیں گے جو خدا سے ڈرتے تھے، اور ظالموں کو اس میں ایسی حالت میں رہنے دیں گے کہ (مارے غم کے) گھٹنوں کے بل گر پڑیں گے۔

تجلی باری تعالیٰ اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ ہر آدمی کا گذر آگ پر ہو گا، یہ ایک یقینی امر ہے، البتہ آگ سے نجات یقینی نہیں ہے، نجات اسی صورت میں ملے گی جب دل ہر طرح کی آلودگی سے پاک و صاف ہو جائے گا، اور تزکیہ اسی مدت میں ہو گا جو اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمادی ہے، اور اس صورت میں دوزخ سے نجات ملے گی جب وہ وعدے پورے ہو چکے ہوں گے جو شریعت میں مذکور ہیں یعنی حساب، کتاب، اور باری تعالیٰ کے حضور میں پیشی، نیز جنت کا مستحق بھی ہو گا، یہ ایک مسلمہ مدت ہے، اس پر اللہ تعالیٰ نے کسی کو مطلع نہیں کیا ہے، یہ واقعہ قیامت کے بعد ظہور پذیر ہو گا اور قیامت کا وقت نامعلوم ہے، ان تمام مراحل سے گذرنے کے بعد نفس کدورتوں سے پاک اور آلائشوں سے صاف ہو گا، اور اس میں کسی طرح کا کوئی داغ یا غبار باقی نہیں رہے گا، اس کے بعد یہ نفس اس لائق ہو گا کہ اس میں اللہ تعالیٰ تجلی فرمائے، اور یہ تجلی بالکل واضح اور نمایاں ہوگی، جیسے آئینہ سے دیکھی ہوئی چیز خیالی چیز سے زیادہ واضح اور نمایاں ہوتی ہے، اسی تجلی کا نام دیدار اور مشاہدہ ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ رویت ضرور ہوگی لیکن یہ رویت

ایسی نہیں ہوگی جیسے خیالی صورتوں کی جو کسی جنت یا مکان میں مخصوص ہوتی ہیں اس لئے کہ اللہ تعالیٰ خیال، جنت اور مکان سے بلند تر ہے، ہم تو یہ کہتے ہیں کہ دنیا میں جو معرفت ہوتی ہے وہی معرفت مکمل اور تمام ہو کر کشف کے درجے کو پہنچ جاتی ہے اور اسی کو مشاہدہ اور بصوت کہتے ہیں، جیسے یہاں تجلی، تصور تقدیر، شکل اور صورت نہیں ہوتی، اسی طرح آخرت میں بھی نہیں ہوگی، دنیا و آخرت کی بصوتوں میں فرق صرف یہ ہے کہ دنیا کی بصوت میں کشف و وضوح ناقص ہوتا ہے اور آخرت میں کامل، خیال و بصوت میں کشف و وضوح کے فرق کی مثال، ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، جب اللہ تعالیٰ کی معرفت میں صورت و جنت کا اثبات نہیں ہوتا تو اس کی معرفت کی تجلی میں جنت و صورت کیسے ممکن ہے، اس لئے کہ یہ بصوت معرفت ہی کا مکمل روپ ہے، صرف کشف و وضوح کی زیادتی کا فرق ہے، جیسے دیکھی جانے والی صورت میں اور خیال میں آنے والی صورت میں کشف و وضوح کی کمی بیشی کا فرق ہوتا ہے، قرآن کریم کی اس آیت میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

نُورُہُمْ یَسْغَىٰ بَیْنَ اَیْدِیْہِمۡ وَبِاَیْمَانِہِمۡ یَقُولُوْنَ رَبَّنَا اَتِنَا نُوْرًا۔ (پ ۲۸، ۲۹، ۳۰ آیت ۸)
ان کا نور ان کے واسطے اور ان کے سامنے دوڑتا ہو گا اور (یوں) کہتے ہوں گے کہ اے ہمارے رب ہمارے لئے ہمارے اس نور کو آخر تک رکھئے۔

یہاں تمام نور سے مراد زیادتی کشف ہے، آخرت میں دیدار الہی کی سعادت وہی لوگ حاصل کریں گے جو دنیا میں عارف ہوں گے کیوں کہ معرفت ہی ایک ایسا پودا ہے جو بڑھتے بڑھتے تناور درخت بن جاتا ہے، اور بصوت کی شکل اختیار کر لیتا ہے، اور جب پودانہ ہو گا تو درخت ہی کیسے بنے گا، اسی طرح جو شخص دنیا میں اللہ کو نہ جانے گا وہ آخرت میں کیسے پہچانے گا، اور کس طرح اس کے دیدار سے شرف یاب ہو گا۔

تجلی کے مختلف درجات جس طرح معرفت کے مختلف درجات ہیں اسی طرح تجلی بھی مختلف ہوگی، جیسے بیج کے اختلاف سے سبزیاں مختلف ہوتی ہیں، اسی طرح تجلی بھی قلت و کثرت، حسن و قوت اور ضعف کے اعتبار سے مختلف ہوگی، اسی لئے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

اِنَّ اللّٰہَ یَتَجَلّٰی لِلنَّاسِ عَامًّا قَوْلًا یَّسِّرُ وَیُکْرِ خَاصًّا۔ (ابن ہدی - جامع)

اللہ تعالیٰ لوگوں کے لئے عام تجلی فرمائے گا اور ابو بکر کے لئے خاص۔

اس کا مطلب یہ کہ اللہ تعالیٰ کے دیدار میں جو لذت حضرت ابو بکر کو حاصل ہوگی وہ لذت ان سے کم درجہ رکھنے والوں کو نہیں ملے گی، بلکہ حضرت ابو بکر کی لذت کا سوداں حصہ بھی انہیں نہیں ملے گا بشرطیکہ ان کی معرفت آپ سے سو درجہ کم ہو، کیوں کہ حضرت ابو بکر حتر الہی کے ساتھ مخصوص تھے، اور آپ کے سینے میں یہ راز گھر کئے ہوئے تھا، اس لئے آخرت میں اسی عظیم تجلی کے مستحق ہوں گے جو اس راز کی حفاظت کرنے والوں کے لئے مخصوص ہے۔ جس طرح دنیا میں یہ دیکھتے ہو کہ بعض لوگ اقتدار کی لذت کو کھانے پینے اور نکاح کرنے کی لذت پر ترجیح دیتے ہیں اور بعض لوگ علم کی لذت، آسمان و زمین کے اسرار و ملکوت کے انکشاف کی لذت کو اقتدار، مطعومات اور نکاح وغیرہ تمام لذات پر ترجیح دیتے ہیں اسی طرح آخرت میں بھی بعض لوگ اے ہوں گے جو اللہ تعالیٰ کے دیدار کی لذت کو جنت کی تمام نعمتوں پر ترجیح دیں گے، وہاں بھی دنیا کی طرح کھانے پینے اور نکاح وغیرہ کی لذتیں موجود ہوں گی، اور یہ لوگ وہی ہوں گے جو دنیا میں علم و معرفت، اور اسرار ربوبیت پر اطلاع کی لذت کو تمام لذتوں پر ترجیح دیتے ہیں اسی لئے جب حضرت رابعہ بصریہ سے دریافت کیا گیا کہ جنت کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے، فرمایا ”اَلْبَحَارُ ثُمَّ النَّارُ“ (پہلے صاحب خانہ ہے اس کے بعد گھر ہے) گویا انہوں نے اپنے اس ارشاد کے ذریعے یہ بیان فرمایا کہ میری توجہ کا مرکز اللہ تعالیٰ ہے، جو جنت کا مالک ہے، میں جنت کی طرف ملقت نہیں ہوں۔

حقیقت یہ ہے کہ جو شخص دنیا میں اللہ کو نہیں پہچانتا وہ آخرت میں بھی اسے نہیں دیکھ پائے گا اور جو اس کی معرفت سے دنیا

میں خط نہیں اٹھا تا وہ آخرت میں بھی دیدار الہی سے لطف اندوز نہیں ہو سکے گا اس لئے کہ اگر دنیا میں کسی کے ساتھ کچھ نہیں کیا تو وہاں کوئی نہیں بات نہیں ہو سکے گی جب تک کوئی محض یوئے گا نہیں کائے گا کیسے؟ ہر محض کا حشر اسی حال پر ہو گا جس حال پر وہ مرے گا اور اسی حال پر مرے گا جس حال پر زندگی گزارنے کا اس لئے اس کے پاس معرفت کا جس قدر توشہ ہو گا وہ اسی قدر لذت پائے گا اور وہی معرفت مشاہدے پر ختم ہوگی اور مشاہدے سے لذت دو چند ہو جائے گی یہ ایسا ہی ہے جیسے عاشق کی لذت معشوق کے دیدار سے دو بالا ہو جائے پہلے وہ خیال میں مستغرق تھا اور اس میں لذت پارہا تھا اچانک صورت سامنے آگئی اب جو لذت اسے ملے گی وہ پہلی لذت کے مقابلے میں دو چند ہوگی بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ یہ دیدار اس کے لئے متناہی لذت ہے تو یہ جانہ ہو گا جنت کا حال یہ ہے کہ اس میں جانے والے ہر محض کو وہ تمام نعمتیں حاصل ہوں گی جن کا وہ حتمی ہو گا لیکن جو محض صرف اللہ تعالیٰ سے ملاقات کا حتمی ہے اسے اس کے علاوہ کسی چیز میں لذت نہیں ملے گی وہ ہر نعمت کو اپنے لئے اذیت کا باعث تصور کرے گا۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ جنت کی نعمتیں اسی قدر حاصل ہوں گی جس قدر اس کا دل محبت الہی کے نور سے معمور ہو گا اور محبت بقدر معرفت ہوتی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اصل سعادت معرفت ہے شریعت نے اسے ایمان سے تعبیر کیا ہے۔

ایک شبہ کا جواب یہاں یہ کہا جاسکتا ہے کہ تم نے لذت دیدار کو لذت معرفت سے نسبت دی ہے اور کہا ہے کہ آخرت میں دیدار کی لذت دراصل معرفت دنیاوی کی لذت میں اضافے کی صورت ہے اگر یہ بات ہے تو دیدار کی لذت بہت کم ہوگی اگرچہ وہ لذت معرفت سے دو گنی چو گنی ہو کیوں کہ دنیا میں معرفت کی لذت نہایت ضعیف ہوتی ہے اگر ہم اس لذت کو دو گنی چو گنی بھی کر لیں تب بھی وہ اتنی قوی نہیں ہوگی کہ جنت کی نعمتیں اور لذتیں اس کے سامنے بچ نظر آئیں اور آدمی ان سے لا تعلق ہو جائے اس کا جواب یہ ہے کہ معرفت کی لذت کو وہی محض کم سمجھتا ہے جو اس لذت سے محروم ہوتا ہے ظاہر ہے جو محض معرفت سے خالی ہو وہ اس کی لذت کیسے پاسکتا ہے اسی طرح اگر کسی کے دل میں قہوڑی معرفت ہو اور باقی تمام دنیاوی علاقے بھرے ہوئے ہوں تو اسے کیا لطف ملے گا اور کیا لذت حاصل ہوگی یہ مقام صرف حقیقی عارفین کا ہے وہ معرفت فکر اور مناجات میں وہ لذت پاتے ہیں کہ اگر اس لذت کے بدلے انہیں جنت کی نعمتیں دی جائیں تو قبول نہ کریں پھر معرفت کی لذت کتنی ہی مکمل کیوں نہ ہو دیدار کی لذت کے مقابلے میں اس کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی جیسے معشوق کی دید کے مقابلے میں اس کے تصور کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی یا خوش ذائقہ غذا ان کے کھانے کے مقابلے میں ان کی خوشبو سونگھنے کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی یا جماع کرنے کے مقابلے میں محض ہاتھ سے چمونے کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی لذت دیدار اور لذت معرفت میں جو عظیم فرق ہے وہ ایک مثال کے بغیر واضح نہیں ہو گا اور وہ مثال یہ ہے کہ دنیا میں معشوق کے دیدار کی لذت کئی اسباب سے مختلف و متفاوت ہوتی ہے اول معشوق کے جمال کا ناقص یا کامل ہونا ظاہر ہے مکمل جمال کی طرف دیکھنے میں جو لذت ہوگی وہ ناقص میں کب ہوگی دوسرے محبت مشہوت اور عشق میں کمال جس محض کا عشق شدید ہو گا وہ اس محض کے مقابلے میں زیادہ لذت پائے گا جس کی محبت کمزور ہوگی تیسرے اور اک کا مکمل ہونا چنانچہ معشوق کو خوب روشنی میں بغیر حجاب کے قریب سے دیکھنے میں جو لذت ملتی ہے وہ لذت معشوق کو اندھیرے میں باریک پردے کے پیچھے سے یا دور سے دیکھنے میں نہیں ملتی اسی طرح معشوقہ کے ساتھ بیرونہ جسم لینے میں جو مزہ ہے وہ لباس پہن کر لینے میں نہیں ہے چوتھے ان موانع کا دور ہونا جو قلب کو تردد اور تشویش میں مبتلا کرتے ہیں چنانچہ ایک بندہ مست پُر فکر اور پریشانی سے آزاد محض معشوق کو دیکھ کر جو لطف پاسکتا ہے اس قدر لطف وہ محض نہیں اٹھا سکتا جو پریشان ہو خوف زدہ ہو یا کسی دردناک مرض میں مبتلا ہو یا اس کا دل کسی فکر میں مشغول ہو یا تم ایک ایسا عاشق تصور کرو جس کا عشق کمزور ہے اور وہ اپنے معشوق کو دور سے ایک باریک چمن کے پیچھے سے دیکھتا ہے یہاں تک کہ معشوق کا ایک ہیویلی اسے نظر آتا ہے اس کے چہرے کے نقوش یا رنگ واضح نہیں ہے اس پر غضب یہ ہے کہ چاروں طرف سانپ اور بچھو ہیں جو اسے ڈس رہے ہیں اور ڈنگ مار رہے ہیں ظاہر ہے ایسا محض اپنے معشوق کے دیدار کی لذت سے کیا خاک لطف اندوز ہو گا اب اگر اس کی نگاہوں کے سامنے سے وہ پردہ ہٹ جائے

فاصلہ ختم ہو جائے، خوب روشنی ہو، سانپ اور بچھو کا کوئی خطہ نہ ہو، اور ہر طرح سے مامون و محفوظ ہو، عشق کا غلبہ ہو، شہوت پوری طرح دل و دماغ پر محیط ہو، اب دیکھو اسے معشوق کو دیکھ کر کتنی لذت ملے گی، کیا یہ لذت پہلے جیسے محض کی لذت کے برابر ہو گی، ہرگز نہیں! اس لذت کو پہلی لذت سے ذرا بھی نسبت نہ ہوگی بلکہ اسے لذت کہنا ہی مشکل ہوگا۔

اس مثال کی روشنی میں ہمیں لذت دیدار اور لذت معرفت کا فرق سمجھنا چاہیے۔ یہاں ہاں ایک پردہ بدن اور اس کے ساتھ اشتغال کی مثال ہے، سانپ بچھو کی مثال وہ شہوات ہیں جو انسانی حواس پر چھائے ہوئے ہیں، جیسے بھوک، پیاس، غصہ، غم و غیرہ، محبت اور عشق کے ضعف کی مثال یہ ہے کہ نفس دنیا میں مشغول ہو، اور طاعنوں کی طرف ہمت کم رغبت رکھتا ہو، اور اسفل السافلین کی طرف مائل ہو، یہ ایسا ہی ہے جیسے بچہ اپنی کم فہمی کے باعث ریاست کی لذت سے اعراض کرتا ہے، اور چڑیوں کے ساتھ کھیلا پسند کرتا ہے۔ عارف کی معرفت دنیا میں کتنی ہی قوی کیوں نہ ہو مگر یہ کمزوریاں اس کا دامن نہیں چھوڑتے، عارف کا ان سے خالی ہونا ناممکن ہے، تاہم یہ موانع بعض حالات میں کمزور ہو جاتے ہیں، اور بظاہر ایسا لگتا ہے کہ اب کوئی مانع باقی نہیں رہا۔ اس وقت نگاہیں معرفت کے جمال کی چمک دمک سے خیرہ ہو جاتی ہیں، یہاں تک کہ عقل حیران رہ جاتی ہے، بعض اوقات یہ لذت اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ دل میں برداشت کا حوصلہ نہیں رہتا، ایسا لگتا ہے کہ دل پھٹ جائے گا، ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جائے گا۔ لیکن لذت اندوزی کی یہ حالت ہمیشہ برقرار نہیں رہتی، بلکہ اس طرح دل پر وارد ہوتی ہے جیسے آسمان پر بجلی چمک جائے، بسا اوقات عارف کے دل و دماغ پر افکار و حوادث کا حملہ ہوتا ہے، اور وہ اس کا تمام لطف خاک میں ملا دیتے ہیں، اس حیات ناپائدار میں یہ صورت حال اکثر پیش آتی رہتی ہے، اس لئے کہ کوئی عارف یہ دعویٰ مشکل ہی سے کر سکتا ہے کہ وہ معرفت الہی سے پوری طرح لطف اندوز ہوا ہے، موت تک یہ سلسلہ یوں ہی دراز رہتا ہے۔ بہتر اور تمام لذات کی جامع زندگی موت کے بعد کی زندگی ہے، اسی لئے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :-

لَا عَيْشَ إِلَّا عَيْشُ الْآخِرَةِ (۱) آخرت کی زندگی کے علاوہ کوئی زندگی نہیں ہے۔

قرآن کریم میں ہے :-

وَالْآخِرَةُ خَيْرٌ لَّهِیَ الْحَيَوانَ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ۔ (پ ۳۱ آیت ۶۳)

اور اصل زندگی عالم آخرت ہے، اگر ان کو اس کا علم ہوتا تو ایسا نہ کرتے۔

عارف موت کو پسند کرتا ہے جو محض اس بلند درجے تک پہنچ جاتا ہے وہ لٹانے بعد اوندی کی خواہش کرتا ہے، اور اس خواہش کی تکمیل کے لئے موت کو پسند کرتا ہے، اگر کبھی موت کو پسند نہیں کرتا تو اس کی وجہ یہ نہیں ہوتی کہ وہ موت سے خوف زدہ ہے یا اللہ تعالیٰ سے ملنا نہیں چاہتا، بلکہ وہ چاہتا ہے کہ اگر اسے دنیا میں کچھ دیر رہنے کا موقع مل جائے تو وہ معرفت میں مزید کمال حاصل کرے گا، اس لئے کہ معرفت کی مثال ایک چم کی سی ہے تم اس کی جس قدر آزمائش اور نگہداشت کرو گے اسی قدر وہ تندر درخت بنے گا اور ہمیں شیریں پھل دے گا۔ معرفت ایک ناپید اکثر سمندر ہے جو محض اس سمندر میں اپنے فکر کی کشتی ڈالتا ہے، وہ کبھی پار نہیں لگتا، اور نہ اس سمندر کی تہ تک پہنچ پاتا ہے۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ کے جمال و جلال کے حقائق کا مکمل ادراک محال ہے لیکن اس کے افعال صفات اور اسرار کی معرفت جتنی زیادہ ہوگی اسی قدر آخرت کی لذت بھی بڑھے گی، معرفت کا بیج پونے کے لئے دنیا کا زیر ہے، دل اس کی زمین ہے، اور پھل آخرت میں ملتا ہے۔ اسی لئے اگر کوئی محض زیادتی معرفت کے لئے طویل عمر کا متقی ہو تو یہ کوئی عیب نہیں ہے۔ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں :-

أَفْضَلُ السَّعَادَاتِ طَوْلُ الْعُمْرِ فِي طَاعَةِ اللَّهِ۔ (ابراہیم الحبلی۔ ابن بیثم)

بہترین سعادت اللہ کی اطاعت میں عمر کا زیادہ ہونا ہے۔

بہر حال معرفت طول عمر کی وجہ سے زیادہ ہوتی ہے، کامل اور وسیع ہوتی ہے، کیوں کہ آدمی فکر و عمل پر جس قدر مدت کرے گا، اور دنیاوی ملاحق سے لائق رہنے میں جس قدر مجاہدہ کرے گا اسی قدر اس کی معرفت زیادہ ہوگی۔ اگر کسی عارف نے اپنے لئے موت پسند کی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس درجے پر سمجھتا ہے کہ اب اس سے آگے بڑھنا اس کے لئے ممکن نہیں ہے، اہل معرفت موت کو اچھا سمجھتے ہوں یا برا تصور کرتے ہوں دونوں صورتوں میں ان کا مسلح نظر معرفت الہی ہے، جب کہ تمام لوگوں کی نظر دنیا کی شہوات پر رہتی ہے، اگر دنیاوی شہوات و وسیع ہوں تو وہ یہ تمنا کرتے ہیں کہ زندگی طویل ہو جائے اور تنگ ہوں تو وہ موت کی خواہش کرتے ہیں، اور یہ دونوں باتیں ہی نقصان اور محرومی کا باعث ہیں، اور ان کا سرچشمہ جمالت اور غفلت ہے، تمام شہوات میں اور بد بختیاں جمالت اور غفلت کے پہلو سے جہم لگتی ہیں، اور تمام سعادوں کی بنیاد علم و معرفت پر ہے۔

اس تفصیل سے تم محبت اور عشق کے معنی جان گئے ہو، معرفت اور دیدار کی لذتوں کا مطلب سمجھ گئے ہو، اور یہ بات بھی تم پر واضح ہو گئی ہے کہ تمام عقائد اور اصحاب کمال ان لذتوں کو باقی تمام لذتوں پر کیوں ترجیح دیتے ہیں، اگرچہ وہ ناقص الحاصل لوگوں کے نزدیک لائق ترجیح نہیں ہیں، جیسے بچے کے نزدیک ریاست کی لذت کھیل کی لذت کے مقابلے میں لائق ترجیح نہیں ہوتی۔

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخرت میں رویت کا عمل دل ہے یا آنکھ؟ اس سلسلے میں لوگوں کا اختلاف ہے، اہل بصیرت اس اختلاف پر نظر نہیں کرتے، اور نہ اسے کوئی اہمیت دیتے ہیں، وہ یہ کہتے ہیں کہ عقائد وہ ہے جو آم کھائے چلنے گئے، اور یہ ایک حقیقت بھی ہے کہ جو شخص اپنے معشوق کے دیدار کا مشتاق ہوتا ہے، وہ یہ نہیں سوچتا کہ یہ دیدار آنکھوں میں ہو گا یا دل کی روشنی میں، بلکہ اس کا مقصد صرف رویت اور اس کی لذت ہے، خواہ وہ آنکھ کے واسطے سے حاصل ہو یا کسی دوسرے ذریعے سے۔ آنکھ صرف عمل اور طرف ہے اس کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت نہایت وسیع ہے، اس لئے ہم یہ حکم نہیں لگا سکتے کہ رویت کسی ایک ہی ذریعہ سے ہوگی، دوسرے ذریعے سے نہیں ہو سکتی، ہو سکتا ہے آنکھ اور دل دونوں کو اس کی قوت عطا کی جائے، یہ تو امکان اور جو اذکی بات ہے، آخرت میں فی الواقع کیا ہونے والا ہے؟ اس کا قطعی جواب ہم شارع علیہ السلام سے سنے بغیر کہہ دے سکتے ہیں۔ اہل سنت والجماعت کا عقیدہ جس کی بنیاد شرعی شواہد پر ہے یہ ہے کہ آنکھ میں رویت کی قوت پیدا کی جائے گی، تاکہ رویت، نظر اور دوسرے تمام الفاظ جو اس ضمن میں وارد ہوئے ہیں اپنے ظاہر پر محمول ہو سکیں، خواہر سے قطع نظر کرنا صرف ضرورت کے لئے جائز ہو کر رہتا ہے۔

محبت الہی کو پہنچنے کرنے والے اسباب آخرت میں سب سے زیادہ خوشحال اور صاحب سعادت وہ شخص ہو گا جو اللہ کی محبت میں سب سے زیادہ پختہ ہو گا، اس لئے آخرت کے معنی ہیں اللہ کے پاس آنا، اس کی ملاقات کا شرف حاصل کرنا۔ عاشق کے لئے اس سے بڑھ کر کیا نعمت ہو سکتی ہے کہ وہ اپنے طویل شوق ملاقات کے بعد معشوق کے پاس آئے، اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس کے مشاہدے کی سعادت حاصل کرے، نہ کوئی رکاوٹ ہو، نہ مزہ مکرر کرنے والا ہو، نہ رقیب ہو، نہ حاسد اور مخالف ہو، نہ یہ خوف ہو کہ مشاہدہ منقطع ہو جائے گا۔ لیکن یہ نعمت محبت کی قوت کے بقدر حاصل ہوگی، جتنی محبت زیادہ ہوگی اسی قدر لذت بھی زیادہ ہوگی، بندہ اللہ تعالیٰ کی محبت سے صرف دنیا میں سرور ہوتا ہے، جہاں تک اصل محبت کا تعلق ہے اس سے کوئی صاحب ایمان خالی نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ کچھ نہ کچھ معرفت ہر مومن کے دل میں ہوتی ہے، لیکن انتہائی محبت جسے عشق کہتے ہیں ہر شخص میں نہیں ہوتی، بلکہ اکثر میں نہیں ہوتی، محبت کی یہ معراج دو طریقوں سے حاصل ہو سکتی ہے۔

پہلا سبب۔ دنیاوی علائق سے انقطاع پہلا سبب یہ ہے کہ بندہ دنیاوی ملاحق سے اپنا نانا توڑ لے، اور غیر اللہ کی محبت دل سے نکال ڈالے، دل ایک برتن کی طرح ہے، جس میں اس وقت تک سر کے کی گنجائش نہیں ہوتی جب تک پانی نہ نکال دیا جائے، یہ توقع نہ رکھنی چاہیے کہ بیک وقت اللہ تعالیٰ کی محبت بھی ہو سکتی ہے، اور دنیا سے وابستگی بھی۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی انسان کے سینے میں دو دل نہیں بنائے۔ کمال محبت یہ ہے کہ آدمی اپنے پورے دل کے ساتھ اللہ سے محبت کرے، جب تک وہ کسی

غیر کی طرف ملتفت رہے گا اس کے دل کا ایک گوشہ غیر میں مشغول رہے گا اور اسی قدر اس کی محبت ناقص ہوگی جس قدر وہ غیر اللہ میں مشغول ہوگا چنانچہ برتن میں جس قدر پانی رہے گا اسی قدر کم سرکہ آئے گا سرکہ سے برتن کو لبالب بھرنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے اس کا پانی گرا دیا جائے۔ دل کو اس طرح کی تمام آلائشوں سے پاک کرنے اور ہر طرح کی محبتوں سے خالی کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا :-

قُلِ اللّٰهُ ثُمَّ ذَرْهُمْ فِیْ خَوْضِهِمْ یَلْعَبُوْنَ۔ (پ ۷ ر ۱۷ آیت ۹)

آپ کہہ دیجئے اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا ہے پھر ان کو ان کے مشغلے میں بے ہودگی کے ساتھ لگا رہنے دیجئے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا۔ (پ ۲۳ ر ۱۸ آیت ۳۰)

جن لوگوں نے اقرار کر لیا کہ ہمارا رب اللہ ہے پھر ثابت قدم رہے۔

بلکہ کلمہ لَدَالَةِ اللّٰہ کے معنی بھی یہی ہیں کہ اللہ کے سوا نہ کوئی معبود ہے اور نہ کوئی محبوب ہے کیوں کہ محبوب ہی معبود ہوا کرتا ہے اس لئے کہ عہد کے معنی ہیں مقید کے اور معبود ہے جس کی قید میں ہو ہر عاشق اپنے معشوق کا قیدی ہوا کرتا ہے اسی لئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :-

اَرَاَيْتُمْ مِّنْ اَتَّخَذَ اللّٰهُ هَوًّٰی۔ (پ ۱۹ ر ۲ آیت ۴۳)

اے پیغمبر آپ نے اس شخص کی حالت بھی دیکھی ہے جس نے اپنا خدا اپنی خواہش نفسانی کو بنا رکھا ہے۔

سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں :-

اَبْغَضُ الْوَعِيدِ فِی الْاَرْضِ الْهَوٰی۔ بدترین معبود جس کی لہن میں پرستش کی جاتی ہے خواہش نفس ہے۔

ایک حدیث میں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :-

مَنْ قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُخْلِصًا دَخَلَ الْجَنَّةَ

جس شخص نے اخلاص کے ساتھ لا الہ الا اللہ کہا وہ جنت میں داخل ہوگا۔

اخلاص کے معنی یہ ہیں کہ بندہ اپنے دل کو اللہ کے لئے حاصل کر لے اس میں غیر اللہ کے لئے کوئی شرک باقی نہ رہے اللہ ہی اس کے دل کا معبود ہو وہی اس کے دل کا محبوب ہو وہی اس کے دل کا مقصود ہو جس کی حالت یہ ہوتی ہے اس کے لئے دنیا قید خانہ سے کم نہیں ہوتی کیوں کہ وہ اس کے اور مشاہدہ محبوب کے درمیان رکاوٹ ہے موت اس کے لئے قید سے رہائی کا پروانہ ہے تم ایسے شخص کا تصور کرو جس کا صرف ایک محبوب ہو اور وہ ایک عرصے سے اس کی ملاقات کا مشتاق اور اس کے دیدار کے لئے بے چین ہو لیکن قید خانے کی دیواریں اور سلاخیں اس کے راستے میں مزاحم ہوں اچانک اسے آزاد کر دیا جائے اسے کیا کچھ خوشی نہیں ہوگی اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محبوب کے قریب رہنے کا تصور اس کے لئے کس قدر فرحت بخش ہوگا۔

بہر حال دنیا کی محبت کا دل میں قوی ہونا بھی محبت الہی کے ضعف کا ایک اہم سبب ہے دنیا کی محبت میں یہوی پنچوں اقارب زمین جانوروں بانگوں اور تفریحات و فیروہ کی محبت داخل ہے یہاں تک کہ اگر کوئی شخص پرندوں کی خوش الحانی پر خوش ہو یا صبح کی محضی ہو اسے لطف اندوز ہو تو کہا جائے گا کہ وہ دنیا کی محبت میں گرفتار ہے اس کی نعمتوں کی طرف ملتفت ہے اور اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی محبت میں نقصان اٹھا رہا ہے جس قدر اس کا دنیا سے انس زیادہ ہوگا اسی قدر اللہ سے اس کی انیسیت میں کمی واقع ہوگی آدمی کو دنیا میں جس قدر حصہ ملتا ہے اسی قدر آخرت میں اس کا حصہ کم کر دیا جاتا ہے جیسے انسان مغرب سے جتنا قریب ہوتا ہے اتنا ہی مشرق سے دور ہوتا ہے یا جیسے ایک شوہر اپنی بیوی کو جتنا خوش کرے گا اسی قدر دوسری بیوی اس سے ناراض ہوگی دنیا و آخرت بھی دو ستونوں کی طرح ہیں یا ان میں سے ایک مشرق ہے اور دوسرا مغرب۔ اہل دل نے اپنی آنکھوں سے اس کا مشاہدہ کیا ہے دل سے دنیا کی محبت کا قلع قمع کرنے کے لئے ضروری ہے کہ زہد کا راستہ اختیار کیا جائے مبرر مواہبت کی جائے اور خوف و رجاء کے ذریعے ان کی اطاعت کی جائے ہم نے سابقہ ابواب میں توبہ مبرر زہد خوف اور رجاء کے مقام بیان کئے ہیں ان مقامات پر عمل کرنا

در اصل محبت کے دو رکنوں میں سے ایک کے حاصل کرنے کا ذریعہ ہے اور وہ رکن غیر اللہ ہے دل کو خالی کرنا ہے اس کی ابتداء اللہ پر یوم آخرت پر جنت اور دوزخ پر ایمان لانے سے ہوتی ہے پھر اس سے خوف اور رجاء جنم لیتے ہیں اس کے بعد توبہ اور صبر کا ظہور ہوتا ہے اور آہستہ آہستہ قلب کی یہ حالت ہو جاتی ہے کہ اس میں مال و جاہ اور دوسری دنیاوی لذتوں کی طرف ذرا بھی رغبت نہیں رہتی بلکہ وہ تمام نجاستوں سے پاک و صاف ہو جاتا ہے اس میں اللہ تعالیٰ کی پاکیزہ محبت کے پُرانے روشن ہو جاتے ہیں اس کے بعد معرفت الہی اور محبت الہی کے لئے گنجائش پیدا ہوتی ہے توبہ اور صبر وغیرہ مقامات دل کی تطہیر کے لئے مقدمات کی حیثیت رکھتے ہیں اور یہ تطہیر محبت کے دوارکن میں سے ایک رکن ہے حدیث شریف میں اسی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ۔

الْطَّهُورُ شَطْرُ الْإِيمَانِ (مسلم۔ ابومالک اشعری) پاکی نصف ایمان ہے۔

کتاب الممارت کی ابتدا میں اس موضوع پر تفصیل گفتگو کی گئی ہے۔

دوسرا سبب۔ معرفت الہی کو پختہ کرنا دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت کو قوی کرنے کا دوسرا سبب معرفت الہی کو تقویت دینا اور دل میں اسے اچھی طرح پھیلاتا ہے اور یہ اس وقت ممکن ہے جب کہ دل تمام دنیاوی مشاغل اور طوائف سے پاک و صاف ہو اس کی مثال ایسی ہے جیسے زمین کو تمام غیر ضروری گھاس سے پاک و صاف کر کے بیج ڈالا جاتا ہے یہ محبت کا دوسرا رکن ہے جب یہ بیج ڈال دیا جاتا ہے اور اس کی نگہداشت کی جاتی ہے تب محبت اور معرفت کا پودا اُگتا ہے اور بڑھتے بڑھتے ایک تناور درخت کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے اسی کا نام کلمہ طیبہ ہے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں بطور مثال فرمایا ہے ۔

ضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا لِّكَلِمَةٍ طَيِّبَةٍ كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ أَفْضَلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ (پ ۳۳ ر ۱۲ آیت ۲۴)

اللہ تعالیٰ نے مثال بیان فرمائی ہے کلمہ طیبہ کی کہ وہ ایک پاکیزہ درخت کے مشابہ ہے جس کی جڑ خوب گہری ہوئی ہے اور اس کی شاخیں اونچائی میں جاری ہوں۔

اسی کلمے کی طرف قرآن کریم کی اس آیت میں اشارہ فرمایا گیا ہے ۔

الْبَيِّنَةُ صُغْدًا لِّكَلِمٍ طَيِّبٍ بَوَالْعَمَلِ الصَّالِحِ يَرْفَعُهُ (پ ۳۲ ر ۱۳ آیت ۱۰)

اچھا کلام اسی تک پہنچتا ہے اور اچھا کام اس کو پہنچاتا ہے۔

کلمہ طیبہ سے مراد یہاں معرفت ہے اور اعمال صالحہ اس کے لئے اعمال اور خادم کی حیثیت رکھتے ہیں اعمال صالحہ کے ذریعے ہی قلب کی تطہیر ہوتی ہے اور اس طہارت کو بھانصیب ہوئی ہے مگر اعمال صالحہ کا سلسلہ منقطع ہو جائے تو قلب کی طہارت بھی باقی نہ رہے۔ عمل کا مقصد یہی معرفت ہے اور علم عمل کی کیفیت جاننے کا نام ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ علم ہی اول ہے اور علم ہی آخر ہے۔ اول علم علم معاملہ ہے اور اس کا مقصد عمل ہے علم معاملہ کے ذریعے قلب کو گندگی سے پاک کیا جاتا ہے تاکہ اس میں حضرت حق کی تجلی ہو سکے اور وہ علم معرفت سے مزین ہو سکے علم معرفت کا دوسرا نام علم مکاشفہ ہے اور یہی دوسرا علم ہے جب علم معرفت حاصل ہوتا ہے تو محبت ضرور حاصل ہوتی ہے یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص معتدل مزاج ہو اور کسی خوبصورت شئی کو دیکھے اور جب مائل ہو گا تو اس میں لذت بھی پائے گا لذت فطری طور پر محبت کے تابع ہے اور محبت معرفت کے اور اس معرفت تک بندہ اسی وقت تک پہنچ سکتا ہے جب کہ دنیاوی مشغولیات سے اپنا تعلق منقطع کر لے اور انتفاع تعلق صفائے فکر دوام ذکر اور اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات ملکوت اور تمام مخلوقات میں دوام نظر کے بغیر ممکن نہیں۔ معرفت و محبت کے اس مرتبے پر پہنچنے والوں کی دو قسمیں ہیں ایک قسم اقبیاء کی ہے اقبیاء وہ لوگ ہیں جو پہلے اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کرتے ہیں اور اللہ کے ذریعے دوسروں کو پہنچاتے ہیں اور عظامہ وہ ہیں جن کی معرفت کا آغاز انصاف سے ہوتا ہے پھر وہ انصاف سے ترقی کر کے قائل تک پہنچتے ہیں پہلی قسم کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے ۔

أَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ أَنَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ (پ ۲۵ ر ۵۳ آیت ۵۳)

کیا آپ کے رب کی یہ بات کافی نہیں کہ وہ ہر چیز کا شاہد ہے۔

شَهِدَ اللَّهُ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ - (پ ۳۱۰ آیت ۱۸) گواہی دی اللہ نے اس کی۔ جو اس کے کوئی معبود ہونے کے لائق نہیں۔
کسی عارف سے دریافت کیا گیا کہ آپ نے اپنے رب کو کس طرح پہچانا؟ انہوں نے جواب دیا میں نے اپنے رب کو اسی سے پہچانا
اگر میرا رب نہ ہوتا تو میں اسے نہ پہچانتا اور دوسری قسم کی طرف ان آیات میں اشارہ کیا گیا ہے۔
سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْأَفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتَّىٰ نَتَّبِعَنَ لَهُمْ آفَاقَ الْحَقِّ - (پ ۲۵۱ آیت ۵۳)

ہم حقیر اب ان کو اپنی (قدرت کی) نشانیاں ان کے گرد و نواح میں بھی دکھادیں گے اور خود ان کی ذات میں
بھی یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہو جائے گا کہ وہ قرآن حق ہے۔

أَوَلَمْ يَنْظُرُوا فِي مَلَكُوتِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ - (پ ۹۳ آیت ۱۸۵)
اور کیا ان لوگوں نے غور نہیں کیا آسمانوں اور زمین کے عالم میں۔

قُلْ أَنْظِرُوا مَاذَا فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ - (پ ۱۱۵ آیت ۳۱)
آپ کہہ دیجئے کہ تم غور کرو کہ کیا کیا چیزیں آسمانوں اور زمین میں ہیں۔

الَّذِي خَلَقَ سَبْعَ سَمَوَاتٍ طِبَاقًا مَا تَرَىٰ فِي خَلْقِ الرَّحْمَنِ مِنْ تَفَافُوتٍ فَارْجِعِ
الْبَصَرَ هَلْ تَرَىٰ مِنْ فُطُورٍ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ إِلَيْكَ الْبَصَرُ خَائِسًا
وَهُوَ حَصِيرٌ - (پ ۲۹۱ آیت ۴)

جس نے سات آسمان اوپر تلے پیدا کئے تو خدا کی صفت میں خلل نہ دیکھے گا سو تو پھر نگاہ ڈال کر دیکھ لے کہیں
تجھ کو کوئی خلل نظر آتا ہے، پھر بار بار نگاہ ڈال کر دیکھ (آخر کار) نگاہ ذلیل اور درماندہ ہو کر تیری طرف لوٹ آئے گی۔
اکثر لوگوں پر یہ طریقہ زیادہ سہل ہے، اور اس میں گنجائش بھی زیادہ ہے، قرآن کریم نے بھی اپنی ان بے شمار آیات کے ذریعہ جن
میں فکر، تدبیر اور نظرو اعتبار کی دعوت دی گئی ہے اسی طریقے کی طرف رہنمائی کی ہے۔ اب اگر تم یہ کہو کہ یہ دونوں ہی طریقے
تمہیں مشکل نظر آتے ہیں، اور یہ چاہو کہ تمہارے لئے کوئی ایک طریقہ آسان کر کے بیان کر دیا جائے تو ہم یہ کہیں گے کہ پہلا
طریقہ جس میں اللہ تعالیٰ کے ذریعے مخلوق کی معرفت حاصل کی جاتی ہے وہ واحد مشکل، دقیق اور عام لوگوں کے لئے ناقابل فہم
ہے۔ اب صرف دوسرا طریقہ باقی رہ جاتا ہے، اکثر لوگوں کی عقلیں اسے سمجھ سکتی ہیں، اگر لوگ اس طریقے کو مشکل سمجھتے ہیں تو
اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ یہ طریقہ واحد مشکل ہے، بلکہ اصل وجہ یہ ہے کہ وہ لوگ تدبیر ہی نہیں کرتے، دنیاوی شہوات، اور
نفسانی حظوظ میں جھلا رہے ہیں۔ ہم اس طریقے پر تفصیلی گفتگو اس لئے نہیں کر سکتے کہ یہ ایک طویل موضوع ہے، اس میں بڑا
پھیلاؤ ہے، بڑی وسعت ہے، اس کی اتنی قسمیں ہیں کہ انہیں شمار نہیں کیا جاسکتا، اس لئے کہ آسمان کی بلندیوں سے نشن کی پستیوں
تک کوئی ذرہ ایسا نہیں ہے جو اللہ تعالیٰ کے کمال قدرت، کمال حکمت، اتمائے جلال، اور قایت عظمت پر دلالت نہ کرتا ہو، یہ بے
شمار ذرات ہیں، اور ہر ذرہ اپنے اندر لاتعداد اولیاتیں سموئے ہوئے ہے۔

قُلْ لَوْ كَانَ الْبَحْرُ مِثْلًا لِّلْكَلِمَاتِ رَبِّي لَنَفَذَ الْبَحْرُ قَبْلَ أَنْ تَنْفَذَ كَلِمَاتِ رَبِّي - (پ ۳۱۲ آیت ۱۰۹)
آپ ان سے کہہ دیجئے کہ اگر میرے رب کی باتیں لکھنے کے لئے سمندر (کاپانی) دوشاکی (کی جگہ) ہو تو میرے
رب کی باتیں ختم ہونے سے پہلے سمندر ختم ہو جائے۔

ویسے بھی اس علم میں مشغول ہونے کا مطلب علم کا شغف کے سمندر میں غوطہ لگانا ہے، اور یہ بھی مناسب نہیں کہ اسے علوم معاملہ
کے ضمن میں غیر اہم طریقے پر لکھ دیا جائے، البتہ ہم ایک مثال کے ذریعہ بطور اختصار کچھ عرض کرتے ہیں تاکہ اس جیسی دوسری
باتوں پر تنبیہ ہو جائے۔

معرفت افعال سے معرفت خالق فی الحقیقت مذکورہ بالا دونوں طریقوں میں سے سب سے سہل ترین طریقہ افعال کی معرفت سے
 اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کرنا ہے۔ آئیے پہلے افعال الہی پر نظر ڈالیں، اور ان میں سے بھی وہ افعال لیں جو دیگر افعال کے مقابلے
 میں معمولی اور حقیر ہیں، اور اس کے باوجود عجائب قدرت سے معمور ہیں، زمین اور اس کے اوپر بسنے والی مخلوق اور پانی جانے والی
 اشیاء ملائکہ، اور آسمانی ملکوت کے مقابلے میں نہایت معمولی اور حقیر ہیں، زمین کے جسم اور حجم ہی کو لیجئے، بظاہر یہ اس قدر وسیع و
 عریض ہے مگر آفتاب جو ہمیں چھوٹا نظر آتا ہے اس سے ہزاروں گنا بڑا ہے، ایک طرف آفتاب کی وسعت دیکھئے، اور دوسری طرف
 اس آسمان کی وسعت دیکھئے جس سے وہ بڑا ہوا ہے۔ آفتاب اور آسمان میں وسعت کی کوئی مناسبت ہی نہیں ہے، آفتاب کا مرکز
 چوتھا آسمان ہے اور یہ آسمان اوپر کے آسمانوں کے مقابلے میں نہایت مختصر ہے، پھر یہ ساتوں آسمان کرسی کے سامنے ایسے ہیں جیسے
 کسی وسیع و عریض صحرا میں لوہے کا کڑال ڈال دیا جائے، اور کرسی عرش میں ایسی ہے جیسے ساتوں آسمان کرسی کے مقابلے میں ہیں،
 آفتاب، آسمان، اور عرش و کرسی کی وسعتوں کو سامنے رکھ کر دیکھئے، زمین کتنی مختصر اور کتنی حقیر ہے، بلکہ زمین تو دنیا کے سمندروں
 کے مقابلے میں بھی بہت چھوٹی ہے جیسا کہ ایک روایت میں ہے :-

الْأَرْضُ فِي الْبَحْرِ كَالْأَصْطَبِيلِ فِي الْأَرْضِ (۱) زمین سمندر میں ایسی ہے جیسے زمین میں اصطلیل۔

مچھڑکی تخلیق تجربے اور مشاہدے سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے کہ زمین کا جس قدر حصہ پانی سے بچا ہوا ہے وہ اس حصے کے
 مقابلے میں جو پانی سے لبرز ہے ایک مختصر جزیرہ معلوم ہوتا ہے، زمین کے بعد اب آپ اس پر بسنے والی مخلوق پر نظر ڈالیں، آدمی کو
 دیکھئے جو مٹی سے پیدا کیا گیا ہے، تمام حیوانات کا جائزہ لیجئے، تمام روئے زمین کے مقابلے میں وہ کس قدر حقیر اور معمولی نظر آتے
 ہیں، تمام حیوانات سے قطع نظر کر کے صرف وہ حیوانات تلاش کیجئے جو سب سے چھوٹے، اور کم جسامت رکھنے والے ہوں، عام طور
 پر مچھڑ اور مکھی کو سب سے چھوٹا اور حقیر حیوان تصور کیا جاتا ہے، ان دونوں حقیر جانوروں کو دیکھئے، مچھڑ اپنے مختصر ترین جسم کے
 باوجود جسیم و عریض جانور ہاتھی کے مشابہ ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کے ہاتھی کی طرح سونڈ پیدا کی ہے، اور اسی کی قوت کے تمام اعضاء
 بنائے ہیں، سوائے ان بازوؤں کے جو ہاتھی کو بطور خاص عطا کئے گئے ہیں، اتنے مختصر جسم میں تمام اعضاء ظاہری موجود ہیں، آنکھ،
 کان، ناک، بازو، منہ، اور پیٹ باطنی اعضاء بھی تخلیق فرمائے ہیں، اور ان میں غازیہ، جاذبہ، دافئہ، ماسکہ اور ہاضمہ قوتیں بھی رکھی
 ہیں، یہ تو مچھڑ کی شکل و صورت اور قوت کی بات ہوئی۔ یہ بھی تو دیکھئے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے حمل بھی عطا فرمائی، اور غذا کی طرف
 رہنمائی بھی کی، یعنی اس کے نیتے سے داغ میں یہ بات ڈال دی کہ تیری غذا انسان کا خون ہے، پھر اس میں اڑنے کی قوت عطا کر کے
 انسان کی طرح اڑنے کی طاقت اور حوصلہ بھی عطا فرمایا، مچھڑ کی سونڈ تو کیلی ہے، جس کے ذریعے وہ آسانی کے ساتھ انسانی خون چوس
 لیتا ہے، اس کی نگاہ اتنی حیر ہے کہ وہ رات کی تاریکی میں انسانی اعضاء کے ان حصوں پر اپنی سونڈ رکھتا ہے جہاں خون موجود ہے، اس
 کی سونڈ مختصر ہونے کے باوجود سخت ہے کہ آدمی کا خون چلا ہو کر اس میں سے گذر جاتا ہے اور اس کے پیٹ میں پہنچ جاتا ہے، اور
 اس کے تمام اعضاء میں پھیل کر غذا بہم پہنچاتا ہے، اس کے معدے اور اندرونی اعضاء کے بارے میں تصور کیجئے کہ وہ کس قدر
 چھوٹے چھوٹے ہوں گے، اور کس طرح اسے زندہ رہنے میں مدد دیتے ہوں گے، پھر اللہ تعالیٰ نے اسے انسان سے بچنے کی تدبیر بھی
 سکھائی ہے کہ انسان کا ہاتھ بچھ بھی نہیں پاتا ہے کہ وہ اپنی جگہ چھوڑ کر اڑ جاتا ہے، اس کی سماعت اس قدر حیرت انگیز ہے کہ وہ انسان
 کے ہاتھ نے حرکت کی ادھر اسے یہ احساس ہوا کہ اب اڑ جانا ہی بہتر ہے، پھر جب وہ یہ دیکھتا ہے کہ ہاتھ اپنی جگہ پر سکون ہو گیا ہے
 تب اچانک دوبارہ حملہ کر دیتا ہے، اس کی آنکھوں کے ڈھیلے دیکھئے کتنے ننھے ننھے ہیں، لیکن بھائی کس قدر حیر ہے کہ اپنی غذا کی جگہ
 دیکھ لیتا ہے، اور وہیں حملہ کرتا ہے، کہیں کہ مچھڑ اور مکھی جیسے جانوروں کے چہرے اتنے ذرا ذرا سے ہیں کہ ان کی آنکھیں، پیٹوں کی
 متحمل نہیں ہو سکتیں اور پلکیں لگا ہوں کے شیشوں کی صفائی اور غبار اور گندگی سے ان کی حفاظت کے لئے ضروری ہیں اس لئے اللہ

تعالیٰ نے انہیں دو بازو عنایت فرمائے مکی کو دیکھئے وہ ہر وقت اپنے ان دونوں بازوؤں کو منہ پر پھیرتی رہتی ہے انسان اور دیگر بڑے حیوانات کو آنکھوں کے ساتھ ساتھ پلکوں کی نعمت بھی دی ہے اور پیچھے اوپر پوٹے بھی عطا کئے ہیں یہ دونوں ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں تو آنکھیں بند ہو جاتی ہیں ان کے کنارے باریک بنائے ہیں تاکہ جو غبار وغیرہ ان پر جمع ہو جائے اسے پلکوں کی طرف منتقل کر دین پھر پلکوں کو سیاہ بنایا تاکہ آنکھ کی روشنی جمع رہے اور دیکھنے میں معاون ہو آنکھ خوبصورت لگے اور غبار کے

وقت آنکھوں کے سامنے جال سا بن جائے جال بھی ایسا بنے کہ باہر کا غبار آنکھ کے اندر نہ آجائے اور دیکھنے کا سلسلہ برقرار رہے پھر تر کے دو صاف ڈھیلے بنائے ان کے ساتھ پوٹے نہیں ہیں لیکن وہ اپنی آنکھوں کی صفائی کے لئے اپنے دونوں بازو استعمال کرتا ہے لیکن کیوں کہ اس کی بینائی کمزور ہے اس لئے وہ چراغ کی لو پر گر پڑتا ہے نگاہ کے ضعف کی بنا پر وہ دن کی روشنی کا طالب ہے چراغ کی روشنی اس کے لئے ناکافی ہے چنانچہ جب وہ چراغ کی روشنی دیکھتا ہے تو یہ سمجھتا ہے کہ وہ کسی تاریک کمرے میں ہے اور چراغ اس تاریک کمرے کا روشندان یا روشنی میں چمکنے کا دیوانہ ہے بھارہ روشنی کی تلاش میں جان دے دیتا ہے اگر ایک مرتبہ بج گیا تو یہ سمجھ کر اڑ جاتا ہے کہ میں غلطی سے تاریکی میں ہی ٹھوکریں کھا رہا ہوں مجھے باہر نکلنے کا راستہ نظر نہیں آسکا دوبارہ پھر کوشش کرنی چاہیے اسی کوشش میں اور بار بار چراغ پر گرنے پڑنے میں بھارہ اپنے ننھے سے وجود کو آگ کی نذر کر دیتا ہے۔

اب اگر تم یہ کہو کہ بینائی کا یہ ضعف پھر کائنات اور جمالت ہے ہم یہ کہیں گے کہ انسان تو پھر سے بھی بڑا جاہل اور ناقص ہے انسان جب شہوات پر گرتا ہے تو وہ اس پھر سے کسی بھی طرح کم نہیں ہوتا چراغ کی لو پر گر جاتا ہے انسان کو شہوات کے ظاہری انوار متاثر کرتے ہیں اور وہ یہ نہیں سمجھ پاتا کہ ان انوار کے پیچھے زہر قاتل چھپا ہوا ہے بھارہ بار بار شہوتوں پر ٹوٹتا ہے مگر تا ہے یہاں تک کہ از سر نیا ڈوب جاتا ہے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہلاک ہو جاتا ہے کاش انسان کا جمل بھی ایسا ہی ہوتا جیسا اس پھر کا جمل ہے یہ صحیح ہے کہ پھر روشنی سے دھوکا کھاتا ہے لیکن وہ ہلاک ہو کر آزاد ہو جاتا ہے جب کہ آدمی اس ہلاکت کے ذریعے دائمی ہلاکت پاتا ہے اسی لئے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اعلان فرمایا ۔

إِنِّي مُنْذِرُكُمْ بِحَبْرِ النَّارِ وَأَنْتُمْ تَنْهَافْتُونُ فِيهَا تَهَافُتُ الْفَرَّاشِ۔ (بخاری و مسلم۔ ابو ہریرہ)

میں آگ سے تمہاری کمر تھا متا ہوں اور تم اس میں پوانے کی طرح کرتے ہو۔

یہ اس چھوٹے سے جانور کے بے شمار عجائب میں سے ایک چھوٹا سا عجوبہ ہے اس میں اتنے عجائب پوشیدہ ہیں کہ اگر تمام اولین و آخرین جمع ہو کر اس کی حقیقت دریافت کرنا چاہیں تو ناکام رہ جائیں اس کی حقیقت کا تو وہ کیا اور اک کر سکیں گے جو ظاہری امور ہیں ان کا جاننا بھی ممکن نہیں ہے عقلی امور کا علم صرف اللہ کو ہے۔

مکھی کے عجائبات یہ عجائب تمام حیوانات اور نباتات میں ہیں بلکہ ہر حیوان و نبات میں کوئی نہ کوئی عجوبہ ایسا ہے جس میں اسے خصوصیت حاصل ہے کوئی دوسرا اس میں شریک نہیں ہے اب مکھی کا جائزہ لیجئے اللہ تعالیٰ نے اسے بتلایا اور اس نے پہاڑوں درختوں اور پھتوں پر چمکتے بنائے مکھی کے لعاب سے موسم اور شد بدلتا ہے اور شد میں شفا رکھی گئی ہے عجیب بات یہ ہے کہ وہ اپنے مقصد کے حصول کے لئے پھولوں پھلوں اور کلیوں پر بیٹھتی ہے نجاست اور گندگی پر نہیں بیٹھتی اپنے حاکم کی اطاعت کرتی ہے ان کا حاکم جسم میں عام مکیوں سے پیدا ہوتا ہے اللہ تعالیٰ نے اسے اتنی سمجھ عطا کی ہے کہ اگر کوئی مکھی ندی لے کر چمکتے میں جانا چاہتی ہے تو وہ اسے فوراً ہلاک کر دیتا ہے کس قدر حیرت انگیز نظام ہے لیکن اس نظام میں وہی شخص اپنے لئے کام کی باتیں دیکھ سکتا ہے جسے بصیرت حال ہو اور پیٹ اور شرمگاہ کی شہوات سے فراغت نصیب ہو سب سے زیادہ تعجب خیز معاملہ اس کے مکان کا ہے یہ مکان موسم سے بناتی ہے اس کی شکل مسدس ہوتی ہے نہ گول نہ مربع نہ محسوس نہ اس کے پاس پیکائش کے آلات ہوتے ہیں نہ انجینئروں کی سی محفل و غرد مگر اس کا مکان دیکھ کر اچھے اچھے انجینئراں محبت بدنداں رہ جاتے ہیں اس کا مکان چھ گوشہ اس لئے ہوتا ہے کہ یہی شکل دائرے کی وسیع ترین شکل ہے اور یہی اس کے لئے موزوں ہے اس لئے کہ مربع

بنانے کی صورت میں کوئے بیکار ہو جاتے ہیں مکی کی شکل کیوں کہ گول ہوتی ہے، مربع میں رہنے سے زاوئے بیکار جاتے، اور اگر گول بناتی تو گھر سے باہر فرجے بیکار رہ جاتے، اس لئے کہ جب گول چیزیں ایک دوسرے سے جوڑی جاتی ہیں تو انہی طرح مل نہیں پاتیں، بہر حال زاویہ رکھنے والی شکلوں میں مسدس کے علاوہ کوئی شکل ایسی نہیں ہے جو گول جسم کے لئے موزوں ہو، اور اس میں فرجہ بھی باقی نہ رہے، دیکھئے اللہ تعالیٰ نے مکی کو اس کے مختصر حجم کے باوجود اپنی عظمت اور مہمانی سے کس قدر عمدہ تدبیر سکھلائی تاکہ وہ سکون سے زندگی بسر کر سکے، اللہ پاک ہے، بڑی شان والا ہے، اس کا لطف وسیع اور احسان عام ہے۔

ان مختصر جانوروں کے یہ مختصر عجائب دیکھئے اور ان سے عبرت لیجئے، آسمان و زمین کے ملکوت کو چھوڑیے کہ اس کے اسرار کا اور اک ہر شخص کے اس کی بات نہیں ہے، مکی، پتھر کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ بھی موضوع کا پورا احاطہ نہیں ہے، اگر ہم ان دونوں جانوروں کے ایک ایک پہلو پر نگہنا چاہیں تو عمریں گزر جائیں، اور مقصد حاصل نہ ہو، حالانکہ ہم جو کچھ لکھیں گے وہ ہمارے علم اور فہم کے مطابق ہو گا جب کہ ہمارے علم کو علماء اور انبیاء کے علوم سے کوئی نسبت نہیں ہے، اور تمام مخلوق کو جو علم حاصل ہے اسے اللہ تعالیٰ کے علم سے ادنیٰ نسبت نہیں ہے، بلکہ مخلوق کو جو علم حاصل ہے اللہ تعالیٰ کے علم کے مقابلے میں اسے علم کنہائی غلط ہو گا۔

حال اگر آدمی اللہ تعالیٰ کے عجائبات پر اسی طرح غور کرتا ہے تو اسے وہ معرفت حاصل ہو جاتی ہے جو دونوں طریقوں میں سے زیادہ آسان ہے، اور جب معرفت زیادہ ہوتی ہے تو محبت بھی زیادہ ہوتی ہے، اگر ہمیں اللہ تعالیٰ سے ملنے کی تمنا ہے، اور تم اس سے شوق ملاقات رکھتے ہو، اور آخرت میں دیدار کی سعادت حاصل کرنا چاہتے ہو تو دنیا کی طلب سے اعراض کرو ذکر و فکر کو لازم پکڑو، ممکن ہے مسلسل مجاہدہ کرنے سے ہمیں معرفت و محبت کا کچھ حصہ مل جائے یا رکھو دنیا کی لذات چھوڑنے سے ہمیں جو سلطنت ملے گی وہ ہمارے تصور سے زیادہ وسیع اور ابدی ہوگی۔

محبت میں لوگوں کے تفاوت کے اسباب اصل محبت میں تمام مومنین شریک ہیں، کیوں کہ ان کا ایمان مشترک ہے، مگر محبت کے درجات میں مختلف ہیں، اور یہ تفاوت اس لئے ہے کہ وہ معرفت اور حب دنیا میں مختلف ہیں، دراصل اشیاء کا تفاوت اپنے اسباب و علل کے تفاوت پر مبنی ہوتا ہے محبت الہی کا سبب معرفت ہے، اگر معرفت کم زیادہ ہوگی تو محبت میں بھی یقینی طور پر کمی یا زیادتی ہوگی، اکثر لوگ اللہ تعالیٰ کے بارے میں ان اسماء اور صفات سے زیادہ نہیں جانتے جو انہوں نے اپنے کالوں سے سن رکھی ہیں، یہ اسماء اور صفات انہوں نے یاد کر لی ہیں۔ اور کم حسی کے باعث بعض اوقات ان کے ایسے معانی و مطالب تصور کر لیتے ہیں جن سے اللہ تعالیٰ نہایت بلند ہے۔ بعض لوگ ایسے ہیں جو ان اسماء و صفات کے حقائق پر مطلع نہیں ہوئے، اور نہ ان کے کوئی فاسد معنی تصور کرتے ہیں بلکہ سنتے ہیں اور تسلیم و تصدیق کے طور پر ایمان لے آتے ہیں، اور عمل میں مشغول ہو جاتے ہیں، مزید کسی بحث میں نہیں پڑتے، یہ لوگ اصحاب یقین میں سے سلامتی والے ہیں، اور فاسد معنی وضع کرنے والے گمراہ ہیں، اور حقائق کے جاننے والے مقرب ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان تینوں اصناف کا ذکر مندرجہ ذیل آیت کریمہ میں کیا ہے۔

فَلَمَّا كَانَ مِنَ الْمُقَرَّبِينَ فَرَوْحٌ وَرَيْحَانٌ وَجَنَّةُ نَعِيمٍ ۚ وَآمَنَ إِلَيْنَ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْ أَصْحَابِ الْيَمِينِ ۚ فَنُزِّلُ مِنَ الْجَمِيمِ وَتُصْلِيَةُ جَحِيمٍ (پ ۲۷ آیت ۴۳)

پھر جو شخص مقررین میں سے ہو گا تو اس کے لئے تو راحت ہے اور غذائیں ہیں، اور آرام کی جنت ہے، اور جو شخص دابنے والوں میں سے ہو گا تو اس سے کہا جائے گا کہ خیرے لئے امن و امان ہے کہ تو دابنے والوں میں سے ہے، اور جو شخص جھٹلانے والوں اور گمراہوں میں سے ہو گا تو کھولتے ہوئے پانی سے اس کی دعوت ہوگی۔

کیوں کہ تم عام طور پر ایسی اہم باتیں مثال کے ذریعے سمجھتے ہو، اس لئے ہم پہلے مثال بیان کرتے ہیں، اس سے سمجھ میں آئے گا کہ

ایک ہی شئی کی محبت میں لوگ مختلف کیسے ہوتے ہیں، مثال یہ ہے کہ شافعی مذہب کے ماننے والے تمام کے تمام حضرت امام شافعی کی محبت میں شریک ہیں، ان میں فقہاء بھی ہیں، عوام بھی ہیں، یہ سب لوگ امام شافعیؒ کے فضل و کمال، سیرت و کردار، اور عمدہ خصلتوں سے واقف ہیں، لیکن عام آدمی کی واقعیت اجمالی ہے، جب کہ قیہ پرے طور پر آپ کی خصوصیات پر مطلع ہے، اس لئے قدرتی طور پر قیہ کی معرفت مکمل ہوگی، اور وہ اپنی محبت میں بھی شدید تر ہوگا۔ اسی طرح اگر ایک شخص کسی معصی کو اس کی کسی تعصیف کے باعث اچھا سمجھتا ہے، اور اس کے فضل و کمال کا اعتراف کرتا ہے، اب اگر اس کے سامنے اس معصی کی کوئی دوسری تعصیف آجائے، اور یہ تعصیف پہلی تعصیف کے مقابلے میں زیادہ اچھی ہو تو یقیناً اس کی محبت میں اضافہ ہوگا، اور وہ اپنے محبوب کے فضل و کمال کا پہلے سے زیادہ معترف ہوگا۔ یہی حال اس شخص کا ہے جو کسی شاعر کی قادر الکلامی سے متاثر ہے، اور اس کے حسن تخیل کا معترف ہے، اب اگر اس کو اپنے پسندیدہ شاعر کے کچھ اور اشعار سننے کو ملیں جو اس سے پہلے نہیں سنے تھے، اور جو پچھلے اشعار کے مقابلے میں لفظی اور معنوی نتائج کا نادر مجموعہ ہیں تو یقیناً شاعر سے اس کی محبت پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ جائے گی، تمام علوم و فنون کا یہی حال ہے، جو معرفت رکھتا ہے وہ اپنی معرفت میں بڑھتا رہتا ہے، اور اسی اعتبار سے محبت میں بھی دوسری طرف عاصی ہے وہ اگر مستحکم بھی ہے تو صرف اس قدر کہ فلاں شخص معصی ہے، اور اس کی تعصیف عمدہ ہیں، وہ یہ نہیں جانتا کہ اس کی تعصیف میں کون کون سے علوم پوشیدہ ہیں، اس کی معرفت اجمالی ہوتی ہے، اور اسی اعتبار سے اس کی محبت بھی اجمالی ہوتی ہے، صاحب بصیرت انسان محض سننے پر اکتفا نہیں کرتا، بلکہ تعصیف کی ورق گردانی کرتا ہے، علم کے ابدار موتی تلاش کرتا ہے، اور اپنی جدوجہد سے ان عجائب پر مطلع ہونا چاہتا ہے جو ان تعصیف میں بکھرے ہوئے ہیں، اور جب وہ اپنی جدوجہد میں کامیاب ہو جاتا ہے تو اس کی محبت دو چند ہو جاتی ہے۔ کیوں کہ صنعت، شعر اور تعصیف کے عجائب فن کار اور معصی کے فضل و کمال پر دلالت کرتے ہیں۔ اسے بھی ایک مثال کی روشنی میں دیکھو، یہ دنیا اللہ تعالیٰ کی تخلیق و تعصیف ہے، عام انسان اس کا علم اور اعتقاد رکھتا ہے، لیکن اجمالی، جب کہ صاحب بصیرت انسان اس کی تفصیل جانتا ہے، ان میں غور کرتا ہے، یہاں تک کہ حقیر چیزوں میں ایسے عجائب تلاش کرتا ہے جنہیں دیکھ کر محض دنگ رہ جائے۔ اس تفصیلی مطالعے سے اس کے دل میں اللہ تعالیٰ کی عظمت، جلال اور صفات کا کمال بڑھتا ہے، اور اسی اعتبار سے دل میں اس کی محبت بڑھتی ہے، پھر جس قدر اس کی معلومات وسیع ہوتی ہیں اسی قدر اس کی معرفت اور محبت بڑھتی ہے، اللہ تعالیٰ کے عجائب صنعت کا سمندر ایک ٹاپید اکنار سمندر ہے، اس لئے اگر اس معرفت کے حاملین محبت میں متفاوت ہوں تو یہ کوئی حیرت انگیز امر نہیں ہے، محبت ان پانچ اسباب کی وجہ سے بھی مختلف ہوتی ہے جو ہم نے پہلے بیان کئے ہیں، یعنی بعض لوگ اللہ تعالیٰ سے اس لئے محبت کرتے ہیں کہ وہ ان پر احسان و انعام کرنے والا ہے، ظاہر ہے یہ محبت اس کی ذات سے نہیں ہوتی، اس لئے ضعیف ہوتی ہے، اور ضعف کی علامت یہ ہے کہ احسان کے تغیر سے اس میں بھی تغیر آتا رہتا ہے، چنانچہ معصیت کے وقت اس کی محبت کا عالم اور ہوگا اور راحت کے وقت اور، اور جو شخص اس کی ذات سے محبت کرتا ہے، یا اس لئے کہ وہ اپنے کمال، جمال، اور غیرت و جلال کے باعث اس محبت کا مستحق ہے اس کی محبت میں احسان کے تفاوت سے کوئی فرق نہیں آتا۔ یہ ہیں محبت میں تفاوت کے اسباب، اور یہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں کہ آخرت کی سعادت بھی محبت کے اختلاف کے اعتبار سے مختلف ہوگی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :-

وَلِلَّاحِرَةِ أَكْبَرُ دَرَجَاتٍ وَأَكْبَرُ تَفْضِيلًا۔ (پ ۱۵ ر ۲ آیت ۲۱)

اور البتہ آخرت درجوں کے اعتبار سے بھی بہت بڑی ہے اور فضیلت کے اعتبار سے بھی بہت بڑی ہے۔

معرفت الیہ میں مخلوق کے قصور فہم کے اسباب اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ موجودات میں سب سے زیادہ ظاہر اور واضح اللہ تعالیٰ کا وجود ہے، اس لحاظ سے ہونا یہ چاہیے تھا کہ اللہ تعالیٰ کی معرفت معارف میں سرفہرست ہوتی، ذہن اس کی طرف زیادہ سبقت کرتے، فہم کے اعتبار سے اس سے زیادہ آسان معرفت کوئی دوسری نہ ہوتی، لیکن معاملہ اس کے برعکس

ہے 'اللہ تعالیٰ کی معرفت جس قدر مشکل ہے اس قدر مشکل دوسرے موجودات کی معرفت نہیں ہے آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ جانتا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کا اظہر ہونا جس اعتبار سے ہے وہ بغیر مثال کے سمجھ میں نہیں آسکتا اس لئے پہلے ہم مثال بیان کرتے ہیں اور وہ مثال یہ ہے کہ اگر ہم کسی انسان کو لکھتے ہوئے یا سنے ہوئے دیکھیں تو اس کا زندہ ہونا ہمارے نزدیک باقی تمام موجودات تمام ظاہری اور باطنی صفات کے مقابلے میں زیادہ واضح اور ظاہر ہے اس لئے کہ باطنی صفات جیسے شہوت، غضب، غفلت، صحت، مرض وغیرہ ہماری نگاہوں سے غفلت میں ہیں اور ہم ان کے وجود سے بے خبر ہیں اور ظاہری صفات میں سے بعض سے ہم واقف ہیں اور بعض میں ہمیں شک ہے جیسے لبائی، چہرہ کا رنگ وغیرہ البتہ اس کی زندگی، قدرت، ارادہ، علم اور اس کا حیوان ہونا ہمارے نزدیک واضح ہے حالانکہ ان صفات سے ہماری حشر بھر بھی متعلق نہیں ہے گویا یہ چیزیں خواص قسمہ میں سے کسی حس سے ظاہر نہیں ہوتیں لیکن ان صفات کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم اس کے سننے کے عمل یا حرکت کو دیکھیں۔ اس مثال کو سامنے رکھو اور یہ دیکھو کہ اگر ہم تمام عالم پر نظر ڈالیں تو ہمیں اللہ تعالیٰ کی صفت کا علم کیوں نہیں ہو سکتا دونوں صورتوں میں دلیل ایک ہی ہے ہم جتنی چیزوں کا مشاہدہ کرتے ہیں اور ظاہری و باطنی حواس سے جن اشیاء کا ادراک کرتے ہیں خواہ وہ شجر ہو یا حجر انسان ہو یا حیوان آسمان ہو یا زمین چاند ستارے ہوں یا سورج، شعلہ ہو یا تری، آگ ہو یا پانی جو ہر ہوا یا عرض۔ ان میں سے ہر چیز اللہ تعالیٰ کے وجود پر دلالت کرتی ہے بلکہ اس کے وجود پر پہلی شہادت خود ہمارے نفوس، ہمارے اجسام، ہمارے اوصاف، ہمارے احوال کے تغیر ہمارے قلوب کے انقلاب اور ہماری حرکات و سکنات سے ملتی ہے۔

ہمارے محدود علم کی رو سے ہمارے نزدیک سب سے زیادہ واضح خود ہمارے نفوس ہیں پھر وہ اشیاء ہیں جنہیں ہم اپنے حواس خاصہ سے محسوس کرتے ہیں پھر وہ چیزیں ہیں جن کا ادراک ہم اپنی عقل و بصیرت سے کرتے ہیں۔ ان درکات میں سے ہر شے کا ایک درک ہر ایک کے لئے ایک دلیل اور ہر ایک کا ایک شاہد ہے اس عالم میں جتنے بھی موجودات ہیں وہ سب اس حقیقت پر واضح اور کامل دلیل ہیں کہ ان کا خالق، ان کا مدبر، ان کا محرک اور معرف موجود ہے یہ موجودات اس کے علم، قدرت، لطف اور حکمت پر بھی دلالت کرتے ہیں یہ موجودات جن کا ہم ادراک کرتے ہیں یا کر سکتے ہیں بیشمار ہیں اگر کاتب کی زندگی محض اس لئے ہمارے نزدیک ظاہر ہے کہ اس کی حرکت ہمارے مشاہدے میں ہے اس کے علاوہ کوئی دوسرا شاہد نہیں ہے پھر ہم اس وجود کا تصور کیوں نہیں کرتے جس پر بے شمار شواہد دلالت کرتے ہیں اور یہ شواہد ہمارے نفوس کے اندر بھی ہیں اور نفوس سے باہر بھی۔ ہر ذہن زبان حال سے پکار پکار کر کہتا ہے کہ وہ خود بخود وجود پذیر نہیں ہوا ہے اور نہ اس کی حرکت ذاتی ہے بلکہ وہ اپنے وجد میں بھی ایک موجد کا محتاج رہا۔ اب حرکت میں بھی ایک محرک کا محتاج ہے۔ اللہ تعالیٰ کے وجود پر سب سے پہلے خود ہمارے جسمانی نظام سے شہادت ملتی ہے اعضاء ایک دوسرے سے مربوط ہیں ہڈیاں جڑی ہوئی ہیں گوشت کے اجزاء ایک دوسرے میں پیوستہ ہیں پیچھے ایک دوسرے سے منسلک اور وابستہ ہیں ان کے علاوہ مسامات، ہاتھ پاؤں اور دیگر اعضاء کی بناوٹ، ظاہری شکل و صورت اور باطنی نظام یہ سب چیزیں کیا خود بخود پیدا ہو سکتی ہیں ہرگز نہیں ہمارا جسمانی نظام زبان حال سے کہہ رہا ہے کہ یہ نظام خود بخود تشکیل نہیں پاتا بلکہ اس کا ایک بنانے والا بھی ہے جیسے کاتب کا ہاتھ خود بخود حرکت نہیں کرتا، باگہ اسے حرکت دی جاتی ہے تب حرکت کرتا ہے بہر حال موجودات میں سے کوئی چیز خواہ وہ درک ہو یا محسوس یا معقول، حاضر ہو یا غائب ایسی نہیں ہے جو اللہ تعالیٰ کے وجود پر شاہد نہ ہو اور اس کی عظمت پر دلالت نہ کرتی ہو اس کا تصور ان شہادتوں اور دلائلوں سے امتناع واضح اور نمایاں ہے کہ عقلیں حیران نظر آتی ہیں اور ذہن عاجز۔ اور بظاہر مجہود تصور کے دو سبب ہیں۔ ایک تو یہ کہ کوئی شے اتنی عقلی اور باریک ہو کہ نظر نہ آ سکے اس کی مثال بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے ہر شخص اس واقف ہے۔ اور دوسرا سبب یہ ہے کہ کوئی شے حد سے زیادہ واضح ہو جیسے شہرک رات کو دیکھتی ہے دن کو نہیں دیکھ پاتی اس لئے کہ دن نہایت اجلا اور روشن ہے اور وہ اپنی کمزور آنکھوں سے اس اجالے کی متحمل نہیں ہو سکتی چنانچہ جب سورج چمکتا ہے تو اس کی آنکھیں شدت کی دھوپ برداشت نہیں کر

پاتیں بلکہ خود بخود بند ہو جاتی ہیں، البتہ جب روشنی میں تاریکی کا استخراج ہو جاتا ہے اور سورج کی روشنی کمزور پڑ جاتی ہے تب اس کی پیمائی کام کرتی ہے، یہی حال ہماری عقلوں کا ہے، ہماری عقلیں ضعیف ہیں، اور اللہ تعالیٰ کا جمال نہایت روشن اور جلی ہے، اور چاروں طرف پھیلا ہوا ہے، یہاں تک کہ زمین و آسمان کے ملکوت کا کوئی ذرہ ایسا نہیں ہے جس پر اس کے جمال کا پرتو نہ ہو، اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا ظہور ہی اس کے حجاب کا باعث بن گیا۔ پاک ہے وہ جو اپنے نور سے پوشیدہ ہوا، اور اپنے ظہور کی بنا پر نگاہوں سے مخفی ہوا۔

ظہور کے سبب عقلی رہنے پر حیرت نہ کرنی چاہیے، اس لئے کہ اشیاء اپنی اقسام سے پہچانی جاتی ہیں، ہاں اگر کوئی چیز ایسی عام ہو کہ اس کی ضد ہی نہ ہو تو اس کا اور ایک یقیناً مشکل ہو گا، یا اشیاء مختلف نوع کی ہوں کہ بعض دلالت کرتی ہوں اور بعض نہ کرتی ہوں تو ان میں آسانی سے فرق کیا جاسکتا ہے، اور اگر وہ دلالت میں ایک ہی طرز پر مشترک ہوں تب یقیناً مشکل پیش آئے گی، جیسے آفتاب کی روشنی زمین پر پڑتی ہے، ہم اس کے بارے میں جانتے ہیں کہ یہ ایک عرض ہے جو آفتاب کے ساتھ قائم ہے، اور آفتاب غروب ہونے پر نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے اسی کے ساتھ اس کی روشنی بھی چھپ جاتی ہے، اگر یہ آفتاب ہمیشہ روشن رہتا، اور کبھی غروب نہ ہوتا تو ہم یہ سمجھتے کہ اجسام میں ان کے رنگوں سیاہی اور سفیدی وغیرہ کے علاوہ کوئی اور رنگ ہی نہیں ہے، کیوں کہ ہر وقت یہی رنگ نظر آتے ہیں، سیاہ میں سیاہی، اور سفید میں سفیدی، روشنی جسم نہیں ہے کہ ہم تھا اس کا اور اک کر سکیں، لیکن جب سورج غروب ہو جاتا ہے اور ہر جگہ تاریکی اپنا قبضہ جمالتی ہے تب ہم ان دونوں حالتوں میں نمایاں فرق محسوس کرتے ہیں اور اس وقت یہ بات جانتے ہیں کہ جیسا دھوپ سے روشن تھے، اور ایک ایسے وصف سے متصف تھے جو غروب کے وقت نہیں ہے، گویا ہم روشنی کے وجود کو اس کے عدم سے جانتے ہیں، اگر روشنی معدوم نہ ہوتی تو ہم ہر گز یہ نہ جانتے کہ روشنی کا وجود ہے، اس لئے کہ دھوپ کی روشنی میں اجسام یکساں نظر آتے ہیں، اندھیرے اجالے کا کوئی فرق نہ ہوتا۔ اب دیکھئے نور سے ایک چیز کا حال کس طرح مشتبہ ہو جاتا ہے، حالانکہ نور محسوسات میں سب سے واضح ہے، اور اس کے ذریعے دوسری چیزیں بھی واضح ہوتی ہیں، مگر ایک اندھیرے کے نہ ہونے سے وہ تمام چیزیں مشتبہ ہو جاتی ہیں جن پر روشنی کا اثر ہوتا ہے، اس مثال کو ذہن میں رکھ کر سوچئے اللہ تعالیٰ موجودات میں ظاہر تر ہے، تمام چیزیں اسی سے ظاہر ہوتی ہیں، اگر اس کا معدوم و غائب ہونا یا خفیہ ہونا ممکن ہوتا تو زمین و آسمان گر پڑتے، اور ملک و ملکوت بیکار ہو جاتے، اس وقت دونوں حالتوں کا فرق محسوس ہوتا۔ اسی طرح اگر بعض اشیاء کا وجود اس سے ہوتا، اور بعض کا غیر سے تب بھی یہ فرق معلوم کیا جاسکتا تھا، لیکن اللہ تعالیٰ کی دلالت تو تمام اشیاء میں یکساں ہے، اور اس کا وجود ہر حالت میں دائمی ہے، اس کے خلاف ہونا محال ہے، بہر حال اللہ تعالیٰ کا شدت ظہور اس کے خفا کا باعث بن گیا، اسی لئے عقلیں فہم سے قاصر رہ جاتی ہیں، البتہ جس شخص کی بصیرت قوی اور عقل پختہ ہوتی ہے وہ اس معاملے میں اعتدال پر رہتا ہے، وہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو نہیں دیکھتا، اور نہ غیر کو پہچانتا ہے، وہ یہ جانتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی موجود نہیں ہے، تمام افعال اس کی قدرت کے آثار اور اس کے وجود کے تابع ہیں، حقیقی وجود صرف اس کا ہے، جس شخص کی بصیرت کا یہ حال ہو وہ ہر فعل میں فاعل کی جستجو کرتا ہے، اس کی نظر فعل پر نہیں ٹھہرتی کہ یہ آسمان ہے، یہ زمین ہے، یا یہ حیوان ہے یا درخت ہے، بلکہ وہ یہ دیکھتا ہے کہ یہ تمام چیزیں واحد برحق کی کارگیری کا نمونہ ہیں، اس کی نگاہ واحد برحق پر ہی ٹھہرتی ہے، اس سے تجاوز نہیں کرتی، یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص کسی انسان کا شعریا اس کی تحریر یا تصنیف دیکھے، ظاہر ہے وہ اس میں شاعر، خطاط یا مصنف کا پرتو اور اثر دیکھتا ہے، اس لئے اگر اس کی زبان سے تعریفی الفاظ ادا ہوتے ہیں تو وہ صرف مصنف شاعر یا خطاط کے لئے ہوتے ہیں وہ کسی تصنیف کو اس نقطہ نظر سے نہیں دیکھتا کہ اس میں روشنائی ہے یا یہ الفاظ کاغذ پر لکھے ہوئے ہیں، ظاہر ہے ایسے شخص کی نظر صرف مصنف پر ہوگی اس سے تجاوز نہیں کرے گی۔

یہ عالم اللہ تعالیٰ کی تصنیف ہے، جو شخص اس عالم کو اس لحاظ سے دیکھتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا فعل ہے، اور اسی اعتبار سے اسے

پہچانتا ہے، اور اسی خیال سے اس کو پسند کرتا ہے تو اس کی نظر کسی اللہ تعالیٰ سے تجاوز نہیں کرے گی نہ وہ کسی غیر کو پہچانے گا نہ کسی غیر سے محبت کرے گا، حقیقت میں موصود ہی ہے جس کی نظر اللہ کے سوا کسی پر نہ ہو، حتیٰ کہ وہ اپنی طرف بھی دیکھے تو یہ سوچ کر دیکھے کہ میں اللہ کا بندہ ہوں، ایسے شخص کے بارے میں یہ کتنا صحیح ہو گا کہ یہ شخص توحید میں فنا ہو چکا ہے، اور اپنے نفس سے بھی فنا ہو گیا ہے، جس شخص نے بھی کہا ہے صحیح کہا ہے کہ ہم اپنے آپ سے فنا ہو گئے، اب بغیر ”اپنے آپ“ کے باقی ہیں۔ یہ باتیں اہل عقل اور اصحاب بصیرت اچھی طرح جانتے ہیں، البتہ وہ لوگ ان حقائق کا ادراک نہیں کر پاتے جن میں قوت فہم نہیں ہے، یا جن کی عقل کمزور ہے، یا اسے علماء کا قصور قرار دے لیجئے کہ وہ یہ باتیں عوام کو مناسب تشریح و توضیح کے ساتھ سمجھا نہیں پاتے، یا وہ اپنے نفس میں مشغول رہتے ہیں اور یہ گمان کرتے ہیں کہ عوام کو اس طرح کی باتیں بتلانے میں کوئی فائدہ نہیں ہے، بہر حال وجہ خواہ ان کا مجزو قصور ہو یا علماء کی طرف سے غفلت و تساہل ہو کچھ بھی ہو عام طور پر لوگ اللہ تعالیٰ کی معرفت سے عاجز رہ جاتے ہیں۔

یوں تو انسان ان مدرکات کا بچپن ہی میں اور اک کر لیتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے وعدہ اور وحدانیت پر دلالت کرتے ہیں، لیکن جب اس میں عقل آتی ہے اور شعور پیدا ہوتا ہے تو اپنی شہوات میں غرق ہو جاتا ہے، اور ان مدرکات سے مانوس ہو جاتا ہے جنہیں وہ بچپن سے دیکھتا آ رہا تھا، یہاں تک کہ دل سے ان کی اجیت نکل جاتی ہے، یہی وجہ ہے کہ اگر کسی شخص کی نظر اچانک کسی عجیب و غریب جانور یا پودے پر پڑ جائے، یا اللہ تعالیٰ کے عجائب افعال میں سے کوئی فعل سامنے آجائے تو وہ بے ساختہ سبحان اللہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے، جب کہ وہ رات دن اپنے نفس کو، اپنے جسمانی نظام کو، اور ارد گرد پھیلی ہوئی چیزوں کو دیکھتا ہے مگر اسے یہ توفیق نہیں ہوتی کہ وہ انہیں دیکھ کر سبحان اللہ کہہ دے، حالانکہ یہ تمام چیزیں اللہ تعالیٰ کے وجود پر یقینی شہادت کا درجہ رکھتی ہیں، مگر وہ ان کے ساتھ اپنے طول انس کی وجہ سے ان کی شہادت محسوس نہیں کرتا، البتہ اگر کوئی شخص مادر زاد اندھا ہو، اور اچانک اسے بینائی مل جائے اور وہ پہلی بار آسمان، زمین، درخت، سبزہ، حیوان اور دوسری مخلوقات و موجودات کا مشاہدہ کرے تو اس کے متعلق یہ اندیشہ کیا جاتا ہے کہ کہیں اس کی عقل خط نہ ہو جائے، اور اپنے خالق کی اس قطعی شہادت پر اس قدر حیرت زدہ ہو کہ اپنی حیرت کا اظہار بھی نہ کر سکے۔

مذکورہ اسباب کے علاوہ بھی بہت سے امور ایسے ہیں جنہوں نے مخلوق پر انوار معرفت سے فیضیاب ہوئے، اور بحر معرفت میں غوطہ لگانے کے دروازے بند رکھے ہیں، اور وہ امور ہیں شہوات میں مستغرق ہونا، دنیاوی مال و متاع کی محبت میں گرفتار رہنا وغیرہ۔ جو لوگ معرفت کی جستجو اور طلب میں سرگرواں نظر آتے ہیں ہمیں ان کے حال پر حیرت ہوتی ہے کہ کیا وہ بالکل ہی عقل و خود سے بیگانہ ہیں، یا اس شخص کی طرح ہیں جو گدھے پر بیٹھا ہوا ہے، اور گدھے کی تلاش میں پریشان پھر رہا ہے، اصل میں جب واضح اور برہمی امور مطلوب ہو جاتے ہیں تو مشکل بن جاتے ہیں، کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے :-

لَقَدْ ظَهَرَ شَوْءٌ مَا تَخْفَى عَلَى أَحَدٍ وَالْأَعْلَى أَكْثَرُ لَا يَعْرِفُ الْقَمَرَا
لَكِنْ بَطْنَتْ بِمَا أَظْهَرَتْ مَخْتَجِبًا فَكَيْفَ يَعْرِفُ مَنْ بِالْعُرْفِ قَدْ سَتَرَا
(تو ظاہر ہے، کسی پر مخفی نہیں ہے، الا یہ کہ کوئی شخص مادر زاد اندھا ہو کہ چاند بھی نہ دیکھ سکے، لیکن تو اپنے طور سے پردہ خفا میں ہے وہ کیسے پہچان جائے جس کی شہرت ہی حجاب سے ہو۔)

شوق خداوندی کے معنی جو شخص اللہ تعالیٰ کے لئے محبت کا سکر ہو، اسے حقیقت شوق کا بھی انکار نہ کرنا چاہیے، اس لئے کہ شوق صرف محبوب کے لئے مقصود ہے۔ اس عنوان کے تحت ہم یہ بیان کرنا چاہتے ہیں کہ عارف کو اللہ تعالیٰ کا شوق ضرور ہوتا ہے، بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کا مشتاق ہونے پر مجبور ہے۔ ہم اپنے اس دعویٰ کو دو طرح ثابت کریں گے، ایک تجربے اور نظرو اعتبار کے طریقے سے، اور دوسرے اخبار و آثار کے ذریعے۔

پہلا طریقہ نظر و اعتبار پہلے طریقے کے لئے ہمیں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ محبت کے اثبات میں ہم نے جو کچھ لکھا

ہے وہ اس سلسلے میں بھی کافی ہو گا، محبوب اگر نگاہوں سے اوچل ہو تو اس کی دید کا مشتاق ہونا ایک فطری امر ہے، ہاں اگر سامنے موجود ہو، یا حاصل ہو تب اشتیاق نہیں ہوتا، اس لئے کہ شوق طلب کا نام ہے، اور جو چیز حاصل ہو اس کی طلب نہیں ہوتی، اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ شوق کسی ایسی ہی چیز میں ہو سکتا ہے جو من وجہ مد رک ہو اور من وجہ غیر مد رک ہو، جس چیز کا ادراک نہیں کیا جاسکتا اس کا اشتیاق بھی نہیں ہوتا، چنانچہ جس نے کسی شخص کو نہ دیکھا ہو اور نہ اس کے متعلق کچھ سنا ہو تو اس کے بارے میں یہ تصور نہیں کیا جاسکتا کہ وہ اس خاص شخص کا مشتاق ہو گا، اسی طرح جو شئی مکمل طور پر مد رک ہو اس کا بھی اشتیاق نہیں ہو سکتا، کمال ادراک کا معیار رویت ہے، اگر کسی شخص کا محبوب اس کے مشاہدے میں ہو اور اسے مسلسل دیکھ رہا ہو تو یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اسے اپنے محبوب کا شوق ہو گا۔ اس لئے ہم یہ کہتے ہیں کہ شوق اسی محبوب شئی سے متعلق ہوتا ہے جو من وجہ مد رک ہو اور من وجہ غیر مد رک ہو۔ ہم ایک مثال کے ذریعے اس کی توضیح کرتے ہیں، اگر کسی شخص سے اس کا محبوب غائب ہو، اور اس کے دل میں صرف اس کا خیال موجود ہو تو وہ دیدار کے ذریعے اپنے خیال کو مکمل کرنے کا مشتاق ہو گا۔ لیکن اگر اس کے دل سے خیال ختم ہو جائے، اس کی یاد، معرفت، ذکر کچھ بھی باقی نہ رہے بلکہ لیا منیا ہو جائے تو اب اس کے اشتیاق کے کوئی معنی نہیں ہیں، اور یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے دیکھ کر دل میں پھر سے اشتیاق پیدا ہو گا، اس لئے کہ شوق کے معنی یہ ہیں کہ دل میں پائے جانے والے خیال کی تکمیل کے لئے رویت کا طالب ہو، اور یہاں یہ بات کہاں پائی جاتی ہے، اسی طرح بعض اوقات کوئی شخص اپنے محبوب کو تاریکی میں دیکھتا ہے، اس وقت دل میں یہ شوق پیدا ہوتا ہے کہ وہ اپنی رویت کو مکمل کرنے کے لئے روشنی میں دیکھے، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ محبوب کا چہرہ دیکھے، اس کے بال اور دوسرے محاسن نہ دیکھ سکے، اس صورت میں بھی دیکھنے کا اشتیاق ہو سکتا ہے، خواہ اس نے وہ محاسن پہلے نہ دیکھے ہوں، اور نہ دل میں ان کے دیکھنے کا خیال پیدا ہوا ہو، مگر کیوں کہ وہ یہ بات جانتا ہے کہ اس کے محبوب کے بعض اعضاء خوبصورت ہیں اس لئے دل میں دیکھنے کا شوق پیدا ہوتا ہے، تاکہ جو محاسن پہلے نظر نہیں آئے وہ اب منکشف ہو جائیں۔

اللہ تعالیٰ کے سلسلے میں یہ دونوں صورتیں تصور کی جاسکتی ہیں، بلکہ عارف کے لئے ان دونوں دہوں سے اللہ تعالیٰ کا مشتاق ہونا لازم ہے، اس لئے کہ اصحاب معرفت پر جو کچھ امور الہی واضح یا منکشف ہوتے ہیں وہ بظاہر پوری طرح واضح اور روشن نظر آتے ہیں لیکن حقیقت میں وہ اب بھی نہایت غامض ہیں، اور ان کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ گویا انہیں باریک پردے کے پیچھے سے دیکھا ہو کہ کچھ نہ کچھ خفا باقی رہ گیا، اور کمال و وضوح حاصل نہ ہو سکا، بلکہ تعلیلات میں مخلوط ہو گیا، کیوں کہ اس عالم میں خیالات تمثیل و مشابہت سے الگ نہیں ہو پاتے، اور عارف کو اسی طرح کی باتوں سے ٹکدر ہوا کرتا ہے، اور اگر ان پر دنیاوی کاروبار حیات کا عکس بھی پڑ جائے تو پھر سار اللف خاک میں مل جاتا ہے۔ کمال و وضوح مشاہدے اور تجلّی کے مکمل اشراق سے ہو گا، اور یہ واقعہ آخرت سے پہلے ممکن نہیں، اور عارف کا مقصد مشاہدہ اور تجلّی ہے، اس لئے یہ ضروری ہے کہ اس کے دل میں شوق پیدا ہو، یعنی اس چیز کی تکمیل کا شوق جس کے مبادی کی معرفت اسے دنیا میں حاصل ہوئی ہے۔ یہ شوق کی پہلی شق تھی، اور باری تعالیٰ کے سلسلے میں اس کا تصور اس طرح ممکن ہے جیسے بیان کیا گیا۔ اب دوسری شق باقی رہ جاتی ہے کہ بعض چیزیں دیکھ کر بعض کا شوق پیدا ہو باری تعالیٰ کے باب میں یہ بھی ممکن ہے۔ امور الہی بے شمار ہیں، ان کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ ہر بندے پر یہ تمام امور منکشف نہیں ہو پاتے، بلکہ بعض امور منکشف ہو جاتے ہیں، اور بعض اپنی وقت اور غموض کی بنا پر نامعلوم رہ جاتے ہیں، عارف کو ان امور کے وجود کا علم ہوتا ہے اور وہ یہ بھی جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ان امور کا علم ہے، نیز وہ اس حقیقت کا اعتراف بھی کرتا ہے کہ اس کے علم سے جس قدر معلومات غائب ہیں وہ ان معلومات کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہیں جو وہ جانتا ہے، اس لئے وہ ان باقی معلومات کو اپنے دائرہ علم میں لانے اور ان کی معرفت حاصل کرنے کا مشتاق رہتا ہے، جہاں تک پہلے شوق کا تعلق ہے کہ معرفت

الہی پورے وضوح کے ساتھ ہو تو اس کی تکمیل آخرت میں ہوگی، اس معنی میں جسے رویت، لقاء اور مشاہدہ کہتے ہیں، اور یہ ممکن نہیں کہ دنیا میں اس شوق کی تکمیل ہو جائے، حضرت ابراہیم ابن ادہم مشائقین میں سے تھے، کہتے ہیں ایک دن میں نے عرض کیا یا اللہ! اگر تو اپنے عاشقوں میں سے کسی کو کوئی ایسی چیز عطا کرتا ہو جس سے اس کا دل پرسکون ہو جاتا ہو تو مجھے بھی عطا فرما اس لئے کہ مجھے قلب کے اضطراب نے بے چین کر دیا ہے، حضرت ابراہیم ابن ادہم کہتے ہیں کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنے سامنے کھڑا کر رکھا ہے، اور فرماتا ہے کہ اے ابراہیم تجھے وصال سے پہلے کوئی ایسی چیز ملے گی جو تیرے دل کو پرسکون کر دے؟ کیا کوئی مشتاق اپنے محبوب کی ملاقات سے پہلے بھی پرسکون ہو سکتا ہے؟ میں نے عرض کیا یا اللہ! میں تیری محبت میں اس قدر حیرت زدہ ہو گیا کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے، اب میرا قصور معاف فرما، اور مجھے تھلا کہ میں کیا کہوں، فرمایا اے ابراہیم یوں کہنا کہ:-

اَللّٰهُمَّ اَرْضِنِيْ بِقَضَائِكَ وَصَبِّرْنِيْ عَلٰى بِلَايِكَ وَلَوْزِعْنِيْ عَلٰى شُكْرِ نِعْمَاتِكَ

اے اللہ مجھے اپنے فیصلے پر راضی کر، اپنی مصیبت پر صبر دے، اور مجھے اپنی نعمتوں پر شکر عطا فرما۔

شوق کی دوسری شق۔ کہ تمام معلومات حاصل ہو جائیں۔ کی تکمیل نہ دنیا میں ممکن ہے اور نہ آخرت میں اس کا امکان ہے، اس لئے کہ اس شوق کی تکمیل اس طرح ہوگی کہ بندہ پر آخرت میں اللہ تعالیٰ کے جمال، جلال، صفات، حکمت اور افعال کے حقائق وہ تمام امور مشکف ہو جائیں جو اللہ تعالیٰ کو معلوم ہیں، اور یہ محال ہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی معلومات لامتناہی ہیں، بندہ ہمیشہ یہی جانے گا کہ اللہ تعالیٰ کے جمال و جلال میں سے بہت سے ایسے امور باقی رہ گئے ہیں جو ابھی اس پر مشکف نہیں ہوئے، چنانچہ اس کا شوق کبھی مکمل نہیں ہوگا، خاص طور پر وہ شخص جو اپنے درجے سے بلند درجات کا مشاہدہ کرتا ہے وہ یقیناً مزید درجات کا متقاضی ہوگا، لیکن یہ شوق اصل وصال کے بعد وصال کی تکمیل کا ہوگا، اس لئے اس شوق میں لذت ہوگی، رنج و الم نہیں ہوگا۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ کے الطاف کشف و نظر مسلسل جاری رہیں، اور نعمتیں اور لذتیں بیش از بیش حاصل ہوتی رہیں اور ان لذتوں میں کھو کر آدمی ان چیزوں کے شوق سے غافل ہو جائے جو ابھی حاصل نہیں ہوئی ہیں، اور یہ اس شرط کے ساتھ ہے کہ ان امور میں حصول کشف ممکن ہو جن میں دنیا میں کشف نہیں ہوا تھا، ورنہ نعمتوں کی لذت کسی ایک نقطے پر ٹھہر کر بڑھنے والی نہیں ہے، ہاں اس کے داعی ہونے میں کوئی شبہ نہیں کیا جاسکتا۔ جہاں تک اس آیت کا سوال ہے:-

نُورُهُمْ يَسْطٰى قَبْلَهُمْ اَنْلٰيْهِمْ وَيَاۤيْمٰنٰهُمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اَتْمِمْ لَنَا نُورًا۔ (پ ۲۸، آیت ۸)

ان کا نور ان کے سامنے اور ان کے واسطے دوڑتا ہو گا اور وہ یوں دعا کرتے ہوں گے کہ اے ہمارے رب! ہمارے لئے ہمارے اس نور کو آخر تک رکھئے۔

اس میں بھی یہ دونوں احتمال موجود ہیں، ایک یہ کہ وہی نور تمام ہو جو دنیا میں ساتھ تھا، اور یہ بھی احتمال ہے کہ ان امور میں نور کی تکمیل و اثرائت مراد ہو جو دنیا میں روشن نہیں ہوئے تھے، قرآن کریم کی اس آیت سے پہلے معنی ثابت ہوتے ہیں:-

اَنْظُرُوْا نَفْسِيْۤسَ مِنْ نُّوْرِ كُمْ قِيْلَ لَرٰ جَعَلُوْا وِرَآءَكُمْ فَاَلْتَمِسُوْا نُوْرًا۔

(پ ۲۸، آیت ۳)

ہمارا انتظار کر لو کہ ہم بھی تمہارے نور سے کچھ روشنی حاصل کر لیں ان کو جواب دیا جائے گا کہ تم اپنے پیچھے لوٹ جاؤ پھر روشنی تلاش کرو۔

اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ انوار اعلیٰ دنیا سے ساتھ جائیں گے، آخرت میں انہی کی چمک زیادہ کی جائے گی، کوئی نیا نور عطا نہیں کیا جائے گا۔ یہ موضوع نازک ہے، اس سلسلے میں محض اندازے سے کچھ کہنا خطرناک ہو سکتا ہے، ہمیں اب تک کوئی ایسی بات نہیں ملی جس پر عملی اعتماد کیا جاسکے، ہم اللہ تعالیٰ سے زیادتی علم، زیادتی ہدایت، اور احقاق حق کی درخواست کرتے ہیں۔

دوسرا طریقہ اخبار و آثار شوق کے اثبات کا دوسرا طریقہ اخبار و آثار ہیں، اس سلسلے میں بے شمار روایات و آثار ملتے ہیں، چنانچہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی دعاؤں میں ارشاد فرماتے تھے :
 اللَّهُمَّ أَنْتَ أَسْأَلُكَ الرِّضَا بَعْدَ الْقَضَاءِ وَبَرْدَ الْعَيْشِ بَعْدَ الْمَوْتِ وَلَذَّةَ النَّظَرِ إِلَى
 وَجْهِكَ الْكَرِيمِ وَالشَّوْقَ إِلَى لِقَائِكَ (۱)
 اے اللہ میں تجھ سے فیصلے پر راضی رہنے، موت کے بعد عیش کی زندگی، تیرے وجہِ کریم کے دیدار کی لذت،
 اور تیرے ملاقات کے شوق کی درخواست کرتا ہوں۔

حضرت ابوالدرداءؓ نے حضرت کعب اخبار سے کہا کہ میرے سامنے توراۃ کی کوئی خاص آیت بیان کیجئے، انہوں نے یہ روایت بیان کی، اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ نیک لوگوں کو میری ملاقات کا بڑا شوق ہے، اور میں ان کی ملاقات کا بہت زیادہ مشتاق ہوں، حضرت کعب اخبار نے فرمایا کہ توراۃ میں اسی مضمون کی ایک اور آیت ان الفاظ میں ہے کہ جو شخص میرا طالب ہو گا وہ مجھے پائے گا اور جو میرے غیر کا طالب ہو گا وہ غیر کو پائے گا۔ حضرت ابوالدرداءؓ نے یہ روایات سن کر فرمایا کہ میں شہادت دیتا ہوں کہ میں نے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے یہ مضامین سنے ہیں۔ حضرت داؤد علیہ السلام کی روایات میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے فرمایا : اے داؤد زمین والوں کو یہ پیغام پہنچا دے کہ میں اس شخص کا حبیب ہوں جو مجھ سے محبت کرے گا، اور اس شخص کا ہم نشین ہوں جو میرا ہم نشین ہو گا، اور اس کا موسس ہوں جو میرے ذکر سے مانوس ہو گا، اور اس شخص کا دوست ہوں جو میرا دوست ہو گا، اور اس شخص کو پسند کرنے والا ہوں جو مجھے پسند کرے گا، اور اس شخص کا مطیع ہوں جو میری اطاعت کرے گا، جو شخص مجھ سے محبت کرتا ہے میں اس کے دل کا حال اچھی طرح جانتا ہوں، اور اسے اپنے لئے قبول کر لیتا ہوں، اس سے ایسی محبت کرتا ہوں کہ میری مخلوق سے کوئی اس پر مقدم نہیں ہوتا، جو شخص حق کے ساتھ میری جستجو کرتا ہے وہ مجھے پاتا ہے، اور جو غیر کا طالب ہوتا ہے وہ مجھے نہیں پاتا، اے زمین والو، تم دنیا کے غرور کا پردہ چاک کر دو، اور میری کرامت، محبت اور ہم نشینی کی طرف قدم بڑھاؤ، میرے ساتھ انس کرو میں تمہارے ساتھ انس کروں گا، اور تمہاری محبت کی طرف سبقت کروں گا، میں نے اپنے دوستوں کا غیر اپنے غلیل ابراہیم، اپنے کلیم موسیٰ اور اپنے منی محمدؐ کے غیر سے بتایا ہے، اور اپنے مشتاقین کے دل اپنے نور سے پیرا کئے ہیں، اور اپنے جلال سے ان کی پرورش کی ہے۔

ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کسی دوست پر وحی نازل فرمائی کہ میرے بعض بندے ایسے ہیں جو مجھ سے محبت کرتے ہیں، اور میں ان سے محبت کرتا ہوں، وہ میرا اشتیاق رکھتے ہیں اور میں ان کا اشتیاق رکھتا ہوں، وہ میرا ذکر کرتے ہیں اور میں ان کا ذکر کرتا ہوں، وہ میری طرف دیکھتے ہیں، میں ان کی طرف دیکھتا ہوں، اگر تو ان کی راہ چلا تو میں تجھ سے محبت کروں گا اور ان کی راہ سے ہٹا تو میں تجھ سے ناراض ہوں گا، اس شخص نے عرض کیا یا اللہ ان کی علامت کیا ہے؟ فرمایا وہ دن کے سائے کو اس طرح دیکھتے ہیں جیسے کوئی شفق چھو ابا اپنی بکریوں کو دیکھتا ہے اور سورج ڈوبنے کے ایسے مشتاق رہتے ہیں جیسے پرندہ شام کے وقت اپنے آشیانے کا مشتاق ہوتا ہے، جب رات اپنے باند پھیلا دیتی ہے، اور تاریکی چھا جاتی ہے، بستر بچھ جاتے ہیں، راز آشکار ہوتے ہیں حبیب اپنے محبوب کے پہلو میں پہنچتا ہے تب یہ لوگ میرے لئے قدم اٹھاتے ہیں، اپنا سر تکیے ہیں، اور میرے کلام کے ذریعے مجھ سے سرگوشی کرتے ہیں، اور میرے انعام کے حوالے سے میری خوشامد کرتے ہیں، ان میں سے بعض حج حج کر دیتے ہیں، بعض گھٹ گھٹ کر دیتے ہیں، کوئی داہلا کرتا ہے، کوئی شکوہ بہ لب کھڑا ہوتا ہے، کوئی بیٹھا ہوا ہے، کوئی کھڑا ہوا ہے، کوئی رکوع میں ہے، کوئی سجدے میں ہے، ان کے تمام شکوے، مستحسین اور مجاہدے سر آنکھوں پر۔ سب سے پہلے میں انہیں تین چیزیں دوں گا۔ ایک تو

یہ کہ میں اپنے نور سے ان کے دل میں ڈال دوں گا کہ وہ میرے بارے میں خبر دیں جیسے میں ان کے بارے میں خبر دیتا ہوں، دوسری یہ کہ آسمان و زمین اور ان کے مابین جو کچھ ہے اگر ان کے مقابلے میں آئے تو ان کی خاطر ان چیزوں کو حقیر سمجھوں گا، تیسری یہ کہ میں اپنا مقدس چہرہ ان کی طرف کروں گا، اور تو جانتا ہے کہ میں جس کی طرف اپنا چہرہ کرتا ہوں وہ سمجھتا ہے کہ میں اسے کیا بنا چاہتا ہوں، حضرت داؤد علیہ السلام کی روایات میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے وحی نازل فرمائی کہ اے داؤد تم کب تک جنت کو یاد کرتے رہو گے، اور مجھ سے ملنے کے اشتیاق کا اظہار نہ کرو گے، حضرت داؤد علیہ السلام نے عرض کیا: یا اللہ تیرے مشتاق کون لوگ ہیں؟ ارشاد ہوا کہ میرے مشتاق وہ لوگ ہیں جنہیں میں نے ہر کدورت سے صاف کر دیا ہے، اور خوف سے آگاہ کر دیا ہے، ان کے دل میں میری طرف ایک سوراخ ہے جس سے وہ مجھے دیکھتے ہیں، میں ایسے لوگوں کے قلوب اپنے ہاتھ سے اٹھاؤں گا اور انہیں اپنے آسمان پر رکھوں گا، پھر اپنے منتخب فرشتوں کو بلاؤں گا، جب وہ جمع ہو کر میرے سامنے سجدہ ریز ہوں گے تو میں ان سے کہوں گا کہ میں نے تمہیں اس لئے نہیں بلایا کہ تم مجھے سجدہ کرو، بلکہ اس لئے بلایا ہے تاکہ میں تمہیں ان لوگوں کے دل دکھاؤں جو میرا اشتیاق رکھتے ہیں، اور تمہارے سامنے ان اہل شوق پر فخر کروں، ان کے قلوب آسمان میں میرے ملائکہ کے لئے ایسے روشن ہوں گے جیسے سورج زمین والوں کے لئے روشن ہوتا ہے، اے داؤد میں نے اپنے مشتاقین کے قلوب اپنی رضا سے بنائے ہیں، اور اپنے چہرے کے نور سے ان کی تربیت کی ہے، میں نے انہیں اپنے آپ سے بات کرنے والا بنایا، اور ان کے جسموں کو اپنی نگاہ کا مرکز قرار دیا، ان کے دلوں میں ایک ایسا راستہ بنایا جس کے ذریعے وہ مجھے دیکھتے ہیں، اور دن بدن ان کا شوق زیادہ ہوتا رہتا ہے، حضرت داؤد علیہ السلام نے عرض کیا: یا اللہ! مجھے اپنے مشتاق کے دیدار کی سعادت عطا فرما، ارشاد ہوا: اے داؤد! کوہ لبنان پر جاؤ وہاں چودہ آدمی رہتے ہیں، ان میں جو ان بھی ہیں، بوڑھے بھی، اور اوجیل عمر کے بھی۔ جب تم ان کے پاس پہنچو تو ان کو میرا سلام پہنچاؤ، اور یہ کہو کہ تمہارا رب تمہیں سلام کہتا ہے، اور فرماتا ہے کہ کیا تمہیں مجھ سے کوئی حاجت نہیں ہے تم میرے منتخب احباب ہو، نیکو کار دوست ہو، میں تمہاری خوشی سے خوش ہوتا ہوں، اور تمہاری محبت کی طرف سبقت کرتا ہوں، چنانچہ داؤد علیہ السلام کوہ لبنان پر ان کے پاس پہنچے، وہ چودہ آدمی اس وقت ایک چشمے کے قریب بیٹھے ہوئے اللہ تعالیٰ کی عظمت میں غورو فکر کر رہے تھے، حضرت داؤد کو دیکھ کر وہ لوگ اٹھ کر چل دیے، حضرت داؤد نے ان سے کہا کہ میں تمہارے پاس اللہ تعالیٰ کا پیغامبر بن کر آیا ہوں تاکہ تمہیں تمہارے رب کا پیغام پہنچاؤں، چنانچہ وہ لوگ حضرت داؤد کی طرف متوجہ ہو گئے، نگاہیں نیچی کر لیں، اور کان ان کی طرف لگا دیے، حضرت داؤد نے فرمایا کہ اللہ تمہیں سلام کہتا ہے، اور فرماتا ہے کہ کیا تم مجھ سے اپنی حاجت کے متعلق کوئی سوال نہیں کرو گے، میں تمہاری آواز اور تمہارا کلام سنتا ہوں، تم میرے منتخب احباب اور نیکو کار دوست ہو، میں تمہاری خوشی سے خوش ہوتا ہوں، اور تمہاری محبت کی طرف سبقت کرتا ہوں، اور تمہاری طرف ہر وقت اس طرح دیکھتا ہوں جس طرح مہمان شفیق ماں (اپنے بیٹے کو) دیکھتی ہے، حضرت داؤد فرماتے ہیں کہ یہ پیغام سن کر وہ لوگ رونے لگے، ان کے شیخ نے کہا پاک ہے تیری ذات، پاک ہے تیری ذات، ہم تیرے غلام ہیں، اور تیرے غلاموں کے بیٹے ہیں، گزری ہوئی عمر کے ماہ و سال میں اگر ہماری زبان نے تیرے ذکر سے رکنے کا گناہ کیا ہو تو اسے معاف فرما، دوسرے شخص نے کہا تو پاک ہے، ہم تیرے بندے ہیں، اور تیرے بندوں کے بیٹے ہیں، جو معاملہ ہمارے اور تیرے درمیان ہے اس میں حسن نظر کے ساتھ احسان فرما، تیسرے شخص نے کہا ہم تیرے بندے ہیں اور تیرے بندوں کے بیٹے ہیں کیا ہم تجھ سے سوال کی جسارت کر سکتے ہیں، تو جانتا ہے کہ ہمیں اپنے امور میں مزید اب کوئی حاجت نہیں ہے، ہاں اتنا کرم کر کہ اپنے راستے پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ثابت قدم رکھ کر ہم پر احسان فرما، چوتھے شخص نے کہا کہ ہم تیری رضا کی طلب میں کوتاہ ہیں، حصول رضا میں ہماری اعانت کر۔ پانچویں شخص نے کہا اے اللہ! تو نے ہمیں منی کے ایک قطرے سے پیدا کیا ہے، اور ہم پر یہ احسان کیا ہے کہ ہم تیری عظمت میں غورو فکر کر سکیں، کیا وہ شخص تیرے سامنے بولنے کی جرأت کر سکتا ہے جو تیری عظمت و جلال میں ٹھکر کر رہا ہو، اور اولیاء سے تیرا قرب، اور اہل محبت پر تیرے احسانات کی وجہ سے ہم دعا کے لئے زبان نہیں

کھول سکتے، ساتویں شخص نے کہا کہ تو نے ہمارے قلوب کو اپنے ذکر کے لئے ہدایت سے نوازا ہے، اور ہمیں اپنے ساتھ مشغول رہنے کے لئے فارغ کیا ہے۔ اس لئے اگر شکر میں ہم سے کوتاہی سرزد ہوئی ہو تو ہمیں معاف کر۔ آٹھویں شخص نے کہا اے اللہ! تو ہماری حاجت سے واقف ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم تیرے وجہ کرم کی زیارت سے شرف ہوں۔ نویں شخص نے کہا اے اللہ! بندہ میں یہ جرات نہیں ہوتی کہ وہ اپنے آقا کے سامنے زبان کھولے، مگر کیوں کہ تو نے ہمیں حکم دیا ہے اس لئے ہماری درخواست ہے کہ ہمیں وہ نور عطا کر جس سے آسمانی طبقات کے اندھیروں میں روشنی پھیل جائے دسویں شخص نے کہا اے اللہ! تجھ سے دعا کرتے ہیں کہ ہماری طرف توجہ کر اور ہمیشہ ہمارے پاس رہ۔ گیارہویں شخص نے کہا اے اللہ! جو نعمت تو نے ہمیں عطا کی ہے ہم اسے پورا کرنے کی تجھ سے درخواست کرتے ہیں، بارہویں شخص نے کہا اے اللہ! ہمیں تیری مخلوق میں سے کسی چیز کی حاجت نہیں ہے، بس ہم پر اپنے جمال کی طرف نظر کرنے کا احسان کر، تیرھویں شخص نے کہا اے اللہ دنیا کی طرف دیکھنے سے میری آنکھوں کی بینائی دور کر، اور آخرت کی طرف دیکھنے کے لئے میری آنکھوں کو روشنی عطا فرما، چودھویں شخص نے کہا اے اللہ! میں یہ بات جانتا ہوں کہ تو اپنے اولیاء سے محبت کرتا ہے، ہم پر اتنا احسان کر کہ ہمارے قلوب کو ہر چیز سے ہٹا کر اپنی ذات میں مشغول رکھ۔

ان چودہ اشخاص کی دعاؤں کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام پر وحی نازل فرمائی کہ اے داؤد! ان سے کہو کہ میں نے تمہارا کلام سن لیا ہے، اور جو تم چاہتے ہو وہ کر دیا ہے۔ اب تم میں سے ہر شخص ایک دوسرے سے جدا ہو جائے، اور اپنے لئے زمین میں ایک تہ خانہ بنا کر رہے، اس لئے کہ اب میں اپنے اور تمہارے درمیان سے حجاب اٹھانا چاہتا ہوں، یہاں تک کہ تم میرے نور کو دیکھ لو، اور میری عظمت کا مشاہدہ کر لو، حضرت داؤد علیہ السلام نے عرض کیا یا اللہ! ان لوگوں نے یہ مرتبہ کیسے حاصل کیا ہے؟ ارشاد ہوا کہ میرے ساتھ حسن ظن، دنیا اور اہل دنیا سے کنارہ کشی، خلوت اور مناجات سے وہ اس مرتبے تک پہنچے ہیں، اور یہ مرتبہ صرف وہ شخص حاصل کر سکتا ہے جو دنیا اور اہل دنیا کو ہٹا کر اپنے دل سے کسی چیز کا ذکر اپنی زبان پر نہ لائے۔ اپنے دل کو میرے لئے فارغ رکھے، اور تمام مخلوق پر مجھے ترجیح دے، جو شخص ایسا کرتا ہے میں اس پر شفقت کرتا ہوں، اس کے نفس کو اپنے لئے فارغ کرتا ہوں، اور اپنے اور اس کے درمیان سے حجاب اٹھاتا ہوں یہاں تک کہ وہ مجھے اس طرح دیکھ لے جیسے آنکھ سے کوئی چیز دیکھی جاتی ہے، میں اسے ہر گھڑی اپنی کرامت کا مشاہدہ کراتا ہوں جس طرح مہمان والدہ اپنے لاڈلے بیٹے کی تیار داری کرتی ہے، جب اسے پیاس لگتی ہے تو میں اسے اپنے ذکر کا شربت پلا کر سیراب کر دیتا ہوں، جب میں اس کے ساتھ یہ سلوک کرتا ہوں تو اے داؤد اسے دنیا، اور اہل دنیا سے اندھا کر دیتا ہوں، دنیا کو اس کی نگاہوں میں محبوب نہیں کرتا، وہ ہر وقت میرے ذکر و فکر میں مشغول رہتا ہے، کسی وقت غافل نہیں ہوتا، میں اسے موت دیتا پسند نہیں کرتا، اس لئے کہ مخلوق کے درمیان وہ میرا مرکز نظر ہوتا ہے، وہ میرے سوا کسی کو نہیں دیکھتا، اور میں اس کے سوا کسی پر نظر نہیں کرتا، اے داؤد اس کا نفس گھل گیا ہے جسم لاغر ہو گیا ہے، اعضا بکھر گئے ہیں، وہ جب میرا ذکر سنتا ہے تو اس کا دل پارہ پارہ ہو جاتا ہے، میں اپنے فرشتوں میں اس پر فخر کرتا ہوں، تب اس کا خوف فزوں ہو جاتا ہے، اور وہ میری عبادت کثرت سے کرنے لگتا ہے اے داؤد مجھے اپنی عزت و جلال کی قسم میں اسے بالیقین جنت الفردوس میں جگہ دوں گا، اور اس کا سینہ اپنے دیدار سے ٹھنڈا کروں گا یہاں تک کہ وہ راضی ہو جائے، بلکہ مقام رضا سے زیادہ ہی آگے بڑھ جائے۔

حضرت داؤد علیہ السلام کے اخبار میں یہ بھی ہے کہ اے داؤد میرے ان بندوں سے کہہ دو جو میری محبت میں غرق ہیں کہ اگر میں مخلوق کی نگاہوں سے اوچھل رہوں اور تمہارے اور اپنے درمیان سے حجاب اٹھا لوں تو تمہیں کوئی نقصان نہیں ہو گا، تم مجھے اپنے دل کی آنکھوں سے دیکھو گے اس طرح اس میں بھی تمہارا کوئی نقصان نہیں اگر میں تم سے دنیا کو دور کر دوں، اور دین کو فراخ کر دوں، تمہیں اہل دنیا کی ناراضگی سے کیا نقصان ہو سکتا ہے اگر تم میری رضا کے متلاشی ہو، حضرت داؤد علیہ السلام کے اخبار میں یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر وحی نازل فرمائی کہ اے داؤد تم یہ گمان کرتے ہو کہ تمہیں مجھ سے محبت ہے، اگر وہ حقہ تمہیں مجھ

سے محبت ہے تو دنیا کی محبت کو اپنے دل سے نکال دو، اس لئے کہ میری اور دنیا کی محبت ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتیں، اے داؤد! میرے عین سے خلوص کے ساتھ مل، اور اہل دنیا سے ظاہر داری کا برتاؤ کر، دین میں میری تقلید کر، لوگوں کی تقلید نہ کر، اگر اس میں کوئی بات تجھے ایسی ملے جو میری محبت کے موافق ہو تو اسے لازم پکڑ، اور جو مشکل معلوم ہو اسے میرے حوالے کر دے، میں تیری سیاست اور دوستی کی طرف سبقت کرتا ہوں، میں تیرا قائد اور رہنما ہوں، میں تجھے بغیر مانگے دوں گا، اور مصائب پر تیری اعانت کروں گا میں نے اپنے آپ پر قسم کھائی ہے کہ ایسے بندے کے علاوہ کسی کو ثواب نہ دوں گا جس کا میرے سامنے عاجزانہ مطلب اور ارادہ ظاہر نہ ہو جائے اور جو مجھ سے بے نیازی نہ برتے، اگر تو ایسا ہو جائے تو میں تجھ سے ذلت اور وحشت دور کر دوں گا، اور تیرے دل میں غذا بھر دوں گا، میں نے اپنے آپ پر قسم کھائی ہے کہ جو بندہ اپنے نفس پر مطمئن ہو، اور اپنے افعال کا خود ٹکرائے ہو تو میں اسے اس کے نفس کے حوالے کر دوں گا، تو تمام اشیاء کی نسبت میری طرف کر، پھر تیرے اعمال تیرے اس فعل کے خلاف نہ ہوں، ورنہ تو سرکش اور گناہگار ٹھہرے گا، نہ تو خود اپنی ذات سے نفع پائے گا اور نہ تیرے رفقاء تجھ سے استفادہ کر سکیں گے، اور نہ تجھے میری معرفت کی حد ملے گی، اس لئے کہ میری معرفت کی کوئی انتہا نہیں ہے، جب تو مجھ سے زیادہ مانگے گا تو میں زیادہ عطا کروں گا، اس لئے کہ میری زیادتی کی کوئی انتہا نہیں ہے، بنی اسرائیل سے کہہ دے کہ مجھ میں اور مخلوق میں کوئی رشتہ نہیں ہے، اس لئے مجھ میں ان کی رغبت اور ارادت زیادہ ہونی چاہیے، اگر وہ اس طرح اپنے اور میرے درمیان رشتہ استوار کریں گے تو میں انہیں وہ چیز عطا کروں گا جو نہ کسی آنکھ نے دیکھی ہو، نہ کسی کان نے سنی ہو، اور نہ کسی شخص کے دل پر اس کا خیال گذرا ہو، مجھے اپنی آنکھوں کے سامنے رکھ، اور اپنے دل کی نگاہ سے میری طرف دیکھ، ان آنکھوں سے جو تیرے سر میں ہیں، ان لوگوں کی طرف مت دیکھ جن کے دل و نگاہ پر میری جانب سے حجاب پڑا ہوا ہے، ان سے میرا ثواب منقطع ہو چکا ہے، میں نے اپنی عزت و جلال کی قسم کھائی ہے کہ میں کسی ایسے بندے کے لئے ثواب کا دروا نہیں کرں گا جو میری اطاعت کے حلقے میں محض تجربے یا مسخرے پن کے لئے آیا ہے، جو محض تجھے کچھ سکھائے اس کے لئے متواضع رہ، اہل ارادت پر ظلم مت کر، اگر میرے عین اہل ارادت کے مرتبے سے واقف ہو جائیں تو ان کے لئے زمین بن جائیں، اور اہل ارادت ان پر پاؤں رکھ کر چلیں، اے داؤد! اگر تو نے کسی ایک صاحب ارادت کو غفلت کے نشے سے نکال دیا تو تجھے میں اپنے یہاں مجاہد لکھوں گا اور جس شخص کو میں مجاہد لکھتا ہوں اس پر وحشت طاری نہیں کرتا، اور نہ اسے مخلوق کا محتاج بنانا ہوں، اے داؤد! میری صحت پر کان دھر، اور اپنے نفس کے لئے نفس سے ہی عبرت پکڑ، اس میں سے کچھ ضائع نہ کر، ورنہ میں تجھے اپنی محبت سے محجوب کر دوں گا، میرے بندوں کو اپنی رحمت سے مایوس مت کر، اور میری خاطر اپنی شہوت کا سلسلہ منقطع کر، میں نے شہوات مخلوق میں ضعفاء کے لئے مباح کی ہیں، قوت رکھنے والوں کو کیا ہوا کہ وہ شہوات میں پڑنا چاہتے ہیں، ان کے اس عمل سے میری مناجات کی لذت ختم ہو جاتی ہے، اگر وہ ایسا کرتے ہیں تو ان کو میری طرف سے ادنیٰ سزایہ ملتی ہے کہ شہوات میں ابتلاء کے وقت میں ان کی عقلوں پر اپنی طرف سے حجاب ڈال دیتا ہوں میں اپنے احیاء کے لئے دنیا پسند نہیں کرتا ان کو دنیا کی گندگی سے پاک و صاف رکھتا ہوں۔ اے داؤد! تو میرے اور اپنے درمیان کسی ایسے عالم کو وسیلہ مت بننا جو اپنی غفلت سے تجھے میری محبت سے محجوب کر دے، ایسے لوگ میرے مرید بندوں کے لئے راہزن سے کم نہیں ہیں، اے داؤد! ترک شہوات پر تو مسلسل روزوں سے مدد لے، اور اظہار کے تجربے سے پرہیز کر، اس لئے کہ میں انہی لوگوں سے محبت کرتا ہوں جو مسلسل روزے رکھتے ہیں، اے داؤد! تو میرے نزدیک اپنے نفس سے دشمنی کر کے محجوب بن، اور اسے شہوات سے باز رکھ، تب ہی تجھے دیکھوں گا، اور تو یہ بھی دیکھے گا کہ جو حجاب تیرے اور میرے درمیان واقع ہے وہ دور ہو گیا، میں تیری خاطر داری اس لئے کرتا ہوں کہ تاکہ تو تقویٰ کے حصول پر قادر ہو جائے، کیوں کہ میں تجھ پر عطاء ثواب کا احسان کرنا چاہتا ہوں، اور جب تک تو میری اطاعت پر ثابت قدم رہے گا میں تجھ سے ثواب کا سلسلہ منقطع نہیں کروں گا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام پر یہ وحی بھی نازل فرمائی کہ اے داؤد! جو لوگ مجھ سے اعراض کرتے ہیں، اور میری اطاعت سے راہ فرار اختیار کرتے ہیں اگر انہیں

معلوم ہو جائے کہ مجھے ان کا کس قدر انتظار ہے، اور میں ان سے کتنی نرمی اور مہربانی کا معاملہ کرنا چاہتا ہوں، اور مجھے کس قدر شوق ہے کہ وہ گناہوں سے بچے رہیں، اگر انہیں یہ تمام باتیں معلوم ہو جائیں تو وہ مجھ سے ملنے کے اشتیاق میں اس قدر بے چین ہوں کہ جان سے ہاتھ دھو بیٹھیں، اور میری محبت کی تلاش سے ان کے اعضاء ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں اسے داؤد! اعراض کرنے والوں کے لئے میرا ارادہ یہ ہے۔ اس سے اندازہ لگا لو کہ میری طرف کو لگانے والوں کے لئے میرا ارادہ کیا ہو گا، اے داؤد جب بندہ مجھ سے مستغنی ہوتا ہے تو وہ رحم و کرم کا زیادہ محتاج ہوتا ہے، اور جب وہ میری طرف سے اعراض کرتا ہے تو مجھے اس پر زیادہ رحم آتا ہے، اور جب وہ میری طرف لوٹتا ہے تو مجھے بہت بڑا معلوم ہوتا ہے۔

یہ اخبار و روایات اور اس طرح کی بے شمار حدیثیں اور آثار اہل سنت و جماعت کے ثبوت پر دلالت کرتی ہیں۔

بندے کے لئے اللہ کی محبت کے معنی قرآن کریم کی بے شمار آیات اس حقیقت پر دلالت کرتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے سے محبت کرتا ہے۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ ہم اللہ کی محبت کے معنی بیان کریں، لیکن اس سے پہلے بندے کے لئے اللہ کی محبت پر شواہد پیش کرنا بھی ضروری ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :-

يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ (پ ۲۶ آیت ۵۳)

جن سے اللہ تعالیٰ کو محبت ہوگی، اور ان کو اللہ تعالیٰ سے محبت ہوگی۔

إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِهِ صَفًا۔ (پ ۲۸ آیت ۳)

اللہ تعالیٰ تو ان لوگوں کو پسند کرتا ہے جو اس کی راہ میں مل کر لڑتے ہیں۔

إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ وَيُحِبُّ الْمُسْتَطِيرِينَ۔ (پ ۲۲ آیت ۱۲۲)

یقیناً اللہ تعالیٰ محبت رکھتے ہیں توبہ کرنے والوں سے اور محبت رکھتے ہیں پاک و صاف رہنے والوں سے۔

ایک شخص کے جواب میں جس نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کا محبوب ہے ارشاد فرمایا :-

قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوبِكُمْ۔ (پ ۶ آیت ۱۸)

آپ یہ پوچھئے کہ اچھا تو پھر تم کو تمہارے گناہوں کے عوض عذاب کیوں دیں گے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :-

إِذَا أَحَبَّ اللَّهُ تَعَالَى عَبْدًا لَمْ يَضُرَّهُ ذَنْبٌ وَالتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَا ذَنْبَ لَهُ (مُتَّفَقٌ)

إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ۔ (مسند الفردوس، ابن ماجہ، ابن مسعود)

جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے محبت کرتا ہے تو اسے کوئی گناہ ضرر نہیں پہنچاتا، اور گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا

ہے جیسے اس نے کوئی گناہ نہ کیا ہو (اس کے بعد آپ نے آیت پڑھی) اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والوں سے محبت

کرتا ہے۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ جب اللہ کسی بندے سے محبت کرتا ہے تو موت سے پہلے اس کی توبہ قبول کر لیتا ہے، اور ماضی کے گناہ اسے

کوئی نقصان نہیں پہنچاتے اگرچہ زیادہ ہی کیوں نہ ہوں، یہ ایسا ہی ہے جیسے اسلام لانے کے بعد نصرانی کو کوئی نقصان نہیں پہنچاتا،

ایک جگہ اللہ تعالیٰ سے محبت کے لئے گناہوں سے مغفرت کی شرط لگائی گئی ہے، اور فرمایا گیا ہے :-

إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ۔ (پ ۳ آیت ۳۱)

اگر تم خدا تعالیٰ سے محبت رکھتے ہو تو میری اتباع کرو خدا تعالیٰ تم سے محبت کرنے لگیں گے اور تمہارے سب

گناہوں کو معاف کر دیں گے۔

سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں :-

إِنَّ اللَّهَ تَعَالَى يُعْطِي الدُّنْيَا مَنْ يُحِبُّ وَمَنْ لَا يُحِبُّ وَلَا يُعْطِي الْإِيمَانَ إِلَّا مَنْ يُحِبُّ (حاکم، بیہقی، ابن مسعود)

اللہ ہر شخص کو دنیا دیتا ہے وہ اللہ سے محبت کرتا ہو یا نہ کرتا ہو، لیکن ایمان صرف اسے دیتا ہے جو اللہ سے محبت کرتا ہے۔

مَنْ تَوَاضَعَ لِلْعَزِيزِ فَعَمِلَ اللَّهُ لَهُ نَكْبَرًا وَضَعَهُ اللَّهُ وَمَنْ أَكْثَرَ ذِكْرًا لِلْمَوَاحِبَةِ لِلْعَزِيزِ

(ابن ماجہ - ابو سعید الخدری باختصار)

جو شخص اللہ کے لئے تواضع کرتا ہے اللہ اسے بلند کرتا ہے، جو تکبر کرتا ہے اللہ اسے گرا دیتا ہے، اور جو اللہ کا ذکر زیادہ کرتا ہے اللہ اس سے محبت کرتا ہے۔

لَا يَزَالُ الْعَبْدُ يَتَقَرَّبُ إِلَى النَّوَافِلِ حَتَّى أَحَبَّهُ فَإِذَا أَحَبَّهُ كُنْتُ سَمْعَهُ الَّذِي يَسْمَعُ بِبَصَرِهِ الَّذِي يَبْصُرُ بِهِ (بخاری - ابو ہریرہ)

بندہ نوافل کے ذریعے مجھ سے قرب حاصل کرتا رہتا ہے، یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں، اور جب میں اس سے محبت کرتا ہوں تو اس کا کان آنکھ بن جاتا ہوں جن سے وہ سنتا ہے اور دیکھتا ہے۔

زید ابن اسلم فرماتے ہیں کہ بندہ اللہ تعالیٰ سے محبت کرتا ہے یہاں تک کہ اس کی محبت اس درجے کو پہنچ جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے فرماتا ہے کہ جو چاہے کر میں نے تجھے بخش دیا۔ محبت کے سلسلے میں جس قدر روایات وارد ہیں وہ حصر سے باہر ہیں۔

اللہ سے بندے کی محبت ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں کہ بندے سے اللہ کی محبت حقیقی ہے نہ کہ مجازی، اس لئے کہ محبت لغت میں اس شئی کی طرف نفس کے میلان کو کہتے ہیں جو اس کے موافق ہو، اور عشق اسی میلان کے غلبے اور افراط کا نام ہے، اور یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ احسان اور جمال دونوں نفس کے موافق ہیں، اور یہ دونوں چیزیں کبھی آنکھ سے مدد رکھتی ہیں، اور کبھی بصیرت سے ان کا ادراک کیا جاتا ہے، اور محبت بصر اور بصیرت دونوں کے تابع ہے، صرف بصر کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، لیکن بندے سے اللہ تعالیٰ کی محبت کی یہ صورت نہیں ہو سکتی، بلکہ جو الفاظ اللہ اور بندوں پر مشترک ہوتے جاتے ہیں، وہ معنی میں مشترک نہیں ہوتے، حتیٰ کہ لفظ وجود جو اسماء میں نہایت عام ہے اور خالق اور مخلوق دونوں پر ایک معنی میں نہیں بولا جاتا، بلکہ جو کچھ اللہ تعالیٰ کے سوا موجود ہے اس کا وجود اللہ کے وجود سے مستفاد ہے، اور تابع کا وجود متبوع کے وجود کے برابر نہیں ہو سکتا۔ البتہ وجود میں دونوں کی شرکت ہے یعنی دونوں پر لفظ وجود کا اطلاق کیا جاسکتا ہے، یہ ایسا ہی ہے جیسے گھوڑے اور درخت پر لفظ جسم کا اطلاق ممکن ہے، کیوں کہ دونوں جسمیت میں شریک ہیں، لیکن حقیقت میں وہ ایک دوسرے کے مشابہ نہیں ہیں، اور نہ ان میں سے کسی ایک کے متعلق یہ کہنا ممکن ہے کہ اس کی جسمیت اصل ہے اور دوسرے کی جسمیت تابع ہے، کیوں کہ نہ درخت اپنی جسمیت میں گھوڑے کے جسم کے تابع ہے، اور نہ گھوڑا اپنی جسمیت میں درخت کے تابع ہے، لفظ وجود میں جو خالق اور مخلوق دونوں کے لئے بولا جاتا ہے۔ یہ بات نہیں ہے، اور یہ صورت تمام الفاظ میں یکساں ہے، جیسے علم، ارادہ، قدرت وغیرہ۔ ان الفاظ میں بھی خالق اور مخلوق دونوں یکساں نہیں ہیں، بلکہ دونوں پر الگ الگ معنوں میں ان الفاظ کا اطلاق ہوتا ہے، واضحین لغت نے اولاً یہ الفاظ مخلوق کے لئے وضع کئے تھے، کیوں کہ خالق کے اوصاف انسانی عقل و فہم سے بالاتر ہیں اس لئے وہ الفاظ جو مخلوق کے لئے خاص تھے خالق کے لئے بھی بطور استعارہ و مجاز بولے جانے لگے۔ گویا خالق کے لئے ان الفاظ کا استعمال حقیقی نہیں ہے اور نہ ان معنی میں ہے جو بندوں کے لئے خاص ہے۔ اس وضاحت کے بعد لفظ محبت پر نظر ڈالتے، محبت اصل لغت کے اعتبار سے اس شئی کی طرف نفس کے میلان کا نام ہے جو اس کے موافق ہو، لیکن اس کا تصور اس نفس کے لئے ممکن ہے جو شئی موافق کے نہ ملنے سے ناقص رہ جاتا ہو، اور اسے پا کر کمال حاصل کرتا ہو، اور کمال سے لطف اندوز ہوتا ہو، اور یہ اللہ تعالیٰ کے حق میں محال ہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کو جو

کمال، جمال اور جلال حاصل ہے وہ اس وقت بھی حاصل ہے، اور وہ ابدی اور ازلی ہر اعتبار سے واجب الحصول ہے، نہ اس کا تجدد تصور ہے اور نہ زوال ممکن ہے، اس لئے اگر وہ کسی کی طرف نظر کرے گا تو اس کے معنی یہ نہیں ہوں گے کہ وہ غیر کی طرف نظر کر رہا ہے، بلکہ یہ کہا جائے گا کہ اس کی نظر اپنی ذات اور افعال پر ہے، اور موجودات میں اس کی ذات و افعال کے علاوہ کوئی چیز موجود نہیں ہے۔ اسی لئے جب شیخ ابو سعید حمی کے سامنے یہ آیت پڑھی گئی :-

يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ (پ ۳۶ آیت ۵۳)

جن سے اللہ تعالیٰ کو محبت ہوگی، اور جن کو اللہ تعالیٰ سے محبت ہوگی۔

تو انہوں نے فرمایا حقیقت میں وہ خود اپنے آپ سے محبت کرتا ہے، ان کی مراد یہ تھی کہ وہی کل ہے اور موجودات میں اس کے علاوہ کوئی نہیں ہے، جو شخص صرف اپنے نفس سے، اپنے افعال نفس اور اپنی تصانیف سے محبت کرتا ہے اس کی محبت اپنی ذات اور توابع ذات سے تجاوز نہیں ہوتی اور اس کے بارے میں یہی کہا جاتا ہے کہ وہ صرف اپنی ذات سے محبت کرتا ہے، جو الفاظ بندوں سے اللہ تعالیٰ کی محبت پر دلالت کرتے ہیں وہ سب منقول ہیں، اور اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے کے دل پر سے حجاب اٹھا دیتا ہے، یہاں تک کہ وہ اسے اپنے دل سے دیکھنے لگتا ہے یا وہ اسے اپنی قربت کے حصول پر قادر کر دیتا ہے، یا ازل میں اس کو قادر کرنے کا ارادہ تھا۔ اگر محبت کی نسبت ارادہ ازل کی طرف جائے تو بندے سے اللہ تعالیٰ کی محبت ازلی ہوگی، اور اگر اس فعل کی طرف جائے تو بندے کے دل سے حجاب دور کر دیتا ہے تو یہ محبت حدوث کے سبب سے حادث ہوگی، مگر شدت سطور میں جو حدیث بیان کی گئی ہے (لَا يَزَالُ عَبْدِي يَتَقَرَّبُ إِلَيَّ بِالتَّوَّافُلِ) اس کے معنی یہی ہیں کہ توافل کے ذریعے تقرب حاصل کرنے سے باطن صاف ہو جاتا ہے اور دل سے حجاب دور ہو جاتا ہے، اور بندہ اللہ تعالیٰ سے قربت کے درجے پر پہنچ جاتا ہے، یہ سب اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کے لطف و کرم سے ہوتا ہے، اور محبت کے یہی معنی ہیں، اور یہ بات ایک مثال کے ذریعے سمجھی جاسکتی ہے اور وہ مثال یہ ہے کہ بادشاہ اپنے کسی خادم کو اپنے آپ سے قریب کرتا ہے، اور اسے ہر وقت اپنی خدمت میں حاضر رہنے کی اجازت دیتا ہے، بادشاہ اس کی طرف بھی تو اس لئے مائل ہوتا ہے کہ وہ اپنی طاقت کے ذریعے اس کی مدد کرے گا، اس کے مشاہدے سے راحت پائے گا، یا کسی معاملے میں اس کی رائے لے گا، یا اس کے لئے کھانے پینے کا سامان تیار کرے گا، اس صورت میں یہ کہا جائے گا کہ بادشاہ اس سے محبت کرتا ہے کیوں کہ اس میں وہ چیز موجود ہے جو اس کی غرض کے موافق ہے، اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بادشاہ اپنے کسی غلام کو اپنے قریب کرتا ہے اور اسے اپنے پاس آنے جانے سے نہیں روکتا اس لئے نہیں کہ وہ اس سے کوئی فائدہ اٹھانا چاہتا ہے، یا اس کی مدد کا خواہاں ہے، بلکہ اس لئے کہ غلام بذات خود ایسے اخلاق حسنہ اور اوصاف حمیدہ سے متصف ہے کہ ان کی موجودگی میں اسے بادشاہ کے دربار میں بلا روک ٹوک آنے جانے سے منع نہیں کیا جاسکتا۔ اس لئے نہیں کہ بادشاہ کو غلام سے کسی طرح کی کوئی تعقیبت حاصل ہوگی، یا نفع ملے گا، بلکہ اس لئے کہ غلام میں وہ اچھے اوصاف اور عمدہ اخلاق پائے جاتے ہیں کہ ان کی موجودگی میں اسے دربار شاہی کی حاضری زیب دیتی ہے، اور اس کے شایان شان یہی ہے کہ وہ بادشاہ کے قرب سے متعجب ہو، اگرچہ بادشاہ کو اس سے ذرا غرض نہیں ہوتی، اس صورت میں اگر بادشاہ اپنے اور اس کے درمیان سے حجاب اٹھا دے گا تو یہی کہا جائے گا کہ اسے اپنے غلام سے محبت ہے، اور اگر غلام نے اخلاق حمیدہ اور خصائل حسنہ میں سے صرف وہی خصائل اور اخلاق حاصل کئے ہوں جو بادشاہ کی محبت حاصل کرنے میں مؤثر ہوں تو یہ کہا جائے گا کہ اس نے ذریعہ بنا کر بادشاہ کی محبت حاصل کی ہے۔

اس مثال میں دو طرح کی محبتیں ہیں، اللہ کو اپنے بندے سے دوسرے معنی کی محبت ہوتی ہے، پہلے معنی کی نہیں، اور دوسرے معنی کے اعتبار سے بھی اللہ تعالیٰ کی محبت کو بادشاہ کی محبت سے حقیقی مشابہت نہیں ہے، بلکہ اس میں بھی یہ شرط ہے کہ ہمارے ذہن میں یہ خیال نہ آئے کہ اس قربت سے اللہ تعالیٰ پر تغیر واقع ہو گا کہ اللہ تعالیٰ کے سلسلے میں کسی تغیر کا امکان نہیں ہے، بلکہ ہر تغیر اس کے حق میں محال ہے، اللہ تعالیٰ سے بندے کی قربت کے معنی حقیقت میں یہ ہیں کہ بندہ درعدوں اور بہائم کی صفات سے دور

ہو کر ان مکارم اخلاق سے آراستہ ہو گیا جو الہی اخلاق ہیں، گویا یہ قربت صفت میں ہوتی ہے، مکان میں نہیں ہوتی۔ صفت کی قربت کیسی ہوتی ہے، اس کے لئے بھی ایک مثال بیان کرتے ہیں، اور وہ مثال یہ ہے کہ دو شخص کبھی تو ایک دوسرے سے اس طرح قریب ہوتے ہیں کہ دونوں ایک دوسرے کی طرف پلٹے ہیں، اور کبھی ایک حرکت کرتا ہے، اور دوسرا اپنی جگہ ساکن رہتا ہے، اس صورت میں متحرک میں کچھ تغیر واقع ہوتا ہے، جب کہ دوسرے میں کوئی تغیر نہیں ہوتا، مغضات میں بھی اس طرح کا قرب پایا جاتا ہے، چنانچہ شاگرد اپنے استاذ کے جمال و کمال کے درجے سے قرب حاصل کرنے کے لئے ہر وجہ کرتا ہے، استاذ اپنی جگہ ٹھہرا ہوا ہے، وہ اپنے درجے سے اتر کر شاگرد کے درجے تک نہیں پہنچتا، اور شاگرد اس درجے تک رسائی حاصل کرنے کے لئے، اور درجات کی ترقی کے لئے کھل کر علم کی روشنی تک پہنچنے کے لئے مسلسل حرکت کرتا رہتا ہے، یہاں تک کہ استاذ کے درجے تک رسائی حاصل کر لیتا ہے، یہی حال اللہ تعالیٰ سے بندوں کی قربت کا ہے، جس قدر کوئی بندہ اوصاف حسنہ میں کامل، علم میں مکمل، اشیاء کے خالق کی معرفت میں یگانہ، شیطان طاقوں کو مقہور کرنے میں پختہ، اور رذائل سے محفوظ رہنے میں مضبوط کردار کا حامل ہو گا، اسی قدر درجہ کمال سے قریب تر ہو گا، کمال کی انتہا صرف اللہ کے لئے ہے، ہر بندہ اللہ تعالیٰ کے لئے اسی قدر قریب ہو گا جس قدر اسے ان امور میں کمال حاصل ہو گا، البتہ شاگرد اور استاذ اور اللہ تعالیٰ اور بندے کے درمیان یہ فرق ہے کہ شاگرد بعض اوقات اپنی ہر وجہ سے استاذ کے برابر اور کبھی اس سے بھی سبقت لے جاتا ہے، جب کہ اللہ تعالیٰ کے باب میں یہ امر محال ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا کمال متناہی ہے، اور بندہ درجات کمال میں اپنی محسوس حدود سے تجاوز کرنے پر قادر نہیں ہے، اس لئے بندہ اللہ تعالیٰ کے کمال کی برابری بھی نہیں کر سکتا ہے، چہ جائیکہ وہ اس پر فوقیت حاصل کر لے، پھر قرب کے درجات میں بھی لامتناہی تفاوت ہے، کیوں کہ کمال کی کوئی انتہا نہیں ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ بندے کے ساتھ اللہ کی محبت یہ ہے کہ اسے دنیاوی شواغل اور معاصی سے دور کر کے، اس کے باطن کو دنیا کی کدورتوں سے پاک کر کے، اور اس کے قلب سے حجاب اٹھا کر اپنے آپ سے قریب کر لے، یہاں تک کہ وہ بندہ یہ محسوس کرے گا گویا وہ اپنے دل سے اللہ کا مشاہدہ کر رہا ہے، اور اللہ تعالیٰ سے بندے کی محبت یہ ہے کہ اس کمال کے حصول کی طرف مائل ہو جس سے وہ محروم ہے، ظاہر ہے آدمی جس چیز سے محروم ہوتا ہے اس کے حصول کا شوق رکھتا ہے، اور جب وہ چیز پالیتا ہے تو اس سے لذت پاتا ہے، اس معنی میں محبت اور شوق اللہ تعالیٰ کے لئے محال ہے۔

اب اگر تم یہ کہو کہ بندے سے اللہ تعالیٰ کی محبت ایک مشکوک معاملہ ہے، بندے کو کیسے معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا حبیب ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ محبت کی کچھ علامات ہیں، ان علامات سے استدلال کرے گا، چنانچہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں :-

إِذَا أَحَبَّ اللَّهُ عَبْدًا ابْتَدَأَ فَإِنَّا أَحْبَبْنَا الْحُبَّ الْبَالِغَ اقْتِسَنَاهُ (۱)

اللہ تعالیٰ کسی بندے سے محبت کرتا ہے تو اسے جلا کر دیتا ہے اور جب شدید محبت کرتا ہے تو اسے اپنے ساتھ خاص کر لیتا ہے۔

آپ سے ”خاص کرنے“ کی تفسیر دریافت کی گئی، آپ نے ارشاد فرمایا اس کے معنی یہ ہیں کہ اپنے محبوب بندے کے پاس نہ مال باقی رہنے دے، اور نہ اہل و عیال باقی رکھے، اس سے معلوم ہوا کہ بندے سے اللہ تعالیٰ کی محبت کی علامت یہ ہے کہ اسے غیر سے متعثر کر دے، یہاں تک کہ اس میں اور غیر میں حجاب مائل کر دے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی خدمت میں کسی شخص نے عرض کیا کہ آپ اپنی سواری کے لئے کوئی گدھا کیوں نہیں خرید لیتے، فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کو یہ بات گوارا نہیں کہ میں اسے چھوڑ کر گدھے کا

مفضل اختیار کروں۔ ایک حدیث میں یہ مضمون وارد ہے :-
 إِذَا أَحَبَّ اللَّهُ عَبْدًا ابْتَلَاهُ فَإِنْ صَبَرَ اجْتَبَاهُ فَإِنْ خَافَ اضْطَفَاهُ
 جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے محبت کرتا ہے تو اسے جلا کرتا ہے، اگر وہ اس ابتلاء پر صبر کرتا ہے تو اسے برگزیدہ کرتا ہے اور راضی ہوتا ہے تو منتخب کر لیتا ہے۔

بعض علماء کا مقولہ ہے کہ جب تو اللہ تعالیٰ سے محبت کرے اور یہ دیکھے کہ وہ تجھے کسی مصیبت میں مبتلا کرنا چاہتا ہے تو یہ سمجھ لے کہ وہ تجھے برگزیدہ بنانا چاہتا ہے، کسی مرد نے اپنے استاد سے کہا کہ مجھے محبت کے کچھ آثار نظر آتے ہیں، انہوں نے دریافت کیا بیٹے! کیا تم اس کے علاوہ کسی اور محبوب میں مبتلا کئے گئے ہو، اس نے عرض کیا نہیں! فرمایا تب تم محبت کی توقع مت رکھو، اس لئے کہ ابتلاء و آزمائش کے بغیر کسی محض کو محبت نہیں ملتی۔ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :-
 إِذَا أَحَبَّ اللَّهُ عَبْدًا جَعَلَ لَمْوَاظِمًا مِنْ نَفْسِهِ مَوْزَجًا مِنْ قَلْبِهِ مِأْمَرًا مَوْيَنَهُمَا

(مسند الفردوس۔ انس)

جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے محبت کرتا ہے تو اس کے نفس میں ایک نصیحت کرنے والا مقرر کر دیتا ہے، اور اس کے دل میں ایک روکنے والا پیدا کر دیتا ہے وہ اسے حکم دیتے ہیں اور منع کرتے ہیں۔

ایک حدیث میں یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں، فرمایا :-

إِذَا رَآكَ اللَّهُ عَبْدًا خَيْرًا بَصَرَ بَعْضُ نَفْسِهِ (مسند الفردوس۔ انس)

جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کے ساتھ خیر کا ارادہ کرتا ہے تو اسے اس کے عیوب نفس پر مطلع کر دیتا ہے۔

ان تمام علامات میں سب سے اہم اور خاص علامت یہ ہے کہ بندہ کو اللہ تعالیٰ سے محبت ہو، اسی سے یہ سمجھ میں آسکتا ہے کہ اللہ کو اپنے اس بندے سے محبت ہے، اور وہ فضل جس سے بندے کا محبوب خدا ہونا ثابت ہو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے تمام ظاہری اور باطنی پوشیدہ اور کھلے امور کا کفیل ہو، وہی اسے مغفور دیتا ہو، وہی اسے تہنیر و جہاننا ہو، وہی اسے زیور اخلاق سے آراستہ کرتا ہو، وہی اس کے اعضاء کو ٹیک کاموں میں استعمال کرتا ہو، وہی اس کے ظاہر و باطن کو درست رکھتا ہو، وہی اس کے افکار کا ایک مرکز بناتا ہو، وہی اس کے دل میں دنیا سے نفرت پیدا کرتا ہو، وہی اسے غیر سے متوجہ کرتا ہو، اور غلو توں میں مناجات کی لذت بخش کر خود سے مانوس کرتا ہو، وہی اپنی معرفت اور اس کے درمیان سے پردے اٹھانے والا ہو، یہ اور اس طرح کی دوسری علامات بندے کے لئے اللہ تعالیٰ کی محبت کی دلائل کہتی ہیں، اب ہم اللہ سے بندے کی محبت پر دلالت کرنے والی کچھ علامات بیان کرتے ہیں۔ یہ بھی بندے سے اللہ کی محبت کی علامات ہیں۔

اللہ سے بندے کی محبت کی علامات محبت کا دعویٰ ہر شخص کرتا ہے، اور وہ دعویٰ کرنا مشکل نہیں ہے، لیکن اس دعویٰ پر عمل کرنا نہایت دشوار ہے انسان کو چاہیے کہ جب اس کا نفس محبت کا دعویٰ کرے تو اس وقت تک شیطان کے فریب میں مبتلا نہ ہو جب تک اس کی آزمائش نہ کرے، اور دلائل سے اس کے دعویٰ کی صداقت کا حال نہ کھل جائے، محبت ایک شجرہ طوبیٰ ہے، اس کی جڑیں زمین میں نہایت گہری ہیں، اور شاخیں آسمان میں ہیں، اور اس کے پھل دل، زبان اور جو ارجح میں ظاہر ہوتے ہیں، اور ان آثار سے جو دل و جو ارجح پر نمایاں ہوتے ہیں محبت کا وجود اس طرح ثابت ہوتا ہے جس طرح دعویٰ سے آگ کے وجود کا علم ہوتا ہے، یا پہلوں سے درختوں پر دلالت ہوتی ہے۔

آثار محبت اس طرح کے آثار ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ملاقات کو آخرت میں کشف اور مشاہدے کے طریقے پر اچھا کچھ، اس لئے کہ یہ ممکن نہیں ہے کہ کوئی شخص دل سے کسی کو چاہتا ہو اور اس کے مشاہدے اور ملاقات کی

خواہش نہ رکھتا ہو اور کیوں کہ یہ بات سب جانتے ہیں کہ دنیا سے جدا ہوئے بغیر اور موت کو گلے لگائے بغیر یہ خواہش پوری نہیں ہو گی اس لئے موت سے محبت رکھنا بھی انہی آثار میں سے ایک اثر ہے 'اے چاہیے کہ وہ موت سے فرار اختیار نہ کرے' محبت کرنے والا کبھی اپنے وطن سے محبوب کے متفرک سفر کرنے میں کوئی مشقت یا تعب محسوس نہیں کرتا کہوں کہ وہ یہ بات جانتا ہے کہ اس سفر کا انجام محبوب کے مشاہدے پر فحشی ہے 'سفر (موت) اس ملاقات کی کنجی' اور اس مشاہدے کا باب الداعیہ ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں :-

مَنْ أَحَبَّ لِقَاءَ اللَّهِ أَحَبَّ لِقَاءَ عَصَا مُحَمَّدٍ (بخاری و مسلم - ابو ہریرہ)

جو شخص اللہ تعالیٰ کی ملاقات پسند کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی ملاقات پسند کرتا ہے۔

موت کے وقت حضرت حذیفہؓ نے فرمایا ایک حبیب احتیاج کے وقت آیا جو اس سے شرمندہ ہو وہ کبھی ظلالِ یاب نہ ہو، بعض سلف صالحین فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ سے ملاقات کی محبت کے بعد اللہ تعالیٰ کے نزدیک کثرتِ سجد سے زیادہ کوئی عمل پسندیدہ نہیں ہے، دیکھئے یہاں انہوں نے اللہ تعالیٰ سے ملاقات کی محبت کو سجدوں پر فوقیت دی، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے محبت میں صداقت کے لئے راہِ خدا میں شہید ہونے کی شرط لگائی ہے، چنانچہ جب لوگوں نے اللہ سے محبت کا دعویٰ کیا تو اللہ تعالیٰ نے اپنے راستے میں قتل ہونے کو اس دعویٰ میں سچائی کی علامت قرار دے دیا اور فرمایا :-

إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِهِ صَفًّا۔

(پ ۲۸ ر ۹ آیت ۳)

بے شک اللہ تعالیٰ ان لوگوں سے محبت کرتا ہے جو اس کی راہ میں قتل کر جاؤ کرتے ہیں۔

يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَيَقْتُلُونَ وَيُقْتَلُونَ۔ (پ ۱۸ ر ۳ آیت ۱۱)

وہ لوگ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں جس میں قتل کرتے ہیں اور قتل کئے جاتے ہیں۔

حضرت عمرؓ کے لئے اپنی وصیت میں حضرت ابو بکر الصدیقؓ نے ارشاد فرمایا: حق کراں ہوتا ہے اور اس کرائی کے باوجود خوش گوار ہوتا ہے، اور باطل ہلکا پڑتا ہے، اس کے باوجود بڑا تلخ ہوتا ہے، اگر تم نے میری وصیت کی حفاظت کی تو موت سے زیادہ کوئی غائب چیز تمہیں محبوب نہ ہوگی، اور وہ تمہارے پاس آئے گی، اور اگر تم نے یہ وصیت ضائع کر دی تو موت سے زیادہ غائب چیز تمہارے نزدیک مبغوض نہیں ہوگی، حالانکہ تم اسے ٹلانہ سکو گے۔ احن ابن سہد ابن ابی وقاص سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ میرے باپ نے مجھ سے بیان کیا کہ عبد اللہ ابن جہش نے جنگِ احد کے موقع پر کہا آؤ اللہ تعالیٰ سے دعا کریں، سب لوگ ایک گوشے میں چلے گئے، اور عبد اللہ نے یہ دعا کی اے اللہ! میں تجھے قسم دیتا ہوں کہ جب کل میں دشمن سے نبو آنا ہوں تو میرا مقابلہ کسی بہادر، جوان مرد، اور شدید الغضب شخص سے ہو، جس سے میں لڑوں، اور وہ مجھ سے لڑے، پھر وہ مجھے پکڑ لے اور میرے کان ناک کاٹ ڈالے، میرا پیٹ چیر دے، اور جب میں قیامت کے دن اس حال میں تجھ سے ملوں تو تو یہ کہے اے عبد اللہ تیری ناک کس نے کاٹی ہے، تیرے کان کس نے کاٹے ہیں، میں عرض کروں گا اے اللہ! تیری اور تیرے رسول کی راہ میں کئے ہیں۔ تو کہے گا اے عبد اللہ! تو سچ کہتا ہے، سعد کہتے ہیں میں نے لڑائی کے دن بالکل آخری وقت میں دیکھا کہ ان کے کان ان کے جسم میں اس طرح لٹکے ہوئے تھے جیسے کوئی چیز دعا کے میں لٹکی رہتی ہے۔ سعید ابن المسیبؓ فرماتے ہیں میری دعا ہے اللہ تعالیٰ ابن جہش کی قسم کا آخری حصہ بھی اسی طرح پورا فرمائے جس طرح اس نے پہلا حصہ پورا فرمایا ہے۔ سفیان ثوری اور بشر الحافی فرمایا کرتے تھے کہ موت کو صرف وہی شخص ناپسند کرتا ہے جو شک میں گرفتار ہوتا ہے، اس لئے کہ حبیب کسی حال میں بھی اپنے محبوب کی ملاقات کو ناپسند نہیں کرتا۔ ابو ہلی نے کسی زاہد سے دریافت کیا کہ کیا آپ موت کو پسند کرتے ہیں، زاہد نے جواب دینے میں توقف کیا، ابو ہلی نے

کہا اگر تم سچے ہو تو موت کو ضرور پسند کرتے۔ اس کے بعد انہوں نے یہ آیت تلاوت کی :-
فَتَمَتُّواَ الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صَادِقِيْنَ۔ (پارا ۱۱ آیت ۹۳)
 موت کی تمنا کر (کے دکھلاؤ) اگر تم سچے ہو۔

زاہد نے کہا سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں :-
لَا يَتَمَتَّتِيْنَ اَحَدُكُمْ الْمَوْتَ۔ (بخاری و مسلم۔ الن)۔
 تم میں سے کوئی موت کی تمنا نہ کرے۔

انہوں نے فرمایا یہ ممانعت اس شخص کے لئے ہے جو کسی مصیبت سے پریشان ہو کر موت کی تمنا کرتا ہے کیوں کہ اللہ کی قضاء پر راضی رہنا اس سے فرار حاصل کرنے سے افضل ہے۔

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص موت کو پسند نہ کرے تو آیا یہ کہا جائے گا کہ وہ اللہ سے محبت کرنے والا نہیں ہے؟ اس کے جواب کی تفصیل یہ ہے کہ موت کی کراہت کبھی دنیا کی محبت اور اہل مال اور اولاد سے فرقت پر افسوس کے باعث ہوتی ہے، یہ امر اللہ تعالیٰ کی کمال محبت کے متافی ہے، اس لئے کہ کامل محبت وہ ہوتی ہے جو تمام دل کو مستغرق ہو، تاہم یہ امر کچھ بعید نہیں کہ اہل مال اور اولاد کی محبت کے ساتھ اللہ کی محبت کا معمولی شائبہ بھی موجود ہو، اس لئے کہ لوگ محبت میں متفاوت ہوتے ہیں، اور تفاوت پر یہ روایت دلالت کرتی ہے کہ ابو حنیفہ ابن عتبہ ابن ربیعہ ابن عبد شمس نے جب اپنی بہن فاطمہ کا نکاح اپنے آزاد غلام سالم سے کیا تو قریش نے انہیں کافی برا بھلا کہا، اور یہ طعنہ دیا کہ انہوں نے قریش کی ایک شریف خاتون کو ایک غلام سے بیاہ دیا، ابو حنیفہ نے کہا کہ بخدا میں نے اپنی بہن کا نکاح اس شخص سے یہ سوچ کر کیا ہے کہ یہ ہر حال میں اس سے بہتر ہے، ان کا یہ قول ان کے فعل سے بھی زیادہ خطرناک ثابت ہوا، لوگوں نے ان سے پوچھا یہ کیسے ہو سکتا ہے فاطمہ تیری بہن ہے، اور سالم تیرا آزاد کردہ غلام ہے، انہوں نے جواب دیا کہ میں نے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ جو شخص کسی ایسے آدمی کو دیکھنا چاہے جو اللہ تعالیٰ سے اپنے پورے دل کے ساتھ محبت کرتا ہو اسے چاہیے کہ وہ سالم کو دیکھے (ابو نعیم۔ عمران) اس روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ لوگوں میں ایسے بھی ہیں جو پورے دل کے ساتھ اللہ سے محبت نہیں کرتے، بلکہ دوسروں سے بھی محبت کرتے ہیں، اس لئے یہ ضروری ہے کہ جب وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر ہوں تو انہیں ان کی محبت کے بقدر دیدارِ الہی کی لذت حاصل ہو، اور دنیا سے محبت کے بقدر عذاب ملے۔

موت کو برا سمجھنے کا ایک اور سبب یہ ہو سکتا ہے کہ بندہ مقام محبت کا مقبذ ہو، اور موت کا جلدی آنا اس لئے برا سمجھتا ہو کہ اس طرح اسے اللہ تعالیٰ کی ملاقات کے لئے تیاری کا موقع نہیں مل سکے گا، اگر کراہت موت کا سبب یہ ہو تو اس سے ضعف محبت پر دلالت نہیں ہوتی، اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی شخص کو یہ اطلاع ملے کہ اس کا محبوب فلاں دن آ رہا ہے، اور وہ یہ چاہے کہ اس کی آمد میں کچھ تاخیر ہو جائے تاکہ وہ اس کے شایان شان استقبال کی تیاری کر سکے، اس کے لئے اپنا گھر آراستہ کرے، اور خانہ داری کے تمام اسباب فراہم کرے، اور اس طرح اس سے ملاقات کرے کہ دل ہر طرح کے افکار و خیالات سے فارغ ہو، اور ملاقات کی راہ میں کوئی رکاوٹ موجود نہ ہو، بہر حال اس سبب سے موت کو مکروہ سمجھنا کمال محبت کے متافی نہیں ہے اور اس کی علامت یہ ہے کہ وہ شخص مسلسل عمل کرتا ہو، اللہ تعالیٰ سے ملاقات کے لئے ہمہ وقت تیاری کرتا ہو۔

محبت کی ایک علامت یہ ہے کہ جس چیز کو اللہ تعالیٰ پسند کرے اسے اپنی پسند پر ظاہر و باطن میں ترجیح دے، اس کے لئے سخت سے سخت عمل انجام دے، ہوائے نفس کی اتباع سے گریز کرے، اور سستی چھوڑ دے، اللہ تعالیٰ کی اطاعت پر مواظبت کرے، نوافل کے ذریعے اس کا تقرب حاصل کرتا رہے، اور جس طرح محب اپنے محبوب کے دل میں مزید درجہ قرب کا استلزامی رہتا ہے، اسی طرح اعلا سے اعلا درجات کا طالب رہے، اللہ تعالیٰ نے ایسا پسند لوگوں کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے :-

يَجْتَوُونَ مَنْ هَاجَرَ إِلَيْهِمْ وَلَا يَحِلُّونَ فِي صَلَواتِهِمْ حَاجَةً مِمَّا لَوْ تَوَّابُونَ
عَلَى أَنْفُسِهِمْ لَوْ كَانَتْ لَهُمْ حَصَاصَةٌ (پ ۲۸ ر ۴ آیت ۹)

جو ان کے پاس ہجرت کر کے آتا ہے اس سے یہ لوگ محبت کرتے ہیں اور مہاجرین کو جو کچھ ملتا ہے اس سے یہ (انصار) اپنے دلوں میں کوئی رکھ نہیں پاتے اور اپنے سے مقدم رکھتے ہیں اگرچہ ان پر فائدہ ہی ہو۔

جو شخص ہوائے نفس کی متابعت پر کمر بستہ رہتا ہے اس کا محبوب وہی ہوتا ہے جسے وہ چاہتا ہے حقیقت یہ ہے کہ عاشق اپنے معشوق کی مرضی کا پابند ہوتا ہے جو معشوق کی مرضی ہوتی ہے اسے ہی عاشق بھی اپنی رضا قرار دیتا ہے جیسا کہ ایک شاعر کہتا ہے :-

أُرِيدُ وَصَالَاتُكَ نِدْهُ جَرِي فَأَتُرْكُ مَعَارِئُكَ لِمَا يَرِيدُ

(میں اس کا وصال چاہتا ہوں اور وہ میری جدائی کا خواہشمند ہے اس لئے میں اس کی خواہش کے لئے اپنی خواہش چھوڑتا ہوں)

جب کسی پر محبت غالب ہوتی ہے تو پھر اسے کسی چیز کی خواہش نہیں رہتی سوائے محبوب کے اس کا کوئی مطمح نظر نہیں رہتا جیسا کہ بیان کیا جاتا ہے کہ جب حضرت زلخا ایمان لے آئیں اور حضرت یوسف علیہ السلام سے ان کا نکاح ہو گیا تو عبادت کے لئے گوشہ نشین ہو گئیں اور اللہ کی ہو کر رہ گئیں حضرت یوسف علیہ السلام انہیں دن میں اپنے قریب بلاتے تو وہ رات پر بلا دیتیں اور رات میں بلاتے تو دن پر محمول کر دیتیں اور فرماتیں اے یوسف میں تجھ سے اس وقت محبت کرتی تھی جب مجھے اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل نہیں تھی اب میرے دل میں اس کی محبت کے سوا کوئی محبت باقی نہیں رہی ہے اور میں اسے کسی اور چیز سے بدلنا بھی نہیں چاہتی حضرت یوسف علیہ السلام نے ان سے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے تیری قربت کا حکم دیا ہے اور بتلایا ہے کہ اس قربت کے نتیجے میں وہ تیرے بطن سے دو بیٹے پیدا کرے گا اور انہیں نبی بنائے گا حضرت زلخا نے کہا اگر یہ بات ہے تو میں حکم خداوندی کی اطاعت کے لئے تیار ہوں اور آپ کی قربت پر آمادہ ہوں اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص اللہ تعالیٰ سے محبت کرتا ہے وہ اس کی نافرمانی نہیں کر سکتا اسی لئے ابن المبارک فرماتے ہیں :-

تَغْصِي الْأَمَوَانَتْ تَطْهَرُ حَبَّةً هَذَا الْعَمْرِي فِي الْفِعَالِ بَلِيغٌ
لَوْ كَانَتْ حُبُّكَ صَادِقًا لَفَعَلْتَهُ لَنْ الْمُحِبِّ لِمَنْ يُحِبُّ مَطْبُوعٌ

(وہ اللہ تعالیٰ سے محبت کا دعویٰ کرتا ہے اور اس کی حکم بدلی کرتا ہے بخدا تیرا یہ عمل نہایت عجیب ہے اگر تیری محبت سچی ہوتی تو اس کی اطاعت کرتا اس لئے کہ میں اپنے محبوب کا مطیع ہوتا ہے)

اسی مضمون میں یہ شعر کہا گیا ہے :-

وَأَتُرْكُ مَعَارِئُكَ لِمَا يَرِيدُ فَأُرْضَى بِمَا تَرْضَى وَلَنْ مَسَخَطَتْ نَفْسِي
(تیری خواہش کے آگے میں اپنی خواہش ترک کر دیتا ہوں اور تیری رضا پر راضی رہتا ہوں اگرچہ میرا نفس گرائی محسوس کرے)

سل مستری فرماتے ہیں محبت کی علامت یہ ہے کہ تم محبوب کو اپنے نفس پر ترجیح دو پھر اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرنے سے کوئی شخص حبیب نہیں بن جاتا بلکہ حبیب وہ ہے جو مٹائی اور منکرات سے بھی احتراز کرے ان کا یہ قول درست ہے اللہ تعالیٰ سے بددے کی محبت بددے سے اللہ تعالیٰ کی محبت کا سبب ہوتی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :-

يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُمْ (پ ۲۸ ر ۴ آیت ۵۳)

جن سے اللہ تعالیٰ کو محبت ہوگی اور اللہ تعالیٰ سے جن کو محبت ہوگی۔

جب اللہ تعالیٰ کسی سے محبت کرتا ہے تو اس کا کفیل ہوتا ہے اور اسے دشمنوں پر غلبہ دیتا ہے اس کا دشمن خود اس کا نفس اور

خواہشات نفس ہیں، چنانچہ اگر اللہ اسے اپنا محبوب بنالے گا تو بھی اسے دشمنی کے سامنے ذلیل و خوار نہیں کرے گا، اور نہ اس کے نفس کے سپرد کرے گا، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے نہ

وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا عَمِلْتُمْ ۚ كَمْ مَوْكِفٰی بِاللّٰہِ یَوْلٰیہَا وَکَفٰی بِاللّٰہِ یَصْبِرُہَا۔ (پ ۲۵ ر ۴ آیت ۳۵)

اور اللہ تعالیٰ تمہارے دشمنوں کو خوب جانتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کافی صبر کرنے والا ہے اور اللہ تعالیٰ کافی مددگار ہے۔

اگر تم یہ سوال کرو کہ کیا نافرمانی اور گناہ اصل محبت کے مخالف ہے تو ہم یہ کہیں گے کہ معصیت اصل محبت کے خلاف نہیں ہے، بلکہ کمال محبت کے خلاف ہے، محبت سے لوگ ایسے ہیں جو اپنے آپ سے محبت کرتے ہیں، اور کسی نہ کسی مرض میں گرفتار رہتے ہیں، صحت پسند کرتے ہیں لیکن یہ جاننے کے باوجود کہ بسیار غوری صحت کے لئے معرکہ زیادہ کھاتے ہیں، اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ انہیں اپنی جان عزیز نہیں ہے یا وہ سحرست رہنا پسند نہیں کرتے، لیکن حفظان صحت کے اصولوں پر وہ اس لئے عمل نہیں کرتے کہ ان کی معرفت ضعیف ہوتی ہے، اور شہوت غالب ہوتی ہے، اور اس پر یہ روایت دلالت کرتی ہے کہ عیمان صحابی کو بہت جلد جلد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لایا جاتا تھا، اور آپ ان پر حد جاری کیا کرتے تھے، ایک دن وہ کسی معصیت میں پکڑے گئے اور حد کے لئے لائے گئے، کسی شخص نے انہیں اس بات پر ملامت کی وہ اتنی جلدی جلدی حد کے لئے لائے جاتے ہیں، یہ سن کر سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اسے برامت کو، اس لئے کہ یہ شخص اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہے (بخاری) دیکھئے عیمان معصیت کے ارتکاب کی بنا پر محبت سے خارج نہیں ہوئے، البتہ معصیت آدمی کو کمال محبت سے خارج کر دیتی ہے، بعض عارفین کہتے ہیں کہ جب ایمان کسی آدمی کے قلب کے ظاہری حصے میں ہو سکے تو وہ اللہ تعالیٰ سے معتدل محبت کرتا ہے، اور جب دل کی گہرائی میں پہنچ جاتا ہے تو اعتدالی محبت کرتا ہے اور محاسنی ترک کر دیتا ہے۔

حاصل یہ ہے کہ محبت کا دعویٰ ایک مشکل اور خطرناک دعویٰ ہے، اسی لئے حضرت قتیبہ ابن عیاضؒ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص تجھ سے یہ سوال کرے کہ کیا تو اللہ تعالیٰ سے محبت کرتا ہے تو خاموش رہ، اس لئے کہ اگر تو نے جواب میں کہا ”نہیں“ تو یہ کفر ہو گا اور کہا ”ہاں“ تو حیران حال تمین کا سامنا نہیں ہے، اس لئے اللہ کی ناراضگی سے بچنے کے لئے سکوت اختیار کر بعض علماء کہتے ہیں کہ جنت میں اہل معرفت اور اہل محبت کے درجات سے بلند کوئی دو سر اور چہ نہ ہو گا، اور نہ جہنم میں کسی شخص کو اس شخص سے زیادہ عذاب ہو گا جو معرفت اور محبت کا دعویٰ کرے، اور دل میں نہ معرفت ہو اور نہ محبت۔

اللہ تعالیٰ سے محبت کی ایک علامت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ذکر کا شوق سے حریص ہو، نہ زبان مجھے نہ دل خالی ہو، اس لئے کہ جو شخص کسی سے محبت کرتا ہے، اس کا اور اس کی متعلق چیزوں کا ذکر کثرت سے کرتا ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ کی محبت کی علامت یہ قرار پائی کہ بندہ اللہ کا ذکر کرے، قرآن کریم کی تلاوت کرے جو اس کا کمال ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرے، اور ہر اس چیز کو چاہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہو، جو شخص کسی انسان سے محبت کرتا ہے اس کی گلی کے گتے کو بھی چاہتا ہے، جب محبت قوی ہوتی ہے تو محبوب سے متحری ہو کر ان تمام چیزوں تک جا پہنچتی ہے جو اسے گھیرے ہوئے ہوں، اس کا احاطہ کئے ہوئے ہوں، یا اس سے متعلق ہوں، اسے محبت میں شرکت نہیں کہہ سکتے، اس لئے کہ محبوب کے قاصد سے یا اس کے کلام سے محبت کرنا بھی محبوب سے محبت کرنا ہے، بلکہ یہ کمال محبت کی دلیل ہے، چنانچہ جس شخص پر اللہ تعالیٰ کی محبت غالب ہوتی ہے، جو شخص اللہ کی مخلوق سے محبت کر سکتا ہے، علاوہ قرآن کریم سے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے، اور اللہ کے تمام نیک بندوں سے کیسے محبت نہیں کرے گا، اس کی تحقیق ہم نے کتاب الاخاۃ والسمتہ میں بیان کی ہے، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا نہ

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاَتَّبِعُوْنِیْ یُحِبِّکُمُ اللّٰہُ (پ ۲۳ ر ۴ آیت ۳۱)

آپ کہہ دیجئے اگر تم خدا تعالیٰ سے محبت رکھتے ہو تو میری اتباع کرو خدا تعالیٰ تم سے محبت کرنے لگیں گے۔

سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں نہ

أَحِبُّوْا اللّٰهَ لِمَا يَغْنُوْكُمْ مِنْ نِّعَمِهِ وَأَحِبُّوْا نَبِيَّ اللّٰهِ تَعَالٰی (۱)

اللہ سے ان نعمتوں کے لئے محبت کرو جو وہ تمہیں عنایت کرتا ہے اور مجھ سے اللہ کے لئے محبت کرو۔

حضرت سفیان ثوری ارشاد فرماتے ہیں کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے حب سے محبت کرتا ہے وہ گویا اللہ سے محبت کرتا ہے اور جو شخص اللہ تعالیٰ کا اکرام کرنے والے سے محبت کرتا ہے وہ گویا اللہ تعالیٰ کا اکرام کرتا ہے۔ بعض مہدین سے یہ واقعہ نقل کیا گیا ہے کہتے ہیں کہ مجھے ارادت کے دنوں میں مناجات کی لذت ملی چنانچہ میں نے رات دن قرآن کی تلاوت کو اپنا مشغلہ بنا لیا، پھر کچھ وقفہ ایسا گزرا کہ میں تلاوت نہ کر سکا، ایک دن میں نے خواب میں دیکھا کہ کوئی کفن والا یہ کہہ رہا ہے کہ اگر تجھے ہماری محبت کا دعویٰ ہے تو ہماری کتاب قرآن کریم پر کیوں ظلم کرتا ہے؟ کیا تو نے ہمارے اس لطیف کتاب میں تذکرہ نہیں کیا جو قرآنی آیات میں موجود ہے؟ جب میں اس خواب کے بعد غیبت سے بیدار ہوا تو اول قرآن کریم کی محبت سے لبریز تھا، حضرت عبداللہ ابن مسعود فرماتے ہیں کہ تم میں سے کوئی شخص قرآن کریم کے علاوہ اپنے نفس سے کسی چیز کی درخواست نہ کرے، اس لئے کہ جو شخص قرآن کریم سے محبت کرتا ہے وہ اللہ سے محبت کرتا ہے، اور جو شخص قرآن پاک سے محبت نہیں کرتا وہ اللہ سے بھی محبت نہیں کرتا۔ حضرت سہیل تستری فرماتے ہیں محبت الہی کی علامت محبت قرآن ہے، اور محبت الہی اور محبت قرآن کی علامت محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے، اور محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی علامت محبت قرآن ہے، اور محبت قرآن کی علامت یہ ہے کہ دنیا میں سے صرف اس قدر لے جو طریق آخرت میں زاد راہ بن سکے۔

محبت الہی کی ایک علامت یہ ہے کہ بندے کی غلوٹ اللہ کے ساتھ مناجات، اور قرآن کریم کی تلاوت سے انس ہو، چنانچہ وہ نماز تہجد کی پابندی کرے، اور رات کے ہر سکون لحاظ کو بھول دیاوی کہ درویشوں سے خالی ہوتے ہیں۔ قیمت سمجھے، محبت کا کم سے کم درجہ یہ ہے کہ حبیب کے ساتھ تمنا کی لذت پائے، اور اس کی مناجات سے لطف اندوز ہو، جس شخص کے نزدیک غلوٹ و مناجات سے زیادہ غیبت اور گفتگو پیاری ہو وہ محبت کے دعویٰ میں سچا نہیں ہو سکتا۔ ابراہیم ابن ادہمؒ کہا کرتے تھے کہ میں نے کسی نے ان سے دریافت کیا کہ آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ انس باللہ سے۔ حضرت داؤد علیہ السلام کے اخبار میں ہے کہ مخلوق میں سے کسی سے مانوس مت ہو، میں دو شخصوں کو اپنے سے ملکہ رکھوں گا، ایک وہ شخص جس نے یہ سمجھا کہ میرے ثواب میں تاخیر ہے اس لئے فی الحال عمل کی کیا ضرورت ہے، اور دوسرا وہ شخص جس نے مجھے فراموش کیا اور اپنے حال پر راضی ہوا۔ اور اس کی علامت یہ ہے کہ میں اسے اس کے نفس کے سپرد کر دتا ہوں، اور دنیا میں حیران و پریشان چھوڑ دیتا ہوں۔ آدمی جس قدر اللہ تعالیٰ سے مانوس ہوتا ہے اسی قدر غیر سے مانوس ہوتا ہے، اور جس قدر غیر سے مانوس ہوتا ہے اسی قدر اللہ سے وحشت میں مبتلا ہوتا ہے، اور محبت سے بچھڑتا ہے۔ میں نامی ظلام جس کے واسطے سے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بارانِ رحمت کی دعا کی تھی۔ کے حلق یہ مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے بارے میں بیان فرمایا کہ میں میرا اچھا بندہ ہے، مگر اس میں ایک عیب ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا یا اللہ! وہ عیب کیا ہے؟ فرمایا: اسے خیم بھری پسند ہے، اور وہ اس سے لطف اندوز ہوتا ہے، اور جس شخص کو مجھ سے محبت ہوئی وہ کسی دوسری چیز سے لطف اندوز نہیں ہوتا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ پہلی امتوں میں ایک نیک شخص تھا، جو در دراز جنگل میں تھا ایک مقام پر اللہ کی عبادت کیا کرتا تھا، ایک روز اس نے دیکھا کہ ایک پرندے نے درخت کی شاخوں میں اپنا آشیانہ بنا لیا ہے، اور اس میں بیٹہ کرانی سرلی آواز میں گنے بکھرتا ہے، اس نے دل میں خیال کیا کہ اگر میں اس درخت کے سائے میں اپنی عبادت کا وہاں تو پرندے کی چچھاہٹ سے دل لگا رہے گا، چنانچہ اس نے اس درخت کے سائے میں عبادت شروع کی کہ وہی اللہ تعالیٰ نے اس وقت کے پیغمبر روجی بھیجی کہ فلاح شخص سے کہہ دو کہ اس نے مخلوق سے انیسیت کی ہے، اس کی پاداش میں اس کا درجہ تقرب کم کر دیا گیا اور وہ یہ درجہ اپنے کسی عمل سے کبھی حاصل نہ کر سکے

(۱) یہ روایت پہلے گزری تھی۔

گا۔ ہر حال محبت کی علامت یہ ہے کہ آدمی اپنے محبوب کے ساتھ مناجات میں کمالِ انس حاصل کرے، اور اس کے ساتھ تنہائی میں کمال لذت پائے، اور جو چیز اس کی خلوت کو متاثر کرے، یا لذت مناجات سے دور رکھے اس سے متوحش ہو، انس کی علامت یہ ہے کہ بندے کی عقل اور فہم مناجات کی لذت میں اس طرح فرق ہو جائے جس طرح کوئی شخص اس وقت اپنے ہوش و خرد سے بیگانہ ہو جاتا ہے جب وہ اپنے معشوق سے ہم کلام ہوتا ہے۔ بعض بزرگانِ دین اس لذت میں اس طرح ڈوبے کہ وہ لوگ نماز میں تھے اور ان کے گھر میں آگ لگ گئی لیکن انہیں اس کی خبر تک نہیں ہوئی۔ اسی طرح ایک بزرگ کا پاؤں جو کسی بیماری کی وجہ سے گل گیا تھا نماز کے دوران کاٹ دیا گیا لیکن انہیں اس سانے کا علم بھی نہ ہوا، حقیقت یہ ہے کہ جب آدمی پر محبت اور انس غالب ہو جاتا ہے تو خلوت اور مناجات اس کی آنکھوں کی ٹھنڈک بن جاتی ہے، اور وہ اس کے ذریعے اپنے تمام افکار و مہم وضع کرتا ہے بلکہ انس و محبت اس کے دل پر اس طرح چھائی ہے کہ وہ دنیاوی امور کا ادراک کر نہیں پاتا، جب تک کہ وہ امور اس کی سماعت سے بار بار نہ گزر آئیں۔ جیسے کوئی عاشق بظاہر لوگوں سے گفتگو کرتا ہے، لیکن اس کا باطن اپنے محبوب کی یاد میں مشغول ہوتا ہے، اور اسی سے انس حاصل کرتا ہے، محب حقیقی وہ ہے جسے اپنے محبوب کے علاوہ کسی چیز سے اطمینان اور سکون حاصل نہ ہو، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **الَّذِينَ آمَنُوا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوبُهُمْ بِذِكْرِ اللَّهِ أَلَا بِذِكْرِ اللَّهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ** (پ ۱۳ آیت ۲۸)

جو ایمان لائے اور اللہ کے ذکر سے ان کے دلوں کو اطمینان ہوتا ہے، خوب سمجھ لو اللہ کے ذکر سے دلوں کو اطمینان ہو جاتا ہے۔

حضرت قائدِ فرماتے ہیں کہ میں اس کے ذکر سے خوشی حاصل کرتا ہوں، اور انس پاتا ہوں، گویا انہوں نے یہ واضح فرمایا کہ اطمینان سے مراد دلوں کی خوشی اور قلوب کا انس ہے۔ حضرت ابو بکر الصدیقؓ فرماتے ہیں کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی خالص محبت کا ذائقہ چکھتا ہے وہ طلب دنیا سے بے پروا، اور انسانوں سے متوحش ہو جاتا ہے۔ مطرف ابن ابی بکر کہتے ہیں کہ عاشق کو کبھی اپنے محبوب کے ذکر سے اکٹھا نہیں ہوتی، اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام پر وحی نازل فرمائی کہ وہ شخص دروغ گو ہے جو میری محبت کا دعویٰ کرے، اور جب رات اپنے بازو پھیلائے تو وہ نیند کی آغوش میں چلا جائے، کیا کوئی عاشق ایسا ہو سکتا ہے جو اپنے معشوق کی ملاقات کا حتمی نہ ہو، میں یہاں موجود ہوں جو چاہے مجھے پالے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا یا اللہ! تو کہاں ہے، میں تیرے پاس آنا چاہتا ہوں، ارشاد فرمایا جیسے ہی تو نے میرے پاس آنے کا قصد کیا میرے پاس پہنچ گیا، یعنی ابنِ محاذ کہتے ہیں کہ جو شخص اللہ سے محبت کرتا ہے وہ اپنے نفس سے نفرت کرتا ہے، وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ جس شخص میں یہ تین خصوصیات نہ ہوں وہ محب حقیقی نہیں کہلا سکتا، وہ یہ ہیں کہ اللہ کے کلام کو مخلوق کے کلام پر، اللہ کی ملاقات کو مخلوق کی ملاقات پر، اور عبادت کو مخلوق کی خدمت پر ترجیح دے۔

محبت کی ایک علامت یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی چیز فوت ہو جائے تو اس پر متاسف نہ ہو بلکہ ہر لمحے پر زیادہ سے زیادہ افسوس کرے جو اللہ تعالیٰ کے ذکر اور اس کی اطاعت سے خالی گزر گیا ہو، اور اگر غفلت کی بنا پر ایسا ہو گیا تو بکثرت توبہ و استغفار کرے، اور رحم و کرم کا طالب ہو، بعض عارفین کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے کچھ بندے ایسے ہیں جو اللہ سے محبت کرتے ہیں، اور اسی کے ساتھ خلوت میں سکون محسوس کرتے ہیں، اگر کوئی چیز ان سے فوت ہو جائے تو وہ اس کا غم نہیں کرتے نہ وہ اپنے نفس کی لذت میں مصروف ہوتے ہیں، اس لئے کہ ان کے مالک کا ملک وسیع اور مکمل ہے جو وہ چاہتا ہے مملکت میں وہی ہوتا ہے، جو انہیں ملنے والا ہے وہ ان کے پاس پہنچے گا، اور جو انہیں ملنے والا نہیں ہے اس سے وہ محروم رہیں گے، ان کا مالک ان کے لئے اچھی تدبیریں کرتا ہے، محب کا حق اگر اس سے کوئی غفلت یا کوتاہی سرزد ہو جائے یہ ہے کہ اپنے محبوب کی طرف متوجہ ہو، اور اس کا عتاب دور کرنے کی تدبیر کرے، اور یہ عرض کرے: اے اللہ! میں نے کیا قصور کیا ہے جس کے باعث تیرے احسان کا سلسلہ مجھ سے منقطع ہو گیا ہے، اور تو نے مجھے اپنی بارگاہ کی حاضری سے محروم کر دیا ہے، اور مجھے اپنے نفس اور شیطان کی اتباع میں مشغول کر دیا ہے، اس تدبیر سے ذکر الہی کے لئے دل صاف اور نرم ہو گا، اور گزشتہ کوتاہی کی تلافی ہو گی، گویا یہ غفلت تجرید صفائے قلب اور

تجربہ رقت قلب کا سبب بن جائے گی۔ جب محب اپنے محبوب کے علاوہ کوئی چیز نہیں دیکھتا، صرف اپنے محبوب کو دیکھتا ہے تو کسی چیز کا افسوس نہیں ہوتا، اور نہ کسی بات میں شک کرتا ہے، بلکہ ہر حالت کو پوری رضا سے قبول کر لیتا ہے، اور یہ یقین رکھتا ہے کہ میری تقدیر میں وہی لکھا گیا ہے جو میرے حق میں بہتر ہے۔

وَعَلَىٰ أَنْ تَكُونَ هُوَ أَشْيَا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكَ مِنْ (پ ۱۲ آیت ۲۲)

اور یہ بات ممکن ہے کہ تم کسی امر کو گراں سمجھو اور وہ تمہارے حق میں خیر ہو۔

محبت کی ایک علامت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے راحت پائے، اس سے گرائی یا قہم محسوس نہ کرے، بلکہ ایسا حال ہو جائے جیسا ایک بزرگ کا تھا، فرماتے تھے کہ ہم نے بیس برس رات کو مشقت برداشت کی، اور اب بیس سال سے لذت حاصل کر رہے ہیں، حضرت جنید بغدادیؒ فرماتے ہیں کہ محبت کی علامت دائمی نشاط اور ایسا مسلسل عمل ہے جس سے جسم تھک جائے لیکن دل نہ تھکے، بعض بزرگان دین فرماتے ہیں کہ محبت کے ساتھ کئے گئے عمل سے قہم نہیں ہوتا۔ ایک بزرگ کہتے ہیں کہ کسی محب کو اللہ کی اطاعت سے سیری نہیں ہوتی اگرچہ بڑے وسائل حاصل کر لے، یہ امور مشاہد بھی ہیں، دیکھئے عاشق اپنے معشوق کی محبت میں کسی بھی کوشش سے گریز نہیں کرتا، اور اس کی خدمت کر کے لذت پاتا ہے، اگرچہ وہ خدمت بدن پر شاق ہی کیوں نہ ہو، اور جب جسم محنت و خدمت سے عاجز ہو جاتا ہے تو اس کی بڑی تنہائی ہوتی ہے کہ اسے دوبارہ قدرت مل جائے، اور اس کا مجبور ہو جائے، یہاں تک کہ وہ اپنے محبوب کی خدمت میں اسی طرح مشغول ہو جائے جس طرح وہ پہلے تھا، یہی حال اللہ کی محبت کا ہے، آدمی پر جو محبت غالب ہوتی ہے وہ اس سے کم تر ہڈی کو کاٹ کر دیتی ہے، چنانچہ جس شخص کو سستی اور کسلندی سے زیادہ اپنے محبوب سے محبت ہوگی وہ اس کے مقابلے میں سستی اور کسلندی کو ترک کرنے پر مجبور ہوگا، اور اگر مال سے زیادہ محبوب ہو تو اس کی محبت میں مال چھوڑنے پر مجبور ہوگا۔ ایک محب جس نے اپنا تمام مال قربان کر دیا تھا یہاں تک کہ اس کے پاس کوئی چیز باقی نہیں رہی تھی کسی نے کہا کہ محبت میں تیرا یہ حال کیسے ہو گیا ہے؟ اس نے کہا کہ میں نے ایک دن ایک عاشق کو سنا کہ وہ غلوت میں اپنے معشوق سے کہہ رہا تھا کہ میں بخدا تجھے دل سے چاہتا ہوں، اور تو مجھ سے اعراض کرتا ہے، معشوق نے اس سے کہا اگر تو مجھے دل سے چاہتا ہے تو مجھ پر کیا خرچ کرے گا؟ اس نے کہا کہ پہلے تو جو کچھ میری ملکیت میں ہے میں وہ سب تجھے دیدوں گا، پھر میرے اوپر اپنی جان قربان کر دوں گا تاکہ حیرانِ مجھ سے خوش ہو جائے، ان دونوں کی گفتگو سن کر میں نے دل میں سوچا کہ جب مخلوق کا مخلوق کے ساتھ، اور بندے کا بندے کے ساتھ یہ معاملہ ہے تب بندہ کا اپنے معبود کے ساتھ کیا معاملہ ہونا چاہیے، جب کہ سب کچھ اسی کے باعث ہے، یہی سوچ کر محبت میں میرا یہ حال ہوا۔

محبت کی ایک علامت یہ ہے کہ اللہ کے تمام بندوں کے ساتھ رحمت و شفقت کا معاملہ کرے اور ان لوگوں کے خلاف ہو جو اللہ تعالیٰ کے دشمن ہیں، اور اس کی مرضی کے خلاف عمل کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے نہ

أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ (پ ۱۲ آیت ۲۹)

کافروں کے مقابلے میں سخت ہیں آپس میں مہربان ہیں۔

ایسا کرنے سے اسے کسی ملامت گری ملامت نہ ہو کے، اور نہ اللہ تعالیٰ کے لئے غصہ کرنے میں کوئی چیز رکاوٹ بنے، ایک حدیث قدسی میں اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب بندوں کا یہی وصف بیان کیا ہے، یعنی وہ لوگ جو میری محبت میں اس طرح فریفتہ ہیں جیسے بچہ کسی چیز پر فریفتہ ہوتا ہے، اور میرے ذکر پر اس طرح کرتے ہیں جس طرح بچہ اپنے گھونٹے پر کرتا ہے، اور میرے عہدات کے ارتکاب کے منہ سے اس قدر برا فروخت ہوتے ہیں جیسے بچہ اپنے ہار کو دیکھ کر قرعنا ہے، پھر اسے یہ ہوا نہیں ہوتی کہ آدمی کم ہیں یا زیادہ۔ اس مثال پر غور کرنا چاہیے، جب بچہ کسی چیز پر فریفتہ ہو جاتا ہے تو اس سے جدائی گوارا نہیں کرتا، اور اگر وہ چیز اس سے چھن جاتی ہے تو وہ رونا چلاتا ہے، اور غور مچاتا ہے، اور یہ عمل اس وقت تک جاری رکھتا ہے جب تک وہ چیز دوبارہ اسے نہ مل

جائے، جب وہ سوتا ہے تو اس میں ہند چیز کو اپنے کپڑوں میں چمپا کر سوتا ہے، اور اگر اٹھا آگے کل جاتی ہے تو سب سے پہلے اسی کی طرف لپکتا ہے، اور اگر وہ چیز اپنی جگہ موجود نہ ہو تو روتا ہے، مل جائے تو خوش ہوتا ہے، جو اس سے چھیننے کی کوشش کرتا ہے اس سے ناراض ہو جاتا ہے، اور جو روتا ہے اس سے خوش ہوتا ہے، چپتا فتنے سے اس قدر بے قابو ہوتا ہے کہ بعض اوقات وہ خود اپنے آپ کو ہلاک کر ڈالتا ہے۔

شراب خالص کی جزاء یہ ہیں محبت کی علامات۔ جس شخص میں یہ علامات پورے طور پر ہوتی ہیں، اس کی محبت مکمل اور خالص ہوتی ہے، آخرت میں اس کی شراب خالص اور اس کا ذائقہ شیریں ہو گا، اور جس شخص کی محبت میں غیر اللہ کی محبت کا احتراج ہو جاتا ہے وہ آخرت میں اپنی محبت کے بہتر مزہ حاصل کرے گا، یعنی اس کی شراب میں مقربین کی شراب کی کچھ مقدار بھی ملا دی جائے گی، مقربین کی شراب کیا ہے؟ قرآن کریم میں اس کے حقیقی ارشاد فرمایا گیا ہے :-

إِنَّ الْإِبْرَارَ لَفِي نَعِيمٍ (پ ۳۰ ر ۷ آیت ۳۳) نیک لوگ بے شک آسائش میں ہوں گے۔

اس کے بعد ارشاد فرمایا :-

يُسْقَوْنَ مِنْ رَحِيقٍ مَخْتُومٍ خِتَامُهُ مِسْكٌ وَفِي ذَلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُونَ
وَمِنَ الْجِبِّ نَسِيمٌ عَيْنًا يَشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُونَ (پ ۳۰ ر ۸ آیت ۲۸)

اور ان کو پینے کے لئے شراب خالص جس پر مسک کی مہر کی طے کی، اور حرص کرنے والوں کو ایسی چیز کی حرص کرنی چاہیے اور اس (شراب میں) نسیم کی آمیزش ہوگی، یعنی ایک ایسا چشمہ جس سے مقرب بندے پئیں گے۔ ابراہیم کی شراب اس لئے خالص ہوگی کہ اس میں اس خالص شراب کی آمیزش ہوگی جو مقربین کے لئے مخصوص ہے، شراب کسی مخصوص پینے والی چیز کا نام نہیں ہے، بلکہ اس کا اطلاق جنت کی تمام نعمتوں پر ہوتا ہے، جیسا کہ لفظ کتاب تمام اعمال کو شامل ہے، قرآن کریم میں فرمایا گیا :-

إِنَّ كِتَابَ الْإِبْرَارِ لَفِي عِلْيَيْنَ (پ ۳۰ ر ۸ آیت ۱۸) نیک لوگوں کا نامہ اعمال علین میں ہو گا۔

اس کے بعد ارشاد فرمایا :-

يَشْهَدُ الْمُقَرَّبُونَ (پ ۳۰ ر ۸ آیت ۲۱) جس کو مقرب فرشتے شوق سے دیکھتے ہیں۔

یعنی ان کی کتاب اتنی بلند و بالا ہوگی کہ مقربین بھی اس کا مشاہدہ کریں گے، جس طرح ابراہیم مقربین کی قربت اور ان کے مشاہدے سے اپنی معرفت اور اپنے حال میں اضافہ کرتے ہیں ایسا ہی حال ان کا آخرت میں ہو گا جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :-

مَا خَلَقَكُمْ وَلَا يَعْثُبُكُمْ إِلَّا كُنُفُسٌ وَاحِدَةٌ (پ ۳۱ ر ۳ آیت ۲۸)

تم سب کا پیدا کرنا اور زندہ کرنا اسی ایک نفس کا ہے جیسا ایک شخص کا۔

كَمَا بَدَأْنَا أَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيدُهُمْ (پ ۷ ر ۷ آیت ۱۴۳)

ہم نے جس طرح اول بار پیدا کرنے کے وقت ہر چیز کی ابتدا کی تھی اسی طرح (آسانی سے) اسے دوبارہ پیدا کریں گے۔

جَزَاءُ عَوَاقِبَ (پ ۳۰ ر ۸ آیت ۲۶) اور ان کو پورا پورا بدلہ ملے گا۔

یعنی جزاء اعمال کے موافق ملے گی، خالص عمل کے عوض میں خالص شراب عطا کی جائے گی، اور مخلوط عمل کی جزاء میں مخلوط شراب دی جائے گی، اور یہ اختلاط اسی قدر ہو گا جس قدر اللہ تعالیٰ کی محبت اور عمل میں غیر کی محبت مخلوط رہی ہوگی، ارشاد باری تعالیٰ ہے :-

فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ (پ ۳۰ ر ۲۵ آیت ۷۸)

سو جو شخص دنیا میں ذرہ برابر نیکی کرے گا وہ اس کو دیکھ لے گا، اور جو شخص ذرہ برابر بدی کرے گا وہ اس کو دیکھ لے گا۔

إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنْفُسِهِمْ (پ ۳۸ آیت ۱۱)
 واقعی اللہ تعالیٰ کسی قوم کی (اچھی) حالت میں تغیر نہیں کرنا جب تک وہ لوگ خود اپنی حالت کو نہیں بدل دیتے۔
 إِنَّ اللَّهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ وَإِنْ تَكَ حَسَنَةً فَيضَاعِفْهَا (پ ۵۳ آیت ۳۰)
 بلاشبہ اللہ تعالیٰ ایک ذرہ برابر بھی ظلم نہ کریں گے۔
 وَإِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِنْ خَرْدَلٍ أَتَيْنَا بِهَا وَكَفَىٰ بِنَا حَاسِبِينَ (پ ۷۴ آیت ۴۷)
 اور اگر کسی کا عمل رائی کے دانے کے برابر بھی ہو گا تو ہم اس کو (دہاں) حاضر کر دیں گے اور ہم حساب لینے والے کافی ہیں۔

جس شخص کا مقصد محبت دنیا میں یہ تھا کہ وہ آخرت کی زندگی میں جنت کی نعمتوں اور حور عین کی لذتوں سے ہم کنار ہو گا اور اس کی توقع کے مطابق جنت میں ٹھکانہ دیا جائے گا وہ جہاں چاہے گا رہے گا لڑکوں کے ساتھ کھیلے گا اور عورتوں سے لطف اندوز ہو گا بس آخرت میں اس کی لذت کی انتہائی نعمتیں اور راحتیں ہوں گی اس لئے کہ محبت میں ہر انسان کو وہی ملے گا جس کا وہ متعلق ہو گا اور جس کا مقصود دار آخرت کا مالک رب الارباب اور ملک الملوک ہو گا اور جس پر صرف اس کی خالص اور سچی محبت غالب ہوگی اسے وہ خاص مقام عطا کیا جائے گا جس کا ذکر قرآن کریم میں ہے۔

فَنُفِصِّلُ صِلَقَ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِكٍ مُّقْتَدِرٍ (پ ۵۲ آیت ۵۵)
 ایک عمدہ مقام میں قدرت والے بادشاہ کے پاس۔

اس تفصیل سے ثابت ہوا کہ ابرار باخون میں کھوئیں گے اور جنت کے عالی شان محل میں حورو غلمان سے ہمیں کریں گے اور مقربین اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں محفلت رہیں گے اس کے مشاہدے میں ہمہ تن مصروف رہیں گے اور انہیں اس انعام اور سکون میں جو لذت حاصل ہوگی اس کا ایک حقیر ذرہ بھی وہ جنت کی نعمتوں کے لئے چھوڑنے پر راضی نہیں ہوں گے گویا جو لوگ حکم اور شرمگاہ کی شہوات پوری کرنے میں مشغول ہوں گے وہ ان لوگوں سے مختلف ہوں گے جو رب کریم کی بارگاہ میں بیٹھ کر رب کریم کے دیدار کا شرف حاصل کرتے رہیں گے اسی لئے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

أَكْثَرُ أَهْلِ الْجَنَّةِ يَلْمُؤُوعَلَيْ يَوْمِي لَا كِبَابَ (بزار۔ السنن۔ السرا الاول)

اکثر اہل جنت سادہ لوح ہوں گے اور مقامِ ملئین پر اربابِ دانش فائز ہوں گے۔

ملئین کیا ہے ملئین ایک اعلا مقام ہے عقلیں اس کی محبت سے کام لیں اسی لئے قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا۔

وَمَا أَذْرَاكَ مَا عَلَيْنَا (پ ۳۰ آیت ۸)

آپ کو کچھ معلوم ہے کہ ملئین میں رکھا ہوا نادر اعمال کیا ہے۔

جیسا کہ قاری کے متعلق بھی یہی ارشاد فرمایا گیا۔

النَّارُ عَمَّا الْقَارِعَةُ وَمَا أَذْرَاكَ مَا الْقَارِعَةُ عَمَّا (پ ۳۰ آیت ۸)

وہ کھڑکھڑانے والی چیز! کیسی کچھ ہے وہ کھڑکھڑانے والی چیز اور آپ کو معلوم ہے کیسی کچھ ہے وہ کھڑکھڑانے والی چیز۔

محبت کی ایک علامت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے خوف اور اس کی محبت سے دل لہزاں رہے اور جسم لاغر ہو جائے بعض لوگوں کا خیال یہ ہے کہ خوف اور محبت دو متضاد جذبے ہیں یہ ایک غلط خیال ہے ہرگز ایسا نہیں ہے بلکہ عظمت کے اور اک سے دل میں خود بخود ہیبت پیدا ہوتی ہے جیسے جمال کے اور اک سے محبت پیدا ہوتی ہے خاص محبت کے لئے محبت میں بھی خوف کے بڑے مواقع ہیں محبت نہ کرنے والے یہ مواقع کیا جانتے بعض خوف بعض سے زیادہ شدید ہیں پہلا خوف اعراض ہے اس سے شدید تر خوف حجاب کا ہے پھر ابعاد کا ہے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد مبارک میں یہی خوف ابعاد مراد ہے کہ مجھے سورہ ہود نے

پوڑھا کر دیا (ترغی) کیوں کہ سورہ ہود میں جا بجا اس طرح کی آیات وارد ہیں اَلَا بُعِثْنَا لِنُقْضِہٖ (من لو ہر پھٹکار ہو نمود پر) اَلَا بُعِثْنَا لِنَمْلِیْنِ کَمَا بُعِثْتَ تَمُوْدُ (من لو پھٹکار ہو بدین پر جیسے پھٹکار ہوئی نمود پر) بعد کا خوف اور ذرا سی غصہ کے دل میں زیادہ ہو گا جو قربت سے مانوس ہو گا اور جس نے وصال کا ذائقہ چکھا ہو گا اس لئے جب مہدین کے لئے بھی بعد کی بات ہوتی ہے تو مقررین لرز اٹھتے ہیں اور خوف سے پیلے پڑ جاتے ہیں اور جو غصہ بعد سے مانوس ہوتا ہے وہ قرب کا مشتاق نہیں ہوتا اور نہ وہ غصہ بعد کے خوف سے روتا ہے جو قرب کے بستر پر فروکش نہ ہوا ہو ان تین عقوف کے بعد وقوف (قیامت کے دن حساب کے لئے کھڑے ہونے) کا خوف ہے پھر مراتب میں زیادتی نہ ہونے کا خوف ہے جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ درجات قرب کی کوئی انتہا نہیں ہے اور بندہ کا حق یہ ہے کہ ہر لمحہ اپنے مراتب میں زیادتی کے لئے کوشاں رہے تاکہ زیادہ سے زیادہ قربت حاصل کر سکے۔ اسی لئے سرکارِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :-

مَنْ اسْتَوَى یَوْمَ مَا فُفِّهُوَ مَغْبُورٌ وَمَنْ کَانَ یَوْمَ مُشْرِائِمِنْ اُفْرِسَ فُفِّهُوَ مَلْعُونٌ۔ (بیہقی)

جس کے دونوں دن برابر ہوں وہ خسارے میں ہے اور جس کا آج کل سے برا ہو وہ ملعون ہے۔

نیز یہ بھی ارشاد فرمایا :-

اِنَّہٗ لَیَغْنُ عَلٰی قَلْبِیْ فَاسْتَغْفِرُ اللّٰہَ فِی الْیَوْمِ وَاللَّیْلَةِ سَبْعِیْنِ مَرَّةً۔ (بخاری و مسلم)

میرے دل پر میل آ جاتا ہے تو میں دن اور رات میں ستر مرتبہ استغفار فرماتے تھے کیونکہ ہر پچھلا قدم اگلے قدم کے

مقابلے میں بعد اور دوری تھا سا لیکن کارہ سلوک میں کہیں ٹھہر جانا بھی کسی عذاب سے کم نہیں ہے جیسا کہ ایک حدیث قدسی میں وارد ہے :- ”اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب کوئی عالم میری اطاعت کے مقابلے میں دنیا کی محبت اور شہوات کو ترجیح دیتا ہے تو میں اسے کم سے کم سزا یہ دیتا ہوں کہ اس سے مناجات کی لذت سلب کر لیتا ہوں۔ عام سا لیکن زیادتی درجات سے محض دعویٰ محب یا ان مبادی لطف کی طرف میلان سے محبوب کر دیے جاتے ہیں جو ان پر ظاہر ہوتے ہیں یہی نکر خفی ہے اور اس سے صرف وہی غصہ بچ سکتا ہے جو راہ سلوک میں راسخ قدم ہو اس کے بعد اس چیز کی محبت کا خوف ہے جو ضائع جانے کے بعد دوبارہ حاصل نہیں ہوتی حضرت ابراہیم ابن ابیہم اپنے سفر کے دوران کسی پناہ پر تھے کہ کسی نے یہ شعر پڑھے :-

کُلُّ شَیْءٍ مِّنْکَ مَغْفُوٌّ
قَدْ وَهَبْنَا لَکَ مَافَا
رُسُوۃَیْ الْاَعْرَاضِ عَنَا
ت فَهَبَتْ مَافَاثَ مِنَّا

(تیرا ہر گناہ معاف ہو سکتا ہے سوائے ہم سے اعراض کے تو مجھ سے جو فوت ہوا وہ ہم نے عطا کر دیا اور جو ہم سے فوت ہوا وہ تو دے)۔

یہ شعر سن کر آپ مضطرب ہو گئے اور بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑے چوبیس گھنٹے بے ہوشی طاری رہی اس کے بعد پانچوں کی طرف سے ایک آواز سنی کہ اے ابراہیم! بندہ بن چنانچہ میں بندہ بن گیا اور اضطراب سے کچھ راحت پائی۔ اس کے بعد محبوب سے بے فکر اور لا پرواہ ہو جانے کا خوف ہے عاشق ہمیشہ شوق اور طلب و جستجو میں رہتا ہے اور مزید کی طلب میں سستی نہیں کرتا اور ہر دم لطف تازہ کا منتظر رہتا ہے اگر اس جستجو و طلب سے بے پروا ہو جائے تو پھر سالک ایک مقام پر ٹھہر جائے گا یا اس مقام پر پہنچ کر واپسی شروع کر دے گا اور یہ دونوں ہی باتیں بری ہیں بے پروائی آدمی کے اندر اس طرح سرایت کرتی ہے کہ اسے احساس بھی نہیں ہوتا اسی طرح محبت بھی بعض اوقات چپکے سے دل میں داخل ہو جاتی ہے اور آدمی کو اس کا احساس بھی نہیں ہوتا ان تبدیلیوں کے عقلی آسانی اسباب ہیں انسان کے لئے ممکن نہیں کہ وہ ان کا ادراک کر سکے جب اللہ تعالیٰ کسی انسان کے ساتھ مکرو استدراج کرنا چاہتا ہے تو اس کے قلب پر وارد ہونے والے خیالات اور آثار عقلی کر دیتا ہے

یہاں تک کہ بندہ رجاء میں مبتلا رہتا ہے اور حسن ظن سے دھوکا کھاتا ہے یا اس پر غفلت اور لسان کا قلبہ ہو جاتا ہے یہ تمام امور شیطانی لٹکر ہیں اور علم، عقل، ذکر، بیان وغیرہ کے فرشتوں پر قلبہ حاصل کر لیتے ہیں۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کے اوصاف مختلف ہیں اسی طرح ان کے آثار و مظاہر بھی مختلف ہیں چنانچہ رحمت، لطف، اور حکمت کے اوصاف کا تقاضا یہ ہے کہ بندے میں محبت کے جذبات بڑھوں اور جباریت، عزت، اور استغناء کے اوصاف کا معنی یہ ہے کہ بندے میں بے لگری اور لاپرواہی کے آثار پیدا ہوں بہر حال اللہ تعالیٰ سے بے لگری اور ترقی و درجہات سے بے نیازی بدعتی اور حرام عیسوی کا پیش خیمہ ہے۔

اس کے بعد سالک کو یہ خوف دامن گیر رہتا ہے کہ کہیں اللہ تعالیٰ کی محبت غیر کی محبت سے تبدیل نہ ہو جائے یہ مقام مقت ہے یعنی جب بندہ اس مقام تک پہنچ جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے شدید غضب کا مستحق ٹھہرتا ہے اس مقام کا مقدمہ محبوب حقیقی سے بے پروا ہونا ہے اور اس سے پہلے اعراض و محاب کے مقدمات ہیں اور ان سے پہلے یہ کیفیات طاری ہوتی ہیں کہ اچھے کاموں میں دل نہیں لگتا، ذکر پر اومت سے طبیعت اکتاتی ہے اور اوراد و عطا کے سے پہنچا جاتا ہے ان مقدمات و اسباب کے ظہور کا مطلب یہ ہے کہ آدمی محبت کے مقام سے غضب کے مقام تک پہنچ گیا، ہم اس سے اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہتے ہیں اور ان امور سے خائف رہنا اور اجتناب کرنا صدق محبت کی علامت ہے اس لئے کہ جو شخص کسی چیز سے محبت کرتا ہے اس کے ضائع ہو جانے کے خوف سے مضطرب رہتا ہے، عاشق کا خوف سے خالی ہونا ممکن نہیں بشرطیکہ اس کی پسندیدہ اور محبوب چیز کا ضائع ہو جانا ممکن ہو چنانچہ بعض عارفین کہتے ہیں کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے خوف سے خالی محبت کے ساتھ اللہ کی عبادت کرتا ہے وہ ناز کرتے اور اترانے کے باعث اور اپنی حیثیت سے جاہل رہنے کے سبب ہلاک ہو جاتا ہے اور جو شخص محبت سے خالی خوف کے ساتھ عبادت کرتا ہے وہ بوند اور وحشت سے اپنا تعلق منقطع کر لیتا ہے لیکن جو شخص محبت اور خوف دونوں کے ساتھ محبت کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس سے محبت کرتے ہیں اور اسے اپنے قریب کرتے ہیں اور اسے علم عطا کرتے ہیں غرض یہ ہے کہ عاشق بھی خوف سے خالی نہیں ہوتا اور خائف محبت سے خالی نہیں ہوتا البتہ جس شخص پر محبت غالب رہتی ہے اور وہ اس جذبے میں یہاں تک پہنچ جاتا ہے کہ اسے زیادہ خوف باقی نہیں رہتا اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ شخص مقام محبت میں ہے اس شخص کو عین میں شمار کیا جاتا ہے خوف کی یہ معمولی مقدار محبت کے نشے کو قابو میں رکھتی محبت اور معرفت کی زیادتی کا فعل انسانی طاقت سے باہر ہے البتہ خوف سے ان میں اعتدال پیدا ہو جاتا ہے اور دل پر سہولت کے ساتھ ان کا گذر ہو جاتا ہے روایات میں ہے کہ بعض ابدال نے کسی صدیق سے درخواست کی کہ وہ اس کے لئے اللہ تعالیٰ سے ذبح بھر معرفت عطا کئے جانے کی دعا کر دیں انہوں نے دعا کی وہ بزرگ اس دعا کے بعد اس قدر بے چین و مضطرب ہوئے کہ جنگلوں اور پہاڑوں میں گھل گئے ہوش و حواس کم کر دیئے یہ حال دیکھ کر صدیق نے دعا کی کہ اے اللہ! ذبح بھر معرفت سے کچھ حکم معرفت عطا فرما، ولی آئی کہ ہم نے اپنی ذبح بھر معرفت کا لاکھوں جزء عطا کیا تھا اور اس کی وجہ یہ تھی جب آپ نے اس بندے کے لئے دعا کی اسی وقت ایک لاکھ بندوں نے ہم سے ذبح بھر معرفت عطا کئے جانے کی دعا کی تھی میں نے ان کی دعا قبول کرنے میں تاخیر کی یہاں تک کہ آپ نے اس بندے کے لئے سفارش فرمائی تب میں نے ان لاکھ بندوں کو بھی شرف قبولیت بخشا اور اپنی ذبح بھر معرفت کو ان ایک لاکھ بندوں میں تقسیم کر دیا اس ایک جزء سے اس بندے کا یہ حال ہوا اگر آپ کی دعا کے مطابق پورا ذبح عطا کر دیا جاتا تو کیا حال ہوتا صدیق نے عرض کیا: اے اللہ تو اہم الماکین ہے جو کچھ تو نے عطا کیا ہے اس میں سے کم کر لے اللہ تعالیٰ نے یہ جزء اتنا کم کیا کہ صرف اس کا دس ہزارواں حصہ باقی رہ گیا تب جا کر ان کے ہوش ٹھکانے آئے محبت، خوف، معرفت اور رجاء میں اعتدال پیدا ہوا اور دل پر سکون ہوا اور عارفوں میں شامل ہوئے یہ شعر عارف کے احوال کے بہترین عکاس ہیں :-

قَرِيبُ الْوَجْدِ قَوْمٌ مِمِّي بَعِيدُ
غَرِيبُ الْوَصْفِ قَوْمٌ عَلِيمُ غَرِيبُ
عَنِ الْأَحْزَارِ مِنْهُمْ
كَانَ فَوَاحِشُ رَبُّو الْحَبِيدُ

لَقَدْ عَزَّتْ مَعَانِيهِ وَجَحَتْ
يَرَى الْأَعْيَادَ فِي الْأَوْقَاتِ تَجَرَّى
وَلِلْأَحْبَابِ الْفَرَاخُ بَعِيدٌ
عَنِ الْإِبْصَارِ إِلَّا لِلشَّهِيدِ
لَهُ فِي كُلِّ يَوْمٍ أَلْفٌ عِيدٌ
وَلَا يَجِدُ السُّرُورَ لَهُ بَعِيدٌ

(قریب الوجد ہے اس کا مقصد تمام آزاد و غلام لوگوں سے جدا ہے اس کے اوصاف جدا اور اس کا علم اجنبی ہے اس کا دل لوح حدید کی طرح مضبوط و محکم ہے اس کے مقاصد بلند اور لوگوں کی نگاہوں سے اوچل ہیں صرف اس شخص پر ظاہر ہیں جو دنیا بھرا رکھتا ہے وہ ہر لمحہ پر آن عید کا مشاہدہ کرتا ہے اس کے لئے ہر روز ہزاروں عیدیں ہوتی ہیں احباب کے لئے جو باتیں باعث مسرت ہیں وہ ان سے خوش نہیں ہوتا۔ حضرت جنید بغدادیؒ بھی ماریفین کے احوال سے متعلق کچھ اشعار پڑھا کرتے تھے اگرچہ ان کے مشمولات کا اظہار مناسب نہیں ہے وہ اشعار یہ ہیں۔

سِرْتُ بِأَنْبَاسٍ فِي الْغُيُوبِ قُلُوبُهُمْ
عَرَضًا بِقُرْبِ اللَّهِ فِي ظِلِّ قَلْبِهِ
مَوَارِدُهُمْ فِيهَا عَلَى الْعِزِّ وَالْثَهْلَى
تَرْوُحُ بِعِزِّ مُفَرَّدٍ مِنْ صِفَاتِهِ
وَمِنْ بَعْدِ هَذَا مَائِدَةٍ مِنْ صِفَاتِهِ
سَاكِنٌ مِنْ عِلْمِي بِهِ مَا يَصُونُهُ
وَأَعْطَى عِبَادَ اللَّهِ مِنْهُ حَقُوقَهُمْ
عَلَى أَنْ لِلرَّحْمَنِ سِرًّا يَصُونُهُ

(میں ایسے لوگوں کے ساتھ چلا جن کے دل غیب کی بات جانتے ہیں اور وہ بزرگ و برتر کے قرب میں داخل ایسے میدانوں میں قدم رکھتے ہیں جو اس کے سایہ اقدس میں ہیں وہاں ان کی روحیں اور احوال گہو متی بھرتی ہیں عزت و حکمت ان کے وارد ہونے کی جگہ اور صفات کمال ان کے نکلنے کے مقامات ہیں اس کی صفات کے زیور سے آراستہ اور توحید کے لباس کا رخہ میں وہ آتے جاتے ہیں ان مقامات کے بعد جو مقامات ہیں وہ ناقابل بیان ہیں بلکہ ان کا کتمان زیادہ بہتر اور مناسب ہے میں اپنے علم میں سے وہ باتیں چھپاتا ہوں جنہیں یہ دیکھتا ہوں کہ خدائے برحق چھپاتا ہے اور وہ باتیں ظاہر کرتا ہوں جن کی حق اجازت دیتا ہے ہر گاہ خدا کو صرف اتنا دیتا ہوں جتنا دینا ان کا حق ہے اور انہیں اس چیز سے روک دیتا ہوں جس سے روکنا افضل ہے حق تعالیٰ کے کچھ راز ہیں جنہیں وہ ان لوگوں پر آشکار کرتا ہے جو ان رازوں کے امین اور اہل ہیں باقی لوگوں سے ان رازوں کا مخفی رکھنا ہی بہتر ہے۔)

ان اشعار میں جن معارف کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ان میں تمام لوگوں کا شریک ہونا ممکن نہیں ہے اور نہ یہ جائز ہے کہ اگر کسی پر ان معارف میں سے کچھ منکشف ہو جائے تو وہ ان لوگوں کو آگاہ کر دے جن پر کچھ منکشف نہیں ہوا بلکہ اگر تمام لوگ ان معارف میں شریک ہو جاتے تو یہ دنیا تباہ و برباد ہو جاتی دنیا کی تعمیر اور آبادی کے لئے ضروری ہے کہ ان معارف سے غفلت عام رہے حقیقت تو یہ ہے کہ اگر تمام لوگ صرف چالیس روز تک یہ تہیہ کر لیں کہ وہ حلال کے علاوہ کچھ نہ کھائیں گے تو دنیا ان کے باعث تباہ ہو جائے گی بازار ویران ہو جائیں گے اور معیشت کے ذرائع مسدود ہو جائیں گے بلکہ اگر علماء اہل حلال کا عزم کر لیں تو انہیں اپنے نفس کی مشغولیت کے علاوہ کوئی مشغولیت باقی نہ رہے اور اپنے قلم و قدم کے ذریعے جو علوم وہ دنیا بھر میں پھیلاتے ہیں ان کا

سلسلہ موقوف ہو جائے، لیکن اللہ تعالیٰ کا نظام حکمتوں سے خالی نہیں ہے، بظاہر نہیں جو چیز شرف نظر آتی ہے وہ بھی اسرار و حکم سے خالی نہیں ہے، جس طرح خیر میں بھی بے شمار اسرار و حکمتیں ہیں، جس طرح اس کی قدرت کی کوئی انتہا نہیں ہے اسی طرح اس کی حکمت بھی لامتناہی ہے۔

محبت کی ایک علامت یہ ہے کہ اپنی محبت کو پوشیدہ رکھے، دعووں سے اجتناب کرے، محبت اور وجد کے اظہار سے بچے، اس لئے کہ محبت کو چھپانے ہی میں محبوب کا احترام اور تعظیم ہے، اور اسے چھل رکھنا ہی اس کی جلالت و ہیبت کا مقتضی ہے، اس کے راز کو دوسروں پر ظاہر کرنے سے اسے غیرت آئے گی، محبت محبوب کا ایک راز ہے، راز ہر کس و ناکس کو نہیں بتلائے جاتے، پھر بعض اوقات دعویٰ میں مبالغہ ہو جاتا ہے، اور زبان سے وہ بات نکل جاتی ہے جو حقیقت میں نہیں ہوتی، یہ افتراء اور بہتان ہے، آخرت میں شدید ترین عذاب کا باعث ہے، بلکہ اس افتراء کی سزا دنیا میں بھی مل سکتی ہے، تاہم بھیجی عاشق اپنی محبت میں اس قدر مستغرق اور اس کے نشے میں اتنا چور ہوتا ہے کہ اسے یہ ہوش باقی نہیں رہتا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے، اور کیا کر رہا ہے، اگر وہ محبت کا اظہار کر دے تو اسے معذور سمجھا جائے اس لئے کہ وہ جذبہ محبت سے مغلوب ہے، اور دل کی بات زبان پر لانے پر مجبور ہے، کبھی آتش محبت اس قدر بھڑکتی ہے کہ ارد گرد کی چیزوں کو خاکستر کر دیتی ہے، اور کبھی محبت ایک سیلاب کی طرح وارد ہوتی ہے، یہاں تک کہ آدمی اس میں غرق ہو جاتا ہے، جو شخص محبت چھپانے پر قادر ہے وہ اپنے حال کی عکاسی اس طرح کرتا ہے :-

وَقَالُوا قَرِيبٌ قُلْتُ مَا أَتَاكَ صَاحِبُ
يَقْرَبُ شِعَاعِ الشَّمْسِ لَوْ كَانَ فِيهِ حَجَرٌ
فَمَا لِي مِنْهُ غَيْرُ ذِكْرِ بِخَاطِرٍ
يَهْبِجُ نَارَ الْحُبِّ وَالشَّوْقِ فِي صُلْبِي
(لوگ کہتے ہیں محبوب قریب ہے، میں کہتا ہوں اگر سورج کی شعاع میرے پلوں میں ہو تو میں کیا کروں گا؟)

میرے لئے قول میں اس کی اس قدر یاد کافی ہے جو اپنے میں محبت اور شوق کی آگ بھڑکاتی رہے۔
جو شخص محبت کا راز چھپانے سے عاجز ہے وہ یہ کہتا ہے :-

يُخْفِي فِي بَيْتِي التَّمَعُّ أَسْرَارَهُ
وَيُظْهِرُ التَّوَجُّدَ عَلَيْهِ النَّفْسَ
(وہ چھپاتا ہے، لیکن آنسو اس کے راز اظہار کر دیتے ہیں، اور وجد کی کیفیت اس کے باطن کو نمایاں کر دیتی ہے۔)

وہ اس شعر کے ذریعے بھی اپنی کیفیت کی ترجمانی کرتا ہے :-

وَمَنْ قَلْبُهُ غَيْرُهُ كَيْفَ حَالُهُ
وَمَنْ سِرُّهُ فِي جَفْنِهِ كَيْفَ يَكْتُمُ

(جس کا دل غیر کے ساتھ ہو اس کا حال کیا، اور جس کا راز اس کی چلوں پر رکھا ہو وہ اسے کیسے چھپا سکتا ہے؟)۔

بعض عارفین کہتے ہیں کہ لوگوں میں اللہ تعالیٰ سے بعید ترین شخص وہ ہے جو اس کی طرف اشارہ کرے اس سے مراد وہ شخص ہے جو خواہ مخواہ تکلف سے کام لے کر ہر جگہ اللہ تعالیٰ کی طرف اشارہ کرے، ایسا شخص عین خدا اور عارفین باللہ کے نزدیک مغضوب ہے، ذوالنون مصری اپنے ایک دوست کے پاس گئے جو محبت الہی کا ذکر کیا کرتے تھے، آپ نے انہیں کسی مصیبت میں مبتلا دیکھا اور فرمایا جو شخص اس کی عطا کردہ مصیبت میں لذت پاتا ہے اسے حقیقی محبت نہیں ہوتی، دوست نے جواب دیا کہ میرے خیال سے تو وہ شخص حبیب نہیں ہو سکتا جو محبت میں اپنے نفس کی تعمیر کرے، اس شخص نے اپنی حرکت پر غرور امت کا اظہار کیا، اور اللہ تعالیٰ سے مغفرت چاہی۔

اگر یہ کہا جائے کہ محبت متہائے مقامات ہے، اور اس کا اظہار ایک مقام خیر کا اظہار ہے، اس لئے اظہار محبت سے کیسے انکار کیا جاسکتا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ محبت ایک وصف محمود ہے، اور اس کا خود بخود ظاہر ہو جانا بھی محمود ہے، لیکن اس کا مظاہرہ کرنا مذموم ہے، مظاہرے میں دعویٰ اور استکبار دونوں پائے جاتے ہیں، محبت کا حق یہ ہے کہ اس کی محبت پر اس کے انصاف اور احوال دلالت کریں، نہ کہ اس کے اقوال سے اس کی محبت کا حال ظاہر ہو، محبت ایسی ہونی چاہیے کہ اس کے کسی فعل یا عمل سے یہ ثابت نہ ہو کہ وہ اپنی محبت ظاہر کرنا چاہتا ہے، بلکہ اس کا مقصد ہیشہ یہی ہو کہ محبت کا علم محبوب کے علاوہ کسی اور کو نہ ہونے

پائے یہ خواہش کہ محبوب کے علاوہ بھی کوئی دوسرا اس کی محبت کا دوازا بن جائے شرک فی الحب ہے اور محبت کے خلاف ہے جیسا کہ انجیل میں ہے کہ جب تم صدقہ کرو تو اس طرح کرو کہ تمہارے ہاتھ کو یہ معلوم نہ ہو کہ دائیں ہاتھ نے کیا کیا ہے اس کا بدلہ تمہیں اعلانیہ طور پر وہ دے گا جو پوشیدہ باتیں جان لیتا ہے اور جب تم روزہ رکھو تو منہ دھو کر اور سر پر تل مل کر (تاکہ تروتازہ نظر آوے) اور تمہارے رب کے سوا کسی دوسرے کو تمہارے روزے کا علم نہ ہونے پائے بہر حال قول و فعل دونوں سے محبت کا اظہار مذموم ہے الا یہ کہ محبت کا نشہ غالب ہو اور زبان چل پڑے اعضاء مضطرب ہو جائیں تو ایسا شخص اظہار محبت میں قابل ملامت نہیں ہوتا۔

ایک شخص نے کسی مجنوں کو کسی ایسے حال میں دیکھا جس میں وہ جاہل تھا انہوں نے حضرت معروف کرخئیؒ سے اس کا ذکر کیا معروف کرخئیؒ یہ سن کر ہنسنے اور کہنے لگے کہ اے بھائی اس کے بیشمار محبت کرنے والے ہیں ان میں چھوٹے بھی ہیں اور بڑے بھی عقلمند بھی ہیں اور مجنوں بھی جس شخص کو تم نے دیکھا ہے وہ مجنوں میں سے ہے۔ اظہار محبت میں اس لئے بھی قباح ہے کہ اگر محب عارف ہو گا اور دائمی محبت اور مسلسل شوق کے متعلق فرشتوں کے احوال سے واقف ہو گا اور یہ بات اس کے سامنے ہو گی ۔ یَسْتَبْخُونُ اللَّيْلَ وَنَهَارًا لَا يَفْتَرُونَ۔ (پ ۱۷۲ آیت ۲۰)

شب و روز (اللہ کی) تسبیح کرتے ہیں (کسی وقت) موقوف نہیں کرتے۔

لَا يَعْصُونَ لِلْمَعَالِمِ هُمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ۔ (پ ۲۸ آیت ۶)

وہ نافرمانی نہیں کرتے کسی بات میں جو کچھ ان کو حکم دیا جاتا ہے اور جو کچھ ان کو حکم دیا جاتا ہے وہ فوراً بجا لاتے ہیں۔ تو اسے اپنے نفس کے عجز اور محبت کے دعوئی میں شرمندگی ہوگی اور یہ جان لے گا کہ میں عین میں معمولی درجہ رکھتا ہوں اور میری محبت دوسرے عین خدا کے مقابلے میں انتہائی ناقص ہے ایک صاحب کشف محب خدا فرماتے ہیں کہ میں نے تیس برس تک اللہ تعالیٰ کی اپنی تمام تر قوت اور طاقت کے بقدر عبادت کی یہاں تک کہ مجھے یہ گمان ہو چلا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک میرا کچھ مرتبہ ہے اتنا کہہ کر انہوں نے اپنے طویل مکاشفات بیان کئے اور آسمانی اسرار کے انکشاف کی تفصیل بتلائی اور آخر میں کہا کہ فرشتوں کی ایک جماعت میں پہنچا جن کی تعداد تمام مخلوق کی تعداد کے برابر تھی میں نے ان سے پوچھا کہ تم کون ہو انہوں نے جواب دیا ہم عین خدا ہیں یہاں تین لاکھ برس سے اللہ کی عبادت کر رہے ہیں ہمارے دلوں میں آج تک اس کے سوا کسی کا خیال نہیں آیا اور نہ ہم نے اس کے سوا کسی کا ذکر کیا وہ بزرگ کہتے ہیں میں ان کا یہ جواب سن کر سخت شرمندہ ہوا میں نے اپنے تمام اعمال ان لوگوں کو بہہ کر دئے جو عذاب کے مستحق ہیں تاکہ ان کے عذاب میں تخفیف ہو اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص اپنے رب اور اپنے نفس کی معرفت رکھتا ہے اور اس سے ایسی شرم کرتا ہے جیسی شرم کرنا اس کا حق ہے اس کی زبان دعویٰ محبت سے گونگی ہو جاتی ہے البتہ اس کی حرکات و سکنات اور اقدام و اعراض سے محبت کا پتا چلتا رہتا ہے حضرت جنید بغدادیؒ نے اپنے شیخ حضرت سری سغلیؒ کا حال بیان کیا کہ ایک دفعہ وہ بیمار ہو گئے لیکن نہ ہم ان کی بیماری کا سبب جان پائے اور نہ دوا سے واقف ہو سکے کسی نے ہم سے بتلایا کہ فلاں شخص نہایت تجربہ کار اور حاذق حکیم ہے ہم اس سے رابطہ کریں میں اپنے شیخ کا قارورہ لے کر اس حکیم کے پاس گیا حکیم نے قارورہ دیکھا اور دیر تک دیکھنے کے بعد مجھ سے کہا کہ یہ قارورہ تو کسی عاشق کا معلوم ہوتا ہے میں یہ سن کر رونے لگا اور بے ہوش ہو کر گر پڑا شیشی بھی ہاتھ سے چھوٹ کر گر گئی ہوش آنے کے بعد میں نے اپنے مرشد کی خدمت میں تمام واقعہ عرض کیا یہ واقعہ سن کر مسکرائے اور فرمایا واھنہ وہ حکیم قارورہ خوب پہچانتا ہے اللہ اسے ہلاک کر دے میں نے عرض کیا کیا قارورہ میں بھی عشق ظاہر ہو جاتا ہے فرمایا ہاں قارورے میں بھی ظاہر ہو جاتا ہے ایک مرتبہ حضرت سغلیؒ نے فرمایا : میں چاہوں تو کہہ دوں کہ اسی کی محبت نے میرا گوشت کھلا کھلا کر ہڈیوں سے لگا دیا ہے یہ کہہ کر بے ہوش ہو گئے بے چوٹی سے پتا چلتا ہے کہ آپ نے اپنا راز غلبہ و وجد میں ظاہر کر دیا تھا۔ یہ ہیں محبت کی علامات اور اس کے ثمرات انس و رضا بھی محبت کے ثمرات

ہیں، ان کا بیان مختصر یہ ہے کہ تمام محاسن دین اور مکارم اخلاق محبت کے ثمرات ہیں اگر محبت کا کوئی ثمر نہیں تو وہ اجتماع ہوئی ہے اور اجتماع ہوئی بذاتِ اکل اخلاق میں سے ہے۔

اللہ تعالیٰ کے ساتھ دو طرح کی محبت ہوئی ہے، کوئی اس لئے محبت کرتا ہے کہ اس پر اللہ تعالیٰ کا احسان ہے، اور کوئی صرف اس کے جلال و جمال کے باعث محبت کرتا ہے، اگرچہ اس پر کوئی احسان نہ ہو۔ حضرت جہنم بقدر اوی نے فرمایا کہ محبت میں آدمی دو طرح کے ہیں، ایک عام، اور دوسرے خاص، عام آدمی اللہ تعالیٰ سے محبت اس لئے کرتا ہے کہ وہ اس کے عظیم تراحمات اور بے پایاں العامات کا مشاہدہ کرتا ہے، اور اس کی محبت کے علاوہ کوئی چارہ نہیں پاتا، تاہم عوام الناس کی محبت میں احسان میں کمی بیشی کے اعتبار سے کمی بیشی ہوتی رہتی ہے، اور خواص اس لئے محبت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی شان عظیم ہے، وہ علم، قدرت، اور حکمت والا ہے، اور سلطنت میں یکتا ہے، جب وہ اس کی صفات کمال اور اس لئے محبت کا مشاہدہ کرتے ہیں تو اس سے محبت کے بغیر نہیں رہتے، کیوں کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس محبت کا مستحق ہے، اگرچہ اس نے انہیں اپنی کسی نعمت کا اہل نہ سمجھا ہو، اور تمام احسانات سے الگ رکھا ہو، بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو خواہشات نفس، اور دشمن خدا انہیں سے محبت کرتے ہیں، اور بدنامی کے حالت پر سمجھتے ہیں کہ ہم ہمیں خدا ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جن میں محبت کی نہ کوہ بالا علامات نہیں ہوتیں، یا خلاق، رباء اور ناموری کے لئے وہ خدا اور دشمن خدا کی محبت میں تلبیس کر دیتے ہیں، ان کا مقصد دعویٰ مخلوط کا حصول ہے، حالانکہ وہ اس کے برخلاف ظاہر کرتے ہیں، جیسے طلعت سو، اور قراء سو، یہ لوگ زمین میں اللہ کے مغضوب ہیں۔ سل مستری جب کسی انسان سے گفتگو کرتے ہیں تو اسے اے دوست! اے حبیب! کہتے، کسی نے ان سے دریافت کیا کہ آپ ہر شخص کو حبیب کیوں کہتے ہیں، ہو سکتا ہے وہ شخص آپ کا حبیب نہ ہو، آپ نے سائل کے کان میں فرمایا کہ وہ مومن ہے تو اللہ کا دوست ہے، اور منافق ہے تو انہیں کا دوست ہے، ابو تراب بھی محبت کی علامات کے سلسلے میں فرماتے ہیں :-

لَا تَتَّخِذْ عِزًّا فَلِلْحَبِيبِ دَلَائِلُ
وَلَيَكُنْ مِنْ تَحَفِ الْحَبِيبِ وَسَائِلُ
مِنْهَا نِعْمَةٌ بِمَرِّ بَلَاءٍ
وَالْفَقْرُ أَكْرَامٌ وَبِئْسَ عَاجِلُ
وَمِنْ الدَّلَائِلِ أَنْ تَرَى مِنْ عِزِّهِ
طَوَّعَ الْحَبِيبِ وَإِنْ لَحَ الْعَاذِلُ
وَمِنْ الدَّلَائِلِ أَنْ يَرَى مُتَنَبِّهًا
وَالْقَلْبُ فَيَكُونُ مِنَ الْحَبِيبِ بَلَائِلُ
وَمِنْ الدَّلَائِلِ أَنْ يَرَى مُتَنَقِّشًا
مُتَحَقِّظًا مِنْ كُلِّ مَاهُو قَائِلُ

(تم دھوکے میں مت آنا حبیب کے لئے دلائل اور علامات ہیں، اور اس کے پاس حبیب کی جانب سے وسائل کے تحفے ہیں، ان میں سے ایک دلیل مصیبت کی تخی سے مزہلنا ہے، اور محبوب کے ہر کام سے خوش ہونا، اگر محبوب سے کچھ نہیں ملتا تو اسے ہی علیحدہ سمجھ کر قبول کر لیتا ہے، فقر کو اکرام اور بھلائی تصور کرتا ہے، ان دلائل میں سے ایک یہ ہے کہ تم اطاعت محبوب کے لئے اس کا مرم رکھتے ہو، اگرچہ لوگ ملامت کے تیوں سے چھلکی کرتے ہوں، ایک دلیل یہ ہے کہ وہ ہنسا مسکراتا نظر آتا ہے، اگرچہ دل محبوب کی جدائی سے خون کے آنسو رہا ہو اور ایک دلیل یہ ہے کہ تم اسے زبان سے نکلنے والے ہر لفظ میں مخلوط اور محتاط دیکھتے ہو۔)

یہی ابن معاذ نے حب خدا کی چند علامات ان اشعار میں بیان فرمائی ہیں :-

وَمِنْ الدَّلَائِلِ أَنْ تَرَاهُ مُسْتَمِرًّا
وَمِنْ الدَّلَائِلِ حُزْنُهُ وَتَحِيبُهُ
وَمِنْ الدَّلَائِلِ أَنْ تَرَاهُ مُسَافِرًّا
فِي خِرْقَتَيْنِ عَلَى شَطُوطِ السَّاحِلِ
خَوْفُ الظَّلَامِ فَمَا لَهُ مِنْ عَائِلِ
نَحْوُ الْجِهَادِ وَكُلِّ فِعْلٍ فَاضِلِ

وَمِنْ الدَّلَائِلِ زُهْدُهُ فِيمَا يَرَى
وَمِنْ الدَّلَائِلِ أَنْ تَرَاهُ مُسْلِمًا
وَمِنْ الدَّلَائِلِ أَنْ تَرَاهُ بَاكِيًا
وَمِنْ الدَّلَائِلِ أَنْ تَرَاهُ رَاضِيًا
وَمِنْ الدَّلَائِلِ ضَحْكُهُ بَيْنَ النُّورَى
مِنْ كُلِّ الْأُمُورِ الْمَلِيكِ الْعَادِلِ
أَنْ تَقْدَرَاهُ عَلَى قَبِيحٍ فَعَائِلِ
بِمَلِيكِهِ فِي كُلِّ حَكِيمٍ نَازِلِ
وَالْقَلْبُ مَحْزُونٌ كَقَلْبِ الشَّائِلِ

(علامات محبت میں سے ایک علامت یہ ہے کہ تم اسے دو محبتوں میں لپٹا ہوا ساحل سمندر پر چست چست قدم اٹھاتا ہو دیکھتے ہو، اور ایک علامت رات کی تاریکی میں جب کہ کوئی ملامت کرنے ہو اس کا حزن اور آہ زاری ہے، اور ایک یہ کہ تم اسے جہاد اور ہر ایک عمل کے لئے پایہ رکاب دیکھتے ہو، اور ایک علامت ذلت کے گھر اور فنا ہو جانے والی نعمتوں سے اس کا نہد ہے، اور ایک علامت یہ ہے کہ وہ تمام امور کو شہنشاہ عادل کے سپرد کرتا ہے، اور ایک دلیل یہ ہے کہ تم اسے برائی کے مناظر پر روتے ہوئے دیکھتے ہو، اور ایک علامت یہ ہے کہ تم اسے ہر فیصلے میں اپنے مالک اور آقا سے راضی پاتے ہو، اور ایک علامت یہ ہے کہ وہ لوگوں کے مجمع میں ہنستا ہے جب کہ غم سے اس کا دل پھٹا جاتا ہے۔)

النس باللہ کے معنی

ہم نے بیان کیا ہے کہ النس 'خوف' اور شوق محبت کے آثار ہیں، تاہم یہ مختلف آثار ہیں، اور محب پر ان کا وقوع اس کی نظر اور قلب کیفیت کے باعث مختلف ہوا کرتا ہے، بعض اوقات محب مجاہدائے غیب سے متہائے جمال کے ظہور کا متعلق ہوتا ہے، اور اپنے آپ کو کنہ جلال پر مطلع ہونے سے عاجز سمجھتا ہے، اس وقت دل طلب مشغول ہوتا ہے، اور قلب میں کچھ پائے کی ایک ایسی کیفیت پیدا ہوتی ہے جسے شوق کہتے ہیں، اور بعض اوقات محب پر قربت کی خوشی غالب ہوتی ہے، اور دل پر اس قربت سے جمال و جلال کی جو کیفیات کشوف ہوتی ہیں ان میں مشغول ہوتا ہے، انہی کیفیات سے لذت حاصل کرتا ہے، جو چیز اب تک حاصل نہیں ہوئی اس کی طرف التفات نہیں کرتا، اس سرور کو النس کہتے ہیں، بعض اوقات محب کی نظر محبوب کی صفات عزت، استقامت اور بے نیازی پر ہوتی ہے، اور یہ خیال بھی دامن گیر ہوتا ہے کہ قربت زائل ہو سکتی ہے، اور بعد واقع ہو سکتا ہے، اس خیال سے دل کو تکلیف ہوتی ہے، اس کیفیت کو شوق کہتے ہیں۔ یہ تمام احوال ملاحظات کے تابع ہیں، اور یہ ملاحظات ان اسباب کے تابع ہیں جو ان ملاحظات کے مقتضی ہیں، اور یہ اسباب بے شمار ہیں۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ مطالعہ جمال سے قلب کے خوش ہونے کا نام النس ہے، جب یہ سرور غالب ہوتا ہے اور جو چیز غائب ہوتی ہے اس کا خیال نہیں رہتا، اور نہ دل پر بعد یا سلب کا کوئی خوف گذرتا ہے اس وقت یہ سرور نہایت لذت اور الفت بخفا ہے۔ ایک بزرگ سے سوال کیا گیا کہ کیا تم مشتاق ہو؟ فرمایا شوق تو ان چیزوں کا ہوتا ہے جو نگاہوں سے اوچھل ہوں، اور جب کسی کے لئے غائب حاضر ہو تو پھر وہ کس چیز کا مشتاق ہو گا؟ اس سے ثابت ہوا کہ وہ بزرگ ان چیزوں کو پا کر اس قدر خوش تھے، اور اس خوشی میں اس قدر مدہوش تھے کہ جو چیزیں انہیں حاصل نہ تھیں ان کی طرف بھی التفات نہ تھا، جس شخص پر النس کی حالت غائب ہوتی ہے وہ صرف تمنا کی اور غلوت کا مشتاق ہوتا ہے، جیسا کہ حضرت ابراہیم ابن ادہم سے کسی نے پوچھا کہ آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟ وہ اس وقت پہاڑ سے اتر کر آئے تھے، انہوں نے جواب میں فرمایا کہ میں انس باللہ کی طرف سے آیا ہوں، انس کی حالت رکھنے والے تمنا کی اس لئے چاہتے ہیں کہ انہیں غیر اللہ سے وحشت ہوتی ہے، بلکہ ہر اس چیز سے قوحش ہوتا ہے جو غلوت کے مانع ہو، روایت ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ نے گفتگو فرمائی تو کچھ عرصے تک آپ کی یہ کیفیت رہی کہ اگر کانوں میں کوئی بشری آواز پہنچتی تو بے ہوش ہو جاتے، اس لئے کہ محبت کی وجہ سے محبوب کا کلام اس قدر لذیذ اور شیریں معلوم ہوتا ہے کہ

دوسرے کلام کی لذت و وحالت باقی نہیں رہتی۔ اسی لئے بعض حکماء اپنی وعایش کما کرتے تھے۔ اے وہ ذات جس نے مجھے اپنے ذکر سے انس بخشا، اور جس نے مجھے اپنی مخلوق سے متوحش کیا، اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام سے فرمایا میرا مشتاق بن، مجھ سے مانوس ہو جا اور میرے غیر سے وحشت کر۔ حضرت رابعہ مصریہ سے پوچھا گیا کہ آپ نے یہ مرتبہ کیسے حاصل کیا ہے؟ فرمایا غیر ضروری امور ترک کر کے اور خدائے لم یزل سے مانوس ہو کر، عبدالواحد ابن زید کہتے ہیں کہ میرا گذر ایک راہب کے پاس سے ہوا، میں نے اس سے کہا اے راہب تجھے تمنا ہی بہت زیادہ پسند ہے، راہب نے جواب دیا اگر تو بھی تمنا ہی کا مزہ چکھ لے تو اپنے آپ سے بھی متوحش ہو جائے تمنا ہی اصل عبادت ہے، میں نے پوچھا اے راہب تمنا ہی میں تجھے کم سے کم کیا فائدہ محسوس ہوتا ہے؟ راہب نے کہا تمنا ہی میں کم سے کم فائدہ یہ ہے کہ میں لوگوں کی طرح شاہد اور ان کے شر سے محفوظ رہتا ہوں، میں نے اس سے دریافت کیا کہ بندہ انس باللہ کی حالت کب پاتا ہے؟ اس نے جواب دیا جب محبت خالص ہو، اور معاملہ صاف ہو، میں نے پوچھا محبت کب خالص ہوتی ہے؟ اس نے جواب دیا جب تمام افکار کا مرکز اللہ کی اطاعت بن جائے، بعض حکماء کا قول ہے لوگوں پر تعجب ہوتا ہے کہ وہ کیسے تیرا محض چاہتے ہیں، لوگوں کے دلوں پر حیرت ہوتی ہے کہ وہ تجھ سے اعراض کر کے تیرے غیر سے مانوس ہوتے ہیں۔

انس کی علامت انس کی مخصوص علامت یہ ہے کہ لوگوں کے ساتھ ملنے جلنے، اٹھنے بیٹھنے میں دل عقلی محسوس کرے، اور ان سے پریشان ہو، ذکر الہی کی حلاوت کا متلاشی، اور یاد الہی کی لذت کا حریص ہو، اس صورت میں اگر وہ لوگوں سے ملے جلے گا بھی تو ایسا ہو گا جیسے کوئی جماعت میں تنہا ہو، تمنا ہی میں لوگوں کے ساتھ ہو، وطن میں مسافر ہو، اور سفر میں مقیم ہو، غائب ہونے کی حالت میں موجود ہو، اور موجود ہوتے ہوئے غائب ہو یعنی جسم کے ساتھ لوگوں میں ہے، مگر متعلق ہے، لیکن دل اللہ کی یاؤں متعلق ہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے ایسے لوگوں کے متعلق فرمایا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جن پر حقائق امور ہجوم کئے ہوئے ہیں جو یقین کی دولت سے مالا مال ہیں، مالدادوں نے جس امر کو دشوار تصور کیا اسے ان لوگوں نے سہل سمجھا، یہ لوگ اس ذات سے مانوس ہوئے جس نے جہلاء وحشت کرتے ہیں، وہ دنیا میں صرف جسموں کے ساتھ ہیں، ان کی روحیں طہاء اعلا میں متعلق ہیں، یہ لوگ لیکن میں اللہ کے خلیفہ، اور اس کے دین کی دعوت دینے والے ہیں۔ یہ ہیں انس کے معنی، اس کی علامت، اور اس کے شواہد، بعض حکمین انس، شوق اور محبت کا انکار کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں اللہ کے لئے انس، شوق اور محبت ثابت کرنا شبہ پر دلالت کرتا ہے، یہ لوگ دراصل اس جبل میں چلتا ہیں کہ بشار کا اور اک بصیرت کے کھڑا رک سے زیادہ مکمل ہوتا ہے، ان منکرین میں سرفہرست احمد ابن غالب ہیں جو غلام خلیل کے نام سے شہرت رکھتے ہیں یہ شخص حضرت جنید بغدادی اور حضرت ابوالحسن نوری کے شوق، محبت اور عشق کا انکار کیا کرتا تھا۔ اسی قسم کے بعض سرپرے لوگوں نے مقام رضا کا بھی انکار کر دیا، اور کہنے لگے کہ صبر کے علاوہ کوئی مقام نہیں ہے، رضا کا تصور نہیں کیا جاسکتا، حالانکہ یہ ایک ناقص خیال ہے، اور کسی ایسے ہی شخص کا ہو سکتا ہے جو مقامات دین پر مطلع نہیں ہے، اور صرف ظاہری خول کو دین سمجھتے ہوئے ہے، اور یہ سمجھتا ہے کہ ظاہری چمکا ہی سب کچھ ہے، یہ لوگ محسوسات کے اسیر ہیں، اور محسوسات دین کے نقطہ نظر سے صرف چمکے ہیں، مغز ان چمکوں کے بعد ہے، جو شخص اخروث کو محض چمکا تصور کرتا ہے اس کے نزدیک اخروث کی حیثیت ایک گڑی سے زیادہ نہیں ہے، اگر کوئی شخص اس سے یہ کہے کہ اس سے تل لگا ہے تو یہ انکشاف اس کے نزدیک حیرت انگیز ہے، یہ شخص مغرور ہے، اگرچہ اس کا عذر قبول نہیں کیا جاسکتا، ایک شاعر کے بقول :-

الْإِنْسُ بِاللَّهِ لَا يَخْوُهُ نَطَالٌ وَلَيْسَ يَذْكُرُهُ بِالْحَوْلِ مُحْتَالٌ
وَالْإِنْسُونُ رَحَالٌ كَلَّكُهُمْ نُجْبٌ وَكَلَّهْمُ صَفْوَةُ اللَّهِ عَمَالٌ

(انس باللہ اہل باطل کے شایان شان نہیں ہے، اور نہ کوئی حیلہ گرفتاری کے بل پر انس حاصل کر سکتا ہے)

انس والے تمام کے تمام لوگ شریف ہیں، اور تمام کے تمام اہل صدق و صفا ہیں۔)

غلبہٴ انس کے نتیجے میں ہونے والا انبساط اور اولال جب انس دائمی ہو جاتا ہے اور غلبہ و استحکام حاصل کر لیتا ہے اور اسے شوق مضطرب نہیں کرتا اور نہ تغیر و محاب کا خوف اس کا مزہ خراب کرتا ہے تو اس وقت قول و فعل اور اللہ کے ساتھ مناجات میں ایک طرح کا انبساط اور کشادگی پیدا ہوتی ہے، بعض اوقات یہ انبساط اس لئے برا لگتا ہے کہ اس میں جرأت پائی جاتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ صاحب انبساط کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی ہیبت کم ہے، لیکن جو شخص مقام انس میں معین ہوتا ہے اس کی یہ جرأت برداشت کر لی جاتی ہے اور جو شخص اس مقام پر نہیں ہوتا اور وہ محض اہل انس کی تقلید میں ایسا کرتا ہے تو وہ ہلاک ہو جاتا ہے اور کفر کے قریب پہنچ جاتا ہے اس کی مثال میں یرخ اسود کی مناجات ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ بنی اسرائیل سے قحط کا عذاب دور کرانے کے لئے یرخ اسود سے دعا کی درخواست کریں بنی اسرائیل تقریباً سات سال سے اس قحط میں گرفتار تھے اس حکم سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام ستر ہزار نفوس کا ایک کارواں لے کر جنگل میں پہنچے تھے اور باری تعالیٰ سے باران رحمت کی دعا کی تھی اللہ تعالیٰ نے جواب میں ارشاد فرمایا تھا اے موسیٰ! میں ان لوگوں کی دعا کیسے قبول کروں گا۔ گناہوں کی تاریکی انہیں گھرے ہوئے ہے ان کے دل سیاہ باطن خبیث ہیں وہ مجھ سے بے یقینی کے ساتھ دعا کرتے ہیں اس کے باوجود وہ میری پکڑ سے محفوظ ہیں جاؤ میرے ایک بندے کے پاس جاؤ اس کا نام یرخ ہے اس سے نکلنے کے لئے کوئٹہ میں دعا قبول کروں گا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کے متعلق لوگوں سے دریافت کیا کسی کو اس کے حال کی خبر نہ تھی ایک دن حضرت موسیٰ علیہ السلام کسی رستے سے گزر رہے تھے کہ اچانک ایک سیاہ بد ظلم نظر آیا اس کی پیشانی پر دونوں آنکھوں کے درمیان جھڑوں کے اثر سے مٹی لگی ہوئی تھی اور اس نے ایک چادر گلے میں باندھ رکھی تھی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے نور الہی کے ذریعے معلوم کر لیا کہ یہ شخص یرخ اسود ہے آپ نے اسے سلام کیا اور اس سے اس کا نام دریافت کیا اس نے کہا میرا نام یرخ ہے آپ نے فرمایا تو ایک مدت سے ہمارا مطلوب بنا ہوا ہے ہمارے ساتھ چل اور بارش کی دعا کر چنانچہ وہ شخص حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ گیا اور اس نے یہ دعا کی اے اللہ! نہ تیرا یہ کام ہے اور نہ یہ تیرا علم ہے تجھے کیا ہوا کہ تو نے اپنے چشمے خشک کر دیے ہیں یا ہواؤں نے تیری اطاعت سے انکار کر دیا ہے یا تیرے پاس جو ذخیرہ آب ہے وہ ختم ہو گیا ہے یا گناہ گاروں پر تیرا غضب شدید ہو گیا ہے کیا تو گناہگاروں کی تخلیق سے پہلے غفار نہیں تھا کیا تو نے رحمت پیدا نہیں کی اور شفقت کا حکم نہیں دیا کیا تو ہمیں دکھانا چاہتا ہے کہ تجھ تک کسی کی رسائی نہیں ہے یا تجھے مخلوق کے بھاگ جانے کا اندیشہ ہے اور اس خوف سے جلد از جلد سزا دینا چاہتا ہے غرض وہ شخص اسی طرح کی باتیں کہتا رہا یہاں تک کہ بارش برسنے لگی اور اللہ تعالیٰ نے صرف آدھے دن میں اس قدر گھاس پیدا کر دی کہ لوگوں کے گھٹنے چھونے لگی یرخ اس دعا کے بعد واپس چلا گیا جب حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ملاقات ہوئی تو اس نے پوچھا کہ آپ کو اللہ تعالیٰ سے میرا جھگڑا اور میرے ساتھ اس کا انصاف پسند آیا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کچھ کہنے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یرخ مجھ سے دن میں تین مرتبہ ہنسی مذاق کرتا ہے۔

حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ بصرے میں چند جمونہڑے جل کر راکھ ہو گئے صرف ایک جمونہڑا باقی رہ گیا جو ان جلے ہوئے جمونہڑوں کے درمیان واقع تھا ان دنوں حضرت ابو موسیٰ اشعریؒ بصرے کے حکمراں تھے آپ کو اس واقعے کی خبر دی گئی آپ نے اس جمونہڑے کے مالک کو بلا کر پوچھا کہ تیرا جمونہڑا کیوں نہیں جلا اس نے جواب دیا کہ میں نے اللہ تعالیٰ کو یہ قسم دی تھی کہ وہ میرا جمونہڑا نہ جلائے حضرت ابو موسیٰ اشعریؒ نے فرمایا کہ میں نے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے فرمایا کرتے تھے نہ

يَكُونُ فِي أُمَّتِي قَوْمٌ شَعَتَرُوا سَهْمَهُمْ ذَنَسَتْهُ تِيَابَهُمْ لَوْ أَقْسَمُوا عَلَى اللَّهِ لَا يَزِرُهُمْ (ابن ابی الدنیا)
میری امت میں ایسے لوگ ہوں گے جن کے بال الجھے ہوئے اور لباس میلا ہو گا اگر وہ لوگ اللہ کو قسم دیں گے تو اللہ ان کی قسم ضرور پوری کرے گا۔

حضرت حسن بصریؒ نے یہ واقعہ بھی نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ بصرے میں آگ لگ گئی، ابو حنیفہؒ خواص آئے، اور آگ پر چلنے لگے بصرے کے امیر نے ان سے کہا کہ آپ آگ سے دور رہیں، کہیں آگ کو جلانہ والے، ابو حنیفہؒ نے جواب دیا کہ میں نے اللہ تعالیٰ کو قسم دی ہے، مجھے کہ آگ جلانے نہ پائے، امیر نے کہا تب آپ اللہ کو یہ قسم بھی دیں کہ آگ بجھ جائے، آپ نے قسم دی، اور آگ بجھ گئی۔ ایک دن ابو حنیفہؒ کہیں جا رہے تھے، راستے میں ایک دکانی شخص نظر آیا جو اپنے حواس میں نہیں تھا، آپ نے اس سے پوچھا کہ تجھے کیا ہوا؟ اس نے عرض کیا کہ میرا گدھا کم ہو گیا ہے، اور اس کے علاوہ میرے پاس کوئی دوسرا گدھا نہیں ہے، راوی کہتے ہیں کہ ابو حنیفہؒ یہ سن کر ٹھہر گئے، اور کہنے لگے، اے اللہ! حیرت کی قسم! میں اس وقت تک اگلا قدم نہیں اٹھاؤں گا جب تک اس شخص کا گدھا واپس نہیں مل جائے گا، راوی کہتے ہیں کہ اسی وقت وہ گدھا نظر آیا، اور ابو حنیفہؒ آگے بڑھ گئے، اس طرح کے واقعات اہل انس کو پیش آتے ہیں، دوسروں کو یہ اجازت نہیں ہے کہ وہ اہل انس کی تقلید میں اپنی زبان سے جرح و تعدیل نہ نکالیں اور کفر کے قریب ہو جائیں، حضرت جلیل الدین کہتے ہیں کہ اہل انس اپنی متنگیوں میں اپنی حاجات میں، اور اپنی تمنائوں میں ایسی باتیں کر جاتے ہیں کہ وہ عام لوگوں کے حق میں کفر ہوتی ہیں، ایک مرتبہ یہ فرمایا کہ اگر حوام الناس اہل انس کی باتیں سن لیں تو انہیں کافر کہہ دیں، حالانکہ وہ اس طرح کی باتوں سے درجہات میں ترقی پاتے ہیں، یہ باتیں انہیں کو نصب دینی ہیں، اور یہ امر مستبعد نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک ہی بات پر اپنے کسی بندے سے راضی ہو، اور کسی بندے سے ناراض، لیکن اس سلسلے میں شرط یہ ہے کہ دونوں کے عقائد مختلف ہوں، قرآن کریم کی ہمت سی آیات میں اس موضوع پر اشارات ملتے ہیں، اگر تم فہم و بصیرت سے کام لو تو قرآن کریم کے تمام قصوں میں تمہارے لئے حیثیات ہیں، تاکہ تم ان سے عبرت حاصل کر سکو، اور غلط فہمی میں مبتلا لوگوں کے لئے صرف داستانیں ہیں، چنانچہ حضرت آدم علیہ السلام اور ابلیس کا قصہ، لجنے، دونوں مصیبت اور مخالفت میں شریک تھے، لیکن ابلیس اس مصیبت کی بنا پر راہِ راستہ کو گمراہ ہوا، اور رحمت حق سے دور ہوا، اور حضرت آدم علیہ السلام کے متعلق ارشاد فرمایا نہ

وَعَصَى آدَمُ الرَّجُلَ الْفَعْوَى، ثُمَّ اجْتَبَاهُ رَبُّهُ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدَى۔ (پ ۱۱، آیت ۳۱، ۳۲)

اور آدم سے اپنے رب کا تصور ہو گیا، سو غلطی میں پڑ گئے، پھر ان کو ان کے رب نے (زبانہ) قبول فرمایا سو

اس پر توجہ فرمائی، اور راہ (راست) پر (پیش) قائم رکھا۔

ایک شخص کی طرف توجہ کرنے، اور دوسرے شخص سے غمہ موڑنے پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب فرمایا گیا، حالانکہ بزرگی میں دونوں برابر تھے مگر احوال دونوں کے مختلف تھے، چنانچہ ایک شخص سے اعراض کرنے پر ان الفاظ میں تنبیہ فرمائی نہ

وَأَمَّا مَنْ جَاءَكَ يَسْعَى وَهُوَ يَخْشَى، فَأَنْتَ عَنْهُ تَلَهَّى۔ (پ ۳۰، آیت ۸، ۹)

اور جو شخص آپ کے پاس (دین کے حق میں) دوڑتا ہوا آتا ہے اور وہ (خود سے) ڈرتا ہے آپ اس سے بے

انتہائی کرتے ہیں۔

اور دوسرے شخص پر پوری توجہ مبذول کرنے پر یہ تنبیہ فرمائی نہ

أَمَّا مَنْ اسْتَعْطَى فَأَنْتَ لَهُ تَضَلَّى، (پ ۳۰، آیت ۵، ۶)

(اور) جو شخص (دین سے) بے ہودائی کرتا ہے آپ اس کی تو گمراہی پڑتے ہیں۔

اسی طرح بعض لوگوں کے ساتھ آپ کو ہم غلطی کا حکم دیا گیا نہ

وَإِذَا جَاءَكَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِآيَاتِنَا فَقُلْ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ، (پ ۱۳، آیت ۵۴)

اور یہ لوگ جب آپ کے پاس آئیں جو کہ ہماری آیتوں پر ایمان رکھتے ہیں تو یوں کہہ دیجئے کہ تم پر سلامتی ہو۔

وَاضْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ بِالْعَدَاةِ وَالْغَيْبِ يُدْعُوهُمُ، (پ ۱۵، آیت ۲۸)

اور آپ اپنے کو ان لوگوں کے ساتھ مقید رکھا کیجئے جو صبح و شام اپنے رب کی عبادت محض اس کی رضا جوئی کے لئے کرتے ہیں۔

اور بعض دوسرے لوگوں سے اعراض کرنے کا حکم دیا :-

وَلَا رَأْيَ لَ الَّذِينَ يَخُوضُونَ فِي آيَاتِنَا فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتَّى يَخُوضُوا فِي حَدِيثٍ غَيْرِهِ وَإِمَّا يُنسِيَنَّكَ الشَّيْطَانُ فَلَا تَعْقُدْ بِهِ أَذْكُرَىٰ مَعَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ۔ (پ ۷ ر ۳ آیت ۶۸)

اور جب تو ان لوگوں کو دیکھے جو ہماری آیات میں مہم جوئی کر رہے ہیں تو ان لوگوں سے کنارہ کش ہو جا یہاں تک کہ وہ کسی اور بات میں لگ جائیں، اور اگر تجھ کو شیطان بھلا دے تو یاد آئے کے بعد پھر ایسے ظالم لوگوں کے ساتھ مت بیٹھ۔

انبساط اور ناز بھی بعض بندوں سے برداشت کیا جاتا ہے، بعض سے نہیں کیا جاتا، چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حالت انس کے انبساط میں عرض کیا تھا :-

إِنْ هِيَ إِلَّا فِتْنَتُكَ تُضِلُّ بِهَا مَنْ تَشَاءُ تُهْدِي مَنْ تَشَاءُ۔ (پ ۹ ر ۹ آیت ۱۵۵)

یہ واقعہ آپ کی طرف سے محض ایک امتحان ہے، ایسے امتحانات سے جس کو چاہیں آپ گمراہی میں ڈال دیں اور جس کو چاہیں آپ ہدایت پر قائم رکھیں۔

جب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ حکم دیا :-

اذْهَبْ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ۔ (پ ۲۲ ر ۱۰ آیت ۲۳) فرعون کی طرف جا۔

تو حضرت موسیٰ نے اس کے جواب میں یہ مذہب پیش کئے :-

وَلَهُمْ عَلَيَّ ذَنْبٌ فَأَخَافُ أَنْ يَقْتُلُونِ۔ (پ ۲۲ ر ۱۰ آیت ۲۴)

اور میرے ذمے ان لوگوں کا ایک جرم بھی ہے سو مجھ کو اندیشہ ہے کہ وہ لوگ مجھ کو قتل نہ کر دیں۔

إِنِّي أَخَافُ أَنْ يُكَلِّبُونِ۔ (پ ۲۲ ر ۱۰ آیت ۲۵) مجھے اندیشہ ہے کہ وہ مجھ کو جھٹلائے لگیں۔

وَيَضْحَكُ ضَلِيلٌ وَلَا يَنْطَلِقُ لِسَانِي۔ (پ ۲۲ ر ۱۰ آیت ۲۶)

اور میرا دل ٹھک ہوئے لگا ہے اور میری زبان (ابھی طرح) نہیں چلتی۔

إِنَّا نَخَافُ أَنْ يُفْرِطَ عَلَيْنَا أَوْ أَنْ يَطْعَمِي۔ (پ ۲۲ ر ۱۰ آیت ۲۷)

ہم کو اندیشہ ہے کہ کہیں وہ ہم پر زیادتی نہ کر بیٹھے یا یہ کہ زیادہ شرارت نہ کرنے لگے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے علاوہ اگر یہ اعذار کوئی دوسرا پیش کرتا تو یہ بے ادبی ہوتی، لیکن کہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام مقام انس میں تھے اس لئے ان کے یہ اقوال برداشت کئے گئے، جو محض اس مقام میں ہوتا ہے اس کے ساتھ نرمی برتی جاتی ہے، اور اس کی ہمت سی باتیں برداشت کی جاتی ہیں۔ دوسری طرف حضرت یونس علیہ السلام ہیں، یہ بھی ایک جلیل القدر مجتہد ہیں، مگر آپ کا مقام انس کا مقام نہیں تھا، بلکہ بیت و قبض کا مقام تھا، چنانچہ ان کی ایک معمولی بات بھی برداشت نہیں کی گئی، اور انہیں تین دن تین رات چھلی کے تاریک پیٹ میں مقید رکھا گیا، اور قیامت تک کے لئے ان کے حق میں یہ اعلان کر دیا گیا :

لَوْلَا أَنْ تَدَارَكَهُ نِعْمَةٌ مِّنْ رَبِّهِ لَنُبِذَ بِالْعَرَاءِ وَهُوَ مَذْمُومٌ۔ (پ ۳۹ ر ۳ آیت ۳۹)

اگر احسان خداوندی سے ان کی دھمیری نہ ہوتی تو وہ میدان میں بد حالی کے ساتھ ڈالے جاتے۔

حضرت حسن بصریؒ کی رائے کے مطابق عراء سے قیامت کا میدان مراد ہے، سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت یونس علیہ

السلام کی اقتداء کرنے سے منع فرمایا گیا :-

فَاضْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوتِ إِذْ نَادَىٰ وَهُوَ مَكْظُومٌ (پ ۱۹ ر ۴ آیت ۳۸)
تو آپ اپنے رب کی (اس) تجویز پر صبر سے بیٹھے رہے اور مچھلی والے پیغمبر کی طرح نہ ہوئے جب کہ انہوں نے دعا کی تھی اور وہ غم سے گھٹ رہے تھے۔

ان اختلافات میں سے بعض احوال اور مقامات کے اختلاف کی وجہ سے ہوتے ہیں اور بعض اس لئے کہ اہل میں بدوں کے لئے ایک دوسرے پر فضیلت رکھی گئی ہے اور قسمتوں میں فرق رکھا گیا ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :-

وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيِّينَ عَلَىٰ بَعْضٍ (پ ۶ ر ۱۵ آیت ۵۵)

اور ہم نے بعض نبیوں کو بعض پر فضیلت دی ہے اور ہم داؤد علیہ السلام کو زور دے چکے ہیں۔

مِنْهُمْ مَنْ كَلَّمَ اللَّهُ مَرَّةً وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجَاتٍ (پ ۳ ر ۱ آیت ۲۵)

بعض ان میں سے وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہوتے ہیں اور بعضوں کو ان میں سے بہت سے درجوں پر سرفراز کیا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا شمار ان ہی برگزیدہ پیغمبروں میں ہوتا ہے جنہیں فضیلت عطا کی گئی ہے اور اسی لئے انہوں نے بطور ناز اپنے اوپر سلام بھیجا قرآن کریم نے ان کے سلام کی ان الفاظ میں حکایت کی ہے :-

وَالسَّلَامُ عَلَيَّ يَوْمَ وُلِدْتُ وَيَوْمَ أَمُوتُ وَيَوْمَ أُبْعَثُ حَيًّا (پ ۱۱ ر ۵ آیت ۳۳)

اور مجھ پر سلام ہے جس روز میں پیدا ہوا جس روز میں لوگوں کا اور جس روز زندہ کر کے اٹھایا جاؤں گا۔

یہ بات ان کی زبان مبارک سے اس انبساط کے بعد نکلے جو انہیں مقام انس میں پہنچنے کے بعد اللہ تعالیٰ کی مہربانی اور لطف و عنایت سے حاصل ہوا تھا دوسری طرف حضرت یحییٰ امین زکریا علیہ السلام ہیں یہ اولو العزم بیت وحیا کے مقام پر تھے اس لئے ان کی زبان خاموش رہی یہاں تک کہ خالق تعالیٰ نے خود ہی ان کی توصیف فرمائی تھ

وَسَلَامٌ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ وَيَوْمَ يَمُوتُ وَيَوْمَ أُبْعَثُ حَيًّا (پ ۱۱ ر ۴ آیت ۱۵)

اور ان کو (اللہ تعالیٰ کا سلام) پہنچے جس دن کہ وہ پیدا ہوئے اور جس دن کہ وہ انتقال کریں گے اور جس دن کہ زندہ کر کے اٹھائے جائیں گے۔

یہ بھی غور کرو کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کی خطائیں اور اپنے پیغمبر بھائی کے ساتھ ان کا رویہ کیسے برداشت کیا بعض علماء نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد ”وَإِذْ قَالَ الْيُوسُفُ لِأَخُوهُ أَحَبُّ إِلَيَّ لِمُنَا مَنَّا“ سے ”گناہوں“ میں الزام دینے تک برادران یوسف کی تقریباً چالیس خطائیں شمار کی ہیں ان میں سے بعض خطائیں بعض سے بڑی ہیں اور ایک ایک کلمے میں تین تین چار چار خطائیں جمع ہو گئی ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی تمام خطائیں معاف فرمائیں اور ان کو مغفرت سے نوازا۔ لیکن حضرت عزیر علیہ السلام نے تقدیر کے مطلق ایک سوال کر لیا تھا اس پر ان کی سخت پکڑ کی گئی یہاں تک کہا گیا ہے کہ اس سوال کے باعث وہ انبیاء کے صف میں نہیں رہے اسی طرح بلعام ابن باعوراء ایک زبردست عالم تھا لیکن اس کا یہ عمل برداشت نہیں کیا گیا کہ وہ دین کے ذریعے دنیا کما تا ہے حضرت سلیمان علیہ السلام کا ایک وزیر اسراف پسند شخص تھا اور اصحاء کی معصیت میں مبتلا تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کی مغفرت فرمائی نہایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام پر وحی نازل فرمائی کہ اے عابدوں کے سردار اور زاہدوں کے رہنما کے فرزند تھمارا خالہ زاد بھائی کب تک میری معصیت میں مبتلا رہے گا میں ہر بار تحمل کرتا ہوں اور اس کے ہر گناہوں سے صرف نظر کرتا ہوں میں اپنی عزت و جلال کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر میری آمد میں سے کوئی آدمی چل پڑی تو میں اسے اس کے ساتھ والوں کے لئے عبرت اور بعد والوں کے لئے عذاب بنا کے

چھوڑوں گا۔ آصف حضرت سلیمان علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے ان سے وحی کا ذکر فرمایا : یہ سن کر آصف اٹھے اور باہر نکل کر ایک اونچے ٹیلے پر ہوئے، اپنا چہرہ اور منہ آسمان کی طرف کیا، اور عرض کیا اے اللہ! تو تو ہے، اور میں میں ہوں اگر تو نے مجھے توبہ کی توفیق نہ بخشی تو میں کیسے توبہ کروں گا، اور اگر تو نے مجھے گناہوں سے نہ بچایا تو میں کیسے گناہوں سے بچ سکوں گا اللہ تعالیٰ نے وحی بھیجی کی اے آصف! تو نے سچ کہا، تو تو ہے، اور میں میں ہوں، تو توبہ کی طرف متوجہ ہو، میں نے تیری توبہ قبول کر لی ہے، اور میں توبہ قبول کرنے والا اور رحم کرنے والا ہوں۔ آصف کا یہ کلام ایسا ہے جیسے کوئی نازکے طور پر کہتا ہو، ایک حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے کو بچانے کے لئے وحی بھیجی، وہ بندہ اپنے گناہوں کے باعث ہلاکت کے قریب پہنچ چکا تھا، اللہ تعالیٰ نے اس سے فرمایا کہ اے میرے بندے! تو نے بت سے ایسے گناہ میرے سامنے کئے ہیں جنہیں میں نے معاف کر دیا ہے، جب کہ ان سے کم تر گناہوں کے باعث بعض امتوں کو تباہ و برباد کر دیا ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ بندوں میں متفیل، تقدیم اور تاخیر کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ کی یہی سنت ہے، اور یہ اس کی حیثیت ازلی کے مطابق ظہور پذیر ہوا کرتی ہے، قرآن کریم میں قصص اسی لئے وارد ہوئے ہیں کہ تم ان کے ذریعے سابقہ امتوں کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ کی سنت کا علم حاصل کرو، قرآن کریم میں کوئی آیت ایسی نہیں ہے جو ہدایت، نور، اور تعارف نہ ہو، کبھی اللہ تعالیٰ ان آیات کے ذریعے اپنی تقدیس کا تعارف کراتا ہے، اور فرماتا ہے نہ

قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ اللَّهُ الصَّمَدُ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ (پ ۳۰ ر ۳۰ آیت ۱-۲-۳-۴)

آپ کہہ دیجئے کہ وہ یعنی اللہ ایک ہے، اللہ بے نیاز ہے اس سے نہ اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد ہے، اور نہ کوئی اس کے برابر ہے۔

اور کبھی ان سے اپنی صفات جلال کا تعارف کراتا ہے نہ

الْمَلِكُ الْقَلُوسُ السَّلَامُ الْمُؤْمِنُ الْمُهِمِّنُ الْعَزِيزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ - (پ ۲۸ ر ۲۸ آیت ۲۳)

وہ بادشاہ ہے، پاک ہے، سالم ہے، امن دینے والا ہے، تمکبانی کرنے والا ہے، زہدست ہے، خرابی کا درست کرنے والا ہے، بڑی عظمت والا ہے۔

کبھی ان کے سامنے اپنے وہ افعال رکھتا ہے جو خوف و رجا کے حامل ہیں، انہیں انبیاء اور اعداء کے سلسلے میں اپنی سنت سے واقف کراتا ہے نہ

الَّذِينَ كَفَرُوا فَعَلْنَا بِهِمْ ذُنُوبَهُمْ فَجَاءَهُمُ الْعَذَابُ - (پ ۳۰ ر ۳۰ آیت ۷-۸)

کیا آپ کو معلوم نہیں کہ آپ کے پروردگار نے قوم عاد یعنی قوم ارم کے ساتھ کیا معاملہ کیا جن کے قدم قامت ستونوں جیسے تھے۔

الَّذِينَ كَفَرُوا فَعَلْنَا بِهِمْ ذُنُوبَهُمْ فَجَاءَهُمُ الْعَذَابُ - (پ ۳۰ ر ۳۰ آیت ۱)

کیا آپ کو معلوم نہیں کہ آپ کے رب نے ہامی والوں کے ساتھ کیا سلوک کیا۔

قرآن کریم انہی تین اقسام کے مضامین پر مشتمل ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات اور تقدیس ذات کی معرفت اس کی صفات اور اس کی معرفت اور بندوں کے ساتھ اس کے افعال اور سنت کی معرفت، کیوں کہ سورۃ اخلاص ان تین قسموں میں سے ایک یعنی تقدیس پر مشتمل ہے، اسی لئے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے تمام قرآن قرار دیا، اور فرمایا نہ

مَنْ قَرَأَ سُورَةَ الْاِخْلَاصِ فَقَدْ قَرَأَ ثُلُثَ الْقُرْآنِ - (احمد - ابی ابن کعب)

جس شخص نے سورۃ اخلاص کی تلاوت کی اس نے تمام قرآن کی تلاوت کی۔

سورۃ اخلاص تقدیس باری تعالیٰ کا مکمل تعارف ہے، اس لئے کہ متہائے تقدیس ہے کہ وہ تین امور میں یکساں منقول ہو، ایک توبہ

کہ اس سے پیدا ہونے والا کوئی اس کا حل نہ ہو، اس پر کلمہ لکھ کر دلالت کرتا ہے، اور دوسرا یہ کہ وہ اپنے حل سے حاصل نہ ہوا ہو، اس پر کلمہ لکھ کر دلالت ہوتی ہے، اور تیسرا یہ کہ کوئی اس کے درجے میں نہ ہو، اس امر پر کلمہ لکھ کر دلالت ہوتی ہے، یہ تینوں امور ایک آیت میں جمع ہو گئے، قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ حقیقت میں سورہ اخلاص کلمہ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ کی تفسیر و توضیح ہے۔ یہ قرآن کریم کے اسرار و رموز ہیں، اور ان کی کوئی انتہا نہیں ہے، اللہ تعالیٰ خود ارشاد فرماتا ہے نہ

وَلَا رَظْبٌ وَلَا يَآبَسُ إِلَّا فِي كِتَابٍ مَبْنُوعٍ۔ (پ ۷ ر ۳۳ آیت ۵۹)

اور نہ کوئی تر اور خشک چیز مگر یہ سب کتاب مبین میں ہیں۔

اسی لئے حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ نے ارشاد فرمایا قرآنی علوم کی جستجو کرو، اور اس کے عجائب تلاش کرو، اس میں اولین و آخرین کے علوم موجود ہیں، ان کا یہ قول بالکل صحیح ہے، جو شخص قرآن کریم کے ایک ایک کلمے کو نہایت غور سے پڑھتا ہے اور اسے سمجھنے کی کوشش کرتا ہے وہی اس قول کی صداقت کا اعتراف کر سکتا ہے، بشرطیکہ اس کا فہم صاف ہو، اس صورت میں قرآن کریم کا ہر لفظ یہ شہادت دیتا ہے کہ وہ قادر مطلق، خدائے جبار، اور ملک قہار کا کلام ہے، اور انسانی طاقت سے باہر ہے، عام طور پر یہ اسرار قرآنی قصص و حکایات میں پوشیدہ ہیں، جنہیں ان کے استنباط کا حریص ہونا چاہیے، تاکہ تم پر وہ عجائب منکشف ہو جائیں جن کے سامنے دنیا کے علوم پچ نظر آتے ہیں۔ یہ ہے اس کی تفصیل اور اس انبساط کا بیان جو اس کا ثمر ہے اس ضمن میں ہم نے بعدوں کے تفاوت کا ذکر بھی کیا ہے۔ صحیح علم اللہ ہی کو ہے۔

اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر راضی ہونا، رضا کی حقیقت اور فضائل

رضا بھی محبت کے ثمرات میں سے ایک ثمر ہے، مقام رضا مقربین کے اعلا مقامات میں سے ایک مقام ہے، لیکن اکثر لوگوں پر اس کی حقیقت منکشف نہیں ہے، اس کے معنی و مفہوم میں جو تشابہ اور ابہام ہے اس پر صرف وہ لوگ مطلع ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے تاویل کا علم دیا ہے اور دین کی سمجھ بھلا فرمائی ہے، بعض لوگ رضا کا انکار کرتے ہیں، ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ آدمی اس امر پر کیسے راضی ہو سکتا ہے جو اس کی خواہش کے خلاف ہو، وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر ہر حکم، ہر فیصلے، اور ہر چیز سے راضی ہونا اس لئے ضروری ہے کہ وہ اللہ کا فعل ہے تو یہ بھی ضروری ہے کہ بندہ کفر اور معصیت پر بھی راضی ہو، بعض نادان لوگ منکرین رضا کے اس قول سے دھوکا کھا گئے ہیں، اور یہ سمجھنے لگے ہیں کہ فسق و فجور پر راضی رہنا، اور کفر و معصیت پر انکار و اعتراض نہ کرنا تسلیم و رضا کا مقام ہے، یہ اسرار الہی ہیں، اگر دین کے یہ اسرار محض ظاہر احکام کی سماعت یا قرأت سے واضح ہو جایا کرتے تو سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کے حق میں یہ دعانہ فرماتے نہ

اللَّهُمَّ فِقْهُمْ فِي الدِّينِ وَعَلِّمُهُمُ التَّوْبَةَ۔ (بخاری و مسلم و احمد)

اے اللہ اے دین کی سمجھ اور تاویل کا علم عطا کیجئے۔

پہلے ہم رضا کے فضائل بیان کریں گے، پھر اصحاب رضا کے واقعات اور احوال ذکر کریں گے پھر حقیقت رضا پر روشنی ڈالیں گے، اور یہ بتلائیں گے کہ خواہش کے خلاف ہونے والے فیصلے پر آدمی کیسے راضی ہو سکتا ہے، آخر میں بعض ایسے امور کا ذکر کریں گے جو رضا کا تختہ سمجھے جاتے ہیں جیسے دعانہ کرنا، یا معاصی پر خاموش رہنا۔ حالانکہ یہ امور رضائیں داخل نہیں ہیں۔

رضا کے فضائل قرآن کریم میں جا بجا رضا کے فضائل بیان کئے گئے ہیں، مثال کے طور پر نہ

رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ۔ (پ ۳۰ ر ۲۳ آیت ۸)

اللہ تعالیٰ ان سے خوش رہے گا اور وہ اللہ سے خوش رہیں گے۔

هَلْ جَزَاءُ الْإِحْسَانِ إِلَّا الْإِحْسَانُ۔ (پ ۷ ر ۳۳ آیت ۶۰)

بملا غایت اطاعت کا بدلہ بجز عنایت کے اور بھی کچھ ہو سکا ہے۔

احسان کی انتہا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بندے سے راضی ہو اور یہ اللہ تعالیٰ سے بندے کی رضا کا اجر ہے۔ ایک جگہ ارشاد فرمایا :-
وَمَسَاكِينُ طَبَقَاتٍ مِّنْ جَنَّاتٍ عَذْنٍ - (پ ۲۸ ر ۹ آیت ۴)
اور عمدہ مکانوں میں جو ہمیشہ رہنے کے باغوں میں ہوں گے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے رضا کو جنات عدن سے اعلا قرار دیا ہے ایک جگہ ذکر کو نماز پر فوقیت دی گئی ہے۔ فرمایا :-
إِنَّ الصَّلَاةَ تَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ وَلَذِكْرُ اللَّهِ أَكْبَرُ - (پ ۲۱ ر ۱۱ آیت ۳۵)
بے شک نماز بے حیالی اور ناشائستہ کاموں سے روکتی ہے اور اللہ کی یاد بہت بڑی چیز ہے۔

چنانچہ جس طرح نماز میں ذات مذکور کا مشاہدہ نماز سے اعلا و ارفع ہے اسی طرح خالق جنت کی رضا جنت سے اعلا ہے بلکہ یہی رضا اہل جنت کی غایت اور ان کا اصل مقصود ہے حدیث شریف میں ہے کہ اللہ تعالیٰ مومنین کے لئے تجلٰی فرمائے گا اور ان سے کہے گا مجھ سے مانگو! وہ عرض کریں گے ہمیں اپنی رضا عطا کر (بزار، طبرانی۔ انس) دیدار کے بعد رضا کا سوال اس کی فضیلت پر اہم دلیل ہے جہاں تک رضائے عہد کا تعلق ہے ہم عنقریب اس کی حقیقت بیان کریں گے اس وقت ہم رضائے الہی پر گفتگو کرتے ہیں رضائے الہی کے تقریباً وہی معنی ہیں جو محبت الہی کے ضمن میں بیان کئے جا چکے ہیں جہاں تک اس کی اصل حقیقت کا سوال ہے اس کا انکشاف جائز نہیں ہے کیونکہ مخلوق اس کے سمجھنے سے قاصر ہے اور جو شخص سمجھنے پر قادر ہے اسے خود بخود اس حقیقت کا علم ہو جاتا ہے اسے بتلانے کی ضرورت نہیں ہے اہل جنت کے لئے باری تعالیٰ کے دیدار سے بڑی کوئی نعمت نہیں ہے اس کے باوجود انہوں نے رضا کا سوال کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ رضائے الہی سے وہ نعمت دائمی ہو سکتی ہے جو انہیں میسر ہے دیدار الہی کو انہوں نے اپنا مقصود اور مطلوب جانا اور جب ان سے کہا گیا کہ وہ جو مانگنا چاہیں مانگیں تو انہوں نے ایسی چیز مانگی جو ان کے مطلوب کو دائمی بنا سکے وہ یہ بات جان گئے کہ رضائے الہی سے دائمی طور پر حجاب مرفوع ہو سکتا ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :-
وَلَدَيْنَا مَزِيدٌ - (پ ۱۷ ر ۱۷ آیت ۳۵)

اور ہمارے پاس اور بھی بہت زیادہ (نعمت) ہے۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ وقت مزید میں اہل جنت کے پاس رب العالمین کی طرف سے تین تحفے آئیں گے ایک تحفہ ایسا ہو گا کہ اس جیسا کوئی تحفہ ہاشمہ گان جنت کے پاس نہیں ہو گا اس تحفے کا ذکر قرآن کریم کی اس آیت میں ہے :-
فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا أُخْفِيَ لَهُم مِّن قُرَّةِ أَعْيُنٍ - (پ ۲۱ ر ۱۵ آیت ۱۷)
سو کسی شخص کو خبر نہیں جو آنکھوں کی ٹھنڈک کا سامان اپنے لوگوں کے لئے خزانہ غیب میں موجود ہے۔
دوسرا تحفہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے سلام کا ہو گا یہ پہلے ہدئے سے افضل ہے اس کا ذکر قرآن کریم کی اس آیت میں ہے :-

سَلَامٌ قَوْلًا مِّن رَّبِّ رَحِيمٍ - (پ ۲۳ ر ۳ آیت ۵۸)

ان کو پورود گار کی طرف سے سلام فرمایا جائے گا۔

تیسرا تحفہ یہ ہو گا کہ اللہ تعالیٰ اہل جنت سے ارشاد فرمائے گا کہ میں تم سے راضی ہوں یہ تحفہ پہلے اور دوسرے دونوں تحفوں سے افضل ہو گا قرآن کریم میں ہے :-

وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللَّهِ أَكْبَرُ - (پ ۱۰ ر ۱۵ آیت ۷۲)

اور اللہ تعالیٰ کی رضامندی سب سے بڑی چیز ہے۔

یعنی اللہ تعالیٰ کی رضا ان تمام نعمتوں سے افضل ہے جو انہیں میسر ہے اس سے معلوم ہوا کہ رضائے الہی ایک افضل ترین نعمت ہے اور رضائے الہی بندہ کی رضا کا ثمر ہے۔

روایات میں بھی رضا کی قبیلت وارد ہے، ایک حدیث میں ہے کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض صحابہ سے دریافت کیا کہ تم لوگ کیا ہو؟ انہوں نے عرض کیا کہ ہم مومن ہیں، آپ نے ان سے دریافت کیا کہ تمہارے ایمان کی علامت کیا ہے؟ انہوں نے عرض کیا کہ ہم معصیت کے وقت مبر کرتے ہیں، اور فرائی پر شکر کرتے ہیں، اور قضاء کے موقع پر راضی رہتے ہیں، آپ نے فرمایا: رب کعبہ کی قسم! تم مومن ہو۔ (۱) بعض روایات یہ ہیں:-

حُكَمَاءُ عُلَمَاءُ كَانُوا مِنْ فِقْهِهِمْ لَنْ يَكُونُوا أَنْبِيَاءَ (۲) طُوبَى لِمَنْ بَدَى
لِلْإِسْلَامِ مَوْكَانَ رِزْقِهِ كَقَافَاوَرٍ ضَمِي بِهِ (۳)

حکیم عالم ایسے ہیں قریب ہے کہ اپنی سمجھ سے انبیاء ہو جائیں خوش خبری ہو اس شخص کے لئے جو اسلام کے لئے ہدایت کیا گیا، اور اس کا رزق بعد اور کفایت ہے، اور وہ اس پر راضی ہے۔

مَنْ رَضِيَ مِنَ اللَّهِ تَعَالَى بِالْقَلِيلِ مِنَ الرِّزْقِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى مِنْهُ بِالْقَلِيلِ مِنَ الْعَمَلِ (حامی۔ علی ابن ابی طالب)

جو شخص تمہارے رزق پر اللہ تعالیٰ سے راضی ہو جاتا ہے اس سے اللہ تعالیٰ تمہارے عمل پر راضی ہو جاتا ہے۔

إِذَا أَحَبَّ اللَّهُ عَبْدًا ابْتَلَاهُ فَإِنْ صَبَرَ اجْتَبَاهُ فَإِنْ رَضِيَ اصْطَفَاهُ (۴)
جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے محبت کرتا ہے تو اسے معصیت میں مبتلا کرتا ہے اگر وہ مبر کرتا ہے تو اس کو برگزیدہ کرتا ہے اور راضی ہوتا ہے تو مصطفیٰ کرتا ہے۔

ایک طویل حدیث میں ہے، سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب قیامت کا دن ہو گا تو اللہ تعالیٰ میری امت کے ایک گروہ کو ہال و پڑ عطا فرمائے گا اور وہ اپنی قبروں سے اڑ کر جنت میں پہنچ جائیں گے، وہاں عیش کریں گے اور مزے اڑائیں گے، فرشتے ان سے دریافت کریں گے کہ کیا تم نے حساب دیکھا ہے، وہ کہیں گے ہم نے کوئی حساب نہیں دیکھا، فرشتے کہیں گے کہ کیا تم نے کُلِ صراطِ عبور کر لیا، وہ جواب دیں گے ہم نے کُلِ صراطِ عبور نہیں دیکھا، وہ پوچھیں گے کیا تم نے دوزخ دیکھی ہے، وہ کہیں گے ہم نے کچھ نہیں دیکھا، فرشتے سوال کریں گے کہ تم کس پیغمبر کی امت میں سے ہو، وہ کہیں گے ہم سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں سے ہیں، فرشتے کہیں گے ہم تمہیں قسم دیتے ہیں تم ہمیں یہ بتاؤ کہ دنیا میں تمہارے اعمال کیسے تھے، وہ کہیں گے ہم میں دو خصلتیں تھیں، جن کی وجہ سے ہم نے یہ بلند درجہ حاصل کیا، ایک یہ کہ جب ہم تھا ہوتے تو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے حیا کرتے، دوسری یہ کہ ہماری تقدیر میں جو کچھ لکھا گیا تھا ہم اس پر راضی رہتے، فرشتے کہیں گے اگر تمہارے اندر یہ دو خصلتیں تھیں تو تمہارا حال بھی ہونا چاہیے (ابن حبان۔ انس) ایک حدیث میں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:-

يَا مَعْشَرَ الْفُقَرَاءِ اعْطُوا اللَّهَ الزَّصَامَ مِنْ قُلُوبِكُمْ تَنْظُرُوا بِشَوَابٍ فَقَرِكُمْ وَالْأَفْلَا
(۵)

اے گروہ فقراء! اللہ تعالیٰ کو اپنے دلوں سے رضا دو، تاکہ تمہیں اپنے فکر کا ثواب ملے، اگر ایسا نہ کرو گے تو ثواب نہ پاؤ گے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی روایات میں ہے کہ نبی اسرائیل نے ان سے درخواست کی کہ ہمارے لئے اپنے رب سے کوئی ایسا کام معلوم کر لیجئے کہ جب ہم وہ کام کریں تو اللہ ہم سے راضی ہو، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی خدمت میں عرض کیا اے

اللہ! جو کچھ یہ کہتے ہیں آپ نے سنا اللہ نے فرمایا اے موسیٰ! ان سے کہہ دو کہ مجھ سے راضی رہیں تاکہ میں ان سے راضی رہوں۔
 سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ارشاد سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے فرمایا :-
 مَنْ أَحَبَّ أَنْ يَعْلَمَ مَالَهُ عِنْدَ اللَّهِ عَزَّ وَجَلَّ فَلْيَنْظُرْ مَالَهُ عَزَّ وَجَلَّ فَإِنَّ اللَّهَ
 تَبَارَكَ وَتَعَالَى يُنْزِلُ الْعَبْدَ مِنْ حَيْثُ أَنْزَلَهُ الْعَبْدُ مِنْ نَفْسِهِ (ماہم - جامع)
 جو شخص یہ جانتا چاہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کا کیا مرتبہ ہے وہ یہ دیکھے کہ اس کے یہاں اللہ کی کیا
 محبت ہے، اس لئے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ بندہ کو اپنے یہاں اسی مرتبے پر رکھتا ہے جو مرتبہ بندہ اللہ تعالیٰ کو
 اپنے یہاں دیتا ہے۔

حضرت داؤد علیہ السلام کے اخبار میں ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا : میرے اولیاء کو دین کا غم نہیں ہوتا، اس لئے کہ دنیاوی تفکرات
 ان کے دلوں سے مناجات کی لذت و حلاوت ضائع کر دیتے ہیں۔ اے داؤد! میں نے دوستوں سے یہ چاہتا ہوں کہ وہ روحانی بنیں،
 دنیا کے فکر میں مبتلا نہ ہوں، روایات میں ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا : یا اللہ! مجھے کوئی ایسا کام بتلائیے جس میں
 تیری رضا پوشیدہ ہو، تاکہ میں وہ کام کروں اور تیری رضا پاؤں، اللہ تعالیٰ نے ان پر وحی بھیجی کہ اے موسیٰ! میری رضا تیری
 ناپسندیدگی میں ہے، یعنی تو اس بات پر صبر نہیں کر سکتا جس پر تیرا دل آمادہ نہ ہو، حضرت موسیٰ نے عرض کیا اے اللہ! وہ کون سی بات ہے،
 فرمایا : میری رضا اس امر میں ہے کہ تو میری نغصا پر راضی رہے، ایک مرتبہ حضرت موسیٰ نے باری تعالیٰ کی خدمت میں عرض کیا
 یا اللہ! وہ کون شخص ہے جو مخلوق میں تجھے سب سے زیادہ محبوب ہے، فرمایا : وہ شخص جس سے اگر کوئی محبوب چیز چھین لوں تو وہ
 مجھ سے اپنا تعلق منقطع نہ کرے، حضرت موسیٰ نے عرض کیا کہ وہ کون شخص ہے جس پر تو ناراض ہوتا ہے، فرمایا وہ شخص جو مجھ سے
 کسی کام میں خیر چاہتا ہے، اور جب میں کوئی فیصلہ کرتا ہوں تو وہ میرے فیصلے پر ناراض ہوتا ہے، ایک روایت میں اس سے بھی
 زیادہ سخت الفاظ وارد ہیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا : میرے سوا کوئی معبود میں ہے، جو شخص میری مصیبت پر صبر نہیں کرتا، اور میری
 نعمتوں پر شکر ادا نہیں کرتا، اور میرے فیصلے پر راضی نہیں ہوتا، اسے چاہیے کہ وہ میرے سوا کسی اور کو اپنا معبود بنالے (طبرانی)۔
 ابن حبان - ابو ہند الداری) اسی طرح کی ایک شدید وعید سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے موسیٰ ہے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد
 میں ہے، فرمایا : میں نے تمام مقادیر کو مقدر کیا، تمام تدابیر کیں، اور تمام امور محکم کئے جو شخص مجھ سے ناراض ہے اس سے میں
 بھی ناراض ہوں، یہاں تک کہ وہ مجھ سے ملاقات کرے، اور جو شخص مجھ سے راضی رہے اس سے میں بھی راضی ہوں، یہاں تک
 کہ وہ مجھ سے ملاقات کرے (۱) ایک مشہور حدیث قدسی میں ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا : میں نے خیر اور شر دونوں پیدا کئے،
 خوشخبری ہو اس شخص کے لئے جس کو میں نے خیر کے لئے پیدا کیا، اور جس کے ہاتھوں خیر جاری کیا، اور ہلاکت ہو اس شخص کے لئے
 جسے میں نے شر کے لئے پیدا کیا، اور جس کے ہاتھوں شر جاری کیا، اور شدید ترین ہلاکت ہے اس شخص کے لئے جس نے کیا اور
 کیوں کے سوالات اٹھائے (ابن شاہین فی شرح السنہ) سابقہ امتوں کے احوال میں مذکور ہے کہ ایک پیغمبر نے دس سال تک بھوک
 افلاس اور کھٹلوں کی شکایت کی، مگر ان کی شکایت نہیں سنی گئی، اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے وحی بھیجی کہ تم اس طرح کب تک شکایت
 کرتے رہو گے، میرے یہاں آتم الکتاب میں آسمان و زمین کی تخلیق سے پہلے تمہارا یہی حال رہے گا، میں نے دنیا پیدا کرنے سے پہلے
 تمہارے لئے یہی فیصلہ کیا تھا، اب کیا تم یہ چاہتے ہو کہ تمہاری وجہ سے دنیا دوبارہ بنائوں، یا جو کچھ میں نے تمہارے مقدر میں لکھ دیا
 ہے اس میں تبدیلی کروں، تمہاری پسند میری پسند سے بہتر ہو، اور تمہاری خواہش میری خواہش سے بڑھ کر ہو، مجھے اپنی عزت و جلال
 کی قسم ہے اگر تمہارے دل میں یہ خیال بھی آیا تو میں دفعتاً تمہارے تمام حریفوں کا، روایت ہے کہ حضرت آدم علیہ

السلام کا کوئی چھوٹا لڑکا آپ کی پسلیوں کو میڑھی بنا کر سر تک پہنچتا اور اسی طرح نیچے اترتا آپ اس کی یہ حرکت بدداشت کرتے رہے اور سر جھکائے بیٹھے رہے آپ کے ایک صاحبزادے نے عرض کیا ابا جان! آپ اس کو منع کیوں نہیں کرتے یہ آپ کے ساتھ اس طرح کی حرکتیں کر رہا ہے حضرت آدم علیہ السلام نے جواب دیا بیٹے! میں وہ دیکھتا ہوں جو تم نے نہیں دیکھتے میں نے ایک حرکت کی تھی اور اس کی سزا میں عزت کے گھر سے ذلت کے گھر میں مسرتوں کے گوارے سے مصیبتوں کے جنگل میں پھینکا گیا تھا۔ اب میں کوئی حرکت نہیں کرنا چاہتا ایسا نہ ہو کہ پھر کسی آن دیکھی مصیبت میں جھلا کر دیا جاؤں۔ حضرت انس بن مالکؓ فرماتے ہیں کہ میں نے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی دس سال تک خدمت کی ہے اس دوران اگر میں نے کوئی کام کیا تو آپ نے یہ نہیں پوچھا کہ تو نے یہ کام کیوں کیا اسی طرح آپ نے ہونے والی چیز کے متعلق یہ نہیں فرمایا کہ کاش نہ ہوتی اور نہ ہونے والی چیز کے متعلق یہ نہیں فرمایا کاش ہوتی اور اگر آپ کے گھر والوں میں سے کوئی شخص مجھ سے جھگڑتا تو آپ فرماتے جالے دو یہ کام اسی طرح مقدر تھا (۱) روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام پر وحی بھیجی کہ اے داؤد تم بھی ارادہ کرتے ہو اور میں بھی ارادہ کرتا ہوں ہوتا وہی ہے جو میں چاہتا ہوں اگر تم وہ بات مان لو جو میں چاہتا ہوں تو میں اس بات کے لئے تمہارا کفیل ہو جاؤں گا جو تم چاہتے ہو اور اگر تم نے وہ بات حلیم نہیں کی جو میں چاہتا ہوں تو اس کام میں تمہیں تھکاوں گا جو تم چاہتے ہو پھر وہی ہو گا جو میں چاہتا ہوں۔

رضا کی فضیلت سے متعلق کچھ آثار یہ ہیں حضرت عبداللہ ابن عباسؓ فرماتے ہیں قیامت کے دن سب سے پہلے جنت میں وہ لوگ بلائے جائیں گے جو ہر حال میں اللہ تعالیٰ کی تعریف کرتے ہیں حضرت عمر ابن عبدالعزیزؓ فرماتے ہیں کہ مجھے حکم الہی کے علاوہ کسی موقع پر خوشی حاصل نہیں ہوتی کسی نے ان سے پوچھا کہ آپ کیا چاہتے ہیں فرمایا جو اللہ فیعلہ کرے میمون ابن مہران کہتے ہیں جو شخص قضاء پر راضی نہیں ہوتا اس کی حماقت کا کوئی علاج نہیں ہے فضیل ابن عیاض کہتے ہیں اگر تو نے حکم الہی پر صبر نہیں کیا تو اپنے نفس کے فیعلے پر بھی صبر نہ کر سکے گا عبدالعزیز ابن ابی رواد کہتے ہیں کہ جو کی روٹی اور سرکہ کھائے اون اور بالوں کا لباس پہننے میں شان نہیں ہے دوسری کی شان اللہ تعالیٰ کے ساتھ راضی رہنے میں ہے عبداللہ ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ میرے لئے آگ کی چنگاری منہ میں رکھ لینا چاہیے وہ میری زبان کا کچھ حصہ جلا دے اور کچھ حصہ چھوڑ دے اس سے بہتر ہے کہ میں ہو جائے والی چیز کے متعلق یہ کہوں کہ کاش نہ ہوتی اور نہ ہونے والی چیز کے متعلق کہوں کاش ہو جاتی ایک شخص نے محمد ابن الواسع کے پاؤں میں ایک زخم دیکھ کر کہا کہ مجھے اس زخم کی بنا پر آپ کی حالت قابل رحم معلوم ہوتی محمد ابن الواسع نے جواب دیا کہ جب سے یہ زخم ہوا میں مسلسل اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کر رہا ہوں کہ یہ زخم میری آنکھ میں نہیں ہوا۔ اسرائیلی روایت میں ہے کہ ایک عابدہ تون اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول رہا ایک رات اسے خواب میں بتلایا گیا کہ فلاں عورت کہیاں چراتی ہے جنت میں حیرتی رہتی ہوگی عابدہ نے اس کے متعلق معلومات حاصل کیں اور اسے تلاش کر لیا اور اس کے گھر پر تین دن تک مہمان رہا تاکہ اس کے اعمال کا مشاہدہ کر سکے عابدہ تو رات کو نماز کے لئے کھڑا ہو جاتا اور وہ سوئی رہتی عابدہ دن میں روز رکھتا اور وہ افطار کرتی عابدہ نے ایک روز دریافت کیا کہ جو کچھ میں نے دیکھا ہے اس کے علاوہ بھی حیرا کوئی عمل ہے اس نے عرض کیا اس کے علاوہ میرا کوئی عمل نہیں ہے عابدہ نے کہا یاد کر شاید کوئی عمل تو ایسا کرتی ہو جس کی اہمیت کا احساس نہ ہو عورت نے کہا کہ میرے اندر ایک معمولی خصلت ہے اور وہ یہ کہ جب میں کسی مصیبت میں گرفتار ہوتی ہوں تو یہ تمنا نہیں کرتی کہ اس مصیبت سے نجات پا جاؤں اور اگر کسی مرض میں مبتلا ہوتی ہوں تو یہ تمنا نہیں کرتی کہ اس مرض سے شفا یاب ہو جاؤں اور اگر دھوپ میں ہوتی ہوں تو یہ تمنا نہیں کرتی کہ مجھے سایہ مل جائے یہ سن کر عابدہ نے اپنے سر پر ہاتھ رکھا اور کہنے لگا کہ کیا یہ چھوٹی خصلت ہے بخدا یہ اتنی عظیم خصلت ہے کہ بڑے بڑے

عابد و زاہد بھی اسے پانے سے عاجز رہتے ہیں۔ بعض سلف صالحین سے مروی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ آسمانوں میں کوئی فیصلہ کر دیتا ہے تو اہل زمین سے یہ چاہتا ہے کہ وہ اس کے فیصلے پر راضی رہیں، حضرت ابو اللہ رواۃ فرماتے ہیں ایمان کی بلندی تقدیر پر راضی رہنا اور حکم الہی پر صبر کرنا ہے۔ حضرت عمر فرماتے ہیں کہ مجھے اس کی پروا نہیں ہوتی کہ میں کھلی میں ہوں یا خوشحالی میں۔ حضرت سفیان ثوریؒ نے ایک دن حضرت رابعہ بصریہ کے سامنے یہ دعا کی ”اے اللہ! ہم سے راضی رہے۔“ حضرت رابعہ نے فرمایا کیا تمہیں اللہ تعالیٰ سے رضامانگنے میں شرم نہیں آتی، جب کہ تم اس سے ناراض ہو، حضرت سفیان ثوریؒ نے فرمایا میں اللہ سے مغفرت کا طلبگار ہوں۔ جعفر ابن سیمان الضبعی نے عرض کیا کہ بندہ اللہ تعالیٰ سے کب راضی ہوتا ہے، حضرت رابعہ نے فرمایا وہ مصیبت پر بھی اسی طرح خوش ہو جس طرح راحت پر خوش ہوتا ہے، حضرت قتیل ابن عیاض فرماتے ہیں کہ جب بندہ کے نزدیک منع و عطا دونوں برابر ہو جائیں تب اس کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ اللہ سے راضی ہے۔ حضرت سلیمان دارانی کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اپنے بندوں سے اسی بات پر راضی ہوتا ہے جس بات سے غلام اپنے آقا سے راضی ہوتا ہے، احمد ابن الحواری نے ان سے دریافت کیا کہ یہ کس طرح ممکن ہے؟ فرمایا کہ کیا دنیا میں غلام یہ نہیں چاہتا کہ اس کا آقا خوش رہے، انہوں نے کہا ہاں غلام یہی چاہتا ہے، سلیمان دارانی نے فرمایا اللہ تعالیٰ بھی اپنے بندوں سے یہی چاہتا ہے کہ وہ اس سے راضی رہیں۔ حضرت سمیل ستیریؒ فرماتے ہیں کہ بندہ کو اسی قدر یقین ملتا ہے جس قدر وہ اللہ سے راضی رہتا ہے، سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :-

”إِنَّ اللَّهَ عَزَّ وَ جَلَّ بِحُكْمَتِهِ وَ جَلَالِهِ جَعَلَ الرِّضَا وَ الْفَرَحَ فِي الرِّضَا وَ الْيَقِينَ“
 وَ جَعَلَ الْغَمَّ وَ الْحُزْنَ فِي الشُّكِّ وَ السَّخَطِ (طبرانی - ابن مسعود)

اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت و جلالت سے راحت اور سرور کو رضا اور یقین میں رکھا ہے، اور غم و حزن کو شک و ناراضگی میں رکھا ہے۔

رضائی حقیقت اور اس کا خواہش کے خلاف ہونا جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ خواہش کے مخالف امور اور مصائب و فہمو میں صرف صبری ممکن ہے، رضا ممکن نہیں وہ گویا محبت کا انکار کرتے ہیں، جب اللہ تعالیٰ کی محبت کا تصور ثابت ہو گیا، اور یہ بات واضح ہو گئی کہ آدمی اپنی تمام ہمت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی محبت میں مشغول ہو سکتا ہے تو یہ بات عقلی نہیں رہی کہ محب اپنے محبوب کے ہر فعل یا قول سے راضی رہنے پر مجبور ہے، اور یہ رضا و طرح سے ہوتی ہے، ایک توبہ کی رنج اور تکلیف کا قطعاً احساس نہ ہو، حتیٰ کہ اگر کوئی غم لگے یا کسی اور طرح اذیت پہنچے تو اسے درد اور تکلیف بالکل محسوس نہ ہو، اور اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی لڑنے والا جب غصے یا خوف کی حالت میں لڑتا ہے اور جسم زخمی ہو جاتا ہے تو اسے اپنے زخم کی ذرا تکلیف نہیں ہوتی، بلکہ یہ خیال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ کوئی زخم لگا ہے، جب زخم سے خون بہتا ہے اور زخمیں یا کپڑے پر لگتا ہے تب اسے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا جسم زخمی ہے، یہ تو خیر لڑائی کا معاملہ ہے جس میں آدمی اپنے دل و دماغ اور پوری جسمانی اور ذہنی قوت کے ساتھ مشغول ہوتا ہے ہم تو یہ دیکھتے ہیں کہ جب آدمی کسی معمولی کام میں مصروف ہوتا ہے، اور اتفاقاً جسم میں کوئی کانٹا دھیرہ چبھ جاتا ہے تو وہ اپنے قلب کی مشغولیت کے باعث اس تکلیف کا احساس بھی نہیں کرتا جو کانٹا چبھنے کی وجہ سے اس کے پاؤں کو ہوتی ہے، اسی طرح اگر کسی شخص کے بال کندہ استر سے موڑے جائیں یا کندہ چھری سے پچھنے لگائے جائیں تو اس کو بے حد اذیت کا سامنا کرنا پڑتا ہے، لیکن اگر وہ کسی اہم کام میں مشغول ہو تو حجام یا حلاق اپنا کام انجام دے کر چلا بھی جاتا ہے اور اسے احساس بھی نہیں ہوتا، اس کی وجہ یہی ہے کہ جب آدمی کا دل کسی امر میں پوری طرح مشغول ہوتا ہے تو اسے اس کے علاوہ کسی چیز کا ادراک نہیں ہوتا، یہی حال اس عاشق کا ہے جو اپنے محبوب کی محبت یا اس کے مشاہدے میں پوری طرح مشغول ہو، اسے ایسے واقعات پیش آتے ہیں جو اس کے لئے نہایت اذیت بخش ہوتے اگر وہ اس محبت میں مشغول نہ ہوتا، پھر عاشق کو اس تکلیف اور اذیت کا احساس اس وقت نہیں ہوتا جب اس کا مصدر محبت کے علاوہ کوئی دوسرا شخص یا دوسری چیز ہو، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اگر محبوب اپنے عاشق کو خود کوئی تکلیف

پہچانے یا کسی اذیت میں مبتلا کرے تو اسے کیسے احساس ہو سکتا ہے۔

محبت و عشق میں قلب کی مشغولیت بڑی اہم مشغولیت ہے۔ جب معمولی محبتوں میں معمولی درد کا احساس نہیں ہوتا تو بڑی محبت میں بڑے درد کا احساس کیوں ہونے لگا؟ جس طرح درد کی زیادتی ممکن ہے، اسی طرح محبت کی زیادتی بھی ممکن ہے، اور جس طرح حارہ بھرے محسوس ہونے والی خوب صورتی کی محبت قوی ہوتی ہے اسی طرح وہ محبت بھی قوی ہوتی ہے جو بصیرت کے ذریعے باطن کی خوب صورتی کے مشاہدے کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے۔ جہاں تک باطنی صورتوں کے حسن کا تعلق ہے ان میں اللہ تعالیٰ کا جمال و جلال ایسا ہے کہ اس پر کسی اور جمال یا جلال کو قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ جس شخص پر اس جلال و جمال کا کچھ حصہ منکشف ہو جاتا ہے وہ اپنے ہوش و حواس کو دیتا ہے، اور کچھ ایسا ہوش ہوتا ہے کہ اپنی کسی کیفیت کا احساس نہیں کرتا، روایت ہے کہ فتح موصلی کی بیوی ٹھوکر کھا کر گر پڑیں، ٹھوکر لگنے سے ان کے انگوٹھے کا ناخن اکڑ گیا، وہ ہنسنے لگیں، لوگوں نے عرض کیا آپ کو تکلیف نہیں ہو رہی ہے، فرمایا: اس کے ثواب کی لذت نے درد کی تکلیف کا احساس مٹا دیا ہے، حضرت سل مستری دوسروں کا علاج کیا کرتے تھے، انہوں نے اپنا علاج کبھی نہیں کیا، ان سے اس کے مطلق پوچھا گیا تو انہوں نے جواب دیا اے دوست! محبوب کی مار میں تکلیف نہیں ہوتی۔

محبوب کے فعل پر راضی رہنے کی دوسری صورت یہ ہے کہ تکلیف کا ادراک ہو، لیکن اس تکلیف پر راضی ہو، بلکہ اس کی خواہش اور ارادہ رکھتا ہو، اور یہ رغبت و خواہش اصل سے ہو اگرچہ طبیعت نہ چاہتی ہو، یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص فاسد خون کے اخراج کے لئے پیچھے لگواتا ہے، ظاہر ہے اس عمل میں تکلیف ہوتی ہے، لیکن وہ اس تکلیف پر راضی رہتا ہے، اور خود اپنی رغبت و خواہش سے یہ اذیت برداشت کرتا ہے، اور حجام کا ممنون احسان ہوتا ہے، یہی حال اس شخص کا ہوتا ہے جو تکلیف پر راضی رہے، حصول منفعت کے لئے سفر کرنے والا بھی سفر کی مشقت برداشت کرتا ہے، اور قہر اٹھاتا ہے، لیکن سفر کی مشقت کی اسے اس لئے پروا نہیں ہوتی کہ اس کے نتیجے میں حاصل ہونے والا نفع اسے عزیز ہوتا ہے، اور ہر مشقت و قہر پر راضی رہتا ہے، یہی حال ان بزرگانِ خدا کا ہے جن پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی معصیت نازل ہوتی ہے، اور وہ یقین رکھتے ہیں کہ اس کے بدلے میں جو ثواب ہمیں دیا جائے گا وہ ذخیرہ کر لیا گیا ہے، اس یقین کی وجہ سے وہ اس معصیت پر راضی رہتے ہیں، اس میں رغبت کرتے ہیں، بلکہ اس معصیت سے محبت کرتے ہیں، اور اس پر اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں۔ یہ اس صورت میں ہے جب کہ آدمی اس ثواب اور احسان کو ملحوظ رکھے جو معصیت کے عوض اسے ملنے والا ہے، اور ملحوظ نظر اجر و ثواب نہ ہو، بلکہ محبت اس درجے قابل ہو کہ محبوب کی رضا حاصل کرنا ہی اس کا غشاء ہو، وہی مطلوب اور محبوب ہو تب اسے کسی اجر کی تمنا نہیں رہتی، بلکہ اس کا خیال بھی نہیں آتا، اور محبوب کی رضا جوئی اس کا نصب العین بن جاتا ہے۔ حلق کی محبت میں یہ تمام مشاہدات موجود ہیں، اور لوگوں نے قلم و نثر کے اسلوب میں یہ مشاہدات بیان کئے ہیں، حلق کی محبت آنکھ کے ذریعے ظاہری صورت کے جمال کے مشاہدے پر مبنی ہوتی ہے، یہ جمال کوئی انوکھی شئی نہیں ہے، بلکہ کمال گوشت اور خون کے مجموعے کا نام حسن ہے جس میں نجاستیں بھی ہیں، خباثتیں بھی ہیں، جس کی ابتداء ایک ٹپاک نطفے سے ہوتی ہے، اور جس کا انجام ایک مردار گندے جسم کے روپ میں ہو گا یہ شخص جسے تم صاحب حسن کہتے ہو اپنے پیٹ میں فلاحت اٹھائے پھرتا ہے، اور اگر مردار کو دیکھا جائے تو وہ ایک نفیس آنکھ ہے، جو دیکھنے میں اکثر غلطی کرتی ہے، چھوٹے کو بڑا دیکھتی ہے، اور بڑے کو چھوٹا، دوز کو نزدیک، اور بد صورت کو خوب صورت۔ جب اس ظاہری قافی، اور بے حقیقت حسن میں محبت کے غلبے کا عالم یہ ہے تو اذلی اور ابدی جمال کی محبت میں یہ صورت کیسے محال ہو سکتی ہے، جس کے کمال کی کوئی انتہا نہیں ہے، اور جس کا ادراک چشم بصیرت سے کیا جاتا ہے، جو غلطی نہیں کرتی، نہ موت کے ساتھ مرنے سے، بلکہ موت کے بعد بھی اللہ تعالیٰ کے یہاں زندہ رہتی ہے، اس کے رزق سے فرحت حاصل کرتی ہے، اور موت سے مزہ تنبیہ اور کشف پاتی ہے، یہ ایک واضح امر ہے، اگر چشم عبرت سے دیکھا جائے، اور اس کے وجود پر محسن کے اقوال و احوال سے شہادت ملتی ہے۔

عجین کے اقوال و احوال حضرت شعیب علیہ السلام فرماتے ہیں کہ جو شخص معیت میں ثواب دیکھتا ہے وہ اس سے نجات پاتا نہیں چاہتا۔ جنید بغدادی کہتے ہیں کہ میں نے سری سقلی سے پوچھا کہ کیا محبت کرنے والوں کو معیت پر تکلیف ہوتی ہے؟ انہوں نے جواب دیا: نہیں! میں نے کہا اگرچہ اسے تلوار کی ضرب لگائی جائے؟ انہوں نے فرمایا ہاں اگرچہ اسے ستر یا تلوار کی ضرب لگائی جائے؟ اور ضرب پر ضرب لگائی جائے، بعض اکابر فرماتے ہیں کہ میں اس کی محبت کی وجہ سے ہر چیز سے محبت کرتا ہوں، یہاں تک کہ اگر وہ آگ سے محبت کرے تو میں آگ میں کود جاؤں، بشرطیکہ الحارث کہتے ہیں کہ میں نے ایک ایسے شخص کو دیکھا جس کے جسم پر بغداد کے محلہ شرقہ میں ایک ہزار کوڑے لگائے گئے، لیکن اس نے آف تک نہیں کیا، پھر اسے قید خانے میں لے جایا گیا، میں اس کے پیچھے پیچھے چلا، اور اس سے پوچھا کہ تمہیں یہ کوڑے کیوں لگائے گئے ہیں؟ اس نے جواب دیا کہ میں ایک عاشق ہوں، میں نے اس سے پوچھا کہ تم اس کیفیت پر خاموش کیوں رہے؟ اس نے کہا کہ میں میرا معشوق میری نظروں کے سامنے تھا، اور مجھے دیکھ رہا تھا، میں نے اس سے کہا کاش تم سب سے بڑے معشوق کو دیکھتے، یہ سن کر اس نے ایک زبردست چیخ ماری، اور مر گیا۔ یحییٰ ابن محاذ رازی کہتے ہیں جب اہل جنت اللہ تعالیٰ کا دیدار کریں گے تو اس لذت دیدار کی وجہ سے ان کی آنکھیں ان کے دلوں میں چلی جائیں گی اور آٹھ سو برس تک وہیں نہیں آئیں گی، ان دلوں کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے جو اللہ تعالیٰ کے جمال و جلال میں مشغول ہوں، جب جلال کا مشاہدہ کرتے ہیں تو خوف زدہ ہو جاتے ہیں، اور جمال کا مشاہدہ کرتے ہیں تو تعجب ہو جاتے ہیں۔ بشرطیکہ میں کہ میں ابتداء سے سلوک میں جزیرہ عبادان گیا، وہاں میں نے ایک جذائی کو دیکھا جو نایاب اور پاک تھا، اور زمین پر پڑا ہوا تھا، جو ٹیلاں اس کا گوشت کھا رہی تھیں، میں نے اس کا سر اٹھا کر اپنی گود میں رکھا، اور اس سے اس کا حال دریافت کرنے لگا، میں ایک ایک لفظ بار بار کہتا تھا، جب اسے ہوش آیا تو کہنے لگا یہ فضولی کون ہے جو میرے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان مداخلت کر رہا ہے؟ اگر میرے کلوے کلوے کر دیے جائیں تب بھی میری محبت منقطع نہ ہو، بلکہ کچھ زیادہ ہی ہو، بشرطیکہ میں اس واقعے کے بعد جب بھی میں نے کسی بندے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان اس طرح کا کوئی معاملہ دیکھا تو میں نے برا نہیں سمجھا۔ ابو عمرو محمد ابن الاشعث کہتے ہیں کہ اہل مصر پر چار ماہ ایسے گزرے کہ انہیں حضرت یوسف علیہ السلام کے چہرے کی طرف دیکھنے کے علاوہ کوئی کام نہیں تھا، انہیں جب بھی بھوک محسوس ہوتی حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف متوجہ ہو جاتے، گویا حضرت یوسف علیہ السلام کے جمال نے ان سے بھوک کا احساس مٹا دیا تھا، قرآن کریم نے ان کی اس کیفیت کے لئے بیخ تعبیر استعمال کی ہے کہ عورتیں حضرت یوسف علیہ السلام کو دیکھ کر ایسی بے خود ہوئیں کہ چہروں سے اپنے ہاتھ کاٹ بیٹھیں، سعید ابن جبلی کہتے ہیں کہ میں نے بصرے میں واقع حطاب ابن مسلم کی سرائے میں ایک نوجوان کو دیکھا جس کے ہاتھ میں ایک چمرا تھا، لوگ اس کے ارد گرد جمع تھے اور وہ چیخ مچا کر کہہ رہا تھا:۔

يَوْمَ الْفِرَاقِ مِنَ الْقِيَامَةِ اُطْلُوْا
قَالُوْا اَلْزَحِيْلُ فَقُلْتُ لَسْتُ بِرَاحِلٍ لٰكِنْ بَهْجَتِيْ النَّبِيُّ نَسْرَحِلُ

(جدائی کا دن قیامت سے زیادہ طویل ہے، اور موت جدائی کے غم سے زیادہ بھرپور ہے، لوگ کہنے لگے روانگی ہے، میں نے کہا روانگی نہیں ہے، بلکہ میری روح سفر کرتی ہے)

اس کے بعد اس شخص نے چمرا اپنے پیٹ میں گھونپ لیا اور مر گیا، میں نے اس شخص کے بارے میں دریافت کیا تو لوگوں نے بتلایا کہ یہ شخص فلاں بادشاہ کے قلام پر عاشق تھا، ایک روز وہ اس سے دور ہوا، اس صدمے نے اس کا یہ حال بنا دیا۔ حضرت یونس علیہ السلام نے حضرت جبرئیل علیہ السلام سے کہا کہ مجھے ایسے شخص کا پتا بتاؤ جو زمین والوں میں سب سے زیادہ عبادت کرتا ہو، انہوں نے ایک ایسے شخص کا حوالہ دیا جس کے دونوں ہاتھ اور دونوں پاؤں ہڈام نے گلا دیے تھے، اور اس کی آنکھیں بھی ضائع کر دی تھیں، حضرت یونس علیہ السلام جس وقت اس کے پاس پہنچے وہ یہ کہہ رہا تھا اے اللہ! تو نے مجھے جو چاہا عطا کیا، اور جو چاہا مجھ سے سلب کر لیا، اور میرے لئے اپنی امید باقی رکھی، اے احسان کرنے والے! اور تمہارا پر لائے والے! روایت ہے کہ حضرت عبداللہ

ابن عمر کے ایک صاحبزادے سخت بیمار ہوئے، حضرت ابن عمر کو ان کی بیماری سے اتنا شدید غم ہوا کہ لوگ یہ اندیشہ کرنے لگے کہ اس لڑکے کی وجہ سے آپ کو کچھ نہ ہو جائے، اس لڑکے کا انتقال ہو گیا، آپ اس کے جنازے کے ساتھ چلے، اس وقت وہ جس قدر خوش نظر آ رہے تھے اتنا خوش کوئی دوسرا شخص نہ تھا، لوگوں نے اس کی وجہ دریافت کی، فرمایا میں اس کی بیماری کے دوران ازراہ شفقت و رحم آرزوہ تھا، اور جب اللہ تعالیٰ نے اسے اپنے پاس بلایا تو میں اس سے راضی ہوں، حضرت مسوق فرماتے ہیں کہ جنگل میں ایک شخص کے پاس تین جانور تھے، کتا، گدھا، اور مرقا۔ مرقا لوگوں کو نماز کے لئے بیدار کرتا تھا، گدھا ان کے لئے پانی لانے، اور خیمے وغیرہ منتقل کرنے میں کام آتا تھا، اور کتا ان کی رکھوالی کرتا تھا، ایک دن ایک لومڑی آئی اور مرنے کو کہا، اس کے بعد ایک دن بھیڑیا آیا اور گدھے کو اس کا پیٹ چیر کر ہلاک کر گیا، لوگوں کو اس کا بھی بے حد ملال ہوا، لیکن اس شخص نے یہی کہا شاید اس میں بھی کوئی خیر ہو، اس کے بعد کتا ہلاک ہو گیا، اس شخص نے تب بھی یہی کہا شاید اس میں بھی کوئی خیر ہو، پھر ایک دن اس شخص کے گھروالوں نے یہ مہرہ دیکھا کہ ان کے ارد گرد کے تمام لوگ گرفتار کر لئے گئے، صرف وہ باقی رہ گئے، ان لوگوں کو اس لئے گرفتار کیا گیا کہ ان کے پاس گدھے، کتے اور مرنے تھے، ان جانوروں کی آوازوں نے گرفتار کرنے والوں کو ان کی موجودگی سے باخبر کیا، اور کیوں کہ اس نیک شخص کا گھرانہ جانوروں سے محروم ہو گیا تھا اس لئے وہ گرفتاری سے محفوظ رہا، گویا اللہ نے ان جانوروں کی ہلاکت میں ان لوگوں کے لئے خیر رکھ دی تھی، جو شخص اللہ تعالیٰ کے محل الملاف سے واقف ہوتا ہے وہ ہر حال میں اس کے فعل سے راضی رہتا ہے۔

روایت ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایک ایسے شخص کے پاس سے گزرے جو آنکھوں سے محروم تھا، برص زدہ تھا، اور جس کے دونوں پہلو قلع کے محلے سے پکاز ہو چکے تھے، اور ہڈا لگی وجہ سے اس کا گوشت کٹ کٹ کر گر رہا تھا، اور وہ شخص ان تمام مصائب و آلام کے باوجود یہ کہہ رہا تھا، ”تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جس نے مجھے ان بہت سے مصائب سے عافیت بخشی، جن میں اس کی بے شمار مخلوق جلتا ہے۔“ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اس شخص سے دریافت کیا تیرے خیال میں کون سی معصیت ایسی ہے جو تیرے پاس نہیں ہے، اس شخص نے کہا اے روح خدا! میں ان لوگوں سے بہتر ہوں جن کے دلوں میں اللہ تعالیٰ نے وہ معرفت نہیں رکھی جو میرے دل میں رکھی ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا تو جی کہتا ہے، اپنا ہاتھ بوسا، اس شخص نے اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ میں دیا، اچانک وہ ایک خوب رو شخص بن گیا، اس کی شخصیت گہر گئی، اور جن بیماریوں میں وہ جلتا تھا اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے ان تمام بیماریوں سے شفا عطا فرمائی، اس واقعے کے بعد وہ شخص حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ہمراہ رہا اور انہی کے ساتھ عبادت خدا میں مصروف رہا، حضرت عروہ ابن الریر نے اپنا پاؤں گھٹنے تک کٹوا دیا تھا، کیونکہ ان کا ایک زخم سڑ گیا تھا، جس کی وجہ سے پاؤں گل رہا تھا، اس کے باوجود انہوں نے کہا، ”تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جس نے مجھ سے میرا ایک پاؤں لے لیا،“ حیرت ذات کی قسم ہے کہ اگر تو نے لے لیا تو تو نے ہی حلا کیا تھا، اگر تو نے بیمار کیا تو تو نے ہی عافیت دی تھی۔“ وہ تمام رات یہی ورد کرتے رہے۔ حضرت عبداللہ ابن مسعود فرماتے ہیں کہ فخر و فنی دو سواریاں ہیں، مجھے یہ پورا نہیں کہ میں ان میں سے کس سواری پر سوار ہوں گا، اگر فخر پر سواری کروں گا تو اس میں مبر ہے، اور اگر فنی پر سواری کروں گا تو اس میں اللہ کی راہ میں خرچ کرنا ہے، ابو سلیمان دارانی کہتے ہیں کہ میں نے ہر مقام سے ایک کیفیت حاصل کی ہے، سوائے مقام رضا کے۔ اس مقام میں سے مجھے صرف ہوا میں پھیلی ہوئی خوشبو ہی ملی ہے، اب اگر اللہ تعالیٰ اس جرم میں مجھے دوزخ میں، اور تمام مخلوق کو جنت میں داخل کر دے تو میں اس پر راضی ہوں۔ ایک عارف سے کسی نے پوچھا کہ کیا تم نے اللہ تعالیٰ کی عافیت رضا حاصل کر لی ہے، اس نے جواب دیا نہیں، البتہ مقام رضا حاصل کر چکا ہوں، اب اگر اللہ تعالیٰ مجھے دوزخ کا پل بنا دے، اور لوگ میری کمر عبور کر کے جنت میں جائیں، پھر اپنی قسم پوری کرنے کے لئے اور تمام مخلوق کے بدلے صرف مجھے دوزخ میں ڈال دے تو میں اس کے فیصلے کو پسند کروں اور اس کی اس تقسیم پر راضی ہوں۔ یہ اس شخص کا کلام ہے جو اپنی تمام تر محبت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی محبت میں غرق ہوتا ہے، یہاں تک کہ اسے جہنم کی

آگ سے ذرا تکلیف نہیں ہوتی اور اگر ہوتی بھی ہے تو وہ رضائے محبوب کے حصول کی لذت سے مطلوب ہو جاتی ہے حقیقت میں اس حالت کا غالب آنا محال نہیں ہے اگرچہ ہم مجھے ضعیف حالات رکھنے والے اس پر یقین نہیں رکھتے جو لوگ ضعیف ہوں اور اس طرح کی کیفیات کے حصول سے عاجز ہوں ان کے لئے یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ قوت رکھنے والوں کے حالات کا انکار کریں اور یہ گمان کریں کہ جن احوال سے ہم عاجز ہیں اللہ کے نیک بندے بھی ان سے عاجز ہوں گے۔ رو بہاری کہتے ہیں کہ میں نے ابو عبد اللہ ابن جلاء دمشقی سے دریافت کیا کہ فلاں شخص کے اس قول کے حلق آپ کی کیا رائے ہے کہ میں یہ پسند کرتا ہوں کہ میرا جسم قینچیوں سے کھلے کھلے کر دیا جائے اور تمام مخلوق اس کی اطاعت کرے انہوں نے فرمایا اگر یہ قول اجلال و تعظیم کے بطور ہے تو میں اس سے واقف نہیں ہوں اور اگر لوگوں کی غیر خرائی اور ان پر شفقت کے بطور ہے تو تو اسے سمجھتا ہے راوی کہتے ہیں وہ یہ کہہ کر بے ہوش ہو گئے عمران ابن الحصین استقام کے مرض میں مبتلا تھے اور تیس برس تک بستر پر پڑے رہے نہ اٹھ سکتے تھے اور نہ بیٹھ سکتے تھے پاخانے وغیرہ کی حاجت کے لئے چاہائی کے ہان کاٹ دئے گئے تھے ایک مرتبہ ان کے پاس مطرف اور ان کے بھائی ابو الطاء آئے اور ان کا یہ حال دیکھ کر رونے لگے حضرت عمران ابن الحصین نے فرمایا کیوں روتے ہیں انہوں نے عرض کیا میں آپ کو اس زہدست مرض میں گرفتار دیکھ کر روتا ہوں فرمایا مت رُو۔ اس لئے کہ جو چیز اللہ تعالیٰ کو زیادہ محبوب ہے وہی چیز مجھے بھی زیادہ پسند ہے اس کے بعد فرمایا میں تم سے ایک بات کہتا ہوں شاید تمہیں کچھ فہم ہو لیکن تم میرے مرنے تک یہ بات کسی پر ظاہر مت کرنا اور وہ بات یہ ہے کہ فرشتے میری زیارت کرتے ہیں میں ان سے اس حاصل کرتا ہوں وہ مجھے سلام کرتے ہیں اور میں ان کے سلام کی آواز سنتا ہوں اس سے میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ معیت سزا کے طور پر نہیں ہے بلکہ اس عظیم نعمت کے باعث ہے جو مجھے عطا کی گئی ہے جس شخص کا مصائب میں یہ حال ہو وہ کیسے اس پر راضی نہیں ہو گا راوی کہتے ہیں کہ ہم سوید ابن متعب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور دیکھا کہ ایک جگہ لیٹا ہوا کپڑا پڑا ہوا ہے ہمیں گمان ہوا کہ شاید اس کپڑے کے نیچے کچھ نہیں ہے ان کے چہرے سے کپڑا اٹھایا گیا اور ندجہ محترمہ نے عرض کیا ہم آپ پر قربان ہوں آپ کو کیا کھلائیں اور کیا پلائیں انہوں نے فرمایا کہ لیٹے لیٹے کر دیکھ گئی ہے اور سرین چھل گئی ہے اور ایک مدت سے کھانا پینا ترک کرنے کی وجہ سے لاغر ہو گیا ہوں لیکن مجھے یہ پسند نہیں کہ میں اپنی اس حالت میں ذرا سی بھی کی کروں جب حضرت سعد ابی ابی وقاص مکہ مکرمہ تشریف لائے تو آپ کی آنکھوں کی پٹائی باقی نہیں تھی لوگ ان کے آنے کی خبر سن کر دوڑے آتے تھے اور ہر شخص ان سے اپنے لئے دعا کی درخواست کرتا تھا آپ ہر شخص کے لئے دعا کرتے تھے اور دعائیں قبولیت سے بھی سرفراز ہوتی تھیں ہمیں کہ مستجاب الدعوات تھے عبد اللہ ابن السائب فرماتے ہیں کہ میں اس وقت نو عمر تھا آپ کی شہرت سن کر خدمت میں حاضر ہوا اور اپنا تعارف کرایا آپ نے مجھے پہچان لیا اور فرمایا تو مکہ والوں کا قاری ہے میں نے کہا جی ہاں اس کے بعد کچھ اور گفتگو ہوئی آخر میں میں نے ان سے عرض کیا عم محترم! آپ لوگوں کے لئے دعائیں کرتے ہیں اپنے لئے بھی تو دعا کیجئے تاکہ اللہ تعالیٰ آپ کو دوبارہ بیٹائی عطا فرمائے آپ میری بات سن کر مسکرائے اور فرمایا: بیٹے اللہ تعالیٰ کا فیصلہ میرے نزدیک بیٹائی سے بہتر ہے ایک صوفی کا بچہ کم ہو گیا اور تین دن تک اس کی کوئی خبر نہیں ملی ان سے کہا کہ آپ اپنے بچے کی واپس کے لئے خدا تعالیٰ سے دعا کریں فرمایا اس کے فیصلے پر میرا معترض ہونا بچے کی کم شدگی سے زیادہ سخت ہے ایک نیک شخص کہا کرتے تھے کہ میں نے ایک سخت گناہ کیا ہے اور میں اس پر ساٹھ برس سے رو رہا ہوں یہ بزرگ عبادت میں نہایت شہید مجاہدہ کرتے تھے اور مسلسل توبہ و استغفار کیا کرتے تھے لوگوں نے ان سے دریافت کیا کہ آخر وہ کون سا گناہ ہے جس پر آپ کو ساٹھ برس سے السوس ہے انہوں نے کہا کہ میں نے ایک مرتبہ یہ کہہ دیا تھا کہ کاش یہ بات ایسے نہ ہوتی ایک بزرگ فرماتے ہیں اگر میرا جسم قینچیوں سے چھلنی کر دیا جائے تو یہ امر میرے نزدیک اس سے زیادہ بہتر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کسی فیصلے کے حلق یہ کہوں کہ کاش یہ فیصلہ نہ ہو کرتا۔ عبد الواحد ابن زید سے بتلایا گیا کہ یہاں ایک صاحب رہتے ہیں جو پچاس برس سے عبادت کر رہے ہیں عبد الواحد ابن زید ان سے ملاقات کے لئے تشریف

لے گئے اور ان سے پوچھا محترم! یہ بتائیے کہ کیا آپ اس عبادت کو کافی سمجھتے ہیں؟ انہوں نے کہا نہیں، انہوں نے پوچھا کیا آپ نے اس عبادت کے ذریعے اہل حاصل کیا ہے؟ کہا: نہیں، پوچھا کیا آپ اس سے راضی ہیں؟ کہا: نہیں، آپ نے فرمایا اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ کی عبادت ظاہری اعمال پر منحصر ہے اور نماز، روزے سے تجاوز نہیں ہے، انہوں نے جواب دیا: جی ہاں! فرمایا مجھے شرم آتی ہے، ورنہ میں یہ کہتا کہ بھلا اس پر پختہ ہوئی میری یہ عبادت بیکار رہی، اتنی مدت گزرنے کے باوجود تیرے دل کا دروازہ نہ کھلا، اور تو نے قلب کے اعمال کو ترقی اور جات کا وسیلہ نہیں بنایا، تو اب تک اصحاب یمن کے طبقے میں ہے، اور تجھے اعمال ظاہری سے صرف اسی قدر حاصل ہوا جس قدر عوام کو ہوتا ہے۔

کچھ لوگ شعلہ کی خدمت میں حاضر ہوئے، وہ اس وقت ایک قید خانے میں قید و بند کی زندگی گزار رہے تھے، جس وقت یہ لوگ ملاقات کے لئے پہنچے آپ ڈھیلے اکٹھے کرتے میں مصروف تھے، آپ نے آنے والوں سے دریافت کیا کہ تم لوگ کون ہو؟ اور کیوں آئے ہو؟ لوگوں نے عرض کیا ہم آپ کے چاہنے والے ہیں، آپ ان پر چڑھ سارے گئے، وہ لوگ ادھر ادھر بھاگ گئے، فرمایا ابھی تو تم میری محبت کا دعویٰ کر رہے تھے، اگر تم میری محبت کے دعویٰ میں سچے ہو تو ہمارے گئے کیوں ہو؟ میری دی ہوئی مصیبت پر صبر کیوں نہیں کرتے؟ شعلہ کا ایک شعر یہ ہے:۔

اِنَّ الْمُحِبَّةَ تَلْتَزِمُ حُطْمَ مَنْ اسْتَكْرَفَتْ
وَهَلْ رَأَيْتُ مُحِبًّا غَيْرَ سَكْرَانٍ
(رضن کی محبت نے مجھے مدھوش کر دیا ہے، کیا تو نے کوئی ایسا محب دیکھا ہے جو مدھوش نہ ہو۔)

ایک شامی عابد نے فرمایا کہ تم سب اللہ تعالیٰ سے اس کی تصدیق کرتے ہوئے طوگے، اور غالباً تم نے اس کی تکذیب بھی کی ہوگی، اور وہ تکذیب یہ ہے کہ تم میں سے کسی کے ہاتھ کی انگلی میں سونا ہوتا ہے اور وہ اس سے اشارہ کرتا ہے، یا اس میں کوئی غلط ہوتا ہے تو اسے چھپاتا پھرتا ہے، اس قول سے ان کی مراد یہ ہے کہ سوائے اللہ تعالیٰ کے نزدیک برا ہے، اور لوگ اس سے ایک دوسرے پر فخر کرتے ہیں، اور مصائب اہل آخرت کے لئے باعث لعنت ہیں، لوگوں نے حضرت سری ستی کی خدمت میں عرض کیا کہ پورا بازار خاستر ہو گیا ہے، لیکن آپ کی دکان حیرت انگیز طریقے سے بچ گئی ہے، آپ نے فرمایا الحمد للہ، سائل نے عرض کیا کہ آپ نے اپنی دکان کی سلامتی پر الحمد للہ کیسے فرمایا جب کہ تمام مسلمانوں کی دکانیں جل گئیں، یہ سن کر آپ نے تجارت سے توبہ کی، دکان چھوڑ دی، اور اس ایک کلمے کو اس قدر بڑا جانا کہ تمام عمر توبہ و استغفار میں مشغول رہے۔

اگر تم ان واقعات میں غور کرو تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ خواہش کے خلاف کسی فعل پر راضی ہو جانا محال نہیں ہے، بلکہ یہ اہل دین کے مقامات میں سے ایک عظیم ترین مقام ہے، اور جب یہ حلق کی محبت اور دنیاوی حلوظ میں ممکن ہے تو اللہ تعالیٰ کی محبت اور آخرت کے حلوظ میں کیسے ممکن نہ ہوگی، اور اس امکان کی دودھ میں ہیں، ایک وجہ یہ ہے کہ تکلیف پر آدمی اس امید پر راضی ہوتا ہے کہ اس سے اجر و ثواب اور نفع حاصل ہوگا، جیسے آدمی فساد کی توقع میں دوا، پیتا ہے، بچپن گھلاتا ہے، اور قصد کھلواتا ہے، دوسری وجہ یہ ہے کہ آدمی تکلیف پر اس لئے راضی نہیں ہوتا کہ اس میں کوئی منفعت ہے، بلکہ اس لئے راضی ہوتا ہے کہ وہ تکلیف محبوب کی رضا، اس کی مراد اور اس کی خواہش، بعض اوقات محبت اس قدر غالب ہوتی ہے کہ محبوب کی مراد اور خواہش اس کی مراد اور خواہش بن جاتی ہے، یہاں تک کہ اس کے نزدیک لذتہ ترین عمل یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے محبوب کے دل کو خوشی سے ہم کنار کرے، اس کے ارادہ کو نافذ کرے، اور اس کی خواہش پوری کرے، اگرچہ اسے اپنی جان کو ہلاکت میں ڈالنا پڑ جائے، چنانچہ کسی شاعر کا یہ مصرعہ مشہور ہے: رَغَمْتُكَ لِحُبِّكَ يَا كَرِيْمًا كَرِيْمًا، اگر رگم سے تمہیں خوشی ہو تو اس میں تکلیف کہاں؟ پھر اگر رگم سے تکلیف بھی ہو تب بھی یہ ممکن ہے، بعض اوقات محبت اس درجہ غالب ہوتی ہے کہ تکلیف کا احساس ہی باقی نہیں رہتا، قیاس، تجربے اور مشاہدے سے اس کا ثبوت ملتا ہے، اگر کسی شخص کو یہ مقام حاصل نہیں تو اسے اس مقام کے وجود کا انکار نہ کرنا چاہیے کیوں کہ یہ اس مقام سے اس کی محبت کی دلیل ہے، نہ کہ اس مقام کے عدم وجود کی۔ جو شخص

محبت کا ذائقہ نہیں چکھتا وہ اس کے عجائب بھی نہیں دیکھ پاتا، محبت کے توابے لہجے محراب عقل و واقعات ہیں کہ ہم بیان نہیں کر سکتے۔ عموماً ابن الحریث الرافعی سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ میں رقبہ میں اپنے ایک دوست کے پاس بیٹھا ہوا تھا، ہماری مجلس میں ایک نوجوان شخص بھی تھا جو ایک مقلد باندی پر عاشق تھا، وہ مقلد بھی اتفاق سے مجلس میں موجود تھی، اور سارے ساتھ اپنی آواز کے جادو جگاری تھی۔ اس نے یہ دو شعر سنائے :-

عَلَى الْعَاشِقِينَ الْبُكَى كَلَّ الْهَوَى
وَلَا سَيْمًا عَاشِقُ إِنَّا لَمْ يَجِدِ الْمُشْتَكِي
(عاشقین کے لئے ذلت عشق کی پہچان آہ و بکا ہے، خاص طور پر عاشق کے لئے جو اپنے لئے کوئی ایسا شخص پائے جس سے اپنے درد کا اظہار کر سکے۔)

نوجوان نے اس سے کہا بخدا تو نے بڑے اچھے شعر کہے ہیں، کیا تو نے مجھے اجازت دے دی کہ میں میراؤں، اس نے کہا اگر تو عشق میں سچا ہے تو مجھے مرنا چاہیے، یہ سن کر اس نوجوان نے تکیہ پر اپنا سر رکھا، منہ اور آنکھیں بند کیں، قہوڑیں دیر بعد ہم نے اسے بلا کر دیکھا تو وہ شخص مرجھا تھا، حضرت جنید بغدادی کہتے ہیں میں نے ایک شخص کو دیکھا جو ایک لڑکے کی آستین تھا، نہایت عاجزی سے باتیں کر رہا ہے، اور اپنے آپ کو اس کا عاشق بتلا رہا ہے، اس کی تمام باتیں سن کر لڑکے نے کہا کہ حیرانہ جوت کب تک جاری رہے گا، عاشق نے کہا اللہ جانتا ہے میں جو کچھ کہہ رہا ہوں سچ کہہ رہا ہوں۔ میرا حال تو یہ ہے کہ اگر تو مجھ سے مرے لئے کہہ دے تو میں میراؤں لڑنے نے کہا اگر تو سچا ہے تو مر جا، وہ شخص ایک طرف کو گیا، آنکھیں بند کیں، اور مر گیا، سنون عاشق کہتے ہیں ہمارے پردوس میں ایک شخص رہتا تھا، اس کے پاس ایک باندی تھی جس سے اسے بے پناہ محبت تھی، ایک دن باندی بیمار پڑ گئی، وہ شخص اس کے لئے حلوی بنا رہا تھا، اچانک باندی کی زبان سے نکلا، آہ یہ آواز سن کر اس کے ہوش گم ہو گئے، بچھو ہاتھ سے گر پڑا، اور شدت اضطراب کی وجہ سے دیکھی میں جھپے کی جگہ انگلیاں ہی ڈال دیں، یہاں تک کہ اس کی انگلیاں جل کر گر گئیں، باندی نے پوچھا یہ کیا ہوا، کہنے لگا یہ تیری آہ کا نتیجہ ہے۔ عموماً ابن عبد اللہ بغدادی سے روایت ہے کہتے ہیں کہ میں نے بھرے میں ایک بلند پہاڑ پر ایک نوجوان کو دیکھا جو نیچے جھانک کر یہ شعر پڑھ رہا تھا :-

مَنْ مَاتَ عَشْقًا فَلَيْسَتْ هَلَكًا لَا خَيْرَ فِي عَشْقٍ يَلَا مَوْتَ

(جو شخص عشق میں مرے وہ اس طرح مرے موت کے بغیر عشق میں کوئی بہتری نہیں ہے۔)

یہ شعر پڑھ کر اس نے اپنے آپ کو نیچے گرا دیا، اور مر گیا۔ یہ اور اس طرح کے دوسرے واقعات سے پتا چلتا ہے کہ خلق میں اس طرح کی محبت موجود ہے جسے قلب عشق کہتے ہیں اور جب یہ خلق کے باپ میں ہو سکتی ہے تو خالق کے باپ میں کیوں نہیں ہو سکتی، جب کہ باطن کی بصیرت ظاہر کی بصارت سے زیادہ راست ہے، اور حق تعالیٰ کا جمال ہر جمال سے اعلا اور مکمل ہے، بلکہ جس قدر جمال موجود ہے وہ سب اسی کے جمال کا پر تو اور عکس ہے۔ جس طرح وہ شخص صورتوں کے حسن کا انکار کرتا ہے جس کی آنکھ نہیں ہوتی، اور وہ شخص آواز کی تعمیل پر یقین نہیں رکھتا، جو کانوں سے محروم ہوتا ہے اسی طرح وہ شخص بھی قلب کے ذریعے اور اک کئے جانے والی لذتوں کا منکر ہو گا جو قلب نہ رکھتا ہو۔

دعا رضا کے خلاف نہیں یہاں یہ بحث بھی ہے کہ دعا کرنے والا مقام رضا پر فائز رہتا ہے یا نہیں؟ اسی طرح وہ شخص مقام رضا سے خارج ہے یا نہیں جو گناہوں کو برا سمجھتا ہو، مجرموں سے ناراض رہتا ہو، اور گناہ کے اسباب کو معیوب سمجھتا ہو؟ نیز وہ شخص بھی اس مقام پر حتمکن سمجھا جائے گا یا نہیں جو معروف کا حکم کرنا ہو، اور منکر سے روکنا؟ اس بحث کا حاصل یہ ہے کہ بعض اہل باطل اور اصحاب فریب کو بدادھو کا ہوا ہے، وہ یہ کہتے ہیں کہ گناہ، فسق و فجور اور کفر سب کے نیچلے اور اس کی تقدیر سے ہیں، اس لئے ان پر راضی رہنا واجب ہے، یہ قول اس بات کی علامت ہے کہ جس شخص نے بھی یہ دعویٰ کیا ہے وہ تاویل کے علم سے

ناواقف ہے اور اسرار شریعت سے غفلت میں مبتلا ہے۔ جہاں تک دعا کا سوال ہے اسے اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے عبادت قرار دیا ہے۔ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور انبیائے کرام کا کثرت سے دعا کرنا اس کی دلیل ہے، جیسا کہ ہم نے کتاب الدعوات میں اس نوع کی بے شمار روایات نقل کی ہیں۔ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم رضا کے اعلیٰ ترین مقام پر تھے، نیز اللہ تعالیٰ نے اپنے بہت سے بندوں کی ان الفاظ میں تعریف کی ہے :-

يَذْعُوْنَ نَارَ غِيَا وَرَهْبًا۔ (پ آیت)

اور وہ ہمیں رجاء و خوف دونوں حالتوں میں پکارتے تھے۔

دوسری طرف معاصی کا انکار کرنا، انہیں برا سمجھنا اور ان پر راضی نہ رہنا بھی اللہ تعالیٰ کی عبادت کا ایک اہم پہلو ہے، چنانچہ جو لوگ معاصی پر راضی رہتے ہیں اللہ تعالیٰ نے ان کی مذمت اس طرح فرمائی ہے :-

وَرَضُوا بِالْحَيَاةِ النَّبِيَا وَاطْمَأَنَّنُوا بِهَا۔ (پ ۱۸ آیت ۷)

اور دنیا کی زندگی پر راضی اور اس پر مطمئن ہوئے۔

وَرَضُوا بِاِنْ يَكُونُوا مَعَ الْخَوَالِفِ وَطَبَعَ اللَّهُ عَلَى قُلُوبِهِمْ۔ (پ ۱۸ آیت ۹۲)

اور انہیں یہ بات اچھی لگی کہ وہ پچھلی عورتوں کے ساتھ رہ جائیں اور اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر مہر کر دی۔

ایک مشہور حدیث میں وارد ہے، فرمایا :-

مَنْ شَهِدَ مُنْكَرًا فَرَضِي بِهِ فَكَانَ كَقَدْ فَعَلَهُ

جو شخص کسی برائی کو دیکھتا ہے اور خوش ہوتا ہے وہ ایسا ہوتا ہے گویا وہ برائی خود اس سے سرزد ہوئی ہو۔

اسی طرح ایک حدیث میں یہ الفاظ وارد ہیں :-

الَّذِي عَلَى الشَّرِّ كَفًا عَلَيْهِ۔ (ابو منصور دہلی۔ انس)

شر کی رہنمائی کرنے والا ایسا ہے جیسے شرکار کا کتاب کرنے والا۔

حضرت عبداللہ ابن مسعود سے روایت ہے کہ بندہ برائی سے دور ہوتا ہے، لیکن اتنا ہی گنہگار ہوتا ہے جتنا گناہ گار مرتکب ہوتا ہے، لوگوں نے عرض کیا وہ کیسے، فرمایا وہ اس طرح کہ جب اسے اس گناہ کی خبر پہنچے تو خوش ہو، ایک حدیث میں ہے کہ اگر کوئی شخص مشرق میں قتل کر دیا جائے اور مغرب میں رہنے والا دوسرا شخص اس واقعے سے خوش ہو تو وہ بھی قتل میں شریک تصور کیا جائے گا (۱) اللہ تعالیٰ نے غیر کے کاموں، اور شر سے بچنے کے سلسلے میں حد اور منافست کا حکم دیا ہے، ارشاد فرمایا :-

فَلْيَتَنَافِسِ الْمُتَنَافِسُونَ۔ (پ ۸۳۰ آیت ۳۶)

اور حرص کرنے والوں کو حرص کرنا چاہیے۔

سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں :-

لَا حَسَدَ إِلَّا فِي اثْنَيْنِ رَجُلٌ آتَاهُ اللَّهُ حِكْمَةً فَهُوَ يُبَيِّنُهَا فِي النَّاسِ وَيُعَلِّمُهَا

وَرَجُلٌ آتَاهُ اللَّهُ مَالًا فَسَيُلْطَمُ عَلَى هَلِكَةٍ فِي الْحَقِّ۔ (بخاری و مسلم۔ ابن مسعود)

حسد صرف دو شخصوں پر (جائز) ہے، ایک وہ شخص جسے اللہ تعالیٰ نے علم و حکمت سے نوازا ہو اور وہ اسے لوگوں میں پھیلاتا ہو اور سکھاتا ہو اور دوسرا وہ شخص جسے اللہ نے مال دیا ہو اور اسے حق کے راستے میں

(۱) مجھے یہ روایت ان الفاظ میں نہیں ملی البتہ ابن عدی نے ابو ہریرہ سے قدرے مختلف روایت نقل کی ہے۔

ہلاکت پر مسلط کر دیا ہو۔

ایک حدیث میں یہ الفاظ ہیں :-

وَرَجُلٌ آتَاهُ اللَّهُ الْفَقْرَ أَنْ فَهُوَ يَقُومُ بِهِ آتَاهُ النَّيْلَ وَالشَّهَارَ فَيَقُولُ الرَّجُلُ لَوْ أَنَّ لِي
الْفَيْسُ لَمَا أَتَى هَذَا الْفَقْرَ مِثْلَ مَا يَفْعَلُ - (مسلم - ابن مسعود)

اور وہ شخص جسے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم عطا کیا ہو اور وہ رات دن اس کی تلاوت کرے اور کچھ نہ کرے

فحسب یہ کہے کہ اگر یہ شخص جو اللہ کو عطا کیا گیا ہے مجھے بھی عطا کیا جائے تو میں بھی ایسا ہی کرتا ہوں۔

قرآن کریم کی بے شمار آیات میں کافروں، کافروں اور بدکاروں سے دور رہنے، ان سے قطع اور ان سے رشتہ کی قطع کی ممتنع کی ممتنع ہے اس ضمن میں بعض آیات یہ ہیں :-

لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكَافِرِينَ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ - (پ ۳۰ آیت ۲۸)

مسلمانوں کو چاہیے کہ کفار کو دوست نہ بنائیں مسلمانوں کو چھوڑ کر

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا لِلْكَافِرِينَ وَلِلْمُنَافِقِينَ أَوْلِيَاءَ - (پ ۳۰ آیت ۲۸)

اے ایمان والو! تم یہود و نصاریٰ کو دوست مت بناؤ۔

وَكَذَلِكَ كُنْتُمْ لِي بَعْضُ الظَّالِمِينَ بَعْضًا - (پ ۲۸ آیت ۲۹)

اور اسی طرح ہم بعض کفار کو بعض کے قریب رکھیں گے۔

ایک حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر مسلمان سے عہد لیا ہے کہ وہ ہر مخالف سے بغض رکھے اور ہر مخالف سے یہ عہد لیا ہے کہ وہ ہر مومن سے بغض رکھے (۱) بعض احادیث یہ ہیں :-

الْمَرْءُ مَعَ مَنْ أَحَبَّ (۲) آدمی اس کے ساتھ ہے جس سے وہ محبت کرے۔

مَنْ أَحَبَّ قَوْمًا وَوَلَّاهُمْ جُحُشَ مَعَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ (طبرانی - ابو قریبہ ابن ہدی علیہ السلام)

جو شخص کسی قوم سے محبت کرے اور ان سے دوستی رکھتا ہے قیامت کے دن اس کا حشر اسی کے ساتھ ہوگا۔

لَوْ تَقَرَّرَ عُرَى الْإِيمَانِ الْحُبُّ فِي الدِّينِ الْبُغْضُ فِي الدِّينِ (۳)

ایمان کی مضبوط گرہ اللہ کے لئے محبت اور اللہ کے لئے بغض ہے۔

بغض فی اللہ اور حب فی اللہ کے سلسلے میں بے شمار روایتیں وارد ہیں اور ہم نے کتاب آداب المحبت میں ان کا ذکر کیا ہے اور بعض

روایات کتاب الامریا المعروف بالنسی عن النکر میں بھی آئی ہیں اس لئے ہم یہاں ان کا اعادہ نہیں کرنا چاہتے اب اگر تم یہ کہو کہ

بست سی آیات اور روایات سے پتا چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے بغیر محاسن کا وجود محال ہے اور اس کا تصور بھی عقیدہ توحید کے

مقابلے ہے اس لئے گناہوں کو برا سمجھنا گویا اللہ تعالیٰ کی رضا اور رضا کو برا سمجھنا ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہاں دو متضاد اور مختلف

قسم کی روایات موجود ہیں اس لئے ان میں مطابقت کی کوئی صورت ہونی چاہیے یعنی ایک ہی شے میں رضا اور کراہت کا اجتماع

ممکن نہ ہو جانا چاہیے کہ یہ امر ان ضعیف العقل لوگوں پر مشتبہ ہے جو علوم کے اسرار و رموز پر مطلع ہونے کی قدرت نہیں رکھتے

اور یہ سمجھتے ہیں کہ منکرات پر خاموش رہنا بھی رضا کے مقامات میں سے ایک مقام ہے بلکہ اسے انہوں نے حسن ظن قرار دیا ہے

حالانکہ یہ ان کی جمالت اور نادانی ہے بلکہ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ رضا اور کراہت دو متضاد امر ہیں اگر کسی ایک چیز پر ایک ہی جہت

سے ایک ہی طریقے پر وارد ہوں لیکن اگر کراہت کی وجہ رضا کی وجہ سے مختلف ہو تب کوئی تضاد نہیں ہے مثال کے طور پر اگر

تمہارا کوئی دشمن مرجائے اور وہ تمہارے کسی دوسرے شخص کا بھی دشمن ہو اور اسے ہلاک کرنے کے درپے ہو تم اس کی موت

اس لئے ناخوش کرتے ہو کہ وہ تمہارے دشمن کا دشمن تھا اور اس لئے پسند کرتے ہو کہ وہ خود تمہارا دشمن تھا حال محبت کا

(۱) یہ روایت مجھے نہیں ملی۔ (۲) روایت پہلے گذر چکی ہے

ہے، اس کے بھی دو پہلو ہیں، ایک پہلو تو یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا فضل، اس کا اختیار اور ارادہ ہے اس لئے اس پر راضی رہنا مالک الملک کی طوکت کو تسلیم کرنا اور اس کے فضل پر سر تسلیم خم کرنا ہے، اور دوسرا پہلو یہ ہے کہ وہ بندے کا کسب، اس کا وصف اور اس کی علامت ہے، اور اس لحاظ سے وہ اللہ کا ایک مبغوض اور ناپسندیدہ بندہ ہے کہ اس پر بغض اور غضب کے دواعی مسلط کئے گئے ہیں، اور ہمیں بھی وہ اسی لئے ناپسند ہونا چاہیے۔ آئیے اسے ایک مثال کی روشنی میں دیکھتے ہیں، فرض کیجئے بندوں میں ایک معشوق صفت شخص ہے جس کے بے شمار عشاق ہیں، اس نے اپنے عاشقوں کے رویہ و یہ اعلان کیا کہ ہم اپنے دوستوں اور دشمنوں میں امتیاز کرنے کے لئے ایک معیار مقرر کرنا چاہتے ہیں۔ جو اس معیار پر پورا اترے گا ہم اسے اپنا عاشق صادق تصور کریں گے، ہم پہلے فلاں عاشق کی طرف چلتے ہیں، اسے اس قدر اذیت دیں گے، اور اس قدر ماریں گے ستائیں گے کہ وہ ہمیں گالی دینے پر مجبور ہو جائے، اور جب وہ گالیاں دینے لگے تو ہم اس سے بغض کریں گے، ہم اسے اپنا دشمن تصور کریں گے، اور جس سے وہ محبت کرے گا ہم اسے بھی اپنا دشمن سمجھیں گے، اور جس سے وہ نفرت کرے گا اسے ہم اپنا دوست اور عاشق سمجھیں گے۔ چنانچہ اس نے اپنے اعلان کے مطابق اقدام کیا، اور اس کی وہ مراد بھی پوری ہو گئی جو وہ چاہتا تھا کہ اس کا ایک عاشق اذیت پر مبرنہ کر سکے، اور اس نے گالیاں شروع کر دیں، گالیوں سے دل میں بغض پیدا ہوا، اور بغض نے عداوت کی صورت اختیار کر لی، اس صورت میں اس شخص کو جو عاشق صادق ہو اور محبت کی شرائط سے واقفیت رکھتا ہو یہ کہنا چاہیے کہ اپنے فلاں عاشق کو تکلیف پہنچانے، اور اسے زد و کوب کر کے اپنے سے دور کرنے کے لئے جو تدبیر تو نے اختیار کی تھی، میں اس سے راضی ہوں، اور اسے پسند کرتا ہوں، کیوں کہ یہ تیری رائے، تدبیر، فضل اور ارادہ ہے، اور اس شخص نے تیری اذیت کے جواب میں جو گالی دی وہ سراسر اس کی زیادتی اور ظلم ہے، اسے چاہیے تھا کہ وہ ہر اذیت پر مبر کرتا، اور گالی دینے سے گریز کرتا، لیکن کیوں کہ حیرانگشاہی تھا، اور تو یہی چاہتا تھا کہ تیری اذیت کے جواب میں وہ گالی دے اور تیرے دل میں اس کی طرف سے بغض پیدا ہو جائے، اس لئے اس نے تیری تدبیر اور ارادے کے مطابق کیا، میں تیری مراد کی تکمیل پر راضی ہوں، اگر ایسا نہ ہوتا تو تیری تدبیر ناقص رہتی، اور تیری مراد پوری نہ ہوتی، اور میں اسے پسند نہیں کرتا کہ تیری مراد پوری نہ ہو، یہ تو اس کے فضل کی ناپسندیدگی کا پہلو ہوا، لیکن دوسری طرف میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس عاشق نے گالی دے کر بڑی جسارت کی ہے، تیرے جیسا حسین و جمیل انسان اسے مارتا ہو تو اسے اپنی خوش بختی پر نازاں ہونا چاہیے تھا، اور تیرا شکر گزار ہونا چاہیے تھا کہ تو نے اسے اپنی عنایات کا مستحق گردانا، اور تیرے جسم پر اپنے نرم و نازک ہاتھ لگائے، اس عاشق کے نزدیک اپنے رقیب کا یہ فضل پسندیدہ بھی ہے، اس لئے کہ معشوق ہی چاہتا تھا کہ وہ زد و کوب کے جواب میں گالیاں دے، اور دل میں بغض پیدا ہو جائے اور ناپسندیدہ بھی ہے کہ معشوق کی ماریداشت نہیں کی، وہ اپنے رقیب سے اس لئے نفرت کرتا ہے کہ معشوق کو اس سے نفرت ہے، اس لئے کہ محبت کی علامت ہی یہ ہے کہ محبوب کے حبیب کو اپنا دوست سمجھے، اور اس کے دشمن کو اپنا دشمن تصور کرے، گویا یہ شخص ایک ہی فضل کو معشوق کی طرف منسوب کر کے اچھا تصور کرتا ہے، اور مبغوض عاشق کی طرف منسوب کر کے برا سمجھتا ہے، اور اس میں کوئی تضاد نہیں ہے، تضاد کی صورت تو یہ ہے کہ کسی امر سے اس لئے راضی ہو کہ معشوق کی مراد یہی ہے، اور اس لئے ناراض ہو کہ معشوق کا خشاء ہی ہے، آدمی کا کسی چیز کو ایک وجہ سے برا سمجھنا، اور ایک وجہ سے اچھا جاننا ممکن ہے اور اس کی بے شمار نظیریں ہیں۔

اب ہم اپنے اصل مقصود کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ مثال مذکورہ میں مبغوض عاشق سے مراد وہ شخص ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے شہوت کے دواعی مسلط کر دیے ہوں یہاں تک کہ وہ معصیت کو محبوب جانتا ہو اور اس کا ارتکاب کرتا ہو، اللہ تعالیٰ اپنی نافرمانی کرنے والے سے خفا ہوتا ہے، اگرچہ یہ نافرمانی اسی کی تدابیر اور تقدیر سے ظہور پذیر ہوتی ہے، لیکن اس کا نافرمانی پر ناراض ہونا ایسا ہے جیسے معشوق اپنے عاشق کی گالیوں سے بغض کرتا ہے، حالانکہ وہ گالیاں خود اسی کی تدبیر کا نتیجہ تھیں، نہ وہ ایسے اسباب اختیار کرتا اور نہ وہ بندہ مسکین گالیوں پر اترتا، اللہ تعالیٰ اپنے جن بندوں پر معصیت کے دواعی مسلط کرتا ہے ان کے متعلق یہ یقین کر لینا چاہیے کہ مشیت ایزدی اسی میں ہے کہ وہ بندے مرتکب معصیت ہوں، اور اللہ تعالیٰ کی ناراضگی اور غضب کے مستحق ٹھہریں جو

بندہ اپنے اللہ سے بھی محبت رکھتا ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ ہر اس شخص سے بغض رکھے جس سے اللہ بغض رکھتا ہے اور اس شخص پر خفا ہو جس پر اللہ خفا ہوتا ہے اور اس سے دور رہے جسے اس نے اپنے دوبار سے نکال دیا ہو اور اپنی قربت سے محروم کر دیا ہو اگرچہ وہ اللہ تعالیٰ کی قدرت اور قدرت اس درجے پر پہنچا ہے لیکن اس کے باوجود وہ ملعون مذموم اور مردود ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ کے جس قدر عین اور مقربین ہیں ان سب کی نظروں میں اس کا منغوض اور مردود ہونا ضروری ہے تاکہ محبوب کی موافقت پائی جائے یعنی اس پر عاشق کو بھی اپنی ناراضگی ظاہر کرنی چاہیے جس پر معشوق ناراض ہو اور جن روایات و اخبار کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ان سے بغض فی اللہ اور حب فی اللہ کی تاکید ہوتی ہے اور یہ ثابت ہوتا ہے کہ کفار کے معاملے میں تشدید وارد ہے ان سے اعراض کرنا چاہیے اور ناراض رہنا چاہیے اگرچہ اللہ تعالیٰ کے فیعلوں پر راضی رہنا بھی روایات سے ثابت ہے معلوم ہوا کہ رضا کسی اور اعتبار سے مقصود ہے اور ناراضگی کسی اور اعتبار سے چنانچہ رضا اس اعتبار سے ضروری ہے کہ ان افعال کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہے اور کراہت اس اعتبار سے کہ وہ بندے کی طرف بھی منسوب ہیں یہ سب امور تقدیر سے وابستہ ہیں اور ایک راز ہے جس کا افشاء کرنا جائز نہیں ہے زیادہ سے زیادہ اتنا کہہ سکتے ہیں کہ شر اور خیر دونوں مشیت اور ارادے میں داخل ہیں لیکن شر ایک کمزور مراد ہے اور خیر ایک پسندیدہ مراد ہے جو شخص یہ کہتا ہے کہ شر امر مراد نہیں ہے وہ جاہل ہے اور جو یہ کہتا ہے کہ خیر و شر دونوں صرف اللہ سے ہیں اور ان میں کراہت و رضا کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہے وہ بھی جاہل ہے لیکن اس کی تفصیل بیان نہیں کی جاسکتی۔ اس لئے بہتر سکوت ہے اور شریعت کے ادب کا تقاضا بھی یہی ہے چنانچہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں :-

الْقَلْبُ سِرُّ الْمَوْفَلَا تَفْشُوهُ (ابو نعیم۔ معانی) تقدیر اللہ کا راز ہے اسے ظاہر مت کرو۔

تقدیر علم مکاشفہ سے متعلق ہے اور یہاں ہم یہ بیان کرنا چاہتے ہیں کہ اللہ کی قضاء پر راضی ہونا اور گناہوں کو برا سمجھنا جب کہ گناہ خود بھی قضاء الہی سے ہوتے ہیں ممکن ہے اور ان دونوں کے اجتماع میں کوئی تناقض نہیں ہے گذشتہ طور میں اس پر کافی گفتگو ہو چکی ہے ہمارے خیال میں یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ مترتّب فیض کے بغیر رضا اور کراہت کا اجتماع ممکن ہے اسی تقریر سے یہ بات بھی ثابت ہو گئی ہے کہ گناہوں کے ارتکاب اور ان کی عفو و مغفرت کے لئے دعا کرنا اور خیر کی راہ پر استقامت کی طلب قضاء الہی پر رضا کے خلاف نہیں اس لئے اللہ تعالیٰ نے دعا کو اسلئے عبادت قرار دیا ہے کہ وہ صفائے ذکر، خشوع قلب اور تقصیر و عاجزی کے ساتھ دعا کریں اور وہ دعا ان کے دل کے لئے باعث جلا بن جائے اور موجب کشف بن جائے اور اس کے باعث اللہ تعالیٰ کے بے پایاں الطاف کا مرکز ٹھہرے جس طرح پیاس دور کرنے کے لئے گلاس ہاتھ میں لیتا یا پانی تلاش کرنا قضاء الہی کے خلاف نہیں ہے اور نہ اس بات کا اختیار کرنا رضا کے خلاف ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے کسی اور چیز کے لئے بنایا ہو اسی طرح دعا بھی ایک سبب ہے اور اللہ تعالیٰ نے اسے جلائے قلب کے لئے کنجی اور صفائے قلب کا باعث بنایا ہے اب اگر کوئی دعا کرتا ہے تو یہ رضائے الہی کے خلاف کیسے ہو گا ہم پہلے بھی لکھ چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی سنت جاریہ کے مطابق اسباب اختیار کرنا توکل کے متناہی نہیں ہے یہ بحث باب التوکل میں گذر چکی ہے اسی طرح دعا بھی رضا کے متناہی نہیں ہے کیوں کہ رضا مقام کے اعتبار سے توکل کے نہایت قریب ہے۔

البتہ معیبت کا اظہار کرنا اور شکایت کے طور پر پریشانیوں کا تذکرہ کرنا اور دل میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے انہیں برا سمجھنا رضا کے خلاف ہے اور شکر کے طور پر مصائب کا اظہار اور اللہ تعالیٰ کی قدرت و عظمت کے بیان کے لئے اپنی پریشانیوں کا ذکر رضا کے مخالف نہیں ہے چنانچہ بعض سلف صالحین کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی قضاء پر حسن رضایہ ہے کہ کبھی شکایت کے طور پر گرمی کے دنوں میں یہ نہ کہے کہ یہ گرم دن ہے ہاں اگر موسم سرما میں کہے گا تو اسے شکر سمجھا جائے گا شکایت ہر حال میں رضا کے خلاف ہے اسی طرح کھانوں کی برائی کرنا اور ان میں عیب نکالنا بھی اللہ تعالیٰ کی قضاء کے خلاف ہے کیوں کہ صنعت کی مذمت صانع کی مذمت ہے

اور تمام چیزیں اللہ تعالیٰ ہی کی بنائی ہوئی ہیں، کہنے والے کا یہ کہنا کہ فقر مصیبت اور آزمائش ہے، اور اولاد رنج و پریشانی ہے، اور پیشہ تکلیف و مشقت ہے، تو یہ بھی رضا کے خلاف سمجھا جائے گا، بلکہ تدبیر کو مدترک کے سپرد کرنا اور ملک کو صاحب ملک کے حوالے کرنا ہی رضا ہے، کہنے والے کو وہی کہنا چاہیے جو حضرت عمرؓ نے فرمایا تھا ”مجھے یہ پروا نہیں کہ میں مالدار ہوں، یا فقیر نہ مجھے یہ معلوم کہ ان میں سے کون سی چیز میرے لئے بہتر ہے۔“

بلاد مصیبت سے فرار اور اس کی مذمت بعض کمزور عقل رکھنے والے لوگ یہ کہتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کے بموجب جس میں آپ نے طاعون زدہ شہر سے نکلنے سے منع فرمایا ہے، یہ بھی ضروری ہے کہ اس شہر سے بھی راہ فرار اختیار نہ کی جائے جہاں معاصی ظہور پذیر ہو رہے ہوں اس لئے کہ جس طرح طاعون زدہ علاقے سے بھاگنا اللہ تعالیٰ کی قضاء سے فرار ہے، اسی طرح شہر مصیبت سے فرار ہونا بھی اللہ تعالیٰ کے فیصلے کے خلاف کرنا ہے، شہر مصیبت کو بلادِ طاعون پر قیاس کرنا صحیح نہیں ہے، بلکہ طاعون زدہ علاقے سے بھاگنا اس لئے ممنوع ہے کہ بالفرض ستر دست لوگ شہر سے کوچ کر جائیں، اور وہ لوگ باقی رہ جائیں جو مرض میں گرفتار ہیں تو ان کی خبر گیری کون کرے گا، پھارے کس پرسی کے عالم میں ہلاک ہو جائیں گے، اسی لئے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے طاعون سے بھاگنے کو میدانِ جہاد سے بھاگنے کے مشابہ قرار دیا ہے، اگر اس کی وجہ یہی ہوئی جو ضعیف العقل نے تصور کی ہے، یعنی قضائے الہی کے خلاف ہے تو اس شخص کو واپسی کی اجازت کیوں دی جاتی جو شہر کے قریب پہنچ چکا ہو، اور ابھی شہر میں داخل نہ ہو سکا ہو، ہم نے اس موضوع پر کتاب التوکل میں بحث کی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ طاعون زدہ علاقوں سے بھاگنے کی علت شہر مصیبت سے فرار ہونے کی علت سے مختلف ہے، اور یہ رضا سے فرار نہیں ہے، بلکہ جس چیز سے بھاگنا ضروری ہے اس سے بھاگنا بھی حکم الہی میں داخل ہے۔ اسی طرح ان مواقع کی مذمت بھی جو بے حیائی کے جذبات کو متمیز کریں، یا ان اسباب کی برائی کا ذکر جو مصیبت کا باعث ہوں رضائے الہی کے خلاف نہیں ہے۔ بشرطیکہ مقصد محض مذمت نہ ہو بلکہ ان مواقع اور اسباب سے لوگوں کو دور رکھنا ہو۔ اکثر سلف صالحین کا عمل ایسا ہی تھا، ایک زمانے میں تقریباً تمام اہل فضل و کمال بغداد کی مذمت پر حلق ہو گئے تھے، اسی لئے وہ لوگ وہاں رہنا پسند نہیں کرتے تھے، بلکہ دور بھاگنا چاہتے تھے، حضرت عبداللہ ابن المبارک فرماتے ہیں کہ میں مشرق و مغرب میں پھرا میں نے بغداد سے زیادہ کوئی شہر پر انہیں دیکھا، لوگوں نے عرض کیا آپ نے اس شہر کی کیا برائی دیکھی، فرمایا وہاں اللہ کی نعمتوں کی بے حرمتی ہوتی ہے اور مصیبت الہی کو معمولی سمجھا جاتا ہے، جب آپ خراسان تشریف لائے تو لوگوں نے آپ سے دریافت کیا کہ آپ نے بغداد میں کیا دیکھا، فرمایا میں نے وہاں غضب ناک سیاحی، حسرت زدہ تاجر اور حیران و پریشان قاری کے علاوہ کسی شخص کو نہیں دیکھا، یہ گمان نہ کرنا چاہیے کہ حضرت عبداللہ ابن المبارک نے غیبت کی ہے، یہ غیبت نہیں ہے، کیوں کہ آپ نے کسی خاص متعین شخص کا نام نہیں لیا، اور نہ اس کی برائی کر کے اسے نقصان پہنچایا، بلکہ آپ کا مقصد لوگوں کو متنبہ کرنا تھا کہ وہ بغداد کی رہائش سے بچیں۔ جب آپ مکہ مکرمہ کا قصد فرماتے تو بغداد میں صرف سولہ روز ٹھہرتے تاکہ قافلہ تیار ہو سکے اور سولہ روز کی مدت کے عوض سولہ دینار خیرات فرماتے تاکہ ایک دینار ان کے ایک روز کے قیام کا کفارہ بن سکے، بزرگوں کے ایک گروہ نے جس میں حضرت عمر ابن عبدالعزیز، کعب الاحبار وغیرہ ہیں عراق کی مذمت کی ہے، حضرت عبداللہ ابن عمرؓ نے اپنے ایک آزاد کردہ غلام سے دریافت کیا کہ تو کہاں رہتا ہے؟ اس نے عرض کیا عراق میں، فرمایا: تو وہاں کیا کرتا ہے، مجھے بتلایا گیا ہے کہ جو لوگ وہاں رہائش پذیر ہیں وہ کسی نہ کسی مصیبت میں مبتلا ہوتے ہیں، کعب الاحبار نے ایک مرتبہ عراق کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ شہر کے دس حصوں میں سے نو حصے عراق میں ہیں، اور ان میں سے ایک لاءلاج دودھ ہے، ایک بزرگ کا یہ قول بھی نقل کیا گیا ہے کہ خیر کے دس حصے ہیں ان میں سے نو حصے شام میں ہیں، اور ایک حصہ عراق میں۔ ایک بزرگ محدث فرماتے ہیں کہ ایک روز ہم لوگ حضرت قتیل ابن عیاض کی مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک شخص آیا جس نے ہمارے رکھی تھی، حضرت قتیل ابن عیاض نے اس کا اعزاز فرمایا اور اسے اپنے قریب جگہ دی، اور دریافت فرمایا کہ تم کہاں رہتے ہو اس نے کہا میں عراق میں سکونت پذیر ہوں، یہ سب کر آپ نے منہ پھیر لیا، اور فرمایا کہ لوگ ہمارے پاس راہیوں کا لباس پہن کر آتے ہیں اور

جب ہم ان سے پوچھتے ہیں کہ وہ کہاں رہتے ہیں تو ان کا جواب یہ ہوتا ہے کہ ظالموں کے آشیانے میں۔ حضرت بشر ابن الحارث فرماتے ہیں کہ بغداد کے عابدوں کی مثال ایسی ہے جیسے پاخانے میں بیٹھ کر "عابد" بنے ہوں، آپ یہ بھی فرماتے تھے کہ یہاں رہنے میں میری اقتدار امت کو جو باہر جانا چاہیے وہ جاسکتا ہے۔ حضرت امام احمد حنبلؒ فرماتے ہیں کہ اگر ان بچوں کا تعلق ہم سے نہ ہوتا تو یہ شہر چھوڑ دیتے، لوگوں نے دریافت کی کہ یہ شہر چھوڑ کر آپ کہاں تشریف لے جاتے، فرمایا عابدوں میں، ایک بزرگ سے کسی نے بغداد کے متعلق دریافت کیا فرمایا بغداد کا زائد بھی بخت ہے اور بدکار بھی لپکا ہے، ان روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر کسی شہر میں معاصی کی کثرت ہو جائے تو وہاں ٹھہرنا ضروری نہیں ہے، بلکہ اس شہر سے ہجرت کر کے کسی اور جگہ قیام کرنے کی تجاویز ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:-

أَلَمْ نَكُنْ أَرْضَ الْبُحْرَىٰ سَعَفَتْهَا جُرُوفُهَا (پ ۵ ر ۵ آیت ۹۱)

وہ کہتے ہیں کیا خدا تعالیٰ کی زمین وسیع نہ تھی تم کو جو ترک وطن کر کے اس میں چلا جانا چاہیے تھا۔

اگر اہل و عیال کے باعث ہجرت نہ کر سکے تو باطل تاخیر سے رہے، اور اس شہر میں رہ کر قلبی سکون محسوس نہ کرے، اور دل بدو انگلی کے ساتھ یہ دعا کرتا ہے:-

رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْ هَذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ أَهْلُهَا (پ ۵ ر ۵ آیت ۷۵)

اے ہمارے پروردگار ہم کو اس بستی سے باہر نکال جس کے رہنے والے سخت ظالم ہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ جب ظلم عام ہوتا ہے تو صحیحیہ نازل ہوتی ہیں اور تمام رہنے والوں کو تباہ و برباد کر دیتی ہیں، اور وہ لوگ بھی نرنے میں آجاتے ہیں جو بے قصور ہوتے ہیں، اور جن کا شمار اللہ تعالیٰ کے اطاعت گزار بندوں میں ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد

ہے:- وَاتَّقُوا فِتْنَةً لَا تُصِيبُ الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْكُمْ خَاصَّةً (پ ۹ ر ۱۲ آیت ۲۵)

اور تم ایسے وبال سے بچو کہ جو خاص انہی لوگوں پر واقع نہ ہو گا جو تم میں ان گناہوں کے مرتکب ہوتے ہیں۔

بہر حال نقص دین کے اسباب میں رضائے مطلق مقصود نہیں ہے، بلکہ صرف اس اعتبار سے رضا مقصود ہے کہ ان کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہے۔

کونسا شخص افضل ہے اہل علم کا ان تین مقصود کی فضیلت کے سلسلے میں اختلاف ہے، جو تین مختلف مقامات پر قائم ہوں، ایک وہ شخص جو دیدار الہی کے لئے موت کا اشتیاق رکھتا ہو، اور دوسرا شخص وہ جو اپنے آقا کی خدمت و اطاعت کے لئے زندگی کو محبوب سمجھتا ہو، اور تیسرا وہ شخص جو یہ کہتا ہو کہ میری اپنی پسند کچھ نہیں ہے میں وہ پسند کرتا ہوں جو اللہ تعالیٰ میرے لئے پسند کرتا ہے، اور میں اس امر پر راضی ہوں جس پر اللہ تعالیٰ راضی ہے، یہ سوال بعض اہل معرفت کے سامنے رکھا گیا، انہوں نے فرمایا صاحب رضا افضل ہے، کیوں کہ وہ ان میں سب سے کم فضولیات میں مبتلا ہے، ایک دن وہیب ابن الورد، سفیان ثوری، اور یوسف ابن اسباط کا اجتماع ہوا، حضرت سفیان ثوری نے فرمایا کہ میں آج سے پہلے موت کو برا جانتا تھا، لیکن اب میں مرجانا چاہتا ہوں، یوسف ابن اسباط نے اس اچانک خواہش کی وجہ دریافت کی، فرمایا میں فتنے سے ڈرتا ہوں، یوسف نے کہا میں تو طول بھاگو برا نہیں سمجھتا حضرت سفیان نے پوچھا کیوں؟ فرمایا تاکہ مجھے کسی دن عمل صالح اور حسن توبہ کی توفیق ہو سکے۔ وہیب ابن الورد سے پوچھا گیا آپ کیا کہتے ہیں فرمایا میں کچھ نہیں چاہتا، میرے نزدیک محبوب تر بات وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کو محبوب ہے، حضرت سفیان ثوری نے ان کی دونوں آنکھوں کے درمیان بوسہ دیا اور فرمایا رب کعبہ کی قسم یہی روحانیت ہے۔

محبت خدا کی حکایات، اقوال اور مرکاشفات

کسی عارف سے پوچھا گیا کہ آپ محب ہیں، انہوں نے جواب دیا میں محب نہیں ہوں، بلکہ محبوب ہوں، محب تو محتوب

ہوتا ہے، انہی بزرگ سے کسی نے عرض کیا کہ آپ سات میں سے ایک ہیں، انہوں نے فرمایا میں سات میں سے ایک نہیں ہوں بلکہ سات کا مجموعہ ہوں، یہ بھی فرمایا کرتے تھے اگر تم نے مجھے دیکھ لیا تو سمجھ لو کہ چالیس ابدال کو دیکھ لیا، لوگوں نے عرض کیا یہ کیسے ممکن ہے؟ آپ فرد واحد ہیں، آپ کو دیکھنا چالیس افراد کے دیکھنے کے برابر کیسے ہو سکتا ہے؟ انہوں نے جواب دیا اس لئے کہ میں نے چالیس ابدال کی زیارت کی ہے اور ہر شخص سے اس کا ایک مخصوص غلط اور خاص تعلیم حاصل کی ہے، ان سے پوچھا گیا کہ ہمیں بتلایا گیا ہے کہ آپ حضرت خضر علیہ السلام کی زیارت سے مشرف ہوئے ہیں، یہ سن کر آپ مسکرائے اور فرمایا خضر کو دیکھنے پر حیرت کیسی، حیرت اس شخص پر ہونی چاہیے خضر جس کی زیارت کی تمنا کرتے ہوں، اور وہ ان سے اوچھل رہتا ہو، حضرت خضر علیہ السلام سے نقل کیا گیا ہے فرماتے ہیں کہ جس دن بھی میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اب روئے زمین پر اللہ کا کوئی ولی ایسا نہیں رہا جسے میں نہ جانتا ہوں اسی دن میری ملاقات کسی ایسے ولی سے ہوئی ہے جسے میں نہیں جانتا تھا۔ حضرت ہابزید، سلاطی سے عرض کیا گیا کہ آپ کو اللہ تعالیٰ کا مشاہدہ ہوتا ہے، آپ ہمیں اس کے متعلق کچھ بتلائیں، یہ سن کر وہ چیخ پڑے، کم بختو! تمہارے لئے مناسب نہیں ہے کہ ان مشاہدات کا علم حاصل کرو، لوگوں نے عرض کیا اچھا آپ ہمیں اللہ کے سلسلے میں اپنے سخت ترین مجاہدہ، نفس سے باخبر کریں، فرمایا یہ بھی جائز نہیں ہے، لوگوں نے کہا تب آپ ہمیں اپنی ابتدائی ریاضت ہی کے متعلق کچھ بتلائیں، فرمایا ہاں یہ بتلاتا ہوں، پہلے میں نے اپنے نفس کو اللہ تعالیٰ کی طرف ہلایا، اور اس پر زبردستی کی، اور اپنے آپ کو یہاں تک مجبور کیا کہ میں ایک سال تک پانی نہیں پیوں گا، اور نہ ایک برس تک سوؤں گا، میرے نفس نے اس عہد کی پابندی کی۔

یحییٰ ابن معاذ سے مروی ہے کہ انہوں نے ہابزید، سلاطی کو عشاء کی نماز کے بعد سے فجر تک اپنے بعض مشاہدات کے دوران اس حال میں دیکھا ہے کہ وہ بچوں کے بل بیٹھے ہوئے ہیں، ایزیاں زمین سے اٹھی ہوئی ہیں، ٹھوڑی سینے پر ہے، آنکھیں مسلسل کھلی ہوئی ہیں، اس کے بعد انہوں نے صبح کے وقت سجدہ کیا، اور دیر تک سجدے میں پڑے رہے، پھر سجدے سے اٹھے اور یہ دعا کی : اے اللہ بعض لوگوں نے تجھ سے پانی پر چلنے اور ہوا میں اڑنے کی طاقت مانگی، تو نے انہیں یہ طاقت بخشی، وہ اسے پا کر خوش ہوئے، میں اس طرح کی خواہشات سے تیری پناہ چاہتا ہوں، بعض لوگوں نے یہ چاہا کہ وہ زمین کو پیٹ کر رک دیں، تو نے انہیں اس قوت سے نوازا، وہ اس سے خوش ہوئے، میں اس خواہش سے تیری پناہ کا خواستگار ہوں، بعض لوگوں نے تجھ سے زمین کے خزانوں کا مطالبہ کیا، تو نے ان کا مطالبہ پورا فرمایا، اور انہیں زمین کے خزانے عطا کئے، میں ان خزانوں سے تیری پناہ مانگتا ہوں، راوی کہتے ہیں انہوں نے اولیاء اللہ کی تقریباً بیس کرامات شمار کرائیں، پھر اپنا رخ پھیرا، اور مجھے دیکھ کر فرمایا اے یحییٰ! میں نے عرض کیا، فرمایا ہے جناب والا، فرمایا تم یہاں کب سے ہو، میں نے عرض کیا کچھ عرصے سے، آپ یہ سن کر خاموش ہو گئے، میں نے عرض کیا محترم! آپ اس سلسلے میں کچھ بیان فرمائیں، فرمایا میں تمہیں اسی قدر بتلاؤں گا جس قدر تمہارے لئے مفید ہو گا، اللہ تعالیٰ نے مجھے فلک اسفل میں داخل کیا، پھر اسفل ملکوت میں پھرایا، اور مجھے زمینوں اور تخت اثری کی سیر کرائی، پھر فلک اعلا میں داخل کیا، اور مجھے آسمانوں کی سیر کرائی، اور جنتوں سے عرش تک جو کچھ آسمانوں میں موجود ہے، مجھے اس کی زیارت کرائی، اس کے بعد مجھے اپنے سامنے کھڑا کیا، اور فرمایا جو نعمتیں تم نے دیکھی ہیں ان میں سے جو نعمت چاہو مانگ سکتے ہو، میں تمہیں عطا کروں گا، میں نے عرض کیا :

پروردگار عالم! میں نے ایسی کوئی چیز نہیں دیکھی جسے اچھا سمجھ کر میں تجھ سے مانگوں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا تو میرا سچا بدمعہ ہے، تو صرف میری رضا کے لئے عبادت کرتا ہے، میں تیرے ساتھ ایسا ایسا معاملہ کروں گا، یحییٰ ابن معاذ کہتے ہیں مجھے یہ سن کر شدید وحشت ہوئی، اور دل سے چین ہو گیا، چنانچہ میں نے اپنی وحشت دور کرنے کے لئے عرض کیا کہ آپ نے معرفت الہی کا سوال کیوں نہ کر لیا، آپ کو تو ملک الملوک نے سوال کا حکم دیا تھا، آپ کو اس کا حکم ماننے ہوئے کچھ نہ کچھ ضرور مانگنا چاہیے تھا، حضرت ہابزید، سلاطی یہ سن کر مجھ پر سخت برہم ہوئے اور ڈانٹنے کے انداز میں فرمایا، خاموش رہ، مجھے اپنے نفس پر اللہ تعالیٰ سے غیرت آئی کہ اسے اس کے سوا بھی کوئی پہچانے، مجھے یہ بات اچھی نہیں لگتی کہ کسی دوسرے کو بھی اس کی معرفت ہو۔

روایت ہے کہ ابو تراب عیسیٰ اپنے کسی مرید پر بہت زیادہ ناز کرتے تھے، اسے اپنے قریب بٹھلاتے تھے، اس سے محبت کرتے

تھے، اور اس کی خدمت کرتے تھے اور وہ عبادت میں مشغول رہتا تھا، ایک دن ابو تراب نے ان سے فرمایا کہ بائیزید، سلاطی کی خدمت میں حاضری دیا کر، اس نے کہا کہ مجھے ان کی ضرورت نہیں ہے، جب ابو تراب نے بہت زیادہ اصرار کیا اور کہا کہ کاش تو بائیزید، سلاطی سے تعلق پیدا کرتا، یہ سن کر وہ مرید جوش میں آگیا، اور کہنے لگا کہ میں ابو یزید کا کیا کروں گا، میں نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا کہ اس نے مجھے بائیزید، سلاطی سے بے نیاز کر دیا ہے، ابو تراب فرماتے ہیں کہ اس کی اس بات سے میری طبیعت متکدر ہو گئی، میں اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکا، اور کہنے لگا کہ کیا تو اللہ تعالیٰ کو دیکھنے پر مغرور ہو گیا ہے، اگر تو بائیزید کو ایک بار دیکھے گا تو یہ اللہ تعالیٰ کو ستر بار دیکھنے کے مقابلے میں تیرے لئے زیادہ مفید ہے۔ یہ سن کر وہ مرید حیران رہ گیا، اور کہنے لگا یہ کیسے ممکن ہے، ابو تراب نے کہا کم بخت تجھے معلوم نہیں کہ جب تو اللہ تعالیٰ کو اپنے پاس دیکھتا ہے تو وہ تیری مقدار کے مطابق ظاہر کرتا ہے، اور جب بائیزید، سلاطی کے پاس ظہور کرتا ہے تو اس کی مقدار کے مطابق کرتا ہے، میری یہ بات اس کی سمجھ میں آگئی، اور کہنے لگا کہ مجھے ان کے پاس لے کر چلئے، یہ پورا واقعہ نقل کرنے کے بعد ابو تراب نے فرمایا کہ ہم ایک ٹیلے پر جا کر کھڑے ہو گئے، اور یہ انتظار کرنے لگے کہ ابو یزید، سلاطی اپنے ٹھکانے سے باہر تشریف لائیں، آپ کا قیام ایک ایسے مقام پر تھا جہاں درندوں کی کثرت تھی، اسی دوران موصوف اپنی پوشین کر پر ڈالے ہوئے گذرے، میں نے نوجوان سے کہا یہ ابو یزید ہیں، ان کی زیارت کر لو، نوجوان نے دیکھا، اور چیخ مار کر گر پڑا، ہم نے اسے حرکت دینا چاہا تو معلوم ہوا کہ وہ مرچکا ہے، ابو یزید، سلاطی نے اس کی تدفین میں ہمارے ساتھ تعاون کیا، میں نے حضرت سے عرض کیا محترم! آپ کے دیدار نے اسے ہلاک کر ڈالا۔ موصوف نے فرمایا نہیں بلکہ تمہارا دوست سچا تھا، اس کے دل میں ایک راز پنہاں تھا جس پر وہ مطلع نہیں ہو سکا تھا، جب اس نے ہمیں دیکھا تو وہ راز اس پر آشکار ہو گیا، اور اس کا بوجھ برداشت نہ کر سکا کیوں کہ ابھی اس کی ارادت ضعیف تھی۔

جب زنگی لشکر بصرے میں داخل ہوا، اور اس نے وہاں جاہلی و بھلائی، قتل و غارت گری کی تو حضرت سہیل ستیری کے کچھ مرید ان کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ آپ اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ یہ لوگ اس شہر سے دفع ہو جائیں، آپ یہ سن کر کچھ دیر خاموش رہے، اس کے بعد فرمایا کہ اس شہر میں اللہ تعالیٰ کے کچھ بندے ایسے ہیں کہ اگر وہ خالوں کے لئے بددعا کریں تو اللہ تعالیٰ ایک ہی رات میں ان کا خاتمہ کر دے، اور کوئی ظالم زندہ نہ بچے، مگر وہ بددعا نہیں کرتے، لوگوں نے پوچھا کیوں؟ فرمایا جو چیز اللہ تعالیٰ کو اچھی معلوم نہیں ہوتی وہ انہیں بھی اچھی نہیں لگتی، اس کے بعد انہوں نے قبولیت دعا سے متعلق چند باتیں بیان فرمائی جن کے ذکر کی یہاں گنجائش نہیں ہے، یہاں تک کہ آپ نے فرمایا اگر یہ لوگ اللہ تعالیٰ سے قیامت پہانہ ہونے کی دعا مانگیں تو ان کی یہ دعا بھی قبولیت سے سرفراز ہو۔

یہ حقائق ہیں، ان کا انکار نہیں کیا جاسکتا، جس شخص کو ان امور سے کچھ بہونہ ہو اس کو کم از کم ان کی تصدیق اور ایمان سے خالی نہ ہونا چاہیے، یعنی ان کے امکان کی تصدیق ضرور کرے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت وسیع، فضل عام، اور ملک و ملکوت کے بجانب بے شمار ہیں، اس کی مقدرات کی کوئی انتہا نہیں ہے اور برگزیدہ بندوں پر اس کا افضل و احسان بے پایاں ہے، اسی لئے حضرت ابو یزید فرمایا کرتے تھے کہ اگر تجھے حضرت موسیٰؑ کی مناجات، حضرت عیسیٰؑ کی روحانیت اور حضرت ابراہیمؑ کی دوستی عطا کر دی جائے تب بھی تو ان سے زائد کی دعا کر سکتا ہے، اس لئے کہ اس کے پاس ان درجات سے بھی بڑھ کر درجات ہیں، اگر تو کسی درجے پر پہنچ کر ٹھہر گیا تو باقی درجات خود بخود تجھ سے محبوب ہو جائیں گے، لیکن یہ حجاب ان لوگوں کے لئے ہے جو ان بزرگوں کا سا حال رکھتے ہیں اس لئے کہ یہ عظیم درجات ہیں، ایک صاحب معرفت کہتے ہیں کہ مجھے کشف کے ذریعہ ایسا معلوم ہوا جیسے چالیس حوریں ہوا میں اڑ رہی ہوں، ان کے بدن پر سونے چاندنی کے لباس اور زیورات ہیں جن سے جھٹکار کی آوازیں آرہی ہیں، میں نے ایک نظر ان پر ڈالی تو مجھے چالیس روز تک اس کی سزا دی گئی، اس کے بعد مجھے ایسی حوریں نظر آئیں جو سابقہ حوروں سے زیادہ حسین و جمیل تھیں، اور مجھ سے کہا گیا کہ ان کی طرف دیکھو، میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں، اور سر بسجود ہو کر عرض کیا اے اللہ! میں تیرے غیر سے تیری پناہ چاہتا ہوں، مجھے ان کی ضرورت نہیں ہے، میں اسی طرح آہ و زاری کرتا رہا، اور گڑگڑاتا رہا یہاں تک کہ

اللہ تعالیٰ نے انہیں مجھ سے دور کر دیا۔ مومن کو ان مکاشفات کا انکار نہ کرنا چاہیے اور نہ یہ سمجھنا چاہیے کہ اگر مجھ پر یہ امور
مکشف نہیں ہوتے تو ان کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ اگر صورت یہ بن جائے کہ ہر شخص اسی امر کا یقین کرے جو اس پر مشاہد ہو تو
ایمان کی راہ تنگ ہو کر رہ جائے۔ یہ حقائق ہر کس و ہر کس پر مکشف نہیں ہوتے بلکہ اللہ کے مخصوص بندوں پر مکشف ہوتے ہیں
اور ان پر بھی پہلے مرحلے میں نہیں ہوتے بلکہ اس وقت تک مکشف نہیں ہوتے جب تک کہ وہ دشوار ترین گناہیں عبور نہ کر لیں
اور بہت سے مقامات سے نہ گذر جائیں۔ ان مقامات سے بالکل ابتدائی اور ادنیٰ مقام یہ ہے کہ بندہ غلط ہو، نفسانی حظوظ اور حلق
کے ساتھ تمام ظاہری و باطنی ملائقی سے منقطع ہو، اس کے بعد یہ ضروری ہے کہ وہ ان امور کو لوگوں سے مخفی رکھے اور گناہی کی
زندگی پسند کرے، یہ راہ سلوک کا پہلا پڑاؤ ہے، بلکہ نقطہ آغاز ہے اور بہت سے بڑے بڑے پرہیزگار اور متقی بھی اس سے دور نظر
آتے ہیں جب بندہ کامل حلق کی طرف التفات کی کدورتوں سے خالی ہو جاتا ہے تو اس پر نور یقین کا آفتاب طلوع ہو جاتا ہے اور
حق کے مہادیٰ مکشف ہوتے ہیں، گمراہی اور راستے پر چلے بغیر ان امور کا انکار کرنا ایسا ہے جیسے کوئی شخص رنگ آلود لوسے میں اپنی
صورت نہ دیکھ کر کہے کہ میں گندہ ہوں، اگر اسے بخلی کر دیا جائے اور رنگ دور کر دیا جائے تب بھی اس میں صورت نظر نہیں آسکتی کہیں
کہ اس کے ہاتھ میں ایک سیاہ گھٹا ہے جس پر قہر قہر چڑھا ہوا ہے اور اس میں فی الحال کوئی عکس نظر نہیں آتا، ظاہر ہے
یہ انکار نہایت دوسرے کا جمل اور مذمت دوسرے کی گمراہی ہے، یہی حال ان تمام لوگوں کا ہے جو اولیاء اللہ کی کرامات کا انکار کرتے
ہیں وہ گھٹا بے مشاہدہ سے عاجز ہیں، جیسے یہ شخص رنگ آلود آنکھ میں اپنا چہرہ دیکھنے سے عاجز ہے، اللہ تعالیٰ کی قدرت کے انکار
کی یہ بدترین بنیاد ہے، مکاشفات کی خوشبو تو وہ شخص بھی سونگہ لیتا ہے جو راستے کے مہادیٰ میں چند قدم اٹھاتا ہے، چنانچہ کسی شخص
نے حضرت بشار بن الحارث سے پوچھا کہ اس مرتبے تک آپ کی رسائی کس طرح ہوئی، آپ نے فرمایا میں اللہ تعالیٰ سے اپنا حال
مخفی رکھنے کی درخواست کیا کرتا تھا، روایت ہے کہ آپ نے حضرت خضر علیہ السلام کو دیکھا اور ان سے عرض کیا کہ آپ میرے لئے
اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائیں، انہوں نے کہا اللہ تمہارے لئے اپنی اطاعت کی راہ آسان کرے، میں نے عرض کیا مزید دعا کریں، فرمایا
اللہ تعالیٰ تیری پردہ پوشی کرے، کہا گیا ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ تجھے حلق سے پوشیدہ رکھے، اور بعض یہ کہتے ہیں کہ
اللہ تعالیٰ کو تجھ سے دور رکھے، یہاں تک کہ تو کسی کی طرف التفات نہ کر پائے، ایک بزرگ سے منقول ہے کہ انہیں حضرت خضر
علیہ السلام کی زیارت کا بڑا اشتیاق تھا، ایک روز انہوں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی انہیں حضرت خضر علیہ السلام مل جائیں تاکہ وہ ان
سے کوئی اہم بات سکھ سکے، چنانچہ ان کی دعا قبول ہوئی، ملاقات کے موقع پر انہوں نے حضرت خضر علیہ السلام سے عرض کیا اے ابو
العباس! آپ مجھے ایسا ورد تلاویں کہ جب میں اسے پڑھوں تو لوگوں کی نگاہوں سے اوچھل ہو جاؤں، انہوں نے مجھے اس دعا کی
تلقین فرمائی :-

اَللّٰهُمَّ اَسْبِلْ عَلٰی كَشِيفَ سَعْرِكَ وَحَظَّ عَلٰی سَرَافَاتِ حُجُبِكَ وَاجْعَلْنِيْ فِيْ
مَكْنُوْنٍ عَنِكَ وَاجْعَلْنِيْ عَنْ قُلُوْبِ خَلْقِكَ

اے اللہ مجھ پر انکار کرنا پردہ ڈال، اور میرے اوپر اپنے جبابہات کے شامیانے نہاں، اور مجھے اپنے فیض میں
پوشیدہ کر، اور مجھے اپنی حلق کے دہلیز سے محبوب کر۔

اس کے بعد آپ غائب ہو گئے، پھر میں نے بھی آپ کو نہیں دیکھا، اور نہ کسی دل میں دیکھنے کا اشتیاق پیدا ہوا، تاہم میں نے اس ورد
کا التزام رکھا جس کی انہوں نے تلقین فرمائی تھی، اس دعا کی مجھ پر یہ تاثیر ہوئی کہ نہایت بھر میں ذلیل و خوار ہوا، یہاں تک کہ بعض
ذاتی بھی میرا مذاق اڑانے سے نہیں بچتے تھے، اور زبردستی مجھے اپنا مزدور بنا دیتے تھے، بچے الگ میرا مذاق اڑاتے، لیکن مجھے اسی
ذلت و رسوائی میں، اور گناہی کی زندگی میں سکون ملتا تھا۔

اولیاء اللہ کے احوال کا کچھ اور ذکر یہ تھا اولیاء اللہ کا حال، اور ایسے ہی لوگوں میں اللہ تعالیٰ کے محبوب بندوں کی جستجو

ہوتی چاہیے، قریب خود لوگ انہیں بچوند زدہ بوسیدہ گدڑیوں اور عہاؤں میں ڈھونڈتے پھرتے ہیں، اور انہیں اللہ کا دوست گردانتے ہیں جو علم و وسع میں معصوم ہوں اور جاہ و ریاست میں بلند مرتبہ رکھتے ہوں، حالانکہ اولیاء پر اللہ تعالیٰ کی غیرت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ انہیں لوگوں سے مخفی رکھے، چنانچہ ایک حدیث قدسی میں وارد ہے کہ میرے اولیاء میری قبا کے نیچے ہیں، انہیں میرے علاوہ کوئی نہیں جانتا، سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

رَبِّ اشْعَبْتَ أَغْبَرَ ذِي طَمَرٍ لَّنْ لَا يُؤْتِيَهُ لَهْ لَوْ أَقْسَمَ عَلَى اللَّهِ لَا بَرَّكَ (مسلم ابو ہریرہ)
 ہمت سے پرانندہ ہال، غبار آلود، اور دو چادر والے ایسے ہیں جو ذرا قابلِ توجہ نہیں ہوتے، لیکن اگر وہ اللہ تعالیٰ کو قسم دیں تو اللہ تعالیٰ ان کی قسم ضروری پوری کرے۔

ان معانی کی خوشبوؤں سے وہ محروم رہتے ہیں جو شگہر ہوں، خود پسند ہوں، اپنے علم و عمل پر نازاں اور مفتخر ہوں، اور وہ لوگ ان خوشبوؤں سے لیاوا قریب ہوتے ہیں جو شکستہ ہوں۔ اپنے نفوس کی ذلت سے آشنا ہوں، اور خود کو اس قدر ذلیل تصور کرتے ہوں کہ اگر ذلیل و رسوا کئے جائیں تو انہیں ذلت و رسوائی کا احساس نہ ہو جیسے وہ غلام کوئی ذلت محسوس نہیں کرتا جس سے اس کا آقا بلند مقام پر پہنچا ہوا ہو، جب بڑے کا یہ حال ہو جاتا ہے کہ وہ ذلت کو ذلت نہیں سمجھتا، اور اس کے دل میں ذلت کی طرف کوئی التفات باقی نہیں رہتا، بلکہ اس کے نزدیک اس کا مرتبہ تمام ذلتوں سے بھی کم تر ہو، حتیٰ کہ تواضع اور انکساری اس کی طبیعت ثانیہ اور مزاج کی خصوصیت بن جائے تو یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ ان خوشبوؤں کے مہادی سے آشنا ہو سکے گا، اگر ہمارے پاس ایسا دل نہ ہو، اور ہم اس مدح سے محروم ہوں تو یہ مناسب نہیں ہے کہ ہم ان لوگوں کو بھی ان کرامات کا اہل سمجھیں جو ان کے مستحق ہیں، اگر کوئی شخص اللہ تعالیٰ کا ولی نہیں ہو سکتا تو کیا وہ اللہ کے ولی کو دوست بھی نہیں بنا سکتا۔ اگر ہم اولیاء اللہ نہیں بن سکے تو ہمیں اولیاء اللہ سے محبت کرنے والا ضرور بننا چاہیے تاکہ اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ أَحَبَّ کی رو سے ہمارا حشر انہیں لوگوں کے ساتھ ہو، کچھ پانے کے لئے کچھ کھونا پڑتا ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک مرتبہ اپنی قوم بنی اسرائیل سے پوچھا کہ کبھی کہاں ہوتی ہے لوگوں نے عرض زمین میں، فرمایا کہ میں تم سے کچھ کہتا ہوں حکمت بھی انہی دلوں میں پیدا ہوتی ہے جو زمین جیسے ہو جائیں اللہ تعالیٰ کی ولایت کے طالب شرائط ولایت کی تلاش میں اس طرح سرگرداں رہے کہ انہوں نے اپنے نفوس کو ذلت و خست کی انتہا پہنچا دیا، چنانچہ حضرت جنید بغدادی کے استاد ابن الکریچی کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ کسی شخص نے انہیں اپنے گھر پر مدعو کیا، جب وہ اس شخص کے دروازے پر پہنچے تو اس نے انہیں بھاگایا آپ تھوڑی ہی دور چلے گئے کہ اس نے پھر بلایا جب وہ قریب آئے تو پھر دھتکار دیا، اس نے تین بار یہی عمل کیا، پھر تھی مرتبہ آپ کو اپنے گھر میں لے گیا اور عرض کیا کہ میں نے آپ کی تواضع کا امتحان لینے کے لئے یہ حرکت کی تھی، انہوں نے فرمایا میں برس تک میرے نفس نے ذلت پر راضی رہنے کی ریاضت کی ہے، یہاں تک کہ اب میں ایک پالتو کتے کی طرح ہو گیا ہوں جسے دھتکارا جائے تو بھاگ جائے، اور ہڈی ڈال دی جائے تو واپس آجائے، اگر تم مجھے بھاس مرتبہ دھتکار کر بھی بلائے تو میں آتا۔ انہی بزرگ نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ ایک مرتبہ میں نے ایک محلے میں سکونت اختیار کی، وہاں لوگ نیکی، اور فضل و کمال میں میرا نام لینے لگے، میرا دل اس صورت حال سے سخت مضطرب اور بے چین ہوا، چنانچہ میں نے اپنے نیک نامی کا ”داغ“ دھونے کے لئے یہ تدبیر کی کہ ایک حمام میں گیا، اور وہاں رکھا ہوا ایک خوب صورت لباس پہنا، اس پر اپنی بوسیدہ گدڑی ڈال کر باہر نکلا، لوگوں نے میری گدڑی کے نیچے قیمتی لباس کی جھلک دیکھی تو مجھے پکڑ لیا، میرا لباس اتارا اور مجھے اس قدر مارا کہ بے حال کر دیا تب جا کر میرے دل کو قرار آیا۔

غور کیجئے یہ لوگ اپنے نفوس کے ساتھ کس طرح کی ریاضتیں کیا کرتے تھے، اور کتنی مشقت اٹھاتے تھے، ان کا مقصد یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ انہیں مخلوق کی طرف دیکھنے سے محفوظ رکھے، اور خود اپنی طرف دیکھنے سے بھی بچائے، اس لئے کہ اپنے نفس کی طرف التفات کرنے والا بھی اللہ تعالیٰ سے محبوب ہوتا ہے، اور نفس کے ساتھ اشتغال اس کے لئے حجاب بن جاتا ہے، اللہ تعالیٰ کے

اور دل کے درمیان کوئی حجاب نہیں ہے، بلکہ دلوں کی دوری یہ ہے کہ وہ غیر اللہ کے ساتھ یا اپنے ساتھ مشغول ہوں، اور نفس کے ساتھ اشتغال سب سے بڑا حجاب ہے۔ روایت ہے کہ اہل اسلام میں سے ایک خوبصورت اور مالدار شخص ہابزیدہ۔ سلاطی کی مجلس میں حاضر ہوا تھا، وہ کبھی ان کی مجلس سے جدا نہیں ہوتا تھا، ایک دن اس شخص نے ہابزیدہ کی خدمت میں عرض کیا کہ میں تیس برس سے مسلسل روزے رکھ رہا ہوں، کبھی افطار نہیں کرتا، رات بھر نوافل پڑھتا ہوں، کبھی سوتا نہیں ہوں مگر میرے دل میں اس علم کی معمولی سی خوشبو بھی اثر انداز نہیں ہوتی جو آپ بیان کرتے ہیں، حالانکہ میں آپ کے بیان کردہ علم کی تصدیق کرتا ہوں، اور اس سے محبت کرتا ہوں، ہابزیدہ نے فرمایا اگر تم تین سو برس تک دن میں روزے رکھتے رہے، اور رات کو نوافل پڑھتے رہے تو ہمیں اس علم کا ایک ذرہ بھی حاصل نہ ہو سکے گا۔ اس شخص نے عرض کیا کیوں! آپ نے فرمایا اس لئے کہ تم اپنے نفس کی وجہ سے مجھب ہو، اس نے عرض کیا کہ اس کا کوئی علاج بھی ہے، فرمایا ہاں: عرض کیا مجھے بتائیے تاکہ میں اس پر عمل کر سکوں، فرمایا اس علاج پر تم عمل نہ کر سکو گے، اس نے عرض کیا آپ بتائیں میں ضرور عمل کروں گا، فرمایا اسی وقت حجام کے پاس جاؤ، اپنا سر اور داڑھی منڈاؤ، یہ لباس اتار کر گدڑی پہنو، اور اپنے گلے میں اخروٹ سے لہرن جمولی لٹکا کر بچوں سے کہو کہ وہ تمہیں ایک تھپڑ لگائیں، اور اس کے عوض ایک اخروٹ حاصل کر لیں، اپنا یہ طیبہ ہا کرہ زاول میں جاؤ، جہاں لوگوں کا ازدحام ہو وہاں پہنچو، خاص طور پر ان لوگوں کے پاس ضرور جاؤ جو تمہارے شناسا ہوں، اس نے کہا سبحان اللہ! آپ مجھ سے ایسا کہتے ہیں، فرمایا اس موقع پر تمہارا سبحان اللہ کہنا شرک ہے، اس نے سوال کیا: کیسے؟ فرمایا: تم نے اپنے نفس کو عظیم تصور کر کے سبحان اللہ کہا ہے، اللہ تعالیٰ کی عظمت کے اعتبار کے لئے سبحان اللہ نہیں کہا ہے، اس نے عرض کیا یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا، آپ کوئی اور عمل بتائیں، فرمایا تمام تدبیروں سے پہلے اسی تدبیر پر عمل کرنا ہو گا، اس شخص نے کہا میں ایسا نہیں کر سکتا، فرمایا میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ جو علاج میں بتاؤں گا وہ تم قبول نہیں کر پاؤ گے۔ حضرت ہابزیدہ۔ سلاطی نے یہ علاج اس شخص کے لئے تجویز کیا ہے جو صرف اپنے نفس کی طرف التفات رکھتا ہو، اور یہ چاہتا ہو کہ لوگ اس کی طرف ملتفت ہوں، اس بیماری کا علاج اس کے علاوہ ممکن نہیں جو حضرت ہابزیدہ نے تجویز کیا ہے، جو شخص اس علاج کی طاقت نہیں رکھتا اس کے لئے یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ ان لوگوں پر کبیر کرے جو اس مرض میں مبتلا نہیں ہوئے یا ہوئے تو انہوں نے اس تدبیر سے اپنا مرض دور کیا جو ابو یزید۔ سلاطی نے بتلایا ہے، یا یہ ہے کہ اس مرض سے شفا پانا ممکن نہیں ہے، صحت کا کم سے کم درجہ یہ ہے کہ اس کے امکان پر ایمان رکھتا ہو، جو شخص اس درجے سے بھی محروم ہے اس کے لئے خرابی ہی خرابی ہے شریعت میں یہ امور بالکل واضح طور پر بیان کیے گئے ہیں لیکن ان لوگوں پر غلی رہ جاتے ہیں جو اپنے آپ کو علمائے شریعت کے زمرے میں سمجھتے ہیں۔

سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں۔

لَا يَسْتَكْمِلُ الْعَبْدُ الْإِيمَانَ حَتَّى تَكُونَ قِلَّةُ الشَّيْءِ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنْ كَثْرَتِهِ وَحَتَّى يَكُونَ أَنْ لَا يَعْرِفَ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنْ أَنْ يَعْرِفَ (مسند الفردوس۔ علی ابن ابی طلحہ)

بعدہ کا ایمان اس وقت تک مکمل نہیں ہوتا جب تک کہ کم چیز زیادہ سے محبوب نہ ہو، اور جب تک کہ

عدم شہرت شہرت سے زیادہ محبوب نہ ہو۔

ثَلَاثٌ مَنْ كُنَّ فِيهِ اسْتَكْمَلَ إِيْمَانَهُ لَا يَخَافُ فِي اللَّهِ لَوْ مَ لَا يَمُ وَلَا يُؤْتِي شَيْئًا مِنْ عَمَلِهِ وَلَا عَزَّصَ عَلَيْهِ أَنْ أَحْلَاهُمَا لِلنَّبَا وَالْآخِرَةِ لِلْآخِرَةِ أَثَرُ لَمْ يَأْخِرَ الْآخِرَةُ عَلَى النَّبَا۔ (مسند الفردوس۔ ابو ہریرہ)

جس شخص میں تین باتیں ہوتی ہیں اس کا ایمان مکمل ہوتا ہے ایک تو یہ کہ وہ اللہ کے معاملے میں کسی ملامت مگر کی ملامت کا خوف نہ کرے، دوسرے یہ کہ اپنے کسی عمل سے ریا کاری نہ کرے، اور جب اس پر وہ ایسے امر پیش کئے جائیں جن میں سے ایک دنیا کے لئے ہو اور دوسرا آخرت کے لئے تو وہ آخرت کے معاملے

کو دنیا پر ترجیح دے۔

لَا يَكْمُلُ إِيْمَانُ الْعَبْدِ حَتَّى يَكُونَ فِيهِ ثَلَاثُ خِصَالٍ إِذَا غَضِبَ لَمْ يَحْرِجْهُ غَضَبُهُ
عَنِ الْحَقِّ وَإِذَا رَضِيَ لَمْ يُدْخِلْهُ رِضَاهُ فِي بَاطِلٍ وَإِذَا قَدَّرَ لَمْ يَتَنَاوَلَ مَا لَيْسَ لَهُ
(طبرانی صغیر)

بندے کا ایمان اس وقت تک مکمل نہیں ہوتا جب تک کہ اس میں تین خصلتیں نہ ہوں، ایک تو یہ کہ جب غصہ کرے تو اس کا غصہ اسے حق سے دور نہ کرے، اور جب خوش ہو تو اس کی خوشی اسے باطل میں مبتلا نہ کرے، اور جب کسی چیز پر قادر ہو تو وہ چیز نہ لے جو اس کی نہیں ہے۔

ثَلَاثٌ مَنْ أَوْفَيْهِنَّ فَقَدْ لَوْنِي مِثْلَ لَوْنِي آلُ دَاوُدَ الْعَدْلُ فِي الرِّضَى وَالْغَضَبِ
وَالْقَصْدُ فِي الْغِنَى وَالْفَقْرِ وَخَشْيَةُ اللَّهِ فِي السِّرِّ وَالْعَلَانِيَةِ (۱)

جس شخص میں یہ تین باتیں پائی جائیں اسے (گویا) آل داؤد کے برابر عطا ہوا، خوشی و ناخوشی میں اعتدال، مخا اور فقر میں سیمانہ روی، خلوت و جلوت میں اللہ کا خوف۔

رسول اکرم صلی علیہ وسلم نے ایمان کے لئے مذکورہ بالا شرائط بیان فرمائی ہیں ہمیں اس شخص پر حیرت ہوتی ہے جو علم دین کا دعویٰ کرتا ہو اور اس کے دل میں ان شرائط کا ایک ذرہ بھی نہ پایا جائے پھر اس کے پاس علم و عقل بھی ایسی ہو کہ جو بات ایمان کے بعد ہمت سے دشوار گزار مقامات طے کرنے سے حاصل ہوتی ہے اس کا انکار کرتا ہو، روایات میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک نبی پر وحی نازل فرمائی کہ میں اس شخص کو اپنی دوستی کے لئے پسند کرتا ہوں جو میرے نزدیک سستی نہیں کرتا، اور جسے میرے سوا کوئی فکر نہیں ہوتا، اور جو میرے اوپر میری کسی مخلوق کو ترجیح نہیں دیتا مگر اسے آگ میں جلایا جائے تو آگ کی سوزش محسوس نہ کرے، اور آسے سے چیرا جائے تو اس کی آفت کا احساس نہ کرے، جس شخص پر محبت کا اس قدر غلبہ نہ ہو تو وہ کرامات اور معاشقات کے درجے تک کیسے پہنچ سکتا ہے، یہ درجہ کمال محبت کے بعد حاصل ہوتا ہے، اور محبت میں کمال ایمان میں کمال سے پیدا ہوتا ہے، ایمان کے مقامات میں کی بیشی کا اس قدر تفاوت ہے کہ شمار نہیں ہو سکتا۔ اسی لئے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیق سے ارشاد فرمایا۔

إِنَّ اللَّهَ تَعَالَى قَدْ أَعْطَاكَ مِثْلَ إِيْمَانٍ كُلِّ مَنْ آمَنَ بِي مِنْ أُمَّتِي وَأَعْطَانِي مِثْلَ إِيْمَانٍ
كُلِّ مَنْ آمَنَ مِنْ وَلَدِ آدَمَ (ابو منصور مسلمی۔ ط)

اللہ تعالیٰ نے ہمیں ان تمام لوگوں کے ایمان کے برابر ایمان عطا کیا ہے جو میری امت میں سے ایمان لائے ہیں، اور مجھے ان تمام لوگوں کے ایمان کے برابر ایمان عطا کیا ہے جو حضرت آدم علیہ السلام کی اولادوں میں سے ایمان لائے ہیں۔

ایک حدیث میں مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ کے تین سو سے زائد اخلاق ہیں جو شخص توحید کے ساتھ ان میں سے ایک خلق لے کر بھی اس سے ملے گا وہ جنت میں داخل ہو گا (طبرانی۔ انس) حضرت ابوبکر نے غرض کیا یا رسول اللہ! میرے پاس بھی ان اخلاق میں سے کچھ ہے، فرمایا: اے ابوبکر! تمہارے اندر یہ تمام اخلاق موجود ہیں، ان میں سے سخاوت اللہ تعالیٰ کو زیادہ محبوب ہے، ایک حدیث میں ہے، سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا میں نے خواب میں دیکھا کہ آسمان سے ایک ترازو نکل گئی، اس کے ایک پلڑے میں مجھے رکھا گیا اور ایک پلڑے میں میری امت کو رکھا گیا، یہ پلڑا ہماری ہو گیا (پھر) ایک پلڑے میں ابوبکر کو رکھا گیا اور ایک پلڑے میں میری امت کو رکھا گیا تو ابوبکر کا پلڑا ہماری رہا (احمد۔ ابوامامہ) ان تمام باتوں کے باوجود اللہ تعالیٰ کے ساتھ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس طرح کا استغراق تھا کہ اس میں سے کسی دوسرے کے لئے کوئی گنجائش نہیں تھی، آپ نے خود

ارشاد فرمایا۔ (۱) یہ روایت ان الفاظ میں فریب ہے مشہور روایت کی ابتدا یوں ہوتی ہے ثلاث نیجات۔

لَوْ كُنْتُ مَعْتَبَرًا مِنَ النَّاسِ خَلِيلًا لَا تَخْلُتُ بَابَكَ وَلَا يَكُنْ صَاحِبُكُمْ خَلِيلًا لِلَّهِ
تَعَالَى۔ (بخاری و مسلم)

اگر میں لوگوں میں سے کسی کو دوست بنانا تو ایسا بیکار کو بنانا، لیکن میں تو اللہ تعالیٰ کا دوست ہوں۔

محبت سے متعلق کچھ اور مفید اختتامی گفتگو حضرت سفیان ثوری فرماتے ہیں کہ محبت سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع سنت ہے، بعض لوگوں نے دوام ذکر کو بعض نے ایثار محبوب کو اور بعض نے دنیا میں بھائی کرانیت کو محبت قرار دیا ہے یہ تمام امور محبت کے ثمرات ہیں اگرچہ انہوں نے اس محبت کا نام نہیں لیا، مگر اس کے ثمرات کی طرف اشارہ کر دیا۔ ایک بزرگ یہ کہتے ہیں کہ محبت محبوب کی وہ بات ہے جو دلوں پر غالب ہو جائے اور زبان کو اس کے اظہار سے عاجز رکھے، حضرت جہاد مقدادی فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے علاقہ رکھنے والے پر محبت حرام فرمائی ہے یہ بھی فرمایا کہ جس محبت کے پیچھے کوئی غرض ہوتی ہے وہ دیرپا نہیں ہوتی، جب وہ غرض زائل ہو جاتی ہے تو محبت بھی باقی نہیں رہتی، حضرت ذوالنون مصری فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی محبت ظاہر کرنے والے سے کہہ دو کہ کہیں وہ غیر اللہ کے لئے ذلیل نہ ہو جائے، حضرت فضلی سے کسی نے عارف اور محب کے بارے میں پوچھا آپ نے فرمایا عارف بولنے سے ہلاک ہوتا ہے اور محب چپ رہنے سے ہلاک ہوتا ہے۔ حضرت فضلی سے یہ دو شعر بھی منقول ہیں۔

يَا أَيُّهَا السَّيِّدُ الْكَرِيمُ جُنُوبُكَ بَيْنَ الْحَشَا مُوقِيمٌ
يَا زَافِعَ النَّوْمِ عَنْ جُمُوعِنِي أَنْتَ رِيحٌ مَرِيحِي عَالِيمٌ
(اے پروردگارِ معصم! انہری محبت میرے دل میں گھر گئے ہوئے ہے، اے میری آنکھ سے نیند اڑانے والے! جو کچھ مجھ پر گذرتا ہے تو اس سے واقف ہے)

ایک اور بزرگ نے اسی مضمون کے چند شعر کہے ہیں۔

عَجَبْتُ لِمَنْ يَقُولُ ذَكَرْتُ الْغَى
أَمُوتُ إِذَا ذَكَرْتُكَ ثُمَّ أَحْيَا
فَأَحْيَا بِالْمُنَى وَأَمُوتُ شَوْقًا
شَرِبْتُ الْحَبَّ كَأَسَا بَعْدَ كَأَسٍ
فَلَيْتَ خِيَالَهُ نَضَبٌ لِعَيْنِي
وَهَلْ أَنْسَى فَأَذْكُرُ مَا نَسِيتُ
وَلَوْ لَا حُسْنُ ظَنِّي مَا حَبِيتُ
فَكُمُ أَحْيَا عَلَيْكَ وَكُمُ لَمُوتُ
فَمَا نَفَى الشَّرَابِ وَمَا رَوِيتُ
فَإِنْ قَصُرْتُ فِي نَظَرِي عَمِيتُ
(مجھے اس شخص پر حیرت ہوتی ہے جو یہ کہے کہ مجھے محبوب یاد آیا، کیا میں اسے بھول گیا ہوں کہ یاد رکھوں میں اس کی یاد میں مرنے ہوں پھر جیتا ہوں، اگر میرا حسنِ ظن نہ ہو تو میں زندہ نہ رہتا، میں آرزوؤں میں جیتا ہوں، اور شوق میں مرنے ہوں، میں بار بار تجھ پر مرنے ہوں، اور بار بار حیرے لئے جیتا ہوں، میں نے محبت کے گلاس پہ گلاس پیے ہیں، لیکن نہ شراب ختم ہوئی اور نہ میں سیراب ہوا، کیا خوب ہو اگر میری آنکھوں کے سامنے اس کا خیال ہو، پھر اگر میں دیکھنے میں کوتاہی کروں تو اندر جا ہواؤں)۔

ایک مرتبہ حضرت رابعہ بصری نے فرمایا کوئی ہے جو ہمیں عباسی حبیب کا تھا ملائے، خادمہ نے عرض کیا ہمارا حبیب ہمارے ساتھ ہے، لیکن دنیا نے ہمیں اس سے دور کر رکھا ہے، امین الاملاء فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وحی نازل فرمائی کہ جب میں کسی بندے کے راز پر مطلع ہوتا ہوں اور اس دنیا میں آخرت کی محبت نہیں پاتا تو اسے اپنی محبت سے لبریز کر دیتا ہوں، اور اسے اپنی حفاظت میں لے لیتا ہوں، کہتے ہیں ایک بدو سمعون محبت کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے اچانک ایک پرندہ آپ کے سامنے آکر بیٹھ گیا، اور زمین پر اپنی ٹھوٹھیں مارنے لگا، یہاں تک کہ اس کی چونچ سے اس قدر خون بہا کہ ہلاک ہو گیا،

حضرت ابراہیم ابن ادم نے ایک دن بارگاہ الہی میں عرض کیا: اے اللہ! تو جانتا ہے جنت میرے نزدیک اس محبت کے مقابلے میں جو تو نے مجھے ازراہ عنایت بخشی ہے، اور اس ذکر کے سامنے جس سے میں انس حاصل کرتا ہوں، اور اس فراغت کے مقابلے میں جو تو نے مجھے اپنی عظمت میں تکرار کرنے کے لئے عطا کی ہے، ایک پتھر کے حقیر کے برابر بھی دنیا نہیں ہے۔ حضرت سری سقلی فرماتے ہیں جو شخص اللہ سے محبت کرتا ہے دُعا رہتا ہے، اور جو دنیا کی طرف مائل ہوتا ہے ہلاک ہوتا ہے، 'احق وہ ہے جو صبح و شام لغوات میں گزارے اور غمگین رہے جو اپنے محبوب کی جستجو کرتا ہو' کسی نے حضرت راہت سے دریافت کیا کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کی محبت کا کیا حال ہے، فرمایا: اللہ میں آپ سے بے پناہ محبت کرتی ہوں لیکن خالق کی محبت نے مجھے مخلوق کی محبت سے روک دیا، کسی نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے افضل اعمال کے بارے میں دریافت کیا، آپ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ سے راضی رہنا، اور محبت کرنا۔ بائیزید سطاہی فرماتے ہیں کہ محبت نہ دینا سے محبت کرتا ہے اور نہ آخرت سے، وہ صرف اپنے مولیٰ سے محبت کرتا ہے اور مولیٰ سے مولیٰ ہی کو چاہتا ہے، 'حق' فرماتے ہیں کہ لذت میں مدھوشی اور تعظیم میں حیرت کا نام محبت ہے، ایک بزرگ کہتے ہیں کہ محبت یہ ہے کہ اپنا نام و نشان مٹا ڈالے یہاں تک کہ حیرے اندر کوئی چیز ایسی باقی نہ رہے جو تجھ سے تیری طرف راجع ہو، یہ بھی کہا گیا ہے کہ غرضی و مسرت کے ساتھ محبوب سے دل کی قربت کو محبت کہتے ہیں، خواص فرماتے ہیں کہ محبت ارادوں کو مٹا دینے اور تمام صفات و حاجات کو جلا دینے کا نام ہے، حضرت سہل سے محبت کے بارے میں پوچھا گیا، آپ نے جواب دیا: کسی بندے کی مراد سمجھنے کے بعد اللہ تعالیٰ کا کسی قلب کو اپنے مشاہدے کی طرف منعطف کرنا محبت ہے، ایک بزرگ کہتے ہیں کہ محب کا گذر چار مقامات پر ہوتا ہے، محبت، محبت، حیا اور تعظیم، ان میں سے افضل تعظیم اور محبت ہے اس لئے کہ دونوں مقامات جنت میں اہل جنت کے ساتھ باقی رہیں گے، اور باقی مقامات فنا کر دیئے جائیں گے، ہرم ابن حبان کہتے ہیں کہ مومن جب اپنے رب کو پہچانتا ہے تو اس سے محبت کرتا ہے، اور جب محبت کرتا ہے تو اس کی طرف متوجہ ہوتا ہے، اور جب متوجہ ہونے میں لذت پاتا ہے تو دنیا کی طرف شہوت کی آنکھ سے نہیں دیکھتا، اور نہ آخرت کی طرف کالی کی نگاہ سے دیکھتا ہے، وہ جسم کے ساتھ دنیا میں رہتا ہے، اور اس کی روح آخرت میں ہوتی ہے۔ عبد اللہ بن محمد کہتے ہیں کہ میں نے ایک عبادت گزار عورت کو گریہ و زاری کے دوران یہ کہتے ہوئے سنا کہ بخدا میں زندگی سے نکل آگئی، اگر مجھے معلوم ہو جائے کہ کسی جگہ موت فروخت ہو رہی ہے تو میں اسے اللہ تعالیٰ کی محبت میں اور اس کی ملاقات کے شوق میں غریبوں کی راوی کہتے ہیں کہ میں نے اس سے پوچھا کیا تجھے اپنے عمل پر اطمینان ہے اس نے کہا اطمینان تو نہیں ہے، لیکن مجھے اس سے محبت ہے، اور میں اس سے حسن ظن رکھتی ہوں کیا اس صورت میں وہ مجھے عذاب دے گا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام پر وحی نازل فرمائی کہ اگر مجھ سے روگردانی کرنے والوں کو معلوم ہو جائے کہ میں ان کا شکر ہوں، اور یہ جان لیں کہ میں ان کے ساتھ نرمی و محبت کا کیا معاملہ کرنے والا ہوں، اور یہ کہ میں ان کے محاسن ترک کرنے کا کس قدر مشتاق ہوں تو وہ لوگ مجھ سے ملنے کے شوق میں مراحمیں اور میری محبت میں ان کے جسم کا جوڑ جوڑ الگ ہو جائے اے داؤد! روگردانی کرنے والوں کے سلسلے میں جب میرا ارادہ یہ ہے تو ان لوگوں کے سلسلے میں میرا کیا ارادہ ہو گا جو میری طرف متوجہ ہیں، اے داؤد! بندہ کو میری حاجت اس وقت شدید ہوتی ہے جب وہ مجھ سے بے نیازی برتا ہے، اور اس وقت وہ انتہائی قاتل رحم ہوتا ہے جب مجھ سے منہ موڑتا ہے، اور اس وقت نہایت قاتل تعظیم ہوتا ہے جب میری طرف لوٹتا ہے، ابو خالد الصغار کہتے ہیں کہ ایک نبی کی ملاقات کسی عابد سے ہوئی، آپ نے فرمایا تم لوگ جس بات پر عمل کرتے ہو ہم اس پر نہیں کرتے، تم خوف اور رجاء پر عمل کرتے ہو اور ہم محبت و شوق پر، حضرت شقی فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کو وحی بھیجی کہ اے داؤد! میرا ذکر اکرین کے لئے ہے، میری جنت اطاعت گزاروں کے لئے ہے، اور میرا دیدار اہل شوق کے لئے ہے اور میں محبت کرنے والوں کے لئے خاص ہوں، خواص اپنے سینے پر ہاتھ مار کر کہتے ہائے اس سے ملنے کا شوق جو مجھے دیکھتا ہے، اور جسے میں نہیں دیکھتا، حضرت جعید بغدادی فرماتے ہیں کہ حضرت یونس علیہ السلام اس قدر روئے کہ ناپوش ہو گئے، اور اس قدر کھڑے ہوئے کہ

کر جب تک مٹی اور اتنی نماز پڑھی کہ قوت باقی نہ رہی اور فرمایا میری عزت و جلال کی قسم ہے اگر میرے اور میرے درمیان آگ کا سمندر ہوتا تو تجھ سے ملاقات کے شوق میں اس میں بھی کود پڑتا۔ حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ میں نے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کا طریق دریافت کیا، آپ نے ارشاد فرمایا۔

الْمَعْرِفَةُ رَأْسُ مَالِي وَالْعَقْلُ أَصْلُ دِينِي وَالْحُبُّ سَاسِي وَالشَّوْقُ مَرْكَبِي وَذِكْرُ
اللَّهِ أَيْسَرُ وَالثِّقَةُ كَنْزِي وَالْحُزْنُ رَفِيقِي وَالْعِلْمُ سَلَاحِي وَالصَّبْرُ
رِكَائِي وَالرِّضَا غَنِيمَتِي وَالْعِجْزُ فَخْرِي وَالزُّهْدُ جَرَفَتِي وَالْيَقِينُ
قُوَّتِي وَالصَّنْفُ شَفِيعَتِي وَالطَّاعَةُ حَبِيبِي وَالْجِهَادُ خَلْقِي وَقُوَّةٌ عَيْنِي فِي
الصَّلَاةِ (۱)

معرفت میرا سرایہ ہے، عقل میرے دین کی اصل ہے، محبت میری اساس ہے، شوق میری سواری ہے، ذکر خدا میرا انیس ہے، اعتماد میرا خزانہ ہے، غم میرا رفیق ہے، علم میرا ہتھیار ہے، صبر میری چادر ہے، رضا میری قیمت ہے، عجز میرا فقر ہے، زہد میرا پیشہ ہے، یقین میری قوت ہے، صدق میرا سفارشی ہے، طاعت میری محبت ہے، جہاد میرا غلج ہے، اور میری آنکھوں کی لٹکڑ کہ نماز، حضرت ذوالنون مصریؒ فرماتے ہیں کہ وہ ذات جس نے ارواح کے لشکر بنائے، عارفین کی روحیں جلالی اور قدسی ہیں، اسی لئے وہ اللہ کی طرف مشتاق ہوتی ہیں، اور سونین کی روحیں روحانی ہیں اس لئے وہ جنت کی طرف مائل ہوتی ہیں، اور عاقلین کی روحیں ہوائی ہیں اس لئے وہ دنیا کی طرف راغب ہوتی ہیں، ایک بزرگ کہتے ہیں کہ میں نے گندی رنگ کیا ایک لاغر و نحیف شخص کو دیکھا جو کہ لکام کے پھروں پر کودتا پھرتا تھا، اور کہتا تھا۔

الشَّوْقُ وَالْهَوَىٰ صَبْرَانِي كَمَا نَزَى

(شوق اور خواہش نفس نے مجھے ایسا کر دیا ہے جیسا کہ تو دیکھتا ہے)

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ شوق اللہ تعالیٰ کی آگ ہے جسے وہ اپنے دوستوں کے دلوں میں روشن کرتا ہے، یہاں تک کہ دلوں میں موجود ارادے، خیالات، عموارض اور حاجات اس آگ سے جل جاتے ہیں، اور ان کا کوئی وجود باقی نہیں رہتا۔ محبت انس، شوق، رضا کی اس قدر تفصیل کافی ہے، ہم اس پر اکتفا کرتے ہیں۔ واللہ الموفق الصواب۔

کتاب النیۃ والاخلاص والصدق

نیت، اخلاص اور صدق کا بیان

جاننا چاہیے کہ ارباب قلوب پر ایمان کی بصیرت اور قرآن کے نور سے یہ امر متکشف ہو چکا ہے کہ علم و عمل کے بغیر سعادت کا حصول ممکن نہیں ہے، اس لئے کہ تمام لوگ ہلاک ہونے والے ہیں سوائے اہل علم کے، اور تمام اہل علم ہلاک ہونے والے ہیں سوائے اصحاب عمل کے، اور تمام عمل والے ہلاک ہونے والے ہیں سوائے مخلصین کے، اور مخلصین بڑے خطرے میں ہیں، عمل بغیر نیت کے مشقت ہے، اور نیت بغیر اخلاص کے ریاء غفاق اور معصیت ہے، اور اخلاص تصدیق و تحقیق کے بغیر فریب نظر ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس عمل کے بارے میں جو غیر کے ارادے کے ساتھ مخلوط ہو قرآن کریم میں ارشاد فرمایا ہے۔

وَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ مَكَرُوا بِكَ بِمَا كُنْتَ تَصَدَّقُ بِالْأَمْوَالِ فَجَعَلْنَاهُ حَبَاطَةً مِّثْلُ رِيحٍ (پ ۸ آیت ۱۳)

ہم ان کے ان کاموں کی طرف جو وہ (دنیا میں) کر چکے تھے متوجہ ہوں گے سو ان کو ایسا بیکار کر دیں گے جیسے پریشان عمار۔

ہمیں نہیں معلوم کہ جو شخص نیت کی حقیقت سے واقف نہیں وہ اپنی نیت کیسے درست کر سکتا ہے، اور وہ شخص جس نے اپنی

(۱) مجھے اس کی سند نہیں ملی، قاضی عیاض نے اس روایت کی نسبت حضرت علی ابن ابی طالب کی طرف کی ہے۔

نیت صحیح کر لی ہو کیسے محض ہو سکتا ہے جو اخلاص کی معرفت نہیں رکھتا یا وہ محض جو صدق کے معنی میں جانتا اپنے نفس سے صدق کا مطالبہ کیسے کر سکتا ہے۔ ہر بندہ کی جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت و عبادت کرنا چاہے پہلی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ پہلے نیت کا علم حاصل کرے پھر صدق و اخلاص کی معرفت حاصل کرے جو نجات اور سلامتی کا باعث ہیں اس کے بعد عمل کے ذریعے نیت کی تصحیح کرے۔ ہم تین الگ الگ ابواب میں ان تینوں امور پر گفتگو کرتے ہیں۔

پہلا باب

نیت کی فضیلت اور حقیقت

نیت کی فضیلت اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وَلَا تَطْرُدِ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُم بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيدُونَ وَجْهَهُ (پ ۷ ر ۲ آیت ۵۲)

اور ان لوگوں کو نہ نکالنے جو صبح و شام اپنے پروردگار کی عبادت کرتے ہیں جس سے خاص اس کی رضا مندی کا قصد رکھتے ہیں۔

اس آیت میں ارادے سے نیت مراد ہے، سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں۔
اَتَمَّ الْأَعْمَالِ بِالنِّيَّاتِ وَلِكُلِّ امْرِئٍ مَا نَوَىٰ فَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ
فَهِجْرَتُهُ إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ إِلَى دُنْيَا يُصِيبُهَا أَوْ لِمَرْأَةٍ يَتَزَوَّجُهَا
فَهِجْرَتُهَا إِلَى مَا هَاجَرَ إِلَيْهِ (بخاری و مسلم۔ عن)

اعمال کا درود و مداریتوں پر ہے، ہر شخص کو اس کی نیت کے مطابق ملے گا، جس شخص کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہوگی تو اس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہوگی اور جس شخص کی ہجرت دنیا کی طرف ہو کہ اسے ملے یا کسی عورت کی طرف ہو کہ اس سے شادی کرے تو اس کی ہجرت اس چیز کی طرف ہوگی جس کی طرف اس نے ہجرت کی ہے۔

ایک حدیث میں ہے، آپ نے ارشاد فرمایا۔

أَكْثَرُ شَهَادَةِ أَمْرِي أَصْحَابُ الْفِرَاشِ، وَرَبُّ قَتِيلٍ بَيْنَ الصَّفَيْنِ اللَّهُ أَعْلَمُ
بِنِيَّتِهِ (احمد۔ ابن مسعود)

میری امت کے اکثر شہداء بستر والے ہوں گے اور میدان جنگ میں بہت سے قتل ہونے والوں کی نیت

کا حال اللہ زیادہ جانتا ہے۔

قرآن کریم میں ارشاد فرمایا۔

إِنْ يَرَوْا إِصْلَاحًا يُوَفِّقُوا لَهُمُ الْبَيِّنَاتِ (پ ۵ ر ۳ آیت ۳۵)

اگر ان دونوں آدمیوں کو اصلاح منظور ہوگی تو اللہ تعالیٰ ان میں ہدایت میں اتفاق فرمادیں گے۔

اس آیت کریمہ میں نیت کو توفیق کا سبب قرار دیا ہے۔ ایک حدیث میں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔
إِنَّ اللَّهَ لَا يَنْظُرُ إِلَى صَوْرِ كَمٍّ أَوْ أَمْوَالِكُمْ وَإِنَّمَا يَنْظُرُ إِلَى قُلُوبِكُمْ وَأَعْمَالِكُمْ (مسلم ابو ہریرہ)
اللہ تعالیٰ تمہاری صورتوں اور مالوں کو نہیں دیکھتا بلکہ تمہارے دلوں اور اعمال کو دیکھتا ہے۔

دلوں کو اس لئے دیکھتا ہے کہ وہ نیت کا عمل ہیں۔ ایک روایت میں ہے۔

إِنَّ الْعَبْدَ لَيَعْمَلُ أَعْمَالًا حَسَنَةً فَيَضَعُهَا الْمَلَأُ كَقَفِيٍّ صُحُفٍ مُّحْتَمِلَةٍ فَيَقُولُ
بَيْنَ يَدَيْكَ اللَّهُ تَعَالَىٰ فَيَقُولُ الْقَوْلَ هَذِهِ الصُّحُفَةُ فَإِنَّهُ لَمْ يَرِ نِيَّتَهَا فِيهَا وَجْهِي ثُمَّ
يُنَادِي الْمَلَائِكَةَ أَكْتُبُوا لَهُ كَذَا وَكَذَا أَكْتُبُوا لَهُ كَذَا وَكَذَا فَيَقُولُونَ يَا رَبَّنَا إِنَّهُ لَمْ

يَعْمَلُ شَيْئًا مِنْ ذَلِكَ فَيَقُولُ اللَّهُ تَعَالَى ائْتِنُوهُ (دار غلی۔ الس)

بندہ اچھے عمل کرتا ہے، فرشتے اس کے سربہر اعمال ٹائے لے کر اوپر جاتے ہیں، اور ان میں اپنے رب کے سامنے پیش کرتے ہیں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یہ صحیفہ دور بھیجو، اس نے اپنے اعمال سے میری خوشنودی کا ارادہ نہیں کیا تھا پھر ملائکہ سے فرماتا ہے اس شخص کے لیے ایسا ایسا لکھو، اس کے لیے یہ یا لکھو، لکھنے عرض کریں گے اے پروردگار اس نے یہ عمل نہیں کئے، اللہ تعالیٰ فرماتے گا اس نے ان اعمال کی نیت کی تھی۔

ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ آدمی چار طرح کے ہوتے ہیں، ایک وہ شخص ہے جسے اللہ تعالیٰ نے علم اور مال عطا کیا ہو اور وہ شخص اپنے مال میں اپنے علم کی روشنی میں تصرف کرتا ہو اور دوسرا وہ شخص ہے جسے اللہ تعالیٰ نے علم اور مال عطا کرنا تو میں بھی ایسا ہی کرتا جیسا اس نے کیا ہے یہ دونوں شخص اجڑیں یا بڑھیں، ایک شخص وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے مال عطا کیا ہو علم نہ دیا ہو اور وہ اپنے جمل کے باعث اپنے مال میں بھٹا تصرف کرتا ہو، اور دوسرا شخص یہ کہتا ہو کہ اگر اللہ تعالیٰ مجھے بھی مال عطا کرتا تو میں بھی ایسا ہی کرتا جیسا یہ شخص کرتا ہے، یہ دونوں شخص گناہ میں برابر ہیں (ابن ماجہ۔ ابو بکر اللہباری) دیکھئے شخص نیت کی بنا پر کیسے دو شخص دوسرے دو شخصوں کے حسن و قبح میں شریک قرار دئے گئے، ایسی ہی ایک روایت حضرت انس ابن مالک سے منقول ہے کہ جب سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ تبوک میں تشریف لے گئے تو فرمایا کہ میں نے کچھ لوگ ایسے ہیں کہ جو سفر ہم کر رہے ہیں، اور کافروں کی آتش انتقام کو بھڑکانے والی جو زمینیں ہم اپنے پاؤں سے دوند رہے ہیں، یا جو کچھ ہم خرچ کرتے ہیں یا جو فاقے ہم برداشت کرتے ہیں وہ لوگ ان تمام چیزوں میں ہمارے شریک ہیں، حالانکہ وہ مدینے میں ہیں لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! یہ کیسے ممکن ہے جب کہ وہ ہمارے ساتھ نہیں ہیں فرمایا وہ لوگ ہمارے باعث وہاں رہ گئے، اور اپنی حسن نیت کی وجہ سے ہمارے اعمال میں شریک ہیں (بخاری و ابوداؤد) حضرت عبداللہ ابن مسعود کی حدیث میں ہے کہ جو شخص کسی چیز کے لئے ہجرت کرے تو وہ اسی کا ہے، چنانچہ ایک شخص نے ہماری ایک خاتون سے نکاح کرنے کے لیے ہجرت کی تو اس شخص کو ام قیس کا مہاجر کہا جانے لگا (طبرانی) ایک روایت میں ہے کہ ایک شخص اللہ کی راہ میں مارا گیا اور قتل ہمارے کام سے مشہور ہوا کیونکہ وہ شخص اپنے حریف سے اس لیے لڑا تھا کہ اس سے اس کا گدھا چھین لے، چنانچہ مارا گیا، اور اسی کی طرف منسوب ہوا (۱) حضرت عبادہ کی روایت میں ہے آپ نے ارشاد فرمایا جس شخص نے محض حصول مال کے لیے جہاد کیا اسے اس کی نیت کے مطابق ملے گا (نسائی۔ عبادۃ ابن الصامت) حضرت ابی ابن کعبؓ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک شخص سے کہا کہ وہ غزوہ میں میری مدد کے لیے چلے، اس شخص نے کہا اگر تم میری اجرت مقرر کرو تو میں تمہارے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہوں چنانچہ میں نے اجرت مقرر کر دی (اور وہ میری مدد کے لیے غزوہ میں شریک ہوا) میں نے اس کا تذکرہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی جناب میں کیا آپ نے ارشاد فرمایا: اس شخص کو دنیا و آخرت میں سے اسی قدر ملا ہے جس قدر تم نے مقرر کر دیا تھا (طبرانی) ایک اسرائیلی روایت میں ہے کہ ایک شخص قحط کے زمانے میں ریت کے ایک ٹیلے کے پاس سے گذرا، اس نے دل میں سوچا اگر یہ ریت قحط بن جائے تو میں لوگوں کو تقسیم کروں، اللہ تعالیٰ نے اس زمانے کے پیچھے پروردگار نازل فرمایا کہ اس شخص سے کہہ دو کہ اللہ تعالیٰ نے تیرا صدقہ قبول کر لیا ہے، اور اس نے تیری حسن نیت کا شکریہ ادا کیا ہے، اور تجھے اسی ٹیلے کے مطابق اجر و ثواب عطا کیا ہے جو تو نے صدقہ کرنے کا ارادہ کیا تھا، ایک روایت میں وارد ہوا ہے۔

مَنْ هَمَّ بِحَسَنَةٍ قَوْلٍ أَوْ عَمَلٍ كَتَبَتْ لَهُ حَسَنَةً (بخاری و مسلم)

جس شخص نے کسی نیک یا کارہادہ کیا اس کے لیے وہ نیک لکھ دی گئی۔

حضرت عبداللہ ابن عمرؓ سے مروی ہے ایک روایت میں ہے کہ جس شخص کی نیت صرف دنیا ہوتی ہے اللہ تعالیٰ قہر و العباس

(۱) مجھے یہ روایت موصولات میں نہیں ملی، البتہ ابوالحسن فراوی نے سنن میں بطریق ارسال نقل کیا ہے۔

اس کی دونوں آنکھوں کے درمیان رکھ دیتا ہے، اور وہ دنیا میں زیادہ راضی ہو کر دنیا سے جدا ہوتا ہے اور جس شخص کی نیت آخرت ہوتی ہے اللہ تعالیٰ اس کے دل میں استغناء پیدا کر دیتا ہے، اس کا سامان اس کے لیے جمع کر دیتا ہے اور وہ دنیا میں زاہد ہو کر رخصت ہوتا ہے (ابن ماجہ۔ زید ابن ثابت) حضرت ام سلمہؓ کی ایک روایت میں ہے کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایسے لشکر کا ذکر کیا جو جنگل میں زیر زمین دھنستا ہوگا۔ حضرت ام سلمہؓ نے عرض کیا ان میں وہ شخص بھی ہو گا جو زہد ستی یا اجرت دے کر لشکر میں شامل کیا گیا تھا؟ آپ نے فرمایا ان کا حشر ان کی نیوٹوں پر ہوگا (مسلم، ابوداؤد) حضرت عمرؓ کی ایک روایت میں ہے، سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

إِنَّمَا يَفْتَنُ الْكَافِرِينَ الْكَافِرَاتُ عَلَى النَّبِيِّاتِ (ابن ابی الدنیا)

آپس میں لڑنے والے اپنی اپنی نیوٹوں پر ایک دوسرے کو مارتے ہیں۔

ایک روایت میں ہے کہ جب دو لشکر برسرِ پیکار ہوتے ہیں تو فرشتے اترتے ہیں اور مخلوق کے لیے ان کے درجات کے مطابق لکھتے ہیں کہ فلاں شخص دنیا کے لیے لڑتا ہے، اور فلاں غیرت و محبت کے لیے، فلاں تعصب کے لیے، خبردار! کسی شخص کو شہید مت کہو، جو شخص اللہ تعالیٰ کا کلمہ بلند کرنے کے لیے لڑتا ہے صرف وہ شخص شہید ہے (ابن المبارک۔ ابن مسعودؓ مرسلہ) بخاری و مسلم۔ ابو موسیٰ) حضرت جابر ابن عبد اللہؓ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ ہر شخص کو اسی حالت پر مبعوث کیا جائے گا جس حالت پر وہ مرا ہے (مسلم) انصاف ابن ابی بکرؓ کہتے ہیں، سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب دو مسلمان لڑتے ہیں تو قاتلِ مقتول دونوں جہنم میں جاتے ہیں، صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ قاتل کا جہنم میں جانا سمجھ میں آتا ہے لیکن مقتول کیوں جہنم میں جائے گا؟ فرمایا اس لیے کہ اس نے اپنے حریف کو قتل کرنے کا ارادہ کیا تھا (بخاری و مسلم) حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت میں ہے فرمایا جو شخص کسی عورت سے مہر نکاح کرے اور اس کی ادائیگی کا ارادہ نہ رکھتا ہو تو وہ زانی ہے، اور جس شخص نے قرض لیا اور اس کی ادائیگی کی نیت نہ کی وہ چور ہے (احمد۔ مسیب) ایک حدیث میں ہے کہ جس شخص نے اللہ کے لیے خوشبو لگائی وہ قیامت کے دن اس حال میں آئے گا کہ اس کی خوشبو محک سے بھی زیادہ عمدہ ہوگی، اور جس شخص نے غیر اللہ کے لیے خوشبو لگائی وہ قیامت کے دن اس حال میں آئے گا کہ اس کی بو مردار کی بدبو سے زیادہ کربہ ہوگی (ابو الولید الصغار۔ اسحاق ابن ابی

عمر) حضرت عمر ابن الخطابؓ فرماتے ہیں کہ بہترین عمل یہ ہے کہ اللہ کے فرائض ادا کئے جائیں اس کے محرمات سے اجتناب کیا جائے، اور جو کچھ خدا تعالیٰ کے پاس ہے اس میں نیت درست رکھی جائے۔ سالم ابن عبد اللہ نے حضرت عمر ابن عبد العزیزؓ کو اپنے ایک خط میں لکھا جانا چاہیے اللہ تعالیٰ بندے کی مدد اس کی نیت کے مطابق کرتا ہے، جس کی نیت مکمل ہوتی ہے اس کی مدد بھی پوری ہوتی ہے، اور جس کی نیت ناقص ہوتی ہے اس کی مدد بھی ناقص ہوتی ہے، ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ بہت سے چھوٹے اعمال کو نیت بڑا کر دیتی ہے، اور بہت سے بڑے اعمال کو نیت چھوٹا کر دیتی ہے، داؤد طائی فرماتے ہیں جس نیک شخص کی نیت درست ہوتی ہے اگر اس کے تمام اعضاء دنیا سے متعلق ہو جائیں تو اسے اس کی نیت نیک نبی کی طرف پہنچا دیتی ہے، اور جاہل کا حال اس کے برعکس ہے، حضرت سفیان ثوریؓ فرماتے ہیں پچھلے لوگ عمل کے لیے نیت سیکھتے تھے جس طرح تم آج عمل سیکھتے ہو، بعض علماء فرماتے ہیں کہ عمل سے پہلے عمل کے لیے نیت تلاش کرو، جب تک تم خیر کی دعا کرتے رہو گے خیر پر رہو گے، ایک ارادت مند مختلف علماء کی مجلسوں کے چکر لگاتا تھا اور کہتا تھا کہ کوئی مجھے ایسے عمل کی نشاندہی کر سکتا ہے جو میں اللہ کے لئے کرتا رہوں، میں نہیں جانتا تھا کہ مجھ پر شب و روز میں کوئی لمحہ ایسا آئے کہ میں اس میں اللہ کے لیے عمل نہ کر سکوں، علماء نے کہا حیرا مقصد حاصل ہے، جہاں تک ممکن ہو تو عمل خیر کرو، اور جب ہمت نہ پائے تو دل میں اس کی نیت رکھ، نیت سے بھی تجھے اعمال خیر کا ثواب ملے گا۔ بعض سلف صالحین فرماتے ہیں کہ تم پر اللہ تعالیٰ کی اس قدر نعمتیں ہیں کہ تم ان کا شمار نہیں کر سکتے، اور تمہارے بہت سے گناہ اس قدر مخفی ہیں کہ خود تم ان پر مطلع نہیں ہو، لیکن اگر تم صبح و شام توبہ کرتے رہے تو تمہارے گناہ معاف کر دیئے

جائیں گے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ارشاد ہے اس آنکھ کے لیے خوشخبری ہو جو سوئے اور معصیت کا قصد نہ کرے، اور معصیت پر پیدار نہ ہو، حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں قیامت کے دن لوگ اپنی نیتوں پر اٹھائے جائیں گے، حضرت قنیل ابن عیاض جب یہ آیت تلاوت کرتے تو بے حاشا رونے، اور بار بار اس آیت کو دہراتے، اور فرماتے کہ اگر تو نے ہمارا امتحان لیا تو ہم رسوا ہوں گے، اور ہمارا راز فاش ہو جائے گا۔

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ حَتَّىٰ نَعْلَمَ الْمُجَاهِدِينَ مِنْكُمْ وَالصَّابِرِينَ وَنَبْلُوَ أَخْبَارَكُمْ (پ ۳۱)
(۸ آیت ۳۱)

اور ہم ضرور تم سب کی آزمائش کریں گے تاکہ ہم ان لوگوں کو معلوم کر لیں جو تم میں مجاہد ہیں اور جو ثابت قدم رہنے والے ہیں اور تاکہ تمہاری حالتوں کی جانچ کر لیں۔

حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ جنت والے جنت میں، اور دوزخ والے دوزخ میں اپنی نیتوں کی وجہ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رہیں گے، حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ توراۃ میں لکھا ہوا ہے کہ جس عمل سے میری رضا مندی مطلوب ہوتی ہے وہ تھوڑا بھی بہت ہے، اور جس عمل سے غیر کی نیت کی جاتی ہے وہ بہت بھی تھوڑا ہے، بلال ابن سعد ان کہتے ہیں کہ بندہ مومنین کی سی باتیں کرتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ اسے نہیں چھوڑتا جب تک کہ وہ اس کے اعمال نہ دیکھ لے، اور محض اعمال نہیں دیکھتا جب تک تقویٰ نہ ہو، اور محض تقویٰ کافی نہیں سمجھتا جب تک نیت درست نہ ہو، جس شخص کی نیت صحیح ہوتی ہے اس کے تمام کام درست ہوتے ہیں، خلاصہ کلام یہ ہے کہ اعمال کا دارِ نجات پر ہے، نیتوں ہی سے اعمال اعمال خیر بنتے ہیں، نیت بذات خود خیر ہے، اگرچہ وہ کسی مانع کی وجہ سے عملی شکل اختیار نہ کر سکے۔

نیت کی حقیقت : جاننا چاہیے کہ نیت، ارادہ، اور قصد ایک ہی معنی کے حامل مختلف الفاظ ہیں، اور وہ دل کی ایک ایسی حالت یا کیفیت سے عبارت ہے جسے دو امر گھیرے ہوئے ہیں، ایک علم، اور دوسرا عمل، علم پہلے ہوتا ہے کیونکہ یہ اس حالت کی اصل اور شرط ہے، اور عمل اس کے بعد ہوتا ہے کیوں کہ وہ اس کی فرع اور ثمر ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر عمل یعنی ہر اختیاری حرکت و سکون امور سے پایہ تکمیل کو پہنچتا ہے، علم، ارادے اور قدرت سے، کیوں کہ انسان کسی ایسی چیز کا ارادہ نہیں کر سکتا جسے وہ نہ جانتا ہو اور نہ کوئی ایسا عمل کر سکتا ہے جس کا ارادہ نہ کیا ہو، اس سے معلوم ہوا کہ ارادہ ضروری ہے۔ ارادے کے معنی ہیں دل میں کسی ایسے امر کی تحریک ہونا جو حال یا مال میں غرض کے موافق ہو، انسان کی تخلیق کچھ اس طرح عمل میں آتی ہے کہ بعض امور اس کے موافق بنائے گئے ہیں، اور بعض مخالف۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ وہ ان امور کے حصول کی طرف راغب ہو جو اس کے موافق ہیں، اور ان امور کو رفع کرے جو اس کے مخالف ہیں، موافق اور مخالف میں تمیز کے لیے مفید اور مضر اشیاء کے اور اک اور معرفت کی ضرورت ہے چنانچہ جو شخص کسی عذاب سے واقف نہیں ہوتا، یا آنکھوں سے نہیں دیکھتا اس کے لیے غذا کا استعمال ممکن نہیں ہے، اس طرح یہ بھی ممکن نہیں کہ کوئی شخص آگ کو دیکھے بغیر فرار ہو جائے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے معرفت اور ہدایت پیدا کی ہے، اور اس کے لیے اسباب بنائے ہیں، جنہیں ظاہری اور باطنی حواس کہتے ہیں، پھر یہ کافی نہیں ہے کہ آدمی محض غذا سے واقف ہو جائے، اور اس کی موافقت پر مطلع ہو جائے یا اسے آنکھوں سے دیکھ لے، بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ اس غذا کی طرف رغبت بھی ہو، نفس کا میلان اور شہوت بھی ہو، چنانچہ مریض غذا کا مشاہدہ بھی کرتا ہے، اور یہ بھی جانتا ہے کہ غذا اس کی غرض کے موافق ہے مگر اس کے باوجود وہ کھانا نہیں ہے، کیوں کہ قوت محرک موجود نہیں ہے اور دل میں رغبت کا فقدان ہے، پھر یہ رغبت اور تحریک بھی کافی نہیں ہے، بلکہ بعض اوقات آدمی کھانے کا مشاہدہ بھی کرتا ہے، اور اسے کھانا بھی چاہتا ہے، لیکن معذور ہونے کے باعث کھا نہیں پاتا، اس کے لیے قدرت اور محرک اعضاء پیدا کئے گئے، تاکہ غذا کے تناول کا عمل مکمل ہو سکے، اعضاء قدرت سے حرکت کرتے ہیں، اور قدرت محرک کی منتظر رہتی ہے، محرک علم و معرفت، یا عن و اعتقاد کے تابع ہے،

یعنی جب یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ فلاں امر میرے موافق ہے اور اس کا کرنا ضروری ہے اور کوئی معارض محرک موجود نہیں ہوتا تب ارادہ پیدا ہوتا ہے، اور میلان ظاہر ہوتا ہے، اور جب ارادہ ہوتا ہے تو قدرت اعضاء کو حرکت دیتی ہے، گویا قدرت ارادے کی خادم ہے، اور ارادہ اعتقاد اور معرفت کے حکم کے تابع ہے، اس تفصیل سے ثابت ہوا کہ نیت ایک درمیانی وصف کا نام ہے، اور اس کا حاصل یہ ہے کہ غرض کے موافق امور کی طرف نفس کا میلان، اور رغبت کا دل میں پیدا ہونا خواہ وہ امور حال میں موافق ہوں یا مآل میں۔ یہاں پہلا محرک غرض مطلوب ہے، اسی کو باعث کہتے ہیں، اور یہی غرض نیت کیا ہوا مقصد ہے، اور ابھرنے کے عمل کو مقصد اور نیت کہتے ہیں، اور ارادے کی خدمت کے لیے قدرت کا اعضاء کو حرکت دینا عمل ہے، تاہم عمل کے لیے قدرت کبھی ایک باعث سے برانگیختہ ہوتی ہے، اور کبھی ایسے دو باعثوں سے جو ایک ہی فعل میں جمع ہو جاتے ہیں، اور اگر دو باعثوں سے قدرت برانگیختہ ہو تو کبھی یہ صورت ہوتی ہے کہ ہر باعث تمام قدرت کو برانگیختہ کرنے پر قادر ہوتا ہے، اور کبھی عاجز ہوتا ہے، یہاں تک کہ دونوں کا اجتماع نہ ہو، کبھی ایک باعث کافی ہو جاتا ہے مگر دوسرا باعث اس کا معاون بنتا ہے، اس طرح کل چار قسمیں بنتی ہیں، ہم ان چاروں کی الگ الگ مثال اور نام بیان کرتے ہیں۔

پہلی قسم۔ نیت خالص : پہلی قسم یہ ہے کہ تمام ایک باعث ہو، جیسے کسی انسان پر کوئی درندہ حملہ کر دے، چنانچہ جب وہ اسے دیکھتا ہے ایک دم اپنی جگہ سے اٹھ جاتا ہے، یہاں درندے سے بھاگنے کے علاوہ کوئی دوسرا محرک موجود نہیں ہے کیوں کہ اس نے درندے کو دیکھا ہے، اور اسے اپنے لیے مضر جانتا ہے، چنانچہ درندے کو دیکھ کر اس کے دل میں فرار کا داعیہ پیدا ہوا ہے، اور اس کے رغبت نے جنم لیا ہے، اسی داعیے اور رغبت کے بموجب قدرت نے بھی اپنا عمل کیا۔ اس صورت میں یہی کہا جائے گا کہ اس شخص کی نیت محض درندے سے فرار ہے، کھڑے ہونے میں دوسری کوئی نیت نہیں ہے، ایسی نیت کو خالص کہتے ہیں اور اس نیت کے مطابق عمل کرنے کو اخلاص سے تعبیر کیا جاتا ہے، یعنی یہ ایک ایسا عمل ہے جس میں غیر کی شرکت اور احتیاج نہیں ہے۔

دوسری قسم۔ رفاقت بواعث : دوسری قسم یہ ہے کہ دو بواعث یکجا ہو جائیں، اور دونوں اپنی جداگانہ حیثیت میں محرک ہوں، اور اس میں ایک دوسرے کے محتاج نہ ہوں، محسوسات میں اس کی مثال یہ ہے کہ دو آدمی کسی وزن کو اٹھانے پر اپنی وہ قوت استعمال کریں کہ اگر تمنا ہوتی تب بھی اتنی قوت صرف کر کے اٹھا سکتے تھے، اور پیش نظر بحث کے مطابق مثال یہ ہے کہ کسی شخص سے اس کا کوئی تنگدست عزیز کچھ مانگے، اور وہ اس کے فقر اور قربت کے باعث اس کی حاجت دوائی کر دے، جب کہ وہ یہ بات جانتا ہے کہ اگر مانگنے والا تنگدست نہ ہوتا تب بھی قربت کے باعث اس کی حاجت دوائی ضرور کرتا، یا قریب نہ ہوتا تو محض تنگدستی کے باعث اس کی ضرورت پوری کرتا، اور دل میں اس امر کا یقین ہو کہ اگر اس سے کسی مالدار رشتے دار نے بھی کچھ مانگا تو وہ اسے ضرور دے گا، اور اگر کسی مفلس اجنبی نے کچھ طلب کیا تو وہ اسے منع نہیں کرے گا۔ اس کی مثال یہ بھی ہے جیسے کسی شخص کو ڈاکٹر کھانے کا پرہیز بتلائے، اور اتفاق سے عرفے کا دن ہو، جس میں وہ روزہ رکھتا ہے، چنانچہ اس نے روزہ رکھ لیا، اور دل میں یہ خیال ہے کہ اگر عرفہ نہ ہوتا تب بھی وہ بطور پرہیز کھانا ترک کرتا، اور اگر حکیم پرہیز تجویز نہ کرتا تب بھی وہ عرفہ کا روزہ ضرور رکھتا، اب اتفاق سے دونوں باعث جمع ہو گئے ہیں، اس لیے اس نے فعل پر اقدام کیا۔ یہاں دوسرا باعث پہلے باعث کا مددگار اور رفیق ہے، اس لیے ہم اس قسم کو مراقت بواعث کہہ سکتے ہیں۔

تیسری قسم۔ مشارکت : تیسری قسم یہ ہے کہ دونوں میں سے کوئی تمنا کسی عمل کا محرک نہ ہو، بلکہ ان دونوں کے مجموعے سے قدرت کو تحریک ہوتی ہو، محسوسات میں اس کی مثال یہ ہے کہ دو کمزور و ناتواں انسان ایک دوسرے کی مدد سے کوئی ایسی چیز اٹھائیں کہ اگر دونوں الگ الگ اٹھانے کی کوشش کرتے تو اٹھانے پاتے۔ اور زیر نظر معاملے میں یہ مثال ہے کہ کسی شخص کے پاس اس کا کوئی مالدار رشتہ دار آئے اور ایک درہم مانگے اور وہ دینے سے منع کر دے، پھر مفلس اجنبی آکر ایک درہم طلب کرے وہ

فحص اسے بھی نہ دے اس کے بعد ایک جھکست رشتہ دار آئے اور ایک درہم مانگے وہ فحص اسے انکار نہ کرے، گویا اس کی اندر دونوں باخوں کے اجتماع سے تحریک ہوئی ہے، یعنی قربات اور فقر کے اجتماع سے اس کی ایک مثال یہ ہے کہ کوئی فحص لوگوں کے سامنے ثواب اور تعریف دونوں غرضوں کے لیے صدقہ کرے، اگر تھا ہوتا تو فحص ثواب کی نیت سے ہرگز نہ دیتا، یا فحص تعریف مقصد ہوتی اور کوئی ایسا فاسق دست طلب دراز کرتا جسے صدقہ دینے میں کوئی فائدہ نہ ہوتا تو وہ فحص تعریف کے لیے اسے ہرگز نہ دیتا، بلکہ جب یہ دونوں مقصد جمع ہوئے تب دل میں صدقہ کی تحریک ہوئی۔ اس قسم کو ہم مشارکت کہہ سکتے ہیں۔

چوتھی قسم۔ معاونت : چوتھی قسم یہ ہے کہ دونوں باخوں میں سے ایک مستقل ہو کہ اگر تھا بھی ہو تب بھی محرک بن سکے، اور دوسرا مستقل نہ ہو، تاہم جب اسے پہلے سے ملا دیا جائے تب اعانت اور سہولت دینے میں مؤثر ضرور ہو، محسوسات میں اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی ناواں فحص وزن اٹھانے میں کسی طاقت ور انسان کی اعانت کرے اگر طاقت ور انسان تھا ہوتا تب بھی وہ وزن اٹھا سکتا تھا، جب کہ کم زور آدمی بذات خود اس قابل نہیں کہ وہ تھما وزن اٹھا سکے، تاہم وہ اس قابل ضرور ہے کہ قوی کی مدد کر سکے، اور اس کا کچھ بوجھ ہلکا کر سکے، اس موقع کے لیے مثال یہ ہے کہ جیسے کسی فحص کا نمازیہ صدقات میں کوئی معمول ہو اور اس مخصوص وقت میں کچھ لوگ آجائیں، اور وہ ان کی موجودگی میں اپنا معمول ادا کرے اگر وہ لوگ نہ آتے تب بھی یہ فحص اپنا معمول ادا کرتا اگرچہ طبیعت پر کچھ گرانی ہوتی، لیکن لوگوں کے آنے اور دیکھنے سے کچھ تخفیف اور سہولت پیدا ہو گئی ہے، وہ معمول سخت تر ہونے کے باوجود ہلکا ہلکا ہو گیا ہے، حالانکہ وہ یہ یقین رکھتا ہے کہ اگر آنے والے نہ آتے تب بھی میں یہ معمول اپنے وقت پر ادا کرتا، اور اگر میرا معمول نہ ہوتا تو آنے والوں کی خاطر میں ہرگز کوئی ایسا کام نہ کرتا جس سے ناموری مطلوب ہو، اس کو ہم معاونت کہہ سکتے ہیں۔ اس تقسیم کا حاصل یہ ہے کہ دوسرا باعث یہ رفت ہو گا، یا شریک ہو گا یا معین ہو گا۔ ہم ان اقسام کی مزید تفصیلات کتاب الاخلاص میں بیان کریں گے، یہاں صرف نیات کی قسمیں بیان کرنا مقصود ہے، کیوں کہ عمل نیت کے تابع ہوتا ہے اور اسی سے حکم پاتا ہے جیسے کہ حدیث شریف میں ہے: **إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ** اعمال کا مدار نیتوں پر ہے۔

گویا اعمال نیات کے تابع ہیں، اور تابع کی کوئی حیثیت نہیں ہے، حکم متبع پر لگتا ہے۔

سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک قول کی حقیقت : ایک روایت میں ہے، سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

فِيَمَّا الْمُؤْمِنُ خَيْرٌ مِنْ عَمَلِهِ (طبرانی۔ ابن سعد)

مومن کی نیت اس کے عمل سے بہتر ہے۔

آئیے اس حدیث کے مفہوم پر گفتگو کریں، اور یہ دیکھیں کہ عمل سے نیت کے بہتر ہونے کی وجہ کیا ہے، بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ نیت کو اس لیے ترجیح دی گئی ہے کہ یہ ایک خلی جذبہ ہے، اور اللہ تعالیٰ کے سوا اس پر کوئی مطلع نہیں ہو سکتا، جب کہ عمل ظاہر ہے، ہر فحص اس کا مشاہدہ کر سکتا ہے، اسی لیے پوشیدہ اعمال کو بھی فضیلت دی گئی ہے، ہم یہ کہتے ہیں کہ ان لوگوں کی اس قدر بات صحیح ہے کہ پوشیدہ اعمال افضل ہیں، مگر یہاں یہ مراد نہیں ہے، اس لیے کہ اس سے تو یہ لازم آتا ہے کہ اگر کوئی فحص دل سے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرے، اور مسلمانوں کی مصالح میں غور و فکر کرے کی نیت کرے تو یہ نیت نفس ذکر، اور نفس فکر سے افضل ہو؟ حالانکہ ایسا نہیں ہے، بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ نیت کو اس لیے ترجیح دی گئی ہے کہ یہ عمل کے آخر تک باقی رہتی ہے، جب کہ اعمال کو دوام نہیں ہوتا، لیکن یہ وجہ بھی صحیح نہیں ہے، اس لیے کہ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ تھوڑا عمل زیادہ سے بہتر ہو، حالانکہ ایسا نہیں ہے، پھر یہ قابل غور ہے کہ نماز کے اعمال کی نیت۔ مثلاً۔ صرف چند لمحوں تک رہتی ہے اور اعمال زیادہ دیر تک باقی رہتے ہیں۔ بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ اگر فحص نیت ہو تو وہ عمل بلا نیت سے افضل ہے، یہ بات بھی صحیح ہے، مگر یہاں یہ مراد نہیں ہو سکتی،

اس لیے کہ بلانیت کے عمل، یا غفلت کے ساتھ کئے گئے عمل میں قطعاً کوئی خیر نہیں ہے، جب کہ تخانیہ خیر ہے، لیکن ترجیح ان امور میں ہونی چاہیے جو اصل خیر میں مشترک ہوں، جب تخانیہ پائی گئی عمل نہیں پایا گیا تو خیر میں اشتراک کہاں رہا، بلکہ اس حدیث میں ہر وہ طاقت یا عمل مراد ہے جو نیت اور عمل دونوں سے مرکب ہو، نیت بھی خیر ہو، اور عمل بھی خیر ہو یہاں کہا جائے گا کہ اس اطاعت میں نیت عمل سے بہتر ہے اگرچہ مقصود میں دونوں اپنی اپنی جگہ مؤثر ہیں، لیکن نیت کی تاثیر عمل کی تاثیر سے بہتر ہے۔ گویا حدیث کے معنی یہ ہوئے مومن کی نیت جو منجملہ اطاعت ہو اس عمل سے بہتر ہے جو خود بھی منجملہ اسی اطاعت کے ہو، حاصل یہ ہے کہ بندے کو عمل میں بھی اختیار ہے، اور نیت میں بھی، کیوں کہ دونوں عمل ہیں، ایک ظاہری اعضاء سے متعلق ہے، اور دوسرا قلب سے، لیکن بہتری نیت کا حاصل ہے۔

نیت عمل سے کیوں افضل ہے : یہ حدیث کے معنی و مفہوم کی تفصیل ہوئی، اب رہا یہ سوال کہ نیت کے بہتر ہونے اور عمل پر رائج ہونے کی وجہ کیا ہے؟ اس وجہ کو صحیح طریقہ پر وہی شخص سمجھ سکتا ہے جو دین کے مقاصد، اس کے طریقہ کار، اور مقصد تک پہنچنے میں اس کے طریقہ کار کے مؤثر ہونے کی حقیقت سے واقف ہو، اور بعض آثار کو بعض پر قیاس کرنے کی اہلیت رکھتا ہو، ایسے ہی شخص پر یہ امر منکشف ہو سکتا ہے کہ مقصود کے اعتبار سے کس عمل کے اثر کو فضیلت دی جانی چاہیے، مثال کے طور پر اگر کوئی شخص یہ کہے کہ روٹی میوے سے بہتر ہے تو اس کا مقصد یہ ہے کہ قوت اور غذائیت کے اعتبار سے روٹی بہتر ہے، اور یہ بات وہی کہہ سکتا ہے جو جانتا ہو کہ غذا کا ایک مقصد ہوتا ہے اور وہ ہے صحت اور بقا، اور تاثیر کے لحاظ سے غذائیں مختلف نوع کی ہیں، چنانچہ وہ تمام غذاؤں کے اثرات سے واقف ہو، اور انہیں ایک دوسرے پر قیاس کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو، اطاعات بھی قلوب کی غذا ہیں، اور ان غذاؤں کا مقصد اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ قلوب کو شفا ہو، اور وہ آخرت میں بقا و سلامتی پائیں، اور اللہ تعالیٰ کی لقاء کی نعمت و سعادت سے سرفراز ہوں، گویا اصل مقصد اللہ تعالیٰ کی ملاقات سے سعادت کی لذت کا حصول ہے، اور اللہ کی ملاقات سے وہی شخص سرفراز ہو سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی محبت اور معرفت پر مرے، اور اللہ سے محبت وہی کر سکتا ہے جو اس کی معرفت رکھتا ہو، اور وہی شخص افس حاصل کر سکتا ہے جو اس کا خوب خوب ذکر کرتا ہو، افس دوام ذکر سے حاصل ہوتا ہے، اور معرفت دوام فکر و محبت سے۔ گویا محبت بذاتہ معرفت کے تابع ہے، قلب دوام ذکر و فکر کے لئے اس وقت تک فارغ نہیں ہو سکتا جب تک کہ دنیا کے شواغل سے فارغ نہ ہو، اور اس وقت تک وہی مشاغل سے لا تعلق نہیں ہو سکتا جب تک شہوات نفس کا سلسلہ اس سے منقطع نہ ہو، یہاں تک وہ خبر کی طرف مائل ہو جائے اس کا ارادہ کرنے والا بن جائے شر سے محفوظ ہو، اور اسے بغض کرے، صرف وہی شخص خیر و طاعت پر منحصر ہے جیسے عقلمند انسان قصد و حجامت پر اس لئے مائل ہوتا ہے کہ اس کی سلامتی صحت اور بقائے جسم قصد و حجامت پر موقوف ہے، جب معرفت سے اصل میلان حاصل ہو جاتا ہے تو عمل سے اس کو تقویت ملتی ہے اس لئے کہ صفات قلب کے معنی پر عمل کرنا ان صفات کے لئے غذا اور قوت کے قائم مقام ہیں، اعمال کے ذریعے یہ صفات قلب میں گہرائی تک رائج ہوتی ہیں، اور اچھی طرح جم جاتی ہیں۔ چنانچہ طلب علم یا طلب جاہ کی طرف مائل ہونے والے شخص کا میلان ابتدا میں ضعیف ہوتا ہے، لیکن جب وہ میلان کے تقاضوں پر عمل کرتا ہے اور علم میں مشغول ہوتا ہے، یا حصول اقتدار کے لئے تدابیر کرتا ہے تو وہ میلان رائج ہو جاتا ہے، اور اس کے لئے اس سے چمٹکارا پانا دشوار ہو جاتا ہے، اور اگر ابتدا ہی میں میلان کے خلاف کرتا ہے تو وہ بہتر درجہ کمزور پڑنے لگتا ہے، یہاں تک کہ ختم بھی ہو جاتا ہے، چنانچہ اگر کوئی شخص کسی خوب صورت انسان کو دیکھے تو پہلے بار دیکھنے سے اس کی رغبت ضعیف ہو جاتی ہے، لیکن اگر اس رغبت کے موجب ہر عمل کرتے ہوئے اس کے پاس بیٹھنے، اس سے ملنے جلنے، گفتگو کرنے، اور اسے دیکھنے پر موانعت کرے تو وہ رغبت اتنی بڑھتی ہو جائے گی کہ اپنے اختیار سے بھی باہر نکل جائے گی، لیکن اگر ابتدا ہی میں نفس کو رغبت سے الگ رکھے گا، اور اس کے موجب ہر عمل نہیں کرے گا تو یہ ایسا ہو گا جیسے کوئی شخص غذا کا سلسلہ موقوف کر دے، ظاہر ہے کہ اس سے جسم نحیف، نزار اور کمزور رہی ہو گا یہی حال قلب کے میلان کا ہوتا

ہے جب اسے عمل کی غذا نہیں ملتی تو وہ آہستہ آہستہ کمزور ہو کر معدوم ہو جاتا ہے تمام صفات کا یہی حال ہے۔ تمام اعمال خیر اور تمام طاعات سے آخرت مطلوب ہوتی ہے اور تمام شرور سے دنیا مطلوب ہوتی ہے، آخرت مطلوب نہیں ہوتی، اخروی خیرات کی طرف نفس کے میلان اور دنیاوی شرور سے اس کے انحراف سے قلب ذکر و فکر کے لیے فارغ ہو جاتا ہے، لیکن اسے دوام اس وقت حاصل ہوتا ہے جب اعمال خیر اور طاعات پر موانعت ہوتی ہے اور اعضاء معاصی سے اجتناب کرتے ہیں، اس لیے کہ جو ارجح اور قلب کے درمیان ایک رشتہ ہے، اس رشتے کی بنا پر ایک کا اثر دوسرے تک پہنچتا ہے، چنانچہ جب کسی عضو میں کوئی تکلیف ہوتی ہے یا زخم لگتا ہے تو دل میں تکلیف ہوتی ہے اور جب دل کو کسی عزیز قریب کے مرنے یا کسی خوفناک واقعے سے تکلیف ہوتی ہے تو اعضاء بھی متاثر ہوتے ہیں۔ کبھی بدن لرزنے لگتا ہے، کبھی رنگ خیر ہو جاتا ہے، کبھی بھوک پیاس اڑ جاتی ہے اعضاء اور دل میں صرف اس قدر فرق ہے کہ دل ایک امیر اور حاکم کی حیثیت رکھتا ہے اور اعضاء خادم اور رعایا کی طرح ہیں، ان کی خدمت اور اطاعت سے دل کی صفات راح اور بہتہ ہوتی ہیں۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ دل مقصود ہے اور اعضاء آلات ہیں، ان کے ذریعے مقصد تک پہنچا جاتا ہے۔ چنانچہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:-

اِنَّ فِي الْجَسَدِ مَضْغَةً اِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ لَهَا سَائِرُ الْجَسَدِ (بخاری و مسلم۔ نعمان ابن بشیر)
جسم میں ایک لوتھڑا ہے اگر وہ صحیح ہوتا ہے تو اس کی وجہ سے تمام جسم صحیح ہوتا ہے۔
اللّٰهُمَّ اَصْلِحِ الرَّاعِيَ وَالرَّعِيَّةَ (۱)
اے اللہ راہی اور رعیت کو درست رکھئے۔

یہاں راہی سے مراد قلب ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:-

لَنْ يَنْتَهِىَ اللَّهُ لُحُومُهَا وَلَا دِمَافُهَا وَلَكِنْ يَنْتَهِىَ النَّفْسُ مِنْكُمْ (پ ۱۷ آیت ۲۷)
اللہ تعالیٰ کے پاس نہ ان کا گوشت پہنچتا ہے اور نہ ان کا خون، لیکن اس کے پاس تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے۔

تقویٰ قلب کی صفت ہے، اس لیے یہ ضروری ہو کہ قلب کے اعمال اعضاء کی حرکات سے افضل ہوں پھر یہ ضروری ہو کہ نیت ان سب سے افضل ہو، لیکن نیت سے مراد خیر کی طرف قلب کی رغبت اور ارادہ ہے، اور اعمال جو ارجح سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ قلب ارادہ خیر کا عادی بن جائے اور اس میں خیر کی رغبت بہتہ ہو جائے تاکہ وہ دنیاوی شوائب سے خالی ہو کر ذکر و فکر میں پوری طرح منہمک ہو سکے، اعمال میں افضلیت کا مدار غرض پر ہے اور کیوں کہ نیت سے یہ غرض حاصل ہو رہی ہے اس لیے فضیلت نیت ہی کے حق میں ہوگی۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی شخص کے معدے میں درد ہو، اور طبیب اس کے لیے معدے کے ظاہری حصے پر مالش کرنے کے لیے روغن، اور پینے کے لیے دوا تجویز کرے جو براہ راست معدے میں پہنچتی ہے، ظاہر ہے یہاں پینے والی دوا روغن مالش سے بہتر ہوگی، اگرچہ روغن سے بھی درد کا ازالہ مقصود ہے لیکن جو دوا براہ راست معدے میں پہنچ کر مؤثر ہوگی اور درد زائل کرے گی وہ زیادہ نافع قرار دی جائے گی اور مقصود کے لحاظ سے زیادہ مفید ہونے کی بنا پر اسے روغن کے مقابلے میں بہتر کہا جائے گا، یہی حال اطاعات کی تاخیر کا ہے، تمام طاعات سے قلوب کا تقیر اور ان کے اوصاف کی تبدیلی مقصود ہے کہ پیشانی اور زمین کا اتصال ہو، بلکہ اس کا مقصد دل میں تواضع کا وصف راجح کرنا ہے، جو شخص اپنے نفس میں تواضع پاتا ہے، جب وہ اپنے اعضاء کے ذریعے متواضعین کی صورت بناتا ہے تو نفس میں تواضع بہتہ ہو جاتی ہے، اسی طرح جس شخص کے دل میں ترقم کا جذبہ ہوتا ہے اور وہ یتیم کے سر پر ہاتھ پھیرتا ہے، اور اس کی پیشانی کو بوسہ دیتا ہے تو اس عمل سے اس کی صفت ترقم مزید بہتہ ہو جاتی ہے، عمل بغیر نیت کے اسی لیے قطعاً مفید نہیں ہوتا، کیوں کہ جو شخص یتیم کے سر پر ہاتھ پھیرتا ہے اور اس کا دل غافل ہوتا ہے، یادہ

ہم کہ اس کا ہاتھ پکڑے کے اوپر ہے اس کا اثر اعضاء سے منتشر ہو کر قلب تک نہیں پہنچتا۔ اسی طرح جو شخص غفلت کے فتنہ مجتہد کرتا ہے، اور اس کا دل دنیاوی مال و متاع میں مشغول ہوتا ہے تو شخص زمین پر پیشانی رکھ دینے سے دل پر کوئی اثر نہیں ہوتا، بلکہ اس طرح کے سجدوں کا ہونا نہ ہونا برابر ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ نیت کے بغیر عبادت باطل ہے، یہ بطلان بھی اس صورت میں ہے جب کہ سجدہ غفلت میں کیا ہو، اگر ریا کے طور پر کیا یا اس سے کسی شخص کی تعظیم مقصود تھی تو نہ صرف یہ کہ سجدے باطل ہوں گے بلکہ ایک اور خرابی بھی لازم آئے گی، گویا جس صفت کی تاکید مقصود تھی وہ سرے سے حاصل ہی نہیں ہوئی، اور جس صفت کا ازالہ مطلوب تھا وہ اور راسخ ہو گئی۔

عمل سے نیت اسی لیے بہتر ہوتی ہے، امید ہے کہ اس تفصیل سے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کی علت بخوبی واضح ہو گئی ہوگی، اس گفتگو سے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد گرامی کی حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے۔

مَنْ هَمَّ بِحَسَنَةٍ فَلَمْ يَعْمَلْهَا كَتَبَتْ لَهُ حَسَنَةً

جس شخص نے کسی نیکی کا ارادہ کیا اور اس پر عمل نہیں کیا تو اس کے لیے ایک نیکی لکھی جائے گی۔

اس لیے کہ قلب کسی نیکی کا اسی وقت ارادہ کرتا ہے جب وہ خیر کی طرف مائل ہوتا ہے، اور ہوائے نفس و حب دنیا سے انحراف کرتا ہے، اور یہ اعلیٰ درجے کی نیکی ہے، عمل کے ذریعے اس نیکی کی تکمیل اور تاکید ہو جاتا ہے، چنانچہ قربانی کا خون اس لیے نہیں بہایا جاتا کہ اللہ تعالیٰ کو گوشت یا خون مطلوب ہے، بلکہ مقصود یہ ہے کہ دل دنیا کی محبت سے خالی ہو، اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے دنیاوی مال و متاع خرچ کر سکتا ہے، اور یہ صفت اس وقت حاصل ہو جاتی ہے جب دل میں نیت اور ارادہ پیدا ہوتا ہے، اگرچہ عمل اور نیت کے درمیان کوئی رکاوٹ پیدا ہو جائے۔ چنانچہ قرآن کریم میں ہے۔

لَنْ يَنَالَ اللَّهُ لُحُومُهَا وَلَا دِمَآءُهَا وَلَكِنْ يَنَالُ التَّقْوَىٰ مِنْكُمْ (پ ۱۷ آیت ۲۷)

اللہ کے پاس نہ ان کا گوشت پہنچتا ہے اور نہ ان کا خون، لیکن اس کے پاس تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے۔

جیسا کہ روایات میں مذکور ہے تقویٰ کا عمل قلب ہے، اور اس حدیث سے بھی یہی مراد ہے جو پہلے گذری ہے، اور جس میں مدینے میں مقیم کچھ ایسے افراد کا ذکر ہے جو بعض اہل ذاری بنائے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں جہاد کے لیے سفر نہ کر سکے، لیکن انھیں بھی مجاہدین کے برابر ثواب ملا، کیوں وہ جہاد میں شرکت کی نیت رکھتے تھے، اور اللہ کا کلمہ بلند کرنے کے لیے شہادت پانے کے متعلق تھے، کفار و مشرکین سے برسرِ پیکار ہونے کے سلسلے میں جو جذبات سفر جہاد میں جانے والوں کے دلوں میں تھے بالکل وہی جذبات ان لوگوں کے دلوں میں بھی موجزن تھے جو جسموں کے ذریعے شرکت نہ کر سکے، اور شرکت نہ کرنے کے سلسلے میں جو اسباب رکاوٹ بنے وہ قلب سے خارج تھے۔ اس گفتگو سے وہ تمام احادیث سمجھ میں آجائیں گی جن میں نیت کی فضیلت وارد ہے، تمہیں ان احادیث کو ہماری گفتگو کی روشنی میں ان معانی سے مطابق کر کے دیکھنا چاہیے جو ہم نے بیان کئے ہیں انشاء اللہ تم پر ان احادیث کے اسرار منکشف ہو جائیں گے۔

نیت کے اعمال کی تفصیل : اعمال کی بہت سی قسمیں ہیں جیسے فعل، قول، حرکت و سکون، جلب منفعت، دفع مضرت اور فکر و تدبیر وغیرہ، قسمیں اتنی زیادہ ہیں کہ ان کا احاطہ نہیں کیا جاسکتا، لیکن ہمیشہ مجموعی ان کی تین قسمیں کی جاسکتی ہیں، 'معاصی' طاعات، اور مناجات، نیت کی بنا پر ان تینوں اقسام میں جو تغیر واقع ہوتا ہے یہاں اس پر گفتگو کی جاتی ہے۔

پہلی قسم معاصی : نیت سے معاصی میں کوئی تغیر واقع نہیں ہوتا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد مبارک اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ (اعمال کا دار و مدار نیت پر ہے) سے جا مل کو یہ گمان نہ کرنا چاہیے کہ مذکورہ بالا حدیث شریف عموم پر معمول ہے، اور یہ کہ اگر نیک نیتی کے ساتھ کوئی گناہ کیا جائے تو اس پر مواخذہ نہیں ہو گا یا وہ معصیت طاعت میں تبدیل ہو جائے

گی، اگر کوئی شخص ایسا سوچتا ہے تو یہ اس کی بہت بڑی غلطی ہے، مثلاً ایک شخص کی دل جوئی کے لیے کسی دوسرے کی نفیبت کرنا یا کسی فقیر کو غیر کا مال دیدنا یا حرام مال سے مسہرہ مدرسہ اور سرائے تعمیر کرانا اور یہ سمجھنا کہ میں اچھے کام کر رہا ہوں اور مجھے ان پر ثواب عطا کیا جائے گا۔ یہ تمام باتیں جمالت کی ہیں، نیت سے کوئی ظلم انصاف میں نہیں بدلتا اور نہ حرمت حلت میں تبدیل ہوتی ہے، بلکہ متعین شرع کے خلاف ان اعمال پر خیر کی نیت کرنا ایک الگ معصیت ہوگی، اور اس پر دہرا عذاب ہوگا، اگر کوئی شخص جان بوجھ کر ایسا کرتا ہے تو اسے شریعت کا مخالف، معاند اور دشمن تصور کیا جائے گا، اور اگر نادانستگی میں اس سے یہ فعل سرزد ہوتا ہے تو اسے جمالت کی معصیت کا مرتکب قرار دیا جائے گا۔ کیوں کہ ظلم حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔

شریعت ہمیں خیر و شر کا فرق بتلاتی ہے، اور ان اعمال کی نشاندہی کرتی ہے جو خیر ہیں، یا شر ہیں، دونوں میں بڑا فرق ہے، پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ شر خیر میں بدل جائے، اصل میں آدمی کے دل میں مغلّی شہوتیں، اور باطنی خواہشات اس طرح کے خیالات پیدا کرتی ہیں، جب وہ جاہ کا طالب ہوتا ہے، اور یہ چاہتا ہے کہ لوگوں کے قلوب اپنی طرف مائل کرے تو شیطان اس موقع سے بڑا فائدہ اٹھاتا ہے، اور اس کے دل میں یہ خیال القا کرتا ہے کہ اگر نیت اچھی رکھی جائے تو برے اعمال بھی اچھے ہو جاتے ہیں، اسی لیے حضرت سہل ستیری فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ کی کوئی معصیت جمالت کی معصیت سے بڑھ کر نہیں ہے، لوگوں نے عرض کیا اے ابو محمد! کیا آپ کوئی ایسی چیز بھی جانتے ہیں جو جہل سے بڑی ہو، فرمایا اپنی جمالت سے جاہل ہونا جہل سے بھی سخت تر معصیت ہے سہل ستیری کا یہ ارشاد برحق ہے، اس لیے کہ جہل کی جمالت تعلیم و محکم کا دروازہ قطعی طور پر مسدود کر دیتی ہے۔ چنانچہ جو شخص اپنے بارے میں اس غلط فہمی کا شکار ہے کہ وہ تعلیم یافتہ ہے وہ ظلم کیوں حاصل کرے گا؟ اسی طرح ظلم کو خدا تعالیٰ کی اطاعت کا وسیلہ بنانا تمام اطاعتوں میں افضل ہے، اور ظلم کا ظلم اصل ظلم ہے جیسے جہل کا جہل اصل جہل ہے، جو شخص یہ نہیں جانتا کہ ظلم نافع کیا ہے اور ظلم ضار کیا ہے وہ انہی علوم میں مشغول ہوتا ہے جن میں لوگ مصروف ہیں، اور وہ لغو علوم ہیں، جو صرف دنیا کا وسیلہ بن سکتے ہیں، آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہے، ان لغو اور بیکار علوم میں مشغول ہونا جمالت کی اصل، اور فساد عالم کا نقطہ آغاز ہے۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ اگر کوئی شخص جمالت کی وجہ سے معصیت کا ارتکاب کرے اور خیر کی نیت کرے تو اس کا یہ عذر حلیم نہیں کیا جائے گا کہ وہ جاہل ہے، تاہم اگر کوئی شخص دنیا اسلام میں داخل ہوا ہو اور اسے ظلم دین سیکھنے کی مصلحت نہ ملی ہو تو اس کا عذر قابل قبول ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

فَاسْئَلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ۔ (پ ۳۴ آیت ۴۳)

سو اگر تم کو ظلم میں تو اہل علم سے پوچھ لو۔

سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں۔

لَا يُعْلَمُ الْبَاجِلُ عَلَى الْجَاهِلِ، وَلَا يَجِلُ لِلْبَاجِلِ أَنْ يَسْكُتَ عَلَى جَهْلِهِ وَلَا لِلْعَالِمِ أَنْ يَسْكُتَ عَلَى عِلْمِهِ طِبْرَانِ، ابوالفہم جابری

جاہل اپنے جہل پر معذور نہیں سمجھا جائے گا، اور نہ جاہل کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ اپنے جہل پر خاموش رہے اور نہ عالم کے لیے جائز ہے کہ وہ اپنے ظلم پر سکوت اختیار کرے۔

جس طرح حرام مال سے مسہرہ اور مدرسہ بنوا کر بادشاہوں اور حکمرانوں کا تقرب حاصل کرنا ممنوع ہے اسی طرح یہ بھی ممنوع ہے کہ ہمارے علماء ان لوگوں کو اللہ کا پاکیزہ دین سکھائیں جو بے وقوف ہوں، شرارت پسند ہوں، فسق و فجور میں مبتلا ہوں، اور ان کا مطمح نظر یہ ہو کہ وہ علیٰ حق سے محالہ کریں، فقہاء کو ہٹائیں، لوگوں کی غیر شرعی امور میں دلدہی کریں، بادشاہوں، قچہوں اور مسکینوں کے مال و محتاج پر نظر رکھیں، اس لیے کہ ایسے لوگ ظلم سیکھ کر اللہ تعالیٰ کی راہ کے ڈاکو بن جاتے ہیں، اور دجال کے نائب بن کر اپنے شہوں میں اس قدر فساد برپا کرتے ہیں کہ شیطان شرابے لگتا ہے، یہ لوگ نفسانی خواہشات کے اسیر ہوتے ہیں،

تقویٰ سے دور ہوتے ہیں، جو لوگ انہیں دیکھتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی معصیت پر جری ہو جاتے ہیں، اور جو ان سے علم حاصل کرتے ہیں وہ بھی استاد کی اتباع کرتے ہیں اور ان کے نقش قدم پر چل کر اس سلسلہٴ فساد کو دور از کرنے کا باعث بنتے ہیں، اور اپنے علم کو شر کا وسیلہ بناتے ہیں، بعد میں آنے والوں کا تمام وبال اسی شخص پر رہتا ہے جو ان سب کا متبع اور معلم اول ہے جس نے اپنی فسادیت کے باوجود انہیں علم سکھلایا، اور اپنے اقوال، افعال، لباس، طعام اور مسکن میں خدا تعالیٰ کی نافرمانی کا مشاہدہ کر کے انہیں معصیت میں مبتلا کرتا ہے، یہ عالم مرجاتا ہے لیکن اس کے آثار دنیا میں ہزاروں سال تک منتشر رہتے ہیں، وہ شخص نہایت خوش قسمت ہے جس کے ساتھ اس کے گناہ بھی مرجائیں۔

حیرت ہے ایسے علماء یہ کہتے ہیں کہ ہماری نیت صحیح ہے، اعمال کا مدار نیتوں پر ہے، ہم تو علم دین پھیلاتا چاہتے ہیں، اب اگر کوئی شخص اسے غلط مقاصد کے لیے استعمال کرتا ہے، اور وسیلہٴ فساد بناتا ہے، یا ہم سے علم حاصل کر کے خود گمراہ ہوتا ہے، یا دوسروں کو گمراہ کرتا ہے تو اس میں ہمارا کیا قصور ہے، گناہ گار وہ ہے، ہم نہیں ہیں، ہماری نیت تو یہ ہے کہ وہ ہمارے سکھائے ہوئے دین سے راہ خیر پر مدد لے۔ ان علماء کا یہ عذر صحیح نہیں ہے، بلکہ ان کی جاہ طلبی، خواہش اقتدار، اور جذبہ حب ریاست پر دلالت کرتا ہے، وہ مخدوم بننا چاہتے ہیں، انہیں اپنے علم کی زیادتی پر تکبر ہے، شیطان ان امور کو اس پرانے فریب سے مشتبہ کر دیتا ہے، لیکن کیا یہ لوگ ہمارے اس سوال کا جواب دے سکتے ہیں کہ اگر کوئی شخص کسی راہزن کو تلوار دے، گھوڑا اور دوسرے تمام لوازمات مہیا کرے، اور اسے اس کے مقصود پر پوری مدد دے، اور یہ کہے کہ میں سخاوت کی نیت سے دے رہا ہوں، اور سخاوت ان اخلاق کریمہ میں سے ہے جو اللہ تعالیٰ کو محبوب ہیں، اور میں یہ چاہتا ہوں کہ یہ شخص اس تلوار سے، اور اس گھوڑے سے اور جو کچھ ساز و سامان میں نے اسے دیا ہے اس سے جمادنی سمیل اللہ میں مدد لے۔ ظاہر ہے اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والوں کو اگر یہ سامان دیا جائے تو اس میں بڑا ثواب ہے، اب اگر وہ شخص اس سامان کو رہزنی میں استعمال کرے تو یہ اس کا قصور ہے، وہ خود اس کی سزا بھگتے گا؟ ظاہر ہے ہر صاحب علم اس کا جواب یہی دے گا کہ اس شخص کا عمل غلط ہے، کیونکہ تمام فقہاء بالاتفاق رہزنیوں کو رہزنی کے وسائل مہیا کرنے کو حرام کہتے ہیں، اگرچہ سخاوت اللہ تعالیٰ کا سب سے زیادہ محبوب خلق ہے، جیسا کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں۔

إِنَّ لِلَّهِ تَعَالَى ثَلَاثِمِائَةَ خُلُقٍ مَنْ تَقَرَّبَ إِلَيْهِ بِوَاحِدٍ مِنْهَا دَخَلَ الْجَنَّةَ وَأَجْهَأَ إِلَيْهِ السَّحَاءُ (۱)

اللہ تعالیٰ کے تین سو اخلاق ہیں جو شخص ان میں سے کسی ایک سے بھی تقرب حاصل کرتا ہے وہ جنت میں جاتا ہے، ان میں اللہ تعالیٰ کا محبوب ترین خلق سخاوت ہے۔

اس کے باوجود سخاوت کو حرام قرار دیا، اور یہ ضروری قرار دیا کہ پہلے اس شخص کے حال کا قرینہ دیکھ لیا جائے جو تمہاری سخاوت کا مستحق بن رہا ہے، اگر تم یہ جان گئے ہو کہ وہ رہزن ہے، اور ہتھیار لے کر رہزنی کرے گا تو تم پر اس کا ہتھیار چھیننا واجب ہے بجائے اس کے کہ تم اسے اور مسلح کرو، علم بھی ایک ہتھیار ہے، اس کی مدد سے شیطان کا خون کیا جاتا ہے، اور دشمنانِ خدا کی زبانیں خاموش کی جاتی ہیں، بعض اوقات اہل علم اپنی نفسانی خواہشات کے باعث دشمنانِ خدا کی مدد کر بیٹھے ہیں، علم سکھانے سے پہلے ہمیں یہ دیکھ لینا چاہیے کہ وہ شخص اس کا اہل ہے یا نہیں، اگر کوئی شخص دنیا کو دین پر ترجیح دیتا ہو، اور نفسانی خواہشات کے حصول دنیا اور تکمیل خواہشات کا وسیلہ بنالے۔ پہلے زمانے کے بزرگوں کا طریقہ یہ تھا کہ وہ اپنے مسترشدین، طائفہ، اور مجالس میں آمد و رفت رکھنے والوں کے حالات کا تفحص کرتے تھے، اور ان کے گردار کے گھراں رہتے تھے، اگر کبھی کسی سے نقل میں بھی

کوئی غلطی سرزد ہو جاتی تو اس کا اعتبار چھوڑ دیتے تھے، خاطر داری اور تقسیم ترک کر دیتے تھے، اور اگر یہ دیکھتے کہ وہ شخص بدکاری کا مرتکب ہوا ہے، یا حرام کھاتا ہے تو اسے اپنی مجلس سے نکال دیتے تھے، اور اس سے اپنا ہر تعلق منقطع کر لیا کرتے تھے، چہ جائیکہ اس بد قماش اور بد اطوار شخص کو علم دین کے ہتھیار سے مسلح کرتے، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ جو شخص کوئی مسئلہ سیکھتا ہے، اور اس پر عمل نہیں کرتا، اور اسے غیر کا ذریعہ بناتا ہے، وہ علم کو صرف وسیلہ شریعتا چاہتا ہے، اکابرین سلف بدکار علماء سے پناہ مانگتے تھے، جاہل بدکاروں سے انہوں نے پناہ نہیں مانگی۔

حضرت امام احمد ابن حنبلؒ کی خدمت میں ایک شخص اکثر حاضری دیا کرتا تھا، ایک مرتبہ وہ شخص آیا تو آپ نے اس پر کوئی توجہ نہیں دی، بلکہ اس سے اعراض فرمایا، اور منہ پھیر لیا، اس شخص نے اعراض کا سبب دریافت کیا، آپ نے کافی اصرار کے بعد بتایا کہ میں نے سنا ہے تو نے اپنے گھر کی دیوار اپنے قدم کے برابر بلند کر لی ہے، اور سڑک سے مٹی لی ہے جو مسلمانوں کی ملکیت ہے، اس لیے اب تیرے لیے یہ جائز نہیں کہ تو علم کی نقل میں مشغول ہو، بزرگان سلف اپنے ظلمہ کے احوال پر اس طرح نظر رکھتے تھے، یہ امور شیطان پر، اور اس کے متبعین پر غمی رہتے ہیں، اگرچہ وہ سر سے ہر تک مہائیں نصب تن کئے ہوئے ہیں، اور ان کی آستینیں نہایت کشادہ ہیں زبانیں دراز ہیں، خوش گلو اور خوش گفتار ہیں، علم کے خزانے رکھتے ہیں، اگرچہ ان کے پاس وہ علوم نہیں جن سے مخلوق خدا کو دنیا سے ڈرایا جاتا ہے، اور آخرت کی ترفیب دی جاتی ہے، البتہ ان کے پاس ان علوم کے وافر خزانے موجود ہیں جو دنیا میں متوجہ ہیں، اور جن کے ذریعے حرام مال جمع کیا جاتا ہے، اور لوگوں سے احترام کرایا جاتا ہے، ہمسروں اور ہم عصروں پر برتری حاصل کی جاتی ہے۔

اس تمام گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ معاصی سے حدیثاً اَلْاَعْمَالُ بِالْاَنْبِيَاۡتِ کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ بلکہ اعمال کی باقی دو قسموں طاعات اور مباحات سے ہے۔ کیوں کہ طاعت نیت سے معصیت بن جاتی ہے، اسی طرح مباح عمل بھی نیت سے معصیت اور طاعت بن جاتا ہے، لیکن معصیت نیت سے اطاعت نہیں بنتی، البتہ معصیت میں نیت کی تاثیر اس کے برعکس ہے، اور وہ یہ ہے کہ جو شخص معصیت سے خیر کی نیت کرتا ہے اسے معصیت کا گناہ الگ ہوتا ہے، اور نیت کا وبال الگ۔ اس کا بیان کتاب التوبہ میں گذر چکا ہے۔

دوسری قسم۔ طاعات : طاعات میں نیت کا دو باتوں سے تعلق ہے، ایک اصول صحت سے، اور دوسرے ثواب کی زیادتی سے۔ اصل صحت میں نیت کے معنی یہ ہیں کہ عمل سے اللہ تعالیٰ کی عبادت کی نیت کرے، اس کے علاوہ کسی شے کی نیت نہ کرے، چنانچہ اگر کسی نے عبادت سے زیادہ کی نیت کی تو وہ معصیت بن جائے گی اور ثواب کی زیادتی کی صورت یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ اچھی نیتیں کرے، ایک عمل سے بہت سی نیتیں کی جاسکتی ہیں، ہر نیت کا ثواب الگ ہو گا، کیوں کہ ہر نیت بجائے خود نیک ہوگی، پھر ہر نیک کا اجر دس گنا ہو گا، جیسا کہ حدیث شریف میں اس کی طوفی خبر دی گئی ہے، مثال کے طور پر مسجد میں بیٹھنا ایک عبادت ہے، اس عبادت میں بہت سی نیتیں کی جاسکتی ہیں، یہاں تک کہ اس کا یہ عمل متقیین کے فعاصل اعمال میں شامل ہو جائے، اور وہ متقیین کے درجات حاصل کر سکے چنانچہ ایک نیت یہ کی جاسکتی ہے کہ مسجد اللہ کا گھر ہے، اور اس میں داخل ہونے والا خدا کا راز ہے، چنانچہ وہ مسجد میں بیٹھنے سے زیارت الہی کی نیت بھی کرے۔ اس وعدے کی امید پر جو اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر سرکار کو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا ہے، فرمایا۔

مَنْ قَعَدَ فِي الْمَسْجِدِ فَقَدْ زَارَ اللَّهَ تَعَالَى وَحَقَّ عَلَى الْمَرْبُورِ اَكْرَامُ زَائِرِهِ (ابن حیات۔ سلمان)

جو شخص مسجد میں بیٹھا اس نے اللہ تعالیٰ کی زیارت کی، زیارت کئے جانے والے پر ضروری ہے کہ وہ زائر کا اعزاز کرے۔

دوسری یہ کہ ایک نماز کے بعد دوسری نماز کی نیت کرے، کیوں کہ نماز کے انتظار میں بیٹھنے کا ثواب ایسا ہی ہے جیسے نماز کا ثواب۔ قرآن کریم میں کلمۃ ابطون سے یہی مراد ہے، تیسری نیت یہ کرے کہ میں فواحش سے کان اور آنکھ اور دیگر اعضاء کو محفوظ رکھتا ہوں، احکاف بھی روزے کی طرح ایک عبادت ہے، اور اس میں ایک طرح کی رہبانیت پائی جاتی ہے، جیسا کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں۔

رَهْبَانِيَّةً ثَلَاثَتْنِي الْقُعُودُ فِي الْمَسَاجِدِ (۱)

میری امت کی رہبانیت مساجد میں بیٹھنا ہے۔

چوتھی نیت یہ کرے کہ میں اپنی ہمت کو اللہ تعالیٰ پر، اور آخرت کی فکر پر مجتمع کرتا ہوں، اور جو امور ذکر الہی اور ذکر آخرت سے مانع ہیں ان کے تصور سے بھی دور رہنا چاہتا ہوں، پانچویں نیت اللہ تعالیٰ کے ذکر کے لیے تنہائی کی کرے، خواہ ذکر کرنے میں مشغول ہو، یا ذکر سننے میں، یا اس کی یاد میں مستغرق ہو، ایک حدیث میں ہے۔

مَنْ غَدَا إِلَى الْمَسْجِدِ لِيَذْكُرَ اللَّهَ تَعَالَى أَوْ يَذْكُرَ رُبَّكَ كَانَ كَالْمُجَاهِدِ فِي سَبِيلِ اللَّهِ (۲)

جو شخص اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے کے لیے، یا اس کے ذکر کی نصیحت کرنے کے لیے مسجد میں جائے وہ اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والوں کی طرح ہے۔

چھٹی نیت امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ہو سکتی ہے، چنانچہ مسجدوں میں ایسے لوگ ہوتے ہیں جو نماز میں غلطی کرتے ہیں، یا ایسی حرکتوں کے مرتکب ہوتے ہیں جن کا مسجد میں ارتکاب کرنا جائز نہیں ہوتا، ایسے لوگوں کو راہِ راست کی ہدایت کی جاسکتی ہے، اور انہیں صحیح طریقے بتلائے جاسکتے ہیں، یہ بھی ایک خیر ہے، جب تک وہ اس کے بتلائے ہوئے راستے پر گامزن رہے گا، بتلانے والے کو بھی اجر و ثواب ملتا رہے گا، ساتویں نیت کسی دینی بھائی سے کچھ سیکھنے کی بھی ہو سکتی ہے، مساجد میں عام طور پر ایسے لوگ جاتے ہیں جو دیندار ہوں، اللہ تعالیٰ سے محبت کرنے والے، اور اس کے لیے رشتہ صداقت استوار کرنے والے ہوں، اگر مسجد میں جائے والا ان لوگوں سے استفادے کی نیت کرے تو یہ اس کے حق میں قیمت اور ذخیرہ ہو گا، آٹھویں نیت اس صورت سے کرے کہ اللہ تعالیٰ کی شرم میں گناہ چھوڑ دے، اور یہ سوچے کہ اللہ تعالیٰ کے گھر میں کوئی ایسی بات نہ ہونی چاہیے جو اس کے حرمت اور تقدس کے متافی ہو، حسن ابن علیؑ کہتے ہیں جو شخص بکثرت مسجدوں میں آتا جاتا ہے اسے اللہ تعالیٰ سات خصلتوں میں سے ایک خصلت ضرور عطا کرتا ہے، یا تو اسے کوئی ایسا بھائی ملتا ہے جس سے وہ دین کے معاملات میں رہنمائی حاصل کر سکے، یا اس پر رحمت نازل ہوتی ہے، یا کوئی عجیب علم حاصل ہوتا ہے، یا ایک کوئی ایسا کلمہ سیکھتا ہے جو اسے ہدایت کی راہ بتلائے، یا اسے برائی سے روکے، یا وہ اللہ کے خوف سے یا اس کی حیاء سے گناہ ترک کرتا ہے۔ کسی ایک عبادت میں بہت سی نیتیں کرنے کا یہ طریقہ ہے، اسی ایک مثال پر باقی تمام عبادتوں اور طاعتوں کو قیاس کیا جاسکتا ہے، کوئی اطاعت ایسی نہیں ہے جس میں بہت سی نیتیں نہ کی جاسکتی ہوں، بلکہ ہر مسئلہ میں جس قدر کوشش کرتا ہے، اور راہِ حق میں جس قدر حیر گامی سے چلتا ہے، اور امور آخرت میں جتنا فکر کرتا ہے اسی قدر اس کے دل پر نیاات مکشف ہوتی ہے، اور ان نیتوں سے اس کے اعمال پاکیزہ ہوتے ہیں، اور فیکیاں بدھتی ہیں۔

تیسری قسم۔ مباحات : کوئی مباح فعل ایسا نہیں ہے جو ایک یا ایک سے زائد نیتوں کا مقمل نہ ہو، اور ان نیتوں کی بنا پر

(۱) مجھے اس روایت کی اصل نہیں ملی۔

(۲) کعب ابن الاہار کا ایک قول اسی مضمون کا نقل کیا گیا ہے، "البتہ" صحیحین میں ابو امامہؓ وغیرہ کی روایتیں اس سے ملتی جلتی ہیں۔

بہترین عمل بننے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو، اور قائل کو اعلیٰ درجات کا مستحق نہ بناتا ہے، کس قدر عظیم خسارے میں ہے وہ شخص جو نیتوں سے غافل رہے، اور مباح افعال اس طرح انجام دیتا رہے جس طرح بہائم انجام دیتے ہیں، بندے کے لیے یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ کسی خیال، فکر، اقدام، حرکت اور لمحے کو حقیر جانے، قیامت کے دن ہر چیز کے بارے میں سوال کیا جائے گا کہ اس نے فلاں کام کیوں کیا، اور اس کام سے اس کا قصد و ارادہ کیا تھا۔ یہ محاسبہ ان مباح امور میں ہو گا جن میں کراہت کا شائبہ بھی نہیں ہوتا۔ اسی لیے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

خَلَّالَهَا حِسَابٌ وَخَرَّامُهَا عِقَابٌ (۱)

اس کے حلال میں حساب ہے اور اس کے حرام میں عذاب ہے۔

حضرت معاذ ابن جبلؓ کی روایت میں ہے کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

إِنَّ الْعَبْدَ لَيُسْأَلُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَنْ كُلِّ شَيْءٍ حَتَّى عَنْ كُحْلِ عَيْنَيْهِ وَعَنْ فَنَاتِ الْوَطَيْنِ قَبَا ضَبْعَيْهِ وَعَنْ لَمْسِهِ ثَوْبَ أَخِيهِ (۲)

قیامت کے روز بندے سے ہر چیز کے بارے میں سوال کیا جائے گا یہاں تک کہ آنکھ کے سرے کے متعلق بھی، اور انگلیوں سے مٹی کریدنے کے بارے میں بھی، اور اپنے بھائی کا کپڑا چھونے کے بارے میں بھی۔

ایک حدیث میں ہے کہ جو شخص اللہ کے لیے خوشبو لگائے گا وہ قیامت کے دن اس حال میں آئے گا کہ اس کی خوشبو محک سے زیادہ عمدہ ہوگی، اور جو شخص غیر اللہ کے لیے خوشبو لگائے گا اس کی یہ خوشبو مزار کی بدبو سے بھی زیادہ کرمہ ہوگی، دیکھئے خوشبو لگانا مباح ہے، لیکن اس میں بھی نیت ضروری ہے، اب اگر یہ کہا جائے کہ خوشبو میں کیا نیت کی جاسکتی ہے، یہ تو نفس کی لذتوں میں سے ایک لذت ہے، آدمی اللہ کے لیے خوشبو کیسے لگائے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جو شخص جمعہ کے دن شگایا کسی اور وقت میں خوشبو لگاتا ہے اس کا مقصد یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ دنیاوی لذات سے راحت پائے، یا اپنے مال کی کثرت پر فخر کا مظاہر کرے تاکہ ہم عصر مرعوب ہوں، یا لوگوں کو دکھانا مقصد ہو تاکہ ان کے دلوں میں اس کی عظمت اور احترام پیدا ہو، اور جہاں کہیں اس کا ذکر ہو لوگ خوشبو کے حوالے سے اسے یاد کریں، یا یہ مقصد ہو سکتا ہے کہ نامحرم اجنبی عورتوں میں مقبول ہو جائے، اگر ان کی طرف دیکھنا جائز سمجھتا ہو، اسی طرح اور بہت سے مقاصد ہو سکتے ہیں، یہ تمام مقاصد خوشبو لگانے کے عمل کو معصیت بنا دیتے ہیں، اور اس طرح وہ خوشبو قیامت کے دن مزار کی بدبو سے زیادہ کرمہ ہوگی، سوائے پہلے مقصد کے، یعنی محض تلذذ پانا اور راحت حاصل کرنا یہ معصیت نہیں ہے، لیکن اس کا حساب بھی ہوگا، اور جس سے حساب کیا جائے گا اسے عذاب دیا جائے گا، اور جو شخص دنیا میں مباحات اختیار کرے گا اسے آخرت میں عذاب نہیں دیا جائے گا لیکن ان مباحات کے بقدر اس کی اخروی نعمتیں کم کر دی جائیں گی، اس سے بڑا نقصان اور کیا ہو سکتا ہے کہ جو چیز فنا ہونے والی ہے وہ تم حاصل کر لو، اور جو باقی رہنے والی ہے اس سے محروم رہ جاؤ، خوشبو لگانے میں اچھی نیتیں یہ ہو سکتی ہیں کہ جمعہ کے دن سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کی نیت کرے، اور مسجد کی تقسیم، اور اللہ تعالیٰ کے گھر کے احرام کی نیت کرے اور یہ سوچے کہ اللہ تعالیٰ کے گھر کی زیارت کرنے والے کو خوشبو لگائے بغیر مسجد میں داخل نہ ہونا چاہیے یا یہ نیت کرے کہ میں خوشبو لگا کر اپنے قریب بیٹھنے والوں کو راحت پہنچانا چاہتا ہوں، یا میں خود اپنے نفس کو بدبو سے محفوظ کرنا چاہتا ہوں، یا میرا مقصد یہ ہے کہ میرے پاس بیٹھنے والے میرے جسم کی بدبو سے اذیت نہ پائیں یا یہ نیت کرے کہ میں لوگوں کو غیبت کے گناہ سے باز رکھنا چاہتا ہوں، کیوں کہ جب وہ میری بدبو سے اذیت پائیں گے تو میری بددلی کریں

کے، اور گنہگار ہوں گے، میں چاہتا ہوں کہ لوگ میرے باعث اللہ کی نافرمانی کے مرتکب نہ ہوں۔ ایک شاعر کہتا ہے۔
 اِذَا تَرَّ خَلَّتْ عَنْ قَوْمٍ وَقَدْ غَرُّوا اَنْ لَا تَفَارِقَهُمْ فَالْتَرَّ اِحْلُوْنَ هُمْ

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ فَيَسُبُّوا اللَّهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ (پ ۷۷۸ آیت ۱۰۸)

اور گالی مت دو ان کو جن کی یہ لوگ خدا کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہیں پھر وہ لوگ براہِ جہل حد سے گزر کر اللہ تعالیٰ کی شان میں گستاخی کریں گے۔

اس آیت کریمہ میں بتلایا گیا ہے کہ شر کا سبب ہونا بھی شر ہے، خوشبو لگائے والے کو چاہیے کہ وہ اپنے دماغ کی نیت کر کے خوشبو لگائے تاکہ ذہانت اور ذکاوت میں زیادتی ہو، دینی مسائل کا سمجھنا سہل ہو اور ان میں آسانی کے ساتھ غور و فکر کر سکے، چنانچہ حضرت امام شافعی ارشاد فرماتے ہیں کہ جس کی خوشبو عمدہ ہوتی ہے اس کی عقل بھی تیز ہوتی ہے، جس شخص پر فکر آخرت غالب ہوتی ہے اور وہ خیر کا طالب ہوتا ہے، یا دنیا سے اعراض کر کے آخرت کی تجارت کرنا چاہتا ہے وہ اس طرح کی نیتوں کے ذریعے نہ صرف یہ کہ گناہوں سے محفوظ رہ سکتا ہے بلکہ اپنے اجر و ثواب میں اضافہ کا سبب بھی بن سکتا ہے لیکن اگر دل پر دنیاوی خواہشات اور لذات کا غلبہ ہوتا ہے تو اس طرح کی نیتوں کا تصور بھی نہیں آتا، اگر کوئی شخص یاد بھی دلاتا ہے تب بھی دل میں خیال نہیں آتا، اور اگر کوئی بھولے سے اس طرح کی نیتیں کر بھی لیتا ہے تو ان کی اہمیت ”خطرات“ سے زیادہ نہیں ہوتی، بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ انہیں نیت کہا ہی نہیں جاسکتا۔ مباح اعمال بے شمار ہیں اور ان میں بہت سی نیتیں ہو سکتی ہیں، ہم نے ایک مباح عمل کی مثال دی ہے، باقی تمام اعمال کو اسی پر قیاس کیا جاسکتا ہے۔

ایک صاحب معرفت بزرگ فرماتے ہیں میرا دل چاہتا ہے کہ میں اپنے تمام اعمال میں ایک نیت کر لیا کروں، یہاں تک کہ کھانے، پینے، پہننے، سونے، قضاے حاجت کرنے اور دوسرے تمام اعمال میں میری ایک نیت ہو، اور وہ نیت ”تقرب الی اللہ کی ہو سکتی ہے“ یہ تمام اعمال بدن کی حفاظت کرتے ہیں، اور بدن کی سلامتی سے دل تمام تفکرات سے خالی رہتا ہے، اور اللہ تعالیٰ کے ذکر و فکر کے لیے فارغ رہتا ہے، مثال کے طور پر اگر کوئی شخص کھانے سے عبادت پر قوت حاصل کرنے کی نیت کرے، اور صحبت سے یہ نیت کرے کہ دین صحیح رہے، اور پھوی کا دل خوش ہو، اور اولاد صالح پیدا ہو تاکہ میرے بعد اللہ کی عبادت کرے، اور اس سے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں اضافہ ہو، اگر کسی شخص کی کھانے یا جمع کرنے سے یہ نیت ہو تو اس کے یہ دونوں عمل اطاعت قرار دیئے جائیں گے، نفسانی حظوظ میں کھانا اور جماع کرنا ہی سرفہرست ہیں اور جس شخص کے دل پر فکر آخرت کا غلبہ ہو اس کے لیے ان دونوں میں خیر کی نیت کرنا مشکل نہیں ہے، اسی طرح اگر کسی کا مال ضائع ہو جائے وہ بھی یہ نیت کر سکتا ہے کہ یہ مال اللہ کی راہ میں ہے اگر یہ سنے کہ فلاں شخص میری قیمت کرتا ہے تو اس کا اسوہ نہ اپنائے بلکہ دل میں خوش ہو، اور یہ کہے کہ وہ شخص میرا محسن ہے کہ اپنی نیکیاں میرے نامہ اعمال میں جمع کر رہا ہے۔ ایک حدیث میں ہے۔

اِنَّ الْعَبْدَ لَيَحْسَبُ فَتَبْطُلُ اَعْمَالُهُ لِدُخُولِ الْاَقَةِ فِيْهَا حَتَّى يَسْتَوْحِبَ النَّارَ ثُمَّ يُنْشَرُ لَهُ مِنَ الْاَعْمَالِ الصَّالِحَةِ مَا يَسْتَوْحِبُ بِهِنَّ الْجَنَّةَ فَيَسْتَعِجِبُ وَيَقُوْلُ يَا رَبِّ هَذِهِ اَعْمَالٌ مَا عَمِلْتُهَا قَطُّ فَيُقَالُ هَذِهِ اَعْمَالُ الَّذِينَ اِعْتَابُوكَ وَآثَبُوكَ وَظَلَمُوْكَ (ابو منصور دہلی۔ شیخ ابن سعد البلوئی)

بندہ کا محاسبہ کیا جائے گا اور اس کے اعمال کسی آفت کے باعث باطل قرار دے دیئے جائیں گے، یہاں تک کہ اس کے لیے دوزخ واجب کر دی جائے گی، پھر اس کے لیے ان اعمال کا دفتر کھولا جائے گا جس سے وہ

جنت کا مستحق ٹھہرے گا، اس پر وہ تعجب کرے گا، اور کہے گا یا اللہ! یہ اعمال میں نے بالکل نہیں کئے، اس سے کہا جائے گا یہ ان لوگوں کے اعمال ہیں جنہوں نے تیری غیبت کی، تجھے تکلیف پہنچائی، اور تیرے اوپر ظلم کیا۔ ایک حدیث میں ہے کہ قیامت کے دن بندہ پہاڑوں کے برابر نیکیاں لے کر آئے گا، اگر وہ نیکیاں اس کے لیے خالص ہوں تو جنت میں داخل ہو جائے، لیکن وہ اس حال میں آئے گا کہ اس نے اس پر ظلم کیا ہے، اسے برا کہا ہے، اس شخص کو گالیاں دی ہیں، ان تمام لوگوں کو اس کی نیکیاں عوض میں دی جائیں گی، یہاں تک کہ اس کے پاس کوئی نیکی باقی نہیں رہے گی، فرشتے کہیں گے اس کے نیکیاں ختم ہو چکی ہیں، اور مطالبہ کرنے والے بہت ہیں، اللہ تعالیٰ فرمائے گا ان کے گناہ اس شخص پر ڈال دو، اور اس کے لیے دوزخ کے نام ایک رقبہ لکھ دو۔ (۱) خلاصہ کلام یہ ہے کہ ہمیں اپنے کسی بھی فعل کو حقیر نہ سمجھنا چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ تم کسی حرکت کو معمولی تصور کرو، اور اس کا شر زیادہ ہو، اور تم قیامت کے دن اس کی باز پرس سے محفوظ نہ رہ سکو، اللہ تعالیٰ ہمارے ہر عمل کا نگران، اور ہمارے ہر راز پر مطلع ہے۔ قرآن کریم میں ہے:

مَا يَلْفُظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْنَا رَقِيبٌ عَتِيدٌ (پ ۲۴۱ آیت ۱۸)

وہ کوئی لفظ زبان سے نہیں نکالنے یا نام کر اس کے پاس ہی ایک ناک لگانے والا تیار ہے۔

ایک بزرگ کہتے ہیں کہ میں نے ایک خط لکھا اور یہ ارادہ کیا کہ اس پر دوسری کی دیوار سے مٹی لے کر ڈال دوں، تاکہ روشنائی خشک ہو جائے، مگر میرا دل نہیں مانا، لیکن پھر یہ خیال آیا کہ مٹی ایک حقیر شے ہے، اسے لینے میں کیا حرج ہے، چنانچہ میں نے مٹی لی، اور خط کے اوپر ڈال دی، اسی وقت پردہ غیب سے یہ آواز آئی، جو شخص مٹی کو حقیر سمجھتا ہے وہ قیامت کے دن اس کا عذاب پائے گا، ایک شخص نے حضرت سفیان ثوری کے ساتھ نماز پڑھی، اس نے دیکھا کہ آپ الٹا کپڑا پہنے ہوئے ہیں، اس نے آپ کی توجہ اس طرف مبذول کرائی، آپ نے سیدھا کرنے کے لیے ہاتھ بدھایا اور ایک دم روک لیا، اس شخص نے پوچھا آپ کپڑا سیدھا کرتے کرتے کیوں رک گئے، آپ نے فرمایا میں نے یہ کپڑے اللہ تعالیٰ کے لیے پہنے ہیں، پھر میں غیر کے لیے انھیں کیوں سیدھا کروں، حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ قیامت کے دن ایک شخص دوسری شخص کا دامن پکڑ کر کہے گا کہ میرے اور تیرے درمیان اللہ ہے وہ کہے گا بخدا میں تجھ سے واقف نہیں ہوں، پہلا شخص کے گا تو مجھے کیسے نہیں جانتا تو نے میری دیوار سے ایک اینٹ لی تھی، اور میرے کپڑے میں سے ایک دھکا کھینچا تھا یہ اور اس طرح کی روایات اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والوں کے دل ٹکڑے ٹکڑے کر دیتی ہیں اگر تم حوصلہ مند اور محض والے ہو، اور ان لوگوں میں سے نہیں ہو جو فریب کھاتے ہیں تو اپنے احوال پر نظر رکھو، اور اپنے نفس کا باریک بینی سے احتساب کرتے رہو، اس سے پہلے کہ باریکی کے ساتھ تمہارا مواخذہ ہو اور تمہارے احوال کی چھان بین کی جائے، ہمیں اپنی ہر حرکت اور ہر سکون سے پہلے یہ غور کرنا چاہیے کہ تم متحرک کیوں ہونا چاہتے ہو تمہاری نیت کیا ہے اور ہمیں اس حرکت سے دنیا میں کیا نفع پہنچ سکتا ہے اور آخرت میں کیا نقصان ہو سکتا ہے، اور اگر غور و فکر کے بعد تم یہ نتیجہ اخذ کرو کہ اس حرکت سے تمہارا مقصد صرف دین ہے تب تم اپنے ارادے کے مطابق عمل کرو، ورنہ وہیں ٹھہر جاؤ، آگے بڑھنے کی کوشش مت کرو۔ پھر کہنے میں بھی ہمیں اپنے دل کا جائزہ لینا چاہیے کہ فعل سے باز رہنے میں اس کی نیت کیا ہے؟ ترک عمل بھی عمل ہے اور اس میں بھی نیت سمجھ ضروری ہے، ایسا نہ ہو کہ تمہارا دل کسی ایسے مخفی امر کی بنا پر ترک عمل کر رہا ہو جو ہوائے نفس ہو، اور تم اس کے کید پر مطلع نہ ہو سکو غاہری ہاتھوں سے فریب مت کھاؤ، باطن کا تفتحص کرتے رہو تاکہ شیطان تم پر غلبہ نہ پاسکے حضرت ذکریا علیہ السلام سے مروی ہے کہ وہ مٹی سے ایک دیوار تعمیر کر رہے تھے کچھ لوگوں نے آپ کو اجرت پر مامور کیا تھا ان لوگوں نے آپ کی خدمت میں روٹیاں پیش کیں، آپ کا طریقہ یہ تھا کہ صرف اپنی محنت کی روٹی کھایا کرتے تھے چنانچہ آپ کھانا

کھانے بیٹھ گئے، کچھ لوگ آئے آپ نے انہیں کھانے پر مدعو نہیں کیا، یہاں تک کہ کھانے سے فارغ ہو گئے، لوگوں کو اس پر بڑی حیرت ہوئی کیوں کہ آپ کا زہد اور سقاوت مشہور تھی انہوں نے سوچا کہ کھانے کی دعوت دینے میں کوئی مضائقہ نہ تھا یہ ایک طرح کی تواضع ہے حضرت زکریا علیہ السلام نے فرمایا کہ میں اجرت پر کام کر رہا ہوں یہ لوگ مجھے اس لیے روٹی کھلاتے ہیں کہ مجھ میں توانائی پیدا ہو، اور میں ان کی مزدوری صحیح طور پر کرسکوں، اگر تم میرے ساتھ کھانا کھاتے تو یہ کھانا نہ تمہارے لئے کافی ہوتا اور نہ میرے لیے اور نتیجہ یہ ہوتا کہ میں ان لوگوں کا کام جنہوں نے مجھے اجرت میں روٹی دی ہے صحیح طور پر انجام نہ دے پاتا۔

صاحب بصیرت انسان باطن میں اللہ کے نور سے اسی طرح دیکھتا ہے، دیکھنے اس واقعہ میں غور کیجئے، اگر کام میں سستی واقع ہوتی تو فرض میں نقصان ہوتا، اور کھانے کی تواضع نہ کرنے میں صرف نفل اور استہباب کا نقصان ہے، اور فرائض کی موجودگی میں نوافل کی کوئی اہمیت نہیں ہے ایک شخص کہتے ہیں کہ میں حضرت سفیان ثوری کی خدمت میں حاضر ہوا وہ اس وقت کھانا تناول فرما رہے تھے، آپ نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی، یہاں تک کہ آپ انگلیاں چاٹ کر کھانے سے فارغ ہو گئے اس کے بعد فرمایا اگر میں نے یہ کھانا قرض نہ لیا ہوتا تو میری یہ خواہش ہوتی کہ تم بھی میرے ساتھ شریک ہوتے حضرت سفیان ثوری ارشاد فرماتے ہیں کہ جو شخص کسی کو کھانے کی دعوت دے اور اس کا دل یہ چاہتا ہو کہ وہ کھانے کی دعوت قبول نہ کرے، اب اگر اس نے دعوت قبول کر لی تو دعوت دینے والے پر دو گناہ ہوں گے، اور اگر کھانا نہیں کھایا تو ایک گناہ ہوگا، دو گناہوں میں سے ایک نفاق ہے، اور دوسرا یہ کہ اپنے بھائی کو ایسے فعل کی ترغیب دیتا ہے کہ اگر وہ اس کی حقیقت پر مطلع ہو جائے تو برا محسوس کرے، بندے کو چاہیے کہ وہ اسی طرح تمام اعمال میں اپنی نیت کا جائزہ لیتا رہے، اس کا ہر اقدام ہر نیت کے ساتھ ہونا چاہیے، اگر نیت اس وقت نہ ہو سکے تو توقف کرے، اس لیے کہ نیت اپنے اختیار میں نہیں ہوتی

نیت غیر اختیاری ہے : بعض اوقات جاہل انسان نیت کے سلسلے میں ہماری معروضات، اور سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد مبارک "إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ" کو سن کر اپنی تدریس، تجارت یا کھانے کے وقت دل میں کہتا ہے کہ میں اللہ کے لیے کھانے کی نیت کرتا ہوں، یا اللہ کے لیے تدریس کی یا تجارت کی نیت کرتا ہوں۔ یہ کم عقل انسان سمجھتا ہے کہ نیت ہو گئی، اب مجھے اس کا ثواب ملے گا یہ سراسر حماقت ہے، اسے معلوم ہونا چاہیے کہ یہ نیت حدیث ہے یا زہنی بات ہے یا ایک خیال ہے یا ایک فکر سے دوسرے فکر کی طرف انتقال ہے، نیت کا ان امور سے کوئی تعلق نہیں ہے نیت نفس کے میلان اور رغبت کا نام ہے یعنی نفس کا ایسی چیز کی طرف مائل ہونا جس میں اس کی کوئی غرض ہو، خواہ اس وقت یا بعد میں اگر یہ میلان نہیں ہے تو صرف ارادے یا نیت سے اس کا حاصل کرنا ناممکن ہے اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ نیت یا ارادے سے رغبت حاصل کی جاسکتی ہے تو پھر یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ ایک شخص جس کا بیٹ بھرا ہوا ہو یہ کہے کہ میں کھانے کی نیت کرتا ہوں یا کوئی بچہ فکر شخص یہ کہے کہ میں فلاں شخص پر عاشق ہونے اور اسے اپنے دل میں بڑا اور محبوب سمجھنے کی نیت کرتا ہوں ظاہر ہے اس طرح کہنے سے نہ دل میں کھانے کی رغبت پیدا ہوگی، اور نہ کسی کا عشق دل میں کسی چیز کی خواہش اور رغبت پیدا کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے اس کے اسباب حاصل کئے جائیں، پھر یہ اسباب بعض اوقات اختیاری ہوتے ہیں اور بعض اوقات قدرت و اختیار سے خارج ہوتے ہیں، اصل میں انسان کا نفس کسی فعل پر اسی وقت آمادہ ہوتا ہے جب وہ اس کی غرض کے موافق ہوتا ہے، اور جب تک اسے یہ یقین نہیں ہو جاتا کہ فلاں عمل سے میری غرض پوری ہو سکتی ہے، اور یہ بات اختیاری نہیں ہے پھر یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ دل ہر وقت کسی چیز کی طرف مائل ہونے کے لیے تیار رہے کیوں کہ میلان کا تعلق فراغت سے ہو سکتا ہے وہ اس غرض سے زیادہ قوی غرض کی طرف مائل ہو پھر رغبت دلانے والے اور رغبت سے منحرف کرنے والے اسباب کا معاملہ ہے جب اسباب مجتہع ہوتے ہیں تب کسی چیز کی رغبت دل میں پیدا ہوتی ہے اور اسباب ہر شخص کے احوال کے اعتبار سے مختلف ہوتے ہیں مثلاً ایک شخص پر نکاح کی شوق غالب ہو لیکن نکاح سے اس کی غرض اولاد نہ ہو تو یہ شخص جماع کے وقت اولاد کی نیت ہی نہیں کر سکتا بلکہ

اس کی محبت قصائے شہوت کی نیت سے ہوگی، اس لیے کہ نیت کا مدار غرض پر ہے اور یہاں غرض صرف قصائے شہوت ہے ظاہر ہے اگر کوئی شخص زبان سے ولد کی نیت کرے تو کیا اس کی یہ نیت صحیح ہوگی، اسی طرح اگر کسی شخص کے دل میں نکاح کے وقت اجماع سنت کا خیال نہیں اور نہ وہ اس کا اعتقاد رکھتا ہے کہ نکاح میں اجماع سنت کی نیت کرنے سے ثواب ملتا ہے اب اگر اس نے زبان سے یہ کہہ لیا کہ میں اجماع سنت کی نیت کرتا ہوں تو کیا اس کی یہ نیت صحیح ہوگی، یہ کہنا صرف گفتگو ہے اسے کسی بھی حال میں نیت نہیں کہا جاسکتا۔

نکاح میں اجماع سنت کی نیت کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ پہلے شریعت الہی پر اپنا ایمان پختہ کرے پھر دل میں یہ یقین پیدا کرنے کہ جو شخص امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم میں بخیر کا سبب بنتا ہے اسے زبردست ثواب ملتا ہے پھر دل سے وہ تمام خیالات دور کرے جو اولاد سے نفرت پر دلالت کرتے ہیں مثلاً اولاد کو مشقت اور پریشانی کا سبب جاننا اور ان کی پرورش میں پیش آنے والی دشواریوں سے گھبرانا وغیرہ اگر ایسا کرے گا تو یہ ممکن ہے کہ دل میں اولاد کی خواہش پیدا ہو، اور اولاد کی پیدائش کو باعث ثواب سمجھے اور اس سے دل میں نکاح کی رغبت پیدا ہو اور وہ رغبت الفاظ بن کر زبان پر آئے ایسا شخص اگر یہ کہے کہ میں نکاح سے اولاد صالح کی نیت کرتا ہوں تو یہ کہا جائے گا کہ اس کی نیت صحیح ہے اور اسے اس نیت پر ثواب ملے گا لیکن اگر کسی شخص نے یہ تمام اسباب مہیا نہیں کئے اور وہ شخص زبان سے یہ کہتا ہے کہ میں اولاد صالح کی نیت کرتا ہوں تو کہا جائے گا کہ یہ اس شخص کی بکواس ہے کیوں کہ اس کے دل میں اس غرض صحیح کی طرف میلان نہیں ہے بزرگان سلف نیت صحیح کے موجود نہ ہونے کے باعث بعض اوقات نیک عمل سے گریز کرتے تھے، اور صاف کہہ دیا کرتے تھے کہ کیوں کہ ہماری اس میں کوئی نیت نہیں ہے اس لیے ہم یہ عمل نہیں کر سکتے، حضرت ابن سیرین نے حسن بصریؒ کے جنازے کی نماز اس لیے نہیں پڑھی کہ اس وقت ان کی نیت حاضر نہیں تھی، ایک بزرگ نے اپنی اہلیہ سے کنگھا طلب کیا، اہلیہ نے عرض کیا کہ آئینہ بھی لاؤں، آپ کچھ دیر خاموش رہے، پھر فرمایا: ہاں! لوگوں نے پوچھا آپ نے ہاں کہنے میں اتنی دیر کیوں کی، فرمایا پہلے آئینے کے سلسلے میں میری نیت ماضی نہیں تھی، اس لیے میں نے کچھ دیر سکوت اختیار کیا، اور جب دل میں نیت حاضر ہو گئی تب میں نے اس سے آئینہ لانے کی لیے کہا، حماد ابن سلیمان کو فہ کے ایک ممتاز عالم تھے جب ان کا انتقال ہوا تو لوگوں نے حضرت سفیان ثوریؒ کی خدمت میں عرض کیا کہ کیا آپ ان کے جنازے میں شریک نہیں ہوں گے فرمایا اگر میری نیت ہوتی تو میں ضرور جاتا۔ اکابرین سلف سے اگر کسی عمل خیر کی درخواست کی جاتی تو فرماتے اگر اللہ تعالیٰ ہمیں نیت عطا فرمائے گا تو ہم ضرور یہ عمل کریں گے حضرت طاؤسؒ نیت کے بغیر حدیث بیان نہ فرماتے اگر کوئی شاگرد حدیث سنانے کی درخواست بھی کرتا تو خاموشی اختیار فرماتے، اور جب نیت ہوتی تو کہے بغیر حدیث بیان کرنا شروع کر دیتے، لوگوں نے عرض کیا اس کی کیا وجہ ہے جب ہم درخواست کرتے ہیں تو آپ حدیث بیان نہیں فرماتے، اور جب درخواست نہیں کرتے تو بیان فرماتے ہیں، فرمایا کیا تم لوگ یہ چاہتے ہو کہ میں بلا نیت حدیث بیان کر دیا کروں جب میری نیت حاضر ہوتی ہے تو میں حدیث بیان کرتا ہوں، روایت ہے کہ جب داؤد ابن الجری نے کتاب العقل تصنیف کی تو حضرت امام احمد ابن حنبلؒ آپ کے پاس تشریف لائے اور کتاب الجہد طلب کی، اور ایک صفحہ پر نظر ڈال کر واپس کر دی، ابن الجری نے عرض کیا کہ آپ نے کتاب لے کر واپس کیوں کر دی، فرمایا اس میں ضعیف سند ہیں، حضرت داؤد نے فرمایا میں نے اس کی بنیاد استاد پر نہیں رکھی ہے، آپ امتحان کی غرض سے ملاحظہ کریں، اور تنقیدی نظر ڈالیں میں نے عملی نقطہ نظر سے کتاب لکھی ہے، اور میں نے اس سے فائدہ اٹھایا ہے، امام احمدؒ نے فرمایا لاؤ مجھے دوبارہ دو، میں بھی اسی نظر سے اس کا مطالعہ کروں گا جس نظر سے تم نے مطالعہ کیا ہے، چنانچہ آپ نے کتاب لی، اور مدت تک اسے اپنے پاس رکھ کر استفادہ کیا اور فرمایا اللہ تعالیٰ ہمیں جزائے خیر دے میں نے اس سے بھرپور فائدہ اٹھایا ہے، کسی نے حضرت طاؤس سے دعا کی درخواست کی فرمایا اگر نیت حاضر ہوئی تو میں دعا کروں گا ایک بزرگ نے فرمایا کہ میں فلاں شخص کی عیادت کے لیے ایک ماہ سے نیت حاضر کرنے کی کوشش کر رہا ہوں میس ابن کثیر کہتے ہیں کہ میں میمون ابن مران کے ہمراہ چلا یہاں تک کہ ہم

لوگ ان کے گھر کے دروازے پر پہنچ گئے، جب وہ گھر میں داخل ہوئے تو میں واپس ہونے لگا، ان کے صاحبزادے نے عرض کیا کہ کیا آپ انہیں رات کا کھانا نہیں کھلائیں گے؟ فرمایا میری نیت نہیں ہے۔

اصل میں نیت نظر کے تابع ہوتی ہے جب نظر بدل جاتی ہے تو نیت بھی بدل جاتی ہے، اسی لیے اکابرین اسلام نیت کے بغیر کوئی کام نہیں کرتے تھے، وہ لوگ جانتے تھے کہ نیت عمل کی روح ہے، اور نیت صادقہ کے بغیر عمل ریا اور تصنع ہے ایسا عمل باری تعالیٰ کا سبب بنتا ہے، تقرب کا باعث نہیں بنتا، وہ یہ بھی جانتے تھے کہ نیت محض زبان سے نیت (میں نے نیت کی) کہنے کا نام نہیں ہے، بلکہ یہ قلب کی آمادگی کا نام ہے جو غیبی فتوح کے قائم مقام ہے، اور یہ فتوح بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے بعض اوقات عطا کی جاتی ہیں اور بعض اوقات عطائیں کی جاتیں، البتہ جس شخص پر دین غالب ہوتا ہے اسے اکثر اوقات فتوح غیبی میسر رہتی ہیں یعنی خیر کے لیے ان کی نیت حاضر رہتی ہے، کیوں کہ ایسے شخص کا دل بحیثیت مجموعی خیر کی طرف مائل رہتا ہے اس لیے جب بھی کسی عمل خیر کا موقع ہوتا ہے خود بخود دل میں اس کی تحریک اور داعیہ پیدا ہوتا ہے، اور جس شخص پر دنیا کا غلبہ ہوتا ہے وہ اپنی نیت صحیح نہیں کہتا، مباح اعمال میں تو خیر کیا نیت کر سکتا ہے فرائض میں بھی نہیں کہتا، اگر کسی شخص میں یہ مرض ہے تو اس کا علاج یہ ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ دوزخ کے عذاب کو یاد کرے، اور نفس کو اس کی ہولناکیوں سے ڈرائے، اور جنت کی نعمتوں کا تصور کرتا رہے، اور دل کو ان کے پالنے کی ترغیب دیتا رہے، اس صورت میں یہ ممکن ہے کہ دل میں خیر کے لیے آمادگی پیدا ہو جائے، دل میں عمل خیر کے لیے جس قدر رغبت اور میلان ہو گا اسی قدر اس کا ثواب ہو گا، اللہ تعالیٰ کی عبادت محض اس کی جلالت و عظمت کے لیے کرنے کی نیت دنیا میں رغبت رکھنے والوں کو میسر نہیں ہوتی، یہ نیت کا اعلیٰ اور کیا باب درجہ ہے روئے زمین پر ایسے لوگ بہت کم ہیں جو اللہ کی جلالت شان اور عظمت و برتری کے لیے اس کی اطاعت کریں۔

طاعات میں لوگوں کی مختلف نیتیں : طاعات میں لوگوں کی نیتیں مختلف ہوتی ہیں بعض لوگ کسی خوف کی بنا پر عمل کرتے ہیں، یعنی ان کے ذہن میں دوزخ کے عذاب کا تصور ہوتا ہے، اور بعض لوگ جنت کی رغبت سے عمل کرتے ہیں یہ نیت پہلے درجہ کی نیت کے مقابلے میں کم تر ہے، پہلا درجہ تو یہی ہے کہ اللہ کی عبادت محض اس کی جلالت و عظمت کے لیے کی جائے، خوف و رجاء سے اللہ کی عبادت کرنے کا درجہ کم ہے، لیکن اس کا شمار بھی صحیح نیت کی قسموں میں ہوتا ہے، کیوں کہ اس میں ان چیزوں کا خوف یا رغبت ہے جن کا تعلق آخرت سے ہے اور ان میں سے بعض چیزیں وہ ہیں جن سے دنیا میں بھی محبت ہوتی ہے جیسے حکم اور شرم گاہ کی شہوتیں آدمی دنیا میں بھی ان ہی شہوتوں کی تکمیل کے درپے رہتا ہے، اور جنت کا طالب بھی اسی لیے ہے کہ آخرت میں یہ دونوں شہوتیں جنت حاصل کرنے ہی سے پوری ہوں گی، جیسے برآمدور، صرف مزدوری کی خاطر پینہ بہاتا ہے، اسی لیے جنت والوں کو بے وقوف کہا گیا ہے، جیسا کہ ایک حدیث میں ہے اکثر اہل جنت بے وقوف ہوں گے، اس کی وجہ یہی ہے کہ صرف بے وقوف ہی جنت کی نعمتوں کو آخرت کی دوسری لافانوال سعادتوں پر ترجیح دے سکتے ہیں، ورنہ اصحاب بصیرت کی عبادت کا محور اللہ تعالیٰ کا ذکر و فکر ہوتا ہے، وہ اسی کے جلال و جمال میں مستغرق رہتے ہیں، اور تمام اعمال سے اسی محبت اور استغراق کی تاکید ہوتی ہے، ان کا درجہ اس سے کہیں بلند تر ہے کہ وہ جنت میں نکاح اور طعام کی لذات کی طرف ملتفت ہوں، وہ دنیا میں حصول جنت کے لیے عبادت نہیں کرتے، بلکہ یہ وہ لوگ ہیں جن کے بارے میں قرآن کریم کا ارشاد ہے۔

يَذْعُرُونَ زَيْتَهُم بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْلُونَ وَجْهَهُ (پ ۱۵۸ آیت ۲۸)

جو صبح و شام اپنے رب کی عبادت محض اس کی رضا جوئی کے لیے کرتے ہیں۔

لوگوں کو ان کی نیت کے بقدر ثواب ملتا ہے، اس لیے جن لوگوں کی نیت رضائے الہی ہے وہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے دیدار سے متعجب ہوں گے، اور ان لوگوں کا مذاق اڑائیں گے جو حور و غلمان کی دید سے لطف اندوز ہوں گے، یہ ایسا ہی ہے جیسے حوروں کو دیکھنے والے ان لوگوں پر ہنستے ہیں جو مٹی سے بنی ہوئی تصویروں سے لطف اندوز ہوتے ہیں، بلکہ حوروں کو دیکھنے والے زیادہ مذاق کا

نشانہ نہیں گئے کیوں کہ اللہ تعالیٰ کے جمال اور حوروں کے جمال میں اس سے کہیں زیادہ فرق ہے جو حوروں کے جمال اور مٹی سے بنی ہوئی تصویروں کے جمال میں ہے بلکہ نفوس بہیہ کا قضائے شہوت کے لیے حوروں کی طرف متنت ہوتا اور اللہ تعالیٰ کی وجہ کریم کے جمال سے اعراض کرنا ایسا ہے جیسے خضاء اپنے جوڑے سے الٹس رکھتا ہے اور اس کی طرف راغب ہوتا ہے اور عورتوں کی طرف سے اعراض کرنا ہے اکثر قلوب اللہ تعالیٰ کے جمال کے مشاہدے سے اسی طرح محروم ہیں جیسے خضاء عورتوں کے جمال کے اور اک سے محروم رہتا ہے اگر وہ عقل و شعور رکھتا اور اس کے سامنے عورتوں کا ذکر کیا جاتا تو وہ ان لوگوں پر ہنستا جو ان کی طرف متنت ہوتے ہیں کہ حقیقت وہ ہے جو قرآن کریم نے بیان فرمائی ہے۔

كُلُّ حَزْبٍ لِّبِمَا لَدَيْهِمْ فَرَحُونَا (پ ۱۸ آیت ۵۵) ہر گروہ کے پاس جو دین ہے وہ اسی سے خوش ہے۔

اور اسی لیے انھیں پیدا بھی کیا گیا ہے، جیسا کہ فرمایا: ”وَلِيْلٰٓئِكَ خَلَقْنٰهُمْ“ (اور اسی لیے انھیں پیدا کیا ہے) اس طرح لوگوں میں ہمیشہ تفاوت رہے گا اور یہ تفاوت اخروی زندگی میں بھی برقرار رہے گا روایت ہے کہ احمد ابن حنبلہ نے اللہ تعالیٰ کو خواب میں دیکھا اللہ تعالیٰ نے ان سے فرمایا کہ تمام لوگ مجھ سے جنت مانگتے ہیں سوائے ابو زید کے وہ میرا طالب ہے ابو زید نے اللہ تعالیٰ کو خواب میں دیکھا اور عرض کیا یا اللہ! آپ تک پہنچنے کا راستہ کیا ہے؟ فرمایا اپنے لٹس کو ترک کر دو اور میرے پاس آ جاؤ شہیل کو ان کی وفات کے بعد خواب میں دیکھا گیا اور ان سے پوچھا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟ فرمایا اللہ تعالیٰ نے میرے دعووں پر دلیل طلب نہیں فرمائی البتہ صرف ایک دعویٰ پر دلیل کا مطالبہ فرمایا میں نے ایک روز کہہ دیا تھا کہ جنت کے خسارے سے بڑھ کر کوئی خسارہ نہیں ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا میری ملاقات کے خسارے سے بڑھ کر کوئی خسارہ نہیں۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ یہ بات مختلف درجات کی ہیں جس شخص کے دل پر ان میں سے ایک غالب ہو جاتی ہے وہ دوسری کی طرف آسانی سے التفات نہیں کرتا۔ ان حقائق و مخالف سے واقف ہونے کے بعد کچھ ایسے اعمال و افعال رونما ہوتے ہیں کہ فقہائے ظاہر انھیں حلیم نہیں کہتے ہم یہ کہتے ہیں کہ جس شخص کی نیت امر مباح میں موجود ہے امر مستحب میں نہیں ہے تو اس کے لیے مباح بہتر ہے وہی اس کے حق میں مستحب بھی ہے خود مستحب اس کے لیے نیت نہ ہونے کے باعث نقصان کا باعث ہوگا کیوں کہ اعمال کا دائرہ دریافت پر ہے یہ ایسا ہی ہے جیسے اللہ کی رو سے معاف کرنا انتقام لینے سے افضل ہے لیکن کبھی ایسا ہوتا ہے کہ انتقام لینے میں نیت حاضر ہوتی ہے معاف کرنے میں نہیں ہوتی اس صورت میں انتقام لینا افضل ہوگا اسی طرح اگر کسی مستحق کی نیت کھانے پینے اور نفس کو آرام دینے کے لیے سوئے اور اس طریقہ سے مستقبل میں عبادت کے لیے مستعد ہونے میں ہو فی الوقت روزے نماز کے لیے دل میں نیت کا استحضار نہ ہو یا رہا ہو تو اس کے لیے کھانا اور سونا افضل ہے اسی طرح اگر کوئی شخص مسلسل عبادت کرنے سے اکتا جائے طبعی نشاط باقی نہ رہے اور رغبت ضعیف پڑ جائے گا اور بھرپور رغبت کے ساتھ عبادت میں مصروف رہ سکے گا تو اس کے لیے کھیل میں مشغول ہونا نماز سے افضل ہے حضرت ابوالدرداء فرماتے ہیں میں اپنے نفس کو تھوڑے سے کھیل سے راحت دیتا ہوں اس سے مجھے حق پر بڑی مدد ملتی ہے حضرت علی کریم اللہ وجہ فرماتے ہیں کہ اپنے قلوب کو راحت دو اگر انھیں مجبور کرو گے تو وہ اندھے ہو جائیں گے۔

یہ وہ وقتی امور ہیں جن کا اور اک صرف کبار علماء کر سکتے ہیں معمولی علم رکھنے والے لوگ ان سے بہت دور ہیں بعض ماہر اطباء بخار زدہ کا علاج گوشت سے کرتے ہیں حالانکہ گوشت گرم ہوتا ہے طب سے ناواقف یا کم جاننے والے لوگ اسے حیرت انگیز قرار دیتے ہیں حالانکہ طیب کا مقصد گوشت کھلانے سے یہ ہوتا ہے کہ اس کی اصل قوت بحال ہو جائے تاکہ اس میں ضد سے علاج کرنے کی طاقت پیدا ہو جائے اسی طرح طریق کا ماہر کھلاڑی کبھی جان بوجھ کر اپنے رخ اور گھوڑے کو پٹا دیتا ہے اور مقصد یہ ہوتا ہے کہ کسی چال سے اپنے حریف کو شکست دے دے مگر جس شخص کو اس کھیل سے واقفیت نہیں ہوتی اور وہ کھلاڑیوں کے بعید ترین منصوبوں پر نظر نہیں رکھ سکتا وہ ماہر کھلاڑی کی اس حرکت کو حیرت سے دیکھتا ہے اور اس پر ہنستا ہے اسی طرح تجربہ کار سپاہی کبھی اپنے حریف سے دور بھاگ جاتا ہے بظاہر اس کی یہ حرکت بزدلی پر محمول کی جاتی ہے لیکن اصل میں اس کا

مقصد قرار ہے یہ ہوتا ہے کہ وہ حریف کو دم لینے کا موقع دے اور جب وہ ملے ہو جائے تو اس پر ایک دم حملہ آور ہو، راہ سلوک کے مسافروں کا بھی یہی حال ہے، یہ لوگ بھی شیطان سے برسبیل کا ہیں، اس لیے جنگی لطائف انیل سے کام لے سکتے ہیں، جو شخص صاحب بصیرت ہوتا ہے وہ لطیف تدبیروں سے گریز نہیں کرتا، علماء ان قبول کو کج سے دیکھتے ہیں، اور انھیں شریعت کے متنافی تصور کرتے ہیں مرید کے لیے یہ مناسب نہیں کہ اگر وہ اپنے شیخ کا کئی حیرت انگیز عمل دیکھے تو اس کا انکار کر بیٹھے اور نہ شاگرد کو استاذ کے کسی فعل پر نکتہ چینی کا حق ہے، بلکہ اسے اپنی بصیرت کی مدد سے توقف کرنا چاہیے اور جو احوال مشکف نہ ہوں انھیں صاحب احوال کے سپرد کر دینا چاہیے یہاں تک کہ وہ خود بھی ان کا اہل بن جائے اور ان کے مرتبے تک پہنچ کر اس پر بھی یہ احوال طاری ہو سکیں اللہ ہی حسن توفیق دیتا والا ہے۔

دوسرا باب

اخلاص فضائل، حقیقت، درجات

اخلاص کے فضائل : خداوند قدس کا ارشاد ہے۔

وَمَا أَمِرُوا إِلَّا لِيَقْبُلُوا إِلَهُهُمُ الْغُلُوبِ لِيَكُونَ لَهُمُ الدِّينُ (پ ۳۰ ر ۲۳ آیت ۵)

حالانکہ ان لوگوں کو یہی حکم ہوا تھا کہ اللہ کی اس طرح عبادت کریں کہ عبادت اسی کے لیے خاص رہیں۔

إِلَهُ الْغُلُوبِ الْغُلُوبِ الْغُلُوبِ (پ ۳۰ ر ۱۵ آیت ۳) یاد رکھو عبادت خالص اللہ ہی کے لیے ہے۔

إِلَهُ الْغُلُوبِ تَابُوا وَأَصْلَحُوا وَاعْتَصِمُوا بِاللَّهِ وَأَخْلَصُوا دِينَهُمْ لِلَّهِ (پ ۱۸ ر ۵ آیت ۳۶) لیکن جو لوگ توبہ کر لیں، اور اصلاح کر لیں، اور اللہ تعالیٰ پر وثوق رکھیں، اور اپنے دین کو خالص اللہ ہی کے لیے کیا کریں۔

فَمَنْ كَانَ يَرْجُوا لِقَاءَ رَبِّهِ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهِ أَحَدًا (پ ۱۸ ر ۳ آیت ۱۰)

سو جو شخص اپنے رب سے ملنے کی آرزو رکھے تو نیک کام کرتا رہے اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک مت کرے۔

یہ آیت ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی جو اللہ تعالیٰ کے لیے عمل کرتے ہیں اور اس پر لوگوں کی تعریف کے خواہش مند رہتے ہیں۔ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

ثَلَاثٌ لَا يَغْلُ عَلَىٰ هُنَّ قَلْبُ رَجُلٍ مُّسْلِمٍ إِخْلَاصُ الْعَمَلِ لِلَّهِ وَالنَّصِيحَةُ لِلْمَوْلَاةِ وَلِزُومُ الْجَمَاعَةِ (ترمذی۔ نعمان ابن بشیر)

تین چیزیں ایسی ہیں کہ کسی مسلمان آدمی کا دل ان میں خیانت نہیں کرتا، عمل کو اللہ کے لیے خالص کرنا، حکام کو نصیحت کرنا، اور جماعت کے ساتھ رہنا۔

مسعب ابن سعد اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ میرے والد کو یہ خیال ہوا کہ وہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض کم درجے کے اصحاب پر فضیلت رکھتے ہیں۔ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

إِنَّمَا نَصَرَ اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ هَٰذَا مَلَأَ مَقْبَضَ عِقَالِهَا وَدَعَا نَبَهُمْ إِخْلَاصَهُمْ (نسائی)

اللہ تعالیٰ نے اس امت کو کمزوروں سے اور ان کی دعا و اخلاص سے مدد فرمائی ہے۔

حضرت حسن فرماتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حدیث قدسی ارشاد فرمائی کہ اخلاص میرے اسرار میں سے

ایک ستر ہے، اسے میں اپنے بندوں میں سے اس شخص کے دل میں ودیعت کرتا ہوں جسے میں چاہتا ہوں (ابوالقاسم قشیری۔
علی ابن ابی طالب) حضرت علی رضی اللہ عنہ ارشاد فرماتے ہیں کہ تھوڑے عمل کا فکرمیت کرو قبول عمل کا فکرمیت اس لیے کہ
سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذ ابن جبل سے ارشاد فرمایا۔

أَخْلَصَ الْعَمَلُ يُخْزِي كَمَنْهُ الْقَلِيلُ (ابو منصور دہلی۔ معانی)

عمل میں اخلاص بر تو تمہیں تھوڑا عمل کافی ہو جائے گا۔

سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں۔

مَا مِنْ عَبْدٍ يَخْلُصُ لِلَّهِ الْعَمَلُ أَنْ يُعَيِّنَ يَوْمًا لَا ظَهَرَ تَبَاتُيْعُ الْحِكْمَةِ مِنْ قَلْبِهِ
عَلَى لِسَانِهِ (ابن عدی۔ ابوموسیٰ)

جو بندہ چالیس دن تک عمل کو اللہ کے لیے خالص کرتا ہے اس کے دل سے اس کی زبان پر حکمت کے جھٹے

پھوٹتے ہیں۔

ایک حدیث میں ہے کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: قیامت کے دن سب سے پہلے تین آدمیوں سے سوال
کیا جائے گا، ایک وہ جسے اللہ تعالیٰ نے علم دیا ہے، اس سے اللہ تعالیٰ یہ سوال کرے گا کہ تو نے اپنے علم سے کیا کیا، وہ عرض کرے گا
یا اللہ میں دن رات اس کی خدمت کیا کرتا تھا اللہ تعالیٰ فرمائے گا تو جھوٹ کہتا ہے، ملائکہ کہیں گے تو جھوٹ کہتا ہے بلکہ حیرانوارہ
یہ تھا کہ لوگ کہیں فلاں شخص عالم ہے چنانچہ تجھے عالم کہا گیا، دو سراوہ شخص جسے اللہ نے مال عطا کیا ہے اللہ تعالیٰ اس سے فرمائے گا
میں نے تجھے نعمتیں بخشیں تو نے کیا کیا، وہ عرض کرے گا الٰہی میں دن رات صدقہ دیا کرتا تھا اللہ تعالیٰ فرمائے گا تو جھوٹ کہتا ہے،
فرشتے کہیں گے تو جھوٹ بولتا ہے، حیرانمقد تو یہ تھا کہ لوگ تجھے سخی کہیں چنانچہ تجھے سخی کہہ کر پکارا گیا، تیسرا وہ شخص جو اللہ کی راہ
میں قتل کیا گیا، اللہ تعالیٰ اس سے دریافت فرمائے گا کہ تو نے کیا کیا، وہ عرض کرے گا اے اللہ! تو نے مجھے جہاد کا حکم دیا تھا میں لڑا
اور قتل ہوا، اللہ تعالیٰ فرمائے گا تو جھوٹ کہتا ہے، فرشتے بھی اسے جھوٹا کہیں گے، اس سے کہا جائے گا کہ حیرانمقد یہ تھا کہ لوگ
کہیں فلاں شخص بہادر ہے، کیا تجھے بہادر نہیں کہا گیا؟

ابو ہریرہ بیان فرماتے ہیں کہ اس کے بعد سرکار
دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے میری ران پر ایک خط کھینچا اور فرمایا اے ابو ہریرہ! سب سے پہلے انی تین آدمیوں سے دونوں کی آگ
بھڑکائی جائے گی، اس حدیث کے راوی حضرت معاویہ کے پاس گئے، اور ان سے یہ حدیث بیان کی، آپ یہ حدیث سن کر اس قدر
روئے کہ ایسا محسوس ہونے لگا کہ شاید روئے روئے دم نکل جائے۔ اس کے بعد فرمایا اللہ تعالیٰ اپنے کلام میں یہ فرماتا ہے۔

مَنْ كَانَ يَرْيِدُ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا وَزِينَتَهَا نُوَفِّ إِلَيْهِمْ أَعْمَالَهُمْ وَهُمْ فِيهَا لَا يُبْخَسُونَ

(پ ۳۴ آیت ۱۵)

جو شخص محض حیاتِ دنیوی اور اس کی رونق چاہتا ہے ہم ان کو ان کے اعمال (کی جزا) دنیا ہی میں پورے

طور پر بھگتا دیتے ہیں اور ان کے لیے دنیا میں کچھ کی نہیں ہوتی۔

نبی اسرئیل کے حالات میں لکھا ہے کہ ایک عابد بڑی مدت سے اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مصروف تھا، ایک مرتبہ اس کے پاس
کچھ لوگ آئے اور انہوں نے کہا کہ یہاں ایک قوم ایسی بھی ہے جو خدا تعالیٰ کے بجائے درختوں کی پرستش کرتی ہے، اس عابد کو یہ
سن کر بڑا غصہ آیا، اور وہ اسی عالم میں کندھے پر کھلاڑی رکھ کر چلا تا کہ درخت کو بڑے کاٹ ڈالے، راستے میں اسے ایک بوڑھے
آدمی کے روپ میں شیطان ملا، شیطان نے اس سے پوچھا اللہ تجھ پر رحم کرے کہاں کا ارادہ ہے، اس نے کہا میں یہ درخت کاٹ
ڈالنا چاہتا ہوں، شیطان نے کہا تجھے اس سے کیا مطلب؟ تو نے خواہ مخواہ اپنی عبادت چھوڑی، اپنی مشغولیت ختم کی، اور بلاوجہ
دوسرے کاموں میں پڑ گیا عابد نے کیا یہ بھی عبادت ہے شیطان نے کہا میں تجھے ہرگز اس کی اجازت نہیں دے سکتا کہ تو درخت

کاٹے یہ کہہ کر وہ برسیا کر ہو گیا، عابد نے اسے گرا لیا اور اس کے سینے پر چڑھ بیٹھا، شیطان نے کہا اچھا مجھے چھوڑیں کچھ کتنا چاہتا ہوں، چنانچہ عابد کھڑا ہو گیا، ابلیس نے اس سے کہا اللہ تعالیٰ نے تجھ پر درخت کاٹنا فرض نہیں کیا ہے، اور نہ اس قوم کی ذمہ داری تجھ پر ہے جو درخت کی پرستش کرتی ہے، دنیا میں اللہ تعالیٰ کے بے شمار نبی ہیں، اگر وہ چاہے گا تو اپنے کسی نبی کو بھیج کر یہ درخت کٹوا دے گا عابد نے کہا میں یہ درخت ضرور کاٹوں گا، جب ابلیس نے دیکھا کہ اللہ تعالیٰ کا حکم نہیں ہے تو اس نے مقابلے کا اعلان کر دیا چنانچہ دونوں میں جنگ شروع ہو گئی، عابد نے دوبارہ اسے شکست دی، اور زمین پر گر کر اپنے پر چڑھ بیٹھا، جب ابلیس نے یہ دیکھا کہ اب نجات کی کوئی صورت نہیں ہے تو کہنے لگا کہ میں ایک بات بتانا چاہتا ہوں جو تیرے لیے بہت بہتر ہے عابد نے کہا بتا، ابلیس نے کہا پہلے مجھے آزاد کر عابد اس کے اوپر سے ہٹ گیا، ابلیس نے کہا تو ایک محتاج اور ننگ دست انسان ہے، تیرے پاس کچھ نہیں ہے، تو لوگوں پر بوجھ ہے وہ تیری کفالت کرتے ہیں اور تیری دلی خواہش یہ ہے کہ تیرے پاس اس قدر زموال ہو کہ تو اپنے بھائیوں کے ساتھ سلوک کر سکے، اور پڑوسیوں کے ساتھ اچھا معاملہ کر سکے، اور تو اتنا حکم سیر ہو کہ تجھے لوگوں کی ضرورت نہ رہے اور ان کی کفالت سے بے نیاز ہو جائے عابد نے کہا یقیناً یہ میری دلی خواہش ہے، ابلیس نے کہا اگر یہ بات ہے تو اپنے گھر جا میں تیرے سرہانے ہر رات دو دنار رکھ دیا کروں گا، تو وہ دنار اپنے اوپر اور اپنے اہل خاندان پر خرچ کرنا تیرے حق میں اور دیگر مسلمانوں کے حق میں درخت کاٹنے سے بہتر یہ تجویز ہے جو میں نے پیش کی ہے، درخت اپنی جگہ لگا ہوا ہے، اس کے کاٹنے سے پرستش کرنے والوں کو کوئی نقصان نہ ہوگا، اور اس کے باقی رہنے سے مسلمانوں کو کوئی فائدہ نہ ہوگا، عابد نے شیطان کی اس تجویز پر غور کیا اور کہنے لگا کہ واقعی یہ بوڑھا صحیح کہتا ہے، میں نبی نہیں ہوں کہ میرے لئے اس درخت کا کاٹنا ضروری ہو، اور نہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اس کے کاٹنے کا حکم دیا ہے کہ اگر نہیں کاٹوں گا تو کنگار ہوں گا، بوڑھے نے جو تجویز رکھی ہے وہ زیادہ نفع بخش ہے، چنانچہ اس نے بوڑھے کے ساتھ معاہدہ کر لیا، اور درخت نہ کاٹنے پر حلف اٹھالیا، اس کام سے فارغ ہونے کے بعد وہ اپنی عبادت گاہ میں واپس آیا، رات گزار ی صبح ہوئی تو اس نے دیکھا کہ حسب وعدہ دو دنار سرہانے رکھے ہوئے ہیں دوسرے دن بھی ایسا ہی ہوا، تیسرے دن وہاں کچھ نہ ملا، بڑا غصہ آیا، اور اسی عالم میں کندھے پر کھڑائی رکھ کر چلا، راستے میں ابلیس نے اسی بوڑھے شخص کے روپ میں ملاقات کی اور پوچھا کہاں کا ارادہ ہے عابد نے کہا میں درخت کاٹنے جا رہا ہوں، ابلیس نے کہا بھڑا تو جھوٹا ہے، نہ تو وہاں تک پہنچ سکتا ہے، اور نہ کاٹ سکتا ہے، یہ سن کر عابد نے چاہا کہ پہلے کی طرح پھر بوڑھے کو پکڑے اور زمین پر گرا دے، ابلیس نے کہا اب اس گمان میں مت رہتا، یہ کہہ کر ابلیس نے عابد کو پکڑا اور زمین پر پٹخ کر اس کے سینے پر چڑھ بیٹھا عابد اس کی دونوں ٹانگوں کے درمیان ایک چڑیا کی طرح پکڑ پکڑانے لگا، عابد نے بڑا زور مارا لیکن آواز نہ ہو سکا، عاجز آکر بولا کہ مجھے چھوڑ دے اور یہ مٹا کہ پہلے میں تجھ پر کیسے غالب آیا تھا، اور اس مرتبہ تو کیسے مجھ پر غالب ہو گیا ہے، ابلیس نے کہا پہلی مرتبہ تو اللہ کے لیے غضب ناک ہو کر چلا تھا، اور تیری نیت آخرت تھی، اس لیے اللہ تعالیٰ نے مجھے تیرا مسخر کر دیا، اور اس مرتبہ تو اپنے نفس اور دنیا کے لیے غضب ناک ہوا ہے، اس لیے میں تجھ پر غالب آیا۔ یہ واقعہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی تصدیق ہے۔

وَلَا غَوْنَهُمْ أَجْمَعِينَ إِلَّا رِجَابٌ ذِكْرُهُمْ الْمُخْلِصِينَ (پ ۳۳ آیت ۳۹-۴۰)

اور ان سب کو گمراہ نہوں گا، بجز آپ کے ان بندوں کے جو ان میں منتخب کئے گئے ہیں۔

بندہ شیطان سے اخلاص کے ذریعہ حق چھٹکارا پاتا ہے، اسی لیے حضرت محرف کرفیؑ اپنے آپ کو پیٹتے تھے اور کہتے تھے اے نفس اخلاص کر تاکہ مجھے خلاصی (رہائی) ملے، یعقوب کمنوف کہتے ہیں عقل وہ ہے جو اپنی نیکیوں کو بھی اسی طرح چھپائے جس طرح اپنی برائیوں کو چھپاتا ہے، ابو سلیمان کہتے ہیں اس شخص کے لیے خوشخبری ہو جو اپنے ہر گنج قدم سے اللہ کی رضا کا طالب ہو، حضرت عمر ابن الخطابؓ نے ابو موسیٰ اشعریؓ کو لکھا جس کی نیت خالص ہوئی ہے اللہ تعالیٰ اس کے لیے ان امور میں کافی ہو جاتا ہے جو اس میں اور لوگوں میں ہو، ایک بزرگ نے اپنے کسی بھائی کو لکھا کہ اپنے اعمال میں نیت خالص کرو تھوڑا سا عمل بھی کافی ہو جائے گا، ایوب سختیائی فرماتے ہیں کہ عمل والوں کے لیے سب سے زیادہ دشوار عمل نیتوں کا خالص کرنا ہے، مطرف کہتے ہیں جو

مض صاف ہوتا ہے اس کے لیے صفائی کی جاتی ہے اور جو مض غلط ملط کرتا ہے اس کے لیے غلط ملط کیا جاتا ہے کسی مض نے ایک بزرگ کو خواب میں دیکھا اور ان سے دریافت کیا آپ نے اپنے اعمال کو کیسا پایا انہوں نے جواب دیا مجھے ہر اس عمل کا صلہ مل گیا جو میں نے اللہ کے لیے کیا تھا یہاں تک کہ انار کے اس دانے کا بھی جو میں نے رو گذر سے اٹھایا تھا اور میں نے اپنی مروت ملی کو بھی نیکیوں کے پلڑے میں دیکھا میری ٹوپی میں ریشم کا ایک دھاگا تھا وہ مجھے برائیوں کے پلڑے میں ملا مجھے اپنے ایک گدھے کا جس کی قیمت سو بتا رہی تھی ثواب نہیں ملا خواب دیکھنے والے نے عرض کیا کہ آپ نے ملی کو تو نیکیوں کے پلڑے میں دیکھا اور گدھے کو نہیں دیکھا فرمایا مجھ سے فرمایا گیا تیرا گدھا وہاں ہے جہاں تو نے اسے بیٹھا تھا میں نے گدھے کے مرنے کی خبر سن کر کہا تھا خدا کی لعنت میں گیا اس لیے مجھ سے کہا گیا کہ گدھے میں تیرا ثواب ضائع ہو گیا اگر تو یہ کہتا اللہ کی راہ میں گیا تو تجھے حیرا ثواب ملتا میں نے ایک مرتبہ لوگوں کے سامنے صدقہ دیا تھا اس وقت لوگوں کا دیکھنا مجھے اچھا لگا تھا اس صدقے کا نہ مجھے ثواب ملا اور نہ عذاب حضرت سفیان ثوری نے یہ واقعہ سن کر فرمایا وہ طرش قسمت ہے کہ اس صدقے کی سزا نہیں ملی بلکہ یہ تو اس پر بیٹا احسان ہوا بچی ابن معاذ کہتے ہیں کہ اخلاص عمل کو محبوب سے اس طرح صاف کر دیتا ہے جیسے دودھ کو ز اور خون سے صاف ہوتا ہے ایک ایسے مض کا واقعہ بیان کیا گیا ہے جسے عورتوں کا لباس پہننے اور ان کے فیض اختیار کرنے کا بہت شوق تھا وہ ہر اس جگہ پہنچا کرتا تھا جہاں کسی خوشی یا غم کے لیے عورتوں کا اجتماع ہوتا ایک مرتبہ وہ ایک ایسے ہی اجتماع میں شریک تھا اچانک شور ہوا کہ ایک قیمتی موتی چوری ہو گیا پھر یہ اعلان کیا گیا کہ تمام دروازے بند کر کے تلاشی لی جائے گی چنانچہ لوگ آئے اور ایک ایک مض کی تلاشی لی جانے لگی یہاں تک کہ وہ لوگ ایک ایسی خاتون تک پہنچ گئے جہاں اس کے قریب موجود تھی یہ صورت حال دیکھ کر وہ مض اپنا راز افشاء ہونے کے خوف سے بڑا گھبرایا اور اس نے صدقہ دل کے ساتھ یہ دعا کی کہ اگر مجھے اس رسوائی سے محفوظ رکھا گیا تو میں آئندہ کبھی ایسی حرکتیں نہیں کروں گا چنانچہ موتی قریب میں پٹی ہوئی عورت کے پاس سے مل گیا اس کے بعد دروازے کھول دیے گئے اور خواتین کو باہر جانے کی اجازت دے دی گئی ایک بزرگ کہتے ہیں کہ میں مرنے کے دن مصر کی نماز کے بعد ابو عبیدہ حسری کے ہمراہ ان کے کھیت میں کھڑا ہوا تھا ابو عبیدہ اس وقت اپنے کھیت میں مل چلا رہے تھے اچانک ایک ابدال وہاں آئے اور ان سے آہستہ سے کچھ کہنے لگے ابو عبیدہ نے جواب میں کہا نہیں وہ یہ جواب سن کر بادل کی طرح اڑے اور ہوا میں تحلیل ہو گئے میں نے ابو عبیدہ سے پوچھا یہ بزرگ آپ سے کیا کہہ رہے تھے ابو عبیدہ نے کہا یہ کہہ رہے تھے میرے ساتھ ج کچلاؤں میں نے انکار کر دیا راوی کہتے ہیں میں نے پوچھا آپ نے ج کیوں نہ کر لیا فرمایا میری نیت ج کی نہیں تھی بلکہ میں نے یہ نیت کی تھی کہ میں آج رات تک اس زمین میں مل چلاؤں گا اور یہ کام مکمل کروں گا مجھے یہ ڈر ہوا کہ اگر میں ان کے ساتھ ج کچلاؤں گا تو کہیں اللہ تعالیٰ کے غضب کا نشانہ بن جاؤں اور مجھ سے یہ سوال نہ کیا جائے کہ تو نے اللہ کے عمل میں غیر کا اختلاط کیوں کیا تھا میں اس وقت جس کام میں مشغول ہوں اس میں میرے نزدیک سترج سے بھی زیادہ کا ثواب ہے کیوں کہ اس عمل میں میری نیت اللہ کے لیے خالص ہے ایک بزرگ کہتے ہیں کہ مجھے بحری راستے سے جہاد میں شرکت کا موقع ملا راستے میں ایک مض نے اپنا توشہ دان فروخت کرنے کا ارادہ کیا میں نے سوچا کہ یہ توشہ دان خرید لیتا چاہیے راستے میں بھی کام دے گا اور ضرورت پر فلاں شہر میں آسانی سے زیادہ قیمت پر فروخت بھی کیا جاسکے گا چنانچہ میں نے اسے خرید لیا اسی دن رات کو میں نے خواب میں دیکھا کہ وہ مض آسمان سے اترے ان میں سے ایک نے اپنے ساتھی سے کہا کہ نمازیوں کے بارے میں لکھ لو میں نہیں بتلاتا ہوں فلاں مض تفرج کے لیے فلاں مض ریا کے لیے شریک ہوا فلاں تجارت کی غرض سے جہاد میں شامل ہوا فلاں مض اللہ کی راہ میں ہے پھر میری طرف دیکھ کر کہا یہ مض تجارت کے لیے آیا ہے میں نے کہا میرے بارے میں ایسا کہتے ہوئے اللہ کا خوف کھاؤ میں تجارت کے لیے نہیں نکلا ہوں اور نہ میرے پاس کوئی ایسا سامان ہے جس میں تجارت کروں گا وہ مض بولا بدے میاں اتم نے کل ایک توشہ دان نفع اٹھانے کے لیے خرید لیا ہے میں یہ سن کر روئے لگا اور میں نے ان سے کہا کہ وہ میرا نام تاجروں میں نہ لکھیں کہتے والے نے اپنے ساتھی کی طرف دیکھ کر پوچھا بولو کیا کہتے ہو لکھوں یا نہ لکھوں؟ اس نے کہا اس مض کے بارے میں یوں لکھو کہ

یہ شخص غزوے کے لیے گھر سے چلا، مگر اس نے راستے میں ایک توشہ دان خرید لیا جس کے ذریعے وہ نفع کمانے کے امید رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ جو چاہے گا اس کے بارے میں فیصلہ کر دے گا۔ سری متقی فرماتے ہیں کہ عثمانی میں اخلاص کے ساتھ دو رکعت نماز پڑھنا عالی اسناد کی حامل شریعات و روایات نقل کرنے سے افضل ہے۔ ایک بزرگ کہتے ہیں ایک لمحے کے اخلاص میں ابد کی نجات ہے، لیکن اخلاص کا ملنا دشوار ہے، کہا جاتا ہے علم حج ہے، عمل بھی ہے، اور اخلاص اس کا پانی ہے، ایک بزرگ کہتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کو مبغوض رکھتا ہے تو اسے تین چیزیں عطا کرتا ہے اور تین چیزوں سے روک دیتا ہے، اسے نیک لوگوں کی صحبت عطا کرتا ہے، لیکن ان سے استفادے کی صلاحیت سے محروم کر دیتا ہے، اسے اعمال صالح سے نوازتا ہے، لیکن ان میں اخلاص سے محروم کر دیتا ہے، اسے حکمت عطا کرتا ہے اور اس میں مدق سے روک دیتا ہے، سوئی کہتے ہیں کہ مخلوق کے اعمال سے اللہ تعالیٰ کی مراد صرف اخلاص ہے، حضرت جنید فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے کچھ بندے ایسے ہیں کہ عاقل ہوتے ہیں، اور جب عاقل ہوتے ہیں تو عمل کرتے ہیں اور جب عمل کرتے ہیں تو اخلاص اختیار کرتے ہیں، اور اخلاص انھیں نیکیوں کی تمام قسموں کی طرف بلاتا ہے، محمد ابن سعید الروزی کہتے ہیں کہ تمام معاملات کی دو اصل ہیں، ایک اس کا فعل تیرے ساتھ، اور دوسرا تیرا فعل اس کے لیے، جو فعل وہ تیرے ساتھ کرے تجھے اس پر راضی رہنا چاہیے، اور جو فعل تو کرے تجھے اس میں غفلت رہنا چاہیے، اگر تو نے ایسا کیا تو ان دونوں اصولوں میں کامیاب رہے گا، اور دارین کی سعادت حاصل کرے گا۔

اخلاص کی حقیقت : ہر شئی میں غیر کے اختلاط کا تصور کیا جاسکتا ہے، جب کوئی شئی غیر کے اختلاط سے خالی اور صاف ہو تو اسے خالص کہتے ہیں، اور جس فعل سے وہ صاف ہوتی ہے اسے اخلاص کہا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

مِنْ بَيْنِ قُرْبَيْهِمْ لَبَسْنَا خِالَصًا لِّلشَّارِبِينَ۔ (پ ۱۳ ر ۱۵ آیت ۲۱)

گوہر اور خون کا جو (ادھ) ہے اس کے درمیان سے صاف اور گلے میں آسانی سے اترنے والا دودھ (ہم تم کو پینے کے لیے دیتے ہیں)

لبن کا خالص ہونا یہ ہے کہ اس میں گوہر اور خون کی آمیزش نہ ہو، اخلاص کی ضد شرک ہے، جو شخص غفلت نہیں ہوتا وہ مشرک ہوتا ہے تاہم شرک کے کچھ درجات ہیں، توحید میں اخلاص کی ضد الوہیت میں شرک ہے، شرک میں خفی درجات بھی ہیں اور جلی بھی، یہی حال اخلاص کا ہے، اخلاص اور شرک دونوں قلب پر وارد ہوتے ہیں گویا ان دونوں کا محل قلب ہے، اور ان کا ورود قصد و نیت سے ہوتا ہے، چنانچہ ہم نیت کی حقیقت بیان کر چکے ہیں جس کا حاصل یہ ہے کہ نیت کسی ایسے باعث کی تحریک کا نام ہے جو غرض کے موافق ہو، اگر باعث ایک ہو، اور فعل اسی باعث کی وجہ سے صادر ہوا ہو تو اسے اخلاص کہتے ہیں، بشرطیکہ وہ باعث غرض مقصود کے موافق بھی ہو، چنانچہ اگر کسی شخص نے صدقہ دیا اور اس کی غرض غلی ریا ہے، تو وہ غفلت ہے، اور اگر اس کا مقصد محض اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرنا ہے تب بھی غفلت ہے، لیکن عادتاً غفلت اخلاص اسی عمل کے ساتھ مخصوص قرار دیا جاتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے تقرب کے لیے کیا گیا ہو اور جو غیر اللہ کی تمام کمزورتوں سے پاک و صاف ہو، یہ ایسا ہی ہے جیسے الحاد میلان کو کہتے ہیں، لیکن عادتاً حق سے اعراض کو الحاد کہا جاتا ہے، جس شخص کے فعل کا باعث محض ریا ہو وہ معرض ہلاکت میں ہے، ہم یہاں ریا پر گفتگو کرنا نہیں چاہتے، اس کا تفصیلی بیان کتاب الریا میں گذر چکا ہے، ریا کی کم سے کم سزا وہ ہوگی جو حدیث شریف میں مذکور ہے۔

إِنَّ الْمُرَائِي يُدْعَى يَوْمَ الْقِيَامَةِ بِأَرْبَعِ أَسْمَاءٍ يَأْمُرَانِي، يَأْمُرَانِي، يَأْمُرَانِي، يَأْمُرَانِي

پاکا فر۔ (ابن ابی الدنیا)

قیامت کے دن ریا کار کو چار ناموں سے پکارا جائے گا اے ریا کار! اے دھوکا دینے والے! اے مشرک! اے کافر!

یہاں ہم اس باعث پر گفتگو کرنا چاہتے ہیں جو تقرب کی نیت سے برائگی بخندہ ہو، پھر اس باعث میں کوئی دوسرا باعث مخلوط ہو جائے، خواہ وہ دوسرا باعث ریا سے ہو یا غیر ریا سے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص روزے سے بھی تقرب کی نیت کرے

اور اس کا مقصد پرہیز کرنا بھی ہو، یا غلام آزاد کرے، اور ثواب کے علاوہ یہ نیت بھی ہو کہ اس کے مصارف اور غلط عادات سے بچا رہے، یا حج کرے تاکہ حج میں سفر کی حرکت سے اس کے مزاج میں اعتدال آجائے، یا اس شر سے محفوظ رہے جو وطن میں اس کے درپے ہے، یا دشمن سے دور رہے، یا اپنے پیوی بچوں سے تنگ آگیا ہو، اور حج کے ذریعے ان سے دور رہنے کا خواہشمند ہو، یا کسی مشغولیت کے باعث تنگ کیا ہو، اور اب آرام کرنا چاہتا ہو، یا کوئی شخص اس لیے جہاد کرتا ہو کہ فن حرب میں مہارت حاصل کر سکے، یا لشکر کی تیاری اور جنگی سامان کی فراہمی کا طریقہ آجائے، اور دشمن پر حملہ کرنے کے فن سے واقف ہو جائے، یا کوئی شخص اپنے گھر کی حفاظت کے لیے بیدار رہنے کی غرض سے تہجد کی نماز پڑھے، یا کوئی شخص علم اس لیے حاصل کرے کہ اس طرح اس کا مال و متاع محفوظ رہے گا، اور طمع پیشہ لوگوں کے دست و برو سے بچا رہے گا۔ یا اس لیے وعظ و تدریس کی محفل سجائے کہ خاموشی سے آگیا ہو، اور بولنے کی لذت حاصل کرنا چاہتا ہو، یا صوفیاء اور علماء کی کفالت اس لیے کرتا ہو کہ ان کے دل میں اس کی قدرو منزلت زیادہ ہو جائے اور لوگ بھی اسے احرام کی نظروں سے دیکھیں، اور اس کے ساتھ نرمی کا معاملہ کریں کیوں کہ وہ اللہ والوں کا کفیل ہے، یا قرآن کہیم کی کتابت اس لیے کرے کہ مسلسل لکھنے سے خط اچھا ہو جاتا ہے یا پیدل چل کر حج کرے تاکہ کرایہ کے بوجھ سے نجات پائے، یا وضو اس لیے کرے کہ ٹھنڈے پانی سے جسم کو راحت ملتی ہے، اور میل پچیل دور ہوتا ہے، یا اس لیے غسل کرے کہ اس سے جسم کی بدبو دور ہوتی ہے یا حدیث اس لیے بیان کرے کہ لوگ عالی سندوں میں اس کا نام لیں گے یا مسجد میں اس لیے منعک ہو کہ گھر کے کرائے سے بچا رہے، یا روزہ اس لیے رکھے کہ کھانا پکانے کی مشقت سے بچتا چاہتا ہو، یا یہ سوچتا ہو کہ اگر میں کھانا کھاؤں گا تو اس سے کام میں خرچ ہو گا، یا کسی سائل کا سوال اس لیے پورا کرے کہ اس کے بابت لکھنے سے تنگ آگیا ہو، یا مریض کی عیادت اس خیال سے کرے کہ وہ یا اس کے متعلقین اس کی عیادت کریں گے، یا کسی کے جنازے میں اس لیے شریک ہو کہ مرحوم کے اعزاء اس کے اہل خانہ ان کے جنازوں میں شرکت کریں گے، یا ان میں سے کوئی کام اس لیے کرے کہ لوگ ان اعمال کے حوالے سے اس کا ذکر کریں گے، اور اس کی تعریف کریں گے، اور نیک کاموں میں اس کی شہرت ہوگی، اور لوگ اسے احرام اور عزت دیں گے۔ ان تمام صورتوں میں اگر تقرب الی اللہ کی نیت بھی ہوگی اور ان مقاصد میں سے کوئی مقصد بھی ہو گا تو اس کا عمل اخلاص کی تعریف سے نکل جائے گا، اور یہ نہیں کہا جائے گا کہ اس کا عمل خالص اللہ تعالیٰ کے لیے ہے، بلکہ اس میں شرک کو جگہ مل جائے گی، اور اللہ تعالیٰ ایک حدیث قدسی میں ارشاد فرماتا ہے کہ میں تمام شرکاء میں شرک سے سب سے زیادہ بے نیاز ہوں، خلاصہ یہ ہے کہ دنیاوی حظوظ میں سے اگر کوئی حظ ایسا ہے کہ نفس اس کی طرف مائل ہو اور رغبت رکھتا ہو اور وہ کسی عمل میں جگہ پا جائے تو اس حظ کی وجہ سے اس عمل کا اخلاص متاثر ہو گا، کیوں کہ انسان ہر وقت اپنے حظوظ نفس، اور خواہشات میں مستغرق رہتا ہے اس لیے ایسا کم ہوتا ہے کہ اس کا کوئی فعل یا عبارت ان حظوظ اور خواہشات سے خالی ہو، اور اس کا عمل یا عبادت خالص قرار دنی جائے، اسی لیے یہ کہا گیا ہے کہ جس شخص کو زندگی میں ایک لمحہ بھی ایسا مل جائے جو اللہ کے لیے خالص ہو، وہ لمحہ اس کی نجات اور سلامتی کے لیے کافی ہو گا، اور یہ اس لیے کہ اخلاص کا وجود انتہائی کمیاب ہے، اور دل کو ان شوائب اور حظوظ ہونے والی چیزوں سے پاک و صاف کرنا نہایت دشوار ہے، بلکہ خالص عمل وہ ہے جس کا باعث تقرب الی اللہ کے علاوہ کوئی دوسرا نہ ہو، اگر یہ حظوظ اور لذات تمام اعمال کا باعث ہوں تو صاحب اعمال پر ان اعمال کی وجہ سے انتہائی سختی ہوگی، اور یہ بالکل ظاہریات ہے، لیکن اگر اعمال سے نیت تقرب الی اللہ کی ہو، اور ان میں ان حظوظ کی آمیزش بھی ہو جائے تو عمل اللہ کے لیے خالص نہیں رہتا۔ اعمال میں حظوظ نفس کی زیادتی کی تین صورتیں ہیں، یا تو رفاقت کے طور پر زیادتی ہوگی یا شرکت کے طریقے پر یا معاونت کے اعتبار سے نیت میں اسی طرح کی تقسیم تھی، اور وہاں ان تین صورتوں کی وضاحت ہو چکی ہے، یہاں ایک تقسیم یہ بھی ہے کہ نفسانی باعث دینی باعث برابر ہو، یا کم ہو یا زیادہ ہو، اور ان میں سے ہر ایک کا جدا گانہ حکم ہے، ہم عنقریب اس کا ذکر کریں گے انشاء اللہ تعالیٰ۔

اخلاص کے معنی یہ ہیں کہ اعمال ہر طرح کے شوائب سے پاک ہوں، خواہ وہ عوڑے ہوں، یا بہت، اور اس میں صرف تقرب

الی اللہ کی نیت ہو، اس کے علاوہ کوئی اور باعث نہ ہو اور اس طرح کے اعمال کا تصور صرف ان لوگوں سے ممکن ہے جو اللہ تعالیٰ سے محبت کرنے والے اور آخرت میں ڈوبے ہوئے ہیں اور دنیا کی محبت کے لیے ان کے دل میں کوئی جگہ نہیں ہے، یہاں تک کہ وہ کھانا پینا بھی پسند نہیں کرتے، بلکہ کھانے پینے میں ان کی رغبت ایسی ہوتی ہے جیسے قصائے حاجت میں جس طرح سے بشری ضرورت اور انسانی جسم کا تقاضا سمجھا جاتا ہے اسی طرح کھانا پینا بھی انسانی حاجت اور بشری تقاضا ہے۔ وہ کھانے کی طرف اس لیے مائل نہیں ہوتے کہ وہ کھانا ہے، یا اس سے لذت حاصل ہوتی ہے، بلکہ اس لیے راغب ہوتے ہیں کہ کھانے سے جسم میں قوت اور توانائی آتی ہے، اور اللہ تعالیٰ کی عبادت و اطاعت پر اسے قدرت ملتی ہے۔ ان لوگوں کی آرزو یہ ہوتی ہے کہ کاش انھیں بھوک کے شر سے نجات مل جائے، اور کھانے کی کوئی ضرورت باقی ہی نہ رہے، ان کے قلوب میں زائد از ضرورت حظوظ کی طرف کوئی میلان نہیں ہوتا بلکہ وہ قدر ضرورت ہی پر قناعت کرتے ہیں، اور اسے بھی دین کی ضرورت سمجھتے ہیں، ایسا شخص جس کے تمام افکار اور افعال کا محور اللہ تعالیٰ کی ذات ہو جب کوئی عمل کرتا ہے خواہ وہ کھانا پینا ہو، یا قصائے حاجت کرنا تو اس کا عمل خالص ہوتا ہے، اور اس کی تمام حرکات و سکنات میں نیت صحیح ہوتی ہے۔ چنانچہ یہ شخص عبادت پر تقویت حاصل کرنے اور جسم کو اسجد کی اطاعت کے لیے راحت دینے کی خاطر ہوتا ہے تو اس کا سونا بھی عبادت ہے اور اسے مخلصین کا درجہ عطا کیا جاتا ہے، اور جس شخص کا حال یہ نہیں ہوتا، اعمال میں اخلاص کا دروازہ اس پر بند کر دیا جاتا ہے، صرف شاذ و نادر ہی اس سے اخلاص ظاہر ہوتا ہے ورنہ عام طور پر اس کی ہر عبادت کسی نہ کسی دنیوی مقصد کے لیے ہوتی ہے، پھر جس شخص پر اللہ تعالیٰ کی اور آخرت کی محبت غالب ہوتی ہے اس کی تمام حرکات و سکنات بھی اسی کے غلبے کے اثر سے اخلاص بن جاتی ہیں، اور اس کا ہر عمل خلوص کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے، دوسری طرف وہ شخص ہے جس پر دنیا کی، اور اقدار و حکومت کی محبت غالب ہے، اور مجموعی حیثیت سے وہ غیر اللہ کی رغبت رکھتا ہے اس کی تمام حرکات و سکنات پر یہی صفت غالب آجاتی ہے، اور اس کی کوئی عبادت ہونہ، نماز اور صدقہ بھی نہیں پاتا۔ شاذ و نادر کا ضرور استثناء کیا جاسکتا ہے۔

عدم اخلاص کا علاج : اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ اخلاص کا نہ ہونا ایک مرض ہے، اور اس کا علاج یہ ہے کہ نفسانی حظوظ کا قلع قمع کیا جائے، دنیا سے طبع منقطع کی جائے، اور آخرت کے لیے اس طرح خاص ہوا جائے کہ دل پر آخرت غالب ہو جائے، اس طرح اخلاص یقیناً آسان ہو جائے گا، کتنے اعمال ایسے ہیں کہ انسان ان میں تقب اور مشقت برداشت کرتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ میں خالص اللہ کی رضا کے لیے یہ عمل کر رہا ہوں، لیکن اس کا خیال غلط ہوتا ہے، مغالطے کی وجہ یہ ہے کہ اسے آفت کی وجہ معلوم نہیں ہوتی، اور وہ اپنے اعمال کو شوائب سے پاک تصور کرنے کی غلط فہمی میں مبتلا رہتا ہے، ایک بزرگ نے اپنی تیس برس کی نماز میں محض اس لیے دہرائیں کہ ایک دن جب وہ مسجد میں پہنچے تو جماعت کھڑی ہو چکی تھی، اور صف اول میں جگہ باقی نہیں رہی تھی، مجبوراً انھیں دوسری صف میں نماز پڑھنی پڑی، اور اس پر انھوں نے شرم محسوس کی، اس واقعہ کے بعد ان کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ میں صف اول میں محض اس لیے نماز پڑھتا تھا کہ لوگ مجھے دیکھتے تھے، اور مجھے ان کے دیکھنے سے خوشی ملتی تھی، اسی لیے آج دوسری صف میں کھڑا ہونے پر مجھے شرم محسوس ہوئی، اس خیال کے ساتھ ہی انھیں یہ احساس ہوا کہ ان کی تیس برس کی نمازیں ضائع ہو گئیں، اب ان کا اعادہ کرنا چاہیے، یہ ایک دقتی آفت ہے، ہر شخص اسے سمجھنے کا اہل بھی نہیں ہے۔ بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ اعمال اس طرح کی آفتوں سے محفوظ رہیں، اور بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو ان آفتوں سے محفوظ ہو جائیں، صرف وہی لوگ آگاہ ہو پاتے ہیں، اور سلامتی کی تدبیریں کرتے ہیں جنھیں اللہ اس کی توفیق عطا کرتا ہے، غافل دیکھیں گے کہ آخرت میں ان کی تمام نیکیاں گناہوں کا پیکر اختیار کر چکی ہیں، قرآن کریم کی ان آیات میں یہی لوگ مراد ہیں۔

وَيَذَلُّهُمْ مِنَ اللَّعْمَانِ تَكُونُوا يَحْتَسِبُونَ (پ ۲۲۳ آیت ۴۷)

اور خدا کی طرف سے ان کو وہ معاملہ پیش آئے گا جس کا ان کو گمان بھی نہ تھا۔

وَيَذَلُّهُمْ سَيِّئَاتِ مَا كَسَبُوا (پ ۲۲۳ آیت ۴۸)

اور اس وقت ان پر ان کے تمام برے اعمال ظاہر ہو جائیں گے۔
 قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا الَّذِينَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ
 يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ خَيْرٍ صَنَعُوا (پ ۲۱ آیت ۳۳-۳۴)

آپ کہئے کہ کیا ہم تم کو ایسے لوگ بتائیں جو اعمال کے اعتبار سے بالکل خسارے میں ہیں یہ لوگ ہیں جن کی دنیا میں کی کرائی محنت سب گئی گذری ہوئی اور وہ اسی خیال میں ہیں کہ اچھا کام کر رہے ہیں۔

اس فقرے کا سب سے بڑا نشانہ علماء بننے ہیں، اس لیے کہ اکثر علماء دین کی اشاعت اس لیے کرتے ہیں کہ انھیں دوسروں پر برتری میں لذت ملتی ہے، اقتدار اور بیوی میں خوشی ہے، اور تعریف و توصیف سے دل بلیں اچھلتا ہے، شیطان ان پر یہ معاملہ ملتبس کر دیتا ہے، اور یہ کہتا ہے کہ تمہارا مقصد اللہ کے دین کی اشاعت اور اس شریعت کا دفاع ہے جو سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی ہے، بہت سے واعظ ایسے بھی نظر آتے ہیں جو مخلوق کی اصلاح کرنے اور بادشاہوں کو وعظ و نصیحت کرنے کے عمل کو اپنا احسان تصور کرتے ہیں، اور جب لوگ ان کی بات سن لیتے ہیں یا ان کی نصیحت پر عمل کرتے ہیں تو خوشی سے پھولے نہیں سماتے، ان کا دعویٰ یہ ہوتا ہے کہ وہ اس لیے خوش ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں اپنے دین کی نصرت اور تائید کے لیے منتخب کیا ہے، اور اصلاحِ خلق کی توفیق ارزانی کی ہے، حالانکہ ان کا حال یہ ہے کہ اگر اللہ کے سادہ لوح بندے اس کے بجائے اسی جیسے کسی دوسرے عالم کے پاس چلے جائیں، اور اس سے استفادہ کریں تو حسد اور غم انھیں ہلاک کر ڈالے، حالانکہ اگر ان کا مقصد محض وعظ و نصیحت ہوتا تو وہ لوگوں کے اس رجحان پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے کہ اس نے یہ ذمہ داری دوسروں کے سپرد کر کے ایک بڑی مشقت سے بچالیا ہے، اور ایک نازک اور پرخطر فریضے سے محفوظ رکھا ہے۔ شیطان اس وقت بھی اس کا بیچا نہیں چھوڑتا اور یہ کہتا ہے کہ تو اس لیے غم کین نہیں ہے کہ مخلوق خدا احمدیہ کے بجائے کسی اور عالم کی طرف رجوع کئے ہوئے ہے، بلکہ حیرے غم کی اصل وجہ یہ ہے کہ تو اس طرح اشاعتِ دین، حفاظتِ علم، اور اصلاحِ مخلوق کے اجر و ثواب سے محروم رہ گئے، اس بھارے کو معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر سر تسلیم خم کرنے میں اس سے کہیں زیادہ اجر و ثواب ہے جو مخلوق کی رہنمائی میں اسے حاصل ہوتا۔ اگر اس طرح کے معاملات میں غم کرنا محمود ہوتا تو جس وقت حضرت ابو بکرؓ نے بار خلافت سنبھالا تھا حضرت عمرؓ کو ضرور غم ہونا چاہیے تھا، اس لیے کہ تمام مسلمانوں کا امام بننا، اور ان کے دین و دنیا کے امور کا مشغل ہونا ایک بڑا کارِ خیر، اور زبردست سعادت ہے، اس کے برعکس حضرت عمرؓ کو اس واقعے سے بڑی خوشی ہوئی کہ حضرت ابو بکرؓ نے بار امامت اپنے کاندھوں پر اٹھایا، اور وہی اس کے مستحق بھی تھے۔ آج کل کے علماء کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ اس طرح کے واقعات سے خوش نہیں ہوتے، بعض اہل علم شیطان کے اس فریب میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ اگر ہم سے افضل کوئی شخص ہوگا تو ہم بھی خوش ہوں گے یہ محض دعویٰ ہے، جب عملِ فعل میں اس دعویٰ کی کھدائش کی جاتی ہے تو یہ لوگ ناکام رہ جاتے ہیں، اور ان کا عمل دعویٰ کے مطابق نہیں ہوتا، دراصل انسان بہت جلد اپنے وعدے اور دعویٰ پر فراموش کرنے والا ہے، صرف وہی لوگ اس آزمائش میں ثابت قدم رہتے ہیں جو شیطان اور نفس کے مکر سے واقف ہوتے ہیں، اور نفس کا امتحان کرتے رہتے ہیں۔

بہر حال اخلاص کی حقیقت کا جاننا اور اس پر عمل کرنا ایک گہرا سمندر ہے، اس میں اکثر لوگ فرق ہو جاتے ہیں، شاید نادر ہی بچ پاتے ہیں، اور یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جن کا اس آیت میں استثناء کیا گیا ہے۔

إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمْ الْمُخْلِصِينَ (پ ۱۳ آیت ۳)۔ جو آپ کے ان بندوں کے جو ان میں منتخب کئے گئے ہیں۔
 بندے کو چاہیے کہ وہ ان دقیق امور پر گہری نظر رکھے، ایسا نہ ہو کہ غفلت میں شیطان کا قبیح بن جائے۔

اخلاص کے سلسلے میں مشائخ کے اقوال : سوئی فرماتے ہیں کہ اخلاص یہ ہے کہ اخلاص پر نظر نہ ہو، اس لیے کہ جو شخص اپنے اخلاص پر نظر رکھے گا اسے اس اخلاص کی محنت کے لیے دوسرے اخلاص کی ضرورت ہوگی اس قول میں یہ اشارہ کیا گیا ہے کہ اپنے عمل پر نظر کرنا عجب ہے، اور عجب کا شمار آفات میں ہوا کرتا ہے، اور خالص عمل وہ ہے جو تمام آفتوں سے محفوظ ہو،

جس اخلاص میں عجب ہو گا وہ آفت ہے، محفوظ نہیں ہو گا اس لیے اسے اخلاص نہیں کہا جائے گا، حضرت سہل ستیری فرماتے ہیں کہ اخلاص یہ ہے کہ بندہ کی ہر حرکت، ہر سکون اللہ تعالیٰ کے لیے ہو، یہ ایک جامع کلمہ ہے، اور ہمارے مقصد کو پوری طرح حاوی ہے، اسی کے قریب قریب ابراہیم ابن ابراہیم کا یہ قول ہے کہ اخلاص یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ صادق نیت ہو۔ حضرت سہل ستیری سے کسی نے پوچھا کہ نفس پر سب سے زیادہ دشوار چیز کیا ہے؟ فرمایا اخلاص۔ اس لیے کہ نفس کو اس سے کوئی مناسبت نہیں ہوتی۔ روئے فرماتے ہیں کہ عمل میں اخلاص یہ ہے کہ مجلس دنیا و آخرت میں کسی عوض کی امید نہ رکھے، اس قول میں یہ بتلایا گیا ہے کہ تمام حظوظ نفس آفت ہیں خواہ وہ دنیا سے قطع رکھتے ہوں یا آخرت سے قطع ہوں چنانچہ جو شخص آخرت میں جنت کے نعمتوں کے حصول کے لیے عبادت کرتا ہے وہ آفت زدہ ہے صحیح تر بات یہ ہے کہ عمل سے صرف اللہ تعالیٰ کی رضا مقصود ہونی چاہیے، یہ صدیقین کا اخلاص ہے، اسے اخلاص مطلق کہتے ہیں جو شخص جنت کی امید اور دوزخ کے خوف سے عمل کرتا ہے اسے دنیوی لذت کے اعتبار سے قطع کر سکتے ہیں، ورنہ حقیقت میں وہ غم اور شرمگاہ کے حظوظ کا طالب ہے، اہل حق کے نزدیک صرف رضائے حق مطلوب ہوتی ہے، انھیں دنیا یا آخرت کی کسی لذت سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔

رہا یہ قول کہ ہر انسان کسی نہ کسی حد کے لیے متحرک ہوتا ہے، حظوظ سے خالی ہونا اللہ تعالیٰ کی صفت ہے، اگر کوئی انسان یہ دعویٰ کرتا ہے کہ وہ حظوظ سے تنہا ہے تو اس کا یہ دعویٰ غلط ہے بلکہ وہ شخص کفر سے قریب تر ہے، جیسا کہ قاضی ابوبکر مقلات نے اس شخص پر حکم لگایا ہے جو حظوظ نفس سے برأت کا اظہار کرے، وہ یہ کہتے ہیں کہ حظوظ سے دور ہونا اللہ تعالیٰ کی صفت ہے، انسان کو اس طرح کے دعوے زینب نہیں دیتے۔ بظاہر یہ قول صحیح معلوم ہوتا ہے، لیکن اصل میں جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ انسان کو دنیا و آخرت کے حظوظ سے خالی ہونا چاہیے ان کی مراد وہ حظوظ ہیں جنہیں لوگ غم کہتے ہیں یعنی جنت کی نعمتیں، اور ان لوگوں کی مراد معرفت، مناجات اور دیدار الہی کی لذت ہے، لوگ اسے غم نہیں سمجھتے، حالانکہ یہ اتنا بڑا غم ہے کہ اگر اس کے عوض میں جنت کی تمام لذتیں عطا کی جائیں تو وہ انھیں حقیر سمجھ کر ٹھکرا دیں، گویا محبین خدا اس ابدی غم کے لیے عبادت کرتے ہیں جنت کی طمع میں، اور اس کی لذتوں کے حصول کے لیے نہیں کرتے، ان کا غم صرف معبود برحق ہے، اس کے علاوہ وہ کسی نعمت کو غم نہیں سمجھتے، ابوحنن کہتے ہیں کہ اخلاص یہ ہے کہ مخلوق سے نظر ہٹا کر ہمیشہ کے لیے خالق کو اپنی نگاہ کا مرکز بنالے، اس قول میں ریا کی آفت سے بچنے کی طرف اشارہ ہے ایک بزرگ کہتے ہیں کہ عمل میں اخلاص اس طرح ہونا چاہیے کہ شیطان بھی اس پر مطلع نہ ہو سکے، ورنہ وہ اخلاص میں فساد پھیلانے کی کوشش کرے گا، حد یہ ہے کہ فرشتے کو بھی خبر نہ ہونی چاہیے تاکہ وہ لکھ نہ سکے، اس قول میں عمل کو پوشیدہ کرنے پر تنبیہ ہے۔ ایک بزرگ کہتے ہیں کہ اخلاص وہ ہے کہ خلایق سے غلی، اور علاقے سے پاک ہو، یہ مقاصد اخلاص کو جامع قول ہے۔ محاسبی کہتے ہیں کہ اخلاص یہ ہے کہ اپنے اور رب کے درمیان سے مخلوق کی مداخلت کی راہ مسدود کر دے، اس میں ریا کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، خواص کہتے ہیں کہ جو شخص اقتدار کا نشہ کر لیتا ہے وہ عبودیت کے اخلاص سے آزاد ہو جاتا ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے ان کے بعض حواریین نے دریافت کیا کہ عمل خالص کیا ہے، انھوں نے جواب دیا کہ عمل خالص وہ ہے جو صرف اللہ کے لیے کیا جائے اور اس پر مخلوق کی ستائش یا صلے کی تمنا نہ ہو، اس میں بھی ترک ریا کی تاکید کی گئی ہے ریا کو بطور خاص اس لیے بیان فرمایا کہ جن امور سے اخلاص باطل ہوتا ہے ان میں یہ ۱۲ زیادہ مؤثر اور قوی ہے حضرت جابر فرماتے ہیں کہ اخلاص عمل کو کدورتوں سے پاک کرتا ہے حضرت فضیل ابن عیاض کہتے ہیں کہ لوگوں کی وجہ سے عمل نہ کرنا ریا ہے، اور ان کی وجہ سے عمل کرنا شرک ہے، اور اخلاص یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تجھے ریا اور شرک دونوں سے محفوظ رکھے۔ ایک بزرگ کا قول ہے کہ اخلاص دوام مراقبہ، اور حظوظ نفس کو قطعی طور پر فراموش کر دینے کا نام ہے۔ اخلاص کے سلسلے میں بزرگوں کے بے شمار اقوال ہیں، لیکن ان اقوال کے بعد اب مزید اقوال کی ضرورت نہیں رہتی کیوں کہ اخلاص کی حقیقت واضح ہو چکی ہے۔ بلکہ اخلاص کے سلسلے میں تو ہمیں ان تمام اقوال سے قطع نظر کرتے ہوئے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کو حرز جاننا لینا چاہیے۔ کسی شخص نے آپ سے اخلاص کے بارے میں دریافت کیا، آپ نے فرمایا:-

أَنْ تَقُولَ رَبِّيَ اللَّهُ ثُمَّ تَسْتَقِيمُ كَمَا أَمَرْتُ (۱)

یہ کہ تو کہے اللہ میرا رب ہے، پھر ثابت قدم رہے جیسا کہ تجھے حکم دیا گیا ہے۔

یعنی نہ اپنی خواہش نفس کی عبادت کر، اور نہ نفس کی پرستش کر، صرف اپنے رب کی عبادت کر، اور اس میں ثابت قدم رہ جس طرح ثابت قدم رہنے کا حکم ہوا ہے، اس حدیث میں ماسوی اللہ سے قطع نظر کی طرف اشارہ ہے، اور حقیقت میں اخلاص یہی ہے۔

اخلاص کو مکدر کرنے والی آفات اور شوائب : اخلاص کو مکدر کرنے والی آفتیں بہت سی ہیں، ان میں سے بعض جلی

ہیں اور بعض خفی، اور بعض میں جلاء کے ساتھ ضعف ہے، اور بعض میں خفا کے ساتھ قوت ہے لیکن خفاء اور جلاء میں ان آفتوں

کے درجات کا اختلاف مثال کے بغیر سمجھنا ممکن نہیں ہے، اس لیے ہم پہلے ایک مثال بیان کرتے ہیں، مثال میں ہم ریا کا ذکر کریں

گے، اخلاص کو ریا ہی سے زیادہ خطرہ لاحق ہوتا ہے، مثلاً ایک نمازی نماز پڑھنے میں مشغول ہے اور پورے اخلاص کے ساتھ نماز

پڑھ رہا ہے اتنے میں چند لوگ یا ایک شخص اس جگہ آیا جہاں وہ نماز ادا کر رہا تھا، شیطان نے موقع غیبت سمجھا اور بلا تاخیر اس کے

پاس پہنچ گیا، اور اس سے کہنے لگا کہ اچھی طرح نماز پڑھ، تاکہ دیکھنے والوں پر اچھا اثر ہو، اور وہ تجھے نیک صالح سمجھ کر تیرا احترام

کریں، تجھے نظر حقارت سے نہ دیکھیں، اور نہ تیری غیبت کریں، یہ سن کر وہ شخص اپنے اعضاء میں خشوع پیدا کر لیتا ہے، اور مزید

پر سکون ہو کر نماز میں مشغول رہتا ہے، اور نماز میں زیادہ سے زیادہ حسن پیدا کرتا ہے، یہ ریا سے ظاہر ہے، اور مبتدی مریدوں پر بھی

خفی نہیں رہتا یہ ریا کا پہلا درجہ ہے، دوسرا درجہ یہ ہے کہ مرید نے اس آفت کا ادراک کر لیا ہو اور اس سے محفوظ رہنے کی تدبیر

بھی کر لی ہو چنانچہ یہ مرید اس آفت میں شیطان کی اطاعت نہیں کرتا، اور نہ اس کی طرف التفات کرتا ہے، بلکہ اپنی نماز میں اسی

طرح مشغول رہتا ہے جس طرح لوگوں کی آمد سے پہلے مشغول تھا ایسے شخص کے پاس شیطان خیر کا زیادہ پھن کر آتا ہے، اور اس سے

کہتا ہے کہ لوگ تیری اتباع کرتے ہیں تیری تقلید کرتے ہیں، تیری ہر حرکت پر نظر رکھتے ہیں، تو جو کچھ کرتا ہے وہ ان کے الحال پر

اثر انداز ہوتا ہے، وہ تیرے ہر ہر عمل کو قابل تقلید نمونہ تصور کرتے ہیں، اگر تو نے اچھی طرح عمل کیا تو تجھے ان کے اعمال کا ثواب

بھی ملے گا، اور اگر تو نے عمل میں کوتاہی کی تو ان کے اعمال کا وبال بھی تیری گردن پر رہے گا، اس لیے لوگوں کے سامنے اچھی طرح

عمل کر، ہو سکتا ہے یہ لوگ خشوع و خضوع اور تحسین اعمال میں تیری تقلید کریں یہ درجہ پہلے کے مقابلے میں زیادہ عامض ہے

بعض اوقات جو لوگ شیطان کی تدبیر سے فریب نہیں کھاتے وہ اس دوسری تدبیر کے فریب میں آجاتے ہیں یہ بھی ریا ہے، اور

اخلاص کو باطل کرنے والا ہے اس لیے کہ اگر خشوع و خضوع اور تحسین عبادت میں اس کے نزدیک کوئی خیر ہے اور وہ نہیں چاہتا کہ

لوگ اس خیر سے محروم رہیں تو تنہائی میں ایسا کیوں نہیں کرتا، اور یہ بات تسلیم نہیں کی جاسکتی کہ اس کے نزدیک اپنے نفس کے

مقابلے میں دوسرے کا نفس زیادہ عزیز ہو، اور وہ اپنی بہتری کے بجائے دوسرے شخص کی بہتری کا زیادہ خواہاں ہو یہ شخص شیطانی

تلبیس ہے وہ اسے تقلید کا فریب دے کر ریا میں مبتلا کر رہا ہے مقتدی بننے کا اہل وہ ہے جو اپنے نفس میں مستقیم ہو، جس کا قلب

منور ہو اور اس نور کی شعائیں دوسروں تک بھی پہنچتی ہوں اور انھیں بھی روشن کرتی ہوں، اس صورت میں اسے یقیناً دوسروں کی

تقلید اور اتباع کا ثواب ہوگا، لیکن یہ صورت محض فریب اور تلبیس کی ہے تاہم اس اتباع سے قمع کو ضرور ثواب ملے گا، اور

مبتوع سے اس تلبیس پر باز پرس کی جائے گی، اور اسے اس حرکت کی سزا دی جائے گی کہ وہ جس وصف سے متصف نہیں تھا

اس کا اظہار کیوں کیا تیسرا درجہ اس دوسرے درجے سے بھی زیادہ عامض اور مغفل ہے، اور وہ یہ ہے کہ بندہ اس سلسلے میں اپنے

نفس کو آزمائے اور شیطان کے مکر سے آگاہ رہے اور یہ جانے کہ خلوت و جلوت میں حالات کا اختلاف محض ریا ہے، اور یہ کہ اس

کی نماز میں خلوت میں ایسی ہی ہونی چاہئیں جیسی لوگوں کے سامنے ہوتی ہیں اور عادت ہے ہٹ کر محض لوگوں کے لیے خشوع کرنے

میں اپنے نفس اور رب سے شرم محسوس کرے، تنہائی میں اپنے نفس پر متوجہ ہو، اور وہاں بھی اپنی نماز کے افعال میں وہی خوبی اور

حسن پیدا کرنے کی کوشش کرے جو خوبی اور حسن مجمع عام کی نماز میں پیدا کرتا ہے، یہ اسی ریا سے خفی کی ایک صورت ہے اگرچہ

(۱) بخاری و روایت ان الفاظ میں نہیں لی، البتہ ترمذی وغیرہ میں کچھ مختلف الفاظ ہیں۔

بظاہر اس کا احساس نہیں ہوتا اس لیے کہ غلوٹ میں وہ نماز اس لیے اچھی طرح ادا کرتا ہے تاکہ لوگوں کے سامنے بھی اچھی طرح پرمکے ہو گیا غلوٹ اور جلوت دونوں حالتوں میں اس کی نظر مخلوق پر رہی ہے اخلاص اس وقت ہوتا جب اس کی نظر میں بہائم اور مخلوق کی حیثیت یکساں ہو جاتی، یعنی جس طرح وہ بہائم کے لئے عقین عبادت نہیں کرتا اسی طرح لوگوں کے لئے بھی نہ کرتا اور یہاں یہ صورت ہے کہ یہ شخص لوگوں کی سامنے خشوع و خضوع کے ساتھ نماز نہ پڑھنے کو برا سمجھتا ہے، لیکن یہ سوچ کر شرماتا ہے کہ کہیں لوگوں کے سامنے ایسا کرنے سے اس کا فعل ریاء بن جائے، پھر وہ اہل دل میں یہ فیصلہ کرتا ہے کہ اگر میں تمنا میں بھی اسی طرح نماز پڑھوں گا تو ریاء سے دور رہوں گا۔ حالانکہ اس کا یہ خیال قطعاً غلط ہے، ریاء سے دور رہنے کی صرف ایک صورت ہے اور وہ یہ کہ مخلوق کی طرف اس کا انتہائی ایسا ہی ہو جیسا عبادت کی طرف ہوتا ہے، خواہ تمنا میں ہو یا مجمع میں، ورنہ یہ شخص دونوں حالتوں میں مخلوق کے ساتھ مشغول تصور کیا جائے گا۔ یہ شیطان کا انتہائی غلطی کر ہے، بہت کم اس پر اطلاع ہو پاتی ہے۔

چوتھا درجہ ان تمام درجات سے زیادہ خفی ہے، اور وہ یہ ہے کہ جب کوئی شخص مجمع عام میں نماز پڑھ رہا ہو تو شیطان اسے خشوع کرنے کی ترغیب نہ دے، کیوں کہ وہ یہ بات جانتا ہے کہ یہ شخص اس فریب میں آنے والا نہیں ہے، مجبور ہو کر شیطان اس سے یہ کہتا ہے کہ اللہ کی عظمت و جلالت اور اس ذات گرامی کے تقدس میں غور و فکر کر جس کے سامنے تو درست بستہ کھڑا ہوا ہے، اور اس بات سے ڈر کہ اللہ تعالیٰ تیرے دل پر نظر ڈالے اور وہ اس سے غافل ہو، یہ سن کر وہ فوراً دل سے حاضر ہو جاتا ہے، خواہ اس پر خشوع و خضوع طاری کر لیتا ہے، اور سمجھتا ہے کہ میرا یہ عمل عین اخلاص ہے، حالانکہ یہ عین کمرو فریب ہے، اس لیے کہ اگر اس پر اللہ تعالیٰ کی جلالت و عظمت میں غور کرنے کے وقت خشوع و خضوع طاری ہوتا تو اس میں مجمع عام کی تخصیص کیوں ہوتی، تمنا میں اس کا قلب اسی طرح حاضر ہوتا، اور اللہ تعالیٰ کی جلالت شان میں اسی طرح غفلت کرتا، اس فریب سے بچنے کی صورت یہ ہے کہ تمنا میں بھی اس کا دل اللہ تعالیٰ کے ذکر و فکر میں اسی طرح مشغول ہو جس طرح مجمع عام میں رہتا ہے، ایسا نہ ہو کہ لوگوں کے آنے پر اس کے دل کا حال تمنا کے حال سے مختلف ہو جائے، جیسے بہائم کی موجودگی میں یا ان کی آمد پر کسی شخص کے حال میں تغیر واقع نہیں ہوتا، گویا اس وقت تک آدمی کو غفلت نہیں کہا جاسکتا جب تک اس کا دل لوگوں کو دیکھنے اور بہائم کے دیکھنے میں فرق محسوس کرتا ہے، ایسا شخص صفائے اخلاص سے دور ہے، اور اس کا باطن ریاء کے شرک خفی سے آلودہ ہے، یہ شرک انسان کے دل میں رات کی تاریکی میں سخت چہرہ سیاہ چوٹی کے چلنے سے بھی زیادہ خفی ہے، جیسا کہ ایک حدیث میں اس کی یہی مثال دی گئی ہے، شیطان سے صرف وہی شخص محفوظ رہ سکتا ہے جس کی نظر واقع ہو، اور جو اللہ تعالیٰ کی حفاظت عنایت، توفیق اور ہدایت سے سرفراز ہو، ورنہ شیطان ان لوگوں کے پیچھے پڑا رہتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے کمر بستہ کئے ہیں، ان سے ایک لمحے کے لیے بھی غافل نہیں ہوتا، اور اس وقت تک اپنی جدوجہد میں مصروف رہتا ہے جب تک کہ انھیں ریاء پر مجبور نہیں کر دیتا، پھر وہ بڑے اعمال ہی میں ایسا نہیں کرتا، بلکہ بدگمان خدا کی ہر حرکت پر نظر رکھتا ہے یہاں تک کہ آنکھوں میں سرمہ ڈالنے، مونچھوں کے بال کٹوانے، جعد کے دن کپڑے تبدیل کرنے، اور خوشبو لگانے میں بھی اپنے فریب سے باز نہیں آتا، یہ مخصوص اوقات کی سنتیں ہیں، اور نفس کو ان میں ایک خفی حظ ہے، کیوں کہ ان کا تعلق مخلوق کے مشاہدے سے ہے، اور طبع ان سے مانوس ہوتی ہے، اس لیے شیطان اسے ان افعال کی دعوت دیتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ سنتیں ہیں انھیں ترک نہ کرنا چاہیے، حالانکہ ان افعال پر قلب میں تحریک اس لیے نہیں ہوتی کہ یہ سنتیں ہیں، بلکہ اس شہوت کی بنا پر ہوتی ہے جو قلب میں خفی ہے، اور عمل اس کے باعث حد اخلاص سے نکل جاتا ہے۔ جو عمل ان تمام آفات سے خالی ہو وہ خالص نہیں ہوتا۔ بعض لوگ احکاف کرتے ہیں، اور شیطان انھیں ایسی مساجد کی طرف متوجہ کر کے جو فحاشی سے تعمیر کی گئی ہوں، اور اندر سے آراستہ عیادت ہوں احکاف کا شوق دلاتا ہے اور احکاف کے فضائل بیان کرتا ہے، بعض بندے ایسی مساجد میں احکاف کرتے ہیں، اور اس احکاف کی تحریک مسجد کی خوبصورتی سے ہوتی ہے، چنانچہ انھیں اگر ایسی مساجد میں احکاف کے لیے کہا جائے جو کم خوبصورت ہوں تو دل مائل نہیں ہوتا، یہ تمام امور اعمال میں طبیعت کے شوائب اور اعمال کی کدورتوں کے استخراج کا باعث بنتے ہیں، اور ان سے اخلاص باطل ہو جاتا ہے، بعض اعمال میں اخلاص کم باطل

ہوتا ہے اور بعض میں زیادہ۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے خالص سونے میں کھوٹ کی آمیزش ہو، کبھی یہ آمیزش اتنی ہوتی ہے کہ اصل سونے کا پتا ہی نہیں چلتا، اور کبھی کم ہوتا ہے، اور کبھی اتنا کم ہوتا ہے کہ ماہر جو ہری کے علاوہ کوئی اسے پرکھ ہی نہیں سکتا، دایں میں غیر اللہ کی آمیزش، شیطان کی مداخلت، اور نفس کا فریب، اس سے کہیں زیادہ دانتی ہے اسی لیے کہا جاتا ہے کہ عالم کی دو رکعتیں جاہل کی سال بھر کی عبادتوں سے افضل ہے، یہاں عالم سے مراد وہ شخص ہے جو اوقات اعمال کے وقا کئی سے واقف ہو، اور ان سے محفوظ رہنے پر قدرت رکھتا ہو، جاہل کی نظر ظاہر عبادت پر رہتی ہے، اور وہ اس سے اس طرح فریب کھاتا ہے جس طرح ایک گنوار کوئی اشرفی کے چکدار اور روشن رخ کو دیکھ کر فریب میں مبتلا ہو جاتا ہے، حالانکہ کنڈن کا تھوڑا سونا بھی اس اشرفی سے زیادہ قیمتی ہے جسے کم محل لوگ غلطی سے سونا سمجھ لیتے ہیں، ایسی حال عبادات کا ہے، بلکہ عبادات کا معاملہ کچھ زیادہ ہی سخت ہے، اعمال میں جس قدر آفتیں پیدا ہوتی ہیں اس سے خطر گنگو میں ان کا احاطہ نہیں کیا جاسکتا، اور نہ ان کا احاطہ کرنا ممکن ہے، ہم اسی مثال پر اکتفا کرتے ہیں، ذہین آدمی کو یہ مختصر بیان بہت سی تفصیلی بحثوں سے بے نیاز کر دیتا ہے، اور کند ذہن کے لیے لمبی چڑی بحث بھی لا حاصل ہے۔ اس لیے تفصیل میں فائدہ نہیں ہے۔

مخلوط اعمال کا ثواب : جانتا جا رہا ہے کہ جب عمل اللہ تعالیٰ کے لیے خالص نہیں ہوتا، اور اس میں ریا اور دیگر مخلوط نفس کا استعراج ہو جاتا ہے تو لوگ اس سلسلے میں غلط ہو جاتے ہیں کہ آیا اس عمل کا ثواب ملے گا یا عمل کرنے والے کو عذاب ہوگا؟ یا نہ عذاب ہوگا اور نہ ثواب؟ جہاں تک اس عمل کا تعلق ہے جس میں صرف ریا ہو اس میں کسی کا اختلاف نہیں کہ ایسا عمل عذاب اور غضب کا موجب ہے، اور جس عمل سے صرف اللہ کی نیت کی گئی ہو وہ ثواب کا باعث ہے۔ اب گفتگو صرف مخلوط اعمال میں رہ جاتی ہے جہاں تک ظاہری روایات کا تعلق ہے ان سے پتا چلتا ہے کہ مخلوط عمل کا ثواب نہیں ہوگا۔ (۱) تاہم ان روایات میں تعارض پایا جاتا ہے۔ (۲) ہماری رائے یہ ہے، صحیح علم اللہ ہی کو ہے کہ قوت باعث کی مقدار دیکھی جائے گی، اگر باعث دینی اور باعث نفسی دونوں برابر برابر ہوں گے تو دونوں ایک دوسرے کا ازالہ کریں گے اس طرح اس عمل پر نہ عذاب ہوگا اور نہ ثواب، اور اگر باعث ریا غالب تر اور قوی تر ہوگا تو اس میں کوئی لمحہ نہ ہوگا بلکہ وہ مغر ہوگا، اور عذاب کا باعث ہوگا، تاہم اس عمل کا عذاب خالص ریا کارانہ عمل کے عذاب سے کم ہوگا، اور اگر تقرب کی نیت غالب ہوگی تو اسے اسی قدر ثواب ملے گا جس قدر نیت غالب ہوگی قرآن کریم میں یہی اصول بیان کیا گیا ہے۔

فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ (پ ۲۰ ر ۲۳ آیت ۸-۷)

سو جو شخص ذرہ برابر نیکی کرے گا وہ (وہاں) اس کو دیکھ لے گا، اور جو شخص ذرہ برابر بدی کرے گا وہ اس کو دیکھ لے گا۔

إِنَّ اللَّهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ وَإِنْ تَكَ حَسَنَةً بِّضَاعِهَا (پ ۲۵ ر ۳۰ آیت ۴۰)

بلاشبہ اللہ تعالیٰ ایک ذرہ برابر بھی ظلم نہ کریں گے اور کوئی نیکی ہوگی تو اس کو کئی گنا کریں گے۔

اس سے معلوم ہوا کہ خیر کی نیت۔ خواہ کسی مقدار میں ہو ضائع نہیں ہوگی، اگر قصد ریا سے زیادہ ہے تو جو مقدار ریا کے برابر ہے وہ ضائع ہو جائے گی، اور زیادتی باقی رہے گی، اور اگر کم ہے تو خس قدر قصد ریا سے عذاب ہوتا ہے اس میں اسی قدر تخفیف ہو جائے گی۔ اس امر کی تحقیق یہ ہے کہ اعمال کا قلوب میں یہ اثر ہوتا ہے کہ جس وصف کے باعث وہ اعمال صادر ہوتے ہیں ان اعمال سے اس وصف میں استحکام پیدا ہوتا ہے، چنانچہ داعیہ رجا کا تعلق مملکت سے ہے، اور اس مملکت کی غذا اور قوت رسانی کا

(۱) چنانچہ ابو داؤد میں حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ! ایک شخص اللہ کے راستے میں جہاد کرتا ہے اور اس کی نیت

دنوی مال و متاع کی بھی ہوتی ہے؟ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایسے شخص کے لیے کوئی اجر نہیں ہے

(۲) ابن حبان میں حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ ایک شخص غیہ عمل کرتا ہے اور اگر کسی پر ظاہر ہو جائے تو اس سے اسے خوشی ہوتی ہے، آپ نے فرمایا: اس کے لیے دو اجر ہیں ایک چھپائے کا اجر، اور ایک ظاہر ہونے کا۔

ذریعہ اس واسطے کے مطابق عمل کرنا ہے، اور داعیہ خیر کا تعلق نیکیات سے ہے، اور اس کو ان اعمال سے تقویت ملتی ہے جو اس واسطے کے مطابق صادر ہوتے ہیں، اب اگر قلب میں یہ دونوں متضاد صفیں جمع ہو جائیں تو ایک متقنی پر کئے جانے والے عمل سے صفت رہا کو قوت ملے گی اور تقریب کے متقنی پر عمل کرنے سے صفت خیر کو تقویت حاصل ہوگی، ان میں سے ایک مسلک ہے، اور ایک نہایت دلائے والا، اگر ایک کی قوت دوسرے کی قوت کے بقدر ہوگی تو دونوں برابر ہوں گی مثلاً اگر کسی شخص کو گرم چیزیں کھانے سے ضرر ہوتا ہے، اور اس نے گرم چیزوں کی ایک خاص مقدار استعمال کی اب اگر اسی مقدار کے مطابق اس نے سرد چیزیں بھی کھائیں تو یہ ایسا ہوگا جیسے اس نے کوئی چیز نہیں کھائی، اور اگر ایک چیز ان میں سے غالب ہوئی تو وہ اپنا اثر ضرور چھوڑے گی، چنانچہ جس طرح اللہ تعالیٰ کی سنت جاریہ کے مطابق کھانے کا ایک ذرہ یا پانی کا ایک قطرہ یا دوا کی معمولی سی مقدار جسم میں اپنا اثر ضرور چھوڑتی ہے اسی طرح خیر و شر کا ذرہ بھی قلب کو سیاہ کرنے یا منور کرنے میں اللہ سے دور کرنے یا نزدیک کرنے میں اپنا کردار ضرور ادا کرے گا، اگر کسی شخص نے کوئی ایسا عمل کیا جس سے ہاشت بھر قربت ملتی، پھر اس عمل میں ایسا عمل ملا دیا جس سے ہاشت بھر دور ہوئی ہے تو گویا اس نے کوئی عمل ہی نہیں کیا، جہاں تھا وہیں رہ گیا، اور اگر اس نے ایسا عمل کیا جو دو ہاشت کے بقدر قربت دیتا ہے، پھر اس میں ایسا عمل ملا دیا جس سے ایک ہاشت دوری ہوتی ہے تو ایک ہاشت کی برتری حاصل رہے گی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں: **اتَّبِعِ السَّبِيَّةَ الْحَسَنَةَ تَمَحَّضْهَا** کناہ کے بعد نیک عمل کرلو، اس سے کناہ کا اثر زائل ہو جائے گا۔

جیسا کہ یہ بات واضح ہے کہ ربائے محض کو اخلاص محض ضائع کر دیتی ہے، اگر اخلاص محض ربائے محض کے بعد واقع ہو، لیکن اگر دونوں ایک وقت جمع ہوئے تو قدرتی طور پر ایک دوسرے کو ہٹائیں گے، اور ان کا اثر پہلے کے برعکس ہوگا، ہمارے اس دعویٰ کی دلیل اس امر پر اجماع امت بھی ہے کہ جو شخص حج کے لیے نکلے اور اس کے ہمراہ سامان تجارت بھی ہو تو اس کا حج صحیح ہوگا اور اسے اس پر ثواب دیا جائے گا، حالانکہ اس عمل میں نفسانی حظ تجارت کی آمیزش ہے۔ تاہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس شخص کو ثواب اس وقت ہوتا ہے جب وہ مکہ مکرمہ میں داخل ہو جاتا ہے اور حج کے ارکان ادا کرتا ہے اور تجارت کا تعلق سفر سے ہے، حج پر موقوف نہیں ہے، اس لیے حج خالص ہے، البتہ راستے کا سفر مشترک رہا، اور اس سفر میں کوئی ثواب نہ ہوگا، کیوں کہ تجارت کی نیت تھی، صحیح بات یہ ہے کہ اگر حج اصل محرک ہو، اور تجارت محض معین اور تابع ہو تو نفس سفر میں بھی ثواب ہوگا، ہمارے خیال میں وہ غازی جو کثرت غنائم کی جت سے اللہ کی راہ میں کفار سے جہاد آزما ہوتے ہیں ان غازیوں سے مختلف ہیں جو صرف اللہ کے لیے غزوات میں شرکت کرتے ہیں مال غنیمت ان کا مقصد نہیں ہوتا لیکن اس فرق کا یہ مطلب نہیں کہ جو لوگ مال غنیمت کا قصد بھی رکھتے ہوں وہ ثواب سے یکسر محروم رہیں گے بلکہ انصاف کی بات یہ ہے کہ اگر اصل باعث اور قوی محرک اللہ تعالیٰ کا کلمہ بلند کرنا ہے، اور مال غنیمت میں بطور تبعیت و رغبت ہے تو اس سے ثواب ضائع نہ ہوگا تاہم اس کا ثواب اس شخص کے برابر نہیں ہوگا جو محض اطاعتی کلمہ اللہ کے لیے جنگ میں شرکت کرتا ہے، اور اس کا قلب غنیمت کی طرف ذرا التفات نہیں کرتا، اس میں شک نہیں یہ التفات نقص ہے، اور اجر میں کمی کا باعث بنتا ہے، روایات سے پتا چلتا ہے کہ ریا کی آمیزش سے ثواب باطل ہو جاتا ہے، اس معنی میں مال غنیمت کی طلب، تجارت اور دیگر حظوظ کی آمیزش ہے، چنانچہ طاؤس، اور بعض دوسرے تابعین روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نے اس آدمی کے بارے میں دریافت کیا جو عمل خیر کرتا ہے یا اس نے یہ کہا کہ وہ صدقہ کرتا ہے اور یہ چاہتا ہے کہ لوگ اس عمل پر اس کی تعریف بھی کریں، اور وہ ثواب سے بھی حظ اٹھائے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا، یہاں تک کہ مندرجہ ذیل آیت کریمہ نازل ہوئی۔

فَمَنْ كَانَ يَرْجُوا لِقَاءَ رَبِّهِ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهِ أَحَدًا (۲) (پ ۲۱ ر ۳ آیت ۴۰)

سو جو شخص اپنے رب سے ملنے کی آرزو رکھے تو نیک کام کرتا رہے اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے۔
حضرت معاذ بن جبل روایت کرتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

(۱) یہ روایت پہلے بھی گذری ہے (۲) ابن ابی النضیر والحاکم وغیرہ

أَخَذَنِي التَّيْرَاءُ بِشِرْكٍ (طبرانی، حاکم) کم سے کم ریا بھی شرک ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص نے اپنے عمل میں شرک کیا اس سے کہا جائے گا کہ وہ اپنے عمل کا اجر اس سے لے جس کے لیے اس نے شرک کیا ہے۔ (۱) حضرت عبادہ ابن الصامتؓ ایک حدیث قدسی بیان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا میں تمام شریکوں کی بہ نسبت شرک سے بے نیاز ہوں جو شخص میرے لیے عمل کرتا ہے اور اس میں دو سرے کو میرے ساتھ شریک کر لیتا ہے تو میں اپنا حصہ بھی شریک کے لیے چھوڑ دیتا ہوں۔ (۲) حضرت ابو موسیٰؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک اعرابی نے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ! ایک شخص غیرت سے جہاد کرتا ہے ایک شخص اظہارِ شجاعت کے لیے لڑتا ہے اور ایک شخص اللہ کی راہ میں اپنا مرتبہ دریافت کرنے کے لیے جنگ کرتا ہے (ان میں سے کون سا شخص راہِ خدا میں افضل ہے) سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا وہ شخص جو اللہ کا کلمہ بلند کرنے کے لیے لڑا اللہ کی راہ میں ہے، (۳) حضرت عمرؓ نے ارشاد فرمایا کہ تم کہتے ہو فلاں شخص شہید ہے، کیا معلوم اس نے اپنی اونٹنی کے دونوں قیلے (بسم و ذرے) بھر لیے ہوں۔ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ روایت کرتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جس شخص نے دنیا کا مال حاصل کرنے کے لیے ہجرت کی تو وہ اسی کے لیے ہے۔ (۴) ہماری رائے میں یہ روایات اس دعویٰ کے خلاف نہیں ہیں جو ہم نے گذشتہ سطور میں کیا ہے، بلکہ ان سے وہ شخص مراد ہے جو صرف دنیا کا طالب ہو، جیسا کہ مذکورہ بالا روایت سے پتا چلتا ہے کہ جس شخص نے طلبِ دنیا کے لیے ہجرت کی ظاہر ہے ایسے شخص کی ہجرت دنیا کے لیے ہوگی، اور اسے اس ہجرت کا ثواب نہیں ملے گا، بلکہ گناہگار ہوگا، چنانچہ ہم نے یہ بات پہلے بھی واضح طور پر لکھی ہے کہ دنیا کے لیے عمل کرنا معصیت ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ طلبِ دنیا حرام ہے، بلکہ اعمالِ دین کے بدلے میں دنیا طلب کرنا حرام ہے، کیوں کہ اس میں ریا پائی جاتی ہے، اور عبادت کے مقصد میں شرکت پائی جاتی ہے، اور شرکت برابری پر دلالت کرتی ہے، اور ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ جب دونوں قصد برابر ہوں گے تو ساقط ہو جائیں گے ایسے عمل پر نہ ثواب ہوگا اور نہ عذاب ہوگا، جو لوگ مشترک اعمال پر ثواب کی امید رکھتے ہیں وہ حماقت میں مبتلا ہیں۔

مشترک اعمال والے ہوں بھی خطرے میں ہوتے ہیں، اس لیے کہ اگر کسی عمل میں دونوں قصد پائے گئے تو کیا ضروری ہے کہ وہ دونوں برابر ہوں گے، ہو سکتا ہے ان میں سے ایک غالب ہو، ہو سکتا ہے قصدِ ریا غالب ہو جائے اور وہ عمل اس کے لیے وبال بن جائے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

فَمَنْ كَانَ يَرْجُوا لِقَاءَ رَبِّهِ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهِ أَحَدًا (پ ۲۸ آیت ۳۰)

سو جو شخص اپنے رب سے ملنے کی آرزو رکھے تو نیک کام کرنا رہے اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ اگر عمل میں نیتوں کا اشتراک ہو تو ثواب کی توقع نہ رکھنی چاہیے، شرکت کا بہترین حال یہ ہے کہ عمل ساقط ہو جائے، یہاں یہ کہا جاسکتا ہے کہ جہاد میں شہادت کا مرتبہ اخلاص کے بغیر حاصل نہیں ہوتا، اس کے ساتھ ساتھ یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ جس شخص نے جہاد میں محض دینی دایمے کی تحریک پر شرکت کی، اور وہ دل سے جہاد پر آمادہ ہے، اور مطلق اور مالد اور دونوں طرح کے دشمنوں سے لڑنے کے لیے تیار ہے، لیکن مالداروں سے لڑنے میں وہ اس لیے زیادہ دلچسپی رکھتا ہے کہ اصل مقصد اعلائے کلمۃ اللہ کے ساتھ ساتھ مال غنیمت بھی حاصل ہو جائے تو اسے جہاد کا ثواب نہیں ملے گا۔ خدا نخواستہ معاملہ ایسا ہو اس سے تو دین میں بڑی تنگی واقع ہوگی، اور مسلمان مایوسی کا شکار ہو جائیں گے اس لیے کہ اس طرح کے تابع مقاصد اور شوائب سے بہت کم انسان خالی ہوتے ہیں، ان مقاصد سے ثواب میں کمی ہو سکتی ہے، لیکن یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ اس صورت میں ثواب بالکل ہی ضائع ہو جاتا ہے، البتہ دو قصد رکھنے والا شخص زبردست خطرے سے دوچار رہتا ہے اس لیے کہ کبھی وہ شخص یہ گمان کرتا ہے کہ قریب الی اللہ کا قصد قوی باعث ہے، جب کہ اس کے باطن پر نفسانی حظوظ کا باعث غالب ہوتا ہے، اور یہ ایک نہایت مخفی امر ہے، گویا اجر

اخلاص سے حاصل ہے، اور اپنے اخلاص کا یقین بندے کو بہت کم ہوتا ہے، اگرچہ وہ احتیاط میں انتہائی مبالغہ کیوں نہ کرے، اس لیے بندے کو چاہیے کہ وہ اپنی پوری کوشش کے باوجود بدو قیول میں ضرور رہے اور اپنی عبادت کے سلسلے میں ایسی آفات سے خائف رہے جو اس کے لیے اجرو ثواب کے بجائے باعث وبال بن جائیں، اہل بصیرت خائنین کا یہی حال تھا، اور ہر صاحب بصیرت کو ایسا ہی ہونا چاہیے، حضرت سفیان ثوریؒ فرماتے ہیں جو اعمال میں لگے ہیں ان میں انھیں قابل اتمام نہیں سمجھتا، عبدالعزیز ابن ابی مداؤن کہتے ہیں کہ میں تیس برس تک خانہ کعبہ کے حوا میں رہا ہوں اور میں نے تیس حج کئے ہیں، لیکن جب بھی میں نے کوئی عمل خیر کیا اور اس میں اپنے نفس کا احتساب کیا تو مجھے شیطان کا حصہ لیا وہ ملا، اگر میرے تمام اعمال نہ باعث عذاب ہوں اور نہ موجب ثواب تو یہ میرے لیے بہت غنیمت ہے۔

اگرچہ بڑا جیسی آفتیں بندے کے اعمال ضائع کر دیتی ہیں، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ رباء کے خوف سے عمل ترک کر دیا جائے، عمل ترک کرنا شیطان کی عین تمنا ہے، وہ یہی چاہتا ہے کہ انسان اللہ کے لیے کوئی عمل نہ کر لے، اصل مقصد یہ ہونا چاہیے کہ اخلاص ضائع نہ ہو، اگر عمل ترک کر دیا تو عمل اور اخلاص دونوں ضائع ہوں گے، بیان کیا گیا ہے ایک فقیر ابو سعید حنظل کی خدمت کیا کرتا تھا، اور ان کے کاموں میں اعانت کرتا تھا، ایک دن ابو سعید نے اخلاص پر کلام کیا، مقصد یہ تھا کہ بندے کو اپنی ہر حرکت میں اخلاص رکھنا چاہیے، چنانچہ اس خادم فقیر نے ہر عمل اور ہر حرکت کے وقت اخلاص کی خاطر اپنے قلب کی سخت نگرانی شروع کر دی، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ اپنے ضروری امور انجام دینے سے بھی قاصر ہو گیا، شیخ کو بھی تکلیف پہنچی، انہوں نے خادم سے صورت حال دریافت فرمائی خادم نے بتلایا کہ میں اپنے نفس سے ہر عمل میں اخلاص کا مطالبہ کرتا ہوں، اور نفس کو اس سے عاجز پاتا ہوں، اس لیے وہ عمل ترک کر دیتا ہوں، ابو سعید نے فرمایا ایسا مت کرو، اخلاص عمل کو منقطع نہیں کرتا، عمل پر مواظبت کرو، اور اخلاص کے حصول کے لیے کوشش کرتے رہو، میں نے تم سے یہ نہیں کہا کہ عمل ترک کر دو، بلکہ میں نے یہ کہا ہے کہ عمل کو خالص کرو، فضیل ابن عیاض کہتے ہیں کہ مخلوق کی وجہ سے عمل ترک کرنا بڑا ہے، اور مخلوق کے لیے عمل کرنا شرک ہے۔

تیسرا باب

صدق کی فضیلت اور حقیقت

صدق کے فضائل : اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

رَحَالٌ صَدَقُوا مَا عَاهَدُوا اللَّهَ عَلَيْهِ (پ ۲۱ آیت ۲۳)

کچھ لوگ ایسے بھی ہیں کہ انہوں نے جس بات کا اللہ سے عہد کیا تھا اس میں سچے اترے۔

سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں۔

إِنَّ الصِّدْقَ يَهْدِي إِلَى الْبِرِّ وَالْبِرُّ يَهْدِي إِلَى الْحَقِّ قَوْلُ الرَّجُلِ لِيَصْطِقَ حَتَّى يُكْتَبَ
عِنْدَ اللَّهِ صِدْقًا وَإِنْ الْكَذِبُ يَهْدِي إِلَى الْفُجُورِ وَالْفُجُورُ يَهْدِي إِلَى النَّارِ وَإِنْ
الرَّجُلُ لِيَكْذِبَ حَتَّى يُكْتَبَ عِنْدَ اللَّهِ كَذِبًا (بخاری و مسلم ابن مسعود)

سچائی نیکی کی راہ بتلاتی ہے، اور نیکی جنت کی طرف رہنمائی کرتی ہے اور آدمی سچ بولتا ہے یہاں تک کہ اللہ کے یہاں صدق لکھا جاتا ہے اور جھوٹ ہدیٰ کی راہ بتلاتا ہے اور ہدیٰ دوزخ کی طرف لے جاتی ہے، اور آدمی جھوٹ بولتا ہے یہاں تک کہ اللہ کے نزدیک جھوٹ لکھا جاتا ہے۔

صدق کی فضیلت کے لیے اتنا عرض کر دینا کافی ہے کہ صدق اسی لفظ سے مشتق ہے، اور اللہ تعالیٰ نے اسی لفظ کے ذریعے

انبیائے کرام کی مدح فرمائی ہے، چنانچہ ارشاد فرمایا۔

وَأَذْكُرُ فِي الْكِتَابِ الْإِسْرَافِيَّةَ كَانَتْ صِدْقًا نَبِيًّا (پ ۶۱ آیت ۴۱)

اور اس کتاب میں ابراہیم کا ذکر کرتے ہوئے یہی راستی والے پیغمبر تھے۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ اِسْمَاعِيْلَ اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُولًا نَّبِيًّا (پ ۴۲ آیت ۵۳)
اور اس کتاب میں اسماعیل کا ذکر بھی کیجئے بلاشبہ وہ وعدے کے پتے تھے اور وہ رسول بھی تھے نبی بھی تھے۔
وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ اِذْ رِيسُ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيقًا نَّبِيًّا (پ ۴۲ آیت ۵۶)
اور اس کتاب میں اوریس کا بھی ذکر کیجئے بے شک وہ بڑے راستی والے نبی تھے۔

حضرت عبداللہ ابن عباسؓ فرماتے ہیں چار خصلتیں جس میں ہوں وہ طہارح یاب ہے صدق، حیا، حسن خلق اور شکر۔ بشر ابن الحارثؓ کہتے ہیں جو شخص اللہ تعالیٰ سے صدق کا معاملہ کرتا ہے وہ لوگوں سے متوحش ہو جاتا ہے، ابو عبداللہ الرطلیؓ کہتے ہیں میں نے منصور دینوریؒ کو خواب میں دیکھا اور ان سے دریافت کیا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا ہے، انہوں نے جواب دیا اللہ تعالیٰ نے مجھے معاف کر دیا ہے، مجھ پر رحم فرمایا ہے، اور مجھے وہ رجب عطا کیا ہے جس کی مجھے امید بھی نہیں تھی میں نے ان سے دریافت کیا بندہ جن اعمال کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے ان میں سب سے اچھی چیز کیا ہے؟ فرمایا صدق، اور بدترین چیز کذب ہے، ابو سلیمان دارانیؒ کہتے ہیں صدق کو اپنی سواری بناؤ اور حق کو اپنی تلوار کا روپ دو، اللہ تعالیٰ کو اپنا مطلوب اعلیٰ قرار دو۔ ایک شخص نے کسی دانشمند سے پوچھا کہ آپ صدق کے متعلق کیا کہتے ہیں فرمایا اگر میں صادق ہوتا تو صادقین کی معرفت حاصل کر لیتا، محمد ابن علیؒ کہتے ہیں کہ ہم نے اللہ تعالیٰ کے دین کو تین ارکان پر مبنی پایا ہے، ایک صدق، دوم حق، سوم عدل، عدل کا تعلق دلوں سے ہے، حق کا اصحاء سے، اور صدق کا عقلموں سے۔ حضرت سفیان ثوریؒ نے قرآن کریم کی اس آیت کریمہ

وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ تَرَى الَّذِينَ كَذَبُوا عَلٰى اَلْوُجُوهِهِمْ مَسْوَدَةٌ (پ ۲۳ آیت ۶۰)

اور آپ قیامت کے دن ان لوگوں کے چہرے سیاہ دیکھیں گے جنہوں نے خدا پر جھوٹ بولا تھا۔

کی تفسیر میں ارشاد فرمایا ہے کہ یہ لوگ وہ ہیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی محبت کا دعویٰ کیا، لیکن وہ اس دعویٰ میں سچے نہیں تھے، اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام پر وحی نازل فرمائی کہ جو شخص اپنے باطن میں میری تصدیق کرتا ہے میں مخلوق کے سامنے کلمہ کمال اس کی تصدیق کرتا ہوں۔ ایک شخص شعلیؒ کی مجلس میں حج اٹھا اور دیکھتے ہی دیکھتے جگہ میں کود گیا، شعلیؒ نے فرمایا اگر یہ شخص سچا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے اسی طرح نجات عطا کرے گا جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نجات دی تھی، اور اگر جھوٹا ہے اللہ تعالیٰ اسے غرق فرمادے جس طرح قرون کو غرق کیا تھا، بعض لوگ کہتے ہیں کہ تمام فقہاء اور علماء کا تین خصلتوں پر اتفاق ہے کہ اگر وہ صحیح ہوں تو ان میں نجات ہے، اور وہ خصلتیں ایک دوسرے سے مل کر مکمل ہوتی ہیں بدعت و ہوی سے پاک اسلام، اعمال میں اللہ تعالیٰ کے لئے صدق، اور اکل حلال، وہب ابن منبہؒ کہتے ہیں کہ میں نے تورات کے حاشیہ پر بائیس جملے ایسے لکھے ہوئے دیکھے ہیں جنہیں بنی اسرائیل کے صلحاء اجتماعی طور پر پڑھایا کرتے تھے، وہ جملے یہ ہیں کوئی خزانہ علم سے زیادہ نفع بخش نہیں ہے، کوئی مال علم سے زیادہ سودمند نہیں ہے، کوئی حسب غصے سے کم تر نہیں ہے، کوئی ساتھی عمل سے زیادہ نعمت دینے والا نہیں ہے، کوئی رفیق جہل سے زیادہ عیب لگانے والا نہیں ہے، تقویٰ سے بڑھ کر کوئی شرف نہیں ہے، کوئی کرم ترک ہوی سے بڑھ کر نہیں ہے، کوئی عمل فکر سے افضل نہیں ہے، کوئی نیکی صبر سے اعلیٰ نہیں ہے، کوئی برائی کبر سے زیادہ رسوا کرنے والی نہیں ہے، کوئی دوا

فری سے زیادہ نرم نہیں ہے، کوئی مرض حماقت سے زیادہ تکلیف دینے والا نہیں ہے۔ کوئی رسول حق سے زیادہ عدل پرور نہیں ہے، کوئی دلیل صدق سے زیادہ فصاحت کرنے والی نہیں ہے، کوئی فقیری طمع سے زیادہ ذلیل نہیں ہے، کوئی مالدار جمع کرنے سے زیادہ ذلیل نہیں ہے، کوئی زندگی صحت سے زیادہ عمدہ نہیں ہے، کوئی معیشت پاکیزگی سے زیادہ خوش بھکار نہیں ہے، کوئی عبادت خشوع سے زیادہ اچھی نہیں ہے، کوئی زہد قناعت سے بہتر نہیں ہے، کوئی تمہیدان خاموشی سے زیادہ حفاظت کرنے والا نہیں ہے، کوئی غائب موت سے زیادہ قریب نہیں ہے۔ محمد ابن سعید المرؤزیؒ کہتے ہیں کہ جب تو اللہ تعالیٰ سے صدق کے ساتھ طلب کرتا ہے تو وہ حیرے ہاتھوں میں ایک آئینہ دے دیتا ہے، اس میں تو دنیا و آخرت کے تمام عجائب کا مشاہدہ کرتا ہے۔ ابو بکر الوراقؒ کہتے ہیں اپنے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان صدق کی حفاظت کر، ذوالنون مصریؒ سے دریافت کیا گیا کہ کیا بندہ کے

پاس اپنے امور کی اصلاح کی کوئی سبیل ہے، انہوں نے جواب میں یہ دو شعر پڑھے۔

قُلْنَا قِيَمْنَا مِنَ الذَّنُوبِ حَسْبَارِي طَلَبُ الصِّفْقِ مَا لَيْسَ سَبِيلُ
فَدَعَاوَى الْهَوَى نَحْفُفْ عَلَيْنَا وَجَلَّاهُ الْهَوَى عَلَيْنَا نَقِيلُ

(ہم گناہوں کی وجہ سے حیران پریشان کھڑے ہیں، صدق کہ حلالی میں مگر اس کا راستہ نہیں پاتے، عشق کے دعوے ہم پرست آسان ہیں، لیکن ہوا سے جس کی طاقت یہی مشکل ہے۔)

سل ستری سے کسی نے دریافت کیا کہ اس امر کی اصل کیا ہے جس کے ہم مشتاق ہیں، فرمایا صدق، سخاوت اور شجاعت، سائل نے عرض کیا کچھ اور زیادہ کیجئے فرمایا تقویٰ، حیا، اور پاکیزہ خُلاصہ۔ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے کمال کے متعلق دریافت کیا گیا، فرمایا حق بات کہتا، اور صدق پر عمل کرتا۔ حضرت جنید بغدادیؒ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں۔

لَيْسَ سَأَلَ الصَّادِقِينَ عَنْ صِفَتِهِمْ (پ ۲۱، آیت ۸) تاکہ ان بچوں سے ان کے حج کی تحقیقات کر لے۔

جو لوگ اپنے آپ کو صادق تصور کرتے ہیں ان کے صدق کا حال اللہ تعالیٰ کے یہاں کھلے گا، یہ معاملہ بڑا خطرناک ہے۔

صدق کی حقیقت، اس کے معنی اور مراتب : لفظ صدق کا اطلاق چھ معانی پر ہوتا ہے، قول میں صداقت، نیت میں صداقت، ارادے میں صداقت، عزم میں صداقت، عزیمت پر ادا کرنے میں صداقت، عمل میں صداقت، اور دین کے تمام مقامات کی تحقیق میں صداقت۔ جو شخص ان چھ معانی میں صدق کے ساتھ متصف ہو وہ صدیق ہے، اس لیے کہ لفظ صدیق صدق میں مبالغے پر دلالت کرتا ہے، پھر صادقین کے بہت سے درجات ہیں، جس شخص کو کسی خاص چیز میں صدق حاصل ہو گا وہ اس خاص چیز کے اعتبار سے صادق کہلائے گا جس میں اس کا صدق پایا جائے گا اب ہم ان تمام قسموں کی وضاحت کرتے ہیں۔

پہلا صدق لسان : یہ صدق اخبار میں، اور ان اقوال میں ہوتا ہے جو اخبار کو مستحسن ہوں خبر کا تعلق زمانہ ماضی سے بھی ہے، اور زمانہ مستقبل سے بھی، اس میں وقائے عمد، اور نقص عمد بھی داخل ہے، ہر بندے پر واجب ہے کہ وہ اپنے الفاظ کی حفاظت کرے، جب بھی زبان سے کوئی لفظ ادا کرے سچائی کے ساتھ ادا کرے، یہ صدق کی انتہائی منور اور واضح ترین قسم ہے، جو شخص اپنی زبان کی حفاظت کرے گا اور حقائق اشیاء کے خلاف نہ کہے گا وہ صادق کہلائے گا، لیکن اس صدق کے لیے کمال کے دو پہلو ہیں، ایک یہ کہ کنایات سے احتراز کرے، بعض لوگ کہتے ہیں کہ کنایات کا جموٹ جموٹ نہیں ہوتا، کنایات سے بچنا کمال صدق اس لیے ہے کہ یہ جموٹ کے قائم مقام ہے، جموٹ سے اس لیے منع کیا جاتا ہے کہ اس میں کسی چیز کو خلاف واقعہ بیان کیا جاتا ہے، لیکن کبھی اس کی ضرورت پڑتی ہے، اور مصالح کا تقاضا ہوتا ہے کہ جموٹ بولا جائے جیسے بچوں اور عورتوں کی تادیب و تہذیب کے لیے، ظالموں سے دفاع کرنے اور دشمنوں سے جنگ کرنے میں، یا ملک کے رازوں سے ان لوگوں کو دور رکھنے میں، اگر کسی شخص کو ان مواقع پر جموٹ بولنا پڑ جائے اور اس کے علاوہ بچاؤ کا کوئی راستہ نہ ہو تو صدق کی صورت یہ ہے کہ اللہ کے لیے وہ بات کہے جس کا حق حکم کرے، اور دین جس کا مقتضی ہو، جب اس طرح کہے گا تو صادق ہوگا، اگرچہ اس کے کلام سے غیر واقعہ معنوں سمجھا جائے، اصل میں صدق بذات خود مقصود نہیں ہے، بلکہ امر حق پر دلالت کرنے کی وجہ سے، اور اس لیے مقصود ہے کہ وہ حق کی طرف داعی ہے، اس لیے کسی کلام کے ظاہر پر نظر نہ رکھنی چاہیے، بلکہ معنی پر نظر دینی چاہیے، تاہم ایسے مواقع پر اگر کنایات استعمال کئے جائیں تو یہ زیادہ بہتر ہے تاکہ صریحی جموٹ سے احتراز ہو سکے، چنانچہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم جب (جہاد کے لیے) کسی سفر کا ارادہ فرماتے تو دوسروں سے چھپاتے تاکہ دشمنوں کو آپ کے ارادے کی خبر نہ ہو جائے (بخاری و مسلم۔)

کعب ابن مالک (اور یہ جموٹ نہیں ہے جیسا کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔)

لَيْسَ بِكَذَّابٍ مَنْ أَصْلَحَ بَيْنَ اثْنَيْنِ فَقَالَ خَيْرٌ الْوَأَمْسَى خَيْرًا (بخاری و مسلم۔ ام)

کلثوم بنت عقبہ ابن ابی معیط)

وَجْهَتْ وَجْهِي لِلَّذِي فَطَرَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ (پ ۷۱ آیت ۸۰)

اور اس کا دل اللہ تعالیٰ سے منحرف ہو، اور دنیا کی خواہشات اور آرزوں میں مشغول ہو تو یہ شخص جھوٹا ہے، اسی طرح اگر کوئی شخص زبان سے ایتنا کہ نَعْبُدُ (ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں) کہے یا یہ کہے کہ میں تیرا بندہ ہوں، اور اس کے اندر بندگی والی کوئی بات نہ ہو بلکہ وہ اپنے نفس کو یا دنیا کو یا شہوات دنیا کو اپنا معبود سمجھتا ہو تو ایسا شخص اپنے قول میں سچا نہیں کہا جائے گا، جو شخص کسی چیز کی غلامی کرتا ہے وہ اسی کا بندہ بن جاتا ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کے سرکشوں کو ان الفاظ میں خطاب فرمایا کرتے تھے کہ اے دنیا کے بندو! اور سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے:

نَعِيسُ عَبْدِ الدِّينَارِ، نَعِيسُ عَبْدِ الزَّهْرَمِ وَعَبْدُ الْحُلَّةِ وَعَبْدُ الْخَمِيصَةِ (بخاری- ابو ہریرہ)

اس حدیث میں ان لوگوں کی نسبت اسی چیز کی طرف کی گئی ہے جس کے وہ پابند ہیں اللہ تعالیٰ کا سچا بندہ وہ ہے جو پہلے غیر اللہ سے آزادی حاصل کرے، اس آزادی کے بعد دل خالی ہو جائے گا اور اس میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کا اعتقاد راسخ ہو جائے گا۔ یہ اعتقاد اسے اللہ تعالیٰ کی محبت میں مشغول کر دے گا اور اس کا ظاہر و باطن غیر اللہ کی ہر قید و بندش سے آزاد ہو کر اللہ کی اطاعت میں منہمک ہو جائے گا۔ اور اللہ کے سوا اس کی کوئی مراد باقی نہیں رہے گی اس مرتبے کے بعد بندہ اس سے اعلیٰ تر مقامات تک پہنچ جاتا ہے جسے حریت کہتے ہیں، یعنی اس بات سے آزاد ہو جاتا ہے کہ از خود اللہ کے لیے کوئی ارادہ کرے، بلکہ جو کچھ اللہ تعالیٰ اس کے لیے ارادہ کرتا ہے خواہ ابعاد کا یا قریب کا، اسی پر قانع ہو جاتا ہے اس کا ارادہ اللہ تعالیٰ کے ارادے میں فنا ہو جاتا ہے، ایسا شخص دو مرتبہ آزاد ہوتا ہے، ایک مرتبہ اس وقت جب وہ غیر سے آزاد ہوتا ہے، اور دوسری مرتبہ اس وقت جب وہ اپنے نفس سے آزاد ہوتا ہے، اس وقت وہ اپنے نفس کے اعتبار سے معذور اور اپنے آقا کے اعتبار سے موجود ہوتا ہے، اگر وہ اسے حرکت دیتا ہے تو حرکت کرتا ہے، ساکن کرتا ہے تو ساکن ہو جاتا ہے، اور اگر کسی مصیبت میں مبتلا کرتا ہے تو اس پر راضی رہتا ہے، اس میں کسی طلب، آرزو، درخواست، اور التماس و اعتراض کی گنجائش باقی نہیں رہتی بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے ایسا ہو جاتا ہے جیسے مردہ غسال کے سامنے، یہ صدق فی العبودیت کی اہمیت ہے، بندہ حق وہ ہے جس کا وجود معبود کے لیے ہو، اپنے نفس کے لیے نہ ہو، یہ صدیقین کا درجہ ہے، اور غیر اللہ سے حریت صادقین کے درجات میں سے ہے، اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی عبودیت حاصل ہوتی ہے، اس درجے سے پہلے نہ کسی

فخص کو صادق کہا جاسکتا ہے اور نہ صدیق۔

دوسرا صدق نیت و ارادہ : صدق نیت اور صدق ارادہ کا حاصل اخلاص ہے، یعنی بندہ اپنے ہر عمل، اور ہر حرکت و سکون میں صرف اللہ تعالیٰ کی نیت کرے، اگر اس میں حظوظ نفس کا اختلاط ہو گیا تو صدق نیت باطل ہو جائے گا اور ایسے شخص کو جس کے اعمال میں حظوظ نفس کا اختلاط ہو، جموعاً کہا جاسکتا ہے جیسا کہ ہم نے اخلاص کے فضائل کے ضمن میں تین افراد سے متعلق ایک روایت نقل کی ہے جن میں سے ایک عالم ہے، قیامت کے دن اس سے پوچھا جائے گا کہ اس نے علم کے مطابق کیا عمل کیا ہے؟ وہ جواب میں کہے گا کہ میں نے فلاں فلاں عمل کیا ہے، اللہ تعالیٰ فرمائے گا تو جموعاً کہتا ہے بلکہ تو نے یہ چاہا ہے کہ لوگ تجھے عالم کہیں، دیکھئے یہاں اس کے اعمال کی تردید نہیں کی گئی، بلکہ اس کی نیت کو جھٹلایا گیا ایک بزرگ کہتے ہیں کہ نیت میں صحت توحید کا نام صدق ہے۔ قرآن کریم میں ہے۔

وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اَنَّ الْمَنَافِقِيْنَ لَكَ اَذِبُوْنَ (پ ۲۸ ر ۳ آیت ۱)

اور اللہ کو اسی دیتا ہے کہ یہ منافقین جموعاً ہیں۔

یہ شہادت اس وقت دی گئی جب منافقین نے یہ کہا تھا۔

اِنَّكَ لَرَسُولُ اللّٰهِ (پ ۲۸ ر ۳ آیت ۱) بے شک آپ اللہ کے رسول ہیں۔

اگرچہ منافقین صحیح کہہ رہے تھے کہ محمد اللہ کے رسول ہیں، مگر ان کی زبانی شہادت کا اعتبار نہیں کیا گیا، بلکہ ان کے ارادے اور نیت کو دیکھتے ہوئے ان کے دعوے کو ہونے کا اعلان کیا گیا اور جو اعتقاد ان کے دل میں تھا اس کی تکذیب کی گئی، کیوں کہ تکذیب خبر کی ہوتی ہے، اور کفار کا یہ قول حال کے قرینے سے خبر پر مشتمل ہے، گویا کہنے والے اپنی زبان سے دل کے اعتقاد کی خبر دیتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ جو کچھ ہم زبان سے کہہ رہے ہیں وہی ہمارے دل میں ہے، ان کے اس دعویٰ کی تکذیب کی گئی کہ حال کے قرینے سے تم اپنے عقائد پر استدلال کرتے ہو، یہ جموعاً ہے، گویا ان کی تکذیب اعتقاد میں کی گئی، الفاظ میں نہیں کی گئی، صدق کے ایک معنی کا حاصل یہی ہے کہ نیت خالص ہو، اور یہی اخلاص ہے، ہر صادق کا عظم ہونا ضروری ہے۔

تیسرا صدق عزم : بعض اوقات انسان کسی چیز کا عزم کرتا ہے، اور اپنے دل میں کہتا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے مال عطا کیا تو میں وہ تمام مال صدقہ کروں گا یا اس کا نصف اللہ کی راہ میں خرچ کروں گا یا اگر میں نے کسی دشمن خدا کا سامنا کیا تو میں اس سے جہاد کروں گا، اور اس کی بھی پروا نہیں کروں گا کہ قتل کر دیا جاؤں، اور اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے حکومت عطا کی تو میں عدل و انصاف کے ساتھ حکمرانی کے فرائض انجام دوں گا، اور ظلم و ستم یا حقوق کے ساتھ جانبدارانہ رویہ رکھ کر میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہیں کروں گا، یہ عزم کبھی تو دل پر اس طرح وارد ہوتا ہے کہ کسی خارجی یا داخلی اثر سے اس میں واقع نہیں ہوتا یہ ایک عزم جازم ہوتا ہے، اور کبھی اس میں تردد، انحراف یا ضعف ہوتا ہے یہ صدق فی العزمیت نہیں ہے، صدق فی العزمیت یہ ہے کہ آدمی اپنے عزم میں راسخ، ارادے میں پختہ ہو جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص کو شہوت صادقہ ہے یعنی اس کی اشتہا مکمل ہے، اور کبھی کسی مریض کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کی شہوت کا ذبہ ہے، یہ اس وقت کہا جاتا ہے جب اس کی شہوت کسی مضبوط اور پختہ سبب سے نہ ہو، یا ضعیف ہو، گویا جب ہم ان معنوں میں لفظ صدق بولتے ہیں تو صادق یا صدیق سے ہماری مراد وہ شخص ہوتا ہے جس کا عزم خیر کے سلسلے میں مکمل اور قوی ہو، نہ اس میں انحراف ہو، نہ ضعف اور تردد ہو، اس عزم کی مثال حضرت عمر ابن الخطاب کا یہ ارشاد ہے کہ اگر میری گردن کنوا دی جائے تو یہ میرے نزدیک ایسی قوم کا امیر بننے سے بہتر ہے جس میں حضرت ابو بکرؓ ہوں، گویا ان کے دل نے یہ عہد کر لیا تھا کہ وہ حضرت ابو بکرؓ کی موجودگی میں منصب امارت نہیں سنبھالیں گے، اس عہد کی انہوں نے اپنے قتل کئے جانے کو ترجیح دے کر ناکید کر دی عزم کے سلسلے میں صادقین کے مختلف مراتب ہیں، کبھی عزم ہوتا ہے لیکن اس درجے کا نہیں ہوتا کہ قتل کیا جانا پسند ہو، لیکن عزم کر کے پیچھے ہٹنا پسند نہ ہو، اور کبھی عزم ہوتا ہے لیکن اس حد تک نہیں کہ قتل کی پروا بھی نہ کرے، ایسے شخص کا عزم قتل کے ذکر سے باقی نہیں رہتا، ان مومنین صادقین میں ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں اگر یہ اختیار

دیا جائے کہ وہ اپنے یا حضرت ابو بکر الصديقؓ میں سے کس کی زندگی پسند کرتے ہیں تو اپنی زندگی کی پروا نہ کریں اور حضرت ابو بکر کی زندگی کو ترجیح دیں۔

چوتھا صدق وفائے عزم : بعض اوقات آدمی عزم کر لیتا ہے، لیکن کہ عزم کرنے میں کچھ نہیں جاتا، لیکن جب اس عزم کے مطابق عمل کرنے کا موقع آتا ہے، اور قدرت بھی حاصل ہوتی ہے، اور شہوات زور کرتی ہیں تو تمام عزم دھڑے رہ جاتے ہیں، شہوات غالب آجاتی ہیں اور عزم پورا ہونا مشکل ہو جاتا ہے یہ صورت حال صدق وفائے عزم کے خلاف ہے۔ خداوند کریم کا ارشاد ہے:

رِحَالٌ صَدَقُوا مَا عَاهَدُوا اللَّهَ عَلَيْهِ (پ ۱۱ ر ۱۲ آیت ۲۳)

کچھ لوگ ایسے بھی ہیں کہ انہوں نے جس بات کا اللہ سے عہد کیا تھا اس میں بچے اترے۔

حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں کہ ان کے چچا انس ابن النضرؓ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غزوہ بدر میں شرکت نہ کر سکے، اس کا ان کے دل پر بڑا اثر ہوا، اور وہ کہنے لگے کہ یہ شہادت کا پہلا موقع تھا جس میں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم تو شریک ہوئے اور میں غائب رہا، اگر مجھے اب ایسا کوئی موقع جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ملا تو اللہ دیکھ لے گا میں کیا کروں گا؟ راوی کہتے ہیں کہ اگلے سال وہ جنگ احد میں شریک ہوئے، اسی دوران ان کی ملاقات حضرت سعد ابن معاذؓ سے ہوئی، سعد نے ان سے پوچھا کہ ابو عمر کدھر چل دیئے؟ فرمایا جنت کی خوشبو دلاؤ ہے، یہ خوشبو احد کی طرف سے آرہی ہے (راوی کہتے ہیں کہ) انہوں نے احد میں شرکت کی اور اس قدر لڑے کہ شہید ہو گئے، آپ کے جسم پر تیر، تلوار اور نیزے کے اسی سے زائذ زخم تھے، آپ کی بن کستی ہیں کہ میرے بھائی کے جسم پر اتنے زخم تھے کہ میں انہیں پہچان نہ سکی، میں نے انہیں انگلیوں کے پوروں سے پہچانا، اس واقعہ پر مذکورہ بالا آیت نازل ہوئی۔ (ترمذی، نسائی) احد کے دن اسعوب ابن معیرؓ جو سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی فوج کے علم بردار تھے شہید ہو گئے، آپ ان کے قریب کھڑے ہوئے اور یہ آیت تلاوت فرمائی۔ (ابو نعیم فی الحلیہ۔ عبید ابن عمیر مرسل) رِحَالٌ صَدَقُوا مَا عَاهَدُوا اللَّهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُمْ مَنْ قَضَىٰ نَحْبَهُ وَمِنْهُمْ مَنْ يَنْتَظِرُ (پ ۱۱ ر ۱۲ آیت ۲۳)

کچھ لوگ ایسے بھی ہیں کہ انہوں نے جس بات کا اللہ سے عہد کیا تھا اس میں بچے اترے مگر بعض ان میں

وہ ہیں جو اپنی نذر پوری کر چکے اور بعض ان میں شقاق ہیں۔

فضالہ ابن عبیدؓ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عمر ابن الخطابؓ سے سنا، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا شہداء چار طرح کے ہوتے ہیں، ایک وہ صاحب ایمان شخص جس کا ایمان پختہ ہوتا ہے اور جو دشمن کا مقابلہ کر کے اللہ کی تصدیق کرتا ہے اور شہادت سے ہم کنار ہو جاتا ہے، یہ ایسا شخص ہے کہ قیامت کے دن لوگ اسے اس طرح سر اٹھا اٹھا کر دیکھیں گے (یہ کہہ کر آپ نے اپنا سر مبارک اٹھا اور اٹھایا کہ گلاہ مبارک نیچے گر پڑی) راوی کہتے ہیں کہ میں نہیں جانتا کہ سر اٹھانے سے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی گلاہ مبارک نیچے گری یا حضرت عمرؓ کی۔ دوسرا وہ مومن ہے جس کا ایمان عمدہ ہے، جب اس نے دشمن کا سامنا کیا تو گویا اس کی آنکھوں میں تیر گھونپ دیئے، اس پر ایک تیر آکر لگا اور وہ شہید ہو گیا، یہ دوسرے درجے میں ہے، تیسرا وہ مومن ہے جس کے اعمال میں اچھے اور برے دونوں طرح کے اعمال ہوں، جب وہ دشمن خدا سے ملا تو اس نے اللہ تعالیٰ کی تصدیق کی اور شہید ہو گیا، یہ تیسرے درجے میں ہے، چوتھا وہ مومن ہے جس نے اپنے نفس پر ظلم کیا ہے، وہ دشمن سے ملا اور اس نے اللہ کی تصدیق کی یہاں تک کہ قتل ہو گیا یہ چوتھے درجے میں ہے (ترمذی) حضرت مجاہدؓ کہتے ہیں کہ وہ شخص مجمع عام میں آئے، اور کہنے لگے کہ اگر اللہ تعالیٰ ہمیں مال عطا کرے گا تو ہم صدقہ دیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں مال عطا کرے، مگر انہوں نے مل کر کیا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

وَمِنْهُمْ مَنْ عَاهَدَ اللَّهُ لَئِنْ آتَانَا مِنْ فَضْلِهِ لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَكُونُ مِنَ الصَّالِحِينَ (پ ۱۱ ر ۱۲ آیت ۵۵)

اور ان (منافقین) میں بعض آدمی ایسے ہیں کہ خدا تعالیٰ سے عہد کرتے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ ہم کو اپنے

فضل سے (بت سامال) عطا فرمائے تو ہم خوب خیرات کریں اور ہم خوب نیک کام کیا کریں۔
 بعض لوگ کہتے ہیں انہوں نے زبان سے یہ عہد نہیں کیا تھا، بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں روشن کر دیا تھا، جب انہیں
 مال دیا گیا اور انہوں نے عمل کر کے عہد کی خلاف ورزی کی تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔
 وَمِنْهُمْ مَنْ عَاهَدَ اللَّهُ لَنْ آتَيْنَا مِنْ فَضْلِهِ يَخْلُوعُوا بَعْضُهُمْ مَعْرُضُونَ فَأَعْقَبَهُمْ
 نِفَاقًا فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ يَلْقَوْنَ رَبَّهُ بِمَا أَخْلَفُوا ۚ اللَّهُ مَا وَعَدْنَاهُ وَيَمَّا كَانُوا يَكْذِبُونَ
 (پ ۱۰ آیت ۷۵-۷۷)

اور ان (منافقین) میں بعض آدمی ایسے ہیں کہ خدا تعالیٰ سے عہد کرتے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ ہم کو اپنے
 فضل سے (بت سامال) عطا فرمائے تو ہم خوب خیرات کریں اور ہم خوب نیک کام کیا کریں، سو جب اللہ تعالیٰ
 نے ان کو اپنے فضل سے (مال) دے دیا تو وہ اس میں عمل کرنے لگے اور وہ روگردانی کے عادی ہیں، سو اللہ
 تعالیٰ نے اس کی سزا میں ان کے دلوں میں نفاق (قائم) کر دیا (جو) خدا کے پاس جانے تک رہے گا، اس سبب
 سے کہ انہوں نے خدا تعالیٰ سے اپنے وعدے میں خلاف کیا اور اس سبب سے کہ وہ جھوٹ بولتے تھے۔

یہاں عزم کو عہد، خلاف عہد کو کذب، اور وفائے عہد کو صدق کہا گیا ہے، یہ صدق تیسرے صدق سے زیادہ سخت ہے، اس
 لیے کہ بعض اوقات نفس عزم تو کر لیتا ہے، لیکن جب عمل کا وقت آتا ہے تو شہوات کا بیجان، اور اسباب کی فراہمی اسے عمل سے
 باز رکھتی ہے۔ اسی لیے حضرت عمرؓ نے استثناء کیا تھا جب یہ فرمایا تھا کہ مجھے اس قوم کا امیر بننے کے مقابلے میں جس میں حضرت
 ابوبکر موجود ہیں قتل کئے جانا پسند ہے، اسی وقت آپؐ نے یہ بھی فرمایا تھا بشرطیکہ اللہ تعالیٰ اس وقت میرے دل میں کوئی بات ایسی
 پیدا نہ کرے جو اس وقت میرے دل میں موجود نہیں ہے، کیوں کہ میں اپنے نفس سے مامون نہیں ہوں، ہو سکتا ہے جب قتل کا
 وقت آئے تو اپنے عزم سے پھر جائے گویا حضرت عمرؓ نے اپنے اس ارشاد کے ذریعے وفائے عزم کی شدت کی طرف اشارہ فرمایا۔
 ابوسعید الخدریؓ کہتے ہیں کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ دو فرشتے آسمان سے اترے ہیں، اور وہ مجھ سے پوچھ رہے ہیں کہ صدق کیا
 ہے؟ میں نے کہا وفائے عہد کا نام صدق ہے، فرشتوں نے میری تائید کی اور آسمان کی طرف چلے گئے۔

پانچواں صدق اعمال : صدق اعمال یہ ہے کہ وہ اس امر کے لیے کوشاں رہے کہ اس کے ظاہری اعمال باطن کی کسی ایسی بات
 پر دلالت نہ کریں جو واقع میں نہ ہو صدق اعمال کا یہ مطلب نہیں کہ اعمال ترک کر دیئے جائیں، بلکہ بندہ کا باطن ایسا ہونا چاہیے
 جس سے ظاہر کی تصدیق ہو، یہ بات ترک ریا کے خلاف ہے جس کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں ریا کا وہ شخص ہے جو یہ چاہتا ہے کہ اس
 کے اعمال کی بنا پر لوگ اسے ان صفات حمیدہ سے متصف سمجھیں جو ان اعمال سے ظاہر ہوتی ہیں، بہت سے نمازی اپنی نماز میں
 خشوع و خضوع کی ہیئت اختیار کرتے ہیں، اگرچہ ان کا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ لوگ انہیں دیکھیں، تاہم ان کا دل نماز میں غافل رہتا
 ہے، دیکھنے والا یہ سمجھتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑا ہوا ہے حالانکہ وہ باطن سے بازار میں کھڑا ہوا ہے، اور اپنی کسی شہوت
 میں مشغول ہے، یہ اعمال زبان حال سے باطن کا حال کہتے ہیں، اور حقیقت میں باطن ایسا نہیں ہوتا، اس لیے وہ جھوٹ سے متصف
 ہوتے ہیں، اور ان سے صداقت اعمال کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ بعض لوگ بڑے سکون اور وقار کے ساتھ چلتے ہیں حالانکہ ان کے
 باطن میں نہ وقار ہوتا ہے اور نہ سکون، یہ لوگ بھی اپنے اعمال میں صادق نہیں ہوتے، اگرچہ وہ نہ مخلوق کی طرف التفات رکھتے
 ہیں، اور نہ ان کا مقصد ریا ہوتا ہے، اعمال کے جھوٹ سے وہی شخص محفوظ رہ سکتا ہے جس کا ظاہر و باطن یکساں ہو، یا جس کا باطن
 ظاہر سے بہتر ہو، اسی ذرے بعض لوگ اپنا ظاہر ایتر اور لباس پر اگندہ رکھتے تھے تاکہ کوئی شخص ان کے ظاہر سے باطن کے خیر پر
 استدلال نہ کرے، اگر باطن ظاہر کے مطابق اچھا نہ ہو اور لوگ اچھا سمجھتے تو یہ کذب ہو گا۔ اگر ظاہر باطن سے قصداً مخالف ہو گا تو
 اس کا نام ریا رکھا جائے گا اور اس کی وجہ سے اخلاص فوت ہو جائے گا، اور اگر بلا قصد ہو تو اس سے صدق ضائع ہو جاتا ہے، اسی
 لیے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا فرمایا کرتے تھے۔

اللَّهُمَّ اجْعَلْ سِرِّي زَيْنِي خَيْرَ امْنٍ عَلَّائِيْنِي وَاجْعَلْ عَلَّائِيْنِي صَلَاحَةً

اے اللہ میرے باطن کو میرے ظاہر سے اچھا کر اور میرے ظاہر کو اچھا بنا

یزید ابن الحرث کہتے ہیں کہ اگر بندہ کا باطن ظاہر کے مطابق ہو تو یہ بدل ہے اور اگر باطن ظاہر سے بہتر ہو تو یہ کمال ہے اگر ظاہر باطن سے بہتر ہو تو یہ ظلم ہے اس کے بعد آپ نے یہ تین شعر پڑھئے۔

اِذَا السِّرُّ وَالْاَعْلَانُ فِي الْمُؤْمِنِ اسْتَوَى فَقَدْ عَزَّ فِي الدَّرَجَاتِ وَاسْتَوْحَبَ الثَّنَا
فَإِنْ خَالَفَ الْاَعْلَانُ سِرًّا فَمَالَهُ عَلَيَّ سَعْيِهِ فَضْلٌ سِوَى الْكُذْرِ وَالْعَنَا
فَمَا خَالِصُ الدِّيْنَارِ فِي السُّوقِ نَافِقٌ وَمَعْشُوشَةُ الْمَرْكُودِ لَا يَفْتَضِي الْمُنَا

اگر مومن کا ظاہر و باطن یکساں ہو تو یہ اس کے لیے دنیا و آخرت میں عزت کا باعث ہے اور اس سے اس کی

تعریف ہوتی ہے اگر ظاہر باطن کے خلاف ہو تو اس کی تمام کوششیں بیکار اور برباد ہیں بازار میں کھرا سکتے چل

ہے اور کھوتا دکھایا جاتا ہے۔

عطیۃ ابن الغافر کہتے ہیں کہ جب مومن کا باطن ظاہر کے مطابق ہو تا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی وجہ سے ملائکہ پر فخر کرتا ہے اور فرماتا ہے کہ یہ میرا سچا بندہ ہے معاویہ ابن قرۃ کہتے ہیں کہ کون ہے جو مجھے ایسے شخص کا پتا بتلائے جو راتوں کو دوتا ہو اور دن میں ہستا ہو عبد الواحد ابن زید کہتے ہیں کہ حضرت حسن بصری جب کسی کو کوئی بات بتلاتے تو اس پر سب سے زیادہ عمل کرتے اور جب کسی کو کسی بات سے روکتے تو خود پہلے وہ کام ترک کرتے میں نے کوئی ایسا شخص نہیں دیکھا جس کے ظاہر و باطن میں اس قدر مشابہت ہو ابو عبد الرحمن کہا کرتے تھے اے اللہ تو نے میرے اور لوگوں کے درمیان امانت کا معاملہ کیا اور میں نے تیرے اور اپنے درمیان خیانت کا معاملہ کیا وہ یہ کہہ کر رویا کرتے تھے ابو یعقوب نیرجوری کہتے ہیں کہ صدق یہ ہے کہ ظاہر و باطن حق کے باب میں ایک دوسرے سے موافقت رکھتے ہوں۔ معلوم ہوا کہ باطن اور ظاہر کی مساوات بھی صدق کی ایک قسم ہے۔

چھٹا صدق مقامات : یہ صدق کا انتہائی اعلیٰ اور کیا ب درجہ ہے اس کا تعلق دین کے مقامات سے ہے جیسے خوف و رجاء، تعظیم، زہد، رضا، توکل، اور محبت وغیرہ میں صدق ان امور کے کچھ مبادی ہیں جب یہ ظاہر ہوتے ہیں تو ان پر مذکورہ بالا الفاظ کا اطلاق ہوتا ہے اور کچھ غایات اور حقائق ہیں محقق صادق وہ ہے جو ان امور کی حقیقت تک پہنچ جائے جب کوئی چیز غالب اور اس کی حقیقت کھل ہو جاتی ہے تو اس سے متصف ہونے والے شخص کو صادق کہتے ہیں چنانچہ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص لڑائی میں سچا ہے یعنی لڑائی اس پر غالب ہے یا فلاں شخص خوف میں سچا ہے یعنی خوف کی حقیقت اس پر تمام ہوتی ہے یا یہ شہوت بھی ہے وغیرہ۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

اَتَمَّا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ لَمْ يَزْنَابُوا وَجَاهَلُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَكِنَّهُمْ الصَّادِقُونَ (پ ر آیت)

پورے مومن وہ ہیں جو اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان لائے پھر تک نہیں کیا اور اپنے مال و جان سے

خدا کے راستے میں جہاد کیا یہ لوگ ہیں۔

وَالَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّينَ وَآتَى الْمَالَ عَلَى حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَى وَالْيَتَامَى وَالْمَسَاكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ وَالسَّائِلِينَ وَفِي الرِّقَابِ وَأَقَامَ الصَّلَاةَ وَآتَى الزَّكَاةَ وَالْمُوفُونَ بِعَهْدِهِمْ إِذَا عَاهَدُوا وَالصَّابِرِينَ فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ وَحِينَ الْبَأْسِ أُولَئِكَ الَّذِينَ صَبَقُوا (پ ۶۲ آیت ۷۷)

(کچھ) کمال اسی میں نہیں کہ تم اپنا منہ مشرق کو کر لو یا مغرب کو لیکن (اصل) کمال تو یہ ہے کہ کوئی شخص

اللہ تعالیٰ پر یقین رکھے اور قیامت کے دن پر اور فرشتوں پر اور کتابوں پر اور پیغمبروں پر اور مال دینا ہو اللہ کی

محبت میں رشتہ داروں کو، اور قییموں کو اور محتاجوں کو، اور (بے خرچ) مسافروں کو، اور سوال کرنے والوں کو، اور گردن چھڑانے میں، اور نماز کی پابندی رکھتا ہو، اور ذکوۃ بھی ادا کرتا ہو، اور جو اشخاص اپنے ممدوں کو پورا کرنے والے ہیں جب ممد کر لیں اور (وہ لوگ) مستقل رہنے والے ہوں تنگدستی میں، اور بیماری میں اور قتال میں، یہ لوگ ہیں جو سچے ہیں۔

حضرت ابوذر غفاریؓ سے کسی نے ایمان کے بارے میں سوال کیا، آپ نے جواب میں یہی آیت پڑھ کر سنا دی، سائل نے کہا ہم تو آپ سے ایمان کے متعلق دریافت کرنا چاہتے ہیں، فرمایا میں نے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایمان کا حال دریافت کیا تھا، آپ نے بھی یہی آیت تلاوت فرمائی تھی (محمد ابن نصر الموزی ہاشد منقطعاً) اب ہم خوف کی مثال بیان کرتے ہیں، جو بندہ اللہ تعالیٰ پر، اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے اسے اللہ کا خوف ہوتا ہے، لیکن یہ خوف اتنا ہوتا ہے کہ اس پر لفظ خوف کا اطلاق ہو سکے، خوف کی حقیقت اس پر صادق نہیں آتی، یہاں تک کہ یہ کہا جاسکے کہ وہ خوف خدا میں صادق ہے، اور ہمارے اس دعویٰ کی دلیل یہ ہے کہ جب کوئی انسان کسی بادشاہ سے ڈرتا ہے، یا سفر کے دوران اسے کسی رہزن کا خوف ہوتا ہے تو اس کا رنگ زرد پڑ جاتا ہے، ہاتھ پاؤں لرزنے لگتے ہیں، زندگی کا لطف مکدر ہو جاتا ہے، کھانا پینا حرام ہو جاتا ہے، نیند اڑ جاتی ہے، حواس معطل ہو جاتے ہیں، یہاں تک کہ بیوی بچوں کے کام کا بھی نہیں رہتا، ہر وقت پریشان، مضطرب، آزرده خاطر، اور پر آئندہ مزاج نظر آتا ہے، کبھی نوبت یہاں تک پہنچتی ہے کہ خوف کی وجہ سے وطن ترک کر دیتا ہے، اور گھر کے عیش و آرام کو غیر مانوس سرزمین کی مشقت اور تکلیف پر قربان کر دیتا ہے، ایک طرف ہمارے سامنے آدمی پر خوف کی یہ مثال ہے۔ دوسری طرف ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ایک شخص دوزخ سے ڈرتا ہے، لیکن نہ وہ کانپتا ہے، نہ کھانا پینا اور سونا ترک کرتا ہے، نہ گھبرا کر بیوی بچوں سے جدائی اختیار کرتا ہے، معاصی کا مرتکب ہوتا ہے، اور اس کے حال سے کسی پریشانی یا خوف کا اظہار نہیں ہوتا، اسی لیے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں۔

لَمْ أَرِ مِثْلَ النَّارِ نَامَ هَارٍ بِهَا وَلَا مِثْلَ الْجَنَّةِ نَامَ طَلِبُهَا (۱)

میں نے دوزخ جیسی کوئی چیز نہیں دیکھی جس سے فرار اختیار کرنے والا سو رہا ہو اور نہ جنت جیسی کوئی چیز دیکھی جس کا طالب خواب غفلت میں ہو۔

ان امور کی تحقیق نہایت دشوار ہے، اور ان مقامات کی انتہا نامعلوم ہے، اس لیے ان کا تمام و کمال حصول ناممکن ہے، تاہم ان امور میں سے ہر شخص کو اس کے حال کے مطابق حصہ ملتا ہے، خواہ ضعیف ہو یا قوی، اگر قوی ہو تو کہا جائے گا کہ یہ بندہ صادق ہے۔ بہر حال اللہ تعالیٰ کی معرفت، اس کی عظمت اور اس کے خوف کی کوئی انتہا نہیں ہے، سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ حضرت جبرئیل علیہ السلام سے فرمایا کہ میں تمہیں تمہاری اصل صورت میں دیکھنا چاہتا ہوں، انہوں نے کہا آپ دیکھ نہیں سکیں گے، فرمایا نہیں مجھے دکلاؤ، حضرت جبرئیل نے چاندنی رات میں بقیع کا وعدہ کیا، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم (وعدے پر) تشریف لے گئے اور حضرت جبرئیل علیہ السلام کو دیکھا کہ انہوں نے آسمان کے کناروں یعنی افق کو ڈھانپ رکھا ہے، آپ یہ منظر دیکھ کر بے ہوش ہو گئے جب افادہ ہوا تو حضرت جبرئیل علیہ السلام اپنی پہلی صورت پر واپس آ گئے، سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر آپ اسرائیل (علیہ السلام) کو دیکھ لیں تو کیا ہو، عرش معلیٰ ان کے کاندھوں پر ہے اور ان کے دونوں پاؤں زمین کی چلی سطح میں اترے ہوئے ہیں، اس کے باوجود اللہ کی عظمت سے اس قدر سکتے ہیں کہ ایک چھوٹی چڑیا بن جاتے ہیں۔ (۲) دیکھئے حضرت اسرائیل علیہ السلام پر اللہ تعالیٰ کی کس قدر عظمت اور بیت طاری ہوتی ہوگی کہ وہ سمٹ سکر کر چھوٹی چڑیا کے برابر ہو جاتے تھے، لیکن تمام فرشتے ایسے نہیں ہوتے، کیوں کہ درجات میں بڑا تفاوت ہے، سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں معراج کی شب میں گذرا تو میں نے دیکھا کہ جبرئیل اللہ کے خوف سے ایسے تھے جیسے پرانی چادر یعنی وہ کپڑا جو

(۱) یہ روایت پہلے ہی گذری ہے۔ (۲) یہ روایت پہلے ہی گذری ہے

اونٹ کی پشت پر ڈالا جاتا ہے (نبیؐ۔ انسؓ) اسی طرح صحابہؓ بھی خوف و خشیت سے لرزاں رہتے تھے، لیکن ان کا خوف اس درجے کا نہیں تھا جس درجے کا خوف سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا تھا، حضرت عبداللہ ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ جب تک تم لوگوں کو اللہ کے دین میں احق نہیں جانو گے تب تک ایمان کی حقیقت تک رسائی حاصل نہ کرو گے، طرف مکتے ہیں کہ کوئی شخص ایسا نہیں جو اپنے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان احق نہ ہوتا، ہم بعض لوگ بعض کی نسبت کم احق ہیں، سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ کوئی بندہ اس وقت تک ایمان کی حقیقت تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا جب تک کہ لوگوں کو اللہ کے سامنے اونٹوں کے مانند نہ دیکھے پھر اپنے نفس کی طرف رجوع کرے اور اسے سب سے زیادہ حقیر پائے (۱)

صادقین کے درجات : اس پوری گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ ان مقامات میں صدق کے بے شمار درجات ہیں، بعض اوقات بندے کو بعض امور میں صدق ہوتا ہے، اور بعض میں نہیں ہوتا، اگر وہ تمام امور میں صادق ہو تو ایسا شخص حقیقت میں صدیق ہے، حضرت سعد ابن معاذؓ فرماتے ہیں کہ میں تین باتوں میں پختہ ہوں، اور ان تین کے علاوہ میں کمزور ہوں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ اسلام لانے کے بعد میں نے کبھی کوئی نماز ایسی نہیں پڑھی کہ دل میں یہ تصور پیدا ہوا ہو کہ میں اس سے کب فارغ ہوں گا، دوسرے یہ کہ جب بھی کسی جنازے کے ساتھ گیا دل میں یہی خیال رہا کہ اس مردہ شخص سے قبر میں یہ سوالات ہوں گے، اور وہ یہ جوابات دے گا، دفن سے فراغت تک اس خیال کے علاوہ دل میں کوئی دوسرا خیال نہیں آیا، تیسری یہ ہے کہ جب بھی میں نے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے کچھ سنا اس یقین کے ساتھ سنا کہ حق یہی ہے جو آپ فرماتے ہیں، حضرت ابن المسیبؓ نے یہ سن کر فرمایا کہ میرے خیال میں یہ تینوں خوبیاں بیک وقت نبی کے علاوہ کسی شخص میں جمع نہیں ہوتیں ان امور مذکورہ میں حضرت سعد ابن معاذؓ کی صداقت سچی کہنے ہی صحابہؓ ایسے ہیں جنہوں نے نمازیں بھی پڑھیں، اور جنازوں کی بھی مشابحت کی، لیکن وہ اس درجے تک نہیں پہنچے، یہ ہیں صدق کے درجات، اس کے معانی، صدق کے سلسلے میں مشائخ سے جو اقوال منقول ہیں ان میں سے اکثر مذکورہ معانی میں سے ایک سے تعرض کرتے ہیں، البتہ ابو بکرؓ راقی کہتے ہیں کہ صدق کی تین قسمیں ہیں صدق توحید، صدق اطاعت، اور صدق معرفت۔ صدق توحید کا تعلق عام مومنین سے ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وَالَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ أُولَٰئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ (پ ۱۸، آیت ۱۹)

اور جو لوگ اللہ پر اور اس کے رسولوں پر ایمان رکھتے ہیں ایسے ہی لوگ اپنے رب کے نزدیک صدیق ہیں۔ صدق اطاعت اہل علم اور اصحاب تقویٰ سے تعلق رکھتا ہے، اور صدق معرفت ان اہل ولایت کے ساتھ مخصوص ہے جو زمین کی میٹھیں ہیں۔ یہ تینوں قسمیں گہوم پھر کر انہی چھ قسموں میں مدغم ہو جاتی ہیں جو ہم نے بیان کی ہیں۔ ویسے بھی انہوں نے وہ چیزیں لکھی ہیں جن میں صدق ہوتا ہے، مگر ان کا احاطہ نہیں کیا۔ حضرت جعفر صادقؓ فرماتے ہیں کہ صدق مجاہدہ ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ تو اللہ پر غیر کو اختیار نہ کرے جیسے اس نے تجھ پر غیر کو اختیار نہیں کیا، چنانچہ ارشاد فرماتا ہے۔

هُوَ أَحَبُّ بَاكُمْ (پ ۱۷، آیت ۷۸) اس نے تم کو (اور) امتوں سے ممتاز فرمایا۔

بیان کیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وحی نازل فرمائی کہ میں جب کسی بندے کو اپنا محبوب بنا لیتا ہوں تو اس پر ایسی مصیبتیں اور آفتیں نازل کرتا ہوں جو اگر پہاڑوں پر نازل کی جائیں تو ہواشت نہ کر سکیں، میں یہ دیکھتا ہوں کہ وہ میری مصیبتوں میں کیسے صدق اختیار کرتا ہے، اگر وہ صبر کرتا ہے تو میں اسے اپنا دوست اور محبوب بنا تا ہوں، اور اگر داؤد چا کر مخلوق سے میری شکایت کرتا ہے تو میں اسے رسوا کرتا ہوں اور کوئی پروا نہیں کرتا صدق کی علامت یہ ہے کہ مصائب اور اطاعت دونوں کی پردہ پوشی کی جائے، اور مخلوق کی ان پر اطلاع کو برد تصور کیا جائے۔

کتاب المراقبة والمحاسبة

مراقبہ اور محاسبیہ کا بیان

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔

وَنَضَعُ الْمَوَازِينَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيَامَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا وَإِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِنْ خَيْرٍ لَدُنَّا آتَيْنَاهَا وَكَفَىٰ بِنَا حَاسِبِينَ (پ ۱۷۷ آیت ۴۷)

اور قیامت کے روز ہم میزان عدل قائم کریں گے، سو کسی پر امدلاً ظلم نہ ہوگا، اور اگر (کسی کا عمل) رائی کے دانے کے برابر بھی ہوگا تو ہم اس کو (وہاں) حاضر کر دیں گے، اور ہم حساب لینے والے کافی ہیں۔

وَوَضِعَ الْكِتَابَ فَتَرَى الْمُخْرَجِينَ مِنْ مِثْقَلَيْنَ مِمَّا فَيُوقَوْنَ بِأَوْ ثُلُثِنَا مَا لِهَذَا الْكِتَابِ لَا يُغَادِرُ صَغِيرَةً وَلَا كَبِيرَةً إِلَّا أَحْصَاهَا وَوَجَدُوا مَا عَمِلُوا حَاضِرًا وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ أَحَدًا (پ ۱۷۵ آیت ۴۵)

اور نامہ اعمال رکھ دیا جائے گا تو آپ مجرموں کو دیکھیں گے کہ اس میں جو کچھ لکھا ہوگا اس سے ڈرتے ہوں گے اور کہتے ہوں گے کہ ہائے ہماری کم نعتی اس نامہ اعمال کی عجیب حالت ہے کہ بلا قلمبند کئے ہوئے نہ کوئی چھوٹا گناہ چھوڑا نہ بڑا گناہ اور جو کچھ انہوں نے کیا وہ (لکھا ہوا) موجود پائیں گے، اور آپ کا رب کسی پر ظلم نہ کرے گا۔

يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللَّهُ جَمِيعًا فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوا أَحْصَاهُ اللَّهُ وَسُوهُ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ (پ ۱۷۸ آیت ۱)

جس روز ان سب کو اللہ تعالیٰ دوبارہ زندہ کرے گا پھر ان کا سب کیا ہوا ان کو بتلا دے گا (کیوں کہ) اللہ

تعالیٰ نے وہ محفوظ کر رکھا ہے اور یہ لوگ اس کو بھول گئے اور اللہ ہر چیز پر مطلع ہے۔

يَوْمَ يُضِلُّهُمُ الشَّيْطَانُ أَشْتَاتًا لِيُرُوا أَعْمَالَهُمْ فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ (پ ۱۷۳ آیت ۶-۷-۸)

اس روز لوگ مختلف جماعتیں ہو کر واپس ہوں گے تاکہ اپنے اعمال کو دیکھ لیں، سو جو شخص (دنیا میں) ذرہ برابر نیکی کرے گا وہ (وہاں) اس کو دیکھ لے گا، اور جو شخص ذرہ برابر بدی کرے گا وہ اس کو دیکھ لے گا۔

ثُمَّ نُوَفِّي كُلَّ نَفْسٍ مَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ (پ ۱۷۳ آیت ۲۸)

پھر ہر شخص کو اس کا کیا ہوا (بدلہ) پورا پورا ملے گا اور ان پر کسی قسم کا ظلم نہ ہوگا۔

يَوْمَ تَجِدُ كُلَّ نَفْسٍ مِمَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُحَضَّرًا وَمِمَّا عَمِلَتْ مِنْ سُوءٍ تَوَدُّ لَوْ أَنَّ بَيْنَهَا وَبَيْنَهُ أَمَدًا بَعِيدًا وَنُحَذِّرُكُمُ اللَّهُ نَفْسَهُ (پ ۱۷۳ آیت ۳۰)

جس روز (ایسا ہوگا) کہ ہر شخص اپنے اچھے کئے ہوئے کاموں کو سامنے لایا ہو پائے گا اور اپنے برے کئے ہوئے کاموں کو بھی (اور) اس بات کی تمنا کرے گا کہ کیا خوب ہو تا جو اس شخص کے اور اس روز کے درمیان

دور دراز کی مسافت (حائل) ہوتی اور اللہ تعالیٰ تم کو اپنی (مقیم الشان) ذات سے ڈراتے ہیں۔

وَأَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا فِي أَنْفُسِكُمْ فَاخْشَوْهُ (پ ۱۷۲ آیت ۲۳۵)

اور یقین رکھو اس کا کہ اللہ تعالیٰ کو اطلاع ہے تمہارے دلوں کی بات کی۔

ان آیات کریمہ کی روشنی میں اہل بصیرت نے جان لیا ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں کی گھات میں ہے اور یہ کہ ان سے حساب میں

مناقشہ کیا جائے گا اور ذرہ ذرہ کے بارے میں باز پرس ہوگی، ان لوگوں نے یہ بات بھی جان لی ہے کہ ان خطرات سے نجات کی واحد صورت یہ ہے کہ اپنے نفس کا مسلسل احتساب کیا جائے اور سچائی کے ساتھ اعمال کی نگرانی کی جائے اور نفس سے ہر سانس اور ہر حرکت کا محاسبہ کیا جائے اس لیے کہ جو شخص محاسبیہ سے پہلے اپنے نفس کا احتساب کرے گا قیامت کے دن اس کے حساب میں تخفیف کی جائے گی اور ہر سوال کا جواب اس کے ذہن میں مستضر ہوگا وہاں اس کا انجام بہترین ہوگا اور جو شخص اپنے نفس کا محاسبہ نہیں کرے گا وہ ہمیشہ حسرتوں کا شکار رہے گا اور قیامت کے میدان میں اس کے ٹھہرنے کی مدت طویل ہوگی اور اسے اس کے گناہ رسوائی میں مبتلا کریں گے اور اللہ تعالیٰ کے غیظ و غضب تک پہنچائیں گے یہ اہل بصیرت جانتے ہیں کہ قیامت کے دن کی رسوائی اور ذلت سے بچنے کا واحد راستہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے ہر اس معاملے میں جس میں اس نے اطاعت کا حکم دیا ہے اور اللہ تعالیٰ صبر اور نگرانی کا حکم دیتا ہے فرمایا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا الصَّبْرُ وَاصْبِرُوا وَابْتَغُوا (پ ۳۰ آیت ۴۰)

اے ایمان والو! خود صبر کرو اور مقابلے میں صبر کرو اور مقابلے کے لیے مستعد رہو۔

انہوں نے اپنے نفس کی اس طرح نگرانی کی کہ پہلے اس سے شریں لگائیں پھر اس کے احوال پر نظر رکھی اس کے بعد احتساب کیا پھر اسے سزا دی پھر مجاہدہ کیا پھر عتاب کیا گویا نگرانی کے چھ مقامات سے گزرے آئیے ہم ان چھ مقامات کی شرح و تفصیل کریں اور بتلائیں کہ مرا لے (نگرانی) کی کیا حقیقت ہے؟ کیا فضیلت ہے؟ اور اس کے لیے کن اعمال کا ہونا ضروری ہے ان سب مقامات کی اصل محاسبہ ہے اور محاسبہ شریں لگانے اور احوال کی نگرانی کے بعد حاصل ہوتا ہے اور حساب کے بعد اگر نقصان محسوس ہو تو عتاب اور عتاب کی باری آتی ہے۔

پہلا مقام نفس سے شرط لگانا : جو لوگ تجارت میں مشغول ہیں اور سامان تجارت میں شریک ہیں ان کا مقصد اس کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا کہ انھیں کچھ نفع مل جائے پھر جس طرح تاجر اپنے شریک سے مدد لیتا ہے اولاً سامان تجارت اس کے سپرد کرتا ہے تاکہ اس میں تجارت کر سکے اس کے بعد حساب کرتا ہے اسی طرح عقل بھی آخرت کی تاجر ہے اس کا مقصد جسے نفع بھی دے سکتے ہیں تزکیہ نفس ہے اسی پر اس کی فلاح کا دارومدار ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكَّاهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسَّاهَا (پ ۳۰ آیت ۹-۱۰)

یقیناً وہ مراد کو پہنچا جس نے اس کو پاک کر لیا اور نامراد ہوا جس نے اس کو (نہجور میں) دبا دیا۔

نفس اعمال صالحہ سے فلاح یاب ہوتا ہے اور عقل نفس سے اس تجارت میں مدد دیتی ہے یعنی اسے استعمال کرتی ہے اور اسے ان اعمال کے لیے مسخر کرتی ہے جن پر اس کا تذکیہ موقوف ہے جیسے تاجر اپنے شریک یا اس نوکر سے مدد لیتا ہے جو اس مال میں تجارتی لین دین کا ذمہ دار ہے اور جس طرح شریک تاجر کے لیے ایک فریق کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے اور وہ مدعی بن کر حصول منفعت کے لیے یہ چاہتا ہے کہ پہلے کچھ شریں عائد کر لی جائیں پھر اس پر نظر رکھی جائے پھر اس سے حساب لیا جائے اور اس کے بعد عتاب یا عتاب کا معاملہ اگر ہر حساب میں خیانت پائی جائے اسی طرح عقل بھی نفس سے ان چاروں باتوں کی طالب ہے پہلی بات تو یہ ہے کہ اس سے کچھ شریں مقرر کر لے اور اس کے کچھ فرائض متعین کر دے اور اسے کامیابی کی راہ دکھلا دے اور یہ ہدایت کر دے کہ وہ راہ سے منحرف نہ ہو اسی پر ثبات قدمی سے چلتا رہے دوسری یہ کہ کسی بھی وقت اس کی نگرانی سے غافل نہ رہے اس لیے کہ اگر اس سے ذرا بھی غفلت کی گئی تو وہ خیانت کرے گا اور اصل سرمایہ بھی ضائع کر دے گا چہ جائیکہ کچھ کم کر دے یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی بے ایمان ملازم مال کے ساتھ تھا ہو اور میدان خالی ہو تو خیانت سے باز نہیں آتا پھر فراغت کے بعد اس سے حساب لیتا چاہیے اور یہ دیکھنا چاہیے کہ اس نے وہ تمام شرائط پوری کی ہیں یا نہیں جو اس پر عائد کی گئی تھیں یہ ایک ایسی تجارت ہے جس کا نفع جنت الفردوس کی صورت میں عطا کیا جائے گا اور سدرۃ المنتہی پر انبیاء و شہداء کی رفاقت

نصیب نہ ہوگی، اس کا دوبارہ حساب کتاب نہایت باریکی سے ہونا چاہیے اور دنیاوی منافع سے اس تجارت کے منافع پر نظر رکھنی چاہیے کیوں کہ دنیاوی تجارت کے منافع اخروی منافع کے مقابلے میں نہایت حقیر ہیں، پھر دنیا کے منافع خواہ کتنے ہی ہوں باقی نہیں رہتے بھلا ایسے خیر میں کیا خیر ہے جو دائمی نہ ہو، اس سے بہتر تو وہ شر ہے جسے دوام نہ ہو، اس لیے کہ اس کے زوال سے راحت تو ہوگی، اور شر کا ازالہ تو ہوگا، جب کہ خیر کے جانے سے خیر الگ جائے گا اور اس کے جانے کا رنج الگ ہوگا، کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔

أَشَدُّ الْعَمِّ عِنْدِي فِي سُورٍ تَبَيَّنَ عَنْهُ صَاحِبُ الْبُؤْسِ قَالًا

(مجھے اس خوشی پر سخت ملال ہے جس کی جدائی کا یقین ہوتا ہے۔)

اس لیے ہر اس شخص پر جو اللہ تعالیٰ پر، اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے ضروری ہے کہ وہ اپنے نفس کا محاسبہ کرے، اور اس سے تمام حرکات، سکناات، خطرات اور مخلوط میں سختی برتے، اس لیے کہ انسانی زندگی کا ہر سانس ایک ایسا قیمتی جوہر ہے جس کا کوئی عوض نہیں ہو سکتا، اور اس سے ایک ایسا گراں قدر خزانہ خریداجا سکتا ہے جو ابد الابد تک ختم نہ ہو، ان قیمتی سانسوں کو ضائع کرنا، یا ہلاک کرنے والے اعمال میں صرف کرنا ایک ایسا زبردست خسارہ ہے جو کوئی عقلمند انسان برداشت نہیں کر سکتا جب بندہ صبح سویرے نیند سے بیدار ہو اور صبح کے فرائض سے فراغت حاصل کر لے تو ایک گھڑی اپنے نفس کے ساتھ شر میں لگانے کے لیے خلوت اختیار کرے، جیسے تاجر اپنے شریک کو مال دینے سے پہلے ایک مخصوص نشست منعقد کرتا ہے، اور اس سے شرائط پر گفتگو کرتا ہے، اس مجلس میں محفل کو نفس سے یہ کہنا چاہیے کہ میرے پاس عمر کے علاوہ کوئی سرمایہ نہیں ہے، اگر یہ ضائع ہو گیا تو میرا تمام سرمایہ ضائع ہو جائے گا اور میں مفلس اور قہمی دست رہ جاؤں گا، تجارت کرنے اور نفع کمانے کی کوئی امید باقی نہیں رہے گی، آج ایک نیا دین ہے، اللہ نے مجھے پھر مہلت عطا کی ہے، اور میری زندگی میں کچھ مدت اور بڑھائی ہے، اور اس طرح ایک بڑے انعام سے نوازا ہے، اگر میں مرجاتا تو یہ تمنا کرنا کہ کاش مجھے ایک دن کے لیے دنیا میں واپس کر دیا جائے، تاکہ وہاں جا کر میں نیک عمل کروں، بس تم یہ سمجھو کہ گویا میں مرجکا ہوں اور مجھے دوبارہ دنیا میں بھیجا گیا ہے، خبردار! یہ دن ضائع نہ ہونے پائے، ہر سانس ایک ایسا نفیس جوہر ہے جس کی کوئی قیمت نہیں ہو سکتی، اے نفس! تجھے یہ بات جان لینی چاہیے کہ دن و رات میں چوبیس ساعتیں ہیں، جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ بندے کے لیے دن و رات میں چوبیس خزانے پھیلائے جاتے ہیں، اور ان میں سے ایک خزانہ اس کے لیے کھول دیا جاتا ہے، اس خزانے کو وہ اپنی نیکیوں کے نور سے لبریز دیکھتا ہے، یہ وہ نیکیاں ہوتی ہیں جو اس نے اس ساعت میں کی تھیں، ان انوار کے مشاہدے سے جو ملک جبار کی قربت کا وسیلہ ہیں انھیں اس قدر خوشی حاصل ہوتی ہے کہ اگر وہ خوشی اہل جہنم پر تقسیم کر دی جائے تو ان کے حصے میں اس قدر خوشی آئے کہ آگ کی تکلیف بھول جائیں پھر اس کے لیے ایک تاریک سیاہ خزانے کا منہ کھول دیا جاتا ہے، اس کی بڑھتی ہوئی ہے اور اس کی تاریکی نہایت شدید ہوتی ہے، یہ اس ساعت کا خزانہ ہوتا ہے جس میں اس نے گناہوں کا ارتکاب کیا تھا، اس خزانے کو دیکھ کر اس پر اس قدر وحشت طاری ہوتی ہے کہ اگر وہ اہل جہنم پر تقسیم کر دی جائے تو ان کا مزہ مکدر ہو جائے پھر اس پر ایک اور خزانہ کھولا جاتا ہے جس میں وہ سویا ہو، یا غافل رہا ہو، یا دنیا کے مباحات میں مشغول رہا ہو، اس وقت وہ اس خزانے کے خالی رہ جانے پر حسرت کرتا ہے، اور اسے اس قدر افسوس ہوتا ہے جیسے اسے کسی بہت بڑی تجارت میں اپنی غفلت سے کوئی بڑا خسارہ ہو گیا ہو، یا کسی بادشاہ کو قدرت رکھنے کے باوجود زبردست نقصان اٹھانا پڑ گیا ہو، حالانکہ اگر وہ چاہتا تو اس نقصان سے بچ سکتا تھا۔ اس کی ساعتوں کے یہ خزانے اس پر زندگی بھر کھولے جاتے ہیں، اس لیے اپنے نفس سے کہے کہ آج تو اپنا خزانہ بھرنے کے لیے کوشش کرو اور انھیں اپنے اعمال کی قیمتی جوہروں سے خالی مت چھوڑ جو تیری سلطنت کے اسباب ہیں، سستی، کالی، آرام پسندی، چھوڑ دے ایسا نہ ہو کہ یہ سلطنت تجھ سے چھین کر کسی اور کے سپرد کر دی جائے، اور تیرے حصے میں ہمیشہ ہمیشہ کی حسرت آئے، اگر تو جنت میں بھی داخل ہو گیا تب بھی سستی اور کالی کے نتیجے میں حاصل ہونے والا خسارہ تجھے جہنم سے نہیں رہنے دے گا، اگرچہ وہ بے چینی و دوزخ کے عذاب کی بے چینی سے کم ہوگی، ایک بزرگ فرماتے ہیں ہمیں یہ تسلیم ہے کہ گناہ گاروں کے گناہ معاف کر دیے جائیں گے مگر انھیں نیکو کاموں کے درجات تو حاصل نہیں ہوں

کے 'اس قول سے انہوں نے اسی خسارے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

يَوْمَ يَجْمَعُكُمْ لِيَوْمِ الْجَمْعِ ذَلِكِ يَوْمُ التَّعَابِ (پ ۲۸ آیت ۹)

(اور اس دن کو یاد کرو) کہ جس دن تم سب کو ایک جمع ہونے کے دن جمع کرے گا (یہی دن) ہے سو دنیاں کا۔

یہ نفس کو اوقات کے باپ میں وصیت تھی 'اس کے بعد اسے ساتوں اعضاء کے سلسلے میں وصیت کرے اور وہ ساتوں اعضاء یہ ہیں آگمہ 'کان 'زہن' 'عقل' 'شرمگاہ' ہاتھ اور پاؤں۔ اور ان اعضاء کی باگ ڈور نفس کے حوالے کرے 'اور اس سے کہے کہ یہ اعضاء تیری رعایا ہیں 'اور اس تجارت میں تیرے خادم ہیں 'اس تجارت کی تکمیل انہی کے تعاون سے ہوگی 'دورخ کے سات دروازے ہیں 'جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ہر دروازے کے لیے ایک جز منقسم ہوگا 'یہ دروازے اس نفس کے لیے متعین ہوں گے جو ان اعضاء سے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتا ہے 'پھر جس عضو سے وہ اللہ کی نافرمانی کرے گا 'اس عضو کے ساتھ مخصوص دروازے سے جہنم میں داخل ہوگا 'نفس کو وصیت کرے کہ وہ ان اعضاء کو گناہوں سے بچائے 'مثلاً آگمہ سے کہے کہ وہ غیر محرم کی طرف نہ دیکھے کسی مسلمان کے ستر پر نظر نہ ڈالے 'اور نہ کسی مومن کو حقارت کی نظر سے دیکھے 'بلکہ ہر اس چیز کو دیکھنے سے بچے جس کی ضرورت نہ ہو 'اس لیے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے فضول نظر کے بارے میں بھی باز پرس کرے گا 'جیسے وہ فضول کلام کے حلقے باز پرس کرے گا 'پھر آگمہ کو ان امور سے روکنا ہی کافی نہیں ہے 'بلکہ اسے ان امور میں بھی مشغول کرنا ضروری ہے جو اس تجارت کے لیے مفید ہوں 'اور یہ امور وہ ہیں جن کے لیے آگمہ کی تخلیق کی گئی ہے یعنی اللہ کی عجایب صنعت کو چشم عبرت سے دیکھنا 'یا اعمال خیر پر اس اعتبار سے نظر رکھنا کہ ان کی اقتدا کرنی ہے اللہ کی کتاب 'اللہ کے رسول کی سنت 'اور وعظ و نصیحت اور استفادے کی نیت سے حکیمانہ کتابوں کا مطالعہ کرنا آگمہ کی طرح باقی تمام اعضاء کو بھی ان کے فرائض سے آگاہ کرنا چاہیے 'اور ان امور سے روکنا چاہیے جن سے تجارت دین میں نقصان ہوتا ہے 'خاص طور پر زبان اور عقل کے سلسلے میں نہایت محتاط رہے 'اس لیے کہ زبان فطری طور پر چلتی رہتی ہے 'اور اسے حرکت کرنے میں کسی مشقت کا سامنا نہیں کرنا پڑتا 'اور غیبت 'مظہوری 'تزکیہ نفس 'مذمت مخلوق 'مذمت طعام 'لعنت 'بددعا اور سب و شتم میں اس کا گناہ نہایت سخت ہے 'یہ تمام امور ہم کتاب آفات اللسان میں بیان کر چکے ہیں۔ زبان عام طور پر انہی کے درپے رہتی ہے 'جب کہ اس کی تخلیق کا مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر کرے 'مخلوق کو ذکر کی نصیحت کرے 'علمی مباحث میں حصہ لے 'بندگان خدا کو دین کی تعلیم دے 'اور ہدایت کا راستہ تلاشے 'ان دو مسلمانوں میں مصالحت کرائے جو کسی معاملے میں خصومت رکھتے ہوں 'اور اسی طرح کے دوسرے امور خیر انجام دے 'نفس سے یہ شرط بھی ہونی چاہیے کہ وہ زبان کو دن بھر ذکر الہی کے علاوہ کسی بات کے لیے حرکت نہ دے اس لیے کہ مومن کا کلام ذکر ہونا چاہیے 'اس کی نظر عبرت ہونی چاہیے 'اس کی خاموشی عبادت ہونی چاہیے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

مَا يَلْفُظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ (پ ۲۱ آیت ۱۸)

وہ کوئی لفظ منہ سے نکالنے نہیں پاتا مگر اس کے پاس ہی ایک ناگ لگنے والا تیار ہے۔

عقل کو ترک حرص کی تلقین کرے 'اور اسے حلال غذاؤں میں سے کم کھانے کا پابند کرے 'مشتبہ چیزوں سے باز رکھے 'اور شہوات سے روکے 'اور قدر ضرورت پر اکتفا کرنے کی نصیحت کرے اس سلسلے میں نفس کو یہ دھمکی بھی دی جاسکتی ہے کہ اگر تو نے عقل کے سلسلے میں ان احکام کی خلاف ورزی کی تو تجھے پیٹ سے متعلق تمام شہوات سے روک دوں گا تاکہ جتنی شہوات تو نے حاصل کی ہیں ان سے زیادہ قوت ہو جائیں۔ تمام اعضاء کے سلسلے میں اسی طرح کی شرائط ہونی چاہئیں 'ان شرائط کا احاطہ کرنا تکمیل طلب ہے 'نہ اعضاء کے معاصی عقلی ہیں 'اور نہ طاعات پوشیدہ ہیں 'اسی لیے بڑی آسانی سے شرائط طے کی جاسکتی ہیں 'اور ہر عضو کو ترک معاصی اور عمل صالح کا پابند کیا جاسکتا ہے 'اس کے بعد نفس کو ان اطاعت کی تلقین کرے جو دن میں کئی مرتبہ ہوتی ہیں پھر ان نوافل کے سلسلے میں نفس کو وصیت کرے جن پر وہ قدرت رکھتا ہے 'اور جنہیں کثرت سے انجام دے سکتا ہے 'نوافل کی تکمیل کیفیت اور ان کے لیے اسباب کی تیاری کی کیفیت واضح طور پر بیان کر دے 'ان شرائط کی ہر دن ضرورت پڑتی ہے 'لیکن جب انسان

اس کا عادی ہو جاتا ہے، اور نفس بھی شرائط کی تکمیل میں اس کے ساتھ تعاون کرتا ہے تو پھر شرطیں لگانے کی ضرورت باقی نہیں رہتی، اور اگر بعض شرطوں کی پابندی کرے اور بعض کی نہ کرے تو ان امور میں شرط لگانے کی ضرورت رہ جاتی ہے جن کی پابندی نہیں کرتا تاہم ہر روز کوئی نہ کوئی نیا واقعہ یا نیا حادثہ پیش آتا رہتا ہے، اس کا حکم الگ ہے، اور اس میں اللہ تعالیٰ کا حق جداگانہ طریقے پر ہوتا ہے، یہ صورت حال ان لوگوں کو بھی اکثر پیش آتی ہے جو دنیاوی اعمال میں مشغول ہوتے ہیں خواہ وہ حکومت کے کاموں میں لگے ہوئے ہوں، یا تجارت و تعلیم میں مصروف ہوں شاید ہی کوئی دن ایسا ہوتا ہو جس میں کوئی نیا واقعہ پیش نہیں آتا اور اس میں اللہ تعالیٰ کا حق ادا کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی، اس لیے نفس کے ساتھ یہ شرط لگانی بھی ضروری ہے کہ وہ ایسے واقعات میں ثابت قدم رہے، اور حق کی پیروی کرے، اور نفس کو غفلت اور بیکاری سے ڈرائے، اور اسے اس طرح صیحت کرتا رہے جس طرح بھگوڑے اور سرکش غلام کو صیحت کی جاتی ہے، اس لیے کہ نفس فطری طور پر سرکش، اطاعت سے متنفر، اور عیوب سے مخرف ہے، لیکن وعظ و تادیب اس پر اثر انداز ہوتی ہے، قرآن کریم میں ہے:

وَذَكِّرْ فَإِنَّ الذِّكْرَ تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِينَ (پ ۲۲ آیت ۵۵) اور سمجھاتے رہیے کیوں کہ سمجھانا ایمان والوں کو نفع دے گا۔
بہر حال اس طرح کی شرائط عائد کرنا نفس کی نگہداشت کا ابتدائی مرحلہ ہے، یہ عمل سے پہلے کا محاسبہ ہے، اور محاسبہ کبھی عمل کے بعد ہوتا ہے اور کبھی ڈرانے کے لیے عمل سے پہلے بھی ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا فِي أَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوهُ (پ ۲۲ آیت ۳۵)

اور یقین رکھو اس کا کہ اللہ تعالیٰ کو اطلاع ہے تمہارے دلوں کی بات کی، سو اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو۔
اس حذر کا تعلق مستقبل سے ہے، کثرت اور مقدار پر زیادتی اور نقصان کی معرفت حاصل کرنے کے لیے جو نظر ڈالی جاتی ہے اسے محاسبہ کہتے ہیں، اسی طرح اگر بندہ اپنے اعمال پر یہ جاننے کے لیے نظر رکھے گا کہ ان میں کوئی کمی بیشی تو نہیں ہوتی، یہ بھی محاسبہ میں داخل ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا ضَرَبْتُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَتَبَيَّنُوا (پ ۲۵ آیت ۹۳)

اے ایمان والو! جب تم اللہ کی راہ میں سفر کیا کرو تو تحقیق کر لیا کرو۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَأٍ فَتَبَيَّنُوا (پ ۳۱ آیت ۶)

اے ایمان والو! اگر کوئی شریر آدمی تمہارے پاس کوئی خبر لائے تو خوب تحقیق کر لیا کرو۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهِ نَفْسُهُ (پ ۳۱ آیت ۲۱)

اور ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے اور اس کے خیالات آتے ہیں ہم ان کو جانتے ہیں۔

یہ اس لیے فرمایا تاکہ نفس ان چیزوں سے ڈرے، اور ان سے بچنے کی کوشش کرے عبادۃ ابن الصامت کہتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایسے شخص سے جس نے وصیت اور وعظ و صیحت کی درخواست کی تھی ارشاد فرمایا:

إِذَا زِدْتُ أَمْرًا فَتَبَيَّرْ عَاقِبَتُهُ فَإِنْ كَانَ رُشْدًا فَأَمْضِهِ وَإِنْ كَانَ غِيًّا فَانْتَبِعْهُ (۱)

جب تو کسی امر کا ارادہ کرے تو اس کے انجام پر نظر رکھ، اگر انجام بہتر ہو تو اسے کر، اور اگر گمراہی ہو تو اس سے باز رہ۔

ایک دانشور کہتے ہیں اگر تو یہ چاہتا ہے کہ عقل خواہش نفس پر غالب ہو تو شہوت کے تقاضے پر اس وقت تک عمل نہ کر جب تک کہ عاقبت پر نظر نہ ڈال لے، اس لیے کہ دل میں غم امت کا باقی رہنا خواہش نفس کے پورا ہونے سے زیادہ برا ہے۔ حضرت لقمان علیہ السلام فرماتے ہیں کہ جب مومن عاقبت پر نظر رکھتا ہے غم امت سے محفوظ رہتا ہے، شداد ابن اوس روایت کرتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

الْكَيْسُ مَنْ كَانَ نَفْسُهُ وَعَمِلَ لِمَا بَعْدَ الْمَوْتِ وَالْأَحْمَقُ مَنْ اتَّبَعَ نَفْسَهُ هَوَاهَا

(۲-۱) یہ دونوں روایتیں پہلے ہی گذری ہیں

وَتَمَتَّى عَلَى اللَّهِ (۲)

ظن وہ ہے جس کا نفس اس کا مطیع ہو اور جو موت کے بعد کی زندگی کے لیے عمل کرے اور احمق وہ ہے جو اپنے نفس کو خواہشات کا تابع کر دے اور اللہ پر تمنا کرے۔

کَلَنْ نَفْسِهِ کے معنی یہ ہیں کہ نفس سے حساب لے اور یوم حساب کو اسی لیے یَوْمَ الدِّينِ کہتے ہیں قرآن پاک میں وارد ہے اِنَّا الْمَدِينُونَ یعنی ہم محاسبہ کرنے والے ہیں حضرت مزار شاد فرماتے ہیں کہ اپنے نفس کا احتساب کرتے رہو اس سے پہلے کہ تمہارا احتساب ہو اور اس کو تو لو اس سے پہلے کہ خود تو لے جاؤ اور بڑی پیشی کے لیے تیار رہو حضرت عمرؓ نے ابو موسیٰ اشعریؓ کو لکھ کر بھیجا کہ اپنے نفس کا فراخی میں محاسبہ کرو اس سے پہلے کہ سختی کے ساتھ محاسبہ ہو آپؓ نے حضرت کعب الاحبارؓ سے دریافت کیا کہ تم نے محاسبہ کے متعلق کتاب اللہ میں کیا دیکھا ہے انہوں نے کہا: آسان کے حساب کرنے والے کی طرف سے زمین کے حساب کرنے والے کے لئے ہلاکی ہو آپؓ نے ان پر کوڑا اٹھایا اور فرمایا کہ اس شخص کے علاوہ جس نے اپنے نفس کا محاسبہ کیا ہو کعبؓ نے عرض کیا اتوریت میں یہ استثناء پہلو پہلو وارد ہے درمیان میں کوئی فاصلہ بھی نہیں ہے یہ تمام روایات اور اقوال مستقبل کے لیے محاسبہ پر دلالت کرتے ہیں من دان نفسه عمل لما بعد الموت کا حاصل یہ ہے کہ پہلے امور کو وزن کرے اور ان میں اچھی طرح تامل اور تدبیر کرے پھر عمل پیرا ہو۔

دوسرا مقام مراقبہ : جب انسان اپنے نفس کو وصیت کرنے سے فارغ ہو جائے اور اس سے وہ شرائط طے کر لے جو مذکورہ بالا سطور میں بیان کی گئی ہیں تو مراقبہ کی طرف متوجہ ہو یعنی اپنے اعمال میں غور و خوض کرے اور ان پر گہری نظر ڈالے اور حفاظت کے خیال سے نفس پر سخت نظر رکھے اس لیے کہ اگر نفس کو چھوڑ دیا گیا تو وہ سرکش ہو جائے گا اور فساد اعمال کا موجب ہو گا مراقبہ پر مزید گفتگو سے پہلے آئیے اس کے فضائل بیان کرتے ہیں۔

مراقبہ کے فضائل : سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبریل علیہ السلام سے احسان کے بارے میں دریافت کیا آپؐ نے فرمایا:

أَنْ تَعْبُدَ اللَّهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ (بخاری و مسلم ابو ہریرہؓ)

احسان یہ ہے کہ تو اللہ کی عبادت اس طرح کرے گویا اسے دیکھ رہا ہے۔

ایک حدیث میں یہ الفاظ وارد ہیں:

أَعْبُدَ اللَّهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ فَإِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَإِنَّهُ يَرَاكَ

اللہ کی عبادت اس طرح کر گویا تو اسے دیکھ رہا ہو اور اگر تو اسے نہیں دیکھ رہا ہے تو وہ تجھے دیکھ رہا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

أَفَمَنْ هُوَ قَائِمٌ عَلَىٰ كُلِّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ (پ ۳۳ ر ۱۱ آیت ۳۳)

پھر کیا (خدا) ہر شخص کے اعمال پر مطلع ہو (ان کے شرکاء کے برابر ہو سکتا ہے)۔

أَلَمْ يَعْلَم بِأَنَّ اللَّهَ يَرَىٰ (پ ۳۰ ر ۱۱ آیت ۳)

کیا اس شخص کو یہ خبر نہیں کہ اللہ تعالیٰ (اسے) دیکھ رہا ہے۔

إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمٌ قَرِيبٌ (پ ۳۲ ر ۱۱ آیت ۱)

بالتین اللہ تعالیٰ تم سب کی اطلاع رکھتے ہیں۔

وَالَّذِينَ هُمْ لِأَمَانَاتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُونَ وَالَّذِينَ هُمْ بِشَهَادَاتِهِمْ قَائِمُونَ (پ ۲۹ ر ۱۲ آیت ۳۳)

اور جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کا خیال رکھنے والے ہیں اور جو اپنی گواہیوں کو ٹھیک ٹھیک ادا کرتے ہیں۔

حضرت امین المبارک نے ایک شخص سے فرمایا: اَقْبَلِ اللہ اس نے اس جیلے کے معنی دریافت کئے فرمایا ہمیشہ اس طرح رہو گویا تم اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہے ہو، عبد الواحد ابن زید کہتے ہیں جب میرا آقا مجھے دیکھتا ہے تو میں کسی دوسرے کی ہوا نہیں کرتا، ابو عثمان مغربی کہتے ہیں کہ راہ سلوک میں انسان کے لیے سب سے ضروری چیز مراقبہ، محاسبہ اور علم سے عمل کی سیاست ہے، ابن حطاء کہتے ہیں کہ بہترین عبادت ہمہ وقت حق تعالیٰ کا مراقبہ ہے، جریری کہتے ہیں کہ ہمارا یہ امر (سلوک و تقویٰ) دو اصولوں پر مبنی ہے، ان میں سے ایک یہ ہے کہ تو اپنے نفس پر اللہ تعالیٰ کا مراقبہ لازم کرے، اور دوسری یہ کہ تیرا علم ظاہر اعمال پر حجت ہو، ابو عثمان مغربی کہتے ہیں کہ ابو حنفیہ نے مجھ سے فرمایا کہ جب تو لوگوں میں بیٹھے تو اپنے نفس اور قلب کا واعظ بن کر بیٹھ، اور اپنی مجلس میں لوگوں کی آمد سے فریب مت کھا، اس لیے کہ وہ تیرے ظاہر کو دیکھتے ہیں اور اللہ تیرے باطن کو دیکھتا ہے۔

ایک بزرگ سے منقول ہے کہ ان کا ایک نوجوان مرید تھا، جس کی وہ تعظیم کرتے تھے، اور اسے دو سروں پر ترجیح دیتے تھے، ایک مرتبہ ان کے بعض دوستوں اور مریدوں نے عرض کیا کہ آپ اس لڑکے کی اس قدر عزت کرتے ہیں حالانکہ وہ نو عمر ہے، جب کہ ہم بوڑھے ہو چکے ہیں، انہوں نے چند پرندے منگوائے، اور ہر مرید کو ایک پرندہ اور ایک چاقو دے کر کہا کہ اسے کسی ایسی جگہ لے جاؤ جہاں کوئی دیکھنے والا نہ ہو، ان مریدین میں وہ نوجوان بھی تھا، اور بزرگ نے اس نوجوان سے بھی یہی فرمائش کی تھی، تھوڑی دیر بعد ہر شخص فزع شدہ پرندوں کو لے کر واپس آیا، جب کہ وہ نوجوان زندہ پرندہ لے کر آیا، بزرگ نے اس سے پوچھا کہ تو نے اپنا پرندہ کیوں نہیں فزع کیا، نوجوان نے کہا کہ مجھے ایسی کوئی جگہ نہیں ملی جہاں کوئی دیکھنے والا نہ ہو، اللہ تعالیٰ ہر جگہ مجھے دیکھتا ہے تمام لوگوں کو اس کا یہ مراقبہ اچھا لگا، انہوں نے اپنے شیخ سے عرض کیا واقعی یہ نوجوان قابل تعظیم ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ جب زلیخا حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ خلوت میں تھیں تو انہوں نے اللہ کریم کے منہ پر کپڑا دھانپ دیا حضرت یوسف نے فرمایا کہ تو ایک پتھر سے حیا کرتی ہے، پھر میں ملک ببار کے دیکھنے سے شرم نہ کروں، ایک نوجوان نے کسی باندی سے خواہش پوری کرنی چاہی، باندی نے کہا تجھے شرم نہیں آتی، نوجوان نے کہا میں کس سے شرم کروں، میں سب کے علاوہ کون دیکھ رہا ہے، باندی نے کہا اور ستاروں کو پیدا کرنے والا کہاں گیا؟ کسی شخص نے جید بغدادی سے دریافت کیا کہ میں غفلت بھر کر کس چیز سے مدد لوں، فرمایا اس علم سے کہ منظور کی طرف تیری نظر بند میں پہنچتی ہے، اور ناظر حقیقی کی نظر تجھ پر پہنچے پہنچ جاتی ہے، ایک مرتبہ فرمایا مراقبہ میں وہی شخص بختہ ہوتا ہے جو پروردگار سے اس لیے خوف کھاتا ہو کہ کہیں اس کا عطف و شفقت نہ ہو جائے، مالک ابن دینار کہتے ہیں جنت فردوس میں جنت عدن ہیں، اور ان میں ایسی حوریں ہیں جو جنت کے گلاب سے پیدا کی گئی ہیں، سائل نے پوچھا ان میں کون رہے گا، فرمایا اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ جنت عدن میں وہ لوگ رہیں گے جنہیں معاصی کے تصور کے ساتھ میری عظمت کا خیال آجائے، اور وہ میری حیا سے باز رہیں، یہ وہ لوگ ہیں کہ ان کی کمریں میرے خوف سے جھک گئی ہیں، میں اپنی عزت و جلال کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں زمین والوں کو عذاب دینا چاہتا ہوں مگر میری نظر ان لوگوں پر پہنچتی ہے جو میرے خوف سے نہ کھاتے ہیں نہ پیتے ہیں تب میں اللہ دنیا سے عذاب ہٹا لیتا ہوں۔ محاسبی سے مراقبہ کے بارے میں دریافت کیا گیا، انہوں نے جواب دیا اس کی ابتدا یہ ہے کہ دل کو اللہ تعالیٰ کی قربت سے آگاہی ہو، مراقبہ کہتے ہیں کہ مراقبہ یہ ہے کہ غیب کے ملاحظے کے لیے ہر لمحے اور ہر گھٹے میں باطن کی رعایت رکھے، روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فرشتوں سے فرمایا کہ تم ظاہر پر متعین ہو، اور میں باطن کا نگران ہوں، محمد ابن علی ترمذی کہتے ہیں کہ اپنا مراقبہ اس ذات کے لیے کر جس کی نظروں سے تو اوچل نہ ہو، اور اپنا شکر اس کے لیے مخصوص کر جس کی نعمتوں کا سلسلہ تجھ سے منقطع نہ ہو، اور اپنی طاعت کا تعلق اس شخص سے رکھ جس سے تو مستغنی نہ ہو، اور اس شخص کے لیے انکساری کر جس کی سُلطنت اور حکومت سے تو باہر نہ ہو، سئل متری کہتے ہیں کہ اللہ

تعالیٰ نے بندے کے دل کو اس علم سے زیادہ کسی چیز سے مرتن نہیں کیا کہ اللہ تعالیٰ اسے دیکھنے والا ہے خواہ وہ کہیں بھی ہو بعض لوگوں سے اللہ تعالیٰ کے اس قول ”رَضِیَ اللہُ عَنْہُمْ وَرَضُوا عَنْہُ ذَٰلِکَ لِمَنْ خَشِیَ رَبَّہٗ“ کے متعلق دریافت کیا گیا انہوں نے جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں سے راضی ہوں گے جو اپنے قلب کی نگرانی کرتے ہیں، اپنے نفس کا حاسب کرتے ہیں اور اپنی آخرت کے لیے زاور راہ لیتے ہیں، حضرت ذوالنون مصریؒ سے کسی نے پوچھا کہ بندہ کو جنت کس طرح حاصل ہوگی، فرمایا پانچ چیزوں سے، استقامت سے جس میں انحراف نہ ہو، گوشش سے جس میں غفلت نہ ہو، خلوت و جلوت میں اللہ تعالیٰ کے مراقبے سے، تہاری کے ساتھ موت کے انتظار سے اور عجب سے پہلے نفس کے احساب سے۔ ایک شاعر کہتا ہے۔

اِذَا مَا خَلَوْتَ النَّهْرَ یَوْمًا فَلَا تَقُلْ - خَلَوْتُ وَلَٰکِنْ قُلْ عَلَیَّ رَقِیْبٌ
وَلَا تَحْسِبَنَّ اللہَ یَغْفُلُ سَاعَةً - وَلَا اِنَّ مَا خُفِیَہُ عَنْہُ یَغِیْبُ
اَلَمْ تَرَ اَنَّ الْیَوْمَ اَسْرَعَ ظَہَبًا - وَ اِنَّ غَدًا لِلنَّافِلِیْنِ قَرِیْبٌ
(کسی روز اگر تو تنہا ہو تو یہ نہ کہہ کہ میں تنہا ہوں بلکہ یہ کہہ کر مجھ پر ایک نگرانی کرنے والا ہے، اور نہ یہ گمان کر کہ اللہ تعالیٰ کسی تجھ سے غافل ہوگا، اور نہ یہ کہہ کہ تو جو بات اس سے چھپائے گا وہ چھپ جائے گی، کیا تجھے یہ احساس نہیں ہوتا کہ آج زمانہ بہت تیزی سے گزر رہا ہے اور کل دیکھنے والوں کے لیے نہایت قریب ہے۔)

حمید الاول نے سلیمان ابن علی سے کہا کہ مجھے کچھ نصیحت کیجئے، انہوں نے کہا کہ جب تم کوئی گناہ کرتے ہو تو یا تو تمہارا خیال یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں دیکھ رہا ہے تب تو یہ بڑی جسارت کی بات ہے، یا یہ خیال ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں دیکھ نہیں رہا ہے تب یہ کفر ہے حضرت سفیان ثوریؒ فرماتے ہیں کہ اس ذات کا مراقبہ کرو جس پر کوئی پوشیدہ سے پوشیدہ چیز مخفی نہیں رہتی، اور اس ذات سے توجہ رکھو جو فناء کی مالک ہے، اور اس ذات سے ڈرو جسے حقوت کا اختیار ہے، فرد سنجی کہتے ہیں کہ منافق مٹھکر رہتا ہے، جب یہ دیکھتا ہے کہ کوئی اس کی طرف متوجہ نہیں ہے تو گناہ میں پڑ جاتا ہے، وہ صرف لوگوں کو دیکھتا ہے، اس کی نظر اللہ تعالیٰ پر نہیں رہتی۔ عبد اللہ ابن وینار کہتے ہیں کہ میں حضرت عمر ابن الخطابؓ کے ہمراہ مکہ مکرمہ کے لیے پایہ رکاب قحارات ہم نے ایک جگہ قیام کیا پہاڑ کے اوپر سے آپ کے پاس ایک چرواہا آیا، آپ نے اس سے کہا کہ ان بکریوں میں سے ایک بکری میرے ہاتھ فروخت کر دے اس نے کہا میں غلام ہوں، حضرت عمرؓ نے فرمایا اپنے مالک سے کہہ دینا کہ بھیرنے نے ایک بکری کھالی غلام نے کہا اور اللہ تعالیٰ سے کیا کہوں گا، یہ سن کر حضرت عمرؓ نے لگے، صبح کو آپ غلام کے آکا کے پاس گئے اور اسے خرید کر آزاد کر دیا اور فرمایا کہ تجھے اس کلمے نے دنیا میں آزادی دی ہے، امید ہے کہ آخرت میں بھی اسی کلمے کی بدولت تجھے آزادی نصیب ہوگی۔

مراقبے کی حقیقت اور اس کے درجات : مراقبے کی حقیقت یہ ہے کہ رقیب کا لحاظ کیا جائے، اور اپنی توجہ کا رخ اس کی طرف پھیرا جائے چنانچہ اگر کوئی شخص غیر کے باعث کسی چیز سے احتراز کرتا ہے تو یہ کہتے ہیں کہ فلاں شخص نے فلاں کے لحاظ میں ایسا کیا ہے، صوفیاء کے نزدیک مراقبہ قلب کی اس حالت کو کہتے ہیں جو ایک قسم کی معرفت سے حاصل ہوتی ہے، اور اس حالت کی وجہ سے کچھ اعمال اصحاء میں اور کچھ قلب میں پیدا ہوتے ہیں۔ حالت یہ ہے کہ قلب رقیب کی طرف مائل رہے، اس کی طرف مشغول ہو، اس سے التفات رکھے، اور اس کی طرف متوجہ ہو، اور جس معرفت سے یہ حالت پیدا ہوتی ہے وہ یہ جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ دلوں کے ہمد اور مخفی امور پر مطلع ہے، اور بندوں کے اعمال کا نگران ہے، اور تمام نفوس کے اعمال سے واقف ہے، دل کا راز اس پر اس طرح عیاں ہے جیسے ظاہری جلد انسان پر کشف ہوتی ہے بلکہ اللہ پر اس سے زیادہ ہی واضح ہے جب یہ معرفت یقین بن جاتی ہے، یعنی ہر طرح کے شک سے خالی ہو جاتی ہے، مہر دل پر غالب ہو کر اسے دہانتی ہے اور غلبہ اس لیے ضروری ہے کہ بہت سے امور ایسے ہیں جن کا انسان یقین رکھتا ہے لیکن وہ اس کے دل پر غالب نہیں ہوتے، جیسے موت کا علم یقینی ہے، لیکن دل پر

غالب نہیں ہے۔ اس لیے جب کسی چیز کی معرفت دل پر غالب ہو جاتی ہے تو اسے رقیبہ کا لحاظ کرنے پر مائل کرتی ہے، اور اس کی سمت کا رخ رقیب کی طرف پھیر دیتی ہے، اس معرفت پر یقین رکھنے والے مقرب ہیں۔

مقربین کے درجے : اور مقربین کی دو قسمیں ہیں صدیق اور اصحاب یقین۔ اس لیے ان کا مراقبہ بھی دو درجوں کا ہوتا ہے، ایک درجہ ان مقربین کا ہے جو صدیقین ہیں، اور یہ عظمت و جلال کا مراقبہ ہے، اس مراقبے کا حاصل یہ ہے کہ قلب اس جلال کے مشاہدے میں مستغرق ہو جاتا ہے، اور اس کی نسبت سے شکستہ ہو جاتا ہے، اور اس میں غیر کی طرف التفات کی ذرا بھی گنجائش باقی نہیں رہتی، اس مراقبے کے اعمال کی تفصیل پر ہم زیادہ نظر نہیں کرتے، اس لیے کہ اس کے اعمال صرف دل میں منحصر رہتے ہیں، جہاں تک اعضاء کا سوال ہے وہ مباحات کی طرف بھی التفات نہیں کرتے، چہ جائیکہ ممنوعات اور محرمات کی طرف متانت ہوں، اور جب طاعات کے لیے متحرک ہوتے ہیں تو ایسا لگتا ہے گویا وہ معمول اور پابند ہوں، اس لیے انھیں راہ راست پر قائم رکھنے کے لیے کسی تدبیر کی ضرورت نہیں ہوتی، بلکہ جو شخص راضی کا مالک ہوتا ہے وہ رحمت کو خود درست کر دیتا ہے، قلب راضی ہے، جب وہ معبود میں مستغرق ہوتا ہے تو اعضاء بلا تکلف اسی کے راستے پر چلتے ہیں، لیکن ہر شخص کا یہ حال نہیں ہوتا، ایسا وہ ہوتا ہے جسے صرف ایک فکر ہو اور باقی تمام فکرات سے اسے اللہ تعالیٰ نے بچا دیا ہو، جو شخص یہ درجہ پالیتا ہے وہ مخلوق سے اس حد تک غافل ہو جاتا ہے کہ بعض اوقات اپنے پاس موجود لوگوں کو بھی نہیں دیکھ پاتا، حالانکہ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی ہوتی ہیں، اور نہ ان کی باتیں سن پاتا ہے حالانکہ وہ سہو نہیں ہوتا، تمہیں اس طرح کی کیفیات ان دلوں میں بھی مل جائیں گی جو بادشاہان دنیا کی تعظیم سے لبریز ہوتے ہیں، بعض شاہی خدام اپنے بادشاہوں کی تعظیم میں اس قدر مستغرق رہتے ہیں کہ ان پر کچھ بھی گذر جائے مگر انھیں اس کا احساس بھی نہیں ہوتا، اور ان ہی لوگوں پر کیا متوقف ہے ان لوگوں کا بھی یہی حال ہوتا ہے جو کسی دنیاوی کام میں پوری طرح منہمک ہوں یا کسی خیال میں ڈوبے ہوئے ہوں حتیٰ کہ بعض لوگ سوچتے ہوئے اپنے راستے سے ہٹک جاتے ہیں یا محفل سے دور نکل جاتے ہیں اور انھیں یہ یاد نہیں آتا کہ وہ کہاں جا رہے تھے اور کس کام کی غرض سے لگے تھے، عبدالواحد ابن زید سے کسی شخص نے سوال کیا کہ آپ اس زمانے میں بھی کسی ایسے شخص سے واقف ہیں جو مخلوق سے بے خبر ہو، اور اپنے حال میں مشغول ہو، فرمایا ہاں ایک شخص ایسا ہے اور وہ ابھی یہاں آئے والا ہے، ابھی یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ غلام وہاں آئے، عبدالواحد ابن زید نے ان سے پوچھا اے حبیب تم کہاں سے آرہے ہو، انہوں نے کہا فلاں جگہ سے، اس جگہ کا راستہ بازار کی سمت سے تھا آپ نے پوچھا تمہیں راستے میں کون کون ملا تھا، انہوں نے کہا میں نے تو کسی کو نہیں دیکھا۔

حضرت یحییٰ ابن زکریا علیہما السلام سے موسیٰ ہے کہ ایک مرعہ وہ کسی عورت کے پاس سے گذرے اور اس سے کھرا گئے، وہ عورت زمین پر گر پڑی، لوگوں نے عرض کیا آپ نے اس بھاری کودھا کیوں دے دیا، فرمایا میں دیوار سمجھا تھا، ایک بزرگ کہتے ہیں کہ میں چھ لوگوں کے پاس سے گذرا وہ تیر اندازی کر رہے تھے، ایک شخص ان لوگوں سے کہہ دو، وہ پڑھا ہوا تھا، میں اس کی طرف بڑھا، اور میں نے یہ ارادہ کیا کہ اس سے کچھ گفتگو کروں، اس نے کہا مجھے اللہ کا ذکر زیادہ مرغوب ہے، میں نے کہا آپ تما ہیں، کہنے لگا میرے ساتھ میرا رب ہے اور دونوں فرشتے ہیں، میں نے پوچھا ان لوگوں میں سے جو تیر اندازی کر رہے ہیں کون سبقت لے جاسکتا ہے، کہنے لگا جس کی اللہ تعالیٰ مغفرت فرمادے، میں نے پوچھا راستہ کدھر ہے اس نے آسمان کی طرف اشارہ کیا اور اٹھ کر چل دیا اور کہنے لگا کہ خیری اکثر مخلوق تجھ سے بے پروا ہے، یہ اس شخص کا کلام ہے جو اللہ تعالیٰ کے مشاہدے میں مستغرق ہو، صرف اسی سے گفتگو کرتا ہو، اور اسی کے ہارے میں سنتا ہو، ایسے شخص کو زبان اور اعضاء کے مراقبے کی ضرورت نہیں ہے، اس لیے کہ اعضاء تو دل کے حکم پر حرکت کرتے ہیں۔ حضرت ثعلبیؒ حضرت علی ابن الحسینؒ نور علیہما السلام کے پاس آئے وہ ایک گوشے میں بیٹھ گئے تھے، اور بے حس و حرکت بیٹھے ہوئے تھے آپ نے ان سے پوچھا کہ تم نے یہ مراقبہ اور سکون کہاں سے حاصل کیا ہے، انہوں نے جواب دیا اپنی لمبی سے جب وہ شکار کرنا چاہتی تھی تو چوہوں کے پلوں کے پاس ٹانگ لگا کر بیٹھ جاتی تھی اور اپنا بال تک

نہیں بلاتی تھی ابو عبد اللہ خفیف کتے ہیں کہ میں مصر ہے ابو نعی الرودباری سے ملنے کے لیے رملہ کی طرف چلا مجھ سے میسی ابن یونس مصری نے جو زائد نام سے مشہور تھے کہا کہ موضع صور میں ایک نوجوان اور ایک ادیب عمر کا شخص مراقبہ کی حالت میں ہیں اگر تم ایک نظر انہیں دیکھ لو تو شاید کچھ نفع ہو میں انہیں دیکھنے کی غرض سے اس حال میں صور پہنچا کہ بھوک پیاس سے بد حال تھا اور میرے جسم کے درمیان میں ایک کپڑا تھا اوپر اور نیچے کا حصہ برہنہ تھا میں وہاں کی مسجد میں داخل ہوا میں نے دیکھا کہ دو آدمی قبلے کی طرف رخ کئے ہوئے بیٹھے ہیں میں نے انہیں سلام کیا انہوں نے جواب نہیں دیا میں نے دوبارہ اور سہ بارہ بھی سلام لیا مگر وہ خاموش ہی رہے میں نے کہا میں تمہیں اللہ کی قسم دیتا ہوں تمہیں میرے سلام کا جواب دینا چاہیے نوجوان نے اپنا سر اٹھایا اور میری طرف دیکھ کر کہنے لگا اے خفیف کے بیٹے! دنیا بہت مختصر ہے اور اس مختصر میں سے بھی بہت کم بانی رہ گئی ہے مگر تو اس سے بہت کچھ حاصل کر سکتا ہے اے خفیف کے بیٹے! تیری مشغولیات کم ہیں تب ہی تو تجھے ہم سے ملنے کی فرصت مل گئی اس کے بعد اس نے اپنا سر جھکا لیا میں ان کے پاس دیر تک ٹھہرایاں تک کہ میں نے غم اور صبر کی نمازیں بھی انہی کے ساتھ ادا کیں معلوم نہیں ان کی نظر میں کیا تاثیر تھی میری بھوک پیاس سب اڑ گئی اور تمام حکمن دور ہو گئی جب عصر کا وقت آیا تو میں نے اس نوجوان سے کہا کہ مجھے کچھ نصیحت کیجئے نوجوان نے کہا ہم خود مصیبت میں ہیں تجھے کیا نصیحت کریں اس کے بعد میں ان کے پاس تین دن تک ٹھہرا رہا نہ میں کچھ کھاتا تھا اور نہ چیتا تھا اور نہ سوتا تھا اور نہ میں نے انہیں کھاتے پیتے ہوئے دیکھا جب تیسرا دن ہوا تو میں نے اپنے دل میں کہا کہ مجھے نصیحت کرنے کے لیے انہیں قسم دینی چاہیے شاید مجھے ان کے وعظ و نصیحت سے کچھ نفع ہو نوجوان نے اپنا سر اٹھایا اور کہنے لگا اے خفیف کے بیٹے! اس شخص کی صحبت اختیار کرنی چاہیے جسے دیکھ کر خدا یاد آجائے اور تیرے دل میں اس کی طبیعت جم جائے جو تجھے زبان حال سے نصیحت کرے زبان قال سے نصیحت نہ کرے سلام علیکم اب تم یہاں سے جاؤ یہ ہے ان مراقبین کا درجہ جن کے دلوں پر اللہ کی عظمت و جلالت اس قدر غالب ہوتی ہے کہ غیر کی گنجائش نہیں رہتی۔

دوسرا درجہ اصحاب یقین میں سے اہل وسع کا ہے یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں پر یہ یقین تو غالب رہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے تمام ظاہری و باطنی حالات پر مطلع ہے لیکن اس کی عظمت و جلال کا مشاہدہ انہیں مدہوش نہیں کرتا بلکہ ان کے قلوب مداح و احتفال پر رہتے ہیں اور ان میں اعمال و احوال کی طرف التفات رہتا ہے تاہم وہ اعمال پر موانعت کے ساتھ ساتھ مراقبہ سے خالی نہیں رہتے لیکن ان پر اللہ سے حیا غالب رہتی ہے اس لیے وہ تامل کے بغیر نہ کسی کام کی جرأت کرتے ہیں اور نہ کسی کام سے توقف کرتے ہیں اور ہر اس عمل سے رکتے ہیں جو قیامت کے دن انہیں رسوائی میں جٹا کرے گا وہ قیامت کے عطر نہیں رہتے بلکہ دنیا ہی کو میدان قیامت سمجھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کو اپنے احوال پر مطلع سمجھتے ہیں ان دونوں درجوں کا اختلاف مشاہدات سے واضح ہو جاتا ہے چنانچہ اگر کوئی شخص تنہائی میں کوئی عمل کر رہا ہو اور اس وقت وہاں کوئی بچہ یا عورت آجائے اور عمل کرنے والے کو یہ معلوم ہو جائے کہ آئے والا اس کے حال پر مطلع ہے تو وہ اس سے حیا کرے گا اور اپنی نشست سمجھ کرے گا اور اپنے احوال کو درست کرے گا ایسا عورت یا بچے کی تعظیم کے لیے نہیں کرتا بلکہ حیا کی وجہ سے کرتا ہے ان کا مشاہدہ اگرچہ اسے مدہوش نہیں کرتا نہ استغراق کی کیفیت میں جٹا کرتا ہے لیکن حیا میں جوش پیدا کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے باب میں بندوں کے مراقبہ کے یہ مختلف درجات ہیں جس شخص کا یہ درجہ ہوتا ہے جو اوپر ذکر کیا گیا وہ اس امر کا محتاج ہوتا ہے کہ اپنی تمام حرکات، سکناات، خطرات، لحظات اور اختیارات پر نگاہ رکھے اور یہ نگاہ مدہوش ہونی چاہیے ایک عمل سے پہلے اور دوسرے عمل کے بعد عمل سے پہلے یہ دیکھے کہ جو کچھ میرے لیے ظاہر ہوا ہے اور جس فعل کے لیے میرے خاطر نے حرکت کی ہے آیا وہ اللہ تعالیٰ کے لیے خاص ہے یا نفسانی خواہش اور شیطان کی اتباع کے لیے ہے یہاں کچھ دیر رک کر غور و فکر کرے یہاں تک کہ اس پر نور حق سے صحیح بات منکشف ہو جائے اگر اس کی حرکت اللہ کے لیے ہو تو اسے آگے بڑھائے اور ہوائے نفس کے لیے ہو تو اللہ سے حیا کرے اور اس سے رک جائے پھر اپنے نفس کو اس میں رغبت کرنے اور اس کی طرف

إِنَّ الْإِنْسَانَ تَذَعُونَ مِنْ قَوْلِ اللَّهِ عِبَادُ امْشَاكُم (پ ۱۳ ر ۱۳ آیت ۱۳)

تم خدا کو چھوڑ کر جن کو پہنچ رہے ہو وہ تم کو کچھ بھی رزق دینے کا اختیار نہیں رکھتے سو تم رزق خدا کے پاس تلاش کرو اور اسی کی عبادت کرو اور اسی کا شکر کرو۔

آلِ الْاِیْمَانِ الْخَالِصِ (پ ۲۳، ر ۱۵، آیت ۳)

جب بندہ یہ جان لیتا ہے کہ اسے مختلف سوالات کا سامنا کرنا ہوگا، اور نفس سے زبردست باز پرس ہوگی اور جواب دینے بغیر چھٹکارہ نہیں ہوگا تو وہ اس سے پہلے ہی سوال و جواب کے لیے تیاری شروع کر دیتا ہے، ہر سوال کے جواب کی تیاری کرتا ہے تاکہ وقت پر صبح جواب دے سکے بہر حال بندے کو چاہیے کہ وہ اپنے ہر کام سے پہلے نائل کرے خواہ وہ نیا کام کر رہا ہو یا کسی عمل کا اعادہ کر رہا ہو یہاں تک کہ انگلی ہلانے اور ہلکے چمکنے کا قفل بھی سوچے سمجھے بغیر نہیں ہونا چاہیے۔ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ ابن جبلؓ سے ارشاد فرمایا تھا کہ انسان سے اس کی آنکھوں کے سرے، انگلی سے مٹی کھرپٹے، اور اپنے بھائی کا کپڑا چھوئے کے متعلق بھی باز پرس کی جائے گی، حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ جھگڑے لانے کے لوگ صدقہ دینے سے پہلے کچھ دیر توقف کرتے تھے اور سوچتے تھے اگر یہ دیکھتے کہ ان کا صدقہ اللہ کے لیے ہے تو ارادہ پورا کرتے انہی کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے پر رحم فرمائے جو ارادہ کرے تو ٹھہرائے، اور جب یہ دیکھے کہ اس کا ارادہ اللہ کے لیے ہے تو اسے پورا کرے اور اگر غیر کے لیے ہے تو نلتوی کر دے حضرت سعدیؒ روایت میں ہے کہ انھیں حضرت سلمان فارسیؒ نے یہ نصیحت کی کہ جب بھی کوئی قصد کرے تو اللہ سے خوف کیا کر (احمد، حاکم، موقوفات) محمد ابن علیؒ کہتے ہیں کہ صاحب ایمان توقف کرنے والا اور ٹھہرنے والا ہوتا ہے، وہ اپنے

قصد کے وقت توقف کیا کرتا ہے وہ رات میں لکڑیاں بیچ کرے والا نہیں ہوتا (یعنی وہ اس شخص کی طرح نہیں ہوتا جو رات کی تاریکی میں خشک و تر اور غبار آلود ہر طرح کی لکڑیاں سمیٹ لے)۔

مراقبے کی پہلی نظر : یہ اس مراقبے کی پہلی نظر کا حال ہے، اس سے حفاظت کی صورت یہ ہے کہ آدمی پختہ علم رکھتا ہو، اعمال کے اسرار پر مطلع ہو، نفس کے مکائد اور شیطان کے مکر کی معرفت رکھتا ہو، اگر کوئی شخص نہ اپنے رب کو پہچانتا ہے، اور نہ اپنے نفس سے واقف ہے نہ اپنے دشمن شیطان سے واقفیت رکھتا ہے اور نہ یہ جانتا ہے کہ کون سے امور ہوائے نفس کے موافق ہیں اور نہ وہ اللہ تعالیٰ کی پسندیدہ اور غیر پسندیدہ چیزوں میں تمیز کر سکتا ہے اور نہ یہ دیکھتا ہے کہ اس کے ارادے، قصد، نیت اور حرکت و سکون میں سے کیا چیز رضائے الہی کے مطابق ہے وہ اس مراقبے میں صحیح سلامت نہیں رہ سکتا، بلکہ اکثر لوگ اللہ تعالیٰ کے ناپسندیدہ افعال کا ارتکاب کرتے ہیں اور اپنی جمالت کی بنا پر یہ سمجھتے ہیں کہ ہم اچھا کام کر رہے ہیں، اور ہمارے اعمال اللہ تعالیٰ کی رضا کے مطابق ہیں۔

پھر جمالت کوئی عذر نہیں، اگر کوئی شخص علم حاصل کر سکتا ہے تو اس سے کہا جائے گا کہ وہ علم حاصل کرے، اس کا یہ عذر قبول نہیں کیا جائے گا کہ وہ جاہل ہے، اس لیے کہ علم طلب کرنا تمام مسلمانوں پر فرض ہے، اسی لیے عالم کی دور رسکتیں جاہلی کی ہزار رکتوں سے افضل ہیں، یہیوں کہ عالم نفوس کی آفات، شیطان کے مکائد، اور مواقع فریب سے واقف ہوتا ہے اور ان سے بچ سکتا ہے جب کہ جاہل اپنی جمالت کی بنا پر ان سے اجتناب نہیں کر سکتا، اس لیے وہ ہمیشہ مشقت اور پریشانی میں رہے گا، جب کہ شیطان اس سے خوش رہے گا، اللہ تعالیٰ جمالت اور غفلت سے محفوظ رکھے، بد بختی کی اصل اور نقصان کی چڑی ہے، اس لیے ہر بندے پر واجب ہے کہ جب وہ کسی کام کا ارادہ کرے یا کسی اقدام کے لیے کسی کسرے تو کچھ دیر ارادے اور سعی میں توقف کرے، یہاں تک کہ نور علم سے اس پر یہ امر متکشف ہو جائے کہ اس کا ارادہ اور سعی اللہ تعالیٰ کے لیے ہے، اس صورت میں اقدام کرے اور اگر یہ واضح ہو کہ اللہ کے لیے نہیں ہے تو اس سے باز آئے اور قلب کو اس میں غور و فکر کرنے سے روکے کیوں کہ اگر باطل امور میں پہلے ہی مرے پر احتساب نہیں کیا گیا اور خیال و فکر کو باقی رہنے دیا گیا تو اس سے رغبت پیدا ہوگی، اور رغبت سے ارادے کو قطعیت ملے گی، اور ارادے سے عمل ہوگا، اور عمل سے ہلاکت اور بربادی ملے گی اس لیے شر کے مادے کو اس کے منج ہی میں ختم کرنا بہتر ہے، اور مادہ شر فکر باطل ہے بعد کے تمام امور اسی فکر باطل کے تابع ہوتے ہیں، اور اگر بندے پر کوئی امر مشکل ہو جائے اور کوئی واضح پہلو سامنے نہ آئے تو نور علم سے غور و فکر میں مدد لے شیطان کے مکر سے اللہ کی پناہ مانگے اگر اس کے باوجود مقصد حاصل نہ ہو تو علمائے دین کے نور سے روشنی حاصل کرے، اور ان گمراہ علماء سے دور بھاگے جو دنیا پر کتوں کی طرح کرتے ہیں، ان سے اس طرح پناہ مانگے جیسے شیطان لعین سے پناہ مانگتے ہیں، بلکہ ان سے کچھ زیادہ ہی اللہ کی پناہ مانگے، اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام پر وحی نازل فرمائی تھی کہ میرے بارے میں اس عالم سے سوال مت کرنا جو دنیا کے نشے میں مدھوش ہو، ایسا شخص تجھے میری محبت سے دور کر دے گا، یہ لوگ میرے بندوں کے لیے رہزموں سے کلم نہیں ہیں۔

بہر حال جن دلوں پر دنیا کی محبت اور کثرت طمع اور شدت ہوس کے باعث تاریکی چھا جاتی ہے وہ اللہ کے نور سے روشنی حاصل نہیں کر پاتے، اس لیے کہ دلوں کو حق تعالیٰ سے روشنی ملتی ہے جو شخص اس سے اعراض کرے گا اس کے دشمن سے تعلق رکھے گا، اس کی مبغوض اور ناپسندیدہ چیزوں یعنی دنیاوی شہوات سے مشغول رہے گا وہ یہ نور کیسے حاصل کر سکے گا۔ گویا سالک راہ طریقت کو چاہیے کہ وہ سب سے پہلے علم حاصل کرے، یا کوئی ایسا عالم تلاش کرے جو دنیا سے نفرت کرتا ہو یا دنیا میں اس کی رغبت ضعیف ہو، بشرطیکہ کوئی ایسا عالم نہ مل سکے جو بالکل طور پر دنیا سے لاقطع ہو۔ پھر کار و عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ النَّاصِرَ النَّاقِدَ عِنْدَ وَرُودِ الشَّبْهَاتِ وَالْعَقْلَ الْكَامِلَ عِنْدَ هَجُومِ الشَّهَوَاتِ (ابو یوسف۔ عمران ابن حصین)

اللہ تعالیٰ شہادت کے مواقع پر چشم بٹا کر اور ہجوم شہوات کے وقت عقل کامل کو پسند کرتا ہے۔
دیکھئے یہاں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں باتوں کو جمع فرمادیا 'حقیقت میں یہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ لازم و ملزوم بھی ہیں چنانچہ جس شخص کے پاس شہوات سے روکنے والی عقل نہ ہوگی اس کے پاس شہادت کو روکنے والی آنکھ بھی نہیں ہوگی 'اسی لیے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

مَنْ قَارَفَ ذَنْبًا قَارَفَهُ عَقْلٌ لَا يَتَعَوَّذُ إِلَيْهِ ابْنُكَ (۱) جو شخص گناہ کرتا ہے اس کی عقل ہمیشہ کے لیے رخصت ہو جاتی ہے۔

اس پھارے کے پاس عقل ہے ہی کتنی کہ اسے گناہ کر کے ضائع کر دے۔ آج کے دور میں اعمال کی آفتوں کا علم باقی نہیں رہا ہے 'اصل میں لوگوں نے اس طرح کے علوم سے دلچسپی ترک کر دی ہے 'اب عام طور پر ایسے علوم کا چرچا ہے جو لوگوں کے ان خصوصیات میں خللی کا رول ادا کرنے کی صلاحیت پیدا کرتے ہیں جو اتباعِ شہوات کی بنا پر رونما ہوتے ہیں ان علوم کا نام لہ لوگوں نے فقہ رکھا ہے 'اور علمِ دین کے فقہ کو بالائے طاق رکھ دیا ہے 'بلکہ اسے علم کی فہرست سے ہی خارج کر دیا ہے اس فقہ کا تعلق صرف دنیا سے رہ گیا ہے حالانکہ اس کا اصلی مقصد یہ تھا کہ لوگ ان امور میں مشغول نہ ہوں جن سے قلب کی فراغت متاثر ہو تاکہ فقیہ دین میں منہمک ہو سکیں فقہ کو دینی علوم میں اسی لیے جگہ دی گئی کہ یہ فقہ دین کا ذریعہ تھا 'لیکن لوگوں نے اس کا مقصد ہی بدل دیا۔ اب فقہ اس لیے حاصل کیا جاتا ہے کہ خوب خوب جھگڑے اٹھائے جائیں 'باریکیاں نکالی جائیں 'اور مذہب کے نام پر سب و شتم کیا جائے 'آج وہ زمانہ آگیا ہے جس کی پیش گوئی اس حدیث میں کی گئی تھی کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ تم لوگ ایسے زمانے میں ہو کہ جو تم میں سب سے زیادہ عقل کی طرف سبقت کرنے والا ہے وہ حق سب سے زیادہ خیر والا ہے عنقریب ایسا زمانہ آئے گا کہ جو توقف کرے گا وہ سب سے بہتر ہوگا۔ (۲) اسی بنا پر بعض صحابہ کرام نے شامیوں اور عراقیوں سے جنگ کرنے کے معاملے میں توقف کیا تھا 'میں کہ ان پر معاملہ مشتبه ہو گیا تھا 'ان صحابہ میں حضرات سید ابن ابی وقاص 'عبد اللہ ابن عمر 'اسامہ 'محمد ابن مسلمہ رضوان اللہ علیہم اجمعین تھے۔ جو شخص شبہ کے موقع پر توقف نہیں کرنا وہ خواہشِ نفس کا قمع ہے 'اور اپنی رائے کو فوقیت دینے والا ہے 'یہ شخص ان لوگوں میں سے ہے جن کے متعلق سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

فَإِذَا زَايَأَتْ شُغْلًا مَطَاعًا وَهَوًى مُتَّبَعًا وَاعْتَجَابَ كُلُّ ذِي رَأْيٍ بِرَأْيِهِ فَعَلَيْكُمْ بِخَاصَّةِ نَفْسِكُمْ (۳)

جب تو یہ دیکھے کہ بخل کی پیروی ہو رہی ہے اور ہوائے نفس کی اتباع کی جا رہی ہے اور ہر صاحبِ رائے اپنی رائے پر نازاں ہے تو تجھے خاص طور پر اپنے نفس کو لازم پکڑنا چاہیے۔
جو شخص بلا تحقیق کسی مشتبہ امر میں اپنی رائے کا اکتما کرنا ہے یا غور و خوض کرتا ہے وہ اللہ و رسول کے ان احکام کی خلاف ورزی کرتا ہے۔

لَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ (پ ۳۵ آیت ۳۶)

اور جس بات کی تجھ کو تحقیق نہ ہو اس پر عمل درآمد مت کیا کر

إِنَّا كُنْهُوَ الظَّنُّ فَإِنَّ الظَّنَّ أَكْذَبُ الْحَدِيثِ (۴)

ظن سے بچو 'اس لیے کہ ظن بڑا جھوٹ ہے۔

(۱) یہ روایت پہلے بھی گذر چکی ہے 'مجھے اس کی اصل میں (۲) مجھے یہ روایت میں (۳) یہ روایت پہلے گذر چکی ہے (۴) یہ روایت پہلے بھی گذر چکی ہے

اس حدیث میں علم سے مراد وہ علم ہے جس کی کوئی دلیل نہ ہو، بعض عوام مشتبہ مسائل میں اپنے قلب سے فتویٰ لیتے ہیں اور اپنے علم پر عمل کرتے ہیں، اس معاملے کی نزاکت اور شدت کے پیش نظر حضرت ابو بکر الصدیق رضی اللہ عنہ نے دعا کی تھی کہ:

اللَّهُمَّ لِرَبِّنِي الْحَقِّ حَقًّا وَلَا زُفْنِي إِبْتِغَاءً وَلَا رِيْبِي الْبَاطِلَ بِاطِلًا وَلَا زُفْنِي اجْتِنَابًا وَلَا

تَجْعَلْ مُتَشَابِهًا عَلَيَّ فَاتَّبِعْ الْهُدَى

اے اللہ! مجھے حق کو حق کی صورت میں دکھلا، اور مجھے باطل کو باطل کی صورت میں دکھلا اور اس سے بچنے کی توفیق عطا کر، اور مجھ پر امر حق مشتبہ مت کر کہ میں خواہش نفس کی پیروی کروں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں کہ امور تین طرح کے ہیں، ایک وہ جس کا اچھا ہونا ظاہر ہو، اس کی اجتناب کرو، دوسرا وہ کہ اس کا برا ہونا واضح ہو، اس سے اجتناب کرو، اور تیسرا وہ جس کا معاملہ مشکل ہو، یعنی اسکے حق یا باطل ہونے کا فیصلہ نہ ہو سکا ہو اسے عالم کے سپرد کرو۔ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا یہ تھی۔

اللَّهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ كُلِّ قَوْلٍ فِي الدُّنْيَا يُغَيِّرُ عِلْمِي

اے اللہ میں اس بات سے حیرانی پناہ چاہتا ہوں کہ دین کے معاملات میں علم کے بغیر کچھ کہوں۔

بہنوں پر اللہ کی سب سے بڑی نعمت علم، اور امر حق کا انکشاف ہے، ایمان بھی ایک نوع کا کشف اور علم ہے اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اس کو اس موقع پر ذکر فرمایا جہاں بہنوں پر اپنے احسانات کا حوالہ دیا گیا ہے، فرمایا:

وَكَانَ فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكَ عَظِيمًا (پ ۵ ر ۳ آیت ۳)

اور آپ پر اللہ کا بڑا فضل ہے۔

یہاں فضل سے علم مراد ہے، اس علم کی کچھ آیتیں حسب ذیل ہیں۔

فَاسْأَلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ (پ ۳ ر ۳ آیت ۳)

سو اگر تم کو علم نہیں تو اہل علم سے پوچھ لو۔

إِنَّا عَلَيْنَا اللَّهُمَّ (پ ۳ ر ۳ آیت ۳)

واقعی ہمارے ذمے راہ کا بتا دینا ہے۔

ثُمَّ إِنَّا عَلَيْنَا بَيَانَهُ (پ ۳ ر ۳ آیت ۳)

پھر اس کا بیان کرنا بھی ہمارا ذمہ ہے۔

وَعَلَى اللَّهِ قَضَاءُ السَّبِيلِ (پ ۳ ر ۳ آیت ۳)

اور سیدھا راستہ اللہ تک پہنچانا ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں ہوائے نفس اندھے پن میں شریک ہے، اور حیرانی، پریشانی کے وقت توقف کرنا توفیق کی بات ہے، اور تعین کے ذریعے بہر طور پر غم دور ہوتا ہے، کذب کا انجام ندامت ہے، صدق میں سلامتی ہے، ہمت سے بیگانے اپلوں سے زیادہ قریب ہوتے ہیں جس کا کوئی دوست نہ ہو وہ اپنی ہی ہے، اور صدیق وہ ہے جو غائب کی تصدیق کرے سو علم تجھے کسی حبیب سے محروم نہ کرے، کرم بہترین وصف ہے، حیاء ہر احسان کا سبب ہے، تقویٰ سے بڑھ کر کوئی چیز مضبوطی سے تھامی جانے والی نہیں ہے، اور زیادہ محکم سبب وہ ہے جو حیرے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ہو، دنیا میں حیرے لیے اسی قدر ہے جس سے تو نے اپنی آخرت سدھاری ہے، رزق دو طرح کے ہوتے ہیں، ایک وہ رزق ہے جسے تم تلاش کرو، اور دوسرا وہ رزق ہے جو تمہیں تلاش کرے، اگر تم اس تک نہیں پہنچ پاتے تو وہ خود تمہارے پاس آجاتا ہے، اگر تمہارے پاس کوئی چیز ہو، اور وہ ضائع ہو جائے اور تم

اس پر دایلا کرو تو اس پر دایلا نہ کرو جو تمہیں نہیں ملی اور اسے اس پر قیاس کر لو جو تمہیں مل گئی ہے اس لیے کہ تمام چیزیں یکساں ہوتی ہیں جو چیز آدمی سے فوت نہ ہو اس کے ملنے سے خوش ہوتا ہے اور جس چیز کو کبھی حاصل نہیں کر سکتا اس کے نہ ملنے پر رنجیدہ ہوتا ہے۔ تمہیں دنیا میں سے جو کچھ مل جائے اس پر خوش مت ہو اور جو نہ ملے اس پر غم نہ کرو بلکہ اس بات پر خوش ہو جو تم نے آخرت کے لیے توشہ کر لیا ہو اور ایسی چیز ہر الموس کو جو پیچھے رہ گئی ہو آخرت میں مشغول رہو اور موت کے بعد کی زندگی کے لیے فکر کرو۔ یہ حضرت علیؑ کی نصائح ہیں ہم نے یہ قیمتی نصائح اس ایک جملے کے لیے نقل کی ہیں کہ حیرت کے وقت توقف کرنا ایک توفیقی امر ہے۔

بہر حال مراقب کی نظر سب سے پہلے اپنی فکر اور ارادے پر ہونی چاہیے کہ وہ اللہ کے لیے ہے یا ہوائے نفس کے لیے چنانچہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں۔

ثَلَاثٌ مَنْ كُنَّ فِيهِ اسْتَكْمَلَ اِيْمَانَهُ لَا يَخَافُ فِي اللّٰهِ لَوْ مَآءُ لَانِمْ وَلَا يَزِيْزُ اِيْمَانِيْ بِشَيْءٍ مِنْ عَمَلِيْهِ وَاِذَا غِيْرُضَ لَهُ اَمْرَانِ اَخْلَصَ لِلدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ لَآخِرَةُ الْآخِرَةِ عَلٰى الدُّنْيَا (ابو منصور دہلی۔ ابو ہریرہ)

تین باتیں ایسی ہیں کہ اگر کسی شخص میں پائی جائیں تو اس کا ایمان مکمل ہو ایک تو یہ کہ اللہ کے سلسلے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈرے دوسرے یہ کہ اپنے کسی عمل سے ریا نہ کرے اور تیسرے یہ کہ جب اس پر دو معاملے پیش ہوں ایک دنیا کا اور دوسرا آخرت کا تو وہ آخرت کو دنیا پر ترجیح دے۔ اگر غور و فکر کے بعد کسی عمل کے بارے میں یہ نتیجہ نکلے کہ عمل مباح ہے لیکن اس میں کوئی فائدہ نہیں ہے تو اسے ترک کر دے اس لیے کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں۔

مَنْ حُسِّنَ اِسْلَامُ الْمَرْءِ نَزَكَ مَا لَا يَعْنِيْهِ (۱)

آدمی کے اسلام کی خوبی یہ ہے کہ وہ بے فائدہ امور ترک کر دے۔

مراقبہ کی دوسری نظر : مراقبہ کی دوسری نظر اس وقت ہو جب عمل شروع کرے یعنی عمل کی کیفیت کا طالب ہو اور یہ دیکھے کہ میں اس میں اللہ تعالیٰ کا حق ادا کر رہا ہوں یا نہیں اور اس کی تکمیل میں میری نیت درست ہے یا نہیں پھر اس عمل کو پورے طور پر انجام دے اور اسے مکمل طریقے سے بجالانے کی کوشش کرے یہ بات تمام احوال میں لازم ہے اس لیے کہ آدمی کا کوئی لمحہ حرکت و سکون سے خالی نہیں ہے اسے چاہیے کہ وہ اپنی ہر حرکت اور سکون میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کی نیت کرے اس طرح وہ اپنے تمام احوال میں آدابِ شرمیہ کی رعایت پر قادر ہو جائے گا۔ مثال کے طور پر اگر کوئی شخص بیٹھا ہو تو بہتر یہ ہے کہ قبلے کی طرف رخ کر کے بیٹھے۔ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

خَيْرُ الْمَجَالِسِ مَا اسْتَقْبَلَ بِهِ الْقِبْلَةَ

بہترین نشست وہ ہے جس میں قبلے کا استقبال ہو۔

چار زانو ہو کر نہ بیٹھے اس لیے کہ بادشاہوں کے سامنے اس طرح نہیں بیٹھا جاتا اور اللہ تعالیٰ تو تمام بادشاہوں کا بادشاہ ہے اور تمہاری نشست و برخاست پر مطلع ہے۔ حضرت ابراہیم ابن ادہمؒ کہتے ہیں کہ میں ایک دن چار زانو ہو کر بیٹھ گیا اچانک ایک فیہی آواز آئی کہ تو بادشاہوں کے سامنے اس طرح بیٹھتا ہے اس کے بعد میں کبھی چار زانو نہیں بیٹھا۔ سونے میں بھی اس کے آداب کی رعایت کرنی چاہیے مثلاً یہ کہ دائیں ہاتھ پر قبلے کی طرف رخ کر کے سوتے ہم شب و روز کے تمام آداب اپنی اپنی جگہوں پر لکھ

آئے ہیں، ان سب کا لحاظ رکھنا چاہیے، اور ان سب کا تعلق مراقبے سے ہے۔ یہاں تک کہ بیت الخلاء کے آداب کی رعایت کرنا بھی مراقبے سے متعلق ہے۔

بندے کی تین حالتیں : اصل میں بندے کی عام طور پر تین حالتیں ہوتی ہیں، یا وہ طاعت میں ہوتا ہے، یا معصیت میں، یا کسی امر مباح میں، ان تینوں حالتوں کا مراقبہ الگ الگ ہے، چنانچہ پہلی حالت، طاعت کا مراقبہ یہ ہے کہ اخلاص کے ساتھ کرے، پورے طور پر کرے، اس کے آداب کا لحاظ رکھے، اسے آفات سے بچائے، معصیت کا مراقبہ یہ ہے کہ توبہ کرے، اپنی حرکت پر تادم ہو، اس سے باز رہنے کا عزم کرے، شرمسار ہو، اور اس کا کفارہ ادا کرے، حالت مباح کا مراقبہ یہ ہے کہ اس کے آداب کی رعایت کرے، اور ان نعمتوں کا شکر کرے جو منعم نے عطا کی ہیں، بندہ ان تمام حالتوں میں مصائب اور راحتوں سے خالی نہیں رہتا، اسے مصائب پر صبر کرنا چاہیے، اور نعمتوں پر شکر ادا کرنا چاہیے، یہ صبر و شکر بھی مراقبے ہی میں داخل ہیں۔ بندے پر ہر حال میں اللہ کا ایک فرض ہے، خواہ وہ فعل ہو جس کا کرنا اس پر واجب ہے، یا امر ممنوع ہو جس سے باز رہنا اس کے لیے ضروری ہے، یا مستحب ہو جس پر اسے اس لیے برا نہ گنہ کیا جائے تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کی مغفرت کے حصول میں بہت کر سکے، اور ہند گان خدا سے آگے بڑھ سکے، یا امر مباح ہو جس میں اس کے قلب و جسم کی بھلائی ہے، اور اس سے طاعت الہی پر مدد ملتی ہے۔ ان تمام امور کی حدود ہیں، دوام مراقبہ کے ذریعے ان حدود کی رعایت کرنی چاہیے، اس لیے کہ:

وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُودَ اللَّهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ (پ ۲۸، آیت ۱)

اور جو شخص احکام خداوندی سے تجاوز کرے گا اس نے اپنے اوپر ظلم کیا۔

بندے کو چاہیے کہ وہ ان تینوں قسموں میں ہر وقت اپنے نفس کی حالت اور کیفیت کا جائزہ لیتا رہے، اگر کسی وقت فرائض سے فارغ ہو، اور فضائل کی طرف متوجہ ہو تو اسے افضل ترین عمل کی جستجو کرنی چاہیے تاکہ اس میں مشغول ہو سکے، اس لیے کہ جو شخص قدرت رکھنے کے باوجود زائد نفع سے محروم رہ جاتا ہے وہ زبردست خسارے میں ہے، منافع فضائل اعمال سے حاصل ہوتے ہیں انہی منفعتوں کے ذریعے بندہ اپنی آخرت سنوارتا ہے، اور دنیوی زندگی سے اخروی زندگی کے لئے کما کر لے جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَلَا تَنْسَ نَصِيبَكَ مِنَ الدُّنْيَا (پ ۲۰، آیت ۷)

اور دنیا سے اپنا حصہ فراموش مت کر۔

اور یہ تمام باتیں ایک ساعت کے صبر سے حاصل ہو سکتی ہیں، اس لیے کہ ساتتیں تین ہیں، ایک وہ ہے جو گذر گئی، اس میں بندے پر کچھ مشقت نہیں ہے، وہ جیسی بھی تھی اب گذر چکی ہے، ایک وہ ہے جو آئندہ آئے گی، اس کا حال بندے کو معلوم نہیں، نہ وہ یہ جانتا ہے کہ کب تک زندہ رہے گا اور نہ اسے یہ معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس ساعت میں اس کے لیے کیا فیصلہ کیا ہے، ایک موجودہ ساعت ہے، اس میں محنت کرنے، اور اپنے رب کا مراقبہ کرنے کی ضرورت ہے، اگر وہ سری ساعت نہ آئی تو اسے اس ساعت کے ضائع جانے پر حسرت نہ ہوگی، اور اگر وہ سری ساعت مل گئی تو اس میں سے بھی اپنا حق پورا حاصل کرے جس طرح پہلی ساعت سے حاصل کیا گیا تھا، یہ ہرگز تصور نہ کرے کہ میں بچاؤ برس تک زندہ رہوں گا، اور یہ سوچ کر گھبرا جائے کہ بچاؤ برس ایک طویل مدت ہے میں اس میں کیسے مراقبہ کر سکتا ہوں، ہر شخص کو چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو اسی ساعت کا مہمان سمجھے جس ساعت میں وہ موجود ہے، اور یہ سوچے کہ گویا میں آخری سانس لے رہا ہوں، اور یہ کوئی تعجب کی بات بھی نہیں کہ اس کی سانسیں آخری ہوں، اور اسے معلوم نہ ہو، جب وہ سمجھتا ہے کہ میری ساعت آخری ہو سکتی ہے تو اس میں ایسے حالی پر رہنا چاہیے کہ بالفرض موت آجائے تو وہ اسے خوش آمدید کہے سکے، یا اس کے تمام احوال ایسے ہوں جیسے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث میں مذکور ہیں، فرمایا کہ مومن کو تین ہی باتوں کی حرص ہوتی ہے، توشہ آخرت کی، اصلاح معاش کی، یا جائز اور مباح امور

سے لطف اندوز ہونے کی۔ (احمد، ابن حبان، حاکم، ابوداؤد) اسی طرح کی ایک روایت یہ بھی ہے کہ ہر عقلمند کے لیے چار ساعتیں ہونی چاہیے، ایک وہ جس میں اپنے رب سے مناجات کرے، دوسری وہ جس میں اپنے نفس کا احتساب کرے، تیسری وہ جس میں اللہ تعالیٰ کی صنعتوں میں غورو فکر کرے، اور چوتھی وہ جس میں اسے کھانے پینے کے لیے فراغت ہو، یہ ساعت اس کی باقی تین ساعتوں کی مددگار ہے (حوالہ سابق) پھر وہ ساعت بھی جو کھانے پینے میں گزرتی ہے، افضل اعمال یعنی ذکر و فکر سے خالی نہ ہونی چاہیے، چنانچہ جو کھانا وہ کھاتا ہے اس میں اتنے عجائب ہیں کہ اگر آدمی انہی میں غور کرنے بیٹھ جائے تو یہ اس کے لیے جوارح کے بہت سے اعمال سے افضل ہے اس سلسلے میں لوگوں کی کئی قسمیں ہیں، بعض لوگ وہ ہیں جو کھانے کو چشمِ عبرت سے دیکھتے ہیں کہ کیسی عجیب صنعت ہے، اور کس طرح حیوانات کی زندگی اس سے متعلق کر دی گئی ہے، نیز اللہ تعالیٰ نے اس کے کیسے کیسے اسباب پیدا کئے ہیں، پھر کھانے کی شہوات پیدا کی ہیں، اور ان شہوتوں کو مستحکم کرنے کے آلات تخلیق فرمائے ہیں، ہم نے اس طرح کے بعض امور کتاب الفکر میں بیان کر دیئے ہیں یہ عقلمندوں کا مقام ہے، ایک قسم ان لوگوں کی ہے جو کھانے کو غصے اور نفرت سے دیکھتے ہیں اور اسے اپنے مشاغل کے لیے مانع سمجھتے ہیں، اور یہ چاہتے ہیں کہ کسی طرح انہیں اس سے بے نیاز کر دیا جائے، لیکن وہ خود کو مجبور اور شہوات کے مستغریات ہیں یہ زاہدین کا مقام ہے بعض لوگ وہ ہیں جو صانع کی صنعت پر نظر ڈالتے ہیں، اور اس کے ذریعے خالق کی صفات تک ترقی کرتے ہیں گویا غذا کے مشاہدے سے ان پر فکر و تدبر کے دروازے کھلتے ہیں، یہ اعلیٰ مقام ہے اور اس پر عارفین اور محبتیں فائز ہیں، اس لیے کہ عارف اور محب حقیقی ہی صنعت سے صانع تک ترقی کرتا ہے وہ جب اپنے محبوب کا جھٹلایا اس کی کوئی کتاب دیکھتا ہے تو اسی میں مشغول نہیں رہتا بلکہ معنی کے تصور میں کھو جاتا ہے، بندے پر جو کچھ گذرتا ہے، یا جن چیزوں سے بندے کو سابقہ پیش آتا ہے وہ سب اللہ تعالیٰ ہی کی صنعت کے نمونے ہیں، انہیں صانع میں غورو فکر کا ذریعہ بناتے ہیں اس کے لیے بڑی مہجاش ہے بشرطیکہ اس پر ملکوت کے دروازے وا ہو جائیں یہ ایک کم یاب قسم ہے، کچھ لوگ وہ ہیں جو اسے حرص اور رغبت کی آنکھ سے دیکھتے ہیں جو ان سے رہ جاتا ہے اس پر حسرت کرتے ہیں، اور جو حاضر ہوتا ہے اس پر خوش ہوتے ہیں، جو ان کی مرضی کے موافق نہیں ہوتا اس کی مذمت کرتے ہیں، اس میں عیب نکالتے ہیں، پکائے والے کو برا کہتے ہیں، اور یہ نہیں سمجھتے کہ پکائے والے کو قدرت دینے والا اللہ ہی ہے، اور یہ کہ جو شخص اللہ کی اجازت کے بغیر اللہ کی کسی مخلوق کو برا کہتا ہے وہ اللہ کو برا کہتا ہے۔ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں۔

لَا تَسُبُّوا اللَّهَ فَإِنَّ اللَّهَ هُوَ الْكَافِرُ (مسلم، ابو ہریرہ)

نہانے کو برا مت کہو اس لیے کہ اللہ ہی نہانہ ہے۔

یہ دو سرائے مقام ہے اس کی شرح بڑی طویل ہے، ہم نے مختصر طریقے پر جو کچھ بیان کر دیا ہے اس سے مراقبہ کی اصول سے واقفیت ہو جاتی ہے بشرطیکہ وہ ان پر عمل کرنا چاہے۔

تیسرا مقام عمل کے بعد نفس کا محاسبہ : اس عنوان پر گفتگو کرنے سے پہلے ہم محاسبہ کے فضائل اور اس کی حقیقت بیان کریں گے۔

محاسبہ کے فضائل : اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَلَّمَتْ لِغَدٍ (پ ۶۲۸ آیت ۱۸)

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرتے رہو، بیشک اللہ تعالیٰ کو تمہارے اعمال کی سب خبر ہے۔

اس آیت میں ماضی کے اعمال پر محاسبہ کرنے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، حضرت عمرؓ اسی لیے لوگوں سے فرمایا کرتے تھے کہ اس سے پہلے کہ تمہارا حساب لیا جائے تم خود اپنے نفسوں کا احتساب کر لو، اور اس سے پہلے کہ انہیں پرکھا جائے تم خود پرکھ کر دیکھ

لو، حدیث شریف میں ہے کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں ایک شخص حاضر ہوا اور اس نے عرض کیا یا رسول اللہ! مجھے وصیت فرمائیے، آپ نے ارشاد فرمایا کیا تو (واقعی) وصیت چاہتا ہے، اس نے عرض کیا جی ہاں یا رسول اللہ! فرمایا جب تو کسی کام کا قصد کرے تو اس کے انجام پر نظر ڈال لے، اگر بہتر ہو تو اسے کرو ورنہ توقف کر لے! ایک حدیث میں ہے کہ عقلمند انسان کے لیے چار ساعتیں ہونی چاہئیں، ان میں سے ایک ساعت وہ ہے جس میں وہ اپنے نفس کا محاسبہ کرے۔ (۲)

قرآن کریم میں: وَتُؤْتُوا إِلَى اللَّهِ جَمِيعًا أَيُّهَا الْمُؤْمِنُونَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ (پ ۱۸ ر ۱۰ آیت ۳۱)
تم سب اللہ کے سامنے توبہ کرو تاکہ تم فلاح پاؤ۔

اور توبہ کے معنی یہ ہیں کہ فعل پر اس سے فارغ ہونے کے بعد ندامت کے ساتھ نظر ڈالی جائے، سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں اللہ تعالیٰ سے دن میں سو مرتبہ استغفار کرتا ہوں قرآن کریم میں ہے۔

إِنَّ الدِّينَ اتَّقُوا إِذَا مَسَّهُمْ طَائِفٌ مِنَ الشَّيْطَانِ تَذَكَّرُوا فَإِنَّا لَهُمْ مُبْصِرُونَ (پ ۱۹ ر ۱۳)
آیت ۲۹

جو لوگ خدا ترس ہیں جب ان کو کوئی خطرہ شیطان کی طرف سے آجاتا ہے تو وہ یاد میں لگ جاتے ہیں۔

حضرت عمرؓ رات کے وقت اپنے پیروں پر کوڑے لگاتے اور نفس سے خطاب کر کے فرماتے کہ تو نے آج کیا کیا۔ میمون ابن ابی مران کہتے ہیں کہ بندہ متقیین میں سے نہیں ہوتا جب تک کہ اپنے نفس سے اس طرح حساب نہ لے جس طرح تاجر اپنے شریک تجارت سے کیا کرتا ہے یعنی دونوں شریک عمل تجارت سے فراغت کے بعد حساب کرتے ہیں، اور نفع و نقصان کا اندازہ کرتے ہیں حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ حضرت ابو بکرؓ نے اپنے انتقال کے وقت ان سے فرمایا کہ لوگوں میں مجھے عمر سے زیادہ کوئی محبوب نہیں ہے، پھر آپ نے ان سے پوچھا میں نے کیا کہا، حضرت عائشہؓ نے آپ کا قول دہرایا پھر فرمایا کہ عمرؓ سے زیادہ مجھے کوئی عزیز نہیں ہے، دیکھئے کہ انہوں نے بات کہہ کر اس پر کیسے غور کیا، اور ایک کلمے کی جگہ دو سرا کلمہ رکھا، حضرت ابو طلحہؓ سے مروی ہے کہ جب انھیں نماز میں اپنے باغ کے پرندے کا خیال آیا تو انہوں نے اپنے اس تصور پر ندامت کے اظہار کے طور پر اور اللہ سے عفو و مغفرت کی امید میں اپنا وہ باغ صدقہ کر دیا۔ ابن سلام کی روایت میں ہے کہ انہوں نے لکڑیوں کا ایک ٹکڑا اٹھایا، لوگوں نے ان سے کہا کہ آپ کے بیٹے بھی تو ہیں اور نوکروں کی بھی کی نہیں ہے، وہ لوگ آپ کو اس مشقت سے بچا سکتے تھے، فرمایا میں اپنے نفس کو آزما رہا ہوں کہ کیا وہ وزن اٹھائے کو برا نہیں سمجھتا، حضرت حسن بصریؒ کہتے ہیں کہ مومن اپنے نفس کا گمراہ ہوتا ہے اور اللہ کے لیے اس کا محاسبہ کرتا ہے، ان لوگوں پر حساب کا عمل ہلکا ہو گا جو دنیا ہی میں اپنے نفسوں کا حساب کر لیتے ہیں اور ان لوگوں پر شدید ہو گا جنہوں نے دنیا میں اپنے نفسوں کا احتساب نہیں کیا، اس کے بعد آپ نے مجاہد کی تفسیر فرمائی کہ مومن کو اچانک کوئی بات اچھی لگتی ہے، اور وہ کہتا ہے کہ تو مجھے اچھی لگتی ہے اور میرے کام کی ہے، لیکن میرے اور تیرے درمیان ایک رکاوٹ کھڑی کر دی گئی ہے یہ حساب عمل سے پہلے ہوتا ہے، اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ بعض اوقات مومن سے کوئی خطا ہو جاتی ہے اور وہ اپنے نفس کی طرف رجوع کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اس عمل سے تیری کیا نیت ہے خدا کی قسم اس سلسلے میں میرا کوئی مذر حلیم نہیں کیا جائے گا، اور اللہ نے چاہا تو میں کبھی اس کا اعادہ نہیں کروں گا، حضرت انسؓ ابن مالکؓ کہتے ہیں کہ میں اور حضرت عمرؓ ابن الخطابؓ ایک روز ایک باغ میں سو گئے وہاں میں نے حضرت عمرؓ کو یہ کہتے ہوئے سنا۔ اس وقت میرے اور ان کے درمیان ایک دیوار حائل تھی کہ عمر ابن الخطابؓ امیر المومنین ہے، تجھے اللہ تعالیٰ سے ڈرنا چاہیے ورنہ وہ تجھے سخت عذاب دے گا، حضرت حسن بصریؒ نے قرآن کریم کی اس آیت کریمہ کی تفسیر میں فرمایا۔

وَلَا تَقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ (پ ۲۹ ر ۱ آیت ۲)

اور قسم کھانا ہوں اپنے نفس کی جو اپنے اوپر ملامت کرے۔

کہ مومن اپنے نفس پر عتاب کرتا رہتا ہے کہ تیرا اس کلمہ سے کیا ارادہ تھا، اور تو اس کھانے سے کیا نیت رکھتا تھا، اور اس شریعت سے تیرا مقصد کیا تھا، اس کے برعکس فاجر و فاسق آدمی آگے بڑھ جاتا ہے، اپنے نفس کو کسی بھی معاملے میں عتاب نہیں کرتا، حضرت مالک ابن دینار کہتے ہیں اللہ تعالیٰ اس بندے پر رحم کرے جو اپنے نفس سے پوچھ کرنا ہے کہ کیا تجھ سے فلاں غلطی سرزد نہیں ہوئی کیا تو نے فلاں قصور نہیں کیا، پھر اسے برا بھلا کہتا ہے، اور اسے لگام دے کر کتاب اللہ کا پابند کر دیتا ہے، اور کتاب اللہ کو اس کا تہ نہ بنا دیتا ہے، یہ بھی معاتبہ نفس کی ایک شکل ہے جیسا کہ اس کا ذکر عنقریب آئے گا، میمون ابن مہران کہتے ہیں کہ متقی انسان اپنے نفس کا حساب ظالم بادشاہ اور بخیل شریک سے بھی سخت لیتا ہے، ابراہیم النبیسی کہتے ہیں کہ میں نے اپنے آپ کو جنت میں تصور کیا، اس کے پھل کھائے، اس کی نہوں سے پانی پیا، اور اس کی حوروں سے گلے ملا، پھر میں نے خود کو جہنم میں تصور کیا، وہاں کی غذا اکھائی، پیپ پی، اس کا طبق اور زنجیریں پہنیں، پھر میں نے اپنے نفس سے پوچھا کہ اے نفس! تو ان میں سے کیا چاہتا ہے، اس نے کہا میں دنیا میں واپس جا کر نیک عمل کرنا چاہتا ہوں، میں نے کہا تیری آرزو پوری ہوئی، جا اور نیک اعمال کر، مالک ابن دینار کہتے ہیں کہ میں نے حجاج ابن یوسف کو ایک خطبے کے دوران یہ کہتے ہوئے سنا اللہ تعالیٰ اس شخص پر رحم کرے جو اپنے نفس کا حساب اس سے پہلے کر لے کہ اس کا حساب غیر کے حوالے کیا جائے اللہ تعالیٰ اس شخص پر رحم کرے جو اپنے عمل کی لگام پکڑ کر یہ دیکھے کہ اس کا مقصد کیا ہے، اللہ تعالیٰ اس شخص پر رحم کرے جو اپنے پیمانے پر نظر رکھے، اللہ تعالیٰ اس شخص پر رحم کرے جو اپنی میزان پر نظر رکھے، وہ اسی طرح کی باتیں کرتا رہا یہاں تک کہ میں روئے لگا۔ اسنت ابن قیس کے ایک رفیق کہتے ہیں کہ میں ان کے ساتھ رہا کرتا تھا آپ کا عام طور پر معمول یہ تھا کہ رات میں نماز کے بجائے زیادہ تر دعائیں کرتے، اور چراغ کے پاس آکر اس کی کو میں اپنی انگلی رکھتے یہاں تک کہ اس کی حرارت کا احساس ہوتا، اس کے بعد اپنے نفس سے کہتے اے حنیف! تو نے فلاں دن یہ کام کیوں کیا تھا، تو نے اس روز فلاں عمل کس لیے کیا تھا۔

عمل کے بعد محاسبی کی حقیقت : جس طرح بندہ کادن کے آغاز میں کوئی وقت ایسا خاص ہونا چاہیے جس میں وہ اپنے نفس کو خیر کی وصیت کرے، اسی طرح دن کے آخر میں بھی اس کا کوئی مخصوص وقت مقرر ہونا ضروری ہے جس میں وہ اپنے نفس سے مطالبہ کرے، اور اس کی تمام حرکات و سکنات کا حساب لے، جیسے تجارت پیشہ لوگ اپنے شرکاء کے ساتھ سال کے آخر میں یا مہینے کے ختم پر یا دن گزرنے کے بعد حساب فہمی کرتے ہیں، محض دنیا کی حرص سے، اور اس خوف کی بنا پر کہ کہیں وہ دنیاوی مال و متاع سے محروم نہ ہو جائیں حالانکہ اگر ضائع ہو جائے تو اس کا ضائع ہو جانا بہتر ہے، دنیا کا مال اگر کسی کو ملتا بھی ہے تو محض چند روز کے لیے ملتا ہے بالآخر اس سے چھین لیا جاتا ہے جب دنیا کے معاملات میں، اور اسکی عاری منفیوں میں بندوں کا یہ عالم ہے تو ان معاملات میں نفس سے حساب فہمی کیسے نہ کرے گا جن سے آخرت کی سعادت اور شقاوت متعلق ہے اور آخرت دائمی زندگی ہے، اگر کوئی شخص اس میں سستی کرتا ہے تو یہ اس کی غفلت اور ذلت کے مترادف ہے، اور قلت توفیق کی علامت ہے ہم اس سے اللہ کی پناہ چاہتے ہیں۔

شریک کے محاسبہ کا مطلب یہ ہے کہ رأس المال کا جائزہ لیا جائے، اور یہ دیکھا جائے کہ اس میں کتنا نفع ہوا ہے یا کس قدر نقصان پہنچا ہے تاکہ نفع و نقصان دونوں الگ الگ ہو جائیں اگر نفع ہو تو اسے لے لیا جائے، اور شریک کا شکر ادا کیا جائے کہ اس نے نفع کمانے میں محنت کی، اور اگر نقصان پہنچے تو اس سے تاوان کا مطالبہ کرے، اور مستقبل میں تدارک کا پابند قرار دے، بندے کے دین میں فرائض رأس المال ہیں، اور نوافل و فضائل نفع ہیں اور محاسبی نقصان ہیں، اس تجارت کا وقت شب و روز کی تمام ساعتیں ہیں، شریک تجارت نفس آثارہ اس لیے پہلے اس سے فرائض کا حساب لینا چاہیے کہ اس المال بہتتا ہونا چاہیے اتنا موجود

ہے یا نہیں، اگر اس نے فرائض بالکل ادا ہی نہیں کئے تو اس سے قضا کا مطالبہ کرے، اور اگر ناقص ادا کئے ہیں تو اس سے نقص کے طعنی کا مطالبہ کرے، اور یہ طعنی نوافل سے ہونی چاہیے، اور اگر معاصی کے ذریعے نقصان پہنچا ہے تو اس پر عقاب کرے، اسے قرار واقعی سزا دے تاکہ نقصان کی طعنی اچھی طرح ہونے لگے جس طرح تاجر اپنے شریک سے پیسہ پیسہ کا حساب کرتا ہے، اور نفع و نقصان کے تمام پہلوؤں پر نظر رکھتا ہے، اور شریک کی ہر حرکت پر نگاہ رکھتا ہے، اسی طرح دینی معاملات میں بھی نفس کے فریب و مکر سے احتیاط کرنی چاہیے کیوں کہ یہ بڑا فریب کار اور دھوکہ باز ہے۔

حساب کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے اس سے مفصل رپورٹ طلب کرے اور یہ معلوم کرے کہ اس نے دن بھر کس سے کیا گفتگو کی ہے، اس سلسلے میں اس کے ساتھ وہی موقف اختیار کرے جو قیامت کی میدان میں حساب کتاب کے وقت بندے کے ساتھ اختیار کیا جائے گا پھر نظر کا حساب لے یہاں تک کہ تمام افکار و خیالات اٹھنے بیٹھنے کھانے پینے اور سونے کے اعمال کا احتساب کرے، اگر چپ رہا ہو تو یہ دریافت کرے کہ وہ چپ کیوں رہا، اور ساکن رہا ہو تو یہ پوچھے کہ اس نے سکون کیوں اختیار کیا جب نفس پر واجب تمام امور کے سلسلے میں باز پرس کرے، اور یہ واضح ہو جائے کہ اس نے واجبات کا کس قدر حصہ ادا کیا ہے تو جو حصہ ادا ہونے سے رہ جائے وہ صفحہ دل پر نقش کر لے، جس طرح شریک کے ذمے باقی رہ جانے والی رقم کا پیوں پر لکھ لی جاتی ہے، اور اس کے حساب میں درج کر دی جاتی ہے، اور قرض خواہی کے وقت اس کی ادائیگی کا مطالبہ کیا جاتا ہے، اسی طرح نفس سے بھی مواخذہ کرے، اور اگر واجبات کی ادائیگی میں اس نے کچھ تسال کیا ہو تو وہ نقصان اسی کے حساب میں لکھ دے، اور نفس کو مقروض ٹھہرا کر اس سے وصولیابی کی کوشش کرے، کچھ قرض جرمانے کے ذریعے وصول ہو سکتا ہے، کچھ جوں کا توں واپس طلب کیا جاسکتا ہے، اور کچھ کے لئے سزا دی جاسکتی ہے، لیکن یہ تمام صورتیں حساب قسمی کے بعد اس وقت اختیار کی جاسکتی ہیں جب بتایا واجب کی صحیح مقدار متعین ہو جائے، اس کے بعد ہی اپنے حق کی ادائیگی کا مطالبہ کرے۔ یہ ایک روز کا حساب نہیں ہے، بلکہ زندگی بھر ہر روز اپنے تمام ظاہری و باطنی اعضاء سے اسی طرح محاسبہ کرنا چاہیے، جیسا کہ توبہ ابن النمرہ سے منقول ہے، وہ رقبہ میں تھے اور ایک دن اپنے نفس کا محاسبہ کر رہے تھے، انھوں نے اپنی عمر کا حساب کیا تو معلوم ہوا کہ وہ ساٹھ سالگ ہو چکے ہیں، اور ساٹھ برس میں انیس ہزار پانچ سو دن ہوئے ہیں، اس خیال کے ساتھ ہی انھوں نے ایک زبردست چیخ ماری، اور کہا افسوس میں شاہ حقیقی سے انیس ہزار پانچ سو گناہوں کے ساتھ ملاقات کروں گا، اور اگر ہر دن کے دس ہزار گناہ ہوئے تو میرا انجام کیا ہوگا، پھر وہ بے ہوش ہو کر گر پڑے، اور اسی حالت میں اپنے حقیقی مولیٰ سے جا ملے، لوگوں نے ان کے انتقال کے بعد ایک غیبی آواز سنی، کوئی شخص کہہ رہا تھا اب فردوس بریں کی طرف جاؤ، بندے کو اپنی سانسوں کا اسی طرح حساب کرنا چاہیے، قلب اور اعضاء سے جو معاصی سرزد ہوئے ہیں نفس سے ان کا حساب بھی لینا چاہیے، اگر بندہ اپنے ہر گناہ کے عوض ایک پتھر گھر میں ڈالے تو تھوڑی ہی سی مدت میں تمام گھر پتھروں سے بھر جائے، لیکن بندہ معاصی سے بچتے ہیں سستی کرتا ہے، حالانکہ فرشتے سستی نہیں کرتے وہ اس کے تمام گناہ لکھتے رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

أَحْصَاهُ اللَّهُ نَسْوَهُ (پ ۲۸ ر آیت ۶)

اللہ تعالیٰ نے اسے محفوظ کر رکھا ہے اور یہ اسے بھول گئے ہیں۔

چوتھا مقام قصور کے بعد نفس کی تعذیب : جب بندہ اپنے نفس کا احتساب کرے، اور یہ دیکھے کہ وہ معصیت کے ارتکاب سے بچ نہیں سکا ہے، اور اس نے اللہ تعالیٰ کا حق پوری طرح ادا نہیں کیا ہے تو اسے اسی حال پر نہ چھوڑے۔ اس لیے کہ اگر اس نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا تو اس کے لیے گناہ کا ارتکاب اور سہل ہو جائے گا، اور نفس معاصی سے مانوس ہو جائے گا، یہاں تک کہ ان سے بچنا اس کے لیے نہایت دشوار ہو جائے گا، اور یہ سراسر ہلاکت اور تباہی کی بات ہے کہ نفس گناہ کا عادی بن جائے گا، اس لیے یہ ضروری ہے کہ نفس کو اس کی غلامی پر سزا دی جائے، چنانچہ اگر کوئی شخص شہوت نفس کے ساتھ کوئی مشتبہ

لقمہ کھالے تو اس کی سزایہ ہے کہ بھوکا رہے، اور اگر غیر محرم کی طرف دیکھے تو آنکھ کو یہ سزا دے کہ وہ کسی چیز کی طرف نہ دیکھے، اسی طرح تمام اعضاء بدن کو ان کی غلطیوں پر یہ سزا دے کر انہیں ان کی شہوات سے روک دے، سا لکین راہ آخرت کا یہی طریقہ تھا، چنانچہ منصور ابن ابراہیم سے مروی ہے کہ ایک شخص نے ایک اجنبی عورت سے بات کی، اور اس کی باتوں میں کچھ ایسا مدہوش ہوا کہ اپنا ہاتھ اس کی ران پر رکھ دیا، بعد میں اس غلطی پر نہایت شرمندہ ہوا، اور ہاتھ کو آگ کے شعلوں پر رکھ کر سزا دی یہاں تک کہ ہاتھ جل کر کوئلہ ہو گیا، روایت ہے کہ نبی اسرائیل میں ایک شخص اپنے معبد میں عبادت کیا کرتا تھا، ایک زمانے تک وہ اپنی عبادت میں مشغول رہا، ایک دن اس نے باہر جھانکا تو ایک فتنہ طراز حسین عورت پر نظر پڑی، دل چل اٹھا، اور یہ خواہش ہوئی کہ باہر نکلے اور اس عورت سے ملاقات کرے، چنانچہ اس نے معبد سے باہر قدم نکالا، لیکن رحمت الہی اس کے ساتھ ساتھ تھی، اچانک اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا، اور کہنے لگا میں یہ کیا کر رہا ہوں، تھوڑی دیر پس و پیش کرنے کے بعد اس کا دل پُر سکون ہو گیا، اور اس گناہ سے محفوظ رہا، لیکن اس واقعے پر وہ اس قدر شرمندہ ہوا کہ جو پاؤں عورت سے ملنے کے لیے عبادت خانے سے باہر نکلا تھا اسے اپنے ساتھ عبادت خانے لے جانے پر راضی نہ ہوا، چنانچہ وہ اپنا پاؤں باہر کی طرف لٹکا کر بیٹھ گیا، بارش اور برف گرتی رہے، اور دھوپ پڑتی رہی، لیکن اس نے اپنا پاؤں نہیں ہٹایا، یہاں تک کہ وہ پاؤں گل کٹ کر گر گیا، اس کے بعد اس نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا، بعد کی بعض آسمانی کتابوں میں اس واقعے کا ذکر موجود ہے، حضرت جنید بغدادی روایت کرتے ہیں کہ ابن الکریسی نے فرمایا کہ ایک رات مجھے غسل کی ضرورت ہو گئی، وہ ایک سردرات تھی، میں نے اپنے نفس میں کچھ سستی پائی، اور یہ ارادہ ہوا کہ صبح تک غسل کو مؤخر کروں، صبح اٹھ کر پانی گرم کروں گا یا حمام میں جا کر غسل کروں گا، خواہ خواہ نفس کو مشقت میں مبتلا کرنے سے کیا فائدہ، اس کے بعد میں نے اپنے دل میں کہا میں نے زندگی بھر اللہ کا کام کیا ہے، اس کا مجھ پر ایک واجب حق ہے، جلدی کرنے میں تو مجھ کو نہ ملے گا، کیا تاخیر کرنے میں مل جائے گا، مجھے بھی قسم ہے کہ میں اسی گدڑی سمیت نماؤں گا، اور نہانے کے بعد بھی اسے جسم سے جدا نہ کروں گا، نہ دھوپ میں سکھاؤں گا، اور نہ نچوڑوں گا، یہاں تک کہ وہ جسم ہی پر سوکھ جائے۔

روایت ہے کہ غزو ان اور ابو موسیٰ کسی غزوے میں شریک تھے کہ ایک عورت ظاہر ہوئی غزو ان نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا، اور اس زور سے اپنے منہ پر طمانچہ مارا کہ آنکھ پر دم آگیا اور کہا کہ تو ایسی چیز کی طرف نہ دیکھتے ہو جو تیرے لیے مضرب ہے، ایک شخص نے کسی نامحرم عورت کو دیکھا، اور اس غلطی پر نفس کو یہ سزا دی کہ زندگی بھر کے لیے لعنہ پانی نہ پینے کا عہد کیا، وہ بزرگ جب تک زندہ رہے انہوں نے گرم پانی پیا، اور بڑی بے لطفی کے ساتھ زندگی بسر کی، ایک مرتبہ حسان ابن ابی سنان کسی نئی عمارت کے پاس سے گزرے اور یہ پوچھ بیٹھے کہ یہ عمارت کب بنی ہے، اس کے بعد اپنے نفس کی طرف متوجہ ہوئے اور کہنے لگے کہ تم نے ایک لایعنی سوال کیا ہے، میں تجھے ایک سال کے روزوں کی سزا دوں گا، چنانچہ انہوں نے سال بھر تک روزے رکھے، مالک ابن حنیفم کہتے ہیں کہ ایک روز عصر کی نماز کے بعد رہا القیسی ہمارے یہاں آئے اور ہمارے والد کو معلوم کرنے لگے، ہم نے کہا کہ وہ سو رہے ہیں، یہ سن کر انہوں نے کہا کیا یہ سونے کا وقت ہے، وہ اس وقت سو رہے ہیں؟ یہ کہہ کر چلے گئے، ہم نے ان کے پیچھے ایک آدمی بھیج کر یہ کہلایا کہ اگر آپ فرمائیں تو انہیں جگا دیا جائے، وہ آدمی واپس آیا، اور کہنے لگا کہ وہ تو کسی فکر میں غلٹاں تھے، میری بات انہوں نے سنی، آن سنی کر دی، میں نے دیکھا کہ وہ قبرستان گئے، اور اپنے نفس پر عتاب کرنے لگے اور کہنے لگے تو نے یہ کیوں کہا کہ وہ اس وقت سوتے ہیں، کیا خیرے ڈے ایسا کہنا واجب تھا، آدمی جس وقت چاہے سوتے، تو کون ہوتا ہے کسی سے باز پرس کرنے والا، تجھے کیا معلوم یہ سونے کا وقت ہے یا نہیں، تو نے ایسے معاملے میں اپنی زبان کیوں کھولی جس سے تو اچھی طرح واقف نہیں ہے، تو نے ایک بھیا تک فلتسی کی ہے، اور میں تجھے اس کی سزا ضرور دوں گا، اور وہ سزایہ ہے کہ میں ایک برس تک سونے کے وقت زمین سے کمر نہیں لگاؤں گا، آلا یہ کہ کوئی مرض آپڑے، یا غسل میں فور پیدا ہو جائے، کم بخت تجھے شرم نہیں آئی تو کب تک لوگوں کو ڈانٹ ڈھٹ کرے گا، اور اپنی گمراہی سے غافل رہے گا، یہ کہہ کر وہ روئے گئے، انہوں نے مجھے نہیں

دیکھا، میں انہیں اسی حالت پر چھوڑ کر واپس آگیا، ایک رات حیم وادری تہجد کی نماز کے لیے نہ اٹھ سکے، انہوں نے اس کی سزایہ تجویز کہ ایک سال تک رات کو نہیں سوئے، اور پوری رات نماز میں گزاری۔

حضرت طلحہ روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص چلا، اور اس نے اپنے کپڑے اتارے اور گرم پتھروں پر لوٹ لگائی، وہ شخص اپنے نفس کو خطاب کر کے کہہ رہا تھا کہ اے رات کے مودار اور دن کے بیکار لے مزہ چک، 'جنم کی حرارت اس سے بھی زیادہ شدید ہے، وہ اسی حال میں تھا کہ اس کی نظر سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر پڑی، آپ اس وقت ایک درخت کے سائے میں تشریف فرما تھے، وہ شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا رسول اللہ میرا نفس مجھ پر غالب آگیا ہے، آپ نے فرمایا کیا اس کی علاوہ کوئی صورت نہیں تھی جو تو نے اپنے نفس کے ساتھ اختیار کی، بہر حال تیرے لیے آسمان کے دروازے کھول دیئے گئے ہیں، اور اللہ تعالیٰ تجھ پر فرشتوں میں فخر کرتا ہے، پھر آپ نے اپنے اصحاب سے ارشاد فرمایا، اپنے بھائی سے توشہ لو، یہ سن کر ہر شخص کہنے لگا کہ اے فلاں! میرے لیے دعا کر، میرے لیے دعا کر، سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ان سب کے لیے دعا کر، چنانچہ اس شخص نے دعا کی: اے اللہ تقویٰ کو ان کا توشہ بنا، اور ان کو ہدایت پر جمع رکھ، سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے اللہ! اسے راہِ راست پر کر، اس شخص نے یہ دعا کی اے اللہ جنت کو ان سب کا ٹھکانہ بنا (ابن ابی الدنیا۔ یث ابن سلیم) حذیفہ ابن قبادہ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے کسی نیک آدمی سے دریافت کیا کہ شہوات نفس کے باب میں تم اپنے نفس سے کیا معاملہ کرتے ہو، اس نے جواب دیا کہ روئے زمین پر مجھے اپنے نفس سے زیادہ کسی نفس سے بعض نہیں ہے، میں اس کی خواہش کیسے پوری کر سکتا ہوں۔ ابن السماک، حضرت داؤد طائی کے گھر تشریف لے گئے، آپ کا کچھ دیر غلغلہ ہی انتقال ہوا تھا، اور اس وقت لاش زمین پر رکھی ہوئی تھی، آپ نے ان سے مخاطب ہو کر فرمایا اے داؤد تم نے اپنے نفس کو قید کر دیا تھا اس سے پہلے کہ وہ قید کیا جاتا، اور اپنے نفس کو عذاب دیا تھا اس سے پہلے کہ اسے عذاب دیا جاتا، آج تم اپنا ثواب اس کے یہاں دیکھ لو گے جس کے لیے عمل کرتے تھے۔ وہب ابن منبہ کہتے ہیں کہ ایک شخص کو جو طویل عرصے سے عبادت کر رہا تھا اللہ تعالیٰ سے کوئی حاجت پیش آئی، اس نے ستر ہفتے تک اس کے لیے اس طرح مجاہدہ کیا کہ ایک ہفتے میں صرف سات چھوڑے کھاتا تھا، اور شب و روز عبادت کرتا تھا، ستر ہفتے گزرنے کے بعد اس نے اپنی حاجت کے بارے میں دعا کی، مگر دعا قبول نہیں ہوئی، اس نے اپنے نفس سے کہا کہ اگر تجھ میں کوئی بات ہوتی تو تیری دعا ضرور قبول کی جاتی، اسی وقت ایک فرشتہ آیا اور اس نے کہا اے ابن آدم تیری یہ ساعت ماضی کی تمام عبادتوں سے بہتر ہے، اللہ تعالیٰ نے تیری حاجت پوری کر دی ہے۔

عبد اللہ ابن قیس کہتے ہیں کہ ہم ایک جہاد میں تھے، اچانک دشمن کی آمد کا شور ہوا، ہم سب جنگ کے لیے مستعد ہو گئے، اس روز بڑی سخت ہوا چل رہی تھی، میں نے دیکھا ایک شخص لوگوں سے الگ ہٹ کر اپنے نفس سے کہہ رہا ہے اے نفس! تو نے فلاں جہاد کے موقع پر یہودی بچوں کا حوالہ دے کر مجھے شرکت سے باز رکھنے کی کوشش کی تھی، اور میں نے حیران مشورہ قبول کر لیا تھا، پھر فلاں جہاد کے موقع پر بھی تو نے مجھے یہودی بچوں کا خوف دلا کر روکا اور میں رک گیا، لیکن آج میں حیران کہتا نہیں مانوں گا، اور تجھے آگے بڑھا دوں گا خواہ اللہ تجھے پکڑے یا نہ پکڑے، میں نے اپنے دل میں کہا کہ میں اس شخص پر نظر رکھوں گا، چنانچہ میں نے اس پر مسلسل نظر رکھی، جب جنگ شروع ہوئی تو وہ مجاہدین کی صفِ اول میں تھا، پھر دشمن نے مجاہدین پر زبردست حملہ کیا اس حملے سے وہ لوگ منتشر ہو گئے مگر وہ شخص اپنی جگہ ڈٹا رہا، لوگ کئی بار منتشر ہوئے، لیکن وہ شخص اپنی جگہ جما ہوا اور ڈٹا ہوا نظر آیا، اور جب تک وہ شہید نہیں ہو گیا یہی صورت حال رہی، میں نے اس کے جسم پر اور گھوڑے کے بدن پر ساٹھ سے زائد زخم شمار کئے، ہم نے حضرت ابو طلحہ کی روایت نقل کی ہے کہ نماز کے دوران ان کے دل میں اپنے باغ کے ایک پرندے کا خیال آگیا تھا، آپ نے نماز سے فارغ ہونے کے بعد وہ باغ ہی صدقہ کر دیا تاکہ یہ صدقہ ان کی تقصیر کا کفارہ بن سکے، حضرت عمرؓ ہر روز اپنے پاؤں پر کوڑے لگاتے تھے اور کہتے تھے کہ تو نے آج کون سا عمل کیا ہے، مجمع روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے اوپر نظر اٹھائی تو دیکھا ایک عورت

کھڑی ہوئی ہے، آپ نے اس کی یہ سزا مقرر کی کہ آئندہ کبھی آسمان کی طرف نظر نہیں اٹھائیں گے! احنف ابن قیس رات میں چراغ کی لو پر اپنی انگلی رکھ دیتے تھے اور کہتے تھے اے فس تو نے فلاں دن فلاں گناہ کیوں کیا تھا، وہیب ابن الورد کو اپنے فس کا کوئی فعل برا لگا، آپ نے اپنے سینے کے چند بال اکھاڑ لئے، اس سے بڑی تکلیف ہوئی، وہیب نے کہا اے فس! میں تو خیر اسی بھلا چاہتا ہوں، محمد ابن بشر نے داؤد طائی کو دیکھا کہ وہ روٹی کے ساتھ دو دنہ افطار کر رہے ہیں، آپ نے ان سے کہا اگر آپ نمک کے ساتھ روٹی کھا لیتے تو اچھا تھا، انھوں نے فرمایا میرا فس مجھے ایک سال سے نمک پر اکسا رہا ہے، اور داؤد نے یہ عہد کر لیا ہے کہ وہ باقی زندگی نمک نہیں استعمال کرے گا، سجدہ اور دور اندیش لوگ اس طرح اپنے فسوں کو طاب دیا کرتے تھے، ہمیں حیرت ہے کہ تم اپنے غلاموں، باندیوں، اور بیوی بچوں کو ان کی خطاؤں پر سزا دیتے ہو، اور یہ سمجھتے ہو کہ اگر تم نے انھیں معاف کر دیا تو وہ سرکش ہو جائیں گے اور ان کا معاملہ تمہارے اختیار سے باہر ہو جائے گا، وہ تیرے خلاف بغاوت کر دیں گے، ایک طرف غلاموں اور باندیوں کے ساتھ خیرا یہ سلوک ہے، دوسری طرف تو اپنے فس کو ڈھیل دے ہوئے ہے، حالانکہ یہ خیرا بدترین دشمن ہے، اس کی سرکشی زیادہ ہے، اور اس کی بغاوت کا نقصان ان کی بغاوت کے نقصان سے بڑا ہے، وہ لوگ زیادہ سے زیادہ تیری دنیوی زندگی میں پریشانیاں پیدا کر سکتے ہیں، جب کہ فس تیری اخروی زندگی برباد کرنے والا ہے، اگر تو محل کی دولت سے مالا مال ہے تو یہ بات اچھی طرح سمجھتا ہے کہ آخرت کی زندگی کے علاوہ کوئی زندگی نہیں ہے، اس میں ختم نہ ہونے والی نعمتیں ہیں، فس اس زندگی کو بچاؤ کرنے والا ہے۔ اس لیے سزا کا زیادہ مستحق ہے۔

پانچواں مقام مجاہدہ : مجاہدہ یہ ہے کہ جب تو اپنے فس کا حساب کرے اور یہ دیکھے کہ اس نے کسی محبت کا ارتکاب کیا ہے تو اسے وہ سزا میں دے جو گذشتہ طور میں بیان کی جا چکی ہیں، اور اگر یہ دیکھے کہ وہ فحائل یا اوراد میں سستی کرتا ہے تو اسے اوراد کے بوجھ سے گرا ہار کر دے، اور مختلف وظائف کا پابند کر دے تاکہ کچھلی کو تابیوں کی طغیانی اور گذشتہ نقصان کا تذکرہ ہو سکے۔ عالمین خدا اسی طرح عمل کیا کرتے تھے چنانچہ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نماز عصر جماعت سے نہیں پڑھ سکے، آپ نے اپنے فس کو اس کی یہ سزا دی کہ اپنی وہ زمین صدقہ کر دی جس کی قیمت دو لاکھ درہم تھی، اگر حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کوئی نماز جماعت سے نہ پڑھ پاتے تو وہ رات جاگ کر گزارتے، ایک مرتبہ آپ نے مغرب کی نماز اتنی تاخیر سے پڑھی کہ دو ستارے طلوع ہو گئے، اس کی سزا میں آپ نے دو غلام آزاد کئے، ایک ہار ابن ابی ربیعہؓ فجر کی دو سنتیں نہ پڑھ سکے اس کی سزا آپ نے ایک غلام آزاد کر کے دی، بعض لوگ معمولی معمولی خطاؤں پر اپنے فس کو سال بھر کے روزوں، یا پیدل حج، یا اپنا تمام مال راہ خدا میں صدقہ کرنے کا پابند بنالیا کرتے تھے، اور وہ صورتیں اختیار کرتے جن سے ان کی نجات ہو جائے، یہ تمام اعمال فس کے مراتب کے طور پر کیا کرتے تھے۔

رہا یہ سوال کہ اگر تمہارا فس تمہاری اتباع نہیں کرتا، یا وہ مجاہدے اور اوراد کی پابندی پر آمادہ نہیں ہے تو اس کے علاج کی کیا صورت ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ تم اسے وہ روایات سناؤ جو مجاہدین کی فعالیت میں وارد ہوئی ہیں، اور سب سے زیادہ نفع بخش علاج یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کے بندوں میں سے کسی ایسے بندے کی صحبت اختیار کرو جو عبادت میں محنت کرنے والا ہو اس کی باتیں غور سے سنو اور ان پر عمل کرو، اس کے اعمال کا مشاہدہ کرو اور ان کی اقتدا کرو، ایک بزرگ کہتے ہیں کہ جب عبادت کے باب میں مجھ پر کچھ سستی چھانے لگتی تو میں محمد ابن الواسع کے احوال اور عبادات کا مشاہدہ کرتا، ایک ہفتے کے عمل سے میری سستی غائب ہو جاتی، لیکن آج کل یہ عمل پیداوار ہو گیا ہے، اس لیے کہ اب ایسے لوگ کہاں باقی رہے جو عبادت میں مجاہدہ کیا کرتے تھے، پہلے لوگوں کے مجاہدے اب قصہ پارینہ بن چکے ہیں، اس لیے اب مشاہدے کے بجائے سننے پر زیادہ زور دینا چاہیے، ہمارے خیال میں ان کے احوال سننے، اور ان کے واقعات کا مطالعہ کرنے سے زیادہ کوئی چیز نفع بخش نہیں ہے، واقعہً مجاہدہ ان لوگوں کا قاتل ہے ان کی مشقتوں کا دور ختم ہو چکا ہے، ابدالاً باد کے لیے ثواب اور نعمتیں باقی رہ گئی ہیں، یہ سلسلہ کبھی ختم ہونے والا نہیں ہے، ان کی سلطنت کس قدر وسیع ہے، اور ان لوگوں کا خیال کس قدر افسوسناک ہے جو ان کی اقتداء نہیں کرتے، یہ لوگ چند روز تک دنیاوی

لذات سے متنع ہوں گے، پھر موت آئے گی، اور ان کے اور شوقوں کے درمیان ہمیشہ ہمیشہ کے لیے حائل ہو جائے گی، ہم اس سے اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہتے ہیں۔

یہاں ہم مجتہدین کے اوصاف اور ان کے فضائل بیان کرتے ہیں، تاکہ سالک طریقت کے دل میں ان کی اقتداء کرنے کا جذبہ پیدا ہو سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ ان قوموں پر رحم فرمائے جنہیں لوگ مریض تصور کریں، حالانکہ وہ مریض نہ ہو۔ (۱) حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ بظاہر مریض نظر آنے والے لوگ وہ ہیں جنہیں عبادت کی مشقت محض کر دے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

وَالَّذِينَ يُؤْتُونَ مَا آتَوْا وَقُلُوبُهُمْ وَجَلَةٌ (پ ۱۸، آیت ۴۰)

اور جو لوگ دیتے ہیں جو کچھ دیتے ہیں اور (دینے کے باوجود) ان کے دل خوف زدہ رہتے ہیں۔

حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ اس آیت میں وہ لوگ مراد ہیں جو اعمالِ صالحہ کے باوجود اللہ کے عذاب سے ڈریں، اور یہ سوچیں کہ ان کی وجہ سے ہم عذابِ الہی سے محفوظ نہ رہ سکیں گے، ایک حدیث میں ہے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: طوبیٰ لمن طال عمرہ و حسن عملہ (طبرانی۔ عبد اللہ ابن بشر) اس شخص کے لیے خوشخبری ہے جس کی عمر لمبی ہو اور عمل اچھے ہوں۔

ایک روایت میں ہے اللہ تعالیٰ اپنے فرشتوں سے دریافت فرمائیں گے کہ آخر میرے بندوں کو کیا ہوا ہے وہ اس قدر مجاہدہ کیوں کرتے ہیں، فرشتے عرض کریں گے، یا اللہ آپ نے انہیں ایک چیز سے ڈرا دیا ہے اس سے وہ ڈرتے ہیں اور ایک چیز کا مشتاق بنا دیا ہے اس کا وہ شوق رکھتے ہیں اللہ تعالیٰ فرمائے گا اگر میرے بندے مجھے دیکھ لیں تو ان کا کیا حال ہو، فرشتے عرض کریں گے تب وہ اور زیادہ جدوجہد کریں گے۔ حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ میں نے ایسے لوگوں کو دیکھا ہے اور ان میں سے بعض کی مجلسوں میں بھی حاضر رہا ہوں جو دنیا کی کوئی چیز پا کر خوش نہیں ہوتے تھے، اور نہ دنیا کی کوئی چیز کھو کر انہیں رنج ہوتا تھا، دنیا ان کی نظروں میں اس مٹی سے بھی زیادہ حقیر تھی جسے تم اپنے پاؤں سے روندتے ہو، وہ لوگ پوری زندگی گزار جاتے تھے مگر ان کے متعلق کبھی یہ نہیں سنا گیا کہ کبھی ان کے لیے کپڑے طے کئے گئے، یا انہوں نے اپنے گھر والوں سے کسی خاص کھانے کی فرمائش کی، یا زمین اور اس کے درمیان کوئی کپڑا بچھایا گیا، میں نے انہیں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کار بند پایا، جب رات اپنے بازو پھیلاتی تو وہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جاتے، اپنا چہرہ زمین پر رکھتے، وہ لوگ اگر کوئی اچھا عمل کرتے تو اس سے خوش ہوتے، اور اس پر اللہ کا شکر ادا کرتے اور دعا کرتے کہ اللہ تعالیٰ ان کا یہ عمل قبول فرمائے اور اگر ان سے کوئی غلطی سرزد ہو جاتی تو عفو فرماتے، اور اللہ تعالیٰ سے مغفرت کی دعا مانگتے، یقین کرو ان کا ہمیشہ یہی حال رہا، مگر اس کے باوجود نہ وہ گناہوں سے بچ سکے، اور نہ اللہ کی مغفرت کے بغیر نجات پاسکے۔

بندگانِ رب کے کچھ اور حالات : کچھ لوگ حضرت عمر ابن عبد العزیزؒ کی عبادت کے لئے حاضر ہوئے، آپ نے ان میں ایک نوجوان کو دیکھا جو انتہائی نحیف و نزار تھا، آپ نے اس نوجوان سے پوچھا کہ تیری یہ حالت کیوں ہے؟ اس نے عرض کیا امیر المومنین! مجھے بیماری نے اس حال کو پہنچا دیا ہے، حضرت عمر ابن عبد العزیزؒ نے فرمایا میں تجھے اللہ کی قسم دیتا ہوں مجھ سے بچ بچ بچ، اس نے عرض کیا امیر المومنین! صبح بات یہ ہے کہ میں نے دنیا کا مزہ چکھا، اور اسے تلخ پایا، اور میرے نزدیک اس کی رونق اور حلاوت حقیر ہو گئی، اور میری نظروں میں اس کا سونا اور پتھر برابر ہو گئے، اور اب میرا یہ حال ہے کہ میں خود کو عرشِ معلیٰ کے مشاہدے میں محو پاتا ہوں، لوگ میرے سامنے جنت اور دوزخ کی طرف لے جائے جا رہے ہیں، میں اسی لئے دن کو بھوکا پیاسا رہتا ہوں، اور

راتوں کو جاگتا ہوں، اور اللہ تعالیٰ کے ثواب و عذاب کے مقابلے میں مجھے اپنا ہر حال اور ہر عمل پچ نظر آتا ہے۔ ابو نعیم کہتے ہیں کہ داؤد طائی روٹی پانی میں گھول کر پی لیا کرتے تھے، روٹی نہیں کھاتے تھے، کسی نے ان سے اس کی وجہ دریافت کی، فرمایا روٹی کھانے میں دیر بہت لگتی ہے، اس عرصے میں قرآن کریم کی پچاس آیتیں پڑھی جاسکتی ہیں، ایک روز ان کے پاس کوئی شخص آیا اور کہنے لگا کہ آپ کی چھت کی ایک کڑی ٹوٹ رہی ہے، آپ نے فرمایا میں اس گھر میں بیس برس سے ہوں میں نے آج تک چھت کی طرف نہیں دیکھا، ان حضرات کو جس طرح بیکار گھنگھوڑا ہوتا تھا اسی طرح بیکار دیکھتا بھی پسند نہیں تھا، محمد ابن عبدالعزیز کہتے ہیں کہ ایک روز ہم احمد ابن رزین کے پاس چاشت کے وقت سے عصر تک بیٹھے رہے، اس دوران نہ انہوں نے دائیں دیکھا نہ بائیں، کسی نے ان کے اس رویے پر حیرت ظاہر کی، آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں اس لیے پیدا کی ہیں کہ ان سے اس کی عظمت کا مشاہدہ کیا جائے، اگر کوئی شخص دوسرے مقصد کے لیے نظر اٹھاتا ہے اس کے لیے گناہ لکھا جاتا ہے، حضرت مسوق کی اہلیہ کہتی ہیں کہ مسوق کی دو ہڈیاں دیر تک نماز میں کھڑے رہنے کے باعث سوچ گئی تھیں، بخدا میں انھیں دیکھ دیکھ کر روکا کرتی تھی کہ انہوں نے اپنا کیا حال بنا لیا ہے، حضرت ابوالدرداء فرماتے ہیں کہ اگر تین چیزیں نہ ہوتیں تو میں ایک دن بھی زندہ رہنا پسند نہ کرتا، اللہ کے لیے دوپہر میں پیسا رہنا، آدمی رات کو اس کے سامنے سر بسود ہونا، اور ایسے لوگوں کے ساتھ بیٹھنا جو اچھی اچھی باتیں چھانٹتے ہیں جیسے اچھے اچھے پھل چھانٹتے ہیں، اسود ابن یزید عبادات میں سخت مجاہدہ کرتے تھے، اور گرمی کے دنوں میں روزہ رکھتے تھے یہاں تک کہ ان کا جسم سبز یا زرد ہو جاتا، علقمہ ابن قیس ان سے فرماتے کہ تم کیوں اپنے فہم کو عذاب دے رہے ہو، فرماتے ہیں اسی کی خیر خواہی کے لیے ایسا کر رہا ہوں وہ اس قدر روزے رکھتے کہ جسم سبز ہو جاتا اور اس قدر نمازیں پڑھتے کہ تھک کر گر جاتے، ایک مرتبہ حضرت انس ابن مالک اور حضرت حسن ان کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں ان تمام باتوں کا حکم نہیں دیا ہے، آپ نے فرمایا میں تو ایک غلام ہوں، میں کسی ایسی چیز سے دریغ نہیں کرتا جس سے عاجزی ظاہر ہو، ایک بزرگ دن میں ایک ہزار رکعتیں پڑھ لیتے تھے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ دونوں پاؤں سے معذور ہو جاتے، پھر بیٹھ کر ایک ہزار رکعت پڑھتے اور عصر کی نماز کے بعد اتنی پاتی باقی مار کر بیٹھ جاتے اور کہتے کہ مجھے بندوں پر حیرت ہوتی ہے کہ وہ تیرے بجائے دوسرے کا ارادہ کیوں کرتے ہیں، اور تیرے غیر سے کس طرح مانوس ہوتے ہیں، مجھے اس بات پر حیرت ہوتی ہے کہ تیرے غیر کے ذکر سے ان کے دل کیسے روشن ہوتے ہیں، طاہت الہائی کو نماز سے عشق تھا، وہ یہ دعا کیا کرتے تھے کہ اے اللہ اگر تو کسی شخص کو قبر میں نماز پڑھنے کی اجازت دے تو مجھے دینا تاکہ میں بھی قبر میں نماز ادا کر سکوں۔

حضرت جنید بغدادی فرماتے ہیں کہ میں نے سری ستمی سے زیادہ عبادت کرنے والا نہیں دیکھا وہ اٹھانوے برس کے ہو گئے تھے مگر انھیں مرض و فاقات کے علاوہ کبھی لینے ہوئے نہیں دیکھا گیا، حرث ابن سعد کہتے ہیں کہ کچھ لوگ ایک راہب کے پاس سے گزرے اور دیکھا کہ اس نے عبادت میں شدید محنت سے خود کو بے حال بنا لیا ہے، لوگوں نے اس مجاہدے کے بارے میں پوچھا، اس نے کہا کہ جن خطرات اور مصائب سے مخلوق کو گزرنا ہے ان کے سامنے اس مشقت کی کیا حقیقت ہے؟ لیکن لوگ غفلت میں مبتلا ہیں، اور نفسانی لذات میں غرق ہیں، اور اپنے رب کے پاس سے جو عطا نہیں ملنے والا ہے اسے بھول گئے ہیں، تمام لوگ اس کا یہ جواب سن کر رونے لگے۔

ابو محمد الحافظی کہتے ہیں کہ ابو محمد جریری ایک سال تک مکرمہ مکرمہ میں مقیم رہے، اس دوران نہ وہ سوئے، نہ انہوں نے کوئی کلام کیا، نہ کسی ستون سے ٹک لگائی، نہ کسی دیوار کا سارا لیا، اور نہ پاؤں پھیلائے، ابو بکر الککابی ان سے ملے تو پوچھا کہ آپ نے اس قدر سخت احتکاف کیسے کر لیا، فرمایا اس ظلم کی وجہ سے جس نے میرے باطن کو سجا ہونا دیکھا ہے، میرے ظاہر پر اسی کا پرتو ہے، کتنا نے یہ سن کر سر جھکایا اور سوچتے ہوئے چل دئے، ایک بزرگ کہتے ہیں کہ میں حج موصلی کی خدمت میں حاضر ہوا، میں نے دیکھا کہ وہ اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے دو رہے ہیں، اور آنسو ان کے ہاتھوں پر گر رہے ہیں میں نے قریب جا کر دیکھا ان کے آنسو

سرخی مائل تھے، میں نے کہا اے فتح خدا کی قسم کیا تم خون کے آنسو بہاتے ہو، انہوں نے کہا اگر تم مجھے خدا کی قسم نہ دیتے تو میں ہرگز نہ بتلاتا کہ ہاں واقعی میں خون کے آنسو روتا ہوں، میں نے پوچھا تم کیوں روتے ہو، فرمایا اس بات پر کہ میں اللہ تعالیٰ کے واجبات ادا نہیں کر پاتا ہوں، اور خون اس لیے رویا کہ کہیں آنسو بے موقع نہ نکلے ہوں، راوی کہتے ہیں کہ میں نے انہیں خواب میں دیکھ کر پوچھا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے ساتھ کیا معاملہ کیا ہے؟ فرمایا اللہ تعالیٰ نے میری مغفرت فرمادی ہے، میں نے پوچھا اور تمہارے خون میں آنسوؤں کا کیا رہا، فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنے قریب کیا اور فرمایا کہ اے فتح تم نے آنسو کیوں بہائے؟ میں نے عرض کیا تیرا حق صحیح طور سے ادا نہ کرنے پر فرمایا اور خون کیوں بہایا؟ میں نے عرض کیا اس خوف سے کہ کہیں آنسو بے موقع نہ نکلے ہوں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے فتح تو اس سے کیا چاہتا تھا میں اپنی عزت و جلال کی قسم کھا کر کہتا ہوں تیرے دونوں عکبان فرشتے چالیس برس تک تیرے اعمال نامے لائے اور ان میں کوئی خطا نہیں تھی۔ روایت ہے کہ کچھ لوگ سفر کر رہے تھے، کسی جگہ راستہ بھول گئے اور ایک ایسے راہب تک جا پہنچے جو لوگوں سے الگ تھلک ہو کر عبادت میں لگا ہوا تھا، لوگوں نے آواز دی، اس راہب نے اپنی خلوت گاہ سے جھانک کر دیکھا، لوگوں نے کہا اے راہب! ہم راستہ بھول گئے ہیں، ہمیں راستہ بتلا دے، اس نے آسمان کی طرف اشارہ کیا، لوگ سمجھ گئے کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے، انہوں نے کہا اے راہب ہم تیرے ساکل ہیں کیا تو ہمارا سوال پورا کرے گا؟ راہب نے کہا سوال کرو لیکن زیادہ مت پوچھا اس لیے کہ دن بھی واپس نہیں ہو گا، اور عمر بھی نہیں لوٹے گی، اور موت جلدی میں ہے، لوگ اس جواب سے حیرت میں پڑ گئے انہوں نے کہا اے راہب قیامت کے دن مخلوق کا حشر کس بات پر ہو گا، کمانیت پر! انہوں نے کہا ہمیں کچھ وصیت کر، کہنے لگا اپنے سفر کے بقدر توشہ لو، اس لیے کہ بہترین زاد راہ وہ ہے جو مقصد پورا کرے، پھر انہیں راستہ بتلایا اور اپنے عبادت خانے میں چلا گیا عبد الواحد ابن زید کہتے ہیں کہ میں چین کے ایک راہب کی خانقاہ کے پاس سے گزرا، میں نے اسے آواز دی اور اسے راہب! مگر اس نے کوئی جواب نہیں دیا، میں نے دوبارہ پھر آواز دی، وہ بدستور خاموش رہا، میں نے تیسری مرتبہ آواز دی، اس نے اپنی عبادت گاہ سے جھانک کر دیکھا اور کہنے لگا کہ میں راہب نہیں ہوں، راہب تو وہ ہے جو اللہ تعالیٰ سے ڈرے اور اس کی تعظیم کرے، اس کے دیئے ہوئے مصائب پر صبر کرے اور اس کی قضا پر راضی ہو، اس کی نعمتوں پر تعریف کرے اور اس کے انعامات کا شکر ادا کرے، اس کی عظمت کے آگے سرنگوں ہو، اس کی قدرت کے تابع ہو، اس کی ہیبت سے خضوع کرے، اس کے حساب اور عقاب میں غور و فکر کرتا ہو، اس کا دن روزے میں اور رات نماز میں گزرتی ہو، دوزخ کے خوف، اور اللہ تعالیٰ کے سوالات کے ڈرنے اس کی آنکھوں سے نیند اڑادی ہو، ایسا شخص راہب ہوتا ہے، میں تو ایک کٹکھنا کتا ہوں اپنے آپ کو اس قید خانے میں اس خوف سے قید کئے ہوئے ہوں کہ کہیں لوگوں کو کاٹنے نہ لگوں میں نے پوچھا اے راہب! لوگوں کو کس چیز نے اللہ سے دور کر رکھا ہے اور وہ اسے پہچاننے کے بعد کیوں منکر ہو گئے ہیں، راہب نے جواب دیا اے بھائی لوگوں کو اللہ سے دنیا کی محبت اور اس کی نعمت نے دور کر دیا ہے دنیا خطاؤں اور گناہوں کی جگہ ہے، اور ٹھنڈ وہ ہے جو اپنے دل سے دنیا کی محبت نکال پھینکے اور اپنے گناہوں سے توبہ کرے، اور ان اعمال کی طرف متوجہ ہو جو اللہ سے قریب کریں، داؤد طائی سے کسی نے کہا کہ آپ اپنی داڑھی میں کنگھی کر لیں، فرمایا اس کا مطلب یہ ہوا کہ میں بیکار ہوں، حضرت اویس قرنیؓ کا معمول یہ تھا کہ وہ نماز کے لیے کھڑے ہوتے اور فرماتے یہ رات رکوع کی ہے، اور تمام رات رکوع ہی میں گزار دیتے، دوسری رات کے متعلق فرماتے کہ یہ رات سجدے کی ہے، اور تمام رات سجدے ہی میں گزار دیتے، روایت ہے کہ جب غلام جب گناہوں سے تائب ہو کر اللہ کی طرف متوجہ ہوئے تو ان کی بھوک پیاس سب اڑ گئی، ان کی والدہ محترمہ کبھی بیٹے اپنے نفس کو آرام دے، وہ کہتے کہ میں آرام ہی کی تلاش میں ہوں، مجھے نفس پر کچھ مشقت کر لینے دو پھر ہمیشہ آرام کروں گا، حضرت مسروق ج کے لیے تشریف لے گئے، آپ کبھی لیٹ کر نہیں سوئے، بلکہ سجدے کی حالت میں سوئے، حضرت سفیان ثوریؒ فرماتے ہیں کہ لوگ رات کے سفر کی تعریف منج کو کرتے ہیں، اور تقویٰ کے بعد موت کو اچھا سمجھیں گے۔ عبد اللہ ابن داؤد کہتے ہیں کہ بزرگان دین میں سے جب کوئی شخص چالیس برس کا ہوتا

تو اپنا بستر طے کر دیتا، یعنی رات کو سوتا ختم کر دیتا تھا۔

کھس ابن الحسن ہر روز ایک ہزار رکعت نماز پڑھا کرتے تھے، اور بعد میں اپنے نفس سے کہتے تھے اے سرچشمہ شرکڑا ہو، جب بہت زیادہ کمزور ہو گئے تو پانچ سو رکعت پڑھنے لگے، وہ یہ سوچ کر رویا کرتے تھے کہ میں اپنے نصف عمل سے محروم ہو گیا، ربیع ابن خثیم کی صاحبزادی ان سے کہا کرتی تھیں کہ ابا جان! لوگ سوتے ہیں اور آپ جاگتے ہیں، آپ نے جواب دیا کہ بیٹی تیرا باپ آگ سے ڈرتا ہے، آپ کی والدہ محترمہ بھی ان کی اس حالت پر سخت مضطرب رہتی تھیں، ایک مرتبہ آپ نے انہیں انتہائی گریہ و زاری کرتے ہوئے اور شب بیداری کرتے ہوئے دیکھا تو کہنے لگیں اے بیٹا شاید تو نے کسی کو قتل کر دیا ہے اسی لیے اس قدر روتا ہے، اور غم و مغفرت کی دعائیں مانگتا ہے، انہوں نے عرض کیا اتنی جان آپ کا خیال صحیح ہے، وہ کہنے لگیں اگر ایسا ہے تو ہمیں بتاؤ وہ کون ہے، ہم اس کے اعزہ کو تلاش کریں گے، اور ان سے درخواست کریں گے کہ وہ تجھے معاف کر دیں، بخدا اگر انہیں پتا چل جائے کہ تیرا کیا حال ہو گیا ہے تو وہ تجھ پر ضرور رحم کریں گے اور تجھے معاف کر دیں گے ربیع نے کہا اتنی جان میں نے اپنے نفس کو قتل کیا ہے۔ بشر ابن الحرث کے بھانجے کہتے ہیں کہ میرے ماموں جان ایک روز میری اتنی سے کہنے لگے کہ اے بن میری پسلیاں میرے پیٹ کے خالی حصے میں کھس رہی ہیں میری اتنی کہنے لگیں اگر تم اجازت دو تو میں تھوڑے سے میدے کا حریرہ بنادوں تاکہ تم اسے پی کر کچھ طاقت پاؤ، ماموں جان نے کہا نہیں! مجھے ڈر ہے کہ کہیں اللہ تعالیٰ یہ نہ پوچھ لیں کہ تیرے پاس میدہ کہاں سے آیا تھا، مجھے نہیں پتا میں اس کا کیا جواب دوں گا، یہ سن کر میری اتنی رونے لگیں، ماموں جان بھی رونے لگے، اور انہیں روتا ہوا دیکھ کر میں بھی رونے لگا، عمر (بشر ابن الحرث کے بھانجے) کہتے ہیں کہ میری اتنی نے ایک دن دیکھا کہ وہ بھوک کی وجہ سے سخت بڑھال ہیں، اور ضعف کی وجہ سے تنفس کا نظام کمزور پڑ گیا ہے، یہ حالت دیکھ کر میری اتنی ان سے کہنے لگیں کہ اے بھائی کیا اچھا ہوتا اگر تیری ماں نے مجھے نہ جتا ہوتا تیرا حال دیکھ کر میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہوا جاتا ہے، ماموں جان نے کہا میں بھی یہی کہتا ہوں کہ کاش میری ماں نے مجھے نہ جتا ہوتا، اور اگر جتا ہوتا تو مجھے دودھ نہ پلایا ہوتا، راوی کہتے ہیں کہ میری اتنی اپنے بھائی کے لیے ہر وقت روتی تھیں۔ ربیع کہتے ہیں کہ میں حضرت اویسؓ کی خدمت میں حاضر ہوا وہ اس وقت نماز فجر سے فارغ ہونے کے بعد بیٹھے ہوئے تھے، میں بھی بیٹھ گیا، اور دل میں یہ سوچنے لگا کہ مجھے ان کی تسبیحات میں حارج نہ ہونا چاہیے، چنانچہ وہ اپنی جگہ بیٹھے رہے یہاں تک کہ انہوں نے ظہر کی نماز پڑھی، پھر عصر تک نوافل پڑھتے رہے، اس کے بعد عصر کی نماز ادا کی، اور مغرب تک اسی جگہ رہے، اس کے بعد مغرب کی نماز پڑھی اور اپنی جگہ سے نہیں اٹھے اس کے بعد عشا کی نماز پڑھی اور صبح تک نوافل میں مشغول رہے، یہاں تک کہ فجر کا وقت ہو گیا، اس کے بعد آپ نے فجر کی نماز ادا کی، نماز کے بعد آپ پر کچھ دیر کے لیے نیند کا غلبہ ہو گیا، بیدار ہوئے تو آپ کی زبان پر یہ الفاظ تھے اے اللہ! میں سونے والی آنکھ اور میر نہ ہونے والے پیٹ سے تیری پناہ چاہتا ہوں، میں نے دل میں کہا کہ مجھے ان سے اسی قدر کافی ہے، اس کے بعد میں واپس چلا آیا۔

ایک شخص نے حضرت اویسؓ کو دیکھ کر پوچھا کہ آپ بیمار سے کیوں لگ رہے ہیں، فرمایا میں بیمار کیوں نہ ہوں مریض کھاؤ کھاتے ہیں میں نہیں کھاتا، مریض سوتے ہیں میں نہیں سوتا۔ احمد ابن حرب کہتے ہیں مجھے اس شخص کے سونے پر حیرت ہوتی ہے جس کے اوپر جنت آراستہ ہو، اور نیچے دوزخ دکھتی ہو، ایک متقی پر بیزار گار شخص کہتے ہیں کہ میں ابراہیم ابن ادہم کی خدمت میں حاضر ہوا وہ اس وقت نماز عشاء پڑھ چکے تھے، میں انھیں دیکھنے کے لیے بیٹھ گیا اتنے میں آپ نے اپنے اوپر کبل لپیٹا اور لیٹ گئے رات میں کھوٹ بھی نہیں ہوئی، یہاں تک کہ صبح ہوئی، مؤذن نے فجر کی اذان دی، آپ نے اٹھ کر نماز پڑھی اور وضو نہیں کیا، میں نے ان سے کہا کہ آپ تمام رات سوتے رہے اور صبح اٹھ کر بلا وضو نماز پڑھ لی، کہنے لگے میں تو تمام رات جنت کے باغوں میں گھومتا رہا، اور کبھی دوزخ کی ہولناکیاں وادوں میں چکراتا رہا، کیا اس حالت میں کسی شخص کو نیند آسکتی ہے، ثابت ثنائی کہتے ہیں کہ میں نے بعض لوگوں کو اس قدر نماز پڑھتے ہوئے دیکھا ہے کہ وہ (کمزوری اور صحن کے باعث) گھٹنوں کے بل چل کر اپنے بستر پر آیا

کرتے تھے، ابو بکر ابن عیاشؓ نے چالیس برس اس طرح گزاری کہ بستر سے کمر نہیں لگائی، ان کی ایک آنکھ میں پانی اتر آیا تھا مگر میں برس تک ان کے گھروالوں کو اس کا علم نہ ہو سکا۔ کہتے ہیں کہ سنوں کا معمول ہر روز پانچ سو رکعت پڑھنے کا تھا، ابو بکر الملوئی کہتے ہیں کہ میں اپنی جوانی کے دنوں میں انہیں ہزار دفعہ قل ہو اللہ پڑھا کرتا تھا یا چالیس ہزار مرتبہ، راوی کو اس میں شک ہے، منصور ابن الحنفیہ کا عالم یہ تھا کہ اگر کوئی شخص انہیں دیکھتا تو کہتا کہ ان پر کوئی مصیبت آ پڑی ہے، آنکھیں نیچی، آواز پست، ہر وقت آنکھیں نم رہتیں، ذرا حرکت کرتے آنسو بہنے لگتے، ان کی والدہ کہا کرتی تھیں بیٹا تو یہ کیا کرتا ہے، تمام رات روتا ہے، کسی بھی وقت چپ نہیں ہوتا شاید تو نے کسی کو قتل کر دیا ہے، یا کسی پر بڑا ظلم کیا ہے، وہ کہتے انا جان میں ہی جانتا ہوں کہ میں نے اپنے نفس پر کیا ظلم کیا ہے؟

کسی شخص نے عامر ابن عبد اللہ سے دریافت کیا کہ تم پہر کی پیاس پر، اور رات کے جاگنے پر کیسے صبر کر لیتے ہو، کہنے لگے اس طرح کہ دن کے کھانے کو رات پر لٹوی کر دیتا ہوں، اور رات کے کھانے کو دن پر، اور اس میں کوئی زیادہ مشکل بھی پیش نہیں آتی، فرمایا کرتے تھے کہ میں نے جنت جیسی کوئی چیز نہیں دیکھی جس کے طلبگار میٹھی نیند سوتے ہوں، اور نہ دوزخ جیسی کوئی چیز دیکھی جس سے بھاگنے والے خواب خرگوش کے مزے لوٹتے ہوں، جب رات آتی تو فرماتے کہ آگ کی حرارت نے رات کی نیند ضائع کر دی، بھر صبح تک جاگتے رہتے، صبح ہوتی تو فرماتے کہ آگ کی حرارت نے دن کی نیند خراب کر دی ہے، پھر دن بھر جاگتے رہتے یہاں تک کہ رات آجاتی، رات کے آنے پر فرماتے کہ جو شخص ڈرتا ہو اسے رات ہی کو چل دینا چاہیے، صبح کے وقت رات کا چلنا اچھا لگتا ہے، ایک بزرگ کہتے ہیں کہ میں عامر ابن قیس کے ساتھ چار ماہ تک رہا، میں نے انہیں نہ رات میں سوتے ہوئے دیکھا اور نہ دن میں سوتے ہوئے پایا۔ حضرت علی ابن ابی طالبؓ کے ایک ساتھی بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت علیؓ کے پیچھے فجر کی نماز پڑھی، آپ نے سلام پھیرا اور دائیں طرف کو رخ کر کے بیٹھ گئے، اس وقت آپ پر کچھ غم کا اثر تھا، آپ سورج نکلنے تک اسی طرح بیٹھے رہے، اس کے بعد اپنا ہاتھ الٹا اور فرمایا بخدا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کو دیکھا ہے، اب مجھے کوئی شخص ایسا نظر نہیں آتا جو ان سے مشابہت رکھتا ہو، وہ لوگ بکھرے ہالوں اور زرد چھوٹوں کے ساتھ صبح کرتے، ان کی راتیں بھودو قیام اور غلاوت کتاب اللہ میں گزرتی تھیں، وہ اپنے قدموں اور پیشانیوں پر لٹور دیا کرتے تھے، یہ لوگ جب اللہ کا ذکر کرتے تو اس طرح لرزتے جیسے ہوا کے تیز و تند جھکڑوں سے درخت لرزتے ہیں، ان کی آنکھیں اس قدر آنسو برساتیں کہ کپڑے تر ہو جاتے، اب لوگ غفلت کے ساتھ سوتے ہیں، ابو مسلم الخولانی نے اپنے گھر کی مسجد میں ایک کوڑا لٹکا رکھا تھا، اس کو ڈسے سے وہ اپنے نفس کو ڈرایا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ گھڑا ہو جاوے نہ میں تجھے اس قدر رکھ دوں گا کہ تو تھک جائے گا، میرا بھائی نقصان نہ ہو گا، اگر نفس کی طرف سے کچھ سستی دیکھتے تو کوڑا اٹھا کر اپنی چڑیلوں پر مارتے، اور کہتے کہ میرے جانور سے زیادہ تو مار کا مستحق ہے، فرمایا کرتے تھے کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب یہ سمجھتے ہوں گے کہ دین صرف ہم نے ہی اختیار کیا ہے، بخدا ہم اس قدر محنت کریں گے کہ صحابہ کرام کو معلوم ہو جائے گا کہ صرف ہم ہی نے دین کو اختیار نہیں کیا ہے بلکہ ہمارے پیچھے بھی کچھ لوگ آ رہے ہیں، صفوان ابن سلیم طویل قیام کے باعث دونوں ٹانگوں سے معذور ہو گئے تھے، ان کا عہدہ اس درجے پر پہنچ گیا تھا کہ اگر کوئی شخص ان سے کہتا کہ قیامت کل ہوگی تو ان کے اعمال میں ذرا بھی زیادتی نہ ہو پائی، یعنی وہ پہلے ہی اتنے زیادہ ہوتے کہ ان میں مزید زیادتی کی گنجائش نہ ہوتی، سردی کے موسم میں وہ چھٹ پر جا بیٹھتے تاکہ جسم کو سرد ہوا کے چھوڑے کھلائیں، اور گرمی کے دنوں میں تنگ و تاریک کمروں میں پہنچ جاتے تاکہ اپنے نفس کو جس اور کھٹن کا مزہ چکھائیں، وہ رات بھر سوتے نہیں تھے، یہاں تک کہ سجدے کی حالت میں وفات پائی، اپنی موت سے کچھ لمبے پہلے وہ یہ کہہ رہے تھے اے اللہ! میں تیری ملاقات پسند کرتا ہوں، تو بھی مجھ سے ملنا پسند کر۔ قاسم ابن محمد کہتے ہیں کہ میں صبح اٹھ کر سب سے پہلے حضرت عائشہؓ کی خدمت میں حاضر ہوتا، اور انہیں سلام کرتا، اس کے بعد اپنے کاموں میں مشغول ہوتا، ایک روز حسب معمول میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا، آپ اس وقت چاشت کی

نماز پڑھ رہی تھیں اور یہ آیت پڑھ کر رو رہی تھیں۔

فَمَنْ أَلَّهِ عَلَيْهِ نَاوَوْقَانَا عَذَابَ السَّمُومِ (پ ۲۷ ر ۳ آیت ۲۷)

سو خدا نے ہم پر بڑا احسان کیا اور عذابِ دوزخ سے بچالیا۔

میں دیر تک کھڑے رہنے کے باعث محسوس کرنے لگا، لیکن وہ اس طرح آیت کی تلاوت کرتی رہیں، اور روئی رہیں، میں نے سوچا پہلے بازار ہو آؤں، چنانچہ میں بازار گیا اور اپنی ضرورت سے فارغ ہو کر واپس آیا تو آپ اسی طرح آیت کی تلاوت اور گریہ و زاری میں مشغول تھیں، محمد ابن اسحاق کہتے ہیں کہ جب عبدالرحمن ابن اسودج کے ارادے سے ہمارے پاس آئے تو ان کے پاؤں میں کچھ تکلیف تھی، مگر ہم نے انھیں دیکھا کہ وہ ایک پاؤں پر کھڑے ہو کر عشاء کے وضو سے صبح کی نماز ادا کرتے تھے، ایک بزرگ کہتے ہیں کہ میں موت سے صرف اس لیے ڈرتا ہوں کہ وہ میرے اور رات کی نماز کے درمیان حائل ہو جائے گی، علی ابن ابی طالب کہتے ہیں کہ نیک لوگوں کی علامت یہ ہے رات بھر جاگنے کے باعث ان کے چہرے زرد پڑ گئے ہوں، اور رونے کی وجہ سے ان کی آنکھیں چند میا گئی ہوں، اور روزے کی وجہ سے ہونٹ خشک ہو گئے ہوں، ان پر غاشمین کا سا غبار چھایا ہوا ہو، حضرت حسن سے کسی شخص نے دریافت کیا کہ آخر تجھ پڑھنے والوں کے چہرے اس قدر عمدہ کیوں ہوتے ہیں، فرمایا اس لیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ تھا ہوتے ہیں، اللہ انھیں اپنے نور کا لباس پہنا دیتا ہے، عامر ابن عبدالقیس کہتے تھے ”اے اللہ تو نے مجھے پیدا کیا، اور مجھ سے مشورہ نہیں لیا، اور مجھے موت دے گا، اس وقت بھی مجھ سے مشورہ نہیں لے گا، اور میرے ساتھ ایک ایسا دشمن پیدا کر دیا ہے جو میری رگوں میں خون کے ساتھ ساتھ گردش کرتا ہے، اور اس دشمن کو پیدا کر کے تو مجھ سے کہتا ہے اس سے اجتناب کر بھلا میں اس سے کیسے اجتناب کر سکتا ہوں، اگر تو مجھے اس کا حوصلہ نہ بخشے، میرا دشمن مجھے دیکھتا ہے اور میں اسے نہیں دیکھ پاتا، اے اللہ! دنیا میں آلام اور مصائب ہیں، اور آخرت میں حساب و عذاب ہے پھر راحت و مسرت کہاں ہے؟“

جعفر ابن محمد کہتے ہیں کہ عقبہ غلام تین چیخوں میں رات پوری کیا کرتے تھے، ”اولاً عشاء کی نماز پڑھ کر گھٹنوں میں سر رکھتے اور سوچنے بیٹھ جاتے، جب رات کا تہائی حصہ گزر جاتا تو ایک چیخ مارتے پھر گھٹنوں پر سر رکھ کر بیٹھ جاتے، اور جب رات کا دو سرا تہائی حصہ گزر جاتا پھر ایک چیخ مارتے، اس کے بعد پھر اپنے گھٹنوں پر سر رکھ کر سوچنے میں مصروف ہو جاتے، جب صبح ہوتی تو پھر ایک چیخ مارتے، جعفر ابن محمد کہتے ہیں کہ میں نے بھرے کے بعض لوگوں سے ان کی چیخوں کا ذکر کیا، وہ کہنے لگے تم چیخوں کو نہ دیکھو، بلکہ یہ سوچو کہ آخر وہ ان چیخوں کے درمیان کیا سوچا کرتے تھے، قاسم ابن راشد شبانی کہتے ہیں کہ ذمہ حسب میں ہمارے گھر مسلمان تھے، ان کی ساتھ ان کی بیوی اور لڑکیاں بھی تھیں ان کا دستور تھا کہ وہ رات میں دیر تک نماز پڑھا کرتے تھے، جب صبح ہوتی تو با واز بلند کہتے اے آرام کرنے والوں کیا تم رات اسی طرح سوتے رہو گے، اٹھو کیا چلنے کا ارادہ نہیں ہے، ان کی آواز سن کر تمام لوگ بیدار ہو جاتے، کوئی رونے لگتا، کوئی قرآن کریم کی تلاوت شروع کر دیتا، اور کوئی وضو کرنے بیٹھ جاتا، جب فجر کا وقت ہوتا تو بلند آواز سے کہتے کہ صبح کے وقت رات کا چلنا پسند کیا جاتا ہے۔ ایک دانشور کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے بعض بندے ایسے ہیں کہ اللہ نے انہیں اپنی معرفت کا انعام دیا ہے، اور اطاعت کے لیے ان کے سینے کھول دیے ہیں، وہ اس پر توکل کرتے ہیں، اور مخلوق کو اور تمام معاملات کو اس پر رکھتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان کے دل صفائے یقین کے معدن، حکمت کے گھر، حکمت کے صندوق، اور قدرت کے خزانے بن گئے ہیں، وہ لوگ بظاہر لوگوں میں آتے جاتے کھوتے پھرتے نظر آتے ہیں مگر ان کے دل ملکوت کی سیر کرتے رہتے ہیں، اور غیب کے محبوب میں پناہ لیتے ہیں، اور جب واپس آتے ہیں تو ان کے پاس فوائد کے ثمرے اور لطائف کے جواہر ہوتے ہیں، ان خزانوں اور جواہروں کا وصف بیان نہیں کیا جاسکتا، وہ اپنے باطنی امور میں ایسے ہیں جیسے ریشم، اور ظاہر میں ایسے جیسے استعمال شدہ ردال، ہر شخص کے ساتھ تواضع سے پیش آتے ہیں، اور یہ ایک ایسی منہاج ہے جس پر شک و شبہ نہیں چلا جاسکتا۔ یہ تو اللہ کا فضل ہے وہ جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔

ایک بزرگ بیان کرتے ہیں کہ میں بیت المقدس کے پہاڑوں میں گھوم رہا تھا، اسی دوران میرا گزر ایک وادی سے ہوا وہاں میں نے ایک بلند آواز سنی، جس کا جواب پہاڑوں سے دے رہے تھے، یعنی اس جگہ آواز زبردست طریقے سے گونجتی تھی، مجھے اس آواز کا پتا لگانے کا تجسس ہوا، اور کشاں کشاں ایک ایسے غلطے میں پہنچا جہاں بکثرت درخت تھے، میں نے وہاں ایک شخص کو دیکھا جو یہ آیت بار بار پڑھ رہا تھا۔

يَوْمَ نَحْذَرُ كُلَّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا وَمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوءٍ تَوَدُّ لَوْ أَنَّ بَيْنَهَا وَبَيْنَكُمْ أَسْبَابًا يَنْصَبُهَا وَنَحْذَرُكُمْ لِنُفْسِهِ (پ ۳ ر ۳۰ آیت ۳۰)

جس روز ہر شخص اپنے اچھے کئے ہوئے کاموں کو سامنے لایا ہو پائے گا، اور اپنے برے کئے ہوئے کاموں کو بھی، اور اس بات کی تمنا کرے گا کہ کیا خوب ہو تاکہ اس شخص کے اور اس کے درمیان دور دراز کی مسافت حاصل ہوئی اور اللہ تم کو اپنی ذات (عظیم) سے ڈراتا ہے۔

میں اس کے پیچھے بیٹھ گیا اور اس کی تلاوت سننے لگا، وہ کافی دیر تک تلاوت کرتا رہا، یہاں تک کہ اس نے ایک زبردست چیخ ماری اور بے ہوش ہو کر گر پڑا، میں نے کہا یہ میری بد قسمتی ہے کہ میں اس کی زبان سے تلاوت نہ سن سکا، پھر میں اس کے ہوش میں آئے۔ خطرہ پیشا رہا کچھ دیر بعد وہ یہ کہتا ہوا ہوش میں آیا کہ میں جموںوں کے مقام سے اللہ کی پناہ چاہتا ہوں، میں بیکاروں کے مقام سے اللہ کی پناہ چاہتا ہوں، میں غافلوں کے اعراض سے اللہ کی پناہ چاہتا ہوں، پھر اس نے یہ کہا کہ ڈرنے والوں کے قلوب تیرے لیے خاشع ہیں، کوتاہ عملوں کی امیدیں تیری ذات سے وابستہ ہیں عارفین کے دل تیری عظمت کے آگے سرنگوں ہیں، پھر اس نے اپنے ہاتھ جھاڑے اور کہنے لگا گذرے ہوئے زمانے کہاں گئے، اور پچھلے وقتوں کے لوگ کہاں ہیں، وہ مٹی میں سڑتے ہیں، اور تھوڑی سی مدت میں فنا ہو جاتے ہیں، راوی کہتے ہیں کہ میں نے اس شخص کو آواز دی اور کہنے لگا کہ اے اللہ کے بندے میں آج تمام دن سے تیرے پیچھے بیٹھا ہوا ہوں، اور تیری فراغت کا خطرہ ہوں، اس نے کہا بھلا اس شخص کو فراغت کیسے ملے گی جو اوقات سے سبقت کرتا ہے، اور اوقات اس سے سبقت کرتے ہیں اور ڈرتا ہے کہ کہیں موت اس کے نفس پر سبقت نہ کر جائے، یا وہ شخص کیسے قاصر ہو گا جس کی زندگی کے دن گزر گئے ہوں اور گناہ باقی رہ گئے ہوں، پھر اس نے میری طرف سے اپنی توجہ ہٹائی اور اللہ تعالیٰ سے عرض کرنے لگا کہ ان گناہوں کے لیے توبہ ہے، اور ہر معصیت اور شدت کے لیے توبہ ہے، اور مجھے اس کے آنے کی توقع ہے، اس کے بعد اس نے یہ آیت تلاوت کی۔

وَيَذَلُّهُمْ مِنَ اللَّيْلِ مَّا يَكُونُوا يَحْتَسِبُونَ (پ ۲۳ ر ۲ آیت ۳۸)

اور (اس وقت) ان کو تمام برے اعمال ظاہر ہو جائیں گے۔

بمردہ پہلے سے بھی زیادہ زور سے چیخا اور بے ہوش ہو کر گر پڑا، مجھے خیال ہوا کہ شاید اس کی روح نے جسم کا ساتھ چھوڑ دیا ہے، میں اس کے قریب گیا، اور دیکھا کہ وہ سخت مضطرب اور بے چین ہے کچھ دیر بعد اس کی حالت بہتر ہوئی، اس مرتبہ ہوش میں آنے کے بعد اس کی زبان پر یہ الفاظ تھے میں کون ہوں؟ میرا خاطر کیا ہے؟ اپنے فضل سے میرے گناہ معاف فرما، مجھے اپنے پردہ رحمت میں چھپائے، اپنی عظمت و کرم کے صدقے سے میری خطاؤں سے درگزر کرنا اس وقت جب کہ میں تیرے سامنے حاضر ہوں، راوی کہتے ہیں میں نے اس شخص سے کہا کہ میں اس ذات کی قسم دے کر کہتا ہوں جس سے تو امید رکھتا ہے، اور جس پر بھروسہ کرتا ہے کیا مجھ سے شکوک نہیں کرے گا، اس نے جواب دیا اس شخص سے کلام کو جس کے کلام سے تمہیں کچھ نفع ہو، اور اس شخص کے کلام سے بچو جسے اس کے گناہوں نے ہلاک کر دیا ہو، میں اس جگہ طویل مدت سے اللہ ہی جانتا ہے وہ کس قدر طویل ہے ابلیس سے جہاد کر رہا ہوں اور ابلیس مجھ سے جہاد کر رہا ہے، آج تک کوئی ایسا شخص، یہاں نہیں آیا جو اس کے خلاف جہاد میں میری اعانت کرتا۔ اب تو آیا ہے، میں کہتا ہوں تیرا مجھ سے دور رہنا ہی بہتر ہے، تو نے میری زبان مصلح کر دی ہے، اور

میرے دل کو اپنی بات کی طرف مائل کر لیا ہے، میں شرک سے اللہ کی پناہ چاہتا ہوں، اور یہ امید کرتا ہوں کہ وہ مجھے اپنے خیمے سے محفوظ رکھے گا، اور مجھ پر اپنی رحمت کی نظر فرمائے گا۔ راوی کہتے ہیں کہ مجھے خیال ہوا یہ شخص اللہ کا ولی ہے، میں نے اسے اپنی باتوں میں مشغول کر دیا ہے، ایسا نہ ہو اس کی وجہ سے مجھ پر عذاب ہو، یہ سوچ کر میں وہاں سے چلا آیا۔

ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ میں کسی راستے سے گزرتا ہوا ایک درخت تک پہنچا تاکہ کچھ دیر اس کے سائے میں آرام کر لوں، کچھ ہی لمحوں کے بعد میں نے ایک بوڑھے شخص کو دیکھا جو مجھ پر چڑھے چلے آئے تھے، اور کہہ رہے تھے اے شخص! اٹھ اور یہاں سے جا، اس لیے کہ موت مری نہیں ہے، یہ کہہ کر وہ بڑے میاں واپس ہو گئے، میں بھی ان کے پیچھے پیچھے چلا، وہ یہ کہتے ہوئے جا رہے تھے۔

كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ (پ ۱۷۷ آیت ۳۵)

ہر نفس کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔

اے اللہ! میرے لیے موت میں برکت عطا فرما، میں نے کہا اور موت کے بعد کی زندگی میں بھی وہ کہنے لگے جو شخص موت کے بعد پیش آنے والے واقعات و حالت کا یقین رکھتا ہے وہ احتیاط اور خوف کی بنا پر دامن اٹھا کر چلتا ہے، دنیا میں اس کا ٹھکانہ نہیں ہوتا، اے پروردگار! تیری ذات عظیم کے لیے تمام چہرے دلیل ہیں، میرے چہرے کو اپنے دیدار سے روشن کر، اور میرے دل کو اپنی محبت سے لبریز فرما، قیامت کے دن اپنی بارگاہ میں ہر رسوائی اور ذلت سے محفوظ رکھنا، اب تجھ سے شرمانے کا وقت آ گیا ہے، اب تجھ سے اعراض نہ کرنے کا وقت آچکا ہے، اگر حیرا حطم نہ ہوتا تو موت بھی مجھ سے گریزاں رہتی، اور اگر تیرا غنودہ ہوتا تو میری امید کا دامن تیرے بے پایاں عنایات تک وسیع نہ ہوتا، پھر وہ مجھے تنہا چھوڑ کر چل دیا، اس مضمون میں یہ اشعار کے گئے ہیں۔

نَحِيلُ الْجَسِمُ مَكْتَبُ الْفُؤَادِ - تَرَاهُ بِقَمَرٍ أَوْ بَطْنٍ وَادِي
يَنُوحُ عَلَى مَعَايِصِ فَاضْحَابٍ - يَكْثُرُ ثِقْلُهَا صَفْوُ الرِّقَادِ
فَإِنْ هَاجَتْ مَخَافَهُ وَ زَادَتْ - فَدَعْوَتُهُ أَغْنَى يَا عِمَادِي
فَأَنْتَ بِمَا آلاَ فِيهِ عَلَيْهِم - كَثِيرُ الصَّفْحِ عَنْ زَلِيلِ الْعِبَادِ

(کنزور جسم ہے، اور دل غم و اندوہ سے لبریز ہے، ایسے شخص کو تم کسی پہاڑ کی چوٹی پر یا کسی وادی میں دیکھتے ہو، کہ وہ اپنے ان رسوا کن گناہوں پر نوحہ کرتا ہے، جن کا فعل خواب راحت کا مزہ کھد کر دیتا ہے، جب خوف زیادہ بھان پر ہوتا ہے تو اس کی دعا یہ ہوتی ہے کہ اے میرے پروردگار میری مدد کر، جس حال میں میں ہوں تو اس سے اچھی طرح واقف ہے، اور بندے کی لغزشوں سے بہت زیادہ درگزر کرنے والا ہے۔)

الَّذِي مِنَ التَّلَذُّ بِالْعَوَانِي - إِذَا أَقْبَلْنَ فِي حُلَلٍ حَسَانٍ
مُنِيبٌ فَرَّ مِنْ أَهْلٍ وَ مَالٍ - يَسْبِيحُ إِلَى مَكَانٍ مِنْ مَكَانٍ
لِيَتَحَمَّلَ ذِكْرَهُ وَ يَعْيَشَ فَرْدًا - وَيُظْهِرُ فِي الْعِبَادَةِ بِالْأَمَانِ
تَلَذُّهُ التَّلَا وَ أَيْنَ وَلِي - وَ ذَكَرَ بِالْفُؤَادِ وَ بِاللِّسَانِ
وَعِنْدَ الْمَوْتِ يَأْتِيهِ بِشِيرُ يُبَشِّرُ بِالنَّجَاةِ مِنْ الْهَوَانِ
فَيُنْزِلُ مَا أَرَادَ وَ مَا تَمَنَّى مِنَ الرَّاحَاتِ فِي عَرَفِ الْحَنَانِ

(اگر حسین و جمیل پوشاک پہن کر خوبصورت مہفتائیں آجائیں تو اس میں وہ لذت نہ ملے جو اسے میسر ہے، وہ اہل و عیال سے منہ موڑ کر اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہے اور ایک جگہ سے دوسری جگہ بھرتا ہے، تاکہ وہ گوشہ گمنامی میں چلا جائے، اور تنہا کر اپنے

مولیٰ کی خاطر خواہ عبادت کر سکے، جہاں بھی وہ جاتا ہے تلاوت کلام پاک کا ذوق اور دل و زبان سے ذکر الہی کی لذت اس کے ساتھ جاتی ہے، موت کے وقت ایک خوشخبری سنانے والا آتا ہے اور اسے نجات اور راحت کی بشارت سناتا ہے، تب وہ (موت کے بعد) اپنی امیدوں کے مطابق اجر و ثواب پالیتا ہے اور جنت کے مہلوں میں آسائشیں اور لذتیں حاصل کر لیتا ہے۔

کرزا بن ویدہ ہر روز تین قرآن پاک ختم کر لیا کرتے تھے اور عبادات میں شدید مجاہدہ فرماتے تھے کسی نے ان سے کہا کہ آپ بہت سخت مجاہدہ کرتے ہیں۔ انہوں نے پوچھا کہ دنیا کی عمر کیا ہے؟ مسائل نے جواب دیا سات ہزار سال انہوں نے سوال کیا اور قیامت کے دن کی مقدار کیا ہے۔ مسائل مذکور۔ نے عرض کیا پچاس ہزار برس فرمایا تم اس بات سے کیسے عاجز ہو کہ سات دن عمل کر کے اس ایک دن سے بے خوف ہو جاؤ۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ اگر تم دنیا کی عمر کے برابر یعنی سات ہزار برس تک زندہ رہو اور اس مدت میں سخت مجاہدہ کرو۔ محض ایک دن سے نجات پانے کے لئے تو یہ بڑے نفع کی بات ہے تمہیں اس نفع کے حصول کی کوشش کرنی چاہیے اور یہاں تو عمر بھی بہت مختصر ہے اور آخرت کی انتہا بھی نامعلوم ہے تو مجاہدہ کیسے نہ کیا جائے۔

نفس کے ساتھ شرط لگانے اور اس کا مراقبہ کرنے میں سلف صالحین کا یہ معمول تھا اگر تیرا نفس سرکش ہو جائے اور عبادت پر مواعبت کے لئے تیار نہ ہو تو ان بزرگوں کے احوال کا مطالعہ کر۔ اب یہ لوگ تقریباً ناپید ہو گئے ہیں۔ اگر خوش بختی سے تجھے کوئی ایسا شخص مل جائے جو ان بزرگوں کا اتباع کرتا ہو تو اسے قیمت جان۔ اس کا دیکھنا اقتداء کے لئے زبردست محرک کا کام دیتا ہے اور نفس کو راغب کرنے میں بیش بہا کردار ادا کرتا ہے۔ اس لئے کہ سنتا مشاہدے جیسا نہیں ہوتا۔ اگر تم کسی ایسے شخص کو نہ دیکھ سکو تو ان کے حالات کے مطالعے اور سماع سے غفلت مت کرو اگر اوٹ نہ ہو تو بکری بہتر ہے۔ بہر حال اپنے نفس کو اختیار دو کہ وہ یا تو عقلمندوں اور دانشوروں اور دینی بصیرت رکھنے والے کی اقتداء کرے یا اپنے زمانے کے جاہل عاقلوں کی۔ لیکن اس پر ہرگز راضی مت ہو کہ تم ان احمقوں کی فہرست میں شامل ہو جاؤ اور ان بے وقوفوں سے مشابہت اختیار کر لو اور دانشمندوں کی مخالفت پر آمادہ ہو جاؤ۔ اگر تمہارا نفس یہ کہے کہ ان لوگوں کی اقتداء نہایت دشوار ہے کیونکہ وہ مجاہدے کی زبردست قوت سے مالا مال تھے تو ان عورتوں کے احوال کا مطالعہ کرو جو عبادات میں مجاہدہ کرتی تھیں اور نفس سے کہو کہ کیا تجھے اس بات سے شرم نہیں آتی کہ تیرا درجہ عورتوں سے بھی کم ہو۔ وہ مرد انتہائی ذلیل ہے جو دین یا دنیا کے معاملات میں کسی صورت سے کم ہو۔

نیک سیرت عورتوں کا ذکر

اب ہم کچھ عابدہ زاہدہ عورتوں کے حالات بیان کرتے ہیں حبیبہ عدویہ سے موی ہے کہ جب وہ عشاء کی نماز پڑھ لیتی تھیں تو اپنے مکان کی چھت پر پہنچ جایا کرتی تھیں اور اپنے جسم کے اندر گود کرتا اور دوپٹے کس کر کہتی تھیں اے اللہ ستارے نکل آئے ہیں۔ آنکھیں بند سے بوجھل ہو گئی ہیں بادشاہوں نے اپنے دروازے بند کر لئے ہیں عاشق اپنے معشوق کے ساتھ خلوت میں چلا گیا اور میں تیری بارگاہ میں حاضر ہو گئی ہوں۔ پھر وہ اپنی نماز میں مشغول ہو جاتیں۔ جب فجر کا وقت ہو جاتا تو کہیں۔ اے اللہ! یہ رات رخصت ہو گئی ہے اور دن نکل آیا ہے مجھے نہیں معلوم کہ میری یہ رات تو نے قبول کی ہے یا نہیں؟ اگر قبول کر لی ہے تو میں اپنے آپ کو مبارکباد دوں ورنہ تعزیت کروں تیری عزت کی قسم یہ میرا معمول رہے گا جب تک تو مجھے زندہ رکھے گا۔ اگر تو نے مجھے اپنے در سے جھڑک دیا تب بھی میں تیرا در نہ چھوڑوں گی۔ اس لئے کہ میرا دل تیرے جود کرم کے الوار سے روشن ہے۔ مجھ کے بارے میں روایت ہے کہ وہ رات بھر عبادت کرتی تھیں حالانکہ آنکھوں سے محذور تھیں مگر جب فجر کا وقت ہوتا تو اونچی اور تمکین آواز میں کہیں عابدوں نے تجھ تک پہنچے ہی کے لئے رات کی مسافت طے کی۔ وہ تیری رحمت اور فضل و مغفرت کی طرف سبقت کرتے ہیں اے اللہ! میں تجھ ہی سے مانگتی ہوں تیرے غیر سے نہیں مانگتی کہ مجھے سبقت کرنے والوں میں سرفہرست کر اور مجھے علیٰ سبب میں مقربین کا درجہ عطا کر اور تجھے اپنے نیک بندوں میں شامل کر تو انتہائی رحم اور کرم والا ہے تو تمام بیویوں سے بڑا اور تمام بلند یوں سے بلند ہے۔ یہ دعا مانگ کر وہ سجدے میں گر جاتیں۔ یہاں تک کہ ان کے سجدے میں گرنے کی آواز اس پاس میں سنی

جاتی۔ پھر وہ سجدے ہی میں صبح کی نماز تک دعائیں مانگتی رہتیں اور روتی رہتیں۔

یحییٰ بن سلام کہتے ہیں کہ میں شہوانہ کی مجلس میں حاضر ہوتا تھا اور دیکھتا تھا کہ وہ کس قدر روتی ہیں اور کس شدت سے گریہ و زاری کرتی ہیں۔ ایک دن میں نے اپنے ایک ساتھی سے کہا کہ کسی دن تمہاری میں ملاقات کر کے ہم ان سے کہیں گے کہ وہ اپنے نفس کے ساتھ تھوڑی نرمی کا معاملہ کریں ساتھی نے میری اس تجویز سے اتفاق کیا چنانچہ ایک موقع تلاش کر کے ہم لوگ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ کیا اچھا ہو اگر آپ نفس کے ساتھ نرمی برتیں اور اس گریہ و زاری میں کچھ کمی کریں۔ جو آپ چاہتی ہیں اس نرمی سے اس پر بڑی مدد ملے گی۔ یہ بات سکرودہ رونے لگیں اور کہنے لگیں بخدا میں اس قدر رونا چاہتی ہوں کہ میرے آنسو خشک ہو جائیں۔ پھر خون کے آنسو روؤں یہاں تک کہ میرے جسم سے خون کا ایک ایک قطرہ آنسو بن کر آنکھ سے بہہ جائے لیکن میں کہاں روتی ہوں۔ مجھے رونا کب نصیب ہوتا ہے؟ یہ جملے انہوں نے کئی مرتبہ کہے اور بے ہوش ہو گئیں۔ محمد ابن معاذ کہتے ہیں کہ مجھ سے ایک عبادت گزار خاتون نے بیان کیا کہ میں نے خواب دیکھا گویا مجھے جنت میں داخل کیا گیا ہے۔ تمام اہل جنت اپنے اپنے دروازوں پر کھڑے ہیں۔ میں نے کہا جنت والوں کو کیا ہو گیا یہ دروازوں میں کیوں کھڑے ہوئے ہیں کسی کہنے والے نے کہا کہ جنت والے اس عورت کو دیکھنے کے لئے اپنے محلوں سے باہر نکل آئے ہیں جس کے لئے جنتیں سجائی گئی ہیں۔ میں نے کہا کہ وہ کون عورت ہے جس کا زبردست اعزاز منظور ہے۔ جواب دیا گیا کہ وہ ایکہ کی ایک سیاہ فام باندی ہے جسے شہوانہ کہتے ہیں میں نے کہا واللہ وہ تو میری بہن ہے۔ میں ابھی یہ گفتگو کر رہی تھی کہ وہ ایک اونٹنی پر سوار ہو کر ہوا کے دوش پر اڑتی ہوئی آئی۔ میں نے اس سے کہا کہ اے بہن شہوانہ میرے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا کر۔ وہ مجھے تیرے ساتھ ملا دے۔ اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا کہ ابھی تیرے یہاں آنے کا وقت نہیں آیا۔ البتہ میری دو باتیں یاد رکھ، ایک تو یہ کہ دل کو ہمیشہ غم زدہ رکھنا اور دوسرے یہ کہ اللہ کی محبت کو اپنی خواہش نفس پر مقدم رکھنا۔ پھر انشاء اللہ تجھے کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ خواہ کسی بھی وقت تیری موت آئے

آئے محمد اللہ ابن الحسن کہتے ہیں کہ میری ایک رومی باندی تھی اور میں اسے پسند کرتا تھا۔ ایک شب وہ میرے پہلو میں لیٹی ہوئی تھی۔ میری آنکھ لگ گئی۔ رات کے کسی پہر آنکھ کھلی تو میں نے محسوس کیا کہ وہ بستر پر نہیں ہے۔ میں اسے تلاش کرنے کے لئے بستر سے اٹھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ سجدے میں پڑی ہوئی ہے کہہ رہی ہے کہ اے اللہ! اس محبت کی وجہ سے جو تجھے میرے ساتھ ہے میری مغفرت فرما۔ میں نے کہا یوں مت کہہ کہ جو محبت تجھے میرے ساتھ ہے بلکہ یوں کہہ کہ جو محبت مجھے تیرے ساتھ ہے وہ کہنے لگی اے میرے آقا! اسی محبت کی وجہ سے اس نے مجھے شرک سے نکال کر اسلام تک پہنچایا اور اسی محبت کی وجہ سے اس نے میری آنکھ کو جاننے کی قوت بخشی جبکہ اس کی مخلوق خواب راحت میں مست ہے۔ ابو ہاشم القرظی کہتے ہیں کہ یمن سے ایک عورت ہمارے یہاں آئی اس کا نام سریہ تھا۔ وہ ہمارے گھروں میں سے ایک گھر میں مقیم ہوئی۔ میں رات کو اس کے پیچھے چلائے اور گریہ و زاری کرنے کی آوازیں سنا کرتا تھا۔ ایک دن میں نے اپنے نوکر سے کہا جا کر دیکھو یہ عورت کیا کرتی ہے۔ نوکر نے جا کر دیکھا۔ وہ کچھ بھی نہیں کر رہی تھی سوائے اس کہ اس کا چہرہ آسمان کی طرف تھا اور قبلہ رخ کھڑی ہوئی یہ کہہ رہی تھی کہ تو نے سریہ کو پیدا کیا پھر اس کو اپنی نعمتوں سے غذا دی اور ایک حال سے دوسرے حال کی طرف منتقل کیا تیرے تمام احوال اس کے حق میں اچھے ہیں اور تیرے مصائب اس کے نزدیک حسن سلوک ہیں۔ اس کے باوجود وہ خود کو تیرے غضب کا ہدف بناتی ہے اور معاصی پر جرات کر کے تیری ناراضگی مول لیتی ہے کیا تو یہ سمجھتا ہے کہ وہ یہ گمان رکھتی ہے کہ تو اس کے افعال نہ دیکھتا ہوگا۔ حالانکہ تو علیم و خبیر ہے اور ہر چیز پر قادر ہے۔

ذوالنون مصری کہتے ہیں کہ میں ایک روز وادئی کھنان سے اوپر کی طرف چلا۔ جب میں اوپر پہنچا تو دیکھا کہ سامنے کی جانب سے ایک سیاہ چیز چلی آ رہی ہے اور یہ کہہ رہی ہے اور دور رہی ہے۔

وَيَذَلُّهُمْ مِنَ اللَّهِ مَا لَمْ يَكُونُوا يَحْتَسِبُونَ (پ۔ ۲۳، ر۔ ۲۸، آیت ۳۸)

(ترجمہ) اور (اس وقت) ان کو تمام برے اعمال ظاہر ہو جائیں گے۔

جب وہ تاریک چیز میرے قریب آئی تو میں نے دیکھا کہ وہ عورت ہے جس کے بدن پر اونی جبہ ہے اور ہاتھ میں ڈوہلی ہے۔ اس نے مجھے دیکھ کر پوچھا تو کون ہے جو مجھ سے ڈر نہیں رہا ہے۔ میں نے کہا میں ایک اجنبی مسافر ہوں۔ وہ عورت کہنے لگی اللہ کے ہوتے ہوئے غیبت اور سفر کے کیا معنی؟ میں اس کی یہ بات سن کر رونے لگا۔ اس نے کہا تو کیوں روتا ہے؟ میں نے جواب دیا کہ میرے زخم میں تکلیف تھی۔ تیری باتوں نے اس پر مرہم رکھ دیا اس لئے روتا ہوں۔ اس نے کہا اگر تو سچا ہے تو کیوں روتا ہے۔ میں نے کہا کیا سچے رویا نہیں کرتے؟ وہ کہنے لگی نہیں۔ میں نے پوچھا کیوں؟ اس نے جواب دیا اس لئے کہ رونا دل کی راحت میں ہوتا ہے۔ میں اس کی یہ بات سن کر تعجب میں رہ گیا۔ احمد ابن علی کہتے ہیں کہ ہم نے عفیہ کے پاس حاضری کی اجازت چاہی مگر انہوں نے اجازت نہ دی لیکن ہم دروازے پر ہی ٹھہرے رہے۔ وہاں سے نہیں ملے۔ مجبوراً وہ دروازہ کھولنے کے لئے اٹھیں اور یہ کہتے ہوئے دروازہ کھولا کہ اے اللہ! میں ان لوگوں سے تیری پناہ چاہتی ہوں جو تیرے ذکر میں رکاوٹ بنیں۔ ہم نے ان کے حجرے میں پہنچ کر عرض کیا کہ ہمارے لئے دعا فرمائیے۔ انہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ میرے گھر میں تمہاری فیاضیت اس طرح کرے کہ تمہاری مغفرت فرمائے۔ پھر وہ ہم سے کہنے لگیں کہ عطاء السلی نے چالیس برس تک آسمان کی طرف نظر نہیں اٹھائی۔ ایک مرتبہ آنکھ نے خیانت کی اور آسمان کی طرف دیکھ لیا تو شرمندگی کے باعث بے ہوش ہو کر گر پڑے اور پیٹ کا کوئی عضو خوف سے پھٹ گیا۔ کاش عفیہ سر نہ اٹھائے، کاش اگر وہ کوئی نافرمانی کر لے تو دوبارہ نہ کرے۔ ایک بزرگ کہتے ہیں کہ میں ایک دن بازار کی طرف گیا۔ میرے ساتھ ایک جشن باندی بھی تھی میں نے اسے بازار کے ایک گوشے میں ٹھہرنے کے لئے کہا اور اپنی ضرورت پوری کرنے چلا گیا۔ میں نے اسے تاکید کر دی تھی کہ وہ اپنی جگہ سے اس وقت تک نہ ہلے جب تک میں واپس نہ آ جاؤں لیکن جب میں واپس پہنچا تو وہ اپنی جگہ موجود نہ تھی۔ میں گھرواپس آیا اس وقت مجھے شدید غصہ تھا۔ باندی نے میرے حجرے سے اندازہ کر لیا کہ میں سخت غصے میں ہوں۔ وہ کہنے لگی آقائے محترم! سزا دینے میں جلدی نہ کیجئے۔ جس جگہ آپ نے مجھے انتظار کرنے کے لئے کہا تھا۔ وہاں کوئی اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والا نہیں تھا اس لئے مجھے ڈر ہوا کہ کہیں وہ جگہ زمین کے اندر نہ دھنس جائے اس لئے میں اس ڈر سے چلی آئی۔ راوی کہتے ہیں کہ مجھے اس کی یہ گفتگو سن کر سخت تعجب ہوا اور میں نے اس سے کہا کہ آج سے تو آزاد ہے۔ اس نے کہا یہ آپ نے برا کیا میں آپ کی خدمت کیا کرتی تھی تو مجھے دو ہرا اجر ملتا تھا اب میں ایک اجر سے محروم ہو گئی۔

ابن عطاء السعدی کہتے ہیں کہ میری چچا زاد بہن بریرہ بڑی عبادت گزار و نہایت پرہیزگار خاتون تھیں۔ وہ کثرت سے تلاوت کلام اللہ کیا کرتی تھیں اور تلاوت کے دوران مسلسل روتی رہتیں۔ زیادہ رونے کے باعث ان کی آنکھیں ضائع ہو گئی تھیں۔ ایک مرتبہ ہم سب چچا زاد بھائیوں نے پروگرام بنایا کہ بریرہ کے پاس جائیں گے اور اس قدر رونے پر اسے ملامت کریں گے۔ چنانچہ ہم سب اس کے یہاں پہنچے اور اس کی خیر و عافیت دریافت کی۔ اس نے کہا ہم اجنبی مہمان زمین پر پڑے ہوئے ہیں اور شکر ہیں کہ کوئی ہمیں ملائے اور ہم جائیں۔ ہم نے اس سے کہا کہ اس طرح کب تک روتی رہو گی۔ اب تو آنکھیں بھی چلی گئیں اس نے کہا اگر اللہ تعالیٰ کے یہاں میری آنکھوں کے لئے کچھ بہتری ہے تو مجھے ان کے ضائع جانے پر کوئی ملال نہیں ہے اور اگر اللہ کے یہاں ان کی کچھ برائی ہے تو پھر انہیں اور رونا چاہیے۔ ہم میں سے کسی شخص نے کہا یہاں سے چلو اس کا حال دوسرا ہے۔ اس کا حال ہمارے جیسا نہیں ہے۔ معاذ عدویہ دن نکلنے پر کہیں یہ وہ دن ہے جس میں مجھے مرنا ہے۔ پھر وہ شام تک کچھ نہ کھاتیں۔ یہاں تک کہ رات آجاتی۔ وہ رات کے متعلق بھی یہی کہتیں کہ مجھے آج رات مرنا ہے۔ یہ کہہ کر نماز شروع کر دیتیں اور صبح تک پڑھتی رہتیں۔ ابو سلیمان دارانی کہتے ہیں کہ میں نے ایک رات حضرت رابعہ عدویہ کے یہاں گزاری۔ رات شروع ہوتے ہی وہ اپنی عبادت گاہ میں جا کر کھڑی ہو گئیں۔ میں بھی ایک گوشے میں جا کھڑا ہوا۔ وہ صبح

تک نماز میں مصروف رہیں۔ میں نے صبح کو ان سے کہا کہ اس ذات گرامی کا شکریہ کس طرح ادا کیا جائے جس نے ہمیں آج کی رات قیام پر قوت بخشی ہے۔ انہوں نے فرمایا اس کا شکریہ اس طرح ہو گا کہ ہم کل صبح کو اس کی خاطر روزہ رکھیں گے۔

شعوانہ اپنی دعا میں یوں کہا کرتی تھیں اے اللہ! مجھے تیری ملاقات کا کتنا شوق ہے اور تیری جزاء پانے کی کس قدر امید ہے۔ تیری ذات کریم سے امید کرنے والوں کی امیدیں مایوسی سے نہیں بدلتیں اور نہ مشاققین کا شوق ضائع جاتا ہے۔ اے اللہ! اگر میری موت کا وقت آچکا ہے اور میرے کسی عمل نے مجھے تجھ سے قریب نہ کیا ہو تو میں اپنے گناہوں کا اعتراف کرتی ہوں۔ اگر تو مجھے معاف کر دے گا تو اس سلسلے میں تجھ سے بہتر کون ہے اور اگر مجھے عذاب دے گا تو تجھ سے زیادہ عادل کون ہے۔ اے اللہ! میں نے اپنے نفس کے لئے نظری جبارت کی۔ اب تیرے حسن نظری کی امید ہے۔ اگر تو نے اس پر نظر کرم نہیں فرمائی تو یہ تباہ و برباد ہو جائے گی۔ اے اللہ! تو نے تمام زندگی مجھ پر احسانات فرمائے ہیں مرنے کے بعد بھی مجھ سے اپنے احسانات کا سلسلہ منقطع نہ کرنا۔ جس ذات نے زندگی میں مجھے اپنے کرم و احسان کا مستحق سمجھا ہے اسی ذات سے مجھے یہ امید ہے کہ وہ موت کے بعد بھی مجھ پر بخشش کا دروازہ کھولے گا۔ اے اللہ! جب تو زندگی میں میرا ذمہ دار رہا تو مرنے کے بعد میں کیسے تیری نظر کرم سے مایوس ہوں! اے اللہ! ایک طرف مجھے میرے گناہ ڈراتے ہیں دوسری طرف جو محبت تجھ سے ہے اس سے دل مطمئن ہوتا ہے۔ میرے معاملے پر اپنی شان کے مطابق نظر کر اور اس شخص کو بھی اپنے فضل و احسان سے محروم نہ کر جو حالت کے نشے میں مدہوش ہے۔ اے اللہ! اگر تو میری رسوائی چاہتا تو مجھے ہدایت کیوں دیتا اور اگر میری ذلت چاہتا تو میرے گناہوں کی پردہ پوشی کیوں فرماتا؟ اے اللہ! جس سبب سے تو نے مجھے ہدایت دی ہے اسے باقی رکھ اور جس سبب سے تو میری پردہ پوشی کرتا ہے اسے دائم رکھ۔ اے اللہ! میں نہیں سمجھتی کہ جس مقصد کے لئے میں نے عمر لگائی ہے اسے تو نامنکور کر دے گا۔ اگر میں نے گناہ نہ کئے ہوتے تو مجھے تیرے عذاب کا خوف نہ ہوتا اور اگر مجھے تیرے کرم کا علم نہ ہوتا تو میں تیرے اجر اور ثواب کی امیدوار نہ ہوتی۔

حضرت خواصؒ فرماتے ہیں کہ ہم رطلہ عابدہ کے یہاں گئے۔ انہوں نے اتنے روزے رکھے تھے کہ سیاہ پڑ گئی تھیں اور اس قدر آنسو بہائے تھے کہ آنکھوں سے محروم ہو گئی تھیں اور اس قدر نمازیں پڑھی تھیں کہ چلنے پھرنے سے محذور ہو گئی تھیں۔ جس وقت ہم لوگ ان کے پاس پہنچے وہ بیٹھی ہوئی نماز پڑھ رہی تھیں۔ ہم نے انہیں سلام کیا اور اللہ تعالیٰ کے حضور کرم اور فضل و احسان پر کچھ گفتگو کی تاکہ وہ اپنے نفس پر قدرے نرمی کریں۔ ہماری بات سن کر انہوں نے ایک چچ ماری اور کہنے لگیں کہ میں اپنے نفس سے زیادہ واقف ہوں۔ اس لئے میرا دل زخمی ہے اور کبجہ چھلٹی ہے۔ سوچتی ہوں کاش اللہ تعالیٰ مجھے پیدا نہ فرماتا اور میں کوئی قاتل ذکر چہ نہ ہوتی پھر وہ نماز پڑھنے لگیں۔

اگر تم نفس کے ساتھ شرط لگانے والوں میں سے ہو اور مراقبہ کرنے والوں سے تعلق رکھتے ہو تو تمہیں ان بزرگ مردوں اور عورتوں کے حالات زندگی کا مطالعہ کرنا چاہیے تاکہ تمہیں عمل پر نشاط حاصل ہو اور عبادت کی حرم پیدا ہو تمہیں اپنے زمانے کے لوگوں کی طرف نہ دیکھنا چاہیے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وَإِنْ نُطِيعْ أَكْثَرَ مَنْ فِي الْأَرْضِ لَيُضِلَّوكَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ (پ ۸، ر ۱، آیت ۷۷)

(ترجمہ) اور دنیا میں اکثر لوگ ایسے ہیں کہ اگر آپ ان کا کٹمانے لگیں تو وہ آپ کو اللہ کی راہ سے بے راہ کر دیں۔

مہتدین کے واقعات اتنے زیادہ ہیں کہ ان کا احاطہ نہیں کیا جاسکتا۔ ان صفحات میں ہم نے جو کچھ ذکر کر دیا ہے وہ عبرت پکڑنے والوں کے لئے بہت کافی ہے۔ اگر تمہیں مزید کی ضرورت ہو تو حلیۃ الاولیاء نامی کتاب کا مطالعہ کرو۔ اس میں صحابہ کرام، تابعین عظام اور بعد کے بزرگان دین کے احوال مذکور ہیں۔ اس کتاب کے مطالعے سے واضح ہو گا کہ تم اور

تمہارے بنائے زمانہ ان بزرگوں سے کتنے دور ہیں۔ اب اگر تمہارا نفس یہ کہے کہ اپنے زمانے کے لوگوں کو دیکھو کیونکہ اسی زمانے میں خیر ہے اور دین کے مدگاروں کی کثرت ہے۔ نیز اگر تم دوسرے زمانے کے لوگوں کی اتباع کرو گے تو لوگ تمہاری ہنسی اڑائیں گے اور دیوانہ کہیں گے۔ نفس یہ دلیل بھی دیتا ہے کہ تم اس زمانے کے لوگوں کی تقلید کرو۔ اس لئے جس معصیت میں تمہارے زمانے والے جلتا ہوں گے اسی میں تم بھی جلتا ہو گے اور جس عذاب سے وہ دوچار ہوں گے اسی سے تم بھی دوچار ہو گے۔ تم تھا اس معصیت اور عذاب میں جلتا نہیں ہو گے پھر کیا پریشانی ہے۔ دیکھو نفس کے فریب میں مت آنا اور نہ اس کی دلیل سے متاثر ہونا۔ نفس سے تمہیں یہ پوچھنا چاہیے کہ اگر کسی شہر میں زبردست سیلاب آنے کا خطرہ ہو اور یہ اندیشہ ہو کہ اس سیلاب میں شہر کی تمام آبادی بہ جائے گی لیکن تم کشتی وغیرہ کے ذریعہ اس سے بچ سکتے ہو تو کیا یہ بات عقل کے مطابق ہوگی کہ تم اسی شہر میں مقیم رہو اور یہ سوچو کہ جو سب کا حال ہو گا وہی میرا ہو گا پھر مجھے کیا ضرورت ہے کہ میں سیلاب سے بچنے کی تدبیر کروں اور کشتی وغیرہ کھینے کی مشقت جھیلوں۔ ظاہر ہے کوئی بھی سلیم العقل انسان اسے دانائی نہیں کہہ سکتا بلکہ ہر عقلمند انسان اس سے بچنے کی کوشش کرتا ہے۔ جب ایک عارضی اذیت کے سلسلے میں۔ جو چند لمحوں سے زیادہ باقی نہیں رہتی۔ لوگوں کا عالم یہ ہے کہ وہ اس سے بہر صورت بچنے کی کوشش کرتے ہیں تو تم اس عذاب سے کیوں نہیں بچتے۔ جو ہمیشہ کے لئے ہو گا اور نفس کا یہ کہنا کہ معصیت عام ہو تو اچھی لگتی ہے ایک بے بنیاد بات ہے۔ ہو سکتا ہے دنیا میں معصیتیں عام ہونے سے اچھی ہو جاتی ہوں مگر آخرت میں ایسا نہیں ہو گا۔ وہاں دوزخیوں کو اس قدر فرصت کب ہوگی کہ وہ ایک دوسرے کو دیکھیں اور ان کے مصائب دیکھ کر اپنے مصائب پر خوش ہوں۔ دیکھو کفار محض اسی لئے ہلاک ہوئے ہیں کہ انہوں نے اپنے زمانے کے لوگوں کی تقلید کی تھی اور انہیں اسوۂ بنایا تھا جیسا کہ قرآن کریم نے ان کا قول نقل کیا ہے۔

إِنَّا وَجَدْنَا آبَاءَنَا عَلَىٰ أُمَّةٍ وَإِنَّا عَلَىٰ آثَارِهِم مُّقْتَدُونَ (پ ۲۵، ۸۷، آیت ۲۳)

(ترجمہ) ہم نے اپنے باپ دادوں کو ایک طریقے پر پایا ہے اور ہم بھی ان کے پیچھے چلے جاتے ہیں۔

بہر حال اگر تم اپنے نفس کو عتاب نہ کرو اور اسے مجاہدہ پہ اکساؤ اور وہ تمہاری نافرمانی کرے تو تمہیں زبرد توخ اور عتاب و ملامت کا سلسلہ منقطع نہ کرنا چاہئے بلکہ اسے اس کی سوء عاقبت سے ڈراتے رہنا چاہیے ہو سکتا ہے وہ کسی دن اپنی سرکشی

سے باز آجائے
چھٹا مقام نفس کو عتاب کرنا

تمہارا سب سے بڑا دشمن خود تمہارے دونوں پہلوؤں کے درمیان واقع نفس ہے۔ اس کی تخلیق میں یہ بات رکھ دی گئی ہے کہ وہ بدی کا حکم کرتا ہے، شر کی طرف مائل ہوتا ہے اور خیر سے راہ فرار اختیار کرتا ہے اس کے متعلق یہ حکم دیا گیا ہے کہ اس کا تزکیہ کیا جائے اور اس کا ٹیڑھا پن دور کیا جائے اور اسے جبر و اکراہ سے روکا جائے۔ اگر تم نے اسے ڈھیل دی تو وہ سرکش بن جائے گا اور تمہارے قابو سے باہر ہو جائے گا۔ اس کے بعد تم اسے پانہ سکو گے اور اگر تم اس کو ڈانٹنے ڈپٹنے رہے اور اللہ کے عذاب سے ڈراتے رہے تو وہی نفس نفس لواہ بن جاتا ہے جس کی اللہ تعالیٰ نے قسم کھائی ہے اور یہ توح کی جاسکتی ہے کہ یہ نفس بدرجہ نفس مطمئنہ بن جائے گا جسے یہ دعوت دی گئی ہے کہ وہ اللہ کے مجلس بندوں کے زمرے میں شامل ہو جائے اس طرح کہ وہ خود بھی اللہ تعالیٰ سے راضی ہو اور اللہ بھی اس سے راضی ہو۔ اس لئے تم کسی بھی لمحے نفس کی طرف سے غافل مت رہو بلکہ اسے سمجھاتے رہو و عطا وصیحت کرتے رہو اور لعنت و ملامت کرتے رہو تمہیں کسی دوسرے کو اس وقت تک و عطا وصیحت نہ کرنی چاہیے جب تک تم خود اپنے نفس کو و عطا وصیحت نہ کر لو۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰؑ پر وحی نازل فرمائی کہ اے مریم کے بیٹے! پہلے اپنے نفس کو وصیحت کرو جب اسے وصیحت کر چکو تب لوگوں کو وصیحت کرو ورنہ مجھ سے شرماؤ۔ ارشاد خداوندی ہے۔

وَذَكِّرْ فَإِنَّ الذِّكْرَ يُنْفَعُ الْمُؤْمِنِينَ (پ ۲۷ ر ۲ آیت ۵۵)
(ترجمہ) اور سمجھاتے رہئے کیونکہ سمجھانا ایمان والوں کو (بھی) نفع دے گا۔

اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے اپنے نفس پر متوجہ ہو اور اس سے کہو کہ تو کتنا بے وقوف اور کس قدر نادان ہے کہ اپنے آپ کو ذہن، دانا اور حکیم تصور کرتا ہے لیکن آنے والی زندگی کے متعلق کچھ نہیں سوچتا۔ جنت اور دوزخ تیرے سامنے ہیں اور تجھے ان میں سے ایک میں عنقریب جانا ہے۔ اس کے باوجود تو خوش ہوتا ہے قہقہے لگاتا ہے اور لبو و لعب میں مشغول ہوتا ہے حالانکہ تو ایک خطرناک مرطے سے دوچار ہونے والا ہے، موت تیری منتظر ہے، ہو سکتا ہے آج یا کل موت تجھے اپنے بچوں میں جکڑ لے۔ تو سمجھتا ہے کہ موت تجھ سے دور ہے ہو سکتا ہے وہ اللہ کے علم میں نہایت قریب ہو ویسے بھی جو چیز آنے والی ہے وہ قریب ہی ہوتی ہے اور جو آنے والی نہیں ہوتی اسے بعید کہا جاتا ہے۔ کیا تو نہیں جانتا کہ موت تجھے اچانک آکھڑے گی۔ نہ اس سے پہلے کوئی قاصد آئے گا۔ نہ اطلاع آئے گی۔ نہ تاریخ اور وقت مقرر ہو گا نہ موت کی آمد کسی خاص موسم کے ساتھ مخصوص ہے کہ یہ کہا جاسکے کہ گرمی میں آئے گی۔ سردی میں نہیں آئے گی۔ یا سردی میں آئے گی۔ گرمی میں نہیں آئے گی۔ نہ موت کے لئے رات اور دن کی قید ہے، نہ بڑھاپے اور جوانی کی تخصیص بلکہ انسان کا ہر سانس آخری ہو سکتا ہے اور ہر لمحہ موت کا پتلا مہرین سکتا ہے اگر اچانک موت نہیں آتی تو مرض اچانک آجاتا ہے اور وہ موت کی طرف لے جاتا ہے۔ پھر کیا بات ہے تو موت کے لئے تیاری نہیں کرتا حالانکہ وہ تیری رگ جاں سے بھی قریب ہے۔ کیا تو اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں غور نہیں کرتا۔

اقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِي غَفْلَةٍ مُّعْرِضُونَ مَا يَأْتِيهِمْ مِنْ ذِكْرٍ مِنْ رَبِّهِمْ
مُحْدَلٍ إِلَّا اسْتَمَعُوهُ وَهُمْ يَلْعَبُونَ لَا هِيبَةَ قُلُوبُهُمْ (پ ۷۷ ر ۱ آیت ۳)

(ترجمہ) ان لوگوں سے ان کا وقت حساب قریب آ رہا ہے (ابھی) غفلت (ہی) میں (پڑے ہیں) اور اعراض کئے ہوئے ہیں۔ ان کے پاس ان کے رب کی طرف سے جو صیحت تازہ آتی ہے یہ اس کو اس طور سے سنتے ہیں کہ اس کے ساتھ ہنسی کرتے ہیں ان کے دل متوجہ نہیں ہوتے۔

اگر تو اللہ تعالیٰ کی معصیت پر اس لئے جرأت کرتا ہے کہ تیرا اعتقاد یہ ہے کہ اللہ تیرے اعمال کا گہرا نہیں ہے تو یہ تیرا کفر ہے اور اگر تو اللہ کو اپنے اعمال کا گہرا سمجھ کر بھی معصیت کرتا ہے تو یہ بڑی بے شری اور بے خیالی کی بات ہے اے نفس! اگر تیرے سامنے تیرا کوئی غلام نافرمانی کرتا ہے، یا تیرا بھائی حکم عدولی کرتا ہے تو تو کس قدر غضب ناک ہوتا ہے اور اسے کتنا برا سمجھتا ہے، پھر تو کس جسارت کی بنا پر اللہ تعالیٰ کے غضب شدید، مسخض عظیم اور عقاب الیم کا سامنا کرنے پر تیار ہے، کیا تو یہ سمجھتا ہے کہ اس کا عذاب برداشت کرے گا، ہرگز نہیں، یہ تیری خام خیالی ہے، اگر تو ہماری بات پر یقین نہیں کرتا تو تجربہ کر لے اور کچھ دیر کے لئے سخت دھوپ میں کھڑا ہو جا، یا گرم حمام میں کچھ لمحوں کے لئے اپنے آپ کو محبوس کر لے، یا اپنی انگلی آگ کے شعلے پر رکھ اور دیکھ کہ تیرے اندر یہ تکلیف برداشت کرنے کی کس قدر قوت ہے، ایسا تو نہیں کہ تجھے اللہ کے فضل و کرم اور تیری عبادت و اطاعت سے اس کی بے نیازی کا قریب ہو، اگر ہمارا خیال صحیح ہے تو ہم پوچھتے ہیں کہ تو دنیاوی معاملات میں اللہ تعالیٰ کے کرم پر بھروسا کیوں نہیں کرتا، اور کس لئے ذاتی تدبیریں بروئے کار لاتا ہے مثلاً جب کوئی دشمن تجھ پر حملہ آور ہوتا ہے تو تو اس خیال سے خاموش نہیں بیٹھتا کہ اللہ تعالیٰ کی مدد اور فضل و کرم پر یقین رکھتا ہے جبکہ اس کے شر سے محفوظ رہنے کے لئے اپنی پوری قوت اور طاقت استعمال کرتا ہے۔ اسی طرح جب تجھے کوئی ایسی دنیاوی ضرورت پیش آتی ہے جس کی تکمیل درہم و دینار کے بغیر ممکن نہ ہو تو درہم و دینار کے حصول کے لئے سرودھڑی بازی لگا دیتا ہے، ہم پوچھتے ہیں کہ اس وقت تو اللہ تعالیٰ کے کرم پر بھروسا کیوں نہیں کرتا کہ وہ تجھے کسی خزاں کا علم دیدے یا تیری

اعانت کے لئے اپنے کسی بندے کو مسخر کر دے اور تیری کسی کاوش و سعی کے بغیر تیری مطلوبہ شے فراہم کر دے۔ کیا تو سمجھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ صرف دنیا میں کریم ہے۔ آخرت میں کریم نہیں ہے۔ تو یہ بات اچھی طرح جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی سنت اور طرز عمل میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ دنیا و آخرت کا مالک اور پروردگار ایک ہے تو یہ بھی جانتا ہے کہ انسان کو کوشش کے بغیر کچھ نہیں ملتا۔ اے ملعون نفس! ہمیں تیرے خفاق پر حیرت ہوتی ہے اور تیرے باطل و دعوؤں پر تعجب ہوتا ہے تو اپنی زبان سے ایمان کا دعویٰ کرتا ہے اور خفاق کا اثر تجھ پر ظاہر ہے۔ کیا تیرے آقا و مولیٰ نے تجھ سے یہ نہیں فرمایا۔

وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا۔ (پ ۳، ر ۱، آیت ۶)

اور کوئی جانور روئے زمین پر چلے والا ایسا نہیں کہ اس کا رزق اللہ تعالیٰ کے ذمے نہ ہو۔ اور کیا آخرت کے مخلق یہ ارشاد نہیں فرمایا۔

وَإِنْ لَيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ (پ ۲، ر ۷، آیت ۳۹)

اور نہیں ہے انسان کے لئے وہ مگر جو کوشش کرے۔

ان دونوں آیتوں سے پتا چلتا ہے کہ اس نے دنیاوی امور میں تیرے تکفل کا وعدہ کیا ہے لیکن آخرت کے باب میں تیری سعی اور جدوجہد کو مدار قرار دیا ہے لیکن تو نے اپنے افعال سے ان آیات کی تکذیب کر دی ہے اب تو طلب دنیا میں ایسے مشغول ہے جیسے کوئی کتا ارد گرد کے ماحول سے بے خبر ہڈی ہنسنے میں مصروف ہو اور آخرت سے نہایت مغورانہ انداز میں روگرداں ہو اور مابعد الموت کے واقعات کو حقیر سمجھ کر نظر انداز کئے ہوئے ہو۔ یہ ایمان کی علامت نہیں ہے۔ اگر ایمان کا تعلق محض زبان سے ہوتا تو منافقین دوزخ کے نچلے طبقے میں کیوں ہوتے۔ ہمیں تو ایسا لگتا ہے کہ تجھے یوم حساب کا یقین نہیں ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ مرنے کے بعد تو ہر طرح کے قید و بند سے آزاد ہو جائے گا۔ تیرا یہ گمان غلط ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔

فَخَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ نُطْقَةٍ مِنْ مِثْنِ يَمِينِي ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوَّىٰ فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنَ الذَّكَرَ وَالْأُنثَىٰ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لِبَاقَاتٍ عَلَىٰ أَنْ يُحْيِيَ الْمَوْتَىٰ۔ (پ ۲۹، ر ۱۸، آیت ۳۶-۳۷)

کیا انسان یہ خیال کرتا ہے کہ یوں ہی مصل چھوڑ دیا جائے گا کیا یہ شخص (ابتداء ہی میں محض) ایک قطرہ مٹی نہ تھا جو (عورت کے رحم میں) پٹکایا گیا تھا پھر وہ خون کا لوتھڑا ہو گیا پھر اللہ تعالیٰ نے (اس کو انسان) بنایا پھر اعضاء درست کئے۔ پھر اس کی دو قسمیں کر دیں، مرد اور عورت (تو) کیا (خدا) اس بات پر قدرت نہیں رکھتا کہ (قیامت میں) مردوں کو زندہ کرے۔

اگر تیرا خیال یہ ہے کہ تجھے ویسے ہی چھوڑ دیا جائے گا تو یہ تیرا جہل اور کفر ہے تو اپنے مخلق سوچ کہ کیا تو شروع ہی سے ایسا تھا جیسا اس وقت ہے۔ تیری حقیقت ہی کیا تھی۔ تو مٹی کا ایک قطرہ تھا، اسی سے تجھے وجود ملا، پھر کیا یہ ناممکن ہے کہ اللہ تجھے موت دینے کے بعد دوبارہ زندگی دے وہ خود فرماتا ہے۔

قِيلَ الْإِنْسَانُ مَا أَكْفَرَهُ مِنْ أَيْ شَيْءٍ خَلَقَهُ مِنْ نُّطْقَةٍ خَلَقَهُ فَقَتَرَهُ ثُمَّ السَّبِيلَ

يَسَّرَهُ ثُمَّ لَعَنَهُ فَأَقْبَرَهُ ثُمَّ إِذَا شَاءَ أَنْشَرَهُ (پ ۳۰، ر ۵، آیت ۷۷)

خدا کی ماریہ کیا ناشکر ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کو کیسی (حقیر) چیز سے پیدا کیا نطفے سے پیدا کیا، اس کی صورت بنائی، پھر اس (کے اعضاء) کو اندازے سے بنایا پھر اس کو (نکلنے کا) راستہ آسان کر دیا۔ پھر موت دی، پھر اس کو قبر میں لے گیا پھر جب اللہ چاہے گا اسے دوبارہ زندہ کرے گا۔

اگر تو موت کے بعد کی زندگی پر یقین رکھتا ہے تو اس کے لئے تیاری کیوں نہیں کرتا۔ دنیاوی معاملات میں تو حیرا حال یہ ہے کہ اگر یہودی تجھے یہ بتلائے کہ فلاں لذیذ ترین غذا تیری صحت کے لئے سخت نقصان دہ ہے تو اس سے صبر کرتا ہے اسے ہاتھ نہیں لگاتا اور نفس کو اس کے ترک پر مجبور کرتا ہے خواہ تجھے اس سلسلے میں کتنا ہی مجاہدہ کیوں نہ کرنا پڑے مگر دوسری طرف حیرا عالم یہ ہے کہ انبیائے کرام جن کی تائید و توثیق معجزات کے ذریعے کی گئی ہے کے اقوال کو نظر انداز کر دیتا ہے اور آسانی کتابوں میں لکھے ہوئے احکام الہی پر ایک سرسری نظر ڈال کر گذر جاتا ہے کیا اللہ و رسول کے ارشادات کی حیرے نزدیک اتنی ہی اہمیت نہیں جتنی ایک پوچھنے والی کی ہے جو محض غن و تخمین اور قیاس و استقراء کو بنیاد بنا کر حکم لگاتا ہے جس کے پاس یعنی حکم لگانے کا کوئی ذریعہ بھی نہیں ہے پھر وہ یہودی بھی ایسا جس کا علم بھی ناقص ہے اور سمجھ بھی ناقص ہے۔ یہودی کی بات تو پھر دوسری ہے ہمیں تو اس وقت حیرت کا شدید جھٹکا لگتا ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اگر کوئی پوچھ تجھے یہ بتلائے کہ حیرے کپڑوں میں پھٹو ہے تو تو اسی لمحے کپڑے اتار کر پھینک دیتا ہے۔ یہ اس سے کسی دلیل کا مطالبہ کرتا ہے اور نہ حجت کا طالب ہوتا ہے کیا حیرے نزدیک انبیاء، علماء، حکماء اور اولیاء کے ارشادات کی وقعت اتنی بھی نہیں جتنی ایک بچے کے قول کی ہے جسے ساری دنیا کے لوگ تا تجزیہ کار اور کم عقل کہتے ہیں۔ کیا دنیا کے ایک حقیر چھوٹی حیرے نزدیک اس قدر اہمیت ہے کہ جہنم کی تپش، اس کے طوق و سلاسل، مرکز، خون، پیپ، بادِ سموم اور سانپ پھوؤں کی اتنی اہمیت نہیں ہے اسی لئے تو دنیا کے بچھو کا احساس کرتے ہی کپڑے اتار پھینکتا ہے اور ایک بچے کے کہنے پر اس سے بچنے کی سعی کرتا ہے جبکہ انبیائے کرام تجھے دوزخ کے ہولناک پھوؤں، خطرناک سانپوں اور اژدھوں سے ڈراتے ہیں مگر حیرے کانوں پر جوں تک نہیں دیکھتی۔ کیا یہ دانائی ہے کیا اسے کسی ہوشمند انسان کا طرزِ عمل کہا جاسکتا ہے۔ ہم تو یہاں تک کہتے ہیں کہ اگر ہمارے پیر حیرا حال محکف ہو جائے تو وہ حیرا مذاق اڑائیں اور تیری عقل و فہم کا ماتم کریں۔

اے بد بخت نفس! اگر تو ان تمام باتوں پر یقین رکھتا ہے اور انہیں سچ مانتا ہے تو پھر عمل میں نال معلول کیوں کرتا ہے حالانکہ موت گھات لگائے بیٹھی ہے ہو سکتا ہے وہ تجھے توبہ کی مہلت دے بغیر اپک لے اگر تجھے موت کا یقین ہے اور یہ بھی جانتا ہے کہ موت دفعتاً بھی آسکتی ہے تو پھر کس خوش فہمی میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا ہے اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ تجھے اللہ تعالیٰ نے سو برس کی مہلت عطا کی ہے لیکن کیا یہ سو برس کی مدت بغیر طے کئے پوری ہو جائے گی اور کیا کوئی کام کئے بغیر خود بخود ہو جائے گا۔ کیا کوئی شخص سواری کو چارہ دے بغیر اس پر سوار ہو سکتا ہے اور دشوار گزار راہیں طے کر سکتا ہے اگر تو ایسا سمجھتا ہے تو یہ حیرتی بھول ہے۔ ہم تجھ سے پوچھتے ہیں کہ ایک مسافر کسی غیر وطن میں فقہ کا علم حاصل کرنے کے لئے جاتا ہے اور وہاں چند برس اس حال میں گزارتا ہے کہ نہ اس نے کسی استاد سے رابطہ قائم کیا نہ کوئی کتاب ہاتھ میں لی نہ کسی مدرسے میں داخلہ لیا بس اپنے آپ کو یہ تسلی دیتا رہا کہ بس کل سے حصولِ علم کا سفر شروع کروں گا لیکن اس کی کل کبھی نہیں آتی۔ یہاں تک کہ وطن واپسی کا وقت آجاتا ہے کیا تجھے اس کم عقل انسان پر ہنسی نہیں آئے گی کہ وہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھا رہا اور یہ سمجھتا رہا کہ مجھے فقہاء کا منصب خود بخود حاصل ہو جائے گا اور جب یہاں سے رخصت ہوں گا تو ایک بڑا قصبہ بن کر رخصت ہوں گا مگر کیوں کہ یہ ممکن نہیں ہے اس لئے خالی ہاتھ رخصت ہوتا ہے۔

پھر اگر یہ مان لیا جائے کہ مجاہدہ یا کوشش آخر عمر میں مفید ہوتی ہے اور یہ کہ آخری ایام کا مجاہدہ اعلیٰ درجات تک پہنچاتا ہے لیکن تو یہ کیسے کہہ سکتا ہے کہ جس دن کو تو نے خوش آمدید کہا ہے وہ حیرتی زندگی کا آخری دن نہیں ہے اور ابھی تیری زندگی کے شب و روز باقی ہیں۔ ہو سکتا ہے یہی دن آخری ہو اور یہی لمحے موت کو لبیک کہنے پر مجبور ہو جائیں۔ چلے مانے لیتے ہیں کہ تجھ پر مہلت کی وحی نازل ہوئی ہے لیکن آخر عمل کی طرف سبقت کرنے میں کیا مضائقہ ہے۔ ہم تو یہی سمجھتے ہیں کہ تو شہوات سے رکتا نہیں چاہتا کیونکہ ان سے رکنے میں تجھے مشقت محسوس ہوتی ہے اور تو اپنی شہوات کی مخالفت پر قادر نہیں ہے۔ اگر تو عمل کے لئے کسی ایسے دن کا انتظار کر رہا ہے جس میں شہوات کی مخالفت تکلیف دہ نہ ہو تو ایسا دن آنے والا نہیں ہے۔ نہ اللہ نے کوئی ایسا دن

پیدا کیا ہے اور نہ پیدا کرے گا۔ جنٹ ٹاپسندہ چیزوں، مصیبتوں اور مشقتوں سے کھری ہوئی ہے اور یہ چیزیں نفوس پر کبھی سل نہیں ہوتیں۔

اے نفس! تیرا یہ وعدہ کوئی نیا نہیں ہے۔ تو ایک عرصہ دراز سے اعمال کو کل پر ملا رہا ہے۔ نہ جانے کتنے کل آج میں تبدیل ہو گئے لیکن تو نے کوئی جنبش نہیں کی اور آج بھی اسی وعدہ فردا میں مصروف ہے۔ ہمارے خیال سے تو کسی بھی شکل میں عمل نہیں کر سکتا بلکہ تو عمل سے عاجز ہی نظر آتا ہے۔ اس لئے کہ شہوت ایک درخت کی طرح ہے جس کی جڑیں روز بروز مضبوط ہوتی چلی جاتی ہیں۔ اگر اسے اسی وقت اکھاڑ پھینکا جائے جس وقت وہ ایک پودا ہو یا ایک کنور درخت ہو تو اس میں کوئی خاص دشواری نہیں ہوتی لیکن جب وہ ایک تناور درخت بن جاتا ہے اور اس کی جڑیں زمین میں اور شاخیں آسمان میں وسیع ہو جاتی ہیں تو اسے اکھاڑنا آسان نہیں ہوتا۔ جیسے کوئی شخص نہروانی کی حالت میں ایک درخت کو اکھاڑنے کا ارادہ کرے پھر اسے امروز فردا پر ٹلاتے ٹلاتے بوڑھا ہو جائے اور بیچاپے میں اکھاڑنے کی کوشش کرے تو اسے اکھاڑ نہیں پاتا۔ اول تو اس لئے کہ وہ خود بھی ضعیف ہو گیا ہے، دوسرے اس لئے کہ درخت زمین میں راسخ ہو چکا ہے۔ معلوم ہوا جس درخت کو تم نہروانی میں نہیں اکھاڑ سکے اسے بیچاپے میں بھی نہ اکھاڑ پاؤ گے۔ حقیقت یہ ہے کہ بیچاپے کی ریاضت ایک زبردست مشقت ہے چنانچہ مثالیں مشہور ہیں کہ کھرمٹوٹے نہیں پڑتے یا بیٹھریے کو تذبذب سکھانا مذہب مولیٰ لیتا ہے یا نرم شاخ جھک سکتی ہے۔ جب وہ سوکھ جاتی ہے تو اس کا موڑنا یا جھکانا مشکل ہو جاتا ہے۔

نفس کو کچھ اور قیمتی چیزیں : اے نفس! اگر تو یہ واضح امور نہیں سمجھ سکتا، اور ٹال مٹول کرنا اپنا شیوہ بناتا ہے تو خود کو دانشمند کیوں سمجھتا ہے بھلا اس سے بڑھ کر کیا حماقت ہوگی کہ روز روشن کی طرح واضح باتیں بھی نہ سمجھ پائے، شاید تو یہ بھی کہے کہ میں عمل صالح پر مواظبت اس لئے نہیں کر سکتا کہ مجھے لذت شہوت کی حرص ہے، اور تکلیفوں اور مشقتوں پر صبر کرنا میرے لئے نہایت دشوار ہے، تیرا یہ قول بھی نہایت احمقانہ ہے، اگر تجھے لذت و شہوات کی حرص ہے تو وہ لذتیں اور شہوتیں کیوں تلاش نہیں کرتا جو ہمیشہ پیش رہنے والی ہیں، اور ہر طرح کی کمزوریوں سے صاف ہیں، مگر یہ شہوتیں جنس میں ملتی ہیں، دنیا میں نہیں ملتیں، اور ان کے ملنے کی صورت یہ ہے کہ تو دنیا کی شہوات سے صرف نظر کرے، ورنہ یہاں اوقات ایک لمحے کی وجہ سے بہت سے تقویوں سے محروم رہنا پڑتا ہے، ہم تجھ سے پوچھتے ہیں کہ اگر کوئی حکیم کسی مریض سے یہ کہے کہ تین دن ٹھنڈا پانی مت پینا، اگر تم نے میری ہدایت کی خلاف ورزی کی تو تمام عمر ٹھنڈے پانی سے محروم رہو گے، اور اگر میری بات مان لی تو زندگی بھر ٹھنڈے پانی سے لطف لو گے، کیونکہ تین دن کے دوران ٹھنڈے پانی کے استعمال سے ہمیں ایک سنگین مرض لاحق ہو جائے گا بھلا اس صورت میں حمل رکھنے والا مریض حکیم کی ہدایت پر عمل کرے گا یا ٹھکرا دے گا، ظاہر ہے حمل کا نقصان یہی ہے کہ وہ زندگی بھر کی لذت حاصل کرنے کے لئے تین دن کی لذت سے دستبردار ہو جائے، محض اس خوف سے حکیم کی ہدایت پر عمل نہ کرنا کہ تین دن تک صبر کرنا مشکل ہو جائے گا اور یہ کہ شہوت کے خلاف کرنے کی طاقت نہیں ہے، اگر دیکھا جائے تو اخروی زندگی کے مقابلے میں دنیوی زندگی کی مثال ایسی ہی ہے جیسے انسان کی تمام زندگی کے مقابلے میں تین دن بلکہ آخرت کی پیش جاودانی کے مقابلے میں دنیا کی حیات ٹپا انداز ان تین دن سے بھی زیادہ حقیر اور بے حقیقت ہے، خواہ آدمی کی عمر کتنی ہی طویل کیوں نہ ہو، کیوں کہ دنیا و آخرت کے مقابل میں محدود نسبت لامحدود کی طرف کی گئی ہے، ظاہر ہے دنیا محدود ہے، اور آخرت لامحدود، جبکہ آدمی کی عمر اور تین دن کے مقابل میں محدود کی نسبت محدود ہی کی طرف کی گئی ہے۔

اے نفس! تو شہوات اور لذات سے صبر نہیں کر سکتا، کیونکہ اس میں تکلیف ہے، ہم پوچھتے ہیں کیا شہوات سے رکنے کی تکلیف دوزخ کی دائمی لذت سے زیادہ ہے؟ جو محض مجاہدہ کی تکلیف برداشت نہیں کر سکتا وہ جنم کی تکلیف کیسے برداشت کر سکتا ہے، ہمارا خیال تو یہ ہے کہ حیرانجامدے سے امراض کرنا اور اپنے آپ کو سختی نہ کرنا دو حال سے خالی نہیں ہے، یا تو اس کی وجہ وہ کفر ہے جو تو نے اپنے اندر مخفی رکھا ہے، یا وہ حماقت ہے جو بالکل واضح ہے، کفر غرضی تو یہ ہے کہ یوم حساب پر تیرا ایمان کنور ہے،

اور تو ثواب و عتاب کی مقدار کی صحیح معرفت نہیں رکھتا اور واضح حماقت یہ ہے کہ تو اللہ کے کرم اور اس کے فضل و مغفرت پر احمق
رکھتا ہے، لیکن اس پر یقین نہیں رکھتا کہ وہ اپنے بعض بندوں کو نافرمانی کے باعث فوری سزا نہیں دیتا بلکہ انہیں ڈھیل دیتا ہے اور
نہ تجھے اس کا یقین ہے کہ وہ تیری عبادت سے بے نیاز ہے، پھر تجھے اللہ کے عفو و کرم پر تو بھروسہ ہے لیکن روٹی کے ایک ٹوالے میں
یا سم و زر کے حقیر ٹکڑے میں یا حلقوں سے کوئی کلمہ سننے میں اس پر احمق نہیں ہے، بلکہ اگلی حصول کے لئے ہزار چیلے بنائے کرتا
ہے اور اپنی تمام تر تدبیریں بھولے کار لاتا ہے، اسی جمالت کی بناء پر تجھے دہر بار نبوت سے احمق کا خطاب ملا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ
وسلم کا ارشاد ہے :-

الْكَيْسُ مَنْ كَلَنَ نَفْسَهُ وَعَمِلَ لِمَا بَعْدَ الْمَوْتِ وَالْأَحْمَقُ مَنْ اتَّبَعَ نَفْسَهُ هَوَاهَا وَ
تَمَنَّى عَلَى اللَّهِ أَلَّا مَانِيَّ -

محفل مندوہ ہے جس کا نفس مطیع ہو اور جو موت کے بعد کی زندگی کے لئے عمل کرے اور احمق وہ ہے
کہ اپنے نفس کو اس کی خواہشوں کا تابع کر دے اور اللہ تعالیٰ سے امیدیں رکھیں۔

اے بد بخت نفس! تجھے دنیا کی زندگی سے دھوکا نہ کھانا چاہیے اور نہ اللہ تعالیٰ سے کسی چیز میں غلط فہمی کا شکار ہونا چاہیے، بلکہ
تو اپنی فکر خود کر، تجھے کسی دوسرے سے کوئی مطلب نہ ہونا چاہیے اور نہ کسی دوسرے کے لئے تیری ذات اہم ہو سکتی ہے، اپنے
اوقات ضائع مت کر، سالہاں بہت محدود ہیں، تیرے ایک سال کے ساتھ تجھ میں کی واقع ہو جاتی ہے، تیاری سے پہلے صحت کو،
مصروفیت سے پہلے فراغت کو، تنگدستی سے پہلے مالداری کو، بھلاپے سے پہلے جوانی کو اور موت سے پہلے زندگی کو قیمت سمجھ اور
آخرت کی اسی قدر تیاری کر جس قدر تجھے وہاں رہنا ہے، کیا تو دنیا میں دنیا کے لئے تیاری نہیں کرتا، چنانچہ تو سردی کے لئے اسی قدر
تیاری کرتا ہے جس قدر وہ ہوتی ہے یا جتنی مدت کے لئے ہوتی ہے، اس موسم کے لئے غذا، لباس اور لنگڑیاں اور دوسرے اسباب
جمع کرتا ہے، اور اس باب میں اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم پر بھروسہ نہیں کرتا کہ وہ تیری سردی، جیوں اور اونچی کپڑوں اور لنگڑیوں کے
بغیر دور کر دے، حالانکہ وہ اس پر قادر ہے، کیا تو سمجھتا ہے کہ جنم کے طبقہ دھرم میں سردی کم ہوگی یا اس کی مدت دنیا کے موسم
سرا سے کم ہوگی یا حیرا خیال یہ ہے کہ وہاں کی سردی سے تحفظ کے لئے کسی تدبیر کی ضرورت نہیں ہے، جس طرح دنیا کی سردی
جیوں اور آگ کی حرارت کے بغیر زائل نہیں ہوتی، اسی طرح دوزخ کی حرارت و بھڑکت سے بھی توحید کے قلعے اور طاعات کی
تندروں کے بغیر بچنا ہے حد مشکل ہے، یہ تو اللہ کا کرم ہے کہ اس نے حفاظت کا طریقہ سکھلادیا ہے، اور وہ تمام اسباب حیرے لئے
سل کر دیئے ہیں جن کے ذریعے تو عذاب سے نجات حاصل کر سکتا ہے، جس طرح اس نے دنیا کی سردی سے بچنے کا طریقہ بتلادیا ہے
کہ آگ پیدا کی، اور لوہے یا پتھر وغیرہ سے آگ ٹکانے کی تدبیر سکھلائی تاکہ تو اس سے اپنی سردی دور کر سکے، جس طرح جیوں کی
فراہمی، اور لنگڑیاں وغیرہ جمع کرنا اللہ کا کام نہیں، بلکہ یہ چیزیں تیری راحت و آسائش کے لئے اس نے پیدا کر دی ہیں اور ان کے
حاصل کرنے کا طریقہ بھی بتلادیا ہے اسی طرح آخرت میں راحت پانے کے لئے مجاہدات اور طاعات سے بھی بے نیاز ہے، اس نے ان
مجاہدات کا طریقہ بھی بتلادیا ہے اب تو ان پر کار بند ہوتا ہے یا نہیں اللہ اس سے بے پروا ہے۔ ہوا چمکا کرے گا اپنے نفس کے لئے
کرے گا، اور جو برا کرے گا وہ خود اس کی سزا پہنچے گا، اللہ تمام مخلوق سے مستغنی ہے۔

اے نفس! اپنی جمالت سے باز آ، اور اپنی آخرت پر قیاس کر، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :-

مَا خَلَقَكُمْ مَوْلَا يَعْزُبُ عَنْكُمْ الْإِغْفَابُ وَاحِدَةً (پ ۲۸ آیت ۲۸)

تم سب کا پیدا کرنا اور زندہ کرنا بھی ایسا ہی ہے جیسے ایک شخص کا۔

كَمَا بَدَأْنَا أَوَّلَ خَلْقٍ نُعِيدُهُمْ (پ ۷۷ آیت ۱۳)

ہم نے جس طرح اول بار پیدا کئے کے وقت (ہر چیز کی) ابتدا کی تھی اسی طرح اس کو دوبارہ پیدا کر دینگے۔

كَمَا بَدَأْنَاكُمْ نَعْمُوْنُ (پ ۸۰ آیت ۲۹)

جس طرح تم کو اللہ تعالیٰ نے شروع میں پیدا کیا تھا اسی طرح پھر تم دوبارہ پیدا ہو گے۔

اللہ تعالیٰ کی سنت میں تبدیلی نہیں ہوتی، اے نفس! میں تجھے دنیا کی محبت میں گرفتار، اور اس سے مانوس پاتا ہوں، تیرا حال یہ ہے کہ تو اس سے جدائی اختیار نہیں کر سکتا، بلکہ دن بدن اس کے قریب ہوتا جا رہا ہے، اور اپنے نفس میں اس کی محبت راسخ کر رہا ہے، میرے خیال سے تو اللہ کے طاب و ثواب، اور قیامت کے احوال و احوال سے غافل ہے، اور نہ تجھے موت کا یقین ہے جو تیرے اور تیری محبوب اور پیغمبرہ چیزوں کے درمیان تفریق کرنے والی ہے، تیرے نزدیک وہ شخص محل مند کھلانے کا مستحق ہے یا الحق جسے قعر شاہی میں ایک دروازے سے جانا ہو اور دوسرے سے نکلتا، اور وہ محل کی کسی خوبصورت چیز پر فریفتہ ہو جائے، حالانکہ وہ اسے ملنے والی نہیں ہے، بلکہ بہت جلد جدا ہو جانے والی ہے، دنیا بھی ملک الملوک کا گھر ہے، تیری حیثیت اس گھر میں محض گزرنے والے کی سی ہے، تو مسافر ہے، تجھے اپنی منزل پر پہنچنے کا خیال رکھنا چاہیے، نہ کہ ان چیزوں سے دل لگانا چاہیے جو اس رہ گزر میں ہیں، اور پھر ساتھ محل تک نہیں جائیں گے، تو محل پر پہنچ جائے گا، اور یہ چیزیں راستے میں تیرا ساتھ چھوڑ دیں گی، سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے نہ

لَنْ رَوْحُ الْفَنَنِسِ نَفَتْ فِي رَوْعِي أَحِبَّ مَا أَحْبَبْتَ فَإِنَّكَ مَقَارِقُهُ وَاعْمَلْ مَا شِئْتَ
فَإِنَّكَ مَجْرِي دَمٍ وَعِشْ مَا شِئْتَ فَإِنَّكَ مَجْرِي دَمٍ

روح القدس (جبریل) نے میرے دل میں یہ بات القاء کی ہے کہ آپ جس چیز سے چاہے محبت کر لیں اس

سے جدا ضرور ہوں گے، اور جو چاہیں عمل کریں اس کی جزا ضرور ملے گی، اور ممتنا چاہے جنیں مرنا ضرور ہے۔

اے نفس! کیا تو یہ نہیں جانتا کہ جو شخص دنیا سے مانوس، اور اس کی طرف ملحق رہتا ہے اور یہ جاننے کے باوجود کہ موت اس کے تعاقب میں ہے، دنیاوی لذات میں مستغرق رہتا ہے وہ جب دنیا سے جدا ہوتا ہے تو حسرتیں سمیٹ کر لے جاتا ہے، اور زہر ہلاک کو زور اہنا کر لے جاتا ہے، اور اسے اس کا احساس بھی نہیں ہوتا کہ وہ کیا لے جا رہا ہے، کیا تجھے جانے والے یاد نہیں رہے، انہوں نے کتنے اونچے مالیشان محل بنائے، اور رخصت ہو گئے، اور گوشہ گماہی میں جا بسوئے، اور اللہ تعالیٰ نے ان کی زمین، ان کے گھر بار اور مال و متاع دشمنوں کو دے دیا، کیا تو نہیں دیکھتا کہ لوگ وہ مال کس طرح جمع کرتے ہیں جسے استعمال نہیں کپاتے، اور وہ مکانات کس طرح تعمیر کرتے ہیں جن میں وہ نہیں پاتے، اور ان چیزوں کی کس طرح آرزو کرتے ہیں جنہیں حاصل نہیں کپاتے، آدمی آسمان سے ہاتھیں کرتا ہوا محل بناتا ہے اور زمین کے ایک ٹک و تاریک کڑے میں جا کر سو جاتا ہے، کیا دنیا میں اس سے بڑی بھی کوئی حماقت ہو سکتی ہے کہ ایک شخص اس دنیا کو آباد کرتا ہے جس سے یقینی طور پر جدا ہونا ہے، اور اس آخرت کو تباہ و برباد کرتا ہے جو مستقل ٹھکانہ بننے والی ہے، اے نفس! کیا تجھے شرم نہیں آتی کہ تو ان بے وقوفوں کی مدد کرتا ہے، یہ بات تسلیم ہے کہ تو صاحب بصیرت نہیں ہے، اور نہ تیرے اندر اس کی اہلیت ہے کہ تو خود کسی راستے کا تعین کر سکے اور اس پر چل سکے، اس لئے تو اپنی طبیعت سے مجبور ہو کر کسی شخص کی طرف مائل ہوتا ہے، اور افضل میں اس کی اقتدا کرتا ہے، اگر تجھے اقتدا کرنی ہے تو ان بے وقوفوں کی کیوں کرتا ہے، انبیاء، علماء اور حکماء کو اپنا مقتدی کیوں نہیں کرتا، جو عقل و دانش اور علم و حکمت میں بہت آگے ہیں، اگر تجھے عقل اور ذہانت پسند ہے تو تجھے ان لوگوں کی اقتدا کرنی چاہیے مگر تیرا حال عجیب ہے، اور تیری جمالت سخت ہے، اور تو اعتدالی سرکش اور متروک ہے، اسی لئے تو ان واضح امور سے اعراض کرتا ہے، ہو سکتا ہے جاہ کی محبت نے تیری آنکھوں پر پردہ ڈال دیا ہو، یا خواہشات کی محبت نے تیری عقل سلب کر لی ہو، جاہ کے معنی اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ لوگوں کے قلوب تیری طرف مائل ہوں، لیکن تجھے سوچنا چاہیے کہ اگر روئے زمین کے تمام افراد تجھے سجدہ کریں، اور تیری اطاعت کرنے لگیں تو نہ یہ سجدہ ابدی ہو سکتے ہیں اور نہ اطاعت، پچاس سو برس کے بعد نہ تو اس زمین پر باقی رہے گا، اور نہ وہ لوگ جنہوں نے تجھے سجدہ کیا ہے یا تیری اطاعت کی ہے، اور ایک زمانہ وہ آئے گا کہ دنیا میں کوئی شخص تجھے یاد کرنے والا یا نام لینے والا باقی نہیں رہے گا، تجھ سے پہلے بہت سے زبردست بادشاہ اور مطلق العنان حکمران اس دور سے گزر چکے ہیں، قرآن نے ایسے ہی لوگوں کے بارے میں یہ سوال کیا ہے نہ

فَهَلْ نَجِسُ مِنْهُمْ مَنْ أَحْيَلُوْا نَسَمَ لَھُمْ كَرَلًا (پہلے ۹۸ آیت)

آپ ان میں سے کسی کو دیکھتے ہیں یا آہستہ آواز سنتے ہیں۔

جو چیز پیشہ رہنے والی ہے تو اسے اس چیز کے عوض کیوں فروخت کرنا ہے جو سوچا جس برس سے زیادہ باقی نہیں رہ سکتی اور پھر جاہ کی محبت بھی ایسے شخص کو ”زین“ دیتی ہے جو مشرق و مغرب کا بادشاہ ہو اور بے شمار گد میں اس کے سامنے خم ہوتی ہوں اور تمام دنیاوی لوازم اس کے پاس ہوں، لیکن تجھ جیسا شخص جس کی بد بختی اور فقارت کا عالم یہ ہے کہ ایک محلے بلکہ ایک گھر کے رہنے والے بھی اسے اپنا امیر تسلیم نہ کریں، کیا ایسے شخص کے لئے جاہ کی محبت مناسب ہے۔ پھر تو اگر آخرت کی رغبت کے لئے اپنے جہل کے باعث دنیا نہیں چھوڑ سکتا تو یہی سمجھ کر چھوڑ دے کہ دنیا کے شریک نہیں ہوتے ہیں اور اس میں مصائب و آلام کی کثرت ہے اور اس کی ہر چیز بہت جلد فنا ہونے والی ہے، تجھے بہت کم دنیا حاصل ہے، ہم پوچھتے ہیں کہ جب تجھے بہت سی دنیا ملے چھوڑ رکھا ہے تو اس تھوڑی سی دنیا کو بھی کیوں نہیں چھوڑتا جو تجھے حاصل ہے، پھر اگر تجھے دنیا حاصل بھی ہے تو اس میں غمی کی کیا بات ہے، غیر یہی شرمیں بہت سے یہودی اور مجوسی ایسے ہوں گے جو مال و زر میں تجھ سے آگے ہوں گے اور جنہیں دنیا کی نعمتیں اور لذتیں تجھ سے زیادہ میسر ہوں گی، لعنت ہو ایسی دنیا پر جس میں یہ نہیں اور کمین تجھ سے آگے ہوں تو بڑا جاہل، انتہائی بد بخت، غییس اور کم حوصلہ ہے، اسی لئے انبیاء، صدیقین اور مقربین پیشہ پیشہ کے لئے رب العالمین کے جواریں رہیں گے اور یہ بد باطن لوگ جہنم کے نچلے طبقے میں ٹھکانہ پائیں گے، افسوس صد افسوس نہ تجھے دین حاصل ہے اور نہ دنیا۔

اے نفس! موت قریب ہے، ذرا سہت کر، ڈرانے والا آچکا ہے، جو کرنا ہے کر لے، اب بھی عمل کے چند لمحے باقی ہیں پھر وقت نہیں ملے گا، موت کے بعد عمل کی فرصت نہ ہوگی، نہ حیرے بعد کوئی حیرتی طرف سے نماز پڑھنے والا ہوگا اور نہ روزہ رکھنے والا، نہ کوئی ایسا شخص جو تجھ سے اللہ تعالیٰ کو راضی کر سکے حیرتی زندگی کے چند روز باقی نہ گئے ہیں، یہی حیرا سراپا ہیں، بشرطیکہ تو انہیں سراپا سمجھے، اور ان میں تجارت کرے، زندگی کا اکثر سراپا تو نے پہلے ہی برباد کر دیا ہے، اگر تو اس ضائع شدہ سرمائے پر تمام عمر بھی مصائب بھی اپنے نقصان کی طافی نہ کر سکے گا، بھلا اس صورت میں کیسے طافی کر سکتا ہے جبکہ باقی عمر بھی ضائع ہو جائے گی۔

اے نفس! موت حیرے وعدے کی جگہ ہے، قبر حیرا گھر ہے، مٹی حیرا بستر ہے، اور زہد دست خوف حیرے سامنے ہے، کیا تو نہیں جانتا کہ مردوں کی فوج شہر کے باہر حیرتی منتظر ہے، ان سب نے ایمان، مظلہ کی قسمیں کھائی ہیں کہ وہ اس وقت تک اپنی جگہ سے نہیں اٹھیں گے جب تک تجھے اپنے ساتھ نہیں لے لیں گے، تجھے معلوم نہیں کہ ان منتظرین میں سے ہر شخص کی تمنا یہ ہے کہ وہ ایک روز ہی کے لئے گنج دنیا میں واپس جائے اور جو نقصان ماضی میں ہو چکا ہے اس کی طافی کر لے، تجھے تنہا کرنے کی ضرورت نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے یہ موقع تجھے دے رکھا ہے اور تو آسانی سے گزشتہ کی طافی کر سکتا ہے، حیرے پاس ایک قیمتی دن ہے اگر تو اسے ان مردہ لوگوں کے ہاتھ فروخت کرنا چاہے تو وہ اپنا کل سراپا تجھے سوچنے کے لئے تیار ہو جائیں، بشرطیکہ وہ اس پر گور ہوں تو اپنے شب و روز غفلت اور بے کاری میں ضائع کر رہا ہے، کم بخت نفس! تجھے شرم نہیں آتی کہ تو مخلوق کے لئے اپنے نفس کو آراستہ کر رہا ہے، اور باطن میں گناہوں کا ارتکاب کر کے خالق کائنات سے برسرِ پیکار ہے، کیا تو مخلوق سے شرماتا ہے، خالق سے نہیں شرماتا، کیا وہ تجھے اتنا بھی نہیں دیکھتا جتنا مخلوق دیکھتی ہے، تو لوگوں کو خیر اور تقویٰ کا حکم دیتا ہے، اور خود رذائل میں لٹوٹ ہے، لوگوں کو اللہ کی طرف بلاتا ہے، اور خود اس سے دور بھاگتا ہے، لوگوں کو اللہ کے ذکر کی تلقین کرتا ہے اور خود اسے بھولے ہوئے ہے، تجھے یہ بات معلوم ہونی چاہیے کہ گناہ گار یا باخانی سے بھی زیادہ بدو دار ہے، کیا باخانی سے کوئی چیز پاک ہو سکتی ہے؟ ظاہر ہے نہیں، پھر تو کیوں دوسروں کو پاک کرنا چاہتا ہے، حالانکہ خود ٹپاک ہے، اگر تجھے اپنی گنج معرفت حاصل ہو جائے تو یہ بات اچھی طرح جان لے کہ لوگوں پر نازل ہونے والی تمام مصائب تیری وجہ سے ہیں، تو نے اپنے آپ کو ابلیس کا گدھا بنا لیا ہے، وہ تجھے جہاں چاہتا ہے لے جاتا ہے، اور جس طرح چاہتا ہے تجھے بھگا دیتا ہے، ان تمام باتوں کے باوجود تجھے اپنے اعمال پر ناز ہے، حالانکہ وہ آفتوں سے لبریز ہیں، اگر تو ان سے بچا رہے تو یہ ممکن ہے کہ حیرے اعمال سلامت نہ جائیں، اور نجات کا ذریعہ نہیں مگر تجھے اپنی خطاؤں اور گناہوں کے

باوجود اپنے عمل کا فروغ کیا تو یہ نہیں جانتا کہ شیطان نے دو لاکھ برس تک اللہ تعالیٰ کی عبادت کی، مگر صرف ایک خطائے اسے ملحق بنادیا حضرت آدم علیہ السلام کو صرف ایک قلعی کے باعث جنت سے نکلے کا حکم ملا، حالانکہ وہ اللہ کے حبیب اور نبی تھے، اے نفس! تو کتنا فریبی ہے، تو کس قدر بے شرم ہے، تو کتنا بد جاہل ہے، اپنے انجام سے بے خبر ہے، اور معاصی پر کس قدر جری ہے، تو کب تک معاملہ کر کے بگاڑے گا، اور کب تک حمد یعنی کامرکب رہے گا۔

اے نفس! کیا تو ان خلاصوں کے ساتھ دنیا آباد کرنا چاہتا ہے، گویا تجھے یہاں سے رخصت ہی نہیں ہونا، کیا تو قبر والوں کی طرف نہیں دیکھتا، انہوں نے کتنا مال جمع کیا تھا، اور اس کے ذریعے کتنے اونچے اونچے محل بنوائے تھے، اور دنیا سے کیا کچھ امیدیں رکھی تھیں، کیا تو ان سے عبرت حاصل نہیں کر سکتا، کیا تو یہ سمجھتا ہے کہ وہ لوگ آخرت میں طلب کر لئے گئے، اور تو اب تک بیٹیں رہنے والا ہے، حیرا خیال کتنا ناقص، اور حیرا فہم کس قدر افسوسناک ہے، تو جب سے اپنی ماں کے پیٹ سے باہر آیا ہے اپنی عمر کی دیوار ڈھاتا جا رہا ہے، اور زمین پر اپنے مکان کی دیواریں بلند کر رہا ہے، حالانکہ بہت جلد زمین تجھے اپنے پیٹ میں رکھنے والی ہے، کیا تجھے اس وقت سے خوف نہیں آتا جب سانس گلے میں آجائے گا، اور پروردگار کے قہر سے اپنے سیاہ اور خوفناک چہروں کے ساتھ عذاب الیم کی بشارت لے کر حیرے پاس پہنچیں گے، کیا اس وقت تجھے بد امت سے کوئی فائدہ ہوگا، یا حیرا فہم قبول کیا جائے گا، یا حیرے رونے پر رحم کیا جائے گا، تعجب کی بات یہ ہے کہ تو ان تمام باتوں کے باوجود بصیرت اور ذہانت کا مدعی ہے، حیرا ذہانت کا عالم یہ ہے کہ تو ہر آنے والے دن میں مالی کی زیادتی پر خوش ہوتا ہے، اور عمر کے نقصان پر غم نہیں کرتا، بھلا اس سے کیا فائدہ کہ مال بڑھے اور عمر کم ہو، اے نفس! تو آخرت سے اعراض کرتا ہے، حالانکہ وہ بہت جلد آنے والی ہے، اور دنیا کی طرف مقلقت ہے جبکہ وہ بہت جلد تجھ سے پیچھے موڑنے والی ہے، کتنے ہی لوگ ایسے ہیں جو بے دن کا استقبال کرتے ہیں لیکن اسے مکمل نہیں کہاتے، اور کتنے ہی ایسے ہیں جو کل کی امید رکھتے ہیں لیکن کل تک نہیں پہنچ پاتے، تو رات دن اپنے بھائیوں، رشتہ داروں، اور پرہیزیوں میں اس کا مشاہدہ کرتا ہے، تو موت کے وقت ان کی حسرت دیکھتا ہے، مگر اس سے عبرت نہیں لےتا، اور نہ اپنی جمالت سے باز آتا ہے، اے نفس! اس دن سے ڈر، جس دن کے بارے میں اللہ نے یہ قسم کھائی ہے کہ میں اپنے ان بے عملوں کا جنہیں اموغی کی گئی ہے حساب لوں گا، اور ان کے اعمال کا مواخذہ کروں گا، خواہ وہ جلی ہوں، یا غلی، پوشیدہ ہوں یا ظاہر۔ اے نفس! ذرا سوچ تو کس جسم کے ساتھ اللہ رب العزت کے دربار میں کھڑا ہوگا، اور کس زبان سے اس کے سوالوں کا جواب دے گا، ذرا سوالات کے جواب کی تیاری کر لے، اور درست جواب ڈھونڈ لے، اور اپنی باقی زندگی کے مختصر دنوں میں طویل دنوں کے لئے دارقانی میں دارمقامہ کے لئے، اور دار حزن و غم میں دار فہم کے لئے عمل کر، عمل کر کہ پھر عمل کا موقع نہ ہوگا، دنیا سے شرفاء کی طرح اپنے اختیار سے نکلنے کے لئے تیار رہ، اس سے پہلے کہ تجھے زہدستی نکالا جائے، دنیا کی فتنوں، اور مسرتوں پر نازاں نہ ہو، اس لئے کہ اکثر خوش ہونے والے نقصان اٹھاتے ہیں اور اکثر نقصان اٹھانے والوں کو اس کا اندازہ نہیں ہوتا کہ وہ نقصان اٹھانے والے ہیں۔ غرابی ہو اس شخص کے لئے جس کے لئے غرابی ہے، اور اسے خبر نہیں، وہ اپنے حال میں مست بہتا ہے، خوش ہوتا ہے، کھیل کود کرتا ہے، اتراتا ہے، اٹھاتا ہے، کھاتا ہے اور پیتا ہے، حالانکہ کتاب اللہ میں اس کے حلقے یہ فیصلہ ہو چکا ہے کہ وہ جہنم کا اہل حق ہے۔

اے نفس! دنیا کو عبرت کی نظر سے دیکھ کر جمالت مجبوری حاصل کر، اختیار سے ٹھکرا، اور آخرت کی طرف سبقت کر، ان لوگوں میں سے مت ہو جو حلالے خداوندی کا شکر ادا کرنے کے بجائے زیادہ کی ہوس رکھتے ہیں، لوگوں کو برائی سے روکتے ہیں اور خود نہیں رکتے، یہ بات جان لے کہ دین کا کوئی عوض نہیں ہے، اور نہ ایمان کا کوئی بدلہ ہے، اور نہ کوئی چیز جسم کے قائم مقام بن سکتی ہے، جو شخص رات دن کے گھوڑے پر سوار ہے وہ حیل کی طرف دواں دواں ہے، اگرچہ وہ سفر نہ کرنا چاہے، مگر اسے حیل پر پہنچنا ہے، خواہ وہ اس پر راضی ہو یا نہ ہو۔

اے نفس! تو میری یہ نصیحت قبول کر اور اس پر عمل کر، جو شخص نصیحت سے اعراض کرتا ہے وہ گویا آگ پر راضی ہوتا ہے، میں نہیں سمجھتا کہ تو آگ پر راضی ہونے والوں میں سے ہے، یا نصیحت قبول کرنے والوں میں سے، اگر قلب کی قساوت تجھے و معذو

صحت سننے سے روکتی ہے تو قیام لیل سے مدد لے، اگر یہ تدبیر بھی کارگر نہ ہو تو دونوں کا التزام کر، اس سے بھی نفع نہ ہو تو کم آمیزی اور کم گوئی کو اپنا شیوہ بنا، یہ صورت بھی نفع نہ دے تو صلہ رحمی کر، چھپوں کے ساتھ نرمی اور محبت کا معاملہ کر، اس سے بھی کام نہ بنے تو یہ سمجھ لے کہ اللہ تعالیٰ نے حیرے دل پر مرگادی ہے، اور اس کے ظاہر و باطن پر گناہوں کی سیاهی چھا چکی ہے، اب نور کی کرن اندر نہیں پہنچ سکتی، تب تو دوزخ کے راستے پر چل، اللہ نے جنت پیدا کی ہے اور اس کے اہل بھی پیدا کئے ہیں، دوزخ پیدا کی ہے اور اس کے اہل بھی پیدا کئے ہیں، ہر شخص کے لئے وہی راہ سل کر دی گئی ہے جس کے لئے وہ پیدا کیا گیا ہے، تجھ میں وعظ و نصیحت قبول کرنے کی صلاحیت نہیں رہی، اب تجھے مایوس ہو جانا چاہیے، اور مایوسی کبیرہ گناہ ہے، پھر کیا کرے، نہ مایوس ہو سکتا ہے، اور نہ خیر کی راہیں مسدود ہونے کی بنا پر امید ہی کر سکتا ہے، اگر تو رجاء کرے گا بھی تو دھوکا ہوگا، فریب اور مغلطہ ہوگا۔

اے نفس! جس مصیبت میں توجھلا ہے اس پر تجھے صدمہ ہے یا نہیں، یا اپنے آپ پر ترس کھا کر آنکھ سے کوئی آنسو بہاتا ہے یا نہیں، اگر آنکھ سے آنسو بہتا ہے تو یہ سمجھ کہ آنسوؤں کا فاضل بحر رحمت سے ہے، اور حیرے اندر رجاء کی گنجائش ہے، اس لئے گریہ و زاری کا التزام کر، ارحم الراحمین سے رحم کی بجائے مانگ، اکرم الاکرمین سے شکایت کر، پھر نہ اس آہ و زاری سے الٹا نہ ٹھکرو، شکایتوں سے طول ہو، بلکہ اسے اپنا معمول بنالے، شاید اسے حیرے ضعف پر، حیرے بے بسی اور بے کسی پر رحم آجائے، اور وہ حیرے مدد کر دے، کیونکہ حیرے مصیبت شدید ہو چکی ہے، حیرے سرکشی حد سے تجاوز کر چکی ہے، اب نہ کوئی تدبیر تجھے اس مصیبت عظمیٰ سے بچا سکتی ہے اور نہ کوئی حیلہ نجات دے سکتا ہے، حیرے لئے اگر کوئی ٹھکانہ ہے تو صرف اللہ کا ٹھکانہ ہے، اگر نجات کا کوئی راستہ ہے تو وہ اللہ تک جاتا ہے، وہی تیرا ملا دواؤں ہے، وہی حیرے معصوم برادری کر سکتا ہے، وہی حیرے فریاد رسی کر سکتا ہے، اسی کے سامنے سرگوں کر، اسی سے مجبور و نیاز اور خضوع و منسوج کر، جتنی زیادہ حیرے جہالت ہے، اور جس قدر حیرے محاسنی ہیں اسی قدر اس کے سامنے تقضیع کر، اس لئے کہ تقضیع کہنے والے اور اپنے آپ کو اس کے سامنے ذلیل کرنے والے پر رحم کرتا ہے وہ مدد کی بجائے مانگنے والے کی مدد کرتا ہے، وہ مجبور و مضطر کی دعا قبول کرتا ہے، آج تو اسی کی طرف مضطر ہے، اور اسی رحمت کا حجاج ہے، باقی تمام راستے مسدود اور تمام راہیں تنگ ہیں، تدبیریں بیکار ہو چکی ہیں، وعظ و نصیحت سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا، زجر و توبیخ تجھ پر اثر انداز نہیں ہوتی، تو جس سے مانگتا ہے وہ کریم ہے، جس کے سامنے دست سوال دراز کرتا ہے، وہ بخشنے والا ہے، جس سے مدد چاہتا ہے وہ رحم کرنے والا ہے، اس کی رحمت لامحدود و سبقتوں کی حامل ہے، اس کا کریم لامتناہی ہے، اس کا مظلوم ہے، اب تو اپنے دونوں ہاتھ پھیلا اور یہ عرض کر: **يَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ! يَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ! يَا اَعْظَمَ عَظِيْمٍ! يَا اَكْبَرَ اَكْبَرٍ! يَا اَكْبَرَ اَكْبَرٍ! يَا اَكْبَرَ اَكْبَرٍ!** حیرے سرکشی حد سے بڑھ چکی ہے، میں بے شرمی کی حد تک گناہوں پر جری ہوں، اے اللہ! میں ہر طرف سے مایوس ہو کر حیرے بارگاہ میں انتہائی تقضیع اور مسکنت، ذلت و حقارت اور عاجزی کے ساتھ، اپنے ضعف، کمزوری، بے کسی اور بے بسی کا اعتراف کرتے ہوئے حاضر ہوں، میری مدد کرنے میں جلدی کر، میری مشقت دور فرما، مجھے اپنی رحمت کے آثار دکھلا، مجھے اپنے محمود مغفرت کا جام پلا، مجھے اپنی حفاظت کی قوت نصیب کر۔ اے نفس! آہ و زاری کرنے میں اور اپنی ندامت کے اظہار میں اپنے باپ حضرت آدم علیہ السلام کی تقلید کر، حضرت وہب ابن منبہ کہتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو جنت سے زمین پر اتارا، تو کئی روز تک ان کے آنسو نہ رکے، ساتویں دن اللہ تعالیٰ نے ان پر رحم کیا، اور جس وقت وہ انتہائی حزن و ملال اور اضطراب کی کیفیت سے دوچار سر جھکائے بیٹھے تھے تو اللہ تعالیٰ نے ان پر وحی نازل فرمائی کہ اے آدم! یہ تم نے اپنا کیا حال بنالیا ہے، عرض کیا یا اللہ! میری مصیبت بڑھ گئی ہے، خطاؤں نے مجھے گھیر لیا ہے، اپنے رب کے ملکوت سے نکالا گیا ہوں، عزت کے گھر سے ذلت کے گھر میں آ گیا ہوں، سعادت کے بعد شقاوت ملی ہے، راحت کے بعد غم اٹھانا پڑا ہے، غایت کے بعد مصیبت کے گھر میں آیا ہوں، دار قرار سے دار ناپائیدار میں ڈالا گیا ہوں، غلوط و ہٹا کے عالم سے موت اور فنا کے عالم میں پہنچا ہوں، اپنی غلطی پر کیسے نہ روؤں یہ سب اسی غلطی کی وجہ سے ہوا، اللہ تعالیٰ نے وحی نازل فرمائی کہ اے آدم! کیا میں نے تجھے اپنے لئے منتخب نہیں کیا تھا، کیا میں نے تجھے اپنے گھر میں نہیں اتارا تھا، کیا میں نے تجھے اپنی کرامت کے ساتھ مخصوص نہیں کیا تھا، اور اپنے غضب سے نہیں ڈرایا تھا، کیا میں نے تجھے

یہ ہے باری تعالیٰ سے مناجات اور اپنے نفوس کی معایت کا وہ طریقہ جس پر بزرگانِ سلف کا رہنما تھا۔ مناجات سے ان کا مقصد یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کو راضی کریں اور معایت سے ان کا مقصد تنبیہ اور نفس کی رعایت تھا جو فیض مناجات اور معایت سے غفلت کرتا ہے وہ اپنے نفس کی رعایت کرنے والا نہیں ہے اور قہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی بھی اس پر عیاں ہو جائے گی۔

كتاب التفكير

فکرو تدبیر کے بیان میں

حدیث شریف میں ہے کہ ایک ساعت غور و فکر کرنا سال بھر کی عبادت سے افضل ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں غور و فکر اور نظروں اعتبار پر کثرت سے زور دیا ہے، واضح ہو کہ فکر انوار کی کچی ہے، اور بصیرت کا مبداء ہے، وہ علوم کا جال، اور معارف و معانی اور مطالب کے شکار کا ذریعہ ہے، عام طور پر لوگ اس کے فعل اور مرتبے سے واقف ہیں لیکن اس کی حقیقت، ثمرے، مصدر، منع، طریقے اور کیفیت سے واقف نہیں ہیں، یعنی یہ نہیں جانتے کہ فکر کیسے کرتے ہیں، کس امر میں کرتے ہیں، کیوں کرتے ہیں، اور فکر کس لئے مطلوب ہوتا ہے، آیا وہ بذات خود مطلوب ہے، یا کسی ثمرے کے لئے مقصود ہے، اگر وہ ثمرے کے لئے ہے تو وہ نموا کیا ہے، علوم ہیں یا احوال، یا دونوں۔ ان تمام حقائق کو واضح کرنا ایک امر مهم ہے، ہم پہلے فکر کی فضیلت بیان کرتے ہیں، پھر فکر کی حقیقت بیان کریں گے، اس کے بعد اس کے ثمرات پر تفصیل کریں گے، پھر ان امور پر روشنی ڈالیں گے جن میں فکر کیا جانا تفکر کی فضیلت : اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب عظیم میں بے شمار مواقع پر غور و فکر کا حکم دیا ہے، اور فکر کرنے والوں کی

تشریف کی ہے چنانچہ ارشاد ہے :-
 الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللَّهَ قِيَامًا وَقُعُودًا وَعَلَىٰ جُنُوبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ
 السَّمُوتِ وَالْأَرْضِ رِثْنًا مَّا خَلَقْتَ هَذَا بَابًا مُّطْلَقًا (پ ۱۳ ر ۱۱ آیت ۱۹)

جن کی حالت یہ ہے کہ وہ لوگ اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں کھڑے بھی، بیٹھے بھی، لیٹے بھی اور آسمانوں اور
 زمین کے پیدا ہونے میں غور کرتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار آپ نے اس کو لایتنی پیدا نہیں کیا۔

حضرت عبد اللہ ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ کچھ لوگ اللہ تعالیٰ کے بارے میں غور و فکر کر رہے تھے آپ نے ان سے ارشاد فرمایا
 کہ اللہ تعالیٰ کی مخلوقات میں فکر کرو، اس لئے کہ تم اس کا صحیح اندازہ کرنے پر قادر نہیں ہو (ابو نعیم فی الحلیہ) روایت میں ہے کہ
 ایک دن سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم چند ایسے لوگوں کے پاس سے گزرے جو فکر کر رہے تھے، آپ نے ان سے دریافت فرمایا کیا
 بات ہے تم بول کیوں نہیں رہے ہو؟ انہوں نے عرض کیا ہم اللہ تعالیٰ کی مخلوقات میں فکر کر رہے ہیں، آپ نے ارشاد فرمایا ایسا ہی
 کرو، اس کی مخلوقات میں فکر کرو، اس میں فکر مت کرو، یہاں سے قریب ایک سفید زمین ہے جس کی سفیدی روشنی ہے، اور روشنی
 سفیدی ہے، اس کا فاصلہ مغرب کی طرف کو چالیس دن کا ہے اس کے ہاشمے کسی بھی وقت اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہیں کرتے،
 لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ شیطان ان سے کہاں رہتا ہے؟ آپ نے فرمایا وہ نہیں جانتے شیطان پیدا ابھی ہوا ہے یا نہیں، لوگوں
 نے کہا وہ لوگ حضرت آدم کی اولاد ہیں؟ آپ نے فرمایا وہ لوگ نہیں جانتے کہ آدم پیدا ابھی ہوئے ہیں یا نہیں۔ حضرت عطاء
 فرماتے ہیں کہ ایک دن میں اور حید ابن عبیدہؓ حضرت عائشہؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور ہم نے ان سے پردے کے پیچھے سے
 منگھڑکی، آپ نے فرمایا کہ اے حید! تم ہم سے ملنے کے لئے کیوں نہیں آتے، حید نے کہا اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی بنا پر کہ کبھی
 کبھی تم لو اس سے محبت زیادہ ہوگی، حید نے عرض کیا کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی عجیب ترین بات بیان فرمائیے، حضرت
 عائشہؓ یہ سن کر رونے لگیں اور فرمایا کہ آپ کی تمام باتیں ہی عجیب تھیں، ایک رات میرے پاس تشریف لائے، یہاں تک کہ میرا
 بدن آپ کے جسم مبارک سے مس ہو گیا، پھر فرمایا مجھے چھوڑو میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کروں گا، اس کے بعد آپ نے ایک
 منگھڑنے سے پانی لے کر وضو کیا، پھر نماز کے لئے کھڑے ہوئے، اور اس قدر روئے کہ آپ کی داڑھی مبارک تر ہو گئی، اس کے بعد
 سجدے میں روئے یہاں تک کہ زمین تر ہو گئی، پھر کوٹ لے کر لیٹ گئے، یہاں تک کہ بلال صبح کی نماز کے لئے اطلاع دینے حاضر
 ہوئے، انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! آپ کیوں روئے ہیں؟ اللہ تعالیٰ نے آپ کے اگلے جھپٹے گناہ معاف فرمادیئے ہیں، آپ
 نے فرمایا اے بلال! میں کیوں نہ روؤں؟ اللہ تعالیٰ نے آج رات مجھ پر یہ آیت نازل فرمائی ہے :-

إِن فِي خَلْقِ السَّمُوتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَآيَاتٍ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ
 (پ ۱۳ ر ۱۱ آیت ۲۰)

بلاشبہ آسمانوں کے اور زمین کے بنانے میں اور یکے بعد دیگرے رات اور دن کے آنے جانے میں اہل

محل کے لئے دلائل ہیں۔

پھر فرمایا اس شخص کے لئے جہاں ہو جو یہ آیت پڑھے اور اس میں فکر نہ کرے (صحیح ابن حبان۔ عطاء) کسی شخص نے اوزاعیؓ
 سے دریافت کیا کہ ان آیات میں فکر کی حد کیا ہے؟ فرمایا انہیں پڑھنا اور سمجھنا، محمد ابن الواسع کہتے ہیں کہ بصرے کا ایک شخص
 ابو ذرؓ کی وفات کے بعد اُمّ ذر کے پاس آیا، اور ان سے ابو ذرؓ کی عبادت کی کیفیت دریافت کی، انہوں نے فرمایا کہ ابو ذرؓ دن بھر گھر کے
 ایک کونے میں بیٹھے فکر کیا کرتے تھے، حضرت حسنؓ کہتے ہیں کہ ایک ساعت کا فکر رات بھر کی عبادت سے بہتر ہے، قتیبہ ابن
 عیاضؓ کہتے ہیں کہ فکر ایک آئینہ ہے جس میں تو اپنی نیکیاں اور برائیاں دیکھتا ہے، حضرت ابراہیمؓ سے کسی نے عرض کیا کہ آپ بہت
 زیادہ غور و فکر کرتے ہیں، انہوں نے فرمایا کہ فکر محل کا مغز ہے، حضرت سفیان ابن عیینہؓ مثال میں بکھرتے یہ شعر پڑھا کرتے تھے

اَوْ الرَّمْ كَانَتْ لَهُ فِكْرَةٌ فَقِي كُلُّ شَيْءٍ لَهُ مِجْرَةٌ
(اگر انسان کو فکر میسر ہو تو وہ ہر چیز سے عبرت حاصل کر سکتا ہے۔)

طاؤس فرماتے ہیں کہ حواریین نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے عرض کیا کہ یا روح اللہ! آج روئے زمین پر کوئی شخص آپ جیسا بھی ہے۔ فرمایا ہاں وہ شخص میری طرح ہے جس کی محفل ذکر ہو، جس کا سکوت فکر ہو، اور جس کی نظر عبرت ہو، حضرت حسن فرماتے ہیں کہ جس کے کلام میں حکمت نہ ہو وہ لغو ہے، جس کے سکوت میں فکر نہ ہو وہ سو ہے، اور جس کی نظر میں عبرت نہ ہو وہ لہو ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

مَنْ أَصْبِرْ فَعَنْ آيَاتِنَا الَّذِينَ يَتُكَبَّرُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ۔ (پ ۹ ر ۱ آیت ۱۳۶)

میں ایسے لوگوں کو اپنے احکام سے برکشتہ ہی رکھوں گا جو دنیا میں تکبر کرتے ہیں جس کا ان کو کوئی حق حاصل نہیں ہے۔

اس آیت کی تفسیر میں حضرت حسن بھری نے ارشاد فرمایا کہ ”میں ان کے دلوں کو فکر سے باز رکھتا ہوں“ حضرت ابو سعید الخدریؓ روایت کرتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ آنکھوں کو عبادت میں سے ان کا حصہ دو، لوگوں نے عرض کیا آنکھوں کا عبادت میں کیا حصہ ہے؟ فرمایا قرآن کریم میں دیکھنا، اس میں غور و فکر کرنا اور اس کے عجائبات سے عبرت حاصل کرنا (ابن ابی الدنیا) ایک عورت جو مکہ مکرمہ کے قریب واقع ایک جنگل میں رہا کرتی تھی کتنی تھی کہ اگر شکرین کے قلوب اپنے فکر کے ذریعے اس خیر کا مشاہدہ کر لیں جو آخرت کے عجاہوں میں ان کے لئے مٹتی ہے تو دنیا کی کوئی لذت ان کے لئے معاف نہ ہو، اور نہ دنیا میں ان کی آنکھ کو قرار ہو، حضرت لقمان علیہ السلام دیر تک تعالیٰ میں بیٹھے رہے، ان کا آقا ان کے پاس آتا اور کہتا کہ تو ہمیشہ تنہا بیٹھا رہتا ہے، اگر لوگوں کے ساتھ بیٹھے تو کچھ دل لگے، حضرت لقمان جواب دیتے کہ دیر تک تنہا بیٹھنے سے اچھی طرح فکر کرنے کا موقع ملتا ہے، اور طول فکر سے جنت کی طرف رہنمائی ہوتی ہے وہب ابن منبہ کہتے ہیں کہ جس شخص نے بھی دیر تک فکر کیا اس نے علم حاصل کیا، اور جس نے علم حاصل کیا اس نے عمل کیا، حضرت عمر ابن عبدالعزیز فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں فکر کرنا افضل عبادت ہے، ایک دن عبداللہ ابن المبارک نے سل ابن علی سے پوچھا کہ کہاں تک پہنچے وہ اس وقت خاموش بیٹھے فکر کر رہے تھے انھوں نے جواب دیا صراط تک۔ پھر کہتے ہیں کہ اگر لوگ اللہ تعالیٰ کی عظمتوں میں غور کریں تو کبھی اس کی انفرمانی کے مرتکب نہ ہوں، حضرت عبداللہ ابن عباس کہتے ہیں فکر کے ساتھ دو معتدل رخصتیں بے دلی کے ساتھ تمام رات کے قیام سے افضل ہیں ابو شریح کہیں جا رہے تھے، اچانک راستے میں ایک جگہ بیٹھ گئے، اور منہ پر چادر ڈال کر روئے گئے، لوگوں نے پوچھا کیوں روئے ہیں؟ فرمایا مجھے اپنی عمر کے ضیاع، اعمال کی قلت، اور موت کی قربت کا خیال آ گیا تھا، حضرت ابو سلیمان کہتے ہیں کہ اپنی آنکھوں کو روئے گا، اور قلوب کو فکر کا مادی نفاذ، ابو سلیمان دارانی کہتے ہیں کہ دنیا کی فکر کرنا آخرت سے حجاب ہے، اور اہل ولایت کے لئے عذاب ہے، اور فکر آخرت سے حکمت حاصل ہوتی ہے اور قلوب کو زندگی ملتی ہے، حاتم کہتے ہیں کہ عبرت سے علم زیادہ ہوتا ہے، ذکر سے محبت بڑھتی ہے، اور فکر سے خوف زیادہ ہوتا ہے، حضرت عبداللہ ابن عباس فرماتے ہیں کہ خیر میں فکر عمل کا باعث ہوتا ہے، اور شر پر ندامت اس کے ترک کا سبب ہوتی ہے، روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کسی آسمانی کتاب میں یہ کلمات نازل فرمائے ہیں کہ میں کسی حکیم کا کلام قبول نہیں کرتا بلکہ اس کے ارادے اور خواہش کو دیکھتا ہوں، اگر اس کا ارادہ اور خواہش میرے لئے ہوتا ہے تو میں اس کی خاموشی کو فکر، اور اس کے کلام کو حمد بناتا ہوں، اگرچہ وہ زبان سے کچھ نہ بولے، حضرت حسن بھری فرماتے ہیں کہ اہل عقل ذکر سے فکر کے اور فکر سے ذکر کے عادی ہوتے ہیں، یہاں تک کہ ان کے قلوب حکمت کی باتیں کرتے ہیں۔ اہل ابن خلف کہتے ہیں کہ ایک رات جب کہ چاند پوری طرح روشن تھا حضرت داؤد طالعی گھر کی پھرت پر تھے، وہ آسمان کی جانب دیکھنے لگے، اور زمین و آسمان کے ملکوت میں غور کرنے لگے، اور روئے گئے، اور روئے روئے اپنے ایک بڑوسی کے گھر میں جا کرے، آپ کا بڑوسی برونہ جسم اپنے بستر سے کود کر کھڑا ہوا، اس کے ہاتھ میں تلوار تھی، اس نے یہ خیال کیا کہ کوئی چور

گھر میں کس آیا ہے، مگر جب اس کی نظر داؤد طائی پر پڑی تو تلواریں میان میں رکھ لی، اور کہنے لگا کہ آپ کو کس نے کرادیا ہے، انھوں نے فرمایا مجھے کرنے کا احساس تک نہیں ہوا۔ جینہ بغدادی کہتے ہیں کہ بحرین اور اعلا مجلس وہ ہے جس میں میدان توحید میں فکر کے کھوڑے دوڑائے جائیں، نسیم معرفت کا لطف لیا جائے، اور بحر حجت سے شراب محبت پی جائے، اور اللہ تعالیٰ پر حسن ظن کے ساتھ نظر کی جائے، اس کے بعد فرمایا کہ ان مجالس کی کیا تحریف کی جائے وہ نہایت اعلا ہیں اور وہ شراب نہایت لذیذ شیریں ہے، حضرت امام شافعی فرماتے ہیں کہ کلام پر خاموشی سے، اور استنباط پر فکر سے مدد لو، یہ بھی فرمایا کہ امور میں صحیح طور پر نظر کرنا مغالطہ سے بچاتا ہے، رائے میں جھکی برداشت سے محفوظ رکھتی ہے، غور و فکر سے آدمی کی دانائی اور احتیاط ظاہر ہوتی ہے، غلطیوں سے مشورہ کرنا مستقل مزاجی، اور پختہ بصیرت پیدا کرتا ہے، اس لئے عزم کرنے سے پہلے فکر کرو، اور عمل سے پہلے غور کرو، اور اقدام سے پہلے مشورہ کرلو، آپ نے یہ بھی فرمایا کہ فضائل چار ہیں ایک حکمت، اس کا قوام فکر ہے، دوسری غفلت، اس کا قوام شہوت ہے، تیسری قوت، اس کا قوام غضب ہے، اور چوتھی عدل، اس کا قوام نفسانی قوتوں میں اعتدال ہے، فکر کے متعلق علماء کے یہ اقوال ہیں، لیکن ان میں سے کسی نے بھی فکر کی حقیقت، اور امور فکر پر روشنی نہیں ڈالی۔

فکر کی حقیقت اور اس کا ثمرہ : فکر کے معنی یہ ہیں کہ دل میں دو معرفتیں حاضر ہوں تاکہ ان سے تیسری معرفت پیدا ہو، اور اس کی مثال یہ ہے کہ جو شخص دنیا کی طرف مائل ہو تاکہ، اور دنیوی زندگی کو ترجیح دیتا ہے، اور یہ چاہتا ہے کہ اسے کسی طرح اس امر کی معرفت حاصل ہو جائے کہ آخرت کا اختیار کرنا دنیا سے بہتر ہے، تو اس معرفت کے طریقے یہ ہیں، ایک تو یہ ہے کہ کسی دوسرے سے سنے کہ آخرت کو ترجیح دینا دنیا کو ترجیح دینے سے بہتر ہے، اس کی تقلید کرے، اور حقیقت امر سے واقف ہوئے بغیر اس کی تصدیق کرے، اور اپنے عمل سے محض کہنے والے پر اعتماد کرتے ہوئے ترجیح آخرت کی طرف مائل ہو، اسے تقلید کہتے ہیں، معرفت نہیں کہتے، اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ پہلے یہ جائے کہ جو چیز باقی رہنے والی ہے اسے ترجیح دینا بہتر ہے، پھر یہ جائے کہ آخرت باقی رہنے والی ہے، ان دونوں معرفتوں سے تیسری معرفت یہ حاصل ہوگی کہ آخرت کو ترجیح دینا بہتر ہے، اس معرفت کا تحقق ساہتہ دونوں معرفتوں کے بغیر ممکن نہیں ہے، ان دونوں معرفتوں کا قلب میں اس لئے حاضر کرنا کہ ان سے تیسری معرفت حاصل ہوگی، فکر، اعتبار، تذکر، نظر، تامل اور تدبر کہلاتا ہے، جہاں تک تدبر، تامل، فکر کا سوال ہے یہ ایک ہی معنی کے لئے مختلف الفاظ ہیں، اور تذکر، اعتبار اور نظر کے معانی الگ الگ ہیں، اگرچہ کسی ایک ہے جیسے صارف مند اور سیف کا اطلاق ایک ہی چیز پر ہوتا ہے، لیکن اعتبار رات مختلف ہوتے ہیں، چنانچہ صارف اس تلوار کو کہتے ہیں جو کاٹنے والی ہو، اور مند اس تلوار کو جو ہندوستان میں بنی ہو، اور سیف مطلق تلوار کو کہتے ہیں کوئی زائد امر اس سے سمجھا نہیں جاتا۔ اسی طرح لفظ اعتبار کا اطلاق ان دو معرفتوں پر اس لحاظ سے ہوتا ہے کہ ان سے تیسری معرفت تک پہنچا جائے اور اگر تیسری معرفت تک پہنچنا ممکن نہ ہو، بلکہ دونوں معرفتوں پر ٹھہر جائے تو اسے تذکر کہتے ہیں، اعتبار نہیں کہتے، اور نظر و فکر کا اطلاق اس اعتبار سے ہوتا ہے کہ آدمی میں تیسری معرفت کی طلب ہو، جس شخص میں تیسری معرفت کی طلب نہیں ہوتی اسے ناظر یا شکر نہیں کہہ سکتے، چنانچہ ہر شکر مند کو کہتے ہیں، لیکن ہر تذکر مند شکر نہیں ہو سکتا۔

تذکار کا فائدہ یہ ہے کہ قلب پر معارف کی تکرار ہو، تاکہ وہ اچھی طرح راسخ ہو جائیں اور قلب سے محو نہ ہوں، فکر کا فائدہ یہ ہے کہ علم زیادہ ہو، اور ایسی معرفت حاصل ہو جو پہلے سے مجہوز تھی، اور تذکر اور فکر میں فرق ہے، جیسا کہ قلب میں جمع ہو جائے، یہ ایک مددگار ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کے بعض نقصان بھی ہیں، مثلاً ہر وقت ایک معرفت دوسری معرفت کا ثمرہ ہوتی ہے، اور جب وہ نئی معرفت کسی دوسری معرفت کے ساتھ ملتی ہے تو اس سے ایک اور ثمرہ حاصل ہوتا ہے، یہ نتائج و ثمرات معلوم و معارف اور فکر اسی طرح بدھتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ موت اس سلسلے کو منقطع کر دیتی ہے، یا موانع سے یہ راہ مسدود ہو جاتی ہے، یہ طریقہ اس شخص کے لئے مفید ہے جو علوم سے مشغول حاصل کرتا ہو اور طریق فکر سے واقفیت رکھتا ہو، اکثر لوگ علم کی کثرت سے غرور میں ہیں، ان کے پاس راس المال نہیں ہے، یعنی وہ معارف نہیں ہیں جن سے دوسرے معارف پیدا ہوتے ہیں، اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی شخص کے پاس سامان تجارت نہ ہو، اور وہ نفع

حاصل کرنے سے محروم نہ جائے، کبھی آدمی کے پاس راس المال بھی ہوتا ہے لیکن وہ فن تجارت سے اچھی طرح واقف نہیں ہوتا اس لئے نفع نہیں کماتا اس طرح بعض لوگوں کے پاس معارف و علوم کا راس المال ہوتا ہے، لیکن وہ ان کے صحیح استعمال سے واقف نہیں ہوتے اور نہ یہ جانتے ہیں کہ ان معارف کو ایک دوسرے کے ساتھ کس طرح ترکیب دیا جائے کہ دوسرے معارف حاصل ہوں اس لئے اپنے راس المال میں زیادتی نہیں کر پاتے راس المال کو استعمال کرنے کا طریقہ اور ایک معرفت سے دوسری معرفت اخذ کرنے کا طریقہ بھی نور الہی کے ذریعے دل میں فطری طور پر منکشف ہو جاتا ہے جیسے انبیاء طہیم الصلوٰۃ والسلام پر منکشف تھا، لیکن یہ صورت اب بہت کم یاب اور نادر الوقوع ہے اور کبھی ممکن کرنے اور سیکھنے سے آجاتا ہے، عام طور پر کسی صورت پائی جاتی ہے، کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ شکر کو معارف حاصل ہوتے ہیں اور وہ ان کے ثمرات بھی رکھتا ہے، لیکن اسے حاصل کرنے کی کیفیت معلوم نہیں ہوتی، اور نہ وہ اسے بیان کرنے پر قادر ہوتا ہے کیوں کہ اسے بیان کا فن نہیں آتا، چنانچہ بہت سے انسان ایسے ہیں جو یہ جانتے ہیں کہ آخرت کو ترجیح دینی چاہیے، لیکن اگر ان سے اس معرفت کا سبب دریافت کیا جائے تو وہ اسے بیان نہ کر سکیں، حالانکہ یہ معرفت سابقہ دونوں معرفتوں کے بعد ہی حاصل ہوتی ہے، یعنی باقی رہنے والی چیز کو ترجیح ملنی چاہیے اور آخرت باقی رہنے والی ہے اور ان دونوں معرفتوں کے بعد یہ معرفت سامنے آتی کہ آخرت کو ترجیح ملنی چاہیے۔

فکر کے ثمرات : خلاصہ کلام یہ ہے کہ فکر کے معنی دل میں دو معرفتوں کا حاضر کرنا ہے تاکہ ان سے تیسری معرفت حاصل ہو، فکر کے ثمرات علوم، احوال اور اعمال تینوں ہی ہو سکتے ہیں، لیکن اس کا خاص ثمر صرف علم ہی ہے، ہاں جب علم قلب میں حاصل ہوتا ہے تو قلب کی حالت بدل جاتی ہے، اور جب قلب کی حالت بدلتی ہے تو جو اس کے اعمال بھی بدل جاتے ہیں، گویا عمل حال کے تابع ہے، اور حال علم کے تابع ہے، اور علم فکر کے تابع ہے، فکر ہی تمام خیرات کا مبداء اور ان کی کنجی ہے، اس سے فکر کی فضیلت بھی واضح ہوتی ہے، اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ فکر ذکر سے افضل ہے کیوں کہ فکر میں ذکر بھی ہے، اور ذکر سے دائرہ بھی ہے، تاہم ذکر قلب عمل جو اس سے بہتر ہے، بلکہ اشرف ترین عمل وہ ہوتا ہے جس میں عمل بھی ہو، بہر حال فکر تمام اعمال سے افضل ہے، اسی لئے یہ کہا گیا ہے کہ ایک ساعت کا فکر سال بھری عبادت سے افضل ہے، بعض اکابر کہتے ہیں کہ مفکر وہ ہے جو قلب کو بری چیزوں سے پسندیدہ چیزوں کی طرف منتقل کر دے، اور حرص سے زہد اور قناعت کی طرف پھیر دے، بعض کہتے ہیں کہ فکر مشاہدے اور تقویٰ کو کہتے ہیں قرآن کریم میں ہے۔

لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ لَوْ يَخْلُصُ لَهُمْ ذِكْرًا۔ (پ ۸، آیت ۳۳)

شاید وہ لوگ ڈر جائیں اور یہ (قرآن) ان کے لئے کسی قدر (ق) سمجھ پیدا کر دے۔

اگر تم فکر کے ذریعہ تغیر حال کی کیفیت جاننا چاہتے ہو تو اس کی مثال وہی ہے جو ہم آخرت کے سلسلے میں پہلے لکھ چکے ہیں، اس مثال میں غور کرنے سے پتا چلتا ہے کہ آخرت کو ترجیح دینا بہتر ہے، جب یہ معرفت یعنی طور پر ہمارے قلوب میں راجح ہو جاتی ہے تو وہ خود بخود آخرت کی محبت اور دنیا میں زہد کی طرف مائل ہوتے ہیں، اسی میلان کو ہم نے حال سے تعبیر کیا ہے، اس معرفت سے پہلے دل کا حال یہ تھا کہ وہ عاجلہ (دنیا) کو پسند کرتا تھا، اس کی طرف مائل تھا، اور آخرت سے غفلت تھا، اور اس کی طرف بہت کم التفات کرتا تھا لیکن جب یہ معرفت حاصل ہوئی تو دل کا حال یکسر بدل گیا، اس کے ارادے اور رغبت میں تغیر ہو گیا، پھر ارادے کے تغیر نے جو اس کو مجبور کیا کہ وہ دنیا کو ایک طرف ڈالیں، اور آخرت کے اعمال پر رغب ہوں۔

فکر کے پانچ درجات : یہاں پانچ درجات ہیں، ایک تذکر اس کے معنی ہیں قلب میں دونوں معرفتوں کو حاضر کرنا، دوسرا فکر یعنی وہ معرفت حاصل کرنا جو پہلی دونوں معرفتوں سے مخصوص ہے، تیسرا درجہ یہ ہے کہ معرفت مطلوبہ حاصل کی جائے اور اس کے ذریعے قلب کو منور کیا جائے، چوتھا درجہ یہ ہے کہ قلب نور معرفت کے بعد سابقہ حالت سے خیر ہو جائے، اور پانچواں درجہ یہ ہے کہ جو اس قلب کی اس کے تغیر پذیر احوال کے مطابق خدمت کریں، جس طرح پھر لوہے پر مارا جاتا ہے تو اس سے آگ نکلتی ہے،

اور آگ سے تاریک جگہ میں روشنی پہنچتی ہے، اور آنکھ دیکھنے لگتی ہے، جب کہ اس سے پہلے اسے کوئی چیز نظر نہیں آ رہی تھی، اور احصاء عمل کے لئے پیدا ہو جاتے ہیں یہی حال نور معرفت کے متعلق کا ہے، اور اس متعلق کا نام فکر ہے یہ فکر دو معرکوں کو جمع کرتا ہے، جیسے وہاں آگ اور پتھر دونوں جمع ہوتے ہیں، اور ان دونوں کے درمیان ایک مخصوص ترکیب پیدا کی جاتی ہے، جس طرح لوہے پر پتھر کو مخصوص طریقے پر مارا جاتا ہے، اس سے معرفت کا نور پیدا ہوتا ہے جس طرح لوہے سے آگ پیدا ہوتی ہے، اور اس نور کی وجہ سے قلب خیر ہو جاتا ہے، اور اس طرف مائل ہو جاتا ہے جس طرف پہلے مائل نہیں تھا، جیسے آگ کی روشنی میں آنکھ ان چیزوں کو دیکھتی ہے جنہیں روشنی سے پہلے نہیں دیکھتی تھی۔

بہر حال فکر کے ثمرات علوم اور احوال دونوں ہیں، یہ علوم کی کوئی انتہا ہے، اور نہ ان احوال کی کوئی حد ہے جو قلب پر وارد ہوتے ہیں، اسی لئے اگر کوئی سالک یہ چاہے کہ وہ ان امور کا احاطہ کر سکے جن میں فکر کی گنجائش ہے تو ایسا کرنا اس کے لئے ممکن نہ ہو، اس لئے کہ مواقع فکر بے شمار ہیں، اور اس کے ثمرات کی کوئی انتہا نہیں ہے، تاہم ہماری کوشش یہ ہوگی کہ وہ تمام مواقع فکر ضبط تحریر میں آجائیں جو سمات علوم دین سے متعلق ہیں، یا ان احوال سے جن کا تعلق سالکین کے مقامات سے ہے، لیکن یہ ایک اجمالی ضبط ہوگا، کیوں کہ تفصیل کے لئے ضروری ہے کہ ہم تمام علوم کی شرح کریں۔ اس کتاب کے مختلف ابواب دراصل انہی علوم و احوال میں سے بعض کی شرحیں ہیں، کیوں کہ ان میں وہ علوم بیان کئے گئے ہیں جو مخصوص افکار سے مستفاد ہوتے ہیں۔ ہم بطور اشارہ بیان کریں گے تاکہ فکر کے مواقع پر اطلاع ہو جائے۔

مواقع فکر یا فکر کی راہیں : جاننا چاہیے کہ فکر کبھی ایسے امر میں ہوتا ہے جس کا تعلق دین سے نہیں ہوتا۔ ہماری غرض متعلقات دین سے ہے، اس لئے ہم غیر متعلق چیزوں کو نظر انداز کرتے ہیں، اور دین سے ہماری مراد وہ معاملہ ہے جو بندے اور اس کے رب کے درمیان ہوتا ہے۔

بندے کے تمام افکار یا تو خود بندے سے، اس کی صفات اور احوال سے متعلق ہوتے ہیں، یا معبود اور اس کی صفات و افعال سے متعلق ہوتے ہیں، یہ ممکن ہی نہیں کہ افکار ان دو قسموں سے تجاوز کر سکیں، جن افکار کا تعلق بندے سے ہے ان کی بھی دو قسمیں ہیں یا تو وہ ان احوال و صفات میں ہوتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کو پسند ہیں، یا ایسے احوال و صفات میں جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک مبغوض ہیں، ان دونوں قسموں کے علاوہ کسی میں فکر کی حاجت ہی نہیں ہے، اور جن افکار کا تعلق اللہ تعالیٰ سے ہے یا تو وہ اس کی ذات و صفات اور اسماء حسنیٰ میں ہوتے ہیں، یا اس کے افعال، ملک و ملکوت اور زمین و آسمان اور ان چیزوں میں ہوتے ہیں، گویا فکر ان چار قسموں میں منحصر ہے، اس کی کیفیت ذیل کی مثال سے بخوبی واضح ہو سکتی ہے۔

جو لوگ اللہ تعالیٰ کی طرف چل رہے ہیں اور اس کی ملاقات کے مشتاق ہیں ان کا حال عاشق کے حال سے زیادہ مشابہ ہے، ہم ایک عاشق صادق فرض کیے لیتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ جو شخص عشق میں اپنے پورے وجود سے مستغرق ہوتا ہے اس کا فکر یا تو معشوق سے متعلق ہوتا ہے یا اپنے نفس سے، اگر معشوق کا فکر کرتا ہے تو اس کے جمال اور خوبصورتی میں فکر کرتا ہے، یا اس کی ذات میں فکر کرتا ہے تاکہ اس فکر سے لذت حاصل کرے، یا اس کے ان اوصاف میں فکر کرتا ہے جو اس کی خوبی اور کمال تصور کئے جاتے ہیں تاکہ اس فکر سے لذت اور پیہم جائے، اور اگر اپنے نفس میں فکر کرتا ہے تو یہ دو حال سے خالی نہیں ہوتا، یا تو اپنے ان اوصاف میں فکر کرتا ہے جو محبوب کے نزدیک اچھے نہیں ہیں اور ان کی وجہ سے وہ اس کی نظروں میں ذلیل و خوار ہوتا ہے، یا ان اوصاف میں فکر کرتا ہے جو محبوب کو پسند ہیں، اور ان کے باعث محبوب کا زیادہ التفات حاصل کیا جاسکتا ہے، ان امور کے علاوہ کسی امر میں فکر کرنا عشق سے خارج ہے، اور نقصان کا باعث ہے، اس لئے کہ عاشق صادق وہ ہے جو معشوق کی محبت میں پوری طرح ڈوبا رہے، یہاں تک کہ اس کے دل میں کسی دوسرے خیال و فکر کی گنجائش ہی باقی نہ رہے، اللہ تعالیٰ کے عاشق کو بھی ایسا ہی ہونا چاہیے، اس کی فکر و فکر بھی محبوب سے متجاوز نہ ہونی چاہیے۔

پہلی قسم۔ متعلقات نفس : جب تک بندے کا فکر کوہ بالا چاروں قسموں میں محصور رہتا ہے وہ محبت کے متعلق سے جدا نہیں ہوتا، اب ہم ان چاروں قسموں کا الگ الگ جائزہ لیتے ہیں۔ پہلے قسم اول پر نظر ڈالتے یعنی نفس کے احوال اور صفات میں فکر کرنا تاکہ اچھے اور برے میں تمیز کر سکے، اس فکر کا تعلق علم معاملہ سے ہے جو اس کتاب میں مقصود ہے، اور دوسری قسم کا تعلق علم مکاشفہ سے ہے۔ پھر وہ تمام امور جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ یا ناپسندیدہ ہوں وہ طرح کے ہیں، ظاہری جیسے طاعات اور معاصی اور باطنی جیسے نجات دینے والی یا ہلاک کرنے والی صفات ان کا محل قلب ہے، اس کی تحصیل ہم نے احیاء العلوم کی تیسری اور چوتھی جلد میں کی ہے، پھر طاعات اور معاصی میں سے بعض وہ ہیں جن کا تعلق انسان کے سات اصحاء سے ہے، اور بعض کا تعلق پورے بدن سے ہے، جیسے میدان جنگ سے فرار، والدین کی نافرمانی، حرام جگہ پر رہنا۔ جو باتیں اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہیں ان میں تین طرح سے فکر کرنا چاہیے، ایک تو اس طرح کہ یہ باتیں اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہیں یا نہیں، بسا اوقات آدمی پر کسی چیز کی کراہت ایک دم واضح نہیں ہوتی، بلکہ دقت نظر سے کام لینا پڑتا ہے، دوسرا فکر یہ کرے کہ اگر یہ امور اللہ کے نزدیک مکروہ ہیں تو ان سے بچنے کا طریقہ کیا ہے؟ اور تیسرا فکر یہ کہ اس مکروہ کے ساتھ وہ فی الحال متصف ہے کہ اسے چھوڑ دے، یا مستقبل میں متصف ہونے والا ہے کہ اس سے باز رہے، یا ماضی میں رہ چکا ہے کہ اس کی طاعتی کسے۔ اسی طرح محبوب چیزوں میں بھی تین طرح سے فکر کرنا چاہیے، اگر ان تمام قسموں کو جمع کیا جائے تو فکر کی راہیں سو سے تجاوز کر جاتی ہیں، اور بندہ کو ان سب میں یا ان میں سے اکثر میں فکر کرنے کی ضرورت پڑتی ہے، ان قسموں کا الگ الگ جائزہ لینا طوالت طلب ہے، ہم نے اس قسم کو چار انواع میں محصور کر دیا ہے، طاعات معاصی، ملک صفات، اور نجات دینے والی صفات۔ ہم ہر نوع میں ایک مثال ذکر کریں گے تاکہ مرید ان پر تمام اقسام کو قیاس کر سکے، اور اس پر فکر کا دروازہ وا ہو سکے، اور اس کا میدان وسیع ہو سکے۔

نوع اول معاصی : انسان کو چاہیے کہ وہ ہر روز صبح کو اپنے ساتوں اصحاء میں تنصیل اور باقی جسم میں ابعالیٰ تفتیش کرے، اگر وہ فی الحال معصیت میں ملوث ہوں تو اسے ترک کر دے، اور اگر کل ملوث ہو چکے ہیں تو اس کا تدارک کرے، اور اگر کل کو لباس میں ملوث ہونے والے ہیں تو اس سے بچنے اور دور رہنے کی تیاری کرے، مثال کے طور پر زبان کا جائزہ لے، اور یہ تصور کرے کہ زبان غیبت، جھوٹ، خود ستائی، دوسروں کے استہزاء، قطع کلامی، دوسروں کو برا کہنے، اور لائینی امور میں دخل دینے میں لگی رہتی ہے، سب سے پہلے اپنے دل میں یہ اعتقاد راجح کر لے کہ یہ تمام باتیں اللہ تعالیٰ کو سخت ناپسند ہیں، پھر قرآن و سنت کی آیات و روایات پر غور کرے جو شدید عذاب بردالت کرتی ہیں، پھر یہ دیکھے کہ وہ اپنے گناہوں کے باعث اس عذاب شدید کا مستحق بننے والا ہے، اس کے بعد یہ فکر کرے کہ وہ ان گناہوں سے کیسے بچ سکتا ہے، اور یہ جانے کہ ان گناہوں سے بچنے کا اس کے علاوہ کوئی طریقہ نہیں ہے کہ گوشہ نشینی، غلوٹ، اور تمنائی اختیار کرے، اور ایسے نیک اور متقی شخص کی ہم نشینی اختیار کرے جو ہر اس کلام پر تعمیری گرفت کر سکے جو اللہ کو ناپسند ہے، یا دوسروں کے ساتھ بیٹھنے سے پہلے اپنے منہ میں نکھر رکھ لے، تاکہ زبان غلط باتوں سے رکی رہے، اور یہ یاد رہے کہ زبان کی آفات سے بچنے کے لئے یہ نیکر منہ میں رکھا گیا ہے، زبان کے گناہوں سے بچنے کے لئے یہ تدبیریں کی جاسکتی ہیں۔

اسی طرح کان کے متعلق فکر کرے کہ اس کے ذریعے غیبت، جھوٹ، لغو گفتگو، بے ہودہ اور بدعت کی باتیں سنی جاتی ہیں، یہ باتیں عام ہیں، اور زید و عمر کسی سے بھی سننے میں آسکتی ہیں، ان سے بچنا چاہیے، غلوٹ، نفس ہو کر یا غی من المنکر کے ذریعے، یعنی اگر کسی کو کان کی برائی میں مبتلا دیکھے تو اسے منع کر دے، پیٹ کے بارے میں یہ فکر کرے کہ اس کی معصیت کھانے پینے کے باب میں ہوتی ہے، کبھی تو زیادہ کھا کر اگرچہ وہ غذا حلال ہو، لیکن کہ زیادہ کھانا بھی اللہ کو ناپسند ہے، اس سے شہوت کو تقویت ملتی ہے، اور شہوت دشمن خدا شیطان کا ہتھیار ہے، اور کبھی حرام اور مشتبہ غذا کھا کر پیٹ معصیت کا مرکب ہوتا ہے، کھانے سے پہلے یہ دیکھ لینا چاہیے کہ اس کی غذا کہاں سے حاصل ہو رہی ہے، پیٹ کی برائی سے اسی طرح بچا جاسکتا ہے، پھر یہ بات صرف غذا ہی کے ساتھ خاص نہیں ہے، بلکہ لباس اور مکان کے سلسلے میں بھی سوچنا چاہیے کہ یہ چیزیں اسے حلال ذرائع سے میسر ہوئی ہیں یا حرام و مشتبہ

ذرائع سے 'اپنے ذرائع آمدنی کے متعلق بھی فکر کرے کہ وہ جائز ہیں یا نہیں' اگر ناجائز ہوں تو جائز ذرائع آمدنی کے باب میں فکر کرے اور ان ذرائع سے اپنا رزق حاصل کرنے کی تدبیر سوچے اور یہ دیکھے کہ وہ حرام امور سے کس طرح بچ سکتا ہے 'اپنے نفس کو باور کرائے کہ اکل حرم کی موجودگی میں تمام مبادئیں ضائع ہو جاتی ہیں 'مبادئ کی بنیاد اکل حلال پر ہے' چنانچہ ایک حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی ایسے بندے کی نماز قبول نہیں کرتا جس کے پیرے کی قیمت ایک درہم حرام ہو (احمد۔ ابن عمر) تمام اعضاء میں اسی طرح فکر کرے۔ جو کچھ یہاں بیان کر دیا گیا ہے وہ بہت کافی ہے 'امید ہے جو شخص فکر کے ذریعے ان احوال کی صحیح اور حقیقی معرفت حاصل کرے گا وہ دن بھر اعضاء کی نگرانی رکھے گا' اور اس نگرانی کی وجہ سے اعضاء گناہوں سے محفوظ رہیں گے۔

نوع ثانی طاعات : سالک کو چاہیے کہ وہ پہلے ان اعمال میں فکر کرے جو اس پر فرض کئے گئے ہیں 'یعنی وہ انہیں کس طرح ادا کرے' نقص اور کوتاہی سے کس طرح محفوظ رکھے' اور اگر ان میں نقص پیدا ہو جائے تو نوافل کے ذریعے ان کی طمانی کس طرح کرے' پھر ہر عضو کا الگ الگ جائزہ لے اور ان اعمال میں فکر کرے جو اللہ کو پسند ہیں اور جن کا تعلق اس کے اعضاء سے ہے 'مثال کے طور پر یہ سوچے کہ آنکھ جہت کے متاخر دیکھنے کے لئے پیدا کی گئی ہے' اس کے ذریعے آسمان و زمین کے ملکوت کا مشاہدہ کرنا چاہیے 'اور اللہ تعالیٰ کی کتاب اور سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کا مطالعہ کرنا چاہیے' میں اس پر قادر ہوں کہ آنکھ کو کتاب اللہ و سنت رسول اللہ کے مطالعے میں مشغول کر سکوں 'پھر میں ایسا کیوں نہیں کرتا' میں اس پر بھی قادر ہوں کہ فلاں اطاعت گزار بندے کو تعظیم کی نظروں سے دیکھوں اور اس کے دل میں خوشی پیدا کروں' اور اس پر بھی قادر ہوں کہ فلاں فاسق کو حقارت کی نظر سے دیکھوں اور اس طرح اسے معصیت سے باز رکھنے کی کوشش کروں 'پھر میں ایسا کیوں نہیں کرتا۔ اسی طرح اپنے کانوں کے متعلق یہ کہے کہ میں ان کے ذریعے مظلوم کی فریاد بھی سن سکتا ہوں 'حکمت' 'علم' اور قرأت و ذکر بھی سننے پر قادر ہوں' پھر میں کیوں انہیں بیکار کئے ہوئے ہوں' اللہ نے مجھے کانوں کی نعمت اس لئے دی ہے کہ میں انہیں نیک کا ذریعہ بنا کر اس نعمت پر اس کا شکر ادا کروں 'لیکن میں انہیں ضائع یا محفل کر کے کفران نعمت کرتا ہوں' اسی طرح زبان میں فکر کرے 'اور یہ کہے کہ میں تعلیم و حفظ اہل صلاح سے اہتمام تعلق' فقراء کے احوال کے بارے میں سوال کرنے پر قادر ہوں' اور مجھے اللہ نے اس کی قدرت بھی عطا کی ہے کہ اچھی بات کہہ کر نیک زید' اور عالم عمر کے قلوب کو خوش کر سکوں' ہر اچھی بات ایک صدقہ ہے اسی طرح اپنے مال کے متعلق بھی فکر کرے کہ میں اپنا مال فلاں کو صدقہ دے سکتا ہوں' میں فی الوقت اس کا محتاج نہیں ہوں' جب مجھے ضرورت ہوگی اللہ تعالیٰ مجھے اسی طرح کا دو سرا مال عطا کرے گا اور اگر مجھے فی الحال بھی اس مال کی ضرورت ہے تب بھی یہ مال دوسرے کو صدقہ کر دینا ہی زیادہ بہتر ہے 'کیونکہ ضرورت کے ہوتے ہوئے ایثار کرنا بڑے ثواب کا کام ہے اور میں مال سے زیادہ اس ثواب کا محتاج ہوں۔

اپنے تمام اعضاء 'تمام جسم' تمام مال و دولت بلکہ اپنے تمام جانوروں 'غلاموں اور بچوں کا اسی طرح جائزہ لے' کیونکہ یہ تمام چیزیں اس کے اسباب و آلات ہیں 'اور وہ ان کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کر سکتا ہے' اپنی وقت فکر کے ذریعے اطاعت کی ممکنہ صورتیں تلاش کرے' پھر ان امور کی جستجو کرے جن کی وجہ سے طاعات کی ترغیب ہو' پھر نیت کے خلوص میں فکر کرے تاکہ عمل ہر طرح سے پاکیزہ اور ستمرا ہو۔

نوع ثالث صفات مہلک : تیسری نوع میں وہ مہلک صفات ہیں جن کا محل قلب ہے 'جلد سوم میں ہم ان کا ذکر کر چکے ہیں' اور وہ ہیں غلبہ شہوت' غضب' بخل' کبر' عجب' ریاء' حسد' بدظنی' غفلت اور غرور وغیرہ۔ اپنے دل کا جائزہ لے کر یہ دیکھے کہ اس میں یہ صفات پائی جاتی ہیں یا نہیں' اگر یہ خیال ہو کہ اس کا قلب ان صفات سے پاک ہے تو اس کی آزمائش کا طریقہ سوچے' اور ان علامات کی جستجو کرے جو اس کے اس خیال کی تصدیق کر سکیں 'نفس اکثر و بیشتر اپنے حلق خیر کا گمان رکھتا ہے وہ خیر ہی کا وعدہ کرتا ہے' لیکن بہت جلد وعدہ خلافی بھی کر بیٹھتا ہے' اس لئے اگر کسی شخص کا نفس تواضع' اور کبر سے برأت کا مدعی ہو تو بازار میں لکڑیوں کا ستر سر پر رکھ کر اس کی آزمائش کرنی چاہیے جیسا کہ پچھلے لوگ اپنے نفس کا اسی طرح امتحان لیا کرتے تھے' اگر کسی شخص کا نفس علم کا دعویٰ کرے تو اسے غصہ میں مبتلا کرنے کی کوشش کرو' اور کوئی ایسی بات کہہ کر دیکھو جس سے اسے غصہ آجائے' پھر یہ

دیکھو کہ وہ اپنا قصہ چیتا ہے یا نہیں تمام صفات میں اسی طرح کرنا چاہیے اس فکر کا مطلب یہ دیکھنا ہے کہ اس کا دل نا پسندیدہ صفات سے متصف ہے یا نہیں؟ اس کی کچھ علامات ہیں جو ہم نے تیسری جلد میں بیان کی ہیں اگر علامات سے ان صفات کی موجودگی ثابت ہوتی ہو تو ان امور میں فکر کرے جن سے یہ صفات بری معلوم ہوں اور یہ واضح ہو جائے کہ ان صفات کا طبع جمالت، غفلت اور باطن کی خباثت ہے مثلاً "کوئی شخص اپنے اعمال کے عجب میں مبتلا ہو اسے اس طرح فکر کرنا چاہیے کہ میرا عمل میرے جسم، اعضاء، قدرت اور ارادے سے ظہور پذیر ہوا ہے اور ان تمام چیزوں کا تعلق نہ مجھ سے ہے اور نہ یہ چیزیں میرے اختیار کی ہیں بلکہ میری طرح ان چیزوں کو بھی اللہ تعالیٰ نے پیدا ہے اور مجھ پر اپنا فضل و احسان فرمایا ہے گویا اسی نے مجھے پیدا کیا ہے اور اسی نے میرے اعضاء پیدا کئے ہیں اسی نے میری قدرت اور ارادہ کو پیدا کیا ہے اسی نے اپنی قدرت سے میرے اعضاء کو حرکت دی ہے میں نہ اپنے آپ پر عجب کر سکتا ہوں اور نہ اپنے عمل پر میرے اندر اتنی بھی طاقت نہیں کہ میں از خود کھڑا ہو سکوں۔ اگر کسی شخص کو اپنے نفس میں کبر کا احساس ہو تو اسے اس کی حماقت پر مطلع کرے اور اسے سمجھائے کہ تو اپنے نفس کو بڑا سمجھتا ہے بڑا تو وہ ہے جو اللہ کے نزدیک بڑا ہے اور یہ بات موت کے بعد معلوم ہوگی کہ اللہ کے نزدیک کون بڑا ہے بہت سے کافر موت سے کچھ پہلے شرف با ایمان ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے مقرب بندے بن کر موت سے ہم کنار ہوتے ہیں اور بہت سے مسلمان ایسے ہیں جو مرنے سے پہلے بد بختی کا شکار ہو جاتے ہیں اور ان کا خاتمہ برائی پر ہوتا ہے جب یہ بات معلوم ہو جائے کہ کبر ملک ہے اور اس کی اصل حماقت ہے تو اس کے علاج کی فکر کرے اور اس مرض کے ازالے کے لئے یہ تدبیر کرے کہ متواضعین کے طور پر طریقے اپنائے اسی طرح اگر کسی شخص کے نفس میں کھانے کی شہوت اور اس کی حرص ہو تو یہ سوچے کہ یہ بہائم کی صفت ہے اگر شہوت طعام یا شہوت جماع میں کوئی کمال ہوتا تو یہ اللہ تعالیٰ اور ملائکہ کی صفت ہوتی جیسے علم اور قدرت بہائم کو اس کے ساتھ متصف نہ کیا جاتا۔ جس شخص پر یہ شہوت جس قدر غالب ہوگی اسی قدر وہ بہائم کے ساتھ مشابہ ہوگا اور ملائکہ مقربین سے دور ہوگا اسی طرح غضب کے سلسلے میں اپنے نفس کو سمجھائے اور اس کے علاج کا طریقہ سوچے ہم نے یہ تمام باتیں متعلقہ ابواب میں بیان کر دی ہیں جو شخص اپنا دامن فکر وسیع کرنا چاہے اسے ان ابواب کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

نوع رابعہ۔ صفات منجیہ : نجات دینے والی صفات ہیں توبہ، گناہوں پر ندامت، مصائب پر صبر، نعمتوں پر شکر، خوف، رجاء، زہد فی الدنیا، اخلاص، اطاعت میں صدق، اللہ کی محبت اس کی تعظیم، اس کے افعال پر رضا، شوق، خشوع اور تواضع۔ یہ تمام صفات ہم نے اس جلد میں بیان کی ہیں اور ان صفات کے اسباب و علامات پر بھی روشنی ڈالی ہے، بندہ کو چاہیے کہ وہ ہر روز اپنے دل پر نظر ڈالے اور یہ دیکھے کہ اللہ تعالیٰ سے قریب تر کرنے والی صفات میں سے کون سی صفت کی اسے ضرورت ہے اگر یہ معلوم ہو جائے کہ اسے فلاں صفت کی ضرورت ہے تو یہ سوچے کہ یہ صفات احوال ہیں اور احوال علوم کا ثمر ہوتے ہیں اور علوم امارت کا۔ چنانچہ اگر وہ اپنے نفس کے لئے توبہ اور ندامت کے احوال کا ارادہ کرے تو پہلے اپنے گناہوں کا جائزہ لے ان میں فکر کرے اور نفس پر ان سب کو جمع کر دے اور دل میں ان کو بڑا جائے پھر اس وعید اور تشہید پر نظر ڈالے جو گناہوں کے سلسلے میں شریعت میں وارد ہوئی ہیں اور اپنے دل میں یہ یقین رکھے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی مول لینے والا ہے یہ فکر اس وقت تک کرے جب تک دل میں ندامت کا حال پیدا نہ ہو جائے اور اگر دل میں شکر کا حال پیدا کرنا چاہے تو پہلے اللہ تعالیٰ کے احسانات اور اس کے انعامات کا مطالعہ کرے اور یہ سوچے کہ اللہ نے اس کے گناہوں پر اپنا مہر جمیل ڈالے رکھا ہے اس فکر کی تشریح ہم نے کتاب الفکر میں کی ہے وہاں مطالعہ کرنا چاہیے جب محبت اور شوق کا حال پیدا کرنا چاہتا ہو تو اللہ کے جلال و جمال اور عظمت و کبریائی میں فکر کرے اور وہ اس طرح پہلے اللہ تعالیٰ کی عجیب و غریب حکمتوں پر نظر ڈالے اور اس کی عمدہ صفات کو دیکھے پھر اس کے جلال و جمال میں غور کرے کتاب الفکر کے دوسرے باب میں اس موضوع پر کچھ روشنی ڈالی جائے گی خوف کا حال پیدا کرنا ہو تو پہلے اپنے ظاہری اور باطنی گناہوں پر نظر ڈالے پھر موت اور مابعد الموت کے واقعات و مناظر میں فکر کرے کہ موت سے پہلے سکرات موت طاری ہوتے ہیں مرنے کے بعد مگر تکبر کے سوالات کا سامنا کرنا پڑے گا قبر کے عذاب اس کے سانپ، بچھوؤں اور کیڑوں

مکونوں کے بارے میں سوچے، پھر صور پھونکا جائے گا اور محشر بھا ہوگا، اس دن کی دہشت اور حساب کتاب کی شدت کے متعلق فکر کرے، وہاں زندہ دہ کے بارے میں مواخذہ ہوگا، اس کے بعد پل صراط سے گذارا جائے گا جو پل سے زیادہ ہار یک اور تنوار سے زیادہ تیز ہے، اس پر سے گذرنے میں یہ خطرہ ہے کہ اگر بائیں طرف کو گرا تو سیدھا دوزخ میں جائے گا، اور دائیں طرف کو گیا تو جنت والوں میں سے ہوگا۔ قیامت کے احوال کے بعد جنم کا تصور کرے کہ اس کے مختلف طبقات ہیں۔ ان میں گنہگاروں، اور نافرمانوں کے لئے گرز، طوق و سلاسل، اور پیپ، اور مختلف قسم کے عذاب ہیں، مزید برآں فرشتوں کی خوفناک اور دہشت زدہ کرنے والی صورتیں ہیں، یہ فرشتے دوزخیوں کی کھالیں بدلنے پر مامور ہیں جب وہ کل سڑ جاتی ہیں، اگر کوئی دوزخ سے لٹکا چاہے گا تو وہ فرشتے اسے پھر اندر دھکیل دیں گے، اور دور کھڑے ہو کر اس کی پٹھیں اور آہوں کی آوازیں سنیں گے، دوزخ کے متعلق قرآن کریم نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ ذہن میں حاضر کرے، اگر رجاہ کا حال پیدا کرنا ہو تو جنت کی نعمتوں، راحتوں، باغوں، درختوں، نہروں، حوروں اور غلاموں کے متعلق سوچے کہ وہاں کی ہر نعمت لازوال اور ہر آسائش ابدی ہے۔

اس فکر کا یہی طریقہ ہے جس سے دل میں عمدہ احوال پیدا ہوتے ہیں اور وہ صفات ذمہ سے پاک ہوتا ہے، ہم نے ان احوال میں سے ہر حال پر الگ الگ گفتگو کی ہے، اس سے تفصیل فکر پر مدد مل سکتی ہے، اگر کوئی شخص ان تمام احوال کو کسی ایک مجموعہ کتاب میں دیکھنے کا خواہاں ہو تو اسے قرآن کریم کی تلاوت کرنی چاہیے، اس سے زیادہ کوئی کتاب جامع اور نفع دینے والی نہیں ہے، اس میں تمام مقامات اور حالات کا ذکر ہے، یہ کتاب لوگوں کے لئے شفا ہے، کیونکہ اس میں وہ تمام باتیں ہیں جن سے خوف، رجاہ، صبر، شکر، محبت، شوق اور دوسرے احوال پیدا ہوتے ہیں، اور جو انسان کو اوصاف ذمہ سے روکتی ہیں، بندے کو چاہیے کہ وہ اس عظیم، نافع اور جامع کتاب کا مطالعہ کرے، اور ان آیات کو بار بار پڑھے جن میں اسے ہر لمحہ فکر کرنے کی ضرورت ہے، اگرچہ ایک آیت سو بار پڑھنی پڑے، فکر کے ساتھ ایک آیت کا پڑھنا اس سے بہتر ہے کہ متعدد فکر کے بغیر پورا قرآن کریم پڑھ لیا جائے، ہر ہر آیت پر غور اور تامل کرے، اگرچہ تامل کرنے میں پوری رات گزر جائے، اس کے ہر کلمے میں بے شمار اسرار و رموز پنہاں ہیں، اور ان پر صرف وہی شخص مطلع ہو سکتا ہے جو صدق معاملہ کے بعد صفائے قلب کے ساتھ فکر و تحقیق سے کام لے، قرآن کریم کی طرح سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات مبارکہ، اور احادیث مقدسہ کا بھی مطالعہ کرنا بے حد ضروری ہے، اس لئے کہ آپ کو جامع الکمل عطا کئے گئے ہیں، آپ کا ہر کلمہ حکمتوں کا سمندر ہے، اگر کوئی عالم ان میں صحیح طور پر تامل کرے تو وہ زندگی بھر اپنا سلسلہ فکر و تدبیر منقطع نہیں کر سکتا، ایک آیت یا ایک حدیث شریف کی شرح کے لئے ضخیم دفتار ناکافی ہیں۔ چنانچہ ایک حدیث میں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:-

إِنَّ رُوحَ الْقَلْبِ نَفْتٌ فِي رُوحِي أَحَبُّ مَا أَحْبَبْتُ، فَإِنَّكَ مُفَارِقُ مَوْعِشٍ مَاشَتْ
فَإِنَّكَ مَفِيتٌ وَأَعْمَلٌ مَاشَتْ فَإِنَّكَ مُبْجَرِي بَدَ.

جبریل نے میرے دل میں یہ بات ڈالی کہ آپ جس چیز کو چاہیں محبوب رکھیں اس سے جدا ضرور ہوں گے، اور جتنا چاہیں زندہ رہیں انتقال ضرور فرمائیں گے، اور جو چاہیں عمل کریں اس کا بدلہ ضرور پائیں گے۔ یہ کلمات اولین و آخرین کی حکمتوں کو جامع ہیں، اور ان لوگوں کو کافی ہیں جو زندگی بھر ان میں فکر و تامل کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں، اس لئے کہ اگر وہ ان کلمات کے معانی پر مطلع ہو جائیں، اور ان کے دل پر یقین کی طرح غالب آجائیں تو وہ دنیا کی طرف ذرا بھی التفات نہ کر سکیں گے۔

علوم معاملہ میں، اور بندے کی اچھی یا بری صفات میں فکر کرنے کا یہ طریقہ ہے، تو آموز مالک طریقت کو چاہیے کہ وہ اپنے اوقات کو ان افکار میں مستغرق رکھے، یہاں تک کہ اس کا قلب اخلاق محمودہ، اور مقامات شریفہ سے منور ہو جائے، اور اس کا ظاہر و باطن مکہ ہات سے پاک ہو جائے، یہاں یہ بات بھی یاد رہنی چاہیے کہ ان امور میں فکر کرنا اگرچہ بہترین عبادت ہے، لیکن اصل مطلوب نہیں ہے، بلکہ جو شخص ان امور میں مشغول ہوتا ہے وہ صدیقین کے مطلوب سے محجوب ہوتا ہے، صدیقین کا مطلوب اللہ

تعالیٰ کے جلال و جمال میں فکر کرنا اور اس فکر میں اس طرح مستغرق ہونا ہے کہ اپنے آپ سے بھی فاصلہ ہو جائیں، یعنی اپنے نفس، اپنے احوال، اپنے مقامات، اور صفات سب کچھ فراموش کر دیں، محبوب کے فکر میں ان کا عالم ایسا ہو جیسا کسی عاشق صادق کا اس وقت ہوتا ہے جب وہ اپنے معشوق کا دیدار کرتا ہے، اس وقت اسے یہ ہوش ہی نہیں رہتا کہ وہ اپنے حال پر نظر ڈالے، اور اپنے اوصاف پر غور کرے، بلکہ وہ تو مبسوت رہ جاتا ہے، اور اپنا سب کچھ فراموش کر دیتا ہے، عشاق کی لذت کا یہ اعلیٰ ترین درجہ ہے۔ زیر بحث فکر کا تعلق ان امور سے ہے جو قلب کو اخلاقِ حسنہ سے آہاد کریں، تاکہ اس سے قربت اور وصال کی لذت حاصل ہو، اب اگر کوئی شخص تمام عمر اپنے قلب

کی اصلاح ہی میں مصروف رہا تو اسے قرب و وصال کی لذت کب حاصل ہوگی، اسی لئے حضرت خواص جنگلوں میں چکراتے پھرتے تھے، ایک مرتبہ حسین ابن منصور نے ان سے پوچھا کہ تم کس حال میں ہو، انہوں نے کہا میں اپنا حال اچھا بنانے کے لئے جنگلوں میں گھومتا پھرتا ہوں، حسین ابن منصور نے فرمایا کہ تم نے اپنی تمام عمر باطن کی اصلاح میں ضائع کر دی، توحید میں فنا کا درجہ کب حاصل کرو گے اس سے معلوم ہوا کہ واحد برحق میں فنا ہو جانا ہی طائیں کا اصل مقصود، اور صدیقین کی لذت کا حقیقی ہے، ملک صفات سے بچنے کا عمل ایسا ہے جیسے کوئی عورت نکاح کی عزت گزار کر آزاد ہو جائے، اور نجات دلانے والی صفات اختیار کرنے اور اطاعت کرنے کا عمل ایسا ہے جیسے کوئی عورت اپنے خاوند کے استقبال کے لئے تیار ہو، ہاتھ منہ دھوئے، پال سنوارے تاکہ اپنے شوہر سے ملنے کے قابل ہو جائے، اب اگر وہ تمام عمر غیر کے نفع سے رحم کی صفائی، اور چہرے کی آرائش میں مصروف رہی تو اپنے شوہر سے کب ملے گی، طریق دین کو بھی اسی طرح سمجھنا چاہیے، ہر طریقہ تم میں ہم نشینی کی صلاحیت ہو، اور اگر تم کسی شریر غلام کی طرح ہو کہ وہ زبردستی اور مار پیٹ کے بغیر اطاعت نہیں کرتا تو اپنے بدن پر اعمال کی مشقت مت ڈالو، اس لئے کہ تمہارے اور قلب کے درمیان ایک دیوار ہو جائے، اعمال سے تم صرف جنت کے مستحق بن سکتے ہو، لیکن اس منصب کے اہل دوسرے ہیں جسے ہم نشین کہتے ہیں۔

بندے اور اس کے رب کے درمیان جو علوم معاملہ ہیں ان میں فکر کا طریقہ وہ ہے جو گزشتہ سطور میں مذکور ہوا، سالک کو چاہیے کہ وہ اسے اپنا دستور بنائے، اور صبح و شام اس پر عمل کرے، اور ہر وقت اپنے نفس پر، اور ان صفات پر جو اللہ تعالیٰ سے دور کرتی ہیں، اور ان احوال پر جو اللہ سے قریب کرتے ہیں غافل نہ رہے، بلکہ ہر مرتبہ کو اپنے پاس ایک کاپی رکھنی چاہیے جس میں تمام اچھی بری صفات، تمام معاصی اور طاعات درج ہوں، اور وہ ہر دن ان پر نظر ڈال کر اپنے نفس کی آزمائش کیا کرے۔

صفات مہلکہ اور صفات منجیہ یوں تو ملکات بھی بے شمار ہیں، اور منیات بھی، لیکن اگر دس ہلاک کرنے والی، اور دس نجات دلانے والی صفات پر نظر رکھی جائے تو بہت کافی ہے، وہ دس ملکات یہ ہیں، کبر، کبر، عجب، ریاء، حسد، شدت غضب، حرص، طعاع، کثرت شہوت، حب مال، اور حب جاہ، امید ہے جو شخص ان چیزوں سے بچا رہے گا وہ تمام برائیوں سے محفوظ رہے گا، اور دس منیات یہ ہیں گناہوں پر ندامت، مصائب پر صبر، قہقام پر رضا، نعمتوں پر شکر، خوف ورجاء میں اعتدال، دنیا میں زہد، اعمال میں اخلاص، مخلوق خدا کے ساتھ اچھا برتاؤ، اللہ تعالیٰ سے محبت اور اس کے لئے خشوع، اگر یہ تمام ہیں باتیں سالک کی کاپی میں درج ہوں تو علاج کچھ مشکل نہیں رہتا، اور طریقہ علاج یہ ہے کہ ان میں باتوں میں سے ایک میں فکر کرے، جب ایک بری بات مثلاً دور ہو جائے تو اپنی کاپی میں اس بات پر خط کھینچ دے، اور اس کے متعلق فکر کرنا چھوڑ دے، اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے کہ اس نے اسے اس برائی سے نجات عطا فرمائی، اور اس کے قلب کو صاف کیا، اور یہ بات جانے کہ میں نے اپنے قلب کو اس صفت سے محض اللہ کی توفیق اور اس کی مدد سے پاک کیا ہے، اگر اس نے یہ معاملہ میرے نفس پر چھوڑ دیا ہوتا تو میں اپنے قلب سے معمولی رزق بھی ملنے پر قادر نہ ہوتا، اس کے بعد باقی امور کی طرف متوجہ ہو، ایک ایک میں فکر کرے، اسے دور کرے، اور کاپی میں اس پر خط کھینچ دے، یہاں تک کہ تمام رذائل سے پاک ہو جائے، پھر منیات کے سلسلے میں اسی طرح کرے کہ ایک ایک عمدہ صفت اختیار کرے، اور اس پر خط کھینچا جائے، یہاں تک کہ تمام اوصافِ حسنہ حاصل ہو جائیں، مستعد مرید کا یہی طور ہونا چاہیے۔

جو لوگ صلوات میں شار کئے جاتے ہیں انہیں اپنی کامیابی میں ظاہری گناہ بھی لکھ لینے چاہئیں، جیسے مشتبہ مال کھانا، غیبت، چغلی، خصومت، خود ستائی، دشمنوں کی عداوت میں مبالغہ، دوستوں کی دوستی میں افراط، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ترک کرنے میں غلطی خدا کے ساتھ براہمت وغیرہ اکثر وہ لوگ بھی ان گناہوں سے بچ نہیں پاتے جنہیں صلوات کہا جاتا ہے، حالانکہ جب تک آدمی کے اعضاء گناہوں سے پاک نہیں ہوتے وہ اپنے قلب کی تعمیر و تعمیر میں مصروف نہیں ہو سکتا، پھر مختلف آدمیوں پر مختلف قسم کے معاصی کا غلبہ ہوتا ہے، ہر شخص پر ایک ہی نوع کے معاصی غالب نہیں ہوتے، اس لئے ہر شخص کو چاہیے کہ وہ انہی معاصی میں فکر کرے جو اس پر غالب ہیں، ان معاصی میں فکر نہ کرے جس سے وہ دور ہے، مثال کے طور پر اکثر متقی پرہیزگار علماء وعظ و تدریس کے ذریعے خود نمائی، خود ستائی، یا نام و نمود کی خواہش سے محفوظ نہیں ہوتے، یہ بھی ایک ذہدیت قندہ ہے، اور جو شخص اس قندہ میں مبتلا ہو جاتا ہے وہ نجات نہیں پاتا، صرف صدیقین ہی اس سے محفوظ رہتے ہیں، ورنہ عام علمائے امت کا حال تو یہ ہے کہ اگر ان کا خطاب لوگوں میں مقبول اور ان کے قلوب پر اثر انداز ہونے والا ہو تو وہ فخر و مسرت سے پھولے نہیں ساتے، اور عجب و خود پسندی میں مبتلا ہو جاتے ہیں، حالانکہ یہ امور ملکات میں سے ہیں، اور اگر لوگ ان کا کلام قبول نہیں کرتے تو پھر ان کے غصہ، نفرت اور حسد کا عالم قابل دید ہوتا ہے، حالانکہ اگر وہ لوگ کسی دوسرے عالم کا کلام ٹھکراتے ہیں تو اسے ذرا غصہ نہیں آتا، صرف اپنا کلام ٹھکراتے پر زیادہ غصہ آتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ شیطان اس پر یہ امر متبلس کر دیتا ہے اور کہتا ہے کہ تیرا غصہ اس لئے نہیں ہے کہ لوگوں نے تیرا کلام ٹھکرایا ہے، بلکہ اس لئے ہے کہ انہوں نے حق کو ٹھکرایا ہے، اور اسے قبول کرنے سے انکار کیا ہے، ظاہر ہے وہ شخص شیطان کے فریب میں آگیا، ورنہ اس کے اور دوسرے عالم کے کلام میں کیا فرق ہے، وہ بھی دین کی تبلیغ کرتا ہے اور یہ بھی پھر کیا وجہ ہے کہ اسے اپنے کلام کے ٹھکرائے جانے پر غصہ آتا ہے اور دوسرے عالم کے ٹھکرائے جانے پر غصہ نہیں آتا، بلکہ خوشی ہوتی ہے، پھر وہ شخص اپنے کلام کی مقبولیت صرف اترانے اور خوش ہونے پر ہی اکتفا نہیں کرتا، بلکہ مزید مقبولیت حاصل کرنے کے لئے تصنع اور تکلف سے کام لیتا ہے، اور الفاظ کی ادائیگی کو خوبصورت بنانے میں وقت ضائع کرتا ہے، مقصد یہ نہیں ہوتا کہ لوگوں کے دلوں پر اس کا کلام اثر انداز ہو، اور وہ دل جمعی اور توجہ کے ساتھ سن کر قبول کر سکیں، بلکہ اسے تعریف کی طلب ہوتی ہے، حالانکہ اسے معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ کو تکلف کرنے والے پسند نہیں ہیں، شیطان یہاں بھی اسے بھگانے آجاتا ہے اور کہتا ہے کہ تجھے حمین الفاظ کی حرص اس لئے ہے کہ تو حق پھیلا سکے، لوگوں کے قلوب میں دین کی باتیں اچھے انداز میں اثر کریں، اور اللہ کا کلمہ بلند ہو، حالانکہ اگر یہ بات ہوتی تو اسے دوسرے علماء کی تعریف سے خوشی بھی ہوتی، جس طرح اپنی تعریف سے ہوتی ہے مگر حقیقت میں ایسا نہیں ہوتا، بلکہ دوسرے علماء کی مقبولیت سے اس کے سینے پر سانپ لوٹنے ہیں، معلوم ہوا یہ شخص مبتلائے فریب، اور حرص عروجاہ ہے اگرچہ اس کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ دین سے غرض رکھتا ہے۔

پھر جب یہ صفات اس کے دل میں پیدا ہوتی ہیں تو ظاہر ہر بھی اثر انداز ہوتی ہیں چنانچہ اگر اس کے سامنے دایے شخص ہوں جن میں سے ایک اس کا احترام کرتا ہو، اس کے علم و فضل کا معتقد ہو، اور دوسرا شخص وہ ہو جو اس کے کسی حریف کا معتقد اور اس کا احترام کرنے والا ہو تو اسے پہلے آدمی سے مل کر زیادہ خوشی ہوتی ہے اور وہ مجلس میں زیادہ تراسی کی طرف توجہ دیتا ہے، اور اسی کا احترام کرتا ہے، خواہ دوسرا شخص بھی اس کے احترام اور عزت افزائی کا مستحق ہو، بعض اوقات ان علماء کا یہ حال ہوتا ہے کہ وہ سوکھوں کی طرح لڑتے ہیں، اور انہیں یہ گوارا نہیں ہوتا کہ ان کا کوئی شاگرد کسی دوسرے عالم کے پاس جائے، اگرچہ وہ یہ جانتا ہے کہ اس کا شاگرد دوسرے عالم سے بھی استفادہ کرتا ہے، اور دین حاصل کرتا ہے۔

ان تمام امور کا مبداء وہی صفات ملکہ ہیں جن کے متعلق عالم یہ گمان کرتا ہے کہ میں ان سے محفوظ ہوں، حالانکہ وہ فریب خوردہ ہے، یہ علامتیں اس کے دل میں پائی جانے والی صفات پر واضح دلالت کرتی ہیں، عالم کا قندہ بڑا ذہدیت ہے، یہ شخص یا تو اپنے تقویٰ و طہارت سے بادشاہ بن جاتا ہے، یا اپنے حرص و طمع سے ہلاک ہو جاتا ہے، جو شخص اپنے دل میں یہ صفات محسوس کرے اس پر گوشہ نشینی، عزت، گمانی واجب ہے، اس کی کوشش یہ ہونی چاہیے کہ لوگ اس سے مسائل بھی دریافت نہ کریں۔ ایک دوسرے

بھی تھا کہ مسجد نبوی میں ایسے صحابہ کا اجتماع رہتا تھا جو فتویٰ دینے کے اہل تھے، لیکن جب ان سے کوئی فتویٰ دریافت کیا جاتا تو وہ ایک دوسرے پر ٹال دیا کرتے تھے، اور اگر کوئی فتویٰ دے بھی دیتا تھا تو وہ یہ سوچا کرتا تھا کہ کاش کوئی دوسرا مجھے اس مشقت سے بچالیتا۔ عزت کے وقت آدمی کو اپنی ہی جس کے شیطاں سے احتیاط کرنی چاہیے، وہ یہ کہتے ہیں کہ تم گوشہ نشینی اختیار مت کرو، اس لئے کہ اگر عزت کا دروازہ کھول دیا گیا تو علوم مٹ جائیں گے، اگر کوئی شخص اس عذر کے ساتھ تجھے عزت سے روکنے کی کوشش کرے تو تجھے کہنا چاہیے کہ دین اسلام مجھ سے بے نیاز ہے، اسے میری ضرورت نہیں ہے، یہ دین مجھ سے پہلے بھی آباد تھا اور میرے بعد بھی آباد رہے گا، میرے مرنے سے ارکان اسلام منہدم نہیں ہوں گے، دین اسلام مجھ سے تو مستغنی ہے، لیکن میں خود اپنے قلب کی صلاح سے مستغنی نہیں ہوں، یہ کہنا کہ اس سے علم مٹ جائے گا ایک بے بنیاد اور غلط خیال ہے، اور جمالت پر دلالت کرتا ہے، اگر لوگ قید خانے میں ڈال دیئے جائیں اور زنجیروں میں جکڑ دیئے جائیں، اور ان سے کہا جائے کہ اگر انہوں نے علم حاصل کیا تو انہیں آگ میں ڈال دیا جائے گا تو وہ زنجیریں توڑ کر اور قید خانے کی دیواریں پھاند کر باہر نکل جائیں، اور جاہ و ریاست کی محبت انہیں تحصیل علم میں مشغول رکھے جب تک شیطان انسان کو ریاست و اقتدار کی طمع دلاتا رہے گا علم کا دروازہ بند نہیں ہوگا، اور یہ ظاہر ہے کہ شیطان کبھی بھی اپنے کام میں سستی نہیں کرے گا، اس طرح علوم کو میری عزت سے کوئی خطرہ نہیں ہے، علوم ان لوگوں کی وجہ پھیلنے کے جن کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے، سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

إِنَّ اللَّهَ يُؤْتِي هَذَا الدِّينَ بِأَقْوَامٍ لَا خَلْقَ لَهُمْ وَإِنَّ اللَّهَ لَيُؤْتِي هَذَا الدِّينَ بِالرَّجُلِ الْفَاجِرِ (۱)

اللہ تعالیٰ اس دین کی تائید ایسے لوگوں سے کرے گا جن کو دین میں کچھ بہرہ نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ اس دین کی تائید بدکار آدمی سے کرے گا۔

عالم کو ان تلیسات سے فریب نہیں کھانا چاہیے، ایسا نہ ہو کہ وہ مخلوق کے ساتھ اختلاط میں مشغول ہو جائے، اور اس کے دل میں جاہ و ثناء کی محبت پروان چڑھنے لگے، مال و جاہ کی محبت نفاق کا بیج ہے، سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں۔

حُبُّ الْجَاهِ وَالْمَالِ يُنْبِتُ النِّفَاقَ فِي الْقَلْبِ كَمَا يُنْبِتُ الْمَاءُ الْبَقْلَ (۲)

جاہ اور مال کی محبت دل میں اس طرح نفاق پیدا کرتی ہے جس طرح پانی سبزی اگاتا ہے۔

مَا ذَنْبَانِ خَصَّ رِيَاسَانِ أَرْسِلَ فِي زُرِّيَّةِ عَنِمٍ بِكَثْرَةِ أَفْسَادٍ فِينَا مِنْ حُبِّ الْجَاهِ وَالْمَالِ فِي دِينِ الْمُعْرِءِ الْمُسْلِمِ (۳)

دو خونی غمخوار بھیڑیے جو کسی گائے میں چھوڑ دیئے جائیں اتنے نقصان کا باعث نہیں ہوتے جتنا نقصان مال و جاہ کی محبت سے مومن کے دین کو لاحق ہوتا ہے۔

جاہ کی محبت دل سے اس وقت تک زائل نہیں ہوتی جب تک لوگوں سے کنارہ کشی اختیار نہ کی جائے، اور ان کے ساتھ ملنے جلنے سے اجتناب نہ کیا جائے، اور وہ تمام چیزیں ترک نہ کی جائیں جو لوگوں کے دلوں میں اس کی محبت اور جاہ پر بھاتی ہوں، عالم کو اپنے دل کی ان مخفی صفات کی جستجو کرنی چاہیے، اور ان سے بچنے کا طریقہ اختیار کرنا چاہیے، یہ ایک مقلی اور پرہیزگار عالم کا فریضہ ہے، اور ہم جیسے لوگوں کو یہ چاہیے کہ ان امور میں فکر کریں جو یوم حساب پر ہمارے ایمان کو بچھڑ کریں، اگر سلف صالحین ہمیں دیکھ لیتے تو وہ قطعیٹ کے ساتھ یہ بات کہتے کہ یہ لوگ یوم حساب پر ایمان نہیں رکھتے، کیا ہمارے اعمال ان لوگوں کے سے ہیں جو جنت اور دوزخ پر ایمان رکھتے ہیں اس لئے کہ جو شخص کسی چیز سے ڈرتا ہے اس سے دور بھاگتا ہے، اور جو شخص کسی چیز کی امید کرتا ہے اسے طلب کرتا ہے، اور ہم یہ بات جانتے ہیں کہ آگ سے فرار کا مطلب ہے مشتبہ اور حرام امور ترک کرنا اور معاصی سے کنارہ

(۱) یہ دونوں روایتیں پہلے بھی گزری ہیں (۲) یہ حدیث بھی گزری ہے۔ (۳) یہ حدیث بھی پہلے گزری ہے۔

کشی اختیار کرنا، حالاں کہ ہم ان میں منہمک ہیں۔ اور جنت نقلی عبادات کی کثرت سے حاصل ہوتی ہے، جب کہ ہم فرائض میں بھی کوتاہی کرتے ہیں۔ ہمارے نزدیک تو علم کا صرف یہ ثمر ہے کہ لوگ دنیا کی حرص و ہوس میں ہماری اقتداء کریں اور یہ کہا جائے کہ اگر حرص دنیا مذموم ہوتی تو علماء اس سے بچتے اور اجتناب کرنے کے زیادہ مستحق ہوتے، کیا اچھا ہو تاکہ ہم جاہل عوام کی طرح ہوتے جن کے مرنے سے ان کے گناہ بھی مراحاتے ہیں، کتنا بڑا فتنہ ہے جس میں ہم جلا ہیں، کاش ہم سوچ سکتے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہماری اصلاح فرمائے، اور ہمارے ذریعے دوسروں کی بھی، اور ہمیں موت سے پہلے توبہ کی توفیق عطا فرمائے وہ مہمان ہے، کریم ہے، شہم ہے۔

علوم معاملہ میں فکر کرنے کا یہ طریقہ تھا جو علماء اور صلحاء نے اختیار کر رکھا تھا، جب وہ لوگ اس طریقہ سے فارغ ہوتے تو پھر اپنے نفسوں کی طرف ان کالفتات باقی نہیں رہتا تھا، بلکہ ان انکار سے ترقی کر کے وہ اللہ تعالیٰ کی عظمت و جلال اور قلب کی آنکھوں سے اس کے مشاہدہ جمال کی لذت میں فکر کرنے لگتے تھے، لیکن یہ فکر اسی وقت حاصل ہوتا ہے جب کوئی تمام مملکت سے دور ہو، اور تمام منہیات سے متصف ہو، اگر اس سے پہلے یہ ظاہر بھی ہوا تو ناقص اور عارضی ہوگا، اور اس کی مثال ایسی ہوگی جیسے بجلی چمک کر معدوم ہو جائے، مملکت سے برأت اور منہیات سے انصاف کے بغیر جو شخص فکر الہی میں مشغول ہوتا ہے وہ اس عاشق کی طرح ہے جسے اپنے معشوق کے ساتھ تنہائی میسر آئی ہو، اور اس کے کپڑوں میں سانپ اور پتھر رینگ رہے ہوں، اور اسے کاٹ رہے ہوں، ظاہر ہے ان کیڑوں کے کاٹنے کی تکلیف سے اس غلطی کی تمام لذت ضائع ہو جائے گی، اور تمام لطف قارت ہو جائے گا، صفات مذمومہ، ملکہ بھی سانپ پتھر کی طرح ایذا دینے والی ہیں، اور جمال الہی کے مشاہدے کی لذت کو مکتدر کرنے والی ہیں، قبر میں ان سے جو تکلیف ہوگی وہ سانپ پتھروں کے کاٹنے سے زیادہ ہوگی۔ اس تفصیل سے ثابت ہوتا ہے کہ بندے کو اپنے نفس کی پسندیدہ اور ناپسندیدہ صفات میں کس طرح فکر کرنا چاہیے۔

دوسری قسم۔ اللہ تعالیٰ کی جلالت، عظمت اور کبریائی میں فکر : فکر کی دوسری قسم یہ ہے کہ بندہ اللہ تعالیٰ کی جلالت، عظمت اور کبریائی میں فکر کرے اس فکر کے دو مقام ہیں، پہلا مقام جو اعلیٰ ہے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات اور اس کے اسماء کے معانی میں فکر کیا جائے اور یہ وہ مقام ہے جس سے منع کیا گیا ہے اس لئے کہ کہہ دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں فکر کرو، اس کی ذات میں فکر مت کرو، منع اس لئے کیا گیا ہے کہ عقلیں اس حیران رہ جاتی ہیں، صرف صدیقین ہی اس کی طرف نگاہ اٹھانی کی جرأت کر سکتے ہیں، مگر دوام نظر کا حوصلہ ان میں بھی نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کے جلال کی نسبت مخلوق کی آنکھوں کا حال ایسا ہے جیسے شہرک کی آنکھوں کا حال آفتاب کی روشنی کے مقابلے میں ہوتا ہے، شہرک آفتاب کی روشنی برداشت نہیں کر پاتی، اس لئے وہ دن میں چھپی رہتی ہے، اور رات کے وقت آفتاب کی باقی رہ جانے والی روشنی میں اڑتی پھرتی ہے، اور صدیقین کا حال ایسا ہے جیسے دھوپ میں عام آدمی کا حال ہوتا ہے کہ وہ سورج کی طرف دیکھ سکتا ہے، لیکن اسے دوام نظر کی تاب نہیں ہوتی، بلکہ یہ خطروں سے کہیں مسلسل دیکھنے سے بصارت زائل نہ ہو جائے، خوب گہری نظر سے دیکھنا بھی۔ خواہ وہ مختصر وقفے کے لئے ہو۔ آنکھوں کے لئے نقصان کا باعث ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کی ذات کی طرف دیکھنے سے بھی حیرت اور استعجاب پیدا ہوتا ہے، اور عقل مضطرب ہو جاتی ہے اس لئے بہتر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کو اپنے فکر کی جولانگاہ نہ بنائے کیونکہ اکثر عقلیں اس فکر کا تحمل نہیں کر سکتیں، بلکہ فکر کی وہ معمولی مقدار جس کی علماء نے صراحت کے ساتھ اجازت دی ہے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مکان، اطراف اور جہات سے پاک ہے، نہ وہ عالم کے اندر ہے اور نہ باہر ہے، نہ اس سے متصل ہے اور نہ اس سے جدا ہے، بعض لوگوں کی عقلیں اس سلسلے میں اس قدر حیران و پریشان ہوئیں کہ اس سے انکار کر بیٹھے، کیونکہ نہ ان میں ان باتوں کے سننے کی طاقت تھی، اور نہ سمجھنے کی، بعض لوگ اس سے کم درجے کی تہذیب بھی برداشت نہ کر سکتے، چنانچہ جب ان سے کہا گیا کہ اللہ تعالیٰ اس سے بلند تر ہے کہ اس کے سر ہو، پاؤں ہاتھ یا آنکھ ہو، یا کوئی دوسرا عضو ہو، یا کوئی ایسا جسم شخص ہو جو کسی مقدار یا حجم میں سا سکتا ہو ان

لوگوں نے اس کا بھی انکار کیا اور کہنے لگے کہ یہ تو اللہ تعالیٰ کی عظمت و جلالت میں نقصان کی بات ہے، بعض احمق عوام تو یہاں تک کہنے لگے کہ تم اللہ تعالیٰ کی جو تعریف کر رہے ہو وہ ایک ہندوستانی غریبوں کی تعریف معلوم ہوتی ہے، ان احمقوں کا خیال یہ تھا کہ بزرگی اور عظمت اعضاء میں ہوتی ہے، اس کی یہ وجہ ہے کہ انسان صرف اپنے جسم کو جانتا ہے اور اسی کو بڑا سمجھتا ہے، جو چیز صفات میں اس کے نفس کے برابر نہیں ہوتی اسے عظیم نہیں سمجھتا، چنانچہ جو شخص تمام تر عظمت اور بڑائی اس میں سمجھتا ہے کہ کسی مریض تخت پر بیٹھا ہوا ہو، اور سامنے دست بستہ غلاموں کی قطار ہو، اور وہ انہیں حکم دے رہا ہو، چنانچہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں بھی اس کا یہی تصور ہے کہ وہ ایک تخت پر بیٹھا ہوا اپنے ہزاروں لاکھوں نوکروں پر حکم چلاتا ہے، اور اس تصور کو وہ اللہ تعالیٰ کی عظمت کا اعتراف قرار دیتا ہے اور اس بے چارے پر کیا موقوف ہے اگر کبھی کو عقل ہوتی اور اس سے کہا جاتا کہ حیرے خالق کے بازو نہیں ہیں، اور نہ وہ اسی طرح اڑتا ہے جس طرح تو اڑتی ہے تو کبھی یقین نہ کرتی کہ اس کے خالق کے بازو ٹوٹے ہوئے ہیں یا وہ مخدور ہے، بھلا مجھے تو اس نے اڑنے کی قدرت اور اس کا آلہ دیا، اور خود نہ یہ قدرت رکھتا ہے اور نہ یہ آلہ حالانکہ وہ میرا خالق ہے مجھے بنانے والا ہے، اکثر لوگوں کی عقلوں کا حال یہی ہے، واقعی انسان بڑا عالم، جاہل اور ناشکرا ہے، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک نبی سے فرمایا کہ میرے بندوں کو میری صفات مت بتلاؤ وہ انکار کر دیں گے، بلکہ انہیں وہ باتیں بتلاؤ جو ان کی سمجھ میں آجائیں، ادب شرع اور اصلاح خلق کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کی ذات میں فکر کے درپے نہ ہوں، اسی لئے ہم پہلے مقام سے عدول کر کے دوسرے مقام پر منتقل کرتے ہیں۔

دوسرا مقام یہ ہے کہ ہم اس کے افعال، اس کی قدرت اور صفات کے عجائبات، اور مخلوق کے سلسلے میں اس کے عجیب و غریب معاملات میں فکر کریں، یہ امور اس کی جلالت، کبریائی، تقدس اور برتری پر بھی دلالت کرتے ہیں، اور اس کے کمال، علم، کمال حکمت، کمال قدرت، اور نفوذ مشیت پر بھی دلالت کرتے ہیں، معلوم ہوا کہ ہمیں اس کی صفات پر نظر نہ کرنی چاہیے بلکہ ان صفات کے آثار پر نظر کرنی چاہیے، کیونکہ ہم صفات کی طرف دیکھنے کی طاقت نہیں رکھتے جس طرح ہم سورج کو نہیں دیکھ سکتے لیکن جب سورج کی روشنی سے زمین روشن ہو جاتی ہے تو ہم اسے دیکھ سکتے ہیں، اور اس سے یہ استدلال کرتے ہیں کہ چاند اور دوسرے کواکب کی روشنی کے مقابلے میں سورج کی روشنی بہت زیادہ ہے، زمین کا نور سورج کے نور کا اثر ہے اور اثر سے مؤثر پر دلالت ہوتی ہے، اگرچہ مؤثر کا مشاہدہ نہ ہو سکے، دنیا کی تمام موجودات اللہ تعالیٰ کی قدرت کے آثار میں سے ایک اثر اور اس کی ذات کے انوار میں سے ایک نور ہے، بلکہ کوئی تاریکی عدم سے بڑھ کر نہیں ہوتی، اور نہ کوئی نور وجود سے زیادہ واضح ہوتا ہے، تمام اشیاء کا وجود اللہ تعالیٰ کی ذات کا نور ہے، کیونکہ تمام اشیاء اس کی ذات کے ساتھ قائم ہیں اور وہ خود بخود قائم ہے، جیسے جسموں کا نور آفتاب سے ہے، اور آفتاب خود روشن ہے، اور جب آفتاب قدرے روشن ہو جاتا ہے تو ایک طشت میں پانی ڈال کر اس کا عکس دیکھا جاتا ہے کیونکہ اس پر نظر ٹھہر جاتی ہے، گویا پانی کے ذریعے سورج کی روشنی کچھ کم کر دی جاتی ہے، اسی طرح افعال الہی بھی قائل کے مشاہدے کا ایک ذریعہ ہیں، ہم اس کی صفات کا مشاہدہ کرتے ہیں، اس کے نور ذات سے حیران نہیں ہوتے، اسی لئے سرکارِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

تَفَكَّرُوا فِي خَلْقِ الدُّمُوعِ لَا تَتَفَكَّرُوا فِي ذَاتِ الدُّمُوعِ
اللہ کی مخلوق میں فکر کرو اس کی ذات میں فکر مت کرو۔

خلق خدا میں تفکر کا طریقہ : جانا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا جو چیز بھی موجود ہے وہ اس کا فعل اور اس کی مخلوق ہے، اور ہر ذوق میں جو ہر عرض اور موصوف و صفت کے ایسے عجائب و غرائب ہیں جن سے اللہ تعالیٰ کی حکمت، قدرت، جلالت اور عظمت کا اظہار ہوتا ہے، ان عجائبات کا شمار ممکن نہیں ہے، اگر سمندر کو روشنائی بتا دیا جائے اور اس کے ذریعے عجائبات لکھنے شروع کئے جائیں تو روشنائی ختم ہو جائے، اور عجائبات کا دسواں حصہ بھی تحریر کی قید میں نہ آسکے، لیکن ہم بطور نمونہ کچھ لکھ رہے ہیں، ان کی

دستی میں باقی عجائبات کو قیاس کیا جاسکتا ہے۔

موجودات کی قسمیں : دنیا میں اللہ تعالیٰ کی مخلوق موجودات جس قدر بھی ہیں دو قسموں میں منحصر ہیں، ایک وہ ہیں جن کی اصل کا ہمیں علم نہیں، اس قسم کی موجودات میں ہم تکثر نہیں کر سکتے اور اس طرح کی موجودات بے شمار ہیں جن کا ہمیں علم نہیں ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام میں ارشاد فرمایا ہے
وَنَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُونَ۔ (پ ۱۳ ر ۸ آیت ۸)
اور وہ ایسی ایسی چیزیں بناتا ہے جن کی تم کو خبر بھی نہیں۔
سُبْحَانَ الَّذِي خَلَقَ الْأَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا نَبَتْ الْأَرْضُ وَمِنْ أَنْفُسِهِمْ وَمِمَّا لَا يَعْلَمُونَ۔ (پ ۳ ر ۲ آیت ۳۶)

پاک ہے وہ ذات جس نے تمام مقابل قسموں کو پیدا کیا نباتات زمین کے قبیل سے بھی اور ان آدمیوں میں سے بھی اور ان چیزوں میں سے بھی جن کو لوگ نہیں جانتے۔

وَنَنْشِئُكُمْ فِي مَا لَا تَعْلَمُونَ۔ (پ ۲ ر ۱۵ آیت ۶)

اور تم کو ایسی صورت میں بنادیں جن کو تم جانتے ہی نہیں۔

دوسری قسم میں وہ موجودات ہیں جن کی اصل ہمیں معلوم ہے اور جو اجمالی طور پر معروف ہیں، لیکن انکی تفصیل ہمیں معلوم نہیں ہے، ایسی اشیاء کی تفصیل میں ہم فکر کر سکتے ہیں، ان اشیاء کی بھی دو قسمیں ہیں، کچھ وہ ہیں جو آکھ سے نظر آتی ہیں اور کچھ وہ ہیں جو آکھ سے نظر نہیں آتیں، جو چیزیں آکھ سے نظر نہیں آتیں وہ فرشتے، جن شیاطین، عرش اور کرسی وغیرہ ہیں، لیکن ان میں فکر کا دائرہ بہت تنگ اور محدود ہے، اس لئے ہم صرف وہی قسم لکھتے ہیں جو ہم سے قریب تر ہے، اور اس قسم میں وہ اشیاء ہیں جو آکھ سے نظر آتی ہیں جیسے آسمان، زمین، اور ان کے درمیان کی چیزیں، آسمان میں ستارے، چاند، اور سورج نظر آتے ہیں، اور ان کی حرکت اور طلوع و غروب کے لئے ان کی گردش محسوس ہوتی ہے، زمین میں پہاڑ، کانیں، نہریں، سمندر، حیوانات اور نباتات نظر آتے ہیں، اور آسمان و زمین کے درمیان فضا ہے جس میں بادل، بارش، برف، بجلی، ہوا اور ستاروں کے ٹوٹنے کا مشاہدہ ہوتا ہے، بہر حال آسمان و زمین میں ان اجناس کا مشاہدہ ہوتا ہے، پھر ہر جنس مختلف انواع میں منقسم ہوتی ہے، اور ہر نوع کی مختلف قسمیں نکلتی ہیں، اور ہر قسم کی اصناف ہو جاتی ہیں، صفت، صفت اور ظاہری و باطنی معنی کے لحاظ سے یہ اصناف ناقابل شمار ہیں، اور ان تمام اصناف میں فکر کی گنجائش ہے۔

آسمان و زمین کا کوئی ذرہ خواہ اس کا تعلق جمادات، نباتات، یا حیوانات کسی بھی چیز سے ہو ایسا نہیں ہے جس کو حرکت دینے والا اللہ تعالیٰ نہ ہو، اور اس کی حرکت میں ایک یا دو یا دس یا ہزار عظمتیں ایسی نہ ہوں جن سے اللہ کی وحدانیت، اس کی جلالت اور عظمت پر دلالت ہوتی ہو یہ تمام چیزیں گویا اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کی دلائل اور جلالت کی نشانیاں ہیں، قرآن کریم میں ان آیات و دلائل میں فکر کرنے کی ترغیب دی گئی ہے، ارشاد ہے۔

إِنْ فِي خَلْقِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَآيَاتٍ لِأُولِي الْأَلْبَابِ۔
(پ ۱۳ ر ۱۹ آیت ۱۹)

بلاشبہ آسمانوں اور زمین کے بنانے میں اور یکے بعد دیگرے رات اور دن کے آنے جانے میں دلائل ہیں اہل عقل کے لئے۔

قرآن کریم میں متعدد مواقع پر وہی آیت کے الفاظ آئے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی نشانیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہاں ہم بعض آیات میں فکر کرنے کا طریقہ بیان کرتے ہیں۔

انسانی نطفے کا ذکر : انسان کا نطفہ اس کی بے شمار آیات میں سے ایک آیت ہے جس سے انسان پیدا ہوا ہے جو چیز تھ سے انتہائی قریب ہے وہ خود تیرا نفس ہے اور اس میں اتنے عجائب مخفی ہیں کہ عمریں فنا ہو جائیں مگر تجھے ان عجائبات کا سوا اس حصہ بھی معلوم نہ ہو، لیکن تو ان عجائبات سے غافل ہے بھلا جو شخص خود اپنے نفس سے غافل ہو گا وہ غیر کی معرفت کیسے حاصل کر سکے گا اللہ تعالیٰ نے بے شمار مواقع پر انسان کو اپنے نفس میں غور و فکر کرنے کی دعوت دی ہے ارشاد ربانی ہے۔

وَفِي أَنْفُسِكُمْ أَفَلَا تُبْصِرُونَ۔ (پ ۱۸، آیت ۲۸)

اور خود تمہاری ذات میں بھی کیا تم کو دکھائی نہیں دیتا۔

قُلِ الْإِنْسَانُ مَا أَكْفَرَهُ مِنْ أَيِّ شَيْءٍ خَلَقَهُ مِنْ نُّطْفَةٍ خَلَقَهُ فَقَدَرَهُ ثُمَّ السَّبِيلَ يَسْرَهُ ثُمَّ أَمَّا تَعْتَابِرُهُ ثُمَّ إِنْ شَاءَ اللَّهُ تَشْرَهُ۔ (پ ۵۳، آیت ۲۳)

خدا کی بارودہ کیا ناشکرا ہے اللہ تعالیٰ نے اس کو کیسی حقیر چیز سے پیدا کیا، نطفے سے (پیدا کیا) اس کی صورت بنائی پھر انداز سے اس (کے اعضاء) بنائے، پھر اس کو (نطفے کا) راستہ آسان کر دیا، پھر اس کو موت دی، پھر اس کو قبر میں لے گیا، پھر جب اللہ چاہے گا اس کو دوبارہ زندہ کرے گا۔

وَمِنْ آيَاتِنَا أَنْ خَلَقْنَاكُمْ مِنْ نَرٍ وَإِنَّا أَنْتُمْ بِسَرٍّ تَنْشُرُونَ۔ (پ ۶۲، آیت ۲۰)

اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا، پھر تمہوڑے ہی دونوں بعد تم آدمی بن کر پھیلے ہوئے پھرتے ہو۔

الَمْ يَكُنْ نُّطْفَةً مِنْ مَنِيٍّ يُمْنَى ثُمَّ كَانَ عُلُقَةً فَخَلَقَ فَسَوَّى۔ (پ ۱۸، آیت ۳۷-۳۸)

کیا یہ شخص ایک قطرہ مٹی نہ تھا جو (رحم میں) ٹپکایا گیا تھا، پھر وہ خون کا لو تھڑا ہو گیا پھر اللہ نے (اس کو انسان) بنایا، پھر اعضاء درست کئے۔

الَمْ نَخْلُقْكُمْ مِنْ مَّاءٍ مَهِينٍ فَجَعَلْنَاهُ فِي قَرَارٍ مَكِينٍ إِلَى قَدَرٍ مَعْلُومٍ۔ (پ ۲۷، آیت ۲۲)

کیا ہم نے تم کو ایک بے قدر پانی سے نہیں بنایا۔ پھر ہم نے اس کو ایک وقت مقرر تک ایک محفوظ جگہ میں رکھا۔

أَوَلَمْ يَرِ الْإِنْسَانُ أَنَّا خَلَقْنَاهُ مِنْ نُّطْفَةٍ فَإِذَا هُوَ خَصِيمٌ مُبِينٌ۔ (پ ۲۳، آیت ۷۷)

کیا آدمی کو معلوم نہیں کہ ہم نے اس کو نطفے سے پیدا کیا، سو وہ اعلانیہ اعتراض کرنے لگا۔

إِنَّا خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ مُفْشَاةٍ۔ (پ ۲۹، آیت ۲۱)

ہم نے اس کو مخلوق نطفے سے پیدا کیا۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ سُلَالَةٍ مِنْ طِينٍ ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نُفُورًا فَنُفُورًا مَكِينًا ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعُلُقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظَامًا فَكَسَوْنَا الْعِظَامَ لَحْمًا۔ (پ ۱۸، آیت ۳۳-۳۴)

اور ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصہ سے بنایا، پھر ہم نے اس کو نطفے سے بنایا جو ایک محفوظ مقام میں رہا، پھر ہم نے اس نطفہ کو خون کا لو تھڑا بنادیا۔ پھر ہم نے اس خون کے لو تھڑے کو بوٹی بنادیا۔ پھر ہم نے اس بوٹی (کے بعض اجزاء) کو ہڈیاں بنادیا۔ پھر ہم نے ان ہڈیوں پر گوشت چڑھا دیا۔

قرآن کریم میں لفظ نطفہ بار بار اس لئے ذکر نہیں کیا گیا کہ محض اس کا سنا متصوّر ہے اس کے معنی میں غور کرنا ضروری نہیں ہے بلکہ اس لفظ کے تکرار میں دعوت فکر موجود ہے۔ مثلاً "تم نطفے کے بارے میں اس طرح فکر کر سکتے ہو کہ یہ پانی کا ایک ٹپاک

قطرہ ہے۔ اگر کچھ دیر کے لئے ہوا میں چھوڑ دیا جائے تو سبز جائے اور بدلو دینے لگے لیکن دیکھو اللہ نے کس طرح یہ قطرہ مردوں کی پشت اور عورتوں کے سینے سے نکالا۔ کس طرح مردوں اور عورتوں میں اجتماع کیا اور ان کے دلوں میں محبت اور الفت پیدا فرمائی اور انہیں محبت و شہوت کی زنجیروں میں قید کر کے یکجا کیا پھر کس طرح جماع کی حرکت کے باعث مو سے منی نکال کر عورت کے رحم میں پہنچائی۔ پھر کیسے عورت کی رگوں میں سے حیض کا خون اٹھا کر کے اس کے رحم میں ذخیرہ کیا۔ پھر منی کے اس قطرہ سے بچہ بنایا اور اسے حیض کی غذا دی۔ یہاں تک کہ اس نے نشوونما پائی اور بڑا ہوا۔ دیکھو منی کا قطرہ نہایت سفید اور چمکتا ہوا تھا لیکن اسے سرخ پتلی بنایا، پھر پتلی کو لو تھرا کیا، پھر نطفے کے حصے کو دیے حالانکہ یہ تمام حصے ایک ہی چیز کے تھے، لیکن حکمت دیکھو کہ کسی حصے سے ہڈیاں بنائیں، کسی سے پٹھے بنائے، کسی سے رگیں اور گوشت بنایا۔ پھر گوشت، پٹھوں اور رگوں کے ذریعہ ظاہری اعضاء بنائے، سر کو گول بنایا، کان، آنکھ، ناک، منہ اور دوسرے منفذ بنائے۔ ہاتھ اور پاؤں کو لہبا کیا، ان کے سروں میں انگلیاں بنائیں اور انگلیوں کے سرے میں پورے بنائے، پھر اندرونی اعضاء بنائے جن میں دل، جگر، معدہ، تلی، پیہبہ ہڈی، رحم، مثانہ اور آنتیں وغیرہ ہیں۔ ہر عضو کی اپنی مخصوص شکل، مخصوص سائز اور مخصوص عمل ہے۔ پھر ان اعضاء میں سے ہر عضو کو دوسری قسموں میں تقسیم کیا مثلاً آنکھ کے سات طبقے بنائے، ہر طبقے کا ایک خاص وصف اور مخصوص فیتہ ہے۔ اگر ان میں سے ایک طبقہ بھی مفقود ہو جائے یا اس کی صفات میں سے کوئی صفت زائل ہو جائے تو آنکھ پینائی سے محروم ہو جائے، اگر ہم ان اعضاء کو الگ الگ لیں اور جو کچھ عجائبات اور آیات ان میں پوشیدہ ہیں بیان کرنا شروع کر دیں تو عمریں تمام ہو جائیں بیان ختم نہ ہو۔

مثال کے طور پر ہڈیوں پر نظر ڈالو، یہ سخت اور مضبوط اجسام ہیں، مگر ان کی تخلیق ایک نرم اور ہتھوڑے ہوئے مادے سے عمل میں آئی ہے۔ پھر ان ہڈیوں کو جسم کے قیام، ٹھہراؤ اور راست رہنے کا سبب قرار دیا گیا ہے، پھر تمام ہڈیاں یکساں نہیں ہیں بلکہ مختلف شکلوں اور مختلف مقداروں کی ہیں، بعض بڑی ہیں، بعض چھوٹی ہیں، بعض لمبی ہیں، بعض گول ہیں، بعض کھوکھلی ہیں، بعض ٹھوس ہیں، بعض چمٹی ہیں اور بعض پتلی ہیں۔ غرضیکہ ہر طرح کی ہڈیاں ہیں۔ انسان کو اپنے تمام جسم سے بھی حرکت کرنی پڑتی ہے اور اپنے بعض اعضاء سے بھی، اس لئے اس کے جسم میں مختلف ہڈیاں بنائی گئیں اور ان کو ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح جوڑا گیا کہ ایک ہڈی دوسرے کے بغیر اور ایک عضو دوسرے عضو کے بغیر حرکت کر سکے۔ پھر ہر ہڈی کو وہی ساخت عطا کی گئی ہے جو اس کی حرکت کے مطابق ہو۔ ہڈیوں کو ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح جوڑا ہے کہ ایک ہڈی میں سے نکلے ہوئے ریشے دوسری ہڈی میں پیوست ہو گئے، نیز ایک ہڈی کا سرا کچھ آگے کو نکلا ہوا بنایا ہے اور دوسری ہڈی میں اتنا خلا بنایا ہے کہ پہلی ہڈی کا زائد حصہ اس میں سما سکے۔ اس طرح انسان کو یہ سہولت حاصل ہو گئی ہے کہ اگر وہ اپنے جسم کا کوئی حصہ ہلانا چاہے تو ہلا سکے، اگر یہ جوڑ نہ ہوتے تو اس کے لئے اپنے جسم کے کسی مخصوص حصے کو حرکت دینا آسان نہ ہوتا۔ سر کی ہڈیوں کا معاملہ بھی کچھ کم حیرت ناک نہیں ہے۔ انہیں ایک دوسرے سے پیوست کر کے گول شکل دی، یہ مختلف شکلوں اور مختلف صورتوں کی تقریباً "بچپن ہڈیاں" ہیں، یہ تمام ہڈیاں ملتی ہیں تو سر بنتا ہے۔ ان میں سے چھ ہڈیاں کھوپڑی کے ساتھ مخصوص ہیں اور چودہ ہڈیاں اوپر کے جڑے کی ہیں اور بارہ نیچے کے جڑے کی ہیں اور باقی دانت ہیں۔ ان میں سے بھی بعض دانت چوڑے ہیں جو کھانے کو پینے کی صلاحیت رکھتے ہیں، بعض دانت تیز ہیں جن سے غذا کاٹنی جاتی ہے۔ بعض ٹوکیلے ہیں، بعض داڑھیں ہیں اور بعض کچلیاں ہیں اور بعض سادہ دانت ہیں۔ پھر گردن کو سر کی سواری بنایا اور اسے سات منکوں سے مرکب کیا جو چھ میں سے خالی اور گول ہیں۔ ان میں سے بعض چھوٹے اور بعض بڑے ہیں، تاکہ ایک دوسرے میں اچھی طرح پیوست ہو سکیں۔ اس کی حکمت کا بیان بڑا تفصیل طلب ہے۔ پھر گردن کو پیٹھ پر سوار کیا اور پیٹھ کو گردن کے نچلے حصے سے سرین کی ہڈی تک چوبیس منکوں سے بنایا اور سرین کی ہڈی کے تین مختلف حصے کئے، نیچے کی طرف سے وہ ہڈی ریڑھ کی ہڈی سے وابستہ ہے اور یہ بھی تین اجزاء پر مشتمل ہے، پھر پیٹھ کی ہڈیوں کو سینے، موٹڑھوں، ہاتھوں، زیر ناف اور سرین کی ہڈیوں کے ساتھ جوڑا، پھر رانوں، پنڈلیوں اور انگلیوں کی ہڈیاں ہیں۔ ہم الگ الگ شمار کر کے گفتگو کو طویل نہیں دینا چاہتے۔ تمام

بدن میں دو سواڑ تالیس ہڈیاں ہیں۔ ان میں وہ چھوٹی ہڈیاں داخل نہیں ہیں جن سے جوڑوں کے خالی حصے بھرے گئے ہیں۔ دیکھو اللہ تعالیٰ نے یہ تمام اعضاء کس طرح ایک رقیق اور نرم مادے سے پیدا کئے ہیں۔ ہڈیوں کی تعداد بیان کرنے سے یہ مقصود نہیں ہے کہ ہم ہڈیاں شمار کرنا چاہتے ہیں۔ یہ علم اطباء سے متعلق ہے اور وہ ان کی تعداد خوب جانتے ہیں۔ ہم تو صرف اس کے بنانے والے، اس کے خالق سے غرض رکھتے ہیں کہ اس نے انہیں کیسے بنایا، کس طرح ان کی شکلیں اور مقداریں ایک دوسرے سے مختلف بنائیں اور پھر انہیں اس مخصوص عدد میں منحصر رکھا اور نہ اگر ایک ہڈی بھی زیادہ ہو جاتی تو انسان کے لئے وہاں بن جاتی اور اسے ضرورت پیش آتی کہ وہ زائد ہڈی اس کے جسم سے نکال دی جائے اور اگر ایک ہڈی بھی کم ہو جاتی تو جسم میں عیب رہ جاتا اور اس کے تدارک کی ضرورت ہوتی۔ طبیب ہڈیوں پر اس لئے غور کرتا ہے کہ وہ ان کا علاج کر سکے اور عقلمند انسان اس لئے نظر ڈالتا ہے کہ ان کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی جلالت اور عظمت پر استدلال کرے، دونوں کے نقطہ نظر میں زبردست فرق ہے۔

پھر یہ بھی دیکھو کہ اللہ تعالیٰ نے ہڈیوں کو حرکت دینے کے آلات پیدا کئے، انہیں پٹھے کہہ سکتے ہیں۔ انسان کے بدن میں پانچ سو انتیس پٹھے ہیں اور ہر پٹھا گوشت، بند اور مصلیوں سے مل کر رہا ہے۔ یہ تمام پٹھے مختلف شکلوں اور مقداروں کے ہیں اور جس جگہ سے متعلق ہیں اسی کی مناسبت سے بنائے گئے ہیں، ان میں جو ہیں پٹھے تو آنکھ اور پلکوں کو حرکت دینے کے لئے بنائے گئے ہیں، اگر ان میں سے ایک بھی کم ہو جائے تو آنکھ کا نظام درہم برہم ہو جائے، اسی طرح ہر عضو کے لئے مخصوص تعداد میں عضلات ہیں۔ پٹھوں، رگوں اور شریانوں کی تعداد ان کے نکلنے اور پھیلنے کی جگہوں کا حال اس سے کہیں زیادہ عجیب تر ہے جو بیان کیا گیا ہے، اس کی تفصیل طوالت کا باعث ہوگی۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ آدمی کے لئے ان اجزاء میں سے ایک میں یا ان اعضاء میں سے کسی ایک میں اور پھر تمام جسم کے مقام میں فکر کرنے کی گنجائش ہے۔ اس طرح آدمی جسم کے ان عجائبات، معانی اور صفات میں فکر کر سکتا ہے جو حواس سے معلوم نہیں ہوتے۔ پھر آدمی کے اندرونی جسمانی نظام سے گذر کر اس کے ظاہر پر نظر ڈالو، اس کے باطن میں غور کرو اور اس کی صفات میں داخل کرو تو یہ بھی عجائبات سے خالی نہیں ہے اور یہ تمام چیزیں اسی ایک ٹپاک قطرے سے وجود پذیر ہوئی ہیں۔ جب ایک ٹپاک قطرے میں اس کی منافی کا یہ عالم ہے تو آسمانوں کے ملکوت اور کوکب میں اس کی صنعت اور حکمت کا کیا عالم ہوگا۔ ان کے احوال، اشکال، مقادیر، تعداد اور بعض کے ساتھ بعض کے اجتماع اور افتراق اور غروب و طلوع کے اختلاف میں کیا کیا راز و پنہاں ہوں گے اور کس قدر حکمتیں پوشیدہ ہوں گی۔

جہیں یہ گمان نہ کرنا چاہیے کہ آسمانی ملکوت کا کوئی ذرہ حکمت یا حکمتوں سے خالی ہے بلکہ آسمانی ملکوت صفت کے اعتبار سے محکم، تخلیق کے اعتبار سے پختہ اور عجائبات کے لحاظ سے جامع تر ہے۔ انسان کے جسم سے اس کا کسی بھی اعتبار سے کوئی مقابلہ نہیں ہے بلکہ آسمانی ملکوت کا مقابلہ زمین کی کسی بھی چیز سے نہیں کیا جاسکتا۔ آسمان اور زمین کی چیزوں میں کوئی مناسبت ہی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

أَلَمْ تَرَ أَنَّا أَلْخَقْنَا السَّمَاءَ بَنَاهَا رَفَعْنَا سَمَكُهَا فَسَوَّاهَا وَأَغْطَشْنَا لَيْلَهَا وَأَخْرَجْنَا ضُحَاهَا۔ (پ ۳۰، ر ۳، آیت ۷، ۸)

بھلا تمہارا دوسرا ہمارا پیدا کرنا زیادہ سخت ہے یا آسمان کا؟ اللہ نے اس کو بنایا، اس کی چھت کو بلند کیا اور اس کو درست بنایا اور اس کی رات کو تاریک اور اس کے دن کو ظاہر کیا۔

اب پھر نطفے کی طرف واپس چلو اور غور کرو کہ پہلے اس کا کیا حال تھا اور اب کیا ہو گیا ہے۔ اگر تمام جن اور انس اس امر پر متفق ہو جائیں کہ وہ نطفے کو کان، آنکھ، عقل، قدرت، علم اور مدح دیں یا اس میں ہڈی، رگ، پٹھا، کھال اور ہال پیدا کریں تو وہ اپنے ارادے میں کہیں کامیاب نہ ہوں بلکہ وہ یہ بھی نہیں جان سکتے کہ اس نطفے سے لبا چوڑا انسان کس طرح پیدا ہو جاتا ہے۔ اب تم

اپنے دل پر نظر ڈالو، بعض اوقات تم کسی دیوار کاغذا پر دے پر کسی مصور کی بنائی ہوئی کوئی خوبصورت تصویر دیکھتے ہو اور اس تصویر کی خوبصورتی تمہارے دل و دماغ پر اپنا اثر چھوڑتی ہے، تم بے ساختہ واہ کہہ اٹھتے ہو اور مصور کی نقاشی، چاکرستی اور کمال فن کی داد دینے بغیر نہیں رہتے، دل میں بھی اس کی عظمت کا اعتراف کرتے ہو اور زبان سے بھی اس کا اظہار کرتے ہو حالانکہ تم یہ بات اچھی طرح جانتے ہو کہ وہ تصویر محض ایک نقل ہے۔ ہاتھ، دیوار، قدرت، علم، ارادے، قلم اور رنگ کی مدد سے مصور نے ان اعضاء کی نقل کی ہے جنہیں وہ حقیقت میں بنانے کی صلاحیت نہیں رکھتا بلکہ ایک اور قوت ان اعضاء کی خالق ہے مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ تم یہ تمام باتیں جاننے کے باوجود اس مصور کے فعل کو تعجب کی نظر سے دیکھتے ہو اور یہ نہیں دیکھتے کہ ایک مصور حقیقی بھی ہے جس نے محض ایک قطرے سے انسان کو پیدا کیا۔ پہلے قطرہ بھی نہیں تھا، پھر اسے پشت اور سینے میں مخصوص جگہوں پر پیدا کیا، پھر اسے وہاں سے نکالا، پھر اسے اچھی شکل دی اور عمدہ صورت بنائی اس کے مشابہ اجزاء کو مختلف اجزاء پر تقسیم کیا، پھر ان میں مضبوط ہڈیاں بنائیں، اچھے اعضاء بنائے، ظاہر و باطن کو خوبصورت کیا، رگوں اور پتھوں کو ایک خاص ترتیب سے بنایا اور انہیں غذا کی گذر گاہ قرار دیا تاکہ جسم باقی رہ سکے۔ پھر اس جسم کو سننے، دیکھنے، جاننے اور بولنے والا بنایا، اس کی پشت کو بدن کی بنیاد قرار دیا اور پیٹ کو غذائی آلات کا جامع اور سر کو حواس کا مخزن بنایا، پھر دو آنکھیں کھولیں، ان کے طبقات ایک دوسرے پر رکھے، ان کی شکلیں اچھی بنائیں، اچھا رنگ دیا پھر بولنے پیدا کئے تاکہ آنکھوں کی حفاظت کریں، ان میں جلا پیدا کریں اور خس و خاشاک سے بچائیں، پھر آنکھوں کی پتلیوں میں جس کا حجم مل سے بڑا نہیں ہے، زمین و آسمان کی دو ستیوں سمودیں، وہ آنکھ کے نہایت مختصر شیشے کے ذریعے دور دور تک دیکھ لیتا ہے اور حد نظر تک پھیل ہوئی کوئی چیز اس سے بچ کر نہیں رہ سکتی، پھر دو کان بنائے اور ان میں ایک سطح پانی دو بہت کیا تاکہ سماعت کی حفاظت ہو اور کیزے کوڑے اندر نہ جاسکیں، پھر کان کو ایک سیب جیسے چڑے سے گھیر دیا تاکہ باہر سے آنے والی آواز پہلے اس چڑے میں جمع ہو پھر وہاں سے اندر کان میں پہنچے، اس کی تخلیق میں ایک حکمت یہ بھی ہے کہ اگر کوئی کیرا کان کے اندر جانا چاہے تو اس چڑے پر بیگھنے سے پتا چل جائے، کان کے سورخ میں متحدہ نشیب و فراز اور ٹیز مے میزے راستے رکھے تاکہ اگر کوئی کیرا کان کے اندر گھسنے کی کوشش کرے تو انسان کو خبر ہو جائے خواہ وہ اس وقت سو رہا ہو، کیزے کی مسلسل حرکت اسے بیدار کر سکتی ہے، پھر چہرے کے پھونچ ایک اونچی سی ناک بنائی، یہ انسان کی خوبصورتی کی علامت ہے، ناک کے دو نتھنے رکھے، ان میں سونگھنے کی قوت پیدا کی تاکہ سونگھ کر کھانے پینے کی چیزوں کے اچھے یا برے بولے کا اندازہ کر سکے اور تروتازہ ہوا کھینچ کر قلب کو راحت دے سکے اور باطن کی حرارت سے سکون پائے، پھر منہ پیدا کیا اور اس میں زبان رکھی جو بولتی ہے، دل کی باتیں ظاہر کرتی ہے اور دماغ کی ترجمانی کرتی ہے، منہ کو دانتوں سے نہنت دی، دانت پیسنے، توڑنے اور کاٹنے میں کام آتے ہیں۔ ان کی جڑیں مضبوط، سر نوکیلے اور رنگ سفید ہے، ان کی صفیں سیدھی اور سر کے برابر بنائیں، ان میں ایک ترتیب رکھی، گویا لڑی میں پروئے ہوئے موتی ہوں، دو ہونٹ پیدا کئے، انہیں اچھا رنگ اور شکل دیا، یہ دونوں ہونٹ ایک دوسرے پر اگر منہ کا راستہ بند کر دیتے ہیں، ان کے بند ہونے سے کلام کے بہت سے حروف مکمل ہوتے ہیں، زخم پیدا کیا اور اسے آواز نکالنے کی قدرت دی۔ زبان میں بولنے اور علیحدہ کرنے کی قوت رکھی تاکہ آواز کو الگ الگ مخرج سے باہر نکال سکے اور بہت سے حروف بول سکے، پھر بعض زخمے تنگ اور بعض فراخ بنائے گئے، بعض میں نرمی اور بعض میں سختی ہے، بعض صاف ہیں اور بعض کھورے ہیں، بعض طویل اور بعض حقیر ہیں۔ اسی لئے آوازیں الگ الگ ہوتی ہیں، کسی کی عمدہ اور دل کو بھانے والی، کسی کی سخت اور کھوروی کہ کان نفرت کریں، سب کی آوازیں الگ الگ بنائیں تاکہ آوازوں میں اختلاط نہ ہو اور آواز کی مدد سے اندھیرے میں بھی ایک دوسرے کو پہچانا جاسکے، پھر ہاٹوں سے نہنت دی اور چہرے کے اوڑھی اور بھونوں سے سجایا اور بھونوں کو باریک بانوں سے کمان کی صورت بخشی، آنکھوں کو پلکوں کی جھار دی۔ پھر باطنی اجزاء پیدا کئے اور ان سب کو مخصوص اعمال کے لئے مسخر کیا، چنانچہ معدہ غذا کو پکانے کے لئے مسخر ہے، جگر غذا کو خون بنانے پر مامور ہے، تلی پٹا اور گردے جگر کے خادم بنائے گئے ہیں۔ تلی کی خدمت یہ ہے

کہ وہ جگر سے سوداوی مادے کو جذب کر لیتی ہے۔ پتا صفراوی مادہ کو جذب کرتا ہے اور گردے آبی رطوبت کو جذب کرتے ہیں۔ مثلاً گردے کا خادم ہے، وہ پانی جو گردے میں جمع ہوتا ہے مثلاً اسے قبول کر لیتا ہے اور پیشاب کے راستے سے باہر نکال دیتا ہے۔ رگیں بھی جگر کی خدمت پر مامور ہیں۔ ان کی خدمت یہ ہے کہ وہ خون کو بدن کے ہر حصے میں پہنچاتی ہیں۔ اس کے بعد دونوں ہاتھ پیدا کئے۔ انہیں لمبا بنایا تاکہ مقصود چیزوں کی طرف بڑھ سکیں۔ پھلی کو کشادہ بنایا اور اسے پانچ انگلیوں میں تقسیم کر دیا اور ہر انگلی کو تین تین پودوں پر تنسیم کیا۔ چار انگلیوں کو ایک طرف رکھا اور انگوٹھے کو ایک طرف تاکہ انگوٹھا سب انگلیوں پر گھوم سکے۔ اگر اگلے اور پچھلے زمانے کے تمام لوگ متفق ہو کر نہایت غور و خوض کے ساتھ انگلیوں کی موجودہ ترتیب سے ہٹ کر کوئی اور ترتیب تجویز کریں تو وہ مقاصد حاصل نہ ہوں جو موجودہ ترتیب سے حاصل ہوتے ہیں۔ موجودہ ترتیب میں چاروں انگلیوں سے انگوٹھے دور ہونے، چاروں انگلیوں کی لمبائی میں تفاوت اور ان کے ایک مرتب صف میں ہونے کے اندر وہ حکمتیں پوشیدہ ہیں جو کسی دوسری ترتیب سے حاصل نہیں ہو سکتیں۔ اس ترتیب کے ذریعے ہاتھ پکڑنے اور دینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اگر انگلیوں کو پھیلا لیا جائے تو ایک طشتری بن جائے۔ اس پر جو چیز چاہو رکھ لو اور بند کر لیا جائے تو گھونسا بن جائے جو مارنے کا ایک آلہ ہے اور اگر مکمل طور پر بند کیا جائے تو چلو بن جائے اور اگر انگلیوں کو ملا کر کھول دیا جائے تو کھرپی یا پٹیلے کی شکل اختیار کر لے۔ پھر انگلیوں کے سروں پر ان کی زیبائش کے لئے ناخن پیدا کئے گئے۔ ان ناخنوں کی وجہ سے پشت کی جانب انگلیوں کو سارا بھی ملتا ہے۔ ناخنوں کا ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ جو باریک چیزیں انگلیوں سے نہیں اٹھ پاتیں وہ ناخنوں سے اٹھائی جاسکتی ہیں۔ نیز بدن کو کھانے کے لئے بھی ناخن کی ضرورت پڑتی ہے۔ بظاہر یہ ایک حقیر ترین عضو بدن ہے مگر اس وقت اس کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے جب بدن میں کھلی پیدا ہو اور ناخن موجود نہ ہوں۔ تب پتا چلتا ہے کہ یہ کس قدر قیمتی چیز ہے اور اس کے بغیر انسان کتنا محتاج اور عاجز ہے۔ کھانے میں کوئی چیز ناخنوں کے قائم مقام نہیں بن سکتی ہے پھر ہاتھ خود بخود اس جگہ پہنچ جاتا ہے جہاں کھلی ہو۔ خواہ آدمی نیند میں ہو یا غفلت میں ہو۔ اگر کھیلانے میں کسی دوسرے آدمی کی مدد لی جائے تو وہ سکون حاصل نہیں ہوتا جو خود اپنے ہاتھ سے کھانے میں ملتا ہے۔ علاوہ ازیں خود اپنا ہاتھ جس آسانی سے کھلی کی جگہ تک پہنچ جاتا ہے اتنی آسانی سے دوسرے کا ہاتھ نہیں لے جایا جاسکتا۔ یہ تمام امور نطفے میں پیٹ کے اندر تین تہہ بہ تہہ تاریکیوں کے بعد یکے بعد دیگرے وقوع پذیر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ بالقرض اگر یہ تہہ بہ تہہ تاریکیاں دور کر دی جائیں اور رحم کے اندر بچہ صاف نظر آجائے تو دیکھنے والا خود دیکھ لے کہ یہ امور ایک دوسرے کے بعد خود بخود بنتے چلے جاتے ہیں۔ نہ مصور نظر آتا ہے نہ اس کے آلات نظر آتے ہیں۔ کیا تم نے کوئی ایسا مصور دیکھا ہے جو نہ اپنے آلات کو ہاتھ لگائے اور نہ اپنی مصنوعات کو مگر ان میں اس کا تعارف جاری ہے۔ یہ صرف اسی کی شان ہے اور یہی اس کی عظمت کی دلیل ہے۔

اس کمال ذریت کے بعد اس کی وسیع تر رحمت دیکھو کہ جب رحم تک ہو گیا اور وہ نطفہ بچہ بن کر بڑا ہو گیا تو اسے ہدایت کی کہ وہ رحم میں اتر دھا۔ بجائے اور اس تک جگہ سے نکلنے کی راہ تلاش کرے اور اس سے باہر نکلے۔ اس نے اپنی راہ تلاش کی گویا وہ سمجھتا ہو محتاج و دانا رہتا ہے۔ پھر جب رحم مادر سے باہر آیا اور اسے غذا کی حاجت ہوئی تو اسے اپنی ماں کی چھاتیوں کا پتا بتایا اور ان سے اپنی غذا حاصل کرنے کا طریقہ سکھلایا۔ پھر غذا بھی ایسی نرم اور لطیف پیدا کی جو اس کے مزاج اور جسم سے مطابقت رکھتی ہو۔ یعنی دودھ جو ماں کی چھاتیوں میں سے خون اور غلاظت سے الگ ہو کر نکلتا ہے۔ چھاتیوں پر غور کرو، انہیں کیسا بنایا اور ان میں کس طرح دودھ جمع کیا اور چھاتیوں کے سرے ایسے گول بنائے کہ بچے کے منہ میں سانسکیں اور ان سروں میں ایک تنگ سوراخ بنایا جس کے ذریعے دودھ دبائے بغیر نہیں نکلتا اور نکلتا بھی ہے تو آہستہ آہستہ ہیوں کہ بچہ صرف تھوڑا تھوڑا ہی پی سکتا ہے۔ بچے کو چوسنے کی صلاحیت بخشی۔ وہ اس تنگ سوراخ سے اتنا دودھ برآمد کر لیتا ہے کہ پیٹ بھر سکے۔ پھر اس کی بے پایاں رحمت و وسیع تر شفقت اور لطف و کرم دیکھو کہ پیدائش کے ساتھ ہی دانت نہیں نکلتے بلکہ دو سال کے بعد دانت نکلتے ہیں کیونکہ دو سال تک اس کی غذا

دودھ ہوتی ہے جسے چبانے میں دانتوں کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ پھر جب وہ بڑا ہو جاتا ہے تو پتلا دودھ اس کے مزاج کے موافق نہیں رہتا۔ اس وقت اسے گاڑھی غذا کی ضرورت ہوتی ہے اور اس غذا کو پیتا یا چباتا پڑتا ہے۔ اس کے لئے دانت پیدا کئے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت کے قربان جانیے کہ اس نے نرم مسوڑھوں سے سخت دانت کیسے پیدا کئے۔

اس تمام تحقیقی حکمتوں سے ہٹ کر والدین کے دلوں میں اس کی محبت اور شفقت پیدا کی تاکہ وہ لوگ اس زمانے میں اس کی دیکھ بھال کر سکیں جس زمانے میں وہ خود اپنی دیکھ بھال نہیں کر سکتا۔ اللہ تعالیٰ والدین کے دلوں پر اس کی محبت مسلط نہ کرنا تو وہ مخلوق میں انتہائی عاجز ہوتا۔ پھر جب وہ بڑا ہو جاتا ہے تو اس کو بتدریج قدرت، تمیز، عقل اور ہدایت عطا کی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ سن بلوغ کو پہنچ جاتا ہے۔ پہلے نوجوان بنتا ہے پھر جوان ہوتا ہے پھر اوجیز عمر ہو جاتا ہے۔ پھر بوڑھا ہو جاتا ہے۔ کوئی ناشکرابندہ ہوتا ہے کوئی شکر گزار، کوئی گنہگار ہوتا ہے کوئی اطاعت گزار، کوئی مومن، کوئی کافر، اسی لئے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی تصدیق ہوتی ہے۔ جیسا کہ فرمایا۔

هَلْ أَتَى عَلَى الْإِنْسَانِ حِينٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُورًا إِنَّا خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ
مِنْ نُّطْفَةٍ أَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيهِ فَجَعَلْنَاهُ سَمِيعًا بَصِيرًا إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِرًا
إِمَّا كَفُورًا (پ ۲۹ ر ۱۸ آیت ۱-۳)

بے شک انسان پر زمانے میں ایک ایسا وقت بھی آچکا ہے جس میں وہ کوئی قابل تذکرہ چیز نہ تھا۔ ہم نے انسان کو مخلوق نطفے سے پیدا کیا۔ اس طور پر کہ ہم اس کو مکلف بنائیں تو ہم نے اس کو شاکر یا ناشکر بنایا۔ ہم نے اس کو راستہ بتلایا یا تو وہ شکر گزار ہو گیا یا ناشکر ہو گیا۔

بہر حال پہلے اس کے لطف و کرم پر نظر ڈالو۔ پھر اس کی قدرت و حکمت پر غور کرو۔ اس کے عجائبات ہمیں حیران کر دیں گے۔ حیرت اس شخص پر ہوتی ہے جو کوئی اچھا خط یا عمدہ نقش دیکھ کر حیران ہوتا ہے اور اس کی تعریف و توصیف کرتا ہے اور اپنی تمام تر فکری توانائی نقاش یا خطاط پر مرکوز کر دیتا ہے کہ اس کو کتنی زبردست قوت حاصل ہے اور اس نے کتنا خوبصورت اور دلکش نقش بنایا ہے وہ دیر تک اس کے فن کی داد دیتا ہے اور دل و زبان سے اس کی مشائقی اور چابکدستی کو سراہتا ہے لیکن یہی شخص اپنے نفس کے عجائبات دیکھتا ہے مگر ان کے صانع اور مصور سے غفلت برحق ہے۔ نہ اسے اس کی عظمت کا احساس ہوتا ہے نہ اسے اس کی جالت و حکمت حیران کرتی ہے۔

یہ ہیں ہمارے جسم کے کچھ عجائبات، ان کا احاطہ کرنا بے حد دشوار ہے بلکہ ناممکن ہے۔ ہاں! ان میں فکر کا میدان بڑا وسیع ہے۔ اگر کوئی فکر کرنا چاہے اور یہ عجائبات خالق تعالیٰ کی عظمت پر واضح حجت ہیں۔ اگر کوئی ان سے استدلال کرنا چاہے لیکن تم اپنے پیٹ اور شرمگاہ کی شہوت میں اس قدر منہمک ہو کہ ہمیں اس کے علاوہ کچھ معلوم نہیں کہ بھوک محسوس ہو تو کھانا کھالیا جائے اور پیٹ بھر جائے تو نیند کی آغوش میں پہنچ جاؤ۔ شہوت ہو تو جماع کر لو، غصہ آئے تو برسرِ کار ہو جاؤ۔ بہائم بھی ان امور میں ہمارے شریک ہیں۔ وہ بھی کھانے پینے، سونے اور جماع کرنے کے بارے میں وہی معرفت رکھتے ہیں جو ہمیں حاصل ہے۔ انسان کی وہ خصوصیت جس میں وہ بہائم سے ممتاز ہے یہ ہے کہ اسے اللہ نے آسمانوں اور زمین کے ملکوت اور آفاق اور نفس کے عجائبات میں غور و فکر کرنے کی صلاحیت بخشی ہے۔ اسی خصوصیت کی بناء پر وہ ملائکہ مقربین کے ذمے میں داخل ہو جاتا ہے اور انہی خصوصیت کے باعث وہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کا مقرب بندہ بن کر نبی تین اور صدیقین کے ساتھ اٹھے گا۔ یہ مرتبہ بہائم کو حاصل نہیں ہے اور نہ اس شخص کو حاصل ہے جو دنیا میں بہائم کی شہوات پر راضی ہو گیا بلکہ ایسا شخص تو بہائم سے بھی بدتر ہے اس لئے کہ بہائم کو تو فکری قوت ہی میسر نہیں ہے۔ انسان کو تو یہ قدرت عطا کی گئی ہے مگر اس نے اس سے فائدہ نہیں اٹھایا بلکہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی ناشکری کی۔ ایسے لوگ واقعی چوپایوں سے بھی بدتر اور ان سے زیادہ گمراہ ہیں۔

زمین میں فکر

جب تم اپنے فکس میں فکر کرو تو اس زمین پر بھی نظر ڈالو جو تمہارا مکان ہے۔ پھر اس کی نسوں مسندوں پہاڑوں اور کانوں میں فکر کرو۔ پھر آسمانوں کے ملکوت تک پہنچو۔ زمین میں اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے زمین کو فرش اور بستر بنایا، اس میں سڑکیں اور راستے بنائے، اسے نرم کیا تاکہ تم اس کے اطراف میں پھر سکو، اسے ساکن بنایا تاکہ وہ حرکت نہ کرے، اس میں پہاڑوں کی میخیں گاڑیں تاکہ وہ اپنی جگہ سے نہ ہلے، پھر اسے اتنا وسیع کیا کہ لوگ اس کے اطراف میں پھرنے سے عاجز نظر آتے ہیں، خواہ ان کی عمریں کتنی ہی لمبی کیوں نہ ہوں اور وہ کتنا ہی کیوں نہ گھومیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

وَالسَّمَاءَ بَنَيْنَاهَا بِأَيْدٍ وَإِنَّا لَمُوسِعُونَ وَالْأَرْضَ قَرَشْنَاهَا فَتَنْعَمَ الْمَاهِلُونَ۔
(پ ۲۷ ر ۲ آیت ۷۷-۷۸)

اور ہم نے آسمان کو (اپنی) قدرت سے بنایا اور ہم وسیع القدرت ہیں اور ہم نے زمین کو فرش (کے طور پر) بنایا سو تم اچھے بچانے والے ہیں۔

الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ فِرَاشًا۔ (پ ۱ ر ۳ آیت ۷۷)
جس نے تمہارے لئے زمین کو بستر بنایا۔

هُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ خَلْقًا فَامْشُوا فِي مَنَاكِبِهَا (پ ۲۹ ر ۲ آیت ۱۵)
وہ ایسا ہے جس نے تمہارے لئے زمین کو مسخر کر دیا سو تم اس کے راستوں میں چلو۔

قرآن کریم میں متعدد مواقع پر زمین کا ذکر کیا گیا ہے تاکہ لوگ اس کے عجائبات میں فکر کریں اور یہ سوچیں کہ زندہ لوگ اس کی پشت پر رہتے ہیں اور مرنے کے بعد اس کے پیٹ میں آرام کرتے ہیں اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے۔

لَمْ نَجْعَلِ الْأَرْضَ كِفَاتًا أَحْيَاءً وَآمَاتًا (پ ۲۹ ر ۲۱ آیت ۷۵) کیا ہم نے زمین کو ذندوں اور مردوں کو پیٹنے والا نہیں بنایا۔

پھر زمین پر اس پہلو سے بھی غور کرو کہ یہ بظاہر مردہ ہوتی ہے لیکن جب اس پر پانی پڑتا ہے تو یہ جی اٹھتی ہے اور طرح طرح کی سبزیاں اگتی ہیں۔ اس کے پیٹ سے عجیب و غریب کپڑے کوڑے نکلتے ہیں۔ پھر دیکھو اللہ تعالیٰ نے سخت اور بلند پہاڑوں کے ذریعے زمین کو کس قدر مستحکم بنایا اور ان کے نیچے شیریں اور صاف شہرے پانی کے چشمے رکھے اور نہریں نکالیں جو روئے زمین پر رواں دواں ہیں۔ خشک چٹروں کے نیچے سے نکلنے والے پانی کے ذریعے ہر جاندار اپنی پیاس بجھاتا ہے اور زندہ رہتا ہے۔ اس طرح طرح کے درخت اور سبزیاں پیدا ہوتی ہیں جیسے اناج، انگور، زیتون، کھجور اور انار وغیرہ۔ ہر پھل کا الگ ذائقہ اور ہر اگانہ فصل و صورت اور خوشبو، کھانے میں ایک دوسرے پر فضیلت رکھنے والے یہ انواع و اقسام کے میوے اور پھل پانی ہی کے باعث زمین کے سینے سے نکلتے ہیں، ان کی شکلیں دیکھو کتنی مختلف ہیں، ان کے ذائقے کتنے جدا جدا ہیں، ان کی خوشبوؤں پر نظر ڈالو کس قدر ایک دوسرے سے مختلف ہیں لیکن یہ سب ایک ہی زمین سے نکلتے ہیں اور ایک ہی پانی سے سیراب ہوتے ہیں، اگر تم یہ کہو کہ یہ اختلاف اس لئے ہے کہ ان پہلوں اور میوؤں کی گھٹلیاں اور بیج ایک دوسرے سے مختلف ہیں، ہم کہیں گے کہ گھٹلی میں کھجوروں کے خوشے کہاں تھے اور گیہوں کے ایک دانے میں سات بالیاں کب تھیں اور ہریالی میں سودا نے کب تھے، جنگلوں میں جا کر دیکھو ہر جگہ کی زمین کا ظاہر و باطن یکساں نظر آتا ہے، ہر جگہ کا پانی ایک ہی قسم کا ہے لیکن جب وہ خشک زمین پر پڑتا ہے تو عجیب و غریب چیزیں اس کے باطن سے باہر نکلتی ہیں، کسی کا رنگ کچھ ہوتا ہے اور کسی کا کچھ، ذائقے اور بو بھی ایک جیسی نہیں ہوتی، ان میں بظاہر ایک جیسی نظر آنے والی سبزیاں ہوتی ہیں، پہلے تم ان سبزیوں کی کثرت اور ان کی اشکال کے اختلاف پر نظر ڈالو، پھر ان کے طابع کے اختلاف

اور صنایع کی کثرت پر غور کرو، اللہ تعالیٰ نے حقیر سبزیوں میں کتنے زبردست منافع ودیعت فرمائے ہیں، یہ سبزی غذا بہم پہنچاتی ہے یہ طاقت اور توانائی فراہم کرتی ہے، یہ زندگی دیتی ہے، یہ ہلاک کرتی ہے، یہ بارود ہے، یہ جار ہے۔ یہ معدہ میں پہنچ کر رگوں کی جڑوں سے صفراوی مادہ باہر نکال دیتی ہے، یہ صفراوی مادہ پیدا کرتی ہے، یہ ہضم اور سوداوی مادہ ختم کرنے والی ہے، یہ سبزی ان دونوں مادوں کو جنم دیتی ہے، یہ خون صاف کرتی ہے، یہ خون بناتی ہے، یہ فرحت بخش ہے، یہ نیند لانے والی ہے، اس سے کمزوری لاحق ہوتی ہے، اللہ نے زمین کے جسم سے کوئی ذرہ کوئی تنکا ایسا پیدا نہیں فرمایا جس میں بے شمار منافع نہ ہوں، کسی انسان کے بس کی بات نہیں ہے کہ ان منافع پر پوری طرح مطلع ہو سکے۔

پھر ہر سبزی کے لئے کاشتکار کو عمل کے ایک مخصوص مرحلے سے گزرنا پڑتا ہے۔ مثلاً کھجوروں میں نرمادہ کا پانی ملایا جاتا ہے، انگوروں کو صاف کیا جاتا ہے، کھیتی کو خود روگھاس کی آلودگی سے بچایا جاتا ہے۔ کسی کا بیج بویا جاتا ہے، کسی کی شبنیاں لگائی جاتی ہیں، کسی کی پود لگاتے ہیں، اگر ہم نباتات کی جنسوں کا اختلاف، ان کی قسمیں، منافع، احوال اور عجائبات بیان کرنے بیٹھ جائیں تو عمریں گزر جائیں اور بیان ختم نہ ہو لیکن ہم صرف اسی بیان پر اکتفا کرتے ہیں، تم اسی کی روشنی میں مزید عجائبات پر فکر کر سکتے ہو۔
جواہر اور معدنیات

زمین میں پھاڑ ہیں اور کانیں ہیں، پہاڑوں میں سے سونے، چاندی، فیروزہ، لعل وغیرہ جیسے نفیس جواہر نکلتے ہیں۔ ان میں سے بعض ہتھوڑوں سے پٹتے ہیں، جیسے سونا، چاندی، تاجا، رانگ اور لوہا اور بعض نہیں پٹتے، جیسے فیروزہ اور لعل وغیرہ، پھر یہی نہیں کہ اللہ نے پہاڑوں کے سینے میں جواہر پیدا کر دیئے بلکہ لوگوں کو ان کے نکالنے کا طریقہ بھی بتایا اور یہ بھی سکھایا کہ انہیں کس طرح صاف کیا جائے اور کس طرح ان سے برتن، آلات، سکتے اور زیورات بنائے جائیں، پھر معادن کو دیکھو، ان میں پٹرول، گندھک اور قیرہ ہیں، معدنیات میں سب سے ادنیٰ نمک ہے اس کی ضرورت کھانے میں ہوتی ہے اگر کھانے میں نمک نہ ہو تو مرغن غذا نہیں بیکار ہو جائیں اور کوئی کھانے کا نام نہ لے بلکہ اگر کسی شہر میں نمک نہ رہے تو لوگ مرنے لگیں، اللہ تعالیٰ کی رحمت واسعہ پر نظر کرو کہ بعض زمینوں کے جواہر شوریدہ بنائے ان میں بارش کا صاف پانی جمع ہوتا ہے اور ان شوریدہ جواہر سے مل کر نمک بنتا ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ کوئی شخص تمام چیزیں ملانے بغیر ایک تولہ نمک کھالے۔ نمک صرف کھانے کی اصلاح کے لئے بنایا۔ غرض یہ کہ کوئی حجاد، کوئی حیوان، کوئی نبات ایسی نہیں ہے جس میں ایک یا ایک سے زائد حکمتیں نہ ہوں، اللہ تعالیٰ نے کوئی بھی چیز بیکار نہیں بنائی، نہ کسی چیز کو لود و لعب کے طور پر پیدا کیا بلکہ تمام مخلوق حق کے ساتھ اسی طرح پیدا ہوئی ہے جس طرح اسے پیدا ہونا چاہیے تھا اور جس طرح پیدا کرنا اللہ تعالیٰ کی عظمت و جلالت کے شایان شان ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا إِلَّا عِبَسِينَ مَا خَلَقْنَا هُمَا إِلَّا بِالْحَقِّ۔

(پ ۲۵، ر ۱۵، آیت ۳۸)

اور ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان میں ہے اس کو اس طور پر نہیں بنایا کہ ہم فعل

عصبت کرنے والے ہوں۔ ہم نے ان دونوں کو کسی حکمت ہی سے بنایا ہے۔

حیوانات

حیوانات بھی اللہ تعالیٰ کی زبردست نشانیوں میں سے ایک نشانی ہیں، ان کی بے شمار قسمیں ہیں، بعض ہوا میں اڑتے ہیں، بعض زمین پر چلتے ہیں، پھر زمین پر چلتے والے جانوروں کی بھی متحد قسمیں ہیں، بعض جانور دو پاؤں پر چلتے ہیں، بعض چار پر، بعض دس پر اور بعض سوناٹگوں پر چلتے ہیں جیسا کہ بہت سے حشرات ارض میں اس طرح کے جانوروں کے چلنے کا مشاہدہ ہوتا ہے، پھر منافع، اشکال، اخلاق اور صورتوں کے اعتبار سے بھی بے شمار جانور ایک دوسرے سے مختلف نظر آتے ہیں، فضا میں منزلانے والے پرندوں، خشکی کے وحشی درندوں اور گھروں میں پائے جانے والے جانوروں کو دیکھو، تم ان میں ایسے عجائبات کا مشاہدہ کر گے کہ ان کی موجودگی میں خالق کائنات کی قدرت اور حکمت سے منکر نہیں ہو سکتے اور یہ عجائبات اتنے زیادہ ہیں کہ ان کا احاطہ نہیں کیا

جاسکتا، بلکہ اگر ہم پتھر، چوٹی، کھٹی اور کڑی کے عجائبات بیان کرنے لگیں تو یہ سلسلہ کبھی ختم نہ ہو، یہ ننھے ننھے جانور ہیں مگر تم رات دن دیکھتے ہو کہ یہ جانور اپنے بھڑ اور بے کسی کے باوجود گھر بھی تعمیر کرتے ہیں غذائی مواد بھی جمع کرتے ہیں اپنی مادہ سے الفت کا اظہار بھی کرتے ہیں اور اس کے تقاضے بھی پورے کرتے ہیں، ان کے گرد دیکھو کس قدر مہارت اور خوش سلیقگی سے بنائے جاتے ہیں گویا کسی انجینئر نے مقررہ نقشے کے مطابق تعمیر کئے ہوں۔ اپنی ضرورت کی تمام چیزوں کی طرف وہ کسی خارجی رہنمائی اور ہدایت کے بغیر متوجہ ہو جاتے ہیں، انہیں حاصل کرتے ہیں، کڑی کے حال پر نظر ڈالو وہ اپنا گھر نمر کے کنارے پر بناتی ہے، پہلے وہ ایک ہاتھ لی جگہ خالی جگہ تلاش کرتی ہے اور اس خالی جگہ میں اپنے تار بچھاتی ہے۔ ایک جانب سے اپنی تعمیر کا آغاز اپنے منہ کے لعاب پھینک کر کرتی ہے، یہی لعاب دھاگے کی شکل اختیار کر لیتا ہے، وہ یہ دھاگا دوسری جانب لے جا کر کسی چیز پر چکاڑتی ہے اور اسی طرح لعاب سے دھاگے کی لکیر بناتی ہوئی اس جانب بڑھتی ہے جہاں سے آغاز کیا تھا، یہ عمل کئی بار کرتی ہے، دو دھاگوں کے درمیان مناسب فاصلہ برقرار رکھتی ہے جب دونوں جانب کے سرے مضبوط ہو جاتے ہیں اور دھاگے تانے کی شکل اختیار کر لیتے ہیں تب ہانے میں مصروف ہوتی ہے اور ہانے کو تانے پر رکھتی ہے۔ جہاں جہاں ہانے کا تار تانے کے تار سے ملتا ہے وہاں وہاں گرہ لگا دیتی ہے۔ اس میں بھی تناسب اور مہندسانہ اصولوں کی رعایت کرتی ہے۔ بالآخر اس کی یہ جدوجہد ایک جال کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ جس میں پتھر، کھٹی وغیرہ چھوٹے چھوٹے اڑنے والے کیڑے مکوڑے آسانی سے پھنس جاتے ہیں، اس عمل سے فارغ ہونے کے بعد وہ ایک ایسے کونے میں چھپ کر بیٹھ جاتی ہے جہاں سے وہ اپنے شکار پر نظر رکھ سکے اور شکار اسے نہ دیکھ پائے۔ جب کوئی شکار جال میں پھنستا ہے تو وہ تیزی سے اس کی طرف دوڑتی ہے اور اسے کھاتی ہے، اگر اس طرح شکار کرنے سے تھک جاتی ہے تو اپنے لئے دیوار کا کوئی گوشہ تلاش کرتی ہے اور اس گوشے کے دونوں جانب ایک تار کھینچ دیتی ہے، پھر اس میں ایک دھاگا نیچے کی جانب لٹکا کر خود اس میں لٹک جاتی ہے اور کسی کھٹی، پتھر کی شہر رہتی ہے کہ وہ ادرے گزرے اور اسے اس دھاگے میں قید کر لے جو نیچے لٹکا ہوا ہے اور اسے اپنی خوراک بنانے۔

بہر حال کوئی چھوٹا یا بڑا جانور ایسا نہیں ہے جس میں ناقابل شمار عجائبات نہ ہوں۔ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ کڑی نے شکار کرنے کا یہ فن خود بخود سیکھا ہے یا وہ خود بخود جو پڑ پڑ ہو گیا ہے یا کسی آدمی نے اسے اس فن کی تعلیم دی ہے اور اس طریقے کی طرف رہنمائی کی ہے، ہر صاحب بصیرت جانتا ہے کہ یہ ننھی کڑی نہایت عاجز اور کمزور ہے کس ہے، اس کڑی ہی پر کیا موقوف ہے بلکہ ہاتھی جو اپنے تن و قوت میں پہاڑ جیسا عظیم ہے اور دوسرے جانوروں سے بلند ہے مجروح ضعف میں کڑی سے کم نہیں ہے، کیا کڑی کی یہ مہارت اور شکار کرنے کا یہ فن اس عظیم قادر مطلق کی گواہی نہیں دیتا جس نے اسے یہ فن سکھایا ہے اور اپنی غذا حاصل کرنے کے طریقے کی طرف رہنمائی کی ہے اور اسے قدرت بخشی ہے، فہم انسان اس ننھے جانور سے وہ سبق حاصل کرتا ہے جو بڑے جانوروں سے حاصل نہیں کر پاتا، اسی جانور کے عجائبات میں اس کی عقل دیکھ رہ جاتی ہے۔ باقی جانوروں تک وہ اپنے فکر کا دائرہ وسیع نہیں کر پاتا۔

فکر کا یہ پہلو بھی بڑا وسیع ہے۔ اس لئے کہ حیوانات اپنی اشکال، اخلاق اور طبائع کے لحاظ سے بے شمار ہیں۔ اصل میں ان سے حیرت اس لئے نہیں ہوتی کہ اکثر نظر آتے ہیں اور کثرت مشاہدہ کے باعث دل ان سے مانوس ہو جاتے ہیں۔ البتہ جب کسی شخص کی نظر کسی نامانوس اور عجیب و غریب جانور پر پڑتی ہے تو حیرت کرتا ہے اور کہتا ہے کہ سبحان اللہ کس قدر عجیب جانور ہے دور کیوں جائے خود انسان کس قدر حیرت ناک حیوان ہے لیکن وہ خود اپنے آپ پر حیرت نہیں کرتا۔

بہر حال جانوروں میں فکر کا یہ انداز ہونا چاہیے کہ ان کی شکلوں اور صورتوں پر نظر ڈالے، پھر ان کے منافع اور فوائد میں غور کرے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے چمڑوں، بالوں اور اون میں بے شمار فوائد رکھ چھوڑے ہیں، جن میں سے ایک اہم ترین فائدہ یہ ہے کہ ان چیزوں سے انسان اپنا لباس اور سفر و حضر میں اپنا مکان بناتا ہے، کھانے، پینے کے برتن وضع کرتا ہے، اپنے پاؤں کے لئے حفاظتی موزے تیار کرتا ہے، ان کا دودھ اور گوشت بطور غذا استعمال کرتا ہے، ان میں سے بعض جانور ایسے بھی ہیں جو سواری کے

کام آتے ہیں، بعض بوجہ اٹھاتے ہیں اور دور دراز کے جنگلوں اور صحراؤں کی مسافت طے کرتے ہیں، دیکھنے والوں کو ان کی تخلیق سے جس قدر بھی حیرت ہو کم ہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اس علم سے پیدا کیا ہے جو ان کے مناخ کو پہلے ہی سے جامع تھا، پاک ہے وہ ذات جس کے علم میں تمام امور کسی تفکر، تامل اور تدبر کے بغیر اور کسی وزیر یا مشیر سے مشورہ حاصل کے بغیر واضح ہیں، وہ نہایت حکمت والا اور نہایت قدرت والا اور نہایت علم والا ہے، جس نے اپنے عارفین کے دلوں میں ادنیٰ مخلوق کے مشاہدے سے اپنی توحید کی شہادت القاء کی مخلوق کے لئے اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں ہے کہ وہ اس کی قدرت و قہر کا یقین کریں، اس کی ربوبیت کا اقرار کریں اور اس کی عظمت و جلالت کی معرفت سے اپنے عجز کے معترف ہوں، کون ہے جو اس کی ثناء کا احاطہ کر سکتا ہے، وہ ایسا ہے جیسا کہ خود اس نے اپنی تعریف کی ہے، ہماری معرفت کی انتہا تو یہی ہے کہ ہم اس کی معرفت سے اپنے عجز کا اعتراف کریں۔ ہماری دعا ہے اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی ہدایت، اپنے کرم و احسان سے نوازے۔

وسیع اور گہرے سمندر

زمین کے چاروں طرف پھیلے ہوئے وسیع اور گہرے سمندر بھی اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہیں۔ ہمیں جتنی زمین خشک نظر آتی ہے اور جس قدر پہاڑ، نظر تک پھیلے ہوئے دکھائی دیتے ہیں وہ وسیع تر سمندروں کے مقابلے میں ایسے ہیں جیسے دور تک پھیلے ہوئے کسی سمندر میں کوئی مختصر جزیرہ۔ جیسا کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں۔

الْأَرْضُ فِي الْبَحْرِ كَالْأَصْطَبِلِ فِي الْأَرْضِ سَلَه

سمندر میں زمین ایسی ہے جیسے زمین میں اصطبل۔

تم اچھی طرح جانتے ہو کہ اصطبل کو زمین سے کیا نسبت ہے، اسی پر زمین کو سمندر کے مقابلے میں قیاس کر لو، تم نے زمین کے عجائبات کا مشاہدہ کیا، اب سمندر کے عجائبات میں فکر کرو، سمندر میں حیوانات اور جو اہرات کے جس قدر عجائبات ہیں وہ زمین کے عجائبات سے کہیں زیادہ ہیں، جس طرح سمندر کی وسعت زمین سے کہیں زیادہ ہے۔ اسی وسعت کی وجہ سے سمندر میں اتنے بڑے بڑے جانور ہیں کہ اگر ان کی پشت پانی کی سطح سے اونچی ہو تو تم یہ سمجھو کہ شاید یہ کوئی جزیرہ ہے اور اسی مقابلے میں اس پر لنگر انداز ہو جاؤ اور یہ صرف تصوراتی مفروضہ نہیں ہے بلکہ حقیقت میں ایسے حادثات ہو چکے ہیں کہ لوگ جزیرہ دیکھ کر اتر پڑے اور جب وہاں آگ جلائی گئی تو جزیرے نے حرکت شروع کر دی، اس وقت معلوم ہوا کہ ہم خشکی پر نہیں ہیں بلکہ کسی عظیم الجثہ جانور کی پشت پر سوار ہیں، خشکی پر کوئی حیوان بشمول انسان ایسا نہیں ہے جس کی نظیر سمندر میں نہ ہو، اس کے برعکس اس میں بے شمار ایسے حیوانات ہیں جن کی نظیر خشکی پر نہیں ملتی، ان کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے، خاص طور پر ان لوگوں نے بڑی ضخیم کتابیں لکھی ہیں جنہوں نے سمندر کے سینے پر سفر کیا اور اس کے عجائبات کی جستجو کی۔

سمندر کی ایک چھوٹی سی پیداوار موتی ہی پر نظر ڈالو، یہ پانی کے نیچے سپی میں پیدا ہوتا ہے اور اسی میں رہ کر گول شکل اختیار کرتا ہے، موتی کو دیکھو یہ کیسے پانی کے نیچے پتھر کے اندر سے نکلتا ہے، دیکھنے میں ایک سبزہ لگتا ہے جس نے پتھر کے پہلو سے سر نکالا ہو، ان کے علاوہ غبر اور اسی جیسی بے شمار نفیس چیزیں ہیں جنہیں سمندر کی لہریں کنارے پر ڈالتی ہیں، یا وہ سمندر کی تہوں سے نکالی جاتی ہے، کشتیوں کے عجائبات پر غور کرو، اللہ تعالیٰ نے پانی کے سینے پر انہیں کس طرح ٹھہرایا ہے، مال و دولت کے طالب، تجارت پیشہ اور سیاحت کرنے والے ان کے ذریعے دور دراز کے ملکوں کا سفر کرتے ہیں، دیکھو اس نے پہلے کشتیوں کو مستحکم کیا کہ وہ لوگوں کا بوجہ اٹھائیں، پھر ہواؤں کو حکم دیا کہ وہ کشتیوں کو ہٹائیں، ملاحوں کو ہواؤں کی معرفت دی کہ وہ کس رخ کو کب اور کیسے چلتی ہیں اور ان کی سواری کے لئے کون سی ہوا مفید اور کون سی نقصان دہ ہے، صاف ظاہر ہے کہ سمندر کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ کے جس قدر عجائبات ہیں وہ ضخیم ترین جلدوں میں بھی نہیں سانسکتے، سب سے زیادہ حیرت انگیز چیز وہ ہے جو سب سے زیادہ ظاہر ہے، یعنی پانی کا وہ

آسمان اور زمین کے درمیان ٹھہری ہوئی لطیف ہوا بھی اللہ تعالیٰ کی ایک بڑی نشانی ہے، جب ہوا چلتی ہے تو نہ تم اسے ہاتھ لگا سکتے ہو اور نہ اس کو جسم شکل میں سانسکتے ہو، ہوا کی مثال مسندِ مکی سی ہے جس طرح آبی جانور سمندر میں تیرتے پھرتے ہیں اسی طرح بے شمار پرندے اپنے پروں اور ہانڈوں کی مدد سے ہوا کے دوش پر اڑتے نظر آتے ہیں، جب ہوائیں چلتی ہیں تو سمندر میں مدوجز پیدا ہوتا ہے اور لہریں بے چین ہو کر اپنا سر پہنتی ہیں، اسی طرح تیز ہواؤں کی گردش سے اس فضاے آسمانی میں بھی تموج ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ ہوا کو حرکت دیکر رحمت کا سبب بھی بناتا ہے یعنی وہ بادلوں کو ہٹاتی ہے اور پیاسی زمین پر بارش برساتی ہے جیسا کہ ارشاد فرمایا۔ **وَأَرْسَلْنَا الرِّيحَ لَوَاقِحَ۔** (پ ۳۳ ر ۲ آیت ۲۲)
اور ہم ہی ہواؤں کو بھیجتے ہیں جو کہ بادلوں کو پانی سے بھرواتی ہیں۔

اس طرح یہ ہوا حیوانات اور نباتات کی زندگی کا سبب ہوتی ہے اور وہ جب چاہتا ہے اس ہوا کو عذاب بنا دیتا ہے ان لوگوں کے لئے جو اس کی نافرمانی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا۔

إِنَّا أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ صَرْصَرًا فَمِنْ يَوْمٍ مُّسْتَمِرٍّ نَنْزِعُ النَّاسَ كَأَنَّهُمْ أَعْجَازُ نَخْلٍ مُّنْقَعَةٍ۔ (پ ۲۷ ر ۸ آیت ۲۰-۱۹)

ہم نے ان پر ایک تیز ہوا بھیجی۔ ایک نحوست کے دن میں وہ ہوا لوگوں کو اس طرح اکھاڑتی ہے گویا وہ اکڑے ہوئے مجوروں کے تھے ہوں۔

ہوا لطیف بھی ہے اور شدید بھی، تم اس کی لطافت اور شدت کا اس طرح مشاہدہ کر سکتے ہو کہ اگر کسی مکینے میں ہوا بھر کر دیا میں ڈال دو اور یہ کوشش کرو کہ وہ مکینہ ڈوب جائے تو یہ ممکن نہیں ہوگا، خواہ اسے ڈوبنے کے لئے کتنا ہی طاقت ور شخص اپنی تمام تر قوت کیوں نہ صرف کر دے، اس کے برعکس اگر تم لوہے کا کوئی گھڑا پانی کی سطح پر رکھو تو وہ فوراً آہ میں چلا جائیگا، فوراً کرو کہ ہوا اپنی نزاکت اور لطافت کے باوجود پانی کی شدت سے کس طرح مقابلہ کرتی ہے، اللہ تعالیٰ کی یہی حکمت ہے جس کے باعث کشتیاں پانی کی سطح پر ٹھہری رہتی ہیں اور اپنے تمام تر بوجھ کے باوجود ڈوبتی نہیں ہیں، یہ مکینے اور کشتی پر کیا موقوف ہے ہر کھوکھلی چیز کا جس میں ہوا بھر جائے یہی حال ہے کیونکہ ہوا میں پانی سے روکنے کی قوت ہے، اسی ہوا کی قوت کے سارے بھاری بھرکم کشتی اپنی قوت اور صلاحیت کے ساتھ پانی کی سطح پر برقرار رہتی ہے، جیسے کوئی شخص کنوئیں میں گر جائے اور ایک ایسے آدمی کا دامن تھامے رہے جو اس میں گرنے سے خود کو اس کے بوجھ کے ساتھ بچا سکتا ہو، ظاہر ہے ایسا شخص ڈوبتا نہیں ہے، پاک ہے وہ ذات جس نے ہماری کشتی کو لطیف ہوا پر معلق کیا، نہ دونوں میں نظر آنے والا کوئی رابطہ ہے نہ کوئی گمراہی۔

اس کے بعد فضا کے عجائبات پر نظر ڈالو، اس میں بادل منڈلاتے ہیں، بادلوں میں بجلیاں چمکتی کڑکتی ہیں، بارشیں برستی ہیں، شبنم پڑتی ہے اور برف گرتی ہے، یہ سب آسمان اور زمین کے درمیان رونما ہونے والے عجائبات ہیں، قرآن کریم نے اس آیت میں بطور اجمال اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا إِلَّا عَجَبِينَ۔ (پ ۲۵ ر ۱۵ آیت ۳۸)
اور ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان میں ہے اس کو اس طور پر نہیں بنایا کہ ہم ضل محبت کرنے والے ہوں۔

پھر اس کی تفصیل مختلف مواقع پر فرمائی ہے۔ چنانچہ ایک جگہ ارشاد فرمایا۔

وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ۔ (پ ۲ ر ۳ آیت ۲۳)

اور ابر میں جو آسمان و زمین کے درمیان مفید رہتا ہے۔

دوسری بے شمار آیات میں وعدہ 'میع' بادل اور بارش کا ذکر کیا گیا ہے اگر ان تمام امور میں فکر نہیں کر سکتے تو صرف بارش ہی میں فکر کر لو، جس کا تم اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرتے ہو اور بجلی کی کڑک پر غور کرو، جسے تم اپنے کانوں سے سنتے ہو، ان دونوں چیزوں کی معرفت تو بہائم کر بھی حاصل ہے، تمہیں تو عالم بہائم سے اٹھ کر عالم اعلیٰ تک پہنچنا چاہیے، تم نے اپنی کھلی آنکھوں سے ان چیزوں کے ظاہر کو دیکھا ہے، اب ذرا ظاہر کی آنکھیں بند کرو اور باطن کی آنکھیں کھول کر ان چیزوں کے عجائب و دیکھو اور ان کے اسرار پر غور کرو، یہ بھی ایک طویل باب ہے، جس میں تم اپنے فکر کا دائرہ دور تک وسیع کر سکتے ہو، اگرچہ احاطہ کرنا ممکن نہیں ہے دیکھو گھٹا سیاہ بادل کس طرح اچانک صاف فضا میں جمع ہو جاتا ہے، اللہ تعالیٰ جب چاہتا ہے اور جہاں چاہتا ہے اسے پیدا کر دیتا ہے، پھر یہ دیکھو کہ بادل اپنی نرمی کے باوجود پانی کا بوجھ اٹھائے اور سرے اور دوڑتا ہے اور اس وقت تک آسمان کی فضاؤں میں گردش کرتا رہتا ہے جب تک اللہ تعالیٰ اسے یہ حکم نہیں دیتا کہ وہ اپنا مکینہ خالی کر دے، پھر وہ اپنے قطرات اس قدر اڑھٹا دیتا ہے جس قدر اللہ اس کی اجازت دیتا ہے اور اسی شکل میں گرتا ہے جس شکل میں اللہ کی مرضی ہے تم دیکھتے ہو کہ بادل زمین پر پانی برساتا ہے اور اپنے قطرات اڑھٹا دیتا ہے، اگرچہ یہ قطرات مسلسل ہوتے ہیں لیکن ہر قطرہ اپنی جگہ الگ ہوتا ہے، بحال نہیں کہ ایک قطرہ دوسرے قطرے سے مل جائے، ہر قطرہ اسی راستے سے زمین پر پہنچتا ہے جو اس کے لئے متعین کر دیا گیا ہے، بحال نہیں کہ وہ راستے سے ہٹ جائے یا تاخر پر مقدم یا تاخر ہو جائے، اگر اولین و آخرین کے تمام لوگ جمع ہو کر بارش کا ایک قطرہ پیدا کرنے کی کوشش کریں یا وہ ایک شہر میں پڑنے والے قطرات کی صحیح تعداد بیان کرنے کے درپے ہوں تو انہیں ناکامی کے سوا کچھ ہاتھ نہ لگے، ان کی صحیح تعداد ہی جانتا ہے جس نے انہیں پیدا کیا ہے، پھر ہر قطرہ ایک مخصوص قطعہ زمین کے لئے متعین کیا گیا ہے اور اسی پر پڑتا ہے اور اسی کے استعمال میں آتا ہے، جس کے لئے وہ زمین پر اتار دیا گیا ہے خواہ وہ کوئی جانور ہو یا انسان، پرندہ ہو یا درندہ، ہر قطرہ پر حظ الہی سے اس جانور یا کیرے کوڑے کا نام لکھا جاتا ہے، جس کے لئے وہ برسا ہے، اگرچہ ظاہر کی آنکھوں سے وہ تحریر نظر نہیں آتی لیکن اللہ تعالیٰ کو علم ہے کہ یہ قطرہ فلاں کیرے کا رزق ہے جو فلاں پہاڑ کے فلاں گوشے میں پڑا ہوا ہے، جب اسے پاس لگے گی تو یہ قطرہ اس کے پاس پہنچے گا اور اس کی پیاس دور کرے گا، یہ تو پانی کے ان قطرات کی باتیں ہیں جو زمین پر گرتے ہیں، یہاں ان کا ذکر نہیں جو فضائی آسمان پر ٹھہر ہو جاتے ہیں اور برف یا اولے کی صورت میں زمین کا رخ کرتے ہیں اور زمین پر ایسے بچھ جاتے ہیں جیسے سفید دھن ہوئی ہوئی پھیلی ہو، برف اور اولوں میں بھی بے شمار عجائبات ہیں، یہ سب کچھ جبار قادر کا فضل اور خلاق قادر کا ہر کا قدر ہے۔ مخلوق میں سے کسی کو اس میں کوئی دخل ہے نہ شرکت، بلکہ مومن بندوں کے لئے خشوع و خضوع اور اس کے جلال و عظمت کے آگے سرنگون کرنے کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں ہے اور جو اس کی عظمت کے منکر ہیں ان کے لئے بھی اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ وہ حقیقت اسباب پر مطلع ہوئے بغیر محض اندازے سے کچھ کہیں، چنانچہ فریب خوردہ جاہل کہا کرتا ہے کہ بارش اس لئے نازل ہوتی ہے کہ یہ بے غاٹھ فصل ہے، یہی بارش کا سبب ہے، وہ سمجھتا ہے کہ یہ ایک ایسی معرفت ہے جو اس پر منکشف ہوئی ہے، اس معرفت کے انکشاف پر وہ اترا تا ہے اگر کوئی اس سے پوچھ بیٹھے کہ طبع کیا چیز ہے طبع کو کس نے پیدا کیا اور وہ کون ہے جس نے پانی کی طبع کو قفل بنایا اور اس کے باوجود وہ درختوں کی جڑوں میں ڈالنے سے ان کی شاخوں تک پہنچ جاتا ہے، بھلا یہ قفل، چیز اوپر سے نیچے کیسے اتری اور نیچے سے اوپر کیسے چڑھی، درختوں کی شاخوں اور تنوں میں جذب ہو کر اور اس طرح اوپر چڑھتی ہے کہ آنکھوں سے نظر بھی نہیں آتی اور درخت کے ہر ہر جڑ میں سرایت کر جاتی ہے، ہر ہر پتے کو غذا فراہم کرتی ہے اور ان رگوں میں سے گذرتی ہے جو بال سے زیادہ باریک ہیں، پانی پہلے بڑی رگ میں جاتا ہے جو پتے کی جڑ ہے پھر اس بڑی رگ سے جو تمام پتے کے طول میں پھیلی ہوئی ہے ارد گرد کی چھوٹی چھوٹی رگوں میں منتقل ہوتا ہے، گویا بڑی رگ نہری مانند ہے اور چھوٹی رگیں ندیوں کی طرح ہیں، ان ندیوں سے نالے اور نالیاں پھولتی ہیں اور نالیوں سے کڑی کے جالے جیسے باریک دھاگے نکلتے ہیں جو آنکھ سے نظر نہیں آتے، اسی طرح یہ پانی لے لے چوڑے درخت کے تمام پتوں میں اور ہر پتے کے تمام اطراف میں پھیل جاتا ہے، اسے بڑھاتا ہے، سرسبز و شاداب

کرتا ہے، اس کی طراوت اور شادابی باقی رکھتا ہے، پتوں کی طرح یہ پانی پھلوں اور میوؤں میں سرایت کرتا ہے، اس غافل سے یہ پوچھا جاسکتا ہے کہ اگر پانی اپنے ثقل کے باعث زمین کی طرف حرکت کرتا ہے تو اوپر کی طرف کس لئے حرکت کرتا ہے، اگر وہ یہ کہے کہ اوپر کی طرف ایک قوت جاذبہ ہے جو پانی کو نیچے سے اوپر کی طرف جذب کرتی ہے تو اس سے پوچھا جائے کہ آخر وہ قوت کون سی ہے جس نے جاذب کو مسخر کیا، اگر انتہا میں معاملہ اللہ تعالیٰ پر ختم ہو جو سوات وارض کا حقیقی خالق اور ملک و ملکوت کا جبار ہے تو ابتداء ہی میں تمام معاملات اسی پر کیوں محول نہیں کئے جاتے، صحیح بات یہ ہے کہ جاہل جہاں پہنچ کر ٹھہرتا ہے وہاں سے عاقل اپنی ابتداء کرتا ہے۔

آسمان و زمین کے ملکوت اور کواکب

اصل یہی چیزیں ہیں جس شخص کو تمام باتیں معلوم ہوں اور آسمانوں کے عجائبات کا علم نہ ہو اسے گویا کچھ معلوم نہیں ہے، زمین، سمندر، ہوا اور آسمانوں کے علاوہ تمام اجسام آسمانوں کے مقابلے میں ایسے ہیں، جیسے سمندر کا ایک قطرہ بلکہ اس سے بھی کم، دیکھو اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور ستاروں کا معاملہ اپنی کتاب عظیم میں کتنا عظیم بیان کیا ہے، اس میں کوئی سورت ایسی نہیں ہے جس میں متعدد مواقع پر آسمانوں کے ملکوت کا بیان نہایت شاندار طریقے پر نہ ہو، اللہ تعالیٰ نے بے شمار مواقع پر ان کی قسمیں کھائی ہیں۔

وَالسَّمَاءِ ذَاتِ الْبُرُوجِ۔ (پ ۳۰ ر ۲۰ آیت ۱)

قسم ہے برجوں والے آسمان کی۔

وَالسَّمَاءِ الطَّارِقِ۔ (پ ۳۰ ر ۱۱ آیت ۱)

قسم ہے آسمان کی اور اس چیز کی جو رات میں نمودار ہونے والی ہے۔

وَالسَّمَاءِ ذَاتِ الْجُبُكِ۔ (پ ۳۱ ر ۱۸ آیت ۷)

قسم ہے آسمان کی جس میں راستے ہیں۔

وَالسَّمَاءِ وَمَا بَنَاهَا۔ (پ ۳۰ ر ۲۱ آیت ۵)

اور قسم ہے آسمان کی اور اس کی جس نے اسے بنایا۔

وَالشَّمْسُ وَضُحَاهَا وَالْقَمَرُ إِذَا تَلَاهَا۔ (پ ۳۰ ر ۲۱ آیت ۱-۲)

قسم ہے سورج کی اور اس کی روشنی کی اور چاند کی جب سورج سے پیچھے آئے۔

فَلَا أُقْسِمُ بِالْخُنُوسِ الْجَوَارِ الْكُنُوسِ۔ (پ ۳۰ ر ۲۱ آیت ۵)

تو میں قسم کھاتا ہوں ان ستاروں کی جو پیچھے کو ہٹے لگتے ہیں اور چلتے رہتے ہیں اور (اپنے مطالع میں) جا چھپتے ہیں۔

وَالنَّجْمِ إِذَا هَوَىٰ۔ (پ ۲۷ ر ۵ آیت ۱)

قسم ہے ستارے کی جب وہ غروب ہونے لگے۔

فَلَا أُقْسِمُ بِمَوَاقِعِ النُّجُومِ وَإِنَّهُ لَقَسَمٌ لَّو تَعْلَمُونَ عَظِيمٌ۔ (پ ۲۷ ر ۲۱)

آیت ۷۵-۷۶

سو میں قسم کھاتا ہوں ستاروں کے چھپنے کی اور اگر تم غور کرو تو یہ ایک بڑی قسم ہے۔

گذشتہ صفحات میں تم نے ناپاک نطفے کے عجائب پڑھے لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کی قسم نہیں کھائی حالانکہ اس کے عجائب بھی کچھ کم نہیں ہیں۔ اس سے اندازہ لگاؤ کہ جس چیز کی اللہ نے قسم کھائی ہے اس کے عجائب کیا کچھ ہوں گے۔ آسمانوں کا یہ عجوبہ بھی کچھ کم

نہیں کہ تمام مخلوق کا رزق آسمان میں ہے جیسا کہ فرمایا۔

وَفِي السَّمَاءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوعْلُونَ۔ (پ ۳۱ ر ۱۸ آیت ۲۲)
اور تمہارا رزق اور جو کچھ تم سے وعدہ کیا جاتا ہے آسمان میں ہے۔

جو لوگ آسمانوں کی فکر کرتے ہیں اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں ان کی تعریف فرمائی ہے۔

وَيَنْفَعُ كَثْرَتُ فِي خَلْقِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ (پ ۳۱ ر ۱۸ آیت ۲۴)
اور آسمانوں اور زمین کے پیدا ہونے میں غور کرتے ہیں۔

اس آیت کے حلق سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں۔

وَبَلِّغْ لِمَنْ قَرَأَ هَذِهِ الْآيَةَ ثُمَّ مَسَحَ بِهَا سُبُلَتَهُ (۱)

بڑی خرابی یہ اس شخص کے لئے جو یہ آیت پڑھے اور اپنی مونچھوں کو
ناؤدے کر گزر جائے۔

یعنی اس میں فکر کئے بغیر آگے بڑھ جائے۔ اللہ تعالیٰ نے اعراض کرنے والوں کی
منعت کی ہے۔ فرمایا۔

وَجَعَلْنَا السَّمَاءَ سَقْفًا مَحْفُوظًا وَهُمْ عَنْ آيَاتِهَا مُعْرِضُونَ۔ (پ ۱۷ ر ۳ آیت ۳۲)
اور ہم نے آسمان کو چھت (کی طرح) بنایا جو محفوظ ہے اور یہ لوگ (آسمان کی) نشانیوں سے اعراض کرنے
والے ہیں۔

اول تو آسمان کو زمین اور اس کے خشک و تر حصوں، دریاؤں، سمندروں اور پہاڑوں سے اونٹنی درجے کی بھی نسبت نہیں ہے
دوسرے زمین مغرب ہونا والی ہے جبکہ آسمان اپنی جگہ محکم رہے گا اور اس وقت تک تغیر سے محفوظ رہے گا جب تک کہ تغیر
کا وقت مقرر نہ آئے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے انہیں محفوظ فرمایا ہے۔ جیسا کہ مذکورہ بالا آیت میں مذکور ہے۔ آسمان کے متعلق کچھ
اور آیات یہ بھی ہیں۔ فرمایا۔

وَبَيْنَنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شَدَادًا۔ (پ ۳۰ ر ۱ آیت ۴)
اور ہم نے تمہارے اوپر سات مضبوط آسمان بنائے۔

أَنَّا نَسْتَشْدُ خَلْقًا أَمَّ السَّمَاءِ بَنَاهَا رَفَعَ سَمَكُهَا فَسَوَّاهَا۔ (پ ۳۰ ر ۳ آیت ۲۷)
بھلا تمہارا (دوسری بار) پیدا کرنا زیادہ سخت یا آسان گا۔ اللہ نے اس کو بنایا۔

ملکوت کی طرف نظر کرو تاکہ تمہیں عزت و جہوت کے عجائب کا علم ہو۔ ملکوت کی طرف نظر کرنے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ تم
آنکھ اٹھا کر ان کی طرف دیکھ لو اور آسمان کے نیلگوں رنگ اور ستاروں کی روشنی کا مشاہدہ کر لو اس لئے کہ اس میں تو بہائم بھی
تمہارے شریک ہیں۔ وہ بھی آسمان کے رنگ اور ستاروں کی چمک کا مشاہدہ کر لیتے ہیں۔ اس لئے کہ اگر صرف دیکھنا مقصود ہوتا تو
اللہ تعالیٰ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تعریف کیوں فرماتے۔

وَكَذَلِكَ نَذَرِي ابْنِ إِدْرِيسَ مَلَكُوتِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ۔ (پ ۷ ر ۱۵ آیت ۷۶)
اور ہم نے ایسے ہی طور پر ابراہیم کو آسمانوں اور زمین کی مخلوقات دکھلائیں۔

آنکھوں سے نظر آنے والی تمام چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے عالم ملک و شہادت سے تعبیر فرمایا ہے اور جو چیزیں پردہ غیب میں ہیں

(۱) یہ حدیث پہلے بھی گزر چکی ہے۔

اور آنکھوں سے نظر نہیں آتیں، ان کے لئے عالم حکومت کی تعمیر ہے۔ اللہ تعالیٰ کو فہم ہے شہادت ہر جگہ کا علم ہے، وہ سراسر کوئی شخص ان عالموں میں اپنے عالم ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا، اگر کسی کو ان دونوں میں سے ایک عالم ہے تو صرف اس قدر ہے جتنا اللہ نے اس کے لئے پسند کیا ہے۔ قرآن کریم میں ہے۔

عَالَمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلَى غَيْبِهِ مُتَكَلِّفًا مِّنْ لَّدُنْهِ شَيْءٌ وَمِمَّا يُصَلِّىٰ ۖ
 (آیت ۳۱)

اور غیب کا پلنے والا وہی ہے جو اسے غیب پر کن کو سچ میں آنکھیں کھولے گی اور کن کی طرف

[illegible][illegible]

آسمان کے درمیان سے ہوتی ہے تو موسم بدلتے ہیں گرمی و سردی اور ریح و خریف کے موسم پیدا ہوتے ہیں جب آفتاب خط استواء سے نیچے اتر جاتا ہے تو ہوا سرد ہو جاتی ہے اور سردی کا موسم ظاہر ہو جاتا ہے اور جب ٹھیک خط استواء پر رہتا ہے تو گرمی سخت پڑتی ہے اور جب ان دونوں کے درمیان میں ہوتا ہے تو موسم معتدل ہو جاتا ہے۔

فرض یہ ہے کہ آسمانوں کے عجائبات بے شمار ہیں۔ اگر کوئی شخص ان کے سوویں حصے کی معرفت بھی حاصل کرنا چاہے تو یہ اس کے لئے ممکن نہیں ہے، ہم نے جو کچھ بیان کیا اس سے عجائبات کا شمار مقصود نہیں ہے، بلکہ طریق فکر پر تنبیہ کرنا مقصود ہے اور اس اعتقاد کی طرف توجہ دلانا ہے کہ کوئی ستارہ ایسا نہیں ہے جس کی تخلیق بے شمار حکمتوں کے ساتھ نہ ہوگی ہو یہ حکمتیں اس کی شکل، رنگ، آسمان میں ان کے محل وقوع، خط استواء سے ان کے بعد و قرب، دوسرے کو اکب سے ان کی نزدیکی اور دوری غرضیکہ ہر چیز میں ہیں، اسی پر اپنے اعضاء بدن کو قیاس کرو، تمہارا کوئی جزو بدن ایسا نہیں ہے جس میں ایک یا بہت سی حکمتیں نہ ہوں، آسمان کا معاملہ عظیم تر ہے بلکہ زمین کو آسمان سے کوئی نسبت ہی نہیں ہے نہ جماعت میں اور نہ معنوی اوصاف میں، ظاہر ہے آسمان جس قدر عظیم ہے اسی قدر اس کے معنوی اوصاف بھی عظیم ہیں، تم جانتے ہو کہ زمین ایک وسیع ترین سیارہ ہے یہاں تک کہ کوئی انسان اس کے اطراف میں گھومنے کی طاقت نہیں رکھتا لیکن اہل علم اس حقیقت پر متفق ہیں کہ سورج زمین سے ایک سو ساٹھ گنا سے بھی زائد ہے، ایسی بہت سی روایتیں موجود ہیں جن سے سورج کی وسعت کا علم ہوتا ہے پھر وہ کو اکب جنہیں تم بہت مختصر دیکھتے ہو زمین سے کم از کم آٹھ گنا بڑے ہیں اور ان میں جو سیارہ سب سے بڑا ہے وہ زمین سے ایک سو بیس گنا بڑا ہے، اس سے تم ان کو اکب کی دوری اور بلندی کا اندازہ کر سکتے ہو اسی دوری کے باعث وہ تمہیں بہت چھوٹے نظر آتے ہیں، قرآن کریم کی اس آیت میں اسی بعد کی طرف اشارہ ہے۔

وَرَفَعَ سَمَكَهَا فَسَوَّاهَا۔ (پ ۳۰، ر ۴، آیت ۲۸) اس کی چھت کو بلند کیا اور اس کو درست بنایا۔

روایات میں ہے کہ ایک آسمان سے دوسرے آسمان کے درمیان پانچ سو سال کی مسافت ہے۔ (ترمذی ابو ہریرہ) یہ معلوم ہو چکا ہے کہ ایک ستارہ زمین سے کئی گنا بڑا ہے اور تم بے شمار ستارے آسمان پر چمکتے ہوئے دیکھتے ہو، پہلے تم ان کو اکب کی کثرت پر نظر کرو پھر اس آسمان پر نظر ڈالو جس میں یہ کو اکب جڑے ہوئے ہیں، پھر اس کی وسعت پر غور کرو، پھر سرعت رفتار پر نظر کرو، تم اس کی حرکت بھی محسوس نہیں کرتے، چہ جائیکہ اس کی سرعت اور تیز رفتاری محسوس کر سکو لیکن تمہیں اس میں شک نہ کرنا چاہیے کہ آسمان ایک ستارے کے عرض کی مقدار ایک لمحے میں حرکت کرتا ہے گویا اگر ایک ستارے کا عرض زمین سے سو گنا زائد ہے تو آسمان ایک لمحے میں زمین کے عرض سے سو گنا چلا ہے، اس کی یہ رفتار ہمیشہ رہتی ہے، اگرچہ تم اس سے غافل رہتے ہو، اس سرعت رفتار کی تعبیر حضرت جبرئیل علیہ السلام نے اپنے ان الفاظ سے فرمائی ”ہاں نہیں“ یہ واقعہ معراج کے موقع پر پیش آیا، سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ سے دریافت کیا تھا کہ کیا سورج ڈھل گیا۔ آپ نے جواب دیا ”ہاں نہیں“ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ”ہاں نہیں“ کے کیا معنی ہیں۔ حضرت جبرئیل نے عرض کیا ”ہاں“ کہنے سے ”نہیں“ کہنے کے درمیان جو وقفہ ہوا اس میں آفتاب نے پانچ سو برس کی مسافت طے کر لی ہے^(۱) دیکھو آسمان کس قدر وسیع ہے اور کتنا بڑا ہے لیکن اس کی رفتار کس قدر سریع اور حرکت کس قدر خفیف ہے، پھر اللہ تعالیٰ کی قدرت دیکھو کہ اس کی تصویر تمام تروسعتوں کے باوجود آنکھ کے چھوٹنے سے ڈھیلے میں منعکس کر دی ہے، تم زمین پر بیٹھ کر اس کی طرف دیکھتے رہو اور تمام آسمان اور اس کے کو اکب تمہیں نظر آ جاتے ہیں، اس میں شک نہیں کہ آسمان عظیم ہے اور اس کے کو اکب وسیع ہیں لیکن تم ان کی طرف مت دیکھو بلکہ ان کے خالق کی طرف دیکھو کہ اس نے انہیں کیسے پیدا کیا ہے، پھر کیسے بغیر ستون اور بغیر کسی بالائی رابطے کے رو کا ہے، تمام عالم ایک گھر کی طرح ہے، آسمان اس کی چھت ہے، ہمیں تم پر تعجب ہوتا ہے کہ جب تم کسی مالدار کے گھر جاتے ہو اور اس کے دروازے پر دو لکھ دو لکھ سہرے رنگوں سے آراستہ دیکھتے ہو تو حیرت سے منہ میں انگلی دے لیتے ہو اور اس مکان کی خوبصورتی کی تعریف کئے بغیر نہیں

(۱) مجھے اس روایت کی اصل نہیں ملی۔

تھکتے، جبکہ تم اس زمینی گھر کو رات دن دیکھتے ہو، اس کی زمین، اس کی چھت، اس کی ہوا، اس کا عجیب و غریب ساز و سامان، اس کے متحیر العقول حیوانات، اس کے عمدہ نقوش یہ تمام چیزیں ہر وقت تمہاری نظر میں رہتی ہیں لیکن نہ تم ان کے متعلق کوئی گفتگو کرتے ہو نہ دل سے ان کی طرف ملتفت ہوتے ہو، کیا یہ گھر اس گھر سے کسی اعتبار سے کم ہے جس کی تعریف میں تم رطب اللسان رہتے ہو حالانکہ وہ گھر تو اس عظیم الشان گھر کا ایک جز ہے بلکہ اس کا معمولی حصہ ہے، اس کے باوجود تم اصل گھر کی طرف نہیں دیکھتے اس کی وجہ اس کے علاوہ کچھ نہیں ہے کہ یہ گھر رب کریم نے تیار کیا ہے اور یہ کہ تم اپنے نفس، اپنے رب اور اپنے رب کے گھر کو بھول چکے ہو اور اپنے غم اور شرمگاہ میں مصروف ہو، تمہیں شہوت اور حشمت کے علاوہ کسی چیز سے غرض نہیں ہے، تمہاری شہوت کی غایت یہ ہے کہ اپنے پیٹ کو لبریز کرلو، تمہارا پس نہیں چلا کہ چوپایہ سے دس گنا کھاسکو، اگر کھانا ہی معیار فضیلت ہے تو چوپایہ تم سے دس گنا زیادہ افضل ہے کیونکہ وہ تم سے دس گنا زیادہ کھانا ہے اور غایت حشمت یہ ہے کہ تمہارے ارد گرد دس بیس سو آدمی جمع ہو جائیں اور زبان سے تمہاری تعریف کریں اور دل میں تمہارے لئے مخلوط اعتقادات رکھیں، اگر وہ تمہاری محبت اور عقیدت میں سچے بھی ہیں، تو تمہیں ان سے کیا واسطہ، نہ وہ تمہارے لئے اور نہ خود اپنے لئے کسی نفع و نقصان کے مالک ہیں، نہ موت، حیات اور حشران کے ہاتھ میں ہے، تمہارے شہر میں نہ جانے کتنے یہود و نصاریٰ ایسے ہوں گے جن کا سماجی مرتبہ تم سے کہیں زیادہ بلند ہو گا۔

تم شہوت و حشمت کے فریب میں پڑ کر آسمانوں اور زمین کے ملکوت کی طرف دیکھنے سے غافل ہو گئے ہو اور اب تمہاری نظر میں مالک ملک و ملکوت کے جمال کی بھی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ تمہاری مثال تو ایسی ہے جیسے چوٹی جس نے کسی عالی شان محل میں اپنا گھر بنا رکھا ہو، وہ محل نہایت بلند و بالا، حسین و جمیل اور مضبوط ہو، اس کے خوبصورت غروں میں حوریں، غلام ہوں اور اس کے کمرے قیمتی سامان سے بھرے ہوئے ہوں، اگر وہ چوٹی اپنے بل سے باہر نکلے اور اپنی کسی بہن سے ملے اور اسے بولنے کی قدرت حاصل ہو جائے تو وہ اپنے تنگ و تاریک مکان اور معمولی غذا کی فراہمی اور معیشت کی کیفیت کے علاوہ کسی اور موضوع پر گفتگو نہ کر سکے، حالانکہ اس کا مسکن ایک خوبصورت محل میں ہے چاہے تو یہ کہ وہ اپنی بہن کو بتلائے کہ وہ ایک عظیم الشان محل میں رہتی ہے جس کی دیواریں سونے کی ہیں، جس کی زمین چاندی کی ہے جس میں مہ و شوں کا جھوم ہے اور جو نفیس اور قیمتی سامان سے آراستہ ہے مگر وہ بے چاری محل کے متعلق کچھ جانتی ہی نہیں ہے نہ اس کی نظر اپنے مسکن اور غذا سے تجاوز کراتی ہے کیونکہ وہ کوتاہ نظری کے باعث ان امور سے تجاوز نہیں ہو سکتی لیکن تمہاری کیا مجبوری ہے تم کیوں اپنے تنگ اور معمولی مکان میں رہ کر اللہ تعالیٰ کے وسیع ترین محل، اس کی بلند و بالا چھت اور خوبصورت ساز و سامان سے غافل ہو، نہ اس کے ملائکہ۔ یہ واقعہ ہو جو اس کے آسمانوں میں رہتے ہیں، آسمان کے بارے میں بس تم اتنا جانتے ہو جتنا چوٹی اپنے مسکن کی چھت سے واقف ہے اور ملائکہ سے تمہاری واقعیت صرف اس قدر ہے جس قدر چوٹی کو تم سے ہے اور تمہارے گھر کے دوسرے باشندوں سے ہے مگر چوٹی کو تو اس سے زیادہ معرفت کی قدرت ہی نہیں ہے نہ اس کی مختصر عقل میں تمہارے مخلوق کے عجائب سمجھ سکتے ہیں، اس کے برعکس تمہیں ملکوت میں فکر کے گھوڑے دوڑانے اور اس کے عجائب کی معرفت حاصل کرنے پر قدرت ہے۔ پھر اس قدرت سے فائدہ کیوں نہیں اٹھاتے۔

اب ہم اپنے قلم کو فکر کے مزید ذکر سے روکتے ہیں۔ یہ ایک ایسا موضوع ہے جس کی کوئی انتہا نہیں ہے مگر ہم طویل ترین عمریں بھی اس کے ذکر میں کھپا دیں تو جو معرفت اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے ہمیں عطا کی ہے اس کی شرح و تفصیل بھی نہ کہہ سکیں حالانکہ جو کچھ ہمیں معلوم ہے وہ علماء اور اولیاء کے علم کے مقابلے میں نہایت کم ہے اور جو کچھ تمام علماء اور اولیاء جانتے ہیں وہ انبیائے کرام کے علوم کے مقابلے میں نہایت حقیر ہے اور جو معرفت تمام انبیائے کرام کو حاصل ہے وہ ملائکہ مقررین کی معرفت کے سامنے کچھ بھی نہیں ہے۔ پھر تمام ملائکہ اور تمام جنوں اور انسانوں کے علم کو اگر اللہ تعالیٰ کے علم کے سامنے رکھا جائے تو اسے علم کما ہی صحیح نہ ہو بلکہ اسے دہشت، حقیر، قصور اور عجز کے علاوہ کوئی نام نہ دیا جاسکے۔ پاک ہے وہ ذات جس نے اپنے بندوں کو معرفت عطا کی اور اسے آگاہ کر دیا کہ۔

وَمَا أَوْتَيْنَاهُم مِنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا۔ (پ ۵، ر ۱۰، آیت ۸۶) اور تم کو بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے۔

یہ ان طریقوں پر اجماعی گفتگو تھی جن میں لوگوں کو فکر کرنی چاہیے۔ یہاں اللہ تعالیٰ کی ذات میں فکر کرنے کا طریقہ مذکور نہیں ہے بلکہ صرف مخلوق میں فکر کا ذکر ہے تاکہ خالق کی معرفت حاصل ہو اور اس کی عظمت، ہیبت اور قدرت کا فہم پیدا ہو۔ جس قدر اللہ تعالیٰ کے عجائب صنعت کی معرفت زیادہ ہوگی اسی قدر ہمیں اس کی جلالت و عظمت کی معرفت زیادہ حاصل ہوگی۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے تم کسی عالم سے اس کے علم کی بناء پر محبت کرتے ہو اور اس کے علم کی تمہیں معرفت حاصل ہے۔ اب اگر تم پر اس کے کچھ اور علوم منکشف ہوں کوئی اچھوتا شعر یا خوبصورت تصنیف دیکھو یا کسی نئی تحقیق سے تمہارے کان آشنا ہوں تو ہمیں اس عالم سے کچھ اور محبت ہو جاتی ہے اور تم اس کی توقیر، تعظیم اور احترام میں کچھ اور آگے بڑھ جاتے ہو۔ اس کا ہر کلمہ، ہر شعر، ہر تحقیق تمہارے دل میں اس کا وقار بوحالی ہے اور مرتبہ زیادہ کرتی ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں غور کرنا چاہیے۔ یہ آسمان و زمین اور ان دونوں کے درمیان جو کچھ موجود ہے سب اسی کی تالیف اور تصنیف ہے اور یہ ایک عظیم تصنیف ہے۔ تم زندگی بھر اس کا مطالعہ کرو کبھی ختم نہیں ہوگی اور ہر روز تم پر نئے انکشافات، نئی معرفتوں کے دروازے کھلیں گے لیکن صحیح بات یہ ہے کہ ہر شخص کے لئے فکر و نظر میں اتنا ہی حصہ ہے جتنا اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کیا گیا ہے۔

اس گفتگو کو ہم یہیں پر ختم کرتے ہیں۔ اس بیان میں کتاب الفکر کے مضامین بھی شامل کر لئے جائیں۔ کتاب الفکر میں بھی ہمارا موضوع اللہ تعالیٰ کی مخلوق تھا لیکن وہاں اس اعتبار سے تھا کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے ہمیں عطا کیا ہے وہ اس کا احسان، انعام اور فضل ہے اور یہاں اس اعتبار سے ہے کہ یہ اس کا فضل ہے اور ہمیں اس میں فکر کرنا چاہیے، یہاں ہم نے جن چیزوں میں فکر کیا ہے ایک فلسفی بھی ان چیزوں میں فکر کرتا ہے لیکن اس کا فکر بدبختی اور گمراہی کا باعث بنتا ہے اور فتنی یا فتنہ محض کی گھر دہایت اور سعادت کا سبب بنتی ہے، آسمان و زمین میں کوئی ذرہ ایسا نہیں ہے جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ کسی کو گمراہ اور کسی کو ہدایت یا فتنہ نہ کرے۔ بہر حال جو شخص ان امور میں اس نقطہ نظر سے غور کرتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے افعال ہیں اس کی صفت ہیں وہ ان سے اللہ تعالیٰ کے جلال اور عظمت کی معرفت حاصل کرتا ہے اور ان سے ہدایت پاتا ہے اور جس شخص کی نظر اس پر رہتی ہے کہ یہ امور ایک دوسرے کے لئے مؤثر اور ایک دوسرے کا سبب ہیں، مسبب الاسباب سے ان کا کوئی علاقہ نہیں ہے وہ گمراہ ہوتا ہے، ہم گمراہی سے اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہتے ہیں، دعا ہے اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے کرم و فضل اور رحمت سے ان مواقع سے بچائے جہاں جلاء کے قدم ڈگمگا جاتے ہیں۔

کتاب ذکر الموت وما بعده

موت اور ما بعد الموت کا بیان

جس شخص کو موت سے شکست کھانی ہے، جس کی آرام گاہ قبر ہوگی، جس کے مولس و دمساز سانپ، بچھو اور کیڑے مکوڑے ہوں گے، جسے منکر نکیر کی ہم نشینی ملے گی، قیامت اس کے وعدے کی جگہ ہوگی اور جس کا ٹھکانہ جنت یا دوزخ ہوگا، اس کے لئے اس کے علاوہ کچھ مناسب نہیں کہ وہ صرف موت کے متعلق سوچے، صرف موت کا ذکر کرے، صرف اسی کے لئے تیاری کرے، اسی میں تدبیر کرے، اسی کا مشتاق ہو، اس کے علاوہ کسی چیز کا اہتمام نہ ہو، اس کے سوا کسی کا انتظار نہ ہو، ایسے شخص کے لئے مناسب یہ ہے کہ وہ زندگی ہی میں اپنے نفس کو مردہ تصور کرنے لگے اور خود کو قبر کے گمرے گڑھے میں لیٹا ہوا تصور کرے، اس لئے کہ جو چیز آنے والی ہے وہ قریب ہے، بیدار ہے جسے آننا نہیں ہے، سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

الْكَيْسُ مَنْ كَانَ نَفْسُهُ عَمِلَ لِمَا بَعْدَ الْمَوْتِ۔ (۱)

(۱) یہ حدیث پہلے بھی گذر چکی ہے

مکندہ ہے جو اپنے نفس کو دبائے اور موت کے بعد کی زندگی کے لئے عمل کرے۔

یہ حقیقت ہے کہ اگر کسی چیز کا بار بار ذکر نہ ہو تو اس کی صحیح طریقے پر تیاری نہیں ہو سکتی اور بار بار ذکر اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک موت کی یاد دلانے والی باتیں سننے پر دھیان نہیں دیا جاتا، یہاں ہم اسی لئے موت، اس کے مقدمات، اس کے مطلقات، آخرت، قیامت، روزِ آخر اور جنت کے احوال کے ذکر کرتے ہیں تاکہ بندہ اس کے لئے تیاری کر سکے کیونکہ سفر کا وقت آپہنچا ہے، زندگی مختصر ہوتی جا رہی ہے، اب بہت تھوڑی عمر باقی رہ گئی ہے، لیکن لوگ اس سے غافل ہیں۔

اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِي غَفْلَةٍ مُّعْرِضُونَ۔ (پ ۷، آیت ۱)

ان لوگوں سے ان کا (وقت) حساب نزدیک آپہنچا اور یہ غفلت میں پڑے ہیں۔

پہلا باب

ہم موت کے مطلقات کو دو بابوں میں بیان کرتے ہیں، پہلے باب میں موت سے پہلے کے واقعات اور توابع سے لے کر صور پھونکنے تک کے حالات بیان کئے گئے ہیں، یہ پہلا باب آٹھ بیانات پر مشتمل ہے۔

موت کا ذکر اور اسے کثرت سے یاد کرنا جانا چاہیے کہ جو شخص دنیا میں منہمک ہوتا ہے اس کے فریب میں مبتلا ہوتا ہے اور اس کی شہوات کی محبت میں غرق رہتا ہے، اس کا قلب یعنی طور پر موت سے غافل ہوتا ہے، کبھی اس کی زبان پر موت کا ذکر نہیں آتا، نہ دل میں اس کا خیال پیدا ہوتا ہے، اگر کوئی اس کے سامنے ذکر بھی کرتا ہے تو نفرت سے منہ موڑ لیتا ہے، اور اس ذکر کو سخت ناپسند کرتا ہے، یہی لوگ ہیں جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

قُلْ اِنَّ الْمَوْتَ الَّذِي تَفِرُّوْنَ مِنْهُ فَارْتَمِلُوْهُ مَلَاٰئِكَةُكُمْ ثُمَّ يَرْجُوْنَ اِلَىٰ عَالِمِ الْغَيْْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ۔ (پ ۲۸، آیت ۸)

آپ کہہ دیجئے کہ جس موت سے تم بھاگتے ہو وہ تم کو آکھڑے گی، پھر تم پوشیدہ اور ظاہر جاننے والے (خدا) کے پاس لے جائے جاؤ گے، پھر وہ تم کو تمہارے سب کئے ہوئے کام بتلا دے گا۔

پھر آدمی تین طرح کے ہیں، بعض وہ ہیں جو دنیا میں ڈوبے ہوئے ہیں، بعض وہ ہیں جو ابتداً توبہ کر رہے ہیں اور بعض وہ ہیں جو انتہائی معرفت رکھتے ہیں، پہلی قسم میں جو لوگ ہیں وہ موت کا ذکر نہیں کرتے اور کبھی ذکر بھی کرتے ہیں تو اس کے ذکر کو دنیا کی جدائی کے افسوس کے ساتھ مقید کر دیتے ہیں اور اس کی خدمت کرنے بیٹھ جاتے ہیں، موت کا اس انداز میں ذکر ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ سے اور دور کر دیتا ہے اور توبہ کرنے والے موت کا ذکر کثرت سے اس لئے کرتے ہیں تاکہ ان کے دل سے خوف و خشیت نکل جائے اور توبہ کی تکمیل کر سکیں، بعض اوقات یہ لوگ بھی موت کو ناپسند کرتے ہیں، محض اس لئے کہ کہیں موت انہیں توبہ کی تکمیل اور زاوراہ لینے سے پہلے ہی نہ چاک لے، ایسا محض موت کو ناپسند کرنے میں معذور ہے اور سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کے تحت نہیں ہے۔

مَنْ كَرِهَ لِقَاءَ اللَّهِ كَرِهَ لِقَاءَ عَذَابِهِ (بخاری و مسلم۔ ابو ہریرہ)

جو شخص اللہ سے ملنا پسند نہیں کرتا اللہ اس سے ملنا پسند نہیں کرتا۔

اگر کوئی شخص اس لئے موت کو پسند نہیں کرتا تو یہ مطلقاً موت کو مکروہ سمجھتا نہیں ہے، بلکہ اپنے گناہوں کی بنا پر اللہ تعالیٰ کی ملاقات سے محروم رہ جانے کا خوف ہے، یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص محض اس لئے محبوب کی ملاقات سے محروم رہ جائے کہ وہ اس ملاقات کے لئے تیاری کر رہا تھا اور خود کو محبوب کی پسند کے مطابق آراستہ کر رہا تھا، ایسے شخص کے متعلق یہ نہیں کہا جائے گا کہ وہ اپنے محبوب سے ملنا پسند نہیں کرتا، اور اس کی علامت یہ ہے کہ وہ ہر وقت اس ملاقات کی تیاری میں مشغول رہے، اس کے علاوہ

اس کے لئے کوئی دوسری مشغولیت نہ ہو، ورنہ وہ بھی پہلی قسم میں داخل ہو جائے گا، عارف وہ ہے جو ہمیشہ موت کو یاد کرتا ہو اور اسے اس حیثیت سے یاد کرتا ہو کہ موت کے بعد محبوب سے ملاقات ہوگی، عاشق کبھی اپنے معشوق سے ملنے کا وقت نہیں بھولتا، ایسا شخص اکثر موت کی آمد میں جلدی چاہتا ہے اور اس کے آنے پر خوش ہوتا ہے تاکہ گناہوں کے گھر سے نجات پائے، اور رب العالمین کے جوار میں منتقل ہو سکے، جیسا کہ حضرت حذیفہؓ سے مروی ہے کہ جب ان کی وفات کا وقت قریب آیا تو انہوں نے فرمایا کہ حبیب وفات کے وقت آیا جو نام ہوا سے فلاح نصیب نہ ہو، اے اللہ! اگر تو جانتا ہے کہ مجھے مالداری سے زیادہ مفلسی پسند ہے اور صحت سے زیادہ مرض پسند ہے اور زندگی سے زیادہ موت پسند ہے تو مجھ پر موت کو آسان کر تاکہ میں تجھ سے ملاقات کر سکوں، گویا توبہ کرنے والا موت کو ناپسند کرنے میں معذور ہے، اور یہ شخص موت کو پسند کرنے اور اس کی تمنا کرنے میں معذور ہے، ان دونوں اخصاص سے مرتبے میں اعلیٰ وہ ہے جو اپنا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دے، یعنی ایسا ہو جائے کہ نہ اپنے لئے موت کو پسند کرے اور نہ زندگی کو بلکہ اس کے نزدیک وہی چیز محبوب تر ہو جو اس کے پروردگار کو محبوب ہو، ایسا شخص اپنے فرط محبت سے تسلیم و رضا کے اعلیٰ مقام تک پہنچ جاتا ہے، یہی غایت اور انتہا ہے۔

بہر حال موت کے ذکر میں بڑی فضیلت اور ثواب ہے، دنیا میں مستغرق شخص بھی موت کے ذکر سے یہ فائدہ اٹھاتا ہے کہ اس سے کنارہ کشی اختیار کرتا ہے اور اس ذکر سے اس کی لذات میں کدورت پیدا ہو جاتی ہے اور لذات و شہوات کا مکدر ہونا اسباب نجات میں سے ہے۔

موت کی یاد کے فضائل سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں۔

اَكْثَرُ وَاَمِنْ ذِكْرِ هَادِمِ اللَّذَاتِ۔ (ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، ابو ہریرہؓ) لذتوں کو مٹانے والے کی یاد زیادہ کرو۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ موت کی یاد سے لذات کو مکدر کرو، یہاں تک کہ تمہارا دل ان سے اعراض کرنے لگے اور تم اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جاؤ، ایک حدیث میں ہے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

لَوْ عَلِمَ الْبَہَاِیْمُ مِنَ الْمَوْتِ مَا يَعْلَمُ اِنْ اَدَمَ مَا اَكَلْتُمْ مِنْهَا سَمِیْنًا۔ (بیہقی، ائم حبیبہ)

اگر بہائم موت کے بارے میں وہ باتیں جان لیں جو تم جانتے ہو تو تم ان میں سے کوئی (فریہ) جانور نہ کھاؤ۔

حضرت عائشہؓ نے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں عرض کیا، یا رسول اللہ! کیا کوئی شخص شداء کے ساتھ بھی اٹھے گا؟ فرمایا! ہاں، وہ شخص جو دن اور رات میں میں مرتبہ موت کا ذکر کرے، موت کی یاد کی فضیلت اس لئے ہے کہ اس سے آدمی دنیا سے علیحدگی اختیار کرتا ہے، اور آخرت کے لئے تیاری کرتا ہے، اور موت سے غفلت دنیاوی شہوات میں انہماک کی دعوت دیتی ہے۔ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں۔

تُخَفِّفُ الْمَوْتُ مِنَ الْمَوْتِ۔ (ابن ابی الدنیا، طبرانی، حاکم، عبد اللہ ابن عمرؓ) مومن کا تخفیف موت ہے۔

موت کو مومن کا تخفیف اس لئے قرار دیا گیا کہ دنیا مومن کے لئے قید خانہ ہے، جب تک وہ دنیا کے قید خانے میں محبوس رہتا ہے، اپنے نفس کی ریاضت، شیطان سے مدافعت اور شہوات سے دور ہونے میں طرح طرح کی مشقتیں برداشت کرتا ہے، موت اسے اس عذاب سے چھٹکارہ دلاتی ہے، گویا یہ آزادی اس کے لئے تخفیف بن جاتی ہے، ایک حدیث میں موت کو مسلمان کے لئے کفارہ قرار دیا گیا ہے، (ابو نعیم، النس) یہاں مسلمان سے مومن حقیقی مراد ہے، یعنی جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں، جس میں مومنوں کے اخلاق پائے جائیں، سوائے لغزشوں اور صفائے اس کا دامن گناہوں سے آلودہ نہ ہو، موت اس کے تمام گناہوں کا کفارہ بن جاتی ہے، بشرطیکہ وہ فرائض پر کاربند ہو اور کبائر کا ارتکاب نہ کرنا ہو، عطاء خراسانی کہتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایسی مجلس کے پاس سے گزرے جہاں قہقہے بلند ہو رہے تھے آپ نے فرمایا اس مجلس میں لذات کو مکدر

کرنے والی چیز شامل کرلو، لوگوں نے عرض کیا وہ کیا چیز ہے؟ فرمایا موت ہے (ابن ابی الدنیا) حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ موت کا کثرت سے ذکر کرو، اس لئے کہ وہ گناہوں کو مٹا دیتی ہے اور دنیا میں زاہد بناتی ہے (ابن ابی الدنیا) ایک حدیث میں ہے۔

كَفَى بِالْمَوْتِ مُعْفِرًا۔ (مسند حارث ابن ابی الدنیا، انسؓ) موت جدا کرنے کے اعتبار سے کافی ہے۔

ایک حدیث میں واعظاً کا لفظ ہے یعنی موت باعتبار فصاحت کے کافی ہے (طبرانی، بیہقی، عمار ابن یاسرؓ) ایک مرتبہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف لے گئے، آپ نے دیکھا کہ وہاں کچھ لوگ بیٹھے ہوئے نہں رہے ہیں اور باتیں کر رہے ہیں، آپ نے ارشاد فرمایا موت کا ذکر کرو، بخدا جس کے قبضے میں میری جان ہے، اگر تم وہ باتیں جان لو جو میں جانتا ہوں تو کم ہنسو اور زیادہ روؤ (ابن ابی الدنیا، ابن عمرؓ) سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں ایک شخص کا ذکر کیا گیا، لوگوں نے اس کی بے حد تعریف کی، آپ نے دریافت فرمایا کہ تمہارے ساتھی کا ذکر کیا ہے؟ لوگوں نے عرض کیا کہ ہم نے اسے موت کا ذکر کرتے ہوئے نہیں سنا، فرمایا تب وہ ایسا نہیں ہے جیسا تم سمجھتے ہو (ابن ابی الدنیا، انسؓ) حضرت عبداللہ ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں عشرہ کے دسویں کو سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، ایک انصاری شخص نے آپ کی خدمت میں عرض کیا یا رسول اللہ! لوگوں میں سب سے زیادہ عقلمند اور سب سے زیادہ بزرگ کون ہے؟ فرمایا! جو شخص موت کا زیادہ ذکر کرتا ہو اور موت کے لئے زیادہ تیاری کرتا ہو وہی عقلمند ہے اور وہی دنیا کا شرف اور بزرگی حاصل کئے ہوئے ہے (ابن ماجہ، ابن ابی الدنیا)

حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ موت نے دنیا کو رسوا کر دیا، کسی عقلمند کے لئے خوشی میں کوئی حصہ نہیں چھوڑا، ربیع ابن خیثم کہتے ہیں کہ سو من اگر کسی غائب کا انتظار کرے تو موت سے بہتر کوئی چیز انتظار کے قابل نہیں ہے، یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ جب میں مرجاؤں تو کسی کو میری موت کی اطلاع مت دینا اور مجھے آہستہ سے میرے پروردگار کی طرف بھیج دینا، ایک دانشور نے اپنے ایک بھائی کو لکھا کہ اے بھائی اس دنیا میں موت کی آرزو کر، اس سے پہلے کہ تو ایسے گھر میں جائے جہاں تو موت کی تمنا کرے اور موت نہ ملے، حضرت ابن سیرینؒ کے سامنے جب موت کا ذکر ہوا تو ان کا ہر عضو مرجاتا، حضرت عمر ابن عبدالعزیزؒ ہر شب فقیہاء کو جمع کرتے اور سب مل کر موت، قیامت اور آخرت کا ذکر کرتے اور اس طرح روتے گویا ان کے سامنے کوئی جنازہ رکھا ہو، ابراہیم التیمی کہتے ہیں کہ دو چیزوں نے مجھ سے دنیا کی لذت منقطع کر دی ہے، موت کی یاد اور اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑا ہونے کا خیال، کہب فرماتے ہیں جو شخص موت کی معرفت رکھتا ہے اس پر دنیا کے مصائب اور اس کی پریشانیاں آسان ہو جاتی ہیں، مطرف کہتے ہیں میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک شخص بھرے کی مسجد کے درمیان کھڑا ہوا یہ کہہ رہا ہے کہ موت کی یاد نے ڈرنے والوں کے دل کلڑے کلڑے کر دیئے ہیں، بخدا وہ اس کے خوف کی بناء پر ہوش و خرد سے بیگانہ نظر آتے ہیں، اشعث کہتے ہیں کہ ہم جب بھی حسن بصریؒ کی خدمت میں حاضر ہوتے وہ دونوں، آخرت اور موت کا ذکر کرتے ہوئے ملتے، حضرت سفیہؒ روایت کرتی ہیں کہ ایک عورت نے حضرت عائشہؓ سے اپنے قلب کی شقاوت کا ذکر کیا، آپ نے فرمایا کہ موت کو کثرت سے یاد کر، حیرا دل نرم ہو جائے گا، چنانچہ اس عورت نے آپ کی ہدایت پر عمل کیا اور اس کا دل نرم ہو گیا، حضرت عیسیٰؑ کے سامنے موت کا ذکر ہوتا تو خوف کی وجہ سے جلد پھٹ جاتی اور خون بننے لگتا، حضرت داؤد علیہ السلام کی موت اور قیامت کے ذکر سے یہ کیفیت ہوتی کہ جسم کے جوڑ جوڑ اکھڑ جاتے، پھر جب رحمت الہی کا ذکر ہوتا تب اپنی حالت پر واپس آتے، حضرت حسنؒ فرماتے ہیں کہ میں نے کوئی ایسا دانا نہیں دیکھا جو موت سے خوف زدہ اور دل گرفتہ نہ ہو، حضرت عمر ابن عبدالعزیزؒ نے کسی عالم سے فصاحت کی درخواست کی، انہوں نے کہا کہ تم پہلے غلیفہ نہیں ہو جو مومگے یعنی تم سے پہلے خلفاء بھی موت سے ہمتا رہے ہو چکے ہیں، حضرت عمر ابن عبدالعزیزؒ نے کہا کچھ اور بھی کہیے، فرمایا تمہارے آباء و اجداد میں حضرت آدم علیہ السلام تک کوئی ایسا شخص نہیں ہے جس نے موت کا ذائقہ نہ چکھا ہو؟ اور اب تمہاری باری ہے، حضرت عمر ابن عبدالعزیزؒ عالم کی یہ بات سن کر رونے لگے، ربیع ابن خیثم نے اپنے گھر کے ایک حصے میں قبر

کھود رکھی تھی، وہ دن میں متعدد بار قبر میں لیٹتے، اس طرح موت کی یاد ان کے دل میں ہر وقت تازہ رہتی، فرمایا کرتے تھے کہ اگر میرا دل ایک لمحے کے لئے بھی موت سے غافل ہو جائے تو قاسد ہو جائے، طرف ابن عبد اللہ الظہیر کہتے ہیں کہ اس موت نے تو اہل دنیا کی لذات مکدر کر دیں، ایسی نعمتیں تلاش کرو جن کے لئے موت نہ ہو، حضرت عمر ابن عبد العزیزؓ نے حبسہ سے فرمایا کہ موت کو کثرت سے یاد کر، اگر تجھے عیش میں وسعت حاصل ہے تو اسے تنگ کر اور اگر تنگی ہے تو اسے وسیع کر، ابو سلیمان دارانی کہتے ہیں کہ میں نے ام ہارون سے پوچھا کہ کیا تم موت کو پسند کرتی ہو، انہوں نے کہا نہیں، میں نے کہا کیوں؟ انہوں نے جواب دیا کہ اگر میں کسی انسان کی نافرمانی کروں تو اس سے منہ چھپائے پھرتی ہوں، پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اپنے رب کی نافرمانی کروں اور اس سے ملنا پسند کروں۔

دل میں موت کی یاد راسخ کرنے کا طریقہ : جاننا چاہیے کہ موت ایک خوفناک شے ہے، اس کا خطرہ عظیم ہے، لوگ اس سے اس لئے غفلت کرتے ہیں کہ اس کے فکر و ذکر میں مشغول نہیں ہوتے اور اگر کوئی موت کا ذکر کرتا بھی ہے تو قاصر دلی کے ساتھ نہیں کرتا، بلکہ ایسے قلب کے ساتھ کرتا ہے جو دنیا کی شہوت میں مشغول ہو، اس لئے موت کے ذکر سے اس کے دل پر کوئی اثر مرتب نہیں ہوتا، موت کی یاد دل میں راسخ کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ بندہ اپنے دل کو موت کی یاد کے علاوہ ہر شے سے قاصر کر لے اور ہر وقت یہ خیال کرے گویا موت اس کے سامنے موجود ہے، جیسے کوئی مسافر اگر خطرناک راہ پر چلے کر کہتا ہو، یا مسند رکے سینے پر محو سفر ہو تو اس کی تمام توجہ سفر پر رہتی ہے، چنانچہ اگر دل میں موت کی یاد اس طرح رہے گی تو امید ہے کہ اثر انداز بھی ہوگی، اس صورت میں اس کا دل دنیا کی خوشیوں اور مسرتوں سے اعراض کرنے لگے گا، موت کی یاد کا مفید ترین طریقہ یہ ہے کہ ان لوگوں کے متعلق سوچے جو اس کے ہم عصر، ہم عمر اور ہمسرتے اور اب موت کی آغوش میں چلے گئے ہیں، ان کی موت کا تصور کرے، پہلے وہ اسی کی طرح ایک زندہ وجود کے مالک تھے اور کا دوبار حیات میں مشغول نظر آتے تھے، لیکن اب خاک کے بستر پر خواب ہیں، وہ لوگ کتنے اونچے مناصب پر فائز تھے، کتنے خوشحال اور قاصد البال تھے لیکن مٹی نے ان کے تمام مناصب اور مراتب مٹا دیئے ہیں، ان کی حسین صورتیں مسخ کر دی ہیں، ان کے اعضاء بکیر دیئے ہیں اور اب وہ خود مٹی بن چکے ہیں، ان کی بیویاں بیوگی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں، بچے یتیم ہیں، مال و جائیداد تباہ و برباد ہو گئی ہے، مساجد اور مجالس ان سے خالی ہیں، حتیٰ کہ اب ان کا کوئی ذکر بھی نہیں کرتا گویا وہ پیدا ہی نہیں ہوئے تھے، اگر ایک ایک شخص کا اس طرح جائزہ لیا جائے اور اپنے دل میں اس کا حال، اس کے مرنے کی کیفیت، اس کی صورت، اس کی سرگرمیوں اور دوسری مصروفیات ذہن میں حاضر کی جائیں اور یہ سوچا جائے کہ وہ کس طرح زندگی میں غرق تھا اور موت کو فراموش کر چکا تھا اور یہ سمجھا تھا کہ مجھے اسباب حاصل ہیں، میری قوت اور جوانی کبھی ختم نہیں ہوگی، اسی لئے وہ ہر وقت لہو و لعب میں مشغول رہتا تھا اور موت سے غافل رہتا تھا جو اس کی طرف تیزی سے بڑھ رہی تھی، زندگی میں وہ پہلے ادھر سے ادھر فرمستیاں کرتا نظر آتا تھا اور اب اس کے پاؤں ٹوٹ چکے ہیں، جسم کے تمام جوڑ ٹوٹ پھوٹ کر بکھر گئے ہیں، زندگی میں وہ خوب زبان چلاتا تھا اور قہقہے بکھیرتا تھا اور آج کیڑوں نے اس کی زبان کھالی ہے اور مٹی نے اس کے دانت خاک کر دیئے ہیں، اپنے لئے عمدہ سے عمدہ تدبیریں کرتا تھا اور ان چیزوں کا بھی بہتر سے بہتر انتظام کرتا تھا جن کی آنے والے دس برسوں میں بھی ضرورت نہیں ہوتی حالانکہ اس وقت اس کے اور موت کے درمیان صرف ایک ماہ کا فاصلہ تھا اور اسے اس کا احساس بھی نہیں تھا، یہاں تک کہ ایسے وقت میں اسے موت نے آلیا جبکہ اسے اس کے آنے کی توقع بھی نہیں تھی، اچانک موت کا فرشتہ اس کے سامنے آگیا اور اس کے کانوں میں جنت اور دوزخ کا اعلان گو مجاہ۔

یہاں پہنچ کر اپنے آپ پر نظر ڈالے کہ وہ بھی تو انہی لوگوں جیسا ہے اور اس کی غفلت کا عالم بھی وہی ہے جو ان کا ہے۔ لامحالہ اس کا انجام بھی ایسا ہی ہوگا جیسا ان کا ہوا۔ حضرت ابو الدرداءؓ فرماتے ہیں کہ جب مرنے والوں کا ذکر ہو تو اپنے آپ کو مردوں میں شمار کر، حضرت عبد اللہ ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ سعادت مند وہ ہے جو دوسروں سے عبرت پکڑے۔ حضرت عمر ابن عبد العزیزؓ فرماتے ہیں کیا تم نہیں جانتے کہ ہر دن صبح میں یا شام میں کسی نہ کسی مسافر کو آخرت کی طرف الوداع کہتے ہو اور اسے مٹی کے ایک گڑھے

میں چھوڑ آتے ہو وہ مٹی کو اپنا ٹکیر بناتا ہے۔ احباب کو پیچھے چھوڑ جاتا ہے اور اسباب دنیا سے اپنا تعلق منقطع کر لیتا ہے۔ اگر ان افکار کے ساتھ قبرستانوں میں آئے جانے اور مریضوں کی مزاج پرسی کرنے کا معمول بھی ہو تو موت کا خیال ہر وقت دل میں تازہ رہے گا بلکہ اتنا غالب آجائے گا کہ اس کا نصب العین بن جائے گا۔ اس صورت میں یہ امید کی جاسکتی ہے کہ وہ موت کی تیاری کرے گا اور اس دنیائے فریب سے کنارہ کش ہو گا۔ محض زبان سے موت کا ذکر کرنا یا اوپرے دل سے یاد کر لینا زیادہ سودمند نہیں ہے۔ جب بھی دل میں کسی اچھی چیز کا خیال پیدا ہو یہ سوچ لو کہ تمہیں اس سے جدا ہونا پڑے گا۔ ایک دن ابن مطیع کی نظر اپنے گھر پر پڑی۔ انہیں یہ کچھ اچھا محسوس ہوا۔ اس احساس کے ساتھ ہی ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور کہنے لگے بخدا اگر موت نہ ہوتی تو میں تمھ سے خوش ہوتا اور اگر ہمیں تنگ قبروں میں نہ جانا ہوتا تو ہم دنیا سے اپنی آنکھیں ٹھنڈی کرتے، پھر اس قدر روئے کہ بے اختیار جیٹیں لگ گئیں۔

طول امل، قصر امل، طول امل کے اسباب اور طریق علاج سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ ابن عمرؓ سے فرمایا۔

إِذَا أَصْبَحْتَ فَلَا تُحَدِّثْ نَفْسَكَ بِالْمَسَاءِ وَإِذَا أَمْسَيْتَ فَلَا تُحَدِّثْ نَفْسَكَ بِالصَّبَاحِ وَخُذْ مِنْ حَيَاتِكَ لِمَوْنِكَ وَمِنْ صَحَّتِكَ لِسُقْمِكَ فَإِنَّكَ يَا عَبْدَ اللَّهِ لَا تَذِيرِي مَا لِسُوءِكَ غَدًا۔ (ابن حبان) جب تو صبح کرے تو اپنے نفس سے شام کا ذکر نہ کر اور اگر شام کرے تو صبح کا ذکر نہ کر اور اپنی موت کے لئے اپنی زندگی سے اور اپنے مرض کے لئے اپنی صحت سے کچھ لے۔ اس لئے کہ اے عبداللہ تجھے یہ معلوم نہیں آنے والے کل میں تیرا نام کیا ہو گا۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ روایت کرتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

إِنْ أَشَدَّ مَا أَخَافُ عَلَيْكُمْ خَصْلَتَانِ اتِّبَاعُ الْهَوَىٰ وَطُولُ الْأَمَلِ، فَمَا اتِّبَاعُ الْهَوَىٰ فَإِنَّهُ يُصَدِّقُ الْحَقَّ، وَمَا طُولُ الْأَمَلِ فَإِنَّهُ الْحَقُّ لِلنَّبِيَّاتِ ثُمَّ قَالَ أَلَا إِنَّ اللَّهَ تَعَالَىٰ يُعْطِي النَّبِيَّاتِ مَنْ يُحِبُّ وَيَنْعُضُ وَإِذَا أَحَبَّ عَبْدًا أَعْطَاهُ الْإِيمَانَ، أَلَا إِنَّ لِلنَّبِيِّ اتِّبَاءً وَ لِلنَّبِيَّاتِ اتِّبَاءً فَكُونُوا مِنْ اتِّبَاءِ النَّبِيِّ وَلَا تَكُونُوا مِنْ اتِّبَاءِ النَّبِيَّاتِ أَلَا إِنَّ النَّبِيَّاتِ قَدْ ارْتَحَلَتْ مَوْلَانَهُنَّ أَلَا إِنَّ الْآخِرَةَ قَدَارٌ تَحُلَّتْ مُقْبِلَةً وَأَنْتُمْ فِي يَوْمٍ عَمَلٍ لَيْسَ فِيهِ حِسَابٌ أَلَا وَأَنْتُمْ تَوْشِكُونَ فِي يَوْمٍ حِسَابٍ لَيْسَ فِيهِ عَمَلٌ۔ (ابن ابی الدنیا)

سب سے زیادہ مجھے تم پر دو خصلتوں کا خوف ہے، ایک اتباعِ ہوی کا اور دوسرے طولِ امل کا، اتباعِ ہوی (آوی کو) راہِ حق سے روک دیتی ہے اور طولِ امل کے معنی ہیں دنیا کی محبت (اس کے بعد آپؐ نے فرمایا) آگاہ رہو اللہ تعالیٰ ہر شخص کو دنیا عطا کرتا ہے خواہ اس سے محبت کرتا ہو یا نفرت کرتا ہو اور جب کسی شخص سے محبت کرتا ہے تو اسے ایمان عطا کرتا ہے۔ آگاہ رہو کچھ لوگ دین کے بیٹے ہیں اور کچھ دنیا کے بیٹے ہیں، تم دین کے بیٹوں میں سے ہو جاؤ دنیا کے بیٹوں میں سے مت ہو، آگاہ رہو دنیا پیٹھ پھیر کر رخصت ہو چکی ہے، آگاہ رہو آخرت سامنے چلی آ رہی ہے، تم آج عمل کے دن میں ہو اس میں کوئی حساب نہیں ہے، عقرب تم حساب کے دن میں ہو گے، اس میں کوئی عمل نہیں ہو گا۔

اُمّ المنذر فرماتی ہیں کہ ایک شام سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کے پاس تشریف لائے اور فرمایا اے لوگو! کیا تم اللہ سے شرم نہیں کرتے؟ لوگوں نے عرض کیا وہ کیا ہے یا رسول اللہ! فرمایا تم ایسی چیزیں جمع کرتے ہو جو کھاتے نہیں ہو اور ان چیزوں کی آرزو کرتے ہو جو حاصل نہیں کرتے اور ایسے مکانات تعمیر کرتے ہو جن میں رہتے نہیں ہو (ابن ابی الدنیا) حضرت ابو سعید

خدریؒ فرماتے ہیں کہ اسامہ ابن زید نے زید ابن ثابت سے ایک مینے کے وعدے پر ایک باندی خریدی، میں نے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ کیا تمہیں اسامہ پر حیرت نہیں ہوتی جس نے ایک مینے کے وعدے پر باندی کی خریداری کی ہے، بلاشبہ اسامہ طول اہل رکھتا ہے، اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے میں نے جب بھی آنکھیں کھولیں اس گمان کے ساتھ کھولیں کہ پلکیں بند کرنے سے پہلے ہی اللہ تعالیٰ میری روح قبض کر لے گا اور جب بھی میں نے آنکھیں اوپر اٹھائیں یہ سوچ کر اٹھائیں کہ انہیں نیچے کرنے سے پہلے میری روح قبض کر لی جائے گی اور میں نے جب بھی کوئی نوالہ اٹھایا اس خیال کے ساتھ اٹھایا کہ اس کے نکلنے سے پہلے موت آجائے گی اس کے بعد فرمایا کہ اے اولادِ آدم! اگر تم عقل رکھتے ہو تو تمہیں اپنے آپ کو مردوں میں شمار کرنا چاہیے، اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے جس چیز کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے وہ آنے والی ہے اور تم اسے عاجز نہ کر سکو گے (ابن ابی الدنیا، طبرانی، بیہقی) حضرت عبداللہ ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم پیشاب گاہ سے نکلتے ہی تنیم فرماتے، میں آپ کی خدمت اقدس میں عرض کرتا یا رسول اللہ! پانی آپ سے قریب ہے، آپ ارشاد فرماتے کون جانتا ہے میں پانی تک پہنچ بھی سکوں گا یا نہیں (ابن المبارک، ابن ابی الدنیا) روایت ہے کہ ایک مرتبہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے تین لکڑیاں لیں، ایک لکڑی اپنے سامنے گاڑی، دوسری اس کے برابر اور تیسری اس سے کچھ فاصلے پر۔ اس کے بعد فرمایا کیا تم جانتے ہو یہ کیا چیز ہے۔ لوگوں نے عرض کیا اللہ و رسول زیادہ جانتے ہیں، فرمایا قریب کی دونوں لکڑیوں میں سے ایک انسان ہے اور دوسری اس کی موت ہے اور دور کی لکڑی انسان کا اہل ہے، آدمی اس کا معاملہ کرتا ہے اور موت اس کے اور اہل کے درمیان رکاوٹ بن جاتی ہے (ابن ابی الدنیا، ابوسعید الخدریؓ) ایک مرتبہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ آدمی کی مثال یہ ہے کہ اس کے ارد گرد ناونیس موتیں ہیں۔ اگر ان سب سے محفوظ رہتا ہے تو بڑھاپے کا شکار ہو جاتا ہے (ترمذی، عبداللہ الشغیر) حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ فرماتے ہیں یہ آدمی ہے، یہ موتیں ہیں جو اس کی طرف بڑھ رہی ہیں، بڑھاپا ان موتوں کے بعد ہے اور اہل بڑھاپے کے بعد ہے، آدمی اہل کرتا ہے اور موتیں اس کی طرف بڑھتی ہیں جس کو حکم دیا جاتا ہے وہ اسے اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ اگر موت سے بچ جاتا ہے تو اسے بڑھاپا قتل کر دیتا ہے حالانکہ وہ اہل کا شکار ہوتا ہے، حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک چوکور خط کھینچا اور اس کے درمیان میں بھی ایک خط کھینچا، پھر خط کے برابر میں سمت سے خطوط کھینچے اور ایک خط باہر کی طرف کھینچا، پھر فرمایا کیا تم جانتے ہو یہ کیا ہے؟ لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! اللہ اور اس کا رسول زیادہ جانتے ہیں، فرمایا یہ درمیانی خط انسان ہے اور یہ چوکور خط اس کی موت ہے جو چاروں طرف سے اس کو اپنے گھیرے میں لئے ہوئے ہے اور یہ خطوط مصائب ہیں جو اسے نوپتے کھسکتے ہیں، اگر ایک سے بچ جائے تو دوسرا اپنا عمل کرتا ہے اور چوٹی خط اہل ہے (بخاری) حضرت انسؓ فرماتے ہیں ابن آدم بوڑھا ہو جاتا ہے اور اس کے ساتھ دو چیزیں باقی رہ جاتی ہیں، ایک حرص اور دوسری اہل اور ایک روایت میں ہے کہ اس کے ساتھ دو چیزیں جو ان ہو جاتی ہیں۔ مال کی حرص اور طولِ عمر کی ہوس (ابن ابی الدنیا، مسلم) سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں اس امت کے پہلے لوگوں نے یقین اور زہد کی وجہ سے نجات پائی اور اس امت کے آخری لوگ بخل اور طولِ اہل کی وجہ سے ہلاک ہوں گے (ابن ابی الدنیا) روایت ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام تشریف فرما تھے اور ایک بوڑھا شخص اپنی کدال سے زمین کھود رہا تھا، آپ نے دعا فرمائی اے اللہ! اس شخص سے اس کا اہل دور کر دے، وہ شخص اسی وقت کدال پھینک کر زمین پر لیٹ گیا اور ایک کھٹے تک لیٹا رہا، اس کے بعد آپ نے دعا فرمائی اے اللہ! اس کا اہل واپس لوٹا دے، اس دعا کے بعد وہ شخص کدال تمام کر کھڑا ہو گیا اور زمین کھودنے لگا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دریافت کرنے پر اس شخص نے بتلایا کہ کام کرتے کرتے اچانک میرے دل نے کہا کہ اب تک کام کرے گا تو بوڑھا ہو چکا ہے، اس خیال کے آتے ہی میں نے کدال پھینک دی اور آرام کرنے لیٹ گیا، پھر میرے دل نے کہا کہ جب تک تجھے زندہ رہنا ہے معیشت ضروری ہے، یہ سوچ کر میں کدال لے کر کھڑا ہو گیا، حسن کہتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ

و سلم نے دریافت فرمایا کیا تم سب جنت میں جانا چاہتے ہو؟ لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ کیوں نہیں! فرمایا اہل کوتاہ کو اور اپنی موت اپنی آنکھوں کے سامنے جہنم اور اللہ تعالیٰ سے ایسی شرم کو جیسا کہ اس کا حق ہے (ابن ابی الدنیا) سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی دعا میں فرمایا کرتے تھے اے اللہ! میں ایسی دنیا سے تیری پناہ چاہتا ہوں جو آخرت کے خیر سے روک دے اور ایسی زندگی سے تیری پناہ چاہتا ہوں جو موت کے خیر سے روک دے (ابن ابی الدنیا، خوشب)

آثار صحابہ و تابعین طرف ابن عبد اللہ کہتے ہیں اگر مجھے یہ معلوم ہو جائے کہ میری موت کب ہے تو مجھے اپنے پاگل ہو جانے کا اندیشہ ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر موت سے غفلت دیکر احسان فرمایا ہے، اگر غفلت نہ ہوتی تو وہ زندگی کا لطف حاصل نہ کر پاتے اور نہ ان کے درمیان خرید و فروخت ہوتی، حضرت حسن بصری کہتے ہیں کہ سو اور اہل بنی آدم پر اللہ تعالیٰ کی دو بڑی نعمتیں ہیں، اگر یہ دونوں نعمتیں نہ ہوتیں تو مسلمان راستوں پر چلتے پھرتے نظر نہ آتے، حضرت سفیان ثوری فرماتے ہیں مجھے معلوم ہوا ہے کہ انسان احق پیدا کیا گیا ہے، اگر احق نہ ہوتا تو اس کی زندگی کا تمام لطف غارت ہو جاتا، ابوسعید ابن عبد الرحمن فرماتے ہیں کہ دنیا اس کے رہنے والوں کی کم عقلی سے آباد کی گئی ہے، حضرت سلمان الفارسی کہتے ہیں کہ تین آدمی مجھے اتنے حیرت انگیز لگتے ہیں کہ ان پر ہنسی آتی ہے ایک تو دنیا کا حریص حالانکہ موت اس کی تلاش میں ہے، دو سرا غافل حالانکہ اس سے غفلت نہیں کی جاتی، تیسرا قہقہے لگانے والا جسے یہ علم نہ ہو کہ پروردگار عالم اس سے ناراض ہے یا راضی ہے اور تین چیزوں نے مجھے اتنا غمزہ کیا ہے کہ میں رونے لگا ہوں، ایک تو دوستوں یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی جماعت کا فراق، دو سری قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑے ہونے کا خوف، تیسری یہ کہ میں نہیں جانتا کہ مجھے جنت کا حکم دیا جائے گا یا دوزخ کا؟ ایک بزرگ کہتے ہیں کہ میں نے زرارہ ابن ابی اونی کو ان کی وفات کے بعد خواب میں دیکھ کر کہا کہ آپ کے نزدیک کون سا عمل زیادہ بخشنے والا ہے، انہوں نے جواب دیا توکل اور قہر اہل، حضرت سفیان ثوری کہتے ہیں کہ دنیا میں زندہ کرنے کے معنی ہیں اہل کو مختصر کرنا، موٹا کھانا اور کھیل پہننا زندہ نہیں ہے، مغفل ابن فضالہ نے اپنے رب سے درخواست کی کہ ان سے اہل اٹھالیا جائے، یہ دعا مقبول ہوئی اور ان سے کھانے پینے کی خواہش رخصت ہو گئی، پھر انہوں نے اہل کی واپسی کے لئے دعا مانگی، اس دعا کے بعد ان میں کھانے پینے کی خواہش دوبارہ پیدا ہوئی، کسی شخص نے حضرت حسن بصری کی خدمت میں عرض کیا کہ اے ابوسعید! کیا آپ اپنے کپڑے نہیں دھوئیں گے؟ فرمایا معاملہ اس سے بھی زیادہ جلدی آئے والا ہے، حضرت حسن بصری فرماتے ہیں کہ موت تمہاری پیشانیوں سے بندھی ہوئی ہے اور دنیا تمہارے پیچھے لپٹی جا رہی ہے، ایک بزرگ کہتے ہیں کہ میں اس شخص کی طرح ہوں جس نے اپنی گردن لمبی کر رکھی ہو اور اس پر تلوار ہو اور یہ انتظار کر رہا ہو کہ کب اس کی گردن ماری جائے گی، داؤد طائی کہتے ہیں کہ اگر میں ایک ماہ تک زندہ رہنے کی امید کروں تو یہ ایسا ہے جیسے گناہ کبیرہ کا ارتکاب کر بیٹھوں اور میں ایک ماہ تک جینے کی توقع کس طرح کر سکتا ہوں جبکہ میں یہ دیکھتا ہوں کہ شب و روز کی ہر ساعت میں مخلوق خدا پر مصائب چھائے رہتے ہیں۔

شعین بنی اپنے شیخ ابو ہاشم الرہانی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان کی چادر کے ایک گوشے میں کوئی چیز بندھی ہوئی تھی۔ شیخ نے پوچھا یہ کیا چیز بندھی ہوئی ہے۔ انہوں نے جواب دیا تھوڑے سے بادام ہیں۔ میرے ایک بھائی نے یہ کہہ کر دیئے ہیں کہ تم شام کو ان سے انتظار کرنا، شیخ نے فرمایا اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم شام تک زندہ رہنے کی امید رکھتے ہو؟ جاؤ میں تم سے کبھی کلام نہیں کروں گا، یہ کہہ کر شیخ نے اپنا دوا نہ بند کر لیا اور اندر جا کر بیٹھ گئے، حضرت عمر ابن عبد العزیزؓ نے اپنے ایک خطبے میں ارشاد فرمایا کہ ہر سفر کے لئے بالیقین کوئی نہ کوئی توشہ ہوا کرتا ہے، تم دنیا سے آخرت تک کے سفر کے لئے تقویٰ کا زور اہ اختیار کرو، اللہ تعالیٰ نے تمہیں اپنے عذاب و ثواب کے جو مظاہر دکھائے ہیں ان میں خوف و رغبت رکھو، حرم کو طول مت دو، ورنہ تمہارے دل سخت ہو جائیں گے اور تم اپنے دشمن کے تابع ہو جاؤ گے، خدا کی قسم وہ شخص طول اہل میں جھلا نہیں ہوتا جو یہ جانتا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ

میں صبح کے بعد شام نہ کروں اور شام کے بعد صبح کا منہ نہ دیکھوں، ان دونوں وقتوں کے درمیان اکثر موت کے حملے ہوا کرتے ہیں، میں نے اور تم نے بے شمار لوگوں کو دنیا کے قریب میں جلا دیکھا ہے لیکن آنکھیں اس شخص کی ٹھنڈی ہوا کرتی ہیں جو اللہ تعالیٰ کی نجات پر اتماد رکھتا ہو اور وہ شخص خوش ہوتا ہے جو قیامت کی دہشتوں سے محفوظ و مامون ہو اور جس شخص کا حال یہ ہو کہ ابھی زخم کا علاج صحیح طریقہ پر نہیں ہو سکا اور دوسرا زخم ہو گیا بھلا وہ شخص کیسے خوش رہ سکے گا، میں اس بات سے اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہتا ہوں کہ جو کام خود نہ کروں اس کا دوسرے کو حکم دوں پھر میری تجارت کا نقصان، میرا عیب اور مسکنت اس دن ظاہر ہو جس دن مالدار کی اور غربت کی صحیح حقیقت سامنے آئے گی اور ترازو نہیں کھڑی ہو جائے گی، تم ایسے امر کی تکلیف میں مبتلا کئے گئے ہو کہ اگر ستاروں کو یہ تکلیف ہوتی تو ان کی روشنی زائل ہو جاتی اور اگر پہاڑوں کو اس تکلیف میں مبتلا کیا جاتا تو وہ پکھل کر بہ جاتے اور اگر زمین کو یہ تکلیف دی جاتی تو اس کا سینہ پھٹ جاتا، کیا تم نہیں جانتے کہ جنت اور دوزخ کے درمیان کوئی منزل نہیں ہے، تم ان دونوں میں سے کسی ایک کی طرف جانے والے ہو، ایک شخص نے اپنے بھائی کو لکھا ”سلام و دعا کے بعد واضح ہو کہ دنیا ایک خواب ہے اور آخرت بیداری ہے اور ان دونوں کے درمیان موت ہے اور ہم پر آئندہ خوابوں میں ہیں، فقط والسلام“ ایک اور شخص نے اپنے بھائی کو لکھا کہ ”دنیا پر غم بہت طویل ہے اور موت انسان سے قریب ہے اور ہر روز کچھ نہ کچھ کی ہوتی رہتی ہے اور جسم میں مصائب گردش کرتے رہتے ہیں اس سے پہلے کہ کوچ کا قافہ بچے تمہیں سفر کی تیاری کرنی چاہیے“ حضرت حسنؑ کہتے ہیں کہ خطا کرنے سے پہلے اہل حضرت آدم علیہ السلام کی پشت کے پیچھے تھی اور موت آنکھوں کے سامنے اور جب خطا کے مرتکب ہوئے تو اہل کو آنکھوں کے سامنے کر دیا گیا اور موت پیٹھ کے پیچھے، عبد اللہ ابن سہید کہتے ہیں کہ میں نے اپنے والد کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ اے طویل صحت سے قریب کھانے والے کیا تو نے کوئی شخص نہیں دیکھا جو بغیر مرض کے موت کی آغوش میں پہنچ گیا ہو، اے وہ شخص جسے زیادہ ڈھیل ملنے سے غلط فہمی ہو گئی ہے کیا تو نے کوئی ایسا شخص نہیں دیکھا جو بغیر سالمان کے گرفتار کر لیا گیا ہو اگر تو اپنی طویل عمر میں فکر کرے تو اپنی تمام پچھلی لذتیں فراموش کر دے، کیا تم صحت سے قریب کھا رہے ہو، کیا طویل حیات سستی سے خوش ہو، کیا موت سے محفوظ ہو، کیا ملک الموت پر جبری ہو؟ اگر ملک الموت آگئے تو انہیں نہ حیرتی مالدار کی روک کے گی اور نہ دوستوں کی کثرت، کیا تو نہیں جانتا کہ موت کی گھڑی تکلیف، اذیت اور ندامت کی گھڑی ہے، اس کے بعد وہ یہ کہا کرتے تھے اللہ تعالیٰ اس شخص پر رحم کرے جو موت کے بعد کی زندگی کے لئے عمل کرے، اللہ تعالیٰ اس شخص پر رحم فرمائے جو موت کی آمد سے پہلے اپنے اوپر نظر ڈال لے، ابو ذرؓ کیا سلیمان اٹھی کہتے ہیں کہ سلیمان ابن عبد الملک مسجد حرام میں بیٹھے ہوئے تھے اسی دوران کوئی شخص ایک ایسا پتھر لے کر آیا جس پر کچھ عبارت کندہ تھی انہوں نے ایسے شخص کو طلب کیا جو یہ عبارت پڑھ کر سنا سکے، چنانچہ وہب ابن منبہ کو پڑھنے کے لئے لایا گیا، اس پتھر پر یہ عبارت تھی اے ابن آدم! اگر تجھے معلوم ہو جائے کہ موت کس قدر قریب ہے تو تو طویل اہل ترک کر دے اور کثرت عمل کی طرف راغب ہو، اپنی حرص اور حیلے کم کر دے، اگر تیرے قدموں نے لغزش کھائی تو تجھے آنے والے کل میں ندامت کا سامنا کرنا ہو گا، تیرے گمراہی اور خدم و حشم تجھے قبر کے حوالے کر دیں گے، تیرے والد اور قریبی عزیز تم سے جدا ہو جائیں گے، تیرے بیٹے اور داماد تجھے چھوڑ دیں گے پھر نہ تجھے دنیا میں واپس آنے کا موقع ملے گا اور نہ تیرے اعمال میں زیادتی ہوگی، تجھے حیرت اور ندامت سے پہلے قیامت کے لئے عمل کرنا چاہیے، یہ عبارت سن کر سلیمان ابن عبد الملک بہت رونے لگے۔

ایک بزرگ کہتے ہیں کہ میں نے محمد ابن یوسف کا ایک خط دیکھا جو عبد الرحمن ابن یوسف کے نام تھا، اس خط میں لکھا ہوا تھا کہ میں اس ذات کی حمد و ثناء بیان کرتا ہوں جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے حمد و ثناء کے بعد! میں تجھے اس وقت سے ڈراتا ہوں جب تو اپنے مملکت کے گھر سے اپنے قیام اور جزاء اعمال کے گھر کی طرف منتقل ہو اور زمین کے سینے پر رہنے کے بعد اس کے باطن میں غفل ہو جائے، پھر تیرے پاس منکر نکیر آئیں تجھے قبر میں بٹھائیں اور ڈانٹ ڈھٹ کریں اب اگر اللہ تیرے ساتھ ہو تو پھر تجھے کسی

قسم کا خوف نہ ہو گا نہ وحشت ہوگی اور نہ کسی چیز کی ضرورت ہوگی اور اگر تیرے ساتھ اللہ کے سوا کوئی ہو تو میری دعا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تجھے اور مجھے بے لٹکانے اور تنگ مسکن سے محفوظ رکھے پھر حشر پھا ہو گا قیامت کا صور پھونکا جائے گا جبار مطلق مخلوق کے مقدمات فیصلہ کرے گا زمین اپنے باشندوں سے خالی ہو جائے گی اور آسمان اپنے رہنے والوں سے خالی ہو جائے گا تب اسرار سے پردے اٹھیں گے، آگ سلائی جائے گی ترازو نہیں کھڑی کی جائیں گی، انبیاء اور شہداء بلائے جائیں گے اور لوگوں کے معاملات میں صحیح فیصلہ کیا جائے گا اور کہا جائے گا کہ تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں جو تمام جانوں کا پالنے والا ہے، بہت سے رسوا ہوں گے، بہت سوں کے عیوب پر پردہ ڈالا جائے گا، بہت سوں کی قسمت میں ہلاکت ہوگی، بہت سے نجات پائیں گے، بہت سوں کو عذاب ہوگا، بہت سوں کے ساتھ رحم و کرم کا معاملہ کیا جائے گا، میں نہیں جانتا کہ اس دن میرا اور تیرا کیا حال ہوگا، اگر اس دن کا تصور کر لیا جائے تو لذتیں فنا ہو جائیں، شہوات ترک کر دی جائیں اور اہل کوتاہ ہو جائیں، سونے والے بیدار ہوں اور غفلت میں پڑے ہوئے لوگ ہوشیار ہوں، اللہ تعالیٰ اس عظیم خطرے پر ہماری اور تمہاری مدد فرمائے اور میرے تیرے دل میں دنیا و آخرت کے لئے وہ جگہ کرے جو ان دونوں کے لئے متعین کے دلوں میں ہوتی ہے، ہم اسی کے ہیں اور اسی کے باعث موجود ہیں۔ والسلام۔“

حضرت عمر ابن عبدالعزیزؓ نے ایک دن تقریر فرمائی اور حمد و ثناء کے بعد ارشاد فرمایا۔ اے لوگو! تم بلاوجہ پیدا نہیں کئے گئے ہو اور نہ تمہاری تخلیق بلا مقصد عمل میں آئی ہے بلکہ تمہارے لئے ایک یوم معاہدہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ تمہیں عہد اور فیصلے کے لئے اکٹھا کرے گا، کل وہ شخص ناکام اور بد بخت رہے گا جسے اللہ تعالیٰ اپنی اس رحمت سے محروم کر دے جو ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے اور اپنی جنت سے نکال دے جس کا عرض آسمانوں اور زمین کے برابر ہے، کل کے دن امان اسی شخص کو حاصل ہو گا جو ڈرے گا، تقویٰ کی راہ پر چلے گا اور بہت سی چیز کو تھوڑی سی چیز کے عوض اور پائیدار شئی کو ناپائیدار کے عوض اور سعادت کو شقاوت کے عوض خرید لے، کیا تم یہ نہیں دیکھتے کہ تم مرنے والوں کے بعد باقی رہ گئے ہو اور تمہارے مرنے کے بعد اور لوگ باقی رہ جائیں گے، کیا تم ہر روز اللہ تعالیٰ کی طرف جانے والوں کی مشاہدت نہیں کرتے جنہوں نے اپنا وقت پورا کر لیا ہے اور جن کے اہل کاسلہ منقطع ہو چکا ہے، تم انہیں زمین کے ایک ایسے گڑھے میں رکھ آتے ہو جس میں نہ کوئی فرش ہوتا ہے اور نہ ٹکیہ ہوتا ہے نہ ان کے ساتھ کوئی سامان ہوتا ہے اور نہ دوستوں کا ساتھ ہوتا ہے، حساب و کتاب کا مرحلہ درپیش ہوتا ہے، میں یہ باتیں تم سے کر رہا ہوں، بخدا میں اپنے نفس میں جتنے گناہ پاتا ہوں اتنے گناہ تم میں سے کسی شخص کے اندر نہیں دیکھتا لیکن اللہ کی سنن عادلانہ ہیں، میں ان میں اس کی اطاعت کا حکم کرتا ہوں اور نافرمانی سے منع کرتا ہوں اور اللہ سے مغفرت مانگتا ہوں اتنا کہ کہ حضرت عمر ابن عبدالعزیزؓ نے آستین اپنے پیچ پر رکھ لی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے، یہاں تک کہ آپ کی داڑھی آنسوؤں سے بھیگ گئی اور اپنی نشست گاہ تک پہنچنے سے پہلے وفات پا گئے، حقیقۃً ابن حکیم کہتے ہیں کہ میں نے تیس برس سے موت کی تیاری کر رکھی ہے، جب موت آئے گی تو میں یہ پسند نہ کروں گا کہ ایک شے دوسری شے سے مؤخر ہو جائے، سفیان ثوریؒ کہتے ہیں کہ میں نے کوئے کی مسجد میں ایک بوڑھے کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ میں اس مسجد میں تیس برس سے موت کا منتظر ہوں جب بھی وہ آئے گی نہ میں کسی چیز کا حکم کروں گا اور نہ کسی چیز سے منع کروں گا، نہ میرے پاس کسی کی کوئی چیز ہے اور نہ کسی کے پاس میری، عبداللہ ابن عجلہ کہتے ہیں کہ تم ہنس رہے ہو، ہو سکتا ہے تمہارا کفن دھوبی کے یہاں سے آچکا ہو، ابو محمد ابن علی الزہادؒ کہتے ہیں کہ ہم کوئے میں ایک جنازے کے ساتھ چلے، حضرت داؤد طائیؒ بھی ہمارے ساتھ تھے، جب میت کی تدفین عمل میں آگئی تو داؤد طائیؒ ایک گوشے میں جا بیٹھے، میں بھی ان کے قریب جا کر بیٹھ گیا، انہوں نے فرمایا جو شخص عذاب کی وعید سے ڈرتا ہے وہ دور کی چیز کو قریب سمجھتا ہے، جس کا اہل طویل ہوتا ہے، اس کا عمل ضعیف ہوتا ہے، جو چیز آنے والی ہے وہ نہایت قریب ہے، اے بھائی یہ بات جان لو کہ جو چیز تمہیں رب سے مشغول کر دے وہ نہایت منحوس ہے، یاد رکھو تمام دنیا والے قبر میں جائیں گے اس وقت ان اعمال پر ندامت ہوگی جو ان سے پیچھے رہ جائیں گے اور ان اعمال پر خوشی ہوگی جو آگے چلے جائیں گے، قبر والے جن چیزوں پر نادم ہوں گے دنیا والے انہی پر لڑتے مرتے ہیں، انہی میں

مسابقت کرتے ہیں اور انہی میں قاضیوں کے پاس انصاف کی تلاش میں جاتے ہیں، روایت ہے کہ معروف کرفی نے تکبیر کی اور محمد ابن ابی توبہ سے کہا کہ تم امامت کرو، انہوں نے کہا کہ اگر میں نے یہ نماز پڑھا دی تو دوسری نماز نہیں پڑھاؤں گا، معروف کرفی نے ان سے فرمایا کیا تم یہ سوچ رہے ہو کہ دوسری نماز نہیں پڑھا سکو گے، ہم طول اہل سے اللہ کی پناہ چاہتے ہیں، وہ آدمی کو عمل خیر سے روکتا ہے، حضرت عمر ابن عبدالعزیزؓ نے اپنے خطبے کے دوران فرمایا دنیا رہنے کی جگہ نہیں ہے، بہت سے گمراہے ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے فحاکم لکھ دیا ہے اور ان گھروں کے باشندوں پر ان سے جدائی لکھ دی ہے، بہت سے وہ لوگ جو خوب آباد ہوتے ہیں چند روز میں برباد ہو جاتے ہیں اور بہت سے ایسے قیام کرنے والے کہ لوگ ان کے قیام کی خواہش کریں، رخت سفر باندھ لیتے ہیں، اللہ تعالیٰ تم پر رحم فرمائے، تم ان سے اچھی طرح سفر کرنا اور اچھا سامان سفر اور عمدہ زاد راہ لے لیتا، بہترین زاد راہ تقویٰ ہے، دنیا ایک سائے کی طرح ہے جو گھٹنا چلا جاتا ہے، بندہ کا حال تو یہ ہے کہ ابھی دنیا میں رغبت و حرص رکھے ہوئے اور اس کے مال و دولت پر نازاں و شاداں بیٹھا ہوا ہے، اتنے میں اللہ تعالیٰ نے اسے اپنے حکم سے بلالیا اور اس کے سر پر اس کی موت نازل کر دی، اس کے تمام آثار مٹا ڈالے، اس کی دنیا فنا کر دی اور اس کا تمام امانہ تمام آثار اور مال و دولت دوسروں کے لئے کر دی، دنیا جتنا نقصان پہنچاتی ہے اتنا نفع نہیں پہنچاتی، خوشی کم دیتی ہے اور رنج و غم زیادہ بخشتی ہے، حضرت ابو بکر الصدیقؓ اپنے خطبے میں ارشاد فرمایا کرتے تھے ”وہ لوگ کہاں گئے جن کے چہرے روشن اور خوبصورت تھے، جنہیں اپنی جوانی پر غرور تھا، وہ بادشاہ کہاں رخصت ہو گئے جنہوں نے بڑے بڑے شہر آباد کئے اور ان کے ارد گرد بلند و بالا دیواریں کھڑی کیں، وہ لوگ کہاں چلے گئے جو میدان جنگ میں دشمنوں پر غلبہ پاتے تھے، زمانے نے انہیں شکست دیدی اب وہ قبر کی تاریکیوں کا حصہ بن گئے ہیں، اس لئے جلدی کرو اور اپنے لئے نجات کا وسیلہ ڈھونڈو۔“

طول اہل کے اسباب اور علاج : طول اہل کے دو سبب ہیں۔ ایک جمالت اور دوسرا حبت دنیا۔ حبت دنیا کے معنی یہ ہیں کہ جب آدمی اس سے اس کی سموات، لذات اور علائق سے مانوس ہو جاتا ہے تو اس کے دل پر دنیا سے مفارقت اختیار کرنا گراں گذرتا ہے اور وہ اسے موت میں فکر کرنے سے روک دیتا ہے کیونکہ موت ہی مفارقت کا سبب ہے۔ آدمی اس شئی کو فطرتاً خود سے دور کرتا ہے جو اسے پسند نہیں ہوتی۔ انسان کی فطرت یہ ہے کہ وہ ہمیشہ جموٹی آرزوؤں میں مبتلا رہتا ہے اور ایسی چیز کی تمنا کرتا ہے جو اس کی مراد کے موافق ہو۔ چنانچہ دنیا میں باقی رہنا اس کی مراد کے عین مطابق ہے۔ اس لئے وہ ہر وقت اسی کے متعلق سوچتا ہے اور ان تمام چیزوں کو اپنے لئے فرض کر لیتا ہے جو بقاء کے قائل ہیں جیسے مال، بیوی بچے، گھر، دوست، احباب، جانور اور دوسرے تمام اسباب دنیا۔ اس کا دل اس فکر میں اس قدر مشغول رہتا ہے کہ موت سے غافل بن جاتا ہے اس کا قرب پسند نہیں کرتا، اگر کبھی دل میں یہ خیال بھی پیدا ہوتا ہے کہ اسے مرنا ہے اور اب ضرورت موت کے لئے تیار رہنے کی ہے تو ٹال مٹول سے کام لیتا ہے اور نفس کو وعدہ فردا پر ترخا دیتا ہے اور کہتا ہے کہ ابھی بہت دن باقی ہیں۔ پہلے بڑا تو ہو جاؤں۔ پھر توبہ کر لوں گا، جب بڑا ہو جاتا ہے تو اسے بڑھاپے پر متعلق کر دیتا ہے۔ جب بوڑھا ہو جاتا ہے تو اس سے یہ کہتا ہے کہ پہلے مکان کی تعمیر سے فراغت حاصل کر لوں یا فلاں سفر سے واپس آ جاؤں یا اس بچے کے مستقبل کے لئے کچھ کر لوں یا فلاں دشمن سے نمٹ لوں پھر توبہ کر لوں گا۔ نفس کو اسی طرح ٹالتا ہے اور توبہ میں تاخیر پر تاخیر کرنا چلا جاتا ہے اور یہ سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوتا کیونکہ جس کام میں مشغول ہوتا ہے اس میں دس کام نئے پیدا ہو جاتے ہیں، یہاں تک کہ توبہ میں تاخیر کا سلسلہ دراز سے دراز تر ہو جاتا ہے، نئی نئی مشغولیات سامنے آتی رہتی ہیں اور ان کی تکمیل کے ددائی شدت کے ساتھ ابھرتے رہتے ہیں، بالآخر وقت موعود آپہنچتا ہے اور موت اسے ایسے وقت میں اچک لیتی ہے جب اسے اس کا وہم و گمان بھی نہیں ہوتا، اس وقت اس کی حسرت دیکھنے کے قابل ہوتی ہے، اکثر لوگوں کو اس ٹال مٹول کی بناء پر دونخ کا عذاب دیا جائے گا، چنانچہ اکثر اہل دونخ چیخ و گریہ کر کہیں گے ہائے افسوس ہم نے توبہ میں تاخیر کی، اعمال صالحہ میں تاخیر کی، یہ بھلا انسان یہ نہیں سمجھ پاتا کہ آج میں جس سبب سے توبہ کو کل پر متعلق کر رہا ہوں کل بھی وہ سبب اپنی

جگہ برقرار رہے گا بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس میں مزید قوت اور مزید رسوخ ہو جائے گا وہ یہ سمجھتا ہے کہ دنیا میں مشغول رہنے والے کو کسی نہ کسی وقت فرصت ضرور نصیب ہوگی، یہ اس کی خام خیالی ہے، فراغت صرف اسے میسر آسکتی ہے جو بالکل طور پر دنیا سے اپنے آپ کو لا تعلق کر لے، چنانچہ اسی مضمون کا ایک شعر ہے۔

فَمَا قَضَىٰ أَحَدٌ لُبَّائَتَهُ - وَمَا انْتَهَىٰ لُبُّ إِلَىٰ لُبِّ

(کوئی اپنی حاجت پوری نہیں کر سکا۔ اس لئے کہ حاجتوں کی کوئی انتہا نہیں ہوتی)

ان تمام آرزوؤں کی اصل دنیا کی محبت، اس کا انس اور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان سے غافل ہونا ہے۔
أَحِبِّ مَنْ أَحَبَّتْ فَإِنَّكَ مُقَارِقُهُ (تو جس سے چاہے محبت کر لے تجھے اس سے لانا جدا ہونا ہے)۔

جہالت یہ ہے کہ انسان کو اپنی جوانی پر بڑا بھروسہ ہوتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ اسے عالم شباب میں موت نہیں آسکتی، حالانکہ یہ سراسر ناوانی اور جہالت ہے اگر وہ اپنے گرد و پیش پر نظر ڈالے تو بوڑھوں کی تعداد بہت کمپائے گا، جس کی وجہ یہ ہے کہ بڑھاپے سے پہلے اموات بہت ہوتی ہیں، جب تک ایک بوڑھا موت کے دروازے پر دستک دیتا ہے ہزاروں جوان اور بچے موت کی آغوش میں چلے جاتے ہیں، کبھی موت کو اپنی صحت کے نقطہ نظر سے بعید تصویر کرتا ہے اور اچانک موت کو اہمیت ہی نہیں دیتا، وہ یہ نہیں جانتا کہ اچانک موت مستبعد نہیں ہے، اگر اچانک موت کو مستبعد فرض کر لیا جائے تو اچانک مرض کو مستبعد نہیں کہا جاسکتا بلکہ مرض اچانک ہی ظاہر ہوتا ہے اور جب آدمی بیمار ہو جائے تو کون کہہ سکتا ہے کہ موت اس سے بعید ہے اگر یہ غافل سوچے اور سمجھے کہ موت کا کوئی مخصوص اور متعین وقت نہیں ہے بلکہ وہ بچپن، جوانی، بڑھاپے، سردی، گرمی، بہار، خزاں، دن اور رات میں کسی بھی وقت آسکتی ہے تو امید ہے کہ موت اس کی نظر میں اہمیت اختیار کر لے گی اور وہ اس کی تیاری میں کھل ہو سکے گا، لیکن ان امور سے عدم واقفیت، اور دنیا کی محبت اس کے سامنے ہے لیکن اسے یہ خیال نہیں آتا کہ اس پر واقع بھی ہو سکتی ہے، وہ جنازوں کی مشاہدت کرتا ہے لیکن یہ نہیں سمجھتا کہ میرے جنازے میں بھی لوگ اسی طرح چلیں گے، اصل میں جنازوں کی مشاہدت ایک عادت سی بن گئی ہے، وہ سروں کو مردہ دیکھنے کا عمل اتنی بار ہو چکا ہے کہ اب اس سے بھی طبیعت مانوس ہو گئی ہے، اب کسی میت کو دیکھ کر دل میں اپنی موت کا احساس نہیں جانتا اور نہ اس کا خیال آتا ہے نہ طبیعت اس سے مانوس ہوتی ہے کیونکہ اس کی موت ایک ہی بار آئے گی، وہ ہی اول ہوگی وہی آخر ہوگی بمثلاً ایک مرتبہ کے حادثے سے طبیعت کو کیسے انس ہو سکتا ہے؟ اصل میں جب بھی کسی جنازے کی مشاہدت کرے خود کو مردہ تصور کرے اور یہ سوچے کہ خود اس کا جنازہ بھی اسی طرح لوگ کاندھوں پر لے کر چلیں گے اور اسے بھی قبر میں دفن کریں گے، شاید وہ انہیں بھائی چاچکی ہوں جو اس کی لحد بند کرنے میں استعمال ہوں گی۔ حالانکہ اسے اس کا علم بھی نہیں، بہر حال ٹال مٹول سے کام لینا محض جہالت اور ناوانی ہے۔

جب یہ بات واضح ہو گئی کہ تاخیر کا سبب جہل اور دنیا کی محبت ہے تو اس کا علاج بھی جاننا ضروری ہے۔ کسی مرض کا علاج اس کا سبب دور کر کے کیا جاتا ہے۔

جہل کا علاج قلب حاضر میں منہائے فکر اور قلوب طاہرہ سے حکمت کی باتیں سننے سے کیا جاسکتا ہے البتہ دنیا کی محبت کا علاج مشکل ہے، یعنی قلب سے اس کا نکالنا نہایت سخت ہے، یہ ایک ایسی سنگین بیماری ہے جس کے علاج نے انگوں اور پچھلوں سب کو تھکا دیا ہے اور اس کا علاج اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ بندہ یوم آخرت پر اور جو کچھ اس میں عذاب و ثواب ہے اس پر ایمان لائے اور جب یوم آخرت پر یقین کامل ہو جائے گا تو دنیا کی محبت قلب سے رخصت ہو جائے گی کیونکہ عظیم چیز کی محبت دل سے حقیر چیز کی محبت زائل کر دیتی ہے۔ یہاں ایک طرف دنیا اپنی تمام خفارتوں کے ساتھ ہے اور دوسری طرف آخرت اپنی تمام تر خفاستوں کے ساتھ ہے، جب آدمی منہائے قلب کے ساتھ ان دونوں میں فکر کرے گا تو وہ دنیا کی طرف ذرا بھی التفات نہیں رکھے گا، اگرچہ اسے مشرق سے مغرب تک کی حکومت ہی کیوں نہ دیدی جائے، اس لئے کہ آدمی کو اس وسیع دنیا میں سے نہایت معمولی حصہ ملتا ہے اور

وہ بھی ٹکڑے خالی نہیں ہوتا۔ سبھی ایک شخص جس کے دل میں آخرت کا ایمان راسخ ہو اس معمولی دنیا پر کیسے خوش ہو سکتا ہے اور کس طرح اس کی محبت اپنے دل میں بٹخت کر سکتا ہے، دعا ہے اللہ ہمیں دنیا کو اسی طرح دکھلائے جس طرح صالحین امت دیکھا کرتے تھے۔

موت کا تصور اپنے دل میں راسخ کرنے کی اس سے بہتر کوئی اور صورت نہیں ہے کہ ہم شکلوں اور ہمسروں میں سے جو لوگ موت کی آغوش میں پہنچ گئے ہیں، ان کی یاد اپنے دل میں تازہ رکھے اور یہ سوچے کہ ان بھائیوں کو موت نے کس طرح اپنے بچوں کی گرفت میں لے لیا، حالانکہ انہیں اس کی آمد کا گمان بھی نہیں تھا، ہاں جو شخص ہر طرح مستعد ہوتا ہے وہ زبردست کامیابی حاصل کرتا ہے اور جو شخص طول اہل کے قریب میں رہتا ہے وہ سخت نقصان اٹھاتا ہے، انسان کو ہر گھڑی اپنے اعضاء و جوارح پر نظر ڈالنی چاہیے، اس وقت یہ کتنے خوبصورت، جاندار اور مضبوط ہیں لیکن غریب قبر کے کیرے انہیں اپنی خوراک بنالیں گے، ہڈیاں بکھر جائیں گی، کیرے پہلے دائیں آنکھ یا بائیں آنکھ کے ڈھیلے کو اپنا لقمہ بنائیں گے۔ میرے جسم کا کوئی عضو ایسا نہیں ہے جسے کیرے نہیں کھائیں گے، اگر میرے ساتھ کچھ جائے گا تو وہ صرف علم صحیح یا عمل صالح ہوگا، اس فکر کے ساتھ ساتھ ان امور پر بھی فکر کرے جو غریب بیان کئے جائیں گے، جیسے عذاب قبر، منکر نکیر کے سوال، حشر، نشر، احوال قیامت اور بڑے دن کی پیشی کے لئے آواز، یہ امور ایسے ہیں کہ اگر ان میں فکر کیا جائے تو موت کی یاد تازہ رہتی ہے اور اس کے لئے تیاری کی خواہش ہوتی ہے۔

طول اہل اور قصر اہل کے سلسلے میں لوگوں کے مراتب : لوگ اس سلسلے میں مختلف قسم کے ہیں، بعض لوگ بقاء کی آرزو کرتے ہیں اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دنیا میں رہنا چاہتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کے متعلق ارشاد فرمایا ہے۔

يَوْمَآحْلُكُهُمْ لِيُؤَيِّمَنَّ الْفَسَقَةُ (پ ۱، ا ۱، آیت ۹۶)

ان میں سے کوئی چاہتا ہے کہ اگر اسے ایک ہزار برس کی عمر دیدی جائے۔

بعض لوگ بوجہ اپنے تک زندہ رہنا چاہتے ہیں، یہ وہ انتہائی عمر ہے جو مشاہدہ میں آتی رہتی ہے، یہ لوگ دنیا کی شدید محبت میں گرفتار ہوتے ہیں، چنانچہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں۔

الشَّيْخُ شَابٌ فِي حُبِّ طَلَبِ الدُّنْيَا وَإِنْ التَّفَتُ نَزَقُوا مِنْ الْكِبَرِ إِلَّا الَّذِينَ اتَّقَوْا
وَقَلِيلٌ مِّنْهُمْ (بخاری و مسلم، ابو ہریرہؓ، مکتبہ آخر)

بوجہ آدمی طلب دنیا کی محبت میں جوان ہوتا ہے، اگرچہ بوجہ اپنے سے اس کی ہنسلیاں مڑ گئی ہوں مگر وہ لوگ ایسے نہیں ہوتے جو متقی ہیں۔ تاہم متقی بہت کم ہیں۔

بعض لوگوں کو ایک سال سے زیادہ کی توقع نہیں ہوتی، اسی لئے وہ صرف ایک سال کی ضروریات کا اہتمام کرتے ہیں اور سردی میں گرمی کے لئے اور گرمی میں سردی کے لئے جمع کرتے ہیں، چنانچہ جب ایک سال کی ضروریات جمع ہو جاتی ہیں تو عبادت میں مشغول ہو جاتے ہیں، بعض لوگ ایک سال سے بھی کم جینے کی توقع رکھتے ہیں، ایسے لوگ ایک موسم میں دوسرے موسم کی تدبیر نہیں کرتے، بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو ایک دن سے زیادہ کا اہل نہیں کرتے، صرف آج کی تیاری کرتے ہیں، کل کی فکر میں مشغول نہیں ہوتے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں کہ کل کے رزق کی فکر مت کرو، اگر تمہاری زندگی میں کل آئے والا ہے تو اس کے ساتھ کل کا رزق بھی ضرور آئے گا اور اگر تمہاری زندگی میں کل کا وجود نہیں ہے تو تم دوسروں کی زندگی کے لئے فکر مت کرو، بعض لوگ وہ ہیں جن کا اہل ایک ساعت سے تجاوز نہیں کرتا، جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اے عبد اللہ! جب تو صبح کئے تو اپنے دل میں شام کا خیال نہ کر اور شام کئے تو اپنے دل میں صبح کا تصور نہ کر۔ اور بعض لوگ ایک ساعت کا بھی محسوس نہیں کرتے تھے، چنانچہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم استغیثے سے فراغت کے بعد اسی ساعت میں تنہم فرما لیتے تھے

حالا نکلے پانی زیادہ دور نہیں ہوتا تھا، فرماتے تھے کہ شاید میں پانی تک نہ پہنچ سکوں اور بعض ایسے ہوتے ہیں گویا موت ان کے سامنے ہے اور اب واقع ہو اسی چاہتی ہے ایسا ہی شخص رخصت کرنے والے کی سی نماز پڑھا کرتا ہے، معاذ ابن جبلؓ کا یہی حال تھا، چنانچہ جب سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے ان کے ایمان کی حقیقت دریافت کی تو انہوں نے عرض کیا کہ میں نے کوئی قدم ایسا نہیں رکھا کہ یہ گمان کیا ہو کہ اب اس کے بعد دو سر اقدم رکھ سکوں گا (ابو نعیم فی الحلیہ) اسود جشیؓ کے ہارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ وہ رات کو نماز پڑھتے تھے اور ادھر ادھر دیکھتے تھے کسی کئے والے نے ان سے کہا کہ آپ یہ کیا کرتے ہیں، انہوں نے فرمایا میں یہ دیکھتا ہوں کہ ملک الموت کس طرف سے آرہے ہیں۔

یہ ہے لوگوں کے مختلف مراتب اور درجات کی تفصیل۔ اللہ تعالیٰ کے یہاں ان تمام درجات کے مطابق جزاء ہے، جس شخص کا اہل ایک مہینے کا ہے وہ اس شخص سے مختلف ہے جس کا اہل ایک مہینے سے زائد کا ہے خواہ وہ زیادتی ایک ہی دن کی کیوں نہ ہو دونوں کا ایک مرتبہ نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کے یہاں عدل ہے، وہ دونوں کو برابر و رچہ کر کے نا انصافی نہیں کرتا، فرمایا۔

فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ (پ ۳۰ ر ۲۳، آیت ۸)

سو جو شخص ذرہ برابر نیکی کرے گا وہ اس کو لکھ لے گا۔

قصر اہل کا اثر عمل کی طرف مبادرت کرنے میں ظاہر ہوتا ہے، اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ میرا اہل کوتاہ ہے تو اس کا یقین نہ کرو، پہلے اس کے اعمال دیکھو، اگر وہ ایسے اسباب میں مشغول نظر آتا ہے جس کی حاجت اسے سال بھر میں بھی پڑنے والی نہیں ہے تو یہ عمل طول اہل پر دلالت کرتا ہے، توفیق کی علامت یہ ہے کہ موت آنکھوں کے سامنے ہو اور اس سے ایک ساعت کے لئے بھی غافل نہ ہوتا ہو اور موت کے لئے ہر وقت مستعد نظر آتا ہو اور اگر شام تک زندہ رہ جائے تو اللہ کا شکر ادا کرے کہ اس نے اپنی طاعت کا موقع نصیب فرمایا اور خوش ہو کہ اس کا دن رائیگاں نہیں گیا بلکہ اس نے اس میں سے اپنا حصہ وصول کر لیا ہے اور جو کچھ وصول کیا ہے اسے آخرت کے لئے ذخیرہ کر لیا ہے، ہر صبح کی ابتدا بھی اسی شکر اور سبوح و طاعت کے ساتھ کرے، یہ کام صرف وہی شخص سہولت سے انجام دے سکتا ہے جس کا قلب آنے والے کل سے فارغ ہو اور اسے یہ فکر نہ ہو کہ کل کیا ہو گا؟ ایسا شخص مرنے کے بعد سعادت پائے گا اور زندگی میں موت کی تیاری اور مناجات کی لذت سے خوش رہے گا، موت اس کے لئے ذریعہ سعادت ہے اور زندگی زیادتی سعادت ہے، اے شخص تو ہر وقت دل میں موت کا تصور رکھ، زندگی تجھے اڑائے لے جا رہی ہے اور تو اپنے نفس سے غفلت میں مبتلا ہے، ہو سکتا ہے تیرا سفر ختم ہونے والا ہو اور مثل قریب آجکی ہو عمل کی طرف مبادرت کرنے ہی سے تو منزل کی راحتیں حاصل کر سکتا ہے۔

اعمال کی طرف سبقت کرنا اور تاخیر سے بچنا : دیکھو جس شخص کے دو بھائی گھر سے باہر ہوں اور ان میں سے ایک کی آمد ایک دن کے بعد اور دوسرے کی آمد ایک مہینے یا سال بھر کے بعد متوقع ہو تو وہ اس بھائی کے استقبال کی تیاری نہیں کرتا جو ایک مہینے یا ایک سال کے بعد آنے والا ہے بلکہ اس بھائی کے استقبال کی تیاری کرتا ہے جو کل آنے والا ہے، معلوم ہوا کہ تیاری انتظار کے قرب کی بناء پر ہوا کرتی ہے، چنانچہ جو شخص یہ تصور کرتا ہے کہ میری موت ایک یا ایک سال بعد آنے والی ہے وہ اسی مدت پر دھیان دیتا ہے اور درمیانی دنوں کو فراموش کر دیتا ہے، ہر صبح کو وہ سوچتا ہے کہ ابھی ایک سال باقی ہے اور سال کا آغاز اسی دن سے کرتا ہے جس میں وہ آج موجود ہے۔ اس صورت میں وہ شخص اعمال کی طرف سبقت کرتی نہیں سکتا کیونکہ وہ یہ سمجھتا ہے کہ ابھی بڑی منجائش ہے، سال میں بارہ مہینے اور تین سو پینسٹھ دن ہوتے ہیں، وہ کسی بھی دن عمل میں مشغول ہو سکتا ہے۔ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ تم میں سے کوئی انتظار نہیں کرتا مگر ایسی مالدار کی کا جو سرکش بنادے یا ایسی مفلسی کا جو اطاعت فراموش کرادے یا ایسے مرض کا جو آدمی کو ناکارہ بنادے یا ایسے پوسھاپے کا جو عقل کو خبط کر دے یا ایسی موت کا جو جلدی آنے والی

ہو، یا دجال کا، اور دجال بدترین غائب ہے جس کا انتظار کیا جاتا ہے یا قیامت کا، اور قیامت نہایت سخت اور کڑوی ہے (ترمذی ابو ہریرہ) حضرت عبداللہ ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو یہ نصیحت فرمائی۔

إِغْتَنِمْ خُمْسًا قَبْلَ خَمْسِينَ شَبَابَكَ قَبْلَ هَرَمِكَ وَصِحَّتَكَ قَبْلَ سَقَمِكَ وَغِنَاكَ قَبْلَ فَقْرِكَ وَفَرَاغَكَ قَبْلَ شُغْلِكَ وَحَيَاتَكَ قَبْلَ مَوْتِكَ۔ (ابن ابی الدنیا)

پانچ چیزوں کو پانچ چیزوں سے پہلے قیمت سمجھ، اپنی جوانی کو اپنے بوجھ سے پہلے، اپنی صحت کو اپنی بیماری سے پہلے، اپنی مالداری کو اپنے فقر سے پہلے، اپنی فرصت کو اپنی مشغولیت سے پہلے اور اپنی زندگی کو موت سے پہلے۔

ایک حدیث میں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

نِعْمَتَانِ مَغْبُورٌ فِيهِمَا كَثِيرٌ مِنَ النَّاسِ الصِّحَّةُ وَالْفَرَاغُ۔ (بخاری، ابن عباسؓ)
دو نعمتیں ایسی ہیں کہ ان میں اکثر لوگ خسارے میں ہیں۔ صحت اور فرصت۔

اس حدیث کے معنی یہ ہیں کہ آدمی کو یہ دونوں نعمتیں عطا کی جاتی ہیں لیکن وہ ان سے فائدہ نہیں اٹھاتا اور جب سلب ہو جاتی ہیں تب ان کی قدر پہچانتا ہے۔ بعض روایات یہ ہیں۔

مَنْ خَافَ أَدْلَجَ وَمَنْ أَدْلَجَ بَلَغَ الْمَنْزِلَ إِلَّا إِنْ سِلْعَةَ اللَّهِ غَالِيَةً إِلَّا إِنْ سِلْعَةَ اللَّهِ جَنَّتْ۔ (ترمذی، ابو ہریرہ)

جو (منزل تک نہ پہنچے) ڈرتا ہے وہ ابتدائی شب میں (سفر کے لئے) چل رہا ہے اور جو ابتدائے شب میں چل رہا ہے وہ منزل تک پہنچ جاتا ہے۔ سن لو کہ متاعِ خداوندی نہایت گراں قیمت ہے۔ جان لو متاعِ خداوندی جنت ہے۔

حَاضِرَاتُ الرَّادِقَةِ تَتَّبِعُهَا الرَّادِقَةُ حَتَّى جَاءَ الْمَوْتُ بِمَا فِي بَيْتِهَا۔ (ترمذی، ابی ابن کعب)
آئی ہلانے والی، اس کے پیچھے آئی پیچھے آنے والی اور موت ان چیزوں کے ساتھ آئی جو اس میں ہیں۔

سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول یہ تھا کہ جب اپنے اصحاب میں سستی یا غفلت ملاحظہ فرماتے تو بلند آواز سے اعلان فرماتے۔

أَتُنَكِّمُ الْمُنْبِتَرِ أَيْ لَازِمًا بِشَقَاوَةٍ وَأَمَّا بِسَعَادَةٍ۔ (ابن ابی الدنیا، زید السلی مرسل)
موت تمہارے پاس آئی لازم و قیض بن کر یا تو بد بختی کے ساتھ یا نیک بختی کے ساتھ۔

حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میں ڈرانے والا ہوں اور موت حملہ کرنے والی ہے اور قیامت وعدے کی جگہ ہے (ابن ابی الدنیا)۔ حضرت عبداللہ ابن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت باہر تشریف لائے جب سورج کی شعاعیں کعبہ کی شبنیوں پر پہنچ چکی تھیں اور فرمایا دنیا صرف اسی قدر باقی رہ گئی ہے جتنا یہ دن اس مقدار کے مقابلے باقی رہ گیا ہے جو گزر چکا ہے۔ (ابن ابی الدنیا) ایک حدیث میں ارشاد فرمایا کہ دنیا ایک ایسے کپڑے کی طرح ہے جو شروع سے آخر تک پھٹ گیا ہو اور صرف ایک دھاگہ باقی رہ گیا ہو۔ عجب نہیں کہ یہ دھاگہ بھی ٹوٹ جائے (ابن ابی الدنیا، انسؓ) حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم جب خطبہ کے دوران قیامت کا ذکر فرماتے تو آپ کی آواز بلند ہو جاتی۔ رخسار مبارک سرخ ہو جاتے، گویا آپ کسی لشکر سے ڈرا رہے ہوں فرماتے کہ صبح بھی گزری اور شامیں بھی گزریں، میں اور قیامت دونوں اس طرح پیچھے گئے ہیں جیسے یہ۔ یہ ارشاد فرما کر آپ اپنی دو انگلیاں ایک دوسرے سے

ملا لیتے (مسلم، ابن ابی الدنیا) حضرت عبداللہ ابن مسعود روایت کرتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔

فَمَنْ تَرَدَّ اللَّهُ أَنْ يَهْدِيَهُ يَشْرَحْ صَدْرَهُ لِلْإِسْلَامِ (پ ۸، ر ۲، آیت ۵۶)
سو جس شخص کو اللہ تعالیٰ راستے پر ڈالنا چاہے ہیں اس کے سینے کو اسلام کے لئے کشادہ کر دیتے ہیں۔

اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ جب نور سینے میں داخل ہوتا ہے تو کھل جاتا ہے۔ لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! اس کی کوئی علامت بھی ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا ہاں! دارِ غرور سے کنارہ کش ہو، دارِ غلو کی طرف متوجہ ہونا اور موت کے آنے سے پہلے اس کے لئے تیار رہنا (ابن ابی الدنیا) قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

الَّذِي خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيَاةَ لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا۔ (پ ۲۹، ر ۱، آیت ۲)
جس نے موت اور حیات کو پیدا کیا تاکہ تمہاری آزمائش کرے کہ تم میں کون محض عمل میں زیادہ اچھا ہے۔

اس آیت کی تفسیر سدی نے اس طرح کی ہے کہ کون محض موت کو زیادہ یاد کرتا ہے اور کون اس کی اچھی تیاری کرتا ہے اور کون اس سے بہت زیادہ خوف کرتا ہے۔ حذیفہ فرماتے ہیں کہ ہر صبح و شام ایک مٹادی یہ اعلان کرتا ہے (اے لوگو! کوچ کو کوچ کرو) اس کی تصدیق قرآن کریم کی اس آیت سے ہوتی ہے۔

إِنَّمَا لِلْآخِذِينَ الْكُبْرَىٰ نَذِيرٌ الْبَشِيرُ لِمَنْ شَاءَ مِنْكُمْ أَنْ يَتَقَدَّمَ أَوْ يَتَأَخَّرَ۔ (پ ۲۹، ر ۴، آیت ۳۵-۳۶)

دونوں بڑی بھاری چیز ہے۔ جو انسان کے لئے بڑا ڈر اور اچھے کو بڑے اس کے لئے اور جو (خیر سے) پیچھے کو جئے اس کے لئے بھی۔

حکم مولیٰ بنی تمیم کہتے ہیں کہ میں عامر ابن عبداللہ کی خدمت میں حاضر ہوا، آپ نے مختصر نماز پڑھی، نماز کے بعد میری طرف متوجہ ہوئے اور ارشاد فرمایا کہ اپنی ضرورت بیان کرو، میں انتظار میں ہوں، میں نے عرض کیا کہ آپ کس کے انتظار میں ہیں، فرمایا ملک الموت کے، راوی کہتے ہیں کہ میں ان کا یہ جواب سن کر جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا اور وہ نماز میں مشغول ہو گئے، داؤد طائی کہیں سے گذر رہے تھے کہ ایک شخص نے کوئی حدیث دریافت کی، داؤد طائی نے فرمایا مجھے جانے دو، میں جان نکلنے تک کے موقع کو قیمت سمجھتا ہوں، حضرت عمر ارشاد فرماتے ہیں کہ تاخیر ہر چیز میں عمدہ ہے لیکن آخرت کے لئے کئے جانے والے اعمال صالحہ میں بہتر نہیں ہے، منذر کہتے ہیں کہ میں نے مالک ابن دینار کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ بخت عمل کے لئے سبقت کر، کم بخت عمل کے لئے سبقت کر۔ آپ نے یہ جملہ ساتھ ساتھ مرحبہ ارشاد فرمایا، میں ایسی جگہ سے ان کا یہ قول سن رہا تھا جہاں سے وہ مجھے نہیں دیکھ رہے تھے، حضرت حسن بصری نے اپنے خطبے میں ارشاد فرمایا اعمال کی طرف سبقت کرو، سبقت کرو، یہ چند سانس ہیں، اگر رک گئیں تو ان اعمال کا سلسلہ منقطع ہو جائے گا جن سے تم اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرتے ہو، اللہ تعالیٰ اس بندے پر رحم فرمائے جو اپنے نفس پر نظر ڈالے اور اپنے گناہوں کی تعداد پر روئے، اس کے بعد آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔

إِنَّمَا نَعْلَمُهُمْ عَمَلًا۔ (پ ۴، ر ۹، آیت ۸۷)

ہم ان کی باتیں خود شمار کر رہے ہیں۔

یہاں گنتی سے مراد سانسیں کی گنتی ہے، آخری سانس پر آدمی کی جان نکلتی ہے، اس کے بعد اپنے اعمال کی مفارقت ہے، پھر قبر میں داخل ہونا ہے، حضرت ابو موسیٰ اشعری نے اپنی وفات سے پہلے سخت ترین ریاضتیں اور مجاہدے کئے، لوگوں نے عرض کیا آپ اس قدر سخت مجاہدہ نہ کیا کریں یا اپنے نفس پر کچھ نرمی فرمائیں، فرمایا کھڑو ڈھیں گھوڑا جب آخری نشان تک پہنچنے والا ہوتا

ہے تو دوڑنے میں اپنی پوری قوت صرف کر دیتا ہے، میری عمر تو اس سے بھی کم باقی رہ گئی ہے، حضرت ابو موسیٰ نے موت کے وقت تک مجاہدے جاری رکھنے، اپنی اہلیہ سے فرمایا کرتے تھے اپنی سواری تیار رکھ، جہنم میں کوئی پل نہیں ہو گا ایک خلیفہ نے بر سر منبر ارشاد فرمایا بندگان خدا جس قدر ممکن ہو اللہ سے ڈرو اور ایسے لوگ بن جاؤ جنہیں چھین سائی دیں اور وہ ہوشیار ہو جائیں اور جان لیں کہ دنیا ان کا گھر نہیں ہے اور اسے آخرت کے عوض دیدیں، موت کے لئے تیار رہو اس لئے کہ وہ سر پر کھڑی ہوئی ہے اور سفر کی تیاری کرو، اس لئے کہ سفر بڑا کٹھن ہے، جو موت ایسی ہو کہ لمحے اور ساعت سے کم ہو اسے واقعی کم تر مدت کہا جانا چاہیے۔ جس غائب پر رات دن گذر رہے ہوں وہ بس آیا ہی چاہتا ہے اور جو آنے والا یہ نہ جانتا ہو کہ اسے سعادت کا سامنا کرنا ہو گا یا شقاوت کا اسے بہترین تیاری کرنی چاہیے۔ اللہ کے نزدیک متقی وہ ہے جو اپنے نفس کا خیر خواہ ہو، توبہ کو مقدم کر چکا ہو اور اپنی شہوت پر غالب ہو کیونکہ موت اس سے غفلتی ہے اور اہل اسے فریب دیتا ہے اور شیطان اس پر مقرب ہے جو توبہ کی آرزو اس لئے دلاتا ہے کہ اسے ملتا ہے اور معصیت کو مزین کر کے پیش کرتا ہے تاکہ ارتکاب کر بیٹھے، یہاں تک کہ اس کی موت سبقت کرے اور اسے اچک کر لے جائے اور وہ انتہائی غفلت میں مبتلا ہو، تمہارے اور جنت اور دوزخ کے درمیان صرف موت واقع ہے، اس غافل پر بڑی حیرت ہوتی ہے جس کی زندگی اس پر حجت بنے اور اس کے شب و روز اسے بد بختی کی طرف لے جائیں، اللہ تعالیٰ ہمیں اور تمہیں ان لوگوں میں شامل فرمائیں، جو نعمتیں پا کر اتراتے نہ ہوں اور گناہوں کے باعث اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں کوتاہی نہ کرتے ہوں اور مرنے کے بعد حسرت میں مبتلا نہ ہوں۔ بلاشبہ وہ دعاؤں کا سننے والا ہے، اسی کے قبضے میں خیر ہے وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ قرآن کہہ میں ہے۔

فَتَنَّتُمْ أَنْفُسَكُمْ وَ تَرْتَضُّنَّمْ وَ اَرْتَبْتُمْ وَ عَزَّ نُكُمُ الْاَمَانِي حَتَّى جَاءَ اَمْرُ اللّٰوِ عَزَّكُمْ
بِاللّٰهِ الْغُرُورِ۔ (پ ۲۷، ۱۸ آیت ۱۳)

لیکن تم نے اپنے کو گمراہی میں پھنسا رکھا تھا اور تم بھڑک رہا کرتے تھے اور تم شک رکھتے اور تم کو تمہاری بے ہودہ تمناؤں نے دھوکے میں ڈال رکھا تھا یہاں تک کہ تم پر خدا کا حکم آچنچا اور تم کو دھوکہ دینے والے نے اللہ کے ساتھ دھوکے میں ڈال رکھا ہے۔

اس آیت کی تفسیر میں بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ فَتَنَّتُمْ أَنْفُسَكُمْ سے مراد یہ ہے کہ تم نے لذات اور شہوات کی وجہ سے اپنے آپ کو گمراہی میں ڈالا اور تَرْتَضُّنَّمْ سے مراد توبہ کو مؤخر کرنا اور انتظار کرنا اور اَرْتَبْتُمْ سے مراد یہ ہے کہ تم نے موت کی آمد میں شک کیا۔ امر اللہ سے موت مراد ہے۔ حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ مبرکرو اور امر حق پر ثابت قدم رہو، یہ چند روز ہیں جو بہت جلد گذر جائیں گے، تم ایک ایسے قافلے کی طرح ہو جس نے کہیں پڑاؤ ڈال رکھا ہے۔ جب تم میں سے کسی کی طلبی ہوتی ہے وہ چلا جاتا ہے اور مڑ کر نہیں دیکھتا، تم یہاں سے عمدہ چیزیں لے کر رخصت ہو، حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ تم میں سے کوئی شخص ایسا نہیں ہے جو مسمان نہ ہو اور جو کچھ تمہارے پاس مال ہے وہ مستعار ہے، مسمان جانے والا ہے اور عاریت کی چیز واپس کی جانے والی ہے، ابو عبیدہ الباقی کہتے ہیں کہ ہم حضرت حسن بصریؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے آپ اس وقت مرض وقات میں مبتلا تھے ہمیں دیکھ کر فرمایا، خوش آمدید اللہ تعالیٰ تمہیں سلامتی کے ساتھ زندہ رکھے اور ہمیں اور تمہیں جنت میں داخل فرمائے یہ ایک واضح نکتہ ہے، اگر تم نے مبرک کیا، سچا جانا اور تقویٰ اختیار کیا، ایسا نہ ہو کہ تم اسے ایک کان سے سنو اور دوسرے کان سے نکال دو، جس شخص نے بھی سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے اس نے یہ دیکھا ہے کہ آپ کے پاس ایک چیز صبح کو آئی اور شام کو چلی گئی، آپ نے کبھی اینٹ پر اینٹ نہیں رکھی اور نہ بالیں پر بالیں، بلکہ آپ کے لئے علم بلند کیا گیا، آپ اس کی طرف متوجہ ہوئے، جلدی کرو جلدی کرو، تم کس چیز کی طرف مائل ہوتے ہو، خدا کی قسم تم اور موت گویا ایک ساتھ آئے ہو، اللہ تعالیٰ اس بندے پر رحم فرمائے جو آخرت کو اپنی زندگی بنالے، ایک کھلا کھائے، پرانا لباس پہنے، زمین پر سوئے، عبادت میں مجاہدہ کرے،

خطاؤں پر آنسو بہائے، عذاب سے راہ فرار اختیار کرے اور رحمت کا حلاشی ہو، یہاں تک کہ اس کی موت آجائے، عاصم الاحول کہتے ہیں کہ فیصل الرقاشی سے میں نے ایک سوال کیا، اس کے جواب میں انہوں نے فرمایا لوگوں کی کثرت کے باعث ہمیں اپنے نفس سے غافل نہ ہونا چاہیے، اس لئے کہ معاملہ آخرت تم سے متعلق ہو گا نہ کہ ان سے، یہ نہ کہو کہ ذرا وہاں چلا جاؤں یا وہاں سے آجاؤں، اس طرح دن بلا عمل کے گزر جائے گا، موت کا وقت مقرر ہے۔ وہ کسی بھی وقت آسکتی ہے، نیکی سے زیادہ کوئی چیز نہایت سرعت سے پرانے گناہ کو نہیں مٹاتی۔

موت کے سکرات اور شدت اور موت کے وقت مستحب احوال اگر بندہ مسکین کو موت کے وقت سکرات موت کے علاوہ کسی اذیت، ہول اور عذاب کا سامنا نہ ہو تا تب بھی اس کے شایان شان بات یہ تھی کہ اس کی زندگی تلخ اور مزہ مکدر ہوتا اور وہ سود و غفلت سے دور رہتا اور اس کے لئے مناسب یہ تھا کہ وہ موت کے باب میں طویل فکر کرتا اور اس کے لئے زبردست تیاری کرتا خاص طور پر اس صورت میں جب کہ وہ ہر لمحے تیرے پیچھے ہے بعض حکماء کہتے ہیں کہ اذیت تیرے ہاتھ میں نہیں ہے بلکہ کسی اور کے ہاتھ میں ہے اور تو نہیں جانتا کہ تجھے اس کا کب سامنا کرنا ہو گا، حضرت لقمان علیہ السلام نے اپنے بیٹے سے فرمایا موت کے بارے میں تجھے معلوم نہیں کہ وہ کب آکر تیرا گلا دبا دے گی، تو اس کے لئے تیاری کر، اس سے پہلے کہ وہ تجھے اچانک آدلوچے، حیرت کی بات یہ ہے کہ اگر آدمی کسی لذت کے حصول میں مشغول ہو یا لہو لعب کی کسی خاص مجلس سے لطف اندوز ہو رہا ہو اور اچانک اسے کسی سپاہی کا خیال آجائے کہ وہ یہاں آسکتا ہے اور دس پانچ ڈھڑے رسید کر سکتا ہے، اس خیال کے ساتھ ہی اس کا تمام مزہ اور لطف غارت ہو جاتا ہے، دوسری طرف وہ یہ جانتا ہے کہ موت اس کے پیچھے لگی ہوئی ہے اور ملک الموت کسی بھی وقت سکرات موت کے ساتھ اس کے پاس آسکتا ہے، لیکن اس کے باوجود وہ موت سے غافل رہتا ہے اور ملک الموت کا خیال اس کی زندگی کا مزہ مکدر نہیں کرتا، اس کا سبب جنل اور فریب کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔

سکرات موت کی تکلیف جانا چاہیے کہ سکرات موت میں تکلیف کا صحیح اندازہ ہی محض کر سکتا ہے جو اس مرحلہ سے گذرا ہے، جس شخص نے اس تکلیف کا ذائقہ نہیں چکھا وہ اسے ان تکالیف پر قیاس کر سکتا ہے، جو وقتی فوقی اسے پہنچتی رہتی ہیں یا شدت نزع کے وقت لوگوں کے حالات کا مشاہدہ کر کے اس کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے۔

قیاس سے اس طرح استدلال کر سکتا ہے کہ جس عضو میں روح نہیں ہوتی اس میں تکلیف کا احساس نہیں ہوتا اور روح ہوتی ہے تو تکلیف کا احساس ہوتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ تکلیف کا ادراک روح کو ہوتا ہے چنانچہ جب کوئی زخم لگتا ہے یا کوئی عضو جل جاتا ہے تو اس کا اثر روح تک پہنچتا ہے اور جس قدر روح کو اثر پہنچتا ہے اسی قدر اسے تکلیف ہوتی ہے کیونکہ درد گوشت، خون اور دوسرے اجزائے بدن میں پھیل جاتا ہے۔ اسی لئے روح کو تھوڑی تکلیف ہوتی ہے لیکن اگر صورت یہ ہو کہ درد اور تکلیف کا مرکز خاص طور پر روح ہو اور روح کے علاوہ کوئی اور شے نہ ہو تو خود اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ یہ درد کس قدر شدید ہو گا۔ نزع کے معنی اسی تکلیف کے ہیں جو نفس روح پر وارد ہوتی ہے اور اس کے تمام اجزاء میں پھیل جاتی ہے حتیٰ کہ پورے جسم میں پھیلی ہوئی روح کا کوئی حصہ ایسا باقی نہیں رہتا جس میں یہ تکلیف سرایت نہ کرتی ہو۔ اگر کسی شخص کے کانٹا چھ جائے تو اسے روح کے اسی حصے میں تکلیف ہوتی ہے جس میں وہ کانٹا بٹھا ہے، اس کے برعکس آگ کی تکلیف بہت زیادہ ہوتی ہے کیوں کہ اس کے اجزاء تمام اجزائے بدن میں گھس جاتے ہیں، اور جلے ہوئے عضو کا کوئی ظاہری یا باطنی جزء ایسا باقی نہیں رہتا جس پر آگ اثر انداز نہ ہوئی ہو، جو روح ان تمام اجزاء میں منتشر ہوتی ہے وہ یہ تکلیف برداشت کرتی ہے اور زخم کی تکلیف اسی جگہ تک محدود رہتی ہے جہاں لوہا لگا ہو، یا کانٹا بٹھا ہو، اس اعتبار سے زخم کی تکلیف آگ کی تکلیف سے کم ہوتی ہے، نزع کی تکلیف نفس روح پر حملہ کرتی ہے، اور اس کے تمام اجزاء پر چھا جاتی ہے، کیوں کہ اسے ہر ہر گ، ہر ہر پتے اور ہر ہر جزو، ہر جزو، اور ہر بن موسے فرشتہ سر

سے پاؤں تک ہر حصے سے کھینچ کر باہر نکالا جاتا ہے اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ روح کو کس قدر اذیت اور تکلیف برداشت کرنی ہوتی ہے، اسی لئے بعض لوگ کہتے ہیں کہ موت تلوار سے کاٹنے اور آری سے چیرنے اور قینچی سے تراشنے سے زیادہ سخت ہے، کیوں کہ تلوار سے بدن کستا ہے تو اسے اس لیے تکلیف ہوتی ہے کہ روح اس سے متعلق ہے، لیکن اگر خاص طور پر روح ہی کو تکلیف ہو تو درود عالم کا کیا عالم ہوگا؟

موت کے وقت انسان کیوں نہیں چیختا: رہا یہ سوال کہ آدمی اس وقت تو بہت چلاتا ہے جب اسے زخمی کیا جاتا ہے یا مارا جاتا ہے، لیکن موت کے وقت چیخ و پکار نہیں کرتا، حالانکہ تم یہ کہتے ہو کہ نزع میں تکلیف زیادہ ہوتی ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ شدت الم کی بنا پر مرنے والے کی زبان بند ہو جاتی ہے، اور وہ چیخ نہیں پاتا، تکلیف اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ اس کا دل، دماغ اور جسم سب کچھ اس کے حملے سے بیکار ہو جاتا ہے، تمام قوت سلب ہو جاتی ہے، اور تمام اعضا کمزور پڑ جاتے ہیں، فریاد کی قوت ہی باقی نہیں رہتی، عقل الگ ہو جاتی ہے، زبان سے گویائی چھن جاتی ہے، اعضا بے حس و حرکت ہو جاتے ہیں، وہ چاہتا ہے کہ چیخ کر دل کی بٹراس نکالے اور درود عالم سے کچھ راحت پائے، لیکن وہ چیخ نہیں سکتا، اگر اس وقت کچھ طاقت باقی رہ جاتی ہے تو روح نکلنے کے وقت حلق اور سینے سے غرغری کی آواز نکلتی ہے، رنگ بدل کر میلا ہوا جاتا ہے، مویا وہ مٹی ظاہر ہو جاتی ہے جو اس کی اصل ہے، تمام رگیں کھینچ لگتی ہیں، کیوں کہ اندر اور باہر ہر جگہ درد ہوتا ہے، آنکھیں اوپر کو چڑھ جاتی ہیں، ہونٹ سکڑ جاتے ہیں، زبان اندر کو چلی جاتی ہے، نصیبتین اوپر کی جانب چڑھ جاتے ہیں، انگلیاں سبز ہو جاتی ہیں، ایسے بدن کا کیا حال ہو جھٹے ہو جس کی ہر رگ کھینچی ہو، اگر جسم کی ایک رگ کھینچ جائے تو آدمی شدت درد سے چیخنے چلاتے پر مجبور ہوتا ہے، یہاں تو تمام رگیں کھینچ رہی ہیں، پھر تمام اعضا بتدریج مردہ ہوتے ہیں، پہلے دونوں پاؤں ٹھنڈے ہوتے ہیں، پھر ہڈیاں، پھر رانیں، ہر عضو کو سکرات کے بعد شدت اور شدت کے بعد شدت کا سامنا کرنا ہوتا ہے، یہاں تک کہ روح کھینچ کر حلق تک آ جاتی ہے، اس وقت اس کی نظر دنیا اور اہل دنیا سے پھرتی ہے، توبہ کا رونا زہ بند ہو جاتا ہے، اور حسرت و ندامت چھا جاتی ہے، سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

تُغْبِلُ التَّوْبَةُ قُلُوبَهُمْ يُغْرِغُ عَزْرُ - (ترمذی، ابن ماجہ - ابن عمر)

توبہ اس وقت تک قبول کی جاتی ہے جب تک غرغرو نہ ہو۔

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وَلَيْسَتْ التَّوْبَةُ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السَّيِّئَاتِ حَتَّىٰ إِذَا حَضَرَ أَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ إِنِّي تُبْتُ الْآنَ (پ ۳، ر ۳۳، آیت ۱۸)

اور ایسے لوگوں کی توبہ نہیں جو گناہ کرتے رہتے ہیں یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کے سامنے موت آنکڑی ہوئی تو کہنے لگا کہ میں اب توبہ کرتا ہوں۔

حضرت مجاہدؒ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ یہاں وہ وقت مراد ہے جب ملک الموت اور فرشتے نظر آنے لگتے ہیں، خلاصہ یہ ہے کہ موت کی سختی، اس کا کرب، اور سکرات کی تلخی بیان نہیں کی جاسکتی، اسی لیے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی دعاؤں میں ارشاد فرماتے تھے۔

اللَّهُمَّ هَوِّنْ عَلَيَّ مُحَمَّدٍ سَكْرَاتِ الْمَوْتِ
اے اللہ محمدؐ پر موت کی سختیاں آسان فرما۔

عام لوگ نہ ان سکرات کو اہمیت دیتے ہیں، اور نہ ان سے پناہ مانگتے ہیں، کیوں کہ وقوع سے پہلے اشیاء کا اور اک نبوت اور ولایت کے نور سے ہوا کرتا ہے، اسی لیے انبیائے کرام و اولیائے عظام کو موت کا زیادہ خوف ہوتا ہے، چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام

اپنے حواریین سے ارشاد فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ سے دعا کرو کہ مجھ پر موت کی تکلیف آسان فرمائے، اس لیے کہ میں موت کے خوف سے مر جاتا ہوں، روایت ہے کہ بنی اسرائیل کے کچھ لوگ ایک قبرستان کے پاس سے گزرے، ان میں سے بعض سے کہا کہ کاش تم اللہ تعالیٰ سے دعا کرو، اور وہ اس قبرستان کا کوئی مردہ تمہارے لیے زندہ کر دے، اور تم اس سے کچھ دریافت کر سکو، چنانچہ انہوں نے دعا کی، اور اس دعا کے نتیجے میں ایک شخص اپنی قبر سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا، اس کی دونوں آنکھوں کے درمیان میں سجدے کا نشان تھا، وہ شخص کہنے لگا کہ اے لوگو! تم مجھ سے کیا پوچھنا چاہتے ہو میں نے پچاس برس پہلے موت کا زائقہ چکھا تھا، لیکن آج تک اس کی تفتی دل سے نہیں گئی، حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی موت کی سختی دیکھ کر مجھے کسی کی موت کی آسانی پر رشک نہیں آتا، روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرمایا کرتے تھے۔

اللَّهُمَّ إِنَّكَ تَأْخُذُ الرُّوحَ مِنْ بَيْنِ الْعَصَبِ وَالْقَصَبِ وَالْأَنَامِلِ اللَّهُمَّ فَأَعِنِّي عَلَى الْمَوْتِ وَهُوَ نِعْمَ عَلَى - (ابن ابی الدنیا۔ عمر ابن خیطان البغوی)

اے اللہ! تو پتھروں، ہڈیوں اور اٹھکیوں کے درمیان سے روح نکالتا ہے، اے اللہ موت پر میری مدد فرما اور میرے لیے اے آسان کر۔

حضرت حسنؓ بیان کرتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے موت کی تکلیف اور سختی کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ اس کی تکلیف تلوار کے تین سو گھاؤں کے برابر ہے (ابن ابی الدنیا۔ مرسل) ایک حدیث میں ہے کہ کسی نے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے موت کی سختی کے متعلق دریافت کیا، آپ نے فرمایا اس کی مثال ایسی ہے جیسے گو کھراؤں میں ہو، اگر اس میں سے گو کھر کو نکالا جائے تو وہ تما نہیں نکلا بلکہ اس کے ساتھ اون بھی آتا ہے (ابن ابی الدنیا مرسل) ایک مرتبہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کسی مریض کے پاس گئے، اور فرمایا میں جانتا ہوں اسے کس قدر تکلیف ہو رہی ہے اس کی کوئی رگ ایسی نہیں ہے جو الگ الگ موت کی اذیت برداشت نہ کر رہی ہو (ابن ابی الدنیا) حضرت علی کرم اللہ وجہہ لوگوں کو جہاد میں شرکت کی ترغیب دیتے ہوئے فرماتے کہ اگر تم نہ لڑے تب بھی مومنین اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے، بستر پر مرنے سے زیادہ آسان میرے نزدیک تلوار کے ہزار زخم برداشت کرنا ہے، اور زانی فرماتے ہیں کہ مردے کو موت کی اذیت اس وقت تک ہوتی ہے جب تک اسے قبر سے نہیں اٹھایا جاتا، شداد ابن اوس کہتے ہیں کہ موت مومن کے لیے دنیا اور آخرت میں سب سے بڑی دہشت ہے، اور اس اذیت سے زیادہ خطرناک ہے جو آری سے جسم کو چیرنے میں یا ٹیچنیوں سے تراشنے میں یا دیگوں میں یا ہالے میں ہوتی ہے، اگر وہ زندہ ہو تا تو وہ دنیا والوں کو موت کی سختی سے آگاہ کرتا اور لوگ زندگی کا تمام لطف بھول جاتے، یہاں تک کہ آنکھوں سے نیند بھی اڑ جاتی، زید ابن اسلم اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ جب مومن کے کچھ درجات باقی رہ جاتے ہیں، جن تک وہ اپنی کوتاہی کے باعث پہنچ نہیں پاتا تو اس پر موت سخت کر دی جاتی ہے، تاکہ وہ موت کے سکرات اور اس کی اذیت میں مبتلا ہو کر جنت میں اپنے درجے تک رسائی حاصل کرے، اور اگر کافر کے پاس کوئی ایسا نیک عمل ہوتا ہے جس کا بدلہ نہ عطا کیا گیا ہو تو اس کے لیے موت آسان کر دی جاتی ہے، تاکہ دنیا میں اپنی نیکی کا عوض حاصل کر لے اور دوزخ میں جائے۔ ایک بزرگ لوگوں سے ان کے مرض و فاقہ میں پوچھا کرتے تھے کہ تم موت کو کیسی پاتے ہو، جب وہ خود مرض و فاقہ میں مبتلا ہوئے تو لوگوں نے ان سے دریافت کیا کہ آپ موت کو کیسی پاتے ہیں، انہوں نے جواب دیا ایسا لگ رہا ہے کہ گویا آسمان زمین سے آٹا ہو، اور گویا میری روح سوئی کے ٹاکے سے نکل رہی ہو، سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

مَوْتُ الْفَجْأَةِ أَحَدٌ لِلْمُؤْمِنِ وَأَسْفٌ عَلَى الْفَاجِرِ - (امیر۔ عائشہ)

اچانک موت مومن کے لیے راحت ہے اور فاجر کے لیے باعثِ الموس۔

حضرت کھول کی روایت میں ہے کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر مردے کا ایک ہال آسمانوں اور زمین

والوں پر رکھ دیا جائے تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے سب مرجائیں گیوں کہ ہر مال میں موت ہے، اور جس چیز پر موت واقع ہوتی ہے وہ مرجاتی ہے (ابن ابی الدنیا۔ ابو یسرو) روایت ہے کہ اگر موت کی تکلیف کا ایک قطرہ دنیا کے پہاڑوں پر رکھ دیا جائے تو تمام کے تمام پکھل جائیں گے!

میان کیا جاتا ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی وفات ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے ان سے فرمایا: اے دوست! تم نے موت کو کیسی پایا؟ حضرت ابراہیم نے عرض کیا اے اللہ! جیسے گرم بخ تر روئی میں داخل کی جائے اور پھر اسے کھینچا جائے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہم نے تمہارے اوپر آسان موت نازل کی ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا کہ میں نے تو خود کو ایسا پایا جیسے زندہ چڑیا آگ میں رکھی ہوئی دیکھی میں ڈال دی جائے کہ نہ مرنی ہے اور نہ اڑ پاتی ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ایک قول یہ نقل کیا گیا ہے کہ میں نے اپنے نفس کو ایسا پایا جیسے زندہ بکری قصاب کے ہاتھوں میں ہو اور وہ اس کی کھال کھینچ رہا ہو، روایت ہے کہ وفات شریف کے وقت سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب پانی سے بھرا ہوا ایک پیالہ رکھا ہوا تھا، آپ اس میں ہاتھ ڈالتے تھے اور اپنے چہرہ مبارک پر ملے تھے، اور فرماتے تھے: اے اللہ مجھ پر موت کی سختیاں آسان فرما (بخاری و مسلم۔ عاتقہ) حضرت فاطمہ آپ کی یہ تکلیف دیکھ کر کہنے لگیں: ابا جان! آپ کس قدر تکلیف میں ہیں؟ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں ارشاد فرمایا آج کے بعد حیرے باپ کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی (بخاری۔ انس) حضرت عمر بن الخطابؓ نے حضرت کعب الاحبار سے کہا کہ ہم سے موت کے متعلق کچھ بیان کرو، حضرت کعب الاحبار نے عرض کیا کہ امیر المومنین موت ایک ایسی کاتوں بھری شاخ ہے جو کسی شخص کے پیٹ میں داخل کر دی گئی ہو اور اس شاخ کے ہر کانٹے نے ایک ایک رگ اپنی گرفت میں لے لی ہو، پھر کوئی شخص اسے بری طرح کھینچنے لگے اور جو کچھ ٹکٹا ہو وہ نکل جائے اور جو باقی رہنا ہو وہ باقی رہ جائے، سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ بندہ موت کی سختی برداشت کرتا ہے اور اس کے جوڑ ایک دوسرے سے سلام کر کے کہتے ہیں کہ اب ہم قیامت کے دن تک کے لئے جدا ہوتے ہیں۔ (الاربعمین لابی ہدیہ۔ انس) یہ ہیں موت کی وہ سختیاں جن کا سامنا اولیاء اللہ اور محبت خدا کو کرنا پڑتا ہے، ہم کس شمار میں ہیں، ہمارا حال تو یہ ہے کہ گناہوں میں سر سے پاؤں تک ڈوبے ہوئے ہیں، ہمارے اوپر سکران موت کے علاوہ بھی سختیاں آئیں گی۔

موت کی مصیبتیں موت کی مصیبتیں تین طرح کی ہیں، ایک تو نزاع کے وقت کی سختی، اس کا ذکر ابھی ختم ہوا ہے، دوسری مصیبت یہ ہوگی کہ مرنے والے کو ملک الموت کی صورت نظر آجائے گی اور دل پر ان کا خوف اور رعب چھائے گا اور اگر ان کی وہ صورت نظر آجائے جس سے وہ گناہگاروں کی روح قبض کرتا ہے تو مضبوط سے مضبوط دل رکھنے والا شخص بھی خوف سے گنگ ہو جائے، حضرت ابراہیمؑ نے ملک الموت سے فرمایا کہ کیا تم اپنی وہ صورت دکھلا سکتے ہو جس میں تم گناہگاروں کی روح نکالتے ہو؟ انہوں نے عرض کیا جی ہاں دکھا سکتا ہوں لیکن آپ برداشت نہیں کر سکیں گے، حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا برداشت کیوں نہیں کر سکتا؟ ملک الموت نے عرض کیا تب آپ دوسری طرف منہ کر لیجئے، آپ نے دوسری طرف رخ کر لیا اور جب ادھر دیکھا جہاں ملک الموت موجود تھے تو دیکھا کہ ایک سیاہ آدمی ہے، اس کے بال کھڑے ہوئے ہیں، جسم سے حقن پھوٹ رہا ہے، سیاہ کپڑے پہنے ہوئے ہے، اس کے منہ اور منتھوں سے آگ کے شعلے اور دھواں نکل رہا ہے، یہ مہر دیکھ کر حضرت ابراہیمؑ علیہ السلام بے ہوش ہو گئے، جب ہوش میں آئے تو ملک الموت اپنی اصل صورت پر واپس آچکے تھے، حضرت ابراہیمؑ نے ان سے فرمایا کہ اگر تم قاجر کے سامنے صرف یہی صورت لے کر جاؤ اور اس کے علاوہ اسے کوئی تکلیف نہ پہنچے تو یہ سزا بہت کافی ہے، حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ حضرت داؤد علیہ السلام غیرت مند آدمی تھے جب آپ باہر تشریف لے بھٹے تو گھر کے دروازے بند کر دیا کرتے تھے، چنانچہ ایک دن آپ نے دروازہ بند کر لیا اور باہر تشریف لے گئے ان کی اہلیہ نے گھر میں جھانکا تو دیکھا ایک شخص گھر کے اندر موجود ہے، انہوں نے کہا اس آدمی کو یہاں کون لے کر آیا ہے؟ اگر حضرت داؤد علیہ السلام واپس آگئے تو اس شخص پر مصیبت آجائے گی، چنانچہ حضرت داؤد علیہ السلام تشریف لے آئے اور انہوں نے اس آدمی سے

دریافت کیا کہ تو کون ہے؟ اس نے کہا کہ میں وہ ہوں جو نہ بادشاہوں سے ڈرتا ہے اور نہ پیر وادیوں سے رکتا ہے، حضرت داؤد علیہ السلام نے فرمایا معلوم ہوتا ہے تم ملک الموت ہو، یہ کہہ کر آپ نے کھلی اوڑھ لی (احمد رحمہ) روایت ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایک کھوپڑی کے پاس سے گزرے، اس میں ٹھوکر لگا کر کہا خدا کے حکم سے بول، اس کھوپڑی سے آواز آئی اے روح اللہ! میں فلاں دور کا بادشاہ ہوں، ایک روز میں اپنے قصر میں تاج شاہی سر پر رکھے ہوئے تخت شاہی پر بیٹھا ہوا تھا، میرے چاروں طرف حاشیہ بردار، مصاحب اور سپاہی تھے، اچانک میری نگاہ ملک الموت پر پڑی انہیں دیکھ کر میرا جوڑ جوڑ مل گیا اور روح نکل کر ان کے پاس پہنچ گئی، کاش لوگوں کا جھوم نہ ہوتا اور اس انس و قلع کے بجائے وحشت اور تمنا ہوتی، یہ ہے وہ معیبت جس کا سامنا گناہگاروں کو کرنا پڑتا ہے۔

مومنین کی روح قبض کرنے والا فرشتہ انبیاء عظیم السلام نے نزع کی تکلیف بیان فرمائی ہے، لیکن ملک الموت کو دیکھ کر دل میں جو خوف اور دہشت پیدا ہوتی ہے وہ بیان نہیں فرمائی، اگر کوئی شخص اسے خواب میں بھی دیکھ لے تو باقی زندگی بے لطف ہو جائے اور کھانے، پینے اور عیش کرنے کا تمام مزہ جاتا رہے، مگر ملک الموت اتنی کریمہ اور خوفناک صورت میں صرف گناہگار بندوں کی روح قبض کرنے کے لئے آتے ہیں، مطیع اور فرمانبردار بندوں کے لئے ملک الموت خوبصورت اور حسین قالب میں آتے ہیں، چنانچہ عکرمہؒ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام ایک فیرت مند انسان تھے، ان کا ایک مخصوص مکان تھا جس میں وہ عبادت کیا کرتے تھے اور جب باہر تشریف لے جاتے تو اس کا دروازہ بند کر دیتے، ایک دن واپس تشریف لائے تو دیکھا کہ ایک شخص گھر کے اندر موجود ہے، آپ نے اس سے دریافت کیا کہ تجھے گھر میں کس نے داخل کیا ہے؟ اس نے جواب دیا کہ مجھے اس گھر میں اس گھر کے مالک نے داخل کیا ہے۔ حضرت ابراہیم نے کہا کہ اس کا مالک تو میں ہوں، اس نے کہا کہ مجھے اس نے داخل کیا ہے جو میرے اور آپ سے بڑا مالک ہے، حضرت ابراہیم نے پوچھا مالک میں تمہاری کیا حیثیت ہے؟ اس نے کہا میں ملک الموت ہوں، حضرت ابراہیم نے ملک الموت سے پوچھا کہ کیا تم مجھے اپنی وہ شکل دکھلا سکتے ہو جس میں مومن کی روح قبض کرتے ہو؟ ملک الموت نے کہا میں ضرور دکھاؤں گا مگر آپ رخ پھیر لیجئے۔ حضرت ابراہیمؑ نے اپنا رخ دوسری طرف کر لیا، تھوڑی دیر بعد اوھر دیکھا جہاں ملک الموت موجود تھے تو ایک ایسے نوجوان کو پایا جو انتہائی خوبصورت تھا، بہترین لباس پہنے ہوئے تھا اور عمدہ خوشبوؤں میں بسا ہوا تھا، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان سے کہا اے ملک الموت! اگر مومن کو تمہاری زیارت میرے آجائے اور کچھ نہ ملے تو یہ اس کے لئے کافی ہے، موت کے وقت دو محافظ فرشتے بھی نظر آتے ہیں، وہ یہ کہتے ہیں کہ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ کوئی شخص اس وقت تک نہیں مرتا جب تک اسے وہ دونوں فرشتے نظر نہیں آجاتے جو اس کے اعمال لکھنے پر مامور تھے، اگر وہ شخص مطیع و فرمانبردار ہوتا ہے تو اس سے کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ تجھے ہماری طرف سے بہترین جزا دے۔ تو نے ہمیں بت سی عمدہ مجلسوں میں بٹھایا ہے اور ہمارے سامنے اچھے اچھے عمل کئے ہیں اور اگر مرے والا بدکار ہوتا ہے تو اس سے کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ تجھے ہماری جانب سے جزائے خیر نہ دے تو نے ہمیں بری مجلسوں میں بٹھایا ہے، ہمارے سامنے برے اعمال کئے ہیں اور ہمیں بری باتیں سنائی ہیں، یہ واقعہ اس وقت پیش آتا ہے جب مرنے والے کی نگاہیں ہر طرف سے منقطع ہو کر ان پر پڑتی ہیں اور پھر کبھی دنیا کی طرف نہیں لوٹتیں۔

گناہگاروں پر موت کے وقت تیسری معیبت یہ نازل ہوتی ہے کہ انہیں دوزخ میں ان کا ٹھکانہ دکھایا جاتا ہے اور دیکھنے ہی سے پہلے خوف کے مارے ان کا برا حال ہو جاتا ہے، سکرات کی حالت میں ان کے قویٰ کمزور پڑ جاتے ہیں اور وہ جس بدن کا ساتھ چھوڑنے لگتی ہیں لیکن وہ اس وقت تک بدن کا ساتھ نہیں چھوڑتیں جب تک ملک الموت کی زبان سے بشارت کا نغمہ نہ سن لیں، گناہگار کو وہ یہ بشارت دیتے ہیں کہ اے دشمن خدا دوزخ کی خوشخبری سن اور مومن سے یہ کہتے ہیں کہ اے اللہ کے دوست جنت کی بشارت سن، ارباب عقل کو نزع کے وقت کے اسی لمحے کا خوف ستاتا ہے، سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم

میں سے کوئی شخص اس وقت تک دنیا سے نہیں نکلے گا جب تک وہ اپنا انجام نہ جان لے گا اور یہ نہ دیکھ لے گا کہ جنت یا دوزخ میں اس کا ٹھکانہ کہاں ہے؟ (ابن ابی الدنیا موقوفاً) ایک روایت میں ہے کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص اللہ سے ملنا پسند کرتا ہے اللہ اس سے ملنا پسند کرتا ہے اور جو شخص اللہ تعالیٰ سے ملنا پسند نہیں کرتا اللہ تعالیٰ اس سے ملنا پسند نہیں کرتا، صحابہ کرام نے عرض کیا مگر ہم سب ہی لوگ موت کو نا پسند کرتے ہیں، سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اس کا یہ مطلب نہیں، بلکہ مومن پر جو چیز (موت) آنے والی ہے اگر اسے آسان کر دیا جائے تو وہ اللہ تعالیٰ سے ملنا پسند کرے اور اللہ اس سے ملنا پسند کرے (بخاری و مسلم، عبادة الصامت) روایت ہے کہ حذیفہ ابن الیمان نے حضرت عبد اللہ ابن مسعود سے رات کے آخری حصے میں کہا کہ اٹھ کر دیکھو کیا وقت ہوا ہے، چنانچہ حضرت عبد اللہ ابن مسعود باہر اٹھ کر گئے اور واپس آکر بتلایا کہ سرخ رنگ کا ستارہ طلوع ہو چکا ہے، حضرت حذیفہ نے کہا کہ میں صبح کو دوزخ میں جانے سے اللہ کی پناہ چاہتا ہوں، مروان ایسے وقت میں حضرت ابو ہریرہؓ کے پاس گیا جب آپ عالم نزع میں تھے اور کہنے لگا اے اللہ! ان پر موت کو آسان کیجئے، حضرت ابو ہریرہؓ نے کہا اے اللہ! سخت کیجئے، یہ کہہ کر حضرت ابو ہریرہؓ رونے لگے، پھر فرمایا بخدا میں دنیا کے غم میں یا تم سے جدا ہونے کے رنج میں نہیں روتا ہوں بلکہ میں اللہ کی طرف سے جنت یا دوزخ میں سے کسی ایک بشارت کا خضر ہوں، حدیث شریف میں ہے کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندے سے راضی ہوتا ہے تو ملک الموت سے کہتا ہے کہ فلاں بندے کے پاس جا اور اس کی روح لے کر آتا کہ میں اسے راحت دوں، بس اس کے یہ اعمال کافی ہیں، میں نے اس کی آزمائش کی اور جیسا میں چاہتا تھا اسے ویسا پایا، یہ حکم سن کر ملک الموت نیچے اترتے ہیں اور ان کے ساتھ پانچ سو فرشتے ہوتے ہیں، ان کے پاس پھولوں کے گلدستے اور زعفران کی خوشبودار جڑیں ہوتی ہیں اور ان میں سے ہر ایک اپنے ساتھیوں سے مختلف خوشخبری سناتا ہے اور ملائکہ اس کی روح کے استقبال کے لئے گلدستے لے کر دو قطاروں میں کھڑے ہو جاتے ہیں، جب شیطان انہیں دیکھتا ہے تو دھاڑیں مار مار کر رونے لگتا ہے، اس کا لشکر پوچھتا ہے کہ کیوں روتے ہو؟ کیا حادثہ پیش آیا؟ وہ کہتا ہے کہ کیا تم نہیں دیکھا کہ اس بندے کو کس عزت دی جا رہی ہے۔ تم نے اس پر اپنے حیر کیوں نہیں چلائے، تم نے اسے کیوں چھوڑا؟ وہ کہیں گے ہم نے بڑی کوشش کی مگر وہ محفوظ رہ گیا، حضرت حسن بھری کہتے ہیں کہ مومن کو صرف بھائے خداوندی میں راحت ملتی ہے اور جسے اللہ کی ملاقات میں راحت ملتی ہے اس کے لئے موت کا دن خوشی، حسرت، امن، عزت اور شرف کا دن ہوتا ہے، موت کے وقت جابر ابن زید نے کسی سے پوچھا کہ آپ کس چیز کی خواہش رکھتے ہیں، انہوں نے کہا حضرت حسن کی زیارت کرنا چاہتا ہوں، لوگ حضرت حسن بھری کو بلا کر لائے، جابر ابن زید نے آگے کھول کر انہیں دیکھا اور کہا اے بھائی اب ہم جہیں چھوڑ کر جنت یا دوزخ کی طرف جاتے ہیں، محمد ابن الواسع نے انتقال کے وقت فرمایا دوستو! تم پر سلامتی ہو، دوزخ کی تیاری ہے مگر اس صورت میں کہ اللہ تعالیٰ ہم سے درگزر فرمائے، بعض بزرگانِ دین یہ تمنا کرتے تھے کہ ہمیشہ عالم نزع میں رہیں، نہ ثواب کے لئے اٹھائے جائیں اور نہ عذاب کے لئے، عارفینِ خدا کے قلوبِ سوم خاتمہ کے خوف سے گھڑے گھڑے ہو جاتے تھے، سوم خاتمہ ایک زبردست مصیبت ہے، کتاب الخوف الرجا میں ہم نے سوم خاتمہ کے خوف اور عارفین کے شدتِ خوف پر روشنی ڈالی ہے، یہاں بھی کچھ گفتگو ہونی چاہیے تھی لیکن طوالت کے خوف سے ہم اسی پر اکتفا کرتے ہیں۔

موت کے وقت مردے کے حق میں کون سے اعمال بہتر ہیں؟

مرنے کے وقت عمدہ بات یہ ہے کہ مرنے والا پرسکون ہو، اس کی زبان پر کلمہ شہادت جاری ہو اور دل میں اللہ تعالیٰ کے لئے حسنِ عن کے جذبات ہوں، موت کے وقت صورت کیسی ہو اس کے بارے میں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ مرنے والے کے لئے تین باتوں میں خیر کی امید رکھو، اس کی پیشانی عرق آلود ہو، آنکھوں میں آنسو ہوں اور ہونٹ خشک ہوں، اگر ایسا ہو تو رحمت خداوندی کی علامت ہے اور اگر اس کے منہ سے ایسی آوازیں نکل رہی ہوں جیسے اس شخص کے منہ سے نکلتی

ہیں جس کا گلا گھونٹا جا رہا ہو اور رنگ سرخ ہو جائے اور ہونٹ مٹا لے ہو جائیں تو یہ اللہ کے عذاب کی علامت ہے زبان سے کلمہ شہادت کا ادا ہونا خیر کی علامت ہے۔ حضرت ابو سعید الخدریؓ فرماتے ہیں۔ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

لَقِنُوا مَوْتَكُمْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ

اپنے مرنے والوں کو لا الہ الا اللہ کی تلقین کرو۔

حضرت حذیفہ کی روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں۔

فَإِنَّهَا تَهْدِيكُمْ مَقَبَلَهَا مِنْ الْخَطَايَا (۲)

اس لئے کہ کلمہ لا الہ الا اللہ پچھلے گناہوں کو ختم کرتا ہے۔

حضرت عثمان روایت کرتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص مرے اور یہ جانتا ہو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے وہ جنت میں داخل ہوتا ہے اور حضرت عبد اللہ کی روایت میں یہ علم کی جگہ یشہد ہے۔ حضرت عمر ابن الخطاب فرماتے ہیں کہ اپنے مرنے والوں کے پاس جاؤ انہیں نصیحت کرو اس لئے کہ وہ ان امور کا مشاہدہ کرتے ہیں جن کا تم نہیں کرتے اور انہیں لا الہ الا اللہ کی تلقین کرو، حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ میں نے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ ملک الموت ایک شخص کے پاس گئے اور اس کے دل کو دیکھا مگر اس میں کچھ نہ تھا پھر اس کے جڑے چیر کر دیکھے تو ان کو تالو سے چپکا ہوا پایا اور دیکھا کہ زبان لا الہ الا اللہ کا ورد کر رہی ہے چنانچہ اس کی کلمہ اخلاص کی وجہ سے بخشش کر دی گئی (امین ابی الدنیا، طبرانی، بیہقی) تلقین کرنے والے کو چاہیے کہ وہ تلقین میں اصرار نہ کرے بلکہ نرمی سے کام لے اس لئے کہ بعض اوقات مریض کی زبان اشقی نہیں ہے اس صورت میں اصرار کرنے سے وہ جھنجھلاہٹ میں مبتلا ہو سکتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ غصے میں انکار کر دے اور یہ انکار اس کے سوہ خاتمہ کا سبب ہو۔

اس تفصیل کا حاصل یہ ہے کہ آدمی موت سے ہم آغوش ہو تو اس کے دل میں اللہ تعالیٰ کے سوا کچھ نہ ہو اگر اس کے دل میں واحد برحق کے سوا کوئی مطلوب باقی نہ رہا تو اس کا مرنا محبوب کے پاس جانا ہو گا اور اس کے لئے اس سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں ہو سکتی کہ وہ اپنے محبوب کے پاس جائے اور اس کے عمل دنیا میں مشغول اور اس کی لذات کے فراق پر مغموم ہو اور کلمہ لا الہ الا اللہ محض اس کی زبان پر ہو دل سے اس کی تصدیق نہ کرنا ہو تو اس کا معاملہ خطرے سے خالی نہیں ہے اس لئے کہ محض زبان کو حرکت دینا کافی نہیں ہے لہذا یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنا فضل فرمائے اور محض قول کو قبولیت سے سرفراز کرے البتہ اس وقت حسن عمن رکھنا بہتر ہے جیسا کہ ہم نے کتاب الرجاء میں بیان کیا ہے اس سلسلے میں حسن عمن رکھنے کے حلق بے شمار روایات وارد ہیں روایت ہے کہ واخذاً ابن الاثیر ایک مریض کے پاس گئے اور اس سے پوچھا کہ تم اس وقت اللہ تعالیٰ سے کیا حسن عمن رکھتے ہو؟ اس نے جواب دیا کہ میرے گناہوں نے مجھے فرق کر دیا ہے اور مجھے ہلاکت کے قریب کر دیا ہے لیکن مجھے اللہ کی رحمت سے امید ہے یہ سن کر وہ اللہ نے اکبر کہا اور ان کے ساتھ گھر والوں نے بھی اللہ اکبر کہا اس کے بعد واخذاً نے فرمایا کہ میں نے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے فرمایا کرتے تھے کہ میں اپنے بندے کے گمان کے قریب ہوں وہ جیسا چاہے مجھ سے گمان رکھے (امین حبیب، احمد، بیہقی) نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایسے نوجوان کے پاس گئے جو مرنے والا تھا آپ نے اس سے دریافت فرمایا کہ اس وقت تم اپنے آپ کو کیا پاتے ہو؟ اس نے جواب دیا کہ میں اللہ تعالیٰ سے امید رکھتا ہوں اور گناہوں سے ڈرتا ہوں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ یہ دونوں باتیں جس بندے کے دل میں جمع ہوتی ہیں اس کو وہی عطا کرتا ہے جس کی وہ توقع رکھتا ہے اور اس چیز سے نجات دیتا ہے جس سے وہ خوف کرتا ہے ثابت البنانی کہتے ہیں کہ ایک نوجوان بڑا حیر مزاج تھا اس کی ماں اسے اکثر یہ نصیحت کرتی تھی کہ اے بیٹے! تجھے ایک دن مرنے سے ڈرنا ہے اس دن کو یاد رکھ جب اس کی موت کا وقت قریب آیا تو اس کی

(۱) یہ روایت حکیم ترمذی نے نوادر الاصول میں مسلمان سے روایت کی ہے مگر اس کی سند صحیح نہیں ہے (۲-۳) پچھلے گناہوں میں (۴) یہ حدیث پہلے گناہوں کی ہے

ماں اس کے اوپر گر پڑی اور رو رو کر کہنے لگی بیٹے میں تجھے اسی دن سے ڈرایا کرتی تھی اور کتنی تھی کہ تجھے ایک دن مرنا ہے، اس نے کہا اماں! میرا رب بڑے احسان والا ہے اور مجھے امید ہے کہ وہ آج کے دن بھی مجھے اپنے احسان سے محروم نہیں کرے گا، ثابت کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے حسن عن کی وجہ سے اس پر رحم فرمایا، جابر ابن دواہ کہتے ہیں کہ ایک لڑکھون بڑا مغرور تھا جب اس کی موت کا وقت آیا تو ماں نے پوچھا کہ بیٹے کیا تو کچھ وصیت کرنی چاہتا ہے اس نے کہا ہاں! میری انگلی سے انگوٹھی مت نکالنا۔ اس میں اللہ کا نام ہے۔ جب اسے دفن کر دیا گیا تو لوگوں نے اسے خواب میں دیکھا کہ وہ کہہ رہا تھا میری ماں سے جا کر کہہ دو کہ کلمہ نے مجھے نفع دیا ہے اور اللہ نے میری مغفرت فرمادی ہے، ایک اعرابی بتا رہا تھا تو لوگوں نے اس سے کہا کہ تو مر جائے گا، اس نے کہا مرنے کے بعد میں کہاں جاؤں گا؟ لوگوں نے جواب دیا اللہ کے پاس، اس نے کہا اگر ایسا ہے تو مجھے کوئی پریشانی نہیں ہے۔ اس لئے کہ مجھے خیر اسی کے پاس سے ملتا ہے، ابوالمعتز ابن سلیمان کہتے ہیں کہ میرے والد نے وفات کے وقت مجھ سے فرمایا اے معتز! مجھ سے رخصت کی حدیثیں میان کرنا کہ میں اللہ تعالیٰ سے حسن عن کے ساتھ طویل۔ مستحب یہ ہے کہ بندے کے سامنے موت کے وقت اس کے اچھے اعمال بیان کئے جائیں تاکہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ وہ اچھا عن رکھے۔

ملک الموت کی آمد پر حیرت ظاہر کرنے والے واقعات: اشعث ابن اسلم کہتے ہیں کہ ابراہیم علیہ السلام نے ملک الموت سے جن کا نام عزرائیل ہے اور جن کی دو آنکھیں ہیں، ایک چہرے پر اور دوسری گدڑی پر۔ دریافت کیا کہ اگر ایک آدمی مشرق میں ہو اور دوسرا مغرب میں اور دونوں کی موت کا وقت ایک ہو یا کسی جگہ دو میں قبض کرنی ہوں جہاں دیا پھیلی ہوئی ہو یا جنگ ہو رہی ہو تو تم کیا کرتے ہو؟ انہوں نے کہا کہ میں اللہ کے حکم سے مدحوں کو بلاتا ہوں اور وہ میری ان انگلیوں کے درمیان سما جاتی ہیں، راوی کہتے ہیں کہ زمین ملک الموت کے لئے ایک طشت کی طرح ہے وہ جسے چاہتا ہے اس میں سے لے لیتا ہے، یہ بھی راوی کا قول ہے کہ ملک الموت حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بشارت دیا کرتے تھے کہ آپ غلیل اللہ ہیں، حضرت سلیمان ابن داؤد علیہ السلام نے ملک الموت سے فرمایا کہ تم لوگوں میں انصاف کیوں نہیں کرتے؟ اسے لے جاتے ہو اور اسے چھوڑ دیتے ہو، ملک الموت نے جواب دیا کہ میں اس کے حلق تم سے زیادہ نہیں جانتا، مجھے تو پیچھے دھپے جاتے ہیں اور ان بھیفوں میں مرنے والوں کے نام لکھے رہتے ہیں، وہ ابن منہ کہتے ہیں کہ ایک بادشاہ نے کسی جگہ جانے کا ارادہ کیا اور پہننے کے لئے کپڑے منگوائے، وہ اچھے نہ لگے، دو سرا لباس منگوا دیا، وہ بھی ناپسند کر دیا، یہاں تک کہ سب سے عمدہ لباس پہنا، اسی طرح اس نے سواری کے لئے بہترین گھوڑا منتخب کیا اور اس پر سوار ہو کر چلا، اس کے ہمراہ ایک لشکر بھی تھا، شیطان نے اس کے حضور میں نہ جانے کیا پھونکا کہ اس کا دل کبر و غرور سے بھر گیا اور اس طرح چلا کہ اس کی نظریں کسی آدمی کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ اسی دوران اس کے پاس ایک بد حال اور پرانندہ بال شخص آیا اور اسے سلام کیا لیکن بادشاہ نے سلام کا جواب نہیں دیا، آنے والے نے اس کے گھوڑے کی لگام پکڑ لی۔ بادشاہ نے کہا لگام پکڑ کر تو نے ایک خوفناک غلطی کی ہے، اس شخص نے کہا میں چہرے پاس ایک ضرورت سے آیا ہوں، بادشاہ نے کہا میرے اترنے کا انتظار کر، اس نے کہا میں اسی وقت کام ہے، یہ کہہ کر اس نے لگام کو جھٹک دیا، بادشاہ نے کہا ٹھیک ہے اپنی ضرورت بیان کر، اس شخص نے کہا یہ ایک راز کی بات ہے، بادشاہ نے اپنا چہرہ اس کے قریب کیا، اس نے کان میں سرگوشی کی، میں ملک الموت ہوں، یہ سن کر بادشاہ کا رنگ خنجر ہو گیا اور زبان لڑکھڑا گئی اور کہنے لگا مجھے اتنی مہلت دو کہ میں گھر واپس جاؤں اور اپنی بعض ضروریات پوری کر لوں اور انہیں الوداع کہہ دوں، ملک الموت نے کہا اب اس کی اجازت نہیں، اب تو کبھی اپنے گھروالوں کو اور مال و متاع کو نہ دیکھ سکے گا، یہ کہہ کر ملک الموت نے اس کی روح قبض کر لی اور وہ سواری سے بے جان لکڑی کی طرح زمین پر گر پڑا، پھر ملک الموت آگے بڑھے اور اسی حال میں ایک مومن بندے سے ملاقات کی اور اسے سلام کیا، بندہ مومن نے ان کے سلام کا جواب دیا، ملک الموت نے کہا مجھے تم سے ایک راز کی بات تمہارے کان میں کہنی ہے، اس شخص نے کہا ضرور کو، ملک الموت نے کہا میں ملک الموت ہوں، اس شخص نے کہا خوش آمدید، میں بڑے دنوں سے آپ کا منتظر تھا، بخدا وہ زمین پر کسی

غائب سے ملنے کا اتنا اشتیاق کسی کو نہ ہوگا جتنا شوق مجھے آپ سے ملنے کا تھا، ملک الموت نے کہا کہ تم جس کام کے لئے نکلے ہو وہ پورا کرلو، اس شخص نے کہا مجھے اللہ کی ملاقات سے زیادہ کوئی کام محبوب نہیں ہے، آپ روح قبض کر لیں، ملک الموت نے کہا تم کس حالت میں مرنا پسند کرو گے؟ اس شخص نے پوچھا کیا آپ کو اس کا اختیار ہے؟ ملک الموت نے کہا ہاں تم جو حالت پسند کرو گے میں اسی میں تمہاری روح قبض کروں گا، چنانچہ ملک الموت نے اس کی نیک روح سجدے کی حالت میں قبض کی۔

ابوبکر ابن عبد اللہ المزنی کہتے ہیں کہ بنی اسرائیل کے ایک شخص نے کافی دولت جمع کر لی، جب اس کی موت کا وقت قریب آگیا تو اس نے اپنے بچوں سے کہا کہ مجھے میری دولت دکھاؤ، اس کے بیٹوں نے گھوڑوں، اونٹ، غلام اور دو سری قیمتیں چیزیں اس کے سامنے رکھ دیں، وہ یہ دولت دیکھ کر رونے لگا، ملک الموت نے کہا اب کیوں روتا ہے؟ اس ذات کی قسم جس نے تجھے اس قدر نعمتیں دی ہیں میں تیرے گھر سے تیری روح لئے بغیر نہیں جاؤں گا، اس آدمی نے درخواست کی کہ اسے اتنی مہلت دیدی جائے کہ وہ یہ مال اللہ کی راہ میں خرچ کر دے، ملک الموت نے کہا اب مہلت کا وقت ختم ہو چکا ہے، تجھے اس سے پہلے یہ خیال کیوں نہیں آیا؟ یہ کہہ کر ملک الموت نے اس کی روح قبض کر لی، روایت یہ ہے کہ ایک شخص نے بہت سا مال جمع کیا، کوئی قیمتی شے ایسی نہیں تھی جو اس کے خزانے میں نہ ہو، اس نے ایک عالیشان اور مضبوط محل بنوایا اور اس کے دو بڑے دروازے بنوائے اور ان دروازوں پر پھیردار مقرر کئے، پھر اپنے اہل و عیال کو جمع کیا اور ان کے لئے کھانا پکوا دیا اور اپنے تخت پر اس طرح بیٹھ گیا کہ اس کا ایک پاؤں دوسرے پاؤں پر تھا، سب لوگوں نے مل کر کھانا کھایا، جب کھانے سے فارغ ہو گئے تو اس نے اپنے نفس سے کہا اے نفس! اب تو چند برسوں تک عیش کر، میں نے تیرے لئے اتنا سرمایہ جمع کر دیا ہے جو تجھے لمبے عرصے تک کافی رہے گا، ابھی وہ اس کلام سے فارغ بھی نہیں ہوا تھا کہ ملک الموت اس کے محل کے دروازے پر اس حال میں پہنچے کہ ان کے کپڑے بوسیدہ اور پٹھے پرانے تھے اور گلے میں فقیروں جیسا ایک کھلکھلا ہوا تھا، وہاں پہنچتے ہی انہوں نے دروازے پر دستک دی، دستک سن کر وہ شخص ڈر گیا، نوکر چاکر باہر کی طرف دوڑے اور دیکھا کہ ایک بدویّت شخص وہاں موجود ہے اور ان کے آقا سے ملنا چاہتا ہے، نوکروں نے اسے ڈانٹ دیا اور یہ کہہ کر دروازہ بند کر لیا کہ کیا ہمارا آقا اس جیسے حقیر شخص سے ملنا پسند کرے گا؟ ملک الموت نے دروازے پر دوبارہ دستک دی، اس مرتبہ آواز پہلے سے زیادہ شدید تھی، نوکر پھر دوڑے اور ملک الموت کو ڈانٹنے کا ارادہ کیا، ملک الموت نے کہا اپنے آقا سے جا کر کہو میں ملک الموت ہوں، یہ سن کر نوکر گھبرائے اور دہشت زدہ ہو کر مالک کے پاس پہنچے اور اسے بتلایا کہ باہر ملک الموت موجود ہے، اس شخص نے کہا ملک الموت کے ساتھ نرمی سے بات کرو، اس سے کہو کہ وہ میرے بجائے کسی اور کو لے جائے، ملک الموت محل میں داخل ہو گئے اور اس کے سامنے جا کر کہنے لگے کہ تو اپنے مال میں جو کچھ کرنا چاہے کر لے اب میں تجھے لئے بغیر نہیں جاؤں گا، اس نے اپنا تمام مال منگوایا اور کہنے لگا اے مال تجھ پر اللہ کی لعنت ہو، تو نے ہی مجھے اللہ کی عبادت سے روکا ہے، مال کو اللہ نے گویا کی بخشی اس نے جواب دیا کہ مجھے کیوں برا کہتا ہے تو ہی مجھے لے کر بادشاہوں کے پاس جاتا تھا اور نیکیوں کو اپنے دروازے سے دھکے دلا دیتا تھا، میرے ذریعہ طرح طرح کے مزے لوٹا تھا، بادشاہوں کی مجلسوں میں بیٹھتا تھا اور مجھے برے کاموں میں صرف کرتا تھا، اب میں تجھے کس طرح پچاسکتا ہوں، اگر تو مجھے خیر کی راہ میں خرچ کرنا تو آج میں تجھے نفع پہنچا سکتا تھا، اے ابن آدم! تو مٹی سے پیدا ہوا ہے، چاہے نیکی کر چاہے گناہ تجھے فنا ضرور ہوتا ہے، اس گفتگو کے بعد ملک الموت نے اس شخص کی روح قبض کر لی۔

دوب ابن منبہ کہتے ہیں کہ ملک الموت نے ایک ایسے زبردست بادشاہ کی روح قبض کی دنیا میں جس کی شوکت کے ڈٹکے بچتے تھے اور جس کی عظمت کے ہر سوچے چھتے اور اس کی روح کو آسمان پر لے کر پہنچے، ملائکہ نے ان سے پوچھا تمہیں کس شخص کی روح قبض کرتے ہوئے زیادہ رحم آیا، ملک الموت نے کہا ایک مرتبہ مجھے ایک ایسی عورت کی روح قبض کرنے کا حکم دیا گیا جو جنگل میں تھاتی تھی اور اس نے ایک بچے کو جنم دیا تھا، مجھے اس کی غریب الوطنی اور بچے کی تھائی کا خیال آیا کہ وہ اس جنگل میں اکیلی ہے کوئی اس کی دیکھ بھال کرنے والا بھی نہیں، فرشتوں نے کہا جس بادشاہ کی روح لے کر تم یہاں آئے ہو وہ یہی بچہ تھا جس پر تم نے

رحم کیا تھا، ملک الموت نے کہا وہ جس پر چاہے کرم فرمائے اور جس پر چاہے رحم کرے، عطاء ابن یسار کہتے ہیں کہ شعبان کی پندرہویں شب میں ملک الموت کو ایک صحیفہ دیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اس سال تمہیں ان سب لوگوں کی روحیں قبض کرنی ہیں جن کے نام اس صحیفے میں درج ہیں، عطاء کہتے ہیں آدمی درخت لگاتا ہے، نکاح کرتا ہے، عمارتیں بناتا ہے اور اسے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اس کا نام ملک الموت کے صحیفے میں لکھا جا چکا ہے، حسن بصری کہتے ہیں کہ ملک الموت ہر روز تین مرتبہ تمام گھروں کی تلاشی لیتے ہیں اور ہر اس شخص کی روح قبض کر لیتے ہیں جسے یہ دیکھتے ہیں کہ اس نے اپنا رزق وصول کر لیا اور عمر تمام کر لی ہے، جب اس کے مرنے پر اعزہ و اقرباء روتے چلاتے ہیں تو ملک الموت دروازے کے دونوں پہلو تھام کر کہتے ہیں کہ بخدا نہ میں نے اس کا رزق کھایا، نہ اس کی عرضا لگ کی، نہ اس کے کچھ دن کم کئے، میں تو تمہارے گھر میں اسی طرح آتا رہوں گا، یہاں تک کہ تم میں سے ایک بھی باقی نہیں رہے گا، حسن کہتے ہیں بخدا اگر گھروالے ملک الموت کی یہ باتیں سن لیں اور ان کے کھڑے ہونے کی جگہ دیکھ لیں تو بخدا میت پر رونا بھول کر اپنے نفسوں پر رونے بیٹھ جائیں، یزید الرقاشی کہتے ہیں کہ بنی اسرائیل کا ایک ظالم جابر بادشاہ اپنے مکان میں اپنی بیوی کے ساتھ تنہا تھا، چاک اس نے دیکھا کہ ایک شخص گھر کے دروازے سے اندر چلا آ رہا ہے، بادشاہ اسے دیکھ کر آگ بگولا ہو گیا اور اس کی طرف بڑھ کر پوچھا تو کون ہے اور تجھے میرے گھر میں کس نے داخل کیا ہے، آنے والے نے جواب دیا کہ مجھے اس گھر کے مالک نے گھر میں داخل کیا ہے اور میں وہ ہوں جسے اندر داخل ہونے کے لئے کسی رکاوٹ کا سامنا نہیں کرنا پڑتا، نہ میں بادشاہوں سے اجازت لیتا ہوں اور نہ سلاطین کی طاقت سے ڈرتا ہوں، نہ کوئی ظالم اور سرکش آدمی مجھے روک سکتا ہے اور نہ شیطان ملعون میرے راستے کی دیوار بن سکتا ہے، بادشاہ یہ سن کر کانپ اٹھا اور سر کے بل زمین پر گر گیا، اس نے نہایت ذلت و مسکنت کے ساتھ اپنا سراٹھایا اور کہنے لگا کہ تم ملک الموت ہو، انہوں نے کہا ہاں میں ملک الموت ہوں، اس شخص نے کہا کیا تم مجھے اتنی مہلت دو گے کہ میں تجدید عہد کر لوں۔ ملک الموت نے کہا ہرگز نہیں! اب فرصت کی مدت ختم ہو گئی ہے، تیرے سانس پورے ہو چکے ہیں اور عمر تمام ہو چکی ہے، اب میں تیری بھلائی کے لئے کچھ نہیں کر سکتا، بادشاہ نے پوچھا اب تم مجھے کہاں لے کر جاؤ گے، ملک الموت نے جواب دیا تیرے ان اعمال کی طرف جو تو نے آگے بھیج دیئے ہیں اور اس گھر کی طرف جو تو نے اپنے لئے تیار کر رکھا ہے، اس نے کہا میں نے اچھے اعمال آگے نہیں بھیجے اور نہ کوئی اچھا مکان بنایا ہے، ملک الموت نے کہا تب تجھے میں دروغ میں لے جاؤں گا، جس کی آگ تیری کھال اور گوشت سب کچھ جلا ڈالے گی، یہ کہہ کر ملک الموت نے اس کی روح قبض کر لی، بادشاہ کی پہے جان لاش زمین پر گر پڑی اور گھروالے رونے چلاتے گئے، یزید الرقاشی کہتے ہیں اگر انہیں اپنے انجام کی خبر ہوتی تو وہ اس سے بھی زیادہ روتے چلاتے، اعمش خثعمہ سے روایت کرتے ہیں کہ ملک الموت سلیمان ابن داؤد علیہما السلام کی مجلس میں آئے اور ان کے مصاحبین میں سے ایک شخص کو گھورنے لگے، جب مجلس پر غصہ ہو گئی تو اس شخص نے حضرت سلیمان سے پوچھا یہ شخص کون تھا جو مجھے اس طرح گھور گھور کر دیکھ رہا تھا، حضرت سلیمان نے جواب دیا یہ ملک الموت تھے، وہ شخص یہ سن کر بہت گھبرایا اور کہنے لگا شاید وہ میری روح قبض کرنا چاہتے ہیں، حضرت سلیمان نے اس سے دریافت کیا اب تم کیا چاہتے ہو، اس شخص نے جواب دیا کہ میں چاہتا ہوں آپ مجھے ان سے بچائیں اور ہوا کو حکم دیں کہ وہ مجھے اڑا کر کہیں دور لے جائے، سلیمان علیہ السلام نے ایسا ہی کیا، توڑی دیر بعد ملک الموت دوبارہ مجلس میں آئے، سلیمان علیہ السلام نے ان سے پوچھا کہ تم میرے ملاں مصاحب کو کیوں گھور رہے تھے، ملک الموت نے کہا مجھے اس شخص کو یہاں دیکھ کر حیرت ہو رہی تھی، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم دیا تھا کہ میں ہند کے انتہائی حصے میں اس کی روح قبض کروں، چنانچہ وہ شخص وقت مقررہ پر وہاں پہنچ گیا اور میں نے اس کی روح قبض کر لی۔

سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات شریف : جاننا چاہیے کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات، وفات، قتل، قول اور تمام احوال میں امت کے لئے اسوۂ حسنہ، ناظرین کے لئے عبرت اور اصحابِ فہم کے لئے بصیرت ہے، اس لئے کہ اللہ کے نزدیک آپ سے بڑھ کر کوئی کرم نہیں تھا، آپ اللہ کے غلیل، حبیب، نجیب، مصلیٰ، رسول اور نبی تھے، اس کے باوجود

جب آپ کی عمر شریف پوری ہوئی تو اللہ نے ایک لمحے یا ایک لمحے کی بھی سہولت نہیں دی بلکہ وقت مقررہ پر اپنے ان معزز فرشتوں کو جو لوگوں کی روحیں قبض کرنے کے کام پر مامور ہیں آپ کی روح پر فتوح قبض کرنے کے لئے بھیجا انہوں نے آپ کی مبارک اور پاکیزہ روح آپ کے اطہر و مقدس جسم سے حاصل کر کے ایسے مکان کی طرف منتقل کر دی جو اللہ کے جوار میں سب سے بہتر جگہ ہے اور جہاں رحمت و رضائے خداوندی کا جلوہ ہوتا ہے، آپ اللہ کے محبوب دوست اور برگزیدہ وغیرہ تھے لیکن اس کے باوجود عالم نزع میں آپ کو تکلیف اور کرب کے ایک سخت مرحلے سے گزرنا پڑا، زبان سے آہ نکل، شوق کے کلمات زبان پر آئے، چہرہ مبارک کا رنگ خنجر ہوا، پیشانی مبارک عرق آلود ہوئی، اضطراب کی حالت میں دونوں ہاتھوں نے دائیں بائیں گردش کی، آپ کی یہ حالت دیکھ کر وہ لوگ رونے لگے جو اس وقت آپ کے قریب موجود تھے، آپ منصب نبوت پر فائز تھے لیکن کیا اس منصب کی بناء پر حکم الہی میں کوئی تبدیلی ہوئی یا آپ کے اہل خانہ کے غم و اندوہ کا خیال کیا کیا یا آپ کی اس لئے رعایت کی گئی کہ آپ دین کے حامی و نصیر اور مخلوق کے بشیر و نذیر تھے؟ نہیں! بلکہ وہ سب کچھ ظہور پذیر ہوا جو حکم الہی سے لوح محفوظ میں لکھا ہوا تھا، یہ تھا آپ کا حال، حالانکہ اللہ کے یہاں آپ کا مقام و مرتبہ نہایت بلند ہے، آپ حوض کوثر پر وارد ہونے والے ہیں، آپ ہی سب سے پہلے اپنی قبر سے باہر تشریف لائیں گے، آپ ہی قیامت کے دن گناہگاروں کے لئے شفاعت فرمائیں گے۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ ہم آپ کے حالات مبارک سے عبرت حاصل نہیں کرتے اور جو کچھ ہمارے ساتھ پیش آنے والا ہے اس پر یقین نہیں رکھتے بلکہ ہم سموات میں گرفتار اور معاصی و سیئات میں پڑے رہتے ہیں، ہمیں کیا ہو گیا ہے، ہم سید المرسلین، امام المکتبین اور حبیب رب العالمین کی کیفیت وفات سے نصحت کیوں نہیں پکڑتے؟ شاید ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ہمیں ہمیشہ یہاں رہنا ہے یا ہمیں یہ غلط فہمی ہے کہ ہم اپنی تمام تر بد اعمالیوں کے باوجود اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندے ہیں۔ اگرچہ ہمیں یہ یقین ہے کہ ہم سب کو دوزخ سے گزرنا ہے اور یہ بھی یقین ہے کہ صرف متقین دوزخ میں گرنے سے بچیں گے لیکن ہمیں یہ وہم ہو گیا ہے کہ ہم متقی ہیں اور دوزخ سے بچنا یقینی ہے حالانکہ ہم نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا ہے، ہم کسی بھی طرح متقین میں شامل نہیں ہو سکتے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وَإِنْ مِنْكُمْ إِلَّا وَارِدُهَا كَانَ عَلَى رَبِّكَ حَتْمًا مَقْضِيًّا ثُمَّ نُنْجِي الَّذِينَ اتَّقَوْا وَنَذَرُ
الظَّالِمِينَ فِيهَا جِثِيًّا۔ (پ ۸، ر ۸، آیت ۱۷-۱۸)

اور تم میں سے کوئی بھی نہیں جس کا اس پر سے گزر نہ ہو۔ یہ آپ کے رب کے اعتبار سے لازم ہے جو پورا ہو کر رہے گا۔ پھر ہم ان لوگوں کو نجات دیں گے جو خدا سے ڈرتے تھے اور ظالموں کو اس میں ایسی حالت میں رہنے دیں گے کہ (بارے غم کے) گھٹنوں کے بل گر پڑیں گے۔

ہر بندے کو یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ ظلم کرنے والوں سے زیادہ قریب ہے یا اصحاب تقویٰ سے، پہلے تم اکابرین سلف کے احوال پر نظر ڈالو کہ وہ توفیق ایزدی میسر آنے کے باوجود خائنین میں سے تھے، پھر اپنے نفس پر نظر ڈالو کہ توفیق سے محرومی کے باوجود غلط فہمی میں مبتلا ہو، پھر سرور کائنات اور سید المرسلین کی سیرت طیبہ میں غور کرو کہ بحیثیت نبی کے آپ کی آخرت محفوظ تھی مگر اس کے باوجود آپ کو دنیا سے رخصت ہونے کے وقت نزع کا کرب ہوا اور جنت ماویٰ کی طرف منتقل ہونے سے پہلے کس قدر سخت مرحلے سے گزرنا ہوا۔

حضرت عبداللہ ابن مسعود کہتے ہیں کہ ہم اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے حجرہ طیبہ میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کے لئے اس وقت حاضر ہوئے جب فراق کے لمحات قریب آچکے تھے۔ آپ نے ہمیں دیکھا، آپ کی آنکھوں میں آنسو آگئے، پھر آپ نے فرمایا آؤ آؤ، اچھا ہوا تم آگئے اللہ تعالیٰ تمہیں زندگی عطا کرے، اپنی پناہ میں رکھے اور تمہاری مدد فرمائے، میں تمہیں اللہ سے ڈرنے کی وصیت کرتا ہوں اور تمہارے باب میں اللہ سے وصیت کرتا ہوں بلاشبہ میں اس کی طرف

سے ہمیں کھلے طور پر ڈرانے والا ہوں، میری وصیت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے اس کے ملک اور اس کے بندوں پر برتری اختیار مت کرو، موت کا وقت قریب آچکا ہے اور اللہ کی طرف 'سدرۃ المنتہی' کی 'جنت الماویٰ' اور بھرپور جام کی طرف جانا ہے، پھر میری طرف سے خود اپنے آپ کو اور ان لوگوں کو سلام پہنچاؤ جو میرے بعد تمہارے دین میں داخل ہوں گے (بزار) روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وفات شریف کے وقت حضرت جبرئیلؑ سے ارشاد فرمایا کہ میرے بعد میری امت کا کون ہوگا؟ اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرئیلؑ سے فرمایا کہ میرے حبیب کو خوشخبری سناؤ کہ میں انہیں ان کی امت کے سلسلے میں رسوا نہ کروں گا اور یہ بھی بشارت دیدو کہ حشر کے دن آپ لوگوں میں سب سے پہلے زمین سے اٹھیں گے اور جب سب جمع ہوں گے تو آپ ان کے سردار ہوں گے اور یہ خوشخبری بھی دیدو کہ جب تک آپ کی امت جنت میں داخل نہیں ہوگی۔ تمام امتوں پر جنت حرام رہے گی، (طبرانی) جابرؓ ابن عباسؓ حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں حکم دیا کہ ہم سات کنوؤں سے سات منگیزے پانی منگو اگر آپ کے جسم اطہر کو غسل دیدیں، چنانچہ ہم نے ایسا ہی کیا، اس سے آپ کو کچھ راحت ہوئی، اس کے بعد آپ باہر تشریف لے گئے اور لوگوں کو نماز پڑھائی اور شہدائے احد کے لئے دعائے مغفرت فرمائی، پھر انصار کے سلسلے میں وصیت فرمائی اور ارشاد فرمایا! اے مہاجرین کے گروہ! تم لوگ بدھتے جا رہے ہو اور انصار اپنی اس عیت سے نہیں بدھ رہے ہیں جس پر وہ آج ہیں، یہ لوگ میرے خاص ہیں۔ میں نے انکے پاس آکر نہادلی، تم ان میں سے اس شخص کا احترام کرنا جو اچھا کرے اور اس شخص سے تجاوز کرنا جو برائی کرے۔ پھر فرمایا ایک بندے کو دنیا میں اور اللہ تعالیٰ کے پاس جو چیز ہے اس میں اختیار دیا گیا ہے۔ چنانچہ بندے نے وہ چیز اختیار کر لی جو اللہ تعالیٰ کے پاس ہے، یہ سن کر حضرت ابوبکرؓ رونے لگے، آپ نے سمجھ لیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ہی متعلق ارشاد فرما رہے ہیں، آپ نے فرمایا اے ابوبکرؓ تسلی رکھو، پھر فرمایا یہ تمام دروازے جو مسجد میں کھلے ہوئے ہیں بند کرنا مگر ابوبکرؓ کا دروازہ مت بند کرنا، اس لئے کہ میں رفاقت میں اپنے نزدیک ابوبکرؓ سے بہتر کسی کو نہیں پاتا۔ (مسند داری) حضرت عائشہؓ یہ بھی روایت فرماتی ہیں کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے گھر میں میری باری کے دن میں اور میری گود میں انتقال فرمایا اور اللہ تعالیٰ نے آپ کی وفات کے وقت میرے اور آپ کے احباب دہن کو بکھا فرمایا اور وہ اس طرح کہ میرے پاس میرے بھائی عبدالرحمنؓ آئے ان کے ہاتھ میں ایک مسواک تھی، آپ مسواک کی طرف دیکھنے لگے اس سے میں یہ سمجھی کہ شاید آپ کو مسواک پسند آگئی، چنانچہ میں نے عرض کیا کیا میں آپ کے لئے لے لوں، آپ نے اثبات کا اشارہ فرمایا، چنانچہ میں نے عبدالرحمنؓ سے مسواک لے کر آپ کے دہن مبارک میں داخل کی، آپ کو وہ سخت معلوم ہوئی، میں نے عرض کیا کیا میں اسے نرم کر دوں، آپ نے سر مبارک سے اشارہ فرمایا ہاں! میں نے اسے (داعیوں سے چپا کر) نرم کر دیا، آپ کے سامنے پانی کا ایک پالہ تھا، آپ اپنا دست مبارک اس میں ڈالتے تھے اور فرماتے تھے لا الہ الا اللہ موت کے لئے سکرات ہیں، پھر آپ نے اپنا دست مبارک بلند فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ رفیق اعلیٰ، رفیق اعلیٰ، میں نے اپنے دل میں سوچا بخدا اب آپ ہمیں پسند نہ فرمائیں گے (بخاری و مسلم) سعید ابن عبداللہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ جب انصار نے یہ محسوس کیا کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی طبیعت زیادہ ناساز ہو گئی ہے تو انہوں نے مسجد کا طواف شروع کر دیا (یہ دیکھ کر) حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ انصار (اضطراب کے عالم میں) مسجد کے ارد گرد پھر رہے ہیں اور ڈرتے ہیں پھر قریب حاضر ہوئے اور انہوں نے بھی یہی خبر دی، پھر علیؓ حاضر ہوئے اور انہوں نے بھی یہی بتلایا، تب آپ نے اپنا دست مبارک بڑھایا اور فرمایا لو پکڑو، چنانچہ لوگوں نے اپنے ہاتھوں میں آپ کا دست مبارک لے لیا، پھر آپ نے فرمایا تم لوگ کیا کہتے ہو؟ عرض کیا ہم لوگوں کو آپ کی وفات کا اندیشہ ہے اور آپ کی خدمت میں لوگوں کے اجتماع سے ان کی عورتیں چیخنے چلاتے لگی ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم (یہ سن کر) اٹھے اور حضرت علیؓ کے سامنے باہر تشریف لائے، حضرت ابن عباسؓ آپ کے آگے آگے چل رہے تھے، آپ کا سر مبارک کپڑے سے بندھا ہوا تھا اور آپ تھک کر قدم رکھ رہے تھے، یہاں تک کہ آپ منبر کی پہلی سیڑھی پر

تشریف فرما ہو گئے، لوگ آپ کی طرف متوجہ ہوئے، آپ نے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء کی اور ارشاد فرمایا، 'لوگو! مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم میری موت سے ڈرتے ہو، گویا موت سے نفرت کرتے ہو اور پھر تم اپنے نبی کی موت کا انکار کیوں کرتے ہو؟ کیا میں نے تمہیں اپنی موت کی خبر نہیں دی تھی اور کیا تمہیں خود تمہارے مرنے کی خبر نہیں پہنچی؟ کیا مجھ سے پہلے مبعوث ہونے والے انبیاء ہمیشہ زندہ رہے ہیں کہ میں ہمیشہ زندہ رہوں گا؟ آگاہ رہو! میں اپنے رب سے ملنے والا ہوں اور تم خود بھی اس سے ملنے والے ہو، میں تمہیں وصیت کرتا ہوں کہ جو لوگ پہلے ہجرت کر کے آئے ہیں، ان سے بہتر سلوک کرنا اور میں مہاجرین کو بھی یہ وصیت کرتا ہوں کہ وہ انہیں میں اچھی طرح رہیں۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔

وَالْعَصْبِرُ إِنَّ الْإِنْسَانَ لَفِي خُسْرٍ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالْعَصْبِرِ۔ (پ ۳۰، ر ۲۸، آیت ۱-۳)

قسم ہے نبی کی انسان ہمیشہ خسارے میں ہے مگر جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اچھے کام کئے اور ایک دوسرے کو اعتقاد حق کی تمنا کی اور ایک دوسرے کو پابندی کی تمنا کی کرتے رہے۔

تمام امور اللہ تعالیٰ کے حکم سے انجام پذیر ہوتے ہیں ایسا نہ ہو کہ کسی امر کی تاخیر تمہیں اس کی قبیل پر اکساوے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کسی کے جلدی کرنے سے جلدی نہیں کرتا، جو شخص اللہ تعالیٰ پر غالب ہونا چاہے گا اللہ اسے مغلوب کر دے گا اور جو اللہ تعالیٰ کو دھوکہ دے گا اللہ تعالیٰ اسے دھوکا دے گا۔

فَهَلْ عَسَيْتُمْ إِنْ تَوَلَّيْتُمْ أَنْ تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ وَتَقَطَّعُوا أَرْحَامَكُمْ۔ (پ ۳۱، ر ۷، آیت ۱۲)

سو اگر تم کنارہ کش رہو تو تم کو یہ احتمال بھی ہے کہ تم دنیا میں فساد مچا دو اور آپس میں قطع رقابت کرو۔ میں تمہیں انصار کے بارے میں خبر کی وصیت کرتا ہوں کیونکہ انہوں نے ہی تم سب سے پہلے مدینہ میں اقامت اختیار کی اور ایمان میں اخلاص حاصل کیا، تم ان کے ساتھ اچھا سلوک کرنا، کیا انہوں نے تمہیں آدھے پھل نہیں دیئے، کیا انہوں نے تمہارے لئے گھروں میں وسعت نہیں کی، کیا انہوں نے تم کو اپنے آپ پر ترجیح نہیں دی حالانکہ وہ خود ضرورت مند تھے، دیکھو! اگر کوئی دوسرے شخصوں پر بھی حکومت پائے تو اسے چاہئے کہ وہ احسان کرے والے کا احسان قبول کرے اور برائی کرنے والے کی برائی سے درگزر کرے، خبردار ان پر اپنے آپ کو ترجیح مت دینا، آگاہ رہو میں تم سے آگے جا رہا ہوں اور تم میرے بعد آنے والے ہو اور تمہارے وعدے کی جگہ حوض ہے (یعنی) میری وہ حوض جس کی وسعت شام کے بھرے اور یمن کے صنعا کا درمیانی فاصلہ ہے، اس میں کوثر کا آبشار گرتا ہے اس کا پانی دودھ سے زیادہ سفید، مکھن سے زیادہ لطیف اور شہد سے زیادہ شیریں ہے جو اس کا پانی پی لے گا وہ کبھی بیمار نہ ہوگا، اس کے شکرینے موتی ہیں اور اس کی مٹی ٹھک ہے، جو کل کے دن وہاں کھڑا ہونے سے محروم رہا وہ ہر چیز سے محروم رہے گا، دیکھو! جو شخص کل کے دن اس حوض پر میرے پاس آنا چاہے وہ اپنی زبان اور ہاتھ کو مناسب باتوں سے روکے، حضرت عباسؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ! قریش کو بھی کچھ وصیت فرمائیے، آپ نے فرمایا میں قریش کے لئے امر خلافت کی وصیت کرتا ہوں، باقی لوگ قریش کے تابع ہیں، ان کے ٹیک ٹیک کے تابع ہیں اور بدد کے، اے قریش! لوگوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا، اے لوگو! گناہ لغتیں بدل دیتے ہیں اور قسمتوں میں تغیر کر دیتے ہیں، اگر لوگ نیک ہوں گے تو ان کے ائمہ بھی ان کے ساتھ اچھا سلوک کریں گے اور اگر وہ برے ہوں گے تو ان کے ائمہ بھی ان پر ظلم و حاکمیں گے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

وَكَذَلِكَ نُوَلِّي بَعْضَ الظَّالِمِينَ۔ (پ ۸، ر ۲، آیت ۳۰)

اور اسی طرح ہم بعض کفار کو بعض کے قریب رکھیں گے۔

حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ روایت کرتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم نے حضرت ابوبکر الصدیقؓ سے ارشاد فرمایا اے ابوبکر کچھ پوچھو!

انہوں نے عرض کیا! یا رسول اللہ کیا اجل قریب آگئی؟ آپ نے فرمایا اجل قریب آئی اور تک آئی، ابو بکر نے عرض کیا یا رسول اللہ! اللہ تعالیٰ کی نعمتیں آپ کو مبارک ہوں، ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ آپ کہاں تشریف لے جائیں گے؟ فرمایا! اللہ تعالیٰ کی طرف، سدرۃ المستقیٰ کی طرف، پھر جنت المادویٰ، طاء اعلا، جام لبریز، رفیع اعلا اور خوشگوار زندگی کی جانب، حضرت ابو بکر نے عرض کیا یا رسول اللہ آپ کو حسل کون دے گا؟ فرمایا میرے خاندان کے وہ موجد قریب تر ہوں۔ پھر جو ان سے ذرا دور ہوں، حضرت ابو بکر نے عرض کیا یا رسول اللہ! ہم آپ کو کن کپڑوں میں گفتائیں؟ فرمایا میرے ان کپڑوں میں، یمانی طے اور مصر کے سفید کپڑے میں، حضرت ابو بکر نے عرض کیا ہم آپ پر کس طرح نماز (جنازہ) پڑھیں؟ ہم لوگ رونے لگے، سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم بھی رونے لگے، اس کے بعد آپ نے فرمایا بس چپ ہو جاؤ، اللہ تعالیٰ تمہاری مغفرت فرمائے اور تمہارے نبی کی طرف سے جنہیں جو اسے خیر عطا فرمائے، جب تم مجھے غسل دیکر اور گفتا کر فارغ ہو جاؤ تو مجھے میرے اس حجرے میں میری قبر کے کنارے میری چارپائی پر لٹاؤ، پھر کچھ دیر کے لئے تنہا چھوڑ دینا، سب سے پہلے مجھ پر اللہ تعالیٰ نماز پڑھیں گے وہ اور اس کے فرشتے تم پر رحمت بھیجے رہتے ہیں، پھر اللہ تعالیٰ ملائکہ کو میرے اوپر نماز پڑھنے کی اجازت دیں گے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں سے پہلے جبریل میرے پاس آئیں گے اور میرے اوپر نماز پڑھیں گے، پھر میکائیل پڑھیں گے، پھر اسرافیل پھر ملک الموت، بہت سے لشکروں کے ساتھ، پھر تمام ملائکہ (اللہ ان سب پر اپنی رحمت نازل فرمائے) پھر تم لوگ ٹولی بنانا کر آنا اور مجھ پر انفرادی اور اجتماعی طور پر صلوٰۃ و سلام کہنا، مجھے میری تعریف کر کے یا سچ کر چلا کر ایذا مت دینا، تم میں سے پہلے امام نماز پڑھے، پھر میرے گھر کے افراد جو قریب تر ہوں پھر دور کے اہل خاندان، مردوں کے بعد عورتوں کی جماعتیں پھر بچے، حضرت ابو بکر نے دریافت کیا کہ قبر مبارک کے اندر کون اترے؟ آپ نے فرمایا کہ میرے خاندان کے کچھ لوگ جو قریب تر ہوں، بہت سے فرشتوں کے ساتھ تم انہیں دیکھ نہیں پاؤ گے اور وہ جنہیں دیکھیں گے، اب یہاں سے اٹھو اور میرے بارے میں بعد کے لوگوں کو بتلاؤ، (طبقات ابن سعد) عبد اللہ ابن زمرہ روایت کرتے ہیں حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی ابتدائی تاریخوں میں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور نماز کی اطلاع دی، آپ نے فرمایا ابو بکر سے نماز پڑھانے کے لئے کو۔ ابن زمرہ کہتے ہیں کہ میں باہر نکلا، دروازے کے سامنے چند لوگوں کے ساتھ حضرت عمرؓ موجود تھے، میں نے حضرت عمرؓ سے کہا کہ اے عمر! آپ کھڑے ہو جائیں اور لوگوں کو نماز پڑھا دیں، حضرت عمرؓ نے نماز کی نیت باندھی اور اللہ اکبر کہا کیونکہ آپ کی آواز بلند تھی، اس لئے اللہ اکبر کہنے کی آواز سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی سنی اور فرمایا ابو بکر کہاں ہیں، عمر کا نماز پڑھانا نہ اللہ کو پسند آئے گا اور نہ مسلمانوں کو، آپ نے یہ جملہ تین مرتبہ ارشاد فرمایا، ابو بکر سے کہو کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھائیں، حضرت عائشہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ! ابو بکر نرم دل انسان ہیں اگر وہ آپ کی جگہ کھڑے ہوئے تو ان پر گریہ غالب آجائے گا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہؓ سے فرمایا کہ تم حضرت یوسف کے ساتھ والی ہو، ابو بکر سے کہو کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھائیں، راوی کہتے ہیں کہ عمر کے نماز پڑھانے کے بعد وہی نماز حضرت ابو بکر نے دوبارہ پڑھائی، حضرت عمرؓ عبد اللہ ابن زمرہ سے کہا کرتے تھے کہ کم بخت تو نے میرے ساتھ یہ کیا ظلم کیا، بخدا اگر مجھے یہ خیال نہ ہوتا کہ تجھے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے تو میں کبھی نماز نہ پڑھاتا، عبد اللہ کہتے ہیں کہ میں نے اس وقت آپ سے بہتر کسی کو نہ پایا، حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے حضرت ابو بکرؓ کی طرف سے اس لئے عذر کیا تھا کہ آپ کو دنیا کی رغبت نہ تھی۔ نیز خلافت میں خطوط اور ہلاکت بھی ہے، مگر جسے اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے اور مجھے یہ ڈر بھی تھا کہ لوگ ہرگز یہ بات پسند نہیں کریں گے کہ آپ کی حیات میں کوئی بھی آپ کی جگہ نماز پڑھائے، لا یہ کہ خدا ہی اس بات کو چاہے، حضرت ابو بکر کے نماز پڑھانے سے لوگ حسد کریں گے اور ان سے سرکشی اختیار کریں اور برا بھلا کہیں گے لیکن ہوتا وہی ہے جو اللہ چاہتا ہے، اللہ نے انہیں دنیا و دین کی ہر اس بات سے محفوظ رکھا جس سے میں ڈرا کرتی تھی، (ابوداؤد نمونہ مختصر)۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ جس دن آپ نے دنیا سے پردہ فرمایا اس دن ابتدائی وقت میں آپ کی طبیعت بھلی تھی، لوگ یہ دیکھ

کر خوش خوش اپنے کمر چلے گئے اور اپنی ضروریات میں مشغول ہو گئے، سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس صرف عورتیں رہ گئیں، ہم اس روز جس قدر پُر امید اور خوش تھے اتنے پہلے کبھی نہ ہوئے تھے، سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے (عورتوں سے) فرمایا تم لوگ میرے پاس سے جاؤ، فرشتہ میرے پاس آنے کی اجازت مانگ رہا ہے، میرے علاوہ تمام عورتیں باہر چلی گئیں، آپ کا سر مبارک میری گود میں تھا، آپ اٹھ کر بیٹھ گئے، میں بھی کمرے کے ایک گوشے میں ہو گئی، آپ نے فرشتے سے دیر تک سرگوشی کی پھر آپ نے مجھے آواز دی اور دوبارہ میری گود میں اپنا سر مبارک رکھا، آپ نے عورتوں سے اندر آنے کے لئے فرمایا، میں نے عرض کیا یہ حضرت جبرئیل علیہ السلام تونہ تھے، آپ نے فرمایا، اے عائشہ صبح کتنی ہو، یہ ملک الموت تھے جو میرے پاس آئے تھے اور کہہ رہے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے آپ کی خدمت میں بھیجا ہے اور حکم دیا ہے کہ میں آپ کی اجازت کے بغیر آپ کی خدمت میں حاضر نہ ہوں اور اگر آپ اجازت نہ دیں تو واپس چلا جاؤں اور اگر اجازت دیں تو حاضر ہوں اور اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں آپ کی روح اس وقت تک قبض نہ کروں جب تک آپ قبض کرنے کی اجازت نہ دیں، اب آپ حکم فرمائیں؟ میں نے کہا مجھ سے دور ہو یہاں تک کہ جبرئیل میرے پاس آئے، اب جبرئیل کے آنے کا وقت ہو گیا ہے، حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے سامنے ایسا معاملہ رکھا کہ اس کا ہمارے پاس نہ کوئی جواب تھا اور نہ کسی قسم کی رائے تھی، چنانچہ ہم نے سکوت اختیار کیا اور ہمیں ایسا محسوس ہوا کہ گویا کوئی سخت آواز ہمیں پریشان کر گئی ہے، گھر والوں میں سے بھی کوئی معاملے کی اہمیت کے پیش نظر کچھ نہیں بولا، اس امر کی ہیئت ہم سب کے دلوں پر چھا گئی، حضرت عائشہ کتنی ہیں اسی وقت حضرت جبرئیل علیہ السلام تشریف لائے اور انہوں نے سلام کیا، میں نے ان کی آہٹ محسوس کر لی، گھر والے حجرے سے باہر چلے گئے اور وہ اندر تشریف لے آئے اور کہنے لگے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو سلام کہتا ہے اور آپ کی مزاج پرسی کرتا ہے حالانکہ وہ آپ سے زیادہ آپ کی حالت سے باخبر ہے لیکن وہ مزاج پرسی کر کے آپ کے شرف و کرامت میں اضافہ کرنا چاہتا ہے اور مخلوق پر آپ کی شرافت و کرامت مکمل کرنا چاہتا ہے اور اسے آپ کی امت کے لئے شفع بنانا چاہتا ہے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں درد محسوس کرتا ہوں، حضرت جبرئیل علیہ السلام نے فرمایا آپ کو خوشخبری ہو اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ آپ کو اس مقام تک پہنچائے جو اس نے آپ کے لئے تیار کر رکھا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے جبرئیل! ملک الموت میرے پاس آئے تھے اور اجازت مانگ رہے تھے (آپ نے پوری گفتگو کی نقل فرمائی) حضرت جبرئیل علیہ السلام نے فرمایا یا محمد! آپ کا رب آپ کا مشتاق ہے اور جو کچھ وہ چاہتا ہے وہ آپ کو معلوم ہو چکا ہے، بخدا ملک الموت نے آج تک کسی سے اجازت نہیں لی اور نہ آئندہ کبھی لیں گے مگر کیونکہ اللہ آپ کے شرف کی تکمیل چاہتا ہے (اس لئے اجازت لی ہے) اور آپ کا مشتاق ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تو اب تم ملک الموت کے آنے تک یہاں سے مت جانا اس کے بعد آپ نے عورتوں کو اندر بلا لیا اور فرمایا اے قاطمہ! میرے قریب آؤ، وہ آپ کے اوپر جھک گئیں آپ نے ان کے کان میں کچھ فرمایا، حضرت قاطمہ نے سر اٹھایا تو ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ آپ نے دوبارہ انہیں اپنے قریب آنے کے لئے فرمایا، وہ آپ کے اوپر جھک گئیں۔ آپ نے ان کے کان میں کچھ فرمایا اس کے بعد انہوں نے سر اٹھایا تو ہنس رہی تھیں اور ہنسی کے مارے بات نہیں کر پا رہی تھیں، ہمیں ان کی یہ حالت دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی، بعد میں ہمارے پوچھنے پر انہوں نے بتلایا کہ پہلی مرتبہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا تھا میں آج انتقال کرنے والا ہوں، میں یہ سن کر رونے لگی، دوبارہ یہ فرمایا کہ میں نے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کی ہے کہ وہ میرے اہل و عیال میں سب سے پہلے تمہیں مجھ سے ملائے اور میرے ساتھ رکھے، میں یہ سن کر ہنسنے لگی، پھر حضرت قاطمہ نے اپنے دونوں بیٹوں کو آپ کے قریب کیا، آپ نے انہیں پیار کیا، حضرت عائشہ کتنی ہیں ملک الموت آئے انہوں نے سلام کیا اور اجازت عطا فرمائی، ملک الموت نے اندر آکر عرض کیا اے محمد! آپ ہمیں کیا حکم دیتے ہیں، آپ نے فرمایا مجھے میرے رب سے ابھی ملاؤ، ملک الموت نے عرض کیا آج ہی ملاؤں گا، آپ کا رب آپ کا مشتاق ہے اور اسے آپ کے علاوہ کسی کا اتنا خیال نہیں ہے اور مجھے کسی کے پاس آپ کے علاوہ اجازت کے بغیر

جانے سے نہیں روکا لیکن آپ کی سماعت آپ کے سامنے ہے یہ کہہ کر وہ چلے گئے، حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں حضرت جبریلؑ آئے اور سلام کر کے کہنے لگے یا رسول اللہ یہ میرا آخری مرتبہ آنا ہے، آج کے بعد میں کبھی زمین پر نہیں اتروں گا، وحی پیٹ دی گئی ہے اور دنیا بھی تمہ کوئی گئی ہے، مجھے دنیا میں آپ کے علاوہ کسی سے حاجت نہیں تھی اور نہ آپ کی خدمت میں ماضی کے علاوہ کوئی کام تھا، اب میں اپنی جگہ ٹھہرا رہوں گا، حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ اس ذات کی قسم جس نے محمد کو حق کے ساتھ مبعوث کیا گھر میں کسی کو تاب نہ تھی اور حضرت جبریلؑ کی گفتگو کی ہیبت اور خوف ہم لوگوں پر اس قدر حاوی تھا کہ ہم مردوں کو بھی بلانہ پارہ تھے پھر میں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچی اور آپ کا سرمہ مبارک اپنی گود میں رکھ لیا یہاں تک کہ آپ پر بے ہوشی طاری ہونے لگی اور پیشانی مبارک پر پسینے کے قطرے نمودار ہوئے اور اس قدر پسینہ بہا کہ میں نے کسی انسان سے اتنا پسینہ نہ دیکھا، میں اپنی انگلی سے آپ کا پسینہ پونچھ رہی تھی، آپ کے پسینے میں جس قدر خوشبو تھی اس قدر خوشبو میں نے کسی چیز میں نہیں پائی، جب آپ کو بے ہوشی سے کچھ افاقہ ہوتا تھا تو میں کہتی تھی میرے ماں باپ، میری جان اور رشتے دار سب آپ پر قربان ہوں، آپ کی پیشانی سے اس قدر پسینہ کیوں نکل رہا ہے، آپ نے ارشاد فرمایا، اے عائشہ مومن کی جان پسینے کی راہ سے نکلتی ہے اور کافر کی جان پانچھوں کی راہ سے گدھے کی جان کی طرح نکلتی ہے، اس وقت ہم گھبرا گئے اور ہم نے اپنے گھروالوں کو بلائے کے لئے بھیجا، سب سے پہلے جو شخص ہمارے پاس آیا وہ میرا بھائی تھا جس کو میرے والد نے میرے پاس بھیجا تھا، مگر وہ آپ کو دیکھ نہیں پایا کیونکہ اس کے آنے سے پہلے ہی سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی روح پاک جسم اطہر کا ساتھ چھوڑ چکی تھی اور اللہ ہی نے مردوں کو آنے سے روکا تھا کیونکہ اللہ نے آپ کا معاملہ حضرت جبریلؑ اور میکائیلؑ کے سپرد کر دیا تھا جب آپ پر بے ہوشی طاری ہوتی تو آپ فرماتے بلکہ رفیقِ اعلاؑ اس سے معلوم ہوتا تھا گویا آپ کو بار بار اختیار دیا جا رہا ہے، جب آپ کو کلام کی سکت ہوتی تو آپ ارشاد فرماتے نماز نماز، تم لوگ نماز جماعت سے پڑھو گے تو ہمیشہ متحد رہو گے، نماز نماز، آپ بار بار نماز کی وصیت فرماتے رہے، یہاں تک کہ نماز نماز کہتے ہوئے جان جان آفرین کے سپرد فرمائی۔ (طبرانی کبیر، ابن عباس، جامعہ اختلاف)

حضرت عائشہؓ کی ایک روایت میں ہے کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے چاشت اور دوپہر کے درمیانی وقت میں انتقال فرمایا (ابن عبد البر) حضرت فاطمہؓ فرماتی ہیں کہ میرے دن سے مجھے مصیبت ملی، بخدا امت کو اس دن بڑے مصیبت ہوا کرے گی، حضرت ام کلثومؓ نے کوفہ میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے انتقال پر فرمایا کہ دو شے میں میرے لئے خیر نہیں ہے، اس دن سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات پائی، حضرت علی شہید ہوئے اور میرے شوہر شہید ہوئے، اس لئے اس دن سے مجھے خیر نہیں ملا۔ حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ جب سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات پائی تو لوگ مصیبت میں پڑ گئے یہاں تک کہ رونے کی آواز بلند ہوئی، آپ کو فرشتوں نے آپ کے کپڑوں میں ڈھانپ دیا، لوگوں کا مختلف حال ہو گیا، بعض لوگوں نے آپ کی وفات کی تکذیب کی بعض کو غصے ہو گئے اور عرصہ دراز تک نہ بولے اور بعض مہمل باتیں کرنے لگے، بعض لوگوں کی عقل پانی رہی، بعض بیٹھے کے بیٹھے رہ گئے، حضرت عمر ابن الخطابؓ ان لوگوں میں تھے جنہوں نے آپ کی وفات کو جھٹلایا، علیؓ ان لوگوں میں سے تھے جو بیٹھے رہ گئے اور عثمانؓ کو گتے ہو گئے تھے، حضرت عمرؓ لوگوں کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے انتقال نہیں فرمایا، اللہ تعالیٰ انہیں واپس فرماوے گا اور ان منافقین کے ہاتھ پاؤں کاٹ ڈالے گا جو سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے موت کی تمنا کرتے ہیں، ہمارے حضور سے اللہ نے ایسا ہی وعدہ کیا ہے جیسا حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کیا تھا، اب وہ ہمارے پاس آنے والے ہیں، ایک روایت میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے یہ کہا کہ لوگوں کو سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کچھ کہنے سے اپنی زبان کو روکو، بخدا آپ نے وفات نہیں پائی اب اگر کسی نے ایسی بات کہی تو میں تلوار سے اس کی گردن اڑا دوں گا، حضرت علیؓ گھر میں بیٹھے رہ گئے، حضرت عثمانؓ کسی سے کچھ نہ بولتے تھے، لوگ ان کا ہاتھ پکڑ لاتے تھے اور لے جاتے تھے کسی مسلمان کا حال ایسا نہیں تھا جیسا حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عباسؓ کا تھا، اللہ تعالیٰ نے ان دونوں حضرات کو توفیق اور راستی عطا فرمائی تھی اگرچہ

لوگوں نے صرف حضرت ابوبکرؓ کے کہنے کی رعایت کی، حضرت عباسؓ لوگوں کے پاس تشریف لائے اور کہنے لگے خدائے وحدہ لا شریک کی قسم سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے موت کا زائقہ چکھا ہے اور آپ اپنی زندگی میں ارشاد فرمایا کرتے تھے۔ (۱)
 اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّ اِنَّهُمْ مَيِّتُونَ ثُمَّ اَنْتُمْ كَمَا كُنْتُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عِنْدَ رَبِّكُمْ تَخْتَصِمُونَ (پ ۳۳ ر ۱۷)
 آیت (۳۱-۳۰)

آپ کو بھی مرنا ہے اور انہیں بھی مرنا ہے پھر قیامت کے روز مقدمات اپنے رب کے سامنے پیش کرو گے۔
 حضرت ابوبکر الصدیق اس وقت قیلہ حث بخوارِ ج میں تھے جب آپ کو سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے حادثہ وفات کی اطلاع ہوئی آپ تشریف لائے۔ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی اور آپ کے اوپر جھک کر بوسہ دیا، اس کے بعد فرمایا میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں یا رسول اللہ! اللہ تعالیٰ آپ کو دوبارہ موت نہیں دے گا، پھر آپ وفات پا چکے ہیں، پھر لوگوں کے پاس تشریف لائے اور ارشاد فرمایا: اے لوگو! جو شخص محمدؐ کی عبادت کرتا تھا تو محمدؐ انتقال فرما چکے ہیں اور جو رب محمدؐ کی عبادت کرتا تھا تو وہ زندہ ہے مرے گا نہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اَفَاِنْ مَاتَ اَوْ قُتِلَ اِنْعَلَبْتُمْ عَلٰى اَعْقَابِكُمْ مِّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقْبَيْهِ فَلَئِنْ نُّصِّرَ اللّٰهُ شَيْئًا (پ ۳ ر ۶) آیت (۱۳۳)
 اور محمدؐ نے رسول ہی تو ہیں آپ سے پہلے اور بھی امت سے رسول گذر چکے ہیں، سو اگر آپ کا انتقال ہو جاوے یا آپ شہید ہی ہو جائیں تو کیا تم اٹھ کر پھر جاؤ گے اور جو شخص الٹا پھر بھی جاوے گا تو خدا تعالیٰ کا کوئی نقصان نہ کرے گا۔

اس وقت لوگوں کا حال ایسا ہوا گویا انہوں نے یہ آیت اسی دن سنی ہے (بخاری و مسلم، عائشہ) ایک روایت میں یہ کہ جب حضرت ابوبکرؓ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی اطلاع ہوئی تو آپ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے حجرہ مبارکہ میں درود پڑھتے ہوئے تشریف لائے، اس حال میں کہ آپ کی آنکھوں سے اشک بہہ رہے تھے اور شدت لرزش سے دانت بچ رہے تھے اس کے باوجود آپ قول و فعل میں مضبوط تھے، چنانچہ آپ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے جسد مبارک پر جھکے، آپ کے چہرہ مبارک پر سے کپڑا ہٹایا۔ آپ کی پیشانی اور رخساروں کو بوسہ دیا، آپ کے حجرہ مبارک پر ہاتھ پھیرتے جاتے تھے اور روتے ہوئے کہتے جاتے تھے کہ میرے ماں باپ، میری جان اور گھر ہر سب کچھ آپ پر فدا ہو، آپ زندہ بھی اچھے تھے اور انتقال فرما کر بھی اچھے ہیں، آپ کی وفات سے وہ بات ختم ہو گئی جو دوسرے انبیاء کی وفات سے ختم نہیں ہوئی تھی، یعنی نبوت، آپ کا مرتبہ ناقابل بیان ہے، رونے سے برتر ہے، آپ مخصوص ہوئے تو ایسے کہ سب کے لئے ذریعہ تسلی بن گئے اور عام ہوئے تو ایسے کہ ہم سب آپ کے باب میں سزا بردار ہو گئے، اگر آپ کی وفات آپ کے اختیار سے ہوتی تو ہم مارے غم کے اپنے آپ کو ہلاک کر ڈالتے اور اگر آپ نے ہمیں رونے سے منع نہ فرمایا ہوتا تو ہم آپ کے غم میں آنکھوں کا سارا پانی بہا دیتے لیکن جو بات ہم خود سے دور نہیں کر سکتے وہ جدائی اور فراق کا سبب ہے، اے اللہ! تو یہ باتیں ہمارے حضور تک پہنچا دے، اے محمدؐ! آپ اپنے پروردگار کے پاس ہمیں یاد رکھیں اور ہمیں اپنے دل میں جگہ دیں، اگر آپ اپنے پیچھے سکون نہ چھوڑ جاتے تو کون تھا جو آپ کی جدائی کی وحشت سے نجات پاتا، اے اللہ! اپنے نبیؐ تک ہمارا حال پہنچا دے اور آپ کی (یاد اور اتباع کو) ہم میں محفوظ فرما (ابن ابی الدنیا، ابن عمر) حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ جب حضرت ابوبکر الصدیقؓ حجرہ مبارکہ میں تشریف لائے اور آپ نے درود پڑھا، آپ کی ثناء کی تو گھروالوں نے زور سے رونا شروع کیا جس کی آواز باہر تک سنی گئی، جیسے ہی حضرت ابوبکرؓ کچھ فرماتے گھروالوں کے شور میں اضافہ ہو جاتا، ان کا گریہ کسی طرح رکنا ہی نہیں تھا، یہاں تک کہ ایک شخص دروازے پر آیا اور اس نے گھروالوں کو سلام کر کے یہ آیت پڑھی۔

كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ (پ ۵ ر ۱ آیت ۳۵)
ہر نفس کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔

اور کہنے لگا کہ اے گھروالو! اللہ ہر جانے والے کا خلیفہ ہے اور ہر رغبت کے لئے ملنا ہے اور ہر خوف کے لئے نجات ہے، پس اللہ ہی سے امید رکھو، اسی پر اعتماد رکھو، جب لوگوں نے یہ آواز سنی تو عجیب معلوم ہوئی۔ سب گھروالے یہ آواز سن کر چپ ہو گئے، جب رونے کا سلسلہ منقطع ہو گیا تو آواز بھی معدوم ہو گئی، کسی نے باہر جا کر دیکھا کوئی موجود نہ تھا، گھروالے پھر رونے لگے، دوبارہ کسی نے جس کی آواز معروف نہیں تھی ان الفاظ میں خطاب کیا، اے گھروالو! اللہ کا ذکر کرو اور ہر حال میں اس کی حمد و ثناء بیان کرو تاکہ تم غلصہ میں سے ہو جاؤ، اللہ تعالیٰ کے پاس ہر معصیت کے لئے راحت ہے اور ہر مرغوب چیز کا عوض ہے، پس اللہ ہی کی اطاعت کرو، اسی کے احکام پر عمل کرو، حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا یہ دونوں محضر اور الیاس علیہما السلام تھے اور سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے جنازے پر حاضر ہوئے تھے (ابن ابی الدنیا، السنن)۔

تھقاع ابن عمروؓ نے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبہ کی پوری تفصیل بیان کی ہے۔ فرماتے ہیں کہ حضرت ابو بکر الصدیقؓ خطبے کے لئے کھڑے ہوئے اور ایسا خطبہ دیا کہ لوگ بے اختیار ہو کر روتے رہے، ان کے خطبے کا بیشتر حصہ دو دو سلام کے مضامین پر مشتمل تھا، ابتدا میں آپؐ نے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء بیان کی اور کہا میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، وہ یکتا ہے، اس نے اپنا وعدہ سچا کیا، اس نے اپنے بندے کی مدد کی اور تمنا کفار کے لشکروں کو شکست دی اور یہ بھی گواہی دیتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے بندے، اس کے رسول اور خاتم الانبیاء ہیں اور یہ بھی گواہی دیتا ہوں کہ کتاب ایسی ہی ہے جیسی اتری، دین ایسا ہی ہے جیسے شروع ہوا اور حدیث ایسی ہی ہے جیسی بیان فرمائی اور قول ایسا ہی ہے جیسا کہ فرمایا اور اللہ تعالیٰ کھلا ہوا حق ہے، اے اللہ! رحمت نازل کر محمدؐ پر جو تیرے بندے، تیرے رسول، تیرے نبی، تیرے حبیب، تیرے امین، تیرے منتخب اور برگزیدہ ہیں، ایسی رحمت نازل کر کہ تو نے اپنی مخلوق میں سے کسی پر نازل نہ کی ہو، اے اللہ! اپنی رحمتیں، صفو و کرم اور برکتیں سید المرسلین، خاتم النبیین، امام المستقین کے ساتھ مخصوص فرما جو قائد خیر، امام خیر اور رسول رحمت ہیں۔ اے اللہ تو ان کا قرب زیادہ کر، ان کی حجت بڑی کر، ان کا مقام بلند کر اور انہیں ایسے مقام محمود پر مبعوث فرما جس پر اولین و آخرین سب رشک کریں اور آپ کے مقام محمود پر فائز ہونے سے قیامت کے دن ہمیں نفع پہنچا اور دنیا و آخرت میں آپ کے عوض تو ہمارے درمیان رہ اور آپ کو جنت میں درجے اور وسیلے پر پہنچا، اے اللہ محمدؐ اور آل محمدؐ پر اپنی رحمت اور برکت نازل فرما۔ جیسا کہ تو نے حضرت ابراہیم علیہ السلام پر اپنی رحمت و برکت نازل فرمائی۔ بلاشبہ تو لائق تعریف اور بزرگ ہے اے لوگو! جو شخص محمدؐ کی عبادت کرتا تھا سو آپ کا اقبال ہو چکا ہے اور جو اللہ کی عبادت کرتا تھا سو اللہ تعالیٰ زندہ ہے مرا نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے باب میں پہلے ہی تم کو آگاہ کر دیا تھا۔ اس لئے تم آپ کو بے صبری سے مت پکارو، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے جو چیز تمہارے پاس ہے اس کے بجائے وہ چیز پسند فرمائی جو اس کے پاس ہے۔ اپنا ثواب عطا کرنے کے لئے انہیں اپنے پاس بلایا اور تم میں اپنی کتاب اور اپنے نبی کی سنت کو قائم مقام بنایا جو شخص ان دونوں پر کاربند ہو گا وہ عارف ہو گا اور جو شخص ان دونوں میں فرق کرے گا وہ اس آیت شریفہ کا منکر ہو گا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ (پ ۵ ر ۱ آیت ۳۵)
اے ایمان والو! انصاف پر خوب قائم رہنے اور اللہ کے لئے گواہی دینے والے رہو۔

تمہیں شیطان تمہارے نبی کی وفات سے غافل نہ کر دے اور تمہیں تمہارے دین سے گمراہ نہ کر دے، تم شیطان پر خیر کے ساتھ جلدی کرو اس طرح تم اسے عاجز کر دو گے، اسے سہلت نہ دو ورنہ وہ تم سے آٹے گا اور تمہیں فتنے میں ڈال دے گا، حضرت

عبداللہ ابن عباس کہتے ہیں کہ حضرت ابو بکر اپنے خطبے سے فارغ ہوئے تو حضرت عمر سے ارشاد فرمایا اے عمر مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم یہ کہتے ہو کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات نہیں پائی کیا تمہیں یاد نہیں کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فلاں دن یہ ارشاد فرمایا تھا اور فلاں دن یہ بات ارشاد فرمائی تھی اور اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں فرمایا ہے۔

اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ۔ (پ ۲۳ ر ۱۷ آیت ۳۰-۳۱)

آپ کو بھی مرنا ہے اور انہیں بھی مرنا ہے۔

حضرت عمر نے فرمایا بخیر مجھے مصیبت کی وجہ سے ایسا محسوس ہوا گویا میں نے آج سے پہلے یہ آیت نہیں سنی تھی۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ کتاب حق ہے جیسی نازل ہوئی ہے اور حدیث حق ہے جیسی بیان کی گئی ہے اور اللہ زندہ ہے، مرے گا نہیں، ہم اللہ کے لئے ہیں اور اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں، اللہ تعالیٰ کی رحمتیں اس کے رسول پر نازل ہوں اور ہم جدائی کا ثواب اللہ کے پاس پاتے ہیں، یہ کہ حضرت عمر حضرت ابو بکر کے قریب جا کر بیٹھ گئے، حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ جب لوگ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی نعش مبارک کو غسل دینے کے لئے جمع ہوئے تو آپس میں کہنے لگے کہ بخیر ہمیں معلوم نہیں کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو کیسے غسل دیں، آیا آپ کے کپڑے اتار کر غسل دیں جیسے ہم اپنے مردوں کو نسلاتے ہیں یا آپ کے کپڑوں ہی میں غسل دیں، ابھی اسی تردد میں تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر نیند نازل فرمائی، یہاں تک کہ ان میں کوئی شخص ایسا نہیں تھا جو اپنی داڑھی سینے پر ڈالے سویا نہ ہو، پھر کسی کہنے والے نے کہا معلوم نہیں وہ کون تھا کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو انہی کپڑوں میں غسل دوجو آپ پہنے ہوئے ہیں، یہ سن کر سب لوگ بیدار ہو گئے اور انہوں نے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کی قمیص ہی میں غسل دیا، جب غسل سے فارغ ہو گئے تو آپ کو کفن پہنایا گیا، حضرت علی کرم اللہ وجہہ کہتے ہیں کہ ہم نے آپ کی قمیص نکالنے کا ارادہ کیا، اچانک آواز آئی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کپڑے مت اتارو، چنانچہ ہم نے آپ کو قمیص پہنے ہوئے نسلایا، جس طرح اپنے مردوں کو نکال کر نسلاتے ہیں، اگر ہم کسی عضو کو الٹا پلٹا چاہتے تھے تو کسی دشواری کے بغیر اس کا رخ تبدیل ہو جاتا تھا، یہاں تک کہ ہم اس عضو کو غسل دے کر فارغ ہو جاتے تھے۔ غسل کے دوران ہم پورے گھر میں ہوا کی سی سنناٹ محسوس کرتے تھے اور ہمیں یہ آواز سنائی دیتی تھی کہ رسول اللہ کے ساتھ نرمی کرو۔ اس لئے کہ تمہیں کچھ کرنا نہیں پڑے گا یہ تھے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے کچھ واقعات۔ آپ کے بعد نہ بالوں سے بنا ہوا کوئی کپڑا باقی رہا اور نہ اون کا سب آپ ہی کے ساتھ دفن ہو گئے۔

ابو جعفر کہتے ہیں کہ قبر شریف میں لحد کے اندر آپ کا بستر اور چادر بچھائی گئی اور اس کے اوپر ان کپڑوں کا فرش کیا گیا جو آپ پہنا کرتے تھے۔ پھر آپ کفن میں لپیٹ کر اس میں لٹائے گئے، گویا آپ نے اپنی وفات کے بعد کوئی مال نہیں چھوڑا اور نہ اپنی زندگی میں اینٹ پر اینٹ اور بانس پر بانس رکھا، آپ کی وفات میں مسلمانوں کے لئے مکمل عبرت اور اسوۂ حسنہ ہے۔

حضرت ابو بکر الصدیقؓ کی وفات : جب حضرت ابو بکرؓ کی وفات کا وقت قریب آیا تو حضرت عائشہؓ آئیں اور آپ نے یہ شعر پڑھا۔

لَعَمْرُكَ مَا يُعْنِي الشَّرَاءُ عَنِ الْفَتَى - اِنَّا حَشِرُ جَتِ يَوْمًا وَضَاقَ بِهَا الصَّدْرُ
(خدا کی قسم، دولت آدمی کے کام نہیں آتی، جب سانس بولتا ہے اور سینہ تنگ ہو جاتا ہے)

یہ سن کر آپ نے اپنا چہرہ کھول دیا اور فرمایا ایسا مت کہو بلکہ یوں کہو۔

وَجَاءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ ذَلِكُمْ مَا كُنْتُمْ تَحْجِدُونَ (پ ۲۶ ر ۱۵ آیت ۸)
اور موت کی سختی آپ کی حق کے ساتھ یہ وہ چیز ہے جس سے تو بد کہتا تھا۔

میرے یہ دونوں کپڑے دیکھو، مجھے ان دونوں میں غسل دینا اور انہی دونوں کپڑوں میں کفنانا اس لئے کہ نئے کپڑے کی ضرورت مردوں کی بہ نسبت زندوں کو زیادہ ہے، حضرت عائشہؓ نے ان کی وفات کے وقت یہ شعر پڑھا۔

وَأَبْيَضُ يَسْتَسْقِي الْغَمَامُ بِوَجْهِهِ رَبِيعُ الْيَتَامَى عَصْمَةُ لِلْأَرَامِلِ
(روشن چہرہ جس سے ہادل پانی لیتا تھا جو یتیموں کی بہار اور یتیموں کی حفاظت تھا)
حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا کہ اس شعر کے مصداق سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، اس وقت لوگ حضرت ابو بکرؓ کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ ہم آپ کے لئے طیب کو بلائیں جو آپ کو دیکھ لے فرمایا مجھے میرے طیب نے دیکھ لیا ہے وہ کہتا ہے۔

فَعَالٌ لِّمَآئِرٍ نُّكْ (پ ۳۰، ر ۱۰، آیت ۴۱)

وہ جو چاہتا ہے سب کچھ کر گذرتا ہے۔

حضرت سلمان الفارسیؓ آپ کی عبادت کے لئے گئے اور کہنے لگے اے ابو بکر! ہمیں کچھ وصیت کیجئے، فرمایا اللہ تعالیٰ تم پر دنیا فتح کرنے والے ہیں، تم اس میں سے صرف اس قدر لینا جس سے گذر بسر ہو جائے، دیکھو جو شخص صبح کی نماز ادا کرتا ہے وہ اللہ کے ذمے میں ہو جاتا ہے، تم حمد غنّی کر کے اس کی تحقیر مت کرو ورنہ تم منہ کے بلِ دونخ میں جا پڑو گے اور جب حضرت ابو بکرؓ کو یاد دہنار ہو گئے اور لوگوں نے ان سے درخواست کی وہ خلیفہ مقرر کر دیں تو انہوں نے حضرت عمر ابن الخطابؓ کو خلیفہ مقرر کروایا، لوگوں نے کہا آپ نے ایک سخت دل اور درشت مزاج آدمی کو اپنا خلیفہ مقرر کیا ہے، آپ اس سلسلے میں اپنے رب کو کیا جواب دیں گے؟ فرمایا میں یہ کہوں گا کہ میں نے تیری مخلوق پر تیری مخلوق میں سے بہتر شخص کو خلیفہ مقرر کیا ہے، پھر آپ نے حضرت عمرؓ کو بلایا، وہ آئے، آپ نے ان سے فرمایا میں تمہیں ایک وصیت کرتا ہوں یاد رکھو کہ اللہ کا ایک حق دن میں ہے، اگر کوئی رات میں وہ حق ادا کرے تو اللہ اسے قبول نہیں کرتا اور ایک حق رات میں ہے اگر کوئی رات میں ادا کرے تو وہ قبول نہیں ہوتا، نوافل اس وقت تک قبول نہیں ہوتے جب تک فرائض ادا نہ کئے جائیں، قیامت کے روز جن لوگوں کے پلائے بھاری ہوں گے وہ ان کے ہوں گے جنہوں نے دنیا میں حق کا اتباع کیا ہوگا اور اسے بھاری سمجھا ہوگا اور اس ترانہ کا حق جس میں صرف حق ہو یہ ہے کہ اس کا وزن زیادہ ہو اور قیامت کے دن جن لوگوں کے پلائے ہلکے ہوں گے وہ ان کے ہوں گے جنہوں نے باطل کا اتباع کیا ہوگا اور اسے ہلکا سمجھا ہوگا اور اس ترانہ کا حق جس میں باطل کے علاوہ کچھ نہ رکھا جائے یہ ہے کہ وہ ہلکی ہو، اللہ تعالیٰ نے اہل جنت کا ذکر ان کے اچھے اعمال کے ساتھ کیا ہے اور ان کے برے اعمال سے درگزر فرمایا ہے، کہنے والا کہتا ہے کہ میں ان سے کم ہوں اور ان کے درجے تک میری رسائی نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ نے اہل دونخ کا ذکر برے اعمال کے ساتھ کیا ہے اور جو نیک اعمال انہوں نے کئے ہیں وہ انہی پر رد کر دیئے ہیں، کہنے والا پوچھتا ہے کہ میں ان سے افضل ہوں اور اللہ تعالیٰ نے آیاتِ رحمت اور آیاتِ عذاب بیان فرمائی ہیں تاکہ مومن کو رغبت بھی ہو اور ڈر بھی ہو اور اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالے اور اللہ سے حق کے سوا کسی چیز کی تمنا نہ کرے، اگر تم نے میری یہ وصیت یاد رکھی تو موت سے زیادہ کوئی غائب تمہیں محبوب نہ ہوگا اور موت سے تمہیں کوئی مضر نہیں ہے، اگرچہ تم میری وصیت پر عمل نہ کرو لیکن اس صورت میں موت سے زیادہ کوئی غائب تمہارے نزدیک مبنغض نہیں ہوگا حالانکہ موت اگر رہے گی تم اسے عاجز نہیں کر سکتے۔

حضرت سعید ابن المسیبؓ کہتے ہیں کہ جب حضرت ابو بکرؓ کی وفات کا وقت قریب آیا تو کچھ صحابہ آپ کے پاس آئے اور کہنے لگے اے خلیفہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں کچھ توشہ عطا فرمائیں، ہم دیکھ رہے ہیں جو آپ کا حال ہے۔ حضرت ابو بکرؓ نے ارشاد فرمایا جو شخص یہ کلمات کہہ کر مرجائے گا اللہ تعالیٰ اس کی مدح کو افقِ بین میں جگہ دے گا۔ لوگوں نے عرض کیا افقِ بین کیا چیز ہے؟ فرمایا عرش کے سامنے ایک میدان کا نام افقِ بین ہے۔ اس میں اللہ کے باغ، نہریں اور درخت ہیں۔ اسے ہر روز سو مرتبہ

اللہ کی رحمت و احسان لیتی ہے جو شخص یہ کلمات سو مرتبہ کہے گا اللہ تعالیٰ اس کی مدوح کو اس میدان میں رکھے گا وہ کلمات یہ ہیں۔ اے اللہ! تو نے مخلوق کو پیدا کیا ہے حالانکہ تجھے ان کی حاجت نہیں تھی پھر انہیں دو گروہوں میں تقسیم کر دیا، ایک گروہ جنت کے لئے اور دوسرا گروہ دوزخ کے لئے، اے اللہ! تو مجھے جنت والے گروہ میں کر اور دوزخ والے گروہ میں نہ کر، اے اللہ! تو نے مخلوق کو مختلف گروہوں میں پیدا کیا ہے اور انہیں پیدائش سے پہلے ہی الگ کر دیا ہے، ان میں سے تو نے بعض کو بد بخت بنایا اور بعض کو نیک بخت، بعض کو گمراہ بنایا اور بعض کو راہ یاب، بس تو مجھے اپنی نافرمانیوں سے بد بخت نہ بنا، اے اللہ! تو ہر نفس کو پیدا کرنے سے پہلے جانتا ہے کہ یہ کیا کرے گا، جو تو جانتا ہے اس سے کسی کو مفر نہیں ہو سکتا، مجھے ان لوگوں میں کر جنہیں تو اپنی طاعت میں استعمال کرے، اے اللہ! جب تو نہ چاہے کوئی نہیں چاہتا، اس لئے تو اپنی مشیت اس میں کر، میں وہ باتیں چاہوں جو مجھے تجھ سے قریب کر دیں، اے اللہ! تو نے بندوں کی حرکات مقرر کر دی ہیں، اب کوئی چیز تیری اجازت کے بغیر حرکت نہیں کر سکتی، میری حرکات کو اپنے تقویٰ میں مخصوص کر، اے اللہ! تو نے خیر اور شر دونوں پیدا کئے ہیں اور ان میں سے ہر ایک کے لئے عامل پیدا کئے ہیں جو ان پر عمل کرتے ہیں، تو مجھے ان دونوں میں سے بہتر کے ساتھ کر، اے اللہ! تو نے جنت اور دوزخ دونوں پیدا کی ہیں اور دونوں کے اہل پیدا کئے ہیں، تو مجھے جنت کے رہنے والوں میں شامل کر، اے اللہ! تو نے ایک قوم کو گمراہ کرنے کا ارادہ کیا ہے اور گمراہی کے ساتھ ان کے سینے تلک کر دیئے ہیں، تو میرے سینے کو ایمان کے لئے کھول دے اور اسے میرے قلب کی زینت بنا دے، اے اللہ! تو نے امور کی تدبیر کی اور ان کا مرجع اپنی ذات کو بنایا، تو مجھے مرنے کے بعد پاک زندگی دے اور مجھے اپنی قربت سے نواز، اے اللہ! جو شخص تیرے غیر پر امید اور اعتماد کے معج و شام کرے مجھے اس سے غرض نہیں، میرا اعتماد تو ہے، میری امید تو ہے، تجھ ہی سے طاقت اور قوت ہے، حضرت ابو بکر نے فرمایا یہ تمام باتیں کتاب اللہ میں ہیں۔

حضرت عمر ابن الخطابؓ کی وفات : عمرو ابن میمون کہتے ہیں کہ میں بھی اسی دن صبح جماعت میں شریک تھا جس دن حضرت عمرؓ زخمی ہوئے، میرے اور ان کے درمیان صرف عبد اللہ ابن عباسؓ تھے، جب حضرت عمرؓ دونوں منوں کے درمیان سے نذرے تو کچھ دیر کے لئے ٹھہر جاتے، اگر کوئی غلط دیکھتے تو ارشاد فرماتے سیدھے ہو جاؤ اور اگر کوئی غلط نہ پاتے تو آگے بڑھ جاتے، اور نماز شروع فرماتے، اکثر اوقات پہلی رکعت میں سورہ یوسف اور سورہ نحل وغیرہ پڑھتے، یہاں تک کہ لوگ نماز کے لئے جمع ہو جاتے، ابھی انہوں نے تکبیر تحریمہ ہی کہی تھی کہ میں نے انہیں یہ کہتے ہوئے سنا کہ مجھے کسی گٹھے نے قتل کر دیا ہے، یا کات کھایا ہے، یہ اس وقت کہ جب ابو لؤلؤہ نے آپ کو دو دھاری تلوار سے زخمی کیا، وہ بد بخت دونوں منوں کے درمیان میں سے تلوار لے کر بھاگا اور منوں میں دونوں سمت کھڑے ہوئے لوگوں کو زخمی کیا، اس واقعے میں تیرہ آدمی زخمی ہوئے، ان میں سے نو اور ایک روایت کے مطابق سات آدمی جاں بحق ہو گئے، جب ایک مسلمان نے اسے بھاگتے ہوئے دیکھا تو اپنی چادر اس کے اوپر ڈال دی، اس بد بخت نے یہ محسوس کرنے کے بعد کہ اب میں پکڑا جا چکا ہوں خود کشی کر لی، اور حضرت عمر ابن الخطابؓ نے حضرت عبدالرحمن ابن عوفؓ کا ہاتھ پکڑ کر آگے کر دیا تاکہ وہ نماز پڑھا دیں، جو لوگ حضرت عمرؓ کے قریب تھے انہوں نے اس تمام واقعہ کا مشاہدہ کیا لیکن جو لوگ مسجد کے مختلف گوشوں میں تھے یا پیچھے تھے انہیں پتا ہی نہیں چلا کہ کیا واقعہ ہوا ہے، بس اچانک انہیں یہ معلوم ہوا کہ حضرت عمرؓ کی آواز آتی بند ہو گئی ہے، چنانچہ انہوں نے زور زور سے سبحان اللہ سبحان اللہ کہنا شروع کیا، عبدالرحمن ابن عوفؓ نے مختصر نماز پڑھی، جب سب لوگ نماز سے فارغ ہو گئے تو حضرت عمر ابن الخطابؓ نے حضرت عبد اللہ ابن عباسؓ سے فرمایا جا کر دیکھو، مجھے کس نے مارا ہے۔ راوی کہتے ہیں کہ ابن عباسؓ کچھ دیر کے لئے غائب ہوئے اور واپس آکر بتلایا کہ مغیرہ ابن شعبہؓ کے غلام نے یہ حرکت کی ہے، حضرت عمرؓ نے ارشاد فرمایا اللہ اسے ہلاک کرے، میں نے تو اس کے لئے سلوک کا حکم دیا تھا، پھر فرمایا اللہ کا شکر ہے کہ اس نے میری موت کسی مسلمان کے ہاتھ سے نہیں لکھی، تو اور تیرا باپ ہی چاہتے ہیں کہ مدینہ میں کافروں کی کثرت ہو جائے، حضرت عباسؓ کے پاس بہت سے کافر غلام تھے، حضرت عبد اللہ ابن عباسؓ نے عرض کیا اگر حکم ہو تو ان غلاموں کو قتل

کر دیا جائے، فرمایا! اب قتل کرتے ہو جب وہ تمہارا کلمہ پڑھنے لگے، تمہارے قتل کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے لگے اور تمہاری طرح حج کرنے لگے، اس کے بعد انہیں گھرا لیا گیا، ہم بھی ساتھ تھے، لوگوں کا حال یہ تھا کہ گویا ان پر اس سے بڑی مصیبت کبھی نازل نہیں ہوئی تھی، بعض لوگ یہ کہہ رہے تھے کہ اس زخم سے جاگیر نہ ہو سکیں گے، بعض لوگوں کی رائے یہ تھی کہ کوئی نقصان نہیں ہوگا، کھجور کا شربت لایا گیا، آپ نے پیا لیکن زخم کے راستے سے باہر نکل گیا، پھر دودھ پلایا گیا وہ بھی باہر نکل گیا، اس وقت لوگوں کو یہ یقین ہو گیا کہ اب بچ نہیں سکیں گے۔

راوی کہتے ہیں کہ ہم حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے، لوگ آپ کی تعریف میں رطب اللسان تھے، ایک نوجوان نے کہا اے امیر المومنین آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے خوشخبری ہو، آپ کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مصاحبت کا شرف حاصل ہے، آپ ان لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے سب سے پہلے اسلام قبول کیا، پھر آپ منصب خلافت پر فائز ہوئے اور آپ نے عدل و انصاف سے کام لیا، اب یہ شہادت آپ کو عطا کی گئی ہے، حضرت عمرؓ نے فرمایا میری خواہش ہے کہ یہ تمام امور میرے لئے کافی ہو جائیں، نہ ان سے مجھے نفع پہنچے اور نہ ضرر ہو، جب وہ نوجوان یہ باتیں کر کے واپس چلا گیا تو اس کا تہبند ٹخنوں سے نیچے لٹک کر زمین کو چھو رہا تھا، آپ نے لوگوں سے فرمایا اس نوجوان کو واپس لے کر میرے پاس آؤ، وہ نوجوان آیا آپ نے اس سے فرمایا بھتیجے! اپنا تہبند اوپر اٹھاؤ! اس طرح یہ کپڑا بھی دیر تک چلے گا اور یہ فضل تقویٰ سے بھی بہت قریب ہے، اس کے بعد اپنے صاحبزادے سے فرمایا اے عبداللہ! مجھ پر کتنا قرض ہے، چنانچہ حساب لگایا گیا، معلوم ہوا کہ کم و بیش چھیالیس ہزار ہے، آپ نے فرمایا اگر عمر کے گھرانے کے مال سے یہ قرض ادا ہو سکے تو اس کے مال سے ادا کرنا ورنہ بنو عدی ابن کعب سے مانگنا، اگر ان کا مال بھی کافی نہ ہو تو قریش سے درخواست کرنا، پس ان سے آگے مت بڑھنا اور میرا یہ قرض ادا کرنا اور اب ام المومنین حضرت عائشہؓ کی خدمت میں جاؤ اور ان سے کہو کہ عمر آپ کو سلام کہتا ہے، امیر المومنین مت کہنا، اس لئے کہ آج میں مسلمانوں کا امیر نہیں ہوں اور کہنا کہ عمر ابن الخطاب اپنے دونوں ساتھیوں کے ساتھ دفن ہونے کی اجازت چاہتا ہے، حضرت عبداللہ ابن عمرؓ گئے، سلام کیا اور اجازت مانگی، پھر اندر داخل ہوئے دیکھا کہ وہ بیٹھی ہوئی رو رہی ہیں، آپ نے عرض کیا عمر ابن الخطاب آپ کو سلام کہتے ہیں اور اپنے دونوں ساتھیوں کے ساتھ دفن کی اجازت چاہتے ہیں، حضرت عائشہؓ نے فرمایا یہاں میں خود اپنی تدفین چاہتی تھی لیکن میں آج عمر کو اپنے آپ پر ترجیح دیتی ہوں، جب آپ واپس پہنچے تو لوگوں نے کہا عبداللہ ابن عمر آگئے ہیں، حضرت عمرؓ نے فرمایا مجھے اٹھاؤ، چنانچہ ایک شخص نے سارا دیکر بٹھایا، آپ نے پوچھا کیا خبر ہے؟ عبداللہ نے عرض کیا آپ کو جو بات محبوب ہے وہ پوری ہوئی۔ ام المومنین نے آپ کو اجازت دیدی ہے، فرمایا الحمد للہ! میرے لئے اس سے زیادہ اہم بات کوئی دوسری نہ تھی، جب میں مر جاؤں تو میرا جنازہ لے کر جانا، پھر سلام کرنا اور کہنا عمر اجازت مانگتا ہے، اگر اجازت مل جائے تو مجھے اندر لے جانا اور اگر انکار کر دیں تو مسلمانوں کے قبرستان میں لے جانا۔

راوی کہتے ہیں کہ اسی دوران ام المومنین حضرت حفصہؓ تشریف لائیں، عورتیں انہیں ڈھاری ہوئی تھیں، جب ہم نے دیکھا تو اٹھ کھڑے ہوئے، وہ اندر تشریف لے گئیں اور کچھ دیر ان کے پاس روٹی رہیں، پھر لوگوں نے اجازت مانگی، حضرت حفصہؓ گھر کے اندر چلی گئیں، ہم نے اندر سے ان کے رونے کی آواز سنی، لوگوں نے عرض کیا امیر المومنین! آپ کچھ وصیت فرمائیے اور اپنا جانشین مقرر کر دیجئے، فرمایا! میرے خیال میں اس ذمہ داری کے لئے ان لوگوں سے زیادہ کوئی شخص اہل نہیں ہے جن سے سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ہم سے پردہ فرمانے تک راضی رہے، آپ نے حضرت علیؓ، عثمانؓ، زبیرؓ، طلحہؓ، سعدؓ اور عبدالرحمنؓ کے نام بھی لئے اور فرمایا کہ عبداللہ ابن عمرؓ تمہارے پاس آئے گا لیکن اس معاملے سے اسے کوئی واسطہ نہیں ہے، یہ بات آپ نے کچھ اس انداز سے فرمائی کہ عبداللہ ابن عمرؓ کی دلجوئی ہو جائے اگر امارت سعدؓ کی طرف منتقل ہو جائے تو نبھا ورنہ جو بھی امیر بنے اسی سے مدد چاہے، میں نے اسے خیانت اور عجز کی بنا پر معزول نہیں کیا ہے اور فرمایا کہ میں اپنے بعد آنے والے خلیفہ کو اولین مہاجرین

کے لئے وصیت کرتا ہوں کہ ان کا مرتبہ پہچانا جائے، ان کے ناموس کی حفاظت کی جائے، میں انصار کے ساتھ بھی خیر کی وصیت کرتا ہوں، یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے یہاں اور ایمان میں سب سے پہلے جگہ بنائی ہے، ان کے نیکو کار کی نیکی قبول کی جائے اور خطا کار کی خطا سے درگزر کیا جائے اور میں دوسرے شہروں کے باشندوں کے لئے بھی خیر کی وصیت کرتا ہوں کیونکہ وہ لوگ اسلام کے معاون، بیت المال کے لئے سرمایہ اکٹھا کرنے والے اور دشمنوں کے لئے باعث غیظ ہیں، ان سے اس مال کے علاوہ کچھ نہ لیا جائے جو ان سے زائد ہو اور وہ بھی ان کی رضامندی سے، میں اعراب سے بھی خیر کی وصیت کرتا ہوں، اس لئے کہ یہی اصل عرب ہیں اور یہی لوگ اسلام کی اصل ہیں، ان کے زائد اموال میں سے لے کر انہی کے فقراء میں تقسیم کروا جائے اور میں اللہ اور اس کے رسول کے حمد کا حوالہ دیتے ہوئے یہ وصیت کرتا ہوں کہ وہ مسلمانوں کا عہد پورا کرے اور ان کی حفاظت کے لئے دشمنوں سے جنگ کرے اور اپنی استطاعت سے زیادہ کسی امر کا تلف نہ کرے۔

راوی کہتے ہیں کہ جب آپ وفات پا گئے تو ہم آپ کا جنازہ لے کر چلے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مزار مبارک پر پہنچ کر عبد اللہ ابن عمرؓ نے سلام کیا اور عرض کیا کہ عمر ابن الخطابؓ اجازت چاہتے ہیں، حضرت عائشہؓ نے فرمایا انہیں اندر لے آؤ، چنانچہ لوگ انہیں اندر لے گئے اور صاحبین کے برابر میں جو جگہ خالی تھی وہاں دفن کر دیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جبرئیل علیہ السلام نے مجھ سے کہا کہ عمر کی موت پر اسلام روئے گا (ابوبکرؓ لا جبری فی کتاب الشرط، ابی ابن کعب) حضرت عبد اللہ ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کی میت کو چاہنا پانی پر رکھ دیا گیا، لوگوں نے انہیں چاروں طرف سے گھیر لیا اور آپ کے لئے مغفرت و رحمت کی دعائیں کرنے لگے، میں بھی ان لوگوں میں تھا، اچانک ایک شخص نے میرے کندھے سے نذر سے پکڑ کر مجھے ڈرایا، میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہ حضرت علی ابن ابی طالبؓ تھے، انہوں نے حضرت عمرؓ کی وفات پر اظہار افسوس کیا اور فرمایا آپ نے کوئی ایسا شخص اپنے بعد نہیں چھوڑا جس کے عمل پر میں اللہ سے ملنا پسند کروں، جیسے میں آپ کے عمل پر مرنا پسند کرتا ہوں، بخدا میں یہ سوچا کرتا تھا کہ اللہ آپ کو آپ کے دونوں رفیقوں کے ساتھ کر دے گا کیونکہ میں نے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے بارہا سنا ہے کہ میں، ابوبکر اور عمرؓ گئے، میں، ابوبکر اور عمرؓ نکلے، میں، ابوبکر اور عمرؓ داخل ہوئے، میں یہ امید کرتا تھا اور یہ سوچا کرتا تھا کہ اللہ تعالیٰ (مرنے کے بعد بھی) آپ کو ان دونوں کے ساتھ رکھے گا۔ (بخاری و مسلم)

حضرت عثمان ذوالنورینؓ کی وفات : آپ کے قتل کی روایت مشہور ہے۔ عبد اللہ ابن سلام کہتے ہیں کہ جب عثمانؓ اپنے گھر میں محصور ہو گئے تو میں ان کو سلام کرنے کے لئے پہنچا، انہوں نے مجھ کو دیکھ کر کہا خوش آمدید، اے بھائی! آج رات میں نے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس (غزوہ) میں دیکھا، آپ فرما رہے تھے اے عثمان! لوگوں نے تجھے محصور کر دیا ہے، میں نے عرض کیا جی ہاں! فرمایا کیا تجھے پانی سے محروم کر دیا ہے، میں نے عرض کیا جی ہاں! یہ سن کر آپ نے پانی کا ایک ڈول نیچے لٹکایا، میں نے سیراب ہو کر پانی پیا، میں اب بھی اپنے سینے میں اس پانی کی ٹھنڈک محسوس کرتا ہوں، پھر فرمایا اگر تو چاہے تو تجھے ان پر غلبہ دیا جائے ورنہ تو ہمارے پاس اظہار کرتا، میں نے آپ کے پاس اظہار کرنا پسند کیا ہے، چنانچہ آپ کو اسی دن شہید کر دیا گیا، حضرت عبد اللہ ابن سلام نے ان لوگوں سے پوچھا جنہوں نے حضرت عثمانؓ کو زخمی حالت میں ترختے دیکھا تھا کہ جب آپ زخمی ہو کر خون میں تر رہے تھے تو آپ نے کیا فرمایا تھا، لوگوں نے کہا ہم نے ان کی زبان سے تین بار یہ کلمات سنے، اے اللہ! امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کو شفق رکھے، عبد اللہ ابن سلام کہتے ہیں بخدا اگر وہ یہ فرما دیتے کہ امت محمدیہ کو کبھی شفق نہ کرنا تو قیامت تک کبھی ان میں اتفاق و اتحاد نہ ہوتا۔

ثمامہ ابن حزن انشیری کہتے ہیں کہ اس وقت میں بھی وہاں موجود تھا جب حضرت عثمانؓ نے اپنے مکان سے نیچے جھانکا تھا اور لوگوں سے فرمایا تھا کہ میرے پاس ان دو آدمیوں کو لاؤ جنہوں نے ہمیں یہاں جمع کیا ہے۔ چنانچہ وہ آئے ایسے لگ رہے تھے جیسے دو اونٹ یا دو گدھے چلے آ رہے ہوں، حضرت عثمانؓ نے لوگوں سے کہا کہ میں ہمیں اللہ کی قسم دیکر پوچھتا ہوں، تم جانتے ہو کہ جب

سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم منورہ تشریف لائے تو یہاں پیر رومہ کے علاوہ کہیں بیٹھاپانی نہیں تھا، آپ نے فرمایا تھا کون ہے جو رومہ کانتواں خریدے اور اپنے ڈول کو مسلمانوں کے ڈولوں کے ساتھ جمع کرے اور جنت میں اپنے لئے اس سے بہتر پائے، میں نے خاص اپنے مال سے یہ کتاواں خریدی اور آج تم مجھے اس کلاپیانی اور نمر کا پانی پینے سے روکتے ہو، لوگوں نے کہا واقعی آپ سچ کہتے ہیں، حضرت عثمان نے فرمایا کہ میں تم کو اللہ کی قسم اور اسلام کا واسطہ دیکر پوچھتا ہوں کہ کیا میں نے مفلس لشکر اسلام کو اپنے مال سے اسلحہ خرید کر نہیں دیا تھا، لوگوں نے عرض کیا یہ سچ ہے پھر فرمایا میں تمہیں اللہ کی قسم دیکر پوچھتا ہوں تم جانتے ہو کہ مسجد مسلمانوں کے لئے تنگ پڑ گئی تھی اور سرکارِ رومہ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اعلان فرمایا تھا کہ کون شخص فلاں خاندان کی زمین خرید کر مسجد میں اضافہ کرے گا اور جنت میں اس سے بہتر پائے گا، کیا میں نے وہ زمین اپنے مال سے نہیں خریدی تھی اور آج تم مجھے اس مسجد میں دو رکعت نماز پڑھنے سے روکتے ہو، لوگوں نے عرض کیا آپ سچ کہتے ہیں، پھر فرمایا میں تمہیں اللہ کی قسم اور اسلام کا واسطہ دیکر پوچھتا ہوں کیا تم جانتے ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ کے شیر پھاڑ پر رونق افروز تھے، آپ کے ہمراہ اس وقت میں اور ابو بکر اور عمر بھی تھے، اچانک پہاڑ نے حرکت کی، کچھ پتھر لڑھک کر نیچے گرے، آپ نے پہاڑ کو ایک ٹھوکری اور ارشاد فرمایا اے شیر ٹھمر جا کیا تو نہیں جانتا کہ اس وقت تیرے اوپر ایک نبی، ایک صدیق اور دو شہید ہیں۔ لوگوں نے کہا یہ سچ ہے، فرمایا اللہ اکبر، رب کعبہ کی قسم ان لوگوں نے میری گواہی دی۔ بلاشبہ میں شہید ہوں۔

عرب کے ایک شیخ روایت کرتے ہیں کہ جب حضرت عثمان کو زخمی کیا گیا اور خون آپ کی داڑھی پر بہنے لگا تو آپ کی زبان پر یہ الفاظ تھے ”لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ سُبْحَانَكَ إِنِّي كُنْتُ مِنَ الظَّالِمِينَ“ اے اللہ میں ان لوگوں سے تیرے ہی ذریعے انتقام چاہتا ہوں اور اپنے تمام معاملات میں تجھ سے مدد مانگتا ہوں اور جس امر میں تو نے مجھے جلا کیا ہے میں اس پر تجھ ہی سے مبرا کا خواہاں ہوں۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی شہادت : اصح منخلی کہتے ہیں کہ جس رات کی صبح کو حضرت علی کرم اللہ وجہہ زخمی ہوئے آپ طلوع فجر کے وقت آرام کر رہے تھے امین التیاح آپ کو نماز کی اطلاع دینے کے لئے آیا، آپ کی بیعت کچھ ہماری تھی، اس لئے آرام کرتے رہے، دوبارہ وہ شخص پھر آیا، آپ نے اس مرتبہ بھی تاخیر کی اور لیٹے رہے، تیسری مرتبہ آیا تو آپ اٹھ کر چل دیئے، اس وقت یہ اشعار آپ کی زبان پر تھے۔

أَشْدُّ حَبَارِئِمَكَ لِلْمَوْتِ فَإِنَّ الْمَوْتَ لَا قَبِيكَ
وَلَا تَجْزَعُ مِنْ الْمَوْتِ إِنْ خَلَّ بِوَلَدِيكَ

موت کی تیاری کر، اس لئے کہ موت تجھ سے ملاقات کرنے والی ہے، جب وہ تیرے آگن میں قدم رکھے تو اس سے گھبرانا جب آپ چھوٹے دروازے پر پہنچے تو ابنِ مسلم نے آپ پر حملہ کیا اور آپ کو شہید کر دیا، آپ کی صاحبزادی حضرت اُمّ کلثوم باہر نکلیں اور کہنے لگیں کہ صبح کی نماز کو کیا ہو گیا ہے کہ میرے شوہر کو بھی اسی میں قتل کیا گیا اور میرے والد بھی اسی میں شہید ہوئے، قریش کے ایک شیخ کی روایت ہے، فرماتے ہیں کہ جب ابنِ مسلم نے حضرت علیؑ پر حملہ کیا تو انہوں نے بے ساختہ نرمایا رب کعبہ کی قسم میں کامیاب ہو گیا، حضرت محمد ابنِ علیؑ فرماتے ہیں کہ جب حضرت علیؑ کو زخمی کیا گیا تو انہوں نے اپنے بیٹوں کو وصیت کی اور مرتے دم تک سوائے لا الہ الا اللہ کے کچھ نہیں کہا۔

جب حضرت امام حسنؑ کو ہر طرف سے گھیر لیا گیا اور زندگی کی کوئی امید باقی نہیں رہی تو ان کے بھائی حضرت امام حسینؑ نے کہا اے بھائی تم کیوں گھبرا رہے ہو، تم رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور علی ابنِ ابی طالب کی طرف بڑھو، یہ دونوں تمہارے باپ ہیں اور خدیجہ بنت خویلد اور فاطمہ بنت محمدؑ کی طرف بڑھو، یہ دونوں تمہاری مائیں ہیں، حمزہ اور جعفرؑ کی طرف بڑھو یہ دونوں تمہارے چچا ہیں، حضرت حسنؑ نے جواب دیا بھائی! میں اس لئے گھبراتا ہوں کہ ایک ایسے امر سے سابقہ ہے کہ اس سے پہلے کبھی اس سے سابقہ

نہیں بڑا، محمد ابن الحسن بیان کرتے ہیں کہ جب لوگوں نے حضرت حسینؑ کو گھیر لیا اور یہ یقین ہو گیا کہ وہ لوگ قتل کئے بغیر نہیں رہیں گے تو انہوں نے اپنے ساتھیوں سے خطاب کرتے ہوئے حمد و ثناء کے بعد ارشاد فرمایا جو حالات ہیں وہ تمہارے سامنے ہیں، دنیا بدل چکی ہے اور اس میں تغیر واقع ہو چکا ہے، اب نیکی کا دور ختم ہو چکا ہے، دنیا صرف اتنی باقی رہ گئی ہے جتنی تری برتن میں پانی گرانے کے بعد باقی رہ جاتی ہے، ایسی زندگی سے موت بہتر ہے کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اب حق پر عمل نہیں کیا جاسکتا اور باطل سے باز نہیں رہا جاتا، یہ اس لئے ہوا کہ مومن صادق اللہ سے ملاقات کی خواہش کرے، میں موت کو سعادت سمجھتا ہوں اور ظالموں کے ساتھ زندگی کو جرم تصور کرتا ہوں۔

موت کے وقت خلفائے اسلام، امراء کرام اور صحابہ عظام کے اقوال : جب حضرت معاویہ ابن ابی سفیان کی وفات کا وقت قریب آیا تو آپ نے فرمایا مجھے اٹھا کر معاویہؓ لوگوں نے بٹھادیا، آپ اللہ کا ذکر کرتے رہے اور شہید بیان کرتے رہے، پھر رونے لگے اور ارشاد فرمایا اے معاویہؓ بڑھاپے میں اللہ کی یاد آئی اور دور انحطاط میں ذکر خدا زبان پر آیا، اس وقت خیال کیوں نہیں آیا جب جوانی کا درخت سرسبز و شاداب تھا، یہ کہہ کر اس قدر روئے کہ آواز بلند ہونے لگی۔ ساتھ میں یہ دعا بھی کرتے رہے اے اللہ! سخت دل گنہگار بوڑھے پر رحم فرما، اے اللہ! انفرشیں معاف کر اور خطاؤں سے صرف نظر فرما اور اس شخص کے ساتھ حلم کا معاملہ کر، جو تیرے سوا کسی سے امید نہیں رکھتا اور تیرے علاوہ کسی پر بھروسہ نہیں کرتا، قریش کے ایک شیخ بیان کرتے ہیں کہ وہ کچھ لوگوں کے ساتھ مرض وفات کے دوران حضرت معاویہؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے، ہم نے ان کے جسم میں جھڑیاں دیکھیں، آپ نے حمد و ثناء کے بعد فرمایا، دنیا تمام وہی ہے جو ہم نے دیکھی ہے اور جس کا ہم نے تجربہ کیا ہے، ہم نے اس کی رونق کا استقبال کیا اور عیش کی زندگی سے لطف اندوز ہوئے لیکن ابھی کچھ ہی لمحے گزرے تھے کہ دنیا نے تمام رونقوں اور عیش کو شیوں کو سمیٹ لیا، اسی کے بعد رستی کاٹ ڈالی، اب دنیا نے ہمیں کھوکھلا اور بوسیدہ کر دیا ہے اور اب وہ ہمیں ملامت کرنے لگی ہے، لعنت ہے ایسی دنیا پر، اور تک ہے ایسے گمراہ، روایت ہے کہ حضرت معاویہؓ نے اپنے آخری خطبے میں ارشاد فرمایا، اے لوگو! جو کھیتی کرتا ہے وہ کاٹتا ہے، میں نے تمہاری امارت کا بار سنبھالا، اب جو شخص میرے بعد تمہارا امیر بنے گا، وہ مجھ سے زیادہ برا ہوگا، جیسے مجھ سے پہلے کے امراء مجھ سے بہتر تھے، اے یزید! جب میں مروانؓ کو مجھے کسی سمجھدار اور عقلمند انسان سے منلوانا، اس لئے کہ عقلمند انسان کو اللہ کے نزدیک ایک مرتبہ حاصل ہے اور زور زور سے تکبر کرتا، پھر خزانے میں سے ایک دھال نکالنا اس میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ کپڑے ہیں آپ کے کچھ بال اور ناخن ہیں، بال اور ناخن میری ناک، منہ، کان اور آنکھ میں رکھ دینا اور کپڑے کفن کے اندر میرے جسم کے اوپر رکھ دینا، اے یزید والدین کے بارے میں میری وصیت پر دھیان دینا۔ جب تم میری نعین اور تدفین سے فارغ ہو جاؤ تو مجھے اور ارحم الراحمین کو تماچو ڈرنا، محمد ابن عقبہ کہتے ہیں کہ جب حضرت معاویہؓ کی وفات کا وقت قریب آیا تو آپ نے فرمایا کاش! میں قریش کا ایک بھوکا شخص ہوتا اور اس منصب خلافت پر فائز نہ ہوتا۔

عبدالملک ابن مروان نے انتقال سے پہلے دمشق کے اطراف میں ایک دھوبی کو کپڑے دھوتے ہوئے دیکھ کر کہا کاش! میں ایک دھوبی ہوتا اور ہر روز اپنے ہاتھ سے کما کر کھاتا اور مجھے دنیاوی چیزوں میں سے (مراد خلافت و حکومت ہے) کچھ حاصل نہ ہوتا، ابو حازم کہ جب اس قول کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے فرمایا اللہ کا شکر ہے کہ ہمارے خلفاء اور حکام موت کے وقت اس حال کی تمنا کرتے ہیں جس میں ہم ہیں اور ہم موت کے وقت ان کے حال کی آرزو نہیں کرتے کسی شخص نے عبدالملک ابن مروان سے مرض وفات میں مزاج پر کسی کی اور پوچھا اے امیر المومنین! آپ خود کو کیا پاتے ہیں، جواب دیا میں خود کو ایسا پاتا ہوں جیسا اس آیت میں مذکور ہے۔

وَلَقَدْ جِئْتُمُو نَافِرًا هٰذَا كَمَا خَلَقْنَاكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَ تَرْكُنتُمْ مَا خَوَّلْنَاكُمْ وَرَاءَ ظُهُورِكُمْ (پ ۷، ر ۱۷، آیت ۹۵)

اور تم ہمارے پاس تماچھا آگئے جس طرح ہم نے تمہیں اول بار پیدا کیا تھا اور جو کچھ ہم نے تم کو دیا تھا اس کو

اپنے پیچھے ہی چھوڑ آئے۔

حضرت عمر ابن عبدالعزیز کی البیہ محترمہ فاطمہ بنت عبدالملک کہتی ہیں کہ میرے شوہر اپنے مرض وفات میں یہ دعا کرتے رہے تھے کہ اے اللہ! میری موت کو لوگوں پر ظاہر مت کرنا، کو کچھ ہی دیر کے لئے مٹلی رہے، چنانچہ جس روز آپ نے وفات پائی میں آپ کے پاس سے اٹھ کر چلی گئی اور دوسرے کمرے میں جا کر بیٹھ گئی جس کا ایک دروازہ ان کے کمرے میں بھی کھلا ہوا تھا، میں نے آپ کو یہ آیت پڑھتے ہوئے سنا۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ عَلْوًا فِى الْاَرْضِ وَلَا فِى السَّمٰوٰتِ
لِلْمُنٰفِقِيْنَ۔ (پ ۲۰، ر ۳، آیت ۸۳)

یہ عالم آخرت ہم ان ہی لوگوں کے لئے خاص کرتے ہیں جو دنیا میں نہ بڑا بننا چاہتے ہیں اور نہ فساد کرنا اور نیک نتیجہ منجی لوگوں کو ملتا ہے۔

اس کے بعد آپ خاموش ہو گئے، جب میں نے دیر تک آواز نہیں سنی تو تشویش ہوئی اور ایک غلام کو بھیجا کہ وہ یہ جا کر دیکھے کہ کیا آپ سو گئے ہیں؟ غلام نے جا کر دیکھا اور زور سے ایک چیخ ماری، میں بھی تیزی سے کمرے میں داخل ہوئی، دیکھا تو آپ پیشہ کے لئے سوچکے تھے، کسی نے انتقال سے پہلے آپ سے وصیت کی درخواست کی، آپ نے فرمایا میرے اس حال سے ڈرو، تمہیں بھی ایک دن اس حال میں پہنچنا ہے، روایت ہے کہ جب آپ کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی تو ایک طبیب کو بلایا گیا، اس نے معائنہ کرنے کے بعد کہا میرے خیال سے انہیں زہر دیا گیا ہے، مجھے ان کی موت کا خوف ہے، حضرت عمر ابن عبدالعزیز نے فرمایا جسے زہر نہیں دیا جاتا کیا تم اس کی موت سے بے خوف ہو جاتے ہو، طبیب نے پوچھا! امیر المومنین کیا آپ کو زہر کا احساس ہو گیا تھا، فرمایا مجھے اسی وقت معلوم ہو گیا تھا جب زہر میرے پیٹ میں پڑا تھا، طبیب نے کہا آپ کو علاج کرانا چاہیے۔ مجھے آپ کے نفس کے چلے جانے کا اندیشہ ہے، فرمایا کہاں جائے گا۔ یقیناً میرے رب کے پاس جائے گا جو جانے کی بہترین جگہ ہے، بخدا اگر مجھے معلوم ہوتا کہ میری شفا میرے کان کی لو کے پاس ہے میں تب بھی ہاتھ نہ بڑھاتا، اے اللہ! عمر کے لئے اپنی ملاقات میں خیر کر، اس واقعے کے بعد آپ چند دن حیات رہے، کہتے ہیں کہ وفات سے پہلے آپ رونے لگے، لوگوں نے عرض کیا امیر المومنین کیوں روتے ہیں؟ آپ کو تو خوش ہونا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے ذریعے سنتیں زندہ کی ہیں اور انصاف کا بول بالا فرمایا ہے، آپ نے فرمایا کیا مجھے کھڑا نہیں کیا جائے گا اور اس مخلوق کے متعلق سوال نہیں کیا جائے گا، بخدا اگر میں نے ان میں بدل کیا ہو گا، تب بھی مجھے اپنے نفس پر خوف ہو گا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی جہت پیش نہیں کر سکے گا۔ الایہ کہ اللہ تعالیٰ ہی اسے جہت کی تعلیم دے اور اس صورت میں ہمارا کیا حال ہو گا۔ جب ہم نے بدل سے دامن بچایا ہو گا اور انصاف کی فتح منی کی ہو گی، یہ کہہ کر ان کی آنکھیں چمک اٹھیں، اس کے بعد کچھ ہی دیر زندہ رہے، جب وفات کا وقت ہوا فرمایا مجھے بخدا، لوگوں نے انہیں بخدا دیا، اس کے بعد کہنے لگے اے اللہ میں وہ ہوں جسے حکم دیا گیا مگر اس نے کوتاہی سے کام لیا جسے منع کیا گیا مگر اس نے حکم عدولی کی لیکن لا الہ الا اللہ کے باب میں میں نے کوتاہی نہیں کی، پھر اپنا سراٹھایا اور دیر تک ایک طرف دیکھتے رہے، لوگوں نے پوچھا کیا دیکھتے ہیں؟ فرمایا میں کچھ سبز پوشوں کو دیکھ رہا ہوں جو نہ انسان ہیں اور نہ جن۔

ہارون الرشید سے منقول ہے کہ انہوں نے موت کے وقت اپنا کفن خود پسند کیا اور اسے دیکھتے تھے اور یہ آیت تلاوت کرتے تھے۔

مَا اَعْنٰى عَيْنِىْ مَا لِيْ بِهٖ هَلٰكٌ عَنِّىْ سُلٰطٰنٌ اَبِيْہٖ (پ ۲۹، ر ۵، آیت ۲۸-۲۹)

میرا مال میرے کچھ کام نہ آیا۔ میری جاہ بھی مجھ سے گذر گئی۔

ماسون نے راکھ بچائی اور اس پر لٹ گیا اور کہنے لگا اے وہ ذات جس کے ملک کو زوال نہیں اس شخص پر رحم کر جس کا ملک زوال پذیر ہو چکا ہے، مقتسم اپنی موت کے وقت کہتا تھا کہ اگر مجھے معلوم ہو تا کہ میری عمر اتنی مختصر ہے تو میں کبھی وہ کام نہ کرتا جو

میں نے کہے ہیں، 'مستمربانہ وفات کے وقت سخت ہے چین اور مضطرب تھا' لوگوں نے کہا امیرالمومنین آپ گھبراتے ہیں، آپ کو کوئی خطرہ نہیں ہے، اس نے کہا اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ دنیا رخصت ہو گئی ہے اور آخرت آچکی ہے، عموماً بن عاص نے وفات کے وقت صندوقوں کو دیکھتے ہوئے اپنے بیٹوں سے کہا کہ ان صندوقوں کو اندر کی چیز کے ساتھ کون لے گا، پھر فرمایا: کاش! اس میں بیگنیاں ہوتیں، حجاج نے اپنی موت کے وقت کہا اے اللہ! میری مغفرت فرما، لوگ کہتے ہیں کہ تو میری مغفرت نہیں کرے گا، عمر ابن عبدالعزیز حجاج کے اس کلمہ پر حیرت اور رشک کیا کرتے تھے جب حضرت حسن بصری کے سامنے اس کا یہ مقولہ نقل کیا گیا تو انہوں نے دریافت کیا کہ کیا واقعی اس نے ایسا کہا تھا، کہنے والے نے عرض کیا جی ہاں! فرمایا ہو سکتا ہے اللہ تعالیٰ نے اس کی مغفرت فرمادی ہو۔

اجلہ صحابہ اور تابعین اور دوسرے بزرگان امت کے اقوال : حضرت معاذ ابن جبلؓ نے وفات کے وقت ارشاد فرمایا، اے اللہ! میں تجھ سے ڈرتا تھا اور آج تجھ سے امید رکھتا ہوں، اے اللہ! تو جانتا ہے کہ میں دنیا کو اور اس میں دیر تک رہنے کو اس لئے پسند نہیں کرتا تھا کہ نہیں جاری کروں یا درخت لگاؤں بلکہ دوپہر کی سخت دھوپ میں پیاسا رہنے، مصائب جھیلنے اور ذکر کے حلقوں میں علماء کے سامنے دو زانو ہو کر بیٹھنے کے لئے پسند کرتا تھا، جب آپ پر نہایت سخت نزع اور جاں کنی کا عالم طاری ہوا یہاں تک کہ کسی اور پر نہ ہوا تھا تو جب کچھ طبیعت میں ٹھہراؤ ہوتا تو عرض کرتے اے اللہ! تو چاہے میرا کھانا کتنا ہی کیوں نہ گھونٹ لے تیری عزت کی قسم تو جانتا ہے میں تجھ سے محبت کرتا ہوں، جب حضرت سلمان الفارسی کا وقت وفات ہوا تو رونے لگے، لوگوں نے عرض کیا کیوں روتے ہیں، فرمایا، میں دنیا کے فراق میں نہیں روتا ہوں بلکہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے عہد لیا تھا کہ دنیا میں سے تو شے کی مقدار ہمارے پاس اتنا ہی ہو جتنا مسافر کے پاس زادراہ ہوتا ہے۔ (احمد، حاکم) جب حضرت سلمان نے وفات پائی تو ان کا مال دیکھا گیا۔ ان کا ترکہ دس بارہ درہم کا تھا، جب حضرت بلال حبشی کی وفات کا وقت ہوا تو ان کی اہلیہ کہنے لگیں ہائے افسوس! فرمایا ہائے افسوس نہ کہہ بلکہ وہ کس قدر خوشی کی بات ہے کہ کل ہم اپنے احباب یعنی عمر صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی جماعت سے ملاقات کریں گے، کہتے ہیں کہ وفات کے وقت حضرت عبداللہ ابن المبارکؓ نے اپنی آنکھیں کھولیں اور یہ آیت پڑھتے ہوئے ہنسنے لگے۔

لِمِثْلِ هَذَا فَلْيَعْمَلِ الْعَامِلُونَ۔ (پ ۲۳، ر ۶، آیت ۶)

ایسی ہی کامیابی کے لئے عمل کرنے والوں کو عمل کرنا چاہئے۔

حضرت ابراہیمؑ نفعی اپنی وفات سے پہلے رونے لگے لوگوں نے عرض کیا کیوں روتے ہیں، فرمایا میں اللہ کے قاصد کا پھر ہوں جو مجھے جنت یا دوزخ کی بشارت دے، حضرت ابن المنکدر بھی وفات کے وقت رونے لگے، یہ پوچھنے پر کہ آپ کیوں روتے ہیں انہوں نے جواب دیا بخدا میں کسی ایسے گناہ کی وجہ سے نہیں روتا ہوں جس پر میں نے معمولی سمجھ کر اقدام کیا ہو اور وہ اللہ کے نزدیک غیر معمولی ہو، عامر ابن عبدالقیس بھی وفات سے پہلے رونے لگے، لوگوں نے پوچھا کیوں روتے ہیں، فرمایا میں دنیا کی حرص میں اور موت کے خوف سے نہیں روتا بلکہ اس لئے روتا ہوں کہ میں گریہوں کی دوپہر میں پیاسا نہ رہ سکا اور سرویوں کی راتوں میں اپنے رب کے سامنے کھڑا نہیں ہو سکا، حضرت قنیل ابن عیاض وفات کے وقت بے ہوش ہو گئے، جب ہوش آیا تو آنکھیں کھولیں اور فرمایا ہائے افسوس سفر کتنا طویل ہے اور زاد سفر کس قدر قلیل ہے، حضرت عبداللہ ابن المبارکؓ نے وفات سے پہلے اپنے آزاد کردہ غلام نصر سے فرمایا کہ میرا سرمی پر رکھ دے، نصر یہ سن کر رونے لگا، فرمایا کیوں روتا ہے؟ اس نے عرض کیا کہ مجھے آپ کی وہ آسائشیں اور راحتیں یاد آئیں جن میں آپ نے پوری زندگی بسر کی اور آج فقر، افلاس اور غریب الوطنی کے عالم میں انتقال کر رہے ہیں، فرمایا خاموش رہ، میں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی تھی کہ مجھے مالداروں کی طرح زندہ رکھنا اور فقراء کی موت دینا، اس کے بعد نصر سے فرمایا مجھے کلمہ طیبہ کی تلقین کر اور جب تک میں دو سرا کلام نہ کروں اس سے پہلے دوبارہ مت کہنا، عطاء ابن یسار کہتے ہیں کہ شیطان ایک

مخص کے سامنے اس کی موت کے وقت آیا اور کہنے لگا کہ تم نے نجات پائی، اس نے کہا میں تجھ سے اب بھی خطرو محسوس کرتا ہوں۔ ایک بزرگ وفات کے وقت رونے لگے، لوگوں نے پوچھا کیوں رورہے ہیں؟ فرمایا! یہ آیت رونے پر مجبور کر رہی ہے۔ اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللَّهُ مِنَ الْمُتَّقِينَ (پ ۶، ر ۹، آیت ۲۷) خدا تعالیٰ متقیوں ہی کا عمل قبول کرتے ہیں۔ حضرت حسن ایک ایسے مخص کے پاس تشریف لے گئے جو نزع کے عالم میں تھا بس جان سپرد ہی کرنے والا تھا اور فرمایا! جس کام کی ابتدا ایسی ہو اس کی انتہا سے ڈرنا چاہئے اور جس کی انتہا ایسی ہو اس کی ابتدا میں نہ کرنا چاہیے۔ جریری کہتے ہیں کہ میں نزع کے وقت حضرت جنید بغدادیؒ کی خدمت میں حاضر تھا۔ اس دن جمعہ تھا اور نو روز بھی تھا، نزع کے وقت بھی وہ قرآن پڑھتے رہے یہاں تک کہ انہوں نے پورا قرآن پڑھا، میں نے عرض کیا ابو القاسم! اس حالت میں بھی آپ نے ختم کر لیا، فرمایا مجھ سے زیادہ اس کا مستحق کون ہے، خاص طور پر اس وقت جب کہ میرا صحفہ لپیٹا جانے والا ہے اور ہم کہتے ہیں کہ ابو سعید الخزاز نے یہ اشعار پڑھتے ہوئے جان جاں آفریں کے سپرد کر دی۔

حَنِينٌ قُلُوبٌ الْعَارِفِينَ إِلَى الذِّكْرِ
وَنَذْرٌ لِّكَارِهِمْ وَقَتُّ الْمُنَاجَاةِ لِلْمُسْتَعِ
لِدُيْرَتِ كُنُوسٍ لِّلْمَنَانِيَا عَلَيْهِمْ
فَاغْفُوا عَنِ اللَّثِيَا كَاغْفَاؤِ ذِي الشُّكْرِ
هُمُ مَهْمُ حَوَالَةِ بِمَعْسِكِرِ
بِه لَقْلُ وَذِي اللُّو كَالَا نَجْمِ الزُّهْرِ
فَأَحْسَامُهُمْ فِي الْأَرْضِ قَتْلِي بِحَبِي
وَأَرْوَاهُمْ فِي الْحَجَبِ نَحْوُ الْعَلَا تَسْرِي
فَمَا عَرَسُوا إِلَّا بِقُرْبِ حَبِيْبِهِمْ
وَمَا عَرَجُوا مِنْ مَّسْرِ بَنُوسٍ وَلَا مَضَرِ

(عارفین کے دل خفیہ مناجات کے وقت ذکر و تذکار کے مشتاق رہتے ہیں، فنا کے جام ان پر گردش کرتے ہیں اور وہ دنیا سے اس طرح غافل ہو جاتے ہیں جس طرح نشے میں مبتلا مخص تمام باتیں بھول جاتا ہے، ان کے افکار ایسے میدان کو اپنی جولا نگاہ بناتے ہیں جہاں اللہ کے عین روشن ستاروں کی طرح جلوہ نکھرتے ہیں، ان کے جسم زمین میں بے جان نظر آتے ہیں اور وہ جس بلند یوں کی طرح محسوس نہ اسی جگہ ٹھہرتے ہیں جہاں حبیب قریب ہوتا ہے، پھر انہیں کسی معیبت یا ضرر کا احساس نہیں ہوتا۔)

حضرت جنید بغدادیؒ سے کہا گیا کہ ابو سعید الخزازؒ پر موت کے وقت وجد کا زیروست قلبہ تھا، فرمایا مجب نہیں کہ ان کی روح شدت اشتیاق کے باعث پرواز کر جاتی، ذوالنونؒ سے موت کے وقت پوچھا گیا کہ آپ کیا چاہتے ہیں، فرمایا! میں موت سے ایک لمحہ پہلے اللہ کی معرفت چاہتا ہوں، ایک بزرگ سے عالم نزع میں کہا گیا اللہ کو کہنے لگے کہ کب تک؟ میں تو اس کے دوسے خاکستر ہوا جاتا ہوں، ایک بزرگ کہتے ہیں کہ میں مثلاً اللہ تعالیٰ کے پاس تھا اتنے میں ایک فقیر آیا اور سلام کر کے کہنے لگا کہ یہاں کوئی ایسی صاف ستھری جگہ ہے جہاں انسان مرتے لوگوں نے اسے ایک جگہ تلاوی، وہاں پانی کا ایک چشمہ بھی تھا، اس مخص نے تجرید و وضو کیا اور کچھ رکتیں پڑھیں اور اس جگہ پناہ لے کر تلاوی لگی تھی، پاؤں پھیلا کر لیٹا اور مر گیا، ابو العباس الدیوریؒ کی مجلس میں ایک عورت کو حال آگیا اور وہ چیخنے لگی، ابو العباس نے اس سے فرمایا مرا، وہ عورت اٹھ کر دووازے کی طرف چلی، دووازے پر پہنچ کر مڑی اور ابو العباس کی طرف دیکھ کر کہنے لگی لو میں مری ہوں اور یہ کہہ کر زمین پر گر پڑی، دیکھا تو بے جان ہو چکی تھی، ابو علی

الروذیاری کی ہمیشہ فاطمہ سے موی ہے کہ جب ابو علی الروذیاری کی وفات کا وقت قریب آیا تو ان کا سر میری گود میں تھا انہوں نے آنکھیں کھولیں اور کہنے لگے کہ یہ آسمان کے دروازے کھل دیئے گئے ہیں یہ جہنم سماوی گئی ہیں اور یہ کہنے والا کہہ رہا ہے اے ابو علی ہم نے تجھے ایک بلند مرتبے پر فائز کر دیا ہے اگرچہ تو اس مرتبے کا خواہشمند نہ ہو پھر وہ یہ شعر پڑھنے لگے۔

وَ حَقَّقَ لَا تَنْظُرْتُ إِلَى سِوَاكَ
بَعَيْنَيْنِ مَوَدَّةٍ حَتَّى أَرَاكَ
أَرَاكَ مُعَذِّبِي بِفَتْوَرٍ لَجِظٍ
وَبِالْخَذِ الْمُوَرَّدِ مِنْ حَيَاكَ

(اور تیرا حق یہ ہے کہ میں تیرے سوا کسی پر الفت کی نظر نہ ڈالوں۔ یہاں تک کہ تجھے دیکھ لوں۔ میں دیکھتا ہوں کہ تو چشم بیمار اور حیات کے باعث سرخ ہو جانے والے رخساروں سے سزا دیتا ہے)

حضرت جنید بغدادی سے کسی نے کہا لا الہ الا اللہ کہو انہوں نے جواب دیا کیا میں بھول گیا ہوں کہ اسے یاد کروں؟ جعفر ابن نصیر نے بکران الدینوری سے جو شلی کے خادم تھے دریافت کیا کہ موت کے وقت شلی کا کیا حال تھا؟ انہوں نے جواب دیا کہ شلی نے فرمایا کہ میرے اوپر ایک شخص کا ایک درہم ہے جو ظلم کی راہ سے میرے پاس آیا تھا حالانکہ میں نے اس کی طمانی کے لئے مالک درہم کے ثواب کی نیت سے ہزاروں درہم صدقہ کئے ہیں لیکن وہ درہم آج بھی میرے دل میں پھانس کی طرح بھستا ہے پھر فرمایا کہ مجھے نماز کے لئے وضو کرادو۔ میں نے وضو کرادیا لیکن واڑھی میں خلال کرنا بھول گیا اس وقت آپ بول نہیں پارہے تھے اس لئے آپ نے میرا ہاتھ پکڑا اور اپنی واڑھی میں خلال کر دیا پھر انتقال فرمائے جعفریہ واقعہ سن کر رونے لگے اور کہنے لگے کہ تم ایسے شخص کے بارے میں کیا کہو گے جس سے عمر کے آخری لمحے میں بھی شریعت کے آداب فوت نہیں ہوئے بشرائین الحارث پر جاں کنی سخت تھی کسی نے کہا کہ تم جو موت سے اس قدر پریشان ہو شاید دنیا چھوڑ کر جانا نہیں چاہتے کہنے لگے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی خدمت میں حاضر ہونا ایک بہت مشکل کام ہے صالح ابن مسار سے کسی نے کہا کہ کیا آپ اپنے بیوی بچوں کے بارے میں کوئی وصیت نہیں کریں گے؟ فرمایا اچھے شرم آئی ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر اپنے بچوں کو کسی اور کے سپرد کروں جب ابو سلیمان دارانی کی وفات کا وقت قریب ہوا تو آپ کے ساتھی آپ کے پاس آئے اور کہنے لگے آپ لومزد ہو اس لئے کہ آپ رب غفور رحیم کے پاس جارہے ہو آپ نے فرمایا کیا تم یہ نہیں کہتے کہ ڈنڈا اس لئے کہ تم رب کے پاس جارہے ہو جو معمولی غلطیوں کا حساب لے گا اور بڑے گناہوں پر عذاب دے گا ابو بکر الواسطی سے لوگوں نے عرض کیا کہ ہمیں وصیت فرمائیں ارشاد فرمایا تم سے اللہ تعالیٰ کی جو مراد ہے اس کی حفاظت کرو ایک بزرگ کے انتقال کا وقت قریب ہوا تو ان کی بیوی رونے لگیں آپ نے ان سے فرمایا کیوں روتی ہو؟ بیوی نے جواب دیا میں آپ پر روتی ہوں فرمایا اگر رونا ہی ہے تو اپنے آپ پر رو میں تو اس دن کے لئے چالیس برس سے رو رہا ہوں حضرت جنید کہتے ہیں کہ میں سری سعلی کی عیادت کے لئے گیا وہ اس وقت مرض وفات میں مبتلا تھے میں نے ان سے پوچھا کیسی طبیعت ہے۔ جواب میں انہوں نے یہ شعر پڑھا۔

كَيْفَ أَشْكُو إِلَى طَبِيبِي مَا بِنِي
وَالَّذِي أَصَابَنِي مِنْ طَبِيبِي

(میں اپنے طبیب سے اپنے حال کا کیا شکوہ کروں۔ اس لئے کہ میرا یہ حال میرے طبیب ہی کی وجہ سے ہوا ہے۔)

حضرت جنید کہتے ہیں کہ میں انہیں پکھا کرنے لگا کہنے لگے وہ شخص بچے کی ہوا سے کیا الجھ اندوز ہو گا جو اندر سے جل رہا ہو۔ پھر یہ تین اشعار پڑھے۔

الْتَلَبُ مُحْتَرَقٌ وَالتَّمَعُ مُسْتَبَقٌ
وَالْكَرْبُ مُجْتَمِعٌ وَالضَّبَرُ مُفْتَرَقٌ
كَيْفَ الْقَرَارُ عَلَى مَنْ لَا قَرَارَ لَهُ
مِمَّا جَنَاهُ الْهَوَى وَالشَّوْقُ وَالْفَلَقُ
يَارَبِّ أَنْ يَكُ شَيْءٌ فِيهِ لِي قَرْجٌ
فَأَمْسِنُ عَلَى رِبِّهِ مَا قَامَ بِي رَمَقٌ

(دل جل رہا ہے اور آنکھیں اشک بہا رہی ہیں دردِ جمع ہے اور صبر منتشر ہے، اس شخص کو قرار کیسے حاصل ہو جسے شوق، محبت اور غفلت نے بے قرار کر رکھا ہو۔ اے اللہ! اگر کسی چیز میں میرے لئے کشادگی ہو تو مجھ پر اس کا فضل فرما جب تک مجھ میں زندگی کی رمتی ہے۔)

روایت ہے کہ فحلی کے کچھ احباب ان کی خدمت میں اس وقت حاضر ہوئے جب کہ وہ موت کی جاں کنی میں مبتلا تھے۔ انہوں نے عرض کیا کہ آپ کلمہ لا الہ الا اللہ پڑھیں۔ جواب میں انہوں نے یہ اشعار پڑھے۔

إِنَّ بَيْنَنَا أَنْتَ سَاكِنَةٌ
غَيْبُكَ مُخْتَاَجٌ إِلَيَّ الشَّرِجُ
وَجَهْكَ الْعَامُولُ حُجَّتُنَا
يَوْمَ يَأْتِي النَّاسُ بِالْفُتُوحِ
لَا أَتَاخُ اللَّهَ لِي فَرْجًا
يَوْمَ أَدْعُو مِنْكَ بِالْفَرْجِ

(وہ گھر جس میں تو رہتا ہے کسی چراغ کا محتاج نہیں ہے، حیرتی ذات کہ تم جو ہماری امیدوں کا مرکز ہے ہماری محبت ہوگی جس دن لوگ تجھ سے آئیں گے۔ جس دن میں تجھ سے اس حال سے کشائش چاہوں اللہ تعالیٰ مجھے کشادگی عطا نہ کرے۔)

بیان کیا جاتا ہے کہ ابو العباس ابن عطاء حضرت جنید کے پاس نزاع کے عالم میں پہنچے اور سلام کیا، حضرت جنید نے اس وقت تو جواب نہیں دیا لیکن کچھ دیر بعد وعلیک السلام کہا، پھر فرمایا بھائی! میں وعید پڑھ رہا تھا اس لئے جواب نہیں دے سکا، پھر اپنا رخ قبلہ کی طرف کیا اور عجیب کہہ کر وفات پا گئے، کہانی سے وفات کے وقت پوچھا گیا کہ آپ کا عمل کیا تھا، فرمایا! اگر موت کا وقت قریب نہ ہوتا تو میں تمہیں کبھی اپنے عمل کے متعلق کچھ نہ بتلاتا، میں اپنے دل کے دوازے پر چالیں برس تک کھڑا رہا، جب بھی کسی غیر نے اندر گھسنے کی کوشش کی میں رکاوٹ بن کر کھڑا ہو گیا، معتبر کہتے ہیں کہ جب حکم ابن عبدالملک کی وفات ہوئی تو میں وہاں موجود تھا، اس وقت میں نے یہ دعا کی اے اللہ! اس پر موت کے سکرات آسان فرما، کیونکہ یہ ایسا تھا ویسا تھا، میں نے اس کے کچھ حاسن ذکر کئے، حکم نے آنکھیں کھولیں اور پوچھا یہ کون شخص بول رہا ہے۔ میں نے اپنا نام بتلایا، اس نے کہا ملک الموت مجھ سے کہہ رہے ہیں کہ میں ہر نئی کے ساتھ نرمی کا معاملہ کرتا ہوں یہ کہہ کر جاں بحق ہو گیا، جب یوسف ابن اسباط مرض الوفا میں مبتلا ہوئے تو حذیفہ ان کے پاس آئے اور کہنے لگے اے ابو محمد! یہ گھبراہٹ اور پریشانی کا وقت ہے؟ یوسف نے کہا میں کیوں نہ گھبراؤں اور کس لئے پریشان نہ ہوں؟ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ میں نے اپنے کسی عمل سے اللہ تعالیٰ کی تصدیق نہیں کی، حذیفہ نے کہا اس نیک آدمی پر حیرت ہوتی ہے کہ وہ موت کے وقت یقین کے ساتھ اس بات کا دعویٰ کرتا ہے کہ اس نے اپنے کسی عمل سے اللہ تعالیٰ کی تصدیق

نہیں کی، مغالطی کہتے ہیں کہ میں ایک بزرگ صوفی کی خدمت میں حاضر ہوا وہ اس وقت بیمار تھے، میں نے سنا وہ یہ کہہ رہے تھے کہ اے اللہ! تو سب کچھ کر سکتا ہے، مجھ پر رحم فرما، ایک بزرگ مشاد بخوری کے پاس بوقت وفات پہنچے اور ان کے لئے دعا کی، اے اللہ! ان کے ساتھ ایسا سلوک کیجئے ویسا معاملہ کیجئے، یہ دعائیں کو وہ ہنسنے لگے اور کہنے لگے کہ تیس برس سے مجھ پر رحمت اور اس کی نعمتیں پیش کی جا رہی ہیں لیکن میں انہیں نگاہ بھر کر دیکھتا بھی نہیں، دویم سے موت کے وقت کہا گیا کہ لا الہ الا اللہ کو، انہوں نے کہا میں اس سے بہتر کوئی بات نہیں کہہ سکتا، حضرت سفیان ثوری کو بھی وفات سے پہلے کہنے لگا لا الہ الا اللہ کی تلقین کی گئی۔ انہوں نے فرمایا کیا وہاں کوئی اور بات نہیں، مزیٰ امام شافعی کی خدمت میں آپ کے مرض وفات کے دوران حاضر ہوئے اور دریافت کیا اے ابو عبد اللہ! آپ نے کس حال میں صبح کی، آپ نے فرمایا میں نے اس حال میں صبح کی کہ دنیا سے رخصت ہوتا ہوں، دوستوں سے جدا ہوں، اپنے برے اعمال سے ملتا ہوں اور جام فنا پیتا ہوں اور اللہ کے پاس جاتا ہوں اور یہ نہیں جانتا کہ میری روح جنت کی طرف جائے گی کہ میں اسے مبارکبادوں یا دوزخ میں جائے گی کہ اس سے تعزیت کروں۔ بھریہ اشعار پڑھے۔

لَمَّا قَسَتْ قَلْبِي وَضَاقَتْ مَذَاهِبِي
تَعَاظَمَنِي ذَنْبِي فَلَمَّا قَرْنَتْهُ
فَمَا زِلْتُ نَا عَفْوٍ عَنِ الذَّنْبِ لَمْ تَزَلْ
وَلَوْلَاكَ لَمْ يُعْفَوْ بِإِبْلِيسَ عَابِدُ
جَعَلْتَ رَجَائِي نَحْوَ عَفْوِكَ سَلَمًا
بِعَفْوِكَ رَبِّي كَأَنَّ عَفْوَكَ أَعْظَمًا
نَحْوُودٌ وَتَعْفُو مِنِّي وَتَكْرُمًا
فَكَيْفَ وَقَدْ أَغْوَى صَفِيَّتِكَ أَعْمَا

(جب میرا دل سخت ہوا اور میری راہیں مسدود ہو گئیں، تو میں نے تیرے عفو سے اپنی امید کو بیڑی بنالیا، میں نے اپنے گناہوں کو برائی کے اعتبار سے نہایت بڑا سمجھا، لیکن جب تیرے عفو سے موازنہ کیا تو تیرے عفو کو بڑا پایا، تو ہمیشہ اپنے عفو و کرم اور فضل و عنایت سے گناہوں کی بخشش کرتا ہے۔ اگر تو نہ ہوتا تو کوئی عابد کسی اہلس سے گمراہ نہ ہوتا، اس نے تو تیرے پاکیزہ بندے آدم کو گمراہ کیا)

احمد ابن الحنفیہ سے وفات کے وقت ایک مسئلہ دریافت کیا گیا، سوال سن کر ان کی آنکھیں بھر آئیں اور کہنے لگے اے بیٹے! اس دروازے پر پہچانوںے برس سے دستک دے رہا تھا، اب کھلنے کا وقت آیا ہے، معلوم نہیں سعادت کے ساتھ کھلے گا یا شقاوت کے ساتھ، اب مجھے جواب کی فرصت کہاں؟

یہ ہیں بزرگان دین کے اقوال، جو ان کے احوال کے اعتبار سے مختلف ہوتے ہیں، اصل میں بعض لوگوں پر وفات کا خوف غالب رہا۔ بعض پر رجاء، بعض پر شوق اور محبت، اس لئے ہر شخص نے اپنے حال کے اعتبار سے گفتگو کی، اس لئے یہ تمام اقوال اپنی اپنی جگہ صحیح ہیں اور ان میں کوئی تضاد نہیں ہے۔

جنازوں اور قبرستانوں میں عارفین کے اقوال۔ اور زیارت قبور کا حکم۔ : جنازوں میں اہل بصیرت کے لئے عبرت ہے، اور اہل غفلت کے لئے تنبیہ اور تذکرہ ہے، بشرطیکہ وہ قلم و مدد کر س، ورنہ اکثر اہل غفلت کے قلوب جنازوں کے مشاہدے سے سخت ہوتے ہیں، کیوں کہ وہ سمجھتے ہیں کہ وہ لوگ ہمیشہ دوسروں کے جنازے دیکھتے رہیں گے، یہ خیال نہیں کرتے کہ خود انہیں بھی جنازے کی صورت لوگوں کے کاندھوں پر جانا ہے، اور اگر اس کا خیال ہوتا بھی ہے تو یہ نہیں سمجھتے کہ انہیں جلد جانا ہے، اور نہ یہ سوچتے ہیں کہ جو لوگ آج جنازوں کی صورت قبرستان جا رہے ہیں وہ خود بھی اسی غلط فہمی میں مبتلا تھے، اور یہی سوچا کرتے تھے کہ انہیں مرنا نہیں ہے، یا مرنا ہے تو اتنی جلدی نہیں مرنا ہے، مگر ان کا خیال غلط نکلا، اور ان کی مدت بہت جلد پوری ہو گئی ہے، اسلئے جب بھی کوئی شخص جنازہ دیکھے اسے یہ سوچنا چاہیے گویا وہ خود اس جنازے میں ہے، اور اگر آج نہیں ہے تو بہت جلد اس جگہ آنے والا ہے، یا تو آج ہی یا کل اور کل نہیں تو پرسوں، حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ آپ جب کوئی جنازہ دیکھتے تو ارشاد فرماتے جاؤ ہم تمہارے پیچھے آرہے ہیں، مکحول اللہ مشقی جنازہ دیکھ کر فرماتے تم صبح کو جا رہے ہو ہم شام کو آنے والے ہیں،

صحیح مؤثر ہے اور غفلت تیزی سے آنے والی ہے پہلا جاتا ہے اور دوسرے کو کوئی عقل نہیں ہے، السید ابن خضیر کہتے ہیں کہ میں کسی جنازے پر اس طرح نہیں گیا کہ میرے دل میں اسکے علاوہ کسی اور چیز کا خیال آیا ہو اور اسکے علاوہ بھی کوئی بات سوچی ہو کہ اسکے ساتھ کیا ہونے والا ہے اور وہ کن حالات سے دوچار ہوگا جب مالک ابن دینار کے بھائی کا انتقال ہوا تو مالک ابن دینار ان کے جنازے کے لئے باہر نکلے اور یہ کہتے ہوئے رونے لگے کہ بخدا میری آنکھیں اس وقت تک ٹھنڈی نہیں ہوں گی جب تک مجھے یہ معلوم نہ کہ اس کا انجام کیا ہوا ہے اور یہ بات مجھے مرتے دم تک معلوم نہیں ہو سکے گی۔ امش کہتے ہیں کہ ہم جنازوں میں شریک ہوتے تھے اور یہ نہیں جانتے تھے کہ کس شخص سے تعزیت کریں کیوں کہ اس مجمع میں ہر شخص غم و حزن کی تصویر نظر آتا تھا ثابت الہنائی کہتے ہیں کہ ہم جنازوں میں شریک ہوتے تھے اور ہمیں کوئی شخص ایسا نظر نہیں آتا تھا جو اپنے چہرہ پر کپڑا ڈالے ہوئے رہتا نہ ہو، یہ تھا ہمارے بزرگوں کا خوف اور آج یہ حال یکہ جنازے میں شریک ہونے والے اکثر لوگ ہستے بولتے اور کھیلنے نظر آتے ہیں اگر وہ مرنے کے بارے میں کوئی گفتگو کرتے بھی ہیں تو یہ کہ اس نے کتنا ترکہ چھوڑا اور اسکی میراث کس کو ملے گی اگر کوئی قریبی عزیز ہوتا ہے تو وہ یہ نہیں سوچتا کہ اپنے مرنے والے عزیز کی بخشش کا کیا سامان کیا جائے بلکہ یہ سوچتا ہے کہ مرحوم نے جو مال چھوڑا ہے اسے اس میں سے کتنا حصہ کس حیلے اور تدبیر سے حاصل ہو سکتا ہے ان میں شاید ہی کوئی شخص ایسا ہوگا جو اپنے جنازے میں غور کرتا ہوگا اور مرنے کے بعد اپنے انجام کے متعلق سوچتا ہوگا۔ اس غفلت کا سبب اسکے علاوہ کچھ نہیں کہ معاصی اور گناہوں کی کثرت سے دل شخص ہوجاتے ہیں اور لائینی امور میں پڑجاتے ہیں۔ دعا یہ ہے کہ اللہ ہم کو اس غفلت سے بیدار فرمائے۔

جنازوں میں حاضر ہونے والوں کا بہترین ادب یہ کہ وہ مرنے والوں پر روئیں بلکہ اگر عقل رکھتے ہوں تو خود اپنے اوپر روئیں نہ کہ میت پر۔ ابراہیم الزیلات نے لوگوں کو دیکھا کہ وہ میت پر رحم کر رہے ہیں آپ نے ان سے فرمایا کہ اگر تم اپنے اوپر رحم کرو تو یہ زیادہ بہتر ہے اس لئے کہ یہ شخص تو تین دہشتناک امور سے نجات پاگیا، ملک الموت کا چہرہ دیکھ چکا ہے، موت کی نفی چھ چکا ہے اور خوف خاتم کے خوف سے مامون ہو چکا ہے۔ ابو عمر ابن العلاء کہتے ہیں کہ میں جریر شاعر کے پاس بیٹھا ہوا تھا اور وہ اپنے کاتب کو شعر الماء کر رہا تھا اچانکہ ایک جنازہ سامنے آیا جریر شعر کہتے کہتے رک گیا اور کہنے لگا واللہ مجھے ان جنازوں نے بوڑھا کر دیا ہے۔ پھر اس نے یہ دو شعر پڑھتے۔

نَرَوْعُنَا الْجَنَائِزُ مُقْبِلَاتٍ وَنَلْهُو جِئِينَ نَنْهَبُ مُدْبِرَاتٍ
كَرَوْعَةٍ ثَلَاثَةٍ لِمَعَارِ ذَنْبٍ فَلَمَّا غَابَ عَادَتْ رَاتِعَاتٍ

(جنازے جب سامنے آتے ہیں تو ہمیں خوف زدہ کر دیتے ہیں اور جب وہ او جھل ہوجاتے ہیں تو ہم کھیل میں لگ جاتے ہیں جس طرح بکریاں بھیڑنے کو دیکھ کر ڈر جاتی ہیں اور جب وہ غائب ہوجاتا ہے تو پھر چرنے لگتی ہیں) جنازے میں شرکت کے آداب : جنازوں میں حاضری کے بھی کچھ آداب ہیں مثلاً یہ کہ فکر کرے غفلت سے بھی اجتناب کرے تیار ہو اور متواضع بن کر اس کے ہمراہ چلے ہم نے فن فقہ میں اس کے کچھ آداب اور سنن بیان کئے ہیں ایک ادب یہ ہیکہ میت کے متعلق اچھا گمان رکھے خواہ وہ فاسق ہی کیوں نہ رہا ہو اور اپنے متعلق اچھا گمان نہ رکھے اگرچہ ظاہری حالت نیکی اور تقویٰ پر دلالت کرتی ہو اس لئے کہ خاتمہ خطرناک ہے اسکی حقیقت معلوم نہیں ہے چنانچہ عمر ابن زروایت کرتے ہیں کہ ان کے ایک پڑوسی کا انتقال ہو گیا وہ نہایت گناہ گار شخص تھا بے شمار لوگوں نے اس یرائی کے باعث اسکی نماز جنازہ نہیں پڑھی لیکن انھوں نے اس کے جنازے میں شرکت کی اسکی نماز پڑھی جب اسے قبر کے اندر لٹا دیا گیا تو انھوں نے اسکی قبر پر گھڑے ہو کر فرمایا کہ اللہ تجھ پر رحم فرمائے تو نے اپنی زندگی توبہ میں بسر کی اور سجدوں سے اپنی پیشانی کو گرد آلود کیا اگرچہ لوگ تجھے گناہ گار کہتے ہیں بھلا ہم میں سے کون شخص ایسا ہے جس نے گناہ نہیں کیا اور خطا کا ارتکاب نہیں کیا روایت ہیکہ بصرے کے نواح میں ایک ایسے شخص کا انتقال ہو گیا جو فساد اعمال میں مبتلا تھا اسکی بیوی کو کوئی ایسا شخص نہیں مل سکا جو جنازہ اٹھانے میں

اسکی مدد کرتا کیوں کہ کثرت فق کی وجہ سے کوئی شخص اس کے قریب نہیں آتا تھا، مجبوراً اس نے بوجہ ڈھونڈنے والے بلائے اور ان کی مدد سے جنازہ لے گئی، کسی شخص نے نماز پڑھی اور کرائے کے مزدور اسے دفن کے لئے جنگل میں لے گئے، مقام تدفین سے قریب ایک پہاڑ واقع تھا اور اس پر ایک بڑے بزرگ مسکنت تھے، عورت نے دیکھا گویا وہ جنازے کے شہر بیٹھے ہوئے ہیں، جو نہی جنازہ وہاں پہنچا وہ بزرگ پہاڑ سے اتر کر نیچے تشریف لائے اور اس پر نماز پڑھنے کا ارادہ کیا، انا قاتناہ خبر شہر میں پھیل گئی کہ فلاں بزرگ پہاڑ سے اتر کر جنازہ کی نماز پڑھنا چاہتے ہیں، لوگ یہ خبر سن کر حوق در حوق وہاں پہنچے اور بزرگ کے ساتھ نماز جنازہ ادا کی، لوگوں کو اس واقعے پر بڑی حیرت ہوئی، انھوں نے بزرگ سے پوچھا کہ وہ کس خیال سے نیچے تشریف لائے، بزرگ نے جواب دیا کہ مجھ سے خواب میں کہا گیا تھا کہ فلاں جگہ جاؤ وہاں تمہیں ایک جنازہ ملے گا جس کے ساتھ اسکی بیوی کے علاوہ کوئی نہیں ہے، اس پر نماز پڑھو، اسلئے کہ اسکی مغفرت کدی گئی ہے، لوگوں کو یہ سن کر بڑا تعجب ہوا، بزرگ نے اسکی بیوی کو بلایا اور اسکے حالات معلوم کئے، بیوی نے بتلایا کہ وہ تمام دن شراب کے نشے میں رہتا تھا، بزرگ نے پوچھا کیا تم سوچ کر مٹا سکتی ہو کہ وہ کبھی نیک عمل کر لیا کرتا تھا، بیوی نے کہا ہاں اس میں تین باتیں تھیں، ایک تو یہ جس دن وہ شراب کے نشے میں نہیں ہوتا تھا صبح کے وقت کپڑے بدلنا تھا، اور وضو کر کے ہاجرات نماز ادا کرتا تھا، دوسری بات یہ کہ اسکے گھر میں ایک دو یتیم بچے ہر وقت موجود رہتے تھے، جن پر وہ اپنی اولاد سے زیادہ شفقت کرتا تھا، اور ہر وقت ان کے بارے میں پوچھتا رہتا تھا، تیسری یہ کہ وہ رات کی تاریکی میں سو کر کما کرتا تھا اے اللہ! تو اس غیبت سے (مجھ سے) دونوں کا کون سا گوشہ بھڑکا رہا تھا، بزرگ یہ سن کر واپس چلے گئے اور ان کے ذہن میں جو خطبات قہارہ رفع ہو گیا، صلہ ابن اہم سے منقول ہے کہ انھوں نے اپنے بھائی کی تدفین کی بعد قبر پر یہ شعر پڑھا۔

فَوَلَّانَ تَنْجُ مِنْهَا تَنْجُ مِنْ ذِي عَظِيمَةٍ
وَلَا قَاتِنِي لَا أَخَالَكَ نَجِيًّا

(اگر تو نے نجات پائی تو ایک زبردست مرحلے سے نجات پائے گا ورنہ مجھے خیال نہیں کہ تو نجات پا سکے گا۔)

قبر کا حال، اور قبور پر بزرگوں کے اقوال: ضحاکؒ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ! لوگوں میں سب سے زیادہ زاہد کون ہے؟ فرمایا وہ شخص جو قبر کو اور اپنے جسم کے کفنے سونے کو فراموش نہ کرے، اور دنیا کی زائد نعمت ترک کر دے، اور باقی رہنے والی چیز کو فنا ہو جانے والی چیز پر ترجیح دے، اور اپنی زندگی میں آنے والے کل کو شمار نہ کرے، اور خود کو قبور والوں میں تصور کرے، حضرت علیؓ کرم اللہ وجہہ سے کسی نے دریافت کیا کہ آپ قبرستان کے پڑوس میں کیوں آباد ہیں، فرمایا: وہ بہترین اور سچے پڑوسی ہیں، اپنی زبانیں دوتے ہیں، اور آخرت کا ذکر کرتے ہیں، سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں۔

مَا رَأَيْتُ مَنْظَرًا إِلَّا وَالْقَبْرِ أَفْظَعَ مِنْهُ (۱)

حضرت عمر ابن الخطابؓ فرماتے ہیں کہ ہم سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ قبرستان گئے، آپ ایک قبر کے پاس بیٹھ گئے، میں آپ سے لوگوں میں سب سے نزدیک تھا، آپ رونے لگے، میں بھی رویا، اور دوسرے لوگ بھی رونے لگے، سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیوں روتے ہو؟ ہم نے عرض کیا آپ کو دیکھ کر روتے ہیں، فرمایا یہ میری والدہ آمنہ بنت وہب کی قبر ہے، میں نے اپنے رب سے والدہ محترمہ کی قبر کی زیارت کی اجازت مانگی تھی، چنانچہ مجھے اجازت دیدی گئی، میں نے اللہ سے دعائے مغفرت کے لئے بھی اجازت چاہی تھی مگر اس سے منع کر دیا گیا، اس لئے مجھ پر وہ رقت غالب ہو گئی جو اولاد کو والدین کے لئے ہوتی ہے، (۲) حضرت عثمان ابن عفانؓ ایک قبر پر کھڑے ہوئے اور اس قدر رونے لگے کہ آپ کی داڑھی مبارک تر ہو گئی، کسی نے عرض کیا کہ آپ جنتِ دونوں کے ذکر پر نہیں رونے، اور جب قبر پر کھڑے ہوتے ہیں تو روتے ہیں، فرمایا میں نے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ قبر آخرت کی پہلی منزل ہے، اگر آدمی اس سے نجات پالیتا ہے تو بعد کی منزلیں آسان ہو جاتی ہیں، اور اگر نجات نہیں پاتا تو بعد کی منزلیں دشوار رہتی ہیں، (ترمذی، ابن ماجہ، حاکم) روایت یہ کہ حضرت عمرو ابن العاصؓ ایک قبرستان دیکھ کر سواری سے اترے اور دو رکعت نماز پڑھی، لوگوں نے کہا ایسا تو آپ نے پہلے کبھی نہیں کیا تھا؟ فرمایا میں نے قبور والوں کو اور اس

(۱) یہ روایت پہلے بھی گزر چکی ہے (۲) یہ روایت پہلے بھی گزری ہے

چیز کو جو اسکے درمیان واقع ہے یاد کیا تو یہ بہتر جانا کہ دو رکعت نماز پڑھ کر اللہ کی قربت حاصل کروں، حضرت مجاہد فرماتے ہیں کہ ابن آدم سے سب سے پہلے اسکی قبر کھنکھو کرتی ہے، اور کہتی ہے میں کیڑوں کا گھر ہوں، تنہائی، اجنبیت، اور تاریکی کا مکان ہوں، یہ تو میں نے حیرے لئے تیار کر رکھا ہے، تو نے میرے لئے کیا تیاری کی ہے۔ حضرت ابو ذرؓ نے لوگوں سے فرمایا میں تمہیں اپنی عقلی کے دن کے متعلق نہ بتلاؤں، یہ وہ دن ہے جس میں میں قبر کے اندر رکھا جاؤں گا، ابو الدرداءؓ قبروں کے پاس بیٹھتے تھے، لوگوں نے پوچھا آپ ایسا کیوں کرتے ہیں فرمایا میں ایسے لوگوں کے پاس بیٹھتا ہوں جو مجھے میری آخرت یاد دلاتے ہیں، اور جب میں ان کے پاس نہیں ہوتا تو میری غیبت نہیں کرتے، جعفر ابن محمد رات کو قبرستان میں جایا کرتے تھے، اور کہتے تھے کہ اے قبر والو! جب میں تمہیں پکارتا ہوں تو تم جواب کیوں نہیں دیتے، پھر فرماتے بخدا ان کے اور جواب کے درمیان کوئی شئی حائل ہے، اور گویا میں بھی ان جیسا نہیں ہوں، پھر صبح تک نماز پڑھتے رہتے، حضرت عمر ابن عبدالعزیزؓ نے اپنے ایک ہم نشین سے ارشاد فرمایا اے فلاں! میں تمام رات قبر اور اسکے رہنے والے کے حلق سوچتا رہا اور جاگتا رہا، اگر تو مرنے کو تین دن کے بعد قبر میں دیکھ لے تو اسکے قرب سے وحشت زدہ ہو جائے جب کہ زندگی میں تو اس سے مانوس تھا، تو ایک ایسا گھر دیکھے جس میں کیڑے دوڑتے ہیں، پیپ بہتی ہے، اور کیڑے اس کا جسم کھاتے ہیں، گھر بدل گیا ہے، کفن پر اٹا ہو گیا ہے، جب کہ وہ بہترین خوشبوؤں میں سما ہوا، صاف ستھرا اور پاکیزہ تھا، راوی کہتے ہیں کہ یہ کہہ کر آپؐ نے ایک زبردست سچ ماری اور بے ہوش ہو کر گر پڑے، یزید الرقاشیؓ کہتے تھے اے وہ شخص جو اپنی قبر میں مدفون ہے، اور اپنے مدفن میں تھا ہے، اگر اس کے ساتھ کوئی ہے تو اسکے اعمال ہیں میں نہیں جانتا کہ تجھے کون سے اعمال سے خوشخبری ملی ہے، اور اپنے کن بھائیوں پر رشک کیا ہے؟ یہ کہہ کر اس قدر رونے لگا کہ عمامہ تر ہو جاتا، پھر بخدا اتنے نیک و صالحہ سے بشارت حاصل کر، اور ان بھائیوں پر رشک کر جو اللہ کی اطاعت پر ایک دوسرے سے معاونت کرتے ہوں، قبر دیکھ کر آپؐ اس قدر ڈراتے جیسے ذبح ہوتا ہوا تیل ڈکراتا ہے، حاتم اصم کہتے ہیں کہ جو شخص قبرستان کے پاس سے گزرے اور اپنے متعلق نہ سوچے اور نہ مردوں کے لئے دعائے مغفرت کرے وہ اپنے نفس کے ساتھ بھی خیانت کرنے والا ہے، اور مردوں کی ساتھ بھی، بکر العابد اپنی ماں سے کہتے ہیں اتنی جان! کاش آپؐ میری پیدائش سے بانجھ رہتیں، اسلئے کہ آپؐ کے بیٹے کو قبر میں طویل قید ہونے والی ہے، اس کے بعد اگلا سفر درپیش ہے، یحییٰ ابن معاذؓ کہتے ہیں اے ابن آدم! تجھے حیران و سلا متی کے گھر کی طرف بلانا ہے، اب تو یہ دیکھ کہ تو اپنے رب کی دعوت کہاں سے قبول کرتا ہے، اگر دنیا میں قبول کرتا ہے، اور سفر کی تیاری کرتا ہے تو تجھے جنت میں داخلہ نصیب ہوگا، اور اگر قبر میں کرتا ہے تو تجھے اس سے روک دیا جائے گا۔ حسن ابن صالح جب قبروں کے پاس سے گزرتے تو کہتے تمہارے ظاہر اچھے ہیں، لیکن مہمبتیں تمہارے اندر ہیں، عطاء سلیؓ کا دستور یہ تھا کہ جب رات ہو جاتی تو قبرستان تشریف لے جاتے، اور کہتے اے قبر والو! تم مر گئے ہو، ہائے افسوس! تم نے اپنے اعمال کا مشاہدہ کر لیا ہے، وائے افسوس! پھر کہتے کل کے دن قبر میں عطاء ہوگا، ٹوری فرماتے ہیں جو شخص بکھرت موت کا ذکر کرتا ہے اسے جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ملتا ہے، اور جو موت سے غافل رہتا ہے اسے دوزخ کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا دیا جاتا ہے۔ ربیع ابن خثیمؓ نے اپنے گھر میں ایک قبر نما گڑھا کھود رکھا تھا، جب کبھی اپنے دل میں سختی محسوس کرتے اس میں لیٹ جاتے اور جب تک چاہتے لیٹے رہتے، پھر یہ آیت پڑھتے۔

رَبِّ ارْجِعُونِي لَعَلِّيْ اَعْمَلُ صَالِحًا فِيمَا تَرَكْتُ (پ ۶۱۸ آیت ۹۹-۱۰۰)

اے میرے رب مجھ کو پھر واپس بھیج دیجئے تاکہ جس (دنیا) کو میں چھوڑ آیا ہوں، اس میں پھر جا کر نیک کام کروں۔ پھر یہ کہتے ہوئے اٹھ جاتے، اے ربیع! تیرے رب نے تجھے واپس کر دیا ہے، اب عمل کر، احمد ابن حرب کہتے ہیں کہ زمین ایسے شخص پر تعجب کرتی ہے جو اپنے لیٹنے کی جگہ درست کرتا ہے، اور اس پر سونے کے لئے بستر بچھاتا ہے، اور کہتی ہے کہ اے ابن آدم! تو اپنے دیر تک سڑتے رہنے کو کیوں یاد نہیں کرتا تیرے اور میرے درمیان کوئی چیز خالی نہیں ہوگی، میمون ابن مهران کہتے ہیں کہ میں حضرت عمر ابن عبدالعزیزؓ کے ساتھ قبرستان گیا، آپؓ قبریں دیکھ کر رو پڑے، پھر مجھ سے فرمانے لگے کہ اے میمون! یہ ہمارے آباء و اجداد بنو امیہ کی قبریں ہیں، اب ایسے ہو گئے ہیں گویا دنیا والوں کے ساتھ ان کی لذتوں میں شریک ہی نہیں تھے، دیکھو

کیسے شکست خوردہ پڑے ہوئے ہیں، ان پر مصائب ٹوٹ پڑے ہیں، اور بوسیدگی پختہ ہو گئی ہے، کیڑے ان کے جسموں میں آرام کرتے ہیں، اس کے بعد روئے، اور کہنے لگے بخدا میں ان قبر والوں میں سے کسی کو ایسا نہیں جانتا کہ وہ اللہ کے عذاب سے محفوظ رہ گیا ہو، ثابت البنانی کہتے ہیں کہ میں ایک قبرستان میں گیا، جب وہاں سے واپس آنے لگا تو ایک آواز آئی کہ اے ثابت! تو قبرستان والوں کی خاموشی سے فریب مت کھانا، ان میں سے بہت سے نفوس مغموم ہیں، روایت ہے کہ فاطمہ بن حسین نے اپنے شوہر حسن ابن الحسن کا جنازہ دیکھا، اور اپنے چہرے پر کپڑا ڈال کر یہ شعر پڑھا۔

وَكَا نَوَارٍ جَاءَتْهُمْ أَمْسُؤَازِيَّةٌ لَقَدْ عَظُمَتْ نِلْكَ الزَّوَايَا وَجَلَتْ

(پہلے امید تھی پھر مصیبت (کا باعث) بن گئے، یہ مصیبتیں کس قدر عظیم اور زبردست ہیں۔)

روایت ہے کہ انھوں نے اپنے شوہر کی قبر پر ایک خیمہ لگالیا تھا، سال بھر تک وہاں مقیم رہیں اسکے بعد خیمہ اکھاڑ کر سینہ منور واپس چلی آئیں، جس وقت واپس ہو رہی تھیں، جنت البقیع کی طرف سے آواز آئی کیا کھوئی ہوئی چیز واپس مل گئی، دو سری جانب سے آواز آئی بلکہ مایوس ہو کر واپس ہوئی، ابو موسیٰ اسمعیلی کہتے ہیں کہ فرزدق شاعر کی بیوی کا انتقال ہو گیا، اس کے جنازے میں بھرے کے بڑے بڑے لوگ شریک تھے، ان میں حضرت حسنؓ بھی تھے، حضرت حسنؓ نے فرزدق سے پوچھا اے ابو فراس! تو نے اس دن کے لئے کیا تیاری کر رکھی ہے، فرزدق نے کہا ساٹھ برس سے اللہ کی وحدانیت کی گواہی اسی دن کے لئے دے رہا ہوں، جب تدفین مکمل ہو گئی تو اس نے اپنی بیوی کی قبر پر کھڑے ہو کر یہ شعر پڑھا۔

أَخَافُ وَرَاءَ الْقَبْرِ أَنْ لَمْ تَعَافِنِي إِذَا حَاءَ نَبِيَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ قَائِدُ
أَشَدَّ مِنَ الْقَبْرِ التَّهَابًا عَنِيفٌ وَسَوَاقٌ يَسُوقُ الْقَرْزَ دَقًا
إِلَى النَّارِ مَغْلُولُ الْقِلَادَةِ أَرْزَقًا لِي الْتَمِشِي

(اگر تیرا غم و کرم شامل حال نہ ہوا تو میں قبر کے بعد اس سے بھی سخت ٹھگی اور سوزش سے ڈرتا ہوں،

جب قیامت کے دن کوئی سخت گیر قائد اور ہنگامے والا آئے گا اور فرزدق کو ہٹا کر لے جائے گا، بلاشبہ آدم کی

اولاد میں وہ شخص ناکام ہے جو پاپہ زنجیر اور نیکیوں رنگ کے ساتھ دونوں کی جانب بڑھے گا)

قبر والوں کے سلسلے میں لوگوں نے یہ شعر بھی کہے ہیں :-

قِفْ بِالْقُبُورِ وَقُلْ عَلَى سَاحَتِهَا
وَمَنْ الْمُكْرَمِ مِنْكُمْ فِي قَعْرِهَا
أَمَّا السُّكُونُ لِيَنْزِي الْعُيُونُ فَوَاحِدُ
لَوْجًا وَتَوَكَّ لَا خَبْرُوكَ بِالسِّنِ
أَمَّا الْمُطِيعُ فَتَارِلُ فِي رَوْضَةٍ
وَالْمُجْرِمُ الطَّاعِي بِهَا مُتَقَلِّبُ
وَعَقَارِبُ تَسْعَى إِلَيْهِ فَرُوحُهُ

مَنْ مِنْكُمْ الْمَعْمُورُ فِي ظُلُمَاتِهَا
قَدْ ذَاقَ بَرْدَ الْآ مِنْ رَوْعَاتِهَا
لَا يَسْتَبِينُ الْفَضْلُ فِي دَرَجَاتِهَا
نَصِيفُ الْحَقَائِقِ بَعْدُ مِنْ حَالَاتِهَا
يُقْضَى إِلَى مَا شَاءَ مِنْ دَوَّحَاتِهَا
فِي حُفْرَةٍ يَأْوِي إِلَى حَيَاتِهَا
فِي شِدَّةِ التَّغْلِيْبِ مِنْ لَدَغَاتِهَا

(قبروں پر کھڑے ہو اور ان کے میدانوں میں پہنچ کر پوچھو کہ تم میں سے کون ان کی تاریکیوں میں گرفتار

ہے اور کون ان کی گہرائی میں مکرم و معزز ہے، اور اس کی دہشتوں سے امن کی ٹھنڈک محسوس کر رہا ہے، پھر

سب پر یکساں سکون نظر آتا ہے، اور ان کے درجات میں کوئی فرق معلوم ہی نہیں ہوتا، لیکن اگر انھوں نے

تجھے جواب دیا تو وہ ایسی زبانوں سے تجھے خبر دیں گے جو قبور کے تمام حالات و حقائق بیان کر دیں، اطاعت گزار

ایک باغ میں ٹھہرے گا، اور اس باغ میں جہاں چاہے گا جائے گا، اور مجرم و سرکش بندہ آگ کے گڑھے میں

ترپے گا اور اسکے سانپوں کی پناہ لے گا، پھر اس کی طرف بڑھیں گے اور اسکی روح انکے ڈننے سے شدید

عذاب میں مبتلا ہوگی)

داود طائی ایک ایسی عورت کے پاس گزرے جو کسی قبر پر بیٹھی ہوئی ہے یہ شعر پڑھ رہی تھی۔
 كَرُمْتُ الْحَيَاةَ وَلَا نِلْتَهَا لَئِنَّا كُنْتُ فِي الْقَبْرِ قَدْ أَحْدُوْنَا
 فَكَيْفَ أَنْوُقَ لِطَعْمِ الْكَرِيِّ وَأَنْتَ بِمُتْنَاكِ قَدْ وَسَلُوْنَا
 (تو زندگی سے محروم ہوا اور اسے دوبارہ نہ پاسا کیوں کہ لوگوں نے تجھے قبر میں دفن کر دیا مہلک میری
 آنکھوں میں غند کہاں سے آئے کہ تو زمین کو تکیہ بنائے لیٹا ہوا ہے)

اسکے بعد وہ عورت کہنے لگی اے بیٹے! کیڑے نے تیرا کون سا رخسار کھانا شروع کیا ہے؟ داؤد نے یہ سن کر ایک چیخ ماری اور
 بے ہوش ہو کر گر پڑے۔

مالک ابن دینار کہتے ہیں کہ میں ایک قبرستان کے پاس گزرا اور میں نے شعر پڑھے۔
 أَتَيْتُ الْقُبُورَ فَنَا دَبَّتْهَا فَأَيْنَ الْمُعْظَمُ وَ الْمُحْتَقَرُ
 وَأَيْنَ الْمَلِكُ يَسْلُطَانِهِ وَأَيْنَ الْمُرْكَبِيُّ إِنَّا مَا افْتَحَرُ
 (میں قبروں پر گیا اور قبر والوں کو آواز دی کہ کہاں ہیں عزت دار اور حقیر لوگ اور کہاں ہیں وہ جو اپنی
 سلطنت پر نازاں تھے اور کہاں ہیں وہ جو فخر و غور میں مبتلا تھے)

مالک ابن دینار کہتے ہیں کہ ابھی یہ شعر پڑھ ہی رہا تھا کہ مجھے ایک آواز سنائی دی، لیکن جس شخص کی یہ آواز تھی وہ مجھے نظر
 نہیں آ رہا تھا، وہ کہہ رہا تھا :-

تَفَانُوا جَمِيعًا فَمَا مُخْبَرٌ وَمَاتُوا جَمِيعًا وَمَاتَ الْخَبَرُ
 تَرُوحُ وَتَغْلُو نَبَاتُ الشَّرِّ فَتَمُحُو مَحَاسِنَ بِلَاغَةِ الضُّورِ
 فَيَا سَائِلِي عَنْ أَنَاكِسٍ مَضُوءَا أَمَا لَكَ فِيمَا تَرَى مُعْتَبَرُ
 (سب لوگ فنا ہو گئے، اب کوئی خبر دینے والا نہیں ہے، تمام لوگ مر گئے اور خبر بھی مر گئی، زمین کے
 کیڑے صبح و شام آتے ہیں، اور ان صورتوں کے محاسن مٹاتے ہیں، اے وہ شخص جو گزر جانے والے لوگوں کا
 حال پوچھتا ہے جو کچھ تو دیکھ رہا ہے کیا اس میں تیرے لئے عبرت نہیں ہے۔)

راوی کہتے ہیں کہ میں یہ شعر سن کر رونا ہوا واپس آیا۔

کتبوں پر لکھے ہوئے شعر: ایک قبر کے کتبے پر یہ دو شعر درج تھے :-
 نَبَاتًا حَيْثُكَ اخْلَاثٌ وَهَسَنٌ صَمُوتٌ وَسُكَّانُهَا نَحْتُ التُّرَابِ خَفُوتٌ
 أَيْهَا جَامِعُ الدُّنْيَا لِعَبِيرٍ بِلَاغَةٍ لِمَنْ تَجْمَعُ الدُّنْيَا وَأَنْتَ تَمُوتُ
 (قبریں خاموش ہیں، لیکن زبان حال سے تجھے اپنے راز سے آگاہ کر رہی ہیں، اور ان میں رہنے والے
 مٹی کے نیچے سوئے ہوئے ہیں، اے وہ شخص! جو لامحدود دنیا جمع کرتا ہے، تو یہ دنیا کس لئے جمع کر رہا ہے جب
 کہ تجھے مرنا ہے)

ایک قبر کے کتبے پر یہ دو شعر لکھے ہوئے تھے۔
 أَيْهَا غَائِمٌ أَمَا نَرَاكَ فَوَاسِعُ وَقَبْرُكَ مَعْمُورُ الْجَوَانِبِ مُحْكَمُ
 وَمَا يَنْفَعُ الْمَقْبُورَ عَمْرَانُ قَبْرِهِ إِنَّا كَانَ فِيهِ جِسْمُهُ يَتَهَدَّمُ
 اے غنیمت لوٹنے والے اگرچہ تیرا گھر کشادہ ہے، اور تیری قبر ہر جانب سے آباد اور محکم ہے، مگر قبر
 کے اندر جو شخص موجود ہے اسکو قبر کی آبادی سے کیا نفع ہو سکتا ہے جب کہ اس میں اس کا جسم گرا رہا ہو۔

ابن السکاک کہتے ہیں کہ میں ایک قبرستان میں گیا وہاں ایک قبر پر یہ شعر کندہ تھے۔
 يَمُرُّ أَقَارِبِي حُبْنَاتِ قَبْرِي كَانَ أَقَارِبِي لَمْ يَعْرِفُونِي
 ذَوُو الْمِيرَاتِ يَنْتَسِمُونَ مَالِي وَمَا يَالُونِ لَنْ حَجَلُوا كَيُونِي
 وَقَدْ أَخْلَوْا سَهَامَهُمْ وَعَاشُوا فَيَا لِمَلُو أَسْرَعُ مَا نَسُونِي
 (میرے اقارب میری قبر کے برابر سے اس طرح گزر جاتے ہیں گویا مجھے جانتے ہی نہیں ہیں، میراث والے میرا مال تقسیم کر لیتے ہیں، اور ذرا سی دیر میں میرے قرضوں کا انکار کر دیتے ہیں، اپنے اپنے حصے لے کر الگ ہو جاتے ہیں، اور زندگی گزارتے ہیں، حالانکہ جتنی جلد انھوں مجھے فراموش کیا ہے، اس سے کہیں جلد امر الٰہی ان تک پہنچنے والا ہے)

ایک قبر پر انھوں نے یہ چند اشعار لکھے ہوئے دیکھے۔
 اِنْ الْحَبِيبِ مِنَ الْاَحْبَابِ مُخْتَلَسٌ
 فَكَيْفَ تَفْرَحُ بِالْاُنْبِيَا وَلَدْنَهَا
 اَصْبَحْتَ يَا غَافِلًا فِي النِّقْصِ مُنْعِمِسَا
 لَا يَرْحَمُ الْمَوْتُ فَاجْهَلْ لِعَزِيهِ
 كَمْ اَخْرَسَ الْمَوْتُ فِي قَبْرِ وَقَفْتَ بِهِ
 قَدْ كَانَ قَضْرُكَ مَعْمُورًا لَهُ شَرَفٌ
 (احباب میں سے ایک حبیب ایک لیا جاتا ہے، موت کو کوئی دربان یا سپردار روک نہیں سکتا، تو دنیا اور اس کی لذت پر کیسے خوش ہوتا ہے، جبکہ تیرے الفاظ اور سانس کم ہوتے جا رہے ہیں، اور تو لذات میں غرق ہو رہا ہے، موت نہ کسی جاہل پر رحم کرتی ہے، اور نہ کسی ایسے شخص پر جس سے علم کی روشنی حاصل کی جاتی ہے، موت نے کتنی ہی زبانوں کو قبر میں جواب سے ساکت کر دیا حالانکہ وہ کوئی نہیں تھیں، تیرا عمل آباد تھا، اسکی عظمت تھی، اور آج تیری قبر کے آثار مٹ رہے ہیں)

ایک قبر پر یہ اشعار درج تھے۔
 قَوِّفْتُ عَلَى الْاَحْبَةِ حِينَ صَفْتُ
 قَبُورَهُمْ كَأَفْرَاسِ الزَّهَانِ
 فَلَمَّا اَنْ بَكَيْتُ وَقَاصُ تَعْنِي
 رَأَتْ عَيْنَايَ بَيْنَهُمْ مَكَانِي
 میں احباب کے پاس سے اس وقت گزرا جب انکی قبریں گھروڑوں کے گھوڑوں کی طرح برابر ہو گئیں، جب میری آنکھوں نے انکے درمیان اپنی جگہ دیکھی تو میں رو پڑا)

ایک حکیم کی قبر کے کتبے پر مندرجہ ذیل اشعار کندہ تھے۔
 قَدْ قُلْتُ لَمَّا قَالَ لِي قَائِلٌ
 قَدْ صَارَ لِقَمَانٍ اِلَى رَمْسِهِ
 فَابْنَ مَا يُوصَفُ مِنْ طَبِ
 وَحَنَقُهُ فِي الْمَاءِ مَعَ حَبِ
 هَيْهَاتَ لَا يَنْفَعُ عَنْ غَيْرِهِ
 مَنْ كَانَ لَا يَنْفَعُ عَنْ نَفْسِهِ
 (جب مجھ سے کسی کہنے والے نے کہا کہ لقمان اپنی قبر میں جاسویا ہے تو میں نے اس سے پوچھا اب وہ طب کہاں گئی جس میں وہ مشہور تھا، اور قاروہ شامی میں اس کی مہارت کہاں گئی، وہ دوسروں کو امراض سے کیسے بچا سکتا تھا جب کہ وہ خود سے امراض دور نہیں کر سکتا)

ایک قبر پر یہ چند اشعار لکھے ہوئے تھے :-

يَا أَيُّهَا النَّاسُ كَانَ لِي أَمَلٌ قَصَرَ بَنِي عَنْ بُلُوغِهِ الْأَجَلُ
فَلْيَتَّقِ اللَّهَ رَبَّهُ رَجُلٌ أُمِنْتُ فِي حَيَاتِهِ الْعَمَلُ
مَا أَنَا وَخَيْتُ نَقِلْتُ حَيْثُ تَرَى كُلُّ إِلَهِي مِثْلِهِ سَيَسْتَقِيلُ

(اے لوگو! میری بھی ایک آرزو تھی جس تک پہنچنے سے میری موت مانع رہی ہے جو شخص دنیا میں عمل

کر سکا ہو اسے اپنے رب سے ڈرنا چاہئے، تمہاری یہاں عقل نہیں ہوا ہوں، بلکہ ہر شخص کو ہمیں پہنچنا ہے)

یہ اشعار قبروں پر اسلئے لکھے گئے ہیں کہ ان کے رہنے والے موت سے پہلے عبرت پکڑنے میں کوتاہ تھے، مگر انسان وہ ہے جو دوسرے کی قبر کو دیکھ کر خود کو اسی میں تصور کرے اور قبر والوں کے ساتھ ملنے کی تیاری کرے، اور یہ بات جان لے کہ وہ لوگ اپنی جگہ سے اس وقت تک نہیں ہٹیں گے جب تک وہ ان میں شامل نہیں ہو جائے گا، اسے یہ بات جان لینی چاہئے کہ اگر قبر والوں کو وہ ایک دن دیدیا جائے جسے وہ ضائع کر رہا ہے تو ان کے نزدیک یہ دن دنیا کی سب سے زیادہ قیمتی شئی ہو، کیوں کہ اب انہیں عمر کی قدر و منزلت کا علم ہوا ہے اور اب ان پر حقائق امور منکشف ہوئے ہیں، انہیں عمر کے ایک دن پر حسرت اسلئے ہے تاکہ کو تباہی کرنے والا اس ایک دن کے ذریعے گزشتہ کو تباہیوں کی حلائی کر سکے، اور عذاب سے محفوظ رہ سکے، اور توفیق یافتہ شخص یہ چاہتا ہے کہ اس کا مرتبہ بلند ہو، اور ثواب زیادہ ملے، گویا انہیں عمر کی قدر کا علم اس وقت ہوا ہے جب وہ پوری ہو چکی ہے، اور زندگی کی ایک ساعت ضائع جانے پر افسوس اس وقت ہوا ہے جب اسکی واپسی کی کوئی صورت نہیں ہے، اور تجھے یہ ساعت حاصل ہے، ہو سکتا ہے تجھے اس جیسی بے شمار ساعتیں ملیں، اور تو انہیں ضائع کر دے، اگر تو نے سبقت کر کے اپنی ساعتوں سے اپنا حصہ وصول نہیں کیا تو اس وقت حسرت کے علاوہ کچھ ہاتھ نہیں آئے گا، جب یہ ساعتیں گزر جائیں گی، اور معاملہ اختیار سے باہر نکل جائے گا۔ ایک بزرگ کہتے ہیں کہ میں نے اپنے ایک بھائی کو خواب میں دیکھ کر کہا الحمد للہ رب العالمین تو زندہ ہے اس نے کہا اگر یہ کلمہ جو تو نے ادا کیا ہے میں کہنے پر قادر ہو جاؤں تو یہ بات میرے لئے دنیا اور اسکی تمام چیزوں سے بہتر ہوگی، کیا تجھے وہ وقت یاد نہیں جب مجھے دفن کیا جا رہا تھا، اور ایک شخص نے وہاں سے اٹھ کر دو رکعت نماز پڑھی تھی، اگر مجھے دو رکعت پڑھنے کی قدرت مل جائے تو یہ دو رکعت میرے لئے دنیا بھر کی نعمتوں سے زیادہ محبوب ہو۔

اولاد کے مرنے پر بزرگوں کے اقوال : جس شخص کا بچہ یا عزیز قریب مر جائے تو اس کے پہلے مرجانے کو ایسا تصور کرے جیسے وہ دونوں سفر میں تھے، دونوں کی منزل ایک ہی شہر تھی، بچہ نے سبقت کی، اور وہ مجھ سے پہلے منزل پہنچ گیا، میں بھی کچھ عرصے کے بعد اس سے جا ملوں گا، دونوں میں تقدیم و تاخیر کا فرق ہے، منزل دونوں کی ایک ہی ہے، اگر اس طرح سوچے گا تو افسوس اور غم کم ہوگا، اور اگر وہ ثواب بھی ذہن میں مختصر کر لے، تو شاید غم بالکل ہی نہ ہو، جو بچے کے مرنے پر روایات میں وارد ہے، سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں پیٹ سے گرا ہوا بچہ آگے بھیجنا میرے نزدیک اس سے بہتر ہے کہ میں اپنے پیچھے سو سوار چھوڑ جاؤں، جو اللہ کی راہ میں جہاد کریں۔ (۱) (۱) مساقہ بچے کا ذکر آپ نے اسلئے فرمایا تاکہ ادنیٰ سے اعلا پر تنبیہ ہو جائے، ورنہ ثواب اس قدر ملتا ہے جس قدر دل میں بچے کے لئے محبت ہوتی ہے، زید ابن اسلم کہتے ہیں کہ حضرت داؤد علیہ السلام کے ایک بیٹے کا انتقال ہو گیا، آپ کو اس کے مرنے کا بے حد رنج ہوا، دریافت کیا گیا کہ آپ کے نزدیک بچے کی کیا حیثیت تھی، فرمایا زمین کے برابر سونے کی حیثیت رکھتا تھا، ان سے کہا گیا تمہیں آخرت میں اسی قدر اجر ملے گا، سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جس مسلمان کے تین بچے مرجاتے ہیں، اور وہ ان پر صبر کرتا ہے تو وہ بچے اسکے لئے دوزخ سے ڈھال بن جاتے ہیں، ایک عورت نے جو سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھی، عرض کیا کہ اگر دو مر جائیں، آپ نے فرمایا اگر دو مر جائیں تب بھی ایسا ہی ہے، والد کو کو چاہئے کہ وہ اپنے بچے کیلئے موت کے وقت دعا کرے اسلئے کہ یہ زیادہ امید والی، اور قبولیت سے قریب تر ہوتی۔ (۲)

(۱) ابن ماجہ۔ ابو ہریرہ۔ مکر سوساؤں کا ذکر نہیں ہے۔ (۲) یہ روایت کتاب النکاح میں گزری ہے۔

محمد ابن سلیمان نے اپنے بیٹے کی قبر پر کھڑے ہو کر کہا اے اللہ! میں تجھ سے اس کے لئے امید رکھتا ہوں اور تجھ سے اس پر خوف کرتا ہوں، میری امید پوری فرما اور خوف سے مامون کر ابوسنان نے بیٹے کی قبر پر کھڑے ہو کر کہا اے اللہ! میں نے وہ حقوق معاف کر دیے ہیں جو میرے اس کے اوپر تھے، تو بھی وہ حقوق معاف فرما دے جو تیرے اس پر واجب ہیں بلاشبہ تو نہایت سخی اور بڑے احسان والا ہے، ایک اعرابی نے اپنے بیٹے کی قبر پر کہا اے اللہ! اس نے میری فرماں برداری میں جو کوتاہی کی وہ میں نے معاف کر دی ہے، تو بھی وہ قصور معاف کر دے جو اس نے تیری اطاعت کی باب میں کیا ہے، جب عمر ابن ذر کے بیٹے ذر کا انتقال ہوا تو عمر ابن ذر نے ان کی تدفین کے بعد کہا، اے ذر! تیری عاقبت کے خوف نے ہمیں حیرے غم سے بے نیاز کر دیا ہے، ہمیں نہیں معلوم کہ تجھ سے کیا کہا جائے گا، اور تو کیا جواب دے گا، پھر کہنے لگے، اے اللہ! یہ ذر ہے، تو نے مجھے اس سے نفع دیا جب تک تو نے نفع دینا چاہا، اور اب تو نے اس کا رزق پورا اور عمر تمام کر دی ہے، اور یہ کوئی ظلم نہیں ہے، اے اللہ! تو نے اس پر میری اور اپنی اطاعت لازم کی تھی، اے اللہ! تو نے مصیبت پر صبر کرنے کے سلسلے میں جس ثواب کا وعدہ کیا ہے، وہ میں اسے پہنچا ہوں، اور تو اس کا عذاب مجھے دیدے، اسے عذاب نہ دینا، لوگ ان کی یہ دعائیں کر رونے لگے، جب تدفین کے بعد واپس ہونے لگے تو فرمایا، اے ذر تیرے بعد ہمیں کسی اور کی حاجت نہیں ہے، اور نہ اللہ کے ہوتے ہوئے ہمیں کسی انسان کی ضرورت ہے، اب ہم چلتے ہیں، اور تجھے یہاں چھوڑتے ہیں، اگر ہم یہاں کھڑے بھی رہے تو تجھے کیا نفع دے پائیں گے، ایک شخص نے بھرے میں ایک عورت کو دیکھا وہ چہرے سے نہایت ترنما تازہ لگ رہی تھی، اس شخص نے کہا کہ تو انتہائی کھفہ نظر آتی ہے، معلوم ہوتا ہے تجھے کوئی غم نہیں ہے، اس نے کہا مجھے تو اتنا غم ہے کہ شاید ہی کسی دوسرے کو اس قدر غم ہو، اس نے پوچھا وہ کیا عورت نے بتلایا کہ میرے شوہر نے عید الاضحیٰ کے دن ایک بکری ذبح کی، میرے دو خوبصورت بچے وہاں کھیل رہے تھے، انھوں نے یہ مٹھو دیکھا، اور کھیل ہی کھیل میں بڑے لڑکے نے چھوٹے سے کہا کیا میں تجھے دکھاؤں کہ ابا جان نے بکری کیسے ذبح کی ہے، چھوٹے بچے نے کہا ہاں، بڑے لڑکے نے اپنے بھائی کو لٹایا، اور اسکے گلے پر چھری پھیر دی، ہمیں اس وقت یہ واقعہ معلوم ہوا جب چھوٹا لڑکا خون میں لت پت ہو گیا، جب بہت زیادہ چیخ و پکار اور آہ و بکا ہوئی تو بڑا لڑکا خوف زدہ ہو کر پہاڑ کی طرف بھاگ گیا، وہاں ایک بھیڑیا موجود تھا، اس نے بچے کو کھالیا، جب میرا شوہر بچے کی تلاش میں گیا تو دھوپ اور پیاس کی شدت سے بے تاب ہو کر مر گیا، اب میں اس دنیا میں بالکل تنہا رہی ہوں۔

اولاد کی موت کے وقت اسی طرح کی مصائب پر نظر رکھنی چاہیے، تاکہ شدت رنج و غم میں ان کے ذریعہ تسلی حاصل کی جاسکے، کوئی مصیبت ایسی نہیں ہے جس سے بڑی مصیبت موجود نہ ہو، اور اللہ اسے دور نہ فرماتا ہو۔

زیارت قبور، میت کے لئے دعا اور اسکے متعلقات : زیارت قبور نصیحت حاصل کرنے اور عبرت پکڑنے کے لئے مستحب ہے، خواہ وہ قبریں عام لوگوں کی ہوں، یا عزیز و اقارب کی، یا صلحاء کی، تاہم صلحاء کی قبروں کی زیارت کرنے سے عبرت کے علاوہ برکت بھی حاصل ہوتی ہے، سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے زیارت قبور سے منع فرمایا تھا اسکے بعد اجازت عطا کی تھی (مسلم - بریدہ) حضرت علیؓ روایت کرتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

كُنْتُ نَهَيْتُكُمْ عَنْ زِيَارَةِ الْقُبُورِ فَزُورُوهَا فَإِنَّهَا تَذَكِّرُكُمْ الْآخِرَةَ غَيْرَ أَنْ لَا تَقُولُوا هَاجِرًا (احمد، ابو حنیفہ، ابن ابی الدنیا)

میں نے تمہیں زیارت قبور سے منع کیا تھا، (اب) تم ان کی زیارت کرو، اسلئے کہ زیارت قبور تمہیں آخرت کی یاد دلائے گی، تاہم کوئی غلط بات مت کرنا۔

سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ہزار مسلح صحابہ کرام کے ساتھ اپنی والدہ محترمہ کی قبر کی زیارت کی، اس دن آپ جس قدر روئے، اس سے پہلے کبھی نہیں روئے تھے (ابن ابی الدنیا - بریدہ) اس دن کے متعلق آپ نے ارشاد فرمایا کہ مجھے زیارت کی اجازت دی گئی، لیکن استغفار کی اجازت نہیں دی گئی۔ (مسلم - ابو ہریرہ) ابن ابی ملیکہ روایت کرتے ہیں کہ ایک دن ام المومنین حضرت عائشہؓ قبرستان سے تشریف لائیں، میں نے پوچھا یا ام المومنین! آپ کہاں سے تشریف لاری ہیں، آپ نے فرمایا

میں اپنے بھائی عبدالرحمن کی قبر پر گئی تھی میں نے عرض کیا کیا سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع نہیں فرمایا تھا؟ آپ نے فرمایا ہاں منع فرمایا تھا پھر اجازت دیدی تھی (ابن ابی الدنیا) لیکن اس روایت کو بنیاد بنا کر عورتوں کو قبرستان میں جانے کی اجازت دینا مناسب نہ ہوگا کیوں کہ عورتیں قبرستان میں جا کر بہت زیادہ لغو اور بے ہودہ حرکتیں کرتی ہیں، اس لئے ان کی زیارت میں جتنا شر ہے، اسکی طمانی اس خیر سے نہیں ہو سکتی جو قبرستان جانے میں مضمر ہے، علاوہ ازیں عورتیں راستے میں بے پردہ ہو جاتی ہیں، اور بن سنور کر نکلتی ہیں، یہ سخت گناہ کی باتیں ہیں جب کہ زیارت قبور محض سنت ہے، صرف سنت کے لئے ان گناہوں کو برواشت نہیں کیا جاسکتا، ہاں اگر کوئی عورت پھٹے پرانے، اور بوسیدہ کپڑے پہن کر اس طرح نکلے کہ مردوں کی نظریں اس کا طواف نہ کریں، تو کوئی مضائقہ نہیں، بشرطیکہ وہ صرف دعا پر استغفار کرے، اور قبر پر کھڑے ہو کر کوئی گفتگو نہ کرے۔ حضرت ابو ذرؓ کہتے ہیں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:-

زُرُّ الْقُبُورَ تَذَكُّرُ بِهَا الْآخِرَةَ وَاغْتَسِلَ الْمَوْتَى فَإِنَّ مَعَالِجَةَ جَسَدِهَا وَمَوْعِظَةٌ بِلَيْعَةٍ وَصَلَّ عَلَى الْجَنَائِزِ لَعَلَّ ذَلِكَ أَنْ يُخَزِّنَكَ فَوَانَ الْحَزِينِ فِي ظِلِّ اللَّهِ (ابن ابی الدنیا۔ الحاکم)

قبوروں کی زیارت کر، اس سے آخرت یاد رہے گی، مردے کو غسل دے، اسلئے کہ بے جان جسم کو ہلانے جلانے میں زبردست صعبت ہے، اور جنازوں پر نماز پڑھ، شاید اس سے تو غمگین ہو، اسلئے کہ غمگین انسان اللہ کے سامنے ہوتا ہے۔

ابن ابی ملیکہ کہتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

رُؤُورُ أَمْوَاتِكُمْ وَسَلَامُكُمْ عَلَيْهِمْ فَإِنَّ لَكُمْ فِيهِمْ عِبْرَةً (ابن ابی الدنیا)

اپنے مردوں کی زیارت کرو، اور ان پر سلامتی بھیجو اسلئے کہ تمہارے لئے ان میں عبرت ہے۔

نافع روایت کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ اگر کسی قبر کے پاس سے گزرتے تو اس پر کھڑے ہوتے اور سلام کرتے، جعفر ابن محمد اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی حضرت فاطمہؓ اپنے چچا حضرت حمزہؓ کی قبر کی زیارت کیلئے تھوڑے تھوڑے دنوں کے بعد جایا کرتی تھیں، وہاں نماز پڑھتی تھیں اور رویا کرتی تھیں، سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:-

مَنْ زَارَ قَبْرَ أَبِيهِ أَوْ أَحَدِهِمَا فِي كُلِّ جُمُعَةٍ غُفِرَ لَهُ وَكُتِبَ بِهِ رَاحَةً (طبرانی۔ ابو ہریرہ)

جو شخص ہر جمعہ کو اپنے والدین یا ان دونوں میں سے ایک کی قبر کی زیارت کرتا ہے، اس کے گناہ بخش دئے جاتے ہیں، اور اسے نیک لکھا جاتا ہے۔

ابن سیرین روایت کرتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر کسی شخص کے والدین انتقال کر جائیں، اور وہ زندگی میں انکی نافرمانی کرتا ہو، اب اگر انتقال کے بعد ان کے لئے دعائے مغفرت کرے تو اللہ اسے فرماں برداروں میں لگتا ہے (ابن ابی الدنیا مرسل) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:-

مَنْ زَارَ قَبْرِي فَقَدْ وَجَّهَتْ لَهُ شَفَاعَتِي

جس شخص نے میری قبر کی زیارت کی اسکے لئے میری شفاعت واجب ہو گئی۔

ایک موقع پر ارشاد فرمایا:-

مَنْ زَارَنِي بِالْمَدِينَةِ مُحْتَسِبًا كُنْتُ لَهُ شَفِيعًا وَ شَهِيدًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ

جس شخص نے ثواب کی نیت سے مدینے میں میری زیارت کی میں قیامت کے روز اس کے لئے سفارشی

اور گواہ ہوں گا۔

حضرت کعب الاخبار فرماتے ہیں کہ ہر دن طلوع فجر کے وقت ستر ہزار فرشتے آسمان سے اترتے ہیں اور سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر شریف کو ڈھانپ لیتے ہیں اور اپنے بازو پھڑپھڑاتے ہیں اور آپ پر دودھ پڑھتے ہیں جب شام آجاتی ہے تو یہ فرشتے آسمان پر چلے جاتے ہیں اور ان جیسے دوسرے فرشتے اترتے ہیں اور (صبح تک) ایسا ہی کرتے ہیں جیسا انھوں نے کیا تھا یہاں تک کہ جب زمین شق ہوگی تو آپ ستر ہزار فرشتوں کے جلو میں باہر تشریف لائیں گے اور یہ سب آپ کا اعزاز کریں گے۔

زیارت قبور کے آداب : زیارت قبور میں مستحب یہ ہے کہ قبلہ کی طرف پشت کرے اور میت کی طرف رخ کر کے کھڑا ہو اور اسے سلام کرے نہ قبر کے اوپر ہاتھ پھیرے نہ اسے چھوئے نہ بوسہ دے اسلئے کہ یہ تمام باتیں نصاریٰ کی ہیں نافع کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کو سو سے زائد بار دیکھا کہ آپ روضہ الطہر پر حاضر ہوتے اور کہتے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام ابو بکر کو سلام اور میرے والد کو سلام اور یہ کہہ کر واپس ہو جاتے ابو امامہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت انس ابن مالکؓ کو دیکھا کہ آپ روضہ اقدس پر حاضر ہوئے اور اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے یہاں تک کہ میں نے یہ گمان کیا کہ شاید انھوں نے نماز شروع کی ہے مگر آپ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کر کے واپس ہو گئے حضرت عائشہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتی ہیں کہ جو شخص اپنے بھائی کی قبر کی زیارت کرتا ہے اور اس کے پاس بیٹھتا ہے صاحب قبر اس سے مانوس ہوتا ہے اور اسکے سلام کا جواب دیتا ہے یہاں تک کہ وہ کھڑا ہو (ابن ابی الدنیا) سلیمان ابن حکم کہتے ہیں کہ میں نے خواب میں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی اور آپ سے عرض کیا یا رسول اللہ علیہ وسلم! یہ لوگ آپ کے پاس آتے ہیں اور سلام کرتے ہیں کیا آپ ان کا سلام سمجھتے ہیں؟ آپ نے ارشاد فرمایا ہاں اور میں جواب بھی دیتا ہوں حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ جب آدمی اپنے کسی جاننے والے کی قبر کے پاس سے گزرتا ہے اور اسے سلام کرتا ہے تو صاحب قبر بھی اسے پہچان لیتا ہے اور سلام کا جواب دیتا ہے اور جب کسی انجان آدمی کی قبر کے پاس سے گزرتا ہے تو اسے پہچانتا نہیں ہے لیکن سلام کا جواب دیتا ہے عامم الجدری کی اولاد میں سے ایک شخص کہتا ہے کہ میں نے عامم کو ان کے انتقال کے دو سال بعد خواب میں دیکھا اور پوچھا کہ آپ کا انتقال نہیں ہو گیا؟ انھوں نے کہا ہاں! میں نے پوچھا اب آپ کہاں رہتے ہیں؟ انھوں نے جواب دیا بخدا میں جنت کے باغوں میں سے ایک باغ میں ہوں میں اور میرے رفقاء ہر جمعہ کی شب اور صبح میں ابو بکر ابن عبد المزیٰ کے یہاں جمع ہوتے ہیں اور تم لوگوں کی خبریں سنتے ہیں میں نے پوچھا اپنے جہنم کے ساتھ یا روحوں کے ساتھ؟ عامم نے جواب دیا اجسام گل جکے ہیں صرف روحیں ملتی ہیں میں نے دریافت کیا کہ ہم آپ کی قبروں پر جاتے ہیں کیا آپ کو ہماری زیارت کا علم ہو جاتا ہے کہنے لگے ہاں ہمیں شب جمعہ، یوم جمعہ اور شبے کے دن طلوع شمس تک کی زیارتوں کی اطلاع ہو جاتی ہے میں نے کہا دوسرے دنوں میں کیوں نہیں ہوتی؟ انھوں نے کہا اسلئے کہ جمعہ کا دن افضل ہے محمد ابن الواسع جمعہ کے دن قبرستان جایا کرتے تھے کسی نے ان سے کہا کہ آپ ہر کے دن بھی جاسکتے ہیں فرمایا میں نے سنا ہے کہ جمعہ کے دن اور اس سے ایک دن پہلے اور ایک دن بعد مردوں کو زیارت کرنے والوں کی اطلاع ہوتی ہے ضحاک کہتے ہیں کہ جو شخص جمعہ کے دن سورج نکلنے سے پہلے کسی قبر کی زیارت کرتا ہے تو مرنے والے کو اس کا علم ہو جاتا ہے لوگوں نے پوچھا اسکی کیا وجہ ہے انھوں نے جواب دیا کہ جمعہ کی عظمت کی وجہ سے۔ بشر ابن منصور کہتے ہیں کہ طاعون کے زمانے میں ایک شخص بکھرت قبرستانوں میں جاتا تھا اور جنازوں کی نماز پڑھا کرتا تھا جب شام کے وقت وہ گھر واپس ہوتا تو قبرستان کے دروازے پر کھڑا ہو کر کہتا کہ اللہ تمہاری وحشت کو انس سے بدلے تمہاری غریب الوطنی پر رحم کرے اور تمہارے گناہوں کو معاف فرمائے اور تمہاری نیکیاں قبول فرمائے ان کلمات سے زائد کچھ نہ کہتا تھا یہ شخص کہتا ہے کہ ایک دن میں قبرستان نہ جا سکا رات کو میں نے خواب میں دیکھا کہ میت سے لوگ میرے پاس آئے میں نے ان سے دریافت کیا تم لوگ کون ہو اور میرے پاس کیوں آئے ہو انھوں نے کہا ہم قبرستان سے آئے ہیں جب تم ہمارے پاس سے شام کو واپس آتے تھے تو ہمیں ایک تحفہ دے کر آتے تھے میں نے پوچھا تحفہ کیا ہوتا تھا انھوں نے کہا وہ دعاؤں کا تحفہ تھا آج ہم تمہارے

تھے سے محروم رہے، میں نے کہا آج کے بعد میں کبھی قبرستان جانا ترک نہیں کروں گا، اور تمہیں تحفہ ملتا رہے گا۔
 بشار ابن غالب فخرانی کہتے ہیں کہ میں نے مشہور عابدہ رابعہ حدادیہ بصریہ کو خواب میں دیکھا میں ان کے لئے بہت زیادہ دعائیں مانگا کرتا تھا، انہوں نے مجھ سے فرمایا اے بشار! تیرے ہدایا ہمیں ریشمی رومال سے ڈھانپنے ہوئے نورانی طباق میں ملتے ہیں، میں نے عرض کیا وہ کیسے؟ کہنے لگیں جو زندہ مومن اپنے مرنے والوں کے حق میں خیر کی دعا کرتے ہیں وہ قبول ہو جاتی ہے، اور نور کے طباق میں رکھ کر اسکے اوپر ریشم کا رومال ڈالا جاتا ہے، اور مرنے کو یہ طباق دے کر کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص نے تجھے یہ ہدیہ بھیجا ہے، سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ قبر میں مرنے کا حال ایسا ہوتا ہے جیسے فریاد خواہ ڈوبنے والے کا، مردہ ایسی دعا کا منتظر رہتا ہے جو اسے باپ، بھائی، دوست سے ملنے والی ہو، جب اسے یہ دعا ملتی ہے تو اس کے نزدیک دنیا اور اسکی تمام چیزیں محبوب تر ہو جاتی ہے، مرنے والوں کے لئے زندوں کے تحفے دعا اور استغفار ہیں (ابو منصور دہلیک ابن عباس) ایک بزرگ کہتے ہیں کہ میرے بھائی کا انتقال ہو گیا تھا، تدفین کے بعد رات کو میں نے اسے خواب میں دیکھا اور پوچھا کہ جب تجھے دفن کیا گیا تو قبر میں میرے ساتھ کیا معاملہ ہوا، اس نے کہا ایک شخص میرے پاس آگ کی شہاب لے کر آیا، اگر کوئی شخص میرے لئے دعائے مغفرت نہ کرتا تو یقیناً وہ آگ مجھے جلا دیتی۔

اسی لئے دفن کے بعد میت کو تلقین کرنا، اور اس کے لئے دعا کرنا مستحب ہے، سعید ابن جبشہ ازدی کہتے ہیں کہ میں ابو امامہ باہلی کی خدمت میں حاضر ہوا، اس وقت رمضان کے عالم میں تھے، انہوں نے فرمایا اے ابو سعید! جب میں مراؤں تو میرے ساتھ وہ معاملہ کرنا جس کا حکم سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جب تم میں سے کوئی مر جائے اور تم اس کی مٹی برابر کر چکو تو تم میں سے ایک شخص قبر کے سرہانے کھڑا ہو اور یہ کہے کہ اے فلاں ابن فلاں، وہ (تمہارا یہ خطاب سنے کا جواب نہیں دے گا) پھر کہے اے فلاں ابن فلاں (یہ آواز سن کر وہ سیدھا ہو کر بیٹھ جائے گا، تیسری مرتبہ بھی یہی کہے، اس وقت کہے گا رہنمائی کر، اللہ تجھ پر رحم فرمائے، تم اسکا یہ جواب سن نہیں سکو گے، پھر اس سے کہے کہ وہ بات یاد کر جس پر تو دنیا سے نکلا ہے، یعنی اس بات کی شہادت کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں، اور یہ کہ تو اس پر راضی ہے کہ رب ہے، دین اسلام ہے، محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں، قرآن امام ہے (اگر تم نے اسے یہ تلقین کی تو) مگر کثیر اسکے پاس سے ہٹ جائیں گے اور ایک دوسرے سے کہیں گے یہاں سے چلو، ہمیں اسکے پاس بیٹھنے کی کیا ضرورت ہے، اسے تو حجت سکھلا دی گئی ہے، اور اللہ اس کی طرف سے مگر کثیر کو جواب دے گا، ایک شخص نے عرض کیا یا رسول! اگر اس کی ماں کا نام معلوم نہ ہو تو؟ آپ نے فرمایا اسے خواہاں کیا کہہ کر پکارے (طبرانی رحمہ سعید ابن جبشہ) قبروں پر قرآن کریم کی تلاوت کرنے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے، علی ابن موسیٰ حداد کہتے ہیں کہ میں ایک جنازہ میں امام احمد ابن حنبل کے ہمراہ تھا، محمد ابن قدامہ جو ہری بھی ہمارے ساتھ تھے، جب میت کو دفن کیا گیا تو ایک نابینا شخص آیا اور قبر کے پاس کھڑا ہو کر قرآن کریم پڑھنے لگا، امام احمد ابن حنبل نے فرمایا یہ کیا کرتے ہو، قبر پر قرآن پڑھنا بدعت ہے، جب ہم قبرستان سے باہر آگئے تو محمد ابن قدامہ نے امام صاحب سے پوچھا کہ آپ مہر ابن اسماعیل الجلبلی کے متعلق کیا کہتے ہیں، فرمایا اللہ ہے، انہوں نے پوچھا کیا آپ نے اس سے کچھ لکھا ہے، آپ نے فرمایا ہاں لکھا ہے، محمد ابن قدامہ نے کہا کہ مجھے مہر ابن اسماعیل نے خبر دی ہے، وہ عبد الرحمن ابن الطاء اللہاج سے روایت کرتے ہیں، اور وہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے وصیت فرمائی کہ جب مرنے کو دفن کر دیا جائے تو اسکے سرہانے سورۃ بقرۃ کی ابتدائی اور آخری آیتیں پڑھی جائیں، اور وہ کہتے ہیں کہ میں نے ابن عمر کو بھی اسکی وصیت کرنے ہوئے سنا ہے، امام احمد نے ان سے کہا اب اس نابینا شخص کے پاس جاؤ اور اس سے کہو کہ وہ قرآن پڑھے۔ محمد ابن احمد السوزی کہتے ہیں کہ میں نے امام احمد ابن حنبل سے سنا ہے کہ جب تم قبرستان جاؤ تو سورۃ فاتحہ، سورۃ تین اور سورۃ اخلاص پڑھو، اور اس کا ثواب مردوں کو بخش دیا کرو، اسلئے کہ ثواب ان تک پہنچ جاتا ہے، ابو قلابہ کہتے ہیں کہ میں شام سے بصرے آیا، اور میں نے ایک شخص میں اتر کر وضو کیا، اور رات میں دو رکعت نماز پڑھی، پھر میں ایک قبر پر سر رکھ کر سو گیا، خواب میں دیکھا کہ صاحب قبر مجھ سے بطور شکایت کہہ رہا ہے کہ تو نے تمام رات مجھے اذیت میں

جتلا رکھا، پھر کما تم نہیں جانتے، ہم جانتے ہیں، اور ہم عمل پر قادر نہیں ہیں، تم نے جو دودھ کتنی رات بڑھی ہیں وہ ہمارے نزدیک دنیا و مافیہا سے بہتر ہیں، اللہ دنیا والوں کو ہماری طرف سے جزائے خیر عطا فرمائے، تم انھیں سلام پہنچانا بھی بھی ان کی دعا کی وجہ سے ہمیں پہاڑ کے برابر نور مل جاتا ہے۔

بہر حال زیارت قبور سے مقصود یہ ہے کہ زائر کو عبرت حاصل ہو، اور صاحب قبر کو خیر و برکت ملے، اس لئے زائر کو اپنے لئے میت کے لئے دعا کرنے سے غافل نہ ہونا چاہئے اور عبرت حاصل کرنے کا کوئی موقع نہ ہوتا ہے، عبرت اس طرح حاصل ہو سکتی ہے کہ اپنی دل میں میت کا تصور کرے کہ کس طرح اس کے اجزاء بکھر گئے، اور وہ کس طرح قبر سے اٹھایا جائے گا، اور خود اسے بھی اس انجام کو بہت جلد پہنچنا ہے، مطرف ابن ابی بکر اہلبندی روایت کرتے ہیں کہ بنو عبد قیس میں ایک عبادت گزار یوڑمی عورت تھی، جب رات آئی تو وہ کمر بہت کس کر نماز کے لئے کھڑی ہو جاتی، اور دن لگتا تو قبرستان چلی جاتی، لوگوں نے اس کثرت سے قبرستان آنے جانے پر طاعت بھی کی، اس نے اپنے طاعت گروں سے کہا کہ پھر دل کیجو یہ پرانے اور شکستہ کھنڈر نرم کرتے ہیں میں قبروں پر آئی ہوں، اور مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے گویا ان کے اندر سے لوگ اٹھ کھڑے ہوئے ہیں، ان کے چہرے خاک آلود ہیں، جسم خفیف ہے، اور کفن بوسیدہ ہے، اگر کسی پاس یہ دیدہ بیٹا ہو تو اس کا کیا کہنا، اگر بعدوں کو یہ نظر حاصل ہو جائے تو ان کے نفس کس قدر تلخی محسوس کریں، اور ان کے جسموں پر کیا کچھ نہ بن آئے، دل میں میت کی وہ تصویر واضح ہونی چاہئے جو حضرت عمر ابن عبد العزیزؓ نے بیان کی ہے، ایک مرتبہ ان کے پاس کوئی قہیر آئے اور کہنے لگے کہ مسلسل عبادت اور شدید مجاہدے کی بنا پر آپ کا چہرہ تبدیل ہو گیا ہے، حضرت عمر ابن عبد العزیزؓ نے جواب دیا اے شخص! تو تدفین کے تین دن بعد مجھے دیکھا آنکھیں اپنی جگہ چھوڑ کر رخساروں پر آجائیں گی، ہونٹ دانتوں سے چٹ جائیں گے، کپلے ہوئے منہ سے پیپ بہہ رہی ہوگی، پیٹ پھول کر سینے سے اونچا ہو جائے گا، اور پشت پاخانے کے راستے سے نکل جائے گی، ناک کے سوراخوں سے کیرے اور پیپ بہتی ہوگی، وہ مہر اس مہر سے زیادہ قویٰ ہوگا جو اس وقت تیرے سامنے ہے۔

موت کی تعریف کرنا مستحب ہے، اس کا ذکر اچھائی کے ملائکہ کرتے، حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

إِذَا مَاتَ صَاحِبُكُمْ فَدَعَوْهُ مَوْلَا نَقَعُوا فِيهِ (ابوداؤد)

جب تمہارا ساتھی مر جائے تو اسے چھوڑ دو اس کی برائی مت کرو۔

ایک حدیث میں ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

لَا تَسْبُوا الْأَمْوَاتَ فَإِنَّهُمْ قَدْ لَفُضُوا إِلَى مَا قَلَّمُوا (بخاری۔ عائشہ)

مرنے والوں کو برا مت کہو، اس لئے کہ وہ اپنے اعمال کو پہنچ گئے ہیں۔

ایک حدیث میں یہ مضمون وارد ہے۔

لَا تَذْكُرُوا أَمْوَاتَكُمْ إِلَّا بِخَيْرٍ فَإِنَّهُمْ إِنْ يَكُونُوا مِنْ أَهْلِ الْجَنَّةِ تَنَامُوا وَإِنْ يَكُونُوا مِنْ أَهْلِ النَّارِ فَحَسْبُهُمْ مَا هُمْ فِيهِ (نسائی۔ عائشہ)

اپنے مردوں کا ذکر بخیر کے نہ کرو، اس لئے کہ وہ جنتی ہیں تو ہمیں خواہ مخواہ گناہ ہوگا، اور اگر وہ دوزخی

ہیں تو انھیں وہ مصیبت کافی ہے، جس میں وہ جلا ہیں۔

حضرت انس ابن مالکؓ روایت کرتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک جنازہ گزرا، لوگوں نے اس کی برائی کی،

آپ نے فسر مایا واجب ہو گئی۔ اس کے بعد دوسرا جنازہ گذرا، لوگوں نے اس کی تعریف کی

آپ نے فرمایا واجب ہو گئی، حضرت عمرؓ نے اس سلسلے میں سوال کیا، فرمایا تم نے اس شخص کی تعریف کی ہے، اس لئے اس کیلئے جنت

واجب ہو گئی، اور اسکی بڑائی کی ہے، اسلئے کہ اس کے لئے دوزخ واجب ہو گئی، تم لوگ زمین میں اللہ کے گواہ ہو (بخاری و مسلم)
حضرت ابو ہریرہ روایت کرتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب بندہ مر جاتا ہے اور لوگ اسکی وہ
تقریف کرتے ہیں جو کے علمِ حقیقی میں نہیں ہوتی، تو اللہ تعالیٰ فرشتوں سے فرماتا ہے میں تمہیں گواہ بناتا ہوں کہ میں نے اپنے بندے کے
لئے اپنے بندوں کی شہادت قبول کر لی ہے اور اسکے جو گناہ میں جاتا ہوں وہ معاف کر دیئے (احمد)۔

موت کی حقیقت : موت کی حقیقت کے متعلق لوگوں کے مختلف جموئے خیالات و نظریات ہیں، اور وہ لوگ غلطی پر ہیں،
بعض لوگوں نے یہ گمان کیا ہے کہ موت عدم ہے، اور یہ کہ کوئی حشر نشر نہیں ہوگا، اور نہ خیر و شر کا انجام ہوگا، گویا ان کے نزدیک
انسان کی موت ایسی ہے جیسے حیوانات کی موت، یا گھاس کی خشکی، یہ طہرین کی اور ان لوگوں کی رائے ہے جو اللہ پر اور یومِ آخرت پر
ایمان نہیں رکھتے کچھ لوگوں نے یہ گمان کیا ہے کہ انسان موت سے معدوم ہو جاتا ہے، اور قبر میں نہ کسی عذاب کی تکلیف اٹھاتا
ہے، اور نہ کسی ثواب سے راحت پاتا ہے، یہاں تک کہ حشر کے دن دوبارہ پیدا کیا جائے گا، دوسرے لوگ کہتے ہیں کہ روح باقی رہتی
ہے، موت سے معدوم نہیں ہوتی اور ثواب و عذاب صرف روحوں کو ہوتا ہے، جسوں کو نہیں، اور جسم دوبارہ نہیں اٹھائے جائیں
گے، یہ تمام خیالات فاسد ہیں، اور حق سے منحرف ہیں، بلکہ جو بات عقل کے معیار پر پوری اترتی ہے، اور آیات و روایات سے جس
کا ثبوت ملتا ہے یہ ہے کہ موت صرف تغیر حال کا نام ہے، اور روح جسم سے جدا ہونے کے بعد باقی رہتی ہے، یا تو عذاب کی تکلیف
جھیلی ہے، یا ثواب سے لطف اندوز ہوتی ہے، جسم سے روح کی مفارقت کے معنی یہ ہیں کہ جسم پر روح کا تصرف اور اختیار نہیں رہتا
یعنی جسم اس کی اطاعت سے منحرف ہو جاتا ہے، انسانی جسم کے اعضاء اسکی روح کے لئے آلات کی حیثیت رکھتے ہیں، اور وہ انھیں
استعمال کرتی ہے، یہاں تک کہ وہ ہاتھ کے ذریعے پکڑتی ہے، کان کے ذریعے سنتی ہے، آنکھ کے ذریعے دیکھتی ہے، اور قلب کے
ذریعے حقیقتِ اشیاء کا ادراک کرتی ہے، دل سے یہاں روح مراد ہے، اور روح اشیاء کا علم خود بخود بغیر آلے کے حاصل کر لیا کرتی
ہے، اسلئے وہ غم، رنج اور مصیبت سے خود تکلیف اٹھاتا ہے، اور خوشی اور مسرت سے لطف پاتا ہے، اور یہ تمام چیزیں اعضاء سے
متعلق نہیں ہیں، روح کا یہ وصف کہ وہ کسی آلے کی مدد کے بغیر تکلیف اور راحت کا ادراک کرتی ہے، جسم سے مفارقت کے بعد
بھی باقی رہتا ہے، اور جو اختیارات اسے اعضاء کے ذریعے حاصل تھے، وہ جسم کی موت سے باطل ہو جاتے ہیں، یہاں تک کہ روح
دوبارہ جسم میں ڈالی جائے۔

پھر یہ امر بعید نہیں بلکہ روح قبر کے اندر جسم میں لوٹائی جائے، اور نہ اس میں کچھ اشکال ہے کہ روح کی واپسی قیامت کے دن
پر مؤخر کر دی جائے، اللہ ہی جانتا ہے کہ اس نے اپنے بندے کے لئے کیا فیصلہ کیا ہے، موت کی وجہ سے جسم کا معطل ہو جانا ایسا ہے
جیسے معذور آدمی کے اعضاء فسادِ مزاج کے باعث، یا اعضاء میں کسی خلل کی وجہ سے بیکار ہو جاتے ہیں، اور روح ان کے اندر نفوذ
نہیں کہ پاتی، اس صورت میں روح کے اوصافِ علم، ادراک اور عقل تو باقی رہتے ہیں، اور بعض اعضاء بھی اختیار میں رہتے ہیں،
لیکن بعض اعضاء اختیار سے نکل جاتے ہیں، اور اس کی نافرمانی کرتے ہیں، جب کہ موت یہ ہے کہ تمام اعضاء روح کا ساتھ
چھوڑ دیں، اور اسکے نافرمان ہو جائیں، اعضاء روح کے آلات تھے، ان کے ذریعے وہ اپنے کام نکالتی تھی، اور روح سے انسان کی وہ
قوت مراد ہے جن سے وہ علوم، فنون کی تکالیف، اور راحتوں کی لذت کا ادراک کرتا ہے، اگرچہ اعضاء میں اسکا تصرف ختم ہو جاتا
ہے، لیکن علوم و ادراکات، اور حسرت و الم کے احساسات کی قوت فنا نہیں ہوتی، انسان حقیقت میں اسی قوت کا نام ہے جو علوم،
اکلام اور لذات کا ادراک کرتی ہے، اور یہ قوت نہ مرنے اور نہ فنا ہوتی ہے، موت کے معنی یہ ہیں بدن سے انسان کا تصرف ختم
ہو جائے، اور وہ اس کا آلہ باقی نہ رہے، اس سے معلوم ہوا کہ موت تمام اعضاء کو لاپاچ اور ناکارہ کر دیتی ہے، لیکن انسان کی حقیقت
جسے اس کا نفس یا روح بھی کہہ سکتے ہیں اپنے حال پر باقی رہتی ہے، صرف انسان کا ظاہری وجود خیر ہوتا ہے، اور یہ تغیر و طرح واقع
ہو جاتا ہے۔

تغییر کے حال کی دو نوعیتیں : ایک تو اس طرح کہ اس کی آنکھیں، کان، زبان، ہاتھ پاؤں اور دوسرے تمام اعضاء سلب کر لئے جاتے ہیں، اور اس کے اہل و عیال، عزیز و اقارب اور تمام شناسا لوگوں سے جدا کر دیا جاتا ہے، اسکے گھوڑے جانور، غلام، گھر، زمین اور دوسری تمام مملوکہ چیزیں چھین لی جاتی ہیں، پھر اس میں کوئی فرق نہیں کہ یہ چیزیں انسان سے چھینی جائیں یا انسان کو ان چیزوں سے چھینا جائے، اصل تکلیف وہ چیز جدائی اور فراق ہے، فراق اس صورت میں بھی ہے کہ آدمی سے اس کا مال چھین لیا جائے، اور اس صورت میں بھی ہے کہ مال اپنی جگہ رہے اور مالک مال کو قید کر دیا جائے، دونوں صورتوں میں تکلیف برابر ہے، موت کے معنی بھی یہی ہیں کہ اسے مال سے چھین کر اور عزیز و اقارب اور اہل و عیال سے جدا کر کے ایک ایسے عالم میں بھیج دیا جائے جو اس عالم کے مشابہ نہ ہو، اب اگر دنیا میں کوئی ایسی چیز باقی رہ گئی جس سے اسے انیت تھی، یا وہ اس سے راحت پاتا تھا، یا اسکے وجود کو اہمیت دیتا تھا تو موت کے بعد اسے زبردست حسرت ہوگی اور اس چیز سے جدائی کے سلسلے میں زبردست مصیبت اور شقاوت کا سامنا ہوگا، بلکہ اگر بہت سی چیزیں ہوں تو اس کا دل ہر ایک چیز کی طرف الگ الگ ملکت ہوگا، مال کی طرف بھی، جاہ اور جائیداد کی طرف بھی، یہاں تک کہ اس قبض میں بھی اس کا دل اٹکا رہے گا جو وہ پنا کر تا تھا اور اسے پن کر خوش ہوتا تھا، اور اگر وہ صرف اللہ کے ذکر سے خوش ہوتا تھا اور صرف اسی سے مانوس تھا تو اسے عظیم ترین نعمتیں میسر ہوں گی سعادت کی تکمیل کا بہترین ذریعہ یہ ہے کہ اپنے محبوب کے درمیان تخیلہ رکھے، اور تمام موانع و شواغل کا سلسلہ منقطع کرے، کیوں کہ دنیا کے تمام شواغل اللہ کے ذکر سے روکنے والے ہیں، زندگی اور موت کی حالتوں میں اختلاف کی ایک نوعیت تو یہ ہے جو مذکور ہوئی، اور دوسری نوعیت تغیر حال کی یہ ہے کہ اس پر موت سے وہ امور منکشف ہوتے ہیں جو زندگی میں منکشف نہیں تھے، دنیا میں لوگ سونے والوں کی طرح ہیں جب مر جائیں گے تب بیدار ہوں گے اور سب سے پہلے ان پر وہ اعمال منکشف ہوں گے جو انھیں نفع دینے والے ہیں یا نقصان پہنچانے والے، یہ تمام سینات و حسنت ایک بند کتاب میں رقم ہیں، اور یہ کتاب قلب کے باطن میں محفوظ ہے، آدمی ان پر اپنے دنیاوی مشاغل کے باعث مطلع نہیں ہوتا، جب یہ مشاغل منقطع ہو جاتے ہیں تب تمام اعمال منکشف ہو جاتے ہیں، جب اسے اس کی برائی نظر آتی ہے تو اس پر انتہائی حسرت و افسوس کرتا ہے اور اس سے بچنے کے لئے اپنے آپ کو آگ میں ڈالنا اختیار کر سکتا ہے، اس وقت اس سے کہا جاتا ہے نہ

كَفَىٰ بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسَنًا (پہلا ۲ آیت ۱۳) آج تو خود اپنا آپ ہی محاسب کافی ہے۔ اور یہ بات اس وقت منکشف ہوتی ہے جب سانس کی ذور ٹوٹ جاتی ہے، اور ابھی دفن بھی نہیں ہوا تاکہ دل میں ان چیزوں سے جدائی کی آگ بھڑکنے لگتی ہے جو اس دنیائے فانی میں عزیز تھیں، ان چیزوں کے فراق پر کوئی رنج نہیں ہوتا جو زور راہ کے طور پر اختیار کی تھیں، کیونکہ جو شخص منزل تک رسائی حاصل کرنے کے لئے زور راہ طلب کرتا ہے، وہ مقصد حاصل کرنے کے بعد باقی رہ جانے والے زور راہ سے جدائی پر خوش ہوتا ہے، بشرطیکہ خاص زور راہ مقصود نہ رہا ہو، یہ حال اس شخص کا ہے جو دنیا سے صرف بقدر ضرورت لیتا ہے، اور یہ چاہتا ہے کہ ضرورت جلد از جلد ختم ہو جائے تاکہ دنیا سے مستغنی ہو سکے، موت کے ساتھ ہی وہ اپنا مقصود حاصل کر لیتا ہے، اور زاد لینے سے مستغنی ہو جاتا ہے، یہ عظیم و شدید عذاب اس پر دفن سے پہلے نازل ہوتا ہے، پھر جب وہ دفن کر دیا جاتا ہے تو کبھی روح جسم کی طرف دوسرے نوع کے عذاب کی تکلیف جھیلنے کے لئے عود کرتی ہے، اور کبھی یہ عذاب معاف کر دیا جاتا ہے، دنیا کی لذتوں سے لطف اٹھانے والے، اور اسکی نعمتوں پر مطمئن ہو جانے والے شخص کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص کسی بادشاہ کے محل میں اس کی عدم موجودگی میں قیام پزیر ہو، اور اسکے اہل و عیال اور خدم و حشم کے ساتھ مزے اڑاتا ہو، اور یہ سمجھتا ہو کہ میں بادشاہ کا مقرب ہوں، بادشاہ میری ان حرکتوں سے چشم پوشی کرے گا، یا اسے معلوم ہی نہیں ہوا کہ میں اس کی عدم موجودگی میں کیا کرتا ہوں، اچانک بادشاہ آ جاتا ہے، اور اسے فرد جرم تھامتا ہے، جس میں اس کے تمام فواحش اور تمام جرم لکھے ہوتے ہیں، بلکہ ایک ایک حرکت اور ایک لفظ درج رہتا ہے، پھر بادشاہ زبردست اقتدار اور قوت رکھتا ہے، وہ اپنے جرم کے سلسلے میں غیرت مند بھی ہے، اور ظالموں سے انتقام لینا، اور مجرموں کو سزا دینا بھی خوب جانتا ہے، اور ان کے سلسلے میں بڑے

بڑے شخص کی سفارش قبول نہیں کرتا، غور کرو اس مجرم کا پادشاہ کا عذاب نازل ہونے سے پہلے کیا عالم ہوگا، اور وہ خوف، ندامت، شرمندگی، اور حسرت کے کتنے تکلیف دہ اور اذیت ناک احساسات سے دوچار ہوگا، یہی حال اس بدکار میت کا عذاب قبر بلکہ موت سے پہلے ہوتا ہے جو دنیا سے فریب غور ہو، اور اسکی راحتوں پر تکیہ کرتا ہو، ہم اس سے اللہ کی پناہ چاہتے ہیں، رسوائی، قیامت اور راز آشکار ہونے میں جس قدر تکلیف ہے وہ مار پیٹ اور زخم و غیرو کی تکلیف سے کہیں زیادہ ہے جس کا عمل جسم ہے۔

بہر حال موت کے وقت مرنے والے کا یہ حال ہوتا ہے، اہل بصیرت نے باطنی قوت کے ذریعے اس کا مشاہدہ بھی کیا ہے، اور باطن کی بصیرت آنکھ کی بصارت سے زیادہ پختہ اور قوی ہوتی ہے، کتاب و سنت کے شواہد سے بھی اس عذاب کا ثبوت ملتا ہے، البتہ موت کی حقیقت پر مطلع ہونا ممکن نہیں ہے، کیونکہ موت کی حقیقت وہی جان سکتا ہے، جو زندگی کی حقیقت سے واقف ہو اور زندگی کی حقیقت روح پر اطلاع کے بغیر معلوم نہیں ہو سکتی، اور روح ایک ایسا موضوع ہے جس پر سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے کلام کرنے کی اجازت نہیں دی ہے، اور نہ آپ نے روح کے سلسلے میں کئے گئے سوال کے جواب میں اسکے علاوہ کچھ ارشاد فرمایا کہ ”یہ روح میرے رب کے حکم سے ہے“ (بخاری و مسلم ابن مسعود) اسلئے کسی عالم دین کے لئے جائز نہیں کہ وہ روح کا راز آشکار کرے، اگرچہ اس پر مطلع ہی کیوں نہ ہو جائے، اگر اجازت ہے تو صرف اس قدر کہ مرنے کے بعد روح کا جو حال ہوتا ہے وہ بیان کر دیا جائے، اس حقیقت پر کہ موت روح کے معدوم ہونے یا اسکے اور اذیت کے فنا ہونے کا نام نہیں ہے، بے شمار آیات اور روایات دلالت کرتی ہیں، چنانچہ شہداء کے متعلق اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا :-

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتًا بَلْ أَحْيَاءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ
فَرِحِينَ بِمَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ (پ ۸۴ آیت ۴۹)

اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل کئے گئے ان کو مردہ مت خیال کر، بلکہ وہ تو زندہ ہیں اپنے پروردگار کے مقرب ہیں ان کو رزق بھی ملتا ہے، وہ خوش ہیں اس چیز سے جو ان کو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے عطا فرمائی ہے۔
بدر کے دن جب قریش کے بڑے بڑے سردار قتل کر دئے گئے تو سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں نام نہام آواز دی، اور فرمایا :-

قُلُوا جَدْتُمْ مَا وَعَدَنِي رَبِّي حَقًّا فَهَلْ وَجَدْتُمْ مَا وَعَدَ رَبُّكُمْ حَقًّا (پ ۸۴ آیت ۴۴)
میرے رب نے مجھ سے جس چیز کا حق کے ساتھ وعدہ کیا تھا وہ میں نے پایا ہے، کیا تم نے وہ چیز پائی ہے جس کا تمہارے رب نے حق کے ساتھ وعدہ کیا تھا۔

صحابہ کرام نے عرض کیا یا رسول اللہ! آپ انہیں آواز دیتے ہیں حالانکہ وہ مر چکے ہیں، سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے وہ تم سے زیادہ اس کلام کو سننے والے ہیں، لیکن وہ جواب دینے پر قدرت نہیں رکھتے (مسلم، عر ابن الخطاب) اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ بد بخت کی روح اور اس کا اور اک اور معرفت باقی رہتی ہے، اور نہ کوہ بالا آیت سے شہداء کی روحوں کے باقی رہنے کا علم ہوتا ہے، اور مرنے والا دو حال سے خالی نہیں ہوتا، یا تو وہ بد بخت ہوتا ہے اور یا سعادت مند۔ جیسا کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :-

الْقَبْرِ لَمَّا حُفِرُوا مِنْ حَقْرِ النَّارِ لَوْ رُؤِضُ قَمِيْنٍ زِيَاضِ الْجَنَّةِ (ترمذی، ابوسعید)
قبر یا تو آگ کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا ہے یا جنت کے باغوں میں سے ایک باغ۔

اس حدیث سے صاف واضح ہوتا ہے کہ موت غیر حال کا نام ہے، اور یہ کہ میت کیلئے تقدیر الہی نے سعادت یا شقاوت کا جو فیصلہ صادر کیا ہے، اس پر بلا تاخیر عمل ہوتا ہے، اگرچہ عذاب و ثواب کی بعض انواع پر اس وقت عمل نہیں ہوتا، مگر ان کی اصل پر اسی وقت عمل ہوتا ہے، ایک حدیث میں حضرت انس ابن مالک سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں :-

الْمَوْتُ الْقِيَامَتُ مَنْ مَاتَ فَقَدْ قَامَتْ قِيَامَتُهُ (ابن ابی الدنیا)
موت قیامت ہے جو مرتا ہے اس کی قیامت قائم ہو جاتی ہے۔

ایک حدیث میں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :-

إِنَّمَاتِ أَحَدُكُمْ غَيْرُ حَيٍّ عَلَيْهِ مَقْعَدُهُ بِالْغَدَلِ وَالْعَشِيِّ إِنْ كَانَ مِنْ أَهْلِ الْجَنَّةِ فَمِنْ
الْجَنَّةِ وَإِنْ كَانَ مِنْ أَهْلِ النَّارِ فَمِنْ النَّارِ وَيُقَالُ هَذَا مَقْعَدُكَ حَتَّى تُبْعَثَ إِلَيْهِ يَوْمَ
الْقِيَامَةِ (بخاری و مسلم ابن عمر)

جب تم میں سے کوئی شخص مرتا ہے تو صبح و شام اس پر اس کا ٹھکانہ پیش کیا جاتا ہے اگر وہ جنتی ہوتا
ہے تو جنت میں سے اور دوزخی ہوتا ہے تو دوزخ میں سے اور کہا جاتا ہے یہ تیرا ٹھکانہ ہے یہاں تک کہ تو
قیامت کے دن اس کی طرف بھیجا جائے۔

ظاہر ہے قبر میں صبح و شام اپنے اپنے ٹھکانے دیکھ کر سعادت مندوں کو خوشی اور بد بختوں کو تکلیف ہوگی، ابو قیس کہتے ہیں کہ
ہم حضرت طلحہؓ کے ساتھ ایک جنازے میں شریک تھے، آپ نے فرمایا اس کی قیامت تو ہو گئی، حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں
کہ نفس پر اس وقت تک دنیا سے نکلنا حرام ہوتا ہے جب تک اسے اپنے جنتی یا دوزخی ہونے کا علم نہ ہو جائے۔ حضرت ابو ہریرہؓ
روایت کرتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ”جو شخص حالتِ سفر میں مرتا ہے وہ شہید مرتا ہے“ اور قبر
کے دو قفے میں ڈالنے والوں سے محفوظ رہتا ہے اور اسے صبح و شام جنت سے رزق حاصل ہوتا ہے (ابن ماجہ) حضرت مسروقؓ
فرماتے ہیں کہ مجھے اتنا رشک کسی پر نہیں آتا جتنا اس مومن پر آتا ہے جو قبر میں دنیا کی مصیبتوں سے محفوظ اور اللہ کے عذاب سے
مامون ہو چکا ہو۔ علی ابن الولید کہتے ہیں کہ میں ایک دن ابوالدرداءؓ کے ساتھ جا رہا تھا میں نے ان سے پوچھا آپ اس شخص کے
لئے کیا چیز پسند کریں گے جس سے آپ محبت کرتے ہیں؟ فرمایا موت، میں نے کہا اگر وہ مرے نہیں تب؟ کہنے لگے تب میں اس کے
لے یہ پسند کروں گا کہ اسکے پاس مال و دولت کم سے کم ہو، میں اپنے محبوب کے لئے موت اسلئے پسند کرتا ہوں کہ موت صرف
مومن محبوب جانتا ہے، کیونکہ موت مومن کے لئے قید خانے سے آزادی کا پروانہ ہے، اور مال و اولاد کی کمی اسلئے مطلوب ہے کہ
ان چیزوں کا وجود قند ہے، اور دنیا کے ساتھ انس کا سبب ہے، اور ان چیزوں سے مانوس ہونا جن سے ہر حال جدا ہونا ہے، انتہائی
بد بختی ہے، اللہ اور اسکے ذکر کے سوا جتنی چیزوں سے بھی مانوس ہوتا ہے ان سے ہر حال میں موت کے وقت جدا ہونا ہے، اسی لئے
حضرت عبداللہ ابن عمرؓ نے ارشاد فرمایا کہ مومن کی مثال جس وقت اس کی جان نکلے یا دوح پرواز کرے اس شخص کی طرح ہے جو قید
خانے میں رہ کر باہر نکلا ہو، اب وہ زمین کو کشادہ پا کر اس میں لوٹ لگتا پھرتا ہے، لیکن یہ اس مومن کی مثال ہے جو دنیا سے کنارہ
کش، اور اس سے دل بدداشت ہو، اور اسے ذکرِ الہی کے علاوہ کسی چیز سے انس نہ ہو، لیکن دنیاوی مشاغل نے اسے محبوب سے
محبوس کر رکھا ہو، اور شہوات کی سختی اسے گراں گزرتی ہو، ظاہر ہے ایسے شخص کیلئے موت ان تمام اذیت دینے والی چیزوں سے
پھٹکارے کا باعث ہے، اور اس محبوب کے ساتھ تیار رہنے کا ایک بہترین موقع ہے جس سے اسے انس تھا، لیکن موانع کے باعث
تمنائی سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا تھا، موت کے ساتھ ہی ہر طرح کی رکاوٹیں دور ہو جاتی ہیں، یقیناً ان شداء کیلئے موت میں مکمل اور
اعلاذاتِ مخفی ہیں، جو اللہ کی راہ میں شہید ہوئے، کیونکہ انھوں نے کفار کے ساتھ قتال پر اقدام محض اسلئے کیا تھا کہ وہ دنیا سے
اپنے رشتے منقطع کرنا چاہتے تھے، اور لقائے خداوندی کے مشتاق تھے، اور اس کی رضا جوئی کے لئے جان دینے پر راضی تھے مگر دنیا
کے اعتبار سے دیکھا جائے تو انھوں نے آخرت کے عوض دنیا فرودخت کی تھی، اور بائع کا قلب بیع کی طرف کبھی التفات نہیں کرتا،
اور اگر آخرت کے لحاظ سے دیکھا جائے تو انھوں نے دنیا کے عوض آخرت خریدی تھی، اور خریدار کا قلب اس چیز کا مشتاق رہتا
ہے، جو انھوں نے خریدی ہے، جب وہ آخرت کو دیکھے گا تو اسے کس قدر خوشی ہوگی، اور دنیا کو دیکھے گا تو اس کی طرف کتنا کم التفات
ہوگا، بلکہ التفات ہی نہیں ہوگا، حبِ الہی کیلئے قلب کبھی کبھی مخصوص بھی ہو جاتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ موت بھی اسی

حالت پر واقع ہو، لیکن جو شخص خدا کی راہ میں شہید ہوتا ہے اسکے دل میں یہی خیال ہوتا ہے کہ وہ اللہ کی راہ میں ہے، اسی پر شہادت پاتا ہے، اسی لئے اسکی نعمتیں اور لذتیں بھی زیادہ ہوتی ہیں، متہائے نعمت و لذت یہ ہے کہ آدمی کو اسکی مراد حاصل ہو جائے۔ قرآن کریم میں ہے:-

وَلَهُمْ فِيهَا مَا يَشْتَهُونَ

اور ان کے لئے جنتوں میں من چاہی چیزیں ہیں

یہ کلام نہایت جامع ہے، اور جنت کی تمام لذات کو حاوی ہے، سب سے بڑا عذاب یہ ہے کہ انسان کو اسکی مراد حاصل نہ ہو، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:-

وَحِيلَ بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ مَا يَشْتَهُونَ (پ ۱۲۲ آیت ۵۳)

اور ان میں اور ان کی آرزو میں ایک آڑ کردی جائیگی۔

یہ عبارت اہل دوزخ کی سزاؤں کو پورے طور پر جامع ہے، اور ہم نے جن نعمتوں اور لذتوں کا ذکر کیا ہے وہ شہداء کو جام شہادت نوش کرنے کے بعد بلا تاخیر ملتی ہیں، اگر باب قلوب پر یہ امر نورانی سے منکشف ہوا ہے، مگر تم اسکی کوئی نقلی دلیل چاہتے ہو تو تمہیں شہداء کے فضائل سے متعلق تمام روایات دیکھنی چاہئیں، ہر روایت میں اسکی نعمتوں کی انتہا مختلف الفاظ اور عبارت میں بیان کی گئی ہے، چنانچہ حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جابرؓ سے ارشاد فرمایا کہ کیا میں تمہیں خوشخبری سناؤں، حضرت جابرؓ کے والد غزوہ احد میں شہید ہو گئے تھے، حضرت جابرؓ نے عرض کیا ضرور سنائیں اللہ تعالیٰ آپ کو خیر کی بشارت دے، آپ نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ نے تیرے باپ کو زندہ کیا اور اسے اپنے سامنے بٹھا کر ارشاد فرمایا اے میرے بندے! تو مجھ سے جس چیز کی چاہے تمنا کرے میں تجھے وہی چیز عطا کروں گا، انھوں نے عرض کیا یا اللہ! میں نے تیری عبادت کا حق ادا نہیں کیا ہے، میں چاہتا ہوں کہ مجھے دنیا میں واپس بھیج دے اور میں (وہاں جا کر) تیرے پیغمبر کے ہمراہ (گناہوں سے) جہاد کروں، اور تیری خاطر دوبارہ قتل کیا جاؤں، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا یہ بات میری طرف سے پہلے طے ہو چکی ہے کہ تو دنیا میں دوبارہ واپس نہیں جائے گا (ترمذی، ابن ماجہ) حضرت کعبؓ فرماتے ہیں کہ جنت میں ایک شخص روتا ہوا پایا جائے گا اس سے پوچھا جائے گا کہ وہ کیوں روتا ہے، حالانکہ اسے جنت عطا کی گئی ہے وہ عرض کرے گا کہ میں اسلئے روتا ہوں کہ مجھے راہ خدا میں صرف ایک مرتبہ قتل ہونے کی سعادت ملی ہے، میری خواہش ہے کہ میں بار بار واپس جاؤں اور بار بار قتل کیا جاؤں۔

جاننا چاہیے کہ موت کے بعد مومن پر اللہ تعالیٰ کی جلالت و عظمت اس قدر وسیع ہوگی کہ تمام دنیا اس کے مقابلے میں ایک قید خانہ اور تنگ مکان سے زیادہ نہ ہوگی، اور اسکی مثال ایسی ہوگی جیسے کوئی شخص کسی تاریک مکان میں قید ہو، اچانک اسکے لئے ایک ایسے باغ کا دروازہ کھول دیا جائے جو نہایت وسیع و عریض ہو، یہاں تک کہ ایک سمت کھڑے ہو کر دوسری جانب کی حدود دیکھنے سے قاصر ہو، اس میں طرح طرح کے درخت، پھل، پھول، اور پرندے ہوں، ظاہر ہے وہ شخص اس باغ میں اس تاریک مکان میں کیوں جانا پسند کرے گا، سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے شخص کی ایک عمدہ مثال فرمائی ہے، ایک شخص کے متعلق جس کا انتقال ہو گیا تھا ارشاد فرمایا کہ یہ شخص دنیا سے جاتا ہے اور دنیا کو دنیا والوں کے لئے چھوڑتا ہے، اگر یہ راضی ہے تو اسے کبھی دنیا میں آنا پسند نہیں ہوگا، جیسے تم میں سے کوئی شخص دوبارہ اپنی ماں کے پیٹ میں جانا پسند نہیں کرتا (ابن ابی الدنیا۔ عمو ابن دینار مرسل) اس سے معلوم ہوا کہ آخرت کی وسعت کو دنیا کی وسعت سے وہی نسبت ہے جو دنیا کی وسعت کو رحم مادر کی وسعت سے ہے، ایک حدیث میں ارشاد فرمایا گیا کہ دنیا میں مومن کی مثال ایسی ہے جیسے ماں کے پیٹ میں بچہ، جب ماں کے پیٹ سے نکلتا ہے تو اپنے نکلنے پر روتا ہے، لیکن جب روشنی دیکھتا ہے تو اپنی جگہ واپس جانا پسند نہیں کرتا (ابن ابی الدنیا) یہی حال مومن کا ہے، جب وہ اپنے پروردگار کے پاس جاتا ہے تو روتا ہے، لیکن وہاں پہنچ کر جب اسکی بے پایاں رحمتیں دیکھتا ہے تو دنیا میں واپس ہونا نہیں چاہتا، جیسے

نومولود بچہ اپنی ماں کے پیٹ میں جاتا نہیں چاہتا، ایک مرتبہ کسی صحابی نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فلاں شخص مر گیا ہے، فرمایا وہ راحت پانے والا ہے یا لوگ اس سے راحت پانے والے ہیں (بخاری و مسلم ابو قتادہ) یہاں راحت پانے والے سے مراد مومن ہے، اور اس شخص سے مراد جس سے لوگ راحت پاتے ہیں قاجر ہے کہ اسکے مرنے سے لوگوں کو راحت ملی، ابو عمرو بانی پلایا کرتے تھے کہتے ہیں کہ ہم نو عمر تھے، ایک دن حضرت عمر ہمارے پاس سے گزرے اور ایک قبر کو دیکھا جس میں سے ایک کھوپڑی جھانک رہی تھی، آپ نے کسی شخص سے کہا کہ اس پر مٹی ڈال دے اس نے قبیل حکم کی، آپ نے فرمایا ان جسموں کو مٹی کوئی نقصان نہیں پہنچاتی، اصل روحیں ہیں جنہیں قیامت تک عذاب یا ثواب دیا جائے گا، عمرو ابن دینار کہتے ہیں کہ ہر شخص مرنے کے بعد یہ جانتا ہے کہ اس کے اہل و عیال بعد میں کیا کریں گے، وہ اسے غسل دیتے ہیں، کفن پہناتے ہیں اور وہ یہ تمام عمل دیکھتا رہتا ہے، مالک ابن بشر کہتے ہیں کہ مومن کی روحوں کو چھوڑ دیا جائے گا وہ جہاں چاہیں جائیں، نعمان ابن بشیر کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو منبر پر یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے، آگاہ رہو کہ دنیا میں سے صرف اس قدر حصہ باقی رہ گیا ہے جیسے اسکی لٹھ میں اڑنے والی کھسی، اپنے مردہ بھائیوں کے باب میں اللہ تعالیٰ سے ڈرو، اسلئے کہ تمہارے اعمال ان پر پیش کئے جاتے ہیں، (ابن ابی الدنیا) حضرت ابو ہریرہ روایت کرتے ہیں کہ جناب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اپنے مردوں کو اپنے برے اعمال سے رسوا نہ کرو، اسلئے کہ تمہارے اعمال تمہارے مردہ دوستوں کے سامنے رکھے جاتے ہیں، (ابن ابی الدنیا) چنانچہ حضرت ابو الدرداءؓ یہ دعا کیا کرتے تھے کہ اے اللہ! میں ایسے اعمال سے تیری پناہ چاہتا ہوں جن سے عبد اللہ ابن رواحہ کے سامنے رسوا کی ہو، عبد اللہ ابن رواحہ کا انتقال ہو گیا تھا، اور یہ بزرگ حضرت ابو الدرداء کے ماموں تھے، عبد اللہ ابن عمر ابن العاص سے کسی شخص نے پوچھا کہ مومنین کی روحیں مرنے کے بعد کہاں جائیں گی، فرمایا پرندوں کے سفید پوٹوں میں عرش کے زیر سایہ اور کافروں کی روحیں زمین کے ساتویں طبقہ میں۔ حضرت ابو سعید الخدری روایت کرتے ہیں کہ میں نے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے فرماتے تھے کہ مردہ جانتا ہے کہ اسے کون غسل دے رہا ہے، کون اٹھا رہا ہے، اور کون قبر میں اتار رہا ہے (احمد صالح المری کہتے ہیں کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ روحیں موت کے بعد آپس میں ملتی ہیں، چنانچہ مردوں کی روحیں اس روح سے جو تازہ تازہ وارد ہوتی ہے دریافت کرتی ہیں کہ حیران کنانہ کہاں تھا، تو کون سے جسم میں تھی، پاکیزہ جسم میں یا گندے جسم میں؟ عید اللہ ابن عمیر کہتے ہیں کہ اہل قبور مردوں کے شہر رہتے ہیں، جب کوئی مردہ پہنچتا ہے تو اس سے پوچھتے ہیں کہ فلاں شخص کا کیا حال ہے، وہ کہتا ہے کہ جس شخص کو تم معلوم کرتے ہو وہ عرصہ ہوا مر چکا ہے، کیا یہاں نہیں آیا؟ اہل قبور کہیں گے کہ نہیں! پھر وہ انا، اللہ وانا اللہ راجعون کہتے ہوئے کہیں گے اسے کہیں اور لے گئے ہیں وہ ہمارے پاس نہیں آیا، جعفر ابن سعید کہتے ہیں کہ جب آدمی مرتا ہے تو اسکی اولاد اسکا اس طرح استقبال کرتی ہے جس طرح لوگ غائب کا واپسی پر استقبال کرتے ہیں، مجاہد فرماتے ہیں کہ آدمی کو اس کے بچوں کی نیکی کی خوشخبری قبر میں سنائی جاتی ہے، حضرت ابو ایوب الانصاری سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ جب مومن کی روح قبض ہوتی ہے تو رحمت والے لوگ اللہ کے پاس اس سے اس طرح ملاقات کرتے ہیں جیسے دنیا میں خوشخبری لانے والے سے ملا جاتا ہے، اور کہتے ہیں اس بھائی کو دیکھو تاکہ اسے کچھ راحت مل جائے، بے چارہ بھئی اذیت میں جلا تھا، پھر پوچھتے ہیں فلاں شخص کیسا تھا، یا فلاں عورت کیسی تھی، کیا اس نے شادی کر لی ہے، اگر کسی ایسے شخص کے حلق پوچھتے ہیں جو پہلے مر چکا ہے، تو آئے والا کہتا ہے کہ وہ مجھ سے پہلے مر گیا تھا، وہ لوگ کہتے ہیں انا، اللہ وانا اللہ راجعون، اسے اسکی ماں باویہ کے پاس لے جایا گیا ہے۔

میت سے قبر کی گفتگو: مردوں کا کلام یا تو زبان حال سے ہوتا ہے، یا زبانِ قال سے اور زبان حال مردوں کو سمجھانے کے لئے زبانِ قال سے فصیح تر ہے، جس کے ذریعے زندوں کو سمجھایا جاتا ہے، سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ جب مردوں کو قبر میں رکھا جاتا ہے، تو قبر اس سے کہتی ہے کہ اے کم بخت انسان تجھے کس چیز نے مجھ سے دھوکہ میں رکھا، کیا تو نہیں

جانتا کہ میں فتنے، تاریکی، تمنا کی، اور کیڑوں کا گھر ہوں، تو مجھ سے کس مغالے میں جلتا تھا کہ میرے اوپر اکڑ کر چلتا تھا، اگر مرے والا سعادت مند ہوتا ہے تو اس کی طرف سے کوئی جواب دینے والا یہ جواب دیتا ہے کہ کیا تو نہیں جانتی کہ یہ شخص نیک کام کا حکم دیتا تھا اور برے کام سے منع کرتا تھا، قبر کے گی تب میں اسکے لئے سرسبز و شاداب (باغ) بن جاتی ہوں، چنانچہ اس کا جسم نور میں جائے گا، اور روح اللہ تعالیٰ کی طرف پرواز کر جائے گی، (روایت میں لفظ فدا و اودہ ہے، اس سے وہ شخص مراد ہے جو ایک پاؤں پہلے اٹھاتا ہے اور دوسرا بعد میں اٹھاتا ہے) (ابن ابی الدنیا، طبرانی) عبید ابن عمر لیشی کہتے ہیں کہ جب کوئی شخص مرتا ہے تو اس کا وہ گڑھا جس میں وہ دفن ہوتا ہے اسے یہ آواز دیتا ہے کہ اے شخص میں تاریکی اور تمنا کی کا گھر ہوں، اگر تو اپنی زندگی میں اللہ کا مطیع تھا تو میں آج تیرے لئے رحمت ہوں، اور اگر تو نافرمان تھا تو آج میں تجھ پر عذاب ہوں، میں وہ ہوں جو مجھ میں مطیع بن کر داخل ہوتا ہے خوش ہو کر نکلتا ہے، اور جو نافرمان بن کر داخل ہوتا ہے وہ تباہ و برباد ہو کر نکلتا ہے، محمد ابن صبیح کہتے ہیں کہ ہمیں معلوم ہوا ایک جب آدمی کو اسکی قبر میں رکھ دیا جاتا ہے تو اسے عذاب ہوتا ہے یا کوئی اور پسندیدہ امر پیش آتا ہے، اس وقت پڑوسی مومے اس سے کہتے ہیں کہ اے وہ شخص جو اپنے پڑوسیوں اور بھائیوں سے دنیا میں پیچھے رہ گیا تھا کیا تو ہم سے عبرت نہیں کر سکتا تھا کیا ہمارے پہلے آنے میں تیرے لئے مقام فکر نہیں تھا کیا تو یہ نہیں دیکھ رہا تھا کہ ہمارے اعمال کا سلسلہ منقطع ہو چکا ہے، اور تجھے فرصت میرے ہے، کیا تو یہ ان کو تابیوں کا تذکرہ نہیں کر سکتا تھا جو تیرے بھائیوں سے سرزد ہوئی تھیں اور وہ ان کا تذکرہ نہیں کر سکے تھے، زمین کے مختلف حصوں سے یہ آواز آئے گی اے دنیا کے ظاہر سے فریب کھانے والے کیا تو نے اپنے عزیزوں سے عبرت حاصل نہیں کی جو زمین کے سینے میں دفن ہو گئے ہیں، حالانکہ دنیا کے فریب میں وہ بھی جلتا تھے، پھر موت نے سبقت کی، اور انھیں قبروں میں پہنچا دیا، تو نے دیکھا کہ دوسروں نے اپنے کاندھوں پر اٹھا کر انھیں انکی منزل تک پہنچایا جہاں پہنچنا بہر حال انکی تقدیر میں تھا۔ یزید الرقاشی کہتے ہیں کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ جب میت کو قبر میں رکھ دیا جاتا ہے تو اسے اس کے اعمال گھیر لیتے ہیں، پھر انھیں اللہ زبان صلا کرتا ہے، اور وہ کہتے ہیں کہ اے اپنے گڑھے میں تمنا رہ جانے والے تجھے تیرے دوست احباب اور اہل و عیال تمنا چھوڑ کر جا چکے ہیں، آج ہمارے پاس تیرا کوئی غم خوار نہیں ہے، کعب کہتے ہیں کہ جب کسی نیک بندے کو اسکی قبر میں رکھا جاتا ہے تو اسے اس کے اعمال صالحہ روزہ، نماز، حج، جہاد اور صدقہ گھیر لیتے ہیں، عذاب کے فرشتے پاؤں کی طرف سے آنا چاہتے ہیں تو نماز ان سے کہتی ہے اس سے دور رہو، تم اس تک راہ نہ پاسکو گے، کیونکہ اس نے اللہ کے لئے میرے ساتھ ان پر لباقیام کیا ہے، وہ سر کی طرف سے آئیں گے، اس وقت روزے آڑے آئیں گے اور کہیں گے تم اس پر قابو پا نہیں سکتے کیونکہ یہ دنیا میں اللہ کے لئے بے عرصے تک پیاسا رہا ہے، وہ اس کے پاس جسم کی طرف سے آئیں گے، وہاں حج اور جہاد کھڑے ہو جائیں گے، اور کہیں گے کہ اس سے دور رہو، اسلئے کہ اس نے اپنے نفس کو تھکایا ہے، اور جسم کو مشقت میں ڈالا ہے، اور اللہ کے لئے حج اور جہاد کیا ہے، فرشتے ہاتھوں کی طرف سے آئیں گے، اوھر سے صدقہ کے گاکہ میرے دوست سے دور رہو، اسلئے کہ ان ہاتھوں سے بے شمار صدقات نکلے ہیں، اور وہ اللہ کے یہاں مقبول ہوئے ہیں، کیونکہ اس نے اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لئے یہ صدقات دئے تھے، راوی کہتے ہیں کہ اب اس سے کہا جائے گا مبارک ہو، تو اچھے حال میں زندہ رہا اور تو نے اچھے حال میں موت پائی، راوی مزید کہتے ہیں کہ قبر میں رحمت کے فرشتے آتے ہیں، اور اس کے لئے جنت کا بستر بچھاتے ہیں، اور جنت کی چادر اڑھاتے ہیں، اور اسکی قبر کو حد نظر تک وسیع کرتے ہیں، اور جنت سے ایک قدیل لاکر جلائی جاتی ہے، اسکے نور سے قبر قیامت کے دن تک روشن رہیگی، عبداللہ ابن عبید اللہ ابن عمر نے ایک جنازے کی مشاعت کے دوران فرمایا کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مودہ قبر میں بیٹھتا ہے، اور اپنے ساتھ آنے والوں کے قدموں کی آوازیں سنتا ہے، اس سے اس کی قبر کے علاوہ کوئی چیز کھٹکھٹو نہیں کرتی، وہ کہتی ہے اے ابن آدم! تیرا اس ہو، کیا تو مجھ سے خوف زدہ نہیں تھا، کیا تجھے میری بھٹی، میری گندگی، میرے کیڑوں اور میری وحشت کا ڈر نہیں تھا، پھر تو نے میرے لئے کیا تیاری کی ہے (ابن ابی الدنیا)۔

عذاب قبر اور منکر نکیر کا سوال : حضرت براء ابن عازب روایت کرتے ہیں کہ ہم سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک انصاری کے جنازے میں گئے، آپ اسکی قبر پر سر جھکا کر بیٹھ گئے، اور تین مرتبہ فرمایا: اے اللہ میں عذابِ قبر سے تیری پناہ چاہتا ہوں، پھر فرمایا جب مومن آخرت میں حاضری کے لئے تیار ہوتا ہے اللہ تعالیٰ ایسے فرشتے بھیجتا ہے جن کے چہرے سورج کی مانند ہوتے ہیں، ان کے پاس اسکے لئے خوشبوئیں اور کفن ہوتا ہے، اور مرنے والے کی حد نظر تک بیٹھ جاتے ہیں، جب اسکی روح جسم سے باہر آجاتی ہے تو اس پر آسمان اور زمین کے درمیان کے تمام فرشتے اور آسمان کے تمام فرشتے نماز پڑھتے ہیں، اور آسمان کے دروازے کھول دئے جاتے ہیں، ہر دروازہ یہ چاہتا ہے کہ اسکی روح اس میں داخل ہو، جب اسکی روح آسمان پر پہنچ جاتی ہے تو فرشتے عرض کرتے ہیں: یا اللہ! یہ تیرا اقبال بندہ ہے؟ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اسے واپس لے جاؤ اور اسے دکھلاؤ کہ میں نے اس کے لئے کس قدر اعراف کیا ہے، اسلئے کہ ہم یہ وعدہ کر چکے ہیں۔

مِنْهَا خَلَقْنَاكُمْ وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً أُخْرٰی (پ ۶ ر ۴ آیت ۵۵)
ہم نے تم کو اسی زمین سے پیدا کیا، اور اسی میں ہم تم کو لے جائیں گے، اور پھر دوبارہ اسی سے تم کو نکالیں گے۔

وہ شخص (اپنی قبر میں) لوگوں کے جوتوں کی آوازیں سنتا ہے، جب وہ واپس لوٹنے میں یہاں تک کہ اس سے کہا جاتا ہے اے شخص تیرا رب کون ہے؟ تیرا دین کیا ہے؟ اور تیرا نبی کون ہے؟ وہ جواب دیتا ہے میرا رب اللہ ہے، میرا دین اسلام ہے، اور میرے نبی محمد ہیں، یہ سوالات اس سے نہایت سختی سے کئے جاتے ہیں، اور یہ آخری آزمائش ہوتی ہے جس میں مردے کو جھٹلایا جاتا ہے، اس وقت کوئی کہنے والا کہتا ہے تو نے سچ کہا، اور یہی معنی ہیں اللہ تعالیٰ کے اس ارشادِ گرامی کے۔

يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ (پ ۳ ر ۲ آیت ۶۷)

اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو اس پکی بات سے دنیا اور آخرت میں مضبوط رکھتا ہے۔

پھر کوئی آنے والا آتا ہے، اس کا چہرہ خوبصورت، اسکی خوشبو عمدہ، اور لباس بہترین ہوتا ہے، وہ کہتا ہے تجھے رحمتِ حق کی اور ایسی جنتوں کی خوشخبری ہو جن میں دائمی نعمتیں ہیں مردہ کہتا ہے اللہ تعالیٰ تجھے بھی خیر کی بشارت دے، تو کون ہے، آنے والا کہتا ہے میں تیرا نیک عمل ہوں، بخدا میں جانتا ہوں کہ تو اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں جلدی کرنے والا، اور اسکی معصیت میں دیر کرنے والا تھا، اللہ تعالیٰ نے تجھے جزائے خیر دی، اسکے بعد ایک اعلان کرنے والا یہ اعلان کرتا ہے، اسکے لئے جنت کا بستر رکھو، اور اسکے لئے جنت کا دروازہ کھول دو، چنانچہ اس کے لئے جنت بستر کر دیا جاتا ہے، اور جنت کی سمت ایک دروازہ کھول دیا جاتا ہے، اس وقت وہ دعا کرتا ہے اے اللہ! قیامت جلدی کر تاکہ میں اپنے اہل و عیال کی طرف واپس جاسکوں، اور کافر کا حال یہ ہے کہ جب اسے آخرت میں پیش ہوتا ہوتا ہے، اور دنیا سے اسکا تعلق منقطع ہوتا ہے تو نہایت تند مزاج، اور سخت گیر فرشتے آسمان سے نیچے اترتے ہیں، ان کے پاس آگ کے کپڑے اور تیزاب کی قیصیں ہوتی ہیں، وہ آکر اس کے پاس بیٹھ جاتے ہیں، جب اسکی روح نکل جاتی ہے تو آسمان و زمین کے درمیان تمام فرشتے اور آسمان کے تمام فرشتے اس پر لعنت بھیجتے ہیں، اور آسمان کے تمام دروازے بند کر دئے جاتے ہیں یہاں تک کہ ہر دروازہ اپنے اندر سے اسکا داخلہ ناپسند کرتا ہے، جب اسکی روح اوپر لے جا کر پھینک دی جاتی ہے تو فرشتے عرض کرتے ہیں یا اللہ! یہ تیرا اقبال بندہ ہے، اسے نہ کسی آسمان نے قبول کیا ہے اور نہ زمین نے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اسے واپس لے جاؤ، اور دکھلاؤ کہ میں نے اسکے لئے کیا عذاب تیار کیا ہے، میں اس سے یہ وعدہ کر چکا ہوں مَعَا خَلَقْنَاكُمْ اِنْ لَمْ يَكُنْ لَكُمْ دَارٌ اُخْرٰی وہ شخص بھی واپس جانے والوں کے جوتوں کی آوازیں سنتا ہے، یہاں تک کہ اس سے پوچھا جاتا ہے کہ تیرا رب کون ہے؟ تیرا دین کیا ہے؟ اور تیرے نبی کون ہیں؟ وہ کہتا ہے میں نہیں جانتا، کہا جاتا ہے خدا کرے تو نہ جانے، پھر ایک آنے والا آتا ہے، اس کا چہرہ نہایت برا، اس کا جسم

بدلو اور اس کے کپڑے نہایت گندے ہوتے ہیں، وہ کہتا ہے تجھے اللہ کے غضب اور دائمی دردناک عذاب کا شردہ ہو، مر وہ کہتا ہے تجھے بھی برائی کا شردہ ہو تو کون ہے، وہ کہتا ہے میں حیرا عمل ہوں، بخدا تو اللہ کی معصیت میں بہت زیادہ جلدی کرنے والا اور اس کی اطاعت میں نہایت سست رہتا تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے تجھے برا بدلہ دیا، وہ کہتا ہے اللہ تعالیٰ تجھے بھی برا بدلہ دے، پھر اس پر ایک اندر حل ہوا، گونا گونا گونہ متحین کر دیا جاتا ہے، اس کے پاس لوہے کا (تاج بھاری) گرز ہوتا ہے کہ اگر جن و انس مل کر اسے حرکت دینا چاہیں تو حرکت نہ دے سکیں، اور اگر اسے پہاڑ پر مارا جائے تو پہاڑ مٹی ہو جائے اس (خونخاک) گرز سے اس کا فرق کو مارا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ مٹی بن جاتا ہے، پھر اس میں روح واپس آتی ہے، پھر اس کو دونوں آنکھوں کے درمیان اتنے زور سے مارا جاتا ہے کہ زمین پر رہنے والے سب چہرہ پر بند (سوائے جن اور انسان کے) اس کی آواز سنتے ہیں، پھر ایک اعلان کرنے والا یہ اعلان کرتا ہے کہ اس کے لیے آگ کی دو تختیاں بچا دی جائیں اور اس کے لئے دوزخ کا ایک دروازہ کھول دیا جائے، چنانچہ اس کے لیے صرف آگ کی دو تختیاں کافر ش کر دیا جاتا ہے، اور دروازہ کھول دیا جاتا ہے (ابوداؤد، حاکم، ابن حبان، نسائی)۔

محمد ابن علی کہتے ہیں کہ ہر شخص کے سامنے اس کی موت کے بعد اس کے اچھے اور برے اعمال مجسم ہو کر آتے ہیں، وہ اپنی نیکیوں کو دیکھتا ہے اور برائیوں سے آنکھیں بند کر لیتا ہے، حضرت ابو ہریرہ روایت کرتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب مومن کی موت کا وقت قریب آتا ہے تو فرشتے اس کے پاس ریشم کے ایک کپڑے میں مٹک اور ریحان کی خوشبوئیں لے کر آتے ہیں، اور اس کی روح ایسے نکالتے ہیں جیسے آٹے میں سے بال نکال لیا جاتا ہے، اور اس سے کہا جاتا ہے اے نفس مطمئن! تو اللہ کی راحت اور کرامت کی طرف نکل، اس حال میں کہ تو اللہ سے راضی ہے، اور اللہ تجھ سے راضی ہے، جب اس کی روح نکل جاتی ہے تو اسے مٹک اور ریحان پر رکھا جاتا ہے، اور اس پر ریشم کا کپڑا ڈال دیا جاتا ہے، اور اسے مطمئن میں بھیج دیا جاتا ہے، اور جب کافر کی موت آتی ہے تو اس کے پاس فرشتے ٹاٹ میں آگ کے شعلے لپیٹ کر آتے ہیں، اور نہایت سختی سے روح قبض کرتے ہیں، اور اس سے کہا جاتا ہے کہ اے نفس خبیث! تو اللہ تعالیٰ کے عذاب اور ذلت کی طرف نکل، اس حال میں کہ تو اللہ تعالیٰ سے ناخوش ہے، اور اللہ تعالیٰ تجھ سے ناراض ہے، جب اس کی روح نکل جاتی ہے تو اسے آگ کے شعلوں پر رکھا جاتا ہے، روح کے پھنسنے کی آواز آتی ہے، اور اس پر ٹاٹ ڈال دیا جاتا ہے، پھر اسے قید خانے میں لے جایا جاتا ہے (مسند بزار، ابن ابی الدنیا، محمد ابن کعب، القرطبی نے قرآن کریم کی یہ آیت تلاوت کی :-

حَتَّىٰ لَإِجَاءِ أَحْلَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُونِ لَعَلِّي أَعْمَلُ صَالِحًا فِيمَا تَرَكْتُ
(پ ۱۸ ر ۶ آیت ۹۹)

یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی پر موت آتی ہے تو اس وقت کہتا ہے کہ اے میرے رب مجھ کو دنیا میں پھر واپس بھیج دیجئے تاکہ جس دنیا کو میں چھوڑ کر آیا ہوں اس میں پھر جا کر نیک کام کروں۔ اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ بندے سے پوچھتا ہے کہ تو کیا چاہتا ہے، تجھے کس چیز کی خواہش ہے کیا تو یہ چاہتا ہے کہ مال جمع کرے، درخت لگائے، عمارتیں بنائے، نہریں کھودے، وہ کہتا ہے نہیں میں یہ سب کچھ نہیں چاہتا بلکہ دنیا میں جو کچھ چھوڑ آیا ہوں اس میں اچھا کام کرنا چاہتا ہوں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :-

كَلَّا إِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَائِلُهَا (پ ۱۸ ر ۶ آیت ۱۰۰)

ہرگز نہیں! یہ ایک بات ہی بات ہے جس کو یہ کہے جا رہا ہے۔

یعنی وہ موت کے وقت یہ خواہش ظاہر کرتا ہے، حضرت ابو ہریرہ روایت کرتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مومن اپنی قبر میں ایک ہنریاغ کے اندر رہتا ہے، اس کی قبر ستر کر کشادہ کر دی جاتی ہے، اور اس قدر روشن کر دی جاتی ہے کہ گویا چودھویں رات کا چاند نکلا ہو، کیا تم جانتے ہو قرآن کریم کی یہ آیت کس کے بارے میں نازل ہوئی ہے :-

فَإِنْ لَّمْ يَعْيشَ شَعْنُكُمْ (پ ۱۸ ر ۶ آیت ۱۰۲)

تو اس کے لیے ٹکلی کا جینا ہو گا۔

لوگوں نے عرض کیا اللہ اور اس کے رسول زیادہ جانتے ہیں، یہ کافر کا عذاب ہے، جو اس پر قبر میں ہو گا اس پر ننانوے تین مسلط کر دی جائیں گی، کیا تم جانتے ہو تین کیا ہے، تین ننانوے اڑدہا ہیں، ان میں سے ہر ایک کے سات سر ہوں گے، یہ تمام اڑدے قیامت تک اسے کھسوٹے ڈستے اور اس کے جسم میں پھنکا مارتے رہیں گے (ابن حبان) ہمیں اس تعداد پر تعجب نہ کرنا چاہیے اس لئے کہ اڑدھوں کی یہ تعداد اخلاق مذمومہ کے مقابلے میں ہے جیسے کبر، حسد، ریا، فریب اور کینہ وغیرہ، ان اخلاق مذمومہ کے کچھ اصول ہیں، پھر ان سے متعدد فروغ نکلتی ہیں پھر فروغ کی متعدد قسمیں ہوتی ہیں، یہ صفات ملک ہیں، اور یہی صفات قبر میں سانپ، بچھو، اور اڑدہا بن جاتی ہیں، قوی صفت اڑدہا کی طرح ڈستے ہے، اور کمزور صفت بچھو کی طرح اور ان دونوں کے درمیان جو اوصاف ہیں وہ سانپ کی طرح ڈستے ہیں، ارباب قلوب اور ارباب بصیرت سے ان ملکات کا اور ان کی فروغ کا مشاہدہ کرتے ہیں، تاہم انکی تعداد پر نور نبوت کے بغیر مطلع ہونا ممکن نہیں ہے، اس طرح کی روایات کے خواہر صحیح اور اسرار مخفی ہیں، لیکن ارباب بصائر کے نزدیک یہ اسرار بالکل عیاں ہوتے ہیں، جس پر روایات کے حقائق منکشف نہ ہوں اسے خواہر کا انکار نہ کرنا چاہیے ایمان کا کم سے کم درجہ تصدیق و تسلیم ہے۔

خلاف مشاہدہ امور کی تصدیق : رہا یہ اعتراض کہ ہم کافر کو اسکی قبر میں طویل عرصے تک دیکھتے ہیں، اور ہمیں مذکورہ بالا عذابوں میں سے کوئی عذاب واقع ہوتا ہوا نظر نہیں آتا، پھر ہم مشاہدے کی خلاف کسی امر کی تصدیق کس طرح کر سکتے ہیں، اس کا جواب یہ ہے کہ تم ان امور کی جو مشاہدے کے خلاف ہوں تین طرح تصدیق کر سکتے ہو۔

ایک صورت جو زیادہ صحیح اور نہایت واضح ہے یہ ہے کہ تم ان اڑدھوں اور سانپ بچھوؤں کے وجود کی تصدیق کرو، اور اس امر کا اعتراف کرو کہ یہ میت کو ڈستے ہیں، لیکن تم ان کا مشاہدہ نہیں کہاتے، کیونکہ تمہاری آنکھوں میں ملکوتی امور کے مشاہدے کی صلاحیت نہیں ہے، اور جو چیز بھی آخرت سے متعلق ہے وہ ملکوتی ہے، دیکھو صحابہ کرام حضرت جبرئیل علیہ السلام کے نازل ہونے پر ایمان رکھتے ہیں حالانکہ وہ حضرات جبرئیل علیہ السلام کو نہیں دیکھتے تھے، ساتھ ہی انھیں یہ بھی یقین تھا کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم جبرئیل کو دیکھتے ہیں، اگر ہمیں نزول جبرئیل کا یقین نہیں ہے تو تمہارے لئے اہم ترین بات یہ ہے کہ ملائکہ اور وحی کی تصدیق کئے بغیر ایمان کو مضبوط کرو، اور اگر تم اس پر ایمان رکھتے ہو، اور یہ بھی یقین ہے کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت جبرئیل علیہ السلام کو دیکھتے تھے، حالانکہ امت آپ کو نہیں دیکھتی تھی، پھر تم میت کے سلسلے میں اس کا یقین کیوں نہیں رکھتے کہ بعض امور ایسے واقع ہو سکتے ہیں جو تمہارے مشاہدے سے خارج ہوں، پھر جس طرح فرشتے آدمیوں اور حیوانات کے مشاہدہ نہیں ہیں اسی طرح قبر کے سانپ اور بچھو بھی دنیا کے سانپ بچھو کی طرح نہیں ہیں، ان کی جنس دوسری ہے، اور ان کے اور اک کے لئے بھی دوسرے حواس ہیں۔

دوسری صورت یہ ہے کہ تم سونے والے پر قیاس کرو، بعض اوقات وہ نیند میں یہ دیکھتا ہے کہ اسے سانپ نے کاٹ لیا ہے، وہ اس کی اذیت بھی محسوس کرتا ہے، اور چیخنے لگتا ہے، دوسرے لوگ اسکی چیخ سنتے ہیں، اس کی پیشانی پر پسینہ آجاتا ہے، کبھی اپنی جگہ سے اٹھ پڑتا ہے، سونے والا ان تمام امور کا اور اک کرتا ہے، اور ان سے ویسی ہی تکلیف پاتا ہے جیسی جاگنے والا پاتا ہے، وہ ان چیزوں کا مشاہدہ کرتا ہے، حالانکہ تم اسے پُر سکون پاتے ہو، ہمیں اس کے اور کوئی سانپ یا بچھو بھی نظر نہیں آتا، جب کہ اس کے حق میں سانپ موجود ہیں، اور اسے تکلیف ہو رہی ہے، اگر عذاب کا مطلب تکلیف ہے تو پھر سانپ کے نظر آنے یا نہ آنے میں کیا فرق ہے؟

تیسری صورت یہ ہے کہ تم جانتے ہو سانپ بذات خود تکلیف دینے والا نہیں ہے بلکہ تکلیف اس کے زہر سے ہوتی ہے، پھر زہر بھی تکلیف دہ نہیں ہے، بلکہ اس اثر میں ہوتی ہے جو تمہارے جسم میں زہر پھیلنے سے رونما ہوتا ہے، اگر یہ اثر زہر کے علاوہ کسی اور

چیز سے واقع ہو تب بھی تکلیف ہوگی، تاہم عذاب کی اس نوع کا تعین نہیں کیا جاسکتا، بس اتنا کیا جاسکتا ہے کہ عذاب کو اس سبب کی طرف منسوب کر دیا جائے جس کے باعث وہ اثر پھیلا ہے اور تکلیف ہوئی ہے، مثلاً اگر انسان کے اندر صحبت کی لذت پیدا ہو جائے، اور فی الحقیقت صحبت نہ ہوئی ہو تو اس لذت کو صرف اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ صحبت کی طرف اس کی نسبت کر دی جائے یعنی اس طرح کہہ دیا جائے کہ وہ لذت حاصل ہوتی ہے جو عورت کے ساتھ ہم بستری سے حاصل ہوتی ہے، اس نسبت سے سبب کی معرفت حاصل ہو جائے گی، اور اس کا ثمرہ معلوم ہو جائے گا، اگرچہ سبب کی صورت حاصل نہ ہو، ویسے سبب ثمرے کے لئے مقصود ہوتا ہے، بذات خود مالملوب نہیں ہوتا۔

بہر حال یہ مسلک صفات موت کے وقت نفس میں ایذا دینے والی اور تکلیف پہنچانے والی بن جاتی ہے، اور انکی تکلیف ایسی ہوتی ہے جیسے سانپوں کے کاٹنے کی ہوتی ہے، حالانکہ ان کا وجود نہیں ہوتا، صفت کے مسلک بن جانے کی مثال ایسی ہے جیسے معشوق کے مرجانے سے عشق موزی بن جاتا ہے، پہلے وہ لذیذ تھا، پھر ایسا حال ہوا کہ لذیذ شئی تکلیف دہ بن گئی، یہاں تک کہ قلب پر ایسے عذاب وارد ہوتے ہیں کہ آدمی یہ تمنا کرنے لگتا ہے کاش اس نے عشق و وصال کا مزہ چکھایا نہ ہوتا، میت کے مختلف عذابوں میں سے ایک عذاب کی بسندہ یہی نوعیت ہے، دنیا میں اس پر عشق مسلط تھا، یعنی وہ اپنے مال، جاہ، اولاد، اقارب اور معارف کے عشق میں جھٹکا تھا، چنانچہ اگر کوئی شخص اسکی زندگی میں ان چیزوں میں سے لے لیتا اور لے کر واپس نہ دیتا تو تم دیکھتے وہ کس قدر بے چین، مضطرب اور پریشان ہوتا، اور مایوس ہو کر کہتا کاش میرے پاس مال ہی نہ ہوتا یا میں جاہ سے محروم ہوتا تاکہ مجھے آج جدائی کی آفت نہ سہی پڑتی، موت تو نام ہی محبوب چیزوں سے فراق کا ہے، یہ تمام چیزیں دفعتاً اس سے چھٹ جاتی ہیں، ایک شاعر کے بقول :-

مَا حَالُ مَنْ كَانَ لَعُوًّا حِدٌ غَيْبٌ عَنْهُ ذَلِكَ الْوَاحِدُ

(اس کا کیا حال ہو گا جس کے ایک ہو، اور وہی ایک غائب ہو جائے)

غور کرو، اس شخص کا کیا حال ہو گا جو صرف دنیا سے خوش ہوتا تھا، اچانک اس سے دنیا چھین لی گئی، اور اسکے دشمنوں کو دیدی گئی، پھر اس عذاب میں وہ حسرت بھی شامل کر لیجئے، جو آخرت کی نعمتیں نہ ملنے پر، اور اللہ تعالیٰ سے محبوب رہ جانے پر ہوتی ہے، اسلئے کہ غیر اللہ کی محبت آدمی کو اللہ تعالیٰ کی ملاقات کے شرف سے محروم کر دیتی ہے، اس پر اپنی محبوب چیزوں سے جدائی کا عالم، اور اخروی نعمتوں سے محرومی کا غم ٹھکرائے جانے، اور اللہ تعالیٰ سے محبوب رہ جانے کی ولت ابد الابد تک مسلط رہے گی، جدائی کی آگ بس دوزخ کی آگ کے بعد ہے، اور ان دونوں کے درمیان کوئی تیسرا آگ نہیں ہے،

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

كَأَلَانَهُمْ عَنْ رَبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَمْ يَخْبَوْا مِنْهُ لَمَّا صَالُوا الْوَالِجَ حَيْمِ (پ ۳۰ آیت ۴۱)

ہرگز نہیں یہ لوگ اس روز اپنے رب سے روک لیے جائیں گے بھریہ دوزخ میں داخل ہوں گے۔

لیکن جو شخص دنیا سے انس نہ رکھتا ہو، اور اس نے اللہ تعالیٰ کے سوا کسی سے محبت نہ کی ہو اور وہ لقللہ الہی کا مشتاق ہو وہ موت کے ذریعے دنیا کے تیر خانے، اور شہوات کی تکلیف سے نجات پاتا ہے، اپنے محبوب کے پاس جاتا ہے، اس سے رکاوٹیں اور موانع منقطع ہو جاتے ہیں، اور اس پر نوال کے خوف کے بغیر اخروی نعمتیں دیر تک برستی ہیں، ملل کرنے والوں کو ایسے ہی درجات پر پہنچنے کے لئے عمل کرنا چاہیے۔

اب ہم اصلی مقصود کی طرف رجوع کرتے ہیں، بعض اوقات آدمی کو اپنے گھوڑے سے اس قدر محبت ہوتی ہے کہ اگر اسے اختیار دیا جائے تو اپنے گھوڑے سے ہاتھ دھو لے، یا خود کو بچھو سے کٹوالے تو وہ دوسری صورت اختیار کر لیتا ہے، کیوں کہ اسکے نزدیک بچھو کے کاٹنے پر صبر کرنا گھوڑے کی فراق پر صبر کرنے سے آسان ہے، اگر گھوڑا لے لیا گیا تو اس کی محبت جان لیوا اور تکلیف دہ ہوگی، اور زیادہ ڈنک مارے گی، اگر آدمی دنیا کی محبت میں جھلا ہے تو اسے ان ڈنکوں کے لئے تیار رہنا ہو گا، کیوں کہ موت اسے اس

کی تمام محبوب اور مرغوب چیزوں سے محروم کر دے گی، اس کا گھوڑا، سواری، گھر، زمین، اہل، اولاد، احباب، معارف، جاہ اور مقبولیت سب کچھ لے لے گی، یہاں تک کہ اس کے کان، آنکھ اور دوسرے اعضاء بھی چھین لے گی، اور پھر یہ چیزیں حاصل بھی نہ ہو سکیں گی، انکی واپسی سے پیشہ پیشہ کے لئے مایوس ہو جانا ہوگا، اب اگر کسی کو ان چیزوں سے محبت ہے، اور وہ جیتے جی ان سے جدا نہ ہوتا تھا تو موت اسے جدا ہونے پر مجبور کرے گی، اور اس جدائی کی تکلیف ایسی ہوگی جیسے سانپ پھوڑوں کے ڈسنے اور کانٹے سے ہوتی ہے، ہم پہلے ہی لکھ چکے ہیں کہ انسان کے اندر وہ قوت جسے رنج اور خوشی کا اور اک ہوتا ہے مرنے کے بعد بھی باقی رہتی ہے، بلکہ موت کے بعد یہ اور اک زیادہ سریلج اور قوی ہو جاتا ہے، اسلئے محبوب چیزوں سے جدائی کی تکلیف نہایت شدید ہوتی ہے، کیونکہ زندگی میں تو وہ خود کو بولنے، اور بیٹھنے اٹھنے سے تسلی دے سکتا تھا، اور دل کو یہ کہہ کر سلا سکتا تھا کہ وہ چیز دوبارہ مل سکتی ہے، جو چھینی گئی ہے، یا اسکا عوض مل سکتا ہے، لیکن مرنے کے بعد تسلی کی کیا صورت ہوگی تسلی اور ہلاوے کے تمام راستے مسدود کر دئے جائیں گے، صرف مایوسی ہی مایوسی ہوگی، بالفرض اگر کسی کو اپنے کرتے پا جائے سے ایسی محبت تھی کہ وہ اس سے چھین لیا جاتا تو ناگوار ہوتا، موت کے بعد بھی اسکے فراق کے تکلیف اٹھانی ہوگی، سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے یہی مراد ہے "نَبَاُ الْمُؤْمِنِينَ" (ملکوں نے نجات پائی) اور اگر ہماری ہوا تو عذاب بھی زیادہ ہوگا جیسے اگر کسی شخص کا غم دوسرے کے غم سے ہلکا ہوگا، اور ایک درہم والا درہم والے سے ہلکا ہوگا چنانچہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ "ایک درہم والا حساب میں دو درہم والے سے ہلکا ہوگا۔ بہر حال دنیا میں موت کے بعد ہم کوئی ایسی چیز چھوڑ کر نہیں جاؤ گے جس پر ہمیں حسرت نہیں ہوگی، اگر تم چاہو تو دنیا کی چیزوں میں کی رکھو، اور چاہو تو زیادتی رکھو، زیادتی رکھو گے تو تمہاری حسرت بھی زیادہ ہوگی، اور کی رکھو گے تو اپنی کر کا بوجھ ہلکا کر دے گے۔ سانپ اور بچھوان مالداروں کی قبروں میں زیادہ ہونگے، جو آخرت کے مقابلے میں دنیا کو پسند کرتے ہیں، اس پر خوش ہوتے ہیں، اسے پا کر مطمئن ہوتے ہیں۔"

یہ ایمان و تصدیق کی وہ صورتیں جو قبر کے سانپوں اور بچھوؤں، اور عذاب کی دیگر انواع میں اختیار کی جاسکتی ہیں، ابو سعید الخدری نے اپنے بیٹے کو جو انتقال کر گئے تھے خواب میں دیکھا، اور کہا اے بیٹے! مجھے کچھ نصیحت کر، بیٹے نے کہا آپ اللہ کے ارادے کی مخالفت نہ کریں، ابو سعید الخدری نے کہا کچھ اور نصیحت کر، بیٹے نے جواب دیا آپ اس پر عمل نہ کر سکیں گے ابو سعید نے کہا تو بیان کر، بیٹے نے کہا اپنے اور اللہ کے درمیان کوئی قیض نہ لائیں، یعنی قیض سے بھی اس قدر مانوس نہ ہوں کہ وہ اللہ کی محبت سے مشغول کر دے۔ چنانچہ حضرت ابو سعید الخدری نے تیس سال تک قیض نہیں پرست، اب رہا یہ سوال کہ مندرجہ بالا تین صورتوں میں سے کون سی صورت صحیح ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ بعض پہلی صورت کا انکار کریں گے، اور دوسری صورت کا اثبات کریں گے، اور بعض تیسری صورت کا اثبات کریں گے، لیکن غور و فکر کے بعد جو امر حق ہم پر منکشف ہوا ہے وہ یہ ہے کہ یہ تمام امکانات ہیں، جو لوگ بعض صورتوں کا انکار کرتے ہیں وہ اپنی پست ہمتی، جہالت، اور اللہ تعالیٰ کی وسیع تر قدرت اور عجائب تدبیر سے لاعلمی کی بنا پر کرتے ہیں، اصل میں وہ اللہ تعالیٰ کے ان افعال کا انکار کرتے ہیں جن سے وہ مانوس نہیں ہوتے، اور یہ محض جہالت اور غرور ہے، تعذیب کے یہ تین طریقے ممکن ہیں، اور ان کی تصدیق واجب ہے، ہمت سے بندوں کو ان میں سے ایک ہی نوع کا عذاب ہوگا، اور بہت سوں میں یہ تینوں صورتیں جمع کر دی جائیں گی، ہم عذاب الہی سے پناہ چاہتے ہیں خواہ وہ توڑا ہو یا زیادہ۔ یہ ہے حق بات، تم اسے تقلید کے طور پر تسلیم کر لو، دوسرے زمین پر کوئی ایسا شخص موجود نہیں ہے جو اس سلسلے میں میں تحقیق کے ساتھ کچھ کہہ سکا ہو، میں ہمیں وصیت کرتا ہوں کہ اس کی تفصیل میں نہ پڑو، اور نہ اسکی معرفت کے حصول میں مشغول نہ ہو، بلکہ عذاب سے خود کو محفوظ رکھنے کی تدبیر کرو، خواہ کیسے بھی ہو، اگر اس شخص کی طرح ہو گے جسے بادشاہ نے ہاتھ اور ناک کاٹنے کے لئے قید کر لیا ہو، اور وہ تمام رات یہ سوچتا رہے کہ بادشاہ میرے اعضاء چھری سے کاٹے گا، یا تلوار سے، یا اخترے سے، اور اس سزا سے بچنے کی تدبیر نہ کرے، یہ نہایت درجے کی جہالت ہے، بہر حال یہ بات اچھی طرح واضح ہو چکی ہے کہ موت کے بعد بعد یا تو عذاب الہم میں جہاں ہو گا یا دعامی فتنوں کا مستحق بنے گا، اسلئے بندے کو دعامی فتنوں کے حصول کی تیاری کرنی چاہیے، عذاب و عذاب کی تفصیل پر بحث کرنا بے کار

ہے اور وقت ضائع کرنے کے مترادف ہے۔

منکر نکیر کا سوال ان کی صورت، قبر کا دھاؤ اور عذاب قبر کے سلسلے میں مزید گفتگو: حضرت ابو ہریرہ روایت کرتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جب بندہ مرجا رہا ہے تو اسکے پاس دو سیاہ رو اور نیلی آنکھوں والے فرشتے آتے ہیں ان میں سے ایک کو منکر اور دوسرے کو نکیر کہا جاتا ہے وہ دونوں بندے سے کہتے ہیں کہ تو نبی کے سلسلے میں کیا کہتا تھا اگر وہ مومن ہے تو کہتا ہے کہ میں انھیں اللہ کا بندہ رسول کہتا تھا میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور پھر اسکی قبر ستر گز لمبی اور ستر گز چوڑی کردی جاتی ہے اور اسکے لئے قبر میں روشنی کردی جاتی ہے پھر اس سے کہا جاتا ہے کہ سو جا وہ کہے گا مجھے اپنے اہل و عیال کے پاس جانے دو تاکہ میں انھیں اسکی خبر دے سکوں وہ کہتے ہیں کہ سو جا وہ دہن کی طرح سو جاتا ہے اور اسے وہی جگاتا ہے جو اسے اپنے گھر والوں میں زیادہ محبوب ہوتا ہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اسے اسکی خواب گاہ سے اٹھائے گا اور اگر وہ منافق ہے تو کہتا ہے میں نہیں جانتا میں لوگوں کو کچھ کہتے ہوئے سنتا تھا اور وہی کہہ دیتا تھا جو سنتا تھا وہ فرشتے کہتے ہیں ہم جانتے تھے تو یہی کہے گا پھر زمین سے کہا جاتا ہے اس پر لپٹ جا زمین اس پر لپٹ جاتی ہے یہاں تک کہ اس کی پسلیاں ادھر سے اُدھر ہو جاتی ہیں وہ قیامت تک اسی عذاب میں مبتلا رہے گا (ترمذی ابن حبان) عطا ابن یسار روایت کرتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر ابن الخطابؓ سے ارشاد فرمایا اے عمر! جب تم مرجاؤ گے تو تمہارا حال کیا ہوگا تمہاری قوم تمہیں لے جائے گی اور لوگ تمہارے لئے تین ہاتھ لہا اور ڈیڑھ ہاتھ چوڑا ایک گڑھا تجویز کریں گے پھر تمہاری طرف واپس آئیں گے تمہیں سلاخیں کے اور کھن پستانیں گے اور تمہیں خوشبو میں بساتیں گے پھر اٹھا کر لے جائیں گے اور اس گڑھے میں رکھ دیں گے پھر تم پر مٹی ڈالیں گے اور دھن کر دیں گے جب وہ تمہیں وہاں رکھ کر واپس آئیں گے تو تمہارے پاس قبر کے دو فتنہ گر منکر نکیر آئیں گے ان کی آوازیں ایسی ہوں گی جیسے کڑکنے والی بجلی اور ان کی آنکھیں چمکنے والی بجلی کی طرح ہوں گی ان کے بال زمین پر پھسکتے ہوئے ہوں گے وہ قبر کو اپنی پکیلیوں سے اوجڑ کر تجھے مہینہ ڈالیں گے اور ہلا ڈالیں گے اے عمر! اس وقت تمہارا کیا عالم ہوگا حضرت عمرؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا اس وقت بھی میرے پاس محل ہوگی جیسے اس وقت ہے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہاں حضرت عمرؓ نے عرض کیا تب میں ان کے لئے کافی رہوں گا (یعنی میں ان سے نہٹ لوں گا) (ابن ابی الدینا) یہ ایک نفی صریح ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ محل موت سے حقیر نہیں ہوتی بلکہ صرف جسم اور اعضاء بدلنے ہیں گویا مرنے کے بعد بھی انسان آلام اور لذات کا علم رکھتا ہے اور ان کا ادراک کرتا ہے جیسے وہ اپنی زندگی میں کرتا تھا محلِ مد رک کوئی ظاہری عضو نہیں ہے بلکہ وہ ایک باطنی شے ہے جس کا نہ طول ہوتا ہے اور نہ عرض بلکہ جو چہنی بنفس مضمسم نہیں ہوتی وہی اشیاء کا ادراک کرنے والی ہے اگر انسان کے تمام اعضاء نکھر جائیں اور اسکے پاس وہ جزو مد رک باقی رہ جائے جو قائل تجوی نہیں ہو تو انسان کمال محل کے ساتھ باقی اور قائم رہتا ہے یہی حالت موت کے بعد بھی رہتی ہے اسلئے کہ اس جزو پر موت طاری نہیں ہوتی اور نہ اس میں عدم طویل کرتا ہے۔

محمد ابن الاسکندر کہتے ہیں کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ کافر اسکی قبر میں ایک اندھا بہرا جانور مسلط کیا جائے گا اسکے ہاتھ میں لوسہ کا ایک گرز ہوگا اور اسکا سراونٹ کے کوبان کی طرح ہوگا وہ اس گرز سے قیامت تک کافر کو ملتا رہے گا نہ اسے دیکھے گا کہ بچا کر مارے اور نہ سنے گا کہ اس پر رحم کرے حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ جب مردے کو قبر میں رکھ دیا جاتا ہے تو اسکے اہمال صالحہ آتے ہیں اور اسے گھیر لیتے ہیں اگر وہ جانور مسر کی جانب سے آتا ہے تو قرأت قرآن آجاتی ہے اور پاؤں کی جانب سے آتا ہے تو نمازوں میں کھڑے ہونے کا عمل سامنے آجاتا ہے اور اگر ہاتھوں کی طرف سے آتا ہے تو ہاتھ یہ کہتے ہیں بخدا یہ مجھے صدقہ اور دعا کیلئے پھیلایا کرتا تھا تو اس پر قابو نہیں پاسکتا اور اگر منہ کی جانب سے آتا ہے تو اس کا ذکر اور روزے آجاتے ہیں اسی طرح نماز اور صبر بھی ایک طرف کھڑے ہو جاتے وہ کہتے ہیں بخدا اگر ہمیں کوئی نظر آیا تو ہم اسکے ساتھ ہوں گے حضرت سفیان ثوریؒ کہتے ہیں کہ میت کیلئے اس کے نیک اعمال لڑتے ہیں جیسے کوئی شخص اپنے بھائی کے لئے اور زن و فرزند اپنے شوہر اور باپ کیلئے لڑتے

ہیں، پھر اس وقت کہا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ تجھے تیری آرام گاہ میں برکت عطا کرے، تیرے دوست بہترین دوست، اور تیرے رفیق بہترین رفیق ہیں، حضرت حذیفہ روایت کرتے ہیں کہ ہم سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ ایک جنازے میں تھے، آپ قبر کے کنارے بیٹھ گئے، اور اس میں دیکھنے لگے، پھر فرمایا سو من اس طرح دہرایا جاتا ہے کہ اسکی پسلیاں اور سینے کی ہڈیاں چورچور ہو جاتی ہیں (احمد) حضرت عائشہ روایت کرتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قبر دہرایا کرتی ہے، اگر قبر کے دہانے سے کوئی شخص محفوظ رہتا تو وہ سعد ابن معاذ ہوتے (احمد) حضرت انس روایت کرتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی زینب کا انتقال ہوا، آپ اکثر بیمار رہا کرتی تھیں، سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم جنازے کے ہمراہ تشریف لے گئے، آپ کا چہرہ مبارک بدلا ہوا تھا، جب ہم لوگ قبر پر پہنچے تو آپ ان کی قبر میں اترے، جب باہر تشریف لائے تو آپ کا چہرہ مبارک کھلا ہوا تھا، ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ! آپ کی ہم نے عجیب حالت دیکھی؟ آپ نے فرمایا مجھے اپنی بیٹی کا دہنا، اور عذابِ قبر کی شدت یاد آگئی تھی، جب میں قبر میں اترتا تو مجھے خبر دی گئی کہ اللہ تعالیٰ نے دہاؤں میں تخفیف کر دی ہے، اور اسے صرف اتنا دہایا گیا ہے کہ اسکی آواز مشرق و مغرب کے درمیان سنی گئی ہے (ابن ابی الدنیا)۔

خواب میں مردوں کے احوال کا مشاہدہ : جاننا چاہیے کہ انوارِ بصیرت سے جو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مستفاد ہوتے ہیں۔ ہمیں مردوں کے احوال کا علم ہوتا ہے، اور بالخصوص یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ نیک بخت ہیں یا بد بخت، لیکن کسی فرد معین مثلاً زید عمر کا حال بالکل مشکف نہیں ہوتا، ہمیں کہ اگر ہم زید و عمر کے ایمان پر احماد بھی کر لیں تب بھی ہم یہ بات یقین کے ساتھ کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ اس کا خاتمہ ایمان پر ہوا ہے، اور اگر ظاہری تقویٰ پر اکتفا کریں تو تقویٰ کا عمل قلب ہے، اور وہ خود صاحبِ تقویٰ پر مبنی رہتا ہے، چاہے غیر آدمی اس پر مطلع ہو گیا، اگر باطن میں تقویٰ نہ ہو تو ظاہری نیکی کا کوئی اعتبار نہیں ہے، اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے نہ

إِنَّمَا يَنْتَظِرُ اللَّهُمِّنُ الْمُتَّقِينَ (پ ۶، آیت ۲۷) خدا تعالیٰ متقین ہی کا عمل قبول کرتے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ زید و عمر کے حال کی معرفت مشاہدے کے بغیر ممکن نہیں، اور جب آدمی مر جاتا ہے تو وہ عالم ملک و شہادت سے عالم غیب و ملکوت کی طرف منتقل ہو جاتا ہے، اسلئے وہ ظاہری آنکھ سے نظر نہیں آتا، بلکہ اسے دیکھنے کے لئے دوسری آنکھ کی ضرورت ہوتی ہے، اور وہ آنکھ ہر انسان کے دل میں پیدا کی گئی ہے، لیکن انسان نے اس پر اپنی شہوات، اور دنیوی اشغال سے پردہ ڈال رکھا ہے، اسلئے وہ اس آنکھ سے دیکھ نہیں پاتا، اور نہ یہ ممکن ہے کہ وہ عالم ملکوت کی کوئی چیز اس وقت تک دیکھ سکے جب تک اسکے دل کی آنکھ پر شہوات کا پردہ ہے، کیونکہ انبیاءِ علیہم السلام کی آنکھوں پر یہ پردہ نہیں تھا اس لیے انھوں نے ملکوت اور اسکی عجائبات و معجزات تک کہ عالم ملکوت میں مردوں کے احوال کا مشاہدہ کیا، اور پھر گانِ خدا کو اسکی خبر دی، اسی لئے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے سعد ابن معاذ اور زینب کے سلسلے میں یہ خبر دی کہ قبر نے انھیں دہایا، اسی طرح جب حضرت ابو جابرؓ شہید ہو گئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے صاحبزادے کو بتلایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے باپ کو اپنے سامنے اس طرح دکھایا کہ دونوں کے درمیان کوئی پردہ نہیں تھا، انہی نے کرام، اور درجہ نبوت سے قربت رکھنے والے اولیائے مقام کے علاوہ کسی شخص سے اس مشاہدے کی توقع نہیں کی جاسکتی، ہم جیسے لوگوں کے لئے تو ایک ضعیف مشاہدہ ہی ممکن ہے، اگرچہ یہ بھی نبوی مشاہدہ ہے، ہماری مراد خواب ہے جو نبوت کے انوار میں سے ایک نور ہے، اور جس کے حلق سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ”مجھے خواب نبوت کے چھپالیں حصوں میں سے ایک حصہ ہے“ خواب بھی ایک انکشاف ہے، اور اس وقت ہوتا ہے جب دل سے پردہ ہٹ جاتا ہے، اسی لئے صرف اس شخص کے خواب کا اعتبار ہوتا ہے جو نیک چلن اور راست باز ہو، جو شخص بہت زیادہ جھوٹ بولتا ہے اس کا خواب قابلِ اعتبار نہیں ہوگا، جس شخص کے معاصی زیادہ ہوتے ہیں اس کا دل سیاہ ہو جاتا ہے، اور وہ نیند کے عالم میں دیکھتا ہے وہ خواب پریشان کہلاتا ہے، اسی لئے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے سونے سے پہلے وضو کا حکم دیا ہے تاکہ آدمی پاک ہو کر سونے (بخاری و مسلم۔ براء ابن عازب) اس حدیث میں باطن کی طہارت کے لئے تکمیل اور تہہ ہے، اور جب باطن صاف ہوتا ہے تو قلب

مبارک پر کہ کرمہ میں داخلہ مکشف ہو گیا تھا، حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے مکاشفہ کی تصدیق کیلئے یہ آیت نازل فرمائی :-
 لَقَدْ صَدَقَ الْمُرْسُوْلُ مَا يَدْعُوْا بِالْحَقِّ (پ ۳۱ ر ۴ آیت ۷۷)
 بے شک اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو سچا خواب دکھلایا

شاید ہی کوئی شخص ایسا ہو جو سچا خواب نہ دیکھ پاتا ہو، ورنہ عام طور لوگ خواب میں ایسی باتیں دیکھ لیتے ہیں جو بعد میں حقیقت بن کر سامنے آتی ہیں، خواب سچا ہونا اور نیند میں امور غیب کی معرفت اللہ تعالیٰ کی عجائب صنعت اور فطرت انسانی کے روشن اور عمدہ پہلوؤں میں سے ایک پہلو ہے، اور عالم ملکوت پر واضح ترین دلیل ہے، مخلوق جس طرح قلب اور عالم کے دیگر عجائبات سے غافل ہے اسی طرح وہ خواب کے عجائب سے بھی غافل ہے۔

لیکن خواب کی حقیقت کا بیان علوم مکاشفہ کے دقائق سے متعلق ہے، اور یہاں علم معاملہ سے ہٹ کر منھگو نہیں کی جاسکتی، اس لئے ہم صرف اس قدر ذکر کرتے ہیں جس کی اجازت ہے، اور ایک مثال کی صورت میں جس کے ذریعے تم مقصود پر بخوبی مطلع ہو سکتے ہو، دیکھو قلب کی مثال ایسی ہے جیسے آئینہ، اس میں صورتیں اور امور کے حقائق منعکس ہوتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ نے جو کچھ ازل سے ابد تک مقدر کیا ہے، وہ سب ایک جگہ لکھا ہوا ہے، اور وہ جبکہ اللہ کی مخلوق ہے، اسے بھی لوح محفوظ کہا گیا ہے، کبھی کتاب مبین، اور کبھی امام مبین، جیسا کہ قرآن شریف میں وارد ہوا ہے، عالم میں جو کچھ ہوا ہے یا جو کچھ ہونے والا ہے وہ سب اس میں نقش ہے، لیکن تم ظاہری آنکھ سے اس نقش کا مشاہدہ نہیں کر سکتے، تم یہ گمان نہ کرنا کہ وہ لوح لکڑی، لوسے یا پٹری کی ہے، یا کتاب کاغذ اور ورق سے ہے، بلکہ یہ بات تمہیں قطعی طور پر جان لینی چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کی لوح مخلوق کی لوح کے مشابہ نہیں ہے، اور نہ اسکی کتاب مخلوق کی کتاب کے مشابہ ہے، جس طرح اسکی ذات وصفات مخلوق کی ذات وصفات کے مشابہ نہیں ہوتی، اگر تم تقریب فہم کے لئے کوئی مثال چاہنا چاہو تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ لوح میں مقادیر الہی کا ثابت ہونا ایسا ہے جیسے حافظ قرآن کے دماغ اور قلب میں قرآن کریم کے کلمات اور حروف ثابت ہو جاتے ہیں اور ایسے ہوتے ہیں جیسے لکھے ہوئے ہوں، حافظ قرآن جب قرآن پڑھتا ہے تو ایسا لگتا ہے گویا وہ کہیں دیکھ کر پڑھ رہا ہے، حالانکہ اگر اس کا دماغ ٹھوٹا جائے اور ایک ایک جزء کر کے دیکھا جائے تو ایک حرف بھی لکھا ہوا نظر نہ آئے، اسی طرح لوح محفوظ میں وہ سب کچھ لکھا ہوا ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے فیصلہ کیا ہے، اور جو تقدیر انبی سے وجود پذیر ہونے والا ہے، لوح کی مثال ایک آئینے کی طرح ہے جس میں صورتیں منعکس ہوتی ہیں، اب اگر ایک آئینہ دوسرے آئینے کے مقابلے میں رکھا جائے تو دوسرے آئینے میں بھی وہی صورتیں منعکس ہوتی ہیں جو پہلے آئینے میں ہیں، بشرطیکہ دونوں کے درمیان کوئی پردہ حائل نہ ہو، قلب بھی ایک آئینے کی طرح ہے جو علوم کے آثار قبول کرتا ہے، اسی طرح لوح محفوظ بھی ایک آئینہ ہے جس میں تمام علوم کے آثار موجود رہتے ہیں، اور قلب کا شہوات کے ساتھ اشتغال اور حواس کے متغنیات ان دونوں ”آئینوں“ کے درمیان ایک حجاب ہیں، قلب کا آئینہ اس حجاب کے باعث لوح کا مطالعہ نہیں کرتا جس کا تعلق عالم ملکوت سے ہے، جب ”ہوا“ چلتی ہے تو اس حجاب کو حرکت دیتی ہے اور اسے اٹھا دیتی ہے، اس سے قلب کے آئینے میں عالم ملکوت کے بعض انوار برحق غائب کی طرح چمکتے ہیں، بعض اوقات یہ انوار دائمی ہو جاتے ہیں، اور کبھی دائمی نہیں ہوتے، عام طور پر یہی دوسری صورت ہوتی ہے، بیداری کے دوران جو کچھ حواس کے ذریعے عالم ظاہر سے آدمی تک پہنچتا ہے وہ اسی میں مشغول رہتا ہے، اور یہی مشغولیت اس کے لئے عالم ملکوت سے حجاب بن جاتی ہیں، اور نیند کے عالم میں حواس ٹھہر جاتے ہیں، اور قلب پر وارد نہیں ہوتے، اسلئے جو کچھ قلب پر وارد ہوتا ہے، وہ خالص ہوتا ہے، اور اس کا جو ہر نفس صاف ہوتا ہے، اس وقت اسکے قلب اور لوح کے درمیان سے پردہ اٹھ جاتا ہے، اور اسکی کوئی بات قلب کے آئینے میں منعکس ہوتی ہے، اگر دونوں کے درمیان کوئی حجاب نہ ہو، نیند حواس کو غفل سے روک دیتی ہے، لیکن خیال کو عمل اور حرکت سے نہیں روکتی، اسلئے جو بات دل میں واقع ہوتی ہے خیال اسی کی طرف سبقت کرتا ہے اور اسکو ایسی چیز سے مشابہت دے لیتا ہے جو اس کے قریب ہو، کیوں کہ خیالات حافظے میں زیادہ راسخ ہوتے ہیں، اسلئے خیال حافظے میں رہ جاتا ہے، جب آدمی بیدار ہوتا ہے تو اسے خیال کے علاوہ کوئی چیز یاد نہیں

رہتی، اسلئے تعبیر بتانے والے کو اس خیال پر نظر رکھنی پڑتی ہے اور وہ خیال و معنی میں مناسبت دیکھتا ہے اور اسی مناسبت پر اعتماد کرتے ہوئے تعبیر بتاتا ہے فن تعبیر سے واقف لوگوں کے سامنے اسکی بے شمار مثالیں ہیں، تاہم جو لوگ اس فن سے واقف نہیں ہم ان کیلئے ایک مثال بیان کرتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ ایک شخص نے امام فن علامہ ابن سیرین کی خدمت میں عرض کیا میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میرے ہاتھ میں انگوٹھی ہے اور میں لوگوں کے منہ اور شرمگاہوں پر اس سے مہر لگا رہا ہوں ابن سیرین نے فرمایا تو مؤذن ہے اور رمضان میں صبح سے پہلے اذان دیتا ہے اس شخص نے کہا آپ صحیح فرماتے ہیں دیکھو مہر لگانا منع کی علامت ہے اسلئے ابن سیرین کے ذہن میں فوراً یہی معنی پیدا ہوئے اور انھوں نے برخاستہ تعبیر بیان کر دی کہیں کہ اس مثال میں لوگوں کا کھانے پینے اور ہم بستر ہونے سے روکنے کا علم ہوتا ہے اور یہ حکم رمضان ہی میں ہو سکتا ہے۔

علم رویا کے متعلق یہ ایک مختصر گفتگو ہے ورنہ یہ علم ایک ناپید اکثار سمندر ہے اور اس کے بے شمار عجائب ہیں اور کیوں نہ ہوں جب کہ نیند موت کی بہن ہے اور موت خود ایک عجیب و غریب واقعہ ہے خواب اور موت میں مشابہت کی ایک وجہ یہ ہے کہ خواب میں فیص کے کچھ واقعات ظاہر ہو جاتے ہیں یہاں تک کہ سونے والا یہ جان لیتا ہے کہ مستقبل میں کیا ہونے والا ہے اور موت سے تو تمام عجائبات اٹھ ہی جاتے ہیں اور جو کچھ پردہ خفا میں تھا وہ سب ظاہر ہو جاتا ہے یہاں تک کہ سالس کی ڈور ٹوٹنے ہی انسان کسی تاخیر کے بغیر یہ جان لیتا ہے کہ وہ عذاب اور معیت میں پڑنے والا ہے یا اغروی سعادت اور ابدی سلطنت حاصل کرنے والا ہے اسی لئے جب بد بختوں کو اپنا انجام نظر آئے گا اور آنکھیں کھلیں گی تو ان سے کہا جائے گا۔

لَقَدْ كُنْتُمْ فِي غَفْلَةٍ مِنْ هَذَا فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَاءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيدٌ (پ ۱۲۱ آیت ۲۲)

تو اس دن سے بے خبر تھا سو اب ہم نے تجھ پر سے چھاپہ (مٹایا) سو آج تیری نگاہ بدی تجر ہے۔
اَفَسِحْرُ هَذَا اَمْ اَنْتُمْ لَا تُبْصِرُونَ اَصْلَوْهَا فَاُضْيِرُوا الْوَلَا تُبْصِرُوا سَوَاءٌ عَلَيْكُمْ اِنَّمَا تُجْرُونَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ۔ (پ ۲۲ آیت ۱۵)

تو کیا یہ سحر ہے یا یہ کہ تم کو نظر نہیں آتا اس میں داخل ہو پھر خواہ سار کرنا یا سارنا کرنا تمہارے حق میں دونوں برابر ہیں جیسا تم کہتے تھے ویسا ہی بدلہ تم کو دیا جائیگا۔

وَبَلَّاهُمْ مِنَ اللَّعْنَةِ لَمْ يَكُونُوا يُخْتَصِمُونَ (پ ۲۲ آیت ۴)

اور خدا کی طرف سے ان کو وہ معاملہ پیش آئے گا جس کا ان کو گمان بھی نہ تھا۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ جو شخص یہاں علماء میں سب سے بڑا عالم اور حکماء میں سب سے بڑا حکیم ہے اس پر موت کے بعد وہ عجائب اور نشانیاں منکشف ہوں گی کہ کبھی اس کے خواب و خیال میں بھی نہیں آئی ہوں گی اسلئے اگر عقل کو اس کے علاوہ کوئی غم اور فکر نہ ہو کہ مرنے کے بعد کیا ہوگا اور حجاب کس چیز سے اٹھے گا، تفاوت دائمی سے یا سعادت ابدی سے اگر وہ اسی فکر رات دن مشغول رہے اور اس فکر کے علاوہ اسے کوئی کام نہ ہو تو یہ اسے پوری عمر کے لئے کافی ہے، تعجب اس پر ہوتا ہے کہ عقیم تین مصیبتیں ہمارے سامنے ہیں اور ہم غفلت میں مبتلا ہیں بلکہ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ ہم اپنے احوال، اہل اسباب اور ذریت سے بلکہ اپنے اعضاء اور اپنی قوت سامعہ و بصرہ سے خوش ہوتے ہیں اور ان کے وجود پر نازاں ہوتے ہیں حالانکہ ہم ان چیزوں سے یقینی طور پر جدا ہونے والے ہیں، لیکن وہ شخص کہاں ہے جس کے دل میں روح القدس وہ بات القاء کرے جو سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمائی تھی کہ آپ جس چیز سے چاہیں محبت کر لیں آپ کو اس سے لانا جدا ہوتا ہے اور جس قدر چاہیں دنیا میں رہ لیں آپ کو مرنا ہے اور جو چاہیں عمل کر لیں اسکی آپ کو جزاء ملتی ہے کیونکہ یہ امور آپ پر یقین کے ساتھ منکشف تھے اسلئے آپ دنیا میں اس طرح رہے جیسے مسافر رہتا ہے نہ آپ نے ایٹم پر ایٹم رکھی اور نہ ہائس پر ہائس نہ ٹرکے میں کوئی درہم چھوڑا اور نہ دینار نہ کسی کو اپنا حبیب بنایا نہ دوست ارشاد فرمایا کرتے تھے نہ۔

لَوْ كُنْتُ مُتَّخِذًا خَلِيلًا لَا تَخَلَّتْ أَبَابُكُورُ خَلِيلًا وَلَكِنْ صَاحِبُكُمْ خَلِيلُ الرَّحْمَنِ

اگر میں کسی کو دوست بناتا تو ابو بکر کو بناتا، لیکن تمہارا ساتھی تو اللہ کا دوست ہے۔

گویا آپ نے یہ بیان فرمایا کہ رخص کی دوستی آپ کے باطن قلب میں جاگزیں ہو گئی تھی اور اسکی محبت آپ کے دل میں رائج ہو گئی تھی، یہاں تک کہ اس میں نہ کسی دوست کی محبت کی بات رہی تھی، اور نہ کسی حبیب کی، آپ نے اپنی امت سے ارشاد فرمایا: **إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ** (پ ۳۲ آیت ۳۱)

اگر تم خدا تعالیٰ سے محبت رکھتے ہو تو تم لوگ میرا اتباع کرو، خدا تعالیٰ تم سے محبت کرنے لگیں گے۔

آپ کی امت میں وہی داخل ہے جو آپ کا قبیع ہو اور آپ کی اتباع صحیح معنوں میں وہی محض کرتا ہے جو دنیا سے اعراض کرتا ہو، اور آخرت کی طرف متوجہ رہتا ہو، کیونکہ آپ نے اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت کے سوا کسی چیز کی طرف نہیں بلایا، اور نہ آپ نے دنیا اور فانی لذتوں کے علاوہ کسی چیز سے روکا، اس لئے تم جس قدر دنیا سے اعراض کرو گے، اور آخرت کی طرف راغب ہو گے اسی قدر تم اس راستے پر چلنے والے کلاؤ گے اسی قدر آپ کے قبیع کلاؤ گے، اور جس قدر اتباع کرو گے اسی قدر آپ کی امت میں سے ہو گے، اور جس قدر دنیا پر کرو گے اسی قدر آپ کے راستے سے انحراف کرو گے، اور آپ کی اتباع سے اعراض کرو گے، اور ان لوگوں کے ساتھ مل جاؤ گے، جن لوگوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **فَأَمَّا مَنْ طَغَىٰ وَ آتَرَ الْحَيٰةَ الْاَلْسِنٰی فَاِنَّ الْجَحِيْمَ هِيَ الْمَاوٰی** (پ ۳۰ آیت ۷-۸)

جس شخص نے سرکشی کی، اور دنیوی زندگی کو ترجیح دی، سو دوزخ اس کا ٹھکانہ ہوگا۔

کاش تم غرور کی چال سے نکل سکتے، اور اپنے نفس کے ساتھ انصاف کر سکتے، اور اس میں تمہارا ہی کیا قصور ہے، ہم سب کا یہی حال ہے، ہم سب ایک ہی راستے کے مسافر ہیں، صبح سے شام تک فانی لذتوں کے درپے رہتے ہیں، ہماری ہر حرکت اور ہر سکون دنیائے فانی کے لئے ہوتا ہے اور ان تمام نافرمانیوں کے بعد ہم یہ امید رکھتے ہیں کہ کل ہم آپ کی امت میں سے ہوں گے، اور آپ کے متبعین کی صف میں نظر آئیں گے، کتنا بعید ہے، یہ غن اور غنی ناقص ہے، یہ طعن اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: **اَفَنْجَعِلُ الْمُسْلِمِيْنَ كَالْمُجْرِمِيْنَ مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ** (پ ۱۹ آیت ۳۵-۳۶)

کیا ہم فرماں برداروں کو نافرمانوں کے برابر کر دیں گے، ہم کو کیا ہوا تم کیا فیصلہ کرتے ہو۔

اب ہم اپنے اصل مقصد کی طرف چلتے ہیں، قلم مقصد سے ہٹ گیا تھا، یہاں ہم بعض وہ خواب بیان کرتے ہیں جن سے مردوں کے احوال مشکف ہوتے ہیں، یہ خواب نافع ہیں، نبوت ختم ہو گئی ہے لیکن ہمشرات یعنی خواب باقی رہ گئے ہیں۔

مردوں کے احوال سے متعلق کچھ خواب: خوابوں میں اہم ترین خواب وہ ہے جس میں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہو، چنانچہ آپ کا ارشاد گرامی ہے جس نے مجھے خواب میں دیکھا اس نے واقعہ مجھے دیکھا، اس لئے کہ شیطان میری صورت اختیار نہیں کر سکتا (بخاری و مسلم ابو ہریرہ) حضرت عمر ابن الخطاب کہتے ہیں کہ میں نے خواب میں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی، آپ میری طرف متوجہ نہیں تھے، میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! میرا کیا قصور ہے؟ آپ میری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کیا تم روزے کی حالت میں بوسہ نہیں لیتے ہو، میں نے عرض کیا اس ذات کی قسم! جس کے قبضے میں میری جان ہے میں روزے کی حالت میں کبھی کسی عورت کا بوسہ نہیں لوں گا، حضرت عباسؓ بیان فرماتے ہیں کہ میں عمر ابن الخطاب کا دوست تھا، ان کی وفات کے بعد میرے دل میں یہ تمنا ہوئی کہ میں انھیں خواب میں دیکھوں، ایک سال کے بعد یہ تمنا پوری ہوئی، اور میں نے انھیں خواب میں دیکھا کہ پیشانی سے پینہ پونچھتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ اب مجھے فرصت نصیب ہوئی ہے، اگر میں رؤف و رحیم سے نہ ملا ہوتا تو میرا تخت ٹوٹ چکا ہوتا، حضرت حسنؓ روایت کرتے ہیں کہ میرے والد نے مجھ سے بیان فرمایا کہ آج رات میں نے خواب میں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی، اور عرض کیا کہ مجھے آپ کی امت سے بھلائی نہیں پہنچی، آپ نے فرمایا تم ان کے لئے بد دعا کرو، میں نے کہا اے اللہ! مجھے ان کے عوض ان سے بہتر لوگ عطا فرما، اور انھیں میرے بجائے مجھ سے برا آدمی

دے یہ خواب بیان کر کے آپ باہر نکلے اور ابن مسلم غیث نے آپ کو زخمی کر دیا ایک بزرگ بیان کرتے ہیں کہ میں نے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خواب میں زیارت کی اور عرض کیا یا رسول اللہ! میرے لئے دعا ہے مغفرت فرمائیے آپ نے مجھ سے اعراض فرمایا میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! ہم سے سفیان ابن عیینہ نے حدیث بیان کی کہ محمد ابن المنکدر سے روایت کرتے ہیں اور وہ جابر ابن عبد اللہ سے کہ آپ سے جب بھی کوئی چیز مانگی گئی آپ نے انکار نہیں فرمایا یہ سن کر آپ میری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا اللہ تیری مغفرت فرمائے عباس ابن عبد المطلب سے روایت ہے کہ مجھ میں اور ابو لہب میں بھائی چارہ کا رشتہ تھا جب وہ مر گیا اور اللہ نے اسکے بارے میں خبر دی تو مجھے اس کے انجام پر افسوس ہوا اور اسکی مجھے پیٹی لکھ ہوئی میں نے اللہ تعالیٰ سے سال بھر تک یہ دعا کی اے اللہ! مجھے اسے خواب میں دکھا دے ایک روز میں نے اسے خواب میں دیکھا کہ آگ میں جل رہا ہے میں نے اسکا حال پوچھا کہنے لگا کہ دوزخ کی آگ کے عذاب میں جلا ہوں شب و روز میں کبھی یہ آگ کم نہیں ہوتی اور نہ عذاب سے کچھ راحت ملتی ہے مگر وہ شبہ کی رات کو تخفیف ہو جاتی ہے میں نے کہا وہ شبہ کی رات میں کیا خصوصیت ہے ابوبسب نے جواب دیا اس رات محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے تھے اور ایک ہانڈی آندہ کے گھر میں ولادت کی خبر لے کر آئی تھی میں یہ سن کر خوش ہوا تھا اور اسی خوشی کے اظہار کے لئے میں نے ہانڈی کو آزاد کر دیا تھا اس کا ثواب مجھے اللہ تعالیٰ نے اس طرح دیا ہے کہ ہر وہ شبہ کی رات مجھ سے عذاب اٹھایا جاتا ہے عبد الواحد ابن زید کہتے ہیں کہ میں حج کے ارادے سے نکلا میرے ساتھ ایک ایسا شخص بھی تھا جو اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے دودھ شریف پڑھتا رہتا تھا میں نے اس سے اسکی وجہ دریافت کی اس نے کہا میں پہلی بار کہہ کر رہ گیا اس سفر میں میرے ساتھ میرے والد بھی تھے جب ہم لوگ واپس ہوئے تو ایک حیل پر پہنچ کر مجھے نیند آگئی ابھی میں سوی رہا تھا کہ ایک آنے والا آیا اور کہنے لگا کھڑا ہو اللہ تعالیٰ نے میرے والد کو ماریا ہے اور اس کا چہرہ سیاہ کر دیا ہے میں گھبرا کر کھڑا ہو گیا میں نے اپنے باپ کے چہرے سے کپڑا ہٹا کر دیکھا وہ واقعی مر چکے تھے اور ان کا چہرہ سیاہ ہو گیا تھا یہ حال دیکھ کر میرے دل میں خوف بیٹھ گیا ابھی میں اسی غم میں جلا تھا کہ مجھ پر نیند غالب آگئی میں نے خواب میں دیکھا کہ میرے والد کے سرہانے چار سیاہ دھبے تھے اور ان کے ہاتھوں میں لوہے کے گرز ہیں اچانک ایک شخص جو نہایت خرم تھا اور جس نے سبز لباس پہن رکھا تھا وہاں آیا اور ان لوگوں سے کہنے لگا دور رہو پھر میرے والد کے چہرے پر ہاتھ پھیرا اسکے بعد میرے پاس آیا اور کہنے لگا کھڑا ہو اور دیکھ اللہ تعالیٰ نے میرے باپ کا چہرہ روشن کر دیا ہے میں نے کہا میرے باپ آپ پر فدا ہوں آپ کون ہیں؟ اس نے کہا میں محمد ہوں میں اپنی جگہ سے کھڑا ہوا اور اپنے والد کے چہرے سے کپڑا ہٹا کر دیکھا تو واقعی ان کا چہرہ سفید ہو گیا تھا اس دن کے بعد سے میں نے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں ہدیہ دودھ و سلام بھیجتا ترک نہیں کیا حضرت عمر ابن عبد العزیز فرماتے ہیں کہ میں نے خواب میں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی حضرت ابو بکر عذرا آپ کی خدمت میں بیٹھے ہوئے تھے میں نے سلام کیا اور بیٹھ گیا اتنے میں حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ حاضر ہوئے اور ان دونوں کو میری نظموں کے سامنے ہی ایک کمرے میں داخل کیا گیا اور کمرہ بند کر دیا گیا ابھی تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ حضرت علیؓ یہ کہتے ہوئے باہر نکلے رب کعبہ کی قسم! میرے لئے فیصلہ کر دیا گیا ہے اور حضرت علیؓ کے لکھنے کے کچھ دیر بعد حضرت معاویہؓ یہ کہتے ہوئے نکلے کہ رب کعبہ کی قسم! میری خطا معاف کر دی گئی ہے حضرت عبد اللہ ابن عباسؓ ایک رات اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُونَ پڑھتے ہوئے نیند سے بیدار ہوئے اور کہنے لگے واللہ حسین کو قتل کر دیا گیا ہے یہ واقعہ اس وقت کا ہے کہ ابھی حضرت حسین علیہ السلام کی شہادت کی اطلاع وہاں نہیں پہنچی تھی اسلئے ابن عباسؓ کے رفقاء نے آپ کی اس خبر کا یقین نہیں کیا آپ نے فرمایا کہ میں نے خواب میں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی ہے آپ کے پاس ایک برتن میں خون تھا آپ نے مجھ سے ارشاد فرمایا کیا تو نہیں جانتا کہ میری امت نے میرے بعد کیا کیا ہے انھوں نے میرے بیٹے کو قتل کر دیا ہے یہ اس کا اور اس کے ساتھیوں کا کا خون ہے میں اسے اللہ تعالیٰ کے پاس لے جاؤں گا چوتھیں دن کے بعد خبر آئی کہ حضرت حسینؓ کو اسی دن شہید کر دیا گیا تھا جس دن حضرت عبد اللہ ابن عباسؓ نے خواب میں دیکھا تھا کسی نے حضرت ابو بکر الصدیقؓ کو خواب میں دیکھا اور دریافت کیا کہ آپ ہمیشہ اپنی زبان کے حلق یہ ارشاد فرماتے رہے ہیں کہ اس نے مجھے

تجلی کی جگہوں پر پہنچایا ہے، اب آپ کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے کیا معاملہ کیا ہے؟ انھوں نے فرمایا میں نے اس زبان سے لا الہ الا اللہ کہہ کر اپنے لئے اللہ تعالیٰ نے مجھے جنت میں داخل فرمایا۔

مشائخ عظام کے خواب : ایک بزرگ کہتے ہیں کہ میں نے تمیم الدوری کو خواب میں دیکھا اور عرض کیا کہ جناب والا! اللہ تعالیٰ نے آپ کے ساتھ کیا معاملہ فرمایا ہے، انھوں نے کہا کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے جنتوں میں گھمایا اور دریافت فرمایا کہ کیا تجھے جنت کی کوئی چیز اچھی لگی، میں نے عرض کیا نہیں، فرمایا اگر تجھے کوئی چیز اچھی لگتی تو میں وہ چیز تیرے سپرد کرتا، اور تجھے اپنی بارگاہ میں رہنے کا شرف نہ بخش۔ یوسف ابن الحسین کو خواب میں دیکھ کر کسی نے پوچھا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے ساتھ کیا معاملہ کیا ہے، انھوں نے کہا کہ میری مغفرت فرمادی ہے، سائل نے دریافت کیا کس وجہ سے؟ فرمایا میں نے سچیدہ بات کو مذاق میں نہیں اڑایا، منصور ابن اسماعیل کہتے ہیں کہ میں نے عبد اللہ البرادر کو خواب میں دیکھا اور پوچھا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے ساتھ کیا معاملہ کیا ہے، انھوں نے جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنے سامنے کھڑا کیا، اور میرے وہ تمام گناہ معاف فرمادیے جن کا میں نے اقرار و اعتراف کیا، صرف ایک گناہ ایسا تھا جس کا اعتراف کرتے ہوئے مجھے شرم آئی، اس کی سزا میں مجھے پسینے کے اندر کھڑا کیا گیا، یہاں تک کہ میرے چہرے کا گوشت گر گیا، میں نے پوچھا وہ گناہ کیا تھا، کہنے لگے میں نے ایک خوب روڑے کے گرد بکھاؤ مجھے اچھا لگا، مجھے اللہ تعالیٰ سے شرم آئی کہ میں اسکے سامنے اسکا ذکر کروں، ابو جعفر صدیق لانی کہتے ہیں کہ میں نے خواب میں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا آپ کے ارد گرد کچھ فقراء بیٹھے ہوئے تھے، اچانک آسمان درمیان میں سے پھا اور دو فرشتے نیچے اترے ان میں سے ایک کے ہاتھ میں طشت تھا وہ سرے کے ہاتھ میں لوٹا تھا۔ فرشتے نے طشت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پہنچا کر کہا، آپ نے اس میں ہاتھ دھوئے، اور لوگوں کو بھی حکم دیا، چنانچہ لوگوں نے بھی ہاتھ دھوئے، پھر طشت میرے سامنے رکھ دیا گیا، ان فرشتوں میں سے ایک نے دوسرے سے کہا کہ اسکے ہاتھوں پر پانی مت ڈالتا، اسلئے کہ وہ ان میں سے نہیں ہے، میں نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا آپ نے ارشاد نہیں فرمایا کہ آدمی ان لوگوں کے ساتھ ہے جن سے وہ محبت کرے، آپ نے فرمایا ہاں میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! میں آپ سے محبت کرتا ہوں، اور ان فقراء سے محبت کرتا ہوں، سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اسکے ہاتھ بھی دھلاؤ، یہ بھی انہی میں سے ہے، حضرت جنید فرماتے ہیں کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ میں لوگوں میں خطاب کر رہا ہوں، اتنے میں ایک فرشتہ میرے پاس آیا اور کہنے لگا وہ عمل کون سا ہے جس سے تقرب حاصل کرنے والے اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرتے ہیں، میں نے کہا وہ عقلی عمل جو میزانِ عمل میں پورا اترے، وہ فرشتہ یہ کہتا ہوا واپس ہو گیا، اس کا کلام تو فنی یافتہ شخص کا کلام ہے، مجمع کو خواب میں دیکھ کر پوچھا گیا کہ آپ نے معاملہ کیا پایا؟ انھوں نے جواب دیا کہ میں نے دنیا میں زہد کرنے والوں کو دیکھا کہ وہ دنیا و آخرت کی خیر سمیٹ کر لے گئے شام کے ایک شخص نے علاء ابن زیاد سے کہا کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ آپ جنت میں ہیں، وہ اپنی نشست سے اترے، اور اس شخص کے پاس آکر فرمایا کہ شیطان نے مجھے گمراہ کرنا چاہا تھا، اس سے توجہ گیا، لیکن اب تجھے اس کام کے لئے متعین کیا ہے، محمد ابن الواسع کہتے ہیں کہ اچھے خواب مومن کو خوش کرتے ہیں، قریب نہیں دیتے صالح ابن بشر کہتے ہیں کہ میں نے عطاء سلمیٰ کو خواب میں دیکھا اور عرض کیا آپ تو دنیا میں نہایت رنجیدہ اور مغموم رہا کرتے تھے، فرمایا اب بخدا مجھے ایک طویل راحت اور خوشی میسر ہے، میں نے پوچھا آپ کس درجے میں ہیں، انھوں نے جواب میں یہ آیت پڑھی ۔

مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ (پ ۵، آیت ۶۹)

ان حضرات کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا ہے یعنی، انبیاء صدیقین شہداء اور صالحین۔
ذرا تہ ابن ابی اونی سے خواب میں کسی نے پوچھا کہ آپ کے نزدیک افضل ترین عمل کون سا ہے، انھوں نے جواب دیا، رضا اور اہل کا کوتاہ ہونا، یزید ابن مذکور کہتے ہیں کہ میں نے اوزاعی کو خواب میں دیکھا اور عرض کیا اے ابو عمرو مجھے کوئی ایسا عمل بتلاؤ جسکے ذریعے میں اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کر سکوں، انھوں نے فرمایا میں نے یہاں علماء کے درجے سے بڑا کوئی درجہ نہیں دیکھا، انکے بعد غمگین رہنے والوں کا درجہ ہے، روایت ہے کہ یزید ابن مذکور نہایت ضعیف البرع تھے، وہ اس خواب کے بعد اس

کرتے تھے کہ ان کی بیٹائی جاتی رہی تھی۔

ابن عیینہ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے بھائی کو خواب میں دیکھا اور دریافت فرمایا کہ اے بھائی! اللہ تعالیٰ نے تیرے ساتھ کیا معاملہ کیا ہے؟ اس نے کہا کہ اللہ نے میرے تمام گناہ بخش دئے ہیں جن کی میں نے مغفرت چاہی تھی، اور جن کی مغفرت نہیں چاہی تھی وہ نہیں بخشے ہیں، علی الملحی کہتے ہیں کہ میں نے خواب میں ایک عورت کو دیکھا جو دنیا کی عورتوں جیسی نہیں تھی، میں نے اس سے پوچھا کہ تو کون ہے؟ اس نے کہا میں حور ہوں، میں نے کہا مجھ سے شادی کر لے، وہ کہنے لگی میرے آقا کو پیغام دے اور میرا امر ادا کر، میں نے پوچھا تیرا امر کیا ہے، وہ کہنے لگی کہ اپنے نفس کو اسکی آفات سے بچانا میرا امر ہے۔ ابراہیم ابن اسحاق الحمیری کہتے ہیں کہ میں نے زیدہ کو خواب میں دیکھا اور پوچھا کہ اللہ نے تیرے ساتھ کیا معاملہ ہے؟ اس نے کہا اللہ تعالیٰ نے میری مغفرت کر دی ہے، میں نے پوچھا اس مال کی بنا پر جو تو نے مکہ مکرمہ کے راستے میں خرچ کیا ہے، اس نے کہا مال کا ثواب تو اس کے مالکوں کو ملا ہے، مجھے تو میری نیت کا صلہ عطا کیا گیا ہے، جب حضرت سفیان ثوری کا انتقال ہو گیا تو کسی نے انھیں خواب میں دیکھ کر دریافت کیا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے ساتھ کیا معاملہ کیا ہے، انھوں نے جواب دیا کہ میں نے پہلا قدم بل صراط پر رکھا، اور دوسرا جنت میں، احمد ابن ابی الحواری کہتے ہیں کہ میں نے خواب میں ایک باندی کو دیکھا وہ بے حد حسین تھی، اتنا حسن میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا، اس کا چہرہ نور سے چمک رہا تھا، میں نے اس سے پوچھا کہ تیرے نورانی چہرے کی وجہ کیا ہے؟ اس نے کہا کہ کیا تجھے وہ شب یاد ہے جس میں تو رویا تھا، میں نے کہا ہاں مجھے یاد ہے، اس نے کہا میں نے تیرے آسولے کر اپنے چہرے پر مل لئے تھے، اسی وقت سے میرا چہرہ اس قدر روشن ہے، کتانی کہتے ہیں کہ میں نے خواب میں حضرت جنید کو دیکھا اور پوچھا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے ساتھ کیا معاملہ کیا ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ وہ اشارات ضائع گئے اور وہ عبادتیں رائگاں ہوئیں، ہمیں جو کچھ ثواب ملا وہ ان دور رسکتوں پر ملا جو ہم رات میں پڑھا کرتے تھے، زیدہ کو خواب میں دیکھ کسی نے پوچھا کہ اللہ تعالیٰ نے تیرے ساتھ کیا معاملہ کیا ہے، اس نے جواب دیا کہ مجھے ان چار کلموں کی وجہ سے بخش دیا ہے، **لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ أَقْبَرُ بِهَا عُمْرِي، لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ أَدْخُلُ بِهَا قَبْرِي، لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ أَخْلُو بِهَا وَحْدِي، لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ أَلْقَى بِهَا رَبِّي**۔ (اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اسی کلمے پر میں اپنی عمر تمام کروں، اسی پر اپنی قبر میں داخل ہوں، اسی پر اپنی غلوت میں تھرا ہوں، اسی پر اپنے پروردگار سے ملوں)۔

بشر ابن الحارث کو خواب میں دیکھ کر کسی نے پوچھا اللہ تعالیٰ نے آپ کے ساتھ کیا معاملہ کیا ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ میرے اللہ نے مجھ پر رحم کیا، اور ارشاد فرمایا کہ اے بشر تجھے ہم سے شرم نہ آئی کہ ہم سے اس قدر ڈرتا تھا، ابو سلیمان کو خواب میں دیکھ کر دریافت کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے ساتھ کیا معاملہ کیا ہے؟ فرمایا مجھ پر رحم کیا، اور ہمیں سب سے زیادہ نقصان لوگوں کے اشاروں نے پہنچایا، ابو بکر الکتانی کہتے ہیں کہ میں نے خواب میں ایک بے حد حسین و جمیل نوجوان کو دیکھا، اور اس سے دریافت کیا کہ تو کون ہے؟ اس نے کہا کہ میں تقویٰ ہوں، میں نے پوچھا تیرا مسکن کہاں ہے؟ اس نے کہا کہ میں ہر قلب حزیں میں رہتا ہوں، یہ کہہ کر اس نے رخ بدلا، اسکے بعد دیکھا تو وہ ایک سیاہ عورت تھی، میں نے پوچھا تو کون ہے؟ کہنے لگی میں بیماری ہوں، میں نے پوچھا تو کہاں رہتی ہے؟ اس نے کہا میں ہر خوش و خرم دل میں رہتی ہوں، اس کے بعد میں بیدار ہو گیا، اور میں نے عہد کیا کہ میں کبھی مسکراؤں گا نہیں، **اللّٰہ** کہ بے اختیار ہو جاؤں، ابو سعید الخراز کہتے ہیں کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ ابلیس نے مجھ پر حملہ کیا ہے؟ میں نے اسے مارنے کے لئے لاٹھی اٹھائی، مگر وہ ذرا ہی خوف زدہ نہ ہوا، اچانک یہ آواز آئی کہ ابلیس لاٹھی سے نہیں ڈرتا، بلکہ قلب کے نور سے ڈرتا ہے، موسیٰ کہتے ہیں کہ میں نے خواب میں ابلیس کو دنگا گھومتے ہوئے دیکھا اور اس سے کہا کہ کیا تجھے لوگوں سے شرم نہیں آتی، اس نے کہا کیا یہ آدمی ہیں، اگر آدمی ہوتے تو میں ان کے ساتھ رات دن اس طرح کیوں کھیلتا جس طرح بچے گیند کے ساتھ کھیلا کرتے ہیں، بلکہ آدمی ان کے علاوہ دوسرے ہیں، انھوں نے میرا جسم کمزور کر دیا ہے، یہ کہہ کر اس نے ہمارے اصحاب تصوف کی طرف اشارہ کیا، ابو سعید الخراز کہتے ہیں، میں دمشق میں تھا، میں نے خواب میں دیکھا کہ نبی اکرم صلی اللہ

علیہ وسلم حضرات ابو بکر و عمر کا سارا لئے ہوئے میرے پاس تشریف لائے اور کھڑے ہو گئے میں اس وقت کچھ کلمات کہہ کر اپنے سینے پر ضرب لگا رہا تھا آپ نے فرمایا اس کی برائی اسکے خیر سے کم ہے حضرت سفیان ابن عیینہ فرماتے ہیں کہ میں نے سفیان ثوریؒ کو خواب میں دیکھا کہ آپ جنت میں ہیں اور ایک درخت سے دوسرے درخت پر یہ کہتے ہوئے اڑ رہے ہیں ”لِمِثْلِ هَذَا فَلْيَعْمَلِ الْعَامِلُونَ“ میں نے کہا کہ مجھے کچھ وصیت فرمائیں فرمایا: لوگوں کی معرفت کم کرو ابو حاتم الرازی قیثم ابن عقبہ سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے سفیان ثوریؒ کو خواب میں دیکھا اور پوچھا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے ساتھ کیا معاملہ کیا ہے انھوں نے فرمایا:

نَظَرْتُ إِلَى رَبِّي كِفَاحًا فَقَالَ لِي
فَقَدْ كُنْتُ لَدَا أَظْلَمَ اللَّحْمِي
فَلَوْ نَكَ فَاخْتَرْتُ أَيْ قَصَصْتُ لِرَبِّي
وَزَرْنِي فَإِنِّي مِنْكَ غَيْرُ بَعِيدٍ

(میں نے اپنے رب کو سامنے دیکھا تو اس نے فرمایا اے ابن سعید! تجھ سے میری رضامندی مبارک ہو جب رات ہو جاتی تھی تو تو تہجد کے لئے کھڑا ہوتا تھا، قلب مشتاق اور چشم گریاں کے ساتھ اب تو جنت کا جو بھی مکان چاہے پسند کر لے اور میری زیارت کر میں تجھ سے دور نہیں ہوں۔)

حضرت قتیبہؒ کو ان کی وفات کے تین دن کے بعد خواب میں دیکھا گیا اور دریافت کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے ساتھ کیا معاملہ کیا ہے فرمایا اللہ تعالیٰ نے میرے ساتھ اس قدر منافقہ کیا کہ میں اپنی بخشش سے مایوس ہو گیا جب اس نے میری مایوسی دیکھی تو مجھے اپنی رحمت میں ڈھانپ لیا بنو عامر کے بھون کو اسکے انتقال کے بعد خواب میں دیکھ کر پوچھا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے تیرے ساتھ کیا معاملہ کیا ہے اس نے کہا میری مغفرت فرمائی اور مجھے محبت کرنے والوں پر رحمت قرار دیا حضرت سفیان ثوریؒ کو خواب میں دیکھ کر کسی نے انکے ساتھ اللہ کے معاملے کے بارے میں پوچھا انھوں نے جواب دیا کہ اللہ نے مجھ پر رحم فرمایا ہے سائل نے دریافت کیا عبد اللہ ابن المبارک کا کیا حال ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ وہ اپنے رب کے پس ہر روز دودھہ جایا کرتے ہیں ایک بزرگ کو خواب میں دیکھ کر کسی نے ان کا حال دریافت کیا بزرگ نے کہا پہلے ہم سے سختی کے ساتھ پوچھنا چھ کی پھر احسان کرتے ہوئے ہمیں آزاد کر دیا مالک ابن انس کو خواب میں دیکھ کر دریافت کیا گیا کہ اللہ نے آپ کے ساتھ کیا معاملہ کیا ہے؟ فرمایا کہ میرے اس کلمے کے باعث مغفرت کر دی گئی جو حضرت عثمان ابن عفانؓ جنازے کو دیکھ کر فرمایا کرتے تھے ”سُبْحَانَ الْحَيِّ الَّذِي لَا يَمُوتُ“ جس رات حضرت حسن بھری کا انتقال ہوا اس رات خواب میں دیکھا گیا کہ گویا آسمان کے دروازے کھلے ہوئے ہیں نور کوئی اعلان کرنے والا یہ اعلان کر رہا ہے کہ آگاہ ہو حسن بھری اللہ تعالیٰ کے پاس اس حال میں آرہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہے جاہل کو خواب میں دیکھ کر کسی نے پوچھا کہ اللہ تعالیٰ نے تیرے ساتھ کیا معاملہ کیا ہے اس نے یہ شعر پڑھا:

وَلَا تَكُتُبْ بِخَطِّكَ غَيْرَ شَيْءٍ
يَسْتَرْكَبِي الْقِيَامُ قَاتِلُ تَرَاهُ

(تو اپنے قلم سے اس بات کے علاوہ کچھ نہ لکھنا جسے دیکھ کر تجھے قیامت کے دن خوشی حاصل ہو)

حضرت جنیدؒ نے ابلیس کو خواب میں دیکھا کہ وہ ننگا پھر رہا ہے انھوں نے اس سے کہا کیا تجھے ان آدمیوں سے شرم نہیں آتی ابلیس نے کہا کیا یہ آدمی ہیں آدمی تو وہ ہیں جنھوں نے مسجد شونیزی میں میرے جسم کو لاغیر کر دیا اور میرے جگر کو خاکستر کر ڈالا حضرت جنیدؒ کہتے ہیں کہ میں نے بیدار ہونے کے بعد مسجد کا قصد کیا اور دیکھا کہ وہاں کچھ لوگ سر جھکائے بیٹھے ہیں اور سوچتے ہیں مصروف ہیں مجھے دیکھ کر وہ لوگ کہنے لگے تمہیں جھپٹ کے قریب میں نہ آنا چاہئے نصر آبادی کو مکہ مکرمہ میں وفات کے بعد خواب میں دیکھا گیا اور دریافت کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے انھوں نے کہا کہ مجھ پر شرفاء کا عتاب نازل ہوا پھر فرمایا گیا اے ابو القاسم کیا ملنے کے بعد جدائی ہوتی ہے میں نے عرض کیا نہیں اے صاحب جلال چنانچہ مجھے ابھی قبر میں رکھا گیا تھا کہ میں اپنے رب سے جا ملا عقبہ غلام نے خواب میں ایک خوبصورت حور دیکھی حور نے ان سے کہا اے عقبہ میں تجھ پر

عاشق ہوں، اب کوئی ایسا کام نہ کرنا جو میرے اور تیرے درمیان حائل ہو جائے، تجھ نے کہا میں دنیا کو تین مغلطہ ملاؤں دے چکا ہوں، اب رجعت کی کوئی صورت نہیں ہے، یہاں تک کہ تجھ سے ملاقات کروں روایت ہے کہ ایوب العلیانی کسی گناہ گار بندے کا جنازہ دیکھ کر گھر چلے گئے تاکہ ان کی نماز جنازہ نہ پڑھیں، رات کو کسی بزرگ نے اس شخص کو خواب میں دیکھا اور پوچھا اللہ نے میرے ساتھ کیا معاملہ فرمایا، اس نے کہا اللہ نے مجھ بھل دیا ہے، اور تم ایوب العلیانی کو یہ آیت سناؤ نہ

قُلْ لَّوْ أَنْتُمْ تَعْمَلُونَ خَيْرًا لِّنَفْسِكُمْ أَنْ لَا مَنِّكُمْ خَشْيَةً مِّنَ اللَّهِ (پ ۱۵ ر ۴ آیت ۱۰۰)

آپ فرما دیجئے اگر تم لوگ میرے رب کی رحمت کے بخار ہوتے تو اس صورت میں تم خراج کرنے کے اندیشے سے ضرور ہاتھ روک لیتے۔

ایک بزرگ کہتے ہیں کہ جس رات حضرت داؤد الخالی کی وفات ہوئی میں نے خواب میں دیکھا کہ آسمان پر ایک نور ہے، اور دنیا میں فرشتوں کی آمد و رفت جاری ہے، میں نے پوچھا یہ کون سی رات ہے؟ لوگوں نے کہا اس رات میں داؤد الخالی کا انتقال ہوا ہے، اور ان کی روح کے استقبال کے لئے جنت سجائی جا رہی ہے، ابوسعید الخدیم کہتے ہیں کہ میں نے سل معلوکی کو خواب میں دیکھا اور کہا اے شیخ! وہ کہنے لگے اب مجھے شیخ مت کہنا، میں نے کہا کیوں نہ کہوں، دنیا میں تمہارے حالات اسی قابل تھے کہ تمہیں شیخ کہا جائے، کہنے لگے وہ حالات ہمارے کچھ کام نہ آئے، میں نے کہا اللہ تعالیٰ نے آپ کے ساتھ کیا معاملہ کیا ہے؟ فرمایا مجھے ان مسائل کی وجہ سے بھٹن دیا ہے جو فلاں بڑھیا مجھ سے دریافت کرتی تھی، ابن راشد کہتے ہیں کہ میں نے عبد اللہ ابن المبارک کو وفات کے بعد خواب میں دیکھا اور دریافت کیا کیا آپ انتقال نہیں کر گئے تھے؟ انھوں نے فرمایا ہاں! میں نے پوچھا اللہ تعالیٰ نے آپ کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے؟ فرمایا اللہ تعالیٰ نے میری ایسی مغفرت فرمائی بیکہ تمام گناہوں کو محیط ہو گئی ہے، میں نے پوچھا سفیان ثوری کا کیا حال ہے؟ انھوں نے کہا ان کا کیا پوچھنا وہ تو ان لوگوں کے ساتھ ہیں ”مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ“ ریح ابن سلیمان کہتے ہیں میں نے امام شافعی کو انتقال کے بعد خواب میں دیکھا اور دریافت کیا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے ساتھ کیا معاملہ کیا ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ اللہ نے مجھے سونے کی کرسی پر بٹھایا، اور مجھ پر تانہ موتی بکھیرے حسن بھری کے کسی ساتھی نے انھیں ان کے انتقال کی رات خواب میں دیکھا کہ گویا ایک اعلان کرنے والا یہ اعلان کر رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم، نوح، آل ابراہیم، آل عمران کو تمام مخلوق پر فضیلت بخشی ہے، اور حسن بھری کو اس کے زمانے کے لوگوں پر فضیلت دی ہے، ابویعقوب قاری رقمی کہتے ہیں کہ میں نے خواب میں ایک انتہائی طویل قامت شخص کو دیکھا لوگ اس کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے، میں نے لوگوں سے پوچھا یہ کون صاحب ہیں؟ لوگوں نے کہا یہ اویس قرنی ہیں، میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا، اور عرض کیا کہ اللہ آپ پر رحم فرمائے مجھے کچھ نصیحت کیجئے، آپ نے بے انتہائی فرمائی اور مجھ سے ترش روئی ظاہر کی، میں نے عرض کیا کہ میں آپ سے رہنمائی کا خواستگار ہوں، آپ میری رہنمائی فرمائیں اللہ آپ کی رہنمائی فرمائے گا، وہ میری طرف متوجہ ہوئے، اور فرمایا اپنے رب کی رحمت کو اسکی محبت کے وقت طلب کرو، اور اس کے انتقام سے اسکی معصیت کے وقت ڈرو، اور اس دوران اس سے امید کا سلسلہ منقطع مت کرو، پھر وہ مجھے چھوڑ کر آگے بڑھ گئے، ابو بکر ابن ابی مریم کہتے ہیں کہ میں نے ور قاع ابن بشر الحضری کو خواب میں دیکھا اور پوچھا اے ور قاع تیرا انجام کیا ہوا؟ اس نے جواب دیا کہ مجھے بڑی مشکل سے نجات حاصل ہوئی، میں نے کہا تمہیں کون سا عمل بہتر لگا، کہنے لگے اللہ کے خوف سے رونا، یزید ابن نعمان کہتے ہیں کہ ایک لڑکی طاعون جارف کے زمانے میں مر گئی، رات کو اس کے باپ نے خواب میں دیکھا اور کہا اے بیٹی! مجھے آخرت کے متعلق کوئی خبر دے، اس نے کہا انا جان! ہم ایک ایسے زبردست امر سے دوچار ہوئے ہیں جسے جاننے ہیں لیکن عمل نہیں کرتے اور تم عمل کرتے ہو لیکن چاہتے نہیں ہو، اللہ کی قسم دنیا اور اسکی تمام تر نعمتوں سے بہتر میرے نزدیک یہ ہے کہ میرے نامہ اعمال میں ایک یا دو بار کہا گیا کہ سمان اللہ، اور ایک یا دو رکعت نماز ہو، عتبہ فلام کے ایک مرید کہتے ہیں کہ میں نے عتبہ کو خواب میں دیکھا اور دریافت کیا اللہ تعالیٰ نے تمہارے ساتھ کیا معاملہ کیا ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ میں ان کلمات دعا کے فضیل جنت میں داخل ہوا جو تیرے گھر

میں لکھے ہوئے ہیں، بیدار ہونے کے بعد میں گھر کے اندر گیا تو دیکھا کہ ایک دیوار پر حجب غلام نے اپنے قلم سے یہ کلمات لکھ چھوڑے ہیں نہ

يَا هَادِيَ الْمَضَلِّينَ وَبِالْحَمْدِ الْمُنِيبِينَ وَيَا مُقْبِلَ عَشَرَاتِ الْعَازِمِينَ لِرَحْمَةِ عَبْدِكَ
ذَا الْخَطَرِ الْعَظِيمِ وَالْمُسْلِمِينَ كُلَّهُمْ أَجْمَعِينَ وَاجْعَلْنَا مَعَ الْأَخْيَارِ
الْمَرْتُوقِينَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّينَ وَالصَّالِحِينَ وَالشَّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ
الَّذِينَ يَأْتُونَكَ بِالْحَقِّ

اے گمراہوں کو راہ دکھانے والے، اے خطاکاروں پر رحم کرنے والے، اے لغزش کرنے والوں کی لغزشیں دور کرنے والے، اپنے بندے پر رحم کر جو زہدست خطرے سے دوچار ہے، اور تمام مسلمانوں پر رحم کر، اور ہمیں ان زندہ لوگوں کے ساتھ کر جو رزق دے جاتے ہیں جن پر تو نے انعام کیا ہے، انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین میں سے اے تمام جہانوں کے پروردگار یہ دعا قبول فرما۔

موسیٰ ابن حماد کہتے ہیں میں نے خواب میں دیکھا کہ سفیان ثوری جنت میں ہیں، اور ایک درخت سے دوسرے درخت پر اڑ رہے ہیں، میں نے عرض کیا اے ابو عبد اللہ آپ نے یہ مرتبہ کس عمل سے حاصل کیا، انھوں نے جواب دیا دوسرے سے، میں نے پوچھا علی ابن حاتم کا کیا حال ہے، فرمایا وہ تو سارے کی طرح درختوں میں ایک تا جی نے خواب میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی، اور عرض کیا یا رسول اللہ مجھے نجات فرمائیے! فرمایا جو نقصان پر نظر نہیں رکھتا وہ نقصان اٹھاتا ہے، اور جو نقصان اٹھائے اس کے لئے موت بہتر ہے، امام شافعی فرماتے ہیں کہ گزشتہ دنوں میں ایک ایسی مصیبت کا فکار تھا جس نے مجھے سخت پریشان کر رکھا تھا، اور اس کے باعث میں انتہائی تکلیف میں تھا، اور اس مصیبت پر اللہ کے سوا کسی کو اطلاع بھی نہیں تھی، گزشتہ رات ایک شخص میرے پاس آیا اور کہنے لگا اے محمد ابن ادریس! تو یوں کہا کہ۔

اللَّهُمَّ إِنِّي لَا أَمْلِكُ لِنَفْسِي نَفْعًا وَلَا ضَرًّا وَلَا مَوْتًا وَلَا حَيَاتًا وَلَا نُسُورًا وَلَا
أَسْتَطِيعُ أَنْ أَخْذِلَ إِلَّا مَا أَعْطَيْتَنِي، وَلَا أَتَقَى إِلَّا مَا وَقَيْتَنِي، اللَّهُمَّ فَوَقِّفْنِي لِمَا
تُحِبُّ وَتَرْضَى مِنَ الْقَوْلِ وَالْعَمَلِ فِي عَافِيَةٍ

اے اللہ! میں اپنے لئے نہ کسی نفع کا مالک ہوں نہ نقصان کا، نہ موت کا، نہ حیات کا، نہ مرنے کے بعد

زندہ ہونے کا، اور نہ میرے لئے ممکن ہے کہ وہ لوں جو تو مجھے نہ دے، اور اس چیز سے محفوظ رہوں جس سے تو

محفوظ نہ رکھے، اے اللہ! مجھے اس قول و عمل کی توفیق عطا کر جسے تو اچھا جانتا ہے اور پسند کرتا ہے، عافیت کے ساتھ۔

صبح کو میں نے یہ دعا دوبارہ پڑھی، جب دوپہر ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے میرا مقصد پورا فرمایا، اور مجھے اس مصیبت سے نجات عطا کردی، جس میں میں مبتلا تھا، لوگو! تم ان دعاؤں کا التزام کرنا، اور ان سے غفلت مت کرنا۔

یہ ہیں کچھ مکاشفات جن سے مردوں کے احوال کا پتا چلتا ہے، اور ان کا علم ہوتا ہے جو بندوں کو اللہ سے قریب کرنے والے ہیں۔

دوسرا باب

صور پھونکنے سے، جنت یا دوزخ میں جانے تک مردے کے حالات

اس سے پہلے باب میں تم سکرات موت میں میت کے احوال، اور خوف آخرت کے سلسلے میں اس کے خطرات کا بیان پڑھ چکے ہو، اور یہ جان چکے ہو کہ اگر مرنے والا ان لوگوں میں سے ہے جن پر اللہ تعالیٰ کا غضب نازل ہوگا تو اسے قبر کی تاریکی اور اس کے کیڑوں کا سامنا ہوگا، گھبریں اس سے سوال کریں گے، پھر قبر کا عذاب ہوگا، ان سے بھی زیادہ سخت مراحل عذاب وہ ہیں جو قبر کے بعد پیش آنے والے ہیں جیسے صور کا پھونکنا، قیامت کے دن دوبارہ زندہ ہونا، اللہ رب العزت کے سامنے پیش ہونا، تم و بیش کے

متعلق سوال ہوتا، اعمال کی مقدار جاننے کے لئے میزان کھڑی ہوتا، پھر مل صراط کو عبور کرنا جو نہایت باریک اور تیز دھار والا ہوگا، پھر سعادت یا شقاوت کے فیصلے کے لئے پیش کا پتھر رہتا۔ ہمارے لئے ان خطرات و احوال کی معرفت حاصل کرنا اور تصدیق و جزم کے طریقے سے ان پر ایمان لانا، اور پھر ان میں طویل خورد فکر کرنا ضروری ہے تاکہ ہمارے قلب میں ان خطرات سے بچنے کے لئے تیاری کرنے کے دوائی پیدا ہوں، یوم آخرت پر ایمان اکثر لوگوں کے قلوب کی گہرائی میں داخل نہیں ہوتا اور اسکی دلیل یہ ہے کہ وہ سرد و گرم موسموں کے لئے جہنم کے سرد گرم حصوں سے بچنے کے مقابلے میں زیادہ تیاری کرتے ہیں، حالانکہ جہنم کا عمل زیادہ سخت اور شدید ہوتا کیوں کا حال ہے، جب ان سے یوم آخرت کے متعلق سوال کیا جاتا ہے تو وہ زبان سے اسکے وجود کا اعتراف کرتے ہیں، لیکن قلب سے غفلت برتتے ہیں، یہ تو ایسا ہے جیسے کوئی شخص کسی کو خبر دے کہ تیرے سامنے جو کھانا رکھا ہوا ہے، وہ نہ ہر آلود ہے، اور وہ شخص یہ خبر سن کر اسکی تصدیق کرے، لیکن ہاتھ بڑھا کر کھانا بھی شروع کر دے گویا اس نے زبان سے تصدیق کی ہے، اور عمل سے تکذیب کی ہے، حالانکہ عمل کے ذریعے کسی واقعے کی تکذیب کرنا زبان کے ذریعہ تکذیب کرنے سے زیادہ بلیغ ہے، سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے موسیٰ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، 'ابن آدم نے مجھے گالی دی، اور اس کے لئے مناسب نہ تھا کہ مجھے گالی دیتا، اور میری تکذیب کی، اور اسکے لئے مناسب نہ تھا کہ میری تکذیب کرتا، اس کی گالی تو یہ ہے کہ وہ خدا کے لئے بیٹا تجویز کرتا ہے، اور تکذیب اس کا یہ کہتا ہے کہ مجھے دوبارہ اس طرح پیدا نہیں کر سکا جیسے پہلے پیدا کیا ہے (بخاری۔ ابو ہریرہ) اصل میں لوگ اس طرح کے امور کی تصدیق اسلئے نہیں کرتے کہ انھیں کم سمجھتے ہیں، کیوں کہ جو واقعات عالم آخرت میں پیش آنے والے ہیں عالم قانی میں اسکی نظریں کم ہیں، اگر لوگ حیوانات اور انسانوں کے بچے پیدا ہوتے ہوئے نہ دیکھتے اور ان سے کہا جاتا کہ ان بچوں کا ایک صانع ہے، جو انھیں ایک گندے قطرہ سے پیدا کرتا ہے تو ان کا باطن کبھی اس سلسلہ تخلیق کی تصدیق نہ کرتا، اسلئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

اَوَلَمْ يَكُنْ لِّلْاِنْسَانِ اِنَّا خَلَقْنَاهُمِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ (پ ۲۳ آیت ۷۷)

کیا آدمی کو یہ معلوم نہیں کہ ہم نے اس کو نطفے سے پیدا کیا ہے سو وہ اعلانیہ اعتراض کرنے لگا۔

اَتَنَحَسِبُ الْاِنْسَانَ اَنْ يُتْرَكَ سُدًى اَلَمْ يَكُنْ نُّطْفَةً مِنْ مِّنْثًى يُّمْنًى ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقْ فَسَوًى فَجَعَلَ مِنْهَا لَزَوْجِيْنَ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى (پ ۲۹ آیت ۳۱-۳۹)

کیا انسان یہ خیال کرتا ہے کہ وہ بیکہ یوں ہی مہمل پھوڑ دیا جائے گا کیا یہ شخص ایک قطرہ مٹی نہ تھا جو (عورت کے رحم میں) ٹپکایا گیا تھا پھر وہ خون کا لوتھڑا ہو گیا پھر اللہ تعالیٰ نے (اس کو انسان) بنایا، پھر اعضاء درست کئے، پھر اسکی دو قسمیں کر دیں، مرد اور عورت۔

جس طرح انسان کی تخلیق، اور اسکے اعضاء کی ترکیب و اختلاف میں بے شمار عجائبات مخفی ہیں ان سے کہیں زیادہ عجائب انسان کے دوبارہ پیدا ہونے میں ہیں، جو شخص اللہ کی قدرت و صفت کا مشاہدہ کرتا ہے وہ اسکی صنعت و حکمت کا کیسے انکار کر سکتا ہے، اگر ہمارے ایمان میں ضعف ہے تو پہلی پیدائش پر نظر کر کے اپنے ایمان کو پختہ کرلو، اسلئے کہ دوسری پیدائش پہلی ہی کی نظیر ہے، بلکہ اس سے بھی زیادہ سہل ہے، اور اگر ہمارا ایمان پختہ ہے تو ہمیں اپنے دل کو ان خطروں اور اندیشوں سے واقف کرانا چاہئے جو مغرب پیش آنے والے ہیں، اور ان میں سے زیادہ سے زیادہ فکر کرنا چاہئے اور عبرت حاصل کرنی چاہئے تاکہ ہمارے دل کا سکون و قرار جاتا رہے، اور تہجارت و ارض کے دوسرے پیش ہونے کے لئے تیار ہو سکو۔

لفظ صورت : سب سے پہلے اہل قبر جو آواز سنیں گے وہ تصویر کی آواز ہوگی، یہ ایک ایسی زبردست اور ترنہ خیرج ہوگی کہ قبریں سن ہو جائیں گی، اور مردے اٹھ کھڑے ہوں گے، فرض کرو قیامت بپا ہو چکی ہے، صورت پھوٹا جا چکا ہے، اور تم قبر سے نکلے ہو، ہمارے چہرے کا رنگ خیر ہے، تم سر سے پاؤں تک غبار آلود ہو۔ اور اس سچ سے پریشان ہو جیسے سن کر تم اپنی قبر سے اٹھ کھڑے

ثُمَّ نَفِخَ فِيهِ أُخْرَىٰ فَإِذَا هُمْ قِيَامٌ يَنْظُرُونَ (پ ۲۳ ر ۴ آیت ۶۸)

پھر اس میں دوبارہ پھونک ماری جائے گی تو وہ سب کے سب کھڑے ہو جائیں گے۔
یعنی وہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہو کر زندہ ہونا دیکھیں گے، سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں: جب اللہ تعالیٰ نے مجھے مبعوث فرمایا تو اسرائیل علیہ السلام سے کہلا دیا انھوں نے میرا اپنے منہ سے نکالیا، اور ایک قدم آگے اور دو سر پیچھے رکھے پھر میں کہ کب صور پھونکنے کا حکم ہو، اس لئے صور پھونکنے سے ڈرو۔ (۱) ذرا سوچو کہ مخلوق کے اسی جہوم میں تم بھی موجود ہو گے تم دنیا میں جس قدر خوش حال، ذی اقتدار، اور با حیثیت ہو، اسی قدر وہاں ذلیل و خوار ہوں گے، آج جو لوگ دنیا کے بادشاہ ہیں وہ کل مخلوق میں سب سے زیادہ ذلیل اور حقیر ہوں گے، اور معمولی ذلہ سے زیادہ انکی کوئی حیثیت نہیں ہوگی، اس وقت جنگلوں اور پہاڑوں کے وحشی اپنی تمام وحشوں کے باوجود لوگوں میں آئیں گے، حالانکہ ان سے کوئی خطا سرزد نہ ہوئی ہوگی، اسکے باوجود وہ صور کی خوفناک آواز سے گھبرا کر لوگوں کے ساتھ کھڑے ہوں گے، اور اس خوف کے باعث لوگوں کے درپے ہونے کا تصور بھی نہ کریں گے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَإِذَا الْوُحُوشُ حُشِرَتْ** (پ ۳۰ ر ۵) اور جب وحشی جانور سب جمع ہو جائیں گے پھر شیاطین سر جھاکر آئیں گے جو پہلے انتہائی سرکش اور نافرمان تھے، وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہونے کے خوف سے لرزے کا پتے کھڑے ہوں گے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

فَوَرَّكَ لَنَحْشُرَنَّهُمْ وَالشَّيَاطِينَ نَمْلَنَحْضُرَنَّهُمْ حَوْلَ جَهَنَّمَ جَنِيًّا (۸ ر ۲۸ آیت ۶۸)
سو قسم ہے آپ کے رب کی ہم ان کو جمع کریں گے اور شیاطین کو بھی، پھر ان کو دوزخ کے گرد گرداس حالت سے حاضر کریں گے کہ گھٹنوں کے بل گرے ہوں گے۔

میدان حشر اور اہل حشر: پھر یہ دیکھو کہ دوبارہ زندہ ہونے کے بعد انھیں کس طرح برہنہ پا برہنہ جسم اور غیر مختون میدان حشر کی طرف ہٹایا جائے گا، یہ ایک سفید، نرم اور چمکیل زمین ہوگی، جس میں حد نظر تک کوئی ٹیلہ بھی نہ ہوگا، کہ آدمی اسکے پیچھے چھپ جائے، اور نہ کوئی گڑھا ہوگا کہ اس کے نیچے چھپا جائے، بلکہ وہ ایک مسطح زمین ہوگی جس میں کوئی نشیب و فراز نہ ہوگا، لوگ اسکی طرف گروہ در گروہ پہنچائے جائیں گے، پاک ہے وہ ذات جو اس میدان میں زمین کے چار جانب سے تمام مخلوق کو انکی مختلف اقسام و اصناف کے ساتھ جمع کرے گا، اس دن دلوں کے شایان شان یہ ہوگا کہ وہ خوف زدہ رہیں، اور آنکھوں کے شایان شان ہوگا کہ ڈرتی رہیں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: قیامت کے روز لوگوں کا حشر ایک سفید خاکی زمین پر ہوگا جو صاف گردے کی طرح ہوگی جس میں کوئی عمارت نہ ہوگی کہ آدمی اس میں چھپ سکے، اور نہ کوئی ایسی آڑ ہوگی جو نظر کو واپس کر دے، اور نہ تو یہ گمان کر کہ وہ زمین دنیا کی زمین طرح ہوگی، بلکہ وہاں کی زمین اور یہاں کی زمین صرف نام میں برابر ہوں گی، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ (بخاری و مسلم، سہل ابن سعد)

يَوْمَ نَبْدِلُ الْأَرْضَ غَيْرَ الْأَرْضِ وَالسَّمَاءَ (پ ۳۳ ر ۸ آیت ۳۸)
جس روز دوسری زمین بدل جائے گی، اس زمین کے علاوہ اور آسمان بھی۔

حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کی رائے یہ ہے کہ اسی زمین کے اندر کچھ کمی یا زیادتی کی جائے گی، اور اسکے درخت، پہاڑ، اور جنگل ختم کر دیے جائیں اور وہ عکاظ کے چمڑے کی طرح پھیلا دی جائے گی، زمین سفید چاندی کی طرح ہوگی نہ اس پر کوئی خون بہایا گیا ہوگا اور نہ اس میں کوئی گناہ کیا گیا ہوگا، اور آسمان کا سورج، چاند اور ستارے فنا ہو جائیں گے، اس لئے اے مسکین! تو اس دن کی دہشت اور شدت میں غور کر، جب مخلوق اس میدان میں کھڑی ہوگی، اور انکے سروں کے اوپر سے ستارے چاند اور سورج بکھر جائیں گے، زمین اپنے چراغ کے گل ہونے کے باعث تاریک ہو جائے گی، ابھی تو اسی حال میں ہوگا کہ اچانک آسمان گھومے گا، اور اپنی غفلت اور غتی کے باوجود پھٹ کر گر جائے گا، انکی یہ غفلت پانچ سو برس کی مسافت کے برابر ہوگی، فرشتے ان کے کناروں پر کھڑے ہوئے ہوں گے آسمانوں کے پھٹنے سے تیرے کانوں میں زبردست گونج پیدا ہوگی، اور آسمان پکھلی ہوئی چاندی کی طرح جس (۱) مجھے یہ روایت اس طرح نہیں ملی، بلکہ بخاری نے اپنی تاریخ میں ابو ہریرہؓ سے مختلف الفاظ میں نقل کی ہے

میں زردی کی آمیزش ہوگی بنے لکڑی کے، پھر وہ سرخ چڑے اور گلے ہوئے تانبے کی طرح ہو جائیں گے، پہاڑ روٹی کے گالوں کی طرح اڑیں گے، اور آدمی بکھرے ہوئے پتھروں کی طرح ہوں گے، اور وہ ننگے پاؤں، اور ننگے بدن پھرتے نظر آئیں گے، سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ لوگ برہنہ یا برہنہ جسم، بلا ختنہ اٹھائے جائیں گے، اور ہمینہ انکے منہ اور کانوں کی ٹونک لگام کی طرح پہنچ جائے گا، ام المومنین حضرت سودہ جو اس حدیث کی راویہ ہیں فرماتی ہیں کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! بڑی خرابی کی بات ہوگی، ہم ایک دوسرے کو نکال دیکھیں گے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اس دن لوگوں کو اسکی فرصت نہ ہوگی، بلکہ وہ دوسری ہی لکڑیوں میں ہوں گے (بخاری و مسلم - عائشہ)

لِكُلِّ امْرِئٍ مِنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَأْنٌ يُغْنِيهِ (پ ۵۳۰ آیت ۷۳)

ان میں ہر شخص کو ایسا مشغلہ ہوگا جو اس کو اور طرف متوجہ نہ ہونے دے گا۔

وہ دن کتنا سخت ہوگا کہ لوگ ننگے ہوں گے، لیکن ایک دوسرے سے محفوظ ہوں گے، اور ایسا کیوں نہ ہو کہ بعض لوگ پیٹ کے بل، اور بعض لوگ سر کے بل چلیں گے، اس صورت میں انہیں یہ قدرت ہی کہاں ہوگی کہ وہ ایک دوسرے کی طرف التفات کر سکیں، حضرت ابو ہریرہ روایت کرتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے دن لوگوں کا حشر تین حالتوں پر ہوگا سوار، پیدل، اور سر کے بل چلنے والے، ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ! سر کے بل کس طرح چلیں گے؟ فرمایا جو ذات لوگوں کو ان کے پیروں پر چلاتی ہے وہ انہیں سر کے بل بھی چلانے پر قادر ہے (ترمذی) اصل میں آدمی طبعی طور پر ان امور سے انکار کرتا ہے جن سے مانوس نہیں ہوتا چنانچہ جو شخص سانپ کو پیٹ کے بل تیزی کے ساتھ چلتا ہوا نہیں دیکھتا وہ یہی سمجھتا ہے، کہ آدمی پاؤں کے بغیر نہیں چل سکتا، ایسے ہی اگر کوئی شخص پیروں پر چلتا ہوا نہ دیکھے وہ پیروں پر چلنے کا انکار کرے گا، اس لئے تم قیامت کے ان عجائبات کا انکار مت کرو، جو تمہارے دنیاوی قیاسات کے خلاف ہوں، تم تو دنیا کے ان عجائبات کا بھی انکار کر بیٹھو گے جو پہلے سے تمہارے مشاہدے میں نہ ہوں اور وہ نعمت سائے آجائیں، قیامت کے حیرت انگیز واقعات کو بھی اسی پر قیاس کرنا چاہیے، اب تم اپنے دل میں اپنی صورت کا استحضار کرو، اور چشم تصور سے دیکھو کہ تم میدان حشر میں ننگے بدن، ذلیل و خوار، حیران اور پریشان کھڑے ہوئے ہو، اور سعادت و شقاوت کے فیصلوں کے منتظر ہو، یہ حالت یقیناً سخت ہوگی، تمہیں اس سختی سے بچنے کے لئے ابھی سے کوشش کرنی چاہیے۔

میدان حشر میں آنے والا پسینہ : پھر مخلوق کے اژدہام اور اجتماع میں غور کرو، حشر کے دن جو جگہ کھڑے ہونے کے لئے مقرر کی جائے گی، وہاں ساتوں آسمانوں اور ساتوں زمینوں کے رہنے والے جمع ہوں گے، ان میں فرشتے، جن انسان، شیطان، وحشی، درندے اور پرندے سب ہوں گے، اور ان کے سروں پر سورج چمکے گا جس کی حرارت کئی گنا بڑھ چکی ہوگی، اور جو حالت اسکی پہلے تھی وہ بدل چکی ہوگی، پھر وہ لوگوں کے سروں سے اس قدر قریب ہو جائے گا کہ صرف دو کمانوں کے درمیان کا فاصلہ برقرار رہ جائے گا، زمین پر عرش رب العالمین کے سائے کے علاوہ کوئی سایہ باقی نہ رہے گا، اور اسکے سائے سے صرف وہ لوگ فائدہ اٹھا سکیں گے جو اللہ کے مقرب بندے ہوں گے، چنانچہ ان میں بہت سے لوگ ایسے ہوں گے جن کے بدن سورج کی گرمی، حرارت اور تپش سے مجلس رہے ہوں گے، اور ناقابل بیان درد و اذیت میں مبتلا ہوں گے، اس پر مستزاد یہ کہ تمام حاضرین ایک دوسرے کو دیکھ کر آگے بڑھنے کے لئے کوشاں ہوں گے، عجیب نفسا نفسی کا عالم ہوگا، دوسری طرف جبار سموات کے حضور پیش ہونے کی صورت میں موقع رسوائی، اور ذلت کے تصور سے شرمندگی اور خوف سے عجیب حالت ہوگی، گویا اس جگہ سورج کی حرارت، انسانوں کی حدت، حیا اور خوف کی آگ تینوں چیزیں بیک بوقت جمع ہو جائیں گی اور ہر بن مومن سے پسینہ نکل کر قیامت کے میدان میں پہنچے گا، پھر وہ پسینہ ان جسموں تک اس قدر بلند ہوگا جس قدر اللہ کے نزدیک کا مرتبہ ہوگا بعض لوگوں کے صرف گھٹنوں تک، اور بعض لوگوں کی کونکھ تک، اور بعض کے کانوں کی ٹونک پہنچے گا، اور بعض لوگوں کا پسینہ اس قدر ہوگا کہ وہ اس میں ڈوبتے ہوئے نظر آئیں گے،

حضرت عبداللہ ابن عمر روایت کرتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے روز لوگ رب العالمین کے سامنے کھڑے ہوں گے اور ان میں سے بعض اس قدر عرق اکھڑیں گے کہ نصف کھن تک ڈوب جائیں گے (بخاری و مسلم) حضرت ابو ہریرہ روایت کرتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ لوگوں کو قیامت کے روز اس قدر پینہ آئے گا کہ زمین میں ان کا پینہ سترہاچ (ایک سو چالیس گز) تک پھیل جائے گا اور ان کے منہ تک بصورت لگام اور ان کے کانوں تک پہنچ جائے گا (بخاری و مسلم) ایک حدیث میں بیکہ لوگ چالیس برس تک آسمان کو مسلسل دیکھتے ہوئے کھڑے رہیں گے اور تکلیف کی شدت کے باعث ان کا پینہ نکل کر لگام بن جائے گا (ابن عدی۔ ابن مسعود)۔ عقبہ ابن عامر کہتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے روز سورج زمین سے قریب ہو جائے گا اور لوگوں کو پینہ آئے گا بعض لوگوں کے ٹخنوں تک پینہ ہوگا، بعض کے راتوں تک، بعض کے کھن تک، اور بعض کے منہ تک (آپ نے ہاتھ سے اشارہ بھی فرمایا) اور منہ پر لگام لگا دے گا اور بعض ایسے ہوں گے جو پیسے میں فرق ہو جائیں گے (یہ فرماتے ہوئے آپ نے اپنے سر مبارک پر ہاتھ پھیرا) (احمد)۔

اے بندہ مسکین! اہل محشر کے پیسے اور ان کے شدت کرب پر اس طرح غور کر، اس وقت بعض لوگ چچ چچ کر کہیں گے کہ ہر دو گار عالم ہمیں اس کرب اور انتظار سے راحت دے، خواہ دونوں میں ڈال کر دے، اور یہ وہ مصائب اور تکالیف ہوں گی جن کا کوئی تعلق حساب و عذاب سے نہیں ہوگا۔ تو بھی انہیں لوگوں میں سے ایک ہوگا، تو نہیں جانتا کہ پینہ تیرے جسم کے کس حصے تک پہنچے گا، یہ بھی یاد رکھ کہ اگر تو نے حج اور روزے نماز یعنی راہِ خدا میں پینہ نہیں بہایا، یا مسلمان کی ضرورت پوری کرنے میں تعب برداشت نہیں کیا، یا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے سلسلے میں مشقت نہیں اٹھائی تو قیامت کے میدان میں خوف اور حیا کے باعث پینہ ضرور بہائے گا، اور اس میں تیرے لئے اذیت زیادہ ہوگی، جو محض جہل و غور سے پاک ہوتا ہے وہ جانتا ہے کہ طاعات کی سختی اور شدت برداشت کرنا قیامت کے دن انتظار کی سختی، اور پیسے کا کرب برداشت کرنے سے زیادہ آسان، اور نہانے کے اعتبار سے نہایت کم ہے، یہ ایک سخت ترین دن ہوگا جو ایک طویل مدت کو محیط ہوگا۔

طویل یوم قیامت : وہ دن جس میں لوگ نگاہ نہ کھڑے ہوں گے، ان کے دل ٹکڑے ٹکڑے ہوں گے نہ ان سے کوئی بات کرنا ہوگا نہ ان کے معاملے پر توجہ دینا ہوگا، نہ کچھ نہ کھائیں گے نہ پئیں گے، اور نہ ہادسیم کے پُر کیف جموگوں کا لطف لیں گے، یہ دن قیامت کا دن ہوگا، حضرت کعب و قتادہ نے یَوْمَ یَقُومُ النَّاسُ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ یہ لوگ اس حالت پر تین سو ساٹھ سال تک کھڑے رہیں گے، بلکہ حضرت عبداللہ ابن عمر فرماتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی اور ارشاد فرمایا کہ اس وقت تمہارا کیا حال ہوگا جب اللہ تعالیٰ تمہیں اس طرح جمع کرے گا جیسے ترکش میں حیر بھرے جاتے ہیں، اللہ تعالیٰ یکاس ہزار برس تک تمہاری طرف نظر نہ فرمائے گا، حضرت حسن بصری فرماتے ہیں کہ تم اس دن کے حلق کیا سوچتے ہو جس میں لوگ اپنے عیوں پر یکاس ہزار برس تک کھڑے رہیں گے، نہ اس دوران کچھ کھائیں گے نہ پئیں گے، یہاں تک کہ یکاس کی شدت سے ان کی گردنیں تن جائیں گی، اور بھوک کی سختی سے پیٹ جل جائیں گے، پھر انہیں دونوں کے چشمے سے پانی پلایا جائے گا، جو نہایت گرم، تلخ، اور ہڈا کھنڈ ہوگا، جب اس دن کی سختیاں ان کی طاقت و ہمت سے تجاوز کر جائیں گے تو وہ آپس میں کہیں گے آؤ اس ذاتِ گرامی کو تلاش کریں جو اللہ کے نزدیک مکرم و معزز ہے، تاکہ وہ ان کے حق میں سفارش کر سکے، وہ لوگ تمام انبیاء کے پاس جائیں گے لیکن ہر جگہ سے انہیں دھکارا جائے گا، ہر پیغمبر کے گاہکے مجھے پھونڈ میں خود اپنے معاملات میں مشغول ہوں، اس مشغولیت کے باعث مجھے دوسرے کے معاملات کی فرمت نہیں ہے، ہر نبی اللہ تعالیٰ کے غضب کی شدت کا حوالہ دے کر معذرت کرے گا اور کہے گا کہ آج ہمارا رب اس قدر غصے میں ہے کہ اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا، اور نہ اس کے بعد کبھی ہوگا، یہاں تک کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ان لوگوں کے حق میں شفاعت فرمائیں گے جن کے حق میں شفاعت کرنے کی اجازت ہوگی، ارشاد باری ہے لَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ إِلَّا لِمَنْ اِذِنَ لَهُ الرَّحْمَنُ وَرَضِيَ لَهُ قَوْلًا (پ ۱۸ آیت ۱۹)

سفارش نفع نہ دے گی، مگر ایسے شخص کو جس کے واسطے رحمن نے اجازت دیدی ہو، اور اس شخص کے

واسطے بولنا پسند کیا ہو۔

اب اس دن کے طویل اور انتظار کی شدت کا تصور کرو یہاں تک کہ تمہارے لئے اس مختصر زندگی میں محاسنی پر صبر کرنا آسان ہو یا در کھو جو شخص موت کا زیادہ انتظار کرتا ہے اور شہوات پر صبر کرتا ہے وہ قیامت کے دن کم سے کم انتظار کرے گا کم سے کم سختی برداشت کرے گا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے قیامت کے دن کی لبائی کے متعلق دریافت کیا گیا "آپ نے فرمایا اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے کہ وہ دن مومن پر اس فرض نماز سے بھی ہلکا ہو گا جو وہ دنیا میں پڑھتا ہے۔ (ابو سلی) بہت ہی۔ ابو سعید الخدری کہ کوشش کرو کہ تم ایسے ہی مومنین میں سے ہو جب تک زندگی کی سانس باقی ہیں معاملہ تمہارے اختیار میں ہے اور تیاری تمہارے ہاتھ میں ہے اسلئے تم مختصر دنوں میں لمبے دنوں کے لئے عمل کرو اس میں تمہیں ایسا فائدہ حاصل ہو گا جس کی کوئی انتہا نہیں ہے اور اپنی عمر کو حقیر جانو بلکہ دنیا کی عمر کو حقیر سمجھو دنیا کی عمر سات ہزار سال ہے اگر تم نے سات ہزار سال تک صبر کر لیا تو تمہیں ایک ایسے دن سے نجات مل جائے گی جس کی مقدار پچاس ہزار برس ہے اس صورت میں تمہارا نفع زیادہ اور محنت کم ہوگی۔

قیامت اس کے مصائب اور اسماء : اے بندہ مسکین ! اس یوم عظیم کے لئے تیاری کر اسکی شان عظیم اسکی مدت طویل اسکا بادشاہ زبردست اسکا زمانہ قریب ہے تو اس دن دیکھے گا کہ آسمان پھٹ جائے گا ستارے اس کی دہشت سے بکھر جائیں گے ستاروں کا نور ماند پڑ جائے گا آفتاب کی دھوپ تہ ہو جائے گی پہاڑ چلائے جائیں گے گیاجن اونٹیاں چھٹی پھریں گی وحشی درندے اکٹھے کئے جائیں گے دریا ابلیں گے اور نفوس جسوں سے مل جائیں گے دوزخ دھکا لائی جائے گی پہاڑ اڑیں گے زمین پھیلے گی اس میں زلزلہ آئے گا اور اپنے خزانے باہر نکال ڈالے گی یہ تمام واقعات اس دن ظہور پذیر ہوں گے جب آدمی طرح طرح کے ہو جائیں گے تاکہ اپنے اعمال کا مشاہدہ کریں اس دن زمین اور پہاڑ اٹھائے جائیں گے اور انھیں ایک جگہ دی جائے گی واقع ہونے والی چیز واقع ہوگی آسمان پھٹ جائے گا وہ اس دن کنور اور ست پڑ جائے گا فرشتے اس کے چاموں طرف ہوں گے اور تیرے رب کا عرش آٹھ فرشتے اٹھائیں گے اس دن تم سب پیش کئے جاؤ گے اور کوئی چھپنے والی چیز تم سے چھپی نہ رہے گی جب پہاڑ چلیں گے اور تو زمین کو کھلی ہوئی دیکھے گا اس روز زمین ٹھرائے گی پہاڑ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر جائیں گے اس دن لوگ جنگوں کے طرح بکھریں گے اور پہاڑ دھنسی ہوئی ہوئی کی طرح اڑیں گے اس دن دودھ پلانے والی عورتیں اپنے بچوں کو فراموش کر دیں گی اور حاملہ عورتیں بچہ جن دیں گی تو لوگوں کو فتنے میں دیکھے گا حالانکہ وہ فتنے میں نہیں ہوں گے بلکہ اللہ تعالیٰ کا عذاب نہایت شدید ہو گا جب زمین دھری زمین بن جائے گی اور آسمان دھرا آسمان بن جائے گا اور لوگ اللہ تعالیٰ کے سامنے نکلیں گے اس دن پہاڑ اڑا دئے جائیں گے اور زمین چٹیل میدان کر دی جائے گی جس میں نہ کوئی موڑ ہو گا اور نہ ٹیلا ہو گا اس دن تم ان پہاڑوں کو بادلوں کی مانند اڑتا ہوا دیکھو گے جنہیں آج جاد خیال کرتے ہو اس دن آسمان پھٹ پڑے گا اور پھٹ کر لال چمڑے کی طرح ہو جائے گا اس دن نہ کسی انسان سے اسکے گناہ کے متعلق باز پرس کی جائے گی اور نہ کسی جن سے اس دن گناہ گار کو کلام سے منع کر دیا جائے گا اور نہ ان سے جرموں کے متعلق پوچھا جائے گا بلکہ وہ لوگ پیشانی کے بالوں اور پاؤں کے ذریعے پکڑے جائیں گے اس دن ہر شخص اپنے ہر اعضاء اور بدن کے عمل کو اپنے سامنے حاضر پائے گا اور یہ تمنا کرے گا کہ کاش اس دن کے اور اسکے درمیان ایک طویل وقفہ حائل ہو جائے اس دن ہر نفس کو معلوم ہو گا کہ وہ کیا لے کر آیا ہے اور دیکھے گا کہ اس نے کیا آگے بھیجا ہے اور کیا پیچھے چھوڑا ہے اس دن نہ انہیں تنگ ہو جائیں گی اور اعضاء کلام کریں گے یہ وہ دن ہو گا جس کے ذکر نے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو بوڑھا کر دیا تھا روایت ہے کہ حضرت ابو بکر الصدیق نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ! میں دیکھتا ہوں کہ آپ بوڑھے ہو گئے ہیں؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مجھے سورہ ہود اور اسکی بہنوں۔ سورہ واقفہ، مرسلات، تم۔ تساء لون، اذا نفخس کوڑت۔ نے بوڑھا کر دیا ہے (ترمذی حاکم)۔

اے کم فہم قاری قرآن! تجھے قرآن کریم سے صرف اس قدر واسطہ ہے کہ تو اسکے الفاظ سے زبان کو حرکت دے لیتا ہے اگر تو

ان الفاظ میں فکر بھی کرتا تو تجھے اس چیز کا تلخ ذائقہ ملتا جس نے سید المرسلین کو بوڑھا کر دیا تھا اور کیوں کہ تو نے محض زبان کی حرکت پر قناعت کر لی ہے اسلئے اسکے ثمرات سے محروم ہے قرآن کریم میں اللہ نے جن امور کا ذکر کیا ہے ان میں سے ایک قیامت ہے اللہ تعالیٰ نے اسکی بعض حقیقتیں بیان فرمائی ہیں اور اسکے بہت سے نام ذکر فرمائے ہیں تاکہ تو ناموں کی کثرت سے معافی کی کثرت پر مطلع ہو جائے اس لئے کہ ناموں کی کثرت سے ان کا تکرار اور اعادہ مقصود نہیں ہے بلکہ غفلتوں کو تنبیہ کرنا مقصود ہے۔ قیامت کے ہر نام میں ایک راز پنہا ہے اور اسکے ہر لقب میں ایک صفت غفلت ہے اسلئے معافی کی معرفت پر حرص کرو اب تمہاری سہولت کے لئے قیامت کے تمام نام یہاں لکھے ہیں۔

یوم قیامت، یوم حسرت، یوم ندامت، یوم محاسبہ، یوم مسابقت، یوم مناقشہ (جدال)، یوم منافست، یوم ذلولہ، اولٹنے کا دن، بجلی کڑکنے کا دن، واقع ہونے کا دن، کھٹکھٹانے کا دن، شور و غل کا دن، ہلانے کا دن، یوم رادفہ، ڈھانچنے والا دن، یوم مصیبت، یوم آزدہ، یوم حادثہ، ہنگامے کا دن، یوم ملاقات، یوم فراق، ہنگامے جانے کا دن، یوم قصاص، یوم مناد، یوم حساب، واپسی کا دن، یوم عذاب، یوم فرار، یوم قرار، یوم لقاء، یوم بقاء، یوم قضاء، یوم جزاء، یوم بلاء، یوم بکاء، یوم حشر، یوم وعید، پیشی کا دن، تو لے جانے کا دن، یوم حق، یوم حکم، یوم افتراق، یوم اجتماع، یوم بعث، یوم حج، یوم زلت، یوم عظیم، ہانچھ ہو جانے کا دن، مشکلات کا دن، بدلے کا دن، یوم یقین، یوم نشور، یوم مصیر، یوم نفع، یوم صیبر، یوم ریضہ، یوم رجزہ، یوم زجرہ، یوم سکرہ، یوم فزع، یوم جزع، یوم خشی، یوم مادی، یوم میقات، یوم میعاد، یوم مرصاد، یوم تلقی، یوم عرق، یوم اقتدار، یوم استکبار، یوم اشتیاق، یوم وقوف، یوم خروج، یوم خلود، یوم قتالین، یوم عبوس، یوم معلوم، یوم موعود، یوم مشہود، وہ دن جس میں کوئی شک نہیں، وہ دن جس میں دل کے رازوں کا امتحان ہوگا، وہ دن جس میں کوئی نفس دوسرے نفس کے کام نہ آئے گا، جس دن آنکھیں اوپر کی طرف دیکھیں گی، وہ دن جس میں کوئی رفیق دوسرے رفیق کے کام نہ آئے گا، وہ دن جس میں لوگوں کو جنم کی طرف دھکیلا جائے گا، جس دن آگ میں منہ کے ٹل کھینچے جائیں گے، جس دن باپ اپنے بیٹے کے کام نہ آئے گا، جس دن آدمی اپنے بھائی سے، ماں اور باپ سے بھاگے گا، جس دن لوگ کلام نہ کر سکیں گے، اور نہ انھیں معذرت کرنے کی اجازت ہوگی، جس دن لوگوں کو اللہ کے عذاب سے کوئی بچانے والا نہ ہوگا، جس دن لوگ ظاہر ہوں گے، جس دن لوگوں کو اللہ کا عذاب دیا جائے گا، جس دن نہ مال کام آئے گا اور نہ اولاد کام آئے گی، جس دن ظلم کرنے والوں کو ان کی معذرت نفع نہ دے گی، اور انکے لئے لعنت اور برا لکھا نہ ہوگا جس دن معذرتیں مدد کوئی جائیں گی، رازوں کا امتحان ہوگا دل کی باتیں ظاہر ہو جائیں گی، پردے کھل جائیں گے، وہ دن جس میں آنکھیں جھکی ہوں گی، آوازیں خاموش ہوگی، اتفاقات کم ہوگا، غلطی باتیں ظاہر ہوں گی، خطائیں نمایاں ہوں گی، وہ دن جس میں بندوں کو ہنگایا جائے گا، اور ان کے ساتھ گواہ ہوں گے، بچے بوڑھے، ہر جائیں گے اور بڑوں کو نشہ ہو جائے گا۔ اس دن ترانہ نہیں سنائے ہوں

کی رجسٹر کھلیں گے، دونوں ظاہر کی جائے گی، پانی کھلایا جائے گا، آگ دھکائی جائے گی، کفار باپس ہوں گے، دونوں بھڑکائی جائے گی، رنگ بدلیں گے، زبانیں گونگی ہوں گی، انسان کے اعضاء گویا ہوں گے، اے انسان تجھے اپنے رب کریم سے کس چیز نے مغالطے میں ڈالا ہے تو نے دوا دے بند کر لئے ہیں، پردے چھوڑ دیے ہیں، اور مخلوق سے چھپ کر گناہوں کا ارتکاب کیا ہے، اس دن کیا کرے گا جب تیرے اعضاء گواہی دیں گے، نہایت غرابی ہے ہم سب جملائے غفلت لوگوں کی، اللہ نے ہمارے پاس انبیاء کے سردار مبعوث کئے ہیں اور ہم پر کتاب مبین نازل فرمائی ہے، اور آپ نے ہمیں اس دن کی تمام صفات سے آگاہ فرمادیا ہے، اور ہماری غفلت بھی واضح فرمادی ہے، ارشاد فرمایا:

اَقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِي غَفْلَةٍ مُّعْرِضُونَ مَا يَأْتِيهِمْ مِنْ ذِكْرِ مِنْ رَبِّهِمْ
مُحَذِّبٍ لِّلنَّاسِ اَلَّا يَسْتَمْعُوْهُمْ وَلَا يَخْشَوْنَ اَلَّاهُ فَيَقْلُوْهُمْ (پ ۷۷ آیت ۱-۲)

ان لوگوں سے ان کا (وقت) حساب نزدیک آچکا، اور یہ غفلت ہی میں پڑے ہیں اور اعراض کئے ہوئے

ہیں، انکے پاس ان کے رب کی طرف سے جو نصیحت تازہ آتی ہے، یہ اس کو ایسے طور سے سنتے ہیں کہ (اس کے ساتھ) ہنسی کرتے ہیں۔

اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَاَنْشَقَّ الْقَمَرُ (پ ۸۲ آیت ۱)
قیامت نزدیک آچکی اور چاند شق ہو گیا۔

اِنَّهُمْ لَكَاِبِرٌ وَّنَعْبَعِيدَا وَّنُرَا فَرِيضًا (پ ۲۹، آیت ۷۶)
یہ لوگ اس دن کو بعید دیکھ رہے ہیں اور ہم اس کو قریب دیکھ رہے ہیں۔
وَمَا يُؤْنِرُكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ تَكُونُ قَرِيبًا (پ ۲۳، آیت ۳۳)
اور آپ کو اسکی کیا خبر عجب نہیں کہ قیامت قریب ہی واقع ہو جائے۔

ہمارا بہترین حال یہ ہوتا ہے کہ ہم قرآن کی تلاوت اور اسکے مطالعے کو عمل بناتے، لیکن افسوس نہ ہم اسکے معانی میں غور کرتے ہیں، نہ اس دن کے بے شمار اوصاف اور اسماء میں فکر کرتے ہیں، اور نہ اسکے مصائب سے بچنے کی تیاری کرتے ہیں، ہم اس غفلت سے اللہ کی پناہ چاہتے ہیں، اگر وہ اپنی وسیع رحمت سے اس کا تدارک نہ فرمائے۔

سوال کی کیفیت : اے بندہ مسکین! ان احوال کے بعد تو اس سوال میں غور کرو براہ راست تجھ سے کیا جائے گا، تھوڑے اور بہت ذرہ اور تنکے ہر چیز کے متعلق پوچھا جائے گا، قیامت کے دن ابھی جب کہ تو اس دن کی سختی، اذیت، اور پیسے کی تکلیف میں مبتلا ہوگا، آسمانوں کے چار جانب سے فرشتے اتریں گے، ان کے جسم نہایت مخمیر و عریض اور تندرست و توانا ہوں گے وہ مزاج کے اعتبار سے سخت گیر اور تند خو ہوں گے، انھیں حکم دیا جائے گا کہ وہ مجرمین کے پیشانی کے بال پکڑ لیں اور جبار ارض و سماء کے حضور لے چلیں، سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے پاس ایسے فرشتے ہیں کہ ان کی دونوں پلکوں کی مسافت سو برس کی ہے، اس وقت تو اپنے نفس کے متعلق کیا گمان رکھتا ہے جب ان فرشتوں کو دیکھے گا جو تجھے پیشی کی جگہ لے جانے کے لئے پکڑیں گی تو خود ان کا حال بھی ہماری بھرم جسامت کے باوجود بندوں پر نازل غضب الہی کے باعث دگرگوں ہوگا جب وہ زمین پر اتریں گے تو تمام انبیاء کرام، صدیقین، اور صلحاء اس خوف سے سجدے میں گر جائیں گے، کہ کہیں فرشتے انھیں پکڑ کر نہ لے جائیں، جب مقربین کا حال یہ ہوگا تو گناہ گار مجرمین کی حالت کیا ہوگی، اس وقت بعض لوگ خوف کی شدت کے باعث ان ملائکہ سے پوچھیں گے کہ کیا تم ہی میں ہمارا پروردگار ہے، یہ سوال ان فرشتوں کے انتہائی رعب اور دہدہ کی وجہ سے ہوگا، فرشتے اس سوال سے ڈر جائیں گے، اور کہیں گے کہ ہمارا رب اس سے کہیں بلند ہے کہ وہ ہم میں سے ہو، وہ اعلیٰ زمین کے اس توہم سے اللہ رب العزت کی پاکی بیان کریں گے، اور بلند کہیں گے کہ ہمارا پروردگار اس سے پاک ہے کہ وہ ہم میں ہو، تاہم وہ بعد میں آئے والا ہے، اس وقت فرشتے مخلوق کو چاروں طرف سے گھیر کر صف بستہ کھڑے ہو جائیں گے، ان سب پر قیامت کی شدت سے ذلت، خضوع، خوف، اور رعب کی علامتیں ہوں گی، اس وقت اللہ تعالیٰ کے اس قول کی تصدیق ہوگی :-

فَلَنَسْأَلَنَّ الَّذِينَ أُرْسِلَ إِلَيْهِمْ وَلَنَسْأَلَنَّ الْمُرْسَلِينَ، فَلَنَقْضِيَنَّهُمْ عَلَيْهِمْ بِعِلْمٍ وَمَا كُنَّا غَائِبِينَ (پ ۸، آیت ۶-۷)

پھر ہم ان لوگوں سے ضرور پوچھیں گے جن کے پاس پیغمبر بھیجے گئے تھے، اور ہم پیغمبروں سے ضرور پوچھیں گے، پھر ہم جو تک پوری خبر رکھتے ہیں اسلئے ان کے رسول بیان کر دیں گے اور ہم کچھ بے خبر نہ تھے۔

فَوَرَبِّكَ لَنَسْأَلَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ (پ ۱۳، آیت ۳)
سو آپ کے پروردگار کی قسم ہم ان سب سے ان کے اعمال کی ضرور باز پرس کریں گے۔

سب سے پہلے انبیاءِ مطہرین السلام سے سوال کیا جائے گا :-

يَوْمَ يَجْمَعُ اللَّهُ الرُّسُلَ فَيَقُولُ مَاذَ الْجِبْتُمْ قَالُوا لَا عِلْمَ لَنَا إِنَّكَ أَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوبِ
(پ ۷۵ آیت ۱۴۹)

جس روز اللہ تعالیٰ پیغمبروں کو جمع کریں گے پھر ارشاد فرمائیں گے کہ تم کو کیا جواب ملا تھا، وہ عرض کریں گے کہ ہم کو کچھ خبر نہیں، بلاشبہ تو فیوں کا جاننے والا ہے۔

اس دن کی سختی اور شدت کا کیا کتنا جس میں انبیاء کی عقلیں جاتی رہیں گی، اور ان کے علوم فنا ہو جائیں گے، اس لیے کہ جب ان سے پوچھا جائے گا کہ تم مخلوق کے پاس گئے تھے، اور تم نے اللہ کی طرف بلایا تھا تو انھوں نے کیا جواب دیا تھا، حالانکہ انھیں جواب معلوم تھا، مگر اس وقت عقل ساتھ نہیں دے گی، اور خوف اس قدر غالب ہو گا کہ وہ اس سوال کا جواب دینے کے بجائے یہ عرض کریں گے کہ ہمیں علم نہیں ہے، بلاشبہ تو فیوں کا جاننے والا ہے، اس وقت انبیاء کا یہی جواب درست ہو گا کیوں کہ جب ان کی عقلیں زائل ہو جائیں گی اور علوم ختم ہو جائیں گے، تو لاعلمی کے علاوہ کیا باقی رہے گا، الا یہ کہ اللہ تعالیٰ انھیں جواب کی قدرت عطا کرے۔

اسکے بعد حضرت نوح علیہ السلام کو بلایا جائے گا، اور ان سے پوچھا جائے گا کہ کیا انھوں نے اللہ کے بندوں تک اللہ کا پیغام پہنچایا تھا، وہ عرض کریں گے کہ ہاں پہنچایا تھا، پھر ان کی امت سے دریافت کیا جائے گا کہ کیا نوح نے ان کو اللہ کا دین پہنچایا تھا، وہ عرض کریں گے کہ ہمارے پاس کوئی ڈرائے والا نہیں آیا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بلایا جائے گا اور ان سے دریافت کیا جائے گا کہ کیا انھوں نے لوگوں سے کہا تھا مجھے اور میری ماں کو اللہ کے سوا معبود قرار دو، وہ اس سوال کی بیعت سے برسوں پریشان رہیں گے، وہ دن کتنا خطرناک ہو گا، جس میں انبیاء پر اس طرح کے سوالات کی سیاست قائم کی جائے گی، پھر ملائکہ آئیں گے، اور ایک ایک کو آواز دیں گے کہ اے فلاں عورت کے بیٹے، پیشی کی جگہ آ، اس آواز سے شانے لرزے لگیں گے، اور اعضاء مضطرب ہو جائیں گے، عقلیں حیران ہو جائیں گی، اور لوگ یہ تمنا کریں گے کہ ان کے محبوب مخلوق کے سامنے ظاہر نہ ہوں سوال کرنے سے پہلے عرش کا نور ظاہر ہو گا، اور زمین اپنے رب کے نور سے روشن ہو جائے گی، اور ہر بندے کے دل میں یہ یقین پیدا ہو گا کہ اللہ تعالیٰ اس سے باز پرس کے لئے متوجہ ہے، اور ہر شخص یہ تصور کرے گا کہ میرے علاوہ کوئی اپنے رب کو نہیں دیکھ رہا ہے، اور سوال صرف مجھ سے کیا جائے گا، دوسروں سے باز پرس نہیں ہوگی، اسکے بعد حضرت جبرئیل علیہ السلام کو اللہ رب العزت کا حکم ہو گا کہ وہ انکے پاس دو رخ لے کر آئیں، حضرت جبرئیل علیہ السلام دو رخ کے پاس آئیں گے اور کہیں گے کہ اپنے خالق اور مالک کے حکم کی تعمیل کر، اور اللہ کے حضور پیش ہو، اس وقت دو رخ انتہائی غیظ و غضب میں ہوگی، یہ حکم سن کر وہ اور بھڑک اٹھے گی، اس میں مزید جوش اور ہیجان پیدا ہو گا، وہ مخلوق کے لئے جتنے گی، چلائے گی، لوگ اسکے چہچہے چلائے گی، آوازیں سنیں گے، اور دو رخ کے محافظ اٹکی طرف غصے میں بڑھیں گے اور ان پر حملہ آور ہوں گی، یہ آوازیں کر، اور محافظین جہنم کے حلوں کی تاب نہ لا کر لوگ کشموں کے بل کر پڑیں گے، اور پشت پھیر کر بھاگیں گے، بعض لوگ منہ کے بل کریں گے، اور گناہ گار ہائے بد بختی، وائے ہلاکت پکاریں گے اور صد یقین نفسی نفسی کہتے نظر آئیں گے، لوگوں کو ابھی پچھلے غم سے نجات نہ ہوگی کہ دو رخ دوسری چیخ مارے گی، اس چیخ سے لوگوں کا خوف دو گنا ہو جائے گا، اعضاء ست پر جائیں گے، اور ہر شخص کو یہ یقین ہو جائے گا کہ وہ مصیبت میں گرفتار کر لیا گیا ہے، اس کے بعد دو رخ تیسری چیخ مارے گی، اس آواز کی دہشت سے لوگ زمین پر گر پڑیں گے، ان کی آنکھیں اوپر کی سمت مگراں ہوں گی، ظالموں کے دل سینے سے اچھل کر حلق میں آجائیں گے، نیک بختوں، اور بد بختوں سب کی عقلیں ضائع ہو جائیں گی، اسکے بعد اللہ تعالیٰ اپنے تمام مرسلین، اور پیغمبروں کی طرف متوجہ ہو گا اور دریافت فرمائے گا ”مَاذَ الْجِبْتُمْ“ جب گناہ گار یہ دیکھیں گے کہ آج انبیاء بھی تختی میں جتلا رہے ہیں سوچ کر ان کا خوف فزوں ہو جائے گا، اس وقت باپ اپنے بیٹے سے، بھائی بھائی سے، اور شوہر اپنی بیوی سے بھاگے گا، ہر شخص کو اپنے اپنے معاملات کا انتظار ہو گا، پھر ہر شخص کو الگ الگ بلایا جائے گا، اور اللہ تعالیٰ اس سے بالمشافہ

سوال کرے گا، اسکے ہر عمل کے متعلق باز پرس فرمائے گا خواہ وہ تھوڑا تھا یا زیادہ، واضح تھا یا غلی، اسکے تمام اعضاء اور جوارح سے باز پرس ہوگی، حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! کیا ہم قیامت کے دن اپنے رب کو دیکھیں گے، فرمایا کیا تمہیں آفتاب کی رویت میں شک ہوتا ہے جب دوپہر میں سورج اور تمہارے درمیان بادل حائل نہیں ہوتا اور کیا تم چودھویں رات کے چاند کی رویت میں شک کرتے ہو جب تمہارے اور چاند کے درمیان کوئی ابر نہیں ہوتا، لوگوں نے عرض کیا نہیں، فرمایا اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے، تم اپنے رب کے دیدار میں بھی شک نہیں کرو گے، وہ بندے سے ملاقات کرے گا، اور اس سے پوچھے گا کہ کیا میں نے تجھے عزت نہیں دی تھی، تجھے سیادت نہیں دی تھی، تیرا جوڑا نہیں بنایا تھا، کیا گھوڑے اور اونٹ تیرے تابع نہیں کئے تھے کیا تجھے سرداری عطا نہیں کی تھی، بندہ عرض کرے گا پروردگار! یہ سب نعمتیں تو نے مجھے عطا کیں تھیں اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ کیا تو یہ گمان رکھتا تھا کہ تجھے مجھ سے ملنا نہیں ہے، وہ عرض کرے گا نہیں، اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ جس طرح تو نے ہمیں فراموش کیا ہم بھی تجھے فراموش کرتے ہیں۔

اے مسکین! اپنے بارے میں تصور کر، فرشتے تیرے دونوں بازو پکڑے ہوئے ہوں گے، اور تو اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑا ہوگا، اللہ تعالیٰ تجھ سے سوال کر رہا ہوگا کہ کیا میں نے تجھے شباب کی دولت عطا نہیں کی تھی، تو نے یہ شباب کس چیز میں ضائع کیا، کیا میں نے تجھے زندگی کی مہلت نہیں دی تھی، تو نے اپنی عمر کس چیز میں فنا کی، کیا میں نے تجھے رزق عطا نہیں کیا تھا تو نے یہ مال کہاں سے حاصل کیا، اور کہاں خرچ کیا، کیا میں نے تجھے علم کی فضیلت نہیں بخشی تھی، تو نے اپنے علم سے کیا عمل کیا، غور کر جب اللہ تعالیٰ اپنی نعمتوں اور تیری نافرمانیوں، اپنے احسانات اور تیری سرکشی کے واقعات بیان کرے گا تو تیری شرمندگی اور ندامت کا کیا عالم ہوگا؟ اگر تو نے ان تمام نعمتوں کا انکار کیا، اور اپنے محاسن کی نفی کی تو تیرے اعضاء گواہی دیں گے، حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں کہ ہم سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ تھے، اچانک آپؐ ہنسنے لگے، پھر فرمایا کیا تم جانتے ہو کہ میں کیوں ہنسا ہوں، ہم نے عرض کیا اللہ و رسول زیادہ جانتے ہیں، فرمایا میں اللہ تعالیٰ سے بندہ کے طرزِ خطاب پر ہنسا ہوں، وہ اللہ تعالیٰ سے کہے گا اے اللہ! کیا تو نے مجھے ظلم سے پناہ نہیں دی، اللہ تعالیٰ فرمائے گا ہاں دی ہے، وہ کہے گا کہ میں اس وقت یہ باتیں حلیم کروں گا جب مجھ ہی میں سے کوئی گواہی دے گا، اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ آج کے دن تو ہی اپنا حساب لینے کے لئے کافی ہے، اور کراٹا کا تین گواہی کے اعتبار سے کافی ہیں، اسکے بعد بندے کے منہ پر مرگادی جائے گی، اور اسکے اعضاء کو بولنے کا حکم ہوگا، چنانچہ اعضاء اپنے اعمال بتلائیں گے، پھر اسے اور کلام کو تنہا چھوڑا جائے گا، چنانچہ بندہ اپنے اعضاء سے کہے گا تمہارے لئے جہاں اور بربادی ہو، میں تمہاری ہی طرف سے لڑ رہا تھا (مسلم)، ہم ہر سرعام اعضاء کی گواہی پر رسوا ہونے سے اللہ کی پناہ چاہتے ہیں، تاہم اللہ نے مومنین سے یہ وعدہ فرمایا ہے کہ وہ اس کی پردہ پوشی فرمائے گا، اور اس کے گناہوں پر دو سروں کو مطلع نہیں کرے گا۔ حضرت عبداللہ ابن عمرؓ سے کسی شخص نے دریافت کیا کہ آپؐ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سرگوشی کے بارے میں کیا سنا ہے انھوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم میں سے ایک شخص اپنے رب کے اس قدر قریب ہوگا کہ وہ اپنا شانہ اس پر رکھ دے گا اور فرمائے گا کہ کیا تو نے فلاں فلاں گناہ نہیں کیا، وہ عرض کرے گا ہاں، اللہ تعالیٰ فرمائے گا کیا تو نے فلاں فلاں گناہ کئے تھے، وہ عرض کرے گا ہاں، اللہ تعالیٰ فرمائے گا میں نے دنیا میں بھی حیرتی خطاؤں کی پردہ پوشی کی تھی، اور آج بھی حیرتی خاطر محاف کرتا ہوں (مسلم) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جو شخص مومن کی پردہ پوشی کرتا ہے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی پردہ پوشی فرمائے گا لیکن یہ حکم اس شخص کے لئے ہے جو لوگوں کے محبوب چھپائے، اگر وہ اسکے حق میں کوئی کوتاہی کریں تو اسے برداشت کرے، انکی برائی کے ذکر سے اپنی زبان کو حرکت نہ دے، اور نہ انکی عدم موجودگی میں انکے بارے میں ایسی باتیں کرے کہ اگر وہ سنیں تو ناگوار گزرے، ایسا شخص قیامت کے دن یقیناً ایسے ہی سلوک کا مستحق ہوگا۔ لیکن یہ حال تو دو سروں کا ہوگا، اور دو سروں کی پردہ پوشی کی جائے گی، تیرا معاملہ اور ہے تیرے کانوں میں حاضری کی نذر پڑ چکی ہے، تیرے لئے گناہوں کی سزا میں یہی خوف کافی ہے، تیری پیشانی

کے بال پکڑے جائیں گے، اور تجھے کھینچا جائے گا، اس وقت تیرا دل دھڑکتا ہوگا شانے لرزے ہوں گے، عقل پرواز کر رہی ہوگی، اعضاء مضطرب ہوں گے، رنگ تغیر ہوگا، اور خوف و وحشت کی بنا پر تیرے لئے پوری دنیا تاریک ہو جائے گی، اب تو اپنے نفس کی حلق غور کر کہ تیرا حال یہ ہوگا اور تو لوگوں کی گردنیں پھلانگتا ہوگا، اور منہیں چہرہ رہا ہوگا، اور تجھے اس طرح کھینچا جائے گا جیسے گھوڑے کو کوئلے لے جایا جاتا ہے، اور لوگ تیری طرف دیکھتے ہوں گے، تصور کر کہ تو ان فرشتوں کے ہاتھوں میں قید ہے، اور وہ تجھے رب کریم کے عرش تک کھینچنے لئے جارہے ہیں، وہ وہاں پہنچ کر تجھے بھیجتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ تجھے پکارتا ہے کہ اے ابن آدم! مجھ سے قریب ہو، تو یہ آواز سن کر دھڑکتے ہوئے غزوہ دل، لرزے کا پہنچے جسم، اور ذرئی سستی اور ذلت و شرمندگی کے باعث زمین کی طرف جھکی ہوئی آنکھوں کے ساتھ رخن و رحیم کی طرف بڑھتا ہے، اور تجھے وہ کتاب عطا کی جاتی ہے جس میں تمام کبار و صغائر درج ہیں، ہمت سے گناہ ایسے ہی ہوں گے جنہیں تو بھول چکا ہوگا، لیکن یہ کتاب دیکھ کر تجھے وہ تمام گناہ یاد آجائیں گے، اور کتنی ہی عبادتیں ایسی ہوں گی جن کی آفتیں تیرے ذہن میں نہیں رہی ہوں گی، لیکن اعمال نامہ دیکھ کر وہ تمام آفتیں منکشف ہو جائیں گی، تجھے اس وقت کس قدر ندامت ہوگی، کس قدر عجز اور بے کسی کا عالم ہوگا، زبان ساکت ہو جائے گی، جسم کی توانائی جاتی رہے گی، میں نہیں جانتا کہ خدا تعالیٰ کے سامنے کن پیروں پر کھڑا ہوگا، اور کس زبان سے جواب دینگا، کس دل سے جواب سوچے گا، پھر یہ غور کر کہ تجھے اس وقت کتنی شرم آئے گی جب تجھے تیرے گناہ یاد دلانے جائیں گے، اور اللہ تعالیٰ فرمائے گا

اے بندے! کیا تجھے میرا رانی کے ساتھ سامنا کرنے میں شرم نہیں آتی تھی، حالانکہ تجھے لوگوں سے شرم آتی تھی، اور تو ان کے لئے اپنے اچھے اعمال کا اظہار کرتا تھا، کیا تیرے نزدیک میری حیثیت بندوں سے بھی کم تھی، تو نے اپنی طرف میری نظر کو معمولی جانا، اور میرے فیر کی نظر کو بڑا تصور کیا، کیا میں نے تجھ پر انعام نہیں کیا، پھر تجھے کس چیز نے مجھ سے قریب میں جلا کیا، کیا تو یہ سمجھتا تھا کہ میں تجھے دیکھ نہیں رہا ہوں، اور یہ کہ میں تجھ سے ملاقات نہیں کروں گا۔

سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ کوئی شخص ایسا نہ ہوگا جس سے اللہ تعالیٰ اس حال میں سوال نہ کرے کہ اس کے اور مسئول کے درمیان کوئی پردہ حائل ہو، یا ترجمان ہو، (بخاری و مسلم، ابو حاتم) ایک حدیث میں ہے کہ تم میں سے ہر شخص اللہ تعالیٰ کے سامنے اس طرح کھڑا ہوگا کہ تمہارے اور اسکے درمیان کوئی حجاب نہ ہوگا، اللہ تعالیٰ اس سے فرمائے گا کہ کیا میں نے تجھے مال نہیں دیا تھا، وہ عرض کرے گا کہ ہاں تو نے نعمتیں عطا کیں تھیں اور مال دیا تھا، اللہ فرمائے گا کیا میں نے تیرے پاس اپنا رسول نہیں بھیجا تھا، وہ کہے گا ہاں بھیجا تھا پھر وہ اپنے دائیں دیکھے گا اور اسے وہاں دو رخ نظر آئے گی، پھر وہ اپنے بائیں جانب دیکھے گا وہاں اسے دو رخ نظر آئے گی، اس لیے تم میں سے ہر شخص دو رخ سے بچے گو چھوڑے گا ایک کھڑا (صدقہ کر کے) یا ایک اچھے کلمے سے (بخاری۔ عدی ابن حاتم) حضرت عبد اللہ ابن مسعود فرماتے ہیں کہ تم میں سے کوئی ایسا نہیں ہے جس سے اللہ تعالیٰ تمہانہ ہوگا، جیسے تم میں سے ایک چودہویں کے رات کے چاند کے ساتھ تھا ہوتا ہے، پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ اے ابن آدم! مجھ پر تجھے کس چیز نے قریب دیا ہے، اے ابن آدم! تو نے اپنے علم کے مطابق عمل نہیں کیا، اے ابن آدم! تو نے پیغمبروں کے جواب میں کیا کہا، اے ابن آدم! کیا میں تیری آنکھوں کا گھراں نہیں تھا، اور تو ان آنکھوں سے وہ چیزیں دیکھ رہا تھا جن کا دیکھنا تیرے لئے جائز نہیں تھا، کیا میں تیرے کانوں کو نہیں دیکھتا تھا، اور تو ان سے وہ باتیں سنتا تھا جن کا سنتنا تیرے لئے جائز نہیں تھا، ایسی طرح اللہ تعالیٰ تمام اعضاء کو شمار کرائے گا، مجاہد فرماتے ہیں کہ قیامت کے دن بندہ اس وقت تک اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑا رہے گا جب تک اس سے اسکی چار خصلتوں کے بارے میں نہ پوچھا جائے گا ایک عمر کے بارے میں کہ کہاں نہ بچ کی، دوسرے اس کے علم کے حلق کہ کیا عمل کیا، تیسرے جسم کے حلق کہ کس چیز میں بوڑھا کیا، چوتھے مال کے حلق کہ کہاں سے کمایا اور کہاں خرچ کیا، اے بندہ مسکین! اس سے پہلے کہ اللہ تعالیٰ یہ فرمائے کہ میں نے دنیا میں بھی تیرے گناہوں کی پردہ پوشی کی تھی، اور آج بھی تیرے

گناہوں کو معاف کرتا ہوں، تیرا کیا حال ہو گا تجھے کس قدر خطرات کا سامنا ہو گا، لیکن جب تیرے گناہ بخش دئے جائیں گے، تیری خوشی و چند ہو جائے گی، اور اولین و آخرین تجھ پر رشک کریں گے، یا فرشتوں سے کہا جائے گا کہ اس برے شخص کو پکڑو، اسے گلے میں طوق ڈال دو، اور اسے آگ میں پھینک دو، اس وقت اگر تجھ پر زمین اور آسمان دونیں تو یہ تیرے حال کے بالکل مناسب ہو گا، اس لئے کہ تیری مصیبت عظیم ہوگی، اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں تو نے جو کوتاہی کی ہے اور آخرت کے عوض دنیا کو خریدنے کا جو کاروبار تو نے ردا رکھا ہے، اس پر تیری حسرت نہایت شدید ہوگی، لیکن کہ آخرت تو تجھ سے رخصت ہوئی چکی تھی، دنیا بھی تیرا ساتھ چھوڑ دے گی، اور تو اپنے مصائب کے ساتھ تمامہ جائے گا۔

میزان کا بیان : پھر میزان کے باب میں فکر کر، اور اعمال ناموں کا دائیں بائیں اڑنے کا تصور کر، سوال کے مرحلے سے فارغ ہونے کے بعد لوگوں کے تین فرقے ہو جائیں گے، ان میں ایک فرقہ ان لوگوں کا ہو گا جن کا دامن ہر طرح کی نیکی سے خالی ہو گا، ایسے لوگوں کے لئے دونخ سے ایک سیاہ گردن باہر لٹکے گی، اور انھیں اس طرح اچک کر لے جائے گی جیسے پرندے دانے چک کر اڑ جاتے ہیں، انھیں دونخ میں ڈال دے گی، اور دونخ انھیں لٹکے گی، اور ان کے لئے ایسی شقاوت کا اعلان کیا جائے گا، جس کے بعد کسی سعادت کی امید نہیں ہوگی، دوسرا گردہ ان لوگوں کا ہو گا جن کا دامن کسی گناہ سے آلودہ نہ ہو گا، ایسے لوگوں کے متعلق یہ اعلان کیا جائے گا کہ ہر حال میں اللہ تعالیٰ کی حمد کرنے والے کھڑے ہو جائیں گے، نیک لوگ کھڑے ہو جائیں گے، اور جنت کی طرف چلیں گے، پھر یہ اعلان تجہ کزادوں کے لئے کیا جائے گا، پھر ان لوگوں کے لئے کیا جائے گا جنہیں دنیا کی تجارت نے اللہ کے ذکر سے نہ روکا ہو گا، اور ان کے لئے ایسی سعادت کا اعلان کیا جائے گا جس کے بعد کوئی شقاوت نہ ہوگی۔ ان دونوں کے بعد تیسرا گردہ باقی رہ جائے گا، اس گردہ میں وہ لوگ ہوں گے جنہوں نے اپنے اچھے اعمال کی آمیزش کی ہوگی، ان پر حق ہو گا لیکن اللہ تعالیٰ پر حق نہیں ہے کہ ان کے اعمال میں حسنت زیادہ ہیں یا سنیات زیادہ ہیں، لیکن اللہ نہیں چاہتا کہ وہ ان پر یہ بات ظاہر کرے تاکہ جن میں اس کا فضل اور عذاب میں اس کا عدل واضح ہو، اس لئے وہ جیسے اڑائے جائیں گے جن میں نیکیاں اور برائیاں لکھی ہوں گی، اور میزان کھڑی کی جائے گی، اور آنکھیں ان صحیفوں پر لگی ہوں گی کہ وہ دائیں ہاتھ میں پڑتے ہیں یا بائیں ہاتھ میں، پھر ترازو کے کانٹے کی طرف دیکھیں گے کہ وہ نیکیوں کی طرف جھٹکتا ہے یا برائیوں کی طرف، یہ ایک ایسی خوفناک حالت ہوگی کہ مخلوق کی عقلیں ریزا کر جائیں گی، حضرت حسنؑ روایت کرتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا سر مبارک آپ کی گود میں تھا، آپ کو خیر آگئی، حضرت عائشہ کو آخرت کا خیال آگیا، اور وہ رونے لگیں، یہاں تک کہ ان کے آنسو بہہ کر سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے رخسار مبارک پر گرے، آپ بیدار ہو گئے، اور فرمایا اے عائشہ! میں روتی ہو، عرض کیا مجھے آخرت کا خیال آگیا تھا، کیا آپ لوگ قیامت کے دن اپنے گھروالوں کو یاد رکھیں گے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے تین مواقع پر آدمی اپنے سوا کسی کو یاد نہ رکھے گا، ایک اس وقت جب ترازو میں کھڑی کی جائیں گی۔ اور اعمال کا وزن کیا جائے گا اس وقت ابن آدم یہ دیکھے گا کہ اسکی ترازو کا پلاٹا بھاری ہے یا ہلکا، دوسرے اس وقت جب اعمال نامے اڑائے جائیں گے، اس وقت ابن آدم یہ سوچے گا، اس کا سچلہ دائیں ہاتھ میں آئے گا یا بائیں ہاتھ میں، اور تیسرے پل صراط کے وقت حضرت اسؑ روایت کرتے ہیں کہ ابن آدم کو قیامت کے دن لایا جائے گا اور اسے ترازو کی دونوں پلاٹوں کے درمیان کھڑا کیا جائے گا، اور اس پر ایک فرشتہ مقرر کیا جائے، اگر اس کا پلاٹا بھاری ہو تو فرشتہ بلند آواز میں جسے سب لوگ سنیں گے یہ اعلان کرے گا کہ فلاں شخص کے حصے میں ایسی سعادت آئی ہے کہ اس کے بعد وہ کبھی شقی نہیں ہو گا، اور اگر اس کا پلاٹا ہلکا ہو تو وہ فرشتہ ایسی ہی بلند آواز میں یہ اعلان کرے گا کہ فلاں شخص بد بخت قرار پایا اب کبھی وہ سعادت مند نہ ہو گا اور جب پلاٹا ہلکا ہو گا تو دونخ کے فرشتے جن کے ہاتھوں میں لوہے کے گرز اور جسم پر آگ کا لباس ہو گا آئیں گے اور ان لوگوں کو پکڑ کر جہنم میں لے جائیں گے، جن کے پلاٹے ہلکے تھے، گویا وہ دونخ کا حصہ، دونخ کو دیدیں گے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ آدم علیہ

السلام کو پکار کر کہے گا اے آدم! اٹھ اور ان لوگوں کو دوزخ میں بھیج جنہیں دوزخ میں جانا ہے، حضرت آدم علیہ السلام عرض کریں گے اے اللہ! وہ لوگ کتنے ہیں؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا ایک ہزار نو سو ستانوے، جب صحابہ کرام نے یہ سنا تو بہت افسردہ ہوئے، یہاں تک کہ ان کے چہروں سے منکراہٹ رخصت ہوئی، جب آپ نے ان کا یہ حال دیکھا تو ارشاد فرمایا عمل کرو، اور مژدہ پاؤ، اس ذات کی قسم جس کی قبضے میں میری جان ہے تمہارے ساتھ دو مخلوق ایسی ہیں کہ جب کبھی کسی کے مقابل ہوئیں تو اس سے بڑھ کر رہیں، اور ان کے بھی بڑھ کر رہیں جو آدم اور ابلیس کی اولاد میں سے مر گئے، صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہ دونوں مخلوق کونسی ہیں؟ فرمایا یا جوج اور ماجوج، راوی کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد سن کر صحابہ خوش ہو گئے، اسکے بعد آپ نے ارشاد فرمایا عمل کرو اور مژدہ پاؤ، اس ذات کی قسم جس کی قبضے میں میری جان ہے کہ تم قیامت کے روز ایسے ہو گے جیسے لونٹ کے پہلو میں سیاہ داغ ہوتا ہے، یا جانور کے گھٹنوں میں ابھرا ہوا حصہ ہوتا ہے۔

خصوصیت اور ادائے حقوق : ابھی میزان کی ہولناکیوں اور خطروں کا ذکر تھا، اور بیان کیا گیا تھا کہ ہر شخص کی لگا ہوں میزان کے کانٹے پر لگی ہوں گی کہ وہ کہہ کر جھٹکتا ہے، جس کا پلڑا بھاری ہو گا وہ خوش گوار زندگی کا لطف اٹھائے گا، اور جس کا پلڑا ہلکا ہو گا وہ آگ میں گرے گا۔ یہاں یہ بھی جان لینا چاہیے کہ میزان کے خطرے سے صرف وہ شخص سلامت رہ سکتا ہے جو دنیا میں اپنے نفس کا محاسبہ کرے، اور اس میں نہ کر میزان شریعت سے اپنے اعمال، اقوال، افکار، اور خیالات کا وزن کرے، جیسا کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا تھا کہ اپنے نفس کا حساب کرو اس سے پہلے کہ تمہارا محاسبہ ہو، اور اس کا وزن کرو اس سے پہلے کہ تمہارا وزن کیا جائے، اور حساب نفس یہ ہے کہ موت سے پہلے ہر معصیت سے توبہ، فصوح کرے اور اللہ کے فرائض میں جو کچھ کوتاہی سرزد ہوئی ہے اس کا تدارک کرے، اور لوگوں کے حقوق ادا کرے خواہ وہ ایک حبہ برابر ہوں، اور ہر اس شخص سے معافی مانگے جس کو زبان یا ہاتھ سے ایذا دی ہو، یا دل میں اس کے متعلق غلط خیال کیا ہو، اور مرنے تک لوگوں کے دل خوش رکھے، یہاں تک کہ جب وہ مرے تو اس پر کسی کا کوئی حق واجب نہ ہو، نہ کوئی فریضہ باقی ہو، ایسا شخص بلا حساب جنت میں داخل ہو گا، اور اگر حقوق کی ادائیگی سے پہلے مر گیا، تو قیامت کے روز اسے مری گھیر لیں گے، کوئی ہاتھ پکڑے گا کوئی پیشانی پکڑے گا، کوئی گریبان پر ہاتھ ڈالے گا، ایک کے گاکہ تو نے مجھ پر ظلم ڈھایا تھا، دوسرا کہے گا تو نے مجھے گالی دی تھی، تیسرا کہے گا تو نے میرا راق اڑایا تھا، چوتھا کہے گا تو نے میری غیر موجودگی میں ایسی باتیں کی تھیں جو مجھے بری لگتیں، پانچواں کہے گا کہ تو میرے پردوس میں رہتا تھا لیکن توجھیت پردوسی ایک برا شخص ثابت ہوا، چھٹا کہے گا تو نے مجھ سے معاملات کئے، اور ان میں دھوکا کیا، ساتواں کہے گا تو نے مجھے فلاں چیزیں فروخت کی تھی اور اس میں مجھے لوٹ لیا تھا، اور مجھ سے اپنی بیع کا صیب پوشیدہ رکھا تھا، آٹھواں کہے گا تو نے مجھے مظلوم پایا تھا، اور تجھے دفع ظلم پر قدرت حاصل تھی لیکن تو نے ظالم سے چشم پوشی کی، اور میری حفاظت نہیں کی، یہ تمام مری اپنے اپنے حقوق ذکر کریں گے، اور تیرے جسم میں اپنے بچے پیوست کریں گے، اور تیرا گریبان مظلومی سے پکڑیں گے، تو انکی کثرت سے حیران و پریشان ہو گا، یہاں تک کہ کوئی ایسا شخص باقی نہیں رہے گا جس سے تو نے کبھی اپنی زندگی میں کوئی معاملہ کیا تھا، اور اس میں خیانت کی تھی، یا کسی مجلس میں بیٹھ کر اس کی قیمت کی تھی، یا اسے حقارت کی نظر سے دیکھا تھا، یہ سب لوگ تیرے چاروں طرف پھیل جائیں گے، تجھ پر دست درازی کریں گے، اور تو ان کے مقابلے سے خود کو عاجز پائے گا، اور اسی عاجزی اور بے کسی کے عالم میں تیری لگا ہوں اپنے اپنے مالک و مولیٰ کی طرف دیکھتی ہوں گی کہ وہی تجھے اس معصیت سے نجات دلاوے، لیکن تیری مدد نہیں کی جائے گی، بلکہ تیرے کان یہ اعلان سنیں گے :-

الْيَوْمَ تُجْزَى كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ، لَا ظُلْمَ الْيَوْمَ (پ ۲۴۷ آیت ۷۱)

آج ہر شخص کو اسکے کئے کا بدلہ دیا جائے گا، آج (کسی پر) ظلم نہ ہو گا۔

اس وقت تیرا دل اچھل کر طلق میں آجائے گا اور تجھے اپنی جہاں اور برہادی کا یقین آجائے گا، اور تجھے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد یاد

آجائے گا نہ

وَلَا تَحْسَبَنَّ اللَّهَ غَافِلًا عَمَّا يَعْمَلُ الظَّالِمُونَ إِنَّمَا يُؤَخِّرُهُمْ لِيَوْمٍ تَشْخَصُ فِيهِ
الْأَبْصَارُ مُهْطِعِينَ مُقْنِعِينَ رُؤُوسِهِمْ لَا يَرْتَدُّ إِلَيْهِمْ طَرْفُهُمْ وَأَفْنِدُ لَهُمُ آءَاءَ (پ ۱۳) (آیت ۳۲-۳۳)

اور جو کچھ یہ ظالم کر رہے ہیں اس سے خدا تعالیٰ کو بے خبر مت سمجھ، ان کو صرف اس روز تک ملت دے رکھی ہے، جس میں لگا ہوں پھٹی رہ جائیں گی، دوڑتے ہوں گے، اپنے سر اٹھار کھے ہوں گے (اور) اگلی نظر ان کی طرف ہٹ کر نہ آوے گی، اور ان کے دل بالکل بد خواص ہوں گے۔

آج تیری اس خوشی کا کیا ٹھکانہ جو تجھے لوگوں کا مال چھیننے، اور اگلی آہو پر ہاتھ ڈالنے میں ملتی ہے، اس دن تیری حسرت کا کیا عالم ہو گا جب تجھے بساط عدل پر کھڑا کیا جائے گا، اور تجھ سے سوالات کئے جائیں گے، اس وقت تو نہایت مفلس، تنگ دست، عاجز اور ذلیل ہو گا، نہ تو کسی کا حق ادا کر سکے گا، اور نہ کوئی عذر کر سکے گا، تب حق والوں کا حق ادا کرنے کے لئے تیری نیکیاں لے لی جائیں گی، جن میں تو نے اپنی زندگی صرف کی تھی، اور وہ نیکیاں تیرے حقداروں کو ان کے حقوق کے عوض دیدی جائیں گی، حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم جانتے ہو مفلس کون ہے؟ ہم نے عرض کیا مفلس ہم لوگوں میں وہ شخص ہے جس کے پاس نہ درہم و درینار ہوں اور نہ مال و متاع ہو۔ آپ نے فرمایا میسرے امت میں مفلس وہ شخص ہے جو قیامت کے دن نماز، روزے اور زکوٰۃ لے کر آئے گا، اور کسی کو گالی دی ہوگی، یا کسی کا مال کھایا ہوگا، یا کسی کا خون بہایا ہوگا، یا کسی کو مارا ہوگا، اس شخص کو اسکی کچھ نیکیاں دیدی جائیں گی، اور کچھ نیکیاں اس شخص کے حوالے کردی جائیں گی، اور جو حقوق اس پر واجب تھے اگر ان کی ادائیگی سے پہلے نیکیاں ختم ہو گئیں تو حقدار کے گناہ اس پر ڈال دئے جائیں گے، اور اسے آگ میں پھینک دیا جائے گا۔ (۱) توکل پیش آنے والی مصیبت پر آج غور کر لے، آج تیرے پاس کوئی ایسی نیکی نہیں جو ربام کی آفتوں اور شیطان کے مکائد سے پاک ہو، اگر تمام عمر کی ریاضت کے بعد تیرے پاس ایک خالص اور پاک نیکی ابھی گئی تو وہ قیامت کے دن تیرے حقدار چھین لیں گے اگر تو اپنے نفس کا محاسبہ کرے تو تجھے معلوم ہو گا کہ اگرچہ تو دن کے روزوں، اور رات کی نمازوں پر مواظبت کرتا ہے، لیکن تیرا کوئی دن ایسا نہیں گزر تا کہ تیری زبان مسلمانوں کی غیبت سے آلودہ نہ ہوتی ہو، تیری تمام نیکیاں بتو یہی غیبت سمیٹ لے جائے گی، باقی گناہوں کا کیا ہو گا جیسے حرام اور مشتبہ مال کھانا، طامعات میں کوتاہی کرنا، تجھے اس دن مظالم سے نجات کی کس طرح توقع ہو سکتی ہے جس دن بے سینگ کے جانوروں کا حق سینگ دار جانوروں سے لیا جائے گا، حضرت ابو ذرؓ روایت کرتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے دو بکریوں کو دیکھا کہ وہ ایک دوسرے کے سینگ مار رہی ہیں، آپ نے فرمایا اے ابو ذر! تم جانتے ہو یہ کیوں سینگ مار رہی ہیں، میں نے عرض کیا نہیں! فرمایا لیکن اللہ تعالیٰ جانتا ہے اور وہ قیامت کے روز ان دونوں بکریوں کے درمیان فیصلہ فرمائے گا (احمد) قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے نہ

وَمَا مِنْ كَابِتُفِي الْأَرْضِ وَلَا ظَلَّامٍ يَطْمُرُ بِجَنَاحَيْهِ إِلَّا أُمَمٌ أَمْثَلُكُمْ (پ ۱۴) (آیت ۳۸)

اور جتنے قسم کے جاندار زمین پر چلنے والے ہیں، اور جتنے قسم کے پرندے ہیں کہ اپنے بانٹوں سے اڑتے ہیں ان میں کوئی قسم ایسی نہیں جو کہ تمہاری ہی طرح کے گروہ نہ ہوں۔

حضرت ابو ہریرہؓ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ قیامت کے دن تمام مخلوق اٹھالی جائے گی، بہائم درندے، پرندے وغیرہ اور اللہ تعالیٰ کا عدل اس درجے پر پہنچے گا سب سینگ کے جانور کو سینگ دار جانور سے حق دلایا جائے گا پھر اس سے کہا جائے گا مٹی ہو جا، اس وقت کافر بھی کہے گا کہ کاش میں مٹی ہوتا، اے مسکین، اس روز تیرا کیا عالم ہو گا، جب تیرا مجھ ان حسانت سے خالی ہو گا

جن کے لئے تو نے اپنی تمام توانائی خرچ کر دی تھی تو کسے گامیری نیکیاں کہاں چلی گئیں، کہا جائے گا کہ تیرے حقداروں کے صحیفوں میں نخل ہو گئیں، تجھے اپنا صحیفہ ان سینات سے لبریز نظر آئے گا جن سے صبر کرنے میں تو نے بہت سی تکلیفیں برداشت کی تھی، تو عرض کرے گا کہ یہ ان لوگوں کے گناہ ہیں جن کی تو نے غیبت کی تھی، جنہیں تو نے گالی دی تھی، جنہیں ایذا پہنچائی تھی، خرید و فروخت، مجاورت، خطاب، بات چیت، اور بحث و مباحثہ میں ان پر ظلم کیا تھا۔ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ شیطان سرزمینِ عرب پر بتوں کی پرستش سے مایوس ہو چکا ہے، لیکن وہ ان امور سے مایوس نہیں ہوا، جو بت پرستی کے مقابلے میں معمولی ہیں، اگرچہ یہ امور بھی ملک ہیں، اسلئے تم مکہ حد تک ظلم سے اجتناب کرو، اسلئے کہ بندہ قیامت کے دن پہاڑوں کے برابر نیکیاں لے کر آئے گا، اور یہ سمجھے گا کہ یہ نیکیاں اسے ضرور نجات دلائیں گی، لیکن بندگانِ خدا آتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ پروردگار! فلاں شخص نے مجھ پر ظلم کیا ہے، اللہ تعالیٰ فرمائے گا اسکی نیکیاں کم کر دو، لوگوں کی آمد کا سلسلہ جاری رہتا ہے یہاں تک کہ اسکی نیکیوں سے کچھ باقی نہیں رہتا، اس کی مثال ایسی ہے جیسے مسافر کسی جنگل میں قیام کریں، اور ان کے پاس ککڑیاں نہ ہوں، اور لوگ ادھر ادھر منتشر ہو جائیں اور ککڑیاں جمع کر کے لائیں اور آگ لگا دیں، اور جو چاہتے ہیں وہ کریں، یہی حال گناہوں کا ہے، (جس طرح آگ ککڑیوں کو جلا کر راکھ کر دیتی ہے اسی طرح گناہ بھی تمام نیکیوں کو ختم کر دیتے ہیں) (احمد، بیہقی) روایت یہ کہ جب قرآن کریم کی یہ آیت نازل ہوئی تھی۔

رَأَيْتُكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عِنْدَ رَبِّكُمْ تَخْتَصِمُونَ (پ ۲۳ ر ۱۷)

آیت ۳۰-۳۱

آپ کو بھی مرنا ہے، اور ان کو بھی مرنا ہے، پھر قیامت کے روز تم مقدمات اپنے رب کے سامنے پیش کرو گے۔

حضرت زبیر نے عرض کیا یا رسول اللہ! کیا ہمارے گناہوں پر وہ معاملات بھی زائد کئے جائیں گے جو دنیا میں ہم لوگوں کے مابین تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہاں زائد کئے جائیں گے، یہاں تک کہ تم حقداروں کا حق ادا کر دو، حضرت زبیرؓ نے عرض کیا بخدا معاملہ نہایت سخت ہے (احمد، ترمذی) اس دن کی سختی اور سنگینی کا کیا کہنا جس میں ایک قدم کی بخشش نہیں ہوگی، اور ایک کلمے یا ایک طمانچے سے بھی چشم پوشی نہیں کی جائے گی یہاں تک کہ مظلوم ظالم سے انتقام لے لے، حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں کہ میں نے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں کو برہنہ جسم، غیر مخنوں اور قلاش اٹھائے گا، ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (جہاں) قلاش کا کیا مطلب ہے؟ فرمایا یعنی ان کے پاس کچھ نہ ہوگا، پھر اللہ تعالیٰ انہیں ایسی آواز سے پکارے گا جسے دور و نزدیک کے تمام لوگ یکساں طور پر سنیں گے، اور فرمائے گا میں بدلہ لینے والا بادشاہ ہوں، کوئی جنتی جس کے اوپر کسی دوزخی کا حق ہو جنت میں نہیں جاسکتا یہاں تک کہ وہ اس سے اپنا حق نہ لے لے، یہاں تک کہ ایک چائنے کا حق بھی (ادا کرے گا) ہم نے عرض کیا یہ کیسے ہوگا ہم تو اللہ تعالیٰ کے پاس برہنہ جسم، غیر مخنوں اور قلاش حاضر ہوں گے، آپ نے فرمایا یہ حق نیکیوں اور گناہوں سے ادا کرایا جائیگا (احمد) اللہ کے بندو! اللہ سے ڈرو، اور لوگوں پر ان کا مال چھین کر، انکی عزت پر ہاتھ ڈال کر، انکو بدل کر کے اور معاملات میں انکے ساتھ برابر کا برتاؤ کر کے ظلم کا ارتکاب نہ کرو، اسلئے کہ جو گناہ اللہ اور اس کے بندے کے درمیان مخصوص ہوتا ہے اسکی طرف مغفرت بہت جلد سبقت کرتی ہے، اور جس کے اعمال نامے میں مظالم کی کثرت ہو، اگرچہ اس نے ان مظالم سے توبہ کر لی ہو، لیکن وہ مظلومین سے معاف نہ کراسکا ہو، ایسے شخص کو زیادہ سے زیادہ نیک اعمال کرنے چاہئیں تاکہ بدلے کے دن مظلومین کو نیکیاں دینے کے بعد بھی اسکے پاس اس قدر نیکیاں باقی رہیں جن سے اسکی بخشش ہو سکے، اور کچھ ایسے اعمال بھی بچا کر رکھے جو کمالِ اخلاص کے ساتھ ادا کئے گئے ہوں، اور جن پر اسکے مالک حقیقی کے علاوہ کوئی دوسرا مطلع نہ ہو سکتا ہے تاکہ یہ مخلصانہ اعمال اسے اللہ سے قریب کر دیں، اور اللہ تعالیٰ کے اس لطف و کرم کا مستحق بنادیں جو اس

نے اپنے ان عقیدے کے لئے رکھا ہے، جن سے بندوں کے مظالم ادا کرنے مقصود ہیں، جیسا کہ حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں کہ ہم سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بیٹھے ہوئے تھے، اچانک آپ مسکرائے لگے یہاں تک کہ آپ کے دانت ظاہر ہو گئے، حضرت عمرؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ! آپ کس بات پر ہنستے ہیں؟ آپ پر میرے ماں باپ قربان ہوں؟ فرمایا میری امت میں سے دو شخص رب العزت کے سامنے دو زانوں ہوئے، اور ان میں سے ایک نے عرض کیا اے میرے بھائی سے میرے ظلم کا بدلہ لے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا اپنے بھائی کو اپنے ظلم کا بدلہ دے، اس نے عرض کیا یا اللہ! میرے پاس کوئی نیکی باقی نہیں رہی ہے، اللہ تعالیٰ نے مطالبہ کرنے والے سے فرمایا اب تو کیا کرے گا اسکے پاس کوئی نیکی باقی نہیں رہی ہے، اس نے عرض کیا یہ میرے گناہوں کا بوجھ اٹھائے گا، راوی کہتے ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، پھر فرمایا وہ نہایت سخت دن ہوگا، اس دن لوگ اس بات کے محتاج ہونگے کہ انکے گناہوں کا بوجھ کوئی دوسرا اپنے اوپر اٹھائے، پھر اللہ تعالیٰ نے مطالبہ کرنے والے سے فرمایا اپنا سراٹھا، اور جنت کے طرف دیکھ، اس نے اپنا سراٹھایا اور عرض کیا یا اللہ تعالیٰ میں چاندی کے بلند و بالا شر اور سونے کے محل جن پر موتی جڑے ہوئے ہیں دیکھتا ہوں، یہ کس نبی کے لئے ہے، یا کس صدیق کے لئے ہے، یا شہید کے لئے ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا یہ اس شخص کے لئے جو اسکی قیمت چکائے گا، بندہ نے عرض کیا پروردگار! اسکی قیمت کس کے پاس ہوگی؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اسکی قیمت تیرے پاس ہے، بندہ نے عرض کیا وہ کیا؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تیرا اپنے بھائی کو معاف کرنا، اس نے عرض کی اے اللہ! میں نے اپنے بھائی کو معاف کیا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا اپنے بھائی کا ہاتھ پکڑ اور اسے جنت میں لے جا، اسکے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اللہ سے ڈرو، اور آپس میں صلہ رکھو، اسلئے کہ اللہ تعالیٰ مومنین کے درمیان صلہ کرانا ہے، (ابن ابی الدنیا)۔ اور اس حدیث میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ یہ مرتبہ اللہ تعالیٰ کا اخلاق اپنانے سے حاصل ہوتا ہے۔

اب تو اپنے آپ پر نظر ڈال اگر تیرا صحیفہ مظالم سے خالی ہوگا تو اللہ تعالیٰ تجھے اپنے لطف و کرم سے معافی و لادے گا، اور تجھے اپنی ابدی سعادت کا یقین ہو جائے گا، اس وقت تجھے کس قدر خوشی حاصل ہوگی جب تو فیصلے کی جگہ سے واپس ہوگا اس حال میں کہ تیرے جسم پر رضائے الہی کی غلت ہوگی، اور تیرے دامن میں ایسی بحرِ پر سعادت اخروی کا خزانہ ہوگا جس کے بعد کوئی شقاوت نہیں ہے، اور ایسی لادال نعمتیں ہوں گی، جنہیں فنا نہیں ہوتا ہے، اس وقت تیرا دل خوشی اور مسرت سے بے قابو ہو جائے گا، اور تیرا چہرہ اسی قدر چمکدار اور روشن ہو جائے گا جیسے چودھویں شب میں چاند روشن ہوتا ہے، تصور کرو تو اس وقت کس قدر اترائے گا، اور مخلوق کے درمیان سے سراٹھا کر کیسے چلے گا، ہلکا پھلکا روشن اور منور رضائے الہی کی کرنیں تیری پیشانی سے پھوٹ رہی ہوں گی، اور تو اولین و آخرین کی نگاہوں کا مرکز ہوگا، وہ تجھے دیکھ رہے ہوں گے، تیرے حسن اور جمال پر رشک کر رہے ہوں گے، اور ملائکہ تیرے آگے پیچھے چل رہے ہوں گے، اور یہ اعلان کر رہے ہوں گے کہ یہ فلاں ابن فلاں ہے اللہ تعالیٰ اس سے راضی ہوا اور اسکو راضی کر دیا، اور اس نے ایک ایسی سعادت حاصل کر لی ہے جس کے بعد شقاوت نہیں ہے، کیا تیرے خیال میں یہ منصب اس مرتبے سے افضل و اعلا ہے جو تو دنیا میں رہ کر لوگوں کے دلوں میں اپنی ریاء، مدامت، تصنع، اور ترین سے حاصل کرنا چاہتا ہے، اگر تو یہ سمجھتا ہے کہ واقعی آخرت کا درجہ اس دنیاوی مرتبے سے بہتر ہے، بلکہ ان دونوں کے درمیان کوئی مناسبت ہی نہیں ہے تو تجھے یہ مرتبہ حاصل کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنے معاملات میں منصفانہ اور صدق نیت کی مدد حاصل کرنی چاہئے، انکے بغیر یہ مرتبہ حاصل نہیں ہو سکتا، اور اگر معاملہ اسکے برعکس ہو، مثلاً تیرے معاملات میں ایسا کوئی گناہ درج تھا جسے تو معمولی سمجھتا تھا، لیکن فی الحقیقت وہ اللہ کے نزدیک نہایت سنگین تھا، اسلئے اللہ تعالیٰ اس گناہ پر تجھ سے ناراض ہوا، اور اس نے یہ کہہ دیا کہ اے بندہ سوء تجھ پر میری لعنت ہو، میں تیری کوئی عبادت اور اطاعت قبول نہیں کروں گا، یہ سن کر تیرا چہرہ تاریک ہو جائے گا، پھر اللہ تعالیٰ کو غضب ناک دیکھ کر فرشتے بھی اپنی ناراضگی ظاہر کریں گے، اور کہیں گے کہ اے شخص تجھ پر ہماری اور تمام مخلوق کی لعنت ہو، اس وقت جہنم کے فرشتے اپنی سحر خوی، ترش روئی اور سخت گیری کے ساتھ نہایت غضب کے عالم میں تیرے پاس آئیں گے،

اور تیری پوشانی کے بال پکڑ کر تجھے منہ کے بل تھپٹے ہوئے لے جائیں گے، تمام مخلوق موجود ہوگی، ہر شخص کی نظریں تیرے چہرے کی سیاهی اور تیری ذلت اور رسوائی پر ہوں گی، اور تو چیخ چیخ کر کہہ رہا ہوگا، ہائے ہلاکت، وائے بربادی، اور وہ تجھ سے یہ کہیں گے کہ آج ایک ہلاکت کو مت پکار، بلکہ بہت سی ہلاکتوں کو آواز دے، فرشتے یہ اعلان کرتے ہوں گے یہ شخص فلاں ابن فلاں ہے، اللہ تعالیٰ نے آج اسے ذلیل و رسوا کر دیا ہے، اور اسے اس کے بدترین گناہوں کے باعث ملعون قرار دیدیا ہے، اور اسکی قسمت میں ایسی ابدی شقاوت لکھی دی گئی ہے جس کے بعد سعادت نہیں ہے، یہ صورت حال کسی ایسے گناہ کی بدولت بھی پیش آسکتی ہے جو تو نے بندوں کے خوف سے، یا ان کے دل میں اپنی جگہ بنانے کے لئے، یا انکے سامنے رسوائی سے بچنے کے لئے کیا ہے، تو کتنا بڑا جاہل ہے کہ بندگان خدا کے ایک مختصر گروہ کے سامنے رسوائی سے خوف زدہ ہے، اور وہ بھی ایسی دنیا میں جو بہت جلد ختم ہو نیوالی ہے، اور اس عظیم رسوائی سے نہیں جو ایک عظیم اجتماع میں ہوگی، اور اس رسوائی کیساتھ اللہ تعالیٰ کا غضب شدید، اور اسکا عذاب الیم بھی ہوگا، اور جنم کے فرشتے بھی جنم کی طرف کھینچ کر لے جائیں گے۔

پہلے صراط کا بیان : ان خطرات کے بعد اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں غور کرو :-
يَوْمَ نَخْشِرُ الْمُتَّقِينَ إِلَى الرَّحْمَنِ وَفَلَوْ نَسُوقُ الْمُجْرِمِينَ إِلَى جَهَنَّمَ وَرِثًا (پ ۲۶ آیت ۸۵-۸۶)

جس روز ہم متقیوں کو رحمن کی طرف مسمان بنا کر جمع کریں گے، اور مجرموں کو دوزخ کی طرف پھینک دیں گے۔

فَاَهْلَوْهُمْ إِلَى صِرَاطٍ الْجَحِيمِ وَقَفَّوْهُمْ أَنَّهُمْ مَسْئُولُونَ (پ ۲۳ آیت ۲۳)
پھر ان سب کو دوزخ کا راستہ بتلاؤ اور ان کو ٹھہراؤ ان سے کچھ پوچھا جائے گا۔

ان خطرات سے گزرنے کے بعد لوگ پہلے صراط کی طرف لے جائے جائیں گے، پہلے صراط دوزخ کے اوپر بنا ہوا ایک پہل ہے جو تلوار سے زیادہ تیز اور ہال سے زیادہ باریک ہے جو شخص اس دنیا میں صراط مستقیم پر ثابت قدم رہتا ہے اس پر آخرت کی صراط عبور کرنا سہل ہو جاتا ہے، اور اس کے خطرے سے نجات پالیتا ہے، اور جو شخص دنیا میں صراط مستقیم سے انحراف کرتا ہے، اور اپنی پشت کو گناہوں سے بوجھل کرتا ہے، اور نافرمانی کرتا ہے وہ صراط آخرت پر پہلے ہی قدم میں لڑکھڑا جاتا ہے، اور گر کر ہلاک ہو جاتا ہے، اب یہ دیکھو کہ پہلے صراط پر قدم رکھنے سے پہلے تمہارے خوف اور گھبراہٹ کا کیا عالم ہوگا جب تمہاری نگاہ اسکی باریکی اور تیزی پر پڑے گی، اور تم اسکے نیچے جنم کے شعلے دیکھو گے، پھر تمہارے کانوں میں جنم کے چیخے چٹکناڑنے اور اٹھنے کی آواز آئے گی، اور غمیں مجبور کیا جائے گا کہ تم اپنی کمزوری، قلبی اضطراب و ڈگمگاتے قدموں اور کمر کے بے پناہ بوجھ کے باوجود جس کی موجودگی میں تم مسلح زمین پر بھی نہیں چل سکتے۔ اس ہال سے زیادہ باریک صراط پر چلو، اس وقت کیا حال ہوگا جب تو اپنا ایک پاؤں رکھے گا، اچانک تجھے صراط کی تیزی اور حدت محسوس ہوگی، اور تو دو سرا پاؤں اٹھانے پر مجبور ہو جائیگا، اور تیری آنکھوں کے سامنے بیشار لوگ ٹھوکریں کھا کر گرتے ہوئے، اور جنم کے فرشتوں کے ذریعے کانٹوں سے اٹھتے ہوئے دیکھے گا، اور یہ بھی دیکھے گا کہ لوگ منہ کے بل جنم کے گہرے کنویں میں گر رہے ہیں، کتنا خطرناک اور دہشت ناک منظر ہوگا، کتنی پُر مشقت بلندی پر چڑھنا ہوگا، کتنی تنگ رہ گزر ہوگی، چشم تصور سے دیکھو کہ تم اس حال میں ہو، اور اس بلند اور تنگ رہ گزر پر چڑھ رہے ہو، تمہاری پشت بوجھل ہے، دائیں بائیں مخلوق خدا آگ میں گزر رہی ہے، اور سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم رب کریم کے سامنے سر بسجود سلامتی کی دعا مانگ رہے ہیں، دوسری طرف دوزخ کے گہرے کنویں سے فریاد اور آہ و بکا کی آوازیں آرہی ہوں گی، اور وہ لوگ اپنی جاہلی و بربادی کو آواز دے رہے ہوں گے، جو پہلے صراط عبور نہ کر سکے اور گناہوں کے بوجھ سے لڑکھڑا کر گر پڑے، تیرا کیا حال ہوگا، اگر تیرے قدم بھی ڈگمگائے، اس وقت نہ امت سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا، تب تو توحا ہی اور بربادی کو پکارے گا، اور کہے گا کہ میں

اسی دن سے ڈرتا تھا، کاش میں نے اس زندگی کے لئے کچھ آگے سمجھا ہوتا، کاش میں پیغمبر کے بتلائے ہوئے راستے پر چلا ہوتا کاش میں نے فلاں کو اپنا دوست نہ بنایا ہوتا، کاش میں نے فلاں کو اپنا دوست بنایا ہوتا، کاش میں اپنے دامن میں مٹی ہوتا، کاش میں معدوم ہوتا، کاش میری ماں نے مجھے نہ جتا ہوتا، اس وقت تجھے آگ کے شعلے اپنے دامن میں لے لیجئے، اور اعلان کرنے والا یہ اعلان کرے گا نہ۔

اِحْسَنُوا فِيْهَا وَلَا تَكْلِمُوْنَ (پ ۱۸ ر ۲ آیت ۱۰۸)

تم اسی (جہنم) میں راندے ہوئے پڑے رہو اور مجھ سے بات مت کرو۔

چینچنے چلانے، سانس لینے، اور مدد کے لئے پکارنے کی کوئی گنجائش نہیں ہوگی، اب تو اپنی عقل سے اسکی رائے دریافت کر، یہ تمام خطرات تیرے سامنے ہیں، اگر تو ان پر ایمان نہیں رکھتا تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ تجھے جہنم کے طبقات میں مشرکین اور کفار کے ساتھ دیر تک رہنا ہے، اور اگر تو ایمان رکھتا ہے لیکن غافل ہے، اور اس کے لئے تیاری کرنے کو اہمیت نہیں دیتا تو یہ بڑے خسارے کی بات ہے، یہ بھی سرکشی کی ایک علامت ہے، بھلا ایسے ایمان سے کیا فائدہ جو تجھے ترک معصیت، اور اطاعت کے ذریعے رضائے الہی کے لئے سعی و عمل پر نہیں اُکساتا، بالفرض پہلے صراط کے خطروں کے علاوہ قیامت کے دوسرے خطرات نہ ہوں، اور صرف یہی دہشت ہو کہ میں اس تنگ اور خطرناک راہ گزر سے گزر بھی سکتا ہوں یا نہیں صرف یہی دہشت تیرے لئے ایک زبردست تازیانہ، عمل پر ایک طاقتور محرک ہونی چاہیے، سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ پہلے صراطِ جہنم کے اوپر رکھا جائے گا، اور رسولوں میں پہلا شخص میں ہوں گا جو اپنی امت کو لے کر اترے گا، اور اس دن انبیاء کے علاوہ کسی کو اذن کلام نہ ہوگا، اور انبیاء بھی صرف اس قدر کہیں گے اے اللہ سلامت رکھ، اے اللہ سلامتی عطا کر، اور جہنم میں سدا ان کے کانٹوں جیسے کانٹے ہوں گے، کیا تم نے سدا ان کے کانٹے دیکھے ہیں، لوگوں نے عرض کیا جی ہاں یا رسول اللہ! ہم نے دیکھے ہیں، آپ نے فرمایا دوزخ کے کانٹے سدا ان کے کانٹوں جیسے ہوتے تھے، تاہم ان کا طول و عرض کوئی نہیں جانتا، یہ کانٹے انسانوں کو اٹکے اعمال کے مطابق اچھیں گے، بعض لوگ اپنے اعمال کی وجہ سے ہلاک ہو جائیں گے، اور بعض راہی بن جائیں گے پھر بیچ جائیں گے (بخاری و مسلم ابو ہریرہ) حضرت ابوسعید الخدریؓ روایت کرتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا لوگ پہلے صراط سے گزریں گے، اور اس پر کانٹے اور آنکڑے لگے ہوں گے، اور وہ لوگوں کو دائیں بائیں سے اچھیں گے، اور پہلے صراط کے دونوں جانب کھڑے ہوئے فرشتے کہیں گے اے اللہ سلامتی عطا کر، اے اللہ سلامتی عطا کر، بعض لوگ برقی کی طرح گزر جائیں گے، بعض ہوا کی مانند، بعض تیز و کھوڑے کی طرح، بعض دوڑتے ہوئے، بعض پیدل چلنے کے انداز میں، بعض کھنٹوں کے بل، اور بعض کھینچے ہوئے، اور جو لوگ دوزخ میں رہیں گے، وہ نہ مریں گے، نہ زندہ رہیں گے، لیکن جو لوگ اپنے گناہوں کی پاداش میں جہنم کے اندر ڈالے جائیں گے، وہ جل کر کوئلہ بن جائیں گی پھر شفاعت کی اجازت ہوگی (بخاری و مسلم) حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ روایت کرتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تمام اولین و آخرین کو قیامت کے دن جمع کرے گا سب لوگ چالیس برس تک آسمان کی طرف ٹھٹھکی پاندھ کر دیکھتے رہیں گے، اور حکم الہی کے منتظر کھڑے رہیں گے (اس حدیث میں محمود مومنین تک واقعات کا ذکر ہے اور یہ واقعات پہلے بھی گزر چکے ہیں) پھر اللہ تعالیٰ مومنین سے ارشاد فرمائے گا اپنے سر اٹھاؤ وہ لوگ اپنے سر اٹھائیں گے، اور انھیں اٹکے اعمال کے بقدر نور عطا کیا جائے گا، بعض لوگوں کو جبلِ عظیم کے بقدر نور عطا کیا جائے گا، جو اسکے سامنے چل رہا ہوگا، اور بعض کو اس سے چھوٹا نور عطا کیا جائے گا، اور بعض کو نخلے کے برابر نور دیا جائے گا، اور بعض کو اس سے بھی کم، سب سے آخر میں جس شخص کو نور ملے گا وہ اسکے چہرے کے انگوٹھے پر ہوگا، کبھی وہ نور چمکے گا، اور وہ دم پڑ جائے گا، جب چمکے گا تو وہ قدم اٹھائے گا اور آگے بڑھ جائے گا، اور جب تاریک ہو جائے گا تو کھڑا ہو جائے گا، اسکے بعد حدیث شریف میں پہلے صراط سے لوگوں کے گزرنے کی تفصیل بیان کی گئی ہے کہ سب اپنے اپنے نور کے مطابق گزریں گے، بعض لوگ پلک جھپکنے کی مدت

میں گزر جائیں گے، بعض لوگ برق کی رفتار سے، اور بعض ستاروں کے گرنے کی طرح، اور بعض گھوڑے کے دوڑنے کی رفتار سے، اور بعض آدمی کے دوڑنے کی رفتار سے گزریں گے، یہاں تک کہ وہ شخص جسے اپنے پاؤں کے انگوٹھے پر نور عطا کیا گیا تھا، اپنے چہرے، ہاتھوں، اور پیروں پر گھسٹا ہوا چلے گا، ایک ہاتھ آگے بڑھائے گا تو دوسرا منسلق ہو جائے گا، ایک پیر بڑھائے گا تو دوسرا جائے گا، اور اسکے اعضاء تک جسم کی آگ پہنچ رہی ہے، وہ اسی حالت میں گھسٹتا ہوا پل صراط عبور کرنے کے بعد وہ وہاں کھڑا ہو کر کہے گا میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ مجھے ایسی نجات دی جو کسی کو نہیں دی، اور مجھے اس وقت بچایا جب میں اسے دیکھ چکا تھا، پھر وہ باب جنت کے پاس ایک تالاب پر جائے اور غسل کرے گا (ابن عدی، حاکم)۔

حضرت انس ابن مالک روایت کرتے ہیں کہ میں نے سنا ہے کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے تھے پل صراط تلوار کی تیزی یا دھار کی تیزی کی طرح ہے، اور فرشتے مومن مردوں اور مومن عورتوں کو بچاتے ہوں گے اور جبرئیل علیہ السلام میری کمر بکڑے ہوئے ہوں گے، اور میں یہ کہہ رہا ہوں گا رب کریم سلامتی عطا کر، اے اللہ سلامتی عطا کر، تاہم اس روز لغزش کرنے والے مرد اور لغزش کرنے والی عورتیں زیادہ ہوں گی (بیہقی)۔

یہ پل صراط کے احوال اور مصائب ہیں، تمہیں ان میں سے زیادہ سے زیادہ فکر کرنا چاہئے، اسلئے کہ قیامت کے دن لوگوں میں زیادہ سلامت وہ شخص رہے گا جو دنیا میں رہ کر ان احوال میں زیادہ فکر کرے گا، اللہ تعالیٰ کسی بندے پر دو خوف جمع نہیں کرتا، چنانچہ جو شخص ان احوال و خطرات سے دنیا میں ڈرتا ہے وہ آخرت میں مامون رہتا ہے، خوف سے میری مراد عورتوں جیسی رقت نہیں ہے کہ جب ان احوال کا ذکر ہو تو آنکھیں بھر آئیں یہ دل میں رقت پیدا ہو جائے، اور بہت جلد انھیں فراموش بھی کر دو، اور اپنے لبود لعب میں لگ جاؤ، یہ چیز خوف نہیں ہے، بلکہ جو شخص کسی چیز سے ڈرتا ہے وہ اس سے بھگتا ہے، اور جو شخص کسی چیز کی امید رکھتا ہے وہ اسے طلب کرتا ہے، تمہارے لئے صرف وہی خوف باعث نجات ہو سکتا ہے، جو تمہیں اللہ تعالیٰ کے معاصی سے روکے، اور اسکی اطاعت پر آمادہ کرے، عورتوں کے خوف سے بھی زیادہ برا ان احمقوں کا خوف ہے جو قیامت و فیوہ کا ذکر سن کر زبان سے استغاثہ کرتے ہیں، اور کہتے ہیں استغث باللہ، نعوذ باللہ، اللهم سلم سلم، اور اس کے باوجود وہ ان معاصی پر اصرار کرتے ہیں جن کے پیچھے قلعہ ہو، اور سامنے سے خطرناک درندہ حملہ کرنا چاہتا ہو، جب وہ شخص یہ دیکھتا ہے کہ درندے نے پناہ جزا کھول لیا ہے، اور اب وہ حملہ کرنے والا ہے تو زبان سے کہنے لگتا ہے میں اس مضبوط قلعے کی پناہ چاہتا ہوں، اور اسکی محکم بنیادوں اور پختہ دیواروں اور ستونوں کا خواہاں ہوں، مہلا اگر کوئی شخص زبان سے یہ الفاظ ادا کر رہا ہو، اور اپنی جگہ چٹا کھڑا ہو تو یہ الفاظ اسے حملہ آور درندے سے کیسے بچائیں گے، یہی حال آخرت کے خطرات اور مصائب کا ہے، یہ خطرات سامنے سے آرہے ہیں، اور پشت پر لا الہ الا اللہ کا قلعہ موجود ہے، شخص زبان سے کہہ لا الہ الا اللہ کہتا کافی نہیں ہے، بلکہ صدق دل کے ساتھ کہنا ضروری ہے، اور صدق کے معنی یہ ہیں کہ کہنے والے کا کوئی اور مقصود و مقبوضہ اللہ کے سوانہ ہو، جو شخص خواہش نفس کو اپنا مقبوضہ سمجھتا ہے، وہ صدق توحید سے دور ہے، اور اس کا معاملہ خطرے سے پر ہے، اگر آدمی سے یہ سب کچھ نہ ہو سکے تو اسے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا محب، آپ کی سنن کی تقسیم پر حریص، اور آپ کی امت کے نیک قلوب کی خاطر داری کا مشتاق، اور ان کی دعاؤں کی برکات کا طالب ہونا چاہئے، ہو سکتا ہے اس طرح اسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت یا آپ کی امت کے بزرگوں کی شفاعت نصیب ہو جائے، اور معمولی سرمایہ رکھنے کے باوجود شفاعت کے ذریعے نجات پانے میں کامیاب ہو جائے۔

شفاعت : جب مومنین کے بعض گمراہوں پر دوزخ میں جانا واجب ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے انکے باب میں انبیاء کرام اور صدیقین، بلکہ علماء اور صالحین کی شفاعت قبول فرماتا ہے، بلکہ جس شخص کا بھی اللہ تعالیٰ کے یہاں کوئی مرتبہ یا حسن معاملہ ہے اسے اپنے اہل و عیال، قرابت و داموں، دوستوں، اور واقف کاروں کے باب میں شفاعت کا حق عطا کیا جاتا ہے، اسلئے ہمیں یہ کوشش کرنی چاہئے کہ لوگوں کا یہاں مرتبہ شفاعت حاصل کر سکو، اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ تم کبھی کسی انسان کی حقیر مت

کہو، اللہ تعالیٰ نے اپنی ولایت بندوں میں پوشیدہ رکھی ہے، ہو سکتا ہے جس شخص کو تم حقارت کی نظر سے دیکھ رہے ہو، وہ اللہ کا ولی ہو، اور نہ کسی معصیت کو معمولی تصور کرو، اسلئے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا غضب معاصی میں مخفی کر دیا ہے، ہو سکتا ہے جس گناہ کو تم معمولی سمجھ رہے ہو وہی غضب الہی کا باعث ہو، اور نہ کسی عبادت و اطاعت کو حقیر جانو اسلئے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی رضا طاعات میں ودیعت فرمائی ہے، ہو سکتا ہے جس اطاعت کو تم حقیر سمجھ رہے ہو وہی اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا سبب ہو، وہ اطاعت خواہ ایک اچھا کلمہ ہو، یا ایک لقمہ ہو، یا ایک اچھی نیت ہو، یا ان جیسی کوئی اطاعت ہو۔

شفاعت کے دلائل قرآن کریم اور روایات میں بھی بے شمار، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے نہ

وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ كَرِّكَ فَتَرْضَىٰ (۱۸/۳۰ آیت ۵)

اور عنقریب اللہ تعالیٰ آپ کو (نعمتیں) دے گا سو آپ خوش ہو جائیں گے۔

حضرت عمرو ابن العاصؓ سے مروی ہے کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ قول تلاوت فرمایا نہ

رَبِّ اِنَّهُمْ اضْلَلْنِ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ فَعَنْ تَبَعْنِيْ فَاِنَّهُ مُتَّبِعِيْ وَمَنْ عَصَانِيْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (پ ۱۸/۳۱ آیت ۳۶)

اے میرے پروردگار! ان لوگوں نے بہترے آدمیوں کو گمراہ کر دیا، پھر جو شخص میری راہ پر چلے گا وہ تو میرا ہی ہے اور جو شخص میرا کسانہ مانے گا سو آپ تو کثیرِ رحمت ہیں۔

اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ قول بھی تلاوت فرمایا نہ

اِنْ نَعُوْذُبُھُمْ فَاِنَّھُمْ عِبَادُكَ (پ ۱۸ آیت ۶)

اگر آپ انکو سزا دیں تو یہ آپ کے بندے ہیں۔

پھر آپ نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے اور فرمایا میری امت میری امت اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام سے فرمایا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جاؤ، اور ان سے پوچھو کہ وہ کیوں روتے ہیں؟ جبرئیل علیہ السلام حاضر ہوئے اور رونے کا سبب دریافت کیا، آپ نے سبب بتلایا کہ اللہ ہی جانتا ہے وہ سبب کیا تھا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے جبرئیل محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جاؤ اور ان سے کہو کہ ہم آپ کی امت کے بارے میں آپ کو خوش کریں گے، تکلیف نہیں دیں گے (مسلم۔ عبد اللہ ابن عباسؓ)۔ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ مجھے پانچ چیزیں ایسی دی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے انبیاء کو حلال نہیں کی گئیں مجھے ایک ماہ کے فاصلے کا رعب حلال کیا گیا ہے، دو سہری یہ ہے کہ میرے لئے ختمِ حلال کئے گئے ہیں، مجھ سے پہلے کسی کے لئے حلال نہیں تھے، تیسری چیز یہ کہ میرے لئے زمین کو مسجد اور اسکی خاک کو پاک کرنے والا بنایا گیا ہے، میری امت کے جس شخص پر نماز کا وقت آجائے اسے نماز پڑھنی چاہیے، اور چوتھی چیز یہ کہ مجھے شفاعت حلال کی گئی ہے، اور پانچویں چیز یہ کہ ہر مٹی اپنی قوم کی طرف منسوب ہوا ہے، اور میں تمام انسانوں کی طرف مبعوث ہوا ہوں (بخاری و مسلم۔ جابر) سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جب قیامت کا دن ہوگا تو میں انبیاء کا امام و خلیفہ اور ان کی شفاعت کرنے والا ہوں گا، اور انہیں کوئی فخری بات نہیں ہے (ترمذی، ابن ماجہ۔ ابی ابن کعب) ایک روایت میں ہے آپ نے ارشاد فرمایا: میں اولادِ آدم کا سردار ہوں، اور اس میں کوئی فخری بات نہیں ہے، اور میں ان سب لوگوں میں پہلا ہوں جو زمین پھٹنے پر نکلیں گے، اور اولین سفارشی ہوں، اور سب سے پہلے میری سفارش قبول ہوگی، میرے ہاتھ میں حمد کا پرچم ہوگا اور اس کے نیچے آدم اور دو سرے انبیاء ہوں گے (ترمذی، ابن ماجہ۔ سعید الحدادی) ایک روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا ہر مٹی کی ایک دعا قبول ہوتی ہے، میں چاہتا ہوں کہ اپنی دعا کو قیامت کے دن اپنی امت کی سفارش کے لئے چھپائے رکھوں (بخاری و مسلم۔ انس) حضرت عبد اللہ ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم صلی

اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا انبیاء کے لئے سونے کے مہر کھڑے کئے جائیں گے اور وہ ان پر بیٹھ جائیں گے، مگر میرا منبر خالی رہے گا، میں اس پر نہیں بیٹھوں گا، اور اپنے رب کے سامنے اس خوف سے کھڑا رہوں گا کہ کہیں میں جنت میں نہ بھیج دیا جاؤں اور میری امت میرے بعد باقی رہ جائے میں عرض کروں گا الہی میری امت، اللہ تعالیٰ فرمائے گا اے محمد آپ اپنی امت کے ساتھ کیا سلوک کرانا چاہتے ہیں، میں عرض کروں گا یا اللہ! ان کا حساب جلد لیجئے، میں شفاعت کرتا رہوں گا یہاں تک کہ مجھے ان لوگوں کی برأت کا پروانہ مل جائے گا جنہیں دوزخ میں بھیج دیا گیا تھا، اور داودؑ جنم مالک مجھ سے کہے گا اے محمد! آپ نے اپنی امت میں سے دوزخ میں اپنے رب کے غضب کے لئے کچھ نہ چھوڑا (طبرانی) ایک حدیث میں ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ میں قیامت کی دن زمین کے پتھروں اور ڈھیلوں (کی تعداد) سے زیادہ انسانوں کے لئے شفاعت کروں گا (طبرانی، بریدہ) حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں گوشت لایا گیا، اور آپ کو بازو پیش کیا گیا (گوشت کا) یہ حصہ آپ کو مرغوب تھا آپ نے اس میں سے دانتوں سے کاٹا، پھر فرمایا میں قیامت کے دن انبیاء کا سردار ہوں گا، کیا تم جانتے ہو کہ کس وجہ سے اللہ تعالیٰ تمام اولین و آخرین کو ایک میدان میں جمع فرمائے گا، اور پکارنے والے کی آواز انہیں سنائے گا اور انہیں نظر کے سامنے رکھے گا، اور آفتاب قریب ہوگا، اور لوگوں پر ناقابلِ برداشت غم اور تکلیف ہوگی، اور بعض لوگ بعض سے کہیں گے کیا اپنی تکلیف کا احساس نہیں کیا، کیا تم کسی ایسے شخص کو تلاش نہیں کرو گے، جو تمہارے لئے تمہارے رب سے سفارش کر سکے، بعض بعض سے کہیں گے کہ تمہیں حضرت آدم علیہ السلام کے پاس چلنا چاہئے، لوگ حضرت آدم علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوں گے اور عرض کریں گے کہ آپ ابوا بشر ہیں، آپ کو اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھ سے پیدا فرمایا ہے، اور آپ میں اپنی روح پھوگی ہے، اور ملائکہ کو حکم دیا ہے (کہ وہ آپ کو سجدہ کریں) اور انہوں نے آپ کو سجدہ کیا ہے، آپ اپنے رب سے ہمارے لئے سفارش فرمائیے، کیا آپ نہیں دیکھتے کہ ہم کس مصیبت میں گرفتار ہیں، اور کس تکلیف میں مبتلا ہیں، حضرت آدم علیہ السلام ان سے فرمائیں گے میرا رب آج اس قدر غضب ناک ہے کہ اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا، اور نہ اس کے بعد کبھی ہوگا، اور اللہ تعالیٰ نے مجھے درخت سے منع فرمایا تھا (مگر) میں نے نافرمانی کی تھی، میں خود اپنی پریشانی میں ہوں، کسی اور کے پاس جاؤ، نوح علیہ السلام کے پاس جاؤ، لوگ حضرت نوح علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوں گے، اور عرض کریں گے کہ آپ اہلِ نین کی طرف سب سے پہلے رسول بنا کر بھیجے گئے تھے، اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو عبدِ مکرور کے خطاب سے نوازا ہے، ہمارے لئے اپنے رب سے شفاعت فرمائیں، آپ ہماری پریشانی دیکھ ہی رہے ہیں حضرت نوح علیہ السلام فرمائیں گے کہ میرا رب آج اس قدر غصے میں ہے کہ اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا اور نہ آج کے بعد کبھی ہوگا، میں نے اپنی قوم کے خلاف بددعا کی تھی، میں اپنی مصیبت میں گرفتار ہوں، کسی دوسرے کو کچھو، ابراہیم خلیل اللہ کے پاس جاؤ، وہ لوگ حضرت ابراہیم خلیل اللہ کے پاس جائیں گے اور عرض کریں گے کہ آپ دنیا والوں میں اللہ کے نبی اور دوست ہیں، کیا آپ ہماری تکلیف نہیں دیکھ رہے ہیں؟ ہمارے لئے شفاعت کیجئے، حضرت ابراہیم علیہ السلام فرمائیں گے کہ میرا رب آج اس قدر غضب ناک ہے کہ اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا اور نہ اس کے بعد کبھی ہوگا اور میں نے عین مرتبہ جھوٹ بولا تھا، اللہ انہیں یاد دلائے گا، مجھے آج خود اپنی پڑی ہے، دوسروں کے پاس جاؤ، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس جاؤ، لوگ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوں گے اور عرض کریں گے کہ اے موسیٰ! آپ اللہ کے رسول ہیں، اللہ نے آپ کو اپنے کلام اور پیغمبری سے لوگوں پر فعلیت بخشی، آپ ہماری حالت پر نظر فرماتے ہوئے اپنے رب سے ہماری سفارش کر دیجئے، حضرت موسیٰ علیہ السلام فرمائیں گے کہ میرا رب آج اس قدر ناراض ہے کہ نہ اس سے پہلے کبھی ہوا، اور نہ آئندہ کبھی ہوگا، میں نے ایک ایسے آدمی کو قتل کر دیا تھا، جس کے قتل کا مجھے حکم نہیں دیا گیا تھا میں خود مصیبت میں پڑا ہوں، کسی اور کو کچھو، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پاس جاؤ، لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پاس نہیں گئے، اور عرض کریں گے کہ آپ اللہ کے رسول اور اسکے کلمے ہیں جسے اس نے مریم کی طرف ڈالا تھا، اور اللہ کی روح میں آپ اور آپ نے لوگوں سے اس وقت کلام کیا جب آپ گود میں تھے آپ اپنے رب سے ہماری

سفارش فرمائیں ہم نہایت پریشان ہیں، حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرمائیں گے کہ میرا رب آج اس قدر غیظ میں ہے کہ نہ اس سے پہلے کبھی ہوا تھا اور نہ آئندہ کبھی ہوگا (آپ نے اپنی کوئی خطایمان نہیں (فرمائی) میں خود اپنی پریشانی میں ہوں، تم کسی اور کے پاس جاؤ، کوک میرے پاس آئیں گے، اور کہیں گے کہ اے محمد! آپ اللہ کے رسول ہیں، خاتم النبیین ہیں، اللہ تعالیٰ نے آپ کے اگلے پچھلے گناہ معاف فرمائے ہیں، آپ اپنے رب سے ہماری سفارش فرمادیں، آپ دیکھ ہی رہے ہیں ہم کس مصیبت میں ہیں، چنانچہ میں چلوں گا اور عرش کے نیچے آؤں گا، اور اپنے رب کے سامنے سرسجود ہو جاؤں گا، پھر اللہ تعالیٰ اپنے عاقل اور حسن ثناء سے میرے اوپر وہ چیز کھول دے گا جو مجھ سے پہلے کسی پر نہیں کھولی گئی تھی، پھر کہا جائے گا اپنا سراٹھاؤ، جو مانگو گے دیا جائے گا، اور جو سفارش کرو گے وہ قبول کی جائے گی، میں کہوں گا اے میری امت! پھر کہا جائے گا اے محمد! اپنی امت کے ان لوگوں کو جن پر حساب نہیں ہے جنت کے دائیں دروازے سے بچاؤ، اور دوسرے دروازوں میں تمہاری امت کے لوگ دوسروں کے ساتھ شریک ہیں، اسکے بعد آپ نے فرمایا اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے جنت کے دو کواڑوں کا درمیانی فاصلہ اس قدر ہے جس قدر مکہ اور حیر کے درمیان یا مکہ اور ہمرے کے درمیان ہے (بخاری و مسلم) ایک حدیث میں یہ تمام مضمون وارد ہوا ہے اور اسمیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی خطائیں بھی بیان فرمائی گئی ہیں کہ آپ نے کوکب کے متعلق فرمایا تھا اِنِّیْ (یہ میرا رب ہے) یا مشرکین کے محبوبوں کے متعلق فرمایا تھا اِنِّیْ فَتٰہٌ کَبِیْرٌ عَظِیْمٌ (بلکہ یہ کام ان جوں کے بڑے نے کیا ہے) یا ایک مرتبہ فرمایا تھا اِنِّیْ سَیِّمٌ (میں بنار ہوں) (مسلم)

یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کا حال ہے جو مذکور ہوا، امت کے دوسرے لوگوں جیسے علماء اور صلحاء وغیرہ انھیں بھی شفاعت کا حق حاصل ہوگا، چنانچہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ میری امت کے ایک فرد کی شفاعت سے قبیلۂ ریح و مغرب کی تعداد سے زیادہ آدمی جنت میں جائیں گے (جزء ابی عمر ابن الساکب ابو امامہ) ایک حدیث میں ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ایک شخص سے کہا جائے اٹھ کھڑا ہو، اور شفاعت کر، وہ کھڑا ہوگا، اور قبیلے کے لئے گھر والوں کے لئے، ایک آدمی کیلئے، یا دو آدمیوں کے لئے اپنے عمل کے بقدر شفاعت کرے گا، (ترمذی، ابو سعید، بزار، النسائی) حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں کہ قیامت کے دن ایک جنتی شخص دو دنخ والوں پر جھانکے گا، کوئی دو زنی اسے پکارے گا اور کہے گا اے فلاں شخص کیا تو مجھے جانتا ہے، وہ کہے گا نہیں! بھئی نہیں جانتا تو کون ہے؟ وہ کہے گا میں وہ ہوں کہ تو دنیا میں میرے پاس سے گزرا تھا اور تونے پانی کا ایک گھونٹ مانگا تھا اور میں نے تجھے پانی پلایا تھا، جنتی کہے گا میں نے تجھے پہچان لیا ہے، دو زنی کہیں گی تو اپنے رب کے پاس جا کر میرے اس سلوک کے حوالے سے میری شفاعت کر، وہ اللہ تعالیٰ سے یہ حال بیان کرنے کی اجازت مانگے گا اور عرض کرے گا کہ میں دو دنخ والوں پر جھانک رہا تھا، اچانک ایک دو زنی نے مجھے آواز دی، اور کہنے لگا کیا تو مجھے پہچانتا ہے، میں نے کہا نہیں، میں نہیں جانتا تو کون ہے؟ اس نے کہا میں وہی ہوں جس سے تونے پینے کے لئے پانی طلب کیا تھا اور میں نے تجھے پانی پلایا تھا، اسلئے تو اپنے رب سے میرے لئے سفارش کرو، یا اللہ! تو اس شخص کے متعلق میری سفارش قبول فرما، چنانچہ اللہ تعالیٰ اس کی سفارش قبول فرمائے گا اور اسے دو دنخ سے نکالنے کا حکم دے گا (ابو منصور و مسلم) حضرت انسؓ کی ایک روایت میں ہے کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب لوگ قبروں سے اٹھیں گے تو میں ان میں سب سے پہلے انھوں گا، اور جب وہ میرے پاس آئیں گے تو میں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ان کی طرف سے بولنے والا ہوں گا، اور جب وہ مایوس ہو جائیں گے تو میں ان کو بشارت دینے والا ہوں گا، محمد کا پرچم اس دن میرے ہاتھوں میں ہوگا، اور میں اولادِ آدم میں اپنے رب کے نزدیک سب سے زیادہ مکرم رہوں گا اور اسمیں کوئی فخر نہیں ہے (ترمذی) ایک موقع پر سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میں اپنے رب کریم کے سامنے کھڑا ہوں گا، اور میرے بدن پر جنت کے لباسوں میں سے ایک لباس ہوگا، پھر میں عرش کے دائیں جانب ایسی جگہ کھڑا ہوں گا جہاں مخلوق میں سے کوئی میرے سوا کھڑا نہیں ہوگا (ترمذی، ابو ہریرہ) حضرت عبداللہ ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ اصحاب آپ کے انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے، اتنے میں آپ باہر شریف لائے، جب ان لوگوں سے قریب

ہوئے تو انہیں بحث کرتے ہوئے سنا، آپ نے ان کی بات چیت سنی کوئی کہہ رہا تھا تعجب ہے اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق میں سے کسی کو غلیل بنایا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بنایا، دوسرے نے کہا یہ بات حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کلام سے زیادہ تعجب انگیز نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے آپ سے کلام فرمایا، ایک شخص نے کہا اور موسیٰ علیہ السلام اللہ کے کلمہ اور اس کی روح ہیں۔ کسی نے کہا حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ نے برگزیدہ بنایا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان لوگوں کے پاس تشریف لائے اور انہیں سلام کیا، اور ارشاد فرمایا کہ میں نے لوگوں کی گفتگو سنی ہے اور اس امر پر تعجب کرتے ہوئے سنا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ کے غلیل ہیں، واقعی وہ ایسے ہی ہیں، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ سے کلام کرنے والے ہیں اور وہ ایسے ہی ہیں، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام روح اللہ اور کلمہ اللہ ہیں اور وہ ایسے ہی ہیں، اور حضرت آدم علیہ السلام اللہ کے برگزیدہ بندے ہیں، اور وہ واقعہً ایسے ہی ہیں، آگاہ رہو میں حبیب خدا ہوں، اور کچھ فخر نہیں، اور قیامت کے دن حمد کا پرچم اٹھائوں گا اور کوئی فخر نہیں، اور میں قیامت کے روز سب سے پہلے شفاعت کروں گا، اور میری شفاعت سب سے پہلے قبول کی جائے گی، اور کوئی فخر نہیں، اور میں سب سے پہلے جنت کے دروازے کی زنجیر ہلاؤں گا اور اس میں فخر نہیں، اللہ تعالیٰ میرے لئے جنت کے دروازے کھول دے گا اور میں اس میں داخل ہو جاؤں گا اور میرے ساتھ مومنین کے قراء ہوں گے اور اس میں فخر نہیں، اور میں اولین و آخرین میں سب سے برگزیدہ ہوں، اور کوئی فخر نہیں (ترمذی)

حوض کوثر : حوض ایک گراں قدر علیہ ہے جو اللہ رب العزت نے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص فرمایا ہے، روایات میں اس کا ذکر موجود ہے، ہم امید کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں دنیا میں اس کا علم اور آخرت میں اس کا ذائقہ عطا فرمائے گا، اس کا ایک اہم وصف یہ ہے کہ جو شخص اس حوض کا پانی پی لے گا وہ کبھی بیمار نہ ہوگا، حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہلکی نیند لی، پھر سگراتے ہوئے اپنا سر مبارک اٹھایا صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! آپ کیوں سگراتے ہیں؟ فرمایا ایک آیت مجھ پر ابھی نازل ہوئی ہے، اس کے بعد آپ نے سورۃ الکوثر تلاوت کی پھر دریافت کیا تم جانتے ہو کوثر کیا چیز ہے؟ لوگوں نے عرض کیا اللہ و رسول زیادہ جاننے والے ہیں، فرمایا یہ ایک نہر ہے جس کا میرے رب نے مجھ سے جنت میں وعدہ کیا ہے، اس پر بڑی برکت ہیں، یہاں ایک حوض ہے جس پر میری امت قیامت کے دن آئے گی، اس کے برتن اتنے ہیں جتنے آسمان میں ستارے (مسلم) حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب میں جنت کی سیر کر رہا تھا تو مجھے ایک ایسی نہر نظر آئی جس کے دونوں جانب خالی موتیوں کے قتبے بنے ہوئے تھے، میں نے پوچھا اے جبرئیل! یہ کیا ہے؟ انھوں نے کہا یہ کوثر ہے جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطا فرمائی ہے، پھر فرشتے نے اس پر اپنا ہاتھ مارا تو دیکھا کہ اس کی مٹی مشک از غر ہے (ترمذی) حضرت انسؓ کی ایک اور روایت میں ہے کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ میری حوض کے دونوں طرف کی تھریلی زمین کے درمیان اس قدر فاصلہ ہے جس قدر مدینہ اور مضاف کے درمیان ہے، یا مدینہ اور عمان کے درمیان ہے (مسلم) حضرت عبداللہ ابن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ جب سورۃ کوثر نازل ہوئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ یہ جنت میں ایک نہر ہے، اسکے دونوں کنارے سونے کے ہیں، اور اس کا پانی دودھ سے زیادہ سفید، اور شہد سے زیادہ میٹھا، اور مشک سے زیادہ خوشبودار ہے، یہ پانی موتیوں اور موتیوں پر بہتا ہے، (ترمذی باختلاف اللفظ) سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام حضرت ثوبانؓ روایت کرتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میرا حوض عدن سے ہلقاء کے عمان تک (وسیع) ہے اس کا پانی دودھ سے زیادہ سفید، اور شہد سے زیادہ شیریں، اور اسکے برتن ستاروں کی تعداد کے برابر ہیں، جو اسمیں سے ایک گھونٹ پی لیتا ہے، وہ اسکے بعد کبھی بیمار نہ ہوگا، اس پر سب سے پہلے کھینچنے والے قراء مجاہدین ہوں گے، حضرت عمر ابن الخطابؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ! وہ کون ہوں گے؟ فرمایا وہ لوگ ہیں جن کے بال پر آئندہ اور کپڑے میلے ہوتے ہیں، اور جو راحت پسند عورتوں سے نکاح نہیں کرتے، اور نہ انکے لئے مخلوق کے دروازے داہوتے ہیں (ترمذی، ابن ماجہ)

یہ حدیث سننے کے بعد حضرت عمر ابن عبدالعزیزؓ نے ارشاد فرمایا کہ میں نے ناز و نعم والی عورت یعنی فاطمہ بنت عبد الملک سے نکاح کیا ہے اور میرے لئے عطلوں کے دواوے بھی کھولے گئے ہیں (اس لئے مجھے جنت میں داخل ہونے کی امید نہیں) الا یہ کہ اللہ تعالیٰ مجھ پر رحم فرمائے اب آئندہ میں کبھی اپنے سر میں تل نہ لگاؤں گا تاکہ ہال چاکندہ ہو جائیں اور اپنے بدن کے کپڑے نہ دھوؤں گا یہاں تک کہ وہ میلے ہو جائیں۔

حضرت ابوذرؓ روایت کرتے ہیں کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! حوض کے برتن کیسے ہیں؟ فرمایا اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے اس کے برتن تاریک اور صاف (ہاں اور گرد و غبار سے) رات کے آسمان پر ظہور ہونے والے ستاروں سے زیادہ ہیں جو شخص اس میں سے پئے گا وہ کبھی پیاسا نہ ہوگا اس میں دو آبشار جنت سے گرتے ہیں اسکی چوڑائی عمان اور ایلام کی درمیانی مسافت کے برابر ہے اسکا پانی دودھ سے زیادہ سفید اور شہد سے زیادہ شیریں ہے (مسلم) حضرت سرور بیان کرتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ہر نبی کے لئے ایک حوض ہے تمام انبیاء ایک دوسرے پر اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ کس کے حوض پر کتنے زیادہ آدمی آئے ہیں مجھے امید ہے کہ میرے حوض پر سب سے زیادہ آدمی آئیں گے (ترمذی)۔

یہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی امید اور آرزو ہے اسلئے ہر شخص کو یہی کوشش کرنی چاہئے کہ وہ بھی حوض پر وارد ہونے والوں میں سے ہو اور فریب آرزو سے احتراز کرے اسلئے کہ کھیتی کاٹنے کی امید وہی کرتا ہے جو بیج بوتا ہے زمین صاف کرتا ہے اور اسے پانی دیتا ہے پھر اللہ تعالیٰ کے فضل پر اعتماد کر کے بیٹھا ہے کہ وہ اسکی کھیتی کاٹے گا اور آسمانی بجلی وغیرہ کی آفات سے محفوظ رکھے گا یہاں تک کہ کھیتی پک جائے اور اسکے کاٹنے کا زمانہ آجائے جو شخص کھیتی نہیں کرتا زمین نہیں جوتتا اسے صاف نہیں کرتا پانی نہیں دیتا اور اللہ کے فضل سے یہ اس لگائے بیجہ جاتا ہے کہ اسکے لئے غلے اور میوے پیدا ہوں گے وہ جٹلائے فریب اور بے وقوف ہے امید رکھنے والوں میں سے نہیں ہے عام طور پر لوگ اسی طرح کی رجا رکھتے ہیں یہ امتحان کا مبالغہ ہے ہم اس غرور و غفلت سے اللہ کی پناہ چاہتے ہیں تاکہ اللہ تعالیٰ کے باب میں فریب کا شکار نہ ہوں دنیا سے فریب کھانے سے زیادہ سنگین کوئی عمل نہیں ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے

فَلَا تَغُرَّكُمْ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا وَلَا يَغُرَّكُمْ بِاللَّهِ الْغُرُورُ (پ ۲۲ ر ۳۳ آیت ۵)

سو ایسا نہ ہو کہ یہ دنیوی زندگی تم کو دھوکے میں ڈالے رکھے اور ایسا نہ ہو کہ تم کو دھوکہ باز شیطان اللہ سے دھوکے میں ڈال دے۔

جنم اور اس کے دہشتناک عذاب : اے فس سے فاضل اور دنیا کے فریب میں جلا تو اس دنیا میں منہمک ہے جو موت جلد فنا ہونے والی ہے تو اس چیز میں فکر کرنا بھروسہ جس سے تو رخصت ہونے والا ہے اور اس چیز کی فکر کر جس کے پاس تجھے پہنچتا ہے تجھے خبر دی گئی ہے کہ دوزخ تمام لوگوں کے وارد ہو سکتی جگہ ہے۔

وَإِنْ مِنْكُمْ إِلَّا وَارِدُهَا كَانَ عَلَى رَبِّكَ حَتْمًا مَقْضِيًّا ثُمَّ تُنْجِي الَّذِينَ اتَّقَوْا وَنَذَرُ الظَّالِمِينَ فِيهَا جِثِيمًا (پ ۸۷ آیت ۷۷-۷۸)

اور تم میں سے کوئی بھی نہیں جس کا اس پر سے گزرنہ ہو یہ آپ کے رب کے اہبار سے لازم ہے جو پورا ہو کر رہے گا پھر ہم ان لوگوں کو نجات دے دیں گے جو خدا سے ڈرتے تھے اور ظالموں کو اس میں ایسی حالت میں رہنے دیں گے کہ (مارے رنج و غم کے) گھٹنوں کے بل گر پڑیں گے۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ جنم پر تیرا دودھ پینی ہے لیکن نجات ملکوک ہے اسلئے اپنے دل میں اس جگہ کی دہشت کا تصور کر شاید اس طرح تو عذابِ جنم سے نجات پانے کی تیاری کر سکے اور مخلوق کے حال میں فکر کر کہ ابھی وہ قیامت کی مصیبتوں اور حساب کتاب کی سختیوں سے نکلنے بھی نہ پائے ہوں گے اور کسی شفاعت کرنے والے کی شفاعت کے منتظر ہوں گے

کہ ان بے چاروں کو کمری تاریکیاں گھیر لیں گی، اور شعلہ خیز آگ ان پر سایہ نکلن ہو جائے گی وہ دونوں کے چیخنے اور چٹکانے کی آوازیں سنیں گے، ان آوازوں سے معلوم ہو گا کہ دونوں نہایت غیظ و غضب کے عالم میں ہے، اس وقت مجرمین کو اپنی ہلاکت کا یقین ہو جائے گا، اور قومیں گھٹنوں کے بل زمین پر جائیں گی، اور ان میں سے وہ لوگ بھی اپنی برے انجام کے خوف سے لرزے لگیں گے جنہیں برأت کا پروانہ مل چکا ہوگا، دونوں کے فرشتوں میں سے ایک نکلنے والا یہ اعلان کرے گا کہ کہاں ہے فلاں ابن فلاں جس کا نفس دنیا کے طول اہل میں مشغول تھا، اور اسکے باعث نیک اعمال میں ٹل مٹل کیا کرتا تھا، اور اپنی عمر عزیز کو برے اعمال میں ضائع کرتا تھا، اس اعلان کے بعد دونوں کے فرشتے لوہے کے گرز لے کر اسکی طرف بڑھیں گے، اور اسے بری طرح ڈانٹیں گے، اور اسے عذاب شدید کی طرف ہٹا کر لے جائیں گے، اور قعر جنم میں ڈال دیں گے، اور اس سے کہیں گے کہ اس کا مزہ چکھ کہ تو (اپنی دانست میں) عزت اور بزرگی والا ہے، فرشتے اسے ایک ایسے کمر میں پھونڈیں گے جس کے گوشے تنگ راستے تاریک، اور فصائیں منکھ ہیں، قیدی اس کمر میں ہمیشہ رہتا ہے، اس میں آگ بھڑکانی جاتی ہے، اور قیدیوں کو پینے کے لئے کھولتا ہوا پانی دیا جاتا ہے، فرشتے اسے گرز سے ماریں گے، اور آگ انہیں سیٹھنے کی، وہاں یہ مجرم اپنی ہلاکت کی آرزو کریں گے، اور انہیں رہائی نصیب نہیں ہوگی، انکے پاؤں پیشانی کے بالوں سے بندھے ہوئے ہوں گے، اور گناہوں کی تاریکی سے چہرے سیاہ ہوں گے، وہ چیخ چیخ کر کہیں گے اے مالک! تیرا وعدہ عذاب ہم پر پورا ہو چکا ہے، اے مالک! لوہے نے ہمیں بو جھل کر دیا ہے، اے مالک! آگ سے ہماری کھالیں پک گئی ہیں، اے مالک! ہمیں یہاں سے نکال دے، اب ہم گناہ نہ کریں گے، فرشتے جواب دیں گے کہ امن کا دور رخصت ہو چکا ہے، اور اب تم اس ذلت کے گھر سے نکل نہیں سکو گے، اب اس میں ذلت کے ساتھ پڑے رہو، اور زبان نہ چلاؤ، اگر تمہیں یہاں سے رخصت دیدی گئی، اور دوبارہ دنیا میں بھیج دیا گیا تو وہی عمل لے کر واپس آؤ گے جو تم پہلے لے کر آئے تھے، فرشتوں کا یہ جواب سن کر مجرمین مایوس ہو جائیں گے، اور ان اعمال پر افسوس کریں گے جو خدا تعالیٰ کی نافرمانی اور سرکشی کے بطور کئے ہوں گے، لیکن ندامت سے انہیں کوئی فائدہ نہ ہوگا، اور نہ افسوس کام آئے گا بلکہ وہ منہ کے بل، پاپہ زنجیر گرہنیں گے، انکے اوپر بھی آگ ہوگی اور نیچے بھی، دائیں بھی شعلے بھڑک رہے ہوں گے، اور بائیں بھی، وہ سر سے پاؤں تک آگ میں غرق ہوں گے، ان کا کھانا آگ ہوگا، ان کا پانی آگ ہوگا، انکا لباس، اور بستر سب کچھ آگ سے بھرا ہوا ہوگا، وہ آگ کے کپڑوں اور گندھک کے لباس میں ہوں گے، اوپر سے گرز کی ضرب ہوگی، اور پیروں کا بوجھ ہوگا، یہ دونوں اس تاریک مکان کے تنگ راستوں سے چیخے چلائے گزریں گے، اور اسکی دیواروں سے سر ٹکراتے پھریں گے، اور اس کے اطراف میں بے چین گھومیں گے، آگ انہیں اس طرح ابالے گی جیسے ہاضی کو جوش دیتی ہے، وہ ہلاکت اور تباہی کو آواز دیں گے، اور جب بھی انکی زبان سے ہلاکت کا لفظ نکلے گا، ان کے سروں کے اوپر سے کھولتا ہوا پانی ڈالا جائے گا، اس سے ان کی آنتیں اور کھالیں جل جائیں گی، لوہے کے گرز سے انکی پیشانیوں پر ضرب لگائی جائے گی، اور ان کا چہرہ چور چور ہو جائے گا، منہ سے پیپ بہنے لگے گی، پیاس کی وجہ سے ان کے جگر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے، اور ان آنکھوں کے ڈھیلے نکل کر رخساروں پر بہنے لگیں گے، اور چہرے کا گوشت گل کر گر پڑے گا، بال جھڑ جائیں گے، کھال لٹک جائے گی، اور جب ان کی کھالیں گل جائیں گی تو انہیں دوسری کھالیں دیدی جائیں گی، گوشت سے محروم ہو جائیں گی، اور انکی روحیں رگوں اور پٹھوں سے نکل کر رہ جائیں گی، اور آگ کے شعلوں میں داغلا کریں گی، وہ لوگ اس عذاب الیم کی تاب نہ لا کر موت کی تمنا کریں گے، لیکن انہیں موت نہیں آئے گی۔

جب تو انہیں دیکھے گا تو تیرا کیا حال ہوگا، تو دیکھے گا کہ ان کے چہرے کو تنوں سے زیادہ سیاہ ہیں، آنکھیں بیٹائی سے محروم ہیں، زبانوں کو گویائی کی قوت حاصل نہیں رہی، کمریں شکستہ ہیں، ہڈیاں ٹوٹی ہوئی ہیں، کان کٹے ہوئے ہیں، کھالیں پھٹی ہوئی ہیں، ہاتھ گردنوں سے بندھے ہوئے ہیں، پاؤں سر کے بالوں کے ساتھ جکڑے ہوئے ہیں، وہ لوگ آگ کے اوپر اپنے چہروں کے بل چل رہے ہیں، اور لوہے کے بنے ہوئے کانٹوں کو اپنی آنکھوں کی چلیوں سے دوندتے ہیں، آگ ان کے تمام ظاہر و باطن میں سراسیمہ

کہ جگہ ہیں، دوزخ کے سانپ اور پتھو ظاہری اعضاء سے چٹے ہوئے ہیں، مضر ویکہ کرتیر کیا حال ہوگا۔

دوزخیوں کے یہ احتمالی حالات ہیں، اگر تفصیل میں جاؤ تو دو گٹھے کھڑے ہو جائیں گے، اور دل دھڑکتا بھول جائے، آؤ ذرا تفصیلی حالات دیکھیں، پہلے دوزخ کے جنگلوں اور گھاٹیوں پر نظر ڈالیں، سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ جہنم میں ستر ہزار جنگل ہیں، اور ہر جنگل میں ستر ہزار گھاناں ہیں، اور ہر گھاناں میں ستر ہزار سانپ اور ستر ہزار پتھو ہیں، کافر اور منافق جب تک ان تمام چیزوں سے نہیں گزرتا اس کا انجام پورا نہیں ہوتا۔ (۱) حضرت علیؓ روایت کرتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا چاہ حزن یا وادی حزن سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگو، لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وادی حزن یا چاہ حزن کیا چیز ہے؟ فرمایا جہنم میں ایک وادی ہے جس سے خود جہنم ہر روز سات مرتبہ پناہ مانگتی ہے، اللہ تعالیٰ نے اسے ریا کار قاریوں کے لئے تیار کر رکھا ہے (ترمذی، ابن ماجہ، ابو ہریرہؓ) یہ جہنم کی وسعت اور اسکی وادیوں کی کثرت کا حال ہے، اس کے جنگل دنیا کے جنگلوں اور اہل دنیا کے شہوات کے ہتھوڑ ہیں، اور اسکے دوازے انسان کے ان سات اعضاء کے ہتھوڑ ہیں جن سے وہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتا ہے، یہ دوازے ایک دوسرے پر واقع ہیں، ان میں سب سے اوپر جہنم ہے، پھر ستر ہے، پھر لٹی ہے، اسکے بعد جملہ ہے، پھر سیر ہے، پھر جہنم ہے، پھر وادی ہے، باد کے علق اور گرائی کا کیا گھانا، جہنم کا یہ طبقہ اتنا گہرا ہے کہ اسکی کوئی حد نہیں ملتی، جیسے دنیاوی شہوات کی کوئی حد نظر نہیں آتی، جس طرح دنیا کی خواہش کے پھلو سے دوسری خواہش اور ایک ضرورت کے پھل سے دوسری ضرورت جنم لیتی ہے، اسی طرح جہنم کا ایک باویہ (گڑھا) پورا نہیں ہوتا کہ دوسرا گڑھا سامنے آجاتا ہے جو پہلے گڑھے سے زیادہ گہرا ہوتا ہے، حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ ہم ہر کارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ تھے، اچانک دھماکہ کی آواز سنائی دی، سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے دریافت فرمایا کیا تم جانتے ہو یہ دھماکہ کیا تھا، ہم نے عرض کیا اللہ و رسول زیادہ جانتے ہیں، فرمایا یہ ایک پتھر ہے جو ستر برس پہلے جہنم کی گرائی میں پھینکا گیا تھا اب پہنچا ہے (مسلم)۔

آخرت کے درجات مختلف اور متفاوت ہیں، اس لحاظ سے جہنم کے درجات اور طبقات بھی یکساں نہیں ہیں، بعض بعض سے بڑے ہیں، اور بعض بعض سے چھوٹے ہیں، دنیا میں بھی لوگوں کا انصاف یکساں نہیں ہوتا، بعض لوگ اس قدر متمک ہوتے ہیں گویا اس میں سر سے پاؤں تک ڈوب گئے ہوں بعض اس میں غوطہ لگاتے ہیں مگر ایک حصہ حد تک اسی اعتبار سے ان پر آگ کا عذاب بھی مختلف ہوگا اسلئے کہ اللہ تعالیٰ کسی پر ذہ برابر بھی ظلم نہیں کرتا، اس لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ دوزخ میں جانے والے ہر شخص کو عذاب کے تمام مراحل سے گزرنا ہوگا، بلکہ ہر شخص کو عذاب کی اس کے گناہوں اور خطاؤں کے ہتھوڑ متعین حد ہوگی، یہاں تک بعض لوگوں کو موت معمولی عذاب ہوگا، لیکن یہ معمولی عذاب بھی ایسا ہوگا کہ اگر اسکے پاس تمام دنیا کا مال و محتاج ہو تو وہ اس عذاب سے بچنے کے لئے تمام مال و محتاج فدیہ دے دے۔ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ قیامت کے دن اہل دوزخ میں کم درجے کا عذاب یہ ہوگا کہ (محرم) کو آگ کے جوتے پہنا دئے جائیں گے، اور ان جوتوں کی حرارت سے اسکا دماغ کھولے گا (بخاری و مسلم، نعمان ابن حشیر) اس پر قیاس کر لو کہ جس شخص پر عذاب اپنی تمام تر شدتوں کے ساتھ نازل ہوگا اس کی اذیت کا کیا عالم ہوگا، اگر ہمیں آگ کی تکلیف میں شبہ ہو تو اپنی انگلی آگ سے قریب کر کے دیکھ لو، اور اس پر دوزخ کی آگ کو قیاس کر لو، اسکے باوجود ہمارا قیاس غلط ہوگا اس لئے کہ دنیا کی آگ کو جہنم کی آگ سے کوئی نسبت ہی نہیں ہے، لیکن کیونکہ دنیا میں بھی سخت ترین عذاب آگ کا عذاب ہے، اسلئے جہنم کے عذاب کا ذکر یہاں کی آگ کے حوالے سے کر دیا جاتا ہے، ورنہ یہاں کی آگ میں اتنی شدت کہاں، بالفرض کے لوگوں کو دنیا کی آگ کا عذاب دیا جائے تو وہ خوشی سے قبول کر لیں، حدیث میں بیان فرمایا گیا ہے کہ دنیا کی آگ نے رحمت کے ستر چہٹیوں کے پانی سے غسل کیا تب جا کر وہ اہل دنیا کی برداشت کے قابل ہوئی (ابن

عبدالبرہ ابن عباسؓ) بلکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جہنم کا وصف و صاحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا

کہ دوزخ کی آگ ایک ہزار برس تک دھکائی جائے یہاں تک کہ وہ سرخ ہوگئی پھر حکم ہوا کہ ایک ہزار برس تک جلائی جائے یہاں تک کہ وہ سفید ہوگئی پھر ایک ہزار برس تک بھڑکانے کا حکم ہوا یہاں تک کہ وہ سیاہ ہوگئی اب وہ سیاہ اور تاریک آگ ہے۔ (۱) ایک حدیث میں ہے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ آگ نے اپنے رب سے شکایت کی کہ اے پروردگار میرے بعض نے بعض کو کھالیا ہے اللہ تعالیٰ نے دو سانس لینے کی اجازت مرحمت فرمائی ایک سانس سردی میں اور ایک گرمی میں تم گرمی کی جو شدت محسوس کرتے ہو وہ اسی کی حرارت کی تاثیر ہے اور جو شدت سردی میں محسوس کرتے ہو وہ اسی کے سانس کے اثر سے ہے (بخاری و مسلم ابو ہریرہ)

حضرت انس ابن مالک فرماتے ہیں کہ قیامت کے دن ان کافروں کو لایا جائے گا جو سب سے زیادہ ناز و نعم کے پروردگار ہوں گے اور حکم ہوگا کہ انھیں دوزخ کی آگ میں غوطہ دیدیا جائے چنانچہ انھیں غوطہ دیا جائے گا اور دریافت کیا جائے گا کہ کیا تم نے کبھی عیش کی زندگی گزاری تھی کیا کبھی راحت پائی تھی وہ کہیں گے نہیں پھر ان مومنوں کو لایا جائے گا جنہوں نے دنیا کی زندگی میں سب سے زیادہ مصائب جمیلیں ہوں گے اور حکم ہوگا کہ انھیں جنت میں غوطہ دو چنانچہ انھیں غوطہ دیا جائے گا پھر ان سے دریافت کیا جائے گا کہ کیا انھوں نے کوئی تکلیف برداشت کی تھی وہ عرض کریں گے نہیں حضرت ابو ہریرہ فرماتے ہیں کہ اگر مسجد میں ایک لاکھ یا اس سے زائد آدمی ہوں اور کوئی دوزخی وہاں آکر ایک سانس لے لے تو تمام لوگ ہلاک ہو جائیں۔ قرآن کریم میں ہے -

تَلْفَحُ وَجُوهَهُمُ النَّارُ (پ ۶۸ آیت ۴۳)

آگ انکے چروں کو جھلس دے گی۔

بعض مفسرین نے اس آیت میں لکھا ہے کہ آگ کی لپٹیں انھیں اس طرح جھلسائیں گی کہ کسی ہڈی پر گوشت باقی نہ رہے گا بلکہ تمام گوشت اڑیوں پر گر جائے گا اس تکلیف کے بعد تم پیپ میں غور کرو جو ان کے جسموں سے نکلے گی یہاں تک کہ وہ اس میں غرق ہو جائیں گے اس کو خساق کہتے ہیں حضرت ابوسعید الخدری روایت کرتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اگر خساق کا ایک ڈول دنیا پر اڑیل دیا جائے تو تمام اہل دنیا بدبودار ہو جائیں (ترمذی) اہل جہنم کو خساق ہی پینے کے لئے دیا جائے گا جب وہ پیاس سے فریاد کریں گے اللہ تعالیٰ نے اہل جہنم کے کھانے اور پینے کی چیزوں کے متعلق ارشاد فرمایا ہے -

وَيُسْقَىٰ مِنْ مَّاءٍ حَلِيلٍ يُتَجَرَّرُ عَنْهُ وَلَا يَكَادُ يَسْبِغُهُ وَيَأْتِيهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَمَا هُوَ بِمَيِّتٍ (پ ۱۵ آیت ۲۱-۱۷)

اور اس کو ایسا پانی پینے کو دیا جائے گا جو کہ پیپ (لوہ کے مشابہ) ہوگا جس کو گھونٹ گھونٹ کر سچے گا اور (گلے سے) آسانی کے ساتھ اتارنے کی کوئی صورت نہ ہوگی اور ہر طرف سے اس پر موت کی آمد ہوگی اور وہ کسی طرح سے مرے گا نہیں۔

وَلَنْ يَسْتَفِيشُوا يِعَاثُوا بِمَاءٍ كَالْمُهْلِ يَشْوِي الْوُجُوهَ بِئْسَ الشَّرَابُ وَسَاءَتْ مُرْتَفَعًا (پ ۱۵ آیت ۲۹)

اور اگر (پیاس سے) فریاد کریں گے تو ایسے پانی سے اگلی فریاد ہی کیا جائے گی جو تیل کی تھمٹ کی طرح ہوگا اور (دوزخ بھی) کیا ہی بری جگہ ہوگی۔

ثُمَّ إِنَّكُمْ أَنْتَآ الضَّالُّونَ الْمُكَذِّبُونَ لَا تَكْلُونُ مِنْ شَجَرٍ مِنْ زُقُومٍ فَمَالِئُونَ مِنْهَا الْبُطُونَ فَشَارِبُونَ عَلَيْهِمِ الْحَمِيمُ فَشَارِبُونَ شَرْبَ الْهَيْمِ (پ ۱۵ آیت ۵۱-۵۵)

پھر تم کو اے گمراہو جھٹلانے والو درختِ زقوم سے کھانا ہوگا پھر اس سے پیپ بھرنا ہوگا پھر اس پر کھو

ہو پانی پینا ہوگا، پھر پانی پیا سے اونٹوں کا سا۔
 اِنَّهَا شَجَرَةٌ تَخْرُجُ فِيْ اَصْلِ الْحَجِيْمِ طَلْعُهَا كَانَمُرُّوْ سِ الشَّيَاطِيْنِ فَاِنَّهُمْ لَا يَكْلُوْنَ
 مِنْهَا فَمَا لَوْ مِنْهَا الْبُطُوْنُ ثُمَّ اِنْ لَهُمْ عَلَيْهَا شَوْبًا مِّنْ حَمِيْمٍ ثُمَّ اِنْ مَرَجَعَهُمْ لَا كَسَى
 الْحَجِيْمِ (پ ۶۲۳ آیت ۶۲ تا ۶۸)

وہ ایک درخت ہے جو قمر دوزخ میں سے نکلا ہے، اس کے پھل ایسے ہیں جیسے سانپ کے چمن تو وہ
 لوگ اس سے کھا دیں گے، اور اسی سے پیٹ بھریں گے پھر ان کو کھولتا ہو پانی (پیسپ میں) ملا کر دیا جائے گا، پھر
 اخیر ٹھکانہ ان کا دوزخ ہی کی طرف ہوگا۔

نُصَلِّيْ نَارًا اَحَامِيَّةً تُسْقٰى مِنْ عَيْنٍ اٰيِيَّةٍ (پ ۳۰ آیت ۴-۵)
 آتش سوزاں میں داخل ہوں گے، اور کھولتے ہوئے چشمے سے پانی پلائے جائیں گے۔
 اِنْ لِّدِيْنَا اَتْكَا لَا وَحَجِيْمًا وَّ طَعَامًا اِنَّا غَضَبْنَا عَذَابًا اَلِيْمًا

(ہمارے یہاں بیڑیاں ہیں اور دوزخ ہے، اور گلے میں پھنس جانے والا کھانا ہے اور دردناک عذاب ہے۔)

حضرت عبداللہ ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر زقوم کا ایک قطرہ
 دنیا کے سمندروں پر گر پڑے تو دنیا والوں پر انکی زندگی تنگ ہو جائے (ترقی) غور کرو ان لوگوں کا کیا حال ہو گا جن کی غذا ہی زقوم
 ہو، حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ان چیزوں میں رغبت کرو جن کی اللہ نے
 تمہیں رغبت دی ہے، اور ان چیزوں سے دُور جن سے اس نے ڈرایا ہے، یعنی انکے عذاب و عقاب سے اور جنم سے، اگر جنت کا
 ایک قطرہ تمہاری اس دنیا میں تمہارے پاس ہو جس میں تم رہتے ہو تو تمہاری دنیا کو خوشگوار کر دے، اور اگر ایک قطرہ دوزخ کا اس
 دنیا میں تمہارے پاس ہو جس میں تم رہتے ہو تمہارے لئے اس کو برا کر دے۔ (۱) حضرت ابوالدرداءؓ کی ایک روایت میں ہے
 کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اہل جنم پر بھوک ڈالی جائے گی تاکہ انکا عذاب ٹھیک ٹھیک ہو، چنانچہ وہ لوگ
 کھانے کی فریاد کریں گے (اس کے جواب میں) انھیں کانٹوں کی غذا دی جائے گی جس میں نہ مٹا کر کے کی صلاحیت ہوگی اور نہ وہ
 بھوک مٹا سکے گی، وہ (پھر) کھانے کی فریاد کریں گے، اس بار انھیں ایسا کھانا ملے جو گلے میں اٹک جائے گا، وہ یاد کریں گے کہ دنیا میں
 پانی کے ذریعے کھانا خلق سے اتار لیا جاتا تھا، چنانچہ وہ لوگ پانی مانگیں گے (انکے جواب میں) لوہے کے آنکڑوں سے پانی اٹھا کر انکی
 طرف بھجایا جائے گا جب وہ آنکڑے انکے چہروں سے قریب ہوں گے تو ان کے چہرے جل جائیں گے، اور جب یہ پانی انکے پیٹوں
 میں جائے گا تو انکے پیٹ کے اندر کی چیزیں کاٹ ڈالے گا، وہ لوگ کہیں گے عافقیں جنم کو بلاؤ، چنانچہ عافقیں جنم کو بلایا جائے گا،
 اور اہل جنم ان سے کہیں گے کہ اپنے رب سے دعا کرو کہ وہ ایک دن کے لئے ہم سے عذاب ہٹا کر دے، عافقیں کہیں گے کیا
 تمہارے پاس تمہارے پیغمبر معجزے لے کر نہیں آئے تھے، وہ کہیں گے لائے تھے، عافقیں کہیں گے تب پکارا کرو، کافروں کا پکارنا
 محض گمراہی ہے، پھر وہ لوگ مالک کو آواز دیں گے، اور اس سے کہیں گے کہ تیرا رب ہم پر جو حکم کرنا چاہے کہے، مالک جواب میں
 کہے گا کہ تم لوگ اس حال میں ہمیشہ بیٹھ رہو گے، (امش کہتے ہیں کہ مجھے خبر دی گئی ہے کہ اہل جنم کے مالک کو پکارنے میں، اور
 مالک کے جواب میں ایک ہزار سال کا فاصلہ ہوگا) پھر کہیں گے اپنے رب کو پکارو، تمہارے رب سے بہتر کوئی نہیں ہے، وہ اپنے
 رب سے کہیں گے اے اللہ! ہم پر ہماری بد بختی غالب ہو گئی ہے، اور ہم گمراہ قوم تھے، اے ہمارے رب ہمیں اس جنم سے نکال،
 اب اگر دوبارہ گناہ کریں گے تو بلاشبہ ہم ظالم ہوں گے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے انھیں جواب دیا جائیگا کہ دوزخ ہی میں ذلت کے
 ساتھ پڑے رہو اور مجھ سے کلام نہ کرو، اس وقت وہ ہر خبر سے مایوس ہو جائیں گے، اور اس وقت حسرت کے ساتھ چیخا چلاتا شروع
 کر دیں گے (ترقی)۔

حضرت ابو امامہؓ روایت کرتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کریم کی آیت (وَيُسْقَىٰ مِنْ مَّاءٍ حَلِيٍّ يَنْجَرُ عَمُّوْ لَا يَكَادُ يُسِيغُهُ) کی وضاحت میں ارشاد فرمایا کہ یہ پانی اس کے قریب کیا جائے گا، اور اس کے سر کی کھال گر پڑے گی، اور جب اسے پے گا تو اس کی آنتیں کاٹ ڈالے گا اور کئی ہوئی آنتیں پاخانے کے راستے سے باہر نکل جائیں گی (ترمذی) اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

وَسُقُوا مَاءً حَمِيْمًا فَقَطَّعَ اَمْعَاءَهُمْ (پ ۶۲۲۹ آیت ۱۵)

اور کھول ہو پانی اس کے پیٹ کو دیا جائے گا، سو وہ انکی آنتوں کو کھڑے کھڑے کر دے گا۔

وَإِنْ يَنْتَغِيْبُوا يَغَاثُوا بِمَاءٍ كَالْمُهْلِ يَشْوِي الْوُجُوْهَ (پ ۱۲۱۵ آیت ۲۹)

اور اگر فریاد کریں گے تو ایسے پانی سے انکی فریاد رسی کی جائے گی جو تیل کی تھک کی طرح ہوگا، مونہوں

کو بھون ڈالے گا۔

جنہیں کو جب بھوک اور پیاس پریشان کرے گی تو انہیں یہ کھانا اور پانی دیا جائے گا جو اوپر مذکور ہوا اب تم غور کرو کہ جہنم میں نہایت زہریلے، جسم، کریمہ النظر، اور خوفناک قسم کے سانپ بچھو اور اڑدھا ہوں گے، جو اہل جہنم پر بری طرح مسلط ہوں گے اور ان کے خلاف برا نگیختہ کئے جائیں گے، یہاں تک کہ وہ کبھی اپنے شکار کو ڈسنے اور کاٹنے سے سستی نہ کریں گے، ایک حدیث میں ہے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے مال دیا ہو، اور وہ ذکرِ کوفہ نہ کرے قیامت کے دن وہ مال ایک گنچے سر کے سانپ کی صورت اختیار کرے گا، جس کی دو آنکھیں ہوں گی، قیامت کے دن اسے اس ذکرِ کوفہ دینے والے کے گلے میں ڈال دیا جائے گا، پھر یہ سانپ اسکی دونوں باجھیں پکڑے گا، اور کئے گا میں تیرا مال ہوں، میں تیرا خزانہ ہوں، اس کے بعد آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی (بخاری)۔ ابو ہریرہؓ مسلم۔

وَلَا يَخْسِبَنَّ الَّذِينَ يَنْخَلُوعُونَ بِمَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ هُوَ خَيْرٌ لَّهُمْ بِكُلِّ حَسْرَةٍ لَهُمْ سَيُطَوَّقُونَ مَا يَخْلُقُونَ اِيْمَنُومَ الْقِيَامَةِ (پ ۹۴ آیت ۱۸۰)

اور ہرگز خیال نہ کریں ایسے لوگ جو ایسی چیز میں بخل کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے انکو اپنے فضل سے دی

ہے کہ یہ بات کچھ ان کے لئے اچھی ہوگی، بلکہ یہ بات ان کے لئے بہت ہی بری ہے، وہ لوگ قیامت کی روز

طوق پہنا دئے جائیں گے اس کا جس میں انہوں نے بخل کیا تھا۔

سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ دونوں میں انہوں جیسے سروالے سانپ ہوں گے، ان کے ایک مرتبہ ڈسنے سے چالیس برس تک جسم میں اس کے زہری لہر رہے گی، اور وہاں پالان ڈالے ہوئے مچھر جیسے بچھو ہوں گے جن کے ڈنگ مارنے کی تکلیف چالیس سال تک محسوس کی جائے گی (احمد)۔ عبد اللہ ابن الحارث۔

یہ سانپ اور بچھو اس شخص پر مسلط کئے جائیں گے جس پر دنیا میں بخل، بد خلقی اور ایذا خلق جیسے عیوب مسلط ہوتے ہیں، جو شخص ان عیوب سے بچتا ہے اس کے سامنے سانپ بچھو نہیں آتے۔

اس کے بعد تم دو زنجیروں کے جسموں کی ضخامت اور طوالت میں غور کرو، جس کے باعث ان کا عذاب بھی شدید ہوگا اور وہ اپنے تمام اجزائے بدن میں آگ کی تپش، بچھوؤں کے ڈسنے کی تکلیف، بیک وقت اور مسلسل محسوس کریں گے، حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ دونوں میں کافر کی داڑھ جبل احد کے برابر، اور اس کے جسم کا موٹاپا تین دن رات کی مسافت کے برابر ہوگا (مسلم) ایک روایت میں ہے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ کافر کا نچلا ہونٹ سینے پر لٹک آئے گا اور ہالائی ہونٹ اوپر کواٹھ جائے گا یہاں تک کہ چہرے کو ڈھانپ لے گا (ترمذی)۔ ابو سعید) سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ کافر اپنی زبان قیامت کے دن دونوں میں ٹھیسے گا اور لوگ اسکو اپنے پاؤں سے روندیں گے، اور بہت زیادہ جسامت رکھنے کے باوجود آگ انہیں بار بار جلائے گی، اور ان پر نئی کھال اور نیا گوشت آتا رہے گا (ترمذی)۔ ابن عمر

كَلَّمَا نَضِجَتْ جُلُودُهُمْ بِبَلَلِنَاهُمْ غَيْرَهَا (پ ۵ ر ۵ آیت ۵۶)

اس آیت کی تفسیر میں حضرت حسن بصریؒ ارشاد فرماتے ہیں کہ آگ دوزخیوں کو دن میں ستر مرتبہ کھائے گی، اور جب انھیں کھالے گی تو ان سے کہا جائے گا کہ وہ پھر ایسے ہی ہو جائیں چنانچہ وہ ایسے ہی ہو جائیں گے، اب تم انکی حج و پکار، آہ و بکا، اور ہلاکت کی دہائی دینے پر غور کرو، یہ باتیں اگلے اوپر آگ میں گرنے کے پہلے ہی مرحلے میں مسئلہ کردی جائیں گی، چنانچہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اس دن جہنم کو اس طرح لایا جائے گا کہ اس کی ستر ہزار بائیں ہوں گی، اور ہر باگ پر ستر ہزار فرشتے مقرر ہوں گے (مسلم۔ عبد اللہ ابن مسعودؓ) حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ اہل جہنم پر رونا بھیجا جائے گا وہ روئیں گے یہاں تک کہ آنسو ختم ہو جائیں گے، پھر وہ خون روئیں گے، یہاں تک کہ چروں میں دراڑیں پڑ جائیں گی اگر ان میں کشتیاں چھوڑ دی جائیں تو وہ بہنے لگیں، اور جب تک انھیں روئے، چنچنے، آہ بھرنے، اور تباہی و بربادی کو پکارنے کی اجازت ہوگی تب انھیں کچھ راحت ملتی رہی گی، لیکن (بعد میں) ان چیزوں سے بھی منع کر دیا جائے گا (ابن ماجہ۔ انسؓ) محمد ابن کعب کہتے ہیں کہ دوزخیوں کو پانچ مرتبہ دعا مانگنے کا موقع نصیب ہوگا، اور اللہ تعالیٰ ہر بار انھیں جواب دے گا، لیکن پانچویں مرتبہ کے بعد وہ کبھی بول نہیں پائیں گے، پہلی مرتبہ وہ یہ دعا کریں گے۔

وہ لوگ کہیں گے کہ اے ہمارے پروردگار آپ نے ہم کو دوبارہ مہر رکھا، اور دوبارہ زندگی دی، سو ہم اپنی خطاؤں کا اقرار کرتے ہیں، تو کیا نکلنے کی کوئی صورت ہے۔

وجہ اسکی یہ ہے کہ جب صرف اللہ کا نام لیا جاتا تھا تو تم انکار کرتے تھے، اور اگر اس کے ساتھ کسی کو شریک کیا جاتا تھا تو تم مان لیتے تھے سو یہ فیصلہ اللہ کا ہے جو عالی شان اور بڑے رتبے والا ہے۔

رَبَّنَا ابْصُرْنَا وَ سَمِعْنَا فَأَرْجِعْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا (پ ۱۵، آیت ۴)

اسکے بعد اہل دوزخ کہیں گے ۔

اے ہمارے پروردگار! ہمیں یہاں سے نکال لیجئے ہم اچھے کام کریں گے، برخلاف ان کاموں کے جو کیا کرتے تھے۔
 اللہ تعالیٰ اسکا جواب دے گا۔

أَوَلَمْ نُنَعِّمْكُمْ مَّا يَنْذَكُرُ فِيهِ مَنْ تَذَكَّرَ وَجَاءَكُمْ التَّنْذِيرُ فَذُوقُوا فَمَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ نَصِيرٍ (پ ۲۲ ر ۳۷)

کیا ہم نے تم کو اتنی عمر نہ دی تھی کہ جس کو سمجھنا ہوتا تو وہ سمجھ سکتا اور تمہارے پاس ڈرالے والا بھی پہنچا تھا سو مزہ چکھو کہ ایسے ظالموں کا کوئی مددگار نہیں۔

اس کے بعد وہ یہ عرض کریں گے :-
رَبَّنَا عَلَّمَتْ عَلَيْنَا شِقْوَتَنَا وَكُنَّا قَوْمًا ضَالِّينَ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْهَا فَإِنْ عُدْنَا فَإِنَّا ظَالِمُونَ (۱۸ ر ۱۰۶ آیت ۱۷۷)

اے ہمارے رب (واقعی) ہماری بد بختی نے ہم کو گمراہ کر لیا تھا اور ہم گمراہ لوگ تھے اے ہمارے رب! ہم کو اس (جہنم) سے اپ نکال دیجئے پھر اگر ہم دوبارہ کریں تو ہم بے شک پورے قصور وار ہیں۔
اسکے جواب میں اللہ تعالیٰ سختی سے فرمائے گا :-

إِخْسُوا فِيهَا وَلَا تُكَلِّمُونِ (پ ۱۸ ر ۱۰۸ آیت ۱۰۸)

اس میں تم راندے ہوئے پڑے رہو اور مجھ سے کلام نہ کرو۔

اسکے بعد انھیں کہی بولنا نصیب نہ ہوگا اور یہ شدت عذاب کی انتہا ہوگی قرآن کریم میں ہے :-
سَوَاءٌ عَلَيْنَا أَجْرُ غَنَّا أَمْ صَبْرُ نَا مَا لَنَا مِنْ مَّحْجِيصٍ (پ ۳ ر ۱۵ آیت ۲۱)

ہم سب کے حق میں (دونوں صورتیں) برابر ہیں خواہ ہم پریشان ہوں خواہ ضبط کریں ہمارے لئے چھٹکارا نہیں ہے۔

الس ابن مالکؒ سے روایت ہے کہ زید ابن ارقمؒ نے مذکورہ بالا آیت کی تفسیر میں ارشاد فرمایا کہ سو سال تک صبر کیا پھر سو برس تک بے قرار رہے اسکے بعد انھوں نے کہا کہ ہمارے لئے صبر و جزع دونوں برابر ہیں اور اب چھٹکارے کا کوئی راستہ نہیں ہے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ قیامت کے روز موت کو سفید مینڈھے کی شکل میں لایا جائے گا اور جنت و جہنم کے درمیان اسے فز کیا جائے گا اور کہا جائے گا کہ اے اہل جنت موت کے بغیر دوام اور اے اہل جہنم پہنچکی بلا موت کے (بخاری۔ ابن عمرؓ حضرت حسن فرماتے ہیں کہ ایک ہزار سال بعد ایک شخص کو دوزخ سے نکالا جائے گا کاش وہ شخص میں ہی ہوں۔ حضرت حسنؓ کو ایک گوشے میں بیٹھ کر دیتے ہوئے دیکھا گیا اور دریافت کیا گیا کہ آپ کیوں دیتے ہیں؟ فرمایا میں اسلئے دیتا ہوں کہ کہیں مجھے دوزخ میں ڈال کر پھونک دیا جائے۔

جہنم کے عذاب کی مختلف قسموں کا یہ ایک اجمالی بیان ہے جہاں تک جہنم کے غموں، تکلیفوں، مصیبتوں اور حسرتوں کا تعلق ہے اسکی تفصیل کی کوئی انتہا نہیں ہے سب سے زیادہ سخت اور شدید بات کفار کے لئے یہ ہوگی کہ وہ عذاب جہنم کے ساتھ ساتھ جنت کی نعمتوں، راحتوں، اللہ تعالیٰ کی ملاقات اور رضا سے بھی محروم ہوں گے اور انھیں یہ علم بھی ہوگا کہ انھوں نے یہ تمام نعمتیں اور راحتیں چند حقیر چیزوں کے عوض فروخت کر ڈالی ہیں یعنی دنیا کی چند روزہ زندگی کی حقیر شہوات کے عوض جو نا صاف تھیں، عیب اور ٹھکرے پر تھیں آخرت کی پاکیزہ پائدار اور عظیم نعمتیں فروخت کر دیں وہ اپنے دل میں کہیں گے ہائے افسوس! دائے حسرت! ہم نے کس طرح اپنے نفسوں کو اپنے رب کریم کی نافرمانی میں ہلاک کر ڈالا اور کیوں نہ ہم نے اپنے آپ کو چند روزہ صبر کا مٹکٹ بنایا اگر ہم صبر کر لیتے تو وہ دن گزر جاتے اور آج ہم جو رب العالمین میں رضائے الہی کی نعمت سے فیضیاب ہمیشہ و آرام کی زندگی گزار رہے ہوتے لیکن افسوس! جو کچھ ان سے فوت ہوتا تھا وہ فوت ہو چکا ہوگا اور جس مصیبت میں مبتلا ہونا تھا اس میں مبتلا ہو چکے ہوں گے دنیا کی نعمتوں اور لذتوں میں سے کوئی چیز ان کے پاس باقی نہیں رہے گی پھر اگر وہ جنت کی نعمتیں نہ دیکھتے تو شاید ان کی حسرت شدید نہ ہوتی لیکن انھیں جنت کی نعمتوں کا مشاہدہ بھی کرایا جائے گا چنانچہ ایک روایت میں ہے کہ سرکارِ دو عالم

صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے دن کچھ دوزخیوں کو جنت کی طرف لایا جائے گا اور انھیں اس حد تک قہر لایا جائے گا کہ وہ اسکی خوشبو سونگھیں گے، اور اسکے مٹلات دیکھیں گے، اور وہ تمام چیزیں دیکھیں گے جو اہل جنت کے لئے تیار کی گئی ہیں، پھر یہ اعلان کیا جائے گا کہ ان (دہ بختوں) کو یہاں سے واپس لے جاؤ، اور ان چیزوں میں ان کے لئے کوئی حصہ نہیں ہے، وہ انتہائی حسرت کے ساتھ اس طرح واپس ہوں گے کہ اولین و آخرین میں کوئی شخص اس طرح واپس نہ ہوا ہوگا، وہ کہیں گے اے ہمارے رب! اگر تو یہ ثواب، اور یہ نعمتیں جو تو نے اپنے دوستوں کے لئے تیار کر رکھی ہیں، ہمیں دکھلانے سے پہلے دوزخ میں داخل کرنا تو ہمارے لئے دوزخ میں جانا زیادہ آسان ہوتا، اللہ تعالیٰ فرمائے گا میں نے جان بوجھ کر تمہارے ساتھ ایسا کیا ہے اسلئے کہ جب تم (دنیا میں) تنہا ہوتے تھے تو بڑے بڑے گناہوں کے ساتھ میرا مقابلہ کرتے تھے، اور جب لوگوں سے ملے تو متواضع ہو کر ملتے تھے، اور لوگوں کے ساتھ ظاہر میں وہ سلوک کرتے جو دل سے میرے ساتھ نہ کرتے، لوگوں سے ڈرتے تھے اور مجھ سے نہ ڈرتے تھے، اور لوگوں کی تعظیم کرتے تھے، انکی پاسداری کے لئے کوئی چیز چھوڑ دیتے تھے، لیکن میری خاطر کوئی چیز نہیں چھوڑتے تھے، آج میں تمہیں پائندار ثواب سے محروم کر کے دردناک عذاب چکھاؤں گا (الاربعین لابی ہدبہ۔ النس)

احمد ابن حرب فرماتے ہیں کہ ہم دھوپ پر سائے کو ترجیح دیتے ہیں، لیکن جنت کو دوزخ پر ترجیح نہیں دیتے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں کہ کتنے تندرست جسم، حسین چہرے، اور فصیح زبان والے دوزخ کے طبقوں کے درمیان پیچھے چلائے پھریں گے، حضرت داؤد نے عرض کیا اے اللہ! میں تیرے سورج کی حرارت پر مبر نہیں کر سکتا مہلا تیری آگ کی حرارت پر کیسے مبر کر سکتا ہوں، اور میں تیری رحمت کی آواز پر مبر نہیں کر سکتا

تیرے عذاب کی آواز پر کیسے مبر کر سکتا ہوں، اے بے ہمت مسکین! ان خوفناک احوال پر نظر کر، اور یہ جان لے کہ اللہ تعالیٰ نے دوزخ کو اسکی تمام خوفناکیوں کے ساتھ پیدا کیا ہے، اور اسکے لئے اہل بھی پیدا کئے ہیں جو نہ زائد ہوں گے اور نہ کم ہوں گے، یہ ایک ایسا معاملہ ہے جس کا فیصلہ ہو چکا ہے، اور جس کے حکم سے فراغت ہو گئی ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَأَنذَرُكُمْ يَوْمَ الْحَسْرَةِ إِذْ يَفْضِي الْأَمْرَ وَهُمْ فِي غَفْلَةٍ وَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ (پ ۲۸ آیت ۳۹)

اور آپ ان لوگوں کو حسرت کے دن سے ڈراتے ہیں جب کہ (جنت یا دوزخ کا) فیصلہ کر دیا جائے گا، اور وہ

لوگ (آج) غفلت میں ہیں اور وہ لوگ ایمان نہیں لاتے۔

اس آیت میں قیامت کے دن کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، لیکن یہ فیصلہ قیامت کے دن نہیں ہوگا، بلکہ ازل میں ہو چکا ہے، قیامت صرف اس حکم کے ظہور کا دن ہے، تجھ پر حیرت ہوتی ہے کہ ہنسا کھیتا، اور دنیا کی حقیر چیزوں میں مشغول نظر آتا ہے، حالانکہ تجھے یہ معلوم نہیں کہ ازل میں تیرے لئے کیا فیصلہ ہو چکا ہے، اگر تو اسی لامٹی کو مذر بنائے اور کہے کہ میں نہیں جانتا کہ میرا انجام کیا ہوگا، مجھے کہاں جانا ہے، میرا مال اور مرجع کیا ہے؟ اور میرے حق میں کیا فیصلہ ہوا ہے؟ ہم تجھے ایک علامت بتلاتے ہیں تو اس علامت کی روشنی میں اپنے انجام کا اندازہ کر سکتا ہے، اور وہ علامت یہ ہے کہ اپنی حال پر نظر ڈال، اپنے اعمال دیکھ، اسلئے کہ ہر شخص کو وہی چیزیں میسر ہوتی ہیں جن کے لئے وہ پیدا کیا جاتا ہے، اگر تیرے لئے خیر کی راہ آسان کی گئی ہے تو تجھے خوش ہونا چاہئے تو آگ سے دور ہے، اور اگر صورت حال یہ ہے کہ ارادہ خیر کے ساتھ ہی بہت سی رکاوٹیں تیری راہ میں مزاحم ہو جاتی ہیں، اور تجھے ارادہ خیر پر عمل کرنے سے روکتی ہیں، اور جہاں شر کا ارادہ کیا تمام اسباب خود بخود کسی مانع کے بغیر مہیا ہوتے چلے جاتے ہیں تو تجھے یہ جان لینا چاہئے کہ تیرے لئے برے انجام کا فیصلہ ہو چکا ہے، یہ علامت انجام پر دلالت کرتی ہے، پیچھے ہارش سے بڑے، اور دھوئیں سے آگ پر دلالت ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

إِنَّ الْإِنْسَانَ لِرَبِّهِ لَكَنَافٍ (پ ۳۰ آیت ۳۳)

تجھ کو بے شک انسان میں ہوں گے، اور بدکار لوگ بے شک دوزخ میں تیرے۔

تو اپنے نفس کو ان دونوں آجوں پر رکھ، اور جنت یا دوزخ میں اپنا ٹھکانہ پہچان لے۔

جنت اور اسکی مختلف نعمتیں : گزشتہ طور میں اس کا حال مذکور ہوا جو مصیبتوں اور غموں کا گھر ہے، اسکے مقابلے میں ایک اور گھر ہے جس میں خوشیاں اور راحتیں ہیں، اب اس گھر میں غور کرو جو شخص ان دونوں گھروں میں سے ایک سے دور ہو گا وہ دوسرے گھر سے یعنی طور پر قریب ہو گا، اسلئے یہ ضروری ہے کہ جب تم جنم کے احوال اور خطرات میں فکر کرو تو اپنے دل میں خوف پیدا کرو اور جب جنت کی دائمی راحت اور ابدی خوشی میں فکر کرو تو دل میں رجاء پیدا کرو

اس طرح تم اپنے نفس کو خوف کے تازیانوں اور رجاء کی

گام سے صراطِ مستقیم کی طرف سمجھ سکتے ہو اور المناک عذاب سے محفوظ رہ کر دائمی سلطنت حاصل کر سکتے ہو۔

اہل جنت پر ناز کی شادابی اور رونق ہوگی اور انھیں ایسی بوتلوں سے شراب کیف آگیاں پلائی جائے گی جو سزمہ ہوں گی وہ تازہ اور سفید موتیوں سے بنے ہوئے عیموں میں سرخ یا قوت کے منبوں پر بیٹھے ہوئے ہوں گے، عیموں میں سبز قالین کا فرش ہوگا، انہوں کے کنارے بنے ہوئے ان عیموں میں صوفوں پر ٹیک لگائے ہوئے بیٹھے ہوں گے، خیمے بچوں اور غلاموں سے پُر ہوں گے، شہد اور شراب کے ذخیروں سے لبریز ہوں گے، اور حسین چروں اور بڑی بڑی آنکھوں والی عورتوں سے بھرے ہوئے ہوں گے، وہ عورتیں ایسی ہوں گی گویا قوت اور موٹے ہیں، اس سے پہلے نہ کسی انسان نے انھیں چھوا ہوگا، اور نہ جن نے، وہ جنتوں میں خراماں خراماں چلیں گی، جب ان میں سے کوئی نازوں کے ساتھ اٹھ کر چلے گی تو ستر ہزار لڑکے اسکا لباس اٹھا کر چلیں گے، اسکے اوپر اس قدر خوب صورت سفید چادریں ہوگی کہ انھیں دیکھ کر آنکھیں دنگ رہ جائیں گی، اسکے سروں پر موتیوں اور مونگوں سے مزین تاج ہوں گے، ان کی آنکھوں میں سرخ ڈورے ہوں گے، خوشبوؤں میں بسی ہوئی ہوں گی، بدھاپے اور مغلی کے خوف سے مامون ہوں گی، انکے محل جنت کے خوبصورت باغوں کے درمیان بنے ہوئے ہوں گے، پھر ان مردوں اور عورتوں کے درمیان شراب خالص سے لبریز مراچی اور جام کی گردش ہوگی، اور وہ شراب پینے والوں کے لئے انتہائی لذیذ ہوگی، یہ جام موتیوں جیسے خوبصورت لڑکے اور غلام لئے پھریں گے، یہ شراب انھیں ان کے اعمال کے صلے میں عطا کی جائے گی، اور اس جگہ عطا کی جائے گی جو باغوں اور چشموں اور نہروں کے درمیان مقام امن ہے، اور جہاں بیٹھ کر وہ اپنے رب کریم کے دیدار کا شرف حاصل کریں گے، ان چروں پر شادابی اور رونق ہوگی، ذلت اور رسوائی سے انھیں کوئی سروکار نہ ہوگا، بلکہ وہ معزز بندوں کی حیثیت سے جنت میں رہیں گے، اور اپنے رب کی طرف سے طرح طرح کے تحفے اور ہدیے پاتے رہیں گے، اور اپنی دل پسند چیزوں میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے، نہ انھیں کسی طرح کا خوف ہوگا اور نہ کوئی غم ہوگا، موت سے محفوظ ہوں گے، اور جنت میں ہمیشہ کریں گے، اسکے پھل میوے اور غذائیں کھائیں گے، اور اسکی نہروں سے دودھ، شراب اور شہد نکلیں گے، اسکے پھل اسکی نہروں کی زمین چاندی کی ہوگی، اور چھریاں موٹے ہوں گی، اور مٹی مکھ ہوگی، سبز و حمران ہوگا، اور اسکے بادلوں سے کافور کے ٹیلوں پر نسرین کا پانی برسے گا، انھیں چاندی کے پیالے ملیں گے جن میں موتی، بلبل اور موٹے جڑے ہوئے ہوں گے، ان میں شیریں سلیبیل کی سربہر شراب ہوگی، اور وہ اس قدر لطیف ہوں گے کہ اندر کی شہد اپنے سرخ رنگ اور تمام تر لطافتوں کی ساتھ عیاں ہوگی، انھیں کسی انسان نے اپنے ہاتھ سے نہیں بنایا کہ کسی طرح کا کوئی عیب یا نقص رہے گا، بلکہ وہ دست قدرت سے ترشے ہوئے ہوں گے، بے عیب اور خوبصورت، اور ایسے خدام کے ہاتھوں میں ہوں گے، جن کے چہرے سورج کی طرح منور اور تابناک ہوں گے، مگر سورج میں چہرے کی وہ لطافت، زلفوں کی وہ خوبصورتی اور آنکھوں کی وہ چمک کہاں ہے جو ان خدام میں ہوگی۔

ہمیں اس شخص پر حیرت ہوتی ہے جو ان گوناگوں اوصاف کے حامل گھر پر ایمان رکھتا ہو اور یہ یقین رکھتا ہو کہ اس گھر کے رہنے والوں کو موت نہیں آئے گی، اور نہ ان پر کسی قسم کی مصیبت واقع ہوگی، اور نہ حادثات تغیر و تبدل کی نگاہ اسکے اوپر ڈالیں گے، اس یقین و ایمان کے باوجود وہ اس گھر سے کیسے دل لگاتا ہے جس کی تباہی کا فیصلہ ہو چکا ہے، اسے یہاں کی زندگی کیسے خوشگوار محسوس ہوتی ہے، جب کہ یہ زندگی کد روٹوں سے پُر ہے اور اسے فنا ہوتا ہے، فرض کرو جنت میں بدن کی سلامتی، بھوک، پیاس، اور موت سے حفاظت کے علاوہ کچھ نہ ہو تب بھی اس دنیائے فانی کے لائق تر بات یہ ہے کہ اسے چھوڑا جائے، اور جنت پر اس دنیا کو

ترجیح نہ دی جائے جس کا ختم ہو جانا اور مکدر ہونا ناگزیر ہے اور اس صورت میں تو دنیا کو چھوڑنا یوں بھی بے حد ضروری ہے کہ جنت والے ہر خوف سے مامون بادشاہ ہیں، انواع و اقسام کی لذتوں اور خوشیوں سے ہم کنار ہونے والے ہیں، ان کے لئے جنت میں ہر وہ چیز ہے جس کی ان کے دل میں خواہش ہے اور وہ ہر دن عرش الہی کے صحن میں حاضر ہونے والے اور رب کریم کے وجہ کریم کے دیدار سے مشرف ہونے والے ہیں، انہیں اس دیدار سے وہ لطف حاصل ہو گا جو کسی اور نعمت کو دیکھ کر حاصل نہیں ہو گا، وہ ہمیشہ ہمیشہ انہی لذتوں اور نعمتوں میں ان کے زوال سے مامون ہو کر رہیں گے، حضرت ابو ہریرہ روایت کرتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ایک اعلان کرنے والا یہ اعلان کرے گا کہ اے اہل جنت تمہارے لئے یہ بات ہے کہ تم تندرست رہو گے، کبھی بیمار نہیں ہو گے، تم زندہ رہو گے، کبھی مرنے نہیں، تم جوان رہو گے، کبھی بوڑھے نہیں ہو گے، تم نعمتوں میں رہو گے، کبھی مفلس نہیں ہو گے (مسلم) اللہ تعالیٰ کا ارشاد بھی یہی ہے :-

وَنُؤْتُوا لَیْسَ لَکُمْ الْحَیْئَةُ تَمُوتُوا هَیْئًا کُنْتُمْ تَعْمَلُونَ (پ ۸ ر ۲ آیت ۴۳)

اور ان سے پکار کر کہا جائے گا یہ جنت تم کو دی گئی ہے تمہارے اعمال کے بدلے۔

اگر تم جنت کا حال جاننا چاہتے ہو تو قرآن کریم کی تلاوت کرو، اسلئے کہ اللہ تعالیٰ کے بیان کے بعد کوئی بیان نہیں ہے، سورہ رمل میں آیت کریمہ وَلَیْسَ خَافَ مَقَامَ رَبِّہِ جَنَّاتٍ سَورَت کے آخر تک اور سورہ واقعہ وغیرہ میں جنت کا ذکر ہے۔ گزشتہ سطروں میں جنت کی نعمتوں اور خوبیوں کا اجمالی ذکر تھا، اب ہم روایات کی روشنی میں تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔

جنتوں کی تعداد : سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کریم کی آیت وَلَیْسَ خَافَ مَقَامَ رَبِّہِ جَنَّاتٍ کی تفسیر میں فرمایا کہ دو جہنم چاندی کی ہوں گی، ان کے برتن اور جو کچھ ان میں ہے وہ بھی چاندی کا ہو گا، اور دو جہنم چمچیں سونے کی ہو گی، ان کے برتن اور جو کچھ ان میں ہے وہ بھی سونے کا ہو گا، قوم کے اور جنت عدن میں دیدار رب کریم کے درمیان وجہ کریم پر روئے کبریا کی کے علاوہ کوئی پردہ نہ ہو گا (بخاری و مسلم ابوموسیٰ)۔

جنت کے دروازے : جنت کے دروازے اصل طاعات کے لحاظ سے بہت سے ہیں، جیسے اصل معاصی کے اعتبار سے دوزخ کے بہت سے دروازے ہیں، حضرت ابو ہریرہ روایت کرتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص اپنے مال میں دو جوڑے اللہ کی راہ میں خرچ کرے گا وہ جنت کے تمام دروازوں سے بلایا جائے گا جنت کے آٹھ دروازے ہیں، جو نماز والوں میں سے ہے اے نماز کے دروازے سے بلایا جائے گا، اور جو روزہ والوں میں سے ہے اے روزہ والوں کے دروازے سے بلایا جائے گا، اور جو اہل صدقات میں سے ہے اے صدقہ کے دروازے سے بلایا جائے گا، اور جو مجاہدین میں سے ہے اے باب جہاد سے بلایا جائے گا، حضرت ابو بکرؓ نے عرض کیا بخدا یہ کبھی پر ضروری نہیں ہے کہ وہ کس دروازے سے بلایا جائے گا، کیا کوئی شخص ایسا بھی جسے تمام دروازوں سے بلایا جائے گا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہاں! اور مجھے امید ہے کہ تم ان میں ہو گے (بخاری و مسلم) عام ابن حمزہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے سامنے ایک مرتبہ دوزخ کا ذکر ہوا تو انہوں نے اس قدر طویل تقریر کی کہ مجھے یاد نہیں رہا کہ کیا فرمایا، اسکے بعد آپ نے یہ تلاوت فرمائی :-

وَسِیِّقَ الذِّبْنَ اَتَقُوْا رَبَّہُمُ الٰی الْجَنَّةِ مَرَّ (پ ۲۳ ر ۵ آیت ۷۳)

اور جو لوگ اپنے رب سے ڈرتے تھے وہ گروہ درگروہ ہو کر جنت کی طرف روانہ کئے جائیں گے۔

اور فرمایا کہ جب لوگ جنت کے دروازوں میں سے کسی دروازے پر پہنچیں گے تو اسکے پاس ایک درخت دیکھیں گے جس کی جڑیں دو چشمے بہہ رہے ہوں گے، وہ ان میں سے ایک پر حکم کے مطابق جائیں گے، اور اس کے پانی کے اثر سے ان کے پیٹ میں جو کچھ نجاست اور گندگی ہوگی وہ دور ہو جائے گی، پھر دوسرے چشمے پر جائیں گے، اور اس سے پاکی حاصل کریں گے، اسکے اثر سے ان پر شادمانی اور شادابی آجائے گی، اسکے بعد ان کے بالوں میں کوئی تغیر نہ واقع ہو گا، نہ وہ گندے ہوں گے اور نہ انہیں گے، گویا ان پر تیل لگا دیا گیا

ہو، پھر وہ جنت تک پہنچیں گے، جنت کے محافظین ان سے کہیں گے :-

سَلَامٌ عَلَيْكُمْ طَبْتُمْ فَاَدْخَلُوْهُمُ اِلٰی الدِّیْنِ (پ ۲۲ ۵ آیت ۷۳)

تم پر سلامتی ہو، تم مزے میں رہو، سو اس میں ہمیشہ رہنے کے لئے داخل ہو جاؤ۔

پھر انہیں لڑکے ملیں گے، اور ان کے گرد اس طرح طواف کریں گے جیسے دنیا کے بچے اپنے کسی عزیز کا خیر مقدم کرتے ہیں جو کہیں دور سے آیا ہو، اور آنے والے سے کہیں گے پھر اس کرامت کی خوشخبری ہو جو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے تیار کر رکھی ہے، پھر ان میں سے ایک لڑکا اسکی حوروں میں سے کسی سے کہے گا کہ فلاں شخص آیا ہے، اور وہ نام لے گا جو دنیا میں اسکا تھا، وہ پوچھے گی کیا تم نے اسے دیکھا ہے، وہ کہے گا ہاں دیکھا ہے، اور میرے پیچھے آ رہا ہے، یہ سکر حور خوشی سے اٹھے گی اور مہمان کے استقبال کے لئے گھڑی دلیزیر آگھڑی ہوگی، جب وہ اپنے گھر میں داخل ہو گا تو یہ دیکھے گا اس کی بنیادوں میں پتھروں کی جگہ موتی لگے ہوئے ہیں اور ان کے اوپر سرخ سبز زرد رنگ کی ایک عالیشان عمارت بنی ہوئی ہوگی، جب وہ اپنے گھر میں داخل ہو گا تو یہ دیکھے گا کہ اسکی بنیادوں پر پتھروں کی جگہ موتی لگے ہوئے ہیں، اور ان کے اوپر سرخ، سبز، زرد رنگ کی ایک عالیشان عمارت بنی ہوئی ہے، اسکے بعد وہ اوپر کی طرف نظر اٹھائے گا تو اسے انتہائی روشن چمکدار رحمت دکھائی دے گی، اگر اللہ تعالیٰ نے اسے قدرت بخشی ہوئی عجب نہ تھا کہ اسکی نگاہ اسکی چمک سے ضائع ہو جاتی، اسکے بعد وہ نیچے نظر ڈالے گا اور دیکھے گا کہ اسکی بیویاں بیٹھی ہوئی ہیں، جام رکھے ہوئے ہیں، فرش بچھا ہوا ہے، اور نیکے لگے ہوئے ہیں، اسکے بعد وہ نکیہ لگا کر بیٹھے گا، اور کہے گا اللہ رب العزت کا شکر ہے کہ اس نے ہمیں جنت کی ہدایت دی، اگر وہ ہمیں ہدایت نہ دیتا تو ہم کبھی جنت تک رسائی حاصل نہ کرتے، پھر ایک اعلان کرنے والا یہ اعلان کرے گا کہ تم زندہ رہو گے کبھی مو گے نہیں قیام کرو گے کبھی سفر نہیں کرو گے، صحت مند رہو گے کبھی بیمار نہیں ہو گے، سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ میں قیامت کے روز جنت کے دروازے پر آکر اسے کھلو آؤں گا، و ابوءہ جنت سوال کرے گا آپ کون ہیں؟ میں کہوں گا محمد ہوں، وہ کہے گا مجھے آپ کے لئے حکم دیا گیا ہے کہ آپ سے پہلے کسی کے لئے (یہ دروازہ) نہ کھولوں (مسلم۔ النج۔)

جنت کے غرنے اور ان کے درجات کی بلندی کا اختلاف : آخرت میں بڑے بڑے درجات ہیں اور بڑے بڑے فضائل ہیں، جس طرح لوگوں کی ظاہری اطاعت، اور باطنی اخلاق محمودہ میں ظاہری فرق ہوتا ہے اسی طرح انکی جزاء میں بھی فرق ظاہر ہوگا، اگر تم اعلیٰ ترین درجات حاصل کرنا چاہتے ہو تو تمہیں یہ کوشش کرنی چاہئے کہ کوئی شخص تم سے اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں سبقت نہ کر سکے، اللہ تعالیٰ نے تمہیں اطاعت کے باب میں منافست اور مسابقت کا حکم دیا ہے، چنانچہ ارشاد فرمایا :-

سَابِقُوا اِلٰی مَغْفِرَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ (پ ۲۷ ۸ آیت ۲۱) تم اپنے پروردگار کی مغفرت کی طرف دو دو۔

وَفِيْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ (۸۳۰ آیت ۲۱)

اور حرم کرنے والوں کو ایسی چیز کی حرم کرنا چاہئے۔

تعب اس بات پر ہوتا ہے کہ اگر تمہارا کوئی ساتھی یا پڑوسی تم سے ایک درہم میں آگے بڑھ جائے، یا مکان کی بلندی میں سبقت کر جائے تو تمہیں نہایت ناگوار گزرتا ہے، تمہیں تکلیف ہوتی ہے، اور حسد کی بنا پر تم اپنی زندگی کا لطف کھو بیٹھتے ہو، جب کہ دنیا میں نہ جانے کتنے لوگ تم سے بعض ایسی باتوں میں آگے ہوں گے کہ ان کے سامنے دنیا کی تمام دولت حقیر نظر آتی ہے، حضرت ابوسعید الخدریؓ روایت کرتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اہل جنت اپنے اوپر کی کھڑکیوں والوں کو اس طرح دیکھیں گے کہ جیسے تم مشرق و مغرب کے افق میں ستارے کو جانا ہوا دیکھتے ہو، اور یہ ان کے مراتب میں فرق کی بنا پر ہوگا، صحابہ کرام نے عرض کیا یا رسول اللہ یہ مرتبہ صرف انبیاء کو حاصل ہوگا اور انبیاء کرام کے سوا کسی کو نہ ملے گا؟ آپ نے فرمایا کیوں نہیں! (دوسروں کو بھی ملے گا) اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں چھری جان ہے (یہ مرتبہ) وہ لوگ (بھی حاصل کریں گے) جو اللہ

تعالیٰ پر ایمان لائے، جنہوں نے رسولوں کی تصدیق کی (بخاری و مسلم) ایک مرتبہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ بلند درجات والے اپنے نیچے کے درجات والوں کو اس طرح دیکھیں گے جس طرح تم آسمان کے کسی اقل میں روشن ستارے کو دیکھتے ہو، اور ابو بکر و عمرؓ ان بلند درجات والوں میں سے ہیں، اور بلندی میں ان سے بڑھ کر ہیں (ترمذی، ابن ماجہ، ابو سعید) حضرت جابرؓ روایت کرتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے ارشاد فرمایا کہ میں تمہیں جنت کے غروں کے بارے میں نہ بتاؤں، میں نے عرض کیا کیوں نہیں! یا رسول اللہ! آپ پر میرے ماں باپ قربان جائیں، فرمایا جنت میں جو ہر کی تمام اقسام کے کمرے ہیں، ان کے باہر سے اندر کا مہر، اور اندر سے باہر کا مہر نظر آتا ہے، اور ان میں وہ نعمتیں لذتیں اور خوشیاں ہیں کہ نہ کسی آنکھ نے دیکھیں، نہ کسی کان نے سنی، اور نہ کسی آدمی کے دل میں ان کا خیال گزرا، میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! یہ غرے کیسے حاصل ہوں گے؟ فرمایا یہ غرے اس شخص کو ملیں گی جس نے سلام پھیلایا، کھانا کھلایا، مسلسل روزے رکھے، رات کو اس وقت نماز پڑھی جب لوگ سو خواب تھے، ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ! ان اعمال کی طاقت کس میں ہے؟ فرمایا میری امت اس کی طاقت رکھتی ہے، اور میں تمہیں اسکے حلق بتلاتا ہوں، جو شخص اپنے بھائی سے ملا اور اسے سلام کیا اس نے سلام پھیلایا، جس نے اپنے اہل و عیال کو پیٹ بھر کھانا کھلایا تو اس نے کھانا کھلایا، اور جس نے ماہِ رمضان اور ہر مہینے کے تین دن روزے رکھے تو اس نے ہمیشہ روزے رکھے اور جس نے عشاء اور فجر کی نماز جماعت سے ادا کی اس نے رات کو اس وقت نماز پڑھی جب لوگ نیند میں ہوتے ہیں یعنی یسود و نصاریٰ اور مجوسی (ابو نعیم) قرآن کریم کی آیت ”وَمَسَاكُنُ بِرَبِّكَ جَنَّاتٍ عَذْنٌ“ کی تفسیر میں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ موتیوں کے محل ہوں گے، اور ہر محل میں سرخ یا قوت کے ستر گھروں گے، اور ہر گھر میں سرخ زمرود کے ستر کمرے ہوں گے، ہر کمرے میں مسیاں ہوں گی، اور ہر مسری پر ستر بستر ہوں گے ہر رنگ کے، اور ہر بستر پر حوروں میں سے ایک بیوی ہوگی، ہر کمرے میں ستر دستر خوان ہوں گے، اور ہر دستر خوان پر ستر طرح کے کھانے ہوں گے، ہر کمرے میں ستر لوطیاں ہوں گی، اور مومن کو ہر روز اتنی قوت عطا کی جائے گی کہ وہ سب سے ہم بستر ہو سکے (ابن خیابن، ابو ہریرہ)

جنت کی دیواریں، زمین، درخت اور نہریں : ان لوگوں کی خوشی پر غور کرو جو ان جنتوں میں رہیں گے، اور ان لوگوں کی حسرت پر بھی نظر ڈالو جو آخرت کے عوض دنیا پر قانع ہونے کی بنا پر جنتوں سے محروم رہ جائیں گے، پھر جنت کی چار دیواری، اس کی زمین، نہروں اور درختوں میں فکر کرو کہ وہ کتنے خوبصورت، دلربا، مسور کن، اور ابدی ہونگے، ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جنت کی دیواریں ایک اینٹ چاندی کی اور ایک اینٹ سونے کی ہے، اس کی خاک زعفران ہے، اور گارامٹک ہے (ترمذی) سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے جنت کی مٹی کے حلق دریافت کیا گیا، آپ نے ارشاد فرمایا سفید میدا خالص ٹھک ہے (مسلم، ابو سعید الخدریؓ) حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جو شخص یہ چاہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے جنت میں رہی لباس پہنائے وہ دنیا میں نہ پہنے (طبرانی، نسائی) ایک حدیث میں ہے کہ جنت کی نہریں ٹھک کے پھاڑوں یا ٹھک کے ٹیلوں کے نیچے سے پھوٹی ہیں (العتیقی فی النفعاء، ابو ہریرہؓ) ایک روایت میں ہے کہ اگر کسی جنتی کے پاس سب سے کم زیور ہو، اور اسکے زیور کا مقابلہ تمام دنیا کے زیور سے کیا جائے تو اللہ تعالیٰ آخرت میں اسے جو زیور پہنائے گا وہ تمام دنیا کے تمام زیور سے اچھا ہوگا (طبرانی اوسط، ابو ہریرہؓ) حضرت ابو ہریرہؓ کی ایک روایت میں ہے کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جنت میں ایک درخت ایسا ہے کہ اگر اسکے سائے میں سو سال تک چلے تو اسے طے نہ کر سکے، اگر تم چاہو تو قرآن کریم میں پڑھ لو لَوْ ظَلَّ مَمْلُوءٌ (اور طویل سائے میں) (بخاری و مسلم)۔

ابو امامہؓ فرماتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں عراب اور ان کے سوالات سے نفع دیتا ہے، ایک مرتبہ ایک اعرابی آیا اور کہنے لگا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں ایذا دینے والے درخت کا ذکر فرمایا ہے، اور مجھے نہیں معلوم کہ جنت میں کوئی ایسا درخت بھی ہوگا، جو اہل جنت کو تکلیف پہنچائے گا،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ درخت کونسا ہے؟ اعرابی نے عرض کا وہ بھری کا درخت ہے اور اس میں کانٹے ہوتے ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے سِدْرُ مَغْنُودُ فرمایا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ اس کے کانٹے کاٹ ڈالے گا اور اس کے کانٹوں کی جگہ پھل لگیں گے، اور ہر پھل میں سے بہتر رنگوں کی غذا برآمد ہوگی، اور کوئی رنگ دوسرے کے مشابہ نہ ہوگا، (ابن المبارک) جریر ابن عبد اللہ کہتے ہیں کہ ہم صفاح میں اترے، ہم نے دیکھا کہ ایک شخص درخت کے نیچے سو رہا ہے، اور دھوپ اس تک پہنچنے والی ہے، میں نے غلام سے کہا کہ چڑے کا بستر لے جا اور اس کے اوپر سایہ کر لے، چنانچہ وہ گیا اور اس پر سایہ کر کے کھڑا ہو گیا، جب وہ بیدار ہوا تو میں نے دیکھا کہ وہ حضرت سلمان الفارسی ہیں، میں نے انھیں سلام کیا، آپ نے فرمایا اے جریر! اللہ کے لئے تواضع اختیار کر، اس لئے کہ جو شخص دنیا میں اللہ کے لئے تواضع اختیار کرے گا، اسے اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اونچا اٹھائے گا، کیا تم جانتے ہو کہ قیامت کے دن تاریکیاں کیا ہوں گی؟ فرمایا لوگوں کا ایک دوسرے پر ظلم کرنا، پھر ایک چھوٹا سا تنکا اٹھایا جو اتنا چھوٹا تھا کہ مجھے نظر نہیں آ رہا تھا اور فرمایا اے جریر! اگر تم جنت میں یہ تنکا ڈھونڈنا چاہو گے تو تمہیں مل نہیں پائے گا، میں نے عرض کیا اور جنت کے درخت کیسے ہوں گے، فرمایا انکی جڑیں موتی اور سونے کی ہوں گی، اور شاخوں پر پھل ہوں گے۔

اہل جنت کے لباس، بستر، مسہریاں، نیکیے اور خیمے : اللہ تعالیٰ فرماتا ہے نہ

يُحْكَمُونَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَّهَبٍ وَلَا لُؤْلُؤًا وَلَا لِبَاسُهُمْ فِيْهَا حَرِيْرٌ (پ ۷ ار ۱۰ آیت ۲۳)

انکو وہاں سونے کے ٹکڑے اور موتی پہنائے جائیں گے اور پوشاک انکی وہاں ریشم کی ہوگی۔

اس مضمون کی متعدد آیات ہیں، اور تفصیل روایات میں وارد ہے، حضرت ابو ہریرہ روایت کرتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص جنت میں جائے گا وہ نعمتوں سے نوازا جائے گا، وہ کبھی محتاج نہیں ہوگا، اور نہ اس کے کپڑے کبھی گندے ہوں گے، اور نہ جوانی ضائع ہوگی، اسے جنت میں وہ نعمت عطا ہوں گے، جو نہ کسی آنکھ نے دیکھی ہوں، نہ کسی کان نے سنی ہوں، اور نہ کسی انسان کے دل میں انکا خیال گزرا ہو (مسلم و آخر الحدیث رواہ البخاری) ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ! ہمیں کچھ جنت کے لباس کے متعلق بتلائیے کہ وہ مخلوق ہوں گے جو پیدا کئے جائیں گے یا مصنوع ہوں گے کہ بنے جائیں گے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ سکوت فرمایا، بعض لوگ ہنسنے لگے، آپ نے فرمایا کس بات پر ہنستے ہو، کیا اس لئے ہنستے ہو کہ ایک جاہل نے کسی عالم سے سوال کیا ہے، اس کے بعد فرمایا بلکہ جنت کے پھلوں میں نکلا کریں گے، یہ بات آپ نے دو مرتبہ ارشاد فرمائی (نسائی۔ عبد اللہ ابن عمر) حضرت ابو ہریرہ روایت کرتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جنت میں سب سے پہلے جو گروہ داخل ہوگا ان کے چہرے چودھویں رات کے چاند کی طرح چمکتے ہوں گے، وہ جنت میں نہ تھوکیں گے، نہ ناک تمکھیں گے، نہ پیشاب پاخانہ کریں گے، ان کے برتن اور کنگھیاں سونے چاندی کی ہوں گی، ان کا پینہ مشک ہوگا ان میں سے ہر ایک کے پاس دو بیویاں ہوں گی، چمکے حسن کا یہ عالم ہوگا کہ بڑی کا مغز گوشت کے اندر سے جھلکتا ہوگا، ان میں کوئی اختلاف نہ ہوگا، ان کے دلوں میں بغض نہ ہوگا، بلکہ سب لوگ ایک دل ہو کر صبح و شام اللہ کے لئے شہید کیا کریں گے، اور ایک روایت میں یہ ہے کہ ہر بیوی کے جسم پر ستر لباس ہوں گے (بخاری و مسلم) اللہ تعالیٰ کے ارشاد وَ يَحْكُمُونَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ کی تفسیر میں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ان کے سروں پر تاج ہوں گے، ان کے معمولی موتی کا عالم یہ ہوگا کہ اسکی روشنی سے مشرق و مغرب کے درمیان کا حصہ منور ہو جائے گا (ترمذی، ابوسعید الخدری) سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ (جنت میں) خیمہ ایک موتی ہوگا جو بیچ سے خالی ہوگا آسمان میں اسکی لمبائی ساٹھ میل ہوگی، اس خیمے کے ہر گوشے میں مومن کی بیویاں ہوں گی جنھیں دوسرے نہیں دیکھیں گے، (بخاری و مسلم، ابوسعید الخدری) حضرت عبد اللہ ابن عباس فرماتے ہیں کہ خیمہ ایک خالی موتی ہوگا، اسکا طول و عرض ایک فرسخ ہوگا اور اس کے چار زار سونے کے دروازے ہوں گے، حضرت ابوسعید الخدری کی ایک کتبک مطابقت سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے آیت کریمہ ”وَفَرُشٌ مِّنْ فُوقَہِیْ“ کے باب میں ارشاد فرمایا کہ دو فرشوں کے درمیان اتنا فاصلہ ہوگا جتنا فاصلہ

زمین و آسمان کے درمیان ہے (ترندی)۔

اہل جنت کا کھانا : اہل جنت کی غذا کا بیان قرآن پاک میں ہے، یہ غذا میوؤں، موٹے پرندوں، من و سلوی، شہد، دودھ اور دوسرے انواع و اقسام کے کھانوں پر مشتمل ہوگی، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :-
 کَلَّمَآرْزُقُوْا مِنْهَا بِمَنْحَرٍ رَّزَقًا قَالُوْا هٰذَا الَّذِیْ رَزَقْنَا مِنْ قَبْلُ وَاتَّوْبِهِ مُتَشَابِهًا (پ ار ۳ آیت ۲۵)
 جب کبھی دئے جائیں گے وہ لوگ بہشتوں میں سے کسی پھل کی غذا، تو ہر بار یہی کہیں گے کہ یہ تو وہی ہے جو ہم کو ملا تھا اس سے پیشتر، اور ملے گا بھی ان کو دودھوں یا رکھنے والا پھل ملتا جلتا۔

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے متعدد مواقع پر اہل جنت کی شراب کا ذکر فرمایا ہے۔ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام حضرت ثوبانؓ روایت کرتے ہیں کہ میں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کھڑا ہوا تھا، اتنے میں ایک یہودی عالم آیا اور اس نے چند سوالات دریافت کئے، اس نے یہ بھی پوچھا کہ سب سے پہلے پل صراط کون عبور کرے گا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا فقراء، مہاجرین، یہودی نے دریافت کیا کہ جب وہ جنت میں داخل ہوں گے تو ان کا تختہ کیا ہوگا، فرمایا پھلی کے جگر کے کباب، اس نے پوچھا اسکے بعد انکی غذا کیا ہوگی، فرمایا جنت کا وہ پھل انکے لئے ذبح کیا جائے گا جو اسکے اطراف میں پھرتا ہے، اس نے دریافت کیا کھانے کے بعد وہ لوگ کیا بنیں گے آپ نے فرمایا جنت کی جتنی کاپانی ہیں گے جسے سلسیل کہتے ہیں، یہودی عالم نے آپ کے جوابات کی تصدیق کی (مسلم) زید ابن ارقم روایت کرتے ہیں کہ ایک یہودی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا اے ابوالقاسم! کیا تم یہ گمان نہیں رکھتے کہ جنت میں اہل جنت کھائیں گے اور بنیں گے، اور اپنے ساتھیوں سے کہنے لگا کہ اگر انہوں نے اس کا اعتراف کیا تو میں بحث کروں گا سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہاں میں یہی کہتا ہوں، اور اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے، کہ ان میں سے ہر شخص کو کھانے، پینے اور جماع کرنے میں سو آدمیوں کی قوت دی جائے گی، یہودی نے کہا کھانے پینے والے کو تو (پاخانے کی) حاجت ہوتی ہے، سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا انکی حاجت یہ ہوگی کہ انکے جسم سے مشک جیسا پھینٹ نکلے گا اور پیٹ صاف ہو جائے گا (نسائی) حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ روایت کرتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم جنت میں پرندہ دیکھو گے اور اس کی خواہش کرو گے (اچانک) وہ پرندہ تمہارے سامنے ہمیں ہوئی حالت میں آگرے گا (مسند بزار) حضرت حذیفہؓ کی روایت کے مطابق سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جنت میں کچھ پرندے و بھتی اونیٹوں کی طرح ہیں، حضرت ابو بکرؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ! وہ کیا خوب ہوں گے، آپ نے فرمایا ان سے زیادہ خوب وہ ہوں گے جو انہیں کھائیں گے، اور اے ابو بکر! تم ان لوگوں میں سے ہو جو جنت میں پرندوں کا گوشت کھائیں گے (احمد شلیہ عن انس)۔

قرآن کریم کی آیت ”یَطَافُ عَلَیْہِمْ رُحَمَآءٌ“ کی تفسیر میں حضرت عبداللہ ابن عمرؓ ارشاد فرماتے ہیں کہ انکے اوپر سونے کے ستر قابوں کی گردش ہوگی، ان میں سے ہر قاب میں نئی قسم کا کھانا ہوگا، حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ نے وِمِنْ اَجْہُ مِنْ تَسْنِیْمٍ کے سلسلے میں ارشاد فرمایا کہ اصحابِ یمن کے لئے طونی ملائی جائے گی، اور قرین اسے خالص بنیں گے، حضرت ابوالدرداءؓ نے ”وَخِتَامُہُمْ مِنْسُکٌ“ کی تفسیر میں فرمایا کہ وہ سفید چاندی جیسی شراب ہوگی، اس سے جنتیوں کی شراب پر مہر لگائی جائیگی، اگر دنیا والوں میں کوئی شخص اس شراب میں انگلی ڈال کر نکال لے تو تمام دنیا اس کی خوشبو سے مہک اٹھے۔

حور اور لڑکے : قرآن کریم میں متعدد جگہوں پر حوروں اور لڑکوں کی تفصیل وارد ہے، چنانچہ حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں صبح کو جانا یا شام کو جانا دنیا و مافیہا سے بہتر ہے، تم میں سے کسی کے لئے جنت میں اتنی جگہ کا ہونا جو قوس کی مقدار ہوتی ہے یا پاؤں کی جگہ کا ہونا دنیا و مافیہا سے بہتر ہے، اگر جنت کی عورتوں میں

سے کوئی عورت زمین پر جھانکے تو تمام آسمان و زمین کے درمیان روشنی اور خوشبو پھیل جائے، اس عورت کے سر کا ڈھبہ دنیا و مافیہا سے بہتر ہے (بخاری) حضرت ابوسعید الخدریؓ کی روایت کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے باری تعالیٰ کے ارشاد ”كَأَنَّهُنَّ لَيَأْقُوْنَ وَالْمَرْجَانُ“ کی تفسیر میں ارشاد فرمایا کہ ان کے حرے پردوں میں سے بھی آئینے سے زیادہ صاف شفاف نظر آئیں گے، اور انکے جسم پر معمولی درجے کا ہیرا بھی مشرق و مغرب کے درمیان روشنی پھیلا دے گا، ان کے جسم پر ستر کپڑے ہونگے، لیکن نظر ان سے آ رہا ہو کر پڑی کے گوشت کے بیچے کا مغز صاف دیکھنے کی (ابو سلمیٰ) حضرت انسؓ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں کہ جب مجھے معراج ہوئی تو میں جنت میں ایک ایسی جگہ گیا جس کا نام بیدخ ہے وہاں موتیوں کے سبز زبرجد کے، اور سرخ یا قوت کے خیمے نصب تھے، اچانک عورتوں نے کہا السلام علیک یا رسول اللہ! میں نے کہا اے جبرئیل علیہ السلام یہ کیسی آواز تھی، حضرت جبرئیل علیہ السلام نے جواب دیا، یہ خیموں میں پردہ نشین عورتیں ہیں، انھوں نے اپنے رب سے آپ کو سلام کرنے کی اجازت مانگی تھی، چنانچہ انھیں اجازت دیدی گئی، وہ کہنے لگیں کہ ہم راضی ہیں، کبھی ناراض نہیں ہوں گی، ہم ہمیشہ رہنے والی ہیں، کبھی سزا نہیں کریں گی سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کریم کی یہ آیت تلاوت فرمائی (۱) :-

حُورٌ مَّقْصُورَاتٌ فِي الْخَيْلِ (پ ۲۷ ر ۳۳ آیت ۷۲)

وہ عورتیں گوری ہوں گی (اور) خیموں میں محفوظ ہوں گی۔

حضرت مجاہد اللہ تعالیٰ کے ارشاد ”وَأَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ“ کی تفسیر میں ارشاد فرماتے ہیں کہ وہ بیویاں حیض پاخانے، پیشاب، حموک، رینٹ، منی اور بچے کی پیدائش سے پاک ہوں گی، اوزائیؓ نے آیت کریمہ ”فِي شُجُلٍ فَكَاهُونُ“ کی تفسیر میں فرمایا کہ ان کا مشغلہ پاکہ عورتوں کی بکارت دور کرنا ہوگا، ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ! کیا اہل جنت جماع کریں گے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ان میں سے ہر ایک کو ایک دن میں ہمارے ستر آدمیوں سے زیادہ قوت دی جائے گی (ترمذی۔ انسؓ) حضرت عبد اللہ ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ مرتبے کے اعتبار سے کم تر جنتی وہ ہوگا جس کے ساتھ ہزار خادم ہوں گے، اور ہر خادم کو وہ کام ہوگا جو دوسرے کو نہ ہوگا، ایک حدیث میں ہے کہ جنتی مرد پانچ سو عورتوں چار ہزار پاکہ اور آٹھ ہزار شیعہ عورتوں سے نکاح کرے گا، اور ان میں سے ہر ایک کے ساتھ اتنی دیر معاقدہ کرے گا جتنی دیر دنیا میں زندہ رہا ہوگا (ابو الشیخ۔ ابن ابی اوفی) ایک روایت میں ہے کہ جنت میں ایک بازار ہے، جس میں مردوں اور عورتوں کے علاوہ کسی چیز کی خرید و فروخت نہیں ہوگی، جب کسی شخص کو کسی صورت کی خواہش ہوگی وہ بازار میں جائے گا، اور اس میں حور عین کا مجمع ہوگا، اور وہ ایسی آواز سے جو مخلوق نے نہ سنی ہوگی یہ کہتی ہوں گی ہم ہمیشہ رہنے والی ہیں، فنا نہیں ہوں گی، ہم نعمت والی ہیں، کبھی مفلس نہ ہوں گی، ہم راضی رہنے والی ہیں، کبھی ناراض نہ ہوں گی، اچھا ہے وہ شخص جو ہمارا ہو اور ہم اسکے ہوئے (ترمذی۔ علیؓ) حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا حوریں جنت میں گاتی ہیں کہ ہم خوب صورت حوریں ہیں اور شریف مردوں کے لئے ہمیں چھپایا گیا ہے (طبرانی) یحییٰ ابن کثیرؒ نے ارشاد ”فِي رَوْضَةٍ يُحْبَرُونَ“ کی تفسیر میں فرمایا کہ جنت میں سماع ہوگا۔ ابوالامہ الباہلیؒ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ جو بندہ جنت میں داخل ہوتا ہے، اسکے سرہانے، اور پاؤں کے پاس دو دو حوریں بیٹھتی ہیں اور اسے خوش گلوئی کے ساتھ گیت سناتی ہیں جسے جن و انس سب سنتے ہیں، وہ گیت شیاطین کے مزامیر نہیں ہوتے، بلکہ اللہ کی تحمید و تقدیس ہوتے ہیں (ترمذی۔ ابوالیوبؓ)۔

اہل جنت کے مختلف اوصاف جو روایات میں وارد ہیں : اسامہ ابن زیدؓ مروی ہے کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب سے ارشاد فرمایا کہ کیا کوئی ہے جو جنت کے لئے تیار ہو، جنت کو کوئی خطرہ نہیں ہے رب کعبہ کی قسم وہ ایک چمکدار نور ہے، اور پھولوں کی ایک لہرائی ہوئی شاخ ہے، مضبوط محل ہے، جاری نہر ہے، بے شمار کپے ہوئے میوے ہیں، خوبصورت (۱) یہ حدیث مجھے ان الفاظ میں نہیں ملی، ترمذی میں مختلف الفاظ اور مضمون کے ساتھ وارد ہے۔

حسین پیوی ہے، راحت و نعمت کے اندر مقام ابد میں شادابی ہے، عالی شان محفوظ مکان ہے، صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! ہم جنت کے لئے تیار ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ان شاء اللہ تعالیٰ کو، پھر آپ نے جہاد کا ذکر فرمایا اور اس کی ترغیب دی (ابن ماجہ، ابن حبان) ایک شخص نے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں عرض کیا کہ کیا جنت میں گھوڑے ہوں گے، مجھے گھوڑے اچھے لگتے ہیں، آپ نے ارشاد فرمایا کہ اگر تجھے گھوڑا پسند ہے تو سرخ یا قوت کا طے گا وہ تجھے جہاں تیرا دل چاہے گا لے کر آئے گا، ایک شخص نے عرض کیا مجھے اونٹ پسند ہیں کیا جنت میں اونٹ ہوں گے، فرمایا اے عبد اللہ! اگر تو جنت میں گیا تو تجھے وہ تمام چیزیں ملیں گی جن کو تیرا دل چاہیگا، اور جن سے تیری آنکھوں کو لذت ملے گی (ترمذی۔ بریدہ) حضرت ابوسعید الخدریؓ کی روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اہل جنت کے جب وہ چاہیں گے بچے بھی ہوں گے، حمل، وضع، جوانی، سب کچھ ایک ساعت میں ہو جائے گا (ابن ماجہ، ترمذی) ایک حدیث میں یہ کہ جب اہل جنت جنت میں ٹھہر جائیں گے تو بھائی بھائیوں کے مشاق ہوں گے، اس کا تخت اسکے پاس جائیگا، اور دونوں ملیں گے، اور دنیا میں جو کچھ انکے درمیان تھا اسکے متعلق سمجھو کریں گے، ایک کہے گا: وہ دن اور وہ مجلس یاد کر جس میں ہم نے اللہ سے دعا کی تھی (اس دن کی دعا کے باعث) اللہ نے ہماری بخشش فرمادی (بزار۔ السنن) سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ جنت والے بالوں سے صاف، بے ریش، خوش رو، سرمہ لگائے ہوئے تینتیس برس کی عمر کے، آدم کی پیدائش پر، انکا طول ساٹھ ہاتھ کا، اور عرض سات ہاتھ ہوگا (ترمذی۔ ابن معاذ) سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اہل جنت میں اپنی شخصیت وہ ہوگا جس کے ایک ہزار خادم اور بہتر بیویاں ہوں گی، اور جس کے لئے موتی، زبرجد، اور باقوت کا خیمہ نصب کیا جائے گا، اور جو جابیہ سے منشاء تک وسیع ہوگا، اور انکے سروں پر تاج ہوں گے، اور تاج کا معمولی ساموتی مشرق سے مغرب تک روشنی کرے گا (ترمذی۔ ابوسعید)۔

سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرماتے ہیں کہ میں نے جنت دیکھی، اسکے اناروں میں سے ایک انار پالان کے ہوئے اونٹ کی پشت کی طرح تھا، اور اسکا پرندہ سختی اونٹ کی طرح تھا، میں نے اس کی باندنی کو دیکھا اور اس سے پوچھا کہ تو کس کی ہے؟ اس نے کہا میں زید ابن حارثہ کی ہوں، اور جنت میں ایسی چیزیں ہیں جنہیں نہ کسی آنکھ نے دیکھا ہے، نہ کان نے سنا اور نہ کسی انسان کے دل پر ان کا خیال گزرا (مہلبی، ابوسعید الخدریؓ) حضرت کعب الاحبار فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو اپنے ہاتھ سے بنایا، اپنے ہاتھ سے تورات لکھی، اور اپنے ہاتھ سے جنت میں درخت لگائے، پھر اس سے کہا بول، جنت نے کہا قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ (اہل ایمان کامیاب ہوئے)۔

یہ ہیں جنت کی صفات، پہلے ہم نے ان کا اجمالی ذکر کیا، اسکے بعد تفصیلات بیان کیں، حضرت حسن بصریؒ نے جنت کے اوصاف کی ان الفاظ میں تفصیل بیان کی ہے کہ اسکے انار ڈول جیسے ہیں، اور اس کی نسوں میں نہ سڑنے والا پانی ہے، اور اس میں دودھ کی نہریں ہیں جن کا ذائقہ نہیں بدلتا، اور صاف شہد کی نہریں ہیں جو انسان نے صاف نہیں کیا، اور شراب کی نہریں ہیں جن میں پینے والوں کے لئے لذت ہے، وہ نیند میں مبتلا نہیں کرتی، اور نہ اسکے پینے سے سر میں درد ہوتا ہے، جنت میں وہ عجیب و غریب چیزیں ہیں جو نہ کسی آنکھ نے دیکھیں، نہ کسی کان نے سنیں، اور نہ کسی آدمی کے دل میں خیال پیدا ہوا، اسکے رہنے والے صاحب نعمت بادشاہ ہیں، تینتیس برس کی عمر کے، سب کی عمر ایک ہوگی، اور قد بھی یکساں یعنی آسمان میں ان کی لمبائی ساٹھ ہاتھ کی ہوگی، آنکھوں میں سرمہ لگائے ہوئے، جسم بالوں سے صاف، چہرہ داڑھی سے خالی، عذاب سے مامون، ہرے مانوس اور مطمئن، جنت کی نہریں یا قوت اور زبرجد کی کنکریوں میں بہتی ہیں، اسکے درخت، درختوں کی رگیں، اور انگور موتی ہیں، اور اسکے پھلوں کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں ہے، اور اسکی خوشبو پانچ سو برس کی مسافت تک محسوس کی جائے گی، اہل جنت کو جنت میں گھوڑے، اور اونٹ ملیں گے، جو نہایت سبک رفتار ہوں گے، انکی کاٹھیں، لگامیں، اور زین سب یا قوت کی ہوں گی، وہ ان جانوروں پر بیٹھ کر جنت کی سیر کریں گے، ان کی بیویاں بڑی بڑی آنکھوں والی خوریں ہوں گی، گویا پوشیدہ موتی ہوں، اور وہ عورتیں اپنی اگلیوں سے ستر لباس پہنیں گی، اسکے

باجود ستر لباسوں کے پیچھے سے انکی پنڈلی کا مغز صاف چمکے گا، اللہ تعالیٰ نے وہاں اخلاق کو برائی سے، اور جسموں کو موت سے پاک فرمایا ہے، جنتی وہاں نہ ٹھوکیں گے، نہ پاخانہ کریں گے، بلکہ پاخانہ پیشاب وغیرہ کے بجائے مشک کی خوشبو جیسی ڈکار لیں گے، اور انکے جسم سے ہینہ بنے گا، انھیں جنت میں صبح و شام رزق ملایا جائے گا، مگر وہاں رات نہیں آئے گی کہ صبح کے بعد شام آئے یا شام کے بعد صبح طلوع ہو، سب کے بعد، اور سب سے کم مرتبے کا حامل جو شخص جنت میں داخل ہوگا، وہ سو برس کی مسافت کے فاصلے تک سونے چاندی کے محلات، اور موتیوں کے خیمے دیکھے گا، اور اسکی آنکھوں کو اتنی قدرت دی جائے گی کہ وہ دور و نزدیک کی تمام چیزوں کو یکساں طور پر دیکھ سکے، اسکے پاس سونے کی ستر قابیں صبح کو اور ستر شام کو لائی جائیں گی، اور ہر قاب میں الگ ڈانٹے کا کھانا ہوگا، جنت میں ایک ایسا یا قوت ہے جس میں ستر ہزار گریں، اور ہر گھر میں ستر ہزار کمرے ہیں، جن میں نہ کہیں سوراخ ہے، اور نہ شکاف ہے۔

حضرت مجاہدؒ فرماتے ہیں کہ اہل جنت میں سب سے مع دلی مرتبے کا شخص وہ ہوگا جس کی سلطنت ایک ہزار سال کی مسافت کے بقدر ہوگی، اور وہ اپنی سلطنت کی انتہائی حدود تک بالکل اس طرح دیکھ سکے گا، جس طرح قریب کی چیزوں کو دیکھے گا، اور سب سے اعلا مرتبہ اس شخص کا ہوگا جو صبح و شام اپنے رب کی زیارت کرے گا، سعید ابن المسیبؒ فرماتے ہیں کہ جنت میں ایک حور ہے جس کا نام عیناء ہے جب وہ چلتی ہے تو اسکے دائیں بائیں ساٹھ ہزار خادائیں چلتی ہیں، اور وہ کہتی ہے امرا المعروف اور نبی عن المنکر کرنے والے کہاں ہیں، یحییٰ ابن معاذؒ فرماتے ہیں کہ دنیا چھوڑنا سخت ہے، اور اور جنت کا فوت ہونا سخت تر ہے، ترک دنیا حب آخرت ہے، یہ بھی حضرت ابو ہریرہؓ کا قول ہے طلب دنیا میں ذلت نفس ہے، اور طلب آخرت میں عزت نفس ہے، تعجب ہے اس شخص پر جو فنا ہو جانے والی چیز کی طلب کو ذلیل کرے، اور باقی رہنے والی چیز سے اعراض کر کے عزت نفس ترک کرے۔

اللہ تعالیٰ کی وجہ کرم کی روایت : قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا :-

لِّلَّذِينَ أَحْسَنُوا الْحُسْنٰی وَزِيَادَةٌ (پ ۸ آیت ۳۶)

جن لوگوں نے نیکی کی ہے ان کے واسطے خوبی (جنت) ہے اور مزید برآں (خدا کا دیدار)۔

یہ زیادتی اللہ تعالیٰ کی وجہ کرم کی روایت اور اس کا دیدار ہے، اور یہ ایک ایسی اعلا ترین لذت ہے جسے پاکر اہل جنت باقی تمام لذتیں اور نعمتیں بھول جائیں گے، کتاب النجۃ میں روایت الہی کی حقیقت بیان کی گئی ہے، اور کتاب وسنت سے اسکے وہ شواہد پیش کئے گئے ہیں جو اہل بدعت کے معقولات کی تکذیب کرتے ہیں، جریر ابن عبد اللہ البجلی کہتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بیٹھے ہوئے تھے، آپ نے چودھویں شب کے چاند کو دیکھ کر ارشاد فرمایا کہ تم اپنے رب کو اس طرح دیکھو گے جیسے یہ چاند دیکھتے ہو، تم چاند کو دیکھنے میں ایک دوسرے پر نہیں کرتے، اگر تم سے ہو سکے تو طلوع آفتاب اور غروب آفتاب سے پہلے کی نمازوں سے نہ تنھوا تمہیں ادا کر لیا کرو، اسکے بعد آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔

وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوبِهَا (پ ۸ آیت ۳۰)

اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ صبح کیا کیجئے، آفتاب نکلنے سے پہلے اور اسکے غروب سے پہلے۔

یہ روایت صحیحین میں ہے، امام مسلم اپنی صحیح میں حضرت مسیب سے روایت کرتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے آیت کریمہ ”وَلِلَّذِينَ أَحْسَنُوا الْحُسْنٰی وَزِيَادَةٌ“ تلاوت فرمائی اور ارشاد فرمایا کہ جب جنت والے جنت میں اور دوزخ والے دوزخ میں داخل ہو جائیں گے، تو ایک اعلان کرنے والا یہ اعلان کرے گا کہ اے اہل جنت! تم سے اللہ کا ایک وعدہ ہے، اور وہ اب تم سے پورا کرنا چاہتا ہے، جنتی کہیں گے کہ وہ وعدہ کیا ہے؟ کیا ہمارے وزن بھاری نہیں کرچکا، کیا ہمارے چہرے روشن نہیں کرچکا، کیا ہمیں جنت میں داخل نہیں کیا، اور دوزخ سے نہیں بچایا، فرمایا اسکے بعد حجاب اٹھ جائے گا، اور وہ لوگ اللہ تعالیٰ کی وجہ کرم کا دیدار کریں گے، اور کوئی چیز اس سے زیادہ محبوب انھیں حاصل نہیں ہوگی، روایت باری تعالیٰ کی حدیث متعدد صحابہ سے

مروی ہے، دیدار الہی کا شرف ہی تمام اچھائیوں اور خوبیوں کی انتہا اور تمام نعمتوں کی غایت ہے۔ گزشتہ سطور میں جنت کی جو نعمتیں مذکور ہوئیں وہ اس نعمت عظمیٰ کے سامنے حقیرہ جائیں گی، لقاء خداوندی اور دیدار الہی کی سعادت سے انھیں جو خوشی حاصل ہوگی اسکی کوئی انتہا نہیں ہوگی، بلکہ جنت کی لذتوں کو اس لذت سے کوئی نسبت ہی نہیں ہے، یہاں ہم اس موضوع پر مزید کلام نہیں کرنا چاہتے، کیوں کہ کتاب المحبت والشوق والرضا میں اس کا ذکر تفصیل سے آچکا ہے، یہاں صرف اتنا کہیں گے کہ جنت سے بندے کا مقصد اسکے علاوہ کچھ نہ ہونا چاہئے کہ وہاں مالک حقیقی سے ملاقات کا شرف حاصل ہوگا، جنت کی باقی نعمتوں میں تو چرہ اگاہوں میں چہرے والے جانور بھی تمہارے شریک ہیں۔

خاتمہ کتاب وسعت رحمت اللہ کا ذکر بطور فال نیک : جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نیک فال لینے کو پسند فرماتے تھے، ہمارے پاس ایسے اعمال نہیں ہیں جن سے ہم مغفرت کی امید رکھیں، اسلئے ہمیں نیک فال میں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتداء کرنی چاہئے، اور یہ امید کرنی چاہئے کہ اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت میں ہمارا انجام بخیر کرے گا، جس طرح ہم نے اس کی رحمت کے ذکر پر اپنی کتاب ختم کی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ (پ ۵ ر ۱۵ آیت ۴۱)

یشک اللہ تعالیٰ اس بات کو نہ بخشیں گے کہ ان کے ان کے ساتھ کسی کو شریک قرار دیا جائے اور اس کے سوا اور جتنے گناہ ہیں جس کے لئے منظور ہے گناہ بخش دیں گے۔

قُلْ يَا عِبَادِيَ الَّذِينَ آمَنُوا عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوا مِنْ رَحْمَةِ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِيعًا إِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ (پ ۲۳ ر ۳ آیت ۵۳)

آپ کہہ دیجئے کہ اے میرے بندوں جنھوں نے (کفر شرک کر کے) اپنے اوپر زیادتیاں کی ہیں کہ تم خدا کی رحمت سے ناامید مت ہو، بالیقین خدا تعالیٰ تمام گناہوں کو معاف فرمادے گا واقعی وہ بڑا بخشنے والا بڑی رحمت والا ہے۔

وَمَنْ يَعْمَلْ سُوءًا أَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهُ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللَّهَ يَحْدِثِ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا (پ ۵ ر ۳ آیت ۴۰)

اور جو شخص کوئی برائی کرے یا اپنی جان کا ضرر کرے پھر اللہ تعالیٰ سے معافی چاہے تو وہ اللہ تعالیٰ کو بڑی

مغفرت والا بڑی رحمت والا پائے گا۔

ہم اللہ تعالیٰ سے ہر اس لغزش کی معافی کے خواستگار ہیں جو اس کتاب میں یا دوسری کتابوں میں ہمارے قلم سے سرزد ہوئی ہو، اور ہم ایسے اقوال کے لئے بھی اللہ کی مغفرت چاہتے ہیں جو ہمارے اعمال کے موافق نہیں ہیں، اور ہم اللہ کے دین سے اپنی بصیرت آگمی اور علم کے دعویٰ کی بخشش چاہتے ہیں، ہمیں کہ اس علم و آگمی میں ہم سے تقصیر ہوئی ہے، اور ہر اس علم و عمل کی بھی جس سے ہم نے رب کریم کی خوشنودی کا قصد کیا، لیکن بعد میں غیر کا اختلاط کر بیٹھے، اور اس وعدے کی بھی جو ہم نے اپنے نفسوں سے کیا، پھر وفائے عہد میں کوتاہی کی، اور ہر اس نعمت کی بھی جو ہمیں عطا کی گئی اور ہم نے اسے معصیت میں استعمال کیا، اور اس عیب کی بھی جس سے ہم خود متصف تھے، لیکن ہم نے صراحتاً یا بطور اشارہ دوسروں کو اس عیب سے منسوب کیا، اور اس خیال کی بھی جو محض لوگوں کو دکھانے کے لئے، یا تصنع و تکلف کے بطور کسی کتاب کی تالیف، خطاب یا تدریس کا محرک بنا، ان تمام امور کی مغفرت چاہنے کے بعد ہم یہ اُمید کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہماری اس کتاب کے پڑھنے، بکھنے اور سننے والوں کو اپنی مغفرت اور رحمت سے نوازے گا، اور ہمارے تمام ظاہری، اور باطنی گناہوں اور خطاؤں سے درگزر فرمائے گا، اس لیے کہ اس کا کریم عام ہے، اسکی رحمت وسیع ہے اور تمام مخلوق پر اسکی عطا شامل ہے، ہم بھی اللہ ہی کی مخلوق ہیں، ہمارے پاس اسکے فضل و

کرم کے سوا کوئی وسیلہ نہیں ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی سورتھیں ہیں، ان میں سے اللہ تعالیٰ نے جن و انس، چرند پرند اور حشرات الارض کے درمیان ایک رحمت نازل فرمائی ہے، اسی ایک رحمت کے باعث وہ آپس میں ایک دوسرے سے عطف و محبت کا معاملہ کرتے ہیں، اور اس نے اپنی ننانوے رحمتیں پیچھے رکھی ہیں، ان سے قیامت کے دن اپنے بندوں پر رحم فرمائے گا (مسلم۔ ابو ہریرہ، سلمان فارسی)۔ روایت یکہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ عرش کے نیچے سے ایک تحریر نکالے گا، اس میں لکھا ہوگا کہ میری رحمت میرے غضب پر سبقت کر گئی، اور میں تمام رحم کرنے والوں میں سب سے زیادہ رحم والا ہوں، اسکے بعد دوزخ کے اندر سے جنتیوں سے دو گئے آدمی باہر نکلیں گے (بخاری و مسلم) ایک حدیث میں ہے کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ہم پر ہنستا ہوا تجلی فرمائے گا، اور ارشاد فرمائے گا مسلمانو! مژدہ ہو، تم میں سے کوئی ایسا نہیں ہے جس کے عوض میں نے کسی یہودی یا نصرانی کو دوزخ میں نہ ڈالا ہو (مسلم۔ ابو موسیٰ) سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ حضرت آدم علیہ السلام کی شفاعت انکی اولاد میں سے ایک لاکھ کے لئے اور ایک روایت کے مطابق ایک کروڑ کے لئے قبول فرمائے گا (طبرانی۔ انس) اللہ تعالیٰ قیامت کے دن مومنین سے فرمائے گا کہ کیا تمہیں میری ملاقات محبوب تھی؟ وہ عرض کریں گے ہاں! اے ہمارے رب! اللہ تعالیٰ فرمائے گا کیوں؟ وہ عرض کریں گے ہم نے حیرے عفو اور مغفرت کی امید کی تھی، اللہ تعالیٰ فرمائے گا، میں نے تمہارے لئے اپنی مغفرت واجب کر دی (احمد، طبرانی) ایک حدیث میں ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ فرمائے گا دوزخ سے ہر اس شخص کو نکال لو جس نے کسی دن میرا ذکر کیا تھا یا کسی جگہ مجھ سے ڈرا تھا (ترمذی۔ انس) سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب دوزخ میں اہل دوزخ جمع ہو جائیں گے، اور اہل قبلہ میں سے وہ لوگ بھی جمع ہو جائیں گے جن کو اللہ چاہے گا تو کفار مسلمانوں سے کہیں گے کیا تم مسلمان نہیں تھے؟ وہ کہیں گے کیوں نہیں! ہم مسلمان تھے، کفار کہیں گے پھر تمہارے اسلام سے کیا فائدہ ہوا، دوزخ میں تم ہمارے ساتھ ہو، وہ کہیں گے ہم نے گناہ کئے تھے، ان گناہوں کی وجہ سے ہماری پکڑ ہوئی، اللہ تعالیٰ ان کی گفتگو سنے گا، اور دوزخ میں سے اہل قبلہ کو نکالنے کا حکم دے گا، وہ نکلیں گے، جب کفار انھیں دیکھیں گے تو (حسرت سے) کہیں گے کہ کاش ہم بھی مسلمان ہوتے، آج ان کی طرح دوزخ سے نکل جاتے، اسکے بعد سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی :-

رَبِّمَا يَوْئُلُ الْكَافِرِينَ كَفَرُوا وَلَوْ كَانُوا مُسْلِمِينَ (پ ۱۳ آیت ۲)

کافر لوگ بار بار تمنا کریں گے کیا خوب ہوتا اگر وہ مسلمان ہوتے۔

سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر بچے پر ماں کی شفقت سے زیادہ شفقت کرتا ہے (بخاری و مسلم۔ عمر ابن الخطاب) حضرت جابر ابن عبد اللہؓ روایت کرتے ہیں کہ قیامت کے دن جس شخص کی نیکیاں گناہوں سے زیادہ ہوں گی وہ بلا حساب جنت میں داخل ہوگا، اور جس کی نیکیاں اور گناہ برابر ہوں گے اس کا معمولی حساب ہوگا پھر وہ جنت میں داخل ہو جائیگا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت اس شخص کے لئے ہوگی جس نے خود کو ہلاک کر ڈالا ہو، اور جس کی کمر گناہوں کے بوجھ سے جھک گئی ہو۔

روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ارشاد فرمایا اے موسیٰ! سے قارون نے فریاد کی تھی، مگر تم نے اسکی فریاد پوری نہیں کی، قسم ہے اپنی عزت و جلال کی! اگر وہ مجھ سے فریاد کرتا تو میں اسکی فریاد پوری کرتا، اور اسے معاف کر دیتا، سعد ابن بلال کہتے ہیں کہ قیامت کے دن دو آدمیوں کو دوزخ سے نکالے جانے کا حکم ہوگا، پھر اللہ تعالیٰ ان سے فرمائے گا کہ یہ تمہارے اعمال کی سزا ہے، اس کے بعد حکم ہوگا کہ انھیں دوزخ میں واپس لے جاؤ، یہ حکم سنتے ہی ایک شخص پیابہ زنجیر دوڑتا ہوا دوزخ میں جا کرے گا، اور دوسرا کھٹکتا ہوا چلے گا، انھیں پھر دوزخ سے باہر لایا جائے گا، اور ان سے انکی حرکت کا سبب پوچھا جائیگا، ایک تو تیز دوڑتا ہوا دوزخ میں جا پڑا، اور دوسرے نے گھٹ گھٹ کر قدم اٹھائے، دوڑنے والا عرض کرے گا کہ میں تیری نافرمانی کے وبال

سے خوفزدہ تھا، اس لئے اب نافرمانی کر کے مزید غضب کا مستحق بننا نہیں چاہتا تھا، دوسرا عرض کرے گا مجھے تیرے ساتھ حسن ظن تھا اور میں یہ سوچ رہا تھا کہ تو مجھے دوزخ میں سے نکال کر دوبارہ اس میں نہیں ڈالے گا، چنانچہ ان دونوں کو جنت میں داخل کر دیا جائے گا، سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے قیامت کے دن عرش کے نیچے سے ایک اعلان کرنے والا یہ اعلان کرے گا اے امت محمدیہ تم پر میرے جو حقوق واجب تھے وہ میں نے معاف کر دیئے ہیں، اب تمہارے ایک دوسرے کے حقوق باقی رہ گئے ہیں، وہ تم معاف کرو اور میری رحمت سے جنت میں داخل ہو جاؤ (سبعائیات ابن الاسعد القشیری۔ الس ۴) ایک اعرابی نے حضرت عید اللہ ابن عباسؓ کو قرآن کریم کی یہ آیت تلاوت کرتے ہوئے سنا۔

كُنْتُمْ عَلَيَّ شَفَاعَةً مِنْ النَّارِ فَانْقَذَكُمْ مِنْهَا (پ ۲۴ آیت ۴۳)

اور تم لوگ دوزخ کے گڑھے کے کنارے پر تھے، سو اس سے اللہ تعالیٰ نے تمہاری جان بچائی۔

یہ آیت سن کر اعرابی کہنے لگا بخدا اس نے بچایا تو نہیں بلکہ وہ تو اس میں ڈالنا چاہتا ہے، حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا اس نا سمجھ کی بات سنو، مناجی روایت کرتے ہیں کہ میں حضرت عروا بن الصامت کی خدمت میں حاضر ہوا، اس وقت وہ مرض وفات میں گرفتار تھے، میں (انھیں اس حال میں دیکھ کر) رونے لگا، آپ نے فرمایا مبر کو ہیوں روتے ہو، بخدا سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہوئی ہر وہ حدیث تم سے بیان کر دی ہے، جس میں تمہارے لئے خیر ہے، سوائے ایک حدیث کے، اور وہ حدیث آج بیان کرتا ہوں۔ اس وقت جب کہ میں گھر جا چکا ہوں۔ میں نے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے جو شخص یہ گواہی دیتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں، اللہ تعالیٰ اس پر دوزخ حرام کر دیتا ہے، (مسلم) حضرت عبد اللہ ابن عمرو ابن العاصؓ روایت کرتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ میری امت کے ایک شخص کو تمام لوگوں کے سامنے لائے گا، اور اس پر ننانوے رجسٹر کھولے جائیں گے، ہر رجسٹر حد نظر تک وسیع ہوگا، پھر اس سے اللہ تعالیٰ فرمائے گا کیا وہ ان اعمال ناموں میں سے کسی عمل کا انکار کرتا ہے، کیا میرے محافظ فرشتوں نے تجھ پر ظلم کیا ہے، وہ عرض کرے گا نہیں اے رب کریم! اللہ تعالیٰ فرمائے گا ہاں ہمارے پاس تیری ایک نیکی ہے، اور آج کے دن کسی پر کوئی ظلم نہیں ہوگا، چنانچہ ایک کارڈ نکالا جائے گا اس پر لکھا ہوگا ”اَشْهَدُ اَنْ لَا اِلَهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللّٰهِ“ وہ شخص عرض کرے گا یا اللہ ان (لبے جوڑے) رجسٹروں کے سامنے اس (نبولی) کارڈ کی کیا حقیقت ہے، اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ تجھ پر ظلم نہیں ہوگا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں پھر تمام رجسٹر ایک پلڑے میں، اور یہ کارڈ دوسرے پلڑے میں رکھا جائے گا، رجسٹر ہلکے پڑ جائیں گے، اور کارڈ بھاری رہے گا، اس لئے کہ اللہ کے نام سے زیادہ کوئی چیز بھاری نہیں ہو سکتی (ابن ماجہ، تفسیر) ایک طویل حدیث کے آخر میں جس میں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے قیامت اور صراط کا ذکر کیا ہے، یہ ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ملائکہ سے فرمائے گا جس کے دل میں دینار کے برابر بھی خیر ہو اس کو دوزخ سے باہر نکال لو، فرشتے ایسے لوگوں کو نکالیں گے، اور اس طرح بے شمار مخلوق باہر نکل آئے گی، فرشتے عرض کریں گے، یا اللہ! تو نے جن لوگوں کے متعلق حکم دیا تھا ہم نے ان میں سے کسی کو نہیں چھوڑا، پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا واپس جاؤ، اور جس کے دل میں ذرہ برابر بھی خیر ہو اسے دوزخ سے نکالو، چنانچہ بے شمار مخلوق باہر نکل آئے گی، فرشتے عرض کریں گے، یا اللہ! تو نے جن لوگوں کے متعلق ہمیں حکم دیا تھا ان میں سے کوئی بھی دوزخ میں باقی نہیں رہا ہے، ابو سعید الخدریؓ یہ روایت بیان کر کے فرماتے تھے کہ اگر تم اس حدیث کے سلسلے میں میری تصدیق نہ کرو تو یہ آیت پڑھ لو۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِنْقَالَ ذَرَّةً وَاِنْ نَّكَ حَسَنَةً يَّمَسَّ عِظْفَهَا وَيُؤْتِ مِنْ لَدُنْهُ اَجْرًا عَظِيْمًا (پ ۲۵ آیت ۴۰)

بلاشبہ اللہ تعالیٰ ایک ذرہ برابر بھی ظلم نہ کریں گے، اور اگر نیکی ہوگی تو اسکو کئی گنا کریں گے، اور اپنے

پاس سے اور اجر عظیم دیں گے۔

راوی کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرمائے گا ملائکہ نے شفاعت کی انبیاء نے شفاعت کی، مومنین نے شفاعت کی، اب صرف ارحم الراحمین باقی رہ گیا ہے، یہ کہہ کر دونوں میں سے ایک مٹھی بھر کر اپنے آدمیوں کو نکالے گا جنہوں نے کبھی نیک عمل نہیں کیا تھا، اور جو (دونوں میں پڑے پڑے) کوئلہ ہو گئے تھے، دونوں سے نکال کر انہیں جنت کے دروازوں کے سامنے بنی سریش ڈال دیا جائے گا جسے نہر حیات کہتے ہیں، اس نہر میں غسل کر کے وہ ایسے نکلیں گے جیسے روکے پانی سے سبزہ نکل آتا ہے، تم دیکھتے نہیں کہ وہ سبز پتھر اور درخت کے قریب ہوتا ہے چنانچہ اس کا جو حصہ آلاب سے متصل ہوتا ہے وہ زرد اور سبز ہوتا ہے، اور جو سائے میں ہوتا ہے وہ سفید ہوتا ہے، صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! گویا آپ نے جنگل میں چرا لیا تھا، آپ نے فرمایا پھر وہ لوگ ایسے نکلیں گے جیسے موتی، انکی گردنوں میں مہرے ہوں گی، ان کی وجہ سے اہل جنت انہیں پہچانیں گے، اور کہیں گے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے آزاد کردہ ہوئے ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ نے کسی عمل خیر کے بغیر جنت میں داخل کیا ہے، پھر اللہ تعالیٰ ان سے فرمائے گا تم جنت میں داخل ہو، جو تمہیں نظر آئے وہ سب تمہارا ہے، وہ عرض کریں گے اے اللہ! تو نے ہمیں اتنا عطا کر دیا ہے کہ دنیا والوں میں سے کسی کو اتنا عطا نہیں کیا، اللہ تعالیٰ فرمائے گا تمہارے لئے میرے پاس اس سے بھی عمدہ نعمت ہے، وہ عرض کریں گے اس سے افضل چیز کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا تم سے میری رضا میں اس کے بعد تم پر بھی ناراض نہیں ہوں گا (بخاری و مسلم)۔

حضرت عبداللہ ابن عباس سے مروی ہے کہ ایک دن سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس تشریف لائے اور ارشاد فرمایا کہ میرے سامنے اتنی پیش کی گئیں، ایک نبی گزرنا اور اس کے ساتھ ایک آدمی ہوتا کسی نبی کے ساتھ دو آدمی ہوتے، اور کسی کے ساتھ کوئی بھی نہ ہوتا، اور کسی کے ساتھ گروہ ہوتا پھر میں نے ایک زہد دست جمع دیکھا اور مجھے یہ توقع ہوئی کہ شاید یہ میری امت کے لوگ ہیں مجھ سے کہا گیا کہ موسیٰ علیہ السلام اور ان کی امت ہے، پھر مجھ سے کہا گیا دیکھو میں نے ایک زہد دست جمع دیکھا جس سے اقلی چھپ گیا، مجھ سے کہا گیا کہ اسی طرح دیکھتے رہو، چنانچہ میں نے بے پناہ غفلت دیکھی، مجھ سے فرمایا گیا کہ یہ آپ کی امت ہے، اور اس کے ساتھ ستر ہزار آدمی بلا حساب جنت میں داخل ہوں گے، لوگ منتشر ہو گئے، اور سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بیان نہیں فرمایا کہ وہ ستر ہزار آدمی کون ہوں گے، اس پر صحابہ نے ایک دوسرے سے کہا ہم تو شرک میں پیدا ہوئے تھے، لیکن بعد میں ہم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لے آئے، وہ لوگ ہمارے بیٹے ہوں گے، اس گفتگو کی خبر سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہوئی، آپ نے ارشاد فرمایا کہ یہ وہ لوگ ہوں گے جو نہ داخل کھائیں نہ منخرن دھیں نہ بدقالی کریں، اور صرف اپنے رب پر توکل کریں، عکاشہ نے کھڑے ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! دعا فرمائیے اللہ تعالیٰ مجھے ان میں سے کرے، آپ نے ارشاد فرمایا تو ان میں سے ہے پھر دو سرا شخص کھڑا ہوا اور اس نے بھی وہی کہا جو عکاشہ نے کہا تھا، آپ نے فرمایا عکاشہ تم پر سبقت لے گیا (بخاری) عمرو ابن حزم الانصاری کہتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم تین روز ہم سے غائب رہے، آپ صرف فرض نماز ادا کرنے کے لئے تشریف لاتے اور نماز کے بعد واپس تشریف لے جاتے، چوتھے روز آپ ہمارے پاس تشریف لائے ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ! آپ ہم سے غائب رہے یہاں تک کہ ہمیں یہ خیال ہوا کہ شاید کوئی حادثہ رونما ہوا ہے، آپ نے ارشاد فرمایا خیر کی بات وقوع پذیر ہوئی ہے، میرے رب نے مجھ سے وعدہ فرمایا ہے کہ وہ میری امت میں سے ستر ہزار آدمیوں کو بلا حساب جنت میں داخل کرے گا، میں نے اپنے رب سے ان تین دنوں میں یہ تعداد زیادہ کرنے کی دعا مانگی، تو میں نے اپنے رب کو بڑائی والا، ہر چیز کو موجود رکھنے والا، اور کرم والا پایا، اور اس نے ستر ہزار میں سے ہر شخص کے ساتھ ہزار آدمی کی بخشش کا وعدہ فرمایا میں نے عرض کیا یا اللہ! کیا میری امت کی یہ تعداد ہو جائے گی، فرمایا ہم آپ کے لئے یہ تعداد اعراب میں سے پوری کر دیں گے (یعنی ابو سہل، احمد، ابو بکر)۔

حضرت ابو ذرؓ کی روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا حق کی جانب سے جبرئیل علیہ السلام میرے

تمام

کتاب ادعیہ عملیات و تقویٰ ذات طبع و معالجات

آئینہ عملیات	مغربی عملیات و تقویٰ ذات	مولانا عزیز الرحمن
اصلی جواہر خمسہ	عملیات کی مشہور کتاب	شاہ محمد رفیع گویا ری بجلد
اصلی بیاض محمدی	مغربی عملیات و تقویٰ ذات	شیخ محمد تھانوی
اعمال فتر آفی	قرآنی وظائف و عملیات	مولانا اشرف علی تھانوی
مکتوبات و بیاض یعقوبی	علمائے دیوبند کے مغربی عملیات و تقویٰ	مولانا محمد یعقوب
بیماریوں کا گھریلو علاج	ہر وقت پیش آنے والے گھریلو نسخے	
جنات کے پراسرار حالات	ان سے محفوظ رہنے کی تدابیر	فیہر حسین حسینی
حصن حصین	عربی دعائیں مع ترجمہ اور شرح اردو	امام ابن جزائی
خواص حبنا اللہ و نعم الوکیل	اردو	شیخ ابوالحسن شاذلی
ذکر اللہ اور فضائل درود و شریف		مولانا مفتی محمد شفیع
ذاد السعد	فضائل درود و شریف	مولانا اشرف علی تھانوی
شمس المعارف الکبریٰ	تقویٰ ذات و عملیات کی مستند کتاب	علامہ بونی
طب جسمانی و روحانی	ایک مستند کتاب	امام غزالی
طب روحانی مع خواص القرآن	تدریسی عملیات	مولانا محمد ابراہیم دہلوی
طب نبوی کلاں اردو		امام ابن القیم الجوزی بجلد
طب نبوی ضرور	آنحضرت کے فرمودہ علاج و نسخے	حافظ اکرام الدین
علاج الغرباء	طب یونانی کی مقبول کتاب جس میں مستند نسخے درج ہیں	
کیالات عزیز	حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے مغربی عملیات	
میرے والد ماجد اور ان کے مغربی عملیات		مولانا مفتی محمد شفیع
مناجات مقبول مترجم	دعاؤں کا مستند و مقبول مجموعہ	مولانا اشرف علی تھانوی
مناجات مقبول	عربی بہت چمکنا جیسی سائز	مولانا اشرف علی تھانوی
مناجات مقبول	انقسم میں مکمل اردو ترجمہ	مولانا اشرف علی تھانوی
نقش سلیمانی	عملیات و نقوش و تقویٰ ذات کی مشہور کتاب	خواجہ اشرف گھنوی
مشکل کشا	تمام دینی و دنیوی مقاصد کے لئے مجربے مائیں	مولانا احمد سعید دہلوی
مصیبت کے بعد راحت مع راد دافع الافلاس		مولانا مفتی محمد شفیع
نافع الخلائق	عملیات و تقویٰ ذات کی مشہور کتاب	حاجی محمد زرارہاں
مجموعہ وظائف کلاں	مستند ترین نسخہ	

دارالاشاعت اردو بازار کراچی فون ۲۱۳۷۹۸

زیر نگرانی کتب مفت
ذکر کے لئے طلب فرمائیں

عورتوں اور بچوں کے لئے بہترین اسلامی کتابیں

اسوہ رسول اکرمؐ	حدیث کی مستند کتب سے زندگی کے ہر پہلو کے متعلق جامع ہدایات۔ ڈاکٹر عبدالمطی
اسوہ صحابیات اور سیر الصحابیات	صحابی خواتین کے حالات مولانا عبد السلام ندوی
تاریخ اسلام کامل	سوال و جواب کی صورت میں مکمل سیرت طیبہ مولانا محمد میاں
تعلیم الاسلام	(اردو) سوال و جواب کی صورت میں عقائد اور احکام اسلام مفتی محمد کفایت اللہ
تعلیم الاسلام	(انگریزی) سوال و جواب کی صورت میں عقائد اور احکام اسلام زبان انگریزی
رسول عربؐ	آسان زبان میں سیرت رسول اکرمؐ اور نعمتیں
رحمت عالمؐ	آسان زبان میں مستند سیرت طیبہ مولانا سید سلیمان ندوی
بیماریوں کا گھریلو علاج	ہر قسم کی بیماریوں کے گھریلو علاج و شفے طیبہ ام الفضل
اسلام کا نظام عفت و عصمت	اپنے موضوع پر محققانہ کتاب مولانا ظفر الدین
آداب زندگی	چار چھوٹی کتابوں کا مجموعہ حقوق و معاشرت پر مولانا اشرف علی
بہشتی زیور	(کامل گیارہ جلد) احکام اسلام اور گھریلو امور کی جامع مشہور کتاب
بہشتی زیور	(انگریزی ترجمہ) احکام اسلام اور گھریلو امور کی جامع کتاب زبان انگریزی
تحفۃ العروس	صنف نازک کے موضوع پر اردو زبان میں پہلی جامع کتاب محمود صدیقی
آسان نماز	نماز مکمل بخشش کلمے اور چالیس مسنون دعائیں مولانا محمد عاشق اللہ
شرعی پردہ	پردہ اور حجاب پر عمدہ کتاب
مسلم خواتین کیلئے بیس سبق	عورتوں کے لئے تسلیم اسلام
مسلمان بیوی	مرد کے حقوق عورت پر مولانا محمد ادریس انصاری
مسلمان خاوند	عورت کے حقوق مرد پر
میاں بیوی کے حقوق	عورتوں کے وہ حقوق جو مرد ادا نہیں کرتے مفتی عبد الغنی
نیک بیبیاں	چار مشہور صحابی خواتین کے حالات مولانا مفرح مبین
خواتین کیلئے شرعی احکام	عورتوں سے متعلق جملہ مسائل اور حقوق ڈاکٹر عبدالمطی ماری
تنبیہ الغافلین	چھوٹی چھوٹی قیمتی نصیحتیں مکیہ از اقوال اور صحابہ اور ادیب اللہ کے حوالہ فقیر علی
آنحضرت کے ۳۰۰ معجزات	آنحضرت ۳۰۰ معجزات کا مستند ذکر
قصص الانبیاء	انبیاء علیہ السلام کے قصوں پر مشتمل جامع کتاب مولانا طاہر سورتی
حکایات صحابہ	صحابہ کرامؓ کی حکیمانہ حکایات اور واقعات مولانا زکریا صاحب
گناہ بے لذت	ایسے گناہوں کی تفصیل جس سے ہم کوئی فائدہ نہیں اور ہم مبتلا ہیں
وارثہ اشاعت	نہایت مفید ڈک کے مفت بیچ کر دینا اور کراچی فون ۲۱۳۷۸